نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱ | ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

میرا خدا

مہاتما گاندھی

ایک ان جانی بوجھی قوت ہے جو ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے، میں اسے دیکھتا تو نہیں مگر محسوس کرتا ہوں۔ یہی وہ ان دیکھی قوت ہے جو محسوس ہوتی ہے پر ثابت نہیں ہو سکتی ہے اس لئے کہ وہ ان سب چیزوں سے نرالی ہے جنہیں میں حواس سے پہچانتا ہوں، یہ حواس کی سرحد سے پرے ہے۔ پھر بھی خدا کی ہستی کی تھوڑی بہت دلیل تو ہم دے سکتے ہیں۔ ..

روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم دیکھتے ہیں لوگ یہ نہیں جانتے کون حکومت کرتا ہے کیوں کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے پر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ کوئی قوت ہے اور اس کی حکومت ہے۔ پچھلے سال میسور کے دورے میں، میں بہت سے غریب دیہاتیوں سے ملا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ نہیں جانتے کہ میسور پر کون حکومت کرتا ہے، بس انھوں نے اتنا ہی کہا کہ کسی دیوتا کی حکومت ہے۔ جب ان غریبوں کا علم اپنے حکمراں کے بارے میں اس قدر محدود تھا، تو میں جو خدا کے سامنے اس سے کہیں زیادہ ناچیز ہوں جتنے وہ اپنے حکمراں کے مقابلے میں تھے، اس پر کیوں تعجب کروں کہ میں اس احکم الحاکمین کے وجود کا ادراک نہیں کر سکتا۔

پھر بھی مجھے یہ احساس ضرور ہے جیسا ان غریب دیہاتیوں کو میسور کے بارے میں تھا کہ سنسار میں نظم اور ترتیب ہے، ہر چیز جو وجود رکھتی ہے اور ہر شخص جو جان رکھتا ہے، ایک اٹل قانون کے ماتحت ہے۔ یہ کوئی اندھا قانون نہیں، اس لئے کہ جانداروں کا عمل کسی اندھے قانون کے تابع نہیں ہو سکتا اور سر جے۔ سی۔ بوس کی حیرت انگیز تحقیقات کی بدولت اب یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مادے میں بھی جان ہے۔

یہی قانون جس کی عملداری کل عالم حیات میں ہے، خدا ہے۔ قانون اور اس کا بنانے والا ایک ہی ہے؛ اس قانون کا یا اس کے بنانے والے کا محض اس وجہ سے منکر نہیں ہونا چاہئے کہ اس کے بارے میں میرا علم اس قدر محدود ہے۔ جس طرح کسی دنیاوی قوت کے وجود کا انکار یا اس سے ناواقفیت مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اسی طرح خدا اور اس کے قانون سے منکر ہونے سے میں اس کی عملداری سے نہیں بچ سکتا۔ پر حکومت الٰہی کو بے چون و چرا مان لینے سے سفر حیات سہل ہو جاتا ہے، جیسے کسی دنیاوی حکومت کو تسلیم کر لینے سے اس کے ماتحت زندگی بسر کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مجھے کچھ دھندلا سا ادراک ہوتا ہے کہ گو میرے آس پاس ہر چیز نت نیا چولا بدلتی ہے، نت نئی موت مرتی ہے، پر اس سارے تغیر کی تہ میں ایک زندہ قوت ہے جو تغیر سے بری ہے، جو سنسار کو سادھے ہوئے ہے۔ جو بناتی ہے مٹاتی ہے اور پھر نئے سرے سے بناتی ہے۔ یہی اندرونی قوت یا روح خدا ہے، اور چونکہ اور سب چیزیں جن کا ادراک صرف حواس سے ہوتا ہے، نہ قائم رہ سکتی ہیں اور نہ رہتی ہیں، اس لئے حقیقی وجود صرف اسی کا ہے۔

اچھا تو یہ قوت خیر کی ہے یا شر کی؟ میں تو خالص خیر کی سمجھتا ہوں، اس لئے کہ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ موت کے درمیان زندگی قائم ہے۔ باطل کے درمیان حق قائم ہے، ظلمت کے درمیان نور قائم ہے۔ اس سے میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ خدا زندگی ہے، حق ہے، نور ہے۔ وہ محبت ہے۔ وہ خیر اعلیٰ ہے۔ لیکن خدا وہ نہیں جو صرف ہمارے ذہن کو مطمئن کر دے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ ذہن کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی خدائی یہ ہے کہ وہ دل پر حکومت کرے اور اس کی کایا پلٹ دے، وہ اپنے بھگت کے چھوٹے چھوٹے عمل پر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اس کے لئے ایک خاص معرفت درکار ہے اور وہ اتنی گہری حقیقت رکھتی ہے جو حواس خمسہ کے ادراک کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حسی ادراک میں، چاہے وہ ہمیں کتنا ہی حقیقی معلوم ہوتا ہو، دھوکا ہو سکتا ہے اور اکثر ہوتا ہے۔ مگر جو معرفت حواس کے بغیر حاصل ہوتی ہے کبھی خطا نہیں کرتی۔ اس کا ثبوت خارجی شہادتوں سے نہیں بلکہ اس سے ملتا ہے کہ جن عارفوں نے خدا کو اپنے اندر پایا ہے، ان کی سیرت اور عمل میں کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔

اس طرح کی شہادت دنیا کے سب ملکوں کے اندر پیمبروں اور رشیوں کے اٹوٹ سلسلے کی واردات قلب میں ملتی ہے۔ اس شہادت کا منکر ہونا گویا اپنی ذات کا انکار کرنا ہے۔

معرفت سے پہلے اٹل عقیدہ ہونا چاہئے۔ جو شخص اپنی ذات میں خدا کے وجود کا امتحان کرنا چاہتا ہے اسے جیتا جاگتا عقیدہ درکار ہے اور چونکہ خود عقیدے کا بھی کوئی خارجی معیار نہیں ہے اس لئے سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی اخلاقی حکومت پر عقیدہ رکھیں، یعنی یہ مانیں کہ اخلاقی قانون کی حق اور محبت کے قانون کی عملداری ہے، اگر ہم دل میں ٹھان لیں کہ ہر چیز کو جو حق اور محبت کے منافی ہے، رد کر دیں گے تو عقیدے سے کام لینے میں کوئی خطرہ نہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں کہ لوگوں کو عقل کی رو سے قائل کر دوں۔ عقیدہ عقل سے برتر ہے۔ میں تو یہی رائے دے سکتا ہوں کہ ان ہونی چیز کی کوشش نہ کرو۔ میں وجود شر کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کر سکتا۔ اس کا حوصلہ کرنا تو خدا کی برابری کرنا ہے۔ چنانچہ میں عجز و انکسار سے شر کے وجود کو تسلیم کرتا ہوں اور خدا کو اسی وجہ سے صبر و تحمل کا دھنی کہتا ہوں کہ وہ دنیا میں شر کو برداشت کرتا ہے۔ خود اس کی ذات شر سے بری ہے۔ پھر بھی اگر شر ہے تو اسی کی طرف سے گو وہ اس سے آلودہ نہیں — میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں خدا کو ہرگز نہیں پہچان سکتا، اگر میں شر سے لڑوں چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ میرے ناچیز اور محدود تجربے نے میرے اس عقیدے کو پختہ کر دیا ہے جتنا میں گناہ سے پاک ہونے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی مجھے خدا کا قرب محسوس ہوتا ہے۔ میں اس سے کتنا زیادہ قریب ہوتا اگر میرا عقیدہ محض برائے نام نہ ہوتا جیسا کہ آج ہے بلکہ ہمالیہ کی طرح اٹل اور اس کی چوٹیوں پر جمے ہوئے برف کی طرح پاک و صاف ہوتا۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
میرا خدا	مہاتما گاندھی	صفحہ ۱
امن کا سرچشمہ	خواجہ غلام السیدین	؍؍ ۲
نئی روشنی کا پس منظر	(ادارہ)	؍؍ ۳
بزم بے تکلف		؍؍ ۴
پچھلا ہفتہ (۱) ہندوستان		؍؍ ۵
(۲) پاکستان		؍؍ ۶
مغربی دنیا		صفحہ ۷
مسافر ابدی (نظم)	روش صدیقی	؍؍ ۸
نیا سورج (؍؍)	معین احسن جذبی	؍؍ ۸
ہندوستانی مسلمانوں سے		؍؍ ۹
بچہ محبت کا بھوکا ہے		؍؍ ۱۰
اشتہارات		؍؍ ۱۲

قیمت فی پرچہ تین آنے

امن کا سرچشمہ

خواجہ غلام السیدین

چارلس ڈکنس نے اپنے ناول "دو شہروں کی کہانی" میں انقلاب فرانس کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "یہ بہترین زمانہ تھا، یہ بدترین زمانہ تھا، یہ ایمان کا دور تھا، یہ شک کا دور تھا، یہ امید کی حسین بہار تھی، یہ مایوسی کا ٹھٹھرتا جاڑا تھا۔" ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال رہا ہے۔ اسی سال ہم آزادی سے ہمکنار ہوئے، اور امید صبح کے ستارے کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی، اور اسی سال کے دوران میں ہم میں سے بہت سے لوگ اپنی عقل اور سمجھ، اپنی شرافت اور انسانیت کھو بیٹھے، اور انھوں نے ایسے ایسے جرم اور سیاہ کاریاں کیں جن کی وجہ سے شریف انسانوں پر مایوسی کی تاریک گھٹا چھا گئی اور انہیں یہ شبہ ہونے لگا کہ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہے، انھوں نے جو قیمت ادا کی ہے اس پر کہیں یہ سودا بہت مہنگا تو نہیں پڑا!

اس فرقہ وارانہ کشمکش اور جنون کی حالت میں جب اخلاق کے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور ایمان کے قدموں میں لغزش تھی، جب اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ گئے تھے، ایک بزرگ تھا جو استقلال اور شانتی کے ساتھ چلتا رہا اور جوں جوں اندھیرا بڑھتا گیا اس کی روشنی تیز ہوتی گئی، مہاتما گاندھی! شریف اور نیک نیت لوگ جن کی ہمت جواب دے چکی تھی، بس اسی ایک شخص کی نظر اور جرأت اور قیادت پر آسرا لگائے ہوئے تھے اور ان کی امید ٹھیک نکلی۔ اس بڈھے مرد مجاہد نے رجعت پسندی اور تعصب کی تمام خوفناک قوتوں پر بہادری کے ساتھ دھاوا بول دیا اور گو اس کو کبھی کبھی ایک لالۂ صحرائی کی طرح اپنی تنہائی کا احساس ہوتا اور اپنی پکار صدا بہ صحرا معلوم ہوتی لیکن اس نے آہستہ آہستہ ان تھک محنت اور بے انتہا صبر کے ساتھ ہندوستانی ریاست کے طوفان زدہ جہاز کو امن اور عافیت کے ساحل کی طرف کھینچا۔ امریکہ کے مشہور افسانہ نویس سٹیفین ونسنٹ بینٹ نے اپنی ایک بہت اچھی کہانی میں دکھایا ہے کہ مشہور امریکی وکیل ڈینیل وبسٹر کس طرح اپنے موکل جبے برسٹون کی روح کے لئے شیطان کے ساتھ جد وجہد کرتا ہے اور آخرکار اپنا مقدمہ جیت لیتا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی کے آخری دور کا خیال کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے موکل، یعنی اپنے پیارے وطن کو روحانی موت سے بچانے کے لئے دراصل شیطانی قوتوں کے ساتھ رسہ کشی کر رہے تھے۔ انھوں نے دوبارہ مبارزانہ انداز میں انسانی ضمیر کے سامنے اس پرانے سوال کو پیش کیا "کیا فائدہ ہوگا انسان کو اگر وہ ساری دنیا جیت لے، لیکن اپنی روح کو کھو بیٹھے؟" کیا فائدہ ہوگا اگر ہندوستان اپنی سیاسی آزادی حاصل کر لے، لیکن اس کے بدلے اپنی روح کی بیش بہا دولت ہار دے، یعنی اپنی امن اور رفاقت کی جستجو، جان کا احترام، رواداری، دل کی فراخی؟"

انھوں نے اس مسئلے پر اپنی جان کی بازی لگا دی اور جب ایمان کی آزمائش کا وقت معہود آیا تو انھوں نے اس شان سے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی کہ ہونٹوں پر رام کا نام تھا اور اطمینان کا تبسم ان کے چہرے پر کھیل رہا تھا۔ اس دل ہلا دینے والی قربانی سے انھوں نے ظلم اور انتقام کے نہ بند ہونے والے سلسلے کو توڑا۔ سب جماعتوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی حرکتوں پر غور کریں اور اس طرح ہندوستان اور پاکستان دونوں کو (شاید) ایک نہایت زبردست سیاسی اور اخلاقی خطرے سے بچا لیا۔ انہوں نے اپنی زندگی سے دوبارہ اس صداقت کو آشکار کیا کہ اگر ایک شخص کی ذات میں بھی عشق کی گرمی اور ایمان کی پختگی پیدا ہو جائے تو وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے یعنی

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغ خودی   ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

جس چیز نے گاندھی جی کو اس دور کا سب سے بڑا ہندوستانی بنایا، اسی نے انہیں دنیا کا ایک بڑا شہری اور بین الاقوامی امن اور مفاہمت کا ایک بڑا ستون بھی بنا دیا۔ ان کی خاص صفات کیا تھیں؟ ان کی عالمگیر انسان دوستی جو سب انسانوں کو بلا تفریق نسل و رنگ، مذہب و ملت دل میں جگہ دینے کو تیار تھی، ان کی محبت جس کی آغوش ہر شخص کے لئے کھلی ہوئی تھی اور جو اپنے اثر سے دوسروں کے دل میں بھی محبت کا چراغ روشن کر دیتی تھی۔ ان کی گہری ہمدردی اور دل سوزی جو ہر کسی کے دکھ درد اور مظلومی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتی تھی اور جن کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی تلخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسی کمزور امن دوست آدمی نے جس کے پاس نہ فوج تھی نہ دولت، برابر تیس سال تک حکومت برطانیہ کی زبردست قوت کا مقابلہ [illegible] انگریزوں کی قوم کی طرف سے کبھی کوئی [illegible] بالنفر

پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ ان کی بہت سی اچھی باتوں کو ہمیشہ سراہتا رہا اور اپنے پیا کلیتوں کو سمجھاتا رہا کہ وہ جس نظام حکومت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اس میں اور انگریزی قوم میں تمیز کرنا سیکھیں۔ انھوں نے ہمیشہ خلوص سے یہ دعویٰ کیا کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں۔ لیکن ان کی نیک نیتی پر بھروسہ نہیں کیا گیا اور ان کی اس "ریاکاری" کی ہنسی اڑائی گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست بھی ہوں اور ان کے خلاف سیاسی جنگ بھی کرتے رہیں لیکن حال کے واقعات نے نہ صرف ان کے دعوے کی سچائی کو ثابت کر دیا بلکہ دکھا دیا کہ ان کا اصلی دھرم یہ تھا کہ جہاں کہیں برائی اور ناانصافی پائی جائیں اُن کے خلاف جنگ کریں اور اگر ان کی اپنی قوم شرافت اور انصاف کے راستے سے ہٹ جائے تو وہ اسی بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ اس سے بھی جنگ کر سکتے تھے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ کسی غیر قوم کے خلاف جنگ کرنا آسان ہے کیونکہ اس میں عوام کی ہمدردی اور سر دل عزیزی حاصل ہوتی ہے لیکن اپنوں کے خلاف لڑنے کے لئے بہت زیادہ ذہنی اور اخلاقی جرأت درکار ہے۔ یہ ایک غیر معمولی عظمت کی کسوٹی اور اس کا ثبوت ہے اور جو شخص اس آزمائش میں پورا اترتا ہے وہ حق و باطل کی اس ابدی جنگ کا ایک تخلیقی کارکن بن جاتا ہے جو کسی جماعت یا ملک یا قوم کے خلاف نہیں ہوتی، بلکہ درحقیقت انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے خود انسان کی اعلیٰ اور ادنیٰ فطرت کے درمیان ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امن کی ذہنیت جنگ کی ذہنیت پر، نیک نیتی بد نیتی پر اس وقت تک غالب نہیں آ سکتی جب تک افراد اور قومیں خود بے لاگ طریقے پر اپنے اعمال کا احتساب کرنا نہ سیکھیں، جب تک وہ انصاف کی خاطر ہر قسم کی نسلی اور وطنی مصلحتوں کو نظر انداز نہ کریں، جب تک وہ ظلم اور برائی کے خلاف جنگ کرنے کو تیار نہ ہوں، خواہ وہ اپنوں میں ہوں یا دوسروں میں۔ مہاتما گاندھی نے ساری عمر اسی کٹھن اصول پر عمل کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اس کا اطلاق قومی اور بین الاقوامی تعلقات دونوں میں یکساں طور پر ہونا چاہیے۔

مگر انھوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ ستیہ گرہ اور اہنسا کے اُن سیاسی ہتھیاروں کو بھی مکمل کیا جن کے ذریعے لوگ بدی اور ظلم کے خلاف اس جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں جو آج ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ انھوں نے ان ہتھیاروں کو جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے دکھا دیا۔ یہ مسکین صورت، امن پسند آدمی زندگی بھر لڑتا رہا لیکن اس کی جنگ میں ایک انوکھی شان تھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بلکہ ساری دنیا کو یہ اُپدیش دیا "تشدد سے کام نہیں چل سکتا"۔ وہ اخلاقی اور سیاسی دونوں لحاظ سے بیکار ہے، قوت کے بل بوتے پر تم عارضی طور پر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو لیکن اس کے ذریعے دلوں کی کایا پلٹ نہیں ہو سکتی۔ اور اچھا مقصد بھی گھٹیا ذریعوں کی آمیزش سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس لئے لڑو ضرور، لیکن تمہارے دل میں کسی انسان کی طرف سے نفرت نہ ہو۔ لڑو ضرور لیکن تمہارے ہاتھ میں صرف اہنسا کی تلوار ہو اور سچ کی ڈھال ہو، برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اور ایثار اور قربانی کے ذریعے اپنے دشمنوں کو موہ لینے کی کوشش کرو۔ یاد رکھو کہ بالآخر کینہ اور کپٹ اور لالچ پر محبت کی جیت ہوتی ہے"

اس مریض اور جنگ زدہ دنیا کو انہوں نے سب سے قیمتی سبق بھی سکھایا ہے کہ سیاست اور قوموں کے باہمی تعلقات پر بھی شرافت اور اخلاق کے قانون کی اسی طرح حکمرانی ہے جس طرح افراد کے اعمال پر، اور ہم انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس وقت دنیا کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک مکمل تباہی کا وہ راستہ جس کی بشارت ایٹم بم نے اور ان تمام شیطانی قوتوں اور تحریکوں نے دی ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، دوسرا محبت اور امن اور اخلاقی قدروں کے احترام کا راستہ جس کی طرف گاندھی جی نے اور ان سے پہلے خدا کے بہت سے نیک بندوں نے رہنمائی کی ہے۔ ہمیں ان میں سے ایک راستہ اختیار کرنا ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی موت دونوں انسانوں کے تخیل اور ضمیر کو دعوت فکر دیتی ہیں اور ان کو پکار پکار کہتی ہیں کہ اپنے دلوں کو ٹٹولو اور اُن میں جو بوگ بھرا ہوا ہے اس کو دور کرو۔ اسی لئے جو لوگ ان تحریکوں اور قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں جو دنیا میں امن اور مفاہمت کے لئے کوشاں ہیں انہیں محبت اور انسانیت کے اس پاک صاف چشمے کی طرف توجہ کرنی ہوگی، جس کا سرچشمہ موہن داس کرم چند گاندھی کا دبلا پتلا کمزور جسم تھا۔

حالی کی زبان سے

مر کر گاندھی نے زندگانی پائی   جی کھو کے جزائے جاں فشانی پائی
زندہ تھے تو چند روز مہماں تھے یہاں   جب مر گئے عمر جاودانی پائی

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں   خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
گاندھی سے وہ سیکھ لیں کہ ہیں کوچے میں   یوں جیتے ہیں، یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ر جون ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کا پس منظر

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے ہر حصے میں آزادی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ جس کسی نے یہ شاندار منظر دیکھا ہے وہ جیتے جی اسے بھول نہیں سکتا۔ لاکھوں گھروں، دوکانوں اور درختوں پر آزاد ہند کا ترنگا جھنڈا فخر و مسرت سے جھوم رہا تھا اور سرکاری عمارتوں پر یونین جیک کو بے دخل کرکے لہرا رہا تھا، کروڑوں آدمیوں کی رگوں میں خوشی اور جوش کی لہر اس طرح دوڑ رہی تھی جیسے بجلی کی صدا تار پر دوڑتی ہے۔ کلکتے، بمبئی، دہلی اور دوسرے شہروں میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ جو مہینوں سے لگی ہوئی تھی، اب معلوم ہوتا تھا کہ ایک دم سے بجھ گئی ہے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ، عیسائی، پارسی، ہندوستانی کی طرح حقیقی بھائیوں کی طرح گلے مل رہے تھے۔

دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا، ہوا پلٹ گئی، پنجاب کا فتنہ و فساد چند روز دبے رہنے کے بعد پھر بھڑک اٹھا۔ باہمی نفرت کا زہر جو سارے ہندوستان میں برسوں سے پھیلایا جا رہا تھا، پنجاب کے سادہ دل، دلیر، جنگجو باشندوں کی رگوں میں پہنچ کر زہر ہلاہل بن گیا، مشرقی اور مغربی پنجاب میں، پنجاب کی اور متصل علاقے کی ریاستوں میں مار دھاڑ اور آتش زدگی وبا کی طرح پھیل گئی، بڑھتے بڑھتے فساد کی وبا ہندوستان کی راج دھانی پہنچی اور دہلی پر قیامت گزر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائیگا اور سارا دیس بدامنی اور تاراج کا شکار ہوکر تباہ ہو جائیگا۔ اگر ہمارا اسّی سال کا بوڑھا باپ جس نے اپنے آپ کو مٹاکر ہندوستان کو بنایا تھا، خود قید کی سختیاں اٹھاکر ملک کو آزاد کرایا تھا، وقت پر نہ پہنچ جاتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ اس نے اپنی تلقین اور ریاضت سے، اپنی روحانی قوت سے، غصے اور نفرت کی آگ کو دھیما کیا اور پھر اپنے خون کے چھینٹوں سے اس کو ایک بار تو بجھا ہی دیا ورنہ شاید وہ ہندوستان کو پھونک کر بس نہ کرتی بلکہ ساری دنیا کو جو ہر وقت آگ پکڑنے کو تیار ہے، جلاکر بھسم کر دیتی۔

آج جب ہمارے دکھے ہوئے ٹوٹے ہوئے دل مہاتما گاندھی کا سوگ منا رہے ہیں اور ہمارا رواں رواں ان کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ ہمارے دماغوں کو یہ سوچنا ہے کہ اس ہماری کی جڑ کیا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان پر تقسیم کا عمل جراحی اس بے دردی سے کرنا پڑا کہ نہ جانے کتنا خون بہہ گیا، کتنی طاقت زائل ہو گئی اور ایسا گہرا زخم لگا کہ جس کے بھرنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ اس بیماری کا سبب معلوم کرنا اور اس کا علاج کرنا ہماری قومی زندگی کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ فتنہ و فساد کی دبی ہوئی چنگاریاں اب بھی موجود ہیں اور ان کے بھڑک اٹھنے کا ڈر اب بھی ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ مذہبی تعصب کا کرشمہ ہے، یہ جواب ٹھیک ہے مگر کافی نہیں ہے۔ مذہبی تعصب ہمارے ملک میں ہمیشہ سے تھا لیکن اس حد تک نہ تھا کہ قتل و غارت کا محرک بن جائے، عہد وسطیٰ میں جب عیسائیت اور اسلام میں صلیبی جنگیں چھڑی ہوئی تھیں، عہد جدید کے شروع میں جب کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی جنگ نے یورپ کو تباہ کر دیا تھا، ہندوستان خالص مذہبی لڑائیوں سے محفوظ رہا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس آزاد خیالی کے زمانے میں ہندوستان میں مذہب کے نام پر خانہ جنگی برپا ہوئی؟

ذرا سا غور کیجئے تو یہ معمہ حل ہو جائیگا۔ یہ دراصل فرقہ وارانہ لڑائی کی تہ میں تہذیب کی دو تحریکوں، تاریخ کے دو زمانوں عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی ٹکر ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں ہندوستان کو نئی ذہنی تحریکوں سے سابقہ پڑا، ہندوستانی طالب علم یورپ و امریکہ جانے لگے اور عہد جدید کی فضا سے متاثر ہونے لگے، ہندوستان میں تہذیب و معاشرت کی اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں۔ پہلے رام موہن رائے نے اور پھر سید احمد خاں اور راناڈے نے ہمیں تجدید کا سبق پڑھایا، لیکن مغربی تعلیم اور جدید تہذیب ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ساتھ آئی تھی اور بدیسیوں کے سیاسی تسلط کی نشانی تھی، اس لئے آزادی کی تحریک نے ایک حد تک اس کے خلاف بھی بغاوت شروع کی۔ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں نے ہندو مسلمانوں میں تہذیبی اور مذہبی قدامت پسندی بلکہ رجعت پرستی کو ابھارا۔ مہاتما گاندھی نے ہم کو اس تاریک خیالی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ان کی تعلیم مشرقی روحانیت پر مبنی تھی مگر اس میں عہد جدید کے سب رجحانات موجود تھے، تحقیقی فکر تنقیدی نظر، جمہوریت اور اس کے لوازم، انفرادی آزادی، شخصی ذمہ داری، اخوت، مساوات، رواداری۔ لیکن عام طور پر سیاسی تحریک نے ہر فرقے کے لوگوں میں کٹر مذہبیت کے ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس میں اپنوں کی محبت کم اور غیروں سے نفرت زیادہ تھی۔ ادھر انگریزوں نے ہماری تحریک قومیت کی کمر توڑنے کے لئے فرقہ وارانہ نمائندگی اور جداگانہ انتخاب کا جھگڑا کھڑا کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سیاست کے میدان میں وہی لوگ کامیاب ہونے لگے جو اپنے فرقے کے مذہبی تعصب کو زیادہ سے زیادہ ابھار سکتے تھے خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کو برطانوی حکام کی پوری تائید اور مدد حاصل تھی۔

فرقہ پرستی کے زور پکڑنے کے لئے یہی محرکات کچھ کم نہ تھے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ بہت سے مستقل حقوق کے مالک جو اپنے آپ کو کانگریسی تحریک، سوشلزم اور کمیونزم کی وجہ سے خطرے میں پاتے تھے کچھ اپنی طبعی افتاد سے اور کچھ اپنے اغراض کی وجہ سے فرقہ پرستی کے سرپرست بن گئے۔ جنگ کے زمانے میں جب مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کے دوسرے علم بردار جیل میں تھے اور کانگریس قریب قریب کچل دی گئی تھی، مستقل حقوق کے مالک سرمایہ داروں کے سایہ میں فرقہ پرست سیاسی جماعتیں خوب پھلی پھولیں، اور انہیں زور شور سے مذہبی تعصب اور نفرت کا زہر پھیلانے کا موقع ملا۔ جنگ کے بعد جب برطانوی حکومت اپنی اندرونی کمزوری کی وجہ سے ہندوستان کی تحریک آزادی سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوئی اور اس کا امکان نظر آنے لگا کہ ہندوستان میں آزاد حکومت قائم ہو جائیگی تو ان سب رجعت پسند لوگوں میں جن کا وجود برطانوی حکومت کے ساتھ وابستہ تھا ایک ہلچل مچ گئی۔ تحریک آزادی کی کھلم کھلا مخالفت تو وہ کر نہیں سکتے تھے ان کے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ فرقہ وارانہ تعصب کی آگ کو بھڑکا کر ملک میں ایسی بدامنی پیدا کر دی جائے کہ لوگ آزادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھیں اور انگریزوں سے کہیں کہ خدا کے لئے آپ نہ جائیے۔ تحریر اور تقریر میں فرقہ وارانہ نفرت کا ایک ہولناک جہاد شروع ہوا، نجی فوجیں بھرتی ہوئیں، ہتھیار جمع کئے گئے اور ہر موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاکر فساد برپا کرائے گئے۔ دنیا میں کوئی حکومت اس ابتری کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، مگر ہندوستان کے انگریز حکام نے اپنی مصلحتوں سے اگر اسے شہ نہیں دی تو کم سے کم اسے روکنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔

اگر برطانیہ میں لیبر حکومت برسر اقتدار نہ آجاتی تو غالباً ہندوستان میں انگریز سولین اپنی حکومت کچھ دن اور قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے۔ لیکن لیبر حکومت نے دور اندیشی سے کام لے کر اس پالیسی کی مخالفت کی اور حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کرنے پر تیار ہو گئی۔ تاہم فرقہ وارانہ جھگڑے اس حد تک پہنچ گئے کہ اسے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا معقول بہانہ مل گیا۔ سیاسی وحدت کے حاملوں نے یہ سمجھ کر کہ چار صوبوں کی مسلم اکثریت ہندوستان سے الگ ہونے اور ایک الگ ریاست بنانے پر تلی ہوئی ہے اور اس کے مطالبے کو بغیر شدید خانہ جنگی کے رد نہیں کیا جا سکتا، ملک کی تقسیم کو منظور کر لیا۔ اسی کے ساتھ اس پر اصرار کیا کہ بنگال اور پنجاب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرکے مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کو جن کی اکثریت پاکستان میں نہیں رہنا چاہتی، ہندوستان میں شامل کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غم و غصے کا جیسا شدید طوفان وحدت کے حامیوں میں ہندوستان کی تقسیم سے اٹھا تھا ویسا ہی تفریق کے حامیوں میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے برپا ہو گیا۔ یہ جلے ہوئے انگریز حکام اور ملک کی رجعت پسند قوتوں کے لئے زرین موقع تھا۔ یوں تو ہر جگہ فساد برپا کرنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن میوات اور پنجاب میں جہاں لوگ سپاہی پیشہ، جنگجو اور مسلح تھے پورا زور لگا دیا گیا۔ صوبے کی تقسیم سے جو انتظامی ابتری پیدا ہو گئی تھی اس نے سیاسی فتنہ انگیزوں کے کام کو آسان کر دیا۔ انھوں نے نفرت اور تعصب کی آگ کو اس طرح بھڑکایا کہ ہر جگہ اکثریت اقلیت پر وحشیانہ مظالم توڑنے لگی اور جرائم پیشہ لوگ اور بددیانت سرکاری ملازم اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

یہ تھا پس منظر ان ہولناک فسادات کا جنہوں نے ہمارے ملک کو دنیا میں بدنام اور خود اپنی نظر میں ذلیل کر دیا۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک عارضی نفسی کیفیت تھی، جنون کی ایک لہر تھی جو سیاسی انقلاب کے ہیجان خیز موقع پر اٹھی اور گزر گئی لیکن ذرا غور سے کام لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ عارضی کیفیت کسی مستقل حالت مرض کا پتہ دیتی ہے۔ یہ جنون کی لہر ہمارے قومی مزاج کی کسی ناہمواری کو ظاہر کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم عہد جدید کے ماحول میں رہتے ہیں لیکن ہمارے ذہن ابھی تک عہد وسطیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ انسان کے ذہن کا اپنے ماحول سے مطابق نہ ہونا شدید نفسی مرض پیدا کرتا ہے جو انتہائی شکل میں جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

عہد جدید کی فضا ہمارے ملک میں ایک حد تک انگریزوں کے زمانے سے پہلے فطری ارتقا

کی بدولت پیدا ہو چکی تھی۔ اکبر اعظم کے زمانے میں غیر مذہبی یا دنیاوی ریاست کا تصور جو عہد جدید کی ایک بڑی خصوصیت ہے، کم و بیش عملی جامہ پہن چکا تھا، علوم و فنون مذہب کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے، قانون کے ذریعے سماجی اصلاح کا کام شروع ہو گیا تھا، ایک مشترک قومیت اور قومی تہذیب کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ انگریزوں کے آنے کے بعد باہر سے تو جدیدیت کی فضا نے بڑی تیزی سے ہم کو گھیرنا شروع کیا لیکن اندر سے ہم انگریزوں کے ذہنی تسلط سے بچنے کے لئے قدامت پرستی کا ایک مضبوط حصار بنانے لگے۔ ہمارے ہاں سائنس کی نئی ایجادیں، طرح طرح کے آلات، طرح طرح کی مشینیں آپہنچیں، ہم مغربی علوم کی سطحی تعلیم حاصل کرنے لگے، جمہوریت کے اداروں یعنی نمائندہ حکومت وغیرہ سے کھیلنے لگے لیکن ہم نے عملی تفکر مشاہدہ، تحقیق، تنقید کو جو سائنس کی جان ہے، آزادیٔ خیال، قومی برادری، سماجی برابری بے تعصبی اور رواداری کو جو جمہوریت کی روح ہے، قبول نہیں کیا بلکہ توہم اور تقلید، تعصب اور تنگ نظری، ذات اور قبیلے کی تفریق، شریف اور رذیل کے امتیاز کو مذہب کے لوازم سمجھ کر مانتے رہے۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں ہماری پوری مدد کی، مذہبی آزادی کے نام سے ہمارے مہمل سے مہمل اور بدتر سے بدتر رسموں کو قانون کی حمایت میں لے لیا، اقلیتوں کی حفاظت کے نام سے، جداگانہ انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول تسلیم کرکے۔ ہماری روحوں میں فرقہ پرستی کا زہر بھر دیا۔ اس طرح ہمارے ذہن اپنے زمانے سے اپنے ماحول سے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ڈانواں ڈول ہو کر رہ گئے اور جب ہمیں پچھلے سال زبردست سیاسی انقلاب سے سابقہ پڑا تو ہم اپنا ذہنی توازن بالکل کھو بیٹھے اور ہم سے وہ افسوسناک مجنونانہ حرکتیں سرزد ہوئیں جن کا سلسلہ مہاتما گاندھی کے قتل تک پہنچا۔

مہاتما گاندھی کی شہادت سے ہمارے دل و دماغ کو جو شدید دھکا لگا، اُس نے اُس وقت ہماری آنکھیں کھول دی ہیں، ہم اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں اور آئندہ سنبھل کر چلنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تبدیلی محض سطحی ہے۔ ہماری عام رجعت پرستی جس کا فرقہ پرستی ایک لازمی نتیجہ ہے بدستور موجود ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے، اُسے ہوا دے کر بھڑکانے والے، انگریزوں کے جانے کے بعد وہ مستقل حقوق کے مالک ہیں جن کی زندگی انگریزی راج سے وابستہ تھی اور جن کا وجود اب اس پر منحصر ہے کہ عوام کو فرقہ وارانہ جھگڑوں میں الجھائے رکھیں۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے اثرات سطح کے اوپر اور نیچے اب بھی ان کو اس کام میں مدد دے رہے ہیں۔ شاید یہ اثرات پاکستان کے مقابلے میں ہند میں بہت کم ہیں مگر کمزور جسم کو بیمار کرنے کے لئے تھوڑا سا فاسد مادہ بھی کافی ہوتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ فرقہ پرستی کی ایسی وباؤں سے جیسے پچھلے سال آئی تھی، محفوظ رہیں تو ہم کو اس مشکل اور صبر طلب کام کے لئے تیار ہونا چاہئے کہ قدامت پسندی اور رجعت پسندی کے جراثیم کو اپنی قوم کے خون سے دور کر دیں تاکہ وہ جنونی یا دماغی مریضوں کی زندگی کے بجائے انسانوں کی طبعی اور صحت مند زندگی بسر کر سکے۔

"نئی روشنی" کا اجرا اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ اس مقصد کے مختلف پہلو ہیں جن پر ہم آئندہ اشاعتوں میں روشنی ڈالیں گے ہمیں امید ہے کہ ہمارے اہل فکر اور اہل قلم ان تصورات کی وضاحت اور اشاعت کے ذریعے، ان کی مدلل تائید یا تعمیری تنقید کے ذریعے ہندوستانی زندگی کی تعمیر نو میں مدد دیں گے۔ "زندگی کی تعمیر نو" یہ نام اس قدر رعب دار اور کام اس قدر زبردست معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل ہمارا دل چھوٹ جاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کام قدیم زمانے کی بے پناہ قوت کی تحریک سے غیر محسوس طور پر کر ہی رہے ہیں، زندگی کی تعمیر نو ہمارے ان کمزور ہاتھوں سے خود بخود ہو ہی رہی ہے۔ سوال ہے صرف سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر سلیقے اور طریقے سے کرنے کا، تاکہ عمارت بے ڈھنگی، کمزور تنگ اور تاریک نہیں، بلکہ سڈول، خوشنما، پائدار، وسیع اور روشن ہو۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ مضمون اس اداریے کی طرح طویل نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے مختصر ہوں۔ یہ اداریہ مجبوری سے لمبا ہو گیا آئندہ ایسا نہیں ہوگا ہفتہ وار اخبار میں لمبے مضمونوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔

بزم بے تکلف

آج کل ایک مدت سے ساری دنیا فکر و پریشانی، خوف و ہراس، غم و غصے میں مبتلا ہے ایک لڑائی کا بخار اترنے کے بعد انسانیت کے جوڑ جوڑ میں درد ہے، منہ کا مزا کڑوا ہے، مزاج چڑچڑا ہے اور دوسری لڑائی کا جاڑا چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ ہندوستان اس جاڑے بخار سے تو سستا چھوٹ گیا تھا۔ مگر یکایک سیاسی موسم بدلنے سے فرقہ پرستی کا مواد اس طرح ابھر آیا کہ پرانے فساد خون نے شدید بخار کی صورت اختیار کر لی اور عمل جراحی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس آپریشن کے بعد بدن کا زخم اور دل کا زخم ابھی تک بھرنے نہیں پایا ہے اور طاقت بھی پوری طرح نہیں آئی ہے۔ طبیب کہتے ہیں کہ صحت پانے کے لئے ضروری ہے کہ مریض ہنستا بولتا رہے، خوش و خرم رہے۔

سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں، اس فضا میں کوئی بھلا آدمی کیونکر خوش رہ سکتا ہے خصوصاً ہندوستان میں؟ ایک کروڑ سے زیادہ آدمی جیتے جی اکھڑ گئے ہیں، ادھ گئی کروڑ کی جڑیں ہل گئی ہیں، بہت سے خود دُکھ بھر رہے ہیں اور بہت سے اپنے بھائیوں کی مصیبت دیکھ کر کڑھ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں ہنسی تو ایک طرح کی ڈھٹائی کی بے حیائی، بے حسی، بے دردی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بے فکری اور اوچھے پن کی ہنسی کے علاوہ ایک اور ہنسی بھی ہوتی ہے، جو گہرے ایمان پختہ ارادے اور بلند حوصلے کی نشانی ہے۔ جو شخص خدا کی خدائی اور انسان کی انسانیت پر ایمان رکھتا ہے، جو دُنیا کی مشکلوں اور مصیبتوں سے لڑنے کا ارادہ اور ان پر غالب آنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ شدید رنج و الم کو خوش مزاجی اور خوش وقتی کے پردے میں چھپا سکتا ہے اور چھپاتا ہے، اُس کا دل روتا ہے مگر چہرہ ہنستا رہتا ہے۔ اسی کیفیت کا نقشہ غالب نے چند لفظوں میں کھینچا ہے۔ ع

دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ظرافت یا خوش طبعی جو انسان کو ہنسنے ہنسانے پر ابھارتی ہے، قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دراصل یہ احساس تناسب کی صفت ہے اور اسے تہذیب یا کلچر کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ جس شخص میں احساس ظرافت ہوتا ہے اس کی نظر میں ہر قسم کی بے اعتدالی، بے تکاپن، بھونڈاپن فوراً کھٹکتا ہے۔ وہ ان چیزوں پر خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف الم ہستی کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے، اور دوسری طرف لوگوں کو ان کے عیوب کی طرف توجہ دلا کر اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ظرافت کا استعمال بے دردی سے نہیں ہمدردی سے کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جس پر ہم ہنسیں اُسے رلا دیں اس سے تو ضد اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس کی ہنسی اُڑائی جائے وہ خود بھی ہنس پڑے اور جھینپ کر کہے کہ بھئی بات تو ٹھیک ہے، یہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت بہت نمایاں ہوتا ہے، جب ہم اپنے آپ کو اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنسنے میں ہمارا انداز یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ حرکت تو واقعی بے تکی تھی مگر یوں ہم آدمی اچھے ہیں۔ یہی انداز سب کے ساتھ ہونا چاہئے۔ صحیح احساس ظرافت یا احساس تناسب رکھنے والا جانتا ہے کہ دُنیا میں سراسر اچھا یا سراسر بُرا کوئی نہیں ہوتا۔

بالقوہ سب انسان اچھے ہیں۔ یعنی سب میں اچھا بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ بالفعل ہر شخص خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ہماری ظرافت عموماً اس کی خامیوں کو دکھاتی ہے۔ لیکن اگر پس منظر میں اس کی خوبیاں بھی دکھا دی جائیں تو نقش زیادہ ابھرتا ہے۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل تصویر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مثلاً ہمارے دوست سر اے۔ بی۔ سی۔ کو لے لیجئے۔ بچارے کچھ عرصے سے اپنے خوش طبع حریفوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال جب خطابوں کی آخری فہرست میں انہیں سر کا خطاب ملا تو ایک دل لگی باز نے کہا

لے لو سر کا خطاب اے۔ بی۔ سی۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے
جھنڈے کی سلامی کی رسم ادا کی تو ایک بگڑے دل نے فقرہ کسا
یہ جا کا سلامی بھی ہے سرکار کا سر بھی
اسے تھالی کے بینگن تو ادھر بھی ہے اُدھر بھی

اسی طرح بچارے کی اس بات پر کہ پہلے آپ ٹو ڈیٹ انگریزی لباس ڈانٹ کر ولایتی شان سے اکڑتے تھے اور اب شدھ کھدر کے کپڑے پہن کر دیسی انداز میں برتتے ہیں طرح طرح کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ کوئی پکارتا ہے ع او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے۔ کوئی میاں خوجی کے الفاظ میں کہتا ہے "پہچان لیا بہروپیا ہے" کوئی ان کو سن کر کسی اور سے پوچھتا

بقیہ ملاحظہ ہو

پچھلا ہفتہ

۱۔ آیندہ ہندوستان میں سیاسی مسائل سے زیادہ معاشی مسائل کی اہمیت
۲۔ تعمیری کام کرنے والوں کی کانفرنس میں اچاریہ کرپلانی کی تقریر
۳۔ ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن کا اجلاس اُٹاکمنڈ میں
۴۔ حیدر آباد اور حکومت ہند کی گفت و شنید

۱۔ ہندوستان

آزادی کے پچھلے دس مہینوں نے ہندوستان کی سیاست میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ہماری سیاسی زندگی میں ایک قرن سے جو مسئلے زبردست اہمیت رکھتے چلے آ رہے تھے آج اُن کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے۔ ہندوستان برطانیہ کا محکوم رہے یا آزاد رہے یہ پہلا سوال تھا جس پر سیاسی پارٹیاں بنتی تھیں۔ کانگریس پارٹی کو پچھلے تیس سال میں جو زبردست سیاسی اقتدار حاصل ہوا وہ اسی وجہ سے تھا کہ وہ بدیسی حکمرانوں کے راج کو ختم کرانے میں سب سے زیادہ مستعد اور سرگرم تھی۔ ہندوستان سے برطانیہ کی حکومت کے رخصت ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ سیاسی جماعت بندی کی بنیاد نہیں بن سکیگا اور صرف آزادی کا نام لے کر کانگریس پارٹی دیس کی جنتا کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکیگی۔

دوسرا مسئلہ اقلیتوں کی جداگانہ نیابت اور اُن کے لئے مخصوص حقوق اور مراعات کا تھا جس کی تائید اور مخالفت کی وجہ سے سیاسی پارٹیاں بنتی بگڑتی رہتی تھیں۔ یہ مسئلہ پہلے مسئلہ کے مقابلہ میں کم درجہ رکھتا تھا لیکن سیاسی محفلوں کی گرماگرمی میں اس کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ پاکستان کے بن جانے اور مخلوط انتخاب کا اصول طے ہو جانے کے بعد اب یہ بھی جماعت بندی کی بنیاد نہ بن سکیگا چنانچہ اکثر پرانی فرقہ وار سیاسی جماعتوں نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ مذہب کی بنیاد پر اپنی سیاسی جماعت بندی کو ختم کر رہی ہیں۔

تیسرا مسئلہ دیسی ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرانے اور چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کو بڑے بڑے علاقوں میں متحد کرنے کا تھا اس سے بھی سیاسی الجھنیں پیدا کرنے کا کام لیا جاتا تھا، لیکن اب یہ مسئلہ بھی تقریباً حل ہو گیا ہے اور بہت جلد ریاستوں کی متحدہ حکومتوں اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں کوئی نمایاں فرق باقی نہیں رہیگا۔

دستور ساز اسمبلی نے نیا دستور تقریباً تیار کر لیا ہے۔ اُس کے نافذ ہونے کے بعد دستوری مسئلوں کی اہمیت بھی نہیں رہیگی۔ صوبہ پرستی اور زبان پرستی کے جھگڑے ضرور جاری رہیں گے، لیکن غالباً اُن کی حیثیت ضمنی اور مقامی ہوگی اور اُن کی بنیاد پر کوئی بڑی سیاسی تحریک نہیں چل سکیگی۔

اب دوسرے ہی مسئلے اٹھیں گے اور ان میں خارجی پالیسی کے علاوہ داخلی معاملات میں سب سے زیادہ اہمیت معاشی مسئلوں ہی کو دینا پڑیگی۔ کانگریس جو اب تک ایک غیر سرکاری پارلیمنٹ کا درجہ رکھتی تھی اور آزادی کی حامی جملہ قوتوں کے لئے ایک مشترکہ قومی پلیٹ فارم تھی اب اس کو ایک مخصوص سیاسی جماعت کی شکل اختیار کرنا ہوگی۔ چنانچہ اب باہمی اختلافات ابھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ پرانی یک جہتی ختم ہو رہی ہے فارورڈ بلاک والے اور کمیونسٹ تو کانگریس سے عرصہ ہوا نکال ہی دیئے گئے تھے لیکن اب سوشلسٹ بھی کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں ملک کے سامنے سب سے بڑا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی جماعت جو اب تک کانگریس کا دست و بازو تھی مخالف پارٹی بننے کے بعد مخالفت کا کیا طریقہ اختیار کرتی ہے اور اس کا اثر کس حد تک اور کس رفتار سے بڑھتا ہے۔

اچاریہ کرپلانی نے ۱۳ مئی کو یوپی کے تعمیری کام کرنے والوں کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا "اگر تعمیری کام کو اسی جذبہ کے ساتھ کرنا ہے جو گاندھی جی کی نظر کے سامنے تھا تو یہ کام ایسے کارکنوں کی جماعت کو کرنا ہوگا جس کے اندر مبلغوں کا جوش موجود ہو۔ گاندھی جی سیاسی انقلاب کے ساتھ سماجی، معاشی اور اخلاقی انقلاب کی تحریک کو بھی چلا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان دونوں قسم کی تحریکوں کی رہنمائی اسی ایک گروہ کے ہاتھ میں ہو جس نے برسوں تک اُن کے ساتھ کام کیا تھا تکلیفیں اٹھائی تھیں اور قربانیاں دی تھیں"۔

اچاریہ کرپلانی نے کہا "ہمارے سیاسی رہنما سیاسی مسئلوں کو حل کرنے میں اتنے الجھے رہتے ہیں کہ انھوں نے معاشی اور سماجی تعمیر کی اسکیموں کی طرف بہت کم دھیان دیا ہے لیکن بات صرف یہی نہیں ہے بلکہ جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی رہنمائی کی اصل باگ ڈور ہے اُن کو گاندھی جی کے پروگرام پر اب اتنا اعتقاد نہیں رہا ہے جتنا تحریک آزادی کی جد و جہد کے زمانہ میں تھا لیکن یہ لوگ قومی تعمیر کی کوئی اپنی مربوط اسکیم بھی نہیں بنا پائے ہیں۔ ان کی کوششوں میں کوئی سمت اور مقصد نظر نہیں آتا۔ عام آدمی حیران ہیں سماج کی تعمیر کی اسکیموں کو تو چھوڑیئے قومی زندگی کے صحت مند وجود کے لئے جو بنیاد چاہیئے وہی سرے سے مفقود ہے"۔

اچاریہ کرپلانی نے آگے چل کر کہا کہ یہ کانفرنس اس لئے منعقد کی گئی ہے کہ تعمیری کاموں کی از سر نو تنظیم کی جائے اور ایسے تمام عناصر کو چاہے وہ گاؤں میں ہوں چاہے میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں چاہے صوبہ کی اسمبلیوں میں جو موجودہ بے مقصد کارروائیوں سے غیر مطمئن ہوں ایک جگہ جمع کیا جائے۔

اچاریہ کرپلانی نے اطمینان دلایا کہ یہ کانفرنس کانگریس کے اندر یا باہر کوئی جداگانہ پارٹی بنانا نہیں چاہتی بلکہ صرف ایک کمیٹی تعمیری کام کو جوش و خروش کے ساتھ چلانے کے لئے بنا رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نئی تنظیم کی یہ تجویز اپنے اندر بہت زبردست امکانات رکھتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ زمانہ کے دھارے کے ساتھ چلیگی یا اُس کے مخالف؟ مخلص تعمیری کام کرنے والوں کی ضرورت تو بیشک ہے اور جن لوگوں نے گاندھی جی کی نگرانی میں کام کیا ہے اُن کی اہمیت میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن تعمیری کام کا مقصد کیا سمجھا جائیگا؟ کیا صرف گاندھی جی کی تعلیم کی روح کو قبول کیا جائیگا کہ زندگی کی بنیاد دیہاتوں کی خوش حالی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ پر ہو یا ٹیکنیک بھی اُن ہی کی بتائی ہوئی اختیار کی جائیگی؟ کیا جس طرح برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ تعمیری کام کرنے والے گاؤں میں چرخہ چلانے کا پرچار کرتے تھے آزاد ہندوستان میں بھی ایسا ہی کریں گے یا بجلی کی قوت سے تکلے اور کرگھے چلانے کی تعلیم دیں گے؟ بیل سے گھانی چلائیں گے اور گڑ بنائیں گے یا تیل نکالنے اور شکر بنانے والی گھریلو مشینوں کو بجلی سے چلانے کی تعلیم دیں گے؟ یہ صرف چرخے کی ٹیکنیک کو جانیں گے یا گھریلو مشینوں اور بجلی کی انجینیری کو بھی سیکھے ہوئے ہوں گے؟ مختصر یہ کہ سائنس نے انسان کو مدد دینے کے جو وسائل ایجاد کئے ہیں اُن سے کام لیں گے یا نئے زمانہ کی ان ترقیوں کی طرف سے منہ موڑ کر صرف فرسودہ طریقوں کو دوبارہ زندہ کرنے میں اپنی قوت اور وقت صرف کرتے رہیں گے؟ اگر انھوں نے اپنے فرائض کو نئی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تو مستقبل ضرور ان مخلص اور پر جوش مبلغوں کے ہاتھ میں ہوگا ورنہ یہ گوشۂ گمنامی میں ایمانداری کے ساتھ چرخہ چلاتے چلاتے ختم ہو جائیں گے اور رہنمائی دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ جائیگی۔

ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن کا تیسرا اجلاس یکم جون سے اُٹاکمنڈ میں ہو رہا ہے۔ پنڈت نہرو نے اس بین الاقوامی اجتماع کا جس میں اٹھارہ قوموں کے نمائندے اپنے مشیروں اور مددگاروں کے ساتھ شریک ہوئے ہیں۔ افتتاح کیا۔ اس کمیشن کے پچھلے دو اجلاسوں میں عملی فائدہ کا کوئی کام نہیں کیا گیا تھا لیکن موجودہ اجلاس کے ساتھ لوگوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ ایشیا کے تمام ملکوں کا بنیادی مسئلہ ایک ہی ہے۔ یعنی اسباب اور مشین سے کام لیکر ملک کے معاشی وسائل کو ترقی دینا لیکن اس کام میں رکاوٹ یہ ہے کہ ایشیا کے ملکوں کے پاس نہ تو علمی واقفیت اور فنی مہارت ہے، اور نہ جدید اوزار، سامان اور مشینیں۔ جاپان اور یورپ کے ملک اپنے اپنے حال میں گرفتار ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نظر امریکہ ہی پر پڑتی ہے چنانچہ اس اجلاس کے سامنے بنیادی سوال یہی تھا کہ امریکہ نے جس طرح یورپ کے معاشی کمیشن کی سفارش پر یورپ کی امداد کے لئے مارشل پلین منظور کیا اسی طرح ایشیا کے معاشی کمیشن کی سفارش پر ایشیا کے ملکوں کے لئے بھی امداد کا انتظام کرے۔ لیکن امریکہ کے ذمہ دار حلقوں کے بیانات نے اجلاس شروع ہونے سے پہلے اس قسم کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اس کے باوجود پنڈت نہرو کی تقریر اور کمیشن کی ورکنگ پارٹی کی سفارشوں کا رجحان اسی جانب تھا۔ مسٹر گریڈی نمائندہ امریکہ نے ایشیا کے ملکوں پر الزام رکھ کر اس معاملہ کو ختم کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا ایشیا کے ملک امریکہ سے سرمایہ تو لینا چاہتے ہیں لیکن امریکہ کے سرمایہ کو اطمینان دلانا نہیں چاہتے جس کے بغیر وہ دوسرے ملکوں میں سرمایہ لگانے سے ہچکچاتے ہیں۔ انہوں نے کہا ایشیا کے ملک امریکہ کے سرمایہ کے بغیر بھی معاشی ترقی کر سکینگے لیکن اس کام میں دیر لگیگی اور زیادہ قربانی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ شیاما پرشاد مکرجی ہندوستان کے نمائندے نے اپنی تقریر میں کہا امریکہ سیاسی سودا کرنا چاہتا ہے اُس کے سامنے ایشیا کی امداد کا سوال نہیں ہے بلکہ وہ اپنے سیاسی اقتدار کو بڑھانا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں کام مشکل سے بنتا نظر آتا ہے۔

جلسہ کی دوسری کارروائیوں میں سیلاب پر قابو پانے، وسائل آمد و رفت اور خبر رسانی کے طریقوں کو ترقی دینے کے مسائل شامل تھے۔ اس کے علاوہ معاشی تحقیقات اور اعداد و شمار جمع کرنے کی طرف بھی متعلقہ کمیٹیوں نے توجہ دلائی۔

ہماری رائے میں اس کمیشن کے اجلاس سے کسی عملی فائدہ کی توقع رکھنا کچھ فضول ہی سا معلوم ہوتا ہے۔ ایشیا کے ملکوں کے لئے مارشل پلین کے نمونہ پر امریکہ کوئی انتظام نہیں کریگا اس لئے ہندوستان کو امریکہ سے ضروری مال منگانے کے لئے دوسری تدبیریں بھی سوچنا پڑیں گی۔

سیاسی حیثیت سے اس ہفتے میں صرف حیدر آباد کے وفد کی حکومت ہند سے گفت و شنید قابل ذکر ہے۔ اے پی آئی نے اس کے بارے میں جو قیاس آرائی کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں طرف سے امن و صلح کی انتہائی خواہش کے باوجود حکومت ہند اور حکومت حیدر آباد کے نقطۂ نگاہ میں بنیادی اختلاف ابھی تک باقی ہے۔ حیدر آباد حکومت کو مدافعت معاملات [illegible] اور وسائل آمد و رفت کا انتظام [illegible] کرنا تیار ہے لیکن ان کے بارے میں جو قوانین حکومت ہند بنائیگی ان کو منظور کرنے یا نہ کرنے کا حق اپنی مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے اسی طرح اپنی ریاست میں درمیانی زمانہ کے لئے حکومت اور مجلس دستور ساز [illegible] تو تیار ہے جس میں ہندو اور مسلمانوں کو برابر کی نمائندگی دی جائے لیکن پنڈت نہرو [illegible] حکومت ہند کے مجوزہ تناسب نمائندگی یعنی ۶۰ فیصدی غیر مسلم اور ۴۰ فیصدی مسلم کو ماننے کے تیار نہیں ہے عام رائے [illegible] اصول کو بھی حکومت حیدر آباد ماننے [illegible]

۱۔ مغربی پاکستان کے الگ الگ صوبوں کو ملا کر ایک کر دینے کا خیال۔
۲۔ پاکستان میں بیرونی سرمائے کا مسئلہ۔
۳۔ افغانستان اور پاکستان کے تعلقات۔
۴۔ مغربی پنجاب کے دو وزیروں کا استعفا۔
۵۔ مشرقی بنگال کی معاشی حالت۔

اس کو نوٹا نہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد کرنا چاہتی ہے میر لائق علی صاحب دوبارہ حکومت ہند کی تجاویز پر مشورہ کرنے کے لئے حیدرآباد واپس چلے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گو معاملات بہت کچھ بگڑ چکے ہیں لیکن حیدرآباد میں خدائی فوجداروں کی نہیں بلکہ مصلحت اندیش اور ذمہ دار ارباب حکومت کی رائے چلتی ہے تو یہ مسئلہ بھی ویسی ہی باہمی خوش دلی اور رضامندی سے طے ہو جائیگا جیسے اور سب ریاستوں کا ہوا ہے۔
(م۔ ع)

۲۔ پاکستان

کراچی کی بعض خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل کے ذہن میں ملک کے مغربی صوبوں کی الگ الگ حکومتوں کو ختم کرکے ایک مرکزی حکومت قائم کرنے کا خیال مضبوط تر ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی رائے میں شدت شاید صوبوں کے آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے وزارتیں بنانے کا سوال تعمیری کاموں سے زیادہ اہم بن گیا ہے۔ جناح صاحب نے بلوچستان کے انتظام کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لی تھی تو کچھ اس طرح کی بات کہی تھی کہ اس طرح وہ بلوچستان کے تعمیر نو کے کام میں زیادہ کامیاب ہو سکیں گے۔ اسی طرح شاید ان کا یہ خیال ہو کہ اگر پورے مغربی پاکستان کی ایک ہی حکومت ہو تو وہ ان کی براہ راست نگرانی میں تعمیر نو کا کام بہتر طریقے پر انجام دے سکیگی۔ اس اقدام کی حمایت میں ایک اور بہت وزنی دلیل بھی ہے پاکستان کی مالیات کو مستحکم بنانے کے لئے جناح صاحب نے سر آرچیبالڈ رولینڈس کو جو ہندوستان کے وزیر مال رہ چکے ہیں بلایا تھا۔ رولینڈس کی رپورٹ شائع نہیں ہوئی تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وفاقی طرز حکومت سے پاکستان کی مالی حالت پر بہت برا اثر پڑیگا۔ حکومت کو یا تو محصول بہت بڑھانے ہونگے یا اسے دیوالیہ پن کا سامنا کرنا پڑیگا۔ انہوں نے تجویز کیا تھا کہ مغربی صوبوں کو ختم کر دینا پاکستان کے مالی استحکام کے لئے ضروری ہوگا بلکہ صوبجاتی حکومتوں کو ختم کر دیا جائے تو اس اندازہ کے مطابق مرکزی حکومت کے لئے ۸۔۔ ا کروڑ روپے کی بچت ہوگی اور یہ رقم خاصی بڑی ہے۔

لیکن صوبجاتی خود مختاری سے دست بردار ہونے پر صوبوں کے لیڈر مشکل ہی سے تیار ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ اسکیم ابھی تک پس پردہ ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو اس کی مخالفت بہت شدید ہوگی۔

کچھ دن ہوئے ٹائمس آف انڈیا کے کراچی کے نامہ نگار نے پاکستان کی صنعتی زندگی میں امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کی شرکت کا حال بتایا تھا۔ پاکستان کے قیام کو ان ملکوں میں بہت ہی خوش آئند سمجھا گیا تھا، اور پاکستان کے بن جانے کے فوراً بعد ہی امریکی اور برطانوی فرموں کے نمائندوں کا ایک تانتا لگ گیا تھا۔ تیل کی دریافت کے لئے بیرونی کمپنی کو مراعات دئے جانے کی خبریں بھی آئی تھیں۔ پاکستان نے اپنی صنعتی پالیسی کے اعلان میں بیرونی سرمایہ کو خوش آمدید کہا تھا اس کے بعد سے یہ دلچسپی اور بھی گہری ہو گئی ہے اور ٹائمس آف انڈیا کے نامہ نگار کے قول کے مطابق پاکستان میں بجلی پیدا کرنے کی ایک اسکیم کا کام ایک امریکی فرم اور دوسری کا ایک برطانوی فرم کے سپرد کیا گیا ہے، برطانوی مشینوں کے طلب گاروں کو یہ شکایت ہے کہ برطانیہ سے مشینیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں لیکن بعض برطانوی فرموں نے اگلے ۱۲ مہینوں کے اندر اندر پاکستان کو چھ سوتی کپڑے کی ملیں قائم کرنے کے لئے مشینیں دینے کا وعدہ کیا ہے، امریکہ کی کچھ فرموں سے [illegible] ملین ڈالر کی قیمت کا سامان بھی ملنے کی توقع ہے بلکہ کئی برطانوی جوٹ فرموں نے پاکستان کی ایک اسکیم کو زیادہ سے زیادہ مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پاکستان کے پاس سرمایہ کی کمی ہے اور صنعتی ترقی سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں۔ موجودہ سماجی نظام میں جہاں دولت کی غیر مساوی تقسیم اس درجہ نمایاں ہے، ملک کے اندر سے سرمایہ کا حصول اور بھی مشکل ہے، اس لئے کہ پاکستان میں مالدار طبقہ زمینداروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہے۔ ابھی تک نہ تو وہاں ایک صنعتی اوسط طبقہ پیدا ہو سکا ہے اور نہ صنعتی سرمایہ داروں ہی کا وجود ہے اور مرکزی بجٹ کی آمدنی کا بڑا حصہ فوجی مقاصد کے لئے صرف ہو رہا ہے۔ شاید ان کمزوریوں کے احساس کی وجہ ہی سے پاکستان نے بیرونی سرمایہ کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں پاکستان کو جو اور جس طرح کی مدد چاہئے وہ اسے صرف امریکہ سے مل سکتی ہے، اور امریکہ مدد دینے سے پہلے اس خفیف سے شبہ کو ختم کر دینا چاہیگا کہ پاکستان کبھی سنجیدگی سے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا۔ کشمیر کے معاملہ میں بھی پاکستان نے کمیشن میں ارجنٹائن کے ایک نمائندہ کو نامزد کرکے یہی بتایا ہے کہ اس کی دلچسپیاں مغرب سے ہیں۔ آج کل کم و بیش دنیا کے سب ملک امریکہ کے معاشی تعاون کے محتاج ہیں اور امریکہ بھی تعاون کے لئے تیار ہے لیکن اپنی شرطوں پر۔ وہ چیانگ کائی شک کے چین کی طرح سب ملکوں کو جو اس سے مدد مانگتے ہیں صرف اپنے مال کے لئے بازار ہی نہیں بلکہ اپنی سیاست کے آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ پاکستان کی وزارت خارجہ اس مقصد کو کہ امریکہ سے ناگزیر امداد بھی لے اور اپنے آپ کو آئندہ عالمگیر جنگ کا ایندھن بھی نہ بننے دے، کس حد تک اہمیت دیتی ہے اور اس میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہے؟

حکومت افغانستان کے سرکاری اخبار "انیس" نے حال میں اپنے پہلے صفحہ پر ایک مضمون لکھا جس کا مغربی پاکستان کے اخبارات میں بہت چرچا ہے انہیں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان وہ سارا علاقہ جو ڈیورنڈ لائن اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے (یعنی قبائلی علاقہ اور صوبہ سرحد کا بہت بڑا حصہ) افغانستان کے حوالے کر دے۔ ہز مجسٹی ظاہر شاہ کی شاہی تقریر میں بھی جو ابھی چند روز پہلے ہوئی تھی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سردار ایوب خاں کے بیٹے سردار محمد اکرم خاں نے جو افغانستان سے جلاوطن ہوکر پاکستان کے مہمان ہیں کوئٹہ میں "ڈان" کے نمائندے سے ملاقات کے دوران میں افغانستان کے اس مطالبہ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کو ایک ہمسایہ اور ہم مذہب ملک کے ساتھ یہ مخالفانہ رویہ اختیار کرنا ہرگز زیب نہیں دیتا۔ انھوں نے اخبار "انیس" کے مضمون کے اس فقرہ کو کہ "اگر افغانستان کا مطالبہ نہ مانا گیا تو پاکستان میں اندرونی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے" خاص طور پر قابل اعتراض قرار دیا۔ انھوں نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ افغانی ایجنٹوں کو قبائلی علاقے اور صوبہ سرحد میں بھیج کر پٹھانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ انھوں نے ڈان کے نمائندے سے پوچھا کہ جب افغانستان اس طرح پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل دیتا ہے تو آپ لوگ کیوں افغانستان کے اندرونی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہاں جمہوریت نام کو نہیں، عوام کو حکومت میں کوئی دخل نہیں بلکہ آزاد اخبارات کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی رائے کے ظاہر کرنے کا بھی موقع نہیں۔ "ڈان" کے نمائندے نے ان کو سمجھایا کہ پاکستان اس طرح کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھتا خصوصاً افغانستان کے ساتھ تو وہ اپنی طرف سے خلوص اور دوستی کے تعلقات قائم کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔

اگر پاکستان اور ہندوستان کے ارباب سیاست اس بڑے خطرے کو جس کے کچھ تھوڑے سے آثار اس وقت نظر آرہے ہیں، اچھی طرح سمجھتے ہیں تو ہمیں امید کرنی چاہئے، کہ دونوں ملک جلد سے جلد باہمی اختلافات کو دور کرکے دفاع کی ایک مشترک پالیسی کی تشکیل کی طرف توجہ کریں گے۔

میاں افتخار الدین کے بعد میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں کے استعفوں نے مغربی پنجاب کی وزارت میں جو ایماندار اور ترقی پسند عنصر تھا اس کو اگر ختم نہیں تو بہت کمزور کر دیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے تھے اور ان دونوں کے جو بیان چھپے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وزیر اعظم اور دوسرے رفیقوں سے اصولی اختلافات کی بنا پر استعفا دیا ہے مگر میاں افتخار الدین کا جو بیان پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض شخصی کشاکش کا کرشمہ ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے معاشی نقطہ نظر سے مغربی پاکستان کے صوبوں کی حالت مقابلتاً اور صوبوں سے اچھی تھی۔ یہ علاقہ زرعی علاقہ تھا اور پنجاب کو ہندوستان کا غلے کا گودام کہتے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی زرعی حیثیت سے مغربی پاکستان اچھی حالت میں ہے۔ سرحد کو الگ کرکے اس کے غذائی وسائل بہت معقول ہیں لیکن مشرقی پاکستان (یعنی مشرقی بنگال) کی حالت بہت خراب ہے۔ یہاں زمین پر آبادی کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ بعض بعض جگہوں پر آبادی فی مربع میل ۱۲۰۰ سے زیادہ ہے۔ زرعی اور صنعتی دونوں حیثیتوں سے مشرقی بنگال بہت ہی پسماندہ حالت میں ہے اور یہاں کی ۴½ کروڑ کی آبادی انتہائی غربت اور جہالت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے پچھلے جلسہ میں مشرقی بنگال کے دو نمائندوں نے وہاں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی بنگال کی معاشی حالت کس درجہ خستہ ہے۔ چاول کی جو مشرقی بنگال کی خاص غذا ہے بڑی سخت قلت ہے۔ اس قلت کا لازمی نتیجہ مہنگائی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ چاول کے دام لڑائی سے پہلے کے مقابلہ میں دس گنے بڑھ گئے ہیں اور جہاں چاول ۳ یا ۴ روپے من ملتا تھا اب اس کے دام ۳۰ یا ۴۰ روپے من ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے حکومت ہند ایک بڑی رقم امداد کے لئے دیتی تھی اور اس کا ایک حصہ مشرقی بنگال کے کام آتا تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد یہ امداد بند ہو گئی ہے۔ پاکستان کی مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کو آٹھ کروڑ کی رقم قرض دی ہے اور یہ رقم صوبے کے انتظام پر صرف ہو رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرح کے تعمیری کام رکے پڑے ہیں اور سال رواں کے بجٹ میں مشرقی بنگال کی حکومت کو کوئی ۳½ کروڑ روپے کا خسارہ پورا کرنا ہے۔ تجارت بیوپار اور صنعتیں سب رکی پڑی ہیں۔ مچھلی، سبزیاں اور پھل جو مشرقی بنگال میں بکثرت ملتے تھے، اب بازاروں سے ناپید ہو گئے ہیں، کپڑا ابھی نہیں مل رہا، صوبے کے اسپتالوں میں دواؤں اور دوسری ضروری چیزوں کی فراہمی کی حالت ناقابل اطمینان ہے، چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ان کے خلاف احتجاج کے طور پر تین حکومت کے ملازم ڈاکٹروں نے استعفے دیدیے ہیں اور ان خرابیوں کے لازمی نتیجہ کے طور پر سیاسی بے چینی پھیل رہی ہے اور موجودہ وزارت کے خلاف سارے صوبے میں آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔

(ا۔ س)

مغربی دنیا

متحدہ ریاستوں کو مسٹر والس کی تنبیہ

متحدہ ریاستوں کے مدبر جنگ کی دھمکی دینے میں متفق ہو کر اب اور باتوں میں مصروف ہو گئے ہیں، بس ایک مسٹر والس ہیں جو روس اور کومیونزم دونوں کے بارے میں حکومت کا رویہ بدلنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ اب وہ صدارت کے امیدوار بھی ہیں، اور اُنھوں نے ایک نئی پارٹی قائم کی ہے جو کومیونسٹوں کی مخالفت کرنے میں قوم کی روک تھام کرے گی اور جنگ کی طرف سیاست اور عام رائے کا جو میلان ہے اسے بھی روکے گی۔ ایوان نائبین کی ایک کمیٹی کے سامنے رائے دیتے وقت مسٹر والس کو اپنے خیالات بیان کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ کمیٹی منٹ نکسن بل پر غور کر رہی ہے جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ کومیونسٹوں کی گرفت کرنے اور کومیونزم کو متحدہ ریاستوں کے اندر نیست و نابود کرنے کے لئے حکومت کو خاص اختیارات دئیے جائیں۔ مسٹر والس نے کہا کہ اس طرح کومیونسٹ اپنا کام چھپ چھپ کر کریں گے۔ انھیں سزائیں دی جائیں گی تو بہت سے لوگ ان کے ہمدرد بن جائیں گے اور آخر میں قانون کا عمل کومیونزم کے بجائے جمہوریت کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔

کومیونسٹ اور جمہوری سیاست

اس وقت دُنیا کی تقسیم دو حصوں میں ہو رہی ہے بلکہ قریب قریب ہو گئی ہے۔ ایک کومیونسٹ دوسرا جمہوری۔ کومیونزم کے حامی روس کے حمایتی بھی ہیں، اور جمہوریت کے معتقد متحدہ ریاستوں کو جمہوریت کا سب سے بڑا اسہارا سمجھتے ہیں۔ لیکن دُنیا کی یہ تقسیم اس وجہ سے بھی ہوئی ہے کہ ایک طرف روس اور دوسری طرف متحدہ ریاستوں کی یہ کوشش ہے کہ ساری دُنیا میں اُن کا اقتدار پھیل جائے۔ متحدہ ریاستیں حکومتوں اور زندگی کے پُرانے نظام کو روپیہ اور تجارتی اور فوجی سامان دیکر اپنا اثر بڑھا رہی ہیں اور روسی الیٹ نئی زندگی کا پیغام دیکر اپنے حمایتی پیدا کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یورپ کے اکثر ملکوں میں جہاں جنگ کے بعد کومیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہوئی ہے تجربے سے معلوم ہوا کہ کومیونزم در اصل روسی تسلط کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ کچھ کم مایوسی کی بات نہ ہوگی اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہو جائے کہ قومیں اپنے آپ کو متحدہ ریاستوں کے ہاتھ بیچ دیں۔ جمہوریت کی روح افراد کی آزادی اور قومی اور اجتماعی کاموں میں رضاکارانہ اتحاد عمل ہے، اور اگر کسی سیاسی جسم سے یہ روح نکل جائے تو اس کے نظام کو جمہوری سمجھنا صرف اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ اس لحاظ سے مسٹر والس نے جو تنبیہ کی ہے وہ بیجا نہیں ہے۔

مسٹر ٹرومین اور ایوان نائبین

متحدہ ریاستوں کی سیاست ایسی ڈانواڈول رہتی ہے کہ با اثر لوگوں کا قوم کو اس طرح تنبیہ کرتے رہنا بہت مفید ہو سکتا ہے۔ کئی مہینے سے پریذیڈنٹ ٹرومین صدارتی انتخاب میں کامیاب ہونے کی نیت سے ایسی تقریریں کیا کرتے اور بیانات دیتے رہے ہیں کہ متحدہ ریاستوں کی حمایتی حکومتیں اس سوچ میں پڑ گئی ہیں کہ سیاست کا یہ اونٹ نہ جانے کس کل بیٹھے گا۔ کومیونزم کی مخالفت بھی اس طرح ووٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی جا سکتی ہے کہ اس سے کومیونزم اور روسی سیاست سے زیادہ جمہوریت کو نقصان پہنچے۔ مارشل پلین مغربی یورپ کے ملکوں کی معاشی حالت کو درست کرنے اور ان کی سیاست میں استحکام پیدا کرنے کی ایک بہت معقول اور مؤثر تدبیر ہے، لیکن حال ہی میں ایوان نائبین نے یہ فیصلہ کر کے کہ دس میں ۲۵ فی صدی کی کمی کر دی جائے یہ شبہ پیدا کر دیا ہے کہ امداد کا یہ وعدہ کہیں ایک سیاسی چال نہ ہو جسے واپس بھی لیا جا سکتا ہو۔ اس فیصلے کی خبر پھیلتے ہی متحدہ ریاستوں کی وزارت خارجہ سے مغربی یورپ کی حکومتیں نمائندوں کے ذریعے اور براہ راست تار دیکر یہ دریافت کرنے لگیں کہ اس فیصلے کا مطلب کیا ہے اور اس کی اطلاع دی کہ اس کا ان کے ملکوں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے لیکن دوسری طرف خود متحدہ ریاستوں میں بہت سے شہریوں اور اخباروں نے اس تخفیف پر اور اس تنگ نظری پر جس کی وجہ سے یہ تخفیف کی گئی ہے اعتراض کیا، اور اب سینٹ کے ممتاز ممبروں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ سینٹ میں اس تخفیف کو نامنظور کر کے پھر اصل رقم دلانے کا فیصلہ کریں۔

فلسطین

تخفیف کرنے کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ مارشل پلین کی امداد کا بیشتر حصہ برطانیہ کو ملنے والا ہے اور برطانیہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ فلسطین میں عربوں کی حمایت اور سامان جنگ سے مدد کر رہا ہے۔ برطانیہ نے اعلان کیا ہے کہ وہ پچھلے معاہدوں کی وجہ سے بعض عرب ریاستوں کو سامان جنگ دینے کا پابند ہے۔ مگر شرق اردن کی فوج میں جو انگریز افسر تھے ان کو اپنی ملازمتیں چھوڑنے کا حکم دیدیا گیا ہے، اور متحدہ ریاستوں کی حکومت پر وہ سرمایہ دار بھی اپنا اثر ڈال رہے ہیں جنھوں نے عرب میں تیل نکالنے کے ٹھیکے لئے ہیں اور جنہیں اندیشہ ہے کہ ان کی حکومت نے یہودیوں کی بہت زیادہ طرف داری کی تو ان کے کاروبار کو نقصان پہنچے گا۔ اس طرح ایک اختلاف جو برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے درمیان پیدا ہو گیا تھا اب قریب قریب مٹ گیا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ پریذیڈنٹ ٹرومین ووٹ حاصل کرنے کی خاطر پھر کوئی ایسی بات کہدیں جو عربوں اور انگریزوں کو بری لگے۔

مغربی جرمنی کے بارے میں فیصلہ

حال کی سیاسی کارروائیوں میں سب سے اہم وہ فیصلہ ہے جو لندن میں ماہروں کی کانفرنس نے مغربی جرمنی کے بارے میں کیا ہے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کا ارادہ نہیں تھا کہ جرمنی کو تقسیم کریں، روسی بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ جرمنی تقسیم کر دیا جائے، لیکن بدگمانیوں کی وجہ سے اس کے دو حصے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ روسی سمجھتے تھے کہ ابھی ان سے کچھ اور گفتگو کی جائیگی۔ برلن میں اتحادیوں کی کنٹرول کاؤنسل کے جلسے ہوتے رہیں گے یا اس کا مطالبہ کیا جاتا رہے گا کہ اس کے جلسے ہوں۔ انہیں یہ بہت شاق گذرا کہ ۲۰ر مارچ سے، جب مارشل سوکولوفسکی کنٹرول کاؤنسل کے جلسے سے اُٹھ کر چلے گئے، اس کاؤنسل کا کوئی جلسہ نہیں ہوا، اور جرمنی کے پورے ملک کے لئے ایک سکہ یا دونوں حصوں کے لئے الگ سکہ رائج کرنے کے بارے میں جو گفتگو ہو رہی تھی وہ کاؤنسل کے اجلاس کے ساتھ بند ہو گئی۔ روسی اب بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ جرمنی کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے اور اب مشرقی جرمنی میں ان کا پروپیگنڈا زیادہ تر برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے اس ظلم کے متعلق ہوگا جس نے جرمنی کے دو ٹکڑے کر دئیے ہیں۔ مشرقی جرمنی اُن کے قابو میں ہے اور دونوں حصوں کو دوبارہ متحد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورا ملک ان کے قابو میں آ جائیگا لیکن برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی مدد اور سیاسی اطمینان کی وجہ سے مغربی جرمنی کی حالت سدھر گئی تو روسی خالی اتحاد کا پروپگنڈا کر کے مشرقی جرمنی کی آبادی کو تسلی نہ دے سکیں گے۔ انہیں بھی رعائتیں کرنی ہوں گی اور ان کے طرز حکومت میں رعایتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

مغربی جرمنی کے بارے میں جو فیصلے کئے گئے ہیں ان کی ساری تفصیلات ابھی شائع نہیں کی گئی ہیں۔ ابھی صرف یہ معلوم ہے کہ یہاں کی الگ حکومت ہوگی جس کا دستور ایک دستور ساز اسمبلی مرتب کرے گی۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی ضمانت پر یہاں نیا سکہ جاری کیا جائیگا اور مارشل پلین کے ماتحت جو مدد ملے گی اس سے یہاں کی صنعتی زندگی بحال کی جائیگی۔ سیاسی اور انتظامی معاملوں میں آخری فیصلے کرنے اور دیکھنے کے لئے کہ صنعتی استعداد سے جنگ کا سامان تیار کرنے کا کام نہیں لیا جا رہا ہے، چھ اتحادی ملکوں کے نمائندے رہیں گے۔ مگر اس کمیشن یا کمیٹی میں مغربی جرمنی کی حکومت کی نمائندگی بھی ہوگی۔ اس کا خاص انتظام کیا جائیگا کہ فرانس کو جو کوئلہ اور کوک لورین کی کانوں سے ملتا ہے وہ برابر ملتا رہے۔ مغربی جرمنی کی حفاظت کے لئے خاص مقاموں پر اتحادیوں کی فوجیں رہیں گی اور اس کا بھی انتظام کیا جائیگا کہ جنگ کی صورت میں ان کو فوراً مدد پہنچائی جا سکے۔

فرانس کے اندیشے

ان فیصلوں کی تصدیق اتحادی ملکوں کی حکومتیں الگ الگ کریں گی، اور انہیں آخری شکل اسی وقت دی جائیگی جب ان پر عمل کرنے کا موقع آئیگا۔ اسی وجہ سے ماہروں کی کانفرنس میں تفصیلات پر بحث نہیں کی گئی۔ ان فیصلوں کو ماننے میں سب سے زیادہ تامل فرانسیسی نمائندوں کو تھا۔ اس لئے کہ فرانسیسیوں کو سب سے زیادہ خیال اپنی حفاظت کا ہے، اور انہیں اس کا یقین نہیں ہے کہ مغربی جرمنی میں حکومت کا انتظام جرمنوں کے سپرد کر لینے کے بعد برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو فرانس کے بچاؤ کا اتنا خیال رہیگا کہ مشرق کی طرف سے فرانس پر حملہ نہ ہو سکے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغربی جرمنی پر اتحادیوں کا تسلط اسی طرح رہے جیسا کہ اب ہے اور یہ کسی صورت سے ممکن نہ ہو تو کم سے کم اتحادیوں کی اتنی فوجیں ضرور رکھی جائیں کہ مشرقی جرمنی کی حکومت چاہے وہ روسی ہو یا جرمن، مغربی جرمنی پر حملہ کر کے دونوں حصوں کو پھر متحد کرنیکا حوصلہ ہی نہ کر سکے۔ ان تجویزوں پر عمل کرنے میں جو خرچ ہوگا اس کا سارا بار متحدہ ریاستوں اور برطانیہ پر پڑیگا۔ فرانسیسی ایسی حالت میں نہیں ہیں کہ وہ ذمہ داری لینے میں شریک ہوں اس لئے وہ اتنا اصرار نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی تجویز کو منوالیں یا کانفرنس کے کام کو روک دیں ان کے کہنے سے کئی باتیں مبہم رکھی گئی ہیں۔ مغربی جرمنی کی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ فی الحال یکم ستمبر رکھی گئی ہے، مگر یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ کانفرنس کے فیصلوں پر عمل ہوتے ہوتے ہوگا۔

اصل میں فرانسیسیوں پر خوف کی ویسی ہی کیفیت طاری ہے جیسی پہلی جنگ عظیم کے بعد انہیں اپنی کمزوری کا بہت احساس ہے، اپنے اتحادیوں پر وہ بھروسہ ہے مگر یہ ڈر بھی ہے کہ وہ مدد کے لئے بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ پھر فرانس میں ایک بہت طاقتور کومیونسٹ پارٹی بھی ہے جو مغربی جرمنی کو الگ ریاست بنانے کی مخالفت اس وجہ سے کریگی کہ روسی اس کے خلاف ہیں۔ فرانس کے وزیر اعظم موسیو شومان اور وزیر خارجہ موسیو بدو کانفرنس سے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی درخواست کرتے رہے، اور اب بھی انہیں اندیشہ ہے کہ ان کے مخالف نئی وزارت کو توڑ دیں گے۔ فرانسیسی سیاست پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خوف کو شہ دیتی ہے۔ اگر فرانسیسی جذبات ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ کہ مغربی اور مشرقی جرمنی کی ریاستیں مضبوط ہو گئیں تو غالباً وہ اتحادیوں یا روس کا سہارا لے کر متحد بھی ہو جائیں گی، ان کی طاقت برابر بڑھتی رہے گی اور ایسی جنگ کا خطرہ پھر پیدا ہو جائیگا جس کا میدان غالباً مشرقی فرانس ہوگا۔ (م م)

مسافر ابدی

روش صدیقی

مسافر ابدی کی نہیں کوئی منزل
یہاں قیام کیا یا وہاں قیام کیا

تری دنا نے بڑے مرحلے کئے آساں
فروغ صبح کو تونے شریک کام کیا

صنم کدوں میں بڑا اعتبار اہل حرم
حرم نے دیر نشینوں کا احترام کیا

حیات کیا ہے محبت کی آگ میں جلنا
یہ راز بھی ترے سوز وفا نے عام کیا

اُٹھا اُٹھا کے حکایات جب رہ منزل
مسافران صداقت کو تیز گام کیا

گذر کے دانش حاضر کے آسمانوں سے
بلند سادگی عشق کا مقام کیا

ملا جو دست حوادث سے زہر بھی تجھ کو
بڑے خلوص سے تونے شریک جام کیا

وہ درد نیری خموشی میں تھا نہاں جس نے
سکوت ناز کو آمادہ کلام کیا

صلہ تھا تیری ریاضت کا صبح آزادی
وہ صبح جس کو غلاموں نے ننگ شام کیا

ابھی تو گوش بر آواز تھی بھری محفل
کہاں یہ تونے کہانی کا اختتام کیا

خیال دوست کا پرتو تھی کائنات تری
اسی تلاش میں گم ہوگئی حیات تری

(۲)

طلسم غیر تجھے کیا اسیر کر سکتا
نہ چھو سکی کوئی زنجیر ماسوا تجھ کو

کسی کے وہم و گماں میں بھی یہ مقام نہ تھا
پیام دوست بہت دور لے گیا تجھ کو

حلال خدمت خلق خدا ہوا ظاہر
ترے خدا نے بڑا مرتبہ دیا تجھ کو

یہاں تو ہے ترے قاتل سے موت بھی بیزار
وہاں نصیب ہوئی منزل بقا تجھ کو

وہ قوم جس کو دیا حسن زندگی تونے
خود اُس کے خواب پریشاں نے کھو دیا تجھ کو

یہ موت بھی جو بظاہر ہے ہجر لامحدود
نہ کر سکے گی دل ہند سے جدا تجھ کو

ہے ذرہ ذرہ تری خاک کا عزیز وطن
بھلا سکیگی کہاں ارض ایشیا تجھ کو

بلا کے بارگہ بختیار کاکی میں
کسے خبر کہ مشیت نے کیا دیا تجھ کو

تری ضیا سے ہے روشن دل وطن اب بھی
اس انجمن میں ہے تو شمع انجمن اب بھی

نیا سورج

۱۵۔ اگست

معین احسن جذبی

(۱)

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا نئے بل نئے زور ان کو سکھائے
لباس زری آبشاروں نے پایا نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر یہ ہیں آج سب آب زر میں نہائے
مگر ان درختوں کے سائے میں لے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سر د بے حال، بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج! تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو، جو سمٹے ہوؤں کو
حرارت بھی بخشے، گلے بھی لگائے

(۲)

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
فضاؤں میں ہونے لگی بارش زر کوئی نازنیں جیسے افشاں چھڑائے
دمکنے لگے یوں خلاؤں کے ذرے کہ تاروں کی دُنیا کو بھی رشک آئے
ہمارے عقابوں نے انگڑائیاں لیں سنہری ہواؤں میں پر پھڑپھڑائے
فزوں تر ہوا نشہ کامرانی تجسس کی آنکھوں میں ڈورے سے آئے
قدم چومنے برق و باد و آب و آتش بصد شوق دوڑے، بصد عجز آئے
مگر برق و آتش کے سائے میں لے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ صدیوں کے پربستہ برباد طائر
یہ ہیں آج بھی مضمحل، دل گرفتہ
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج! تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
انھیں پنجۂ تیز سے جو بچائے
انھیں جو نئے بال و پر آ کے بخشے
انھیں جو نئے سر سے اڑنا سکھائے

ہندوستانی مسلمانوں سے

ایک ہندوستانی مسلمان

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میرا خطاب مسلمان عوام سے نہیں اس لئے کہ وہ بیچارے تو ابھی تک جہالت کی وجہ سے دیکھنے، سننے، سوچنے کی قابلیت سے محروم ہیں۔ ان کے آنکھ کان اور دماغ تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو پہلے مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور دل سے یا زبان سے تقسیم ہند کے حامی تھے۔ دوسرے نیشنلسٹ مسلمان جو ہمیشہ سے متحدہ ہندوستانی قومیت اور متحدہ ہندوستان کے علمبردار رہے، ان دونوں سے مجھے پہلے الگ الگ اور پھر ساتھ ساتھ کچھ کہنا ہے اور اس میں سچائی اور صفائی سے کام لینا ہے۔ جہاں تک ہو سکیگا نرمی اور متانت سے کہوں گا لیکن جب دل دکھا ہوا ہو تو بات میں کچھ تلخی آ ہی جاتی ہے۔ پھر بھی محبت کی تلخی میں وہ زہر نہیں ہوتا جو غصے اور عداوت کی تلخی میں ہوتا ہے۔ وہ دل آزار ہوتی ہے مگر دل شکن نہیں ہوتی۔

مسلم لیگ کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے مجھے یہ پوچھنا ہے کہ جب آپ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا تو کیا سمجھ کر کیا تھا؟ آپ کہیں گے "مسلمانوں کا مسئلہ بہت نازک تھا۔ وہ اقلیت میں تھے اکثریت انھیں غیر سمجھتی تھی اور اُن سے مغائرت برتتی تھی۔ وہ تعلیم، دولت، سیاسی بیداری غرض ہر چیز میں پیچھے تھے۔ اس لئے اندیشہ تھا کہ اگر ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ایک ہی ریاست بنی تو ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کو کچل ڈالے گی۔ اس سے بچنے کی یہی صورت تھی کہ دو ریاستیں بنیں۔ ایک اُن علاقوں کی جن میں ہندو زیادہ ہیں، دوسری ان علاقوں کی جن میں مسلمان زیادہ ہیں"۔ میں اس وقت یہ بحث نہیں چھیڑوں گا کہ ہندو مسلمانوں میں غیریت کا احساس ہونے کی، مسلمانوں کے دولت، علم اور سیاسی بیداری میں پیچھے ہونے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک آپ ہی پر ہے، یہ بھی نہیں کہونگا کہ مسلمانوں کی نجات کی دوسری صورتیں بھی تھیں اور ان میں سے ہر ایک اس دردناک عمل جراحی سے جسے تقسیم ہند کہتے ہیں، بہتر تھی۔ فرض کر لیجئے کہ مسلمانوں کا تحفظ صرف پاکستان ہی کے ذریعے سے ہو سکتا تھا۔ مگر کن مسلمانوں کا؟ مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد کے مسلمانوں کا جو اپنی کثرت تعداد کی وجہ سے تحفظ کے محتاج نہ تھے یا کم سے کم اس حد تک نہ تھے جس حد تک ہم اور آپ یعنی مغربی بنگال، اڑیسہ، بہار، یوپی، مشرقی پنجاب، دہلی، راجپوتانہ، کاٹھیاواڑ، سی۔ پی، بمبئی، مدراس کے مسلمان۔ اصلی مسئلہ ہمارے آپ کے تحفظ کا تھا۔ وہ پاکستان بننے سے کیونکر حل ہو سکتا تھا؟ شاید آپ نے یہ سوچا تھا کہ ہم اپنے آپ کو قربان کر کے ان مسلمانوں کو بچائیں گے جو بچائے جا سکتے ہیں۔ کیا آپ سچ کہتے ہیں کہ پہلے سے یہ خیال آپ کے دل میں تھا یا یہ محض نکتۂ بعد از وقوع ہے۔ اچھا اگر آپ اپنی اور کروڑوں مسلمان عوام کی قربانی دینے کو تیار تھے تو کیا آپ نے ان غریبوں سے بھی پوچھ لیا تھا؟ جب آپ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں سے پاکستان کے نام پر ووٹ لینے گئے تھے تو آپ نے انہیں جتا دیا تھا کہ پاکستان بننے سے تم کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ الٹا نقصان ہوگا اس لئے کہ اکثریت کو تم سے اور زیادہ عناد پیدا ہو جائیگا؟

دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آپ نے کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ جذبات کے سیلاب میں بہہ گئے تھے یا اگر کوئی بات سوچی تھی تو وہ عوام کو نہیں بتائی تھی بلکہ انہیں دھوکے میں رکھا تھا۔ اپنے دل کو ٹٹولئے اور اپنے قصور کا اعتراف کیجئے۔ غلطی کے اعتراف کے بغیر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی اور تلافی آپ کو کرنی ہے۔ واقعات یہ بتاتے ہیں کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہے اور آپ اس کی تلافی کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ مسلم لیگ سے الگ ہو کر جداگانہ پارٹیاں کہیں جمعیت پارٹی کے نام سے کہیں جنتا پارٹی کے نام سے کہیں جمہوری پارٹی کے نام سے بنا رہے ہیں۔ کیا یہ طریقہ صحیح ہے۔ آپ کہیں گے "آخر پھر ہم کیا کریں؟ اگر ہم کانگریس میں یا سوشلسٹ پارٹی میں کسی اور موجودہ پارٹی میں شریک ہوں تو شبہے کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔ ہمیں پچھلی صف میں جگہ ملیگی" درست ہے۔ لیکن اپنی الگ پارٹی بنانے سے آپ عام مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ آئندہ الکشن میں انتخابی حلقے مخلوط ہوں گے۔ آپ مسلمانوں کے کچھ ووٹ لے کر ضائع کر دیں گے۔ غیر مسلموں کے ووٹ آپ کو نہیں ملیں گے۔ اس لئے آپ منتخب نہیں ہو سکیں گے اور اگر عوام میں آپ کی کچھ ساکھ باقی ہے تو وہ بھی جاتی رہیگی۔ اس لئے آپ الگ پارٹیاں نہ بنائیے۔ کانگریس میں یا کسی اور مخلوط پارٹی میں جس کا پروگرام آپ کو سب سے زیادہ معقول معلوم ہو شریک ہو جائیے۔ اگر پچھلی صف میں جگہ ملے تب بھی بددل نہ ہونا چاہیے۔ کچھ دن انتظار کیجئے اور رفتہ رفتہ اپنے عمل سے، اپنے خلوص کا سکہ بٹھا دیجئے پھر آپ کو آگے بڑھنے کا موقع ملیگا۔ اس سے بھی اچھی صورت یہ ہے کہ ایک مدت کے لئے سیاسی لیڈری کا خیال چھوڑ دیجئے اور تعمیری کاموں کے ذریعے سے عوام کی خدمت کیجئے۔ آپ نے ان کے دلوں میں فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکایا تھا جس کی سزا آپ اور آپ سے کہیں زیادہ وہ بھگت رہے ہیں۔ اب اس زہر کو ان کے رگ و پے سے دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ انھیں رواداری اور اتحاد کا رستہ دکھائیے۔ آپ نے انہیں دس بارہ سال تک پاکستان کے نشے میں ایسا مدہوش رکھا کہ اُن کی توجہ تعلیم، معاشرتی اصلاح، اقتصادی ترقی کے کاموں سے بالکل ہٹ گئی۔ اس کی تلافی بھی آپ کا فرض ہے۔ تعمیری خدمت کے ذریعے سے ان کی محبت اور قیادت حاصل کیجئے۔ پھر آپ جس پارٹی میں شریک ہوں گے وہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لے گی۔

نیشنلسٹ مسلمانوں سے مجھے دوسری شکایت ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اتحاد ہند کے علمبردار تھے مگر خود اپنے حلقے کے اندر اتحاد قائم نہیں رکھ سکے۔ آپ کو کانگریس کے مقاصد سے پورا اتفاق تھا۔ مگر آپ کانگریس سے الگ رہے۔ شاید اس وجہ سے کہ آپ سمجھتے تھے جب تک جداگانہ انتخاب ہے کانگریس میں شریک ہو کر آپ عام مسلمانوں سے ووٹ نہیں لے سکتے۔ الگ پارٹی بنا کر لے لیں گے۔ مگر سچ بتائیے آپ کو کتنی کامیابی ہوئی؟ سب جانتے تھے کہ آپ کانگریسی خیالات رکھتے ہیں اور آپ کا ایک الگ سیاسی جماعت ہونے کا دعویٰ بالکل بے معنی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ آپ پارٹی کے نظم وضبط کی بندشوں کو نہیں سہہ سکتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی بلکہ ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی کئی مسجدیں بنا ڈالیں اور ان میں بھی جب جماعت ہوتی تھی تو ہر شخص امام بننا چاہتا تھا۔ اب آپ اپنی جداگانہ پارٹیوں کو توڑ کر کانگریس میں اور سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو رہے ہیں۔ خدا کے لئے اُن میں جا کر نظم وضبط سے رہئے گا۔ ویسی ابتری نہ پھیلائیے گا جیسی آپ اپنی جماعتوں میں اب تک پھیلاتے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو اپنا لہجہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے سخت کلامی اور بدگوئی فرقہ پرست جماعتوں سے سیکھی اور انہیں ترکی بہ ترکی جواب دے کر خوش ہوتے رہے۔ ان کی تقلید آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو گاندھی جی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ جو ہمیشہ حق کی تلخی کو محبت کی شیرینی میں حل کر کے سننے والوں کے لئے گوارا بنا دیتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ آپ کی زبان کے وار ملک وقوم کے دشمنوں پر ہوتے ہیں اور یہ مادر ہند سے آپ کی وفاداری کی دلیل ہے۔ لیکن آپ کی وفاداری ثبوت کی محتاج نہیں۔ ثبوت تو آپ کو خودداری وقار و متانت، صبر و تحمل اور رواداری کا دینا ہے۔ ورنہ آپ کی بات کتنی ہی سچی اور چبھتی ہوئی کیوں نہ ہو اُس میں وزن نہیں ہوگا۔ اور کشش نہیں ہوگی۔

آخر میں سب تعلیم یافتہ مسلمانوں سے خواہ وہ کسی سیاسی پارٹی میں ہوں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ پر یہ ذمہ داری ہر جگہ اور ہر حال میں عائد ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ مگر اس حقیقت کو نہ بھولئے کہ حقوق اور فرائض کا چولی دامن کا ساتھ ہے حقوق اپنے فرائض کو ادا کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کو عموماً فکر رہتی ہے اپنے حقوق کی اور دوسروں کے فرائض کی۔ آپ دوسرے فرقوں کو، سیاسی پارٹیوں کو، حکومت کو غرض اپنے سوا سب کو ان کے فرائض یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ آپ اپنے سوا سب کے خیرخواہ ہیں۔ اگر آپ اپنے خیرخواہ ہوتے تو سب سے پہلے اپنے نفس کا احتساب کرتے، اپنے اعمال کا جائزہ لیتے، اپنی چوریاں پکڑتے۔ آپ ہندوستانی ریاست کے اندر مسلمانوں کے جائز حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو وہ فرائض سمجھائیے جو ریاست کی طرف سے ان پر عائد ہوتے ہیں اور ان کو ادا کرنے کی تاکید کیجئے۔ یہ کام آسان نہیں ہے، انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہم ریاست کا مفہوم ہی بھول گئے تھے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں با اقتدار ریاست تھی ہی نہیں۔ ہم ہندوستانی والیان ریاست کے علاقوں کو اخلاقاً ریاستوں کے نام سے موسوم کرتے تھے حالانکہ حقیقت میں وہ محض جاگیریں تھیں۔ پورے ہندوستان پر راج کرنے والے ادارے کو جو برطانوی ریاست کا ایک ماتحت ادارہ تھا ہم گورنمنٹ آف انڈیا کے نام سے پکارتے تھے۔ اس نام کا ہم پر بڑا رعب تھا مگر اس سے کوئی دلی رشتہ نہ تھا۔ ہم میں سے بہت سے اسے اپنے ملک کا دشمن سمجھتے تھے اور اُس سے بیزار تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو ہندی برطانوی حکومت کا وفادار کہتے تھے۔ خوف اور لالچ کی بنا پر جو تعلق حکومت سے پیدا ہو گیا تھا اُسے ہم نے وفاداری سمجھ لیا تھا۔ آزاد قوموں کو اپنی جمہوری ریاست سے جو وفاداری ہوتی ہے اس کا ہمارے ذہن میں کوئی تصور تک نہ تھا۔ اب یہ تصور آپ اپنے اور سب ہندوستانیوں کے ذہن میں پیدا کیجئے خصوصاً مسلمانوں کے ذہن میں اس لئے کہ ابھی تک صرف آپ ہی کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ ان کو بتائیے کہ ریاست مظہر ہے افراد کے اجتماعی اخلاقی رجحانات کی۔ اس کی وفاداری جو دراصل خود ہمارے اخلاقی وجود کی وفاداری ہے، ہماری فطرت کا تقاضا ہے۔ جب آپ ریاست کے ساتھ یہ جیتا جاگتا رشتہ قائم کر لیں تو آپ شوق سے اپنے حقوق کا مطالبہ بلکہ دعویٰ اور تقاضا کیجئے۔ مگر اس سلسلے میں ایک

بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲

بچہ محبت کا بھوکا ہے

محبت اور پیار بچہ کی فطری غذا ہے ، جس خاندان میں اسے یہ غذا ملتی ہے ، وہاں وہ اچھی طرح بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے ، ورنہ یہ ننھی سی معصوم جان مرجھا کر رہ جاتی ہے ، ایسا بچہ بڑا ہونے کے بعد ایک بے حس ، بے جان مٹی کا پتلا بن کر رہ جاتا ہے ۔

ذیل میں اسکاٹلینڈ کے ایک ڈاکٹر کا جو نفسی امراض کا معالج تھا ایک تجربہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ بچپن میں محبت سے محروم رہنا انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتا ہے ۔

بچہ کا نام والٹر تھا اور عمر تقریباً چار برس کی ہوگی ، پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جب والٹر ماں کے پیٹ میں تھا ، اس کا باپ فوج میں بھرتی ہو کر دور دراز میدان جنگ میں چلا گیا تھا ، اس کی غیر حاضری میں والٹر پیدا ہوا ، دن گذرتے گئے ، باپ گھر نہ آنا تھا نہ آیا ۔ والٹر ماں کی آغوش محبت میں پلتا بڑھتا رہا ، جب تقریباً چار برس کا ہوا تو ایک دن اس کی نظر باورچی خانہ میں لگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی ، وہ تصویر اس کو کچھ ایسی بھائی کہ وہ گھنٹوں اس کو دیکھتا رہتا ، آخر اس تصویر کی بدولت اس کی زندگی ہی بدل گئی ، اور دماغ میں اس کا ایسا نقش بیٹھا جو ساری عمر نہ مٹ سکا ۔

یہ ایک پوسٹر تھا جو سپاہیوں کی بھرتی کے سلسلے میں شائع کیا گیا تھا ، اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک فوجی عرصہ کے بعد میدان جنگ سے گھر واپس آیا ہے اور آتے ہی اس نے اپنا تھیلا اور دوسری چیزیں پھینک کر اپنے بچے کو جو والٹر ہی کا ہم عمر ہے بڑی محبت اور گرم جوشی سے اپنی گود میں اٹھا لیا ہے ۔ بچہ بہت خوبصورت ہے ، اس کے گلاب جیسے نرم و نازک گال ، چمکیلی معصوم آنکھیں ، سنہرے گھونگھریالے بال بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں ، بچہ باپ کی محبت دیکھ کر پھولا نہیں سماتا اور بڑے پیار اور معصومانہ محبت سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے ، ادھر باپ بھی جب بچہ پر نظر ڈالتا ہے تو خوشی فخر اور محبت سے اس کا چہرہ چمک اٹھتا ہے ۔

والٹر کو اس تصویر سے اتنا شغف ہو گیا تھا کہ گھنٹوں دیکھنے کے بعد بھی جب اس کا دل نہ بھرتا تو وہ اصرار کیا کرتا کہ اس کو اٹھا کر برتنوں کی الماری پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ وہ زیادہ قریب سے تصویر کو دیکھ سکے ، اور جو سبز باغ سے دکھایا گیا ہے اس سے لطف اٹھا سکے ۔

اس تصویر کو ایک عرصہ تک دیکھنے کا اس کے اوپر یہ اثر ہوا کہ اس نے بھی اپنے باپ کی واپسی کا ہو بہو وہی نقشہ اپنے دماغ میں بنا لیا جو اس تصویر میں پیش کیا گیا تھا ۔ وہ سوچا کرتا کہ میرا باپ بھی ایک دن اسی آدمی کی طرح گھر آئے گا وہ بھی اسی طرح بڑے پیار اور محبت سے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیگا ، اسی طرح مجھے دیکھ کر خوش ہوگا اور میں بھی اس کو دیکھ کر پھولا نہ سماؤں گا ۔

دن اور مہینے گزرتے گئے ۔ والٹر برابر تصویر کو اور زیادہ ذوق و شوق سے دیکھتا رہا اور اس کا نقش اپنے ننھے سے دماغ میں بٹھاتا رہا ، آخر ایک دن باورچی خانہ کے دروازے کے سامنے بھاری بھاری پیروں کی آواز سنائی دی ، اور کھڑکی کے رنگین شیشوں سے ایک سایہ سا چلتا دکھائی دیا ، جونہی دروازہ کھلا ، ایک تھکا ماندہ بھاری بھر کم سپاہی داخل ہوا جس کا حلیہ اور وضع قطع تصویر والے آدمی سے بالکل مختلف تھی ، یہ والٹر کا باپ تھا ۔ جس کا وہ مدتوں سے انتظار کر رہا تھا اور جس کا اس نے ایک خاص تصور قائم رکھا تھا ، لیکن اسے دیکھتے ہی والٹر کے دل پر ایک دھچکا لگا ۔ ایک لمحہ کے لئے ہر طرف خاموشی چھا گئی ۔ فوجی آگے بڑھا اور اس نے سب سے پہلے اپنی بیوی اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں لڑکوں کو پیار کیا ، یہ دونوں بیچ سے ہٹ گئے ، اب باپ اور بچہ آمنے سامنے تھے ۔ بچہ منتظر تھا کہ اب باپ اس کو اپنی گود میں اٹھا کر تصویر والے آدمی کی طرح گرم جوشی اور محبت سے پیار کریگا ، لیکن باپ نے اس کی توقع کے خلاف وہ سلوک کیا جس کا اثر اور اس کی تلخ یاد اب تک اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے ۔ فرط جذبات سے اس کا دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ مشکل سے ان الفاظ کو سن سکا جو اس کے باپ نے اس کے متعلق کہے ۔ پھر بھی جو کچھ اس کے کان میں پڑ گئے وہ آج تک اس کے دماغ میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہیں ۔

باپ نے اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور بڑے روکھے پن سے کہا "اچھا تو والٹر یہی ہے" بس اتنا کہہ کر چل دیا ۔

باپ کی اس بے التفاتی کا لڑکے کے اوپر اتنا برا اثر پڑا کہ اس حادثہ کے بعد کئی ہفتے تک دماغ کام ہی نہیں کرتا تھا ، بعد میں جب ذرا سکون ہوا تو پھر تصویر کی طرف اس کی توجہ ہو گئی بلکہ اب اور زیادہ غور اور انہماک سے اسے دیکھنے لگا ، لیکن اس کی آنکھوں کی وہ چمک اب غائب ہو چکی تھی ، اور اس طرح مسلسل تصویر کو دیکھتے رہنے سے اس کے دماغ میں اب یہ وہم بیٹھ گیا کہ تصویر میں جو آدمی ہے دراصل وہ اس کا باپ ہے اور بچہ وہ خود ہے ۔ لیکن تصویر میں جو بچہ بنا تھا وہ بہت خوبصورت تھا اس نے اپنے اوپر جو نظر ڈالی تو اس کو محسوس ہوا کہ میں بڑا بدصورت ہوں ، اسی لیے میرا باپ مجھے نہیں چاہتا ۔ یہ خیال اس کے سینہ میں راسخ ہو گیا ۔

باپ کی واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد پورا خاندان سیر کو جانے کی تیاریاں کر رہا تھا ، والٹر کو اس موقع پر یقین تھا کہ اس کی دلی آرزو پوری ہوگی اور باپ اس کو گود میں لے کر چلیگا ۔ چنانچہ جب خاندان روانہ ہونے لگا تو اس نے مچل کر کہا میں ابا کی گود میں جاؤں گا ، لیکن باپ نے صاف انکار کر دیا اور اسے اپنے کوٹ کا دامن پکڑا دیا کہ اس کے سہارے چلو ، بیچارہ ننھا بچہ کوٹ کے سہارے چلتا رہا آخر کچھ دور چلتے چلتے تھک گیا تو بیچ سڑک میں دردناک چیخیں مار کر رونے لگا کہ اس کا باپ اسے گود میں اٹھائے اور اس تصویر کو حقیقت کر دکھائے ۔ بچہ کے لگاتار رونے اور قابل رحم حالت سے مجبور ہو کر آخر باپ نے اس کو گود میں اٹھا ہی لیا ، اور والٹر کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا ، لیکن جوں ہی اس کی نظر باپ کے غضبناک چہرہ اور کڑے تیوروں پر پڑی اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی اور وہ پھر چیخیں مار کر رونے لگا ۔

اس کے بعد عموماً باپ محبت اور پیار کے بجائے اس سے خفگی اور غصہ ہی کا اظہار کرتا رہا مگر والٹر برابر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی ترکیبیں نکالتا تھا ۔ چنانچہ وہ فرش پر اپنے باپ کے پاؤں کے بالکل قریب اس امید میں بیٹھتا کہ شاید باپ اس کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لے لیکن بے حس باپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا ۔ اس کے علاوہ اس سے وقت بے وقت کہا جاتا کہ دیکھو اپنے باپ کے جیتے نہ چھیڑنا ، کوئی چیز ادھر ادھر نہ کرنا ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا کھیل کود سے جی ہٹ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بے رونق اور غمگیں ہو گئیں ۔

پہلے جب میرا تعارف اس سے ہوا تو وہ ایک گندم گوں ، سڈول جسم کا نوجوان تھا ، میں نے اس کے بشرے سے اس کی نشو و نما کی خامی کو فوراً بھانپ لیا ، اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اس کی گہری آنکھوں سے حقارت اور نفرت برس رہی تھی ، اور اس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار نمایاں تھے ، اس ابتدائی ملاقات میں اس نے ایک بیزاری کے انداز سے مجھے دیکھا اور پھر میرے سر کے اوپر خلا میں اپنی نظریں گاڑ دیں اور پھر کبھی طرف توجہ نہیں کی ۔

اس کے بعد وہ بلا تکلف صوفہ پر لیٹ گیا اور جو کچھ اس سے کہا جاتا اسکو سمجھ لیتا اور جب وہ سوچنے لگتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے مختلف چہرے آجاتے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا وہ دیکھو وہ میرے باپ کا چہرہ ہے ۔ اس کی اس حرکت سے میں نے اس کے مرض کا سبب ، پس منظر اور پورا قصہ سمجھ لیا ۔

مریض سے تعارف ہونے سے پہلے مجھے دیوار کی وہ تصویر دکھلا دی گئی تھی ۔ اب جبکہ میں نے اس کی نفسی الجھنوں کا مشاہدہ کیا تو یہ بات معلوم کر لی کہ اس تصویر کے دیکھنے سے لڑکے کے ذہن میں باپ کی آمد کا ایک خاص تصور بندھ گیا تھا اور باپ کے آجانے کے بعد جب اس فریب خیال سے پردہ اٹھ گیا تو وہی تصویر اس کے لئے اب مرکز حیات بن گئی ، اس کا ردعمل اس کے اوپر یہ ہوا کہ وہ بھی بت بن کر رہ گیا اور اس کے جذبات اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے ۔

جب وہ لوگوں سے باتیں کرتا تو ایک خاص جھٹکے کے ساتھ اور ہکلا کر بولتا ، اکثر اوقات بڑی دیر تک الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل پاتے ۔ جب مجھ سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے بہت جھجھک جھجھک کے باتیں کیں ، اس کی وجہ بھی بہت جلد سمجھ میں آگئی ، اور وہ یہ کہ بچپنے میں اس کو زیادہ بولنے کی اجازت نہ تھی اور خصوصاً جب سے اس کا والد آیا تھا زور سے بولنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی ۔ اس کی ماں ہر وقت کہا کرتی یہ باتیں کیا کرتے ہو ؟ دیکھو ایسا نہ کرو ، چلایا نہ کرو ، یہ نہ کرو ، وہ نہ کرو ۔ اس برتاؤ سے یہی نہیں کہ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا بلکہ اس کی یہ عادت پڑ گئی تھی کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہ بستر کے اندر منہ چھپا کر چپکے چپکے رو دیا کرتا ۔

چونکہ وہ حساس اور نازک دماغ لڑکا تھا اور اس کا احساس ظرافت بری طرح کچل دیا گیا تھا اس لئے وہ دنیا کی اکثر چیزوں کو خراب مہمل اور ناقابل التفات سمجھتا تھا اور چند غیر دلچسپ روکھی پھیکی چیزوں کو اچھا اور قابل التفات ۔

اس کے اوپر اتنی پابندیاں تھیں کہ اتوار کے دن اسکول میں جا کر بکس کے اندر اک پینی ڈالنے کی اجازت تو تھی (جس کو وہ فضول خرچی سمجھتا تھا) لیکن اگر واپسی میں کوئی لڑکی اس کی طرف مسکرا کر دیکھ لے تو اس کی مجال نہ تھی کہ وہ بھی اس کے جواب میں مسکرائے ۔

ایک دن کسی گستاخی پر اس کے باپ نے کوڑے سے اس کی خوب پٹائی کی اور جب شدت تکلیف سے بےچین ہو کر اس کی چیخ نکل گئی تو باپ نے بڑی زور سے ڈانٹ کر کہ "چپ رہو" نہیں تو ابھی اگر دوبارہ تمہاری خبر لینا ہوں ۔

جب تک وہ بچہ رہا ماں نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ، وہ گھرداری کے کاموں میں اس بری طرح پھنسی رہتی کہ اپنے ننھے بچے سے ہنسنے بولنے کا وقت نہ ملتا ، باپ کی

طرف سے تو وہ پہلے ہی مایوس ہو چکا تھا، اب اس کا سہارا صرف ماں رہ گئی تھی وہ بھی باوجود اس کے کہ اچھے سے اچھا کھلاتی اور اچھے سے اچھا پہناتی لیکن اس کو پیار کرنے کے لئے وقت نہ نکال پاتی۔

ماں باپ دونوں سے مایوسی کی وجہ سے اسکول کی تعلیم کے پورے زمانے میں وہ اس تصویر کے خوبصورت رُخ سے متاثر ہوتا رہا اور اسکول میں بھی صرف خوبصورت اور چھوٹے ہی لڑکوں سے وہ بے تکلفی سے ملتا تھا یہی نہیں بلکہ وہ ہر خوبصورت چیز کا معیار تصویر ہی کو سمجھنے لگا۔ اسی لئے خوبصورت لڑکوں سے تعلقات بڑھا کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگا۔ بلوغت کے وقت ایسے لڑکوں سے اس کی دلچسپی اور بڑھنے لگی، لیکن ساتھ ہی اس کو ایک گونہ الجھن بھی ہونے لگی۔ چنانچہ اس نے اپنے جذبات کو دبانے کی پوری کوشش کی اور اپنی توجہ کھیل کود اور ورزش کی طرف پھیر دی یہاں بھی اس کو اپنے ان ساتھیوں سے دلچسپی ہونے لگی جو قد و قامت اور جسمانی اعتبار سے خوب صورت تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اسکول لڑکیوں سے مطلق دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی خود بخود اس کی طرف بڑھتی تو وہ اس سے بھاگتا۔

بڑا ہونے کے بعد اس نے فوج میں ملازمت کر لی [illegible] ملازمت کے دوران میں اس کو کئی بار [illegible] کا تجربہ ہوا لیکن اس میں اس کے دل کی خواہش کو دخل نہ تھا بلکہ اس سے صرف ایک شہوانی ضرورت کی تکمیل مقصود تھی۔

فوج سے برخاست ہونے کے اور لندن میں کسی جگہ ملازم ہو جانے کے بعد جب وہ میرے پاس آیا تو جسمانی طور سے تو وہ مکمل مرد تھا لیکن ذہنی حیثیت سے اپنی عمر کے [illegible] برس میں وہ بدستور بچہ ہی رہا تھا۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا، دوسرا رخ جس کی وجہ سے وہ خوبصورت لڑکوں کی طرف کھنچتا اور اپنے ہم عمروں میں خوبصورت جسم و خوبصورت چہرہ والوں سے تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا، یہ خیال تھا کہ میں تو بدصورت ہوں ہی، ممکن ہے ان لوگوں سے تعلق پیدا کر کے اس سکون میں شریک ہو سکوں جو ان کو اپنی خوبصورتی اور تناسب اعضا سے ملتا ہے۔

علاج کے دوران میں رفتہ رفتہ یہ شخص تاریکی سے اجالے میں آنے لگا۔ اب اس کی نظر میں پیار کی تصویر کا رنگ پھیکا پڑ گیا، اور اس سے اب تک جو لگاؤ تھا اس میں بھی کمی ہونے لگی۔ آخر ایک دن اس نے اپنی بابت ایک نہایت اہم انکشاف کیا اس کو بغیر کسی شک و شبہ کے محسوس ہوا کہ بحیثیت مرد کے اس کا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس کو چاہے، اس سے محبت کرے۔ لیکن یہ محبت کرنے والا اس کا باپ یا کوئی اور مرد نہ ہو بلکہ کوئی عورت ہو۔ اس کے خیال میں چاہنے کا کام مرد کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ بچپنے میں تو بیشک مجھے باپ کی محبت کی خواہش تھی، لیکن اب تو وہ زمانہ گذر گیا، اب تو میں پورا مرد ہوں اور اب مجھے خود باپ بننا چاہیئے۔

اب اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ ناچے۔ اس کو لے کر سیر و تفریح کو جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہتا کہ وہ لڑکی حسین ہونی چاہیئے۔ اب اس کے عادات و اخلاق میں خاصی تبدیلی ہونے لگی، عورتوں سے بے تکلف ملنا جلنا اب بھی دشوار تھا، لیکن چونکہ زندگی اور اس کی نعمتوں کی خواہش اس کے دل میں بہت تھی اس لئے اسے یہ حقیقی زندگی مل گئی۔ وہ اس طرح کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہتا تھا ان کے یہاں عموماً دوسرے گھرانوں کی لڑکیاں بھی آیا جایا کرتی تھیں۔ ایک دن ایک نوجوان عورت گھر میں آئی اور اس کو بیمار مریض سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے بڑی خوش اسلوبی اور خوش ادائی سے اس نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کیا اس وقت سب سے پہلے اس کے دل میں لطیف جذبات پیدا ہوئے اور اس کا دل اس لڑکی کی طرف کھنچنے لگا اور گویا ایسا معلوم ہوا کہ اس کے دماغ پر جو جمود کا کہر چھایا ہوا تھا وہ اب چھٹنے لگا ہے۔

آخر اس نے اس نوجوان لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا اور پھر خدا نے اسے ایک ہنستا کھیلتا بچہ عطا کیا۔ بچہ اس کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنے کے لئے کبھی اس کے بال کھینچتا کبھی نوچتا، غرض مختلف طریقوں سے اس کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ پہلے پہل تو یہ نفسیاتی مریض بہت جھلایا اور بچے کو نفرت کی نظروں سے دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ تو اس کھیل میں جیتنا چاہتا ہے، جس میں مجھے ہمیشہ ہار ہوئی۔

لیکن بعد میں اس نے محسوس کیا کہ اس بچے سے محبت کر کے اسے خاصی فرحت ہوتی ہے، اس کے علاوہ لوگوں کے کہنے سننے سے اس کے اندر خاصی تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ پورا انسان بن گیا۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے تو اس کا مستقبل امید افزا ہے لیکن دوسرے نوجوانوں کی طرح پہلے پہل محبت کرنے سے اس کا دماغ بھی چکر کھا رہا ہے۔

وہ غلطیاں کر رہا ہے، لیکن ان سے سیکھ بھی بہت کچھ رہا ہے، اور چونکہ اب وہ صحیح معنوں میں زندہ ہے اس لئے جو کچھ بھی کرے گا وہ بھلا ہی ہوگا، (ترجمہ عبدالحلیم ندوی)

بسلسلہ صفحہ ۴

ہے "کیوں بھئی کون سے دانت کھانے کے ہیں کون سے دکھانے کے؟"

ان باتوں کو سن کر آپ کے ذہن میں اُن کی تصویر کچھ اس قسم کی آئے گی کہ ایک دھڑ ہے دو سر ہیں۔ ایک سر ہیٹ سے آراستہ ہے، دوسرا کھادی ٹوپی سے۔ ایک ہاتھ میں یونین جیک ہے دوسرے میں قومی جھنڈا۔ آدھے بدن پر کوٹ آدھے پر کرتا، ایک ٹانگ میں پتلون کا پائینچہ ایک میں دیسی پاجامہ کا، ایک پاؤں میں ولایتی شو ہے ایک میں چپل۔ مگر یہ تو للوئے دو سرے کا سر [illegible] انسان کی تصویر نہ ہوئی۔ آئیے ہم آپ کو ان کی سیرت کا ایک روشن رخ بھی دکھاتے ہیں تاکہ دھوپ چھاؤں کے صحیح تناسب سے آپ اُن کی صحیح ذاتی تصویر کھینچ سکیں۔

ہمارے [illegible] بی۔ سی کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمدردی کا مادّہ ہے جس کی عمومیت کی کوئی حد نہیں۔ بچپن میں ان کے ماں باپ [illegible] تقاضائے محبت ہمیشہ آپس میں [illegible] اس وقت تک [illegible] ہوا تھا مگر

بالائے سرش ز ہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

وہ ہوش لغت میں دونوں سے ایک [illegible] ہمدردی کا اظہار کرتا۔ ایک کے سامنے وہ تیر کو بُرا کہہ کر اس کے زخم دل پر مرہم رکھتا اور دوسرے سے پیچھے بلکہ اپنا غم غلط کرنے کو مٹھائی کھاتا۔ وہ بڑا ہو کر مدرسے میں داخل ہوا تو وہاں [illegible] ہمدردی کا یہی حال تھا، دو لڑکوں میں لڑائی ہوتی وہ دونوں کا غمخوار اُستاد [illegible] کشمکش ہو تو فریقین کا مشیر کار بن جاتا تھا۔

جب اے۔ بی۔ سی نے بی۔ اے ایل ایل بی ہو کر پبلک لائف میں قدم رکھا تو ان کے ہمدردی کے جذبے کو اپنے اظہار کے لئے اور زیادہ وسیع میدان مل گیا۔ وہ ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کے ہاں اللہ کا دیا یعنی اللہ کے غریب بندوں سے لیا ہوا سب کچھ موجود تھا اور انہیں کسب معاش میں جان کھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے دیکھا ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص راعی اور رعایا کے بیچ میں پڑے اور اس بات کی کوشش کرے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ سہی کم سے کم اُسی سے خوش رہیں۔ اے۔ بی۔ سی جانتے تھے کہ دل کو دل سے راہ ہو یا نہ ہو، مگر [illegible] پیٹ سے ضرور راہ ہے چنانچہ وہ قومی خدمت کے لئے پبلک پلیٹ فارم اور لکھنے کی میز سے زیادہ کھانے کی میز سے کام لیتے تھے۔ اکبر مرحوم نے انہیں کی شان میں کہا تھا۔ ع

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ

لیکن یہ مصرعہ صرف معاملے کے ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اے۔ بی۔ سی صرف حکام بالادست ہی کی دعوتیں نہیں کرتے تھے بلکہ حکام زیردست یعنی ملکی لیڈروں کے غذائی مسئلے کو حل کرنے میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جب راشننگ کا دور آیا اور ہم کو آپ کو آدھے پیٹ آٹا اور ایک دال شکر ملنے لگی تو اے۔ بی۔ سی کو بڑی مشکل پیش آئی۔ مگر ان کی طبع رسا نے اس کا یہ حل نکالا کہ چور بازاری کے انسداد کا بیڑہ اُٹھا لیا، اور محکمہ غذا کے عمال سا تھ مل کر ناجائز ذخیروں کو بحق افسران سرکار اور بحق لیڈران قوم ضبط کرنے لگے۔ چور بازار خالی کر کے چور معدوں کو پُر کرنے کی خدمت انھوں نے بڑی تندہی سے بغیر کسی معاوضے کے برسوں تک انجام دی۔ اسی کے صلے میں سرکار ابد قرار نے ان کو سر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

مگر افسوس ع سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے۔ یعنی اُن کے سر ہوتے ہی سرکار ابد قرار سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہو گئی، وہ سر جو زیب تن ہوتا اب وبال دوش ہو گیا۔ اب بیچارے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ دو طرح کے ملاقاتی کارڈ رکھیں۔ ایک پر "سر اے۔ بی۔ سی۔ کٹ" اور دوسرے پر "خادم قوم اے۔ بی۔ سی" چھپوائیں، انگریزی وضع کے کپڑے تو بہت تھے۔ اب اس مہنگائی کے زمانے میں شدہ کھدر کے کپڑے جن میں تراش کم اور خراش زیادہ ہوتی ہے بنوانے پڑے۔ آپ ان کی دورنگی پر ہنستے ہیں حالانکہ آپ کو قلق آنا چاہیئے۔ اس غریب کی حالت پر جسے روشنی سے اتنی سچی محبت ہے کہ ڈوبتے چاند کی ٹھنڈی پھیکی کرنیں اور چڑھتے سورج کی گرم تیز شعاعیں یکساں عزیز ہیں۔ دونوں کی چھوٹ نے مل کر یہ گنگا جمنی رنگ پیدا کر دیا ہے جسے آپ دورنگی کہتے ہیں۔

پتے

اپنے پتے ذرا غور سے دیکھ لیجیئے۔ اگر کوئی غلطی ہو تو ہمیں فوراً لکھیئے تاکہ پتوں کے چھپنے سے پہلے ٹھیک کر دی جائے۔

نکتے کو اچھی طرح سمجھیئے۔ جمہوری ریاست کے اندر اقلیت کے لئے چند کونسل کی نشستوں اور ملازمتوں کا محفوظ کر لینا محض دل بہلانے کے لئے ہے در اصل یہ کوئی تحفظ نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ریاست کا پورا آئین حریت اور مساوات پر مبنی ہو اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ریاست کے اندر رہنے والوں میں اخوت کی روح موجود ہو۔ اکثریت کے دل میں بے تعصبی، رواداری اور محبت کا ہونا اقلیت کے لئے سب سے بڑا تحفظ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اکثریت کے دل میں محبت، دوستی اور دوسرے جذبات جو اس کے تابع ہیں کیونکر پیدا ہوں؟ در اصل دو فریقوں میں دوستی اس طرح نہیں پیدا ہو سکتی کہ ایک دوسرے سے کہے پہلے تم دوستی کا برتاؤ کرو پھر ہم کریں گے۔ اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس فریق کو اس کی ضرورت کا زیادہ احساس ہو وہ ابتدا کرے مگر خلوص اندر رکھ کر رکھاوے سے نہ۔ اگر ایک طرف سے دوستی اور محبت کا برتاؤ ایک مدت تک مسلسل ہوتا ہے اور اس میں سچائی ہو، بناوٹ نہ ہو، خود داری ہو خوشامد نہ ہو تو طرف ثانی پر اس کا اثر ہو کر رہتا ہے۔

آج ملک میں فرقہ وارانہ نفرت کا زور ہے اور آپ اس سے دل گیر اور مایوس ہیں۔ اس کا الزام آپ اکثریت پر رکھتے ہیں اور انگریزی حکومت پر۔ لیکن اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ کیا آپ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔ انگریزوں کا تو فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے میں سراسر فائدہ تھا۔ اکثریت کا نقصان ضرور تھا مگر اتنا نہیں جتنا آپ کا۔ آپ کے لئے تو نفرت کی فضا مہلک تھی۔ پھر آپ میں سے بہت سے لوگوں نے اس کے پیدا کرنے میں کیوں مدد دی اور اس کے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ انگریز ہندوستان سے جا چکے ہیں۔ ہندوستانی فرقہ وارانہ جھگڑوں سے تھک گئے ہیں۔ موجودہ دنیا کا ماحول بھی، فرقہ پرستی، کم سے کم مذہبی فرقہ پرستی کے لئے سازگار نہیں ہے۔ دوسرے مسائل اٹھ رہے ہیں جن کے اندر یہ قوت موجود ہے کہ فرقہ پرستی کو مٹا دیں یا کم از کم دبا دیں۔ مذہبی منافرت کی یہ ہوا جو ہمارے ملک میں اس قدر شدت سے چلی ہے بہنے والی نہیں ہے۔ سب فریقوں کے سمجھ دار آدمی چاہیں تو فوراً بدل سکتی ہے۔ اگر ایک فریق کے سمجھ دار آدمی دل و جان سے کوشش کریں گے تو یہ بہت جلد بدل جائیگی۔ خدا پر بھروسہ کیجئے، ہمت اور عقل سے کام لیجئے۔

حافظا از باد خزاں در چمن دہر مرنج　　فکر معقول بفرما گل بے خار کجاست

نئی روشنی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶ اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے۔

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم (ایک صفحہ میں چار کالم)

نمونے کے پرچے

جن لوگوں کی خدمت میں نمونے کے پرچے بھیجے جا رہے ہیں، براہ کرم بواپسی ڈاک اخبار کی خریداری کی اطلاع دیں تاکہ دوسرا پرچہ انھیں وقت پر مل جائے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں فائدہ ہے۔ وی۔ پی بھیجنے میں پیسے زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور اخبار دیر سے پہنچتا ہے۔ خط لکھتے وقت پتہ ہمیشہ صاف لکھئے اور اگر ہو سکے تو انگریزی میں بھی۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)
مطبوعہ: جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۲ | ۲۴ ؍ جون ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

عبادت

مہاتما گاندھی

عبادت نے مجھے بچالیا۔ اس کے بغیر میں کب کا پاگل ہوگیا ہوتا۔ نجی زندگی میں اور عمومی زندگی میں مجھے کئی تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے تھوڑی دیر کے لیئے مایوسی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ اگر میں نے مایوسی سے نجات پائی تو عبادت کی بدولت پائی۔ عبادت اس طرح میری زندگی کا جز نہیں رہی ہے جیسے حق رہا ہے۔ عبادت کرنے پر تو مجھے ضرورت نے مجبور کیا [illegible] نے اپنے آپ کو ایسی حالتِ زار میں پایا کہ عبادت کے بغیر مجھے کسی طرح چین نہیں آسکتا تھا۔ جوں جوں خدا پر میرا عقیدہ بڑھا، عبادت کی لگن بے اختیار بڑھتی گئی۔ اس کے بغیر زندگی سونی لگتی تھی۔

میں جنوبی افریقہ میں عیسائیوں کی عبادت میں شریک ہوا مگر وہ میرے دل کو نہ لگی۔ میرے عیسائی دوست خدا کے آگے گڑگڑاتے تھے مگر مجھ سے یہ نہ ہوسکا۔ میں بالکل ناکام رہا۔ شروع میں تو میں خدا پر اور عبادت پر عقیدہ ہی نہیں رکھتا تھا اور یہ حالت تو بڑی عمر تک رہی کہ مجھے زندگی میں کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر ایک منزل پر پہنچ کر محسوس ہوا کہ جیسے جسم کے لئے غذا ناگزیر ہے اسی طرح روح کے لئے عبادت ناگزیر ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو جسم کو غذا کی اتنی ضرورت نہیں جتنی روح کو عبادت کی ہے۔ اس لئے کہ جسمانی صحت کی خاطر کبھی کبھی فاقہ کرنا پڑتا ہے مگر عبادت کا فاقہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عبادت کبھی اشتہا سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی۔

دُنیا کے تین بڑے ہادی، بُدھ، عیسیٰؑ اور محمدؐ اس بات کی شہادت چھوڑ گئے ہیں، جس پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں کہ انھیں عبادت سے بصیرت حاصل ہوئی۔ اور وہ اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اب تم چاہے ان کی بات کو غلط کہو یا یہ کہو کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو دھوکا دیا۔ اگر وہ چیز جو میری زندگی کا سہارا ہے جس کے بغیر میں دم بھر جینے کی جرأت نہیں کرسکتا، جھوٹ ہے تو مجھ جیسے سچائی کے طالب کو ایسا جھوٹ بڑا پیارا لگتا ہے۔ سیاسی افق پر مایوسی کے بادل چھائے ہونے پر بھی میرے اطمینانِ قلب میں کبھی فرق نہیں پڑا۔ سچ پوچھو تو لوگ اس اطمینان پر رشک کرتے ہیں۔

میں علم کا دعویٰ نہیں ہوں۔ مگر میں عجز کے ساتھ یہ دعوے کرتا ہوں کہ میں عبادت کا دھنی ہوں اور یہ اطمینان عبادت سے حاصل ہوا ہے۔ مجھے پروا نہیں کہ اس کی شکل کیا ہے۔ اس معاملے میں ہر شخص مختار ہے۔ مگر کچھ بنی بنائی سڑکیں موجود ہیں اور ان راہوں پر جن پر قدیم رہنما چل چکے ہیں، چلنے میں سلامتی ہے۔

" بائیس برس کی عمر میں میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ گویا میں بنواس میں رہا۔ بیس برس تک دکھنی افریقہ میں رہنے، یعنی اپنی اصلی جڑلی بنانے کے بعد میں یہاں لوٹا۔ اس زمانہ میں میں نے وہاں پیسہ نہیں جوڑا۔ میں شروع ہی سے یہ سمجھ گیا تھا کہ بھگوان نے مجھے پیسہ جمع کرنے کے لئے نہیں بنایا ہے بلکہ میرا کام یہ ہے کہ اُس کی (ایشور) سیوا کروں۔ ایشور نے مجھے سمجھایا کہ تو دوسرا کوئی کام کریگا تو کامیاب نہ ہوگا۔ سیوا کا طریقہ مجھے گیتا نے یہ بتایا کہ یہ سمجھ کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرا نہیں ہے، "تیرا ہے" (ایشور کا)۔ تب یہ سوال سامنے آیا کہ "تو" (ایشور) کہاں ہے۔ جواب ملا "دنیا کے سارے انسانوں میں" یعنی جو انسانوں کی خدمت کرتا ہے وہ دراصل ایشور کی سیوا کرتا ہے۔"

فہرستِ مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
عبادت	مہاتما گاندھی	صفحہ ۱
قرار یا فرار	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲
نئی روشنی کے مقاصد	(ادارہ)	۳
بزمِ بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مشرقی دنیا		صفحہ ۶
مہاتما گاندھی (نظم)	اثر لکھنوی	۷
جامعہ ملیہ کے طلبہ سے	عرشی رامپوری	۷
عفو (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۸
قنوطیت	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۰
ہند عرب کی نظر میں	پروفیسر عبدالغفور	۱۱
اعلانات		۱۲

قیمت فی پرچہ [illegible] آنے

قرار یا فرار

ڈاکٹر ذاکر حسین

(یہ ڈاکٹر صاحب کی اُس تاریخی تقریر کی بالواسطہ رپورٹ ہے جو موصوف نے ۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کے جنم دن کے جلسے میں جامعہ ملیہ کی چھوٹی سی جماعت کے سامنے کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال کی طرف سے مشین گنوں کی آواز آ رہی تھی۔ جنوب کی طرف سے بلوائیوں کے حملے کا خطرہ تھا، مشرق کی طرف سے سنسناتے ہوئے تیر آتے تھے۔ یہاں آ کر جامعہ میں پناہ لے رہے تھے اور مغرب کی طرف سے ہمایوں کے مقبرے کا اور وہاں سے پاکستان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔)

..... آپ جانتے ہیں کہ اُس بزرگ کا جس کی سالگرہ منانے کو آپ یہاں جمع ہوئے ہیں جامعہ سے کیا تعلق ہے؟ اسی کی دعوت پر کچھ سر پھرے نوجوان مولانا محمد علی کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں کو چھوڑ کر اُن کچے بچے مکانوں اور خیموں میں آ کر پڑ گئے تھے جن کا نام جامعہ ملیہ تھا۔ اسی کے سہارے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جامعہ کے نیم جان مریض کو دہلی لے کر آئے تھے اور اسی کے مشورے اور مدد سے دونوں بزرگوں نے اس کی چارہ فرمائی کی تھی اور اسے تندرست اور تنومند بنایا تھا۔ اس وقت تک گاندھی جی مسلمانوں کے سچے دوست اور محسن سمجھے جاتے تھے۔ اُس کے بعد وہ دور آیا کہ جب مسلمانوں کے نئے دوست اور محسن پیدا ہو گئے اور انھوں نے اُن کو سکھایا کہ گاندھی تمہارا المبر ایک کا دشمن ہے۔ یہ جھوٹ اس قدر پھیلا کہ مسلمانوں کے دلوں کے دروازے گاندھی جی پر بند ہو گئے۔ مگر گاندھی جی کے دل کا دروازہ اُن کے لئے ہمیشہ کھلا رہا۔ وہ اپنے مسلمان دوستوں اور رفیقوں کے ذریعے سے اور جامعہ ملیہ کے ذریعے سے برابر کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے دل ہاتھ میں لیں۔ آج دوست، دشمن کی پہچان کا دن آ گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا سچا پکا دلی دوست ایک ہی ہے، جو آپ کا پشت پناہ اور سینہ سپر ہے آج مسلمان گاندھی جی کو مان گئے ہیں۔ اس لئے کہ مسلمان اور جا ہے جو کچھ ہو لیکن احسان فراموش ہرگز نہیں ہیں۔

..... یہ قیامت جو آپ آج دیکھ رہے ہیں، ایک وقتی جنون کا نتیجہ ہے جس میں سبھی مبتلا ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب نے جی بھر کے گناہ کئے ہیں۔ سب نے اپنے دین کے، اپنے ایمان کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ گاندھی جی سب کو اُن کے گناہ کا احساس دلا رہے ہیں، توبہ کی طرف بلا رہے ہیں، سب کو اُس ہلاکت کے گڑھے سے آگاہ کر رہے ہیں جس کی طرف وہ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر لوگ گاندھی جی کی پکار سُن لیں گے، اپنے کرتوتوں پر شرمائیں گے، اپنے گناہوں سے توبہ کریں گے تو بچ جائیں گے، ورنہ پھر وہ ہیں اور جسم اور روح کی موت، دین اور دُنیا کی ہلاکت۔

...... مگر مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی کی آواز اپنا اثر کر کے رہیگی اور وہ ہمارے دلوں سے اس عارضی وحشت اور بہیمیت کو دور کر دینگے ہماری انسانیت کو جگا دیں گے۔ وہ ہندوستان جو آج اس قدر نیچے گر گیا ہے، ایک بار پھر اُٹھیگا اور ایکبار پھر دنیا کو امن اور تہذیب کا پیام پہنچائیگا۔ ہندوستانی قوم کے اس مصلح پر صرف ایک ہی قوم نہیں بلکہ سب قومیں فخر کریں گی، پوری انسانیت فخر کریگی۔

آپ دہلی کی اور آس پاس کی فضا کو دیکھ کر خائف اور پریشان مایوس اور دل شکستہ نہ ہوں۔ خدا پر بھروسہ کیجئے اور اس کے کمزور اور نحیف بندے پر بھروسا کیجئے جس کا نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔ اپنے ملک کی حکومت پر بھروسہ کیجئے جس کی باگ ڈور آپکے عمر بھر کے آزمائے ہوئے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے برطانیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کو ... ہمت کھٹے کر دئیے وہ ان فساد کی قوتوں سے جو آج ابھر رہی ہیں شکست کھا جائیں گے؟ ابھی ان لوگوں کو حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ اُن کو یہ اندازہ نہ تھا، کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک دم سے یہ قیامت ٹوٹ پڑیگی فسادی کے بھیلے ہتے نے اچانک آ لیا۔ اب وہ سنبھل گئے ہیں، اپنی قوت کو جمع کر رہے ہیں اور اس فتنہ کا سر کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مگر آپ لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ خطرہ ابھی سر پر منڈلا رہا ہے اور جو کچھ اب تک ہوا ہے اُس سے بھی بدتر حالات پیش آ سکتے ہیں۔ یہ آگ سارے ملک میں پھیل سکتی ہے۔ اپنے کو دھوکے میں نہ رکھئے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو بے فکری کا اطمینان دلایا جائے۔ میں آپ کو وہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں جو خطرے کا پورا احساس رکھنے کے باوجود ہوتا ہے ......

...... قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقع آتے ہیں یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمائش کا ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اُس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ..... پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ جو جانا چاہے شوق سے جائے مگر یاد رکھئے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑیگی۔ کتنے ہوں گے جو راستے میں مارے جائیں گے کتنے ریل کے بند ڈبوں میں گھٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن اگر آپکا فیصلہ اس آزمائش سے گزرنے کا ہو تو پھر یہاں ڈٹ جائیے۔ یہ یاد رکھئے کہ بہت ممکن ہے آپ مار ڈالے جائیں۔ لیکن آپکا یہ قتل رائگاں نہیں جائیگا بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن پر قاتل شرماتے ہیں اور مقتول فخر کرتے ہیں۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو سنبھال لیتے ہیں گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اگر ایسے مقتولوں میں داخل ہو جائیں تو وہ کام کر جائیں گے جو پچھلے سب کاموں پر بھاری ہوگا۔

جو لوگ موت کے استقبال کے لئے تیار رہتے ہیں اُن کے لئے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی جس کو غلط رہنمائی نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے۔ آپکے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے۔ کیا عجب ہے کہ خدا آپ ہی کے ہاتھ سے مسلمانوں کی تنظیم کا کام لے جس کی بنا خدا کے خوف اور خلقِ خدا کی محبت، وطن کی وفاداری اور راہل وطن کی خدمت پر استوار ہو۔ اور کچھ نہ سہی تو آپ اپنی مثال سے اس وقت دہلی کے لوگوں کی ہمت بندھائیں گے۔ اب بھی جو مسلمان اپنے اپنے محلوں میں ڈٹے ہوئے ہیں وہ بھاگنے والوں سے زیادہ آرام میں ہیں۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے دہلی بچ جائیگی آپ بھی اس کے بچانے میں حصہ لیجئے ......

آپ میں سے جو لوگ ہمایوں کے مقبرے میں مصیبت زدوں کی خدمت کر رہے ہیں وہ اسے چھوٹا کام نہ سمجھیں۔ اس وقت موت اور زیست کا سوال ہے۔ اگر آپ نے ہمایوں کے مقبرے کو بچا لیا تو دہلی کو بچا لیا اور دہلی کو بچا لیا تو ہندوستان کو بچا لیا۔ اس خیال کو دل میں لئے ہوئے کام کیجئے تو آپ کی قوت عمل دس گنی ہو جائیگی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہی کام اس وقت کرنے کا ہے اور آپ ہی اس کے کرنے والے ہیں .....

اب مجھے چند لفظ خواتین سے کہنے ہیں ..... آپ کی اس گریہ و زاری سے آپ کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچیگا۔ یہ وقت رونے کا نہیں بلکہ کام کا ہے اور جو کام ہمارے سامنے ہے اُس میں آپ کو بھی مردوں کا ہاتھ بٹانا ہے۔ اب سردی آنے والی ہے۔ آپ اپنے کو بہت تکلیف میں سمجھتی ہیں مگر کم از کم آپ کے سر پر چھت تو ہے۔ اُن مصیبت کے ماروں کا خیال کیجئے جو آسمان کی چھت کے نیچے زمین کے فرش پر رہتے ہیں۔ اپنے اوڑھنے بچھونوں کو کم کر کے زیادہ سے زیادہ گدے، توشکیں، لحاف ہمایوں کے مقبرے پہنچائیے۔ پرانے کپڑوں کی مرمت کر کے اُن کو استعمال کے قابل بنائیے ......

بس یہی چند باتیں مجھے کہنی تھیں۔ ان پر غور کیجئے، اپنے دل مضبوط رکھئے۔ اپنی طرف سے سعی کرتے رہیئے۔ انجام کو خدا پر چھوڑ دیجئے۔

نئی روشنی کے مقاصد

(بسلسلہ صفحہ ۳)

جو پہلے کانگریس میں ایک جداگانہ گروپ کی حیثیت سے تھے اور اب اس سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ کانگریس ابھی تک ایک قومی سبھا تھی جس میں مختلف خیال کے لوگ جمع تھے۔ اب وہ ایک مخصوص سیاسی پارٹی کی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ بعض سربرآوردہ کانگریسی لیڈر اور بہت سے کارکنوں، خصوصاً گاندھی جی کے ساتھ کام کرنے والی جماعت کے لوگوں میں اشتراکی جمہوریت کا قوی رجحان موجود ہے اور کانگریس کے نئے دستور کا جھکاؤ بھی اسی طرف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کانگریس میں لبرل جمہوریت کے حامیوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ سال ڈیڑھ سال کے اندر جب کانگریس کی تشکیل اس کے نئے دستور کے مطابق ہو چکیگی اُس وقت پتہ چلیگا کہ کس فریق کا غلبہ رہتا ہے۔ اب رہی سوشلسٹ پارٹی تو اُس کا کھلا ہوا دعویٰ ہے کہ ملک میں اشتراکی جمہوری نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی اشتراکیت تو خیر ظاہر ہے مگر اس کی جمہوریت میں ابھی تک شبہے کی گنجائش ہے۔ پچھلے زمانے میں اس کا طریق کار تشدد پر مبنی رہا ہے جو جمہوریت کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کے ساتھ برابری اور انصاف کے معاملے میں جو جمہوریت کی کسوٹی ہے، اس کا رویہ ابھی تک صاف نہیں ہے۔ کانگریس میں کم سے کم کچھ ذمہ دار لیڈر ایسے ہیں، جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو صاف صاف لفظوں میں بار بار یہ یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کے ہر قسم کے جائز حقوق کی حفاظت کی جائیگی۔ مگر سوشلسٹ پارٹی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی یا کرتی ہے تو اس نے کسی مصلحت سے خاموشی اختیار کی ہے۔

بہرحال ہم بین اقوامی سیاست میں بھی اور اپنے ملک کی سیاست میں بھی مسائل اور معاملات کو اشتراکی جمہوریت کے معیار پر جانچیں گے۔ ہر قوم اور ہر پارٹی جس حد تک فکر و عمل میں اس معیار کو سامنے رکھے گی اُس حد تک اُس کی تائید کریں گے، اور جہاں وہ اس سے انحراف کریگی، اُس پر سنجیدگی اور ذمہ داری سے، بے غرض اور بے لاگ تنقید کریں گے۔

معاصرین سے

نئی روشنی، تنقید و تبصرہ اور تبادلے کے لئے، معاصرین کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے براہ کرم کسی قریبی اشاعت میں تبصرہ فرما کر اور تبادلہ میں اخبار جاری کر کے ممنون فرمائیں۔ منیجر

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۴ر جون ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کے مقاصد

(۱)

جمہوری اشتراکیت

ہم یہاں اس موضوع پر خاص سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عام تہذیبی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہتے ہیں۔

عام جمہوریت یعنی لبرل جمہوریت جیسے یورپ اور امریکہ نے بڑی حد تک اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ڈھال لیا، انسانی تہذیب کے ارتقا کی ایک اہم منزل تھی۔ اگلی منزل اشتراکی جمہوریت کی ہے جس کی طرف مہذب دنیا ڈولتی ہوئی، ڈگمگاتی ہوئی اپنے قدم بڑھا رہی ہے۔

تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک خاندان یا قبیلے کا اور آگے چل کر ایک سماج کا رکن ہوتا تھا اور اس کی ساری زندگی اسی رکنیت کے سانچے میں ڈھلتی تھی۔ قبیلے یا خاندان کے افسر یا بادشاہ یا چند سرداروں کے سوا کسی کی شخصیت کو ابھرنے کا اور اپنے ذاتی قانونِ ارتقا کے مطابق نشو و نما پانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ خدا کے برگزیدہ بندوں، پیمبروں اور مصلحوں نے جہاں اخوت اور مساوات کی تعلیم دی، وہاں اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے خدا کے اور بندے کے درمیان بلا واسطہ تعلق پر زور دے کر ہر انسان کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک الگ شخصیت، اور مخصوص صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان صلاحیتوں کو ترقی دینا اُس کا مقدس فرض ہے۔ اسی احساس کی بدولت دنیا میں بڑے بڑے عالم، عارف، فن کار، غرض ہر طرح کے اہلِ کمال پیدا ہوئے جنہوں نے انسانی تہذیب کو وسعت اور گہرائی، آسودگی اور آرائش کی قدروں سے مالا مال کر دیا۔

ان ہی دونوں عقیدوں کو کہ سب انسان اپنی اصل کے لحاظ سے برابر ہیں اور ہر انسان کی ایک مستقل شخصیت ہے جس کو نشو و نما کا پورا موقع ملنا چاہیے، یورپ نے عہدِ جدید میں عقلی رنگ دے کر جمہوریت کا فلسفہ بنا دیا۔ جمہوریت کا اخلاقی اصول ہم ایک جملے میں بیان کرنا چاہیں تو یہ ہے "ہر فرد کو اس حد تک آزادی دینا جہاں تک وہ دوسروں کی آزادی میں حائل نہ ہو، اور اس کے آگے ضروری پابندیاں عائد کرنا جو سب کے لیے یکساں ہوں"۔ جمہوری فلسفے کی بنیاد پر پہلے یورپ کی بعض ریاستوں اور پھر امریکہ میں جمہوری حکومت اور جمہوری سماج کی عمارت تعمیر ہوئی، جس سے ان ملکوں کی مادی اور ذہنی تہذیب میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ لیکن کم سے کم ایک شعبۂ زندگی میں، یعنی معیشت کے میدان میں، فرد کو زیادہ آزادی دینے کے بہت برے نتائج پیدا ہوئے۔ تھوڑے سے لوگ جو روپیہ کھینچنے کا گر جانتے تھے، زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھا کر جمع کرنے لگے اور بہت سے لوگ، خصوصاً مزدور اور کسان جو مادی دولت کے، اور اربابِ علم و ہنر جو ذہنی دولت کے پیدا کرنے والے تھے، زندگی کی ضرورتوں تک سے محروم ہو گئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب سائنس کی نئی ایجادوں کی مدد سے بڑے پیمانے کی صنعت کا رواج ہوا اور صنعتی سرمایہ داروں کا طبقہ وجود میں آیا تو معاشی انفرادیت کی خرابیاں اور بڑھنی شروع ہوئیں اور بیسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گئیں۔ صرف یہی نہیں کہ دنیا کی ساری دولت سمٹ کر ان صنعتی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آنے لگی، بلکہ اس دولت کے بل پر ان کی سیاسی قوت روز بروز بڑھنے لگی۔ اخبار ان کی مٹھی میں آ گئے۔ عوام کے لیڈر، سیاست داں اور مدبر ان کے اشاروں پر چلنے لگے۔ دنیا کی ساری سیاست بلکہ ساری تہذیب ان کے رنگ میں رنگ گئی۔ ان کی سیاست نے سامراج کو جنم دیا، جو کمزور ملکوں کو دونوں ہاتھوں سے یعنی حکومت اور تجارت کے ذریعے سے لوٹنے کی بے پناہ تدبیر تھی۔ اور اس معاملے میں ان کی باہمی رقابت نے عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کی۔ ان کی تہذیب میں روحانی، ذہنی، جمالیاتی غرض سب اعلیٰ قدریں مادی قدر کی دستِ نگر بن کر رہ گئیں۔ دنیا کے دل و دماغ پر مذہب، علم، آرٹ کی جگہ کوئلہ، لوہا، پٹرول چھا گیا۔

اس مرحلے پر انسان کے ضمیر نے معاشی انفرادیت کے خلاف بغاوت کی اور سوشلزم یعنی اشتراکیت کا خیال وجود میں آیا۔ اشتراکیت کا تصور یہ تھا کہ دولت کی پیداوار اور تقسیم کے وسائل، یعنی زمین، کانیں، کارخانے، ریلیں وغیرہ چند آدمیوں کے ہاتھ میں نہ ہوں جو انہیں نفع کمانے کا ذریعہ بنائیں، بلکہ عوام کی بنائی ہوئی حکومت کے ہاتھ میں ہوں جو انہیں عوام کی ضرورت زندگی پوری کرنے کے لیے استعمال کرے۔

سوشلزم کی تحریک نے دو شکلیں اختیار کیں۔ ایک کمیونزم جس میں اشتراکیت صرف معاشی زندگی تک محدود نہیں رہی بلکہ ساری زندگی پر چھا گئی۔ فرد کے حقوق جماعت کے مقابلے میں بہت محدود ہو گئے، اس کی ذہنی اور معاشرتی آزادی قریب قریب سلب ہو گئی۔ دوسری ڈیموکریٹک سوشلزم یا جمہوری اشتراکیت جس نے اشتراکی اصولوں کو جمہوریت کے ساتھ سمونے کی کوشش کی۔ جمہوری اشتراکیت صرف دولت کی پیداوار اور تقسیم کے معاملے میں عوام کی منتخب کی ہوئی حکومت کو آمرانہ اختیارات دینا چاہتی ہے تاکہ ملک میں معاشی انصاف قائم ہو سکے۔ باقی مذہب، معاشرت اور فکر و عمل کے دوسرے شعبوں میں ہر شخص کو پوری آزادی دیتی ہے۔ صرف اتنی پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ دوسروں کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو۔ کم سے کم ہندوستان کے لوگوں کے لیے جمہوری اشتراکیت ہی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس لیے کہ انہیں اپنا مذہب اور اپنی تہذیب بہت عزیز ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے اپنے مذہب اور تہذیب کی نئی تعبیر اور تغییر کرنے کے لیے تو تیار ہو سکتے ہیں، مگر ان کو ترک کرنے اور اپنی روحانی اور ذہنی آزادی کو ریاست کے حوالے کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوں گے۔

جمہوری اشتراکیت کو مقصد ماننے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں کون سی سیاسی پارٹیاں اس مقصد کی علمبردار ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی چاہے مصلحتاً یہ دعویٰ کرے کہ وہ جمہوریت کی قائل ہے، لیکن در حقیقت کمیونزم میں جمہوریت کی گنجائش بالکل نہیں۔ اب دو جماعتیں رہ جاتی ہیں۔ کانگریس اور سوشلسٹ

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۲)

بزم بے تکلف

ا۔ اے حضرت یہ ہٹلر کا کیا قصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی ساری چنگیز خانی ایک بیماری کی وجہ سے تھی۔ اس بیماری کا نام بھی کچھ عجیب سا بتاتے ہیں، احساس کم تری۔ خدا جیتا رکھے بچوں کی ماں کو، ان کی بدولت بھانت بھانت کی بیماریاں اپنے گھر ہی میں دیکھ ڈالیں۔ مگر یہ بیماری کبھی دیکھی نہ سنی۔

ب۔ آپ کے ہوتے ہوئے یہ بیماری آپ کی بیوی کو نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی جسمانی بیماری نہیں نفسی علت ہے۔

ا۔ جی کیا فرمایا کون سی علت؟

ب۔ نفسی، نفس سے تعلق رکھنے والی۔

ا۔ اچھا اب سمجھا۔ نفس امارہ۔ بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا۔

ب۔ جی ہاں یہی نفس امارہ۔ اگر بچپن میں زیادہ پٹ جائے تو نوجوانی میں اس میں احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے۔

ا۔ وہی ہٹلر والا مرض؟ مگر یہ تو بتائیے اس میں ہوتا کیا ہے؟

ب۔ بس یہی ہوتا ہے کہ بچپن میں کسی وقت زیادہ پٹ جانے سے نفس چوٹ کھا جاتا ہے۔ اور تلملاتا رہتا ہے کہ دوسروں کو دھمکا کر، دبا کر، ستا کر ان کو اور اپنے آپ کو اپنی طاقت اور برتری کا یقین دلائے۔

ا۔ مگر سنئے تو کمزور مار کھانے کی نشانی بھلا دوسروں کو کیا دھمکائے گا اور ستائے گا۔

ب۔ ایسا آدمی جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے تو کمزور ہوتا ہے، مگر اس کے گلے میں اور پھیپھڑوں میں بلا کا زور ہوتا ہے۔ نعرے لگاتا ہے تو زمین ہل جاتی ہے۔ لوگ آ کر اس کے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں۔

ا۔ ہنستے ہوں گے اس کے ہولوپن پر

ب۔ شروع میں ہنستے ہیں مگر وہ انہیں وردیاں پہناتا ہے۔ ہتھیار دیتا ہے۔ قواعد کراتا ہے۔ نعرے لگواتا ہے۔ یہ سب باتیں وہ دل لگی سمجھ کر کرتے ہیں مگر ہوتے ہوتے ان پر ایک نشے کی سی بلکہ جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہٹلر کے جوش خطابت سے انہیں جوش آتا ہے۔ ان کے جوش سے ہٹلر کا جوش اور بڑھتا ہے۔ ایک چکر سا بندھ جاتا ہے۔

ا۔ پھر کیا ہوتا ہے؟

ب۔ وہ ڈھونڈھ کر کمزوروں کو دھمکاتے ہیں۔ ستاتے ہیں اور فتح کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہٹلر کی دکھتی ہوئی چوٹ کو ذرا تسکین ہوتی ہے مگر پھر اس کی ٹیک اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور زیادہ چیختا ہے، چلاتا ہے، نعرے لگاتا ہے۔ کمزوروں کو اور زیادہ دھمکاتا اور ستاتا ہے۔

ا۔ آخر اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ب۔ وہی جو ہٹلر کا ہوا۔

ا۔ بھئی واہ آپ نے تو خوب باتیں بنائیں۔ کیوں حضرت یہ کون سی بدیا ہے؟

ب۔ اسے تحلیل نفسی کہتے ہیں۔

ا۔ اچھا وہی نفسی علت، یہ آپ کو کیسے لگ گئی۔

ب۔ (غصے میں چیخ کر) آپ تو بڑے احمق ہیں

ا۔ الٰہی خیر۔ وہ کیا کہلاتی کم تری؟ معلوم ہوتا ہے اسی کا دورہ پڑ گیا۔ اب بندہ یہاں سے کھسکتا ہے۔

پچھلا ہفتہ

۱- آخری برطانوی اور پہلے ہندوستانی گورنر جنرل۔
۲- یو۔پی کے زمینداروں کے مستقبل کے بارے میں رپورٹ۔
۳- مرکزی حکومت پر انگریزی کی حمایت کا بے جا الزام۔
۴- حیدر آباد کی گتھی۔

۱- ہندوستان

۲۲ر جون کو ہندوستان سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے ساتھ برطانوی اقتدار کی تمام پرانی روایات رخصت ہو جائیں گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو برطانیہ کی طرف سے یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ وہ جلد سے جلد ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دیدیں اور اس سلسلہ میں اگر ملک کی تقسیم ناگزیر نظر آئے تو اس کام کو بھی پورا کریں۔ پچھلے پندرہ مہینہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال حکومت کے اس کام کو بڑی دلیری، یکسوئی، ہمدردی اور وفا کے ساتھ انجام دیا۔ بدقسمتی سے یہ کام پر امن طریقہ پر انجام نہیں پا سکا اور اس کی وجہ سے ملک میں ایک ایسا المیہ رونما ہوا جس کی نظیر تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکیگی۔ اس کلنک کے ٹیکے کے ہوتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زمانے کو بے داغ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن جب اس بات پر نظر کی جاتی ہے کہ یہ کام کس قدر نازک، پیچیدا اور پر خطر تھا تو اس مختصر مدت میں جتنی بھی کامیابی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہوئی اس کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد سے پہلے برطانیہ اور کانگریس کے تعلقات سخت مخالفانہ رہ چکے تھے اس لئے اس بات کا پورا امکان تھا کہ برطانوی گورنر جنرل کے ہر فعل کو شبہ اور بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس کا بھی پورا امکان تھا کہ نئی آزادی کے نشہ میں برطانوی گورنر جنرل کی وہ عزت و توقیر نہ کی جاتی جو اس عہدے کی امتیازی خصوصیت رہ چکی تھی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ ہندوستان کی طرفداری کی وجہ سے پاکستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بہت بدظن اور ناراض ہو جاتا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جس لوچ لچک، احساس تناسب اور بلند سیرت سے کام لیا اور اپنے فرائض کے انجام دینے میں جس تدبر اور فراست کا ثبوت دیا، وہ واقعی قابل داد ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو گئے ہیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن، برطانوی وائسرائے کو آزاد ہندوستان نے اپنی مرضی سے ان کی خدمات کے صلہ کے طور پر اپنا پہلا گورنر جنرل بنایا اور اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کو اس انتخاب کی وجہ سے آج کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس اعتماد کو جو ان پر کیا گیا تھا جائز ثابت کر دیا اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے بھی امداد، رفع تکالیف اور قومی تعمیر کے کاموں میں گہری دلچسپی لے کر ایک عظیم المرتبت شوہر کی موزوں رفیق زندگی ہونے کا ثبوت دیا اس لئے ہندوستان عزت اور دوستی کے ساتھ لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو الوداع کہتا ہے۔

شری راجگوپال آچاریہ، اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جگہ گورنر جنرل مقرر ہوئے ہیں۔ راجہ جی کا پچھلے ایک قرن سے ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کا تدبر اور مصلحت اندیشی، ان کی سیرت کی پختگی اور بلندی، ان کی صلح پسندی اور ہمدردی، ان کا تجربہ اور رشد و ہدایت، یہ سب چیزیں مانی ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ امید قائم کرنا بے جا نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے ایک مثالی گورنر جنرل ثابت ہوں گے۔

جب تک دستور ساز اسمبلی اس کے بارے میں کوئی باقاعدہ فیصلہ کرے، راجہ جی نے گورنر جنرل کے فرائض کا خود ہی تعین کیا ہے اور جب وہ ان کو پورا کرنا شروع کر دیں گے تو ہمیں یقین ہے اس سے ضرور حکومت کے کام میں سہولت اور آسانی پیدا ہو گی۔

〜〜〜(•X•X•)〜〜〜

۸ اگست سنہ ۱۹۴۶ء کو یو۔پی۔ کی اسمبلی نے بھی اور دوسرے صوبوں کی طرح ایک کمیٹی زمینداری کو ختم کرنے کے لئے مقرر کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ کا مسودہ تقریباً تیار کر لیا ہے اور اب اس پر صرف اراکین کے دستخط ہونا باقی رہ گئے ہیں۔

اس رپورٹ نے سفارش کی ہے کہ زمینداروں کو معاوضہ دیکر یو۔پی کی زمینداری کو ختم کر دیا جائے۔ معاوضہ کی بنیاد زمینداروں کی موجودہ حقیقی خالص آمدنی کو قرار دیا جائے اور حسب ذیل شرح سے معاوضہ دیا جائے۔ پچیس روپیہ تک کی آمدنی کی زمین کا معاوضہ ۲۵ گنا ہو۔ پچیس اور پچاس روپیہ کے درمیان آمدنی ہو تو معاوضہ ۲۲½ گنا۔ پچاس تا سو روپیہ کے درمیان بیس گنا۔ سو اور ۲۵۰ روپیہ کے درمیان ۱۷½ گنا۔ ۲۵۰ اور ۵۰۰ کے درمیان ۱۵ گنا۔ پانچ سو اور دو ہزار کے درمیان ۱۲½ گنا۔ دو ہزار اور ۳½ ہزار کے درمیان دس گنا۔ ۳½ ہزار اور پانچ ہزار کے درمیان ۹ گنا۔ پانچ ہزار اور دس ہزار روپیہ کے درمیان ۸ گنا۔ دس ہزار روپیہ سے زیادہ آمدنی کے لئے پہلے دس ہزار روپیہ پر ۸ گنا معاوضہ اور اس سے زائد آمدنی ہو تو اس زائد آمدنی کا دگنا۔

مذہبی، خیراتی اور پبلک اوقاف کے لئے اس بات کا انتظام کیا جائیگا کہ جتنی رقم وہ خیراتی اور پبلک کاموں پر خرچ کرتے ہیں وہ ان کو ہر سال ملتی رہے۔

یہ معاوضے نقد نہیں دئے جائیں گے بلکہ ان کے مساوی قایم امانتی کھاتے، آمدنی کی مقدار کا لحاظ کرتے ہوئے یا تو گاؤں کی امداد باہمی کی پنچایت میں یا امداد باہمی کے مرکزی بنک میں یا صوبہ جاتی امداد باہمی کے بنک میں کھول دئے جائیں گے۔ یہ کھاتے صرف اداروں کے اراکین کو منتقل کئے جا سکیں گے۔ ان کے علاوہ ناقابل انتقال ہوں گے۔

زمینداروں پر جو قرضے واجب ہیں ان کے بارے میں رپورٹ کی سفارش ہے کہ انہیں بھی اسی تناسب سے کم کر دیا جائے جس سے کہ ان کی زمین کی قیمت بازاری قیمت کے مقابلے میں کم کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں ضروری کاغذات کی تیاری اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو مزید خرچ کرنا پڑیگا اس کا اندازہ ½ ۱ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے۔

زمینداری کی جگہ دیہات میں کون سی معیشت چلے گی اس کا جواب رپورٹ میں دیا گیا ہے کہ اشتمالی کھیتی یا مشینوں کے ذریعے کھیتی ہندوستان کے موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں ہے۔ اس لئے امداد باہمی کے ذریعہ کھیتی ہونا چاہیے لوگ اپنی مرضی سے امداد باہمی کی انجمنوں کے رکن بنیں گے اور ان میں اپنی زمین، پونجی اور بیل وغیرہ شامل کریں گے۔ منافع، کام کے حساب سے تقسیم ہوا کریگا۔ جو لوگ اپنی خوشی اور مرضی سے ان انجمنوں کا رکن بننا نہ چاہیں گے انہیں آزادی ہو گی کہ وہ اپنا کام جداگانہ طریقہ پر کریں۔

ان کسانوں سے لگان کی وصولیابی کا کیا طریقہ ہوگا، اس کے بارے میں ابھی سفارشیں تیار نہیں کی جا سکی ہیں۔

اس رپورٹ کی سفارش کے مطابق یو۔پی۔ اسمبلی میں کوئی قانون جلد ہی بنایا جائیگا اس کے آثار تو ذرا کم ہی نظر آ رہے ہیں۔ اچاریہ نرنیدر دیو نے، یو۔پی۔ میں سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے انتخابی مہم شروع کرتے ہوئے کہا کہ "ہم مزدوروں اور کسانوں کی حالت کو بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری کسی پارٹی یا پارٹیوں سے لڑائی نہیں ہے اور ہم زمینداروں کو برباد کرنا نہیں چاہتے"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی اس تقریر کا زمینداروں پر اچھا اثر پڑا اور انہوں نے سوشلسٹ پارٹی کی حمایت شروع کر دی ہے جب زمینداروں کے ووٹ لینے کے لئے سوشلسٹ بھی اسی قسم کا اطمینان دلا سکتے ہیں تو پھر دوسری جماعتیں جو رعایتیں بھی دیں وہ کم ہیں۔

〜〜〜(•X•)〜〜〜

سب جانتے ہیں کہ شری پرشوتم داس ٹنڈن کو ہندی سے بہت پریم ہے۔ لیکن بعض وقت وہ اس پریم کے اظہار میں اتنے حد سے بڑھ جاتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ ٹنڈن جی جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہندی کی ترقی اتنی منظور نہیں ہے جتنی اپنے سیاسی رقیبوں کو تنگ کرنے کی خواہش۔ الہ آباد کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر مرکزی حکومت نے ہندی کو مشترکہ قومی زبان نہ بنا کر لوگوں کی خواہشوں کو ٹھکرایا تو پھر لوگوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت کی مخالفت کریں۔ انھوں نے ذمہ دار لوگوں کے اس رجحان کی مذمت کی کہ وہ انگریزی کی سرپرستی کرتے ہیں اور کہا کہ اس رجحان کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔

جہاں تک ہندی اور ہندوستانی کے جھگڑے کا تعلق ہے ٹنڈن جی کے بہت سے دوست اور ساتھی ان کو راہ پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انگریزی کے بارے میں شاید ہی کوئی ان کو یہ سمجھانے کی جرأت کرے۔ موجودہ حالت میں جس پالیسی کو حکومت ہند نے اختیار کیا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری قابل عمل پالیسی ممکن ہی نہیں تھی۔ آپ ایک جنبش قلم سے اور ان لوگوں کے اندر جو کسی زبان سے قطعاً نابلد ہوں ان میں لکھنے اور بولنے کی مہارت نہیں پیدا کر سکتے۔ مدراسیوں، بنگالیوں اور دوسرے ہندوستانیوں کو جنہوں نے انگریزی کے ذریعہ مغربی علوم و فنون پر عبور حاصل کیا ہے، اس بات پر مجبور کریں کہ وہ اپنی عمر بھر کی عادت کو ایک دم سے چھوڑ دیں اور نئی مہارتیں آناً فاناً پیدا کریں تو ظاہر ہے کہ ایسا نہ کر سکیں گے اور آپ ان کی قابلیتوں کے فیض سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی طرح باہر کے ملکوں سے گفت و شنید اور تعلقات کے قائم کرنے میں آپ کو دشواری کا سامنا کرنا پڑیگا۔ آخر ہندوستان کو بین الاقوامی برادری میں جو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے اس میں اس بات کو بھی بہت بڑا دخل ہے کہ ہندوستان کے نمائندے انگریزی زبان میں اعلےٰ درجے کی مہارت رکھتے ہیں۔ ہندوستانی کو سرکاری زبان ضرور بنانا ہے، لیکن اس میں اتنی جلدبازی اور بے صبری کی ضرورت نہیں۔

〜〜〜〜〜〜

۱۵ر جون کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیدر آباد کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ حیدر آباد کے اور حکومت ہند کے نمائندوں نے مل کر ایک مسودہ تیار کر لیا تھا۔ اور اس پر دونوں کے دستخط ہونے ہی والے تھے مگر میر لائق علی صاحب کو پھر یہ

ضرورت محسوس ہوئی کہ حیدرآباد کی مجلس وزرا سے مشورہ کرلیا جائے۔ اور وہاں جاکر انھیں پھر کچھ شبہات پیدا ہوگئے اور انھوں نے مزید گفت و شنید کی خواہش کی، جسے حکومت ہند نے نامنظور کردیا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے معاہدے کے مسودے کو شائع کرا دیا ہے اور یہ اعلان کردیا ہے کہ اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی۔ حیدرآباد کی حکومت جب چاہے معاہدے پر دستخط کرکے معاملے کو طے کرلے۔

جہاں تک اصل معاملے کا تعلق ہے اُس کے ہر پہلو پر مہینوں تک غور ہوچکا ہے، بہترین قانونی دماغوں سے مشورہ لیا جاچکا ہے اور سمجھوتے کی ایک معقول اور قابل اطمینان صورت نکل آئی ہے۔ اب اس کے بعد جو رکاوٹ ہے وہ بظاہر حیدرآباد کے اندر اہل غرض کی باہمی رسّہ کشی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر اب بھی ان کو یہ توفیق ہو کہ افراد یا بیرونی طبقوں کے مفاد پر ملک و قوم کے مفاد کو ترجیح دیں تو یہ جھگڑا خوش اسلوبی سے طے ہوسکتا ہے۔ ورنہ بعد از خرابیٔ بسیار تو سب جھگڑے طے ہو ہی جایا کرتے ہیں۔

(م - ع)

۲- پاکستان

۱- مشرقی پاکستان
۲- خان عبدالغفار خاں کی گرفتاری اور جی ایم سید کی نظربندی
۳- سندھ

پچھلے ہفتے مشرقی بنگال کی اسمبلی میں حکومت کی غذائی پالیسی پر کڑی تنقیدیں ہوئیں۔ اس تنقید میں مخالف جماعت اور خود حکومت کے طرفداروں نے حصہ لیا۔ شکایت کی سب سے بڑی بات غلہ کی مہنگائی ہے۔ سرکاری طور پر جو قیمت متعین ہوئی ہے اس پر بھی غلہ دستیاب نہیں ہوتا۔ چوربازاری عام ہے۔ غذائی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیر غذا نے کہا فی الحال حکومت ذخیرہ اندوزوں اور چوربازار کے خلاف ایک کشمکش میں لگی ہوئی ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ حکومت قیمت کم کرنے کی انتہائی کوشش کریگی لیکن اس کام میں جلد نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن یہ کام بہت اہم ہے۔ مشرقی بنگال کے عوام کی غیر معمولی غربت اسے اہم تر بنا دیتی ہے۔ مشرقی بنگال کی آبادی چار کروڑ کے لگ بھگ ہے اس میں سے صرف آٹھ لاکھ کی آبادی کے لئے راشننگ کا انتظام ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ طریقہ صرف شہروں میں رائج ہے اور باقی آبادی مہنگے داموں پر غلہ خریدنے پر مجبور ہے۔ وزیر غذا نے کہا کہ وہ شہروں میں راشننگ اس لئے باقی رکھنا چاہتے ہیں کہ اندرونی حصوں میں قیمتوں پر برا اثر نہ پڑے۔ کنٹرول ہٹانے کے متعلق اُنھوں نے کہا کہ اگر یہ صحیح بھی ہو کہ کنٹرول اتنا موثر نہیں جتنا اسے ہونا چاہئے تو بھی حکومت اُسے اُٹھانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اس سے اور بھی زیادہ برے نتائج کا ڈر ہے۔ ایسے میں جب کنٹرول کے خلاف صدا

براعظم متحد ہوگیا ہے، یا کم سے کم جب وہ لوگ جنھیں اس سے نقصان ہوتا ہے اتنی طاقت حاصل کرچکے ہیں کہ کنٹرول ہر جگہ ختم کیا جارہا ہے، مشرقی بنگال کی حکومت کا یہ فیصلہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

بنگال کے بڑے دشمنوں میں دشمن نمبر ایک کا درجہ ملیریا کو ملنا چاہئے۔ مشرقی بنگال کی حکومت اس کے خلاف موثر قدم اُٹھا رہی ہے، پچھلے مارچ میں ڈھاکہ میں مچھروں کے خلاف جہاد شروع ہوا تھا۔ وزیر صحت کا کہنا ہے کہ اس میں کامیابی ۷۵ فی صدی ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوششیں اسی پیمانہ پر اور اتنے ہی جوش و خروش سے جاری رکھنا چاہئے۔ لیکن ڈھاکہ مشرقی بنگال نہیں اور ضرور یہ ہے کہ اس بیماری کے تباہ کن اثرات سے گاؤں کے رہنے والے عوام کو بچانے کے کام کو پہلی اہمیت دی جائے۔

سرحد کی حکومت نے (جہاں کے گورنر سر جارج کننگھم ہیں) خان عبدالغفار خاں کو گرفتار کرکے ایک مختصر سے مقدمہ کے بعد ۳ سال کی قید سخت کی سزا دی ہے۔ ان کے خلاف الزامات کی فہرست خاصی طویل تھی۔ حکومت کے اعلان میں کہا گیا تھا کہ "ان کی سرگرمیوں کا پچھلے نو مہینے سے زیادہ طویل عرصہ تک جائزہ لینے کے بعد حکومت سرحد نے ان کی گرفتاری کا فیصلہ کیا ہے جب ان کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا تو خان عبدالغفار خاں کوہاٹ کے ضلع میں تھے جہاں سے وہ بنوں جارہے تھے۔ قابل اعتماد ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ وہاں فقیرایپی کے نمائندوں سے مل کر سرحدی علاقوں میں فساد کرانا چاہتے تھے"۔ ان الزامات کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ لیکن جن حالات میں یہ گرفتاری عمل میں آئی ہے اور جس طرح چپ چپاتے خان عبدالغفار خاں کا مقدمہ فیصل کردیا گیا ہے اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکومت سرحد نے یہ فیصلہ کرنے میں اپنی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں خان عبدالقیوم نے اپنی وزارت عظمیٰ کو خطرہ میں دیکھ کر فیصلہ یہ کیا ہے کہ ان کی وزارت کے خاتمہ کے بعد پاکستان کے لئے تباہی ناگزیر ہوجائیگی اور اس لئے انھوں نے بڑی تیزی سے خان عبدالغفار خاں اور ان کے خاص خاص ساتھیوں کو اپنے راستہ سے کم از کم عارضی طور پر ہٹا دینا ضروری سمجھا ہے کچھ مہینے ہوئے خان عبدالغفار خاں نے سرحد کے عوام کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے ان سے اپیل

کی تھی کہ وہ سرحد کی حکومت کو کچھ دن کام کرنے کا موقع دیں۔ لیکن سرحد میں سیاسی بے چینی حکومت کے اپنے کارناموں کی بدولت بڑھتی ہی گئی ہے معاصر امروز کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ ہو "یہ ذہن میں رکھنے کی بات ہے کہ یہ پاکستان کا دشمن نہیں ہوسکتا"۔ "صوبہ سرحد میں کاشتکاروں اور زمینداروں ن[illegible] کشیدگی بڑھتی جارہی ہے جیسے سرحد کے دو ضلعوں ہزارہ اور پشاور میں فریقین میں جو تصادم ہوئے ان کی خبریں دریائے اٹک کے اس پار پہنچ گئیں ..... ہمارے نامہ نگار کا بیان ہے کہ کاشتکاروں نے بٹائی میں زمینداروں کو نصف سے زیادہ حصہ دینے سے انکار کردیا ہے اور اس بنا پر زمیندار انہیں زبردستی زمینوں سے بے دخل کررہے ہیں۔ اب تک بےشمار کاشتکاروں کو زمینیں چھوڑنے پر مجبور کیا جاچکا ہے اور باقی ماندہ کے خلاف بھی یہ مہم شروع ہے"۔ ادھر کشمیری مہم کی ناکامیاں بھی خان عبدالقیوم خاں کو ذاتی طور پر مہنگی پڑ رہی ہیں۔ قیوم صاحب نے عرصہ ہوا ایک کتاب لکھی تھی۔ اتفاق سے جس دن یہ کتاب چھپکر آئی اخباروں میں اسی دن اُن کے لیگ میں شامل ہوجانے کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اس کتاب کے آخری جملوں میں متحدہ ہندوستان کے تخیل کی حمایت کی گئی تھی۔ خان عبدالغنی خاں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ خیر کتاب تو جیسی ہے ویسی ہے لیکن اس کا ایک ایک لفظ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اس کا لکھنے والا اپنے ذاتی مفاد کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں کرے گا۔

لیکن اگر خان عبدالغفار خاں کی گرفتاری اور سزا کو تمام تر وزیراعظم سرحد کی انانیت کا کرشمہ سمجھا جائے تو یہ بھی زیادتی ہوگی۔ اس پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کا وجود بھی ہے۔ سندھ سے ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ تین مہینے کے لئے سندھ کی حکومت نے جی ایم سید کو جو صوبہ مسلم لیگ سندھ کے سابق صدر اور نئی عوامی جماعت کے سکریٹری ہیں ان کے گاؤں میں نظربند کردیا ہے اس سے کچھ ہی پہلے مشرقی بنگال کی حکومت نے سہروردی صاحب کو گرفتار کیا اور پھر صوبہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا ان تینوں باتوں کو اگر ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھئے تو یہ خیال بہت پختہ ہوجاتا ہے کہ یہ تمام ایک پروگرام کے اجزا ہیں جس کا مقصد پاکستان کی حکومت اور اس کے موجودہ ارباب حل و عقد کو ہر طرح کی تنقید سے پہلے محفوظ کردیا جائے۔ اور اس بارے میں گورنر جنرل پاکستان کے ذاتی رجحانات اور سرکاری خیالات کوئی چھپی ڈھکی باتیں نہیں ہیں مگر یہ سب پاکستان کے اپنے رموز مملکت ہیں ایک بات جو خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ ان

کارروائیوں کے اسباب کی وضاحت کے متعلق حکومت پاکستان کے ذمہ دار ارباب کے بیانات اور تقریریں ہیں۔ سندھ کے دوسرے اہم شہر حیدرآباد کے دورے کے دوران میں لیاقت علی خاں صاحب نے اپنی تقریروں میں بار بار کہا کہ انہیں بیرونی حملہ کا ہر لمحہ خطرہ رہتا ہے یہ بیرونی حملہ کون کریگا۔ اس سوال کے جواب میں بھی نواب زادہ یا پاکستان کے دوسرے ذمہ دار اصحاب کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ان کے نزدیک یہ حملہ آور ہندوستان ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اب سے پہلے بھی بہت سی حکومتوں نے اندرونی مسائل کے حل کرنے میں اپنی ناکامیابی پر پردہ ڈالنے کے لئے بیرونی خیالی خطروں اور اندیشوں پر زور دینے کا آسان طریقہ اختیار کیا ہے اور تھوڑے عرصہ کے لئے اس میں کامیابی بھی ہوجاتی ہے اور عوام کی توجہ غلط مسائل کی طرف ہوجاتی ہے لیکن یہ طریقہ عرصہ تک کام نہیں دیتا۔

جنگ کے فرضی خطرے کو سیاسی مصلحت سے شہرت دینا آگ سے کھیلنا ہے۔ اس کو امریکہ تک محسوس کررہا ہے، جو اس وقت عالمگیر جنگ کی پیشین گوئی کرنے میں سب سے تیز ہے۔ اس کے ذمہ دار مدبر بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ خطرۂ جنگ کی گرمی کو کم کرنے کے لئے کبھی کبھی امید امن کی ٹھنڈائی پلاتے رہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے سندھ میں صوبائی جذبہ بہت زیادہ زور دوں پر ہے۔ پچھلے دنوں حیدرآباد سندھ میں تقریر کرتے ہوئے وزیراعظم پاکستان نے اس رجحان کی مذمت کی کہ لوگ موجودہ مرکزی حکومت کو پچھلی برطانوی حکومت کی طرح اجنبی سمجھتے ہیں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ خیال غلط ہے اور حکومت اُن کی اپنی ہے۔ جب کسی ملک کے عوام کو یہ یقین دلانے کی ضرورت پڑے کہ حکومت ان کی اپنی ہے تو سمجھنا چاہئے عوام اور حکمراں طبقہ میں اجنبیت اور اختلاف کی خلیج واقعی بہت وسیع ہوگئی ہے۔ لیکن شاید اس کی ذمہ داری حکومت پاکستان سے زیادہ سندھیوں کے صوبائی احساس پر ہے یہ جھگڑا شروع تو ہوا تھا کراچی کے مستقبل کے متعلق لیاقت علی خاں صاحب نے سندھیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ کراچی اپنی جگہ پر ہی رہیگا۔ لیکن سندھیوں کو ڈر شاید یہ نہیں کہ حکومت پاکستان کراچی کو کہیں اور ہٹا دیگی اندیشہ یہ ہے کہ کراچی پر سندھیوں کا قبضہ نہیں رہے گا اس اندیشہ کو کم کرنے کی جو کوشش وزیراعظم نے کی ہے وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہے جس طرح حکومت پاکستان نے اس شہر کو چھین لیا ہے اس سے پاکستان کے دوستوں کو بھی یہ ڈر ہوگیا ہے کہ اس سے صوبائی جذبے کو اور شہ ملے گی۔ جھگڑے کی دوسری وجہ اقتصادی ہے۔ سندھ سے جو لوگ ہجرت کرکے ہندوستان آگئے ہیں ان کی جائیدادوں پر قبضہ کس کا ہے؟ سندھی لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ حق سندھیوں کا ہے۔ اور

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۹)

مشرقی دُنیا

انڈونیشیا

چھ مہینے کی گفت و شنید کے بعد پچھلے ہفتہ ہالینڈ اور انڈونیشیا کی گفتگو ختم کر دی گئی ہے۔ یہ اقدام ڈچ حکومت کی طرف سے ہوا ہے اور عذر یہ ہے کہ ایک مجوزہ عہدنامہ کی کچھ شرطیں وقت سے پہلے پریس تک پہنچ گئیں۔ اور یہ قصور امریکی نمائندے کا ہے قیاس یہ ہے کہ گفتگو ختم کرنے کے لئے یہ ایک حیلہ ہے اور کچھ نہیں۔ لنگاجاتی معاہدے کے ماتحت فوجی کارروائیوں سے ڈچ حکومت نے جمہوری حکومت کے ماتحت کئی علاقے چھین لئے ہیں۔ عارضی صلح کی شرطوں کے ماتحت یہ علاقے نیدرلینڈز کی حکومت کا ہاتھ میں ہی ہیں۔ اس اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اور برطانوی طرز عمل سے کچھ سیکھ کر ڈچ حکومت نے مغربی جاوا اور مدورا میں جمہوریت کے خلاف جماعتیں کھڑی کر دی ہیں اور جیسا کہ متحدہ اقوام کی سیکیورٹی کونسل کے ایک جلسہ میں ہندوستانی نمائندے ڈاکٹر پی پلے نے کہا ہے علیحدگی کے رجحان کو تقویت دینے کی یہ اسکیم ایک پروگرام کا جز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈچ حکومت مجوزہ استصواب رائے عامہ سے بچنے کے لئے اب معاہدہ کی دقتوں میں پھنسانا چاہے۔ بہرحال انڈونیشیا پر خطرناک گھٹائیں منڈلا رہی ہیں۔ انڈونیشیا کی مختلف جماعتوں کا یہ فیصلہ کہ وہ آپس میں مل کر ایک متحدہ محاذ بنائیں ان خطرات کے مقابلے کے لئے قومی طاقتوں کو متحد کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگلے کچھ مہینے انڈونیشیا کے لئے فیصلہ کن ہوں گے۔

برما

انگلستان اور امریکہ کے باخبر حلقوں میں مارشل پلان کی بدولت یورپ میں روس اور کمیونزم کی ترقی اور توسیع کے رک جانے سے یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں روس اب اپنے لئے ایشیا میں میدان عمل نہ تلاش کرے۔ امریکہ سے والٹر لپمین صاحب نے جو امریکہ کی خارجی پالیسی کے مسائل کے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ اور انگلستان میں مشہور لبرل اخبار منچسٹر گارڈین نے اس خطرہ کا اظہار کیا ہے۔ اس اخبار نے لکھا ہے کہ مشرق میں ایک معتدل قسم کی اشتمالیت کے لئے جیسی کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں رائج کی گئی ہے کافی گنجائش ہے۔ اس کے خیال میں برما، سیلون، انڈوچائنا، انڈونیشیا، اور ملایا کی کمیونسٹ پارٹیاں تعداد کے لحاظ سے تو زیادہ اہم نہیں لیکن یہ تعداد کی کمی کو اپنے جوش عمل اور اپنی مستقل مزاجی سے تلافی کر لیتی ہیں۔

ان اندیشوں کی بنیاد برما کے سیاسی حالات پر ہے۔ برما کے وزیراعظم تھاکن نو نے اعلان کیا ہے کہ وہ اگلے مہینے ۔۔۔ سے مستعفی ہو جائیں گے (یعنی) بڑی ذاتی قربانی کی ضرورت انھوں نے اس لئے محسوس کی ہے کہ اس طرح ان کا خیال ہے وہ قومی اتحاد کے لئے زیادہ موثر طور پر کوشش کر سکیں گے۔ لیکن یہ فیصلہ کوئی اچانک فیصلہ نہیں۔ انھوں نے عرصہ ہوا یہ فیصلہ کیا تھا کہ ملک کو موجودہ بے چینی اور تشدد سے نجات دلانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ وہ اپنی طرف سے ایک بڑی قربانی پیش کر دیں۔ برمی وزارت کے خلاف سب سے زیادہ شکایت بائیں بازو کے لوگوں کو ہے اور وجہ یہ ہے کہ انتقال اقتدار کے عمل کے بعد برما کی موجودہ حکمراں جماعت کی عینیت کمزور پڑ گئی اور پارٹی ملک اور عوام سے زیادہ اہم ہو گئی۔ حکومت نے مزدوروں پر پابندیاں لگائیں، ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو غیر معمولی اختیارات حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے ان کے استعمال میں زیادتی اور ناانصافی ہوئی۔ برمی وزیراعظم کی عینیت پسندی اور اصول پرستی کا یہ بہت کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کہ انہوں نے حکومت کی پچھلی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ استبدادی قوانین کی منسوخی اور مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کا مطالبہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی متحدہ بائیں بازو کی جماعت کامیاب ہو سکے گی یا نہیں۔ انہوں نے اس کے لئے ایک پندرہ پائنٹ پروگرام تجویز کیا ہے۔ جس میں روس سے بہتر تعلقات، زمینداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ اور لندن کے مالی اقتدار سے آزادی وغیرہ شامل ہیں۔ پیوپلز والنٹیر آرگنائزیشن نے ان کی اس تجویز کی مخالفت کی ہے اور وہ کمیونسٹوں کو ختم کر دینے پر مصر ہیں۔ لیکن یہ کوشش بہت مہنگی اور آخر میں بیسود ہو گی۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ حکومت ان کے مفاد کو مقدم رکھے گی اور برسر اقتدار سیاست داں یہ سمجھنا چھوڑ دیں کہ ان کے بعد بس تباہی ہے!

انگلستان کا ٹوری پریس اور برما کے اور بھی انگریز دوست "برمی سیاست کے ان رجحانات سے پریشان ہیں۔ برما کے سابق گورنر سر ریجنلڈ ڈارمن اسمتھ کو اس کا بڑا دکھ ہے۔ برما کے آسمان پر انہیں سرخ گھٹائیں منڈلاتی نظر آ رہی ہیں اور ان کا درد مند دل برمی عوام کے لئے تڑپ رہا ہے۔ یہ تو مستقبل بتائیگا کہ برما کے نئے سیاسی رجحانات اسے تباہی کی طرف لے جائیں گے یا ترقی کی طرف لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان رجحانات کو شہ دی ہے سر ریجنلڈ کے ہم وطنوں کی خودغرضی اور تنگ نظری نے، برمی حکومت کے معاشی پروگرام کی مخالفت انہوں نے جس شد و مد سے کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مخالفت کا جذبہ اور بھی شدید تر ہو جائے۔ برما سامراج کے مظالم کا بدلہ چکا رہا ہے۔

چین

چین کے نئے وزیراعظم نے امید ظاہر کی ہے۔ کہ دو سال کے اندر اندر وہ چینی کمیونسٹوں کا نام صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے۔ شاید سال بھر سے زیادہ ہوئے جب مارشل چیانگ کائی شک نے کمیونسٹوں کو چھ مہینے کی مہلت دی تھی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ چینی کمیونسٹ روز کوئی نہ کوئی نئی اور بڑی جگہ فتح کر رہے ہیں کبھی کبھی ان کی عظیم الشان ناکامیوں کی خبر بھی آ جاتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک باعلم کا خیال ہے چینی نیشنلسٹوں کی فتح کی خبریں حقیقتاً ان کی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چین کی قسمت چیانگ کائی شک کے ساتھ کھیل رہی ہے اور چین کے مغربی دوست بھی کیومنتانگ کی کامیابی کی توقع کھو بیٹھے ہیں۔ جون کے پہلے ہفتہ میں مسٹر پالنگٹن ٹانگ نے بتایا تھا کہ امریکہ میں تربیت یافتہ اور امریکن اسلحہ سے مسلح ۱۳ قومی فوجوں میں سے صرف ۲ اب باقی رہ گئی ہیں "پچھلے دو سالوں میں مستقل لڑائی جاری ہے اور یہ لڑائی بہت سے محاذوں پر پھیلی رہی ہے۔ اس دوران میں امریکن سامان کی رسد بند رہی۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں امریکہ میں تربیت یافتہ فوجوں نے وہ بہادری نہیں دکھلائی جتنی ان سے توقع تھی"۔ امریکہ کے خلاف الزام لگایا گیا ہے کہ امریکن مدد ہی نے چیانگ کو دوبارہ کمیونسٹوں کے خلاف جنگ پر ابھارا۔ بہرحال اتنا طے ہے کہ چینی کمیونسٹوں کو روس سے کوئی مدد نہیں ملی ہے۔ پچھلے دنوں والس اسٹالن خط و کتابت کے سلسلہ میں روس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ دوسرے ملکوں کی اندرونی سیاست پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ چین کو پچھلے دنوں امریکہ سے جو مدد ملی ہے اس کا مقصد چیانگ کو تقویت پہونچانا ہے ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔

ہند چینی

فرانس عرصہ سے ہند چینی میں ایک "کٹھ پتلی" حکومت قائم کرنے کی کوشش میں تھا اس سے کہ فرانسیسیوں نے پچھلی جنگ کے تجربوں سے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے۔ یا کم سے کم یہ کہ انہوں نے نہ دیکھا۔ بڑے عرصہ غلام رکھنے پر بھی غلام ملکوں کے جذبہ حریت پرستی کی شدت نہیں سمجھی ہے کئی مہینے ہوئے فرانسیسی کمشنر موسیو بولائرٹ نے قوم پرستوں کے مسلمہ لیڈر ہوچی من نے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ جب سے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اتنا بڑا جمہوریت پسند ہو کہ فرانس کی غلامی قبول کر لے۔ ایک صاحب نے جنہیں حکومت بنانے کا کام سپرد کیا گیا تھا خودکشی کر لی۔ دوسرے صاحب نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے ایسی حرکت کیوں کی کہ فرانسیسیوں کے کہنے میں آ گئے۔ اب شاید یہ تنکے کا سہارا لینے کی خاطر جنرل ژان کے نام قرعہ فال نکلی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کیبنیٹ بھی بنالی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کام کے لئے انہیں نمائندہ قسم کے لوگ نہیں مل سکے اور ان کی وزارت کچھ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کے نام سے واقف نام سے عوام کو نفرت ہے۔ اور پیرس میں نئی حکومت کے زیر اقتدار علاقہ کی وسعت کے اعلانات کو تقریباً سبھی مشتبہ سمجھتے ہیں۔ ایک فرانسیسی جنرل صاحب نے حال ہی میں سائگون میں ہندچینی کے رہنے والوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ فرانس کی لڑائی ہند چینی کی قومیت سے نہیں بلکہ ہند چینی میں سرخ فسطائیت کے خلاف ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ اگر فرانسیسی ہند چینی سے نکل جائیں تو امریکہ اس پر قبضہ کر لیگا یا ایک اور قریبی طاقت جس سے عام خیال یہ ہے کہ ان کی مراد چین سے تھی۔ فرانس نے جنگی کارروائیوں کی ناکامی کے بعد ڈپلومیسی کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کامیابی کی عمر کتنی ہوتی ہے؟

کوریا

پچھلے مہینے کی آخری تاریخ کو جنوبی کوریا کی پہلی قومی مجلس کا جلسہ ہوا۔ جلسہ گاہ کی حفاظت کے لئے سیکڑوں مسلح سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ اس موقع پر نوجوانوں کی کچھ جماعتوں نے "روس شمالی کوریا سے نکل جائے" کے نعرے لگائے۔ ڈاکٹر سنگمن ری نے کوریا کی جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ قومی اسمبلی کورین قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے ڈاکٹر سنگمن نے اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کو ایک آخری موقع دینے کے لئے تیار ہیں کہ وہ جنوب کے ساتھ مل جائیں۔ لیکن انہوں نے کمیونسٹوں کو متنبہ کیا کہ اگر وہ کوریا کو کسی بیرونی ملک کے ساتھ وابستہ کرنے پر مصر رہے تو ان کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائیگی۔ آج کے بعد انہیں کوئی بیرونی طاقت سزا سے نہیں بچا سکیگی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے لفٹنٹ جنرل جان ہاج نے جو کوریا میں امریکن کمانڈر ہیں کہا کہ وہ کورین اسمبلی کو کوئی حکم نہیں دینگے

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۹)

مہاتما گاندھی

اثر لکھنوی

انسانیت ہے کارواں
گاندھی امیرِ کارواں
وہ تھا امر، وہ ہے امر
پھر کیوں کہیں باپو کہاں؟ باپو کہاں
ہم میں ہے، گو ہم میں نہیں
وہ سرگروہِ عارفاں
وہ نازشِ روحانیاں
صدق و صفا کا پاسباں
ربانیت کا رازداں
بالائے ہر سود و زیاں
گاندھی عمل اور قول سے
گیتا کا سچا ترجماں :-
مایا کہو، پرکرتی یا شکتی کہو
سب پر تھا یکساں حکمراں
گاندھی امیرِ کارواں

ہستی سے بالا ہو گیا
قطرہ تھا بحرِ بے کراں
نورِ مجسم ہو گیا، اک روحِ اعظم ہو گیا
مہرِ مبینِ معرفت، نیرانِ شناسی کا نشاں
قائل نہ تھا بیداد کا، ہر قید سے آزاد تھا
سرمایۂ ایجاد تھا اس گلشنِ ایجاد کا
ہندوستاں گلزار ہے گاندھی ہے اس کا باغباں
وہ خوش صفات خوش بیاں
جانِ چمن، سروِ رواں
گاندھی امیرِ کارواں

ٹکرا رہی ہیں قوتیں، اندھیر ہے سارا جہاں
چھائی ہوئی ہیں چار سو گو جہل کی تاریکیاں
تخریب کیا، تعمیر کیا
جو بھی تغیر ہے یہاں
اک نظمِ نو کا ہے نشاں
قربانیاں دیتے رہو محنت نہ ہو گی رائگاں
اضداد کی تفریق کو جس دم مٹایا جائیگا
انسان جو کچھ کھو چکا، اُس سے زیادہ پائیگا
آگے بڑھو، بڑھتے چلو
ہمت بلند اور دل جواں
انسانیت ہے کارواں
گاندھی امیرِ کارواں

"جنگ و جدل کا "شیتر" ہے
خود زندگی، اے مہرباں
تو قتل بھی کر دے مجھے
ہرگز نہ ہوں گا بدگماں"

پھل سے غرض مطلق نہ تھی، ہر حال میں تھا شادماں
یوں کام سے رہکر الگ، دکھلا گیا جولانیاں
ہر کام قربانی بنا بہرِ خدائے دو جہاں
اللہ یا ایشور کہو، سب کچھ اُسی کو سونپ کر

جامعہ ملیہ کے طلبہ سے

عرشی رام پوری

نونہالانِ وطن　مجھے کہنا ہے کچھ　　تم سے کہنا ہے، اگر اب قوم کو لہنا ہے کچھ
دشمنِ جاں بن چکے ہیں غیر بھی احباب بھی　　ہم سے منہ موڑے ہیں سب، تقدیر بھی اسباب بھی
جن سے ہم کچھ سیکھتے، وہ ہم سے ہیں اتنے بلند　　چاہیئے اُن تک رسائی کو کرامانی کمند
اور جو کچھ سیکھتے، کچھ سیکھنا ہے اُن کو عار　　عقلمندوں کو سمجھتے ہیں یہ سب ناکردہ کار

میں اگر اس صورتِ حالات سے غمگین نہیں　　اس سے منہ موڑنا اسلام کا آئین نہیں
تم اگر چاہو، پلٹ دو صورتِ حالات کو　　تم اگر چاہو، بنا دو اب بھی بگڑی بات کو

آسماں پر رات کو تاروں کی محفل ہے وہی　　چاند کی رفتار اور سورج کی منزل ہے وہی
اب تلک اپنا پہاڑوں نے نہیں بدلا مقام　　چوٹی چوٹی، وادی وادی اب تلک ہے صبح شام
ندیاں اب تک چلی آتی ہیں بل کھاتی ہوئی　　سست رو کو تیزیٔ رفتار سکھلاتی ہوئی
سارا جنگل اب تلک لو سے جھلستا ہے یہاں　　آج بھی برسات میں پانی برستا ہے یہاں
اب تلک مردہ زمیں میں زندگی روپوش ہے　　آج بھی پُروا ہوا، مینائے مے بردوش ہے
ہے چمن میں سبزۂ خوابیدہ کی مسند وہی　　اب تلک ہم دیکھتے ہیں خار و گل کی حد وہی
راستے کو ہے ابھی تک رہروؤں کا انتظار　　جا بجا استادہ ہیں اب تک درختِ سایہ دار
کان سنتے ہیں ابھی تک، آنکھ بینا اب بھی ہے　　زندگی کی کشمکش میں مرنا جینا اب بھی ہے
آج بھی کاٹے سے کٹتی ہے مصیبت کی گھڑی　　چلنے والے کیلئے اب بھی نہیں منزل کڑی
بر ربطِ ایام کی بدلی نہیں ہے کوئی لے　　مختصر یہ ہے کہ فطرت اب تلک پہلی سی ہے
بلکہ سچ پوچھو، تو اب پہلی سی مجبوری کہاں　　رازہائے دہر سے انساں کو وہ دوری کہاں
فطرتِ عالم سے عقل و علم کا یہ میل ہے　　جو سمجھ سے دور تھا، اب رات دن کا کھیل ہے

پر یہ دُنیا تھک چکی ہے تیزیٔ رفتار سے　　پا تو زخمی کر چکی ہے جادۂ پُرخار سے
خون میں لتھڑی ہوئی ہے ہڈیاں ہیں چور چور　　ناامیدی سر پہ چھائی، ہو رہی ہے آس دور
مادے کی آگ اس کی روح پگھلانے کو ہے　　اب کوئی دم میں یہ بڑھیا جل کے مر جانے کو ہے
اس کی پُرحسرت نگاہیں اُٹھ رہی ہیں بار بار　　دور سے آتا نظر آ جائے شاید مردِ کار
جس کی کوشش کا پسینہ اس کو ہو آبِ حیات　　پاپ کے گندے گھنونے دکھ سے مل جائے نجات

قوم کی آنکھوں کے تارو تم میں ہے، وہ مردِ کار　　جس کی آمد کا یہ دکھیا کر رہی ہے انتظار
جلد اس کو ڈھونڈ لو، ورنہ بہت پچھتاؤگے　　روحِ عالم کی فنا کے ساتھ ہی مر جاؤگے

آہ وہ ملاح جو لڑتا رہے پتوار سے
آخری دم تک بچائے ناؤ کو منجدھار سے

عفو

صالحہ عابد حسین

آج کل جدھر دیکھو چوریوں کا بازار گرم ہے۔ جس سے ملئے وہ اپنے ہاں کا کسی دوسرے کے ہاں کا چوری کا ایک آدھ قصہ ضرور سنا دیگا۔ بیچاری سلمہ۔ ایک تو یونہی ہمیشہ سے [illegible] مزاج اور گھبرانے والی طبیعت کی تھی اور پھر چوریوں سے تو اُسے بچپن سے بہت ڈر لگتا تھا۔ [illegible] کہ اس کے ہاں کبھی چوری ہوئی نہیں تھی صرف چوروں کے قصے ہی سنے تھے۔ رات کو معمولی سی آہٹ پر کتوں کے بھونکنے پر گیدڑوں کی آواز پر وہ چونک پڑتی اور ساری جان سے لرز اٹھتی۔ ضرور چور ہیں تب ہی تو کتے بھو بھو نک کر مرے جا رہے ہیں۔ اسے ہے اب تو کھٹکا بھی ہو رہا ہے۔ یا اللہ خیر۔ اے جی سنتے ہو۔ اے اختر کے ابا۔ خدا بچے ایسی نیند سے ۔۔۔ میں کہتی ہوں کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو؟ ذرا اٹھو تو ۔۔"

"کیا ہے جی؟ تم نے تو سونا حرام کر دیا۔ کیوں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے" نصیر صاحب جو سارے دن دفتر کی چکی پیسنے کے بعد تھکے ہارے گہری نیند سو رہے تھے جھلا گئے۔

سلمہ نے انھیں خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور لالٹین لیکر سارا گھر دیکھ ڈالا۔ نوکر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ بچے اور گھر کے دوسرے لوگ آرام سے سو رہے تھے۔ چور وور کا کہیں پتہ نہ تھا ہاں باورچی خانے میں چوہے ضرور کشتی لڑ رہے تھے۔ نصیر صاحب اور زیادہ جھلائے۔ "کچھ بھی نہیں۔ تم یونہی روز میری نیند خراب کیا کرتی ہو۔ چوہے ہیں۔"

"نہیں صاحب کمال کیا۔ بھلا چوہے اتنا شور کر سکتے ہیں۔ بڑے زور کا کھٹکا تھا۔"

"آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ چور اتنے احمق نہیں ہوتے کہ آتے ہی زور کا کھٹکا کریں کہ لو صاحب میں آگیا ہوں۔ دوسرے ابھی بارہ بھی نہیں بجے۔ کون گدھا ہوگا جو اتنے سویرے چوری کرنے آئیگا۔ اور پھر آپ کے دولت خانے پر؟ جبکہ ہر جگہ یہ مشہور ہے کہ اس گھر کی بیگم صاحب چوروں کے خوف سے رات بھر جاگ کر پہرہ دیتی ہیں۔ نہ خود سوتی ہیں نہ دوسروں کو سونے دیتی ہیں۔"

"آپ کو سوا تانے دینے کے اور آتا ہی کیا ہے۔ یہ اچھی زبردستی ہے کہ کھٹکا ہو، خطرہ ہو، پر انھیں جگایا نہ جائے۔ چور آ کر موس لے جائیں پر گھر والوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ کسی دن چور سب کچھ لوٹ لے جائیں گے تب پتہ چلیگا۔"

"کاش ایک مرتبہ لے بھی جائیں روز روز کی اس مصیبت سے تو نجات ملے گی۔"

"اے ہے خدا نہ کرے۔ شیطان کے کان بہرے کیسی فال منہ سے نکالتے ہیں۔ پہلے ہی کونسا ہُن برس رہا ہے۔ دولت بھری ہے۔ جس کی چوری کی دعائیں مانگتے ہیں؟"

"بھئی یہی تو میں کہتا ہوں کہ چور آ کر آخر لیں گے کیا؟ چور آتے ہیں سیٹھ ساہوکاروں کے ہاں، امیروں رئیسوں کے ہاں۔ یہاں کیا دھرا ہے جس کو چرانے آئیں گے؟"

"اے نہ سہی دولت۔ پہننے کے کپڑے، گھر کے برتن بھانڈے اور چھوٹا موٹا ہاتھ گلے کا زیور تو ہے اللہ نہ کرے یہی چلا جائے تو کیا ہو؟ مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت۔ مجھے تو پھر نصیب بھی نہ ہوں گے۔"

"سلمہ خدا کے واسطے سو جاؤ۔ اس چوری کے خوف میں تم نے میری اور اپنی اچھی بھلی پُرسکون زندگی عذاب کر رکھی ہے۔"

"آپ کو میری حالت کی کیا خبر؟ جانے رات بھر کیسے کیسے وہم آتے ہیں۔ خوفناک صورتیں نظروں میں پھرتی رہتی ہیں ۔۔۔ سب لوگ آرام سے سوتے ہیں اور میری رات جیسی کٹتی ہے یا میں جانتی ہوں یا میرا خدا" سلمہ نے رونکھی ہو کر کہا۔

"خدا کی پناہ .... تمہاری رات تو شاعروں اور عاشقوں کی شب ہجر سے بھی بڑھ گئی۔"

"ہاں ہاں اڑائیے مذاق ۔۔" رو کر جواب ملا۔

"نہ نہ ۔۔ سلمہ پیاری خفا نہ ہو۔ میں تو ایسے ہی ہنس رہا تھا۔ بھئی آج کل تمہیں کام بہت کرنا پڑتا ہے۔ پھر ادھر ادھر کی چھوٹی سچی خبریں سن کر دل پر خوف بیٹھ گیا ہے۔ اعصاب کمزور ہو گئے اسی لئے نیند نہیں آتی۔ میں کل ہی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا۔ اس طرح تو میری سلمہ بیمار ہو جائیگی پھر میں کیا کرونگا ....؟"

یہ لوری کارگر ہوئی اور تھوڑی دیر میں سلمہ سو گئی۔

اس قسم کا ہنگامہ اکثر رات کو سلمہ کے گھر میں برپا ہوتا تھا۔ سلمہ بیچاری آخر کرتی کیا؟ جو آتا جس کے ہاں جاتی انھیں چوریوں کے قصوں سے اس کی تواضع کی جاتی تھی۔ ایک سہیلی کا کلکتہ سے خط آیا کہ "تمہیں سن کر افسوس ہوگا کہ میرا نوکر میرا سارا زیور چرا کر فرار ہو گیا۔" خط پڑھ کر کئی رات سلمہ نہ سو سکی۔ شہر میں ایک ملنے والی کے ہاں گئی معلوم ہوا رات کو ان کے گھر نقب لگی اور چور پلنگوں کے نیچے سے بکس گھسیٹ کر لے گئے اور گھر والے مدہوش پڑے سویا کئے۔ جانے چوروں نے کیسی "بُرکی" چھڑک دی تھی کہ کسی کی آنکھ نہ کھلی۔ سلمہ کے اوسان خطا ہو گئے "لو غضب خدا کا۔ یہ اندھیر نہ دیکھا نہ سنا۔ اور میرے ہاں تو سدا لوگ ایسے ہی سوتے ہیں جیسے ان پر "بُرکی" چھڑکی ہو۔ اب ہوگا کیا؟" ایک دن سُنا کہ سلمہ کی چچازاد بہن کے ہاں دن دہاڑے چوری ہو گئی۔ ملازم نے دوپہر کے وقت اطمینان سے جس بکس میں ریشمی کپڑے اور زیور تھا، اُسے سر پر رکھا اور سب پڑوسیوں اور دکان داروں کے سامنے لے کر چلتا بنا۔ لوگ سمجھے گھر والی بیوی کہیں جا رہی ہیں۔ سامان نوکر لے جا رہا ہے۔

یوں تو روز ہی چوری کے واقعات سلمہ کے کانوں کی تواضع کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک حادثہ نے تو مہینوں کے لئے اس کے اعصاب شل کر دئیے۔ جمنا، سلمہ کی عزیز سہیلی تھی۔ دونوں کا گھر ملا ہوا تھا۔ جمنا دو چار دن کے لئے ایک تقریب میں اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اس کے پتی بھی ساتھ تھے مگر گھر پر نوکر اور دیودیوانی موجود تھے۔ ایک رات چور آئے۔ کوٹھری کی کھڑکی توڑی اور سارا سامان لے کر چمپت ہو گئے۔ جمنا کے بری جہیز کے سارے کپڑے گھر میں پہننے کے سوتی ادنی کپڑے، گھرداری کا عمدہ اور قیمتی سامان، بے سلے کپڑوں کا بکس، سبھی کچھ تو پار لگا دیا۔ بیچاری جمنا جسے دنیا میں اگر شوق تھا تو اچھے کپڑوں کا اور گھر کو سجانے سوارنے کے لئے قسم قسم کی چیزوں کا۔ اس کا سارا شوق، ساری محنت، سارا اثاثہ چوروں کی نظر ہو گیا۔ بہت دوڑ دھوپ کی گئی مگر سامان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ایک آدھ چور پکڑا بھی گیا اس نے اقبال بھی کر لیا۔ مگر دوسروں نے پولس کو لے دے کر اسے بھی چھٹا لیا اور خود بھی صاف نکل گئے۔ ظاہر ہے کہ جمنا پر اس حادثہ کا گہرا اثر ہوا لیکن اُس نے جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا۔ وہ کہتی جو ہونا تھا ہو چکا۔ بہرحال مال کا نقصان دنیا میں سب سے گھٹیا اور قابل برداشت نقصان ہے۔ اچھے نہ سہی برے، ریشمی اور قیمتی نہ سہی سوتی گھٹیا کپڑے پہن لیں گے۔ اس کا رنج کرنا اور رونا پیٹنا حماقت ہے اور آخر جلنے کڑھنے سے کوئی فائدہ ہو تو یہ بھی سہی۔ بظاہر جمنا کے عزیزوں اور دوستوں کو اس سے زیادہ اس چوری کا صدمہ تھا۔ سلمہ جمنا کی سہیلی تھی اور اپنی سہیلی کے نقصان کا اُسے بڑا قلق تھا وہ جمنا کو ہنس ہنس کر چوری کا ذکر کرتے دیکھ کر حیران ہوا کرتی۔ "تم کیسے اس طرح باتیں کر لیتی ہو۔ میرا بس چلے تو موؤں کو وہاں ماروں جہاں پانی نہ ملے۔" اور جمنا مسکراتی ہوئی کہتی "تم کیوں خواہ مخواہ کڑھتی ہو سلمہ۔ چلو میرے نہ سہی ان ہی کے کام آئیگا۔ اب رات کو آرام سے سو یا کرونگی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتی ہوں رہزن کو

مگر سلمہ کی سمجھ میں یہ منطق نہ آتی۔ وہ سوچتی شاید جمنا کے پاس اور بہت سا روپیہ اور کپڑا ہے جو یہ اس طرح کہہ سکتی ہے یا بنتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے ہاں چوری ہونے کا اندیشہ بھی بہت بڑھ گیا ملازموں کو اور زیادہ شک کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ نئے ملازموں سے بہت خائف رہتی۔ روز رات کو نصیر صاحب کو دو تین مرتبہ اٹھ کر سارا گھر دیکھنا پڑتا۔ کبھی بلی ملتی کبھی کوئی بچہ کسی ضرورت کے لئے اٹھا ہوا نظر پڑتا۔ کبھی ہوا سے کواڑ ہلتے ہوتے اور کبھی چوہے کشتی لڑتے ہوتے اور ان سب کا خمیازہ بھگتنا پڑتا نصیر صاحب کو۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سلمہ اپنی پڑوسن عائشہ کے ہاں بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ عائشہ، جمنا، صدیقہ، شرتی، ساری پڑوسنیں بیٹھی تھیں ادھر ادھر کی گپ شپ ہو رہی تھی۔ کوئی مہنگائی کا رونا رو رہی تھی، کوئی بچوں کی بدتمیزی اور نافرمانی کی شاکی تھی، کسی کو شکایت تھی کہ میاں سارے دن گھر میں گھٹے بیٹھے رہتے ہیں کوئی قسمت کو رو رہی تھی کہ یہی سارا وقت گھر سے باہر گزارتا ہے، کوئی پڑوسن کی برائیاں کر کے دل ٹھنڈا کر رہی تھی، کوئی ساس نند کے مظالم کی داستان دہرا رہی تھی، کوئی بہوؤں کے کرتوت بیان کر رہی تھی۔ غرض اس قسم کے ضروری اور دلچسپ موضوع زیر بحث تھے۔ تمام عورتیں ایک ساتھ چلا چلا کر باتیں کر رہی تھیں اور دوسری کی بات بہت کم سنتی تھیں کوئی باہر سے سنتا تو سمجھتا کہ اس گھر میں سخت لڑائی ہو رہی ہے اتنے میں پڑوس سے شور و غل کی آوازیں "پکڑو۔ دوڑو۔ مارو" کا غل سنائی دیا۔ سب اپنی باتیں چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئیں۔ اتنے میں سلمہ کی ماما دوڑتی ہوئی بدحواس سانس پھولا گھر میں داخل ہوئی "بی بی ۔۔ وہ ۔۔ وہ ۔۔ وہ جمّا ۔۔ وہ بے ایمان۔ باجی۔ نمک حرام ۔۔" منہ سے پوری بات نہیں نکل رہی تھی۔

جمّا سلمہ کے ہاں کا ملازم چھوکرا تھا۔ سولہ سترہ برس کی عمر، تیز طرار، کام کاج میں مشاق اور محنتی۔ چھ مہینے تک خوب اچھی طرح کام کیا۔ پھر نوکروں کے سامان اور اس کے بعد گھر کی چھوٹی موٹی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور آخر عاجز آ کر کوئی ہفتہ بھر ہوا سلمہ نے اُسے الگ کر دیا تھا۔

عورتوں نے بیک وقت چلا چلا کر گھبرا گھبرا کر پوچھنا شروع کیا کہ کیا ہوا؟ پتہ چلا کہ جمّا سلمہ کی الماری کا تالا توڑ کر زیور اور روپیہ کی صندوقچی لے کر بھاگا جا رہا تھا کہ دوسرے ملازم کی نظر پڑ گئی اور لوگوں نے بمشکل اُسے پکڑا۔ ماما اپنی ایمانداری جتانے کے لئے بری سے بری گالیاں اور کوسنے دیتی جاتی تھی اور قصہ نمک مرچ لگا کر بیان کرتی جاتی تھی۔ پڑوسنیں بھیپھڑوں کی پوری طاقت سے اس واقعے پر تعجب اور غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ سلمہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، چور ۔۔ اس کے گھر میں ۔۔ اس کا صندوقچہ ۔۔ چوری ہو ہی گیا تھا ۔۔ جانے کچھ چلا ہی گیا ہو ۔۔ چور ۔۔ جمّا ۔۔ اُف اللہ ۔۔ ۔۔ اُس کا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ بمشکل ماما کے سہارے کانپتی ہوئی گھر کی طرف چلی۔ اکثر پڑوسنیں چور کا تماشا دیکھنے ساتھ ہو لیں۔

جمّا دس بارہ آدمیوں کے [illegible] بیچ میں گھرا کھڑا تھا۔ پندرہ سولہ برس کا سوکھا سہما لڑکا۔ آنکھیں نیچی، چہرے پر

ہوائیاں۔ صورت سے معلوم ہوتا جیسے بالکل بے گناہ اور معصوم ہو۔ نصیر صاحب حلیم مزاج آدمی تھے۔ غصہ بہت کم آتا تھا۔ لیکن اس وقت ان کا منہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اتنے غصے انھوں نے اس لڑکے کو اپنے بچوں کی طرح محبت سے رکھا اُس کا اس نے یہ بدلا دیا؟ برسوں سے جوان کی راتوں کی نیند حرام ہوتی رہی تھی اُس کی ساری جھنجھلاہٹ اس وقت اُبھر آئی۔ پھر اس نے حرام جُمّا کی بدولت ان کی وہ ساری ذلتیں، جو وہ سلمہ سے چوری نہ ہونے کے یقین میں اٹھایا کرتے تھے، بیکار ہو گئیں۔ اب تو شاید انہیں زندگی بھر آرام کی نیند سونا نہ ملے۔ آپ ہی سوچئے کیسے غصہ نہ آئے؟ نصیر صاحب کا ڈنڈا حرکت میں آیا اور دو چار ضربیں جمّا کی کمر پر پڑ گئیں۔ نصیر صاحب تو ایک لمحے کے بعد اپنے پر قابو پا کر ہٹ گئے مگر اب ان کے پڑوسی، دوست اور ملازم اپنی بے غرض ہمدردی اور ایمانداری کا مظاہرہ کرنے پر تل گئے۔ ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سنا جا رہا تھا۔ جمّا پر چاروں طرف سے گالیوں اور لعن طعن کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ بعضے اظہار خصوصیت کے لئے تھپڑ اور ڈنڈے بھی استعمال کر رہے تھے۔ پڑوسنیں کونوں کھدروں سے اپنے غصے کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ایک دوسری کو آنکھ بھی مارتی جاتی تھیں۔ ایک پڑوسن آنکھیں پھاڑے صندوقچی پر نظر گاڑے حیرت اور حسد کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ آخر نہ رہا گیا تو پاس والی سے چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی "دیکھتی ہو بہن جی؟ اس اکیلی عورت کے پاس اتنا زیور — روپے کا اتنا بڑا صندوقچہ"۔

سلمہ کا دل جمّا کے بندھے ہاتھ، سوجا منہ اور کراہ کی آوازوں کو سن کر جانے کیوں اندر سے بے چین ہو اٹھا۔ رنج، غصے، خوف اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات نے اُسے بے حال سا کر دیا۔ وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور سب کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہی۔

جمّا کو مار پیٹ کر، ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ زیر غور یہ مسئلہ تھا کہ لڑکے کو پولیس کے حوالہ کیا جائے یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ ضرور پولیس میں دیا جائے تاکہ دماغ ٹھکانے آ جائے بدمعاش کا۔ مگر نصیر صاحب یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس طرح اس کی ساری زندگی خراب ہو۔ سلمہ کو ان لوگوں پر بھروسہ نہ تھا۔ یہ خیال تھا کہ چپکے سے چھوڑ نہ دیں اس نے کوٹھڑی کے قفل کی چابی اپنے پاس رکھی۔

سارا دن اس گڑبڑ میں بیت گیا۔ سلمہ بہت رنجیدہ تھی [illegible] کہ مال چوری نہ ہوا تھا پھر بھی وہ اداس اور دل گرفتہ تھی۔ رات گئے تک یہی چوری کا واقعہ گفتگو کا موضوع رہا۔ جمّا کو کھانا کھلوانے کا نہ سلمہ نے حکم دیا نہ نصیر صاحب کو کچھ خیال آیا۔ نوکروں نے سوچا اچھا ہے مرنے دو مردود کو بھوکا۔ اس کی نمک حرامی کا یہی علاج ہے۔

۱۱ بجے تک سب لوگ سو سلا گئے۔ مگر سلمہ کی آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا۔ اس نے ہر طرح کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ نصیر صاحب سارے دن کے تھکے ہارے سو چکے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی آنکھ کھلی تو سلمہ کو جاگتا اور بے چین پایا۔ اُنھوں نے بیوی کو تسلی دلاسا دے کر سُلا دیا اور تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اپنے خیال میں سلمہ کو سُلا کر خود پھر غافل سو گئے۔ سلمہ کچھ دیر چپ سادھے بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ آخر دبے پاؤں اٹھی۔ لالٹین کی بتی اکسائی اور صحن کے اُس طرف جا کر اپنی بڑھی ملازمہ کو جگایا۔ وہ آدھی رات کو یوں سلمہ کو بے دھڑک اکیلے گھومتا دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اور اپنی مخصوص زبان اور لہجے میں بیسیوں سوال کر ڈالے۔ سلمہ نے کسی کا جواب نہ دیا صرف اتنا کہا "جاؤ باورچی خانے میں کچھ کھانے کو ہو تو لے آؤ"۔ بڑی بی سمجھی آج بٹیا سے رنج کے مارے کچھ کھایا نہ گیا تھا۔ اب بھوک لگی تو شرم سے میاں سے نہیں کہا۔ بچپن کی طرح میرے پاس دوڑی آئی۔ یہ سوچ کر بڑی بی کی ممتا ابل پڑی۔ جلدی سے لپکی گئیں اور باورچی خانے سے ایک کشتی میں سالن دال روٹی مربہ سب چیزیں لگا کر لائیں اور بولیں "بیں صدقے لو کھالو"۔ سلمہ نے انھیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا وہ حیرت سے منہ کھولے اس کے ساتھ ساتھ چلیں۔ سلمہ جمّا کی بند کوٹھڑی کے سامنے جا کر رکی جیب سے کنجی نکالی قفل کھولا اور کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔

جمّا منہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔ ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے، منہ چوٹوں سے سوجا ہوا۔ کراہ کی دھیمی دھیمی آواز اُس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ دو تین منٹ تک سلمہ سکتے کی حالت میں کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر یک لخت اُس کا سارا بدن لرز اٹھا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

جمّا کے کان میں ایک بھرائی ہوئی شیریں آواز آئی "جمّا"۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ کیا آج دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو اُسے محبت سے پکارے، اس نے دو وقت سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک کے مارے پیٹ میں مروڑیاں سی اُٹھ رہی تھیں، آگ سی جل رہی تھی۔ اس نے نظر اُٹھائی۔ سامنے سلمہ فرشتہ رحمت بنی کھانے کا خوان لئے کھڑی ہے۔ اُسے یقین نہ آیا کہ یہ حقیقت ہے۔ ضرور وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ آہ کتنا اچھا خواب — کھانے کو دیکھ کر اُس کی خوشبو سونگھ کر اس کا بند بند کانپنے لگا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سلمہ نے پھر میٹھی اور پر محبت آواز میں پکارا "جمّا اٹھو کھانا کھالو"۔ بڑی [illegible] اور [illegible] بڑی مشکل سے جمّا کی رسیاں کھولیں اور کھانے کی کشتی اس کے سامنے رکھ دی۔

نصیر صاحب کی آنکھ کھلی تو بستر پر سلمہ کو نہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ ادھر اُدھر سب جگہ ڈھونڈا مگر سلمہ کو نہ پایا۔ تلاش کرتے کرتے جمّا کی کوٹھڑی تک پہونچ گئے۔

دیکھا۔ جمّا کے سامنے کھانے کی بھری کشتی رکھی ہے — وہ زار و قطار روتا جاتا ہے۔ اور کھانا کھاتا جاتا ہے۔ اور — چوروں سے ڈرنے والی سخت دل، جمّا سے خائف، اور بیزار، نہ اس کے سر [illegible] ہاتھ پھیرتی ہے اور نہایت شفقت سے اصرار کر کر کے اُسے کھانا کھلا رہی ہے۔

نصیر صاحب کی آنکھیں آب آلود ہو گئیں۔

پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان پناہ گزینوں کو اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے انہیں بتایا ہے کہ پاکستان پر مہاجرین کا اتنا ہی حق ہے جتنا سندھیوں کا۔ اس وقت یہ بھی سندھی مسئلہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ سندھ کی اسمبلی لیگ پارٹی نے کراچی کی علیحدگی اور پناہ گزینوں کے مسئلہ دونوں ہی سوالات پر سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ پناہ گزینوں کے متعلق فیصلے اس وقت تک سندھ کی حکومت کے لئے قابل قبول نہیں ہوں گے جب تک حکومت سندھ خود ان پر غور نہ کرے۔ یہ کشمکش شدت میں بڑھتی ہی جائیگی اس لئے کہ اب یہ مسائل خوش آہنگ نعروں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ چودہری خلیق الزماں صاحب کو شاید اس کا احساس ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کا اخوت اسلامی کا نعرہ اتنا موثر نہیں جتنا وہ سمجھتے تھے۔ پہ تو ل خود انہیں ہندی سیکھنا گوارا نہ تھا، اس لئے وہ وفاداری کا حلف لینے کے بعد سندھ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں اب انھوں نے ہندوستان سے جانے والے پناہ گزینوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ سندھی سیکھیں اور اس طرح سندھی عوام کی ہمدردی حاصل کر لیں۔

(ا۔ س)

مغربی دنیا (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

لیکن وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔ ڈاکٹر ری نے کہا کہ دنیا کے عوام کو امریکہ اور اقوام متحدہ کی مدد کا بھروسہ ہے۔ کہ اس طرح ان کا اتحاد دوبارہ قائم ہو سکے گا۔

(ا۔ س)

فلسطین

عرب اور یہودی بہت قدیم زمانے سے ایک ساتھ رہتے آئے تھے وہ میل ملاپ اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر صیہونیت کی تحریک اور فلسطین میں سامراجی چالوں کی وجہ سے ان کے تعلقات میں آہستہ آہستہ فرق آیا اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے متضاد وعدوں نے اس اختلاف کو اور زیادہ بڑھا دیا۔

دوسری جنگ عظیم سے انگریزوں کی بین الاقوامی حیثیت کو جو نقصان پہنچا، اس نے انہیں فلسطین کے معاملہ پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا اور بالآخر انہوں نے ۱۵ مئی کو اپنی حکم برداری کو وہاں سے ختم کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ لیکن یہ فیصلہ ایسی حالت میں کیا گیا تھا کہ یہودیوں اور عربوں کی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور دونوں میں لڑائی کی تیاری پورے زوروں پر جاری تھی۔ چنانچہ ۱۵ مئی کو ادھر مینڈیٹ ختم ہوا اور ادھر عربوں اور یہودیوں کے درمیان وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کو شاید ایک معمولی خانہ جنگی یا گھریلو لڑائی سے زیادہ اہمیت نہ ہوتی۔ اگر دنیا کی بڑی طاقتیں اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہ لیتیں۔ چنانچہ ۱۵ مئی کو یہودیوں نے اسرائیلی حکومت کے قیام کا جونہی اعلان کیا امریکہ اور روس نے بغیر کسی تاخیر کے اُسے منظور کر لیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ اسے منظور نہیں کیا، بلکہ شرق اردن کے بادشاہ شاہ عبداللہ کی مدد کرتے رہے اس سے بین الاقوامی سیاست میں اور زیادہ الجھاؤ پیدا ہو گیا۔

یو۔ این او میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو عربوں نے شرق اردن کے محکمہ خارجہ کی معرفت دو تجویزیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ یہودی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں۔ دوسرے یہ کہ یہودی حکومت کے قیام کا خیال چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ عربوں نے یہودیوں کو یقین دلایا کہ فلسطین کی حکومت میں ان کو برابر کے حقوق حاصل ہونگے اور جن علاقوں میں ان کی اکثریت ہوگی وہاں انہیں خود مختاری حاصل ہوگی مگر مرکز ایک ہی ہوگا۔ ہندوستان کے نمائندہ نے وفاقی طرز حکومت کی اسکیم پیش کی تھی، جسے عربوں نے پہلے تو نامنظور کر دیا تھا، مگر بعد میں اس بنیاد پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

یو۔ این او نے عربوں اور یہودیوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لئے کاؤنٹ برناڈوٹ کو ثالث مقرر کیا ہے۔ جزیرہ رہوڈس پر عرب اور یہودی نمائندوں سے گفتگو کرنے کا

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲)

قنوطیت کا خبط

سید عابد حسین

عام بول چال میں رجائیت اور قنوطیت کے الفاظ طبیعت کی دو کیفیتوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ رجائیت وہ کیفیت ہے جس میں انسان کو زندگی اور دنیا کی حالت اچھی معلوم ہوتی ہے، ان کا روشن رخ ہی نظر آتا ہے اور ہر چیز دلکش دکھائی دیتی ہے۔ قنوطیت وہ کیفیت ہے جس میں اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سماج کی دنیا اور سنسار کی حالت خراب ہے اور روز بروز بگڑتی جاتی ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں مختلف جسمانی و نفسی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب ہماری رگوں میں صحت کا خون دوڑ رہا ہو، ہماری زندگی آرام سے گزر رہی ہو، ہمیں کوئی بڑا نفع یا کامیابی یا دوسری کوئی خوشی حاصل ہوئی ہو تو ہمیں ہر طرف بہار نظر آتا ہے اور ہر چیز پر بہار آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اگر صحت کی خرابی خصوصاً ہاضمے اور اعصاب کی کمزوری، محبت میں ناکامی یا اس صدمے کی وجہ سے جو کسی بڑے مالی نقصان یا کسی شدید حادثے کی وجہ سے ہوتا ہے ہماری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا ہے، ہمیں زندگی اور دنیا کی موجودہ اور آئندہ حالت تاریک نظر آتی ہے۔ یہ فرق اکثر ایک عمر کے یا ایک زمانے کے لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً نوجوان عموماً رجائی ہوتے ہیں اور بوڑھے قنوطی۔ خوشحال، کامیاب، فتح نصیب قوموں پر رجائیت کا غلبہ ہوتا ہے اور پس ماندہ ناکام اور شکست خوردہ قوموں پر قنوطیت کا۔

یہ دونوں نفسی کیفیتیں اگر حد سے بڑھی ہوئی ہوں تو عمل اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ زیادہ رجائیت انسان کو سنجیدگی کے ساتھ زندگی کی مشکلوں کا اندازہ اور ان کے مقابلہ کی تیاری نہیں کرنے دیتی اور زیادہ قنوطیت اس کی ہمت کو اس قدر پست کر دیتی ہے کہ وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ دوسری چیز یعنی قنوطیت انسانی زندگی کے لئے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے کہ وہ انسان کی ساری جسمانی اور ذہنی قوتوں کو شل کر کے اُسے ہلاک یا زندہ درگور کر سکتی ہے۔ لیکن انسانی فطرت کے اندر زندہ رہنے کی جبلت کی قوت ہے، وہ قنوطیت کو زیادہ عرصہ کے لئے پنپنے نہیں دیتی یا کم سے کم اسے زیادہ شدید نہیں ہونے دیتی۔ جیسے ہی انسان اس بیماری یا صدمے سے سنبھلتا ہے جس نے اس پر مایوسی کی کیفیت طاری کر دی تھی، اس کے تن من میں زندگی کے سوتے ابلنے لگتے ہیں، امید کی ایک نئی لہر دوڑنے لگتی ہے اور قنوطیت کو بہا لے جاتی ہے۔ بعض وقت وہ بیماری اور صدمے کی حالت میں بھی عقل یا عقیدے کی برکت سے اور مضبوط ارادے کی قوت سے مایوسی کے احساس پر قابو پا لیتا ہے۔

مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی سوچنے والا دماغ قنوطیت کی داخلی کیفیت کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر اسے ایک عملی نظریے کی شکل دے دیتا ہے۔ پرانے اور نئے فلسفہ کی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جب قنوطیت فلسفے کا روپ دھار لیتی ہے تو وہ اور زیادہ خطرناک بن جاتی ہے اس لئے کہ پڑھے لکھے لوگوں پر جن میں خود سوچنے کا مادہ نہیں ہوتا، فلسفے کے نام سے بڑا رعب پڑتا ہے اور جس چیز کو فلسفہ کہہ کر پیش کیا جائے اسے وہ آنکھ بند کر کے مان لیتے ہیں۔ اس لئے ہم کو یہاں قنوطیت پر علمی نظریے کی حیثیت سے غور کرنا ہے، ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ قنوطیت کو علمی نظریے کا درجہ نہ حاصل ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

قنوطیت کہتی ہے دنیا بری ہے۔ ہم مشاہدے کی بنا پر یا کسی اور دلیل کی بنا پر فیصلہ کر سکیں کہ یہ بات صحیح ہے تو قنوطیت ایک علمی نظریے کی حیثیت سے ثابت ہو جائے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سوال کا مشاہدے کی یا عقلی دلیل کی بنا پر فیصلہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ "دنیا بری جگہ ہے" یہ ایک منطقی تصدیق ہے جس میں "دنیا" موضوع اور "بری" محمول ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنے کے لئے اصول تصدیق اس چیز کا مقصد ہی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی مقصد ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو انسانی علم دنیا کا کوئی مقصد اب تک متعین نہیں کر سکا۔ جن لوگوں نے کوئی مقصد مانا ہے وہ علمی حیثیت سے نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر یا باطنی احساس کے ذریعہ سے جو علم اور عقل کی حدود سے باہر ہے۔ اس کا کوئی ثبوت، تجربے، مشاہدے یا عقل سے نہیں دیا جا سکتا۔

شاید قنوطیت کے حامی یہ کہیں کہ دنیا کا مقصد تو عقیدے کی بنا پر قرار دیا جاتا ہے مگر یہ بات علمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس قسم کی جتنی کوششیں قنوطیت کے حامیوں نے کیں وہ ناکام رہیں۔ اس وقت فلسفہ کی تاریخ سے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ جرمن فلسفی ہارٹ مان اور اس کے پیروؤں نے یہ مان کر کہ دنیا اپنا مقصد آپ ہے یعنی اس کا مقصد اپنے وجود کو قائم رکھنا ہے، ثابت کرنا چاہا کہ قدرت کے وسائل دنیا کو قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہیں اور وہ بہت جلد مٹنے والی ہے۔ لیکن جب سائنس نے بقائے مادہ اور بقائے قوت کے نظریوں کو علمی تجربے سے اس طرح ثابت کر دیا کہ ان میں شک کی گنجائش نہ رہی تو ہارٹ مان کے پیروؤں کی زبان بند ہو گئی۔ خود شوپن ہاور کو جو قنوطیت کا سب سے بڑا نمائندہ گزرا ہے یہ ماننا پڑا کہ دنیا مٹنے والی نہیں مگر وہ چل کر کہتا ہے کہ قدرت کے وسائل مشکل سے دنیا کو قائم رکھنے کے لئے کافی ہیں، اگر ذرا بھی کم ہوتے تو دنیا بہت جلد ختم ہو جاتی۔ شوپن ہاور نے قنوطیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسری راہ اختیار کی۔ اس نے یونان کے ابیقورس اور یورپ کے بہت سے فلسفیوں کی طرح راحت یا سکھ کو دنیا کا مقصد قرار دیا یعنی دنیا اس لئے بنی ہے کہ انسان اس کے اندر زیادہ سے زیادہ سکھ پا سکے اور اپنے نزدیک یہ ثابت کیا کہ دنیا میں مجموعی طور پر سکھ کم اور دکھ زیادہ ہے، اس لئے وہ اپنے مقصد کو پورا نہیں کرتی اور اچھی نہیں بلکہ بری ہے۔

یہاں ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کہ اتنے بڑے سنسار کا جس کا اور چھور آج تک کسی نے نہ پایا، ایک چھوٹے سے مخلوق انسان کے سکھ کو سمجھنا کسی طرح عقل میں نہیں آتا۔ ہم تو صرف یہ پوچھتے ہیں کہ آپ یہ کس طرح معلوم کریں گے کہ انسانی زندگی میں مجموعی طور پر سکھ زیادہ ہے یا دکھ۔ یہ دونوں نفسی کیفیتیں ہیں اور جس پر گزرتی ہیں وہی انہیں پوری طرح محسوس کرتا ہے، اگرچہ وہ بھی ان کی مقدار کا تعین نہیں کر سکتا۔ دوسروں کے دکھ سکھ کا صرف موٹا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس کے لئے ہم علمی صحت کا دعویٰ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ تو کیا ہم اپنی ذات پر اور ان لوگوں پر جن سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے، قیاس کر کے اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس کو حل کرنے کی صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ساری دنیا کے دکھ اور سکھ کو تول کر دیکھا جائے کہ کس کا وزن زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دنیا بھر کے دکھ اور سکھ کو ایک جگہ اکٹھا نہیں کر سکتے اور کر بھی لیں تو ہمارے پاس کوئی ایسی ترازو نہیں جس میں دونوں کو تول سکیں۔ اسی طرح ہمارے پاس ان کے ناپنے کا کوئی عقلی پیمانہ بھی نہیں۔ شاید آپ کہیں آج کل جو دنیا کی حالت ہے اُسے دیکھ کر ہم بغیر تولے اور ناپے ہوئے بتا سکتے ہیں کہ سکھ سے دکھ کہیں زیادہ ہے، لیکن علمی نظریہ قائم کرنے کے لئے ایسا سرسری اندازہ کافی نہیں، صحیح جانچ کی ضرورت ہے جو ہو نہیں سکتی۔ اگر ہم آپ کے کہنے سے یہ مان بھی لیں کہ آج دنیا میں دکھ بہت زیادہ ہے اور سکھ کم ہے تو آج کی حالت سے آپ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں کہ دنیا بری ہے۔ آپ کو تو یہ کرنا ہوگا کہ جب سے دنیا ہے اور جب تک رہے گی اس سارے زمانے کے لئے دکھ اور سکھ کا کھاتا تیار کریں اور یہ ثابت کریں کہ اس میں سکھ سے دکھ زیادہ ہے۔ اور یہ کام کسی انسان کے بس کا نہیں۔ اس سے آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ دنیا کا اچھا ہونا یا برا ہونا علمی حیثیت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے "رجائیت" یا "قنوطیت" کا کوئی علمی نظریہ قائم نہیں ہو سکتا۔ جیسا ہم شروع میں کہہ چکے ہیں یہ محض نفسی کیفیتیں ہیں جن میں رجائیت تندرستی اور طاقت کی علامت ہے اور قنوطیت بیماری اور کمزوری کی۔ آپ کے دل پر کبھی عام مایوسی کی کیفیت چھا جائے تو عقیدے سے، عقل سے، ارادے کی قوت سے کام لے کر اسے دور کر دیجئے۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس بات کو سمجھ لیجئے کہ یہ ایک من کی موج ہے، دل کی لہر ہے۔ طبیعت کو اس کے حال پر چھوڑ دیجئے، اور انتظار کیجئے کہ زندگی کی گہرائیوں سے امید کی لہر اٹھ کر یاس کو بہا لے جائے۔ قنوطیت کے فلسفے کے چکر میں نہ پڑئیے، اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔

ذرا انسان کے کارناموں کا ریکارڈ دیکھئے گا

وہ سوئے بغیر ۱۱۵ گھنٹے، پانی پیئے بغیر ۲۲ دن اور کھانا کھائے بغیر ۷۵ دن زندہ رہ سکتا ہے۔

وہ ۲۰ منٹ ۵ سکنڈ تک سانس روک سکتا ہے۔ اور ۴ منٹ ۲۹ سکنڈ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔

وہ ۲۴۸ درجے کی گرمی میں اور صفر سے ۱۰۳ درجے کم سردی میں زندہ رہ سکتا ہے۔

وہ بغیر آکسیجن کے ۴۰۰۰۰ فٹ تک کی بلندی پر چڑھ سکتا ہے۔

وہ ۵۹ دن میں ۵۶۲۵ میل دوڑ سکتا ہے۔

وہ ۵۵ دن تک ہاتھوں کے بل ۱۶ میل روز چل سکتا ہے۔

وہ نٹوں کی طرح بانسوں پر ۵۸ دن تک ۳۱ میل روز چل سکتا ہے۔

وہ ایک موٹی بلی پر دن ۱۴ گھنٹے ۴۴ منٹ بیٹھا رہ سکتا ہے۔

وہ پیراشوٹ کے ذریعے ۳۰۸۰۰ فٹ کی بلندی سے کود سکتا ہے

اور وہ

ایک بم سے اپنے ۱۰۰۰۰۰ ہم جنسوں کو ہلاک کر سکتا ہے۔

ہند عرب کی نظر میں

پروفیسر عبدالغفور

(۱)

تیسری صدی ہجری میں آپ ایک عالم کے حجرے کا تصور کیجئے۔ بصرہ کی بین اقوامی بندرگاہ میں جہاں ہندوستانی بنیا اور سندھی نیم عرب جہازوں کی بھیڑ چلا جا رہا ہے اور لمبا نومند جاٹ ہندوستان کے اصلی فولاد کی تلوار لگائے کھڑا ہوا خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔

آپ کو دکھائی دیگا کہ کمرہ قلمی کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر سے پٹا پڑا ہے ان کے بیچ میں کتابوں کی اس وسیع دنیا میں کھویا ہوا ایک پستہ قد، نحیف الجثہ، ضعیف آدمی اس تیزی سے کچھ لکھ رہا ہے گویا وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ یہ شخص دنیا جہان سے بے خبر اپنے کام میں اتنے انہماک اور یکسوئی سے لگا ہوا ہے کہ اس کے اردگرد کتابوں کا جو بڑا انبار لگا ہوا ہے اگر وہ اس کے اوپر گر پڑے تو وہ اس کے اندر دب کر مر جائے اور اس کو مطلق خبر نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن ان کتابوں نے اسکو اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سلا ہی لیا۔

یہ بڈھا آدمی جاحظ ہے، جس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور یہ ایک کتاب "کالی اور گوری نسلوں کی بحث" کے نام سے لکھ رہا ہے۔

شعوبیت کی مہیب لہروں نے ساری اسلامی دنیا میں ایک ہلچل سی مچا رکھی ہے، اور "شعوبیہ تحریک" پوری ملت اسلامیہ کو عرب اور غیر عرب دو مختلف فرقوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ عرب نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم اور سب قوموں سے افضل و برتر اور خدا کے محبوب بندے ہیں۔ ادھر عجمی کہتے ہیں کہ برتری ایک فرد کو دوسرے فرد پر تو ہو سکتی ہے لیکن ایک قوم کو دوسری قوم پر نہیں ہو سکتی، اس کا معیار تو صرف دین داری اور نیکی ہے۔

یہ زبردست مناظرہ نظم میں بھی ہوتا تھا اور نثر میں بھی ہر فریق اپنی بیجا تعریف اور حریف کی بیجا مذمت کرتا، یہ مرض اس قدر پھیلا کہ اچھے سے اچھے اور شریف سے شریف لوگوں کو بھی لگ گیا۔

ان حالات میں جاحظ بڑی شان و شوکت سے اپنی بے پناہ علمیت و ہمہ گیر اور غیر معمولی شخصیت، دل آویز اور دلکش طرز تحریر کے ساتھ اٹھا اور اس نے غیر عرب قوموں کی تعریف کا ڈنکا بجایا۔

جاحظ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو چند پیسوں کی خاطر کسی کی وکالت کرتے ہیں، اس نے مناظرہ کی گرماگرمی کے زمانے میں بھی ایک متبحر عالم کی شان کو برقرار رکھا۔ اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ کالی نسلوں کی صلاحیتوں کا ایک بے لاگ اندازہ ہے اور دونوں قوموں کا تقابلی مطالعہ۔

جاحظ جب کالی قوموں کے مخالفوں کو قائل کرنے کے لئے اور بہت سی دلیلیں ختم کر چکتا ہے تو آخر میں وہ ایک روشن مثال پیش کر کے ان کو خاموش کر دیتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد سے پوچھتا ہے کہ "کیا ہندوستانیوں کو بھی جو کالے ہیں تم حقیر سمجھتے ہو؟ وہ ہندوستانی جنہوں نے سب سے پہلے بنی نوع انسان کو علم و معرفت کا سبق پڑھایا، جنہوں نے غور و فکر کے راستے کھولے اور سب سے پہلے سائنس کی تحقیق کی"؟ اس نے ہندوستانیوں اور ان کے کارناموں کو گوری قوموں کے مقابلہ میں بطور سند پیش کیا ہے۔ ... میں وزن اور پختگی پیدا کی ہے، اس نے سب سے پہلے اقوام کا ایک گہرا جائزہ لیا ہے، اس کے بعد ہندوستانیوں کی علمی، تہذیبی اور تمدنی خدمات کو بہت خوبی سے ایک جگہ جمع کیا ہے، وہ کہتا ہے "علم نجوم اور ریاضی کو ایجاد کرنے کا شرف ہندوستانیوں کو حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دواؤں کے ایجاد کرنے اور فن طب کے اسرار کا پتہ چلانے میں بھی ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہیں، ان کو ایسی دوائیں معلوم ہیں جو بہت خطرناک امراض میں مفید اور تیر بہدف ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں ایک زمانہ سے ایک مخصوص ہندوستانی رسم خط رائج ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص فنون مثلاً سنگ تراشی، بت گری، اور تعمیرات کو منتہائے کمال تک پہونچا دیا ہے۔ شطرنج جیسے کھیل کے ایجاد کرنے کا سہرہ ہندوستانیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ ان کو دوسرے ورزشی اور تفریحی کھیلوں کے ایجاد کرنے کا بھی فخر حاصل ہے جن سے ذہن، دماغ، اور جسم کی اچھی تربیت ہوتی ہے وہ عمدہ قسم کی تلوار بناتے اور تیغ زنی کے سب داؤں جانتے ہیں، وہ لوگ ایسے منتر بھی جانتے ہیں۔ جن سے زہر اور جسمانی درد اور تکلیف رفع ہو جاتی ہے"۔

جاحظ نے ہندوستانی موسیقی کی بھی بڑی تعریف کی ہے "ان کی موسیقی بہت دلکش ہے، ان کے یہاں ایک ساز ہوتا ہے جو ایک زخمہ کے ذریعے بجایا جاتا ہے۔ یہ زخمہ اس باجہ کے تار پر وہی کام کرتا ہے جو مضراب بربط میں کرتا ہے اس کے علاوہ یہ لوگ جھانجھ بھی استعمال کرتے ہیں"۔

"ہندوستانیوں کے یہاں ناچنے اور تال و سُر پر حرکت کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان کو لونڈیوں کی قیمت لگانے کا بھی بڑا ملکہ ہے، وہ جادو کرنا جانتے ہیں اور بخورات جلانے کے طریقوں سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسا عام رسم الخط ہے جو مختلف زبانوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں دوسرے بہت سے رسم الخط رائج ہیں۔ ان کا سرمایۂ شعر و شاعری بھی بہت وافر اور قیمتی ہے۔ ان کا طرز خطاب مکمل اور مؤثر ہے، وہ علم و ادب اور فلسفہ کے مالک ہیں"۔

"کلیلہ و دمنہ جیسی شہرۂ آفاق کتاب ہم نے ہندوستانیوں ہی سے حاصل کی۔ ہندوستانی بہت دانشمند اور بہادر لوگ ہیں یہ قدرت نے جو خوبیاں ان کو عطا کی ہیں اور جو عظیم الشان کارنامے اُنھوں نے کر دکھائے ہیں، ان سے چینی محروم ہیں"۔

"ان کی عادتیں اور سبھاؤ بھی بہت دلکش ہیں:- مثال کے طور پر ان کے یہاں مسواک کرنے، دانتوں کی صفائی، بالوں کے سنوارنے اور خضاب کے استعمال کرنے کے بہت خوشنما طریقے رائج ہیں، ان میں حسن و زیبائی و نرمی، سلامت روی اعتدال پسندی اور خوشبو ہوتی ہے۔ ان کی عورتیں ساری دنیا میں نمونے کی عورتیں سمجھی جاتی ہیں"۔

"عود جو بادشاہوں کے لئے ایک موزوں تحفہ ہے ہندوستان ہی سے آتا ہے۔ غور و فکر اور گیان دھیان

ص ۱۲

آزاد قوموں کا نصب العین

ہم حُسن کے پرستار ہیں مگر بے اعتدالی سے نہیں عقل کے پیرو ہیں لیکن بزدل نہیں۔ ہمارے لئے دولت محض نمود و نمائش کی چیز نہیں بڑے بڑے کام انجام دینے کا ذریعہ ہے اور افلاس کا اعتراف کرنے میں کوئی ذلت نہیں مگر یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ اُسے دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہمیں اپنی قوت اور حوصلے کو بڑھانے کے لئے ان فرسودہ فقروں سے کام نہیں لینا چاہئے کہ میدان جنگ میں بہادری دکھانا ایسا ہے اور ویسا ہے بلکہ اپنے اس عظیم الشان شہر کی روزمرہ کی زندگی کو جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے قدر اور محبت کی نظر سے دیکھنا چاہئے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے شہر کی یہ ساری عظمت ان افراد کے طفیل ہوئی ہے، جن میں سپاہیوں کی بہادری دانشمندوں کی فرض شناسی اور نیکوں کا حسن عمل اور ضبط نفس تھا۔ وہ ایسے لوگ تھے کہ اگر کسی امتحان میں ناکام رہتے تب بھی قوم کو اپنی خدمات سے محروم نہ کرتے بلکہ اپنی جانیں اس کی نذر کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے اپنے جسموں کو ملک پر قربان کر کے ابدی شہرت اور نیک نامی حاصل کر لی۔ انھیں بڑے شاندار مزار نصیب ہوئے۔ مٹی کے تودوں میں نہیں جہاں ان کی ہڈیاں دفن ہیں بلکہ انسانوں کے دلوں میں جہاں ان کی عظمت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی اور حسب موقع لوگوں کو تقریر اور عمل پر ابھارتی رہے گی اس لئے کہ ساری دنیا مردان اولوالعزم کا مقبرہ ہے۔ ان کے سوانح صرف اپنے ملک میں پتھر پر کندہ نہیں بلکہ دور دور تک غیر مرئی شکل میں، انسانی زندگی کے تار و پود میں شامل ہو گئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ ان کے کارناموں کی ریس کرو اور یہ جان لو کہ مسرت کا راز آزادی میں پنہاں ہے آزادی کا راز یہ ہے کہ انسان جرأت و ہمت سے کام لے اور دشمن کے حملے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے"۔

(پیریکلیس)

ص ۲۴

کے طریقے سب سے پہلے انھیں لوگوں نے ایجاد کئے۔ ایسے تمام منتر اور جادو جن کے عمل سے زہر کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ ہندی سے سارے عالم میں پھیلے، علم ہیئت کا سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی نے انکشاف کیا اور پھر پوری دنیا کو سکھایا"۔

مترجمہ عبدالحلیم ندوی
بی اے (جامعہ)

مشرقی وسطیٰ (بہ سلسلہ صفحہ ۹)

انتظام کیا گیا۔ عربوں کے چار نمائندے پہنچ گئے ہیں اور یہودیوں کے پہنچنے والے ہیں۔

باخبر حلقوں کا خیال ہے کہ فلسطین کی اب ایک اور طرح تقسیم عمل میں آنے والی ہے۔ جن علاقوں میں یہودیوں کی بھاری اکثریت ہے وہاں ان کی خودمختار حکومت قائم کر دی جائیگی اور بقیہ علاقے کو آس پاس کے ملکوں میں ملا دیا جائے گا مثلاً جنوب اور مشرق کے علاقے مصر اور شرق اردن کو دیدئے جائینگے اور مختصر سا حصہ شام اور لبنان کو۔

یہ بھی خبر ہے کہ فلسطین کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ میں جو اختلاف ہو گیا ہے اُسے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان دونوں کے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے امکانات اس لئے بہت زیادہ ہیں کہ ان کے اختلاف سے روس فائدہ اٹھا کر مشرق وسطیٰ میں اپنے اثرات بڑی تیزی سے بڑھا رہا ہے اور اس پورے علاقے میں کمیونزم کے پھیلنے کا خطرہ ان دونوں ملکوں کو صاف دکھائی دے رہا ہے۔

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ شاہ عبداللہ سلطان ابن سعود سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان دونوں حکمرانوں میں کوئی چوتھائی صدی سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے، اس کے علاوہ فلسطین کے بارے میں بھی، ان دونوں کی رایوں کا اختلاف سب کو معلوم ہے۔ شاہ عبداللہ، عظیم تر شرق اردن کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب فلسطین اس سے ملا دیا جائے، اور سلطان ابن سعود اس کی کھلم کھلا مخالفت کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان دونوں حکمرانوں کا ملنا، یقیناً ایک اچھی علامت ہے۔ اس کے بعد مصر کے بادشاہ، شاہ فاروق سے ملنے کا پروگرام ہے۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب حکمرانوں اور رہنماؤں کو موجودہ حالات ... کا پورا پورا احساس ہے، اور وہ معمولی اختلافات کو کسی بڑے مقصد کی خاطر، قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو ان تینوں حکمرانوں کی یہ ملاقات دور رس نتائج کا باعث ہوگی۔ اور بہت ممکن ہے کہ اتحاد عرب کے لئے مفید بنیاد ثابت ہو۔

اگرچہ سامراجی ریشہ دوانیوں نے فلسطین کے مسئلہ کو کچھ ایسا الجھا دیا ہے کہ بظاہر سلجھنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی، لیکن اگر بڑی طاقتیں کسی فریق کی پاسداری نہ کریں اور پوری ایمانداری اور خلوص اور ایمان داری سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں، تو بہت ممکن ہے کہ مایوسی اور لڑائی کے بادل چھٹ جائیں اور بین الاقوامی سیاست کا مطلع صاف ہو جائے۔ اس وقت دنیا کی بڑی طاقتوں کے تدبر اور خلوص کا امتحان ہے۔ دیکھنا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوتی ہیں یا وہ دنیا کو تیسری لڑائی کے جہنم میں جھونک دیتی ہیں۔

(ع ۔ ل)

لبنان
شام
عرب علاقہ
یہودی علاقہ
عکہ
حیفا
بحیرہ روم
تل ابیب
جافہ
عمان
یروشلم
شرق اردن
غزہ
بحیرہ مردار
فلسطین

عظمیٰ (بی اے ۔ جامعہ)

نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبدالحلیم ندوی۔

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶ اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے۔

نمونے کے پرچے

جن لوگوں کی خدمت میں نمونے کے پرچے بھیجے جا رہے ہیں، براہ کرم لوٹتی ڈاک اخبار کی خریداری کی اطلاع دیں تاکہ دوسرا پرچہ انھیں وقت پر مل جائے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں فائدہ ہے۔ وی۔ پی بھیجنے میں پیسے زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور اخبار دیر سے پہنچتا ہے۔ ... خط لکھتے وقت ... لکھئے ... اگر ... سکیں تو انگریزی میں بھی ...

منیجر نئی روشنی ڈاکخانہ جامعہ نگر دہلی

مطبوعہ:۔ جید برقی پریس دہلی

Registered No. D—207

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۵ | ۱۶ جولائی ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

خوف کاہے کا؟

مہاتما گاندھی

میں اپنے سفر کے سلسلہ میں جہاں کہیں بھی گیا مجھ سے لوگوں نے پوچھا کہ "ہندوستان کو فوری ضرورت کس چیز کی ہے؟"..... (میرے نزدیک) عام الفاظ میں سب سے بڑی اور فوری ضرورت صحیح مذہبی روح کی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ جواب بہت عام ہے جس سے ہر شخص مطمئن نہیں ہو سکتا اور یہ جواب خاص اس وقت کی حالت پر نہیں بلکہ) ہر وقت اور زمانے کے لئے صادق آتا ہے۔ میرا مطلب دراصل یہ ہے کہ چونکہ ہماری مذہبی روح سوئی ہوئی ہے اس لئے ہم ایک دائمی خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم دنیوی حکام سے بھی ڈرتے ہیں اور دینی پیشواؤں سے بھی۔ ہماری اتنی مجال نہیں کہ پنڈتوں اور پروہتوں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ اسی طرح ہم پر دنیوی حکام کا رعب طاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہم اپنے حق میں بھی برا کرتے ہیں اور ان کے حق میں بھی۔ نہ تو ہمارے روحانی معلموں کی اور نہ ہمارے حاکموں کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ ہم سچائی کو ان سے چھپائیں۔ ظاہر ہے کہ نڈر ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم دوسروں کا جیسا چاہئے ادب نہ کریں۔ یا ان کے جذبات کا احترام نہ کریں۔ میری ناقص رائے میں کسی حقیقی یا مستقل کامیابی کے حاصل کرنے کی پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ ہم نڈر ہوں۔ یہ صفت بغیر مذہبی شعور کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم خدا سے ڈریں تو پھر ہمیں انسان کا ڈر نہیں رہے گا..... اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہمارے اندر خدا موجود ہے جس سے ہمارا کوئی خیال اور کوئی فعل چھپا ہوا نہیں جو ہمیں سیدھے رستے پر چلاتا ہے اور ہماری حفاظت کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہمیں خدا کے سوا دنیا میں کسی کا خوف نہیں رہے گا۔ اس اَحْکَمُ الْحَاکِمِین کی وفاداری اور ہر قسم کی وفاداری پر مقدم ہے اور اس کے بغیر کوئی وفاداری کچھ معنی نہیں رکھتی۔"

"میں نے ہندوستان بھر کے سفر کے دوران میں یہ دیکھا کہ ہمارے ملک پر اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ پر ایسا خوف مسلط ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو شل کر دیا ہے۔ ہماری مجال نہیں کہ لوگوں کے سامنے ہونٹ تک ہلائیں اور ان خیالات کا اظہار کر سکیں جو ہمارے دل میں راسخ ہیں۔ چوری چھپے ہم ان کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں برملا کہنے کی نہیں ہیں۔ اگر ہم خاموشی کا عہد کر لیتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر جب ہم مجمع عام میں چہکنا شروع کرتے ہیں تو بہت کچھ کہہ ڈالتے ہیں جسے ہم دراصل دل سے نہیں مانتے۔ شاید ہر پبلک لیڈر کا جو ہندوستان میں مجمع عام میں تقریر کرتا ہے یہی تجربہ ہوگا۔ اس لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ صرف ایک ہی ذات ہے، اگر اس کے لئے ذات کا لفظ مناسب ہو جس سے ہمیں ڈرنا چاہئے اور وہ خدا ہے۔ جب ہم خدا سے ڈرتے ہیں تو ہمیں کسی انسان کا ڈر نہیں ہونا چاہئے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اگر آپ کسی شکل میں بھی حق کی پیروی کا عہد کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ کا دل خوف سے خالی ہو۔ چنانچہ بھگوت گیتا میں بے خوفی کو ایک برہمن کی پہلی اہم صفت قرار دیا گیا ہے۔ ہم نتائج سے ڈرتے ہیں اس لئے سچی بات کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ جو انسان خدا سے ڈرتا ہے وہ یقیناً کسی دنیاوی نتیجے کی پروا نہیں کرے گا۔ قبل اس کے کہ ہم اس مقام تک پہنچنے کی ہمت کریں جہاں مذہب کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے یا ہندوستان کی رہنمائی کا منصب حاصل کرنے کا حوصلہ کریں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ہم بے خوفی کی عادت ڈالیں؟ یا ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ جس طرح ہم خود مرعوب ہیں اسی طرح اپنے ہم وطنوں پر رعب جمائیں؟"

"انگریز اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ عرب اور پٹھان موت کو ایک معمولی سی تکلیف سمجھتے ہیں اور جب کوئی مرجاتا ہے تو کبھی نہیں روتے۔ بوئر عورتیں موت کے خوف سے بالکل آزاد ہیں۔ جنگ بوئر میں ہزاروں بوئر عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ کیا ہوا اگر شوہر یا بیٹا مارا گیا۔ یہ کیا کم ہے کہ ملک کی عزت بچ گئی؟ اگر ملک غلام بن جاتا تو شوہر کس کام کا؟ اپنے بیٹے کے جسم فانی کو دفن کر دینا اور اس کی لافانی یاد کو دل میں رکھنا اس سے اچھا ہے کہ اسے نزعی غلام بنا کر رکھا جائے۔ ان باتوں سے بوئر عورتوں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور اپنے پیاروں کو موت کے فرشتے کے حوالے کر دیا۔ جن لوگوں کا میں نے نام لیا وہ مار کر مرتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کا کیا کہنا جو دوسروں کو نہیں مارتے بلکہ خود مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ساری دنیا کی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں یہی ہیں جنہیں خلاصۂ کائنات کہہ سکتے ہیں۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
خوف کاہے کا؟	مہاتما گاندھی	صفحہ ۱
اسلامی تہذیب کی روح	خواجہ غلام السیدین	" ۲
نئی روشنی کے مقاصد	(اداریہ)	" ۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مغربی دنیا		صفحہ ۶
غزل	اثر لکھنوی	" ۷
ویرانی	کوثر بلگرامی	" ۷
عصمت چغتائی	آل احمد سرور	" ۸
ہندوستانی تہذیب کے عناصر	سید احتشام حسین	" ۱۰
کون جانے (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	" ۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے

اسلامی تہذیب کی روح

خواجہ غلام السیدین

(۱)

(الف)

بہت سے لوگ ان مسئلوں سے جو ہماری قوم پر تہذیب اور دوسری قوموں پر گذر رہی ہیں اس شدت سے متاثر ہیں کہ وہ تہذیبی مسئلوں کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اعتماد ہر چیز کا خاتمہ کر دے گا اور جب مذہبی جنون کی آگ بھڑکی ہو تو ساری تہذیبی قدریں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں کی جب روما کا شہر جل رہا ہو تو بانسری بجانا بے حسی نہیں تو اور کیا ہے؟

آئیے ذرا اس نقطۂ نظر پر غور تو کریں۔ دراصل یہاں بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی سب سے اہم اور قیمتی چیزیں کیا ہیں؟ جو گوناگوں مشاغل ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ان کی قدر و قیمت کے تعین کا ہم کون سا معیار اختیار کریں؟ کیا یہ دانشمندی کا فعل ہے کہ جب ایذا رسانی سر پر منڈلا رہی ہو تو ہم آرٹ اور ادب، سماجی اور اخلاقی قدروں کی آدھی ترقی میں اور "ذہنی دنیا" کی فضاؤں میں اڑتے رہیں؟ یا ہم بہ دست ان چیزوں کو بالائے طاق رکھ دیں، صرف مادی اور فوری چالیں سوچتے رہیں اور ان چیزوں پر غور کرتے رہیں جو عملی مسائل کے نشانہ نامے یاد کی جاتی ہیں؟ اگر ہم ایسا کریں تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ہم خطروں میں گھرے ہوں تو ہمیں ان سب چیزوں سے ہاتھ دھو لینا چاہئے جو زندگی میں لطف اور معنویت پیدا کرتی ہیں، جو اسے سچائی، خوبصورتی اور رنگینی سے آراستہ کرتی ہیں اور جو انسان کو بہیمیت کی سطح سے اونچا کرتی ہیں۔ مگر یہ تو بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ آخر ہم ایک آزاد اور طاقتور قومیت کی تعمیر کس لئے کرنا چاہتے ہیں؟ اسی لئے نا کہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں انسان کی تخلیقی روح حق اور حسن کی جستجو میں سرگرمی دکھا سکے؟ نوع انسانی کی حقیقی تاریخ، جو اس نام نہاد تاریخ سے بالکل الگ ہے جس سے ہماری درسی کتابیں بھری پڑی ہیں، جنگ و جدال اور سیاسی کشمکش کی روداد نہیں بلکہ اس سعی پیہم کی داستان ہے جو عورتیں اور مرد کبھی الگ الگ اور کبھی مل جل کر صنعت اور دستکاری، ادب اور شاعری، سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے لئے اور عمرانی تعلقات کی درستی کے لئے کرتے رہے ہیں۔ میں معاشی اور سیاسی جدوجہد کی اہمیت کو کم کر کے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں بے تامل تسلیم کرتا ہوں کہ تہذیب و اخلاق کا کوئی نظام تعمیر نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد سازگار مادی حالات اور معقول معیار زندگی پر قائم نہ ہو لیکن ہم لوگوں کے لئے جو گمنامی کی حالت میں سہی، مگر بہ تدبر اور تہذیبی اقدار کی خدمت میں مصروف ہیں یہ ضروری ہے کہ جو چیزیں مقدم ہیں انہیں مقدم سمجھیں وقت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اہمیت کے لحاظ سے۔ مجھے آکسفورڈ کے ایک پروفیسر کی بات یاد آتی ہے جو انہوں نے تیس سال ہوئے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کہی تھی۔ فوج کے ایک بڑے افسر نے کسی قدر حقارت کے لہجے میں پوچھا "اور پروفیسر صاحب آپ جنگ کے زمانے میں ملک کی کیا خدمت کر رہے ہیں؟" انھوں نے سوکھے منہ سے جواب دیا "جی کچھ نہیں صرف اس تہذیب کی تخلیق میں مدد دے رہا ہوں جس کی آپ اپنے خیال میں حفاظت کر رہے ہیں"۔ اس لئے اگر ہم اپنے وقت اور اپنے فکر و عمل کو ان اقدار کے لئے صرف کرتے ہیں تو ہمیں کسی معذرت کی ضرورت نہیں اس لئے کہ دنیا کی نجات انھیں اقدار کی صحیح قدر و قیمت کے پہچاننے اور ان میں ایک نئی روح پھونک کر ان سے ایک زندہ متحرک قوت کا کام لینے پر موقوف ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ الجھن صرف سیاسی اور معاشی الجھن ہے اندھے یا کم نظر ہیں۔ دراصل یہ ایک روحانی کشمکش ہے، اخلاقی اقدار کی جنگ ہے۔ یہ جنگ اس شدت اور وسعت کے ساتھ تو پہلے کبھی نہیں ہوئی مگر یوں ہمیشہ سے جاری ہے۔ دنیا کی تاریخ ایک مسلسل کشمکش ہے، ہر اس تخلیق اور تخریب کی قوتوں میں، محبت اور نفرت میں، عام انسانی برادری اور تنگ نظرانہ فرقہ بندی میں، معاشی انصاف اور حقیقی داری استبداد میں، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر مذہبی یا علمی تحریک جو تخلیقی روایات کو اور انسانی برادری کی تحریکات کو تقویت پہنچائے نوع انسان کی قابل قدر خدمت ہے۔

(ب)

یہ تو ایک تمہید تھی جس میں نے عام طور پر تہذیبی اقدار کی تحقیق و تلاش کی طرف توجہ دلائی۔ مگر اس مضمون میں خاص طور پر مجھے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت سے بحث کرنی ہے۔ اس سے مراد وہ تہذیب ہے جس نے مذہب اسلام کے فیضان سے پچھلے تیرہ سو سال میں نشو و نما پائی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم سب ہندوستانیوں کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں بلکہ اور قوموں کے لئے بھی ایسی تہذیب کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے میں صرف دو کا ذکر کروں گا۔ ایک تو آج کل کی دنیا میں ایسی وحدت پیدا ہو گئی جو پہلے کبھی نہ تھی ان تمام اختلافات اور جھگڑوں کے باوجود جو بین الاقوامی میدان میں نظر آتے ہیں یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ دراصل یہ اختلافات اسی لئے اور زیادہ خطرناک ہیں کہ سب ملک ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہو گئے ہیں کہ ایک کے فائدے یا نقصان کا اثر سب پر پڑتا ہے اور یہ وابستگی صرف معاشی یا صنعتی نہیں بلکہ ذہنی اور تہذیبی بھی ہے۔ خیالات اشیا سے اور انسانوں سے کہیں زیادہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ ایسی دنیا میں لوگوں کا ایک دوسرے کی تہذیب سے ناواقف ہونا صرف حماقت اور بدتہذیبی ہی نہیں بلکہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اب کوئی قوم یا جماعت یہ نہیں کر سکتی کہ اپنے گرد ایک حصار کھینچ لے اور اس کے اندر رہ کر اپنی تہذیبی خصوصیات کو دوسری تہذیبوں سے الگ تھلگ رکھ کر نشو و نما دے۔ غرض دنیا میں تہذیبی دولت کی لین دین بہت ضروری ہے اور اس میں اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں کو بہت کچھ دے سکتی ہے اور ان سے بہت کچھ لے سکتی ہے۔ دوسروں سے علیحدگی اور بے تعلقی خود اسلامی تہذیب کی روح کے بھی منافی ہے اور اگر اس نے یہ طرز اختیار کیا تو اندیشہ ہے کہ اپنی تخلیقی قوت سے اور قوت حیات سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان صدیوں سے متعدد تہذیبوں کو اپنے اندر جگہ دیتا رہا ہے اور وہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں اور باہم مل جل کر ایک ہم آہنگ مشترک تہذیب بناتی رہتی ہیں۔ ان میں دڑاوڑی تہذیب، ہندو آریہ تہذیب (اور اس سے قدرے مختلف بودھ تہذیب) مسلم تہذیب (جو ترکوں، ایرانیوں اور مغلوں کی تہذیب سے مرکب تھی) اور انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہندوستانی ذہن ہمیشہ سے فراخ دلی اور رواداری کے لئے مشہور ہے۔ اس نے باہر سے آنے والے تہذیبی تحفوں کو رد نہیں کیا بلکہ ان کو اپنی قومی تہذیب زندگی کے اندر بڑی کھپت اور نشو و نما کی صلاحیت ہے جذب کرتا رہا۔ اس کا یہ طرز عمل صرف آریوں کے ساتھ جو سب سے پہلے باہر سے آئے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ جو ہزار برس سے یہاں رس بس گئے ہیں نہیں تھا بلکہ انگریزوں کے ساتھ بھی جنھوں نے فاتح بن کر رہنا چاہا اور صرف ڈیڑھ سو برس تک ٹک سکے۔ باوجود ان ناگوار اور ناسازگار حالات کے جن میں مغرب کا سابقہ ہندوستان سے رہا، مغربی تہذیب کے بہت سے عناصر ہماری تہذیب کا جزو بن گئے۔ اب تک مسلم تہذیب (میں نے خاص کر کے مسلمانوں کی تہذیب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہندوستان کی مسلم تہذیب کو صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بنایا بلکہ یہ بہت سے فرقوں کے باہمی تعاون سے تعمیر ہوئی) تو اس کے اثرات اتنے متعدد اور مختلف ہیں اور عام ہندوستانی تہذیب میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ اگر ان کو الگ کرنا چاہیں تو اندیشہ ہے کہ یہ ساری تہذیب ہی درہم برہم ہو جائے گی۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے سیاسی واقعات نے جس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات حد سے زیادہ بگڑ گئے تھے یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ اس خوبصورت ہم آہنگ تہذیب کو برباد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس رجعت پسندانہ ذہنیت کے بہت سے آثار نظر آ رہے ہیں جن کو روکنے کی اور خود اس ذہنیت کی اصلاح کی بہت سخت ضرورت ہے۔ صرف مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور خود ہندوستان کی خاطر۔ جب تک ہندوستان کی تقسیم کا زخم ہمارے دلوں پر ہرا ہے۔ یہ رویہ سمجھ میں آ سکتا ہے اگرچہ اسے جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن اگر ہندوستان کو تہذیب کے میدان میں عظمت اور بلندی حاصل کرنی ہے تو اس کی تہذیبی روایات کے تسلسل میں خلل نہیں پڑنا چاہئے۔ کچھ دن ہوئے مولانا آزاد نے ایک کانووکیشن ایڈریس میں فرمایا تھا "ممکن ہے دوسری قوموں کو اپنے اندر وسعت نظر اور رواداری پیدا کرنے کے لئے ایک نئے سبق کو سیکھنے کی ضرورت ہو لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ہماری قدیم تہذیب کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اور ہمارے اندر ہزاروں سال سے رچی ہوئی ہے۔ یہاں سب مذہبوں، سب تہذیبوں اور سب معاشرتوں کو آزادی تھی کہ جیسے چاہیں اپنی نجات کی راہ تلاش کریں۔" کیا ہم رواداری اور وسعت قلب کی اس میراث کو اب بیسویں صدی میں جب کہ اس کی ہمیشہ سے زیادہ اور شدید ضرورت ہے چھوڑ دیں گے؟ مہاتما گاندھی نے اپنی فطری حق پرستی اور انصاف پسندی کی بدولت اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا اور اپنی عظیم الشان شخصیت کی پوری قوت سے ملک کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور بار بار متنبہ کرتے تھے کہ سماجی، سیاسی اور تہذیبی تنگ نظری اکثریت کے لئے اور اقلیتوں کے لئے یکساں مہلک ہے۔ ظاہر ہے کہ [illegible]

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲)

۲۔ پاکستان

۱۔ سرحد میں سختیاں۔

سرحد کی حکومت اور اس کے حامیوں کا کہنا تھا کہ خدائی خدمت گاروں کے خلاف کارروائیوں سے صوبہ میں عام لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یہ تحریک ان کے اندازے کے مطابق عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی اور اب صرف چند اسے گنے آدمی اس کے اثر میں تھے۔ غالباً ان اندازوں میں حکومت نے غلطی کی تھی۔ ان کارروائیوں کے بعد روز بروز حکومت کی بڑھتی ہوئی سختی اس کا کھلا ہوا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم خان عبدالقیوم خاں کو غیر معمولی اختیارات مانگنے کی ضرورت پڑ گئی اور اس مقصد میں ایک آرڈیننس نافذ کر دیا گیا ہے۔

خان عبدالقیوم نے یہ اختیارات "صوبے کی سرحدوں کے اندر سے بیرونی دشمنوں کی کارروائیوں کا سد باب کے لئے مانگے ہیں" یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وزیر اعظم نے خان عبدالغفار خاں پر بھی الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستان کے دشمنوں سے ساز باز کر رہے تھے ایسی صورت میں "بیرونی دشمنوں" کی خطرناک اصطلاح کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ سرحد کے عوام کو ایک فرضی خطرے سے ڈرا کر خدائی خدمتگاروں کے اثر سے نکال لیا جائے۔

مقصد جو بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ حکومت سرحد نے جو اختیارات اس آرڈیننس کے ذریعہ سے حاصل کئے وہ حد سے زیادہ وسیع اور مستبدانہ ہیں۔ اس آرڈیننس کے مطابق حکومت جس کو چاہے غیر محدود مدت کے لئے قید کر سکتی ہے اور ایسی کسی جماعت کے اثاثہ پر قبضہ کر سکتی ہے جس کے متعلق وہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کی کارروائی سے حکومت کو خطرہ ہے۔ پریس سے متعلق ایک دفعہ کے مطابق حکومت کسی بھی شخص کو جو صوبے میں خوف یا دہشت پھیلائے یا حکومت کے کسی ملازم کو بدنام کرے گرفتار کر سکتی ہے۔ یہ جرائم اتنے مبہم ہیں کہ حکومت جس کو چاہے اپنے راستے سے ہٹا دے ایک نئی جمہوریت کے لئے یہ آثار کچھ بہت امید افزا نہیں کہے جا سکتے۔

لیکن خان عبدالقیوم خاں کا ستارہ گردش میں معلوم ہوتا ہے۔ انہیں اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے ابھی اچھی طرح نپٹنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی کہ ان کے اپنے دوستوں نے ان کے لئے ایک بڑا دردِ سر پیدا کر دیا ہے۔ صوبہ کی لیگ اسمبلی پارٹی نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ صوبہ میں غذا کی رسد کا مناسب انتظام کرے ورنہ سب لیگ ممبر استعفیٰ دے دیں گے معلوم نہیں حکومت اب کیا کرے گی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر حکومت نے کچھ نہ کیا تو لیگ اسمبلی پارٹی واقعی اتنی بڑی قربانی کر دے گی مگر اس سے یہ پتہ تو بہرحال چلتا ہے کہ صوبہ کی حالت معاشی اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہے۔ اس معاشی پس منظر میں حکومت کے نئے غیر معمولی اختیارات کو دیکھئے تو صورت حال واقعی بہت ہی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ قبائلی علاقوں میں کشمکش

قبائلی علاقوں میں بھی بے چینی کے آثار نمایاں ہیں۔ سرحد پار سے خبریں اس زمانے میں بھی جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا کم ہی آتی تھیں۔ اب جب بیچ میں ایک اور غیر ملکی حکومت بن گئی ہے خبر کے ذرائع اور بھی محدود ہو گئے ہیں۔ اس لئے سرحد پار کے واقعات کو ٹھیک سے سمجھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک مختصر سی خبر آئی تھی کہ فقیر ایپی کے پیروؤں کو میران شاہ میں بڑی بھاری شکست کھانا پڑی لیکن نہ تو یہ پتہ چلتا ہے کہ فقیر ایپی کی اس کشمکش کا مقصد کیا ہے۔ نہ اس کی وجہ صاف سمجھ میں آتی ہے۔ پاکستان کے ہمدرد اس کو فقیر ایپی کی ہندو پرستی بتاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسے اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قبائلی علاقوں کی نگرانی کا کام جن لوگوں کے سپرد ہے وہ برطانیہ عظمیٰ کے ازلی اور ابدی دوست ہیں۔ اور قبائلی علاقہ والے برطانیہ کے پرانے دشمن۔ قیاس یہ ہے کہ یہ کشمکش اسی پرانی کشمکش کی آواز بازگشت ہے بہرحال قبائلی علاقوں کی صورت حال خاصی نازک لگتی ہے۔ اس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان نے قبائلی علاقوں کے لئے ایک نئی وزارت کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ یوں اس کا چارج ایک اور بزرگ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جناح صاحب اس محکمے کو خود اپنی نگرانی میں رکھیں گے۔

۳۔ کراچی کی قسمت کا فیصلہ

کراچی کی قسمت کا فیصلہ آخر کار ہو گیا سندھ کی اسمبلی لیگ پارٹی کو جناح صاحب کے سامنے ہار ماننی ہی پڑی۔ لیکن صوبائی مسلم لیگ اپنے اعتراضات پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ کی بازگشت آئندہ بھی سنائی دے سکتی ہے۔ لیگ اسمبلی پارٹی کے ایک ممبر کے الفاظ میں پارٹی نے یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اسے یہ معلوم تھا کہ حکومت پاکستان سندھ کے عوام کی مرضی کے خلاف کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے فیصلہ پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ ایسا کرنے میں پارٹی نے وزیر اعظم کو ایک ۱۷۔ پائنٹ کا [illegible] نامہ دیا ہے۔ اس کی ایک اہم دفعہ [illegible] کہ "پناہ گزینوں کے بسانے اور آباد کرنے کے معاملہ میں اس کا خیال رکھا جائے کہ اتنے ہی لوگ لئے جائیں جو صوبہ سے ہجرت کر جانے والوں کی جگہ پر بسائے جا سکیں" ایک بار سہروردی صاحب نے کہا تھا۔ پناہ گزین بہت ہی ناگوار قسم کے ناخواندہ مہمان ہیں۔ سندھ کے لیڈروں نے اس بات کو کافی تکلیف دہ طریقہ سے واضح کر دیا ہے۔

۴۔ امریکہ سے ایک کروڑ ڈالر کا قرضہ

حکومت پاکستان کو امریکہ سے ایک کروڑ ڈالر کا قرض ملا ہے۔ اس قرض کی مقدار بہت مختصر سی ہے اور اس کا مقصد بھی محدود ہے۔ امریکی حکومت نے یہ قرض اس لئے دیا ہے کہ پاکستان پناہ گزینوں کی طبی اور دوسری طرح کی امداد کے لئے امریکہ سے فاضل سامان خریدے۔ اس سلسلہ میں جو اعلان ہوا ہے وہ مبہم سا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ امریکی حکومت یکم جولائی ۱۹۴۹ء سے اس طرح کے فاضل سامان کی فروخت کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کرنے والی ہے۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ فروخت پھر شروع ہو جائے گی اور تب حکومت پاکستان زرعی مشینیں اور اس طرح کی دوسری چیزیں جن سے پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے کے کام میں مدد ملے خرید سکے گی۔ لیکن اس ایک سال کی مہلت میں جو حکومت پاکستان کو ملے گا یہ پتہ نہیں کہ حکومت پاکستان کیا اور کتنی مقدار میں چیزیں خرید سکے گی؟ شاید یہ امریکہ کی دوستی کا ایک معمولی سا ثبوت ہے فی الحال اس قرض سے دواؤں وغیرہ کی خرید کا ذکر بہت کیا گیا ہے۔ اس سے یہ خیال [illegible] پاکستان میں ان چیزوں کی بڑی کمی ہوگی لیکن حکومت پاکستان کے متعلق ایک خبر یہ ملی ہے کہ اس نے حکومت ہند سے اجازت مانگی ہے کہ اسے حیدرآباد دوائیں لے جانے کے لئے جہاز بھیجنے کی اجازت دے دی جائے۔ معلوم نہیں ان دواؤں میں دماغ کی بیماریوں کے لئے بھی کوئی پیٹنٹ دوا ہوگی یا نہیں۔

مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کی شکایتیں

جولائی کے پہلے ہفتہ میں مشرقی بنگال کی کانگریس اسمبلی پارٹی کے ایک وفد نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی تین شکایتیں رکھیں۔ پہلی شکایت عام قسم کی تھی کہ سیلاب زدہ علاقوں میں مدد کا معقول انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ دوسری دو شکایتیں اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ وفد کا کہنا ہے کہ ملازمتوں میں اقلیت کے تناسب کے متعلق حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ حکومت کے اعلان کے مطابق مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کو تیس فیصدی ملازمتیں دی جائیں گی۔ اسمبلی میں اقلیتوں کی جو نشستیں خالی ہوئی ہیں اس کے لئے انتخابات نہ ہونے کی بھی شکایت کی گئی ہے۔ ان شکایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اقلیت کو پاکستان کی تعمیر کے کام میں حصہ لینے کے پورے مواقع نہیں ملتے۔ کچھ عرصہ سے صوبہ کی فرقہ وارانہ صورت حال بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مغربی بنگال کی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان سے آنے والے ہندوؤں کو پناہ گزین تصور نہیں کرے گی مشرقی پاکستان کی حکومت کو کوشش کرنی چاہئے کہ یہ اصلاح مستقل ہو جائے اور اقلیت کے دل میں واقعی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ شبہ کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی اور اس کے لئے ملک میں جگہ ہے یہ احساس دونوں نئی ریاستوں کی ترقی کی پہلی شرط ہے۔

(بقیہ ہندوستان)

بڑی تعداد میں تھے لیکن اب پاکستان کی ایک جداگانہ ریاست بن جانے کے بعد ہندیونین میں خال خال رہ گئے تھے جن کی وفاداری شبہ کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھی اور جن کو فوج میں بھرتی کرنا تقریباً مسدود کر دیا گیا تھا۔ وہ ان سب کی نابلدگی کر کے یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہند یونین کے مسلمان اب بھی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ بھروسہ کے لائق ہیں جتنے وہ پہلے کبھی رہ چکے ہیں۔ یہ اعلان وفاداری ہے جو بریگیڈیر عثمان نے انڈین یونین کے مسلمانوں کی طرف سے اپنے جوان خون کے روشن حرفوں سے لکھ کر پیش کیا ہے جو لوگ اب تک انڈین یونین کے مسلمانوں کی وفادار پر شک کر رہے ہیں ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بھروسہ بھروسے سے پیدا ہوتا ہے۔ بریگیڈیر عثمان گاندھی جی کے بھگت اسی لئے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ (م س ع)

مغربی دنیا

برلن کا بلوکیڈ

برلن کے بلوکیڈ کا اب تیسرا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ روسی خفا ہیں، اور ان کی خفگی کا سبب یہ ہے کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ نے مغربی جرمنی کو ایک الگ ریاست کی حیثیت دے دی ہے اور اس ریاست کی معاشی بہبودی کے لئے نیا سکہ جاری کیا ہے، مگر اس کا ابھی تک کسی کو علم یا اندازہ نہیں ہے کہ برلن کا بلوکیڈ کرنے میں روسیوں کا خاص مقصد کیا ہے۔

۹ر جولائی کو وہ احتجاجی نوٹ شائع ہوئے جو متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور فرانس نے روس کو بھیجے ہیں۔ ان نوٹوں کی زبان مختلف ہے، مگر ان میں باتیں ایک سی ہی کہی گئی ہیں۔ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے نوٹوں میں اس پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ انھیں برلن کے ایک حصے پر قبضہ رکھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ روس کو مشرقی جرمنی پر قبضہ رکھنے کا ہے، اور جون ۱۹۴۵ء میں جو سمجھوتا ہوا تھا اس میں انھوں نے بعض ایسے علاقوں کو چھوڑ کر جن میں ان کی فوجیں پہنچ گئی تھیں برلن میں رہنے کا حق حاصل کیا تھا۔ اس وقت مارشل ستالن نے وعدہ کیا تھا کہ برلن کے اس حصے میں آنے جانے کے راستے کھلے اور محفوظ رہیں گے، اور اب کسی اختلاف کی بنا پر ۱۹۴۵ء کے سمجھوتے کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بحث کا قانونی پہلو ہے، اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روسی اس بنا پر جرمنی کی پرانی تقسیم کو رد نہیں کر سکتے کہ آئندہ کے لئے بھی جرمنی کے دو حصے کر دئے گئے ہیں۔ اس کو فوجی نقطۂ نظر سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ روسیوں کو یا تو یہ ماننا چاہئے کہ برلن پر متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ان کا، یا پھر انھیں وہ علاقے واپس کر دینے چاہئیں جو انھیں برلن کے بدلے میں دئے گئے تھے۔ غالباً مغربی طاقتوں کو یہ اندیشہ ہے کہ لیوبک سے تری است تک ایک لائن جو ۱۹۴۵ء میں یورپ کا بٹوارہ کرنے کے لئے بنائی گئی تھی اسے روسی اب ایک مستقل مورچہ قرار دینا اور اس کی مورچہ بندی کرنا چاہتے ہیں، اور اس مورچہ بندی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ اتحادیوں کو برلن سے بے دخل کیا جائے۔ لیکن اتحادیوں نے برلن میں رہنے کے حق کو اسی خیال سے خریدا یا حاصل کیا تھا کہ روسی ۱۹۴۵ء کی حد بندی کو ایک مستقل سیاسی اور فوجی حیثیت نہ دے سکیں، اور اب وہ اس ایک حق کو چھوڑ دیں تو انھیں نہ معلوم اور کیا کیا چھوڑنا پڑے گا۔

یوگوسلاویہ کا مسئلہ

اگر ہم یہ مان لیں کہ روسی واقعی ایک غیر مخدوش مغربی سرحد چاہتے ہیں تو یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یوگوسلاویہ کو کومن فورم سے کیوں خارج کیا گیا ہے۔ کومن فورم کی طرف سے یوگوسلاویہ پر کچھ اصولی اعتراض کئے گئے تھے اور ایک بڑا سیاسی اعتراض کہ وہاں کی حکومت اور کمیونسٹ پارٹی یوگوسلاویہ کے حق میں بہتر سمجھتی ہے کہ روس کے بجائے مغربی طاقتوں کا سہارا لیا جائے۔ یوگوسلاویہ پر الزام لگانے اور اسے مجرم قرار دینے میں روسی حکومت بظاہر شریک نہیں ہوئی، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایسی کارروائی اس کے علم اور رضامندی کے بغیر ہو سکے، اور اس وجہ سے یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یوگوسلاویہ کے پڑوسیوں میں سے صرف البانیہ نے کومن فورم کے فیصلے کو ایک حکم مان کر اس کی تعمیل کی ہے، اور یوگوسلاویہ سے سیاسی اور معاشی تعلقات توڑ دئے ہیں۔ بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی نے کومن فورم کے فیصلے کی تصدیق کی، مگر اس کے ساتھ ہی حکومت نے ایسے بیان شائع کئے ہیں جن کا مقصد اس کا اطمینان دلانا تھا کہ اس سے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کے تعلقات میں کوئی خاص فرق نہ پڑے گا۔ بلغاریہ کی حکومت موسیو دمتروف کے ہاتھ میں ہے جو کمیونسٹ پارٹی کے بہت ہی ممتاز اور معتبر رکن ہیں، اور اگر ان کا مرتبہ اور اعتبار گھٹ نہیں گیا ہے تو ہمیں بلغاریہ کے طرز عمل کو صحیح پالیسی کا نمونہ سمجھنا چاہئے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یوگوسلاویہ کے ساتھیوں اور پڑوسیوں نے اسے مجرم بھی ٹھہرایا ہے اور اس سے بگاڑنا بھی نہیں چاہتے۔ ان میں روسی حکومت کی مخالفت کرنے کی طاقت اور شاید خواہش بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کی مرضی کے خلاف بھی کر رہے ہیں۔

روس کا منشا

اگر اس معاملے پر روسیوں کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس سے اتنے نتیجے نہیں نکلتے۔ روسی پکے کمیونسٹ ہیں، مگر وہ اپنی خارجی سیاست کو بالکل آزاد بھی رکھنا چاہتے ہیں، پہلی مصلحت دونوں کے لحاظ سے وہ چاہتے ہیں کہ پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، آسٹریا، ہنگری، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ اور البانیہ میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہو، مگر روس کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کی سیاست اور معیشت پر حاوی رہے، اور یہاں کمیونسٹ حکومتیں قائم کرنے سے روس کا یہ اصل مقصد حاصل ہوتا نظر نہ آئے تو روسی اس کا بالکل خیال نہ کریں گے کہ یہ حکومتیں جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں ان سے ان کے کیسے پرانے تعلقات ہیں اور وہ کتنے سچے اور اچھے کمیونسٹ ہیں۔ ان لوگوں کو حکومت کرنے کا جو موقع ملا ہے اس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ہوگا، حکومت کے انتظامات کو درست کیا ہوگا۔ ترقی اور بہبودی کی تدبیریں کی ہوں گی، مخالفوں کو کچھ راضی کچھ مجبور کر کے عداوتوں کی آگ کو بجھایا ہوگا۔ ان سب باتوں سے حکومت میں استقلال پیدا ہوتا ہے، اور استقلال سے طاقت۔ دو چار برس میں ممکن ہے یہی کمیونسٹ حکومتیں جو روس کے بل بوتے پر قائم ہوئی تھیں صحیح معنوں میں قومی حکومتیں بن جائیں، قوم کے مفاد کو اصولی باتوں پر ترجیح دینے لگیں، روس کا آلۂ کار ہونے کے بجائے اپنی سیاست کے مقصد خود مقرر کرنے لگیں۔ ان میں کبھی اتنی طاقت نہیں ہو سکتی ہے کہ روس کا مقابلہ کر سکیں اور مغرب کی طرف سے ان کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے، لیکن روس کے لئے بہت بہتر صورت یہ ہے کہ ان ملکوں میں اتنی سکت بھی نہ ہو کہ وہ مقابلے کا حوصلہ کریں، ان کی حکومتیں اپنی اپنی قوم کا سہارا نہ لے سکیں اور کسی قسم کا استقلال حاصل نہ کر سکیں۔

کومن فورم نے یوگوسلاویہ کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اس سے مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کے کمیونسٹوں میں بڑا انتشار پیدا ہوگا۔ جن لوگوں میں خودداری اور فرض داری کا احساس ہے وہ سمجھنے لگے ہوں گے کہ انھیں یا تو حکومت سے دست بردار ہونا یا روس سے ٹکر لینا ہے، جو لیڈری اور حکومت کے امیدوار ہوں گے انھوں نے مارشل ٹیٹو کی مثال سے سبق لیا ہوگا اور سوچ رہے ہوں گے کہ حکومت کے بدلے ضمیر کا سودا کریں یا نہ کریں، جو زمانہ ساز ہیں وہ اس انتظار میں ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ روسی ان کی خدمت سے فائدہ اٹھائیں۔ یوگوسلاویہ کے کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ شہری ابھی تک مارشل ٹیٹو اور اس کی حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کومن فورم کا فیصلہ کس طرح نافذ کیا جاتا ہے۔ روسیوں کو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، خطرہ ہو اور نظر نہ آئے تو اس سے بھی بہت کچھ جاتا ہے۔ روسی چاہتے ہیں کہ تری است کے قریب تک اپنی فوجیں پہنچا دیں، اور یہ بہت بہتر ہوگا اگر اپنی فوجیں بھیجتے وقت وہ کہہ سکیں کہ انھیں یوگوسلاویہ میں امن قائم رکھنا ہے۔

فرانس کی حالت

۹ر جولائی کو جو احتجاجی نوٹ روس کو بھیجے گئے ہیں ان میں سب سے کمزور فرانس کا ہے۔ فرانسیسی وزارت نے بڑی مشکل سے پارلیمنٹ کو اس پر راضی کیا تھا کہ مغربی جرمنی کے بارے میں جو فیصلے لندن کانفرنس میں کئے گئے تھے انھیں منظور کرے۔ وہاں کے مدبروں کا اب بھی خیال ہے کہ روس سے سمجھوتا کرنے کی ایک کوشش کرنا چاہئے، اس لئے کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جرمنی ترقی کرے اور طاقتور ہو جائے، اور یہ دونوں جو ڈھیٹے سے فرانس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں اس سے فرانسیسیوں کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ آج بھی جرمنی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اس کی طاقت سے ڈرتے ہیں۔ روس کی ترقی سے ان کے دلوں میں کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ روس کی رضامندی سے جرمنی پر مستقل قبضہ رکھنے کی کوئی صورت نکال جائے، اور کسی کو یہ یاد رکھنے کی اجازت نہ دی جائے کہ جرمنی کبھی آزاد اور خود مختار تھا۔

مارشل پلین کے ماتحت فرانس کو امداد ملنے لگی ہے لیکن اس سے حکومت کی دشواریاں بہت کم نہ ہو جائیں گی۔ اسے اپنے عملے میں تخفیف اور تنخواہوں میں کمی کرنا ہے، مگر اس طرح کہ ملک میں انتشار نہ بڑھے۔ فرانسیسی کمیونسٹ متحدہ ریاستوں سے مدد لینے کے خلاف۔ اور اب جو یہ مدد ملنے لگی ہے تو وہ کوشش کریں گے کہ اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ مزدوروں کی سب سے بڑی سبھا ان کے قبضے میں ہے، اور اب حکومت خرچ میں کمی کرنے کی جو تدبیریں کر رہی ہے اس سے آبادی کے دوسرے طبقے بھی بیزار اور فساد کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس میں ہڑتالوں کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اور سیاسی اور معاشی زندگی کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔

براہ کرم خط لکھتے وقت اپنا پتہ صاف لکھئے

غزل

اثر لکھنوی

وہ زندگی کی حلاوت سے دور رہتے ہیں
جو بد نصیب محبت سے دور رہتے ہیں

اسیر اپنی خودی کے کبھی سمجھ نہ سکے
کہ فکر عیش میں راحت سے دور رہتے ہیں

یہی ہے آئینۂ دل کی تیرگی کا سبب
جو خود نگر ہیں وہ نفرت سے دور رہتے ہیں

وہ خاکِ عشق کی عصمت کے پاسباں ہوں گے
جو اپنے دل کی طہارت سے دور رہتے ہیں

وہ لوگ جن کے عزائم میں استواری ہے
مصیبتوں میں بھی کلفت سے دور رہتے ہیں

گناہ کر کے پشیمان جو نہیں ہوتے
ہوائے دامنِ رحمت سے دور رہتے ہیں

صفات و ذات میں تفریق ہم نہیں کرتے
طلسم بندئ کثرت سے دور رہتے ہیں

ہوا کے ساتھ بدلنا ہمیں نہیں آتا
بلا سے امن و فراغت سے دور رہتے ہیں

یہ جانتے ہوئے شہرت ہے منتظر اُن کی
جو باکمال ہیں شہرت سے دور رہتے ہیں

ادائیں جن کی دل آرا جفائیں دل جو تھیں
وہ ہم سے روٹھ کے مدت سے دور رہتے ہیں

اثر یہ سچ ہے کہ ہم میں ہنر کوئی
ہزار شکر دنارت سے دور رہتے ہیں

ویرانی

کوثر بلگرامی

یوں تعجب سے تاسف سے نہ دیکھ اے ہمدم!
میرا تاریک سا، ویران سا ایوانِ حیات!
کچھ ہمیشہ ہی سے ویران ہو یونہی یہ تو نہیں
اس کی تخریب میں مضمر ہے جہانِ آیات!

اسی تاریک سے، ویران سے کاشانے میں
آرزوؤں کے دیے میں نے جلا رکھے ہیں
اپنے معصوم و حسیں خوابوں کی تصویروں سے
اس کے سب طاق و در و بام سجا رکھے ہیں

ذرے ذرے سے اُبلتے تھے خوشی کے دھارے
گوشے گوشے میں فروزاں تھے محبت کے چراغ
رو کشِ بزمِ ثریا تھی بساطِ محفل
خندہ زن گردشِ ایام پہ مینا و ایاغ

پھر یکایک رُخِ ہستی سے نقاب اُٹھنے لگی
جاگ اُٹھا گوشۂ دل میں کہیں احساسِ الم
زلزلے آئے تخیل کی حسیں وادی میں
ہو گئی دیکھتے ہی دیکھتے محفل برہم!

آئی جام مے احمر سے مجھے بوئے لہو
پردۂ درد نہاں خندۂ شمعِ محفل
دیدۂ گل میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھے
رقصِ پروانۂ بیتاب تھا رقصِ بسمل

میں نے خود گل کر دئے اپنی مسرت کے چراغ
برہنہ کر دئے طاق و در و ایوانِ حیات
یوں تعجب سے تاسف سے نہ دیکھ اے ہمدم!
میرا تاریک سا، ویران سا ایوانِ حیات
کچھ ہمیشہ سے ہی ویران ہو یونہی یہ تو نہیں
اس کی تخریب میں مضمر ہے جہانِ آیات

عصمت چغتائی

آل احمد سرور

کئی سال کی بات ہے کہ عصمت چغتائی کا مضمون "دوزخی" شایع ہوا۔ میں اس زمانے میں علی گڑھ میں تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے اکثر ادبی مباحث پر گفتگو رہتی تھی۔ رشید صاحب سے میں نے اس مضمون کا ذکر کیا اور زور دیا کہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس مرقع کی بے رحم حقیقت نگاری اور بے باک طنز کو وہ شاید پسند نہ کریں۔ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ رشید صاحب اس مضمون کو ایک مریض ذہنیت کا آئینہ دار کہتے تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں اپنی واقعیت اور صداقت اور نفسیاتی تجربے کے اعتبار سے وہ اردو میں اپنے رنگ کی پہلی کامیاب کوشش ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ دوزخی، لحاف، یا ٹیڑھی لکیر کو بہت سے بزرگ عریاں، اخلاق سوز، جنسیات کی دلدل اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ اردو ناول اور افسانہ دراصل پریم چند کے زمانے تک اچھے لڑکوں، لڑکیوں کو ان کے نیک کاموں پر انعام بانٹتا رہا۔ پریم چند بہت آخر میں اس جذباتیت سے نکل گئے۔ اردو افسانہ نگاری اب جا کر بلوغت کو پہنچی ہے اور اردو ناول تو ہنوز عالم طفلی میں ہے۔ ناولوں کے لیے زندگی کے متعلق جس بصیرت، نظر کی جس گہرائی، شعور کی جس پختگی اور دوسرے کے مزاج، کردار، یا نفسیات میں ڈوبنے کی جو صلاحیت ضروری ہے وہ ابھی کم لوگوں میں پیدا ہو سکی ہے۔ ناول اور افسانے میں جان زندگی اور انسانی فطرت کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے سے آتی ہے اور آپ پیٹھ پر اخلاق، تہذیب، روایت وغیرہ کا بہت بھاری بوجھ لے کر بار بار نہ تو غوطے لگا سکتے ہیں نہ سمندر کی تہ پر قدم جما سکتے ہیں۔ ہمارے ادب میں اب بھی مشرقیت، شرافت، وضع داری، عورت، مرد کے خانے بنے ہوئے ہیں اور ان خانوں میں ظاہری پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جو مر گیا وہ مر کر مقدس ہو گیا۔ اس کے عیبوں پر پردہ ڈھکنا چاہئے۔ جو نیک و سعادت مند، شریف اور وضع دار ہے زندگی میں اسے فتح ہو ئی ہو یا نہ ہو کم از کم افسانے میں تو اسے نیکی کا صلہ ملنا ہی چاہئے۔ نئے ادیب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس جذباتیت اور خوش فہمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس لئے اس دور کے فن کاروں کو سمجھنے کے لئے اس دور کے معیار و اقدار اور فنی اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عصمت چغتائی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ عورت، مرد، اخلاق، سیاست، مذہب کی آڑ لے کر ادبی دنیا میں نہیں آئیں۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ فن کار یا ادیب محض عورت یا مرد، مشرقی یا مغربی نہیں ہوتا بلکہ وہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ یہ آب حیات دنیا کو عطا کرتا ہے اسے تیار کرنے کے لئے اسے سینکڑوں زہر پینے پڑتے ہیں۔ انسانیت کو آخر میں فتح تو ضرور ہوتی ہے مگر روزانہ انسانیت حیوانیت سے شکست بھی کھاتی رہتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں اس سال دیکھا گیا۔ بہت سے لوگ جذباتیت کے دھندلکے میں زیادہ دلکش

رہتے ہیں کڑی دھوپ اور روشنی کی تاب نہیں لا سکتے۔ عصمت کے افسانوں کو پڑھ کر وہ حیران ہوتے ہیں یا خفا ہوتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار کے بیان اپنے خیالات کی تائید ڈھونڈتے ہیں۔ جس طرح مولوی یا وکیل کتاب یا تحریر سے اپنے منشا و مطلب دلیلیں نکالتے ہیں۔ افسانہ نگار یا شاعر کی عظمت تک پہنچنے سے پہلے اپنی عظمت کو بھلانا اور اس کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کیوں نئے سفر پر روانہ ہوتے جھگڑے، سیر و سیاحت کے آداب کے خلاف ہے۔ ناول اور افسانہ بھی ایک ذہنی سفر ہوتا ہے اور یہاں یہاں بھی یہی آداب آتے ہیں۔

اردو میں ادھر دو ایک کی طرح افسانوں کی بنیاد کا خاصہ چھپا ہوا بھی [illegible] مرد افسانہ نگار ناول [illegible] ذہانت یا سلیقے کی تیاری [illegible] عصمت نے ناول ڈرامے افسانے سبھی لکھے ہیں۔ ان کا دلستان اس وقت کی یادگار ہے جب ان کا شعور بھی پختہ نہیں ہونے پایا تھا۔ گو اس میں بھی ایک حرارت اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ "کلیاں" عصمت کی افسانہ نگاری کی پہلی منزل ہے۔ اس میں ان ڈرامے اور افسانے بھی ہیں مگر [illegible]۔ ڈرامے کے فن سے ابھی طرح واقف نہیں ہیں۔ ان کے تازہ ترین ڈرامے "دھانی بانکپن" میں بھی یہ خامی اور بھی نمایاں ہے۔ "دھانی بانکپن" کا موضوع کیسا ہی اہم اور عظیم الشان سہی مگر ڈرامہ معمولی، بھیکا اور بے جان ہے۔ عصمت کا سماجی احساس بہت گہرا نہیں ہے۔ بمبئی کے فسادات سے وہ متاثر ضرور ہوئی ہیں مگر ڈرامہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ [illegible] نا پا گیا ہوں، یہ دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ مگر چوٹیں ایک بات اور ٹیڑھی لکیر کا بڑا حصہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ "چوٹیں" کے متعدد افسانے اردو افسانوں کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں۔ لحاف، پنکچر، بھول بھلیاں، ڈائن، تل میں عصمت میں جس بے باکی، سادگی اور خاست سے افسانے کی حدود میں دنیا میں زندگی کی گرمی، شرارت اور سیمابیت بیش [illegible] وہ ہر ایک کے بس کی نہیں۔ لحاف پر جو ہنگامہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حرف کا ہم پر بڑا گہرا اثر ہے۔ ہم [illegible] ہیں وہ رت ڈھونڈتے ہیں [illegible] کے یہاں یا یمت [illegible]۔ اصغر کے یہاں روحانیت [illegible] عصمت کے یہاں واقعیت ہوتی ہے۔ ڈرامائی حیثیت دیکھنے کے بجائے [illegible] زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ چھوٹی باتوں میں مضبوطی دیکھنے کے بجائے بڑی باتوں میں کمزوری [illegible]۔ زمین پر ہوتے وقت آسمانوں پر نگاہ رکھتے ہیں ہوئے اس کا شکنجہ نہیں اٹھا سکتے جو نہیں ہے اس کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ لحاف افسانہ [illegible] گیا ہے۔ اچھی اور بڑی تنہا [illegible] کی ایک تصویر ہے۔ بیگم جان [illegible] کی تخلیق نہیں۔ وہ پرچھائیں نہیں [illegible] جیتی جاگتی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ فن کار نے بڑی چابکدستی سے اسے نگاہوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ مگر لوگ اب بھی اس پر حیرت کرتے ہیں کہ ایک عورت کیسے اس قدر بے باک ہو سکتی ہے۔ ادب میں یہ بے ادبی کب تک؟

عصمت کا ناول "ٹیڑھی لکیر" کئی باتوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں جو شروع کیا گیا ہے وہ ابتدا سے ہی ٹیڑھ ہے۔ شمن کو ایک نارمل ماحول نہیں ملا۔ والدین کا سایہ سر پر ہونے کے باوجود وہ "یتیم" رہی۔ اس کا وجود گھر میں ایک خوشگوار اضافے کے بجائے گھریلو زندگی کے مسائل میں ایک اور الجھن رہا۔ کسی نے اس سے اس کی خاطر محبت نہ کی۔ آخر تک وہ باوجود دوستوں، عاشقوں اور شوہر کے اپنا سفر اکیلے ہی طے کرتی ہے۔ ابتدا میں اسے کوئی سہارا نہ ملا اور بعد میں اسے کسی سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ اس کی شخصیت عجیب مگر منفرد ہے۔ وہ کسی کو پورے طور پر جذب کر سکتی ہے اور نہ کسی میں جذب ہو سکتی ہے۔ اردو ادب میں یہ پہلی آزاد عورت ہے۔ اچھی ہے یا بری [illegible] پیدا [illegible] ہے۔ بعد ہونے کے [illegible] میں کبھی کبھی کھانیت یا خشکی نہیں۔ زندگی میں ہمیشہ ٹیڑھی لکیریں کم ہوتی ہیں۔ مگر افسانہ نگار اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں [illegible]۔ عصمت کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس ٹیڑھی لکیر کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جیسی تھی اسی طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ ادبی دیانت معمولی بات نہیں ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک لغزش کی پیدا وار ہے۔ عزیز احمد نے اپنے تبصرے میں ٹھیک لکھا تھا کہ عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے اسے نہ کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ مگر عزیز احمد نے ناول کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ناول میں کسی کبھی کسی حد تک [illegible] ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ عصمت کی تصویریں کیسی ہیں۔ وہ ان میں کیسے شوخ اور جیتے جاگتے رنگ استعمال کرتی ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو کیسی صاف، شستہ، زندہ اور رواں دواں زبان عطا کرتی ہیں۔ ان کے یہاں کیسی بے پناہ تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کس قدر نڈر، بے باک اور بہادر ہیں۔ ان کی دنیا کیسی گرم، ہنگامی، جانی پہچانی، پر اسرار اور رنگین ہے۔ ان چیزوں کا اعتراف کر لینے کے بعد ہمیں یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ عصمت کی دنیا بھی ساری دنیا نہیں ہے۔ ساری دنیا کو دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی سعی با درت کے متی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمن جس گھر میں پیدا ہوتی ہے وہ ایسا انوکھا نہیں۔ یوپی کے مسلمانوں کے یہاں متوسط طبقے میں ایسے گھروں کی کمی نہیں۔ ان گھروں پر عورت کی جگہ مرد نے اور مرد پرچھائیوں کی طرح ہیں۔ ماں باپ بچے پیدا کرنے میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ بچوں کی تربیت میں حصہ نہیں لیتے۔ یہاں بیوہ عورتیں زندہ شہیدوں کی طرح رہتی ہیں اور ساری عمر اپنی بدقسمتی کا انتقام گھر بھر سے لیتی رہتی ہیں۔ یہاں تمام زندگی اتنی پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے کہ شادی یا غمی کے واقعات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں شادیاں رومان، آنکھ مچولی اور چھیڑ چھاڑ کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ یہاں لاڈ پیار صرف بیماری میں ہوتے ہیں نہ کہ تندرستی میں۔ یعنی محبت خوف پر قائم ہے۔ یہاں

کون جانے

صالحہ عابد حسین

جب نوجوان ڈاکٹر آئنگر مدراس کے میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم پاتا تھا تو اس کے بعض خیالات عجیب و غریب تھے اس کا عقیدہ تھا کہ ایسے مایوس مریضوں اور اپاہج لوگوں کو جن کی صحت سے مایوسی ہو چکی ہو اور جن کی زندگی سے نہ دنیا کو کوئی فائدہ ہو اور نہ دنیا سے انھیں کوئی نفع زندہ رکھنا حماقت ہے۔ وہ اپنے ساتھی طالب علموں سے گھنٹوں اس پر بحث کیا کرتا۔ آخر ساتھی عاجز آ کر اس سے کہتے "لیکن ہم ڈاکٹروں کا یہی تو فرض ہے کہ اندھے، اپاہج، لنگڑے لولوں کی خبر گیری کریں، مریضوں کا علاج کر کے انھیں تندرست کریں۔"

"بے شک ہم ڈاکٹروں کا یہ فرض ہے کہ مریضوں کا علاج کر کے انھیں تندرست کریں۔ لیکن اگر ان کا مرض لا علاج ہو چکا ہو اور ان کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی ہو تو پھر ایسے سسکتے ہوئے مریضوں کو زندہ رکھنے سے بہتر ہے کہ انھیں ختم کر دیا جائے۔" ڈاکٹر آئنگر ہمیشہ یہ کہہ کر انھیں لاجواب کر دیا کرتا۔

ڈاکٹر آئنگر کا میڈیکل کالج میں آخری سال تھا۔ ان دنوں میں اسے کبھی کبھی باہر کسی کیس پر بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک رات ڈاکٹر آئنگر کو غریبوں کی بستی میں ایک بہت نادار گھر میں جانا پڑا۔ یہاں ایک پردیسی غریب عورت درد زہ میں مبتلا تھی اور اس کی کوٹھری اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی چیخ پکار سے گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اس عورت کے ساتواں بچہ پیدا ہوا۔ بچہ بالکل بے دم اور بے حس و حرکت تھا۔ ڈاکٹر نے بچے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور چاہتا تھا کہ اس کے منہ میں ہوا پھونکے تاکہ اسے سانس آ جائے کہ اس کی نظر بچے کے پاؤں پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا۔ بچے کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی اور شل تھی۔ "لاحول ولا قوۃ!"...... بھلا اس کے وجود سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے...... خود اس بچے کی زندگی اس مفلوج ٹانگ کی وجہ سے مصیبت بنی رہے گی دوسرے بچے اسے لنگڑا لنگڑا کہہ کر چڑائیں گے...... آخر اس ننھی سی مظلوم جان کو کیوں جینے پر مجبور کیا جائے؟ دنیا بھی اس کی کمی محسوس نہ کرے گی!" لیکن ڈاکٹر کا ضمیر اس کے نظریے سے زیادہ قوی تھا۔ وہ اضطراری طور پر بچے کے منہ میں ہوا پھونکنے اور اسے الٹنے پلٹنے لگا اور چند منٹ کے بعد ہی دیکھا کہ بچے کے ننھے سے پھیپھڑوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ چہرے پر زندگی کا رنگ دوڑ گیا اور ایک کمزور سی چیخ بچے کے گلے سے بلند ہوئی۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے روانہ ہوا مگر رستے بھر وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ آخر میں نے کیوں اسے زندہ رکھنے کی تدبیر کی؟ اس افلاس زدہ گھر میں چھ بچے ہی کیا کم عذاب تھے کہ ایک اور اپاہج لنگڑے بچے کا اضافہ ہو گیا ہمارے اس غریب ملک میں جہاں پہلے ہی سے لولے لنگڑے موجود ہیں ایک اور کا اضافہ...... اور یہ ہاتھوں!! بھلا دنیا کو یہ لنگڑا کیا فائدہ پہنچائے گا...... ؟ وہ رستے بھر اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔

بہت دن گذر گئے۔ اب ڈاکٹر آئنگر مدراس سے کچھ دور ایک شہر میں پریکٹس کرتے تھے۔ اب جوانی کی وہ انتہا پسندی اور عجیب و غریب نظریے ختم ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر آئنگر اب بڑا جفاکش، ہمدرد، محنتی اور ہر وقت ہر مریض اور معذور کے علاج کے لئے کمربستہ رہنے والا ڈاکٹر تھا جو سدا کام کی زیادتی سے تھکا ہوا رہتا۔ وہ دن رات مریضوں کے علاج معالجے میں مشغول رہتا...... بلغیر اس خیال کے کہ ان مریضوں کا مر جانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر آئنگر کو بھی گردش زمانہ کا شکار ہونا پڑا۔ اس کا اکلوتا لڑکا اور اس کی بیوی موٹر کے ایک حادثے میں ختم ہو گئے۔ اور اب ڈاکٹر آئنگر کی زندگی کا سہارا صرف اس کی ایک کم سن پارو رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کی بیوی جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا پارو کے پیدا ہوتے ہی چل بسی تھی۔ ڈاکٹر کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز اب صرف پارو رہ گئی۔

کئی سال گذر گئے۔ پارو اب سولہ سترہ سال کی نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے گھر کا کام اور انتظام اپنے سنبھال لیا تھا اور اپنے باپ کی آرام و آسائش کا ہر دم خیال رکھتی تھی۔

ایک دن صبح کو آئی۔ آنکھ کھلی تو اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور ہاتھ پاؤں میں شدید درد تھا۔

پہلے تو ڈاکٹر آئنگر یہی سمجھے کہ لڑکی سردی کھا گئی ہے معمولی درد ہے جاتا رہے گا۔ لیکن کچھ دن میں یہی معمولی درد ایک سخت قسم کے مرض میں تبدیل ہو گیا۔ اور پارو چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔

یہ مرض شاذ و نادر ہی کسی کو ہوتا تھا۔ ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابوں میں صرف اس کے متعلق اشارات تھے۔ خود ڈاکٹر آئنگر کو اپنی تیس سالہ پریکٹس میں ایک بھی اس مرض کے شکار سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے آس پاس کے ہر قسم کے ماہروں کو بلا بلا کر لڑکی کو دکھایا، مگر سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔ کہا وہ اس میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ درد بڑھتا چلا جاتا ہے اور کم و بیش فالج کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر آئنگر کا چہرہ سفید پڑ گیا "اف اس کی پیاری نوجوان بچی کیا زندگی بھر یوں اپاہج بن کر زندہ رہے گی؟" پارو جو امید بھری نظروں سے سب ڈاکٹروں کو دیکھ رہی تھی...... اپنے باپ کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... کیا وہ سب ساری عمر اپاہجوں کی طرح اپنے باپ پر بار ہو کر زندہ رہے گی!"

ایک ڈاکٹر نے ڈاکٹر آئنگر سے کہا "ایک نوجوان ڈاکٹر مکرجی نے ان امراض کی ریسرچ کی ہے۔ اس کا لکھا ہوا ایک پمفلٹ میں نے پڑھا ہے۔ ڈاکٹر مکرجی نے کلکتے سے قریب اپنا ایک انسٹیٹیوٹ بھی قائم کیا ہے جس میں وہ ریسرچ بھی کرتا ہے اور اس قسم کے مریضوں کا علاج بھی۔ میری رائے ہے کہ آپ لڑکی کو وہاں لے جائیں۔"

ڈاکٹر آئنگر کو امید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ فوراً پارو کو لے کر کلکتے روانہ ہو گئے۔

کلکتے سے موٹر میں ڈال کر آئنگر پارو کو لے کر ڈاکٹر مکرجی کے چھوٹے سے انسٹیٹیوٹ میں آیا۔ جو وہاں سے کچھ میل کے فاصلے پر تھا اور بہت سے مایوس مریضوں کی امید گاہ تھا۔ ڈاکٹر مکرجی نے خندہ پیشانی سے ڈاکٹر آئنگر کا سواگت کیا۔ ڈاکٹر آئنگر نے دیکھا کہ مکرجی کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی ہے اور وہ لنگ کرتا ہے۔ مکرجی نے آئنگر کو غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب تعجب نہ کیجئے۔ میں خود بھی بچپن سے لنگڑا ہوں اور اسی لنگڑے ہونے کی بدولت مجھے ان سب مریضوں اور اپاہجوں سے دلی ہمدردی، اور ان کی تکلیف دور کرنے کی لگن پیدا ہوئی۔"

ڈاکٹر آئنگر کچھ بولے نہیں غور سے مکرجی کو دیکھتے رہے...... آرام کرسی پر لیٹی ہوئی پارو امید و بیم کی نظروں سے مکرجی کے سنجیدہ چہرے کو تک رہی تھی!

ڈاکٹر مکرجی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا "میں نے مریض بچوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ مجھے لنگڑا کہہ کر پکاریں...... وہ بے تکلف مجھے ڈاکٹر لنگڑے کہہ کر پکارتے ہیں اور اُن کے منہ سے مجھے یہ نام اپنے اصلی نام دنکٹ راؤ سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"دنکٹ راؤ؟" ڈاکٹر دنکٹ راؤ آئنگر کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا......

"جی ہاں، دنکٹ راؤ...... یہ مدراسی نام میری ماں نے اُس نوجوان ڈاکٹر کے نام پر رکھا تھا جو میری پیدائش کے وقت آیا تھا اور جس کی کوشش نے مجھے زندہ رکھا۔"

"ڈاکٹر دنکٹ راؤ آئنگر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آواز گلے میں پھنس گئی۔ انھیں اپنی وہ بات یاد آ گئی "دنیا کو اس بچے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے...... دنیا کبھی اس کی کمی نہ محسوس کرے گی......" اُف وہ اندھا تھا...... بالکل اندھا......

ڈاکٹر آئنگر نے مکرجی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور عقیدت و محبت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "لنگڑا ہونا اندھے ہونے سے بدرجہا بہتر ہے"

کئی مہینے گذر چکے...... مکرجی کی ان تھک محنت اور دن رات کی کوشش کی بدولت پارو اپاہج پنے کی مصیبت سے نجات پا چکی تھی اور اب سوائے لنگ کے اور کوئی اثر پرانی بیماری کا باقی نہ رہا تھا۔

ڈاکٹر آئنگر اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کی نظر اٹھ کر باہر پڑی تو دیکھا کہ باہر باغ میں پھولوں کے ایک جھنڈ کے پاس پارو اور مکرجی ایک دوسرے کا سہارا لئے چہل قدمی کر رہے ہیں...... جب مکرجی مسکرا کر محبت پاش نظروں سے پارو کی طرف دیکھتا ہے تو وہ شرما کر نظریں جھکا لیتی ہے، اور اس کے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر آئنگر کے چہرے پر دلی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن محبت کے یہ متوالے اس سے بے خبر تھے کہ کوئی تیسرا شخص بھی ان کو دیکھ رہا ہے۔

(ماخوذ)

ہندوستانی تہذیب کے عناصر (بسلسلہ صفحہ ۱)

ادب، زبان، تعمیر، فنون لطیفہ اور دوسرے تہذیبی اداروں کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں جتنا حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے قومیت کی تعمیر میں غیر شعوری طور پر ہی سہی جو کوشش کیں ان کا افسانہ تاریخ کی زبان پر ہے۔ جس بات کو اچھی طرح سمجھنا ہے وہ اس ہندوستانیت کی نشو و نما ہی، جو ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے پیدا ہو رہی تھی۔ پراکرتوں کا ارتقا بھی اس ہندوستانیت کے نشو و نما کا ایک حصہ ہے۔ چند صدیوں کے اندر ان پر اثر ہوا اور اعلیٰ درجے کا ادب پیدا کیا بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ تو مسلمانوں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔

اگر کلچر کی تشکیل انسانوں کے ہاتھوں ہوتی ہو اور اس کا اظہار ان کی زندگی میں ہوتا ہو تو یقیناً ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زندگی میں ایک نئی انسانیت کا ظہور ہو رہا تھا۔ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس انسانیت پر جاگیردارانہ تہذیب کی مہر تھی۔ اس تہذیب نے کبیر، گرو نانک، اکبر، خان خاناں، دادو دیال، ریداس، تان سین اور دارا شکوہ پیدا کئے۔ اس نے ہند اسلامی طرز تعمیر، موسیقی اور مصوری کو جنم دیا اور ایک نئی آریائی زبان کی تخلیق کی جس سے تہذیبی اختلاط اور اس کی ترکیبی وحدت کی غیر مشکوک الفاظ میں نمائندگی ہوتی ہے۔ اس زبان کو ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اس نے ہندوستانی تہذیب کی روح اپنے اندر جذب کی تھی، اور پہلی مرتبہ ملک نے لسانی اتحاد کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ یہ تاریخی اور سماجی ارتقا کے تقاضوں کو پورا کر رہی تھی۔ اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی کی ایک شکل کا نام اردو ہے اس زبان کے بارے میں سے پیدا ہونے والے سرمائے کے لئے بدیشی یا غیر ملکی کا لفظ استعمال کرنا تاریخ تمدن سے ناواقفیت کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ بدمذاقی اور بے انصافی بھی ہے۔ صرف وہ لوگ ایسے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں جو تہذیبی ارتقا اور اختلاط کے قائل نہیں ہیں جو صرف مذہبی تہذیب کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے اسے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے، کیونکہ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندوستان میں شری پرشوتم داس ٹنڈن بھی دوسرے الفاظ میں یہی کہتے ہیں گو دونوں کے کہنے کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ زبان اسی وقت مذہبوں سے متعلق کی جا سکتی ہے جب ذہن بیمار ہو اور نظر پر تعصب اور فرقہ پرستی کے جذبات نے پردے ڈال دئے ہوں۔ لیاقت علی خاں کی زبان سے ایسی بات سن کر تعجب نہیں ہوتا کیونکہ فرقہ پرستی، مذہبی قومیت اور دو قوموں کے نظریے ہی سے انھوں نے اپنی سیاسی زندگی بنائی ہے لیکن ایک ایسا شخص جو کل تک وحدت قومی کا قائل تھا اور اگر پوچھا جائے تو آج بھی اس سے انکار نہ کر سکے گا جب ایسی بات کہتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ یا تو وہ اس بات کا قائل ہے کہ ہندو مسلمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے یا پھر ایک ہندوستانی تہذیب کو تسلیم کرتا ہے جس میں دونوں شریک ہیں۔ ماضی کو گالیاں دینا تاریخ سے لڑنا صحت مند ذہن کا پتہ نہیں دیتا۔ اسی طرح سوچنا کہ اگر یہ نہ آئے تو دراوڑی ہوتے مسلمان نہ آتے تو صرف آریہ ہوتے۔ انگریز نہ آتے تو مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ خواب اور خود فریبی اور طفل تسلی ہے۔ جو کچھ ہو چکا اور اس کا جو حصہ قابل قدر ہے تسلیم کرنا ہی مستقبل کی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی روح (بسلسلہ صفحہ ۲)

بات ہندوستان اور پاکستان دونوں پر صادق آتی ہے۔ پاکستان بھی اگر اپنا بھلا چاہتا ہے تو ہرگز نہیں کر سکتا کہ تہذیب کے معاملے میں الگ تھلگ رہنے کی پالیسی اختیار کرے اور ہندو مسلمانوں کے ہزار سال کے ساتھ سے جو پھل ہم کو ملا ہے اس کو رد کر دے یہ پالیسی صرف رجعت پسندانہ ہی نہیں بلکہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ چونکہ یونین میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب کم ہو گیا ہے اور ان کی سیاسی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اس لئے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کا اور عام طور پر اسلامی تہذیب کا جو حصہ ہندوستان کی عام تہذیب میں ہے اس کی قدر کی جائے تاکہ محض اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اُن کی یہ قیمتی بضاعت جو سب کے لئے قدر و قیمت رکھتی ہے ضائع نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ مشرق قریب اور مشرق بعید میں بہت سے مسلمان ملک ہندوستان کے ہمسائے ہیں جن سے اس کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے ہیں اور ہندوستانی تہذیب کا مطالعے کی وجہ سے ان ملکوں سے اس کا دوستی کا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا

(باقی)

نئی روشنی

اِدارۂ تحریر:-

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبد الحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶ اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۶ | ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

معاشی ترقی اور اخلاقی ترقی

مہاتما گاندھی

(۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو گاندھی جی نے الہ آباد میور سنٹرل کالج کی اکنامک سوسائٹی کے جلسے میں ایک تقریر کی تھی - یہ اس کا خلاصہ ہے)۔

کیا معاشی ترقی حقیقی ترقی سے ٹکراتی ہے؟ معاشی ترقی سے مراد یہاں غیر محدود مادی ترقی ہے اور حقیقی ترقی سے مراد اخلاقی ترقی ہے۔ یعنی اس جوہر انسانیت کی نشو و نما جو ہمارے اندر مستقل طور پر موجود ہے۔ اس لئے ہم زیر بحث مسئلہ کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ کیا ہمارا اخلاق اسی تناسب سے ترقی کرتا ہے جس سے ہماری مادی خوش حالی بڑھتی ہے؟ ....

یہ تو آج تک کسی نے بھی نہیں کہا کہ انتہائی افلاس کا نتیجہ اخلاقی پستی کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے۔ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ زندہ رہے اس لئے اسے پیٹ بھر کھانا اور حسب ضرورت تن ڈھانکنے کو کپڑا اور رہنے کو مکان تو ملنا ہی چاہیے۔ مگر اس سیدھی سی بات کے لئے ہمیں معاشیات کے ماہروں اور ان کے قانونوں کی کوئی ضرورت نہیں "کل کی فکر نہ کرو" یہ وہ تلقین ہے جو قریب قریب دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں ملتی ہے۔ اچھی اور منظم سماج میں ہر شخص کو اپنی روزی نہایت آسانی سے میسر آنی چاہیے اور آتی ہے۔ سچ پوچھئے تو سماج کے منظم ہونے کی پہچان یہ نہیں کہ ملک میں کتنے لکھ پتی اور کروڑپتی ہیں بلکہ یہ ہے اس کے اندر عام لوگ فاقہ نہیں کرتے۔ غور تو اس بات پر کرنا ہے کہ کیا ہم ایک کلیے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مادی ترقی اور اخلاقی ترقی ایک ہی چیز ہے۔

آیئے دو ایک مثالیں لے کر دیکھیں۔ روما کا زوال عین اس وقت ہوا جب اس کی مادی خوش حالی کمال کو پہنچ چکی تھی۔ یہی حال مصر کا ہوا اور شاید اور بھی ملکوں کا جن کا تاریخی ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے .... جنوبی افریقہ میں جہاں مجھے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کا موقع ملا تقریباً ہمیشہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جس شخص کے پاس جتنی دولت تھی اتنی ہی اس کی اخلاقی حالت خراب تھی۔ بہت کم کر کے کہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے امیروں نے ستیہ گرہ کی اخلاقی جد و جہد میں غریبوں کی طرح حصہ نہیں لیا۔ امیروں کی خودداری کو اتنی ٹھیس نہیں لگی جتنی غریبوں کی عزت نفس کو۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ موضوع خطرناک ہے تو میں اور بھی قریب کی مثالیں دے کر دکھاتا کہ دولت حقیقی ترقی کی راہ میں حائل رہی ہے ....

میں بات کو اتنا نہ بڑھاتا اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ جس حد تک ہم نے آج کل کی مادیت کے خبط کو اپنایا ہے اسی حد تک ہم ترقی کی راہ میں پیچھے ہٹے ہیں۔ میرا دعوٰی ہے کہ مادی ترقی اس معنی میں [illegible] میں کہ میں نے اس کا ذکر کیا ہے حقیقی ترقی کے منافی ہے۔ اس لئے اگلوں کا نصب العین یہ تھا کہ روپیہ کمانے کی جد و جہد پر پابندیاں لگائی جائیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ مادی فائدے کے حوصلے کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ ایسے لوگ ہمارے یہاں ہمیشہ رہے ہیں اور اب بھی رہیں گے جو اپنی زندگی کا مقصد دولت حاصل کرنے کو بناتے ہیں۔ لیکن ہم نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ یہ لوگ معیار سے گرے ہوئے ہیں اور یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے کہ ہمارے ہاں بڑے بڑے دولت مندوں کو یہ احساس رہا ہے کہ اگر وہ اپنی خوشی سے غریبی اختیار کرتے تو ان کا درجہ زیادہ اونچا ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی شخص خدا کا بندہ اور زر علیہ السلام کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ ایک قابل قدر معاشی حقیقت ہے۔ ہمیں دو میں سے ایک کو چن لینا ہے۔ مغربی قومیں آج دولت کے دیوتا کے پیروں تلے دب کر کراہ رہی ہیں۔ ان کی اخلاقی بڑھ ماری گئی ہے وہ اپنی ترقی کا حساب روپیہ آنے پائی میں لگاتے ہیں۔ امریکہ کی دولت معیار بن گئی ہے۔ اس پر دوسری قومیں رشک کرتی ہیں۔ میں نے اپنے بہت سے ہم وطنوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم امریکہ کی سی دولت حاصل کریں گے مگر اس کے طریقوں سے بچتے رہیں۔ میری یہ عرض ہے کہ ایسی کوشش اگر کی بھی جائے تو ناکام ہوئی رکھی ہے۔ ہم ایک ہی لمحے میں "سمجھ دار"، "اچھے" اور "آپے سے باہر" نہیں ہو سکتے۔ میں [illegible] چاہتا ہوں کہ ہمارے لیڈر ہمیں اخلاقی برتری حاصل [illegible] ہم گیا تو برطانوی حکومت میں ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ حقیقی [illegible] میں برطانیہ سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ اگر ہم احتیاط سے کام نہ لیں تو ان سب برائیوں کو اختیار کر لیں گے جن میں وہ مادیت کی بیماری کی وجہ سے مبتلا ہو گیا ہے۔ ہم برطانیہ کے سابقے سے اسی وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے اخلاق میں دیانت داری سے کام لیں یعنی اپنے شاندار ماضی کے بارے میں شیخیاں بگھارنے کے بجائے اس کی شان و شوکت کو اپنی زندگی میں ظاہر کریں اور اپنی زندگی کو اپنے دعوے کا گواہ بنا لیں۔

ہماری قوم تبھی سچے معنوں میں روحانی کہلائے گی جب ہمارے پاس سونے سے زیادہ سچائی، عشمت اور دولت سے زیادہ وانڈرین اور خود پرستی سے زیادہ کریم النفسی ہو۔ اگر ہم اتنا کر سکیں کہ اپنے گھروں کو، محلوں کو اور مندروں کو دولت کے لوازم سے پاک کر لیں اور اخلاقی لوازم سے سجا لیں تو کتنی ہی مخالف قوتیں مل کر ہمارے مقابلے پر آئیں ہم بغیر ایک بڑی فوج کا بوجھ اٹھائے ان سے نپٹ سکتے ہیں۔ آؤ ہم پہلے اللہ کی حکومت کو نیکی اور پرہیزگاری کو ڈھونڈھ لیں۔ پھر ہمیں اور سب کچھ مل جائے گا۔ یہ اس کا اٹل وعدہ ہے یہی حقیقی معاشیات ہے۔ خدا ہمیں آپ کو توفیق دے کہ اس کی قدر کریں اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پر عمل کریں۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
معاشی ترقی اور اخلاقی ترقی	مہاتما گاندھی	۱
اسلامی تہذیب کی روح	خواجہ غلام السیدین	۲
نئی روشنی کے مقاصد	(ادارہ)	۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مشرقی دنیا		۶
قطعات	اختر انصاری	۷
ٹیگور کا گیت	ڈاکٹر مسعود حسین	۷
عصمت چغتائی	آل احمد سرور	۸
ہندوستانی تہذیب کے عناصر	سید احتشام حسین	۹
جانور (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۱۰

قیمت فی [illegible] نمونہ آنے

اسلامی تہذیب کی روح

خواجہ غلام السیدین

(۲)

اب ہم اسلامی تہذیب کی چند نمایاں خصوصیات کا ذکر کریں گے جو ساری دنیا کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ مجھے قرون اولیٰ کی اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ اس زمانے میں جب نسلی، فرقے اور طبقے کے تنگ دائرہ تصورات کا زور تھا، رواداری کی روح سے معمور تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے باوجود اس پروپیگنڈا کے جو ناواقف لوگ یا مخالفین صدیوں سے کر رہے ہیں کہ اسلام تنگ نظرانہ اور عامیانہ عقائد رکھتا ہے اور تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ شاید یہ پروپیگنڈا صلیبی جنگوں کے زمانے کی نامبارک میراث ہے جب اسلام اور عیسائیت دنیا کے سب سے بڑے تبلیغی مذہبوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ تعجب ہے کہ مارگولیتھ جیسا عالم اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی مستند کتاب اسلام کے متعلق ایسی باتیں کہے جنھیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ اگر ان کے نتائج اتنے المناک نہ ہوتے۔ انہی باتوں کی وجہ سے وہ غلط فہمیاں اور تعصبات پیدا ہو گئے ہیں جو بین الاقوامی اتحاد میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کی تعلیم کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں اور قدیم مستند کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے انھیں میں یہ مشورہ دوں گا کہ اقبال کے

…ن حمید مولانا ابوالکلا…

…القرآن کا فاضلانہ مقدمہ، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر بھگوان داس اور پنڈت سندر لال کی تحریریں اس موضوع کے متعلق پڑھ لیں۔ اس کے بعد ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی تہذیب میں رواداری کی روح خود اسلام کی بنیادی تعلیم نے پیدا کی ہے جو مذہب کو ارتقائی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ صرف وہی ایک سچا مذہب ہے اور دوسرے مذاہب کی تعلیم سراسر لغو و الحاد ہے۔ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر قوم میں پیغمبر اور ہادی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے وقت کی ضرورت کے مطابق لوگوں کو حقیقت کی راہ دکھائی، پیش روؤں کی سچی تعلیمات کی تصدیق کی اور مذہب کو حالات سے مطابقت دے کر اور ان دور از کار حاشیوں سے پاک کر کے جو اس پر چڑھا دئے گئے تھے ترقی کی راہ میں اور آگے بڑھایا۔ پیغمبر اسلام نے اس عظیم الشان کام کی تکمیل کی جو اگلے پیغمبروں نے شروع کیا تھا اور اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دی کہ سب پیغمبروں کا دل سے احترام کریں۔ یہ نظریہ ان نظریوں سے کس قدر مختلف ہے جن کی رو سے اور سب مذہب کے پیرو دوزخ کی آگ میں ڈھکیل دئے جاتے ہیں۔ اسلام سب مذاہب کے لوگوں کو عقیدے اور عبادت کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے مذہب کے معاملے میں جبر کی گنجایش نہیں (لا اکراہ فی الدین) اور جو عقائد زبردستی منوائے جاتے ہیں انھیں مذہبی واردات کی حیثیت ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی۔ اسلام نے صاف صاف کہا ہے اور بار بار کہا ہے کہ روحانی سعادت اور نجات کسی ایک گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ ان سب کے لئے ہے جو ایمان کی دولت رکھتے ہیں اور نیکی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے اس بات پر اس لئے زور دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ رواداری جو آج دنیا کے امن اور انسان کی دماغی صحت کے لئے ناگزیر ہے اسلام کا لازمی جزو ہے اور اسلامی تہذیب کی جس تعبیر میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے وہ ہرگز صحیح نہیں ہوگی۔

مجموعی طور پر مسلمان قوموں کی تاریخ، دوسری قوموں اور ان کے مذہبوں اور تہذیبوں کے ساتھ عملی اور ذہنی رواداری کی قابل فخر داستان ہے۔ وہ شدید مذہبی جنون جو اسپین میں کلیسا کے محکمۂ احتساب کا خاصہ تھا اور جس نے بازنطین میں زور باندھ رکھا تھا مسلمان ملکوں میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ مجموعی طور پر بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا اور انھیں اپنے مذہبی اور تہذیبی اعمال میں پوری آزادی حاصل تھی۔ ذہنی اعتبار سے اسلامی تہذیب نے یونانی تہذیب سے دل کھول کر فائدہ اٹھایا اور ابتدا میں اس سے آنا کچھ لیا کہ یونان کی میراث یورپ کو براہ راست نہیں ملی بلکہ مسلمانوں کے واسطے سے جنھوں نے اسے اپنایا، اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور جب یورپ "عہد ظلمت" سے نکلا تو اس کے حوالے کر دیا۔ علوم مشرقی کے فاضل اچھی طرح جانتے ہیں جیسا اسے فیضی صاحب نے اپنے ایک قابل قدر مقالے میں دکھایا ہے، کہ اسلامی تہذیب صرف مسلمانوں کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنانے میں مسلمان، یہودی، عیسائی یہاں تک کہ لامذہب بھی شریک ہیں۔ بہت سی قوموں مثلاً عربوں، شامیوں، ایرانیوں، ترکوں، اسپینیوں، مصریوں اور ہندوستانیوں نے اس خزانے میں اپنی اپنی دولت جمع کی اور سب نے مل کر اس کی حفاظت کی۔ اس تہذیبی وسعت قلب کی مثالیں ہمیں بہت سے ملکوں میں ملتی ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی مثلاً عہد وسطیٰ کا ہندوستان اکبر اور دارا شکوہ کا نام تو بہت سے لوگوں نے سنا ہے کہ وہ مختلف مذہبوں اور ملکوں کے علما کی سرپرستی کرتے تھے مگر انھیں یہ نہیں معلوم کہ اس رواداری کا سلسلہ خود پیغمبر اسلام سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے فرمایا تھا۔

"علم کو حاصل کرو چاہے وہ چین میں کیوں نہ ہو"

اور

"حکمت مومن کی کھوئی ہوئی بھیڑ ہے وہ جہاں کہیں بھی ہو اسی کی ہے"

اس طرح اسلام نے وہ دیواریں گرا دیں جو ذہنی دنیا میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ وہ بے معنی لوہے کی دیواریں جو نوع انسانی کی تاریخ میں اکثر جماعتوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں اور زبانوں کو مذہب کا، علم کو جغرافی حدود کا اور تہذیب کو تنگ نظرانہ قومیت کا پابند کر دیتی ہیں۔ اس معاملے میں صرف جرمنی کے نازی ہی گنہگار نہیں ہیں ہم سب کم و بیش اس گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور ہر ایک قوم کی تاریخ میں چند ایسے صفحات موجود ہیں جن کو وہ چاہتی ہے کہ مٹ جائے تو اچھا تھا۔ مسلمانوں کی نسبت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کبھی تنگ نظری اور تعصب سے کام نہیں لیا۔ لیکن یہ بات میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مذہبی جنون کو ہرگز جائز نہیں رکھتا۔ جہاں کہیں مسلمانوں سے یہ جرم سرزد ہوا ہے وہ اسلام کی نظر میں گنہگار ٹھہرے ہیں اور انہوں نے اس نور ایمان کی جو ان کے اندر ہے بے حرمتی کی ہے۔

اسلامی تہذیب کی ایک اور اہم خصوصیت ہے کہ وہ بے تکلف اور صاف صاف مادے اور ذہن، جسم اور روح، دنیا اور عقبیٰ دونوں کے مطالبات کو تسلیم کرتی ہے اس انداز خیال کا اظہار اس مختصر اور پرمغز آیت قرآنی سے ہوتا ہے جو اکثر دعا کے طور پر استعمال کی جاتی ہے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ" "اے خدا ہمیں دنیا کی بھلائی دے اور آخرت کی بھلائی" اس دعا کو لالچ کا ثبوت نہ سمجھئے بلکہ یہ ایک خاص تصور حیات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں اور دوسرے نظریوں میں جنہوں نے بہت سے زمانوں اور قوموں کے فکر و عمل پر گہرا اثر ڈالا ہے بہت فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک نظریہ جو مادیت کہلاتا ہے، زندگی کا مقصد محض مادی ضروریات کو پورا کرنے کو سمجھتا ہے اور دولت اور طاقت کے حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔ اپنی بہترین شکل میں اس نے انسانی تمدن کی ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ایک اور نظریہ ہے جو مادی مظاہر سے انکار کرتا ہے اور اس رنج و مصیبت کی دنیا کو ترک کر کے اپنے اندر کی ذہنی یا جمالی یا روحانی دنیا میں ڈوب جانے کی تلقین کرتا ہے۔ محقق، شاعر، مصور، صوفی اپنے خلوت خانے میں بیٹھ کر زندگی اور دنیا کے شدید تقاضوں کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ اسلام کی نظر میں اس "انفرادی حیثیت" اس خود غرضی کی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ مادی دنیا اور اس کی بے شمار دولت سے بھاگتا نہیں بلکہ رہبانیت کے فلسفۂ زندگی کو رد کر کے تسخیر فطرت کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن اس کا حکم ہے کہ جب انسان عالم فطرت کو اپنے دست و بازو اور دل و دماغ سے مسخر کر لے تو اس سے محض اپنی ذات کے لئے کام نہ لے بلکہ بنی نوع کی مادی اور ذہنی فلاح کے لئے۔ سچے مسلمان کو باہمہ اور بے ہمہ ہونا چاہئے یعنی دولت اور قوت کا ساز و سامان حاصل کرنے کے بعد بھی اس سے بے نیاز رہنا چاہئے اور تجرد کی شان قایم رکھنی چاہئے۔ یہ اقبال کی اصطلاح میں "فقر" ہے جس کی بدولت مرد مومن ان تحریصوں کو جو کمزور انسانوں کے دل کو بھاتی ہیں ٹھکرا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" "جو دنیا میں اندھا ہے آخرت میں بھی اندھا رہے گا" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت ایک ایسے محکم رشتے میں مربوط ہیں جس کے قطع کر دینے میں روحانی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ مولانا روم نے اس حقیقت کو ایک پُرمغز شعر میں ادا کیا ہے ؎

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

غرض اسلام کے نقطۂ نظر سے مادی دولت زندگی کا مقصد نہیں بلکہ محض ایک ذریعہ ہے جس سے اگر ہم چاہیں تو روحانی اور تہذیبی ترقی کا کام لے سکتے ہیں۔ دولت کے صحیح استعمال کے لئے اسلام حدود اللہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں) کا دائرہ کھینچتا ہے۔ جن کے اندر فرد اور جماعت کی زندگی بسر ہونی چاہئے اور جن سے کوئی سچا مسلمان تجاوز نہیں کر سکتا۔ پکتھال نے اپنے ایک لکچر میں کہا ہے "اسلامی جماعتی زندگی میں غیر ذمہ دارانہ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ ہو)

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۲۴ر جولائی ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کے مقاصد

(۶)

زندہ ادب

جب اس مسئلہ پر گرماگرم بحثیں ہوتی ہیں کہ ادب زندگی کا تابع ہے یا اس سے الگ اور اپنا مقصد آپ ہے تو شاید لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ در اصل انسان کا ہر خیال اور عمل جو کوئی معنی رکھتا ہے کسی نہ کسی طرح زندگی سے وابستہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض چیزوں میں یہ وابستگی بالواسطہ ہوتی ہے اور بعض میں بلاواسطہ۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ اس کا رابطہ زندگی سے بالکل سیدھا اور صاف، گہرا اور گاڑھا ہونا چاہیئے ورنہ وہ ادب کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ ذرا سوچیئے تو صحیح آپ ادب کس کو کہتے ہیں؟ ہر چیز جو نظم یا نثر میں لکھی جائے ادب تو نہیں ہے۔ نثر میں علوم و فنون کی کتابیں، کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹیں، کارخانوں کے مال کی فہرستیں اور سیکڑوں چیزیں ہیں جن کا شمار ادب میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی فقہی مسائل کو، جغرافی معلومات کو، گنتی اور پہاڑوں کو نظم کر دے اور کرنے والے کر ہی ڈالتے ہیں، تو ان پر نظم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ان چیزوں کو زندگی سے صرف جزوی، سطحی اور بالواسطہ تعلق ہے۔ ادب اس نظم یا نثر کا نام ہے جو زندگی کو کسی خاص نظری یا عملی مقصد کے لئے سرد اور بے جان تصورات میں تحلیل کر کے نہیں دیکھتی بلکہ مجموعی زندگی کا یا اس کے کسی پہلو کا مشاہدہ اس طرح کرتا ہے کہ اس کے گرماگرم بہتے ہوئے دھارے میں ڈوب کر اس کی حرارت اور گہرائی کو اپنے اندر جذب کر لے اور خود اس کی ایک لہر بن جائے۔

نئے ادب کا یہ اعتراض پرانے ادب پر صحیح نہیں ہے کہ وہ زندگی کی مصوری یا تعبیر یا تنقید نہیں کرتا۔ اس میں اگر کچھ اصلیت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ پرانے ادب میں زندگی کی ترجمانی یا تنقید کھلی ہوئی نہیں بلکہ فن کے پردے میں چھپی ہوئی ہے اور یہ عیب نہیں بلکہ بہت بڑی خوبی ہے جس کی نئے ادب کو تقلید کرنی چاہیئے۔ ادیب اور شاعر کا ڈھول پیٹ کر اعلان کرنا کہ یہ جو ہم کہہ رہے ہیں زندگی کی تصویر یا تفسیر ہے۔ نہ صرف ادب و شعر کے لطف کو بلکہ اس کے [illegible] اثر کو بھی کھو دیتا ہے۔

دراصل جو اعتراض کم سے کم اردو کے پرانے ادب پر ہو سکتا ہے یہ ہے کہ جس زندگی کی اس میں ترجمانی کی گئی ہے وہ تھکی ہوئی، اونگھتی ہوئی، بیمار اور مریل زندگی ہے وہ ان لوگوں کی زندگی ہے جو زمانے کی مشکلات سے گھبرا کر کشمکش حیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور زندگی یعنی جسمانی عیش پرستی یا ترک و تجرد یعنی روحانی عیش پرستی کے شیش محل میں بیٹھے خود بینی و خود کامی کے مزے لے رہے ہیں۔ وہ ایک مخصوص طبقے کی محدود زندگی ہے اور اس قدر بے جان ہے کہ اس پر موت کا دھوکا ہوتا ہے۔

نئے ادب کی خصوصیت یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو جھنجھوڑ کر جگاتا ہے، اس کی رگوں میں تازہ خون داخل کرتا ہے، کاہلی اور جمود کے طلسم کو توڑتا ہے، شیش محل کی اونچی دیواروں کو گرا کر تازہ ہوا کو آنے دیتا ہے۔ اس نئے ادب کی لے اردو میں حالی نے شروع کی تھی۔ اس میں شدت اقبال نے پیدا کی اور وسعت ترقی پسند مصنفین پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سچے ترقی پسندوں میں خلوص اور جوش ہے۔ ان کی تحریروں میں ندرت اور تازگی، لذت اور اثر ہے۔ لیکن ان کی صف میں کچھ بہروپیے بھی شامل ہو گئے ہیں جنہوں نے زمانے کا رنگ دیکھ کر ترقی پسندی کا روپ دھار لیا ہے۔ پرانے ادب کی کھوکھلی رومانیت اور جذبات پرستی پر انقلابی شورش کا، رندی اور بوالہوسی پر بغاوت کا اور ترک و تجرد پر فلسفیانہ یاسیت کا جھول چڑھا دیا ہے۔ اگر ہمارے نقادوں نے ان کھوٹے سکوں کو ڈھونڈ کر الگ نہ کیا تو ترقی پسندی کے زر رائج کی قیمت ادب کے بازار میں بہت گر جائے گی۔

لیکن سچے ترقی پسندوں میں بھی بعض عیب ہیں جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ انھیں اپنے مشن کا اور اپنی ذات کا شعور اتنا زیادہ ہوتا ہے اور اس کے اظہار میں اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ بے خودی اور بے ساختہ پن جس پر ادب کے حسن و لطافت کا بہت کچھ دار و مدار ہے جاتا رہتا ہے۔ اکثر خود اپنی اور ایک دوسرے کی تحریروں پر تنقید و تبصرہ کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اگر "اپنے منہ میاں مٹھو" اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے الزام غلط بھی ہوں تو یہ اعتراض ضرور صحیح ہے کہ بعض اوقات ان کی تنقیدی شعور کی شدت ان کی تخلیقی قوت کو کم کر دیتی ہے۔ جسے ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہو کہ میں "افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" اور "وہ افسانہ کیونکر لکھتا ہے" اس کا افسانہ "کیوں کر" میں گم ہو کر رہ جائے تو کیا تعجب ہے۔

دوسرا عیب پہلے زیادہ تھا اب بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ شروع میں بہت سے لوگ جو اپنے کو ترقی پسند کہتے تھے۔ ادب اور خصوصاً شاعری کے سب قاعدوں اور ضابطوں کو توڑ کر فطری آزادی سے کام لینا چاہتے تھے اس لئے شعر کے نام سے چڑیوں کی فطری چوں چوں اور کوے کی فطری کائیں کائیں سے ملتی جلتی آوازیں سننے میں آیا کرتی تھیں اب عام طور پر ترقی پسند ادیب اصول فن کا بقدر ضرورت لحاظ کرتے ہیں اور زبان و بیان کے معاملے میں بھی پرانے استادوں کے ترکے سے مناسب حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تیسرا عیب وہ ہے جو ہر ادیب میں جس کا کوئی عقیدہ اور جس کے سامنے کوئی مقصد ہو تھوڑا بہت پایا جاتا ہے لیکن اگر حد سے بڑھ جائے تو فن کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

(بقیہ بزم بے تکلف کے نیچے ملاحظہ فرمایئے)

بزم بے تکلف

جی کیا فرمایا آپ نے گیہوں اور دالوں کا راشننگ یو۔پی کے شہروں میں پھر شروع ہونے والا ہے؟ اچھا ہے غریب اور ایمان دار لوگ اب کسی قدر کفایت سے فاقہ کریں گے اور امیروں کو پیٹ کی پوجا کے لئے چور بازار کے مندر میں بھینٹ بڑھانی پڑے گی۔

مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگ بلیک مارکٹ کو چور بازار کیوں کہتے ہیں۔ وہاں تو کھلم کھلا مال من مانی قیمتوں پر بکتا ہے اور زائد منافع خیرات میں دیا جاتا ہے۔ جی ہاں خیرات میں۔ ذرا سنیئے تو سہی آخر یہ منافع دکان داروں کے گھر ہی میں تو جاتا ہے نا۔ اور خیرات انگریزی مثل کے مطابق گھر سے شروع ہوتی ہے۔

تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ من مانے سودے ہمارے آپ کے سامنے ہوتے ہیں، پولیس کے علم میں ہوتے ہیں۔ پھر یہ چور بازاری کیوں کر ہوئی۔؟ کیا کہا پولیس کو معلوم ہے تو چالان کیوں نہیں کرتی، رشوت لیتی ہوگی؟ اجی توبہ کیجیئے رشوت کیسی! یہ آپ ۱۵ راگست سے پہلے کی باتیں کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پولیس کو جب تک سرکاری طور پر علم نہ ہو نجی علم کی بنا پر کیسے کارروائی کر سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ کون سی عقل اور انصاف کی بات ہے۔ حضرت یہاں عقل اور انصاف کا کیا ذکر ہے یہ قانون کا معاملہ ہے۔ دیکھئے نا جرمنی میں آج کل یہ مسئلہ در پیش ہے کہ ہٹلر نازی تھا یا نہیں اس [illegible] ہے تحقیقات ہو رہی ہے اگر قانونی ثبوت بہم پہنچ گیا تو فیصلہ ہو جائے گا [illegible] معاملہ بھی قانون کی نظر میں اسی طرح مشتبہ رہے گا [illegible] یہ کہ زلیخا مرد تھا یا —— نہیں تو یہ مرد تھی یا —— [illegible] مطلب یہ ہے آیا زلیخا تھا یا تھی۔

اچھا تو پھر ہم آپ سرکاری طور پر پولیس کے علم میں کیوں نہیں لاتے؟ آپ کی تو کہہ نہیں سکتے مگر ہمیں دوکان داروں اور آڑھتیوں پر رحم آتا ہے کہ جیل میں بیچاروں کو ایک [illegible]

(بقیہ صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمایئے)

(بقیہ اداریہ)

یعنی زندگی کا مشاہدہ بے لاگ نظر سے نہیں بلکہ کسی خاص نظریہ کی عینک سے کرنا۔ جو زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے اسے ہر رنگین عینک سے بچنا چاہیئے۔ اگر ایک کمیونسٹ شعر کہتے وقت یا افسانہ لکھتے وقت تھوڑی دیر کے لئے کمیونزم کو بھول نہ جائے تو ایک کٹر ملّا کی طرح زندگی کی معرفت اور تفسیر میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی تحریر وعظ یا تبلیغ بن جاتی ہے جو اپنی جگہ قابل قدر چیز ہے مگر ادب ہرگز نہیں ہے۔

بہرحال اردو ادب کا مستقبل اب ترقی پسندوں کے ہاتھ میں ہے اور ہمیں اپنے مذاق کو نئے ادب کے سانچے میں ڈھالنا ہے لیکن پرانے ادب سے بھی بے جا تعصب نہیں برتنا چاہیئے۔ وہ مجموعی طور پر ہمارے لئے فنی اور تاریخی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس انبار میں جو بظاہر راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے جا بجا زندگی کی چنگاریاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔

۲۔ پاکستان

مشرقی بنگال میں زمینداری

پچھلے دنوں مشرقی بنگال میں کسانوں نے ایک مظاہرہ کیا تھا مطالبہ یہ تھا کہ زمینداری کے نظام کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ زمینداری ختم کرنے کی صورت میں زمین داروں کو کوئی معاوضہ نہیں ملنا چاہئیے۔ یہ مطالبہ ظاہر میں بہت انتہا پسندانہ ہے اور اس کی مخالفت میں یہ کہہ دینا شاید کافی ہوگا کہ مشرقی بنگال کے کسانوں پر کمیونسٹ اثر نمایاں ہے۔ شاید کسانوں کے اس مطالبہ کے خلاف یہ دلیل استعمال کی بھی گئی ہو۔ لیکن مشرقی بنگال کے زمینداروں اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے ایک اور دلیل دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صوبہ میں لگان دینے والوں کی تعداد ۵ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور اگر ان کو ان کی جائداد سے محروم کر دیا جائے اور انہیں کوئی معاوضہ نہ دیا جائے تو پھر ان کی اور ان کے خاندانوں کی گذر بسر مشکل ہو جائے گی اور حکومت کو ان کے لئے کوئی انتظام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ دلیل درحقیقت بہت کم وزن رکھتی ہے قیاس یہ ہے کہ مشرقی بنگال کے زمینداروں کی مالی حالت یوپی کے زمینداروں سے بری نہیں ہوگی اور یوپی کی حکومت نے جو تاوان دینا منظور کیا ہے اس کی ادائیگی کی شکل ایسی رکھی ہے جس سے زمینداروں کو معاوضہ کی رقم بہت عرصہ میں ملے گی لیکن یہ مطالبہ کہ زمینداری بغیر معاوضے کے ختم کر دیا جائے قابل عمل نہیں ہے۔ ہندوستان یا پاکستان کے کسی صوبے میں بھی حکومتوں کا سیاسی ڈھانچہ ایسا نہیں جو اس اصول کو نافذ کر سکے۔ بلکہ رجحان تو یہ ہے کہ معاوضے کی رقمیں خاصی بڑی رکھی جائیں۔ بظاہر ابھی سالہا سال کے لئے تاوان کی ادائیگی میں اتنی رقم صرف ہوگی کہ شاید زراعت کی تعمیر کا کام دھیما پڑ جائے یا شروع ہی نہ ہو سکے۔

پاکستان یا مشرقی بنگال کی حکومت سے یہ شکایت شاید زیادہ صحیح ہے کہ زمینداری کو ختم کرنے میں وہ غیر معمولی تاخیر سے کام لے رہی ہے یہ بھی پاکستان اور ہندوستان کی مشترک کمزوری ہے کئی کئی بار کیبنٹ نے اس سوال پر غور کیا ہے۔ ایک کمیٹی عرصہ سے قانون کے اس مسودے پر غور کر رہی ہے جو زمینداری کے خاتمہ کے لئے ترتیب دیا گیا ہے لیکن ابھی تک ابتدائی کارروائی کی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے۔ زمین کی ملکیت کا نظام بنگال میں اور سب صوبوں سے بدتر اور غیر منصفانہ تھا اس لئے وہاں اس اصلاح میں تیز رفتاری کی ضرورت شاید سب سے زیادہ تھی۔ حکومت نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ کام شروع ضرور ہو جانا چاہئیے چنانچہ اس کا آغاز ان ریاستوں یا زمینداریوں سے ہوگا جن کے متعلق ریکارڈ مکمل ہوں۔

سندھ اور مغربی پنجاب میں غلہ کی رسد

پاکستان کی وزارت غذا نے ایک افسر اس بات کی چھان بین کے لئے مقرر کیا ہے کہ سندھ اور مغربی پنجاب میں حکومت کو غلہ کے حصول میں دقتیں کیوں پیش آ رہی ہیں پچھلے دو مہینوں میں حکومت کو اس کوشش میں پچھلے سال کے مقابل میں صرف آدھی کامیابی ہوئی ہے۔ مئی اور جون میں یہ کوشش نتیجہ کے لحاظ سے بہت غیر تسلی بخش رہی۔ امید یہ تھی کہ جولائی اور اگست میں صورت حال بہتر ہو جائے گی لیکن اب تک اس امید کے پورا ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ پاکستان ٹائمز میں ایک خبر شایع ہوئی تھی کہ مغربی پنجاب میں زمیندار اپنی پیداوار منڈی میں آنے نہیں دے رہے ہیں۔ انہیں توقع یہ ہوگی کہ قیمتیں بڑھیں تو وہ اس سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ اس کی وجہ سے حکومت پنجاب کا یہ ارادہ کہ صوبہ میں پانچ لاکھ ٹن اناج کا ذخیرہ اکٹھا کر لیا جائے تاکہ اچانک ضرورت کے وقت استعمال ہو سکے پورا ہوتا نہیں دکھائی دیتا۔ اس کے بعد پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار نے غالباً اپنی خواہش کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے۔ ان کی خبر کے مطابق وزارت غذا نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ ان زمینداروں کے خلاف جلد کارروائی کی جائے جو حکومت کی اس کوشش میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ صوبہ کی حکومت پر زمینداروں کا بہت اثر ہے اس لئے ہمارے معاصر کو ڈر ہے کہ شاید یہ نہ ہو سکے لیکن اگر پچھلے سال کا تجربہ دہرانا مقصود نہ ہو تو اس طرح کی کارروائیاں کرنی ہی ہوں گی۔ یہ ذخیرہ جمع کر لینا حکومت کے لئے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اس طرح وہ غلہ کی قیمت پر بھی کچھ قابو رکھ سکے گی۔ پنجاب میں غلہ کی بہت کمی ہے اور اگر لوگوں کو یہ علم ہو گیا کہ حکومت کے پاس ایک معقول مقدار میں ذخیرہ موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر بازار میں لایا جا سکتا ہے تو قیمتیں بہت بڑھنے نہیں پائیں گی۔ غلہ کی قیمتوں پر قابو رکھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اب ہو سکتا ہے کہ غلہ کی کمی نہ ہو اور پھر بھی قیمتیں اتنی اونچی ہوں کہ عام لوگ اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکیں اور قحط کا شکار ہو جائیں۔ موجودہ قیمتیں ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ خصوصاً ہمارے یہاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اس طرف سے لاپروائی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

صوبۂ سرحد کے متعلق دوستوں کی رائے

ہندو پرست اور پاکستان دشمن خان عبدالغفار خان نے حکومت سرحد پر جو الزامات لگائے تھے ان کی تائید اب عجیب گوشوں سے ہو رہی ہے۔ خان غلام محمد خاں نے جو کانگریس سے ناتہ توڑ کر لیگ کے ایک مشہور اور اہم لیڈر بن چکے ہیں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ صوبے پر مکمل اقتدار قائم کرنے کی غرض سے حکومت سرحد نے صوبے کی میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو توڑ دیا ہے اور ان کے انتظام کے لئے اسمبلی کے ممبروں کا تعین کیا گیا ہے اس طرح صوبے کی اسمبلی میں اکثریت قائم کی جا سکتی ہے۔ پریس کی آزادی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا یہ آزادی سرحد میں عنقا ہے۔ اور محکمۂ اطلاعات کی طرف سے "اخباروں" کو خبریں [illegible] "اپائنٹمنٹ" بھی بتائے جاتے ہیں [illegible] کے ممتاز رہنما جو حکومت پر تنقید کرنے کی ہمت کرتے ہیں انہیں طرح طرح سے ستایا جاتا ہے اور جو لیگ کے ممتاز رہنما نہ ہوں ان کے خلاف پاکستان دشمنی کے الزام کا حکمی نسخہ استعمال ہوتا ہے۔ آزادیٔ تقریر کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ پشاور کے اخبارات کو عوام کے جلسوں کی خبریں شایع کرنے یا ان میں پاس شدہ تجویزوں کی اشاعت کی اجازت نہیں۔ لاہور کے اخبارات کو خط لکھے تو وہ راستے میں غائب کر دیئے جاتے ہیں۔ سرحد کے سیفٹی آرڈیننس پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے "ویسے بھی سرحد کی حکومت دو فرنٹیئر کرائمز ایگزیکیوٹنز" جیسے قانون سے جو برطانوی حکومت کو صوبہ پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے استعمال کرنا پڑتا تھا کام لے رہی ہے۔ سیاسی کام کرنے والوں کی جن میں مسلم لیگی بھی شامل ہیں گرفتاریاں بغیر مقدمہ چلائے قید کی سزائیں اور ایک نظم سرکاری سنسرشپ اور عوام کی جائز شکایتوں کو دبانے کی کوشش بڑے دھڑلے سے ہو رہی ہیں۔ جہاں تک موجودہ آرڈیننس کا تعلق ہے سرحد کی حکومت کی طرف سے کسی نے بھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ریاست کے ان دشمنوں کے خلاف جن کی فہرست ان میں دی گئی ہے حکومت موثر کارروائی کیوں نہیں کر سکتی۔ یہ مطلق اور خالص قسم کی فسطائیت ہے اور اس سے بہت سے لوگ نتیجہ نکالیں گے کہ حکومت کی نااہلی اور بد انتظامی کے خلاف سرحد کے عوام کی بڑھتی ہوئی شکایتوں کی وجہ سے زبردستی ان کا منہ بند کیا جا رہا ہے۔ پاکستان ٹائمز نے قیوم خاں صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ قانون کے مطابق حکومت کریں ورنہ ان لوگوں کے لئے جگہ خالی کر دیں جو ایسا کر سکتے ہیں۔

بقیہ بزم بے تکلف

کارڈ ملا آٹا کھانا پڑے گا اور وہ بھی راشن کی مقدار میں جس سے دوزخ کا ایک کونا بھی نہیں بھرے گا۔

یہ آپ نے خوب کہی کہ دوکان داروں پر رحم آتا ہے۔ گاہکوں پر کیوں نہیں آتا۔ ایسے صاحب رحم ہی تو ہے جس پر آ گیا۔ آپ نے وہ قصہ نہیں سنا کہ پیرس میں ایک بچہ اپنی ماں کے ساتھ تصویر گیلری دیکھنے گیا۔ وہاں ایک تصویر تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ روما کے شہنشاہ کے حکم سے کچھ عیسائی شیروں کے آگے ڈال دیئے گئے ہیں اور شیر انھیں کھا رہے ہیں [illegible]

[illegible] اچھا یا کہ یہ [illegible] تصویر ہے کوئی شیر [illegible] عیسائیوں کو تھوڑا کھا یا تھا [illegible] سسکیاں لیتے ہوئے کہا "اماں۔ مجھے — مجھے — تو — اس بے — چارے — شیر پر — رونا — آتا ہے .... جو اس کونے میں — کھڑا — حسرت کی نظروں سے تک رہا ہے اور — اور — اس — کے — پاس — کوئی — عیسائی — کھانے — کو — نہیں"

چھنگئے وہ جن کے گھر گیہوں بھرے چھکڑے
ہم بچارے سر پہ جھولا لئے ہوئے پکڑے گئے

حسرت پہ اس تلاشیٔ راشن پہ رو دیئے
جو پیس گیا ہو بھیڑ میں آٹے کو کیا

اک بد نصیب ہم جنھیں راشن کی فکر ہے
اک خوش نصیب وہ جنھیں چوران کی فکر ہے

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں لکڑیاں نہ ہوئیں

مشرقی دنیا

کمیونسٹ خطرہ

ولیم فلپ سمز (اسکرپس ہاورڈ) کے بیرونی ایڈیٹر نے ایک خبر دی ہے کہ ایشیا اور یورپ کی پوشیدہ اطلاعوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق اور مغرب کی کشمکش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس اجمال کی تفصیل ان بزرگ کے الفاظ میں یہ ہے کہ سارے ایشیا میں آگ لگ رہی ہے۔ چین سے یہ آگ ہند چینی ہندوستان (؟) برما اور ملایا تک پھیل گئی ہے........ آج سرخ جھنڈا بحر الکاہل کے شمالی وسطی اور جنوبی ساحل پر لہرا رہا ہے۔" لندن ٹائمز نے اس آگ کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ انڈونیشیا اور ہند چینی کے عوام سے معاملات طے کرنے میں جو بھی دیر کی جائے گی اس سے کمیونزم کے پھیلنے کے امکانات بڑھتے جائیں گے یہ اخبار لکھتا ہے "یورپ اور دنیا میں دوسری جمہوریتوں کو اس بات سے زیادہ مدد کسی بات سے نہیں مل سکتی کہ انڈونیشیا اور ہند چینی کے مسئلے کو مناسب بلکہ فیاضانہ شرطوں پر طے کر ڈالا جائے۔" ان اقتباسات سے ایک بات تو ضرور واضح ہو جاتی ہے [illegible] مشرقی ایشیا [illegible] جماعت [illegible] کی وجہ سے [illegible] سیاسی اقتدار کو ہاتھ سے [illegible] مغرب کے سامراج دوست حلقوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی ہے۔ مگر ہمارے [illegible] مہربان نے ہمیں ایک عظیم الشان خطرہ [illegible] کیا ہے۔ لبرل اخبار مانچسٹر گارڈین [illegible] دیا ہے کہ ہندوستان، پاکستان [illegible] اور ملایا کا ایک ملا جلا [illegible] بنانا چاہئے تاکہ جنوبی ایشیا [illegible] قائم رکھا جا سکے۔ قیاس یہ ہے [illegible] کے خیال میں یہ چار ملک ابھی [illegible] ہیں اور اگر برطانوی یا امریکی [illegible] کے زیر سایہ انھیں جنوبی مشرقی ایشیا کی نئی نئی جمہوریتوں کے خلاف کیا جا سکے تو سامراج شاہی کو کچھ دن [illegible] مل جائے گا۔

یہ کمیونسٹ خطرہ آخر ہے کیا؟ اس کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے عوام میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ اسی بے چینی کی وجہ آج جنوبی مشرقی ایشیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے [illegible] روس کی سازش کہہ کر اس [illegible] کی کوشش کرنا یا اسے کمیونسٹوں کی سازش بتانا حقیقت کا انکار کرنا ہے۔ اینگلو امریکن سامراج شاہی کے خلاف اس لڑائی میں مدد اور ہمدردی ایک ہی بڑی طاقت کی سمت سے آتی دکھائی دیتی ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ ایشیائی عوام کی نظریں احسان مندانہ طور پر اس طرف اٹھتی ہیں۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا کو لیجئے۔ انڈونیشیا کا مسئلہ مجلس تحفظ کے سامنے کوئی سال بھر ہوئے آیا تھا۔ لیکن اس بین الاقوامی ادارہ سے دادرسی کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ ڈچ حکومت نے انڈونیشیا کے عوام کے خلاف جنگ شروع کی، اور ملک کا بہترین علاقہ زبردستی اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اس تمام کارروائی میں اگر کسی ملک نے سچ بات کہنے کی جرأت کی ہے تو وہ روس تھا۔ امریکہ نے انڈونیشیا سے اپنی ہمدردی کا ثبوت اس طرح دیا کہ [illegible] میں جمہوریت کا کوئی نمائندہ شرکت نہیں کر سکا۔ ڈچ حکومت کا گفت و شنید سے انکار اور ایک اور حملے کی تیاریاں [illegible] برطانیہ [illegible] ہند چینی میں کھیلا جا رہا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے ویت نام میں بڑی کوشش کے بعد ایک جمہوریت بنائی ہے اس جمہوریت نے فرانسیسی حکومت کا جزو رہنا قبول کر لیا ہے۔ اس حکومت کے لیڈر فرانس کے پٹھو ہیں۔ ان کی حکومت کے افراد کے نام سے ہند چینی کے عوام کو نفرت ہے۔ لیکن یہ جمہوریت بن گئی ہے۔ مغرب کی ایک بڑی جمہوریت فرانس نے اس کی بنیاد رکھی ہے اور امریکہ اور برطانیہ کی جمہوریتیں اس کی ہمدرد ہیں۔ اب اس جمہوریت نے احسانات کا بدلہ چکانے کی خاطر یہ دریافت کر لیا ہے کہ ڈاکٹر ہو چی من کمیونسٹ ہیں اور روس کے ایجنٹ۔ ملایا میں جو کشت و خون ہو رہا ہے وہ کتنا ہی افسوسناک ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں برطانیہ کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ ملایا کے حصے بخرے [illegible] کا ناپاک ارادہ، سیاسی اصلاحات جن سے اختلافات کو تقویت [illegible] سلطانوں کو دوبارہ [illegible] کے منصوبے، مزدوروں کو لاٹھی کے زور سے دبا دینے کی کوشش یہ سب بو کر جو فصل کاٹی جا سکتی ہے وہی اس وقت ملایا میں تیار ہوئی ہے۔ ایک مدراسی اخبار کے الفاظ میں ملایا کی موجودہ بے چینی اس نو آبادیاتی نظام کے سرطان کا نتیجہ ہے جس نے ملایا کے عوام کو مفلس اور غلام بنا رکھا ہے۔

برما

برما کے مختلف حصوں میں بے چینی اور اس کے ساتھ تشدد کی خبریں برابر آتی رہتی ہیں۔ برمی سیاست اس وقت بہت ہی نازک دور سے گزر رہی ہے اپنے وعدے کے مطابق برما کے وزیر اعظم تھاکن نو نے [illegible] کے ساتھ وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے گو ابھی کچھ عرصہ وہ کام کرتے رہیں گے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ استعفیٰ دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اینٹی فاسسٹ پیپلز فریڈم لیگ (مرحوم آنگ سان کی قائم کی ہوئی جماعت) کے ذریعے برمی عوام کے اتحاد کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس طرح کے اتحاد سے ہی ملک کی موجودہ سیاسی الجھنوں کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لیگ کو اس وقت بہت بڑا خطرہ اندرونی ہے جماعت میں ایسے عناصر داخل ہو گئے ہیں جو اسے بدنام کرنے کا سبب بن گئے ہیں۔ تھاکن نو نے کہا اس صورت حال کے بدلنے کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ خود اچھی مثال ملک کے سامنے رکھیں اور دوسری یہ کہ وہ عوام کا سہارا لیں اور ان برے عناصر کو ختم کر دیں۔ تھاکن نو کے خلوص اور عزم کی بہت زیادہ تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ وہ اتنی سوجھ بوجھ بھی دکھائیں گے کہ برما خانہ جنگی کے شعلوں میں نہ پھنس جائے۔ ان کی وزارت کے کئی ممبروں نے استعفیٰ دے کر فوج میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے تاکہ وہ فوج میں کمیونسٹوں کے اثر کو ختم کر سکیں۔ کچھ اور لوگ اس بات پر تلے بیٹھے ہیں کہ کمیونسٹوں کو ختم کرنے کے لئے وہ جنگ سے بھی گریز نہیں کریں گے ادھر کمیونسٹ پارٹی بھی اسی طرح کے کسی مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہی ہے ایسی فضا میں ذرا سی غلطی سے چین کا نقشہ دہرایا جا سکتا ہے۔ [illegible] جو دوران جنگ [illegible] اتحاد کی اپیل کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ برما اس وقت دو طرف سے خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف تو اینگلو امریکن سامراج کی غلامی کا خطرہ ہے۔ دوسری طرف روس کا خطرہ۔ انھوں نے اپنے پروگرام کی وضاحت نہیں کی ہے اس لئے ان کے ارادوں کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

فلسطین

فلسطین میں التوائے جنگ کی توسیع کو یہودیوں نے بے تامل منظور کر لیا تھا اس لئے کہ پچھلے چار ہفتے کے التواء سے انھیں اپنی جنگی قوت بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔ عرب ریاستیں بھی بگڑ رہی تھیں لیکن اقوام متحدہ کے تیور دیکھ کر انھیں بھی منظور کرنا ہی پڑا۔ اب لڑائی قریب قریب رک گئی ہے اور گفت و شنید پھر شروع ہونے والی ہے۔ صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ امریکہ، روس اور ان دونوں کے اثر سے اکثر مغربی ریاستیں یہودیوں کی آزاد ریاست تسلیم کرانے پر تلی ہوئی ہیں برطانیہ عربوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے مگر ان کی عملی مدد کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، اور کچھ ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں رکھتا۔ اسے صرف اس الزام سے بریت کا ثبوت دینا ہے کہ اس نے یہودیوں کو لا کر عربوں کے سر پر مسلط کر دیا۔ عرب حکمرانوں کی اغراض امریکہ سے اس قدر وابستہ ہیں کہ وہ اسے ناراض نہیں کر سکتے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اگر اب جنگ جاری رہی تو یہودیوں کو ضروری سامان جنگ ہر طرف سے پہنچے گا اور انھیں کہیں سے نہیں پہنچے گا۔ لیکن عرب ریاستوں کے عوام میں خصوصاً نوجوان طلباء میں فلسطین کے مسئلے نے اس قدر جوش پیدا کر دیا ہے کہ حکمرانوں کے لئے ہتھیار ڈال دینا بھی آسان نہیں۔ اب ان کے لئے صرف ایک ہی امید ہے کہ شاید امریکہ اور روس کا عام اختلاف اتنا بڑھ جائے کہ فلسطین کے مسئلے میں بھی ان بن ہو جائے یا اس مسئلے کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے اس کا اندازہ آئندہ چند ہفتوں میں ہو جائے گا کہ ان کی یہ امید کہاں تک پوری ہوتی ہے۔

(ا - س)

کیا

آپ [illegible] ٹھیک ہے؟ اگر کوئی غلطی ہو تو ہمیں اطلاع [illegible]

"مینیجر"

قطعات

اختر انصاری

کھیتیاں

شعاعوں نے، بارش نے، شبنم نے بے شک
تر و تازہ اِن کھیتیوں کو بنایا
مگر جذب ہوتا نہ کیا اس زمیں میں؟
پسینہ جو دن رات ہم نے بہایا

صبحِ نو

شمع افسردہ ہے قندیلِ فلک
سیمیائی ہے ستاروں کی جھلک
دیکھ شب تابِ تخیل میں مرے
اک نئی صبح کے کندن کی ڈلک

جہانِ نو

حسن کی مست مست خوشبوئیں
عشق کے گرم گرم آنسو لیں
اور جس سے جہانِ نو ہے مراد
سرحدیں اس جہان کی چھو لیں

بے حسی

کیا کیا فریب ہم کو دیئے زندگی نے ہائے
کیا کچھ نہ ظلم ہم پہ کیے زندگی نے ہائے
اپنی خبر ہے دل کو نہ رفتارِ وقت کی
ہوش و حواس چھین لیے زندگی نے ہائے

ٹیگور کا گیت

(ترجمہ براہِ راست بنگالی سے)

مسعود حسین خاں

آج صبح دودھیا سمندر کی تہ سے
پرندوں کے چہچہے ترنگوں کی شکل میں پھوٹ نکلے
راستے کے دونوں طرف پھول کھلے ہوئے تھے
اور سورج کی کرنیں بادلوں کی اوٹ سے نکل کر چمک رہی تھیں
لیکن ہم اپنے خیال میں مگن دما دم بڑھے جا رہے تھے۔
راستے میں کہیں پل بھر کو بھی نہیں ٹھہرے۔
وقت کے ساتھ ہمارے قدم بھی تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔
اب سورج سر پر آگیا تھا۔
پرندے سایوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے۔
دوپہر کی تیز لپٹ میں پتیاں ناچتی اور چکراتی نظر آ رہی تھیں
گڈریے کا لڑکا پیپل کے سائے میں غافل پڑا سو رہا تھا۔
میں بھی ایک چشمہ کے پاس دراز ہو گیا اور
اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے لئے ہاتھ پاؤں پسار دئے
میرے ساتھیوں نے مجھے [illegible]
اور سر اونچا کئے [illegible] بڑھ گئے
انھوں نے پیچھے مڑ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا
تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے نیلے دھندلکے میں غائب
وہ لمبے چوڑے میدانوں کو پار کرتے
اور سربفلک چوٹیوں کو سر کرتے ہوئے
آگے بڑھتے چلے گئے۔
شاباش! بہادر مسافرو!!
ان کی لعنت ملامت نے مجھے بھی اُکسایا
پر دل نے ایک نہ مانی
اور میں نے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں خود کو کھو دیا
سورج کی کرنوں نے رفتہ رفتہ
مجھے دھوپ چھاؤں کے جال میں جکڑ لیا
مجھے یہ یاد نہ رہا کہ میں کس مقصد کے لئے اس سفر پر نکلا تھا
اس جگہ کے سہانے گیت نے میرے ہوش و حواس اڑا دئیے
بعد کو جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ
تم وہاں کھڑے ہو!!
اور اپنی ہنسی کے نیچے میرا [illegible]
پھر [illegible]
کہاں تمہارے [illegible] راستے کی تھکن اور [illegible] مشکلات سہنا
اور کہاں تمہارا یوں آسانی سے مفت مل جانا!!

عصمت چغتائی

آل احمد سرور

(۲)

اردو نثر پر شاعری اس قدر غالب [illegible] وجہ ہے کہ اچھے اچھے افسانہ نگار شعریت کے سہارے چلتے ہیں۔ کرشن چندر بھی اس سے [illegible] نہیں ہیں۔ عصمت بیدی اور منٹو بیچ بیچ ایک واضح اور [illegible] قوت [illegible] ہیں [illegible] عصمت کی [illegible] صاف اور واضح ہے [illegible] عورتوں کی [illegible] سامنے لا کر [illegible] ماحول [illegible] اور [illegible] کی جذباتی اور گرم [illegible] کی دیہاتی زندگی کے [illegible] کو [illegible] کر کے [illegible] اور ایک [illegible] گیا ہے۔ [illegible] نے اسلوب [illegible] نگاری اور [illegible] ہے۔ وہ جیسی تلخ، بڑی سخت، بڑی [illegible] بڑے پیارے [illegible] زبان پر [illegible] قدرت نہیں [illegible] حاصل ہے۔ ان کے بھائی عظیم بیگ چغتائی نے دلکوں لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ کو بڑے رومانی طرز بلکہ انداز سے پیش کیا تھا۔ عصمت کی طنزیاتی [illegible] میں جا کر سارے رومان کو [illegible] کر رکھ دیا ہے [illegible] کی [illegible] ایک جگہ سوچتی ہے، صاف ستھری [illegible] [illegible] کے بس کا نہیں۔ شاید یہی کمزوری عصمت میں بھی ہے [illegible] ہے مگر [illegible] [illegible]

[illegible] مرض کا علاج کرنے والوں کو اس کا خیال ہے کہ ان کا ذہن مریض نہ ہونے پائے۔ یہ قول [illegible] مارے جسم میں شیطان کا ہونا ضرور ہے مگر اس کے [illegible] جلوہ گر نہ ہونی چاہئے۔ نفسیاتی الجھنوں کی [illegible] قدر ہے مگر ممتاز مفتی کی طرح ان میں الجھ کر [illegible] نہیں رہے۔

[illegible] عصمت کی ایک اور کتاب چھپی ہے۔ [illegible] میں ایک بات، ہیرو ئین، اور [illegible] [illegible] اور ننھی سی جان، نفرت، جال، [illegible] [illegible] افسانے [illegible] ایک بات میں عصمت نے [illegible] جنسی الجھنوں اور [illegible] معیاروں کے متعلق [illegible] کا اظہار کیا ہے [illegible] قابل قدر [illegible] ملتے ہیں۔ عصمت میں نئی نسل کی بے باکی اور [illegible] وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہیں۔ انھوں نے [illegible] کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے وہ [illegible] کو بھی اچھی نہیں لگتی" انھیں اس بات کا احساس ہے [illegible] کی جنگ محض فن اور اخلاق کی جنگ نہیں [illegible] [illegible] کے لئے بھی ہے۔ عریانی کی رٹ لگانے والوں سے [illegible] کا کہنا ہے کہ "چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی"۔ وہ اس پر زور دیتی [illegible] کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو دنیا اتنی گندہ اور عریاں نہ [illegible] نئے ادیب کیا کریں کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی [illegible] کا گلزار نسیم لکھنے لگیں"۔

عصمت کا یہ مضمون [illegible] ادب اور اس کے معیاروں کی بڑی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ انھوں نے مرد و عورت کے لئے جو علیحدہ علیحدہ اخلاق اب تک رائج ہیں ان پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں "مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہئے"۔ مصور اگر شرمانا شروع کر دیں تو آرٹ کیسے نظر آئے۔ عصمت کے اس استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ جس طرح فن کا شرمیلا نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کے لئے محض بے شرمی بھی کمال نہیں ہے۔ وہ بعض باتوں کے بیان میں ذریعہ بھی ہو سکتا ہے مگر مستقل طور پر بے شرمی کو وہ اپنا مسلک نہیں بنا سکتا۔

اس مجموعے میں ہیروئین، یا درچن، ننھی سی جان ناکامیاب ہیں۔ نفرت میں وہی گھریلو ماحول، [illegible] کی رٹائیاں اور جوانی کی تفریحیں ہیں۔ وہی لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصیتوں کا تصادم ہے۔ وہی دلچسپ، عجیب اور تلخ حقیقتیں ہیں جن کے بیان میں عصمت کا کوئی مقابل نہیں۔ منٹو اور اس کی موت، دلی دلہن [illegible] سے بہت میں بھی چھپا نہ چھوٹا متوسط طبقے کے مانند افراد ہیں۔ عصمت نے [illegible] جوان کی دنیا اور اس کی دلفریب شازشوں کا ایک ایسا مرقع دکھایا ہے جس میں منٹو اور [illegible] کٹ پتلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس نیا میں شادیاں جھگڑے کی مانگ کی بنا پر ہوتی ہیں۔ اس میں دادی، دادا، [illegible] سب کا دخل ہوتا ہے مگر نہیں ہوتا تو ان کا جن کی تبدیلیوں بھی بنتا ہے۔ جال کو بہت سے لوگ عریاں کہیں گے مگر اس میں عصمت نے لڑکیوں کے عنوان شباب اور [illegible] بنانے کے ساتھ کی [illegible] تصویر کی ہے۔ لڑکیاں نئی دنیا میں قدم رکھتی ہیں تو گھر بھر کی آنکھیں ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ ان کی حیرانی اور مرنے کی خواہش دو نوں خطرے میں۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں بجائے ہمدردی کے ان کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کرتی ہیں حالانکہ ان کا حال بالکل اس کیڑے کا سا ہوتا ہے جسے ایک خول سے نکل کر دوسری زندگی میں قدم رکھنا ہوتا ہے زندگی کے لئے موت کے قریب سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔

اس مجموعے میں مجھے جو کہانی سب سے زیادہ پسند آئی وہ مہیشہ ہے۔ پیشہ ایک دلچسپ غلط فہمی کی یادگار ہے۔ ایک شریف استانی اپنے پڑوس کی ایک بھڑکیلی اور شوقین عورت کو دیکھ کر اسے طوائف سمجھ لیتی ہے۔ اس کے یہاں جو آزادی اور آزاد ملاقاتیں ہیں ان سے اور بھی اس شبہے کی تصدیق ہوتی ہے۔ شروع شروع میں طوائف کے خلاف ایک قدرتی نفرت اسے اپنی پڑوسن سے زیادہ بے تکلف نہیں ہونے دیتی۔ مگر پڑوسن کا اخلاق اسے کچھ نرم کر دیتا ہے اور وہ اس کے یہاں آنے جانے لگتی ہے۔ مگر پڑوسن کی لڑکی کی سالگرہ میں وہ جو تماشے دیکھتی ہے اور ایک ایڈیٹر صاحب جس طرح اس کے سر ہو جاتے ہیں اس کی وجہ سے وہ پھر بدظن ہو جاتی ہے۔ پڑوسن جو اخلاق برتنے کی کوشش کرتی ہے اس پیپائی سے ناراض ہو جاتی ہے اور ملنے پر غیروں کی طرح [illegible] لیتی ہے۔ بازاری عورت کو اپنی سطح سے اونچا اٹھنے کا حوصلہ مل چکا ہے۔ اخلاق کی فتح ہو گئی ہے۔ مگر خدا کا کرنا یہ ہوتا ہے کہ استانی کے کچھ عزیز آجاتے ہیں اور پڑوسن کی فلیٹ پر قہقہوں کی آواز سے یہ راز کھلتا ہے کہ وہ طوائف نہیں ایک شریف عورت ہے — اور حیثیتوں سے خاندانی اور اس کی چچی کے دور کی عزیز بھی —

افسانے میں عصمت نے سیٹھانی، استانی، نگار اور ایک ترقی پسند ایڈیٹر کی بڑی اچھی مصوری کی ہے۔ سیٹھانی کے یہاں عاشقوں کا ہجوم۔ نگار سے ایک فوجی افسر کا الجھنا۔ سیٹھانی کے لباس اور زینت اور اخلاق کا بار بار تذکرہ، فضا پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ استانی کی ذہنی کیفیت، بچپن کی تربیت اور آزاد انفرادیت کی کشمکش رو میں بہہ جانے اور رو کو بدل دینے کا جذبہ، ایک سانپ کے اونگھنے پر دوسرے کا پھن اٹھانا، سوتیلوں سے نفرت اور پھر انھیں سے رغبت، یہ سب باتیں فطری معلوم ہوتی ہیں۔ افسانے میں کوئی تصویر بے کار نہیں۔ کوئی رنگ زیادہ نہیں، پھر نیک و بد، شریف و ذلیل، پست اور بلند کے عام اور خود ساختہ معیاروں کے بلند ہونے کی یہ کوشش اور زندگی کو ہر فریب اور نقاب سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی یہ تمنا لائق تحسین اور قابل قدر ہے۔

بعض نے شکایت کہا ہے کہ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ مگر عصمت کے یہاں ایک سماجی احساس ضرور ملتا ہے۔ یہ سماجی احساس ایک باغی کا ہے۔ ایک نڈر، بے خوف، آزاد اور بے باک روح کا ہے جو فریبوں کا پردہ چاک کرنے میں، زخموں کو کریدنے میں، جنسی الجھنوں کی بھول بھلیاں میں راستہ تلاش کرنے میں ایک لطف اور خوشی محسوس کرتی ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنا راستہ تلاش کرنے کے بجائے پیچھے رہ جانے والوں کا منہ چڑانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انھیں جسم سے زیادہ دلچسپی ہے اور ان کی دنیا بھی بہت وسیع نہیں مگر انصاف یہ ہے کہ ان کے فن میں بڑی زندگی، روشنی، قدرت اور جاذبیت ہے۔ ان کی تشبیہات خیال انگیز اور حسین ہوتی ہیں۔ عورتوں کی زبان کو راشد الخیری نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ مگر عصمت نے اس میں جلال و جمال پیدا کر دیا ہے۔ زبان کے لحاظ سے اردو کے افسانہ نگاروں میں کوئی بھی ان کو نہیں پہنچا۔ کرشن چندر کے یہاں شعریت ہے، بیدی کے یہاں وہ حزن جو بڑے المیہ احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ منٹو کے یہاں چابکدستی اور صفائی ہے۔ مگر عصمت کے یہاں وہ تخلیقی قوت اور طوفانی کیفیت ہے جس کا زور شور انسان کو بہائے جاتا ہے اور جس کے بغیر زندگی میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ عصمت کی فن کاری سے یہ بات اور بھی ثابت ہوتی ہے کہ محض بلندیوں پر رہنا، یا آسمانوں سے باتیں کرنا فن کار کو بڑا نہیں بناتا، بلکہ اپنی دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں، واقعات اور ہنگاموں میں وہ زندگی اور حرکت پیدا کرنا جو بڑی چیزوں میں ہے اسے بڑائی اور بزرگی عطا کرتا ہے۔ چیخوف نے اپنے ایک معاصر سے کہا تھا ٹوٹی ہوئی بوتل میں سے روشنی کی کرن گزرتی ہوئی دکھانا بھی آرٹ ہے۔ عصمت اس آرٹ سے واقف ہیں یہی ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔

کیوں منحرف نہ ہوں رہ و رسم صواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

(غالب)

ہندوستانی تہذیب کے عناصر (بسلسلہ صفحہ ۹)

ان اشعار میں شیخ اور برہمن کی تفریق ختم کرتی انسانی برادری قائم ہوتی ہے جس کا مذہب محبت ہے ہو سکتا ہے کہ بعض شاعر ایسے ہوں یا کچھ اشعار ایسے ملیں جن کا مذہبی جذبہ انسانی محبت کے اس جذبے کو دبا دیتا ہو اور اس سے تفریقی رجحان نمایاں ہوتا ہو۔ لیکن اردو شاعری کا یہ عام رنگ نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ طور پر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مختلف ذرائع سے اور مختلف زبانوں کے ادبی سرمایہ کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں جتنا صالح غیر فرقہ وارانہ اور ترقی پسند ادب موجود ہے اتنا ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ سامراج کی مخالفت جمہوریت نوازی اور اتحاد ... ادب بھرا پڑا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں یہ ادب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک ہراول کی حیثیت سے پیش پیش رہا ہے شعلہ بار افسانے اور آتشیں نظمیں اس کے ادبی سرمائے میں زیادہ ہیں آج بھی اس کا پیام سماجی انصاف اور جمہوریت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس شرمناک انداز میں اپنے تہذیبی فخر کا گلا گھونٹا ہے اس پر اردو سے بہتر افسانے اور نظمیں کہیں نہیں لکھی گئیں۔ ان میں طنز اور تلخی ہی نہیں ہے غم کا زہر بھی ہے اور انسانیت کا امرت بھی ان میں محض نفرت کی تصویر کشی نہیں ہے محبت کے خوب صورت خاکے بھی ہیں۔ آزادی کی مفصل تاریخ اردو ادب کے سرمائے سے مرتب کی جا سکتی ہے ایسی زبان اور ادب کو بدیسی کہنا یا اس پر تفریقی ہونے کا الزام لگانا تعصب پسندی ہے۔ اردو ادب ہندوستانی تہذیب کے ڈھانچے میں اسی طرح اپنی جگہ رکھتا ہے جس طرح ہندوستان کا کوئی دوسرا ادب۔ اس پر فرقہ داریت کا دھبہ لگانا بھی فرقہ داریت ہے۔ جو شخص دو قوموں کے نظریے کے باعث ہندوستان کی تقسیم کو صحیح جانتا ہے اس میں اور اس شخص میں کوئی فرق نہیں ہے جو ہندوستان میں مشترک تہذیب کے بنیادی عناصر کا منکر ہے اور اسے ایسا رنگ دینا چاہتا ہے جس میں سے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات اور خصوصیات نکال دی جائیں۔

ہندوستانی تہذیب سے ان قدروں کا ارتقا مراد ہے جو ہندوستان میں بسنے والی قوموں اور مذہبوں نے پانچ ہزار سال میں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ اگر ہندوؤں کا ایک گروہ اسے تسلیم نہیں کرتا تو اس سے تاریخی حقیقتیں نہیں بدل [illegible] سے علمی تحقیق [illegible] ثابت نہیں [illegible] مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنی [illegible] نکال دیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ صرف [illegible] نام پر بنگالی مسلمان [illegible] زبان یا تہذیب چھین لیں جو پورے بنگال کی مشترک [illegible] ہندوستان کے ہندو لال قلعہ، تاج محل اور بلند دروازے کو خاک میں ملا سکیں۔ [illegible] ہمارے سامنے بڑے اہم سوالات ہیں۔ ہماری تہذیب اور زبان مذہب یا [illegible] وقت ہوا کی یا ان کی بنیاد جمہوری اور غیر مذہبی ہوگی؟ اسے سماجی انصاف پر ... کیا جائے گا یا آمرانہ یا فسطائی بنیاد پر؟ ان سوالوں کے جواب پر ہندوستان کی عظمت اور اس کے تہذیبی ارتقا کا مستقبل منحصر ہے اور ان کا جواب اس سے [illegible] ہے کہ وفاداری اور قوم پرستی کے نام پر جو زہر پھیلایا جا رہا ہے وہ کام و دہن [illegible] لپیٹ میں سرایت کر جائے۔

اسلامی تہذیب کی روح (بسلسلہ صفحہ ۲)

[illegible] کا غیر ذمہ دار حاکم کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ انسان خدا کے آگے اور خود [illegible] کے آگے جواب دہ ہے اپنے سب اعمال کا خواہ وہ دین سے تعلق رکھتے ہوں [illegible]۔ جن حدود کا اوپر ذکر آیا ہے ان میں اکثر اجتماعی تعلقات کے ضابطوں کی [illegible] رکھتے ہیں مثلاً سود خوری اور قمار بازی کی ممانعت۔ استطاعت رکھنے والوں کے [illegible] وہ اور خمس کی ادائگی کا حکم، جنگ کے قوانین جن میں عہد نامہ [illegible] پابندی شہریوں سے اچھا برتاؤ کرنے اور دشمن پر خوراک نہ بند کرنے کی تاکید ہے۔ اسلام کے معاشرتی معاشی اور سیاسی تصورات انصاف اور مساوات پر اور ان بے اعتدالیوں کے انسداد پر مبنی ہیں جو دولت کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آں حضرت صلعم نے فرمایا ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اپنے ہمسایوں کو بھوکا رہنے دے وہ سچا مسلمان نہیں اگر اس سیدھے سادے معیار پر جانچ کر دیکھا جائے تو آج دنیا میں سچے مسلمان کتنے ہوں گے؟ پھر بھی بہت سے [illegible] تھے جن کا عمل اس پر پورا اترتا تھا حضرت علی نے اپنی خلافت کے زمانے میں فرمایا تھا اگر شہر میں ایک آدمی بھی بھوکا ہو تو میں چین سے نہیں سو سکتا" اور وہ راتوں کو روٹیاں پیٹھ پر [illegible] ان محتاجوں کے لئے جایا کرتے تھے جن کی غیرت سوال کی ذلت کو گوارا نہیں کرتی تھی۔

[illegible] و ناشر: عبد اللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)

نئی روشنی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبد الحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے

مطبوعہ: جید پریس (دہلی)

ہفت روزہ
نئی روشنی دہلی
یکم اگست ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کے مقاصد

(۷)

معقول معاشرت

معاشرت (یعنی عوامی زندگی یا سماجی زندگی) کی [illegible] آپس میں مل جل کر رہنے کا وہ انداز ہے جو کوئی انسانی جماعت اختیار کرتی ہے۔ معاشرتی زندگی نے خاندان و [illegible] قبیلے کی منزلوں سے گذر کر سماج کی صورت کیونکر اختیار کی اس کی طرف ہم ایک پچھلے مضمون میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ان قوتوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو ہماری معاشرت کی تشکیل کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طبیعی احوال یعنی آب و ہوا وغیرہ اور معاشی حالات ہماری پوری تہذیب پر اور خاص کر معاشرت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معاشرتی زندگی کی تشکیل کرنے والی یہی دو مادی قوتیں ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی قوت نہیں۔ لیکن عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ معاشرت کے بنانے اور ڈھالنے میں غیر مادی قوتوں کو بھی دخل ہے۔ جن میں سب سے اہم دو ہیں۔ مذہبی عقیدہ اور عقل۔ یوں دیکھنے میں یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے سے متضاد یا کم سے کم بے تعلق نظر آتی ہیں۔ لیکن اصل میں دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ مذہبی عقیدہ ایک خاص فکر و احساس کا نام ہے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں سے نکل کر اس کے شعور پر چھا جائے۔ بعض لوگ عقیدے کا ماخذ وحی الٰہی کو قرار دیتے ہیں اور بعض انسان کے اپنے وجدان کو۔ مگر اس پر سب متفق ہیں کہ وہ عام ذہنی قوانین کا تابع نہیں ہے اور ان کے معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ عقل وہ ذہنی قوت ہے جو (۱) اپنے مقررہ قوانین کے مطابق انسانی فکر و احساس کی حقیقت کو جانچتی ہے (۲) ان میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور (۳) انھیں عملی شکل دینے کی تدبیر سوچتی ہے۔

یہ غلط فہمی کہ مذہبی عقیدہ عقل سے بے تعلق یا متضاد ہے محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کی حقیقت عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھی جا سکتی یا کسی جائے تو پوری نہیں اترتی۔ لیکن [illegible] تو عقل کے تین کاموں میں سے ایک ہی کام ہے [illegible] باقی دو کاموں کا تعلق ہے عقل مذہب کے دائرے میں بھی اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح فکر و عمل کے اور دائروں میں یعنی مذہبی عقائد میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور انھیں عملی شکل دینے کی تدبیر سوچتی ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کوئی مذہب اپنی ترقی کے زمانے میں عقل سے بے نیاز نہیں رہا۔ ہاں تنزل کے زمانے میں جب قومیں حقیقی مذہبی روح سے محروم ہو جاتی ہیں اور مذہب کی جگہ وہموں اور رسموں کا زور ہوتا ہے، مذہبی پیشوا جو ہر قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں اپنے جہل اور بے عقلی سے، یا چالاکی اور خود غرضی سے عوام سے بے چون و چرا اپنی اطاعت کرانے کے لئے، عقل کو مذہب کا حریف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔

ہم ہندوستانی اور عام طور پر ایشیا والے ایک مدت سے اسی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ توقع ہو سکتی تھی کہ ہماری معاشرت اوہام و رسوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے گی اور عقل سے کام لے کر اس میں وقت کی ضرورت کے مطابق اصلاح کی جائے گی۔ شروع میں راجا رام موہن رائے، [illegible] اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح معاشرت کی تحریک کو زور شور سے اٹھایا۔ مسلمانوں میں سر سید نے حقیقی معاشرتی مسائل مثلاً عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں کی لیکن [illegible] تعلیم یافتہ طبقے اور [illegible] عناصر حلقے [illegible] کا مذاق پیدا کر دیا جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو [illegible] اصلاح کا کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد وقت کی شدید ضرورت نے سیاست کو ہمارے دل و دماغ پر اس طرح مسلط کر دیا کہ ہم نے اصلاح معاشرت کو بالکل بھلا دیا۔ صرف مہاتما گاندھی کے پاس قوت عمل کا اتنا بڑا خزانہ تھا کہ انھوں نے سارے ملک کی سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کی مہم بھی جاری رکھی اور ان کے سیکڑوں مخلص اور پرجوش ساتھیوں نے اس میدان میں بہت قابل قدر کام انجام دئے۔ لیکن حالات کے جبر سے ان بزرگوں کی سماجی خدمت صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ اور ان میں بھی اتنی کامیاب نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ اب رہے مسلمان تو ایک مدت تک تو وہ خلافت اور سوراج کے متوالے رہے، اور اس کے بعد ان کے بہت سے لیڈر پاکستان کے نشے میں سرمست ہو گئے اور پھر اب اصلاح معاشرت پر کیا سوچتے ہیں۔ پچھلے تیس سال میں مسلمانوں نے سوا جامعہ ملیہ کے قائم کرنے کے کوئی بھی قابل ذکر تعمیری کام نہیں کیا۔ معاشرت کا کوئی معقول نقشہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ وہم و تعصب کے بندے اور رسم و عادت کے پرستار رہے۔ تھوڑے سے مغرب زدہ خاندانوں نے انگریزی تہذیب کے اس سستے نمونے کو اختیار کر لیا جو برطانیہ کے بیرونی مقبوضات میں [illegible] پیسوں کے استعمال کے لئے آتا ہے اور جسے ہم وسادہ [illegible] تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں زندگی کے اور شعبوں کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرت کی بھی نئے سرے سے تشکیل کرنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس کے قائل ہیں کہ ہم معاشرت کے معاملے میں مذہب کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مذہبی عقائد کی صحیح تفسیر [illegible] [illegible] اور علم کی [illegible] ہے۔ معقول معاشرت [illegible] [illegible] [illegible] مذہب کی روح کو سمجھنا [illegible] عقل کی روشنی میں [illegible] ضرورت کے مطابق [illegible] ہے۔

یہ [illegible] درست ہے کہ مذہبی قانون [illegible] پرسنل لا کی شکل میں رائج ہے جس کا تعلق تھوڑے [illegible] ہم سے ذاتی یا خاندانی مسائل سے ہے۔ معاشرت کے اکثر مسائل ایسے ہیں جن کا دائرہ کسی ایک خاندان یا جماعت یا فرقے کی زندگی تک محدود نہیں بلکہ سب ہندوستانیوں کی زندگی کو محیط ہے [illegible] ہماری نئی قومی جمہوریت [illegible] معاشرتی قانون سازی عام طور پر کسی خاص مذہب [illegible] کے مطابق نہیں ہوگی بلکہ عام انسانی عقل اور قومی مصلحت کے مطابق ہوگی [illegible]

[illegible] ہم [illegible] معاشرتی مسائل [illegible] رائے [illegible] پیش نظر رکھیں گے [illegible] مقصد [illegible] ہے کہ ہندوستانیوں کو معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اور ایک معقول سماج کی تعمیر کی طرف توجہ دلائیں جس کے بغیر ہماری سیاسی آزادی بے مزہ اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

بزم بے تکلف

"کہئے حضرت خیریت تو ہے۔ آپ کچھ متفکر معلوم ہوتے ہیں، کیا پھر گھر میں تقریب ولادت ہونے والی ہے؟"

"بھلا یہ تقریب ولادت کا کون سا موقع ہے؟"

"موقع محل تو آپ جانیں میں نے تو ایک روایتی معنی - اصل یا غذ [illegible] دستور تھا۔ اس لئے آپ سے پوچھ لیا۔"

"نہیں بھائی آج کل تو اپنی ہی ولادت پر افسوس ہے۔"

"اب افسوس نہ کیجئے۔ بہت دن کی بات ہو گئی اور پھر آپ کا اس میں کیا قصور"

"قصور کیا ہوتا۔ شاعر نے کہا ہے۔

انسان بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"

"اس میں 'انسان بنا کے' محل نظر ہے اور 'مٹی خراب کی' قبل از وقت ہے۔"

"آپ کو تو ہر وقت مسخرا پن سوجھتا ہے۔"

"مسخرا پن آنکھوں کے سامنے ہو تو کیسے نہ سوجھے؟"

"بھئی تم تو آدمی کی جان کو آ جاتے ہو، اسی لئے تو تم سے بات کہتے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا اب جان کی امان ہے۔ کچھ بتائیے تو کہ معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ وہی ہے جو آپ نے سنا ہے۔ پانچ برس میں چار بچے ہو چکے ہیں اور اب ———"

"نقشہ ایک اور نے جما یا۔ پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا۔ مگر اس میں اتنی فکر کی کیا بات ہے؟"

"لو اور سنو سور وپلی کی آمدنی اور قیامت کی مہنگائی پانچ بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا"

"ہاں یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم مرتی نہیں مرتا ہو وہ کھائے جاتے ہیں مچھکو برخوردار۔"

"پھر سوچتا ہوں کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو کیا ہوگا"

"کیوں جاری رہے، ضبط تولید سے کام لیجئے نہ"

"آپ کو تو انگریزیت چڑھی ہے۔ ہمارے یہاں تو ضبط تولید کا نام لینا بھی معیوب ہے"

(بقیہ ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۹ پر)

مغربی دُنیا

کیا برلن کا قضیہ طے ہو رہا ہے؟

برلن کی ناکہ بندی کا پانچواں ہفتہ نہایت خطرناک تھا۔ روس نے یہ اعلان کیا تھا کہ جس فضائی راستے سے برطانیہ اور امریکہ کے ہوائی جہاز مغربی برلن میں رسد لاتے ہیں اس پر روس کے طیارے جنگی مشق کے لئے پرواز کریں گے۔ اگر یہ دھمکی عمل میں آتی تو دونوں حریفوں کی ٹکر یقینی تھی۔ امریکہ سے جنگی طیارے انگلستان میں اور روس سے برلن میں آکر جمع ہو رہے تھے۔ سہمی ہوئی دنیا لرز رہی تھی کہ نہ جانے کب یہ بارود کا ذخیرہ بھک سے اڑ جائے اور سارے یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دے۔ مگر روس نے پینترا بدلا اور یہ کہا کہ ہم خود مغربی برلن کو غذا اور دوسری ضرورت کی چیزیں پہنچانے کو تیار ہیں۔ ظاہر ہے مغربی قوتیں اسے گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ کہ اپنے علاقے کے لوگوں کو روس کا زیر بار احسان ہونے دے۔ امریکہ سے بار برداری کے اور زیادہ جہاز آ گئے اور موسم بھی سازگار ہو گیا۔ اس لئے انھوں نے رسد پہنچانے کی رفتار تیز کر دی۔ اب ہر پانچ منٹ میں ایک طیارہ برلن میں سامان لے کر پہنچ رہا ہے خطرہ ابھی تک دور نہیں ہوا ہے۔ لیکن قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین جو آمد کر کے آگے بڑھے تھے اب پینترے بدلتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ روس کے اشتعال کا سبب یہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ مغربی جرمنی کو مستقل طور پر ایک جداگانہ ریاست بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر اب خبر ملی ہے کہ امریکہ نے جو نوٹ روس کو بھیجا ہے اس میں مغربی جرمنی کی مستقل ریاست کا نام نہیں بلکہ عارضی چارٹر کے ماتحت ایک "حکومت" قایم کرنے کا ذکر ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ روس کو اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ ابھی جرمنی کے معاملے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ادھر برلن کے روسی کمانڈر مارشل سوکولا فسکی نے امریکہ کے یونائیٹڈ پریس کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ برلن میں کہیں بھی ناکہ بندی نہیں بات صرف اتنی ہے کہ امریکہ نے اپنے علاقے میں روسیوں کے داخلے پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ ہم نے بھی اس کے جواب میں کچھ پابندیاں لگا دیں انہوں نے خوش طبعی کے انداز میں پوچھا "اگر آپ کے یہاں کھانے پر مہمان آئیں تو کیا آپ کو یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں یہ کھانے کی میز کے پائے سے کرچھپنٹ نہ ہو جائیں" مطلب یہ تھا کہ امریکہ نے جن شبہات کی بنا پر روسیوں پر پابندیاں لگائیں وہ باطل مہمل تھے۔ اگر امریکہ یہ پابندیاں ہٹا دے تو ہم بھی برلن میں رسد پہنچانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔

اگر دونوں طرف سے یہی انداز رہا تو شاید چند روز میں برلن کی گتھی سلجھ جائے اور جنگ کا خطرہ فی الحال ٹل جائے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین کی شاطرانہ چال

مسٹر ٹرومین کو ڈیموکریٹک پارٹی کے کنونشن نے متفقہ طور پر نیابت صدارت کے انتخاب کے لئے جو نومبر میں ہوگا اپنا امیدوار نامزد کر دیا ہے۔ ان کی پارٹی کے کچھ لوگ ٹوٹ کر تیسرے امیدوار مسٹر ویلیس کی طرف چلے گئے اور کچھ لوگوں نے جو جنوبی ریاستوں کے باشندے ہیں چوتھا امیدوار کھڑا کرنے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن دونوں قسم کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجموعی طور پر ڈیموکریٹک پارٹی مسٹر ٹرومین کے ساتھ ہے اس لئے در اصل مقابلہ ان میں اور ریپبلکن پارٹی کے امیدوار مسٹر ڈیوی میں ہے بہتوں لوگوں کی رائے یہی ہے کہ ان کا ڈیوی کے مقابلے میں کامیاب ہونا محال ہے۔ مگر خود ان کو یہی امید ہے یا کم سے کم ظاہر یہی کرتے ہیں کہ وہ ضرور منتخب ہو جائیں گے۔ انھوں نے ایک چال ایسی چلی ہے کہ اگر حریف کو اس کا جواب نہ سوجھا تو ہو سکتا ہے کہ بازی ان کے ہاتھ رہے۔ انتخاب کے زمانے میں پارٹیاں رائے دہندوں سے بڑے بڑے وعدے کرتی ہیں اور یہ سمجھ کر کہ اس وقت تو ہمارا امیدوار منتخب ہو جائے اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ مسٹر ٹرومین نے عام دستور کے خلاف عین انتخابات کے زمانے میں امریکہ کی مجلس آئین ساز (کانگریس) کا جلسہ طلب کر کے ریپبلکن پارٹی کو چیلنج دیا ہے کہ اس نے امریکی قوم سے جو لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں ان کو پورا کرے ان وعدوں کا تعلق زیادہ تر اندرونی معاملات سے ہے۔ بیرونی سیاست میں دونوں پارٹیوں میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ اسے منظر عام پر نہیں لانا چاہتی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ریپبلکن پارٹی کانگریس کے اس اجلاس میں مفاد عامہ کے کوئی اہم قانون پاس کر کے قوم کو اپنے خلوص کا یقین دلاتی ہے یا لمبی لمبی بحثوں میں وقت گزار کر معاملے کو ٹال دیتی ہے۔ یا اس سے کوئی ایسی چوک ہوتی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر ٹرومین اس کے بہت سے ووٹ توڑ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فرانس کی نئی وزارت

فرانس کی نیشنل اسمبلی نے ۱۹۰ ووٹ کے مقابلے میں ۳۵۲ ووٹ سے ریڈیکل پارٹی کے موسیو آندرے ماری کو وزیر اعظم منتخب کیا ہے۔ یہ پہلے موسیو شومان کی کیبنٹ میں وزیر عدل تھے۔ کیبنٹ بھی اب وزیر اعظم کی مرضی بن گئی ہے۔ اس میں نہایت اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ موسیو بیدو جو چار برس سے وزیر خارجہ چلے آ رہے تھے الگ ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ موسیو شومان کو لیا گیا ہے ابھی تک تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ فرانس کی متعدد پارٹیوں میں سے بیچ کی پارٹیاں اور سوشلسٹ پارٹی نئی حکومت کا ساتھ دیں گی اور کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ انتہا پسند سوشلسٹ بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ موسیو بیدو کے الگ ہونے سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید فرانس کی اندرونی اور بیرونی پالیسی میں اب زیادہ احتیاط اور اعتدال سے کام نہیں لیا جائے گا اور اندر کمیونسٹوں وغیرہ کو دبانے میں اور باہر روس کی مخالفت کرنے میں امریکی پالیسی کا زیادہ بے باکی سے ساتھ دیا جائے گا۔ واقعات بتائیں گے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے۔

برطانیہ کی معاشی حالت سنبھل رہی ہے

انگریزوں کی قوم بھی عجیب غریب قوم ہے۔ برطانیہ میں ابھی چند دن ہوئے روٹی کا راشن برسوں کے بعد ختم ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں غذا کی رسد اب بالکل قابل اطمینان ہے صنعتی اشیاء کی پیداوار میں اور برآمد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ معاشی حالت پچھلے دو سال کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گئی ہے اور کوئی ملک ہوتا تو غذا کے وزیر اور تجارت کے وزیر اپنے کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتے اور قوم سے داد کے طالب ہوتے۔ مگر انگلستان میں غذا کی وزارت نے الٹی معذرت کی ہے کہ راشن تو ختم ہو گیا لیکن لوگوں کو نانبائی کی دوکان سے روٹی کچھ ایسی زیادہ مقدار میں نہیں مل سکے گی۔ اس لئے کہ دوکانوں کو میدہ محدود مقدار میں ملتا ہے۔ اسی طرح بورڈ آف ٹریڈ کے پریسیڈنٹ مسٹر ہیرلڈ ولسن نے لوگوں کو متنبہ کیا ہے کہ ہماری معاشی حالت اتنی اچھی نہیں ہے جتنی پیداوار کے اعداد و شمار سے بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے سال کے اندر انگلستان میں اشیا کی قیمتوں میں ۱۰ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے اس پر بڑی چخ پخ ہے کہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک آٹھ برس میں صرف ۳۱ فی صدی اضافہ ہوا تھا اور اب سال بھر میں ۱۰ فی صدی اور ہو گیا۔ گویا اضافے کی رفتار ڈھائی گنی ہو گئی ہم ہندوستانی یہ سن کر حیران ہیں کہ کوئی ملک ایسا بھی ہے جہاں قیمتیں پچھلے نو دس سال میں صرف ۴۱ فی صدی بڑھی ہیں اور وہ اسے ایسی مصیبت سمجھتا ہے جس کا تدارک ناگزیر ضروری ہے۔ اگر ہندوستان کی طرح وہاں قیمتوں میں چار سو اور پانچ سو فی صدی اضافہ ہوا ہوتا تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے

یورپ کے ملکوں کو معاشی بحالی کے لئے مالی امداد دینے کی جو تجویز امریکہ نے مارشل ایڈ پلین کے نام سے کی تھی وہ خدا خدا کر کے عملی جامہ پہن رہی ہے۔ ۲۵ جولائی سے پیرس میں یورپ کی ۱۶ ریاستوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس میں مارشل ایڈ کے منتظم مسٹر پال ہوفمین کے مشورے سے طے ہوگا کہ امدادی رقمیں کس طرح صرف کی جائیں۔ کانفرنس کا کوئی ایجنڈا پہلے سے طے نہیں ہوا ہے اور اخبار کے نامہ نگار اس کے کسی رکن سے سن گن بھی نہیں لے سکے کہ کن کن مسائل پر بحث کی جائے گی۔ جب یہ سوال برطانیہ کے وزیر خزانہ سر اسٹیفرڈ کرپس سے کیا گیا جو کانفرنس میں اپنے ملک کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لئے پیرس پہنچے ہیں تو انھوں نے فرمایا "آج موسم بڑا خوشگوار ہے"۔ البتہ مسٹر پال ہوفمین نے کو پریس کانفرنس میں اشارتاً ایسی بات کہی "ہمیں ابھی تک یورپ کے ملکوں میں اس معاشی تعاون کے آثار نظر نہیں آتے جو مکمل بحالی کے لئے ضروری ہے" مسٹر ہوفمین نے نام تو معاشی تعاون کا لیا ہے لیکن تمام قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مطلب سیاسی تعاون سے ہے در اصل امریکہ کا منشا یہ ہے کہ جن سولہ ملکوں کو مالی امداد دی جا رہی ہے وہ ایک متحدہ سیاسی محاذ بنا کر کمیونزم کے اس سیلاب کو روکیں جو مشرقی یورپ کی طرف سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے جو بانسری بجانے والے کو پیسے دیتا ہے وہی فرمائش کرتا ہے کہ کون سی گت بجائی جائے۔ ادھر معاشی تعاون میں روس کے خلاف مورچہ بن رہا ہے۔ ادھر مغربی اتحاد کے نام سے کھلم کھلا انگلستان کی قیادت میں فوجی قوت کو متحد کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

(ع - ح)

قطعات

اختر انصاری

ایک یاد

مدت ہوئی کہ نغمہ فشاں بھی ہوئے نہ ہم
شاخِ طرب پہ زمزمہ خواں بھی ہوئے تھے ہم
ہم کو تو کچھ خبر نہیں اپنی، مگر ندیم!
کہتا ہے حافظہ کہ جواں بھی ہوئے تھے ہم

بھوک

تھام لیتے دلِ وحشی کو کبھی
کبھی روتے کبھی آہیں بھرتے
زندگی ہم کو بھی مہلت دیتی
ہم بھی اے کاش محبت کرتے

اوہام

علم کے زمزمے نہ گاؤ کہ ہم
گلشنِ جہل کی بہاریں ہیں
روشنی میں ہمیں نہ لاؤ کہ ہم
عہدِ ظلمت کی یادگاریں ہیں

ہم

شمعِ انسانیت کی لو ہیں ہم
اک نئی روشنی کی ضو ہیں ہم
عیشِ فردا مراد ہے جن سے
ان بہاروں کے پیش رو ہیں ہم

غزل

اثر لکھنوی

شغلِ گرداب ہے گردش سے فقط کام مجھے
کر دیا شوق نے بیگانۂ انجام مجھے

زندگی بھی ہے صلہ، موت بھی انعام مجھے
لے چل اب چاہے جدھر عشق سبک گام مجھے

موجِ دریا کی طرح دور جو ساحل سے ہو
بے قراری ہی میں ملتا ہے کچھ آرام مجھے

کیا یہی شرطِ مساوات ہے کیوں اے "ساقی"
صاف اوروں کے لئے دُرد تہِ جام مجھے

زیب دیتا ہے اگر ناز ہو رسوائی پر
آج اس نے بھی کہا ناز سے "بدنام" مجھے

اک خلش زار ہے جس دشت کا کانٹا کانٹا
چھوڑے جاتا ہے کہاں اے دلِ ناکام مجھے

"کھو چکے ہوش بہت ہوش میں رہنا سیکھو"
اُف ری او چشمِ فسوں ساز یہ پیغام مجھے!

حسرتِ سیرِ چمن کچھ تو نکالوں صیاد
اور رہنے دے ذرا دیر تہِ دام مجھے

کعبۂ دل کا شب و روز ہے درپیش طواف
رختِ ہستی ہے مرا جامۂ احرام مجھے

اللہ اللہ وہ جلوہ تری رعنائی کا
سیکڑوں طور نظر آئے سرِ بام مجھے

کیا فریب اس میں ہے کچھ غور کرو تم بھی اثرؔ
یاد کرتا ہے بتِ سادہ و خود کام مجھے

نیا مرحلہ

(ایک ناتمام ناول کے چند ورق)

سید عابد حسین

سارا دن دوستوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے چہچہوں میں گزارنے کے بعد ظفر رات کو اپنے بستر پر سونے کے لئے لیٹتا تھا تو طبیعت اور عادت کے مطابق تنہائی میں اپنے ہی تخیل کی باگیں چھوڑ دیتا تھا۔ عارضی امید پروری کے گھوڑے پر سوار وقتی خود اعتمادی کے سلاح جنگ سے آراستہ وہ آئندہ تعلیمی اور عملی زندگی کے مدرکے ہنستے کھیلتے طے کرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں امتحانوں میں اول آتا، انعام اور وظیفے حاصل کرتا۔ یونین میں اس کی دھواں دھار تقریروں کی دھوم مچ جاتی۔ میگزین میں لوگ اس کے مضامین پڑھ کر وجد کرتے۔ یہاں تک کہ کھیل اور اسپورٹس میں جن سے ابھی تک اسے ذرا بھی مس نہ تھا وہ چھپا رستم نکلتا اور بہت سارے کپ اور شیلڈ جیت کر لے آتا۔ لڑکے اس کے کمرے کو جو کھیل کی فتوحات اور طرح طرح کے تمغوں کا عجائب خانہ بن گیا تھا جوق جوق دیکھنے کے لئے آتے۔ لڑکے اور لڑکیاں ——— مگر لڑکیاں اندر قدم نہ رکھتیں، باہر سے جھانک کر چلی جاتیں۔ عملی زندگی کی تصویریں نسبتاً غیر معین اور مبہم تھیں مگر ان میں بھی کامیابی، شہرت اور ہردلعزیزی اس کے قدم چومتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کبھی تعلیم، کبھی تصنیف و تالیف کبھی کاروبار، کبھی خدمت خلق اور کبھی سیاست کے میدان میں۔ یہ باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آجاتی اور خواب میں خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور بکھرا ہوا بے جان تصور کے بجائے جاندار اور متحرک تصویروں کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر جب الہ آباد جانے کا دن قریب آگیا، تیاریاں مکمل ہو گئیں روانگی کا وقت مقرر ہو گیا تو یکایک ظفر کی چڑھتی ہوئی امنگیں اتر گئیں۔ وطن کی مانوس فضا اور جانے بوجھے لوگوں سے جدائی اسے سخت تکلیف دہ نظر آنے لگی، غیر مقام اور غیر لوگوں میں جا کر رہنے، نئی زندگی اور نئے حالات سے سابقہ پڑنے کے خیالات سے وحشت ہونے لگی۔ خیالی فتح مندیوں اور کامرانیوں کی جگہ اب خیالی مشکلیں اور رکاوٹیں اس کے ذہن پر مسلط ہو گئیں۔ کالج میں پڑھائی اور بات چیت انگریزی میں ہو گی۔ نہ جانے میں اچھی طرح سمجھ سکوں گا اور بول سکوں گا یا نہیں، اب تک تو بالکل مشق نہیں کبھی بولنے کا موقع پڑتا ہے تو اٹک اٹک کر دو چار جملے کہتا ہوں اور پھر گاڑی رک جاتی ہے بلکہ اگر کوئی تیز بولتا ہے تو سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ امتحان میں سوالوں کے جواب بھی انگریزی میں دینا پڑیں گے۔ انگریزی میں ٹیکسٹ کا مطلب تو میں اچھی طرح بیان کر دیتا ہوں، مضمون بھی لکھ لیتا ہوں۔ مگر دوسرے مضامین میں کیا ہو گا، اور وہاں مضمون کون سے لوں گا۔ ہردیال کو تو ماسٹر صاحب نے تاریخ، سوکس، اور اکنامکس لینے کی رائے دی ہے۔ میں تاریخ اور فارسی لے لوں۔ اب سائنس اور ریاضی وغیرہ کو چھوڑ کر بھی سوکس اور اکنامکس رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک لینا ہو گا۔ خدا جانے ان میں کیا ہوتا ہے مجھ سے چلیں گے بھی یا نہیں؟ استادوں سے کچھ زیادہ مدد ملنے کی امید نہیں، سنا ہے کلاس میں نوٹس لکھوا دیتے ہیں اور بس۔ طالب علموں کی انفرادی مشکلات کو حل نہیں کرتے اور کر بھی کیسے۔ ہر کلاس میں سیکڑوں لڑکے ہوتے ہیں بہت سی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، لڑکیاں لڑکوں کے پاس کیسے بیٹھتی ہیں؟ آپس میں باتیں کرتے شرم نہ آتی ہو گی، مجھ سے تو کوئی لڑکی بات کرے گی تو شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گا۔ اگر اس نے سب کے سامنے میرا مذاق اڑایا تو کیا ہو گا۔ لڑکیوں کے تصور میں اسے گھبراہٹ کے ساتھ لطف بھی آیا۔ اس لئے بڑی دیر تک اس میں الجھا رہا۔ اسی سلسلے میں اسے حسینہ کا خیال آگیا جس سے بچپن میں اس کی نسبت ہوئی تھی اور اب اس کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

ظفر نے حسینہ کو آخری بار آٹھ برس ہوئے دیکھا تھا جب وہ آٹھ نو برس کی تھی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ نازک اندام شرمیلی اور خوبصورت تھی۔ جب تک اس کی والدہ زندہ تھیں اکثر اس کی شادی کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہ اس ذکر سے خوش ہوتا تھا مگر شرما کر بھاگ جاتا تھا اور تھوڑی دیر اس خیال سے جی بہلا کر اسے بھول جاتا تھا۔ اتنی دلچسپی اسے نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اس موضوع کو اپنے تصورات کے سلسلے میں کوئی خاص جگہ دے۔ اب چار برس سے جب سے کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا اسے حسینہ کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ تھوڑے دن ہوئے اسے یہ معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب انجینیر ہو کر الہ آباد آگئے ہیں، حسینہ نے مڈل پاس کر لیا ہے اور اب نویں درجے میں داخل ہو گئی۔ میر صاحب نے الہ آباد سے واپس آکر اسے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے ظفر اور حسینہ کی شادی جلد ہو جانے کی تحریک کی اور وہ نامنظور ہو گئی۔ پھوپھی کے گھر رہنے کی تجویز سن کر ظفر نے کہا تھا کہ ان کا احسان لینا مناسب نہیں۔ میر صاحب نے اسے دخل در معقولات کا ملزم قرار دے کر ڈانٹا تھا مگر اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ بات آئی گئی ہوئی مگر ظفر کے دل میں پھوپھی کی اور اس کی حسین بیٹی کی یاد کو تازہ کر گئی۔

اب اس کے دل میں اور طرح طرح کی فکروں کے ساتھ ایک فکر یہ بھی کھٹک رہی تھی کہ الہ آباد میں اسے حسینہ اور اس کے والدین سے تعلقات کی تجدید کرنی ہو گی۔ وہ نئے آدمیوں سے ملنے سے گھبراتا تھا اور ان لوگوں سے وہ اتنا کم واقف تھا اور اتنے دنوں کے بعد ملنے والا تھا کہ وہ اس کے لئے قریب قریب نئے تھے۔ جس زمانے میں اس کی نسبت حسینہ سے ہوئی تھی صفدر علی صاحب اسسٹنٹ انجینیر تھے اور مالی اعتبار سے میر صاحب جنہیں تحصیلداری کی تنخواہ کے علاوہ جائداد کی معقول آمدنی تھی ان سے زیادہ خوش حال تھے۔ اب صفدر علی انجینیر ہو گئے تھے اور میر صاحب کی آمدنی اتنی کم ہو گئی تھی کہ وہ ان کے مقابلے میں غریبوں میں شمار ہونے کے لائق تھے۔ ظفر کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی مفلسی کی وجہ سے صفدر علی صاحب کے گھر میں اس کے ساتھ بے پروائی کا بلکہ ذلت کا برتاؤ نہ ہو۔ پھوپھی عقیلہ تو کبھی ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ بڑی نیک اور سمجھدار بیوی ہیں۔ اماں مرحومہ میں اور ان میں آپس میں بڑی محبت تھی اور مجھے بھی بچپن میں بہت چاہتی تھیں مگر صفدر علی صاحب اسی زمانے میں صاحب بہادر تھے اب تو ان کا دماغ ساتویں آسمان پر ہو تو تعجب نہیں اور حسینہ؟ کوئی سولہ سترہ برس کی ہو گئی ہو گی، جانے کیسی نکلی ہو، باپ کی طرح یا ماں کی طرح۔ صورت شکل پہلے ہی کیا کم تھی اب تو غضب کی حسین ہو گی۔ غرور حسن تو مشہور ہی ہے اگر اس کے ساتھ دولت کا غرور بھی ہوا تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ خیر نہ دیکھے مجھے کیا پروا ہے، اور میں وہاں جاؤں ہی کیوں؟ اماں کے انتقال کے بعد سے ان لوگوں سے خط و کتابت تک بند ہے۔ جب انہوں نے تعلق نہ رکھا تو مجھے کیا ضرورت ہے؟ مگر نہیں ابا جان ابھی مل کر آئے ہیں وہ لوگ بہت اچھی طرح ملے بلکہ پھوپھی نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے کہا۔ ایک بار جانا ضرور چاہئے اگر صفدر صاحب یا حسینہ نے بے رخی برتی تو پھر دیکھا جائے گا۔"

روانگی کے دن سے پہلے رات کو بستر تنہائی پر وہ اپنی زندگی کے آنے والے دور کو چھوڑ کر پچھلی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی عمر کے اٹھارہ برس میں سے چودہ سال ماں کی محبت سے اور پچھلے چار سال اس محبت کی یاد سے معمور تھے۔ کئی باتوں کے لحاظ سے اس کا بچپن بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کی صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کی والدہ کی بیماری کی وجہ سے عموماً گھر کی فضا پر ایک افسردگی سی چھائی رہتی تھی۔ گھر میں اور بچے نہ تھے جن کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملتا۔ [illegible] میں اس کے والد اسے بہت پیار کرتے تھے جس کی یاد اب کچھ دھندلی سی باقی تھی۔ مگر جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ان کا لطف و کرم قہر و غضب سے بدل گیا تھا۔ وہ بات بات پر ڈانٹنے اور گھڑکنے لگے تھے۔ اسکول کے نیچے درجوں میں اس کے ہم جماعت اس کی کمزوری اور بزدلی سے فائدہ اٹھا کر اسے دق کرتے رہتے اور اکثر اس کی ہتک بھی کر دیتے۔ چونکہ وہ عام طور پر خاموش اور سہما رہتا تھا اور استادوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے گھبراتا تھا اس لئے ایک عرصے تک وہ کند ذہن اور بد شوق سمجھا گیا۔ اور اسے بے جا خفگیاں اور سختیاں سہنی پڑیں۔ مگر ان کانٹوں بھری جھاڑیوں کے بیچ میں ماں کا پیار پھولوں کا ایک سدا بہار پودا تھا جس نے ظفر کی زندگی میں شادابی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ گو اس کی والدہ کے انتقال کو چار ہی برس گذرے تھے مگر ان کے چہرے کے خد و خال کا نقش اس کے حافظے میں بہت دھندلا ہو گیا تھا بس امڈتی ہوئی شفقت، چھلکتی ہوئی محبت اور ایک غمگین تبسم، دل کش اور دلدوز تبسم کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی۔ اس وقت یہ تصویر ایک چھلاوے کی طرح تاریک فضا میں رہ رہ کر چمکتی ہوئی اڑی چلی جا رہی تھی اور ظفر اس کے پیچھے دوڑتا ہوا گذری ہوئی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ پچھلی زندگی کے مناظر اس کی تصور کی آنکھوں میں ایک ایک کر کے آرہے تھے ..... میعادی بخار کی شدت سے بستر پر پڑا ہے آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی ہیں ایک چہرہ جو کمزوری سے ستا ہوا اور پریشانی سے اترا ہوا ہے۔ جس میں خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس کے اوپر جھکا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ جو برف کی طرح ٹھنڈا ہے اس کے ماتھے پر رکھا ہے، دو ہونٹ جن پر سپڑیاں جمی ہوئی ہیں آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں "یا اللہ تیری مشیت میں بندوں کو دم مارنے کی مجال نہیں مگر دعا مانگنے کی تو نے اجازت دی ہے، حکم دیا ہے، یہ تیری عاجز گنہگار بندی تجھے محمد اور آل محمد کا واسطہ دے کر تجھ سے دعا کرتی ہے میرے ظفر کو بچا لے اور اس کے بدلے مجھے دنیا سے اٹھا لے۔ میرے مولا تو نے مجھے بہت سی نعمتیں

دیں مگر سب سے بڑی نعمت یہ بچہ ہے۔ جس نے بڑے دکھ اٹھاکر اسے پالا ہے۔ اپنی جان اس کے اندر کھپا دی ہے پھر اماں وہ جسم آپ کسی کام کا نہیں اسے مٹی میں مل جانے دے مگر اس ننھی سی جان کو زندگی دے۔ اس کے باپ کے سائے میں پروان چڑھا اور اس قابل بنا دے کہ دنیا میں بڑے کام کرے اور بڑا نام پائے۔"

گرمیوں کی ایک ٹھنڈی صبح ہے وہ کسی کے شانہ پکڑ کر ہلانے سے گہری نیند سے چونکتا ہے۔ اماں کی مسکراتی ہوئی شکل نظر آتی ہے۔ "اٹھو بیٹے ساڑھے پانچ بج گئے ساڑھے سات بجے تمھیں مدرسے پہنچنا ہے۔ تم نماز پڑھ کے کلام مجید پڑھ لو۔ اتنے میں تمھارے لئے ناشتہ تیار کر لیتی ہوں۔" "مگر اماں آپ کو تو رات بخار تھا آپ چولہے کے پاس نہ جائیے وزیر ناشتہ تیار کرے گی۔" "نہیں بیٹا میں اب بالکل اچھی ہوں [illegible] کی پکیاں تمھیں اچھی نہیں لگتیں [illegible] کام [illegible] ایسا لگتا ہے [illegible] آٹا گوندھ کر ایک [illegible] پکیاں [illegible] کا چل جاتا ہے، تمھارا آج امتحان ہے اگر کچھ کھایا نہ گیا تو پرچہ کیسے ہوگا" ....

وہ پریشان، رنجیدہ، دل شکستہ اپنے کمرے میں چوکی پر کلام مجید کھولے بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں جنھیں وہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رات اماں کو درد کا شدید دورہ پڑا تھا۔ وہ بچے کمرے [illegible] سے ڈاکٹر کے آنے جانے، لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز آتی رہی۔ اس کا دل بے قرار تھا کہ جا کر اماں کو دیکھے اور ان کی خدمت کرے۔ مگر ابا جان کا کڑا حکم تھا کہ جب اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو وہ ان کے کمرے میں قدم نہ رکھے۔ جان جانے کا تو کیا ذکر ہے اس کی اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ دروازہ کھول برآمدے میں جائے اور باہر سے جھانک کر دیکھے۔ کبھی پلنگ پر پڑا کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی اٹھ کر دروازے کی درز سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا تھا۔ دو بجے کے بعد جب مریضہ کو سکون ہوا اور گھر میں خاموشی چھا گئی تو وہ بھی سو گیا۔ صبح نماز کے وقت آنکھ نہیں کھلی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ابا جان نے جھنجوڑ کر اٹھایا اور بہت بری طرح ڈانٹا۔ اس وقت جب وہ قضا نماز پڑھنے کے بعد کلام مجید پڑھ رہا ہے اس کے دل میں ابا جان کے یہ الفاظ رہ رہ کر نشتر کی طرح چبھ رہے ہیں "ماں غریب رات بھر درد سے تڑپتی رہی، صاحبزادے پاؤں پھیلا کر دن چڑھے تک سوتے رہے، نماز، قرآن کی تلاوت سب غائب" ابا جان کی ناانصافی کا جو رنج ہے اس سے کہیں زیادہ یہ خیال اس کے دل میں کھٹک رہا ہے کہ اماں نے ان کے جھڑکنے کی آواز سنی ہوگی تو ان کو کتنا رنج اور صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ جا کر اماں کے قدموں پر گر پڑے اور رو رو کر ان سے وہ باتیں کہہ دے جو ابا جان سے نہیں کہہ سکا۔ اتنے میں کسی کی آہٹ سنائی دیتی ہے مڑ کر دیکھتا ہے تو ضعف سے نڈھال ماں ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتی چلی آ رہی ہے۔ ہونٹوں پر وہی شگفتہ، دلکش، دل نواز تبسم ہے اور آنکھوں میں خلق، ترس، محبت۔ وہ بے اختیار اٹھ کر ننگے پاؤں دوڑتا ہے اور ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ اماں اپنی ناطاقتی کے باوجود اسے کھینچ کر پیار کرتی ہیں "ہائے میرا بچہ کیسا اداس ہے، بیٹا تم اپنے ابا کے کہنے کا برا نہ ماننا، میں جانتی ہوں کہ تم میری تکلیف کی فکر میں جاگتے رہے اور صبح ہوتے آنکھ لگ گئی۔ ان کے تو غصے میں حواس جاتے رہتے ہیں اور اصل میں غصہ نہیں رنج، تکان اور پریشانی کی جھنجھلاہٹ ہے۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جن کا غم غصہ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔"

پردۂ تخیل پر یہ بے ربط فلم کچھ دیر تک جاری رہا تھا کہ ظفر کو غیر محسوس طور پر نیند آگئی اب وہ خواب دیکھ رہا تھا اور اسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں کو سمیٹ کر اپنے شانوں کو اس طرح بھینچ لیا تھا جیسے ماں کے گلے سے لپٹا ہوا ہو۔ اس کی پلکوں پر آنسو تھے اور ہونٹوں پر بھی وہی مسکراہٹ جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔

(بقیہ ہندوستان)

جہاں [illegible] شہر [illegible] سکے [illegible] آباد کئے جائیں گے [illegible] شہری پناہ گزینوں کے لئے [illegible] ایسا نیا شہر آباد [illegible] اور شہر بسانے کے لئے اگر ہو سکے تو [illegible] کو [illegible] کیا جائے۔ نئے مکانوں کی تعمیر کے لئے [illegible] نئے مکانوں کو تعمیر کرایا جائے اور اس کام کے لئے صوبوں کی حکومتیں [illegible] اور ریاستیں پناہ گزینوں کو روپیہ قرض دیں۔ اس میں جو نقصان ہو اس کا کم سے کم نصف حصہ برداشت کرنے میں مرکزی حکومت شرکت کرے۔ مقامی حکومتیں پناہ گزینوں کی مردم شماری کا کام فوراً [illegible] تک ختم کر لیں [illegible] بیکار [illegible] جہاں [illegible] ہو سکے [illegible] اصول پر چلائے جائیں۔

مسئلہ خاصا وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اس کے جلد پوری طرح حل ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ [illegible] بہت عرصہ تک چلتی رہیں گی۔ زراعت پیشہ اور صنعتی پیشوں کے لوگ تو کہیں نہ کہیں کھپ ہی جائیں گے لیکن سب سے مشکل مسئلہ تاجروں اور دکانداروں کا ہے۔ یہ بہت بڑی تعداد میں آئے ہیں اور ان میں انفرادی ملکیت اور مقابلہ و مسابقت کا جذبہ بہت قوی ہے۔ ہر جگہ ان کے مقامی حریف ان کے خلاف نظر آتے ہیں۔ انھیں حکومت ہند کی امداد باہمی کی تجویزوں اور اشتراکی منصوبوں میں شریک کرنا ایک مشکل کام ہے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مقامی لوگوں کو حسب سابق اپنا کام چلانے کی پوری آزادی ہو۔ ہماری رائے میں انھیں ان کو نئے شہروں میں اپنے پرانے ہی رنگ میں کاروبار کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ اگر پورے ہندوستان میں صنعت اور تجارت کی نئی تنظیم ہوگی تو یہ خود بخود اسی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ (م ع)

(بقیہ بزم بے تکلف)

"ضبط تو لیجے تو ضبط تو لیجے بہرحال بہتر ہے"

"بہتر کیا ہے بالکل خلاف فطرت"

"قبلہ انسان بڑا فطرتی ہے۔ ان [illegible] ہوائی فطرت کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر ان کی فطرت بنا لیتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو ہم سے تو یہ برداشت نہیں ہونے کی"

"تو پھر بدعت نہ اختیار کیجئے۔ ضبط نفس سے کام لیجئے"

"اب وعظ پر اتر آئے۔ بخشئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا"

"خدا کے لئے دوسرا مصرعہ نہ پڑھئے گا"

دلچسپ معلومات

جنوبی مغربی افریقہ میں کاؤکو ویلٹ کے بنجر علاقے میں ایک پتھرایا ہوا جنگل دریافت ہوا ہے۔ جو سائنس دانوں کے اندازے میں بیس کروڑ سال پہلے کا ہے۔ یہ جنگل ۱۲۰ ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا ہے اور جابجا درختوں کے پتھرائے ہوئے تنے ایک بجھے ہوئے آتش فشاں کے لاوے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بعض تنوں کا قطر ۵ فٹ سے لے کر ۶ فٹ تک اور لمبائی ۱۰۰ فٹ ہے۔ ان کی لکڑی [illegible] اور اسی قسم کے پتھروں میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ [illegible] اور بعض عجیب و غریب قبل تاریخی جانوروں کی ہڈیاں اور انسان کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے بھی ملے ہیں جو پتھرا چکے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے مطالعے سے [illegible] انسان کے بارے میں بہت کچھ مفید معلومات حاصل ہوئی ہے۔

گیلپ پول کے ذریعے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندوں سے متعلق جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے یہ نتیجے نکلتے ہیں۔

مردوں کا اوسط قد ۵ فٹ ۱ انچ اور وزن ۱۵۰ پونڈ (تقریباً دو من) ہوتا ہے۔ عورتوں کا اوسط قد ۵ فٹ ۴ انچ اور وزن ۱۳۲ پونڈ (تقریباً پونے دو من)

عورتیں خوش مزاج شوہروں کو پاکباز شوہروں پر ترجیح دیتی ہیں۔ مگر انھیں شکایت ہے کہ عام طور پر [illegible] کم ملتی ہے۔ وہ شادی کے پہلے سال بچہ ہونا پسند نہیں کرتیں اور تین بچوں کو بہت کافی سمجھتی ہیں۔

میاں بیوی میں لڑائی جھگڑے سب سے زیادہ روپیہ پیسہ پر اور اس کے بعد زیادہ تر کلب جانے اور بچوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ستر فی صدی بڑے بچوں کو تنبیہ کے طور پر مارنے کے قائل ہیں۔ بہت ہی کم والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے ہو کر عملی سیاست میں حصہ لیں کیونکہ ان کے خیال میں سیاست آدمی کو رشوت خوار اور چالباز بنا دیتی ہے۔

بالغوں میں ۶۶ فی صدی عینک استعمال کرتے ہیں۔ پوری آبادی میں دس فی صدی بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس موٹر کار ہے ان میں ایک تہائی سے بھی کم اپنی موٹر کا نمبر یاد رکھ سکتے ہیں۔

عام طور پر لوگ [illegible] رات کو سوتے ہیں اور ساڑھے [illegible] بجے صبح اٹھتے ہیں۔ انھیں نیند بستر پر لیٹتے ہی آ جاتی ہے اور صبح آنکھ بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔ سنیچر کی رات کو [illegible] بجے تک جاگتے ہیں اور اتوار کی صبح کو آٹھ بجے تک سوتے رہتے ہیں۔

۶۰ فی صدی بالغ شراب اور تمباکو کا استعمال کرتے ہیں۔

۶۶ فی صدی ابراہام لنکن کو جارج واشنگٹن سے بڑا سمجھتے ہیں۔ زندوں میں امریکنوں کے نزدیک جنرل میک آرتھر، آئزن ہاور، چرچل، ٹرومین اور مارشل سب سے بڑے آدمی ہیں۔

۹۶ فی صدی امریکی خدا کے قائل ہیں اور ۶۲ فیصدی [illegible] صرف ۲ فیصدی اپنے کو ناشاد سمجھتے ہیں، ۵۸ فیصدی کہتے ہیں ہم خاصے خوش ہیں اور ۳۸ فیصدی کہتے ہیں کہ بہت خوش ہیں۔ [illegible] فیصدی کا رہیں جو اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

دعوتِ فکر

سالکؔ

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ ہیں دیکھی کوئی رسوائی سی رسوائی ہو

ہمارا ملک عام طور پر اور مسلمانوں کی جماعت خاص طور پر جس نازک اور خطرناک دور سے گذر رہی ہے اس میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی اعمال پر غور کرنا سیکھیں۔ اپنے خیالات اور جذبات پر سچی کے ساتھ احتساب کریں اور جو خرابیاں ان میں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کہوں تو بات بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور نظری حیثیت سے کوئی اس کی مخالفت نہ کرے گا لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ بہت کم لوگ اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور بہت سے واقعیت پسند لوگ تو یہ پوچھیں گے کہ اس بیسویں صدی میں غور و فکر کی اہمیت ہی کیا ہے؟ جب بین الاقوامی سیاست کا سارا دار و مدار مادی طاقت پر ہو اور قومی سیاست اور جماعتوں کے باہمی تعلقات نفرت، تعصب، جتھہ بندیوں اور ووٹوں کی تعداد کے ساتھ وابستہ ہوں تو طبع سلیم پر زور دینے سے کیا حاصل؟ اور نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سن سکتا ہے؟ توپوں اور ہوائی جہازوں اور ایٹم بموں کے سامنے ایک مفکر کی کیا حیثیت ہے؟ جہاں قومیں اور جماعتیں جذبات سے مغلوب اور معقولیت سے بیزار ہوں وہاں ایک نقاد کو کون پوچھتا ہے؟ اس عالمگیر یورش میں جب انسانی تہذیب اور تمدن کا نظام آنکھوں دیکھے برہم ہوتا چلا جاتا ہے اور تعصب اور تخریب کی اندھی قوتوں نے مذہب اخلاق اور انسانیت کے چراغوں کو تقریباً بجھا دیا ہے لوگوں کو "دعوتِ فکر" دینا تیز آندھی میں چراغ جلانے کی ایک ناکام کوشش ہے اور بس! اور بعض دفعہ یہی سوچتا ہوں کہ غور و فکر فطرت انسانی کی بنیادی جبلتوں میں بھی شامل ہے یا نہیں؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان فکر کی زحمت سے بچنے کے لئے ہر قسم کی آڑ تلاش کرتا ہے تعصب اور ضد کا جنون، عادت کا معمول، یا پھر اجمال کی بے فکری، خوش عقیدگی کا اندھا پن۔ غرض جو عذر بھی اسے مل جاتا ہے اس کی پناہ لیتا ہے تاکہ اس کے دماغ پر فکر کی آنچ نہ آنے پائے! بیشتر لوگ اس بات پر بالکل مطمئن ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص ان کے بجائے سوچنے کا فرض انجام دے اور انہیں جانوروں کی طرح صرف یہ بتا دیا جائے کہ انہیں کیا کرنا ہے تاکہ وہ بغیر سوچے سمجھے [illegible] وہی کرتے رہیں۔ ہندوستان کی سیاست ابھی ایک ایسے دور میں سے گذر رہی ہے جب خصوصاً مسلمانوں کی جماعت میں دیانت داری کے ساتھ تنقید کرنا، یا کسی عام رجحان سے اختلاف کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا اور لوگوں میں سچی تنقید کرنے یا سننے کی صلاحیت بالکل جاتی رہی تھی۔ اہل سیاست نے عمداً یہ کوشش کی کہ جس طرح فوج کے سپاہی قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں اور اس میں ادل بدل ممکن نہیں اسی طرح قوم کے تمام افراد کی ذہنی چال بھی بالکل ایک سی بن جائے اور اس میں شاید انہیں اپنی توقع سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی۔ لیکن اب کے ملک کی تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا ہے۔ اور ہمیں بالکل نئے مسائل اور ایک نئی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے تو ہم سب کا فرض ہے کہ تنقید اور فکر کی روایات کو تازہ کریں اور اپنی ملکی اور ملی حالت پر غور کر کے صحیح راستہ تلاش کریں جو صالح اور حیات بخش تحریکیں ہیں ان کی تائید کریں۔ جو فاسد اور تباہ کن تحریکیں ہیں ان پر بے پناہ تنقید کر کے ان کی روک تھام کریں۔

فکر سے گریز انسانی تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔ دراصل قوتِ فکر انسان کا سب سے بڑا شرف ہے۔ اسی کی بدولت اس نے حیوانوں کی ادنیٰ حیثیت سے ترقی کر کے اپنا موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔ جہاں کبھی کبھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور دنیا میں خدا کا نائب ہے! مگر وہ اسی عطیہ الٰہی کو استعمال نہ کرے تو محض بیرونی قوتوں اور اثروں کا غلام بن کر رہ جائے گا اور اس کے پاس بے بسی اور قنوطیت کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔ وہ اپنی ذہنی کاوش اور عملی کوشش سے اپنی تقدیر کا معمار نہ بن سکے گا بلکہ خس و خاشاک کی طرح طوفان پر سوار ہوگا جو اسے اپنی قوت کے بل جہاں چاہے گا لے جائے گا۔ ممکن ہے وہ اپنے نفس کو یہ سمجھا کر دھوکا دے سکے کہ وہ اس طوفان کا ناخدا ہے لیکن اس کی اصل حالت یہ ہوگی کہ:

دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست!

اگر آپ سوچیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انسان کے پاس اپنی محرومیوں کو دور کرنے اور صحیح راستہ تلاش کرنے کے لئے قوتِ فکر کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں یہ جانتا اور مانتا ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے بعض مشکل ترین مسائل اسی قوتِ فکر کی کارفرمائی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی نے وہ زبردست اور بے پناہ مشینیں اور آلات ایجاد کئے جنہوں نے ہم سے غداری کر کے (یا ہم نے خود سے غداری کی؟) ہماری زندگی کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا۔ اسی فکر کو آلۂ کار بنا کر گذشتہ دو سو برس میں ہماری سماجی اور اقتصادی زندگی نے ایک ایسی شکل اختیار کی جس میں افراد کی آزادی اور ان کی شخصیت کا وقار خطرے میں پڑ گیا ہے اور کلیت کی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جس نے دنیا کی تہذیب کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ لیکن ان فکروں اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی ہمیں اسی قوتِ فکر کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور جس طرح اس نے ہماری مادی طاقت میں بے اندازہ اضافہ کیا ہے اسی طرح اس کی مدد سے ہمیں اپنی سماجی اور اخلاقی زندگی کی عمارت کو درست کرنا ہوگا۔ عقل "بولہب" ہی لیکن اسی "بولہب" کو حیدر کرار بنانا ہے ورنہ دنیا میں انسان کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا!

اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس خواہ مخواہ کی تنقید کو اپنے ذمہ لے کر میں جان بوجھ کر بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ عام طور پر تعصب، نفرت اور خود غرضی کے خمار اور جتھہ بندی کی عافیت کو احتسابِ نفس کی تلخی اور آزادیٔ فکر کے خطروں پر ترجیح دیتے رہیں اور ایک دوسرے کی ہاں سے ہاں ملا کر اپنے ماحول کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور بعض جانوروں کی طرح جو فطرت کی نقالی کرتے ہیں ہر قسم کی مخالفت کے خطرہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں "دعوتِ فکر" دینا ان کی مخالفت مول لینا ہے۔ جس انداز خیال یا تحریک یا تعصب یا توہم کے خلاف کوئی بات کہی جائے گی وہ فوراً ہتھیار بندی اور احتجاج کے لئے تیار ہو جائے گا اور بجائے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے نیت پر حملہ کیا جائے گا۔ یا غیر متعلق چیزوں کو بحث میں شامل کیا جائے گا لیکن اس وقت ہمارے ملک پر جو نازک دور گذر رہا ہے اس میں ہر ایمان دار شخص کو یہ ناگوار فرض انجام دینا چاہئے اور اس کے راستے میں جو مخالفتیں یا رسوائیاں پیش آئیں انہیں صبر اور ضبط سے جھیلنا چاہئے سچی بات کڑوی دوا کی طرح ہوتی ہے اور اس کو پینے میں صرف ناسمجھ بچے ہی ضد نہیں کرتے! اس وقت ہمارے لئے کڑوی دوائیں میٹھے اور نشہ آور شربتوں سے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔ شربتوں کے خمار کا خمیازہ ہم اچھی طرح اٹھا چکے ہیں۔

اس میں بحث اصولوں کی ہوگی یعنی کیا اچھی بات ہے اور کیا بری ہے، کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، کون سی تحریک زندگی کو بنانے والی ہے اور کون سی بگاڑنے والی؟ اس بات کی ضمانت دینا تو ممکن نہیں کہ اصول کی زد میں افراد کبھی نہ آئیں گے لیکن اتنا اطمینان دلا سکتا ہوں کہ افراد سے یا ذاتیات سے براہ راست بحث نہ ہوگی اور چونکہ مقصد کسی خاص پارٹی کی وکالت کرنا نہیں بلکہ اپنے نقطۂ نظر سے صحیح اصولوں کی حمایت کرنا ہے۔ اس لئے کسی خاص فریق یا جماعت کی تائید یا مخالفت کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے امید یہ ہوتی ہے کہ مجھ پر جنبہ داری کا الزام نہیں لگ سکے گا۔ یا کم سے کم ایمان داری کے ساتھ نہ لگایا جا سکے گا۔

آئیے ہم آپ مل کر ہر دو ہفتہ میں ایک دفعہ اڑتے تنکوں سے ہوا کا رخ پہچانیں اور اس بات کا اندازہ کریں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور اس طرف جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

سیمیاس نے کہا "بہت خوب سقراط تو پھر میں تم سے اپنی مشکل بیان کرتا ہوں .... مجھے یہ احساس ہے (اور غالباً تم کو بھی ہوگا) کہ موجودہ زندگی میں اس قسم کے مسائل کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تاہم میں اس شخص کو بزدل سمجھوں گا جو ان کے متعلق ہر قسم کے اقوال کی پوری طرح چھان بین نہ کرے یا ان پر ہر پہلو سے غور کرنے سے پہلے ہمت ہار جائے۔ اسے اس وقت تک استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے جب تک کہ دو باتوں میں سے ایک حاصل نہ ہو جائے۔ یا تو وہ اپنی تحقیق سے یا دوسروں کی تعلیم سے ان کی حقیقت دریافت کر لے۔ یا اگر یہ ناممکن ہے تو میری رائے میں وہ اس انسانی نظریے کو جو سب سے بہتر اور ناقابل تردید ہو اختیار کرے اور اسی بیڑے میں بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو عبور کرے ــــ میں مانتا ہوں کہ یہ صورت خطرے سے خالی نہیں اگر خدا کا کلام اس کی رہنمائی اور حفاظت نہ کرے"

(فیڈو ـ مکالمات افلاطون)

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہمیت جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

(حسرتؔ)

مسئلہ فلسطین کا پس منظر

سید عبدالہادی

مسئلہ فلسطین اب تمام دنیائے عرب کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسئلے کی تاریخ جس نے اب تک کئی رخ بدلے ہیں نہایت دلچسپ ہے۔ ایک مدت سے قریب قریب سب عرب ملک سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ جب ترکوں کی سلطنت پر زوال آنے لگا تو اس کا اثر عرب ملکوں پر بھی پڑا۔ ترکوں اور عربوں کی اس حقیقی حالی کے دوران میں سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنت عثمانیہ اس زمانے میں شل ہو چکی تھی۔ کیونکہ ابھی سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ طرابلس اور بلقان کی لڑائیاں لڑ چکی تھی۔ یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک زوال پذیر سلطنت اتنی جلدی ایک تیسری جنگ کے لئے تیار ہو جائے گی۔ لیکن ان دنوں ترکی میں نوجوان ترکوں کا دور دورہ تھا اور انور پاشا کا طوطی بول رہا تھا۔ انور پاشا ذاتی طور پر تہ دل سے جرمن دوست تھے۔ کیونکہ وہ اپنی شروع کی زندگی میں بطور سفیر کے برلن میں بہت دن قیام کر چکے تھے اور دوسری یورپی قوموں کے مقابلے میں جرمنوں کو پسند کرتے تھے۔ انہیں دنوں سلطنت ترکی برطانیہ کو دو بحری جہاز بنانے کا ٹھیکہ دے چکی تھی۔ یہ دونوں جہاز "گوبن" اور "بریسلا" تیار ہی ہوئے تھے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی۔ برطانیہ نے یہ جہاز ترکی کو حسب معاہدہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر کہ اگر ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا تو یہ جہاز خود انگلستان کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ ترکی نے بجا طور پر یہ کہا کہ برطانیہ کو اپنا معاہدہ پورا کرنا چاہئے۔ سیاسی اور فوجی پیش بندی کا یہ کوئی محل نہیں ہے۔ برطانیہ کے پیہم انکار پر نوجوان ترکوں کو ایک معقول بہانہ مل گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھی بن کر جنگ میں شامل ہو جائیں۔ انھوں نے کئی جگہ خصوصاً دردانیال پر برطانوی فوجوں کے دانت کھٹے کر دئے۔

ترکوں کی سیاسی اور فوجی قوت کو توڑنے کے لئے برطانوی مدبرین اپنی وہی ہمیشہ کارگر ہونے والی سیاسی چال چلے۔ جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کرنل لارنس ایک نوجوان حوصلہ مند انگریز فوجی افسر کو اس کام پر مقرر کیا گیا کہ وہ ترکوں اور عربوں میں پھوٹ ڈال دے تاکہ ترکوں کی قوت منقسم ہو جائے۔

کرنل لارنس کی داستان بڑی عجیب ہے۔ وہ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا اور بلا کا مضبوط، نڈر اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس کے مشورے سے مکے کے شریف حسین عربوں کے سردار بنائے گئے۔ اور سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ وجہ بغاوت یہ بتائی گئی:

(۱) ترک عربوں کو آزادی نہیں دیتے اور عربوں پر بے جا مظالم توڑتے ہیں۔

(۲) ترک شراب پیتے ہیں اور داڑھی منڈاتے ہیں اور غیر مسلم عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں۔

(۳) عرب ایک الگ قوم ہیں اور ان کی اپنی ریاست ہونی چاہئے۔

شریف حسین اور اس کے چاروں نوجوان لڑکوں نے بڑے زور شور سے کرنل لارنس سے مل کر یہ پروپیگنڈا تمام سخت عصبیت رکھنے والے عرب ملکوں میں پھیلا دیا۔ سادہ لوح عربوں نے ان کی باتوں کا پورے طور پر یقین کر لیا۔ مشرق قریب کے سب ملکوں میں ایک آگ لگ گئی اور تھوڑے بہت عرب سپاہی اور افسر جہاں جہاں تھے عربوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

کرنل لارنس اور اس کے عرب ساتھیوں نے جنگ کا ایک عجیب طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ انور پاشا کی فوجی اسکیم یہ تھی کہ وہ براہ سوئز مصر پر حملہ آور ہوں تاکہ برطانیہ کی بہت سی ایشیائی فوج ادھر الجھی رہے اور جرمن افواج کی پیش قدمی شمالی فرانس میں روکی جا سکے۔ اس مدبرانہ منصوبے کو پورا کرنے میں ترک ایک حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ نہر سوئز کے کنارے تک ترکی فوجیں آ گئی تھیں اور نہر پاٹنے کے لئے تھیلوں میں ریت بھر لی گئی تھی کہ کرنل لارنس نے اپنے عرب ساتھیوں کے ساتھ ترکی فوجی لائنوں کے عقب میں مار دھاڑ شروع کر دی۔ ترکی شامی ریلوے جو شام اور فلسطین سے گزرتی تھی اور سوئز تک سامان جنگ پہنچاتی تھی توڑ پھوڑ ڈالی گئی۔ کئی ترکی فوجی ٹرینیں سپاہیوں اور افسروں سے بھری ہوئی بارود سے اڑا دی گئیں۔ راستے کے کوئی چھ سو چھوٹے بڑے پل ڈائنامیٹ سے اڑا دئے گئے اور اسی محاذ پر انور پاشا کو پوری ناکامی ہوئی۔ انور پاشا کے بہترین دوست اور ساتھی جمال پاشا اس محاذ کے کمانڈر تھے۔ لیکن وہ بھی ان مجنونانہ بغاوتوں کا کوئی سدباب نہ کر سکے اور سال ڈیڑھ سال میں ترکوں کی عملداری اس نواح سے بالکل اٹھ گئی۔ آخر جرمنی کو اور ترکوں کو سخت شکست ہوئی۔

لارنس شریف حسین کے بیٹوں یعنی عبداللہ وغیرہ کو عرب ریاستوں کے سبز باغ دکھا چکا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر یہ شہزادے ایفائے وعدہ کے طالب ہوئے۔ چنانچہ فیصل کو عراق کا بادشاہ بنایا گیا اور عبداللہ کو شرق اردن کا۔ فلسطین پر برطانوی سیادت قائم کی گئی اور شام پر فرانس کی۔ یہ دونوں عرب ریاستیں بڑی حد تک برطانیہ کی دست نگر تھیں۔ لیکن جوں جوں برطانوی گرفت ایشیا پر کم ہوتی گئی یہ ریاستیں خود مختار اور مضبوط بنتی گئیں۔

ان کی حالت سنبھلنے کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ عراق اور سعودی عرب کے علاقوں میں پیٹرول بہت افراط سے نکلا اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ اور برطانیہ نے بڑے بڑے ٹھیکے لئے اور تیل کی برآمد پر کروروں روپیہ رائلٹی کا ان لوگوں کو ملنے لگا۔ عرب ملکوں کے خزانے کی حالت قدرے درست ہوئی تو حقوق طلبی اور آزادی کی جو قدرتی رو عام طور پر ایشیا میں دوڑی ہوئی ہے عرب ملکوں میں بھی پہنچ گئی۔ پبلک جمہوری خیالات سے متاثر ہوئی اور حکومتیں کامل خود مختاری کی طالب ہوئیں اور سنہ ۱۹۳۲ء تک یہ ملک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بن گئے۔

اب مسئلے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانیہ جس طرح عربوں سے ساز باز کر رہا تھا اسی طرح فلسطین کے یہودیوں سے اور عام طور پر دنیا کے سب یہودیوں سے بھی ساز باز کر رہا تھا۔ جنگ کے زمانے میں ہر دولتمند کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور یہودیوں کی قیمت اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھی کہ دولت مند قوم کی حیثیت سے انہوں نے قرضوں اور عطیوں کی شکل میں برطانیہ اور امریکہ کو بڑی بڑی رقمیں دی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ نے یہودیوں کو اپنی طرف رکھنے کے لئے دوران جنگ میں مستقل طور پر ان سے بڑے بڑے وعدے کرڈالے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو اعلان بالفور کے ذریعے سے یہودیوں کا "قومی گھر" فلسطین میں بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ دراصل یہ ان کی قومی ریاست بنانے کی تمہید تھی۔ عربوں نے اس خطرے کو ابتدا میں تاڑ لیا تھا لیکن ایک تو وہ بے بس تھے اس لئے سردست کوئی قانونی یا دفاعی کارروائی نہ کر سکے۔ دوسرے اپنی سہل انگاری کی بنا پر انہوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسکین دے لی کہ "اچھا جب یہودی حکومت قائم ہوگی تو دیکھا جائے گا"

فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ رقبہ میں ہندوستان کے صرف دو ضلعوں کے برابر اور آبادی میں صرف ایک اوسط درجے کے ضلعے کے برابر۔ اس وقت وہاں کوئی دس لاکھ مسلمان عرب تھے اور کوئی ایک لاکھ یہودی اور عیسائی۔ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن یہودیوں کے ہم قوم اور مددگار یورپ اور امریکہ میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے سنہ ۱۹۲۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۶ء تک لاکھوں یہودی ہجرت کر کے فلسطین پہنچے۔ انہوں نے جدید طرز کے ہزاروں مکانات بنائے۔ زمینیں خریدیں، تجارت اور زراعت کو فروغ دیا اور قصبات اور شہر آباد کئے جہاں صدیوں سے خاک اڑ رہی تھی وہاں میووں کے باغ لہلہانے لگے۔

یہودیوں میں جو لوگ قومی حکومت کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے صیہونی کہلائے اور اسی نام کی ان کی ایک باقاعدہ قومی جماعت بن گئی۔ ہر یہودی صیہونی نہیں ہے لیکن صیہونیوں کو قدرتی طور پر سب یہودیوں کی ہمدردی حاصل ہے سنہ ۱۹۳۵ء تک جب کئی لاکھ یہودی وہاں آ چکے اور یہودیوں کا زور ملک میں بڑھنے لگا تو عربوں کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے ملک میں بے قاعدہ طور پر مار دھاڑ شروع کر دی۔ برطانیہ حسب دستور کبھی عربوں کو دباتا اور کبھی یہودیوں کو لیکن عربوں کی شورش بڑھتی گئی۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل یعنی سنہ ۱۹۳۹ء تک یہ حالت تھی کہ روزانہ عربوں اور یہودیوں کے مقامی جھگڑوں کی اور دو ایک عربوں، یہودیوں اور برطانوی سپاہیوں کے مارے جانے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے اپنی حکمت عملی سے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ نہ یہودی اس کے خلاف کھڑے ہوئے اور نہ عرب۔ بلکہ دونوں نے قریب قریب اس طرح مدد کی جیسی پہلی جنگ عظیم میں کرتے تھے۔ بیس برس کے تجربے سے کسی نے کچھ نہ سیکھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو فلسطین کا مسئلہ پھر ایک بار بڑی شدت سے اٹھ کھڑا ہوا اور عربوں اور یہودیوں میں لڑائی کا بازار پھر اسی طرح گرم ہو گیا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ اب برطانوی رویہ عربوں کے ساتھ زیادہ نرمی کا تھا۔ برطانیہ نے کسی طرح یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ جلد ملک کو چھوڑنے والا ہے اور وہاں کے باشندے جس طرح چاہیں اپنے ملک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ لیکن اب امریکہ کھلم کھلا یہودیوں کی پشت پناہی کرنے لگا۔ اور اس نے اپنا اثر ڈال کر حفاظتی کونسل میں یہ تجویز پاس کرا لی کہ فلسطین کے دو حصے کر دئے جائیں ایک میں عربوں کی حکومت ہو اور دوسرے میں یہودیوں کی۔ اس کے بعد حالات نے جو صورت اختیار کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

کیا

آپ کا پتہ ٹھیک ہے؟ اگر کوئی غلطی ہو تو ہمیں اطلاع دیجئے۔

مینیجر

اسلامی تہذیب کی روح بسلسلہ صفحہ

ایک جسم اجتماعی بنا دیا ہے اور اس کی نجات اس میں ہے کہ شرافت و انسانیت، عدل و انصاف، محبت اور اخوت، احسان اور ایثار کے سبق کو جو خاصان خدا ہمیشہ سے پڑھاتے آئے ہیں نئے سرے سے پڑھے۔ اس سائنس کے دور میں انسان کو پھر سے یہ سیکھنے کی ضرورت ہے کہ خدا کے نام کو دلیل راہ بنائے اور راضی برضا رہ کر زندگی بسر کرے، تاکہ اپنی خوشی سے مشیت ایزدی کا آلہ کار بن جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صرف معدودے چند آدمیوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔ پوری پوری قومیں یا جماعتیں اس اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتیں۔ لیکن یہ نصب العین کہ طاقت کو قابو میں رکھا جائے اور سائنس سے نوع انسانی کی بھلائی کا کام لیا جائے بجائے خود بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے اور اس سے ہماری ترقی کی سمت متعین ہو جاتی ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے وسیع تر نقطۂ نظر سے ہمیں ہر چیز کا جو زندگی کے اس تصور کو نقصان پہنچائے، خیر مقدم کرنا چاہئے خواہ وہ اسلام کی مذہبی تعلیم ہو یا مہاتما گاندھی، دو میں رولاں اور آئنسٹائن کی اخلاقی تلقین۔

ہندوستان دنیا کا ایک حصہ ہے اس لئے یہ بات اس پر بھی صادق آتی ہے بلکہ اسے اسلامی تہذیب سے اور زیادہ قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ وہ اس تہذیب کا ایک بڑا مرکز رہ چکا ہے۔ اس نے اس تہذیب سے بہت کچھ لیا ہے اور اس کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے باریک دھاگے ہندوستانی تہذیب کی تار پود میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا آرٹ اور فن تعمیر، زبان و ادب، مذہب، فلسفہ ہندوستان کے عظیم الشان تہذیبی ورثہ کا ایک جز بن گیا ہے۔ اس کے معنیوں کا حسن، اس کے مصوروں کی چابک دستی، اس کے عارفوں کی صفائے قلب، اس کے حکمرانوں کا تدبر، اس کے عالموں، ادیبوں، شاعروں کی فارسی، اردو، ہندی، ہندوستانی تصانیف اس ہندوستانی تہذیب میں، جس کی ہمارے دل میں اتنی قدر و محبت ہے، کھپی ہوئی ہیں۔ انہوں نے بہت سے سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے۔ اس لئے کہ ذہن کی دنیا میں سرحدیں نہیں ہوتیں اور علم و ہنر کی ہوائیں بے روک ٹوک ادھر سے ادھر چلتی رہتی ہیں مگر یہ سب اہل علم اور ارباب ہنر اسی زمین پر اُگے، بڑھے اور پھولے پھلے اور اسی کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا۔ ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی تہذیب کے اثرات کو مٹانا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے۔ بے شک جراح کا نشتر یہ عمل کر سکتا ہے لیکن اس کا نظام جسمانی پر جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے ہمارا یہ تقاضا کہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ وسعت قلب کے ساتھ اور قدر شناسی کی نظر سے کیا جائے۔ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود ہندوستان کی آیندہ عظمت کی خاطر ہے اور ان قدروں کی خاطر ہے جن سے دنیا کو کچھ فیض پہنچ سکتا ہے۔

آج روشن خیال قومیں اپنے وقت توجہ اور وسائل کو ان تہذیبوں کے مطالعہ میں صرف کر رہی ہیں جو زمان و مکاں کے لحاظ سے ان سے بہت دور ہیں۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں ایسے علما موجود ہیں جو قدیم مصری تہذیب یا مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کی تہذیبوں اور زبانوں کے مطالعے میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں۔ پھر کیا یہ بات قیاس میں آ سکتی ہے کہ ہندوستان جس میں اب تک چار کروڑ مسلمان موجود ہیں اور جو اسلام سے ایک ہزار سال کے تہذیبی تعلقات رکھتا ہے اسلامی تہذیب کے مطالعے کو ترک کر دے گا یا پاکستان جو کل تک ہندوستانی ریاست کا ایک حصہ تھا اور اب تک ہندوستانی تاریخ اور تہذیب میں برابر کا شریک ہے اپنے سب سے قریبی اور سب سے اہم پڑوسی کی بیش بہا تہذیبی دولت کو نظر انداز کر دے گا؟ نہیں یہ کسی طرح عقل میں نہیں آتا۔ مجھے امید ہے کہ جب فرقہ وارانہ جنون کا دورہ جس میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے لوگ مبتلا ہیں دیر سویر گذر جائے گا تو ہندوستان کی روح جو ہر جگہ سے اچھی چیزوں کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یہاں پھر بیدار ہو جائے گی اور پاکستان کے مسلمانوں میں اسلام کی .... روح نئے سرے سے کار فرما ہوگی اور تہذیبی تعاون اور تعامل کا سلسلہ جو پچھلے دنوں کے واقعات کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے پھر سے شروع ہو جائے گا

نئی روشنی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سیّد عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی دہلی، ئے جامعہ
مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱ || یکم اگست ۱۹۴۸ء || ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

سماجی خدمت

مہاتما گاندھی

دنیا میں ہر خدمت کے لئے، چنانچہ سماجی خدمت کے لئے بھی، ایک ناگزیر شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص خدمت کرنا چاہتا ہے وہ اس کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔ آج ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں گے کہ ہم میں سے وہ لوگ جو اس طرح خدمت کر رہے ہیں اور وہ جو خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اس کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ آپ بھی اس امر میں میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ کام کرنے والے کام کو بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ خواہ ان کی کوشش کتنی ہی پُرخلوص ہو اگر ان میں اس خدمت کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ فائدے کی جگہ الٹا نقصان پہنچائیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے لئے کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔

میرے نزدیک سب سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم ایک ہاتھ میں سچائی اور دوسرے ہاتھ میں بے خوفی لے کر آگے قدم بڑھائیں۔ اگر ہمارے پاس سچائی کی شمع نہ ہو تو ہمیں راستہ نہیں سوجھے گا اور اگر ہم میں بے خوفی کی صفت نہ ہو تو جو پیام پہنچانا چاہتے ہیں وہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہمارا دل خوف سے خالی نہ ہوا تو جب امتحان کی گھڑی آئے گی ہم امتحان میں پورے نہیں اتریں گے۔ اب میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ جو لوگ سماجی خدمت کر رہے ہیں اور جو آگے چل کر کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ان میں یہ دونوں صفتیں ہیں یا نہیں۔۔۔۔۔۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں ۲۳۷۹۴۴۴ آدمی ہیضے، بخار اور پلیگ کے شکار ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ آدھی درجن چوٹی کے ہندوستانی ڈاکٹر اپنی زندگی ان تینوں بلاؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے وقف کر دیں تو وہ کر دکھائیں گے جو انگریز نہیں کر سکے۔ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صحیح راہ علاج کی جستجو نہیں بلکہ انسداد کے طریقوں کی جستجو یا یوں کہئے کہ ان کا استعمال ہے۔۔۔۔۔۔ دراصل ان طریقوں کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں صرف اتنی بات ہے کہ ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ عوام ہرگز انہیں اختیار نہیں کریں گے۔ اس سے زیادہ بے بنیاد الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی کسر شان گوارا کر کے انہیں تسخیر کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ دراصل ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس کام کو حکومت کرے۔ میری رائے میں اس معاملے میں حکومت پیش قدمی نہیں کر سکتی۔ ہم آگے بڑھیں تو وہ ہمارے پیچھے چل کر ہمیں مدد دے سکتی ہے۔ غرض یہاں کے ڈاکٹروں کے لئے اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی ایک پوری فوج کے لئے کام کا بڑا میدان ہے۔۔۔۔

شاید قوم کے خادم کے لئے چاہے وہ اپنا سارا وقت دے سکتا ہو یا صرف تھوڑا وقت مفید خدمت کی اس سے زیادہ آسان راہ اور کوئی نہیں کہ اس اذیت کو دور کرنے کی کوشش کرے جو ریل میں تیسرے درجے کے مسافروں کو اٹھانی پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کا اثر ہمارے کروروں غریب اور متوسط طبقے کے ہم وطنوں پر پڑتا ہے۔ یوں بے بس ہو کر تکلیف اور ذلت کے برداشت کرنے سے ہماری قوم صحیح طور پر پستی کی طرف جا رہی ہے اسی طرح جیسے ہمارے ظالمانہ برتاؤ سے وہ لوگ جنہیں ہم پست طبقہ کہتے ہیں صفائی کے معاملہ میں بے حس ہو گئے ہیں اور خودداری کا تصور تک کھو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ذلت کے گڑھے میں گرنے کے سوا اور کیا انجام ہو سکتا ہے جنہیں ریل کے بدترین ڈبے میں چڑھنے کے لئے جانوروں کی طرح لڑنا پڑتا ہے جنہیں کھڑکی میں منہ ڈال کر گالی گلوچ کرنے کے بعد کھڑے ہونے کی جگہ ملتی ہے، جو سفر کے دوران میں گندگی میں لت پت ہو جاتے ہیں، جو کتوں کی طرح کھانا لیتے ہیں اور کتوں ہی کی طرح کھاتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے سے زیادہ طاقتور آدمیوں کے آگے جھکنے پر مجبور ہیں۔ جو کھچا کھچ بھرے ہوئے خانوں میں کئی کئی رات تک بیٹھے جب موقع پاتے ہیں نیند کی جھپکی لے لیتے ہیں اور اوپر سے ریل کے [illegible] ڈانٹتے ڈپٹتے اور [illegible]

یہاں سماجی خدمت کا کام [illegible] اتنی فکر کی کیا بات ہے [illegible] فرض کا احساس دلائیں، کارڈ اور ریلوے [illegible] ہجوم نہ ہونے دیں اور مسافروں کو چڑھتے اترتے وقت دھکم دھکا نہ کرنے دیں۔ [illegible]

ایک نہایت اہم مسئلہ ہندو اور مسلمان عورتوں کی سماجی حیثیت کا ہے۔ آیا انہیں زندگی کی تعمیر میں اپنے شوہروں کے دوش بدوش پورا پورا حصہ لینا ہے یا نہیں؟ انہیں کا حق ضرور ملنا چاہئے۔ اگر ان کے ساتھ گڑیوں کا سا یا لونڈیوں کا سا سلوک [illegible] ہمارا جسم اجتماعی اسی طرح مفلوج رہے گا۔ اور یہاں میں پھر [illegible] سے یہ عرض کروں گا کہ عورتوں کی آزادی تعلیم سے نہیں بلکہ مردوں کا طرز عمل [illegible] حاصل ہو سکتی ہے۔ تعلیم بہت ضروری ہے مگر اس کی باری آزادی کے بعد آئے گی۔ عورتوں کو وہ درجہ دینے کے لئے جو ان کے شایان شان ہے ان کے کتابی تعلیم پانے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ کتابی تعلیم کے بغیر بھی وہ تہذیب کے لحاظ سے دنیا کے کسی ملک کی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ ان کے مرض کی دوا تو ان کے شوہروں کے ہاتھ میں ہے۔۔۔۔۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا کام قومی زندگی کو متاثر کرے تو ہمارے پاس ایسے کارکن ہونے چاہئیں جو بقول مسٹر گوکھلے کے اپنی ساری زندگی اس کام کے لئے وقف کرنے کو تیار ہیں مجھے دے دیجئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ملک کو ان علتوں سے پاک کر دوں گا جن میں آج مبتلا [illegible]

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
سماجی خدمت	مہاتما گاندھی	۱
اسلامی تہذیب کی روح	خواجہ غلام السیدین	۲
نئی روشنی کے مقاصد	(ادارہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مغربی دنیا		۶
قطعات	اختر انصاری	۷
غزل	اثر لکھنوی	۷
نیا مرحلہ (افسانہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
دلچسپ معلومات		۹
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	"سالک"	۱۰
فلسطین کا پس منظر	سید عبدالہادی	۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے

اسلامی تہذیب کی روح

(۳)

خواجہ غلام السیدین

[illegible] کیونزم کی تعلیم دیتا ہے۔ [illegible] وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ عراقی اور اخلاقی تصورات جن پر موجودہ سماجی اور انصاف کی تحریکیں مبنی ہیں، اسلامی فکر میں محض [illegible] نہیں بلکہ صراحت سے پائے جاتے ہیں [illegible] مسلمان [illegible] خیالات کی طرف سے بے پروا ہو رہے ہیں [illegible] انسانوں کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی [illegible] روح اسلام کا منافی ہے۔ اسلام نے بار بار اجتماعی [illegible] کے اصول پر زور دیا ہے۔ جس کی رو سے کوئی انسان صرف اپنے لئے نہیں جیتا۔ سب ایک ہی اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ایک ہی خاندان کے رکن ہیں۔ ہر ایک اپنے بھائی [illegible] اور اسے ہرگز نہیں چاہئے کہ اس فرض سے جی چرائے۔ قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"ڈرو اس ہولناک مصیبت سے جو صرف
گنہگاروں ہی تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ
سب اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔"

[illegible] کہ دنیا پر [illegible] کے

اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آگ لگا کر [illegible] بچ جائیں گے وہ بڑے [illegible] ہیں۔ [illegible] اسلام نے [illegible] افراد اور قوموں کی باہمی وابستگی پر بہت زور دیا ہے اور [illegible] معاشرے میں اس کی سب سے اہم [illegible] یہ ہے کہ [illegible] کے فرق کو جو ہمیشہ نوع انسانی [illegible] ہے بالکل مٹا دیا۔ مسلمانوں پر [illegible] جائیں مگر یہ بات وہ خوشی اور [illegible] سے سماجی جمہوریت کے قائل [illegible] اور رنگ کے خیالات نے ان کو اور [illegible] متاثر کیا ہے۔ بلال حبشی کی قدر و منزلت [illegible] عالی نسب صحابی سے کم نہیں۔ ان کے [illegible] کا رشتہ نسل اور وطن کے رشتے [illegible] لیکن اسلام انسانوں میں تفریق نسل [illegible] کی بنا پر بھی نہیں کرتا۔ بلکہ صرف ان [illegible] شرافت اور انصاف کے علمبردار ہیں [illegible] گنہگار اور بدکار میں فرق کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام [illegible] الفاظ میں ان اخلاقی اصولوں کا تعین فرمایا ہے [illegible] مسلمان کو عمل کرنا چاہئے:

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو جارحانہ
حملے میں اپنے قبیلے کی مدد کرے، اور وہ
شخص ہم میں سے نہیں جو ناانصافی میں
اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہوا مارا جائے۔"

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کام کے لئے جو انصاف کے [illegible] ہم مذہبی کا واسطہ دینا گناہ ہے اور جو شخص ایسا [illegible] وہ آنحضرت کی امت سے خارج ہو جاتا ہے۔

دراصل قرآن نے انسانی تعلقات کا بنیادی قانون ان الفاظ میں صاف صاف بیان کر دیا ہے:

"ہر کام میں جو اچھا اور نیک ہے ایک
دوسرے سے تعاون کرو لیکن گناہ اور
ناانصافی میں تعاون نہ کرو۔"

یہ ایک قطعی اور صریح حکم ہے جو مذہب کے اس اصول کو ہمیشہ کے لئے رد کر دیتا ہے "بیت مالک کا (یا بیت قرنہ کا) بول بالا چاہئے وہ حق پر ہو یا نہ ہو"۔ حق و باطل، انصاف اور ناانصافی کے اہم ترین سوال کے آگے ملک اور نسل اور مذہب کے رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مسلمان کو ان سب سے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم تعاون کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جو نیکی اور بھلائی کا کام کرنا چاہتے ہیں اور ان سب کے ساتھ تعاون کرنے سے باز رہنا چاہئے جو بے انصافی کی راہ اختیار کرتے ہیں چاہے وہ اپنے منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہوں۔ اقبال نے مرد مومن کی تعریف میں دو شعر کہے ہیں۔ جن میں اسلام کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے:

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر   امر و نہی او عیار خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم   ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

غرض اسلامی تہذیب کی اخلاقی بنیاد جہاں تک عمل کا تعلق ہے "انسانیت" کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ دنیا میں ہر چیز کا مقصد اور معیار انسان ہے، ہندو یا مسلمان، عیسائی یا پارسی، کالا یا گورا، غریب یا امیر انسان نہیں بلکہ محض انسان۔ ہر چیز جو اس کی ترقی میں مدد دے اسے مادی یا روحانی فائدہ پہنچائے قابل قبول ہے اور ہر [illegible] جو اس کے نشو و نما کو روکے یا دبائے، اس کے گرد تعصب یا تفرقے کی دیواریں کھڑی کر دے، اسلام کی روح [illegible] اور رد کر دینے کے قابل ہے۔ انسانی شخصیت کا احترام ماننے محض ذریعہ نہیں بلکہ مقصد سمجھنا اسلامی فکر کا جوہر ہے۔ اقبال اپنے مقالات میں لکھتے ہیں "خودی کو تقویت پہنچانے والے عمل کا سرچشمہ اپنی اور دوسروں کی خودی کا احترام ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک ہم دوسروں کی شخصیت کا، ان کے تصورات اور عقائد کا، ان کے طریق فکر اور عمل کا، اور ان کے اختلاف کا جو وہ ہم سے رکھتے ہیں احترام نہ کریں خود ہماری شخصیت میں بھی ادھورا پن پیدا ہو جائے گی اور اس کی نشو و نما نامکمل رہے گی۔ ایک اور مقام پر اقبال نے "آدمیت" کا تصور بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ تصور تنگ سماجی، سیاسی، یا مذہبی حلقے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی ہمدردی اور رقت قلب کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے اندر مومن اور کافر، پرہیزگار اور گنہگار سب سما جاتے ہیں:

دریں سرا پا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

حرف [illegible] بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خداست

بندۂ حق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

کفر و دیں را گیر در پہنائے دل
دل اگر بگریزد از دل وائے دل

گرچہ دل زندانی آب و گل است
ایں ہمہ آفاق آفاق دل است

(۴)

میں نے اس مضمون میں اسلامی تہذیب کے صرف وہ پہلو دکھائے جو موجودہ زمانے میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک نامکمل تصویر ہے اور ایک لحاظ سے مثالی تصور ہے یعنی اس میں اسلامی تہذیب کی موجودہ حالت نہیں بلکہ اس کا نصب العین دکھایا گیا ہے۔ اس کا عذر میرے پاس یہ ہے کہ اس مذہبی اور تہذیبی تعصب کے زمانے میں جسے جہالت نے اور زیادہ شدید کر دیا ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کی تہذیب کے بہترین عناصر اور ایک دوسرے کی گہری تمناؤں اور حوصلوں کی قدر کریں۔ عام طور پر زمانے کا دھارا گھٹیا اور بے معنی چیزوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ صرف وہی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جو مفید اور اہم ہیں۔ لیکن غیر معمولی حالات میں اور بحران کے زمانے میں اس بات کا بڑا خطرہ ہے کہ کہیں ہم ان چیزوں کو بھی رد نہ کر دیں جو دائمی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ جنہیں ہم نے مل جل کر بڑے صبر اور محنت سے صدیوں میں بنایا ہے۔ یہ خطرہ آج ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس لئے کہ دونوں احیائے ماضی کے مصنوعی جوش کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس چیز کو رد کرنا ہے کیونکہ یہ مقتضائے وقت کے خلاف ہے اور اسلام کی نو ساری روایات کے بلکہ اس کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا بڑا عطیہ انسانیت کو یہی ہے کہ اس نے بین الاقوامی اتحاد پر زور دیا اور نسل، رنگ، اور مقام کے تعصبات کو دور کر کے معاشرتی مساوات اور انسانی برادری کا سبق پڑھایا۔ اقبال کے الفاظ میں اسلام کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس نے ذات پات، عقیدے، رنگ اور طبقے کے مصنوعی اور مصر امتیازات کو مٹا دیا۔ اس نے نسلی تفوق کے خیال کی جو بین الاقوامی اتحاد اور تعاون کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے شدت سے مخالفت کی۔ کوئی شخص جو موجودہ زمانے کے بگڑے ہوئے مزاج سے جس میں یہ خیالات رچے ہوئے ہیں آشنا ہے، وہ اسلام کے اس عطیے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسلام کی تعلیم کا ایک اور قابل قدر پہلو موجودہ زمانے کے اس نازک مسئلہ کو حل کرنے سے تعلق رکھتا ہے کہ طاقت کے نشے میں انسان پر خون سوار ہو گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سائنس کی طاقت نے صنعت اور جنگ کے سانچے میں ڈھل کر دنیا کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ اگر ایک قدم آگے بڑھی تو ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گی۔ اسلام اس طاقت کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے بغیر تمدن کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے خطرناک استعمال کو روکنے کے لئے اس نے انسان کو وہ بصیرت بخشی ہے جو ہمدردی اور محبت کا سرچشمہ ہے۔ اس نے طاقت کو بے قید نہیں رہنے دیا بلکہ قانون الٰہی اور قانون محبت کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا ہے۔ ہم نے قوت کا رشتہ بصیرت سے، سائنس کا مذہب سے، وجدان کا عقل سے توڑ دیا اور دنیا کو اس حالت کو پہنچا دیا کہ اس کے اندر لالچ اور نفرت، تشدد اور استحصال کا زور ہے اور اس کے اوپر ایٹم بم کا عذاب منڈلا رہا ہے۔ آج دنیا کے لئے کوئی امید نہیں اس بھنور سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں [illegible] اس کے کہ یہ روحانی کرب اور جسمانی اذیت اس کی آنکھیں کھول دے اور اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو جائے کہ سائنس اور صنعت کی قوتوں نے ساری نوع انسانی کو سمیٹ کر [illegible]

[illegible]

ہفت روزہ
نئی روشنی دہلی

یکم اگست ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کے مقاصد

(۷)

معقول معاشرت

معاشرت (جسے عمرانی زندگی یا سماجی زندگی بھی کہتے ہیں) آپس میں مل جل کر رہنے کا وہ طریقہ ہے جو کوئی انسانی جماعت اختیار کرتی ہے۔ معاشرتی زندگی رفتہ رفتہ خاندان، کنبے اور قبیلے کی منزلوں سے گذر کر سماج کی صورت کیوں کر پاتی اس کی طرف ہم ایک پچھلے مضمون میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ان قوتوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو ہماری معاشرت کی تشکیل کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طبیعی ماحول یعنی آب و ہوا وغیرہ اور معاشی حالات ہماری پوری تہذیب پر اور خاص کر معاشرت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معاشرتی زندگی کی تشکیل کرنے والی یہی دو مادی قوتیں ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی قوت نہیں۔ لیکن عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ معاشرت کے بنانے اور ڈھالنے میں غیر مادی قوتوں کو بھی دخل ہے۔ جن میں سب سے اہم دو ہیں۔ مذہبی عقیدہ اور عقل۔ بظاہر دیکھنے میں یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے سے متضاد یا کم سے کم بے تعلق نظر آتی ہیں۔ لیکن اصل میں دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ مذہبی عقیدہ ایک خاص فکر و احساس کا نام ہے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں سے نکل کر اس کے شعور پر چھا جائے۔ بعض لوگ عقیدے کا ماخذ وحی الٰہی کو قرار دیتے ہیں اور بعض انسان کے اپنے وجدان کو۔ مگر اس پر سب متفق ہیں کہ وہ عام ذہنی قوانین کا تابع نہیں ہے اور ان کے معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ عقل وہ ذہنی قوت ہے جو (۱) اپنے مقررہ قوانین کے مطابق انسانی فکر و احساس کی حقیقت کو جانچتی ہے (۲) ان میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور (۳) انھیں عملی شکل دینے کی تدبیر سوچتی ہے۔

یہ غلط فہمی کہ مذہبی عقیدہ عقل سے بے تعلق یا متضاد ہے محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کی حقیقت عقل کی کسوٹی پر نہیں کسی جا سکتی یا کسی جائے تو پوری نہیں اترتی لیکن یہ تو عقل کے تین کاموں میں سے ایک ہی کام ہے جہاں تک باقی دو کاموں کا تعلق ہے عقل مذہب کے دائرے میں بھی اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح فکر و عمل کے اور دائروں میں بعض مذہبی عقائد میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور انھیں عملی شکل دینے کی تدبیر سوچتی ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کوئی مذہب اپنی ترقی کے زمانے میں عقل سے بے نیاز نہیں رہا۔ ہاں تنزل کے زمانے میں جب قومیں حقیقی مذہبی روح سے محروم ہو جاتی ہیں اور مذہب کی جگہ وہموں اور رسموں کا زور ہوتا ہے، مذہبی پروہت جو ہر قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں اپنے جہل اور بے عقلی سے یا چالاکی اور خود غرضی سے عوام سے بے چون و چرا اپنی اطاعت کرانے کے لئے عقل کو مذہب کا حریف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔

ہم ہندوستانی اور عام طور پر ایشیا والے ایک مدت سے اسی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ توقع ہو سکتی تھی کہ ہماری معاشرت اوہام و رسوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے گی اور عقل سے کام لے کر اس میں وقت کی ضرورت کے مطابق اصلاح کی جائے گی، شروع میں راجا رام موہن رائے نے، پھر سسٹر انالیٹ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح معاشرت کی تحریک کو زور شور سے اٹھایا۔ مسلمانوں میں سرسید نے حقیقی معاشرتی مسائل مثلاً عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں کی لیکن مغربی تعلیم کا شوق اور ایک خاص حلقے میں عقلیت کا مذاق پیدا کر دیا جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو متفرق اصلاحی کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد وقت کی شدید ضرورت نے سیاست کو ہمارے دل و دماغ پر اس طرح مسلط کر دیا کہ ہم نے اصلاح معاشرت کو بالکل بھلا دیا۔ صرف مہاتما گاندھی کے پاس قوت عمل کا اتنا بڑا خزانہ تھا کہ انھوں نے سارے ملک کی سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کی مہم بھی جاری رکھی اور ان کے سیکڑوں مخلص اور پر جوش ساتھیوں نے اس میدان میں بڑے قابل قدر کام انجام دئے۔ لیکن حالات کے جبر سے ان بزرگوں کی سماجی خدمت صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ اور ان میں بھی اتنی کامیاب نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ اب رہے مسلمان تو ایک مدت تک تو وہ خلافت اور سوراج کے متوالے رہے، اور اس کے بعد ان کے بہت سے لیڈر پاکستان کے نشے میں مست ہو گئے اس لئے اب اصلاح معاشرت پر کیا موقوف ہے، پچھلے تیس سال میں مسلمانوں نے سوا جامعہ ملیہ کے قائم کرنے کے کوئی بھی قابل ذکر تعمیری کام نہیں کیا۔ معاشرت کا کوئی معقول نقشہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ وہم و تعصب کے بندے، رسم و عادت کے پرستار رہے۔ تھوڑے سے مغرب زدہ خاندانوں نے انگریزی تہذیب کے اس سستے نمونے کو اختیار کر لیا جو برطانیہ کے بیرونی مقبوضات میں تعلیم یافتہ دیسیوں کے استعمال کے لئے آتا ہے اور جسے ہم دساورتی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں زندگی کے اور شعبوں کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرت کی بھی نئے سرے سے تشکیل کرنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس کے قائل ہیں کہ ہم معاشرت کے معاملے میں مذہب کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مذہبی عقائد کی صحیح تفسیر اور ان کا صحیح استعمال بغیر عقل اور علم کی مدد کے ناممکن ہے۔ معقول معاشرت کی تعمیر کے لئے سب مذہب والوں کو چاہئے اپنے مذہب کی حقیقی روح کو سمجھنا اور اس کی تعبیر عقل کی روشنی میں زمانے کی ضرورت کے مطابق کرنا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ مذہبی قانون ہمارے ملک میں صرف پرسنل لا کی شکل میں رائج ہے۔ جس کا تعلق تھوڑے ہم ہم سے ذاتی یا خاندانی مسائل سے ہے۔ معاشرتی مسائل ایسے ہیں جن کا دائرہ کسی ایک خاندان [illegible] کی زندگی تک محدود نہیں بلکہ سب ہندوستانیوں [illegible] ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری غیر مذہبی جمہوری کا ریاست [illegible] سازی عام طور پر کسی خاص مذہب کے احکام کے مطابق [illegible] ہو سکتی بلکہ عام انسانی عقل اور قومی مصلحت کے مطابق ہوگی اس لئے ہمیں اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جب معاشرتی مسائل پر بحث کرنی ہو تو اپنے استدلال کی بنا مذہب پر نہیں بلکہ عقل و مصلحت پر رکھیں۔

یہ عام اصول ہیں جن کو ہم معاشرتی مسائل کے متعلق [illegible] رائے کرنے میں مد نظر رکھیں گے۔ ہمارے مقاصد میں ایک [illegible] مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاشرتی خرابیوں [illegible] اور ایک معقول سماج کی تعمیر کی طرف توجہ دلائیں جس [illegible] ہماری سیاسی آزادی بے مغز اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی

بزم بے تکلف

"کہئے حضرت خیریت تو ہے۔ آپ کچھ متفکر معلوم ہوتے ہیں، کیا پھر گھر میں تقریب ولادت ہونے والی ہے"

"بھلا یہ تقریب ولادت کا کون سا موقع ہے"

"موقع محل تو آپ جانیں۔ میں نے تو ایک روایت سنی تھی۔ اصل ماخذ تک پہنچنا دشوار تھا۔ اس لئے آپ سے پوچھ لیا"

"نہیں بھائی آج کل تو اپنی ہی ولادت پر افسوس ہے"

"اب افسوس نہ کیجئے، پرانے دن کی بات ہو گئی اور پھر آپ کا اس میں کیا قصور"

"قصور کیا ہوتا، شامت ہے۔

انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"

"اس میں "انساں بنا کے" محل نظر ہے اور مٹی خراب کی قبل از وقت ہے"

"آپ کو تو ہر وقت مسخرا پن سوجھتا ہے"

"مسخرا پن آنکھوں کے سامنے ہو تو کیسے نہ سوجھے"

"بھئی تم تو آدمی کی جان کو آجاتے ہو، اسی لئے تو تم سے بات کرتے ڈر لگتا ہے"

"اچھا اب جان کی امان ہے۔ کچھ بتائیے تو کہ معاملہ کیا ہے"

"معاملہ وہی ہے جو آپ نے سنا ہے۔ پانچ برس میں چار بچے ہو چکے ہیں اور اب ——"

"نقشہ ایک اور بے جا یا۔ پس ماندہ کا پیش خیمہ آ [illegible]"

"مگر اس میں اتنی فکر کی کیا بات ہے"

"[illegible] تو اور سنئے سو روپے کی آمدنی اور [illegible] پانچ بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا"

"ہاں یہ تو بڑی [illegible] کی خبر ہے۔ جب مرتی نہیں مرتا ہوں نہ کھائے جاتے ہیں مجھکو برخوردار"

"پھر سوچتا ہوں کہ یہ سلسلہ یونہی جاری [illegible] کیا ہوگا"

"کیوں جاری رہے، ضبط [illegible]"

"آپ کو تو انگریزیت چڑھ گئی [illegible] تولید کا نام لینا بھی معیوب ہے"

(بقیہ ملاحظہ فرمائیے صفحہ [illegible])

پچھلا ہفتہ

راج پرمکھوں کی کانفرنس

دو ہفتے ہوئے "ریاستوں کی وزارت کی سال گرہ" کے عنوان سے ہم نے اس کام کی تعریف کی تھی جو ریاستوں کو ہندوستان سے متحد کرنے کے سلسلے میں ریاستوں کی وزارت نے انجام دیا ہے اور آخر میں کہا تھا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے۔ بہت سے ضروری کام کرنا باقی ہیں۔ ریاستوں کے طرز حکومت میں بنیادی تبدیلی کرنا ہے وغیرہ۔ ہمیں خوشی ہے کہ ریاستوں کی وزارت نے اپنے کام کے اس دوسرے حصے کو بھی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا ہے۔ سردار پٹیل کی رہنمائی میں ۱۷ - اور ۱۸ جولائی کو راج پرمکھوں ان کے عوامی وزیروں اور مختلف صوبے کے وزیروں اور دوسرے متعلقہ افراد کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں ریاستوں کے طرز حکومت کی اصلاح، ان کی معاشی اور سماجی پالیسیوں، محاصل کے نظام، عوامی وزیروں اور راج پرمکھوں کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں نہایت اہم اور دوررس فیصلے کئے گئے نئے دور میں [illegible] کے بعد [illegible] اور اسمبلی میں ریاستوں کی نمائندگی کے مسئلے پر بھی نظر ثانی ضروری ہو گئی تھی اس کے بارے میں طے کیا گیا کہ اب ریاستوں کے نمائندے بھی منتخب ہو کر آئیں۔ اس کے متعلقہ انتخابات کا تعین کیا گیا اور ریاستی [illegible] امید وار بننے کی اجازت

[illegible]وں کے طرز حکومت کا معیار انڈین [illegible] کے مقابلے میں بہت گرا ہوا ہے۔ اکثر [illegible] عہد وسطیٰ کے جاگیرداری نظام کا [illegible] دورہ ہے۔ نئے نظام میں ریاستوں کے جو اتحاد بنائے گئے ہیں ان کے لئے ایک سکریٹریٹ، خود مختار عدالت، آڈیٹر جنرل، خود [illegible] پبلک سروس کمیشن اور ریونیو بورڈ وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کارروائیاں من مانے طریقہ پر نہ ہوتی رہیں، انتظام حکومت کا معاملہ چونکہ کارگزار عہدہ داروں اور عملہ کا محتاج ہے۔ اس لئے موجودہ انتظام میں کانٹ چھانٹ ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک عارضی کمیٹی کا تقرر کیا گیا ہے جو انڈین یونین کے نمونے پر تمام ملازموں کی نئی تنظیم کرے گی۔ سینیر جونیر کی فہرست تیار کرے گی اکا دجہ مقرر کرے گی قواعد ملازمت بنائے گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ کام چونکہ بغیر باہروں کی رہنمائی کے نہیں کیا جا سکتا اس لئے

ہندوستان

انڈین یونین انھیں فراہم کرنے پر راضی ہو گئی ہے۔ یہ لوگ ریاستوں کی یونین کا برابر دورہ کرتے اور مفید ہدایتیں اور مشورے دیتے رہیں گے۔

سب سے اہم مسئلہ ریاستوں کی یونین کے عوامی وزیروں اور ان کے راج پرمکھوں کے باہمی تعلقات کا ہے۔ ان پر بھی اس کانفرنس میں منعقد جلسوں میں جو علاحدہ جلسوں میں بحث ہوئی اور ان کے علاوہ میں بھی باہمی رضامندی سے فیصلے کئے گئے۔ ان کی تفصیلات شائع نہیں کی گئی ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس معاملے میں کہاں تک ریاستوں کا یہ نیا نظام انڈین یونین کے جمہوری معیار پر لایا جا سکے گا لیکن یہی دراصل وہ کسوٹی ہے جس پر آخر میں ریاستوں کی وزارت کے سارے کاموں کو جانچا جائے گا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ریاستوں کی وزارت کے نقطۂ نظر میں مقامی جمہوریت کا درجہ اتحاد اور تنظیم کے بعد آتا ہے۔ ریاستوں کے جمہور کی موجودہ غیر منظم حالت میں شاید اس کا یہ خیال ٹھیک ہی ہے لیکن ایسی صورت میں مرکزی جمہوریت کی مداخلت ریاستی معاملات میں اور زیادہ بڑھنا چاہئے۔ راج پرمکھوں کو ریاستی جمہور کا امین اور متولی سمجھنا ٹھیک نہیں ہوگا۔

ہندوستان اور امریکہ کے تجارتی تعلقات

امریکہ کی قومی خارجی تجارت کی کونسل نے ایک رپورٹ اس موضوع پر شائع کی ہے کہ امریکہ کس طرح اپنے تجارتی تعلقات ہند اور پاکستان سے بہتر کر سکتا ہے۔ یہ دس نکات پر مشتمل ہے جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اس معاملے میں خود کس درجہ مستغنی اور ہندوستان اور پاکستان کو اپنا کتنا دست نگر اور محتاج سمجھتا ہے۔ انداز شروع سے آخر تک مربیانہ سرپرستی اور مشفقانہ نصیحت کا ہے۔ بار بار اس بات کو جتلایا گیا ہے کہ امریکہ کے ساتھ تجارت بڑھانے میں ہندوستان اور پاکستان کو کیا کیا فائدے پہنچ سکتے ہیں اور خود امریکہ ہندوستان سے تجارت کرنے کے معاملہ میں کتنا بے نیاز ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں سب کام ان ہی دونوں ملکوں کو کرنا ہے۔ سب سے پہلے ان دونوں کو اپنے باہمی جھگڑے ختم کرنا چاہئیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ دونوں کی معیشتیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ باہمی اشتراک میں دونوں کا فائدہ ہے اور باہمی مقابلہ سراسر حماقت ہے۔ قدرتی یا دوسرے وجوہ سے جو کام ایک ڈومینین میں اچھا چل رہا ہے اس کو دوسرے ڈومینین میں باہمی ضد اور مقابلے کی وجہ سے شروع کرنا سخت نادانی ہے۔ اگر باہمی اختلافات کو جاری رکھا گیا تو پھر امریکہ ان دونوں کے ساتھ اپنی تجارت کو ترقی نہیں دے گا۔ مثال کے طور پر پٹ سن کو پیش کیا گیا ہے کہ دنیا میں اس کی تجارت کا ٹھیکہ ہندوستان کو تقریباً اجارہ ملا ہوا تھا اب کچا پٹ سن تو زیادہ تر پاکستان کے حصے میں آ رہا ہے اور کارخانے تقریباً تمام ہندوستان کے حصے میں ہیں۔ اس معاملے میں اگر پاکستان اور ہندوستان نے باہمی اشتراک عمل نہ کیا تو پھر امریکہ مصنوعی پٹ سن بنانا اور استعمال کرنا شروع کر دے گا۔

دوسرا اہم نکتہ سرکاری نگرانیاں کم کرنے اور نجی سرمایے کو آزادی دینے کا ہے۔ صنعتوں کو قومی ملکیت یا سرکاری نگرانی میں لانے کی بات چیت جو چل رہی ہے۔ تامینی اور ترجیحی محاصل درآمد کو کم کرنے یا ختم کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جینوا کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق ابھی حال میں امریکہ اور ہندوستان کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اسے ناکافی سمجھا گیا اور ہندوستان کے وزیر مالیات کی اس تقریر پر اعتراض کیا گیا ہے جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ برطانوی مال کے ساتھ ترجیحی سلوک جاری رکھا جائے گا۔

سرکار کے عام محاصل کی پالیسی کو بھی ایسا بنانے کے لئے کہا گیا ہے جس سے نجی سرمایہ داروں میں حوصلہ اور امنگ پیدا ہو اور ہندوستان کے لوگوں کے مقابلے میں امریکہ کے تاجروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے۔ سڑکیں، ڈاک، تار، ٹیلیفون وغیرہ کے انتظام کو ترقی دینے اور امریکن سیاحوں کے لئے بہتر انتظامات کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

یہ سب باتیں اگر کی جائیں تو پھر امریکہ کے سرمایہ اور ماہروں کی مدد سے ترقی و تعمیر کے بڑے امکانات تسلیم کئے گئے ہیں اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ امریکہ کوئی سیاسی اقتدار نہیں چاہتا بلکہ صرف اپنے سرمایہ اور ماہروں کے لئے مناسب نفع اور اطمینان چاہتا ہے۔

غرض چچا سام آسانی سے کچھ دینے والے نہیں۔ یہ جب تک اچھی طرح ناک نہیں رگڑوا لیں گے اور تنگی کا ناچ نہیں نچوا لیں گے اس وقت تک ان سے معاشی ترقی کی ایکو میں امداد کی کوئی امید رکھنا فضول ہے ان کی کو نہیں دیتی اور روس کو چھوڑ کر باقی ساری دنیا ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔ پھر ان کا دماغ کیسے عرش معلی پر نہ پہنچے گا۔

پناہ گزینوں کو پھر سے بسانے کا مسئلہ

پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کا مسئلہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا ہے حکومت ہند کو پناہ گزینوں کی امداد پر ہر مہینے دس لاکھ روپے صرف کرنا پڑ رہے ہیں کشمیر کی جنگ پر جتنا خرچ ہو رہا ہے یہ رقم اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ خرچ دولت آفرین ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن چونکہ کیمپوں کے قائم رکھنے اور اسی قسم کی دوسری امدادی کارروائیوں پر خرچ ہو رہا ہے اس لئے اس سے مستقل بہبود کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور پناہ گزینوں کی بے اطمینانی کا تدارک نہیں کیا جا سکتا۔

مرکزی حکومت نے کچھ دنوں سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس کام کو صوبے کی حکومتیں زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہیں اس لئے وہ اس کام کے بڑے حصے کو اب ان ہی کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے۔ امداد دینے اور پھر سے بسانے کے محکمے کے مستعد کارگزار وزیر شری موہن لال سکسینہ نے اس غرض سے صوبوں اور ریاستوں کے وزرا کی ایک کانفرنس بلائی تھی۔ جس میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، شری موہن لال سکسینہ نے مسئلہ کا ایک ابتدائی جائزہ پیش کیا اور اس کے بعد صوبوں کے وزرا نے اپنے اپنے صوبوں کے کام کی رپورٹ اور آئندہ کے لئے اپنی تجویزوں اور ضرورتوں کو پیش کیا آخر میں دس نقطوں پر مشتمل ایک جامع قرار داد منظور کی گئی۔ اس قرار داد کی اہم باتیں یہ ہیں کہ کیمپوں کو ختم کیا جائے اور پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے کے لئے جہاں تک مغربی پاکستان کی دیہی آبادی کا تعلق ہے اسے پوری طرح مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں میں بسایا جائے اور اس علاقہ میں جو پناہ گزین اس وقت موجود ہیں ان میں سے چاہے وہ شہری ہوں یا دیہاتی کوئی پناہ گزین باہر نہ بھیجا جائے اس تجویز پر عمل کرانے کے لئے مرکزی حکومت ضروری قوانین وضع کرے۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں کے لئے پناہ گزینوں کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ صوبوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پھر سے بسانے کے بارے میں اپنی رپورٹیں مقررہ فارموں پر درج کر کے باقاعدگی کے ساتھ مرکزی محکمہ کے پاس بھیجتے رہیں۔ پنجاب کے علاوہ

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

۲۔ پاکستان

سرحد کے بارے میں

حکومت پاکستان کے محکمۂ خارجہ نے بہت غور و خوض کے بعد — شاید اس لئے کہ مضمون آفرینی مشکل کام ہے — خان عبدالغفار خاں کی گرفتاری کے اسباب بتائے ہیں۔ حکومت کے کمیونک میں یہ کہا گیا ہے کہ فقیر ایپی اور بادشاہ خاں کے درمیان "سرحد میں بے چینی پیدا کرنے کے لئے بڑی گہری سازش تھی۔ حکومت پاکستان نے سرحد کی حکومت کے اس دعوی کو بھی دہرایا ہے کہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں کی گرفتاری سے کوئی بے چینی نہیں پھیلی۔ بلکہ لوگ اس گرفتاری سے مطمئن اور خوش ہیں۔ فقیر ایپی پر الزام یہ لگایا گیا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے ان فوجی اڈوں پر جسے پاکستانی فوجیں پہلے ہی چھوڑ چکی تھیں حملہ کیا۔ اس لئے مجبوراً [illegible] پر جنگی کارروائیوں کی ضرورت پڑی۔ لیکن اس میں پاکستانی نوجوانوں سے کام نہیں لینا پڑا۔ کیونکہ پڑوسی قبیلوں کے وفادار خاصہ داروں نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کر دیا۔

خان عبدالقیوم خاں نے اس سے ایک دن پہلے ایک پریس کانفرنس میں یہ بات تسلیم کی تھی کہ فقیر ایپی کے پیروؤں پر بمباری کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے قبائلی علاقوں کی حکومت پاکستان سے وفاداری پر کچھ اچھی روشنی نہیں پڑتی۔ خان عبدالقیوم اور حکومت پاکستان کے اعلان دونوں ہی میں حکومت ہند کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ الزام یہ ہے کہ فقیر ایپی نے پنڈت نہرو سے مدد مانگی تھی۔ اس سلسلے میں پاکستان کے ایک اخبار نے فقیر ایپی کا ایک خط شائع کیا ہے۔ اس مقدمے میں یہ بڑی آسانی ہے کہ ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ عبدالقیوم صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ خدائی خدمتگاروں اور فقیر ایپی کو ہندوستان سے مالی مدد ملی ہے۔ اس میں خیال ہونا چاہئے کہ سرحد کی حکومت کے پاس "دشمنوں" کی سازش کے سارے ثبوت موجود ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس تمام ثبوت کی موجودگی میں حکومت خان عبدالغفار خاں اور ان کے ساتھیوں پر چپ چاپ مقدمہ چلائے گی۔ مقدمہ کی کارروائی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

مشرقی بنگال

کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں مشرقی بنگال کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے صوبے کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے بتایا کہ مشرقی بنگال میں سیمنٹ اور اینٹیں تو موجود ہیں لیکن لوہے کی کمی کی وجہ سے مکانات کی قلت کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بتایا کہ مشرقی بنگال اور پاکستان کے دوسرے صوبوں کے درمیان رسل و رسائل کے موجودہ انتظامات بھی بہت ناکافی ہیں۔ ڈھاکہ اور کراچی کے درمیان براہ راست وائرلیس کے ذریعے تعلق اگلے دو مہینے میں قائم ہو سکے گا۔ غذائی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر اعظم نے حکومت کے اس ارادے کا ذکر کیا کہ صوبے میں دو ڈیڑھ لاکھ ٹن اناج اکٹھا کر لینا چاہتی ہے۔ جس میں سے ۸۵ ہزار کا ذخیرہ اس وقت تک اکٹھا کیا جا چکا ہے۔ مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے سرمایہ داروں کے لئے صنعتی میدان میں بہت مواقع ہیں۔ حکومت کے اپنے منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مستقبل قریب میں [illegible] لوہے کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا۔ تعمیری کاموں میں سب سے اہم حکومت کی یہ اسکیم ہے کہ چٹاگانگ میں دریائے کارنفل کو آبپاشی اور بجلی بنانے کے کاموں کے لئے استعمال کیا جائے۔

دوسرے ذرائع سے مشرقی بنگال کے متعلق جو خبریں آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ صوبے کی غذائی صورت حال بہت اچھی نہیں۔ قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ لوگ بہت غریب ہیں اس لئے یہ بوجھ ان کی برداشت سے باہر ہے۔ کھانے کے ساتھ دوسری اشیا کی بھی کمی ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی پریس کانفرنس میں کمیونسٹوں کا بھی ذکر کیا۔ شاید کمیونسٹ ان شکایتوں کو سامنے لاتے ہوں گے۔ خواجہ صاحب نے ان پر الزام لگایا کہ وہ مشرقی اور مغربی بنگال کو متحد کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی بنگال کی حکومت کو کمیونسٹوں کے نام سے چڑ ہے اور اس نے بھی انہیں بہت زیادہ کڑی توجہ کا مستحق قرار دے رکھا ہے۔ خواجہ صاحب شاید اس خطرے کو ضرورت پڑنے پر کافی موثر طریقہ پر استعمال کر سکیں گے۔

غذا پر کنٹرول

پچھلے ہفتے پاکستان کی غذائی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صوبہ میں غذا پر کنٹرول قائم رکھا جائے گا۔ غلہ کے حصول کے انتظامات کو بھی بہتر بنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر عبدالستار پیرزادہ نے کہا کہ ہندوستان کے تجربے نے جہاں کنٹرول ہٹ جانے کی وجہ سے قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں انہیں یقین دلا دیا ہے کہ کنٹرول قائم رکھنے کی پالیسی صحیح ہے۔

حکومت ہند اور پاکستان میں غذا کی لین دین کے متعلق بات چیت ہو رہی ہے اس مقصد کے لئے ایک ڈیلیگیشن دہلی آیا ہوا ہے۔ حکومت پاکستان نے ۴۰ ہزار ٹن چاول دینے کا وعدہ کیا ہے اور پانچ ہزار ٹن چینی خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ حکومت پاکستان جتنی بھی چینی مل سکے خریدنے کو آمادہ ہے اُدھر ہندوستان کو چاول جتنا بھی پاکستان دے سکے چاہئے۔ ان تفصیلات پر گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور آخری فیصلہ دونوں حکومتوں کی رضامندی سے ہوگا۔

جناح صاحب کے مزید اختیارات

پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح صاحب نے ایک نیا حکم جاری کیا جس کے الفاظ یہ ہیں: "اگر کسی وقت گورنر جنرل کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس سے پاکستان کے امن یا اس کے دفاع کو یا پاکستان کے کسی حصے کو خطرہ لاحق ہے یا ایسی کوئی صورت ہو جس میں صوبے کی حکومت قانون کے مطابق (پاکستان کا عارضی دستور ۱۹۴۷ء) نہ قائم رکھی جا سکے تو گورنر جنرل اعلان کے ذریعے صوبے کے گورنر کو حکم دے سکتا ہے کہ صوبے کی کسی جماعت کے کچھ اختیارات گورنر جنرل کی طرف سے اپنے ہاتھ میں لے لے۔" ہائی کورٹ اس قانون کے تحت نہیں آتے۔ ان اختیارات کے حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پڑی اور ان کے اختیارات کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے، یہ سب [illegible] ہیں۔

اسٹرلنگ سمجھوتہ

ہندوستان کی طرح پاکستان اور انگلستان کے درمیان بھی واجب الوصول اسٹرلنگ سے متعلق ایک معاہدہ ہوا ہے۔ اس کی رو سے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے کھاتے میں جو اسٹرلنگ رقم موجود تھی اس کے علاوہ ۵ ملین پونڈ کی رقم اور اس کو ملے گی۔ اس کے علاوہ ۵ ملین پونڈ کی مزید رقم اگر ضرورت پڑے پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے کے کام میں مدد دینے کے لئے مل سکتی ہے۔ دوسرے سکوں میں تبدیل کرنے کے لئے اس میں سے صرف ۵ ملین پونڈ کی رقم استعمال کی جا سکے گی۔ پاکستان کو اپنی معاشی زندگی کی تعمیر کے لئے منصوبے بنانے ہیں۔ ان منصوبوں پر عمل کرنے میں کئی سال لگیں گے۔ اس لئے برطانوی حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ کم سے کم پانچ ملین پونڈ اگلے سال اور ۵ ہی ملین پونڈ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کو دئے جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت پاکستان اگلے تین سال کے لئے اپنے منصوبے بنائے تو اس طرف سے مطمئن ہو سکتی ہے کہ کم از کم ۲۰ ملین پونڈ اسے انگلستان سے مل سکیں گے۔

یہ معاہدہ کم و بیش اس طرح کا ہے جیسے ہندوستان اور انگلستان کا باہمی معاہدہ۔ لیکن اس میں تھوڑی سی لچک رکھی گئی ہے۔ وہ یوں کہ اگلے تین سال کے لئے ۵ ملین پونڈ فی سال کی رقم کم سے کم ہے یعنی اگر پاکستان کو ضرورت ہوئی ایسی ضرورت جسے برطانوی حکومت نے بھی اہم سمجھا تو کچھ اور رقم بھی مل سکے گی۔ برطانوی حکومت نے اس معاہدہ میں پناہ گزینوں کے مسئلے سے بھی خاص دلچسپی ظاہر کی ہے اور پھر یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ پاکستان کی ہر ممکن مدد کرے گی۔ ان دوستانہ جذبات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت بھی دوست بنی رہے۔ اگر اس دوستی کی شدت میں کمی آئی تو ظاہر ہے امداد کا وعدہ بھی وفا نہ ہوگا۔ اگلے زمانے میں قرض لینے والا قرض خواہ کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔ مگر یہاں معاملہ الٹا ہے برطانوی حکومت نے قرض لیا ہے اور اب ادائگی کی شرطیں خود طے کر رہی ہے وہ بھی اس شان سے کہ گویا یہ بھی احسان ہے۔

ممدوٹ صاحب کے لئے نیا دردِ سر

مشرقی پنجاب کے پناہ گزین ممبران اسمبلی نے جو اب مغربی پنجاب کی اسمبلی کے ممبر [illegible] ہیں اس پر دباؤ ڈالا کہ پناہ گزینوں کے بسانے میں یہ کوشش کی جائے کہ ایک ضلع کے لوگ ایک جگہ بسائے جائیں تاکہ ان کی سماجی اور تہذیبی وحدت ختم نہ ہو۔ ان ممبروں کی تعداد کافی ہے۔ وہ زمانہ وزیر اعظم کے لئے شاید بہت نازک تھا اس لئے انہوں نے یہ مطالبہ مان لیا۔ [illegible] پر عمل کیا جائے تو اس سے بڑی دقتیں پیدا ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ جہاں بس چکے ہیں انہیں اب پھر وہاں سے اکھاڑ کر اور جگہ منتقل کیا جائے۔ اس اسکیم پر عمل میں خرچ بہت ہوگا۔ لوگوں کو دقتیں بھی بہت کافی اٹھانی ہوں گی۔ شاید اسی وجہ سے وزیر اعظم نے اپنے وعدے پر نظر ثانی کر ڈالی ہے اور مشرقی پنجاب کے ان پناہ گزین ممبران اسمبلی نے ستیاگرہ کی دھمکی دینا شروع کیا ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے کابینہ میں ایک آدھ وزیر کا اضافہ کرنا پڑے۔ لیکن یہ مطالبہ اصولاً غلط ہے۔ اگر یہ واقعہ ہو بھی کہ تہذیبی حیثیت سے یہ لوگ اپنی جداگانہ شخصیت رکھتے ہیں تو انہیں اپنے نئے وطن کی تہذیب سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تہذیبی جزیرے بنے بھی تو زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رکھے جا سکیں گے۔

(۱۱ - س)

مغربی دنیا

کیا برلن کا قضیہ طے ہو رہا ہے؟

برلن کی ناکہ بندی کا پانچواں ہفتہ نہایت خطرناک تھا۔ روس نے یہ اعلان کیا تھا جس فضائی راستے سے برطانیہ اور امریکہ کے ہوائی جہاز مغربی برلن میں رسد لاتے ہیں اس پر روس کے طیارے جنگی مشق کے لئے پرواز کریں گے۔ اگر یہ دھمکی عمل میں آتی تو دونوں حریفوں کی ٹکر یقینی تھی۔ امریکہ سے جنگی طیارے انگلستان میں اور روس سے برلن میں آ کر جمع ہو رہے تھے۔ سہمی ہوئی دنیا لرز رہی تھی کہ نہ جانے کب یہ بارود کا ذخیرہ بھک سے اڑ جائے اور سارے یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دے۔ مگر روس نے پینترا بدلا اور یہ کہا کہ ہم خود مغربی برلن کو غذا اور دوسری ضرورت کی چیزیں پہنچانے کو تیار ہیں۔ ظاہر ہے مغربی قوتیں اسے گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ کہ اپنے علاقے کے لوگوں کو روس کا زیر بار احسان ہونے دے۔ امریکہ سے بار برداری کے اور زیادہ جہاز آ گئے اور موسم بھی سازگار ہو گیا۔ اس لئے انھوں نے رسد پہنچانے کی [illegible] مگر روس اب ہر پانچ منٹ میں ایک ہوائی جہاز برلن میں سامان لے کر پہنچ رہا ہے خطرہ ابھی تک دور نہیں ہوا ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین جو اکڑ کر کے آگے بڑھے تھے اب پینترے بدلتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ روس کے مطالبہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ مغربی جرمنی کو مستقل طور پر ایک جداگانہ ریاست بنانے [illegible] ہیں۔ مگر اب خبر ملی ہے کہ امریکہ نے جو نوٹ روس کو بھیجا ہے اس میں مغربی جرمنی کی مستقل ریاست کا نام نہیں بلکہ عارضی چارٹر کے ماتحت ایک "حکومت" قایم کرنے کا ذکر ہے [illegible] ہیں کہ امریکہ روس کو اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ ابھی جرمنی کے معاملے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ادھر برلن کے روسی کمانڈر مارشل سوکولاسکی نے امریکہ کے یونائیٹڈ پریس کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ برلن میں کہیں بھی ناکہ بندی نہیں بات صرف اتنی ہے کہ امریکہ نے اپنے علاقے میں روسیوں کے داخلہ پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ ہم نے بھی اس کے جواب میں کچھ پابندیاں لگا دیں انھوں نے خوش طبعی کے انداز میں پوچھا "اگر آپ کے یہاں کھانے پر مہمان آئیں تو کیا آپ کو یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں یہ کھانے کی میز کے پائے سے کرسیت نہ ہو جائیں" مطلب یہ تھا کہ امریکہ نے جن شبہات کی بنا پر روسیوں پر پابندیاں لگائیں وہ بالکل مہمل تھے۔ اگر امریکہ یہ پابندیاں ہٹا دے تو ہم بھی برلن میں رسد پہنچانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔

اگر دونوں طرف سے یہی انداز رہا تو شاید چند روز میں برلن کی گتھی سلجھ جائے اور جنگ کا خطرہ فی الحال ٹل جائے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین کی شاطرانہ چال

مسٹر ٹرومین کو ڈیموکریٹک پارٹی کے کنونشن نے متفقہ طور پر آیندہ صدارت کے انتخاب کے لئے جو نومبر میں ہوگا اپنا امیدوار نامزد کر لیا ہے۔ ان کی پارٹی کے کچھ لوگ ٹوٹ کر تیسرے امیدوار مسٹر والیس کی طرف چلے گئے اور کچھ لوگوں نے جو جنوبی ریاستوں کے باشندے ہیں چوتھا امیدوار کھڑا کرنے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن دونوں قسم کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ عمومی طور پر ڈیموکریٹک پارٹی مسٹر ٹرومین کے ساتھ ہے اس لئے دراصل مقابلہ ان میں اور ریپبلکن پارٹی کے امیدوار مسٹر ڈیوی میں ہے عموماً لوگوں کی رائے یہی ہے کہ ان کا ڈیوی کے مقابلے میں کامیاب ہونا محال ہے۔ مگر خود ان کو یہی امید ہے یا کم سے کم ظاہر یہی کرتے ہیں کہ وہ ضرور منتخب ہو جائیں گے۔ انھوں نے ایک چال ایسی چلی ہے کہ اگر حریف کو اس کا جواب نہ سوجھا تو ہو سکتا ہے کہ بازی ان کے ہاتھ رہے۔ انتخاب کے زمانے میں پارٹیاں رائے دہندوں سے بڑے بڑے وعدے کرتی ہیں اور یہ سمجھ کر کہ اس وقت تو ہمارا امیدوار منتخب ہو جائے اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ مسٹر ٹرومین نے عام دستور کے خلاف عین انتخابات کے زمانے میں امریکہ کی مجلس آئین ساز (کانگریس) کا جلسہ طلب کر کے ریپبلکن پارٹی کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اس نے امریکی قوم سے جو لمبے چوڑے وعدے کئے ہیں ان کو پورا کرے ان وعدوں کا [illegible] زیادہ تر اندرونی معاملات سے ہے۔ بیرونی سیاست میں دونوں پارٹیوں میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ اسے منظر عام پر نہیں لانا چاہتیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ریپبلکن پارٹی کانگریس کے اس اجلاس میں مفاد عامہ کے کوئی اہم قانون پاس کر کے قوم کو اپنے خلوص کا یقین دلاتی ہے یا لمبی لمبی بحثوں میں وقت گزار کر معاملے کو ٹالتی ہے۔ یا اس سے کوئی ایسی چوک ہوتی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر ٹرومین اس کے بہت سے ووٹ توڑ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فرانس کی نئی وزارت

فرانس کی نیشنل اسمبلی نے ۱۹۰ ووٹ کے مقابلے میں ۳۵۲ ووٹ سے ریڈیکل پارٹی کے موسیو آندرے ماری کو وزیر اعظم منتخب کیا ہے۔ یہ پہلے موسیو شومان کی کیبنٹ میں وزیر عدل تھے۔ کیبنٹ بھی اب وزیر اعظم کی مرضی بن گئی ہے اور اس میں نہایت اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ موسیو بیدو جو چار برس سے وزیر خارجہ چلے آ رہے تھے الگ ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ موسیو شومان کو لیا گیا ہے ابھی تک تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ فرانس کی متعدد پارٹیوں میں سے بیچ کی پارٹیاں اور سوشلسٹ پارٹی نئی حکومت کا ساتھ دیں گی اور کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ انتہا پسند سوشلسٹ بھی اس کی مخالفت کریں گے موسیو بیدو کے الگ ہونے سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید فرانس کی اندرونی اور بیرونی پالیسی میں اب آئی احتیاط اور اعتدال سے کام نہیں لیا جائے گا اور اندر کمیونسٹوں وغیرہ کو دبانے میں اور باہر روس کی مخالفت کرنے میں امریکی پالیسی کا زیادہ بے باکی سے ساتھ دیا جائے گا۔ واقعات بتائیں گے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے۔

برطانیہ کی معاشی حالت سنبھل رہی ہے

انگریزوں کی قوم بھی عجیب غریب قوم ہے۔ برطانیہ میں ابھی چند دن ہوئے روٹی کا راشن برسوں کے بعد ختم ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں غذا کی رسد اب بالکل قابل اطمینان ہے صنعتی اشیاء کی پیداوار میں اور برآمد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ معاشی حالت پچھلے دو سال کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گئی ہے اور کوئی ملک ہوتا تو غذا کے وزیر اور تجارت کے وزیر اپنے کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتے اور قوم سے داد کے طالب ہوتے۔ مگر انگلستان میں غذا کی وزارت نے الٹی معذرت کی ہے کہ راشن تو ختم ہو گیا لیکن لوگوں کو نانبائی کی دوکان سے روٹی کچھ ایسی زیادہ مقدار میں نہیں مل سکے گی۔ اس لئے کہ دوکانوں کو محدود مقدار میں ملتا ہے۔ اسی طرح بورڈ آف ٹریڈ کے پریسیڈنٹ مسٹر ہیرالڈ ولسن نے لوگوں کو متنبہ کیا ہے کہ ہماری معاشی حالت اتنی اچھی نہیں ہے جتنی پیداوار کے اعداد و شمار سے بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے سال کے اندر انگلستان میں اشیا کی قیمتوں میں ۱۰ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے اس پر بڑی چہل ہے کہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک آٹھ برس میں صرف ۳۱ فی صدی اضافہ ہوا تھا اور اب سال بھر میں ۱۰ فی صدی اور ہو گیا۔ گویا اضافے کی رفتار ڈھائی گنی ہو گئی ہم ہندوستانی یہ سن کر حیران ہیں کہ کوئی ملک ایسا بھی ہے جہاں قیمتیں پچھلے نو دس سال میں صرف ۴۱ فی صدی بڑھی ہیں اور وہ اسے ایسی مصیبت سمجھتا ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔ اگر ہندوستان کی طرح وہاں قیمتوں میں چار سو اور پانچ سو فی صدی کا اضافہ ہوا ہوتا تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے

یورپ کے ملکوں کو معاشی بحالی کے لئے مالی امداد دینے کی جو تجویز امریکہ نے مارشل ایڈ پلین کے نام سے کی تھی وہ خدا خدا کر کے عملی جامہ پہن رہی ہے۔ ۲۵ جولائی سے پیرس میں یورپ کی ۱۶ ریاستوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس میں مارشل ایڈ کے منتظم مسٹر پال ہوف مین کے مشورے سے طے ہوگا کہ امدادی رقمیں کس طرح صرف کی جائیں۔ کانفرنس کا کوئی ایجنڈا پہلے سے طے نہیں ہوا ہے اور اخبار کے نامہ نگار اس کے کسی رکن سے سن گن بھی نہیں لے سکے کہ کن کن مسائل پر بحث کی جائے گی۔ جب یہ سوال برطانیہ کے وزیر خزانہ سر اسٹیفرڈ کرپس سے کیا گیا جو کانفرنس میں اپنے ملک کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لئے پیرس پہنچے ہیں تو انھوں نے فرمایا "آج موسم بڑا خوشگوار ہے"۔ البتہ مسٹر پال ہوف مین نے کو پریس کانفرنس میں اشارتاً ایسی بات کہی "ہمیں ابھی تک یورپ کے ملکوں میں اس معاشی تعاون کے آثار نظر نہیں آتے جو مکمل بحالی کے لئے ضروری ہے" مسٹر ہوف مین نے نام تو معاشی تعاون کا لیا ہے لیکن تمام قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مطلب سمجھ کا دیگر است دراصل امریکہ کا منشا یہ ہے کہ جن سولہ ملکوں کو مالی امداد دی جا رہی ہے وہ ایک متحدہ سیاسی محاذ بنا کر کمیونزم کے اس سیلاب کو روکیں جو مشرقی یورپ کی طرف سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے جو بانسری بجانے والے کو پیسے دیتا ہے وہی فرمائش کرتا ہے کہ کون سی گت بجائی جائے۔ ادھر معاشی تعاون میں روس کے خلاف مورچہ بن رہا ہے۔ ادھر مغربی اتحاد کے نام سے کھلم کھلا انگلستان کی قیادت میں فوجی قوت کو متحد کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

[illegible]

قطعات

اختر انصاری

ایک یاد

مدت ہوئی کہ نغمہ فشاں بھی ہوئے تھے ہم
شاخِ طرب پہ زمزمہ خواں بھی ہوئے تھے ہم
ہم کو تو کچھ خبر نہیں اپنی، مگر ندیم!
کہتا ہے حافظہ کہ جواں بھی ہوئے تھے ہم

بھوک

تھام لیتے دلِ وحشی کو کبھی
کبھی روتے کبھی آہیں بھرتے
زندگی ہم کو بھی مہلت دیتی
ہم بھی اے کاش محبت کرتے

اوہام

علم کے زمزمے نہ گاؤ کہ ہم
گلشن جہل کی بہاریں ہیں
روشنی میں ہمیں نہ لاؤ کہ ہم
عہد ظلمت کی یادگاریں ہیں

ہم

شمع انسانیت کی لو ہیں ہم
اک نئی روشنی کی ضو ہیں ہم
عیش فردا مراد ہے جن سے
اُن بہاروں کے پیش رو ہیں ہم

غزل

اثر لکھنوی

مثلِ گرداب ہے گردش سے فقط کام مجھے
کر دیا شوق نے بے گانۂ انجام مجھے

زندگی بھی ہے صلہ، موت بھی انعام مجھے
لے چل اب چاہے جدھر عشق سبک گام مجھے

موجِ دریا کی طرح دور جو ساحل سے ہو
بے قراری میں ہی ملتا ہے کچھ آرام مجھے

کیا یہی شرطِ مساوات ہے کیوں اے "ساقی"
صاف اوروں کے لئے دُردِ تہِ جام مجھے

زیب دیتا ہے اگر ناز ہو رسوائی پر
آج اس نے بھی کہا ناز سے "بدنام" مجھے

اک خلش زار ہے جس دشت کا کانٹا کانٹا
چھوڑے جاتا ہے کہاں اے دلِ ناکام مجھے

"کھو چکے ہوش بہت ہوش میں رہنا سیکھو"
اُف ری او چشم فسوں ساز یہ پیغام مجھے

حسرتِ سیرِ چمن کچھ تو نکالوں صیاد
اور رہنے دے ذرا دیر تہِ دام مجھے

کعبۂ دل کا شب و روز ہے درپیش طواف
رختِ ہستی ہے مرا جامۂ احرام مجھے

اللہ اللہ وہ جلوہ تری رعنائی کا
سیکڑوں طور نظر آئے سرِ بام مجھے

کیا فریب اس میں ہے کچھ غور کرو تم بھی اثر
یاد کرتا ہے بتِ سادہ و خود کام مجھے

نیا مرحلہ

(ایک ناتمام ناول کے چند ورق)

سید عابد حسین

سارا دن دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی میں گذارنے کے بعد ظفر رات کو بستر پر سونے کے لئے لیٹا تھا تو طبیعت اور عادت کے مطابق تنہائی میں آتے ہی تخیل کی باگیں چھوڑ دیتا تھا۔ خارجی امید پرور ی کے گھوڑے پر سوار رفیع خود داعتمادی کے ساز و سنگ سے آراستہ وہ آیندہ تعلیمی اور عملی زندگی کے معرکے بے شمار کھیلتے طے کرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں امتحانوں میں اول آتا، انعام اور وظیفے حاصل کرتا، یونین میں اس کی دھواں دھار تقریروں کی دھوم مچ جاتی، میگزین میں لوگ اس کے مضامین پڑھ کر وجد کرتے یہاں تک کھیلوں اور اسپورٹس میں جن سے اب تک اسے ذرا بھی مس نہ تھا وہ چھپا رستم نکلتا اور بے شمار کپ اور شیلڈ جیت کر اپنے کمرے میں سجاتا۔ لڑکے اس کے کمرے کو جو کھیل کی فتوحات اور طرح طرح کے تمغوں کا عجائب خانہ بن گیا تھا جوق جوق دیکھنے کے لئے آتے، لڑکے اور لڑکیاں ———— مگر لڑکیاں اندر قدم نہ رکھتیں، باہر سے جھانک کر چلی جاتیں۔ عملی زندگی کی تصویریں مقابلتہً غیر معین اور مبہم تھیں مگر ان میں بھی کامیابی، شہرت، ہر دلعزیزی اس کے قدم چومتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کبھی تعلیم، کبھی تصنیف و تالیف ... کبھی [illegible] اور کبھی سیاست کے میدان ... باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آ جاتی اور خواب میں بات کا سلسلہ ٹوٹا اور بکھرا ہوا بے جان تصور کے بجائے جاندار اور متحرک تصویروں کی شکل میں جاری رہتا۔ مگر جب الہ آباد [illegible] کا دن قریب آگیا، تیاریاں مکمل ہو گئیں ... کا وقت مقرر ہو گیا تو یکایک ظفر کی چڑھتی ہوئی امنگیں ... دہلی کی مانوس فضا اور جانے بوجھے لوگوں سے ... اسے سخت تکلیف دہ نظر آنے لگی۔ غیر مقام اور غیر ... جا کر رہنے، نئی زندگی اور نئے حالات سے سابقہ ... یہ خیالات سے وحشت ہونے لگی۔ خیالی فتح مندیوں ... مرانیوں کی جگہ اب خیالی مشکلیں اور رکاوٹیں اس ... ذہن پر مسلط ہو گئیں۔ کالج میں پڑھائی اور بات چیت انگریزی میں ہو گی۔ نہ جانے میں اچھی طرح سمجھ سکوں گا ... بول سکوں گا یا نہیں، اب تک تو بالکل مشق نہیں کبھی بولنے کا موقع پڑتا ہے تو اٹک اٹک کر دو چار جملے کہتا ہوں اور پھر گاڑی رک جاتی ہے بلکہ اگر کوئی تیز بولتا ہے تو سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ امتحان میں سوالوں کے جواب بھی انگریزی میں دینا پڑیں گے۔ انگریزی میں مکسیٹ کا مطلب تو میں اچھی طرح بیان کر دیتا ہوں، مضمون بھی لکھ لیتا ہوں۔ مگر دوسرے مضامین میں کیا ہوگا، اور ہاں مضمون کون سے لوں گا۔ ہر دیال کو نوا سٹر صاحب نے تاریخ، سوکس، اور اکنامکس لینے کی رائے دی ہے۔ میں تاریخ اور فارسی لے لوں۔ اب سائنس اور ریاضی وغیرہ کو چھوڑ کر یہی سوکس اور اکنامکس رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک لینا ہوگا۔ خدا جانے ان میں کیا ہوتا ہے مجھ سے چلیں گے بھی یا نہیں، استادوں سے کچھ زیادہ ملنے کی امید نہیں مناسب ہے کلاس میں نوٹس لکھوا دیتے ہیں اور بس۔ طالب علموں کی انفرادی مشکلات کو حل نہیں کرتے اور کر بھی کیسے۔ ہر کلاس میں سیکڑوں لڑکے ہوتے ہیں بہت سی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، لڑکیاں لڑکوں کے پاس کیسے بیٹھتی ہیں، وہ آپس میں باتیں کرتے شرم نہ آتی ہو گی، مجھ سے تو کوئی لڑکی بات کرے گی تو شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گا۔ اگر اس نے سب کے سامنے میرا مذاق اڑایا تو کیا ہوگا، لڑکیوں کے تصور میں اسے گھبراہٹ کے ساتھ لطف بھی آیا۔ اس لئے بڑی دیر تک اس میں ابھارتا۔ اسی سلسلے میں اسے حسینہ کا خیال آگیا جس سے بچپن میں اس کی نسبت ہوئی تھی اور اب اس کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

ظفر نے حسینہ کو آخری بار آٹھ برس ہوئے دیکھا تھا جب وہ آٹھ نو برس کی تھی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ نازک اندام شرمیلی اور خوب صورت تھی۔ جب تک اس کی والدہ زندہ تھیں اکثر اس کی شادی کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہ اس فکر سے خوش ہوتا تھا مگر شرما کر بھاگ جاتا تھا اور تھوڑی دیر اس خیال سے جی بہلا کر اسے بھول جاتا تھا۔ اتنی دلچسپی اسے نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اس موضوع کو اپنے تصورات کے سلسلے میں کوئی خاص جگہ دیتے۔ اب چار برس سے جب سے کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا اسے حسینہ کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ تھوڑے دن ہوئے اسے یہ معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب انجنیئر ہو کر الہ آباد آ گئے ہیں حسینہ نے مڈل پاس کر لیا ہے اور اب نویں درجے میں داخل ہو گئی۔ میر صاحب نے الہ آباد سے واپس آکر اسے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے ظفر اور حسینہ کی شادی جلد ہو جانے کی تحریک کی اور وہ نامنظور ہو گئی۔ پھوپھی کے گھر رہنے کی تجویز ... کر ظفر نے کہا تھا کہ ان کا احسان لینا مناسب نہیں ... نے اسے دخل در معقولات کا ملزم قرار دے کر ڈانٹا تھا مگر اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ بات آئی گئی ہوئی مگر ظفر کے دل میں پھوپھی کی اور اس کی حسین بیٹی کی یاد کو تازہ کر گئی۔

اب اس کے دل میں اور طرح طرح کی فکروں کے ساتھ ایک فکر یہ بھی کھٹک رہی تھی کہ الہ آباد میں اسے حسینہ اور اس کے والدین سے تعلقات کی تجدید کرنی ہو گی۔ وہ نئے آدمیوں سے ملنے سے گھبراتا تھا اور ان لوگوں سے وہ اتنا کم واقف تھا اور اتنے دنوں کے بعد ملنے والا تھا کہ وہ اس کے لئے قریب قریب نئے تھے۔ جس زمانے میں اس کی نسبت حسینہ سے ہوئی تھی صفدر علی صاحب سب ... انجنیئر تھے اور مالی اعتبار سے میر صاحب جنھیں تحصیلداری کی تنخواہ کے علاوہ جائداد کی معقول آمدنی تھی ان سے زیادہ خوش حال تھے۔ اب صفدر علی انجنیئر ہو گئے تھے اور میر صاحب کی آمدنی اتنی کم ہو گئی تھی کہ وہ ان کے مقابلے میں غریبوں میں شمار ہونے کے لائق تھے۔ ظفر کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی مفلسی کی وجہ سے صفدر علی صاحب کے گھر میں اس کے ساتھ بے پروائی کا بلکہ ذلت کا برتاؤ ہو۔ پھوپھی عقیلہ تو کبھی ایسا نہیں کر سکتیں، وہ بڑی نیک اور سمجھ دار بیوی ہیں۔ اماں مرحومہ میں اور ان میں آپس میں بڑی محبت تھی اور مجھے بھی بچپن میں بہت چاہتی تھیں مگر صفدر علی صاحب اسی زمانے میں صاحب بہادر تھے اب تو ان کا دماغ ساتویں آسمان پر ہو تو تعجب نہیں اور حسینہ؟ کوئی سولہ سترہ برس کی ہو گئی ہو گی، جانے کیسی ہو گئی ہو، باپ کی طرح یا ماں کی طرح۔ صورت شکل پہلے ہی کیا کم تھی اب تو غضب کی حسین ہو گی۔ غرور حسن تو مشہور ہی ہے اگر اس کے ساتھ دولت کا غرور بھی ہوا تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ خیر نہ دیکھے مجھے کیا پروا ہے، اور میں وہاں جاؤں ہی کیوں؟ اماں کے انتقال کے بعد سے ان لوگوں سے خط و کتابت تک بند ہے۔ جب انہوں نے تعلق نہ رکھا تو مجھے کیا ضرورت ہے؟ مگر نہیں ابا جان ابھی مل کر آئے ہیں وہ لوگ بہت اچھی طرح ملے بلکہ پھوپھی نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے کہا۔ ایک بار جانا ضرور چاہئے اگر صفدر صاحب یا حسینہ نے بے رخی برتی تو پھر دیکھا جائے گا۔"

روانگی کے دن سے پہلے رات کو بستر تنہائی پر وہ اپنی زندگی کے آنے والے دور کو چھوڑ کر پچھلی زندگی کا جائزہ لینے لگا اس کی عمر کے اٹھارہ برس میں سے چودہ سال ماں کی محبت سے اور پچھلے چار سال اس محبت کی یاد سے معمور تھے۔ کئی باتوں کے لحاظ سے اس کا بچپن بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کی صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کی والدہ کی بیماری کی وجہ سے عموماً گھر کی فضا پر ایک افسردگی سی چھائی رہتی تھی۔ گھر میں اور بچے نہ تھے۔ جن کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملتا۔ شروع میں اس کے والد اسے بہت پیار کرتے تھے۔ جس کی یاد اب کچھ دھندلی سی باقی تھی۔ مگر جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ان کا لطف و کرم قہر و غضب سے بدل گیا تھا اور وہ اسے بات بات پر ڈانٹنے اور گھڑکنے لگے تھے۔ اسکول کے نیچے درجوں میں اس کے ہم جماعت اس کی کمزوری اور دبو پن سے فائدہ اٹھا کر اسے دق کرتے رہتے اور اکثر اس کی عزت بھی کر دیتے۔ چونکہ وہ عام طور پر خاموش اور سہما رہتا تھا اور استادوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ... تھا اس لئے ایک عرصہ تک وہ کند ذہن اور بد شوق سمجھا گیا۔ اور اسے بے جا خفگیاں اور سختیاں سہنی پڑیں مگر ان کانٹوں بھری جھاڑیوں کے بیچ میں ماں کا پیار پھولوں کا ایک سدا بہار پودا تھا۔ جس نے ظفر کی زندگی میں شادابی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ گو اس کی والدہ کے انتقال کو چار ہی برس گذرے تھے مگر ان کے چہرے کے خد و خال کا نقش اس کے حافظے میں بہت دھندلا ہو گیا تھا بس آنکھوں سے ابلتی ہوئی شفقت، چھلکتی ہوئی محبت اور ایک غمگین تبسم، دل کش اور دلدوز تبسم کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی۔ اس وقت یہ تصویر ایک چھلاوے کی طرح تاریک فضا میں رہ رہ کر چمکتی ہوئی اڑتی چلی جا رہی تھی اور ظفر اس کے پیچھے دوڑتا ہوا گذری ہوئی منزلوں سے گذر رہا تھا پچھلی زندگی کے مناظر اس کی تصور کی آنکھوں میں ایک ایک کرکے آ رہے تھے ..... میعادی بخار کی شدت سے بستر پر پڑا ہے آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی ہیں ایک چہرہ جو کمزوری سے ستا ہوا اور پریشانی سے اترا ہوا ہے۔ جس میں خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس کے اوپر جھکا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ جو برف کی طرح ٹھنڈا ہے اس کے ماتھے پر رکھا ہے، دو ہونٹ جن پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں "یا اللہ تیری مشیت میں بندوں کو دم مارنے کی مجال نہیں مگر دعا مانگنے کی تو نے اجازت دی ہے، علم ... یہ تیری ناچیز گنہگار بندی تجھے محمد اور آل محمد کا واسطہ دے کر تجھ سے دعا کرتی ہے میرے ظفر کو بچا لے اور اس کے بدلے مجھے دنیا سے اٹھا لے۔ میرے مولا تو نے مجھے بہت سی نعمتیں

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

دعوتِ فکر

سالک

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
بیچ میں قالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

ہمارا ملک عام طور پر اور مسلمانوں کی جماعت خاص طور پر جس نازک اور خطرناک دور سے گذر رہی ہے اس میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی اعمال پر غور کرنا سیکھیں۔ اپنے خیالات اور جذبات بےلاگی کے ساتھ احتساب کریں اور جو خرابیاں ان میں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کہوں تو بات بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور نظری حیثیت سے کوئی اس کی مخالفت نہ کرے گا لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ بہت کم لوگ اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور بہت سے واقعیت پسند لوگ تو یہ پوچھیں گے کہ اس بیسویں صدی میں غور و فکر کی اہمیت ہی کیا ہے؟ جب بین الاقوامی سیاست کا سارا دار و مدار مادی طاقت پر ہو اور قومی سیاست اور جماعتوں کے باہمی تعلقات نفرت، تعصب، جتھہ بندیوں اور ووٹوں کی تعداد کے ساتھ وابستہ ہوں تو طبع سلیم پر زور دینے کی [illegible] نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سن سکتا ہے؟ توپوں اور ہوائی جہازوں اور ایٹم بموں کے سامنے ایک مفکر کی کیا حیثیت [illegible] جماعتیں جذبات سے مغلوب [illegible] وہاں [illegible] کو کون پوچھتا ہے؟ اس عالمگیر یورش میں انسانی تہذیب اور تمدن کا نظام آنکھوں دیکھے برہم ہوتا چلا جا رہا ہے اور [illegible] تخریب کی اندھی قوتوں نے مذہب، اخلاق اور [illegible] کے چراغوں کو تقریباً بجھا دیا ہے۔ لوگوں [illegible] میں چراغ جلانے کی ایک ناکام کوشش ہے اور بس! اور بعض دفعہ یہی سوچتا ہوں کہ غور و فکر سے گریز انسانی کی بنیادی جبلتوں میں بھی شامل ہے یا نہیں؟ تو [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ انسان فکر کی زحمت سے بچنے کے لئے [illegible] کی آڑ تلاش کرتا ہے۔ تعصب اور ضد کا جنون [illegible] کا معمول، بے پرواہی کی بے فکری، خوش عقیدگی کا بوجھ [illegible] غرض جو عذر بھی اسے مل جاتا ہے اس کی پناہ لیتا ہے تاکہ اس کے دماغ پر فکر کی آنچ نہ آنے پائے! [illegible] لوگ اس بات پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کوئی رہبر [illegible] ان کے بجائے سوچنے کا فرض انجام دے اور انھیں جانوروں کی طرح صرف یہ بتا دیا جائے کہ انھیں کیا کرنا ہے تاکہ وہ بغیر سوچے سمجھے رہنما کے بھروسے وہی کرتے رہیں۔ ہندوستان کی سیاست ابھی ایک ایسے دور میں سے گذری ہے جب خصوصاً مسلمانوں کی جماعت میں دیانت داری کے ساتھ تنقید کرنا، یا کسی عام رجحان سے اختلاف کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا اور لوگوں میں سچی تنقید کرنے یا سننے کی صلاحیت بالکل جاتی رہی تھی۔ اہل سیاست نے عموماً یہ کوشش کی کہ جس طرح فوج کے سپاہی قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں اور اس میں اول بدل ممکن نہیں اسی طرح قوم کے تمام افراد کی ذہنی چال بھی بالکل ایک سی بن جائے اور اس میں شاید انھیں اپنی توقع سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی۔ لیکن اب ملک کی تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا ہے۔ اور ہمیں بالکل نئے مسائل اور ایک نئی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے تو ہم سب کا فرض ہے کہ تنقید اور فکر کی روایات کو تازہ کریں اور اپنی ملکی اور ملی حالت پر غور کر کے صحیح راستہ تلاش کریں۔ جو صالح اور حیات بخش تحریکیں ہیں ان کی تائید کریں۔ جو فاسد اور تباہ کن تحریکیں ہیں ان پر بے پناہ تنقید کر کے ان کی روک تھام کریں۔

فکر سے گریز انسانی تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔ دراصل قوت فکر انسان کا سب سے بڑا شرف ہے۔ اسی کی بدولت اس نے حیوانوں کی ادنیٰ حیثیت سے ترقی کر کے اپنا موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔ جہاں کبھی کبھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور دنیا میں خدا کا نائب ہے! اگر وہ اسی عطیۂ الٰہی کو استعمال نہ کرے تو محض بیرونی قوتوں اور اثروں کا غلام بن کر رہ جائے گا اور اس کے پاس بے بسی اور قنوطیت کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔ وہ اپنی ذہنی کاوش اور عملی کوشش سے اپنی تقدیر کا معمار نہ بن سکے گا بلکہ خس و خاشاک کی طرح طوفان پر سوار ہوگا جو اسے اپنی قوت کے بل جہاں چاہے گا لے جائے گا۔ ممکن ہے وہ اپنے نفس کو یہ سمجھ کر دھوکا دے سکے کہ وہ اس طوفان کا ناخدا ہے لیکن اس کی اصل حالت یہ ہوگی کہ:

دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست!

اگر آپ سوچیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انسان کے پاس اپنی محرومیوں کو دور کرنے اور صحیح راستہ تلاش کرنے کے لئے [illegible] کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں یہ جانتا اور مانتا ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے بعض مشکل ترین مسائل اسی قوت فکر کی کارفرمائی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی نے وہ زبردست اور بے پناہ مشینیں اور آلات ایجاد کئے جنھوں نے ہم سے غداری کر کے (یا ہم نے خود ان سے غداری کی؟) ہماری زندگی کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا۔ اسی فکر کو آلۂ کار بنا کر گذشتہ دو سو برس میں ہماری سماجی اور اقتصادی زندگی نے ایک ایسی شکل اختیار کی جس میں افراد کی آزادی اور ان کی شخصیت کا وقار خطرے میں پڑ گیا ہے اور ملکیت کی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جس نے دنیا کی تہذیب کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ لیکن ان فکروں اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی ہمیں اسی قوت فکر کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور جس طرح اس نے ہماری مادی طاقت میں بے اندازہ اضافہ کیا ہے اسی طرح اس کی مدد سے ہمیں اپنی سماجی اور اخلاقی زندگی کی عمارت کو درست کرنا ہوگا۔ "عقل" بولہب ہی سہی لیکن [illegible] بولہب کو حیدر کرار بناتا ہے ورنہ دنیا میں انسان کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا!

اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس خواہ مخواہ کی تنقید کو اپنے ذمہ لے کر میں جان بوجھ کر بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ عام طور پر تعصب، نفرت اور خود غرضی کے خمار اور جتھہ بندی کی عافیت کو، احتساب نفس کی تلخی اور آزادئ فکر کے خطروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ زیادہ تر ایک دوسرے کی ہاں سے ہاں ملا کر اپنے ماحول کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور بعض جانوروں کی طرح جو فطرت کی نقالی کرتے ہیں ہر قسم کی مخالفت کے خطرہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انھیں "دعوت فکر" دینا ان کی مخالفت مول لینا ہے۔ جس انداز خیال یا تحریک یا تعصب یا توہم کے خلاف کوئی بات کہی جائے گی وہ فوراً ہتھیار بند ہی اور احتجاج کے لئے تیار ہو جائے گا اور بجائے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے نیت پر حملہ کیا جائے گا۔ یا غیر متعلق چیزوں کو بحث میں شامل کیا جائے گا لیکن اس وقت ہمارے ملک پر جو نازک دور گذر رہا ہے اس میں ہر ایماندار شخص کو یہ ناگوار فرض انجام دینا چاہئے اور اس کے راستے میں جو مخالفتیں یا رسوائیاں پیش آئیں انھیں صبر اور ضبط سے جھیلنا چاہئے۔ سچی بات کڑوی دوا کی طرح ہوتی ہے اور اس کو پینے میں صرف ناسمجھ بچے ہی ضد نہیں کرتے! اس وقت ہمارے لئے کڑوی دوائیں میٹھے اور نشہ آور شربتوں سے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔ شربتوں کے خمار کا خمیازہ ہم اچھی طرح اٹھا چکے ہیں۔

اس میں بحث اصولوں کی ہوگی یعنی کیا اچھی بات ہے اور کیا بری ہے، کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، کون سی تحریک زندگی کو بنانے والی ہے اور کون سی بگاڑنے والی؟ اس بات کی ضمانت دینا تو ممکن نہیں کہ اصولوں کی زد میں افراد کبھی نہ آئیں گے لیکن اتنا اطمینان دلا سکتا ہوں کہ افراد سے یا ذاتیات سے براہ راست بحث نہ ہوگی اور چونکہ مقصد کسی خاص پارٹی کی وکالت کرنا نہیں بلکہ اپنے نقطۂ نظر سے صحیح اصولوں کی حمایت کرنا ہے۔ اس لئے کسی خاص فرد یا جماعت کی تائید یا مخالفت کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے امید یہ ہوتی ہے کہ مجھ پر جنبہ داری کا الزام نہیں لگ سکے گا۔ یا کم سے کم ایمانداری کے ساتھ نہ لگایا جا سکے گا۔

آئیے ہم آپ مل کر ہر دو ہفتہ میں ایک دفعہ اڑتے تنکوں سے ہوا کا رخ پہچانیں اور اس بات کا اندازہ کریں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور اس طرف جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

سیمیاس نے کہا "بہت خوب سقراط تو پھر میں تم سے اپنی مشکل بیان کرتا ہوں .... مجھے یہ احساس ہے اور غالباً تم کو بھی ہوگا کہ موجودہ زندگی میں اس قسم کے مسائل کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تاہم میں اس شخص کو بزدل سمجھوں گا جو ان کے متعلق ہر قسم کے اقوال کی پوری طرح چھان بین نہ کرے یا ان پر ہر پہلو سے غور کرنے سے پہلے ہی ہمت ہار جائے۔ اسے اس وقت تک استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے جب تک کہ دو باتوں میں سے ایک حاصل نہ ہو جائے۔ یا تو وہ اپنی تحقیق سے یا دوسروں کی تعلیم سے ان کی حقیقت دریافت کر لے۔ یا اگر یہ ناممکن ہے تو میری رائے میں وہ اس انسانی نظریے کو جو سب سے بہتر اور ناقابل تردید ہو اختیار کرے اور اسی بیڑے میں بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو عبور کرے ——— میں مانتا ہوں کہ یہ صورت خطرے سے خالی نہیں اگر خدا کا کلام اس کی رہنمائی اور حفاظت نہ کرے۔"

(فیڈو — مکالمات افلاطون)

قول کو زید و عمر کے [illegible] اہم نہ جان
روشنئ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

(حسرت)

مسئلۂ فلسطین کا پس منظر

سید عبدالہادی

مسئلۂ فلسطین اب تمام دنیائے عرب کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسئلے کی تاریخ جس نے اب تک کئی رخ بدلے ہیں خاصی دلچسپ ہے۔ ایک مدت سے قریب قریب سب عرب ملک سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ جب ترکوں کی سلطنت پر زوال آنے لگا تو اس کا اثر عرب ملکوں پر بھی پڑا۔ ترکوں اور یورپ کی اس کھینچا تانی کے دوران میں ۱۹۱۴ء میں یکایک پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنت عثمانیہ اس زمانے میں شل ہو چکی تھی کیونکہ پچھلے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں وہ طرابلس اور بلقان کی لڑائیاں لڑ چکی تھی۔ یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک زوال پذیر سلطنت اتنی جلدی ایک تیسری جنگ کے لئے تیار ہو جائے گی لیکن ان دنوں ترکی میں نوجوان ترکوں کا دور دورہ تھا اور انور پاشا کا طوطی بول رہا تھا۔ انور پاشا ذاتی طور پر قدرے جرمن دوست تھے۔ کیونکہ وہ اپنی شروع کی زندگی میں بطور سفیر کے برلن میں بہت دن قیام کر چکے تھے اور دوسری یورپی قوموں کے مقابلہ میں جرمنوں کو پسند کرتے تھے۔ انہیں دنوں سلطنت ترکی برطانیہ کو دو بحری جہاز بنانے کا ٹھیکہ دے چکی تھی۔ یہ دونوں جہاز "گوبن" اور "برلیلا" تیار ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی۔ برطانیہ نے یہ جہاز ترکی کو حسب معاہدہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر کہ اگر ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا تو یہ جہاز خود انگلستان کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ ترکی نے بجا طور پر یہ کہا کہ برطانیہ کو اپنا معاہدہ پورا کرنا چاہئے۔ سیاسی اور فوجی پیش بندی کا یہ کوئی محل نہیں ہے۔ برطانیہ کے پیہم انکار پر نوجوان ترکوں کو ایک معقول بہانہ مل گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھی بن کر جنگ میں شامل ہو جائیں۔ انھوں نے کئی جگہ خصوصاً دردانیال پر برطانوی فوجوں کے دانت کھٹے کر دئے۔

ترکوں کی سیاسی اور فوجی قوت کو توڑنے کے لئے برطانوی مدبرین اپنی وہی ہمیشہ کارگر ہونے والی سیاسی چال چلے۔ جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کرنل لارنس ایک نوجوان حوصلہ مند انگریز فوجی افسر کو اس کام پر مقرر کیا گیا کہ وہ ترکوں اور عربوں میں پھوٹ ڈال دے تاکہ ترکوں کی قوت منقسم ہو جائے۔

کرنل لارنس کی داستان بڑی عجیب ہے۔ وہ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا اور بلا کا مضبوط، نڈر اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس کے مشورے سے مکے کے شریف حسین عربوں کے سردار بنائے گئے۔ اور ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ وجہ بغاوت یہ بتائی گئی:

(۱) ترک عربوں کو آزادی نہیں دیتے اور عربوں پر بے جا مظالم توڑتے ہیں۔

(۲) ترک شراب پیتے ہیں اور داڑھی منڈاتے ہیں اور غیر مسلم عورتوں سے [illegible] دیاں کرتے ہیں۔

(۳) عرب ایک الگ قوم ہیں اور ان کی اپنی ریاست ہونی چاہئے۔

شریف حسین اور اس کے چار دن نوجوان لڑکوں نے بڑے زور شور سے کرنل لارنس سے مل کر یہ پروپیگنڈا تمام سخت عصبیت رکھنے والے عرب ملکوں میں پھیلا دیا۔ سادہ لوح عربوں نے ان کی باتوں کا پورے طور پر یقین کر لیا۔ مشرق قریب کے سب ملکوں میں ایک آگ لگ گئی اور تھوڑے بہت عرب سپاہی اور افسر جہاں جہاں تھے عربوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

کرنل لارنس اور اس کے عرب ساتھیوں نے جنگ کا ایک عجیب طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ انور پاشا کی فوجی اسکیم یہ تھی کہ وہ براہ سوئز مصر پر حملہ آور ہوں تاکہ برطانیہ کی بہت سی ایشیائی فوج ادھر الجھی رہے اور جرمن افواج کی پیش قدمی شمالی فرانس میں روکی جا سکے۔ اس مدبرانہ منصوبے کو پورا کرنے میں ترک ایک حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ نہر سوئز کے کنارے تک ترکی فوجیں آ گئی تھیں اور نہر پاٹنے کے لئے تھیلوں میں ریت بھر لی گئی تھی کہ کرنل لارنس نے اپنے عرب ساتھیوں کے ساتھ ترکی فوجی لائنوں کے عقب میں مار دھاڑ شروع کر دی۔ ترکی شامی ریلوے جو شام اور فلسطین سے گذرتی تھی اور سوئز تک سامان جنگ پہنچاتی تھی توڑ پھوڑ ڈالی گئی۔ کئی ترکی فوجی ٹرینیں سپاہیوں اور افسروں سے بھری ہوئی بارود سے اڑا دی گئیں۔ راستے کے کوئی چھ سو چھوٹے بڑے پل ڈائنامائٹ سے اڑا دئے گئے اور اسی محاذ پر انور پاشا کو پوری ناکامی ہوئی۔ انور پاشا کے بہترین دوست اور ساتھی جمال پاشا اس محاذ کے کمانڈر تھے۔ لیکن وہ بھی ان مجنونانہ بغاوتوں کا کوئی سد باب نہ کر سکے اور سال ڈیڑھ سال میں ترکوں کی عملداری اس نواح سے بالکل اٹھ گئی۔ آخر جرمنی کو اور ترکوں کو سخت شکست ہوئی۔

لارنس شریف حسین کے بیٹوں یعنی عبداللہ و فیصل کو عرب ریاستوں کے سبز باغ دکھا چکا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر یہ شہزادے ایفائے وعدہ کے طالب ہوئے۔ چنانچہ فیصل کو عراق کا بادشاہ بنایا گیا اور عبداللہ کو شرق اردن کا۔ فلسطین پر برطانوی سیادت قایم کی گئی اور شام پر فرانس کی۔ یہ دونوں عرب ریاستیں بڑی حد تک برطانیہ کی دست نگر تھیں۔ لیکن جوں جوں برطانوی گرفت ایشیا پر کم ہوتی گئی یہ ریاستیں خود مختار اور مضبوط بنتی گئیں۔

ان کی حالت سنبھلنے کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ عراق اور سعودی عرب کے علاقوں میں پیٹرول بہت افراط سے نکلا اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ اور برطانیہ نے بڑے بڑے ٹھیکے لئے اور تیل کی برآمد پر کروڑوں روپیہ رائلٹی کا ان لوگوں کو ملنے لگا۔ عرب ملکوں کے خزانے کی حالت قدرے درست ہوئی تو حقوق طلبی اور آزادی کی جو قدرتی رو عام طور پر ایشیا میں دوڑی ہوئی ہے عرب ملکوں میں بھی پہنچ گئی۔ پبلک جمہوری خیالات سے متاثر ہوئی اور حکومتیں کامل خود مختاری کی طالب ہوئیں اور [illegible] یہ ملک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بن گئے۔

اب مسئلے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانیہ جس طرح عربوں سے ساز باز کر رہا تھا اسی طرح فلسطین کے یہودیوں سے اور عام طور پر دنیا کے سب یہودیوں سے بھی ساز باز کر رہا تھا۔ جنگ کے زمانے میں مددگار کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور یہودیوں کی قیمت اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھی کہ دولت مند قوم کی حیثیت سے انھوں نے قرضوں اور عطیوں کی شکل میں برطانیہ اور امریکہ کو خاصی رقمیں دی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ نے یہودیوں کو اپنی طرف رکھنے کے لئے دوران جنگ میں مستقل طور پر ان سے بڑے بڑے وعدے کرائے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو اعلان بالفور کے ذریعے سے یہودیوں کا قومی گھر فلسطین میں بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ دراصل یہ ان کی قومی ریاست بنانے کی تمہید تھی۔ عربوں نے اس خطرے کو ابتدا میں تاڑ لیا تھا لیکن ایک تو وہ بے بس تھے اس لئے سردست کوئی قانونی یا دفاعی کارروائی نہ کر سکے۔ دوسرے اپنی سہل انگاری کی بنا پر انہوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسکین دے لی کہ "اچھا جب یہودی حکومت قایم ہو گی تو دیکھا جائے گا"۔

فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ رقبہ میں ہندوستان کے صرف دو ضلعوں کے برابر اور آبادی میں صرف ایک اوسط درجے کے ضلعے کے برابر۔ اس وقت وہاں کوئی دس لاکھ مسلمان عرب تھے اور کوئی ایک لاکھ یہودی اور عیسائی۔ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن یہودیوں کے ہم قوم اور مددگار یورپ اور امریکہ میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک لاکھوں یہودی ہجرت کر کے فلسطین پہنچے۔ انہوں نے جدید طرز کے ہزاروں مکانات بنائے۔ زمینیں خریدیں، تجارت اور زراعت کو فروغ دیا اور قصبات اور شہر آباد کئے جہاں صدیوں سے خاک اڑ رہی تھی وہاں میووں کے باغ لہلہانے لگے۔

یہودیوں میں جو لوگ قومی حکومت کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے صیہونی کہلائے اور اسی نام کی ان کی ایک باقاعدہ قومی جماعت بن گئی۔ ہر یہودی صیہونی نہیں ہے لیکن صیہونیوں کو قدرتی طور پر سب یہودیوں کی ہمدردی حاصل ہے ۱۹۳۵ء تک جب کئی لاکھ یہودی وہاں آ چکے اور یہودیوں کا زور ملک میں بڑھنے لگا تو عربوں کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے ملک میں بے قاعدہ طور پر [illegible] شروع کر دی۔ برطانیہ حسب دستور [illegible] کبھی یہودیوں کو کبھی عربوں کو [illegible] شورش بڑھتی گئی۔

[illegible] ۱۹۳۹ء تک یہ حالت تھی کہ [illegible] جھگڑوں کی اور دونوں عربوں، یہودیوں اور برطانوی سپاہیوں کے مارے جانے کی خبریں آتی رہتی تھیں ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے اپنی حکمت عملی سے [illegible] کہ نہ یہودی اس کے خلاف کھڑے ہوئے [illegible] اس صورت دونوں نے قریب قریب اس طرح مدد کی [illegible] جنگ [illegible] میں کرتے تھے۔ بیس برس کے تجربے سے کسی نے کچھ نہ سیکھا تھا ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو فلسطین کا مسئلہ پھر ایک بار بڑی شدت سے اٹھ کھڑا ہوا اور عربوں اور یہودیوں میں لڑائی کا بازار پھر اسی طرح گرم ہو گیا [illegible] یہ ہوا کہ اب برطانوی رویہ عربوں کے ساتھ زیادہ نرمی کا تھا کیونکہ برطانیہ نے کسی طرح یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ جلد ملک کو چھوڑنے والا ہے اور وہاں کے باشندے جس طرح چاہیں اپنے ملک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ لیکن اب امریکہ کھلم کھلا یہودیوں کی پشت پناہی کرنے لگا۔ اور اس نے اپنا اثر ڈال کر حفاظتی کونسل میں یہ تجویز پاس کرا لی کہ فلسطین کے دو حصے کر دئے جائیں ایک میں عربوں کی حکومت ہو اور دوسرے میں یہودیوں کی اس کے بعد حالات نے جو صورت اختیار کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

کیا

آپ کا پتہ ٹھیک ہے؟ اگر کوئی غلطی ہو تو ہمیں اطلاع دیجئے۔

منیجر

اسلامی تہذیب کی روح بسلسلہ صفحہ

ایک جسم اجتماعی بنا دیا ہے اور اس کی نجات اس میں ہے کہ شرافت و انسانیت، عدل و انصاف، محبت اور اخوت، احسان اور ایثار کے سبق کو جو خاصان خدا ہمیشہ سے پڑھاتے آئے ہیں نئے سرے سے پڑھے۔ اس سائنس کے دور میں انسان کو پھر سے یہ سیکھنے کی ضرورت ہے کہ خدا کے نام کو دلیل راہ بنائے اور راضی بہ رضا رہ کر زندگی بسر کرے۔ تاکہ اپنی خوشی سے مشیت ایزدی کا آلۂ کار بن جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صرف معدودے چند آدمیوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔ پوری کی پوری قومیں یا جماعتیں اس اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتیں۔ لیکن یہ نصب العین کہ طاقت کو قابو میں رکھا جائے اور سائنس سے نوع انسانی کی بھلائی کا کام لیا جائے بجائے خود بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے اور اس سے ہماری ترقی کی سمت متعین ہو جاتی ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے وسیع تر نقطۂ نظر سے ہمیں ہر چیز کا جو زندگی کے اس تصور کو تقویت پہنچائے، خیر مقدم کرنا چاہئے خواہ وہ اسلام کی مذہبی تعلیم ہو یا مہاتما گاندھی، دومیں رولاں اور آئنسٹائن کی اخلاقی تلقین۔

ہندوستان دنیا کا ایک حصہ ہے اس لئے یہ بات اس پر بھی صادق آتی ہے بلکہ اسے اسلامی تہذیب سے اور زیادہ قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ وہ اس تہذیب کا ایک بڑا مرکز رہ چکا ہے۔ اس نے اس تہذیب سے بہت کچھ لیا ہے اور اس کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے باریک دھاگے ہندوستانی تہذیب کی تار و پود میں اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا آرٹ اور فن تعمیر، زبان و ادب، مذہب، فلسفہ ہندوستان کے عظیم الشان تہذیبی ورثہ کا ایک جز بن گیا ہے۔ اس کے مغنیوں کا کمال، اس کے مصوروں کی چابک دستی، اس کے عارفوں کی صفائے قلب، اس کے حکمرانوں کا تدبر، اس کے عالموں، ادیبوں، شاعروں کی فارسی، اردو، ہندی، ہندوستانی تصانیف اس ہندوستانی تہذیب میں جس کی ہمارے دل میں اتنی قدر و محبت ہے جذب ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بہت سے سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے۔ اس لئے کہ ذہن کی دنیا میں سرحدیں نہیں ہوتیں اور علم و ہنر کی ہوائیں بے روک ٹوک ادھر سے ادھر چلتی رہتی ہیں [illegible] ارباب ہنر اسی زمین [illegible] پھولے پھلے اور اسی کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا۔ ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی تہذیب کے اثرات کو مٹانا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے۔ بے شک جراح کا نشتر یہ عمل کر سکتا ہے لیکن اس کا نظام جسمانی پر جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے ہمارا یہ تقاضا کہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ وسعت قلب کے ساتھ اور قدر شناسی کی نظر سے کیا جائے۔ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود ہندوستان کی آیندہ عظمت کی خاطر ہے اور ان قدروں کی خاطر ہے جن سے دنیا کو کچھ فیض پہنچ سکتا ہے۔

روشن خیال قومیں اپنے وقت توجہ اور وسائل کو ان تہذیبوں کے مطالعہ میں صرف کر رہی ہیں جو زمان و مکاں کے لحاظ سے ان سے بہت دور ہیں۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں ایسے علما موجود ہیں جو قدیم مصری تہذیب یا مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کی تہذیبوں اور زبانوں کے مطالعے میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں۔ پھر کیا یہ بات قیاس میں آ سکتی ہے کہ ہندوستان جس میں اب تک چار کروڑ مسلمان موجود ہیں اور جو اسلام سے ایک ہزار سال کے تہذیبی تعلقات رکھتا ہے اسلامی تہذیب کے مطالعے کو ترک کر دے گا یا پاکستان کو جو ابھی تک ہندوستانی ریاست کا ایک حصہ تھا اور اب تک ہندوستانی تاریخ اور تہذیب میں برابر کا شریک ہے اپنے سب سے قریبی اور سب سے اہم پڑوسی کی بیش بہا تہذیبی دولت کو نظر انداز کر دے گا؟ نہیں یہ کسی طرح عقل میں نہیں آتا۔ مجھے امید ہے کہ جب فرقہ وارانہ جنون کا دورہ جس میں ہندستان اور پاکستان کے بہت سے لوگ مبتلا ہیں، دور ہو کر گزر جائے گا تو ہندوستان کی روح جو ہر جگہ سے اچھی [illegible] کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یہاں پھر بیدار ہو جائے گی اور پاکستان کے مسلمانوں میں اسلام کی .... روح نئے سرے سے کار فرما ہوگی اور تہذیبی تعاون اور تعامل کا سلسلہ جو پچھلے دنوں کے واقعات کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے پھر سے شروع ہو جائے گا

نئی روشنی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سیّد عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد الحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی دہلی مکتبہ جامعہ

مطبوعہ: جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۹ | ۸ اگست ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سیّد عابد حسین

تشدد کا اصول

مہاتما گاندھی

بے شک میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب بزدلی یا تشدد کے سوا کوئی تیسری صورت نہ ہو تو تشدد سے کام لینا چاہئے۔ چنانچہ جب میرے بڑے لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ اگر وہ اس تقریباً مہلک حملے کے وقت موجود ہوتا جو مجھ پر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا تو اسے بھاگ کھڑا ہونا چاہئے تھا یا جسمانی طاقت سے جسے وہ استعمال کر سکتا تھا اور کرنا چاہتا تھا کام لینا چاہئے تھا، تو میں نے اس سے کہا تمہارا فرض تھا کہ مجھے بچاتے چاہے اس میں جسمانی طاقت ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑتی۔ اسی لئے میں نے ٹنگ بوئر میں جو بے جا طور پر زولو بغاوت کہلاتی ہے اور پچھلی جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ اسی لئے میں ان لوگوں کو جو تشدد کے قائل ہیں فوجی تربیت دئے جانے کی حمایت کرتا ہوں۔ میں اسے بہتر سمجھتا ہوں کہ ہند اپنی عزت کو بچانے کے لئے ہتھیار اٹھائے، بہ نسبت اس کے کہ وہ ایسا بے بس بن جائے یا بنا رہے کہ چپ چاپ اپنی بے عزتی گوارا کرلے۔

گر میرا عقیدہ ہے کہ عدم تشدد، تشدد سے بدرجہا بہتر ہے، عفو سزا سے زیادہ مردانگی کا کام ہے۔ عفو سپاہی کا زیور ہے۔ مگر سزا سے باز رہنے کو عفو اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب سزا دینے کی طاقت موجود ہو۔ ایک بے بس آدمی کی طرف سے عفو کا بہانہ بے معنی بات ہے۔ چوہا جب بلی کو اپنی تکہ بوٹیاں کرنے دیتا ہے تو وہ عفو سے کام نہیں لیتا۔۔۔۔

میرا مطلب سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے۔ طاقت تنومندی سے نہیں پیدا ہوتی۔ اس کا خزانہ وہ قوت ارادی ہے جو دبائے نہ دبے۔ ایک معمولی زولو تنومندی میں ایک معمولی انگریز سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر وہ ایک انگریز لڑکے کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس لڑکے کے یا اس کے حامیوں کے ریوالور سے ڈرتا ہے۔ موت کے خوف سے وہ اس تن و توش کے باوجود ذلیل ہوتا ہے۔۔۔۔۔

اگر ہم سمجھ بوجھ کر عفو سے کام لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں اپنی طاقت کا پورا احساس ہے۔ شعوری عفو کے ساتھ ہمارے اندر طاقت کی ایک زبردست لہر دوڑ جائے گی۔۔۔

میں محض خیالی آدمی نہیں ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں عملی قسم کا عینیت پسند آدمی ہوں۔ اہنسا کا دھرم صرف رشیوں اور سنتوں کے لئے نہیں ہے، معمولی انسانوں کے لئے بھی ہے۔ اہنسا ہماری نوع کا قانون ہے اسی طرح جیسے ہنسا نوع حیوانی کا قانون ہے۔ حیوان کے اندر روح سوئی ہوئی ہوتی ہے اور وہ جسمانی طاقت کے سوا کسی طاقت کو نہیں جانتا۔ انسان کی شان یہ ہے کہ وہ ایک برتر قانون کی پابندی کرے۔ روحانی قوت کی اطاعت کرے۔

اس لئے میں نے یہ جرأت کی ہے کہ ایثار اور قربانی کا پرانا قانون ہندوستان کے سامنے رکھا ہے۔ ساتیہ گرہ اور اس کی شاخیں، عدم تعاون اور سول نافرمانی محض تپسیا کے پرانے دھرم کے نام ہیں۔ وہ رشی جنھوں نے ہنسا کے ماحول میں اہنسا کا قانون دریافت کیا نیوٹن سے بڑھ کر دماغ رکھتے تھے۔ وہ خود ولنگٹن سے اچھے سپاہی تھے۔ چونکہ انھیں ہتھیاروں کے استعمال کا خوب تجربہ تھا وہ جانتے تھے کہ دراصل یہ بے کار ہیں اور انھوں نے دنیا کو جو فنّ دنیا دے سکتے تھے یہ سکھایا کہ اس کی نجات ہنسا سے نہیں بلکہ اہنسا سے ہو سکتی ہے۔

اہنسا کی عملی شکل جان بوجھ کر دکھ اٹھانا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ برائی کرنے والے کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیا جائے بلکہ یہ ہیں کہ اپنی ساری روحانی قوت سے اس کے ارادے کی مزاحمت کی جائے۔ اپنی فطرت کے اس قانون پر عمل کرتے ہوئے ایک فرد واحد اپنی عزت، اپنے مذہب، اپنی روح کو بچانے کے لئے ایک بے انصاف سلطنت کی پوری قوت کے مقابلے پر لا سکتا ہے اور اس سلطنت کے خاتمے یا اس کی اصلاح کی بنیاد ڈال سکتا ہے۔

پس جب ہندوستان کو اہنسا پر عمل کرنے کی رائے اس لئے نہیں دیتا ہوں کہ وہ کمزور ہے میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے زور و قوت کے شعور کے ساتھ ستیاگرہ سے کام لے۔ اپنی طاقت کا شعور حاصل کرنے کے لئے اسے فوجی تربیت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو گوشت کا ایک لوتھڑا سمجھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہندوستان یہ جان لے کہ وہ روح رکھتا ہے جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آ سکتی ہے، جو دنیا بھر کی جسمانی طاقت کے مقابلے پر آ سکتی ہے۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ رام نے جو محض انسان تھے بندروں کو لے کر راون کی تمام قوت کا مقابلہ کیا جس کے دس سر تھے اور جو اپنے آپ کو لنکا میں ہر طرف سے بحر سوراج سے گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے محفوظ سمجھتا تھا؟ اس کا مطلب سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ روحانی قوت نے جسمانی قوت پر فتح پائی؟۔۔۔۔۔۔

اگر ہندوستان تشدد کا اصول اختیار کرے تو ممکن ہے کہ اسے وقتی کامیابی ہو مگر اس صورت میں ہندوستان میرے لئے قابل فخر نہیں رہے گا۔ میں اس کے ساتھ دل و جان سے وابستہ ہوں، اس لئے میرا سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے۔ مجھے پوری طرح یقین ہے کہ وہ دنیا کے لئے ایک پیام رکھتا ہے۔ اسے یورپ کی اندھا دھند نقل نہیں کرلی چاہئے۔ جب ہندوستان تشدد کے اصول کو قبول کرے گا وہ میری آزمائش کا وقت ہوگا۔ خدا کرے میں اس میں پورا اتروں۔ میرا مذہب جغرافی حدود کا پابند نہیں۔ اگر میں اس کا سچا عقیدہ رکھتا ہوں تو وہ اس محبت پر بھی غالب آجائے گا جو مجھے ہندوستان سے ہے۔ میری زندگی اس کے لئے وقف ہے کہ ہندوستان کی خدمت اہنسا کے مذہب کے ذریعے سے کروں، جسے میں ہندو دھرم کی جڑ سمجھتا ہوں۔

۱۱ اگست سنہ ۱۹۲۰ء

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
تشدد کا اصول	مہاتما گاندھی	۱
گاندھی جی اور انقلاب ہند	پروفیسر ہمایوں کبیر	۲
نئی روشنی کے مقاصد	(ادارہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ (۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مشرقی دنیا		۶
طیارہ	(ترجمہ انصاری)	۷
ٹیگور کے گیت	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷
بیتی عید (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۸
کیا فیشن کم نہیں ہوں گے؟	پروفیسر محمد عاقل	۱۰

گاندھی جی اور انقلابِ ہند

(۱)

پروفیسر ہمایوں کبیر

شاید دنیا کی تاریخ میں کسی پس ماندہ اور محکوم ملک کے کسی باشندے کو اپنے زمانے میں وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی ہو جو موہن داس کرم چند گاندھی کو حاصل ہوئی۔ ان کی شہرت صرف ایک بلند پایہ مدبر اور سیاسی لیڈر ہی کی حیثیت سے نہ تھی بلکہ ایک ذہنی رہنما کی حیثیت سے بھی جس نے بنی نوعِ انسان کو ایک خاص پیغام دیا۔ جدید یورپی تہذیب و تمدن کی بنیاد عیسائیت کے اصولوں پر رکھی گئی ہے تاہم خود اہلِ یورپ کو اعتراف ہے کہ جس سچائی اور خلوص کے ساتھ ان اصولوں پر گاندھی جی نے ہر نہم عریاں فقیر نے عمل کیا مغرب میں کوئی شخص نہ کر سکا۔

مشرق و مغرب دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موجودہ زمانے کی سب سے بڑی شخصیت گاندھی جی کی ہے۔ ان کے علاوہ گاندھی جی کے مخالفین بھی آج ان کی شخصیت کی اہمیت اور قوت سے انکار نہیں کر سکتے۔ آخر ان کی اس طاقت کا راز کیا ہے؟

ان کے بعض معتقدین کا خیال ہے کہ ان کی یہ طاقت روحانی اور مافوق الفطرت ہے جس کی ہم تشریح کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ کوئی معقول جواب نہیں۔ ان کی اس طاقت کا سرچشمہ کچھ بھی ہو اس سے کام تو مادی حقائق اور واقعات ہی کی سطح پر لیا جاتا تھا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اعلیٰ طاقتوں کو بھی اپنے اظہار کے لئے انسانی زندگی کے پس منظر اور میدانِ عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ غرض ہمیں تو گاندھی جی کی طاقت کا مطالعہ انسانی حیثیت سے کرنا ہے۔

گاندھی جی کی انقلابی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے اس طاقت کو ابھارا جو ہندوستانیوں کے صبر و تحمل میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ وہ عام ہندوستانیوں کے ساتھ گھل مل کر ایک ہو گئے اور انہیں ننگے بھوکے، جاہل ہندوستانیوں کے اندر کھپ کر انہوں نے خود طاقت حاصل کی اور پھر اس طاقت کا کچھ حصہ عوام کی طرف منتقل کر دیا۔

پہلی نظر میں گاندھی جی کی قوتِ عمل اور عوام کی جمود اور بے حسی میں ایسا تضاد نظر آتا ہے جو ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن در اصل اسی سے ان کی قوت اور اثر کا سراغ ملتا ہے۔

گاندھی جی کو صرف ہندوستانیوں ہی کی ذہنی اصلاح مقصود نہ تھی بلکہ وہ ساری دنیا کو ایک پیغام پہنچانا چاہتے تھے، چاہے وہ دنیا میں کایا پلٹ نہ کر سکے ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ہر جگہ انسان کے دماغ میں ایک حرکت ضرور پیدا کر دی۔ شاید اس قسم کے کاموں کا خاصہ ہی یہ ہے کہ ان میں پوری کامیابی نہیں ہوتی۔ لیکن ہندوستان کے حصولِ آزادی کا ساری دنیا پر جو ردِ عمل ہوا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گاندھی جی کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔

جنگِ آزادی کے شروع کرنے سے پہلے گاندھی جی کو ایک ایسی تلوار کی ضرورت تھی جس کی کاٹ آزمائی جا چکی ہو لیکن چونکہ ہندوستانیوں میں روحانی اتحاد نہیں رہا تھا اس لئے یہ کام بہت مشکل ہو گیا تھا۔ مغرب کی ٹکر سے ان کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور ان کا شعورِ وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اونچے طبقے اور عوام ایک دوسرے سے اتنی دور ہٹ گئے تھے کہ ان میں باہم کوئی رشتہ ہی نہیں رہا تھا۔ گاندھی جی نے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے کی اور کھوئی وحدت کو واپس لانے کی کوشش کی۔ یہ ان کا بہت بڑا سیاسی کارنامہ تھا جس نے ان کو بہت بڑا انقلابی لیڈر بنا دیا۔

گاندھی جی ایسے وقت میں پیدا ہوئے جب کہ برطانوی اقتدار کے جادو نے ہندوستانی ذہن کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا احساس اور ارادہ بھی مسحور ہو چکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے معرکے کی یاد ابھی لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے اثرات مختلف فرقوں پر مختلف تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ان کی قوتِ عمل سلب ہو گئی تھی اور ان کے دل غصے اور نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ ہندوؤں میں مختلف قسم کے احساسات تھے۔ بعض لوگ ان حالات سے جلتے اور کڑھتے تھے مگر بعض ایسے بھی تھے جنہیں شکست یا مایوسی مطلق احساس نہ تھا۔ بعض چھوٹے فرقوں کا خیال تھا کہ انگریزوں کو جو فتح ہوئی ہے اس میں وہ بھی شریک ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ برطانوی اقتدار کا سکہ نہ صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی بیٹھ چکا تھا۔ برطانیہ کی عظمت شباب پر تھی، اور ساری دنیا پر برطانوی امن کی فرماں روائی تھی۔

سائنس کی ترقی کا عہدِ جدید شروع ہو گیا تھا اور نوعِ انسانی کے سامنے امکانات کی ایک وسیع دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔ مادی سطح پر صنعت و حرفت ایسی ترقی کر رہی تھی جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ ذہنی سطح پر انیسویں صدی کی عقلیت فروغ پا رہی تھی۔ سیاسی سطح پر عہدِ جدید کا بہترین نظام لبرل جمہوریت اور قومی ریاست تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانی ترقی کی راہ میں اب کوئی چیز رکاوٹ نہیں ڈال سکتی اور تعلیم کے عام ہونے سے ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ غرض یہ توسیع کا، امید پروری اور عقل پرستی کا دور تھا۔

انسانی ترقی کے ان غیر محدود امکانات نے روشن خیال ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اور برطانیہ کے فیضان سے وہ بھی سائنس اور جمہوریت کے دل سے معتقد ہو گئے۔ مغرب کا اثر ذہنی سطح تک محدود نہیں رہا، ان کے جذبات پر بھی چھا گیا اور ان کی آزادی اور ترقی کے حوصلے بھی یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔ آزادی کی جد و جہد کے لئے برطانیہ کی مدد اور اشتراکِ عمل کو ضروری سمجھا جانے لگا۔

مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک نے ان روشن خیال ہندوستانیوں کی آنکھوں کو اس درجہ خیرہ کر دیا تھا کہ وہ مغربی تہذیب کے پودے کو جوں کا توں اکھاڑ کر ہندوستان کی زمین میں نصب کرنا چاہتے تھے۔ دونوں تہذیبوں کو سمونے کا انہیں خیال تک نہ آیا کیونکہ اس میں دونوں طرف سے لینے اور دینے کا سوال تھا۔ یہ انگریز پرست سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے پاس دینے کے لئے تو کچھ ہے نہیں اسے تو لینا ہی لینا ہے۔ مگر ہندوستانیوں کے کروڑوں عوام کا یہ خیال نہ تھا کہ ان کو اپنی تہذیب کی قدر و قیمت کا فطری احساس تھا اور وہ اسے برباد کرنے کی ہر کوشش میں مزاحم ہوتے تھے۔ اس لئے انگریز پرستوں نے سوچا کہ بغیر عوام کی مدد اور اشتراکِ عمل کے وہ ایک "انڈو انگلین" تہذیب پیدا کر دیں۔ مگر اس قسم کی خود ساختہ تہذیبیں قوم کی زندگی میں جڑ نہیں پکڑتیں۔ اسی لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "انڈو انگلین" معاشرت ایک مضحکہ بن کر رہ گئی۔

گاندھی جی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سیاست کا رخ یورپ سے ہندوستان کی طرف پھیر دیا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ نقلی یورپ کی جگہ اصلی و حقیقی ہندوستان کی تعمیر کریں گے۔ گاندھی جی سے پہلے بھی ہندوستانی لیڈروں نے قوم کی خدمت کی تھی مگر وہ عوام کی سطح سے بلند رہ کر خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس احساسِ برتری کی وجہ سے وہ عوام میں گھل مل نہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی کے آنے سے پہلے ہندوستانی سیاست صرف متوسط اور اعلیٰ طبقہ تک محدود تھی۔ بے چارے بے زبان اور بے عمل ہندوستانی عوام ان لوگوں کی بات سمجھتے تک نہ تھے اس سے متاثر کیا ہوتے۔

ہندوستان کے اونچے طبقوں اور عوام میں دوبارہ روحانی تعلق پیدا کرنا گاندھی جی کا سب سے اہم مقصد تھا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سلسلہ کا پہلا قدم یہ تھا کہ دونوں کی زندگی مشترک ہو۔ چنانچہ گاندھی جی نے ملک کے سیاسی کارکنوں سے جو سب سے پہلا مطالبہ کیا اسی سے ان کی خداداد فہم و فراست کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے کہا تم کو اپنے عادات و اخلاق، فکر و عمل، وضع قطع اور رہن سہن کو ان ننگے بھوکے جاہل عوام کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنا چاہئے۔ انہوں نے سیاسی کارروائیوں کے لئے عوام کی زبان اختیار کی۔ خود ان کا طرزِ زندگی ایسا تھا کہ ان میں اور ایک کسان میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اس کا عوام پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ انہوں نے اپنے لیڈر کا جو ان کی بولی بولتا، ان ہی جیسا لباس پہنتا اور ان ہی جیسا کھانا کھاتا تھا دل و جان سے خیر مقدم کیا۔ بدیسی سامراجی "نیم عریاں فقیر" کہہ کر گاندھی جی کا مذاق اڑاتے تھے لیکن یہ محض ان کی کم فہمی اور حماقت کی دلیل تھی۔ ان کوتاہ بینوں کو کیا خبر تھی کہ جس ہیئت کے اختیار کرنے پر وہ گاندھی جی کا مذاق اڑاتے ہیں اسی میں ہندوستانیوں پر ان کے زبردست اثر کا راز پنہاں ہے۔

گاندھی جی کی خداداد فراست کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں۔ انہوں نے یہ کمال کیا کہ ہندوستانیوں کی کمزوریوں ہی کو ان کی قوت کا سرچشمہ بنا دیا۔ ان کے جمود اور بے عملی سے عمل کا کام لیا۔ گاندھی جی کے آنے سے پہلے ہندوستانی عوام کی یہ حالت تھی کہ ملک میں کوئی ایسا انقلاب قطعاً ناممکن تھا جس میں اپج اور سرگرمی کی ضرورت ہو۔ گاندھی جی نے اس حقیقت سے خفا ہونے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کی تقدیر پرستی اور انفعالیت کو تسلیم کر کے اسے ایک نئے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا۔ جارحانہ جد و جہد کے بجائے انہوں نے عدمِ تعاون کی تحریک چلائی جس میں ہندوستانیوں کی انفعالیت اور ظلم سہنے کی عادت ان کے لئے قوت کا خزانہ بن گئی۔

ہندوستانیوں کے سیاسی اتحاد، قومی نصب العین کا دوبارہ احیا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کر دینا گاندھی جی کی تلاشِ حق کا صرف ایک پہلو تھا۔ ان کا اعلیٰ اور بنیادی مقصد تو سماج اور ریاست کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کرنا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ ہندوستانی فکر اور روایات کو موجودہ ماحول سے مطابقت دے کر عہدِ حاضر کی تمام برائیوں کا حل پیش کریں۔ زندگی اور عمل کے ان نئے فلسفہ پر ان کی ذہنی سیادت کی بنیاد تھی۔ مغرب کے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۸ اگست ۱۹۴۸ء

نئی روشنی کے مقاصد

(۸)

جاگتی تعلیم

تعلیم کے معنی لغت میں علم سکھانے کے ہیں لیکن جن معنی میں یہ استعمال ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ ہم تعلیم اس عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے ایک نسل اپنے پورے تہذیبی ورثے کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ہے اور اسے مہذب زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اس ورثے میں علم کے علاوہ مذہب، اخلاق، معاشرت، آرٹ، سیاست، معیشت سبھی کچھ شامل ہے ان میں علم زیادہ تر جاننے کی اور پڑھ کر سیکھنے کی چیز ہے اور سب زیادہ تر برتنے کی اور کرکے سیکھنے کی چیزیں ہیں۔

ہمارے مدرسوں میں جو تعلیم ہوتی ہے وہ اس وسیع مقصد کو کہاں تک پورا کرتی ہے کہ طالب علم کو تہذیب کے سب شعبوں کا محرم اور عملی زندگی کا اہل بنا دے۔ پرانے طرز کے دینی مدرسوں کا ذکر ہی کیا ہے نئے طرز کے دنیوی مدرسے بھی صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ چند علوم و فنون کی نظری تعلیم دے کر طالب علم کے دماغ میں معلومات کا ایک ذخیرہ اکٹھا کر دیں۔ ذہنی قوتوں میں فہم و ادراک اور کسی حد تک اظہار خیال کی قوت کی مشق کرائی جاتی ہے خواہشات، جذبات، ذوق، ارادے اور عقیدے کو خس و خاشاک کی طرح آپ دہوائے دہر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ بے ترتیبی اور بے اعتدالی سے بڑھتے رہیں یا سوکھ کر جھلس کر جل کر رہ جائیں۔ اگر مدرسہ ذہنی نشو و نما کے مقصد میں پوری طرح کامیاب بھی ہو جائے تو اس طالب علم کی ہیئت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے کسی بچے کا سر بہت بڑا دھڑ چھوٹا سا، ہاتھ پاؤں سوکھے ہوئے یا بھنگم اور بے ڈول ہوں۔

مگر عام طور پر مدرسہ ذہنی نشو و نما کے محدود مقصد کو بھی پوری طرح حاصل نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے مدرسوں کی جماعتوں کو غور سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں جب شور اور شرارت کی رونق نہیں ہوتی اس وقت ایک مردنی سی یا کم سے کم غنودگی سی چھائی رہتی ہے۔ شاید کبھی استاد چست اور چوکس نظر آئے مگر لڑکے تو اونگھتے اور جمائیاں لیتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر استاد کی ڈانٹ ڈپٹ ان کے جسموں کو اونگھنے نہ دے تب بھی ان کے دماغ عام طور پر اونگھتے رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی نیند کی جھپکی بھی لے لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ذہنی نشو و نما کیا خاک ہوگی۔

کیا اس کی وجہ بچوں کی فطری سستی اور بد شوقی ہے؟ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ بچے جو کبھی چین سے بیٹھنا جانتے ہی نہیں جن کے دل میں چھوٹی سی چھوٹی چیز، اگر اس میں زندگی کی ایک رمق بھی ہو شوق اور اشتیاق کا طوفان برپا کر دیتی ہے۔ فطری طور پر سست اور بد شوق ہوتے ہیں؟ ہاں ان میں وہ مخصوص علمی ذوق نہیں ہوتا اور ان میں کیا ان کے بڑوں میں بھی کم ہی ہوتا ہے جو زندگی سے بے تعلق، خشک، بے جان، نظری معلومات کو غذائے روح سمجھ کر شوق سے جذب کر لیتا ہے۔

غرض تعلیم کی ماہیت اور بچوں کی فطرت کا تقاضا ہے کہ مدرسے میں اس اونگھتی سوئی فضا کی جگہ ایک نئی جیتی جاگتی فضا پیدا کی جائے۔ جہاں کتابی علم اور عملی مشاغل کا چولی دامن کا ساتھ ہو عمل سے علم میں جان پڑے اور علم سے عمل کو ہدایت اور بصیرت حاصل ہو۔ جہاں ذہن کے ساتھ جذبات، خواہشات اور ارادے کی ہم آہنگ تربیت یعنی شخصیت کی تعمیر ہو سکے۔

بظاہر بنیادی تعلیم کا طریقہ اور نصاب جو کرکے سیکھنے اور برت کر جاننے کے اصول پر مبنی ہے اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد دے سکتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بنیادی تعلیم کی تحریک پر ابھی تک خالص تعلیمی اور علمی نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا۔ اور شاید آئندہ بھی نہ کیا جا سکے۔ اس تحریک کو گاندھی جی نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور چند اور ماہرین تعلیم کی مدد سے شروع کیا جو اتفاق سے کانگریسی خیال رکھتے تھے اور کانگریس نے اس کی سرپرستی کی اس لئے ملک کی ان سب قوتوں نے جو کانگریس کے خلاف تھیں خصوصاً مسلم لیگ نے بے سمجھے بوجھے اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اب جب کہ مخالف قوتیں کمزور ہو چکی ہیں، اور کانگریس کا سکہ ملک پر بیٹھ چکا ہے یہ اندیشہ ہے کہ لوگ بے سمجھے بوجھے اس کی حمایت کو اپنا فرض سمجھیں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نقادوں کی مدد سے جو تعلیم کے مسائل پر خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، بنیادی تعلیم اور دوسرے نئے تعلیمی تجربات کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات فراہم کی جائے اور ان کے نتائج کو بے لوث اور بے لاگ نظر سے ان اصولوں کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے جو اوپر بیان کئے گئے۔ ہم جہاں تک ممکن ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ تعلیمی مسائل کی بحث صرف ان لوگوں تک محدود نہ رہے جو تعلیم کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ عام طور پر سب ان میں دلچسپی لیں اس لئے کہ جب تک بچے کے والدین تعلیم کے اصول سے واقف نہ ہوں استادوں سے وہ تعاون نہیں حاصل نہیں ہو سکتا جس کے بغیر بچے کی تعلیم ادھوری رہتی ہے۔

بزم بے تکلف

بھائی صاحب کا نام ان کے دوستوں اور عزیزوں میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید ان کی بیوی کے سوا سب ہی لوگ انھیں بھائی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں سچ مچ وہ اپنی طرف سے ہر ایک کے ساتھ بھائی کا سا برتاؤ کرتے ہیں، اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے حقے کو اپنا حقہ سمجھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کسر نفسی کی وجہ سے دوسروں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی ان کے ساتھ اس قسم کا برادرانہ برتاؤ کریں۔

شام کو ہمارے ہاں اکثر دوستوں کا مجمع ہوتا ہے۔ بھائی صاحب بھی اکثر آ براجتے ہیں خصوصاً ان دنوں جب لکھنؤ سے خمیرے کا پارسل آیا ہوا ہو۔ کوئی ایسی ہی مجبوری ہو تو دو ایک چلم کے بعد اٹھ جاتے ہیں ورنہ چلموں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک کان سے سنائی نہیں دیتا، دوسرے سے بھی کئی منزل اونچا سنتے ہیں۔ ہم لوگ ان سے کہتے ہیں "بھائی صاحب کیا بات ہے آپ کے انصاف کی۔ سب کی ایک کان سے سنتے ہیں (آہستہ سے) اور دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں" دراصل سننے کا موقع بہت کم آتا ہے۔ زیادہ تر سناتے ہی رہتے ہیں۔ کسی نے کوئی بات چھیڑی اور انھوں نے اسے زبردستی اپنے ڈھب پر لا کر اپنا کھڑاگ چھیڑ دیا۔ بس ایک موضوع سے گھبراتے ہیں اور وہ سیاست ہے۔ جہاں سیاسی گفتگو شروع ہوئی اور وہ اٹھ کے الگ جا بیٹھے۔ کچھ دیر تک کہیں کہیں سے دو چار لفظ جو کان میں پڑ جائیں سنتے رہتے ہیں تاؤ کھاتے رہتے ہیں اور زور زور سے حقے کے کش لیتے رہتے ہیں۔ پھر سلگتے سلگتے ایک دم بھڑک اٹھتے ہیں اور بحث کے بیچ میں اس طرح دھم سے کود پڑتے ہیں کہ سب دھک سے رہ جاتے ہیں وہ پیچیدہ مسئلے جو بڑے بڑے مدبروں کے ناخن تدبیر سے برسوں میں حل نہ ہوں ان کی گرمی تقریر سے دم بھر میں پگھل جاتے ہیں۔

کل کا ذکر ہے ہم لوگ اس پر بحث کر رہے تھے کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان کو امرطانیہ (امریکہ و برطانیہ) کا ساتھ دینا چاہئے یا روس کا، یا غیر جانب دار رہنا چاہئے بحث کا ایک نکوتا بن گیا اور اسے سیدھی لکیر ملنے کی کوشش کسی طرح کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بھائی صاحب نے ایک ہی جھٹکے میں اسے اور ہم سب کو گھن چکر بنا دیا۔ ڈپٹ کر بولے "یہ کیا بے کار کی رار مچا رکھی ہے۔ کچھ جانیں نہ بوجھیں بحث کرنے کو موجود۔ بھلا بتاؤ ہیروشیما میں جو ایٹم بم پھٹا تھا وہ کہاں سے آیا تھا۔ کہہ دو امریکا سے۔ جی کہیں آیا نہ ہو۔ بھلا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ امریکا کے پاس ایٹم بم ہوتا اور وہ جرمنی پر فتح پانے کے لئے اپنی فوجیں کٹواتا۔ بم سے کام نہ لیتا۔ آج ہم سے سن لو، یہ بم اندر سے پھٹا تھا اندر سے۔ یہ اسی مادے سے بنا تھا جس سے توجو، ہٹلر، مسولینی بنے تھے یہی ایٹم بم آج امریکہ میں اور روس میں بن رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل انگلستان میں یا ہندوستان میں نہیں بنے گا۔ بین الاقوامی حکمت عملی کو گل حکمت کرکے چولھے میں ڈالو۔ اپنے ملک کے اندر، خود اپنے اندر ان چنگاریوں کو ڈھونڈھو اور بجھاؤ جن سے ایٹم بم تیار ہوتا ہے" اٹھنے کا کش لے کر "لاحول ولاقوۃ جل کر رہ گیا کیسا اچھا آ رہا تھا"

پچھلا ہفتہ : ہندوستان

پنڈت نہرو کی دوستانہ تنبیہہ

مدراس کے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بحرانی اور عبوری دور کی طرف اشارہ کیا جس سے ہند یونین کے مسلمانوں کو اس وقت گذرنا پڑ رہا ہے اور اُن کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۱۵ر اگست کی تقسیم کے بعد عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ پاکستان میں ہندو کے لئے اور ہندوستان میں مسلمان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے بڑے پیمانے پر ہجرت شروع ہوئی۔ پنجاب سے ہندو اور سکھ اور مشرقی پنجاب سے مسلمان تقریباً سب کے سب نکل گئے یا نکال دئے گئے۔ دوسرے صوبوں سے خصوصاً سندھ اور بنگال سے بھی خاصی تعداد میں انتقال آبادی ہوا۔ لیکن اس کے آگے معاملہ نہیں چل سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی نے اپنی جان کو بھینٹ چڑھا کر اکثریت کو عقل اور انصاف کا راستہ اختیار کرنے کا سبق دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دیوانگی تو ختم ہو گئی جس نے ہندوستان میں مسلم اقلیت کی جان و مال و آبرو کو غیر محفوظ بنا دیا تھا، لیکن ابھی تک یہ احساس پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے کہ ہندوستان بھی پاکستان کی طرح ایک مذہبی ریاست ہے جس میں کم سے کم مسلمان اقلیت کی حیثیت غیر ملکیوں کی سی ہے اور وہ دوسرے شہریوں کے برابر حقوق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کی ہند یونین کے ساتھ وفاداری مشتبہ ہے، اس لئے اس کا انھیں زبانی اقرار کرتے رہنا چاہیئے چاہے اس پر اعتبار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور اُن کی حکومت کے دوسرے اراکین اس غلط خیال کو لوگوں کے دل سے نکالنے کی برابر کوشش کر رہے ہیں اور اس میں انھیں خاصی کامیابی ہو رہی ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس مشکل کام میں کچھ ناسمجھ مسلمان اپنی غیر ذمہ دارانہ تحریروں یا تقریروں سے رکاوٹ ڈال رہے ہیں تو قدرتی طور پر ان کو غصہ آتا ہے۔ جواہر لال جی کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا ہے۔ اپنی اس دوستی کی وجہ سے وہ [illegible] میں

ڈال چکے ہیں وہ ان لوگوں کی ذہنی کشمکش کو جو مسلم لیگ کے ہمدرد یا اس کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ جھوٹی امیدوں سے دھوکا کھا کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر غلط راہ پر پڑ گئے۔ لیکن جو واقعات پچھلے دنوں ہو چکے ہیں ان کے بعد بھی جب پنڈت جی ان لوگوں کو بے عقلی کی باتیں کرتے دیکھتے ہیں تو ان کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اشوک کے چکر اور "جن من گن" کے گیت پر اعتراض کرتے ہیں جس طرح ہندو قومیت کے حامی چاہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں کے عہد کے اثرات تاریخ کے صفحوں سے مٹ جائیں کہ اس طرح ان حضرات کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں سے پہلے کی ہندوستانی روایات لوح زمانہ سے مٹ جائیں، اشوک کی رواداری امن پسندی اور انسان دوستی نے ساری دنیا کے مؤرخوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ "جن من گن" کے مصنف ٹیگور کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے کیا اعتراض کرنے والوں کا مطالبہ ہے کہ انھیں خوش کرنے کے لئے ہند یونین کی آئین ساز اسمبلی ہند کے مایہ ناز سپوتوں کے کارناموں کو یاد کرنا چھوڑ دے اور اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے سامنے اس بلند نصب العین کو نہ رکھے جس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ٹیگور اور اشوک نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی

فتنہ انگیز افواہیں اور اخباروں کا فرض

پچھلے دنوں کلکتہ کے مسلمانوں کے بارے میں یہ افواہیں پھیلائی گئیں کہ وہ حیدر آباد کی حمایت میں ہند یونین کے خلاف سازش کر رہے ہیں اس مقصد کے لئے ہتھیار جمع کر رہے ہیں اور بڑے پیمانے پر فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ بنگال کی حکومت نے ایک خاص اعلان کے ذریعے افواہوں کو قطعاً بے بنیاد بتایا ہے مسٹر سہروردی نے بھی اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر [illegible] کلکتہ کے مسلمانوں کی طرف [illegible]

بات کا اطمینان دلایا کہ انھیں حکومت حیدر آباد کے موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ مطلق ہمدردی نہیں ہے اور ان کا ارادہ ہرگز فساد برپا کرنے کا نہیں ہے اس قسم کی خبریں بمبئی اور سی پی کے مسلمانوں کے بارے میں بھی شائع کی جا رہی ہیں۔ فتنہ پرداز لوگ اس قسم کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کے خلاف اکثریت کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہتے ہیں اور اخبار اور نیوز ایجنسی بغیر تحقیقات کے ان افواہوں کو اپنی خبروں میں شامل کر کے شائع کر دیتے ہیں اور ان پر ایڈیٹوریل لکھ دیتے ہیں۔ اخباروں کے ایڈیٹروں کی کانفرنس کو اس جانب توجہ کرنا چاہیئے اور اس قسم کی بے بنیاد افواہوں کی اشاعت کا سد باب کرنا چاہیئے۔

کپڑے کی قیمت اور فروخت پر نگرانی

محکمہ صنعت و رسد کی طرف سے کپڑے کی قیمت اور اس کی فروخت پر دوبارہ نگرانی قائم کرنے کے سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے ۱۹ر جنوری ۱۹۴۸ء سے جب کپڑے پر سے کنٹرول کو آہستہ آہستہ اُٹھانا شروع کیا گیا تھا اب تک کے واقعات کا جائزہ لیا گیا۔ کنٹرول کے کم ہوتے ہی قیمتیں بڑھنا شروع ہو گئیں اور ۲۴ر اپریل سے جب کپڑے پر قیمت کی چھاپ لگانا بند کیا گیا اور اس کی عام نقل و حرکت پر نگرانی کے علاوہ باقی سب کنٹرول اُٹھا لیا گیا کپڑے کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ وسط جون تک تھوک قیمتوں میں ضرور کچھ کمی ہوئی لیکن خوردہ فروشی کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس سال کے شروع سے کپڑے کی پیداوار میں ۱۲ فی صدی کا اضافہ ہوا اور کپڑے کی نقل و حرکت میں ۳۰ تا ۴۰ فی صدی بہتری پیدا ہوئی۔ اس صورت حال کا بڑا سبب محکمہ صنعت و رسد کی رائے میں وہ مذموم کارستانیاں ہیں جو کپڑے کی صنعت و تجارت کے چلانے والوں میں عام طور پر رائج ہیں چونکہ لوگوں میں عام بے چینی بڑھ رہی ہے اس لئے حکومت [illegible] کنٹرول کو دوبارہ [illegible] کرنا ضروری ہو گئی ہے۔ کنٹرول [illegible] باتوں پر خاص طور [illegible] میں اول

یہ ہے کہ ملوں میں پیداوار کی جو صلاحیت ہے اس سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا جائے دوسرے مل سے نکلنے کے وقت کپڑے کی جو جائز قیمت ہونی چاہیئے اس کا تعین کیا جائے اور اس کی چھاپ کپڑے پر لگائی جائے تاکہ خوردہ فروش صرف واجبی نفع لے کر اُسے خریداروں کے ہاتھ فروخت کر سکیں تیسرے صوبوں اور ریاستوں کے لئے کپڑے کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا ہے اپنے کوٹے کے ایک حصے کو صوبوں کی حکومتیں ایسی دوکانوں سے تقسیم کریں گی جو ان کی اپنی نگرانی میں ہوں گی۔ باقی کو امداد باہمی کی دوکانوں اور معمولی تاجروں کی معرفت تقسیم کرائیں گی حکومتوں کو تھوک فروشوں سے واجبی قیمت پر کپڑا حاصل کرنے کا اختیار ہوگا۔ غرض خاصا ہمہ گیر کنٹرول ہوگا۔ کام زیادہ تر معمولی مل مالکوں اور تاجروں ہی سے کرایا جائے گا لیکن انھیں ناواجب قیمتیں وصول کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ بنیادی واجبی قیمت کا فیصلہ ٹیرف بورڈ کرے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ واجبی قیمت کیا ہوگی۔ قیمتوں کی عام گرانی کو دیکھتے ہوئے اس کے بہت زیادہ کم ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی

یوپی میں غلے کی امدادی دوکانیں

غلے کی بڑھتی ہوئی گرانی کو دیکھتے ہوئے یوپی کی حکومت نے اپنے ۲۳ شہروں میں جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے غلے کی امدادی دوکانیں کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان دوکانوں سے صرف وہ لوگ غلہ خرید سکیں گے جن کی آمدنی سو روپے یا اس سے کم ہوگی۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے میں غلے کی دو قیمتیں رائج ہو جائیں گی۔ ایک رعایت یافتہ گروہ کے لئے اور دوسری اس گروہ کے لئے جو رعایت سے محروم رکھا گیا ہے۔ رعایت یافتہ گروہ میں شامل ہونے کے لئے جو سستے داموں پر چیزیں مل سکیں گی بڑی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ اس سے فائدہ تنخواہ دار ملازم اور کارخانوں کے مزدور تو یقینی طور پر اُٹھا سکیں گے کیونکہ ان کی آمدنی کا پتہ چلانا آسان ہوگا۔ باقی سب لوگوں کا دارومدار سیاسی رہنماؤں کی نظر التفات اور مربیانہ سرپرستی پر ہوگا اور اس میں شکایت اور بے اطمینانی پیدا ہونے کا بہت احتمال ہے۔ اس پوری کارروائی کو ایک عارضی اور جزوی علاج سمجھنا چاہیئے بنیادی مسئلہ قیمتوں کی عام سطح کو گھٹانے کا ہے اور جب تک [illegible] کے بنیادی اسباب کی طرف توجہ [illegible]

۲۔ پاکستان

مہاجرین کا مسئلہ

اپریل کے آخر میں سرکاری طور پر پناہ گزینوں کے متعلق جو اعداد و شمار شائع کئے گئے تھے اس کے مطابق مغربی پنجاب میں مہاجرین کی مجموعی تعداد ۵۷۴۸۲۹۷ تھی۔ ان میں سے کوئی ۳۱ لاکھ شہروں میں اور ۲۴ لاکھ دیہات میں تھے۔ کیمپوں میں پناہ گزینوں کی تعداد کوئی ۲½ لاکھ تھی۔ ان کیمپوں کی حالت کے بارے میں پچھلے دنوں جو خبریں شائع ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے انتظامات بہت ہی ناقص ہیں۔ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار نے اور یہ اخبار پاکستان کا بہت ہی مخلص دوست ہے لکھا ہے کہ ان کیمپوں کی حالت کو ظاہر کرنے کے لئے "فسنائک" کا لفظ سب سے زیادہ موزوں ہے لاہور اور لاہور کے قریب کے کیمپوں کی حالت اتنی بری نہیں، شاید اس لئے کہ یہ کیمپ صوبائی حکومت کی نظروں کے سامنے ہے۔ لیکن صوبے کے دوسرے حصوں میں کیمپوں کی حالت بہت ابتر ہے مغربی پنجاب میں بارش کی وجہ سے اس مسئلے میں اور بھی شدت ہو گئی ہے وبائی بیماریوں کا خطرہ سر پر کھڑا ہے۔

حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اگست تک سارے کیمپ ختم ہو جائیں گے لیکن اب تک پناہ گزینوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی مفصل پالیسی نہیں بن سکی ہے مغربی پنجاب کے طویل طویل زرعی جھگڑوں کی وجہ سے یہ مسئلہ عرصے تک طاق میں پڑا رہا۔ اب مشرقی پنجاب کے پناہ گزین ممبران اسمبلی کا مطالبہ ہے کہ پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے کے وقت اس اصول کا خیال رکھا جائے کہ ایک ضلع کے لوگ ایک ہی ضلع میں بسائے جائیں اس نے مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ حکومت سیاست کے چکر میں ہے اور مقامی لوگ اپنی تاک میں ہیں۔ مقامی زمینداروں کی نظر میں [illegible] اور جائدادوں پر [illegible] جھپٹ کر گئے ہیں۔ سازباز اور کہیں کہیں تشدد کے ذریعے ان کی کوشش یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں پناہ گزین دیہاتوں میں نہ بسنے پائیں۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ اس طرح اور پیچیدہ ہو سکتا ہے کہ مقامی آبادی کی ہمدردی کم ہوتے ہوتے مٹ جائے یا مخالفت کی شکل اختیار کرے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہمدردی کے اس جذبے میں سال بھر کے عرصے میں نمایاں کمی آگئی ہے اور اس کی ذمہ داری کسی حد تک پناہ گزینوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ فصل کی کٹائی کے بعد کہیں کہیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جن پناہ گزینوں کو زمین اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کے لئے دوسری رعایتیں دی گئی تھیں انھوں نے حکومت کو فصل کی بٹائی دئے بغیر ان زمینوں کو چھوڑ کر کیمپوں میں واپس جانا شروع کر دیا۔ شہروں میں بسنے والے پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد نے ہاتھ کی صفائی سے "روزی" کمانا شروع کر دیا ہے جعل سازی، بد دیانتی اور بدکاری کی انفرادی مثالیں سارے پناہ گزین طبقے کے خلاف منافرت پیدا کر سکتی ہیں پناہ گزینوں کا مسئلہ خود ان کی شدید کوشش کے بغیر حل نہیں ہو سکتا اور خود ان میں اگر اپنی حالت کو بدلنے کی سچی لگن نہ ہو تو کوئی حکومت ان کی حالت کو سدھار نہیں سکتی۔

پنڈت نہرو سے شکایت

حکومت پاکستان نے مدراس میں پنڈت نہرو کی صاف گوئی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اس نے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ پنڈت نہرو نے تقسیم ہند کو اب تک قبول نہیں کیا ہے پھر خود اپنی امن پسندی اور حکومت ہند سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنی دلی خواہش پر زور دیا ہے۔ کشمیر کے کمیشن کے آتے ہی دوستی کی خواہش کا پیدا ہو جانا عجیب بات ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں سڈنی کاٹن کی سرگرمیوں کے متعلق حکومت پاکستان نے اعلان کیا تھا کہ اس نے کاٹن کو منع کر دیا تھا کہ بغیر حکومت ہند کی اجازت کے وہ ہندوستان کی سرحد پار نہ کرے۔ لیکن اس کے بعد کو حکومت پاکستان سے پٹرول بھی مل گیا اور پھر کراچی کے ہوائی اڈے سے اڑنے کی سہولت بھی۔ کاٹن نے حیدرآباد سے پاکستان واپس آکر حکومت کو اور بھی الجھن میں ڈال دیا۔ اگر حکومت نے واقعی کاٹن کو منع کیا تھا تو اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں اسے کاٹن کے خلاف کوئی کارروائی کرنی چاہئے تھی جس لائسنس کو حکومت نے منسوخ کیا ہے وہ ویسے بھی بے کار ہی تھا۔ اس لئے کہ کاٹن ہندوستان کے کسی ہوائی اڈے پر جہاز اتارنے کی جرأت خود بھی نہ کرتا دوستی کی خواہش دوستانہ سلوک سے پروان چڑھتی ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی

پاکستان کی سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جو دو روزہ جلسہ پچھلے دنوں کراچی میں ہوا تھا اس میں چھوٹی ریاستوں کے الحاق اور بڑی ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ سوشلسٹ پارٹی نے موجودہ حکمرانوں کو [illegible] "حکمرانوں" کی حیثیت سے باقی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ زراعت سے متعلق پارٹی نے تجویز کیا ہے کہ زمینداری ختم کر دی جائے اور امداد باہمی یا اجتماعی کھیتوں کے اصول پر اس کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ حکومت کی موجودہ صنعتی پالیسی سے بھی پارٹی مطمئن نہیں ہے اس نے بنیادی اور بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دئے جانے کا مطالبہ کیا ہے، اور حکومت سے دیہی صنعتوں کو ترقی دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

یہ پروگرام اپنی جگہ پر کافی مفصل ہے۔ لیکن پارٹی کی موجودہ حیثیت میں اہم سوال یہ نہیں کہ اس کے مقاصد مکمل ہیں یا نہیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ اہم ترین موجودہ مسائل کے متعلق پارٹی کی رائیں کیا ہیں، اور ان خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لئے پارٹی کون سے ذرائع استعمال کرے گی تنظیم کا کام فی الحال زیادہ اہم ہے اس سلسلے میں اب تک کوئی اطلاعات نہیں آئی ہیں۔ پاکستان کی سوشلسٹ پارٹی کو اگر ہم کوئی مشورہ دیں تو وہ یہ ہوگا کہ وہ پاکستان کے عوام کو اس خطرے سے آگاہ کرے جو اینگلو امریکن سیاست کا آلۂ کار بننے سے پیدا ہو سکتا ہے ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب نے بتایا تھا کہ امریکہ پاکستان کی صنعتی ہو معاشی ترقی کے کام میں پوری پوری مدد دینے کو تیار ہے۔ بدقسمتی سے اس مدد کی قیمت بہت ہے۔ سوشلسٹ پارٹی اگر اس فوری خطرے سے اپنے ملک کو خبردار کر دے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

روئی اور جوٹ

پاکستان کی روئی کی مانگ بہت زیادہ ہے کوئی پچاس سے زیادہ ملکوں نے حکومت پاکستان سے روئی خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ان میں روس انگلستان، جرمنی، جاپان، اسپین، ہالینڈ، بلجیم وغیرہ شامل ہیں۔ امسال پاکستان میں روئی کی پیداوار ۱۴ لاکھ گانٹھ ہوگی اس میں سے حکومت پاکستان نے ۲½ لاکھ گانٹھ ہندوستان کو دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ حکومت نے ابھی برآمد پالیسی کا اعلان نہیں کیا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ حکومت اس بات کی کوشش کرے گی کہ روئی ان ملکوں کو زیادہ دے جہاں سے زر مبادلہ حاصل ہو سکیں۔

پچھلے سال ہندوستان کو کوئی ڈھائی لاکھ گانٹھ روئی مل سکی تھی۔ وعدہ کوئی دس لاکھ گانٹھ کا تھا۔ اس لئے اس مرتبہ روئی کے مبادلے کے متعلق فیصلہ یہ ہوا ہے کہ پاکستان کی روئی کے مقابلے میں ایک طے شدہ تناسب سے ہندوستان کپڑا بھیجے گا۔ اس لئے یہ خیال جاتا ہے کہ اس سال روئی کے حصول میں اتنی دقت نہیں ہوگی۔ جوٹ کی خرید کے متعلق بھی ایک معاہدہ ہوا ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان کو ۵۰ ملین گانٹھ جوٹ ملے گا اس ہفتے ایک ہندوستانی وفد کراچی گیا ہوا ہے کہ ان مسائل کے متعلق تفصیلی معاہدے ہو جائیں؛ تاکہ وہ خام اشیاء کے حصول اور نیز ان کے نقل و حمل وغیرہ کے متعلق کوئی شبہ نہ رہے۔ ہندوستان اور پاکستان سیاسی حیثیت سے تو دو جداگانہ وحدتیں بن چکے ہیں۔ لیکن صدیوں کی معاشی تاریخ نے ان میں جو معاشی وحدت پیدا کر دی تھی وہ ختم نہیں ہوئی ہے اسے ختم ہونا بھی نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے دونوں کو نقصان ہوگا لیکن اگر کوشش اس کو ختم کر دینے پر تل ہی جو جائیں تب بھی فی الحال کوشش یہی ہونی چاہئے کہ کم سے کم پرانے تجارتی تعلقات باقی رہیں۔ معاشی جنگ سے یا اس کی دھمکیوں سے نہ پاکستان کا بھلا ہوگا نہ ہندوستان کا۔

(ا۔ س)

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ کاتب کی غلطی سے ۱۰ اگست کے نئی روشنی میں مسلم لیگ کا [illegible] کے لکھنے والے کا نام غلطی سے [illegible] لکھ دیا گیا ہے صحیح نام [illegible] ہے

طیّارہ

اختر انصاری

یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارہ

یہ اس کی نفاست یہ اس کی لطافت
یہ پرواز اس کی یہ اس کی آفت
یہ قوت یہ جودت یہ چستی یہ تیزی
یہ تندی یہ شدت یہ طوفاں خیزی
پھر اس ساری ہنگامہ آرائی کے باوصف
یہ نرمی کا انداز یہ لوچ کا وصف
یہ مستی بھرے گیت کی سی روانی
یہ سازوں کے سنگیت کی سی روانی
رسیلی ہواؤں کی مانند ہنسنا!
نشیلی ضیاؤں کی مانند بسنا!

ستاروں کی دنیا میں سے جا رہا ہے
بہاروں کی دنیا میں سے جا رہا ہے

جہاں یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا نہ ہوگا
تعصب کی ظلمت کا ڈیرا نہ ہوگا
روایات کا کوئی گھیرا نہ ہوگا
یہ ہر بات میں تیرا میرا نہ ہوگا
نہ ہوں گی سیاسی غرض مندیاں یہ
نہ ہوں گی زمیں کی سی حد بندیاں یہ
یہ ہند اور ایران، چین اور جاپان
یہ اسپین، بلغاریہ اور سوڈان
فرانس اور انگلینڈ، روس اور یونان

ہماری فراست کا شہکار ہے یہ
جدل اور حکمت کا شہکار ہے یہ
عروج ذہانت کا شہکار ہے یہ
عبارت ہے جس سے تمدن ہمارا
مڑا ہے بلندی کی جانب وہ دھارا
ترقی نے اپنی ابھارا ہے نرالا

یہ ... نہ ہوں گے یہ خطے نہ ہوں گے
یہ خونریزیوں کے بہانے نہ ہوں گے
تغلب کے خونیں فسانے نہ ہوں گے
یہ منحوس جنگی ترانے نہ ہوں گے
یہ اہل سیاست کی گھاتیں نہ ہوں گی
یہ مکر و ذلالت کی باتیں نہ ہوں گی
غلامی کے دن اور راتیں نہ ہوں گی

فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ یہ رنگیں شرارہ
یہ فردا کی انسانیت کا سہارا
یہ آیندہ تہذیب کا گہوارہ
ہمیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر
شقاوت بھری بستیوں سے اٹھا کر
تمدن کی بد مستیوں سے اٹھا کر

فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ یہ رنگیں شرارہ
ہے فردا کی انسانیت کا سہارا
ہے آیندہ تہذیب کا گہوارہ
یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارہ

بنگالی سے براہ راست ترجمہ

ٹیگور کے گیت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

(۱)

اے میرے مالک!
جس وقت زندگی کے تمام سوتے خشک ہو جائیں،
اس وقت تو اپنے کرم کی دھاریں اس پر بہا دے۔
جس وقت زندگی اپنی ساری مٹھاس کھو دے، اس
وقت تو اس پر اپنے گیت کا امرت رس ٹپکا۔
جب دنیا کی مصروفیتیں شور و غل کی شکل میں
چاروں طرف سے گھیر لیں، تو اے میرے خاموش
مالک! تو دل کی اس نگری میں چپ چاپ اور
اچانک آ جا!
جس وقت یہ بیچارہ دل بجھا سا کسی کونے میں پڑا
ہو تو میرے بے باک مالک تو شاہانہ سج دھج کے ساتھ
پٹ کھول کر چلا آ جا۔
جب یہ نفس خاک اڑا کر اپنے چاروں طرف تاریکی
پھیلا رہا ہو تو اے میرے بے خواب مالک تو اس
وقت بجلی کی چمک بن کر گذر جا۔

(۲)

او چندر مکھ!
آج سویرے تم سورج کا لال کنول ہاتھ میں لے
کر کیسی سج دھج کر آئے تھے۔ ساری دنیا سو رہی
تھی، راہیں سنسان تھیں۔ تم اپنے سنہرے رتھ پر سوار
اکیلے گذر گئے، اور میرے دروازے کی طرف اپنی
کرنوں بھری نظر تک نہ ڈالی!
چاروں طرف اندھیرا تھا، تم کو دیکھ کر میرا سینا تنگ
ہو گیا۔ اسے میں مسکرائی ہوئی بار السانی ہوئی کروٹیں
بدلیں اور اٹھ بیٹھا۔ پھر اٹھو کر جب اٹھا تو دیکھا
تم جا چکے تھے!!

سچی عید

صالحہ عابد حسین

"اے ہے اکبری بیگم یہ آج کیسا اُدھم مچا ہے معلوم ہوتا ہے کسی پر غصہ اتار رہی ہے۔ بچہ بھی رو رہا ہے شاید آپ ہی تو مار رہی ہیں۔ توبہ کیسے مزاج کی عورت ہے" یہ کہتی ہوئی زاہدہ ایک لڑکی کے پاس آئی جو پڑوس کے گھر میں کھلتی تھی۔ چھوٹا سا لڑکا بلک بلک کر رو رہا تھا اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ دیکھا اکبری بیگم اپنے بچے کا ایک ہاتھ کس کر پکڑے اس کے تماچے مار رہی ہیں۔ زاہدہ نے ان کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا "بس بس آپا کیوں بچے کا خون کئے دے رہی ہو" اور قبل اس کے کہ وہ اپنا ہاتھ زاہدہ سے چھڑائیں بچہ ان کے چنگل سے نکل اپنی بڑی بہن کی گود میں پناہ لے چکا تھا جو رنج اور خوف کی ملی جلی نظروں سے بھائی اور چچی کو دیکھ رہی تھی۔

"قیامت آ جائے ایمان ...... کہاں جائے گا مجھ سے بچ کر کم بخت، بد نصیب، لعنت ہو تجھ پر۔ ہر وقت جلاتا رہتا ہے منحوس مجھے تو خدا ہی نے جلا رکھا ہے قسمت کی ماری بپتیری پڑی ہے۔ تم اور میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو" اکبری بیگم کے لہجے میں غصے سے زیادہ رقت تھی۔

"اے ہے آپا سنبھلو۔ حواسوں میں آؤ۔ برس برس کا دن رمضان کی ۲۹ تاریخ۔ دونوں وقت ملتے تم کیسے منہ بھر بھر کے بچوں کو کوسنے دے رہی ہو۔ توبہ ہے"

"ارے بوا تم کیا جانو۔ ان نامرادوں نے میرا کیسا جی جلا رکھا ہے"

"آخر ہوا کیا؟"

"ہونا کیا۔ کتنے دن سے پیچھے پڑا ہے کہ عید کے لئے نیا جوڑا کیوں نہیں بنایا۔ کار چوبی ٹوپی منگاؤ۔ نیا جوتا منگاؤ ...... اس نامراد، بد نصیب کو یہ نہیں خبر کہ سب کچھ تو غارت ہو گیا، منحوس دشمنوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے، خدا سمجھے ان لعنت کے ماروں کو جنھوں نے بھرا پرا گھر خاک میں ملا دیا، اب ماں بد نصیب کے پاس کیا رکھا ہے کہ عید کے لئے جوڑے بنائے"

"اے ہے تو وہ بچارا چھوٹا سا بچہ وہ یہ سب کیا جانے؟ تم نے اُسے رسان سے سمجھا دیا ہوتا کہ اس سال پہلے کے رکھے کپڑے پہن لو، اگلے سال نیا جوڑا بنائیں گے"

"اری بہنا کس دل سے کہتی؟ ہائے کیسے اپنے نازوں کے پالے کا دل توڑتی۔ ارے جس کے گھر میں سب کچھ تھا، جس کے گھر میں روپیہ کی ریل پیل تھی جس کے بچوں کے عید کے دن اصلی ریشم کے جوڑے بنتے تھے وہ آج یوں ظالموں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو جائے الٰہی غارت ہوں یہ ...... الٰہی غضب ٹوٹے خدا کا ......"

"توبہ آپا کیوں شام کے وقت اپنی زبان خراب کر رہی ہو"

"اے جلے دل سے تو آہ نکلے ہی گی۔ تم کیوں پھر پھڑاتی ہو۔ آخر تمھارے کیا لگتے ہیں یہ منحوس نامراد؟"

"اے واہ میرے کیا لگتے ...... مگر بہن آخر سوچو تو کوسنے گالیاں دینے سے سوا اپنی زبان خراب کرنے اور اپنا جی جلانے کے اور فائدہ کیا۔ کوئی چیز واپس آنے سے رہی ...... اور پھر جہاں تمھارا نقصان ہوا تو کیا ان لوگوں کا نہیں ہوا ...... یہ لو اچھا خاصا عذاب الٰہی تھا سبھی لپیٹ میں آئے ہیں"

"اے بوا نہ میں تمھاری سی منصف مزاج ہوں نہ بے حس پتھر۔ سب کچھ بھگت چکیں، پھر بھی ان ہی کا کلمہ پڑھتی ہو۔ میرے تو دل سے بد دعا نکلتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جلے دل سے دھواں نہ نکلے ...... ہائے میں اس قابل بھی نہ رہی کہ عید منا سکوں"

"توبہ اکبری آپا اتنا مبالغہ بھی نہ کرو۔ ایسی کون سی خدا نہ کرے مصیبت پڑی ہے تم پر۔ یہی نا کہ تھوڑا بہت روپیہ جائداد کا نقصان ہو گیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر کرو کسی کی محتاج نہیں۔ اپنے عزت آبرو سے گھر میں بیٹھی ہو اور اتنا بچ گیا ہے کہ فراغت سے کھا پہن سکو۔ پہلے کے سے ٹھاٹھ نہ سہی ...... ان لاکھوں مصیبت زدوں کا تو خیال کرو جن کے نہ تن پر کپڑا ہے نہ سر چھپانے کو جگہ نہ کھانے کو روٹی ...... عید کے دن ان کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی؟ انسان سب سے زیادہ اپنی ہی کو مصیبت زدہ سمجھ لے ......"

"اے ہے تو اپنے ان مصیبت مارے مسلمان بھائیوں کا غم تو مجھے اور کھائے جاتا ہے۔ جتنا اپنے پر روتی ہوں اس سے زیادہ ان پر ...... الٰہی قہر ٹوٹے اُن پر جنھوں نے ......"

"بس بس خدا کے لئے پھر کوسنوں کا سلسلہ نہ شروع کرو ...... ایسی ہمدردی سے کہ تم اپنے لئے بھی کوسنے کاٹنے دیتی ہو اور دوسروں کے لئے بھی نہ تمھیں فائدہ نہ کسی اور کو۔ اگر ہم مصیبت ماروں کے کچھ کام نہیں آ سکتے تو کم سے کم اتنا تو کریں کہ ان کی حالت سے سبق لیں اور قناعت اور صبر و شکر کرنا سیکھیں"

"تمھیں تو مرض ہے ہر بات سے بات نکلوانے کا۔ اے سچ ہے بوا کسی کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ارے اپنے ملنے جلنے والے عزیز پیارے بھی تو ہمدردی نہیں کرتے ...... الٹے دشمنوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ لڑتے ہیں، بحثیں کرتے ہیں، چکر چلاتے ہیں ......"

اکبری بیگم نے رونا شروع کر دیا۔

"قصور معاف آپ خود اپنے آپ سے ہمدردی کرنے کو کیا کم ہیں جو کوئی اور کرے"

"ہاں ہاں تانے دو۔ جلاؤ۔ مصیبت زدہ کا کون ہوا ہے اس دنیا میں"

"بس آپا رہنے دو۔ تم سمجھتی ہو میں بڑی خوش اور مطمئن ہوں ...... جو اپنے منہ سے مصیبت کا رونا روتا پھرے وہی اور جو سب کچھ چپ چاپ سہہ لے وہ بڑے سکھ میں ہے۔ اوروں کو چھوڑو ذرا میرا اور اپنا ہی مقابلہ کر لو۔ اللہ رکھے بال بچے تمھارے پاس ہیں، اپنے گھر میں بیٹھی ہو، شہر میں سب نہ سہی کچھ عزیز پیارے موجود ہیں۔ میاں تم سے دور سہی پر خاصی طرح روپیہ کما کر بھیج رہے ہیں ...... اور میں ...... جس کے سارے عزیز کالے کوسوں چلے گئے، کتنے مارے گئے، ایک ایک چیز لٹ گئی، گھر جل گیا، میاں کی نوکری گئی، دل بھر مصیبت بھرتے ہیں تو پیٹ کو روٹی نصیب ہوتی ہے ...... ذرا سی بچی اس کے لئے سوتی نئے کپڑے بھی عید کے لئے نہ بنا سکی ...... تمھارے ہاں تو خیر عید ہوگی۔ پر اُن کے دل سے پوچھو جن کے لئے یہ عید محرم سے بدتر ہے ...... خیر شکر ہے خدایا تیرا" زاہدہ کی آواز بھرا گئی، آنکھیں پر آب ہو گئیں۔

"اے بی بی اپنا جی بھاری نہ کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ سچ ہے یہ زمانہ ہی مصیبت کا ہے۔ خیر جی یہ دن بھی کٹ ہی جائیں گے ...... نہ بہن رو ؤ نہیں۔ میرا کلیجہ کٹتا ہے۔ لے ہے منہ میں روزہ ہے۔ جی بھاری نہ کرو" پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اب اکبری بیگم زاہدہ کو سمجھا رہی تھیں۔

اذان کی آواز پر زاہدہ چونک کر کھڑی ہو گئی، "ارے افطار کا وقت ہو گیا۔ تو وہ بےچارے بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے" اور پلو سے آنسو پونچھتی جلدی سے اپنے گھر میں گھس گئی۔

اکبری بیگم نے بلا کر بچے کو گلے سے لپٹایا، چوما اور بولیں "صغری بڑے ٹرنک میں سے بھیا کا وہ ریشمی جوڑا نکال لے جو خیر سے بسم اللہ میں پہنا تھا اور اپنے بھی ریشمی کپڑے نکال لیجیو۔ اے نہ سہی نئے پہلے کے تو نئے سے بھی اچھے ہیں میاں، اور میں ابھی منشی کو بھیج کر اپنے لال کے لئے ٹوپی اور جوتا منگاتی ہوں۔ سویاں آ گئی ہیں دودھ بھی منگا لو۔ عید تو خیر سے ہوگی۔ برس دن کے برس دن کیا میں اپنے بچوں کا دل میلا کر دوں؟ نا بوا، یہ مجھ سے نہ ہوگا ......"

ابھی زاہدہ اور انور نے کھجور سے روزہ افطار کیا ہی تھا کہ گولے چھٹنے کی آواز نے چاند ہونے کا اعلان کیا ...... زاہدہ لپک کر اوپر چڑھ گئی ...... مغرب کی طرف آسمان کے نچلے حصے میں سفید بادلوں کے ٹکڑوں کے بیچ ناخن سے زیادہ باریک کانپتا، لرزتا، ہلکے نیلے رنگ کا ہلال عید جس کی خفیف سی چمک اس کو بادلوں سے ممتاز کر رہی تھی پیام عید سنا رہا تھا ......

عادتاً زاہدہ کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور چہرے پر مسرت کی چمک دوڑ گئی۔ لیکن ایک لمحے کے بعد کیفیت بدل گئی، بدن کانپا، ہونٹ لرزے، حلق میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہوا، اور آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ ان کے پاس کھڑی بچی ساجدہ نے اپنی سریلی میٹھی توتلی زبان میں پوچھا "امی دان عید کا تاند ہو گیا؟" "ہاں میری جان، عید کا چاند ہو گیا" اور زاہدہ نے بچی کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔

انور خاموش سر جھکائے بیوی کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ زاہدہ کے دل کی حالت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ برسوں سے

بچھڑی، پریشانیوں میں جکڑی، غموں کی ماری، گھٹی گھٹی تھکی ہاری روزہ دار زاہدہ کو چھیڑتے اُسے ڈر معلوم ہو رہا تھا ـــــ کہیں اُس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے؟

"زاہدہ ـــــ زاہدہ ـــــ"

"جی؟"

"تم کیسی کھوئی سی بیٹھی ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"کل عید ہے سب لوگ خوش ہیں عید کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تم ایسی اداس اور خاموش بیٹھی ہو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟ کون سی خوشی منانی ہے؟"

"کیوں نہیں تیاری بھی کرو خوشی بھی مناؤ ـــــ عید تو بہرحال عید ہے ـــــ اس دن خوشی منانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔"

"انور، آپ کیوں اور چھیڑ چھیڑ کر میرا دل دکھاتے ہیں ـــــ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے مجھے صدمہ ہو۔"

"افسوس زاہدہ ـــــ تمھارا یہ خیال ہے کہ میں تمھارا دل دکھانے کو تمھیں چھیڑ رہا ہوں؟"

"جس کے لئے عید عید نہ ہو اس کے سامنے بار بار عید کا ذکر کرنا اُسے ستانا نہیں تو کیا ہے؟"

"مگر آخر کیوں ہمارے ہاں عید نہ ہو؟"

"اس لئے کہ عید نام ہے خوشی اور مسرت کا جو اس گھر سے کوسوں دور ہے۔"

"تم یہ سمجھتی ہوگی ـــــ میرا دل تو اُمید اور مسرت سے معمور ہے زاہدہ۔"

"آپ کا سا دل کہاں سے لاؤں انور ـــــ میرا دل تو غم و الم، جدائیوں اور یادوں، فکروں اور پریشانیوں کا گھر بنا ہوا ہے ـــــ"

"جتنا تم ان باتوں کو سوچوگی اتنی ہی یہ تم پر مسلط ہوتی جائیں گی۔ آخر ہر وقت گذشتہ باتوں کو یاد کرکے کڑھنا اس سے حاصل کیا؟"

"یہ کوئی اختیاری بات ہے کیا؟"

"بے شک۔ انسان چاہے تو سخت سے سخت مصیبت اور پریشانی کو صبر، برداشت، قناعت ایمان اور عقیدے کے بل بوتے پر آسانی سے جھیل سکتا ہے۔ اور چاہے تو زرا زرا سی بات کو اپنے لئے عذاب بنا کر اس پر نالہ و فریاد کرتا ہے۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں زرا زرا سی بات پر نالہ و فریاد کرتی ہوں؟ یہی ہے آپ کی نظر میں میرے صبر اور حوصلے کا صلہ؟"

"میں تمھیں بڑے حوصلے اور ہمت والی سمجھتا ہوں مجھے احساس ہے کہ تم نے ساری مشکلوں، نقصانوں اور صدموں کو استقلال اور صبر کے ساتھ سہا ہے اور سہہ رہی ہو مگر بعض وقت چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت متاثر ہو جاتی ہو۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہی کہ کل عید ہے، اور تم بے وجہ رنجیدہ اور پریشان ہو۔"

"میں بے وجہ پریشان اور رنجیدہ ہوں؟ سچ ہے مرد کا دل پتھر ہوتا ہے۔ جس کا دل گھر اور وطن کی تباہی سے زخمی ہو، جس کے عزیز پیارے جو ہمیشہ عید پر اس کے پاس ہوتے تھے اس سے کالے کوسوں دور ہوں جس کا سب کچھ لٹ چکا ہو، مٹ چکا ہو، جس کا شوہر دن رات محنت کرکے اتنا نہ کما سکے کہ فراغت سے دو وقت کھانا ہی کھالے ـــــ وہ عید کے آنے کی خوشی منائے؟ کودتی، اچھلتی، ناچتی گاتی پھرے! آیا عید آئی ہے عید آئی ہے!!!"

زاہدہ کے لہجے میں طنز سے زیادہ درد، بے بسی، غم اور غصہ جھلک رہا تھا

"ہاں بے شک اُسے خوش ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس پر آشوب اور ہولناک زمانے میں خدا نے اس کی اور اس کے بہت سے عزیزوں کی جان اور آبرو بچائی ہے۔ اس کے پاس پہنے کا اوڑھنا ہے، اس کی بچی زندہ سلامت اس کی چھاتی کے نیچے ہے۔ اس کا شوہر اس کی خدمت اور محبت کا خواہاں، اس کے ساتھ ہے۔ اس کے اکثر عزیز زندہ اور سلامت ہیں جن سے ملنے کی امید ہے ـــــ جو اب بھی خدا کے فضل سے کسی کی محتاج نہیں ـــــ اُسے خوش ہونا اور شکر کرنا نہیں چاہیئے؟"

"ہاں میں ان نعمتوں کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں ـــــ میرا رواں رواں اپنے مالک کا احسان مند ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سے بہتر حالت میں رکھا ہے ـــــ مگر انور ـــــ عید کی خوشی دوسری چیز ہے، بھلا جس کے پاس عید منانے کا کوئی سامان نہ رہا ہو جس کی بچی اور میاں کے پاس معمولی نئے کپڑے بھی نہ ہوں۔ جس کے یہاں میٹھی سویاں تک پکانے کو پیسہ نہ ہو ـــــ اسے عید کی کیا خوشی ہوسکتی ہے بھلا؟"

"جو فقر و فاقہ میں بھی فرض ادا کرتی رہی ہو، جس نے روکھی سوکھی کھا کر اس قیامت کی گرمی اور طویل دنوں میں روزے کا مقدس فرض ادا کیا ہو، جس نے اس حالت میں بھی بھوکوں کو کھانا کھلایا ہو، محتاج کی مدد کی ہو ـــــ جس نے رمضان بھر سچے دل سے دن اور رات خدا کی عبادت کی ہو ـــــ اس سے بڑھ کر عید منانے کا حق کسے ہوسکتا ہے؟ ان ریاکار سرمایہ داروں کو جو عید کے دن بیش قیمت لباس پہن کر اور دنیا بھر کی الا بلا پکا اور کھا کر اکڑتے ہیں ـــــ؟ گویا اپنے فرض دینی سے سبکدوش ہوگئے ...... عید آخر محض نئے کپڑے پہننے سویاں اور پکوان کھانے اور نمود و نمائش کے مظاہرے کا نام تو نہیں ـــــ عید منائی جاتی ہے مہینہ بھر کٹھن مذہبی فرض ادا کرنے کی خوشی میں، خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی مسرت میں ـــــ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنا دینی فرض ادا کیا ہے ـــــ پھر ہم عید کیوں نہ منائیں؟ کیوں نہ خوش ہوں؟ ٹھیک ہے کہ تمھارے پاس تن پہننے کو ریشمی کپڑے اور زیور نہیں ـــــ صحیح کہ تمھارا شوہر کل نماز کے لئے ڈھلے کپڑے اور پرانے جوتے پہن کر جائے گا ـــــ مانا کہ تمھاری بچی کے لئے نیا جوڑا نہیں بن سکا ـــــ تمھارے گھر میں شیرینیاں اور پکوان نہ پک سکیں گے ـــــ لیکن یہ سطحی چیزیں حقیقی خوشی کا سرچشمہ ہیں زاہدہ؟"

زاہدہ غور اور توجہ سے دونوں ہاتھوں پر اپنی ٹھوڑی رکھے اپنے میاں کی باتیں سن رہی تھی...... بچی اس کی گود میں سر رکھ کر سو چکی تھی۔

"زاہدہ پیاری حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے روح اور دل کی تسکین سے ...... مجھے تو یہ عید سب عیدوں سے زیادہ پر مسرت معلوم ہو رہی ہے جس کو خدا نے ایسے پر آشوب زمانے میں سخت خطروں سے بچایا، جس کو زاہدہ جیسی سچی غمگسار اور دکھ سکھ کی ساتھی بخشی۔ جس کو سچی محبت کا انمول گوہر عنایت کیا، جس کی آنکھوں کا نور شاہدہ جیسی بچی دی، جسے ایسی صحت، ہمت اور توفیق دی کہ اس نے رمضان بھر روزے رکھے ...... وہ کیوں نہ عید منائے ...... کیوں نہ خوش ہو؟؟"

عرصے کے بعد زاہدہ کے دل کو واقعی سکون اور حقیقی مسرت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں ـــــ لیکن ان میں غصہ اور جلن کے آنسوؤں کی سی سوزش نہ تھی ـــــ یہ آنسو دلی محبت، حقیقی مسرت، سچی رفاقت، اور قلبی سکون کے احساس کے شیریں آنسو تھے ـــــ اس نے انور پر ایک نظر ڈالی اور اپنا سر انور کے شانے پر رکھ دیا ـــــ اس کی آنکھوں میں محبت کی بجلیاں کوند رہی تھیں...... چہرے پر مسرت کی بارش ہو رہی تھی ـــــ انور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا "کیوں مری جان؟ تو کل عید ہوگی نا؟"

"بے شک ہوگی ـــــ ہمیشہ سے زیادہ پر مسرت عید ـــــ حقیقی اور سچی عید۔"

روس غالباً آج جنگ سے پہلے کے مقابلے میں نسبتہً غریب ہوگیا ہے۔ لیکن اس کی دولت میں اضافے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور بہت جلد نہ صرف اپنے نقصانات کی تلافی کرے گا بلکہ پہلے سے زیادہ ترقی کرے گا۔ مادی اور معاشی طاقت کے لحاظ سے یوریشیا کے براعظم پر کوئی اس کا حریف نہیں ہے۔ روسیوں کے ذہن میں ابھی سے اپنے مقبوضات کی توسیع کا رجحان نظر آرہا ہے اور وہ اس معاملے میں کم و بیش روسی سامراج کے نقشے پر چل رہے ہیں۔ روس کی اشتراکی معاشیات کے لئے مقبوضات کی توسیع کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ روس کی معاشی زندگی خودکفیل بنائی جاسکتی ہے، لیکن دوسرے اثرات اور شبہات اور اندیشے پھر کار فرما نظر آتے ہیں اور دوسری طاقتوں سے گھر جانے کے اندیشے کا پھر اظہار کیا جانے لگا ہے اور توسیع کا رجحان اگر ملحقہ مقبوضات کے لحاظ سے نہیں تو دوسری شکلوں میں نمایاں ہے۔

(تلاش ہند از جواہر لال)

کہیں گے میرے مال کے خریدار کم ہو رہے ہیں مجھے قیمتیں کم مل رہی ہیں لیکن میرے مزدوروں کو اجرتیں کم دینے پر راضی نہیں میری لاگتیں کم نہیں ہوتیں۔ اس لئے میں مال کی تیاری بند کرتا ہوں۔ کسان کہے گا، اچھی قومی سرکار آئی۔ اس نے میرے اناج کے دام ہی کم کر دئے۔ مزدور کہے گا میں بے روزگار ہو گیا۔ سرکاری ٹھیکوں کا کام بند ہو گیا۔ کارخانوں میں کام کم ہو گیا۔ ہر طرف بے دلی اور افسردگی چھا جائے گی۔ اس طرح قیمتیں تو کم ہو جائیں گی لیکن سارا کاروبار بیٹھ جائے گا۔

اس سے قطع نظر جب سرکار اپنے وصول شدہ محصول اور قرض کے بڑے حصے سے نوٹوں کے منسوخ کرانے کا کام لے گی تو اپنی بہت سی ذمہ داریوں کو کیسے پورا کر سکے گی؟ سرکار کو پناہ گزینوں کو روزگار سے لگانا اور ڈیرہ سے بسانا ہے کشمیر کی جنگ جیتنا ہے۔ دریاؤں پر بند باندھنا، نہریں کالنا اور بجلی کے بڑے کارخانے چلانے ہیں۔ نئی صنعتیں شروع کرانی ہیں اور زراعت کو ترقی دینا ہے۔ مزدوروں کی اجرتیں بڑھانا اور ان کے لئے سہولتیں مہیا کرنا ہیں۔ ان سب کاموں کے لئے روپے خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگوں سے روپیہ لے گی تو اس سے نوٹوں کے منسوخ کرانے کا فضول کام کیوں کرے گی۔ وہ تو اسے ترقی کے کاموں پر خرچ کرے گی۔ جس سے اس کی نیک نامی ہوگی۔ کاروبار میں حوصلہ اور امنگ پیدا ہوگی۔ مل مالک جو کم ہمت بنے بیٹھے ہیں ان میں بھی ولولہ پیدا ہوگا اور ہر طرف چہل پہل ہو جائے گی۔ اس لئے سرکار سے یہ امید رکھنا نادانی ہے کہ وہ نوٹوں کو کم کرائے گی۔ بلکہ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ نوٹوں کی تعداد اور بڑھائی جائے گی۔ سرکار کو ترقی کے کاموں کو شروع کرنے کے لئے روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن سرکاری تمسکات کی قیمت گر رہی ہے اور ان کی قیمت کو برقرار اور شرح سود کو کم رکھنے کے لئے رزرو بنک کو نوٹ چھاپ کر ان کو خریدنا پڑ رہا ہے۔ جب تک موجودہ تمسکات کی قیمت قایم نہیں ہوگی سرکار نیا قرض کم شرح سود پر کیسے لے سکے گی؟ رہا محصول بڑھانے کا سوال تو سرمایہ داروں کو مطمئن کرنے اور اس کے اندر کام کی امنگ تیز کرنے کے لئے سرکار نے اس سال محصول کم کیا ہے اب اسے پھر کیسے بڑھا سکے گی سرمایہ دار محصول کی اس تفصیل سے جو وزیر مالیات نے کی ہے مطمئن نہیں۔ اگر محصول پھر بڑھایا گیا تو اس کی بے اطمینانی اور زیادہ ہو جائے گی۔ دوسری طرف عوام کو یہ شکایت ہے کہ بالواسطہ محاصل میں اضافہ کر کے غریبوں پر محصول کا بوجھ بڑھا دیا گیا ہے۔ سرکار کو نہ مجال نہ محصول بڑھانے کا موقع ہے نہ قرض زیادہ لینے کا، اور لوگوں میں ہمت اور ولولہ اور کام کرنے کا شوق پیدا کرنے اور اپنی اہم ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے اسے روپیہ کی ضرورت ہے۔ حکومت کے روپیہ خرچ کرنے ہی سے لوگوں کی آمدنی بڑھے گی اور پھر وہ سرکار کو زیادہ محصول اور زیادہ قرض دے سکیں گے اس لئے سرکار نوٹوں کو منسوخ نہیں کرائے گی بلکہ انھیں خرچ کرے گی اور موجودہ نوٹ اس کے خرچ کے لئے کافی ثابت ہوئے تو وہ اپنے تمسکات کی پشتی پر رزرو بنک سے اور زیادہ نوٹ چھپوائے گی۔

یہاں تک تو مسئلہ کے ایک رخ سے بحث کی گئی یعنی روپے کی مقدار سے۔ لیکن قیمتوں کی کمی بیشی کا تعلق جہاں ایک طرف روپے کی مقدار سے ہے وہاں دوسری طرف چیزوں کی مقدار سے بھی ہے۔ اگر چیزوں کی رسد زیادہ ہوگی تو قیمتیں کم ہو جائیں گی۔ چیزوں کی رسد دو طرح سے زیادہ کی جا سکتی ہے۔ ایک تو ملک کے اندر ان چیزوں کو زیادہ پیدا کرنے سے اور دوسرے باہر کے ملکوں سے ان کو زیادہ منگانے سے۔ باہر کے ملکوں سے چیزیں منگانے کا جہاں تک تعلق ہے اول تو وہاں بھی چیزوں کی رسد کم ہے۔ دوسرے جہاں چیزوں کی رسد زیادہ ہے ان کے سکے زیادہ نہیں مل سکتے۔ اس لئے ان کے استعمال میں ہمیں کفایت اور عاقبت اندیشی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی معاشی ترقی کی اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے مشینوں اور دولت آفریں چیزوں کی خریداری کو ترجیح دینا ہوگی اور باہر کے ملکوں سے فوری ضرورت کی چیزوں کی خریداری کم کرنا ہوگی۔

اب رہا اپنے ملک میں چیزوں کا زیادہ تیار کرنا۔ یہی ایک صورت قیمتوں کے کم کرنے کی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے نتائج جلد نکلنے نظر نہیں آتے۔ زراعتی اور صنعتی دونوں قسم کی پیداواروں کو بڑھانے میں کچھ ایسی اڑچنیں ہیں جنکو آہستہ آہستہ ہی دور کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ قیمتوں کی کمی سے چونکہ مال پیدا کرنے والوں کی ہمت پست ہوتی ہے اس لئے مال کی پیداوار بڑھانے کے لئے یہ بات زیادہ موزوں سمجھی جائے گی کہ قیمتوں کو کم نہ ہونے دیا جائے۔ بلکہ اجرتوں اور مختلف طبقوں کی آمدنیوں کو زیادہ کیا جائے۔

عارضی طور پر قیمتوں کو کم کرنے کے لئے حکومت کنٹرول اور راشننگ کو دوبارہ جاری کر سکتی ہے۔ اور اس کے ذریعے زیادہ روپے والے لوگوں کو چیزوں کی خریداری سے روک سکتی ہے اور جو روپے ان کے پاس اس طرح بچ جائیں انھیں مختلف تدبیروں سے قرض لینے کی کوشش کر سکتی ہے۔ اس سے خوش حال خریداروں میں جو بچانے کا جذبہ کم اور خرچ کرنے کا جذبہ بڑھ گیا ہے اس کا تدارک کیا جا سکے گا۔ اور غریب خریدار جو قیمتوں کی گرانی کی وجہ سے چیزوں کی خریداری سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ان کی محرومی کم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کنٹرول اور راشننگ کی ساری وہ خرابیاں اور ذخیرہ اندوزی اور چور بازار کا سارا وہ نظام دوبارہ پیدا ہوگا جس سے نجات حاصل کرنے کا مطالبہ ہر طرف سے کیا گیا تھا۔

غرض، ان حالات میں نظر یہی آتا ہے کہ سرکار کو اپنی ساری توجہ چیزوں کی رسد بڑھانے کی طرف لگانا ہوگی اور گرانی کا علاج یہی کرنا ہوگا کہ لوگوں کی اجرتوں اور آمدنیوں میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ جو دوسری صورتیں ہیں ان سے خرابی کے کم ہونے کی جگہ بڑھنے کا اندیشہ ہے۔

(بقیہ گاندھی جی اور انقلاب ہند)

روایتی طرز فکر نے انسان کو ایسے گھپ اندھیرے میں لا کر چھوڑ دیا تھا جہاں اسے کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی۔ گاندھی جی کے تجربات نے اس سیاسی اور سماجی ظلمت سے نکلنے کی ایک راہ دکھائی۔

یورپ کے ذہنی مرض کا سبب یہ تھا کہ اس میں خود اپنے ہی تجربات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی نے آدمی کو یہ سبق دیا تھا کہ سیاسی آزادی کا پھل ہمیشہ میٹھا نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس کا نتیجہ بدترین معاشی غلامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت نے بارہ سال کے لڑکوں سے بھی متواتر سولہ گھنٹے تک سخت محنت کے کام لینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اس استحصال کی حمایت "آزادی معاہدہ" کے نام پر کی جاتی تھی۔ اس زمانے کے وکیل، سیاسی لیڈر، ڈاکٹر بلکہ کلیسا کے بشپ بھی قانونی، سیاسی، طبی اور مذہبی اصولوں کی بنیاد پر اس کو جائز ثابت کرتے تھے۔ ایسا اندھیر ہمیشہ نہیں چلتا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے شروع میں "آزادی معاہدہ" کے حق کو محدود کرنے کی تحریک زور شور سے اٹھی۔ نیا نعرہ جنگ یہ تھا کہ حکومت کو سیاسی آزادی کے علاوہ معاشی آزادی اور خوش حالی کی بھی ضمانت دینی چاہئے۔

اصولی اعتبار سے تو یہ بات سب نے تسلیم کر لی تھی کہ صرف وہی حکومت رعایا کی وفاداری کا مطالبہ کر سکتی ہے جو ان کو مادی خوشحالی، ضروریات زندگی کی فراہمی اور جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے۔ لیکن جب اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کا سوال سامنے آتا تھا تو یہ اتحاد خیال غائب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ عقلیت پسند لبرل گروہ کا خیال تھا کہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے، تعلیم اور حق رائے دہندگی کو وسیع کر دینے سے نوع انسانی ترقی کر سکتی ہے۔ ان کے خلاف سوشلسٹوں کی یہ رائے تھی کہ سماج کو نقصان پہنچا کر ذاتی فائدہ حاصل کرنے کا کسی فرد کو حق نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کے اختیار کو رفتہ رفتہ وسعت دے کر سوسائٹی کے نظام کو بدل دینا چاہئے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا فرقہ انقلابی مزاجوں کا تھا۔ جس کا خیال تھا کہ اگر ریاست کو ختم کر دیا جائے تو زمین و آسمان ہی بدل جائیں۔

وقت کے ان سب نظریات کا گاندھی جی کے ذہن پر خاصا اثر ہوا۔ چونکہ ان اصولوں میں باہم شدید اختلاف اور تناقض تھا اس لئے گاندھی جی نے اپنا الگ فلسفہ حیات بنانے کا ارادہ کیا۔ ان کے فلسفہ کا ارتقا اس طرح ہوا کہ انھوں نے متضاد مطالبات کو ہندوستانی تاریخ اور روایات کی بنیاد پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ مغربی فکر کے دھاروں کو ہندوستانی تہذیب میں سمونے کی وجہ سے گاندھی جی کے سیاسی اور سماجی خیالات اپنے اندر بہت کچھ انقلابی امکانات رکھتے ہیں۔ (باقی)

مترجمہ عبدالحلیم ندوی بی اے (جامعہ)

مجھے اس کی بالکل فکر نہیں کہ میرے خیال و عمل میں ظاہری استقامت پائی جائے۔ حق کی تلاش میں میں نے بہت سے خیالات کو ترک کیا ہے اور بہت سی نئی باتیں سیکھی ہیں۔ اس بڑھاپے کے باوجود مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میری اندرونی نشوونما رک گئی ہے یا گوشت پوست کے فنا ہو جانے کے بعد رک جائے گی۔ جس بات کی مجھے فکر ہے وہ یہ ہے کہ ہر لحظہ اپنے معبود یعنی حق کی دعوت پر لبیک کہتا رہوں۔

بعض ابدی اصول ہیں جن میں مصالحت کے خیال سے کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ انسان کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ ان پر عمل کرنے کی کوشش میں جان تک قربان کر دے"

(گاندھی جی)

مشرقی دنیا بسلسلہ صفحہ

وہ دن قریب آجاتا ہے جب عوام کی بیزاری کا آتش فشاں پھٹ جاتا ہے۔

یہ ملایا کا جھگڑا کیا ہے؟

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملایا کی آبادی ۵۵ لاکھ تھی۔ اس میں ۲۴ لاکھ چینی، ۲۳ لاکھ ملائی، ۸ لاکھ ہندوستانی اور ۳۰ ہزار یوریشین ہیں۔ ملایا کی اصل آبادی زیادہ تر زراعت پر گذر بسر کرتی ہے۔ صنعتی مزدوروں کا طبقہ تقریباً تمام تر چینی اور ہندوستانی مزدوروں پر مشتمل ہے۔ ملک میں اگر کوئی اوسط طبقہ ہے تو وہ بھی انھی دو قوموں کے تھوڑے سے حصے پر مشتمل ہے۔ مختلف النسل قوموں کا یہ اجتماع برطانوی حکومت کی منشا کے مطابق ہوا تھا۔ چینی اور ہندوستانی مزدور ملایا کی ٹین کی کانوں اور ربڑ کے باغات میں کام کرنے کے لئے لائے گئے تھے اور اب حکومت نے اس اختلاف نسل کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ ملایا میں سیاسی اصلاحات کا اعلان ہوا ہے لیکن ان اصلاحات سے اس اصلیت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ برطانوی حکومت کے ذہن میں ملایا کا جو سیاسی نقشہ ہے وہ پرانے نوآبادیاتی نظام سے مختلف نہیں ہے۔ ملایا کی نئی وفاقی قانون ساز اسمبلی میں منتخب شدہ ایک بھی ممبر نہیں۔ سنگاپور کو اس وفاق سے الگ کر دیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح ملایا کے ان قدامت پسند حلقوں کو خوش کیا جائے جو برطانوی حکومت کے زیر سایہ ہی سانس لے سکتے ہیں اور لینا چاہتے ہیں۔ سنگاپور کی ۸۰ فی صدی آبادی چینیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے الگ کر دئے جانے کی وجہ سے وہ وفاق میں اقلیت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی تحریکوں کو بھی اس تقسیم سے نقصان پہنچے گا کیونکہ وہ دو حصوں میں بٹ جائیں گے۔ وفاق کا دستور بنانے میں برطانوی حکومت نے مشورے کے لئے مطلق العنان سلطان کے حامی برطانوی حکومت کے حلیف اور چینیوں کے دشمن سیاسی لیڈروں سے ہی مشورہ لیا بات چیت کی اور یہ گفتگو پوشیدہ طور پر کی گئی تھی۔

ملایا کے معاشی پس منظر پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ملایا کے باشندوں کی اہم ترین غذا چاول ہے اور چاول کی قیمت لڑائی کے پہلے کے مقابلے میں ۱۵ گنی بڑھ گئی ہے۔ مزدوروں کی اس کوشش کو بھی کہ وہ کم سے کم جنگ سے پہلے کے معیار کو دوبارہ حاصل کر لیں، مالکوں نے کامیاب نہیں ہونے دیا ہے۔ ربڑ کے مالکوں نے اس ڈر سے کہ ربڑ کی قیمت بڑھ گئی تو اُن کے نفع پر اثر پڑے گا اور ٹین کی کانوں کے مالکوں نے بھی کم و بیش اسی طرح کی وجوہ سے اجرتوں میں اضافے کی سخت ترین مخالفت کی ہے۔ اجرتوں کے متعلق جھگڑوں کی بدولت بارہا طویل طویل اسٹرائکیں ہوئی ہیں اور سمجھوتے کے بعد مالکوں نے بسا اوقات لیڈروں کو کام سے نکال دیا ہے۔ برطانوی حکومت کا رویہ ایسا ہی جابرانہ رہا ہے۔ اپریل میں بندرگاہ کی ایک اسٹرائک کو ختم کرنے کے لئے حکومت نے مزدور یونین کے باہر سے مزدور بلائے اور اسٹرائک کے کئی لیڈروں کو جیل میں بند کر دیا۔ باغات کی اسٹرائک کو ختم کرنے کے لئے پولیس اور فوج سے مدد لی گئی۔ سنگاپور میں حکومت نے یکم مئی کے سلسلے میں جلسہ کرنے کی اجازت دی لیکن جلوسوں کی ممانعت کر دی۔ جب مزدوروں نے اس پابندی کو ماننے سے انکار کیا تو جلسے کی اجازت بھی منسوخ کر دی گئی۔ اور فوجیں بلا لی گئیں۔ جلد ہی ملایا کی سب سے بڑی مزدور انجمن غیر قانونی قرار دے دی گئی۔

ملایا کے کمیونسٹوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے پہلے سے منظم سازش کر کے جس کی جڑیں برما اور سارے جنوبی مشرقی ایشیا میں پھیلی ہوئی ہیں، ملایا میں ہنگامے شروع کئے ہیں۔ اس سازش کی نوعیت ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی اس "سازش" سے بھی یاد نہیں لگتی جس کی سزا میں وہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی ایک صبح کو گرفتار کر لئے گئے تھے۔ کمیونسٹوں کو یہ اندیشہ تھا کہ بین الاقوامی سیاسی صورت حال کی خرابی ان کے حق میں مضر ہوگی اور برطانوی حکومت ان کے خلاف شدید تر کارروائیاں کرے گی۔ ملایا کے حالات سے واقف حلقوں کی رائے ہے کہ اگر کمیونسٹوں نے کوئی سازش کی تھی تو ملایا کے حالات کے رخ کی تبدیلی ان کے پروگرام اور ان کی خواہش سے بالکل مختلف ہوئی ہے۔ جہاں تک اس سازش کی جغرافیائی وسعت کا تعلق ہے وہ محض ایک بیمار تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔ ملایا کے کچھ ہندوستانیوں نے برطانوی حکومت سے وفاداری کا اظہار کیا ہے گو گرفتار ہونے والوں میں بھی ۲۰۰ ہندوستانی شامل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کی اس وفاداری کی داد دیں ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ایک درجن یورپین کارخانوں کے مالکوں کی جانیں قیمتی ہیں تو ان کی جانوں کی بھی تو کچھ قیمت ہونی چاہئے جن کے خلاف برطانیہ عظمیٰ کی ساری جنگی قوت صرف کی جا رہی ہے۔ انسانیت دوستی کا جذبہ تو سب انسانوں کے لئے عام ہونا چاہئے۔ ا۔س

نئی روشنی

ادارۂ تحریر:-

ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے۔

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۹ | ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

قومی زبان

از مہاتما گاندھی

میرا خیال یہ ہے کہ :-

۱- ہندی ہندوستانی اور اردو کے الفاظ ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے شمال میں ہندو مسلمان سب بولتے ہیں اور وہ یا تو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے یا فارسی رسم الخط میں

۲- لفظ اردو کے رواج سے پہلے ہندو مسلمان دونوں اس زبان کو ہندی کے نام سے پکارتے تھے

۳- آگے چل کر ٹھیک سن مجھے معلوم نہیں، اسی زبان کے لئے ہندوستانی کا لفظ بھی استعمال ہونے لگا۔

۴- ہندو مسلمان دونوں عام طور پر وہی زبان بولنے کی کوشش کرتے ہیں جسے شمال کے بے شمار عوام سمجھتے ہیں۔

۵- اسی کے ساتھ بہت سے ہندوؤں کو یہ کد ہے کہ وہ صرف سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں اور مسلمانوں کو یہ کد ہے کہ وہ صرف عربی، فارسی کے الفاظ استعمال کریں۔ یہ چیز ہمیں اس وقت تک برداشت کرنی ہوگی جب تک دونوں کی باہمی بے اعتمادی اور علیحدگی باقی ہے

ان ہندوؤں کو جو مسلمانوں کے بعض مخصوص خیالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اردو فارسی رسم الخط میں سیکھنی ہوگی اور ان مسلمانوں کو جو ہندوؤں کے بعض مخصوص خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں ہندی دیوناگری رسم الخط میں سیکھنی ہوگی۔

۶- ایک دن جب ہمارے دل مل جائیں گے اور ہم سب اپنے اپنے صوبوں کے بجائے ہندوستان کو اپنا دیس مان کر اس پر فخر کریں گے اور ایک ہی درخت کے پھل کو پہچانیں گے، برتیں گے اور جیسے کے لہلہائیں گے تو ہماری ایک مشترک زبان ایک مشترک رسم الخط کے ساتھ ہوگی اور صوبوں کی زبانیں صوبوں کے اندر استعمال ہوتی رہیں گی۔

۷- ہندی کی کسی ایک شکل یا ایک رسم الخط کو کسی صوبے، کسی علاقے یا کسی فرقے پر زبردستی رواج دینے کی کوشش ہمارے ملک کے حقیقی مفاد کے خلاف ہوگی۔

۸- مشترک زبان کے مسئلے پر مذہبی اختلافات سے الگ ہو کر غور کرنا چاہئے۔

۹- رومن رسم الخط ہندوستان کا مشترک رسم الخط نہیں ہو سکتا اور نہیں ہونا چاہئے۔ مقابلہ صرف فارسی اور دیوناگری میں ہو سکتا ہے۔ دیوناگری کی اپنی خوبیوں سے قطع نظر کر کے اسے اس بنا پر ہندوستان کا مشترک رسم الخط ہونا چاہیے کہ بہت سی صوبائی زبانوں کے رسم الخط دیوناگری سے نکلے ہیں اور ان صوبوں کے لوگوں کے لئے اس کا سیکھنا سب سے زیادہ آسان ہے مگر اس کے ساتھ اسے مسلمانوں بلکہ اور لوگوں پر بھی جو اس سے ناواقف ہیں زبردستی مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

۱۰- اگر اردو کو ہندی سے الگ کر کے دیکھا جائے تو میں نے یہ اردو کے فائدے کے لئے کیا کہ اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن سے قومی زبان کی تعریف جو دفعہ ۱ میں درج ہوئی ہے منظور کرائی اور ناگپور میں بھارتی ساہتیہ پریشد سے بھی اس تعریف کو منظور کرایا اور اس مشترک زبان کے لئے جو صوبوں کے آپس کے برتاؤ میں استعمال ہوتی ہے "ہندی یا ہندوستانی" کا نام تجویز کیا۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو پورا موقع مل گیا کہ مشترک زبان کو ترقی دینے کی کوشش میں شریک ہوں اور صوبائی زبانوں کے بہترین خیالات کو اس زبان میں منتقل کریں۔

ہریجن ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء

ہاتھ کا کام کیوں سکھایا جائے

مجھے اندیشہ ہے کہ آپ لوگ اس اصول کو اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں کہ کتائی، بُنائی وغیرہ کو ذہنی تربیت کا ذریعہ بنانا چاہئے۔ ہو یہ رہا ہے کہ ہاتھ کا کام ایک فرضی نصاب کے طور پر ذہنی نصاب کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کے فرق کو سمجھ لیں۔ اگر بڑھئی مجھے لکڑی کا کام سکھاتا ہے۔ میں اس سے یہ کام مکانکی طور پر سیکھ لیتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے مختلف اوزاروں کا استعمال آجائے گا مگر اس سے میرے ذہن کی نشوونما نہیں ہوگی۔ لیکن اگر یہی کام مجھے کوئی ایسا شخص سکھاتا ہے جس نے نجاری کی سائنٹفک ٹریننگ حاصل کی ہے تو وہ میرے ذہن کو بھی اُبھارے گا۔ تب میں نہ صرف ایک ہوشیار بڑھئی بلکہ انجینیر بھی بن جاؤں گا۔ اس لئے کہ نجاری کا ماہر مجھے ریاضی سکھائے گا۔ لکڑی کی مختلف قسموں کا فرق سمجھائے گا اور یہ بتائے گا کہ یہ کہاں سے آتی ہیں۔ اس طرح میں کچھ جغرافیہ اور تھوڑا سا علم زراعت بھی سیکھ جاؤں گا۔ وہ مجھے اپنے اوزاروں کی ڈرائنگ بنانا اور ابتدائی جامیٹری اور حساب بھی سکھا دے گا۔

غالباً آپ ہاتھ کے کام میں اور ذہنی تربیت میں جو محض لکھنے پڑھنے کے ذریعے سے دی جاتی ہے کوئی ربط نہیں پیدا کرتے۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے اب تک صرف یہی کہا ہے کہ ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ ہاتھ کا کام بھی سکھایا جائے اور اسے قومی تعلیم میں ایک اہم جگہ دی جائے مگر اب میں کہتا ہوں کہ ذہن کو ابھارنے کا خاص ذریعہ ہاتھ کا کام ہونا چاہئے۔ میں اس نتیجے پر اس لئے پہنچا ہوں کہ ہمارے لڑکوں کی ذہنی قابلیت ضائع ہو رہی ہے۔ ہمارے لڑکے جب مدرسے سے نکلتے ہیں تو ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سچی تعلیم وہ ہے جو بچوں کی روحانی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو اُبھارے اور اُجاگر کرے۔ یہ تعلیم ان کے لئے اس بات کی ضمانت ہونی چاہئے کہ وہ بے کار نہیں رہیں گے۔

ہریجن ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
قومی زبان	مہاتما گاندھی	۱	مغربی دنیا		۶
ہاتھ کا کام کیوں کر سکھایا جائے	مہاتما گاندھی		وطن کے سورما (نظم)	اثر لکھنوی	۷
گاندھی جی اور انقلاب ہند	پروفیسر ہمایوں کبیر	۲	غزل	سیدہ فرحت	۷
آزادی کی سالگرہ	(اداریہ)	۳	قسم قسم کے آنسو	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۸
بزم بے تکلف		۳	ہند سرکار کی نفع خوری کے خلاف مہم	پروفیسر محمد عاقل	۹
پچھلا ہفتہ			ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک	۱۰
(۱) ہندوستان		۴			
(۲) پاکستان		۵			

قیمت فی پرچہ تین آنے

گاندھی جی اور انقلابِ ہند

(۲)

پروفیسر ہمایوں کبیر

تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ زمانے میں صنعتی اور مشینی تمدن کو سراسر رد کر دینا ناممکن ہے۔ سائنس کو اپنی ضرورتوں کے لئے استعمال کرنے سے ہمیں ان مشکلات کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے جو طبیعی عمل اور ماحول کی ناسازگاری سے پیدا ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں مشین کے استعمال سے صرف چند ہی آدمیوں کو فائدہ پہنچے لیکن اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن دنیا میں ہر شخص اس سے مستفید ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ لہٰذا مشین تو سبھی کی خادم ہے۔ البتہ اگر اس کا ناجائز استعمال کیا جائے تو اس کی مدد سے ذاتی فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ مشین کے صحیح استعمال سے مشترک دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے غلط استعمال سے ساری دولت کھنچ کر چند افراد کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مشین کا قصور نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو اس کا بے جا استعمال کر کے انسان کی ذلت کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو مشین سے جو وحشت تھی اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ خود مشین کو برا سمجھتے تھے بلکہ دراصل وہ نوعِ انسانی کی اس ذلت کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے تھے۔

ذرا سا غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آخر چرخہ اور سینھ کرگھا بھی مشینیں ہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ چھوٹی مشینیں ہیں اور ہاتھ سے چلتی ہیں۔ مگر اس سے ان کی نوعیت تو نہیں بدل جاتی۔ بڑی مشینوں سے گاندھی جی ضرور کھٹکتے تھے اور اس کی وجہ تھی۔ جب مشین ہاتھ سے چلتی ہے تو وہ براہِ راست انسان کے قابو میں ہوتی ہے۔ اس کے بے جا استعمال کا امکان بھی کم ہے۔ مگر بڑی مشینوں کی بات اور ہے۔ وہاں تو خود انسان مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔ کم سے کم یہ تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لاشخصی سیرت پیدا کرتی ہے جس میں انسانیت کا عنصر آسانی سے نظر انداز ہو سکتا ہے۔ پیدا کرنے کا عمل پیداوار سے بلکہ خود پیدا کرنے والے سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ مشین انسان کی انسانیت کو زائل کر دیتی ہے۔

بڑے پیمانے کی صنعت کے اندر یہی خطرہ تھا جس کی بنا پر گاندھی جی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خود مختار اور خود کفیل گاؤں کو سماج کی اکائی بنانا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو ہر گاؤں اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کا نظم خود ہی چلائے۔ اس طرح کی چھوٹی اکائیوں میں انسانی تعلقات کے رشتے زیادہ مضبوط ہوں گے۔ اس کا اندیشہ نہ ہوگا کہ اوپری یا لاشخصی تعلقات ان کی جگہ لے لیں گے۔ گاؤں کے اندر انفرادی آزادی کی کافی گنجائش ہوگی مگر یہ خطرہ نہیں ہوگا کہ وہ بگڑ کر افراتفری یا انراج کی شکل اختیار کر لے۔ ریاست کی استبدادی آمریت اور بے ریاستی کا انراج ان دونوں میں بڑے خطرے ہیں۔ چھوٹی سی گاؤں کی سماج میں لوگ ان دونوں خطروں سے بچ کر لبرل جمہوریت کو دھر تک پہنچا سکتے ہیں۔

ایک نئی قسم کی تہذیب ہونی چاہئے جس میں دیہی معیشت کی خامیاں بھی نہ ہوں اور وہ خطرے بھی نہ ہوں جو عہدِ حاضر کی صنعتی تہذیب میں نظر آ رہے ہیں۔ گاؤں کی زندگی میں تنگ دلی ہے، باہمی رقابتیں ہیں اور تضیعِ اوقات ہے۔ شہری زندگی بے روح، بے شکل اور بے مقصد ہے۔ اگر فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کرنی ہے تو اسے ان سب کوتاہیوں پر غالب آنا چاہئے۔ گاؤں میں آپس میں اتنی بے تکلفی ہے کہ نجی زندگی میں خلل پڑتا ہے۔ شہر میں ایک دوسرے سے اس قدر بے پروائی ہے کہ بے حسی اور بے دردی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر دنیا کی آئندہ تہذیب آزاد سماج میں فرد کی آزادانہ نشوونما چاہتی ہے تو اسے دونوں قسم کی خرابیوں سے بچنا چاہئے۔ ایسی تہذیب کی تعمیر کے لئے جس میں ماضی اور حال کے بہترین عناصر کا امتزاج ہو، ذہن کی تیزی، قلب کی وسعت اور ارادے کی مضبوطی کی ضرورت ہے۔

پہلے بڑے پیمانے پر پیداوار ہونے کے لئے بڑے شہروں کا ہونا ناگزیر تھا۔ انسان کی قوت محدود تھی اور زندگی کا معیار بڑھانے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں اکٹھے ہو کر کام کریں۔ معیار کی بلندی اشیاء کی فراوانی پر، اور اشیا کی فراوانی بڑے کارخانوں پر منحصر ہے۔ لیکن آج جب بھاپ کی جگہ بجلی نے لے لی ہے، صورتِ حال بدل گئی ہے۔ جہاں عمل کی قوت سے کام لیا جاتا ہے وہاں ضروری نہیں کہ صنعتی شہروں میں آبادی کا اجتماع ہو۔ بجلی کی بدولت صنعتوں کو بڑے رقبے میں منتشر کیا جا سکتا ہے۔ اسی قسم کے سماجی حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جیسے دیہی دستکاریوں کے عہد میں تھے۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ ہم دیہی اور شہری تہذیبوں کی خوبیوں کو جمع کر سکیں۔ مادی دولت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ انسانی تعلقات کو بھی بڑھا سکیں۔ اگر ایک طرف انسانوں کے دل گہرے جذبات سے مالامال ہوں اور دوسری طرف انھیں خوش حالی اور فراغت نصیب ہو تو ان کی تخلیقی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور نئے نئے کاموں کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کا ایک خفیف سا احساس تھا جس کی وجہ سے گاندھی جی نے صنعت کی لامرکزیت پر اور اسے چھوٹی چھوٹی مستقل اکائیوں میں بانٹنے پر زور دیا۔

مغربی تہذیب و تمدن کے تجربے سے گاندھی جی کو یہ معلوم ہوا کہ فرد کی معاشی آزادی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر سیاسی آزادی محض ایک سوانگ اور جمہوریت ایک ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اجتماعِ دولت یعنی دولت سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھ میں آ جانا فرد کی معاشی آزادی کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعت میں جو ذاتی ملکیت کے اصول پر چلائی جائے یہ اجتماعِ دولت ناگزیر ہے۔ مرض کی تشخیص میں وہ اشتراکیوں کے ہم خیال تھے لیکن علاج کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ اشتراکیوں کے نزدیک اس مرض کا علاج ذاتی ملکیت کو ختم کرنا ہے اور گاندھی جی کے نزدیک صنعت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں منتشر کرنا۔

اس اختلاف کی وجہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اشتراکی اس کے لئے تیار ہیں کہ سیاسی، معاشی اور سماجی برابری قائم کرنے میں اگر ضرورت پڑے تو تشدد سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر گاندھی جی یہ سمجھتے تھے کہ وہ برابری جو معاشی آزادی کی بنیاد ہے یا امن اور بے تشدد طریقے سے قائم کرنی چاہئے۔ سیاسی آزادی خونریز انقلاب کے ذریعے سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے۔ مگر گاندھی جی کے نزدیک اس طرح صرف آزادی کا چھلکا ملتا ہے اس کا مغز ہاتھ نہیں آتا۔ جن لوگوں نے تلوار سے کام لیا ہے وہ اکثر تلوار ہی سے [illegible] گئے ہیں۔ پرتشدد انقلاب کے بعد یہ خطرہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے حاصل ہوا ہے اسے پرتشدد جوابی انقلاب برباد کر دے گا۔ اسی خطرے کی وجہ سے گاندھی جی اس بات پر زور دیتے تھے کہ انسان کو اپنی معاشی اور سیاسی آزادی نفرت کے جذبے پر فتح پا کر حاصل کرنی چاہئے۔ اگر کوئی چیز سمجھا بجھا کر حاصل کی جائے تو اندیشہ کم ہوتا ہے کہ وہ زبردستی چھن جائے گی۔

جب گاندھی ہندوستان کے سیاسی مطلع پر طلوع ہوئے اس وقت سیاسی سرگرمی بس یہیں تک محدود تھی کہ برطانوی حکام کی خدمت میں عرض داشتیں بھیجی جائیں۔ انھوں نے ہندوستان کی قدیم روایات میں سیاسی جدوجہد کا ایک ایسا طریقہ دریافت کر کے جو اس ملک کے لئے موزوں تھا سارا نقشہ بدل دیا۔ انھوں نے ان مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا جو ان کے راستے میں حائل تھیں۔ مگر یہ بھی نہیں کیا کہ ان سے ڈر کر ہتھیار ڈال دیں۔ وہ جانتے تھے کہ مردہ قوم کو نئے سرے سے زندہ کرنا بڑا دیر طلب کام ہے۔ جو لوگ صدیوں سے ظلم سہتے سہتے کمزور ہو گئے ہیں وہ ایک روز میں قربانی اور جفاکشی کے عادی نہیں بنائے جا سکتے۔

گاندھی جی کے نزدیک سب سے مقدم یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں نئے سرے سے خودداری کی روح پھونکیں، وہ جانتے تھے کہ اس کے بعد بدی کا مقابلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ پہلا کام جو انھوں نے اپنے پیرووں کو بتایا کہ گرفتاری اور قید کا خوف اپنے دل سے دور کر دیں۔ مقابلتاً آسان تھا۔ پھر بھی اس زمانے کی حالت کو دیکھتے ہوئے نہایت مشکل تھا، جیل جانا بڑی بدنامی کی بات تھی اور لوگ جرم سے بچنے کی اتنی کوشش نہیں کرتے تھے جتنی جیل سے بچنے کی۔ گاندھی جی نے قصداً ناپسندیدہ قوانین کی خلاف ورزی کی اچھی طرح جان بوجھ کر کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ آج ہم بھول گئے ہیں کہ اس زمانے میں عام شہری جیل جانے سے کس قدر گھبراتے تھے آج کسی سیاسی مقصد کے لئے قید ہونا ہندوستان میں ایک طرح کی شہادت سمجھی جاتی ہے۔ جیل کا خوف ہمارے دلوں سے دور کر کے گاندھی جی نے اتنا بڑا نفسیاتی انقلاب پیدا کر دیا جس کا ہم پوری طرح اندازہ نہیں کر سکتے۔

جب جیل کا خوف جاتا رہا تو گاندھی جی نے خیال کیا کہ اب دوسرا قدم اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب کی بار ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دل سے جائداد کی ضبطی کا خوف جاتا رہے۔ نان کوآپریشن کی تحریک کے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۱۶ اگست ۱۹۴۸ء

آزادی کی سالگرہ

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء نے پہلے سال میں مختلف اور متضاد جذبات کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ ایک طرف فخر و مسرت کا جوش تھا کہ ہماری آزادی کے پودے نے برسات میں فسادات کے خونی سیلاب جاڑے میں خوف اور مایوسی نے بھیانک گرمیوں میں (اللہ تعالیٰ) نازشوں کے کرم اور تند جھکڑوں کا مقابلہ کر کے سال بھر میں نشو و نما سے پھلنا پھولنا ہے۔ دوسری طرف رنج و الم کا ذریعہ کہ غلامی جلتے جاتے تھے اور نفرت کی ایسی آگ لگا دی کہ جلانے نہ جانے کتنے بھائی بہن بچے جان سے گئے۔ ایک کروڑ سے زیادہ لٹ لٹا کر گھر سے بےگھر ہو گئے جیسے اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور اب بھی اٹھا رہے ہیں اور ماسی کے ساتھ تاسف اور ندامت ہے کہ ہماری سب سے بڑی دولت ہمارے بوڑھے باپ مہاتما گاندھی کی ہڈیاں اس آگ کے شعلوں میں جل کر بھسم ہو گئیں اور ہم دیکھتے رہ گئے۔

اگر جذبات کے اس ہیجان کو آپ چند نعروں، چند آنسوؤں میں ضائع نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو اسے غور و فکر کا محرک بنائیے اور بیٹھ کر سوچیے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال میں کیا کیا ہے اور آگے کیا کرنا ہے۔

مشرقی ملکوں اور مغرب کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کا ذکر نہیں اگر آپ فرانس، برطانیہ، امریکہ اور روس سے مقابلہ کر کے دیکھئے تب بھی ماننا پڑے گا کہ اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے میں ہندوستان ان سے زیادہ کامیاب رہا۔ فرقہ وارانہ فساد پر قابو پانا، آبادی کا مبادلہ، پناہ گزینوں کو پھر سے بسانا، ان سیکڑوں سروالے عجیب مخلوق کو رام کرنا جو ہندوستانی ریاستوں کی شکل میں اتحاد اور جمہوریت کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا، اقوام عالم سے ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرانا، ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا، ہندوستانی ریاست کا ایک ایسا آئین بنانا، جسے رائے عامہ کی زیادہ سے زیادہ تائید حاصل ہو۔ ان میں سے ہر ایک مسئلہ نہایت مشکل، پیچیدہ اور دیر طلب تھا مگر سال بھر کے قلیل عرصے میں یہ مسائل بہت کچھ حل ہو چکے ہیں اور جو نہیں ہوئے ہیں ان کے حل ہونے کی صورت نظر آنے لگی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پناہ گزینوں کی بحالی کا کام ابھی ادھورا ہے لیکن اس کو پورا کرنے کے منصوبے بن گئے ہیں اور ان پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کشمیر اور حیدرآباد کے مسئلے ابھی طے نہیں ہوئے لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی صحیح صورت حال دنیا کے سامنے آگئی ہے اور شروع میں دوسرے ملکوں کو جو غلط فہمیاں تھیں وہ بہت کچھ دور ہو گئی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ نیا آئین ابھی باضابطہ طور پر نہیں ہوا لیکن اس کے بنیادی اصول طے ہو چکے ہیں اور اس کا مکمل مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ ایک سال کی اس کارگزاری پر ہم عجز و انکسار کے ساتھ خوشی اور اطمینان کا اظہار کریں تو کچھ بے جا نہیں۔

لیکن نیا سال پرانے مسائل کی بقایا کے علاوہ نئے مسائل اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ نئے آئین کے منظور ہوتے ہی آئندہ انتخابات کے لئے سیاسی پارٹیوں میں رسہ کشی شروع ہو جائے گی اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات، صوبہ وارانہ رقابت، پناہ گزینوں کی تکلیف، گرانی اور افلاس کی عام مصیبت سے اور ان شبہات سے جو ایک نئی قوم کو بیرونی سیاست کے بارے میں ستاتے رہتے ہیں جائز اور ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ ہمارے لئے بڑی سخت آزمائش کا دور ہوگا۔

اندرونی سیاست میں ہمارے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ خیالات اور مقاصد کے اختلافات کے باوجود قومی اتحاد کو قائم رکھیں۔ جن قوتوں نے پچھلے تیس سال میں ہمارے اندر قومی وحدت کا جذبہ پیدا کیا، ان میں سب سے بڑی قوت مہاتما گاندھی کی شخصیت تھی۔ آج گاندھی جی ہم میں موجود نہیں مگر ان کی محبت اور عزت کروڑوں آدمیوں کے دل میں سمائی ہوئی ہے یہ اتنی بڑی وحدت آفریں قوت ہے جو بہت کم قوموں کو نصیب ہوئی ہے۔ اگر ہم اس کی سچی قدر کریں اور اس سے پورا کام لیں تو ہماری قوم کے شیرازے کو بکھرنے نہ دے گی۔

اس شدید خطرے کے باوجود کہ آئندہ طاقت کی کشمکش میں آزادی اور اتحاد کے دشمن فرقہ پرست اور رجعت پرست ہمارے بدترین جذبات کو بھڑکانے کی اور ہمارے تفرقی رجحانات کو اکسانے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ گاندھی جی کی اخلاقی تعلیم کی روح جو کسی نہ کسی حد تک ہندوستان کے جسم اجتماعی میں سرایت کر چکی ہے فساد اور انتشار کی قوتوں کا مقابلہ کرے گی اور ان پر غالب آئے گی اور نئے آئین کے نفاذ اور نئے انتخابات کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان پہلے سے زیادہ مضبوط اور متحد ہوگا۔

بیرونی سیاست میں سب سے پیچیدہ مسئلہ جس سے ہمیں نپٹنا ہے یہ ہے کہ ہم روس اور مغربی جمہوریتوں کی باہمی کشمکش میں کس کا ساتھ دیں۔ اب تک ہندوستان، پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ دونوں فریق اس سے بدظن ہیں اور اس کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اگر ان مشکلات کا مقابلہ اس مصیبت سے کیجئے جو روس اور امریکہ کی جنگ کی صورت میں دونوں فریقوں کے ساتھیوں کو پیش آئے گی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ جہاں تک ہو سکے ہماری نئی ریاست کو، جس کی جڑیں ابھی طرح مضبوط نہیں ہیں، اس طوفانی سیاست سے الگ ہی رہنا چاہیے۔

لیکن موجودہ زمانے میں، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک کے لئے سیاسی مسائل سے بھی زیادہ اہمیت معاشی مسائل رکھتا ہے۔ اگر گرانی، بے روزگاری اور افلاس کی بڑھتی ہوئی رو کو نہ روکا گیا تو یہ اندیشہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کی کشتی کا لنگر ٹوٹ جائے اور وہ تباہی کے تلاطم میں پڑ کر پاش پاش ہو جائے۔ ہماری حکومت نے اب افراط زر اور گرانی کی روک تھام کی طرف توجہ شروع کی ہے۔ ہر محب وطن کو اس کوشش میں حکومت کے ساتھ اسی جوش اور خلوص کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے جیسے جنگ م

م آزادی میں کیا تھا۔ اس آزادی کے لئے جتنے ہم نے ساٹھ برس کی جدوجہد میں حاصل کیا ہے سب سے بڑا اور قومی خطرہ گرانی، چور بازاری اور نفع خوری کا ہے۔ بہر حال طرح طرح کے اندیشوں اور خطروں کے باوجود امید، ہمت اور حوصلے کے ساتھ ہم آزادی کے دوسرے سال کا خیر مقدم کرتے ہیں

اے سوار شہب دوران بیا۔

بزم بے تکلف

"اجی بس رہنے دیجئے۔ آزادی - قومی حکومت باز آئے ایسی آزادی سے۔"

"کیوں خیر تو ہے۔ بی آزادی بچاری سے آپ کیوں خفا ہو گئے؟"

"خفا نہ ہوں تو کیا ہوں۔ یہ تو ہم مردوں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس سے تو وہ غلامی لاکھ درجے اچھی تھی۔ اپنے گھر کے حاکم تھے، عورتوں کے غلام تو نہ تھے۔"

"آخر بات کیا ہے۔ کیا بیوی نے سر سہلا دیا؟"

"یہی حال رہا تو آج نہ سہی کل میں آپ سب مرد جوروں کی جوتیاں کھائیں گے۔"

"مجھے تو معاف ہی کیجئے، خدا آپ ہی کو یہ سعادت نصیب کرے۔"

"دیکھ لینا سر پکڑ کر روؤ گے۔"

"ہوا کیا...... آخر کچھ معلوم تو ہو۔"

"تم نے اخبار میں وہ خبر نہیں پڑھی؟ اب سے سرکاری عورتوں کو مردوں کے برابر نوکریاں ملا کریں گی۔ بھئی ہمارے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔"

"ہاتھوں کے توتے ہی نہیں معلوم ہوتا ہے وہ چڑیا بھی اڑ گئی جس کا نام عقل ہے۔"

"آپ کے نزدیک یہ خبر خطرناک نہیں؟"

"ارے میاں یہ تو خوش خبری ہے خوش خبری۔ میاں بھی کمائے بیوی بھی ع
خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں ہی نوکر ہیں"

"مگر اس کا نتیجہ؟"

"چپڑی اور دو دو...... اس مہنگائی کے زمانے میں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔"

"جی ہاں بیوی کرے گی نوکری اور حضرت بیٹھ کر مسالہ پیسیں گے۔ بچے پالیں گے؟"

"ارے میاں مرد ہی اہل خانہ بن جائیں تو کیا ہرج ہے؟"

"جی اور شاید رفتہ رفتہ بچے بھی پیدا کرنے لگیں گے۔"

"اونہوں۔ اس سعادت بزور بازو نیست۔"

"ذرا سنجیدگی سے سوچو بھائی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایک تو عورتیں پردہ چھوڑ دیں گی۔"

"اجی وہ تو پہلے ہی عقل پہ مردوں کی پڑ چکا۔"

"اور پھر دفتر میں ہوا نئی بن گئیں تو بالکل قابو سے باہر ہو جائیں گی۔"

"یار مجھے دلی ہمدردی ہے تم سے۔ ہائے ہائے اب مردوں پر حکومت جتائیں گی۔ کیسی بے دامول

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

پچھلا ہفتہ: ا۔ہندوستان

حیدرآباد کا بھنور

ریاستوں کی وزارت کی طرف سے حیدرآباد کے بارے میں جو وہائٹ پیپر شائع ہوا ہے اس سے ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے مہینوں کی گفت وشنید میں حکومت ہند نے بار بار یہ تجویز پیش کی کہ حیدرآباد کے مستقبل کے بارے میں ریاست کی رائے عامہ سے استصواب کیا جائے اور حکومت حیدرآباد اس کو ٹالتی رہی۔ اگر شروع میں وہ اس تجویز کو مان لیتی تو شاید صلح و آشتی کے ساتھ معاملے کو طے کرنے کی ایک صورت نکل آتی۔ پہلی گفتگو میں جو وسط جون میں ہوئی تھی پہلی بار حیدرآباد کی طرف سے عام رائے شماری کا نام لیا گیا لیکن اس وقت تک اتحاد المسلمین کے مسلح رضاکاروں کا زور اتنا بڑھ چکا تھا اور عوام کے دلوں میں ان کی ہیبت اتنی بیٹھ چکی تھی کہ ان کی موجودگی میں آزادانہ رائے شماری کا کوئی امکان ہی نہ تھا اور اب تو حال یہ ہے کہ عوام تو ایک طرف خود والی ریاست اور ان کے معقول اور مخلص مشیر رضاکاروں کے ڈر سے اپنی رائے کا آزادی سے اظہار نہیں کرسکتے۔

بظاہر حکومت حیدرآباد نے جس میں اتحاد المسلمین کے نمائندوں کی اکثریت ہے عام رائے شماری پر اپنی رضامندی ظاہر کرکے یہ مان لیا ہے کہ حیدرآباد کے مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ کرنے کا حق جمہور کو ہے۔ اگر یہ محض ظاہرداری نہیں بلکہ واقعی میر لائق علی کی حکومت، جمہوریت کی قائل ہوگئی ہے، تو وہ اس کا کیا جواز پیش کرسکتی ہے کہ ایک سیاسی پارٹی اپنی مسلح فوج رکھے اور وہ ملک کے نظم ونسق میں دخل دے۔ اگر ہم رضاکاروں کے ظلم وتشدد کے قصوں سے، جو روزمرہ سننے میں آتے ہیں، قطع نظر بھی کریں تو ان کا وجود بجائے خود جمہوریت کی نفی ہے۔

درحقیقت حیدرآباد کے مسئلے کے طے ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ رضاکار جماعت ہے۔ جب تک اُسے توڑا نہیں جائے گا اور نفرت کی وہ فضا جو اس کی وجہ سے حیدرآباد کے اندر اور باہر پیدا ہوگئی ہے باقی رہے گی وسائل معاملے پر جو ہمارے نزدیک بہت سہل ہے، ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا جاسکے گا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اب ہز اکزالٹیڈ ہائی نس چاہیں بھی تو رضاکاروں کی جماعت کو نہیں توڑ سکتے، اس لئے کہ اس نے ریاست کی باقاعدہ فوج اور پولیس سے سازباز کرلیا ہے۔ یہ بات مشکل سے یقین آتی ہے کہ ریاست کا فرماں روا جن خدائی فوجداروں کے مقابلے میں اس قدر بے بس یا ہوجائے اور فرض کیجئے یہ صحیح ہے کہ ہز اکزالٹیڈ ہائی نس اور رضاکاروں کے خلاف کارروائی کرنے میں فوج اور پولیس کی عدول حکمی کا خطرہ ہے تو ان کو دیر سویر اس خطرے کا مقابلہ کرنا ہی ہے ورنہ پھر اس سے کہیں زیادہ بڑے خطرے کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یعنی اس فوج کے جس کی وفاداری ان کی ذات کے ساتھ مشتبہ ہے۔ اور ان رضاکاروں کو کہ جو ان کا حکم نہیں مانتے بلکہ ان سے اپنا حکم منوانا چاہتے ہیں، انڈین یونین کی فوج سے لڑنا ہوگا۔

کشمیر کمیشن کا پہلا عملی قدم

کشمیر کمیشن کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے سامنے عارضی صلح کی تجویز پیش کردی ہے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ کشمیر کے سارے محاذوں پر جنگ روک دی جائے اور ہندوستان و پاکستان کی ریاستیں اس کی وساطت سے ان شرطوں کو طے کرلیں جن کے مطابق کشمیر میں عام رائے شماری کی جائے گی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ شروع ہی میں اعلان کرچکا ہے کہ اہل کشمیر کی عام رائے شماری کے ذریعے سے جو فیصلہ ہوگا اُسے منظور کرے گا۔ اگر حکومت پاکستان تین باتوں پر راضی ہوجائے تو عارضی صلح کی کوشش سرسبز ہوسکتی ہے اور کشمیر کا مسئلہ پرامن طریقے سے حل ہوسکتا ہے:

(۱) اس کا باضابطہ اعلان کردے کہ اس کی فوجیں کشمیر میں لڑ رہی ہیں۔

(۲) اپنی فوجوں کو ریاست کشمیر کی سرحد سے واپس بلالے اور دوسرے حملہ آوروں کو بھی کشمیر سے واپسی پر آمادہ کردے۔

(۳) اس کا وعدہ کرے کہ ریاست میں مکمل امن قائم ہونے کے بعد کشمیر کمیشن کی نگرانی میں جو رائے شماری ہوگی اس کے فیصلے کو تسلیم کرے گا۔

گوئے وچوگان

انگریزوں کو ہم کچھ بھی کہیں مگر ان سے ہم نے بعض چیزیں بڑی اچھی سیکھی ہیں، جن میں ورزشی کھیل، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان بدیسی کھیلوں کو ہندوستان نے اس طرح اپنایا اور ان میں ایسی مہارت پیدا کی کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہاکی کے کھیل کو ہندوستان میں آئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں لیکن یہ ہندوستانیوں کے حصے کی چیز بن گئی ہے۔ ہندوستان کی ہاکی ٹیم جب کبھی مغربی ملکوں میں گئی اپنا سکہ بٹھا کر آئی۔ ۱۹۲۸ء سے ہر اولمپک مقابلے میں ہماری ٹیم ہاکی کی چیمپین شپ حاصل کرتی رہی۔ چنانچہ ابھی ۱۲ راگست کو ویمبلے (لندن) کے اولمپک کھیلوں کے سلسلے میں ہندوستان کی ٹیم نے ہاکی کے فائنل میں برطانیہ کی ٹیم کو ہراکر چوتھی بار چیمپین شپ جیت لی۔ اس نے چار گول کئے اور انگلستان کی ٹیم کو ایک بھی نہ کرنے دیا۔ پاکستان نے بھی بڑی اچھی ٹیم بھیجی تھی جس نے ابتدائی میچوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی مگر بدقسمتی سے وہ پہلے سیمی فائنل میں برطانیہ کی ٹیم سے اور دوسرے میں ہالینڈ کی ٹیم سے ہار گئی اس لئے تیسری جگہ بھی نہ حاصل کرسکی۔ ہندوستانی ٹیم کے کپتان کشن لال مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اور ان کے رفیقوں نے ہندوستان کے شاندار رکارڈ کو قائم رکھا۔

اسمبلی اور افراط زر

مرکزی اسمبلی کے موجودہ اجلاس میں عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے سب سے دلچسپ بحث وہ تھی جو گرانی اور افراط زر کے مسئلوں کے متعلق ہوئی۔ اس میں یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ کسی مضبوط مخالف پارٹی کے موجود نہ ہونے کے باوجود خود اپنی پارٹی ان معاملات میں جن کا تعلق عام مفاد سے ہے حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرسکتی ہے۔ چنانچہ کانگرس کے کئی ممبروں نے ایسی تند وتیز تقریریں کیں کہ اگر الفاظ توپ کے گولے نہیں بندوق کے چھرے بھی ہوتے تو حکومت کا قلعہ مسمار ہوجاتا۔ سب سے سخت اور تلخ تقریر اقتصادیات کے پروفیسر کے، ٹی شاہ کی تھی۔ لیکن حکومت کی خوش قسمتی سے پروفیسر صاحب معاشی نظریات کی ادق بحثوں میں الجھ کر رہ گئے اور بہت سے سننے والے اس کے سوا کچھ نہ سمجھ سکے کہ پروفیسر صاحب کسی بات پر خفا ہوگئے ہیں اور ان کا عتاب ارباب حکومت پر نازل ہورہا ہے۔ بہرحال ان کا زور اس پر تھا کہ حکومت کی بار بار کنٹرول قائم کرنے اور پھر ہٹا لینے کی پالیسی ان خرابیوں کی ذمے دار ہے۔ کھانڈو بھائی دلیسائی نے بڑے پتے کی بات کہی کہ حکومت نے افراط زر اور گرانی کا جو علاج پیداوار بڑھانے کی شکل میں تجویز کیا ہے وہ تو تاتریاق از عراق کا معاملہ ہے۔ خود انھوں نے یہ علاج بتایا کہ حکومت کو نوٹوں کی مقدار گھٹا کر لوگوں کی قوت خرید کم کردینی چاہیے۔ غیر ماہروں کے نقطۂ نظر سے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ضرور کرنا چاہیے لیکن ماہر لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا خطرناک عمل جراحی ہے۔ یوں ہی بے سمجھے بوجھے کر ڈالنے کی چیز نہیں۔

مایوسی کی تاریکی میں روشنی کی جھلک وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر سے نظر آئی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ حکومت جو تدبیریں افراط زر اور گرانی کو کم کرنے کے لئے اختیار کرنا چاہتی ہے ان کا اعلان چند روز کے اندر ہوجائے گا۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ معاشی مسائل سے تعلق رکھنے والے محکموں میں ربط اور اتحاد عمل پیدا کرنے کے لئے ایک جداگانہ منسٹر مقرر کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ یہ بدگمانی ہوسکتی ہے کہ جن حضرات نے اس قدر دھواں دھار تقریریں کیں ان کو نئی منسٹری والی بات پہلے سے معلوم تھی لیکن یہ بدگمانی بری چیز ہے نہیں کرنی چاہیے۔

(ع، ح)

پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

حکومت دونوں ہی ضرورتوں کا احساس رکھتی ہے۔ اگر وہ انتظام کو درست نہ کرسکی تو اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ قربانی کا بکرا کون بنے گا۔ جاننے والوں کا کہنا ہے کہ جنوبی اضلاع میں کمیونسٹ [illegible] طاقت ور نہیں ہیں۔ لیکن اگر [illegible] کو درست کرنے کے لئے کچھ نہ کیا گیا تو ان کا اثر یقیناً بڑھ جائے گا۔

ڈھاکے میں کوئی اخبار نہیں۔ [illegible] سخت ہے۔ وہاں پولیس کی [illegible] اس کے متعلق ایک اخبار نویس نے اپنے کلکتے کے آفس کو ٹیلیفون کرنا چاہا تو آپریٹر نے متنبہ کیا کہ اگر تم نے اسٹرائک کا ذکر کیا تو لائن کاٹ دی جائے گی۔ دوسروں نے زیادہ جسارت سے کام لے کر تار سے خبر بھیجی مگر اتفاق سے تار کی لائنیں خراب ہوگئیں۔ (ا۔ س)

۲۔ پاکستان

عہد وفا کیسے نبھے؟

پاکستان نے کشمیر کی جنگ میں شرکت سے اب تک انکار کیا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں پاکستان کے ایک اخبار نے پچھلی مئی سے پاکستانی فوجوں کی شرکت کا اعتراف کیا ہے۔ پنڈت نہرو نے کانڈمی گراؤنڈ میں تقریر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خود حکومت پاکستان نے ابھی تک اس خبر کی تصدیق نہیں کی ہے۔ پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر نے اس خبر کی تصدیق چاہی تو حکومت پاکستان نے تحریری سوال کی خواہش کی اور جب تحریری سوال پوچھا گیا تو حکومت کا جواب یہ تھا کہ یہ راز کی بات ہے جسے حکومت پاکستان صرف یو۔ این کمیشن کو بتا سکتی ہے۔ اس اعتراف سے بہت سے خیالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حکومت پاکستان اس ثبوت کی قوت سے مجبور ہو گئی ہو جو حکومت ہند نے یو۔ این کمیشن کے سامنے رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح جھگڑے میں ایک فریق کی حیثیت اختیار کرنے میں حکومت پاکستان کے ذہن میں مستقبل کی بات چیت سے متعلق کوئی مصلحت ہو۔ لیکن ان سب سے اہم سوال دونوں ڈومنینوں کے درمیان دوستی کی آرزو رکھنے والوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اس جنگ کی موجودگی میں دونوں حکومتوں کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں دوستانہ تعلقات کا باقی رکھنا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ .... مستقبل کے لئے بہت ہی بڑا خطرہ ہے۔

پاکستان کی طرف سے کشمیر کے پاکستان میں شامل ہونے کو دو وجہوں سے ضروری بتایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ مئی میں حکومت ہند نے جو فوجی اسکیمیں مرتب کی تھیں ان سے پاکستان کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ زیادہ دلچسپ ہے۔ کہا گیا ہے کہ پاکستان کے دریاؤں کا منبع کشمیر میں ہے، اور اگر کشمیر ہندوستان میں شامل ہو جائے تو اس سے پاکستان کی زراعتی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پہلی وجہ تو کچھ نظر میں جچتی نہیں، اگر حکومت پاکستان کا محکمہ جاسوسی اتنا کارپرداز ہے تو حکومت نے اس کی رپورٹ ملنے کے بعد کوئی احتجاج کیوں نہیں کیا؟ ہندوستان سے شکایت کرنا اگر شان کے خلاف تھا تو یو۔ این ہی کو اطلاع دے دی گئی ہوتی۔ چپ چپاتے فوجیں بھیج دینا اور اس سارے عرصے میں ہندوستان سے دوستی کے دعوے کرتے رہنا پاکستان کے پوزیشن کو بہت کمزور کر دیتا ہے۔ دریاؤں والی بات پروپیگنڈا کے لئے اچھی ہے۔ مگر درحقیقت یہ غلط ہے کہ پاکستان کے سب دریاؤں کا منبع کشمیر میں ہے اور پھر اگر بحث کی خاطر یہ بات صحیح بھی مان لی جائے تو آیا کوئی دوسرے ملک پر محض اس لئے قبضہ کرنے کا حق کیوں کر ہو جاتا ہے کہ آپ کے دریاؤں کا منبع دوسرے ملک میں ہے۔ پچھلے دنوں حکومت افغانستان نے ایک دریا پر بند باندھ کر ایران کے ایک صوبے کی خاصی بڑی آبادی کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ ایران کی حکومت کو شاید حکومت پاکستان کے مشیروں کی مدد نہ ملی ورنہ اس سوال کا کتنا اچھا حل تھا کہ ایران کی حکومت افغانستان کو ہڑپ کر جاتی۔ اور یہ دونوں دلیلیں بھی صحیح مان لی جائیں تو اہم ترین سوال یہ ہے کہ خود کشمیر کے عوام کی رائے کیا ہے؟ اس بارے میں حکومت ہند نے اول روز سے کہہ رکھا ہے کہ وہ کشمیر کے عوام کی رائے کو تسلیم کرے گی۔ حکومت پاکستان کو ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دینی چاہیئے جن میں کشمیر کے عوام کی صحیح رائے معلوم ہو سکے۔ اسے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جتنے زیادہ عرصے تک کشمیر کی جنگ جاری رہے گی اتنا ہی رائے شماری کا وقت ٹلتا جائے گا۔

گیہوں کے ساتھ گھن

دونوں حکومتوں کے تعلقات کے اس پس منظر میں اقلیتوں کے مستقبل کا سوال ناگزیر طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے دونوں میں کھلم کھلا لڑائی چھڑ گئی تو اس سے اقلیتوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں کم سے کم یہ اندیشہ اقلیتوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ حیدرآباد کے مسئلے نے اس اندیشے کو اور بڑھا دیا ہے۔ پچھلے دنوں "سٹیٹسمین" کے ایک خاص نمائندے نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا اس کی رپورٹ کے بعض حصے عجیب ہیں ——— اور خطرناک۔ اس کا کہنا ہے کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی ہوئی تو نتائج اُن کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ مغربی بنگال کے مسلمانوں پر بعض لوگوں نے یہ الزام لگایا تھا کہ وہ حیدرآباد کی موجودہ ریاست کی مدد کے لئے درپردہ کام کر رہے ہیں۔ سہروردی صاحب نے اس الزام کے خلاف احتجاج کیا تھا انھوں نے بجا طور پر کہا تھا کہ اگر کچھ افراد کے خلاف ثبوت موجود ہے تو انھیں سزا ملنی چاہئے۔ لیکن ساری جماعت کو افراد کے قصور کا ذمہ دار ٹھیرانا نہ صحیح ہے نہ جائز۔ چنانچہ حکومت بنگال نے تسلیم کر لیا کہ مغربی بنگال کے مسلمانوں پر حیدرآباد کی حمایت کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک دوسرے رجحان کی طرف "سٹیٹسمین" اخبار کے نمائندے نے توجہ دلائی ہے۔ پاکستان کے "دشمنوں" کی سازشوں سے متعلق ہے اس نے لکھا ہے سرکاری طور پر مشرقی بنگال کی حکومت اس طرح کی سازشوں کے انکشاف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیتی۔ حالانکہ ذمہ دار افسر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ حکومت کو اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنی غلطیوں یا خامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے حکومت کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن میں پبلک کے غصے کا شکار بنایا جا سکے۔ یہ بہت ہی خطرناک رجحان ہے اور اس کی جتنے سخت الفاظ میں مذمت کی جائے کم ہے۔ دونوں حکومتوں کا فرض ہے کہ اقلیتوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے والے اخبارات اور عہدے داروں کے خلاف سخت ترین کارروائیاں کریں۔ جہاں تک دونوں ریاستوں کے باہمی تعلقات کا سوال ہے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ جنگ کے خواہاں ہیں وہ اپنے ملک کے شدید ترین دشمن ہیں۔

کچھ مشرقی بنگال کے متعلق

"سٹیٹسمین" کی اس رپورٹ کے کچھ حصے مشرقی بنگال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں اس اخبار کے خاص نمائندے کے الفاظ میں ان کا خلاصہ دے دیا گیا ہے۔

"......... ڈھاکے کی سڑکوں پر چلنے والے موٹر کاروں کی تعداد اس سے بھی کم ہے جتنی جنگ کے دوران میں چنگ کنگ میں نظر آتی تھی۔ پاکستان کی مغربی سرحد کے قریب مجھے ایک ایسی بس میں سفر کرنا پڑا جس میں بریک تک غائب تھے .... مگر شکل رکشا مشرقی پاکستان کے ٹرانسپورٹ کے مسئلے کا حل ہے۔ اور یہ مشرقی پاکستان کے سبھی شہروں میں دکھائی دیتا ہے۔ رکشا چلانے والے پیدل چلنے والوں کا ذرا کم ہی لحاظ رکھتے ہیں...... لیکن ڈھاکہ میں بیچ سڑک پیدل چلنے والے لاپرائی میں دنیا میں نام پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر قصور دراصل ان کا بھی نہیں۔ ڈھاکہ کی سڑکوں پر فٹ پاتھ نہیں ہیں۔ پکی سڑکوں اور مکانات کے درمیان کیچڑ ہوتا ہے...... جو بارش کے دوران میں اور بھی رنگ لاتا ہے اس لئے ہر آدمی اور ہر چیز سڑک کے بیچ میں آ کر جمع ہو جاتی ہے، بیل گاڑیاں، گاڑیاں، رکشا، بس، جیپ کاریں، پیدل چلنے والے چیزیں بیچنے والے جانور اور سب......

پاکستان میں لوگ ان زحمتوں سے عاجز نہیں آتے۔ وہ کہتے ہیں یہ ساری خرابیاں صوبے کے نئے عظیم الشان دار السلطنت کے معمار دور کر دیں گے۔ اس نئے شہر کا خاکہ بنانے والی جماعت ایک انگریز کی سرکردگی میں سکریٹریٹ میں نقشوں پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ کام چھ مہینے سے زیادہ سے ہو رہا ہے۔ آنے والوں کے سامنے وہ بڑی سعادت سے اپنے نقشے اور ایک نئے شہر کی تعمیر کے منصوبے پھیلاتے ہیں جو اس قدیم شہر کی گندگی سے اُٹھنے والا ہے۔ لیکن پوچھئے پہلا پتھر کب رکھا جا سکے گا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اٹھارہ مہینے بعد یہ کام شروع کر سکیں لیکن ہم کر نہیں سکیں گے۔" اور نگاہیں پھر نقشوں پر جھک جاتی ہیں اور گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

کچھ حکومت کی ہر دلعزیزی کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ "رواداری شہری بھی شکایت کرتے ہیں کہ حکومت ناتجربہ کاروں پر مشتمل ہے جو وقت پر فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے نہ اس پر عمل کر پاتے ہیں جہاں جرأت اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ پرانے آہستہ خرام بلکہ مخرام قسم کے طریقے کام میں لاتے ہیں۔ انھیں رائے عامہ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ جرأت سے کام لیں اور بڑی قربانیوں کا مطالبہ کریں تو عوام کو کوئی شکایت نہ ہوگی......

اس بے عملی کی پالیسی کی بدولت دیہاتوں میں خاص طور پر مایوسی پھیل رہی ہے۔ بے اطمینانی کے اہم اسباب دو ہیں۔ چاول اور کپڑا۔ موجودہ گومگو کی کیفیت، بہت سے لوگوں کا خیال ہے، زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہ سکتی۔ حکومت کو یا تو انتظام کو بہتر بنانا ہوگا یا ایسے لوگوں کی تلاش کرنی ہوگی جنھیں قربانی کا بکرا بنایا جا سکے۔"

(بقیہ صفحہ ۹ کالم ۴ پر ملاحظہ ہو)

مغربی دُنیا

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

روسیوں کو برلن کے مغربی راستے بند کئے ہوئے کئی ہفتے ہوگئے ہیں اور اتحادی برابر ضرورت کی چیزیں ہوائی جہازوں کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ اتحادیوں نے احتجاج کے جو نوٹ بھیجے تھے ان کے جواب سے صرف یہ ظاہر ہوا ہے کہ روسی برلن کے مغربی راستے بند کرنے پر اس وجہ سے مجبور ہوئے تھے کہ مغربی جرمنی اور برلن کے اس حصے میں جو برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے قبضے میں ہے نیا سکہ جاری ہو گیا تھا اور یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اس کی اور روسی سکے کی قیمت میں کیا نسبت ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ہی شہر میں دو سکوں کا جاری رہنا بہت مشکل ہے۔ خاص طور سے اگر اس کے مختلف حصے معاشی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ نہ کئے جا سکتے ہوں، مگر اس کا کسی کو یقین نہیں کہ روسیوں کا اصل مقصد سکوں کے مسئلے کو طے کرنا ہے۔ روسی دس پندرہ روز سے یہ کہہ رہے ہیں کہ برلن کے تمام شہریوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں کوئلہ وغیرہ مہیا کرنے کا انتظام کر رہے ہیں، اور ان کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے مشرقی جرمنی میں اتنا چھوڑا ہی نہیں کہ وہاں سے برلن کو کچھ بھیجا جا سکے۔ کیونکہ مغربی جرمنی کے مقابلے میں وہاں کی آبادی کو اب بھی کم غذا ملتی ہے۔ مغربی برلن کے جرمنوں کو اتحادیوں پر بھروسا ہے اور پورے شہر میں کومیونسٹوں کی نہ اتنی طاقت ہے نہ اتنا اثر کہ وہ شہر کے انتظام کو، جہاں تک وہ شہریوں کے اختیار میں رکھا گیا ہے، اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے شہر کی انتظامی کمیٹی نے ہرمارک گراف کو ہٹا کر ہرشٹم کو پولیس کا افسر اعلیٰ مقرر کیا ہرمارک گراف کومیونسٹ خیال کئے ہیں، اور انھیں روس کی تائید بھی حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے عہدے کو چھوڑنے سے انکار کیا اور ایک دو دن تک پولیس کے کچھ لوگ ان کا اور کچھ ہرشٹم کا حکم مانتے رہے۔ اب پولیس کا انتظام دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے، اور اگر روسیوں نے دیکھا کہ وہ پورے برلن کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے حصے کو بالکل الگ کر لیں، اور مغربی برلن کے لئے روشنی، پانی کا نیا انتظام کرنا پڑے۔ اس طرح یہ روسی علاقے میں اتحادیوں کا "جزیرہ" بن جائے گا، اور اس پر قبضہ رکھنے کا خرچ اور اس کی دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی۔

ادھر برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی حکومتیں اپنے ارادے پر قائم ہیں۔ مسٹر بیون نے حال ہی میں ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ برلن میں اپنا حق تسلیم کرانے کے لئے طاقت سے بھی کام لیں گے۔ اس معاملے میں حکومت اور مخالف پارٹی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس پر بھی سب متفق ہیں کہ فوجوں کی تخفیف بند کر کے ہوائی اور بری فوج کے وہ تمام عہدہ دار برقرار رکھے جائیں جو مخصوص قابلیت رکھتے ہیں۔ متحدہ ریاستوں کی حکومت اپنے ہوائی بیڑے کی طرف خاص توجہ کر رہی ہے۔ مگر سمجھوتے کی کوشش بھی جاری ہے۔ شروع اگست میں برطانیہ، متحدہ ریاستوں اور فرانس کے نمائندے مارشل سٹالن سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ پہلے روسی حکومت نے اطلاع دی کہ موسیو مولوتوف نمائندوں سے ملاقات نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ ماسکو میں موجود نہیں ہیں، بعد کو وہ بھی شریک ہو گئے لیکن ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ گفتگو کن مسئلوں پر ہوئی اور کس نے کیا کہا۔ دونوں طرف سے انتہائی رازداری سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف برلن کا مسئلہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم معاملات درپیش ہیں۔

ڈینیوب کی لہریں

برخلاف اس کے ڈینیوبی ریاستوں کی کانفرنس کی بحثوں کی خاصی اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہاں برطانیہ اور فرانس ان حقوق کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں جو انھیں ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی رو سے حاصل ہیں اور روس نئی تنظیم کی حقیقت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ ڈینیوب دریا جنوبی جرمنی کے شہر الم سے اپنے دہانے تک جہاز رانی کے قابل ہے۔ اور اس وجہ سے وہ جنوب مشرقی یورپ کی سب سے اہم تجارتی شاہ راہ مانا جاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کے بعد برطانیہ اور فرانس نے جہاز رانی کے انتظام میں خاص اختیار حاصل کئے اور اس میں بہت سرمایہ لگایا۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۰ء میں جہاز رانی کے بارے میں نئے معاہدے ہوئے جن میں برطانیہ اور فرانس کو شریک نہیں کیا گیا تھا۔ برطانیہ اور فرانس کا مطالبہ یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جائے اور روس کے نمائندے موسیو وشنسکی کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ بعد کے دو معاہدوں کے ذریعے منسوخ ہو گیا ہے۔ قانون دان دونوں طرف سے بہت کچھ کہہ سکتے ہیں مگر کانفرنس فیصلہ کثرت رائے سے کرے گی اور اکثریت برطانیہ اور فرانس کے خلاف ہے۔ غالباً کانفرنس موسیو وشنسکی کی تجویز کو مان لے گی کہ ڈینیوب ہر قوم کے تجارتی جہازوں کے لئے کھلا رہے۔ مگر اس میں جنگی جہاز چلانے کا حق صرف ان ریاستوں کو ہو جن میں سے یہ دریا گذرتا ہے، اور جہاز رانی کا انتظام بھی صرف انھیں ریاستوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس طرح وہ حق اور اختیار جو فرانس اور برطانیہ نے ۱۹۲۱ء میں حاصل کئے تھے تلف ہو جاتے ہیں اور انھوں نے جہاز رانی میں جو سرمایہ لگایا تھا اس کی واپسی کا کوئی ذمہ دار نہیں رہتا۔ مگر یہ نقصان تو ہو ہی چکا تھا کانفرنس نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف فیصلہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نقصان کو پورا کرنے کی کوئی قانونی شکل نہیں رہی ہے یہ بات قانون اور جغرافیہ دونوں کے لحاظ سے عجیب ہے کہ آسٹریا کو کانفرنس میں شریک نہیں کیا گیا۔ اس وقت ڈینیوب میں سب سے زیادہ جہاز آسٹریا کی ایک کمپنی کے ہیں۔ روسیوں نے جہازوں میں سے آدھے سے زیادہ پر اس بہانے سے قبضہ کر لیا ہے کہ وہ مال غنیمت ہیں، اور آسٹریا کو کانفرنس میں بلانے کے ذمہ دار بھی وہی ہوں گے۔ شاید اس رویے کا سبب یہ ہے کہ روسیوں کو اندیشہ تھا کہ آسٹریا ان کی مخالفت کرے گا، اور اس معاملے میں وہ کسی قسم کی مخالفت گوارا نہیں کر سکتے۔

راندۂ درگاہ یوگوسلاویہ

آخر جولائی میں یوگوسلاویہ کی کومیونسٹ پارٹی کی جو کانفرنس ہوئی اس میں مارشل ٹیٹو کی جوش کے ساتھ تائید کی گئی اور ان اعتراضوں کو غلط اور بیجا ٹھیرایا گیا جو کومن فورم نے مارشل ٹیٹو اور یوگوسلاویہ کی کومیونسٹ پارٹی پر کئے ہیں۔ لیکن اب یوگوسلاویہ کے پڑوسیوں نے اس کا ساتھ بالکل چھوڑ دیا ہے، اور اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں آپس کی مخالفت ڈینیوبی ریاستوں کی کانفرنس میں ظاہر نہ ہو۔ یوگوسلاویہ کی حکومت نے اپنی طرف سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آپس کی اصولی بحثوں کو بین قومی مسئلوں سے الگ رکھ سکتی ہے، اور ڈینیوب کے بارے میں روس کی جو تجویزیں تھیں ان کی اس نے تائید کی مگر دوسرے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر رہے ہیں۔ کومن فورم اپنے فیصلے پر قائم ہے اور یوگوسلاویہ میں اچانک ایسے رسالے بڑی تعداد میں نظر آ رہے ہیں جو ہنگری، بلغاریہ کے پریس میں چھپے ہیں۔ ان میں مارشل ٹیٹو کی سیاست اور خصوصاً ٹریسٹ کے معاملے میں ان کی انتہاپسندی پر اعتراض کئے گئے ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کے طرز عمل نے کیسے خطرے پیدا کئے ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ ان رسالوں کی اشاعت کون کر رہا ہے، مگر "پراودا" کی مہر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں کس فریق کے خیالات بیان کئے گئے ہیں۔ روس کی کومیونسٹ پارٹی مارشل ٹیٹو اور ان کی حکومت کو برطرف کرنا چاہتی ہے اور اسی کارروائی کے لئے زمین تیار کی جا رہی ہے۔ کارروائی کا وقت اور طریقہ اس پر منحصر ہوگا کہ برلن کی کشمکش کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور روسی یورپ میں جو سرحد قائم کرنا چاہتے ہیں وہ فی الحال بن سکتی ہے یا نہیں۔

صدارت کی شطرنج

متحدہ ریاستوں کے اخباروں میں جو اہمیت برلن کے واقعات کو دی جاتی تھی اس سلطے کی آخری تاریخوں میں وہ مسائل غالب آ گئے جن کی طرف پریذیڈنٹ ٹرومین نے خاص اجلاس کرا کر کانگریس اور قوم کو توجہ دلائی۔ متحدہ ریاستوں میں قیمتیں بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اور کانگریس نے قانون کے ذریعے روک تھام نہ کی تو اندیشہ ہے کہ وہ برابر بڑھتی جائیں گی۔ کانگریس میں اکثریت ریپبلکن پارٹی کی ہے اور پریذیڈنٹ ٹرومین نے خاص اجلاس اس نیت سے کرایا ہے کہ اسے تفتیش کو روکنے کے لئے قانون بنانے کی دعوت دیں اور اسے قبول کرنے میں تامل یا اس سے انکار کرے تو اس پر قومی ضرورتوں سے بے پروا ہونے کا الزام لگا کر قوم کو اپنی طرف مائل کریں۔ قیمتوں کے بڑھنے کا اور پریذیڈنٹ ٹرومین کے اس طرف توجہ دلانے کا قوم پر خاصا اثر ہوا ہے اور معاشی زندگی کی مناسب اصلاح کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ کانگریس میں پریذیڈنٹ ٹرومین کے مخالف ان کی اس چال پر بہت خفا ہیں اور شاید یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پریذیڈنٹ ٹرومین جو کچھ کر رہے ہیں اس کا سبب قوم کی خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ووٹ حاصل کرنے کی خواہش پریذیڈنٹ ٹرومین نے یہ چال چل کر صرف الکشن میں کامیابی کی ایک تدبیر نہیں کی ہے بلکہ حکومت کو بعض الزاموں سے بھی بچا لیا ہے کہا جاتا ہے کہ برلن میں متحدہ ریاستوں کی طرف سے کارروائیاں جس طریقے سے کی گئی ہیں اس سے معاملے کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا، ایک محکمہ کچھ کرتا تھا دوسرا کچھ اور، روس کی مغربی جرمنی سے تجارت بند کی گئی اور وزارت خارجہ کو اس کی پہلے سے اطلاع نہیں دی گئی۔ برلن میں سامان پہنچانے کے سلسلے میں جنرل مارشل برطانیہ اور فرانس سے یہ سمجھ کر گفتگو کر چکے تھے کہ متحدہ ریاستوں کے پاس باربرداری کے اور ہوائی جہاز بہت ہیں جب ہوائی جہاز برآمد ہوئے۔ لیکن اپوزیشن کے لئے ایسے اعتراض کرنا گھونسے کے جواب میں چٹکی لینا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ ہو)

وطن کے سورما

اثر لکھنوی

کیا ہی آرام سے وہ سوتے ہیں
جو وطن پر نثار ہوتے ہیں

پھول برساتی ہے بہار آ کر
ساز پہ نغموں کے گا گا کر

اپنی زلفوں سے صاف کر کے مزار
برکتیں مانگتی ہے باد بہار

چاند کی روشنی ہے چادر کو
موتی شبنم کے ہیں نچھاور کو

خوش ہے ان کے شعار سے کیا کیا
تکتی رحمت پیار سے کیا کیا

کتنی زنگیں ہے ان کی قربانی
حوریں کرتی ہیں فاتحہ خوانی

"عزت" آکر طواف کرتی ہے
دم وفاؤں کا ان کی بھرتی ہے

دے کے آشیرباد "آزادی"
ان کے گن گاتی ہے بصد شادی

سر زمیں جو لہو سے سینچی گئی
کیوں نہ پائندہ ہو بہار اس کی

کون کہتا ہے مر گئے یہ لوگ
موت کو زندہ کر گئے یہ لوگ

غزل

سیّدہ فرحتؔ

ہم کو تلاش جادۂ ملک و بقا کی ہے
وہ راہ جس میں پہلی ہی منزل فنا کی ہے

ساقی پلا رہا ہے تو پینا ہے ناگزیر
مانا شراب زیست میں تلخی بلا کی ہے

بیمار غم کو ہو گیا حاصل سکون مرگ
حاجت دعا کی ہے نہ ضرورت دوا کی ہے

برہم ہوئے حضور سمجھ کر جسے گلہ
تعریف وہ بھی آپ کے طرز جفا کی ہے

پوچھے تو کوئی اس کا مزہ اہل ذوق سے
کہتے ہیں درد دل جسے نعمت خدا کی ہے

فصل بہار ہی میں ہے اندیشۂ خزاں
حالت عجیب اس دل غم آشنا کی ہے

فرحتؔ یہ چوٹ کھائے ہوئے دل کا فیض ہے
تاثیر اس غزل میں تری کس بلا کی ہے

قسم قسم کے آنسو (بہ سلسلہ صفحہ ۰)

کر دیتے ہیں کبھی ان سے طوفان کا کام لے کر سارے جہاں کو ڈبو دیتے ہیں، اور کبھی سارا طوفان سمٹ کر ایک آنسو بن جاتا ہے کہیں کسی نے مژگان سرشک آلود سے کتنوں کا لہو پانی ہوتا ہے۔ اور کبھی تمام شب کی روداد غم مژگاں پر ستارۂ سحری بن کر نمودار ہوتی ہے۔ ایک آنسو وہ بھی ہوتے ہیں جن کی بوند تو کبھی نہیں ہوتی لیکن بہلائے جاتے ہیں یا رعایت طرف آ گیا سے آیا آنکھوں میں ہے، وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا یا موتی سمجھ کر جن کو شان کریمی چن لیتی ہے!

میرے ایک دوست ہیں معمر، ایمان دار اور با خدا، مفلس، کثیر الاولاد اور مریض۔ ایک صاحب سے سخت بیزار رہتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے بلا بھیجا۔ جب کوئی مجھے بلوا بھیجتا ہے تو میں سراسیمہ ہو جاتا ہوں، اس پر نہیں کہ جس نے بلا بھیجا ہے اس پر کیا اُفتاد پڑی ہے بلکہ اس پر کہ مجھ پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔ بہرحال دوست کا بلاوا طرح طرح کے اندیشے لے کر سامنے آئے۔ ان میں سے بعض یہ تھے، توہین آمیز ... اور میری نبض لینے کی عادت، کو برا بتائیں گے نالائق اولاد کی سفارش کریں گے اور افسروں کو نالائق متعصب اور بے ایمان قرار دیں گے یا خدا کی کارسازی کا یقین دلائیں گے اور مقویات کا نسخہ مجھ سے دریافت کریں گے۔ میں پہنچا تو حریف کی شرارتوں کا قصہ چھیڑ دیا۔ میں نے کچھ عقل کی بات کہی کچھ ہمدردی کی جہاں جہاں خدا کی کارسازی کا اعتراف کیا اور اکا دُکا جعل سازی کے گُر بتلائے۔

اتنے میں یہ دیکھتا ہوں کہ دوست کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز اور آواز گلوگیر ہو گئی ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ میں نے جو خدا کی کارسازی کا واسطہ دیا تھا۔ یہ اس کا اثر ہے اور میرے دوست جن ذہنی بیماریوں میں مبتلا تھے ان آنسوؤں سے اُن کا غسل صحت ہو گیا میں نے مسرت طمانیت کا اظہار کیا اور خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ معاً ایک چیخ سنائی دی اور میرے گلے کی طرف ایک ہاتھ جھپٹتا نظر آیا۔ میں دروازے کی طرف بھاگا اور سلامت نکل گیا ... سوچنے لگا ... اتنے میں دوست آ گئے اور قدموں پر گر پڑے مجھے گڑگڑانا اور قدموں پر گرنا بہت ہی ناگوار ہوتا ہے۔ بولے بھائی معاف کر دو۔ مجھ پر غصّے کا جنون سوار ہوتا ہے تو میری آنکھ آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے۔ تم نے دھوکا کھایا۔ اب میں اُن کے پاؤں پر گر پڑا!

کوئی تیس سال کا واقعہ ہے۔ میں جمعہ کی نماز پڑھ کر قصبے کی مسجد سے نکل رہا تھا۔ اس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ مسجد کے باہر بلاتفریق مذہب و ملت بستی کے کچھ بچے، بوڑھے عورتیں مسجد کے دروازے پر نمازیوں کی منتظر رہتیں یہ صف باندھ کر کھڑی ہوتی تھیں کسی کے ہاتھ میں پانی کی کٹوریا یا گلاس ہوتا۔ کسی کی گود میں بیمار بچہ اور کوئی کسی بیمار کو سہارا دیے کھڑا رہتا، نمازی برآمد ہوتے تو کچھ پڑھ کر ورنہ یوں ہی سب کو پھونکتے چلے جاتے۔ عقیدہ یہ تھا کہ نمازیوں کی پھونک میں شفا ہوتی ہے۔

مجمع کے ... قطار سے پھونکتا ہوا گذرا تو سامنے کچھ فاصلے پر ایک جنازہ رکھا ہوا دکھائی دیا۔ صفوں کے کنارے پر چھ سات سال کی ایک بڑی ہی کمزور معصوم اور درماندہ لڑکی کھڑی تھی۔ میں جنازہ کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ لڑکی دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ مجھے کچھ خیال نہ ہوا بلکہ یہ سمجھا کہ جس طرح چھوٹے بچے جمعہ کے دن نماز کے بعد راستے میں بھی مل جاتے ہیں تو تفریحاً دوڑ کر سامنے آ جاتے ہیں کہ پھونک دو۔ اس طرح اس بچی نے بھی کیا ہوگا۔ میں نے اُسے خاموش دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا کہ بات کیا تھی۔ لڑکی نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اس نے میری انگلی پکڑ لی اور بڑے ہی دلدوز انداز و لہجے سے کہا "میری اماں کو بھی پھونک دو"۔ میں نے کہا ہاں ہاں ضرور پھونکوں گا۔ "تمھاری اماں کدھر ہے۔" لڑکی نے مجھے جنازہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ میں لرزنے لگا۔ مجھے یہ معلوم ہوا جیسے میں اس بچی کے آنسو میں ڈوبنے لگا ہوں جو ایک بحر ذخار کی مانند تمام کائنات پر محیط ہو گیا ہے۔ بچی کا وہ آنسو مجھے نہیں بھولتا جیسے وہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ آنسو میرے جسم و جان میں کچھ اس طور پر پیوست ہو گیا ہے کہ میں اس سے چھٹکارا نہیں پاتا۔ جنازے اور آنسوؤں کے اس ... میں معلوم نہیں وہ دکھی اور درماندہ بچی کیا ہوئی کہاں گئی۔ مہاتما جی جس دن شہادت سے سرفراز ہوئے وہ بچی اچانک یاد آئی کچھ ایسا یاد پڑا جیسے اس بچی ہی نے شہادت پائی!

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

قسم قسم کے آنسو

پروفیسر رشید احمد صدیقی

بارش کا زمانہ ہے، کوئی بیچارہ ساز ہوتا، کوئی نگمہ ہوتا! ارمان تھا برسات میں دلی سے دعوت آئے گی۔ پھٹکے کی پکوان کی، اکھیلے کی، قطب صاحب کی، مہ دلی کی کھائیں گے کھلائیں گے بھیگیں گے۔ بھاگیں گے، ہنسیں گے ہنسائیں گے، گائیں گے جھولیں گے جھولیں گے —— دعوت آئی تو آنسوؤں کی! —— لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ برسات میں یوں بھی لوگ بھیگنے لگتے ہیں۔ اس پر میں ٹھیرا دلی کا اندھا۔ میرے پہلے سے تو اور زیادہ لطف اٹھانا چاہیے۔

برسات میں معلوم نہیں آپ کو کیا یاد آتا ہے۔ مجھے تو بے اختیار مگر مچھ یاد آتے ہیں۔ مگر مچھ کے ساتھ ان کے آنسو، آنسوؤں کے ساتھ خواتین اور خواتین کے ساتھ اُن کے آنسو۔ اس کے بعد بادش بخیر، آنسو لانے والی گیس۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک کچھ سجھائی نہیں دیتا صرف اپنی تنامیں اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے۔

آنسوئے افلاک ہے جس کی نظر!

ہمارے ہاں جہاں مذہب اور شاعری پیش پیش ہوں وہاں آنسوؤں کی کیا کمی۔ مذہب اور شاعری دونوں کا آنسوؤں سے بڑا گہرا اور وسیع تعلق ہے۔ کبھی مذہب آنسوؤں کا محرک ہوتا ہے مثلاً توبہ استغفار اور کبھی مذہب پر رونا آتا ہے مثلاً تو با تلی۔ شاعری پر رونا آئے تو بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہمارے ہاں شاعری سے رونے رلانے کا کام لیا گیا ہے اور ہم نے اپنی شاعری پر بھی کافی آنسو بہائے ہیں۔ یہ تمام باتیں میں نے روئے بغیر کہی ہیں اور مجھے امید ہے ان باتوں پر آپ بھی رو نہ پڑیں گے۔

بعض کا خیال ہے کہ مذہب اور شاعری دونوں کی جڑ ایک ہے۔ دوسرے اس پر یہ حاشیہ لگاتے ہیں کہ دونوں جھگڑے کی جڑ ہیں۔ مجھے اس قسم کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ریڈیو کو بھی نہیں۔ بقول شخصے ماتجر شما سلامت!

آنسوؤں کی اقسام بتلانے سے پہلے میں نے مذہب اور شاعری کا نام لیا تھا۔ نام تو میں نے لطفِ داستاں کے لئے لیا تھا۔ لیکن فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے لاشعور یا تحت شعور میں کچھ مشتبہ صلاحیتیں سوتے سوتے جاگ پڑی ہیں۔ لاشعور میں بالعموم ایسی ہی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، جو صلاحیتیں تو کچھ یوں ہی سی ہوتی ہیں، مشتبہ کافی ہوتی ہیں۔ یہ کچھ میری ہی رائے نہیں ہے، جرائم اور سراغ رسانی کے محکمے کی بھی یہی ہے!

اب ذرا اس پر غور کر لیجئے کہ ہمارے ہاں مذاہب اور شاعری کی کتنی اقسام ہیں اس لئے کہ آنسوؤں کی تقسیم بھی اسی اعتبار سے کرنی پڑے گی یعنی کتنی اور کیسے کیسے آنسو مذہب کا کارنامہ ہیں اور کتنے اور کیسے کیسے شاعری کے پیداوار۔ مذاہب کی تقسیم بڑا لمبا کام ہے۔ خاصہ خطرناک بھی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم جتنے لوگ ہیں ان سے زیادہ مذہب ہیں۔ مذہب کو یہیں تک رہنے دیجئے، شاعری پر آ جائیے ورنہ آنسوؤں کی اقسام بڑھ بھی جائیں گی اور پیچیدہ بھی ہو جائیں گی۔

ہمارے ہاں ایک شاعر گذرے ہیں جن کو بعض احباب یوں بھی کہتے ہیں کہ ایک شاعر ہوا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں پہلا فقرہ غلط تو ایسا نہیں لیکن منحوس کافی ہے اس لئے کہ شاعر موجود ہیں۔ دوسرا یوں صحیح ہے کہ شاعر ہی جو ٹھیرا جو چاہے ہو جاوے۔ یہ باتیں کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ اہم تو وہ تقسیم ہے جو انھوں نے شاعری کی ہے۔ میری مراد رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی سے ہے جنھوں نے بڑے آڑے وقت اردو غزل کی آبرو بچائی یہ اور بات ہے کہ اس سے دوسروں کی آبرو کا کیا حشر ہوگا۔

حسرت نے شاعری کی دو موٹی تقسیم کی ہے۔ ایک استادانہ یا شاطرانہ دوسری شاعرانہ —— شاعری کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ عاشقانہ، عارفانہ، اور فاسقانہ۔ شاطرانہ یا استادانہ کو بھی تین حصوں میں بانٹا ہے، اصحابانہ، ناصحانہ اور ایک اور جو اس وقت مجھے یاد نہیں رہی۔ آپ کا جی چاہے تو اس شجرہ نسب کو بالکل بھول جائیں اور غالباً اب تک آپ اسے بھول بھی گئے ہوں گے۔ صرف ان کے تخلص یاد رکھیئے اب شاعری کی جگہ پر آنسو رکھ دیجئے اور آنسوؤں کی اولاد در اولاد پر غور فرمائیے۔

تو آنسو دو طرح کے ہوئے ایک شاطرانہ دوسرا شاعرانہ۔ استادانہ یا شاطرانہ آنسو بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ استادانہ شعر جو سوا شعر ہونے کے سب کچھ ہوتے ہیں یا جو صرف شعر ہوتے ہیں کچھ اور نہیں۔ سیاست اور مذہب کے استاد اسی قسم کے شعر یا آنسو بہاتے ہیں۔ آپ نے ان استادوں کو اسٹیج پر آنسو بہاتے دیکھا ہوگا انھیں کے آنسو سے وہ دریا نکلتے ہیں جہاں مگرمچھ اشکبار رہتے ہیں اور ہماری اشک سوئی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ استادانہ قسم کے اشعار تو بڑی دور سے اور بڑی محنت سے لائے جاتے ہیں۔ استادانہ آنسو بڑے آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ ضرورت تو استاد کی ہوتی ہے آنسوؤں کی کیا کمی!

ان آنسوؤں کے کچھ طبعی خواص بھی ہیں۔ ان کا مزاج بھی ہوتا ہے جو درجوں کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے یہ درجے قانونِ قدرت کے مطابق نہیں بلکہ رونے رلانے والے کی مصلحت سے متعین ہوتے ہیں۔ مثلاً جو آنسو فطری اعتبار سے پہلے درجے میں گرم اور دوسرے میں خشک ہوگا وہ ضرورت اور وقت کو دیکھ کر پہلے درجے میں خشک اور دوسرے درجے میں سرد ہو سکتا ہے۔ دراصل آنسوؤں کا مزاج و خواص مخاطب کے مزاج و اعصاب کو مدنظر رکھ کر متعین کیا جاتا ہے۔ مثلاً عورتوں اور شاعروں کا مجمع ہو، تو استاد کا آنسو گرم تر ہوگا۔ مزدوروں کاریگروں اور طالب علموں کا ہو تو گرم خشک، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا ہو تو سرد تر مولوی اور مہنتوں کا ہو، تو سرد خشک اور ہمارا آپ کا ہو، تو نورٌ علیٰ نور!

بیسویں صدی میں سائنس کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک قوت کو دوسری قوت میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کے شعرا اور [illegible] نے اس قسم کے [illegible] کا انکشاف کیا ہو یا نہیں اس سے کام برابر لیتے رہے۔ انھوں نے رونے اور آنسو بہانے کو جب چاہا شعر و ادب بنا دیا اور جب چاہا رنگ رقص، تصویر غرضکہ ہر انسانی سرگرمی میں منتقل کر دیا۔

ہمارے ہاں رونا ورزش بھی ہے تفریح بھی۔ اکثر صرف عادت! بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رونے یا آنسو بہانے کے یہ سارے نمونے اکٹھا مل جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ آنسو آنسو کی شکل میں نہیں ہوتا بلکہ رونے والے کا حلیہ بن جاتا ہے۔ یہ درجہ بڑے ریاض کے بعد کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک دور ایسا بھی آیا ہے جب اشک آفرینی کی حکومت نیشنلسٹ سوشلسٹ انداز کی تھی اور اشکوں کی پیداوار اور اُن کی نکاسی حکومت کے براہ راست اختیار میں تھی یا خانوں پہ یہ پابندی تھی کہ وہ اپنی بیشتر پیداوار حکومت کے حوالے کر دیں یا پھر اپنے ساتھ آخرت لے جائیں۔ آخرت کے حصے میں کم ہی آتی تھی اس لئے کہ اس زمانے میں ہوائی جہاز نہیں بلکہ صرف روح پرواز کرتی تھی اور اس کے نقل و حمل کے اصول و ضوابط بڑے سخت تھے!

استادانہ آنسو کے بعد شاعرانہ آنسو کا نمبر آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں مثلاً عاشقانہ، عارفانہ اور فاسقانہ۔ فاسقانہ شاعری وہ ہے جہاں جذبات تو فطری ہوتے ہیں لیکن فریقین کا رشتہ غیر ازدواجی اور ناشائستہ ہوتا ہے۔ مثلاً زید کی منکوحہ ہو اور بکر کی مرجوعہ یا بدھو کی بھینس ہو اور بقالی کی بالٹی یا منتخب لیڈر کی اور کاسمیٹک قوم کی۔ اس میں عشق تو اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ فریقین میں سے ایک نہ ایک پٹ جاتا ہے اور اکثر آنسو نکلنے سے پہلے آنکھ نکل پڑتی ہے۔ عارفانہ شاعری کی مانند عارفانہ آنسو وہ ہوتا ہے جہاں شاعر خواب میں ڈرتا ہے اور احمق بیداری میں اس کی تعبیر تلاش کرتا ہے۔

یہ آنسو بڑے مشکل سے دیکھے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اکثر اس لئے کہ وہ اتنے آنسو نہیں ہوتے جتنے رو ہے جو فرگان کے جھڑ جانے سے آنکھوں میں حاشیہ نشین ہو جاتے ہیں اور اپنا اعلان کبھی خفقان نیم شبی اور کبھی گریہ سحری سے کرتے رہتے ہیں۔ آنسوؤں کی ایک قسم نہیں بلکہ ترکیب طبعی یہ ہوتی ہے کہ محبوب کی طرف سے تو وہ اس دانے کا کام دیتا ہے جس سے عاشق کا مرغ دل شکار ہوتا ہے دوسری طرف عاشق کے انھیں دانہائے اشک کو رقیب کا مرغا ایک ایک کر کے چن لیتا ہے اور بڑے اشتعال انگیز طریقے سے بانگ دیتا ہے!

ہمارے ہاں شاعری میں عاشقی کا وہی درجہ ہے جو اشتراکیت میں مفلسی کا یا جمہوریت میں مفسدی کا۔ شاعروں کی عاقبت اور عاشقوں کی درگت کا مطالعہ آپ نے اردو شاعری میں ضرور کیا ہوگا۔ اس میں آپ کو عاشقانہ آنسو کے نمونے کثرت سے ملیں گے مثلاً عاشق کا وہ آنسو جو ٹھیر جائے تو انگارہ اور بہہ جائے تو دریا ہے۔ کبھی یہی آنسو نامۂ اعمال کی سیاہی دھوتے ہیں۔ اور کبھی اس کی سیاہی میں اضافہ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ہند سرکار کی نفع خوروں کے خلاف مہم

پروفیسر محمد عاقل

کانگریسی وزارتوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کی حکومتیں ہیں لیکن پچھلے دنوں کپڑے اور غذا پر کنٹرول کے سلسلے میں جو کاروائیاں حکومت ہند اور صوبوں کی حکومتوں نے کی ہیں ان سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ہند سرکار کے دو بازو ہیں۔ ایک دایاں بازو سردار پٹیل کی رہنمائی میں اور دوسرا بایاں بازو پنڈت نہرو کی رہنمائی میں۔ اس قول کے مطابق دائیں بازو کے ہاتھ میں سب ایسے محکمے ہیں جن کا اثر سرمایہ داروں پر پڑتا ہے۔ مثلاً مالیات، صنعت و رسد اور تجارت، اس لئے مرکزی حکومت کوئی ایسی بات نہیں کرسکتی جو سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف ہو لیکن پچھلے دنوں اسی طبقہ دائیں بازو کے محکموں نے سرمایہ داروں کی سماج دشمنی کے خلاف مہم شروع کی۔ مالیات کے وزیر شری شنمکھم چیٹی کو سرمایہ داروں کا بڑا دوست بلکہ ان کے طبقے کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان ہی چیٹی جی نے ایک انکم ٹیکس کمیشن مقرر کیا ہے جو انکم ٹیکس کے چوروں کا پتہ چلا رہا ہے، اور جنہوں نے ٹیکس نہ ہڑپ کر لئے تھے اس سب کو اگلوانے کا انتظام کر رہا ہے صنعت و رسد کے وزیر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے ملوں سے کپڑوں کے ذخیروں پر شکنجہ بٹھا دیا ہے اور کپڑے کے تھانوں پر ان کی واجبی قیمت کی چھاپ لگانے کا انتظام کر رہے ہیں، صوبوں کی حکومتوں کو کپڑے کے تاجروں کے مال کو جب چاہیں اپنے قبضے میں لینے کے وسیع اختیارات دے گئے ہیں اور سردار پٹیل کے براڈکاسٹنگ کے شعبے کی طرف سے نفع خوروں کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کا ایک پروگرام جمعہ کی ہر چودھویں رات کو "برین ٹرسٹ" کے نام سے لیا جاتا ہے، جس میں ملک کے ممتاز صحافی، پروفیسر، پارلیمنٹ کے ممبر، حکومت کے سکریٹری وغیرہ ریڈیو سننے والوں کے سوالوں پر مباحثہ کرتے ہیں۔ اس میں پچھلے جمعہ کو ایک سوال یہ کیا گیا تھا کہ "برین ٹرسٹ کی اس تجویز کے بارے میں کیا رائے ہے کہ ذخیرہ اندوزوں اور نفع خوروں کو سر بازار کوڑے لگائے جائیں" برین ٹرسٹ میں اس وقت سابق ایڈیٹر اسٹیٹسمین ڈاکٹر کرشنا لال شری دھارانی مشہور صحافی وغیرہ شریک تھے

"برین ٹرسٹ" نے کوڑے لگانے کی سزا کو اول تو اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ایک وحشیانہ چیز ہے دوسرے اس لئے کہ اس کی زد میں بڑے سرمایہ دار اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے نہیں آئیں گے اور اس سزا کو صرف ان بیچارے دکاندار کو بھگتنا پڑے گا جن کا قصور نسبتاً چھوٹا ہوگا۔ لیکن "برین ٹرسٹ" نے سزا کی ضرورت پر پورا اتفاق کیا اور طویل قید یا مستقل کی پرزور حمایت کی اور اس بات کی طرف خاص توجہ دلائی کہ بڑے سرمایہ داروں ہی کو پکڑا جائے اور ان ہی کو زیادہ بڑی سزائیں دی جائیں تاکہ ان کی درگت دیکھ کر چھوٹے لوگ بھی عبرت پکڑ سکیں، غرض یہ سرمایہ داروں کے سب سے بڑے مفروضہ دوست سردار پٹیل کے محکمے کا کارنامہ ہے!

اس لئے نہرو وزارت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے دو بازو ہیں، اور ایک بازو ہر حال میں سرمایہ داروں کا دوست ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ اول تو یہ بات حکومت ہند کی قدیم دفتری روایات کے خلاف ہے جن کو نہرو حکومت جاری رکھنے کے لئے عملاً مجبور ہے۔ دوسرے رائے عامہ ان معاملات میں بہت آگے بڑھ چکی ہے اور اس کو کوئی حکومت نظرانداز نہیں کرسکتی۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ کا ہی ذکر نہیں۔ گاندھی وادی دل بھی سرمایہ داروں کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مفاد عامہ کا امین اور متولی سمجھیں۔

خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ اگر آزادی کے معنی سرمایہ دار یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھیں آزاد ہندوستان میں من مانا نفع کمانے کی آزادی ہوگی تو وہ سخت بھول میں مبتلا ہیں۔

اسی زمانے میں ہندو مہا سبھا کو بھی ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش شروع ہوگئی ہے۔ قیاس کیا جا رہا ہے کہ اس تحریک کے پیچھے وہ سرمایہ دار ہیں جو کانگریسی حکومت کی کاروائیوں اور پالیسیوں سے غیر مطمئن ہیں۔ اس سے پہلے بھی مہا سبھا کو نفع خوروں، چور بازار کے سوداگروں، زمینداروں اور تعلقہ داروں راجہ مہاراجوں اور سرکاری دفاتر کے رشوت خوار ملازموں کی حمایت حاصل تھی اور فرقہ وارانہ منافرت کے ذلیل جذبات کو برانگیختہ کرکے یہ عوام میں مقبول ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ اب بھی غالباً اس کا حلقہ اور طریقہ کار وہی پرانا رہے گا اور یہ اسی طبقے کے مفاد کی نمائندگی کرے گی۔ لیکن یہ جماعت پہلے ہی بہت کچھ بدنام تھی اور مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد تو جس کی جو رسوائی اور ہوا خیزی ہوئی ہے اس کے اثرات کو زائل کرنے میں خاصا وقت لگے گا۔ اس لئے اس کے باوجود اگر سرمایہ دار اس کو شہ دے رہے ہیں تو غالباً محض کانگریس کو دھمکی دینے کے لئے ایسا کر رہے ہیں ورنہ در اصل ان کا ارادہ کانگریس یا کم سے کم اس کے دائیں بازو سے تعلقات منقطع کرنے کا نہیں ہے۔ لیکن یہ کھیل بہت خطرناک ہے۔ کہیں اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ کانگریس بصورت مجموعی بالکل ہی بائیں بازو کے گروہ میں آ جائے اور یہ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

سرمایہ داروں کو سمجھنا چاہئے کہ اب ان چالوں سے کام نہ چلے گا سرمایہ دار اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان ہی شرطوں پر زندہ رہنا ہوگا جنھیں وقت اور حالات کے تقاضے نے ناگزیر کر دیا ہے۔ انہیں انکم ٹیکس کی اونچی شرح کو گوارا کرنا ہوگا۔ انھیں سرکار کی منشاء کے مطابق سب کام کرنا ہوں گے، رو ٹھنے اور اکڑ دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ انھیں سرکاری افسروں سے بہتر اور زیادہ ایمان داری سے اور کم معاوضے پر کام کرنا ہوگا اور اپنے کام کے نتائج سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ان کا وجود جماعتی مفاد کے نقطہ نگاہ سے سرکاری افسروں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لانے اور ٹیکس کے بوجھ کی زیادتی کا جواب یہ نہیں ہے کہ عدم تعاون کیا جائے یا حقیقی آمدنی کو چھپا کر ٹیکس کی چوری کی جائے۔ ایک قومی خود مختار مملکت کے ہر شہری کو وہ محصول جو اس کے نمائندے عاید کریں اور جو ایسے مفاد عامہ کے کاموں پر خرچ کیا جائے جسے اس کے نمائندوں نے تجویز اور منظور کیا ہے، نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ادا کرنا چاہئے سرکار کے قرض کے مطالبوں کو بھی حتی الوسع زیادہ سے زیادہ پورا کرنا چاہئے اور اس کی وجہ سے زندگی کے معیار میں جو کمی پیدا کرنا پڑے اسے گوارا کرنا چاہئے، شہنشاہیت کے ٹھیکیداروں کی حیثیت سے عام جنتا کے مقابلے میں اپنے زندگی کے معیار کو جو آسمان پر پہنچایا گیا تھا وہ ظاہر ہے آزاد ہندوستان میں جاری رکھا جا سکے گا۔ ان آسمانی بلندیوں سے تو نیچے اترنا ہی ہوگا۔ ایسے ہی سرکار کی طرف سے جو نگرانیاں اور ہدایتیں دی جائیں ان کی تعمیل بھی بہ رضا و رغبت کرنا چاہئے۔ اپنے نقطہ نگاہ کو سرکار کے سامنے پیش کرنے کے جو دستوری طریقے ہیں ان کو ضرور خوب استعمال کرنا چاہئے لیکن جب ایک قانون بن جائے تو اس کی پابندی لازماً کرنا چاہئے۔ حکومت کے خلاف غیر قانونی سازشوں اور فتنہ انگیزیوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ یہ طریقے تو ایسے ہیں جن سے سرمایہ دار عزت و وقار کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکیں گے۔ ورنہ سرکاری حکام اور سیاسی رہنماؤں کا طبقہ مزدوروں کے قہر و غضب کی تسکین کے لئے ضرور ان کو بھینٹ چڑھا دے گا۔

بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۳)

کی لونڈی اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے...."

"نہیں بھائی لونڈی غلام کا کیا ذکر ہے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ مرد کما کر لائے اور عورت بچے پالے گھر کا کام کرے۔"

"انسانی فطرت ہو نہ ہو مرد کی فطرت ضرور ہے۔ عورت کو ایسے چکر میں ڈال کر آزادی کا نام نہ لے۔"

"آخر آزادی لے کر کرے گی کیا؟ اقبال کہہ گئے ہیں کہ عورت کو آزادی کی جگہ زمرد کا گلوبند چاہیے۔"

"واللہ آپ تو تو ڈسپا میں بند کر کے رکھنا چاہئے۔ اقبال کہنے والے اور آپ سمجھنے والے خیر کچھ بھی ہو۔ اب تو عورت کہتی ہے آزادی میں لے لی، زمرد کا گلوبند میاں ہی کو مبارک۔"

"بھائی تم جو چاہو کہو، مگر عورت صدیوں سے چار دیواری کے اندر رہنے کی عادی ہے، اُسے آزادی راس نہیں آسکتی۔"

"آپ سے پہلے نصرت بھی سو برس تک یہی کہتے رہے کہ ہندوستانی غلامی کی زندگی کے عادی، انھیں آزادی راس نہیں آسکتی۔"

"تو کیا جھوٹ تھا؟ دیکھ لو نتیجہ۔"

"سچ ہے ع
ہے ستم موری کے کیڑے کے لئے باغ ارم"

ش۔ خ۔ م

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

"سالک"

ایں راہ کہ می روی

پاکستان کی ایک خبر سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ابھی حال ہی میں چار کلچرل جماعتیں قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے کلچرل مراسم عرب، ایران، افغانستان اور ترکی کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ مستحکم کئے جائیں۔ ہر قسم کی زبان میں جب باوجود ... اور ... خیال کی ... دولت کے مختلف ملکوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس درجہ ناواقف یا ایک دوسرے سے متعلق تعصب میں گرفتار ہیں ہر ایک ایسی تحریک خوش آیند ہوگی جو پیدا ہوئے مسلمانوں میں ایک خاص بنیادی ... اور تہذیبی تعلق ہے جس کا اعتراف اور استحکام نہ صرف ان کے لئے بلکہ دنیا کے لئے مفید ہے لیکن اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو جنہوں نے یہ جماعتیں قائم کی ہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ہندوستان کے ساتھ کلچرل تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے بھی ایک انجمن قائم کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ ہندوستان جس کے ساتھ ان کا صدیوں کا ساتھ رہا ہے جس کی تہذیب و تمدن کے رگ و ریشے میں ان کا اثر پیوست ہے اس طرح جس طرح اُن کی اپنی تہذیب کے ہر پہلو میں ہندوستان کا اثر موجود ہے جو بآسانی وقتی تعصب کے تقاضوں کے مٹایا نہیں جا سکتا؟ کیا سیاست کی تلخیوں کو کم کرنے اور خوشگوار مستقبل کی بنیاد ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کیا دونوں ملکوں کے سربرآوردہ مفکر، ادیب شاعر اہل قلم مل کر ان زخموں پر مرہم رکھیں احساس اخلاقی غلاظت کو دھو کر صاف کریں جو سیاسی اور جھوٹے مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے دونوں ملکوں کے سینہ کو فگار اور ان کی شہرت کو داغدار کئے ہوئے ہیں کیا مسلمانوں کا تہذیبی لین دین صرف مسلمان کے ساتھ رہے گا۔ کیا اسلام کی تاریخ اور روایات میں اس تنگ نظری کی کوئی مثال یا دلیل موجود ہے؟ کیا خود ہندوستان کی تاریخ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی میل جول کا ایک روشن ثبوت نہیں ہے؟ سوال میں نے کئے ہیں جواب آپ دیں۔

زبان کی جنگ

آج کل قومی زبان کا مسئلہ ملک بھر میں ایک اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس کے سلسلے میں نئی نئی تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ بیس سال کا عرصہ ہوا کانگریس نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو ہندی اور اردو دونوں رسم خط میں لکھی جا سکے گی اور ہندوستانی کی مستند اور مسلمہ تعریف یہ کی گئی تھی کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان کے ہندو اور مسلمان عام طور پر بولتے ہیں۔ گاندھی جی ملک کی آزادی اور ترقی اور اس کے بسنے والوں کے دل ملانے کے لئے بہت سے کام کئے ان میں ایک بہت بڑا کام۔ ہندوستانی کا پرچار تھا۔ ان کے دل میں اس چیز کی اس درجہ لگن تھی کہ انھوں نے اس کی وجہ سے ہندی پرچارنی سبھا سے اپنا رشتہ توڑا اور آخر دم تک اپنے قول اور فعل سے ہندوستانی کی حمایت کرتے رہے یہاں تک کہ دہلی کا معاہدہ بھی جس کی بنا پر انھوں نے اپنا برت کھولا، انھوں نے خاص کر کے ہندوستانی زبان اور دونوں رسم میں لکھا۔ لیکن کیسے اچنبھے اور افسوس کی بات ہے کہ ان کے عمر بھر کے ساتھیوں اور ان کے اثر سے فائدہ اٹھا کر نام پیدا کرنے والے کانگریسی لیڈروں میں بھی بہت سے ایسے تنگ خیال لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے ان کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ہی انصاف کے تقاضوں اور اپنے لیڈر کے ارشادات کو بھلا کر ہندوستانی کو ختم کر کے اس کے بجائے سنسکرت زدہ ہندی کی مانگ پیش کی بلکہ جہاں کہیں ان کا بس چلا مثلاً یو۔پی میں، اسے رائج بھی کر دیا گویا کانگریس نے جو کچھ فیصلہ زبان کے متعلق کیا تھا وہ محض ایک سبز باغ تھا جس سے مسلمانوں کو پرچانا مقصود تھا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اب تو پاکستان بن گیا ہے۔ اب ہندوستانی کی کیا ضرورت ہے؟ اب ہم کھلی تنگ نظری کا ثبوت دے کر رجوع بہ ماضی کی تحریک چلائیں گے۔ اردو زبان اور ادب نے جو ملک کے ادب کو مالا مال کیا ہے اس کو ایک قلم مسترد کر دیں گے اور ایک ایسی زبان رائج کریں گے جس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ آل انڈیا ریڈیو کی خبروں کی زبان ہے جس کا بحیثیت عام قومی زبان کے کوئی وجود ہی نہیں! دراصل ہندوستانی اور ہندی کا فرق یہی ہے کہ جو لوگ ہندی کو چلانا چاہتے ہیں وہ ہندوستان کی عام زبان سے وہ عناصر نکالنا چاہتے ہیں جو اس میں اردو اور فارسی کی بدولت داخل ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے اس زبان میں ایک خاص لوچ، شیرینی اور وسعت پیدا ہو گئی ہے وہ اول تو اس پرانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے (جو ایک ایسی غلط فہمی ہے کہ صرف تعصب کی کم نگاہی کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہے) اور یہ بھول جاتے ہیں کہ کروڑوں ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ بھی اسی کو بولتے ہیں پھر ان کا دل و دماغ ایسا تنگ ہے کہ چونکہ وہ اردو کو مسلمانوں سے نسبت دیتے ہیں لہذا اس کے اثر سے زبان کو پاک کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ رجعت پسندی یہ تعصب یہ رجوع بہ ماضی کی تحریک کسی قوم یا ملک کے لئے مبارک نہیں ہو سکتی۔ اس میں نقصان صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے بلکہ اتنا ہی، بلکہ شاید زیادہ، دوسری جماعتوں کا ہے جو اکثریت میں ہیں۔ زیادہ اس لئے کہ اگر ایک ترقی پذیر اور جاندار تہذیب اور ادب کا ارتقاء اس قسم کی مصنوعی اور خلاف فطرت کوششوں سے رک گیا تو اس ذہنی اور تہذیبی افلاس میں اکثریت کا حصہ زیادہ ہوگا۔ انیس، حالی، غالب، اقبال، چکبست جیسے شاعروں، آزاد، نذیر احمد، سرسید، پریم چند، سرشار جیسے ادیبوں کے شاہکاروں سے اور اُن کے متحرک اثرات سے اپنے ادب کو محروم کرنا دانش مندی کا نہیں، ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔ بے شک ملک کی قومی زبان میں ہندی زبان کے عنصر کو کافی اہمیت حاصل ہونی چاہئے اور اگر ملک میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جن کو ہندی کا زیادہ پاس ہے تو اس کے بہت سے لفظ اور محاورے جن میں کھپت کی صلاحیت ہوگی، ملک کی عام بول چال میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرقہ وارانہ مخالفت اور تعصب اور علیحدگی کی زبان سے تو برائی کی جائے لیکن عملاً یہی باتیں کی جائیں جن کی وجہ سے دوسرے کو بُرا کہتے ہیں اور تقسیم ہند سے فائدہ اٹھا کر اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ ایک زبان پس پشت ڈال کر سنسکرت زدہ ہندی کو ملک کی راشٹر بھاشا بنایا جائے۔ جب اردو والے زبان کو سہل اور سلیس بنانے اور ہندوستانی کے آدرش کے قریب لانے کے لئے تیار ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہندی والے محض اپنی مذہبی اکثریت کے بل پر الٹی گنگا بہائیں اور بجائے ہندی کو ہندوستانی کے قریب لانے کے اسے سنسکرت کی طرف لے جائیں جو کسی طرح بھی ہندوستان کی عام زبان نہیں بن سکتی۔ ایسی کوشش صرف ملک کے عام مفاد کے خلاف ہی نہیں بلکہ خود ہندی زبان کے ساتھ ظلم اور اس کی آیندہ ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ تعصب ہی کی آنکھ حقیقت کو دیکھنے سے انکار کر سکتی ہے ورنہ اس کو دلیل کی ضرورت نہیں۔

وطن پرستی یا خدا پرستی

انسان کی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ قدروں کا ہے یعنی وہ کس چیز کو زیادہ اور کس چیز کو کم اہمیت دیتا ہے۔ جب تک کسی فرد یا جماعت کا تصور اقدار صحیح نہ ہو اور وہ مختلف خیالوں، اصولوں، آدرشوں اور وفاداریوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک جگہ نہ رکھے اس وقت تک وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے تعریف کے قابل نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز بالکل صاف ہے۔ مثالوں کی خاص ضرورت نہیں۔ آپ آئے دن دیکھتے ہیں کہ شریف آدمی جان کی خاطر مال اور اس کی خاطر زبان قربان کر دینے کو تیار ہوتے ہیں اور آپ کو ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑا ہوگا جن کے دل میں مال کی محبت دوسروں کی جان اور اپنی عزت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں قدم قدم پر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس چیز کو مقدم سمجھیں اور کسے مؤخر۔

میں اس قسم کے ایک بنیادی سوال کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ہندوستان کے ایک بہت معزز سیاسی لیڈر نے جو اہل علم میں شمار ہوتے ہیں اور آج کل ایک نہایت ممتاز عہدے پر مامور ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مضمون لکھا تھا جس میں ہندوستان کے مستقبل سے بحث کی تھی اور خاص طور پر اس بارے میں اظہار خیال کیا تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے سب سے زیادہ مقدم وطن کی محبت ہے یا مذہب (اپنے خیال کی)۔ ان کے مضمون میں سے چند اقتباسات آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہوں۔

"انسان کی زندگی میں دو غالب عناصر ہیں، وطن کی محبت اور مذہب کی محبت۔ ممکن ہے یہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ ممکن ہے نہ ہوں۔ ہم ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد مذہبی عقائد پر نہیں بلکہ وطن پرستی پر ہوگی ...... اس کا لازمی نتیجہ یہ

ہے کہ جب آزمائش کا وقت آئے اس وقت ہر شہری کا فرض ہے وہ مذہب کو پس پشت ڈال کر وطن کی محبت کو اپنا چراغ راہ بنائے۔ ہم اس کو جغرافی وطن پرستی کہہ سکتے ہیں .... اگر کوئی مذہب یہ سکھاتا ہے کہ اس کے احکام وطن کے مطالبات پر مقدم ہیں تو ان دونوں اصولوں میں تصادم ہوگا اور اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہوں گی .... (اس لئے) وطن کی محبت کو سب سے مقدم سمجھنا چاہیئے اور اگر موقع آپڑے تو مذہب کی محبت بلکہ خدا کی محبت بھی اس کے مقابلے میں نہیں آسکتی۔"

مجھے ذاتی طور پر اس میزان قدر سے سخت اختلاف ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ جب ہمارے ممتاز ترین اہل قلم اس قسم کی غلط فہمیوں میں پھنس جائیں تو خطرے کی گھنٹی بجانی ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں ابھی آزادی ملی ہے اور ہمیں ایک غیر مذہبی ریاست کی تشکیل کرنی ہے اور اس کی وجہ سے دیش بھگتی کے جذبے کو خاص اہمیت دینی ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر یہ جائز ہوگا کہ ہم اس راستے پر چلیں جس نے مغربی ممالک کو گذشتہ تیس سال میں دو خوفناک جنگوں کی آگ میں جھونک دیا اور حق و باطل خوب و ناخوب کی تمیز کو بالکل مٹا دیا۔ اگر وطن کی محبت مذہب کی محبت پر مقدم ہے بلکہ خدا کی محبت بھی اس کے سامنے نہیں ٹھیر سکتی تو خدارا بتایئے کہ دنیا میں اخلاقی قدروں کا نظام کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ وطن سے محبت کرنا ایک اچھی اور ضروری چیز ہے۔ لیکن اندھی محبت عقل اور ایمان دونوں کے خلاف ہے۔ جب محبت کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور خیر و شر کا احساس زندہ ہوتا ہے تو وہ محبوب کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر نظر رکھتی ہے ایک کی قدر کرتی ہے دوسری پر تنقید کرتی ہے۔ اس کا نعرہ یہ نہیں ہوتا "میرا ملک خواہ حق پر ہو یا باطل پر" بلکہ اس کی آرزو اور اس کا آدرش یہ ہوتا ہے کہ میں ہر حال میں حق کا ساتھ دوں اور اس بات کی پوری کوشش کروں کہ میرا ملک حق کے راستے پر چلے اور اگر اس راستے سے اس کے قدم ڈگمگائیں تو میں اپنی جان تک کی بازی لگا کر اسے سچائی اور دھرم کے راستے سے ہٹنے نہ دوں۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے فوجی سورما اور ہیرو گذرے ہیں ان کی شہرت محض اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اپنے ملک کی خاطر نہ اپنی جان کی پروا کی نہ دوسروں کی۔ لیکن وہ نام جو دنیا کی تاریخ میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اور جن کی محبت کے چراغ شریف انسانوں کے دل میں ہمیشہ روشن رہیں گے، سقراط، حسین، لنکن، گاندھی ان کا کارنامہ یہ ہے کہ حق اور باطل کی اس جنگ میں جو نئے نئے روپ میں ہمیشہ ہوتی رہی ہے انھوں نے اپنے قبیلے یا جماعت یا قوم یا وطن کو بت بنا کر نہیں پوجا بلکہ بے خوف ہو کر سچی بات کہی، سچ کی طرفداری کی، سچ کی خاطر جان دی اور اسی طرح نہ صرف اپنا بلکہ اپنے وطن کا اخلاقی مقام بھی بلند کر دیا۔ خدا کی محبت کا مطلب ہے ان اصولوں اور مقصدوں کی محبت جو آدمی کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں اور جن کی بنیاد پر ایک شریف، پر امن اور صالح زندگی کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اس عجیب و غریب اصول پر اصرار کریں کہ مذہب اور خدا کی محبت کو پس پشت ڈال کر وطن کی محبت کو اپنا معیار خیر و شر بنا لو تو نہ صرف اخلاقی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی بلکہ وہ سیاسی قوت جو آپ اس غلط طریقے پر حاصل کرنا چاہتے ہیں اس ریت کی بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ ہٹلر اور مسولینی نے بھی تو وطن اور نسل کی محبت کو مقدم رکھ کر ایک ایسی زبردست طاقت کی بنیاد ڈالی تھی جو ظاہر بیں نگاہوں کو اٹل معلوم ہوتی تھی لیکن قوانین قدرت کے مقابلے میں اس کی حقیقت مٹی کے ایک کمزور گھروندے سے زیادہ ثابت نہیں ہوئی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس انداز فکر کو اس سرزمین میں تازہ کریں جس نے ہمیشہ اخلاقی قدروں کو طاقت پر ترجیح دی۔ اور پھر اس قسم کا پرچار ایک ایسے زمانے میں جب قوموں اور ملکوں کی کوئی انفرادی حیثیت ہی نہیں رہی اور دنیا کے سارے ملکوں کی قسمت ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو گئی ہے کہ یا تو سب تیریں گے یا سب ڈوب جائیں گے! اگر اس وقت ہر ملک وطن کی محبت کو انسانیت کی محبت پر، طاقت پرستی کو امن دوستی پر، اپنی جغرافی وطن پرستی کو بین الاقوامی اتحاد اور اختیار پر ترجیح دیتا ہے تو میں بشارت دیتا ہوں اس ساعت قریب کی جب تمام ملکوں اور قوموں کو اس حماقت کا خمیازہ ایک ایسی آگ میں سے گذر کر دینا ہوگا جس کا لوگ خفیف سا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خدا کا قانون ہندوستان اور پاکستان جرمنی اور انگلستان، روس اور امریکہ سب کے لئے ایک ہے۔ اس قانون کی گرفت سے ڈرو، کیونکہ وہ گرفت بہت کڑی ہوتی ہے!

گاندھی جی اور انقلاب ہند (بسلسلہ صفحہ ۲)

تجربے سے حکومت کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جیب کی مار جسم کی مار سے زیادہ موثر ہوتی ہے جو لوگ جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو معمولی بات سمجھتے تھے وہ دائمی افلاس کا خطرہ برداشت کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک نے املاک کے چھن جانے اور افلاس کی زندگی بسر کرنے کا خوف دل سے نکال دیا۔ ہزاروں مردوں اور عورتوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا قومی جدوجہد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ مگر گاندھی جی کو حقیقت حال کا اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم نے جو طاقت نئی نئی حاصل کی ہے اس پر حد سے زیادہ زور ڈالیں۔ انھوں نے کمزوری کے آثار پہلے سے تاڑ لئے اور جنگ کا دیوالہ نکلنے سے پہلے اپنی ہنڈی کھری کر لی۔ گاندھی ارون معاہدہ ان کی حقیقت بینی کا ثبوت ہے اور اس کی وجہ سے کانگریس پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

قوم کو تیار کرنے کے اس عمل کا تیسرا اور آخری حصہ سب سے زیادہ مشکل تھا۔ جیل کے خوف پر لوگ غالب آچکے تھے۔ بہت سے روپے اور املاک کے لوبھ پر بھی قابو پا چکے تھے۔ ایک نئی نسل پیدا ہو گئی تھی جو افلاس کی دھمکی سے نہیں ڈرتی تھی مگر جان جوکھم میں ڈالنا کچھ اور ہی چیز ہے اور گاندھی جی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ آخری امتحان اس وقت ہونا چاہیئے جب حالات کامیابی کا یقین دلائیں۔ یہ حالات ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے پیدا ہوئے۔ جنگ نے صرف مناسب موقع ہی فراہم نہیں کیا بلکہ قومی آزادی کی جدوجہد شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ساری دنیا میں آزادی خطرے میں تھی اور ہندوستان سے اسے بچانے کی اپیل کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو قوم خود غلام ہو وہ دوسروں کی آزادی کے لئے کیسے لڑ سکتی ہے۔ ہندوستان کی زنجیر غلامی کو توڑنا صرف اس کی خاطر نہیں بلکہ دنیا کی آزادی کی خاطر ضروری ہو گیا۔ اس وقت گاندھی جی نے حکم دیا "کر گذرو یا مر مٹو"۔

بعض لوگ جو اپنے آپ کو مارکس کے پیرو کہتے ہیں گاندھی جی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے تین مختلف موقعوں پر ہندوستان کی تحریک آزادی کے ساتھ دغا کی۔ ۱۹۲۲ء میں ۱۹۳۱ء میں اور پھر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ان کا خیال ہے کہ چوری چورا کے واقعے کے بعد نان کوآپریشن کی تحریک کو روک دینا دراصل جان بوجھ کر انقلاب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔ وہ کہتے ہیں گاندھی جی یہ نہیں چاہتے تھے کہ تحریک پوری طرح کامیاب ہو۔ وہ جانتے تھے کہ پوری کامیابی صرف انقلابی طریقوں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن جہاں لوگوں نے انقلابی جدوجہد ایک بار شروع کر دی تو وہ صرف برطانوی سامراج ہی کو نہیں بلکہ سرمایہ داروں کے مستقل حقوق کو بھی ختم کر کے رہیں گے اور یہ گاندھی جی کو منظور نہ تھا۔ چنانچہ ان کی سیاسی چالوں کا مقصد صرف انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا، اس کو ختم کرنا نہ تھا اسی لئے انھوں نے نان کوآپریشن کی تحریک کو عین اس وقت جب وہ کامیاب ہونے والی تھی، روک دیا۔ انھیں یہ خوف تھا کہ اگر عوام کو آزادی کا چسکا پڑ گیا تو وہ صرف سیاسی تبدیلی پر قناعت نہیں کرنے کے بلکہ معاشی نظام بھی سارا کا سارا بدل ڈالیں گے"۔

صرف مارکس کے نام لیوا ہی گاندھی کے اس فعل پر معترض نہیں کہ انھوں نے نان کوآپریشن کی تحریک روک دیا۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ستیاگرہ کو شروع کرنا نہیں بلکہ اس کو روک دینا گاندھی جی کی "ہمالیہ برابر غلطی" تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی قومی جدوجہد میں چوری چورا جیسے واقعات کا پیش آنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کا قول ہے کہ تشدد اور عدم تشدد اضافی چیزیں ہیں۔ ان کو نظری اصول کے معیار پر نہیں بلکہ ضرورت اور مصلحت کے معیار پر پرکھنا چاہیئے۔

اس قسم کے اعتراض اپنی جگہ صحیح ہوں یا غلط ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اعتراض کرنے والے گاندھی جی کی طبیعت سے بالکل ناواقف ہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک تو اہنسا سب سے اعلیٰ قدر ہے اور وہ معیار ہے جس پر ہمیں اپنے اعمال کو پرکھنا چاہیئے۔ وہ ذریعے اور مقصد کے فرق کو نہیں مانتے تھے۔ مصلحت کا خیال ان کے نزدیک خارج از بحث تھا۔ وہ فرد کو بجائے خود قابل قدر سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ فرد کی آزادی صرف عدم تشدد کے ضبط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ سیاسی عمل میں عوام کے مجنونانہ جوش کا دخل گاندھی جی کے نزدیک تحریک آزادی کا خاتمہ تھا۔ اب چاہے ہم اس کو مانیں یا نہ مانیں ہمیں اس کا اعتراف تو کرنا ہی چاہیئے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے اصول کے مطابق کیا چوری چورا کے واقعے کے بعد انھیں تحریک کو بند کر دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

مغربی دنیا (بسلسلہ صفحہ ۶)

پریذیڈنٹ ٹرومین نے کانگریس کو چیلنج ایک دو منتخب مسائل کو پیش کر کے دیا ہوتا تو ان کے مخالف واقعی مشکل میں پڑ جاتے۔ لیکن انھوں نے ایک سیشن کے لئے جو مختصر سی ہو سکتا ہے قانون سازی کا اتنا کام تجویز کیا ہے جو کسی طرح پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ انفلیشن کو روکنے کے ساتھ حبشیوں کو شہریت کے تمام حق دینے کا سوال بھی پیش کر دیا گیا ہے اور جنوبی ریاستیں (جو ان معاملات میں بہت زود حس ہیں) پوری مخالفت پر تیار ہو گئی ہیں۔ انھوں نے صدارت کے لئے اپنا الگ امیدوار کھڑا کیا ہے۔ اور یہ طے کر لیا ہے کہ حبشیوں کو ووٹ دینے سے زبردستی روکیں گے۔ کانگریس کو صدیوں پرانے تعصبات کو مٹانے کے لئے موثر قانون بنانے میں ضرور تامل ہوگا۔ اور پریذیڈنٹ ٹرومین کو واقعی بہت سے ووٹ مل جاتے اگر حبشی خود اپنے حق کو اس طرح منوانے پر مصر ہوتے جیسے پریذیڈنٹ ٹرومین ظاہر چاہتے ہیں۔ لیکن حبشیوں کے لیڈر ایسی جلد بازی کے نقصانوں سے ڈرتے ہیں اور غالباً پریذیڈنٹ ٹرومین کو ووٹ حاصل کرنے کی اس تدبیر سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔

م ، م

نئی روشنی

ادارۂ تحریر:-

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے ہے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے۔

ہماری ایجنسیاں

دہلی	مکتبہ جامعہ اردو بازار، دہلی
	حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار
	فرینک برادرس، چاندنی چوک
	رنجیت نیوز ایجنسی
	پنجاب پبلشرز چوک فتح پوری
لکھنؤ	مکتبہ جامعہ، امین آباد
میرٹھ	عبدالحفیظ صاحب
رانچی	ہاشمی بک ڈپو
بمبئی	مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ
میسور	ملیہ اسٹورز ۱۲۱۰
بھوپال	مکتبہ سرقیہ، ابراہیم پورہ

مطبوعہ: جید برقی پریس دہلی — طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی، بی اے جامعہ

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۰ | ۲۴ اگست ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

نورِ امید

(یہ ڈاکر صاحب کا مکتوب گرامی ہے جو انھوں نے آنکھوں کے آپریشن کے بعد دسویں دن لکھا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ہاتھ کی جنبش بصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے نقش بنے اور آپس میں گڈمڈ بھی ہو گئے بڑی مشکل سے پڑھے گئے مگر پڑھ لیے گئے۔)

بیمارستان "لاکوبین" جنیوا

۱۶ر جون

عابد صاحب،

آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر پر پڑا ہوں، کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں۔ اس وقت رات ہے، نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے نا آشنا ہوں۔ اس کا پتہ اس سناٹے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے کے نیچے آ گیا ہے اور بس مجھ سے ہی باتیں کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی سنتا رہوں۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔ اس کے دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا۔ اس وقت کام آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور۔

اس حالت میں خط لکھنے کو جی یوں چاہا کہ شام ہی سے آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ شاید "نئی روشنی" ۱۴ کو نکل آئے گا۔ ۹ بجے سے جب سونے کا وقت سمجھ کر سب رفیق اور مددگار چلے جاتے ہیں، کچھ اسی کا دھیان بندھ گیا ہے۔ آج وہ پرچہ نکلا ہوگا اور میں نہ جانے کب اسے دیکھ سکوں گا؟ نہ جانے کب اس کے لیے کچھ لکھ سکوں گا؟ یہ پرچہ کیسی پریشانی کے وقت نکلا ہے۔ آپ کے اپنے اور سب کے دل کی طرح اس کی بے سروسامانی کا حال بھی جانتا ہوں۔ یہ چل بھی سکے گا یا نہیں؟ کیا پیسہ بنانے کا کام کیے بغیر یہ بنانے کا کام کر سکے گا؟ لوگ اسے غداروں کی سازش سمجھیں گے یا ساتھیوں، ہم سفروں کے دل کی آواز؟ یہ عام مذاق کو سدھار سکے گا یا عام بدمذاقی کا شکار ہو جائے گا؟ یہ حق کی تلخی سے کترائے گا تو نہیں؟ نشہ پلا کر لوگوں کو بدحواس اور بے عقل بنانے کا چلتا کاروبار تو نہیں کرنے لگے گا؟ نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اٹھتے ہیں۔ مایوس کن سے مایوس کن خیال آتا ہے مگر ٹھیرتا نہیں، جمتا نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کہ حالات کا، میرے اپنے ذاتی اور وطن کے عمومی حالات کا، تقاضا یاس افزا ہونا چاہیے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا، عابد صاحب کہ ان پچھلے بارہ دن رات میں مجھے کبھی ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات، میری بند آنکھیں برابر کمرے کو روشن پاتی ہیں۔ اس روشنی کی کچھ بے ربطیاں بھی محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً میرے کمرے کا دروازہ جو میرے بائیں جانب دیوار کے بیچ میں ہے [illegible] کونے میں دکھائی دیتا ہے! لیکن پھر بھی یہ روشنی ایک طرح کی روشنی ہے۔ البتہ [illegible] جیسی [illegible] آنکھوں سے دیکھتا تھا [illegible] روشنی میں سبز کھیت دیکھتا ہوں [illegible] [illegible]

میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے کہ اس امید کی وجہ بھی صحیح معلوم نہیں۔ [illegible] کا شعر وجہ نہیں بتلاتا لیکن کیفیت کی صحیح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

> دلم بہ کوئے تو باصد ہزار نومیدی
> بہ ابر خوش ہست کہ امید وار می گذرد

مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گذر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ جیسے کم زور ہاتھ ہی انجام کریں گے۔ اور ایک صالح، عادل سماج بنانے کی کٹھن مہم سر کرنے [illegible] میں ہم سب کو اپنی شخصیت کے ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس روشنی کی ہر قدم پر ضرورت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ یہ روشنی مہیا کرے۔ ابھی کہنا ہے کہ یہ کر سکے گا۔ آپ نے اس کا نام "نئی روشنی" خوب رکھا ہے۔ میری دوری اور بے بسی سے یہ نہ اس دیئے کی لو کو روشن رکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو پگھلانے سے بچ نکلوں گا۔

سمجھتا ہوں کہ اب بس کروں۔ شاید صبح ہو [illegible]

[illegible] تھی۔ اب وہ چڑیا [illegible] روز میری کھڑکی کے قریب درخت پر بولتی ہے۔ پہلے ذرا [illegible] ٹھیر ٹھیر کر جیسے آزماتی ہو کہ اور بھی جاگتے ہیں یا نہیں۔ پھر چند منٹ بعد جواب آتی اور ہم [illegible] جلد جلد اور تیز تیز۔ کوئی آدھ گھنٹے میں سارا باغ گونج اٹھتا ہے اور نغمے کا ایک ایسا طوفان ہوتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں ہی نہیں، درختوں کی ہر پتی اور چمن کا [illegible] بھی اس کورس میں شریک ہو گیا ہے۔ مگر جب دن چڑھے آدمیوں کا شور و غل، ڈاکٹروں کی نرسوں کی مستعدی، اس جشن موسیقی کو دبا دیتی ہے، اس وقت بھی مجھے اس چڑیا کی بار بار یاد آتی ہے، سنائی سی دیتی ہے، جو پہلے پہل رک رک کر ذرا آہستہ آہستہ بولی تھی۔ اور آج ایسا لگتا ہے کہ شاید اس چڑیا ہی کا نام "نئی روشنی" ہے!

بس خدا حافظ

آپ کا

ذاکر

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
نورِ امید	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱
گاندھی جی اور انقلاب ہند	پروفیسر ہمایوں کبیر	۲
ہند پاکستان اور مسئلۂ کشمیر	(اداریہ)	۳
[illegible]		۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان		۴
۲۔ پاکستان		۵
مشرقی دنیا		۶
اس بار [illegible] (نظم)	اختر انصاری	۷
غزل	خلیل الرحمن اعظمی	۷
نیرہ جرلائی کا پیغام	خواجہ احمد عباس	۸
تعریف کی قدر و قیمت	صالحہ عابد حسین	۱۰
سوئٹزر لینڈ	(ترجمہ) عبدالحلیم ندوی	۱۱

[illegible]

گاندھی جی اور انقلابِ ہند

(۳)

پروفیسر ہمایوں کبیر

کم سے کم ان لوگوں کو جو مارکس کے فلسفے کے ملزم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں گاندھی جی پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ وہ تو تاریخی جبریت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی قسمت اقتصادی قوانین کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے وہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی نے ۱۹۳۲ء میں ستیہ گرہ کی تحریک کو بند کر کے ہندوستان کی آزادی کو روک دیا۔ وہ یہ ماننے پر تیار نہیں کہ عوام کی بیداری کا سہرا گاندھی جی کے سر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے کے حالات میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی۔ ان کے نزدیک وہ عقیدت جو پنڈت نہرو کو گاندھی جی سے ہے محض پیر پرستی اور خوش اعتقادی ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہ خیال خوش اعتقادی پر مبنی ہے کہ ایک فردِ واحد کسی ملک کو آزاد کرا سکتا ہے تو کیا یہ سمجھنا خوش اعتقادی نہیں ہے کہ ایک فردِ واحد کسی ملک کی آزادی کو روک سکتا ہے؟

جو فیصلہ گاندھی نے چوری چورا کے واقعے کے بعد کیا اس کی وجہ اس وقت کے حالات پر غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ ایک جامد قوم میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی تھی لیکن صدیوں کا جمود اتنی جلدی دور نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مشین جب وہ بالکل نئی ہو بڑی احتیاط سے برتنا پڑتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ چالو کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قوم جو نئی نئی جاگی ہو مشین سے کہیں زیادہ نازک ہے اور اس سے کام لینے میں کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی عوام کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ دونوں کے سینوں میں ایک ہی دل دھڑکتا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کی طاقت پر جس کا ابھی نیا نیا احساس ہوا ہے حد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس وقت اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے دل سے حکومت کا خوف نکل گیا ہے۔ عام جوش اور ہیجان کے باوجود ابھی تک وہ اپنے مقصد کے لئے جان تو کیا مال کی قربانی بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ جد و جہد اور قربانی کا پہلا سبق دوسرے سبق سے بہت زیادہ آسان ہونا چاہیے۔

یہی مصلحت گاندھی ارون معاہدے کے وقت بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم نے ان کی آواز پر بڑی شان سے لبیک کہا تھا۔ عام لوگ مرد اور عورت لاکھوں کی تعداد میں نہ صرف جیل کے خوف کو بلکہ دولت اور املاک کی محبت کو بھی دل سے نکال چکے تھے۔ وہ خوشی خوشی قربانیاں دیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ان سے اور زیادہ قربانیاں طلب کی جائیں۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی نجات کا وقت آگیا ہے۔

مگر گاندھی جی نبض کا حال جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ گو لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے ان کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ لیکن اس سے کہیں بڑی تعداد ابھی تک بے حسی اور جمود میں مبتلا ہے۔ اس کے علاوہ جتنا جوش تھا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا۔ ابھی تک وہ لگن دکھائی نہیں دیتی تھی جس کی بدولت انسان برسوں تک پتہ مار کر کام کرتا ہے اور بڑی سے بڑی رکاوٹ کو گھستے گھستے مٹا دیتا ہے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ایسے وقت میں جبکہ فتح کا کچھ امکان باقی ہے صلح کر لینا اچھا ہے۔ دراصل جنگ کا نقشہ ایسا تھا کہ اگر کچھ دن اور چلتی تو برطانوی حکومت کا پلڑا بھاری ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی امکان تھا کہ اگر عوام کی جد و جہد بہت طویل عرصے تک جاری رہتی تو پھر ایک بار ان کا پلڑا جھک جاتا۔ مگر گاندھی جی کو یہ یقین نہ تھا کہ عوام میں جو نئے نئے جاگے ہیں اتنا دم ہے کہ لڑائی کو اتنی دور تک کھینچ لے جائیں۔ اس لئے انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ صلح کر لیں۔ آزادی سے پہلے گاندھی ارون معاہدہ کانگریس کی کامیابی کا سب سے اونچا درجہ تھا۔

مارکسی فلسفے کا نام لے کر گاندھی جی پر جو تنقید کی جاتی ہے اس کا حقیقت سے دور ہونا اس اعتراض سے بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے جنگ عظیم کے شروع ہونے کے وقت ایک انقلابی عوامی تحریک کیوں نہیں شروع کی۔ کہتے ہیں کہ انگریز جو اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کی للکار کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ لیکن انگلستان کی مشکلات پر زور دیتے وقت وہ معاملے کے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان اس وقت بڑے شدید خطرے میں تھا لیکن پھر بھی اس کے پاس زبردست جنگی وسائل تھے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی حالت اس وقت انقلابی تحریک کے لئے سازگار نہ تھی۔ گاندھی جی کے سامنے تو بنیادی اخلاقی اصول تھے جنھیں وہ مصلحت سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ لیکن اگر وہ انھیں نظر انداز بھی کر دیتے تب بھی مصلحت کا تقاضا وہی تھا جو اخلاق کا تھا۔

عوام کے برسوں کے سابقے سے گاندھی جی کو یہ معلوم تھا کہ سیاسی تحریک کا زور اسی وقت ہوتا ہے جب معاشی حالت زیادہ خراب ہو۔ جنگ عظیم تو ہندوستان کے لئے معاشی خوش حالی کا دور لے کر آئی تھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ خوش حالی محض عارضی تھی۔

اگر ۱۹۳۹ء میں جد و جہد کا فیصلہ کیا جاتا تو وہ ایسی فضا میں شروع ہوتی جب قیمتیں اور اجرتیں بڑھ رہی تھیں۔ سٹے کا بھاؤ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے کسان مجموعی طور پر مطمئن تھے۔ مزدور بھی اس وقت تو مطمئن ہی تھے۔ اس لئے کہ مزدوری قیمتوں کی نسبت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے مخصوص حالات کو دیکھ کر بدیسی حکومت نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا کہ ان دونوں طبقوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔ یہ معلوم تھا کہ آگے چل کر جوں جوں قوم کی قوت لڑائی کے کاموں میں صرف ہوگی معاشی مشکلات بڑھیں گی۔ مگر اس وقت تو کسانوں اور مزدوروں کا معیار زندگی کچھ تھوڑا سا اونچا ہی ہو گیا تھا۔

فوج کے سپہ سالار کو جنگ کا نقشہ موجودہ حالات کے لحاظ سے بنانا ہوتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی خوش حالی مصنوعی اور عارضی سہی مگر جب تک بھی تھی اس وقت تک یہ امر بہت مشتبہ تھا کہ وہ سیاسی جد و جہد کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ اس کے علاوہ فرقہ پرستی کی بڑھتی ہوئی رو نے قوم کو کمزور کر دیا تھا۔ کل ہند وفاق کے بغیر صوبوں میں حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے انتشاری قوتیں ابھر آئی تھیں، ملک کے چھوٹے چھوٹے صوبوں اور قوم کے چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ جانے کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ اس کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر سیاسی جد و جہد کے شروع ہوتے ہی فرقہ وارانہ فساد کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ جنگ کے زمانے میں انگریز ہر چیز سے جو قومی جد و جہد کے دھارے کو دوسری طرف موڑ دے کام لینے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔

پھر گاندھی جی اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ جو تحریک ۱۹۳۹ء میں شروع ہوگی اسے جنگ کے حالات میں چلانا ہوگا۔ پچھلی تحریکوں کو جو امن کے زمانے میں شروع ہوئی تھیں سول نظم و نسق کی سختیاں اٹھانی پڑی تھیں مگر جنگ کے زمانے میں حکومت بے تامل فوجی نظم اور مارشل لا نافذ کر دے گی۔ اس لئے اس تحریک کو کہیں زیادہ خطروں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے اس کا شروع کرنا صرف اسی وقت جائز تھا جب عوام میں اتنی سیاسی اور معاشی سکت ہو کہ وہ کئی محاذ پر لڑ سکیں۔

غرض گاندھی جی جانتے تھے کہ جنگ کے حالات میں معرکہ بہت سخت ہوگا اور بہت عرصے تک جاری رہے گا اس لئے بار بار سورماؤں کے کرتب دکھلانے کا موقع نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے قوم کی سکت کو آزما لیں۔ چنانچہ چند منتخب افراد کی ستیہ گرہ کا تجربہ جو ۱۹۴۰ء میں شروع کیا گیا اس بڑی لڑائی کی تیاری تھی۔

جنگ عظیم میں بحران کا وقت ۱۹۴۲ء تھا۔ بین الاقوامی میدان میں دونوں فریقوں کا پلہ برابر تھا اور خیال تھا کہ جانے کانٹا کدھر جھک جائے۔ دونوں اپنی پوری طاقت میدان میں لے آئے تھے اور اس کے تناسب میں خفیف سا فرق بھی انھیں بہت شدت سے محسوس ہوتا تھا۔ ہندوستان کے اندر قیمتوں کی گرانی دوڑ میں مزدوری کے اضافے سے کہیں آگے نکل گئی تھی۔ اشیائے صرف کی کمی سے عام معیار زندگی میں اتنی کمی ہو گئی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ بڑھتی ہوئی معاشی اور سیاسی مشکلات نے لوگوں کی توجہ کو فرقہ وارانہ اور صوبہ وارانہ جھگڑوں سے ہٹا کر اس بات پر مرکوز کر دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کی ضرورت فوری اور شدید ہے۔ غرض بیرونی اور اندرونی حالات نے ہندوستان کی جنگ آزادی کی راہ ہموار کر دی تھی۔ اس لئے گاندھی جی نے آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

۱۹۴۲ء کی شورش بے منصوبے کا انقلاب تھا۔ حکومت نے گاندھی جی کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ جنگ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسے تجربہ تھا کہ گاندھی جی کی مہم کا آغاز غضب کا ہوتا ہے۔ اگر وہ تحریک کے قوت پکڑنے سے پہلے گرفتار نہ کر لئے جائیں تو انھیں شکست دینا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ دو مرتبہ حکومت کو یہ سبق مل چکا تھا کہ جو چیزیں دیکھنے میں خفیف اور سبک معلوم ہوتی ہیں وہ ہنسی میں نہیں ٹالی جا سکتیں۔ جنگ کے زمانے میں وہ معاملے کو اتفاقات پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ جس نے تحریک کے شروع ہونے سے پہلے ہی گاندھی جی کو اور ایک سرے سے کانگریس کے سب لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

اگر ۱۹۴۲ء کے انقلاب کی باگ گاندھی جی کے ہاتھ میں رہتی تو وہ کیا شکل اختیار کرتا؟ اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ البتہ ایک بات یقینی ہے۔ وہ عدم تشدد کے دل سے قائل تھے اور کسی فوری فائدے کے لئے اپنے اصول سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء کی جد و جہد کو جنگ آزادی کا آخری مرحلہ سمجھتے تھے۔ اور اس بار ان کا نعرہ کچھ اور ہی تھا "کر گذرو یا مر مٹو"۔ مگر آخری مہم کی شدید ضرورت بھی ان کی زبان سے یہ نہیں کہلوا سکتی تھی "مارو یا مر جاؤ"۔

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۲۴ ر اگست ۱۹۴۸ء

ہند و پاکستان اور مسئلہ کشمیر

اب سے کچھ دن پہلے کلکتے میں ہند اور پاکستان کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس سے صلح پسندوں کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ دونوں ریاستوں کے تجارتی تعلقات، اقلیتوں کے مسئلے، پناہ گزینوں کی املاک کے مسئلے اور دوسرے مسائل کے بارے میں معقول سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ صرف کشمیر کا معاملہ رہ گیا تھا۔ مگر ع

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا۔

اسی کشمیر کے معاملے نے باہمی مخالفت کے جذبات کو پھر سے بھڑکا دیا اور وہ مصالحت کی فضا دیکھتے دیکھتے ہوا ہوگئی۔

اب یہ معلوم ہوا کہ قریب قریب اسی زمانے میں جب کلکتے میں صلح کی بات چیت ہو رہی تھی، پاکستان کی فوجیں پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں اور کہیں زیادہ ساز و سامان کے ساتھ حملہ آوروں کی مدد کے لئے کشمیر کے سرحدی علاقے میں داخل ہو رہی تھیں۔

عشوہ چشمش فریب جنگ داشت
ما غلط کردیم و صلح انگاشتیم

اس کی وجہ پاکستان کے اخبار یہ بتلاتے ہیں کہ حکومت پاکستان کو ہندوستان کی حکومت، فقیر ایپی اور خان عبدالغفار خاں کی اس باہمی سازش کا علم ہوگیا تھا کہ ہندوستان کی فوجیں کشمیر کی طرف سے اور فقیر ایپی کے مرید شمال مغربی سرحد کی طرف سے صوبہ سرحد اور پنجاب کے متصل علاقے پر حملہ کریں گے اور خان عبدالغفار خاں کے سرخ پوش ان کا ساتھ دیں گے۔

ذرا سا غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذر اگر تراشا ہوا نہیں تو ایک دور از کار وہم پر مبنی ہے۔ فقیر ایپی تو ایک ایسی نامعلوم شخصیت ہے کہ اس کی طرف انگریز جو چاہتے تھے منسوب کر دیتے تھے اور پاکستان جو چاہے منسوب کرے لیکن خان عبدالغفار خاں اور پنڈت جواہر لال نہرو جن کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر لیا جاتا ہے جانے بوجھے لوگ ہیں جن پر آج تک کسی نے یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن انگریزوں نے بھی فریب اور سازش کا الزام نہیں لگایا۔ اگر واقعی ایسی سازش کی افواہیں حکومت پاکستان کے کانوں تک پہنچی تھیں تو اسے حکومت ہند سے حقیقت حال دریافت کرنی چاہئے تھی اور اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل سے جس کے سامنے کشمیر کا مسئلہ پیش تھا احتجاج کرنا چاہئے تھا۔ احتیاط کا تقاضا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ حکومت پاکستان اپنی سرحد پر کافی فوجیں بھیج دیتی اور انھیں ہوشیار رہنے کا حکم دیتی۔ لیکن بغیر کسی اعلان کے چپ چاپ ایک پوری فوج سرحد پار کشمیر کے اندر بھیج دینا محض احتیاطی اور دفاعی کارروائی نہیں کہی جا سکتی اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکومت پاکستان کشمیر کے مسئلے کو پر امن طریقے سے طے کرنے پر تیار ہے۔

لیکن کشمیر کے مسئلے کا پر امن طریقے سے طے ہونا ہندوستان اور پاکستان دونوں کے امن و عافیت کے لئے بلکہ دونوں کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا دانشمندی نہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دونوں ریاستوں کی جڑیں ابھی کمزور ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ ۵۰، ۶۰ لاکھ پناہ گزینوں کے بسانے کا، ان کی جائدادوں کے تبادلے کا اور ان کو اپنے اپنے ملک کی معیشت میں کھپانے کا انتظام کرنا ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس میں حکومت کو اور قوم کو ایک مدت تک اپنی ساری توجہ اور ساری کوشش صرف کرنی ہے۔ دونوں کو گرانی، چور بازاری اور نفع خوری سے، رجعت پسندی، فرقہ پرستی اور فتنہ انگیزی سے لڑنا ہے۔ ان سب خرابیوں کی پشت پر ارباب غرض کی زبردست قوت ہے جو ڈیڑھ سو سال تک سلطنت برطانیہ کی مدد سے ہندوستان کے غریبوں کا خون چوستے تھے اور اب اس کی مدد کے بغیر اپنے بل پر جمہوریت کی تحریک کو کچل کر ملک پر مذہبی یا نیم مذہبی فسطائیت کا جھنڈا لہرانا چاہتے ہیں اور اس کے سایے میں اپنا خون آشامی کا شغل جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں کو جہالت، وہم پرستی، افلاس، بیماری کا مقابلہ کرنا ہے جس نے آبادی کے بہت بڑے حصے کے ذہن کو ماؤف اور جسم کو مفلوج کر رکھا ہے۔

ان مسائل کا بوجھ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے کندھوں پر ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ پاکستان کی نئی ریاست پر نسبتاً بوجھ زیادہ ہے اور اس کے اندر اس بوجھ کو اٹھانے کی قوت کم ہے۔ اس لئے پاکستان کی حکومت پر اپنے ملک کی طرف سے عقل و مصلحت کی طرف سے یہ فرض زیادہ شدت سے عائد ہوتا ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو بغیر طویل اور خونریز جنگ کے صلح و آشتی سے طے کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کی حکومت کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ صلح کی کوشش کرے یا جنگ کے طول کھینچنے میں اس کا نقصان کچھ کم ہے۔ بیشک اس کے وسائل زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے پاس کھونے کے لئے زیادہ ہے۔

اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کے آجانے سے صلح کی گفتگو شروع ہونے کا بہت اچھا موقع نکل آیا ہے۔ پہلے شاید یہ خیال تھا کہ جس کی طرف سے ابتدا ہو وہ کمزور سمجھا جائے گا۔ اب یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ بات چیت کی ابتدا کمیشن کر رہا ہے۔ کمیشن کے متعلق لوگوں کو یہ بدگمانی ہے کہ اسے حق و انصاف سے زیادہ مصلحت کی فکر ہے اور مصلحت کے معنی ہیں امریکی اور برطانوی جتھے کا مفاد۔ دنیا کے حالات کی رفتار دیکھتے ہوئے یہ بدگمانی بے جا نہیں ہے، لیکن یہی حالات کی رفتار یہ بھی بتاتی ہے کہ کمیشن کی مصلحتیں کچھ بھی ہوں بہرحال وہ کشمیر میں جس کی سرحدیں سوویٹ روس سے ملتی ہیں امن قائم کرنے کی دل و جان سے کوشش کرے گا اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس کوشش میں وہ کسی فریق پر جبر نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی حکمت عملی سے دونوں فریق کو یا ایک فریق کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ یہ ایسا خطرہ ہے جس کا دنیا کی سب قوموں کو صرف اندرونی اور بیرونی سیاست میں نہیں بلکہ ہر معاملے میں سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ارباب سیاست بین اقوامی معاملات میں ناتجربہ کار سہی مگر ایسے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

بزم بے تکلف

"اے حضرت آپ کو ملکی معاملات سے تو بڑی دلچسپی ہے گھنٹوں بیٹھے اخبارات چاٹا کرتے ہیں اور پھر پہروں ہمارا مغز چاٹتے ہیں۔ ذرا یہ تو بتایئے کہ یہ چائے، شکر، بالائی، قیمہ، تنباکو غرض یہ کہ ضرورت کی ہر چیز کو جو آگ لگی ہوئی ہے دن پر دن بھاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی کیا علت ہے؟"

"بھئی واہ مرزا صاحب ضرورت کی چیزوں کی فہرست خوب بتائی مگر یہ بٹیر، کبوتر، پتنگ، ڈور کیوں چھوڑ دیا؟"

"بے پر کی نہ اڑایئے، جو پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے میاں ہم نے بھی منطق پڑھی ہے کچھ گھاس نہیں کھودی۔"

"واللہ گھاس کھودتے تو مزے میں رہتے۔ منطق سے کوئی پیٹ بھرتا ہے؟"

"غرض آپ فقروں میں ٹالیں گے، بتائیں گے نہیں؟"

"نہیں حضرت آپ سے کیا چھپانا ہے۔ بات یہ ہے کہ مہنگائی یا تو چیزوں کی کمی سے ہوتی ہے، یا زر کی بہتات سے۔"

"زر کی بہتات سے مہنگائی؟ کیوں دل لگی کرتے ہو؟"

"دل لگی کی ایک ہی کہی۔ یہ تو ایک ابتدائی معاشی اصول ہے۔"

"اب میں اس معاشی کو کیا کہوں، مگر آپ سے پوچھتا ہوں کہ زر کی بہتات کس بھگوڑے کے پاس ہے؟ یہ [illegible] ہی جانتا ہے کس طرح رو رو کے خرچ چلتا ہے۔"

"مرزا صاحب آپ کے پاس بہتات نہیں تو کیا کسی کے پاس بھی نہیں؟"

"یوں ہونے کو تو لوگوں کے پاس اتنا ہے کہ [illegible] نہیں۔ لڑائی کے زمانے میں انھوں نے کمایا ہے مگر ان لوگوں کے لئے مہنگائی کہاں، انھیں تو ہر چیز مفت معلوم ہوتی ہے۔ خوب دل کھول کر خریدتے ہیں۔"

"ان لوگوں کی وجہ سے مانگ ہوئی زیادہ اور چیزوں کی پیداوار ہوئی کم۔ کاہے سے؟ جنگ کی تباہیوں سے۔ پھر بھاؤ بڑھیں یا نہ بڑھیں؟"

"اچھا تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ دوسروں کے پاس زر کی بہتات ہو تو ہمارے لئے اس کا نتیجہ مہنگائی ہے؟"

"جی یہی مطلب ہے۔"

"بھئی معاف کیجئے میں سمجھا نہ تھا، آپ سچے اور آپ کی معاشی سچی۔"

ع۔ نہیں جھوٹے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے؟

معذرت

کئی ہفتے سے "نئی روشنی" کی اشاعت میں دو تین روز کی دیر ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس کا بہت سخت افسوس ہے اور ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ اخبار وقت پر شائع ہو۔ بات یہ ہے کہ کاتب کو مسطر کے لئے اچھا کاغذ بازار میں نہیں ملتا۔ ناقص مسطر پر لکھائی ہونے کی وجہ سے کاپیاں اچھی نہیں بنتیں خصوصاً برسات کے موسم میں۔ اور سنگ سازی میں بہت وقت صرف ہو جاتا ہے۔ پرچہ دیر میں تیار ہوتا ہے اور دیر میں چھپتا ہے اور چھپائی بھی جیسی چاہئے نہیں ہوتی۔ [illegible] دہلی سے اخبار نکلنے میں جو مشکلیں ہمیں اٹھانی پڑیں ان کی داستان بہت طویل ہے مگر تسلی ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مشکلیں دور ہوتی جاتی ہیں۔

پچھلا ہفتہ : ۱۔ ہندوستان

یہ بھی غنیمت ہے

شری شان مکھم چیٹی نے فنانس منسٹر کے عہدے سے استعفا دے دیا اور وہ منظور کر لیا گیا۔ معاملے کی مختصر روداد یہ ہے۔ پچھلے سال حکومت ہند نے ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ جنگ کے زمانے میں جن لوگوں نے کاروبار میں بہت روپیہ کمایا ہے ان کے معاملات کی تحقیقات کرکے دیکھا جائے کہ انھوں نے پورا انکم ٹیکس ادا کیا ہے یا نہیں، اور نہ کیا ہو تو قانون کے مطابق انھیں مناسب سزا دی جائے۔ حکومت ہند نے محکمۂ فنانس کو ہدایت کی تھی کہ جن معاملات میں بظاہر انکم ٹیکس کے قوانین کی خلاف ورزی کی گئی ہو ان کو ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء سے پہلے کمیشن کے پاس بھیج دے۔ محکمۂ فنانس کو اس جلدی کی وجہ سے جو تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں مرکزی حکومت کے ہاں پھیل گئی تھی، اس قسم کے مقدموں کی پوری جانچ کرنے کا موقع نہیں ملا اور بہت سے مقدمے سرسری طور سے کمیشن کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مرکزی اسمبلی میں ایک ... جن کے پاس ... مقدمے تحقیقات کے لئے بھیجے گئے ہیں، ان میں سے ... کمزور اور بے جان مقدموں کو صرف ... کی رضامندی سے واپس لے سکتی ہے۔ ... ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کیا گیا اور اس نے ... منظوری کی سفارش کر دی۔ اس پر بھی فنانس منسٹر نے محض اپنی شخصی رائے سے کچھ مقدمے کمیشن سے واپس لے لئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ فعل بدنیتی پر مبنی ہو یا نہ ہو ضابطے اصول کے خلاف ضرور تھا۔ چنانچہ پہلے ... اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں سخت اعتراض کیا گیا۔ اس پر فنانس منسٹر شری چیٹی نے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو اپنا استعفا دیا جس میں انھوں نے اپنی غلطی کا کچھ تھوڑا سا عذر پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں بیان دیتے ہوئے انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔ پنڈت نہرو نے ان کی صاف گوئی کی تعریف کی اور اعلان کیا کہ گورنر جنرل نے ان کا استعفا منظور کر لیا ہے۔ اس طرح یہ ناگوار واقعہ جس کی وجہ سے اور زیادہ ناگواری پیدا ہو سکتی تھی، بہ خیر و خوبی ختم ہو گیا۔

شری چیٹی کی قابلیت کا سب کو اعتراف ہے۔ مگر وہ خود سرمایہ دار ہیں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اس لئے ان کا فنانس منسٹر کے عہدے پر ہونا عام طور پر لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا پھر بھی چونکہ اس وقت ہندوستان کی رائے عام نہرو گورنمنٹ کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ شری چیٹی کو برداشت کر رہی تھی۔ اُمید ہے کہ اب فنانس منسٹر کے عہدے کے لئے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے گا جسے جمہور کا اعتماد حاصل ہو۔ ابھی تک تو شری کوپال سوامی آئنگر کا نام لیا جا رہا ہے۔ آئنگر صاحب نے پچھلے سال بھر میں اپنے خلوص، تدبر اور قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا ہے۔ اس لئے ان کا انتخاب بہت مناسب ہوگا۔

جانی بوجھی آواز

آج ہندوستان کی فضا پھر شکوے شکایت، الزام، رد الزام کی کرخت صداؤں سے گونج رہی ہے۔ مہاتما گاندھی کی آواز جو عفو اور درگزر، الفت اور محبت کے شیریں دل آویز نغمے سنایا کرتی تھی خاموش ہو چکی ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایک مدھر سُر کی لہر کانوں تک پہنچتی ہے جس پر دھوکا ہوتا ہے کہ یہ وہی جانی بوجھی آواز ہے۔ شری ونوبا بھاوے گاندھی جی کے حلقے میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ عام طور پر لوگ انھیں گاندھی جی کا جانشین سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ محض انکسار تو نہیں بلکہ اصولاً اس بات کا شدت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خدمت خلق کے میدان میں جانشینی کوئی چیز نہیں، ہر شخص کی اپنی جگہ ہوتی ہے کوئی دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ بہر حال ونوبا جی نے اپنے آپ کو ہندو مسلم اتحاد کے کام کے لئے، جسے گاندھی جی نے شروع کیا تھا وقف کر دیا ہے۔ کچھ دنوں سے ان کا مستقل قیام دہلی میں رہتا ہے۔ مگر ضرورت کے وقت دوسرے مقامات پر بھی جاتے رہتے ہیں چند ہفتے ہوئے وہ اجمیر میں حضرت خواجہ اجمیری کے عرس میں شریک ہوئے تھے اور ان ہی کی بدولت اس پر آشوب زمانے میں عرس بخیر و خوبی ہو گیا تھا۔

ابھی اندور میں مسلمان تاجروں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے ونوبا جی نے کہا کہ آپ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھئے۔ ہندوستان آپ کو اپنا سمجھتا ہے اور سمجھے گا۔ اس نظریے نے کہ ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، بہت سے مسلمانوں کو کچھ دن کے لئے مسرور کر لیا تھا۔ لیکن جو لوگ گاندھی جی کی تعلیم سے متاثر تھے انھوں نے اس کو کبھی نہیں مانا۔ اب آپ اپنے عمل سے ثابت کر دیجئے کہ آپ بھی اس کو نہیں مانتے اور ہند کے سب باشندوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ ونوبا جی نے مسلمانوں کو ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط سیکھنے کی اور ہندوؤں کو اردو زبان اور اردو رسم الخط سیکھنے کی تاکید کی۔

ونوبا جی اپنے گرو گاندھی جی کی طرح سیدھی سی بات سیدھے سادے طریقے سے کہتے ہیں لیکن چونکہ وہ خود اس پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں اور دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں وہ اثر ہوتا ہے جو بڑے بڑے خطیبوں کی دھواں دھار تقریروں میں نہیں ہوتا۔ قومی زبان کے مسئلے کو انصاف اور فراخ دلی کے ساتھ طے کرنے کی جو مخلصانہ کوششیں ونوبا جی اور ان کے ساتھی کر رہے ہیں اُس سے یاس کی تاریکی میں امید کی روشنی نظر آتی ہے۔

طمع زری سہی جذبہ قومی نہ سہی

معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند ایک مسودہ قانون مرتب کر رہی ہے اور اسے اسمبلی کے موجودہ اجلاس میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ جس کی رو سے کپڑے کے کنٹرول کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مال کی ضبطی، جرمانے اور قید کی سزائیں دی جا سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ ایسے قانون کی بہت سخت ضرورت ہے ورنہ قیمتوں کا کنٹرول راشننگ کے بغیر رشوت اور چور بازاری کے لئے ایک نیا راستہ کھول دے گا۔ کہا جاتا ہے قانون میں ایک نئی بات یہ ہوگی کہ جو شخص کنٹرول کی خلاف ورزی کی اطلاع دے اس کو معقول انعام دیا جائے۔ ... ہے تو یہ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ جس کام کا محرک عوام کی بہی خواہی کا جذبہ ہونا چاہئے تھا اس کے لئے ہمیں انعام کا لالچ دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ واقعہ یہی ہے کہ ابھی تک ہم میں وہ چیز جسے پبلک اسپرٹ کہتے ہیں پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ہماری سہل انگاری کا یہ حال ہے کہ دوسروں کے معاملے میں تو کیا خود اپنے معاملے میں بھی اتنی زحمت نہیں اٹھاتے کہ دوکانداروں یا سرکاری ملازموں کی بدعنوانیوں کی شکایت وہاں تک پہنچائیں جہاں کچھ شنوائی کی امید ہو۔ شاید انعام کا لالچ ہم میں کچھ مستعدی پیدا کر دے۔

بسم اللہ تو ہوئی

مرکزی حکومت کی طرف سے تعلیم کی اصلاح اور توسیع کے منصوبے ایک مدت سے بن رہے ہیں۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ سالہا سال سے قائم تھا اور معلومات فراہم کرنے اور اعداد و شمار جمع کرنے کا کام کر رہا تھا۔ حکومت ہند کے کئی ممبر تعلیم اور مشیر تعلیم آئے اور چلے گئے۔ مگر یہ کام نہ ہو سکا کہ معلومات اور اعداد و شمار کی بنا پر کوئی معقول اسکیم تیار کرے ۱۹۴۳ء میں جب مسٹر جان سارجنٹ (جو آگے چل کر سر جان سارجنٹ ہو گئے) مشیر تعلیم مقرر ہوئے تو ایڈوائزری بورڈ اور محکمۂ تعلیم میں کچھ جان پڑی اور انھوں نے سات آٹھ سال کی محنت کے بعد ملک کی تعلیم کا ایک نقشہ بنایا جو سارجنٹ اسکیم کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ در اصل ایک سادہ خاکہ تھا جس میں رنگ نہیں بھرا گیا تھا یعنی صرف تعلیم کے مالی اور انتظامی پہلو سے بحث تھی طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کا کوئی ذکر نہ تھا۔ آخر ایڈوائزری بورڈ نے ابتدائی تعلیم کے لئے ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی بنی بنائی بنیادی اسکیم بعض اہم ترمیموں کے ساتھ اختیار کر لی اب کام شروع کرنے کا وقت آیا اور حکومت نے چاہا کہ صوبہ دہلی میں بنیادی تعلیم کا ایک مکمل نمونہ پیش کرے۔ لیکن ۱۹۴۵ء سے آئینی تبدیلیوں کا قصہ شروع ہوا اور یہ اسکیم یوں ہی رہ گئی۔ خدا خدا کرکے اس سال کے شروع میں مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے مشیروں ڈاکٹر تارا چند اور پروفیسر ہمایوں کبیر کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ عملی کام فوراً شروع کر دیا جائے اور سر دست تجربہ کار معلموں کو منتخب کرکے اور انھیں بنیادی طریق تعلیم کی مختصر ٹریننگ دے کر نئے بنیادی مدارس کھول دئے جائیں۔ چنانچہ مئی اور جون میں پچاس مردوں اور عورتوں کو جامعہ ملیہ کے ٹریننگ اسکول میں بنیادی طریق تعلیم سکھا کر یکم جولائی سے دیہات میں پینتالیس نئے مدارس کھول دئے گئے۔ اس وقت پچاس مزید اُستانیاں اور استاد جامعہ میں ٹریننگ پا رہے ہیں اور ان کے جانے کے بعد پچاس اور آئیں گے۔ اس طرح یکم اپریل تک سو اور نئے مدرسوں کے لئے بنیادی طریق جاننے والے استاد تیار ہو جائیں گے اور یہ مدرسے کھول دئے جائیں گے۔

جو مدرسے کھلے ہیں۔ ان کے کام میں غیر معمولی حالات کی وجہ سے بڑی دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ استادوں اور استانیوں کو رہنے کو مکان نہیں ملتے اور کھانے پینے کی چیزیں اتنی مہنگی ملتی ہیں کہ ان کی گذر نہیں ہوتی لیکن اُمید ہے کہ یہ سب دقتیں رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی اور کام اچھی طرح چلنے لگے گا۔ یہی کیا کم ہے کہ جس کام کی تیاریاں ایک چوتھائی صدی سے ہو رہی تھیں اس کا آغاز حکومت نے پہلے ہی سال شروع کر دیا۔ (ع۔ ح)

مشرقی دُنیا

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں

اس مہینے کے پہلے ہفتے میں جنوبی مشرقی ایشیا کے برطانوی گورنروں اور فوجی عہدہ داروں کی ایک دوروزہ کانفرنس سنگاپور میں ہوئی۔ لڑائی کے بعد سے یہ پہلی بڑی کانفرنس ہے۔ اس کانفرنس میں موضوع گفتگو کیا تھا، یہ بتایا نہیں گیا۔ لیکن قیاس کیا گیا ہے، اور یہ قیاس یقین سے کم نہیں، کہ برطانوی دولت مشترکہ کے اس بہت ہی اہم علاقے کے وقائع کے متعلق بحث و گفتگو ہوئی۔ اس کانفرنس میں ملایا، سنگاپور، اور ہانگ کانگ کے نمائندے شامل تھے۔ ملایا میں بڑے پیمانے پر گوریلا جنگ ہو رہی ہے جس کا مقصد ٹین اور ربر کی صنعتوں کو بیکار کردینا اور آخرکار ایک کمیونسٹ ریاست قائم کرنا ہے۔ سنگاپور کے بحری اڈے کو مضبوط کیا جا رہا ہے تاکہ وہ کمزوریاں دور ہو جائیں جن کی وجہ سے پچھلی لڑائی میں یہ اڈہ فتح ہو گیا تھا۔ انگریزی سیاست دانوں کو شاید ملایا کے آتش فشاں کی حدت کا اندازہ تھا اور اس لئے سنگاپور کو الگ کر دیا گیا تھا۔ اگر ملایا میں برطانوی حکومت کو زوال ہوا تو سنگاپور کو اڈا بنا کر ملایا کو دوبارہ فتح کرنا ہوگا۔ اب رہا ہانگ کانگ، قوم پرست چینیوں کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ جزیرہ چین واپس کر دیا جائے تاکہ وہ اسے اپنی ریپبلک میں شامل کرلیں اور دوسری طرف جنوبی چین میں کمیونسٹ گوریلا فوج کا ڈر ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں برطانوی مقبوضات اس وقت شدید خطرے میں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ گورنروں کی اس کانفرنس کے عملی نتائج کون سی شکل اختیار کرتے ہیں۔ کانفرنس کے فیصلے بتلائے نہیں گئے ہیں، اس لئے اس پالیسی کا جو یہاں وضع کی گئی ہے، نقشہ اگلے کچھ مہینوں میں جنوبی مشرقی ایشیا کے سیاسی اسٹیج کی چالوں کو دیکھ کر سمجھ میں آسکے گا۔

جرار فوج اور ماہر کتے

ملایا میں کمیونسٹ گوریلا فوجوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ تعداد کی یہ کمی ممکن ہے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہو کہ برطانوی حکومت کی جمہوریت نوازی سے بیزار صرف مٹھی بھر سر پھرے ہیں۔ لیکن وجہ جو کچھ بھی ہو اتنا تو طے ہے کہ ملایا کی بغاوت اس سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع ہے جتنا برطانوی حکومت اسے تسلیم کرتی ہے۔ فینشن ترجمے سے نہ روس اور اس کے ساتھی ملکوں کو آہنی پردے کے پیچھے کہا جائے لیکن برطانیہ کی نوآبادیوں کے متعلق جس طرح خبریں آتی ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کو بھی کچھ چھپانا ضرور ہے۔ ملایا میں برطانوی حکومت کی عظیم الشان کامیابیوں کی خبریں کئی بار آچکی ہیں۔ لیکن ملایا کی بغاوت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ جلد ختم ہونے والی ہے۔ خود برطانوی حکومت کی تیاریاں بھی اسی بات کی چغلی کھاتی ہیں۔ برطانوی طاقت کے مظاہرے کی خاطر "گارڈز بریگیڈ" جو برطانوی فوج کے بہترین تربیت یافتہ فوجی ہیں، ملایا بھیجے جا رہے ہیں۔ ان کے پہنچ جانے کے بعد جنوبی مشرقی ایشیا میں دو ڈویژن برطانوی فوجیں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اتنی تعداد میں فوج پچھلی لڑائی کے بعد سے کبھی ملایا میں نہیں بھیجی گئی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ خبر آئی تھی کہ ملایا کے جنگلوں میں کمیونسٹوں کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے برطانوی حکومت تربیت یافتہ کتے بھی لا رہی ہے۔

لیکن اس تمام فوجی طاقت کے یکجا کرنے سے صرف ملایا پر قبضہ رکھنا مقصود نہیں برما کی بغاوت، سیام میں فیلڈ مارشل پبل سونگرم کے خلاف بغاوت اور انڈونیشیا کی سیاسی صورت حال ان سب نے مل کر اس علاقے میں برطانوی اقتدار کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ویسے تو اصل خطرہ کمیونسٹ استبداد کے پھیل جانے کا بتایا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی سچی بات کچھ لوگوں کے منہ سے نکل جاتی ہے ایشیائی قومیت سے کچھ لوگوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ بنگال کے ایک سابق گورنر مسٹر آر جی کیسی نے "ایشیائی قومیت کے بڑھتے ہوئے خطرے" سے اپنے ملک اور برطانیہ کو آگاہ کیا ہے۔ ایشیا اور ہندوستان کے کروروں ننگے بھوکے جواب گورے رنگ سے اتنے مرعوب نہیں ہوتے۔ مغربی تہذیب کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ جو لوگ جنوبی مشرقی ایشیا کی جنگ آزادی کو کمیونسٹ استبداد کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو مغربی جمہوریت نوازوں کی جنگی کارروائیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

ازماست کہ برماست

برمی وزیر اعظم تھاکن نو کی اصول پرستی پارٹی کے شکنجوں میں دب کر کچھ مرہم ہو گئی [illegible] انھوں نے کچھ مذہبی جوش و خروش، کچھ علم دوستی کے انداز میں کیا تھا، ہوا میں اُڑائے گئیں۔ برما کی حکومت اب کمیونسٹ پارٹی کے دشمنوں کا ایک مجموعہ ہے اور کچھ نہیں۔ سیاست کے اس رنگ سے برما میں بغاوت کی شدت کا بڑھ جانا یقینی تھا اور یہی ہوا۔ فوج اور پولیس کے کچھ لوگوں نے بغاوت کردی ہے اور اگرچہ یہ بغاوت شاید کسی منصوبہ یا نقشے کے مطابق نہیں ہے لیکن اس کا کمیونسٹ نقشہ بن جانا ناممکن نہیں۔ ابھی برما سے خبریں الجھی ہوئی آرہی ہیں اس لئے فی الحال دلچسپ موضوع گفتگو اس بغاوت کے اسباب اور اس کی نوعیت ہے۔ برطانیہ کے نزدیک تو یہ عالمگیر کمیونسٹ سازش کا نتیجہ ہے۔ جو برما کی اندرونی سیاسی اور معاشی حالت سے کسی قسم کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھتی۔ او ٹن ہٹ صاحب نے جو برما کے وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ ہو کر اب فوج میں شامل ہو چکے ہیں ایک اور شوشہ چھوڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سازش کا منصوبہ ہندوستانی کمیونسٹوں نے کلکتہ کے اجلاس میں بنایا تھا انھوں نے اتنا احسان کیا کہ یہ اعتراف کر لیا ہے کہ کمیونسٹوں کو کسی بیرونی ملک سے مدد نہیں مل رہی ہے ایک برمی اخبار نویس نے بتایا ہے کہ برمی حکومت نے امریکہ کو یہ اطلاع دے دی ہے کہ برما کو اس بغاوت کے کچلنے میں بیرونی مدد کا سہارا لینا ہوگا برمی سیاست کا یہ رنگ ہی اس بغاوت کا فوری سبب ہے۔ برمی حکومت کے کچھ ذمہ دار اصحاب جن میں برطانیہ کے پرانے دوست او ٹن ہٹ صاحب شامل ہیں عرصے سے کمیونسٹوں کو کچل ڈالنے کے منصوبے تیار رہے تھے۔ پچھلے مارچ میں حکومت نے اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کو کچل دینے کی پوری تیاریاں کر چکی ہے۔ پھر وزیر اعظم کے اثر سے مجبور ہو کر باغیوں کو عام معافی دینے کا ایک ڈھونگ رچایا گیا۔ لیکن ظاہر ہے جب وزیر اعظم یہ کہیں کہ مزدوروں پر سختیاں نہ ہونی چاہئیں، اور یہ سختیاں ہوتی رہیں تو اس عام معافی پر کمیونسٹ کیوں کر بھروسا کرتے۔ انھوں نے بغاوت کر دی، اس میں تو کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ شورش عرصے تک جاری رہے گی اور تاریخ کے دستور کے مطابق ناکام ہوئی تو بغاوت اور کامیاب ہوئی تو انقلاب کہلائے گی

کیا جمہوریت اسی کا نام ہے

اوٹاکمنڈ میں ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن کے جلسے میں اس سوال پر بڑی بحث ہوئی تھی کہ انڈونیشیا کو کمیشن کا ممبر ہونے کی اجازت دینی چاہیے یا نہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریت دوست ملک نے اس کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر گریڈی نے ارشاد فرمایا اگر انڈونیشیا کو ممبری کا حق ہو تو حیدرآباد کو کیوں نہ ہو۔ اب بحث کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اور انڈونیشیا اور ویٹ نام کی جمہوریتوں کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ جنیوا میں کئی دن کی بحث و گفتگو کے بعد جب اس مسئلہ کو ٹالنے کی کوششیں ناکام ہوئیں تو آخرکار جمہوری نمائندوں نے روس کے اس رزولیوشن کو کہ ان ملکوں کے بغیر ایشیا کی معاشی ترقی کا کام مناسب طرح سے انجام نہ ہو سکے گا نامنظور کر دیا۔ فرانس کے جمہوری نمائندے صاحب نے ارشاد فرمایا ویٹ نام کی جمہوریت کا نہ واقعتہً وجود ہے نہ قانوناً۔ ڈچ نمائندے نے اپنے امریکی آقاؤں کا قول دہرایا کہ اگر انڈونیشیا کو یہ حق دیا جائے تو حیدرآباد کو بھی کیوں نہ دعوت دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام واقعات کے باوجود جمہوریت دوستی کا بھانڈا پھوٹ کیوں نہیں جاتا۔

ایشیا ہی سے متعلق ایک اور کارنامہ ملاحظہ ہو۔ روس نے ایک رزولیوشن کے ذریعے چاہا تھا کہ ایشیا میں صنعتی ترقی کا مقصد قرار دیا جائے کہ ایشیائی قوموں کی نوآبادیاتی اور معاشی غلامی مٹ جائے۔ برطانیہ کے نمائندے ہکشر میکینل صاحب نے اس رزولیوشن کو سیاسی مینی فسٹو قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے کہ اس علاقے کی موجودہ معاشی بدحالی اس بات کا نتیجہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ ابھی خود مختار نہیں ہوا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ واقعی جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کی سبھی ملکوں کی سیاسی زندگی نوآبادیاتی ہے، جس میں زراعت اور کان کنی زیادہ اہم ترپیشے ہیں کمیشن کو معاشی زندگی کا یہ نقشہ بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انڈونیشیا ملایا اور ویٹ نام چھوٹے علاقے ہوں تو ہوں لیکن انھیں آزادی کا حق اتنا ہی ہے جتنا برطانیہ عظمیٰ کے مٹھی بھر لوگوں کو۔

(ا، س)

براہِ کرم خط لکھتے وقت
اپنا پتہ صاف صاف
انگریزی میں بھی لکھئے

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

اختر انصاری

اسباب سے ہم معذور سہی ｜ تقدیر کے ہم مقہور سہی
مختار نہیں، مجبور سہی ｜ مقصودِ دلی پانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

وہ فکر کی سحر آگیں دنیا ｜ وہ سیم فشاں زرّیں دنیا
جو دور ہے وہ رنگیں دنیا ｜ نزدیک اُسے لانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

اشکوں میں ہے اپنے جس کی جھلک ｜ ہے اپنی نظر میں جس کی ڈلک
اور پا نہیں سکتے جس کو ملک ｜ اُس خلد کو اپنانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

آتی ہے غنا کو جس سے حیا ｜ جڑنے میں ہے نادر، دُھن میں نیا
پہلے جو کبھی گایا نہ گیا ｜ وہ گیت ہمیں گانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

زرتار ہو جس کا ہر شعلہ ｜ گلزار ہو جس کا ہر شعلہ
مے بار ہو جس کا ہر شعلہ ｜ اُس آگ کو بھڑکانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

جو غم کو بنا دے افسانہ ｜ ہر درد سے کر دے بیگانہ
چھلکا دے خوشی کا پیمانہ ｜ وہ عہدِ طرب لانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

اسباب سے ہم معذور سہی ｜ تقدیر کے ہم مقہور سہی
مختار نہیں، مجبور سہی ｜ مقصود دلی پانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

پھر اُفق پر پھینکتا ہے کوئی تاریکی کا جال
تیرے اِن روشن جہانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

عشق کی رگ رگ سے پھر رستا ہے یہ کس کا لہو
آج غم کے رازدانوں کو نہ جانے کیا ہوا

گونجتے ہیں پھر تصور میں اجل ~~کے قہقہے~~
زندگی کی داستانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

چھین لینا چاہتا ہے کوئی دل کے حوصلے
آج تیرے ناتوانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

پھیلتے جاتے ہیں سائے، بجھتے جاتے ہیں چراغ
اب وفا کے پاسبانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

کھو گیا ہے آج جیسے آ کے منزل پر کوئی
صبحِ نو کے کاروانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

دوسرا۔ ایک والنٹیر کو پوسٹر لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

پہلا۔ ایک گمنام مگر جوشیلے آدمی عبدالقدیر کو باغیانہ تقریر کرنے پر پکڑ لیا گیا۔

دوسرا۔ عوام کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ حکومت نے ڈر کر فیصلہ کیا کہ مقدمہ جیل کے ایک بند کمرے میں کیا جائے۔

پہلا۔ ۱۳ر جولائی کی صبح جب مقدمہ پیش ہونے والا تھا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ سنٹرل جیل کے پھاٹک کے سامنے جمع ہو گئے۔

پہلا۔ کشمیر کا باسٹیل گھر گیا۔

دوسرا۔ ویسا ہی انقلابی جوش۔

بھیڑ۔ اللہ اکبر۔

پہلا۔ افسر گھبرا گئے۔ انھوں نے عوام کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

دوسرا۔ عوام بگڑ بیٹھے، انھوں نے مطالبہ کیا۔۔۔۔۔

بھیڑ کا لیڈر۔ ہمارے لیڈروں کو۔۔۔۔۔۔۔

بھیڑ۔ چھوڑ دو!

لیڈر۔ ہمارے لیڈروں کو۔

بھیڑ۔ چھوڑ دو!

پہلا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دئے گئے۔

دوسرا۔ پتھر چلنے لگے۔

پہلا۔ انقلاب آ پہنچا۔

دوسرا۔ سرکاری افسروں کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

(گولیاں چلنے کی آواز)

پہلا۔ گولیاں۔

دوسرا۔ آزادی کے متوالے۔۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ انقلاب کے دیوانے۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا۔ گولیوں سے کب ڈرتے ہیں۔

پہلا۔ سینہ تان کر سامنے آ گئے۔

دوسرا۔ قمیصوں کو پھاڑ کر، چھاتیاں ننگی کر کے بندوقوں کے سامنے ڈٹ گئے۔

کشمیری۔ مارو کتنی گولیاں مارتے ہو

(گولیاں چلنے کی آواز)

کشمیری۔ آہ۔

پہلا۔ ایک دو نہیں، اُنتیس ۲۹ مارے گئے۔

دوسرا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔

پہلا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔

دوسرا۔ کشمیر کا جلیان والا باغ۔

پہلا۔ کشمیر کا باسٹیل۔

دوسرا۔ جان دے کر وہ ظلم اور استبداد کی بنیادیں ہلا گئے۔

پہلا۔ انقلاب کا راستہ دکھا گئے

دوسرا۔ اسی وقت شہیدوں کے جنازوں کا جلوس نکالا گیا۔

پہلا۔ کوئی اُسے نہ روک سکا، نہ پولیس نہ فوج۔ پہلی بار عوام نے اپنی طاقت کو آزمایا۔

کشمیری۔ وہ دیکھو جلوس کے آگے آگے۔

دوسرا کشمیری۔ لال جھنڈا؟

کشمیری۔ ہاں شہیدوں کے خون سے رنگا گیا ہے۔

دوسرا۔ اور ان شہیدوں کی یاد میں کشمیر کے قومی جھنڈے کا رنگ آج تک لال ہے۔

پہلا اناؤنسر۔ مگر یہ کیا ہو رہا ہے!۔۔۔۔۔؟

دوسرا۔ عوام کے دشمن انھیں بہکانے میں کامیاب ہو گئے عوام کے قدم ڈگمگا گئے۔

ایک کشمیری۔ ہندو مسلمان فساد ہو گیا۔ ہندوؤں کی دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔

دوسرا کشمیری۔ ٹھیک تو ہے۔ ہندوؤں نے دوکانیں کیوں بنا رکھی ہیں؟

(پولیس کی سیٹیوں کی آواز)

آوازیں۔ پولیس! پولیس۔ ملٹری۔ ملٹری۔

کشمیری ہندو۔ اب ہم مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔

(دکانوں کے لوٹنے کی آوازیں)

کشمیری۔ اب مسلمانوں کی دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔

پہلا اناؤنسر۔ چند لمحوں کے لئے عوام راستہ بھول گئے۔

دوسرا۔ انقلاب نے ٹھوکر کھا لی۔

پہلا۔ ٹھوکر کھا کر ہی چلنا سیکھتے ہیں

دوسرا۔ ۱۳ر جولائی کو کشمیری عوام نے سیکھا کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

پہلا کشمیری۔ یہ ہماری بھول تھی کہ ہم آزادی اور اتحاد اور جمہوریت کا راستہ چھوڑ کر فرقہ پرستی اور نفاق کے راستے پر چل پڑے۔

دوسرا کشمیری۔ یہ کون کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ شیخ محمد عبداللہ۔

دوسرا کشمیری۔ تو کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

پہلا کشمیری۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ ہے مگر ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ کر فرقہ پرستی کا دامن پکڑ لیا وہ کہتا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کی لڑائی ظالم حاکموں اور سرمایہ داروں کے خلاف ہے، ہندو عوام سے نہیں ہے! ہندو عوام ہمارے دوست ہیں، ہمارے ساتھی ہیں۔

دوسرا کشمیری۔ اور کیا کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ کہتا ہے کہ اتفاق اور اتحاد کے بغیر ظلم کے پنجے سے کبھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی، کشمیر کے ہندوؤں مسلمانوں، سکھوں کو قدم ملا کر شانہ بہ شانہ چلنا ہوگا۔

دوسرا کشمیری۔ اور کیا کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ کہتا ہے کہ اگر ہم سب اپنی قومی جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو ایک دن آئے گا جب مہاراجہ ہمارے جمہوری حقوق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ کوئی طاقت ہمیں غلام نہ بنا سکے گی۔ نہ کوئی راجہ مہاراجہ، نہ سرمایہ دار، نہ جاگیردار۔۔۔۔۔۔۔ اور نہ کوئی بیرونی حملہ آور۔

پہلا اناؤنسر۔ بس یہی ہے ۱۳ر جولائی کا پیغام۔

دوسرا۔ سترہ برس کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اتفاق اور اتحاد ہی میں ہماری نجات ہے۔

پہلا۔ آج ہم یوم شہدا مناتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا۔ اور شہیدوں کے خون میں رنگا ہوا لال جھنڈا لہراتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ آج ہم جمہوری حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا۔ اور آج جب ہمیں ہمارے ملک پر لٹیروں نے حملہ کر رکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ ہم کو ۱۳ر جولائی کا پیغام نہ بھولنا چاہئے۔ جو ہمیں شہیدوں سے ورثہ میں ملا ہے!

دوسرا۔ وہ پیغام کیا ہے؟

پہلا۔ اتفاق اور اتحاد ہی سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اتفاق اور اتحاد ہی سے وطن کی آزادی اور عزت کو دشمنوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

ہند پاکستان اور مسئلہ کشمیر (بسلسلہ صفحہ ...)

بچے بھی نہیں ہیں کہ کمیشن ان کو آسانی سے بے وقوف بنا لے گا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ کشمیر و جموں کے باشندوں کی آزاد رائے شماری کا جو فیصلہ ہوگا اُسے منظور کر لیں گے۔ اس لئے اصل مسئلہ یہی ہے کہ آزاد رائے شماری کا کیا طریقہ ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ریاست میں امن کی حالت پیدا ہو۔ بھاگے ہوئے لوگ اپنے گھروں میں آ کر بسیں اور اس کے بعد کمیشن کے ناظروں کے سامنے لوگوں کی رائیں درج کی جائیں۔ پاکستان کے یہ مطالبے کہ اس کی فوجیں کشمیر کے محاذ پر رہیں اور شیخ عبداللہ کی حکومت ہٹا کر دوسری حکومت قائم کی جائے، عقل و انصاف کے رو سے ناقابل قبول ہیں اس لئے کہ ان کے پورا کرنے سے تو حالت امن کسی طرح قائم ہی نہیں ہو سکتی جو رائے شماری کے کام کے لئے ناگزیر ہے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی اٹھارہ سال سے برابر کشمیر کے عوام کے ساتھ رہے ہیں۔ کئی بار آزادی کی جدوجہد کر چکے ہیں ان کے ساتھ جیل جا چکے ہیں اور طرح طرح کی قربانیاں دے چکے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں آج کشمیر کی باگ ڈور ہے۔ ان ہی نے اس قیامت کے بعد جو ڈوگرہ حکومت کے مظالم سے پچھلے سال برپا ہوئی تھی، ریاست میں امن قائم کیا اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو جو جموں میں لگی تھی کشمیر تک پہنچنے سے پہلے بجھا دیا۔ ان ہی کی بدولت فرقہ پرستی کا زہر جو اب بھی جا بجا ریاست کے جسم اجتماعی میں موجود ہے اس کے خون میں پھیلنے نہیں پاتا۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی حکومت کے متعلق کا حفاظتی کونسل یا کشمیر کمیشن کو کوئی حق نہیں ہوئی ذی عقل ایسے پُر آشوب زمانے میں ایک بنی بنائی جمی جمائی حکومت کو ہٹانے کا نام نہیں لے سکتا جس کے حامی اٹھارہ سال کے سابقہ کی شہادت کے مطابق جمہور کے معتمد اور ہر دل عزیز لیڈر ہیں۔ پاکستان کی حکومت کا کہنا ہے کہ پرانے حالات دفعتہ بدل گئے ہیں اور اب شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ مگر دنیا کے دستور، قانون، عقل اور انصاف سب کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک نئے دعوے کا ثبوت عام رائے شماری سے نہ مل جائے اس وقت تک سابقہ حالات کی شہادت ہی کو قابل اعتماد سمجھا جائے۔

اگر پاکستان کے ارباب حل و عقد کو بیرونی اور اندرونی حالات کی نزاکت کا اندازہ ہے اور وہ فوری صلح کو پاکستان اور ہندوستان کی سلامتی کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں تو انھیں ایسی ناقابل عمل شرطیں لگا کر کمیشن کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہئے۔

تعریف کی قدر و قیمت

صالحہ عابد حسین

یہ تو آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ راشن کی سختی، چور بازار اور مہنگائی کے باعث اکثر بھوکے رہتے ہیں اور آپ ان پر ترس بھی کھاتے ہیں۔ شاید حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی بھی کوشش کرتے ہوں۔ مگر ان ہزاروں بھوکوں کی طرف آپ کا دھیان شاید ہی جاتا ہوگا جو آپ کی توجہ، قدر اور تعریف کے بھوکے ہیں جن کو جسمانی غذا تو بری بھلی مل ہی جاتی ہے مگر ان کی روح کی بھوک مٹانے والا کوئی نہیں۔

آپ کسی کی مناسب موقع پر تعریف، پرخلوص اور سچی تعریف کریں تو وہ ان پر جادو کا سا اثر کرے گی۔ انسان کی صحیح قدر پہچان کر اس کی تعریف کی جائے تو وہ اس کی نفسی زندگی پر بڑا گہرا اور پائدار اثر ڈالتی ہے۔ کسی قدردان کی فیاضانہ تعریف سن کر ممکن ہے آپ گھبرا جائیں، جھینپ جائیں، آپ کی زبان بند ہو جائے، نظریں جھک جائیں۔ لیکن اگر آپ فرشتے یا ولی نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ آپ کا دل مسرت سے جھوم نہ اٹھے اور آپ کے دل میں خود اعتمادی اور امنگ کی لہریں ہلکورے نہ لینے لگیں۔ اپنی تعریف سن کر دس آدمیوں میں نو آدمیوں کے دل میں یہ خیال ضرور گذرے گا کہ اپنا کام اور بھی زیادہ شوق اور محنت سے کرنا چاہئے۔ جس کی تعریف کی گئی ہے وہ آئندہ بھی اس کا مستحق ثابت ہوں اور میرے مداح کو میری طرف سے ناامیدی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں میں اس کی نظر میں ہلکا ثابت ہوں۔

ڈاکٹر جانسن اپنے ایک مداح کے بارے میں کہتا ہے "اس نے میری اس وقت تعریف کی جب یہ تعریف میرے لئے ایک بڑی اہمیت رکھتی تھی یعنی جب لوگ اس کے کام کی قدر اور اس کی ادبی عظمت سے ناواقف تھے اس وقت اس کے مداح نے اس کی قدر پہچانی اور تعریف کرکے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ہمارے بہت سے مشہور راہبر، لیڈر، شاعر اور ادیب ایسے ہیں جو اپنی شہرت اور کامیابی کے لئے کسی ایسے شخص کے مرہون منت ہیں جس نے اس وقت ان کے جوہر کو پرکھا جب دوسرے اس سے بے خبر تھے اور وہ پھر اتنا کشادہ دل بھی تھا کہ اس نے ان کی تعریف کرکے ان کی ہمت افزائی کی۔ انھیں خود اعتمادی کی دولت دی اور ترقی کی راہ میں قدم آگے بڑھانے کا حوصلہ اور میدان عمل میں جد و جہد کی ایک نئی طاقت بخشی۔

آپ خواہ لیڈر ہوں یا استاد، باپ ہوں یا ماں، سرپرست ہوں یا مربی، نقاد ہوں یا دوست کوئی بھی ذمہ دار حیثیت رکھتے ہوں آپ کا یہ فرض ہے کہ دوسروں کے کام اور صفات کو پہچانیں اور ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔

یوں تو دوسروں کی نظر میں اپنی قدر و عزت بڑھانے اور اپنی تعریف کرانے کا شوق کون ہے جسے نہ ہو۔ جو لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس جذبے سے بہت اونچے ہیں، وہ غالباً اور زیادہ تعریف کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن بچے، نوجوان اور عورتیں قدر اور تعریف کی ہمیشہ زیادہ خواہش مند نظر آتی ہیں۔ ان کی آرزو ہوتی ہے کہ لوگ ان کی صفات کو پہچانیں اور ان کے کام کو دیکھیں اور پرکھیں اور اس کی قدر اور تعریف کریں۔ اکثر جوانی کی ناکامیوں اور نوجوانوں کی ناشاد اور افسوسناک زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں جاکر پتہ چلے گا کہ ان کا بچپن توجہ، تعریف اور محبت کی بھوک میں کٹا ہے۔ اس وقت کی بزرگوں اور استادوں کی بے پروائی اور بے توجہی نے ان کی آئندہ ساری زندگی تلخی اور ناکامی کی نذر کر دی۔

ہمارے یہاں کی ایک مثل ہے "گھر کی مرغی دال برابر" جس سے ہم زیادہ قریب ہوتے ہیں جس کے کام اور خوبیاں ہر وقت ہماری نظر سے گذرتی رہتی ہیں اس کی ہم بہت کم قدر کرتے ہیں اور عام طور سے اس کی طرف سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کی گھریلو زندگی پر یہ مثل اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ اکثر ماں اور باپ بچوں کی ضرورتوں اور خوبیوں دونوں سے بے پروا اور ناواقف رہتے ہیں۔ جسمانی ضرورتیں ممکن ہیں پوری کر دی جائیں لیکن اس کا احساس بہت کم بزرگوں کو ہوتا ہے کہ بچے کو ہماری توجہ کی اور صحیح تعریف کی کتنی سخت طلب اور ضرورت ہے اور وہ اس پر کیسا دل خوش کن اور دیرپا اثر ڈال سکتی ہے۔ اسی طرح ایک گھر والی بیوی جو رات دن شوہر، بچوں اور خاندان بھر کے لئے اپنی ہڈیاں پیلتی اور تکلیفیں سہتی رہتی ہے اس کی خدمت اور محنت اور کام کی تعریف بہت کم کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ اس کی بھوکی اور مستحق ہوتی ہے کہ اس کے کام کی تعریف کی جائے۔ اس لئے کہ اس کا کام اب ایسا تو نہیں کہ دنیا بھر کو نظر آئے اور غیر بھی آکر اس کی تعریف کریں۔ اس کے کام کی تعریف اور قدر تو گھر والے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے "آخر عورت کا تو کام ہی یہ ہے۔ اس میں بھلا تعریف کی کیا بات ہے؟" یا "یہ بچاری یہ نہ کرے گی تو اور کرے گی بھی کیا" وہ "عورت ہی کیا جو گھرداری اور بچوں اور شوہر کی خدمت نہ کرے" آپ جو کھانا مزے لے لے کر کھاتے ہیں اور خوش وضع اور آرام دہ کپڑے پہنتے ہیں، جس گھر میں راحت و سکھ کا لطف اٹھاتے ہیں اس کے بنانے اور سنوارنے والی کی تعریف اور قدر کیوں نہیں کرتے؟ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو نہ صرف بے حس اور ناقدر شناس ثابت ہوتے ہیں بلکہ اکثر اس کے بڑے خراب نتیجے بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اکثر گھروں میں محض تعریف اور قدر کی اس کمی کی وجہ سے عورتیں چڑچڑی، بدمزاج، بددل یا کبھی اور بعض اوقات ہسٹریا اور دوسری نفسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں، حالانکہ برمحل اور پرخلوص توجہ اور تعریف بڑی آسانی سے انھیں اس سے بچا سکتی ہے۔

ایک آدھ جملہ اپنی تعریف و توصیف سے بچا کر اپنے پاس محفوظ رکھئے، اور کسی لڑکے، لڑکی، گھر والی بیوی، کسی کارگذار نوکر، کسی ابھرتے ہوئے فن کار غرض کسی بھی مستحق کو فیاضی کے ساتھ بخش دیجئے اور دیکھئے کہ وہ کیسا اچھا اثر ڈالتا ہے۔

ہمارے ہاں بچے اپنے بزرگوں خاص طور پر اپنے استاد اور اپنی ماں کی بدمزاجی کا بڑا آسان شکار ہیں۔ ماں کسی بات پر جھنجھلائی ہے، تھکی ہوئی ہے یا بیمار ہے، شوہر سے لڑائی ہوئی ہے، یا ساس نے ڈانٹا ہے، غصہ غریب بچے پر اترتا ہے۔ استاد بیوی سے لڑ کر آیا ہو، یا کھانا بدمزہ ملا ہو، کسی افسر کی ڈانٹ کھائی ہو، یا کسی دوست سے جھڑپ ہوئی ہو جھنجھلاہٹ اور غصہ ڈانٹ اور بید کی شکل میں شاگرد پر اتارنا بہت آسان سا کام ہے۔

لیکن ماں اور استاد کا یہ فعل بڑے مہلک اثرات اور خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ کون نہیں مانتا کہ ماں اور استاد کا یہ فرض ہے کہ بچے کو بری بات سے روکیں اور غلط کام سے بچائیں اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ بچے کی تعلیم اور تربیت بڑا کٹھن اور صبر آزما کام ہے اور بعض اوقات اس کے لئے سزا بھی دینی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ہماری مائیں اور استاد دونوں بچے کی فطرت اور نفسیات کا ہمدردی اور غور سے مطالعہ کریں اور دل سوزی اور محبت سے کام لیں تو اس کے نتائج مار دھاڑ، غصے اور خفگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش گوار نکلیں گے۔

جو استاد اور مائیں آسانی سے بچے کی خوبیوں کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی تعریف کرنے میں بھی کنجوسی نہیں کرتے کہ تعریف بچے کا دل بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے، وہ بچے کی طبیعت اور فطرت پر بڑے دیرپا اور خوش گوار اثرات ڈال سکتے ہیں جس سے بہت ممکن ہے کہ اس کی آئندہ ساری زندگی بن جائے۔

اس طرح مالکوں اور آقاؤں کو بھی نوکروں اور مزدوروں کو محض مشین کے پرزے نہ سمجھنا چاہئے، یہ خطرناک غلطی ہے۔ انسان غریب ہو یا امیر بہر حال انسان ہے وہ نہ لوہے یا لکڑی کا بے جان آلہ یا پتلا ہے اور نہ جانور ہے ایک مزدور اور ادنیٰ ملازم کو بھی قدر و عزت کی خواہش اور تعریف کی بھوک اسی طرح ہوتی ہے جس طرح کسی بڑے رئیس یا لیڈر یا ادیب، شاعر، مصور وغیرہ کو۔ جو لوگ اس گر کو جانتے ہیں اور اپنے ملازموں کے قابل قدر کاموں کو پہچان کر ان کی کھلے دل سے تعریف کرتے ہیں وہ صرف ان کی بھوکی روحوں کو غذا ہی نہیں پہنچاتے بلکہ خود ان کا کام بھی زیادہ اچھا اور آسانی سے ہوتا ہے اور ملازم اور مزدوروں کو ان سے انس اور ان پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

صحیح وقت، مناسب موقع پر کی ہوئی پرخلوص اور سچی تعریف بڑی نعمت ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلا کر آپ وہ مسرت محسوس نہیں کر سکتے جو قدر و عزت کی پیاسی روحوں کو ان کی دماغی غذا پہنچا کر آپ کو ملے گی۔ دوسروں کی تعریف کھلے دل اور فیاضی سے کیجئے اور اگر اس چیز میں کنجوسی ہی کرنی ہے تو اپنی تعریف میں کیجئے نہ کہ دوسروں کی۔ (ماخوذ)

"زکام اڑتالیس گھنٹے میں دور ہو سکتا ہے۔ دوا کی ضرورت نہیں۔ صرف نیچے لکھی ہوئی تدبیریں کافی ہیں:

(۱) سب سے پہلے ایک ہلکا سا مسہل مثلاً سنا کی پتیوں کا لے لیجئے۔

(۲) پھر گرم پانی سے نہائیے اور تولیے سے بدن خوب رگڑ کر ملئے۔

(۳) اس کے بعد گرم بستر میں لیٹ جائیے۔

(۴) کوئی گرم چیز مثلاً نیبو کا آب شورہ پی لیجئے۔

(۵) اس وقت تک لیٹے رہئے جب تک زکام کی علامات بالکل دور نہ ہو جائیں۔

ان تدبیروں پر عمل کرنے سے وہ سمیت جسم سے خارج ہو جائے گی جو زکام پیدا کرتی ہے اور جسم کی قوت مزاحمت کم نہیں ہوگی۔ زکام کو بند کرنے کی کوشش کرنا یا زکام کی حالت میں چلتے پھرتے رہنا عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

سوئٹزرلینڈ

فاقہ مست مغربی اقوام کے نزدیک سوئٹزرلینڈ عجیب و غریب طلسمی ملک ہے۔ جہاں کے لوگ اب بھی سفید روٹی اور گوشت کھاتے اور اصلی کافی اور دودھ پیتے ہیں۔ جہاں اس زمانے میں بھی لوگوں کے ناشتے میں انڈا ہوتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ غربت اور فلاکت کے سمندر میں خوش حالی اور مرفہ الحالی کا ایک جزیرہ ہے۔

اگر آپ فرانس، جرمنی، آسٹریا یا اٹلی سے آکر سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ ایک بالکل نئی دنیا میں آ گئے۔ کیونکہ اس ملک پر جنگ کی تباہ کاریوں اور خوف و ہراس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ اب بھی اچھا لباس پہنتے، اچھے کھانے کھاتے اور اچھے گھروں میں رہتے ہیں۔

اس دنیا سے امن و سکون میں۔ اس دل کش اور دل آویز سوئٹزرلینڈ میں جہاں کی فرحت دہ شادابی اور سکون و اطمینان میں جنگ کی تلخ کامیوں کا کہیں ذکر نہیں، جہاں کے لوگ مسلسل چھ صدی سے زبان، نسل اور قومیت کے اختلاف کے باوجود اتحاد و اتفاق اور میل و محبت کی زندگی گذار رہے ہیں ــــــ متحدہ اقوام، امن اور امن سے بڑھ کر پوری دنیا کے امن و سکون کے بابت خوش آیند امیدیں کتنا اور کچھ توقعات قائم کرنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے مغربی لوگوں کی طرح سوئستانی لوگ جمہوریت کے متعلق سوالات نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اب محتاج ارد و قدح نہیں رہا بلکہ پوری طرح حل ہو چکا ہے ــــ کیونکہ اس کی بدولت ان کو براعظم یورپ میں سب سے بلند اور برتر معیار زندگی مل سکا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی دولت کا اندازہ فی کس دولت سے لگایا گیا ہے۔ جو برطانیہ سے ۲۵ فی صدی زیادہ اور امریکہ سے ۲۰ فی صدی کم ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں صرف ایک آدمی بے روزگار ہے اور اگر آپ کسی سوئستانی سے پوچھیں کہ وہ کون ہے؟ تو آپ کو بتلائے گا کہ وہ شخص محکمہ بے روزگاری کا افسر ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے لوگ، خوش باش اور خود پسند ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ملک اور اپنی طرز زندگی پر بڑا ناز ہے۔ اُن کی حکومت بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ لیکن اور سب ملکوں کے مقابلے میں حکومت کے اختیارات سے بہت کم کام لیتی ہے۔ یہاں شدت پسند داہنے بازو اور بائیں بازو کی سی سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں۔

غرض سوئٹزرلینڈ ایک معتدل ملک ہے جہاں ایک معتدل قسم کی حکومت ہے، شہر میں سڑکوں کے کنارے جو قہوہ خانے ہیں ان میں لوگ بیٹھ کر سیاسیات پر خوب گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ان کی گفتگو کا موضوع غیر ملک کی سیاست ہوتی ہے۔ اپنے ملک کی سیاست نہیں کیونکہ وہاں ایسے مسائل ہی نہیں پیدا ہونے پاتے جن سے شہریوں میں ملکی سیاست پر گفتگو کرنے کا جوش پیدا ہو۔ سوئٹزرلینڈ ایسا ملک ہے جہاں واقعی پیشہ ور سیاست باز نہیں ہیں۔ سوئستانیوں کو اس پر ناز ہے کہ دنیا میں چاہے جیسا انقلاب آئے جس قسم کی تبدیلی ہو جائے لیکن ان کی ملکی سیاست اور ان کے ملکی سسٹم میں کوئی انقلاب اور کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی دونوں کو مکمل ثبات حاصل ہے۔ ابدی اور دائمی ثبات۔

ملک میں آپ کو چند ہی آدمی ملیں گے جو بے تامل اپنے صدر کا نام بتا دیں، صدر کا انتخاب صرف ایک سال کے لئے ہوتا ہے اور وہ مقننہ کے ماتحت رہتا ہے۔ اس کو ویٹو کا بھی حق نہیں ہوتا۔ درحقیقت اس کے اختیارات بہت ہی محدود ہوتے ہیں ....

سوئٹزرلینڈ میں حکومت کی خدمت کرنے کو بڑی عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں دوسرے ملکوں کی طرح اس کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا۔ چنانچہ نیشنل کونسل کے ممبر کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ہاں کونسل کے جلسوں کے دوران میں سفر خرچ کے علاوہ صرف ۳۵ فرنیک (جو تیس روپے کے قریب ہوتے ہیں) یومیہ ان کو ملتے ہیں۔

بہت سی چھوٹی ریاستوں میں قدیم یونانیوں کی طرح بلاواسطہ جمہوریت کا قاعدہ اب بھی رائج ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب باشندے مرکزی قصبے کے چوک میں جمع ہوتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کے اپنے ریاستی افسروں کا انتخاب کر لیتے ہیں، اس انتخاب میں جو بھی آتا ہے اپنے ساتھ ایک تلوار لاتا ہے، جو پرانے زمانے سے آزاد آدمی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ عورتوں کو ابھی تک رائے دینے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کل پندرہ ہزار سات سو پینتیس مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی بھی بہت کم یعنی کل ۴۲ لاکھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مختصر سے ملک نے تقریباً سات صدیوں سے دنیا کے سامنے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مختلف نسلوں کے لوگ کس طرح آپس میں بڑے اطمینان اور چین سے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کے پیچھے جرمن، فرانسیسی اور اطالوی برابر لڑتے رہے ہیں لیکن سوئٹزرلینڈ کے حدود کے اندر ہی تینوں قومیں مکمل صلح و آشتی اور برادرانہ محبت کے ساتھ ۱۳ صدیوں سے رہتی چلی آئی ہیں۔

زبان اور مذہب کا اختلاف کبھی بھی سوئستانی قوم کی اتحاد و یگانگت کو کمزور نہ کر سکا۔ سوئستانی چار مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ چنانچہ آبادی کے ۷۱ فی صدی لوگ ایک قسم کی جرمن زبان جس کا نام سوئستانی جرمن ہے بولتے ہیں اور تقریباً ۲۱ فی صدی لوگ ایک عجیب قسم کی فرانسیسی زبان بولتے ہیں جس کو سوئستانی رومانڈ کہتے ہیں۔ ۶ فی صدی اطالوی زبان بولی جاتی ہے اور ایک فی صدی رومانش زبان یہ ایک قدیم لاطینی زبان ہے جو خاص طور سے صرف سوئٹزرلینڈ ہی میں بولی جاتی ہے اور عہد رومان سے رائج چلی آ رہی ہے ــــــ ان چاروں زبانوں کو حکومت ملکی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے۔

موضوع تشنہ رہ جائے گا اگر یہ نہ بتا دیا جائے کہ باشندوں میں سے تقریباً ۵۷ فی صدی پروٹسٹنٹ ہیں ۴۱ فی صدی لوگ کیتھولک اور باقی دو فی صدی مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے باوجود سوئستان قانون مذہب اور ضمیر کی پوری آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔

اس ننھی مجلس اقوام کی ابتدا ۱۲۹۱ء میں ہوئی تھی اور وہ اس طرح کہ ملک کی تین ریاستوں، اوری، شوائتز اور نیڈروالڈن کے نمائندوں نے دائمی اتحاد کا حلف اٹھایا۔ بعد میں یہی حلف اتحاد آیندہ سوئستانی وفاق کی بنیاد بن گیا، اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا دوسرے فرقے کے لوگ بھی اس پرانی جماعت میں شامل ہوتے گئے اور انہوں نے باہمی اشتراک عمل اور اتحاد و یگانگی سے اپنے ان سب دشمنوں کا مقابلہ کیا جو تعداد، طاقت اور فوجی ساز و سامان میں ان سے کہیں زیادہ تھے۔

سولھویں صدی میں سوئستانیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ صلح جوئی اور امن پسندی ہی بہترین لائحہ عمل ہے۔ اسی لئے انھوں نے "جنگ اسی سالہ" سے اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ رکھا۔ چنانچہ جب ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کی صلح ہوئی تو مغربی ریاستوں نے سوئٹزرلینڈ کی غیر جانب داری کو تسلیم کر لیا، اور اس وقت سے لے کر آج تک سوئٹزرلینڈ غیر جانبداری کو نباہتا رہا ہے، البتہ ۱۷۹۸ء میں سوئٹزرلینڈ کی یہ روایت ٹوٹ گئی، یہ زمانہ نپولین کی مختصر جنگوں کا زمانہ تھا اور سوئٹزرلینڈ تین یورپی ممالک فرانس، آسٹریا اور روس کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ بڑی طاقتیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ سوئٹزرلینڈ کے اہم پہاڑی دروں پر کسی بڑے اور خطرناک دشمن کا قبضہ رہے۔ اس لئے انھوں نے سوئٹزرلینڈ کو ہمیشہ کے لئے غیر جانب دار ریاست قرار دینا منظور کر لیا۔

ویانا کانگریس کے موقعہ پر ۲۰ نومبر ۱۸۱۵ء کو ریاستوں نے ایک قانون پر دستخط کئے جس کا منشا یہ تھا کہ اب سوئٹزرلینڈ کی غیر جانبداری کو ہمیشہ کے تسلیم کیا جاتا ہے اور اتحادی طاقتیں اس کی ضامن ہیں کہ اس کی سرحدیں ــــ [illegible] نے اس اصول کو بالکل واضح کر دیا کہ سوئٹزر غیر جانبدارانہ پالیسی یورپ کے حق میں بجائے مضر ہونے کے مفید ہے۔ چنانچہ ویانا کانگریس نے ملک کی سرحدیں بھی مقرر کر دیں جو اب تک برقرار ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں سوئٹزرلینڈ نے بہت زیادہ معاشی اور فوجی نقصان اٹھا کر بھی اپنی خطرناک غیر جانبداری کو برقرار رکھا۔ جنگ میں جتنے ملک بھی شریک ہوئے تھے ان سب کی مرضی کے خلاف اس نے نہ صرف سب ملکوں کے امن پسند لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دی بلکہ اس نے عام انسانوں کی خدمت کا بھی بیڑا اٹھایا اور جنگی قیدیوں اور زخمیوں کی پوری پوری مدد کی۔ چنانچہ بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی کی بنیاد اسی جگہ پڑی۔ اس کا مرکز بھی اسی جگہ بنا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جو صلح نامے ہوئے ان میں بھی سوئٹزرلینڈ کی غیر جانب داری کی دوبارہ توثیق کر دی گئی اور جب سوئٹزرلینڈ مجلس اقوام میں باقاعدہ شریک ہوا تو مجلس نے بھی اس کی غیر جانب داری کو مان لیا۔ پوری مجلس اقوام میں صرف یہی ایک ملک تھا جس کو فوجی غیر جانبداری کے حقوق حاصل تھے۔

سوئستانیوں کے نزدیک ان کی غیر جانبداری بھی تقریباً ایک مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کو وہ آزادی کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ میں نے بہت سے سوئستانیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ہم اپنی غیر جانبداری کو چھوڑ بیٹھیں تو ایک آزاد ملک کی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱ | ۲۴ راگست ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

نور امید

(یہ ذاکر صاحب کا مکتوب گرامی ہے جو انھوں نے آنکھوں کے آپریشن کے بارھویں دن لکھا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ہاتھ کی جنبش ابصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے نقش بیٹھ اور آپس میں گڈمڈ بھی ہو گئے بڑی مشکل سے پڑھے گئے مگر پڑھ لئے گئے۔)

بیمارستان "لاکولین" جنیوا

۱۴ر جولائی

عابد صاحب،

آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر پر پڑا ہوں، کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں۔ اس وقت رات ہے، نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے نا آشنا کو اس کا پتہ اس سناٹے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے کے نیچے آگیا ہے اور بس مجھ سے ہی باتیں کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی سنتا رہوں۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔ اس کے دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا، اس وقت کام آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے گی مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور۔

اس حالت میں خط لکھنے کو جی یوں چاہا کہ شام ہوتے آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ شاید نئی روشنی ۱۶ ر کو نکل آئے گا۔ ۹ بجے سے جب سونے کا وقت سمجھ کر سب رفیق اور مددگار چلے جاتے ہیں، کچھ اسی کا دھیان بندھ گیا ہے۔ آج وہ پرچہ نکلا ہوگا اور میں نہ جانے کب اسے دیکھ سکوں گا؟ نہ جانے کب اس کے لئے کچھ لکھ سکوں گا؟ یہ پرچہ کیسی پریشانی کے وقت نکلا ہے۔ آپ کے اپنے اور سب اداروں کی طرح اس کی بے سروسامانی کا حال بھی جانتا ہوں۔ چل بھی سکے گا یا نہیں؟ کیا پیسہ بنانے کا کام کئے بغیر رستے بنانے کا کام چل سکے گا؟ لوگ اسے غداروں کی سازش سمجھیں گے یا ساتھیوں، ہم سفروں کے دل کی آواز؟ یہ عام مذاق کو سدھار سکے گا یا عام بدمذاقی کا شکار ہو جائے گا؟ یہ حق کی تلخی سے کترائے گا تو نہیں؟ نشہ پلا کر لوگوں کو بدحواس اور بے عقل بنانے کا چلتا کاروبار تو نہیں کرنے لگے گا؟ نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اٹھتے ہیں۔ مایوس کن سے مایوس کن خیال آتا ہے مگر ٹھہرتا نہیں، جمتا نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کہ حالات کا، میرے اپنے ذاتی اور وطن کے عمومی حالات کا، تقاضا یاس افزا ہونا چاہیے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا، عابد صاحب، کہ ان پچھلے بارہ دنوں میں کتنے ہی مجھے کبھی ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات، میری بند آنکھیں برابر کمرے کو روشن پاتی ہیں۔ اس روشنی کی کچھ بے رنگیاں بھی محسوس کرتا ہوں، مثلاً میرے کمرے کا دروازہ جو میرے بائیں جانب دیوار کے بیچ میں ہے مجھے دوسرے کونے میں دکھائی دیتا ہے! لیکن پھر بھی یہ روشنی اسی طرح کی روشنی ہے، البتہ ذرا دھیمی دھیمی جیسی کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس روشنی میں وسیع کھیت دیکھتا ہوں، ہل کی لکیر صاف دکھائی دیتی ہے، اس کے ایک طرف روشنی ایک طرف سایہ تک محسوس ہوتا ہے! بڑے بڑے مکان بنتے دیکھتا ہوں، آس پاس کثرت سے تعمیر کا سامان۔ ۔ ۔ اس کی ٹھیک وجہ مجھے معلوم نہیں، نہ اس کے پتہ چلانے کی مجھے فکر ہے۔ آپ سے [illegible] اس لئے کیا کہ حالات کی تاریکی میں

میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ اس لئے کہ اس امید کی وجہ بھی صحیح معلوم نہیں ۔ نی کا شعر وجہ نہیں بتلاتا لیکن کیفیت کی صحیح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

دم بہ کوئے تو با صد ہزار نومیدی
بہ ایں خوش است کہ امید دار می گذرد

مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گذر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ کے میرے جیسے کمزور ہاتھ ہی مل کر کریں گے۔ اور ایک صحیح، عادل سماج بنانے کی کٹھن مہم سر کرنے کی کوشش ہی میں ہم سب کو اپنی شخصیت کے ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس مہم میں اونچا روشنی کی ہر قدم پر ضرورت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ یہ روشنی مہیا کرے۔ جی کہتا ہے کہ یہ مہیا کر سکے گا۔ آپ نے اس کا نام نئی روشنی خوب رکھا ہے۔ میری دوری اور بے بسی سے یہ نہ سمجھئے کہ اس دئے کی لو کو روشن رکھنے کے لئے میں اپنے آپ کو بچانے سے بچ نکلوں گا۔

سمجھتا ہوں کہ اب بس کروں۔ شاید اب صبح ہونے والی ہے۔ ابھی کچھ دیر ہوئی مرغ نے بانگ دی تھی۔ اب وہ چڑیا بولی جو روز میری کھڑکی کے قریب درخت پر بولتی ہے۔ پہلے ذرا آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر جیسے آزمائش ہو کہ اور بھی جاگتے ہیں یا نہیں۔ چند منٹ میں جہاں لوگ اور ہم نوا ملا کر ذرا جلد جلد اور تیز تیز۔ کوئی آدھ گھنٹے میں سارا باغ گونج اٹھتا ہے اور نغمے کا ایک ایسا طوفان ہوتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں ہی نہیں، درختوں کی ہر پتی اور چمن کا ہر پھول بھی اس کورس میں شریک ہو گیا ہے۔ مگر جب دن چڑھے آدمیوں کا شور و غل، ڈاکٹروں کی آمد، رسولوں کی مستعدی، اس جشن موسیقی کو دبا دیتی ہے، اس وقت بھی مجھے اس چڑیا کی آواز بار بار یاد آتی ہے اور سنائی سی دیتی ہے، جو پہلے پہل رک رک کر ذرا آہستہ آہستہ بولی تھی۔ اور آج ایسا لگتا ہے کہ شاید اس چڑیا ہی کا نام "نئی روشنی" ہے۔

بس خدا حافظ

آپ کا
ذاکر

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
نور امید	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱
گاندھی جی اور انقلاب ہند	پروفیسر ہمایوں کبیر	۲
ہند پاکستان اور مسئلہ کشمیر	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان		۴
۲۔ پاکستان		۵
مشرقی دنیا		۶
اس پار رہیں جان ہاں ضرور (نظم)	اختر انصاری	۷
غزل	خلیل الرحمن اعظمی	۷
تیرہ جولائی کا پیغام	خواجہ احمد عباس	۸
تعریف کی قدر و قیمت	صالحہ عابد حسین	۱۰
سوئٹزرلینڈ	(ترجمہ) عبدالحلیم ندوی	۱۱

قیمت فی پرچہ، تین آنے

گاندھی جی اور انقلابِ ہند

(۳)

پروفیسر ہمایوں کبیر

کم سے کم ان لوگوں کو ... کے ... ہوم رولے ... کہتے ہیں کہ گاندھی جی پر ... اعتراض کرتے ... تھی جو ... کے قائل ہیں ... کو ... ہم ... میں دکھتی ہے ... گاندھی جی نے ۱۹۲۲ء میں ... نہ ... زندگی کو معطل نہ کیا - وہ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ عوام کی بیداری کا ... گاندھی کے سر ہے ... نے ... حالات ... پر ... کیونکہ ... محض پیرپرستی اور جوشِ اعتقاد کی ... ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہ خیال جوشِ اعتقادی پر مبنی ہے ... کسی ملک کو آزادی ... ہو گیا یہ سمجھنا خوش اعتقادی نہیں ہے کہ ایک فردِ واحد کسی ملک کی آزادی کو روک سکتا ہے؟

جو فیصلہ گاندھی جی نے چوری چورا کے واقعے کے بعد کیا اس کی وجہ اس وقت کے حالات پر غور کرنے سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک جامد قوم میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی تھی لیکن صدیوں کا جمود اتنی جلدی دور نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مشین کو بھی جب وہ بالکل نئی ہو بڑی احتیاط سے برتنا پڑتا ہے۔ اسے آہستہ آہستہ چالو کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم جو نئی نئی جاگی ہو مشین سے کہیں زیادہ نازک چیز ہے۔ اور اس سے کام لینے میں کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی عوام کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ دونوں کے سینوں میں ایک ہی دل دھڑکتا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کی طاقت پر جو انھیں نیا نیا احساس ہوا ہے حد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس وقت اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے دل سے جیل کا خوف نکل گیا ہے۔ عام جوش اور ہیجان کے باوجود ابھی تک وہ اپنے مقصد کے لئے جان تو کیا مال کی قربانی بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ جدوجہد اور قربانی کا پہلا سبق آخری سبق سے بہت زیادہ آسان ہونا چاہیے۔

یہی مصلحت گاندھی اردن معاہدے کے وقت بھی ان کے پیشِ نظر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم نے ان کی آواز پر بڑی شان سے لبیک کہا تھا۔ عام لوگ مرد اور عورت لاکھوں کی تعداد میں نہ صرف جیل کے خوف کو بلکہ دولت اور املاک کی محبت کو بھی دل سے نکال چکے تھے۔ وہ خوشی خوشی قربانیاں دیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ان سے اور زیادہ قربانیاں طلب کی جائیں۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی نجات کا وقت آگیا ہے۔

مگر گاندھی جی تہہ کا حال جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ گو لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے ان کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ لیکن اس سے کہیں بڑی تعداد ابھی تک بے حسی اور جمود میں مبتلا ہے۔ اس کے علاوہ جتنا جوش تھا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا۔ ابھی تک وہ لگن دکھائی نہیں دیتی تھی جس کی بدولت انسان برسوں تک پتہ مار کر کام کرتا ہے اور بڑی سے بڑی رکاوٹ کو گھستے گھستے مٹا دیتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ ایسے وقت میں جبکہ فتح کا کچھ امکان باقی ہے صلح کر لینا اچھا ہے۔ دراصل جنگ کا نقشہ ایسا تھا کہ اگر کچھ دن اور چلتی تو برطانوی حکومت کا پلہ بھاری ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی امکان تھا کہ اگر عوام کی جدوجہد بہت طویل عرصے تک جاری رہتی تو پھر ایک بار ان کا پلہ جھک جاتا۔ مگر گاندھی جی کو یہ یقین نہ تھا کہ عوام میں جو نئے نئے جاگے ہیں اتنا دم ہے کہ لڑائی کو اتنی دور تک کھینچے جائیں۔ اس لئے انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ صلح کر لیں۔ آزادی سے پہلے گاندھی اردن معاہدہ کانگریس کی کامیابی کا سب سے اونچا درجہ تھا۔

مارکسی فلسفے کا نام لے کر گاندھی جی پر جو تنقید کی جاتی ہے اس کا حقیقت سے دور ہونا اس اعتراض سے بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے کے وقت ایک انقلابی عوامی تحریک کیوں نہیں شروع کی۔ کہتے ہیں کہ انگریز جو اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کی للکار کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ لیکن انگلستان کی مشکلات پر زور دیتے وقت وہ معاملے کے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان اس وقت بڑے شدید خطرے میں تھا لیکن پھر بھی اس کے پاس زبردست جنگی وسائل تھے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی حالت اس وقت انقلابی تحریک کے لئے سازگار نہ تھی۔ گاندھی جی کے سامنے تو دراصل اخلاقی اصول تھے جنھیں وہ ہر چیز سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ لیکن اگر وہ انھیں نظر انداز بھی کر دیتے تب بھی مصلحت کا تقاضا وہی تھا جو اخلاق کا تھا۔ عوام کے برسوں کے سابقے سے گاندھی جی کو یہ معلوم تھا کہ سیاسی تحریک کا زور اسی وقت ہوتا ہے جب معاشی حالت زیادہ خراب ہو۔ جنگِ عظیم تو ہندوستان کے لئے معاشی خوش حالی کا دور لے کر آئی تھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ خوش حالی محض عارضی تھی۔

اگر ۱۹۴۰ء میں جدوجہد کا فیصلہ کیا جاتا تو وہ ایسی فضا میں شروع ہوتی جب قیمتیں اور اجرتیں بڑھ رہی تھیں۔ ہر چیز کا بھاؤ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے کسان مجموعی طور پر مطمئن تھے۔ مزدور بھی اس وقت تو مطمئن ہی تھے۔ اس لئے کہ مزدوری قیمتوں کی نسبت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے مخصوص حالات کو دیکھ کر برطانوی حکومت نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا کہ ان دونوں طبقوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔ یہ معلوم تھا کہ آگے چل کر جوں جوں قوم کی قوت لڑائی کے کاموں میں صرف ہوگی معاشی مشکلات بڑھیں گی۔ مگر اس وقت تو کسانوں اور مزدوروں کا معیارِ زندگی کچھ تھوڑا سا اونچا ہی ہو گیا تھا۔

فوج کے سپہ سالار کو جنگ کا نقشہ موجودہ حالات کے لحاظ سے بنانا ہوتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی خوش حالی مصنوعی اور عارضی سہی مگر جب تک بھی تھی اس وقت تک یہ امر بہت مشتبہ تھا کہ وہ سیاسی جدوجہد کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ اس کے علاوہ فرقہ پرستی کی بڑھتی ہوئی رو نے قوم کو کمزور کر دیا تھا۔ کل ہند وفاق کے بغیر صوبوں میں حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے انتشار کی قوتیں ابھر آئی تھیں، ملک کے چھوٹے چھوٹے صوبوں اور قوم کے چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ جانے کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ اس کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں سیاسی جدوجہد کے شروع ہوتے ہی فرقہ وارانہ فساد کی آگ نہ بھڑک اٹھے یہ بات بالکل یقینی تھی کہ جنگ کے زمانے میں انگریز ہر ایسے قومی جدوجہد کے دھارے کو دوسری طرف موڑنے کا کام میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔

پھر گاندھی جی اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ جو تحریک ۱۹۳۹ء میں شروع ہوگی اسے جنگ کے حالات میں چلانا ہوگا۔ پچھلی تحریکوں کو جو امن کے زمانے میں شروع ہوئی تھیں سول نظم و نسق کی سختیاں اٹھانی پڑی تھیں مگر جنگ کے زمانے میں حکومت بے تامل فوجی نظم اور مارشل لا نافذ کر دے گی۔ اس لئے اس تحریک کو کہیں زیادہ خطرے کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے اس کا شروع کرنا صرف اسی وقت جائز تھا جب عوام میں اتنی سیاسی اور معاشی سکت ہو کہ وہ اس محاذ پر لڑ سکیں۔

غرض گاندھی جی جانتے تھے کہ جنگ کے حالات میں معرکہ بہت سخت ہوگا اور بہت عرصے تک جاری رہے گا۔ اس میں سورماؤں کے کرتب دکھلانے کا موقع نہیں ہوگا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے قوم کی سکت کو آزما لیں۔ چنانچہ چند منتخب افراد کی ستیہ گرہ کا تجربہ جو ۱۹۴۰ء میں شروع کیا گیا اس سے بڑی لڑائی کی تیاری تھی۔

جنگِ عظیم میں بحران کا وقت ۱۹۴۲ء تھا۔ بین الاقوامی میدان میں دونوں فریقوں کا پلہ برابر تھا اور خیال تھا کہ جانے کانٹا کدھر جھک جائے۔ دونوں اپنی پوری طاقت میدان میں لے آئے تھے اور اس کے تناسب میں خفیف سا فرق بھی انھیں بہت شدت سے محسوس ہوتا تھا۔ ہندوستان کے اندر قیمتوں کی گرانی دوڑ میں مزدوری کے اضافے سے کہیں آگے نکل گئی تھی۔ اس لئے صرف کی کمی سے عام معیارِ زندگی میں اتنی کمی ہو گئی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ بڑھتی ہوئی معاشی اور سیاسی مشکلات نے لوگوں کی توجہ کو فرقہ وارانہ اور صوبہ وارانہ جھگڑوں سے ہٹا کر اس بات پر مرکوز کر دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کی ضرورت فوری اور شدید ہے۔ غرض بیرونی اور اندرونی حالات نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کی راہ ہموار کر دی تھی اس لئے گاندھی جی نے آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

۱۹۴۲ء کی شورش بے منصوبے کا انقلاب تھا۔ حکومت نے گاندھی جی کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ جنگ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسے تجربہ تھا کہ گاندھی جی کی مہم کا آغاز غضب کا ہوتا ہے۔ اگر وہ تحریک کے قوت پکڑنے سے پہلے گرفتار نہ کر لئے جاتے تو انھیں شکست دینا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ دو مرتبہ حکومت کو یہ سبق مل چکا تھا کہ جو چیزیں دیکھنے میں خفیف اور سبک معلوم ہوتی ہیں وہ ہنسی میں نہیں ٹالی جا سکتیں۔ جنگ کے زمانے میں وہ معاملے کو اتفاقات پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے تحریک کے شروع ہونے سے پہلے ہی گاندھی جی کو اور اوپر سے نیچے تک کانگریس کے سب لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

اگر ۱۹۴۲ء کے انقلاب کی باگ گاندھی جی کے ہاتھ میں رہتی تو وہ کیا شکل اختیار کرتا؟ اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ البتہ ایک بات یقینی ہے۔ وہ عدم تشدد کے دل سے قائل تھے اور کسی فوری فائدے کے لئے اپنے اصول سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء کی جدوجہد کو جنگِ آزادی کا آخری مرحلہ سمجھتے تھے۔ اور اس بار ان کا نعرہ کچھ اور ہی تھا "کر گذرو یا مر مٹو"۔ مگر آخری مہم کی شدید ضرورت بھی ان کی زبان سے یہ نہیں کہلوا سکتی تھی "مارو یا مر جاؤ"۔

بقیہ صفحہ ۱۷ پر

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی

۲۴ر اگست ۱۹۴۸ء

ہندو پاکستان اور مسئلہ کشمیر

اب سے کچھ دن پہلے کلکتے میں ہند اور پاکستان کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس سے صلح پسندوں کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ دونوں ریاستوں کے تجارتی تعلقات، اقلیتوں کے مسئلے، پناہ گزینوں کی املاک کے مسئلے اور دوسرے مسائل کے بارے میں معقول سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ صرف کشمیر کا معاملہ رہ گیا تھا۔ مگر ع

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا۔

اسی کشمیر کے معاملے نے باہمی مخالفت کے جذبات کو پھر دوبارہ بھڑکا دیا اور وہ مصالحت کی فضا دیکھتے دیکھتے ہوا ہوگئی۔

اب یہ معلوم ہوا کہ تقریب قریب اسی زمانے میں جب کلکتے میں صلح کی بات چیت ہورہی تھی، پاکستان کی فوجیں پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں اور کہیں زیادہ ساز و سامان کے ساتھ حملہ آوروں کی مدد کے لئے کشمیر کے سرحدی علاقے میں داخل ہورہی تھیں۔

عشوۂ چشمش فریب جنگ داشت
ما غلط کردیم و صلح انگاشتیم

اس کی وجہ پاکستان کے اخبار یہ بتلاتے ہیں کہ حکومت پاکستان کو ہندوستان کی حکومت، فقیر ایپی اور خان عبدالغفار خاں کی اس باہمی سازش کا علم ہوگیا تھا کہ ہندوستان کی فوجیں کشمیر کی طرف سے اور فقیر ایپی کے مرید شمال مغربی سرحد کی طرف سے صوبہ سرحد اور پنجاب کے متصل علاقے پر حملہ کریں گے اور خان عبدالغفار خاں کے سرخ پوش ان کا ساتھ دیں گے۔

ذرا سا غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذر اگر تراشا ہوا نہیں تو ایک دور از کار وہم پر مبنی ہے۔ فقیر ایپی تو ایک ایسی نامعلوم شخصیت ہے کہ اس کی طرف انگریز جو چاہتے تھے منسوب کردیتے تھے اور پاکستان جو چاہے منسوب کرے لیکن خان عبدالغفار خاں اور پنڈت جواہر لال نہرو جن کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر لیا جاتا ہے جانے بوجھے لوگ ہیں جن پر آج تک کسی نے یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن انگریزوں نے بھی فریب اور سازش کا الزام نہیں لگایا۔ اگر واقعی ایسی سازش کی افواہیں حکومت پاکستان کے کانوں تک پہنچی تھیں تو اسے حکومت ہند سے حقیقت حال دریافت کرنی چاہیے تھی اور اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل سے جس کے سامنے کشمیر کا مسئلہ پیش تھا احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ احتیاط کا تقاضا زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ حکومت پاکستان اپنی سرحد پر کافی فوجیں بھیج دیتی اور انھیں ہوشیار رہنے کا حکم دیتی۔ لیکن بغیر کسی اعلان کے چپ چاپ ایک پوری فوج سرحد پار کشمیر کے اندر بھیج دینا محض احتیاطی اور دفاعی کارروائی نہیں کہی جاسکتی اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکومت پاکستان کشمیر کے مسئلے کو پر امن طریقے سے طے کرنے پر تیار ہے۔

لیکن کشمیر کے مسئلے کا پر امن طریقے سے طے ہونا ہندوستان اور پاکستان دونوں کے امن و عافیت کے لئے بلکہ دونوں کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ واقعات سے آنکھیں بند کر لینا دانشمندی نہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دونوں ریاستوں کی جڑیں ابھی کمزور ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ ۵۰-۶۰ لاکھ پناہ گزینوں کے بسانے کا، ان کی جائدادوں کے تبادلے کا اور ان کو اپنے اپنے ملک کی معیشت میں کھپانے کا انتظام کرنا ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس میں حکومت کی ہر قدم کو ایک مدت تک پوری ساری توجہ اور ساری کوشش صرف کرنی ہے۔ دونوں کو گرانی، چور بازاری اور نفع خوری سے، رجعت پسندی، فرقہ پرستی اور فتنہ انگیزی سے لڑنا ہے۔ ان سب خرابیوں کی پشت پر ارباب غرض کی زبردست قوت ہے جو ڈیڑھ سو سال تک سلطنت برطانیہ کی مدد سے ہندوستان کے غریبوں کا خون چوستے رہے اور اب اس کی مدد کے بغیر اپنے بل بوتے جمہوریت کی کمزور تحریک کو کچل کر ملک پر مذہبی یا نیم مذہبی فسطائیت کا جھنڈا لہرانا چاہتے ہیں اور اس کے سائے میں اپنا خون آشامی کا شغل جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں کو جہالت، وہم پرستی، افلاس، بیماری کا مقابلہ کرنا ہے جس نے آبادی کے بہت بڑے حصے کے ذہن کو ماؤف اور جسم کو شل کر دیا ہے۔

ان مسائل کا بوجھ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے کندھوں پر ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ پاکستان کی نئی ریاست پر نسبتہً بوجھ زیادہ ہے اور اس کے اندر اس بوجھ کو اٹھانے کی قوت کم ہے۔ اس لئے پاکستان کی حکومت پر اپنے ملک کی طرف سے عقل و مصلحت کی طرف سے یہ فرض زیادہ شدت سے عائد ہوتا ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو بغیر طویل اور خونریز جنگ کے صلح و آشتی سے طے کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کی حکومت کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ صلح کی کوشش کرے یا جنگ کے طول کھینچنے میں اس کا نقصان کچھ کم ہے۔ بیشک اس کے وسائل زیادہ ہیں لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے پاس کھونے کے لئے زیادہ ہے۔

اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کے اعلان سے صلح کی گفتگو شروع ہونے کا بہت اچھا موقع نکل آیا ہے۔ پہلے شاید یہ خیال تھا کہ جس کی طرف سے ابتدا ہو وہ کمزور سمجھا جائے گا۔ اب یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ بات چیت کی ابتدا کمیشن کر رہا ہے۔ کمیشن کے متعلق لوگوں کو یہ بدگمانی ہے کہ اسے حق و انصاف سے زیادہ مصلحت کی فکر ہے اور مصلحت کے معنی ہیں امریکی طرز کے جتھے کا مفاد۔ دنیا کے حالات کی رفتار دیکھتے ہوئے یہ بدگمانی بے جا نہیں ہے، لیکن یہی حالات کی رفتار یہ بھی بتاتی ہے کہ کمیشن کی مصلحتیں کچھ بھی ہوں بہرحال وہ کشمیر میں جس کی سرحدیں سوویت روس سے ملتی ہیں امن قائم کرنے کی دل و جان سے کوشش کرے گا اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس کوشش میں وہ کسی فریق پر جبر نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی حکمت عملی سے دونوں فریق یا کسی ایک فریق کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ یہ ایسا خطرہ ہے جس کا دنیا کی سب قوموں کو صرف اندرونی اور بیرونی سیاست میں نہیں بلکہ ہر معاملے میں سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ارباب سیاست بین اقوامی معاملات میں ناتجربہ کار سہی مگر ایسے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

بزم بے تکلف

"اے حضرت آپ کو ملکی معاملات سے تو بڑی دلچسپی ہے گھنٹوں بیٹھے اخبارات چاٹا کرتے ہیں اور پھر پہروں تک ہمارا مغز چاٹتے ہیں، ذرا یہ تو بتایئے کہ یہ چائے، شکر، بالائی، افیم، بھیا کو غرض یہ کہ ضرورت کی ہر چیز کو جو آگ لگی ہوئی ہے دن پر دن بھاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی کیا لم ہے؟"

"بھئی واہ مرزا صاحب ضرورت کی چیزوں کی فہرست خوب بتائی۔ مگر یہ بٹیر، کبوتر، پتنگ ڈور کیوں چھوڑ دیا؟"

"بے پر کی نہ اڑایئے، جو پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے بندے نے بھی منطق پڑھی ہے کچھ گھاس نہیں کھودی ہے"

"واللہ گھاس کھودتے تو مزے میں رہتے منطق سے کوئی پیٹ بھرتا ہے"

"غرض آپ فقروں میں ٹالیں گے، بتائیں گے نہیں"

"نہیں حضرت آپ سے کیا چھپانا ہے۔ بات یہ ہے کہ مہنگائی یا تو چیزوں کی کمی سے ہوتی ہے یا زر کی بہتات سے۔"

"زر کی بہتات سے مہنگائی؟ کیوں دل لگی کرتے ہو!"

"دل لگی کی ایک ہی کہی۔ یہ تو ایک ابتدائی معاشی اصول ہے۔"

"اب میں اس معاشی کو کیا کہوں، مگر آپ سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ زر کی بہتات کس بھگوے کے پاس ہے؟ اللہ ہی جانتا ہے کس طرح رو رو کے خرچ چلتا ہے۔"

"مرزا صاحب آپ کے پاس بہتات نہیں تو کیا کسی کے پاس نہیں۔"

"یوں ہونے کو تو لوگوں کے پاس اتنا ہے کہ رکھنے کی جگہ نہیں۔ لڑائی کے زمانے میں انھاروں کمایا ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے مہنگائی کہاں، انھیں تو ہر چیز مفت معلوم ہوتی ہے۔ خوب دل کھول کر خریدتے ہیں"

"ان لوگوں کی وجہ سے مانگ ہوئی زیادہ اور چیزوں کی پیداوار ہوئی کم۔ کاہے سے جنگ کی تباہیوں سے۔ پھر بھاؤ بڑھیں یا نہ بڑھیں؟"

"اچھا تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ دوسروں کے پاس زر کی بہتات ہو تو ہمارے لئے اس کا نتیجہ مہنگائی ہے؟"

"جی ہی مطلب ہے"

"بھئی معاف کیجئے میں سمجھا نہ تھا، آپ سچے اور آپ کی معاشی سچی۔"

ع۔ نہیں جھوٹے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے!

معذرت

کئی ہفتے سے "نئی روشنی" کی اشاعت میں دو تین روز کی دیر ہوجاتی ہے۔ ہمیں اس کا بہت سخت افسوس ہے اور ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ اخبار وقت پر شائع ہو۔ بات یہ ہے کہ کاتب کو سطر کے لئے اچھا کاغذ بازار میں نہیں ملتا ناقص مسطر پر لکھائی ہونے کی وجہ سے کاپیاں اچھی نہیں جمتیں خصوصاً برسات کے موسم میں، اور سنگ سازی میں بہت وقت صرف ہوجاتا ہے۔ پرچہ دیر میں تیار ہوتا ہے اور دیر میں بھیجا جاتا ہے اور چھپائی بھی جیسی چاہیے نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں دہلی سے اخبار نکالنے میں جو مشکلیں ہمیں اٹھانی پڑیں ان کی داستان بہت طویل ہے مگر شکر ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مشکلیں دور ہوتی جاتی ہیں۔

۲-پاکستان

پردہ نشین غازی

برطانوی پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کی ایک جماعت کا جو آزاد پاکستان "اسلام لیگ" کے نام سے کام کر رہی ہے ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس جماعت کا مقصد ہندوستان کے بعض علاقوں کو پاکستان کے لئے حاصل کرنا ہے۔ اس جماعت نے ہندوستان کی بعض ہستیوں پر اپنا لٹریچر بھی بھیجا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان ٹائمز نے اس جماعت کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی ہے۔ اس اخبار نے بتایا ہے کہ یہ جماعت کچھ گمنام لوگوں نے، مریض دماغ کی پیداوار ہے جو اپنا نام ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہیں رکھتے۔ اخبار نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان سر پھروں کے خلاف جلد از جلد مناسب کارروائی کرے۔ پاکستان ٹائمز نے کہا ہے ایسے لوگ اپنی فرقہ پرستی سے ہندوستان میں فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ بات نہ آتی ہو اور وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی کوئی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی ترقی ہندوستان میں اسی طرح کے عناصر کو مضبوط کر سکتی ہے اور کرے گی۔ پاکستان ٹائمز نے ہندو پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ موجودہ پیچیدگیاں ہی کیا کم ہیں کہ ان میں اس طرح کے زہریلے عناصر اور شامل کر لئے جائیں۔ ہم اپنے پاکستانی معاصر کی اس حق گوئی پر سے مبارکباد دینا چاہتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ آزادی کے دوسرے سال میں سرحد کے دونوں طرف اسی قسم کے جذبات کارفرما ہوں گے۔

سال بھر میں کیا کیا

آزادی کے ایک سال میں حکومت پاکستان کی تعمیری کارروائیوں پر کچھ سرکاری تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کا خلاصہ ہے۔

حکومت پاکستان نے پاکستان کے لئے جیولوجیکل سروے کا شعبہ قائم کیا ہے۔ اس کے سب سے بڑے افسر ڈاکٹر کرسٹنیف ہیں جو پہلے ہندوستان کے سروے ڈپارٹمنٹ کے صدر رہ چکے ہیں۔ یہ شعبہ پاکستان کی معدنی دولت کا مفصل جائزہ لے گا۔ حکومت نے مغربی پاکستان میں کوئلہ کی تلاش کرنے کے لئے بھی ایک محکمہ قائم کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کام تین مہینے میں پورا ہو جائے گا۔ اس کام کے لئے ایک مشہور انجینیر مسٹر ہیٹ کی خدمتیں حاصل کی گئی ہیں۔

پانی سے بجلی پیدا کرنے کے سلسلے میں حکومت نے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام "سنٹرل انجینیرنگ اتھارٹی" ہوگا۔ اس کے ذمے کام یہ ہوگا کہ آبپاشی کے لئے نہریں نکالنے، جہازرانی اور پانی سے بجلی پیدا کرنے کے مسائل کی چھان بین کرے۔ حکومت نے سر ہنری ہاورڈ کی خدمات حاصل کی ہیں تاکہ پانی سے بجلی کے ذرائع کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جاسکے۔ ... سفارشوں پر عمل شروع ہو گیا ہے چنانچہ ... بجلی بنانے کے لئے مشینوں کا آرڈر دیا جا چکا ہے۔ ... سپلائی اور ڈویلپمنٹ کے ڈائریکٹوریٹ میں ایک شعبہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس کی توجہ کا مرکز کیمیاوی صنعتیں، دوا سازی، چمڑے، ... سوتی کپڑے اور جوٹ کی صنعتوں کو ترقی دینا ہوگا۔

پچھلے سال میں ۵۰ کمپنیوں نے سرمائے کے لئے درخواستیں دیں۔ حکومت نے جو درخواستیں منظور کی ہیں ان کی مجموعی رقم ۱۵ کروڑ ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق انفرادی طور پر جو سرمایہ کاروبار میں لگ گئے ہوں گے جن کی اجازت حکومت سے لینا ضروری نہ تھا ان کی مجموعی مقدار دس کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔

حکومت کے کاموں کے متعلق ابھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ڈھانچہ تیار کیا جا رہا ہے جس کے بغیر کسی قسم کی معاشی تعمیر کا خواب پورا نہیں ہو سکتا اس سلسلے میں بھی ابھی بہت سا کام باقی ہے اور اسے انجام دینے کی خواہش ہو تو اسے تمام تر توجہ کا مرکز بنانا پڑے گا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے لئے اس دور اندیشی کی ضرورت اس سے کم نہیں جتنی ہندوستان کو ہے۔ دونوں ہی ملکوں میں آزادی کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا کام باقی ہے کیونکہ جیسا کہ پنڈت نہرو نے قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا۔ آزادی کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک وہ عوام کو اس بھاری بوجھ سے نجات نہ دلائے جو انھیں کچلے ڈالتا ہے۔ یہ بوجھ ہندوستان کے عوام پر جتنا گراں ہے اتنا ہی پاکستان کے عوام پر ہے اور اسے حل کرنے کی کوشش اگر باہمی تعاون سے ہو تو ان کی کامیابی کی رفتار تیز بھی ہوگی اور یقینی بھی ہوگی۔ باہمی کشمکش اور کشیدگی سے یہ کام پس پشت پڑ جائے گا اور دونوں ریاستوں میں ایسے عناصر کو ترقی ہوگی جو اپنے ملک کو سیدھے تباہی اور بربادی کی طرف لے جائیں گے۔ اگلے سال آزادی کے دوسرے سال میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سچے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ ان عناصر کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں جو دوستی اور تعاون کے حامی ہیں۔ اور انھیں اپنی قومی زندگی سے نکال پھینکیں جو اس کشمکش اور تصادم میں اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

امن اور آشتی کے بعد پاکستان کی صنعتی اور معاشی ترقی کی دوسری بڑی شرط اس سلسلے میں تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ کی کوششیں ہیں۔ پچھلی فروری میں حکومت نے ایک آرڈی نینس جاری کیا تھا جس کی رو سے خاص خاص کام جاننے والے لوگوں کے لئے جن کی عمریں ۱۸ سے ۵۵ سال تک کی ہوں، چلانے والے رہے ہوں یا پرائیوٹ ملازمتوں میں۔ حکومت کے مختلف ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں میں اپنا نام لکھانا ضروری تھا جس قسم کے کام جاننے والوں کے لئے یہ آرڈی نینس جاری کیا گیا تھا ان میں سے چند یہ ہیں:۔ ہر طرح کے انجینیر، فورمین، میکینک، لوکو فورمین، نرس، دانت کے ڈاکٹر، سرجن ... وغیرہ۔ اس آرڈی نینس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کے کاموں کے ماہروں کی ایک مکمل فہرست تیار کر لی جائے تاکہ ان کی خدمات سے بہتر طریقے پر فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ان معلومات کی فراہمی کا مقصد یہ بھی تھا کہ ملک میں صنعتی تنظیم کے منصوبے بنانے میں سہولت ہو۔ ایک ایسی فہرست تیار ہو جائے جس سے پتہ لگ سکے کہ کس طرح کا کام جاننے والوں کی تعداد کافی ہے کن چیزوں کی ٹریننگ کے انتظامات کی ضرورت بہت زیادہ۔ اس آرڈی نینس کے تحت ۳۰ جون ۱۹۴۸ء تک ۱۹۰۶ آدمیوں نے اپنے نام لکھائے تھے۔ پورے پاکستان پر پھیلائیے تو یہ تعداد بہت ہی کم ہے اور حکومت کو تربیت کی سہولتیں فنی بڑے پیمانے پر اور کافی تعداد میں فراہم کرنی ہوں گی۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ امریکہ اور جاپان کی صنعتی ترقی بہت بڑی حد تک صنعتی اور فنی تعلیم کی توسیع کی رہین منت ہے۔

ساڑھے تین کروڑ کا سامان

کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے پاکستان کو ایک کروڑ ڈالر رقم قرض لی تھی تاکہ حکومت پاکستان پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے اور ضروری طبی امداد کی فراہمی کے لئے امریکہ سے فاضل سامان خرید سکے معلوم ہوا ہے کہ یہ سامان اب بہت جلد پاکستان پہنچ جائے گا۔ حکومت پاکستان نے اس قرض سے طبی اور زرعی سامان خریدا ہے اس کی پہلی قسط جس کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے اگلے مہینے تک پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ چھ مہینے کے اندر اندر حکومت پاکستان پناہ گزینوں کو بسانے کے سلسلے میں اپنی تمام فوری ضرورتیں پوری کر سکے گی۔

وہاں بھی وہی مہنگائی

مہنگائی کا مسئلہ کم و بیش عالم گیر ہے حکومت پاکستان اس سلسلے میں کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں غلہ کپڑے کی قیمتیں بہت بڑھ رہی ہیں۔ غلہ کی قیمتوں میں اضافے کا ایک سبب یہ ہے کہ دیہاتی علاقوں میں جہاں راشننگ نہیں ہے زمیندار مہنگے داموں پر غلہ فروخت کرنے کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کر رہے ہیں پچھلے دنوں مغربی پنجاب میں غلہ حاصل کرنے کی مہم کی ناکامیوں کی خبریں آئی تھیں۔ حکومت نے ایسے زمینداروں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ حکومت کو غلہ نہیں دیں گے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ حکومت پاکستان نے صوبوں کی حکومتوں سے غلے کے حصول میں سختی سے کام لینے کا مشورہ دیا ہے۔ کپڑے کی قلت کا سوال حل کرنے کی ایک ہی صورت ہے حکومت نے ہندوستان اور سٹرلنگ کے دوسرے ملکوں سے کپڑا درآمد کرنے کی کوشش کی ہے۔

بارش اور سیلاب سے تباہی

بارش کی کثرت سے مغربی پنجاب کے دریاؤں میں باڑھ آگئی ہے۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے ضلعوں میں اور راولپنڈی قسمت میں سیکڑوں گاؤں تباہ ہیں بعض قصبوں اور شہروں میں سڑکیں نہر بن گئی ہیں۔ لاہور میں مکانوں کے گرنے سے بڑا نقصان ہوا ہے۔ حکومت نے دو ہزار مکان خالی کرائے ہیں اور انھیں گرانے کا حکم دے دیا ہے۔ سندھ میں صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہے۔ پانی کے زور سے دریائے سندھ کے پشتے جا بجا ٹوٹ گئے ہیں۔ بہت بڑے دیہاتی علاقے میں مکانات اور فصلیں برباد ہو چکی ہیں اور سیلاب کی شدت اور بڑھتی جاتی ہے حکومت سندھ اپنے سارے وسائل اس بلائے ناگہانی کا مقابلہ کرنے میں صرف کر رہی ہے۔

(ا۔ س)

مشرقی دُنیا

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں

اس مہینے کے پہلے ہفتے میں جنوبی مشرقی ایشیا کے برطانوی گورنروں اور فوجی عہدہ داروں کی ایک دو روزہ کانفرنس سنگاپور میں ہوئی۔ لڑائی کے بعد سے یہ پہلی بڑی کانفرنس ہے۔ اس کانفرنس میں موضوع گفتگو کیا تھا یہ بتایا نہیں گیا۔ لیکن قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس یقین سے دور نہیں کہ برطانوی دولت مشترکہ کے اس بہت ہی اہم علاقے کے دفاع کے متعلق بحث و گفتگو ہوئی۔ اس کانفرنس میں ملایا، سنگاپور، برما، ہانگ کانگ کے نمائندے شامل تھے۔ ملایا میں بڑے پیمانے پر گوریلا جنگ ہو رہی ہے جس کا مقصد ٹین اور ربر کی صنعتوں کو بیکار کر دینا اور آخرکار ایک کمیونسٹ حکومت قائم کرنا ہے۔ سنگاپور کے بحری اڈے کو از سر نو تعمیر کیا جا رہا ہے تاکہ وہ کمزوریاں دور ہو جائیں جن کی وجہ سے پچھلی لڑائی میں یہ اتنی جلدی فتح ہو گیا تھا۔ انگریزی سیاست دانوں نے پہلے ہی ملایا کے آتش فشاں کی حدت کا اندازہ کر لیا تھا اور اس لئے سنگاپور کو الگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن اگر ملایا میں برطانوی حکومت کو نقصان پہنچا تو سنگاپور کو اڈا بنا کر ملایا کو دوبارہ فتح کرنا ہوگا۔ اب رہا ہانگ کانگ، قوم پرست چینیوں کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ جزیرہ انھیں واپس کر دیا جائے تاکہ وہ اسے اپنی ریپبلک میں شامل کر لیں اور دوسری طرف جنوبی چین میں کمیونسٹ گوریلا فوج کا ڈیرہ۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں برطانوی مقبوضات بھی شدید خطرے میں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ گورنروں کی اس کانفرنس کے عملی نتائج کون سی شکل اختیار کرتے ہیں۔ کانفرنس کے فیصلے بتلائے نہیں گئے ہیں، اس لئے اس پالیسی کا جو یہاں وضع کی گئی ہے، نقشہ اگلے کچھ مہینوں میں جنوبی مشرقی ایشیا کے سیاسی اسٹیج کی چالوں کو دیکھ کر سمجھ میں آئے گا۔

حرّار فوج اور ماہر کتّے

ملایا میں کمیونسٹ گوریلا فوجوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ تعداد کی یہ کمی ممکن ہے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہو کہ برطانوی حکومت کی جمہوریت نوازی سے بیزار صرف مٹھی بھر سر پھرے ہیں لیکن وجہ جو کچھ بھی ہو اتنا تو طے ہے کہ ملایا کی بغاوت اس سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع کر مقتدر برطانوی حکومت اسے تسلیم کرتی ہے۔ فیشن تو یہ ہے کہ روس اور اس کے ساتھی ملکوں کو آہنی پردے کے پیچھے کہا جائے لیکن برطانیہ کی نوآبادیوں کے متعلق جس طرح خبریں آتی ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کو بھی کچھ چھپانا ضرور ہے۔ ملایا میں برطانوی حکومت کی عظیم الشان کامیابیوں [illegible] ہیں۔ لیکن ملایا کی بغاوت بھی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ جلد ختم ہونے والی ہے خود برطانوی حکومت کی تیاریاں بھی اسی بات کی غمازی کرتی ہیں۔ برطانوی طاقت کے مظاہرے کی خاطر [illegible] برطانوی فوج کے بہترین تربیت یافتہ [illegible] ملایا بھیجے جا رہے ہیں۔ ان کے پہنچ جانے کے بعد جنوبی مشرقی ایشیا میں [illegible] برطانوی فوجیں [illegible] پہنچ چکی ہوں گی۔ اتنی تعداد میں فوج پچھلی لڑائی کے بعد سے کبھی ملایا میں نہیں بھیجی گئی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ خبر آئی تھی کہ ملایا کے جنگلوں میں کمیونسٹوں کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے برطانوی حکومت تربیت یافتہ کتے بھی لا رہی ہے۔

لیکن اس تمام فوجی طاقت کے یکجا کرنے سے صرف ملایا پر قبضہ رکھنا مقصود نہیں برما کی بغاوت، سیام میں فیلڈ مارشل پبل سونگرام کے خلاف بغاوت اور انڈونیشیا کی سیاسی صورت حال ان سب نے مل کر اس علاقے میں برطانوی اقتدار کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ویسے تو اصل خطرہ کمیونسٹ استبداد کے پھیل جانے کا بتایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی سچی بات کچھ لوگوں کے منہ سے نکل جاتی ہے ایشیائی قومیت سے کچھ لوگوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ بنگال کے ایک سابق گورنر مسٹر آر جی کیسی نے "ایشیائی قومیت کے بڑھتے ہوئے خطرے" سے اپنے ملک اور برطانیہ کو آگاہ کیا ہے۔ ایشیا اور ہندوستان کے کروروں ننگے بھوکے جو اب گورے رنگ سے اتنے مرعوب نہیں ہوتے۔ مغربی تہذیب کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں جو لوگ جنوبی مشرقی ایشیا کی جنگ آزادی کو کمیونسٹ استبداد کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو مغربی جمہوریت نوازوں کی جنگی کارروائیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

آزماست کہ بر ماست

برمی وزیر اعظم تھاکن نو کی اصول پرستی پارٹی کے شکنجوں میں دب کر کچھ مرجھا گئی [illegible] انھوں نے کچھ مذہبی جوش، فرقہ پرستی، کچھ علم دوستی کے انداز میں کیا تھا، ہوا میں اڑائے گئے۔ برما کی حکومت اب کمیونسٹ پارٹی کے دشمنوں کا ایک مجموعہ ہے اور کچھ نہیں۔ سیاست کے اس رنگ سے برما میں بغاوت کی شدت کا بڑھ جانا یقینی تھا اور یہی ہوا۔ فوج اور پولیس کے کچھ لوگوں نے بغاوت کر دی ہے اور اگرچہ یہ بغاوت شاید کسی منصوبہ یا نقشے کے مطابق نہیں ہے لیکن اس کا کمیونسٹ نقشہ بن جانا ناممکن نہیں۔ ابھی برما سے خبریں الجھی ہوئی آ رہی ہیں اس لئے فی الحال دلچسپ موضوع گفتگو اس بغاوت کے اسباب اور اس کی نوعیت ہے۔ برطانیہ کے نزدیک تو یہ عالمگیر کمیونسٹ سازش کا نتیجہ ہے جو برما کی اندرونی سیاسی اور معاشی حالت سے کسی قسم کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھتی۔ اور [illegible] صاحب نے جو برما کے وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ ہو کر اب فوج میں شامل ہو چکے ہیں ایک اور شوشہ چھوڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سازش کا منصوبہ ہندوستانی کمیونسٹوں نے کلکتہ کے اجلاس میں بنایا تھا انھوں نے اتنا احسان کیا کہ یہ اعتراف کر لیا ہے کہ کمیونسٹوں کو کسی بیرونی ملک سے مدد نہیں مل رہی ہے ایک برمی اخبار نویس پر کوئی نے بتایا ہے کہ برمی حکومت نے امریکہ کو یہ اطلاع دے دی ہے کہ برما کو اس بغاوت کے کچلنے میں بیرونی مدد کا سہارا لینا ہوگا برمی سیاست کا یہ رنگ ہی اس بغاوت کا فوری سبب ہے۔ برمی حکومت کے کچھ ذمہ دار اصحاب جن میں برطانیہ کے پرانے دوست [illegible] صاحب شامل ہیں عرصے سے کمیونسٹوں کو کچل ڈالنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ پچھلے مارچ میں حکومت نے اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کو کچل دینے کی پوری تیاریاں کر چکی ہے۔ پھر وزیر اعظم کے اثر سے مجبور ہو کر باغیوں کو عام معافی دینے کا ایک ڈھونگ رچایا گیا۔ لیکن ظاہر ہے جب وزیر اعظم یہ کہے کہ مزدوروں پر سختیاں نہ ہوئی چاہئیں، اور یہ سختیاں ہوتی رہیں تو اس عام معافی پر کمیونسٹ کیوں کر بھروسا کرتے۔ انھوں نے بغاوت کر دی، اس میں تو کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ شورش عرصے تک جاری رہے گی اور تاریخ کے دستور کے مطابق ناکام ہوئی تو بغاوت اور کامیاب ہوئی تو انقلاب کہلائے گی

کیا جمہوریت اسی کا نام ہے

اوٹاکمنڈ میں ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن کے جلسے میں اس سوال پر بڑی بحث ہوئی تھی کہ انڈونیشیا کو کمیشن ممبر ہونے کی اجازت دینی چاہیئے یا نہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریت دوست ملک نے اس کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر گریڈی نے ارشاد فرمایا اگر انڈونیشیا کو ممبری کا حق ہو تو حیدرآباد کو کیوں نہ ہو۔ اب بحث کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اور انڈونیشیا اور ویٹ نام کی جمہوریتوں کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ آگر جنیوا میں کئی دن کی بحث و گفتگو کے بعد جب اس مسئلہ کو ٹالنے کی کوششیں ناکام ہوئیں تو آخرکار جمہوری نمائندوں نے روس کے اس رزولیوشن کو کہ ان ملکوں کے بغیر ایشیا کی معاشی ترقی کا کام مناسب طرح سے انجام نہ ہو سکے گا نامنظور کر دیا۔ فرانس کے جمہوری نمائندے صاحب نے ارشاد فرمایا ویٹ نام کی جمہوریت کا نہ واقعتہً وجود ہے نہ قانوناً۔ ڈچ نمائندے نے اپنے امریکی آقاؤں کا قول دہرایا کہ اگر انڈونیشیا کو یہ حق دیا جائے تو حیدرآباد کو بھی کیوں نہ دعوت دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام واقعات کے باوجود جمہوریت دوستی کا بھانڈا پھوٹ کیوں نہیں جاتا۔

ایشیا ہی سے متعلق ایک اور کارنامہ ملاحظہ ہو۔ روس نے ایک رزولیوشن کے ذریعے چاہا تھا کہ ایشیا میں صنعتی ترقی کا مقصد قرار دیا جائے کہ ایشیائی قوموں کی نوآبادیاتی، معاشی غلامی مٹ جائے۔ برطانیہ کے نمائندے ملکم میکڈانلڈ صاحب نے اس رزولیوشن کو سیاسی مینی فسٹو قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے کہ اس علاقے کی موجودہ معاشی بدحالی اس بات کا نتیجہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ ابھی خود مختار نہیں ہوا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ واقعی جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کی سبھی ملکوں کی سیاسی زندگی نوآبادیاتی ہے جس میں زراعت اور کان کنی زیادہ اہم ترپیشے ہیں کمیشن کو معاشی زندگی کا یہ نقشہ بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انڈونیشیا ملایا اور ویٹ نام چھوٹے علاقے ہوں تو ہوں لیکن انھیں آزادی کا حق اتنا ہی ہے جتنا برطانیہ عظمیٰ کے مٹھی بھر لوگوں کو۔

(ا۔س)

براہِ کرم خط لکھتے وقت
اپنا پتہ صاف صاف
انگریزی میں بھی لکھئے

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

اختر انصاری

اسباب سے ہم معذور سہی | تقدیر کے ہم مقہور سہی
مختار نہیں، مجبور سہی | مقصودِ دلی پانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

وہ فکر کی سحر آگیں دنیا | وہ سیم فشاں زریں دنیا
جو دور ہے وہ رنگیں دنیا | نزدیک اُسے لانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

اشکوں میں ہے اپنے جس کی جھلک | ہے اپنی نظر میں جس کی ڈھلک
اور پا نہیں سکتے جس کو ملک | اُس خلد کو اپنانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

آتی ہے غنا کو جس سے حیا | جیسے میں ہے نادر، دُھن میں نیا
پہلے جو کبھی گایا نہ گیا | وہ گیت ہمیں گانا ہی ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

زرتار ہو جس کا ہر شعلہ | گلزار ہو جس کا ہر شعلہ
مے بار ہو جس کا ہر شعلہ | اُس آگ کو بھڑکانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

جو غم کو بنا دے افسانہ | ہر درد سے کر دے بیگانہ
چھلکا دے خوشی کا پیمانہ | وہ عہدِ طرب لانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہے ضرور

اسباب سے ہم معذور سہی | تقدیر کے ہم مقہور سہی
مختار نہیں، مجبور سہی | مقصودِ دلی پانا ہے ضرور

اُس پار ہمیں جانا ہی ضرور

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

پھر اُفق پر پھینکتا ہے کوئی تاریکی کا جال
تیرے اِن روشن جہانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

عشق کی رگ رگ سے پھر رستا ہی یہ کس کا لہو
آج غم کے رازدانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

گونجتے ہیں پھر تصور میں اجل کے قہقہے
زندگی کی داستانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

چھین لینا چاہتا ہے کوئی دل کے حوصلے
آج تیرے ناتوانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

پھیلتے جاتے ہیں سائے، بجھتے جاتے ہیں چراغ
اب وفا کے پاسبانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

کھو گیا ہے آج جیسے آ کے منزل پر کوئی
صبحِ نو کے کاروانوں کو نہ جانے کیا ہوا؟

تیرہ جولائی کا پیغام

ریڈیو فیچر

خواجہ احمد عباس

پہلا اناؤنسر۔ ۱۴ جولائی۔
دوسرا اناؤنسر۔ ایک تاریخی دن! ایک انقلابی دن!
پہلا۔ تاریخ جو شہیدوں کے خون سے لکھی گئی۔
دوسرا۔ انقلاب جو عوام کے جمہوری غصے اور جوش سے پیدا ہوا۔
پہلا۔ ۱۴ جولائی! فرانس کا یوم نجات۔
دوسرا۔ ۱۳ جولائی! کشمیر کا یوم شہدا۔
پہلا۔ ایک سو ساٹھ سال پہلے۔ سات سمندر پار۔
دوسرا۔ انقلاب سے پہلے کا فرانس۔
پہلا۔ چودھویں لوئی اور ملکہ ماری انطونیت کے محلوں میں رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔
دوسرا۔ مگر پیرس کے عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔
لوگوں کی بھیڑ۔ (بہت اونچی دور کی آواز) ہم بھوکے ہیں، ہمیں روٹی دو۔
(آوازیں رفتہ رفتہ قریب آ رہی ہیں)
بھیڑ۔ (ذرا اونچی آوازیں) ہم بھوکے ہیں۔ ہمیں روٹی دو۔
(آوازیں بالکل قریب آ گئیں)
بھیڑ۔ (بڑے زور کی گونجتی ہوئی آوازیں) ہم بھوکے ہیں ہمیں روٹی دو۔
(ملکہ کے قہقہوں کی آوازیں)
ملکہ۔ اوئی (ہی ہی ہی) اگر ان لوگوں کو روٹی نہیں ملتی تو کیک کیوں نہیں کھاتے؟
پہلا۔ ملکہ کا طعنہ پیرس کے بھوکوں پر کوڑوں کی طرح پڑا۔ پیرس کے مزدور، غریب اور بے روزگار تحقیر سے کوڑا کرکٹ کہلاتے تھے۔ مگر جب وہ اٹھے تو طوفان بن کر اٹھے اور انھوں نے بوربون سلطنت کا نام و نشان تک مٹا دیا۔
دوسرا۔ باسٹیل کا قید خانہ جہاں ہزاروں انقلاب پسند آزادی کے متوالے قید کی گھڑیاں گزار رہے تھے بوربون بادشاہوں کے ظلم و استبداد کا ایک ہولناک نمونہ تھا۔
بھیڑ کا لیڈر۔ باسٹیل ......
بھیڑ۔ توڑ دو۔
بھیڑ کا لیڈر۔ باسٹیل ......
بھیڑ۔ توڑ دو۔
دوسرا۔ اور اس طرح نہ صرف باسٹیل قید خانے کا بلکہ فرانسیسی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ انقلاب فرانس کے تین نئے نعروں سے دنیا گونج اٹھی
پہلا۔ آزادی
بھیڑ۔ آزادی
دوسرا۔ برابری
بھیڑ۔ برابری
پہلا۔ برادری
بھیڑ۔ برادری۔
دوسرا۔ آزادی! برابری! برادری! دنیا کے عوام کے لئے۔
پہلا۔ مزدوروں اور کسانوں کے لئے ....
دوسرا۔ محکوموں اور مظلوموں کے لئے ....
پہلا۔ ایک نیا پیغام۔
دوسرا۔ ایک نیا راستہ۔
پہلا۔ انقلاب کا راستہ۔ آزادی کا راستہ!
منزل بہ منزل ......
دوسرا۔ کارواں بڑھتا گیا!
پہلا۔ امریکہ کی جنگ آزادی!
دوسرا۔ آئرلینڈ کی بغاوت!
پہلا۔ انقلاب روس!
دوسرا۔ انقلاب چین!
پہلا۔ انقلاب ترکی۔
دوسرا۔ انقلاب [illegible]۔
پہلا۔ مشرق و مغرب نظر آنے لگے زیر و زبر۔
دوسرا۔ انقلاب ہند ہے سارے جہاں کا انقلاب۔
پہلا۔ انیس سو بیس (۱۹۲۰ء)
دوسرا۔ خلافت اور نان کوآپریشن۔
پہلا۔ مہاتما گاندھی اور علی برادران۔
دوسرا۔ انیس سو تیس (۱۹۳۰ء)
پہلا۔ لاہور کانگریس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہو گیا!
دوسرا۔ انیس سو اکتیس (۱۹۳۱ء)
پہلا۔ ڈانڈی، مارچ، نمک کا ستیہ گرہ، سول نافرمانی...
دوسرا۔ گرفتاریاں، لاٹھی چارج، گولیاں، پورے ملک میں سیاسی ہلچل۔ انقلاب کی آگ!
پہلا۔ مگر کشمیر؟ ....
دوسرا۔ جنت نظیر!
پہلا۔ ہری بھری وادیاں، پرہیبت پہاڑ، برف پوش چوٹیاں۔
دوسرا۔ ڈل پر غروب آفتاب کا نظارہ!
پہلا۔ سبک اور نازک شکارے جھیل کی سطح کو چیرتے ہوئے۔
دوسرا۔ نشاط اور شالامار باغ، گاتے ہوئے آبشار، گنگناتے ہوئے فوارے۔
پہلا۔ جہلم میں ہاؤس بوٹ۔ پانی پر تیرتے ہوئے محل
دوسرا۔ گلمرگ۔ ہر طرف سبز مخمل بچھا ہوا۔
پہلا۔ پہلگام۔ کتنی شانتی، کتنا سکھ۔
دوسرا۔ کشمیر جنت نظیر!
ایک عورت۔ میں تو ہمیشہ چھٹیوں میں کشمیر ہی آتی ہوں بات یہ ہے کہ یہاں ہر چیز سستی ملتی ہے۔
دوسری عورت۔ ایک پیسے میں انڈا، چھ آنے میں مرغی، چھ آنے سیر سیب۔
پہلی عورت۔ اور سب سے سستے یہاں کے آدمی۔ دو تین روپے مہینے اور کھانے پر باورچی رکھ لو۔
دوسری۔ گھوڑے کا کرایہ ایک روپیہ فی گھنٹہ۔ اور قلی کا کرایہ آٹھ آنے۔
پہلی۔ اچھا ہوا، یہاں ابھی آزادی اور انقلاب کی ہوا نہیں چلی۔ نہیں تو ان لوگوں کے دماغ بھی خراب ہو جائیں گے۔ ہر قلی اور ہر کشتی والا اپنا حق مانگا کرے گا۔
دوسری۔ ارے ہاں تو۔ شکارا روکو، ہم یہاں اتریں گے۔
پہلی۔ یہ لو چار آنے!
شکارے والا۔ سلام سرکار۔ (پاؤں کی چاپ)
پہلی۔ ارے یہ کیا دیوار پر لگا ہے۔
دوسری۔ اشتہار۔
پہلی۔ (پڑھتے ہوئے) مظلوم کشمیری۔
دوسری۔ یہ تو کسی باغی کا معلوم ہوتا ہے!
پہلا اناؤنسر۔ ہاں یہ ایک باغی ہی کا کام تھا۔ اس باغی کا نام ....
دوسرا۔ شیخ محمد عبداللہ۔
پہلا کشمیری۔ محمد عبداللہ۔ یہ نام تو آج پہلی بار سنا ہے؟
دوسرا کشمیری۔ تو پھر کان کھول کر سن لو۔ آئندہ بار بار سنو گے۔ یہ ہمارا نیا رہنما ہے۔
پہلا کشمیری۔ مگر وہ کرتا کیا ہے۔
دوسرا کشمیری۔ وہ ایک نوجوان اسکول ماسٹر ہے۔ مگر اب وہ بچوں ہی کو نہیں بلکہ پوری قوم کو پڑھا رہا ہے۔ آزادی کا سبق۔
پہلا کشمیری۔ ایک اسکول ماسٹر، کیا وہ اتنے بڑے مہاراجہ اس کے افسروں اور اس کی فوج اور پولیس سے ٹکر لے سکتا ہے!
دوسرا کشمیری۔ کیوں نہیں؟ نپولین شروع میں کارپورل ہی تو تھا۔ ابراہیم لنکن ایک معمولی وکیل۔ کل تک مہاتما گاندھی کو کون جانتا تھا؟ محمد عبداللہ ایک مرد مومن ہے، بات کا سچا، ارادے کا پکا۔ ایسا باہمت جوان پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔
پہلا کشمیری۔ ٹھیک ہے! مگر بھائی ہماری قوم کو خواب غفلت سے جگانا کوئی آسان کام نہیں۔ مجھے تو اس میں شبہ ہی ہے کہ ایک ریڈنگ روم میں گپ شپ کرنے والے کالج کے لڑکے اپنی اشتہار بازی سے کچھ کر پائیں
دوسرا کشمیری۔ وقت سب کچھ بتا دے گا۔ سونے اور پیتل کو الگ کر دکھائے گا۔
پہلا اناؤنسر۔ ایک ریڈنگ روم، ایک اسکول ماسٹر، چند باغیانہ خیالات کے نوجوان ساتھی، ایک اشتہار! تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کبھی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔
دوسرا اناؤنسر۔ انقلاب کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر تختہ لگا ہوا ہو کہ یہ راستہ انقلاب کو جاتا ہے، عام طور پر بھٹکنے، راستہ بھولنے، ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی قومیں یہ راستہ پا سکی ہیں۔
پہلا اناؤنسر۔ جب ظلم و استبداد حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم عوام کی آتش بغاوت کو بھڑکانے کے لئے ایک چنگاری بھی کافی ہو سکتی ہے۔
دوسرا۔ ۲۹ر اپریل سنہ ۳۱ء۔ عید کے دن جموں میں ایک بد دماغ سب انسپکٹر پولیس نے نماز کے بعد خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔
پہلا۔ سری نگر میں اشتہار نکل آئے۔

دوسرا۔ ایک طالب علم کو پوسٹر لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

پہلا۔ ایک گمنام مگر جوشیلے آدمی عبد القدیر کو باغیانہ تقریر کرنے پر پکڑ لیا گیا۔

دوسرا۔ عوام کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ حکومت نے ڈر کر فیصلہ کیا کہ مقدمہ جیل کے ایک بند کمرے میں کیا جائے۔

پہلا۔ ۱۳ جولائی کی صبح جب مقدمہ پیش ہونے والا تھا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ سنٹرل جیل کے پھاٹک کے سامنے جمع ہو گئے۔

پہلا۔ کشمیر کا باسٹیل گھر گیا۔

دوسرا۔ [illegible] انقلابی جوش۔

بھیڑ۔ اللہ اکبر۔

پہلا۔ افسر گھبرا گئے۔ انھوں نے عوام کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

دوسرا۔ عوام بگڑ بیٹھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا ۔۔۔۔۔۔

بھیڑ کا لیڈر۔ ہمارے لیڈروں کو ۔۔۔۔۔۔۔

بھیڑ۔ چھوڑ دو!

لیڈر۔ ہمارے لیڈروں کو۔

بھیڑ۔ چھوڑ دو!

پہلا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیے گئے۔

دوسرا۔ پتھر چلنے لگے۔

پہلا۔ انقلاب آ پہنچا۔

دوسرا۔ سرکاری افسروں کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

(گولیاں چلنے کی آواز)

پہلا۔ گولیاں۔

دوسرا۔ آزادی کے متوالے ۔۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ انقلاب کے دیوانے ۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا۔ گولیوں سے کب ڈرتے ہیں۔

پہلا۔ سینہ تان کر سامنے آ گئے۔

دوسرا۔ قمیصوں کو پھاڑ کر، چھاتیاں ننگی کر کے بندوقوں کے سامنے ڈٹ گئے۔

کشمیری۔ مارو کتنی گولیاں مارتے ہو

(گولیاں چلنے کی آواز)

کشمیری۔ آہ۔

پہلا۔ ایک دو نہیں، ۲۱ اکیس مارے گئے۔

دوسرا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔

پہلا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔

دوسرا۔ کشمیر کا جلیان والا باغ۔

پہلا۔ کشمیر کا باسٹیل۔

دوسرا۔ جان دے کر وہ ظلم اور استبداد کی بنیادیں ہلا گئے۔

پہلا۔ انقلاب کا راستہ دکھا گئے

دوسرا۔ اسی وقت شہیدوں کے جنازوں کا جلوس نکالا گیا۔

پہلا۔ کوئی اُسے نہ روک سکا نہ پولیس نہ فوج۔ پہلی بار عوام نے اپنی طاقت کو آزمایا۔

کشمیری۔ وہ دیکھو جلوس کے آگے آگے۔

دوسرا کشمیری۔ لال جھنڈا؟

کشمیری۔ ہاں شہیدوں کے خون سے رنگا گیا ہے۔

دوسرا۔ اور ان شہیدوں کی یاد میں کشمیر کے قومی جھنڈے کا رنگ آج تک لال ہے۔

پہلا اناؤنسر۔ مگر یہ کیا ہو رہا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔؟

دوسرا۔ عوام کے دشمن انھیں بہکانے میں کامیاب ہو گئے عوام کے قدم ڈگمگا گئے۔

ایک کشمیری۔ ہندو مسلمان فساد ہو گیا۔ ہندوؤں کی دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔

دوسرا کشمیری۔ ٹھیک تو ہے۔ ہندوؤں نے دوکانیں کیوں بند نہیں کیں؟

(پولیس کی سیٹیوں کی آواز)

آوازیں۔ پولیس! پولیس۔ ملٹری۔ ملٹری۔

کشمیری ہندو۔ اب ہم مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔

(دکانوں کے لوٹنے کی آوازیں)

کشمیری۔ اب مسلمانوں کی دوکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔

پہلا اناؤنسر۔ ہندو [illegible] نے عوام راستہ بھول گئے۔

دوسرا۔ انقلاب نے ٹھوکر کھائی۔

پہلا۔ ٹھوکر کھا کر ہی چلنا سیکھتے ہیں

دوسرا۔ ۱۳ جولائی کو کشمیری عوام نے سیکھا کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

پہلا کشمیری۔ یہ ہماری بھول تھی کہ ہم آزادی اور جمہوریت کا راستہ چھوڑ کر فرقہ پرستی اور نفاق کے راستے پر چل پڑے۔

دوسرا کشمیری۔ یہ کون کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ شیخ محمد عبد اللہ۔

دوسرا کشمیری۔ تو کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟

پہلا کشمیری۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ ہے مگر ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ کر فرقہ پرستی کا دامن پکڑ لیا وہ کہتا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کی لڑائی ظالم حاکموں اور سرمایہ داروں کے خلاف ہے۔ ہندو عوام سے نہیں ہے۔ ہندو عوام ہمارے دوست ہیں، ہمارے ساتھی ہیں۔

دوسرا کشمیری۔ اور کیا کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ کہتا ہے کہ اتفاق اور اتحاد کے بغیر ہم کبھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کشمیر کے ہندو، مسلمانوں، سکھوں کو قدم ملا کر شانہ بہ شانہ چلنا ہوگا۔

دوسرا کشمیری۔ اور کیا کہتا ہے؟

پہلا کشمیری۔ کہتا ہے کہ اگر ہم سب ایک ہو کر جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو ایک دن آئے گا جب مہاراجہ ہمارے جمہوری حقوق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ کوئی طاقت ہمیں غلام نہ بنا سکے گی۔ نہ کوئی راجہ مہاراجہ، نہ سرمایہ دار، نہ جاگیر دار ۔۔۔ اور نہ کوئی بیرونی حملہ آور۔

پہلا اناؤنسر۔ بس یہی ہے ۱۳ جولائی کا پیغام۔

دوسرا۔ سترہ برس کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اتفاق اور اتحاد ہی میں ہماری نجات ہے۔

پہلا۔ آج ہم یوم شہدا منانے ہیں ۔۔۔۔۔

دوسرا۔ اور شہیدوں کے خون میں رنگا ہوا لال جھنڈا لہراتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ آج ہم جمہوری حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا۔ اور آج جب ہمارے ملک پر لٹیروں نے حملہ کر رکھا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

پہلا۔ ہم کو ۱۳ جولائی کا پیغام نہ بھولنا چاہئے۔ جو ہمیں شہیدوں سے ورثہ میں ملا ہے!

دوسرا۔ وہ پیغام کیا ہے؟

پہلا۔ اتفاق اور اتحاد ہی سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اتفاق اور اتحاد ہی سے وطن کی آزادی اور عزت کو دشمنوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

ہند پاکستان اور مسئلہ کشمیر

(بسلسلہ صفحہ ۳)

سکے بھی نہیں ہیں کہ کمیشن ان کو آسانی سے بے دخل کر سکے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ کشمیر کے باشندوں کی آزاد رائے شماری کا جو فیصلہ ہوگا اُسے منظور کر لیں گے۔ اس لئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ آزاد رائے شماری کا کیا طریقہ ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ریاست میں امن کی [illegible] پیدا کی جائے [illegible] لوگ [illegible] اور اس کے بعد کمیشن کے ناظروں کے سامنے لوگوں کی [illegible] کی [illegible] پاکستان [illegible] اس کی [illegible] شیخ عبد اللہ کی حکومت [illegible] قائم کی جائے [illegible] انصاف کے نزدیک ناقابل قبول ہیں اس لئے کہ ان کے پورا کرنے کے بعد وہ حالت کسی طرح قائم ہی نہیں ہو سکتی جو رائے شماری کے کام کے لئے ناگزیر ہے۔ شیخ عبد اللہ اور ان کے ساتھی اٹھارہ سال سے برابر کشمیر کے عوام کے مسلم لیڈر رہے ہیں۔ کئی بار وہ آزادی کی جد و جہد میں ان کی رہنمائی کر چکے ہیں۔ انہوں نے ساتھ جیل کاٹے ہیں اور طرح طرح کی [illegible] دے چکے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں آج کشمیر [illegible] ہے۔ ان ہی نے اس قیامت کے بعد [illegible] حکومت [illegible] سال [illegible] ریاست میں امن قائم کیا اور [illegible] منافرت [illegible] کشمیر تک پہنچے سے پہلے بجھا دیا۔ ان ہی کی بدولت فرقہ پرستی کا زہر جو اب بھی جا بجا ریاست کے جسم اجتماعی میں موجود ہے اس کے تن میں پھیلنے نہیں پاتا۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی حکومت کے سامنے کا حفاظتی کونسل یا کمیشن کو کوئی حق نہیں، کوئی ذی عقل اس کا ثبوت ملنے میں ایک ایسی منظم جمی ہوئی حکومت کو ہٹانے کا نام نہیں لے سکتا جس کے حامل اٹھارہ سال کے سابقہ حالات کی شہادت کے مطابق جمہور کے معتمد اور ہر دل عزیز لیڈر ہیں۔ پاکستان کی حکومت کا کہنا ہے کہ پرانے حالات دفعتہ بدل گئے ہیں اور اب شیخ عبد اللہ اور ان کے ساتھیوں کو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ مگر دنیا کے دستور، قانون، عقل اور انصاف سب کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک نئے دعوے کا ثبوت عام رائے شماری سے نہ مل جائے اس وقت تک سابقہ حالات کی شہادت ہی کو قابل اعتماد سمجھا جائے۔ اگر پاکستان کے ارباب حل و عقد کو بیرونی اور اندرونی حالات کی نزاکت کا اندازہ ہے اور وہ فوری صلح کو پاکستان اور ہندوستان کی سلامتی کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں تو انھیں ایسی ناقابل عمل شرطیں لگا کر کمیشن کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہئے۔

تعریف کی قدر و قیمت

صالحہ عابد حسین

یہ تو آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ راشن کی سختی، چور بازار اور مہنگائی کے باعث اکثر بھوکے رہتے ہیں اور آپ ان پر ترس بھی کھاتے ہیں۔ شاید حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی بھی کوشش کرتے ہوں۔ مگر ان ہزاروں بھوکوں کی طرف آپ کا دھیان شاذ ہی جاتا ہوگا جو آپ کی توجہ قدر اور تعریف کے بھوکے ہیں جن کو جسمانی غذا تو بری بھلی مل ہی جاتی ہے مگر ان کی روح کی یہ بھوک مٹانے والا کوئی نہیں۔

آپ کسی کی مناسب موقع پر تعریف، پرخلوص اور سچی تعریف، کریں تو وہ ان پر جادو کا سا اثر کرے گی، انسان کی صحیح قدر پہچان کر اس کی تعریف کی جائے تو وہ اس کی نفسی زندگی پر بڑا گہرا اور پائدار اثر ڈالتی ہے۔ کسی قدر دان کی فیاضانہ تعریف سن کر ممکن ہے آپ گھبرا جائیں، جھینپ جائیں، آپ کی زبان بند ہو جائے، آنکھیں جھک جائیں۔ لیکن اگر آپ فرشتے یا دلی نہیں ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ آپ کا دل مسرت سے جھوم نہ اٹھے اور آپ کے دل میں خود اعتمادی اور امنگ کی لہریں ہلکورے دکھانے لگیں۔ اپنی تعریف سن کر دس آدمیوں میں سے نو آدمیوں کے دل میں یہ خیال ضرور گذرے گا "مجھے اپنا کام اور بھی زیادہ شوق اور محنت سے کرنا چاہیے تاکہ میری جو یہ تعریف کی گئی ہے میں آیندہ بھی اس کا مستحق ثابت ہوں اور میرے مداح کو میری طرف سے ناامیدی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں میں اس کی نظر میں ہلکا ثابت ہوں۔"

ڈاکٹر جانسن اپنے ایک مداح کے بارے میں کہتا ہے "اس نے میری اس وقت تعریف کی جب یہ تعریف میرے لئے ایک بڑی اہمیت رکھتی تھی۔" یعنی جب لوگ اس کے کام کی قدر اور اس کی ادبی عظمت سے ناواقف تھے اس وقت اس کے مداح نے اس کی قدر پہچانی اور تعریف کر کے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ہمارے بہت سے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر اور ادیب ایسے ہیں جو اپنی شہرت اور کامیابی کے لئے کسی ایسے شخص کے مرہون منت ہیں جس نے اس وقت ان کے جوہر کو پرکھا جب دوسرے اس سے بے خبر تھے اور وہ پھر اتنا کشادہ دل بھی تھا کہ اس نے ان کی تعریف کر کے ان کی ہمت افزائی کی۔ انھیں خود اعتمادی کی دولت دی اور ترقی کی راہ میں قدم آگے بڑھانے کا حوصلہ اور میدان عمل میں جد و جہد کی ایک نئی طاقت بخشی۔

آپ خواہ لیڈر ہوں یا استاد، باپ ہوں یا ماں، سرپرست ہوں یا مربی، نقاد ہوں یا دوست کوئی بھی ذمہ داری حیثیت رکھتے ہوں آپ کا یہ فرض ہے کہ دوسروں کے کام اور صفات کو پہچانیں اور ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔

یوں تو دوسروں کی نظر میں اپنی قدر و عزت بڑھانے اور اپنی تعریف کرانے کا شوق کون ہے جسے نہ ہو۔ جو لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس جذبے سے بہت اونچے ہیں، وہ غالباً اور زیادہ تعریف کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن بچے، نوجوان، اور عورتیں قدر اور تعریف کی ہمیشہ زیادہ خواہش مند نظر آتی ہیں۔ ان کی آرزو ہوتی ہے کہ لوگ ان کی صفات کو پہچانیں اور ان کے کام کو دیکھیں اور پرکھیں اور اس کی قدر اور تعریف کریں۔ اکثر جوانی کی ناکامیوں اور نوجوانوں کی ناشاد اور افسوس ناک زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں جا کر پتہ چلے گا کہ ان کا بچپن توجہ، تعریف اور محبت کی بھوک میں کٹا ہے۔ اس وقت کی بزرگوں اور استادوں کی بے پروائی اور بے توجہی نے ان کی آیندہ ساری زندگی تلخی اور ناکامی کی نذر کر دی۔

ہمارے یہاں کی ایک مثل ہے "گھر کی مرغی دال برابر" جس سے ہم زیادہ قریب ہوتے ہیں جس کے کام اور خوبیاں ہر وقت ہماری نظر سے گذرتی رہتی ہیں اس کی ہم بہت کم قدر کرتے ہیں اور عام طور سے اس کی طرف سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کی گھریلو زندگی پر یہ مثل اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ اکثر ماں اور باپ بچوں کی ضرورتوں اور خوبیوں دونوں سے بے پروا اور ناواقف رہتے ہیں۔ جسمانی ضرورتیں ممکن ہے پوری کر دی جائیں لیکن اس کا احساس بہت کم بزرگوں کو ہوتا ہے کہ بچے کو ہماری توجہ کی اور صحیح تعریف کی کتنی سخت طلب اور ضرورت ہے اور وہ اس پر کیسا دل خوش کن اور دیرپا اثر ڈال سکتی ہے۔ اسی طرح ایک گھر والی بیوی جو رات دن شوہر، بچوں، اور خاندان بھر کے لئے اپنی ہڈیاں پیلتی اور تکلیفیں سہتی رہتی ہے اس کی خدمت اور محنت اور کام کی تعریف بہت کم کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ اس کی بھوکی اور مستحق ہوتی ہے کہ اس کے کام کی تعریف کی جائے۔ اس لئے کہ اس کا کام ایسا تو نہیں کہ دنیا بھر کو نظر آئے اور غیر بھی آکر اس کی تعریف کریں۔ اس کے کام کی تعریف اور قدر تو گھر والے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے "اُدنھ عورت کا تو کام ہی یہ ہے۔ اس میں بھلا تعریف کی کیا بات ہے؟" یا "یہ بچاری یہ نہ کرے گی تو اور کرے گی بھی کیا" وہ "عورت ہی کیا جو گھر داری اور بچوں اور شوہر کی خدمت نہ کرے" آپ جو کھانا مزے لے لے کر کھاتے ہیں اور خوش وضع اور آرام دہ کپڑے پہنتے ہیں، جس گھر میں راحت و سکھ کا لطف اٹھاتے ہیں اس کے بنانے اور سنوارنے والی کی تعریف اور قدر کیوں نہیں کرتے؟ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو نہ صرف بے حس اور ناشناس ثابت ہوتے ہیں بلکہ اکثر اس کے بڑے خراب نتیجے بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اکثر گھروں میں محض تعریف اور قدر کی اس کمی کی وجہ سے عورتیں چڑچڑی، بدمزاج، بددل، بانجھ اور بعض اوقات ہسٹریا اور دوسری نفسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں، حالانکہ بر محل اور پرخلوص توجہ اور تعریف بڑی آسانی سے انھیں اس سے بچا سکتی ہے۔

ایک آدھ جملہ اپنی تعریف و توصیف سے بچا کر اپنے پاس محفوظ رکھئے، اور کسی لڑکے، لڑکی، گھر والی بیوی، کسی کارگذار نوکر، کسی ابھرتے ہوئے فن کار غرض کسی بھی مستحق کو فیاضی کے ساتھ بخش دیجئے اور دیکھئے کہ وہ کیسا اچھا اثر ڈالتا ہے۔

ہمارے ہاں بچے اپنے بزرگوں خاص طور پر اپنے استاد اور اپنی ماں کی بدمزاجی کا بڑا آسان شکار ہیں۔ ماں کسی بات پر جھنجھلائی ہے، تھکی ہوئی ہے یا بیمار ہے، شوہر سے لڑائی ہوئی ہے، یا ساس نے ڈانٹا ہے، غصہ غریب بچے پر اترتا ہے۔ استاد بیوی سے لڑ کر آیا ہو، یا کھانا بدمزہ ملا ہو، کسی افسر کی ڈانٹ کھائی ہو، یا کسی دوست سے جھڑپ ہوئی ہو جھنجھلاہٹ کو غصہ ڈانٹ اور بید کی شکل میں شاگرد پر اتارنا بہت آسان سا کام ہے۔

لیکن ماں اور استاد کا یہ فعل بڑے مہلک اثرات اور خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ کون نہیں مانتا کہ ماں اور استاد کا یہ فرض ہے کہ بچے کو بری بات سے روکیں اور غلط کام سے بچائیں اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ بچے کی تعلیم اور تربیت بڑا کٹھن اور صبر آزما کام ہے اور بعض اوقات اس کے لئے سزا بھی دینی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ہماری مائیں اور استاد دونوں بچے کی فطرت اور نفسیات کا ہمدردی اور غور سے مطالعہ کریں اور دل سوزی اور محبت سے کام لیں تو اس کے نتائج مار دھاڑ غصے اور خفگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش گوار نکلیں گے۔ جو استاد اور مائیں آسانی سے بچے کی خوبیوں کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی تعریف کرنے میں بھی کنجوسی نہیں کرتے کہ تعریف بچے کا دل بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے، وہ بچے کی طبیعت اور فطرت پر بڑے دیرپا اور خوش گوار اثرات ڈال سکتے ہیں جس سے بہت ممکن ہے کہ اس کی آیندہ ساری زندگی بن جائے۔

اس طرح مالکوں اور آقاؤں کو بھی نوکروں اور مزدوروں کو محض مشین کے پرزے نہ سمجھنا چاہیئے، یہ خطرناک غلطی ہے۔ انسان غریب ہو یا امیر بہرحال انسان ہے وہ نہ لوہے یا لکڑی کا بے جان آلہ یا پتلا ہے اور نہ جانور ہے ایک مزدور اور ادنیٰ ملازم کو بھی قدر و عزت کی خواہش اور تعریف کی بھوک اسی طرح ہوتی ہے جس طرح کسی بڑے رئیس یا لیڈر یا ادیب، شاعر، مصور وغیرہ کو۔ جو لوگ اس گر کو جانتے ہیں اور اپنے ملازموں کے قابل قدر کاموں کو پہچان کر ان کی کھلے دل سے تعریف کرتے ہیں وہ صرف ان کی بھوکی روحوں کو غذا ہی نہیں پہنچاتے بلکہ خود ان کا کام بھی زیادہ اچھا اور آسانی سے ہوتا ہے اور ملازموں اور مزدوروں کو ان سے انس اور ان پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

صحیح وقت، مناسب موقع پر کی ہوئی پرخلوص اور سچی تعریف بڑی نعمت ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلا کر آپ وہ مسرت محسوس نہیں کر سکتے جو قدر و عزت کی پیاسی روحوں کو ان کی داغی غذا پہنچا کر آپ کو ملے گی۔ دوسروں کی تعریف کھلے دل اور فیاضی سے کیجئے اور اگر اس چیز میں کنجوسی ہی کرنی ہے تو صرف اپنی تعریف میں کیجئے نہ کہ دوسروں کی۔ (ماخوذ)

"زکام اڑتالیس گھنٹے میں دور ہو سکتا ہے۔ دوا کی ضرورت نہیں۔ صرف نیچے لکھی ہوئی تدبیریں کافی ہیں:

(۱) سب سے پہلے ایک ہلکا سا مسہل مثلاً سنا کی پتیوں کا لے لیجئے۔

(۲) پھر گرم پانی سے نہایئے اور تولیے سے بدن خوب رگڑ کر ملئے۔

(۳) اس کے بعد گرم بستر میں لیٹ جایئے۔

(۴) کوئی گرم چیز مثلاً نیبو کا آب شورہ پی لیجئے۔

(۵) اس وقت تک لیٹے رہئے جب تک زکام کی علامات بالکل دور نہ ہو جائیں۔

ان تدبیروں پر عمل کرنے سے وہ سمیت جسم سے خارج ہو جائے گی جو زکام پیدا کرتی ہے اور جسم کی قوت مزاحمت کم نہیں ہوگی۔ زکام کو بند کرنے کی کوشش کرنا یا زکام کی حالت میں چلتے پھرتے رہنا عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

سوئٹزرلینڈ

تندرست مغربی قوم کے نزدیک سوئٹزرلینڈ عجیب و غریب ملک ہے۔ جہاں کے لوگ اب بھی سفید رنگ [illegible] لگاتے اور اصلی کافی اور دودھ پیتے ہیں۔ جہاں اس زمانے میں بھی لوگوں کے ناشتے میں انڈا ہوتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ غربت اور فلاکت کے سمندر میں خوش حالی اور فارغ البالی کا ایک جزیرہ ہے۔

اگر آپ فرانس، جرمنی، آسٹریا یا اٹلی سے آکر سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ ایک بالکل نئی دنیا میں آگئے۔ کیونکہ اس ملک پر جنگ کی تباہ کاریوں اور خستہ حالی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ اب بھی اچھا لباس پہنتے، اچھے کھانے کھاتے اور اچھے گھروں میں رہتے ہیں۔

اس دنیا کے امن و سکون میں۔ اس دل کش اور دل آویز سوئٹزرلینڈ میں جہاں کی فرحت و شادمانیوں [illegible] داستان میں جنگ کی تباہ کاریوں کا کہیں ذکر نہیں، جہاں کے لوگ مسلسل چھ صدی سے زبان، نسل اور قومیت کے اختلاف کے باوجود اتحاد و اتفاق اور میل و محبت کی زندگی گزار رہے ہیں ——— متحدہ اقوام، امن اور اس سے بڑھ کر پوری دنیا کے امن و سکون کی بابت خوش گوار امیدیں کیا اور ان کو قائم کرنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے مغربی لوگوں کی طرح سوئستانی لوگ یورپ کے مستقبل سے متعلق سوالات نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یورپ کا مستقبل [illegible] بلکہ [illegible] طرح حل ہو چکا ہے کیونکہ ان کے خیال میں اگر یہ عظیم یورپ میں [illegible] بلند اور برتر معیار زندگی پا سکتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی دولت کا اندازہ اس سے لگایا گیا ہے کہ برطانیہ سے ۲۵ فی صدی زیادہ اور امریکہ سے ۲۰ فی صدی کم ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں صرف ایک آدمی بے روزگار ہے اور اگر آپ کسی سوئستانی سے پوچھیں کہ وہ کون ہے؟ تو آپ کو بتائے گا کہ وہ شخص محکمہ بے روزگاری کا افسر ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے لوگ، خوش باش اور خود پسند ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ملک اور اپنے طرز زندگی پر بڑا ناز ہے۔ اُن کی حکومت بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ لیکن اور سب ملکوں کے مقابلے میں حکومت کے اختیارات سے بہت کم کام لیتی ہے۔ یہاں شدت پسند یعنی بائیں بازو اور دائیں بازو کی سی سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں۔

غرض سوئٹزرلینڈ ایک مستقل ملک ہے جہاں ایک مستقل قسم کی حکومت ہے، شہر میں سڑکوں کے کنارے جو قہوہ خانے ہیں ان میں لوگ بیٹھ کر سیاسیات پر خوب گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ان کی گفتگو کا موضوع غیر ملک کی سیاست ہوتی ہے۔ اپنے ملک کی سیاست نہیں کیونکہ وہاں ایسے مسائل ہی نہیں جن پر لڑنے جھگڑنے جیسے شہریوں میں ملکی سیاست پر گفتگو کرنے کا جوش پیدا ہو۔ سوئٹزرلینڈ ایسا ملک ہے جہاں واقعی پیشہ ور سیاست باز نہیں ہیں۔ سوئستانیوں کو اس پر ناز ہے کہ دنیا میں چاہے جیسا انقلاب آئے جس قسم کی تبدیلی ہو جائے لیکن ان کی ملکی سیاست اور ان کے ملکی مزاج میں کوئی انقلاب اور کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی دونوں کو مکمل ثبات حاصل ہے۔ ابدی اور دائمی ثبات۔

ملک میں آپ کو چند ہی آدمی ملیں گے جو بے تامل اپنے صدر کا نام بتا دیں، صدر کا انتخاب صرف ایک سال کے لئے ہوتا ہے اور وہ مقننہ کے ماتحت رہتا ہے۔ اس کو ویٹو کا بھی حق نہیں ہوتا۔ درحقیقت اس کے اختیارات بہت ہی محدود ہوتے ہیں ....

سوئٹزرلینڈ میں حکومت کی خدمت کرنے کو بڑی عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح اس کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا۔ چنانچہ نیشنل کونسل کے ممبر کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ہاں کونسل کے اجلاس کے دوران میں سفر خرچ کے علاوہ صرف ۳۵ فرینک (جو تیس روپے کے قریب ہوتے ہیں) یومیہ ان کو ملتے ہیں۔

بہت سی چھوٹی ریاستوں میں قدیم یونانیوں کی طرح بلاواسطہ جمہوریت کا قاعدہ اب بھی رائج ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب باشندے مرکزی قصبے کے چوک میں جمع ہو جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کے اپنے ریاستی افسروں کا انتخاب کر لیتے ہیں، اس انتخاب میں جو بھی آتا ہے اپنے ساتھ ایک تلوار لاتا ہے، جو پرانے زمانے سے آزاد آدمی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ عورتوں کو ابھی تک رائے دینے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کل پندرہ ہزار سات سو سینتیس مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی بھی بہت کم یعنی کل ۴۳ لاکھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مختصر سے ملک نے تقریباً سات صدی پوری دنیا کے سامنے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مختلف نسلوں کے لوگ کس طرح آپس میں بڑے اطمینان اور چین سے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کے پیچھے جرمن، فرانسیسی اور اطالوی برابر لڑتے رہے ہیں لیکن سوئٹزرلینڈ کے حدود کے اندر یہی تینوں قومیں مکمل صلح و آشتی اور برادرانہ محبت کے ساتھ ۱۳ صدیوں سے رہتی چلی آئی ہیں۔

زبان اور مذہب کا اختلاف کبھی بھی سوئستانی قوم کی اتحاد و یگانگت کو کمزور نہ کر سکا۔ سوئستانی چار مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ چنانچہ آبادی کے ۷۱ فی صدی لوگ ایک قسم کی جرمن زبان جس کا نام سوئستانی جرمن ہے بولتے ہیں اور تقریباً ۲۱ فی صدی لوگ ایک عجیب قسم کی فرانسیسی زبان بولتے ہیں جس کو سوئستانی رومانڈ کہتے ہیں۔ ۶ فی صدی اطالوی زبان بولی جاتی ہے اور ایک فی صدی رومانش زبان۔ یہ ایک قدیم لاطینی زبان ہے جو خاص طور سے صرف سوئٹزرلینڈ ہی میں بولی جاتی ہے اور عہد روما سے رائج چلی آئی ہے ——— ان چاروں زبانوں کو حکومت ملکی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے۔

موضوع تشنہ رہ جائے گا اگر یہ نہ بتا دیا جائے کہ باشندوں میں سے تقریباً ۵۷ فی صدی پروٹسٹنٹ ہیں ۴۱ فی صدی لوگ کیتھولک اور باقی دو فی صدی مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے باوجود سوئستان قانون مذہب اور ضمیر کی پوری آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔

اس ننھی مجلس اقوام کی ابتدا ۱۲۹۱ء میں ہوئی تھی اور وہ اس طرح کہ ملک کی تین ریاستوں، اوری، شوائتز اور نیڈ والڈن کے نمائندوں نے دائمی اتحاد کا حلف اٹھایا۔ بعد میں یہی حلف اتحاد آئندہ سوئستانی وفاق کی بنیاد بن گیا، اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا دوسرے فرقے کے لوگ بھی اس پرانی جماعت میں شامل ہوتے گئے اور انھوں نے باہمی اشتراک عمل اور اتحاد و یگانگی سے اپنے ان سب دشمنوں کا مقابلہ کیا جو تعداد، طاقت اور فوجی ساز و سامان میں ان سے کہیں زیادہ تھے۔

سولھویں صدی میں سوئستانیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ صلح جوئی اور امن پسندی ہی بہترین لائحہ عمل ہے۔ اسی لئے انھوں نے "جنگ سی سالہ" سے اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ رکھا۔ چنانچہ جب ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کی صلح ہوئی تو مغربی ریاستوں نے سوئٹزرلینڈ کی غیر جانب داری کو تسلیم کر لیا، اور اس وقت سے لے کر آج تک سوئٹزرلینڈ غیر جانبداری کو نباہتا رہا ہے، البتہ ۱۷۹۹ء میں سوئٹزرلینڈ کی یہ روایت ٹوٹ گئی، یہ زمانہ نپولین کی محشر خیز جنگوں کا زمانہ تھا اور سوئٹزرلینڈ تین یورپی ممالک فرانس، آسٹریا اور روس کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ بڑی طاقتیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ سوئٹزرلینڈ کے اہم پہاڑی دروں پر کسی بڑے اور خطرناک دشمن کا قبضہ رہے۔ اس لئے انھوں نے سوئٹزرلینڈ کو ہمیشہ کے لئے غیر جانب دار ریاست قرار دینا منظور کر لیا۔

ویانا کانگریس کے موقع پر ۲۰ نومبر ۱۸۱۵ء کو چار ریاستوں نے ایک قانون پر دستخط کئے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب سوئٹزرلینڈ کی غیر جانبداری کو ہمیشہ کے لئے تسلیم کیا جاتا ہے اور اتحادی طاقتیں اس کی ضمانت دیتی ہیں کہ اس کی سرحدیں محفوظ و مامون رہیں گی۔ انھوں نے اس اصول کو بالکل واضح کر دیا کہ سوئٹزرلینڈ کی غیر جانبدارانہ پالیسی یورپ کے حق میں بجائے [illegible] کے مفید ہے۔ چنانچہ ویانا کانگریس نے ملک کی سرحدیں بھی مقرر کر دیں جو اب تک برقرار ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں سوئٹزرلینڈ نے بہت زیادہ معاشی اور فوجی نقصان اٹھا کر بھی اپنی خطرناک غیر جانبداری کو برقرار رکھا۔ جنگ میں جتنے ملک بھی شریک ہوئے تھے ان سب کی مرضی کے خلاف اس نے نہ صرف سب ملکوں کے امن پسند لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دی بلکہ اس نے عام انسانوں کی خدمت کا بھی بیڑا اٹھایا اور جنگی قیدیوں اور زخمیوں کی پوری پوری مدد کی۔ چنانچہ بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی کی بنیاد اسی جگہ پڑی۔ اس کا مرکز بھی اسی جگہ بنا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جو صلح نامے ہوئے ان میں بھی سوئٹزرلینڈ کی غیر جانب داری کی دوبارہ توثیق کر دی گئی اور جب سوئٹزرلینڈ مجلس اقوام میں باقاعدہ شریک ہوا تو مجلس نے بھی اس کی غیر جانب داری کو مان لیا، پوری مجلس اقوام میں صرف یہی ایک ملک تھا جس کو فوجی غیر جانبداری کے حقوق حاصل تھے۔

سوئستانیوں کے نزدیک ان کی غیر جانبداری بھی تقریباً ایک مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کو وہ آزادی کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ میں نے بہت سے سوئستانیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ہم اپنی غیر جانبداری کو چھوڑ بیٹھیں تو ایک آزاد ملک کی

حیثیت سے ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

اسی وجہ سے وہ انجمن متحدہ اقوام میں بھی شریک ہونے سے گھبراتے ہیں کہ کہیں ان کو اپنی قومی غیر جانبداری سے نہ ہاتھ دھونا پڑے اور وہ اسی میں اسی وقت شریک ہو سکتے ہیں جبکہ انجمن اقوام متحدہ بھی مجلس اقوام کی طرح ان کی غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کا ذمہ لے۔

میں گذشتہ موسم گرما میں انجمن اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس میں جو جنیوا میں منعقد ہوئی تھی شریک ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پورے مغربی یورپ کے ملکوں میں صرف سوئٹزرلینڈ ہی ایسا ملک ہے جس کا نمائندہ اس کانفرنس میں شریک نہیں تھا ——— اس کے یہ معنی نہیں کہ سوئٹزرلینڈ کسی انجمن میں شریک ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ بہت سی غیر سیاسی بین اقوامی مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ چنانچہ انجمن اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی، اور تہذیبی انجمنوں میں سوئٹزرلینڈ کے نمائندے برابر شریک ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح بین اقوامی انجمن صحت، غذا اور زراعت کی انجمن اور دنیا کی تجارتی، روزگار اور پیشہ کی کانفرنس میں بھی سوئٹزرلینڈ نے اپنے نمائندے بھیجے تھے ......

سوئٹزرلینڈ کو مجبوراً صنعتی ملک بننا پڑا کیونکہ اس کے تقریباً چوتھائی حصے میں کوئی چیز پیدا ہی نہیں ہوتی چنانچہ وہ اپنی غذا کی بہم رسانی کے لئے ہمیشہ غیر ممالک کی برآمد کا محتاج رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں خام اشیا اور معدنی چیزوں کی بھی بہت کمی ہے۔ درحقیقت سوئٹزرلینڈ کے پاس جو قدرتی دولت ہے وہ محض اس کے حسین اور دلکش مناظر ہی ہیں اور بس۔

ملک میں صرف ۲۰ فی صدی لوگ کھیتی باڑی اور مویشیوں کی افزائش نسل کا کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ تک بھگ ۵۰ فی صدی لوگ صنعت میں لگے ہوئے ہیں، اور گھڑیاں بجلی کے ساز و سامان۔ نازک اور باریک پرزوں، کپڑوں اور دواؤں کے بنانے کے کام کرتی ہیں۔ عام حالات میں سیاحوں کی مہمان داری سے نفع حاصل کرنا بھی ان کی آمدنی کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے ۱۹۴۷ء میں اس ذریعے سے ان کو تقریباً ۴۰ ملین ڈالر آمدنی ہوئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ۲۸ ہزار ہوٹل، قہوہ خانے اور سرائیں ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی مرفہ الحالی کا دارو مدار اب یورپ کی از سر نو تنظیم پر ہے۔ اس حقیقت کو سوئٹزرلینڈ کے لوگ بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آٹھ سو ملین فرانک کی رقم تباہ و برباد شدہ شہروں کی دوبارہ تعمیر و تنظیم کی مد میں دینا منظور کر لیا ہے۔

سوئٹزرلینڈ بھی مارشل پلان میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کسی ایسے معاملے میں بالکل شریک نہ ہوگا جس سے اس کی روایتی غیر جانبداری کی پالیسی پر اثر پڑنے کا خطرہ ہو۔ روس سے اب تک سیاسی تعلقات اچھے نہ تھے۔ لیکن گذشتہ سال سے دوبارہ اس سے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ والوں کا خیال ہے کہ اب کوئی دوسری جنگ نہیں ہوگی۔ لیکن اگر ہوئی تو ان کا اب بھی ارادہ ہے کہ پہلے کی طرح اس سے دور ہی دور رہیں گے۔

(تلخیص اور ترجمہ عبدالحلیم ندوی)

گاندھی جی اور انقلاب ہند (سلسلہ صفحہ ۲)

بظاہر ۱۹۴۲ء کی جدوجہد ناکام رہی تین مہینے کے اندر عوام کی شورش کچل دی گئی۔ اب ملک میں بد دیانتی اور رشوت کا دور دورہ تھا، قحط کا زور تھا۔ حکومت کی جیلیں کشمکش سے بھری تھیں۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھی قید خانے میں گھٹ رہے تھے۔ لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

لیکن سامراج کی فتح محض ظاہری تھی حقیقی نہیں تھی ادھر گاندھی جی کی زبان سے "ہندوستان چھوڑ دو" نکلا ادھر لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے یہ نعرہ اٹھایا۔ انھوں نے "کرو یا مرو" کہا اور ہزاروں آدمی سچ مچ مر مٹے۔ پچھلی تحریکوں نے لوگوں کے دل سے جیل کا خوف اور غربت کا خوف نکال دیا تھا۔ اس آخری اور سب سے بڑی تحریک نے ان کے پیرووں کو موت کے خوف پر غالب آنا بھی سکھا دیا۔

جب لوگ جان دینے پر تیار ہوں تو قوم نہیں مر سکتی۔ آخر گاندھی جی نے ہندوستان کے عوام کو جان کی بازی لگانا سکھا کر چھوڑا۔ انگریزوں نے عام ہندوستانیوں سے پہلے اس سبق کی اہمیت کا اندازہ کر لیا۔ وہ بڑے حقیقت بیں ہیں، اس لئے سمجھ گئے کہ اب ان کی سلطنت تھوڑے دن کی مہمان ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ابھی راستہ کھلا ہے ایسے میں نکل چلو تو اچھا ہے۔ گاندھی جی نے اس چیز میں کامیابی حاصل کی جس کی دنیا کی تاریخ میں کسی نے آج تک کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یعنی ایک محکوم قوم کو بغیر مسلح بغاوت کے، بغیر تشدد کی جنگ کے آزاد کرا لیا۔

آزادی کے حاصل ہونے کے بعد گاندھی جی کا عمر بھر کا سیاسی میدان میں پورا ہو گیا لیکن لوگوں کی سماجی اور اخلاقی اصلاح کے میدان میں ابھی ان کا کام باقی تھا۔ اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد بڑے شاندار کارنامے دکھانے کا موقع ملا۔ آزادی کی خوشی پر ملک کی تقسیم سے اوس پڑ گئی تقسیم کے ساتھ ہی قتل و غارت کا سیلاب آ گیا۔ آزادی، اتحاد اور امن کو بھینٹ چڑھا کر ملی۔ ہند کی اقلیم کو چک میں اس سرے سے اس سرے تک شمع انسانیت کی روشنی دھیمی پڑ گئی۔ نئی سرحد کے دونوں طرف لوگ نفرت اور غصے سے اور اس سے بھی زیادہ خوف سے اندھے ہو گئے۔ انسان انسان سے اس طرح ڈرنے لگا جس کی ہندوستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ لوگوں پر ایسا جنون سوار تھا کہ معلوم ہوتا تھا سماجی زندگی کی شہر پناہ مسمار ہو جائے گی یعنی سیاسی تقسیم سے خود انسان کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ایک ہی آدمی کبھی شرمناک افعال کے گڑھے میں گر جاتا تھا اور کبھی شرافت اور مردانگی کی بلندیوں پر پہنچ جاتا تھا۔

جب دنیا ڈگمگا رہی تھی اور انسان کی انسانیت معرض خطر میں تھی۔ گاندھی جی سنگ خارا کے ستون کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ ان کا پیام مشعل کی طرح روح کے تاریک سے تاریک گوشوں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ عقل اور عفو کو دلیل راہ بناؤ جن لوگوں نے سخت سے سخت تکلیف اور ذلت اٹھائی تھی ان سے بھی وہ روا داری، مروت اور محبت کا مطالبہ کرتے تھے وہ ان کی مردانگی کو للکار کر ابھارتے تھے اور کہتے تھے کہ انسانیت کے معیار کو گرانا موت سے بھی بدتر ہے۔ وہ ذاتی انتقام کو جو انسان کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور سماج کی بنیاد کو مسمار کر دیتا ہے، کھلم کھلا بُرا کہتے تھے۔ جب تک (۴)

نئی روشنی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین صالحہ عابد حسین عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

سال بھر کا چندہ ..... اور چھ مہینے کا ..... منی آرڈر سے چندہ بھیجیے میں کفایت رہتی ہے اور سہولت بھی

(۱۴) وہ زندہ تھے۔ بدی کی قوتوں کو یہ خوف تھا کہ وہ فتح یاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ان پر الٹ پڑیں۔ اور انھوں نے چاہا کہ اس نور کو جو ظلمت کے گھٹا ٹوپ کو روشن کئے ہوئے ہے، بجھا دیں۔

بدی نے ان پر وار کیا اور ان کے جسم فانی کو قتل کر دیا مگر ان کے پیام کو قتل نہیں کر سکی جسم کی قید سے آزاد ہو کر ان کی روح دنیا پر چھا گئی اور اُسے وہ قوت حاصل ہو گئی جو ان کو اپنی زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی موت نے ان کی زندگی کا کام مکمل کر دیا اور انسانیت نے ایک اور مسیح کی طرح جو ان سے دو ہزار سال پہلے گذرا تھا، مر کر فتح پائی۔

نئی روشنی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۱ | یکم ستمبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندو مسلم اتحاد

مہاتما گاندھی

میری اپنے ہم وطنوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ فرقوں کے باہمی تعلقات کو درست کرنے اور سوارات حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کو مستقل عقیدے کے طور پر اختیار کر لیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں کو آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام نہیں لینا چاہئے ....

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم عدم تشدد کے عقیدے [illegible] رجوع کریں (یہ شرط ہے کہ ہم واقعی کبھی یہ عقیدہ رکھتے تھے) چاہے وہ صرف مندرجہ بالا مقاصد [illegible] تو دونوں فرقوں کے درمیان جو کشیدگی اس وقت ہے وہ بہت کچھ دب جائے گی۔ اس لئے کہ میرے خیال میں قبل اس کے ہم اس کشیدگی کو دور کرنے کی تدبیروں پر غور کریں ہمیں اپنے باہمی تعلقات میں عدم تشدد کا رویہ اختیار کرنا لازمی ہے۔ دونوں فریقوں کا مشترک مقصد ہونا چاہئے کہ ان میں سے کوئی ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کرے بلکہ جب کبھی اختلافات پیدا ہوں تو دونوں انھیں پنچوں کے ذریعے سے باہمی چلیں تو عدالتوں کے ذریعے سے طے کر لیں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ معاملات کا تعلق ہے عدم تشدد کا بس اتنا ہی مطلب ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح ہم دیوانی کے جھگڑوں میں ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے اسی طرح ہمیں مذہبی معاملات میں بھی نہیں کرنا چاہئے ....

ہندو کی حیثیت سے میرا دل یہ کہتا ہے کہ سب مذہب کم و بیش حق ہیں۔ سب اسی خدا کی طرف سے ہیں۔ مگر سب میں خامیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس لئے کہ وہ ہم تک پہنچتے پہنچتے ناقص انسانوں کے ہاتھوں سے گزرے ہیں۔ سچی شدھی کی تحریک کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ ہر ایک اپنے اپنے مذاہب میں کامل ہو جائے۔ اس کا صرف ایک ہی معیار ہو سکتا ہے اور وہ انسان کا کردار ہے۔ اس خانے سے اس خانے میں جانے سے کیا فائدہ اگر اس سے اخلاق میں بلندی نہ پیدا ہو جائے۔ دوسرے کو اپنے مذہب میں لا کر خدا کی بندگی کا رستہ دکھانا (جو شدھی کا مقصد ہونا چاہئے) بالکل بے معنی ہے، جب خود ہمارے مذہب والے روزمرہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کے منکر ہیں۔ "طبیب پہلے اپنا علاج کر" وہ مثل ہے، جو دنیاوی معاملات سے زیادہ دینی معاملات پر صادق آتی ہے ....

مجھے یقین ہے کہ اگر لیڈر نہ لڑیں تو عوام کبھی نہیں لڑنا چاہتے۔ اس لئے اگر لیڈر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ سب ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہم آپس کے فساد کو وحشیانہ اور منافی مذہب سمجھ کر عمومی زندگی کو اس سے پاک کر دیں تو مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ عوام بہت جلد ان کی پیروی کریں گے ....

ہندو اگر مختلف فرقوں میں اتحاد چاہتے ہیں تو ان میں اتنی ہمت ہونی چاہئے کہ اقلیتوں پر اعتماد کریں۔ اس کے سوا جو صورت اختیار کی جائے گی اس سے تنگی پیدا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عوام لوگ ہندوں اور مسلمانوں کے مسیر بنتا نہیں چاہتے اور اگر ہم نے ستیہ گرہ کا صحیح استعمال سمجھ لیا ہے تو ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ اس کا استعمال ہر بے انصافی کے خلاف ہو سکتا ہے، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہو یا کسی نسل و مذہب کا بھی ہو اور ایک با انصاف ضمیر کا عالم ہمیشہ اجتناب چاہتا ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان ہم چاہتے ہیں کہ سرے سے فرقہ داری زہر ہی ختم ہو جائے۔ اس لئے اکثریت کو پہل کرنی چاہئے اور اقلیتوں کو اپنی نیک نیتی کا بھروسا دلانا چاہئے۔ اتفاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب طاقتور اپنی طرف سے پہل کرے بغیر اس کا انتظار کئے کہ کمزور بھی صلح پر آمادگی ظاہر کرے ....

مجھے اس مصیبت زدہ ملک میں کوئی بڑا کام کرنے کی راہ اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ ہندو مسلمانوں میں پائدار دلی اتحاد پیدا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتحاد فوراً ہو سکتا ہے [illegible] قدرتی طور پر دونوں [illegible]

[illegible] رہا ہے جو پہلے [illegible] رکھنے پر چھپایا [illegible] مسلمان [illegible] شبہات کو دور کر دیا جائے [illegible] فوراً فراخ دلی اور اعتماد سے کام لیتے ہیں .... اسلام کی تاریخ میں اگر اخلاقی اصول سے انحراف کی مثالیں نظر آتی ہیں تو بہت سے زریں صفحات بھی ہیں۔ اسلام عروج کے زمانے میں اس میں تعصب نہ تھا۔ دنیا اس کی تعریف کرتی تھی۔ جب مغرب پر ظلمت چھائی ہوئی تھی، مشرق کے آسمان پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا اور اس نے دکھیا دنیا کو روشنی اور راحت بخشی۔ اسلام کوئی جھوٹا مذہب نہیں۔ ہندو اگر عقیدت اور احترام سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ اس سے اسی طرح محبت کرنے لگیں گے جیسے میں کرتا ہوں۔ اگر یہاں اکثر اس میں اکھڑپن اور شدید تعصب پیدا ہو گیا ہے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ اس میں ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر ہندو اپنی اصلاح کر لیں تو مجھے ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اسلام بھی اس کے جواب میں وہ کرے گا جو اس کی رواداری کی قدیم شایان ہے۔ معاملے کی کنجی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں جھجک اور بزدلی چھوڑ دینی چاہئے۔ ہمیں بہادر بن کر بھروسا کرنا چاہئے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہندو مسلم اتحاد	مہاتما گاندھی	۱
مسلمان اور آزادی	سید عابد حسین	۲
حیدرآباد سیاست علم کی بساط پر (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مغربی دنیا		۶
یہ لوگ (نظم)	اختر انصاری	۷
فرار "	کوثر بلگرامی	۷
نزول رحمت "	اختر حمید خاں	۷
میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی	خواجہ احمد عباس	۸
اپاہج بچے اور ان کا علاج	صالحہ عابد حسین	۱۰
ہم کدھر جا رہے ہیں	سالک لکھنوی	۱۱

قیمت فی پرچہ ۳ر

مسلمان اور آزادی

ڈاکٹر سید عابد حسین

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں نے روڑا اٹکایا۔ پچھلے پانچ سات برس میں جو کچھ ہوا اسے سرسری نظر سے دیکھئے تو سچ مچ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن سرسری نظر اکثر دھوکا دیتی ہے۔ آئیے کچھ اور پیچھے چلیں اور پچھلے تیس سال کے واقعات پر ایک گہری نظر ڈال کر دیکھیں کہ بات کہاں تک صحیح ہے۔

یوں تو ہماری آزادی کی تحریک کو شروع ہوئے ساٹھ برس کے قریب ہو چکے ہیں لیکن تیس پینتیس سال تک وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ تک محدود رہی۔ گاندھی جی نے آکر اسے خاص و عام سب کے دل میں اتار دیا۔ آزادی کا جذبہ خون بن کر ہماری رگوں میں دوڑنے لگا۔ روح کی طرح نس نس میں سما گیا۔

اس سے پہلے کانگریس میں جس نے آزادی کی تحریک اٹھائی تھی مسلمان بہت کم تھے۔ عام مسلمانوں میں سیاسی جھجک نہ ہونے کے برابر تھا، مذہبی جوش بہت تھا۔ انھیں بھی انگریزوں سے بڑی نفرت تھی، مگر اس لئے کہ وہ ترکی کی خلافت کو ختم کرکے اسلام کو کمزور کرنا اور مسلمان ملکوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ مولانا محمود الحسن اور علی برادران نے "دوسرے ملک دبا کر تو انگریز غلام بنانا چاہتے ...

... بھی احساس ہونا چاہئے ... تب تک تم خود غلام ہو ... ملکوں کی ... کر سکتے ہو۔ یہ بھی سمجھو کہ انگریز، مصر اور عرب کے ... پر اپنا اثر زیادہ تر اسی لئے رکھنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کے راستے محفوظ رہیں، جہاں ہندوستان اس کے ہاتھ سے نکلا، اسے مسلمان ملکوں میں اپنا اثر قائم رکھنے کی اتنی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر رہی بھی تو ہندوستان کے وسائل کے بغیر انھیں دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔" کتنا صحیح اندازہ تھا! آج سب کو یہ بات صاف نظر آرہی ہے۔

غرض مسلمانوں میں غلامی کا گہرا احساس اور آزادی کا شدید جذبہ مسئلہ خلافت کے ذریعے ابھرا۔ کانگریس نے برطانوی حکومت کے سامنے سوراج کی مانگ کے ساتھ ساتھ کچھ وقتی مطالبے بھی رکھے تھے۔ ان میں خلافت کا مطالبہ بھی شامل کر لیا تھا۔ مسلمان بڑے جوش سے بہت بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس میں چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ہزاروں لاکھوں محب وطن ستیہ گرہ کی نہتی لڑائی لڑنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے وکالت چھوڑی، نوکریاں چھوڑیں، لڑکوں نے مدرسے چھوڑے۔ ملک کے جانباز سپاہیوں نے لاٹھیاں اور کہیں کہیں گولیاں کھائیں اور برسوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہے۔ ان دنوں ہندو مسلمان اس طرح گھل مل گئے تھے کہ کسی نے گنتی نہیں کی کہ ملک کے لئے قربانیاں کرنے والوں میں ہندو کتنے ہیں اور مسلمان کتنے ہیں، لیکن اگر چھان بین کی جائے تو شاید مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہی ہو گی۔

یہ حالت ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک رہی لیکن اس عرصے میں ترکوں نے خلافت کو خود ختم کر دیا۔ اس سے ہمارے ہاں اکثر مسلمان لیڈروں کو جن کی سیاسی زندگی تحریک خلافت سے شروع ہوئی تھی بڑا سخت دھکا لگا۔ بہت سے تو بالکل بیٹھ ہی گئے، اور بہت سے ڈگمگانے لگے لیکن عام مسلمانوں کے دل میں اب آزادی کا جذبہ خلافت سے الگ اپنی جگہ کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ کی دوسری تحریک میں بھی انھوں نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس وقت بڑے مسلمان لیڈروں میں سے پکے کانگریسیوں کو چھوڑ کر بہت کم میدان میں آئے۔ لیکن عام مسلمان چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی رہنمائی میں کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور انھوں نے پھر جیلوں کو بھر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں کوئی دس ہزار مسلمان جیل میں گئے۔

اس کے بعد بارہ سال کا زمانہ کانگریس کی تاریخ میں زیادہ تر تعمیری کاموں کا زمانہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہمیں برطانوی سامراج سے آخری لڑائی لڑنے سے پہلے اپنے دامن کی اور اپنی سماج کی گندگی کو صاف کرنا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی عملی خدمت کرکے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے اس لئے تو خود وہ ان کے حلقے کے کارکن جنھیں کانگریس کی جان سمجھنا چاہئے زیادہ تر تعمیری کاموں کی انجمنیں قائم کرنے اور انھیں مضبوط بنانے میں مصروف رہے۔ نمک کی محدود ستیہ گرہ کے سوا اس زمانے میں عام سول نافرمانی کی کوئی تحریک شروع نہیں کی گئی۔ یہ مسلمانوں کے سیاسی جوش سوت بھی تعمیری کاموں سے اُن کا جی گھبراتا ... بس نعرے لگانے، لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے سے ... اور اس کا اب موقع نہیں ملتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانگریس سے کٹ گئے، اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔ اب فرقہ پرست لیڈروں اور انگریزی حکومت کے وفاداروں کو موقع ملا کہ مسلمان عوام کے دل میں آہستہ آہستہ اپنے پنجے جمائیں، پھر بھی ان کرائے کے لیڈروں کی مجال نہ تھی کہ عام جلسوں میں آکر زبان کھول سکیں۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں انھیں کانگریس کی مخالفت کی ہمت نہیں ہوئی۔ یو۔پی میں یونٹی بورڈ اور دوسرے صوبوں میں بھی مسلمان امیدواروں نے زیادہ تر یہی کہہ کر عام مسلمانوں سے ووٹ لئے کہ ہم کانگریس کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

۱۹۳۷ء میں سات صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کا قائم ہونا ان کا غیر کانگریسی مسلمانوں کے ساتھ کولیشن بنانے سے انکار کرنا، زمینداری کو ختم کرنے کی تجویز۔ یہ چیزیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں کو بدحواس کر دیا، وہ سمجھے کہ ہم سیاسی اور معاشی حیثیت سے برباد ہو جائیں گے۔ اب فرقہ پرست لیڈروں کی بن آئی۔ اور انھوں نے "اسلام خطرے میں" چلانا شروع کیا۔ ادھر برطانوی حکومت کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت ڈر گئی تھی اور اپنے سارے زبردست وسائل سے فرقہ پرستوں کی مدد کر رہی تھی۔ چونکہ مسلمان فرقہ پرست لیڈروں کے ذریعے سے کامیابی کی زیادہ امید تھی اس لئے ان پر نظر عنایت زیادہ تھی۔ پھر بھی مسلم لیگ کو جس میں اب سرکار کے وفادار اور قوم کے "بہی خواہ" دونوں جمع ہو گئے تھے کئی سال تک زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ آخر بار ... نعرہ ... پاکستان کا نعرہ سمجھایا گیا ...

مفہوم کو اس قدر مبہم رکھا گیا کہ ہر شخص جو مطلب چاہے سمجھ لے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان زمیندار اور لاکھوں آدمی جن کے اغراض ان کے ساتھ وابستہ تھے، پاکستان کے نام کو ایک تعویذ سمجھتے تھے جس کی برکت سے ان کی زمینداری اور دوسرے حقوق بچ جائیں گے۔ لیکن عام مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اس سے وہ خطرہ جو اسلام کے سر پر منڈلا رہا ہے ٹل جائے گا۔ روپیہ ان لوگوں کے پاس تھا، اخبار اُن کے ہاتھ میں تھے حکومت کی طاقت اُن کے ساتھ تھی، کانگریسی مسلمان اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمان تعداد میں کم تھے، اور انھوں نے کوشش میں کمی نہیں کی کہ لوگوں کو حقیقت حال سمجھائیں، لیکن وسائل کی کمی نے اور تنظیم کی کمی نے اُن کو کامیاب نہ ہونے دیا ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

اب ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا موقع آیا۔ آپ اس بات کو مد نظر رکھئے کہ مسلمانوں میں ووٹ دینے والے زیادہ تر اونچے اور نچلے اوسط طبقے کے تھے اور یہ تقریباً سب کے سب زمیندار اور سرکاری ملازم تھے یا ان کے ساتھ وابستہ تھے کئی سال سے مسلم لیگ تبلیغ و اشاعت کے سارے وسائل اختیار کرکے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا رہی تھی حکومت حکمت عملی کی باریک سوئیوں سے ان کے خون میں فرقہ پرستی کا زہر داخل کر رہی تھی، اور پھر یہ دیکھئے کہ کونسلوں کے انتخابات میں صوبہ سرحد میں کانگریسی مسلمانوں کی اکثریت رہی، پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت ناکامی ہوئی اور سندھ میں اس کی اکثریت نہ ہو سکی۔ یو۔پی میں بارہ کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمان الیکشن میں کامیاب ہوئے، اور ہارنے والوں میں بہت سے تھوڑے ووٹوں سے ہارے۔ اندازہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے ۳۹ یا ... فی صدی ووٹ مسلم لیگ کے خلاف پڑے۔ دوسرے صوبوں کے اعداد و شمار میرے پاس نہیں ہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ بہار اور آسام میں بہت بڑی تعداد میں اور دوسرے صوبوں میں معقول تعداد میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دئے۔

غرض ۱۹۴۵ء تک باوجود اس کے کہ چار پانچ برس سے مسلمان اپنے آپے میں نہ تھے بلکہ ایک دماغی ہیجان میں مبتلا تھے ان میں سے بہتوں کے دل میں آزادی کا جذبہ اور وطن کی محبت کا جذبہ اس ہیجان پر غالب رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ ۱۹۴۵ء میں بلکہ ۱۹۴۶ء کے آخر تک خود مسلم لیگ کے پیروؤں کی بہت بڑی اکثریت یہ چاہتی تھی کہ کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے اور ہندوستان متحد ہو کر آزادی حاصل کرلے۔ لیکن ارباب غرض نے جن میں ہر فرقے اور کئی طبقوں کے لوگ شامل تھے، یہ دیکھ کر کہ ان کے ولی نعمت انگریز جا رہے ہیں، ان کو روکنے کے لئے اپنا آخری خونی کھیل کھیلا۔ کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ لگائی گئی، اور ملک میں چاروں طرف پھیلنے لگی، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیسر سے ہوتی ہوئی پنجاب پہنچی، جہاں پہلے ہی سے بارود بچھی ہوئی تھی۔ عام لوگ غصے نفرت اور خوف سے بدحواس ہو گئے تھے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اور کیا ہو رہا ہے۔

اس آگ کو بجھانے کے لئے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کرنا پڑا جو علاقہ پاکستان میں چلا گیا وہاں کے مسلمانوں پر اس کا کیا اثر ہوا اس سے مجھے بحث نہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمان سناٹے میں آگئے، خود مسلم لیگی سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ تھوڑے سے لوگ جن کے پاس دولت تھی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار

نئی روشنی دہلی

یکم ستمبر ۱۹۴۸ء

حیدرآباد سیاست عالم کی بساط پر

بہت دنوں سے یہ خبر گرم تھی کہ حیدرآباد اپنے اور حکومت ہند کے معاملے کو اقوام متحدہ کی مجلس کے سامنے پیش کرنے والا ہے۔ اب اس کی باقاعدہ تصدیق ہو گئی ہے۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم میر لائق علی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط کے ذریعے سے اپنی حکومت کے اس ارادے کی اطلاع دے دی ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اور اخباروں میں اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حکومت ہند اور حیدرآباد کے تعلقات کے بارے میں اقوام متحدہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے ادارے کا آئین کچھ بھی ہو اس کا عمل یہی بتاتا ہے کہ وہ قانونی نقطۂ نظر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ ہر معاملے پر سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے غور کرتا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ بین الاقوامی سیاست کے آئینے میں حیدرآباد کے معاملے کی شکل کیا نظر آتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے میں دو جتھے ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ بڑا جتھا امریکہ اور انگلستان کا اور چھوٹا روس کا ہے۔ دونوں اپنی جگہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ملکوں کو جو اس ادارے میں شریک ہوں اپنے حلقۂ اثر میں لے آئیں۔ اس کے لیے درشتی اور نرمی، ہمدردی اور دباؤ دھمکی [illegible] دونوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہندوستان یو۔ این۔ او کا ممبر بنا ہے، امریکی جتھے کی طرف سے اس پر دونوں ہتھیاروں کے وار ہو رہے ہیں۔ [illegible] بے تعلقی اور بے پروائی کا حربہ استعمال کر رہا ہے لیکن جب ضرورت ہو گی دوسرے حربوں سے بھی کام لے گا۔

یہ کہنا غلط ہو گا کہ دنیا کی قومیں [illegible] غرضی کو دخل [illegible] انصاف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ اگر کسی بہت بڑی غرض کا پردہ حائل نہ ہو تو انہیں حق کی صورت بھی نظر آتی ہے لیکن ان کے پیشہ ور سیاست داں عام طور پر اپنی آنکھوں کو اس طرح سدھاتے ہیں کہ انہیں حق اسی بات میں دکھائی دیتا ہے جس میں ان کا فائدہ ہو۔ تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سیاست دانوں کو اپنے ملک کی رائے عامہ سے مجبور ہو کر حق کا ساتھ دینا پڑتا ہے خواہ وہ ان کے مفاد کے خلاف ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ حیدرآباد کا معاملہ دوسرے ملکوں کے عوام کو حق کی روشنی میں کیسا معلوم ہو گا اور ان کے پیشہ ور سیاست دانوں کو غرض و مصلحت کی عینک سے کیسا نظر آئے گا۔

عوام کو چاہیے وہ جمہوری ملکوں کے ہوں یا [illegible] ملکوں کے رجعت پسند نظام کی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی جس نے ایک سیاسی پارٹی کے مسلح رضاکاروں کی مدد سے عام رعایا اور فرماں روا دونوں کے دلوں پر دہشت کے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور جسے اس میں ذرا بھی باک نہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کو قید کر دے یا اگر زیادہ خطرناک سمجھے تو قتل کرا دے۔ کہ میر لائق علی یا ان کے ہم راز قاسم رضوی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مہذب ملک کے باشندے حیدرآباد کے جاگیرداری طرز حکومت کی جسے حال میں فسطائیت کے پیوند نے اور زیادہ رجعت پسند بنا دیا ہے، حمایت کریں گے تو وہ بڑے دھوکے میں ہیں۔

لیکن در اصل حیدرآباد کے سیاست باز کسی ملک کے عوام سے کوئی توقع نہیں رکھتے بلکہ ان کی امیدیں ان پیشہ ور سیاست دانوں سے وابستہ ہیں جو اقوام متحدہ کی مجلس میں اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قاسم رضوی صاحب اب اپنی تقریروں میں دنیا کو کمیونزم کے ہوّے سے ڈراتے ہیں اور یہ وعدہ کرتے ہیں کہ حیدرآباد کمیونسٹ خطرے کا مقابلہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دے گا۔ ان کے خیال میں امریکی اس نازک وقت میں ان کی اور ان کے رضاکاروں کی مدد کو بہت غنیمت سمجھے گا، اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن جو لوگ اقوام متحدہ کے طرز عمل کو پچھلے [illegible] سے غور سے دیکھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں [illegible] یا امریکی جتھے کو حیدرآباد کے معاملے [illegible] ہو گی تو صرف اتنی کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان پر کس طرح احسان رکھا جا سکتا ہے یا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ روسی رویے کا اندازہ کرنا تو بہت مشکل ہے مگر امریکی جتھے کا معاملہ صاف ہے۔ اگر وہ ممبروں کی اکثریت کو اس پر آمادہ نہ کر سکا کہ اس مقدمے کی قانونی کمزوری کو نظر انداز کریں تو وہ خود ہی حیدرآباد کی درخواست کو رد کر کے ہندوستان پر احسان رکھے گا اور جو نہیں [illegible] ناول سے اور اس پر وہ گفت و شنید سے اس معاملے پر غور کرنے کے لیے راضی ہو گئے تو پھر یا [illegible] ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کا ایک اور حربہ ہاتھ آ جائے گا۔

لیکن حیدرآباد کی چار دیواری میں رہنے والے مدبروں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ان جیسے پیادے محض اس کام آتے ہیں کہ انہیں پٹوا کر اپنے کسی قیمتی مہرے کو بچا لیا جائے یا حریف کے کسی قیمتی مہرے کو پھانس لیا جائے۔ اگر حیدرآباد چند ہفتوں میں اندرونی سازشوں اور سورشوں کا شکار ہونے سے بچ گیا اور یو۔ این۔ او نے اس کی درخواست پر غور کرنا منظور کر لیا تو ممکن ہے اس سے امریکی جتھے کی حکمت عملی کو تھوڑی بہت مدد ملے۔ مگر حیدرآباد کی موجودہ حکومت کا بھلا نہیں ہو گا۔ اس پیادے کو تو پٹنا ہی ہے، چاہے پہلی چال میں پٹے یا دوسری میں یا تیسری میں۔

بزم بے تکلف

نعیم صاحب اور ان کی وکالت میں ان بن تو رسمی سی تھی سنہ ۱۹۲۱ء کی سیاسی تحریک میں موقع دیکھ کر اسے طلاق دے بیٹھے۔ خدا کے فضل و کرم سے معاش سے آزاد تھے۔ جس کا بھائی محکمہ تعمیرات میں انجینیر ہو وہ آرام سے گھر بیٹھ کر سونے کا نوالہ کھا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انجینیری تو کیمیا کا نسخہ ہے۔ مٹی سے سونا بنانا اور جگہ استعارہ ہو۔ مگر محکمہ تعمیرات میں حقیقت ہے۔ ریت، سیمنٹ، اینٹوں سے، لوہے سے ہر چیز سے کھرا کندن بنتا ہے۔

وکالت چھوڑ کر نعیم صاحب نے سیاست میں قدم رکھا مگر ناظر ہی کے استاد رہے، اکھاڑے میں نہیں اترے۔ ان کے گھر پر شام کو کانگرس اور خلافت کے پٹھے جمع ہوتے تھے۔ نعیم صاحب ان کو اندرونی اور بیرونی سیاست کے داؤ پیچ سمجھاتے اور اس کے بعد لیکچر کا دور چلتا۔ پہلے دھواں دھار تقریر اور پھر گرما گرم چائے۔ لوگ صبر کی تلخی کو بر شیریں کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔

نعیم صاحب کے ولی النعمت اور بھائی انجینیر صاحب نتین بائی کے ہول سے وفات پا گئے۔ اور وصیت نامے میں بیوی بچوں کے نام جائداد اور نعیم صاحب کے نام دعائے خیر لکھ گئے۔ اس صدمے سے نعیم صاحب کا دماغ الٹ گیا۔ بہت دنوں تک مرے ہوئے بھائی کو کوستے رہے کہ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ سیاست سکھانے کا شوق اب بھی باقی تھا مگر سکھانے کا سامان نہیں رہا تھا۔ اپنے ہاں چائے پلا کر چسکنے پر ہوشیار تھے [illegible]

[illegible] کے لیے سیاسی [illegible] ۱۹۲۱ء [illegible] زمانے [illegible] اور عمل کا وصل [illegible] کی نظری [illegible] سمجھانے ہی کا نہیں بلکہ ان کی عملی گتھیاں سلجھانے کا بار بھی پڑ گیا اور اس لویہ ناتوان اٹھائے پھر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں شیر ٹرومین تو آئین ٹائین فش ہو کر رہ گیا۔ اب دیکھیں ڈیوی کیا کرتا ہے۔ ہماری رائے میں تو جرنیل کو جو امریکی شہری بن کر صدر منتخب ہو جائے امریکہ ملکوں کو آج کل اسی کی ضرورت ہے اور یہ چین اور جرمنی کے جھگڑے تو محض بے کار ہیں۔ کوئی ان کو سمجھائے کہ میاں دو قوموں کا نظریہ مان لو اور دو حصوں میں بٹ کر برطانوی ڈومینین بن جاؤ۔ کور نر جنرلوں کی ضرورت ہو تو ہندوستان سے منگوا لو۔ فلسطین تو وہاں کی ریاست کا بادشاہ قاسم رضوی کو بنا دو۔ اپنے آپ کو عرب نسل سے بتاتا ہے۔ صورت سے یہودی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے اور ضمناً حیدرآباد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ چین کا قصہ برسوں سے چل رہا ہے کسی طرح طے ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جاپان پوست کی کاشت کرے اس کی معاشی مشکل آسان ہو جائے گی اور چین کو افیون بھیجی جائے۔ اس کی سیاسی گتھی سلجھ جائے گی۔ افیم کے عمل سے چینیوں میں پھر وہی دھیان گیان، رقت قلب اور صلح جوئی پیدا ہو جائے گی اور اس روز روز کی خانہ جنگی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور کشمیر کا جھگڑا بھی کوئی جھگڑا ہے۔ وہ تو اس دن طے ہو گیا تھا جس دن مہاراجہ نے "مایۂ خویش" یا سب بنیوں میں منتقل ہوئے ریاست کا حساب کم و بیش شیخ عبداللہ کے سپرد کر دیا۔ آ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

یہ لوگ

اختر انصاری

ستم قاتل بہ اعتبار اثر
یوں تو شاخِ نبات ہیں یہ لوگ

ذہن تاریک اُن کے دل تاریک
علم و عرفاں کی رات ہیں یہ لوگ

دشمنی اِن کی بڑھ جائے سے
ظلمتِ کائنات ہیں یہ لوگ

تشنہ تیغ بستہ روح بستہ
انجمادِ حیات ہیں یہ لوگ

نہیں ان میں کوئی تڑپ باقی
مدفنِ حسیات ہیں یہ لوگ

تپشِ زیست سے عناد انہیں
موت کا سرد ہاتھ ہیں یہ لوگ

نہ تفکر، نہ سوزِ دل، نہ شعور
کس قدر واہیات ہیں یہ لوگ

فرار

کوثر بلگرامی

سرِ دنیا کیسی قیامت کی گھٹا چھائی ہے
اہرمن کی سپہِ شر کی صف آرائی ہے
کشت و خوں، خطرہ و بلا، ذلت و رسوائی ہے
نوعِ انساں پہ تباہی کی گھڑی آئی ہے

روحِ بیتاب تڑپتی ہی چلی جاتی ہے!
زندگی آہ کے سانچوں میں ڈھلی جاتی ہے!

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ گرجتے طوفاں
یہ تڑپتی ہوئی آہیں، یہ سسکتے ارماں
نیم جاں تشنہ دہاں، فاقوں کے مارے انساں
چار جانب ہے بپا ایک قیامت کا سماں

یہ نئے نشترِ خاطر نہیں دیکھے جاتے!
یہ جگر سوز مناظر نہیں دیکھے جاتے!

محفلِ عیش نہیں، بزمِ عزا ہے دنیا
لاکھ آنسو ہیں یہاں ایک تبسم کی بہا
چار سو خونِ تمنا، الم و آہ و بکا
دل میں اب طاقتِ برداشت نہیں ساز اٹھا!

ہو جائے ساحر ہو خاموش تو ہو جانے دے!
مجھے نغمات کے سیلاب میں کھو جانے دے!

نزولِ رحمت

اخترحمید خاں

(۱)

اگر نزول نہ رحمت کا آسماں سے ہو
اگر کرم کا ترشح زمیں کو نم نہ کرے
اگر یہ آبِ مصفّٰی یہ شبنم و باراں
زمیں کی خستگی و شورِیدگی کو کم نہ کرے
تو یہ فروغ، یہ بالیدگی کہاں سے ہو
تو زندگی یہ نئی روح آکے دم نہ کرے

(۲)

مری مثال بھی اُس خاکِ تشنہ کی سی ہے
جو آبِ پاک سے نمناک و سرفراز رہے
یہ ولولے، یہ امنگیں نزولِ رحمت ہیں
خدا کرے کہ مرا دل یونہی گداز رہے
نئی ترنگ، نئی اک شگفتگی سی ہے
امید و شوق کا یہ سلسلہ دراز رہے

(۳)

[illegible] نزول [illegible] کی لہر
ابھارتے ہیں سمندر سے [illegible] جس کو
بلا شبہ وہی امرت ہے سارے دنیا کی جھڑی
طواف کرتی ہیں جس ارض کا نسیم و صبا
وہ ارض ہوتی ہے شاداب و خوش گوار بڑی

(۴)

مری مثال بھی اُس ارض خوش گوار کی ہے
نسیم ہے مرے لہجے میں اور صبا بھی ہے
کھلے ہوئے ہیں شگوفے، بنا ہوں صحنِ چمن
خدا کے فضل سے بارش بھی ہے ہوا بھی ہے
دبا ہوا ہوں زمانے کے پاؤں کے نیچے
اور آسمان و سمندر سے واسطہ بھی ہے

(۵)

ہوا نے، ابر نے، موسم نے، روحِ فطرت نے
دیا ہے [illegible] یہ پیغام نازنینوں کو
ہمارے پاس بھی آیا ہے عرش سے تحفہ
حقیر سمجھو نہ ہم زاویہ نشینوں کو
سنا کریں گا یہی وہ چار گیت بر کھا کے
کشیدہ قامتِ گل پیرہن حسینوں کو

میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی؟

خواجہ احمد عباس

ایک دو نہیں، سری نگر کے ایس پی کالج کے چار نوجوان دوست فرمائش کرنے آئے۔ کل ہماری بزم ادب کا جلسہ ہے۔ اس میں شرکت کرو اور ایک کہانی پڑھو۔ اب کوئی انکار کرے بھی تو کیسے کرے۔

"کون سی کہانی پڑھوں؟" میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا جس کا نام بھی وہی ہے جو میرا ہے اور جو میری ہی طرح لکھتا ہے۔ [illegible]

"کشمیری نوجوانوں کی محفل میں کہانی پڑھنے جاتے ہو تو کشمیر پر کوئی کہانی پڑھو۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے تو کشمیر کے بارے میں ایک ہی کہانی لکھی ہے۔ زعفران کے پھول۔ مگر وہ تو یہاں کی ٹھیک آزادی سے ایک دو مہینے ہی پہلے کی داستان ہے۔ آج تو حالات بدل چکے ہیں ......"

میں نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا، وہ بولا "تو کوئی نئی کہانی لکھو۔"

"کہنا آسان ہے اور لکھنا مشکل ہے۔" میں نے کہا "چند گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں۔ کیسے لکھ پاؤں گا؟"

مگر اس نے بچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "[illegible] لکھ سکتے [illegible] کے پھول [illegible]

نئی، ہاں اگر [illegible] نئی [illegible] اسے تلاش کرنا چاہیے تو ......"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا بھئی اچھا، تم جیتے میں ہارا۔ نئی کہانی ہی لکھتا ہوں ......"

کاغذ قلم لے کر میں بیٹھ گیا۔ چہرے پر انہماک بلکہ الہام کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس والے سب جان جائیں کہ دماغ پر تخلیقی بھوت سوار ہے۔ کیا کہانی لکھوں؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

کہانی کے بارے میں اکثر کم سمجھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی اخبار کے مضمون کی طرح لکھی جاتی ہے۔ ناپ تول کر۔ یا غزل کی طرح قافیے ردیف کو گھڑ کر تیار کی جاتی ہے۔ درحقیقت کہانی لکھی نہیں جاتی بلکہ الہامی اشعار کی طرح نازل ہوتی ہے۔ کسی گجراتی افسانہ نگار نے کہانی کو ایک ہرنی سے تشبیہ دی ہے، جو جنگل میں کلیلیں مارتی پھرتی رہتی ہے اور کوئی خوش قسمت اور چالاک شکاری ہی اس کو قابو میں کر پاتا ہے۔

عالم خیال کے جنگلوں اور میدانوں میں میں اسی ہرنی کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا مگر ہر بار وہ زقند مار کر نکل گئی اور میں نشانہ لگاتا ہی رہا۔ کشمیر کی ہر جنت نظیر وادی، ہر دامن کوہسار، ہر جھیل اور دریا کی سیر میں نے کی۔ شکارے پر بیٹھ کر میں ڈل میں گھوما، گھوڑے پر سوار ہو کر الپتر ہو آیا۔ شالامار میں گاتے ہوئے آبشاروں کے نغمے میں نے سنے مگر کہیں مجھے کہانی نہ ملی۔ میں ہر طبقے کے کشمیریوں سے ملا۔ ہانجی، شکارے والے دستکار، گوجر، پنڈت، پیر، لکڑہارے، بڑھئی، لہار، سنار، شالیں کاڑھتی ہوئی عورتیں، دھان کے کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہوئے کسان، مگر یہ سب تو معمولی کام کرنے والے انسان تھے۔ بھلا ان کے بارے میں کہانی کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ کہانی تو ہیرو، ہیروئن کے بارے میں لکھی جاتی ہے اور ہیرو ہیروئن صرف ایک کام کرنا جانتے ہیں ـــــ عشق۔

غرض اس جنت نظیر ملک میں جہاں قدرت نے انسان اور انسان کے قدرتی ماحول دونوں کو حسن بخشا ہے، جہاں کا ہر منظر رومان انگیز ہے، جہاں حبہ خاتون عرفانی محبت سے سرشار رہی اور جہاں شہزادے اور لالہ رخ کا عشق پروان چڑھا مجھے کہیں عاشق و معشوق کا جوڑا نہ ملا تاکہ میں ان کے بارے میں ایک رومانی افسانہ تصنیف کر سکوں۔ اب آپ ہی سوچیے [illegible] کے بارے میں کہانی لکھی جاتی ہے ......

جیسا میں نے عرض کیا عالم خیال میں اسی طرح کہانی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ میں نہ جانے کس طرح پام پور جا نکلا۔ پام پور! اس گاؤں کے بارے میں میں نے کتنی ہی رومانی روایات سنی تھیں۔ کرشن چندر نے کہیں لکھا ہے کہ جس نے پام پور کا چاند نہیں دیکھا وہ دنیا کے حسین ترین نظارے سے محروم رہا ہے۔ نہ معلوم پامپور میں کوئی الگ چاند نکلتا ہے یا وہی زرد رنگ روپہلی ٹکیا جو ساری دنیا میں دکھائی دیتی ہے۔ پھر میں اور دوستوں کی زبانی سنا تھا کہ زعفران کے موسم میں پام پور کے قریب زعفران کے کھیت چاندنی رات میں [illegible] پر بہار کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ پام پور! زعفران! [illegible] خوشبو [illegible]، دریا کا کنارہ اور [illegible] چاند۔ میں نے سوچا پام پور میں ضرور رومان پلتے ہوں گے۔ مگر جب میں نے گاؤں کے تنگ اور تاریک ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ سڑک پر بارش کی وجہ سے کیچڑ تھا اور مرد عورت سب اونچی اونچی لکڑی کی چبوترے نما کھڑاؤں پہنے پھر رہے تھے۔ جہلم میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ ایک رومانی، مدھم بہنے والی ندی کے بجائے ایک بپھرا ہوا سمندر بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں نہ رومان کا پتہ چلا اور نہ کوئی ہیرو ہیروئن ملے۔

پھر میں نے دور سے ایک لڑکی کو دیکھا جو گھڑا سر پہ اٹھائے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور جوان ہے۔ جیسا آپ سب جانتے ہیں، سر پر گھڑا اٹھائے ہوئے پنگھٹ کی طرف جاتی ہوئی عورت ہمیشہ ایک خوب صورت اور رومانی منظر پیش کرتی ہے۔ پنگھٹ کا تصور ہی کس قدر دل فریب اور رومانی ہے۔ سکھیوں کی چہل، پانی کے چھینٹے، عاشقوں کا چھپ چھپ کر دیکھنا، کسی مسافر کا پنگھٹ پر ٹھیر کر پانی مانگنا اور شربت دیدار کے گھونٹ پی کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے چلے جانا ......

معاف کیجیے میں کسی فلم کا خیال کر رہا تھا۔

وہ لڑکی پنگھٹ پر جانے کے بجائے دریا کے کنارے پر گئی اور وہاں سے گھڑا بھر کر واپس ہوئی۔ میری نگاہ میں یہ ایک رومانی فعل نہیں بلکہ ایک نہایت غیر صحت مند فعل تھا۔ کیونکہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا پانی گدلا اور گندا تھا۔ نہ جانے کیا الابلا بہا کر لا رہا تھا۔ بھلا کوئی کنوئیں کا صاف پانی چھوڑ کر اس گندے پانی کو کیوں پیئے؟

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا گندا پانی رس رس کر کنوؤں میں بھی پہنچ گیا ہے، اس اس وقت تو دریا کا بہتا ہوا پانی کنوئیں کے ٹھیرے ہوئے پانی سے بہتر ہے۔

ہاں تو جب وہ لڑکی پانی بھر کر واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہی تھی، گوری رنگت تھی مگر اس پر کچھ کیچڑ لگا ہوا تھا، بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی، پیرہن میلا تھا، ننگے پاؤں کیچڑ میں دھنسے جاتے تھے۔ میرے رومان زدہ دماغ نے فوراً کہانی کا عنوان طے کر لیا "کیچڑ کا کنول"۔

قریب کھڑے ہوئے ایک بڑے میاں سے میں نے پوچھا اس لڑکی کا نام کیا ہے، جواب ملا "نوراں"۔

نوراں کتنا اچھا نام ہے! کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو دونوں کی کہانیوں میں آچکا ہے۔ یہ لڑکی ضرور ایک افسانے کی ہیروئن بن سکتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور کسی سے عشق کرتی ہوگی۔

ایک اور آدمی سے میں نے پوچھا "کیوں بھائی یہ نوراں کسی سے عشق کرتی ہے؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "عشق! اس کی تو کئی برس ہوئے شادی ہو چکی ہے!"

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے سوچا جبھی تو ہندوستان اور کشمیر دونوں ترقی نہیں کر پاتے، ابھی لڑکی جوان نہیں ہوتی، دو چار عشق نہیں کر پاتی کہ جھٹ سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بھلا شادی شدہ لڑکی کے بارے میں بھی کوئی افسانہ لکھ سکتا ہے؟ جب تک وہ اپنے شوہر کے بجائے کسی دوسرے جوان کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے؟ اور نوراں کی چال ڈھال، وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سیدھی سادھی جاہل ہندوستانی لڑکیوں میں سے ہے جو شادی بیاہ ہی کو اپنے رومان کی معراج اور اس کا اختتام سمجھتی ہیں۔

خیر میں نے سوچا، اس نوراں کے شوہر سے تو ملا جائے، شاید اسی میں رومانی جراثیم پائے جائیں۔ میں نے ایک راہ چلتے سے پوچھا "کیوں جی اس نوراں کا شوہر کیا کرتا ہے؟"

اس نے کہا "نانبائی ہے۔" میرے رومانی تخیل کو پھر ایک ٹھیس پہنچی۔ بھلا کوئی نانبائی بھی عشق و محبت کر سکتا ہے، کیا اس کے دل میں بھی آٹے کی طرح خمیر اٹھ سکتا ہے؟ یا وہ ایک خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر بھی سوچ سکتا ہے کہ اس کے پھولے ہوئے گال بالکل میری نانوں کی طرح ہیں۔

پھر بھی میں نے سوچا چلو، اسے دیکھ تو لوں۔ "کیوں بھائی اس کی دوکان کہاں ہے؟"

"وہ کیا ہے سامنے۔"

"مگر وہ تو بند ہے۔"

"یار وہ محاذ پر گیا ہوا ہے۔"

"محاذ پر؟ تمہارا مطلب ہے جنگی محاذ پر؟"

"ہاں ہاں فرنٹ پر۔"

ہم کِدھر جا رہے ہیں؟

سالکؔ ہندی

ہمارے اخباروں کی روش

کسی ملک کی نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی اور ذہنی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے بھی اس کے اخباروں کا مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ جب میں اپنے ملک کے اخباروں کے گذشتہ دس سال کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھ پر شرمندگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میری یہ تنقید سب اخباروں کے لئے نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے اخباروں نے ملک کی خدمت میں بڑا حصہ لیا ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ بعض اخباروں کا طرز عمل ملک کے اندرونی معاملات کے بارے میں بھی معقول رہا ہے۔ لیکن صداقت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم ان اخباروں پر سختی کے ساتھ تنقید کریں جنھوں نے گذشتہ چند سال کے اندر اندر اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے اور فساد کی آگ تیز کرنے میں علی الاعلان حصہ لیا جب کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اس وقت بعض مسلمان اخباروں نے نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ کانگریس کے ہندو اور مسلمان لیڈروں پر ذاتی حملے کئے اور اپنی قابل اعتراض تحریروں سے عام مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ اس کے مقابلہ میں بعض ہندو اخباروں نے اسی دریدہ دہنی کے ساتھ نہ صرف مسلم لیگ کی بلکہ عام طور پر سب مسلمانوں کی مخالفت کی اور ان کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا۔ جب اسی طرح دونوں طرف نفرت اور تعصب اور نامعقولیت کی بارود جمع ہو گئی تو تقسیم ہند کی چنگاری نے ملک کے امن و عافیت اور انسانیت و شرافت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ صرف اخباروں کا کارنامہ تھا۔ نہیں، اس میں عوام کی جہالت، اور غلط قسم کی مذہبیت، فریق ثالث کی ریشہ دوانیاں، بہت سے لیڈروں کی خود غرضی اور حماقت، اور ان کی قابل اعتراض تقریریں بھی شامل تھیں۔ لیکن اگر اخباروں کے کالم ان فساد انگیز تقریروں کا استقبال نہ کرتے اور ان کے لئے مائکروفون کا کام نہ دیتے، اگر وہ "دوسرے فریق" کی ہر بُری اور غلط بات کو بڑھا چڑھا کر نہ دکھاتے، اگر سنسنی خیز خبروں اور عنوانوں سے وہ عام لوگوں میں نفرت کی آگ نہ بھڑکاتے، تو شاید ان شر پسندوں کو اس قدر کامیابی نہ ہوتی۔ لیکن جب ملک کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ (میں ان کو تعلیم یافتہ کیسے کہوں؟) صرف اپنی "پارٹی" کے اخبار پڑھیں، اور اس میں جو کچھ چھپے اس کو حقیقت مطلق سمجھیں، اور اخبار ان کو گمراہ کرنے پر تلے ہوں تو دوسری اصلاحی اور تعلیمی کوششوں کی کامیابی بہت مشکوک ہو جاتی ہے۔ نفرت اور تعصب کے اس طوفان کے مقابلے میں مہاتما گاندھی تک کی تعلیم اور مثال جس میں خلوص کی [illegible] قوت تھی ناکا[illegible]

اور ہمیں اس کی وجہ سے اُن کے قیمتی جیون کا بلیدان دینا پڑا!............ ممکن ہے کہ آپ ماضی کا یہ رونا بیکار سمجھیں لیکن مستقبل کی فکر تو ضروری ہے اور مجھے اندیشہ یہ ہے کہ اس قدر زبردست دھکا لگنے کے بعد بھی اخباروں میں جو ضبط اور اعتدال اور ذمہ داری پیدا ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں دو تازہ مثالیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوں گی۔

پاکستان کے ایک اہم اور نیم سرکاری انگریزی اخبار میں حال ہی میں کسی شخص کا، جو خود کو پیر غازی سخی سید محمود شاہ کہتا ہے، ایک خط چھپا ہے، جس کو ہندوستان کے بعض اخباروں نے نقل کیا ہے اور اس سے پاکستان کی مریضانہ ذہنیت پر استدلال کیا ہے۔ خط کا ترجمہ یہ ہے:-

"برادران اسلام۔ السلام علیکم۔ مجھے سرحد کے ایک سو ستر آزاد قبیلوں نے اپنا نمائندہ بنا کر کراچی بھیجا ہے تاکہ میں اسلام کی بے لوث خدمت کروں۔ کشمیر اور حیدرآباد کے مسلمان بھائیو میرے پاس اس کام کے لئے بے شمار آدمی ہیں۔ اگر مجھے کافی سرمایہ مل جائے تو مجھے امید ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کشمیر وغیرہ میں ہندوستانی یونین کی قبر کھود ڈالوں گا اور اسلام اور پاکستان کا جھنڈا دلی کے لال قلعہ کے میناروں پر بلند کر دکھاؤں گا"

میں نے اس خط کو پڑھا اور بحیثیت ایک مسلمان کے میرا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ عقل و ایمان کا دشمن جو خود کو دنیا کے سب سے زیادہ امن پسند اور صلح دوست مذہب کا پیر سمجھتا ہے۔ اس ناپاک ارادے کو "اسلام کی بے لوث خدمت" قرار دیتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے زیادہ گلہ نہیں، کیونکہ وہ جاہل اور بے شعور، ناراضگی سے زیادہ رحم کا مستحق ہے، لیکن اس مؤقر جریدے [illegible] متعلق جو اس وقت [illegible] خط کو شائع کرنے سے نہیں جھجکا تاکہ [illegible] ایک ہمسایہ ملک کے متعلق اس قسم کے خیالات کی اشاعت پر شرم نہیں آئی؟ اگر کوئی معقول پسند شخص اس اخبار کا ایڈیٹر ہوتا تو خط کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا۔ یا اس کو شائع کرتا لیکن اس کے ساتھ ایک سخت نوٹ لکھتا اور اس قسم کے جذبات پر سختی کے ساتھ تنقید کرتا اور اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اسلام کی صحیح تعلیم کو، جو امن دوستی اور سلامتی کی تعلیم ہے، جو جارحانہ جنگ کو ملعون قرار دیتی ہے، جو احتساب نفس سکھاتی ہے۔ اپنی قوم کے سامنے پیش کرتا۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اس اخبار نے ایسا نہیں کیا اور نہ شاید اس کے خلاف کسی نے احتجاج کیا۔ بھلا اس راستے پر چل کر اعرابی کعبہ تک کیسے پہنچے گا؟

اب ایک نمونہ ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار کی ذہنیت کا دیکھ لیجئے۔ اس نے حال ہی میں حیدرآباد کے بارے میں ایک ایڈیٹوریل لکھا ہے۔ حیدرآباد میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے ہندوستان میں عموماً بہت ناراضگی اور تشویش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ پر بجا ہے۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ایسے موقع پر اکثر لوگ اپنی رائے کو بہت سختی اور تلخی سے ظاہر کیا کرتے ہیں اس سے یقیناً معاملے کو سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن بہرحال یہ انداز گفتگو اور بیان سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن جب کوئی اخبار اپنے ایڈیٹوریل

کو ان الفاظ سے شروع کرے تو ایسے ذہنی مریض کا کیا علاج ممکن ہے

"پنڈت نہرو نے حیدرآباد کے بارے میں جو تقریر بمبئی میں کی، اس کی گونج ہندوستان کے آسمان میں سنائی دے رہی ہے۔ لیکن ہم جس چیز کو سننا چاہتے ہیں وہ بندوقوں کی باڑھ، ہوائی جہازوں کا غل، فوجوں کی یورش، توپوں کی گرج اور مسلح دستوں کا شور ہے!"

یہ ہندوستان کے ایک اخبار کی پکار ہے! وہ ہندوستان، جس کو گوتم بدھ پر ناز ہے، مہاویر پر ناز ہے، گرو نانک پر ناز ہے، مہاتما گاندھی پر ناز ہے وہ ہندوستان جس نے اہنسا کو اپنی تہذیب کی سنت سمجھا ہے، وہ ہندوستان جس کے بہت سے باشندے گوشت نہیں کھاتے اور بعض ترکاریاں کھانے سے بھی پرہیز کرتے ہیں! اس ہندوستان کا ایک ایڈیٹر (اور وہ ایک فرد واحد نہیں بلکہ ایک خاص طرز خیال کا نمائندہ ہے) جنگ کے ان مظاہر کے لئے بے قرار ہے جن کا آتشیں لطف دنیا ابھی چھ سال تک اٹھا چکی ہے اور جس کی تلخی کام و دہن پر ابھی مدتوں تک باقی رہے گی۔ وہ جنگ کا خواہش مند ہے، یہ جانتے ہوئے کہ آج کل کی جنگ محض کرائے کے سپاہیوں کی جنگ نہیں، بلکہ عام لوگوں کے لئے تباہی اور بربادی کی بشارت اور تہذیب اور شرافت کی قدروں کے لئے موت ہے۔ اس شخص کے لئے مہاتما گاندھی کی زندگی اور موت دونوں بے معنی ہیں، اس نے یورپ کی جنگوں سے کچھ نہیں سیکھا، ہیروشیما سے کچھ نہیں [illegible] گذشتہ سال [illegible] کے [illegible]

[illegible] شروع کرے۔ دوسرے تمام [illegible] کے بعد بالآخر [illegible] ہو کر یہ جنگ کر [illegible] ہے۔ لیکن یہ خون کی پیاس یہ جنگلی درندوں کی طرح [illegible] کا شوق (یا شاید ایسا کہنا جنگلی درندوں کے ساتھ بے انصافی ہو؟) کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا..........

میں دعوت دیتا ہوں دونوں ملکوں کے ارباب [illegible] اور خداوندان سیاست کو کہ وہ ان تاریک قوتوں اور ناپاک تحریکوں کی طرف توجہ کریں اور ان کا انسداد کرنے کی کوشش کریں ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ وہ خود کو دفعتہ جنگ کی آگ میں گرفتار پائیں گے، اور پھر ان کے کئے دھرے کچھ نہ ہو سکے گا...... اگر ہم شریفوں کی طرح دوستی اور میل جول اور تعاون کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ درندوں کی طرح ایک دوسرے پر دانت نہ نکالیں۔ بلکہ معمولی تمیز اور آداب محفل ہی برتنا سیکھ لیں؟ اگر سیکڑوں برس کی رفاقت تہذیب اور شرافت کی روایات اور رواداری ہمیں ٹھیک راستے پر نہیں چلا سکتیں ——— تو کیا محض دانش مندانہ خود غرضی کے تقاضے بھی بے کار ہو گئے ہیں؟

ہماری قومی کارکردگی

ابھی کچھ عرصہ ہوا مجھے ریل میں ایک لمبا سفر کرنا پڑا میرے پاس "دوسرے درجے" کا ٹکٹ تھا، اس درجے کا ٹکٹ نہ تھا جن کے مسافروں کے ساتھ بے عقلی پر [illegible]

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۱ | یکم ستمبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندو مسلم اتحاد

مہاتما گاندھی

میری اپنے ہم وطنوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ فرقوں کے باہمی تعلقات کو درست کرنے اور سوراج حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کو مستقل عقیدے کے طور پر قبول کرلیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں کو آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام نہیں لینا چاہیے ....

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم عدم تشدد کے عقیدے کی طرف رجوع کریں (یہ شرط ہے کہ ہم ناقص ہی یہ عقیدہ رکھتے تھے) چاہے وہ صرف مندرجہ بالا مقاصد ہی تک محدود ہو تو دونوں فرقوں کے درمیان جو کشیدگی اس وقت ہے وہ بہت کچھ دب جائے گی۔ اس لئے کہ میرے خیال میں قبل اس کے کہ ہم اس کشیدگی کو دور کرنے کی تدبیروں پر غور کریں ہمیں اپنے باہمی تعلقات میں عدم تشدد کا رویہ اختیار کرنا لازمی ہے۔ دونوں فریقوں کا مشترک مقصد ہونا چاہیے کہ ان میں سے کوئی ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کرے بلکہ جب کبھی اختلافات پیدا ہوں تو دونوں انھیں پنچوں کے ذریعے سے یا جی چاہے تو عدالتوں کے ذریعے سے طے کرلیں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ معاملات کا تعلق ہے عدم تشدد کا بس اتنا ہی مطلب ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح ہم دیوانی کے جھگڑوں میں ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے، اسی طرح ہمیں مذہبی معاملات میں بھی نہیں کرنا چاہیے ....

ہندو کی حیثیت سے میرا دل یہ کہتا ہے کہ سب مذہب کم و بیش حق ہیں۔ سب اسی خدا کی طرف سے ہیں، مگر سب میں خامیاں پیدا ہو گئی ہیں اس لئے کہ وہ ہم تک پہنچتے پہنچتے ناقص انسانوں کے ہاتھ سے گذرے ہیں۔ سچی شدھی کی تحریک کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہر ایک اپنے اپنے مذاہب میں کامل ہو جائے، اس کا صرف ایک ہی معیار ہو سکتا ہے اور وہ انسان کا کردار ہے۔ اس خانے سے اس خانے میں جانے سے کیا فائدہ اگر اس سے اخلاق میں بلندی نہ پیدا ہو جائے۔ دوسرے کو اپنے مذہب میں لاکر خدا کی بندگی کا رستہ دکھانا (جو شدھی کا مقصد ہونا چاہئے) بالکل بے معنی ہے، جب خود ہمارے مذہب والے روزمرہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کے منکر ہیں۔ "پہلے معالج اپنا علاج کر" وہ مثل ہے، جو دنیاوی معاملات سے زیادہ دینی معاملات پر صادق آتی ہے ....

مجھے یقین ہے کہ اگر لیڈر نہ لڑیں تو عوام کبھی نہیں لڑنا چاہتے۔ اس لئے اگر لیڈر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ سب ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہم آپس کے فساد کو وحشیانہ اور منافی مذہب سمجھ کر عوامی زندگی کو اس سے پاک کردیں تو مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ عوام بہت جلد ان کی پیروی کریں گے ....

ہندو اگر مختلف فرقوں میں اتحاد چاہتے ہیں تو ان میں اتنی ہمت ہونی چاہئے کہ اقلیتوں پر اعتماد کریں۔ اس کے سوا جو صورت اختیار کی جائے گی اس سے تلخی پیدا ہوگی ظاہر ہے کہ عوام کونسلوں اور میونسپلٹیوں کے ممبر بننا نہیں چاہتے، اور اگر ہم نے ستیہ گرہ کا صحیح استعمال سمجھ لیا ہے تو ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اس کا استعمال ہر بے انصاف حاکم کے خلاف ہو سکتا ہے، چاہے وہ ہندو ہو مسلمان ہو یا کسی نسل و مذہب کا بھی ہو۔ ایک باانصاف ممبر یا حاکم ہمیشہ اچھا ہے چاہے ہندو ہو یا مسلمان۔ ہم چاہتے ہیں کہ سرے سے فرقہ داری روح ہی ختم ہو جائے۔ اس لئے اکثریت کو پہل کرنی چاہیے اور اقلیتوں کو اپنی نیک نیتی کا بھروسا دلانا چاہیے۔ دلتِ خیر اسی وقت ہو سکتا ہے جب طاقتور اپنی طرف سے پہل کرے۔ بغیر اس کا انتظار کئے کہ کمزور بھی صلح پر آمادگی ظاہر کرے ....

مجھے اس مصیبت زدہ ملک میں کوئی بڑا کام کرنے کی راہ اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ ہندو مسلمانوں میں پائدار دلی اتحاد ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتحاد فوراً ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قدرتی طور پر دونوں کے لئے ضروری ہے اور اس لئے کہ مجھے انسانی فطرت پر بھروسا ہے ممکن ہے مسلمان بہت سی باتوں میں قصوروار رہے ہوں۔ مجھے بعض ایسے مسلمانوں سے بھی سابقہ رہا ہے جو برے لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ کسی ایک موقع پر میں ان سے تعلق رکھنے پر پچھتایا ہوں۔ مسلمان بہادر ہیں۔ اور جیسے ہی ان کے شبہات کو دور کر دیا جائے فوراً فراخ دلی اور اعتماد سے کام لینے لگتے ہیں .... اسلام کی تاریخ میں اگر بلند اخلاقی اصول سے انحراف کی مثالیں نظر آتی ہیں تو بہت سے زریں صفحات بھی ہیں۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس میں تعصب نہ تھا۔ دنیا اس کی تعریف کرتی تھی جب مغرب پر ظلمت چھائی ہوئی تھی، مشرق کے آسمان پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا اور اس نے دکھیاری دنیا کو روشنی اور راحت بخشی۔ اسلام کوئی جھوٹا مذہب نہیں۔ ہندو اگر عقیدت اور احترام سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ اس سے اسی طرح محبت کرنے لگیں گے جیسے میں کرتا ہوں۔ اگر یہاں آکر اس میں اکھڑپن اور شدید تعصب پیدا ہو گیا ہے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میں ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر ہندو اپنی اصلاح کرلیں تو مجھے ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اسلام بھی اس کے جواب میں وہ کرے گا جو اس کی مردانگی کی قدیم روایات کے شایاں ہے۔ مسئلے کی کنجی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے ہمیں جھجک اور بزدلی چھوڑ دینی چاہیے ہمیں بہادر بن کر بھروسا کرنا چاہیے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہندو مسلم اتحاد	مہاتما گاندھی	۱
مسلمان اور آزادی	سید عابد حسین	۲
حیدرآباد سیاست عالم کی بساط پر (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان		۵
مغربی دنیا		۶
یہ لوگ (نظم)	اختر انصاری	۸
فرار (نظم)	کوثر بلگرامی	۷
نزول رحمت (نظم)	اختر حمید خاں	۷
میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی	خواجہ احمد عباس	۸
اپاہج بچے اور ان کا علاج	صالحہ عابد حسین	۱۰
ہم کدھر جا رہے ہیں	سالک مہدی	۱۱

قیمت فی پرچہ ۳ ر

مسلمان اور آزادی

ڈاکٹر سید عابد حسین

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں نے روڑا اٹکایا۔ پچھلے پانچ سات برس میں جو کچھ ہوا اُسے سرسری نظر سے دیکھئے تو سچ مچ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن سرسری نظر اکثر دھوکا دیتی ہے آئیے کچھ اور پیچھے چلیں اور پچھلے تیس سال کے واقعات پر ایک گہری نظر ڈال کر دیکھیں کہ بات کہاں تک صحیح ہے

یوں تو ہماری آزادی کی تحریک کو شروع ہوئے ساٹھ برس کا دور ہو چکے ہیں لیکن تیس بتیس سال تک وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ تک محدود رہی۔ گاندھی جی نے آکر اسے خاص و عام سب کے دل میں اُتار دیا، آزادی کا جذبہ خون بن کر ہماری رگوں میں دوڑنے لگا، روح کی طرح نس نس میں سما گیا۔

اس سے پہلے کانگریس میں جس نے آزادی کی تحریک اٹھائی تھی مسلمان بہت کم تھے۔ عام مسلمانوں میں سیاسی جھکا نہ ہونے کے برابر تھا مذہبی جوش بہت تھا۔ انھیں بھی انگریزوں سے بڑی نفرت تھی مگر اس لئے کہ وہ ترکی کی خلافت کو ختم کرکے اسلام کو کمزور کرنا اور مسلمان ملکوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ مولانا محمود الحسن اور علی برادران نے مسلمانوں کو سمجھایا "دوسرے ملکوں کو تو انگریز غلام بنانا چاہتے ہیں۔ مگر تمھیں غلام بنا چکے ہیں۔ ترکوں سے ہمدردی کرنا بڑی اچھی بات ہے، پر اپنی غلامی کا بھی تم احساس ہونا چاہئے جب تک تم خود غلام ہو ترکوں کی کیا مدد کر سکتے ہو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ انگریز، مصر اور عرب کے جزیرہ نما پر اپنا اثر زیادہ تر اسی لئے رکھنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کے راستے محفوظ رہیں، جہاں ہندوستان اُس کے ہاتھ سے نکلا اسے مسلمان ملکوں میں اپنا اثر قائم رکھنے کی اتنی زیادہ خواہش نہیں رہے گی اور اگر رہی بھی تو ہندوستان کے وسائل کے بغیر انھیں دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا"؟ کتنا صحیح اندازہ تھا! آج ہمیں یہ بات صاف نظر آ رہی ہے غرض مسلمانوں میں غلامی کا گہرا احساس، اور آزادی کا شدید جذبہ مسئلہ خلافت کے ذریعے اُبھرا، کانگریس نے برطانوی حکومت کے سامنے سوراج کی مانگ کے ساتھ ساتھ کچھ وقتی مطالبے بھی رکھے تھے۔ ان میں خلافت کا مطالبہ بھی شامل کر لیا تھا۔ مسلمان بڑے جوش سے بہت بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس میں چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ہزاروں لاکھوں محب وطن ستیہ گرہ کی نہتی لڑائی لڑنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے وکالت چھوڑی نوکریاں چھوڑیں، لڑکوں نے مدرسے چھوڑے۔ ملک کے جانباز سپاہیوں نے لاٹھیاں اور کہیں کہیں گولیاں کھائیں اور برسوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہے۔ ان دنوں ہندو مسلمان اس طرح گھل مل گئے تھے کہ کسی نے گنتی نہیں کی کہ ملک کے لئے قربانیاں کرنے والوں میں ہندو کتنے ہیں اور مسلمان کتنے ہیں، لیکن اگر چھان بین کی جائے تو شاید مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہی ہو گی۔

یہ حالت سنہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک رہی لیکن اس عرصے میں ترکوں نے خلافت کو خود ختم کر دیا۔ اس سے ہمارے ہاں اکثر مسلمان لیڈروں کو جن کی سیاسی زندگی تحریک خلافت سے شروع ہوئی تھی بڑا سخت دھکا لگا۔ بہت سے تو بالکل بیٹھ ہی گئے، اور بہت سے ڈگمگانے لگے لیکن عام مسلمانوں کے دل میں اب آزادی کا جذبہ خلافت سے الگ اپنی جگہ کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ کی دوسری تحریک میں بھی اُنھوں نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس وقت بڑے مسلمان لیڈروں میں سے پکے کانگریسیوں کو چھوڑ کر بہت کم میدان میں آسکے۔ لیکن عام مسلمان چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی رہنمائی میں کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور انھوں نے پھر جیلوں کو بھر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں کوئی دس ہزار مسلمان جیل میں گئے۔

اس کے بعد بارہ سال کا زمانہ کانگریس کی تاریخ میں زیادہ تر تعمیری کاموں کا زمانہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہمیں برطانوی سامراج سے آخری لڑائی لڑنے سے پہلے اپنے دلوں کی اور اپنی سماج کی گندگی کو صاف کرنا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی عملی خدمت کرکے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے اس لئے وہ خود اور ان کے حلقے کے کارکن جنھیں کانگریس کی جان سمجھنا چاہئے زیادہ تر تعمیری کاموں کی انجمنیں قائم کرنے اور اُنھیں مضبوط بنانے میں مصروف رہے۔ نمک کی محدود ستیہ گرہ کے سوا اس زمانے میں عام سول نافرمانی کی کوئی تحریک شروع نہیں کی گئی۔ یہ مسلمانوں کے سیاسی جوش کی موت تھی، تعمیری کاموں سے اُن کا جی گھبراتا تھا انھیں تو بس نعرے لگانے، لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے سے دلچسپی تھی، اور اس کا اب موقع نہیں ملتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانگریس سے کٹ گئے، اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔ اب فرقہ پرست لیڈروں اور انگریزی حکومت کے وفاداروں کو موقع ملا کہ مسلمان عوام کے دل میں آہستہ آہستہ اپنے افسوں پھونکیں، پھر بھی ان کرائے کے لیڈروں کی مجال نہ تھی کہ عام جلسوں میں آکر زبان کھول سکیں ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں اُنھیں کانگریس کی مخالفت کی ہمت نہیں ہوئی۔ یو۔پی میں یونٹی بورڈ اور دوسرے صوبوں میں بھی مسلمان اُمیدواروں نے زیادہ تر یہی کہہ کر عام مسلمانوں سے ووٹ لئے کہ ہم کانگریس کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

۱۹۳۷ء میں سات صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کا قائم ہونا ان کا غیر کانگریسی مسلمانوں کے ساتھ کولیشن بنانے سے انکار کرنا، زمینداری کو ختم کرنے کی تجویز۔ یہ چیزیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں کو بدحواس کر دیا وہ سمجھے کہ ہم سیاسی اور معاشی حیثیت سے برباد ہو جائیں گے اب فرقہ پرست لیڈروں کی بن آئی، اور انھوں نے "اسلام خطرے میں" چلانا شروع کیا۔ ادھر برطانوی حکومت کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت ڈر گئی تھی اور اپنے سارے زبردست وسائل سے فرقہ پرستوں کی مدد کر رہی تھی، چونکہ مسلمان فرقہ پرست لیڈروں کے ذریعے سے کامیابی کی زیادہ اُمید تھی اس لئے ان پر نظر عنایت زیادہ تھی۔ پھر بھی مسلم لیگ کو جس میں اب سرکار کے وفادار اور قوم کے "بہی خواہ" دونوں جمع ہو گئے تھے کئی سال تک زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ آخر پاکستان کے نعرے نے [illegible] "پاکستان" کا نعرہ سمجھایا جس کے مفہوم کو اس قدر مبہم رکھا گیا کہ ہر شخص جو مطلب چاہے سمجھ لے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان زمیندار اور لاکھوں آدمی جن کے اغراض ان کے ساتھ وابستہ تھے، پاکستان کے نام کو ایک تعویذ سمجھتے تھے جس کی برکت سے ان کی زمینداری اور دوسرے حقوق بچ جائیں گے۔ لیکن عام مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اس سے وہ خطرہ جو اسلام کے سر پر منڈلا رہا ہے ٹل جائے گا۔ روپیہ ان لوگوں کے پاس تھا، اخبار اُن کے ہاتھ میں تھے حکومت کی طاقت اُن کے ساتھ تھی، کانگریسی مسلمان اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمان تعداد میں کم تھے، اور انھوں نے کوشش میں کمی نہیں کی کہ لوگوں کو حقیقت حال سمجھائیں، لیکن وسائل کی کمی نے اور تنظیم کی کمی نے اُن کو کامیاب نہ ہونے دیا ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

اب ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا موقع آیا، آپ اس بات کو مدنظر رکھئے کہ مسلمانوں میں ووٹ دینے والے زیادہ تر اونچے اور پچھلے اوسط طبقے کے تھے اور یہ تقریباً سب کے سب زمیندار اور سرکاری ملازم تھے یا ان کے ساتھ وابستہ تھے کئی سال سے مسلم لیگ تبلیغ و اشاعت کے سارے وسائل اختیار کرکے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔ حکومت حکمت عملی کی باریک سوئیوں سے ان کے خون میں فرقہ پرستی کا زہر داخل کر رہی تھی، اور پھر یہ دیکھئے کہ کونسلوں کے انتخابات میں صوبہ سرحد میں کانگریسی مسلمانوں کی اکثریت رہی، پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت ناکامی ہوئی اور سندھ میں اس کی اکثریت نہ ہو سکی، یو۔پی میں بارہ کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمان الیکشن میں کامیاب ہوئے، اور ہارنے والوں میں بہت سے تھوڑے ووٹوں سے ہارے۔ اندازہ لیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے ۳۹ یا ۴۱ فی صدی ووٹ مسلم لیگ کے خلاف پڑے۔ دوسرے صوبوں کے اعداد و شمار میرے پاس نہیں ہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ بہار اور آسام میں بہت بڑی تعداد میں اور دوسرے صوبوں میں معقول تعداد میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دئے

غرض ۱۹۴۵ء تک باوجود اس کے کہ چار پانچ برس سے مسلمان اپنے آپے میں نہ تھے بلکہ ایک دماغی ہیجان میں مبتلا تھے ان میں سے بہتوں کے دل میں آزادی کا جذبہ اور وطن کی محبت کا جذبہ اس ہیجان پر غالب رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ ۱۹۴۵ء میں بلکہ ۱۹۴۶ء کے آخر تک خود مسلم لیگ کے پیرووں کی بہت بڑی اکثریت یہ چاہتی تھی کہ کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے اور ہندوستان متحد ہو کر آزادی حاصل کرے۔ لیکن ارباب غرض نے جن میں ہر فرقے اور کئی طبقوں کے لوگ شامل تھے، یہ دیکھ کر کہ ان کے ولی نعمت انگریز جا رہے ہیں، ان کو روکنے کے لئے اپنا آخری خونی کھیل کھیلا۔ کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ لگائی گئی، اور ملک میں جا بجا پھیلنے لگی، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیسر سے ہوتی ہوئی پنجاب پہنچی، جہاں پہلے ہی سے بارود بچھی ہوئی تھی۔ عام لوگ غصے نفرت اور خوف سے بدحواس ہو گئے تھے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اور کیا ہو رہا ہے۔

اس آگ کو بجھانے کے لئے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کرنا پڑا جو علاقہ پاکستان میں چلا گیا وہاں کے مسلمانوں پر اس کا کیا اثر ہوا اس سے مجھے بحث نہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمان سناٹے میں آ گئے، خود مسلم لیگی سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ تھوڑے سے لوگ جن کے پاس دولت تھی

بقیہ صفحہ ۹ پر

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
یکم ستمبر ۱۹۴۸ء

حیدرآباد
سیاست عالم کی بساط پر

بہت دن سے یہ خبر گرم تھی کہ حیدرآباد اپنے اوپر حکومت ہند کے حملے کو اقوام متحدہ کی مجلس کے سامنے پیش کرے گا۔ اس کی باضابطہ تصدیق ہو گئی ہے۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم میر لائق علی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط کے ذریعے سے اپنی حکومت کے اس ارادے کی اطلاع دے دی ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اور اخباروں میں اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حکومت ہند اور حیدرآباد کے تعلقات کے بارے میں اقوام متحدہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے ادارے کا آئین کچھ بھی ہو اس کا عمل یہی بتاتا ہے کہ وہ قانونی نقطۂ نظر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ ہر معاملے پر سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے غور کرتا ہے۔ آئیے ذرا یہ دیکھیں کہ بین اقوامی سیاست کے آئینے میں حیدرآباد کے معاملے کی شکل کیا نظر آتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے میں دو جتھے ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔ بڑا جتھا امریکہ اور انگلستان کا اور چھوٹا روس کا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ نئے ملکوں کو جو اس ادارے میں شریک ہوں اپنے حلقۂ اثر میں لے آئیں اس کے لئے درشتی اور نرمی، ہمدردی اور دباؤ، دھمکی اور لالچ دونوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہندوستان یو۔ این۔ او کا ممبر ہوا ہے، امریکی جتھے کی طرف سے اس پر دونوں ہتھیاروں کے وار ہو رہے ہیں روسی جتھا اب تک بے تعلقی اور بے پروائی کا حربہ استعمال کر رہا ہے لیکن جب ضرورت ہوگی دوسرے حربوں سے بھی کام لے گا۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ دنیا کی قومیں صرف اپنی غرض کو دیکھتی ہیں، حق و انصاف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ اگر کسی بہت بڑی غرض کا پردہ حائل نہ ہو تو انھیں حق کی صورت بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کے پیشہ ور سیاست داں عام طور پر اپنی آنکھوں کو اس طرح سدھاتے ہیں کہ انھیں حق اسی بات میں دکھائی دیتا ہے جس میں ان کا فائدہ ہو۔ تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سیاست دانوں کو اپنے ملک کی رائے عامہ سے مجبور ہو کر حق کا ساتھ دینا پڑتا ہے خواہ وہ ان کے مفاد کے خلاف ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ حیدرآباد کا معاملہ دوسرے ملکوں کے عوام کو حق کی روشنی میں کیسا معلوم ہوگا اور ان کے پیشہ ور سیاست دانوں کو غرض و مصلحت کی عینک سے کیسا نظر آئے گا۔

عوام کو چاہے وہ جمہوری ملکوں کے ہوں یا کمیونسٹ ملکوں کے رجعت پسند فسطائی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی جس نے ایک ایسی سیاسی پارٹی کے مسلح رضاکاروں کی مدد سے عام رعایا اور فرماں روا دونوں کے دلوں پر دہشت کے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور جسے اس میں ذرا بھی باک نہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کو قید کر دے یا اگر زیادہ خطرناک سمجھے تو قتل کرا دے۔ اگر میر لائق علی یا ان کے ہم راز قاسم رضوی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مہذب ملک کے باشندے حیدرآباد کے جاگیردارانہ طرز حکومت کی جسے حال میں فسطائیت سے پیوند نے اور زیادہ رجعت پسند بنا دیا ہے، حمایت کریں گے تو وہ بڑے دھوکے میں ہیں۔

لیکن دراصل حیدرآباد کے سیاست داں کسی ملک کے عوام سے کوئی توقع نہیں رکھتے بلکہ ان کی امیدیں ان پیشہ ور سیاست دانوں سے وابستہ ہیں جو اقوام متحدہ کی مجلس میں اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قاسم رضوی صاحب اب اپنی تقریروں میں دنیا کو کمیونزم کے ہوے سے ڈراتے ہیں اور یہ دعوہ کرتے ہیں کہ حیدرآباد کمیونسٹ محاذ کا مقابلہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دے گا۔ ان کے خیال میں امریکی اس نازک وقت میں اُن کی اور ان کے رضاکاروں کی مدد کو بہت غنیمت سمجھے گا، اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن جو لوگ اقوام متحدہ کے طرز عمل کو پچھلے دو سال سے غور سے دیکھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روسی یا امریکی جتھے کو حیدرآباد کے معاملے سے اگر کوئی دلچسپی ہوگی تو صرف اتنی کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان پر کس طرح احسان رکھا جا سکتا ہے یا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ روسی رویے کا اندازہ کرنا تو بہت مشکل ہے مگر امریکی جتھے کا معاملہ صاف ہے۔ اگر وہ ممبروں کی اکثریت کو اس پر آمادہ نہ کر سکا کہ اس مقدمے کی قانونی کمزوری کو نظر انداز کریں تو وہ خود ہی حیدرآباد کی درخواست کو رد کر کے ہندوستان پر احسان رکھے گا اور جو کہیں قانونی تاویل سے اور پس پردہ گفت و شنید سے لوگ مقدمے پر غور کرنے کے لئے راضی ہو گئے تو پھر کیا ہے، ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کا ایک اور حربہ ہاتھ آ جائے گا۔

لیکن حیدرآباد کی چار دیواری میں رہنے والے مدبروں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بین اقوامی سیاست کی بساط پر ان جیسے پیادے محض اس کام آتے ہیں کہ انھیں پٹوا کر اپنے کسی قیمتی مہرے کو بچا لیا جائے یا حریف کے کسی قیمتی مہرے کو پھانس لیا جائے۔ اگر حیدرآباد آئندہ چند ہفتوں میں اندرونی سازشوں اور شورشوں کا شکار ہونے سے بچ گیا اور یو۔ این۔ او نے اس کی درخواست پر غور کرنا منظور کر لیا تو ممکن ہے اس سے امریکی جتھے کی حکمت عملی کو تھوڑی بہت مدد ملے۔ مگر حیدرآباد کی موجودہ حکومت کا بھلا نہیں ہوگا۔ اس پیادے کو تو پٹنا ہی ہے، چاہے پہلی چال میں پٹے یا دوسری میں یا تیسری میں۔

بزم بے تکلف

نعیم صاحب اور ان کی وکالت میں ان بن تو رسمی ہی تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی سیاسی تحریک میں موقع دیکھ کر اُسے طلاق دے بیٹھے۔ خدا کے فضل و کرم سے معاش سے آزاد تھے۔ جن کا بھائی محکمہ تعمیرات میں انجینیر ہو وہ آرام سے گھر بیٹھ کر سونے کا نوالہ کھا سکتا ہے۔ اس لئے کہ انجینیری تو کیمیا کا نسخہ ہے۔ مٹی سے سونا بنانا اور جگہ استعارہ ہو تو ہو، مگر محکمہ تعمیرات میں حقیقت ہے۔ ریت سے، سیمنٹ سے، اینٹوں سے، لوہے سے، ہر چیز سے کھرا کندن بنتا ہے۔

وکالت چھوڑ کر نعیم صاحب نے سیاست میں قدم رکھا مگر منبر ہی کے استاد رہے، اکھاڑے میں نہیں اُترے۔ ان کے گھر پر تمام کوٹھاگردوں اور خلافت کے پٹھے جمع ہوتے تھے۔ نعیم صاحب ان کو اندرونی اور بیرونی سیاست کے داؤ پیچ سکھاتے اور اس کے بعد لنچ کا دور چلتا۔ پہلے دھواں دھار تقریر اور پھر گرما گرم چائے۔ لوگ تقریر کی تلخی کو بریانی کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔

نعیم صاحب کے ولی نعمت اور بھائی انجینیر صاحب پنشن پانے کے ہول سے وفات پا گئے۔ اور وصیت نامے میں بیوی بچوں کے نام جائداد اور نعیم صاحب کے نام دعائے خیر لکھ گئے۔ اس صدمے سے نعیم صاحب کا دماغ الٹ گیا۔ بہت دنوں تک مرے ہوئے بھائی کو کوستے رہے کہ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ سیاست بگھارنے کا شوق اب بھی باقی تھا مگر بگھارنے کا سامان نہیں رہا تھا۔ اپنے ہاں چائے پلا کر چہکنے میں جو شان تھی وہ دوسروں کے ہاں پی کر بہکنے میں نہ تھی۔ مگر ان کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ جوں جوں ان کی مالی حالت ابتر ہوتی گئی اس کی تلافی کے لئے سیاست دانی کا ادعا بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ تخیل کے زور سے فکر اور عمل کا فصل مٹ گیا۔ اب بچارے پر سیاست کی نظری باریکیاں سمجھانے ہی کا نہیں بلکہ ان کی عملی گتھیاں سلجھانے کا بار بھی پڑ گیا اور اس کو یہ ناتوان اٹھائے پھرتا ہے۔

فرماتے ہیں یہ ٹرومین تو ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا۔ اب دیکھیں ڈیوی کیا کرتا ہے۔ ہماری رائے میں تو چرچل کو چاہیے کہ امریکی شہری بن کر صدر منتخب ہو جائے۔ امریکہ والوں کو آج کل ایسے ہی قابو جی کی ضرورت ہے اور یہ چین اور جرمنی کے جھگڑے تو محض بے کار ہیں۔ کوئی ان کو سمجھائے کہ میاں دو قوموں کا نظریہ مان لو، دو دو حصوں میں بٹ کر برطانوی ڈومینین بن جاؤ۔ گورنر جنرلوں کی ضرورت ہو تو ہندوستان سے منگوا لینا۔ رہا فلسطین تو وہاں نئی ریاست کا بادشاہ قاسم رضوی کو بناؤ۔ اپنے آپ کو عرب نسل سے بتاتا ہی ہے، صورت سے یہودی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے اور ضمناً حیدرآباد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ چین کا قصہ برسوں سے چل رہا ہے کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جاپان پوست کی کاشت کرے اس کی معاشی مشکل آسان ہو جائے گی اور چین کو افیون بھیجی جائے اس کی سیاسی گتھی سلجھ جائے گی۔ افیم کے عمل سے چینیوں میں پھر پرانی دھیان گیان، رقت قلب اور صلح جوئی پیدا ہو جائے گی اور اس روز روز کی خانہ جنگی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور یہ کشمیر کا جھگڑا بھی کوئی جھگڑا ہے۔ وہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا جب دلی نے مہاراجا سے "نان خورش" ماہانہ نیلام میں منتقل کر کے ریاست کا حساب کم و بیش شیخ عبداللہ کے سپرد کر دیا۔ اب

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

سارا گلہ جاتا رہا

شاید بہت کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ مشرقی پنجاب میں ڈھلون صاحب کا فاقہ ٹوٹ جانے سے کتنا بڑا خطرہ ٹل گیا۔ آزاد ہند فوج کے اس ہردل عزیز افسر نے یہ فاقہ مشرقی پنجاب کی حکومت کے ایک اعلان کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع کیا تھا۔ اعلان میں حکومت نے آزاد ہند فوج کے سابق جنرل سردار موہن سنگھ پر الزام لگایا تھا کہ وہ نوجوانوں کو فوجی تربیت دینے کے بہانے سے اپنی فوج بنا کر مشرقی پنجاب کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں آئی این اے کے لوگوں اور ان کے ہمدردوں میں عام طور پر اس اعلان کی وجہ سے بے چینی تھی، اور پھر ڈھلون صاحب کے فاقے نے اس کو اور تیز کر دیا تھا۔ اہل غرض اس سے فائدہ اٹھا کر سخت شورش برپا کر سکتے تھے۔ خصوصاً سکھوں کے فرقہ وارانہ جذبات کو بہت بھڑکایا جا سکتا تھا۔ مگر ڈھلون صاحب سردار موہن سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی تعریف کرنی چاہیئے کہ انھوں نے اس قضیے میں فرقہ وارانہ رنگ کی خفیف سی جھلک بھی نہیں آنے دی۔ اور صوبے کی کانگرس کمیٹی کے صدر سردار گرمکھ سنگھ مسافر اور سکریٹری سردار لہنا سنگھ کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ انھوں نے بیچ میں پڑ کر حکومت میں اور سردار موہن سنگھ میں صفائی کرادی۔ دونوں فریقوں کی غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور ان کو ایک دوسرے سے جو شکایتیں تھیں وہ جاتی رہیں۔ اس معاملے کا تعلق جتنے لوگوں سے تھا وہ سب سکھ تھے۔ ان کا اس پیچیدہ گتھی کو اتنی خوش اسلوبی سے سلجھا لینا بڑا نیک شگون ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ قوم پرست سکھوں سے مشرقی پنجاب کی بگڑی حالت کو سدھارنے میں بڑی بیش بہا مدد ملے گی

خیر ایک ہی قدم سہی

ڈومینین پارلیمنٹ کی پچھلے چند دنوں کی کارروائی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کارواں ابھی سماجی اصلاح کے میدان میں بہت پیچھے ہے مگر رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی ہے ایک طرف تو کچھ لوگوں کا ہندو کوڈ بل کی مخالفت کرنا اور بہتوں کا اسے ٹالنے کی کوشش کرنا، اور دوسری طرف اس بل کا جو بچپن کی شادی کے قانون میں ترمیم سے تعلق رکھتا ہے۔ برسوں کی رکاوٹ کے بعد سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جانا بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی تضاد نہیں پہلا بل ایک دم سے ہندوؤں کی ساری سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ دھرم شاستر کے مختلف مذاہب میں سے سب سے معقول اصول لے کر ان کو ایک ہم آہنگ اور مکمل ضابطہ کی شکل دینا چاہتا ہے۔ اور اس ضابطے کو ہر علاقے، ہر ذات، ہر خیال کے ہندوؤں پر یکساں عاید کرنا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ فوری انقلاب کو انسانی فطرت سیاست میں قبول کرے تو کرے معاشرت میں عموماً قبول نہیں کرتی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اس بل کی بہت مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ خود کانگرس پارٹی میں ایک گروہ اسے ملتوی کرنے پر مصر ہوا۔ اندیشہ تھا کہ کانگرس پارٹی میں اس معاملے میں پھوٹ پڑ جائے گی مگر ۲۶ اگست کے جلسے میں پارٹی نے متفقہ فیصلہ کیا کہ بل پر غور کرنے کی تجویز موجودہ سیشن میں منظور کر لی جائے مگر اس پر بحث آیندہ سیشن کے لئے ملتوی رکھی جائے۔ اس طرح بات کچھ دن کے لئے ٹل گئی۔ اب رہا دوسرا بل وہ بظاہر ایک جزوی چیز تھی۔ اصولی بات مانی جا چکی ہے کہ بچپن میں شادی کی ممانعت کر دی جائے۔ اب اس میں چند ترمیمیں تجویز کی جا رہی ہیں مثلاً شادی کی عمر اور بڑھا دی جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کو پولیس کی دست اندازی کے قابل جرم قرار دیا جائے۔ ایسی شادی کی بھی ممانعت کر دی جائے جس میں دولہا دلھن کی عمر میں بہت زیادہ فرق ہو مثلاً دلھن ۱۸ سال کی اور دولہا ۴۵ سال کا ہو۔ حقیقت میں یہ ترمیمیں اگر منظور ہو جائیں تو قانون میں جو اب مردہ سا ہے جان پڑ جائے گی۔ بہت غنیمت ہے کہ ہمارے آئین ساز اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ انھوں نے اس بل کو بغیر زیادہ مخالفت کے سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا۔

صلح کے پیامی

کشمیر کمیشن نے ۱۳ اگست کو لڑائی بند کرنے کی جو تجویز ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے سامنے پیش کی تھی اس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ دونوں حکومتوں کے جواب تو کمیشن کے پاس پہنچ گئے ہیں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اگر مگر ہو رہی ہے۔ کسی نے کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی۔ کمیشن کئی روز تک دونوں فریقوں کے جوابوں پر غور کرنے کے بعد اب پھر پاکستان کی حکومت سے بات چیت کرنے کراچی گیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ رکاوٹ جو کچھ ہے اس طرف سے ہے۔ خدا کرے اب کی بار وہ کوئی قطعی جواب لے کر آئے اور ہمیں افسوس کے ساتھ یہ نہ کہنا پڑے

> نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی
> وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

یوں دیکھنے میں آثار تو کچھ اچھے ہی معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ کمیشن نے اقوام متحدہ کے مرکز سے ایک فوجی مشیر اور چالیس ناظر (آبزرور) جلد بھیجنے کا تقاضا کیا ہے۔ دراصل لڑائی بند ہونے میں تو کچھ ایسی دشواری نہیں۔ اصل مسئلہ صلح کی شرطوں کا ہے۔ ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ کمیشن نے اس کے بارے میں بھی کوئی تجویز دونوں حکومتوں کے سامنے رکھی ہے یا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک طرف شیخ عبداللہ اور دوسری طرف چودھری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم (ایک نیام میں دو تلواریں!) اپنی تقریروں میں کہہ رہے ہیں کہ ہم ریاست کی تقسیم ہرگز نہیں چاہتے۔ اس لئے قیاس یہ کہتا ہے کہ کمیشن نے تقسیم کی تجویز پیش کی ہے یا کرنے والا ہے۔ ایسا ہو تو کوئی تعجب نہیں اس لئے کہ یہ زمانہ ہی تقسیم کا ہے انڈونیشیا، فلسطین، جرمنی یہاں تک کہ یروشلم اور برلن کے شہروں تک کے دو دو تین ٹکڑے کر دئے گئے ہیں۔ یہ تو بہ قول اکبر کے وہ لوگ ہیں کہ ع

> "ہم کیا ہیں خدا کے تین ٹکڑے کر دیں"

رعب کی حکومت یا محبت کی

جن آنکھوں نے انگریز گورنر جنرلوں کے تزک و احتشام کے منظر دیکھے ہیں اور ان کی رعب داب کی تقریریں سنی ہیں وہ ہمارے ہندوستانی گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی چکرورتی راج گوپال چاری کے نزول اجلال کی شان دیکھ کر اور ان کے ارشادات گرامی کو سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔

خود دار السلطنت کے اندر جلسوں [illegible] ہند کی عظیم الشان ریاست کا سردار حکومت کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح کھدر کے سیدھے سادے مگر صاف اور بے داغ کپڑے پہنے لوگوں میں اس طرح گھس بیٹھ کر گھل مل کر ہنستا بولتا نظر آتا ہے جیسے ایک بے تکلف خوش مزاج باپ اپنے شوخ بچوں کے جھرمٹ میں۔ اور اب جو راجا جی اپنے خاص صوبے مدراس کے دورے پر گئے ہوئے ہیں تو کچھ نہ پوچھیے، گرم جوشی اور بے تکلفی کی حد نہیں رہی۔ مدراس ویمنس ایسوسی ایشن میں راجا جی کے استقبال کی تصویر اخبار میں آئی ہے۔ مجمع میں گھرے ہوئے ہیں، ایک خاتون ان کے گلے میں ہار ڈال رہی ہے اور وہ خود ایک چھوٹی سی بچی کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ تقریروں کی رپورٹیں دیکھئے تو الفاظ اوپر سے نیچے کو نازل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک دل سے نکل کر سیدھے دوسرے دلوں میں جا رہے ہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح حاکمانہ شان و شوکت اور رعب داب کے بغیر حکومت ہو سکتی ہے۔ پاکستان کے ارباب حکومت کے خیال میں تو نہیں ہو سکتی۔

تن ڈھانکنے کو کپڑا

معلوم ہوتا ہے کہ اب کپڑے کو ترسنے والوں کی مشکل کچھ آسان ہونے والی ہے صوبوں کی حکومتوں نے عملی قدم اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ مدراس میں ملوں کا کپڑا جس پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا صوبے کے بائیس کوآپریٹیو سٹورز کو مناسب قیمت پر فروخت کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اور یہ تجویز ہے کہ ملوں کی پیداوار میں سے آدھی اسی طرح حکومت کی لیسنس دار دکانوں سے فروخت ہوا کرے۔ بمبئی میں قیمت کا کنٹرول اور راشن دونوں چیزیں شروع ہونے والی ہیں شہروں میں (جہاں سال بھر میں) فی کس ۲۴ گز کپڑا اور دیہات میں فی کس ۱۸ گز ملا کرے گا۔ قیمتیں لاگت پر لانے لے جانے کا خرچ اور ۱۲ سالہ فی صدی منافع رکھ کر لگائی جائیں گی۔ امید ہے کہ دوسرے صوبے بھی بہت جلد بمبئی یا مدراس کی تقلید کریں گے۔

کھانے کو روٹی

غلے کی گرانی دور ہونے کی کوئی صورت ابھی تک نظر نہیں آتی۔ تھوک قیمتوں میں تو کچھ خفیف سی کمی ہوئی ہے۔ مگر مشکل قیمتوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ معاملہ مشکل ضرور ہے۔ اس لئے کہ ایک دم سے بھاؤ کا گرنا کسانوں کے لئے بہت بُرا ہوگا۔ لیکن ابھی تو بیچ والوں کی نفع خوری کو ختم کر کے قیمتوں میں خاصی کمی کی جا سکتی ہے۔ کسانوں کے نقصان یا فائدے کا سوال [illegible] میں پیدا ہوگا۔

۲۔ پاکستان

روشنی کی کرن

مغربی پاکستان کے پرانے کانگریسیوں نے اپنی ایک کانفرنس میں جو ابھی حال میں ڈھاکہ میں منعقد ہوئی تھی پاکستان نیشنل کانگریس کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ نئی جماعت کے مقصد کی وضاحت ایک رزولیوشن میں یوں کی گئی ہے "پاکستان کی نیشنل کانگریس کا مقصد ہماری آزاد ریاست پاکستان میں امن دوستی رکھنے انفرادی آزادی کے تحفظ اور خوشحالی کے قیام کی کوشش ہے" طریق کار کے متعلق اس رزولیوشن میں بتایا گیا ہے کہ نئی جماعت کے پیرو سچائی، عدم تشدد اور خدمت کو اپنا آدرش بنائیں گے۔ اور اس طرح وہ یہ کوشش کریں گے کہ ملک میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کیا جائے۔ مسٹر ستیش داس گپتا نے جو پاکستان کی مجلس آئین ساز کے ممبر ہیں اپنی تقریر میں گاندھی جی کے اصولوں کی عالمگیر عظمت کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کے اصول آج بھی ان کے لئے اسی طرح مشعل راہ بن سکتے ہیں جیسے اور کبھی۔

اس نئی جماعت کی ضرورت شاید یوں پڑی ہو کہ لیگ نے جو پاکستان کی برسر اقتدار جماعت ہے اپنا دروازہ اب تک دوسرے مذہب کے لوگوں کے لئے نہیں کھولا ہے، اور وہ اب بھی ایک فرقہ پرور جماعت ہے۔ اس بات میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ اتفاق سے لیگ جس فرقہ کی جماعت ہے وہی ملک میں اکثریت میں ہے۔ ممکن ہے کہ لیگ کے ارباب حل و عقد نے اس ڈر سے اپنا دروازہ پاکستان کے دوسرے شہریوں کے لئے بند کر رکھا ہو کہ اس اصلاح کے بعد وہ اسلام کے نام سے اتنا کام نہ لے سکیں گے۔ بہر حال اس کی وجہ سے ایک ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے جو غیر فرقہ پرور ہو، جس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اس نئی جماعت کے بانیوں نے ابھی اپنا دائرہ صرف مشرقی پاکستان تک محدود رکھا ہے۔ ان کی ایک کمیٹی نئی جماعت کا قانون مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ خود یہ بات کہ انھوں نے اپنے سامنے گاندھی جی کی مثال رکھی ہے اس کی ضمانت ہے کہ ان کا دامن فرقہ پرستی سے آلودہ نہ ہوگا۔ پاکستان کے ترقی پسند اور جمہوریت دوست جماعتوں اور افراد کا فرض ہے کہ وہ اس نئی جماعت کو جو قوم پرستی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے پھلنے پھولنے میں مدد دیں۔

گھر کے بھیدی

پچھلے دنوں سرحد کی حکومت نے مرخیز تبن کے ایک مجمع پر گولی چلوائی۔ جس میں لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے۔ حکومت نے اس سلسلے میں جو بیان دیا ہے اس پر بھروسا کرنا مشکل ہے۔ قیوم صاحب شاید اپنے سلسلے میں ڈرنے لگے ہیں کہ کہیں پھر مرخیز تبن کا ایک دنگا جمع ہو جائے ابھی ان کے نزدیک ریاست کے وجود کے لئے عظیم نقصان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ ان کے سینہ زوری [illegible] کے قوانین سے مطابق اکھاڑ کر ہنسی ہیلے سے بعض سرحدی لوگ اور کارکنان کو بھی پاکستان دشمنی کے جرم میں گرفتار کر رکھا ہے اور خان عبد الغفار خاں کے نام لینے والوں پر ان کے خاص کا بھنا لیا گھڑکا ہو سکتا ہے۔

غالباً ان کی تشدد آمیز پالیسی اب ظلم و تعدی کی حد تک پہنچ گئی ہے ورنہ مغربی پنجاب لیگ کی ایڈہاک کمیٹی کا لہجہ اتنا سخت نہ ہوتا۔ کمیٹی نے سرحد کے معاملات پر ایک رزولیوشن پاس کیا جس کے الفاظ یہ ہیں۔ "ملک میں عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ صوبہ سرحد میں انتہائی بدنظمی بلکہ بے دردی کا دور دورہ ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سرحد سے ہر طرح کی شخصی آزادی ختم ہو چکی ہے اور موجودہ حکومت نے بہت زیادہ سختیوں اور ظلم سے کام لیا ہے"۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں حکومت پاکستان اور صوبے کے وزیر اعظم مسٹر عبد القیوم سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ صوبے میں حکام کے ظلم و ستم کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کا انتظام کریں۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ مخالفت کو ظلم کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے ایسے عناصر کے پیدا ہونے اور ابھرنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے جو نہ صرف صوبے بلکہ سارے ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیں قیوم صاحب کی سیاست کا نیا رنگ جناح صاحب کے دورہ سرحد کے بعد شروع ہوا ہے اس لئے یہ قیاس غالباً ٹھیک ہوگا کہ انھیں جناح صاحب کی تائید حاصل ہے۔ ایسی صورت میں یہ امید کہ وہ تحقیقات پر آمادہ ہو جائیں گے یا تاریخ کے اس سبق کو یاد کریں گے کہ ظلم سے عوام کو کچلا نہیں جا سکتا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ لیکن پنجاب لیگ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے حق کی حمایت کی جرأت کی صحت مند جمہوریت کی تعمیر ایک مناسب حزب مخالف کے بغیر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

یہ آئین زبان بندی

مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ایک پریس نوٹ میں پریس کو متنبہ کیا ہے کہ پاکستان کی مخالفت میں پروپیگنڈے پر سخت کارروائی کی جائے گی۔ حکومت کو پریس کے ایک حصے کی بعض حرکتیں گراں گذری ہیں اور اس بات سے تشویش پیدا ہو گئی ہے کہ کھلے بندوں اور ڈھکے چھپے بعض اخبارات نے پاکستان کے بعض قومی مقاصد کی مخالفت کرنے کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ ان مقاصد میں خاص طور پر کشمیر کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ حکومت کی دوسری شکایت یہ ہے کہ بعض اخبارات عوام اور پاکستان کے موجودہ لیڈروں کے درمیان ایک خلیج پیدا کرنا چاہتے ہیں پریس نوٹ میں قومی اتحاد و نظم پر زور دیا گیا ہے۔ اور حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان رجحانات کو دبانے اور ختم کر دینے کے لئے سخت کارروائیاں کرے۔

حکومت کی شکایتوں میں کتنی سچائی ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ قیاس کرنا بھی آسان نہیں کہ کوئی ایسا اخبار بھی پاکستان میں موجود ہے جس پر پاکستان کے قومی مفاد کی مخالفت کا شبہ بھی کیا جا سکے۔ لیکن یہ حکومت کے اپنے موڑ ہیں اور بحث رموز مملکت سے نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ حکومت اخبارات کے معاملے میں اس طرح خود ہی جج بن جاتی ہے، خود ہی الزام لگاتی ہے اور خود ہی سزا بھی دیتی ہے۔ یہ صورت حال ایک نئی نئی جمہوریت کے لئے کچھ زیادہ امید افزا بات نہیں۔ حکومت پنجاب نے پچھلے دنوں دو اخبارات کے خلاف سخت کارروائی کی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پاکستان ٹائمز نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے احتجاج میں ایک بیان شائع کیا ہے ان کی بعض نصیحتوں پر عمل کر کے مغربی پنجاب کی حکومت اپنے کو زیادہ شاید ترخطرناک امکان سے بچا سکتی ہے ہماری حکومت اگر واقعی عوام کے فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھتی ہے اور ملک کو انقلاب کی سختیوں سے بچانا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی خیال اور آزادی تقریر دے۔ عوام کی آزادی تقریر و تحریر میں مداخلت کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ طاقت و اقتدار پر امن قانونی ذرائع کے ہاتھ سے نکل کر سوسائٹی کے انقلاب دوست عناصر کے ہاتھ میں چلا جائے اور انقلاب سے سب کو ڈرنا چاہئے۔ کم سے کم مغربی پنجاب کی حکومت کو تو ضرور ہی۔

پناہ گزین کہاں جائیں؟

کچھ ہی عرصہ ہوا مغربی پنجاب کی حکومت کے بعض ذمہ دار وزرا نے ایسے بیانات شائع کئے تھے جس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ حکومت پناہ گزینوں کے سوال پر قابو پا چکی ہے۔ اس خوش فہمی نے پچھلے ہفتے ایک دردناک صورت حال پیدا کر دی۔ حکومت نے پناہ گزینوں کے ایک لیڈر کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس پر احتجاج ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے گولی چلائی۔ اور ۱۵ آدمی جان سے مارے گئے۔ اور کافی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ منٹگمری میں جہاں جھگڑا یہ شروع ہوا حکومت کے اعلان کے مطابق اب بھی کھچاؤ باقی ہے گو صورت حال پر قابو پا لیا گیا ہے۔ بعض دوسرے کیمپوں میں بھی احتیاطی تدابیر کی گئی ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ [illegible] منٹگمری کا سین کہیں اور دہرایا نہیں جائے گا۔

لیکن اس واقعے سے پناہ گزینوں کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا ہے۔ مغربی پنجاب کے کیمپوں میں کم و بیش ۵ لاکھ پناہ گزین پڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے ریلیف کمشنر نیغاری صاحب نے بہت ہی صاف الفاظ میں کیمپوں کی حالت کی خرابی کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ پانچ لاکھ پناہ گزین کہیں اور نہ ہٹائے گئے تو کیمپوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو جانا ناگزیر ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ مغربی پنجاب نے اپنی پہلی آبادی سے ۲۵ فی صدی زیادہ پناہ گزین اپنے ہاں دوبارہ بسائے ہیں۔ اس کے برخلاف صوبہ سرحد اور سندھ میں دو دو تین تین لاکھ پناہ گزینوں کو بسایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا جہاں تک مغربی پنجاب کا تعلق ہے اب اس میں اور لوگوں کو بسا سکنے کی صلاحیت نہیں رہی۔

ان اعداد سے خیال ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں نے پناہ گزینوں کے بسانے کے مسئلے میں تعاون نہیں کیا ہے۔ قصور بڑی حد تک مرکزی وزارت کا سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ کام اس کا تھا کہ صوبوں کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے پناہ گزینوں کو بسانے کا ایک پروگرام مرتب کرتی۔ اس ہفتہ کراچی میں اس سلسلے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے اور کم سے کم اس جلسے کے بعد پالیسی کا تعین ضرور ہو جانا چاہئے لیکن پالیسی کے تعین کے بعد بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اتنی تاخیر کے لئے کیا قیمت دینی ہوگی۔ پانچ لاکھ انسانوں کو مغربی پنجاب سے سرحد اور سندھ منتقل کرنا خود ایک دشوار کام ہوگا۔ اس میں وقت لگے گا۔ اور اس وقفہ میں کیمپوں کی حالت اگر بدتر نہیں تو پھر یا تی سے گذر جائے گا۔ ممکن ہے بہت سے لوگ مغربی پنجاب سے ہٹنا نہ چاہیں۔ حکومت کو ان کے ساتھ بھی زبردستی کرنی ہوگی۔ حکومت کو کوئی ایسا طریق کار ڈھونڈنا ہوگا کہ اسے پناہ گزینوں کا پورا پورا تعاون حاصل ہو سکے۔ پورے تعاون کے بغیر کچھ کرنے کی

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

مغربی دُنیا

برلن میں کبڈی کا کھیل

دو حریفوں کو ایک دوسرے کے خلاف خوب بھڑکائیے مگر لڑنے نہ دیجئے تو ان سے عجیب مضحکہ خیز حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ پچھلے ہفتے جو برلن کی حالت تھی اُسے دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ جرمنی کے المناک ڈرامے کا دل خراش اثر کم کرنے کے لئے بیچ میں ایک تفریحی نقل داخل کر دی گئی ہے۔ برلن میں ایک چوک پوٹسڈامر پلاتس کہلاتا ہے یہاں برلن کے روسی، امریکی اور برطانوی علاقوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ۲۰ اگست کو روسی پولیس چور بازاری کے ملزموں کا پیچھا کرتی ہوئی امریکی حد میں داخل ہو گئی اور ملزموں کو پکڑ لے گئی۔ اس سے امریکی اور برطانوی علاقوں میں ہل چل مچ گئی۔ سپاہی پولیس اور فوج موقع واردات پر بھیج دی گئی۔ ادھر سے روسی پولیس اور فوج بھی آ گئی۔ بیچ میں سفید روغن کی ایک چوڑی سی لکیر کھینچ دی گئی۔ گویا پالا بن گیا۔ اس کے بعد لوگوں کے ادھر سے اُدھر آنے جانے، گرفتار ہونے یا بچ نکلنے کے متعدد واقعات ہونے لگے جنھوں نے بالکل کبڈی کی صورت اختیار کر لی۔ چند روز کے بعد یہ سلسلہ تو موقوف ہو گیا۔ لیکن شہر کے جرمن باشندوں میں سے کمیونسٹ پارٹی نے برلن کی حکومت بلدیہ کے خلاف جس میں مغربی علاقے کے لوگوں کی اکثریت ہے مظاہرے شروع کر دئے ہیں۔ دوسری پارٹیاں حکومت کی حمایت میں مظاہرے کر رہی ہیں۔

ادھر ماسکو میں مغربی جمہوریتوں کے نمائندوں اور روسی حکومت میں گفت و شنید برابر جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۳ اگست کو ان نمائندوں کی مارشل اسٹالین سے دوسری ملاقات بہت امید افزا ثابت ہوئی۔ سرکاری طور پر کوئی اعلان نہیں کیا گیا کہ اس ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی۔ [illegible] کہ عام خیال ہے کہ برلن کے [illegible] جو اس وقت سارے جھگڑے کی جڑ ہے زیر بحث تھا اور اس کے بارے میں [illegible] سمجھوتا ہو گیا ہے۔ تفصیلات خود برلن میں فریقین کے مقامی افسر آپس میں طے کریں گے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ برلن کی فوری نزاع کے علاوہ جرمنی اور بقیہ یورپ کے معاملات کے متعلق بھی کچھ بات چیت ہو رہی ہے یا نہیں۔ [illegible] ہے کہ [illegible] ہی سے [illegible]

اب ماسکو میں گفت و شنید جاری ہے، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اُدھر صلح کی باتیں اِدھر یہ

ایک طرف تو یہ خبریں آ رہی ہیں کہ ماسکو میں روسی حکومت سے امریکا اور اس کے ساتھیوں کی بات چیت کا رنگ اچھا ہے اور برلن کے معاملے میں سمجھوتے کی تمامی امید ہے، اور دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ امریکا نے روسی قنصل کو اس الزام میں کہ اس نے چند روسیوں کو جو امریکا کی پناہ میں تھے حبس بے جا میں رکھا، واپس چلے جانے کا حکم دے دیا ہے اور روس نے اس کے جواب میں اپنے ہاں کے امریکی قنصل خانے بند کر دئے ہیں۔ اگر امریکا میں صدر کا انتخاب قریب نہ ہوتا تو ہم سمجھتے کہ امریکی حکومت نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے جس کا رخ اعلان جنگ کی منزل کی طرف ہے۔ لیکن وقت تو یہ پریسیڈنٹ ٹرومین کا ایک انتخابی ہتھکنڈا معلوم ہوتا ہے کہ ووٹ لینے کے لئے اپنے دبنگ پن کا رعب ڈالیں۔ غالباً روس اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب تو دے دیا لیکن ماسکو کی بات چیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

ہارے دشمن کی دُرگت

پچھلی جنگ کے ختم ہونے کے بعد مغرب ملک کے ارکان حکومت اور بڑے بڑے عہدہ داروں پر مقدمے چلا کر ان کو سزائیں دینا ایک انوکھی بات تھی۔ مگر اس کو اس وجہ سے جائز سمجھا گیا کہ یہ لوگ شیطانی نازی [illegible] سے [illegible] جنھوں نے ایسے ایسے ظلم کئے تھے جن کا حال سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ جوش ان سے [illegible] روسیوں کو تھا اس لئے کہ ان ہی کو نازیوں کے ہاتھ سے سب سے زیادہ مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں۔ لیکن ان کے غصے کی لپیٹ میں جنگی مجرموں کے ساتھ وہ جرمن فوجی افسر بھی آ گئے جن کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک کی طرف سے لڑ کر روس کی فوجوں کو شکست دی۔

امریکا اور انگلستان سے رجوع کو جو شکایتیں تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جرمن فوج کے بعض اعلیٰ افسروں پر جو ان کے ہاں قید ہیں مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ اب معلوم ہوتا ہے روسیوں کی تالیف قلب کے لئے ان کی یہ شکایت دور کر دی جائے گی۔ حال میں فیلڈ مارشل رُنڈسٹیڈ، فیلڈ مارشل براؤخِش، فیلڈ مارشل مان اشٹائن اور جنرل اشٹراؤس کو انگلستان سے جرمنی بھیجا گیا ہے۔ اب وہ جنگی قیدیوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ معمولی قیدیوں کی حیثیت سے رکھے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے تو ان کو اپنا سامان خود لاد کر لے جانا پڑتا ہے۔ انگلستان میں اس مسئلے پر خاصی گرم بحث ہے۔ کچھ لوگ ان پر سختی کرنے اور مقدمہ چلانے کی حمایت کر رہے ہیں اور کچھ اسے شرافت اور انسانیت کے خلاف بتاتے ہیں۔ اس زمانے میں کہیں شرافت اور انسانیت کا نام سنائی دے یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

تکلف یا ہچکچاہٹ؟

مغربی یورپ کی ایک متحدہ پارلیمنٹ [illegible] کی تجویز جو برسلز کانفرنس نے مسٹر چرچل کی صدارت میں منظور کی تھی اب فرانس کی طرف سے سرکاری طور پر اٹھائی گئی ہے۔ فرانس کی حکومت نے ان سب ملکوں کو جو برسلز کے معاہدے میں شریک تھے خط لکھے ہیں جن میں ان سے اس تجویز پر غور کرنے کی درخواست کی ہے۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان خطوں کے کیا جواب آئے ہیں مگر اس بارے میں مسٹر اٹلی اور مسٹر چرچل میں جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ شائع کر دی گئی ہے اور مسٹر اٹلی کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مغربی یورپ کے اتحاد عمل کو وفاق کی حد تک لے جانے میں تامل ہے۔ پیرس کے اخبار "لی ماند" کے ایک مضمون نگار نے مسٹر اٹلی کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے ان سے پوچھا ہے کہ کیا آپ اپنے ملک کو مغربی یورپ کا امام بنانے کے بجائے پچھلی صف میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے انھیں غیرت دلائی ہے کہ فرانس میں موسیو بلوم اور موسیو رماڈیئے اور بلجیم میں موسیو اسپاک تو اس مقصد کی طرف جو حقیقت میں سوشلسٹ مقصد ہے، دلیری سے قدم بڑھا رہے ہیں اور آپ یورپ کے مفاد اور عقل کے تقاضے کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی اندرونی مصلحتوں کی وجہ سے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ آخر میں اس نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ مسٹر اٹلی اور مسٹر بیون خود اپنے ملک اور اپنی پارٹی کی رائے سے مجبور ہو کر وفاق یورپ کی تحریک میں شریک ہو جائیں گے۔

یہ تو ممکن نہیں کہ مغربی یورپ کی لیڈری کا لالچ مسٹر اٹلی کے دل کو نہ کھینچتا ہو۔ یا تو وہ محض تکلف کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ زیادہ اصرار کیا جائے یا انھیں یہ قدم اٹھانے میں کچھ خطرات نظر آتے ہیں اس کی وجہ سے ہچکچاتے ہیں۔ خطرات بظاہر دو ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ وفاق کا رکن ہونے کے بعد انگلستان کو آیندہ جنگ میں لازمی طور پر شریک ہونا پڑے گا۔ مگر سچ پوچھئے تو یوں بھی اس نے اپنے آپ کو مغربی یورپ سے اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ اگر جنگ وہاں تک پہنچی تو وہ کسی طرح الگ نہیں رہ سکتا۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں وفاق کے اندر سوشلسٹ پارٹی اقلیت میں نہ رہ جائے، اور مغربی یورپ کی لیڈری مسٹر اٹلی کی بجائے مسٹر چرچل کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ یہ پہلو واقعی قابل غور ہے اور اگر مسٹر اٹلی اسی وجہ سے تامل کر رہے ہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ اس لئے کہ اگر خدا مسٹر چرچل کو ناخن دے دے تو پھر یورپ کی خیریت نہیں۔

پاکستان (بقیہ صفحہ ۵)

کوشش کی گئی تو نتائج خاصے دردناک اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منٹگمری میں پناہ گزینوں نے اسلحہ جمع کر رکھے ہیں۔ یہ اس خطرہ کی طرف ایک معمولی سا اشارہ ہے۔ ادھر بارش کی کثرت اور سیلاب کی وجہ سے ایک نئی مشکل بھی پیدا ہو گئی ہے۔ سندھ اور مغربی پنجاب دونوں ہی جگہ فصل کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مغربی پاکستان کی غذائی صورت حال خراب ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو پناہ گزینوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا۔ مغربی پنجاب کے متعلق لیگ کی ریڈھاک کمیٹی نے اپنی ایک تجویز میں مغربی پنجاب کی غذائی صورت حال کے متعلق تشویش کا اظہار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر اس صورت حال پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو فاقہ کشی کی مصیبت سے بچنا مشکل ہوگا۔

ا۔ س

یہ لوگ

اختر انصاری

ستم قاتل بہ اعتبارِ اثر
یوں تو شاخِ نبات ہیں یہ لوگ

ذہن تاریک اُن کے دل تاریک
علم و عرفاں کی رات ہیں یہ لوگ

دشمنی اِن کی ہر اُجالے سے
ظلمتِ کائنات ہیں یہ لوگ

قلب یخ بستہ، روح یخ بستہ
انجمادِ حیات ہیں یہ لوگ

نہیں ان میں کوئی تڑپ باقی
مدفنِ حسیات ہیں یہ لوگ

تپشِ زیست سے عناد انھیں
موت کا سرد ہاتھ ہیں یہ لوگ

نہ تفکر، نہ سوزِ دل، نہ شعور
کس قدر واہیات ہیں یہ لوگ

فرار

کوثر بلگرامی

مطربا! کیسی قیامت کی گھٹا چھائی ہے
اہرمن کی سپہِ شر کی صف آرائی ہے
کشت و خوں، قحط و بلا، ذلت و رسوائی ہے
نوعِ انساں پہ تباہی کی گھڑی آئی ہے

روح بیتاب تڑپتی ہی چلی جاتی ہے!
زندگی آہ کے سانچوں میں ڈھلی جاتی ہے!

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ گرجتے طوفاں
یہ تڑپتی ہوئی آہیں، یہ سسکتے ارماں
نیم جاں تشنہ دہاں، فاقوں کے مارے انساں
چار جانب ہے بپا ایک قیامت کا سماں

یہ نئے نشترِ خاطر نہیں دیکھے جاتے!
یہ جگر سوز مناظر نہیں دیکھے جاتے!

محفلِ عیش نہیں، بزمِ عزا ہے دنیا
لاکھ آنسو ہیں یہاں ایک تبسم کی بہا
چار سو خونِ تمنا، الم و آہ و بکا
دل میں اب طاقتِ برداشت نہیں، ساز اٹھا!

تارِ احساس ہو خاموش تو ہو جانے دے!
مجھے نغمات کے سیلاب میں کھو جانے دے!

نزولِ رحمت

اختر حمید خان

(۱)

اگر نزول نہ رحمت کا آسماں سے ہو
اگر کرم کا ترشح زمیں کو نم نہ کرے
اگر یہ آبِ مصفّیٰ، یہ شبنم و باراں
زمیں کی خشکی و شوریدگی کو کم نہ کرے
تو یہ فروغ، یہ بالیدگی کہاں سے ہو
تو زندگی یہ نئی روح آکے دم نہ کرے

(۲)

مری مثال بھی اُس خاکِ تشنہ کی سی ہے
جو آبِ پاک سے نمناک و سرفراز رہے
یہ ولولے، یہ اُمنگیں نزولِ رحمت ہیں
خدا کرے کہ مرا دل یونہی گداز رہے
نئی ترنگ، نئی اک شگفتگی سی ہے
امید و شوق کا یہ سلسلہ دراز رہے

(۳)

ہوائیں پورب و پچھم کے ساگروں سے اٹھا
اُٹھا کے لاتی ہیں انمول موتیوں کی لڑی
نتھارتے ہیں سمندر سے دیوتا جس کو
بلاشبہ وہی امرت ہے ساونوں کی جھڑی
طواف کرتی ہیں جس ارض کا نسیم و صبا
وہ ارض ہوتی ہے شاداب و خوش گوار بڑی

(۴)

مری مثال بھی اُس ارضِ خوش گوار کی ہے
نسیم ہے مرے کوچے میں اور صبا بھی ہے
کھلے ہوئے ہیں شگوفے، نہا ہوں صحنِ چمن
خدا کے فضل سے بارش بھی ہے ہوا بھی ہے
دبا ہوا ہوں زمانے کے پاؤں کے نیچے
اور آسمان و سمندر سے واسطہ بھی ہے

(۵)

ہوا نے، ابر نے، موسم نے، روحِ فطرت نے
دیا ہے بوسہ بہ پیغام نازنینوں کو
ہمارے پاس بھی آیا ہے عرش سے تحفہ
حقیر سمجھو نہ ہم زاویہ نشینوں کو
سناؤں گا یہی دو چار گیت بر کھا کے
کشیدہ قامت و گل پیرہن حسینوں کو

میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی؟

خواجہ احمد عباس

ایک دو نہیں، سری نگر کے ایس پی کالج کے چار نوجوان دوست فرمائش کر رہے ہیں - کل ہماری بزم ادب کا جلسہ ہے - اس میں شرکت کرو اور ایک کہانی پڑھو - اب کوئی انکار کیسے ہی تو کیونکر -

"کون سی کہانی پڑھوں؟" میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا جس کا نام بھی وہی ہے جو میرا ہے اور جو میری طرح کہانیاں لکھتا ہے - کشمیری نوجوانوں کی محفل میں کہانی پڑھنے والے ہو تو کشمیر پر کوئی کہانی پڑھو" اس نے جواب دیا -

"میں نے تو کشمیر کے بارے میں ایک ہی کہانی لکھی ہے زعفران کے پھول - مگر وہ تو یہاں کی مہک آنے سے پہلے ایک دوسرے ہی منزل کی عکاسی کرتی ہے - آج تو حالات بدل چکے ہیں ...."

میں نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ بولا " تو کوئی نئی کہانی لکھو"

"کہنا آسان ہے اور لکھنا مشکل ہے" میں نے کہا "چند گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں کیسے لکھ پاؤں گا!"

مگر اس نے بچنے کا موقع ہی نہیں دیا " لکھنے والے چند گھنٹے میں بھی کہانی لکھ سکتے ہیں - زعفران کے پھول تم ہی نے سری نگر سے راولپنڈی تک کے سفر میں لکھی تھی، ہاں اگر کوئی اپنی سستی کے بہانے تلاش کرنا چاہے تو ...."

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا بھئی اچھا - تم جیتے میں ہارا - نئی کہانی ہی لکھتا ہوں ...."

کاغذ قلم لے کر میں بیٹھ گیا - چہرے پر انہماک بلکہ الہام کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس والے سب جان جائیں کہ دماغ پر تخلیقی جوت سوار ہے - کیا کہانی لکھوں یہ سمجھ میں نہیں آیا -

کہانی کے بارے میں اکثر کم سمجھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی اخبار کے مضمون کی طرح لکھی جاتی ہے - ناب تول کر - یا غزل کی طرح قافیہ ردیف کو گھڑ کر بنا لی جاتی ہے - درحقیقت کہانی لکھی نہیں جاتی بلکہ الہامی اشعار کی طرح نازل ہوتی ہے - کسی گجراتی افسانہ نگار نے کہانی کو ایک ہرنی سے تشبیہ دی ہے - جو جنگل میں کلیلیں مارتی پھرتی ہے اور کوئی خوش قسمت اور چالاک شکاری ہی اس کو قابو میں کر پاتا ہے -

عالم خیال کے جنگلوں اور میدانوں میں میں اسی ہرنی کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا مگر ہر بار وہ زقند مار کر آگے نکل گئی اور میں تکتا ہی رہا - کشمیر کی ہر جنت نظیر وادی، ہر دامن کوہسار، ہر جھیل اور دریا کی سیر میں نے کی - شکارے پر بیٹھ کر میں ڈل میں گھوما، گھوڑے پر سوار ہو کر اپتر ہو آیا - شالامار میں گاتے ہوئے آب شار کے نغمے میں نے سنے مگر کہیں مجھے کہانی نہ ملی - میں ہر طبقے کے کشمیریوں سے ملا - ہانجی، شکارے والے دست کار، گوجر، پنڈت، پیر، لکڑہارے، بڑھئی، لہار، سنار، شالی کوٹتی ہوئی عورتیں، دھان کے کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہوئے کسان - مگر یہ سب تو معمولی کام کرنے والے انسان تھے - بھلا ان کے بارے میں کہانی کیسے لکھی جا سکتی ہے - کہانی تو ہیرو، ہیروئن کے بارے میں لکھی جاتی ہے اور ہیرو ہیروئن صرف ایک کام کرنا جانتے ہیں ــــــ عشق

غرض اس جنت نظیر ملک میں جہاں قدرت نے انسان اور انسان کے قدرتی ماحول دونوں کو حسن بخشا ہے، جہاں ظاہر نظر رومان انگیز ہے، جہاں حب خاتون عرفانی محبت ... ... اور جہاں شہزادے اندلال ... عاشق پروان چڑھا مجھے کہیں عاشق و معشوق ... ملا کہ میں ان کے بارے میں ایک رومانی افسانہ تصنیف کر سکوں - اب آپ ہی سوچئے کہیں بیلے بیلے ... چھیننے والے ہانجیوں اور کسانوں کے بارے میں کہانی لکھی جاتی ہے ....

جیسا میں نے عرض کیا عالم خیال میں اسی طرح کہانی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ میں نہ جانے کس طرح پام پور جا نکلا - پام پور! اسی گاؤں کے بارے میں میں نے کتنی ہی رومانی روایات سنی تھیں - کرشن چندر نے کہیں لکھا ہے "جس نے پام پور کا چاند نہیں دیکھا وہ دنیا کے حسین ترین نظارے سے محروم رہا ہے - نہ معلوم پامپور میں کوئی الگ چاند نکلتا ہے یا وہی زرد رو روشنی کی ٹکیا جو سارے دنیا میں دکھائی دیتی ہے بہرحال اور دوستوں کی زبانی سنا تھا کہ زعفران کے موسم میں پام پور کے قریب زعفران کے کھیت، چاندنی رات میں عجیب پر بہار کیفیت پیدا کرتے ہیں - پام پور زعفران اور شہد، خوش بو اور مٹھاس، دریا کا کنارہ اور وہ مست چاند، میں نے سوچا پام پور میں ضرور رومان پلتے ہوں گے - مگر جب میں نے گاؤں کے تنگ اور تاریک ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا - سڑک پر بارش کی وجہ سے کیچڑ تھا اور مرد عورت سب اونچی اونچی لکڑی کی چبوترے نما کھڑاؤں پہنے پھر رہے تھے - جہلم میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ ایک رومانی، مدھم بہنے والی ندی کے بجائے ایک بپھرا ہوا سمندر بنا ہوا تھا - چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں نہ رومان کا پتہ چلا اور نہ کوئی ہیرو ہیروئن ملے -

پھر میں نے دور سے ایک لڑکی کو دیکھا جو گھڑا سر پر اٹھائے پانی بھرنے جا رہی تھی - اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور جوان ہے - جیسا آپ سب جانتے ہیں، سر پر گھڑا اٹھائے ہوئے پنگھٹ کی طرف جاتی ہوئی عورت ہمیشہ ایک خوب صورت اور رومانی منظر پیش کرتی ہے پنگھٹ کا تصور ہی کس قدر دل فریب اور رومانی ہے سکھیوں کی چہل، پانی کے چھینٹے، عاشقوں کا چھپ چھپ کر دیکھنا کسی مسافر کا پنگھٹ پر ٹھیر کر پانی مانگنا اور شربت دیدار کے گھونٹ پی کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے چلے جانا .... معاف کیجئے میں کسی فلم کا خیال کر رہا تھا -

وہ لڑکی پنگھٹ پر جانے کے بجائے دریا کے کنارے پر گئی اور وہاں سے گھڑا بھر کر واپس ہوئی - میری نگاہ میں یہ ایک رومانی فعل نہیں بلکہ ایک نہایت غیر صحت مند فعل تھا - کیونکہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا پانی گدلا اور گندا تھا - نہ جانے کیا الابلا بہا کر لا رہا تھا - بھلا کوئی کنوئیں کا صاف پانی چھوڑ کر اس گندے پانی کو کیوں پیئے؟

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا گندا پانی رس رس کر کنوؤں میں بھی پہنچ گیا ہے، اور اس وقت تو دریا کا بہتا ہوا پانی کنوئیں کے ٹھیرے ہوئے پانی سے بہتر ہے

ہاں تو جب وہ لڑکی پانی بھر کر واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہی تھی، گوری رنگت تھی مگر اس پر کچھ کیچڑ لگا ہوا تھا، بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی، پیراہن میلا تھا، ننگے پاؤں کیچڑ میں دھنسے جا رہے تھے میرے رومان زدہ دماغ نے فوراً کہانی کا عنوان طے کر لیا "کیچڑ کا کنول" -

قریب کھڑے ہوئے ایک بڑے میاں سے میں نے پوچھا اس لڑکی کا نام کیا ہے، جواب ملا "نوراں"

نوراں کتنا اچھا نام ہے! کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو دونوں کی کہانیوں میں آ چکا ہے - یہ لڑکی ضرور ایک افسانے کی ہیروئن بن سکتی ہے - اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور کسی سے عشق کرتی ہوگی -

ایک اور آدمی سے میں نے پوچھا "کیوں بھائی یہ نوراں کسی سے عشق کرتی ہے؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "عشق! اس کی تو کئی برس ہوئے شادی ہو چکی ہے"

لاحول ولا قوۃ - میں نے سوچا - جبھی تو ہندوستان اور کشمیر دونوں ترقی نہیں کر پاتے، ابھی لڑکی جوان نہیں ہوتی، دو چار عشق نہیں کر پاتی کہ جھٹ سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے - بھلا شادی شدہ لڑکی کے بارے میں بھی کوئی افسانہ لکھ سکتا ہے؟ جب تک وہ اپنے شوہر کے بجائے کسی دوسرے جوان کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے؟ اور نوراں کی چال ڈھال، وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سیدھی سادھی جاہل ہندوستانی لڑکیوں میں ہے جو شادی بیاہ ہی کو اپنے رومان کی معراج اور اس کا اختتام سمجھتی ہیں -

پھر میں نے سوچا، اس نوراں کے شوہر سے تو ملا جائے، شاید اسی میں رومانی جراثیم پائے جائیں - میں نے ایک راہ چلتے سے پوچھا "کیوں جی اس نوراں کا شوہر کیا کرتا ہے؟"

اس نے کہا "نانبائی ہے" - میرے رومانی تخیل کو پھر ایک ٹھیس پہنچی - بھلا کوئی نانبائی بھی عشق و محبت کو سمجھ سکتا ہے، کیا اس کے دل میں بھی آٹے کی طرح خمیر اٹھ سکتا ہے؟ یا وہ ایک خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر بھی سوچ سکتا ہے کہ اس کے پھولے ہوئے گال بالکل میری نانوں کی طرح ہیں -

پھر بھی میں نے سوچا چلو، اسے دیکھ تو لوں "کیوں بھائی اس کی دوکان کہاں ہے؟"

"وہ کیا ہے سامنے"

"مگر وہ تو بند ہے"

"یار وہ محاذ پر گیا ہوا ہے"

"محاذ پر؟ تمہارا مطلب ہے جنگی محاذ پر؟"

"ہاں ہاں فرنٹ پر"

یہ سُن کر میں خوش ہوگیا۔ نوراں کا شوہر میدانِ جنگ پر دشمن کا مقابلہ کر رہا ہے۔ شاید درجنوں قبائلیوں کو مار چکا ہوگا۔ شاید اُسے کوئی میڈل یا انعام ملا ہو۔ وہ ضرور ہیرو بننے کے قابل ہوگا۔ میں ضرور اس سے فرنٹ پر جاکر ملوں گا۔ تب میرا افسانہ مکمل ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا "نیشنل ملیشیا میں ہے نا؟"

جواب سُن کر میرے جوش و خروش پر پانی پڑ گیا۔ "نہیں جی۔ وہ تو بے چارہ قلی بن کر گیا ہے، ہندوستانی فوج کا سامان اُٹھا کر لے جاتا ہے۔"

اب آپ ہی سوچئے۔ ایک سپاہی کو تو ہیرو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر ایک قلی کو کیسے ہیرو بنایا جا سکتا ہے..........

سپاہی خواہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو ایک رومانی ہستی ہوتا ہے۔ مگر قلی.......

خیر میں نے پوچھا "نام کیا ہے اس کا؟"

"احمدو۔"

میں نے دماغ میں نام نوٹ کر لیا کہ شاید آئندہ کام آئے۔

پھر میں نوراں کے گھر پہنچا۔ ممکن ہے وہاں کوئی فسانوی مسالہ مل جائے۔ مگر اس کا گھر جس کے آنگن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نہایت غیر رومانی تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید نوراں اپنے شوہر کے فراق میں بیٹھا کوئی درد بھرا کوئی کشمیری گیت گا رہی ہو۔ مگر وہ نہایت غیر رومانی انہماک سے دھان کوٹ رہی تھی.......... ہاں اسی کے پاس ہی اس کا ڈیڑھ دو برس کا بچہ گیلی زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ غالباً اوکھلی میں سے جو گرد نکل رہی تھی وہ اس کی آنکھوں میں گر گئی تھی۔ کیونکہ وہ بار بار آنکھیں مل رہا تھا۔

اس گھٹیا قسم کے گھریلو منظر میں مجھے کوئی رومانی یا افسانوی پہلو نظر نہیں آیا۔ اس لئے میں وہاں سے چلنے لگا یہ سوچ کر کہ کل معافی مانگ لوں گا کہ کہانی مکمل نہیں ہوسکی — ..... مگر میں باہر نکلنے والا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ نوراں نے کام روک کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا ہے اور اسے پیار کرتی جا رہی ہے اور کچھ کہتی جاتی ہے اور اس کی آنکھیں دور، بہت دور سے کچھ دیکھ رہی ہیں اور بیک وقت ہنس بھی رہی ہیں اور رو بھی پڑی ہیں۔ میں کشمیری نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے میں نے ایک ہمسائے سے پوچھا۔ "یہ نوراں اپنے بچے سے کیا کہہ رہی ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ کہتی ہے کیوں روتا ہے رے تو؟ تجھے تو باپ کی طرح بہادر ہونا چاہئے رے۔"

بہادر! یہ لفظ سن کر میں ٹھٹکا۔ میں نے سوچا۔ اس احمدو کی ضرور تلاش کرنی چاہئے۔ شاید وہ سچ مچ افسانے کا ہیرو بننے کے قابل ہو۔

مگر احمدو کا پتہ کہاں ملتا؟ فرنٹ پر تو ہزاروں قلی کام کرتے ہیں۔ پھر بھی جب میں بارامولا ملٹری ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا قبائلیوں کے رجسٹر میں کہیں احمدو کا نام درج ہے؟ معلوم ہوا ایک نہیں درجن بھر احمدو لکھے ہوئے ہیں۔

اوڑی کے راستے میں میں ایک پکٹ پر ٹھہرا، جہاں نیشنل ملیشیا کی ایک کمپنی تعینات تھی۔ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ وہاں اوڑی سے واپس آئی ہوئی قلیوں کی ایک لاری ٹھہری۔ یہ وہ لوگ تھے جو فرنٹ پر چار پانچ مہینے کام کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ ملیشیا کے لڑکے لاری کی طرف دوڑے اور پوچھا:۔ "کیوں بھئی بام پور والا احمدو بھی ہے تم میں کیا؟"

ایک بوڑھا قلی ہنس کر بولا۔ "اوڑی.......... احمدو واپس آسکتے ہیں۔ مگر بام پور والا احمدو فرنٹ سے ٹلنے والا نہیں۔" میرے دماغ میں یادداشت کی ایک گھنٹی بجی۔ لاری روانہ ہوگئی۔ میں نے ملیشیا والوں سے پوچھا "کیوں بھئی یہ بام پور والا احمدو، کیوں مشہور ہے؟" انھوں نے بتایا کہ اس نے ملیشیا میں بھرتی ہونے کی تین بار کوشش کی تھی مگر ہر بار اُسے نامنظور کر دیا گیا۔

"مگر کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا وہ قابلِ اعتبار آدمی نہیں ہے؟"

"قابلِ اعتبار کیوں نہیں؟ نیشنل کانفرنس کا پرانا کارکن ہے۔ مگر اس کی آنکھیں نہایت کمزور ہیں۔ اس لئے ڈاکٹری معائنہ میں بے چارا فیل ہو جاتا ہے۔ مگر وہ محاذ پر جانے کے لئے اتنا مصر تھا کہ چپکے سے قلیوں کے دستے میں بھرتی ہو گیا اور اب تین مہینے سے کام کر رہا ہے۔

سنا ہے کہ احمدو اوڑی کے محاذ پر ہے۔ میں اس سے ملنے اوڑی پہنچا، وہیں معلوم ہوا کہ ٹیتھوال میں زیادہ خطرہ ہونے کی وجہ سے قلی وہاں جانے سے جھجکتے ہیں۔ اس لئے احمدو ان کو لے کر اس محاذ پر چلا گیا ہے۔ میں ٹیتھوال پہنچا تو وہ سکھ دو جا چکا تھا۔ میں سکھ دو میں تو وہ پونچھ میں۔ میں پونچھ میں تو وہ واپس اوڑی میں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ اور جب تک وہ نہ ملے تو میری کہانی کیسے پوری ہو!

میں واپس اوڑی پہنچا، جو کرنل قلیوں کا انچارج تھا اس سے پوچھا۔ "آپ کے یہاں ایک احمدو قلی ہے۔ بام پور والا۔" یہ کہہ کر میں قلم کاغذ نکال کر بیٹھ گیا۔ تاکہ اس کے حالات معلوم کرکے افسانہ مکمل کر لوں، کرنل نے میری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھا، اور جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ "تھا"— "تھا؟"

"ہاں" کرنل بولا "رات وہ ایک قریب کی پہاڑی پر مارا گیا۔"

"مارا گیا؟ مگر وہ سپاہی تو نہ تھا، وہ صرف ایک قلی.........."

کرنل نے کہا: "احمدو صرف ایک قلی نہیں تھا۔"

میں کچھ مطلب نہیں سمجھا۔ اتنے میں ایک کیپٹن داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنگ لگی ہوئی دقیانوسی توڑے دار بندوق تھی، کرنل کو سلام کرتے ہوئے اس نے کہا "جناب اپنی بندوق سے اس نے دشمن کے آٹھ آدمی ہلاک کر دئے، اسے وہ ہمیشہ اپنے پیراہن میں چھپائے رکھتا تھا۔"

میرے دماغ میں ایک زنانی آواز نے کشمیری میں کہا۔ "کیوں روتا ہے رے تو، تجھے تو اپنے باپ کی طرح بہادر ہونا چاہئے۔"

میں نے کرنل سے کہا۔ "کیا میں احمدو کی لاش کو دیکھ سکتا ہوں۔" شاید اسی غریب نانبائی کے مردہ چہرے پر اس کے خدوخال میں اس کی شجاعت اور وطن پرستی کا راز مل سکے!

کرنل نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا، کیپٹن نے ہلکے سے سمجھایا کہ ایک پچیس پونڈ کے گولے نے احمدو کے چیتھڑے بکھیر دئے تھے۔ اس کی لاش کا ایک ٹکڑا بھی دستیاب نہ ہوا تھا۔

میرے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ میں نے احمدو کی بندوق اُٹھالی جس کے کندے پر اب تک لہو —— احمدو کا لہو —— لگا ہوا تھا۔

سو احمدو سے میری ملاقات نہ ہوسکی جو یہ افسانہ مکمل ہو سکتا۔ اُمید ہے کہ آپ معاف کریں گے کہ میں آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ بہر حال اب آپ جان گئے کہ میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی۔

مسلمان اور آزادی (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

جنھیں پاکستان میں نوکری کا اور دوسرے طریقوں سے کمانے کا موقع تھا، وہاں جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ باقی سب ظاہر میں جو کچھ بھی کہتے ہوں، دل میں افسردگی، مایوسی ندامت لئے ہوئے رہ گئے۔

اسی عالم میں ۱۵ اگست آگئی۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی اور دوسرے شہروں میں جن لوگوں نے یوم آزادی کا شاندار منظر دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک بارگی زندگی کے سوتوں سے خوشی کا سیلاب اس طرح پھوٹا کہ ہندو، مسلمان، کانگریسی، سبھائی، لیگی سب کو بہا لے گیا۔ کلکتہ میں تو خیر گاندھی جی کی برکت تھی بمبئی کو کیا کہئے کہ بمبئی کے مسلمان، ہندوؤں کے محلوں میں اور ہندو مسلمانوں کے محلے میں کل تک قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے اور آج اپنے گھروں کی طرح پھر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح گلے مل رہے تھے۔ آزادی کی خوشی قلب کی گہرائیوں سے اس طرح اُمنڈ رہی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے غرض کا کھوٹ اور تعصب کا میل بالکل غائب ہو گیا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعصب اور نفرت کا جو زہر مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں میں دس سال میں (بلکہ پانچ چھ سال کہئے اس لئے تمام مسلمانوں میں اس کا اثر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں رہا۔) پھیلایا تھا۔ اس کی تلخی نے کام و دہن کو تو کڑوا کر دیا مگر رگ وپے میں نہیں پہنچنے پائی۔ عام مسلمانوں کے دل میں وطن کی محبت، آزادی کی لگن جو ۱۹۲۲ء میں تھی جو ۱۹۳۰ء میں تھی، اب بھی دبی ہوئی موجود ہے۔ صرف اُسے اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت میں ۱۹۳۷ء تک چند سر اور خان بہادروں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی پوری جماعت دل و جان سے تحریک آزادی میں شریک تھی۔ ۱۹۴۲ء تک آدھے ساتھ رہے اور آدھے دور سے تماشا دیکھتے رہے۔ اس کے بعد بے شک کچھ لیڈروں نے جو قریب قریب سارے پاکستان جا چکے ہیں، ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرکے کچھ دنوں کے لئے آزادی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور بہت سے لوگوں نے بلا سمجھے بوجھے ان کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں کو اب آزادی کی حفاظت میں مدد دے کر اپنے قصور کی تلافی کرنا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ کریں گے۔ مگر اس وقت ان پر بڑی مایوسی اور خوف غالب ہے، اور کچھ کھسیانا پن اور ضد بھی۔ ان کے دلوں سے اس کیفیت کو دور کرنے اور حب وطن کے جذبے کو جو کچھ دن سے سو گیا ہے، جگانے کی کوشش کرنا ہے خود ان کو، کانگریس کو، اور حکومت کو۔

(منقول از "اطلاعات صوبہ متحدہ")

اپاہج بچے اور اُن کا علاج

صالحہ عابد حسین

یوں تو بہت سی مصیبتیں اور مشکلیں ہمارے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے بڑی مصیبت بیماری کی ہے۔ قسم قسم کی بیماریاں ہیں جن کی بدولت لاکھوں اپنی زندگی سے بیزار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک بچوں کا فالج بھی ہے۔ نہ جانے کتنے بچے اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ کے لئے اپاہج، معذور اور بے دست و پا ہو کر زندگی گذارتے ہیں۔ وہ خود اپنے لئے وبال جان اور اپنے بد بخت ماں باپ کے لئے روحانی تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی مصیبت دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے اس وسیع ملک میں جو ایک برّاعظم کہا جا سکتا ہے ایک بھی ایسا ادارہ نہیں ہے (یا کہنا چاہیئے نہیں تھا) جہاں کہ اپاہج بچوں کا علاج کرایا جا سکے۔

ہمیں محترمہ فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس اہم اور نازک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ وہ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ انھیں اس کا خیال کیسے آیا، یہ ایک داستان ہے۔

۱۹۴۲ء میں ان کی ڈھائی سال کی بچی اچانک بچوں کے فالج میں مبتلا ہو گئی۔ اگرچہ وہ بمبئی میں رہتی تھیں جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ ملک بھر میں یہی ایک ایسا شہر ہے جہاں ہر قسم کے علاج معالجے کی سہولتیں میسر ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب فاطمہ اسمٰعیل کی بچی اس مہلک مرض میں مبتلا ہوئی اور انھوں نے اس کے علاج کی کوشش شروع کی تو ہر ڈاکٹر کی طرف سے انھیں یہی جواب ملا کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ بچی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ صبر کرو اور دیکھو کہ خدا کیا کرتا ہے۔ لیکن ماں کے تو دل کو لگی تھی اس سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ اپنی پیاری بچی کو اس حالت میں چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو جائے۔ خوش قسمتی سے بیگم اسمٰعیل کو مدراس میں ایک ڈاکٹر ملا جس نے کچھ امید بندھائی اور کہا بے شک کچھ نہ کچھ تدبیر کی جا سکتی ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ تم انتہائی محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرو۔ بچی کی محبت میں بے قرار ماں نے اس کا عزم کر لیا کہ خواہ اس راہ میں اُسے کتنی ہی مصیبت کیوں نہ جھیلنی پڑے مگر وہ ہمت نہ ہارے گی۔ چنانچہ آٹھ مہینے تک فاطمہ اسمٰعیل اپنی بچی کو لے کر اسی اسپتال میں رہیں اور اس دوران میں ڈاکٹر نے ان کو اپاہج اور معذور بچوں کا "عضویاتی طریقے" سے علاج کرنے کے ابتدائی اصول سکھا دیئے۔ اس کے بعد ایک سال تک پونا کے "بحالی کے مرکز" میں رہیں۔ جو لڑائی کے زخمیوں کے لئے قائم ہوا تھا۔ ہندوستان میں صرف وہی ایک ایسا ادارہ تھا، جہاں مالش وغیرہ کے ذریعے دوبارہ کام کرنے کے قابل بنانا سکھایا جاتا تھا۔ وہاں رہ کر مسز فاطمہ اسمٰعیل نے ایک کورس ٹریننگ کا لیا تاکہ وہ اپنی بچی کا علاج خود کر سکیں۔ اور اس طرح انھیں "عضویاتی طریقۂ علاج" کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی۔

انھوں نے تحقیق و جستجو کی تو انھیں معلوم ہوا کہ امریکہ اور یورپ میں اس طریقۂ علاج کا کافی کامیاب تجربہ ہوا ہے اور صرف "عضویاتی طریقۂ علاج" ہی مایوس اور اپاہج بچوں کی اُمید ثابت ہو سکتا ہے۔ انھیں بڑا افسوس ہوا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں لاکھوں ایسے بچے موجود ہیں نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی ادارہ نہیں، بلکہ لوگ اس طریقۂ علاج سے واقف بھی نہیں ہیں۔ انھیں یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ میری طرح اور ہزاروں مائیں بے بسی سے ان بچوں کو اس مہلک مرض میں مبتلا دیکھتی ہوں گی اور اسے لاعلاج اور ان کو بے بس سمجھتی ہوں گی؟ ان کی اپاہج بچی عضویاتی طریقۂ علاج کی بدولت اب تقریباً بالکل تندرست تھی اور سوا ایک ہلکے سے نقص کے کوئی مرض اور کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ کیوں نہ دوسرے بچوں کو بھی اس طرح تندرست کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ ایسے سب اپاہج بچوں کو اور نوجوانوں کو ہفتے کے بعد یہ کہہ کر خارج کر دیا جاتا ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے اور انھیں "قسمت" پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ عمر بھر بے بسی اور محتاجگی کی دردناک زندگی بسر کریں۔ بلکہ میں ایک بھی آدمی، ایک بھی ادارہ ایسا نہیں جو ان کی اُمید گاہ اور رہنما ہو۔ اپاہج بچوں کی بے بسی نے انھیں بے چین کر دیا۔ اور انھوں نے پوری لگن اور استقلال سے ایسے ادارے کی قیام کی کوشش شروع کر دی، جہاں عضویاتی طریقے سے، مالشوں وغیرہ کے ذریعے، اپاہج بچوں کو پھر سے کام کے قابل بنایا جا سکے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ نے بمبئی کے چوٹی کے ڈاکٹروں کو جمع کر کے یہ تجویز ان کے سامنے پیش کی اور انھوں نے ہر قسم کی مدد اور مشورہ دینے اور خود کام کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام "اپاہج اور معذور بچوں کے عضویاتی طریقۂ علاج کا مرکز" رکھا گیا۔

مئی ۱۹۴۷ء میں کام کرنے والے سامان، اعزازی مشیر روپیہ سب کچھ فراہم ہو چکا تھا۔ لیکن مکان نایاب تھا۔ ہر ممکن کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ممکن تھا کہ نا امید ہو کر یہ خیال چھوڑ دیا جاتا، لیکن ایک ڈاکٹر سنز گیری نے اپنے اسپتال کے کمرے میں ایک میز بیماروں کی مالش کے لئے مخصوص کر دی۔ اپنے خلوص نیک نیتی اور بلند مقصد پر بھروسہ کر کے ان لوگوں نے ۲ جولائی کو کام شروع کر دیا۔ مہینہ بھر بعد ڈاکٹر بالیگا نے جو چند مہینے کے لئے امریکہ جا رہے تھے، عارضی طور پر اپنا اسپتال اس کام کے لئے پیش کیا، اور دسمبر کے آخر تک کے لئے جگہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا مگر پھر کیا ہوگا۔ آخر حکومت بمبئی نے ایک پرانی فوجی عمارت ایک سال کے لئے کرایے پر دے دی لیکن عمارت خستہ حالت میں تھی اور اس میں نہ نل تھا، نہ نالیاں۔ کارکنانِ ادارہ کا خیال تھا کہ حکومت ان کے بلند مقصد اور اس ضروری کام میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں پہنچائے گی چنانچہ عمارت کی مرمت اور درستگی کے لئے دس ہزار روپے کا تخمینہ حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ دو مہینے تک درخواست دفتر در دفتر میں رہی اور اس کے بعد یہ جواب ملا کہ حکومت ایک ایسے مکان کی مرمت میں، جو صرف سال بھر کے لئے کرایے پر دیا گیا ہے، اتنی رقم خرچ نہیں کر سکتی۔ اب کیا کیا جائے؟ کیا اس تجربہ گاہ کو بند کر دیا جائے جو ابھی سے بہت سے مریضوں کی امید گاہ ہو گیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ حکومت کا سہارا چھوڑ کر فیاض عوام پر بھروسہ کیا گیا اور ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ڈاکٹر جیوراج مہتہ کے ہاتھوں ادارے کی نئی عمارت کی بنیاد پڑ گئی۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں اس ادارے میں ۲۹ بچے زیر علاج تھے اور ۴۰ بچے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام "اپاہج اور معذور بچوں کا علاج کی انجمن" رکھا گیا۔ اس کے مقصد یہ تھے۔

"ایک تو ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں اپاہج بچے اور معذور بچوں کے مرض کی تشخیص اور ان کو دوبارہ باکام بنانے کا کام ہو۔ .... دوسرے سارے ملک میں بے کار بچوں اور جوانوں کے علاج اور ان کے لئے اسپتال قائم کرنے کا پرچار کیا جائے، اور لوگوں کو اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس دلایا جائے۔"

"اپاہج اور معذور بچوں کے علاج کے اس ادارے کو سائنٹیفک طور پر چلانا شروع کیا گیا ہے اور فوجی ٹرینڈ نرسیں وغیرہ اس کے اسٹاف میں رکھی گئی ہیں اس لئے کہ ہندوستان میں صرف فوجی ٹرینڈ اسٹاف ہی اس کام سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ اس کے علاوہ اکثر لوگوں نے اپنی اعزازی خدمات اس کے لئے پیش کی ہیں اور بہت سی عورتیں ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبے کے ماتحت اس ادارے کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ لیکن اس کی روح رواں بیگم فاطمہ اسمٰعیل ہیں۔ جو تن من دھن سے اس کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ اور دلی لگن اور سچے خلوص کے ساتھ اپاہج اور معذور بچوں (اور بالغوں) کی خدمت کر رہی ہیں۔

اس طریقہ علاج کو در اصل دواؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کی مالشوں کے ذریعے سے بے کار ہو جانے والے اعضاء کو دوبارہ حرکت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ خود اپنے ہاتھ سے مریضوں کی مالش کرتی اور دوسروں کو اس کے طریقے سکھاتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ سارے ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوں، اور ہر جنرل اسپتال میں ایک شعبہ اپاہج اور معذور بچوں کے علاج کا ہو۔

یہ ملک کی کتنی بڑی خدمت ہے .... اور کتنی اہم؟ اس کا اندازہ ہماری حکومت اور ہمارے عوام دونوں کو کرنا چاہیئے، اور اس ادارے کی دل و جان سے مدد کرنی چاہیئے۔ جو ہمارے معذور اپاہج اور ناکارہ بچوں کو دوبارہ باکار انسان بناتا ہے۔

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

"ہو ہندوستان اور پاکستان کی میزان نہیں بیٹھتی، اس کی تدبیر ہم سے پوچھو۔ پنڈت نہرو تو کر لیں شادی اور لیاقت علی خاں تجرد کی زندگی اختیار کریں، تیل مرچ، کھٹائی، بادی چیزوں کا پرہیز رکھیں، پھر اگر ہماری سیاست اعتدال پر نہ آ جائے، تو نعیم کا نام بدل دینا مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سب کے کون۔ لے دے کر ایک نعیم کم بخت اکیلا کس کس چیز کو سنبھالے۔ ایک دل ہزار فکریں، ایک سر ہزار سودا۔"

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالکؔ ہندی

ہمارے اخباروں کی روش

کسی ملک کی نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی اور ذہنی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے بھی اس کے اخباروں کا مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ جب میں اپنے ملک کے اخباروں کے گذشتہ دس سال کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھ پر شرمندگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میری یہ تنقید سب اخباروں کے لئے نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے اخباروں نے ملک کی جنگ میں بڑا حصہ لیا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ بعض اخباروں کا طرزِ عمل ملک کے اندرونی معاملات کے بارے میں بھی معقول رہا۔ لیکن صداقت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم ان اخباروں پر سختی کے ساتھ تنقید کریں جنہوں نے گذشتہ چند سال کے اندر اندر اپنی ناعاقبت اندیشی کی۔ جب سے ملک میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا کرنے اور فساد کی آگ تیز کرنے میں علی الاعلان حصہ لیا جب کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اس وقت بعض مسلمان اخباروں نے نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ کانگریس کے ہندو اور مسلمان لیڈروں پر ذاتی حملے کئے اور اپنی قابلِ اعتراض تحریروں سے عام مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ اس کے مقابلے میں بعض ہندو اخباروں نے اسی دیدہ دہنی کے ساتھ نہ صرف مسلم لیگ کی بلکہ عام طور پر سب مسلمانوں کی مخالفت کی اور ان کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا۔ جب اسی طرح دونوں طرف نفرت اور تعصب اور نامعقولیت کی بارود جمع ہو گئی تو تقسیمِ ہند کی چنگاری نے ملک کے امن و عافیت اور انسانیت و شرافت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ صرف اخباروں کا کارنامہ تھا۔ نہیں، اس میں عوام کی جہالت، اور غلط قسم کی مذہبیت، فریقِ ثالث کی ریشہ دوانیاں، بہت سے لیڈروں کی خود غرضی اور حماقت، اور ان کی قابلِ اعتراض تقریریں بھی شامل تھیں۔ لیکن اگر اخباروں کے کالم ان فساد انگیز تقریروں کا استقبال نہ کرتے اور ان کے لئے مائکروفون کا کام نہ دیتے، اگر وہ "دوسرے فریق" کی سرگرمی اور غلطیات کو بڑھا چڑھا کر نہ دکھلاتے، اگر سنسنی خیز خبروں اور عنوانوں سے وہ عام لوگوں میں نفرت کی آگ نہ بھڑکاتے، تو شاید ان شر پسندوں کو اس قدر کامیابی نہ ہوتی۔ لیکن جب ملک کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ (میں ان کو تعلیم یافتہ کیسے کہوں؟) صرف اپنی پارٹی کے اخبار پڑھیں، اور اس میں جو کچھ چھپے اس کو حقیقتِ مطلق سمجھیں، اور اخبار ان کو گمراہ کرنے پر تلے ہوں تو دوسری اصلاحی اور تعلیمی کوششوں کی کامیابی بہت مشکوک ہو جاتی ہے۔ نفرت اور تعصب کے اس طوفان کے مقابلے میں مہاتما گاندھی تک کی تعلیم اور مثال جس میں خلوص کی بے پناہ قوت تھی ناکام [illegible] ہوئی

اور ہمیں اس کی وجہ سے اُن کے قیمتی جیون کا بلیدان دینا پڑا!............. ممکن ہے کہ آپ ماضی کا یہ رونا بے کار سمجھیں لیکن مستقبل کی فکر تو ضروری ہے اور مجھے اندیشہ یہ ہے کہ اس قدر زبردست دھکا لگنے کے بعد بھی اخباروں میں جو ضبط اور اعتدال اور ذمہ داری پیدا ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں دو تازہ مثالیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوں گی۔

پاکستان کے ایک اہم اور نیم سرکاری انگریزی اخبار میں حال ہی میں کسی شخص کا، جو خود کو پیر غازی سخی سید محمود شاہ کہتا ہے، ایک خط چھپا ہے جس کو ہندوستان کے بعض اخباروں نے نقل کیا ہے اور اس سے پاکستان کی مریضانہ ذہنیت پر استدلال کیا ہے۔ خط کا ترجمہ یہ ہے:-

"برادرانِ اسلام۔ السلام علیکم۔ مجھے سرحد کے ایک سو ستر آزاد قبیلوں نے اپنا نمائندہ بنا کر کراچی بھیجا ہے تاکہ میں اسلام کی بے لوث خدمت کروں۔ کشمیر اور حیدر آباد کے مسلمان بھائیو میرے پاس اس کام کے لئے بے شمار آدمی ہیں۔ اگر مجھے کافی سرمایہ مل جائے تو مجھے اُمید ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کشمیر وغیرہ میں ہندوستانی یونین کی قبر کھود ڈالوں گا اور اسلام اور پاکستان کا جھنڈا دہلی کے لال قلعہ کے میناروں پر بلند کر دکھاؤں گا۔"

میں نے اس خط کو پڑھا اور بحیثیت ایک مسلمان کے میرا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ عقل و ایمان کا دشمن جو خود کو دنیا کے سب سے زیادہ امن پسند اور صلح دوست مذہب کا پیرو سمجھتا ہے۔ اس ناپاک ارادے کو "اسلام کی بے لوث خدمت" قرار دیتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے زیادہ گلہ نہیں، کیونکہ وہ جاہل اور بے شعور ہے اور ناراضگی سے زیادہ رحم کا مستحق ہے، لیکن میں کیا کہوں اس موقر جریدے کے متعلق جو اس قسم کے نامعقول خط کو شائع کرنے سے نہیں ہچکچاتا؟ جس کو ایک ہمسایہ ملک کے متعلق اس قسم کے خیالات کی اشاعت پر شرم نہیں آتی؟ اگر کوئی معقول پسند شخص اس اخبار کا ایڈیٹر ہوتا تو خط کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا۔ یا اس کو شائع کرتا لیکن اس کے ساتھ ایک سخت نوٹ لکھتا اور اس قسم کے جذبات پر سختی کے ساتھ تنقید کرتا اور اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اسلام کی صحیح تعلیم کو، جو امن دوستی اور سلامتی کی تعلیم ہے، جو جارحانہ جنگ کو ملعون قرار دیتی ہے۔ جو احتسابِ نفس سکھاتی ہے۔ اپنی قوم کے سامنے پیش کرتا۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اس اخبار نے ایسا نہیں کیا اور نہ شاید اس کے خلاف کسی نے احتجاج کیا۔ بھلا اس راستے پر چل کر اعرابی کعبہ تک کیسے پہنچے گا؟

اب ایک نمونہ ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار کی ذہنیت کا دیکھ لیجئے۔ اس نے حال ہی میں حیدر آباد کے بارے میں ایک ایڈیٹوریل لکھا ہے۔ حیدر آباد میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے ہندوستان میں عموماً بہت ناراضگی اور تشویش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ پر بجا ہے۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ایسے موقع پر اکثر لوگ اپنی رائے کو بہت سختی اور تلخی سے ظاہر کیا کرتے ہیں اس سے یقیناً معاملے کو سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن بہر حال یہ اندازِ بیان سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی اخبار اپنے ایڈیٹوریل

کو ان الفاظ سے شروع کرے تو ایسے ذہنی مریض کا کیا علاج ممکن ہے

"پنڈت نہرو نے حیدر آباد کے بارے میں جو تقریر ملتان میں کی، اس کی گونج ہندوستان کے آسمان میں سنائی دے رہی ہے۔ لیکن ہم جس چیز کو سننا چاہتے ہیں وہ بندوقوں کی باڑھ، ہوائی جہازوں کا غل، فوجوں کی یورش، توپوں کی گرج اور مسلح دستوں کا شور ہے!"

یہ ہندوستان کے ایک اخبار کی پکار ہے! وہ ہندوستان جس کو گوتم بدھ پر ناز ہے، مہاویر پر ناز ہے۔ گرو نانک پر ناز ہے، مہاتما گاندھی پر ناز ہے وہ ہندوستان جس نے اہنسا کو اپنی تہذیب کی روح سمجھا ہے، وہ ہندوستان جس کے بہت سے باشندے گوشت نہیں کھاتے اور بعض ترکاریاں کھانے سے بھی پرہیز کرتے ہیں! اس ہندوستان کا ایک ایڈیٹر (اور وہ ایک فردِ واحد نہیں بلکہ ایک خاص طرزِ خیال کا نمائندہ [illegible]) ان مظاہر کے لئے بے قرار ہے جن کا [illegible] ابھی چھ سال تک اٹھا چکی ہے اور جس کی تلخی کام و دہن میں ابھی مدتوں تک باقی رہے گی۔ وہ جنگ کا خواہش[illegible] ہے، یہ جانتے ہوئے کہ آج کل کی جنگ محض کرائے کے سپاہیوں کی جنگ نہیں، بلکہ عام لوگوں کے لئے تباہی اور بربادی کی قیامت اور تہذیب اور شرافت کی قدروں کے لئے موت ہے۔ اس شخص کے لئے مہاتما گاندھی کی [illegible] بے معنی ہیں، اس نے یورپ کی [illegible] کچھ نہیں سیکھا، ہیروشیما سے کچھ نہیں [illegible] سوز فنا دل [illegible] کچھ نہیں سیکھا.......... اپنی حفاظت کرنے یا [illegible] کو رفع کرنے کے لئے، گفت و شنید اور [illegible] دوسرے تمام طریقوں کو آزمانے کے بعد بالکل ہی مجبور ہو کر، جنگ کرنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ خون کی پیاس یہ جنگلی درندوں کی طرح جنگ کا شوق (یا شاید ایسا کہنا جنگلی درندوں کے ساتھ بے انصافی ہو؟) کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا..........

میں دعوت دیتا ہوں دونوں ملکوں کے اربابِ فکر اور خداوندانِ سیاست کو کہ وہ ان تاریک قوتوں اور ناپاک تحریکوں کی طرف توجہ کریں اور ان کا انسداد کرنے کی کوشش کریں ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ وہ خود کو دفعتہً جنگ کی آگ میں گرفتار پائیں گے اور پھر ان کے کئے دھرے کچھ نہ ہو سکے گا........ اگر ہم شریفوں کی طرح دوستی اور میل جول اور تعاون کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ درندوں کی طرح ایک دوسرے پر دانت نہ نکالیں۔ بلکہ معمولی تمیز اور آدابِ محفل ہی برتنا سیکھ لیں؟ اگر سیکڑوں برس کی رفاقت تہذیب اور شرافت کی روایات اور رواداری ہمیں ٹھیک راستے پر نہیں چلا سکتیں ——— تو کیا محض دانش مندانہ خود غرضی کے تقاضے بھی بے کار ہو گئے ہیں؟

ہماری قومی کارکردگی

ابھی کچھ عرصہ ہوا مجھے ریل میں ایک لمبا سفر کرنا پڑا میرے پاس "درمیانے درجے" کا ٹکٹ تھا، اور جن کا ٹکٹ نہ تھا ان کے مسافروں کے ساتھ بے اطمینانی بلکہ

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۲ | ۸ ستمبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد عابد حسین

عمل کا ولولہ

جواہر لال نہرو

قید میں زمانے کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ حال کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ نہ کوئی حس باقی رہتی ہے نہ کوئی احساس جو اسے بے جان ماضی سے جدا کر سکے۔ یہاں تک کہ باہر کی چلتی پھرتی، مرتی جیتی دنیا کی چیزیں بھی خواب کی طرح بے حقیقت، ماضی کی طرح بے تغیر بے حرکت معلوم ہوتی ہیں۔ خارجی معروضی زمانہ غائب ہو جاتا ہے، داخلی موضوعی حس کچھ مدھم سی باقی رہ جاتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی تخیل اسے جھنجھوڑ کر حال کی نیند سے چونکاتا ہے اور ماضی یا مستقبل کو جیتی جاگتی حقیقت بنا کر دکھاتا ہے یوں بھی ہم بہ قول اوگسٹ کونت کے مردوں کی طرح ماضی کے کفن میں لپٹے رہتے ہیں۔ مگر قید خانے میں خاص طور پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے بھوکے پیاسے جذبات کو ماضی کی یاد یا مستقبل کے تصور سے تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماضی میں ایک عجیب سکون اور دوام پایا جاتا ہے۔ وہ تغیر سے بری ہے اور موقلم کی تصویر یا کلاسے اور مرمر کے مجسمے کی طرح ابدیت کی شان رکھتا ہے۔ حال کے طوفان و ہیجان سے اس کے وقار و تمکین میں خلل نہیں پڑتا اور وہ ہماری بے چین روح اور شوریدہ دماغ کو اپنے زمین دوز مقبرے میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں امن و امان کا دور دورہ ہے اور ایک خاص روحانی کیفیت محسوس ہوتی ہے مگر ماضی سرد اور بے جان ہے، جب تک ہم اس کا رشتہ موجودہ زندگی کی کشمکش سے اور اس کے پیچیدہ مسائل سے نہ جوڑیں یہ ایک طرح کا خالص آرٹ ہے۔ اس میں وہ احساس کی شدت اور عمل کا ولولہ جسے زندگی کا سرمایہ کہنا چاہئے مفقود ہے۔ احساس اور ولولے کے بغیر رفتہ رفتہ امید اور قوت کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ یہ زندگی کی سطح پست ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وجود عدم میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہم ماضی کے بندے ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس کا جمود ہم میں سرایت کر جاتا ہے۔ ذہنی موت کا یہ عمل قید خانے میں اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جہاں ہم جیل کی روزمرہ زندگی میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

پھر بھی ماضی ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کا دیا ہوا ہے۔ ہم خود اس کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ماضی کو نہ پہچانیں اور اس کی روح کو اپنے اندر محسوس نہ کریں تو حال کو نہیں پہچان سکتے۔ ماضی کو حال سے ربط دینا اور مستقبل سے ملانا، اس کے بے ربط اجزاء کو رد کر دینا اور اس ترکیب سے فکر و عمل کے لئے جاندار اور متحرک مواد حاصل کرنا اسی کا نام زندگی ہے……

ایک مدت سے عمل کا تقاضا میرے دل میں فکر سے جدا نہیں ہوتا بلکہ خود عمل فکر کے سلسلے کی ایک کڑی بن جاتا ہے۔ شاذ و نادر کوئی لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ان دونوں میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے فکر عمل میں آ کر تکمیل کو پہنچتی ہے اور عمل فکر کو حقیقت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ وجود کے اس لمحہ میں مجھے بھر پور زندگی کا، بصیرت اور قوت کا احساس ہوتا ہے مگر ایسے لمحے بہت کم میسر آتے ہیں۔ بہتیرے ہی کم زیادہ تر فکر کئے عمل سے یا عمل کئے فکر سے بڑھ جاتی ہے۔ اور ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش ناکام رہتی ہے۔ برسوں پہلے ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب مہینوں میرے دل میں جذبات کا دریا چڑھا رہتا تھا، اور میں عمل کی رو میں بہتا چلا جاتا تھا۔ جوانی کے وہ دن اب بہت دور نظر آتے ہیں، کچھ تو اس لئے کہ اتنے برس بیت گئے۔ مگر زیادہ تر اس وجہ سے کہ اُس زمانے اور اِس زمانے کے درمیان تجربے اور فکر کا دریائے شور حائل ہو گیا ہے۔ اب وہ اگلا سا ولولہ نہیں رہا۔ امنگوں کا بے پناہ جوش دھیما پڑ گیا اور احساسات اور جذبات ایک حد تک قابو میں آ گئے۔ فکر کا بوجھ اکثر رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اور اس دل میں جہاں یقین کا راج تھا شبہہ سر اٹھانے لگتا ہے شاید یہ عمر کا تقاضا ہے یا زمانے کی ہوا کا اثر ہے۔

تاہم اب بھی عمل کی دعوت میرے نفس کی گہرائیوں میں ایک ہیجان برپا کر دیتی ہے اور تھوڑی دیر فکر سے الجھنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں پھر وہی "جذبہ بے اختیار شوق" جاگ اٹھے جو خطروں سے کھیلتا ہے اور موت کا منہ چڑاتا ہے۔ مجھے موت کی تمنا تو نہیں، مگر اس سے ڈرتا بھی نہیں۔ میں زندگی کی نفی یا ترک کا قائل نہیں۔ مجھے زندگی سے محبت تھی اور اب تک ہے۔ میں اپنے رنگ میں اس سے لطف اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگرچہ اب میرے پیروں میں بہت سی غیر محسوس بیڑیاں پڑ گئی ہیں۔ اس محبت کی وجہ سے میں زندگی کا پرستار بن کر نہیں رہ گیا بلکہ اس سے کھیلتا ہوں اور اس کے کنارے کھڑا باہر جھانکتا رہتا ہوں۔ اسی لئے ہم دونوں ایک دوسرے کی اور زیادہ قدر کرتے ہیں۔ شائد مجھے ہوا باز ہونا چاہئے تھا کہ جب میرا جی زندگی کی سست روی اور بے کیفی سے اکتا جاتا تو میں بادلوں کی تند و پرشور فضا میں گھس جاتا اور اپنے دل میں کہتا:

"میں نے سب کچھ دل کی ترازو میں تول کر دیکھ لیا۔
گزرے ہوئے سال اکارت
اور آنے والے سال بے کار
ایک پلڑے میں یہ زندگی دوسرے میں یہ موت"

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
عمل کا ولولہ	جواہر لال	۱
ہم کیا کریں؟	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲
تیسری جنگ عظیم کا خطرہ (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		۴
ہندوستان ۴۔ پاکستان		۴، ۵
مشرقی دنیا		۶
غزل	معین احسن جذبی	۷
منزل	باقر مہدی	۷
غزل	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۸
دیہی اور گھریلو صنعتیں	پروفیسر محمد عاقل	۸
زبان غیر سے فریاد میری	عبدالحلیم ندوی	۹
ہندوستان کی تاریخ……	خواجہ احمد فاروقی	۱۰
گرہستن کے حقوق	سلطانہ آصف فیضی	۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے

ہم کیا کریں؟

ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک دوست لکھتے ہیں: "جب اوپر سے ایٹم بم پھٹ کر اور اندر سے باہمی نفرت کا جوالا مکھی بھڑک کر دنیا کو برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے آدمی کس اُمید پر تعمیری کام میں جان کھپائے؟ تھوڑے سے بھیروں کی تعمیری قوت کس طرح ان ہولناک تخریبی قوتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اس بنیادی سوال کا اطمینان بخش جواب مل جائے تو کچھ اور پوچھوں ورنہ بے کار قیل و قال میں اپنا اور آپ کا وقت کیوں ضائع کروں؟"

یہ سوال آج بے شمار نیک دل اور مخلص لوگوں کو ستا رہا ہے۔ یہ جس کیفیت کا ترجمان ہے وہ کبھی مایوس کرتی ہے اور قوت عمل کو شل کر دیتی ہے، کبھی شکستہ دلوں کو اپنی توانائی کا آخری شمہ تک اپنے ذمہ کے پورا کرنے میں لگا دینے پر اُبھارتی ہے؛ کبھی انسان کو اپنے ماحول، خود اپنی بہیمیت، خود اپنی حماقت کے سامنے بے بس بناتی ہے کبھی اسے اس کائنات میں ایک فعال قوت بنا کر ماحول کو بدلنے بہیمیت کو دبانے اور حماقت کی اصلاح کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ کبھی آدمی حالات کی تاریکی کو ایک دائمی رات سمجھنے لگتا ہے، کبھی یاد کرتا ہے کہ رات کے لئے میں نے ہی چراغ بنایا ہے تو ہر تاریکی میں روشنی پیدا کرنے، ہر شب کو سحر کرنے کا حوصلہ اس کے سینے میں جاگ اُٹھتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس سوال کا اُٹھنا ہی اس کے شرف انسانیت کی خبر دیتا ہے۔ مایوسی اور اُمید، خوف اور رجا کے بیچ سے ایمان کی ڈگر پر پڑ لینا انسانیت کی خصوصیت ہے ——— ایمان ان مطلق قدروں پر جن کی تصدیق اس کا ضمیر کرتا ہے یہی ان سب قدروں کو توڑتا بھی ہے لیکن کبھی ان سے پوری طرح دامن چھڑا بھی نہیں سکتا۔ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ مگر سچ کو افضل مانے بغیر بھی چارہ نہیں؛ یہ سخت سے سخت ظلم بھی کرتا ہے مگر عدل کی لگن سے بھی اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا! یہ ہزار بد نمائیوں کا ذمہ دار بھی ہے۔ مگر حسن کی پذیرائی کے لئے بھی دل کا ایک گوشہ محفوظ رکھتا ہے جس طرح یہ کیفیت ہر فرد پر کم و بیش گذرتی ہے اسی طرح جماعتوں پر بھی صادق آتی ہے۔ انسانی سماج میں بسا اوقات بڑا حصہ اچھائیوں کی جگہ برائیوں کا گرویدہ ہو جاتا ہے، عقل کی جگہ بے عقلی کا ساتھ دینے لگتا ہے، عدل کی جگہ ظلم پر اُتر آتا ہے، سچ کو چھوڑ کر جھوٹ میں اپنا بھلا دیکھنے لگتا ہے! زیبائی کی جگہ بد نمائی پر آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ لیکن کوئی سماج جو انسانیت کے مرتبے سے ہمیشہ کے لئے بہیمیت کے پاتال میں نہ گرنے لگی ہو کبھی بھی ایسے افراد سے خالی نہیں ہوتی جو بدی کی اس آندھی میں بھی نیکی کے چراغ کو اپنے دامن کی پناہ میں روغن رکھتے ہیں۔ جو ان قدروں پر جمتے ہیں جن کو زندگی میں پورا کرنا اور رچانا انسانیت کا امتیازی وصف ہے۔ یہ لوگ تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ مگر جیسے روٹی میں نمک۔ ان کے بغیر ساری انسانی تاریخ ایک بے کیف داستان ہو جائے۔ ان کی کامیابی محدود ہوتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا کاروبار چل ہی اس لئے رہا ہے کہ ابھی ان کا کام نا مکمل ہے۔ یہی لوگ اور انھیں کی کوشش زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے۔ مایوسیوں میں، ابتلاؤں میں، حوادث کی آندھیوں میں یہی لوگ زندگی کا دیا ہوتے ہیں۔ اس دیے کی لو کبھی اونچی ہو جاتی ہے، کبھی نیچی، مگر بجھتی کبھی نہیں۔ یہ بجھ جائے تو انسانیت بہ حیثیت انسانیت ختم ہو جائے۔

آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو یہی اندیشہ ہے کہ انسانیت ختم ہوا چاہتی ہے۔ اخلاقی چراغ کے گل ہونے سے نہیں بلکہ ایٹم بم کے حادثے سے یا جنگ و جدال کی آگ میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ لوگوں نے بارہا پہلے بھی سمجھا ہے کہ انسانیت اب ختم ہوئی۔ مگر اپنی اچھائیوں اور اپنی برائیوں کے ساتھ یہ چل رہی ہے۔ نفرت کے طوفان پہلے بھی بہت آئے ہیں۔ تباہیاں اور بربادیاں بھی بہت ہوئی ہیں۔ مگر انسانوں نے ہی اپنی نفرت کی آگ بجھائی ہے اور جانور بنتے ہوئے ساتھیوں کو پھر سے آدمی بنایا ہے بدی کی جگہ نیکی کے ظہور کا موقع ہوا ہے۔ نفرت کی آگ میں سے محبت کے پھول بھی کھلتے دیکھے گئے ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ نفرت کی یہ آگ جو ہمارے ملک میں لگی ہوئی ہے اور ہمارے ملک ہی میں کیا ساری دنیا میں اس کے شعلے بھڑک رہے ہیں ایسی ہی آگ ثابت ہو گی اور انسانیت اس میں سے بھی کچھ جھلسی ہوئی مگر پھر بھی ایک صالح اور عدل والی سماج میں سرگرم باہر نکلے گی۔ رہا ایٹم بم کا خطرہ، تو یہ سچ ہے کہ آدمی کی صنعتی اور علمی ترقی کا ساتھ اس کی اخلاقی اور تنظیمی ترقی نے نہیں دیا ہے۔ اخلاق پیچھے رہ گیا ہے، علم اشیا آگے بڑھ گیا ہے۔ اس علم کے ساتھ سماجی زندگی کا جو نقشہ چاہیے وہ ابھی نہیں جم سکا ہے، اور اس عدم مطابقت نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی ہے لیکن دیکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ ذہن انسانی اور اس سے زیادہ قلب انسانی اس صورت حال پر بے چین ہے۔ ایٹم بم کو ممکن بنانے والے حکیموں کے سینے میں ضمیر کا کانٹا کھٹکنے لگا ہے۔ یہ دراصل ساری انسانیت کے ضمیر کی آواز ہے۔ یہ عدم مطابقت ضرور دور ہو کر رہے گی اور بہتر اخلاق کا انسان اپنے وسیع علم سے تخریب کی جگہ تعمیر کے ایسے کرشمے دکھا سکے گا کہ پچھلی انسانی تاریخ ماند پڑ جائے گی۔ آدمی کی نظر سے کوئی چیز بہت قریب ہو تو صاف نہیں دکھائی دیتی۔ یہی حال ہمارا ان ذہنی تغیرات کے متعلق ہے جو آج رونما ہو رہے ہیں۔ زندگی کا ایک نیا ڈھنگ ڈالنے اور فرد اور جماعت کے تعلقات کو ہم آہنگ بنانے کی ایک نئی کوشش اس وقت دنیا میں شروع ہو چکی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ عرصہ نہ گذرے گا کہ یہ کرۂ ارض کی ساری زندگی کو یکسر بدل دے گی اور بہتر بنا سکے گی۔

لیکن یہ سب کچھ تب ہی ہو گا کہ انسان، آپ اور میں اس کے لئے اپنی جان کھپائیں۔ انسانی معاملات میں موثر قوت خود انسان ہے کا خیال اور انسان ہی کا عمل ہے۔ الٰہی ارادے تک انسانی زندگی میں انسان ہی کی معرفت کار فرما ہوتے ہیں۔ تاریخ اسی کے عمل کی داستان ہے معیشت اسی کی کاوش کی کہانی۔ اس کے ارادے ہی اس کی زندگی میں تغیرات کا سرچشمہ ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ہمارے، آپ کے اور میرے ارادوں کا کچھ نہ کچھ پرتو ہے، جو کچھ ہو گا اس میں بھی اس کا اثر ہو گا۔ اس لئے اپنی ذمے داری کو محسوس کرنا چاہیے۔ نامساعد حالات کا بہانہ لے کر کام سے بچنا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا خود اپنے ساتھ ناانصافی ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی۔ یہ انسانیت ختم نہیں ہو رہی ہے، کہ

آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اور اگر بالفرض ختم ہونے والی ہی ہے تو بھی خاتمہ تک جو تھوڑی سی مہلت ہے اسے صرف کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہے؟ ناک کی ڈیک پر ترکی جا کر بیٹھ رہنا؛ کسی خانقاہ میں گوشہ نشیں ہو کر ختم ہونے والے انسان کا ایک کامل نمونہ بنانا؛ خاتمہ کے غم کو عرق میں ناب کرنا؛ یا نفرت کو محبت میں، انتشار کو نظم میں۔ بدی کو نیکی میں بدلنے کی مردانہ وار کوشش کرتے ہوئے جان دینا:

آخر کار ہمیں است کہ در تن فرد
کف خیزے کہ یاراں رونق دارے نہ دہی

نہیں ایٹم بم اور جنگ و جدل کے خطروں سے اس درجہ مایوس نہ ہو جیے۔ یہ انسانیت ابھی چلے گی اور اس کو اچھا بنانے کے لئے اچھوں کی کوشش پہلے سے زیادہ درکار ہو گی۔ ان اچھوں میں شریک ہو جیے۔ ان کی کامیابی ان کی تعداد پر کبھی منحصر نہ تھی، ان کے خلوص، ان کی اپنے کام سے شیفتگی، ان کے یقین، ان کے صبر، ان کی سعی سے اس کی پیمائش ہوتی ہے۔ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی، ان کا وزن دیکھا جاتا ہے اور اگر میرا یہ یقین کہ انسانیت ختم نہیں ہو رہی ہے غلط ہو اور آپ کا گمان کہ خاتمہ آن پہنچا۔ خدانخواستہ درست ہو تب تو اور بھی اس مہلت کو جو ہے صحیح طور پر صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ سا نیکوں نے اپنے کام کے لئے نتیجے کی شرط کبھی نہیں لگائی۔ انسان کا کام کوشش ہے۔ نتیجہ نہ کبھی اس کے ہاتھ میں تھا نہ اب ہے۔ ہمت، محنت، محبت سے کام لیجئے اور نتیجوں کی طرف سے نظر ہٹا لیجئے۔ پہلے بھی اس طرح بگڑے کام بنے ہیں، اب بھی اس طرح بن سکتے ہیں۔

خدا حافظ۔

کاٹتے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو صدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی سے اکتاتے اور محنت سے کتراتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا سکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح
اُس کھیتی کے پنپنے کی اُمیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے اُن کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں تبسّم داتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

تیسری جنگ عظیم کا خطرہ

آج کل دنیا میں جہاں دیکھئے
حالت اک اضطراب کی سی ہے

دوسری جنگ عظیم سے جو دھچکا لگا تھا اس کا اثر دور نہیں ہونے پایا تھا کہ تیسری جنگ کا ہول دل میں سما گیا۔ آخر انسان ہی ہیں۔ اُن کے اعصاب لوہے کے تو بنے نہیں ہیں اگر ان پر پریشانی اور بدحواسی طاری ہو تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پریشانی اور بدحواسی کی وجہ سے وہ سیاسی اور معاشی گتھیاں جو لڑائی کی جڑ ہیں سلجھنے نہیں پاتیں بلکہ اور نئی گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ جنگ کے خطرے سے گھبرا کر دنیا کی بڑی طاقتیں ایسی حرکتیں کر رہی ہیں جن سے بظاہر جنگ کا خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ جہاں کہیں دو فریقوں میں نزاع ہو مثلاً چین، انڈونیشیا، فلسطین، کشمیر وہاں بڑی طاقتیں مل کر جھگڑے کو حق و انصاف کی رو سے چکانے کی کوشش نہیں کرتیں، بلکہ اپنے اپنے مفاد کے مطابق طے کرنا چاہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی طرح طے نہیں ہوتا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ بڑی طاقتوں خصوصاً روس اور امریکا کا ایک دوسرے پر جارحانہ حملے کا ارادہ رکھنے کا گمان محض بے بنیاد ہے یا اس کی کچھ اصلیت بھی ہے؟ جہاں تک روس کا تعلق ہے یہ بات کسی طرح عقل میں نہیں آتی کہ وہ پچھلی جنگ میں اتنی تباہی اٹھانے کے بعد اتنی جلدی ایک اور خوفناک بلکہ مہلک لڑائی چھیڑنے کو تیار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روس کے پھیلنے اور دنیا پر چھا جانے کے حوصلے اب بھی موجود ہیں، بلکہ ایک نئے مذہب کے تبلیغی جوش کے ساتھ مل کر پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ لیکن اس کے موجودہ قائد خصوصاً مارشل اسٹالین حقیقت بینی اور مصلحت اندیشی میں دوسرے ملکوں کے مدبروں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اور ان سے یہ بدگمانی بے جا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے ہلاکت کے گڑھے میں کود پڑیں گے۔ پچھلے تین سال سے روس کا جو رویہ رہا ہے اس پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ روس تو یورپی ملکوں کی اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر برابر آگے قدم بڑھاتا جاتا ہے، اور مغربی جمہوریتوں کی خالی خولی دھمکیوں سے نہیں دبتا لیکن جیسے ہی یہ دیکھتا ہے کہ اب واقعی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ ہے فوراً رک جاتا ہے۔ اگر اس میں امریکی جتھے کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرنے کا دم ہوتا تو سارے یورپ پر قبضہ کرنے کے لئے موجودہ زمانے سے بہتر کوئی زمانہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اسے اپنی طاقت کا صحیح اندازہ ہے اور اس سے اتنا ہی کام لیتا ہے جتنا لے سکتا ہے۔

اب رہے برعظیم یورپ کے دوسرے ملک سو وہ اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ان کی ساری توجہ خود اپنی سیاسی اور معاشی ابتری کو دور کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ جنگ کا ارادہ تو درکنار وہ اس کے نام سے ڈرتے ہیں ان کی دلی آرزو یہ ہے کہ انھیں امن کے دس بیس سال مل جائیں تاکہ روس کی یا امریکا اور انگلستان کی مدد سے اپنی حالت کو درست کرلیں۔ خود انگلستان کی حالت ان ملکوں سے کچھ ہی بہتر ہے۔ وہ انتہائی صبر و استقلال، جفاکشی اور محنت سے کام لے کر یہ کوشش کر رہا ہے کہ دیوالیہ ہونے سے بچ جائے اس میں کامیابی کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن جلدی نہیں بلکہ ایک مدت کے بعد۔ اس کے لئے آئندہ چند سال کے عرصے میں کسی بڑی لڑائی میں شریک ہونے کے معنی ہیں یقینی دیوالہ۔

صرف امریکا (یو، ایس، اے) ایک ایسا ملک ہے جو لڑائی کے لئے کسی حد تک تیار ہے اور جس کا شاید اس وقت لڑنے میں فائدہ بھی ہو۔ چنانچہ وہی اس وقت سب سے زیادہ جنگ کے خطرے کا ڈھول پیٹ رہا ہے۔ اور جنگ کی دھمکیاں دینے میں بھی سب سے آگے رہتا ہے۔ لیکن ابھی تک نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگی نعرے محض الیکشن جیتنے کے منتر ہیں یا اس سے کچھ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں امریکا میں ریپبلکن پارٹی بڑے زمینداروں اور کارخانہ داروں کی قدامت پسند پارٹی ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی اس کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند ہے۔ اور روزویلٹ کے زمانے سے اس میں کچھ خفیف سا رنگ اشتراکیت کا آگیا ہے۔ اس کی طرف سے صدارت کے امیدوار ٹرومین ہیں جو روزویلٹ کی پالیسی کے مطابق ملک کے معاشی نظام پر ایک حد تک حکومت کا کنٹرول رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا پروگرام موجودہ زمانے میں خاصی مقبولیت حاصل کر سکتا تھا۔ اس کو روکنے کے لئے ریپبلکن پارٹی نے ضروری سمجھا کہ جمہور کی توجہ روس کی جانب پھیر دی جائے۔ اور اس کی طرف سے جارحانہ حملے کے خطرے کا اتنا شور مچایا کہ وہ لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا اب ڈیموکریٹک پارٹی کے اُمیدوار ٹرومین صاحب کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اور بھی بلند آواز سے جنگ کے خطرے کا بگل بجائیں، اور لوگوں کو تیار رہنے کا حکم دیں۔ امریکا کا صدارت کا الیکشن ۲ر نومبر کو ہوجائے گا اور اس کے بعد امریکی سیاست دانوں کا مزاج تو اعتدال پر آجائے گا۔ ہمیں اُمید کرنی چاہئے کہ اس کے بعد انھیں جنگ کا خطرہ کچھ کم نظر آنے لگے گا اور ان کا جوش نبرد کچھ دھیما پڑ جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو فضائے عالم میں ایک خوشگوار سکون پیدا ہو جائے گا۔ اور دنیا کو کم سے کم چند سال تک امن اور چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا۔

بزم بے تکلّف

"ارے بھئی! یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آپ بیاہ رچا رہے ہیں۔"

"جی، میں کس قابل ہوں۔ محض دوستوں کا ——"

"مذاق ہے۔ لاحول ولا قوۃ، ایسا مذاق کس کام کا۔ ہم تو میں کہتا تھا کہ یہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونا کیا معنی؟!"

"آپ تو بات کاٹ دیتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ محض دوستوں کا اصرار تھا، جس نے مجبور کر دیا۔"

"تو سچ ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون بھلے آدمی یہ عمر شادی کرنے کی ہے؟"

"تو اور کون سی عمر ہوگی؟ پچاس کے پیٹے میں تو آ چکا ہوں۔"

"کیا خوب سمجھے۔ ارے عقل مند میرا مطلب یہ ہے شادی کا سن رفت گیا اور بود تھا۔ آپ اب پچاس کے پیٹے میں نہیں۔ ساٹھ کے منہ میں ہیں؛ اور اس بدنصیب کی کیا عمر ہے؟"

"کس بدنصیب کی؟ یہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں!!"

"اس بدنصیب دلہن کی ع
جس کی قسمت میں تھا بوڑھے کی لگائی ہونا۔"

"دیکھئے گالیاں نہ دیجئے مجھے غصہ آنے ہی والا ہے۔"

"غیر، ابھی بہت دور ہے، آپ دلہن کی عمر تو بتلائیے۔"

"کیسے بتا دوں، مجھے تو شرم آتی ہے۔"

"شرم سے پوچھئے، اس وقت کیوں نہ آئی۔ جب آپ نے اس پوپلے منہ سے شادی کا پیام دیا تھا۔"

"اس میں شرم کی کون سی بات ہے؟"

"بالکل نہیں، بلکہ سخت بے شرمی کی بات ہے۔"

"بس رہنے دیجئے۔ آپ کا کیا مطلب آپ کوئی قاضی ہیں"

"میں قاضی ہوتا تو آپ کی قضا ہی آجاتی۔ اچھا اب ذرا شرما کر دلہن کی عمر تو بتا دیجئے۔"

"کوئی پندرہ ——"

"یا کہ سولہ کا سن۔ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ جب وہ پندرہ دونی تیس برس کی ہوگی تو آپ کا سن شریف کیا ہوگا۔ ساٹھ دونی؟"

"ایک سو بیس، مگر ٹھہرئیے تو یہ کون سا حساب ہے۔ ساٹھ اور پندرہ پچھتر ہی تو ہوئے۔"

"خیر پچھتر ہی سہی، فرض کیجئے پچھتر برس کی عمر میں آپ بن کھلے غنچے کی طرح مرجھا جائیں تو اس بچاری کو کس پر چھوڑ جائیے گا۔"

"جی وہ عقد ثانی کر لیں گی۔ شرع میں اجازت ہے۔"

"شرع میں تو سب کچھ ہے مگر تیس برس کی غریب بیوہ سے شادی کرے گا کون۔ آپ جیسے شیخ فانی بھی تو پندرہ برس کی ڈھونڈھتے ہیں۔"

"خیر اللہ مالک ہے! اسی کے سپرد کر جاؤں گا۔"

"اس کا اللہ مالک، اور آپ کا وہ فرشتہ جسے مالک کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو دوسرے مالک کے سپرد کر دیجئے گا۔ چلئے قصہ ختم ہوا۔"

پچھلا ہفتہ : ۱۔ ہندوستان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ

ہندوستان کی پارلیمنٹ کے لئے آزادی کا پہلا سال بڑا کٹھن تھا۔ ایک طرف اُسے آئین ساز مجلس کی حیثیت سے آزاد ہندوستان کا آئین بنانا تھا۔ دوسری طرف اس بدامنی اور شورش کو جو ملک کی تقسیم کے بعد پھیل گئی تھی قابو میں لانے کے لئے تھوڑی مدت کے خاص حفاظتی قانون پاس کرنے تھے، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ تعمیری اور اصلاحی کاموں کی قانونی داغ بیل ڈالنی تھی۔ اس نے یہ تینوں کام بڑی سرگرمی سے انجام دیئے اور اس کی سال بھر کی کارگزاری اتنی ہے جس پر دنیا کی ہر پارلیمنٹ فخر کر سکتی ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ انقلاب حکومت کے بعد متعدد وجوہ سے ملک کی انتظامی اور معاشی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے لیکن اپنے آئین سازوں کی چوکسی اور مستعدی کو دیکھ کر یہ امید ہوتی ہے کہ بہت جلد حالت سنبھل جائے گی۔

دوسرے سال کے شروع میں ہماری پارلیمنٹ کے کام کی رفتار سست نہیں ہوئی، بلکہ پہلے سے تیز رہی۔ متعدد چھوٹے چھوٹے قوانین کے علاوہ اس نے آخری ہفتے میں دو بڑے اہم مسودوں کو قانون کی شکل دی۔ ان میں سے ایک لیبر ممبر کا کارخانوں کا بل تھا، اور دوسرا فنانس ممبر کا۔ ریزرو بینک کو سرکاری ادارہ بنانے کا بل۔

پہلے بل میں ہندوستان کے ۲۵ لاکھ صنعتی مزدوروں کے کام کی شرائط، اوقات رہنے سہنے کے انتظام اور حفظان صحت کے متعلق ایسے ضابطے تجویز کئے گئے ہیں کہ اگر ان پر پوری طرح عمل ہو تو وہ کسی حد تک انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے۔ عام طور پر پارلیمنٹ کے ممبروں نے بل کو بہت پسند کیا۔ اس کی تعریف میں کم سے کم یہ کہا گیا کہ کارخانوں کے متعلق جتنے قانون اب تک پاس ہوئے تھے ان سب کو اس میں یکجا کر دیا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ مزدوروں کے حقوق کا چارٹر ہے۔ شری شبن لال سکسینہ تک نے جو مذمت کرنے میں بہت کم اور تعریف کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ [illegible]

اعتراض بھی بہت سے ہوئے۔ مگر وہ کچھ ایسے زیادہ وزنی نہ تھے، نذیر الدین احمد صاحب نے حسب معمول صرف و نحو، املا اور انشا کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ قانون میں ایک سرے کمی جس کا بابو رام نرائن سنگھ نے ذکر کیا یہ ہے کہ کروڑوں زرعی مزدوروں کو جن کی حالت عموماً صنعتی مزدوروں سے بھی ابتر ہے اس کے دائرے میں شامل نہیں کیا گیا۔

دوسرے بل کی رو سے ریزرو بینک کا سارا انتظام حکومت کے سپرد کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اب تک اس کے چلانے میں حصہ داروں کے نمائندے جو عموماً بڑے سرمایہ دار ہوتے تھے حکومت کے نامزد کئے ہوئے ڈائرکٹروں کے ساتھ شریک تھے۔ اب سب ڈائرکٹر کو حکومت نامزد کرے گی۔ حصہ داروں کو صرف ان کے لگائے ہوئے سرمائے کا منافع ملے گا، اور کوئی حقوق و اختیارات نہیں ہوں گے۔ یہ تبدیلی بجائے خود کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن جب حکومت اپنی سکے کی پالیسی کو اور بیرونی مبادلے کی پالیسی کو، افراط زر گرانی اور نفع خوری کے انسداد کے خیال سے بدلنا چاہے گی۔ اس وقت اس کی اہمیت پوری طرح ظاہر ہوگی۔ ریزرو بینک پر سرمایہ داروں کا اثر نہ رہا تو ان کے ہاتھ سے حکومت کی راہ میں روڑے اٹکانے کا ایک بڑا ذریعہ نکل جائے گا۔

افسوس ہے کہ افراط زر کے روکنے کے بارے میں حکومت جو اعلان کرنے والی تھی وہ اب تک نہیں ہوا۔ صنعت کے ناخدا، معاشیات کے ماہر اور دوسرے لوگ اپنی اپنی تجویزیں حکومت کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور وہ ان پر غور کر رہی ہے۔ لیکن اب زیادہ سوچنے کا وقت نہیں۔ دیر کرنے میں بڑے مہلک خطرے ہیں۔

آخر ہمارا بھی کچھ فرض ہے

محکمہ بحالی کے اندازے کے مطابق پاکستان سے آئے ہوئے ۵۰ لاکھ پناہ گزینوں میں سے تقریباً آدھے مستقل طور پر دوبارہ بسائے جا چکے ہیں، جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس نے توجہ، محنت اور خرچ میں کوئی کمی نہیں کی، اور اس کی سال بھر کی کوششوں کا نتیجہ بھی بُرا نہیں رہا۔ انفرادی طور پر بہت سے سماج سیوک بھی پناہ گزینوں کی خدمت کا کام دل اور جان سے کر رہے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہمارے ملک کے لوگوں نے ان بدنصیب بھائیوں کی مدد کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے۔ یہی وجہ ہے کہ مادر ہند کے ۲۷ لاکھ بیٹے اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں سے اکھڑنے کے بعد ابھی تک کہیں جمنے نہیں پائے ہیں اگر ۳۴ کروڑ ہندوستانی ان دردرسیدوں کے درد کو دل سے محسوس کریں اور یہ سمجھیں کہ ان کی بحالی کا کام بھی جنگ آزادی کی طرح ایک قومی اور ملکی فرض ہے تو سوا سو آدمیوں میں ایک آدمی کا کھپا دینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں یہ سچ ہے کہ پناہ گزینوں میں سے کچھ لوگ ارباب غرض کے بھڑکانے سے فرقہ وارانہ فساد، اور دوسری قابل اعتراض حرکتیں کرتے رہتے ہیں جس کا لازمی ردعمل یہ ہے کہ لوگوں کو ان سے ہمدردی کی جگہ وحشت ہو۔ لیکن اگر ہم میں سچی برادرانہ محبت کا جذبہ ہو تو ہم اس وحشت پر غالب آ کر برابر ان کی دلجوئی اور دستگیری کی کوشش کرتے رہیں۔ یوں تو ہم بہت کہتے رہتے ہیں کہ یورپ کے لوگ خشک اور بے مروت ہوتے ہیں اور ایشیائیوں خصوصاً ہندوستانیوں میں مروت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن آج جب ایک بڑے امتحان کا وقت آیا ہے ہم ابھی تک اپنے دعوے کا ثبوت پیش نہیں کر سکے۔

راہ پر آ ہی گئے

مہاراجہ بڑودہ نے یورپ سے واپس آنے کے بعد ریاست کی بگڑی ہوئی حالت اور اپنی بگڑی کو سنبھال لیا۔ رعایا کو ان سے دو شکایتیں تھیں، ایک یہ کہ انھوں نے ریاست کے خزانے سے کروڑوں روپیہ نکال لیا اور دوسری یہ کہ وہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے سے بچنا چاہتے ہیں۔ اب دونوں شکایتیں رفع ہو گئی ہیں۔ مہاراجہ نے ایک بڑی رقم ریاست کے خزانے کو واپس کرنے کا وعدہ کر لیا، اور ۵ ستمبر کو اپنے ہاں نئی اصلاحات نافذ کر کے عارضی ذمہ دار حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد حیدرآباد کے سوا سارے ہندوستان میں کوئی چھوٹی بڑی ریاست باقی نہیں رہی جہاں ذمہ دار حکومت نہ ہو۔ والیان ریاست کے امتحان کا زمانہ ایک لحاظ سے ختم ہو گیا۔ اب ریاست کے عوام کی آزمائش ہے کہ وہ اپنے اوپر آپ حکومت کر سکتے ہیں یا نہیں، امتحان سخت ہے اور تیاری بھی نہیں، دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

صلح سے یا جنگ سے

حیدرآباد اور کشمیر کی حالت میں اس ہفتے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم لیئق علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر یو، این، او نے حیدرآباد کی درخواست پر غور نہ کیا تب بھی وہ اپنی آزادی کو قائم رکھے گا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یو، این، او میں کچھ دال گلتی نظر نہیں آتی۔ آثار یہ ہیں کہ اب حکومت ہند بہت جلد حیدرآباد کے معاملے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے والی ہے۔ حیدرآباد میں جو لوگ معاملے کو صلح سے طے کرنے کے حق میں ہیں ان کے لئے یہ آخری موقع ہے۔ کشمیر میں جنگ کی حالت میں مجموعی طور پر وہ سکون نظر آ رہا ہے۔ جو سمندر میں طوفان سے پہلے ہوتا ہے۔ دونوں طرف فوجیں کھڑی ہیں اور اشارے کی منتظر ہیں۔ صلح کے حامیوں کی نظریں کشمیر کمیشن کی طرف لگی ہیں کہ شاید کوئی ایسا حل نکال سکے جس کو دونوں فریق قابل قبول سمجھیں، جو شرطیں کمیشن نے پیش کی تھیں ان کا جواب ہندوستان کی طرف سے مدت ہوئی دیا جا چکا ہے۔ دیر پاکستان سے جواب ملنے میں ہو رہی ہے۔

دو تین روز ہوئے کمیشن کے ممبر "آزاد کشمیر حکومت" کے صدر سردار محمد ابراہیم اور صدر اعلیٰ چودھری غلام عباس سے ملے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں یا تو حضرت ناصح کے سمجھانے کا حکومت پاکستان پر کچھ اثر ہوا ہے، اور ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں اب "آزاد کشمیر" کی حکومت کو سمجھانے کی باری ہے یا پھر حکومت پاکستان کمیشن کی پیش کی ہوئی شرطوں کو نامنظور کرنے کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتی، اور اس نے کمیشن کو ان دونوں صدروں سے بھڑا دیا ہے۔ بہرحال اتنے دنوں کی خاموشی اور پردہ داری کے بعد اب کمیشن کو کچھ نہ کچھ بتانا ہے کہ اس نے اب تک کیا کیا، اور اس کا کیا نتیجہ نکلا۔

(ع، ح)

مشرقی دنیا

کہیں برما چین نہ بن جائے

برما میں بظاہر کمیونسٹوں کو دبانے میں حکومت کامیاب ہو رہی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے۔ تو حالات اب بھی اطمینان بخش نہیں ہیں، اور اندر عام بے چینی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

اگرچہ بظاہر برما اب بالکل آزاد ہے اور اس کا برطانوی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب سیاسی تعلق باقی نہیں ہے، مگر انگریزوں کا وہاں کروڑوں اربوں کا کاروبار ہے۔ جائنٹ برٹش مناپلیز اراوڈی فلوٹیلا کمپنی اور برما آئل کمپنی میں انگریزوں کا کوئی دس کروڑ پونڈ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ برما سے برطانیہ کا فوجی اتحاد ہے۔ اس کی رو سے بری فوج کی تربیت کرنے کے جملہ حقوق برطانیہ کو حاصل ہیں اور جنگ کے زمانے میں وہاں اُسے اپنی فوج اُتارنے کا بھی حق ہے۔ اسی معاہدے کی برکت ہے کہ برما اسٹرلنگ بلاک میں شامل ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر کسی برطانوی صنعت کو قومی ملکیت قرار دیا جائے گا، تو اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ موجودہ بے چینی اور کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے سے برطانیہ کے یہ تمام مفاد خطرے میں ہیں اس لئے باوجود اس کے کہ برما آزاد ہے اور وہ ہندوستان اور پاکستان کی طرح برطانوی کامن ویلتھ میں بھی شامل نہیں، مگر برطانیہ اس سے بے تعلق بھی نہیں رہ سکتا اور اگر ضرورت ہوئی تو فوجی مداخلت کرے گا۔ کمیونسٹوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی انتہاپسندی کی وجہ سے دوسری پارٹیوں سے مل کر کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تھاکن نو نے کمیونسٹوں سے سمجھوتہ کرنے اور ان کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اسٹالن کا یہ فقرہ بھی دلیل کے طور پر پیش کیا کہ "روس اور مغرب میں نظریوں کے اختلاف کے باوجود، عملاً اتحاد ممکن ہے" انھوں نے کہا کہ ہم مغرب اور مشرق دونوں سے تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر کمیونسٹ شورش بند کردیں تو ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی جائے گی اور انھیں جمہوری طریقے پر اپنے خیالات کی اشاعت کی پوری آزادی ہوگی۔ اور یہ بھی یقین دلایا کہ ستمبر میں زمینداری ختم کرنے کا بل نافذ کر دیا جائے گا، لیکن کمیونسٹ سمجھوتے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو یقین نہیں تھا کہ تھاکن نو اپنی حکومت سے اپنے وعدوں کی پابندی کرا سکیں گے۔

اگرچہ کمیونسٹ فوجوں کے دبانے میں تھاکن نو کو بظاہر کامیابی ہو رہی ہے، مگر ان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ خود ان کے حامیوں میں اس بارے میں شدید اختلاف ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کمیونسٹوں کے خلاف سخت سے سخت اقدام کرنے پر اصرار کر رہی ہے اور پیپلز والنٹیر آرگنائزیشن جس میں انتہاپسند نوجوان شامل ہیں کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتے ہیں تھاکن نو نے اگر تدبیر اور حکمت عملی سے کام نہ لیا، تو ڈر ہے کہ برما بھی چین کی طرح خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔

۳۱ اگست کو برمی پارلیمنٹ کا چھٹا اجلاس شروع ہوا۔ اونگ سان اور ان کی کابینہ کے کچھ ممبروں کے قتل کے بعد یہ پہلا اجلاس ہے۔ یہ اجلاس خاردار تاروں کے درمیان اور مسلح دستوں کی حفاظت میں منعقد ہوا ہے۔ کمیونسٹوں نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کیا ہے۔ اس لئے ۲۲۵ ممبروں میں سے صرف ۱۴۵ ممبروں نے شرکت کی۔ یہ اجلاس کئی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے اور جنوب مشرق ایشیا کی آنکھیں اس کے فیصلوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

چین بھی بٹ ہی گیا

چین کی خانہ جنگی ایک طویل مدت سے جاری ہے۔ کسی طرح ختم ہونے کو ہی نہیں آتی۔ کچھ آنکھ مچولی کی سی کیفیت ہے کبھی نیشنل حکومت آگے بڑھتی ہے کبھی کمیونسٹ۔ اگرچہ کمیونسٹ عرصے سے ملک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہیں مگر اب تک ان کی سیاسی حیثیت معین نہ تھی اب تازہ اطلاعوں سے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے شمال میں ایک باقاعدہ حکومت کا اعلان کر دیا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے کمیونسٹوں کی کامیابی کی برابر خبریں آ رہی ہیں، اور ابھی حال میں جنرل ہوانگ چن نے جو نانکنگ کی حکومت کے وزیر دفاع ہیں، اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے قومی فوج کی کمزوریوں کو تسلیم کر کے ان خبروں کی تصدیق کر دی ہے انھوں نے فرمایا ہے کہ اگرچہ قومی فوج کی تعداد اب بھی بہت زیادہ ہے مگر ان کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ انھوں نے ہوائی فوج کے متعلق کچھ نہیں فرمایا کہ اس کی کیا حالت ہے۔ نیشنل حکومت کے پاس ہوائی طاقت بھی اچھی خاصی ہے جس کے مقابلے میں کمیونسٹوں کے پاس ایک ہوائی جہاز بھی نہیں۔ مگر شروع ہی سے اسے اس طرح بے محل استعمال کیا گیا کہ اس سے زمینی فوج کو بہت کم مدد مل سکی۔

کمیونسٹوں نے شمالی چین میں اپنی حکومت قائم کی ہے۔ چین میں شمال اور جنوب کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن پچھلے چند مہینوں سے شمالی فوج میں تفریقی رجحانات اس قدر نمایاں ہو گئے تھے کہ دوربین نگاہوں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا کہ اس علاقے کا نانکنگ حکومت کے قبضے میں رہنا ممکن نہیں۔

دوسری جنگ عظیم نے پوری دنیا کو تہ و بالا کر دیا اور کوئی ملک نہیں بچا جس کی معاشی زندگی کا شیرازہ نہ بکھرا ہو۔ چین میں تو دو سال پہلے ۱۹۳۷ء سے لڑائی ہو رہی تھی، اس لئے وہ تمام ملکوں سے زیادہ متاثر ہوا، مگر اس طویل خانہ جنگی اور نیشنل حکومت کی نااہلی اور بدانتظامی نے اس کو موت کے منہ میں دے دیا ہے۔ اب کمیونسٹ اگر پورے چین پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو انھیں ننگے بھوکے اور تباہ حال لوگوں کا ملک ملے گا جس میں نہ کوئی صنعت ہوگی نہ کوئی کاروبار ہوگا، بس انسانوں کا ایک سوکھا جنگل نظر آئے گا۔

کہاں جاپان اور کہاں کمیونزم

لینن نے کہا تھا کہ جس ملک میں جس قدر زیادہ غربت اور بے کاری ہوگی، وہاں اسی قدر جلد کمیونزم پھیلے گا۔ پچھلی جنگ نے تمام ملکوں کے معاشی نظام کو ابتر کر دیا ہے۔ اس لئے ہر جگہ، حالات کے فرق کے ساتھ کمیونزم کا خطرہ بڑھ رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں عام بے چینی اور بے اطمینانی سے فائدہ اُٹھا کر، کمیونسٹ لینن کے مذکورہ قول کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہر طریقوں کو اختیار کرنے سے بھی نہیں چوکتے، جو سامراج کے ساتھ مخصوص تھے۔ یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں تو پرانا نظام بہت مضبوط بنیادوں پر تھا، اس لئے گو پچھلی لڑائی نے اس کی جڑوں کو ہلا دیا ہے تاہم ابھی اس میں زندہ رہنے کی کافی طاقت موجود ہے مگر مشرق کے زیادہ تر ممالک غلام یا نیم غلام تھے۔ پچھلی لڑائی نے یا تو ان کو شہنشاہیت کی قدیم غلامی سے نجات دلا دی ہے یا کم از کم سامراج دشمن طاقتوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا ہے۔

ایشیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک جاپان تھا۔ مگر پچھلی لڑائی نے اس کی کمر توڑ دی ہے اور اتحادیوں کی مضبوط گرفت اس کی ہر قسم کی ترقی میں مانع ہے اس سے ڈر ہے کہ مشرق میں کمیونزم کا بڑھتا ہوا سیلاب جاپان کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہے گا۔

پہلی ستمبر کو جاپان میں باقاعدہ ہتھیار ڈالنے کی تیسری سالگرہ منائی گئی اس موقع پر وہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے جلد سے جلد صلح کے معاہدے اور جاپان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے ہر ایسی اسکیم کی مخالفت کا ارادہ ظاہر کیا ہے جس سے جاپان فوجی اڈا بن جائے یا معاہدۂ صلح کے بعد اتحادی فوجیں کسی روپ میں بھی وہاں باقی رہیں۔ اس مطالبے سے وہاں کے ان لیڈروں میں جو اتحادیوں کے ہم نوا ہیں کھلبلی پڑ گئی ہے اور وہ انتہاپسندوں خاص طور پر کمیونسٹوں کی نقل و حرکت کو کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔

ہمسائے کی بے مہری

سیلون کے ایوانِ زیریں میں شہریت کا بل پاس کر کے منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس بل کی رو سے صرف وہی سیلون کا شہری ہو سکتا ہے جو وہاں پیدا ہوا ہو۔ اس کی وجہ سے وہ ہزاروں ہندوستانی جو مدت سے وہاں کام کر رہے ہیں جو خود سیلون کی خواہش پر وہاں بھیجے گئے تھے جنھوں نے سیلون کی، اس کی انتہائی ضرورت کے وقت خدمت کی ہے۔ اور جو اب بالکل وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ سب کے سب شہریت کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔

سیلون کے ہندوستانیوں کے مسئلے پر نئی روشنی کے آئندہ نمبر میں ایک مضمون شائع ہو رہا ہے، جس سے صورت حال کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

(ع، ل)

غزل

مُعینُ احسن جذبیؔ

زمیں، آسماں، چاند، سورج ستارے
ہمارے ہیں لیکن نہیں ہیں ہمارے

ازل سے لرزتے رہے ہیں مژہ پر
خدا جانے ٹوٹیں گے کب یہ ستارے

نہ جانے کوئی منزلِ نور بھی ہے
کہاں تک چلیں ظلمتوں کے سہارے

ہوائیں تو کچھ اور اُلجھا رہی ہیں
کوئی کاکلِ دہر کیوں کر سنوارے

تجھے آسماں ناز ہے اک شفق پر
زمیں پر تو ہیں کتنے خونیں نظارے

نئی منزلیں دعوتیں دے رہی ہیں
نئی مشکلیں کر رہی ہیں اشارے

جھلکتی ہے یوں منزلِ شوق ہمدم
بہت دور سے کوئی جیسے پکارے

لبِ غم پہ کیا آگیا اک تبسم
فضاؤں میں نوٹے اُٹھے ہیں شرارے

رو پہلے پہاڑوں سے کیونکر رُکیں گے
یہ بڑھتے ہوئے آگ کے تیز دھارے

وہاں سے بھی طوفان اُٹھے ہیں اے دل
جنھیں لوگ سمجھا کئے ہیں کنارے

یہ ہے سختیٔ روز و شب انتہا پر
کہ دن پھر رہے ہیں ہمارے تمھارے

سیہ رات کیوں کانپ اُٹھتی ہے جذبیؔ
سحر کے تو ہوتے ہیں دل کش نظارے

منزل

باقر مہدی

چمک چمک کے ستاروں نے روشنی کھوئی
مگر حیات کو نورِ سحر ملا ہی نہیں
اُلجھ رہے ہیں رہِ شوق ہی سے دیوانے
محبتوں کا ابھی کارواں چلا ہی نہیں
جنونِ عشق کی گمراہیوں سے کیا حاصل
نقابِ حُسنِ بشر تو ابھی ہٹا ہی نہیں

ہزار موجِ حوادث سے کھیلتا ہوں میں
مگر ابھی تو نگاہوں سے دور ساحل ہے
چھلک رہے ہیں غمِ آرزو کے پیمانے
بھری بہار میں اُجڑی ہوئی سی محفل ہے
بُجھی بُجھی سی تمنا رُکے رُکے سے قدم
ہجومِ یاس کے ماروں کی کون منزل ہے

غزل

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

غم بدل جائیں گے، راحت بھی بدل جائے گی
تیری نفرت، مری وحشت بھی بدل جائے گی

نظریں مایوس سی ہیں منبر و محراب سے آج
زاہدو! رسمِ عبادت بھی بدل جائے گی

ہوگیا سبزۂ خوابیدہ جو بیدار کبھی
لالہ و گل کی یہ رنگت بھی بدل جائے گی

چاک ہوجائے گا جس وقت سراپردۂ شب
ماہ و انجم کی سیاست بھی بدل جائے گی

زندگی موت کو پی جائے گی سرمستی میں
دہرِ سیّال کی فطرت بھی بدل جائے گی

جب رگِ سنگ سے ٹپکے کا تمنا کا لہو
زندگی کیا، کہ حقیقت بھی بدل جائے گی

دیہی اور گھریلو صنعتیں

ہندوستانی معیشت کا پس منظر

پروفیسر محمد عاقل

ہندوستان کی آبادی بڑھ رہی ہے اور اس کا ۸۰ فی صد حصہ گاؤں میں رہتا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو کیسے روزگار سے لگایا جائے اور زندگی کے عام معیار کو کیسے اونچا کیا جائے؟ یہ سب سے اہم سوال ہے جو ہندوستان کے سامنے ہے اور اس کو اسی طرح حل کیا جاسکتا ہے کہ اصلاح کی تمام کوششیں گاؤں سے شروع کی جائیں، یا گاؤں پر لاکر ختم کی جائیں۔

باہر سے جو سیاح اس ملک میں آتے ہیں یا خود یہاں کے لوگ جو زندگی کا مشاہدہ سرسری نظر سے کرتے ہیں وہ شہروں میں چند بڑی صنعتوں کی ترقی اور ان سہولتوں کو دیکھ کر جو نئے زمانے کی زندگی کے ساتھ مخصوص ہیں اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ ہندوستان کیوں غریب اور پچھڑا ہوا ہے؟ جب کہ اس ملک میں ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے تار، ٹیلیفون کا سلسلہ موجود ہے۔ کپڑے اور لوہے اور فولاد کی بڑی صنعتیں خاصی ترقی کر چکی ہیں۔ لیکن ان کی یہ حیرت دور ہو جائے گی جب وہ معلوم کریں گے کہ ۱۹۰۱ء سے ہندوستان کی آبادی میں ۶۹ فی صدی اضافہ ہوا ہے مگر اس کے مقابلے میں روزگار کے مواقع بہت کم بڑھے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانیہ کے قبضہ کے بعد سے رقبہ زیر کاشت میں اضافہ ہوا۔ رسل و رسائل بہتر ہوئے۔ کچھ صنعتوں کو خصوصاً گذشتہ ۳۰ سال میں ترقی ہوئی۔ لیکن جب قومی آمدنی فی کس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو یہ ترقی بہت کم نظر آتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے فی کس اوسط آمدنی کا تخمینہ ۶۵ روپے سالانہ کیا گیا تھا۔ جنگ اور بعد جنگ کے زمانے میں روپے کی قیمت گر گئی ہے اور آمدنی بڑھ گئی ہے۔ اب یہ تخمینہ تقریباً تین گنا ہوگا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ روپے کی قوت خرید پہلے سے بہت کم رہ گئی ہے۔ پھر گاؤں کے لوگوں کی آمدنی ملک کے عام اوسط سے بھی کم ہے۔ غرض اس ملک کے عوام کے لئے شائستہ زندگی کی آسائش فراہم ہونا تو درکنار، ان کی معمولی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ اس خرابی کا اصل سبب یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے اس بیان میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ یہاں کے لوگوں کا خود اپنا قصور ہے۔ یہ اپنی آبادی کم کرلیں حالت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن آبادی کا اضافہ بہت پیچیدہ معاشی، حیاتیاتی اور عمرانی اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان میں سے بہت کم پر ایک فرد واحد کو پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اگر ہم مستقبل بعید کے امکانات اور تجاویز میں کھوئے ہوئے نہیں ہیں اور کوئی فوری لائق عمل علاج تجویز کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ آبادی اور اس کے اضافہ کی شرح کو تو ہمیں ایک حقیقت مان کر آگے بڑھنا ہوگا۔ ہمارے ملک کے موجودہ حالات میں آبادی میں تخفیف کرانا جتنا مشکل کام ہے اتنا پیداوار میں اضافہ کرانا مشکل نہیں ہے۔ اس بات کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان میں معاشی ترقی کے بے انتہا امکانات موجود ہیں۔ ضرورت پیداوار میں اضافہ، وسائل کے معقول استعمال اور تقسیم دولت میں مساوات قائم کرنے کی ہے۔ بنیادی مسئلہ دراصل یہ ہے کہ پیشوں کی تقسیم میں جو موجودہ عدم توازن ہے کہ زراعت کے کام میں خواہ مخواہ بے شمار لوگ چمٹے ہوئے ہیں اس کو دور کیا جائے، اور اس کی جگہ لوگوں کو بڑی اور چھوٹی صنعتوں، مفید خدمات اور علمی پیشوں میں کھپایا جائے۔

اس قسم کی زائد آبادی کا مسئلہ کچھ ہندوستان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ معاشی ترقی کی ایک خاص منزل میں یورپ کے اکثر ملکوں کو اس کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور اس کے حل کرنے کے لئے وہاں کی حکومتوں نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ چار چیزوں پر مشتمل تھی۔

(۱) کاشت کے معیار کو بلند کرکے موجودہ زمینوں کی زراعتی پیداوار کو بڑھانا۔

(۲) بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دینا جس میں زائد آبادی جذب کی جاسکے۔

(۳) نئی نسل کے بسانے کے لئے بڑی زمینداریوں کے ٹکڑے کرنا اور دلدلی اور بنجر زمینوں کو لائق کاشت بنانا اور

(۴) دوسرے متفرق طریقوں سے کسان کی آمدنی میں اضافہ کرنا۔

اس بات کو سب جانتے ہیں کہ کاشت کے معیار کو بلند کرنے اور ضمنی اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے ہندوستان میں ابھی تک بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ زراعتی اصلاح اور دیہات سدھار کی مختلف اسکیموں سے بہت کم نتائج برآمد ہوئے ہیں ایسا کیوں ہے؟ تجویزوں کی خرابی کی وجہ سے ہے یا ان کو عملی جامہ پہنانے والوں کی نااہلی کی وجہ سے؟ یہاں ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہے یہ مسلمہ حقیقت۔ اس کے بعد بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے بارے میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا ان کی ترقی خصوصاً پچھلے ۲۰ سال میں نہایت تیزی کے ساتھ نہیں ہوئی ہے۔ اور کیا اس ترقی کی وجہ سے زمین پر آبادی کا بوجھ کم نہیں ہوا۔ لوگوں کی آمدنی کا معیار نہیں بڑھا؟

ہندوستان میں بڑے پیمانے کی جدید صنعت کی ابتدا انیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک حکومت ہند نے کبھی اپنی اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا کہ صنعتی ترقی کے بارے میں بھی اس کی کوئی پالیسی ہونا چاہئے اس زمانے میں صرف سوتی کپڑے کی صنعت نے ہندوستانیوں کی ملکیت میں ترقی پائی باقی سب صنعتیں غیر ملکیوں کی ملکیت اور انتظام میں رہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے ہندوستان کی سوتی کپڑے اور سن کی صنعتوں کو خوب سہارا ملا۔ لیکن اس زمانے میں جس صنعت کو سب سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی وہ جمشید پور کا لوہے اور فولاد کا کارخانہ تھا جس میں روپیہ لگانے والے اور جس کے چلانے والے ہندوستانی تھے۔ اس کی ترقی سے ہندوستانیوں میں بہت جوش، دلچسپی اور تحریک کے جذبات پیدا ہوئے۔

جنگ عظیم کے بعد جن مسئلوں نے اہمیت حاصل کی ان میں ایک تو جاپان کا ہندوستان کی منڈی میں داخلہ تھا اور دوسرے ہندوستان کے جذبہ قومی کی بڑھتی ہوئی طاقت۔ ان دونوں کا اثر یہ ہوا کہ ملک کے اندر صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے باہر کے مال پر تامینی محصول عائد کرنے کا مطالبہ بڑے زور شور سے کیا جانے لگا محصول درآمد و برآمد کے کمیشن نے جس پالیسی کو تجویز کیا تھا اس کے ماتحت سب سے پہلے لوہے اور فولاد کی صنعت کو تامین ہوگئی۔ اس کے بعد سوتی کپڑے، شکر، کاغذ، دیا سلائی اور کئی دوسری صنعتوں کو۔ ۱۹۲۲ء کے بعد بصورت مجموعی خاصی تیز رفتار سے ترقی ہوئی۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرے ملکوں کی طرح، ہندوستان کو بھی اس عظیم کساد بازاری کا شکار ہونا پڑا جو ۱۹۲۹ء کے بعد شروع ہوئی۔ اور اس کے بعد سے آزادی کے حصول تک صنعتی ترقی میں حکومت ہند کی پالیسی کچھ زیادہ معاون اور مددگار ثابت نہیں ہوئی۔

لیکن ان موانع کے باوجود، خاص کر جنگ کے زمانے کے حوصلہ افزا ماحول میں ہندوستان کی صنعتوں نے خاصی ترقی کی۔ ہندوستان میں فولاد کی پیداوار ۱۵ لاکھ ٹن اور لوہے کی پیداوار ۲۸ لاکھ ٹن سالانہ تک پہنچ گئی۔ کاغذ کی پیداوار ایک لاکھ ٹن ہوگئی اور کپڑے کی پیداوار چار ارب پچاس کروڑ گز۔ شیشے کے کارخانوں نے ملک کی ضرورت کا نصف حصہ اور دواؤں کی صنعت نے تین چوتھائی حصہ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ سیمنٹ اور دیا سلائی کی پیداوار اتنی بڑھی کہ ہندوستان کو انہیں باہر سے منگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ شکر کے معاملے میں بھی ہندوستان باہر کے ملکوں کا محتاج نہیں رہا۔ اس ہمہ جہت صنعتی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں آٹھویں نمبر پر کیا جانے لگا۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہندوستان میں اتنی صنعتی ترقی ابھی تک نہیں ہوسکی ہے، جتنا ملک کے وسائل کا اور آبادی کے اضافہ کی شرح کا تقاضا ہے ملک کے ترقی پسند صوبوں میں صنعتی محکموں کو قائم ہوئے اب تقریباً ۴۵ سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک منظم اسکیم کے ماتحت ملک کے معدنی اور دیگر وسائل کو ترقی دینے کا کام شروع نہیں کیا جاسکا ہے۔ ملک کے کوئلے کے مجموعی ذخائر کا اندازہ ساٹھ ہزار ملین ٹن کیا گیا ہے۔ لیکن سالانہ پیداوار صرف ۲۸ ملین ٹن کے قریب یعنی برطانیہ کی پیداوار کا آٹھواں حصہ ہے۔ ملک میں بہترین لوہے کے ذخائر تقریباً ۲۷ ہزار ملین ٹن موجود ہیں لیکن پیداوار ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ سے بھی کم ہے۔ ہندوستان کے مینگنیز کے ذخائر دنیا میں سب سے زیادہ ہیں اور دنیا کا تین چوتھائی ابرق ہندوستان میں موجود ہے المونیم کی خام دھات کے بھی بہت بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ ملک میں چیزوں کے استعمال کا معیار ابھی تک بہت

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

زبانِ غیر سے فریاد میری

عبدالحلیم ندوی

جیل خانے میں آج بڑی گہما گہمی تھی۔ عمارت کے پُرشکوہ سنگین مینار پر حکومت کا جھنڈا ہوا میں لہرا کر اعلان کر رہا تھا کہ آج تحقیقاتی بورڈ کے اجلاس کا دن ہے اور گورنر صاحب مع اراکین بورڈ جیل میں تشریف فرما ہیں۔ متعلقین مسکرا رہے تھے اور قیدی سمجھ رہے تھے کہ آج کسی خوش قسمت کی تقدیر کھلی اور قید زندان سے رہائی ملی۔ لیکن جس کمرے میں بورڈ کا اجلاس ہو رہا تھا اس سے ملی ہوئی آہنی کوٹھری میں قیدیوں کے چہروں پر رنج والم کے آثار ہویدا تھے۔ ان میں سے بعض پانچ پانچ اور دس دس سال سے اس موقع کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ آج ان کی امیدوں کا دن آگیا تھا۔ اور ہر ایک کو اپنی رام کہانی بورڈ کے سامنے پیش کر کے اپنی بے گناہی کا ثبوت دینا تھا۔ چنانچہ اس کمرہ کا ہر قیدی اس فکر میں کھویا ہوا تھا کہ پیشی کے وقت اپنی صفائی میں وہ گورنر صاحب بہادر سے کیا کیا کہے گا۔ سب اپنے خیالات میں غرق تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

دفعتہً جیل کا پہرہ دار نمودار ہوا۔ اور اس نے کوٹھری کے دروازے کو کھول کر چارلی نامی ایک قیدی کو پکارا۔ سارا دور کوٹھری کے کونے میں ایک خفیف سی حرکت ہوئی اور ایک دُبلا پتلا آدمی جس کے سر کے سارے بال سفید تھے آگے بڑھا۔ اس کا رنگ زرد، اور آنکھیں اونگھتے ہوئے آدمی کی طرح بے آب تھیں۔ جوں ہی اس نے قدم آگے بڑھائے کسی نے اس کے کان میں چپکے سے کہا "چارلی مبارک ہو"۔ لیکن بوڑھا قیدی اپنے خیالات میں محو بغیر توجہ دئے آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے قیدی کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی، قریب تھا کہ گر پڑتا مگر پہرہ دار نے سنبھال لیا، اور بولا "چارلی ذرا ہمت سے کام لو۔ سوچو تو تم نے اس مبارک دن کے لئے انتظار کی کتنی گھڑیاں کاٹی ہیں"۔

چارلی کو جیل میں آئے ایک عرصہ گذر چکا تھا، پورے بیس برس، مگر اس پوری مدت میں رات اور دن کا کوئی لمحہ ایسا نہ گذرا تھا جس میں چارلی آج کے دن کے لئے اپنے بیان کی مشق نہ کرتا رہا ہو۔ پہلے ہی دن سے اس نے تحقیقاتی بورڈ کے سامنے بیان دینے کی تیاری شروع کر دی تھی اور اس کو آج تک رٹتا رہا تھا۔ شروع شروع میں تو جب نوجوان قیدی اس کو اس انہماک سے بیان کی تیاری کرتے دیکھتے تو مذاق اڑاتے۔ "ارے بھئی چارلی اتنی بھی جلدی کیا ہے، ابھی تو ماشاء اللہ مشق کے لئے ساری عمر پڑی ہے"۔ لیکن چارلی سب سے بے پروا اپنے کام میں لگا رہا پورے استقلال اور عزم راسخ کے ساتھ۔ آخر وہی لوگ جو کل تک اس کا مذاق اڑاتے تھے آج اس کے غم گسار اور ہمدرد ہو گئے۔ اور اب اس کی حالت دیکھ کر ان کو اس پر ترس آنے لگا۔

جیل میں جتنے قیدی آتے وہ اس مختصر سے آدمی کو سب سے الگ تھلگ اپنی تقریر کی مشق کرتے ہوئے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے، اور بڑے تعجب سے پوچھتے کہ آخر کیا بات ہے؟ یہ کون شخص ہے؟ کیا اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے؟ اور جب انھیں بتایا جاتا کہ یہ چارلی ہے اور اپنا صفائی کا بیان رٹ رہا ہے جو وہ تحقیقاتی بورڈ کے سامنے پیش کرے گا تو ان پر بھی اس کا خاصا اثر ہوتا۔

پرانے قیدیوں کو بھی چارلی کا بیان روز سنتے سنتے ازبر ہو گیا تھا۔ جوں جوں دن گذرتے جاتے چارلی اپنے بیان میں کانٹ چھانٹ کرتا جاتا، برسوں رد و بدل کے بعد اس کی آخری شکل یہ تھی۔

"حضور والا اور محترم حضرات! مجھے بخوبی علم ہے کہ آپ کے لئے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے کہ ایک ملزم آپ کے حضور میں آکر اپنی بے گناہی کا حلف اٹھائے اور آپ سے داد کا طالب ہو، لیکن میرے محترم میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے حضور میں اس مقصد سے بالکل نہیں آیا ہوں، اگر مجھے فقط اپنی رہائی مقصود ہوتی تو دیکھئے کہ میں آج ۲۰ برس تک سزا بھگتنے کے بجائے اپنی بے گناہی کی طرف اشارہ بھی نہ کرتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں صرف اپنی رہائی ہی نہیں چاہتا بلکہ آج یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جس جرم شنیع کا میں نے ارتکاب کیا ہے اس میں میری بدطینتی، سنگدلی اور اخلاقی پستی کو دخل نہیں ہے بلکہ میرے مسلسل اور پیہم ناسازگار حالات تھے جنھوں نے مجھے پستی کے اس عمیق غار میں لا ڈھکیلا۔"

یہ تھا اس تقریر کا ابتدائی حصہ جس کو چارلی مسلسل بیس سال سے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری کے گوشے میں کھڑے ہو کر دہراتا تھا۔ اس کے بعض دوستوں نے اس سے کہا کہ یہ تقریر بہت ادق اور مشکل ہے کسی نے اس کے اندر چھانٹ چھانٹ کے اپنی جیبی لغت سے جو مشکل الفاظ بھر دئے ہیں ان کو نکال کر اسے آسان اور عام فہم بنا دو۔ لیکن چارلی کو ان کی یہ رائے بالکل نہ بھائی بلکہ جس طرح اس نے یہ ٹھان لی تھی کہ وہ رہائی حاصل کر کے رہے گا۔ اسی طرح اس بیان پر بھی پورے استقلال اور خود اعتمادی سے قائم رہا۔

جونہی چارلی کمرہ کی دہلیز کے پاس آکر رکا اس نے دیکھا کہ گورنر ایک میز کے سامنے بیٹھا ہے اور اس کے پاس کمیٹی کے چار ارکان جو ادھیڑ عمر کے پُروقار لوگ ہیں۔ ایک قطار میں بیٹھے ہیں۔ وارڈن نے یہاں پہنچ کر سر کے اشارہ سے چارلی کو ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اب گورنر نے اپنا رکارڈ کھولا اور بلند آواز سے پڑھ کر سنایا "چارلی گریگوری جس کو قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا دی گئی"۔ اتنا پڑھ کر وہ چپ ہو گیا اور پہلے چارلی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس نے اس کو مخاطب کر کے کہا "چارلی اب یہ بتاؤ تم کس بنا پر رہائی چاہتے ہو"۔ چارلی نے اپنے لب تر کئے اور مری ہوئی آواز میں بولا "حضور والا اور محترم حضرات! مجھے بخوبی علم ہے کہ آپ کے لئے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے کہ...... کہ...... کہ......" اس کی آواز دھیمی ہوتی ہوتی گئی اور آخر میں صرف لبوں کی جنبش رہ گئی۔

یہ حالت دیکھ کر وارڈن نے تسلی دیتے ہوئے کہا "چارلی، گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آپ سب حضرات تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں تم اپنا بیان پھر سے شروع کرو"۔ چارلی کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ لیکن منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا یہ حالت دیکھ کر بورڈ کے دو ممبروں نے اپنی الجھن اور بے چینی چھپانے کی غرض سے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اب گورنر نے کہا "چارلی تم بے دھڑک اپنی روداد ہم سے کہدو، گھبراؤ نہیں"۔ چنانچہ اس نے پھر ہمت کی اور ایک بے جان کَل کی طرح جیسے کوک دے دی گئی ہو۔ اس نے پھر اپنا بیان شروع کیا "حضور والا اور محترم حضرات! مجھے بخوبی علم ہے کہ آپ کے سامنے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے کہ .... کہ ...." اور اس مرتبہ بھی الفاظ ہلکے ہلکے ہوتے گئے اور پھر بالکل غائب ہو گئے۔ ۲۰ سال سے جس تقریر کو شب و روز رٹتا رہا تھا آج موقعہ پڑنے پر وہ زبان سے نہ نکلی۔

گورنر تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید قیدی کے حواس ٹھیک ہو جائیں۔ پھر اس نے وارڈن سے کہا "اب اس کو چھوڑ دو، دوسرا آدمی لاؤ۔ بعد میں اس کے مسئلے پر غور کیا جائے گا"۔ چارلی بدستور بُت بنا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وارڈن ایک نوجوان سنہرے بالوں والے قیدی کو لے کر اندر آگیا۔ نئے قیدی کے آنے کے بعد گورنر نے پھر چارلی سے کہا "میں تمھیں صفائی پیش کرنے کا ایک اور موقع دیتا ہوں تمھیں معلوم ہے کہ ہمیں ابھی اور قیدیوں کے بیان لینے ہیں"۔ سنہرے بالوں والے قیدی نے بڑے حیرت سے چارلی کو دیکھا چارلی کے ہونٹ تھرتھرائے لیکن منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

اب گورنر نے عاجز آکر کہ کوشش بے سود ہے وارڈن سے کہا کہ اس کو باہر لے جاؤ۔ شاید اس کی طاقت گویائی واپس آجائے۔

"اگر حضور کی مرضی ہو تو" نوجوان قیدی بولا۔ گورنر نے اس کی طرف تیکھے پن سے دیکھا اور کہا: "تھوڑی دیر صبر کرو نوجوان ہم ابھی تمھارا بیان سنتے ہیں"۔

"یہ بات نہیں ہے حضور"۔ قیدی نے جواب دیا۔ "میں اپنا معاملہ پیش نہیں کرنا چاہتا بلکہ چارلی کا۔ میں اس کی پوری سرگذشت جانتا ہوں اور لفظ بلفظ بالکل اسی کے انداز میں سنا سکتا ہوں اگر اجازت ہو تو......" "کیا کہا؟" گورنر نے حیرت سے پوچھا "تمھیں اس کی سرگذشت کیسے معلوم ہو گئی؟"

حضور! "وہ مسلسل بیس سال سے آج کے بیان کی تیاری کر رہا ہے اور اس پوری مدت میں کبھی اس کی زبان نہیں رکی"۔

گورنر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اچھا اجازت ہے سناؤ"۔ پھر اس نے ممبران بورڈ

(بقیہ صفحہ ...)

ہندوستان کی تاریخ میں اتحاد پسندی کا رجحان

خواجہ احمد فاروقی

حرم جویاں درے را می پرستند
فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ہندوستان مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔ اس کے شمال مغربی دروں سے آریہ، ہن، سیتھین اور مسلمان فاتح نئے پرچم کے ساتھ داخل ہوئے۔ ان کے آنے کی وجہ سے بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، اور بہت سے سیاسی انقلابات رونما ہوئے۔ لیکن ان موجوں نے تہذیب اور تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز کر دیا۔ اور اس ملک کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔

گنگا اور جمنا کی دھاریں جہاں آکر ملتی ہیں۔ وہ صاف الگ الگ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اس طرح ملی ہوئی بھی ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہے۔ یہی حال ہندوستانی تہذیب کا ہے، اسی لئے ہندوستان کو ملتی بھومی اور کرم بھومی کہا گیا ہے۔ یہ مادی اور روحانی ترقی کا ایسا گہوارہ ہے جہاں صداقت، خدمت، رواداری اور آشتی کے عظیم الشان اصول، مقدس ویدوں سے لے کر مہاتما گاندھی کی تعلیم تک ہمیشہ کارفرما رہے ہیں۔ مختلف فرقوں کی موجودگی اور مذہبوں کی کثرت، ہندوستان کی روحانی سربلندی، عظمت اور قوت کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔

اسی سرزمین میں سے اپنشد کا فلسفہ اور گیتا کا پیغام دنیا میں پہنچا۔ اسی سرزمین سے مہاتما بدھ اور مہاویر سوامی نے مذہبی جمہوریت اور عدم تشدد کا غلغلہ بلند کیا۔ مہاتما کبیر، گرونانک، حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اسی سرزمین پر محبت الٰہی اور خدمت خلق کی تعلیم دی۔ سانچی، سارناتھ، کھجوراہو اور لورا، کے بے مثال تعمیری کارنامے اسی ملک سے متعلق ہیں۔ اجنتا کے نقوش یہیں ابھرے ہیں۔ ایلورا کے حسین بت یہیں تراشے گئے ہیں۔ قطب مینار، دہلی کی جامع مسجد، اور آگرہ کا تاج محل اسی جنت نشان ملک کے تہذیبی سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ کالی داس، امیر خسرو، ملک محمد جائسی، تلسی داس، میرا بائی، فیضی، غالب، ٹیگور، اقبال اور نذر الاسلام نے اپنے نغمے اسی سرزمین پر سنائے ہیں۔

یہ کل تہذیبی سرمایہ ہماری میراث ہے اور اس نقشے میں ایک قوم نے نہیں بلکہ بہت سی قوموں نے مل کر رنگ بھرا ہے۔ یہ تہذیب کی دھنک ایک رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بہت سے رنگوں کے ملنے سے اتنی خوش نما اور اتنی دل فریب معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تہذیب غالباً تمام تہذیبوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کی معاصر قوموں میں بہت سی حرف غلط کی طرح مٹ گئی ہیں۔ لیکن اس کی تاریخ اسی طرح رواں دواں ہے، اور اس میں کوئی خلا نہیں ہے۔ اس نے ہر قوم اور مذہب کو اپنی آغوش میں جگہ دی ہے۔ ہر ایک سے بہت کچھ لیا ہے، اور بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و فن کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کا اپنا نقش ثبت نہ ہو۔ مختلف رنگوں میں یک رنگی اور بہت سے اختلافات میں بھی یک جہتی جیسی اس تہذیب میں نظر آتی ہے۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ کون سی قوت ہے جس نے اس کو قدرتی مصیبتوں اور انسانی گمراہیوں میں زندہ رکھا ہے؟ وہ کون سی پختہ کار عقل ہے جس نے اس کے مختلف نظریوں میں مصالحت کرادی ہے؟ یہ صحیح جویانہ قوت، یہ پختہ کارانہ عقل، دراصل ہندوستان کی کلچر میں پوشیدہ ہے۔ جو اختلاط و امتزاج کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

آریوں کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان پر حملے ہوئے ہیں۔ ان حملہ آوروں نے تہذیب کی شمع کو اس شان سے فروزاں کیا کہ وہ دور تک تاریکی کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی تہذیب کا قصر خوب صورتی اور دل کشی میں آریوں سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ ان قبل آریائی دراوڑوں نے قدیم باشندوں کو شکست دے کر اپنا پرچم لہرایا۔ اور مخلوط تہذیب کا ایسا دل کشا ایوان تیار کیا کہ علمائے جدید بھی اس کی وسعت اور زیبائی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

جب آریہ فتح و نصرت کے جھنڈے لے کر ملک میں داخل ہوئے تو قدیم و جدید کی آمیزش پھر تیز ہو گئی۔ ان لوگوں نے موہنجوداڑو کی تہذیب کو نیست و نابود نہیں کیا، بلکہ اپنی کلچر کی اساس اسی پر قائم کی۔ دونوں تہذیبوں کا تسلسل اس طرح قائم ہے کہ بعض علما یہ باور ہی نہیں کرتے کہ یہ دو علیحدہ تہذیبیں ہیں یا کوئی ماقبل آریائی تہذیب بھی رہی ہے۔

قدیم آریہ قدرتی قوتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کو انھوں نے اپنے قصوں اور مناجاتوں میں مشخص کر لیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کے مذہب میں دراوڑی اور غیر آریائی عناصر شامل ہو گئے تھے۔ برہما کی جگہ شکتی دیوی کو مل گئی اور وشنو کا تصور ایک کالے دیوتا کا ہو گیا جو قطعی غیر آریائی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آویزش کے بعد آمیزش کا دور شروع ہو گیا تھا

یہ مفاہمت، مذہب کے علاوہ لٹریچر میں بھی نظر آتی ہے۔ آریوں کے قدیم لٹریچر میں دراوڑوں کے متعلق خوف اور نفرت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح قدیم تامل شاعری میں آریوں کے متعلق منافرت کے شعلے ملتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ جذبات سرد ہوتے جاتے ہیں اور رواداری و آشتی کا نغمہ ہر جگہ سنائی دینے لگتا ہے۔

یہ لسانی مفاہمت سنسکرت کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج کی صورت میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ زبان جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے ایک اور زبان کی مہذب صورت ہے۔ لیکن کون سی زبان ہے جو اس سے متاثر نہیں ہوئی اسی وجہ سے بعض علما کا خیال ہے کہ تمام ہندی زبانیں سنسکرت ہی کی شاخیں ہیں۔ اور اسی کی جڑوں کو چوس چوس کر پلی اور بڑھی ہیں۔ تامل جو آریوں کے آنے سے پہلے بھی ترقی یافتہ زبان تھی سنسکرت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دوسرے حملہ آوروں کے بعد جو لسانی انقلابات ہوئے ان کو ڈھالنے میں بھی سنسکرت کا ہاتھ رہا ہے اور اس نے بعد کی زبانوں کے بھی الفاظ اور قواعد کو متاثر کیا ہے۔

مہاتما بدھ نے جس وقت اپنی تحریک شروع کی ویدک مذہب کی اصلی روح ختم ہو چکی تھی اور وہ اوہام کے تار و پود اور ظواہر و رسوم کے مجموعہ سے زیادہ کچھ باقی نہ تھا۔ اس ظاہر پرستی کے خلاف، رد عمل بھی سخت ہوا۔ مہاتما بدھ نے تمام رسوم و قیود کو یک قلم ختم کر دیا، اور سارا زور اخلاقی درستی اور روحانی پاکیزگی پر دیا۔ یہ فلسفیانہ طرز زندگی، عوام کی سمجھ سے باہر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بدھ مذہب میں ظواہر و رسوم کا ایسا دور شروع ہو گیا جس کے آگے پچھلی رسم پرستیاں ہیچ تھیں۔ ہندو مذہب جو درحقیقت کسی زمانہ میں بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے بدھ مذہب کے بنیادی اصول کو اپنے نظام فکر میں جگہ دے لی اور جذب و قبول کے اس رد عمل نے اس مذہب کو جو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا، ہندوستان ہی میں نامقبول بنا دیا۔

ہندوستان کے جغرافیہ نے بھی اس کی تاریخ کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ملک کی وسعت اور آب و ہوا کے اختلافات نے ذہن میں وسعت اور کشادگی پیدا کر دی ہے اور اس کو اختلافات کے قبول کرنے اور رواداری کے برتنے کا اہل بنا دیا ہے۔ مادی سطح پر تصادم ہوئے ہیں لیکن روحانی سطح پر، جہاں کلچر کو فروغ نصیب ہوتا ہے ہمیشہ اختلاط و اتحاد ہی کی کارفرمائی رہی ہے۔

ہندوستان کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ ہے، اور باقی تین طرف سمندر ہے۔ اس جغرافی وحدت نے تاریخی وحدت بھی پیدا کی ہے۔ اسی وجہ سے جب کبھی ہندوستان کی حدیں قدرتی حدوں سے کم یا زیادہ ہو گئی ہیں۔ وہ کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ آریوں کا تعلق بہت جلد ایران کے ہم قوموں سے ختم ہو گیا۔ آریوں کی یہ کوشش کہ افغانستان کو ہندوستان میں شامل کر لیں۔ اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ نہ یونانی پنجاب پر قبضہ رکھ سکے اور نہ موریہ قندھار پر۔ غزنوی خاندان ہندوستان کے باہر سے ہندوستان پر حکومت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دلی کے بادشاہ سرحد کے آگے زر کثیر صرف کر کے فوج کشی تو کر سکے۔ لیکن اپنے قبضے کو قائم نہیں رکھ سکے۔

اسی کے ساتھ اندرون ملک کے مختلف حصوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کی کوشش ہمیشہ رہی ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے قصے اس میلان کے شاہد ہیں۔ مہایانی فلسفہ اور منو کے قوانین اتحاد پسندی کا ثبوت ہیں۔ چندر گپت موریہ نے ملک کے ایک بڑے حصے میں اپنی حکومت قائم کی اشوک نے اس روایت کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اس کام کو اور آگے بڑھایا۔ اگر عہد قدیم میں یہ کام نہ ہو چکا ہوتا تو علاء الدین اور اکبر نے جو ملکی وحدت قائم کرنے کی کوشش کی، اس کی کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہوتی اور یہ حکومتیں ایسی ہی حباب ہوتیں جیسی کہ سکندر اعظم کی تھی۔ لیکن اگر ملکی وحدت کے یہ رشتے عصر جدید کی طرح مضبوط اور دیرپا ثابت نہیں ہو سکے تو اس کا سبب مادی وسائل اور رسل و رسائل کی کمی ہے۔ فطری اتحاد کا فقدان نہیں۔

فکر و خیال کی اس مفاہمانہ روش نے ہندی کلچر میں بڑی وسعت، یکسانیت، گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے۔ یہ وحدت فکر ہمارے معاشی و معاشرتی نظام، زبان و ادب، آرٹ اور فلسفہ غرض ہر شعبہ میں موجود ہے، اس طرح ہندوستان کی کلچر آویزش

وما تیر بش کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اتحاد و اختلاط کا یہ سرچشمہ جو موہنجدارو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا آج بھی اسی طرح جاری ہے اور ہماری مقدس سرزمین کو سیراب کر رہا ہے۔

مسلمانوں کے حملے کی داستان، آریوں کے حملے کی داستان کو تازہ کر دیتی ہے۔ آریوں کی طرح، ترکوں نے بھی ہندوستان کا رخ اس وقت کیا جب وسط ایشیا میں آبادی کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ سنہ ۱۲۰۶ء میں ان کی دہلی میں حکومت قائم ہو گئی۔ اس حکومت نے اس تاریخی تسلسل کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اس کے اتحاد پسندانہ رجحانات کو اور مہمیز کیا۔ ہرش کے انتقال کے بعد ساڑھے پانچ سو سال تک ملک میں لامرکزیت اور سیاسی افراتفری رہی تھی۔ شہری امیر قطب الدین نے اس سیاسی وحدت کو جو ختم ہو گئی تھی دوبارہ قائم کیا اور ایک ایسے معاشرہ کی ابتدا کی جس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کے مواقع فراہم کئے گئے۔ نئے حملہ آور نہ باختر کے یونانیوں کی طرح اعلیٰ تہذیب سے تہی دست تھے۔ اور نہ ہنوں کی طرح محض ابتدائی تہذیب کے حامل تھے۔ اس لئے وہ یہاں جذب تو نہیں ہوئے لیکن انھوں نے ثقافتی حلقوں میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کی اور اس مشترکہ تہذیب کے پیدا کرنے میں پوری طرح معاون و مددگار ہوئے جس کا سلسلہ ہندوستان میں پہلے سے قائم تھا۔

اس اختلاط باہمی کی گواہ ہماری مصوری، ہماری موسیقی، ہماری شاعری، ہماری عمارتیں اور ہماری مذہبی تحریکیں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ کو بادشاہوں کی رزم آرائیوں میں ڈھونڈا گیا۔ منصور و منوہر کی رنگ کاری، خسرو اور تان سین کی موسیقی، جائسی اور فیضی کی شاعری، لال قلعہ اور تاج محل کی صناعی اور بھاگت کبیر اور حضرت محبوب الٰہی کی صلح پسندی میں ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ ان تخلیقی کوششوں نے جو یقیناً زماں و مکاں کے قومی موثرات کا نتیجہ تھیں، ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ ابن حوقل اور مسعودی چودھویں صدی عیسوی کا میں ہندوستان کی سرزمین پر آئے، وہ دونوں قوموں کی ہم رنگ وضع و معاشرت کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور بابر تو اس ہندوستانی طرز زندگی کو دیکھ کر اس قدر مستفیض ہوا کہ اس نے ۱۵۲۶ء میں اپنی حکومت کی اساس ہی اس اتحاد و ارتباط کے اصول پر قائم کی۔

کچھ لوگ ہیں جو ہندوستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم سے شروع کرتے ہیں کچھ لوگ ہیں جو اسے ہرش پر لا کر ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ہزار سال کا زمانہ انسانی کوششوں کا صحرائے لق و دق ہے۔ جہاں ایک محقق کو اپنی تھکن اور پیاس دور کرنے کے لئے نخلستان کا ایک پیڑ اور پانی کا ایک چشمہ بھی نہیں مل سکتا۔ اس عصبیت نے نہ صرف تاریخ کے تسلسل کو صدمہ پہنچایا ہے بلکہ اشتراک خیال اور اتحاد ذوق کے ان عظیم الشان تخلیقی کارناموں کو بھی نظر سے پوشیدہ کر دیا ہے جن کے ساتھ پوری عہد وسطیٰ کی تاریخ وابستہ ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے صحیح تاریخی نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ہندوستانیوں کے صفحات زندگی پر مختلف نقوش دیکھ سکے، اور ان کی مجموعی قدر و قیمت کو پہچان سکے۔

پاکستان

(بسلسلہ صفحہ ۵)

ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں الگ الگ صوبوں کی حکومتیں ختم کر کے سارے علاقے کا انتظام حکومت پاکستان کے سپرد کر دیا جائے۔ دو صوبوں کے حالات کی ابتری ظاہر ہے۔ شمال مغربی سرحد میں شورش کا بازار گرم ہے۔ ڈنڈے کے زور سے حکومت ہو رہی ہے مغربی پنجاب کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ابھی دو چار روز کی بات ہے، مغربی پنجاب کے فنانس منسٹر میاں نور اللہ نے اس خبر کو کہ صوبے کی مالیات میں سخت ابتری ہے، سراسر غلط اور حکومت کے بدخواہوں کا پروپاگنڈا بتایا تھا، انھوں نے فرمایا تھا کہ صوبے کی مالی حالت بہت اچھی ہے، اس لئے کہ حکومت پاکستان نے اسے نو کروڑ روپے دینا منظور کر لیا ہے لیکن تازہ خبر یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے مغربی پنجاب کے مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اپنا ایک خاص افسر لا بٹھایا ہے جو وزیر مالیات کے کام کی نگرانی کرے گا۔ میاں نور اللہ صاحب کا مطلب ابھی حالت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنانس منسٹر کے عہدے پر فائز رہیں گے۔ اور اس کی تنخواہ پائیں گے۔ لیکن سب ذمہ داریوں اور فکروں سے آزاد ہوں گے اب یہ دیکھنا ہے کہ "غیر معمولی حالت" کے اعلان سے پنجاب سرحد اور دوسرے صوبوں میں کیا کیا کام لیا جاتا ہے بظاہر اب سب سے پہلے عبدالقیوم خاں کی حکومت کو اس کی زد میں آنا چاہئے۔

گرہستن کے حقوق

سلطانہ آصف فیضی

آج کل جمہوریت کے زمانے میں ہر شخص اپنے اپنے حق کے مطالبہ کے لئے کھڑا ہو گیا ہے۔ ہر جگہ ہڑتال پر ہڑتال ہو رہی ہے۔ بس چلانے والے، ٹرام چلانے والے، ورک شاپ کے مزدور، کالج کے طالب علم، مدرسوں کے معلم اور سڑک صاف کرنے والے مہتر، ہر ایک اپنا حق مانگ رہا ہے مگر تعجب ہے کہ اب تک عورتوں نے اپنے حق مانگنے کے لئے کہیں ہڑتال کی دھمکی نہیں دی!

عورتوں کے شہری حقوق سے ہمیں اس وقت بحث نہیں، صرف اس حق پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جو وہ گھر والی گرہستن کی حیثیت سے رکھتی ہے۔

ساری دنیا میں ایک گرہستن ہی ہے جو صبح سے لے کے شام تک اپنے بچوں کا اور شوہر کا کام کرتی رہتی ہے مگر نہ اس کو ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی ملتی ہے نہ سال بھر میں وہ مہینہ بھر کی تعطیل کی حق دار ہے۔ اس کے کام کا چرخہ صبح سے جب وہ بستر سے اٹھتی ہے رات گئے تک چلتا رہتا ہے۔ وہ کھانا ریندھتی ہے، سیتی پروتی ہے، گھر کو صاف کرتی ہے، کپڑے دھوتی ہے، بچے پالتی ہے، مہمانوں کی خاطر مدارات کرتی ہے، گھر کا حساب رکھتی ہے۔ وہ ہر حال میں شوہر کی خدمت اور رفاقت کا فرض انجام دیتی ہے بلا اچھے برے دن صبر و شکر سے اس کے ساتھ گذار دیتی ہے۔ ہمارے دیس میں تو عورت جب ایک دفعہ شوہر کے گھر جاتی ہے تو پھر وہاں سے مر کے نکلتی ہے۔ اپنے بچوں کے لئے اس کی جاں فشانی تو ضرب المثل ہے۔ اور اس کی قربانی کی داستانیں کتابوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ تو ہوئے اس کے فرائض۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں؟ قانون کی رو سے ایک گرہستن بی بی کو اس گھر پر جس کو وہ بناتی ہے، سنوارتی ہے۔ آباد رکھتی ہے، کیا حق دیا گیا ہے؟

سچ پوچھئے تو ہماری سماج کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اسے اس گھر میں جو اس کے خون جگر سے بنا ہے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز کا مالک قانوناً صرف شوہر ہے۔ شوہر کی زندگی تک اس کے روپے پیسے میں بی بی کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر شوہر سے نہ بنی تو وہ جب چاہے بی بی کو گھر سے نکال سکتا ہے، بچے تک اس غریب کے نہیں سمجھے جاتے۔ نہ سماج اس کا ساتھ دیتی ہے۔ نہ ملک کا قانون اس کو کوئی حق دیتا ہے۔ اس گھر میں جہاں اس کی جوانی بیتی، حسن و جمال کے ابتدائی دلکش دور گزرے۔ اس گھر میں جہاں صبح سے لے کر شام اور کبھی کبھی شام سے صبح تک اس نے ہر ایک کی دل و جان سے خدمت کی اس گھر میں موقع پڑنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایک بن داموں کی لونڈی یا بے تنخواہ کی ماما تھی۔ مالک ناخوش ہوا۔ اسے کان پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ چلو قصہ ختم ہوا۔

ان ہی سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا ویمنز کانفرنس نے عورتوں کے حقوق کا جو چارٹر تیار کیا ہے۔ اس میں گرہستن کے حقوق کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ ویمنز کانفرنس کے اس چارٹر میں لکھا ہے "گرہستن عورت کی محنت کو اب تک سماج کی طرف سے کوئی تحفظ یا حق نہیں دیا گیا۔ یہ بی بیاں جن کے دم سے گھر آباد رہتا ہے اور جو آئندہ نسل کی مائیں ہیں ان کا کام بھی سوسائٹی میں ویسا ہی اہم اور ضروری ہے جیسے سوسائٹی کی فلاح و بہبود اور حفاظت کے دوسرے کام ہیں۔ گرہستن کی خدمات اور محنت کو سوسائٹی نے اب تک اس حیثیت سے نہیں مانا ہے کہ اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے کوئی قانون بنایا ..."

اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ گھر بنانے والی اور آئندہ نسل پالنے والی ماں کے حقوق اور فرائض کی، اس کے درجے اور اس کی عزت کی حفاظت کی جائے۔ پس اگر سرکار یہ چاہتی ہے کہ سوشیل انشورنس کی کوئی اسکیم ایسی عورتوں کے لئے بنائے جو کھیت میں، فیکٹری میں، اسپتالوں میں اور مدرسوں میں کام کرتی ہیں تو ہم اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک گرہستن عورت کو بھی اس بیمے کا مستحق قرار دیا جائے، اور اس بیمے کے فنڈ کے لئے روپیہ شوہر کی تنخواہ سے ماہ بماہ کاٹ لئے جائیں تاکہ ضرورت اور مجبوری کی حالت میں وہ روپیہ گرہستن بی بی کو مل جائے۔ اس سے یہ تو نہ ہوگا کہ طلاق یا علیحدگی کے وقت بی بی کوڑی کوڑی کی محتاج ہو۔

اس خیال سے کہ گرہستن عورت کو بھی کچھ سکون کے لمحات میسر ہو سکیں، یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ شہروں میں سرکار کی طرف سے اور میونسپلٹی کی طرف سے ایسے مرکز قائم کئے جائیں جہاں گرہستن ماں شام کو اپنے بچے کو چھوڑ کے کچھ دیر سیر و تفریح کے لئے یا کسی علمی و ادبی مجلس میں شرکت کے لئے جا سکے اور ہر جگہ اپنا بچہ لادے لادے نہ پھرے۔ آج کل ہماری گرہستن جہاں جہاں جاتی ہیں مجبوراً بچوں کو ساتھ لے جانا پڑتا ہے، اور ان کی چیخ پکار، رونا، دھونا نہ صرف بے چاری ماں کے لئے بلکہ تمام حاضرین کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی معیشت کا پس منظر (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

کم ہے، اور قوت خرید کے اضافہ کے ساتھ استعمال اشیاء کی صنعتوں میں توسیع کی بہت گنجائش ہے صنعتی ترقی میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ملک کے اندر اشیاء سرمایہ تیار کرنے والی صنعتیں موجود نہیں ہیں۔ نہایت اہم چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے مثلاً مشینیں، کیمیاوی سامان، بجلی کے سامان اور اوزار، مشین سازی کے سامان موٹرکار، ریل کے انجن، بحری جہاز، ہوائی جہاز وغیرہ کے لئے ہم دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں، مجموعی طور پر ہندوستان کے بارے میں اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ تر کچا مال برآمد اور بنا ہوا مال درآمد کرتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر یہ اُمید پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان اپنی صنعتی خامیوں کو دور کر سکے گا اور متحدہ اقوام کے لئے مشرق میں اسلحہ خانے کا کام انجام دے گا۔ روجر کمیشن، ایسٹرن گروپ سپلائی کونسل اور گریڈی ٹیکنیکل مشن کی آمد سے اس بات کو اور تقویت حاصل ہوئی تھی کہ اگر بعض صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے مناسب قدم اُٹھائے جائیں گے تو ہندوستان کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی جنگ کی وجہ سے ان صنعتوں کو جو پہلے سے قائم تھیں ضرور فائدہ پہنچا۔ ہندوستان میں جو جنگی ٹھیکے دیئے گئے ان کی مالیت دس ارب تک پہنچ گئی۔ سرکاری سامان جنگ تیار کرنے والی ان فیکٹریوں کا کام جو ملک کے مختلف حصوں میں جنگ کے دوران میں قائم کی گئی تھیں اس کے علاوہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان نے جنگ کی ضرورتوں کا ۹۰ فی صدی حصہ پیدا کرنا شروع کر دیا اور اس نے جنگ کے مختلف محاذوں کو گولہ بارود بہت بڑی مقدار میں مہیا کیا۔ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو بھی بڑی مقدار میں مال تیار کرنے کے آرڈر دیئے گئے۔ اور انھیں بھی ملک کے صنعتی کام میں اضافہ سے فائدہ پہنچا۔ لیکن لائق توجہ یہ امر ہے کہ ملک کے صنعتی نظام میں جو بنیادی خامی، اشیاء سرمایہ کی صنعتوں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے تھی، اس کے دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ گریڈی مشن کی رپورٹ ٹھنڈے میں ڈال دی گئی اور ان صنعتوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں ہندوستان کے صناعوں کی کوئی مدد نہیں کی گئی۔ پھر صنعتی پیداوار کے اعداد کے دیکھنے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جہاں ایک طرف سرکاری آرڈروں میں اضافہ ہوا وہاں شہری آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا کام بہت کم رہ گیا آزادی ملنے کے بعد سے حکومت دل سے چاہتی ہے کہ یہ خامیاں دور ہوں، لیکن باہر کے ملکوں سے اس سامان کے حاصل کرنے میں دشواری ہو رہی ہے جس کے بغیر یہ کسی طرح دور نہیں ہو سکتیں۔

غرض یہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال ہے۔ اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ جتنی صنعتی ترقی ہوئی ہے اس نے کس حد تک روزگار کے بڑھانے اور آمدنی کی سطح بلند کرنے کے بنیادی مسئلے کو حل کرنے میں حصہ لیا ہے اس پر ہم "نئی روشنی" کی آیندہ اشاعت میں بحث کریں گے۔

زبانِ غیر سے فریاد میری (بہ سلسلہ صفحہ ۹)

کی طرف دیکھا اور بولا کہ اگر آپ حضرات کو اعتراض نہ ہو۔" ان لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نوجوان نے اس طرح تقریر شروع کر دی۔

"حضور والا اور محترم حضرات! مجھے بخوبی علم ہے کہ آپ کے لئے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے کہ ایک ملزم آپ کے حضور میں آکر اپنی بے گناہی کا حلف اُٹھائے......" نوجوان نے پوری تقریر دُہرا ڈالی، صرف "پیہم اور مسلسل نا مساعد حالات" کے الفاظ پر آکر رکا بورڈ کے ممبران نے اس موقع پر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور گورنر نے اس سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ لفظ ہی ایسے مغلق ہیں، تمھارا قصور نہیں" اور نوجوان نے پھر سلسلہ بیان شروع کیا۔

نوجوان جوں جوں بیان دُہراتا جاتا تھا، چارلی کے اندر ایک جان سی پڑتی جاتی تھی بیان کے دوران میں وہ نوجوان کے ہر ہر لفظ پر اپنے سر کی جنبش کے ساتھ زور دیتا جاتا تھا، اور آخر میں بے اختیار چلا اُٹھا "یہی ہے میری داستان"۔ "یہی ہے میری آپ بیتی" اور پھر پھوٹ کے رونے لگا۔

بوڑھے چارلی کو انھوں نے اس کی کوٹھری میں بھجوا دیا، ایک منٹ کے اندر بجلی کی سی تیزی سے سارے قیدیوں میں یہ خبر گشت کر گئی کہ چارلی نے آج کا زرین موقع بھی ہاتھ سے

نئی روشنی

اِدارۂ تحریر:

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا چار روپے آٹھ آنے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے، اور پرچہ جلد ملتا ہے۔

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں)

شرائطِ ایجنسی

۱۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔
۲۔ جس قدر پرچے منگوائے جائیں ان کی قیمت بعد وضع کمیشن پیشگی بھیجی جائے۔
۳۔ اگر پرچے رجسٹری سے منگوائے جائیں تو رجسٹریشن فیس ایجنٹ کے ذمہ ہوگی۔
۴۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جائیں گے۔
۵۔ وی پی سے اخبار دیر میں پہنچتا ہے اس لئے وی پی سے پرچے نہیں بھیجے جائیں گے۔

منیجر "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی

کر دیا۔ اس واقعے سے باقی ماندہ قیدیوں کے اندر ایک عجیب جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ جو نہایت سنگین مجرم تھے، جن کے دل و دماغ مجرمانہ سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ جنھوں نے نہ معلوم کتنے ڈاکے ڈالے تھے۔ کتنے خون کئے تھے، ان کے کٹھور دلوں میں بھی بوڑھے چارلی کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔

تحقیقاتی بورڈ کے سامنے یکے بعد دیگرے ملزم پیش ہو رہے تھے۔ لیکن اس واقعے کے بعد فضا بالکل بدل گئی۔ اب جب کوئی ملزم بورڈ کے سامنے جاتا تو سب سے پہلے کہتا "اگر حضور کی مرضی ہو تو اپنا بیان دینے سے پہلے بوڑھے چارلی کی بابت کچھ کہوں۔"

چنانچہ ایک نے کہا "جب مری ماں مری ہے تو چارلی میرے پاس آیا اور اس نے اُس آڑے وقت میں مری بہت مدد کی۔ دوسرے نے کہا" اگر جیل میں میرا کوئی مخلص دوست ہے تو صرف چارلی ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ ہر موقعہ پر میرے کام آئے" تیسرے نے کہا "اس نے مجھے جیل کے باغ سے ایک گلدستہ بنا کر دیا جو میں نے اپنی بیوی کو تحفے میں دیا" اور چوتھے نے کہا "میں جب جیل میں آیا ہوں تو بالکل بچہ تھا، چارلی نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔"

غرض جو آتا چارلی کی ہمدردی، خلوص اور محبت کے قصے بیان کرتا۔ ان شہادت دینے والے قیدیوں میں بعض ایسے بھی تھے جنھیں خود اپنا معاملہ سمجھانے کے لئے الفاظ بڑی مشکل سے ملتے۔ مگر اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک اتنا ضرور کہتا "یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی رہائی کی بڑی تمنا ہے۔ لیکن چارلی مجھ سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے"

چارلی کے اخلاق اور کردار کے متعلق جن لوگوں نے شہادتیں دی تھیں وہ ایسے سنگین اخلاقی مجرم تھے کہ ان کے حلفیہ بیانات بھی دنیا کی کسی عدالت میں قابل اعتبار نہ سمجھے جاتے، لیکن چارلی کے معاملے میں ان کے ہر لفظ سے خلوص، ہمدردی، اور سچائی ٹپکتی تھی۔

جب آخری آدمی اپنی شہادت دے چکا تو گورنر ممبران بورڈ کو مخاطب کرکے بولا "محترم حضرات! یہ قیدی گریگوری ——— کچھ عجب قصہ ہے ——— کوئی نظیر سمجھ میں نہیں آتی میں تو ——— (رک کر اور گلا صاف کرکے) یہ سمجھتا ہوں کہ آزمائش کے طور پر......" اور دوسرے اراکین نے بھی سر کے اشارے سے اس کی پر زور تائید کی......

(ترجمہ)

پرنٹر و پبلشر: عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)
مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۲ | ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

ٹوٹے دِلوں کو جوڑیے

آچاریہ ونوبا بھاوے

(ہم نے ۲۲ اگست کو "جانی پہچانی آواز" کے عنوان سے آچاریہ ونوبا بھاوے کی اس تقریر پر جو انھوں نے اندور میں ۱۷ اگست کو مسلمانوں کے ایک جلسے میں کی تھی، ایک چھوٹا سا نوٹ لکھا تھا۔ اب ونوبا جی کی تقریر کی رپورٹ ہمارے پاس پہنچی ہے اور وہ ہم اس پرچے میں دے رہے ہیں۔ ذرا غور سے پڑھئے اور بتائیے کیا زبان لہجے اور مضمون کے لحاظ سے یہ نہیں لگتا کہ ہم وہی سیدھی سادی، سچی، کھری اور پھر بھی کومل اور میٹھی باتیں سُن رہے ہیں جو اس سال ۲۹ جنوری تک روز چھ بجے شام کو سنا کرتے تھے؟ کیا یہ وہی حق اور انصاف کی، انسانیت اور شرافت کی، خلوص اور محبت کی جانی پہچانی آواز نہیں ہے۔ آپ اس تقریر کو خطابت کی ترازو میں تولیں تو ہلکی ہی ہوگی۔ لیکن اگر یہ سمجھ کر پڑھیں کہ ان لفظوں کو جو دیکھنے میں ہلکے پھلکے ہیں پکے یقین اور اٹل ارادے کا سیسہ پلایا گیا ہے تو آپ کو ان میں اتنا وزن محسوس ہوگا کہ اُٹھانا مشکل ہو جائے گا)

دن بھر اتنا بولنا پڑا ہے کہ مجھے (دھک) زیادہ بولنے کی شکتی نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ بھائی پریم سے یہاں آ گئے ہیں تو دو چار باتیں کہوں گا۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ آج کل میں رہتا ہوں اور مسلمان سنکٹ (مصیبت) میں پڑے ہوئے لوگوں کی سیوا کر رہا ہوں۔ ان میں ہندو مسلمان دونوں ہیں جہاں جہاں میری پہنچ ہے جتنا بن سکتا ہے کرتا ہوں۔ میں مسلمانوں کا سوال میں نے ہاتھ میں لیا ہے اور میرا خیال ہے وے اب ہندوستان میں ایک بہت دُکھ کی بات ہو گئی ہے۔ "ہندوستان میں دو قومیں ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں" ایسا وچار پاکستان کے پریمیوں نے پھیلایا۔ ہم لوگ نہیں مانتے تھے۔ شکایتیں تھیں پرنتو (پر) ان کا علاج بھی تھا۔ علاج یہ نہیں تھا کہ کروڑوں لوگ وطن چھوڑ کر باہر جائیں۔ بھائی چارہ ہونے سے ہی سمسیا (مسئلے) کا حل نکل سکتا تھا اور نکل سکتا ہے۔ پرنتو یہ مسلمانوں کو نہیں سوجھا۔ بعد میں جو گھٹنائیں گھٹیں وہ بڑی دکھ دائی ہیں (جو واقعات ہوئے بڑے تکلیف دہ ہیں) میں نے سُنا ہے کہ یہاں کے بھی بہت مسلمان حیدر آباد اور دوسری جگہ گئے اور پھر انھیں وہاں سے یہیں لوٹنا پڑا۔ وے اب کافی مصیبت میں ہیں۔ انھوں نے غلطی کی۔ کنتو (لیکن) اگر وے یہاں پھر آ گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی مدد کریں۔ اس طرح ہم دل کے ساتھ دل کو جوڑ سکیں گے اور ایسا ہوگا تو پھر دونوں ایک ہو سکیں گے۔ آخر دونوں الگ کہاں ہیں ہی نہیں۔ صرف عبادت کے پرکار (طریقے) الگ ہیں وے رہیں۔ جو مسلمان یہاں ہیں، وہ یقین رکھیں کہ انھیں سمپورن مذہبی آزادی رہے گی۔ پرنتو مسلمان بھائیوں سے میں کہوں گا کہ آپ کو ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جانا چاہیے۔ عبادت کا طریقہ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے محبت رکھی جا سکتی ہے۔ ایسی محبت رکھیے۔ اس دیس کو اپنا وطن مانیے۔ دیس آپ ہی کا ہے۔

میں آپ سے کہوں گا کہ آپ یہاں کی بھاشا بھی سیکھیے۔ ناگری تو آپ جانتے ہی نہیں۔ آپ میں سے کچھ نے انگریزی تھوڑی سی سیکھ لی ہے۔ پرنتو ہندی تو نہیں سیکھی۔ یہاں کے بھائیوں کی بھاشا، لپی (زبان اور رسم خط) سیکھنے سے پریم بھاؤ (کیف محبت) بڑھے گا۔ ابھی جو بھائی یہاں بول کر گئے، وے جو کچھ بولے اسے سب لوگ نہیں سمجھ سکے۔ میں اس لیے سمجھ سکا کہ میں کچھ فارسی، عربی، اردو جانتا ہوں۔ آپ کی بھاشا یہاں کے لوگ سمجھ سکیں ایسی ہونی چاہیے۔ باہر کے جھگڑوں کا اثر ہمیں یہاں نہیں ہونے دینا چاہیے اور آپس میں پریم سے رہنا چاہیے۔ اسی طرح سب کہیں ہوا تو ٹوٹے دلوں کو جوڑنا آسان ہو جائے گا اور بچھڑے بھائی کبھی نہ کبھی ایک ہوں گے۔

"ہم اللہ والوں نے اس شیوے کو بھول گئے کہ اپنے عقیدے کی خاطر جان دے دیں۔ مگر بدلہ لینے کے لئے دوسرے پر ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہم یہ بھی بھول گئے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے تشدد سے کام لیں اور اس میں اپنی جان پر کھیل جائیں۔ ہندو مسلم اتحاد اگر ہمارے مردوں اور عورتوں کا بھائی چارہ نہیں تو پھر بے کار چیز ہے۔ ہمیں سدا ایک دوسرے پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ مگر آخر میں اپنے آپ اور خدا کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اب جو کچھ بھی ہو دونوں فرقے ہندوستان سے اس طرح وابستہ ہیں کہ کسی طرح الگ نہیں ہو سکتے۔ ان کی جڑیں اسی زمین میں پیوست ہیں وہ یہیں پیدا ہوئے اور انھیں یہیں مرنا ہے۔ اگر اپنی خوشی سے نہ ملے تو قدرت انھیں مل جل کر امن وامان سے رہنے پر مجبور کرے گی۔"

"گاندھی جی"

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
ٹوٹے دلوں کو جوڑیے	آچاریہ ونوبا بھاوے	۱	مغربی دنیا		۶
سیلون میں ہندوستانیوں کی حالت	پرنسپل عبدالشکور	۲	مصنف (نظم)	اختر انصاری	۷
			غزل		۷
بحران کا وقت	(اداریہ)	۳	ٹیگور کے گیت	ڈاکٹر مسعود حسین	۷
بزم ماتم		۳	مجذوب کی بڑ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
پچھلا ہفتہ			اردو ناگری حرفوں کے نام	سید مسعود حسن رضوی	۹
۱۔ ہندوستان		۴	یورپ کا خط	نامہ نگار خصوصی	۱۰
۲۔ پاکستان		۵	ترکی کے پچھلے پچیس سال	(ترجمہ)	۱۱

سیلون میں ہندوستانیوں کی حالت

پرنسپل عبدالشکور۔ رام پور

حال ہی میں سیلون کے نمایندوں کے ایوان میں ۱۸ ووٹوں کی اکثریت سے یہ بل منظور ہوا ہے جس کی رو سے صرف وہ ہندوستانی سیلون کے شہری ہونے کا حق حاصل کرسکیں گے جو ۱۹۳۹ء سے متواتر سات سال تک اس جزیرے میں مقیم ہوں گے حالانکہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ یہ سات سال کی مدت ۱۹۳۹ء سے شمار کی جائے۔ لیکن اس ہمسایہ جزیرے کے ایوان حکومت نے ہندوستان کا یہ مطالبہ مسترد کردیا۔ اور اپنے پہلے فیصلے پر قائم رہا۔ اس سے اندیشہ ہے کہ ہندوستان اور سیلون کے درمیان تلخی پیدا ہو، اور آگے چل کر سیلون میں بھی ہندوستانیوں سے وہی ناروا سلوک شروع کردیا جائے جو ہندوستان کے ساتھ جنوبی افریقہ میں مدت مدید سے ہو رہا ہے۔

جنگ کے دوران میں جب سیلون پر غنیم کے حملے کا قوی اندیشہ تھا، بہت سے ہندوستانی سیلون کی حکومت کے مشورے کے مطابق ہندوستان واپس آگئے تھے۔ حقیقت میں ان کا ہندوستان کو اُن حالات میں واپس آنا ایک نوع کی امداد تھی جو انھوں نے سیلون کے ساتھ کی، لیکن اس ہمدردی کے جذبے کا سیلون کی حکومت اور اس جزیرے کے نمایندوں پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اور جنگ کے اختتام پر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوبی افریقہ کے ساتھ ساتھ سیلون کی سرزمین بھی ہندوستانیوں کے لئے تنگ سے تنگ تر ہوتی جا رہی ہے۔ گذشتہ سال یو، این، او کے عام اجلاس میں جنوبی افریقہ کے ظالمانہ رویّے پر لعنت لے دے کی۔ لیکن جنوبی افریقہ کے رویّے میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا، اور آج تک وہ اسی ظالمانہ پالیسی پر کاربند ہے جو اب سیلون رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کے خلاف اختیار کر رہا ہے۔

سیلون کو یہ حق ہے کہ وہ آیندہ ہندوستانیوں کی اپنے ملک میں درآمد بالکل بند کردے، لیکن ان ہندوستانیوں کے خلاف ناروا اور ظالمانہ رویہ اختیار کرنا جو مدت سے وہاں مقیم ہیں اور جنھوں نے اس جزیرے کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ جس روز ہندوستانیوں کو سیلون یا جنوبی افریقہ میں شہری اور وطنی حقوق حاصل ہو جائیں گے اسی دن سے ہندوستان کی حکومت سے ان کا سیاسی تعلق ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی تعلق ان سے باقی رہے گا تو وہ صرف اخلاقی اور تمدنی ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ برما اور سیلون دونوں ملکوں میں ہندوستانی کچھ زیادہ ہردل عزیز نہیں ہوئے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے ان مقامات پر پیسہ بنایا، ثروت حاصل کی اور دولت کمانے میں کامیاب اور سرخ رو ہوئے۔ ان میں سے بہت سے دولت کما کر اپنے ملک کو واپس آگئے۔ اور ان ملکوں کی آبادی پر ناخوش گوار اثر چھوڑ گئے مگر ان کے ساتھ ساتھ ہزاروں ایسے بھی ہندوستانی ہیں جنھوں نے سیلون کو اپنا مستقل وطن بنا لیا اور اسی خاک سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوگئے۔ جنگ کے دوران میں سیلون کی حکومت کے بلانے پر بھی ہندوستان کے مزدور سیلون جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس لئے جب یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سیلون میں جس قدر ہندوستانی موجود ہیں وہ وہاں کے مستقل باشندے ہیں۔ اس لئے انصاف کی رو سے ان کو وہ حقوق ملنا چاہئے جو سیلون کے عام باشندوں کے لئے قانون مروجہ کی رو سے مل سکتے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ نمایندوں کی ایوان میں جب یہ بل پیش ہوا تو قدم قدم پر مختلف سیاسی جماعتوں کے نمایندوں نے اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی اور محض نامزد شدہ ممبروں کی امداد سے حکومت اس بل کو منظور کرانے میں صرف اٹھارہ کی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ سیاسی جماعتوں کی مخالفت اس صالح سیاسی شعور کا پتہ دیتا ہے جو اب رفتہ رفتہ سیلون کی فضا پر چھاتا جا رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اس بل کا منظور ہونا ان تعلقات کو تلخ کردے گا جو ہندوستان اور سیلون کے درمیان قائم ہیں اور دنیا کی رائے عامہ بھی اس بل کی مخالفت پر ہمیشہ کمربستہ رہے گی۔ اس بل کا ایک نمایاں اثر یہ ہوگا کہ اسی لاکھ ہندوستانی سیلون کے شہری حق سے ہمیشہ کے لئے محروم کردیے جائیں گے۔ ان کی آواز ایوانِ حکومت تک نہ پہنچ سکے گی، اور کسی ملک سے ان کی سیاسی وابستگی قائم نہ رہے گی۔ خود وزیر اعظم نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ ان ہندوستانیوں کو ہندوستان واپس کرنا چاہتے ہیں جن کی اب سیلون کو ضرورت نہیں ہے۔ سیلون کے مفکرین کو یہ خطرہ ہے کہ وہاں کا اصلی باشندہ تجارت میں ہندوستانیوں کے مقابلے میں سرسبز اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ بات کو ذرا پیچ دے کر فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے قیام سے ان کو یہ خطرہ دامن گیر ہے کہ ان کی موجودگی وہاں کے معاشرتی معیار کو پست کردے گی لیکن یہ مفکرین آسانی سے فراموش کردیتے ہیں کہ جن ہندوستانیوں کو واپس کرنے کی تجویز ہو رہی ہے وہ سیلون میں ہی پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ ان کو شہری حقوق سے محروم کرنا ایک ایسا ظلم ہے جس کی مثال صرف سرزمین جنوبی افریقہ میں تو مل سکتی ہے۔ مگر اور کہیں مشکل سے ملے گی۔ سیلون کی حکومت کی جانب سے یہ صفائی پیش کی جاتی ہے کہ یہ بل کسی قومی یا نسلی تعصب کی بنا پر پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ محض اقتصادی بنا پر معرض وجود میں آیا ہے۔ اس کی مثالیں فلسطین اور جنوبی افریقہ کے معاملات میں پائی جاتی ہیں۔ یہودیوں سے عربوں کی مخالفت محض نسلی نہیں ہے بلکہ اقتصادی ہے دولت مند اور کفایت شعار یہودی کے مقابلے میں عربوں کا اقتصادی میدان میں گوئے سبقت لے جانا ناممکن ہے۔ اسی طریقے پر جنوبی افریقہ میں ڈچ اور یہودی دونوں وہاں کی ہندوستانی آبادی کی کفایت شعاری اور سادہ زندگی کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہیں، اور اس بنا پر وہاں آئے دن ہندوستانیوں کے خلاف نت نئی پابندیاں اس لئے عاید کی جاتی ہیں کہ اس سرزمین سے ہندوستانی نیست و نابود ہو جائے۔

اس موقع پر یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ سیلون کا یہ مجوزہ بل حقیقت میں ایک سیاسی چال ہے جس پہلو پر عموماً کم توجہ کی گئی۔ وہاں کا ہندوستانی سیاسی اعتبار سے بیدار، روشن خیال اور باخبر ہے جس کے مقابلے میں وہاں کے مقامی مزدور عموماً جاہل اور بے خبر ہیں۔ اور اپنی جہالت اور بے خبری کی بنا پر مزدوروں کی کثیر آبادی موجودہ حکومت سے تعاون کرنے پر آسانی سے تیار ہو جائے گی اور انتخابات کے موقع پر اس کی امداد کرے گی۔ اگرچہ حکومت کے نمایندوں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بڑی اکثریت ہے، حکومت کو خوف ہے کہ اگر ہندوستانی مزدوروں کی تعداد میں معتدبہ تخفیف نہ ہوئی تو ان کی موجودگی انتخابات کے موقعے پر موجودہ حکومت کے مفاد کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ اس لئے انھیں ووٹ سے محروم کردینا چاہئے، اور جہاں تک ہوسکے اُن کی تعداد کو اس حد تک کم کردینا چاہئے کہ آیندہ ان سے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اس قسم کا ناروا اور ظالمانہ سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ جنوبی افریقہ سے شروع ہوا، اس کا تتبع اب سیلون کر رہا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس کے خطرناک جراثیم آہستہ آہستہ ملایا، سنگاپور، فیجی، ماریشس، مشرقی افریقہ اور مغربی افریقہ تک پہنچ جائیں، جہاں ہندوستانی کثیر تعداد میں عرصے سے آباد ہیں۔ عنقریب پیرس میں یو، این، او کے اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے والا ہے اور کوشش جاری ہے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اس اجلاس کے موقع پر ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے شامل ہوں۔

اس اجلاس میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ پیش ہونے والا ہے، اس موقع پر یقیناً ان مظالم کا ذکر ہوگا۔ جو ان کے ساتھ وہاں کی حکومت ان پر ہمیشہ تراشتی رہتی ہے۔ مگر سیلون کے مجوزہ بل کی وجہ سے ہندوستانیوں کا معاملہ کمزور پڑ جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے نمایندے بڑے شد و مد کے ساتھ اس بل کا ذکر کریں گے، اور ان کے لئے یہ دلیل ہو جائے گی کہ جب سیلون جو ہندوستان سے اس قدر قریب اور تمدنی اعتبار سے ہم آہنگ ہے یہ بل عالم وجود میں لاسکتا ہے تو جنوبی افریقہ یہ پالیسی کیوں نہ اختیار کرے، اور ان ہندوستانیوں کو ہندوستان واپس نہ کردے جن کی موجودگی اس ملک میں بے چینی اور انتشار پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل بیانات جو اخباروں میں شائع ہوئے ہیں دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ہفت روزہ

نئی روشنی دہلی

۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء

بحران کا وقت

واقعات کی رفتار جو پچھلے ہفتہ رہی اس نے اس امید کو بہت کم زور کر دیا کہ کشمیر کا مسئلہ اور حیدرآباد کا مسئلہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے گا۔ مصالحت کی کوشش اب بھی جاری ہے۔ خدا کی قدرت اور انسان کی عقل سے مایوس اب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اپنے قلب و دماغ کو اس کے لئے تیار رکھنا چاہیے کہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر فوجی کارروائیوں کی خبریں سننے میں آئیں اور یہ سوچنا چاہیے کہ ایسی حالت میں ہمارا کیا فرض ہے؟

سب سے پہلے ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات صاف کر لینی چاہیے کہ ان دونوں معاملوں میں ہماری حکومت کا رویہ مجموعی طور پر صحیح اور حق بجانب ہے۔ یوں تو ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو کی تائید میں اچھی خاصی دل کو لگتی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ خطابت اور وکالت کا مقصد قدیم زمانے سے لے کر آج تک یہی رہا ہے کہ کمزور دلیل کو قوی بنا کر دکھایا جائے، اور یہ دونوں فن برابر ترقی کرتے رہے ہیں لیکن خوش قسمتی سے شائستہ تعلیم کے ساتھ ساتھ سخن فہمی میں بھی ترقی کی ہے، وکیلوں کی لفاظی کی منطق کے ساتھ ساتھ جھوٹ سچ کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے کی مشق بھی بڑھ گئی ہے۔

جہاں تک کشمیر کے معاملے کا تعلق ہے چودھری ظفر اللہ خان صاحب نے جنھیں قانونی بحث اور مناظرے میں حیرت انگیز مہارت ہے، یو۔ این۔ او میں پاکستان کی وکالت کا پورا حق ادا کر دیا تھا، اور اب یو۔ این۔ او کے کشمیر کمیشن کے سامنے بھی اپنے مقدمے کو بڑی قابلیت سے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن قانونی باریکیوں کے اس طلسم میں جو چودھری صاحب نے باندھا ہے کشمیر کمیشن ہی کو نہیں بلکہ ہر شخص کو جس کی آنکھیں کھلی ہیں یہ موٹی سی بات صاف نظر آ گئی ہے کہ معاملے کی جو تصویر انھوں نے یو۔ این۔ او کے سامنے پیش کی وہ بالکل غلط تھی۔ پاکستان ابتدا سے قبائلی حملہ آوروں کی پوری مدد کر رہا ہے، اس کی فوجیں ایک عرصے سے ان کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ اس حقیقت کے کھل جانے کے بعد جسے چودھری صاحب نے جب تک چھپا سکتے تھے چھپایا۔ کشمیر کمیشن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ صورت حال بدل گئی ہے اور رائے شماری کی شرائط طے ہونے سے پہلے پاکستان کی فوجوں کا کشمیر سے ہٹنا ضروری ہے۔ چودھری صاحب کا اصرار ہے کہ پہلے ہندوستان اس رزولیوشن کو مان لے جو یو۔ این۔ او نے رائے شماری کے بارے میں پاس کیا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے کہ ان کے ڈھکے ہوئے پردے کے اٹھ جانے کے بعد یو۔ این۔ او کے رزولیوشن کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی ہے، اور اب اس کو سارے معاملے پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔ بہرحال ان باتوں میں کتنے ہی پیچ کیوں نہ ہوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمیشن کی صلح کی تجویز کو ہندوستان نے بغیر کسی قید کے مان لیا ہے، اور پاکستان اس کے ماننے کے لئے ایسی شرطیں لگا رہا ہے جن پر ہندوستان تو کیا کمیشن تک غور کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے اگر صلح کی کوشش خدانخواستہ قطعاً ناکام رہی تو اس کی ذمہ داری سراسر پاکستان پر ہوگی۔

اب رہا حیدرآباد سو اس کو تو کوئی چودھری صاحب سا مناظر اور وکیل بھی نہ ملا جو تھوڑے دن تک کمزور دلیل کو قوی بنا کر دکھا سکتا۔ اس اشتراکیت اور جمہوریت کے زمانے میں دنیا میں کون ہوگا جو قاسم رضوی صاحب کے اس نامبارک ارادے کی تائید کرے "ہم ہرگز حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے" یہ مسٹر چرچل تک جن کی آنکھوں میں آزاد ہندوستان کو دیکھ کر خون اتر آتا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ حیدرآباد کے معاملے کو جمہور کی رائے سے طے ہونا چاہیے۔

یہ یاد رکھیے کہ حیدرآباد کا اصل مسئلہ ذمہ دار حکومت اور رضاکاروں کا ہے۔ دوسرے قصے محض اس لئے چھیڑے گئے ہیں کہ ان دو سوالوں کی طرف سے توجہ ہٹ جائے۔ اگر آج اعلان کر دیا جائے کہ حیدرآباد میں جمہور کی ذمہ دار حکومت قائم کی جا رہی ہے اور رضاکاروں کی تنظیم توڑی جا رہی ہے تو حکومت ہند مطمئن ہو جائے گی اور دوسرے مسائل کے فوراً طے ہونے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایک نجی سیاسی فوج اور ایک غیر ذمہ دار حکومت کا وجود اور اس کی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں نہ صرف حیدرآباد کے لوگوں کے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے سوہان روح ہیں۔ حکومت ہند نے انتہائی صبر سے کام لیا ہے۔ اس سے زیادہ صبر کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جا سکتا۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ ہماری حکومت کا طرز عمل دونوں معاملوں میں ایسا ہے جس پر کسی انصاف پسند کو اعتراض نہیں ہو سکتا، ہمارا کھلا ہوا فرض ہے کہ ہم اس کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ اس وقت حکومت ہم سے صرف یہ چاہتی ہے کہ ملک میں امن اور سکون کی فضا قائم رکھیں خصوصاً فرقہ وارانہ جھگڑے نہ اٹھنے دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی پوری آبادی دل و جان سے حکومت کی اس خواہش کو پورا کرنے کو تیار ہے لیکن اگر کہیں اکا دکا ایسے شریر اور فتنہ انگیز لوگ موجود ہیں جو اس نازک وقت میں گڑبڑ پیدا کر کے حکومت کو پریشان کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ رائے عامہ کے دباؤ سے ان کو روکیں۔ ورنہ پھر ظاہر ہے کہ حکومت ان کو بے دردی کے ساتھ کچلنے پر مجبور ہوگی۔ بیرونی خطرے کی حالت میں دنیا کی کوئی حکومت اندرونی فساد کو برداشت نہیں کر سکتی۔

ہمیں زیادہ خطرہ اس کا نہیں کہ لوگ جان بوجھ کر فساد برپا کریں گے، بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ کہیں گھبراہٹ یا جوش کی حالت میں ان سے اضطراری طور پر ایسی حرکتیں سرزد نہ ہوں جن سے فضا بگڑ جائے۔ ملک کو اس وقت ہمارے جوش و خروش سے کہیں زیادہ ہمارے صبر و سکون کی ضرورت ہے۔ جو شخص خاموشی اور اطمینان سے اپنا کام کرتا رہے، افواہوں

م سے پریشان نہ ہو، ہم اور دوسرے متاثر نہ ہو، وہ ملک کا حقیقی بہی خواہ اور قوم کا سچا خادم ہے۔

بزم ماتم

قائداعظم محمد علی جناح ۱۱ ستمبر کو رات کے ساڑھے دس بجے دنیا سے اٹھ گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور سب عزاداروں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آج سارے پاکستان میں ان کا ماتم ہو رہا ہے اور دنیا کا ہر ملک بہ قدر تعلق اس میں شریک ہے۔

مرحوم نے ہندوستان کی اور دنیا کی سیاست پر جو انقلاب انگیز اثر ڈالا اس کے مفید یا مضر ہونے کے بارے میں شدید اختلاف ہے مگر اس بات پر موافقین اور مخالفین سب متفق ہیں کہ مرحوم کی شخصیت تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہوگی۔ مرحوم کے ذاتی اوصاف نے ابتدا سے لوگوں کے دلوں پر ان کا سکہ بٹھا دیا تھا اور وہ روز بروز گہرا ہی ہوتا گیا۔ ان کی ذہانت اور فراست، سرعت فہم اور دقت نظر، متانت اور خودداری، ارادے کی قوت اور اخلاقی جرأت، خلوص اور دیانت، صاف گوئی اور سخت گیری نے مل کر ان کے اندر وہ ہیبت و وقار پیدا کر دیا تھا جو اس زمانے کے چوٹی کے ارباب اقتدار میں شاید ہی کسی میں پایا جائے۔ جس زمانے میں انگریزی حکومت کا رعب ہندوستان میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کے لئے ایک معمولی انگریز سے آنکھ ملانا مشکل تھا اس زمانے میں مرحوم نے انگریز ججوں، گورنروں اور وائسرائیوں سے ٹکر لی، اور ان کے دانت کھٹے کر دئیے۔ آخر میں اپنی سیاسی مصلحتوں سے ان کو برطانوی حکومت کا حلیف بننا پڑا لیکن اس میں بھی ان کی یہ شان رہی کہ ہر انگریز محسوس کرتا تھا کہ اس دبلے پتلے نحیف و ناتواں آدمی سے صرف کاروباری اصول پر برابر کا معاملہ ہو سکتا ہے اس کو خریدا نہیں جا سکتا، دبایا دھمکایا نہیں جا سکتا۔

ہمارے ہمسایہ ملک پاکستان کے لئے جو کل تک ہمارے جسم کا ٹکڑا تھا یہ حادثہ بہت سخت اور یہ وقت بہت نازک ہے۔ ہمیں اپنے پاکستانی بھائیوں سے اس مصیبت میں قلبی ہمدردی ہے ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو اس کے برداشت کرنے کی ہمت دے اور ان کو اس نازک وقت میں کوئی ایسا رہبر مل جائے جس میں قائداعظم مرحوم کی صفات کا پرتو بھی موجود ہو اور اس کے ساتھ ساتھ صلح جوئی، سلامت روی، دل کشی اور دلنوازی بھی ہو تاکہ وہ پاکستان کے اندر سب فرقوں اور جماعتوں کو ساتھ لے سکے۔ اور ہندوستان اور باہر کے ملکوں سے خوش گوار اور دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکے۔

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

صلح کی صرف یہی صورت ہے

کشمیر کمیشن نے اپنی صلح کی تجاویز شائع کر دی ہیں۔ کشمیر اور جموں کے مسئلے کا آخری حل کمیشن نے عام رائے شماری ہی کو قرار دیا ہے اور متحدہ اقوام کی نگرانی میں اس کام کو پورا کرنے کی تائید کی ہے۔ لیکن چونکہ متحدہ اقوام کی انجمن کے پاس اپنی کوئی فوج اور پولس نہیں ہے اور نہ وہ اپنا ذاتی عملہ، ریاست کے انتظام کو عارضی طور پر چلانے کے لئے مقرر کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ مقامی حکام کی مدد لینے پر مجبور ہے۔ یہ مدد کس سے لی جاتی؟ ہندوستان یا پاکستان سے یا دونوں سے؟ اگر دونوں سے تو کس کس تناسب سے؟ سو اس معاملے میں کمیشن نے ہندوستان اور شیخ عبداللہ کی حکومت پر بھروسہ کیا ہے پاکستان پر نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انصاف کے خلاف ہے، اور یہ بات ظفر اللہ خاں صاحب نے کہی بھی ہے۔ لیکن ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت لائق عمل نہیں تھی۔ متحدہ اقوام کو یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر کی جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ ریاست کے مسلمان عوام نے ریاست کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت کر کے ایک آزاد حکومت قائم کر لی ہے وہ لڑ رہے ہیں اور اُن کی مدد اُن کے ہم مذہب قبائلی کر رہے ہیں۔ لیکن کشمیر کمیشن جیسے ہی پاکستان پہنچا تو اس کو بتایا گیا کہ اب پاکستان کی فوجوں نے بھی اپنے خلاف ہندوستان کے حملے کا دروازہ بند کرنے کے لئے کشمیر میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔ کشمیر کمیشن کو جب تحقیقات کرنے اور اپنی تجاویز مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا تو وہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر میں موجود نہیں ہیں۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ پاکستان کی فوجیں محض مدافعت کے لئے لڑ رہی ہیں۔ کمیشن نے پاکستان کی اس بات کو مان لیا اور جب اس نے جنگ بند کرنے کی تجویزیں بنائیں تو ان میں سب سے مقدم اس بات کو رکھا کہ پاکستان اپنی فوجیں واپس بلا لے کیونکہ جب جنگ بند ہو جائے گی تو حملے کا خطرہ بھی ختم ہو جائے گا اور کشمیر میں پاکستان کی فوجوں کے رہنے کی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی۔ اسی طرح قبائلیوں کو بھی کشمیر سے واپس بلانے میں پاکستان کو پوری مدد کرنا ہوگی۔ یہ لوگ پاکستان کے بیان کے مطابق اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد ایسے زمانے میں کرنے کے لئے گئے تھے جب کہ ان پر ظلم توڑے جاتے تھے اور ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ مجوزہ صلح کے بعد جب کہ متحدہ اقوام کے نگراں ہر بات کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کشمیر میں موجود ہوں گے اُن کا وہاں رہنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ کمیشن کے کام میں رکاوٹ کا موجب ہو سکتا ہے۔

رہا کشمیر کی آزاد حکومت کا معاملہ چونکہ اس کے وجود کو ابھی تک دوسری حکومتوں کا تو کیا ذکر خود پاکستان کی حکومت نے تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کا کوئی باقاعدہ نظم و نسق نہیں ہے اس لئے اس کے قبضے میں جو علاقہ ہے اس کا انتظام کشمیر کمیشن جب تک رائے شماری کا فیصلہ معلوم ہو اپنی نگرانی میں کرے گا۔

اب رہا کشمیر اور جموں ریاست کے بقیہ حصے کا انتظام اور ہندوستان کی فوجوں کو واپس بلانے کا سوال، سو بقیہ علاقے کا انتظام چونکہ شیخ عبداللہ کی مسلمہ اور مستحکم حکومت باقاعدگی کے ساتھ کر رہی ہے، اس لئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ رائے شماری کا مخصوص کام کمیشن اپنی مکمل نگرانی میں انجام دے گا۔ شیخ عبداللہ کو اندرونی امن و انتظام قائم رکھنے اور غیر منظم قبائلیوں سے کشمیر کی سرحد کی حفاظت کرنے کے لئے کچھ باقاعدہ فوج کی ضرورت ہوگی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی فوج سے کام لیا جائے گا، اور اس کی ایک مناسب تعداد کو جس کا فیصلہ کمیشن کے مشورے سے کیا جائے گا، کشمیر میں اس طرح رکھا جائے گا کہ وہ عام رائے شماری کے کام میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ باقی ہندوستانی فوج کشمیر سے واپس بلا لی جائے گی۔

انتظام کی صرف یہی ایک صورت قابل عمل تھی اس لئے اسی کو کمیشن نے تجویز کیا کیونکہ اگر ہندوستان اور پاکستان دونوں کی فوجوں کو کشمیر میں رکھا جاتا تو ذرا سی بات پر دونوں میں جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ شیخ عبداللہ کی حکومت اور ہندوستانی فوج کی موجودگی سے رائے شماری کا کام غیر جانب داری سے نہ ہو سکے گا۔ لوگ ان سے مرعوب ہو کر اپنی آزادانہ رائے نہیں دے سکیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں جو لوگ مذبذب ہیں البتہ ان پر اس کا ضرور اثر پڑے گا لیکن جو لوگ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے ہیں ان کی رائے کو موثر بنانے کے لئے متحدہ اقوام کی طرف سے بہت سے نگراں موجود رہیں گے۔ ان کو پاکستان کی موافقت میں اپنے خیال کے اشاعت کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اس آزادی میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے گی تو وہ ساری دنیا کو جس کے اخباری نمائندے کشمیر میں موجود ہوں گے متوجہ کر سکیں گے۔

اگر جیسا کہ پاکستان کا دعویٰ ہے کشمیر اور جموں کی غالب اکثریت دل و جان سے پاکستان میں شرکت کی تائید میں ہے تو شیخ عبداللہ کی حکومت اور ہندوستانی فوج کی موجودگی کی وجہ سے اس میں سے تھوڑے سے ووٹ شاید ٹوٹ جائیں باقی سب کے ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے آزادی عطیہ کے طور پر نہیں ملتی اس کو قربانی کے ذریعے حاصل کرنا ہوتا ہے اگر اپنے ضمیر اور ایمان کے مطابق رائے دینے کی وجہ سے ان لوگوں کو کچھ قربانی بھی کرنا پڑے تو اس کے لئے انھیں تیار رہنا چاہیے۔ شیخ عبداللہ اور ان کی جماعت نے کشمیر کی رہنمائی کا حق اسی قربانی کے ذریعے حاصل کیا۔ انھوں نے ڈوگرا فوج اور مہاراجہ کشمیر کی حکومت کی مخالفت کے باوجود انتخابات جیتے ہیں اگر سردار محمد ابراہیم اور چودھری غلام عباس میں ہمت ہے تو وہ بھی آگ میں کود دیں، اور اپنا رہنمائی کا حق تسلیم کرائیں ورنہ شیخ عبداللہ کے راستے سے ہٹ جائیں کشمیر بہت تباہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کے کسی محب وطن کو اب ایک لمحہ کے لئے بھی تباہی کو جاری رکھنے میں مدد نہیں دینا چاہیئے ملک میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے اگر انھیں اپنے ذاتی حوصلوں اور جماعتی عصبیت کو قربان کرنا پڑے تو اس کے قربان کرنے میں اُن کو ذرا تامل نہ ہونا چاہیے۔

حیدرآباد کی گتھی کیسے سلجھے

ہندوستان کی پرامن ترقی کو برطانوی شہنشاہیت نے چلتے چلاتے جو آخری ڈنک مارا ہے وہ اس کا یہ اعلان تھا کہ جیسے ہی برطانوی حکومت ہندوستان سے رخصت ہوگی ویسے ہی وہ اقتدار اعلیٰ بھی ختم ہو جائے گا جو اسے دیسی حکمرانوں پر حاصل ہے۔ یہ ریاستیں انڈین یونین یا پاکستان جس کے ساتھ چاہیں اپنی مرضی کے مطابق شامل ہو سکیں گی اور اس سلسلے میں ضروری معاہدے کر سکیں گی اس اعلان نے ریاستوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کر دی۔ جو چھوٹی اور کمزور ریاستیں تھیں انھوں نے تو جلد ہی اس بات کو محسوس کر لیا کہ یہ نرا فریب ہی فریب ہے پہلے کی طرح اب بھی انھیں اپنے ملحقہ ڈومینین کے ماتحت رہنا ہے اور جیسا وہ چاہے اس کی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ کچھ اور ریاستوں نے تھوڑی آنا کانی کی لیکن ان کو بھی جلد ہی عقل آ گئی۔ لیکن حیدرآباد کو اس کے بدخواہ غلط مصلح کاروں نے کچھ ایسا گمراہ کیا کہ یہ انڈین یونین سے جس کے ساتھ اس کو آخر میں بہرحال رہنا ہے برابر دور ہٹتا چلا گیا۔ اس نے ایک سال کے لئے ہندوستان سے اس بات کا ضرور معاہدہ کیا کہ معاملات جوں کے توں رکھے جائیں لیکن اس عرصے میں رضاکاروں کی جماعت برابر اپنی تنظیم بڑھاتی رہی اور ہندوستان کے ساتھ شریک ہونے کی جو تحریک ریاست میں شروع کی گئی تھی اس کو زور زبردستی سے دباتی رہی جس کی وجہ سے ہندوستان اور حیدرآباد میں برابر بدمزگی بڑھتی گئی اور معاملہ کو سلجھانے کے لئے جو گفتگوئیں ہندوستان سے کی گئیں اور تجویزیں مرتب کی گئیں وہ بارآور نہیں ہوسکیں، ہندوستان کی طرف سے دباؤ بڑھتا گیا حیدرآباد کی طرف سے جوابی کارروائیاں کی گئیں دونوں طرف سے جواب کے جواب الجواب ہوئے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ حکومت ہند کو اس کے سوا اور کوئی صورت حیدرآباد میں دوبارہ امن و امان اور انتظام قائم کرنے کی نظر نہیں آتی کہ وہ پہلے کی طرح سکندرآباد میں اپنی فوجیں رکھے۔ چنانچہ ہندوستان کی حکومت نے حیدرآباد کی حکومت کو لکھا ہے کہ وہ رضاکاروں کی جماعت کو توڑ دے اور ہندوستانی فوج کو سکندرآباد میں رہنے کا پرامن طریقے پر موقع دے ورنہ حکومت ہند، حکومت حیدرآباد کی مرضی کے بغیر اپنی فوج کو سکندرآباد بھیج دے گی۔

حکومت ہند کی طرف سے جو سفید کاغذ پیش کیا گیا، اور پارلیمنٹ میں جواہر لال جی نے جو بیان دیا اور اخبارنویسوں کے نمائندوں سے اس کی جو وضاحت کی ہے ان سب کے مطالعے سے حیدرآباد کے معاملے میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق حیدرآباد کبھی بھی دلی کی حکومت سے آزاد نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ دلی کی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا ہے۔ جو صورت اب تک رہی ہے وہ آیندہ بھی رکھی جائے گی۔ لیکن اپنے اندرونی معاملات میں حیدرآباد آزاد رہ سکتا ہے۔ البتہ اس کو اپنی رعایا سے بات چیت کر کے اسے ذمہ دار حکومت دینی ہوگی۔ انڈین یونین میں کسی مطلق العنان حکمراں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ تو لمبی مدت کی پالیسی ہے۔ فوری طور پر رضاکاروں نے جو ہڑبونگ مچا رکھی ہے، اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے حکومت ہند کے خیال میں اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے کہ سکندرآباد میں انڈین یونین کی فوجیں رکھی جائیں اور نظام کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں تاکہ وہ رضاکاروں کی جماعت کو توڑ سکیں اور لوگوں میں دوبارہ بھروسہ کی کیفیت پیدا کر سکیں۔

یہ تجاویز ایسی ہیں جن کی معقولیت سے بہت کم لوگ انکار کر سکیں گے متحدہ اقوام میں اگر حیدرآباد کا معاملہ پیش ہوا تو وہاں بھی اس کے سوا دوسرا کوئی حل تجویز نہیں کیا جائے گا۔ حیدرآباد کو آزاد مملکت کی حیثیت سے وہاں بھی کوئی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور جب یہ حیثیت نہیں مانی جائے گی تو پھر انڈین یونین کی موجودہ تجویزیں ہی سب سے زیادہ پسندیدہ نظر آئیں گی۔

تازہ اطلاع کے مطابق نظام نے حکومت حیدرآباد کے مشورے (یا دباؤ؟) سے ہندوستانی فوج کے داخلے کے لئے اپنی رضامندی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جب ہندوستانی فوجیں حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوتی ہیں تو حکومت حیدرآباد صرف قانونی احتجاج کرتی ہے، یا مسلح مزاحمت کر کے خودکشی کی مرتکب ہوتی ہے۔ (م ع)

۲۔ پاکستان

سرحد میں بھی مربعوں کی سیاست

سرحد کی حکومت نے آزاد قبائلیوں کو بسانے کی ایک اسکیم بنائی ہے۔ اس کام کا آغاز محسود قبیلے کے لوگوں سے ہوگا جنھیں حکومت ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ضلع میں جگہ دے گی۔ اس زمین کا مجموعی علاقہ دس ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں سے فی الحال قابل کاشت زمین محض ڈھائی ہزار ایکڑ ہے۔ تو پل کی زمین کی قیمت ڈھائی ہزار فی مربع ہوگی۔ بت سے خیال یہ ہوتا ہے کہ شاید شکست پہلے مالدار قبائلیوں کو بسانا چاہتی ہے یا ممکن ہے ان کی دوستی کا معاوضہ ہو۔ اس قیمت میں سے ایک ہزار روپے فی مربع جنوبی وزیرستان کا پولیٹیکل ایجنٹ ادا کرے گا۔ بظاہر یہ رقم غیر آباد زمین کی صفائی کے لئے دی جا رہی ہے لیکن زمین کی صفائی کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ کا انتخاب کچھ زیادہ موزوں نظر نہیں آتا۔ یہ بھی شاید سیاسی خدمات کے انعام کی ایک صورت ہوگی۔ توقع یہ ہے کہ اس طرح ۱۵۰ مربع کی حد تک بسائے جا سکیں گے اور اس پر کاشت شروع ہو سکے گی۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں حکومت کی زمین کی تقسیم کا انتظام بدلا جا رہا ہے۔ اب تک کھیتی کی زمین معمولی لگان پر اٹھا دی جاتی تھی اور لگان داروں کی مالی حیثیت کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر زمین استعمال نہ ہو سکے تو حکومت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح حکومت لگان نہ ملنے کی وجہ سے گھاٹا ہوتا تھا اور پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ اب پاڑ پور نہر پر ۸۰۰۰ ایکڑ زمین لگان پر دی جانے والی ہے۔ اس میں ایک پلاٹ ۱۲½ ایکڑ کا ہوگا اور یہ زمین ۲۰ سال کے لئے دی جائے گی اور اس میں ایک چوتھائی حصہ حکومت کا ہوگا۔ ... بھی حکومت کے پیش نظر بڑے ... ہی مفاد معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۲½ ایکڑ شاید ان ہی لوگوں کو دئے جا سکیں جو ... کی علاقے کے معیار سے خاصے دولت مند ہوں گے۔

... سلیقے سے ہونا چاہیے

پاکستان کی صنعتی اسکیموں کے متعلق تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ... خبریں بار بار آتی رہتی ہیں۔ ایک تو یہ ... وزیر صنعت ملک کا دورہ فرما رہے ہیں تاکہ ... صنعتی ترقی کے امکانات کا اندازہ لگا سکیں ... یہ کہ حکومت نے صنعتوں کو مالی امداد دینے کے لئے ایک کارپوریشن کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ پچھلے دنوں وزیر صنعت مسٹر فضل الرحمٰن نے سرحد کا بھی دورہ کیا ہے۔ انھوں نے اس دورے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ مجوزہ صنعتی اداروں کے قیام کی جگہوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس سلسلے میں مزید معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریق کار ذرا غیر معمولی ہے۔ یہ ایک فنی سوال ہے کہ کسی صنعت کے قیام کے لئے مناسب جگہ کیا ہوگی، اور وزیر صنعت غالباً فنی حیثیت سے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ خیال ہوتا ہے کہ فیصلہ کسی مناسب ادارے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تھا۔ ہر صنعت کے قیام کا کام صوبے کی حکومت کی نگرانی میں چھوڑ دیا جا سکتا تھا۔ مرکز کا کام تو اتنا ہی ہونا چاہئے کہ بنیادی پالیسی کا تعین کر دے اور پھر یہ نگرانی رکھے کہ ان اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔

کارپوریشن کے قیام کے متعلق اب تک صرف اتنی سی بات واضح ہو سکی ہے کہ اس کا سرمایہ ۵ کروڑ پر مشتمل ہوگا اور اس سے نئے صنعتی اداروں کو مالی امداد مل سکے گی۔ اگلے نومبر تک یہ ادارہ وجود میں آ جائے گا۔ جیسا کہ معاصر پاکستان ٹائمز نے کہا ہے، اس کے متعلق ذہن میں ان گنت سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس ادارے کا انتظام کن اصولوں پر ہوگا؟ کیا حکومت نے پاکستان کے وسائل کا پورا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کون کون سی صنعتوں کا قیام ممکن اور ضروری ہے؟ اگر اس طرح کی اسکیم مرتب کی جا چکی ہے تو اس کے لئے ضروری مشینوں اور اشیائے اصل کا کیا انتظام ہے؟ پاکستان ٹائمز نے اس خطرے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے مٹھی بھر سرمایہ دار صنعتی رہنما کہیں پاکستان کی معاشی زندگی پر قابض نہ ہو جائیں۔ اتنا تو بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ ایک مکمل اسکیم اور پالیسی کے تعین کے بغیر روپے کی فراہمی کا انتظام قبل از وقت سی بات ہے۔

فضل الرحمٰن صاحب نے بتایا کہ پاکستان اسمبلی کے اگلے جلسے کے بعد پاکستان کا ٹیرف بورڈ پاکستان کی صنعتوں کو تحفظ دینے کے سوال پر اپنی سفارش پیش کرے گا۔ تاکہ نئی نئی صنعتوں کے تحفظ کا انتظام ہو سکے۔ ایسی صنعتوں کو تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کے لئے بیرونی مقابلے سے عہدہ برآ ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے تحفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں سے ایک قربانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ تحفظ کی وجہ سے باہر سے آنے والی چیز پر محصول لگایا جاتا ہے اور اس طرح انھیں مہنگے داموں خریدنا ہوتا ہے۔ اس کا جواز یہی ہے کہ آئندہ چل کر دیسی کی اپنی صنعت اس قابل ہو سکے گی کہ وہ بڑی صنعتوں کا مقابلہ کر سکے اور سستے داموں پر چیزیں فراہم کر سکے۔ لیکن جیسا کہ ہندوستان میں ہمارا تجربہ ہے اس قسم کی مدد سے یہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ صنعتی کارکردگی میں اصلاح و ترقی کے کام پر پورا دھیان نہ دیا جائے۔ ہندوستان کی بیشتر صنعتوں نے جنھیں اس طرح کی مدد ملی تھی اپنی کارکردگی بڑھانے کی کوئی قابل لحاظ کوشش نہیں کی ہے۔ تحفظ کے ساتھ ساتھ ایک اور مقصد بھی سامنے رکھنا چاہئے اور وہ یہ کہ صنعتی کارکردگی کے لحاظ سے اس طرح کی صنعتیں پیچھے نہ رہنے پائیں۔

مغربی پنجاب کے پناہ گزینوں کے کیمپ خالی کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ دو لاکھ پناہ گزیں سندھ، ایک لاکھ سرحد اور ایک لاکھ بلوچستان، خیرپور اور بہاولپور بھیجے جائیں گے۔ اس کام میں سہولت اور پناہ گزینوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پناہ گزینوں سے پوچھا جائے گا کہ وہ کہاں جانا پسند کریں گے، اور کوشش یہ ہوگی کہ ایک گاؤں یا ضلع کے لوگوں کو ایک ہی گاڑی میں بھیجا جائے۔ اس لئے جہاں تک کیمپ چھوڑ کے رہنے والوں کا تعلق ہے ممکن ہے پناہ گزینوں کا یہ مطالبہ کہ انھیں ضلع وار بسایا جائے پورا ہو جائے۔ کیمپوں کے منتظموں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک ضلع یا ایک قبیلہ وغیرہ کے لوگوں کو ایک ہی جگہ بسانے کے لئے بھیجیں۔

پناہ گزینوں کو منتشر کرنے کے اس پروگرام کو پورا کرنے کے لئے یہ طے پایا ہے کہ راستے کے اسٹیشنوں کے پاس کیمپ کھولے جائیں۔ یہاں طبی امتحان کے بعد پناہ گزینوں کو بتایا جائے گا کہ گاڑی کہاں کہاں ٹھہرے گی اور کھانے کے لئے کس جگہ رکے گی۔ گاڑی میں کھانے کے لئے پناہ گزینوں کو مزید راشن دیا جائے گا۔

چودھری خلیق الزماں صاحب کی دھونس

چودھری خلیق الزماں صاحب نے برطانوی حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ اگر اس نے ہر معاملے میں ہندوستان کا ساتھ دینا نہ چھوڑا تو پاکستان برطانوی حکومت سے رشتہ توڑ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ دراصل لیگ کی ساری سیاست برطانوی سرپرستی کا نتیجہ تھی لیکن چودھری صاحب نے پاکستان کے اس فیصلے کی کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ کا جزو ہے، ایک نئی توضیح کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ پاکستان نے یہ فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ ہندوستان سے ہمارا تعلق خوشگوار رہے اور امید یہ تھی کہ برطانوی حکومت سے تعلق اس سلسلے میں مفید ثابت ہوگا۔ لیکن ہندوستان سے اچھے تعلقات رکھنے کی خواہش تو برطانوی حکومت سے قطع تعلق کے بعد بھی پوری ہو سکتی ہے۔ دولت مشترکہ میں شمول سے ان دوستانہ تعلقات میں کسی قسم کی خوشگواری پیدا ہونا لازمی یا ضروری نہیں تھا۔ چودھری صاحب کو شکایت ہے کہ پاکستان کے ساتھ برطانوی حکومت کا رویہ ناہمدردانہ ہے۔ یہ بات ذرا حقیقت سے دور ہے۔ برطانوی حکومت نے بار بار پاکستان کی ہمدردی کا ثبوت دیا ہے لیکن چودھری صاحب شاید یہ چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت ان ہی کی ہو کر رہ جائے۔ مگر یہ بات سامراجی سیاست کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس کی بنیاد تو اس پر ہے کہ پلڑا برابر رکھا جائے اور اس کے لئے برطانوی حکومت کو کبھی دوسری طرف بھی جھکنا پڑتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کا بھلا اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو سامراجی سیاست کے چنگل سے نکال لیں۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اخبار چھپنے کو جا رہا تھا کہ پاکستان کے قائد اعظم محمد علی جناح کی رحلت کی افسوسناک خبر آئی۔ پاکستان کے ایک اعلان میں بتایا گیا کہ قائد اعظم محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ ۱۱ ستمبر کو ۸ بجے شام سے پہلے زیارت سے کراچی تشریف لائے۔ پھر دوسرا اعلان ہوا کہ قائد اعظم رات کو ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ پر یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ ۱۲ ستمبر کو ۹ بجے شب کو ریڈیو نے خبر دی کہ قائد اعظم کا جنازہ ۳ بجے سہ پہر کو گورنمنٹ ہاؤس سے اٹھا اور ۶ بجے شام کے بعد ... گراؤنڈ پہنچا۔ نماز مغرب سے کچھ پہلے اس قطعہ زمین پر جو کراچی کی جامع مسجد کی تعمیر کے لئے تجویز کیا گیا ہے یہ گراں بہا امانت سپرد خاک کر دی گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

نئے گورنر جنرل

قابل وثوق خبر ہے کہ خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل بنائے جا رہے ہیں۔ یہ انتخاب کئی لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ ایک تو پاکستان کے بڑے لیڈروں میں وہ سب سے زیادہ انتظامی تجربہ رکھتے ہیں۔ دوسرے ان کے ذریعے سے مشرقی بنگال کا رشتہ مرکز سے زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ تیسرے وہ مغربی پاکستان کے سیاسی اور نیم سیاسی حلقوں سے جن کی باہمی رقابت نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے بے تعلق اور ان رقابتوں سے بالاتر ہیں۔

مغربی دنیا

ناکہ بندی کے بعد خانہ جنگی

قریب ایک ہفتہ ہوا یہ خبر آئی تھی کہ روسی محاصرہ شروع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ برلن سے ایک ریل گاڑی روسی علاقے سے گذرتی ہوئی ہانوور تک گئی۔ اس سے کئی دن پہلے سے یہ خبر گرم تھی کہ روسیوں اور اتحادیوں میں سمجھوتا ہونے والا ہے، تمام راستے کھلنے والے ہیں اور کوئلے اور دوسرے سامان سے لدی ہوئی مال گاڑیاں جو روسی علاقے کی سرحد پر کھڑی ہیں سگنل ملتے ہی سیٹی دے کر روانہ ہو جائیں گی۔ روسی برلن کے بلوکیڈ کو ایسا معاملہ نہیں بنانا چاہتے تھے جس پر جنگ ہو جائے۔ انھیں اتحادیوں کی فراخی کیفیت اور ان کے اتحاد کی مضبوطی کو آزمانا تھا، اور اسی کے ساتھ جس حد تک ممکن ہو برلن میں اتحادیوں کے اثر اور اقتدار کو کمزور کرنا۔ جیسا مبہم مقصد تھا ویسی ہی مبہم کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اتحادی اپنی انتظامی قابلیت اور اپنے ارادے کی مضبوطی کو ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے، اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ روس کی مخالفت کرنے میں فرانسیسی اتحادیوں کو صرف اس وجہ سے ساتھ دے رہے ہیں کہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہوائی جہازوں سے سامان پہنچانے میں اتحادیوں کا بے حساب روپیہ خرچ ہوا، ہوابازوں کو بے اندازہ محنت کرنا پڑی اور کارآمد ہوائی جہازوں کی تعداد میں خاصی کمی ہو گئی۔ اس طرح روسیوں نے جتا دیا کہ اگر وہ دق کرنا چاہیں تو ایسا کچھ کر سکتے ہیں کہ اتحادیوں کو روپیہ اور محنت فضول صرف کرنا پڑے اور خود روسیوں کا کوئی نقصان نہ ہو۔ بے شک اتحادی اس طرح جو کچھ خرچ کریں گے اس کی عالمگیر جنگ کے اخراجات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن یہ سوال تو پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ برلن پر قبضہ رکھنے کی یہ قیمت مناسب ہے یا بہت زیادہ۔

روسیوں کو ان ہی پر کیا موقوف ہے ہر مہذب قوم کو اپنے مقصد اور اغراض حاصل کرنے کی تدبیریں مقرر کرتے وقت سوچنا چاہیے کہ دنیا کی عام رائے پر اس کے عمل کا کیا اثر ہوگا لیکن برلن میں روسیوں اور اتحادیوں کے مشترک انتظام کی ناکامی اور برلن کے بلوکیڈ کے بارے میں صحیح رائے کون قائم کر سکتا ہے۔ مارشل سوکولوفسکی نے مارچ میں برلن کی کنٹرول کاؤنسل کے جلسے سے خفا ہو کر چلتے ہوئے کہا تھا کہ برلن میں مشترک حکومت ختم ہو گئی ہے۔ اب وہی مارشل سوکولوفسکی اتحادی افسروں سے اس پر گفتگو کر رہے ہیں کہ برلن میں روسی سکہ کن شرطوں پر جاری کیا جائے۔ اتحادیوں کی طرف سے سیکڑوں مرتبہ کہا جا چکا ہے کہ جب تک برلن کا محاصرہ جاری رہے گا وہ روسیوں سے گفتگو نہ کریں گے۔ لیکن بلوکیڈ کے دوران میں برابر گفتگو جاری رہی اور یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اتحادیوں نے مجبور ہو کر اور دب کر نہیں بلکہ پوری آزادی اور خودداری کے ساتھ گفتگو کی۔ بحثوں اور مشوروں کا جو نتیجہ نکلے گا اس کے بارے میں بھی کہنا دشوار ہوگا کہ ان میں کون ہارا اور کون جیتا۔

غالباً روسیوں نے پہلے ہی سے طے کر لیا تھا کہ بلوکیڈ کے بعد کون سی چال چلی جائے گی۔ کچھ اوپر ایک مہینے سے برلن کے کومیونسٹ اور غیر کومیونسٹ شہریوں میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں جن میں روس کے فوجی افسر اور سپاہی بھی مناسب طریقے پر شریک ہو جاتے ہیں۔ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ روسیوں کا منشا یہ ہے کہ برلن کے اس حصے کو بالکل الگ کر لیں جس پر ان کا قبضہ ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ برلن کے شہریوں میں خانہ جنگی کی سی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کومیونسٹ بلوائی شہریوں کی انتظامی کاؤنسل کے جلسے نہیں ہونے دیتے، اور وہ مار پیٹ کر کے ان انتظامی اداروں پر قبضہ کر لیں گے جن میں شہریوں کو کچھ دخل ہے۔ برلن کے غیر کومیونسٹ شہری تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ لیکن وہ مار پیٹ کا جواب نہیں دے سکتے اور اتحادی شاید غیر کومیونسٹ شہریوں کی مدد پر اسی وقت آمادہ ہوں گے جب اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

دونوں ہی طرف مشکل

روسی اس لحاظ سے بہت فائدے میں ہیں کہ تمام اہم فیصلے کرنا ایک مرکزی کمیٹی کے اختیار میں ہے۔ اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنا ہر حکومت، ادارے اور جماعت کا فرض ہو جاتا ہے جو قانوناً اس کے ماتحت ہے ان فیصلوں پر عمل کرنا اور کرانا ان افراد کا بھی فرض ہو جاتا ہے کہ جو کومیونزم اور روسی سیاست کے معتقد ہیں۔ اعتقاد کا یہ رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے روس کی عمل داری ہونا بھی ضروری نہیں۔ ایسے نظام کو جو لوگ صحیح سمجھتے ہوں ان کی نظر میں اختلاف اور دشمنی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا، اور وہ ایسی ہم نوائی پر اصرار کرتے ہیں کہ آدمی کا اپنا گلا اس کا اپنا نہیں رہتا۔ یہ ناممکن ہے کہ روس اور اس کے ماتحتوں اور ساتھیوں میں اختلاف نہ ہوں اور انھیں دور کرنے کی انتہائی تدبیریں نہ کی جائیں۔ مارشل ٹیٹو دل سے اپنی سیاست کو روسی سیاست سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں مگر روس کے لئے یہ کافی نہیں ہے، اور اب روس کے سرکاری اخبار "پراودا" میں ایسے مضمون نکلنے لگے ہیں جو کسی بڑی سیاسی کارروائی کی تمہید معلوم ہوتے ہیں۔ روس کو اس کی فکر ہے کہ اپنا اثر اور اقتدار بڑھائے، اور اس میں شک نہیں کہ یہ بڑھ بھی رہا ہے، لیکن روس کے ماتحت قوموں کا اتحاد اسی حالت میں مضبوط رہ سکتا ہے جب اختلاف کے باوجود اتحاد عمل ممکن مان لیا جائے۔ یوگوسلاویا کی طرح پولینڈ نے معاشی اور تہذیبی معاملوں میں ایک رویہ اختیار کیا ہے جو چاہے اصولاً صحیح نہ ہو مگر عملاً بہت مفید ثابت ہوا ہے، اور یوگوسلاویا کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو اس کا پولینڈ پر بھی اثر ہوگا۔

دوسری طرف جمہوری ملکوں نے اپنا کام کچھ بہت آسان نہیں کر لیا ہے۔ فلسطین کے معاملے میں برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے طرز عمل نے عربوں کو بہت بددل کر دیا ہے۔ یونان کی موجودہ حکومت کو برقرار رکھنے اور قزاقانہ جنگ کے فتنے کو دور کرنے کی ذمہ داری متحدہ ریاستوں نے اپنے اوپر لے لی ہے۔ مگر قزاقانہ جنگ کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور یونان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اتحادیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھیں فرانس جیسے ملک کو صرف اپنے ساتھ رکھنا نہیں بلکہ تمام مشوروں میں شریک کرنا ہے۔ فرانسیسی ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ ان کے لئے جرمنی زیادہ خطرناک ہے یا روس۔ جرمنی کی صنعت کو بحال کرنے اور وہاں کی حکومت کو جرمنوں کے سپرد کرنے کی جو تدبیریں اتحادی کرتے ہیں ان میں وہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ تر اس غرض سے کہ کوئی موثر تدبیر نہ کی جا سکے، روس کی مخالفت میں وہ اتحادیوں کا ساتھ دیتے ہیں مگر اتنے پس و پیش کے ساتھ کہ روسیوں پر اتحادیوں کی دھمکیوں کا اثر نہیں ہوتا، فرانس میں ایک مضبوط کومیونسٹ پارٹی بھی ہے جسے حکومت مل گئی تو اتحادیوں کے لئے غضب ہی ہو جائے گا۔

کیا اب کی بار کومیونسٹ حکومت ہوگی؟

ایسا ہونا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ فرانس میں امیر و غریب، مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش برابر بڑھتی جا رہی ہے اور کوئی وزارت حکومت کے کاموں کو سنبھال نہیں پاتی۔ فرانک کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔ مزدور زیادہ مزدوری، تنخواہ پانے والے زیادہ تنخواہ مانگتے ہیں، ضرورت اور آسائش کا سامان باہر سے آتا ہے تو بڑھے چڑھے داموں پر۔ ملک کی صنعت ہڑتالوں اور عام بے چینی کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے یہ ہیں بنیادی مسئلے جن کا حل ہر پارٹی اپنے فائدے کو اور تمام باتوں پر ترجیح دے کر پیش کرتی ہے۔ کومیونسٹ چاہتے ہیں کہ ابتری بڑھے اور یہ دیکھ کر کہ مزدوروں کے علاوہ ان کا ساتھ دینے والے بہت کم ہیں، غصہ میں کہتے ہیں کہ فرانس انقلاب سے اتنا ڈرنے لگا ہے کہ اب فرانس کہلانے کے قابل نہیں رہا۔ سوشلسٹ مزدوروں کے حامی ہیں۔ مگر پوری جماعت کے مفاد کا بھی لحاظ رکھتے ہیں اور ان پر انقلاب پسند اور انقلاب دشمن دونوں قسم کے لوگوں کی مار پڑتی ہے۔ کوئی ایسی پارٹی جو سب کے ساتھ انصاف کر سکے موجود نہیں ہے۔ اور جنرل دے گول کے سوا کوئی لیڈر نہیں ہے جو اپنی شخصیت کے بل پر حکومت کر سکے۔ پس اگر کوئی مسئلہ ہے جس پر تمام پارٹیاں متفق ہیں تو وہ یہ ہے کہ جنرل دے گول کو حکومت کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

م، م،

سیلون (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

مسٹر ڈی، ایس، سینانائکے وزیر اعظم نے دوسری مرتبہ نمائندوں کے ایوان میں بل پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ اس بل کا مقصد یہ ہے کہ سیلون میں ان اشخاص کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے جو سیلون کے شہری نہیں ہیں اور ان اشخاص کو اس ملک سے نکالا جا سکے جو یہاں کے جائز طور پر شہری تسلیم نہیں کئے جاتے، اور ان اشخاص کو بھی ملک بدر کیا جا سکے جو ملک کے لئے مضر خیال کئے جائیں۔

مخالف جماعت کے لیڈر ڈاکٹر پیریرا نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ اغلباً اس بل کا مدعا یہ ہے کہ آئندہ ہڑتالیں نہ ہو سکیں۔ ان کے خیال میں سیلون میں پانچ سال کا قیام شہری حقوق حاصل ہونے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے خیال میں بل کی مخالفت اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ آبادی کے مختلف حصوں میں امتیاز پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا اس کی رو سے وزیر اعظم جن اشخاص کو [illegible] گا ملک سے باہر کر دے گا۔ ایسا [illegible] جو امتیازات پیدا کرنے کا موجب ہو [illegible] کسی ملک کے لئے مفید نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ آگے چل کر وہ فسادات پیدا کرے اور ملک میں خون ریزی کا بازار گرم ہو۔ کومیونسٹ ممبروں نے بھی اس بل کی مخالفت کرتے ہوئے اسے مزدوروں کی عافیت کے منافی تصور کیا۔ ان کے خیال میں ملک کی حکومت ہندوستانی مزدوروں کی آمد کے لئے دروازے کھولے ہوئے ہے لیکن ان کو ووٹ کا حق دینے کے لئے کسی صورت سے تیار نہیں ہوتی۔ اسی طرح بالشویک لینن پارٹی کے نمائندے نے مدلل تقریر کے دوران میں ملک کو کہ [illegible]

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

مصنف

اختر انصاری

مجھے خدا نے بنایا ادیب اور فن کار
الم پرست ہتم دوست، خوں فشاں شاعر
اگر کتابوں کی دنیا ہی تھی مری تقدیر
تو کیوں نہ مجھ کو بنایا کتابوں کا ناشر؟
جو یہ نہیں تو بناتا کرم سے اپنے مجھے
رسائل و کتب و کاغذات کا تاجر
اگر میں اس کے بھی قابل نہ تھا تو پھر مجھ کو
بنایا ہوتا کتابت کے فن کا ہی ماہر
یہ کیا کیا کہ مصنف بنا دیا مجھ کو
بنا دیا کہ نہ جانے مٹا دیا مجھ کو

غزل

اختر انصاری

مطربِ دل کی وہ تانیں کیا ہوئیں؟
وہ تخیل کی اڑانیں کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے وہ ترچھی نظروں کے خدنگ؟
ابروؤں کی وہ کمانیں کیا ہوئیں؟
وہ ادائیں جن پہ ہوتی تھیں نثار
چاہنے والوں کی جانیں، کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے ٹوٹے دلوں کے زمزمے؟
بے زبانوں کی زبانیں کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے اختر امیدوں کے حصار؟
اور عزائم کی چٹانیں کیا ہوئیں؟

ٹیگور کے گیت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرے دوست!

تمھارا کنگن کتنا سندر ہے! وہ رنگ برنگ کے ان گنت تاروں سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن تمھاری بجلی کے مانند بانکی تلوار اس سے بھی زیادہ حسین ہے!! وہ ڈوبتے ہوئے سورج کے خون میں نہا کر ابھی ابھی نکلی ہے۔

وہ مرتے ہوئے انسان کی آخری سانس کی طرح کپکپاتی ہے۔ وہ اس دکھتی روح کی طرح پڑی جگ مگ جگ مگ کرتی ہے جس نے اپنی ساری آلائشوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ تمھارا کنگن نہایت خوبصورت ہے۔ وہ تاروں کے موتیوں سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن تمھاری تلوار اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کا خیال آتے ہی دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

اے میرے دوست!

ایسی بھیانک رات میں میں تم سے ملنے کی خاطر نکل پڑا ہوں، آسمان کسی مایوس کی طرح چیخ رہا ہے۔ درختوں کے پتے ہاتھ مل رہے ہیں میری آنکھوں میں اس وقت نیند کہاں۔ بار بار دروازہ کھولتا ہوں۔

باہر گھپ اندھیرا چھایا ہے۔ اسی اندھیرے میں میں تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں۔

بن میں یہ کس کی سرسراہٹ ہے؟
ندی کے اس پار کون کھڑا ہے؟
تاریکی کو اور زیادہ تاریک کون بنا رہا ہے؟
بتاؤ دوست!

مجذوب کی بڑ

ڈاکٹر سید عابد حسین

اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے کئی سال بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنے گاؤں میں مہمان سے بہتر معلوم ہوا اور نہ وہاں کے باشندوں کی حیثیت رشتہ داروں سے زیادہ دل بستگی محسوس ہوئی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میرا بچپن اپنے والد کے ساتھ رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر شہر پھرتے رہتے۔ اس لئے میرے دل پر حب وطن کا جذبہ نقش ہو کر رہ گیا۔ یا یہ ہوا کہ مجھے خلیل آباد میں کبھی وہ محبت نصیب نہیں ہوئی جس کا پرتو کسی پتھر اور درخت کو زندگی اور کشش بخشتا ہے اور وطن کو وطن بناتا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ میرے دل میں حب وطن نہ سہی مگر اس سے ملتی جلتی ایک چیز ضرور موجود ہے۔ میں جس کالج میں تعلیم پاتا ہوں اس سے مجھے عزیز دوست اور شفیق استادوں کی بدولت بے حد انس ہے۔ جب میں وہاں سے کہیں جاتا ہوں تو دل میں درد جدائی کی ٹیس لئے ہوئے، اور جب لوٹ کر آتا ہوں تو جوش مسرت میں ڈوبا ہوا مگر خلیل آباد سے مجھے کوئی قلبی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری والدہ اور پھوپھی کا انتقال ہو گیا، اور اسی سال میرے چچا وطن کی سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ خلیل آباد میں چند دور کے عزیزوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے میں کبھی تعطیل کے دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو محض ایک فرض سمجھ کر۔ جب تک میں وہاں رہتا ہوں صبر کی نیکی روزانہ میرے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور جب وہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو میرا شمار شکر گزاروں میں ہوتا ہے۔

اس بار خلیل آباد میں میرے ہم سنوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے مجھے وہاں کا قیام اور بھی کھل گیا۔ صبح سے شام تک میرا وقت اس طرح سے گزرتا تھا کہ کبھی اپنے خاندانی کتب خانے میں جا کر کرم خوردہ کتابوں کی گرد جھاڑی اور ورق گردانی کی، کبھی زنانے مکان میں جا کر عورتوں کے آپس کے جھگڑے اور ہمسایوں کی شکایتیں سنیں، کبھی کھیتوں کی طرف چلا گیا، کبھی آم کے باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ممکن ہے کہ فلسفیانہ طبیعت والوں کو تنہائی کی زندگی میں غور و فکر کا بہت اچھا موقع ملتا ہو اور نظر ہوشیار کو درختوں کے پتوں میں معرفت کردگار کے دفتر نظر آتے ہوں، لیکن میرے جیسے لوگ جو تنہائی میں اوبنے لگتے ہیں اور پتوں کی دفتری زبان سے ناواقف ہیں۔ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے تو پہلے ہی دن سے فکر تھی کہ کوئی انسان ملے جس سے باتیں کر کے دو گھڑی دل بہلا سکوں۔ مگر ہمارے گھر میں کیا سارے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سوائے کھیتی، مویشی، پٹواری وغیرہ کے کسی چیز سے دلچسپی ہو۔ مجھے گاؤں کے ہر آدمی سے وحشت ہوتی تھی۔ خصوصاً ایک صاحب سے تو ڈر سا لگتا تھا۔ ان بزرگ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر یہ مجذوب کہلاتے ہیں اور ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ یہ مجھے اکثر راہ میں ملا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کبھی درخت کے تلے بیٹھے ہوئے، کبھی کھیتوں کے بیچ میں منڈیر پر لیٹے ہوئے، مگر ان کی بے تصنع ہیئت اور ان کا بے تکلف لباس دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے قریب جاؤں یا ان سے بات کروں۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ میں سیر کرنے نکلا اور بستی سے باہر جا کر ریل کی پٹری کے پاس ایک آم کے باغ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے قریب ہی ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں حضرت مجذوب سو رہے ہیں۔ میں سر جھکائے تالاب کی موجوں کا تماشا کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سر جو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مجذوب پاس کھڑے ہیں۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر غیر معمولی تیزی سے قطع مسافت کرتا ہوا چل دوں، لیکن خیال ہوا کہ شاید کوئی دیکھ لے اور اس فعل کو بھاگنا سمجھے۔ اس لئے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا مگر دل میں دعا مانگتا جاتا تھا کہ خدا کرے خود ان حضرت کے دل میں اس وقت ذوق سفر لطف مقام پر غالب آ جائے مگر دعا کا اثر الٹا ہوا۔ مجذوب صاحب اور قریب آئے اور مجھ سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر مزے میں پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میں سہم کر تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔ اس حرکت سے وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اور غصے کے لہجے میں پوچھنے لگے "تو تیرنا جانتا ہے؟" مجھے واحد حاضر کی ضمیر زیادہ مرغوب نہیں۔ مگر اس وقت میں نے اسے سہہ لیا اور آہستہ آہستہ جواب دیا "جی نہیں" "تو پھر اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟" یہ مجذوبانہ منطق مجھے بہت مہلک معلوم ہوئی میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس خوف سے کہ کہیں یہ اس سلسلے میں کوئی عملی دلیل نہ دے بیٹھیں میں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ ضرورت ہو تو بے اجازت رخصت ہو کر گھر کی راہ لوں۔

مجذوب صاحب نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا "کیا تو دنیا سے نرالا ہے۔ سب یہی کرتے ہیں۔ ہر مسلمان یہی کرتا ہے مسلمان مسلمان سب برابر ہیں، کوئی غریب ہے کوئی امیر ہے کوئی عالم ہے، کوئی جاہل ہے۔ مگر ہیں سب مسلمان، سب بے صبر، سب غافل، سب ناعاقبت اندیش، سب من کے موجی، سب جذبات کے غلام۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ مسلمان جو اپنے نفس پر، اپنے دل پر اپنی زبان پر، اپنے ارادوں پر، اپنی خواہشات پر اپنے خیالات پر قابو نہیں رکھتے۔ رہنما بن کر قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمان جو سچے علم و فضل سے، مطالعہ فطرت سے، مشاہدۂ زندگی سے، حق کی محبت سے بیگانۂ محض ہوتے ہیں۔ عالم دین بن کر تعلیم و تلقین کے مسند پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ مسلمان جو لذت بے خودی سے، کیف تسلیم سے ذوق درد سے، ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ پیر روشن ضمیر بن کر رشد و ہدایت کا باب کھول دیتے ہیں۔ اگر تو نے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو پھر تو جو تیرنا نہیں جانتا اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا .... کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمان مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ذرائع سے بے نیاز ہیں فصل کاٹنا چاہتے ہیں، لیکن جوتنے بونے سے جی چراتے ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان ایک طلسمی دنیا میں رہتے ہیں جہاں قول کے معنی فعل، ارادے کے معنی عمل، دعوے کے معنی دلیل، خواہش کے معنی واقعہ سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں آنکھ صرف ان چیزوں کو دیکھتی ہے جو اسے پسند آئیں۔ کان صرف ان باتوں کو سنتا ہے جو اسے مرغوب ہوں اور ذہن صرف ان معروضات کا ادراک کرتا ہے جو اسے گوارا ہوں۔ اگر تجھے یہ علم ہے تو پھر کیوں بے کار عقل سے کام لیتا ہے، اور کیوں اس تالاب میں کود نہیں پڑتا؟ .... معلوم ہوتا ہے تو باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف نہیں، سن میں تجھے سناتا ہوں۔ دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں۔ یہ پیکر خیالی جو تیری چشم باطن کے سامنے ہے۔ ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور سنا کہ اس کے بزرگوں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے بزرگ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، قوت و سطوت، جاہ و حشمت، مال و دولت کے مالک تھے، زراعت، تجارت، لیکن دین یہ چیزیں ان کے پاس نہ تھیں، اور ان کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ سلامت روی، مسکنت، تحمل، جفاکشی کی صفات یہ لوگ نہیں رکھتے تھے، اور ان کے یہ شایان شان بھی نہ تھیں، دفعتہً ہوا بدلی، زمانہ پلٹا، ہندوستان میں انقلاب ہو گیا، مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی، اور اس کے ساتھ وہ باتیں بھی جو حکومت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قصر زندگی کی بنیادیں پہلے ہی سے ان کی نہ تھیں۔ اب اس کی دیواریں، اس کی چھتیں، اس کے کنگرے اس کے گنبد بھی چھن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچارے مسلمان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ سر پر سائے کا [illegible] ہے، پیر تلے سے زمین بھی نکل گئی۔ اب یہ [illegible] ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اس کی زندگی خیالی [illegible] بسر ہونے لگی۔ کون سی خیالی دنیا؟ وہ نہیں جو انسان کو وسعت نظر اور قوت عمل بخشتی ہے بلکہ وہ جو حواس ظاہری و باطنی کو نیم بیداری کی حالت میں رکھتی ہے جو جسم و جان پر ایک کابوس مسلط کر دیتی ہے۔ وہ نہیں جو انسان کو بہار کر مشاہدہ و عرفان کی بلندی پر لے جاتی ہے بلکہ وہ جو اسے گرا کر جمود و غفلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ اسے زندگی کی حقیقتوں سے وحشت ہونے لگی وہ واہمے کی بنائی ہوئی تصویروں سے دل بہلانے لگا۔ کاہلی کا نام اس نے قناعت رکھ لیا، بے عملی کا توکل، بے بسی کا صبر بے حسی کا زہد .... یہ غنودگی، یہ غفلت اس پر ہمیشہ طاری نہیں رہتی۔ بلکہ اکثر وہ چونکتا ہے، سر اٹھاتا ہے، ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر دوڑتا ہے اور اتنا دوڑتا ہے کہ تھک کر گر پڑتا ہے لیکن کیا چونکنے کے بعد اسے زندگی کی حقیقتیں نظر آتی ہیں؟ کیا دوڑنے کے بعد وہ منزل مقصود سے قریب تر ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، یہ چونکنا محض خواب پریشاں کا نتیجہ ہے، اور یہ دوڑنا محض وحشت کی دلیل ... . یہ حقیقت سے بے خودی، یہ واہمہ کی غلامی یہ غفلت اور وحشت کا تضاد مسلمان کی زندگی کے ہر شعبے سے نمایاں ہے۔ مذہب کو اس نے زندگی کے واقعات سے، دنیا کے حالات سے، زمانے کی رفتار سے جدا کر لیا

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اُردو اور ناگری

حرفوں کے نام

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

بعض لوگ اردو حرفوں کے ناموں پر اعتراض کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ حروف مفرد آوازوں کی علامتیں ہیں اس لئے اُن کے ناموں کا کئی کئی آوازوں سے مرکب ہونا درست نہیں مثلاً اَ کی آواز کو ظاہر کرنے والے حرف کا الِف نام رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ناگری میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ درست ہے کہ جو حرف جس آواز کو ظاہر کرتا ہے وہی آواز اس حرف کا نام ہے مثلاً اَ کی آواز کے لئے جو حرف ہے اس کا نام بھی اَ ہے۔

یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں الف اَ کی آواز کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جو آ، اَ، اِ، اِی، اُ، اُو، اے، اَی، اَو، او میں مشترک ہے۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس مجرد اور غیر متحرک آواز کی علامت ا ہے اور اس کا نام الف ہے۔

یہی حالت اور سب حرفوں کی ہے۔ مثلاً میم کو یہ مَ نام نہیں ہے۔ بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جس سے ان لفظوں کی ابتدا ہوتی ہے مَن، [illegible]، میں، مِیر، مُل، موٹھا، میخ، مَیل [illegible] لفظ ایک ہی آواز سے شروع [illegible] حرکت ہر جگہ مختلف ہے جس سے [illegible] صورتیں ہو گئی ہیں۔ ان میں سے [illegible] کو مَ کہنا درست ہے۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صورت کو بھی مَ کہہ لیجئے۔ اس لئے کہ [illegible] حرکت کو کھینچنے سے ما بن جاتا ہے۔ ان دو [illegible] کے علاوہ باقی آٹھ صورتوں کو بھی مَ کہنا [illegible] کہ ناگری میں حرفوں کی جو آوازیں [illegible] ہیں، کہاں تک درست ہے؟

[illegible] دی ہوئی مثالوں میں مس، میر [illegible] میل، مَیل، موج، مَوج [illegible] متحرک آواز مَ نہیں ہے۔ اسی طرح نام [illegible] م کی آخری ساکن آواز بھی مَ نہیں ہے [illegible] لئے ناگری میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حرف کا نام بھی مَ نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس سلسلے میں ہندی اور اردو تلفظ کا ایک اصولی فرق توجہ کے قابل ہے۔ ہندی میں لفظ کی آخری آواز متحرک ہوتی ہے۔ جیسے رامَ، شیامَ، اسی لئے ہندی میں ان لفظوں کے آخری حرف کو مَ کہنا درست ہے لیکن اردو میں اس کی آخری آواز ساکن ہوتی ہے اس لئے رام اور شیام کی آخری آواز کو بھی مَ نہیں کہہ سکتے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظر انداز کر دی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اسی لئے حرفوں کی اور سب حرکتوں کے لئے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں۔ مگر زبر کے لئے کوئی ماترا نہیں ہے، اور اسی وجہ سے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جن سے زبر کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملا کر لکھتے ہیں۔ اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس طرح دو دو حرفوں کے ملنے سے جو نئی صورتیں یا مرکب حروف بنتے ہیں۔ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے، اور چونکہ دو حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے۔ اس لئے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے جو اچھا خاصا مشکل کام ہے۔

اردو کی طرح ہندی میں بھی ہر آواز دس مختلف حرکتیں اختیار کر سکتی ہے۔ اس لئے ناگری حرفوں کے نام بیشتر حالتوں میں آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر آواز کو متحرک ماننے اور زبر کو اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً مَ پر اُو کا ماترا اور گ پر اِی کا ماترا لگانے سے مَنُو اور گَنِی کی آوازیں نکلنا چاہئے۔ ان کو مُو اور گی پڑھنا اصولاً صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ ان آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا اصولاً ممکن ہی نہ ہوگا۔

اُردو میں دنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں۔ اس لئے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے۔ اسی طرح اردو رسم خط ناگری تحریر کی ان بے اصولیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے جس کی وہ علامت ہے۔ اس طرح حرفوں کے نام اُن کی آوازوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ناگری حرفوں کے نام تعریف کے لائق ہیں نہ اردو حرفوں کے نام اعتراض کے قابل۔

صرف دنیا کی تہذیب کا بلکہ زبان کا بھی سرچشمہ وسطی ایشیا کے وہ ترک ہیں جو زمانہ قبل اسلام میں وہاں رہتے تھے تو مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اس فرضی نظریے کا ماننا خاصا مشکل تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کے عقائد پولیس کے ذریعے سے نہیں منوائے جا سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت کی وفاداری میں ترکوں نے مشرق سے اپنے تمام تہذیبی و تمدنی اور عثمانی سلطنت سے بھی اپنے تعلقات ختم کر لئے۔

(باقی آئندہ)

ترکی پچھلے پچیس سال میں (بسلسلہ صفحہ ۱۱)

طبقوں کو پوری نمائندگی دی گئی اور مختلف فرقوں اور علاقوں کے مفاد میں اس طرح توازن پیدا کر دیا گیا کہ کوئی قابل ذکر مخالف جماعت سوا کُردوں کے نہ رہی۔ دراصل یہی ایک اہم اقلیت اب ملک میں باقی ہے۔

پارٹی کے لیڈر مسلمانوں کی موجودہ مذہبی تنظیم کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اس مغربیت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ اور سدّ راہ ہے جو قومی بقا اور اس کے وجود کے لئے ضروری ہے۔ اسی لئے جن اوقاف سے مسلمان مبلغوں، استادوں اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا اور موذنین کا خرچ چلتا تھا اور جن کا انتظام عثمانی حکومت کرتی تھی، جمہوری حکومت نے ان کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ان کی آمدنیوں کو اپنے مصارف میں خرچ کرنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے مذہب کو پیشہ بنا لیا۔ اب وہ بغیر ذریعہ معاش کے رہ گئے۔ اسی طرح جن درویشوں کا عوام پر اثر تھا، اور ان کی مخصوص تعلیمات اور خاص سلسلے تھے ان کو بھی ان کے کاموں سے روک دیا گیا اور ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اور جن درسگاہوں میں اس قسم کی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی ان کو بھی بند کر دیا گیا سوا قومی یونیورسٹی اور یہودی و عیسائی اقلیتوں کی تعلیم گاہوں کے تمام درسگاہوں اور اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کے بعد شرعی قوانین اور شرعی عدالتوں کو بھی توڑ دیا گیا، اور اس کی جگہ پر سوئٹزرلینڈ کا مکمل ضابطہ دیوانی اٹلی کے ضابطہ فوجداری اور جرمن جمہوریہ کے ضابطہ تجارت کو اپنا لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیک جنبش قلم ترکی کے ہر باشندے کو خواہ مرد ہو یا عورت وہی فرائض اور وہی حقوق مل گئے جو مغربی ممالک میں وہاں کے باشندوں کو حاصل ہیں۔

سماج میں عورتوں کا جو درجہ تھا اس میں بھی بڑی تبدیلی ہوئی۔ اب ایک مرد کو اس کی اجازت نہ تھی کہ ایک ہی وقت میں متعدد شادیاں کر سکے۔ اسی طرح پردہ یا تو بالکل غائب ہو گیا یا برائے نام رہ گیا۔ قدیم روایتوں کے بندھنوں کو کمزور کرنے اور قدامت پرست لوگوں کے ذہنوں میں خلا پیدا کرنے کے لئے قدیم عربی حرف تہجی کی جگہ جس میں صدیوں سے ترک لکھتے چلے آ رہے تھے جدید لاطینی حروف تہجی کو رواج دیا گیا۔ اس کے بعد تعلیم بالغان کی مہم شروع کی گئی اور ایک ہفتے کے اندر قدیم رسم خط کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تاکہ آئندہ نسل قدیم ادب اور اپنے اسلاف کے خیالات سے بالکل کٹ جائے۔ اس میں اس حد تک سختی کی گئی کہ قدیم ادب اور لٹریچر کو دوسری زبان میں بھی بمشکل تمام نقل کرنے کی اجازت دی جاتی تھی جو لوگ عربی رسم خط سے بالکل واقف نہ تھے، اُن کے لئے یہ رعایت تھی کہ وہ افسران متعلقہ سے اجازت لے کر ان کو دوسری زبان میں منتقل کر سکتے اور چھاپ سکتے تھے۔

عوام کو ترکی ٹوپی پہننے، صافہ باندھنے اور ایسے رسم و رواج کی سخت ممانعت تھی جن کا تعلق مذہب سے تھا اور اس حکم کو بذریعہ پولیس نافذ کیا گیا۔ حکومت نے یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ترکوں کی ظاہری وضع قطع کو بالکل مغربی بنا دے وطن پرستی کے جوش میں تاریخ کو اس طرح پیش کیا گیا کہ نہ

یورپ کا خط

(ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے)

بلگراڈ
۳۰ جولائی ۱۹۴۸ء

جناب ایڈیٹر صاحب نئی روشنی، دہلی

میں نے شروع جولائی میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً یورپ کے حالات سے "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو آگاہ کرتا رہوں گا۔ میرا ہیڈ کوارٹر تو جنیوا ہے، وہیں سے آپ کو اکثر خط بھیجوں گا لیکن ان دنوں دریائے ڈینیوب سے متعلق جو کانفرنس بلگراڈ میں ہو رہی ہے اس کی وجہ سے بلگراڈ آیا ہوا ہوں۔ پہلا خط یہیں سے بھیجتا ہوں۔

ساری دنیا کی طرح آپ کے ملک میں بھی ضرور آج کل یوگوسلاویہ کا خاصا چرچا ہوگا۔ یہاں کے مشہور لیڈر مارشل ٹیٹو جو ابھی کچھ دن پہلے تک بالشویک سیاست کے ایک بڑے رکن مانے جاتے تھے، آج کل روسی بالشویک جماعت میں بہت شبہ کی نظر سے دیکھے جانے لگے ہیں اور ان پر اس جماعت کا غصہ برس رہا ہے۔ دنیا حیرت میں ہے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا روس کے آہنی پردے کے پیچھے ایسے رخنے پڑ گئے ہیں کہ لینن اور ٹراٹسکی کی مخالفت کی تاریخ پھر سے دہرائی جانے والی ہے؟ کوئی کہتا ہے۔ ٹیٹو امریکہ سے مل گیا ہے اس لئے روسی اسے ختم کر کے رہیں گے۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ بہرحال ماسکو اور بلگراڈ کا یہ جھگڑا دنیا کی سیاست کا ایک اہم معمہ بن گیا ہے۔ آپ کے پڑھنے والوں کو بھی ضرور اس کی تہہ تک پہنچنے کی خواہش ہوگی۔

میں نے یہاں لوگوں سے باتیں کیں، ان کی آپس کی باتیں سنیں تو ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عام خیال یہ ہے کہ روس والے اور دوسرے مشرقی یورپ کے بالشویک لیڈر ٹیٹو سے جلتے ہیں۔ اس کے اثر اور مقبولیت پر رشک کرتے ہیں۔ ایک نوجوان نے جب مجھے یہ وجہ بتائی تو میں نے پوچھا کہ آخر اس جلنے کی وجہ۔ تو بولا "ہمارا پیارا ٹیٹو شان دار آدمی ہے، ٹھاٹھ سے رہتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ وہ ٹھاٹھ سے رہے۔ اس لئے کہ اس کی شان میں ہمیں اپنی شان دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سربیوں کے بادشاہ نے اسے ۵ برس قید میں رکھا تھا اب ہمارے سب بچے اپنے اس گیت میں جو وہ صبح صبح مدرسوں میں گاتے ہیں، سربی خاندان کے جد امجد قراجار جورج کی بجائے ٹیٹو کا نام لیتے ہیں۔ شاہ اسکندر کے مشہور متعلقہ بیس محل ہیں۔ ٹیٹو نے اپنی سرکاری قیام گاہ بنایا ہے۔ شہزادہ پال کے محل میں اپنے رہنے کا انتظام کیا ہے۔ کیوں نہ کرے۔ بادشاہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے تو ہمارا لیڈر کیوں نہ ٹھاٹھ سے رہے۔ اس میں قوم کا جی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ پچھلے ظلم پر قوم کی فتح کا اعلان ہوتا ہے۔ اچھا کرتا ہے ٹھاٹھ کرتا ہے، ہم کراتے ہیں تو کرتا ہے۔ دوسرے کیوں جلتے ہیں؟"

اس ٹھاٹھ کرنے والے لیڈر کی یہ ہر دلعزیزی اس وجہ سے ہے کہ یہ واقعی لوگوں کا آدمی ہے اور اس ٹھاٹھ کے باوجود ان کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ اور پھر اس نے جو کام کیا ہے وہ بہت عظیم الشان ہے۔ مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں کو تو آزادی دلائی ہے ماسکو نے اور یوگوسلاویا کو آزاد کیا ہے ٹیٹو نے۔ روس سے تو زیادہ سے زیادہ جنگ کے بعد مدد دی تھی۔ پچھلی جنگ میں شاید ہی کہیں ایسی سنگین لڑائیاں ہوئی ہوں جتنی یوگوسلاویہ میں۔ ہر خاندان نے ملک کی آزادی کے لئے کچھ نہ کچھ جانیں نذر کیں۔ ٹیٹو نے ملک کے کسان نوجوانوں سے ایک مضبوط فوج بنائی جس نے دشمن کے ۲۵ ڈویژن روکے رکھے اور جرمنی ہنگری اور اٹلی کی فوجوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

میں نے نوجوان سے پوچھا "جلتے تو ہمیشہ سے ہوں گے، اس وقت کیا خاص بات ہوئی کہ اس کا اظہار ہوا؟" بولا "یہ تو صاف بات ہے۔ مدتوں بعد یہ دن نصیب ہوا ہے کہ ہم اپنی پارٹی کا اپنے آزاد ملک میں جلسہ کریں۔ ۱۹۲۰ء میں ہماری پارٹی یہاں دبا دی گئی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں ہم نے چھپ کر ایک جلسہ کیا، اس کے بعد جنگ لڑی، ملک بنایا۔ اب ذرا چین نصیب ہوا ہے تو اپنا جلسہ کرنے کو ہیں۔ بس یہ بات ان کم بختوں سے نہ دیکھی گئی۔ آپ جانیں وہ بلغاریہ والا ڈیمٹروف تو ہمیشہ سے ہم سے بپھرا رہتا ہے۔ اس نے اس پاس کے دوسرے لیڈروں نے اور روس کے کچھ بوجھ بجھکڑوں کو اکسایا، اور ہمیں اور ہمارے لیڈر کو بدنام کرنا شروع کیا۔"

"لیکن بھائی" میں نے کہا "جلنا اور رشک کرنا تو میں سمجھا، مگر کیا ان ذاتی باتوں سے لوگ اتنے بڑے بڑے کاموں کو خراب کر دیتے ہیں؟" "ذاتی رشک کی آگ جب بھڑکتی ہے تو ساری اچھی صفتیں جل کر خاک ہو جاتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کا ایک سمجھ دار طالب علم تھا وہ بولا "ہاں یہ ٹھیک ہے رشک بھی ہے جلاپا بھی۔ مگر اصل وجہ یہ ہے کہ سارے مشرقی یورپ کے سامنے اس وقت ایک بنیادی مسئلہ ہے، وہ یہ کہ اس عبوری دور میں ہم اپنی معیشت کی تشکیل کیسے کریں؟ ایک ابتدائی جاگیرداری نظام سے اشتراکیت تک کی منزلیں کس طرح طے کریں؟ اس مسئلے پر ہمارے یہاں بھی اور ہمارے پڑوسی ملک میں بھی برابر بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے، اور اب تک ہوتا ہے۔ اس بحث سے دو باتیں ہمارے سامنے نکھر آگئی ہیں۔ ایک یہ کہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر اور بے جا ہر معاملے میں روس کی نقل کریں، روس کے خیال اور روس کے تجربے سے بے شک بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے لیکن نقالی ضرور نہیں۔ ہمیں ابتدائی سرمایہ داری سے اشتراکیت تک کی راہ اپنے اپنے طریق پر طے کرنی ہوگی۔ اس طریق پر رہنمائی اشتراکی اصول کریں گے، ہماری پارٹی نگرانی کرے گی، لیکن فیصلے کا حق اس کا ہوگا۔ دوسرا نتیجہ بحث سے یہ برآمد ہوا کہ اشتراکیت اب صرف ایک ملک میں نہیں بہت سے ملکوں میں ایک حقیقت بن سکتی ہے اور اگر یہ مل کر کام کریں تو بہت اچھا ہو۔ ان بحثوں میں سے جمہوریت قومی کا خیال پیدا ہوا۔ یہ خیال لینن کی نئی معاشی پالیسی سے ملتی جلتی ایک چیز ہے۔ یعنی یہ خیال کہ مکمل نمونہ کی اشتراکیت کا پورا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دولت پیدا کرنے کے طریقوں میں بنیادی تبدیلی نہ ہو جائے۔ اس تبدیلی کے رونما ہونے تک پورا نقشہ پر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب اس منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب ہیں، لیکن اپنی راہ پر چل کر۔ ہمارے لئے اس پاس کے ملکوں کو اپنے ساتھ ملا کر ضرور نہیں کہ روس کے ساتھ ہم بالکل ضم ہو جائیں، ہمارے پاس آزمایا ہوا لیڈر ہے تجربہ کار پارٹی ہے، کامیاب عمل کا سہارا ہے، ہم اپنے ہاتھ پاؤں کیسے کٹوا دیں؟"

میں سمجھتا ہوں کہ ان نوجوانوں نے ٹھیک ٹھیک بات مجھے بتا دی۔ ماسکو اور یوگوسلاویا کے اختلاف کی تہہ میں کچھ شخصی رقابتیں ہیں اور بہت کچھ یوگوسلاوی قوم کی یہ آرزو کہ وہ روس کی بالکل تابع نہ ہو جائے بلکہ ہو سکے تو مشرقی یورپ کے ممالک کو اپنی سرکردگی میں منظم کرے۔ پہلی بات بات کا صحیح فیصلہ تاریخ میں پھر کر سکتی ہے لیکن دوسری میں وہ کیوں کچھ کرانے لگا۔ تو وجہ یہ ہے کہ کشیدگی بڑھے گی۔

لیکن اس امید پر امریکا اور سرمایہ دار ملکوں کو زیادہ سہارا نہ لینا چاہیئے۔ باوجود سخت آزمائش کے یہ بات نوٹ رکھنے کی ہے کہ مشرقی یورپ کے ممالک نے اپنی سیاست میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے۔ ہنگری اور بلغاریہ میں یوں تو بحث لے دے ہو رہی ہے۔ مگر یوگوسلاویہ سے سیاسی تعلقات میں ذرا فرق نہیں آیا۔ ابھی چند روز ہوئے بلغاریہ سے ایک تجارتی مشن یہاں پہنچا ہے۔ البتہ گرم مزاج البانیہ والے یوگوسلاویا سے اپنا معاہدہ ختم کر دیا ہے۔ آج ہی ڈینیوب کانفرنس کے پہلے دن یوگوسلاویا نے روس کا ساتھ دیا۔ لوگ بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ شاید یہاں کچھ آتش بازی ہوگی۔ پہلے ہی جلسے میں کانفرنس کی زبانوں کا مسئلہ اٹھا، روس اور اس کے حلیفوں نے یہ طے کیا تھا کہ روسی اور فرانسیسی سرکاری زبانیں ہوں، اور انگلستان کی انگریزی زبان کو ضمنی حیثیت [illegible] کاغذات سب صرف سرکاری زبانوں میں ہوں [illegible] ضمنی زبان میں بھی ہو سکیں۔ اس مسئلہ میں یوگو[illegible] کے نمائندہ بھلر نے بڑے زور سے روسی لیڈر [illegible] کی تائید کی۔ اکثریت نے اس رائے کو قبول کیا [illegible] ٹم میں اختلاف کی امیدوں [illegible] کانفرنس ہے جس میں روس [illegible] ہے پیشین گوئی [illegible] دکھائی دیتا ہے کہ یہاں [illegible] گزرے گی جو اکثر کانفرنس [illegible] امریکا اور انگلستان [illegible] جائیں گے۔

یہ یورپ کی تصویر [illegible]

کئی سال سے یورپ کی [illegible] ہے۔ لوگوں کو کھانے کو صرف اتنا [illegible] کے بیچ میں جھولتے ہیں۔

بھوک کا اثر صرف [illegible] جسم بے جان سا ہو جاتا [illegible] کے دماغ پر ایک ہی خیال [illegible]

مزاج اور اخلاق پر بھوک کا بہت [illegible] وئینا کے باشندے جن کی خوش مزاجی مشہور تھی [illegible] ہو گئے ہیں جن باتوں کو وہ مسکرا کر ٹال [illegible] سے لڑنے لگتے ہیں۔

آدھے پیٹ کھانے سے ہر وقت غنودگی [illegible] یورپ کے لوگ آج کل کھوئے کھوئے سے رہتے [illegible] کے سامنے آ جاتے ہیں اور ایک دم سے چونک کر پیچھے [illegible] ٹرام میں بیٹھے سو جاتے ہیں مشین پر کام کرتے کرتے اونگھ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مشین کے حادثوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ لاکھوں آدمی دق سے مر جائیں گے۔ جیسی اور اسی معدہ اور آنتوں کی بیماریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ وٹامن کی کمی [illegible]

۴ سے آنکھوں کی خوبصورتی [illegible] کی [illegible] کا تعدہ سے

ترکی
پچھلے پچیس سال میں

(۱)

آج سے تقریباً پچاس برس پہلے (۱۸۹۸ء) لارڈ سالسبری نے ترکی اور برطانوی معاہدہ اور اتحاد پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ "برطانیہ نے روس کے مقابلے ترکی کا ساتھ دے کر گویا اپنے مرے گھوڑے پر بازی لگائی ہے" یہ زمانہ عبدالحمید خاں کے عہد حکومت کا تھا، اور رعایا ان کے سخت مظالم اور ہولناک سختیوں سے بہت پریشان تھی۔ اور سلطان کو اس کا کچھ احساس نہ تھا۔ ان حالات میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی کے دن کبھی نہیں پھر سکتے، اور ایسے فرمانرواؤں سے اصلاح و ترقی کی کوئی اُمید نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بات اس وقت تو ٹھیک تھی، لیکن اب حالات بالکل دیگر ہیں، اب اگر کوئی یہ بات کہے تو ترکی سے ناانصافی ہوگی، کیونکہ اس عرصے میں ترکی نے وہ نمایاں ترقی حاصل کرلی ہے کہ جس کی مثال دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے، [illegible] کے باوجود اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے نزدیک ابھی تک ترکی اسی دور جاہلیت سے گزر رہا ہے اور اب بھی وہاں عہد وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام حکومت قائم ہے [illegible] قسم کی بدگمانیوں میں پروفیسر لاسکی جیسی اہم اور معروف ہستی بھی [illegible] پروفیسر صاحب موصوف نے حال ہی [illegible] اس بیان پر تنقید کی ہے جس میں یورپ کے [illegible] بتائی گئی ہے اور جس کو کانگریس [illegible] کی رہنمائی بھی کردی ہے، اسس [illegible] نے اس اسکیم کی خوب دھجیاں [illegible] سبری کے اس مشہور فقرے [illegible] کی ہے [illegible] اس [illegible] بیان سے کوئی مطلب ہے اور نہ اس [illegible] کرنے والوں سے کوئی مباحثہ کرنا [illegible] ترکی کے متعلق ایک امریکن سیاسی [illegible] میں۔

[illegible] کا ترکی آج کے ترکی سے [illegible] اتاترک کا تھا جس پر عثمانی خلفا [illegible] حکومت تھی جو اپنے آپ کو [illegible] مسلم کے حقیقی جانشین سمجھتے تھے [illegible] مٹھی بھر مستبد ترکوں کے [illegible] یورپ، ایشیا اور افریقہ کے ہزاروں [illegible] جو تہذیب و تمدن میں، رسم و رواج میں [illegible] میں، زبان اور رہنے سہنے کے طریقوں میں [illegible] بالکل جدا تھے، اپنی حکومت اور ظلم و جبر کی مشق [illegible] جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کا سارا ڈھانچہ کمزور [illegible] معاشی اور سماجی نظام ڈھیلا اور تہذیب و تمدن بے جان [illegible] گیا تھا، بدنظمی، اور بدانتظامی کی وجہ سے سلطنت نہ صرف [illegible] ناتوان ہوگئی تھی بلکہ عالم نزع میں سسک رہی تھی اور قریب تھا کہ دم توڑ دیتی مگر ۱۹۱۹ء میں ترکی میں ایک انقلاب آیا اور ترکی کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی۔ یہ ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا اس کو ترکی کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اسی وقت سے جدید ترکی کی داغ بیل پڑی۔

یہ وہ یادگار زمانہ تھا جبکہ جنگ عظیم کو ختم ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اور مجلس اقوام کے فیصلے کے مطابق اتحادیوں نے ترکی کے عربی ممالک آپس میں بانٹ لئے تھے اور باقی ماندہ اکثر ملکوں میں ان کی فوجیں داخل ہورہی تھیں۔ اس بندر بانٹ میں صرف اناطولیہ کا علاقہ غریب ترکوں کے پاس رہ گیا تھا، لیکن اس پر بھی اتحادیوں کی شہ پا کر یونان دانت لگائے ہوئے تھا اور دست اندازی کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت ترک نوجوانوں کی بے مثال بہادری، عزم مصمم اور جرأت و حمیت نے ہوا کا رُخ پھیر دیا اور ترکی کو نیا جنم دیا۔ ان جانبازوں اور بہادر وطن کے سپوتوں میں مصطفیٰ کمال کا نام سب سے نمایاں تھا۔

مصطفیٰ کمال نے تمام ترکوں کو اپنی سرکردگی میں قومی مجلس کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا، اور اپنی بے پناہ ثابت قدمی اولوالعزمی اور اپنی موثر شخصیت کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ یورپ کے اس مردہ کو جس نے گدھوں نے ٹرپ کر لیا تھا۔ آخرکار اگل دینے پر مجبور ہوئے۔ یہ انھیں جواں مردوں اور بلند ہمتوں کا کام تھا کہ ۱۹۲۲ء تک انھوں نے تمام مغربی اقوام کو اپنے ملک سے نکال دیا، اور یونان برطانیہ اور فرانس جنھوں نے ملک کے کثیر حصے پر کرکے اپنے قبضے میں کر لیا تھا مجبور ہوکر ترکی کو چھوڑ کر الگ ہوگئے۔ ان جانباز ترکوں نے ترکی کو نہ صرف بیرونی عمل دخل سے پاک کیا بلکہ ملک سے سلطان کے اثر کو بھی ختم کیا۔ اور اس کی شاہنشاہی کی جگہ انقرہ میں مصطفیٰ کمال کی صدارت میں ایک جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی، اس حکومت کی دوسرے ملکوں پر اتنی دھاک بیٹھی کہ اسی سال صلح لوزان کانفرنس کے موقع پر اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا گیا، ادھر سے جب ذرا سکون ہوا تو مصطفیٰ کمال نے حکومت کی تشکیل کی۔ یہ حکومت ترکی باشندوں کی اپنی حکومت تھی جس میں ذات پات، درجہ اور طبقہ کا کوئی امتیاز نہ تھا، اسی لئے تمام باشندوں کی وفاداریاں، ہمدردیاں اس حکومت سے وابستہ تھیں اور سب نے تن من دھن سے اس کے ساتھ تھے

اس طرح ترکی نے بڑی حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ میدان ترقی کی طرف بغیر ایک قطرہ خون بہائے قدم بڑھانے شروع کردئے۔

ترکی کی اس جنگ آزادی کی ابتدا تو چند فوجی نوجوانوں نے کی تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لہریں تمام ملک میں دوڑ گئیں اور ترکی کا ہر باشندہ اور ہر طبقہ اس مہم میں ان نوجوانوں کے دوش بدوش کام کرنے لگا، ملکی و فوجی افسران یعنی یورپی ترکی کے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کے علاوہ تاجروں اور ان پڑھ دہقانیوں نے بھی جنگ آزادی میں پورا حصہ لیا، اور خالص سیدھی سادی قومیت کے بھرپور جذبہ اور انمٹ طاقت کے بل بوتے پر یہ جانباز ترک اپنے رہنماؤں کی قیادت میں برابر آگے قدم بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ مکمل آزادی و حریت نے ان کے قدم چومے۔

شروع میں جب تک کہ جنگ آزادی کی مہم جاری رہی ترکوں نے داخلی اصلاحات کی طرف سے عمداً پہلوتہی کی کہ اصلاح و تعمیر نو کے لئے سکون و اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی دولت اس ہنگامی دور میں ناپید تھی

بعد میں جب حالات درست ہوگئے اور ترکوں نے اپنی مہم میں کامیابی حاصل کرلی تو اصلاحوں کا دور شروع ہوا۔

ترکی کی اصلاحات کے سلسلے میں اتاترک اور ان کے ساتھیوں کا اصرار تھا کہ بے دھڑک ملک کو پوری طرح مغربی رنگ میں رنگ دینا چاہیے۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے کہ گذشتہ زمانے کی طرح ہم مغربی اثرات کو تھوڑا تھوڑا کرکے قبول کریں بلکہ اس وقت ہم کو تیزی سے پوری طرح مغربی رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔ ہاں اپنی ترکیب کو اس حد تک ضرور برقرار رکھنا چاہیے۔ جہاں تک خود مغربی اقوام اپنی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس قسم کے اصلاح کرنے والے زیادہ تر فوجی افسر تھے جو احکام کی خلاف ورزی پر بہت برافروختہ ہوتے تھے، جن کی عادت بن چکی تھی کہ احکامات جوں ہی صادر ہوں بے چون و چرا ان پر عمل درآمد شروع ہو جائے مگر باوجود طبیعت کی اس افتاد کے اور اس طرح کے تجربوں میں زندگی گذارنے کے، جنگ عظیم نے یہ بات اچھی طرح ان کے دل میں بٹھا دی تھی کہ یورپ کے دیگر سماجی نظاموں اور طرز ہائے حکومت کے مقابلے میں آئندہ جمہوری طرز حکومت ہی کامیاب ہوسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ترکی جمہوریہ صرف ایک فرقہ ایک جماعت یا ایک قوم کی حکومت نہ تھی بلکہ یہ مختلف فرقوں اور جماعتوں کی ملی جلی حکومت تھی جو پوری طرح جمہوری اصولوں کی حامل تھی، اور اس کے کل پرزوں پر جمہوری رنگ غالب تھا، اگرچہ اس کے رہنما مغرب کی پارلیمانی طرز حکومت کے قائل تھے لیکن ابھی تک عملاً حکومت پوری طرح خالص جمہوری نہ تھی بلکہ اچھی قسم کی رعایا پرور استبدادی حکومت تھی جو مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھی۔

اتاترک بہت تیز طبع بلند حوصلہ اور پرزور آدمی تھے، ملکی اور بین اقوامی معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان معاملات کے بارے میں کہ ترکوں کو کون سی چیزیں قبول کرنی چاہئیں، یا کون سی چیزیں برداشت کرنی چاہئیں ان کا فیصلہ بہت صحیح اور بہت موزوں ہوتا تھا، ان میں ضبط اور برداشت کی بے پایاں طاقت تھی۔ اسی لئے انھوں نے کبھی بھی بے سوچے سمجھے اندھا دھند سیاسی یا فوجی معاملات میں ہاتھ نہیں ڈالا جس کی وجہ سے ان کے بُرے نتائج سے ہمیشہ محفوظ رہے!

مصطفیٰ کمال کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور اس قدر موثر تھی کہ اگر وہ چاہتے تو انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتتے۔ لیکن انھوں نے کبھی ایسا نہیں بلکہ "حزب خلق" (جنتا پارٹی) کے سرگردہ کی حیثیت سے وہ خود اسمبلی کے لئے اُمیدواروں کا انتخاب کرتے اور جمہوریہ کے صدر کی حیثیت سے وہ ایسے افسروں کا تقرر کرتے جو حکومت کی مشینری کو بہتر سے بہتر طریقے پر چلا کر اس بات کا یقین دلادیں کہ پارٹی ہی کے اُمیدواروں کو انتخاب کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسمبلی نے مسلسل دو مرتبہ ان کو اپنا صدر چنا۔

اسمبلی نے ملک کے لئے جو دستور بنایا اس نے مرکزی حکومت کو بہت مضبوط بنا دیا۔ اگرچہ حکومت ایک پارٹی کے ہاتھ میں رہی لیکن آبادی کے با اثر

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

نئی روشنی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد الحلیم ندوی

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۶، ۲۴

چندہ:- سالانہ ۶؍ ششماہی للعہ

مجذوب کی بڑ (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

جو وہ سمجھتا ہے کہ دین داری نام ہے ہر زندہ قوت نسے لڑنے کا۔ وہ خود تو اتمام اور نیم گرم عقیدہ رکھتا ہے۔ بے توجہی اور بے دلی سے عبادت کرتا ہے مگر جب کسی دوسرا عقیدہ رکھنے والے یا دوسرے طریقے سے عبادت کرنے والے کو دیکھتا ہے تو یا دل کی طرح اٹھتا ہے۔ گرجتا ہے اور برس پڑتا ہے۔ شاعری کو اس نے سچے مشاہدات، واردات اور جذبات سے بے تعلق کر کے بے رنگ حسن، بے کیف عشق، بے ثمر وصل اور بے تکین ہجر کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری حقیقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے اور جذبات میں خوش نما حرکت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو نہیں کہتے، بلکہ خارجی اور عینی دنیا سے منہ موڑ کر اپنے نفس کی اندھیری کوٹھری میں بھٹکنے، اِدھر اُدھر ٹٹولنے اور کچھ نہ پا کر کف افسوس ملنے کو۔ اس کے خیال میں شاعر وہ نہیں جس کا دل کائنات کے درد سے دکھتا ہے اور جس کا ذہن حسن ازلی اور عشق ابدی کی موسیقائی میں اس درد کی دوا ڈھونڈتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے ہاتھوں ادنیٰ خواہشات اور جذبات کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ باہر نکلنے کی کوشش کرے روتا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے۔ اس نے اقتصاد و سیاست کی طرف سے ابتدا میں ایسی غفلت برتی کہ وہ مال و زر سے بالکل خالی اور قوت و سطوت سے قطعاً محروم ہو گیا، اور اب جو ذرا سنبھلا ہے تو اس نے ان چیزوں کو جن میں فکر و عمل کی ضرورت ہے جذبات کا کھیل بنا دیا ہے۔ اپنے بستے گھر نہیں بس سکتا، دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا ہے، آج ایک کا کل دوسرے کا۔ پھر جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں تو طیش میں اپنے آپ سے لڑتا ہے، جھنجھلاہٹ میں اپنی بوٹیاں چباتا ہے.......اگر اس خیالی تصویر پر تیری نظر نہ جمی ہو تو مجھے دیکھ میں تیرے سامنے کھڑا ہوں، ایک دن تھا کہ میں بھی انسان تھا، میں بھی مسلمان تھا۔ میں نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اس عرصۂ جدو جہد سے، اس جہاں گیر و دار سے الگ ایک طلسمی دنیا میں پرورش پائی تھی۔ مذہب کے پردے میں کاہلی، بے عملی، بے بسی، بے حسی سیکھی تھی، شاعری کے نام سے نفس پرستی حقیقت فراموشی کی تعلیم پائی تھی۔ سیاست و اقتصاد کے دھوکے میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے اور آخر میں مایوس ہو کر تقدیر سے، دنیا سے اور اور اپنے آپ سے لڑنے کی مشق کی تھی۔ میری زندگی بھی غفلت وحشت، جمود اور اضطراب کا تضاد تھی۔ مگر میرا تخیل دوسروں سے زیادہ قوی تھا، اور میرا دل و دماغ دوسروں سے زیادہ کمزور۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے قوائے ذہنی میں باہمی ربط کے رشتے ٹوٹ گئے۔ میری محدود خیال زندگی کا سلسلہ بھی میری آنکھوں کے سامنے الگ الگ کڑیوں میں بکھر گیا جن کو ملانے کی میں کوشش کیا کرتا ہوں مگر بہت کم کامیاب ہوتا ہوں، لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں مگر چونکہ میری پچھلی زندگی میں رہبانیت غالب تھی اور اب بھی اس کا شائبہ موجود ہے، اس لئے اخلاقاً مجذوب کہتے ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ مجھ پر حقیقت کے بھید اور معرفت کے اسرار کھل گئے ہیں اور عقل برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عارفوں کی روشن ضمیری تو ایک طرف میں تو معمولی انسانوں کے مربوط ادراک، احساس اور عمل کے لئے تڑپتا ہوں، مگر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی حالت مجھ سے کچھ بہتر ہے؟ نہیں ہرگز نہیں وہ سب میری طرح مجذوب ہیں اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ میں کھلا ہوا مجذوب ہوں، وہ چھپے ہوئے مجذوب ہیں۔ میں نے زندگی کی بازی میں ہار مان لی، اور وہ ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں......... خیر مجھے اس وقت سے غرض نہیں میں تو تجھ سے وہ بھید کہنا چاہتا ہوں جو میں نے سب کچھ کھو کے پایا ہے میرے ذہن کی تاریکی میں اس وقت جو عارضی روشنی آ گئی ہے اسے غنیمت سمجھ اور میری بات غور سے سن۔ تو ابھی نوجوان ہے۔ تو نے پہلے پہل زندگی کے اس گھنے اور تاریک جنگل میں قدم رکھا ہے جس میں میں سیدھی راہ چھوڑ کر بھٹک گیا ہوں۔ تیرے پاس ابھی عقل کا چراغ موجود ہے جس میں عقیدے کا تیل جلتا ہے۔ تیری رگوں میں ابھی شوق اور ولولے کا خون دوڑ رہا ہے اور تیرے پیروں میں رہ نوردی کی قوت موجزن ہے۔ اگر تو منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو چلنے سے پہلے منزل کو متعین کر لے۔ پہلا قدم اٹھانے سے پہلے بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے [illegible] اس چراغ کی روشنی میں جو تیرے پاس ہے، اس جنگل کے

مالک کے بھیجے ہوئے نقشے کا خوب مطالعہ کر لے اور منزل رسیدہ مسافروں کے سفرناموں کو غور سے پڑھ لے۔ جب یہ کر چکے تو استقلال اور استقامت کو اپنا رفیق راہ بنا اور خدا کا نام لے کر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں داخل ہو جا۔ اگر راہ میں تیرے ساتھی بھٹک جائیں تو قدم اور تیزی سے بڑھا۔ اگر تجھ پر نیند غالب ہو تو آنکھیں اور اچھی طرح کھول لے اور اگر روشنی چھپ جائے اور اندھیرا چھا جائے تو اپنے چراغ کی بتی کو اور اکسا لے۔ جب تجھے دوسرے رہ نورد نظر آئیں تو ان سے گریز نہ کر کیونکہ وہ تیرے رفیق سفر ہیں، ان کی مدد کرنا تیرا فرض ہے، اور ان سے مدد لینا تیرا حق ہے۔ لیکن سہارا لینا ہو تو اس کا لے جو سیدھے راستے پر چل رہا ہے۔ سہارا دینا ہو تو اُسے دے جو سیدھے راستے پر چلنا چاہتا ہے......

......اگر تجھے یہ باتیں منظور ہیں تو جا خدا تیرا حافظ ورنہ اُٹھ اور اس تالاب میں کود پڑ اگر تیرا بھی وہی انجام ہونا ہے جو میرا ہوا تو بہتر ہے کہ تو اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر دے!

میں تصویر عبرت بنا ہوا مجذوب صاحب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اُن کے آخری الفاظ پر میں چونک پڑا۔ مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ اُٹھے اور بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ خدا جانے انھیں مجھ پر رحم آ گیا یا ان کے دل میں میری طرف سے کچھ اُمید پیدا ہو گئی۔

سیلون میں ہندوستانیوں کی حالت (بہ سلسلہ صفحہ [illegible])

لئے نہایت مضر بتایا، اور اس امر پر زور دیا کہ دیکھنے میں تو یہ بل مزدوروں کی [illegible] کے لئے وضع کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی آمد کو [illegible] لیا جائے حکومت کی جانب سے یہ بات واضح کی گئی کہ [illegible] کی ابتدا سے اس [illegible] کہ مزدوروں کا داخلہ سیلون میں روکا جائے جس کے لئے قوانین کا وضع [illegible] تھا لیکن اس زمانے میں ملک کی اقتصادی حالت نے اس بل کا [illegible]

ان تقریروں سے چند امور صاف طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) ملک کی اقتصادی حالت اس دارو گیر کی ذمہ دار ہے (۲) [illegible] کہا جا سکتا ہے اگر وہ نہ سیاسی حقوق کا طالب ہو اور [illegible]

ان امور کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ [illegible] میں پیدا ہو۔ نو آبادیات اور مقبوضات میں مدتوں کار فرما [illegible] ایشیا کے مختلف حصوں میں رونما ہیں

سیلون حقیقت میں ہندوستان سے اس قدر قریب ہے کہ اس کو ہندوستان کا [illegible] اور علمائے سائنس تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں [illegible] سمندر کی موجوں نے ہزارہا سال کے عمل کے بعد اس حصے کو ہندوستان سے [illegible] کے درمیان میں سمندر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا حائل ہو گیا۔ اس موقعہ پر [illegible] وہاں کے اور ہندوستان کے مختلف حصوں کی آبادی میں گہری مماثلت و مشابہت [illegible] وجوہ کی بنا پر انگریزوں نے سیلون کو عرصہ دراز سے ایک نو آبادی کا [illegible] سیاست سے قطعاً جدا کر دیا تھا، اور یہ جدائی آئے دن اس قدر استوار [illegible] مخالفت سے بھی گریز نہیں کرتا کیونکہ وہاں کی حاکمیت دولت مندوں اور [illegible] ہے اور سرمایہ دار نہ نظام حکومت نہ نسلی ہم آہنگی کی پروا کرتا ہے اور نہ تمدنی مماثلت کی [illegible] باشندہ ہندوستان کی کوئی زبان نہیں بولتا اگرچہ وہ تامل اور تلنگی زبانیں بخوبی [illegible] معتقدات پر ہندوستانی چھاپہ کا گہرا اثر ہے، اور اس کی بود و ماند کا طریقہ ہندوستان [illegible] ذرا بھی مختلف نہیں۔ اس کی تہذیب کے اجزا ہندوستانی تہذیب سے اخذ کئے گئے ہیں [illegible] سیاست کے وزن نے ان تمام اجزا کو اس قدر پامال کر دیا ہے کہ منکرین کی نگاہوں سے [illegible] ہو گئے ہیں۔ ہندوستان بہر حال صلح، امن اور آشتی کا پیامبر ہے اس سے غیر ملکی پروگرام میں جنگ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اسے ایشیا کی تہذیب کا علمبردار بننا ہے مشرق کی تہذیب شائستگی کی روایات [illegible] مرکب ہوئی ہے، ہمیں اُمید کرنا چاہیئے کہ ایشیا کے ممالک برطانیہ اور امریکہ کی سامراجی اور اقتصادی چالوں کا شکار نہ بنیں گے۔ بلکہ سب متحد ہو کر خود ایشیا کو اس قدر مستحکم بنا لیں گے کہ بیرونی اثرات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔

طابع و ناشر [illegible] عظمی

مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۴ | ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

جمود و حرکت کا قانون

مولانا ابوالکلام آزاد

قوموں کا آغاز و انجام عروج و زوال، غفلت و بیداری، آزادی و محکومیت، فتح مندی و ناکامی سب پر ایک ہی قانون نافذ ہے، اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور ایک کے لئے ہوا ہے بجنسہ وہی ہر قوم پر گذرتا اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مورخ عبدالرحمن ابن خلدون نے (جس نے سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ کے مبادیات و اصول مدون کئے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے "اگر ہم زبانوں اور ناموں کی قید نکال دیں تو ایک قوم اور ایک زمانے کی تاریخ بجنسہ ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں سے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا" اس حقیقت کو موجودہ زمانے کے مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر گسٹاولی بان نے زیادہ جامع و علمی پیرائے میں بیان کیا ہے "جب ہم جماعتی زندگی کے سائیکولوجی اس طرح مدون کر لیں گے جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کر لی ہے تو پھر ہمارے لئے ممکن ہو جائے گا کہ ہم ایک قوم اور تمدن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدن کے لئے استعمال کر سکیں ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکے گی"

آج ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔ صرف یہی بات ہمارے تمام بے جا تعجبوں اور بے جا اندیشوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہمیں آگاہ رہنا چاہیئے کہ آج جو کچھ پیش آرہا ہے وہ نہ تو نیا ہے نہ معمول کے خلاف۔ بلکہ قومی جدوجہد کے اس مرحلے کی جس سے ہندوستان گذر رہا ہے ایک بالکل قدیم، معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔ در اصل ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمیشہ گذر چکا ہے۔ اور وہ دیکھ رہے ہیں جو ہم سے پہلے دیکھا جا چکا ہے۔ ہم کچھ نہیں ہیں مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہیں جو اس قانون اجتماع کی یکسانیت کی بے شمار نظیروں پر ایک نئی نظیر کا اضافہ کرتا ہے!

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی دماغی اور فکری حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن کا استعارہ مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے۔ ذہن اور دماغ کے تعلیمات میں خواب دیکھتی ہے۔ جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے اور بالآخر جدوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جدوجہد ایسا سفر ہے جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں اور ٹھہرائے ہوئے رسم و راہ ہیں۔ جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں۔ اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گزرے جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بے شمار ہیں اور جس طرح اس کی فتح مندی اٹل ہے اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی، اس میں دماغ کے لئے بھی آزمائشیں ہیں اور جسم کے لئے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں، اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں اس میں جا بجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ رک رک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں مگر ضروری ہیں۔ اس کی فتح مندی قدم قدم پر نہیں ہے مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی۔

خدا کا یہ قانون حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطل نہیں ہو سکتا ہم چلے ہیں تو ہمارے لئے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں اور ناگزیر ہے کہ ان سب میں سے گذریں۔ اگر ہماری تیز رفتاری رک گئی تو ہمیشہ رکا کرتی ہے۔ ہمیں تیزی سے بے پروا نہ ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو پڑا ہی کرتا ہے۔ ہمیں از سر نو کوچ شروع کر دینا چاہیئے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہو سکے۔ یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں ہم کیوں نہ متفق ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک آزمائش ہے جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیئے جس طرح باہمت قومیں غالب آتی ہیں لیکن اس سے زیادہ اس میں نہ کوئی ہراس ہے نہ مایوسی یہ کوئی نرالی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو۔ یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے جو ہماری طرح نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئے گا ...... اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ردعمل کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک بندھن میں بہت سے بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے تھے یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوئے ہیں۔ انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور قومی جدوجہد کو ایک آزمائش پیش آجاتی ہے ...... تاہم اگر جدوجہد کا دماغ اور پھیپھڑا محفوظ ہے تو یہ جو کچھ ہوتا ہے جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی زندگی کے لئے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن جوں ہی وہ مدت ختم ہوتی ہے جو اس نشہ خمار کے لئے ضروری تھی۔ معاً افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہو جاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رونما ہو جاتی ہے۔ (خطبات)

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جمود و حرکت کا قانون	مولانا ابوالکلام آزاد	۱	ذاکر صاحب کی واپسی پر (نظم)	آل احمد سرور	۷
ہم کدھر جا رہے ہیں	سالک ہندی	۲	غزل	خلیل الرحمٰن اعظمی	۷
خوشی اور عبرت کا مقام	ع، ح	۳	غزل	باقر مہدی	۷
بزم بے تکلف	"	۳	دیہی اور گھریلو صنعتیں	پروفیسر محمد عاقل	۸
پچھلا ہفتہ ۱۔ ہندوستان	"	۴	گلاب، ریحان اور فریب (افسانہ)	اوپندر ناتھ اشک	۹
۲۔ پاکستان	ا، س	۵	ترکی، پچھلے پچیس سال میں	عبدالحلیم ندوی	۱۰
مشرقی دنیا	ا، س	۶	اسٹالن کی ایک جھلک	شیخ حبیب اللہ	۱۱

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

سر اونچا رکھو

آج کل ہندوستان کے مسلمانوں اور غالباً پاکستان کے ہندوؤں میں مایوسی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جس کے خلاف خطرے کی گھنٹی بجانا ضروری ہے۔ دونوں نے اپنے صدیوں کے ساتھیوں اور ہم وطنوں کے ہاتھوں جو دکھ اٹھائے ہیں اور اقلیت میں ہونے کا احساس جو دونوں ملکوں میں بہت بڑھ گیا ہے اس کی وجہ سے انھیں اپنا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ان میں ایک عجیب ذہنی کیفیت اور الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ بعض نے تو تھکے ہارے بیلوں کی طرح کندھا ڈال دیا ہے کہ بازی ہو چکی، ہم کچھ نہیں کر سکتے، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ بعض یہ طے نہیں کر سکتے کہ انھیں اپنے موجودہ وطن میں رہنا چاہیئے یا دوسرے ملک میں چلا جانا چاہیئے جس کو وہ دوری کا فریب کھا کر جنت سمجھتے ہیں۔ بعض جو طے کر چکے ہیں کہ جہاں ہیں وہیں رہنا ہے وہ خود کو لباس، زبان، وضع قطع کے لحاظ سے ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں کہ ان میں اور اکثریت کے افراد میں تمیز نہ کی جا سکے، جس طرح بعض جانور پرندے، کیڑے مکوڑے ماحول اور موسم کے مطابق رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض تنگ نظر حلقوں کا ان سے مطالبہ بھی یہی ہے کہ تم اپنی کسی قسم کی مذہبی یا تہذیبی انفرادیت قائم نہ رکھو کیونکہ یہی قوم پرست ہونے کا ثبوت ہے! اگر وہ یہ تبدیلی خلوص کے ساتھ کریں تو اس میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں، لیکن وہ تو خود کو "امتیاز" کے خطروں سے محفوظ کرنے کے لئے مجبوراً ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا مناسب ہے؟ قابل اعتراض کیا چیز ہے؟ جماعتوں اور افراد کی خاص خاص تمدنی روایات اور طور طریقے یا وہ ذہنیت جو کسی قسم کے اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ سب کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے؟ کیا ہندو یا مسلمان یا سکھ ہونا کوئی گناہ یا جرم ہے جس کو اکثریت کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے؟ کیا اچکن اور شلوار پہننا یا ڈاڑھی رکھنا یا اردو یا گورمکھی کے ساتھ وابستہ ہونا کوئی عیب ہے جس کا اظہار ایک متمدن سماج میں نہ کرنا چاہیئے؟ فرقہ وارانہ جنون کے ان کارناموں کو دیکھنے کے بعد بھی جنھوں نے خوف کی یہ ذہنیت پیدا کی ہے اور ہماری صدیوں کی تہذیبی قدروں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ مرض کا یہ علاج ٹھیک نہیں! اگر کسی ملک میں رہنا ہے تو خودداری کے ساتھ اور سر اونچا کرکے رہو۔ بے شک انسان کی طرح سر بلند کرکے چلنا، گرگٹ کی طرح رینگنے سے زیادہ مشکل ہے اور اس میں خطرے بھی زیادہ ہیں لیکن اس بنا پر گرگٹ کو انسان پر ترجیح دینا میرے نزدیک تو ٹھیک نہیں۔

آج کل کے ہندوستان میں کوئی بات معقولیت اور انصاف کی کہو تو اس کا سلسلہ خود بخود جا کر گاندھی جی سے مل جاتا ہے۔ مجھے گاندھی جی کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ ہندوستان کی نجات کسی مذہبی یا کلچرل یکسانیت میں نہیں بلکہ اس کوشش میں ہے کہ ہر ہندو اچھا ہندو ہو کر، مسلمان اچھا مسلمان بن کر، سکھ اچھا سکھ بن کر اچھے ہندوستانی اور اچھے انسان ہونے کا ثبوت دے۔ ایک موقع پر گاندھی جی نے "شدھی" کی یہی الٹی لیکن دل لگتی تفسیر پیش کی تھی! یہ بات ٹھیک ہے اگرچہ بہت سے تنگ نظر، روشن خیال قوم پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی تہذیبی دولت اور روایتوں کا احترام کرتے ہوئے، اپنی شرافت، انسانیت، رواداری اور خدمت کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کے دل میں گھر کریں۔ بے لوث اور پرخلوص خدمت کی حرارت انسان کا یاذکر ہے پتھر اور لوہے کو موم بنا سکتی ہے۔ گاندھی جی نے اپنے مرنے سے پہلے کروڑوں مسلمانوں کا دل جیت کر اس صداقت کو پھر سے ثابت کر دکھایا۔ اسی کا ایک اور نظارہ ابھی حال میں جامعہ ملیہ میں ہوا جہاں ہندو اور سکھ استادوں اور استانیوں کے لئے جو سب کے سب شرنارتھی تھے، ایک ریفریشر کورس منعقد کیا گیا تھا۔ یہ سب پنجاب کے خونی واقعات کو جھیل چکے تھے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے شک تھا، ہچکچاہٹ تھی، غصہ تھا لیکن جامعہ کی فضا اور جامعہ کے سلوک نے جس میں ایثار، خلوص اور خدمت کا جلوہ ہے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دل میں رواداری، دوستی اور محبت کی شمع پھر سے روشن کر دی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں اسی جذبے کے ساتھ کام کریں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی بہترین خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے ملک میں ایک عزت کا مقام حاصل نہ کریں؟ اسی خدمت اور خلوص کی آگ میں سیرت کا سونا تپ کر ایسا کندن بن جاتا ہے کہ جب گذشتہ سال جالندھر کے اسٹیشن پر ایک مشتعل مجمع نے ذاکر صاحب کو گھیر لیا اور ایک شخص نے جو ان کو قتل کرنے پر آمادہ تھا ان سے سوال کیا کہ "کیا تم مسلمان ہو؟" تو انھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا "الحمد للہ، میں مسلمان ہوں" یعنی میری زندگی خدا کی چیز ہے اور اس کے بندوں کی محبت اور خدمت کے لئے وقف ہے، اگر اس جرم میں میری جان لینا چاہتے ہو تو لے لو، حیات جاوداں سے تو مجھے محروم نہیں کر سکتے!

آج سے تیرہ سال پہلے جب ہندوستان کے سیاسی مطلع پر ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے تاریک بادل محیط نہ تھے انھیں ذاکر صاحب نے کاشی ودیاپیٹھ کے سالانہ اجلاس میں یہ الفاظ کہے تھے جو بار بار دہرانے کے قابل ہیں:-

"سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے ہی لئے بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں .... ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔" یہ بات اگر ۱۹۴۷ء میں صحیح تھی تو آج بھی اور اتنی ہی صحیح ہے۔ گذشتہ چند سال کے واقعات اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے بلکہ ان کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

لیکن گذشتہ سالوں میں ہمارے رہنماؤں نے اپنی جہالت اور عاقبت نا شناسی کی وجہ سے اسلام کی تعلیم اور تہذیب کو ایک غلط رنگ میں پیش کیا۔ انھوں نے اس کی عالمگیر دوستی، اس کی رواداری، اس کی فرض شناسی، اس کے احترام مذاہب کو بھلا دیا اور مسلمانوں کو ہر معاملے میں علیحدگی اور جماعتی عصبیت کی تعلیم دی جس سے صرف مسلمانوں ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ اسلام کا ایک تنگ اور غلط تصور دوسروں کے دماغ میں پیدا ہو گیا جس سے ان کے شر پسندوں اور متعصب کارکنوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اس طرح باہمی اختلافات کی خلیج بڑھتی چلی گئی۔ اب کہ ہندوستان کا سیاسی نقشہ بالکل بدل گیا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوری ریاست میں اپنے فرائض کو ادا کرنے اور اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے اسلام ہی کے بہترین اصولوں اور قدروں سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے معذرت کرنی ضروری ہو۔ ہر شخص اور ہر جماعت کو حق ہے کہ وہ اپنی سیرت کی تشکیل میں اس سرچشمۂ الہام سے فیض حاصل کرے، جس سے اس کو دلی عقیدت ہے۔ گاندھی جی یا سر رادھا کرشنن کی انسانی عظمت اور ان کے خیالات کی اخلاقی اہمیت اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی کہ وہ بھگوت گیتا یا ہندو فلسفہ سے روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح وہ اپنی فراخ دلی اور وسیع النظری کی وجہ سے دوسری تہذیبوں اور مذہبوں کے معترف اور ان سے مستفید ہونے کو تیار ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی پوری رواداری اور احترام کے ساتھ ہر اچھی چیز کو لینا اور قبول کرنا چاہیئے خواہ وہ کہیں سے دستیاب ہو۔ حکمت تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے، لیکن ہمارے تنگ خیال لیڈر اکثر اس ارشاد نبوی کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے وطن ہندوستان میں، جس کو ابھی صرف سیاسی آزادی ملی ہے بہت سے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ لاکھوں ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ہے۔ دماغوں سے تنگ خیالی اور تعصب کو نکالنا ہے۔ افلاس، بیماری اور جہالت کے خلاف جنگ کرنی ہے۔ ہر طرح کے دکھیوں کی سیوا کرنی ہے اور ذات پات، نسل رنگ، مذہب کے فرق کو بھلا کر سیوا کرنی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ خود کو اس میں کھپا کر ہم جسم اجتماعی کے تمام زہروں کو دور کر سکتے ہیں اور کھوئی ہوئی قومی صحت پھر سے حاصل کر سکتے ہیں .... اور اسی میں ہماری ذاتی، جماعتی اور قومی نجات ہے۔

دستور زباں بندی

میں نے اس سلسلے کے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ ہر قسم کی ترقی کے لئے خیال کی آزادی ضروری ہے۔ اگر فکر کو زنجیریں پہنا دی جائیں یا اس کی آنکھوں پر اندھیریاں چڑھا دی جائیں تو نہ صرف ذہنی ترقی کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ مادی خوشحالی، سماجی اور سیاسی اصلاح سب خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ لیکن ہندوستان (یعنی انڈین یونین اور پاکستان دونوں) اس وقت ایک ایسی منزل میں سے گذر رہے ہیں جب مطلق العنانی کے ظاہری بندھن ٹوٹ چکے ہیں لیکن ابھی تک ہم نے اختلاف خیال کی پذیرائی کرنا، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا نہیں سیکھا۔ اس کی چند واضح مثالیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفت روزہ
نئی روشنی دہلی
۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

خوشی اور عبرت کا مقام

حیدرآباد کا پنج روزہ معرکہ ختم ہوگیا۔ ریاست کی فوج نے دو روز میں یہ محسوس کرلیا کہ اس کا ہندوستانی فوج سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ناتجربہ کار رضاکاروں کو اس حقیقت کے محسوس کرنے میں دو دن اور لگ گئے۔ پانچویں دن بلدے میں افراتفری کا عالم تھا۔ اعلیٰ حضرت نظام نے آخری وقت میں بگڑی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اپنی فوج کو لڑائی بند کرنے کا حکم دے دیا اور ہندوستانی فوج کو دعوت دی کہ سکندرآباد اور بولارم کی چھاؤنیوں میں داخل ہو جائے۔ انھوں نے نواب معین نواز جنگ کو جو حیدرآباد کا مقدمہ یو، این، او میں پیش کرنے کے لئے پیرس گئے ہوئے ہیں حکم بھیج دیا ہے کہ مقدمے کو واپس لے لیں۔

جب ہم اس کا خیال کرتے ہیں کہ جلد لڑائی بند ہو جانے سے حیدرآباد بلکہ سارا ہندوستان کتنی شدید خونریزی اور تباہی سے بچ گیا تو ہمارا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ کشمکش دو چار دن اور جاری رہتی تو شاید حیدرآباد پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی نوبت آتی اور اس سے خدا جانے کتنا جانی اور مالی نقصان ہوتا اور جو اپنی بدحواسی اور دہشت کے عالم میں رضاکار شہر کے پرامن باشندوں کو مارنا اور لوٹنا شروع کر دیتے تو پھر قیامت ہی آجاتی ساری ریاست میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس کی لپٹیں دور دور تک پہنچتیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان چند دنوں میں انڈین یونین کے سب باشندوں نے عام طور پر اور مسلمانوں نے خاص طور پر حیرت انگیز ضبط نظم اور صبر و سکون سے کام لیا اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ ہمارے ملک کی ہر جماعت خواہ کسی مذہبی اور سیاسی خیال کی ہو اتنا حب وطن اور جذبہ قومی ضرور رکھتی ہے کہ نازک وقت میں ہر قسم کی شکایات اور اختلافات کو بھول کر دل و جان سے قومی حکومت کا ساتھ دے۔ اس بات پر گورنر جنرل، مرکز اور صوبوں کے وزیروں اور دوسرے قومی لیڈروں نے مسلم اور غیر مسلم عوام کا دل و جان سے شکریہ ادا کیا ہے اور یقیناً وہ اس شکریے کے مستحق ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ملک میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ افراد ہر فرقے اور ہر جماعت میں موجود ہیں جو اپنی سیاسی اور معاشی اغراض یا غصے اور نفرت یا محض شرارت پسندی کی وجہ سے فتنہ انگیزی کا کوئی موقع نہیں چھوڑنا چاہتے۔ یہ حضرات تاک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حیدرآباد کا معاملہ طول کھینچے، لوگوں میں الجھن اور گھبراہٹ پیدا ہو اور یہ اپنا کام شروع کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

ایک اور شدید خطرہ جس سے ہندوستان محفوظ رہا یو، این، او کا تھا۔ اگر حیدرآباد کا معاملہ اس مجلس کے ہاتھ میں جاتا تو جیسا ہم پچھلی اشاعت میں کہہ چکے ہیں لائق علی قاسم رضوی اور ان کی ذریات کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، لیکن ہندوستان کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ مغربی طاقتیں ان خدائی فوجداروں کو نہ تو بچاتیں اور نہ بچا سکتیں۔ لیکن ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کا ایک اور ذریعہ ان کو ہاتھ آجاتا۔ ممکن ہے ان میں سے بعض اب بھی بے جان مقدمے میں مصنوعی دم پھونکنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس سے کچھ ہونا نہیں جب شکست ہو تو گویا ہوں کی چستی کچھ کام نہیں دیتی۔

لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ ان واقعات سے عبرت بھی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں عوام اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ بہت سے خواص بھی جہالت اور سادہ لوحی، جذبات پرستی اور خود فریبی کے کس قدر گہرے گڑھے میں گر چکے ہیں۔ حیدرآباد میں چند ارباب غرض اپنی طاقت اور دولت کو قائم رکھنے کے لئے چاہتے ہیں کہ ریاست کی کشتی کو زمانے کے زبردست دھارے کے خلاف چلائیں اور ذمہ دار حکومت قائم نہ ہونے دیں۔ وہ اپنے روپے سے حیدرآباد کے اندر اور باہر کچھ کرائے کے دماغ خریدتے ہیں اور ان کی خطابت کی مدد اور پروپاگنڈا کے جادو سے غریب مسلم عوام کو اپنا بن داموں کا نوکر بنا لیتے ہیں۔ اس ناپاک تحریک کو اسلام کے نام سے شروع کیا جاتا ہے اور اتحاد المسلمین جیسی ہر دل عزیز انجمن پر قبضہ کرکے اس کو آلہ کار بنایا جاتا ہے۔ اتحاد المسلمین کے پرانے لیڈروں کو ہٹا کر ایک سرپھرے ہسٹیریا کے مریض کو لا کر قائد ملت کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔ اس کی زہریلی تقریریں اور لایعنی شیخیاں معاذ اللہ آیت حدیث سمجھی جاتی ہیں اس کو محمد ابن قاسم بلکہ ایسے بزرگان دین سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اگر حیدرآباد کے مسلمان اپنے ہوش میں ہوتے تو اس بے ادبی پر کانپ اٹھتے مگر ان پر تو نشہ سوار ہے جس قدر بے ادبی، دریدہ دہنی، جھوٹ اور مبالغے سے مقرر کام لیتے ہیں اتنا ہی سننے والوں کا جوش بڑھتا ہے۔ بس تقریر، تقریر، تقریر، جوش، جوش، جوش ع

اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

ان غریبوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ ہندوستان چھ ہزار سال تک حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی کی جرأت نہیں کر سکتا اور کہیں کر گذرا تو دنیا تہ و بالا ہو جائے گی۔ پاکستان میں اور تمام عالم اسلامی میں ہل چل مچ جائے گی۔ بر و بحر اور فضائے آسمانی سے حیدرآباد کے لئے جنگی امداد ابلنے اور برسنے لگے گی۔ ہندوستان کے مسلمان جنھوں نے سندھ میں کھرو کی، پنجاب میں ممدوٹ کی اور سرحد میں عبدالقیوم کی حکومت قائم کرنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دی تھیں، حیدرآباد میں میر لائق علی اور قاسم رضوی کی حکومت قائم رکھنے کے لئے ایک بار پھر اپنے کو قربان کر دیں گے، اور وہ غریب حیدرآبادی ایک ایک حرف پر دل و جان سے ایمان لے آتے ہیں، آنکھیں بند کرکے ہلاکت کی آگ میں کود پڑتے ہیں اور آخر

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

بزمِ بے تکلف

"کہئے میر صاحب تیسری پیالی حاضر کروں"

"بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے۔ آپ اصرار کرکے تین چار پیالیاں پلا دیتے ہیں اور یہاں یہ حال ہوتا ہے کہ دامن تر اور دماغ خشک"

"ہے ہے کہیں یہ کشت زعفران خشک ہو گئی تو لطف محفل ہی جاتا رہے گا۔ آپ رہنے دیجئے، میں خود سے لیتا ہوں"

"خیر اب آپ کو اصرار ہے تو دے ہی دیجئے مگر زرا بالائی زیادہ ہو تاکہ خشکی نہ کرے"

"لیجئے بسم اللہ، چسکی لیتے جائیے اور اپنی باتیں جاری رکھیئے۔ ہاں وہ فلسطین اور حیدرآباد کا کیا قصہ تھا"

"ارے میاں کیا کہیں، کوئی قدرداں ہو تو اسے سنائیں ہم تو کس کس جتن سے دور کی کوڑی لائیں اور آپ لوگ ہنسی میں اڑا دیں"

"نہیں میر صاحب ہنسی تو آپ کے انداز بیان پر آتی ہے۔ نفس مضمون پر ہم سب سر دھنتے ہیں"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے انداز پر آئی تو کیا اور ناز پر آئی تو کیا، ہماری تو کرکری ہو جاتی ہے"

"میر صاحب جتنی چھانیے گا اتنی ہی کرکری نکلے گی۔ آپ تو آنکھ بند کرکے پی جایا کیجیے"

"بھئی خوب کہی۔ اسی بات پر سنئے، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہمارے زمانے میں جو دبنگ زمیندار ہوتے تھے، وہ کیا کرتے تھے کہ کسی گاؤں کے بیچوں بیچ میں ایک پٹی خرید لی۔ پھر کیا تھا ان کا کھونٹا وہاں گڑ گیا اور دوسرے پٹی داروں کی کور دبنے لگی۔ آج اپنی زمین تک پہنچنے کے لئے گاڑی بھر رستہ مانگ رہے ہیں۔ کل مینڈ کا جھگڑا کھڑا کر دیا، کبھی گالی گلوچ، کبھی لاٹھی پونگا۔ کبھی تھانہ کچہری۔ غرض سب پٹی داروں کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ سو حضرت یہی داؤں یار لوگ فلسطین میں کھیل رہے ہیں اور حیدرآباد میں کھیلنا چاہتے تھے۔ فلسطین میں تو پو بارے ہیں۔ اس بچارے برنادوت کو جسے پنچ بنا کر بھیجا گیا تھا سر پھرے یہودیوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ آب کیا ہے۔ جب چاہیں یہودیوں کو سزا دینے کے بہانے فوجیں آئیں اور ڈیرے ڈال کر بیٹھ جائیں۔ چلئے پٹی دار بن گئے۔ مگر حیدرآباد میں قسمت سے تین کانے ہی آئے وہ رضاکار محض ناکارہ ہی نکلے۔ پہلے ہی ہلے میں جیبیں بول گئے۔ خواہ مخواہ کلاکار نے جو قاسم رضوی اور ان کے رضاکاروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا تھا۔ عین وقت پر تار کاٹ دئے۔ چلئے تماشا ختم اور پیسہ ہضم۔ یہاں تو پٹی داری کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب کشمیر رہ گیا ہے۔ سنا ہے وہاں نقشہ خسرہ بن رہا ہے، کھتونی مرتب ہو رہی ہے۔ فکر یہ ہے کہ بٹوارہ ہو، اور اس طرح ہو کہ ایک پٹی یار لوگوں کے لئے بچ جائے۔ امین پٹواری سب بٹوارہ کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ صرف فریقین کو پٹی پڑھا کر راضی کرنا ہے۔ ارے لاحول ولا قوۃ باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ چلئے ٹھنڈی ہو گئی"

پچھلا ہفتہ :- ۱۔ ہندوستان

ایک ہی ہفتے میں سب کچھ

۱۳ ستمبر کی شام کو جب ہمارا ۱۶ کا پرچہ چھپنے کے لئے پریس جا رہا تھا یہ خبر آئی کہ صبح ۴ بجے ہندوستانی فوجیں پانچ طرف سے حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں اور سکندرآباد کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ ان کی تعداد نہیں بتائی گئی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ صرف پانچ بٹالین تھے۔ مگر آرمڈ ڈویژن کے ——— بکتر بند موٹروں اور ٹینکوں کے ساتھ جن کی پشت پر ہوائی جہازوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا۔ ان کے مقابلے پر نظام کی باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج تھی جس کی گنتی ۴۰ ہزار سے ۶۰ ہزار تک بتائی جاتی تھی اور رضاکاروں کی جمعیت جو ایک لاکھ سے اوپر کہی جاتی تھی۔ گویا ہندوستانی فوج کو اپنے سے پندرہ بیس گنی تعداد کے حریف سے نپٹنا تھا۔ ایک طرف بیش تر تعداد تھی۔ دوسری طرف بہتر ہتھیار اور برتر تنظیم۔ اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کی مسلح طاقت میں بدنظمی اور نااتفاقی تھی خصوصاً باقاعدہ فوج ابتدا سے حیص بیص میں تھی کہ لڑے یا نہ لڑے۔ پھر بھی ہندوستانی فوج کا کام کچھ ایسا آسان نہ تھا اور اگر اس کے افسر تدبیر جنگ اور ترتیب لشکر میں غیر معمولی قابلیت کا ثبوت نہ دیتے تو وہ کسی طرح چار روز میں ڈیڑھ سو سے لے کر دو سو میل تک آگے بڑھ کر حیدرآباد اور سکندرآباد کو گھیرے میں نہیں لے سکتی تھیں۔ بہرحال ۱۷ ستمبر کو یونین کی فوجیں تین طرف سے منزل مقصود سے کوئی پچاس پچاس میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھیں اور اب ان کی راہ میں کوئی قدرتی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ ان کے اعلیٰ افسر نے بے فائدہ کشت و خون سے بچنے کے لئے نظام کی فوج کو پیام بھیجا کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے لڑائی بند کرنے کا حکم دے دیا اور دوسرے دن ۱۸ ستمبر کو ہندوستانی فوج سکندرآباد اور بولارم میں داخل ہو گئی اس طرح یہ زبردست فوجی کارروائی چھ روز کے اندر ختم ہو گئی۔ البتہ ابھی رضاکاروں کی متفرق ٹولیاں جا بجا پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپی ہوئی ہیں اور ان کا پیچھا کر کے گرفتار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

میر لائق علی کی کیبنٹ استعفا دے چکی ہے اور اس کے ممبر اپنے اپنے گھروں میں نظربند ہیں۔ قاسم رضوی اور دوسرے رضاکار لیڈر گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ حکومت کا نظم و نسق اعلیٰ حضرت نظام کی مقرر کی ہوئی ایک کمیٹی ملٹری گورنر میجر جنرل چودھری کی نگرانی میں چلا رہی ہے۔ اہم انتظامی جگہوں پر ہندوستانی سول افسر عارضی طور پر مقرر کئے جا رہے ہیں۔ نظام کی خواہش یہ ہے کہ نئے آئین اور نئی حکومت کے مسائل سر مرزا اسمٰعیل، نواب زین یار جنگ اور دیوان بہادر اردمد آئنگر کے مشورے سے طے کریں۔ ابھی حکومت ہند نے اس بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

امریکا اور انگلستان کے اخبارات متفقہ طور پر یہ رائے دے رہے ہیں کہ اس شاندار فتح کے بعد حکومت ہند کو فیاضی، فراخ دلی اور عالی ظرفی سے کام لینا چاہیے۔ عام طور پر ہندوستان کے اخباروں کا لہجہ بھی یہی ہے۔ البتہ وہ مفسد لیڈروں کو سزا دینے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے حکومت خود انتقام یا تشدد کی طرف مائل نہیں ہے بلکہ عفو و کرم سے کام لینا چاہتی ہے مگر اسی حد تک کہ حیدرآباد کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے منافی نہ ہو۔ سوامی رام تیرتھ قید سے رہا ہو گئے ہیں۔ اسٹیٹ کانگریس کے دوسرے ممبر مدراس، بمبئی وغیرہ سے آ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اگلے دو تین ہفتے میں یہ لوگ نظام سے اور حکومت ہند سے گفت و شنید کرنے کے بعد حیدرآباد کے سیاسی مستقبل کا ایک خاکہ بنا سکیں گے۔

ہمارے ہر دل عزیز گورنر جنرل نے اپیل کی ہے کہ اتوار ۲۶ ستمبر کو ہندوستان میں شکرانے کا دن منایا جائے ہمیں اُمید ہے کہ سب ہندوستانی اس آواز پر لبیک کہیں گے، اور درگاہ ایزدی میں تہ دل سے شکر ادا کریں گے کہ حیدرآباد بلکہ سارا ہندوستان اس "خون کے غسل" سے بچ گیا جس کا ہمارے "خوں خواہ" بڑے شوق سے انتظار کر رہے تھے۔

نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی

جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوئی۔ کشمیر کمیشن اس کوشش میں ناکام رہا کہ پاکستان کی حکومت کو مصالحت پر آمادہ کرے۔ اب وہ واپس جا رہا ہے اور پیرس میں سیکورٹی کونسل کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے گا ممکن ہے یہ معاملہ یو، این، او کی جنرل اسمبلی میں بھی جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے چونکہ اس وقت یو، این، او کو فلسطین کے مسئلے پر فوری توجہ کرنی ہے اور شاید اس سے بھی کہیں زیادہ اہم چیز یعنی برلن کا معاملہ اس کے سامنے آئے اس لئے اس کو کشمیر کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہو گی۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ برلن کا قصہ اگر بات چیت سے طے نہ ہوا بلکہ اس کو سیکورٹی کونسل میں پیش کرنے کی ضرورت پڑی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ روس اور مغربی جمہوریتوں میں جنگ چھڑ جانے کا امکان ہے اور ایسی صورت میں یو، این، او انتہائی کوشش کرے گی کہ کشمیر کا مسئلہ صلح و آشتی کے ساتھ جلد سے جلد طے ہو جائے اور ہندو پاکستان مل کر شمالی مغربی سرحد کی حفاظت کریں لیکن فرض کیجئے یو، این، او حسب معمول بات کو ٹال دیتی ہے۔ پھر کیا ہو گا؟ صلح پسندوں کی امید اس کے بعد جا کر برطانوی دولت مشترکہ کے بڑے وزیروں کے جلسے پر ٹھہرتی ہیں جو ۱۱ اکتوبر سے شروع ہو گا اور جس میں جواہر لال صاحب اور لیاقت علی خاں صاحب دونوں شرکت کریں گے۔ یہاں بھی ہندوستان اور پاکستان میں سمجھوتہ کرانے کی انتہائی کوشش کی جائے گی اس لئے کہ برطانوی دولت مشترکہ کے دو ممبر اگر کھلم کھلا برسر پیکار ہوں تو دولت مشترکہ واقعی ظفراللہ خاں صاحب کے قول کے مطابق تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بن جائے گی۔ لیکن اگر ہندوستان یا پاکستان دونوں دولت مشترکہ سے الگ ہو جائیں تو؟ بظاہر تو ایسے آثار نہیں کہ دونوں میں سے ایک بھی الگ ہو لیکن اگر دونوں کے درمیان یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو پھر واقعی صلح پسندوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے گا۔

رحمت جو بڑھے عذاب بن جائے

اس سال بارش اتنی کثرت سے اور شدت سے ہوئی کہ پاکستان اور ہندوستان کے بہت بڑے علاقوں میں سیلاب نے تباہی مچا دی۔ مغربی پنجاب اور سندھ میں اور نقصانات کے علاوہ فصلوں کو اتنا سخت نقصان پہنچا کہ یہ دونوں صوبے جو فاضل غلہ باہر بھیجتے تھے اب باہر سے منگانے کی فکر کر رہے ہیں مشرقی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریاں ابھی جاری ہیں۔ ہندوستان میں یو، پی اور بہار میں متعدد شہر اور بے شمار گاؤں سیلاب کی زد میں آ گئے۔ انسانوں کی جانیں تو بہت کم تلف ہوئیں لیکن مویشی بہت ضائع ہوئے مکانوں کے گرنے سے اور خریف کی فصل تباہ ہونے سے جو نقصان ہوا اس کے اندازے سے دل دہل جاتا ہے اور اب اس کے بعد سیلاب زدہ علاقے میں بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے سیلاب ہمارے ملک میں اکثر آتے رہتے ہیں اور ہم نے ان کے روکنے کی کوئی موثر تدابیر ابھی تک اختیار نہیں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ پانی کے بند باندھنے کی بڑی بڑی اسکیمیں جب عمل میں آئیں گی تو سیلاب پر قابو پا لیا جائے گا۔ لیکن ان اسکیموں کے عملی جامہ پہننے میں ویسے بھی کئی سال کی دیر تھی اور اب مالی حالات کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہے کہ اور دیر لگ جائے گی۔ بیچ کے زمانے کے لئے سیلاب کی تباہ کاریوں کو روکنے کی تدبیروں پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ حکومت نہر کے انجینیروں اور دوسرے ماہرین فن کا ایک کمیشن اس اہم مسئلے پر غور کرنے کے لئے مقرر کرے؟

(ع، ح)

خوشی اور عبرت کا مقام (بسلسلہ صفحہ ۲)

(بسلسلہ صفحہ ۲)

اور آخر وقت تک فضائے آسمانی کی طرف آنکھیں اور ریڈیو کی لہروں کی طرف کان لگائے رہتے ہیں کہ اب مدد آئی، اب آئی، اب آئی۔

اس واقعے سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے اور سبق لینا چاہیے۔ ہندوستان کے سب فرقوں میں ایسے لوگ موجود ہیں اور ایک مدت تک رہیں گے جن کو اس میں ذرہ برابر تامل نہیں ہو گا کہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ ذاتی اغراض کے لئے ایک نام سے عوام کو بھڑکا کر کٹوا دیں۔ لیکن کیا سب فرقوں کے عوام کو اب بھی اتنا ہوش نہ آئے گا کہ مذہب کا نام سنتے ہی آپے سے باہر نہ ہو جائیں بلکہ یہ دیکھیں کہ نام لینے والا کون ہے۔ اس کی اصل غرض کیا ہے۔ خود اس میں مذہب کتنا ہے۔ اخلاق کتنا ہے اور عقل کتنی ہے؟

کیا اب بھی ہم لامذہب، بے اصول، بدنیت خود پرست دنیاداروں کو یا سادہ لوح ضعیف العقل، جذبات پرست مذہبی دیوانوں کو اس کا موقع دیں گے کہ وہ اپنی دنیا یا عاقبت کو سنوارنے کے لئے کروروں بے گناہوں کے جان و مال سے اور ان کی عزت آبرو سے کھیلیں؟ ع، ح

۲ - پاکستان

جناح صاحب کے بعد کیا ہوگا

جناح صاحب پاکستان کے بانی بھی تھے اور اس کے معمار بھی۔ وہ بنیاد کو کمزور اور تعمیر کو ناتمام چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے اس لئے قدرتاً ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے اب کیا ہوگا؟ سب سے پہلا امکان اور اندیشہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں لیڈروں کے آپس کے اختلافات خطرناک صورتیں اختیار کرلیں نئے گورنر جنرل کے تقرر میں خاصی دیر ہوئی اور اس کے بعد بھی تقرر عارضی کیا گیا۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پورا اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ یہ کچھ ایسی اہم بات نہیں کیونکہ کسی گورنر جنرل کو اب وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکے گی جو جناح صاحب کو حاصل تھی، اور اسے ایک آئینی گورنر جنرل کی حیثیت سے حکومت کرنی ہوگی ملک کی سیاست پر اس کا اثر بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ نہیں۔ پاکستان میں موجودہ اختلافات کی بنیاد در اصل شخصی رقابتوں پر ہے اور اگر ریاست کی سیاسی زندگی کسی شدید خطرے میں پڑ گئی تو لوگ ان اختلافات کو کچھ دنوں کے لئے بھول جائیں گے۔ کم از کم آئندہ انتخاب تک یہ دبے رہیں گے

شخصی رقابتوں پر قابو پا لیا گیا تو پھر سیاسی تصورات کی کش مکش زیادہ بڑھنے نہ پائے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ برسراقتدار جماعت کے مخالفین کئی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اُن کے مل کر کام کرنے کے امکانات بہت کم ہیں اس وقت حزب مخالف کی جماعتوں میں "شریعت" کے نام لیواؤں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ لیکن شریعت کی تعبیر میں بڑا اختلاف رائے ہے۔ اگر پیر مانکی شریف امیر المومنین بننا چاہیں تو جماعت اسلامی لیاقت علی خاں صاحب کو ان پر ترجیح دے سکتی ہے ابو الاعلیٰ صاحب سیاسی اقتدار کی لڑائی میں کود پڑیں تو ان کے مخالفوں میں پیر مانکی شریف کا شریک ہو جانا بعید از قیاس بات نہ ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ شریعت کا نام اب زیادہ سنائی دے گا۔ جناح صاحب کا عوام کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ شریعت کی جو بھی تعبیر کر دیتے لوگوں کے لئے قابل قبول بن جاتی۔ مخالفت میں آوازیں اٹھتیں تو ان کی زیادہ شنوائی نہ ہوتی۔ اب عوام کے مذہبی جنوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش زیادہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان کے چوٹی کے رہنما متحد رہے تو ان کی رجز خوانی اس طرح کے نعروں کو دبا دے گی۔ وہ اب بھی چاہیں تو پاکستان کو ایک حقیقی عہد جدید کی جمہوریت بنا سکتے ہیں۔

پاکستان میں بائیں بازو کی جماعتوں کا وجود عدم کے برابر ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے مستقبل قریب میں کسی نمایاں اختلاف کا اندیشہ نہیں۔ جناح صاحب کی شخصیت نے ان سب کو قریب قریب مٹا دیا اور موجودہ سیاسی فضا پر اتنی مذہبیت طاری ہے کہ میاں افتخار الدین تک کو شریعت کا جامہ پہننا پڑا ہے اب ان کا طرز عمل کچھ ان سے مختلف ہو سکا یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن حال کی روشنی میں مستقبل کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ لوگ مذہبیت کا جامہ ابھی نہیں اتاریں گے اور پاکستان میں سیاست یا معاشیات کی بنیاد پر جماعتوں کا قیام مستقبل بعید کا ایک خواب ہے۔ ایک نظاہر چھوٹی سی بات سے جو ابھی پچھلے دنوں ہوئی ہے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ مغربی پنجاب مزدوروں میں ریلوے والے شاید سب سے زیادہ متحد ہیں، اور ان کے مسلم الثبوت لیڈر مرزا ابراہیم ہیں۔ انھیں پچھلے دنوں تین سال کی قید کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن اس سزا کے خلاف شاید احتجاج تو درکنار کسی قابل ذکر شخصیت نے اس پر ایک بیان دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ پاکستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد ویسے بہت کم ہے اور اشتراکیت کے ہراول یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کے لئے زمین ہموار کرنا ہی ایک بڑا کام ہے۔ پاکستان کی سیاسی زندگی میں وہ جماعت یا شخصیت ابھی دکھائی نہیں دیتی جو اس کام کو انجام دے سکے۔

مستقبل کا ایک سوال جس کا جواب مشکل ہے صوبوں کے اور مرکز کے تعلقات کا ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے اور ہو سکتا ہے اس پیچیدگی کے احساس کو نئے گورنر جنرل کے انتخاب میں دخل ہو۔ مسٹر جناح کی شخصیت صوبوں اور مرکز کی سیاست پر یکساں حاوی تھی۔ اب مرکزی حکومت میں کوئی ایسا نہیں جو صوبوں کی سیاست پر اسی طرح اثر انداز ہو سکے۔ مشرقی بنگال جو پاکستان سے اتنی دور اور الگ تھلگ سا ہے یہ مسئلہ سب سے زیادہ ٹیڑھا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر ناظم الدین صاحب کو گورنر جنرل بنانے سے مشرقی پاکستان میں یہ احساس پیدا کیا جا سکے گا کہ وہ پاکستان کا ایک اہم جز ہے۔ لیکن صوبوں کی طرف سے یہ مطالبہ اب زیادہ زور شور سے ہوگا کہ مرکز اور صوبوں کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی حد بندی کر دی جائے اور مرکز صوبوں کے اندرونی معاملات میں بہت گہری دلچسپی نہ لے۔ اس کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ صوبے کی اہم شخصیتیں مرکز میں آجائیں لیکن یہ صورت بھی آئندہ انتخابات کے وقت ہی اختیار کی جا سکتی ہے اس وقت تک کے لئے ــــــ شاید جناح صاحب کی وفات کے اندیشے سے مرکزی حکومت نے بہت وسیع اختیارات لے رکھے ہیں۔ اور اگر فوراً ہی کسی صوبے میں کسی نے زیادہ جوش سے کام لیا تو اس پر یہ سنگین الزام لگایا جا سکے گا کہ وہ پاکستان کی وحدت کو خطرے میں ڈال رہا ہے

ہندو پاکستان میں کیسی نبھے گی

ہندوستان نے جس طرح پاکستان کے غم میں شرکت کی ہے اس کا ایک اثر تو پاکستان پر پڑنا ہی چاہئے کہ ہند کے ارادوں کے متعلق شک اور بدگمانی کی فضا چھٹ جائے۔ ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کی ہولناکیوں کی یاد سے بلاشبہ ہندوستان میں بہت سے دلوں میں تلخی اور غصہ باقی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ پاکستان کے رہنما کی موت کا غم منایا گیا۔ ہندوستان کے لیڈروں نے، سیاست والوں نے غرض سبھی نے جناح صاحب کی موت پر اظہار غم کیا اور پاکستان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ملک کے اخباروں نے جناح صاحب کی موت پر بہت ہی مناسب الفاظ میں مقالے لکھے اور ان سب میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کا تھوڑا سا اندازہ ہندوستان ٹائمز کے تھوڑے سے اقتباس سے ہو سکتا ہے "یہاں شاید یہ کہہ دینا بے جا نہ ہوگا کہ اس اخبار سے بہت سے لوگوں کو فرقہ واری جانب داری اور اس طرح کی دوسری شکائتیں ہیں"۔ پاکستان کے امن اور استحکام سے ہندوستان کو جو دلچسپی ہے وہ پاکستان کے عوام سے کچھ ہی کم ہے۔ ہندو پاکستان دونوں ایک عظیم الشان میراث کے مالک ہیں جس سے انھیں کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ ان میں باہم کوئی کش مکش یا تصادم نہیں۔ یا کم از کم ہونا نہیں چاہئے۔ ان کے عوام دل سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ ...... ان میں کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں جس پر دونوں ریاستوں میں آپس میں جھگڑے ہوں۔ اس کے برخلاف ان کے مل جل کر کرنے کے کتنے ہی کام ہیں جن سے دونوں کے عوام کا بھلا ہوگا ...... خود غم کا شکار ہندوستان پاکستان کے غم کو بھلانے میں ہر طرح کی مدد دینے کو تیار ہوگا کہ دونوں ملک بے جا منافرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی رہنمائی کا کام انجام دے سکیں"

بعض اخبارات نے جن میں اسٹیٹس مین سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جناح صاحب کے بعد ممکن ہے دونوں حکومتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں۔ انگلستان کے بعض اہم اخبار بھی یہی کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اندازہ صحیح نہ ہو کہ ہندو پاکستان کے تعلقات کے خراب ہونے کی ذمہ داری زیادہ جناح صاحب پر تھی لیکن اتنا تو بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد دونوں ریاستوں کے تعلقات کے ابتر ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس وقت حیدرآباد کے مسئلے کا اس طرح آسانی سے حل ہو جانا ایک بہت ہی خوش آیند فال ہے کہ اس طرح دونوں حکومتوں کے درمیان اختلاف رائے کا ایک بڑا سبب دور ہو گیا ہے۔

قیوم صاحب کی قوامی

قیوم صاحب نے اپنے مخالفوں کو ختم کر دینے کی جو مہم شروع کر رکھی تھی اس کا آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ سرخ پوشوں کی گرفتاریاں کافی بڑے پیمانے پر پہلے ہی ہو چکی تھیں لیڈروں کو کئی کئی سال کے لئے قیوم صاحب نے جیلوں میں بند کر کے اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ بس ایک مخالف جماعت کا نام کا نشان باقی تھا سو قیوم صاحب نے اسے بھی نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے دنوں سُرخ پوشوں کی جماعتی تنظیم کو حکومت نے خلاف قانون قرار دے دیا ہے اور ان کی ملکیت وغیرہ پر حکومت کا قبضہ ہو گیا ہے اس آخری قدم کے اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر قیوم صاحب کے ان دعووں پر غور کیجئے کہ اب صوبے میں خدائی خدمت گاروں کو کوئی کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا تو پھر اس کارروائی کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قیوم صاحب کے سارے ظلم و تشدد کے باوجود صوبہ سرحد میں اس جماعت کا اثر اب بھی کافی ہے۔

(ا، س)

مشرقی دُنیا

چین کی حالت سے سبق لو

چینی رائے عامہ کے انسٹی ٹیوٹ نے اعداد و شمار فراہم کر کے بتایا ہے کہ چین کی ۸۰ فی صدی آبادی افراطِ زر کا شکار ہے اور اسے مشکل سے دو وقت کھانا نصیب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے عہدہ دار حکومت کے خرچ پر آراستہ کئے ہوئے عالی شان مکانوں میں مغربی ڈھنگ سے مزے اُڑاتے ہیں۔ انھیں ان گنت مراعات حاصل ہیں جن کی وجہ سے انھیں اپنی تنخواہوں پر گذر کرنا نہیں پڑتا۔ اوسط درجے کے حکومت کے ملازم کو صرف ۸ء۹ امریکن ڈالر یعنی ۳۲ء۰۴ روپے ماہوار اور چاول، شکر، نمک اور کوئلہ کا راشن ملتا ہے۔ ان میں سے بیشتر حکومت کے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ جہاں چار چار، پانچ پانچ کے خاندان ایک چھوٹے سے کمرے میں سکڑ سکڑ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

طالب علموں کی حالت اور بھی خراب ہے تقریباً ایک تہائی طالب علم حکومت کی مدد کے محتاج ہیں۔ ان ہی حالات کا نتیجہ ہے کہ چینی طالب علموں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ اس بے چینی کو دبانے کے لئے حکومت نے بظاہر سیدھا راستہ اختیار کیا ہے جو کبھی منزل تک نہیں لے جاتا۔ پچھلے دنوں جنرل سیمو چیانگ نے طالب علموں کے خلاف کچھ قوانین بنائے ہیں ان قوانین کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت اس طرح کمیونسٹ خیال سے متاثر طالب علموں کو دبا دینا چاہتی ہے۔

سپاہیوں کا حال اتنا برا نہیں جتنا عام خیال ہے لیکن دیہی علاقوں میں حکومت کے سپاہیوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ وہ من مانی لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔

اونچے اونچے عہدہ داروں کے خلاف بے ایمانی اور رشوت ستانی کی داستانیں عام ہیں اور حکومت نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔

خانہ جنگی میں پچھلے سال ڈیڑھ سال میں حکومت کی فوجوں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ منچوریا اور شمالی چین کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے تقریباً نکل چکا ہے پچھلے دنوں چینی حکومت کے وزیر دفاع نے حکومت کی بعض بڑی ناکامیوں کی وجہ بتلاتے ہوئے کہا کہ قومی فوج کی تعداد چینی کمیونسٹوں کے مقابلے میں کم ہے۔ ان کی [illegible] پست تر [illegible] اشرفی ... کی ایک بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ قومی حکومت کے پاس امریکہ کی عنایت سے بہتر سامانِ جنگ موجود ہے اور اس کے پاس ایک ہوائی بیڑہ بھی ہے جو کمیونسٹوں کے پاس نہیں۔ اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ عام بددلی ہے جس سے چینی سماج کا کوئی حصہ بچا ہوا نہیں ہے۔ اس صورت حال کی بڑی ذمہ داری افراطِ زر پر ہے۔ جو خانہ جنگی کے روز افزوں اخراجات کا نتیجہ ہے یہ رجحان تقریباً مستقل ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ امسال کے دوسرے نصف حصے کا جو چینی بجٹ شائع کیا گیا ہے اس کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں تقریباً دو تہائی حصہ فوجی خرچ پر صرف ہوگا۔ ٹائمز کی رائے میں معاشی صورت حال خانہ جنگی سے زیادہ نازک ہو چکی ہے۔

کچھ عرصے سے اس سلسلے میں اصلاح کی کوششوں کی افواہیں گرم ہیں۔ اب چینی حکومت نے ایک نیا سکہ جاری کیا ہے مگر شاید موجودہ حالات میں نئی کرنسی کے اجراء سے چین کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اصل مسئلہ فوجی مصارف کا ہے۔ موجودہ پیمانے پر فوجی خرچ جاری رہا تو کوئی بھی اصلاح چین کو اس ابتری سے نہیں نکال سکتی۔ چین کی حکومت نے جنگ کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے چین کے دولت مندوں سے ٹیکس وصول کرنے کی جرأت نہیں کی ہے کومن تانگ کی حکومت کی بنیاد جاگیرداروں اور ساہوکاروں کی بہبودی کے مقصد پر قائم ہے اور موجودہ جنگ کا مقصد انھی کے مفاد کی حفاظت ہے۔ مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہ پورا طبقہ اس قدر کوتاہ اندیش ہے کہ یہ بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ موجودہ صورت حال باقی رہی تو ان کی بھی خیر نہیں۔

انڈونیشیا میں بھی پھوٹ پڑ گئی

انڈونیشیا سے پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں ان سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت نوازوں کی دوستانہ گفت و شنید کے بے نتیجہ رہنے سے کہیں انڈونیشیا کے صبر کا پیمانہ لبریز تو نہیں ہو گیا ہے؟ جہاں تک ڈچ حکومت کا تعلق ہے وہ تو دنیا والوں سے یہ اعلان کر رہی ہے کہ انڈونیشیا میں دہشت پسندی اور کمیونزم عروج پر ہیں۔ لیکن خود جمہوری حکومت کے اندر سیاسی اختلافات نے پچھلے دنوں زیادہ نمایاں شکل اختیار کر لی ہے۔ جمہوریت کے ایک مشہور لیڈر نے کھلے بندوں کمیونسٹ پارٹی سے اپنے تعلق کا اعلان کر دیا ہے اور ڈاکٹر محمد حطّا نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ سیاسی اختلافات کی پیدا کی ہوئی ابتری کی بدولت بیرونی ملکوں میں جمہوری حکومت کی پوزیشن بہت کمزور ہو رہی ہے۔

جمہوری حکومت کے بائیں بازو کی چار جماعتوں میں سے تین پارٹیوں نے کمیونسٹ پارٹی میں ضم ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب انھوں نے لنگا جاتی اور رینویل معاہدوں کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ اس تبدیلی مذہب کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان جماعتوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ ڈچ حکومت سے گفت و شنید کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دھیرے دھیرے جمہوری حکومت کمزور ہوتی جائے۔ یہاں تک کہ ڈچ حکومت ایک آخری وار کرے اور جمہوریت پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دی جائے۔ خود ڈاکٹر حطّا کو ڈچ حکومت سے اسی طرح کی امیدیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خطرے کا اعتراف کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ عارضی فیڈرل حکومت کو ڈچ انڈونیشین جمہوریت کو کچل ڈالنے کی خاطر استعمال کریں۔ مستقبل کے اس نقشے کی روشنی میں یہ افسوس ناک بات ہے کہ ڈاکٹر حطّا نے کمیونسٹوں کو کچل ڈالنے کی دھمکی دی ہے انھوں نے انتہا پسندی کو انڈونیشین جمہوریت کی بچپن کی بیماریوں سے تعبیر کیا ہے اور بچوں کے ساتھ بہت زیادہ سختی جائز نہیں سمجھی جاتی۔ قومی اتحاد کی ضرورت آج انڈونیشین جمہوریت کو ہمیشہ سے زیادہ ہے اور یہ عقل مندی کی بات نہیں ہوگی کہ جو لوگ میدانِ جنگ میں آپ کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑیں گے ان پر ناروا سختیاں برتی جائیں۔

کمیونسٹوں کا مطالبہ ہے کہ قومی اتحاد کی خاطر ایک قومی حکومت قائم کی جائے لیکن ڈاکٹر حطّا نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی ساتھی دو جماعتیں اس پر آمادہ ہیں اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "دونوں جماعتوں میں حکمت عملی کا بہت فرق ہے۔" ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ پر گفت و شنید بھی اس وقت تک بیکار ہے جب تک دعوت دینے والوں کو اور ان لوگوں کو جنھیں دعوت دی گئی ہے ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو، اور اس عدم اعتماد سے فائدہ اٹھا کر ڈچ حکومتوں نے کمیونسٹوں کے خلاف پہلا قدم اٹھایا ہے انڈونیشیا میں کمیونسٹوں پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ ڈچ حکومت سے جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس کی صورت حال یہ ہے۔ انڈونیشین جمہوریت کے لیڈروں نے یو۔ این گڈ آفس کمیٹی کے آسٹریلین اور امریکن ممبروں کی تجویزوں کو گفت و شنید کی بنیاد کے طور پر مان لیا ہے۔ حالانکہ ان تجویزوں کے سلسلے میں جمہوریت کو کتنے ہی تلخ گھونٹ پینے پڑے ہیں۔ ڈچ حکومت اس کو بنیاد کے طور پر بھی ماننے کو تیار نہیں ڈچ حکومت کٹھ پتلی ریاستوں کی تعمیر کا کام زور شور سے کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں حال میں جنوبی سماٹرا کی ریاست کو حق خود اختیاری عطا کئے جانے کی خبریں آئی ہیں۔ یہاں کی مشاورتی کونسل کو جو ڈچ حکومت کے نیاز مندوں پر مشتمل تھی پارلیمنٹ بنا دیا گیا ہے سیاست کے ساتھ ساتھ کچھ روپے کے جادو سے بھی کام لیا جانے والا ہے۔ خبر آئی ہے کہ ڈالر کی جو مدد ہالینڈ کو مل رہی ہے اس کا کچھ حصہ اب انڈونیشیا کے جمہوریت پسندوں کو بھی مل سکے گا۔

بھلا ملایا کو کیسے چھوڑ دیں

ملایا کے باغیوں کو کچل ڈالنے کے کام میں آسٹریلین حکومت بھی اپنے بس بھر حصہ لے رہی ہے۔ آسٹریلیا سے اسلحہ فراہم کئے جا رہے ہیں اور آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر چیفلے نے یقین دلایا ہے کہ برطانوی حکومت نے مدد مانگی تو اس تجویز پر وہ پوری ہمدردی سے غور کریں گے "آسٹریلیا ہمیشہ برطانیہ کی مدد کو تیار رہے۔" اس کے باوجود ملایا کے یورپین سرمایہ داروں کے بارے میں جن کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مسٹر چیفلے کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے "۰۰ لاکھ کی آبادی میں صرف ۱۷ ہزار یورپین ہیں جنھیں ملک سے کوئی محبت نہیں۔ وہ محض نفع کی خاطر وہاں ہیں۔" اصل بات یہ ہے کہ ملایا میں ٹین اور ربر کی کثرت ہے اور برطانیہ کی موجودہ معاشی صورت حال میں اسے ایسی ان تمام چیزوں کی ضرورت بہت سخت ہی جس سے ڈالر مل سکیں۔ ملایا سے برطانیہ کی یہ ضرورت بہت بڑی حد تک پوری ہوتی ہے۔

معاشی خود غرضی پر جمہوریت نوازی کا پردہ ڈالنے میں کچھ ایسی دقت نہیں پڑتی جب جمہوریت کی تعریف برطانوی حکومت اپنی مرضی کے مطابق کر سکے۔ اس سلسلے کا سب سے شاندار کارنامہ سیام کے ڈکٹیٹر مارشل سونگرام سے یہ سمجھوتا ہے جس کی رو سے برطانوی حکومت کو ملایا کے کمیونسٹوں کے کچلنے کے کام میں کچھ سہولت ہو گی۔

(ا۔ س)

ذاکر صاحب کی واپسی پر

آل احمد سرور

صد شکر اپنا مردِ قلندر پھر آگیا
صحرا سے تازہ دولتِ عرفاں لئے ہوئے
آنکھوں میں عزمِ کوہ کنی کی جلالتیں
باتوں میں لطفِ صبحِ بہاراں لئے ہوئے
افسردگی کے دور میں امید کی کرن
تاریکیوں میں شمعِ فروزاں لئے ہوئے

جذبہ جسے کچل نہ سکا کوئی بھی ستم
شعلہ جو آندھیوں سے بھی برہم نہ ہو سکا
دیوانگی کے رقص، لہو کی ترنگ میں
انسانیت پہ جس کا یقیں کم نہ ہو سکا
ہر برقِ تازہ شمعِ سیہ خانہ بن گئی
دل وقفِ خود فریبیِ ماتم نہ ہو سکا
سوزِ نفس کی آنچ بجھائے نہ بجھ سکی
خونِ جگر کا نقش تھا مدھم نہ ہو سکا

محفل پہ آج موت کا سایہ ضرور ہے
تیری جبیں سے نور فشاں زندگی تو ہے
ذہنوں پہ چھا گیا ہے اندھیرا تو کیا ہوا
ہمدم تری نظر میں ابھی روشنی تو ہے

مرشد کی واپسی پہ یہ حاضر ہیں چند شعر
بے رنگ و بو ہیں پھول، مگر تازگی تو ہے

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

مہکا رہا ہے جیسے کوئی حسن تازہ کار
اے بے خودیِ شوق یہ کیسا مقام ہے
کھوئی گئیں تصورِ جاناں کی لذتیں
کچھ اس طرح سے آج یہ گردشِ میں جام ہے
باقی نہیں رہی ہے ستاروں میں روشنی
کیسا بجھا بجھا سا یہ ماہِ تمام ہے
جنبش میں ہیں ہنوز وہی پردہ ہائے شب
گونجا ہوا اگرچہ سحر کا پیام ہے
شعلوں کا رقص بھر دو لہو کی شراب میں
افسانۂ حیات ابھی ناتمام ہے

غزل

باقر مہدی

آزادیِ حیات کی دل میں خوشی ہے کیا
میری نظر میں اب بھی وہی زندگی ہے کیا؟
شیرازۂ حیات بکھرتا چلا گیا
جانے سے تیرے دہر میں کوئی کمی ہے کیا؟
آہوں سے اونچے اونچے محل تھرا اٹھے
عشرت کدوں پہ چھائی ہوئی بے بسی ہے کیا؟
میں مبتلائے کشمکشِ زندگی رہا
بن بن کے ایک ایک تمنا مٹی ہے کیا؟
کُل کائنات وردِ ہی پھر محوِ رقص آج
تاریکیٔ محیط میں یہ روشنی ہے کیا؟

دیہی اور گھریلو صنعتیں

۲- موافقت میں دلیلیں

پروفیسر محمد عاقل

"نئی روشنی" کی پچھلی اشاعت میں ہم نے بتلایا تھا کہ ہندوستان میں پچھلے پچیس سال میں بڑے پیمانے کی صنعتوں نے ایسی ترقی کرلی ہے کہ اب ہندوستان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں آٹھویں نمبر پر کیا جانے لگا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے ہمارے دیہات کی بے کاری کا مسئلہ حل ہو سکا ہے یا نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہمارے دیہات کے لوگوں کے پاس ملک کے مختلف حصوں میں سال میں تین مہینے سے لے کر چھ یا نو مہینے تک آمدنی فراہم کرنے کے لائق کوئی کام نہیں ہوتا اور دوسری طرف ہماری آبادی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ برابر تیزی کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی ہے ذیل کے نقشے سے اس بات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے گا کہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد کتنی بڑھی ہے:

سال	بڑے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد	کام کرنے والی کل آبادی کے مقابلے میں اس کا تناسب فی صد	مجموعی آبادی کے مقابلے میں اس کا تناسب فی صد
۱۹۲۱ء	۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار	۱ء۷۰	ء۵۰
۱۹۳۱ء	۱۵ " ۷۰ "	۱ء۰۲	ء۴۱
۱۹۳۹ء	۲۰ " ۳۰ "	۱ء۲۰	ء۵۴

اب اس کا مقابلہ آبادی کے اضافہ سے کیجئے جو ہر سال چالیس پچاس لاکھ کے حساب سے بڑھ جاتی ہے! اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتیں چاہے ان کی ترقی کی رفتار کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو نہ تو ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے اندر جذب کرسکتی ہیں اور نہ زمین پر آبادی کا فی الحال جو دباؤ ہے اس کو کم کرسکتی ہیں۔ پھر چونکہ بڑی صنعتوں کو شہروں ہی میں شروع کیا جاسکتا ہے اس لئے اس سے دیہات کی آبادی کو زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اتنا فائدہ البتہ ہوتا ہے کہ ان سے صنعت کے لئے کچے مال کی اور شہروں کے لئے غذا کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ غرض ہندوستان کی معیشت کے موجودہ پس منظر میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی ہمارے لئے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اس قسم کی صنعتوں کی بھی ہندوستان کو ضرورت ہے۔ خاص کر بنیادی صنعتوں کو تو بڑے پیمانے پر اور شہری ماحول ہی میں چلایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارا مقصد دیہات کی بے کاری یا نیم بے کاری کو ختم کرنا ہے تو ہمیں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی پر زیادہ انحصار کرنا ہوگا۔

ہندوستان کی معیشت کی دو بنیادی خصوصیتیں ہیں۔ (۱) جتنی افراط کے ساتھ مزدور موجود ہیں اتنی افراط سے سرمایہ موجود نہیں ہے (۲) لوگوں میں وسیع پیمانے پر بے کاری یا نیم بے کاری پائی جاتی ہے۔ پہلی خصوصیت کا تقاضا ہے کہ مہنگے ترقی یافتہ طریقوں کے مقابلے میں سستے ابتدائی طریقوں کو ترجیح دی جائے۔ دوسری خصوصیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ہندوستان کی اصلی ضرورت یہ نہیں ہے کہ دست کار کی جگہ مشین سے کام لیا جائے بلکہ ایسی دیہی صنعتوں کو ترقی دینا ہے جو کام کرنے والوں کو کام سے بے دخل نہ کریں۔ بلکہ ان کے لئے کام کے مزید موقع فراہم کریں اور ان کی آمدنی میں اضافہ کا موجب بنیں چاہے یہ اضافہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔

ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ہے اس سے اچھی طرح ثابت ہو جائے گا کہ پارچہ بافی کی صنعت میں مختلف قسم کے طریقوں کو اختیار کرکے کتنا سرمایہ لگانے سے کتنے آدمیوں کو روزگار سے لگایا جاسکتا ہے۔

ذیل کا نقشہ ظاہر کرتا ہے کہ جب کپڑا بننے کا کام ایسے ابتدائی طریقے سے کیا جاتا ہے جس میں کم سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو سرمایہ کی ایک مقررہ رقم سے زیادہ مزدوروں کو کام سے لگایا جاسکتا ہے جس قدر زیادہ ترقی یافتہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اتنی ہی سرمایہ فی مزدور کی رقم بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے پیداوار فی مزدور تو ضرور بڑھتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سرمایہ کی مفروضہ رقم کے ذریعے زیادہ مزدوروں کو کام سے لگانے کا امکان کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے پیداوار فی مزدور کو بڑھانے کے لئے اگر ترقی یافتہ طریقوں کا اختیار کرنا ناگزیر بھی سمجھا جائے تب بھی ابتدائی منزلوں میں ترقی یافتہ طریقوں کو اختیار کرنے کی رفتار کو ایک طرف تو سرمایہ کی کمیابی کی وجہ سے اور دوسری طرف مزدوروں کے روزگار کی مجموعی مقدار کو قائم یا اضافہ پذیر رکھنے کے خیال سے سست ہی رکھنا پڑے گا۔

پھر اس کے علاوہ بڑے پیمانے کی صنعت کی دوسری خرابیاں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں مرکزیت پسند نظام دولت آفرینی میں جہاں سرمایہ کی بڑی مقدار کو صنعت میں لگانے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بیکاری کی تقسیم میں عدم مساوات کے پیدا ہونے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے اور پیداوار کے بڑے حصے سے مزدوروں کو محروم ہو جانا پڑتا ہے۔ پھر ضرورت سے زیادہ گنجان شہروں اور تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے اور اس طریقے سے دولت آفرینی کے دوسرے خطرات اور مشکلات کو برداشت کرنے کی وجہ سے مزدوروں کو جن تکلیفوں، بیماریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سب کا شمار بھی اگر مصارف پیدائش میں کیا جائے تو بڑے پیمانے کی صنعت کی کفائتیں ان عدم کفائتیوں کی تلافی کرنے میں غائب ہو جائیں گی۔ ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بڑے پیمانے کی صنعت کی بہت سی کفائتیں درحقیقت ان امدادی کاموں کی رہین منت ہیں جو مرکزی اور صوبے کی حکومتیں، میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ سماج کی خدمت کی صورت میں عام رعایا سے وصول کئے ہوئے محصول کو خرچ کرکے فراہم کرتی رہتی ہیں۔ اگر ان سرکاری اداروں کے مصارف کو صنعتی مصارف میں شامل کیا جائے تو پھر چھوٹے پیمانے کی دیہی صنعتوں کے مقابلے میں بڑے پیمانے کی شہری صنعتوں کی کفائتیں بہت کم رہ جائیں گی۔

پیداوار کا طریقہ	سرمایہ فی مزدور جو لگایا گیا	پیداوار فی مزدور	پیداوار فی مزدور کے مقابلے میں سرمایہ کا تناسب	سرمایہ کی اکائی کے مقابلہ میں کام سے لگے ہوئے مزدوروں کی تعداد
جدید طرز کا کارخانہ (بڑے پیمانے پر)	بارہ سو روپے	چھ سو پچاس روپے	۱ء۹	۱
قوت محرکہ سے چلنے والا کرگھا (چھوٹا پیمانہ)	تین سو روپے	دو سو روپے	۱ء۵	۴
خود حرکی کرگھا (گھریلو صنعت)	نوے روپے	اسی روپے	۱ء۱	۱۳
دستی کرگھا (" ")	پینتیس روپے	پینتالیس روپے	۰ء۸	۳۴

بہرحال اس بات سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم متوسط پیمانے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی (جن کے چلانے میں جہاں ممکن ہو بجلی کی طاقت سے بھی کام لیا جاسکتا ہے) حوصلہ افزائی کریں تاکہ ہمارے صنعتی نظام میں ہمارے مخصوص حالات اور مالی وسائل کے مطابق تنوع پیدا کیا جاسکے۔

ہماری دوسری ضرورت یہ ہے کہ ایسی گھریلو صنعتوں کو ترقی دی جائے جنہیں زراعت کے کام کے ساتھ شامل کیا جاسکتا ہو تاکہ کسانوں کو جس طرح آج کل سال کے بڑے حصے میں مجبوراً بیکار بیٹھا رہنا پڑتا ہے وہ نہ رہنا پڑے۔

ہماری تیسری ضرورت یہ ہے کہ دیہات کی موجودہ صنعتوں اور دستکاریوں کو ہم نہ بھول جائیں اور ان کو امداد دینے اور زیادہ کارگذار اور نفع بخش بنانے کی پوری کوشش کریں۔

ہم کو یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ زراعت پیشہ آبادی کو سارے سال کے لئے کام فراہم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم یا تو ایسی صنعتوں پر خاص زور دیں جو کھیتی کی پیداوار کو مصنوعہ یا نیم مصنوعہ شکل دیتی ہیں یا ایسی ضمنی صنعتوں پر جن میں کھیتی کو نقصان پہنچائے بغیر کسان اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے۔ ایسی صنعتوں کے نام اور ان کی ترقی کے امکانات اور ذرائع کو بیان کرنے سے پہلے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ دیہاتی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں خاص خاص سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے اب تک جو تجربے اور کوششیں کی جاتی رہی ہیں ان کا خلاصہ پیش کردیں۔

گلاب، رومان اور فریب

او۔ ہینری (ترجمہ از "جاہ نم")

راونیل سیاح، آرٹسٹ اور شاعر سبھی کچھ تھا۔ رسالہ دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے رسالے کو اپنے دوست سیمی براؤن کے آگے پھینک دیا جو اس کے قریب ہی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا ریوی (راونیل)؟" اس نے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے ناقدوں نے تمھیں آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔۔۔۔"

"رومان مرگیا، دفن ہوگیا ۔۔۔۔۔" راونیل نے آہستہ سے کہا۔ جب راونیل آہستہ بولتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ بہت سنجیدہ ہے۔ اس نے رسالہ دوبارہ اٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

"بھئی سیمی یہ تو تمھارا جیسا کاروباری آدمی بھی جو ساہوکار کے یہاں بہی کھاتے لئے جھک مارا کرتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ آج کل ادب کی کیا درگت بن رہی ہے۔ اب دیکھو یہی رسالہ تھا سامنے ہے ۔۔۔۔۔" راونیل نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا ۔۔۔۔ "کبھی اس میں لو، لاول اور وہٹ مین کی تحریریں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن ذرا اس نمبر کے مضامین پر نظر ڈالو تو بھئی ایک مضمون جنگی جہازوں میں کوئلہ جھونکنے والوں اور کوئلے کے ذخیروں پر ہے گا، دوسرا اس پر کہ کلیجی کا قلمہ کیونکر بنایا جاتا ہے، تیسرا وال اسٹریٹ میں معیاری بیکنگ پاؤڈر کے استعمال پر ایک نظم اس رنگ پر امریکہ کے موجودہ پریزیڈنٹ کا نشانہ چوک گیا۔ ایک اور افسانہ اس عورت کی زبانی جس نے مشرقی ریاستوں میں جاسوسی کے فرائض انجام دیئے۔ ایک اور فرضی قصہ جس سے موٹر اور پٹرول کی بو آتی ہے۔ البتہ اس کا عنوان ضرور دلکش ہے یعنی کیوپڈ اور شوفر۔

ایک آرٹیکل بحری فوجی نقشہ کے متعلق ہے جسے ہسپانوی آرمیڈا اور نئے اسٹیشن جزیرے کی تصویروں سے مزین بھی کیا گیا ہے۔ ایک اور کہانی اس سیاسی ایجنٹ کے متعلق ہے جس نے نفتھم ایونیو کی ایک حسین لڑکی کو اپنا گرویدہ محبت بنا لیا اور بقیہ اتنیس صفحے ایسے ہیں جن کو ایڈیٹر نے رسالہ کی اشاعت کے بارے میں اپنی مجذوب کی سی بڑ سے سیاہ کیا ہے۔ سیمی ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومان مرگیا، دفن ہوگیا۔ تمھیں کہو میں جھوٹ کہتا ہوں کہ نہیں؟ ۔۔۔۔"

سیمی براؤن نہایت آرام سے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا جو کھڑکی کے قریب پڑی ہوئی تھی اور اپنے دوست کے ادبی مرثیے کو سن رہا تھا۔ اس کا سوٹ گہرا بادامی رنگ کا تھا جس کی ایک جیب سے چار سگاروں کے سرے نظر آرہے تھے۔ اس کے جوتے گلابی رنگ کے تھے۔ موزے خاکستری قمیض آسمانی جس کے کالر بہت سخت اور انڈے کی طرح سفید تھے۔ اس کے اوپر ایک سیاہ بو تھی جیسے سفید پھولوں پر کوئی سیاہ تیتری آکر بیٹھ گئی ہو۔ سیمی کا چہرہ جس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی گول اور بشاش تھا اور اس کا رنگ ہلکا شہابی تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے دوست راونیل کی طرح دم بھر کے رومان کے لئے کوئی اضطراب نہ تھا۔ بے چینی نہ تھی۔

راونیل کے کمرے کی وہ کھڑکی جس کے پاس سیمی بیٹھا ہوا تھا ایک باغ میں کھلتی تھی جو پرانے درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ راونیل کا مکان اس باغ کے کنارے پر تھا اور اس کا کمرہ گھر کی پہلی منزل پر ۔۔۔۔ باغ کے سامنے اینٹ کی ایک اونچی دیوار تھی جو باغ اور عام سڑک کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام کرتی تھی۔ راونیل کی کھڑکی کے سامنے باغ کے آخری کنارے پر ایک پرانی عمارت واقع تھی جس کا ایک حصہ پرانی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ مکان کیا تھا گویا ایک قلعہ تھا جو محصور ہو۔ شہر اس کے دروازوں پر چیختا، چلاتا اور ہتھیار ڈالنے کی شرائط پیش کرتا لیکن اس مکان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ گرد کی تہیں کی تہیں اس کے درختوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس قلعہ نما مکان میں ایک سن رسیدہ مرنجان، مرنج شریف آدمی رہتا تھا جسے اپنے اس پرانے گھر سے بڑی محبت تھی اور جسے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ تھا محصور قلعہ کا رومان ۔۔۔۔۔

سیمی براؤن ہر ہفتہ تین چار مرتبہ راونیل کے یہاں آیا کرتا تھا وہ شعراء کے کلب کا ممبر تھا اور خود اس کا باپ ایک غزل گو شاعر تھا۔ لیکن اس میں کاروبار کی وجہ سے کچھ سوقیت آگئی تھی۔ اسے اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ موجودہ دور رومان سے محروم ہے اسے تو صرف اپنے معاملات سے اور اپنی گھڑی کی ٹک ٹک سے جس کا نغمہ اس کی روح میں رچا ہوا تھا دلچسپی تھی۔ راونیل کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھنا اور اس سے باغ کا نظارہ کرنا اس کا ۔۔۔ مشغلہ تھا۔ اور راونیل کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ سیمی اس کی گفتگو غور سے سنتا اور اس میں دلچسپی لیتا تھا اور پھر ایک ساہوکار کا کلرک ہونے کی وجہ سے وہ جدت، اور عملیت کا اس قدر مکمل نمونہ تھا راونیل اس کی صحبت میں اپنی کسر شان نہیں سمجھتا تھا۔

"بھئی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ" سیمی نے کاروباری اختصار سے کہا۔ "اس رسالہ نے تمھاری نظموں کے چھاپنے سے انکار کردیا ہوگا۔ اسی کا یہ سارا غصہ ہے۔"

"جی یہ بھی کوئی وال اسٹریٹ میں زنانہ کلب کی صدارت کا انتخاب ہے جس میں آپ کا اندازہ صحیح نکلے۔" راونیل نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "آپ کی دعا سے اسی نمبر میں میری ایک نظم موجود ہے ۔۔۔۔"

"اچھا تو پھر پڑھ کر سناؤ ۔۔۔۔۔" سیمی نے اپنے پائپ کے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

راونیل مندرجہ ذیل نظم رسالے سے پڑھ کر سنائی۔

"چار گلاب کے پھول"

"ایک گلاب کا پھول ۔۔۔۔۔۔۔ جسے میں نے تمھارے بالوں میں لگایا۔

(سفید پھول ۔۔۔۔ جو محبت کا اظہار تھا)

اور دوسرا پھول ۔۔۔۔۔ جسے تم نے اپنے سینہ پر لگایا

(سرخ پھول ۔۔۔۔ آغاز عشق کی نشانی)

ایک اور پھول ۔۔۔۔۔ جسے تم نے گلاب کی شاخ سے توڑا۔

(زرد پھول ۔۔۔۔ جس کے معنی تھے اقرار)

اور ایک وہ پھول ۔۔۔۔۔ جو تم نے مجھے دیا۔

(جس میں میرے لئے تمھاری یاد کے کانٹے تھے۔)

"بہت خوب، بہت خوب، ماشاءاللہ"

سیمی نے تعریف کی۔

"ابھی تو پانچ بند اور باقی ہیں ۔۔۔۔" راونیل نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا ۔۔۔۔ "اور ظاہر ہے کہ ہر بند کے خاتمہ پر توقف ضروری ہے ۔۔۔۔۔"

"یقیناً ۔۔۔۔۔" سیمی بولا ۔۔۔۔ "لیکن ریوی اس وقت تو رہنے ہی دو۔ پھر سن لیں گے۔ ویسے تم کہو تو سن لوں کہیں تم برا مان جاؤ۔

بھئی تم تو جانتے ہو کہ میں شاعری کے معاملے میں بالکل سپاٹ ہوں ۔۔۔۔۔۔"

راونیل نے ایک آہ سرد کھینچی اور رسالہ رکھ دیا۔

"کیوں ٹھیک ہے نا" سیمی نے خوش ہوکر کہا "بھئی اچھا اب چلتا ہوں۔ ۵ بجے مجھے ایک صاحب سے ملنا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے کھڑکی سے باہر سرسبز سایہ دار باغ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو راونیل اپنے نئے سانیٹ کے ایک مصرعے میں زیادہ روانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی نظر قلعہ نما مکان کے دریچے پر پڑی جو کھلا ہوا تھا گیا دیکھتا ہے کہ دریچہ میں اس کے رومان اور شاعری کا ایک حسین مجسمہ ایک سفید ریشمی لباس میں ملبوس کھڑا ہے لیکن ایک لمحہ کو معلوم ہوا کہ اس کے خواب مجسم ہوگئے ہیں یہ ایک حسین لڑکی تھی شبنم کی طرح تر و تازہ کسی بیل کی طرح نازک اور اس پھول کی طرح خوبصورت جس کی تعریف میں شاعر رطب اللسان رہتے ہیں۔ راونیل نے آج اسے پہلی مرتبہ دیکھا وہ کچھ دیر دریچہ میں کھڑی رہی اور پھر ایک جھپاکے کے ساتھ غائب ہوگئی۔ راونیل کے کانوں تک کسی گیت کے میٹھے بول آئے اور پھر یہ بول حرکت کی آمد و رفت کی آوازوں میں گم ہوگئے لیکن اس ایک لمحے کے منظر نے راونیل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ اب ان بیل گاڑیوں کے پہیوں سے جو اس کے گھر کے پاس سے گزرتی تھیں محبت کا نغمہ نکلتا تھا۔ اخبار بیچنے والے لڑکے کی چیخیں طائران خوش الحان کی نواسنجیاں معلوم ہوتی تھیں۔ باغ کوئی حسین تفریح گاہ معلوم ہوتا تھا اور ۔۔۔۔۔۔ اس کے دروازے پر کھڑا ہوا دربان گویا ایک مردم خور دیو تھا اور خود راونیل وہ بہادر شہزادہ جو اس پر حملے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو ۔۔۔۔ جب "وہ" نظر آئی تو بجائے خود رومان کا مرجع تھی اور جب غائب ہوگئی تو اس کی کھڑکی، اس کی دیوار دیوار کی اینٹیں۔ باغ، باغ کے درخت سب رومانی کہریا لپٹے ہوئے دکھائی دیئے۔

دوسرے دن چار بجے راونیل نے اپنی کھڑکی سے دوبارہ سرزمین رومان کی سمت نگاہ ڈالی اور اس نے دیکھا کہ سامنے کے دریچے میں چار گلدان رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ایک بڑا گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے، جوں ہی راونیل نے اسے گھور کر دیکھا وہ پھولوں پر جھک سی گئی۔ گویا وہ انھیں اس طرح سجانے سے شرما رہی ہو۔ لیکن جب اس کی نظریں راونیل پر پڑیں تو وہ ان کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

معلوم ہوتا ہے یہ گلدان خاص اشارے ہیں۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ اگر اس نے ان اشاروں کو نہ سمجھا تو یہ اس کی انتہائی نالائقی اور نااہلی ہوگی۔ یقیناً اس نے اس کی نظم "چار گلاب" پڑھی ہوگی، اور اس سے متاثر ہوکر اس نے نظم کا جواب ان گلدانوں سے دیا ہے۔ یقیناً وہ جانتی ہوگی کہ امریکا کا سب سے بڑا رومانی شاعر اس کا پڑوسی ہے اور وہ سامنے کے مکان میں رہتا ہے اور یہ بھی اغلب ہے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ترکی

پچھلے پچیس سال میں

(۲)

ترکی کی نئی جمہوریہ نے معاشی حیثیت سے ملک کو صرف دہقانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کا ملک پایا جہاں عملاً کارخانوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ قدرت نے معدنی دولت دے رکھی تھی، لیکن نہ کبھی ان سے کام لیا گیا اور نہ کبھی ان کی تحقیق و تفتیش کی گئی۔ تجارتی میدان میں غیر ملکیوں نے ترکوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور خود بڑے بڑے شہروں میں کاروبار پر اپنا اجارہ قائم کر رکھا تھا۔ اسی طرح رسل و رسائل و ذرائع آمد و رفت بھی بڑی افسوس ناک حد تک کم تھے۔ ملکی یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ تھا۔ لیکن پرجوش قوم پرست کب اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ غیر معتمد اقلیتیں حکومت کے ترقی کے کاموں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عثمانی خلافت کے زمانے میں جو قرضے لئے گئے تھے اور اگرچہ اب وہ ختم ہو چکے تھے، لیکن اب تک ان کی مثال لوگوں کے سامنے تھی۔ اس لئے اب یہ لوگ ان اقلیتوں سے بھی گھبراتے تھے کہ مبادا یہ ترکی کو پھر مالی مشکلوں میں نہ الجھا دیں، ان قوم پرستوں کا کہنا تھا کہ ترکی سرمایہ اور ترکی محنت ہی سے کچھ ہو سکتا ہے، دوسروں سے ترقی کی امید رکھنا بے کار ہے۔

جمہوری حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی اصلاح و ترقی کے کام شروع کر دئے۔ اس کے لئے ضرورت تھی سرمائے کی اور سرمائے کا فقدان شروع ہی سے تھا اس لئے اس نے ملکی قرضوں کے لئے اپیل کی، اور اس طرح مختصر سا سرمایہ فراہم کر لیا اور اس سے ملک میں چھوٹے پیمانے پر کارخانوں کی ابتدا کر دی گئی۔ ملک کی ریلوں پر غیر ملکیوں کا اجارہ تھا۔ حکومت نے ان کو ان کے مالکوں سے خرید کر مزید لائنیں بنائیں اور ضروری اصلاحات کیں، چنانچہ اب ریلیں زیادہ مستعدی اور پابندی وقت کے ساتھ چلنے لگیں۔ حکومت نے اپنے سرمائے سے بنک قائم کئے اور ان سے بھی ملکی حالت سنوارنے میں بہت مدد ملی، ان بنکوں نے اپنے سرمائے سے کانوں، لکڑی چیرنے کے کارخانے، کپڑے اور فولاد کے کارخانے اور اسی طرح کے کئی اور کارخانے قائم کئے، اور ان کو اپنے انتظام اور سرمایے سے چلاتے رہے۔ ملکی صنعت کو فروغ دینے اور ابتدائی کاموں کو مقابلے سے بچانے کے لئے حکومت نے درآمد و برآمد پر بھاری ٹیکس عاید کر کے کارخانوں کے تحفظ کا پورا انتظام کیا، اسی طرح غیر ملکی تجارت میں دشواری اور پیچیدگی پیدا کر کے ملکی تاجروں اور اندرونی کاروبار کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے، معاشی مسئلہ کی طرف حکومت نے جو زیادہ توجہ دی اس سے نہ صرف ملکی حالت بہتر ہو گئی بلکہ قوت میں بھی اضافہ ہوا اور دولت بھی خوب بڑھی اور اس طرح سے حکومت اپنے حکام کی تنخواہوں میں قابل قدر اضافہ کر سکی جس سے وہ حکومت کے پکے وفادار ہو گئے کیونکہ جن کاموں کی مہم ان کی سپرد کی گئی تھی۔ اکثر غیر نفع بخش اور بسا اوقات خسارہ کا باعث ہو جاتے تھے۔ مثلاً ترکی کا فولاد باوجود ملکی ہونے کے امریکہ کے فولاد کے مقابلے میں کبھی سستا نہ بک پاتا اور امریکہ کا فولاد محاصل باربرداری، اور چنگی وغیرہ ادا کر کے بھی ترکی فولاد کے مقابلے میں سستا فروخت ہوتا، حکومت کو اپنے سرمائے سے کاروبار چلانے میں مادی نقصان تو بہت ہوا لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کاروبار چلانے اور صنعتی کاموں کی خاصی تعلیم اور اچھا تجربہ ہو گیا۔

بہت سے ترکوں اور غیر ملکوں کا خیال ہے کہ ترکی معدنی وسائل کے اعتبار سے بہت مالدار ہے اور اگر کوشش کی جائے تو اس سلسلے میں یہاں بہت ترقی ہو سکتی ہے۔ اسی خیال سے تیل کی کھدائی کی گئی لیکن نتیجہ صفر رہا اور تیل کا ایک قطرہ بھی نہ نکل سکا۔ ہاں بحر اسود کے ساحل پر آبنائے باسفورس کے قریب سال کے کوئلہ کا ایک مختصر سا میدان ہے۔ اسی طرح سے پتھر کا بھورے رنگ کا کچا کوئلہ بہت سے علاقوں میں پایا جاتا ہے لیکن ان کو کام میں لانے کے انتظامات بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔ اسی طرح کچا فولاد بھی خاصی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ کوئلے کے کانوں سے اتنی دور ہے کہ اس کو کام میں لانا مشکل ہو رہا ہے۔ کچا کرومیم ترکی کے بہت سے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اور جنگ کے زمانے میں جب قیمتیں خوب چڑھی ہوئی تھیں، بڑی تعداد میں برآمد بھی کیا جاتا تھا۔ آج کل تھوڑا بہت تانبا بھی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کار آمد کانوں کے خزانوں کا علم ہو چکا ہے۔ پن بجلی کے بھی معتد بہ وسیلے ملک میں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ملک کے آباد حصوں سے اتنی دور ہیں کہ ان سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ترکی کی معدنی اور قوتی ذرائع کا کسی کو اچھی طرح علم نہیں ہو سکا ہے کہ بڑے پیمانے پر ترکی کی صنعتی ترقی کے امکانات پر غور کیا جا سکے۔

ترکی کے زراعتی وسائل اچھی طرح معلوم نہیں زراعتی پیداوار میں ترکی کسی کا دست نگر نہیں ہے بلکہ وہ خود کفیل ملک ہے، مخصوص پیداواریں مثلاً تمباکو اور خشک میوے خاصی مقدار میں باہر کے ملکوں کو برآمد کئے جاتے ہیں، چونکہ کسان ہی ملک کی دولت کے اہم پیدا کرنے والے ہیں۔ اس لئے جب کسی حکومت کی کامیابی کا اندازہ لگانا ہوگا تو ضروری ہوگا کہ ہم یہ معلوم کریں کہ حکومت نے ملک کے اس اہم طبقے کو کس قدر متاثر کیا ہے؟ اور اس نے اپنے وجود سے ان کو کس قدر فائدہ پہنچایا ہے؟ موجودہ ترکی حکومت نے ملک کے اس طبقے کے لئے جو کام کیا ہے وہ بہت قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ اس حکومت نے ان کو امن و سکون کی وہ دولت عطا کی ہے جس کے لئے وہ پشتہا پشت سے ترستے رہے ہیں اسی طرح امن عامہ اور تحفظ کا وہ انتظام کیا ہے جو اس سے پہلے ترکی کسانوں کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور سب سے بڑا کارنامہ اس حکومت کا یہ ہے کہ اس نے زمین کے لگان کی ادائیگی کا طریقہ کسانوں کے حسب منشا اور ان کی افادیت کے مدنظر بہت معقول کر دیا ہے عثمانی سلطنت کے زمانے میں لگان جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا جو کسانوں پر شاق گذرتا تھا۔ اب حکومت نے نقدی کی شکل میں لگان لینے کا طریقہ رائج کر دیا ہے نئی ریلوں اور روز افزوں باربرداری کے موٹروں کی بدولت ترکوں کے لئے وسیع بازار کھلتے جا رہے ہیں اور حکومت کی کوششوں سے زیادہ سے زیادہ زمینوں پر کاشت کی جا رہی ہے جس سے پیداوار میں خاصی ترقی ہو رہی ہے، کسانوں کو نئے بیج بونے کی ترغیب دینے، بیجوں کو اچھا بنانے اور زراعت کے نئے طریقوں کو اپنانے کے لئے حکومت نے جابجا نمونے کے زراعتی فارم قائم کر دئے ہیں کسانوں کی قدامت پسندی، جہالت اور لاعلمی، اور سائنس متعلقہ کے شکوک و شبہات کی وجہ سے ابھی تک اس میں نمایاں کامیابی نہیں ہو سکی ہے لیکن اس کے باوجود پیداوار بڑھ رہی ہے اور روز افزوں اس سلسلے میں اور بھی ترقیوں کے خاصے امکانات تھے، لیکن دسمبر ۱۹۴۱ء میں حملے کی دھمکی کے سبب ترکی کو اپنی فوجوں کو ایک جگہ مجتمع کر دینا پڑا۔ اس کا اثر زراعت کے علاوہ دوسری صنعتوں پر بھی بہت پڑا، اور پورے نظام میں گڑبڑ ہو گئی، اس قسم کے خطرات پہلے تو نازیوں سے تھے اور اب وہ نہیں ہیں تو روس نے ان کی جگہ لے لی ہے اور فوجوں کے بل پر ترکی کی بہترین پیداوار پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے، یہ صورت ترکی کے لئے بہت خطرناک ہے۔ اسی لئے اس نے اپنی فوجوں کو مدافعت کے لئے جمع کر دیا ہے جس سے پیدائش کے کام کرنے والوں کی سخت کمی ہو گئی ہے اس فوج کو منتشر اس لئے نہیں کیا جا سکتا ہے کہ معلوم نہیں کب روسی فوجیں اچانک حملہ کر دیں، اور ترکی میں رسل و رسائل کی آسانیاں اتنی نہیں ہیں کہ حسب ضرورت ہوئی آسانی کے ساتھ تھوڑے وقت میں فوجوں کو جمع کر لیا جائے۔ نوجوان اور کام کرنے والوں کے فوج میں چلے جانے کی وجہ سے پیداوار میں خاصی کمی ہو گئی ہے۔ باقی ماندہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے اپنی سی کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں لیکن ان سے وہ کمی پوری نہیں کی جا سکتی جو ہو چکی ہے، اور روس کا دباؤ برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ جو ترکی کی معاشی زندگی کو گھن کی طرح دھیرے دھیرے کھا رہا ہے۔

ترکی کی انسانی قوت بہت خوش آیند ہے، گذشتہ پچیس سال کے عرصے میں ترکی کے ہر طبقے اور ہر جنس نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ موجودہ صنعتی طرز معاشرت کی اہلیت میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ مزید تعلیم کا مطالبہ اور حکومت کی اس سلسلے میں کوششیں بہت کامیاب رہی ہیں اور تعلیم میں بہت موثر ترقی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو صنعتی تربیت کی طرف بہت زور دیا جا رہا ہے، دوسری طرف اس کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ کاشتکار اپنی زمینیں نہ چھوڑیں، صدیوں سے جنگوں میں جو جانی نقصان ہو رہا تھا اور جس سے گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے تھے چونکہ اب ان کا سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ حکومت نے صحت عامہ کے لئے بہت اچھے انتظامات کر دئے ہیں۔ اس لئے آبادی میں خاصا اضافہ ہوا اور اب مجموعی تعداد تقریباً ایک کروڑ ۹۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

ترکی میں ابھی تک پوری طرح فارغ البالی نہیں پیدا ہو سکی ہے، کیونکہ اول تو ترکی کے اکثر حصے ناہموار اور کھردرے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصا بڑا حصہ ریتیلا ہے، اور پھر جو خطے اور وادیاں زرخیز ہیں وہ بہت ہی گنجان آباد ہیں ملک کے اکثر خطوں میں بغیر پانی کے کاشت ہوتی ہے اور جانوروں کو چرایا جاتا ہے، اور ان علاقوں میں آبادی چھدری ہونے کے باوجود بھی صرف گذارنے کے لائق ہی پیداوار ہوتی ہے۔ نہری آب پاشی کے ذریعے مزید زمینوں پر کاشت ہو سکتی

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

اسٹالین کی ایک جھلک

شیخ حبیب اللہ

اسٹالین کی پسند عجیب ہے اور طبیعت نرالی وہ ہر جدت کا دشمن ہے ، وہ قدیم طرز تعمیر اور قدیم ادب کا بہت دل دادہ ہے ۔ اس کو نقاشی سے بہت کم دلچسپی ہے " یہ ہے ایک فرانسیسی جریدے کی رائے روس کے لیڈر اسٹالین کے متعلق ۔

افسانہ نگاروں میں وہ پشکن اور چیخوف کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے ۔ اس کا محبوب جارجی مصنف بارہویں صدی میں گذرا ہے جس نے "چوٹا رسٹا ویلی" لکھی تھی اسٹالین کو غیر ملکی مصنفین سے بہت کم دلچسپی ہے پھر بھی اُسے ایمیل زولا کے ناول یوحن سو ، مسٹریز آف پیرس ، اور ہیوگو کی ، لی مزرابل اور جولیس ورن کی "۲۰ ہزار لیگ تہ دریا" پسند ہیں ۔ ان کے علاوہ ڈکنس اور شیکسپیر کے شہ پاروں سے بھی اسٹالین محظوظ ہوتا ہے ۔

اسٹالین کے کتب خانے میں سنسنی خیز جاسوسی قصے کہانیوں کی کتابیں بھی ملتی ہیں لیکن عموماً یہ ادھ پڑی ہوتی ہیں وہ کہتا ہے کہ مجھے کتاب ختم کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ قاتل کون ہوگا " ایسے ساز جن میں فنی باریکیاں نہ ہوں اسٹالین کو بہت پسند ہیں ، ایک دفعہ اُسے ایک محفل سرور میں مدعو کیا گیا ، لیکن وہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے صرف اس وجہ سے اُٹھ کر چلا آیا کہ وہ ساز کی لے کو سیٹی پر نہ بجا سکتا تھا " طبیعت کی اسی افتاد کی وجہ سے وہ روسی اور جارجی لوک گیتوں کو بہت پسند کرتا ہے ، حالانکہ لینن کو ان سے بے حد نفرت تھی ۔

موجودہ زمانے کے گویوں ، ساز نوازوں اور ڈرامانگاروں کا وہ بہت مخالف ہے ۔ اسے جاز بھی مرغوب نہیں ، لیکن بیلے سے لگاؤ ہے ۔

اسٹالین کو صرف رومان پسند مصوروں کی تصویریں بھاتی ہیں پکاسو جیسا مصور بھی اسٹالین کی تصویر بنائے تو اسے وہ بالکل پسند نہیں کرتا اور اس کو غارت گری کے نام سے تعبیر کرتا ہے ۔ ہٹلر کی طرح اسٹالین کو فن تعمیر اور آرائش بلدہ کے کاموں سے خاصی دلچسپی ہے لیکن لینن کے برخلاف وہ جدید فن تعمیر کو نہیں پسند کرتا ۔

اسٹالین نے بعض ایسے ڈراموں پر سے جو قانوناً ممنوع تھے ، پابندیاں ہٹا دی ہیں ، اسی قسم کا ایک ڈراما تھا جس میں باغیانہ خیالات کا اظہار تھا ، اور خاندان زار کی تعریف کی گئی تھی ۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا دکھانا خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا ۔ لیکن اسٹالین نے اس پر سے پابندی اُٹھالی ، اور اس کو دوبارہ تیار کرنے کا حکم دے دیا ۔

کریملن میں اسٹالین کے تین خوب صورت کمرے ہیں ان میں سے ایک اس کے کھانے کے لئے مخصوص ہے غذا میں اس کو چاول گوشت اور لکڑی کی آگ پر تیار کیا ہوا کباب بے حد پسند ہے ۔ اسٹالین شراب کا بہت عادی ہے اور ووڈکا کے مقابلے میں ارغوانی شراب کو زیادہ شوق سے پیتا ہے ۔ تمباکو نوشی کی بھی سخت عادت ہے ، اور روزانہ سخت قسم کے تمباکو کے چالیس پائپ پی جاتا ہے ۔ کبھی کبھار سگریٹ کے بھی دو ایک کش لگا لیتا ہے ۔ لیکن سگار پیتے ہوئے آج تک اسے کسی نے نہیں دیکھا ۔ مسٹر چرچل نے ایک مرتبہ اُسے سگار پیش کیا ، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا ۔

اسے تاش سے تو نفرت ہے ، لیکن شطرنج سے خاصی دلچسپی ہے ۔ اس کا محبوب ترین مشغلہ گھوڑے کی سواری ہے جب وہ اپنے دیہاتی مکان پر جو ماسکو سے ۲۵ میل دور ہے ، رہتا ہے تو روزانہ صبح کو پستول اور رائفل کے نشانے کی مشق کرتا ہے ۔

لباس کے معاملے میں اسٹالین کی کم پسندی مشہور ہے ۔ ہاں ادھر کچھ دنوں سے اس میں کمی ہو رہی ہے ۔ چنانچہ ماسکو کانفرنس میں اس کے کپڑے نسبتاً اچھے تھے ۔ آج کل وہ فوجی وردی میں رہتا ہے جس پر صرف " ہیرو آف دی سوویٹ یونین " کا تمغا لگا ہوتا ہے ۔

عمر کے ساتھ ساتھ اسٹالین کی جسمانی کمزوری بھی اب بڑھتی جا رہی ہے ۔ بال بالکل سفید ہو گئے ہیں اور وزن بھی بارہ پونڈ کم ہو گیا ہے ۔ اب کی دفعہ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی مونچھیں ترشوائی ہیں وہ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے ، اس کے رفیق اور بے تکلف دوست بہت کم ہیں ۔ مولوٹوف سے اس کے تعلقات صرف کاروباری قسم کے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ صرف مارشل ورشیلوف سے اس کی بے تکلفی ہے ۔ عام سیاسی لوگوں کے برخلاف وہ ہمیشہ سکون اور اطمینان قلب کے ساتھ رہتا ہے ۔ اس پر افسردگی یا شادمانی کے اثرات بہت کم پڑتے ہیں ۔

سینما سے اُسے مطلق دلچسپی نہیں اور باوجود اس کے کہ اب سینما کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے اسٹالین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس سے اُسے نفرت ہے

(ترجمہ)

گلاب ، رومان اور فریب (بسلسلہ ۹)

کہ اس نے مختلف رسالوں میں اس کی تصویر دیکھی ہو ۔ یہ نازک لطیف رنگیں ، خوب صورت اور شاعرانہ پیغام کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

راونیل نے اس ذہنی شاعری کے بعد جب دوبارہ دریچہ کو دیکھا تو اس کو ان چار بڑے گلدانوں کے پاس ایک چھوٹا سا گلدان اور نظر آیا جس میں ایک چھوٹا سا پودا لگا ہوا تھا بغیر کسی شرم کے احساس کے اس نے اپنی دوربین اُٹھائی اور اپنی کھڑکی کے پردے سے لگا کر اسے غور سے دیکھا " اوہو یہ گل ریحان کا پودا ہے " فوراً شاعرانہ فراست کے اشارے پر اس نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور اس میں "پھولوں کی زبان" کا باب نکال کر پڑھنے لگا ۔

"گل ریحان ——— ملاقات کی اُمید" وہ فرط مسرت سے اچھل پڑا ——— "دیکھا ! رومانی تخیل کے پس منظر میں ہمیشہ ایک حقیقت ہوتی ہے ۔ اب اگر وہ دوبارہ آئی تو وہ ضرور اپنے ساتھ کوئی ایسی چیز لائے گی جیسے سوئیٹر بننے کا سامان وغیرہ جس کو لے کر وہ دیر تک دریچہ میں بیٹھ سکے اور وہ اس کا نظارہ کرتا ہے ۔

یہ سوچ کر راونیل مسکرایا ۔ عاشق اس وقت مسکراتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ۔ اس کے برعکس محبت کرنے والی عورت کامیابی کے بعد مسکرانا بند کر دیتی ہے وہ ایک معرکہ سر کرتا ہے اور وہ ایک دوسرا میدان کارزار گرم کرتی ہے ۔ راونیل سوچنے لگا کہ اس کے دیکھنے کے لئے چار گلاب کے پھولوں کو دریچہ میں سجانا کتنا نادر خیال ہے ۔ وہ یقیناً ایک شاعرانہ روح کی حامل ہے ۔ اب صرف ملاقات کی تکمیل باقی ہے

راونیل ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دروازوں کے بند ہونے اور کھلنے اور سیٹی بجانے کی آواز آئی ۔ یہ سیمی براؤن کی آمد کا پیش خیمہ تھا ۔

راونیل دوبارہ مسکرایا ۔ شاید سیمی براؤن اس لئے اس وقت عہد وسطیٰ کا کوئی رومانی کیریکٹر معلوم ہو رہا تھا اس کے فیشن ایبل کپڑے ، اس کا گول چہرہ ، اس کی سادہ زبان اور اس کی ناقابل فہم کم عقلی راونیل کے لئے یہ سب چیزیں رومان انگیز تھیں ۔

سیمی کھڑکی کے قریب والی اپنی پرانی نشست پر بیٹھا اور اپنی پرانی عادت کے مطابق باغ کا نظارہ کرنے لگا ۔ پھر اس نے اپنی گھڑی کو دیکھا اور فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ۔ گویا اسے کوئی بات یاد آگئی " اُف وہ ——— " اس نے کہا " چار بج کر بیس منٹ ۔ اب میں ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتا ساڑھے چار بجے مجھے ایک شخص سے ملنا ہے "

" جب تمہیں اس وقت ملنا تھا تو یہاں آنے کی ایسی کیا ضرورت تھی " راونیل مسکراتے ہوئے گویا سیمی کی بدحواسی پر طنز کیا " میں تو سمجھتا تھا کہ تم کاروباری لوگ اپنے گھنٹوں اور لمحوں کا حساب زیادہ باقاعدہ رکھتے ہو ، مگر آج معلوم ہوا کہ اس معاملے میں بھی تم بس بالکل بے ڈھال کے لودم ہو ——— "

سیمی جاتے جاتے دروازے میں رُکا اور یک لخت اس کا چہرہ گلابی سے سفید ہو گیا ۔

" بھئی یہ بات ہے ——— " اس نے معذرت کے ساتھ کہا " کہ میں جب تک یہاں نہیں آیا تھا مجھے خود اس بات کا علم نہیں تھا کہ مجھے ملاقات کرنی ہے ——— اب یار تم سے کیا چھپانا ۔ قصہ یہ ہے کہ ربری کے سامنے کے بڑے مکان میں ایک خوب صورت لڑکی رہتی ہے اور میں اس پر جان دیتا ہوں ، اور اب دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں ۔ میرا مطلب ہے رشتۂ محبت سے ۔ اس کا باپ انکار کرتا ہے ۔ مگر ہمیں کب اس کھوسٹ کی پروا ہے ۔ وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہے ۔ میں اپڈھ کے دریچے کو یہاں تمہاری کھڑکی سے دیکھ سکتا ہوں ۔ جب کبھی وہ خرید و فروخت کے لئے بازار جاتی ہے تو مجھے اشارہ کر دیتی ہے اور میں اس سے وہاں مل لیتا ہوں ..

...... آج ساڑھے چار بجے ملاقات ہے ۔ مجھے چاہئے تھا کہ یہ راز تم سے ذرا پہلے کہہ دیتا لیکن خیر ایک ہی بات ہے ۔ تم میرے دوست ہو ، اور دوست سے دیر کیا اور سویر کیا ——— اچھا بھئی اب چلتا ہوں خدا حافظ ——— "

اچھا .... لیکن کم بخت یہ تو بتاتا جا کہ اس نے تجھے اشارہ کیسے کیا " راونیل نے جس کے چہرے کی مسکراہٹ اب رخصت ہو چکی تھی جلدی سے پوچھا

" گلاب کے پھولوں سے ——— " سیمی نے جواب دیا " چار گلاب کے پھولوں کا مطلب چار بجے ۔ براؤن نے کے لئے کہ بڑے "

" اور گل ریحان کا مطلب " راونیل نے بھاگتے ہوئے رومان کا دامن پکڑنے کی کوشش کی ۔

" گل ریحان سے مراد آدھا گھنٹہ ——— " سیمی ہال کے آخری حصے سے چلایا ——— " اچھا پھر ملاقات ہوگی ——— "

> براہ کرم خط لکھتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ دیجئے اور اپنا پتہ صاف اور انگریزی میں بھی لکھئے ۔

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر

تاریخ اشاعت:- یکم ، ۸ ، ۴۸ء

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبدالحلیم ندوی

چندہ:- سالانہ ؎ ششماہی للعہ

ہم کدھر جا رہے ہیں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے!

(۱) حیدرآباد کے چند ممتاز شہری اور سابق سرکاری ملازمین حکومت نظام کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ اسے ہندوستانی یونین میں شریک ہو جانا چاہیئے اور رضاکاروں کی بدلگامیوں کو روکنا چاہیئے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ رائے اپنی جگہ پر مناسب ہے، ہر شخص کو اپنے ملک یا ریاست کے اہم سیاسی معاملات میں اظہار رائے کا صرف حق ہی حاصل نہیں بلکہ وہ اس کا فرض بھی ہے۔ لیکن اس اظہار خیال کی پاداش میں اُن سے جواب طلب کیا جاتا ہے، ان کی پنشن بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے، انسان کو خطرناک نتائج کا خوف دلایا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت یا شخصی حکومت نہیں فاشزم ہے!

(۲) پاکستان میں ابھی تک کوئی ایسی منظم جماعت قائم نہیں ہوئی جو حزب مخالف کی حیثیت رکھتی ہو اور بے لاگ تنقید کی ہمت کی ہے۔ لیکن وہاں بعض ایسے ادبی اور سیاسی گروہ اور افراد ہیں جو وطن دوستی اور اراکین حکومت کی جا و بے جا تائید میں فرق کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے تنقید کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن نشۂ قوت ایک خطرناک چیز ہے۔ اور نئے حکام اپنی شان میں تنقید کی گستاخی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ حال ہی میں حکومت نے نوائے وقت، نقوش، سویرا تینوں کی زبان بند کر دی ہے۔ کیونکہ ان کی اشاعت "مفاد حکومت" کے خلاف ہے! ان میں سے پہلا ایک سیاسی اخبار ہے۔ باقی دونوں ادبی رسالے ہیں۔ اس قسم کا اقدام جو آزادیٔ فکر کی آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے، خوف کی ذہنیت اور عاقبت ناشناسی کا ثبوت ہے، اور یہ کسی ملک کے مستقبل کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔ تنقید کو برداشت کرسکنا تہذیب اور خود اعتمادی کی علامت ہے۔ اس کا گلا گھونٹنا سیاسی اور اخلاقی کمزوری کا نشان ہے!

(۳) خود ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں جن کی روک تھام اشد ضروری ہے۔ اس کی بھی ایک تازہ ترین مثال سن لیجئے جو المناک بھی ہے اور مضحک بھی۔ خواجہ احمد عباس کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ گذشتہ پندرہ سال سے اُن کا شغل اخبار نویسی ہے اور ایک جرنلسٹ اور ادیب کی حیثیت سے انھوں نے ملک میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا ہے جس وقت مسلمانوں کی اکثریت فرقہ پرستی میں گرفتار تھی انھوں نے اپنی قوم پرستی اور رواداری کو بے داغ رکھا۔ کم لوگوں نے قلم کے ذریعے باہمی دوستی اور مفاہمت کی خاطر اس قدر خلوص کے ساتھ جہاد کیا ہوگا یا خود مسلمانوں کی غلط راہ روی پر اس سختی کے ساتھ تنقید کی ہوگی جس قدر احمد عباس نے .... انھوں نے حال ہی میں ایک کہانی لکھی تھی جس کا عنوان تھا "سردار جی" جس میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح ایک سکھ اپنی جان پر کھیل کر فساد کے زمانے میں ایک ایسے تنگ خیال مسلمان کی جان بچاتا ہے جس کے دل میں سکھوں کی طرف سے بغض اور عناد بھرا ہے اور اس ایثار کی بدولت اس مسلمان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ بعض حلقوں میں اس کہانی کے خلاف جو باہمی اتفاق اور اتحاد کے لئے ایک زبردست ادبی اپیل ہے سخت پراپگنڈا جاری ہے! کیوں؟ خدا ہی جانے! شاید ان لوگوں نے اس کو پڑھا ہی نہیں یا اس کا صرف پہلا حصہ پڑھا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ سکھوں کی طرف سے اس مسلمان کے کیا جذبات تھے۔ ان حضرات نے یہ نہیں دیکھا کہ کہانی کا مقصد اور انجام کیا ہے، یہ نہیں معلوم کیا کہ وہ کس شخص نے لکھی۔ بس ایک مورچہ قائم کر لیا ہے کہ اس کہانی کو جو ایک شریف سکھ کی خدمت میں ایک مسلمان کا ہدیۂ عقیدت ہے "ضبط کر لیا جائے"! سنتا ہوں ۔۔۔ لیکن یقین نہیں آتا کہ ایک روشن خیال کانگریسی حکومت نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس کہانی اور رسالے کو "بحق سرکار ضبط" کر لیا ہے!

خیر میں اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ اپنی مصلحتوں کو حکومت ہی خوب جانتی ہے۔ لیکن میں ان حضرات سے جو اس ایجی ٹیشن میں شریک ہیں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا سیکھیں، بغیر کسی چیز کو پڑھے اور سمجھے رائے قائم نہ کریں۔ بغیر پورے واقعات معلوم کئے اس رائے کا اظہار نہ کریں، ورنہ ان کی جلد بازی اور بے صبری ان کی پوزیشن کو مضحک بنا دے گی۔ شاعر نے یہ شکایت کی تھی کہ شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد۔ بیچارہ ادیب سوچے گا کہ میری کہانی کن سخن شناسوں کے پنجے میں جا پھنسی! ان تمام حضرات کی خدمت میں جو آزادانہ اظہار رائے کو جرم سمجھتے ہیں اور ادب کو شکنجے میں کسنا چاہتے ہیں میں فرانس کے مشہور ادیب اور نقاد والٹیر کا یہ قول پیش کرتا ہوں اور اس کا مطلب نکالنا ان کی ذہانت پر چھوڑتا ہوں۔

"جو کچھ تم کہتے ہو مجھے اس سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن تمھیں اس کے کہنے کا حق ہے اور میں تمھارے اسی حق کی خاطر اپنی جان دینے کو تیار رہوں"

جان دینے کو دوستو، جان لینے کو نہیں!

ترکی پچھلے پچیس سال میں (بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ہے لیکن اگر عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے تو یہ کافی نہیں ہے بلکہ کاشتکاری کو اور زیادہ ترقی دینے اور مستعدی اور تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس وقت تک جس تناسب سے پیداوار بڑھ رہی ہے اسی تناسب سے آبادی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے جس سے معیار زندگی بلند ہونے کی کوئی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

ترکی میں اب تک صرف ایک ہی سیاسی پارٹی حزب خلق یا پیپلز پارٹی تھی اور اس پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ اپنے مخالفوں کو سختی سے کچل دیتی ہے۔ لیکن اگر مقامی معیار سے دیکھئے تو مخالفوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں "حزب خلق" نے بہت صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ صرف مٹھی بھر آدمیوں کو پھانسی دی گئی ہے اور چند درجن آدمیوں کو جلاوطن کیا گیا ہے، اس موقعہ پر اگر چینی اور روسی انقلاب سے ترکی انقلاب کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اور ترکی انقلاب میں ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔ مصطفےٰ کمال نے مخالف جماعتوں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ لیکن یہ ہمت افزائی اسی وقت تک رہی جب تک کہ انھوں نے امن و سکون کے ساتھ صرف سیاسی کام کئے۔ لیکن جب انھوں نے اپنی سرگرمیوں سے امن عامہ کو متاثر کرنا شروع کیا۔ لوگوں کو مخالفت پر اکسانا شروع کیا تو مصطفےٰ کمال نے ان کو ختم کر دیا، اور سختی سے اُن کی عملی کارروائیاں روک دیں ——— ایک پارٹی کے نظام حکومت اور اسی کے اقتدار کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اور نہ ایسی حکومت کو کبھی معیاری نظام حکومت سمجھا گیا ہے۔ اگر کبھی ایسی پارٹی برسر اقتدار آگئی تو بالآخر اس میں دو یا اس سے زیادہ پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ یہ کیفیت "حزب خلق" میں نہیں ہے۔ اس کے جلسوں میں معاملات پر حقیقی مباحثے ہوئے ہیں۔ رائے طلب امور میں آزادی اور پوری خود مختاری سے رائیں دی گئی ہیں، اس طرح قومی مجلس کی کمیٹیوں نے بھی بغیر کسی بے جا دباؤ کے ہر معاملے پر پوری آزادی اور بے باکی سے رائیں دی ہیں اور پالیسی کے متعلق ہر پہلو پر پوری طرح سوچ بچار اور غور و خوض کیا ہے، اور بغیر ادنیٰ مداخلت کے ممبران نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

ملک کا اکثریت والا طبقہ نظم و ضبط، رواداری و مفاہمت کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے، اسی طرح وہاں کی اقلیتیں بھی اس بات کو اچھی طرح جانتی ہیں کہ صبر اور دلائل کی طاقت سے وہ اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا سکتی ہیں۔ الغرض ترکی میں جمہوری تصور اور اس کی کارروائیوں کا خاصا مطالعہ کیا جا چکا ہے اور ایک حد تک اس پر عمل بھی کیا جا چکا ہے۔

(باقی آئندہ)

ترجمہ از عبدالحلیم ندوی

مطبوعہ:- جید برقی پریس دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی (جامعہ ملیہ دہلی)

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۵ | یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

ہند و برطانیہ

(۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تھے۔ ان سے نیشنل لیبر کلب میں چند سوال کئے گئے۔ گاندھی جی کے جوابات سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ ہند اور برطانیہ میں کس قسم کے تعلقات چاہتے تھے۔)

"اگر ہم آپ کو کامل آزادی دے دیں تو یہ غلطی نہ ہوگی؟"

"اگر آزادی دینے کا سوال ہے تو آپ جس کسی کو آزادی دیں بڑی غلطی ہے۔ کہیں مہربانی کرکے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ سے آزادی مانگنے آیا ہوں۔ میں تو یہاں اس لئے آیا ہوں کہ پچھلے سال ہم لوگ جو تکلیفیں جھیل چکے ہیں۔ دیکھوں ان کا کافی اثر انگریزوں کے دل پر ہوا ہے اور ان سے کوئی باعزت تصفیہ کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میں کوئی باعزت تصفیہ کرکے لوٹا تو یہ ہرگز نہیں سمجھوں گا کہ میں نے اس قوم کی دی ہوئی چیز پائی ہے۔ آزادی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ایک قوم اٹھا کر دوسری قوم کو دے دے۔ یہ تو وہ چیز ہے جو انسان خود لیتا ہے، اپنے خون کے بدلے خریدتا ہے اور میرے خیال میں ہم لوگ اپنا خون اس تحریک میں جو ۱۹۱۹ء سے اب تک جاری ہے کافی بہا چکے ہیں۔ مگر ممکن ہے خداوند تعالےٰ یہ سمجھتا ہو کہ ابھی ہم نے کافی تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ ابھی ہمارا تزکیۂ نفس نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ ہے تو میں قوم کی طرف سے کہے دیتا ہوں کہ ہم اپنی قربانی اس وقت تک جاری رکھیں گے، کہ برطانیہ کا ایک شخص بھی حاکم بن کر ہندوستان میں نہیں رہنا چاہے گا۔"

"لارڈ ارون نے سینٹرل ہال میں ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے یہ کہا کہ مجھے معلوم ہے گاندھی جی کامل آزادی پر اصرار نہیں کریں گے، کیا یہ سچ ہے؟"

"اول تو مجھے اسی کا علم نہیں کہ جو تقریر لارڈ ارون کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ انھوں نے کی یا نہیں، دوسرے مجھے لارڈ ارون کی طرف سے کچھ کہنے کا حق نہیں۔ یہ سوال آپ انھیں سے کریں تو اچھا ہے۔ میں نے لارڈ ارون سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں کامل آزادی پر اصرار نہیں کروں گا۔ برخلاف اس کے جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ میں کامل آزادی پر زور دوں گا، اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میرے نزدیک کامل آزادی سے یہ مراد نہیں کہ نائبوں کے ذریعے حکومت کی جائے یعنی بجائے انگریز گماشتوں کے ہندوستانی گماشتے ہوں۔ بلکہ میں کامل آزادی کے معنی قومی حکومت سمجھتا ہوں۔"

"آپ کامل آزادی کے ساتھ انگریزی فوج رکھنے پر راضی ہیں، یہ دونوں چیزیں کیوں کر جمع ہو سکتی ہیں؟"

"برطانوی فوج ہندوستان میں رہے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ اصل میں اس پر موقوف ہے کہ دونوں شریکوں میں کیا معاہدہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فوج ایک محدود زمانے تک رہے تو اس میں ہندوستان کا فائدہ ہے، کیونکہ ہندوستانی بہت کمزور ہو گئے ہیں اور قومی حکومت کے لئے برطانوی سپاہیوں کا یا کچھ برطانوی افسروں کا رکھنا ضروری ہی ہے بشرطیکہ یہ نوکر بن کر رہیں، میں شرکت کا بھی حامی ہوں، اور اس کے ساتھ فوج کے رکھنے کا بھی۔"

"آپ ہندوستان میں وائسرائے کے عہدے کو باقی رکھنا چاہتے ہیں؟"

"وائسرائے کا رہنا یا نہ رہنا ایسا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ دونوں فریقوں کو مل کے کرنا چاہیے، آپ میری ذاتی رائے پوچھتے ہیں تو وائسرائے کے رہنے کی مطلق کوئی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ برطانوی ایجنٹ یہاں رہا کرے۔ کیونکہ برطانیہ والوں نے یہاں اپنی بہت سی اغراض پیدا کر لی ہیں جن کو میں ذاتی طور پر مٹانا مناسب نہیں سمجھتا، اور ان اغراض کی وکالت کے لئے اور برطانوی سپاہیوں اور افسروں کے خیال سے ایک ایجنٹ کے رہنے کی ضرورت ہوئی میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں برطانوی ایجنٹ ہرگز نہ رہے۔ اس کے علاوہ چونکہ معاملے کا تعلق ہندوستانی رئیسوں سے ہے اور میں ان کی طرف سے کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا، اس لئے میرے خیال میں اس نظام کے تحت جو میرے ذہن میں ہے یہ مشکل ہے کہ کوئی برطانوی ایجنٹ خواہ وہ گورنر جنرل کہلائے یا وائسرائے نہ رہے مگر میں اس نظام کی اس حیثیت سے حمایت کرتا ہوں کہ یہ برابر کی شرکت ہوگی جو فریقین میں کسی ایک کی خواہش پر ختم ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں گویا ایسی تختی پر لکھ رہا ہوں جس میں سے بہت کچھ مٹانا پڑے گا۔"

"وہ کون سے مشترک مقاصد ہیں جو اس شرکت سے پورے ہوں گے؟"

"اس شرکت سے یہ مشترک مقصد حاصل ہوگا کہ دنیا میں جو قومیں لوٹی جا رہی ہیں ان کا لوٹنا موقوف ہو، اگر ہندوستان اس لوٹ سے جس میں وہ برسوں سے گرفتار ہے، بچ جائے تو اس کا فرض ہوگا پھر کبھی ایسی لوٹ نہ ہونے دے۔ حقیقی شرکت میں دونوں کا فائدہ ہوگا۔ یہ شرکت دو قوموں کے درمیان ہوگی جن میں سے ایک وہ ہے جو مردانگی، ہمت، بہادری اور تنظیم کی بے نظیر قوت مشہور ہے اور دوسری وہ پرانی قوم ہے جس کی تہذیب دنیا میں کسی سے کم نہیں اور جس کا ملک بجائے خود ایک اقلیم ہے۔ بھلا جب ایسی دو قوموں کے درمیان شرکت ہو تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اس میں دونوں کا فائدہ اور سارے انسانوں کا بھلا نہ ہو۔"

(مہاتما گاندھی)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہند و برطانیہ	مہاتما گاندھی	۱
سیرت کی تعمیر	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲
اردو زبان کے حامیوں سے (اداریہ)	ایڈیٹر	۳
بزم بے تکلف	ع، ح	۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴
۲۔ پاکستان	ا، س	۵
مغربی دنیا	م، م	۶
سعادہ فکر و عمل (نظم)	اختر انصاری	۷
ایں و آں	باقر رضوی	۷
پیدائشی اندھا استاد	محمد اکرام خان	۸
چوڑی والا (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	
ترکی پچھلے پچیس سال میں	عبد الحلیم ندوی	

قیمت فی پرچہ ۲ آنہ

سیرت کی تعمیر

ڈاکٹر ذاکر حسین

سیرت کی تعمیر کے لئے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے: ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، جتنہاد فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حس جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کروں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوت فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد میں اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو۔ دوسرے نے کرکے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو، جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قوت فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلہ میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادہ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتی تسویف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آ سکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظر ثانی و نظر ثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوت ارادہ بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت یعنی ثبات قدم، ارادے کو خارجی رکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دئے جاتے یا بالکل ترک کر دئے جاتے ہیں۔

قوت ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں، جن میں تغیر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے، یعنی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور بچہ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے، وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدت سے عبارت نہیں، اس لئے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کون سی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو۔ مضبوط ارادہ دراصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتہ مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرط جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا مختصر کرلیں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلہ میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں کہ مایوسی توانائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لئے دوسری شرط قوت فکر ہے: منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت، صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے، نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یکسوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربے، معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے۔ جیسے اندھا ٹٹولی ٹٹولی کر چلے۔ لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوت عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتا ہے یا بخت و اتفاق کے سہارے ڈگمگاتا آگے بڑھتا ہے۔ ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی؛ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔ منطقی استدلال اور حکیمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی؛ اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کرکے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجے پر جرح کی جائے، اسے جانچا جائے، پرکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش کرکے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان، تعجیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خود غرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکر منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کی ان جھاڑ جھنکاڑوں کو پیہم کوشش سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی فکر کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشو و نما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہو گئی، بس ہر قضیے پر شبہہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جا سکتی ہے۔ مگر علمی مسائل پر غور کرنے کی مشق عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو پھر اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔ اور اصول ہی کافی نہیں، ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لئے نیکی کرنا بھی لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی شہانی راگنیاں، مرغوب عام، مقبول عام سطحی دلیلیں، ناپختہ مطالبے، ضدیں، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خود غرضیاں، یہ سب اور نہ جانے کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے۔ آپ کو اگر اپنی سیرت کی تعمیر عزیز ہوگی تو آپ ان کا مقابلہ کریں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اسے گوارا بنائیں گے۔ اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی متاع عزیز کی، اور سیرت سازی کی اسی شرط دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے۔ شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے۔ دوسروں کا عکس رہیں گے اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر شروع سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لئے تیسری شرط اشیا اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوت حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے۔ حواس ظاہری کے فعل میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی وہ سب سنتا ہے جس کے لئے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھو کر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ مصور، ماہر موسیقی، موتی پرکھنے والے، جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوت حس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقات انسانی میں بھی ایسی ذکاوت حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حس ہے۔ کچھ بہت تیز، کچھ بہت کند، کچھ ذکی، کچھ غبی۔ بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں۔ آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں۔ جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں۔ دوسروں کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں، بعض اس کے بالکل برعکس۔ انسانوں اور چیزوں کے برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشو و نما پاتی ہے، کتابی کیڑے اور خبری علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں۔ زندگی کی ناکامیاں، بچپن میں دل شکستگی، آلام روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کر دیتے ہیں، خود غرضی کی شدت، خود پرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کر دیتی ہے۔ بے غرض خدمت، بے لاگ میل جول اس کو جلا دیتے ہیں۔ آدمیوں سے سابقہ ہیں۔ عمل کے متنوع تجربے، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے، خلوت میں اکثر ٹھٹھر جاتی ہے، جلوت میں نکھرتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشو و نما میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفت روزہ
نئی روشنی دہلی
یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء

اُردو زبان کے حامیوں سے

ہندوستانی زبان کی دو ادبی شکلیں اردو اور ہندی ہیں۔ ان میں سے اب تک اردو ملک کے بڑے حصے میں زیادہ مقبول تھی۔ کوئی نصف صدی سے کچھ لوگ ان مصلحتوں کی بنا پر جنھیں زبان ادب سے کوئی تعلق نہیں اور کے رقبے میں ہندی کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تھی پچھلے دس سال سے ملک میں فرقہ واری سیاست کا زور ہوا تو اردو کی مقبولیت ہندوؤں میں کم ہونے لگی اور ہندی کی بڑھنے لگی۔ جب فرقہ واری سیاست انتہا کو پہنچی اور پاکستان الگ ہو گیا تو ایک دم سے ہندی کو یو۔پی، بہار، سی۔پی اور مشرقی پنجاب میں سرکاری زبان کی حیثیت دے دی گئی اور اردو کو محض مسلم اقلیت کی زبان سمجھ کر اس کے ساتھ عام طور پر تعصب برتا جانے لگا۔

پاکستان کا الگ ہونا اور صرف ہندی کا چار صوبوں میں (خاص کر مشرقی پنجاب میں جہاں اب تک دفتری اور عدالتی زبان اردو تھی) سرکاری زبان بنایا جانا دونوں چیزیں فرقہ واری ذہنیت کے افسوسناک نتیجے ہیں لیکن دونوں کو جمہوریت کی آئینی تائید حاصل ہے، اور جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے مدت تک حاصل رہے گی۔ اس لئے دانش مندی اور جمہوریت پسندی کا تقاضا ہے کہ ہم دونوں کو طے شدہ امور جان کر چار ناچار تسلیم کر لیں۔ اس لئے کہ ان کی مخالفت کرنے سے فرقہ پرستی کم نہیں ہوگی بلکہ ضد کی وجہ سے اور بڑھے گی۔ اب رہا اردو سے تعصب، اس کی نوعیت دوسری ہے۔ یہ کروروں مسلمانوں اور بہت سے ہندوؤں کے ساتھ جو اب بھی اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، اتنی بڑی ناانصافی ہے کہ کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس تعصب سے آپ کو بہرحال نبٹنا ہے۔

لیکن کس طرح نبٹنا ہے؟ اس پر امن اخلاقی جدوجہد کے ذریعے سے جس کی تعلیم مہاتما گاندھی نے دی ہے جس میں اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جاتا دوسرے فریق پر بے جا الزام نہیں لگایا جاتا، اسے خواہ مخواہ غصہ نہیں دلایا جاتا جس میں فتنہ و فساد کی دھمکیوں سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ سنجیدگی اور نرمی سے اپنی بات سمجھائی جاتی ہے، مضبوطی سے اس پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے کے دل پر اخلاقی اثر ڈالنے کے لئے اپنے اوپر ہر طرح کی سختیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ مقابلے کی دوسری قسم ہے جس پر فرقہ پرست لیڈر آپ کو ابھار رہے ہیں یعنی بکنے جھکنے، کوسنے پیٹنے، بچوں کی طرح مچلنے اور روٹھنے سے دور رہیئے۔ یہ حضرات سیاست کی بازی ہار چکے ہیں۔ عوام کی اور حکومت کی نظروں میں اپنی ساکھ کھو چکے ہیں۔ عوام کی تو نہ ان کو پروا تھی اور نہ اب ہے۔ ساری فکر یہ ہے کہ حکومت میں رسوخ حاصل ہو جائے سو اس کے لئے بعض تو خوشامد کے حربے سے کام لے رہے ہیں اور بعض سوچتے ہیں کہ کوئی ایسا فتنہ برپا کریں جس سے حکومت پریشان ہو کر انھیں خریدنے کی کوشش کرے اور یہ اپنے آپ کو مہنگے سے مہنگے دام پر بیچیں۔ یہ دوسری قسم کے لوگ دیکھتے ہیں کہ اس وقت مذہب کا نام لے کر بھڑکانا مشکل ہے اس لئے زبان کا فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے اول تو انھیں کامیابی نہیں ہو سکتی اور ہوئی بھی تو اردو زبان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جیسے ہی انھیں خاطر خواہ قیمت مل جائے گی یہ اپنے ساتھ اردو کو بھی بیچ دیں گے۔

در اصل آپ کو اردو کی حفاظت کے سلسلے میں تین فریقوں سے الگ الگ نبٹنا ہے۔ حکومتوں سے، کانگریس سے اور ہندی کے عام حامیوں اور ادیبوں سے۔ لیکن ان تینوں پر اخلاقی اثر ڈالنے کے لئے سب سے پہلے آپ کو اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دینا چاہیئے کہ آپ کو ہندی سے ذرا سا بھی تعصب نہیں اور خواہ اس کے سرکاری زبان بنائے جانے کو آپ نے کیسی ہی بے دلی سے قبول کیا ہو لیکن ایک بار اس فیصلے کو مان لینے کے بعد آپ اس کے عمل درآمد میں پوری دیانت داری اور سرگرمی سے مدد دے رہے ہیں۔ خود ہندی شوق اور انہماک سے سیکھتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ دوسرے صوبوں میں آپ کو یہی رویہ صوبائی زبان کے ساتھ اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو اردو کے خلاف جو تعصب ہے وہ بہت کم ہو جائے گا اور آپ کی آدھی مہم سر ہو جائے گی۔

اس کے بعد آپ کو صوبوں کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ آپ کے بچوں کو ابتدائی تعلیم بدستور اردو زبان کے ذریعے دی جائے۔ اور اس سے آگے اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ ہندوستان کے مجوزہ دستور اساسی میں آپ کو یہ حق دیا گیا ہے جسے کوئی صوبائی حکومت نہیں چھین سکتی۔ ابھی تک صرف یو۔پی کی حکومت کے خلاف یہ شکایت سننے میں آئی تھی کہ اس نے اس بنیادی حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شکایت بالکل بے بنیاد ہے۔ شری سمپورنا نند جی وزیر تعلیم نے ذاتی طور پر ہمیں یقین دلایا ہے، اور حکومت یو۔پی سرکاری طور پر اعلان کر چکی ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کو پہلی سے پانچویں تک اردو کے ذریعے سے تعلیم دی جائے گی اور ہائی اسکول اور کالج میں اردو اختیاری مضمون رہے گا۔ اب آپ کو یہ چوکسی رکھنی ہے کہ اس پالیسی کی خلاف ورزی نہ ہو۔ جب کوئی ایسی مثال نظر آئے تو اسے حکومت کے علم میں لائیے اور اگر وہ توجہ نہ کرے تو آئینی احتجاج کے دوسرے طریقے اختیار کیجئے۔ اس کے علاوہ صوبائی حکومت

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

بزمِ بے تکلّف

"لالہ جی بندگی"

"بندگی سرکار بندگی؟

کہیئے مزاج اچھے ہیں؟"

"جی رہے ہیں سرکار۔ آپ کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔"

"لالہ اب یہ سرکار ورکار چھوڑو، اب دیس آزاد ہو گیا ہے۔"

"اسے تو کیا ہوا سرکار۔ پہلے ودیشی سرکار تھی اب دیسی ہے۔"

"ارے بھئی سرکار تو منتری منڈل ہے ہم تو معمولی ملازم ہیں۔"

"آپ اور وہ الگ الگ تھوڑی ہیں، وہ تھوک سرکار آپ پھٹکل سرکار۔"

"تھوک اور پھٹکل میں بڑا فرق ہوتا ہے لالہ۔"

"فرق ہی ہوتا ہے سرکار کہ پھٹکل تھوک سے ذرا مہنگا پڑتا ہے۔"

"کہہ گئے فقرہ، مگر یہ تو تمھیں ماننا ہی پڑے گا کہ اصل سرکار وہی ہے جسے تم تھوک سرکار کہتے ہو۔"

"نہیں سرکار، ہم دوکان داروں گاہکوں کے لئے تو اصل چیز پھٹکل ہی ہے۔ مٹھی بھر آڑھتیوں کو چھوڑ کر دیکھئے تو تھوک سے کسی کو کیا لینا ہے۔"

"ارے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں لالہ۔ ہمیں تو اب کوئی کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا۔ ہر گنوار جو کانگریس کا ممبر بن گیا ہے ہمیں سلام کرنے کی جگہ یہ چاہتا ہے کہ الٹے ہم اسے سلام کریں۔"

"تو سلام کر لیا کرو سرکار۔ اس میں کون سا ٹوٹا ہوتا ہے؟"

"تمھیں بس ٹوٹے کی فکر ہے، ارے عزت بھی کوئی چیز ہے؟"

"کیوں نہیں سرکار۔ عزت بہت بڑی رقم ہے۔ ہمارے ہاں اس کا کھاتا الگ رہتا ہے۔"

"لو اور سنو، کل کو تم کہو گے کہ اس کا لین دین بھی ہوتا ہے۔"

"وہ تو ہوتا ہی ہے سرکار۔ پر اس کے دو ڈھنگ ہیں ایک بانکپن کا جس میں عزت لیتے ہیں اور عزت دیتے ہیں دوسرا بنیئے پن کا جس میں عزت کرتے ہیں اور عزت چاہتے ہیں۔"

"بانکپن کا ڈھنگ تو خوب معلوم ہے۔ ذرا بنیئے پن والا سمجھا دو۔"

"دیکھئے سرکار جیسے آپ روز اکڑتے ہوئے بنیئے کی دوکان کے سامنے سے نکلیں وہ آپ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جائے اور جھک کر سلام کرے تو آپ یہ کہیں سمجھو کہ اس کی گرہ سے عزت جا رہی ہے۔ چلئے ٹھیک ہے۔ اب ایک دن آپ رکتے، جھجکتے ہچکچاتے ہوئے آئے ہیں اور لڑکھڑاتی زبان سے کہتے ہیں لالہ جی بندگی، بھئی ایک پچاس روپے کی ضرورت ہے تنخواہ پر دے دوں گا، بنیا ہاتھ اٹھا کر دینا ہے اور آپ ہاتھ پھیلا کر لیتے ہیں کہیئے بنیئے کے پاس ساری عزت بیاج سمیت واپس آ گئی یا نہیں؟"

"بھئی لالہ خوب خوب کہتے ہو، مگر عجیب اتفاق ہے مجھے واقعی اس وقت ——"

"ایک پچاس روپے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں تو یہ! پچاس روپے کیسے —— صرف پچیس روپے کی۔"

پچھلا ہفتہ: ہندوستان

پھر وہی کنٹرول اور راشن

خدا خدا کرکے وہ دن آیا کہ حکومت ہند نے غلے کے کنٹرول کے بارے میں ایک قطعی فیصلہ کرلیا اور اس کا اعلان کر دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ جنگ کی طرح حکومت غلے کی قیمتیں مقرر کرے گی، افراط کے علاقوں میں کاشتکاروں سے غلہ حاصل کرے گی اور اپنے اہتمام میں قلت کے علاقوں میں پہنچائے گی اور رفتہ رفتہ حسب ضرورت سارے ملک میں راشن بندی کا طریقہ رائج کیا جائے گا۔ اس پالیسی کا نفاذ بتدریج ہوگا اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک مکمل ہو جائے گا۔ پچھلے سال جب غلے پر سے کنٹرول اٹھانے کا سوال درپیش تھا اس وقت ترقی پسند عناصر زیادہ تر کنٹرول قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ لیکن کنٹرول کے مخالف فریق کو مہاتما گاندھی کی تائید حاصل ہو گئی اس لئے اس کی قوت بہت بڑھ گئی اور حکومت کو اس کی بات ماننی پڑی۔ گاندھی جی زیادہ تر اخلاقی وجوہ سے نہ صرف غلے بلکہ ہر جنس کے کنٹرول کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے چور بازاری اور رشوت ستانی کو فروغ ہوتا ہے۔ جب لوگ ان سے کہتے تھے کہ کنٹرول اٹھ جانے کے بعد کاشتکار اور آڑھتی قیمتیں بہت بڑھا دیں گے تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ غلہ ملک میں بہت ہے اگر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا معقول انتظام ہو تو رسد اتنی کافی ہوگی کہ قیمتیں زیادہ بڑھنے نہیں پائیں گی۔ لیکن تجربے سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ غلے کا نرخ گیارہ بارہ روپے من سے تیس روپے من تک پہنچ گیا اور غریب خصوصاً شہروں میں بھوکوں مرنے لگے۔ اگر گاندھی جی زندہ ہوتے تو یہ ہو سکتا تھا کہ ان کے اثر سے رائے عامہ میں اتنا زور پیدا ہو جاتا کہ وہ لوگوں کو نفع خوری نہ کرنے دیتی اور غلے کے نرخ میں بے جا اضافہ نہ ہونے پاتا۔ لیکن اس کے بعد یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو گئی کہ کنٹرول کے بغیر غلے کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو قابو میں رکھنا ناممکن ہے۔ ہم حکومت کو اس فیصلے پر مبارک باد دیتے ہیں مگر اسی کے ساتھ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ وہ پچھلے تجربے سے فائدہ اٹھا کر چور بازاری اور رشوت ستانی کو روکنے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر رائے عامہ کو اچھی طرح ابھارا جائے تو وہ اس معاملے میں حکومت کا پورا ساتھ دے گی۔ اس سے پہلے کپڑے پر دوبارہ کنٹرول کرنے کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے۔ اگر ہماری حکومت جسے حیدرآباد کی کامیابی نے اس وقت حقیقی معنی میں ہر دل عزیز بنا دیا ہے عام گرانی کم سے کم کپڑے اور غلے کی گرانی کا مسئلہ حل کرے تو اس کی یہ ہر دل عزیزی بہت دیرپا ہو سکتی ہے۔

حیدرآباد امن کی راہ پر

حیدرآباد کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ رضاکاروں اور کمیونسٹوں کی گرفتاری، لوگوں سے ہتھیار واپس لینے، آمد و رفت اور ڈاک و تار کا سلسلہ دوبارہ قائم کرنے کا کام آگے بڑھ رہا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے چند اعلیٰ افسر اور چند ضلع کے افسر عارضی طور پر بھیجے گئے ہیں، ورنہ سارا انتظام ریاست کے پرانے عہدہ دار ہی کر رہے ہیں۔ حکومت ہند اس مسئلہ پر برابر غور کر رہی ہے کہ تھوڑے دن بعد جب مکمل امن قائم ہو جائے گا، اور وہ اپنے وعدے کے مطابق فوجی گورنر اور سول عہدہ داروں کو جو انڈین یونین سے بھیجے گئے ہیں واپس بلائے گی تو ریاست کا انتظام کس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نئے انتخاب کرانے، آئین ساز اسمبلی اور عارضی نمائندہ نمائندہ حکومت بنانے میں ابھی بہت دن لگ جائیں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام مارچ ۱۹۴۹ء تک ختم ہو سکتا ہے مگر ہمیں اس میں بہت شبہ ہے۔ بہرحال اس کے لئے جتنا زمانہ بھی درکار ہو اتنے زمانے کے لئے "کیئر ٹیکر" (کام چلانے والی) حکومت کی ضرورت ہوگی جسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اسٹیٹ کانگریس اور نیشنلسٹ مسلم پارٹیوں کے نمائندوں کے انتخاب میں تو کوئی خاص دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن چونکہ ان پارٹیوں کا اثر محدود ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی لینا پڑے گا اور ان کا انتخاب خاصا مشکل کام ہے۔ اعلیٰ حضرت نظام نے اس معاملے میں جن مشیروں سے مدد لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے یعنی سر مرزا اسمٰعیل، نواب زین یار جنگ اور دیوان بہادر ارامودا آینگر ان سے زیادہ موزوں اس کام کے لئے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ مقامی حالات سے پوری طرح واقف ہیں۔ اور ہر قسم کی جتھے بندیوں سے بالاتر ہیں۔

حیدرآباد کے انتظام کی بحالی میں اس وقت مالیات کی درستی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پچھلے آٹھ مہینے کے اندر میر لائق علی کی منسٹری نے اس اندھادھند طریقے سے ریاست کا روپیہ، ہتھیاروں کی خریداری، رضاکاروں کی امداد، اندرونی اور بیرونی پروپاگنڈا اور اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض کاموں میں صرف کیا ہے اور حسابات کی حالت اس قدر ابتر ہے کہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ ۲۰ ستمبر کو حضرت نظام کی طرف سے لندن کے ایک بینک کو جس میں حیدرآباد کا روپیہ جمع ہے ہدایت کی گئی کہ تا حکم ثانی ریاست کے حساب میں سے کوئی رقم نہ ادا کی جائے تو اس نے اطلاع دی کہ نواب معین نواز جنگ کے (جو لائق علی وزارت میں فنانس منسٹر تھے) آرڈر کے مطابق دو دن پہلے ایک کروڑ چالیس لاکھ کی رقم پاکستان کے ہائی کمشنر کے نام منتقل کی جا چکی ہے۔ جب پوری تحقیقات ہوگی تو شاید پتہ چلے گا کہ یہ ایک کروڑ چالیس لاکھ کی رقم تو اس اندھیر کھاتے کی محض ایک چھوٹی سی مد ہے۔

پاکستان کی حکومت کے لئے چیلنج

آج کل پاکستان کے اخباروں میں اور وہاں کے ارباب حل و عقد کی تقریروں میں "دشمن" کی طرف سے حملے کا خطرہ بڑی شد و مد سے ظاہر کیا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "دشمن" نے الٹی میٹم دے دیا ہو۔ ہم پاکستان کی حکومت کی توجہ کو اس خیالی الٹی میٹم کی طرف سے ہٹا کر اس حقیقی چیلنج کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان کی حکومت ان کو دے رہی ہے۔ پنجاب کے بحالی کے بورڈ نے ابھی چند روز ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بھرت پور، الور اور گوڑگانوں کے ان مسلمان میوؤں کو جو پچھلے فسادات میں خانماں برباد ہو چکے تھے اور جن میں سے پچیس تیس ہزار پاکستان جا کر وہاں سے مایوس اور نامراد واپس آئے تھے گوڑگانوں کے ضلع میں پھر سے بسایا جائے گا۔ ان لوگوں کو جن کی تعداد عورتوں بچوں سمیت کوئی ۶۲ ہزار ہے، ساٹھ ہزار ایکڑ زمین، زراعت کا ضروری سامان اور وہ سب رعایتیں دی جائیں گی جو پاکستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ کاشتکاروں کو دی جا رہی ہیں۔ یہ واقعی شاندار چیلنج ہے جس کا جواب پاکستان کو ضرور دینا چاہیئے اور یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ وہ انسانیت اور شرافت کے میدان میں ہیٹا نہیں ہے۔

کوئی تو شروع کرے

یو پی میں جو تحقیقاتی کمیٹی حکومت نے مزدوروں کی حالت پر غور کرنے کے لئے مقرر کی تھی اس کی سفارشات کو "شمالی ہند کے آجروں کی انجمن" نے جس کے ممبر کانپور کے اور یو پی کے دوسرے شہروں کے مالکان کارخانہ ہیں نامنظور کر دیا ہے۔ کمیٹی نے اجرت اور گرانی کے الاؤنس میں اضافے کی اور کارخانے کے منافع میں سے مزدوروں کو حصہ دینے کی سفارش کی تھی۔ منافع کے مسئلے کو تو آجروں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حکومت ہند اس پر غور کر رہی ہے۔ اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ لیکن اجرت اور گرانی الاؤنس کے اضافے کے بارے میں بڑا دلچسپ جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر کمیٹی کی تجویز کی ہوئی اجرتیں مان لی جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کانپور کے کپڑوں کے کارخانوں میں مزدوروں کو بمبئی کے مزدوروں سے جو ان سے اچھا کام جانتے ہیں اور کرتے ہیں، زیادہ اجرت ملے گی۔ ایسی صورت میں کانپور کے مل بمبئی کے ملوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور دوسرے شہروں کے مل تو شاید بیٹھ ہی جائیں۔ ہم ان آجر حضرات کو اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ بے کھٹکے اپنے ہاں مزدوروں کی اجرت بڑھا دیں اس سے ہرگز وہ نتائج پیدا نہیں ہوں گے جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ بمبئی کے مزدور اپنے یو پی کے بھائیوں سے صرف کام کرنے ہی میں بہتر نہیں بلکہ زیادہ چوکس اور منظم بھی ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ جیسے ہی یو پی میں مزدوروں کی اجرت بڑھے گی، بمبئی والے اپنی اجرت کے بڑھانے کا خود انتظام کر لیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ یو پی کی حکومت آجروں کے اس عذر لنگ کو نہیں مانے گی اور انھیں کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرنے پر مجبور کرے گی۔

(ع۔ ج)

"نئی روشنی" کے مضامین بہت سے معاصرین اپنے صفحات میں نقل کرتے ہیں مگر ان میں سے بعض "نئی روشنی" کا حوالہ نہیں دیتے۔ ان سے درخواست ہے کہ براہ کرم حوالہ ضرور دے دیا کریں۔

۲ - پاکستان

لیکن نہ اس قدر

جناح صاحب کے انتقال کے بعد، وزیر اعظم پاکستان کے قول کے مطابق پاکستان میں، اتحاد اور ڈسپلن کے رجحانات اور بھی نمایاں ہوگئے ہیں۔ لیاقت علی خاں صاحب نے لاہور میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ بہت سے ایسے لیڈر بھی جو اب تک حکومت کی مخالفت کرتے تھے اب مخالفت ترک کرنے پر آمادہ ہیں اور غیر مشروط تعاون کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس سے شاید وزیر اعظم کو غیر مخلوط خوشی ہوئی ہوگی لیکن "غیر مشروط" تعاون کی پیشکش ایک نئی نئی حکومت کے مستقبل کے لئے کچھ بہت مبارک نہیں ہے اس لئے کہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت جو بھی چاہے کرے اب اسے کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا۔ عام خیال ہے کہ جمہوریت کی کارکردگی میں ان لوگوں کا حصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ جو حکومت کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کرتے رہیں، اور ضرورت ہو تو بُرا بھلا بھی کہتے رہیں، اور یہ کوئی غلط خیال نہیں ہے۔ پاکستان میں ابھی تک مخالف جماعت کا وجود ہی نہیں اس لئے کہ جناح صاحب کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا اب اگر ان کی وفات کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا کہ مخالف جماعت قائم نہ ہو سکے تو یہ پاکستان کے مستقبل کے مفاد کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ مخالفت محض مخالفت کی خاطر بری ہے اور اگر اس کی بنیاد محض شخصی رقابتوں پر ہو تو بہت ہی بری ہے۔ لیکن پاکستان کے ترقی پسندوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے سامنے سیاسی اور معاشی جمہوریت کا ایک مکمل خاکہ پیش کریں اور کوشش کریں کہ اس خاکہ میں رنگ بھرنے پر وہ پاکستان کے عوام کو آمادہ کر سکیں۔ پاکستان فی الحال ایک جاگیرداری قسم کی ریاست ہے اور اس نظام زندگی کا باقی رکھنا پاکستان کے عوام کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر صنعتی ترقی ہوئی تو قیاس یہ ہے کہ وہ بھی چند سرمایہ داروں ہی کے ہاتھ ہوگی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی معاشی زندگی مٹھی بھر آدمیوں کی ملکیت بن کر رہ جائے گی۔ پاکستان میں سرمایہ کی کمی ہے اور یہ خواہش شدید کہ بیرونی سرمائے سے اس کمی کو بدل جائے۔ موجودہ دنیا میں یہ مدد ایک ہی قیمت پر ملتی ہے۔ باہر سے مدد لینا ہو تو ایک قومی معاشی پالیسی کے مقصد کو بہت گہری قبر کھود کر دفن کر دیجئے اگر پاکستان نے اس طرح کی مدد لی تو اس مصیبت سے بچنا ہوگا جس کا شکار آج "اسلامی" دنیا کا ایک ایک ملک ہے۔

اسلامی دنیا کے ذکر کے سلسلے میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ اینگلو سیکسن سیاست کا طلسم ہے۔ آج نام کو اسلامی دنیا آزاد ہے لیکن اس آزادی کی حقیقت اتنی ہے، یہ کسی بھی سمجھدار آدمی سے پوشیدہ نہیں۔ مسٹر جناح کے بعد لیاقت علی خاں صاحب پاکستان کے سب سے بڑے اسلامی ریاست ہونے کا بار بار ذکر کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں یہ کوئی بڑے فخر کی بات نہیں آج کل اسلامی دنیا جہالت، افلاس کی ظلمات اور اینگلو سیکسن سیاست کی طلسمات کا نام ہے۔ لیاقت علی صاحب کو شوق ہے اسلامی دنیا کی رہنمائی کا۔ رہنمائی کے یہ دعوے عجیب طرفہ ہیں۔ اسلامی دنیا کا حال تو پولینڈ کی فوج کا سا ہے۔ جس میں سب جنرل ہیں سپاہی کوئی بھی نہیں۔ عرب لیگ کو دعوے ہے عرب کی رہنمائی کا۔ لیکن اس کے پہلو میں ایک کانٹا ہے شرق اردن کا، اور جس دن عرب لیگ نے فیصلہ کیا کہ واقعی وہ رہنمائی کرے گی اس دن یہ کانٹا برطانیہ کی شہ پر عرب لیگ کے غبارے کو پھاڑ ڈالے گا۔ ترک اسلامی دنیا کی سیاست سے الگ تھلگ ہیں، یا کر دئے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کا امکان ذرا کم ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل کو اسلامی دنیا کا لیڈر بن جانے کا موقع مل سکے پھر بھی لیاقت علی خاں صاحب کی یہ خواہش بجائے خود قابل اعتراض نہیں۔ اندیشہ ہے تو یہ ہے کہ کہیں پاکستان اسلامی ممالک میں اینگلو سیکسن سیاست کا سب سے بڑا مہرہ نہ بن جائے۔

اس وقت تو آثار اس کے خلاف ہیں اور اس کا سب سے واضح ثبوت حیدرآباد کے معاملے میں ملتا ہے۔ خوش قسمتی سے حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں کھلم کھلا دلچسپی نہیں لی۔ لیکن پاکستان کے اخبارات اور پاکستان کے بہت سے لیڈر اس معاملے میں اینگلو سیکسن سیاست کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ بات تو معمولی سی سمجھ والوں کے ذہن میں آجانی چاہیے تھی کہ قانونی اور اخلاقی حیثیت سے قاسم رضوی اور ان کی قزاقی کی حمایت کا کوئی جواز نہیں مل سکتا۔ تاریخی حیثیت سے نظام کی آزادی کی کوئی بنیاد نہیں تھی، جغرافی، اقتصادی تہذیبی نقطہ نظر سے حیدرآباد کے لئے ہندوستان کے ساتھ شریک ہونے کے سوا چارہ نہ تھا۔ پھر بھی بعض اہل غرض نے حیدرآباد میں آزادی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا وہ اس لئے کہ اس سے اینگلو سیکسن سیاست کا ایک مقصد حل ہو سکتا تھا یعنی یہ امید کی جا سکتی تھی کہ حیدرآباد کے معاملے سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان سے سودا کیا جائے اس میں حیدرآباد کا پٹنا ناگزیر تھا۔ یو۔ این کا یہ فیصلہ کہ اس فیصلے کو ختم نہیں سمجھا جائے گا ظاہر کرتا ہے کہ برطانوی اور امریکی بلاک اب بھی یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان کو کسی نہ کسی طرح اپنا پابند بنانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اینگلو امریکن سیاست کا پابند ہو گیا تو یہ ایشیا کی بڑی ہی بد قسمتی ہوگی۔ لیکن بجائے اس کے کہ پاکستان اپنے مفاد کو پہچانتا اور ہندوستان سے اس بارے میں تعاون کرتا کہ ایشیا میں مغربی سیاست کے آخری قلعے مسمار کر دئے جائیں اس نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ اسے کسی دوسری منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔

صنعتوں کی ازسرِ نو تعمیر

پناہ گزینوں کو دوبارہ بحالی اور بسانے کے محکمے کے وزیر خواجہ شہاب الدین نے ایک بیان میں صنعتوں کی دوبارہ بحالی پر بڑا زور دیا ہے کیونکہ یہ صنعتیں ملک کی معاشی زندگی کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ حکومت کا اولین مقصد یہ ہے کہ جو صنعتیں موجود ہیں ان کو ایسے آدمیوں کے سپرد کیا جائے جنھیں کام کا تجربہ ہو اور جو کام کو جاری رکھ سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر ایسے کارخانے پناہ گزینوں کو دے جائیں گے۔ لیکن حکومت کا یہ ارادہ کبھی نہیں تھا کہ یہ کارخانے صرف پناہ گزینوں کو ہی دئے جائیں چاہے وہ انھیں چلا سکیں یا نہ چلا سکیں۔

پاکستان میں صنعتوں کی بڑی کمی ہے ایسی حالت میں موجودہ صنعتوں کے کام میں رکاوٹ پڑنے سے اور بھی زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اس سلسلے میں یہ اصول بلاشبہ صحیح ہے کہ کارخانے ایسے ہی لوگوں کو ملیں جو انھیں چلا بھی سکیں لیکن اس اصول پر عمل کی شرط اولین بہت اچھا انتظامی عملہ ہے جو ہر طرح کی ترغیبات سے بے نیاز ہو۔ لیاقت علی خاں صاحب نے لاہور میں پاکستان کے سول اور فوجی افسروں کے جلسے میں کہا کہ ملک کی عظمت کا دارومدار حکومت کے ملازمین پر ہوتا ہے انھوں نے ملازمین سے اپیل کی کہ وہ کارکردگی، محنت اور ایمانداری کا ایسا نمونہ پیش کریں جو دنیا کے لئے ایک سبق ہو۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مسئلہ اپیلوں کی حد سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ ہندو پاکستان دونوں ملکوں میں رشوت ستانی اور چوربازاری کی جڑیں اتنی گہری ہو گئی ہیں کہ انھیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے بہت نیچے تک کھودنا پڑے گا، لڑائی اور اس کے فراہم کردہ مواقع نے اخلاق کی زنجیریں بہت ڈھیلی کر دی ہیں اور انھیں دوبارہ کسنے کا کام خاصا ٹیڑھا بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ یہ کام نہ ہوا تو دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی ترقی نہیں کر سکے گا اور یہ طے ہے کہ محض تقریروں سے اور دھمکیوں سے کہ ایسا نہ ہوا تو حکومت یوں کرے گی، ووں کرے گی کچھ بھی نہیں ہوگا۔ حکومت کو بعض چوٹی کے مجرموں کو عبرتناک سزا دینی ہوگی اور تب کہیں یہ بدنصیبی ملک سے دور کی جا سکے گی۔ (ا، ص)

"اداریہ" کا بقیہ حصہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

سے اس بات کا مطالبہ کرنا بھی جائز اور ضروری ہے کہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی کو یک بارگی نہیں بلکہ بہ تدریج رائج کیا جائے۔

ان چاروں صوبوں کی حکومت سے آپ کو اس سے زیادہ نہیں کہنا چاہیے اس لئے کہ ان کے اندر جمہور کی غالب رائے جس کی حکومت پابند ہے، اس سے زیادہ سننے کو تیار نہیں ہے۔ لیکن مرکزی حکومت سے آپ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی سرکاری زبان ہندوستانی کو دیوناگری اور اردو رسم الخط کے ساتھ قرار دے جس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں کو سرکاری زبان بنایا جائے لیکن ایسی اردو اور ایسی ہندی جو عام بول چال کی زبان سے قریب ہوں۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں لوگوں کو اردو سے کوئی تعصب نہیں ہے اور ان کے نمائندے جو آئین ساز اسمبلی میں ہیں ہندی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے ماننے پر تیار ہو گئے تو اردو کو بھی مان لیں گے۔ اس لئے مرکزی حکومت جو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی خاص طور پر ذمہ دار ہے صحیح رہنمائی کرے

بقیہ صفحہ ۱۳ پر

مغربی دنیا

اِنسانیت کا نیا نمونہ

۳۱ اگست کو اندریئی ژدانوف کا انتقال ہوا۔ یہ کومیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی، پولیت بیورو کے چوٹی کے لوگوں میں سے تھا۔ دس سال سے زیادہ کومیونسٹ پارٹی کے پروپگنڈا کا ذمہ دار رہ چکا تھا، اور کومن فورم کو قائم کرنے والوں میں بھی ممتاز تھا۔ اسے یہ عروج اس لئے حاصل ہوا کہ وہ مارشل ستالن سے بہت عقیدت رکھتا تھا، اور اسے ہر طرح سے ظاہر بھی کرتا تھا اور روس میں اور روس کے باہر بہت سے لوگوں کو خیال تھا کہ ستالن کا وارث وہی ہوگا۔

ژدانوف نے دو برس ہوئے روسی ادیبوں سے کہا تھا کہ اگر ان کے دلوں میں یورپی تہذیب کی محبت باقی ہو تو اُسے بھی نکال دیں، اور ایک نئے انسان کی تعمیر میں مشغول ہو جائیں جو خالص سوویت روسی تہذیب کی پیداوار ہو۔ ادیبوں کو مجال نہ تھی کہ اس خدمت کو انجام دینے سے انکار کریں، لیکن فی الحال وہ یورپی تہذیب کی قدروں سے انکار کرنے کی منزل تک ہی پہنچے ہیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں دنیا کے علم دوستوں کی کانگریس ورو سلاف (سابق جرمن شہر برسلاؤ) میں ہوئی جس میں برطانیہ، فرانس اور متحدہ ریاستوں کے ایسے عالم اور ادیب بھی شریک ہوئے جو اپنے ملکوں میں کومیونسٹ نہیں تو ان کے "ہم سفر" سمجھے جاتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کانگریس میں اکثریت کومیونسٹ ریاستوں کے نمایندوں کی تھی۔ اور یہی ہر طرح سے حاوی رہے روسی ادیب فادیے یف نے کہا کہ یورپی تہذیب کراہت پیدا کرنے والی گندگی ہے، اور چند مشہور شاعروں اور ادیبوں کا نام لے کر یہ رائے ظاہر کی کہ "لکڑ بگھے ٹائپ کر سکتے اور گیدڑ فاؤنٹن پن سے لکھ سکتے تو وہ ایسی ہی چیزیں لکھتے جیسی کہ ان لوگوں نے لکھی ہیں"۔ دوسرے دن ایک اور زیادہ مشہور روسی ادیب ایلیا ایرن برگ نے اس تمہید کے بعد کہ امریکہ کے لوگوں میں بہت سی خوبیاں ہیں یورپی ادب اور تہذیب کے بارے میں ویسی ہی باتیں کہیں جیسی کہ فادیے یف نے، مگر ذرا ہوشیاری اور سلیقے سے، اور متحدہ ریاستوں پر "جنگ کی تیاری" کرنے کا الزام لگا

دوسری طرف سے ایسے اعتراضوں کا جواب کیا دیا جاتا۔ مگر کمیونزم کے ہمدرد بھی صاف صاف کہہ دینے پر مجبور ہوگئے کہ اگر کومیونسٹ ادیبوں نے تنقید کے اس انداز کو قائم رکھا تو دنیا میں علمی اور ذہنی اتحاد ناممکن ہو جائے گا۔ لیکن روسی اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ ان کی علمی دنیا الگ ہو جائے۔ ایک روسی سائنس دان ژبراک نے جس کو بین اقوامی شہرت حاصل ہے، امریکہ کے ایک رسالے میں مضمون لکھا اور اس میں یہ بیان کیا کہ دنیا کے اور ملکوں کی طرح روس کے سائنس داں بھی مورگن اور مندیلیف کے اس نظریئے کو مانتے ہیں کہ جانداروں کی موروثی خصوصیتیں پیدا کرنے میں زیادہ تر "جے نیس" کا دخل ہوتا ہے اور ان "جے نیس" کا اثر ماحول کے معمولی حالات زائل نہیں کر سکتے۔ کومیونسٹ پارٹی کا عقیدہ ہے کہ زندگی کی تشکیل ماحول کرتا ہے، اور اس بنا پر روس کے سرکاری اخبار "پراودا" نے ژبراک کے مضمون پر سخت اعتراض کیا۔ روسی سائنس دانوں میں بعض ایسے ہیں جو سائنس کو پارٹی کے عقیدوں کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ ژبراک کو معلوم ہوگا کہ علمی اصول کی خاطر جھگڑے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس نے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ میں پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ میرے لئے ان نظریوں پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے جنھیں ہماری پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے غلط ٹھیرایا ہے۔"

تصویر کا دوسرا رُخ

لیکن خرابیاں صرف انفرادی آزادی کو سلب کرنے سے ہی نہیں پیدا ہوتی ہیں بے قید انفرادی آزادی سے بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ حال ہی میں ہولی ووڈ کی کولمبیا کمپنی نے ایک مشہور فرانسیسی اوپیرا "کارمن" کا فلمی ایڈیشن "کارمن کی عشق بازیوں" کے نام سے تیار کیا ہے۔ اصل فرانسیسی قصے میں کارمن ایک خوب صورت اور آوارہ مزاج جپسی عورت ہے جو اپنے ناچ اور اپنی اداؤں سے مردوں کو فریفتہ اور اپنے فقروں اور بے وفائیوں سے ان کے دلوں کو زخمی کرتی رہتی ہے۔ آخر میں ایک عاشق اسے رشک میں مار ڈالتا ہے۔ کارمن کا پارٹ کرنے کے لئے ایک ایکٹرس مل گئی جس کی طبیعت اس پارٹ سے بہت مناسبت رکھتی ہے اور یہی کیا کم تھا کہ فلم میں مزاج کی آوارگی اور شوق کی بے پروائیوں کا نمونہ پیش کیا جائے۔ فلم کی تیاری کے دوران میں ایسا کچھ ہوا کہ کارمن کے نام اور اس کی وضع کا چرچا کرنے کے موقع نکل آئے۔ کارمن "کپڑا"، "کارمن" جوتے، "کارمن" ہینڈ بیگ، سگرٹ، موزے، صابن، کریم اور پاؤڈر، لپ اسٹک، ٹوپیاں، گلوبند، بالوں کے کلپ، زیور سبھی کچھ بننے لگے ہیں، اور کارمن متحدہ ریاستوں کی زندگی میں کچھ اس طرح سما جائے گی کہ اسے بھولنا بھلانا مشکل ہو جائے گا۔ انسانیت کے نمونے وہ مرد عورتیں بھی ہیں جو اس طرح فریب کھائیں۔

لیکن تہذیب اسی کا نام ہے، اور معلوم ہوتا ہے دونوں طرف انسانیت کے جو نمونے ہیں اس کی پشت پر ایسی قدریں ہیں جن کی بقا کے لئے لڑنا ایک تہذیبی اور سیاسی فرض ہے۔

پھر وہی تماشا

ماسکو میں روسی اور اتحادی نمایندوں کی بحثیں بہت طول کھینچ رہی تھیں، اندازہ کا اندیشہ تھا کہ اتحادی عاجز آکر کھڑے ہوں گے کہ اب ہمیں اس گفتگو کو جاری رکھنے سے سود معلوم ہوتا ہے۔ ۲۲ اگست کی رات کو بارہ بجے مارشل ستالن نے اتحادی نمایندوں کو اپنے پاس کریملین میں بلایا اور کہا کہ حضرات، میں نے سمجھوتے کے لئے ایک تجویز تیار کی ہے۔ تجویز کی خاص باتیں یہ تھیں کہ برلن میں روسی سکہ رواں، متحدہ ریاستوں برطانیہ اور فرانس کی نگرانی میں جاری کیا جائے اس پر اور سفر خبر کے وسائل کے بارے میں چاروں ریاستوں کے سپہ سالاروں کے درمیان گفتگو ہو، اور اگر ان کے درمیان مفاہمت ہو جائے تو برلن کا محاصرہ اُٹھا لیا جائے، اور پھر چاروں ریاستوں کے وزیر جرمنی کے بارے میں معاہدہ کرنے کے لئے گفتگو شروع کریں۔

اس تجویز کا مطلب یہ تھا کہ پچھلے چھ سات مہینے سے جو بحثیں اور جھگڑے ہو رہے ہیں، وہ پھر سے شروع کئے جائیں۔ اتحادی مدبر جانتے ہیں کہ روسیوں کا مقصد صرف وقت گذارنا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ روسیوں کو مہلت کی ضرورت کیوں ہے۔ لیکن وہ بھی اپنا وقت بے کار ضائع نہیں کر رہے ہیں، امریکہ والوں کے نزدیک اس میں کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے اگر روسیوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ بھی جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بعض خبروں سے اندازہ کیا گیا ہے کہ روس کے سب سے ممتاز رہنماؤں میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ خبریں بے بنیاد ہوں تب بھی اس میں تو شک نہیں کہ یوگوسلاویہ اور روس کا اختلاف بڑھ رہا ہے، اور روسیوں کی نظروں میں اب پولینڈ کے حاکم بھی قابل اعتبار نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں میں مارشل ستالن نے رومانیہ، بلغاریہ اور چکوسلواکیہ کے وزیر اعظموں کو مشورے کے لئے بلایا، یوگوسلاویہ اور پولینڈ سے کسی کو نہیں بلایا۔ اگر یہ خبر سرے سے غلط نہیں ہے تو غالباً اس مشورے کا مقصد ایسی کارروائیاں تجویز کرنا ہوگا جس سے پولینڈ اور یوگوسلاویہ کی حکومتیں قابو میں کی جا سکیں۔ کومیونسٹ ریاستوں میں بگاڑ کا امکان ہو تو اتحادیوں کا اس میں فائدہ ہے کہ سیاسی بحثیں اور زیادہ لمبی اور لاحاصل ہوتی جائیں، یہاں تک کہ روسی یہ دیکھ کر کہ ان کی کمزوری ظاہر ہو گئی ہے، اپنا رویہ بدل دیں، یا جمہوریت کے حامیوں کو پورا یقین ہو جائے کہ لڑائی کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ خطرہ بھی ہے کہ روسی جنگ کے لئے اور زیادہ تیار ہو جائیں گے۔ بعض اخبار اسی وجہ سے مسٹر بیون اور جنرل مارشل کی پالیسی پر اعتراض کرنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ برلن کا بلوکیڈ چیک ناکامیاب رہا۔ لیکن ہوائی جہازوں کے ذریعے سامان پہنچانے کا سلسلہ بھی آخر کب تک جاری رکھا جائے گا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے تو یہ ایک بند گلی ہے اور اس سے باہر نکلنے کے لئے کوئی راستہ تلاش نہیں کیا جا رہا ہے۔ متحدہ ریاستوں کے لوگ اور بھی زیادہ بے صبر ہیں۔ انھیں عادت ہے کہ ہر ضروری کام جلدی سے کر لیں، اُن کے پاس ایٹم بم ہیں اور وہ ایسا ہوائی بیڑا تیار کر رہے ہیں جو بڑی سے بڑی جنگ میں فوج کا کام آسان کر دے گا۔ مگر جو ملک جنگ کی تباہیوں کو بھگت چکے ہیں وہ اسے ایک ضروری کام سمجھ کر مستعدی سے شروع نہیں کر سکتے۔ برطانیہ میں پچھلے دنوں ہوائی جنگ کی مشق بڑے پیمانے پر کی گئی۔ شاید یہی ان اعتراضوں کا جواب تھا کہ روسیوں کا دماغ درست کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جا رہی ہے۔

مغربی جرمنی کا دستور

مغربی جرمنی کے نئے دستور مرتب کرنے کی غرض سے جو دستور ساز اسمبلی

(دیکھو صفحہ ...)

روداد فکر و عمل

(ایک سیاسی کارکن کی زبانی)

اختر انصاری

اپنے اوجِ فکر کی آغوش میں
عرش کے لاکھوں ستاروں کو لئے
چاندنی کے آبشاروں کو لئے
کہکشاں کے خلدزاروں کو لئے
چھانتا پھرتا ہوں میں سڑکوں کی خاک

اپنی تخئیلِ لطافت کوش میں
باغ جنت کے نظاروں کو لئے
آب کوثر کی پھواروں کو لئے
نخلِ طوبےٰ کی بہاروں کو لئے
چھانتا پھرتا ہوں میں سڑکوں کی خاک

اپنے دل کے محشر خاموش میں
گل رخوں، رنگیں عذاروں کو لئے
برق پاروں، ماہ پاروں کو لئے
طور کے زریں، شراروں کو لئے
چھانتا پھرتا ہوں میں سڑکوں کی خاک

میرے دم سے گلستاں ہونے کو ہے
یہ زمیں اب آسماں ہونے کو ہے

"ایں و آں"

باقر رضوی

مشغلہ

جذبات سے قلب کو نہ عاری رکھو
قبضے میں یہ تلوار دودھاری رکھو
گلزار بقا کی آب یاری کے لئے
ہنسنے رونے کا شغل جاری رکھو

گناہِ آدم

کچھ "خیر بد انجام" کا قصہ بھی سُنا
رنگینیِ فردوس کو برباد کیا
سُن لے افسانۂ "شر نیک انجام"
آدم کے گناہ نے بسائی دُنیا

نظامِ قدرت

کوئی کیسے کرے بھلا اس کا گلا
قدرت کا نظام ہے سراسر اُلٹا
صحرا کو تو ملتا نہیں اک قطرۂ آب
گرتے ہیں سمندروں میں جا کر دریا

مقصدِ تکوین

نشائے کن مکاں سے آگاہ نہیں
سب کچھ تیرے لئے ہے اے خاک نشیں
سیم و زر کے مہ و نجوم و خورشید
نیلم کا آسماں زمرد کی زمیں

پیدائشی اندھا اُستاد

محمد اکرام خاں

امریکا میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے اوہاما۔ اس کے جنوبی ہائی اسکول میں ایک استاد ہیں ایڈورڈ جے کینسل۔ ان کا شمار وہاں کے بہت ہی ہردل عزیز اور اچھے استادوں میں ہوتا ہے۔ اس وقت سماجی علوم کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ نہایت خلیق، خوش مذاق اور مضبوط کیرکٹر کے آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے مدرسے میں درسی کتابوں کو نصاب سے خارج کر دیا ہے تاکہ لڑکوں اور لڑکیوں میں فن عمل اور مشاہدہ کے ذریعے موجودہ جمہوریت کی روح پیدا ہو۔

مسٹر کینسل کے متعلق عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ پیدائشی اندھے ہیں۔ لیکن بغیر کسی کی مدد اور سہارے کے چلتے پھرتے اور تعلیمی کام کرتے ہیں۔ شاید یہی وہ پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اندھوں کے لئے آنکھوں والوں کی طرح آسانی سے چلنا پھرنا، پڑھنا اور کام کرنا فطری چیز ہے۔ انھوں نے فرمایا "میں یہ بتا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں کہ اندھے آدمی کو بھی سوانکھوں کی دنیا میں شریک ہونا چاہیے۔ ایسے بہت سے کام کرنے چاہئیں جن سے وہ عملی طور پر ہچکچاتا ہے۔ اسے اپنے طور پر بالکل سوانکھوں کی طرح سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اندھے آدمی کو صرف اپنے جذبۂ خود اعتمادی کا سہارا لینے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے اپنے اندر سے اس جذبہ کو ختم کر دیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنے آپ کو دنیا کی ہر چیز سے محروم رکھا۔"

ڈاکٹر کینسل کی مضبوطی اور مستعدی کا سہرا ان کے والدین کے سر ہے۔ ان کے والد ایک گوشت کے کارخانے کے مالک تھے۔ وہ روزانہ سوتے وقت ننھے کینسل سے دن بھر کے کاموں کی رپورٹ سنتے تھے۔ اگر کسی کام میں کم ہمتی یا کمزوری پائی جاتی تھی تو وہ اس کی ہمت بڑھاتے اور کہتے کہ تم کسی بات میں کسی طرح کم نہیں ہو۔ اگر تم گرتے ہو تو فوراً اٹھ جایا کرو کیونکہ بہادر بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔"

کینسل کی والدہ کہا کرتی تھیں "ہر شخص اپنی زندگی میں گرتا ہے۔ بہادر اور مستعد بچے ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اندر گر کر اٹھنے اور اٹھ کر آگے چلنے کی ہمت رکھتے ہیں۔"

کینسل بچپن میں لڑنے کھیل کھیلا کرتا۔ سارے دن درختوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا اور چوٹ کھاتا رہتا تھا۔ اس کے والدین نے اس عمر میں یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ دوسرے بچوں سے کسی چیز میں مختلف ہے۔ جب کوئی چڑیا چہکتی تو کہتے تھے کہ چڑیا دیکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی آواز سنی جائے۔ جب کینسل چھ برس کا ہوا تو اس کو ایک اقامتی مدرسے میں داخل کیا گیا جس میں صرف اندھے بچے تعلیم پاتے تھے۔

یہ چھ سال کا زمانہ (۷ سے ۱۳ سال تک کی عمر کا) غنیمت تھا۔ کینسل کو ہر ہفتہ اوماہا آتے وقت ریل کے سفر میں گاڑی کی آواز کو سننے اور گننے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد خود ہی کوئی سواری تلاش کر کے اسٹیشن سے اپنے محلے تک آنا پڑتا تھا اور گھر کی خوشبو سونگھ کر گھر جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں وہ درختوں کی چوٹی تک چڑھتا اور ایسے ایسے اونچے درختوں پر کہ دیکھنے والوں کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے شہر اور اپنے ملک کی خوب چھان بین کی۔ خوشبو اور بدبو نیز آوازوں کے فرق کو محسوس کر کے ذہن کو مرتب کیا۔ تازہ جتے ہوئے کھیتوں کی مٹی کو سونگھ کر اندازہ کر لیتا تھا کہ ابھی تک اس کھیت میں بیج نہیں بویا گیا ہے۔ اسی طرح اپنے علاقے کے دریاؤں کے کناروں کی پہچان مقرر کر لی تھی۔ اس نے قوت لامسہ کے ذریعے راستے میں ہر چیز کی پہچان کے لئے نشانات مقرر کر لئے تھے۔ اور یہی نشانات اس کی راہ نمائی کرتے تھے۔ اب بھی اگر کوئی صاحب ڈاکٹر کینسل کو ان کی ریاست کے کسی ضلع میں لے جا کر چھوڑ دیں تو وہ خود بخود راستے کی چیزوں کو چھوتے اور سونگھتے ہوئے سوانکھوں کی طرح اپنے گھر چلے جائیں گے۔

کینسل کو تیرہ سال کی عمر میں محسوس ہوا کہ اندھوں کے اسکول نے اس کو ذرا بودا بنا دیا ہے۔ اس زمانے میں صرف ہفتہ کے آخری دن گھر آتے وقت یا گھر آکر آزادی کے ساتھ کام کرنے اور اپنے اندھے پن کے خلاف جنگ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ان دنوں دوسرے اندھے بچوں کی طرح اس کو بھی ہوشیار رہنے اور دشوار گذار راہوں سے بچنے اور بچ کر نکلنے کا احساس دلایا جاتا تھا۔ اسے سمجھایا جاتا کہ تم اس دنیا میں دوسروں کی طرح آزاد رہ کر روزی نہیں کما سکتے۔ تمھاری روزی کا ذریعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پیانو کی آواز کو درست کرو۔ جھاڑو کے مٹھے باندھو یا پھر ٹوکریاں بنایا کرو۔

ان پابندیوں سے بچنے اور احساس کمتری دور کرنے کے خیال سے کینسل جنوبی ہائی اسکول میں پہنچا اور اس کے پرنسپل مسٹر آر۔ ایم۔ مارشل سے درخواست کی کہ "اب میں یہ نہیں چاہتا کہ اندھوں کے اسکول میں تعلیم پاؤں۔ میں جب تنہا سڑک پر جاتا ہوں تو وہاں کے استاد مجھ پر ناراض ہوتے ہیں۔ براہ کرم آپ اپنے اسکول میں داخلے کا موقع دیجئے۔"

پرنسپل صاحب نے کینسل کو سمجھانا چاہا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اندھا لڑکا زینے پر چڑھتے یا چلتے پھرتے وقت گر جائے اور ....

کینسل نے کہا "مجھے زینے پر چڑھنے اور نیچے اترنے کی مشق ہے۔"

وہ نیچے گیا اور اسکول کے سات منزلہ عمارت کے زینے پر بلا کسی مدد اور راہ نمائی کے چڑھتا ہوا چلا آیا۔ اس کے علاوہ اس قسم کے اور بہت سے کام کر کے دکھلائے جن سے پرنسپل صاحب کو یقین ہوا کہ یہ اندھا لڑکا سوانکھوں کے ہمراہ رہ سکتا ہے۔

کینسل نے اسکول میں الجبرا کے سوالات حل کئے۔ استاد کی مدد سے جیومیٹری کی شکلوں پر انگلی پھیرتا، اور انگلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس نقشہ کو ذہن نشین کرتا جاتا تھا۔ شام کے اوقات میں وہ لڑکوں کی اتالیقی کرتا تھا۔ یہی لڑکے کینسل کو ان کے سبق پڑھ کر سناتے تھے۔ اس طرح کینسل نے تین سال بعد امتیازی حیثیت سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابھی تک کوئی طالب علم ان کے تعلیمی ریکارڈ کو نہیں توڑ سکا ہے۔

بی اے کرنے کے بعد کینسل کو اعزازی وظیفہ ملا اور تعلیم کے لئے ان کو ریاست اوماہا کی کرائٹن یونیورسٹی میں بھیجا گیا۔ یہاں انھوں نے ٹائپ کرنے کے کام میں کمال حاصل کیا اور اتالیقی کے فرائض کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اپنی خواہش کے مطابق استاد بنائے گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کامیاب استاد ثابت ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں کینسل نے کیلیفورنیا یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد امریکا کی تاریخ میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ استاد کی حیثیت سے جنوبی ہائی اسکول میں کام شروع کیا۔ جب وہاں سماجی علوم میں مشیر کی جگہ خالی ہوئی تو ذمہ دار حضرات نے وہاں کے استادوں کو اجازت دی کہ وہ اپنے میں سے کسی کو عارضی طور پر مشیر منتخب کر لیں۔ سب نے متفقہ رائے سے ڈاکٹر کینسل کو مشیر چنا۔ ڈاکٹر کینسل نے اپنے کام کو اس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ دوسرے سال ان کو اس عہدے پر مستقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر کینسل نے درسی کتابوں کا استعمال بالکل ترک کر دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ اپنے گرد و پیش اور سماج میں رہ کر ضرورت کے مطابق علم حاصل کریں۔ اسی سلسلے میں وہ اپنے طلبہ کو شہر کے ہسپتال، ملک کے صدر مقام بھیج کر عام مسائل معلوم کراتے اور ان کا حل تلاش کراتے تھے۔ وہ طلبہ سے یہ بھی تحقیق کراتے کہ شہر یا ملک کی حالت کو بنانے یا سنوارنے کے لئے ان کے سرپرستوں سے کتنا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کتابوں کے ذریعے زندگی کے حقیقی مسائل کو سمجھ نہیں سکتے۔

جن لوگوں نے ڈاکٹر کینسل کی جماعت دیکھی ہے ان کا بیان ہے کہ کلاس کا ضبط بہت معقول تھا۔ کیا مجال کہ طلبہ باہر کے کسی دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوں اور ڈاکٹر کینسل کو محسوس نہ ہو۔ وہ جغرافیہ پڑھاتے وقت نقشہ استعمال کرتے اور شہروں اور دریاؤں پر بالکل ٹھیک ٹھیک انگلی رکھتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم غلطی کرتا تو اس کی گرفت کرتے تھے۔

انھیں اپنی جماعت کے سب طلباء (۱۴۰) کے نام یاد تھے۔ ناموں اور آوازوں کا تعلق ذہن نشین تھا۔ طلبہ کی نشستیں نام کے لحاظ سے یاد تھیں۔

دراصل ڈاکٹر کینسل اس روشن دنیا کا حقیقی جزو بننا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ہے۔ ان کے شاگرد ان سے بہت مانوس اور قریب رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو چیزیں انسان کی نظر سے دور ہوتی ہیں ان کو ذہن تلاش کرتا ہے ان کے متعلق سوچنے اور انھیں اپنے قریب لانے کی دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ نظر سے دور رہنے والے لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی فکر۔

ڈاکٹر کینسل اپنی دنیا میں بالکل سوانکھوں کی طرح رہتے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ اندھے لڑکوں سوانکھوں کے

(بقیہ صفحہ ۱۴۱)

چوڑی والا

(چارو چندر بنرجی)

ترجمہ از صالحہ عابد حسین

"چوڑیاں لو کانچ کی چوڑیاں، کانچ کے گلاس، بچوں کے کھلونے ــــــ مرتباں" شام کا وقت تھا، غروب ہونے والے سورج کی سرخ سرخ کرنیں زمین پر سونا بکھیر رہی تھیں گلی تقریباً خالی تھی۔ گھر والی بیبیاں کام کرکے سستا رہی تھیں کہ گلی میں چوڑی والا سر پر بڑا سا ٹوکرا رکھے چلایا "چوڑیاں لو کانچ کی چوڑیاں، کانچ کے گلاس، بچوں کے کھلونے ــ مرتبان"

ایک منزلے گھر کی کھڑکی آہستہ سے کھلی اور ایک نوجوان لڑکی نے آواز دی "چوڑی والے، چوڑی والے چوڑی والے ــــــ یہاں آؤ ــــــ ادھر ــــــ اس گھر میں۔

چوڑی والے نے اپنا ٹوکرا دونوں ہاتھوں سے سر سے اونچا کیا اور گردن گھما کر گلی کے دونوں طرف نظر دوڑائی "کہاں؟ تم کہاں سے پکار رہی ہو؟"

"یہاں آؤ ــــــ اس گھر میں چوڑی والے"

چوڑی والے نے دیکھا ایک حسین نوجوان لڑکی اُسے بلا رہی ہے۔ سرخ کنارے والی ساڑھی کا چھوٹا سا گھونگھٹ اُس کے چہرے کا ہالہ بنا ہوا ہے اور ساڑھی کے چوڑے لال کنارے کے اندر سے اس کی مانگ کا سرخ سیندور چمک رہا ہے۔ اس کی ناک میں ننھی سی کیل ہے اور کانوں کی سونے کی بالیاں اس کے چہرے کی چمک دمک کے سامنے ماند آ رہی ہیں......

بڈھا علی جان اس حسینہ کو دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ اس کا دل ایک عجیب قسم کی خوشی سے معمور ہو رہا تھا۔ ایسا حسن آج تک اس کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ اس نے ہزاروں خوب صورت عورتوں کے ہاتھوں چوڑیاں فروخت کی تھیں لیکن اس کے دل کو ایسی سچی مسرت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ٹوکرا دوبارہ سر پر رکھا اور اس گھر کے برآمدے میں داخل ہو گیا۔

نوجوان لڑکی اپنے کمرے سے باہر نکلی اور اس کے سامنے آکر بولی "کیا تمھارے پاس لال چوڑیاں ہیں؟" چوڑی والے نے مسکرا کر کہا "اللہ تمھیں جیتا رکھے۔ ہاں میرے پاس لال بھی ہیں۔ کس کے لئے چاہئیں؟ تمھارے لئے؟"

نوجوان لڑکی نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

بڈھے علی جان نے اپنا ٹوکرا زمین پر رکھ دیا اور اس کا اوپر کا کپڑا ہٹاتے ہوئے بولا۔

"لال چوڑیاں تمھاری گلابی کلائیوں پر بھلی نہیں لگیں گی مائی۔ چوڑی کا رنگ تمھارے رنگ سے بالکل مل جائے گا ــــــ گلابی ہاتھوں میں تو کالی چوڑیاں سجتی ہیں نکالوں کالی چوڑیاں؟"

نوجوان لڑکی کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔ اس نے سر جھکا کر کہا "نہیں مجھے لال چوڑیاں چاہئیں"

بڈھا علی جان ہنس پڑا "مائی لال چیزوں کی بڑی شوقین معلوم ہوتی ہے۔ اپنا ہاتھ تو دکھاؤ مجھے"

نوجوان لڑکی ہچکچائی۔ "نہیں تم مجھے چوڑیاں دے دو میں خود چڑھا لوں گی"

"نہیں مائی، میں اپنے ہاتھ سے تمھیں چوڑیاں پہناؤں گا........"

"نہیں نہیں، ماتا جی مجھے پہنا دیں گی"

بڈھا چوڑی والا مسکرایا "نہیں ماں جی یہ نہیں ہو سکتا میں صرف اسی شرط پر چوڑیاں دوں گا کہ ان پھول جیسے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ سے چوڑی چڑھاؤں۔ اگر تم اس کی اجازت نہ دو گی تو میں چوڑی نہ بیچوں گا........"

اس وقت چوڑی والے کے دماغ میں اس وقت سے لے کر جب اُس نے اپنا پیشہ شروع کیا تھا، آج تک کے واقعات چکر لگا رہے تھے۔ اس نے زندگی میں کتنے عالی شان محلوں میں چوڑیاں دی ہیں، کیسی کیسی حسین مہارانی عورتوں کے ہاتھ تھامے، کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے وہ بے قابو بھی ہو گیا، لیکن جو مسرت اور سکون اس کا دل اس حسینہ کو دیکھ کر محسوس کر رہا تھا ایسی کیفیت تو اس پر آج تک نہ گزری تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس وقت اس لڑکی کو اس نے اپنے ہاتھ سے چوڑیاں نہ پہنائیں تو اس نے زندگی بھر یہ جو کام کیا وہ بالکل اکارت جائے گا۔ یہی خوب صورت ہاتھ تھے جن کی تلاش میں وہ ساری زندگی ہر ہر گلی کوچہ، ہر ہر گھر میں آوازیں لگاتا پھرتا رہا ہے۔ انھی کی تلاش میں اس نے اپنی ساری جوانی بتائی اور کالا سر سفید کیا۔ اسی لئے اس نے یہ کہا "اگر تم مجھے خود چوڑیاں نہ پہنانے دو گی تو میں ان کو نہ بیچوں گا"

نوجوان لڑکی یہ سن کر بہت شرمائی مگر اس نے پھر کچھ کہا نہیں۔ آہستہ سے چوڑی والے کے برابر ٹوکرے کے سامنے بیٹھ گئی اور اپنا نرم سفید اور خوب صورت ہاتھ دھیرے سے بڑھا دیا۔ اس وقت اس کے چہرے کا رنگ سرخ گلاب سے میل کھا رہا تھا جو سرخ کنارے کی ساڑھی پر کھلا ہوا تھا۔

چوڑی والے نے اس کے کنول جیسے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اپنے دل کی کیفیت سے بے خود ہو کر ایک مرتبہ اُسے دبایا اور پھر ہاتھ کے ناپ کی چوڑی تلاش کرنے لگا۔

بڈھا محسوس کر رہا تھا کہ اگر وہ ان ہاتھوں کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے، اگر ان پر بوسوں کی بوچھار کر دے اور پھر اپنی ٹوکری چھوڑ کر خالی ہاتھ واپس جائے تبھی اس کے دل کو جو محبت کے جوش سے چھلکا پڑتا تھا تسکین ہو گی۔

چوڑی والے نے حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور ایک ایک کرکے چوڑیاں چڑھانا شروع کیں۔ درد کی تکلیف کا جو اثر لڑکی کے چہرے پر نظر آیا، وہ سوگنا ہو کر چوڑی والے کے دل کو برمانے لگا۔ اس نے کہا "ماں جی ــــــ کیا تمھیں بہت تکلیف ہو رہی ہے ــــــ ذرا دیر اور سہہ لو۔ دیکھنا یہ چوڑیاں تمھاری کلائیوں پر کیسی ٹھیک بیٹھی ہیں یہ اتنی پیاری لگیں گی ــــــ"

حسینہ کی آنکھوں میں تکلیف سے آنسو بھر آئے تھے مگر یہ سن کر اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور وہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کے دونوں گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے

چوڑی پہنانے کے بعد چوڑی والے نے ٹوکرے میں سے کانچ کے کھلونے اور گلاس و گلدان نکالے۔ یہ دیکھ کر نوجوان لڑکی نے کہا "مجھے یہ نہیں چاہئیں"

بڈھا مسکرایا "تمھیں نہیں چاہئیں تو اپنے بچے کو کھیلنے کے لئے دے دینا"

حسینہ شرم سے سرخ ہو گئی اور اس نے اپنا سر نیچا کر لیا۔ اس کی ساس جو کچھ دور کھڑی تھی مسکرا کر بولی "اس کے ابھی کوئی بچہ نہیں۔ ان کھلونوں کی ضرورت نہیں ہے بڑے میاں"

چوڑی والا ٹوکرے کو کپڑے سے ڈھک کر رسی سے باندھتے ہوئے بولا "نہ ہو ــــــ پر میری ماں جی خود ان سے کھیلے گی"

ساس نے پوچھا "ان کے دام کیا ہیں؟"

چوڑی والے نے اپنا ٹوکرا سر پر اٹھایا "یہ تو میں نے اپنی ماں جی کی خدمت میں یوں ہی بھینٹ چڑھائے ہیں"

ساس نے کہا "نہیں نہیں ــــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... یہ ٹھیک نہیں ــــــ دیکھو چوڑی والے ــــــ چوڑی والے ــــــ ارے سنو تو ــــــ ٹھیرو ــــــ ٹھیرو ــــــ دام تو لیتے جاؤ ــــــ"

لیکن اتنی دیر میں چوڑی والا گلی کے سرے پر پہنچ چکا تھا اور مسرت سے بھرپور آواز میں چلا رہا تھا "چوڑیاں لو کانچ کی چوڑیاں، کانچ کے گلاس، بچوں کے کھلونے ــ"

اس دن سے روز شام کے وقت چوڑی والا اس گلی میں آتا اور آواز لگاتا۔ لیکن چوڑی روزمرہ کی ضرورت کی چیز تو ہے نہیں، اس لئے کوئی اسے اندر نہ بلاتا۔ ہاں نوجوان حسینہ جب اس کی آواز سنتی تو ایک لمحہ کے لئے ضرور کھڑکی میں آکر کھڑی ہو جاتی۔ بڈھا چوڑی والا دونوں ہاتھوں سے اپنا ٹوکرا اونچا کر کے اپنا سر اٹھاتا اور مسکراتے ہوئے ان دونوں کی نظریں ملتیں۔ وہ شرمیلی مسکراہٹ سیدھی اس کے دل میں اتر جاتی۔ ایک دن کی اتفاقی ملاقات میں محبت کا جو بندھن بندھ گیا وہ اور مضبوط ہو جاتا۔

حسینہ کی ساس ہنس کر کہتی "بہو کیا تیرا بیٹا آ گیا؟ بڑا سفید ڈاڑھی والا بیٹا بڑا اچھا آدمی ہے" نوجوان لڑکی کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور وہ کھڑکی سے ہٹ آتی۔

چوڑی والے نے سوچا کہ وہ چوڑی بیچنا چھوڑ کر ترکاریاں یا مٹی کا تیل بیچنا شروع کر دے تاکہ روز اس گھر میں بلایا جائے۔ لیکن اُسے خیال آیا کہ اگر اس نے چوڑیاں بیچنا بند کر دیا تو اس کے حسین ہاتھوں میں چوڑیاں پہنانے کی خوش قسمتی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے کنول جیسے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر جو خوشی، جو قلبی مسرت اُسے ملتی ہے وہ کیسے نصیب ہو گی۔ مستقبل کی اس خوش نصیبی کے تصور میں چوڑی والا روز سر پہ بھاری ٹوکرا اٹھائے دوپہر کی جلتی دھوپ میں آوازیں لگاتا پھرا کرتا "کانچ کی چوڑیاں...... کھلونے ــــــ گلاس ــــــ"

چند دن بعد اچانک ایسا ہوا کہ نوجوان حسینہ کا کھڑکی سے نظر آنا بند ہو گیا۔ روز بڈھا چوڑی والا آوازیں لگاتا وہاں سے گذرتا اور مایوس واپس جاتا۔ شرم سے گلابی، مسکراتا ہوا حسین چہرہ کھڑکی میں کسی دن بھی نظر نہ آیا۔

بڈھا ایک گہری سانس لیتا اور چکر لگا کر واپس ہو جاتا لیکن اس کا دل اس کے پاؤں کا ساتھ نہ دیتا تھا، وہ قدم آگے بڑھاتا اور وہ پیچھے ہٹتے محسوس ہوتے۔

کتنے دن گذر گئے لیکن چوڑی والے کے بار بار آوازیں لگانے کے باوجود وہ چہرہ کھڑکی میں نظر نہ آنا تھا نہ آیا۔ آخر ایک دن ہمت باندھ کر چوڑی والا گھر کے دروازہ کے سامنے کھڑا ہو کر چلایا۔

"ماں جی تمھیں چوڑیاں چاہئیں؟"

ایک عورت کی کرخت آواز اندر سے آئی "نہیں۔"

چوڑی والے نے ٹھنڈی سانس بھری، ذرا دیر پچکچایا اور برآمدے کے اندر داخل ہو کر ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ میری ماں جی کہاں ہیں؟"

وہی آواز پھر آئی "وہ یہاں نہیں ہے۔"

چوڑی والا سینکڑوں سوال کرنا چاہتا تھا مگر اس کی ہمت نہ پڑی، وہ افسردہ و غمگین، دھیمی چال سے واپس ہوا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اور گلی میں اس کی آواز کی گونج بھی سنائی نہ دیتی تھی۔

"وہ گھر نہیں ہے ——— وہ کب واپس آئے گی؟"

روزانہ ایک موہوم اُمید پر چوڑی والا اس گلی میں جاتا اور زور سے آواز لگاتا "کانچ کی چوڑیاں، کانچ کے گلاس، بچوں کے کھلونے۔" ایک مرتبہ ...... دو مرتبہ ...... تین ...... اور تب وہ بند کھڑکی کی طرف دیکھتا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر واپس چلا جاتا ——— اگلے دن پھر آتا۔

کئی مہینے گذر گئے اور آخر درگا پوجا کا تہوار آپہنچا۔ ہر گھر میں اس وقت چوڑیوں کی مانگ تھی، بیاہی عورتیں، کنواری لڑکیاں، ننھی بچیاں۔ ہر کوئی چوڑیوں کی تلاش اور انتخاب میں لگی تھیں۔ چوڑی والا ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوڑی چڑھاتا مگر اس کے دل کو کوئی خوشی نہ محسوس ہوتی۔ کوئی ہاتھ ایسا خوب صورت، کوئی کلائی ایسی نرم، کوئی ہنسی، کوئی بات ایسی شیریں نہ تھی جیسی اس کی "ماں جی" کی۔

انتظار سے تھک کر بڈھے نے پھر ایک دن اُس گلی میں جا کر آواز لگائی۔ چوڑیاں لو ——— کانچ کی چوڑیاں ——— کانچ کے گلاس ——— لیکن کسی نے اس کھڑکی میں سے نہیں پکارا "یہاں چوڑی والے ——— اس گھر میں آؤ۔"

کھڑکی بدستور بند تھی۔ چوڑی والا گھر کے برآمدے میں چلا گیا، اور زور سے چلایا "ماں جی چوڑیاں چاہئیں؟"

ایک ملازمہ لڑکی نے جھلا کر کہا "نہیں نہیں ——— سو مرتبہ کہہ چکے کہ ہمیں چوڑیاں نہیں چاہئیں، پھر تم کیوں بار بار آکر ہمیں پریشان کرتے ہو۔ ضرورت ہوگی تو خود بلا لیں گے۔"

شرم اور خوف سے لرزتا ہوا چوڑی والا آہستہ آہستہ واپس جا رہا تھا کہ اس کی نظر لڑکی کی ساس پر پڑی جو ایک کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر وہ بے اختیار ہو گیا اور گویا یہ لفظ خود بخود اس کے منہ سے نکل پڑے۔ "ماں ——— کیا میری ماں جی واپس آگئی؟"

ساس نے غمگین نظروں سے اُسے دیکھا، "ہاں وہ واپس آگئی۔"

چوڑی والا مسکرا پڑا ——— آواز خوشی سے کانپنے لگی "ماں کیا میں ایک مرتبہ اُسے نہیں دیکھ سکتا؟ کتنے دن سے میں نے اپنی ماں جی کو نہیں دیکھا ——— میں اتنی مرتبہ آیا اور ہر بار مایوس واپس گیا ——— کیا ایک دفعہ بھی اُسے نہیں دیکھوں گا؟"

ساس کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا اور آہستہ سے کہا "نہیں بڑے میاں، اب تم اُسے نہیں دیکھ سکتے۔"

سرود بڈھے کا خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ ایک دم اس طرح ماند پڑ گیا جیسے جلتا ہوا چراغ بجھ جائے۔ اُس نے پُرآب آنکھوں سے ایک مرتبہ ساس کو دیکھا اور پھر اپنے ڈوبتے ہوئے اور نہ اُٹھتے ہوئے پاؤں کو کھینچتا ہوا چلنے کو واپس مڑا ——— پوجا کے تہوار کے لئے اس نے سارا بازار چھان کر چوڑیوں کا ایک سب سے خوب صورت جوڑا اس کے لئے تلاش کیا تھا جنھیں وہ اپنے ہاتھ سے اُسے پہنائے گا ——— اگر وہ اس کی اپنی بیٹی ہوتی کیا تب بھی ساس اس طرح اس کا دل توڑ کر ملانے سے انکار کر سکتی تھی؟ ایک سرد آہ بڈھے کے منہ سے نکلی اور اس نے انگوچھے سے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھے۔ ذرا دیر وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور کانپتے قدموں سے برآمدے سے اُترنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان لڑکی کی ساس اب تک برآمدے میں کھڑی ہے۔ اس نے اٹکتے ہوئے کہا "ماں ——— میں اب کبھی چوڑیاں بیچنے نہیں آؤں گا بس صرف ایک مرتبہ میری ماں جی کو دکھا دو"

اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

ساس نے یہ دیکھا اور جو بھی رکاوٹ بہو کو اس کے سامنے لانے میں حائل تھی وہ ان آنسوؤں نے دور کر دی۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے بڈھے کی طرف دیکھا اور بھرائی آواز میں پکارا "چھوکری ——— لڑکی کو یہاں بلا لا۔"

دھیرے دھیرے لڑکی باہر آئی اور چوڑی والے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بڈھے کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اس نے ایک ڈبا اپنی جیب سے نکالا اور اس میں سے رنگ برنگی چوڑیوں کا ایک خوب صورت جوڑا نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا "ماں جی، دیکھو میں تمھارے لئے جوبلی چوڑیوں کا جوڑا لایا ہوں۔" یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے چوڑی والے نے اپنا سر اٹھایا ——— لڑکی کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا ——— نہ سرخ کنارے کی ساڑھی بدن پر، نہ مانگ میں سیندور ——— نہ پاؤں میں منہدی ——— نہ ہاتھ میں چوڑی نہ دامن پر لاکھا ——— اور نہ لبوں پر دنیا کو مسحور کرنے والی دلکش مسکراہٹ ......

سفید میلی دھوتی لپیٹے، ایک طرف کو جھکی ہوئی، رنج و غم سے بے ہوش ہونے کے قریب ——— اُس کی حسینہ سامنے کھڑی تھی ——— رنج اور مایوسی کے اس مجسمے کو سامنے دیکھ کر چوڑی والے نے چوڑیوں کا جوڑا اپنے ہاتھ سے زمین پر پھینک دیا ——— اور چوڑیوں کے ٹکڑوں کی طرح ٹوٹے ہوئے دل سے اس کی نکلتی ہوئی آواز بلند ہوئی ——— "ہائے میری ماں جی ——— یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ——— اللہ یہ [illegible] میں کیوں نہ گیا...؟"

نوجوان لڑکی نے اپنا سر اور زیادہ جھکا لیا اور دھیرے دھیرے اندر چلی گئی۔ چپ چاپ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے ساس بھی گھر میں گھس گئی ......

کانپتے ہاتھوں سے ٹوکرا سر پر اُٹھا کر دل شکستہ غم نصیب بڈھا چوڑی والا گھر سے باہر نکل گیا۔

مغربی دنیا (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

منتخب ہوئی تھی، اس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور غالباً وہ ایسا دستور تیار کرے گی جو موجودہ حالات میں قابل عمل ہوگا۔ اور متحدہ جرمنی کا دستور بھی بنایا جا سکے گا۔ بہرحال دو تین کمیونسٹوں کو چھوڑ کر اسمبلی کے تمام ممبر اس پر متفق تھے کہ دستور میں اس زمانے کی مجبوریوں اور مستقبل کے امکانوں کا پورا لحاظ رکھا جائے، تاکہ ایک طرف اتحادی یہ نہ کہہ سکیں کہ مغربی جرمنی کی حکومت کے لئے بہت زیادہ اختیارات کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور دوسری طرف کمیونسٹ یہ اعتراض نہ کر سکیں کہ دستور کے ذریعے جرمنی کی تقسیم کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔

روس کا نیا حربہ

بعض خبروں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ برلن میں روسی خود کچھ پیچھے ہٹ جائیں گے، اور اپنے مطلب کے کام برلن کے جرمن کمیونسٹوں سے کرائیں گے۔ لیکن کمیونسٹ جو اعتراض برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی جرمن پالیسی پر کرتے تھے ان میں کوئی وزن نہیں رہا ہے اور مغربی جرمنی کی حالت مشرقی جرمنی کے مقابلے میں اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ ظلم اور زیادتی کی جو داستانیں کمیونسٹ اخبار بیان کرتے ہیں انھیں کوئی یقین نہیں کرتا۔ مغربی برلن کے جرمن اپنے طور پر جرمن کمیونسٹوں اور ان کے روسی سرپرستوں کی مخالفت کرنے لگے ہیں انھیں اس کا تو ڈر نہیں ہے کہ کمیونسٹ ان پر حاوی ہو جائیں گے مگر اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ ایسا نہ ہو اتحادیوں کی سیاست پلٹا کھائے اور وہ روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جائیں۔ (م، م)

اندھا استاد (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اسکولوں میں تعلیم و تربیت کا موقع دیا جائے۔ دوسرے بچوں کی طرح ان کی ہمت افزائی کی جائے اور ان کے حواس کی باقاعدہ تربیت ہو۔ ان کو روزمرہ کی عملی دنیا میں رکھا جائے۔ ان میں ہر چیز کو جاننے کی خواہش ہوتی ہے اس لئے ان کی خواہش کے مطابق ہر چیز کے بارے میں اچھی طرح سمجھایا جائے۔ ان کو کسی طرح بھی کسی قسم کی کمی یا غم محسوس کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے کیونکہ یہی غم اور احساس کمتری [illegible] کی پستی اور تنزلی کا سبب بن جاتا ہے۔ (باقی [illegible])

ترکی
پچھلے پچیس سال میں

(۳)

عبد الحلیم ندوی

عصمت انونو کی دعاؤں سے اگست ۱۹۴۶ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی تنظیم ہوئی، اور اب اس نے اتنی طاقت حاصل کرلی ہے کہ بغیر تشدد کے کوئی طاقت اس کو دبا نہیں سکتی۔ نئی پارٹی جس کے سرگروہ سابق وزیر اعظم ہیں جن کو فوجی معاملات کے مقابلے میں بینکنگ کے معاملات کا زیادہ تجربہ ہے حکومت کی خارجی پالیسی سے تو اتفاق کرتی ہے لیکن اس کی دوسری کارروائیوں کی پوری مخالفت کرتی ہے۔ مثلاً حکومت نے اندرون ملک معاشی معاملات میں جو عمل دخل کر رکھا ہے اس کو یہ پارٹی کم سے کم کردینا چاہتی ہے۔ اسی طرح اس کا خیال ہے کہ نظام حکومت میں مرکزیت نہیں بلکہ لامرکزیت ہونی چاہئے۔ یہ نئی پارٹی ترکوں کی نئی نسل کو زیادہ پسند ہے اور اپنی طرف زیادہ کھینچ رہی ہے کیونکہ یہ لوگ عصمت انونو اور ان کے مشیروں کو قدامت پسند سمجھتے ہیں، جو زیادہ سے زیادہ اقتدار اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ فوجی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اسمبلی میں ڈیموکریٹک پارٹی پر بھی بے لاگ اور بے جھجک تنقید کی جاتی ہے یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس کے ممبروں کو تادیبی کارروائیوں کا مطلق خوف نہیں ہے۔

عصمت انونو نے "حزب خلق" کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور اب ان کی یہ کوشش ہے کہ عہدۂ صدارت کو "پارٹی پالیٹکس" سے بلند رکھیں۔ چونکہ وہ اور ان کے رفقار کار تقریباً ۲۵ سال سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ وہ آسانی سے حکومت اور اقتدار چھوڑنے پر راضی ہوجائیں گے۔ لیکن ان کے حب وطن اور جمہوری نظام حکومت سے عقیدت اور آئندہ اس کی کامیابی کے یقین کی وجہ سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر انتخاب میں ان کے خلاف رائے عامہ کا اظہار ہوا تو وہ حکومت سے دست بردار ہوجائیں گے۔ عصمت انونو اور ان کے ساتھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی بقا کا دارومدار مغرب کی تمام بڑی بڑی جمہوری حکومتوں کی امداد پر ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے کی تمام کوششیں اسی وقت بارآور ہوسکتی ہیں جبکہ برطانوی اور امریکی عوام کی رائیں ان کے حق میں ہوں اور ان کی تائید و مدد ان کو حاصل ہوتی رہے۔

ملک کے پڑھے لکھے لوگوں میں سے جو لوگ حکومت کے ملازم ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کو آدمیوں کی ضرورت تھی اور اس نے یونیورسٹی کے ہر فاضل اور صنعتی اسکول کے ہر طالب علم کو اس کی خواہش پر اپنے یہاں جگہ دے دی یہ بات ترکی کے حق میں زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اگر مختلف پیشوں اور مختلف کاموں کے لئے وسیع میدان اور تجارتی کاروبار میں وسعت میسر نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں ایک طبقہ "تعلیم یافتہ پرولتاریہ" کا پیدا ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ اگر اسی طرح تمام پڑھے لکھے لوگ حکومت میں ختم ہوتے گئے تو آخر میں ایک ایسا اونچا طبقہ پیدا ہوجائے گا جس پر ملک کی ساری دولت خرچ ہوجائے گی اور نچلا حصہ اس سے محروم رہے گا اور تہی مائیگی، تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرے گا۔

حکومت میں اکثر اسامیوں فوجی افسر ہی کرتے ہیں، ان فوجی افسروں نے حکومت کے نظام قائم کرنے میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور مغربیت کے پورے پروگرام کو بروئے کار لانے میں حکومت کی بڑی مدد کی ہے۔ اس لئے ترکی میں اور اس کے نظام میں ان کی اہمیت بہت ہے۔ اور فوج پر حکومت بہت خرچ کرتی ہے چونکہ ان فوجی افسروں اور ان کے دستوں نے عثمانی سلطنت کے زمانے میں حکومت کی صنعتی اور مشینی کمزوریوں کی وجہ سے کئی معرکوں میں اپنے خون کی قربانی دی ہے۔ اس لئے اب جبکہ ترکی آزاد خود مختار اور ترقی یافتہ ملک ہے فوج پر جتنا بھی خرچ کرے مناسب ہے۔ لیکن ان فوجی افسروں میں اپنی تفوق اور برتری کا جو جذبہ پیدا ہوگیا ہے وہ یقیناً نامناسب ہے اور اس سے بہت سے خطرات کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اب تک دونوں صدر جمہوریہ مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو خود سابق فوجی افسر تھے چنانچہ وہ ہر وقت اس کا خیال رکھتے تھے کہ ان ساتھیوں کو کہیں کسی معاملے میں بدگمانی یا بے اطمینانی نہ ہونے پائے۔ لیکن اب اگر کوئی ایسا صدر ہوجائے جس کو پہلے سے فوجی تجربہ نہ رہا ہو تو اس کے لئے بہت دشوار ہوجائے گا کہ وہ ایک طرف تو ان فوجی افسروں پر ملکی حکام کا اقتدار برقرار رکھے اور دوسری طرف خود ان کے اندر تفوق اور برتری کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کو بھی ٹھیس نہ لگنے دے۔

جدید ترکی نے جو ترقیاں کی ہیں اور موجودہ حکومت نے جو اصلاحات کی ہیں وہ بلاشبہ بہت امید افزا اور بہت مؤثر ہیں لیکن اسی کے ساتھ حکومت سے بعض غلطیاں ایسی بھی ہوگئی ہیں جو ان ترقیوں کے مقابلے میں رجعت پسندانہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس قسم کا ایک واقعہ پچھلے چند برسوں میں یہ ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بہت سی نار وا سلوک کیا گیا۔ حکومت کو اس زمانے میں بہت زیادہ مالی پریشانیوں سے سابقہ پڑا جس سے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہ رہا اور اس نے ملک کی اقلیتوں پر بھاری ٹیکس لگادیا تھا جس سے ان کو بڑا خطرہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ بعد میں حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس نے وہ قانون واپس لے لیا لیکن اس سے جو نقصان پہنچ چکا تھا اس کی تلافی نہ ہوسکی کیونکہ مشرق قریب میں مختلف مذہب لوگوں کے اندر باہمی اعتماد بہت دھیرے دھیرے اور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ ترک غیر ملکیوں اور غیر ملکی سرمائے کو بہت شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے شکوک و شبہات اور تنگ نظری ایک نسل پہلے تو کچھ موزوں بھی تھی لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ ترکی کے لئے مغرب کی جمہوری حکومتوں کا اشتراک عمل ضروری ہے ایسی ذہنیت رکھنا نامناسب اور نقصان دہ ہے۔ ترکی کو اس وقت غیر ملکی سرمائے، وہاں کی ہنرمندی اور طریقۂ تجارت کی سخت ضرورت ہے لیکن ان سے ترکی فائدہ اسی وقت اٹھا سکتا ہے جبکہ وہ بھاری ٹیکس جو ان پر عاید ہیں اور تحفظی قوانین جو ان کے خلاف نافذ ہیں ختم کردیئے جائیں۔ ترکی حکومت اور عوام دونوں کا خیال ہے کہ مٹھی بھر غیر ملکی آکر یہاں تجارت کرتے ہیں اور بہت سا سرمایہ پیدا کرکے ترکی سے باہر ڈھوے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے روکنے کے لئے غیر ملکیوں کے خلاف حفاظتی قوانین اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک مخصوص عملہ کا تقرر کیا گیا ہے۔ جب کوئی غیر ملکی ترکی کے کسی حصہ سے دوسرے حصہ ملک میں جانا چاہتا ہے تو اس کو ایک داخلی پاسپورٹ لینا پڑتا ہے اور اس کو پولیس تک میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت دکھانی ہے۔ اس کے علاوہ جس جگہ وہ ٹھہرتا ہے وہاں بھی اس کی جانچ کی جاتی ہے، کچھ فوجی قوانین ایسے ہیں جن کی رو سے غیر ملکیوں کو ملک کے بیشتر حصوں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترکی میں شہریوں پر پولیس کا اقتدار خاصا تکلیف دہ ہے۔ لیکن ترک اس کے عادی ہیں۔

آمدنی، تجارتی سامان اور منافع پر اتنے بڑے محاصل ہیں کہ ایماندار کاروباری لوگ بہت مشکل سے نپ پاتے ہیں۔ حکومت کے کارندے ہر جگہ سے اس کی پوری نگرانی کرتے ہیں کہ ٹیکسوں سے کوئی بچ تو نہیں گیا یا کوئی ناجائز کاروبار تو نہیں کررہا ہے، ترکی کو حقیقی خطرہ کمیونزم یا فیشزم سے نہیں بلکہ دفتری حکومت کے ارکان کی تعداد اور اختیارات میں روز افزوں اضافے سے ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ تو نہیں مگر اکثر دیانت دار اور ہمدرد رہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ میں عوام پر حکومت کرنے اور ان کی زندگی میں مداخلت کرنے کے وہ سب آلات موجود ہیں جو مشرق اور مغرب نے ایجاد کئے ہیں۔

ترکی میں ہر ایک کو ذہنی آزادی حاصل ہے البتہ کمیونسٹوں کو اس حق سے محروم کرکے جیل خانوں میں بھر دیا گیا ہے، لیکن شہریوں کے انفرادی خیالات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتی ہاں ان کی منظم کارروائیوں پر پوری توجہ دیتی ہے۔ کلب اور سوسائٹیوں پر اجتماعی طور سے بڑی کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ لیکن انفرادی طور پر جس کا جو جی چاہے سوچے جس قسم کے خیالات چاہے رکھے اس کو اصولاً آزادی حاصل ہے۔ لیکن عملاً حکومت بڑی گہری نظر اور بہت دباؤ رکھتی ہے اور ایسے اخبارات جو حکومت کی مخالفت یا اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں، قانونی گرفت میں لے لئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے نامہ نگاروں پر بھی نظر رکھی جاتی ہے جو حکومت کے خلاف لکھنے کے عادی ہوتے ہیں، اس زمانے میں بہت سی اصلاحات کی گئی ہیں۔ لیکن اب بھی اس میں بہت کچھ کرنے کی گنجائش ہے۔

انفرادی طور پر تو ہر ایک کو مذہب کی پوری آزادی ہے۔ لیکن حکومت نے کسی نامعلوم خطرے کی وجہ سے

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

اِدارۂ تحریر
تاریخ اشاعت بدھ یکم ۸، ۱۶ ، ۲۴
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبدالحلیم ندوی
چندہ : سالانہ ۶ ششماہی ۳

مذہب اسلام پر سخت بندشیں عائد کر رکھی ہیں ۔ اب وقت آگیا ہے کہ تمام شہریوں کو مذہب کی پوری آزادی دی جائے کہ وہ جس طرح چاہیں منظم ہو کر اجتماعی طور سے عبادت کر سکیں اور اپنے ان بچوں کو مذہبی تعلیم دے سکیں جو غیر مذہبی فضا اور غیر مذہبی تصورات کے درمیان پرورش پا رہے ہیں ۔

یہ حقیقت ہے کہ ترکی پچھلے چند برسوں سے عہد وسطیٰ کے عثمانی سلطنت کے نقش قدم اور اس کے راستے کو چھوڑ کر مغرب کی جمہوری شاہراہ پر بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ مغرب نے اس کے سامنے ایک اچھی سوسائٹی اور سماج کا نمونہ پیش کیا ہے ۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ترکی ہر طرح دل و جان سے مغربی بن جانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں امریکنوں کی تائید اور مخالفت کو خصوصیت کے ساتھ بہت سنجیدگی سے دیکھتا ہے امریکہ کے ساتھ ترکوں کی یہ خوش اعتقادی اور خوش فہمی اس وقت برقرار رہ سکتی ہے جبکہ ہم ہینری ویلیس کی سی بے معنی اور بے تکی تنقیدوں سے کہ "ہم کو پورے زمانۂ جنگ میں اپنی فوجوں کو مجتمع رکھنا پڑا کیونکہ ہمیں آخر تک یہ معلوم ہو سکا کہ ترکی کی فوجیں کس طرف سے لڑیں گی" باز رہیں کہ دوستی، اعتماد اور اخوت کے راستے سے سب موانع ہٹ جائیں ۔ ہم موقع پر ہیں امریکن اخبار نویسوں اور عوامی مقرروں سے جنھوں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ امریکا کی خارجی سیاست کے دھارے کو بدل دیں گے ۔ کہوں گا رواداری بھی جمہوریت کی ایک بہت بڑی صفت ہے ، اور اگر ترکی پوری طرح جمہوری ملک نہیں ہے تو امریکہ [illegible] کے راستے پر گامزن ہے ۔

ترکوں کا یقین ہے کہ ان کو یہ بے پایاں طاقت محض قسمت سے نہیں مل گئی ہے بلکہ یہ ان کی سماج اور ان کی حکومت کی کوششوں کا ثمرہ ہے ، ہم ترکوں کو جو مدد دے رہے ہیں وہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں ، اور ہم کو اس بات کا حق دیتے ہیں کہ ہم اس بات پر اصرار کر سکیں کہ اس مدد کو ایک پارٹی کی حکومت کو مستحکم کرنے میں اور ملکی افسروں کے اقتدار کو تقویت دینے میں ، ترکی کو دوسرے ملکوں سے تجارتی اور دوسرے معاملات میں بے نیاز اور الگ تھلگ رکھنے میں نہ صرف کیا جائے گا ——— ترکوں کو یقین ہے کہ امریکا اپنی طاقت اور اپنے وسائل سے ترکوں اور امریکنوں دونوں کو یکساں فائدہ پہنچائے گا کہ دونوں قوموں کے مفاد آیندہ آزاد دنیا میں یکساں اور مساوی ہیں موجودہ ترکی ایک آزاد قوم ہے اور اس کا مصمم ارادہ ہے کہ آزاد رہے ، وہ باوجود رکاوٹوں اور مشکلات کے جمہوریت کے لئے کوشش کر رہا ہے اور برابر ترقی کر رہا ہے ، ہمیں اس کی دوستی سے خوش ہونا چاہیے ۔ (ترجمہ)

سیرت کی تعمیر

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے یعنی ، یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے ، ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں ، اور کتنی مدت تک چلتی ہیں ۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے ۔ پتھر کو کوئی آدمی کیسے بنا دے ' اور گوبر کا تودہ انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکنے لگے ؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے ، لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے ۔ ان پر ہر رنگ چڑھ جاتا ہے یہ ہر تیز ہوا کے پیچھے چلتے ہیں مگر بس تھوڑی ہی دور ، یہ ہر تحریک کے علمبردار بن جاتے ہیں ۔ مگر بس چند دن کو ، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں ، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں ، آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں ، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں ، ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں ! بڑے دلچسپ لوگ ہیں یہ نیک دل ، ہلکے پھلکے لوگ ، مگر سیرت کی یکسوئی انھیں نصیب نہیں ہوتی سیرت پختہ بنتی ہے ان کی جن کے ذہن اگر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے ۔ ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے ۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر لیتے ، اس کو سب نئے تجربات و واردات کا محور بناتے ہیں ، بجز زندگی کی ہر ہوا کو اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں ۔ یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے اور یہ دائمی فکر و ضمیر اگر اقدار متعلقہ سے ہو جائے تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا جاگنا ، مرنا جینا سب کچھ اسی کے لئے ہے ۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت میں ڈھل جاتی ہیں ۔

اُردو زبان کے حامیوں سے

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

[illegible] پر راضی ہو جائے ۔

کانگریس کو البتہ آپ ، کم سے کم آپ میں سے وہ لوگ جو خود کانگریسی یا نیم کانگریسی ہیں یہ سمجھا کر خود اس کی تاریخ ، اس کے مزاج ، اس کی روح اور مہاتما گاندھی کی تعلیم کا یہ تقاضا ہے کہ اس کا ہر ممبر اردو ہندی سیکھے ، ان دونوں کے میل سے ایک مشترک زبان بنائے اور اسے قومی زبان کی حیثیت سے سارے ملک میں پھیلانے کی دل و جان سے کوشش کرے ۔ اگر آپ زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ عملی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں تو وردھا کی ہندوستانی پرچار سبھا سے تعلق پیدا کیجئے جس نے وسط ہند اور جنوبی ہند میں مشترک زبان کو دونوں رسم خط میں پھیلانے کے لئے قابل قدر کام کیا ہے ۔ اس کی شاخیں شمالی ہند میں کھلوائیے اور ان کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیے ۔ آپ نے اردو کی حفاظت اور اشاعت کے لئے کوئی الگ انجمن بنائی تو موجودہ ماحول میں اس کے ذریعے سے آپ کو وہ کامیابی نہیں ہو سکتی جو ہندوستانی پرچار سبھا کے ذریعے سے ہو سکتی ہے ۔ بہ شرطیکہ آپ کا دل فرقہ پرستی کے زہر سے پاک ہو اور آپ اس اسپرٹ میں کام کر سکیں جس میں مہاتما گاندھی کے پیرو کرتے ہیں ۔

اب رہا تیسرا فریق یعنی ہندی کے عام حامی مصنف اور ادیب ۔ ان کو اردو کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ کرنا بظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اتنا مشکل نہیں ہے اگر آپ ہندی زبان دیوناگری رسم الخط میں سیکھ لیں تو وہ خلیج جو آپ کے اور ان کے بیچ میں حائل ہو گیا ہے پٹ جائے گا ۔ آپ کی آواز دور سے ان کے کانوں تک پہنچ کر نہیں رہ جائے گی بلکہ قریب سے ان کے دل میں اتر سکے گی ، اور آپ انھیں یہ سمجھا سکیں گے کہ اردو اس عام بول چال کی زبان سے جو ملک کے بہت بڑے حصے میں رائج ہے ہندی کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے اور اگر کوئی ایسی قومی زبان بنانی ہے جو بیرونی محرکات کے بہتے پر نہیں بلکہ اندرونی قوت حیات کے بل پر زندہ رہ سکے تو اس میں اردو کا بہت بڑا عنصر داخل کرنا ہوگا ۔

لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے ، آپ دوسروں کو اردو کی حمایت پر یا کم سے کم اس کے ساتھ رواداری اور انصاف کا برتاؤ کرنے پر اسی وقت آمادہ کر سکتے ہیں جب خود آپ کے دل میں اردو کی محبت خالص ہو ، اس میں ناجائز اغراض کا کھوٹ نہ ملا ہو اور آپ اس محبت کو اپنے روزمرہ کے عمل سے ظاہر کرتے رہیں ۔

(ع ، ح)

مطبوعہ : جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۶ | ۸ راکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد عابد حسین

دونوں زبانیں دونوں کی ہیں

ڈاکٹر راجندر پرشاد

وہ زبان جو شمالی ہندوستان میں آج کل بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہے اسے خواہ کسی نام سے بھی پکارا جائے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ کوشش کی پیدا کی ہوئی نہ بھی ہو تب بھی اس پر ہندو مسلمانوں کی کوششوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے۔ اس کا ماخذ سنسکرت اور سنسکرت کی شاخیں پراکرت اور پالی زبانیں ہیں جو کہ اس زمانے میں رواج پا گئیں جب سنسکرت عام بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ مسلم حملہ آوروں اور فاتحوں کی اپنی اپنی الگ زبانیں قبیلوں کے لحاظ سے تھیں لیکن ان میں سے ہر ایک پر فارسی کا زیادہ اور عربی کا کم کم اثر تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے عہد میں سرکاری زبان فارسی تھی اور اونچے خاندانوں کے ہندو بھی کثرت سے اسے پڑھتے اور حاصل کرتے تھے بالخصوص وہ ہندو جن کا حکومت سے اور حکمرانوں سے قریبی واسطہ اور تعلق تھا۔ لیکن وہ کبھی عوام کی زبان نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کے اندر زیادہ تعداد ایسے ہی مسلمانوں کی تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اس زمانے کے مسلمان عوام کی زبان بھی فارسی نہ تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جس میں ملک کے حکمران اور محکوم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے باہم بات چیت کر سکیں۔ دونوں نے مل کر بول چال کے لئے ایسی زبان کو ترقی دینا شروع کیا اور بالکل ابتدائی زمانے ہی میں یعنی امیر خسرو کی زندگی میں وہ اتنی ترقی کر چکی تھی کہ امیر خسرو نے اس میں شعر کہے ہیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے۔ (کیونکہ آج کل وہ دو زبانیں خیال کی جاتی ہیں) حامی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ ہے۔ چونکہ اپنے مذہبی احکام کے متعلق ہندوؤں کو سنسکرت کی طرف اور مسلمانوں کو عربی اور فارسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دونوں ماخذوں سے الفاظ اس میں داخل ہوتے رہتے، مگر اس کا اپنا ڈھانچا اصلی حالت پر قائم رہتا۔ وہ اصلی نیو جس پر کہ زبانوں کی عمارت بنتی ہے زبان کی دونوں صورتوں یعنی اردو اور ہندی میں بالکل ایک ہے۔ فرق و امتیاز جو کچھ ہے وہ تھوڑے سے الفاظ میں ہے۔ اسی لئے شمالی ہندوستان میں ایسا ہے کہ صرف ایک زبان ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں گفتگو کرتے ہیں۔ اگرچہ تعلیم یافتہ لوگ اپنی اپنی تحریروں میں سنسکرت اور عربی اور فارسی کے الفاظ اپنی اپنی تعلیم کے مطابق کم یا زیادہ تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایک ایسی چیز کے متعلق بھی اختلافات کھڑے کر لئے جائیں کہ جو بالکل صحیح طور پر ہندو مسلمان دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے بھی، اور ہونا بھی چاہیے۔

ہندی کی طرف سے لڑنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے اور کسی وقت میں بھی مسلمانوں کے اس احسان سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیے جو ہندی زبان اور ہندی ادب کو ترقی دینے کے صورت میں انھوں نے امیر خسرو کے وقت سے لے کر آج تک کیا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے اس مجموعۂ نظم میں مل سکتی ہے جو انھوں نے "کویتا کومدی" کے نام سے شائع کی ہے، جس میں ہر زمانے کے مسلمانوں کا کلام ہے۔ اس مجموعہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے نہ صرف وہ زبان اپنے اشعار میں استعمال کی ہے جسے ہندی کے ادیب ہندی کہتے ہیں، بلکہ اس میں بعض ایسی مذہبی نظمیں بھی شامل ہیں جن کا اصل مضمون بھی ہندوانہ ہے۔ یہ مختصر کتاب ان پانچ جلدوں کے مجموعے میں شامل ہے جو گورکھپور کے گیتا پریس نے شائع کیا ہے۔ اس میں صرف مسلمانوں کے لکھے ہوئے مذہبی بھجن ہیں اور ہندو مذہب کا دلدادہ ان سے لطف اندوز ہونے اور ان سے روحانیت کا سبق حاصل کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ رحمان کے دوہے شمالی ہند میں ظرافت، طبع اور عقل آموزی کے لئے اسی طرح گھر گھر میں بیرے ہوئے ہیں جس طرح گردھر کے سوئیے۔ کبیر کا نام ایک مذہبی فلسفی کی حیثیت سے اس سے پہلے ہی لیا جا چکا ہے جس نے کہ اپنشدوں اور ویدانت کی بلند تعلیمات کو ان کے اونچے منبر سے گرا کر اس قدر نیچا کر دیا ہے کہ وہ عوام کی سمجھ میں آ سکیں اور انھیں جوگیوں کی پوشیدہ کٹیوں اور جنگلوں اور پہاڑوں اور آشرموں سے کھینچ کر کسانوں کی جھونپڑیوں میں پہنچا دیا ہے جو خدمات کالی داس نے شمالی ہندوستان میں اور مہا پربھو چیتن نے بنگال اور بہار میں بھگتی کی تہذیب کو ہر دل عزیز بنانے میں انجام دی ہیں وہی یوگ اور ویدانت کی تعلیمات عام کرنے کے لئے کبیر نے شمالی ہند میں انجام دی ہیں۔

اس طرح اردو ادب کی جو خدمت ہندوؤں نے کی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی ہندو اس جماعت کا ایک بہت بڑا حصہ نہیں ہیں جو کہ اردو زبان اور اردو ادب کی دلدادہ ہے۔ اس لئے یہ صرف گزشتہ تاریخ ہی کو جھٹلانا نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت موجودہ زمانے کی زندگی کے روزمرہ واقعات سے انکار کرنا ہے کہ زبان کے مسئلے کو ہندو مسلمانوں کے درمیان لڑائی کی بنیاد بنا دیا جائے۔

مسلمانوں کی خدمات صرف ہندی یا اردو ہی کو ترقی دینے تک محدود نہیں رہی ہیں دوسری صوبہ واری زبانوں کی بھی انھوں نے بہت کچھ خدمت کی اور وہ بھی اپنی ترقیات کے لئے ایک بڑی حد تک مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں، شمال میں ہندی، مغرب میں مرہٹی اور پورب میں بنگالی زبانیں محض بول چال کی زبانوں سے ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئیں اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کافی حصہ ہے۔ (ہندوستان کا مستقبل)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
دونوں زبانیں دونوں کی ہیں	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱
ہم کیا کریں ؟	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲
کشمیر کے مسئلے کی حقیقت	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان	ع ، ح	۴
(۲) پاکستان	ا ، س - ع ، ل	۵
مشرقی دنیا	ا ، س	۶
غزل	باقر مہدی	۷
غزل	فرید بخش قادری	۷
گلہ (نظم)	طپش صدیقی	۷
ملک فروشی	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
ڈھولک کے ڈھول سہاؤنے	صالحہ عابد حسین	۱۰
سونا، کیا ایک مصیبت ہے	عبد الحلیم ندوی	۱۱

ہم کیا کریں؟

ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک دوست نے، جو کوئی اٹھائیس سال سے قومی خدمت میں دل و جان سے لگے رہے ہیں اور ہمیشہ ایک متحدہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہے ہیں، ایک خط بھیجا ہے جس میں پچھلے سال کی درد بھری داستان پر تبصرہ ہے۔ اصول اور واقعات کی ٹکر ان کے فکر کو شکست نہیں دے سکی ہے۔ مگر اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کی طرف سے بھی یہ آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ان کے خط کا مرکزی سوال ان لفظوں میں سامنے آجاتا ہے: "ہندوستان کے مسلمانوں پر معاش کی راہیں تنگ ہوتی جاتی ہیں۔ آپ کی رائے میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں؟"

یہ سوال کسی نہ کسی شکل میں روز سامنے آتا ہے۔ بہت سے لوگ اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے، بہت سے اس میں ایک عام مایوسی اور بد دلی کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ دونوں باتیں مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتیں پیٹ کم بخت ایسی حقیقت ہے کہ اسے باتوں سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن مایوسی اور بد دلی سے بھی یہ بھرتا نہیں ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس دوسری حقیقت کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کھانے والے منہ کے ساتھ قدرت نے دو کام کرنے والے ہاتھ عطا کئے ہیں معیشت کا وسیلہ محنت ہے۔

ہاں ہم نے جس سماج میں پرورش پائی ہے، اس میں بے محنت یا بہت کم محنت سے پیٹ بھر سکنے کے امکانات بھی تھے اور ہیں۔ ہوشیار لوگوں کی نظر اکثر انھیں پر رہتی ہے۔ ان میں کمی ہوتی ہے تو یہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں کہیں کمی ہو رہی ہے کہیں اضافہ۔ مسلمانوں کے لئے بھی، اوروں کے لئے بھی مثلاً زمینداریاں ختم ہو رہی ہیں۔ اور یوں دوسروں کی محنت سے اپنا پیٹ پالنے کی ایک راہ بند ہو رہی ہے مگر سرمایہ دارانہ صنعت کو فروغ ہو رہا ہے اور مزدوروں کی محنت سے پیٹ پالنے ہی کی نہیں توندیں بھرنے کی راہ کھل رہی ہے۔ مسلمان زمیندار اور تعلقدار زمینداری ختم ہونے پر روتے ہیں اور ان کو اندیشہ ہے کہ زمینداری کا سارا معاوضہ خود وہ اور ان کے ولی عہد عیاشی میں اڑا کر برابر کر دیں گے اور غیر مسلم اسے صنعت میں لگا کر اور دھن کمائیں گے۔ پہلے زمینداری میں اثر اور طاقت کے زور پر دولت حاصل کرتے تھے، اب دولت کے زور پر اثر اور رسوخ بڑھائیں گے۔ اپنی غفلت یا اپنی عادتوں کی خرابی سے مسلمان زمیندار اس نئی لوٹ میں حصہ نہیں لے سکتے تو شکایت کیا اور کس کی؟ یا تو وہ بھی صنعت میں سرمایہ لگائیں اور جب تک صنعت قومی تصرف میں نہیں آتی وہ بھی اس سے شخصی نفع کمائیں، یا اگر وہ اس کو برا سمجھتے ہیں تو اس بدعت کو پھیلنے اور زور پکڑنے سے روکنے کی کوشش کریں۔ اشتراکی مسلک کو اپنائیں اور پھیلائیں، یا کم سے کم امداد باہمی کی درمیانی راہ پر چل کر دیسی صنعتوں کی تنظیم پر کمربستہ ہوں کہ آپ کمائیں اور دوسروں کو کمانے میں مدد دیں، اور اگر بدکاری اسراف اور تعیش ہی پر اصرار ہے تو مٹ جائیں مگر بدکار اور مسلمان کو ہم معنی لفظ بنانے کی کوشش نہ کریں۔

معیشت کی ایک دوسری راہ سرکاری ملازمت تھی جسے "تعلیم یافتہ" مسلمانوں نے اپنا کعبہ مقصود بنا لیا تھا۔ ایک عرصے تک سرکاری ملازمت میں یہ خالص بہ حیثیت مسلمان کے حصہ مانگتے اور پاتے رہے تھے۔ یہ مقابلے کے امتحانوں کی مخالفت کرتے تھے، سفارش یعنی نااہلی کے باوجود جگہ پانے کی سفارش۔ خاندانی خدمات، یعنی ہندوستان میں اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں اپنے خاندان کی خدمات یا سیاسی بیداری کے روکنے میں اپنی اور اپنے بزرگوں کی خدمات کے زور پر ملازمت چاہتے تھے۔ اور پاتے تھے!

ہماری قومی جد و جہد کا یہ مخصوص مشغلہ تھا کہ اپنے اچھوں بروں سب کو سرکاری ملازمت میں کھپائیں۔ اچھی سے اچھی علمی صلاحیت کے نوجوانوں کو ڈپٹی کلکٹری کی معراج تک پہنچانے پر ہمارے "رہنما" علی الاعلان فخر کیا کرتے تھے۔ بڑی بڑی اسلامی تعلیم گاہوں کی پچھلی پچاس سال کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ ان میں سے جو نوجوان تعلیم پا کر نکلے وہ سب یہ تو نہ تھا کہ نالائق ہی تھے۔ ذہین سے ذہین، قابل سے قابل نوجوان یہاں آئے۔ مگر کسی نے کبھی یہ نہ چاہا کہ ان میں سے علمی صلاحیت والوں کو علمی کاموں کے لئے روکا جائے، کچھ کو تجارت کی ترغیب دی جائے، کچھ کو صنعت میں بھیجا جائے۔ بس ڈپٹی کلکٹر، تحصیل دار، نائب تحصیل دار!! ہم اپنے بہترین دماغوں کو ایک ایسے کاروبار میں لگاتے جس میں انھیں واقعی کوئی اختیار نہ تھا، ایک پردیسی مشین کے پرزے تھے، اپنے ہم وطنوں کی حق تلفی، انھیں غلام رکھنے، ان کے ہر حریت خواہ رجحان کو دبانے میں کام آتے تھے۔ انعام تھا "تنخواہ حکومت اور بالائی یافت"۔ اس طائفہ کے اعمال پر تبصرہ یہاں مقصود نہیں۔ سوال کے جواب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اب سرکاری ملازمت ہمارے تعلیم یافتوں کا تنہا پیشہ نہیں رہ سکتی اور اچھا ہے کہ نہ رہے۔ اب کوئی نوکری مسلمان کو اس لئے نہیں ملے گی کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن اس لئے مل سکے گی کہ وہ اس کام کا اوروں سے زیادہ اہل ہے۔ مسلمانوں کو پرورش کی جگہ مقابلہ کے حق پر اصرار کرنا ہوگا۔ اور مقابلہ میں اپنی قابلیت منوانی ہوگی ہم اپنی تعداد کی نسبت سے نوکریاں نہیں مانگیں گے اپنی قابلیت کی نسبت سے مانگیں گے۔ کچھ دن تک اس میں دقت ہوگی۔ اس لئے کہ مصنوعی تحفظات نے سفارش کی جو عادت ڈال دی ہے وہ جاتے ہی جاتے جائے گی، خود اعتمادی آتے ہی آتے آئے گی۔ لیکن میرا یقین ہے کہ مسلمان نوجوان حکمرانی کے بہت سے کاموں کے لئے کسی دوسرے سے کم نہیں بلکہ شاید بعض اعتبارات سے بہتر ہی ہیں۔ آزمائش کا ایک مختصر سا زمانہ گزار نے کے بعد ان کے لئے سرکاری ملازمت کے امکانات میں بھی کمی نہ ہوگی۔ مگر قابلیت، صلاحیت اہلیت کے زور پر۔ نالائق اور نااہل کسی تاریخی استحقاق کے بل پر اپنی پرورش نہ کرا سکیں گے اور اچھا ہو کہ یہ نااہل اور مسلمان کو مترادف الفاظ بنانے کی کوشش چھوڑ دیں۔

تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ دوسروں کی طرح مسلمانوں کے بھی سب قابل نوجوان سرکاری ملازمت میں نہیں کھپ سکیں گے۔ انھیں دوسری چیزوں کی طرف بھی قدم اٹھانا ہوگا۔ طب اور انجینیری کے پیشے ان کی ملازمت پرستی کی بدولت ان سے خالی خالی سے ہیں۔ ادھر تیز تیز قدم بڑھانا چاہئے۔ تجارت کے میدان میں بعض مخصوص سوداگر گروہوں کے سوا تعلیم یافتہ لوگ جاتے ہی نہیں۔ ادھر رخ کرنا چاہئے۔ تعلیم کے پیشے کو وسیع پیمانے پر اپنانا چاہئے۔ اور ان کاموں میں امتیاز حاصل کر کے آگے آنے والوں کے لئے اچھی روایتیں قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ابتدائی عبوری دقتوں کو سر کرنا تو ہوگا، مگر یہ سب سر ہو سکتی ہیں۔ محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ کم ہمتی اور کاہلی کو مسلمانوں سے مخصوص نہ کرنا چاہئے۔

اوپر کے لوگوں اور متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ ہماری قوم کے عوام ہیں۔ ان غریبوں کو کبھی کسی نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کے متعلق برابر یہ رویہ رہا ہے کہ اوپر کے لوگ پیٹ بھر کر کھائیں گے تو ان تک بھی کچھ ریزے پہنچ جائیں گے۔ اوپر کے لوگ تعلیم پائیں گے تو اس کی برکتیں چھن چھن کر ان تک بھی پہنچیں گی، اوپر والے حکمراں ہو جائیں گے تو ان کے لئے سب کچھ کر دیں گے۔ ان سے کھیلے سب ہیں۔ ان کے کندھوں پر رکھ کر بندوقیں چلائی ہیں۔ ان کے نام پر اپنا کام بنایا ہے، ان سے اپنے معرکے سر کرائے ہیں اور موقع پایا ہے تو ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت ان میں تعلیم کو عام کرنا ہے۔ حکومت کی طرف سے جلد ہی ہمارے ملک میں تعلیم عام اور لازمی ہو جائے گی۔ لیکن پھر بھی اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے ہوتے ہوتے خاصی دیر لگے گی ہمیں اس کی رفتار کو تیز کرنے میں ساعی ہونا چاہئے تعلیم کے ایسے نظام کی حمایت کرنی چاہئے جس سے افراد کا سب پیدا ہوں، لازمی تعلیم کی مدت کو اتنا بڑھانے پر ہمیں اصرار کرنا چاہئے کہ تعلیم ایک آرائشی کھیل نہ بن کر رہ جائے بلکہ کام کی ایک چیز ہو۔ اس طرح حکومت پر اثر انداز ہونے کے علاوہ ہمیں نجی کوششوں سے بھی عام مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کو تیزی سے پورا کرنے میں لگ جانا چاہئے۔ مخلص کام کرنے والوں کا ایک لشکر کا لشکر شہروں کے مسلمان محلوں میں تعلیم بالغان کے کام میں لگ سکتا ہے اور مسلمانوں ہی کی نہیں ساری قوم کی ترقی میں معتد بہ حصہ لے سکتا ہے۔ ان محلوں میں امداد باہمی کے اصول پر قرضہ اور عام ضرورت کی چیزوں کی فراہمی کے لئے انجمنیں بنائی جا سکتی ہیں۔ جن سے شخصی مفاد کی انتشاری قوت کی جگہ جماعتی مفاد کی تنظیمی توانائی پرورش پائے۔ مسلمان بہت اچھے کاریگر ہیں۔ دلی کے فسادات میں جب مسلمانوں پر زمین تنگ تھی میں نے غیر مسلم کارخانہ والوں، جوہری لیپ پریس کے مالکوں کو جو سب وقتی تعصبات سے بھی خالی نہ تھے۔ اپنے مسلمان کاریگروں کی تلاش میں سرگرداں اور انھیں دلی میں روکنے کے لئے کوشاں پایا۔ ان کے بغیر ان کا کام نہیں چلتا تھا۔ لیکن کاریگروں کی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

کشمیر کے مسئلے کی حقیقت

خدا میں بڑی قدرت ہے۔ وہ چاہے تو کشمیر کا مسئلہ اب بھی صلح و آشتی سے طے ہو سکتا ہے مگر آثار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ نہ صرف جاری رہے گی بلکہ بہت شدت پکڑ جائے گی۔

ہم جمہوری ملک کے شہری ہیں۔ عام طور پر ہم ہر معاملے میں حکومت کا ساتھ دیتے ہیں یہ سمجھ کر کہ حکومت ہماری بنائی ہوئی ہے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن پر ہم کو پورا اعتماد ہے لیکن ایسے اہم معاملات میں جیسے جنگ کا معاملہ ہے بے سوچے سمجھے ساتھ دینے سے کام نہیں چلتا اس لئے کہ اس میں ضرورت کے وقت بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اور وہ انسان جبھی کر سکتا ہے جب اس نے جنگ کے مقصد کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر صحیح اور برحق مان لیا ہو۔ اس لئے ہمیں پہلے اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کشمیر کے معاملے میں ہند کی حکومت حق پر ہے یا نہیں۔

اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ پچھلے سال آخر اکتوبر میں (قبائلیوں کے حملے کے وقت) مہاراجہ نے جو قانون کے مطابق ریاست کا سربراہ ہے انڈین یونین میں شریک ہونے کی درخواست کی اور وہ منظور کر لی گئی اس لئے کشمیر یونین کا ایک جز ہے اور حکومت ہند اسے حملہ آوروں سے بچانے میں اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ یہ جواب بہت سے قانون دانوں کے اور بین الاقوامی عدالتوں کے لئے بالکل کافی ہے لیکن ہم جیسے لوگوں کے لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق نہیں بلکہ کبھی کبھی خلاف بھی ہوتا ہے ہرگز کافی نہیں، دنیا کا مروجہ قانون کشمیر میں اقتدار اعلیٰ کا حامل مہاراجہ کو سمجھتا ہو لیکن ہمارا حق و انصاف کا تصور جو جمہوریت پر مبنی ہے اس کا حامل کشمیر کے ارادۂ عامہ کو قرار دیتا ہے اس لئے ہم یہ پوچھیں گے کہ کیا کشمیر کے عوام واقعی ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ان ہی لوگوں کو جن سے ہم ان کی حفاظت کر رہے ہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں اور ان ہی کا ساتھ دینا چاہتے ہیں؟ اس وقت شیخ عبداللہ کی حکومت اور آزاد کشمیر کی حکومت دونوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ جموں اور کشمیر باشندوں کی اکثریت اُن کے ساتھ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کس کا دعوےٰ سچا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت جبکہ ریاست میں جنگ چھڑی ہوئی ہے باقاعدہ رائے شماری نہیں ہو سکتی جس سے اس معاملے کا دو ٹوک فیصلہ ہو جائے سردست جو کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے عام مشاہدے اور پچھلی تاریخ کی شہادت کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ عام مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ پچھلے اکتوبر میں جب حملہ آور دو طرف سے سری نگر شہر کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ مہاراجا اپنی ساری فوج کو لے کر جموں بھاگ گئے تھے اور ہندوستان سے فوجی امداد پہنچنے کی اُمید موہوم نظر آتی تھی تو وادی کشمیر کے باشندوں نے عام طور پر اور سری نگر شہر کے لوگوں نے خاص طور پر حملہ آوروں کا ساتھ دینے کے بجائے شیخ عبداللہ اور ان کے رفیقوں کا ساتھ دیا۔ اگر شہر اور مضافات کے باشندوں کی بڑی تعداد شیخ عبداللہ کے خلاف اور حملہ آوروں کے موافق ہوتی تو کیا عقل اس بات کو قبول کرتی ہے کہ شیخ صاحب شہر کے انتظام کو نیشنل کانفرنس کے والنٹیروں کی مدد سے پورے امن و امان کے ساتھ چلا سکتے تھے؟ پھر ہندوستانی سپاہی جو تھوڑے تھوڑے کر کے ہوائی جہازوں سے آ رہے تھے حفاظت سے ہوائی اڈے پر اُتر سکتے تھے ان کو بار برداری، سامان اور رسد، مزدور اور رہبر مل سکتے تھے؟ ہندوستان کی فوج کا پچاس پچاس سو سو کر کے کئی روز میں ایک اجنبی خطے میں پہنچنا، اپنا کیمپ بنانا، ضرورت کی سب چیزیں فراہم کرنا، دشمن کی نقل و حرکت کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلانا، اور پھر اس کے بے شمار دستوں کو جو ساری وادی میں پھیل چکے تھے اور شہر کو گھیر چکے تھے دو ہفتے کے اندر ساٹھ ستر میل پیچھے دھکیل دینا اس قدر خطرناک اور مشکل کام تھا کہ مقامی آبادی کی پوری اور سچی مدد کے بغیر کسی طرح انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اس سے تو ناگزیر طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیر کے لوگ ہندوستانی فوج کو اپنا دوست اور حملہ آوروں کو دشمن سمجھتے تھے۔

اب ذرا تاریخی شہادت پر نظر ڈالئے جو ہمیں بیس برس کی ذاتی واقفیت کی بنا پر بہم پہنچی ہے۔ ۱۹۳۰ء تک کشمیر کی عام آبادی خصوصاً مسلم اکثریت استبدادی حکومت کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ ہل نہیں سکتی تھی دوسرے سال چند کشمیری مسلمان نوجوانوں نے جو علی گڑھ سے تعلیم پا کر آئے تھے اور ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے۔ اس استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ان میں شیخ عبداللہ بھی تھے جو اپنی خداداد قابلیت کی بدولت ان کے قائد بن گئے۔ شیخ صاحب کی آواز نے مسیحائی کی اور کشمیری مسلمانوں کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں یہ تحریک مسلم کانفرنس کی شکل میں منظم ہوئی۔ استبداد کی سختیاں، قید کی مصیبتیں ان لوگوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکیں۔ ان کا اثر بڑھتا گیا۔ حکومت کو ان کے بعض مطالبات ماننے پڑے اور مسلمانوں کو ملازمتیں اور تعلیمی سہولتیں پہلے سے کچھ زیادہ ملنے لگیں۔ ۱۹۳۴ء تک مسلم کانفرنس اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ پرجا منڈل کی انتخابی نشستوں میں اس نے ۲۵ میں سے ۱۹ پر قبضہ کر لیا۔

کوئی اور ہوتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا مگر بلند حوصلہ قائد شیخ عبداللہ نے اپنے کاموں کا جائزہ لیا تو ان کو سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ چھ سات برس کی قربانیوں کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو چند عہدے ملے۔ عوام کو کچھ بھی نہیں ملا۔ ان کی مصیبتوں میں کچھ بھی کمی نہیں ہوئی اس پر طرہ یہ کہ جن مسلمانوں کو کانفرنس نے ریاست میں بڑے عہدے دلوائے تھے اب اپنے ولی نعمت کی خوشامد میں عوام کو اور مسلم کانفرنس کو کچلنے میں اوروں سے زیادہ انہماک دکھا رہے تھے۔ شیخ صاحب کے درد قومی اور عقل سلیم نے ان کو حقیقت سمجھائی کہ فرقہ وارانہ جماعت سے خواہ وہ کتنی ہی بے تعصب کیوں نہ ہو عوام کی فلاح و بہبود کا مقصد کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو خواہ مخواہ تعلیم یافتہ طبقہ کی ذاتی اغراض کا آلہ کار بن جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم کانفرنس کا جلسہ کر کے اس کے دستور اساسی کو بدلا۔ اس کا نام نیشنل کانفرنس رکھا۔ اس کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھول دیئے اور چھوٹے چھوٹے مقاصد کو چھوڑ کر عوام کی حکومت کو اپنا خاص مقصد قرار دیا۔ شیخ صاحب کے ساتھ مسلمان رفیقوں کی بہت بڑی اکثریت نیشنل کانفرنس میں ان کے ساتھ رہی اور بہت سے ہندو اور سکھ جو پہلے بھی ان کے دوست تھے اب رفیق کار بن گئے لیکن پرانے ساتھیوں میں سے چند ایسے بھی تھے جنھیں یہ تبدیلی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے مسلم کانفرنس کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس میں تنگ خیال مولویوں، ریاست کے حکام اور ان سب لوگوں نے جو شیخ عبداللہ کی انقلابی جدوجہد سے خائف تھے اُن کا ساتھ دیا۔ سات آٹھ برس تک نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس ایک دوسرے کی مدمقابل رہیں لیکن جو لوگ اس عرصے میں کشمیر گئے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کی تنظیم ایک ایک گاؤں میں موجود تھی اور مسلم کانفرنس کا اثر سری نگر کے چند محلوں اور دو سرے شہروں میں ایک چھوٹی سی جماعت تک محدود تھا۔ اس کے لیڈر زیادہ تر قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھانے والے اور موقع ملے تو خود حکام کے عہدے میں داخل ہو جانے والے لوگ تھے چنانچہ جب امتحان کا وقت آیا یعنی ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے مہاراجا کے خلاف کشمیر چھوڑ دو کی مہم شروع کی اور نیشنل کانفرنس والے قید کی مصیبتیں جھیلنے لاٹھیاں اور گولیاں کھانے لگے تو مسلم کانفرنس کے لیڈر سوا چودھری غلام عباس اور دو چار اور مخلص آدمیوں کے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور آئینی جدوجہد اختیار کی یا ... کے محفوظ قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد جب یاران طریقت کی سیاسی مصلحتوں سے پونچھ کے لوگوں کی مقامی جدوجہد اور قبائلیوں کے غارتگرانہ حملوں کی ... کی جنگ آزادی کی زنجیر گھڑی گئی تو یہ مسلم کانفرنس ... مجاہد اور لیڈر بن کے پہنچے اور آزاد کشمیر کی حکومت میں شامل ہو گئے۔

اب آپ ہی بتائیے جن لوگوں کی نظر میں یہ تاریخی پس منظر ہے وہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو کشمیر کے عوام کا حقیقی نمائندہ تسلیم نہ کریں اور ہندوستانی حکومت کے اس فعل کی دل و جان سے تائید نہ کریں کہ وہ ان کے جان و مال عزت اور آزادی کی حفاظت کے لئے دفاعی جنگ کر رہی ہے؟

بزمِ بے تکلف

ہمارے دوست ل، ک، ملاحی صاحب دیکھنے میں تو بڑے حلیم الطبع اور رقیق القلب نظر آتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ دائمی نزلہ نے ان کی آواز میں ایک جکڑی ہوئی نرمی اور چہرے پر ایک بہتی ہوئی رقت کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے لیکن اگر کبھی غصہ آ جائے تو الامان، الحفیظ یہی رقت اس طرح تپنے اور دہکنے لگتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا ابل رہا ہے۔ لوگ جتنا ان کے فرطِ غضب سے ڈرتے ہیں اتنے ہی ان کے وفور محبت سے بھی خائف رہتے ہیں اس لئے کہ دونوں حالتوں میں صرف پاسبان عقل ہی نہیں بلکہ پاسبان ادب بھی اس بگڑے دل کو تنہا چھوڑ کر ٹہل جاتا ہے، اور اس کی زبان سے بے ساختہ اردو کے معلّے کے چھٹے ہوئے محاورے سرزد ہونے لگتے ہیں جن میں عموماً مخاطب کی خلاف شرع پیدائش کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ سسرالی رشتوں کا اور طرح طرح کے ازدواجی اور غیر ازدواجی تعلقات کا دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ ملاحی صاحب کو اپنے صاف دل ہونے پر بڑا فخر ہے اور یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ گو ان کے دل میں گندگی بڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے پر ٹھہرنے نہیں پاتی۔ فوراً اُگل پڑتی ہے اور دل بنی ہوئی اوجھڑی کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ مگر ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کا دل صاف ہوتے ہی دوسروں کا دل میلا ہو جاتا ہے۔ سخت افسوس کیا کرتے ہیں کہ اس انگریزی تہذیب نے ہمارے مذاق اور اخلاق کا ہاضمہ خراب کر دیا ہے۔ ان کو کوئی چٹ پٹی مسالہ دار چیز پچتی ہی نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

پچھلا ہفتہ : ۱ - ہندوستان

صلح نمائی اور جنگ فروشی

صلح پسندوں کی یہ امید کہ کشمیر کا مسئلہ پرامن طریقے سے حل ہو جائے گا۔ کم ہو جاتی ہے۔ پچھلے ہفتہ لیاقت علی صاحب نے مغربی پاکستان کے دورے کے سلسلے میں جو تقریریں کیں ان سے جنگ جوئی کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اور صلح جوئی کا کم۔ پنڈت نہرو نے اپنی ۱۸ ستمبر کی تقریر میں پاکستان سے صلح و امن کی اپیل کی تھی اس کے جواب میں لیاقت علی خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان سے دوستی کے لئے تیار ہیں۔ لیکن دوستی کشمیر کے معاملے کے طے ہونے پر موقوف ہے۔ انھوں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اسی کشمیر کے معاملے میں یو، این، او کمیشن نے جس کے بلانے کے لئے خود پاکستان نے پورا زور لگایا تھا، دو مہینے کی کوشش کے بعد مصالحت کی ایک ابتدائی تجویز مرتب کی جسے ہندوستان نے منظور کر لیا، لیکن پاکستان نے رد کر دیا یہ بھی نہیں فرمایا کہ اگر وہ ایک غیر جانب دار کمیشن کی تجویز کو قابل غور نہیں سمجھتے، تو آخر وہ خود مصالحت کی کیا صورت تجویز کرتے ہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے پاکستان کی بحری، بری اور ہوائی فوج کی رجز خوانی شروع کر دی۔ یہ تو صلح جوئی نہ ہوئی بلکہ صلح نمائی اور جنگ فروشی ٹھہری۔

اس کے بعد سے پنڈت نہرو کا لہجہ بھی سخت ہو گیا ہے۔ یکم اکتوبر کی تقریروں میں، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل دونوں نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ اگر پاکستان کا یہی طرز رہا، تو کشمیر کی جنگ جو آج کل رکی ہوئی ہے پوری شدت سے شروع کر دی جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ دونوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ خود پاکستان پر ہندوستانی فوج ہرگز حملہ نہیں کرنا چاہتی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ پاکستان کی طرف سے، اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ اگلے چند روز صلح پسندوں کے لئے بہت تشویش ناک ہیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

یکم اکتوبر کو سردار پٹیل نے پالم میں ہندوستانی ہوائی فوج کے عملے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی انجمن (یو، این، او) پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ یو، این، او آج تک کسی مسئلے کو طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے پھر بھی اس کو اپنے دائرہ عمل کے بڑھانے کا اس قدر شوق ہے کہ اس کی سیکوریٹی کونسل حیدرآباد کے معاملے میں جس سے اس کو خود اپنے آئین کی رو سے کوئی تعلق نہیں، دخل دینے پر راضی ہو گئی اور اب بھی جبکہ معاملہ طرفین کی رضامندی سے بہ خیر و خوبی طے ہو رہا ہے اور نظام نے اپنی شکایت کو واپس لے لیا ہے، سیکوریٹی کونسل کو اصرار ہے کہ یہ مسئلہ اس کے ایجنڈا پر رہے اور اس پر مزید بحث کی جائے۔ سردار پٹیل نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یو، این، او کی اصلاح نہ ہوئی تو وہ دنیا میں امن قائم کرنے کے بجائے اور زیادہ تباہی اور خونریزی کا باعث بن جائے گی۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سردار پٹیل کی یہ تنقید حرف بہ حرف صحیح ہے، لیکن اس کو اخبار میں پڑھنے کے بعد دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ پیرس سے خبریں آ رہی ہیں کہ سیکوریٹی کونسل حیدرآباد کے معاملے میں اپنی غلطی محسوس کر رہی ہے اور اس کی تلافی کرنے پر تیار ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس مایوسی میں جو سردار نے یو، این، او کی طرف سے ظاہر کی ہے تھوڑی سی امید کی جھلک بھی ہوتی۔ اس لئے کہ لے دے کے یہی ایک سہارا دنیا کے امن کا رہ گیا ہے اس کو اتنی جلدی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔ شکر ہے کہ دوسرے دن وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنے اس تقریر میں جو انھوں نے باشندگان دلی کے عام جلسے میں کی ہمارے دل سے اس خلش کو مٹا دیا انھوں نے کہا کہ یو، این، او کی ان سب کمزوریوں کے باوجود جو ہمارے سامنے ہیں ہمیں اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد اونچے مقاصد پر رکھی گئی ہے۔ نائب وزیر اعظم کی جھڑکی اور وزیر اعظم کی تھپکی دونوں مل کر ان خیالات کی پوری ترجمانی کرتی ہیں جو ہندوستان کا سوچنے والا طبقہ یو، این، او کے بارے میں رکھتا ہے۔

کیا زمینداری کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا؟

کانگریس نے زرعی اصلاحات کی جو کمیٹی مقرر کی تھی وہ اور تو سب صوبوں کا دورہ کر چکی ہے صرف یو، پی اور مدراس کے صوبے باقی رہ گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یو، پی میں شدت سے سیلاب آنے کی وجہ سے کمیٹی کو اس صوبے میں اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا ہے۔ اب وہ مدراس کا دورہ مقررہ وقت سے ایک مہینہ پہلے شروع کر دے گی اور یو، پی کی باری اس کے بعد آئے گی۔ صوبوں کی حکومتیں زمینداری کے متعلق نئے قانون بنانے سے پہلے اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کر رہی ہیں، کہا جاتا ہے کہ کانگریس کے حلقوں میں زمینداری کو جلد سے جلد ختم کرنے کا جوش فی الحال ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ کیونکہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر اس میں عجلت کی گئی تو حکومتوں کو کم سے کم معاوضے کی ادائیگی کے لئے بھی اربوں روپے کی ضرورت ہو گی جس کا فوراً مہیا ہونا محال ہے اور اگر کسی طرح ہو بھی گیا تو اتنی بڑی رقم کے گردش میں آ جانے سے افراط زر حد سے گذر جائے گی اور پھر گرانی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔

ہمارے خیال میں مناسب یہ ہے کہ حکومتیں اس معاملے میں وہ طرز عمل اختیار کریں جو انگلستان کی حکومت نے بینک آف انگلینڈ کو قومی ملکیت بنانے کے سلسلے میں اختیار کیا تھا یعنی زمینداریوں پر سرکار کا قبضہ ہو جائے اور زمینداروں کو لگان کی ایک مقررہ رقم ہر سال ادا ہوتی رہے۔ جب معاوضہ کی مجوزہ رقم ادا کرنے کا سبیتا ہو تو یہ سالانہ ادائگی بند کر دی جائے۔ اس سے سب فریقوں کو یکسوئی ہو جائے گی اور موجودہ انتظار اور اضطراب کی حالت جاتی رہے گی جس نے ملک کے معاشی توازن میں خلل ڈال رکھا ہے۔

اتحاد کا مضبوط رشتہ

۲ اکتوبر کو گاندھی جینتی جس شان سے سارے ملک میں منائی گئی اس نے ایک بار پھر ہمیں یہ یاد دلایا کہ طرح طرح کے اختلافات کے باوجود ہندوستان اس سرے سے اس سرے تک ایک اتحاد کے رشتے میں مربوط ہے اور وہ رشتہ گاندھی جی کی شخصیت کا ہے۔ جو روحانی مقاصد، اخلاقی اصول خیالات اور جذبات ہم سب میں مشترک ہیں، ان کا مجسم نمونہ گاندھی جی کی ذات تھی اور اب ان کی یاد ہمیں اس اشتراک کا احساس دلاتی ہے اور اسے قوت پہنچاتی ہے۔ سارے ملک میں، ایک ایک شہر میں، ایک ایک گاؤں میں یہ تقریب خوشی اور رنج، فخر اور شرم کے مخلوط جذبات کے ساتھ منائی گئی۔ خوشی اور فخر اس پر کہ یہ فخر انسانیت ہم میں سے تھا۔ رنج اور شرم اس کی کہ جس نے ہماری روح کو ہلاکت سے بچایا۔ اس کے جسم کی ہم حفاظت نہ کر سکے۔ یوں تو ہر جگہ اس تقریب نے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی کے فرق کو کہ سے کم تھوڑی دیر کے لئے مٹا دیا لیکن حیدرآباد میں خاص طور پر اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ موقع ملا کہ پچھلے آٹھ مہینے کے افسوسناک واقعات کو بھلا کر ایک جگہ جمع ہوں اور گاندھی جی کی محبت کے سہارے آپس کی محبت کو تازہ کریں۔ سنا ہے ۲ اکتوبر کو جا بجا شہر کے ہندو، مسلمان اور ہندوستانی اور حیدرآبادی فوج کے سپاہی مل جل کر مہاتما گاندھی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ہی مدرسے کے لڑکے ہیں جو اپنے عزیز استاد کا جوش و خروش سے استقبال کر رہے ہیں۔

ایک دلچسپ تجویز

ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ کی یہ تجویز بہت دلچسپ ہے کہ حکومت ہند اپنے اسٹرلنگ قرضے کے بدلے انگریزوں کے کارخانے اور ان کی دوسری املاک جو ہندوستان میں موجود ہیں لے لے۔ ان کا اندازہ ہے کہ انگریزوں کی کل املاک کی مالیت آٹھ ارب روپے کے قریب ہے اگر یہ حکومت ہند کو مل جائے تو قرضے کا بہت بڑا حصہ ادا ہو جائے گا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے دو بڑے فائدے بتائے ہیں ایک یہ کہ اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی جس میں بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں، آسانی سے ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی صنعت کا بیس فی صدی حصہ جو اب انگریزوں کے پاس ہے حکومت ہند کی ملکیت اور انتظام میں آ جائے گا۔ اور صنعتوں کو قومی بنانے کے مقصد میں بیس فی صدی کامیابی ہو جائے گی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس سودے پر انگریز سرمایہ داروں اور برطانوی حکومت کو کیسے راضی کریں گے۔ شاید برا چین میں اس طرح کا معاملہ ہوتا تو انگریز اس پر غور بھی کرتے لیکن ہندوستان جیسے پرامن ملک سے اپنا کاروبار چھوڑ کر وہ کیوں جائیں گے۔ اگر ڈاکٹر صاحب جبر سے کام لینا چاہتے ہیں تو پھر صنعتوں کو قومی بنانے کا مسئلہ بیس فی صدی کیا سو فی صدی حل ہو سکتا ہے۔

(ع، ح)

۲۔ پاکستان

وہی بیرونی سرمائے کا آسرا

حال میں پاکستان کے وزیر صنعت نے ملک کی صنعتی ترقی کا جو جائزہ لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاول پور اور کراچی میں دو سوتی کپڑے کی ملیں قریب قریب مکمل ہو گئی ہیں۔ اس طرح پاکستان میں سوتی کپڑا پیدا کرنے کی صلاحیت دگنی ہو گئی ہے۔ ساری دنیا کو تو شکایت ہے کہ سوتی کپڑے کی مشینیں کافی تعداد میں اور بآسانی دستیاب نہیں ہوتیں، مگر وزیر صنعت نے یہ کہا ہے کہ حکومت پاکستان کو مشینوں کے بارے میں پریشانی نہیں، انھیں یہ ڈر نہیں کہ ان کا اگلا پنج سالہ پروگرام مشینوں کے نہ ملنے کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے گا۔ مشینوں کے وعدے انگلستان فرانس، جاپان، اٹلی اور چیکو سلوواکیا نے کئے ہیں۔

دو جوٹ کی ملیں بھی جلد ہی قائم ہونے والی ہیں۔ وزیر صنعت نے اس موضوع پر کچھ بتانے سے گریز کیا کیونکہ اس سلسلے میں ابھی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ صنعتیں بیرونی کمپنیاں قائم کریں گی۔ بہت عرصہ ہوا خبریں آئی تھیں کہ کلکتہ میں جوٹ کی کچھ انگریزی کمپنیاں اپنی توجہ پاکستان کی طرف منتقل کر رہی ہیں۔ ان کا اور حکومت پاکستان کا جو معاہدہ ہو رہا ہے اس کی تفصیلات کا مطالعہ دلچسپ ہو گا شاید پاکستان کو جو شرطیں پیش کی جائیں گی وہ اس کے لئے خاصی پسندیدہ ہوں گی۔

پچھلے دنوں چمڑے کی صنعت سے تعلق رکھنے والے صوبوں اور مرکز کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس نے بعض سفارشیں کی تھیں جن کا مقصد یہ ہے کہ خام پیداوار کی زیادہ مقدار کو ملک کے اندر ہی کام میں لگایا جائے ان سفارشات پر حکومت غور کر رہی ہے۔ ویسے مسٹر فضل الرحمٰن نے کہا کہ حکومت اس سلسلے میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار پہلے ہی کر چکی ہے۔

دواؤں کی صنعتوں کو مدد دینے کے سوال پر بھی سوچ بچار کیا جا رہا ہے۔ حکومت کے پیش نظر یہ سوال بھی ہے کہ ان صنعتوں کی پیداوار کی اچھائی وغیرہ کی نگرانی کے لئے مناسب صورت کیا ہوگی۔ قیمتوں پر بھی نگرانی رکھنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔

مشرقی بنگال میں کاغذ کے لئے ضروری خام اشیا ملتی ہیں۔ وہاں ایک کاغذ بنانے کی مل کے قیام کے سوال پر بھی حکومت غور کر رہی ہے۔ اس مل پر ایک یا ڈیڑھ کروڑ کا سرمایہ لگے گا اور حکومت بعض ماہرین فن سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے والی ہے۔

شکر سازی کی صنعت کی طرف بھی دھیان دیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں تو پاکستان کو اپنے اس ارادے پر خاصا فخر ہے کہ مردان کی نئی شکر فیکٹری شاید ایشیا میں سب سے بڑی ہوگی۔ مشرقی بنگال میں جو ملیں موجود ہیں ان میں بھی توسیع ہو رہی ہے۔ بیرونی سرمائے کے داخلے کے سوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر فضل الرحمٰن نے کہا "حکومت نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ بیرونی سرمائے کو دعوت دی جائے تاکہ پاکستان کی صنعتی ترقی کا کام ہو سکے۔ ایسا کرنے میں حکومت نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بیرونی کارخانوں کے ساتھ سیاسی اثر نہ آنے پائے۔" مگر قیاس یہ ہے کہ سیاسی اثرات پہلے ہی آ گئے ہیں، کارخانے بعد میں قائم ہوتے رہیں گے۔ اس بات کا شبہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وزیر صنعت کو اپنی پالیسی کی صحت کا سرٹیفکٹ امریکا سے ملا ہے اور انھوں نے خود اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا "حکومت کی پوزیشن کو باہر اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ ہمارے پاکستان سے امریکا کے معاشی تعلقات کے سوال پر نیویارک کی نیشنل فارن ٹریڈ کونسل نے ایک رپورٹ میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان کی پالیسی حقیقت بینی پر مبنی ہے۔ اور اس سے پاکستان میں سرمایہ کاری کے امکانات قوی ہو گئے ہیں۔ اس رپورٹ کے الفاظ میں 'یہاں بیرونی سرمائے کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ اور جو معاشی نظام بنے گا وہ سرمایہ کاری کے لئے نفع بخش ہوگا' پاکستان کے وزیر صنعت نے اپنی اس امید کا اضافہ کیا ہے کہ اس سے پاکستان کے حقیقی مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن دوسرے ملکوں کا تجربہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں دنیا ابھی اس منزل سے بہت دور ہے جہاں ایک ملک دوسرے ملک کی مدد خالصتاً لوجہ اللہ کرے گا۔ کونسل کے بعض مبہم الفاظ کی تفسیر کی جائے تو یہ ہوگی کہ اُسے پاکستان سے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ وہ معاشی حیثیت سے کوئی ایسا راستہ اختیار کرے گا جو سرمایہ داری کے مدار سے دور جاتا ہو یا سیاسی حیثیت سے اس سمت جائے جو امریکا کے مفاد کے خلاف ہو۔ ممکن ہے پاکستان کے عوام کا مفاد یہی ہو اور وہ یہی فیصلہ کریں۔ بیرونی سرمایہ قبول کرنے یا اس کے چنگل میں پھنس جانے کے بعد پھر اس فیصلہ کو بدل لینا آسان نہیں ہوگا اور سیاسی آزادی معاشی زنجیروں میں جکڑ کر دم توڑ دے گی۔ پاکستان اگر یہ چاہتا ہو کہ اس کی معاشی حکمت عملی اس کے اپنے قومی مفاد کی پابند ہو تو اُسے اپنا راستہ نکالنے کے لئے اپنے ہی قوت بازو پر بھروسہ کرنا چاہئے، ہند و پاکستان کے تعلقات بہتر رہیں تو وہ دقتیں جو حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں پیش آئیں گی یا آ رہی ہیں بہت کم ہو جائیں گی۔ (ا۔ س)

صلح میں جنگ کی باتیں کیسی؟

پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی صاحب نے قائد اعظم کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان کے اہم شہروں یعنی لاہور، پشاور اور راولپنڈی کا دورہ کیا اور عام جلسوں میں اہم اور طویل تقریریں کیں۔ دورہ پر روانہ ہونے سے پہلے، کراچی سے ریڈیو پر بھی ایک تقریر کی تھی۔ ان تمام تقریروں میں انھوں نے ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی اس اپیل کے حوالے دئے ہیں جو انھوں نے ۱۸ ستمبر کی تقریر میں پاکستان سے کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ "خوف اور شبہے کو دل سے نکال ڈالئے اور امن و آشتی کے قیام میں مدد دیجئے۔"

لیاقت علی صاحب نے اپنے براڈکاسٹ میں نہرو جی کی اپیل کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کو یقین دلایا تھا کہ دونوں حکومتوں کی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے اور امن و امان کے قیام میں وہ ہر طرح مدد دینے کی کوشش کریں گے۔ لاہور کی تقریر میں بھی اس وعدہ کو دہرایا مگر اسی کے ساتھ بہت سی اور باتیں کہیں، جن سے یہ وعدہ مشروط ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پشاور میں انھوں نے صاف صاف فرمایا کہ "جب تک کشمیر کا مسئلہ اطمینان بخش طور پر حل نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان میں دوستی ہو ہی نہیں سکتی" اور راولپنڈی پہنچنے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرمایا "کشمیر تو پاکستان کا جز ہے، جسے کسی طرح الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ لیاقت علی خاں صاحب نے کراچی کے براڈکاسٹ میں جس صفائی کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور نہرو جی کی اپیل کا خیر مقدم کیا تھا، اسی پر قائم رہنا چاہئے اور صلح کے لئے خلوص دل سے کوشش کرنی چاہئے۔ بعد میں انھوں نے جو شرطیں پیش کی ہیں اور جس طرح حملہ کا خطرہ ظاہر کیا ہے اور پاکستان کی جنگی قوت کا رعب ڈالنا چاہا ہے اس سے کشیدگی دور نہیں ہوگی بلکہ اور بڑھ جائے گی۔

آپ کا بھی تو کچھ فرض ہے

بنگال کے وزیر، شہاب الدین صاحب سے حیدر آباد سندھ کے ہندوؤں کے ایک وفد نے ملاقات کی۔ وزیر موصوف نے وفد کو اقلیتوں کے ساتھ اچھا اور مساوی برتاؤ کا یقین دلایا، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ جو لوگ ایک قدم پاکستان میں رکھتے ہیں اور دوسرا پاکستان کے باہر وہ اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہیں انھوں نے فرمایا کہ حکومت کی "پانچویں دستے" پر بڑی کڑی نگاہ ہے۔ اس سلسلے میں کسی کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس سلسلے میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمان گرفتار کئے گئے ہیں۔

شہاب الدین صاحب نے اقلیت کو جو مشورہ دیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت ٹھیک ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کی اقلیتوں کو آخری طور پر طے کر لینا چاہئے کہ انھیں کہاں رہنا ہے اور اس کا فیصلہ کر چکنے کے بعد انھیں پوری وفاداری اور خلوص کے ساتھ حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں انھیں بڑی مشکلیں اٹھانی پڑیں گی لیکن اس کے بعد جو سماج بنے گی۔ وہ دونوں ملکوں میں سچی جمہوریت کا نمونہ پیش کر سکے گی اسی کے ساتھ شہاب الدین صاحب سے بھی عرض کرنا ہے کہ وہ اقلیتوں کے جذبات اور شبہات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسی حالت میں جبکہ ہنوز پاکستان کا دستور تیار نہیں ہوا ہے اور وہاں ایسی جماعتوں کی کمی نہیں جو خالص مذہبی حکومت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اقلیتوں کے خدشے بے بنیاد نہیں ہیں۔ حکومت پاکستان کو چاہئے کہ ان کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اُٹھائے۔ اس سے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا۔

(ع، ل)

مشرقی دُنیا

یہ بغلی گھونسہ ہے

ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جن کا خیال ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اصل ذمہ داری ماسکو پر ہے بہت پہلے جب یورپ میں کمیونسٹ اثرات کی قوت کم ہو رہی تھی تو یہ کہا گیا تھا کہ ممکن ہے کمیونسٹ پارٹیاں اب اپنی توجہ ایشیا کی طرف پھیر دیں۔ دلّی میں کمیونسٹ پارٹی کی شکست کے بعد ہی ملایا کا جھگڑا شروع ہوا۔ اس طرح کے اور اتفاقات نے یہ موقع دے دیا ہے کہ اس ساری جدوجہد کو ایک پروگرام کا نتیجہ بتایا جائے جو ماسکو میں مرتب ہوا ہے اور جس کا مقصد ساری دنیا پر قبضہ جمانا ہے اس میں کچھ تو اس بات کو دخل ہے کہ مغربی ممالک کے رہنما نوآبادیات کو کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتے، اور ان کے اس قبضے کو جائز ثابت کرنے کی صورت ایک ہی ہے کہ نوآبادیات کی جدوجہد کو جمہوریت اور کمیونسٹ استبداد کی کشمکش بنا کر اپنا الّو سیدھا کیا جائے ان تحریکوں کا سلسلہ ماسکو تک پہنچانے کے لئے جن دلیلوں سے کام لیا گیا ہے وہ دلچسپ ہیں۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں محض بنکاک ہی ایک جگہ ہے جہاں روس کا ایک لگیشن ہے اس کے روسی افسروں کی تعداد چالیس ہے چالیس افسر اتنی چھوٹی سی جگہ میں! اب زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت ہی کیا رہی؟ ظاہر ہے ان کا کام یہی ہو سکتا ہے کہ مشرقی ایشیا پر روس کا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کریں بنکاک میں ایک ایشیا کی کومن فارم کا وجود ایک واقعہ کی حیثیت سے ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ بنکاک میں برطانوی سفارت خانے کے اسٹاف کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ وہاں مارشل سونگرام کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے لئے راستہ ہموار کرنے کا کام کر رہے ہیں کمیونسٹوں کی بین الاقوامی سازش کے لئے جہاں تک اس کا تعلق ایشیا سے ہے ایک اور دلچسپ بات بھی کہی گئی ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے واقعات کی کڑی پچھلے کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس سے جو پچھلے سال کلکتے میں ہوئی تھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ برما اور ملایا میں کہیں بھی یہ ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ماسکو نے یہاں کے کمیونسٹوں کی کوئی مدد کی ہے لیکن یہ الزامات اسی شدومد سے دہرائے جا رہے ہیں۔

بھلا ہو انڈونیشیا کی کمیونسٹ جمہوریت کے لیڈروں کا کہ انھوں نے پروپیگنڈے کے لئے ایک نئی اور بظاہر قوی دلیل مہیا کر دی ہے۔ انڈونیشیا کی نئی کمیونسٹ جمہوریت جو ابھی قائم ہوئی ہے اس کے صدر موسو صاحب ہیں جو ۲۵ برس کی جلاوطنی کے بعد پچھلے ہی دنوں ماسکو سے انڈونیشیا واپس آئے ہیں۔ یہ پروپیگنڈا بہت زور شور سے جاری ہے۔ دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ کمیونسٹ نے ساری جنوبی مشرقی ایشیا پر قبضہ جمانے کی مکمل سازشیں کر لی ہیں۔ چنانچہ لندن ٹائمز نے کہا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ملایا میں عوام کی جدوجہد کے لئے نوآبادیاتی اور اجارہ دارانہ نظام کے مصائب کے وجہ جواز تھے تو برما میں کمیونسٹ تحریک کے لئے کون سا جواز پیش کیا جا سکتا ہے جہاں کی حکومت اب سوشلسٹ ہے۔ اور انڈونیشیا میں تو کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جہاں کی حکومت عرصے سے سوشلسٹ چلی آ رہی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ انڈونیشیا کی حکومت کے لیڈروں کو کمیونسٹ کہا جاتا تھا غنیمت ہے کہ اب ٹائمز نے ان کو کمیونزم کے الزام سے بری کر دیا ہے بہرحال انڈونیشیا کی کمیونسٹ بغاوت کے بارے میں ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ ٹائمز سے اتفاق رائے کرنا پڑتا ہے۔

ملایا اور برما دونوں میں بلاشبہ کمیونسٹ تحریکوں کے پیدا ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ملایا تو آبادیاتی استبداد کا شکار ہے۔ برطانوی حکومت نے پرامن سیاست کے نکمے پن کا تصور اس طرح لوگوں کے ذہنوں پر بٹھا دیا ہے کہ یہ خواہش دبی تشدد کی زبان استعمال کی جائے جسے طاغوتی حکومت سمجھتی ہے۔ زور پکڑ گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں برما میں دائیں بازو کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ تھاکن نو جیسا وزیر اعظم مجبور ہو کر رہ گیا۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی اپنی حفاظت کے لئے بغاوت کرنے کا عذر پیش کر سکتی ہے۔

لیکن انڈونیشیا میں کمیونسٹ بغاوت کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں۔ کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر حطّا نے ڈچ سے مل کر کمیونسٹوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو اور آزادی اور جمہوریت کو بچانے کی خاطر یہ جہاد شروع کر رکھا ہے لیکن اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں جس معاہدے کے خلاف آج کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اپنا سارا زور خطابت ختم کر رہے ہیں اس میں وہ بھی ڈاکٹر محمد حطّا کے ساتھ شریک تھے ڈچ حکومت کے متعلق ڈاکٹر حطّا نے ابھی پچھلے ہی دنوں جس صاف گوئی سے کام لیا ہے اس کی روشنی میں ان پر ڈچ سے مل جانے کا الزام سراسر زیادتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈچ حکومت سے بارہا بات چیت ہوئی اور ہر بار انڈونیشین حکومت کو ناکامی کے تلخ گھونٹ پینے پڑے ہیں۔ اس لئے وہاں انتہا پسندی کا جذبہ زور پکڑ گیا۔ یہ بات سمجھ میں بھی آ سکتی ہے لیکن اس صورت میں کمیونسٹ بغاوت کا مقصد ڈچ اقتدار کو نقصان پہنچانا ہونا چاہئے تھا، نہ یہ کہ جمہوریت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے۔

اس بغاوت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ توقع تو صرف کمیونسٹ پارٹی کو ہی ہو سکتی ہے کہ وہ جمہوریت کو جھٹ پٹ ختم کر کے پھر ڈچ حکومت سے بھی نپٹ لے گی۔ بغاوت کے متعلق خبریں پوری طرح نہیں آ رہی ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ بغاوت خاصی وسیع ہے اس کا مطلب ہے کہ جمہوریت کو اسے دبانے میں اچھی خاصی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ کشمکش لمبی ہو سکتی ہے اور اس صورت میں ڈچ حکومت اسے مداخلت کا بہانہ بنا سکتی ہے ایسا ہوا تو یہ ڈچ حکومت کی بڑی زیادتی ہوگی۔ کیونکہ انڈونیشیا کے متعلق اور کچھ طے ہو نہ ہو یہ قطعی طور پر طے ہے کہ انڈونیشیا کے لوگ ڈچ اقتدار کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ مگر ایسی انصاف پسندی کا ثبوت سامراجی طاقتوں نے کم ہی دیا ہے۔ اگر ڈچ حکومت بیچ میں کود پڑی تو جمہوریت کو کون بچا سکے گا جیسے انڈونیشیا کے حالات سے کچھ بھی واقفیت ہے اسے یہ اندازہ ہوگا کہ ڈچ حکومت دوبارہ "پولیس ایکشن" کے لئے تیار بیٹھی ہے اور یہ صرف غیر ملکی رائے عامہ کا ڈر کہ اس نے اس سلسلے میں آخری اقدام سے گریز کیا ہے۔ اب کمیونسٹ خطرے کی وجہ سے مغربی ملکوں کی رائے عامہ ڈچ حکومت کی تائید پر آمادہ ہو جائے گی۔ غرض انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی نے سامراج کا مقابلہ کرنے کے بجائے سامراج دشمن طاقتوں کو کمزور کرنے کا کام شروع کیا ہے جس کی دنیا میں کوئی ترقی پسند حمایت نہیں کر سکتا۔

چین کی قومی حکومت کا حال

پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کو ایک بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ انھوں نے سنان پر جو ایک صوبے کا دارالسلطنت ہے قبضہ کر لیا ہے۔ اس لڑائی میں انھیں صرف دس دن کوشش کرنی پڑی اور یہ اہم جگہ ان کے ہاتھ آ گئی اس سے نانکنگ کی حکومت کے وقار کو بہت دھچکا لگے گا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس شہر کے فتح ہو جانے کی وجہ سے شمالی اور وسطی چین کے درمیان ایک اور شگاف پڑ جائے گا شمالی چین میں قومی حکومت کی فوجی حالت نازک ہو جائے گی۔ سنان پر حملہ ہوا تو قومی حکومت کی فوج بالکل تیار نہ تھی اور اسے بچانے کی کوشش بہت دیر میں شروع کی گئی۔ یہ بات اہم ہے کہ ڈویژنل کمانڈر جو اس شہر کی مدافعت پر مامور تھا اپنی فوج کے ساتھ چینی کمیونسٹوں سے مل گیا۔

پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین میں قومی حکومت کی حالت اور بھی خراب ہو گئی ہے کم سے کم امریکن اخبارات کی پریشانی سے یہی اندازہ ہوتا ہے اور چیانگ کائی شک کو ہر طرح کی مدد دینے کے مطالبے کئے گئے ہیں مشکل یہ ہے کہ اس وقت کمیونتانگ کی مدد جس طرح سے ہو رہی ہے اس سے کوئی کامیابی کی امید نہیں باندھی جا سکتی۔ لیکن امریکا میں مسٹر ڈیوی جو ریپبلکن پارٹی کی طرف سے صدارت کے امیدوار ہیں چین کی قومی حکومت کو زیادہ سے زیادہ مدد دینے کے وعدے بڑے زور شور سے کر رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ انتخاب کے بعد وہ ان وعدوں کو کہاں تک پورا کرتے ہیں۔ (ا۔ س)

بزمِ بے تکلف

(بسلسلہ صفحہ ۴)

موجودہ عہد کے اخلاقی ضعف معدہ پر ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ہمارے بزرگ بھی تو تھے جو میر ضاحک اور سودا کی ہجویں جعفر زٹلی کی ہزل، رنگین اور جان صاحب کی ریختی شوق کی مثنویاں، یہاں تک کہ چرکین کی اہمالیات ہضم کر جاتے تھے اور ڈکار نہ لیتے تھے بیچارے نئے ادب کی عریانیات میں ملّاجی صاحب کو خاک مزہ نہیں آتا۔ وہ تو اس اکیلے قائل ہیں جس سے مراد آباد میں مردہ زندہ ہو جائے جیا جوگی کی کسی تصنیف نہانی کا ذکر سنتے ہیں تو بڑے شوق سے منگوا کر پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر کہتے ہیں، "ہوا ہمیں دیکھ لیا" اس پر ستے پر تیتا پانی تا

غزل

باقر مہدی

بادہ خانوں پہ کوئی شعلہ فشاں ہے کہ جو تھا
بزم رنداں میں وہی شورِ فغاں ہے کہ جو تھا

اُن کا اندازِ تغافل ہے وہی اے غمِ دل
یاں وہی دردِ وفا سب پہ عیاں ہے کہ جو تھا

عالمِ عشق میں آتے رہے لاکھوں طوفاں
دردِ دل اب بھی وہی نذرِ بتاں ہے کہ جو تھا

حسن آدم پہ خزاں چھائی ہوئی ہے کہ جو تھی
چمن دہر سے اُٹھتا سا دھواں ہے کہ جو تھا

جگمگاتی ہوئی کرنوں سے سیاہی نہ مٹی
روح انساں پہ وہی بارِ گراں ہے کہ جو تھا

اپنی وحشت کے کرشموں کا تماشا کیسا
ابن آدم کا جنوں اب بھی جواں ہے کہ جو تھا

غزل

فرید بخش قادری

دیارِ شوق میں رسوا ہوئے ہیں فرزانے
انھیں فریب دیا اعتبارِ فردا نے

جنوں بھی خام ہے، ذوقِ طلب بھی خام ان کا
بھٹک رہے ہیں سرِ رہگذار دیوانے

خدا کرے کہ مجھے زندگی بھی راس آئے
زہے نصیب وہ آئے ہیں غم کو بہلانے

بلا سے ہجر میں تھی لذّتِ طلب باقی
تمھارے آتے ہی پرواز کی تمنّا نے

بس اتنا میں نے سُنا تھا بہار آئی ہے
پھر اس کے بعد گلستاں میں کیا ہوا جانے

گلہ

طیش صدّیقی

گلہ نہیں مجھے اے طیشؔ ان رفیقوں سے
جنھوں نے تیرگیٔ غم میں ساتھ چھوڑ دیا
گلہ نہیں مجھے ماحول کے شکنجوں سے
جنھوں نے اک دلِ بیدار کو مروڑ دیا
گلہ نہیں مجھے غدّار غم گساروں سے
جنھوں نے بادۂ نو رس میں سم نچوڑ دیا
گلہ نہیں مجھے مذہب کے ناخداؤں سے
جنھوں نے رشتۂ انسانیت کو توڑ دیا
گلہ ہے مجھ کو خود اپنی بلند فطرت سے
کہ اس نے شانۂ احساس کیوں جھنجھوڑ دیا

عینک فروش

(بسلسلہ صفحہ ۹)

جو خام کار راہ فرار میں تنہائی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوا ئے نفس سے اور گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات و جذبات کی مستی کو نشۂ معرفت، غرورِ نفسانی کو تکمیل روحانی، خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں، خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ بے شک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ رہنما بھی ہیں۔ ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہے۔ یہی دنیا ہے۔ کمزور دل اس دگدرے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط لوگ اس میں نیک سوئی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنے والا ہے اسی پر مجھ کو اترنا ہے۔ وہ دیکھئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں۔ اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی زبان میں سمجھا بھی دیا سنئے ؎

کاٹئے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تکلیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
بلتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلاتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو!
ہیں اسے پانی دئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ، میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے اپنا قصد بدلا یا نہیں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دے دیا تو پوچھنے کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ آیئے مصافحہ کر لیجئے۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر پیر مرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اتر کر چل دئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھی۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ اب کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بدحواسی میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا ہے اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے اپنے لحن شدادی میں چائے والے کو پکار رہے ہیں۔

عینک فروش

ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ مجھے معمولی سواری کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی سے تو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے سست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کرلے تو دن بھر میں منزل سے دور نہ ہٹے گا لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آ سکتا ہے۔ مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اُسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر یہ بتائیے کہ پچھلے ہفتے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی، اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر چاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلم مگر زندگی میں ان کا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں، غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کو کوئی دخل نہیں۔

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں موٹے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری نظر میں اُس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً ان کے چہرے کی زیارت ہوتی تھی مجھے ان کے موٹاپے سے اور ان کے یوں بے ساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آ کر خراٹے بھی لینے لگتے تھے تب تو بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انھیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دروازے سے باہر پھینک دوں۔

میری بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے لب خشک تھے۔ چہرے کا رنگ زرد تھا، اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد نیم دیسی، نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے، جنھیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آج موقع پا کر میں نے اتنا معلوم کرلیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اُسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا، اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اس لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجے میں خالی ڈبہ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے۔ مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کرے گا سامنے کی بنچ والے حضرت خواہ مخواہ مرد آدمی کا شمار لو اس وقت حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں، رہے وہ دونوں حضرات جو میری بنچ پر تھے، ان میں سے نوجوان تو بے چارے حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے، کچلنے مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی .... اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اُٹھے گویا یہیں اترنا چاہتے ہیں۔ مگر جب انھوں نے کھڑکی کے پاس جا کر اسٹیشن کا نام پڑھا تو کسی قدر مایوسی کے ساتھ آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کی طرف مڑ کر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انھوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید نزع کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہوگی۔ سودے والے کو بلایا اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی، پوری، کباب، دہی بڑے، ککڑی، امرود الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انھیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ لیکن جب انھوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسد ان کے صندوق شکم میں جا کر غائب ہوگیا کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ پھر آستین سے منہ پونچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی، اور پیر مرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کردی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بے حد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہو اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہ کہیں وہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل در معقولات کا کیا حق ہے۔ اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیر مرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کرے مگر نوجوان نے گھٹی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں؟ اب مجھے یقین ہوگیا کہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دور تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اس کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو۔ بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اُداس معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں کچھ ایسی پریشانیاں ہیں۔"

"آخر معلوم تو ہو وہ کون سی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کردیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے۔ میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گذار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں، اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے۔"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہوگی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہوگا۔"

"نہیں ایسا نہیں، راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے۔"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں اور اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے امین، زندگی کی کشمکش سے محفوظ، امن و عافیت سے دن گذار سکتا ہے۔ جہاں نہ اُسے بھائیوں کی غفلت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے، اور نہ ان کی نامہربانی، ناشکر گذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اس کی اصلاح کی کوشش کرکے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی مومیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں۔ خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر لوں، اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں۔"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں۔"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا۔ یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا۔ اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں۔ مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اُسے سن کر دکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دے دی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے دیے سے لبریز۔ میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا [illegible] چاہتا تھا کہ ان کو ناپاک [illegible] پر دوش [illegible] آزادی [illegible]

میں دو کر گزار کر دوں۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایمان ہے، خلوص ہے، درد ہے، قابلیت ہے، ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کے لئے ایک الاپ، دیوانوں کے لئے ایک ہو، عقل مندوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانۂ اُمید، ایک نعرۂ مستانہ چاہیے۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ غلامی کا طوق اُتار کر پھینک دیں گے، جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان قومی تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعثِ حیرت اور قابلِ تقلید ہوگا۔ یہ تھا میرا عقیدہ، یہ تھی میری اُمید۔

مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔ میں اور مجھ جیسے دہر تکلیفیں اُٹھا کر، کڑیاں جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں، رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں۔ سونے والے اُٹھے، مسافروں نے آگے قدم بڑھایا، اور جوش و خروش سے ہمت و استقلال سے بڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک آزادی کی منزل آگئی۔ مگر افسوس صد افسوس منزل پر پہنچ کر راہ طلب کے رہبروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ آزاد ہونے سے پہلے غریب ہندوستان کے بڑی بے دردی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے اس خوفناک عمل جراحی کے بعد ملک کے مجروح جسم سے اس قدر خون بہا کہ اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔

ہندوستان کے ضعف نے سب جماعتوں کے قلب و دماغ کو ضعیف کر دیا۔ ہندو، غصے، بیزاری اور شک کی ہسٹریائی خوف، کھسیانے پن اور ضد کی نفسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت یہ آئی کہ اس نازک وقت میں کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا نہ رہا۔ ان کے کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد، ان میں سے بعض اپنے پیرووں کو ہٹ کر چل دئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اس پر جھگڑنے لگے کہ دائیں کو مڑیں یا بائیں کو، آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا، یہ پھل ملا مدتوں کی ریاضت کا۔ میرا تو یہ دیکھ کر دل چھوٹ گیا، ہاتھ پیر شل ہو گئے، زبان بند ہو گئی، افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی۔ مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں نے سمجھا کہ یہ ہندوستانی مسلمان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتے رہیں گے۔ ناکامی اور ذلت اُٹھاتے رہیں گے۔ مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیابان کی طرف جا رہا ہوں، تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ندامت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے ذریعے سے معرفت اور نجات حاصل کروں۔"

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طیش کے یاس کا غلبہ ہو گیا ہے۔ میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے، سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں کی قلعی کھول دے۔ بہر حال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا، اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجھے ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انھوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا:-

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا، مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبۂ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہو کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا۔ شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہے، یاس اور اُمید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہوشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبیر کیوں؟ آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام۔ آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی؟"

"جناب! انسان کو جس نے عشق دیا ہے اسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر، تعقل، تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مر مٹے۔ اس کی مستی ہوشیاری کے سہارے چلتی ہے۔ اس کی دیوانگی دانائی کے پیروں پر آڑتی ہے عشق انسان کے دل میں شوقِ منزل پیدا کرتا ہے اور ذوقِ سفر، عقل اسے راہ سجھاتی ہے، اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں۔ لیکن میری عقل کہتی ہے کہ ملک و قوم کے پنپنے کی کوئی اُمید نہیں تو اپنی روح کو بچا اور اس کی بالیدگی کا سامان کر۔"

"الحمد للہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے اہلِ حال کے یہاں تو عقل بے چاری راندۂ درگاہ ہے۔ اس لئے کہ وہ عشق کی ضد سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہو گئی، عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی ہنگامۂ زندگی سے مایوسی اور گوشۂ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے پہلے اس یاس کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدانخواستہ نظامِ عالم اور قانونِ زندگی سے نہیں ہے۔ بلکہ انسانوں سے ہے۔ اپنے ملک کے مسلمانوں سے ہے۔ آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص و ایثار، پامردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی جماعت ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ رحمتِ ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنی جماعت کی طرف سے نا اُمیدی جو آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگرچہ ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے، ہندوستان بلکہ ایشیا کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتلائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ لوگ خواب غفلت سے چونک اُٹھے ہیں۔ ان کی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انھوں نے راہ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں، مگر سنبھل جاتے ہیں۔ تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوے نہیں کر سکتا کہ اسے انجام کا یقینی علم ہے۔ بڑے سے بڑا دانشمند علامات پر حکم لگاتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اٹھی ہے یہ اب رکنے والی نہیں، یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے، بہت نشیب و فراز دیکھیں گے۔ مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ زندگی کا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ دستور ہے خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامی کو رو رہے ہیں وہ ہندوستانی قومیت کے سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کا لوہا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا نامردی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتھوڑے کی چوٹ کھانے دیجئے کہ وہ فولاد بن جائے، پھر کڑی میں کڑی پڑتی جائے گی، سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپ کی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے تیز بخار بعد مدت کے اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی۔ اور اُمید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اُسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرا نوردی کی ایک مدت معین کر لوں اور اسے پورا کر کے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہیے۔ لیکن لوہا اگر زنگ آلود ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں آپ کا بخار اگر اترا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے اُمید کی تہ اُبھرنے کو مستعد تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی .... میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیمار دار کا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیۂ نفس کے ہفت خواں کو طے کر لیں گے۔ یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اُتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ تو ہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اُسے فولاد بناتی ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے

(بقیہ صفحہ، پر)

دور کے ڈھول سہانے

(ادیبہ)

صالحہ عابد حسین

ادیبہ کا نام سنتے ہی ہم لوگ عجیب قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس کی صورت کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کم سے کم اپنے قصوں کی ہیروئن جیسی حسین ہوگی۔ اس کے چہرے سے علمیت اور لیاقت ٹپک رہی ہوگی، اس کی گفتگو میں ڈراما کے مکالموں کا سا انداز ہوگا، غرض عام انسانوں، معمولی عورتوں سے بالکل الگ کچھ یونانی دیوی سے ملتی جلتی ہوگی۔ اور کیوں نہ ہو؟ اس کے دماغ میں مضمون، افسانے اور ناول پرورش پاتے ہیں، وہ کرداروں کی خالق ہے، اپنے قلم کی معمولی جنبش سے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسان پیدا کر دیتی ہے لیکن جب خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کسی ادیبہ یا مصنفہ سے ہماری ملاقات ہوتی ہے تو اکثر یہ خیالی قلعے مسمار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے! ارے یہی ہیں وہ مشہور و معروف ادیبہ؟ انھیں کی اس قدر شہرت ہے؟ بھئی ہماری نظر میں تو کچھ جچیں نہیں۔ بھلا یہ کیا خاک لکھتی ہوں گی۔

بے شک حقیقی فن کار میں بعض باتیں ضرور عام لوگوں سے مختلف اور غیر معمولی ہوتی ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ آپ اس کے چہرے پر لکھی ہوئی نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی صورت، گفتگو، طرزِ زندگی اور روزمرہ کے مشاغل عام طور پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے دوسروں کے۔ فرق جو کچھ ہے وہ دل و دماغ کے لحاظ سے ہے۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور تخیل بلند ہوتا ہے اور یہی احساس کی شدت، مشاہدہ کی گہرائی، تخیل کی بلندی فن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ سچا فن کار اپنے فن کا اظہار نہ لوگوں کو متحیر اور مسحور کرنے کے لئے کرتا ہے نہ تعریف و تحسین کا خراج وصول کرنے کے لئے اور نہ روپیہ کمانے کی خاطر۔ بلکہ اس کی اندرونی کیفیات اور جذبات ذوقِ اظہار سے مجبور ہو کر اپنے لئے کوئی پیکر تلاش کر لیتی ہیں۔ کبھی وہ پتھر کے بے حس ٹکڑے میں جان ڈال کر بت تراش کہلاتا ہے، کبھی موقلم اور رنگوں سے کاغذ کے ورق کو زندۂ جاوید بنا کر مصور کا لقب پاتا ہے، کبھی الفاظ میں شعر کا اعجاز دکھا کر پیمبرِ سخن بنتا ہے اور کبھی نثر میں اپنے احساس و جذبات کا اظہار کر کے ادیب کہلاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ادیب کی ان خصوصیات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ وہ دیکھنے میں دوسرے انسانوں سے مختلف معلوم ہو۔

اور پھر ادیب یا ادیبہ کے متعلق یہی نہیں اور بھی بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کو ہوتی ہیں۔ بظاہر لوگ سمجھتے ہیں بھئی کیا قسمت کے دھنی لوگ ہیں۔ محفلوں اور جلسوں میں انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ گھیر کے دنیا بھر کی باتیں پوچھتے ہیں، نوعمر لڑکے، لڑکیاں اپنی آٹوگراف بک میں ان کے دستخط لیتے ہیں، رسالوں اخباروں میں ان کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کے کتابوں کے اشتہاروں میں تو کچھ نہ پوچھیے، تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں...... بھئی کیا خوش قسمت لوگ ہیں دو چار قصے کہانیاں لکھ کر مفت کی شہرت اور عزت مل گئی۔ کاش لوگ یہ جانتے کہ فطری اور سچے ادیب کا مقصد کبھی سستی شہرت یا ظاہری عزت حاصل کرنا نہیں ہوتا اور اس کی راہ میں ایسی ایسی مشکلیں ہوتی ہیں کہ اگر وہ اپنی فطرت سے مجبور نہ ہو تو کبھی لکھنے کی مصیبت اپنے سر نہ لے۔

دنیا میں عورت پر ایک تو یوں ہی قدرت نے غیر معمولی ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ پھر ہندوستانی عورت کو تو سماج نے پابندیوں میں اس طرح جکڑا ہے کہ اس کا ہلنا مشکل ہے۔ گھرداری کے فرائض، شوہر کی ناز برداری، خاندان کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس کی جان۔ اگر ان سب کے ساتھ ساتھ وہ ایک ادیب کا دل اور دماغ بھی رکھتی ہے تو اس کی بدقسمتی میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ سب فرائض ادا کرنے ہیں جو صدیوں سے اس کے ذمے چلے آ رہے ہیں۔ دوسری طرف دل اور دماغ کے تقاضے سے لکھنے پر بھی مجبور ہے۔ اگر دوسرے فرائض میں سارا وقت گنوا دیتی ہے تو ذوقِ خامہ فرسا چین نہیں لینے دیتا اور اگر لکھنے میں کچھ وقت صرف کرنے کی وجہ سے گھریلو اور خاندانی فرائض میں کچھ کوتاہی ہو جائے تو لوگوں کے تانے تشنے سننے پڑتے ہیں۔ یوں اکثر دوست اور عزیز اس کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھ لیتے ہیں، آپ کا کیا کہنا —— آپ ٹھیریں ادیبہ! ارے بھئی ان سے ڈرو —— ان کے ہاتھ میں قلم ہے جانے کیا لکھ ماریں! میاں مضمون نگار بیوی کا ڈر تو اکبر تک نے مانا ہے! وغیرہ وغیرہ عام طور پر ادیبہ کو اپنے دوستوں عزیزوں سے اس قسم کے مزاحیہ اور طنزیہ فقروں کا انعام ضرور ملتا ہے۔ گویا ذوقِ ادب ایک مضحک چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ لیلیٰ اس شوق کو نہیں چھوڑتی...... کیوں؟ اس لئے کہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ شدتِ احساس کی بدولت وہ معمولی معمولی واقعات سے متاثر ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی اس کی نظر وہاں تک پہنچا دیتی ہے جہاں دوسروں کا تصور بھی نہیں پہنچتا، اور تخیل کی بدولت دماغ میں افسانے کا پلاٹ مرتب ہو جاتا ہے۔ اور وہ مجبور ہو جاتی ہے کہ کس طرح ان کیفیات، احساسات اور جذبات کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کر دے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے لئے وقت نکالتی ہے...... اگر نہیں لکھ سکتی تو ایک بے چینی ایک الجھن ایک کشمکش اس کے دماغ کے اندر برابر رہتی ہے۔

انسان کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ارد گرد اپنے ہم مذاق اور ہم خیال لوگوں کو دیکھنا اور ان ہی سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ مگر شاید قسمت ہی سے ہمارے ملک میں کسی ادیب عورت کو ایسا مناسب اور پسندیدہ ماحول نصیب ہوتا ہو...... بڑی خوش نصیبی سمجھیے اگر کسی عورت کو خاندان میں یا دوستوں میں دو ایک ایسے لوگ مل جائیں ورنہ اکثر لوگ ادب سے بیگانہ اور خود ادیبہ کی قابلیت اور صلاحیت سے ناواقف ہوتے ہیں...... یا وہ ان میں ان کی سی بن کر رہے اور اپنے ذوقِ ادب کو دبائے رکھے، یا ان کے سامنے اپنے ذوق کا اظہار کر کے جھینپ کے آگے بین بجائے اور خود ان کے طنز اور مذاق کا نشانہ بنے۔ کسی ادیبہ کے دل سے پوچھیے کہ یہ ناموافق ماحول اس کے دل پر کیسا گراں گزرتا ہے۔

اور پھر ہماری ادیبہ کے لئے یہ رسالے اخبار اور ایڈیٹر بھی ایک مستقل مصیبت ہیں۔ جب وہ نو مشق اور غیر معروف ہوتی ہے تو ایڈیٹروں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے اور اسے ان کا احسان مند رہنا پڑتا ہے، اور جب مشہور ہو جائے تو ان کے اصرار اور تقاضے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اکثر ان رسالوں کا مذاق بھی عجیب ہوتا ہے، ادیب اپنی امنگ اور شوق سے کچھ لکھتا ہے جس میں اس کی خوبیاں اور صلاحیتیں اجاگر ہیں مگر ایڈیٹر صاحب کو وہ ناپسند ہے۔ وہ اس میں ترمیم اور تنسیخ کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اکثر افسانے کا پلاٹ بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ ادیبہ دو ایک رسالوں کو پسند کرتی ہے اور اس میں لکھنا چاہتی ہے، لیکن بچاری کے پاس بیسیوں ایڈیٹروں کے خط آتے ہیں کہ ہمارے علمی، ادبی، معاشرتی، مذہبی، رسالے کے لئے مضمون، افسانہ، نظم (وہ بھول جاتے ہیں کہ ادیبہ شاعرہ نہیں) بھیجیے...... ایک مرتبہ کے انکار سے وہ مطمئن نہ ہوں گے۔ بار بار اصرار کریں گے، خفا ہوں گے، مغرور، کنجوس، خود غرض کہیں گے، اور فرمائش جاری رکھیں گے۔

ایک نئی مصیبت ادیبہ پر افسانوں کے مجموعوں کی شکل میں نازل ہوتی ہے جسے دیکھیے ادیبہ سے ایک افسانے کا طالب ہے تاکہ اپنے "بے مثل" "نایاب" مجموعے میں اسے شائع کر کے ادیبہ کی عزت افزائی کرے۔ یہ مجموعے عام طور پر حقیقی معنوں میں نایاب ہوتے ہیں یعنی ان کے چھپنے اور شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ادیبہ اپنے دماغی مشاغل میں اتنی منہمک، اپنی خیالی دنیا میں اس قدر مگن رہتی ہے کہ دنیاوی فکریں، خاندانی جھگڑے، مالی پریشانیاں اسے نہیں ستا سکتیں۔ وہ ان سب سے بالاتر ہے۔ بھلا وہ فکرِ دنیا میں کیوں سر کھپائے ع وہ کہاں اور یہ وبال کہاں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ادیبہ بھی انسان ہے، عورت ہے، اسے بھی وہ ساری مشکلیں اور پریشانیاں سہنی پڑتی ہیں جو کسی اور عورت کو اور چونکہ وہ زیادہ حساس ہوتی ہے اس لئے انھیں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی محسوس بھی کرتی ہے۔ اور پھر اس کے لئے تو اور مصیبت ہے اسے دوسروں کے رنج و غم، مشکلوں اور پریشانیوں تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ مشاہدہ کی گہرائی اور نظر کی وسعت کی وجہ سے اپنے ذاتی غم و الم اور مشکلوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی عذاب کر دے، مگر یہ خیال کہ دنیا میں دوسرے لوگ بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ قابلِ رحم ہیں، اس کی ذاتی مشکلوں اور مصیبتوں کو ایک حد تک ضرور قابلِ برداشت بنا دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اسے غمِ روزگار —— یعنی ساری دنیا کے غم کا روگ لگ جاتا ہے۔ خصوصاً ہمارے دیس کی آج کل جیسی ابتر حالت ہے کہ وہ ایک حساس ادیبہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ جس طرف نظر اٹھاتی ہے اسے افلاس جہالت بیماری، نفرت، عداوت

(بقیہ صفحہ [illegible])

سونا کیا ایک مصیبت ہے

عبدالحلیم ندوی

عرصہ سے امریکا میں ایک پیلے رنگ کی خطرناک دھات کی بڑی ہوشیاری اور فنی مہارت کے ساتھ حفاظت کی جا رہی ہے۔ یہ خطرناک دھات جس کے لئے دائمی پہروں اور چوکیوں کا انتظام کیا گیا ہے کوئی عجیب و غریب انجان دھات نہیں ہے۔ ہم آپ سبھی اس کو جانتے اور پہچانتے ہیں ـــــــ اسے سونا کہتے ہیں۔ پیلے رنگ کی چمکیلی اور جاذب نظر دھات۔

امریکہ نے ساری دنیا سے گھسیٹ کر ۲۲ ارب ڈالر کی قیمت کا سونا اپنے بہترین فولاد اور سیمنٹ کے بنے ہوئے تہہ خانوں میں بحفاظت تمام دفن کر رکھا ہے۔ ان تہہ خانوں کی مضبوطی اور پائداری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نہ ان کی چھتوں پر بموں کا اثر ہو سکتا ہے اور نہ وہ آسانی سے گرائے اور توڑے پھوڑے جا سکتے ہیں اور دروازے ایسے دیو پیکر کہ صرف ایک کا وزن ۲۰ ٹن ہے

ذرا اس کا تصور کیجئے کہ اگر یہ سب سونا دنیا کی سب قوموں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو دنیا کا نقشہ کیا ہو جائے؟ لیکن اس دولت کے مالک امریکی آپ کے ان حسین تصورات سے بے نیاز اپنی پالیسی سے نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے خوب کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آگے چل کر دنیا کو ایک سخت قسم کی معاشی تباہ حالی سے یقیناً دوچار ہونا ہے اور ایسے نازک موقعہ پر ہم اپنی دولت سے اس کا مقابلہ کریں گے اور دنیا کے دکھوں کو کم کرنے میں مدد دیں گے۔

آج کل دنیا کا معیار مبادلۂ زر اس قدر مضحکہ خیز ہو گیا ہے کہ بالکل پیشہ ور مسخروں کی طرح آئے دن شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ امریکہ نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا، چنانچہ اس نے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک کے اس قلیل عرصہ میں جتنا بھی سونا ہاتھ لگا بلا تامل خرید لیا ہے چاہے آسٹریلیا، افریقہ، کناڈا اور چین کے کان کن زیادہ سے زیادہ جتنا سونا نکال سکتے تھے نکالتے رہے اور امریکا اسی تیزی سے اسے اپنے تہہ خانوں میں دفن کرتا گیا

اور آج وہی سونا امریکا کے خزانوں میں عام ایسی اینٹوں کے برابر اسی شکل اور موزونیت کے ساتھ پوری حفاظت سے موجود ہے۔ ان میں سے ہر اینٹ کی قیمت تین ہزار ڈالر اور ہر ایک کا وزن ۲۷ ۱/۲ پونڈ ہے۔

سونے کی یہ اینٹیں جن بڑے بڑے زیر زمین تہہ خانوں میں جمع کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑا اور سب سے مضبوط ناکس کیٹکی نامی قلعہ ہے۔ امریکا میں ناکس جیسے عظیم الشان تہہ خانے ایک دو نہیں بلکہ پورے چودہ ہیں اور ہر ایک کی حفاظت مائیکرو فونز برقی آنکھوں، اشک آور دھانوں اور خطرے کے پیچیدہ آلات کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

یہ سب حفاظتی تدبیریں اور پہرہ داروں کے انتظامات صرف ایک زرد رنگ کی دھات کی حفاظت کے لئے کئے جاتے ہیں جو خواہ مخواہ ساری دنیا میں اس قدر گراں بہا اور قابل قدر چیز بن گئی ہے۔ حالانکہ اسی دنیا میں تقریباً ۲۹ دھاتیں اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور قابل قدر بڑی ہوئی ہیں۔ مثلاً ریڈیم ہی کو لے لیجئے کہ ایک اونس کی قیمت دس گنے سونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن سونے کی مخصوص شکل میں دولت کا تصور دنیا میں کچھ اس طرح عام اور اس قدر رائج ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اگر کسی دھات کو پیش کیجئے تو سب آپ پر ہنسیں گے اور آپ کی عقل کا ماتم کریں گے۔

امریکا والوں کو سونا جمع کرنے کا خبط دراصل پریذیڈنٹ روزولٹ کی پالیسی کی وجہ سے ہوا جس وقت انھوں نے اپنے عہدہ صدارت کا چارج لیا ہے امریکا کی مالی ساکھ بہت گر چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بین الاقوامی تجارت کو اپنے ملک کے حق میں سازگار بنانے کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ ڈالر کی قیمت بڑھا دی برطانیہ نے بھی یہی ترکیب ۱۹۳۱ء سے اختیار کر رکھی تھی۔ انھوں نے یہ تدبیر اس خیال سے کی کہ جب سونے کی قیمت چڑھے گی تو لازماً تجارتی اشیا کی قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ اور چونکہ دنیا کی منڈیوں پر ہمارا قبضہ ہے اس لئے اس سے خوب نفع ہوگا اور ملک میں خوشحالی پیدا ہو جائے گی۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا لیکن اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی ہوئی اور وہ یہ کہ جونہی سونے کی قیمت بڑھی ساری دنیا میں بڑی تیزی اور کثرت سے اس کی تلاش اور کھدائی کا کام ہونے لگا پہلے سونے کی جتنی قلت تھی، دیکھتے دیکھتے اس کی اتنی ہی کثرت ہو گئی۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بہت شدید قسم کی افراط زر پیدا ہو گئی۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ میں اس قدر سونا کبھی نہیں نکلا جتنا اس قلیل عرصے میں نکال لیا گیا۔

جن ملکوں میں پہلے سے سونے کی کھدائی کا کام ہوتا تھا ان کے علاوہ افریقہ میں نئے کارخانوں میں کام شروع ہوا۔ روس نے "لینا" کے کان کا جب پورا سونا نکال لیا تو اپنی دوسری مقبوضات میں لگا لگا دیا، اور ہندوستان کے راجے مہاراجے اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی اپنے طلسمی خزانوں کے منہ کھول دئے اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر خوب خوب سونا بیچا۔ چنانچہ یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مشرق بعید نے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے مختصر سے عرصے میں ایک ارب ۲۸ کروڑ ڈالر کی قیمت کا سونا اگل دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ سب سونا ہوتا کیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سارا سونا ڈھل کر امریکا کے پُراسرار اور گہرے تہہ خانوں میں پہنچ کر دفن ہو جاتا تھا۔ کیونکہ امریکا کو اس زمانے میں ایک مخصوص قانون کے ذریعے (جسے اس نے اپنے نفع کی خاطر خود ہی بنایا تھا) یہ حق مل گیا تھا کہ جتنا سونا بھی اسے پیش کیا جائے وہ ساٹھ ڈالر فی اونس کے حساب سے خرید لے۔ برطانیہ نے بھی فی اونس سات ڈالر شرح مقرر کی تھی لیکن اس نے امریکا کے مقابلے میں بہت ہی کم سونا خریدا۔ مسٹر روزولٹ کی صدارت کی ابتدا میں امریکا کے پاس صرف چار ارب ڈالر کی قیمت کا سونا تھا

۱۹۳۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸ ارب ڈالر ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے وقت ریاستہائے متحدہ امریکا کا ذخیرۂ طلا بڑھ کر سولہ ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ ۱۹۴۲ء میں تو یہ تعداد ۲۳ ارب ڈالر ہو گئی۔ اور اس طرح دنیا کا ۴/۵ حصہ سونا امریکا کے پراسرار خزانوں میں پہنچ گیا لیکن اس کے باوجود امریکا کی پیاس نہ بجھی اور ہل من مزید کا نعرہ برابر بلند ہوتا رہا۔

یہ حالت کب تک رہتی آخرکار ۱۹۳۶ء میں برطانیہ اور امریکا دونوں سونا جمع کرتے کرتے عاجز آ گئے اور دونوں قوموں کے ماہرین معاشیات نے مل کر یہ طے کیا کہ ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے سونے کی اہمیت ذریعہ مبادلہ کی حیثیت سے کم ہو جائے۔ چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد ان مفکرین نے مطلوبہ سونے کو "بانجھ بنانے" کا نسخہ تجویز کیا جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ان ماہرین نے پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور گہری خندقیں کھود کر ان میں سونے کو دفن کر دیا۔ ممکن ہے یہ طریقہ شروع میں بہت موثر معلوم ہوا ہو لیکن جب اس کو برتا گیا تو پتہ چلا کہ اس پر تو بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ کیونکہ جن قلعوں میں امریکا نے دنیا کا سونا سمیٹ کر بھر رکھا تھا۔ ان کی پاسبانی کے لئے انھیں بہت سے پہرہ دار رکھنے پڑتے تھے اور ان کو معقول تنخواہ دینی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سونا امریکا کے شہریوں سے قرض لے کر خریدا گیا تھا اور ان کو خاصا منافع دینا پڑتا تھا۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر امریکا کے لوگ پریذیڈنٹ روزولٹ کی پالیسی کے خلاف سونے کی قیمت گرا دیں تو مجبوراً سونے کے کان کن کھدائی کا کام بند کر دیں گے اور پھر امریکا کو زمین کے اندر اس کے گاڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ جہاں تک محض جمع کرنے کا تعلق ہے وہ بہت خوشی سے اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن جب اخراجات کا معاملہ آتا ہے تو ہمت جواب دینے لگتی ہے لیکن اس صورت میں اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں ایک عالمی کساد بازاری نہ پیدا ہو جائے۔ امریکا کے لوگوں کو یہ خطرہ ہے کہ اس عمل سے معیار طلا برقرار نہ رہ سکے گا اور دوسروں کے مقابلہ میں امریکا پر اس کا براہ راست اثر پڑے گا۔ کیونکہ جب سونے کی قیمت گرے گی تو غلے کی قیمت بھی گر جائے گی اور اس طرح کسان طبقہ مارا جائے گا اور اگر اس کی موجودہ قیمت میں آدھی تخفیف کر دی جائے تو اس کا اثر کان کنوں پر یہ پڑے گا کہ وہ اپنا کام چھوڑ دیں گے اور سونے کی رسد کم ہو جائے گی، اور جب رسد کم ہو جائے گی تو دنیا کے حصوں کے بازار میں زلزلہ آ جائے گا اور ساری دنیا کے اسٹاک ایکسچینج تہ و بالا ہو جائیں گے۔

اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھا اگر سونے کی قیمت بالکل گرا دینے میں یا کم کر دینے میں یہ خطرات اور پیچیدگیاں ہیں تو امریکا سرے سے سونا خریدنا ہی کیوں نہ بند کر دے کہ قصہ ہی پاک ہو جائے۔ لیکن امریکا کے حق میں یہ اور زیادہ بدتر ہے۔ کیونکہ اس طرح تو اس نے اب تک جتنا سونا خریدا ہے اس کی قیمت گر کر صفر کے برابر ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ دنیا کے لئے بھی یہ کچھ سود مند نہیں اس لئے کہ اگر امریکا جو اس وقت دنیا میں سونے کی سب سے بڑی منڈی ہے ٹھپ ہو جائے تو ایشیا

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبدالحلیم ندوی

تاریخ اشاعت یکم [illegible] ۱۹۴۸ء
چندہ: سالانہ [illegible] ششماہی [illegible]

کی قیمتیں بھی لازماً گر جائیں گی اور پھر اسی کساد بازاری کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے جو قیمت کے کم کرنے کی صورت میں پیدا ہو رہی تھی۔

انھی دشواریوں اور پیچیدگیوں کی بنا پر امریکا دھڑے سے سونا خریدے جا رہا ہے ادھر برطانیہ کی یہ کیفیت ہے کہ اب اس کو اپنا پس انداز سونا بھی بیچنا پڑ رہا ہے چنانچہ آسٹریلیا سے جتنا بھی سونا نکلتا ہے برطانیہ اس کو ایک ہاتھ سے خریدتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ڈالر کی خاطر امریکا کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا اور خاص طور پر آسٹریلیا میں سونا نکالنے کا کام بڑی سرگرمی سے شروع ہو گیا ہے، اور اب جو آسٹریلوی سونے کی برآمد کا حکومتی تخمینہ بعد وضع محاصل کیا گیا ہے تو پتہ چلا کہ گذشتہ سال آسٹریلیا نے ۹ لاکھ ۱۰ ہزار ۸ سو اونس سونا برآمد کیا ہے جس کی قیمت ایک کروڑ ڈالر تھی، اور ابھی اس مقدار میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہے ماہانہ ترقی کی رفتار ۴۰ ہزار اونس سونا ہے۔ یہ سب سونا سب سے پہلے برطانیہ آتا ہے اور پھر یہاں سے امریکا منتقل ہو جاتا ہے اور امریکا اسے زمین کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دیتا ہے۔

اس وقت اشد ضرورت اس کی ہے کہ اس الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ماہرین معاشیات اس نیک ساعت کا انتظار کر رہے ہیں جب انسائیکلو پیڈیا کے اوراق میں سونے کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہوگی:-

"سونا ایک نرم دھاتی اور [illegible] پیلے رنگ کی دھات ہے جس کا جوہری [illegible] ۱۹۷ء ۲ اور ثقل نوعی ۱۹ء۳۲ ہے۔ اس دھات کا استعمال کارخانوں، نگارخانوں اور آرائشی کاموں میں کم ہوتا ہے۔ پہلے اس کو کانوں سے کھود کر باہر نکالتے تھے اور پھر دوبارہ زمین کی گہرائیوں میں دفن کر دیتے تھے اور اس خیال کے پیش نظر اس کی بہت سخت حفاظت کی جاتی تھی کہ اس کے بل بوتے پر مالیاتی کارروائیاں بڑے اطمینان اور استقلال سے کی جا سکتی ہیں!" (ترجمہ)

ہم کیا کریں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

صفوں میں نئے لوگ کم بھرتی ہوتے تھے۔ اب کوشش کا ایک نیا میدان یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کاریگروں کی اچھی تعلیم اور انھیں کام سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ اس کی صلاحیت ہمارے عوام میں ہے، روایات بھی ہیں، قومی کام کرنے والوں کو انھیں بے کار نہ جانے دینا چاہیے۔

مگر یہ سب باتیں جو میں نے اوپر لکھی ہیں محنت چاہتی ہیں اور ہمت کی طالب ہیں جو ہمت ہار بیٹھے گا اور محنت سے جی چرائے گا اس کے لئے ہندوستان میں کیا ہر جگہ حلال معیشت کی راہیں بند ہیں۔ حرام کے کچھ اور راستے بھی ہیں، خدا کرے وہ مسلمانوں پر، نہیں سارے انسانوں پر، جلد سے جلد بند ہو جائیں اور مسلمان اگر ان کے بند کرانے والوں میں ہو جائیں تو دنیا میں اپنا صحیح منصب پورا کریں گے۔

معاصرین کی خدمت میں

"نئی روشنی" کے مضامین بہت سے معاصرین اپنے صفحات میں نقل کرتے ہیں مگر ان میں سے بعض "نئی روشنی" کا حوالہ نہیں دیتے۔ ان سے درخواست ہے کہ براہ کرم حوالہ ضرور دے دیا کریں۔

دور کے ڈھول سہانے (بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ظلم، ناانصافی، زرپرستی، لالچ، خودغرضی، مصیبت اور مشکلات کا سمندر لہریں مارتا نظر آتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ حقیقت کی تلخیوں کو بھلانے کے لئے تخیل کی دنیا میں پناہ لے تو یہ بھی اس کے لئے ناممکن ہے، جیسے خدا نے آنکھیں دی ہیں اور دل دیا ہے جو اپنے ملک قوم اور اپنی جنس کی یہ زبوں حالت دیکھتی اور اس سے متاثر ہوتی ہے اسے کس طرح دماغی سکون میسر آ سکتا ہے اس کے تخیل میں بھی یہی درد و مصیبت کی دنیا بسی رہتی ہے۔ اس کے قلب پریشان کو دیکھ کر اور محسوس کر کے جو کیفیت گذرتی ہے اسے وہ افسانے یا ناول کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتی ہے کیونکہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ محسوس کرے اسے بیان بھی کر دے لیکن اسی کے ساتھ ایک حقیقی اور سچے ادیب کا فرض یہ بھی ہے کہ خدا نے جو صلاحیت اسے دی ہے اس سے کام لے کر اپنے اردگرد کی دکھ بھری دنیا کی اصلاح کی کوشش بھی کرے۔ آج کل اپنے دیس کی حالت دیکھ کر عام طور پر درد مند اور حساس دل لوگوں پر ایک مایوسی اور بے بسی کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے کیا یہ دکھ بھری دنیا پھر سکھ کا سانس لے گی؟ یہ سسکتی ہوئی انسانیت کیا پھر سے زندہ ہو سکتی ہے؟ یہ بدنصیب دیش اس کے جاہل مفلس باشندے، اس کی جہالت اور ظلم کے بوجھ سے دبی ہوئی عورتیں ابھر سکتی ہیں؟ ترقی کر کے اپنی اور دوسروں کی زندگی بنا سکتی ہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب محال ہے اور اس احساس کے ساتھ دل پر جو درد و غم کی کیفیت گذرتی ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن بلند مقصد، بلند خیال، بلند نظر ادیب کو اس تاریکی میں بھی روشنی کی کرن نظر آ جاتی ہے [illegible] انسانیت [illegible] ادیب کو خدا پر بھروسہ ہونا چاہیے۔ اسی انسان میں انسانیت سوئی ہوئی ہے جس کا ابھارنا ہر ادیب کا فرض ہے، خصوصاً ادیب عورت کا۔

ساری دنیا کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کیا آسان کام ہے؟

(لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی)

طابع و ناشر۔ عبداللطیف اعظمی بی اے (جامعہ) مطبوعہ جید پریس، دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۷ | ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

ماضی حال کے آئینے میں

جواہر لال نہرو

مجھے تاریخ سے دیر میں سابقہ پڑا اور وہ بھی اس طریقے سے نہیں کہ ان واقعات کا مطالعہ کرتا اور ان سے نتیجے نکالتا جنھیں میری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا جب تک میں یہ کرتا رہا تاریخ میری نظر میں ایک بے معنی چیز تھی۔ مابعد الطبیعی نظریات سے یا آئندہ زندگی کے مسائل سے مجھے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ شوق سائنس سے روزمرہ کے واقعات سے اور موجودہ زندگی کے مسائل سے تھا۔

فکر، جذبے اور ارادے کے ایک معجونِ مرکب نے جس کا مجھے محض دھندلا سا شعور تھا۔ مجھے عمل پر ابھارا اور عمل نے میرے اندر مزید فکر کا شوق اور اپنے زمانے کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ چونکہ اس زمانے کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں اس لئے میں نے ماضی پر تحقیق کی نظر ڈالی اور ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہا جن سے حال کے سمجھنے میں مدد ملے۔ اس حالت میں بھی جب میں پچھلے واقعات اور گذرے ہوئے لوگوں کے خیال میں محو ہو جاتا تھا اور مجھے یہ خبر نہ رہتی تھی کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں، حال کا تصور برابر میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ماضی کے قبضے میں ہوں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ آج سارا ماضی میرے تصرف میں ہے۔ گذشتہ تاریخ موجودہ تاریخ میں جذب ہو جاتی تھی اور ایک زندہ حقیقت بن جاتی تھی جو راحت و الم کے احساسات سے وابستہ تھی۔

جہاں ماضی حال بن جاتا تھا وہاں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ حال پیچھے ہٹتے ہٹتے بہت دور چلا جاتا تھا اور ماضی کی طرح پتھر کی بے حس و حرکت مورت بن کر رہ جاتا تھا۔ عین شدت عمل کی حالت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی گذرا ہوا مرحلہ ہے جسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ یہی ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی خواہش تھی جس کی وجہ سے میں نے اب سے بارہ سال پہلے "تاریخ عالم کی ایک جھلک" اپنی بیٹی کے نام خطوط کے پیرائے میں لکھی۔ میں نے یہ کتاب سرسری طور پر سیدھے سادھے اسلوب میں لکھی تھی اس لئے کہ میرا خطاب ایک کم سن لڑکی سے تھا۔ اس کی تہہ میں وہی تحقیق اور تلاش کی لگن تھی، مجھ پر فہم جوئی کا شوق غالب تھا۔ اور میں پرانے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک ایک کرکے تاریخ کی منزلوں سے گذر رہا تھا جیل میں فرصت ہی فرصت تھی مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ کوئی ضروری کام ہے جسے ایک مقررہ مدت کے اندر ختم کرنا ہے اس لئے جب جی چاہتا تھا تیزی سے قدم بڑھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا تھا رک جاتا تھا، تاکہ تاثرات دل میں اچھی طرح بیٹھ جائیں اور ماضی کی سوکھی ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھ جائے۔ یہی تحقیق کی دھن تھی۔ اگرچہ اس کا دائرہ اپنے زمانے اور جانے بوجھے لوگوں تک محدود تھا جس نے آگے چل کر مجھ سے "میری کہانی" لکھوائی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس بارہ برس میں بہت کچھ بدل گیا ہوں، مجھ میں غور و فکر کا مادہ بڑھ گیا ہے۔ شاید پہلے کے مقابلے میں کچھ توازن اور تجرد طبیعت میں قدرے اطمینان و سکون پیدا ہو گیا ہے۔ اب المناک واقعات کا مجھ پر اتنا شدید اثر نہیں ہوتا دل میں ہیجان کم پیدا ہوتا ہے اور کم دیر تک رہتا ہے۔ حالانکہ المناک واقعات اس زمانے میں پہلے سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یا صرف یہ بات ہے کہ اعصاب سخت ہو گئے ہیں۔ یہ محض کہولت کا اثر، قوت حیات کا انحطاط، جوش زندگی کی کمی ہے یا اس کا نتیجہ ہے کہ مدتوں قیدخانے میں رہنے سے زندگی کا چڑھا ہوا دریا رفتہ رفتہ اتر گیا ہے۔ خیالات کے جھونکے آکر گذر جاتے ہیں اور ذہن کی سطح پر خفیف سے ہلکورے چھوڑ جاتے ہیں، افکار اور آلام کا مارا ہوا دل قرار کی تسکین ڈھونڈھتا ہے جو اس صدمے سہتے سہتے بے حس ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا رنج و مصیبت کے بوجھ میں اس قدر دبی ہوئی ہے کہ تھوڑی سی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف ایک چیز ہے جسے کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ یہ عزم ہے کہ ہم ہر حال میں ہمت اور وقار کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں گے اور ان آدرشوں کو نہ چھوڑیں گے، جن کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔

کچھ دن ہوئے کسی نے کہا تھا "موت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے"۔ بات تو صحیح ہے۔ مگر کہنے کا انداز عجیب ہے۔ اس پیدائشی حق سے نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ ہم خود ہی کوشش کرتے کہ جہاں تک ہو سکے اس حق کو بھول جائیں اور جتنے زیادہ عرصے تک ممکن ہو اس کے استعمال سے بچے رہیں پھر بھی جملہ نیا اور دلچسپ ہے۔ جو لوگ زندگی سے اس قدر نالاں ہیں ان کے لئے نجات کی راہ ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ جب چاہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ اگر ہمیں زندگی پر قابو نہیں موت پر تو اختیار ہے۔ یہ ایک دل خوش کن خیال ہے جس سے بے بسی کا احساس کم ہو جاتا ہے

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ماضی حال کے آئینے میں	جواہر لال نہرو	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
محتاط اشتراکیت یا روشن خیال سرمایہ داری	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف	ع، ح	۳
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع، ل	۴
۲۔ پاکستان	ع ل	۵
مغربی دنیا	م، م - ا، ا، ع	۶
عید قرباں (نظم)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۷
غزل	سیدہ فرحت	۷
یورپ کا خط	نامہ نگار خصوصی	۸
بہی اور گھریلو صنعتیں	پروفیسر محمد عاقل	۹
کشمیر کا خط	"سیلانی"	۱۰

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

افق پر روشنی کے آثار

ایک نامہ نگار کو شکایت ہے کہ اس عنوان کے ذیل میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس میں تصویر کے صرف تاریک رخ کو دکھایا ہے، وہ پوچھتے ہیں: کیا ہندوستان کی تصویر میں کوئی شگفتہ رنگ نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو انھیں کیوں نہیں دکھاتے؟

اعتراض تسلیم، لیکن عذر بھی سن لیجئے۔ اس عنوان کے تحت میں آپ کو ان چیزوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن میں اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے، جن کا وجود ہماری قومی تہذیب اور سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ میرا خیال یہ ہے (خواہ آپ اس کو سادہ لوحی اور غلط فہمی سمجھیں) کہ سیدھے راستے پر چلنا انسان کی فطرت ہے اور اس سے ہٹنا اس کی بھول۔ راست رفتاری اس کا معمول ہونا چاہئے اور بھول پر اس کو ٹوکنا ضروری ہے۔ گذشتہ چند سال سے ہم بدقسمتی اور ناعاقبت اندیشی کے ایک ایسے چکر میں پھنس گئے ہیں کہ اچھی باتیں کبھی کبھار ہوتی ہیں اور پریشان کرنے والی باتیں روزمرہ ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کیا کرے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سچا دوست وہ ہے جس کی آنکھوں میں ہمیں اپنی اصلی صورت دکھائی دے اور اگر صورت میں کوئی خرابی ہو تو وہ آئینے کا قصور ہے یا صورت کا؟

لیکن ہوا کا رخ بدلنا ضرور شروع ہوا ہے اور بہت سے چھوٹے بڑے تنکوں سے یہ رخ پہچانا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں سن لیجئے تاکہ امید اور ایمان کا چراغ روشن رہے اور آندھیوں کی دھمکیاں اس کو آزردہ نہ کر سکیں۔

آپ نے یوم آزادی پر ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں کی تقریریں اور بیان پڑھے اور سنے ہوں گے۔ ان میں پنڈت جواہر لال اور راجہ جی کی تقریریں خاص طور پر قابل غور تھیں۔ مجھے ان کی علمی اور سیاسی اہمیت پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں وہ تو بہت کچھ ہو چکا ہے ان کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعتراف کرنا ہے۔ پنڈت جی کی تقریر میں انکسار اور احتساب نفس کی ایک خاص شان تھی، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف تھا۔ گاندھی جی کے بلند نصب العین کی وضاحت تھی اور اس پر عمل کرنے کا عہد تھا۔ اپنا ڈھول خود پیٹنا۔ اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اپنی حماقتوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالنا ایک آسان چیز ہے اور ہم نے بہت سے سیاسی لیڈروں کو اس قسم کی ذاتی اور قومی خود ستائی میں گرفتار دیکھا ہے لیکن یہ عقل اور مصلحت کا تقاضا نہیں، حماقت کا ثبوت ہے مجھے خوشی ہے کہ پنڈت جی نے اس تاریخی موقع پر وقار اور شرافت کا اظہار کیا اور کوئی گھٹیا یا اوچھی بات نہیں کی جو کہ ان لوگوں کی ذہنی سطح اور تعریف دونوں سے بلند رکھا جو ہر موقع پر تقریر کی ڈاب میں تلوار کی کھڑکھڑاہٹ سننا چاہتے ہیں!

راجہ جی نے اپنی تقریروں میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی قابل تعریف اور امید افزا ہے۔ وہ ہر موقع پر سیدھی سادھی، لیکن پکی اور جچی تلی باتیں کہتے ہیں اور ان اٹل اخلاقی قدروں پر زور دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ذہنی اور مادی اور صنعتی ترقی سے بھی زیادہ ضروری ہیں۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں گاندھی جی کے اہنسا کو دل نشین انداز میں پیش کیا اور بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان اور پاکستان کی قسمت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور جب تک ان کے باہمی تعلقات خوش گوار اور پرامن نہ ہوں گے اس وقت تک ایک کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا۔ بے شک سچی باتیں ایسے انداز میں کہنا کافی نہیں اور زبان اور عمل کی دنیا میں ایک دشوار گذار خلیج حائل ہے جس کو پار کرنے کے لئے بہت صبر اور سمجھ داری اور محنت کی ضرورت ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جب دونوں ملکوں میں لوگ کلمہ خیر کہنے میں بھی بخل کریں۔ ہمارے چوٹی کے لیڈروں اور ملک کے قسمت سازوں کی طرف سے ایسے جذبات کا اظہار مقام شکر و مسرت ہے ۔ اور اگر کہیں دونوں ملکوں کے لیڈر اپنی تقریروں کی تعداد کم کر دیں اور ان میں "دشمنوں" کا لفظ کم استعمال کیا کریں تو کیا ہی کہنا ہے!

حیدر آباد کا معاملہ جس خوش اسلوبی اور سمجھ داری اور سب جماعتوں کے تعاون کے ساتھ طے ہوا وہ بھی ایک نیک شگون ہے۔ خون ریزی اور باہمی کشمکش کا جو اندیشہ تھا اس کا دور ہو جانا ملک کے مستقبل کے لئے بہت بہت اچھا ہوا لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس واقعہ کی اصل اہمیت یہ نہیں کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہو گیا اور وہ اس میں پورے اترے اور ملک میں ان کی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ یہ سب چیزیں بھی اپنی جگہ پر اچھی ہیں گو میرا خیال یہ ہے کہ وفاداری کی آزمائش کا یہ سارا قصہ معقولیت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چلا تھا اور ملک کی کسی ایک جماعت کو بحیثیت جماعت کے کسی دوسری جماعت کے امتحان لینے کا حق نہیں، کیونکہ آج ہمارے ملک میں مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام مذہبوں اور جماعتوں کے لوگ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور سب کو اپنی اپنی بداعمالیوں کی جواب دہی کرنی ہے۔ میری نظر میں اس واقعہ کی حقیقی سیاسی اور اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاں تک ان کے طرز عمل ارادہ اور غور و فکر کا تعلق ہے مسئلے کی نوعیت کو سمجھا اور ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں کھیلے جو غلط بحث کر کے انھیں غلط راستے پر ڈالنا چاہتے تھے انھوں نے دیکھا کہ بعض لوگ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں ایک ایسا راستہ اختیار کر رہے ہیں جو انصاف، رواداری اور جمہوریت کے صریحاً خلاف ہے۔ انھوں نے اپنے عمل سے اس بات کو واضح کر دیا کہ جو لوگ اس راستے میں اسلام کے نام پر ان کی امداد کی توقع کرتے ہیں وہ اسلام کی توہین اور جنگ عقل و انسانیت کی تعلیم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور وہ ان کو سہارا دینے کے لئے تیار نہیں، ہر معاملے میں اصلی چیز ظلم اور انصاف کے درمیان حکم لگانا اور تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے اصول پر عمل کرنا ہے۔ جب تک ہندوستان کے اور دنیا بھر کے مسلمان اور دوسری تمام قومیں اس اصل اصول کو مضبوط نہ پکڑیں اس کی دنیا کی موجودہ حالت نہیں سدھر سکتی۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی حالیہ روش میں اس حقیقت کا اعتراف پوشیدہ ہے تو وہ ایک مبارک فال ہے۔ ورنہ محض خوف یا جبر کی وجہ سے کوئی اچھا کام بھی کیا جائے تو وہ اخلاقی قدر سے عاری ہوتا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے انتقال پر ہندوستانی لیڈروں اور اخباروں نے بحیثیت مجموعی جس سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اظہار خیال کیا وہ بھی ایک امید افزا بات ہے اور پاکستان نے جس خلوص کے ساتھ گاندھی جی کے ماتم میں شرکت کی تھی اس کا ایک اچھا جواب ہے۔ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ گذشتہ دس سال کے واقعات اور گذشتہ سال بھر کے خونی فسادوں کی وجہ سے بہت سے لوگوں کا ذہنی توازن اس درجہ برہم ہو گیا ہو کہ وہ اپنی تہذیبی روایات کو بھول کر اس شوقیہ پسند انداز خیال کا ناپسندیدہ طرز اختیار کریں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ دو تین اخباروں کو چھوڑ کر (جو روش عام کو ترک کرنا اپنی ہستی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں) عام طور پر اخباروں اور لیڈروں نے اختلاف خیال کے باوجود ان کی ذاتی عظمت اور کارناموں کا اعتراف کیا .... اس کا افسوس کسی ہندوستانی کو نہیں ہوگا کہ تاریخ کی قوتوں نے محمد علی جناح جیسی قابلیت کے انسان کو دوسرے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ مل کر اپنی مادر وطن کی خدمت نہ کرنے دی۔ اگر وہ بھی آخر تک اس جنگ آزادی میں گاندھی جی کے دوش بدوش رہے ہوتے تو آج ہندوستان کا خانگی نقشہ اور اس کی بین الاقوامی پوزیشن کس قدر مختلف ہوتی، لیکن یہ مقدر نہ تھا اور اب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں طرف کے لیڈر دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور اپنی تقریروں، تحریروں اور کارناموں میں کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں جو باہمی تعلقات میں بدمزگی پیدا کرے۔

لیکن چوکسی کی ضرورت

افق پر روشنی کے آثار ضرور ہیں لیکن ابھی تاریکی دور نہیں ہوئی۔ اگر چاروں طرف روشنی ہو تو سر اٹھاتا ہوا خطرہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تو تاریکی ہی ہے جو جگنو کی شمع سی روشنی کو اجاگر کر کے دکھاتی ہے۔ ہمارے ملک کے سیاسی اور ذہنی مطلع سے خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ اس کی پرچھائیاں عجیب عجیب شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ دیکھئے!

ایک اخبار نے اپنے "بزم بے تکلف" قسم کے کالم میں لکھا ہے کہ ہمیں چاہئے کہ لوگوں کو ہتھیاروں کا استعمال اور اپنی حفاظت کرنا سکھائیں۔ شاید اس بارے میں مکمل اہنسا کے ماننے والوں کو اعتراض ہو۔ لیکن عام طور پر لوگ اس خیال سے اختلاف نہ کریں گے۔ لیکن اگلے ہی فقرے میں یہ اخبار اپنی ذہنیت کو اس طرح بے نقاب کر دیتا ہے "یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم درخت پر سے

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

هفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ اکتوبر سنہ ۴۸ء

محتاط اشتراکیت
روشن خیال سرمایہ داری

پچھلے ہفتے حکومت ہند نے دو نہایت اہم قدم اٹھائے ہیں۔ ایک تو اس نے ان تجویزوں کا اعلان کیا ہے جن پر وہ افراطِ زر اور گرانی کو روکنے کے لئے عمل کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے مزدوروں کے سرکاری بیمہ کا کارپوریشن قائم کیا ہے گرانی کو روکنے کی تجویزوں میں اور تو سب ضمنی حیثیت رکھتی ہیں اصل تجویز جو موجودہ حالات میں موثر ثابت ہو سکتی ہے یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشینوں پر محصول درآمد معاف کر کے اور نئے کارخانوں کو انکم ٹیکس سے مستثنےٰ کر کے سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ اپنے سرمائے کو کام میں لگائیں اور اشیاء کی پیداوار بڑھائیں۔ صنعت کاروں اور مزدوروں دونوں کا برابر خیال رکھنا اور دونوں کے لئے یکساں سہولتیں بہم پہنچانا۔ روشن خیال سرمایہ داری کی پالیسی ہے جسے پریذیڈنٹ روزویلٹ نے امریکا میں اختیار کیا تھا اور جو "نیو ڈیل" کے نام سے مشہور تھی۔

ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سب اہم صنعتوں کو سرکار کی طرف سے چلانے کی اشتراکی پالیسی جس کا ہماری حکومت پہلے کئی بار اعلان کر چکی ہے ترک کر دی گئی اور روشن خیال سرمایہ داری کی پالیسی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی؟ اس کا جواب در اصل اس وقت ملے گا جب وزیر اعظم جواہر لال نہرو مجلس آئین ساز میں اس پر روشنی ڈالیں گے کہ پیداوار بڑھانے کی مجوزہ تدبیریں محض عارضی ہیں یا حکومت کی مستقل پالیسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ہمارے ہردل عزیز گورنر جنرل نے بیمہ کارپوریشن کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی اس کے بعض فقرے ہمارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کرتے ہیں کہ چاہے وزیر اعظم خود یہ سمجھتے ہوں کہ وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ اشتراکیت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ہماری حکومت کے نزدیک منزل مقصود در اصل روشن خیال سرمایہ داری ہے۔ راجہ جی نے فرمایا "میں آجر اور مزدور کی اصطلاحیں پسند نہیں کرتا۔ آجر تو صرف ریاست ہے جتنے کام کرنے والے ہیں وہ سب محب وطن شہری ہیں۔ ہر جھگڑا اس طرح چکایا جا سکتا ہے کہ پیداوار کم نہ ہونے پائے اس لئے کہ مزدوروں کے بہت بڑے دوست، جن کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، حکومت میں اخباروں میں اور ان پارٹیوں میں موجود ہیں جو ہماری سیاست پر حاوی ہیں"۔ سردار پٹیل نے بھی اپنی زبردست تقریر میں جو انھوں نے ۱۳ اکتوبر کو باشندگان دہلی کے ایڈریس کے جواب میں کی تھی آجر اور مزدور دونوں کو ان کے فرائض یاد دلائے اور دونوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ ان کے دوست ہیں۔

ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حکومت کے ارکان خصوصاً ہمارے کانگریسی وزیر آجروں اور مزدوروں دونوں کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک ہو یعنی دونوں ریاست کو اصل آجر اور اپنے آپ اس کے کارکن سمجھیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی تاریخ میں یہ مراد کبھی پوری نہیں ہوئی اس لئے اشتراکیوں کو یہ کوشش کرنی پڑی کہ محض استعارے میں نہیں بلکہ حقیقت میں "آجر صرف ریاست ہو اور جتنے کام کرنے والے ہیں وہ سب اس کے محب وطن شہری ہوں" یعنی سب صنعتیں صرف ریاست کی ملکیت ہوں اور اسی کی انتظام میں چلائی جائیں یہاں تک کہ انگلستان جیسے ملک کو جس کے باشندے احتیاط اور اعتدال میں ضرب المثل ہیں آخر مجبور ہو کر یہی راہ اختیار کرنی پڑی۔

ہم حکومت ہند کی صنعتی پالیسی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتے۔ لیکن دو باتیں ہم کو اپنے ذہن میں صاف کر لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ جیسا سردار پٹیل نے فرمایا مجوزہ پالیسی کیبنٹ کی کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ پوری کیبنٹ کی پالیسی ہے۔ چاہے اس کے ممبروں میں نظری اصول کے بارے میں اختلاف ہو لیکن جو عملی قدم اٹھائے جاتے ہیں ان پر سب ممبر کم و بیش متفق ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ پچھلے انتخابات میں ہمارے رائے دہندوں نے جو نمائندے منتخب کر کے بھیجے ہیں ان کی اکثریت کا اعتماد اپنے اوپر قائم رکھنے کے لئے حکومت اس کے سوا کوئی پالیسی اختیار نہیں کر سکتی۔ یعنی در اصل خود ہماری رائے عامہ ابھی تک روشن خیال سرمایہ داری کے تصور سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے سے ان لوگوں کی حیرت رفع ہو جائے گی۔ جو یہ پوچھا کرتے ہیں کہ آخر پنڈت نہرو جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے چاک گریباں کی تعلیم دی ایک دم سے وضع احتیاط کے پابند کیسے ہو گئے؟ ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس نازک وقت میں جبکہ ہندوستان کی نئی ریاست کو نہایت شدید اندرونی اور بیرونی طوفان کا مقابلہ کرنا تھا پنڈت نہرو کے ہاتھ میں حکومت کی کشتی کی پتوار دی ان کو یہ تاکید کر دی کہ گرداب اور چٹانوں سے بچتے ہوئے چلو، ان کو کشتی کے کھینے والے ایسے دئے جو سچے دل سے سمجھتے ہیں کہ آہستگی میں سلامتی ہے پھر ہم ان سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد ساحل مقصود تک پہنچ جائیں۔

وزیر اعظم ان کی حکومت اور مجلس آئین ساز پر اعتراض کرنے سے ہمارے آزادی رائے کے جذبے کو تسکین ہو تو خیر یہ بھی کرتے رہیں لیکن ہم کو اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہیئے کہ اس سے کوئی عملی فائدہ ہوگا اگر ہمیں اپنے ملک میں اشتراکی جمہوریت قائم کرنی ہے تو ایک طرف رائے عامہ کو صبر و استقلال کے ساتھ سمجھا بجھا کر صنعتی سرمایہ داری کے خلاف اسی طرح ابھارنا ہوگا جیسے ہم نے اُسے زمینداری کے خلاف ابھارا اور دوسری طرف فرقہ داری اور صوبہ داری تعصبات کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ جب تک رائے عامہ کا صریحی تقاضا اور اس کی پوری مدد نہ ہو کوئی جمہوری حکومت سرمایہ داری کے زبردست نظام کو توڑنے کا ارادہ نہیں کر سکتی۔ اور جب تک مختلف فرقوں اور صوبوں کے آپس کے جھگڑے ہر وقت اس کی توجہ کو بٹاتے رہیں اور اس کی قوت کو منتشر کرتے رہیں وہ اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

بزم بے تکلف

(۱)

"کیوں حضرت آپ نے تو بہت سی لغت کی کتابیں چاٹ ڈالی ہیں، کیا لیڈر کے لئے ہمارے ہاں کوئی لفظ نہیں جو ہم یہ مکروہ انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں؟ جس سے سنئے لیڈر، لیڈر، لیڈر۔ کان پک گئے سنتے سنتے۔ آخر پیشوا، رہنما، رہبر، زعیم، قائد کہتے کیا زبان گھستی ہے؟"

"زعیم اور قائد کہنے میں تو ضرور گھستی ہے، بلکہ اگر خشوع خضوع کے ساتھ کہئے تو حلق میں خراش بھی آ جاتی ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان سب لفظوں میں خصوصیت ہے اور لیڈر میں عمومیت ہے"۔

کیا مطلب آپ کا؟ یعنی لیڈر میں کوئی خصوصیت ہی نہیں تو پھر لیڈر کیوں بنا پھرتا ہے؟"

ارے بھئی مطلب یہ ہے کہ اور سب لفظوں کا مفہوم خاص ہے اور لیڈر کا مفہوم عام ہے"۔

"اور آپ کا مفہوم بندے کے فہم سے باہر ہے"۔

"گھبرائیے نہیں ابھی آپ کے فہم کے اندر سما جائے گا دیکھئے "پیشوا" روحانی نجات کی راہ دکھانے والوں کے لئے مخصوص ہے "رہنما" اور "رہبر" اخلاقی ہدایت کرنے والوں کے لئے۔ زعیم وہ سیاسی نیتا جو گرجتا اور پھنکارتا ہو ع۔ نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اور قائد وہ ہے جو دوسروں کو قید و بند میں رکھتا ہے اور خود ہر قید سے آزاد ہوتا ہے۔ دیکھا آپ نے ان لفظوں کے مفہوم محدود ہیں۔ مگر لیڈر ان سب پر حاوی ہے"۔

"سب پر حاوی نہ ہو تو لیڈر کا ہے کا۔ مگر پھر بھی بات صاف نہ ہوئی، آخر ان پانچوں میں اور لیڈر میں کیا خاص فرق ہے"۔

یہی فرق ہے کہ اور سب اضافی اصطلاحیں ہیں اور لیڈر مطلق ہے"۔

"پھر وہی موٹے موٹے لفظ، حیوان مطلق، جاہل مطلق تو سنا تھا یہ خالی مطلق کیا بلا ہے؟"

"شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں لیڈر کی منطقی تعریف کروں اور یہ بہت مشکل ہے"۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

حیدر آباد روبہ صحت ہے

حیدر آباد میں امن قائم کرنے کا کام بہت ہو چکا ہے، تھوڑا باقی ہے۔ دیہات میں ابھی کہیں کہیں رضاکاروں اور کمیونسٹوں کے جتھے اپنی سرگرمیاں دکھا رہے ہیں اور ہندوستانی فوج حیدر آبادی فوج کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کارروائی کر رہی ہے۔ سکندر آباد میں کبھی کبھی دوکانوں اور لیٹنے کے واقعات ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے فوجی حکومت نے کرفیو اور دوسری پابندیوں کی میعاد میں تھوڑی سی توسیع کر دی ہے ریل کی آمد و رفت، ڈاک، تار، ٹیلیفون کا انتظام ساری ریاست میں معمول پر آگیا ہے۔ باہر سے مسافروں کے مال اور ڈاک کے آنے جانے میں اب کوئی دقت نہیں رہی ہے۔ صدر میں اور اضلاع میں چند خاص ذمہ داری کے عہدوں پر حکومت ہند نے عارضی طور پر اپنے آدمی مقرر کر دئے ہیں، لیکن جہاں تک ممکن ہے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ پرانے ملازموں کو اپنے عہدوں پر برقرار رکھا جائے بلکہ ان میں سے جو لوگ جنتی پر تھے خطرے کی وجہ سے بھاگ کر چلے گئے، یا میر لائق علی کی حکومت کے زمانے میں بے وجہ برخاست کر دئے گئے تھے ان کو واپس بلایا جا رہا ہے۔

لیکن حیدر آباد کی حکومت کا آیندہ نقشہ ابھی تک نہیں بنا ہے یہ تو ظاہر ہے کامل ذمہ دار حکومت قائم ہونے سے پہلے درمیانی زمانے کے لئے عوام کی نمایندہ حکومت قائم ہوگی۔ لیکن حکومت کی تشکیل کس انداز پر ہوگی، کن کن جماعتوں کے آدمی کیبنٹ میں لئے جائیں گے، وزیر اعظم بھی عوام کا نمایندہ ہوگا یا اُسے نظام مقرر کریں گے۔ یہ سب باتیں فیصلہ طلب ہیں۔ فیصلے میں دیر غالباً اس لئے ہو رہی ہے کہ اسٹیٹ کانگریس کی تنظیم از سر نو کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کے نتیجے کا انتظار ہے اگر ریاست کے سب قوم پرور مسلمان اسٹیٹ کانگریس میں شریک ہو جائیں تو اس سے ایک مضبوط حکومت بنانے کا کام بھی آسان ہو جائے گا اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر بھی بڑا خوش گوار اثر پڑے گا۔

وصل یا فراق

۱۱ اکتوبر کو، لندن میں کامن ویلتھ کے وزیر اعظموں کی کانفرنس ہو رہی ہے اس کی شرکت کے لئے ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو لندن پہنچ گئے ہیں ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کامن ویلتھ میں رہنے یا اس سے الگ ہونے کے بارے میں کافی لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ بائیں بازو والوں کا بڑا سخت اصرار ہے کہ ہندوستان کو کامن ویلتھ سے فوراً الگ ہو جانا چاہئے اور کانگریس چاہتی ہے کہ جذبات سے الگ ہو کر تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ البتہ اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ برطانیہ سے خوش گوار اور گہرا تعلق رکھنے میں ہندوستان کا بڑا فائدہ ہے اور ان دونوں کے اتحاد سے دنیا کے امن اور اس کے اتحاد و ترقی کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ہندوستان کامن ویلتھ میں شریک رہے گا یا اس سے الگ ہو جائے گا۔ اس کے متعلق فی الحال کوئی پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کوئی ایسی شرط ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ جس سے اس کی خارجی سیاست قطعی طور پر پابند ہو جائے: اور نہ وہ کسی حالت میں بھی یہ برداشت کرے گا کہ کامن ویلتھ کے شریک ملکوں میں اس وقت جو نسلی امتیازات پائے جاتے ہیں وہ موجود رہیں اور جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کی نو آبادیاں بدستور غلام رہیں۔ اسی کے ساتھ کامن ویلتھ کے بعض قاعدوں اور اصولوں میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ لندن کے مشہور اور با اثر ہفتہ وار اخبار "اکانومسٹ" نے "کامن ویلتھ کیا ہے" کے عنوان سے، چند دن ہوئے۔ ایڈیٹوریل لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کامن ویلتھ میں بعض ایشیائی ملکوں کی شرکت سے، اس کی صورت حال میں، نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے قانونی رشتہ کے علاوہ کامن ویلتھ کے شریک ممالک کی روایات، طبائع اور رجحانات میں بڑی حد تک اتحاد اور یکسانی تھی۔ مگر ہندوستان، پاکستان سیلون اور دوسری نو آبادیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اس لئے یہ ممالک پرانے قوانین اور شرائط پر کامن ویلتھ میں شریک ہونے پر راضی نہیں ہوں گی

اس وقت بڑی طاقتوں میں جو اختلافات ہیں اور طاقت حاصل کرنے کے لئے، جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں ان میں ہندوستان بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے، وہ اگر ایک طرف برطانیہ اور امریکہ سے دوستی رکھنا چاہتا ہے تو دوسری طرف روس سے بھی بلا وجہ بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جو بین اقوامی مسائل پیدا ہوں ان کے متعلق مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزادی کے ساتھ جو چاہے فیصلہ کرے۔ موجودہ پیچیدہ حالات میں اس قسم کی پالیسی پر عمل کرنا مشکل ضرور ہے مگر ہندوستان جیسے ملک کے لئے، جو طویل غلامی سے ابھی ابھی آزاد ہوا ہے یہ پالیسی بہت ضروری ہے مگر ظاہر ہے غیر جانبداری کی یہ پالیسی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے۔ جب تک ہندوستان کا بنیادی مفاد دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے مفاد سے نہیں ٹکراتا

ہند میں ایک اور بین اقوامی ادارہ

۴ اور ۵ ر اکتوبر کو نئی دہلی میں عالمی ادارۂ صحت کی علاقہ واری کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ یہ ادارہ یو، این او کے ماتحت ڈبلو، ایچ، او (ورلڈ ہلتھ ارگنائزیشن) کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے سب ملکوں میں لوگوں کی صحت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ کام کی سہولت کی خاطر اس کی پانچ علاقہ وار کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ جلسہ جنوب مشرقی ایشیا کی کمیٹی کا تھا جس میں سیلون اسیام برما، افغانستان اور نیپال کے نمایندوں نے شرکت کی۔ پاکستان مشرق وسطی کی علاقہ وار کمیٹی میں ہے۔ اس لئے اس کانفرنس میں اس کا کوئی نمایندہ نہیں تھا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے فرمایا کہ "اگر صحت اور ایسے ہی دوسرے امور میں زیادہ سے زیادہ بین اقوامی اشتراک عمل سے کام لیا جائے تو ہم معاشی اور سیاسی پیچیدہ مسائل میں بھی ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں گے۔ اگر یہ ادارہ اپنے مقاصد یعنی عام جسمانی دماغی اور سماجی بہبودی میں کامیاب ہوا، تو دنیا کے اور بہت سے مسائل بھی حل ہو جائیں گے"۔

کمیٹی کا سب سے اہم فیصلہ یہ ہے کہ مجوزہ ادارہ جو خاص جنوب مشرقی ایشیا کے لئے ہوگا، دہلی میں قائم کیا جائے۔

اس ادارہ سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کی صحت بڑی توجہ کی محتاج ہے۔ کون سی بیماری ہے جو یہاں نہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گذرتا ہو جس میں ہزاروں انسان قبل از وقت نہ مر جاتے ہوں۔ اگر یہ ادارہ سیاسی اختلافات سے بلند ہو کر اور صحیح معنی میں بین اقوامی نقطۂ نظر سے کام کیا تو یہ دنیا کی بہت بڑی خدمت انجام دے گا۔

الیکشن میں دھاندلی

فرنچ انڈیا کی میونسپلٹی کے جو انتخابات ۱۷ ر اکتوبر کو ہونے والے تھے وہ ملتوی کر دئے گئے۔ پچھلے دو ہفتوں کے واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرانسیسی مقبوضات کے انڈین یونین میں شامل ہونے کے مسئلے پر وہاں آزادانہ رائے شماری کا امکان نہیں۔ مقامی حکومت اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کر رہی ہے کہ جائز اور ناجائز طریقے سے ہندوستان میں شامل ہونے والوں کے ووٹ کو بے اثر کر دیا جائے اس کے لئے انتخابی حلقے بار بار بدلے جاتے ہیں تاکہ بعض حلقوں میں ہندوستان کے حامیوں کی اکثریت، اقلیت میں تبدیل ہو جائے جلسوں پر پابندیاں ہیں، ہندوستان کے خلاف غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے کئے جا رہے ہیں طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ فرنچ انڈیا میں جو رعایتیں انہیں حاصل ہیں، وہ ہندوستان میں شامل ہونے کے بعد ختم ہو جائیں گی پنشن یافتہ ملازموں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے ہندوستان کے حق میں ووٹ دیا تو ان کی پنشنیں ضبط کر لی جائیں گی۔ متوسط طبقہ کے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں جانے کے بعد انھیں بھاری ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ غرض ہر طرح کے دباؤ۔ اور جھوٹے

پروپیگنڈے سے رائے عامہ کو غلط راہ پر ڈالنے کی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے انڈین یونین کوئی موثر اور فوری قدم اٹھائے۔

۲۔ پاکستان

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات

پچھلا پرچہ پریس بھیجا جا چکا تھا کہ سندھ کے گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کے انتقال کی خبر آئی۔ مرحوم کوئی ۴۴ سال سے سندھ کی پبلک زندگی میں دخیل رہے ہیں۔ شروع میں تو انھوں نے اپنے صوبے کی مقامی اور چھوٹے موٹے اداروں کے ذریعے خدمت کی لیکن اپریل ۱۹۳۶ء میں سندھ الگ صوبہ بنا تو ان کی خدمت کا حلقہ اور وسیع ہو گیا۔

پچھلے چند سال میں سندھ کی سیاست میں مرحوم کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اگرچہ ہمیں ان کی سیاست سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور انھوں نے برسر اقتدار رہنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ قوم پرور حلقوں میں کبھی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھے گئے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے سندھ کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کا صوبہ ایسے موقع پر ان کی خدمات سے محروم ہو گیا جب اسے ان کی بڑی ضرورت تھی۔

پچھلے دنوں پاکستان کی مرکزی حکومت سے، سندھیوں کو بڑی شکایت ہو گئی تھی اور اگر مرحوم کی شخصیت درمیان میں نہ ہوتی، تو ممکن ہے صوبے اور مرکز کا یہ اختلاف کوئی بہت ہی ناگوار صورت اختیار کر لیتا۔

لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج دین محمد صاحب مرحوم کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف کی قانونی قابلیت مسلم ہے لیکن پاکستان کے بعض اخبارات نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ سندھیوں کو پنجاب کے لوگوں سے جو مخالفت ہے، وہ اس تقرر سے کہیں اور نمایاں نہ ہو جائے اور مرکزی حکومت اور سندھی حکومت کا پچھلا اختلاف جو جناح صاحب کی شخصیت اور غلام حسین ہدایت اللہ صاحب کی کوششوں سے دب گیا تھا، کہیں پھر ابھر نہ آئے۔ خدا کرے کہ یہ اندیشہ غلط ثابت ہو، تاکہ پاکستان ان جھگڑوں میں الجھنے کی بجائے تعمیری کاموں کی طرف توجہ دے سکے۔ اس سے صرف پاکستان ہی کو فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ہندوستان کو بھی۔

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

پاکستان میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی ایک شخص بھی جیل کے باہر نہیں رہ سکے گا، جو کسی طریقے سے بھی ——— خواہ وہ ہمدردانہ ہو یا مخالفانہ، پاکستان کی حکومت پر تنقید کرے۔ شروع میں ایسے اشخاص کو چن چن کر گرفتار کیا گیا جن کا تقسیم ہند سے پہلے کانگریس سے ذرا سا بھی تعلق تھا۔ اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی اور مزدور انجمنوں کے کارکنوں کو جیل میں بھر دیا گیا یہاں تک کہ ڈاکٹر اشرف کو بیماری کی حالت میں، ایک ہسپتال سے گرفتار کیا گیا اور اب جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں پر نظر عنایت ہے، چنانچہ امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جماعت کے ناظم طفیل احمد صاحب اور اس کے روح رواں اور راولپنڈی شاخ کے انچارج مولانا امین احمد صاحب اصلاحی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کا جرم صرف اتنا ہے کہ مسلم لیگ نے انتخابات کے وقت جو وعدے کئے تھے، ان کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے کشمیر کی لڑائی کو اسلامی جہاد تسلیم کرنے سے انکار کیا اور پاکستانی حکومت کو مشورہ دیا کہ جب تک ہندوستان سے پاکستان کا معاہدہ ہے اس وقت تک کشمیر پر حملہ کرنا یا کسی جماعت کی فوجی مدد کرنا جو اس پر حملہ کر رہی ہو ناجائز ہے۔ جماعت اسلامی کی اس صاف گوئی پر، پہلے اس کے اخبارات کو بند کیا گیا اور اب اس کے ممتاز کارکن گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

پاکستان اپنے قیام سے جس پالیسی پر چل رہا ہے اس کے آمرانہ بلکہ فاشست رجحانات پر موافق، مخالف سبھی ٹوک چکے ہیں۔ مگر حکومت پر اس کا اثر کچھ الٹا ہی ہوتا ہے۔ تازہ گرفتاریوں اور سختیوں پر پاکستان ٹائمز لاہور نے اپنی ۵ ر اکتوبر کی اشاعت میں "ہنگامی اختیارات" کے عنوان سے ایڈیٹوریل لکھا ہے جس میں اس نے بتلایا ہے کہ گرفتاریوں کی زد سے مسلم لیگ، احرار، کانگریس، کمیونسٹ، سوشلسٹ، مزدور اور کسان انجمنیں غرض کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور بقول پاکستان ٹائمز "ان کے جرائم" سے نہ صرف عوام کو بے خبر رکھا گیا ہے بلکہ ان گرفتار ہونے والوں میں سے بہتوں کو بھی اپنے جرم کا علم نہیں۔ آخر میں پاکستان ٹائمز نے نئی مسلم لیگ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے اور تمام پاکستانیوں کو ——— چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، یہ یقین دلائے کہ انھیں باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بغیر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔"

لازمی اور عام تعلیم

پاکستان اپنی اندرونی اور خارجی سیاست میں کچھ ایسا الجھا ہوا ہے کہ اسے تعمیری کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع بہت کم مل سکا ہے۔ جن اہم مسائل پر اب تک دھیان نہیں دیا گیا ہے ان میں سے ایک تعلیم بھی ہے۔ شکر ہے کہ اب توجہ کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے ناظمان تعلیمات کی کمیٹی کا ابھی حال میں جلسہ ہوا اور اس نے تعلیم کو لازمی اور عام کرنے کے مسائل پر غور کیا۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ جس طرح ٹرکی میں تعلیم کو عام اور لازمی کرنے کے سلسلے میں دیہاتوں میں خود عوام نے اپنے اسکول قائم کئے تھے اسی طرح پاکستان میں بھی عوام کو اس پر آمادہ کیا جائے۔ جسمانی تربیت کے لئے دو کالجوں کے قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے، ایک مغربی پاکستان میں اور ایک مشرقی پاکستان میں، معلوم ہوا ہے مغربی پنجاب کی حکومت مری میں اس طرح کا ایک کالج قائم کرنے کے لئے عملی قدم بھی اٹھا چکی ہے تعلیم بالغان پر کمیٹی نے بڑا زور دیا ہے اور اسی سلسلے میں معلومات اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے میکسیکو اور ترکی وغیرہ میں جہاں تعلیم بالغان کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے، مطالعہ کے لئے ماہرین تعلیم کو بھیجنے کی سفارش کی گئی ہے، تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ، اردو رسم خط کے سلسلے میں بھی متعدد تجویزوں پر بحثیں ہوئیں۔ زیر غور تجویزوں میں ایک رومن خط اور ایک نسخ ٹائپ کے اختیار کرنے کی بھی تجویز تھی۔ یہ مسئلہ کافی اختلافی اور غور طلب تھا۔ اس لئے اسے ماہروں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ان سفارشات پر غور کیا جائے تو پاکستان ٹائمز کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ پریس رپورٹ سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ ان تجویزوں پر عمل درآمد کس طرح ہوگا۔ اگر اسکولوں کے قائم کرنے کی ذمہ داری تمام تر عوام پر ڈال دی گئی تو اس کی کامیابی معلوم! نیز اس کی بالکل وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ تعلیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا وہی پرانا طریقہ جو اب تک مکتبوں اور مدرسوں میں رائج ہے یا نئے طریقے اختیار کئے جائیں گے؟ اگر نئے طریقے اختیار کئے گئے تو استادوں کی ٹریننگ کا حکومت کو فوراً کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ اس طرح تعلیم بالغان کے متعلق بھی کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس مسئلے پر پاکستانی علاقوں خاص طور پر پنجاب میں صوبجاتی خود مختاری کے بعد کئی اسکیمیں بنائی گئیں اور کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ مگر نتیجہ صفر سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اب بھی صرف ترکی اور میکسیکو وغیرہ کی "سیر" تک کام کو محدود رکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لئے ہندوستان میں بھی بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے مگر یہاں ۱۹۳۷ء سے بہت کچھ ہو رہا ہے اور آزادی کے بعد اس طرف توجہ کچھ زیادہ ہی ہوئی ہے، کم نہیں، مگر پاکستان نے تو ابھی تک اس مسئلے کو چھیڑا ہی نہیں تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم جیسے اہم اور ضروری کام میں کس قدر تساہل سے کام لیا جا رہا ہے "پاکستان ٹائمز" (مورخہ ۲ ر اکتوبر) میں ایک فنی ماہر تعلیم کا خط چھپا ہے جس میں پاکستان کی تعلیمی رفتار پر بڑی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جلسے اور کانفرنسیں تو بہت منعقد ہوتی ہیں، اسکیموں کی بھی کمی نہیں، مگر تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ کراچی میں جو چند تعلیمی ادارے پہلے سے موجود تھے، وہ بھی یا تو بند ہو چکے ہیں یا بند ہو رہے ہیں .... پاکستان میں جو تھوڑے بہت کارخانے ہیں فنی ماہروں اور سیکھے مزدوروں کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں، "مکتوب نگار نے آخر میں پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ ہمیں میٹھے وعدوں اور کاغذی اسکیموں کی ضرورت نہیں ہے، ہم عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور ابھی۔"

جنگ کا ہوّا

پاکستان کے وزیر اعظم صاحب نے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مغربی دنیا

پنچوں کی رائے

روس اور اتحادیوں کا جو مقدمہ آج کل یو، این، او کے سامنے پیش ہے اس میں تو صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ دونوں کے بیان سن کر یہ بتا دیا جائے کہ کون ٹھیک کہتا ہے۔ اتنا ہو جائے تو بھی بہت ہے اس سے آگے کچھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ورنہ روس پنچایت سے اٹھ کر چلا جائے گا اور قوموں کی محفل بے رونق ہو جائے گی۔ اس بات کو روسی اور ان کے مخالف دونوں خوب سمجھتے ہیں۔

لیکن جب فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہیں ہے تو بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ جمہوری پارٹیں چاہتی ہیں کہ اگر لڑائی ہو تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اس سے بچنے کی انتہائی کوشش نہیں کی گئی، تو روسی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اتحادیوں نے ان تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے جو طہران، یالٹا اور پوٹسڈام میں کئے گئے تھے اور اس کے علاوہ جمہوری ملکوں کے لیڈر لڑائی چھیڑنے کی غرض سے جنگ کا چرچا اور اس کے لئے تیاری کرتے رہے ہیں اور اب تو انھیں اور بھی یہ کہنے کا موقع ہے اس لئے کہ مغربی یورپ کی قوموں کا ایک الگ اتحاد ہو گیا ہے اور فیلڈ مارشل منٹگمری کی صدارت میں ایک کمیٹی مغربی یورپ کی حفاظت یعنی روس کے خلاف لڑنے کے لئے جنگ کے نقشے تیار کرنے کی غرض سے مقرر ہوئی ہے۔ یو، این، او کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ساری زیادتیاں روس کی طرف سے ہو رہی ہیں ان کا خیال اور پختہ ہو جائے گا۔ اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر معاملے میں زیادتی برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ انھیں اس کا آخری اور یقینی ثبوت مل جائے گا۔

مغربی یورپ کا بچاؤ کیسے ہوگا؟

ایک خاتون مس سمرز نے، جو پچھلی جنگ کے دوران میں جنرل آئزن ہاؤر کا موٹر چلاتی تھیں حال ہی میں ایک کتاب میں اپنی دیکھی سنی باتیں بیان کی ہیں، ان کا بیان ہے کہ جنرل آئزن ہاؤر کے لئے جرمنوں سے لڑنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ جنرل منٹگمری کو راضی رکھنا۔ اس بیان میں کچھ مبالغہ ضرور ہوگا، لیکن پھر بھی تعجب ہوتا ہے کہ مغربی یورپ کے بچاؤ کی تدبیریں کرنا بالکل انگریزی اور فرانسیسی سپہ سالاروں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی ماہر روسی فوجوں سے حملے کو انھیں روکنا ممکن نہیں سمجھتے۔ وہ بے شک حملے کو روکنے اور پسپا کرنے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہر طرح سے مدد کریں گے، مگر اپنے لئے انھوں نے یہ تجویز کیا ہوگا کہ برطانیہ اور شمالی افریقہ میں ہوائی اڈے قائم کرکے وہاں سے بڑے پیمانے پر بم باری کریں اور جب اس کا پورا اثر ہو جائے تو میدان میں آئیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو زیادہ فکر اس کی ہے کہ روسیوں کا پہلا حملہ ان کے ملکوں کو برباد نہ کرنے پائے اور ان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ میدان میں جم کر لڑنے کی تیاری کریں۔

فرانس کا کوئی بھروسہ نہیں

بچاؤ کی تمام تدبیروں کا دارومدار اس پر ہوگا کہ فرانسیسی سیاست میں ایسا انقلاب نہ ہو کہ کمیونسٹ حکومت حاصل کر لیں۔ اس وقت فرانسیسی عام طور پر اپنی حالت سے بیزار ہیں۔ موجودہ لیڈروں سے خفا ہیں مگر نہ تو جنرل دے گول کو برسر اقتدار لانا چاہتے ہیں نہ کمیونسٹوں کو۔ جنرل دے گول کا مزاج اتنا تیز ہے کہ ان کا نہ اپنی قوم سے نباہ ہو سکے گا نہ دوسری قوموں سے اور کمیونسٹ حاوی ہو گئے تو ظاہر ہے کہ روسی فوجوں کے لئے راستہ صاف کر دیں گے شاید اسی وجہ سے یہ تحریک ہوئی ہے کہ ہسپانیہ کو مہذب قوموں کی برادری میں شامل کر کے اس سے پھر سفارتی تعلقات قائم کئے جائیں اور اسے یو، این، او کا ممبر بنا لیا جائے۔ متحدہ ریاستیں اس تحریک کی تائید کرنے پر تیار ہیں لیکن برطانیہ میں اس کی ضرور مخالفت کی جائے گی۔ وہاں اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سوشلسٹوں اور دستوری بادشاہی کے حامیوں میں صلح کرائی جائے اور ہسپانیہ میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی راہیں نکالی جائیں۔ جنرل فرینکو اس پر بہت خفا ہیں اور ہسپانیہ کے اخباروں میں برطانیہ کے خلاف بہت سخت مضمون لکھے جا رہے ہیں لیکن ہسپانیہ کی خانہ جنگی ایسی پرانی بات نہیں ہے جسے لوگ بھول گئے ہوں اور برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت حفاظتی تدبیروں کو محکم کرنے کی خاطر ان انگریزوں کی انصاف پرستی اور جمہور دوستی پر پانی نہیں پھیر سکتی۔ جنھوں نے ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کو بچانے اور فاشسٹ سیلاب کو روکنے کے لئے اپنا خون بہایا تھا غالباً متحدہ ریاستوں کا دباؤ اور خود جنرل فرینکو کی مصلحت اندیشی معاملے کو بگڑنے نہ دے گی۔ جنرل فرینکو خود کمیونزم کے کٹر دشمنوں میں سے ہیں، اور وہ یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ روسی فوجیں فرانس کو فتح کرتی ہوئی ہسپانیہ کی سرحد تک پہنچ جائیں۔ فرانس میں ایسا کوئی نہیں ہے جس پر دباؤ ڈالنے سے کچھ فائدہ ہو، جس کی مصلحت اندیشی قوم اور حکومت کو راہ راست پر لا سکے۔ فیلڈ مارشل منٹگمری کو اپنے فرانسیسی رفیقوں کی آنکھ بچا کر جنگ کا ایسا نقشہ بنانا ہوگا جس میں فرض کیا گیا ہو کہ جنگ شروع ہوتے ہی روسیوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا ہے۔

(م، م)

اس لوٹ کا کچھ ٹھکانا ہے!

پچھلے سو برس سے اوپر کی مدت میں جرمنی اور فرانس کے تعلقات کا اتار چڑھاؤ تاریخ کا ایک بہت ہی دلچسپ باب ہے۔ ۱۸۰۶ء میں نپولین نے پرشیا کو شکست دی تھی، اور برلن میں داخل ہوا تھا۔ اسی کا بدلہ ۱۸۷۰ء میں بسمارک نے لیا تھا اور پیرس میں کم و بیش اسی شان سے داخل ہوا تھا اسی کا بدلہ پچھلی جنگ میں فرانس نے دوبارہ جرمنی کو شکست دے کر لیا تھا، ہٹلر نے ۱۹۴۰ء میں اس کا انتقام تو لیا مگر خود جرمنی کو انگلستان امریکن اور روسی فوجوں نے شکست دی، فرانس اگلی جنگ کا انتظار کرنے سے پہلے ہی غالباً انتقام لے رہا ہے مگر اس بار اس کا طریقہ اور ہے اور اسی لئے ہم اس پر غور کرنا چاہتے ہیں۔

ابھی ابھی ایک انگلستان کے مصنف نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔ جرمنی کے ایک حصہ پر جو جنوب مغرب میں واقع ہے فرانس کی حکومت ہے۔ جرمنی سب ہی فاتح قوموں کے حصے میں آیا ہے۔ اور سب ہی اس سے ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ورٹمبرگ کا یہ حصہ کثرت سے آباد ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ اس حصے میں کارخانے اور صنعتیں سب گاؤں ہی میں واقع ہیں۔ دنیا بھر کو جراحی کا سامان شیورنگن سے ملتا رہا ہے اور شفرامبرگ گھڑیاں بنانے میں سوئٹزرلینڈ سے کم نہیں۔ ورٹمبرگ آج امریکنوں اور فرانسیسیوں کے حصہ میں آیا ہے۔ امریکا کے زیر اثر حصہ قدرے بہتر حالت میں ہے۔ ہم صرف فرانسیسی حصہ کی حالت کو دکھانا چاہتے ہیں۔

اگست کے وسط میں ورٹمبرگ کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ایک روز تک عام ہڑتال رہی تھی۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو تفصیل سے دیکھنا ہوگا کہ فرانس نے جرمنی کے اس حصہ میں پچھلے تین سال میں کیا کیا کرم کئے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس حصے میں تقریباً ۳۸۰۰۰ مشینیں ہوں گی۔ ۱۹۴۶ء میں ۲۰۰۰۰ جن میں نئی مشینیں زیادہ تھیں فرانس پہنچائی گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں ۴۳۰۰ کے جانے کا آرڈر ہوا۔ اب جو آخری حکم ملا ہے اس میں ۸۲۰۵ مشینیں وہاں پہنچائی جائیں گی۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ تفصیل سے یہ اعداد و شمار درج کئے جائیں، مگر جو درج ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس حصے کے جفاکش اور قابل کاریگروں کا کیا حال ہوگا، ساتھ ہی ساتھ ورٹمبرگ کی حکومت سے مجبوراً ایک معاہدہ کیا گیا جس سے ۴۰ فی صدی گھڑیاں تو فرانس کو دی جائیں گی جو ان کو خود سے کوئی قیمت مقرر کرکے فروخت کرے گا اور ۴۰ فی صدی گھڑیاں جرمنی سے باہر جو مال جا رہا ہے اس میں بھیجی جائیں گی اور صرف ۲۰ فی صدی جرمنی کے حصے میں آئیں گی، ادھر گھڑیاں غائب ہوئیں۔ ادھر امریکن اپنے حصہ میں امریکا سے سامان منگوا کر گھڑیاں بنانے کے کارخانے قائم کر رہے ہیں۔ یہ علاقہ چند ہی میل دور ہے۔

پچھلی جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد بھی فرانس نے فتح کے نشے میں جرمنی پر کئی سال تک ایسی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس میں لاکھوں معصوم جرمنوں پر مصیبت اور تباہی ڈھائی گئی تھی اس وقت بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ یہ طریقہ اسی قوم کو دبانے اور پھر سے نہ اٹھنے دینے کے لئے کافی ہوگا، اس پالیسی کا نتیجہ ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ تھی اور ہٹلر کے لئے زمین اسی پالیسی نے تیار کی تھی۔ تاریخ کے سبق کو

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

عیدِ قرباں

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

حسنِ عشق آموز جاناں تیری شوخی کے نثار
مجھ کو مجھ سے کھو دیا اور خود رہا بیگانہ وار

چہرۂ زیبا پہ تیرے بے نقابی ہی نقاب
دیکھنے والوں کی نظریں بن گئیں خود پردہ دار

پھر دکھا دے اپنا جلوہ اے جمالِ طور سوز
ہم بھی جل جائیں فروغِ حسن سے پروانہ وار

ہے ہمارا دل بھی ممنونِ نگاہِ شعلہ خو
ہم بھی رکھتے ہیں جگر میں سوزِ الفت کا شرار

دل نے سیکھا تھا نگاہوں سے محبت کا چلن
اب نگاہیں دل سے سیکھیں گی تڑپنے کا شعار

دل میں تو، آنکھوں میں تو، خلوت میں تو، جلوت میں تو
ہر طرف تو ہے تو پھر "اس" "میں" کا کیا ہوا اعتبار

نیست ایں ہستی بجز عکسِ جمالِ شاہدے
لاشریکے، لایزالے، ذوالجلالے واحدے

دل کہ تھا روزِ ازل زینت فزائے بزمِ یار
آج وہ حسرت کا مرقد ہے تمنا کا مزار

آ ادھر اے بے دلی تو ہی مری دمساز ہو
کر مدد اے ناامیدی تو ہے میری غمگسار

نارسا ہے آہ میری، کیا کروں مجبور ہوں
گر پہنچ جائے تو ہو جائے فلک کے دل کے پار

آج میں اس جبر کے پردے کو کر دوں تار تار
جبر کے مالک مجھے مل جائے اتنا اختیار

مرحبا اے سوزِ غم دردِ دروں را تازہ کن
حبذا اے نیشِ الفت زخمِ دل را زندہ دار

باز آمد عیدِ قرباں در دلِ ویرانِ من
باز شد آئینہ دار یارِ من مہمانِ من

جانتی ہے عید بھی طرزِ تغافل ہائے یار
ہائے اس کا منہ دکھانا سال بھر میں ایک بار

اے تعالی اللہ کیسا خوش دلی کا روز ہے
ہر خوشی دنیا کی اس دینی مسرت پر نثار

نعرۂ الیوم عیدٌ ساز لب سے نغمہ ریز
کتبۂ الحب للہ لوحِ دل پر آشکار

سر خمارِ بادۂ عشرت سے محوِ سرخوشی
رخ وفورِ نشۂ شادی سے ہم رنگِ بہار

باش اے طبعِ فضولم یاوہ گوئی تا کجا
نغمۂ مستانہ سنج و خموشی عرضہ دار

بس خجل ہستم نہ دارم فدیۂ شایانِ تو
انچہ غیر از تست شاہا می کنم قربانِ تو

غزل

سیّدہ فرحت

اے ہم نشیں نہ پوچھ غمِ زندگی نہ پوچھ
پابندِ مرگ و زیست کی بے چارگی نہ پوچھ

یہ جانتی ہوں ہستیِ دل ہے گراں بہا
پھر کیوں ہے مجھ کو آرزوئے بیدلی نہ پوچھ

اے چشمِ ملتفت مری خندہ لبی کو دیکھ
آنکھوں سے کیوں جھلکتی ہے افسردگی نہ پوچھ

ہوش و خرد میں کیفیتِ شوق یہ کہاں
کیفِ جنون و لذتِ دیوانگی نہ پوچھ

تجھ میں بھی کچھ خلوص ہے فرحت یہ غور کر
پھر کس لئے یگانوں میں بیگانگی نہ پوچھ

یورپ کا خط

بخارست

اوائل ستمبر [illegible]ء

کوئی مہینہ بھر ہوا میں نے بلگراڈ سے "نئی روشنی" کو اپنا پہلا مراسلہ بھیجا تھا۔ اس مہینہ بھر میں یورپ کے اُن مشرقی ملکوں میں رہا جو عموماً روس کے زیر اثر سمجھے جاتے ہیں۔ میں یورپ کی اس تقسیم میں، مشرقی اور مغربی یا روسی اور امریکن حلقہ اثر میں سے کسی کا مخالف ہوں نہ کسی کا موافق۔ ہر ملک کو اپنی مصلحتوں کے مطابق اپنی سیاست کی تشکیل کا حق ہے چاہے جس سے دوستی کرے۔ میں مغربی ملکوں میں تو رہتا ہی ہوں البتہ یہاں مشرقی ممالک میں پہلی بار آیا ہوں جو خاص فرق مجھے ان ملکوں اور مغربی یورپ کے ملکوں میں نظر آیا۔ وہ یہ ہے کہ مغرب میں لوگ تھکے تھکے سے ہیں، پژمردہ ہیں، حوصلہ پست ہے۔ ولولہ ناپید۔ امریکہ کے روپے پر سب کی نظر ہے، اسی کی مدد پر سب کچھ منحصر ہے لیکن دل اس سے بھی صاف نہیں کسی کا! امریکی نو دولتوں کو سب یورپ والے دلی حقارت سے دیکھتے ہیں، عالی گر چھپی، غرض کی وجہ سے ظاہر نہیں کر سکتے اور دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ روس کا ڈر یوں بھی عام ہے اور امریکن اپنی مدد کو ناگزیر بتلانے کے لئے اس ہوّے سے اور بھی ڈراتے رہتے ہیں۔ اسی خوف میں بس امریکا کے سہارے جیتے ہیں اور پورا بھروسہ اس پر بھی نہیں کہ یہ اپنے قابو کی چیز نہیں ہے۔ امریکا سے پوچھتے ہیں کہ روس نے حملہ کر دیا تو ہماری سرحد کی حفاظت کرو گے؟ وہ کہتا ہے "یہ کیسے بتا سکتا ہوں جنگ کے جو تقاضے ہوں گے وہ پورے کئے جائیں گے۔ یہ کیا معلوم کہ کہاں مورچہ بنے گا۔ روس کو شکست ہم دے دیں گے لیکن الگ الگ ہر ملک کی سرحد کی حفاظت کے ضامن ہم کیسے بن جائیں؟" اس سے ان ملکوں کو تسکین نہیں ہوتی۔ سوچتے ہیں کہ جب جنگ کی تباہی نے ہمارے وطن کو برباد کر دیا تو ہمیں اس سے کیا کہ روس ہارا یا امریکا جیتا۔ غرض ہر طرف بڑی بد دلی ہے۔ زندگی میں کیف نہیں سیاست ریاکاری معلوم ہوتی ہے نوجوان بوڑھوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔

وہاں سے یہاں آیا تو کچھ رنگ ہی اور پایا یہاں عام کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ روس سے اندر اندر اختلافات یہاں بھی ہیں پارٹی بازی بھی ہے، آپس کی شخصی رقابتیں بھی ہیں، مگر عام فضا مایوسی کی نہیں اُمید کی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ کرنا ہے اور اس کے لئے کمربستہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنگ کی تباہی کے آثار تیزی سے مٹائے جا رہے ہیں ہر طرف تعمیر نو کا زور ہے، مثلاً یوگوسلاویہ کو لیجئے۔ میں صرف زغرب، لوبلیانا اور بلگراڈ ہی جیسے بڑے شہروں میں نہیں گیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں جانے کا موقع بھی ہوا، ہر جگہ لوگوں میں ہمت اور ولولہ نمایاں ہے، کام میں ضبط اور نظم ہے اور کام کی دُھن ہے۔ کھانے کو کافی ہے، کپڑا بھی ہے جوتے بھی۔ دودھ اور چکنائی کی کمی ہے، مگر لوگ تندرست ہیں، مطمئن ہیں، حکومت سے خوش اور اس کے لئے کام کرنے کو تیار، مزدور اور کسان خوش حال ہیں اور بشاش۔ پرانے مال دار خاندان اور سرمایہ دار ضرور کچھ شکائتیں کرتے ہیں، لیکن عام خوش حالی کے نقار خانے میں اُن کی آواز سنائی بھی نہیں دیتی۔

نوجوانوں، طالب علموں کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ یہ خالی باتیں نہیں کرتے، تقریروں کے زور پر دنیا کا نقشہ بدلنا نہیں چاہتے بلکہ کام کرتے ہیں، نظم کے ساتھ اور جم کر کام کرتے ہیں۔ نوجوان تحریک میں دو ملین سے زیادہ نوجوان شریک ہیں۔ اس میں سے پچھلے دنوں کوئی تین لاکھ نوجوان "کام کے دستوں" میں مصروف عمل رہے ہیں۔ ان دستوں میں جو نوجوان کام کرتے ہیں ان کا انتخاب بڑے اہتمام سے ہوتا ہے۔ ہر گاؤں، ہر قصبے کی کمیٹی اپنے یہاں سے چنے ہوئے نام بھیجتی ہے۔ پھر ضلع کمیٹی ان میں سے چھانٹتی ہے اور ان میں سے مرکزی کمیٹی انتخاب کرتی ہے۔ جس نوجوان کا انتخاب ہوتا ہے وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ انتخاب کے بعد خاصی کٹھن تیاری کرنی ہوتی ہے اور پھر کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ پچھلے سال ان دستوں نے سماق سے سراجیوو تک ۲۵۰ میل سے زیادہ لمبی ریل بنائی، ماشی نگرد میں ایک اور ریل تیار کی، اس سے ذرا چھوٹی بلگراڈ کے قریب ایک اوزاروں اور مشینوں کا کارخانہ بنایا اور جگہ جگہ سڑکیں۔ ہر دستہ میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ تک نوجوان ہوتے ہیں اور ہر جوان اپنے دستہ میں دو مہینے کام کرتا ہے، روزانہ کا معمول یہ ہے: صبح ۴½ بجے سب اٹھتے ہیں ۵ بجے تک تیار ہو کر اپنے کام پر پہنچ جاتے ہیں۔ ۵ بجے سے ۱۲ بجے تک روزانہ جم کر کام ہوتا ہے بس ۹ بجے آدھ گھنٹے کو ناشتہ کے لئے چھٹی ہوتی ہے ناشتہ میں روٹی، جام اور بے دودھ کی کافی ملتی ہے۔ ۱۲ بجے دوپہر کا کھانا ہوتا ہے، گوشت ترکاری روٹی اور پھل۔ ایک بجے سے تین بجے تک آرام کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھنا، پڑھنا، گانا، بجانا ہوتا ہے، ڈرامہ کرتے ہیں، مباحثے ہوتے ہیں، استاد بھی ساتھ ہوتے ہیں اور امتحان دینے والوں کو امتحان کی تیاری بھی کراتے جاتے ہیں۔

ان کا کام واقعی کام ہوتا ہے، کھیل نہیں ہوتا، سماق سے سراجیوو تک جو ریل انھوں نے بنائی ہے اس میں پانچ تونل بنانے پڑے ہیں اور چھ سرنگیں، لاسووے کے پاس ایک سرنگ ۱۵۰۰ گز سے زیادہ لمبی ہے اور ۳۰ گز ٹھوس چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ جو پتھر اس نے یہاں کاٹا تھا، اُسے ایک دوسرے دستے نے اُٹھا لیا اور دریائے بوسینا کے کنارے ایک دیوار چن دی جس کی بڑی ضرورت تھی۔

عام تعلیمی ترقی کا اندازہ آپ کو اس طرح ہو سکے گا کہ ۱۹۳۹ء میں یہاں یونیورسٹیوں میں کوئی ۱۶ ہزار طالب علم تھے [illegible] ۴۰ ہزار داخل ہو چکے ہیں۔ تعلیم گاہوں اور اقامت گاہوں کی عمارتوں کو جو نقصان جنگ میں پہنچا تھا وہ تقریباً سب کا سب پورا کیا جا چکا ہے۔ سراجیوو میں ایک فنی طبی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اور ایک اور طبی یونیورسٹی مقدونیا میں۔ بلگراد میں کان کنی اور انجینیری کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۴ نئی اقامت گاہیں کھلی ہیں جن میں ۴ ہزار سے اوپر طالب علم رہتے ہیں، ۱۰ کھانے کے مرکز کھلے ہیں جہاں ۱۰ ہزار طلبہ کو سستا کھانا ملتا ہے۔ طلبہ کا اپنا امداد باہمی کا انتظام ہے۔ ۴۷ تک طالب علم خود ۴ ملین دینار سے زیادہ اپنی ضرورت کے لئے آپس میں جمع کر چکے ہیں۔ حکومت کی طرف سے وظائف برابر بڑھائے جا رہے ہیں۔ [illegible] میں ۵½ ہزار طلبہ کو حکومت نے وظیفے دیئے تھے، [illegible] میں ۱۳ ہزار سے اوپر طلبہ سرکاری وظیفہ پا رہے ہیں۔

ہنگری، رومانیہ اور پولینڈ میں بھی کم و بیش یہی رنگ ہے۔ ہنگری میں جنگ کی تباہی بہت عام ہے۔ بداپسٹ میں تو شاید ہی کوئی عمارت ہو جسے نقصان نہ پہنچا ہو۔ پسٹ تو یوں سمجھئے کہ بالکل مسمار ہو گیا ہے۔ لیکن اس تباہی میں بھی لوگوں کے دل اُمید سے معمور معلوم ہوتے ہیں۔ ساری قوم کی تعمیر از سر نو ہو رہی ہے، مادی بھی، روحانی بھی، غریب اور پسماندہ طبقوں کو ابھارنے کی خاص کوشش ہو رہی ہے۔ مثلاً جنگ سے پہلے ہنگری میں صرف ۷ فی صدی یونیورسٹی کے طلبہ کسانوں کی اولاد تھے اور کسانوں کی آبادی ہے ۸۰ فی صدی۔ اب ان کے لئے خاص ادارے کھولے گئے ہیں۔ اور گوشے گوشے میں کھولے جا رہے ہیں۔ ان کے استادوں کی تربیت کا خاص اہتمام ہے۔ اور بہترین آدمی اس کام کے لئے چنے جا رہے ہیں۔ اسی طرح رومانیہ میں بھی کسانوں میں بھی تعلیم و ترقی کے جتن ہو رہے ہیں۔ پولینڈ میں تو تباہی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ وارسا کے شہر میں پتھروں کا ایک انبار تھا، کم و بیش یہی حال اور شہروں کا تھا، لیکن ایک نئے ولولے نے تباہی کے یہ نشان بہت کچھ مٹا دئے ہیں۔ نوجوانوں میں بڑا جوش عمل ہے۔ یونیورسٹیوں میں جو بربادی ہوئی تھی اس کے درست کرنے میں بوڑھے پروفیسر اور جوان طالب علم ایسے منہمک نظر آتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل پر ایک دفعہ تو پھر کچھ اعتماد ہونے لگتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کے لڑکے لڑکیاں ثانوی مدرسوں اور کالجوں میں جوق در جوق آ رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں ان کے لئے خاص انتظام ہے۔ ثانوی تعلیم کی کمی پوری کرنے کے لئے یونیورسٹی کے ساتھ ایک سال کا خاص نصاب جاری کیا گیا ہے، اور استاد اور شاگرد سب صرف علمی اور ادبی کاموں میں مصروف نہیں بلکہ اپنی تعلیم گاہوں کی تباہ شدہ عمارتوں کو بھی یہی بنا رہے ہیں۔ استقلال و پامردی، محنت جفاکشی، سب کی پیشانیوں پر ہویدا ہے۔

ان ملکوں کا یہ حال دیکھ کر مجھ پر تو بڑا اثر ہوا، اور میں نے سمجھا کہ کوئی واقعی بڑا جماعتی کام آدمی کرتا ہے تو وہ کام خود آدمی کو بدل دیتا ہے، ولولہ اور ہمت بڑھتا ہے اور کام کی اچھائی پر یقین ہو تو سخت سے سخت مصیبت میں قوائے عمل شل نہیں ہوتے۔ یہ احساس کوئی نیا کام انجام پا رہا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دیہی اور گھریلو صنعتیں

۳۔ چرخہ اور کھادی

پروفیسر محمد عاقل

گھریلو صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام، دیہات سدھار کے مجموعی کام کا ایک حصہ ہے اور مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان سب کی کارگذاری کا جائزہ لینے سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکے گا کہ دیہی اور گھریلو صنعتوں کی از سر نو تنظیم و ترقی کا کام کن راستوں پر چلانا مفید ثابت ہوگا۔ ہم اپنے اس جائزہ کو غیر سرکاری اداروں اور افراد کے کام سے شروع کریں گے۔

اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ

۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے معاشی اصلاح کے کام میں چرخہ کو مرکزی جگہ دی اور ۱۹۲۳ء میں اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ اس لئے بنایا گیا کہ اپنے مختلف مرکزوں اور بھنڈاروں کے ذریعے کھادی کی تیاری کے کام پر نگرانی رکھے اور روپیہ فراہم کرے۔

چرخہ سنگھ کا بڑا کارنامہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دیہات کی ایک بڑی تعداد کے لئے ان کے قدرتی ماحول میں کام مہیا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ سنگھ کی سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء کی رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ اس نے پندرہ ہزار ایک سو دس گاؤں میں پھیلے ہوئے تین لاکھ ۴۵ ہزار، ۲۵۷ دستکاروں سے کام کرایا اور انھیں ان اٹھارہ مہینوں میں جو ۳۰ جون ۱۹۴۲ء پر ختم ہوئے تقریباً اسی لاکھ روپیہ اجرت کے طور پر تقسیم کیا۔ کھادی کی مجموعی لاگت میں جس کی میزان ایک کروڑ بیس لاکھ دو ہزار چار سو تیس ہوتی تھی۔ اجرتوں کا تناسب دو تہائی کے قریب تھا۔ یہ کھادی ایک کروڑ ۴۸ لاکھ ۸۴ ہزار ۳ ۵۱ روپے کی فروخت کی گئی

چرخہ سنگھ کا کام شروع ہونے کے بعد سے ۱۹۴۲ء تک یعنی ۱۷ سال کی مدت میں کل پیداوار کی قیمت ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ۷۵ ہزار ۶۸۲ روپے کی ہوئی جس میں سے چار کروڑ ۱۰ لاکھ ۴۰ ہزار ۳۱ روپے اجرت کے طور پر تقسیم کئے گئے۔ اس تنظیم کو بہت کم سرمائے سے شروع کیا گیا تھا۔ اور سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں اس کے پاس جو سرمایہ تھا یعنی پچاس لاکھ روپیہ جب اس کے مقابلے میں سوتی کپڑے کے کارخانوں کے سرمائے یعنی ۵۰ کروڑ روپئے سے کیا جاتا ہے تو سرمایہ کی یہ رقم بہت بے حقیقت معلوم ہوتی ہے لیکن اسی بے حقیقت رقم نے ملک کے سارے کارخانوں میں جتنے مزدور کام کرتے تھے ان کے نصف سے زیادہ کے لئے کام مہیا کیا۔

چرخہ سنگھ کے پروگرام میں اس مقصد کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھا گیا ہے کہ گاؤں کی ضرورتیں گاؤں کے اندر پوری کی جائیں۔ نصب العین یہ رہا ہے کہ ہر گھر میں ایک یا ایک سے زیادہ چرخے ہوں اور ہر گاؤں میں ایک یا ایک سے زیادہ کرگھے ہوں۔ کپڑا بننے کے ہر کام کے بارے میں خاص طور پر ابتدائی کام کے بارے میں سنگھ کے کارکن باقاعدہ تعلیم دیتے ہیں اور ان کاموں کو اور ان اوزاروں کو جن سے یہ کام کئے جاتے ہیں سادہ سے سادہ بنانے اور ان کی کارگذاری کو بڑھانے کے لئے برابر تجربے کئے جا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں علمی تحقیق جاری ہے۔ چنانچہ روئی کے دھننے، پونی بنانے، تانے اور بانے سوت کی مضبوطی اور یکسانی کو بڑھانے کے سلسلے میں گذشتہ سترہ سالوں میں اوزاروں اور کاموں میں بڑی انقلاب انگیز تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

چونکہ سنگھ کے پروگرام میں کھادی کی تیاری کے کام کو تجارتی اصول پر چلانا بھی شامل ہے اس لئے لاگتوں کو کم کرنے اور پیداوار کو بڑھانے اور ساتھ ہی ساتھ مال تیار کرنے کا کام بھی جاری ہے سنہ ۱۹۳۵ء سے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ کاتنے والوں کی اجرت کو اتنا بڑھا دیا جائے کہ اس سے ان کا گذر چل سکے ورا س کے بعد سالوں میں کم ترین اجرتوں کا تعین دھننے اور بننے والوں کے لئے بھی کر دیا گیا ہے۔

اس کام کو چونکہ ایک سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ چلایا گیا ہے۔ اس لئے اس کی تائید یا تنقید کرتے وقت اکثر سیاسی جذبات اور تعصبات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سے خالی ہوکر اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا جائے۔

اوپر جو اعداد مجموعی صورت میں پیش کئے گئے ہیں وہ بظاہر بہت بھاری بھرکم معلوم ہوتے ہیں، لیکن انھیں ہر دستکار کی اجرت کی صورت میں پھیلا کر دیکھئے تو وہ صرف ڈھائی پیسہ یومیہ تک نکلتی ہے۔ اس آمدنی کا مقابلہ شہر کے خرچ سے کیجئے جہاں چائے کی پیالی دو آنے، پان دو پیسے اور دیا سلائی ایک آنے میں ملتی ہے تو ایسا نظر آئے گا کہ چرخا سنگھ کے مخلص اور ایثار پیشہ کارکنوں کی ساری محنت اکارت جارہی ہے۔ وہ پہاڑ کے برابر محنت کرتے ہیں اور صرف ایک رائی کا دانہ پیدا کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ یہی ڈھائی پیسے سال بھر میں پندرہ روپے ہو جاتے ہیں اور اگر ملک کے محض دس کروڑ بچے، عورتیں اور مرد، پندرہ روپے سالانہ فی کس کمائیں تو ان سب کی مجموعی آمدنی ڈیڑھ ارب روپیہ ہو سکتی ہے۔ پھر اگر وہ اصل پیشے جن سے یہ لوگ اس وقت لگے ہوئے ہیں ویسے کے ویسے ہی رہیں یا ان میں کچھ اور اضافہ ہو جائے اور امدادی پیشہ کے طور پر چرخہ اور کھادی کے ذریعے وہ ڈیڑھ ارب روپئے کے برابر قومی آمدنی کو بڑھا سکیں تو پھر کھادی اور چرخے کی قدر و قیمت اتنی حقیر نظر نہیں آئے گی، جیسی سرسری نظر میں معلوم ہوتی ہے۔

چرخے اور کھادی کی صنعت کے حامی اس کی تین مختلف صورتوں کو جداگانہ طور پر پیش کرتے ہیں یعنی اس کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں یہ صنعت اصل پیشہ کے طور پر اختیار کی جاتی ہے۔ دوسری وہ جس میں اس کی حیثیت امدادی پیشے کی ہوتی ہے اور تیسری وہ جس میں یہ خود کفالتی حیثیت رکھتی ہے۔

اصل پیشہ کی صورت میں بھی اس صنعت کے مختلف کاموں میں امتیاز کرنا ضروری ہے، یعنی دھننے کا کام، کتائی کا کام اور بنائی کا کام۔ رضائی اور لحاف بھرنے کے موسم میں، دھننے کو اپنے کام سے اچھی خاصی اجرت مل جاتی ہے لیکن اس کام میں پھیلاؤ کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح بننے والا اگر اسے سوت ملتا رہے اور اس کا بنا ہوا مال نکلتا رہے سال بھر اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے اور اپنی گذر کر سکتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اگر کوئی شخص محض کاتنے کو اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہے تو جب تک وہ بہت سخت محنت نہ کرے اور چرخہ سنگھ والوں یا دوسرے گرام سیوکوں کی مدد اسے نہ ملے اس کے لئے اپنے گذر کے لائق کمترین اجرت کمانا بھی بہت مشکل ہوگا۔

موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک معمولی مہارت کا آدمی نصف گھنٹے میں معمولی چرخے کے ذریعے دس نمبر کے ڈیڑھ سو تار کات سکے گا۔ لیکن سوت کاتنا شروع کرنے سے پہلے اسے بازار سے روئی خریدنا ہوگی۔ روئی کو دھننا اور اس کی پونی بنانا ہوگی اور سوت کے کاتنے کے بعد اسے اٹیرنا اور اس کی لٹی اور گنڈی بنانا ہوگی جو ۶۴۰ تار کی ہوتی ہے۔ اگر وہ آدھ گھنٹے سے زیادہ کام کرے گا تو ظاہر ہے اس کی رفتار آخر تک وہ نہ رہے گی جو شروع میں ہوگی۔ ان سب باتوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس کی آمدنی روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنے کی صورت میں کیا ہوگی یہ ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے کیونکہ کام کرنے والی کی مہارت، چرخے کی قسم، سوت کے نمبر اور گنڈی کی قیمت وغیرہ کی وجہ سے اجرت میں بڑا فرق ہو سکتا ہے۔ گنڈی کے دام ایک وقت میں دو آنے اور دوسرے وقت میں پانچ آنے ہوئے تو اجرت میں ہو سکتا ہے ڈھائی گنے کا فرق ہو جائے۔ سوت کے ایک نمبر کے دام دو آنے گنڈی اور دوسرے نمبر کے تین آنے گنڈی ہوئے تو اجرت میں ڈیڑھ گنے کا فرق ہو سکتا ہے۔ ایک چرخے کی پیداوار دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوئی تو پہلے چرخے پر کام کرنے والے کی اجرت دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔ اسی طرح ایک ماہر کام کرنے والے کی اجرت اپنے زائد کام کی وجہ سے زیادہ ہوگی۔ پھر گذر کے لائق کم ترین آمدنی کسے کہا جائے اس کے بارے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا تو بہت مشکل ہے لیکن جانکاروں کی یہ رائے ہے کہ کتائی کے کام کو اگر مستقل پیشے کے طور پر اختیار کیا جائے تو اس سے عام طور پر اتنے پیسے نہیں کمائے جا سکیں گے کہ اس سے زندگی گذاری جا سکے۔ عام طور پر اوسطاً تین گنڈی سے زیادہ ایک شخص تیار نہ کر سکے گا اور لاگت نکالنے کے بعد جو مزدوری اسے بچے گی وہ گذر کے لئے ناکافی ہوگی۔

اب رہی چرخہ اور کھادی کی صنعت کی دو بقیہ صورتیں سو ان میں پہلے اس کی امدادی شکل کو لیجئے یعنی کھیتی کے اصل پیشہ کے مددگار کے طور پر اس صنعت کا اختیار کرنا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں کھیتی کے کام کو بہت سے قدرتی خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے بچنے کی تدبیریں کرنے پر بھی ملک کے بہت سے حصوں میں یہ خطرے باقی رہتے ہیں اور رہیں گے۔ دوسرے کھیتی سارے سال کا دھندا نہیں ہو سکتا۔ کھیتی کے

(بقیہ صفحہ ۱۱۴ پر)

کشمیر کا خط

(۱)

"سیلانی"

سری نگر
۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء

گذشتہ ہفتے میں دلی میں تھا جب حیدرآباد میں ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی شروع ہو گئی تھی اور قاسم رضویوں کی گیدڑ بھبکیوں کا بھانڈا ایک ہی روز میں پھوٹ گیا تھا۔ مگر کشمیر کے محاذ کے متعلق وہاں کچھ عجیب عجیب پریشان کن افواہیں چپکے چپکے اس زمانے میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ کشمیر کا حال کچھ اچھا نہیں ہے ...... کوئی حیدرآبادی شکستوں کا جواب کشمیر کے محاذ سے ملنے کا اندیشہ ظاہر کرتا تھا۔ کوئی اپنے اندیشوں اور بدگمانیوں کو کسی فوجی سپاہی یا افسر کی زبان سے نقل کرتا تھا اور یہ باتیں تو ہر جگہ بیسیوں سیاست دان کی زبان سے آپ سن سکتے ہیں کہ کشمیر کا اتنا پھیلا ہوا مورچہ اور ہندوستان سے چار سو میل دور پہاڑیوں پر وہاں رسد پہنچانا کوئی آسان کام ہے۔ کروڑوں روپیہ بے دریغ صرف ہو رہا ہے ...... آخر کس لئے؟ کشمیری مسلمان ...... پہلے مسلمان ہیں ...... اور پھر کشمیری ...... شیخ عبداللہ بے چارے کہتے تو سب کچھ ہیں مگر کتنے ووٹ وہ ہندوستان کے لئے لا سکتے ہیں ...... رائے عامہ معلوم کرنے کا وقت آنے دیجئے ...... کشمیر بالآخر پاکستان ہی میں جائے گا ...... ہندوستانی فوج کیا یہ نہیں جانتی ...... بس پنڈت جی کی ضد ہے کہ مسلمان کو ملائیں گے ...... ہندوستان کو سیکولر اسٹیٹ بنائیں گے۔ دو قوموں کے نظریے کا جواز کشمیر میں نکالیں گے اور ہندوستان کو یہ بنائیں گے! وہ بنائیں گے۔ روس بنا دیں گے! امریکا بنا دیں گے! بھگوان ہی جانے کیا بنائیں گے! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اسی ضدا ضدی میں بات بگڑتی جا رہی ہے۔ کشمیر میں تو الجھے تھے ہی اب حیدرآباد میں ادھر الجھ گئے۔ خیر! حیدرآباد میں جو ہوگا سو ہوگا مگر کشمیر میں جیت بھی ہو گئی تو پھر پاکستان سے چپکانا مشکل ہو جائے گا ...... ہندوستان کا بٹوارہ جب مان لیا تو کشمیر بھی بانٹ لیں۔ جانے دیں کشمیر کے مسلمانوں کو بھی پاکستان میں! بات کی پچ کرنے سے فائدہ! یو، ان، او کمیشن آیا ہی ہے ...... موقع اچھا ہے ...... اور سنا ہی اوپر اوپر کچھ بات چیت بھی ہو رہی ہے!"

یہ اور اسی طرح کی باتیں اچھے اچھے شہر خبریوں اور معتبر نائبوں کی زبان سے سن کر جی اداس ہو جاتا تھا۔ میں ۱۶ ستمبر کو یہاں پہنچا تھا۔ دریائے جہلم کی گودی میں ایک ہاؤس بوٹ پر قیام ہے۔ قریب ہی سرکاری مہمان خانے ہیں جہاں یو، ان، او کمیشن کے ممبر ٹھہرائے گئے ہیں۔ سفید فام ولایتیوں کی شاید یہی ایک ٹولی ہے جو آج کل یہاں نظر آتی ہے۔ ورنہ جنگی حالات کی وجہ سے بیرونی اور اجنبی لوگوں کی آمد و رفت اور سیر و تفریح پر مجبوراً اب پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ کئی ولایتی پاکستان کی جاسوسی میں اب تک ماخوذ اور شہر بدر کئے جا چکے ہیں۔ کمیشن کے لوگ البتہ بلا کسی روک ٹوک کے کہیں موٹروں پر کہیں پیدل اور کہیں شکاروں پر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور کشمیر کے اصلاحات بچشم خود مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم جہاں جاتے ہیں سوداگر، قریش اور عوام مانجی اور شکارے والے قدم قدم پر صاحب لوگوں کو بے تکلف گھیر لیتے اور روک لیتے ہیں اور کچھ انگریزی، کچھ ہندوستانی اور کچھ کشمیری میں یعنی خالص اردو زبان میں کمیشن کے اراکین سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ کچھ پیسے وصول نہ ہوئے نہ سہی مگر انھیں یہ اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بھی جہاں تک اس کا تعلق ہے کشمیر کے مقدمے کی پیروی کا گویا حق ادا کر دیا۔

کشمیر پاکستانی حملے سے پہلے دنیا بھر کے سیلانیوں کا ایک تفریحی مرکز تھا اور یہاں کے سوداگر اور دستکار، کشتی والے اور سیر کرانے والے سب انھیں سیلانیوں کی خریداری اور سیر و تفریح سے اپنی روزی کماتے تھے۔ بلکہ اپنی جیبیں بھرتے تھے اور لوٹنے کے فن میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ جو اجنبی اس سرزمین میں آ جاتا تھا وہ یہاں سے ننگا ہی واپس جاتا تھا۔ یہاں کا کاریگر طبقہ غریب ہندوستانیوں کو تو خیر بخش دیتا تھا لیکن پردیسیوں کو خدا کی نعمت سمجھتا تھا۔ اور انتہائی خاکساری اور لجاجت، چالاکی اور ہوشیاری سے مونڈتا تھا۔ مگر سیلانیوں کی آمد و رفت پر اس وقت جو پابندیاں عائد ہو گئی ہیں اس کا اثر کشمیر کی پوری معاشی زندگی میں نظر آتا ہے اور گذشتہ چار سال کے اندر جو سیاسی بیداری اور انقلاب کشمیر میں رونما ہوا ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ اس مشکل ترین زمانے کو بھی کشمیری انتہائی صبر و استقامت سے گذار رہے ہیں۔ اور اپنی ان معاشی تکالیف اور پریشانیوں کا غم، ولولہ انگیز سیاسی بیداری سے غلط کر لیتے ہیں۔

میں نے پرسوں ڈل کے کنارے شکاروں کے ایک اڈے کے پاس دو صاحب بہادروں کو شکارے والوں کے جھرمٹ میں دیکھا۔ میں سمجھا کہ "بزم بے تکلف" کی سی باتیں ہو رہی ہیں، میں بھی قریب چلا گیا اور وہاں دیکھا کہ وہ لوگ بڑے جوش و خروش سے صاحب بہادر کو اپنے کسی جلسے پر مدعو کر رہے ہیں۔ بات چیت کا انداز سنئے: "صاحب! آپ ہمارے شیر کشمیر کا مہمان ...... ہمارا بھی مہمان ...... ہم آپ کو سیر کرائے گا ...... صاحب! آپ ہمارے جلسے میں تقریر کرے گا؟ ہم سب لوگ بوٹ مین یونین کا ممبر ہے، ہم شیر کشمیر کو بھی دعوت دے گا، وہ ضرور آئے گا۔ ...... ہم اپنے بخشی صاحب کو بھی لائے گا ...... یہ ہمارا بچہ لوگ بھی ہے ...... یہ بھی یونین کا ممبر ہے ...... ہمارا اپنا بھائی غوث کشمیر ملیشیا میں پاکستانی قبائلی سے لڑنے اوڑی چلا گیا ہے ...... صاحب! صاحب! تم جواہر لال نہرو سے ملا ہے! وہ بھی ادھر آ چکا ہے۔ ہمارا بڑا لیڈر ہے ...... ہم نے بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کیا۔ صاحب! آپ نہیں تقریر کرے گا؟" وغیرہ وغیرہ۔

صاحب لوگ اس بات چیت کا جواب دوستانہ تبسم سے دیتے رہے اور کشمیر کی نوزائیدہ قوم اور شیر کشمیر کی امت کے چند لوگوں سے جو انھیں سر راہ مل گئے تھے جلد رخصت ہو کر کہیں جانا چاہتے تھے مگر ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ قصہ کشمیر بر سر کشمیر بلکہ اسی جگہ اسی وقت طے کر کے اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے اور ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی تھی کہ جو کچھ طے ہو جائے اس کا اعلان خود ان نمائندوں کی زبان سے کسی جلسے میں کرایا جائے۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ہر بڑا شہر ایک فوجی چھاؤنی معلوم ہوتا تھا۔ جدھر دیکھو جیپ اور فوجی لاریوں کی بھاگ دوڑ۔ ہر گلی اور ہر کوچہ میں سپاہیوں اور فوجیوں کی چہل پہل۔ یہی کیفیت کچھ آج کل سری نگر کشمیر کی ہے۔

"گذشتہ سال" قبائلیوں کے حملے کے بعد جب ہندوستانی افواج یہاں بھیجی گئی تو ہماری فوج کے سپاہی بھی ہندوستان کی مسموم فرقہ وارانہ فضا سے وہاں کا اثر اپنے ساتھ لائے تھے اور یہاں پہنچتے ہی انھوں نے بھی کچھ ایسی زیادتیاں کیں کہ جو افسوسناک تھیں لیکن شیر کشمیر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقائے کار کے "تحمل" اور حکومت ہند کے تدبر سے اس کی اصلاح فوراً ہی کر دی گئی اور اب تو کیفیت یہ ہے کہ ہر کشمیری انڈین یونین کی افواج اور اس کے ہر جوان اور ہر سپاہی کو اپنی جان و مال، عزت اور آبرو کا محافظ سمجھتا ہے اور اس کی شرافت اور انسانیت، ہمدردی اور خدمت کے گیت گاتا ہے۔ اس تعلق، خاطر اور اعتماد کی ایک وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچھلی سردیوں میں کچھ غیر معمولی برف باری کی وجہ سے کشمیر تک رسد پہنچانے کا واحد راستہ مسدود ہو گیا۔ اور ضروری سامان کا کوئی ذخیرہ سول آبادی کے لئے جمع نہ ہو سکا۔ اس لئے باہر سے آنے والی ہر چیز کا یہاں بڑا کال پڑا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نمک جیسی چیز بیچنے کو نصیب نہ تھی۔ جو کچھ تھا بھی وہ نفع بازوں نے روک لیا۔ اور چور بازار میں ۳۰۔۴۰ روپے سیر تک نمک بیچا گیا! یہی حال شکر اور دیا سلائی، چاول اور غلے اور دوسری چیزوں کا بھی تھا۔ اس نازک وقت میں انڈین یونین کی فوجوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنے محاذ جنگ پر گاؤں گاؤں رسد پہنچائی، اور بھوکوں مرنے والوں کی جانیں بچائیں۔

انڈین یونین کی افواج کی طرف سے انسانیت اور ہمدردی کے اس عدیم المثال مظاہرے نے کشمیریوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس وقت تقریباً تیس ہزار

کشمیری مختلف حیثیتوں سے کشمیر کے محاذ جنگ پر انڈین افواج کے ہم رکاب ہیں اور میدان جنگ کے مشکل سے مشکل کام خواہ اسکاوٹنگ کا ہو یا مخبری کا قلی کا ہو یا مزدور کا بڑے جوش و خروش سے انجام دے رہے ہیں۔ انھی کی وجہ سے انڈین یونین کی افواج کشمیریوں میں ایک ایسا رابطہ اور تعلق اعتماد اور یک جہتی پیدا ہو گئی ہے کہ اب کشمیر کی جنگ کو ہندوستانی سپاہی بھی اپنی جنگ، ہندوستان کی جنگ اور ہندوستان کی قومی جنگ سمجھنے لگا ہے۔ علاوہ ان کشمیری کاسیوں کے کشمیری نوجوانوں کی ملیشیا بھی بن گئی ہے۔ جن میں اس وقت صرف ۸۰۰ سپاہی ہیں۔ ان کی فوجی تربیت ہندوستانی کمان کی نگرانی میں ہوتی ہے، اور اب یہ لوگ بھی میدان جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ گذشتہ چار ماہ کے اندر اس ملیشیا نے اپنے افسروں اور کمانڈروں سے ڈسپلن، بہادری، ہمت اور استقلال کی ایسی سندیں حاصل کی ہیں جو بقول ہمارے ایک کرنل کے دنیا کی کسی سپاہ کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہیں۔

کشمیر ملیشیا کے کارناموں نے اور کشمیری خادمان فوج کی سچی رفاقت اور ان کے والہانہ جوش و خروش نے نہ صرف یہ کہ کشمیری مسلمانوں کی طرف سے ہر بدگمانی کو دور کر دیا ہے بلکہ ہندوستانی فوج کو متحدہ قومیت کا ایک ایسا ناقابل فراموش درس دیا ہے جو نکالیا صرف میدان جنگ ہی میں جان کی بازی لگا کر دیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کے خلاف اب تک کسی منہ سے کوئی شکایت نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا محاذ جنگ ہمارے نوجوانوں کے لئے صرف محاذ جنگ ہی نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی تربیت گاہ بھی ہے۔ شیر کشمیر کی قیادت نے اس جنت نظیر ملک کی سیاسی آب و ہوا بھی ایسی بدل دی ہے کہ یہاں آنے کے بعد بڑے سے بڑا فرقہ پرست اپنی فرقہ پرستی سے توبہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور صحیح معنوں میں ایک تندرست ہو جاتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں یاران طریقت کی سیاست کا فتنہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ختم ہو گیا۔ کشمیر کا بچہ بچہ اور ہر سپاہی اور ہر جوان حیدرآباد کے مورچہ کو کشمیر ہی کا ایک محاذ سمجھتا تھا اسی لئے اس مورچہ پر ہندوستانی افواج کی شاندار کامیابی کو کشمیر کے لئے فال نیک سمجھتا ہے۔ اس کامیابی نے واقعہ یہ ہے کہ یہاں ایک ایک سپاہی اور ایک ایک جوان میں ایک ایک فوج کی قوت اور غرور اعتماد پیدا کر دی ہے۔ کچھ ذمہ دار فوجی افسروں سے بھی مجھے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا اور مجھے محسوس ہوا کہ حیدرآباد کی طرح کشمیر کا معاملہ بہت پہلے طے ہو چکا ہوتا۔ اگر صرف فوجی مقابلہ ہوتا، لیکن فوجیوں کو شکایتیں ہیں کہ اس فوجی محاذ کا فیصلہ مختلف قسم کے بین الاقوامی، سیاسی اور فرقہ دارانہ مصالح اور نظریات کی وجہ سے ہونے نہیں پاتا۔

ایک طرف یو، ان، او میں مقدمہ دائر ہے اور بین الاقوامی سیاست کے جال میں پھنس کر یہ معاملہ سلجھایا جا رہا ہے۔ پھر پاکستان تو ہم سے لڑ رہا ہے مگر ہمیں پاکستان سے لڑنے کی اجازت نہیں! اس کے بعد خود ہندوستان کے فرقہ پرستوں، رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کی سازشیں الگ اپنا اپنا نقشہ جما رہی ہیں۔ وہ معلوم نہیں کیا چاہتی ہیں مگر ان کی ایک ایک سازش اور ان کی ایک ایک حرکت کی چوٹ خود ان کے ملک پر پڑتی ہے، ان کے وطن پر پڑتی ہے ان کے جانباز سپاہیوں پر پڑتی ہے جو اس وقت کشمیر کی پہاڑیوں پر جنگ لڑ رہے ہیں اور ہندوستان کے یہ نادان محب وطن اپنی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی بدولت اپنے وطن کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں! غیر شعوری طور پر دشمنوں کو قوت پہنچا رہے ہیں۔

خط ذرا طویل ہو گیا، مگر کیا کروں۔ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم! ارادہ ہے کہ جب تک یہاں رہوں یہاں کے حالات آپ کو لکھتا رہوں۔ (باقی آئندہ)

بزم بے تکلف (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

"حضرت میں بالکل نہیں چاہتا کہ آپ لیڈر کی کسی قسم کی تعریف کریں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ لیڈر کہتے کس کو ہیں؟"

"بھئی آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ سچ پوچھئے تو لیڈر ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے۔" (باقی)

دیہی اور گھریلو صنعتیں (بہ سلسلہ صفحہ ۹)

موسم میں بھی اس میں ایک سی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ خاص خاص موقعوں پر اس میں بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور باقی دنوں میں ملک اور اس کے گھر کے لوگ بھی بے کار رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہندوستان میں زراعت اور صنعت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ کھیتی کے ساتھ کوئی دوسرا دھندا جسے امدادی دھندا کہنا چاہئے لگانا ضروری ہو جاتا ہے کھیتی کے اس امدادی دھندے میں مندرجہ ذیل شرائط ہونی چاہئیں۔

(الف) امدادی کام ایسا ہونا چاہئے کہ وہ اصل کام یعنی کھیتی کے ساتھ پوری مطابقت پیدا کر سکے اور اس کی وجہ سے کھیتی کے کام میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔

(ب) یہ ایسا ہونا چاہئے کہ جب اصل کام کے لئے محنت کی ضرورت پڑے تو اسے بغیر کسی نقصان کے سمیٹا جا سکے اور ادھر ادھر دھیان دئے بغیر اس کا کام چلتا ہے۔

(ج) یہ روزگار کی شکل نوکری کی نہیں بلکہ خود مختار محنت کی ہونا چاہئے۔

(د) اس کام میں مشین اور کچے مال کے لئے اتنی پونجی کی ضرورت نہ ہونا چاہئے کہ غریب عوام کی استطاعت سے باہر ہو۔

(ہ) یہ ایسا ہونا چاہئے کہ کھیت کے نزدیک یا اپنے گھر اور گاؤں میں کیا جا سکے۔

(و) کروڑوں آدمیوں کو اسے اپنانے کی صلاح دینی ہو تو یہ دھندا ایسا ہونا چاہئے کہ اس کا مال آسانی سے کھپ سکے۔ یعنی وہ عام استعمال کی چیز ہو۔

(ز) اسی طرح کروڑوں کے نقطہ نگاہ سے اس دھندے کا انتظام کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا انتظام جھٹ پٹ آسانی سے اور تھوڑے خرچ میں کیا جا سکتا ہو۔

(ح) اسی طرح کروڑوں کے نقطہ نگاہ سے وہ ایسا بھی ہونا چاہئے کہ ان پڑھ، تھوڑی عقل کے، کمزور، چھوٹے بڑے سب طرح کے لوگوں سے ہو سکے۔

(ط) اس کے ساتھ ساتھ یہ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ وہ آدمیوں کو مشین کا ایک بے جان پرزہ بنا دے اور انھیں کام کے دوران میں خوشی اور ذوق سے محروم کر دے اور کام کے بعد ان کے اندر بیزاری اور تھکاوٹ پیدا کر دے۔

چرخہ اور کھادی کے حامیوں کے [illegible] نزدیک صرف یہی دھندا اوپر بیان کئے ہوئے معیار پر پورا اترتا ہے۔ گائے بھینس کے پالنے کا کام بھی اوپر کی بہت سی شرطوں کو پورا کرتا ہے اور اسے بھی کل ملک کے لئے امدادی دھندا بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کے لئے تھوڑی بہت زمین اور پونجی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ نجی زمین رکھنے والے کسانوں کے لئے امدادی دھندا بن سکتا ہے۔ لیکن ان لاکھوں لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے جو صرف کھیتی کی مزدوری ہی پر گزر کرتے ہیں دوسرے مویشی پالنے کا کام کھیتی سے علیحدہ ایک مستقل دھندا بھی ہو سکتا ہے اور چرخہ کے کام کو ان دونوں کے ساتھ امدادی دھندے کے طور پر چلایا جا سکتا ہے۔

آخر میں چرخہ اور کھادی کی صنعت کی تیسری صورت یعنی خود کفالتی کھادی کو لیجئے۔ یا تو کسان اپنے ہی کھیت کی کپاس سے خود اوٹ، دھن کات لے اور صرف بنائی کے پیسے خرچ کرے یا یہ پیسے بھی خرچ نہ کرے اور بنائی کا کام سیکھ کر اپنے لئے خود ہی کھادی بننے لگے تو یہ کھادی مل کے کپڑے کے مقابلے میں سستی پڑتی ہے اور اسے چرخے اور کھادی کی بہترین صورت سمجھنا چاہئے۔

چرخے اور کھادی کی صنعت کی جگہ اگر صرف دستی بنائی کی صنعت کو ترقی دی جائے اور مل کے سوت کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو کسان کے لئے امدادی روزگار کی مقدار بہت کم ہو جائے گی۔ دستی بنائی کے کام کو جس طرح سب لوگ کر سکتے ہیں اس طرح دستی بنائی کے کام کو نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کو روزانہ دو کروڑ گز کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارا کپڑا دستی کرگھے پر بنا جائے تو بھی اس میں زیادہ سے زیادہ روزانہ دو گھنٹے کام کرنے والے ایک آدھ کروڑ بننے والوں کو ہم کام سے لگا سکیں گے اگر یہ کہا جائے کہ اتنے بننے والوں کو نہیں بلکہ اتنے خاندانوں کو کام ملے گا تو روز کے ڈیڑھ آنے اتنے ہی لوگوں میں بٹ جائیں گے اور اس طرح فی آدمی آمدنی اور بھی کم ہو جائے گی۔

چرخہ امدادی صنعت ہی ہو سکتا ہے اور بنائی مستقل صنعت کی صورت ہی میں چل سکتی ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

اگر قانون کے ذریعے مل کی بنائی بند نہ کی جائے بلکہ عوام کی کوشش ہی سے اس کا

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

اداریۂ تحریر
تاریخ اشاعت: یکم ۸۰، ۱۶، ۲۴
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبدالحلیم ندوی
چندہ سالانہ ششماہی

باقی کاٹ کرنا پڑے تو بننے والوں کو ان کے رحم و کرم پر ہی رہنا پڑے گا کیونکہ میں تو دستی بنائی کی حریف ہیں اور روز بروز ملیں ہی بنائی کا کام زیادہ کرتی جا رہی ہیں اور آئندہ یہ مقابلہ اور بھی سخت ہو جائے گا۔

اس کے برخلاف دستی کرگھے اور چرخہ دونوں جڑواں بھائی بہن ہیں دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

لیکن چرخہ پر اتنا زور دینے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس کے سوا اور کوئی امدادی دھندا نہیں ہونا چاہیے۔ مقامی حالات اگر موافق ہوں تو چرخے کے مقابلے میں دوسرا امدادی دھندا کہیں چل سکتا ہو تو چرخے کے بدلے یا اس کے علاوہ اس کو بھی ضرور چلانا چاہیے۔ ایسے دھندوں کے بارے میں ہم نئی روشنی کی آئندہ اشاعت میں کچھ باتیں بیان کریں گے

مغربی یورپ کا حال بوسیدہ مکان کو سہارا دینے کا سا ہے۔ یہاں مشرقی یورپ میں یہ احساس ہے کہ ہم ایک نئی دنیا بنا رہے ہیں۔ وہاں تھوڑے آدمیوں کے حاصل شدہ حقوق کی حفاظت کا سوال ہے، یہاں بے حق، حق داروں کو حق دلانے کی مہم ہے۔ میرا خیال ہے دیکھو کہ آپ کے ملک کے عظیم الشان مواقع کی طرف جاتا ہے آپ کے ملک نے ابھی آزادی حاصل کی ہے۔ وہاں بھی ایک نئی دنیا بنانے کا موقع ہے اگر اس کی لگن لگ جائے تو آزادی اور غلامی کا اصل فرق سامنے آئے۔ یہ نہ ہوا تو تھوڑے دن میں آزادی بھی ایک بے کیف عادت ہو جاتی ہے۔ دنیا کی نظریں ہندوستان پر لگی ہوئی ہیں اور ہم سب کی خواہش ہے کہ آپ اپنی آزادی کو کام کی چیز یعنی کام کا موقع بنائیں۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

تعلیم اور تہذیب کو پھیلانے اور سوت کاتنے کا ڈھونگ رچاتے رہیں گے۔ ایسے ڈھونگ ہم بہت رچا چکے ہیں! دیکھا آپ نے؟ وہی تعمیری کام، زندگی بخشنے والے کام انسان بنانے والے کام سے بیزاری۔ وہی گوبلز کی طرح ادب اور آرٹ پر ریو لور۔ کیوں تڑپتے ہیں! یہ ذہنیت خراب ہے اور خطرناک ہے۔ اس کو شروع ہی سے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔

بعض اخبار آج کل بڑے زور شور سے لوگوں کے خطوط اور مضمون شائع کر رہے ہیں کہ رضاکاروں کو زنجیریں پہنا کر عجائب خانوں کے اندر پنجروں میں رکھنا چاہیے، تاکہ لوگ مسخ شدہ انسانوں کا تماشہ کر سکیں۔ ہمیں رضاکاروں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں انھوں نے جو خلاف قانون حرکتیں کیں یا لوگوں پر سختیاں کیں ان کی سزا انھیں ضرور ملنی چاہیے۔ لیکن آخر یہ عبرت ناک تشہیر صرف رضاکاروں ہی کے لیے کیوں تجویز کی جاتی ہے۔ ان مدعیان انسانیت کو اس وقت کیا ہوا تھا جب کلکتہ، نواکھلی، بہار، امرتسر اور دہلی، پٹیالے میں سبھی فرقوں کے لوگوں نے رضاکاروں سے بڑھ کر وحشیانہ حرکتیں کیں۔ نہ جان اور مال کا پاس کیا، نہ عزت و ناموس کا، نہ بوڑھوں کے سفید بالوں کا، نہ عورتوں کی بے بسی کا، نہ بچوں کی معصومیت کا۔ اس وقت یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا تھا کہ ان ہزاروں ننگ انسانیت لوگوں کو کم سے کم قانون کے مطابق ہی سزا دی جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کونے کونے میں عورتوں، مردوں، بچوں کا خون بہتا رہا، شرافت کا خون بہتا رہا۔ لیکن اسی وقت مسلمانوں نے مسلمانوں پر، ہندوؤں نے ہندوؤں پر، سکھوں نے سکھوں پر سختی کے ساتھ احتساب نہ کیا اور مجرموں اور بدمعاشوں کو سزا دینے کے لیے نہ حکومت کی مشینری حرکت میں آئی نہ رائے عامہ کا دباؤ بلکہ بہت سے وہ لوگ جنھوں نے یہ شرمناک اور کمینہ حرکتیں کیں وہ دوبارہ بغیر کسی تامل کے سوسائٹی میں لے لیے گئے۔ شاید کہیں کہیں ان کو سورما کا مرتبہ دیا گیا۔

دوستو، کبھی کبھی سامنے اور پیچھے کی گٹھریوں کو جن میں دوسروں کے اور ہمارے اعمال بندھے ہوتے ہیں، ادل بدل کر کے بھی دیکھ لیا کرو کیا عجب ہے کہ تمھاری آنکھ کا شہتیر دوسروں کی آنکھ کے تل سے بڑا ہو!

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

ادھر جتنی تقریریں کی ہیں ان سب میں پاکستان پر حملہ کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں ہر شخص کے اعصاب پر جنگ سوار ہو گئی وہاں کے اخبارات اور لیڈر اس کیفیت کو دور کرنے کے بجائے اس کو اور تیز کر رہے ہیں، چند دن ہوئے، خان قلات نے بلوچیوں کو مدافعت کی تیاری کا حکم دیا تھا اور اب وزیرستان کے قبائلیوں کو خان جہانگیر خاں نے تیار رہنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرحدی قبائلیوں اور بلوچیوں کی توجہ کو اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے کشمیر کا جو "جہاد" شروع کیا گیا تھا اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے اب "نئے خطرے" اور "نئے حملے" کے نعرے بلند کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پاکستان اپنے لئے بڑا سخت خطرہ مول لے رہا ہے۔ اگر عوام کے ذہن و دماغ کی اس طرح تربیت کی گئی تو وہ ایک دن خود پاکستان کے لئے وبال جان بن جائیں گے۔

(ع، ل)

مغربی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

پس پشت ڈال کر ایک بار پھر فرانس اسی راہ پر چل رہا ہے۔ مشینوں کی لوٹ، اس آڑ میں کہ جنگی سامان بنانے والے کارخانے توڑے جا رہے ہیں۔ اس طرح جاری بھی رہی تو ان محنتی کاریگروں کے ہاتھ کا جوہر کیسے چھین لیا جائے گا۔ غرض ورٹمبرگ کی پرانی فیکٹریاں فرانسیسی اور انگریز ہاتھوں سے تباہ ہو رہی ہیں اور چند ہی میل پر امریکن علاقے میں امریکن نئی فیکٹریاں قائم کر رہے ہیں، اور حیران مرد قوم وہاں کم سے کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ انگلستان کے نامہ نگار سے ایک کاریگر نے یہ کہہ بھی دیا کہ ہمارے سامنے کوئی اور راہ نہ ہوگی تو ہم ایسا ہی کریں گے اس نامہ نگار کو یہ امید نہیں تھی کہ انگریز، امریکی اور فرانسیسی کمانڈر جو اس علاقہ کے حاکم ہیں اس آخری لوٹ کو روک کر جو ستمبر کے شروع میں ہونے والی تھی خستہ حال مگر چابک دست کاریگروں کو بچا سکیں گے۔

(ا، ا، ع)

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے نئی روشنی کی نمائندوں کا پیالہ بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے، ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ آپ کو نہ مل سکے۔

یورپ کا خط

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

خود حیثیت کو بلند کر دیتا ہے۔ نئی عمارت بنانے اور پرانی بوسیدہ عمارت کو تھونیاں لگا لگا کر برقرار رکھتے ہیں دو بالکل مختلف ذہنی کیفیتیں سامنے آتی ہیں۔ ہمارے

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے، جامعہ
مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۱۸ | ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

دعا

مولانا محمد علیؒ

۹ر نومبر ۱۹۲۶ء کو ہمدرد کی دوسری بسم اللہ اس دعا سے ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے رب ذوالجلال، اے وہ کہ تیری لطف فرمائی و کرم گستری کے بغیر ارادے ناکام حوصلے پست، اور آرزوئیں صحرائے نامرادی میں تشنۂ تکمیل رہتی ہیں۔ تیرا ایک عاجز و خطاکار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوتا ہے کہ دل کی تڑپ اور روح کی بے چینی کے ساتھ دست دعا دراز کرے۔ اور تجھ سے اپنے ان عزائم و افکار کی کامیابی اور اپنے ان مقاصد و اغراض کی تکمیل کے لئے رہنمائی و توفیق کی درخواست کرے جو آج سے دس بارہ سال پہلے کر نکلا تھا، اور جو ایک عرصے سے میرے عمق قلب میں پرورش پا رہے تھے......

میں اپنی کھوٹی پونجی لے کر بازار جہاں میں نکلا ہوں جو چند امادوں اور چند افکار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں، نہ تو میری جیب میں دولت ہی جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس پر بھروسہ ہو لیکن باوجود ان بے سروسامانیوں کے ایک تیرا وجود ہے جس پر مجھ کو بھروسہ اور ایک تیری ذات ہے جس پر تکیہ اور سہارا ہے اور یہ اتنا بڑا بھروسہ اور اتنا بڑا سہارا ہے کہ اگر دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے چھین لی جائے، میرا تمام ساز و سامان بے سروسامانیوں سے بدل جائے اور میں دنیا سے اور دنیا مجھ سے الگ کر دی جائے تب بھی جب تک تجھ پر بھروسہ کرنے کی توفیق شامل حال ہے میں اپنے آپ کو بہت بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں، البتہ مشکلات سفر کو بڑھانے کے لئے ایک نفس امارہ بار گراں ہے جس سے نجات کی تجھی سے التجا کرتا ہوں ....

اے میرے معبود اور اے کائنات عالم کے پروردگار میں تجھ سے دولت کے انبار اور زر و جواہر کے ڈھیر نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے صبر و استقامت کی درخواست کرتا ہوں مجھے مسلح شیطانی طاقت کا گھمنڈ درکار نہیں ہے اور نہ ابلیسی قوتوں کا بل اپنے بازوؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، بلکہ ایک درد مند اور عاجز بندے کی طرح ظلم و ناانصافی کے خلاف حق و صداقت کے ہتھیاروں سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔

ما دریں در نہ پے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم

آبروی برود اے ابر خطا پوش ببار
کہ بہ دیوان عمل نامہ سیاہ آمدہ ایم

با چنیں گنج کہ شد خازن او روح امیں
بہ گدائی بہ در خانۂ شاہ آمدہ ایم

لنگر حلم تو اے کشتی توفیق کجاست
کہ دریں بحر کرم غرق گناہ آمدہ ایم

خداوندا تو دل کے چھپے ہوئے بھیدوں اور پہلوئے قلب کے رموز و اسرار کا علیم و خبیر ہے۔ اگر میرے دل میں کچھ کھوٹ ہو تو اپنے لطف بندہ پروری سے اس کو دور کر، اور میری نیت، میرے قول، اور میرے عمل کو صدق و صفا کے زیور سے آراستہ فرما دے تاکہ صداقت و راستی کا دریا میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہو جائے، کیونکہ تو حق پرستی کو دوست رکھتا اور صداقت و راستی کو پیار کرتا ہے۔ میرے مالک اور میرے آقا میرا ملک اور میری قوم جو ۳۲ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تیری نصرت بخشی میرا ساتھ دے اور میں اپنی قوم اور اپنے ملک کو اس ہلاکت و بربادی کے دوزخ سے نکال کر صلح و سلامتی اور امن و آشتی کے بہشت زار حیات میں لا کھڑا کر دوں اور ہندوستان جو سالہا سال سے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے جہنم کدۂ فساد بنا ہوا ہے وہ پھر جنت نشان بن جائے۔ گو حالت نہایت یاس افزا اور مایوس کن ہے۔ مگر اے وہ ذات پاک کہ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی تیری شان ہے، میں مایوس نہیں ہوں، اور کیوں کر مایوس ہو جاؤں جبکہ مژدہ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور فرمان لا تیئسوا من روح اللہ موجود ہے۔ پس اے مایوسی کو کامیابی، نا امیدی کو امید اور ناکامی و نامرادی کو کامیابی و کامرانی سے بدل دینے والے قادر ذوالجلال ہم پر رحم کر تو نے ابراہیمؑ کو نمرود سے نجات دلائی، موسیٰ کو فرعون سے چھٹکارا دلایا۔ رام کو راون پر فتح دی اور کرشن کو کنس پر غالب کیا۔ ہم بھی مظلوم ہیں، اور محکوم ہم کو بھی غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے پاک اور روحانی طاقت عطا فرما یعنی ہمارے قلوب کو سمندروں کا سا جوش و خروش، پہاڑوں کی سی مضبوطی اور عزم و وقار اور زمین کی سی عجز و فتادگی اور تحمل و برداشت مرحمت فرما، تاکہ آزادی کی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے ہم بھی کوشش سے دریغ نہ کریں، اور کسی ناکامی و نامرادی سے نہ گھبرائیں۔ اور انھیں کی تقلید کریں جن کے بارے میں تو نے فرمایا ہے: فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
دعا	مولانا محمد علیؒ	۱	غزل	اختر انصاری	۷
کشمیر کا خط	"سیلانی"	۲	غزل	خلیل الرحمٰن اعظمی	۷
قومی تہذیب اور قومی زبان	(اداریہ)	۳	غزل	رزم ردولوی	۷
بزم بے تکلف		۳	چھپا چھکن نے کھانا پکایا (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۸
پچھلا ہفتہ ۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴	جنوبی افریقہ کی حکومت کا	پرنسپل عبدالشکور	۱۰
۲۔ پاکستان	ا، س	۵	نیا شاہکار		
مشرقی دنیا	ا، س	۶	یورپ کے بھوت	عبدالحلیم ندوی	۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے

کشمیر کا خط

(۲)

"سیلانی"

سری نگر
۲۶ ستمبر ۱۹۴۸ء

میں نے اپنے پچھلے خط میں کچھ ان بازگیر نیوں اور بداندیشیوں کا ذکر کیا تھا جو یہاں ہماری ہندوستانی افواج کے متعلق ہمارے بدخواہوں اور ہمارے نادان دوستوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں۔ اور جو تحقیقات کے بعد مجھے یہاں بالکل بے بنیاد معلوم ہوئیں۔

دشمن کے بدخواہوں سے خیر شکایت ہی کیا! البتہ آپ کے وہ نادان دوست جو بزعم خود سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں، حالات کا مطالعہ بالکل غیر جانبداری سے کرتے ہیں اور اپنی صاف گوئی کے ثبوت میں اپنے خلاف اپنے مخالفوں کی ہر غلط دلیل کو صحیح تسلیم کرکے اپنی فراخ دلی کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں اور دشمنوں کی ہوائیوں کو حقائق کا درجہ دیتے ہیں، ان سے اتنی گذارش ہے کہ آپ شوق سے ملکی اور بین الاقوامی سیاست کا مطالعہ کیجئے، لیکن یہ یاد رکھئے کہ اگر خدانخواستہ زیادہ گہری نظر سے آپ نے مطالعہ کیا تو آپ اپنے اور اپنے ملک کے دشمنوں کے مقصد کو غیر محسوس طریقے پر پورا کریں گے۔

مثلاً ایک سوال جو ہر وقت مسئلہ کشمیر کی بنیادی کمزوری کو ثابت کرنے کے لئے زیر بحث رہتا ہے اور ہر طرح کی قیاس آرائیوں اور فرضی اعداد و شمار کی مدد سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کشمیر کی رائے عامہ کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ کس طرح کرنا چاہتی ہے؟

اس سوال کا مقدمہ یوں شروع ہوتا ہے کہ "کشمیر کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے" اس کے بعد یہ مفروضہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں کہ مسلمان بہرحال مسلمان ہیں! یعنی "مسلم لیگی" اس لئے قدرتاً پاکستان کے ساتھ ان کی ہمدردیاں ہیں، اور وہ پاکستان ہی کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے آرزومند ہیں! لہٰذا کشمیر کی رائے عامہ کا فیصلہ ظاہر ہے۔ بدیہی باتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا! حقائق کو جھٹلایا نہیں جاسکتا! آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جاسکتی" وغیرہ وغیرہ! اور پھر آخر میں یہ فیصلہ کہ اس وقت "بزور فوج اور بزور شمشیر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی تمام تر کوششیں اور کارروائیاں جابرانہ ہیں، ظالمانہ ہیں! فاسسٹی ہیں! اور ہٹلرانہ ہیں!"

غرض کشمیر کی رائے عامہ کا فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو، ہم لوگ وہاں اپنے بدخواہوں کی ہوائیوں اور اپنی خداداد سیاسی ذہانت کی مدد سے کشمیر کی "رائے عامہ کے فیصلے" کا تصفیہ گویا اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے کر چکے ہیں!

واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا یہی وکیلانہ طرز استدلال ہے جس کی بدولت انگریزی سرکار کی اونچی سیاسی عدالت سے ہمارے ملک کے بٹوارہ کا مسئلہ بالآخر ہمارے دشمنوں کے حق میں طے ہوا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اب اگر کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے سے ہندوستان میں ہندوؤں کی خالص حکومت قائم ہو جائے تو پھر کیا ہے ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی منہ مانگی مراد مل گئی، کشمیر کی صرف چالیس لاکھ آبادی کو پاکستان کے حوالے کر دیجئے، اور اس کے بعد اطمینان سے متحدہ ہندو حکومت جو دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت سے بھی بڑی ہو بنا لیجئے! یہ تجویز اتنی معقول اور ازبس منصفانہ ہے کہ ہر فرقہ پرست خواہ وہ مسلم لیگی ہو یا مہاسبھائی اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا اور اسی لئے حکومت پاکستان کے اس پرزور مطالبے کی تائید اگر ہندوستان کے کسی حلقے میں ہو رہی ہے تو وہ یہی مہاسبھائی حلقہ ہے .... بلکہ حیدرآباد کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے وہاں اس حلقہ کی طرف سے کشمیر کا فیصلہ چکانے کے لئے بڑی پرزور کوششیں شروع ہو گئی تھیں اور بڑے بڑے ذمہ دار اخبارات نے حکومت ہند کی کشمیر نوازی پر تنقید نکتہ چینی شروع کر دی تھی، اور اسی تجربے کے لئے میدان تیار کیا جا رہا تھا۔

یہاں سری نگر میں، مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس مسئلہ کو ازسرنو طے کرنے پر وہاں اصرار ہے یعنی الحاق کا مسئلہ، وہ یہاں ایک طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور یہ فیصلہ ان لوگوں کا ہے جو کشمیر کی اکثریت کے حقیقی نمائندے ہیں، ان کے اس فیصلے کے عمل درآمد پر پورا ایک سال گذر چکا ہے، اور ہر دیکھنے والا یہ اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے کہ وادی کشمیر کی رائے عامہ کلیتاً اس فیصلہ کی تائید میں ہے، جن علاقوں پر پاکستانی قبائل کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہ پھر پاکستانیوں سے خالی کرا لئے گئے ان کی "رائے عامہ" بھی غیر مشتبہ طور پر اس فیصلہ کے حق میں ہے ہاں ان کی اس "رائے عامہ" کے معنی یہی ہیں کہ وہ شیخ عبداللہ کے ساتھ ہیں! اور مہاراجہ کے مخالف! اس وقت تک جو علاقے پاکستان کے قبضہ میں ہیں اور کشمیری ہیں، ان کے متعلق بھی پورے وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ ان کی رائے عامہ بھی شیر کشمیر کے ساتھ ہے، اور ہاں! مہاراجہ کے خلاف ہے، کشمیر کی سیاست کا یہی ایک عقدہ تضاد ہے جو شیخ عبداللہ اور ان کی عوامی حکومت آج کل عملاً حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شیخ صاحب اور ان کی عوامی حکومت کے مخالفین کی فہرست تیار کی جائے تو سرفہرست مہاراجہ کا نام نامی آئے گا اور پھر ان کے لواحقین کا، مسلم کانفرنس کا اور اس کے مفرور شکست خوردہ لیڈروں کا۔ ملازمت پیشہ "مجاہدین اسلام" کا، اقتدار یافتہ برہمنوں کا، جاگیرداروں کا، اور سرمایہ داروں کا! یہ سب حضرات اپنی اپنی اغراض کے بندے ہیں، اور اسی لئے شیخ صاحب کے مخالف ہیں اور ان کی عوامی حکومت کے مخالف ہیں۔ ان کی کل تعداد ۵، ۱۰ فی صدی ہی سہی، لیکن اب تک تو انہیں کا راج رہا ہے۔ یہی لوگ اپنے مستقل مفادات کی بدولت ۹۰ اور ۹۵ فی صدی آبادی پر حکومت کرتے رہے ہیں، ان کو لوٹتے رہے ہیں، اور ان کی لوٹ پر جیتے رہے ہیں۔ ان میں شیخ بھی ہیں اور برہمن بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں اور کافر بھی ہیں، "کٹر مسلم لیگی" بھی ہیں اور کٹر مہاسبھائی بھی، پاکستانی بھی ہیں اور پاکستان کے دشمن بھی، لیکن جہاں تک ان کے اغراض اور مفاد کا تعلق ہے سب کے سب شیر کشمیر اور ان کے عوامی راج کے دشمن ہیں اور اس لحاظ سے بقول مرشد، سب کے سب "امتہ واحدہ" میں شمار کئے جا سکتے ہیں! کل تعداد ان کی مگر ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کو نہ بھولئے! باقی ۹۰ فی صدی شیخ عبداللہ کے ساتھ ہے۔ شیخ عبداللہ کا فیصلہ ان کا فیصلہ ہے۔ اور جن لوگوں کو اب تک معلوم نہیں ہے ان کو بھی صاف اور صریح الفاظ میں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ نیشنل کانفرنس کا کنونشن اوائل اکتوبر میں طلب کیا گیا ہے، اس میں دو فیصلے ہونے والے ہیں، ایک تو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے مستقل الحاق کا فیصلہ اور دوسرا عوامی راج کے "نئے کشمیر" کا تعمیری پروگرام۔

شیخ عبداللہ کے عوامی راج اور ان کے "نئے کشمیر" میں مہاراجہ کے لئے صرف برائے نام جگہ رکھی گئی ہے اور وہ بھی صرف حکومت ہند کی عام ریاستی سیاست کی یکسانی کو قائم رکھنے کے لئے، ورنہ کشمیر کے معاملات میں فی الحقیقت اب مہاراجہ کا کوئی عمل دخل نہیں رہا ہے اور کشمیر کا بچہ بچہ روز بروز اس حقیقت سے واقف ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے گذشتہ چند ماہ کے عرصے میں شیخ عبداللہ کا اثر اور اقتدار اور ان کی عوامی حکومت بڑی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے، شیخ صاحب کو اور ان کے رفقائے کار کو بھی یہ اطمینان اور یقین ہو گیا ہے کہ ان کے "نئے کشمیر" کی عمارت رفتہ رفتہ جیسے بلند ہو گی، کشمیر کی سیاست کا عقدہ تضاد خود بخود حل ہو جائے گا۔

کشمیر کی عوامی حکومت کی یہی خود اعتمادی ہے جس کے بل بوتے پر وہ کشمیر کی سیاسی اور ہندوستان کی قومی جنگ اس وقت لڑ رہے ہیں اور "نئے کشمیر" کی تعمیر کر رہے ہیں۔

وہاں ہندوستان میں جس طرح عنان حکومت اس وقت کانگریس کے ہاتھ میں ہے، بالکل اسی طرح یہاں حکومت کشمیر پر نیشنل کانفرنس کا تسلط ہے نیشنل کانفرنس کی مخالف جماعت "مسلم کانفرنس" تھی جو برائے نام مسلم تھی، اور فی الحقیقت بلا تفریق مذہب و ملت جملہ رجعت پسندوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی! اس کے لیڈر سب کے سب پاکستان چلے گئے، لیکن جس طرح تقسیم سے پہلے ہندوستان میں مسلم لیگ کے اصلی کارکن اور روح رواں سرکاری دفاتر کے ملازم پیشہ مسلمان تھے اسی طرح یہاں بھی مسلم کانفرنس کے اصلی کارکن سرکاری دفاتر ہی میں ملیں گے۔ ان خاموش کام کرنے والے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

قومی تہذیب اور قومی زبان

اس مسئلے پر ہم ۰ر جولائی کے "نئی روشنی" میں اپنے خیالات اختصار کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ اب اس پر دوبارہ قلم اٹھانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس عرصے میں شری پرشوتم داس ٹنڈن نے ایک تہذیب اور ایک زبان کی تحریک اٹھائی ہے جو ہمارے نزدیک ملک اور قوم کے لئے نہایت مضر ہے، اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اہلِ نظر کو اس کے خطروں سے آگاہ کر دیں۔

اس وقت اگر ملک کی تہذیبی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ بہت سے تہذیبی عناصر میں سب فرقوں اور جماعتوں میں صدیوں سے گہرا اشتراک چلا آ رہا ہے۔

بعض میں اشتراک پچھلے ڈیڑھ سو سال میں پیدا ہوا ہے۔

بعض میں ابتدا سے اختلاف ہے، اور وہ کچھ دن سے بہت بڑھ گیا ہے۔

جو چیزیں مدتوں سے مشترک چلی آتی ہیں، ان میں رہنے سہنے، کھانے پینے کا طریقہ ہے، عام طبیعت اور مزاج، سبھاؤ اور برتاؤ ہے، عام وجدان اور احساس، آرٹ اور ایک حد تک ادب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم کو جزوی اختلافات ضرور نظر آتے ہیں، مگر وہ ایسے سطحی ہیں کہ ان سے زندگی کی بنیادی وحدت میں خلل نہیں پڑتا۔ غیر ملک کے لوگوں سے پوچھئے تو ان کو سب ہندوستانیوں کی گھریلو معاشرت اور تہذیب یکساں نظر آتی ہے۔

جو مشترک چیز زمانہ حال میں مغربی اثر سے پیدا ہوئی ہے یا اگر تھوڑی بہت پہلے سے موجود تھی تو اب زیادہ ابھر آئی ہے، وہ جمہوری روح اور علمی نقطۂ نظر ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے جو اشتراک خیال پیدا ہوا ہے وہ تو صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہے، مگر جمہوری روح انڈین نیشنل کانگریس کی ساٹھ برس کی کوششوں سے خاص و عام میں پھیل گئی ہے، اور اس نے ذہنی وحدت کی ایک مضبوط بنیاد قائم کر دی ہے جس پر تہذیبی وحدت کی پائدار عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔

اب ان عناصر کو لیجئے جن میں اختلاف ہے، ان میں سب سے اہم مذہب ہے اور زبان۔ مذہبی عقائد و اعمال کے فرق سے ہم فرقوں میں اور زبانوں کے فرق سے لسانی حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مذہب اور زبان ہی ہمارے سب سے بڑے تہذیبی اختلافات ہیں۔ برطانوی حکومت نے اور اس کی سرپرستی میں ان ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو جمہوریت و آزادی کی تحریک سے خائف تھے اور اس کو کچلنا چاہتے تھے، ان اختلافات کو خوب خوب ابھارا، یہاں تک کہ ملک ایک خوں ریز عمل جراحی کے ذریعے سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اب ہندوستان کے سب ہی خواہ چاہتے ہیں کہ آئندہ ہمارے ملک کے اندر یہ دونوں چیزیں قومی وحدت میں خلل ڈالنے کا باعث نہ بنیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جہاں تک کہ مذہب کا تعلق ہے، اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ سب مذہبوں کو ایک سرے سے ختم کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سب لوگوں کو ایک مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ ہر مذہب سے بے جا تعصبات کا پردہ ہٹا کر اس کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جائے اس لئے کہ متعدد ہندو مسلمان عارفوں کی تعلیم اور زندگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سچی مذہبی روح ہندوستان میں فصل کی قوت نہیں بلکہ وصل کی قوت ہے۔ شکر ہے کہ پہلی دو صورتوں کی حمایت ہمارے ملک میں کسی ذمہ دار فرد یا جماعت نے آج تک نہیں کی، البتہ تیسری صورت ہمارے زمانے میں مہاتما گاندھی نے اختیار کی اور اب ان کے پیچھے پیرو اختیار کر رہے ہیں۔

اب رہی زبان سو اس کے اختلاف کو مٹانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کسی ایک ترقی یافتہ زبان کو لے کر سارے ملک کی علمی ادبی اور سرکاری زبان بنا دیا جائے دوسرا یہ کہ فی الحال ان سب کاموں کے لئے کسی حد تک انگریزی اور بڑی حد تک صوبائی زبانوں کو استعمال کیا جائے (مدھ دیش کے صوبوں میں ہندی اور اردو دونوں کو صوبائی زبانوں کی حیثیت حاصل رہے) مگر اسی کے ساتھ یہ کوشش کی جائے کہ ہندوستانی جو مدھ دیش میں عام بول چال کی زبان ہے، سارے ملک کے اندر ایک کاروباری زبان کی حیثیت سے پھیلے۔

ان میں سے پہلے طریقے پر شری پرشوتم داس ٹنڈن زور دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندی زبان پر سنسکرت کا رنگ، زیادہ سے زیادہ چڑھا کر اسے جلد سے جلد ملک کی عام زبان بنا دیا جائے۔ ٹنڈن جی کے اس خیال سے کسی محب وطن کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی قومیت کے استحکام کے لئے ایک مشترک قومی تہذیب کا ہونا لازمی ہے، اور قومی تہذیب کی تکمیل کے لئے ایک قومی زبان ضروری ہے۔ اختلاف اس امر میں ہے اور بڑی شدت سے ہے کہ یہ مقصد ادبی ہندی کو جو زیادہ سے زیادہ ایک خاص علاقے میں ایک بڑی جماعت کی زبان ہے، زبردستی سب جماعتوں اور سب صوبوں پر ادبی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے مسلط کر دینے

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

بزمِ بے تکلف

(۲)

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جو اپنے آپ کو لیڈر کہے وہ لیڈر ہے"۔

"بات کیوں نہیں ہوئی۔ ارے بھئی لیڈر کی تعریف اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہی سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ہے۔ اور یہی ان میں اور دوسروں میں ما بہ الامتیاز ہے"۔

"قبلہ آپ نے تو اور بھی بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیے۔ مشترک تو قدرے سمجھ میں آ بھی گیا، مگر یہ "ما بہ" تو کسی طرح گلے نہیں اترتا، معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے موٹی سی گالی دے دی"۔

"معلوم نہیں آپ مجھے بنانے کے لئے بنتے ہیں یا بنے بنائے ہیں۔ خیر! اب سن لیجئے۔ قدرِ مشترک وہ صفت ہے جو ایک نوع کے سب افراد میں موجود ہو۔ سب پرندوں میں یہ صفت ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ سب لیڈروں میں ——————"

"........ یہ صفت ہے کہ وہ اڑاتے ہیں۔

بے پرکی۔ اب سمجھ گیا"۔

"خاک سمجھ گئے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ادعا ہے۔ یعنی ہر ایک لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اپنی زبان سے اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے"۔

"ہاں! ہاں صاحب!! وہی مثل ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو۔ مگر یہ بے پر کی اڑانی نہیں ہوئی تو اور کیا ہوئی؟ آپ تو خواہ مخواہ کی حجت کرتے ہیں"۔

"اچھا آپ یوں ہی سمجھ لیجئے۔ اب رہا ما بہ الامتیاز۔ یہ اس صفت کا نام ہے جو ایک نوع کی ایک جنس میں ہو اور دوسری میں نہ ہو۔ مثلاً یہی اڑنے کی صفت کہ پرندوں میں ہے، انسانوں اور دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتی"۔

"سو لیڈر کے وہ تو ایسا اڑتا ہے کہ کیا کوئی پکھیرو اڑے گا۔ یوں تو خیر پیر بھی اڑتے ہیں مگر انھیں اڑانے کو مرید ہونے چاہئیں۔ لیڈر کو اس کی ضرورت نہیں، وہ اپنی ہوا میں آپ ہی نرالے بھرتا ہے"۔

"ارے بھائی یہ اڑنا استعارہ ہے، پرندوں کا اڑنا حقیقت ہے، مگر بات آپ ٹھیک کہتے ہیں ——

اچھا تو لیڈر ——————"

"میں کتنی ہی ٹھیک بات کہوں، آپ مین میکھ نکالے بغیر نہیں رہتے، خیر آگے چلئے۔ اچھا تو لیڈر ——————"

"اپنی نوع کے دوسرے لوگوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے لیڈری کا دعوےٰ کرتا ہے، اور دوسرے اپنی بڑائی کا کم سے کم صریحی یعنی کھلا ہوا دعوےٰ نہیں کرتے"۔

"جی، اور یہ شاعر حضرات کیا ڈھکا ہوا دعوےٰ کرتے ہیں۔

ع سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

مرحبا کشمیر

آخر کار کشمیر نیشنل کانفرنس نے ان سب شکوک و شبہات کا خاتمہ کر دیا جو انڈین یونین میں بہت سے لوگوں کے دل میں موجود تھے اور بعض لوگوں کی زبان پر بھی آ جاتے تھے۔ ان کی تفصیل "آپ سیلانی" کے دوسرے خط میں پڑھیں گے، جو اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ وہمی اور بدگمان طبیعت لوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو خود شیخ عبداللہ آخر میں ہندوستان سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کریں یا ان کے ساتھی ان سے باغی ہو کر کشمیر کو پاکستان کی طرف کھینچ لے جائیں۔ مگر اب نیشنل کانفرنس کے اتنے بڑے موتمر نے جتنا بڑا اس سے پہلے کبھی منعقد نہیں ہوا تھا، یک زبان ہو کر صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ نیشنل کانفرنس کشمیر کے مستقل طور پر انڈین یونین میں شریک ہو جانے کی حامی ہے۔ اس میٹر میں جموں اور کشمیر کے ہر ایک گوشے کے نمایندے موجود تھے جو اپنے اپنے حلقے میں اٹھارہ برس سے عوام کے مسلمہ لیڈر رہے۔ اس لئے ان کی رائے جمہوریت کے ہر معیار کے مطابق ریاست کے عوام کی رائے سمجھی جائے گی۔ موتمر نے نہ صرف انڈین یونین میں شرکت کے بارے میں شیخ عبداللہ کی دل و جان سے تائید کی بلکہ ان کی معاشی پالیسی کی بھی بڑی شد و مد سے حمایت کی۔ ہم نیشنل کانفرنس کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ اس نے مستقبل کی دشوار گزار اور صبر آزما راہ میں ہندوستان کو اپنا رفیق سفر بنا کر اپنی قوم کی صحیح رہنمائی کی ہے، اور شیر کشمیر شیخ عبداللہ صاحب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کہ اس موتمر نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ان کو ریاست کے عوام میں اتنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے، جتنی اس زمانے میں بڑے سے بڑے لیڈروں کو اپنے ملک میں ہو سکتی ہے۔

آخر مقابلے کی ٹھہری

انڈین نیشنل کانگریس کی روایات میں داخل ہے کہ صدارت کے لئے مقابلہ نہیں ہوتا۔ مختلف صوبوں کے لوگ امیدوار کو نامزد کرتے ہیں، اور کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر ہر طرح کے علامات اور قرائن سے پیرا اندازہ کرنے کے بعد کہ کانگریس کے ممبروں کی اکثریت ان میں سے کس امیدوار کو صدر بنانا چاہتی ہے، اس کی تائید کرتے ہیں اور دوسروں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے نام واپس لے لیں۔ اب تک صرف ایک بار مقابلہ ہوا تھا، جب گاندھی جی سبھاش چندر بوس سے اپنا نام واپس لینے سے انکار کیا تھا۔ وہ ڈاکٹر پٹابھی ستیارمیہ کا مقابلہ کیے ان کو شکست دی تھی۔ سبھاش چندر کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ انھوں نے صرف چند روز کی انتخابی مہم میں عام رائے کا دھارا پلٹ دیا، اور کانگریس کے ذمہ دار لیڈروں کے اندازے کو جو در اصل صحیح تھا، غلط ثابت کر دیا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ کانگریس کی اکثریت دم بھر کے لئے ان کی دلکش سیرت کی مقناطیسی قوت سے مسحور ہو گئی تھی، لیکن در اصل ان کے ساتھ نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر استعفا دے دیا اور کانگریس کے اندر ایک الگ گروپ فارورڈ بلاک کے نام سے قائم کیا۔ اس بار بھی یہ صورت پیش آ رہی ہے کہ ڈاکٹر پٹابھی ستیارمیہ کے مقابلے میں اور تو سب امیدواروں نے کانگریس ہائی کمانڈ کے سمجھانے سے اپنے نام واپس لے لئے ہیں مگر شری پرشوتم داس ٹنڈن میدان سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس لئے مقابلہ ہوگا، اور کانگریس کے آیندہ اجلاس کے تین ہزار ڈیلیگیٹ اپنے اپنے صوبے میں رائے دیں گے کہ وہ دونوں میں سے کس کو صدر بنانا چاہتے ہیں۔ ذاتی اوصاف خصوصاً جوش اور خلوص کے لحاظ سے کسی ایک دوسرے پر ترجیح دینا بہت مشکل ہے لیکن چونکہ ڈاکٹر پٹابھی ستیارمیہ سیاسی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں گاندھی جی کے اصولوں کے پیرو ہیں، عرصے تک ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہنے کی وجہ سے کانگریس کی پالیسی کو زیادہ سمجھتے ہیں اور ریاستوں میں کانگریس کی تحریک کو فروغ دینے میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دے چکے ہیں، اس لئے اکثر صوبوں میں کانگریس کی عام رائے کا غالب اور قوی رجحان ان ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ٹنڈن جی بھی وہ کرشمہ دکھا سکتے ہیں یا نہیں جو سبھاش بوس نے دکھایا تھا۔

حیدر آباد میں کامل امن

سرکاری اور نجی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بلدے میں اور اضلاع میں پوری طرح امن ہو گیا ہے۔ اکا دکا رضاکار اور کمیونسٹ اب بھی کہیں کہیں شورش برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ فوجی گورنر کی امداد کے لئے نئی مجلس مقرر ہوئی ہے جس میں نواب زین یار جنگ بھی ہیں۔ باب حکومت میں بعض پرانے معتمدوں کی جگہ نئے معتمد مقرر کئے گئے ہیں، اور بعض جن میں سجاد مرزا صاحب معتمد تعلیمات شامل ہیں اپنے عہدوں پر بحال رکھے گئے ہیں۔ ۱۲ر اکتوبر کو بمبئی میں سردار پٹیل کی موجودگی میں حیدر آباد کے مستقبل کے متعلق گفتگو ہوئی، لیکن در اصل حیدر آباد کا مستقبل خود وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، دونوں فرقوں کے ذمے دار لیڈر مل کر ایک مضبوط جمہوری پارٹی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو فوجی حکومت جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔ ملک کا انتظام اس پارٹی کے معتمد لیڈروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔

لندن سے اُمید کی کرن

لندن سے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے شاندار استقبال، ان کی اکابر عالم سے دوستانہ ملاقاتوں کی خبروں کے ساتھ ساتھ ایک خوش آیند خبر یہ آئی ہے کہ ان سے اور لیاقت علی خاں صاحب سے مسٹر اٹلی اور مسٹر بیون کی موجودگی میں دو ملاقاتیں ہوئیں۔

خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے حال میں بی۔ بی۔ سی کے نمایندے کو جو بیان دیا تھا اس کے بعد یہ دوسری امید افزا علامت ظاہر ہوئی ہے۔ سب صلح پسندوں کو دعا کرنی چاہیئے کہ لندن کی گفتگو کامیاب رہے اور کشمیر کے مسئلے کا جو ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی راہ میں حائل ہے بہ خیر و خوبی فیصلہ ہو جائے۔

قومی زبان قومی تہذیب (بسلسلہ صفحہ ۲)

سے حاصل نہیں ہو سکتا، اور نہیں ہونا چاہیئے۔ صرف مسلمانوں کا ذکر نہیں۔ سب جماعتوں میں اور سب صوبوں میں جن کی ذہنی نشو و نما صدیوں سے دوسری زبانوں میں ہو رہی ہے اور سنسکرت ان کے لئے اجنبی زبان ہے اس پالیسی کی شدید مخالفت ہوگی، اور اس کی کامیابی کے لئے جمہوری طریقے کے بجائے فسطائی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کو خود ٹنڈن جی بھی ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔ اس لئے اگر کانگریس کی طرف سے جو جمہوریت کا سب سے بڑا سہارا ہے فسطائیت کو ذرا سی ڈھیل مل گئی تو اس کی دبی ہوئی قوتیں اُبھر کر جمہوریت کو نگل جائیں گی۔ دوسرا طریقہ قومی زبان کی تعمیر کا وہ ہے جو ہندوستانی پرچار سبھا ڈاکٹر راجندر پرشاد کاکا کالیلکر اور شری ستیہ نرائن کی رہنمائی میں اختیار کر رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابھی صرف اس پر قناعت کی جائے کہ سہل اور سادہ ہندوستانی (جو ہندوستان کی بول چال ہے) اردو اور ناگری خطوں میں صوبوں کی زبان کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو سکھائی جائے، اور یہ اُمید رکھی جائے کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی لسانی حیثیت سے اتنی ترقی کرے گی۔ اور ملک میں اتنی مقبولیت حاصل کرے گی کہ حقیقی معنوں میں مشترک قومی زبان بن جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دوسرا طریقہ بہت دیر طلب ہے مگر کیا کیا جائے جمہوریت کے طریقے ہوتے ہی دیر طلب ہیں۔ فسطائیت کی راہ میں قومیں بڑی تیزی سے آگے بڑھ سکتی ہیں۔ مگر ہمارا یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں سر کے بل ہلاکت کے گڑھے میں نہ گر جائیں۔

(ع، ح)

بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۳)

کہنے اس سے بڑھ کر آپ کا لیڈر کیا کہے گا؟

"یہ آپ نے بجا فرمایا، شاعر بے شک اس صفت میں لیڈر کے ساتھ شریک ہے بلکہ ان میں بعض اور چیزیں بھی مشترک ہیں، دونوں میں تخیل کی فراوانی۔۔۔"

"ارے صاحب! صاف صاف کہیے نا کہ دونوں بے پر کی اُڑاتے ہیں۔"

"اچھا بابا یوں ہی سہی، تمھاری تسلی تو ہو کسی طرح۔"

۲۔ پاکستان

مشرقی بنگال سے فتنہ اُٹھ رہا ہے

اپریل ۱۹۵۰ء میں ہندوستان اور پاکستان کے معاہدے کے بعد مشرقی بنگال سے ہندوؤں کے نکلنے کی رفتار سست ہوگئی تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا اور آنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ۵ مہرجون کو مغربی بنگال کی حکومت نے اعلان کیا کہ اس تاریخ کے بعد آنے والوں کو پناہ گزیں تصور نہیں کیا جائے گا۔ اور انھیں کسی خاص مدد کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ سے نقل مکان کے اس رجحان میں کچھ کمی آئی، لیکن اب یہ مسئلہ دوبارہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اور مغربی بنگال کی حکومت نے، زبر نو کچھ پابندیاں لگائی ہیں۔

سہروردی صاحب نے مشرقی پاکستان کی حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اقلیتوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرے ان کی تجویز ہے کہ اقلیتوں کے نمائندوں کو وزارت اور دوسرے اہم عہدے دیئے جائیں تاکہ ان میں یہ احساس پیدا ہوسکے کہ پاکستان میں وہ اجنبی نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تجویز حکومتِ پاکستان کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی، لیکن سہروردی صاحب کی اپیل کا ایک حصہ پھر بھی اہم ہے۔ انھوں نے کہا ہے "ہمیں یہ حق ہے کہ حکومت پاکستان سے ایسا برتاؤ کرنے کا مطالبہ کریں جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کا بھلا ہو حکومت پاکستان کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہندو مشرقی پاکستان میں ٹھہر جائیں۔ انھوں نے پاکستان کے ارباب حل وعقد کو یہ موٹی سی بات یاد دلائی کہ دونوں مملکتوں میں اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کا ایک پیمانہ بھی ہوسکتا ہے کہ کہاں سے اقلیتیں بھاگنا چاہتی ہیں اور کہاں وہ رہنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی حکومت کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی یہ پالیسی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہوسکتی ہے۔

پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر سری پرکاش نے ان اسباب کی وضاحت کی ہے جن کی وجہ سے ہندو مشرقی بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے ارباب حل وعقد ہر وقت اپنی ریاست کے "اسلامی" ریاست ہونے پر زور دیتے رہتے ہیں، اور اس لئے قدرتاً غیر مسلم اس فضا میں اپنے لئے ایک مبہم سا خوف محسوس کرتے ہیں۔ سری پرکاش نے کہا کہ دونوں ملکتوں کو چاہیئے کہ ایسی کسی بات پر زور نہ دیں جس سے یہ گمان ہو کہ ان کی ریاست ایک مذہبی ریاست ہے۔ ہندوستان میں یہ نعرہ بلند کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ پاکستان میں یہ نعرہ نہ لگانے والوں کی تعداد کم ہے، اقلیتوں کے ساتھ سلوک، جمہوری حکومتوں کی جانچ کا ایک معیار ہے۔ حکومت پاکستان خود اپنے لئے اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے مذہبی ریاست کا نعرہ بلند کرکے کانٹے بو رہی ہے

حیدرآباد میں دخل درمعقولات

معین نواز جنگ صاحب نے عارضی طور پر حیدرآباد کا مسئلہ سکیورٹی کونسل سے واپس لے لیا ہے اور کراچی تشریف لائے ہیں۔ تاکہ وہاں سے حیدرآباد کی "حقیقی" صورتِ حال کا اندازہ لگائیں اور پھر فیصلہ کریں کہ حیدرآباد کے سوال کو دوبارہ اُٹھائیں یا نہیں۔ معین نواز جنگ صاحب کی اس ہستی کے متعلق ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے، کیونکہ وہ بے چارے بساط سیاست کے ایک مہرے ہیں جن کی چالیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن حکومت پاکستان سے کچھ ضرور کہنا چاہتے ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستانی وزیراعظم نے ہندوستان کے ساتھ دوستی کے بہت سے دعوے کئے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان دعووں کے ساتھ ایک شرط لگادی ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ہندوستان کشمیر کو بھون کر اور ایک پلیٹ میں رکھ کر لیاقت علی صاحب کی خدمت میں پیش کردے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نہ تو دوستی کی خواہش میں خلوص ہے نہ ان دعووں کی کوئی حقیقت ہے۔ حیدرآباد کے سلسلے میں پاکستان کی یہ درخواست ہے کہ اب کی بار جب اس سوال پر بحث ہو تو انھیں بھی اس میں حصہ لینے کا حق دیا جائے؟ دوستی کے ان دعووں کی آخری تردید ہے۔ ظاہر ہے حکومت پاکستان کو یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ متحدہ اقوام حیدرآباد کے عوام کا فیصلہ بدل سکے گی۔ اس دلچسپی کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ سکیورٹی کونسل کے اس جلسے میں اگر حیدرآباد پر مزید بحث وگفتگو کی حماقت کی جائے ظفراللہ صاحب ہندوستان کے خلاف زہر اگلیں کیا پاکستان میں ایسا ایک بھی آدمی نہیں جو عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ ہندوستان سے دشمنی پاکستان کے مفاد کے لئے تباہ کن ہوگی؟

البتہ خواجہ ناظم الدین صاحب نے حال میں جو بیان دیا ہے اس کا لہجہ مصالحانہ ہے۔ انھوں نے دولتِ مشترکہ کی ممبر ریاستوں سے درخواست کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کریں، اور یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ پرامن طریقے سے ہوسکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بہ خلاف لیاقت علی خاں صاحب کے سمجھوتے کے لئے کوئی ایسی شرط نہیں لگائی کہ دوسرا فریق ہتھیے پر سے اُکھڑ جائے اگر پاکستان کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ بھی صلح جوئی کا یہی انداز اختیار کریں، تو شاید کچھ نتیجہ نکلے۔

غذا کی حالت بگڑ گئی

پچھلے دنوں پاکستان کے وزیر غذا مسٹر عبدالستار پیرزادہ نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ چاول کی فصل کی تباہی کی وجہ سے پاکستان ہندوستان کو چاول نہیں دے سکے گا۔ پاکستان میں عام طور پر غلہ کی بہتات ہوتی ہے لیکن اس سال کوئی ۲۵ لاکھ ایکڑ زمین سیلاب کی زد میں آگئی اور اس طرح پاکستان کو کوئی چھ لاکھ ٹن کا نقصان اُٹھانا پڑا ہے مشرقی پاکستان میں جو عام صورتوں میں بھی اپنی ضرورت بھر غلہ پیدا نہیں کرتا محض سیلاب سے ۱۰ لاکھ ایکڑ کی اُگی ہوئی فصلوں کو نقصان پہنچا چار لاکھ ایکڑ کی پیداوار تو بالکل ہی تباہ ہوگئی ہے۔ مشرقی پاکستان کی غذائی صورتِ حال نازک تو ہمیشہ ہی رہتی ہے۔ اس مصیبت کی وجہ سے جو دقتیں پیدا ہوں گی ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ مشرقی بنگال کے بعض علاقوں میں چاول کے دام بڑھ کر ۶۰ روپے من تک پہنچ گئے ہیں ظاہر ہے یہ قیمت مشرقی پاکستان کے بسنے والوں کی سکت سے بالکل باہر ہے مغربی پنجاب میں ساڑھے چار لاکھ ایکڑ کی پیداوار بالکل ہی تباہ ہوگئی ہے۔ ویسے سیلاب کا اثر کوئی ۱۵ لاکھ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا اب مغربی پنجاب نے ۶۵ ہزار ٹن غلہ مرکزی حکومت سے مانگا ہے۔ مرکزی حکومت نے ۱۷ ہزار ٹن غلہ مغربی پنجاب کو دیا ہے اور عبدالستار صاحب پیرزادہ نے کہا ہے کہ اس بات کا دارومدار کہ پاکستان کی مرکزی حکومت مغربی پنجاب، مشرقی بنگال اور دوسرے صوبوں کو کتنا اناج دے سکے گی اس پر ہوگا کہ بین الاقوامی غذائی کونسل پاکستان کو کتنا اناج دے گی۔ وزیر غذا نے بتایا کہ پاکستان نے کونسل سے ایک لاکھ چھہتر ہزار ٹن اناج مانگا ہے جو اس کی ضرورت کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے اور ملکوں سے بھی غلہ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردی ہیں، اور اگر ضرورت پڑی تو باہر کے علاقے سے بھی درآمد کرنے پر تیار ہوگا۔ وزیر غذا نے یقین دلایا کہ پاکستان میں قحط پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ حکومت پاکستان اپنے اس فرض سے واقف ہے کہ عوام کو غذا بہرحال ملنی چاہیئے اور وہ اپنا یہ فرض پوری طرح ادا کرے گی۔ لیکن سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہندو پاکستان دونوں کو ایک اور سبق لینا چاہیئے اور وہ یہ کہ اس مصیبت سے جو ہر سال کہیں نہ کہیں تباہی پھیلاتی ہے، بچنے کی صورتیں نکالی جائیں۔

تجارت کے سنبھلنے کی اُمید

حکومت پاکستان نے حال ہی میں چیکوسلوواکیہ سے ایک تجارتی معاہدہ کیا ہے۔ چیکوسلوواکیہ سے ایک تجارتی مشن ہندوستان اور پاکستان آیا تھا۔ اس مشن نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کو فنی امداد فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی چیکوسلوواکیہ وسط یورپ کا شاید سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے اور وہاں سے پاکستان اور ہندوستان دونوں کو بہت سے کام سیکھے لوگ اور ماہر مل سکتے ہیں جو ہماری صنعتوں کے قیام میں مدد دے سکتے ہیں۔ پتہ نہیں چیکوسلوواکیہ کے مشن کی اس پیش کش کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن یہ تجارتی معاہدہ مزید نفع بخش تعاون کے لئے راستہ کھول سکتا ہے۔ موجودہ حالت میں جب پاکستان میں مشینوں کی ضرورت سخت ہے، اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی دوبارہ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

مشرقی دنیا

برما کی حالت ناگفتہ

برما کے متعلق خبریں بہت تھوڑی اور ادھوری آتی ہیں، لیکن اگر کوشش کی جائے تو ان کی بنا پر ملک کے مسائل کا ایک ایسا خاکہ بنایا جا سکتا ہے جو سارے مسائل کا احاطہ کرے۔ سب سے پہلے خانہ جنگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹ اثر و اقتدار وسط برما میں قائم ہے اور یہاں سے اس کا ہٹانا مشکل ہے۔ اس لئے یہ خانہ جنگی طویل ہوگی۔ پچھلے دنوں یہ خبریں آئی ہیں کہ میڈم آنگ سان اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ اینٹی فاشسٹ لیگ (آنگ سان کی جمعیت) سے الگ ہو جانے والی جماعتوں کو دوبارہ لیگ کے حلقے میں داخل کر لیا جائے۔ اس کوشش میں کامیابی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے۔ پیپلز والنٹیر لیگ کے ایک حلقہ کی یہ رائے تھی کہ برمی حکومت کی پالیسی کے تعین میں کمیونسٹوں کو شریک کرنا ضروری ہے۔ اور جب ان کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا تو وہ الگ ہو کر کمیونسٹوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ انھیں اب کمیونسٹوں سے توڑنا مشکل ہے۔ قیاس ہے کہ خانہ جنگی میں پارٹیوں کی موجودہ تقسیم غالباً عارضی نہیں ہے۔

اس خانہ جنگی کو برما کی موجودہ معاشی زندگی کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ برما کے بجٹ میں دس کروڑ کا خسارہ ہے، لیکن خسارہ کا یہ اندازہ ان مفروضوں پر مبنی ہے کہ بغاوت جلد ختم ہو جائے گی۔ یا کی جاسکے گی۔ یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا اور امکان اسی کا ہے، تو پولیس اور فوج کے مصارف میں ظاہر ہے اضافہ ہوگا، اور بجٹ کا خسارہ اسی تناسب سے بڑھ جائے گا۔ ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں اس خسارے کو پورا کیونکر کیا جائے گا؟ موجودہ حالت تو یہ ہے کہ انتظامی مشین بہت سے علاقوں میں درہم برہم ہو چکی ہے اور اس کی کارکردگی عام طور پر بری طرح مجروح ہو چکی ہے۔ حکومت کے محصول کہیں کہیں تو جمع نہیں کئے جا سکتے اور کہیں کہیں ادا نہیں کئے جاتے۔ محصولوں میں اضافے شاید چین کی طرح برما میں بھی نہیں کئے جا سکیں گے۔ اضافے ہوئے تو ان کا جمع کرنا آسان نہ ہوگا۔ ملک کی معاشی زندگی خود اس طرح درہم برہم ہے کہ یہ توقع بھی نہیں ہونی چاہئے کہ برما اپنی تجارت باقی رکھ سکے گا۔ اس سال برما شاید ڈیڑھ ملین ٹن سے زیادہ چاول برآمد نہ کر سکے گا۔ اتنا بھی برآمد ہو سکے گا یا نہیں یہ بھی مشتبہ ہے اور اس کا دارومدار نقل و حمل کی سہولتوں کی دستیابی پر ہوگا، اور برما کی معاشی زندگی کا یہ پہلو کچھ ایسا زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ پیداوار میں اضافے کی توقع اس لئے نہیں کی جاتی کہ برما کی حکومت نے جو دو ایک اچھے کام کئے تھے وہ ادھورے رہ گئے تھے اور اس لئے ان سے اچھے نتائج کی امید نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر زمین کے قومی ملکیت بنائے جانے کا سوال لیجئے۔ حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ زمین وہ اپنے قبضے میں لے لے گی، اس لئے زمیندار محنت کرنے سے بچتے ہیں۔ یہ اصلاح کی نہیں گئی۔ اس لئے کہ کسانوں سے اس خلا کو پر کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ خانہ جنگی نے طول کھینچا تو معاشی زندگی کا نقشہ اور بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ زندگی کے مصارف آج بھی بہت بڑھ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیا جائے تو قیمتیں چارگنی بیٹھی ہیں۔ بجٹ کے گھاٹے کو نوٹوں سے پورا کرنے کی کوشش ہوئی تو اندیشہ ہے کہ برما کی حالت چین کی سی ہو جائے گی۔

پچھلے دنوں برما کو انگریزی حکومت کی طرف سے تھوڑی سی مدد مل گئی ہے۔ برما کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ وہ دو ملین پونڈ ڈالر کے علاقے کے ملکوں سے ضروری چیزیں منگانے پر صرف کر سکے گا۔ یہ رقم اس سے الگ ہوگی جو برما اپنی تجارت کے ذریعے سے حاصل کرے لیکن اس سے جو مدد ملے گی وہ عارضی ہوگی۔

برما کے سامنے ایک اور بھی پیچیدہ سوال ہے۔ وہ کرن قبیلوں کا یہ مطالبہ ہے کہ انھیں ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ اس مطالبے کے لیڈر سابا اوگوئی صاحب ہیں۔ کرن بغاوت سے دلچسپی لینے والوں میں ایک انگریز افسر صاحب کا ذکر آیا ہے۔ وہ پچھلے دنوں کلکتہ میں مقیم تھے، اور اب کسی نامعلوم جگہ چلے گئے ہیں۔ بعض حلقوں میں اس علاقے سے خاصی ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تفریقی رجحانات کو شہ دینے کی روایت پر انگریزوں نے برما میں بھی عمل کیا ہے۔ کرن مطالبات کا ماننا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ بہت سے وسیع علاقوں کے لئے خود مختاری کا حق مانگتے ہیں۔ جن میں خاصی تعداد میں برمی رہتے ہیں۔ یہ علاقہ معاشی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چاول کی پیداوار کا بڑا حصہ یہیں سے آتا ہے، لیکن مطالبات نہ ماننے گئے تو برمی قومی حکومت کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ برما کی پولیس اور فوج میں کرن عنصر بہت زیادہ ہے اور ایک خانہ جنگی کے وقت فوج کی وفاداری کے متعلق کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ فوری طور پر تو حکومت نے کرن مطالبات مان لئے ہیں، تھاکن نو صاحب نے اعلان کیا ہے کہ کرن لیڈر سے سمجھوتے کی گفتگو کامیاب رہی ہے، لیکن کرن قوم کے بیرونی "دوستوں" کے اس سلسلے میں کیا ارادے ہیں یہ کون جانتا ہے؟

چین کا قصہ تمام ہی سمجھو

جنرل سمو چیانگ کائی شک نے کمیونسٹوں پر چینی انقلاب سے غداری کا الزام لگایا ہے۔ یہ الزام تو نیا نہیں، لیکن اس وقت اس کے دہرانے میں چیانگ کائی شک کی مستقبل سے مایوسی کی جھلک نمایاں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ چین کی خانہ جنگی کے ختم ہونے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ چینی کمیونسٹوں کی کامیابی سے اب انکار کرنا ناممکن ہے۔ چیانگ کائی شک کو اب صرف اس طرح بچایا جا سکتا ہے کہ "جمہوریت" کی حفاظت کے لئے بیرونی فوجیں بلائی جائیں اور یہ صورت بھی قطعی کامیابی کی ضامن نہیں کہی جا سکتی۔

منچوریا سے قومی حکومت کے اقتدار کا کم و بیش خاتمہ ہو چکا ہے، پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کو یہاں دو ایک بڑی کامیابیاں ہوئی ہیں۔ منچوریا پر پوری طرح چینی کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا تو اس سے ان کی طاقت بہت بڑھ جائے گی کیونکہ اس طرح انھیں مکڈن کے اسلحے کا کارخانہ مل جائے گا جو چین میں اپنی قسم کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ہتھیار بنتے ہیں پھر اس کے فتح ہو جانے کی ریلوں کے سلسلے پر چینی کمیونسٹ قابض ہو جائیں گے۔

کٹھ پتلیوں کی ضرورت ہی!

فرانسیسی حکومت ہند چینی میں اپنی پرانی چالوں سے دوبارہ جو کھیل رہی ہے اور یہ استقلال قابل رشک ہی۔ ہند چینی میں فرانسیسی حکومت نے کئی بار ایسے لوگ ڈھونڈھ نکالے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہنے پر آمادہ ہو گئے لیکن یہ غداری فرانسیسی حکومت کے لئے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اب سابق بادشاہ بائو ڈے پیرس تشریف لے جا رہے ہیں، انھیں فرانسیسی حکومت نے دعوت دی ہے اور اس گفت و شنید کا مقصد یہ ہے کہ ہند چینی کے مسئلے کا ایسا حل نکالا جائے جس میں فرانسیسی اقتدار اپنی جگہ قائم رہے، اور ہند چینی کے عوام کے جذبۂ آزادی کو بھی دھوکا دیا جا سکے۔ ایک خبر تو یہ ہے کہ ملک معظم اس بار فرانسیسی دباؤ میں آ جائیں گے لیکن ان کے ایک ساتھی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرانسیسیوں سے کوئی معاہدہ کرنے جا رہے ہیں۔ اب تک بائو ڈے نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ ان کے ایک جملے سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ "آزاد رہنا اور محض شہری ہونا غلامی کی بادشاہی سے بہتر ہے۔" لیکن ایک شہری کی زندگی میں زندگی کی وہ لذتیں کہاں جو بادشاہوں کو حاصل ہوتی ہیں۔

فرانسیسی حکومت نے ڈاکٹر ہوشی من پر جو ہند چینی کی جنگ آزادی کے رہنما اور آزاد ہند چین کے صدر ہیں بارہا یہ الزام لگایا ہے کہ وہ گفت و شنید کے ذریعے مسائل حل کرنا ہی نہیں جانتے لیکن پچھلے دنوں ہوشی من نے پھر یہ اعلان کیا ہے کہ وہ فرانسیسیوں سے سمجھوتا کرنے پر تیار ہیں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ یہ سمجھوتہ ویٹ نام کی حقیقی آزادی کا ضامن ہو اور فرانسیسی اقتدار ختم ہو جائے۔ ان شرائط پر فرانسیسی حکومت ——— جو ایک جمہوری حکومت ہے ——— صرف اسی وقت سمجھوتہ کرے گی جب وہ مجبور ہو جائے۔

ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد

پیرس میں یو، این، او کے اجلاس کے موقع پر یہ خبریں سننے میں آئی تھیں کہ پاکستان اور افغانستان وغیرہ ایک

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

غزل

اختر انصاری

محبت کے غموں کو کب تک نباہیں؟
بتا اے جدائی! کہاں تک کراہیں؟
اِدھر سوزشِ دل، اُدھر کاہشِ جاں
اِدھر جلتے آنسو، اُدھر ٹھنڈی آہیں
یہ افسردہ چہرہ، وہ مغموم صورت
یہ ترسا ہوا دل، وہ پیاسی نگاہیں
الٹ کیوں نہ دیں اس بساطِ الم کو
نہ تم ہم کو چاہو، نہ ہم تم کو چاہیں

نہ تم نام لو گفتگو میں ہمارا
نہ ہم اپنے شعروں میں تم کو سراہیں
بہت ہو چکا پیار، اے یادِ ماضی!
ہٹا ہاتھ اپنے، سمیٹ اپنی باہیں
نئے دور نے مجھ کو آواز دی ہے
بلاتی ہیں مجھ کو نئی سیر گاہیں
پکارا ہے مجھ کو نئی منزلوں نے
مری منتظر ہیں نئی شاہ راہیں

حقیقت کی زد سے بچا دل نہ اختر
بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈیں پناہیں

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب نکھرتی ہے فضا وہ گیسوئے برہم کہاں
جاگ اے دل! اب اندھیری رات کا عالم کہاں؟
ناتوانوں نے بدل دیں آسماں کی گردشیں
اب جفائے حسن پر وہ نالۂ پیہم کہاں؟
خاک کے ذرے سنواریں گے اب اپنی کائنات
اب کسی کی آرزو میں دیدۂ پُرنم کہاں
لگ رہی ہے پھر چمن میں ہر طرف اک آگ سی
شعلۂ گل رقص کر اب گریۂ شبنم کہاں
غیر کی بے مہریوں کے داغ تو اب مٹ چلے
یہ نشانِ عہد کے اس زخم کا مرہم کہاں؟
اب بھی باقی ہیں جہانِ نو کی کتنی منزلیں
اب یہاں کھوئی ہوئی اک راہ کا ماتم کہاں

غزل

رزم ردولوی

کمالِ درد کی دنیا ہی دوسری دیکھی
سنوارے موت جسے ایسی زندگی دیکھی
جو شورشوں کو دبا دے وہ گفتگو بھی سنی
ہوا دے فتنوں کو ایسی بھی خامشی دیکھی
ہے رسمِ باطل و حق بھی بڑی تحیر زا
جدا جدا تو کبھی یہ ملی جلی دیکھی
وہ راہ نکلی جو بھٹکا دے تیز گاموں کو
جو راستے پہ لگا دے وہ گمرہی دیکھی
خوشی و رنج کا اللہ رے ربطِ نیرنگی
کہ آنسوؤں میں تبسم کی روشنی دیکھی
تڑپ کے کود پڑا آتشِ بلا میں دل
پلٹ کے موت کو دیکھا نہ زندگی دیکھی
ستم ظریفیٔ فیضانِ انقلاب نہ پوچھ
کہ دیدنی تو سنی اور شنیدنی دیکھی

چچا چھکن نے کھانا پکوایا

صالحہ عابد حسین

چچی کو دن بھر کے لئے اپنی سہیلی کے ہاں جانا تھا۔ انہوں نے سویرے سویرے سب کام کا انتظام کر، کپڑے وپڑے بدل ڈولی کا انتظام کر رہی تھیں کہ باورچی نے آکر کہا "بیوی جی، بچہ بہت بیمار ہے، دو دن کی چھٹی دے دو۔" چچی بولیں "نہیں بھائی آج چھٹی نہیں دے سکتی آج تو مجھے جانا ہے۔ کل سویرے چلے جانا۔" باورچی نے کہا "بیوی جی بچے کا جی بہت برا ہے۔ گھر والی نے کہلا بھیجا ہے کہ آکر کچھ کرو، ورنہ پلا پلایا بچہ ہاتھ سے چلا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا، چچی متاثر ہوکر بولیں "ارے میں تو فوراً چھٹی دے دیتی پر اب کیا کروں، میاں اور بچوں کا رات کا کھانا کون پکائے گا؟" "بیوی جی میں عوضی میں اپنے بھتیجے جمن کو بھیج دوں گا۔"

چچا چھکن دالان میں بیٹھے یہ سب سن رہے تھے کبھی کھڑے ہو جاتے کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ملنے لگتے۔ آخر نہ رہا گیا، تیز تیز چلتے ہوئے چچی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے "ارے بی کاہے کو پریشان ہوتی ہو، ہم جو ہیں؟" چچی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "تم بس معاف کرو۔ بھلا کھانا پکوانا مردوں کے بس کا کام ہے؟" چچا حیران ہو گئے "کھانا پکوانا کون سا مشکل کام ہے؟ تم بچاری گھر میں بیٹھنے والی ان جان عورت کیا جانو، مرد کیسے کیسے زبردست کام کرتے ہیں ......"

چچی بات کاٹ کر بولیں "دنیا بھر کے کام مرد کرتے ہوں پر گھر نہیں چلا سکتے۔"

"جی ہاں ریلیں چلائیں، کارخانے چلائیں، جہاز چلائیں، اجی بم چلائیں، اور گھر نہیں چلا سکتے ——— عورتیں کتنی جاہل ہوتی ہیں۔" چچا کو مردوں کی توہین سن کر طیش آ رہا تھا، چچی نے آگ پر اور تیل چھڑک دیا۔ "اور چاہے کوئی کر سکے یا نہ کر سکے پر تم تو ہرگز نہیں کر سکتے۔"

"اُف تمہاری ان باتوں کو سن کر تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، گویا تمہارے نزدیک تو میں دنیا بھر کا ناکارہ اور بدسلیقہ آدمی ہوں، مجھے کیا کریں سب گھر والے فاقہ۔"

منہ پھلائے سست رفتار سے چچا جاکر پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گئے، اور بڑبڑانے لگے۔ چچی نے دیکھا معاملہ بگڑا جا رہا ہے، ان کے جلنے میں کھنڈت پڑے گی اور چچا کا منہ الگ کئی دن سیدھا نہ ہوگا۔ ہیں بڑی بڑی حضرت۔ مسکراتی ہوئی آ چچا کے پاس کھڑی ہو گئیں ...... انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا پر چچی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا "اے ہے اٹھو بھی ——— تم تو حق ناحق خفا ہو گئے ...... میں تو مذاق کر رہی تھی ———" چچا نے روٹھے ہوئے انداز سے جواب دیا "بس جی معاف کرو ——— خدا کی قسم ایسی عورتیں ہم نے نہیں دیکھیں، جو یوں اپنے میاں کو بدنام کریں۔ ارے کون سا تمہارا کام ہے جو میں نے نہیں کیا؟ دھوبن کو کپڑے دئیے، تصویر ٹانگی، گھڑے برتن صاف کئے، تمہارے خطوں کے جواب لکھے۔ کیا کچھ نہیں کیا ——— مگر تم تم اس کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہو۔"

چچی ہنسی دباتے ہوئے بولیں "اے تو میں نے کب کہا کہ تم نے یہ سب کام نہیں کئے۔ کئے اور ایسے کئے کہ ساری دنیا کو خبر ہو گئی ...... اچھا تو یہ جنس کی کوٹھری کی کنجی۔ جمن کو جنس تلوا کر پکانے کو دینا میری تو ڈولی آ گئی، میں جا رہی ہوں، آٹھ بجے تک آ جاؤں گی۔" کنجی ہاتھ میں لے کر اور چچی کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر چچا چھکن کی باچھیں کھل گئیں۔ چچی تو خیر کوئے ڈولی میں سوار ہو گئیں، بندو کو ساتھ لیتی گئیں اور چچا حقہ پیتے پیتے جانے کب غافل ہو گئے ......

آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ددو، اور چھٹن اسکول سے آ گئے ہیں اور سارے گھر میں اودھم مچا رکھا ہے، انہیں قسمت سے ایسا موقع ملا تھا کہ اماں گھر نہ ہوں، ابا خراٹے لے رہے ہوں، اور گھر میں اور کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی موجود نہ ہو۔ انھوں نے اپنی اس آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا، گھر بھر کی چیزوں کا معائنہ کر ڈالا۔ بستر کھول دئیے، کتابیں گرا دیں، نعمت خانے کی چیزوں کا صفایا کر دیا، سارے گھر میں کاغذ کے پرزے، گنے کے چھلکے اور روشنائی کے دھبے ہی دھبے نظر آ رہے تھے ...... ایک دم چچا کی آنکھ کھلی "ارے شیطانوں ...... یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے ...... اور گھر کا یہ کیا حال ہے ...... آنے دو اپنی اماں کو دیکھو لو کیسی گت بناتی ہیں۔"

ددو نے جو چچا چھکن کی گرج سنی تو دوڑتا ہوا آیا "ابا میاں، ابا میاں، ایک لڑکا آیا بیٹھا ہے کہتا ہے خانساماں نے بھیجا ہے، جمن نام ہے، اب میں کھانا پکایا کروں گا۔"

"اچھا اچھا اُسے یہاں بھیج دو، اور تم شور مت کرو۔"

ایک سترہ، اٹھارہ سال کا لڑکا میلے کپڑے پہنے بے پھندنے کی ترکی ٹوپی اوڑھے آکر سلام کرکے چچا کے سامنے کھڑا ہو گیا ...... چچا چھکن نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا "ہوں، تو گویا تم جمن ہو ...... کھانا پکانے آئے ہو ......

تو کیا کیا پکا لیتے ہو؟"

میاں پکانا وکانا تو جانتا نہیں ...... ہاں کوئی بتا دے تو کچھ تھوڑا بہت کام کر لیتا ہوں۔" چچا نے اطمینان سے جواب دیا "خیر خیر اس کی فکر نہ کرو، ہم سب بتا دیں گے ...... ارے اب تو دوپہر ڈھلنی شروع ہو گئی ——— تو یوں سمجھو کہ پکوانے کا وقت آ گیا، اچھا چلو پہلے تمہیں جنس دے دیں۔" یہ کہہ کر چچا نے ایک عدد جمائی لی، پھر ایک انگڑائی لی اور بولے "اور کنجی کہاں ہے؟ ...... جنس کی کوٹھری کی کنجی ......" کچھ دھندلا سا خیال تھا کہ چلتے وقت چچی کنجی دے گئی تھیں۔ تکیے کے نیچے دیکھا، جھک کر پلنگ کے تلے نظر ڈالی، اپنی جیبیں ٹٹولیں، پائینتی لوٹا رکھا تھا، اس کے اندر دیکھا مگر کنجی نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ تو چچا چھکن کو غصہ آنا شروع ہو گیا۔ یعنی آخر یہ کنجی گئی کہاں ...... سب جگہ دیکھ چکے ملتی ہی نہیں ...... بس کچھ نہیں وہ تمہاری چچی دے کر ہی نہیں گئیں ...... اس بھول کا بھی بھلا کوئی ٹھکانا ہے ...... اور بنتی ہیں بڑی سلیقہ والی ......"

چچا سست رفتار سے دالان میں ٹہلتے جاتے تھے بکتے جاتے تھے، نظریں بھی چاروں طرف گھما تے جا رہے تھے کہ شاید کنجی کو رحم آ جائے اور وہ مل جائے اور ساتھ ساتھ پیٹھ پر ہاتھ بھی پھیر رہے تھے کہ اچانک ان کا ہاتھ اپنے شیشے پر پڑا ...... کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی ...... دیکھا تو ازار بند میں کنجی بندھی ہے "شکر ہے آخر ہم نے ڈھونڈھ لی نا کنجی" اور جمن کو جو دیوار کے سہارے بیٹھا اونگھ رہا تھا کڑک کر آواز دی ...... "چلو اٹھو جی ...... ہم نے انتظام کر لیا ہے کنجی کا۔"

صحن میں آئے، دو ایک سی کوٹھریاں، اور ان میں ایک سے تالے ...... بڑی دیر تک سوچتے رہے جمن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں کیا جانوں، میں تو آج ہی آیا ہوں۔ آخر ہار کر ایک تالے میں کنجی ڈالی تو پھنس کر رہ گئی۔ اب لاکھ لاکھ کوشش کرتے ہیں، مگر کنجی نہیں نکلتی۔ پسینے پسینے ہو گئے، جمن نے کہا "میاں ہٹئے آپ سے نہیں نکلے گی، میں نکال دوں۔" آنکھیں نکال کر بولے ...... "یعنی کیا مطلب تیرا، جو کام ہم نہیں کر سکتے، وہ تو کرے گا؟" اور پھر چچا نے زور لگانا شروع کیا، مگر توبہ کیجئے اُسے تو ضد ہو گئی تھی بے چارے چچا چھکن سے۔ آخر پسپا ہو کر چچا پیچھے ہٹے، اور دھیمے لہجے میں بولے "چلو تم بھی کوشش کر دیکھو جمن!" جمن لپک کر آگے بڑھا، دو چار بار کنجی کو ہلایا پھر اس کے سرے میں ایک کیل ڈال جھٹکا جو دیتا ہے تو کنجی اس کے ہاتھ میں! چچا کی آنکھیں کچھ جھک سی رہی تھیں جمن نے جھٹ دوسری کوٹھری کا قفل کھول کواڑ کھول دئے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چچی بڑے سلیقے کی عورت ہیں، ان کی جنس کی کوٹھری بھی دیکھنے کے قابل تھی، ایک طرف لکڑی کا بڑا سا آٹے کا صندوق، دوسری طرف دروازے والی چھوٹی سی الماری تھی، دالیں، مسالہ وغیرہ رکھنے کے لئے۔ ایک طرف المونیم کا بڑا سا گھی کا ڈبہ رکھا تھا۔ دیوار کی الماری میں چینی اور شیشے کے برتن چنے تھے، لکڑی کی ایک کارنس پر بھرت کی ایک چمک دار کشتی آڑی کھڑی تھی، اور اُس کے آگے چھ شیشے کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

چچا چھکن پہلی مرتبہ آج اس کوٹھری میں آئے تھے۔ پہلے تو سمجھے کہ غلطی سے چچی دوسری کوٹھری کی کنجی

دے کہیں بھلا یہ جنس کی کوٹھری کیسے ہوسکتی ہے...... للّو کو آواز دی۔ وہ آیا تو بولے کیوں وودو میاں آخر تمھاری اماں جنس کس کوٹھری میں رکھا کرتی ہیں؟ وہ مسکرایا...... ابا میاں یہی تو جنس کی کوٹھری ہے" سبحان اللہ" یہ جنس کی کوٹھری ہے؟ یعنی صندوقوں اور الماریوں میں رکھی جاتی ہے جنس؟" وودو نے بجائے جواب دینے کے آٹے کا صندوق دالوں کی الماری وغیرہ کھول کر دکھا دی۔ چچا جھلا گئے "ہم نے کہیں دنیا میں نہیں سنا کہ صندوقوں اور الماریوں میں دال آٹا رکھا جائے ...... تمھاری ماں کے کچھ چونچلے تو ہم عاجز آگئے ہیں ...... ہائے اکیلی گوشت کھا شیلوں پر پڑے میلے ہیں ، کدھر ادھر ادھر جھٹک ماری پھرتی اور صندوقوں ، الماریوں میں رکھا جاتا ہے صاحب ...... دال ...... چاول آٹا ......" چچا نے یہ کہہ کر سر پیٹ لیا تو وودو غائب ......

جمن سے بولے " میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ——— نکالو جنس"

" میاں گھی ، دال ، آٹا مسالہ سب کے برتنوں کی بھی تو ضرورت ہوگی"

ہاں ہاں برتنوں کی تو ضرورت ہوگی ہی...... ہم میں کیا جانوں کہاں ہیں برتن ...... تمھاری چچی نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا...... اتنا بھی نہ بتا گئیں کہ سب چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ ——— اچھا دیکھو ہم کچھ انتظام کرتے ہیں" یہ کہہ کر چچا نے کوٹھری میں پینترے بدلنے شروع کئے...... ادھر دیکھا ، ادھر دیکھا آخر نظر جا کر چینی کے برتنوں پر رکی ...... " یہاں تو بس چینی ہی کے برتن ہیں، معلوم ہوتا ہے اسی میں نکالی جاتی ہیں چیزیں ......" یہ کہہ کر چچا نے ایک بڑا سا پھول دار چینی کا پیالہ اٹھایا۔ اور ایک بڑی سی پلیٹ۔" لو بھئی اس میں لو بیٹا گھی اور اس میں شکر......" جمن نے سہمے ہوئے کہا " پر میاں کہیں ٹوٹ نہ جائیں" چچا کڑک کر بولے " ٹوٹ کیسے سکتے ہیں...... مجال ہے کہ ٹوٹ جائیں" جمن خاموش ہو گیا......

چچا کی نظریں پھر ساری کوٹھری میں گھومیں " اور آٹا ——— آٹا کس میں رکھا جائے گا......"

ایک دم چہرہ چمکنے لگا...... ہاں آٹے کے لئے یہ کشتی ٹھیک رہے گی" لپک کر آگے بڑھے اور ایک جھٹکے سے کشتی کو اتار لیا...... چھن ——— چھن چھن ——— اور شیشے کے چھ گلاس چچا کے آس پاس چکنا چور پڑے تھے...... چچا بدحواس چیخ مار کر پیچھے ہٹے تو جمن سے ٹکرا گئے اس کا سر دیوار میں لگا اور پلیٹ اور پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر بیچ فرش پر کھیل کھیل ہو گیا......

بیچارے چچا چھکن چند لمحے تو حواس باختہ کھڑے رہے ...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں ایک دم ان کی نظر اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر پڑی جس میں شیشے کی کرچ چبھ گئی تھی اور خون نکل رہا تھا...... گھبرا کر زمین پر بیٹھ گئے " ارے ——— ارے ——— اف ——— اوہ ——— میں مارا لہو لہان ہو گیا ——— ارے او جمن کے بچے اپنا منہ بیٹھے کھڑا ہے ، اور دیکھتا نہیں ہمارا پاؤں خون میں تر بتر ہے ...... ارے کچھ کر جلدی......

...... " جمن نے فی الحال اپنا سر تو چھوڑا اور چچا کے لئے پانی لینے کوٹھری سے نکلا۔ چچا کی آوازیں برابر آ رہی تھیں " ارے بھئی وودو او چھٹن ادھر آؤ میاں یہاں ——— ارے یہاں جنس کی کوٹھری میں ...... ہمارا پاؤں زخمی ہو گیا ——— پاؤں ——— ارے لہو لہان ہو گیا ——— ارے ہمارا پاؤں ہمارا ———"

دو چھٹن ان کے دوست یاروں وودو دوڑتے ہوئے آئے ، اور چچا کو ایک شہید کی شان سے کانچ اور چینی کے ٹکڑوں کے بیچ بیٹھا دیکھ کر بڑی مستعدی سے مرہم پٹی میں مشغول ہو گئے " ابا میاں ہلئے نہیں ، خون زیادہ نکل جائے گا۔ چھٹن جا تو روئی اور پٹی لے آ جا کر اور ہاں اسپرٹ کی بوتل بھی" پٹی کے لئے چچی کا دوپٹہ اور پاؤ بھر روئی ، چولہا جلانے کی اسپرٹ سب مہیا ہوئی ——— اسپرٹ ڈالتے اور پٹی باندھتے وقت چچا نے بہت غل شور مچایا" اوہ ——— اوہ ——— ارے میں مرا...... ہائے ...... ارے اپنی ماں کو تو بلاؤ ......" چھٹن نے کہا" ابا میاں اماں آکر کیا کریں گی ہم ہیں تیمارداری کرنے کو" وودو بولا اب آپ لیٹ جائیے ابا میاں، چچا نحیف آواز میں بولے" لیٹوں کیسے کھانا جو پکوانا ہے۔ وودو نے کہا" ابا میاں ، چھ تو بجنے والے ہیں ، کھانا پکے گا کب؟" اب تو چچا ست پٹائے اور سب بھول بھال کر کھڑے ہو گئے مگر فوراً ہی زخم کا خیال آیا تو" ہائے" کا نعرہ مار کر بیٹھ گئے ...... وودو لپک کر ایک کرسی لایا۔ اور اس پر انھیں بٹھا کر بولا بس آپ آرام سے اس پر بیٹھے رہئے۔ بدقسمتی سے چھٹن اور اس کے دوست کو چچا کی حالت پر آگئی کہیں ہنسی ...... بیچئے صاحب چچا کا پارہ ایک سو سات ڈگری پر جا پہنچا " اور سنئے صاحب ہم تو مر رہے ہیں ، اور آپ کو سوجھی ہے ہنسی ، بے شرم ، بے حیا ، باوا کی مصیبت پر ہنستا ہے ...... دور ہو جاؤ میرے سامنے سے بے ادب ...... بے نصیب۔ چاروں لڑکے ہنسی سے بیتاب سر پر پیر رکھ کر بھاگے ، مگر محلے کا ایک شیطان جاتے جاتے ایک فقرہ چست کر گیا" واہ چچا چھکن ایک زرا سا شیشہ لگ گیا تو آپ نے اتنا شور مچایا اسی پر کہتے ہیں کہ ہم لام پر جائیں گے"۔

چچا کو غصہ تو بہت آیا مگر لڑکا ان کی زد سے بہت دور جا چکا تھا اور وہ ٹھہرے زخمی...... جھلا کر جمن پر برس پڑے" ہم نے تجھ جیسا پھوہڑ اور کاہل آدمی نہیں دیکھا ، جب تجھے کچھ کام نہیں آتا تھا تو آیا کیوں تھا...... سارے برتن توڑ دئے ، ہمارا پاؤں زخمی کر دیا" جمن جو پہلے ہی سے جلا بیٹھا تھا کہ کہاں آکر پھنسا ، تنک کر بولا" واہ میاں واہ ——— خواہ مخواہ آپ خود تو میرے اوپر آ پڑے ...... میں گر پڑا ——— یہ دیکھو سر میں کتنا بڑا گولا پڑ گیا ہے ......

میرا بھلا کیا قصور ، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ———"

" جی ہاں ، جی ہاں آپ عالم الغیب ہیں ، آپ نے پہلے فرمایا تھا کہ برتن ٹوٹ جائیں گے چنانچہ ٹوٹ گئے ...... چلو بک بک بند کرو جلدی سے جنس تولو ، شام ہونے والی ہے"

اب جمن ترازو باٹ ڈھونڈھتا ہے تو کہیں نہیں چچا نے بھی لاکھ نظروں نظروں میں ڈھونڈا مگر نہیں ملیں۔ جمن کو ہدایتیں مل رہی ہیں" جا یا سے سیڑھی لاکر اس مچان پر چڑھ جہاں تانبے کے برتن رکھے ہیں ضرور اس پر ہوگی ترازو ...... وہاں بھی نہیں تو پھر کہاں ہے ——— ہم خود اٹھتے ہیں ——— تجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا ———" چچا اٹھے جو سہی تو اس پانی پر جو ان کے پاؤں پر ڈالا گیا تھا ان کا پاؤں رپٹا اور آٹے کے صندوق کے نیچے گھس گیا جہاں ترازو رکھی تھی خوش ہو کر پکارے ——— جمن ——— آ جاؤ بھئی ہم نے خود ڈھونڈ لی ترازو۔"

جمن نے ترازو ہاتھ میں لی اور بولا" میاں کتنا آٹا لوں ؟" چچا کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا" کتنا آٹا لوں ؟ یعنی یہ کہ کتنا آٹا پکے گا ؟" پیشانی پر سوچ کی شکنیں نمودار ہو گئیں ، کیوں میاں جمن ایک آدمی کتنا کھاتا ہے ایک وقت میں ؟" جمن بولا" پاؤ بھر ، پر میں تو ڈیڑھ پاؤ ، آدھ سیر کی روٹی کھاتا ہوں" چچا نے انگلیوں پر گننا شروع کیا" تو یوں سمجھو کہ ایک ہم خود ایک تمھاری چچی دو ، بنو تین ، وودو چار چھٹن پانچ ، سیدو چھ ، تم سات بلکہ آٹھ ——— ہاں تو یہ ہوئے آٹھ پاؤ ——— اور ایک سیر میں ہوتے ہیں چار پاؤ ——— ہوتے ہیں نا ؟ ——— خیر تو چار دونی آٹھ ——— بس تو لو دو سیر آٹا" میاں یہ تو بہت ہوگا" بہت سیسے ہوگا حساب نہیں لگا لیا ہم نے ——— چلو تو لو تم" جمن نے آٹا تول کر کشتی میں ڈالا چچا بولے" اور اب تو لو تم چاول ——— میٹھے چاول پکیں گے۔ ہمیں جب تک دسترخوان پر میٹھا نہ ہو کھانے کا مزا نہیں آتا" جمن نے پوچھا کتنے لوں چاول ؟" "یہی پاؤ بھر فی کس ...... دو سیر"

" میاں دو سیر چاول بہت ہوں گے آپ تو فی آدمی چھٹانک بھر لیجئے"

" نہیں جی کسی کی داڑھ بھی گرم نہ ہوگی ——— خیر تم آدھ پاؤ فی کس لے لو ——— تو ہم کے آدمی تھے ؟ آٹھ نا ——— تو آٹھ دونی سولہ ——— سولہ اکن سولہ۔ گویا سیر بھر چاول ہوئے۔ چاول تل چکے تو بولے" اب شکر بھی تول لو ——— چار سیر شکر" جمن نے حیرت سے پوچھا ، چار سیر شکر ؟ اتنی کیا ہوگی"

ارے چاولوں میں پڑے گی اور کیا ہوگی تمھاری چچی ہمیشہ پھیکا ، میٹھا کھلاتی ہیں ، لاکھ کہتے ہیں چونے گنے کے چاول پکاؤ پر سنتی ہی نہیں ، راستن ہے شکر کا منہنگی ہے ، یہ ہے وہ ہے ، آج ہم کھلائیں گے انھیں چاول ...... اب معلوم ہوگا کہ کسے کہتے ہیں میٹھے چاول یہ نہیں کہ نمک کے برابر میٹھا ڈال کر خوش ہو گئیں کہ میٹھا پکایا ہے" جمن نے پوچھا اور رکھوں کس چیز میں آٹے؟"

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

جنوبی افریقہ کی حکومت کا نیا شاہکار

پرنسپل عبدالشکور، رام پور

کیپ ٹاؤن سے تازہ ترین اطلاع پہنچی ہے کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ میں ایشیاٹک بل کی ترمیم دوسری مطالعے کے لئے پیش ہوئی، اور وزیر داخلہ مسٹر ڈانجس کا یہ خیال ہے کہ یہ ترمیم ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ سے جلاوطن کرنے کے بارے میں پہلا قدم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ترمیم کثرت رائے سے منظور ہوئی اور اس پر اب خوف ہے کہ بہت جلد عمل درآمد شروع کر دیا جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے سابق وزیر اعظم جنرل اسمٹس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس بل کو ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس پر غور و خوض کر سکے، اور آگے چل کر اپنی مفصل رپورٹ دے سکے، لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔ اغلباً اس وجہ سے کہ جنوبی افریقہ کی موجودہ حکومت اس معاملے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔ اس بل کے مجوز اس ملک کے وزیر اعظم ڈاکٹر ملان ہیں جن کی ہندوستانیوں سے دشمنی کی مثالیں متعدد بار ہمارے سامنے آ چکی ہیں اور جن کے وزیر اعظم ہو جانے پر ہمیں شدید خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ اس بل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یونین کی مجلس مقننہ اور نیٹال کے صوبہ جاتی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا سلسلہ تمام و کمال ختم ہو جائے گا، اور ۱۹۴۶ء کا ایکٹ کالعدم کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کو یہ نمائندگی اس ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دی گئی تھی، حالانکہ ہمیں بخوبی یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کے بل سے بھی ہندوستانی متفق نہ تھے، اور بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کو جن کی تعداد اس قوم آبادی میں ایک لاکھ پچاس ہزار ہے اس حق سے اس لئے محروم کر دیا جاتا ہے کہ آگے چل کر اس سرزمین کی اور غیر یورپین آبادی بھی اسی قسم کا مطالبہ پیش کرے گی۔ وہاں کی ہندوستانی آبادی کو ہمیشہ ایک خطرہ تصور کیا گیا، کیونکہ وہ دوسرے ملک سے آکر یہاں آباد ہوئے، ان کا قیام ہمیشہ عارضی سمجھا گیا، اور وہ اپنی مشکلات اور دقتوں کو ہمیشہ ایک دوسرے ملک کے سامنے پیش کرتے رہے۔

گذشتہ حکومت نے نیٹال کے میونسپل بورڈوں سے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کو نمائندگی کا حق دیا جائے لیکن اس صوبے کے تمام بورڈوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اسمبلی میں ہندوستانیوں کے صرف تین نمائندے پہنچ جائیں تو پھر دیسی نمائندوں سے متحد ہو کر ایک مختصر سا مخالف گروہ بنا لینے پر کامیاب ہو جائیں گے۔ پارلیمنٹ کی موجودہ جماعت بندی میں جہاں حکومت کی اکثریت بہت کم ہے مخالف جماعت متحدہ ہو کر جنوبی افریقہ کی سیاست پر ایسا گہرا اثر ڈال سکتی کہ یورپین دور دور دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ ڈاکٹر ملان کے خیال میں ہندوستانی آبادی کو سیاسی حق دینا کسی عنوان سے جائز نہیں، اول تو وہ خود اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، دوسرے وہ یو، این، او میں اس معاملے کو پیش کر چکے ہیں اور بار بار جنوبی افریقہ کے مدبروں کو رسوا ہونا پڑا ہے۔ وزیر اعظم موصوف کو ہندوستانیوں سے یہ سخت شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس ملک میں ہمیشہ اجنبی ثابت کیا۔ ان کو اگر حکومت سے شکایات پیدا ہوئیں تو انھوں نے حکومت سے کبھی مرافعہ نہ کیا، بلکہ سیدھے ہندوستان کی راہ لی۔ بین الاقوامی ایوانوں کے دروازے کھٹکھٹائے، اور ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے تجارتی تعلقات ختم کر دینا پڑے دنیا بھر میں جنوبی افریقہ کو بدنام کیا، اس لئے وہ اگر اس ملک میں رہنا چاہیں تو ان کو پابندیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ ان کو علیحدہ جداگانہ علاقوں میں رہنا پڑے گا، جہاں ان کی رہائش، طبی امداد اور تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا، ان پر کوئی ظلم روا نہ رکھا جائے گا۔ لیکن پابندیاں ان پر ضرور عائد کی جائیں گی۔

مسٹر ڈانجس نے اپنی تقریر میں اور زیادہ شدت کا ثبوت دیا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مجوزہ طرز عمل ہندوستانیوں کو جلاوطن کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے بعد ان کو جلاوطن کرنا محال ہو جائے گا۔ عارضی طور سے اس کا انتظام کیا جائے گا کہ ہندوستانی اپنی آواز حکومت تک پہنچا سکیں لیکن یہ بجائے پارلیمنٹ صوبجاتی کونسل اور میونسپل بورڈ میں سنائی جائے گی۔ وزیر موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندو اور مسلم علیحدہ علیحدہ اپنی جداگانہ مجالس کے ذریعے اپنے مطالبے حکومت تک پہنچائیں تو بہتر ہے۔ ہندو مسلم کی متحدہ جماعت یعنی جنوبی افریقہ کی نیشنل کانگریس کو حکومت قابل قبول تصور نہیں کرتی، بلکہ ہندو مسلم خلیج کو اور زیادہ وسیع کر کے اپنا کام چلانا چاہتی ہے۔ آگے چل کر اس کی امید کی جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے کانفرنس کی صورت پیدا ہو، اور ایسا ملک تجویز کیا جا سکے جہاں ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ سے بھیجا جا سکے، اور جہاں وہ آباد ہو سکیں۔

جنوبی افریقہ میں تو ہندوستانیوں کے لئے نئے ستم ایجاد کرنے کے یہ منصوبے باندھے جا رہے ہیں ادھر یو، این، او کی مجلس عامہ کے ایجنڈے میں وہ شکایت درج کر دی گئی ہے جو ہندوستان نے جنوبی افریقہ کے خلاف اس کے طرز عمل کے بارے میں کی ہے۔ اگرچہ جنوبی افریقہ کے ڈیلیگیٹ مسٹر ایرک لو نے اس کی دھمکی دی تھی کہ اگر ہندوستان کی یہ شکایت ایجنڈے میں داخل کی گئی تو پھر جنوبی افریقہ کی حکومت اس پر غور کرے گی کہ وہ اس مباحثہ میں شریک ہو یا نہیں۔ ڈیلیگیٹ موصوف کی یہی پرانی دلیل ہے کہ یہ معاملہ خانگی ہے۔ اسے یو، این، او کی دسترس سے باہر سمجھنا چاہئے۔ تقریر کے دوران میں فاضل مقرر نے اس پر زور دیا کہ خانگی معاملات میں مداخلت کرنا یو، این، او کی بقا کے لئے مضر ہو گا۔ مگر سر بی این راؤ نے جوابی تقریر میں کہا کہ یہ معاملہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں برابر زیر بحث رہ چکا ہے تو پھر اسے ایجنڈے میں اب کیوں داخل نہ کیا جائے؟ بہرحال معاملہ ایجنڈے میں تو آ چکا ہے مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ یو، این، او اس بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتی ہے کیا یو، این، او اس قدر طاقتور ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کے اس دیرینہ اور ظالمانہ رویے کو تبدیل کر سکے گی؟ اس کے باور کرنے میں ہمیں بڑا تامل ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں یو، این، او کی کارروائی کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کیا جائے گا۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

تعمیر کا سوال در پیش ہے۔ چیکوسلوواکیہ سے چھوٹی مشینوں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی دستیابی سے پاکستان کو بہت مدد ملے گی۔ چیکوسلوواکیہ کو جوٹ اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہے جو پاکستان پوری کر سکتا ہے۔

ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کے وزیر تجارت مسٹر فضل الرحمن نے بتایا کہ "تجارت کی بحالی ہمارے لئے ایک بہت ہی اہم مسئلہ بن کر رہ گئی ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ باوجود اس کے کہ حکومت نے اس سلسلے میں بہت کوشش کی ہے۔ اسے اپنے مقاصد کے حصول میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی، پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوئی ہے۔ فی الحال پاکستان کی اہم ترین اشیاء برآمد کے بیچنے میں کوئی دقت نہیں۔ جوٹ، روئی اور خام چمڑے کی جن میں پاکستان کی پوزیشن بہت اچھی ہے۔ اس وقت دنیا میں قلت ہے۔ لیکن دور تک سوچئے تو تجارت کی توسیع کا کام بغیر محنت کے نہیں ہو سکے گا۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ دوسرے ملکوں کو پاکستان کی پیداوار سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی حکومت مختلف ممالک میں اپنے تجارتی نمائندے متعین کرنے کے سوال پر سوچ بچار کر رہی ہے۔ تجارت کی ترقی کے لئے دوسری ضروری چیز ایک تجارتی بیڑے کا قیام ہے۔ فضل الرحمن صاحب نے بتایا کہ اس مقصد کے لئے حکومت ڈالر کی فراہمی میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے رہی ہے۔ بحری تجارتی بیڑے کے افسروں کی تربیت کے لئے بھی حکومت ایک اسکیم تیار کر رہی ہے۔

(ا، س)

یورپ کے بھوت

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

کرنے میں میری کو دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن ان کی بابت بھی وہ کوئی قطعی رائے نہیں دیتے صرف یہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ اور علم اس واقعہ کی توجیہ کرنے سے قاصر ہے۔

اب آپ ہی کہئے کہ اس بیسویں صدی میں اگر کوئی قوم ایسی مہمل اور بے بنیاد باتوں پر یقین رکھے تو اسے کیا کہئے گا۔ ہندوستانی تو خیر توہم پرست مشہور ہی ہیں، لیکن انگریز قوم بھی جس نے ہر قسم کی ترقی کر لی ہے ابھی تک لاطائل خیالات سے پیچھا نہیں چھڑا سکی ہے۔

یورپ کے بھوت

عبدالحلیم ندوی

[illegible] سائنس اور میکانکی ترقی کی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ کتنی عبرت ناک حقیقت ہے کہ باوجود ان کمالات اور روز افزوں ترقیوں کے ابھی تک یہ قوم صدیوں پہلے کے طلسماتی اوہام اور خیالی عفریتوں کے چنگل سے نہیں نکل پائی ہے۔ [illegible] ابھی تک ان کے یہاں نہ صرف بھوتوں پریتوں کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ ان کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور اس کام کے لئے انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ ذیل میں یورپ کے بھوتوں کے قصے ان کا تاریخی پس منظر اور ان کی حقیقت پیش کی جاتی ہے۔

لندن ایوننگ نیوز نے چند مہینے ہوئے ایک خبر شائع کی تھی کہ "ونڈسر پارک" میں رہنے والا شکاری ہرن نامی بھوت [illegible] ظاہر ہوا ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ پارک کی رہنے والی ایک عورت اس جنگل سے کچھ رات گئے گذر رہی تھی کہ دفعتہ اسے کچھ دور پر ایک گھڑسوار کا سایہ چلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف لپکی لیکن جوں ہی قریب آئی گھڑسوار ایک مجنونانہ قہقہے کے ساتھ غائب ہوگیا۔ اس کے غائب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے شکاری کے قرنا کی آواز سنی۔

اہل مغرب کے بھوتوں کے عقیدے کی بابت کچھ کہنا بیکار ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں بھوتوں کی اتنی ہی کثرت ہے جتنی امریکا میں دیمک کی۔ اور کم و بیش دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلے ہیں۔

بھوت عموماً پرانے مکانات، گرجے بڑے کھنڈرات میں رہتے ہیں، اور جب کسی جگہ ایک مرتبہ ان کا قبضہ ہوجاتا ہے تو مشکل ہی سے وہاں سے ہٹتے ہیں۔

برطانیہ میں جنگ کے بعد ان کی بڑی کثرت ہوگئی ہے پہلے تو ہرن جیسے اکیلے رہنے والے بھوتوں کی سارے یورپ میں کثرت تھی۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اب وہ بندروں کے غول کی طرح دکھائی دینے لگے ہیں۔ چنانچہ ابھی کچھ ہی دن ہوئے سینٹ ڈنسٹن کے ایک ممتاز پادری ریورنڈ اینٹن اسٹیفنس نے بتایا کہ انھوں نے اس قسم کے ایک عفریتی غول کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اسیکس کے مقام پر بورلے ریکٹری نام کا ایک قدیم [illegible] ہے۔ کہتے ہیں یورپ بھر میں سب سے زیادہ بھوت یہیں رہتے ہیں۔ حال ہی میں انگریزی اخبارات نے ان بھوتوں کے بہت سے دلچسپ قصے شائع کئے تھے۔ بورلے میں جو بھوت رہتے ہیں ان میں دو سر کٹے کوچوان ایک نن اور ایک گاڑی بہت مشہور ہے جس میں دو گھوڑے جتے رہتے ہیں اور اس پر ایک عورت بیٹھی ہوئی یہ چلایا کرتی ہے کہ "یہ مت کرو [illegible] مت کرو"۔ بورلے ریکٹری کی عمارت ۱۸۶۳ء میں بنی تھی اور اس وقت سے لے کر ۱۹۲۹ء تک اس کے قریب رہنے والے سب لوگوں کو یہاں بھوت دکھائی دیتے تھے۔ آخر اس میں آگ لگ گئی وہ تباہ و برباد ہوگئی۔ وہاں کے رہنے والوں کا کہنا ہے کہ جس وقت مکان جل رہا تھا تو غیر معروف شکلیں کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں اور زرد لبادہ پوش آدمی اس کے باغ میں گھوم رہے تھے۔

یوں تو یورپ میں بھوتوں کا عقیدہ عہد وسطیٰ میں ہی اچھی طرح پھیل گیا تھا لیکن اس کی تکمیل اٹھارہویں صدی میں ہوئی اور اس میں ریڈ کلف اور والپول کی گاتھک رومانی کہانیوں کو بہت دخل ہے۔ ان کے بعد اسکاٹ، ڈکنس اور پھر اولیور لاج اور کونن ڈائل اور بھوت کلب نے تو (جس کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں پڑی تھی اور ابھی کل ہی میں دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔) تو ان بھوتوں کی ساکھ بہت بڑھا دی۔

جزیرہ برطانیہ کا سب سے مشہور بھوت ملکہ الزبتھ کے بچپن کے محل گلامس کاسل کا بھوت ہے۔ اس بھوت کو محل میں قیام کرنے والے تمام مہمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ عموماً یہ ایک لال بالوں والے دیو کی صورت میں دکھائی دیتا ہے

لیکن کیتھرین ہاورڈ نام کا ایک نامی بھوت تو گلامس کے مذکورہ بھوت سے بھی بڑھ گیا ہے۔ کیتھرین ہاورڈ کو ہنری ہشتم نے اس جرم میں قتل کرا دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آتی تھی۔ چنانچہ ملکہ کو جب اپنے فرمان قتل کی خبر ملی تو ایک دن وہ پہرہ داروں کی نظر بچاکر بھاگ نکلی کہ بادشاہ سے حقیقت حال بتاکر اپنی سزا معاف کرالے۔ لیکن عین موقع پر اس کو پہرہ داروں نے پکڑ لیا اور گھسیٹتے، مارتے اس کو مقتل میں لائے وہ بے چاری چیختی چلاتی رہی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور اس کو قتل کردیا۔ چنانچہ اس تاریخ سے میں اکثر اس کی روح اسی انداز سے چیختی چلاتی ہیمپٹن کورٹ محل دکھائی دیتی ہے۔

ڈروری لین تھیٹر کا بھوت کئی باتوں میں دوسروں سے بڑھ گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ وہ ہمیشہ دن کو نکلتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ نہ کسی کو ڈراتا ہے اور نہ ستاتا ہے۔ اس بھوت کو بھی سینکڑوں آدمیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جن میں ڈروری لین کے ممتاز مورخ میکن پوپ بھی شامل ہیں۔ وہ اپنے عینی مشاہدہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ ڈروری لین کا یہ بھوت متوسط قد کا آدمی ہے، اور بھورے رنگ کا ایک سواری کا لبادہ پہنے اور ایک تکونہ ہیٹ لگائے رہتا ہے۔

لارڈ نلسن کی معشوقہ لیڈی ہملٹن نامی بھوت کو کیمبرج اسکوائر کے مکان نمبر ۲ میں رہنے والے لوگ یورپ کے سب بھوتوں میں سب سے زیادہ حسین سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لیڈی ہملٹن جب ایک انداز دل ربا سے کوٹھے پر ٹہلتی ہے تو پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ بس اس میں ایک بڑی بری عادت ہے اور وہ یہ کہ ہم لوگ تو دروازے بند کرکے چلے جاتے ہیں وہ انھیں چوپٹ کھول کر چل دیتی ہے۔

تاریخی ہستیوں کی روحیں جو اب بھوت بن گئی ہیں تین ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بلیک پرنس ہے۔ یہ بھوت بکنگھم کے قریب ہال پیلس میں رہتا تھا، اور پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی شکست سے پہلے اس [illegible] مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ اس قسم کے دوسرے بھوت کو سر فرانسس ڈریک کہتے ہیں۔ یہ بھوت [illegible] دوسرے گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتا ہے، گاڑی کے پیچھے پیچھے اس کے کتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کتوں کے بھونکنے سے زندہ کتے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ تیسرا تاریخی بھوت ڈک ٹرپن مشہور ڈاکو ہے۔ یہ بھوت لاکنگٹن کے قریب ٹریمیس ہل میں گھوڑے کو دوڑائے ہوئے سال میں تین مرتبہ دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ آخری مرتبہ جولائی [illegible] میں بلینی نامی ایک شخص کے مکان میں یہ بھوت دیکھا گیا تھا۔ اس نے حکومت کو درخواست دی تھی کہ چونکہ میرے گھر میں بھوتوں کی کثرت ہوگئی ہے اس لئے کرایہ دار بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور مجھے خاصا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے مکان کے موجودہ ٹیکس میں کمی کردی جائے۔ بھوتوں کی تفصیل بتلاتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ یہ چند قاتلوں کی روحیں ہیں جن کو ٹرپن نے پکڑا تھا اور ان کے جرم کا انکشاف اس لئے نہ کیا کہ وہ بھی اس کے جرائم کو پوشیدہ رکھیں گے۔

انگلستان میں اگر کسی گھر کے متعلق یہ معلوم ہوجائے کہ اس میں بھوتوں کا اڈا ہے تو اس کی قیمت گرجاتی ہے۔ دراصل قیمت کا گرنا بھوتوں کے برتاؤ پر منحصر ہے پھر بھی ایسے بدنام گھروں کے کرائے میں کچھ کمی تو ضرور ہی ہوجاتی ہے اسی لئے اب اگر کوئی کسی گھر کے متعلق بھوتوں کی خبر اڑائے تو قانوناً اس سے ہرجانہ وصول کیا جاسکتا ہے۔

جانوروں میں عموماً گھوڑے کی شکل کے بھوت انگلستان میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور اکثر ان کے سوار بھی سر بریدہ ہوتے ہیں۔ گھوڑوں کے بعد کتوں اور بلیوں کی شکل کے بھوتوں کا نمبر ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک لمبا چوڑا جھبرے بالوں اور نرم پاؤں کا ٹرشش یا سٹرکر نامی کتا برنلے میں دیکھا گیا ہے۔ یہ کتا کبھی قصبے سے کچھ آگے اور کبھی کچھ پیچھے نظر آتا ہے۔ اور جب چلتا ہے تو اس کے پاؤں سے چھپ چھپ کی آواز نکلتی ہے جیسے کوئی پانی سے گزر رہا ہو۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جو کوئی اس کو دیکھ لے بہت جلد مر جاتا ہے۔

انگلستان میں سب سے بڑے بھوتوں کے عامل ہیری پرائس ہیں جو ۴۰ سال سے بھوتوں کی تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ ان کے وجود کو نہیں مانتے۔ انھوں نے اپنے صرفے سے ایک بہت بڑا معمل بنایا ہے جہاں وہ ان اطلاعوں کی جو بھوتوں کے متعلق ملتی ہیں تحقیق کرتے ہیں۔ اس معمل پر سالانہ ۱۸ ہزار خرچ ہوتے ہیں۔ بھوتوں کے واقعات کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس ہر ہفتہ کم و بیش دو سو اس قسم کے خطوط آتے ہیں۔ انھوں نے انگلستان کے ہر علاقے میں اپنے شاگرد اور کارندے رکھ چھوڑے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ جہاں کسی واقعہ کی اطلاع ملی وہ فوراً مقامی کارندے کو اس کی اطلاع کرتے ہیں کہ وہ اس کی تحقیق کرے اگر مقامی کارندہ واقعہ کی تصدیق کرتا ہے تو ہیری خود اپنے معمل میں اس کی تحقیق کرتے ہیں چنانچہ بیان کردہ [illegible] واقعات میں سے کہیں ایک ایسا نکلتا ہے جس میں ہیری کو تحقیق کرنی پڑتی ہے اور ایسے واقعات میں صرف ایک فی صدی ایسے ہوتے ہیں جن کی قدرتی توجیہ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر

تاریخ اشاعت: یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۴۸

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبد الحلیم ندوی

چندہ: سالانہ ؏ ششماہی ؏

چچا چھکن نے کھانا پکوایا

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

چچا کا ذہن رسا فوراً نجات کی طرف منتقل ہوا " اتارو اس پر سے سینیاں اور خوان ابھی یہیں سب چیزیں تل کر رکھی جائیں گی " بیچارہ جمن غریب اوپر چڑھ کر بھی کے جہیز کے بھاری بھاری تین خوان اتار کر لایا ایک میں شکر رکھی ، دوسری میں دال ، دال بھی چچا نے سیر بھر تلوا لی تھی ...... چچا بولے " ارے یہ اندھیرا کیوں ہو گیا ...... شاید بادل ہو ......

...... رسا بجلی کا بٹن تو دبا دو ، جمن نے اٹھ کر بٹن دبایا ، ساری کوٹھری روشن ہو گئی ۔ جمن نے گھبرا کر کہا " میاں رات تو ہو گئی ، اب یہ اتنا بہت سا کھانا پکے گا کب ؟ چچا چیٹ پڑے " رات ہو گئی تو ہمارا کیا قصور تو ہی ایسا کاہل سستی پوستی ، دو بجے سے یہ وقت آ گیا ، اب تک ذرا سی جنس نہ تولی جا سکی ...... ہم خود پریشان ہو گئے سر میں درد ہو رہا ہے ، پاؤں زخمی ہو چکا ہے ۔ چلو ...... اٹھو دو سیر گھی بھی تول لو ، پھر پکانا شروع کریں " جمن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا " دو سیر گھی؟ چچا بگڑ گئے " ہاں دو سیر گھی ...... یہ باورچی کا بچہ بنا ہے ہر بات پر اعتراض کرتا ہے گویا ہم سے زیادہ جانتا ہے ـــــ پاؤ بھر فی کس گھی بھی نہ پڑے ہنڈیا میں کھانا بھلا بچوں میں طاقت کیا آئے گی ؟ ہمیں بھی کوئی شٹلو بجا ، کنجوس ، مکھی چوس سمجھا ہے جو چھٹانک بھر گھی ڈالیں ؟ پڑھنے والے بچے ، پھر ہم خود دماغی کام کرنے والے اتنا گھی بھی نہ کھائیں تو کیسے کام چلے ، وہ تمھاری چچی ہمیشہ پاؤ بھر فی کس گھی ڈالتی ہیں ۔ جب تو سالن میاں انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ گھی چڑھا ہوتا ہے " جمن سخت پریشان تھا ، منھ آنسو و پسینے میں شرابور ، چاروں طرف چیزوں کا انبار ، سر جھکائے چچا کی ڈانٹ سن رہا تھا ، بھرائی آواز میں بولا " اور گھی تول کر رکھوں کس میں ؟ "

" اچھا ، اچھا خیر تم یہ سب چیزیں باورچی خانے میں لے جا کر رکھو گھی کا ڈول ہم وہاں لے آتے ہیں ، پکاتے جائیں گے ، ڈالتے جائیں گے "

جمن نے لمبا سا سانس لیا اور آٹے ، دال ، چاول ، شکر وغیرہ کی بھری بھری سینیاں لے جا لے جا کر باورچی خانے کے سامنے رکھنی شروع کیں ۔

چچا نے گھی کا ڈول ہاتھ میں لٹکایا اور کرسی سے اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے باہر نکلے ...... باورچی خانے کے سامنے کشتی اور سینیوں کی لائن اور ان میں ڈھیروں سامان دیکھ کر کسی قدر چکرائے ...... جمن سے کچھ کہنے والے تھے کہ ٹن ٹن گھنٹے نے آٹھ بجائے ...... چچا نے گھبرا کر کہا " ارے تو گویا سچ مچ رات ہو گئی ـــــ آٹھ بج گئے ـــــ جمن تم بھی تم بڑے پوستی ـــــ بات پوری نہ کرنے پائے تھے کہ دروازے میں قدموں کی آواز آئی ، اور چچا کی نظر جو اٹھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگے بنو اس کے پیچھے چچی چلی آ رہی ہیں ...... چچا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ، گھی کا ڈول ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اوندھا گیا اور صحن بھر میں گھی کا دریا بہنے لگا ـــــ

چچا چند منٹ منہ کھولے بہوت کھڑے رہے اور پھر تیزی سے باہر دیوان خانے میں ! کمرہ اندر سے بند کر کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے ۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے " نئی روشنی " کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں ۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دیں ۔ ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ ان کو نہ مل سکے ۔

کشمیر کا خط

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

مجاہدین اسلام کے ساتھ سرکاری دفاتر میں دوسری جماعت مہاراجہ بہادر کے ڈوگرہ اور برہمن دست ہیں ! اور یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ صدق دل سے عوامی حکومت کے شدید ترین مخالف ہیں ، لیکن فرماں برداری اور تابعداری کا حق پوری چاپلوسی سے ادا کرتے ہیں ! مسلمان مجاہدین پوری منافقانہ شان سے پاکستان کے خلاف لڑنے کے لئے رضاکارانہ خدمات کی پیشکش کرتے ہیں ! ڈوگرہ اور برہمن پر مہاراجہ کو برطرف کرنے کے لئے اسی منافقانہ شان سے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں ! لیکن ادھر پاکستان کی عنایت اور ادھر ہندوستان کے مہاراجہ نواز ہندوؤں کی عنایت سے دونوں گروہوں کو اپنی اپنی جگہ اب تک یکسوئی حاصل نہیں ہے ، اور یہ لو اب تک لگی ہے کہ شاید پھر کشمیر کی کایا کوئی پلٹ دے ! اور کشمیر پر گویا بہ یک وقت پاکستان کا پرچم بھی لہرائے اور مہاراجہ بہادر کا اقتدار بھی از سر نو قائم ہو جائے ! اسی لئے یہ حضرات اندرونی طور پر شیخ عبد اللہ کی عوامی حکومت کے ترقی پسند پروگرام کو دل ہی دل میں کوستے ہیں اور ساتھ ساتھ حق تابعداری بھی ادا کرتے ہیں ! اپنی حکومت کے خلاف بڑی دیانت داری کے ساتھ ہر غلط الزام کو بھی صحیح تسلیم کر کے دل ہی دل میں رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں ! اور حکومت کی ہر پریشانی پر خوش ہوتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں ۔

مجھے اس طبقہ کے کچھ ممتاز لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ۔ پنڈتوں نے تو غیر یک رنگ کر اور دب دب کر شکائتیں کیں اور اپنا مستقبل تاریک بتایا ! اور ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان بھاگنے کی فکر دامن گیر ہے !

" مجاہدین اسلام " نے بلا کسی انکسار اور تکلف کے فوراً ہی شیخ عبد اللہ اور عوامی حکومت کے خلاف ادھر ادھر دیکھ کر اعلان جہاد کر دیا اور وہی دم اپنی تیغ زبان سے کشمیر کو فتح کر کے پاکستان کے حوالے کر دیا ! اس کے بعد کھانے اور چائے کی پر تکلف ضیافت دیر تک رہی اور پھر نجی اور غیر رسمی گفتگو میں مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو بھی پاکستان بھاگنے کی فکر دامن گیر ہے ، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اب کشمیر میں کسی پاکستانی کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا ہے ! بوڑھے تو خیر کہیں جانے کی ہمت ہی نہیں رکھتے ہیں مگر نوجوان مجاہدین اسلام البتہ کسی نہ کسی بہانے سے راہ فرار تلاش کر رہے ہیں اور بلا وجہ مصیبت اور ہلاکت میں اپنی جان ڈالنا احکام اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں ۔

مشرقی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

الگ بلاک بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں ، نئی جتھہ بندی کا شوشہ چھوڑنے کا سہرا مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے نمائندوں کے سر ہے اور اس کے ساتھ سارے عرب ملکوں کی ہمدردیاں شامل ہیں ، اس جتھہ بندی کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سیکورٹی کونسل میں شام کی جگہ ان کا کوئی نمائندہ منتخب ہو ، دوسرا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس گروہ کے ہاتھ میں بارہ ووٹ ہیں ، اگر یہ مل کر کام کریں تو جنرل اسمبلی کے فیصلوں پر خاصا اثر ڈال سکتے ہیں ، ایک خبر یہ بھی ہے کہ اس بلاک کے بنانے میں ان ملکوں کی اس خواہش کو بڑا دخل ہے کہ وہ اپنے معاشی مسائل کو خطہ وارانہ کوشش کے ذریعے حل کریں ۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کی کامیابی اصولاً اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی بنیادیں خیالی گتنی مقدار لگے گی ۔ آج کل معاشی تعمیر کا کام سبھی لوگ ڈالر کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں ، دوسرا طریقہ ذرا مشکل ہے اور محنت چاہتا ہے اور جمہوریت کو از سیاست دان شاید محنت سے گھبراتے ہیں ۔

(۱۰۶ ش)

مطبوعہ جدید پریس ، دہلی

طابع و ناشر ۔ عبد اللطیف اعظمی دہلی سے جامعہ

نئی روشنی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۹
یکم نومبر سنہ ۱۹۴۸ء
ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

سرسیدؔ کا قوم پروری کا دور

ڈاکٹر راجندر پرشاد

...ء کے غدر میں سرسید احمد خاں نے بہت مصیبت جھیلی تھی اور باغیوں سے
...تھے اور انھوں نے باغیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد بھی کی تھی۔
...شا اثر ہوا جو مسلمانوں کی ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے یہ بھی دیکھا
...ت کی بنا پر ملازمتوں سے نکالے جا رہے ہیں وہ ایک قوم پر
...ستان ہندو اور مسلمان ایک منحوس قسمت میں ملا... قدم کے۔
...میں ہمیشہ قوم پروارانہ رہیں، اور ہندو اور مسلمان
...وہ بالکل جائز طور پر یہ خواہش رکھتے تھے
...میں اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ مسلمانوں
...مختلف مقامات پر جہاں جہاں وہ ملازمت کے
...ن میں سے بعض ابھی تک چل رہے ہیں۔ ان کا
...ہے اور اس حکومت میں جو نقائص ہیں ایسے
...جائیں۔ ان کے اس اعتقاد میں اس زمانے کے تمام
...ریں کی بنیاد رکھی۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ
...کی فرق نہ ہونا چاہئے اور سرکاری ملازمتوں کے
...امتیاز سماجی تعلقات اور سیاسی دستوری حقوق
...۔ "البرٹ بل" کی وائسرائے کی کونسل کے ممبر کی حیثیت
...موقع پر وہ صرف اس وجہ سے انگریز باہر چلے آئے
...کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور ہندستانیوں کے لئے ڈائس سے
...ڈالی تھی جس کے ممبر ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور جس میں
...تعلق میں انھوں نے اس طرح لکھا ہے:-

...حاصل نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ وہ حکمران قوم کی برابری نہ حاصل
...حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں اور ہندوؤں کی
...نہیں کرے وہ محرری کی یا اور کسی ادنیٰ درجہ کی ملازمت پر مطمئن ہیں اور ملک
...سے نہیں بھی جا سکتی جو اپنی رعایا کی جائز عزت افزائی نہ کرے عزت
...کے گی جب ہمارے ہم وطن انھی رتبوں اور عہدوں پر فائز ہوں گے کہ جیسے
...ہیں۔ حکومت نے سچے دل سے اور خلوص نیت کے ساتھ اپنی رعایا کو ہر ملک میں
...وہ اس برابری کے درجے کو پہنچا۔ لیکن ہندستانیوں کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں
...عزم اور استقلال کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہئے اور اس خوف سے کہ مبادا ہم پر کوئی مصیبت
...ہمیں قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہئے"[۱]

۱۸۸۳ء میں جبکہ "لوکل سیلف گورنمنٹ بل" کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں حکومت کی نامزدگی کے ذریعے پر کی جائیں اور یہ طے پایا کہ ایک تہائی نشستیں اس طریقے سے پر کرنی چاہئیں تاکہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کرے کہ کمی پوری کر دے جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخابات میں نہیں آئے ہیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کر دی جائیں یا یہ انتخابات جداگانہ ہوا کریں اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا مطالبہ کر بھی کس طرح سکتے تھے جب کہ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندو مسلمان مل کر ایک قوم ہیں۔ اور ان کا یہ اعتقاد ذیل کی سطروں سے جو کہ ان کی تحریرات کا اقتباس ہیں اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے:-

"لفظ قوم کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ایک ہی ملک میں رہتے ہوں...... یاد رکھیے کہ ہندو مسلمان ... ملک کو نفع پہنچائے گی سب کو نفع پہنچانے والی ہوگی...... اب وہ وقت گیا کہ صرف مذہب کے اختلاف کی بنا پر ملک کے باشندوں کو دو الگ الگ قومیں تصور کر لیا جاتا تھا۔"[۵]

ایک دوسرے موقع پر انھوں نے یہ کہا ہے کہ:-

"جس طرح آرین لوگوں کو ہندو کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح اسی معنی میں مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔"[۶]

پنجاب کے ہندوؤں کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا کہ:-

"اپنے لئے آپ نے لفظ ہندو جو استعمال کیا ہے میرے خیال میں وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میری رائے میں یہ مذہب کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ لوگ مجھے ہندو نہیں سمجھتے، حالانکہ میں بھی آپ کی طرح ہندوستان کا باشندہ ہوں۔"[۹] (ہندوستان کا مستقبل)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
سرسید کا قوم پروری کا دور	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱
آزاد تعلیم کا تجربہ	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲
علی گڑھ	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
(۱) ہندوستان		۴
(۲) پاکستان (مکتوب کراچی)	جادہ پیما	۵
مغربی دنیا	ع۔ ل	۶
غزل	اثر لکھنوی	۷
گیت	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷
ٹوٹے تارے	باقر مہدی	۷
ابتدا کی طرف (افسانہ)	خواجہ احمد عباس	۸
امریکہ یا روس	پروفیسر آغا اشرف	۹
ترکی	سید قاسم الحسنی	۱۰
بچوں کا ملک	ثریا قمر	۱۱
انسانی زندگی کا مقصد	جیٹھا نند	۱۱

[۱] طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۰۳ ماخوذ از مجموعہ لیکچر سرسید احمد صفحہ ۱۶۷
[۲] اسی کتاب کا صفحہ ۲۸۳ ماخوذ از "سرسید کے آخری مضامین" صفحہ ۵۵
[۳] " " " ۲۸۳ "سفرنامہ پنجاب" سرسید احمد " ۱۲۹

... طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۸۱، ۲۸۲

قیمت فی پرچہ ۱۳

آزاد تعلیم کا ایک تجربہ

ڈاکٹر ذاکر حسین

(جامعہ ملیہ کی اٹھائیسویں سال گرہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۴۸ء کو منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر ہم شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اس خطبے کا ایک حصہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو موصوف نے جامعہ جوبلی کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جامعہ ملیہ کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔)

جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول، سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کام میں بنیادی فرق کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لئے اس موقف پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی، ان کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست، خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالا ہے آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے، تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا ایک میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست کا کام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب؛ تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب؛ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور بیدار کرتی ہے۔ سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت؛ اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت، سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے، راہ رو کا رخ متعین کرتی ہے۔

ملال عالمیاں دم بدم دگرگوں است
منم کہ مدت عمرم بہ یک ملال گذشت

بہر حال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں، کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رنگ رنگ کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفے کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عملی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا۔ اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کا۔ پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے۔ ان کی محبت و شفقت ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکر گذاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیۃ خلافت اٹھاتی تھی، لیکن سیاسی دریا کے اتارنے [illegible] تھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا، اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا ہم کارکنوں کو حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارہ کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنا کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا۔ سیاسی ردعمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بین نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا۔ چنانچہ ہمارے امنا کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا، اور بہت سوں نے شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصے کو زندہ رکھنے کا خیال قابل تعریف تو ہے مگر قابل عمل نہیں، اس [illegible] کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت، اور احتیاط کتنی ہی [illegible] یقین اور جرأت کی کمی ضرور تھی لیکن یہ چیزیں الحمد للہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ ہم نے اسی خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا کہ غالباً امنا کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی [illegible] نہیں ہے، قرض ہے، [illegible] بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں۔ بچوں کو [illegible] کر سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بجا ہوگا، کہئے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا [illegible] بلا استثناسب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں [illegible] نہ ہوگا، بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا۔ لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جا سکا۔ [illegible] نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی [illegible] جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ [illegible] دل کو لگی تھی اس کام کے [illegible] انجمن تعلیم ملی کے نام سے [illegible] نے حیاتی رکن بنا [illegible] یا تاحیات، اگر [illegible] کی خدمت کر [illegible] سے زیادہ [illegible] حیاتی رکن [illegible] انجمن میں [illegible] رکن [illegible] کے کام [illegible] بہت [illegible] مولانا ابوا[illegible] مدراس کا دورہ [illegible] فیاضی سے وہ [illegible] میں سمجھتا ہوں [illegible] ایک قابل توجہ [illegible] میں تعلیمی، تہذیبی [illegible] کی طرح ڈالی ہے اور [illegible] انعام خود کام میں ہوتا [illegible] روایات اس طرز عمل کی [illegible] لئے اس نئے طرز خدمت کا [illegible] دوسرے اس انجمن کے قیام [illegible] کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے تعلیمی [illegible] پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس [illegible] واضح ہو گیا ہے

پچھلا ہفتہ: ہندوستان

بڑی خیریت ہوئی

کانگریس کی صدارت کے انتخاب میں حسب توقع ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ کامیاب ہو گئے لیکن خلاف توقع بہت تھوڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے یعنی انھیں اپنے حریف سے صرف ۱۱۴ ووٹ زیادہ ملے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ کانگریس کے بڑے لیڈروں نے پہلے یہ کوشش کی کہ مقابلہ نہ ہو اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں غیر جانب دار رہیں گے، لیکن اپنے اس فیصلے کا اعلان نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے حامیوں کو موقع مل گیا کہ ان بزرگوں کے نام سے فائدہ اٹھائیں اور ووٹ دینے والے الجھن میں پڑ گئے۔ اس کا اثر زیادہ تر گجرات اور بمبئی میں دیکھنے میں آیا۔ جہاں گاندھی جی کے پیرووں کی سے کہ وہاں کے ووٹ دینے والوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا گیا۔ اس بار جو گڑبڑ ہوئی اس سے سبق ملتا ہے کہ آئندہ سے صدارت کے انتخاب کے موقع پر کانگریس ہائی کمانڈ کو اپنی رائے کا صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے تاکہ ان کا نام لے کر لوگوں کو دھوکا نہ دیا جا سکے۔

بہر حال بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ڈاکٹر سیتا رمیہ کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے اور ملک کو یہ اطمینان ہو گیا کہ کانگریس بدستور گاندھی جی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

سیاسی افق پر نیا ستارہ

سوشلسٹ پارٹی جو اس سال کے شروع میں قائم ہوئی تھی۔ اب دس مہینے کے بعد اپنی حالت کا اور ملک کے حالات کا جائزہ لے رہی ہے اور ہندوستان کے مجوزہ دستور اساسی کے مسودے پر غور کر رہی ہے۔ وسط اکتوبر سے اس مجلس عاملہ کا جلسہ جبل پور میں ہو رہا ہے۔ اس کی کارروائی کے متعلق یہ خبر آئی ہے کہ اس نے دستور اساسی کے مسودے پر بحث کی اور اس میں ..ترمیمیں تجویز کیں۔ اس کا سب سے اہم اور بنیادی مطالبہ تو یہ ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی جو ملک کی آبادی کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ توڑ دی جائے اور ہر بالغ کے حق رائے دہندگی کی بنا پر نئی اسمبلی منتخب ہو۔ مسودے کے متعلق اس کی مجموعی رائے یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے پرستاروں کے لئے مایوس کن ہے۔ اس کے ذریعے سے مکمل جمہوریت وجود میں نہیں آ سکتی، بلکہ اس کا امکان ہے کہ حکومت کو استبدادی بلکہ آمرانہ طرز عمل اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔"

سوشلسٹ پارٹی کی مجلس عاملہ بالغوں کے حق رائے دہندگی، وفاقی نظام اور پارلیمنٹی طرز حکومت کی دل سے حمایت کرتی ہے۔ مگر اس کا خیال ہے کہ دستور کے مسودے نے مجالس مقننہ کے دو ایوان تجویز کر کے جمہور کے قانون سازی کے حق [illegible] اور اس طرح وفاقی کی حکومت خود اختیاری کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور گورنروں کے اختیار تمیزی کے ذریعے سے ذمہ دار حکومت کی کمر توڑ دی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ دستور میں حق ملکیت کو محدود کر دیا جائے اور اس بات کی صراحت کر دی جائے کہ ہندوستان میں جمہوری اشتراکیت کا نظام قائم کیا جائے گا۔ بہت سی ترمیمیں اس بنیادی اصول کو عمل میں لانے کے سلسلے میں پیش کی گئی ہیں۔

بیرونی سیاست کے سلسلے میں سوشلسٹ پارٹی یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کے برطانوی شرکت اقوام سے الگ ہو جانے کا اعلان کر دیا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سوشلسٹ پارٹی جمہوری مساوات اور معاشی انصاف کا زیادہ بلند اور واضح تصور رکھتی ہے اور اس کے مخلص اور پرجوش لیڈر ان اصولوں پر عمل کرنے کے لئے زیادہ بے چین ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس نے کانگریس سے الگ ہونے میں کسی قدر عجلت سے کام لیا ہے۔ اس کے لیڈر اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے ہم خیالوں کی بہت بڑی تعداد ابھی تک کانگریس میں بائیں بازو کی حیثیت سے موجود ہے اور صرف اس وجہ سے کہ اگر وہ الگ ہو جائے تو اس نازک زمانے میں حکومت کے سارے اختیارات رجعت پسند دائیں بازو کے ہاتھ میں چلے جائیں گے جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ان لوگوں کا خیال ہے آج کل ہندوستان ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے اس وقت کانگریس کے اندر اتحاد اور ملک کے اندر امن قائم رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے سیاسی اور معاشی ترقی کی رفتار کچھ دن کے لئے دھیمی پڑ جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ خود کانگریس کو رجعت پسند عناصر سے پاک کر کے ترقی پسند بنا لیں گے یا اگر اس میں کامیاب نہ ہوئے تو کانگریس کو چھوڑ کر الگ پارٹی بنائیں گے اور اس کے ساتھ زور شور سے آئینی جنگ کریں گے۔ ان کے نزدیک یہ وقت کسی شدید کشمکش کے لئے خواہ وہ آئینی ہو ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ سوشلسٹ پارٹی کا خیال اس کے برعکس تھا لیکن پچھلے دس مہینے میں اس کے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی حکومت کے خلاف تنقید یا اجتماع کی کوئی پرزور تحریک اٹھانا ناممکن یا مناسب نہیں سمجھتی۔ ایسی صورت میں اس کی جلد بازی سے صرف کی ایک صحیح تصویر ملک کے سامنے پیش کرنی شروع کر دی۔ اس کے مقابلے میں نقصان یہ ہوا کہ بایاں بازو کانگریس کے اندر پہلے سے کمزور ہو گیا۔ بہر حال نقصان عارضی ہے اور فائدہ امید ہے کہ مستقل اور پائدار ثابت ہوگا۔

بنگال کی حالت تشویش ناک

مغربی بنگال کے ذمہ دار لوگوں کا کہ مشرقی بنگال سے ہندو بہت بڑی [illegible] میں ترک وطن کر کے آ رہے ہیں۔ اب تک جتنے لوگ آ چکے ہیں ان کی تعداد تیرہ لاکھ سے لے کر پندرہ لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو مغربی بنگال میں جس کی آبادی پہلے ہی سے بہت گنجان ہے بسانے کا سوال خاصا نازک ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر آنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی تو یہ مسئلہ خطرناک صورت اختیار کر لے گا۔ اس انتقال آبادی کی دو وجہیں بتائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ حکام کا برتاؤ اچھا نہیں، بڑے پیمانے پر تلاشیاں لے کر پولیس ان کو دق کرتی ہے اور بہت سی باتوں میں ان کی حق تلفی کی جاتی ہے جس سے ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے دوسرے گرانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چاول جو صوبے کی عام غذا ہے پچاس روپے من ہو گیا ہے۔ مشرقی بنگال کے ایک وزیر حمید الحق چودھری صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ مشرقی بنگال سے بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہو رہا ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ تلاش معاش میں مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم معاصر اسٹیٹسمین کے خیال میں حمید الحق صاحب کا یہ بیان "بالکل لغو ہے" پناہ گزینوں کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ایک صریحی واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے مشرقی بنگال کی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ اس خطرناک صورت حال کی جلد سے جلد اصلاح کرے ورنہ نتائج بہت افسوسناک ہوں گے۔

سخت تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ مشرقی بنگال کی حکومت اس نازک [illegible] کو حل کرنے کے بجائے اس کے وجود [illegible] انکار کر رہی ہے۔ شاید انکار محض [illegible] سے بچنے کے لئے [illegible] معاملے کی نزاکت [illegible] قیاس کی [illegible] کہ [illegible]

[illegible] اور [illegible] کی تقریر [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] صاحب کا ہم خیال [illegible] کی جنگ جاری رہے [illegible]

ضروری اعلان [illegible] یکم نو[illegible] نمبر [illegible] ندوی صاحب بی اے جامعہ [illegible]

۲- پاکستان

مکتوب کراچی

"جادہ پیما" ——— نے بندر روڈ کراچی سے لکھا

لاہور، راولپنڈی اور پشاور آپ نے دیکھے ہوں گے، کراچی ان معنوں میں شہر ہرگز نہیں۔ یہاں آپ کو ہر دوسرا آدمی دہلی سے الہ آباد تک کسی بھی قصبہ یا شہر کا رہنے والا ملے گا، ہر تیسرا باشندہ خلد آباد سے پٹنہ تک کہیں کا باشندہ ہوگا۔ ہر چوتھا ذی روح جبل پور سے کان پور تک کسی جگہ کا ہو سکتا ہے۔ گویا ہندوستان کے تین صوبوں یوپی، بہار اور سی پی کی مکمل نمایندگی یہاں بکثرت موجود ہے اس پانچویں سے آٹھویں تک، جو اشخاص آپ کو ملیں گے وہ یقیناً میمن، خوجے اور بوہرے ہوں گے یعنی کاٹھیاواڑ، گجرات اور دکن کی پیداوار۔ ہر نواں شخص بنگالی، عرب، چینی، حبشی، ایرانی، ہندوستانی [illegible] میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ دسواں شخص [illegible] ہیں، جو کراچی کے علاوہ پاکستان کے [illegible] کے رہنے والے ہوں گے۔ ہاں اگر [illegible] صبح کو آپ کے سر [illegible] کا شوق [illegible] کراچی [illegible]

[illegible] اور [illegible] [illegible] پر [illegible] کراچی کی بدنصیبی [illegible] انقلاب یا ردِ انقلاب [illegible] میں بیسیوں شہر اجڑے [illegible] اور غیر محرم لوگ محرم

گھروں میں آکر بس گئے ہیں، لیکن شاید کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بڑے شہر کی .. فی صدی سے زائد آبادی سمندر اور خشکی کے راستے سے کوچ کر گئی ہو، اور اصلی باشندوں میں جو ۲۴ فی صدی سے کم لوگ اس میں بچے ہوں وہ سب کے سب مزدور اور قلی ہوں۔ اتفاق سے کراچی کا یہی حشر ہوا ہے۔ یہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت خوش حال سندھی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اب یہاں وہ خال خال نظر آتے ہیں۔ "کراچی ہمارا ہے" یا "ہم کراچی کے ہیں" یہ کہنے والے اب صرف مٹھی بھر سندھی مسلمان مزدور یا قلی رہ گئے ہیں

کراچی کے اس انتقال آبادی میں مزید تماشہ یہ ہوا ہے کہ جو لوگ باہر سے آئے ہیں وہ ایک زبان اور ایک معاشرت یا ایک صوبے کے نہیں وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، رنگ رنگ کی معاشرت کے حامل ہیں، اور ہندوستان کے ہر صوبہ بلکہ ہر شہر کی یاد دلاتے ہیں، شاہ راہوں پر تفریح گاہوں میں اور تجارتی اداروں میں صبح و شام کسی وقت بھی آپ گجراتی، مرہٹی، لکھنوی، ہندو، بنگالی، مدراسی، اردو، فارسی سب ہی زبانوں پر شوق سے سن سکتے، یا لباسوں کی قطع برید سے لطف اندوز [illegible] ہوتے رہیے۔ صحیح معنوں میں کسی شہر کی پہچان [illegible] ہے کہ ایک ذی ہوش نووارد وہاں چند [illegible] رہنے کے بعد یہ اندازہ لگا سکے کہ فلاں قسم [illegible] کے اور خاص طرح کے چال ڈھال والے [illegible] سے کون سا سوال کرنے پر کس قسم کا [illegible] میں کیا جواب ملے گا، کیونکہ ہر شہر میں [illegible] تمدنی طبقات ہوتے ہیں جن میں [illegible] تمیز کی جا سکتی ہے اور روزمرہ کی بات [illegible] متعلق ان کے ذہنی رد و بدل کا بخوبی اندازہ [illegible] جا سکتا ہے۔ لیکن کراچی ایک ایسا شہر ہے [illegible] میں ایک شہر ہونے کا یہ بنیادی امتیاز سر [illegible] سے غائب ہے اور شاید مدت تک غائب رہے۔ کراچی آنے سے پہلے اور یہ معلوم کر کے کہ دہلی اور یوپی سے کراچی میں کافی لوگ آئے ہوئے ہیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں دہلی کی زبان اور یوپی کا تمدن چھایا ہوا ہوگا۔ لیکن اس بارے میں یہاں آکر سخت مایوسی اور حیرت ہوتی ہے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے۔

ایک روز شام کے وقت صدر میں جو یہاں کی انارکلی ہے، یہ آواز کان میں پڑی۔

"کھائیں گا، تو ہمیش یاد کریں گا .. دلی کے دہی بڑے ہیں یہ دلی کے"۔

میں خوانچہ والے کے پاس گیا اور پوچھا۔

"آپ دلی کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں"

"تو پھر آپ یہ کیا آواز لگا رہے ہیں۔ کھائیں گا تو ہمیش یاد کریں گا؟"

"کیا کریں سرکار! جب دلی میں تھے تو شام کو فتح پوری میں آواز لگایا کرتے تھے "ایک دفعہ کھلیئے گا تو کبھی نہ بھولئے گا۔ شاہی دہی بڑے ہیں یہ شاہی دہی بڑے" جب سے قسمت یہاں لائی ہے، جیسی یہاں کی بولی ہے ویسی آواز لگاتے ہیں۔ کیا کریں سرکار پیٹ پالنا ہے اب یہیں رہنا ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس"۔

واضح رہے کہ یہ خوانچہ والا دہلی کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا اور جو چاندنی چوک، قاضی حوض یا فتح پوری میں پنجاب، سرحد وغیرہ کے گاہکوں کو غلط اردو پر ٹوک دیا کرتے تھے اور اکثر لطیفے کی چوٹ بھی کر جاتے تھے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر کم و بیش یہی ذہنیت کہ "پیٹ پالنا ہی اور جیسا دیس ویسا بھیس" عام طور پر ہر دہلی اور یوپی سے آنے والے کی یہاں ہو کر رہ گئی ہے، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ بے شک ان میں بعض مستثنیات بھی ہیں اور کہیں کہیں صحرائے اعظم کے نخلستان کی طرح خالص دہلوی تہذیب کے نظارے یا لکھنوی زبان کے چٹخارے بھی مل جاتے ہیں لیکن بہت کم اور شاذ و نادر دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً ان علاقوں سے آئے ہوئے لوگ زبان و معاشرت کے لحاظ سے اپنی امتیازی انفرادیت کھوتے جا رہے ہیں، یہی حال سی۔ پی اور بہار سے آئے ہوئے لوگوں کا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے شمالی مغربی صوبوں کے مسلمانوں کو یوپی کے مسلمانوں کا احساس برتری اور اپنی زبان و تہذیب پر ان کا واجبی لیکن بعض دفعہ تکلیف دہ حد تک بڑھا ہوا فخر بڑا ناگوار گزرتا تھا۔ لیکن یہاں کراچی میں آکر ان کے یہ دونوں احساس تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ دانستہ اپنی انفرادیت مٹا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ جس قدر جلد ہو سکے یہ لوگ مقامی کل میں مدغم ہو جائیں شاید یہ رجحان "پناہ گیرانہ ذہنیت" کا ایک درد ناک تقاضا ہے جس کے ایفا میں آج لاکھوں انسان پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں لسانی و تمدنی موت مر رہے ہیں۔ زبان و تمدن کے اس "مرگ انبوہ" سے کوئی تمدنی حیات نو پیدا ہوگی جو عمومی بھی ہو اور ارتقائی بھی۔ اس کا فیصلہ تو مستقبل بعید ہی کر سکے گا، گو اس معاملے میں کراچی کے آثار چنداں حوصلہ افزا نہیں لیکن اگر آپ "مرگ ثقافت جشن دارد" کے قائل ہیں تو شوق سے کراچی آئیے اور یہاں کے ہر ہوٹل اور ہر فلیٹ میں یوپی کی نازوں کی پلی ہوئی تہذیب کو دم توڑتے دیکھیے، اور ہر گلی اور ہر کوچہ میں دلی کی کوثر میں دھلی ہوئی اردو زبان کی سسکیاں سن لیجیے۔

گو یہ تعجب کی بات ہو لیکن یہ ہے اپنی جگہ بالکل صحیح کہ کراچی میں نئے آئے ہوئے لوگوں میں صرف میمن، خوجے، بوہرے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی جداگانہ زبان و معاشرت بڑی حد تک قائم رکھی ہے وہی ان کی گجراتی زبان، وہی تنھی پگڑی، وہی ملاجی، وہی رہن سہن اور وہی اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان میں صحیح معنوں میں پناہ گیر بہت کم ہیں میمن، خوجے اور بوہروں کے لئے پاکستان پناہ کی جگہ نہیں ہے بلکہ ایک تجارتی منڈی ہے جو ہندو تاجروں کے جانے سے لاوارث پڑی تھی۔ یہ لوگ بمبئی، کاٹھیاواڑ سے آئے اور اس کے وارث بن گئے، اور اس اسلامی نہیں بلکہ بیوپاریانہ ہجرت کی وجہ سے خوب سرخرو ہو گئے۔ لیکن حالات صاف بتا رہے ہیں کہ اگر ان مسلمان مارواڑیوں نے پاکستانی عوام سے معاشی سمجھوتہ نہ کیا اور اپنی امتیازی معاشرت کے موجودہ سنگین حصار کو نہ گرایا تو یہاں ان کے فرقے کا جداگانہ وجود گہری نفرت کا باعث بن جائے گا۔

کراچی کے بچے کھچے اصلی باشندے اکثر یہ سوال کرتے سنائی دیتے ہیں کہ "پاکستان سے پہلے کراچی میں ہندو سیٹھ لوگ ہوتا تھا۔ اب مسلمان سیٹھ لوگ آگیا ہے، ہم جب بھی مزدوری کیا اور اب بھی مزدوری کرتا ہی، ہمارے کو کیا ملا؟"

غالباً یہی سوال پاکستان کے ہر قریہ اور قصبے میں بھی غریب عوام ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، اور کچھ دنوں بعد شاید یہ لوگ ایک آواز ہو کر حکومت وقت سے بھی پوچھیں گے اور اسی سوال کے تسلی بخش جواب پر پاکستان کے استحکام وارتقا کا تمام تر انحصار ہے۔

الغرض پاکستان کا دارالسلطنت کراچی اس وقت شہر نہیں بلکہ ایک مسکن ہے جہاں انواع و اقسام کے لوگ سکونت پذیر ہیں۔ اور جن میں بیشتر مسکین ہیں۔ عمارتوں کے اعتبار سے تو کراچی بے شک ایک شہر ہے، لیکن یہاں کی پہلی شہریت تو کچھ عرصہ ہوا ہند کو کوچ کر گئی اور نئی شہریت پیدا ہونے کے لئے ابھی بتیں درکار ہیں۔ یہ ایسا مدینہ ہے جس کی مدنیت کہیں دور جا کر غیریت بن گئی اور کہیں دور کی مدنیت یہاں آکر غیریت کا شکار ہو گئی ہے اس سلسلے میں راقم الحروف کو ایک دلچسپ واقعہ دیکھنے کا

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اجنتا کی طرف

خواجہ احمد عباس

ہونہہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

"تمہارا کیا خیال ہے بھارتی ...."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا، کوئی نہیں تھا، نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا، اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آکر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہوگا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی تھی وہ کالی پڑ چکی تھی، غالباً آفتاب غروب ہو چکا تھا .... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا، اور وہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا، بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا، پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈھتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے، منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتھوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہوئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں، اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پُرحیرت منظر کو دیکھتا رہا پھر اس سے نہ رہا گیا، اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

"معاف کیجئے میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہے اور یہ ادھورا ہی رہے گا۔"

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے مگر ان کی تکمیل ہونی ہی چاہئے۔"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا، اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے۔"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر ..."

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ، اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"آپ کا نام؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں۔"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا، انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے۔"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا؟"

"کون جانتا ہے؟"

"اس غار کو ...."

"پورا ہونے میں دو برس لگیں گے، اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا ...."

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی ۔ جب انسان کی تکمیل ہوگی۔"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟"

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آتا گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گل کاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ آپ لوگوں نے سنگ تراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بنائے ہیں، یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگ تراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ تھی جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں۔"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر اور سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو۔" اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پہ لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا صرف اس کی چھینی کی کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام ...."

مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن [illegible] چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر [illegible] پڑنے کی آواز —— یہی تھا [illegible] نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں [illegible] اپنی معصوم ادا [illegible] ہو گیا۔ اور [illegible] دنیا کا [illegible] اس قیمتی [illegible] پیغام [illegible] نرمل [illegible] ہوا پتھر [illegible] کھٹ [illegible] اور [illegible] تھی نرمل [illegible] عمل [illegible] محنت [illegible] عمل [illegible] کی چٹانیں [illegible] ہے۔ عمل سے [illegible] عمل سے انسان [illegible] خود عمل کا [illegible] کھٹ کھٹ [illegible]

پتھر پر لو[illegible] سو برس میں نہیں تو [illegible] کر سنگ تراشی اور مصوری [illegible] دھکے ہاتھوں نہیں ہزاروں [illegible] کے بعد نسلیں اس کام کو جاری [illegible] نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمال فن [illegible] کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔

امریکہ یا روس؟

پروفیسر آغا اشرف

آج سب سے اہم سوال جس پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے روس اور امریکہ کے تعلقات کا ہے جب سے ان دونوں نے مل کر جرمنی کو شکست دی ہے وہ خلیج جو اُن کے درمیان موجود تھی وسیع ہوتی جا رہی ہے اس لئے اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ حالات دونوں میں سے ایک کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ ملک دونوں جتھوں سے الگ رہ سکیں مگر اس وقت تو یہ بات بہت مشکل معلوم ہوتی ہے موجودہ تہذیب کے بننے میں انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ فرانس کے انقلاب نے یورپ میں سیاسی آزادی کی فضا پیدا کر دی اور صنعتی انقلاب نے معاشی آزادی دے کر زندگی میں کایا پلٹ دی۔ یہ سب کچھ انیسویں صدی میں ہوا۔ واقعات [illegible]ت دیتے ہیں کہ معاشی آزادی نے سیاسی [illegible] کر یا اس کو ایک ڈھکوسلا بنا کر [illegible] سرمایہ داری کہتے ہیں [illegible] مگر عوام کی زندگی پر [illegible] کا دائرہ عمل [illegible] فرانس کے مفکر [illegible] لاب سے [illegible] وہ پا [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی تھیں [illegible] کی نئی اور [illegible] عرصے تک [illegible]

[illegible] فرانس نے انقلاب [illegible] کے اکثر ملکوں کو فتح [illegible] کر لی تھی، یہ سب مل کر نپولین کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور [illegible] ہوئی۔ مگر اس شکست کے باوجود انقلاب کے اصول آہستہ آہستہ یورپ کے سب ہی ملکوں میں مقبول ہوئے، اور یوں آخری فتح ان کی ہوئی۔

آج تاریخ ایک ایسے ہی دور سے گذر رہی ہے روس میں جن اصولوں کی بدولت انقلاب ہوا، وہ اکثر ممالک کے بنیادی معاشی تناقض کو ختم کر سکتے ہیں۔ دنیا کی عام فضا اور رُخ کچھ اسی طرف مائل ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی پوری قوت اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ امریکہ میں دولت، انفرادی آزادی اور بے پناہ وسائل کے ساتھ میکانکی جدت کمال کو پہنچ چکی ہے۔ روس میں ایک نیا ولولہ انسانوں کے اندر ایک اٹل اعتقاد اور اعتماد اور وہ طاقت جو اس سے پیدا ہوتی ہے دنیا کے لئے ایک نمونہ بن گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ذرا غور سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ دنیا کے وہ ملک جو الگ ہیں یا الگ رہنا چاہتے ہیں کیا کرتے ہیں یا کس طرف قدم بڑھاتے ہیں ان کا حقیقی فائدہ ہے۔

پہلے مشرقی یورپ کو لیجئے۔ یہاں پرانا نظام غائب ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ ایک نئی زندگی اور ایک نیا جوش تعمیر نو میں مصروف ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر روس کے نقشے کی روشنی میں کام کر رہے ہیں اور اس کے زیر دست ہیں۔ پولینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری الگ کر دئے گئے ہیں۔ حکومت میں ان کا ہاتھ اب بھی ہے۔ مگر ان سے جو شکایتیں تھیں وہ سب مشترکی جاتی ہیں، جب تک اشتراکیت کے اصولوں کو ہر ملک کے مخصوص حالات کے مطابق ڈھالنے کا اصول تسلیم کیا جاتا تھا۔ مسٹر گومکا کی وفاداری پر شک نہیں کیا گیا تھا۔ اب ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ مارکس اور لینن کی تعلیم کو انھوں نے ادب آرٹ اور سائنس پر پوری طرح سے اثر انداز نہیں ہونے دیا، اپنی ملکی مصلحت کی بنا پر زراعت میں پوری تبدیلی نہیں کی، اور عام طور پر رجعت پسند قوتوں کے خلاف قدم نہیں اُٹھایا۔ انگلستان کا ایک مشہور ترقی پسند اخبار لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انقلاب اپنے بہترین سپوتوں کو قربان کر رہا ہے اسی طرح یوگوسلاویہ کے لیڈر مارشل ٹیٹو کے خلاف روس میں سخت سخت الزام لگائے جاتے ہیں اور کومن فارم کے ذریعے ان مشرقی ممالک کے آزادی سے سوچ سمجھ کر اشتراکیت کو اپنانے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں بس یوں سمجھئے کہ اشتراکیت اب روس کا ناقابل تقسیم اجارہ ہے۔ صرف وہی اس نسخے کو پڑھ سکتا ہے اور مریض کے لئے صرف اسی کے دواخانے سے دوا مل سکتی ہے جس طرح نپولین کے ہاتھوں روسو کا پیغام مسخ ہوا تھا۔ ویسے ہی خطرہ ہے کہ کہیں اسٹالین کے ہاتھوں مارکس کا نسخہ مسخ نہ ہو جائے۔ شاید اشتراکیت روس کی قیادت ختم ہونے کے بعد جیسا کہ نپولین کی شکست کے بعد ہوا تھا سارے یورپ میں اپنائی جائے۔

آئیے ذرا دوسری طاقت کا بھی جائزہ لیں۔ امریکہ کے پاس نہ اصول ہے نہ کوئی پیغام ایک دولت مند ملک ہے جو اپنے ایک ایک ڈالر کے عوض میں کچھ نہ کچھ فائدہ چاہتا ہے۔ امریکہ جن ملکوں کی مشکل آسان کر رہا ہے، در اصل ان کو اپنے بس اور نکما بنانے کا سامان کر رہا ہے۔ اسے صرف روس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے سے مطلب ہے اور اپنی دولت کے بل پر وہ مغربی یورپ اور انگلستان تک کو استعمال کر رہا ہے۔ آئندہ موقع ملا تو اس سودے کے تہذیبی نقصانات بھی دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت تو صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دنیا کے بہت سے ملکوں کو روس کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اور اگلی جنگ میں تو اور بھی زیادہ کیا جائے گا۔

امریکہ دولت کے نشہ میں چور ہے اور روس اپنی قوت اور نئے جوش کی رو میں بہہ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان جو ملک واقع ہیں وہ گویا چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں ہیں۔ فرانس میں حکومت آئے دن بدلتی رہتی ہے ایک حد تک تو یہ تلوّن ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے مگر آج کل اس وجہ سے بہت بڑھ گیا ہے کہ وہاں جو بھی حکومت بنتی ہے اس کی آنکھیں امریکن روپے کی طرف لگی ہوئی ہیں، روس سے دوستی کا تو کیا ذکر ہے، روس کے کسی اصول کو اپنانے سے بھی امریکن برہم ہو جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی سے کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ نہیں۔ حالانکہ اس کے بغیر معاشی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ امسال جو امریکہ کی طرف سے مارشل امداد مل رہی ہے اس میں فرانس کا سب سے زیادہ حصہ ہے، مگر اس پر بھی اُمید نہیں کہ معاشی بحران دور ہو سکے۔

ایشیا کے اکثر ملکوں کو بھی امریکہ اور انگلستان اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ چین میں چیانگ کائی شک بھی امریکن روپے کے سہارے جی رہے ہیں۔ بہت بڑے ملکوں میں صرف ہندوستان باقی ہے اور سب کی نظر اس کی طرف ہے۔ ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں کی آزمائش کا وقت ہے۔ امریکہ کی دولت کھینچ لے گئی تو اپنے مستقبل کو خود بنانے کی آزادی ختم ہو جائے گی لیکن روس سے معاملہ کیا تو شاید ہماری سب سے بڑی اور بنیادی بیماری کا حل اس دوا سے جو روس کے دواخانہ میں ملتی ہے اور مفت ملتی ہے ہو جائے۔ مگر کبھی کبھی ایک بیماری کا علاج دوسری بیماری کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔

ہماری رائے میں تو خود اپنے جمہور کی بے پناہ قوت پر اعتماد کر کے نئے ہندوستان کی تشکیل ہو سکتی ہے جس میں نہ دولت کا نشہ ذہنی توازن بگاڑ سکے نہ کسی معاشی مذہب کا جنون زندگی کے محور سے ہٹا سکے۔ روس کی معاشی جمہوریت، فرانس کی سیاسی آزادی، انگلستان کا اعتدال ان سب کو سمو کے اپنی قدیم روایتوں اور تہذیب کے سلسلے میں ہندوستان ایک نئی زندگی کی تعمیر کر سکتا ہے۔ آج نہ تو اندھی تقلید سے اور نہ دنیا سے الگ ایک انوکھی دنیا بنانے سے کام چل سکتا ہے۔ ہماری نجات اس میں ہے کہ ہم اپنے اندر وہ اٹل اعتقاد جو روس کی سب سے بڑی قوت ہے اور وہ کام کرنے کی دھن جو امریکہ کی سب سے بڑی دولت ہے پیدا کریں مگر نیا ہندوستان امریکہ یا روس کا ایک گھٹیا سا نمونہ نہ بن جائے بلکہ دنیا میں اپنی تہذیبی اور اخلاقی روح کو زندہ رکھ سکے۔ کیا تعجب ہے کہ قدرت ہندوستان کے ہاتھ سے یہ کام لے کہ روس اور امریکہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ دور ہو جائے اور جنگ کا خطرہ جس نے [illegible] بدنصیب انسانیت کی نیند حرام کر رکھی ہے ٹل جائے۔

ترکی

ایک طائرانہ نظر

پریسیڈنٹ عصمت انونو

(ترجمہ از سید قاسم الحسنی)

پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء کی خزاں میں ختم ہوئی۔ اور ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں سب قوموں سے صلح کے عہد نامے ہوئے۔ صرف ترک باقی رہ گئے۔

اس جنگ میں ترکی نے سلطنت عثمانیہ کی حیثیت سے حصہ لیا۔ جب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں نے ملک پر بڑے پیمانے پر حملہ کیا تو ترک عوام نہایت جوش کے ساتھ فاتحین کے خلاف اپنے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ قومی جدوجہد جس کو ترک "جنگ آزادی" کہتے ہیں چار سال تک جاری رہی اور ترکی کے لئے پہلی جنگ صلح نامہ لوزان کی تکمیل پر ۱۹۲۳ء میں ختم ہوئی۔

نو سال کی جنگ کے بعد ترکی اپنی سلطنت کھو چکا تھا جس کے سبب سے زیادہ خوش حال علاقوں نے سخت نقصان اٹھایا تھا۔ اور ملک مادی حیثیت سے ختم ہو چکا تھا لیکن اس بات سے کہ تمام عالم کو ان کے قومی مقصد کو تسلیم کرنا پڑا ترکی کے عوام میں ایسی اخلاقی جرأت اور خود اعتمادی پیدا کر دی گویا کہ وہ کامیاب ہوئے تھے۔

۱۹۲۳ء میں قوم کی قوت عمل اور عزم سے ترکی جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ جمہوریت نے جو تبدیلیاں پیدا کیں محض ریاست کی شکل ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ انھوں نے قوم کی تمدنی اور سیاسی تنظیم کو بھی یکسر بدل دیا۔

سلطنت عثمانیہ کی بنیاد مذہب پر اور جبر کے قانون پر تھی۔ جدید ترکی ایک عوامی جمہوریت بن گئی۔ مسلسل اصلاحات کے بعد ایک ایسی ریاست وجود میں آئی جس میں جدید ترین اصولوں نے قرون وسطیٰ کے نظریات کی جگہ لے لی۔ افراد کے حقوق کے تعین کے لئے سوئس سول کوڈ اختیار کیا گیا۔ اب تک عورتیں قانوناً آزادی سے محروم تھیں۔ اب ان کو سماج میں مناسب جگہ ملی۔ ان کو مکمل حق انتخاب دیا گیا۔ اس طرح سے وہ مجلس ملی کی رکن ہو سکتی ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ترکی زبان لکھنے کے لئے عربی حروف کو چھوڑ کر لاطینی حروف اختیار کئے گئے۔ نمایاں تبدیلیوں اور اصلاحوں میں یورپین ہیٹ اختیار کیا گیا جس نے بیرونی دنیا کی نظر میں ترک کی ہیئت تبدیل کر دی۔

ترکی جمہوریت کے قیام نے چار پانچ سال کے اندر اندر ملک کی صدیوں پرانی روایات کو ختم کر دیا، اور ترکی کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا کہ ملک کی بحالی کے لئے اقتصادی اور تمدنی ضروریات کیسے پوری کی جائیں۔

ترکی جمہوریت کا رقبہ ۷۶۸۰۰۰ مربع کیلو میٹر ہے۔ انقرہ جمہوریت کا صدر مقام ہے۔ استنبول، ازمیر، ادرنہ، بروسہ، اسکی شہر، غازی انتپ، قونیہ، سیواس، ارضروم قارص، دیار بکر، طرابزون اور سمسون اہم شہر ہیں۔

۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے ملک کی آبادی ۱۶۰۱۸۸۶۹ ہے۔ ۱۹۴۵ء کی مردم شماری کی رپورٹ ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے ترکی بولنے والی آبادی کا تناسب ۹۰ فی صدی تھا، اور مسلمانوں کا تناسب ۹۸ فی صدی تھا۔ ترکی کا یہ بنیادی قانون ہے کہ اقتدار اعلیٰ غیر مشروط طور پر جمہور کے ہاتھ میں ہے۔ ترکی قوم کی مکمل نمائندگی مجلس ملی کبیر کرتی ہے۔

ترکی جمہوریت میں مقننہ اور عاملہ کے اختیارات مجلس ملی کبیر کو حاصل ہیں۔ عاملی اختیارات کا استعمال مجلس وزرا کرتی ہے جس کو صدر جمہوریت نامزد کرتا ہے اور وہ خود مجلس ملی کبیر کے ذریعے منتخب ہوتا ہے۔ مدت صدارت ۴ سال ہے۔ اور صدر ارکان مجلس میں سے منتخب ہوتا ہے۔ مرد اور عورت ۲۲ سال ختم کرنے پر ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں۔ مجلس ملی کبیر کے انتخابات ہر چار سال بعد عمل میں آتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان مندرجہ ذیل صدر جمہوریت منتخب ہوئے: کمال اتاترک (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء تا ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء)، عصمت انونو (۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء)

۱۹۳۷ء سے مندرجہ ذیل وزیر اعظم ہوئے: جلال بیار (۲۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء تا ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء)، ڈاکٹر رفیق سیدام (۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء تا ۸ جولائی ۱۹۴۲ء)، شکری سراج اوغلو (۹ جولائی ۱۹۴۲ء تا ۵ اگست ۱۹۴۶ء)، رجب پیکر (۷ اگست ۱۹۴۶ء تا ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء)، حسن ساکا (۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء ....)

داخلی سیاست کے میدان میں سب سے اہم تاریخی واقعہ ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو صدر اتاترک کی موت ہے۔ سب متمدن قوموں نے اتاترک کے لئے عزت اور احترام کا مظاہرہ کر کے ترکوں کے دل فخر سے معمور کر دئے۔ تمام دنیا کہتی تھی کہ اتاترک کی موت کے بعد ترکی تمدنی اور سیاسی میدانوں میں کس طرح ترقی کر سکے گا۔ مگر واقعات نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہے۔

ترکی جمہوریت کی بیرونی حکمت عملی کی بنیاد پر خلوص امن پسندانہ پالیسی پر رہی ہے، جس کا مقصد اپنے ہمسایوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنا ہے۔ یونان سے ۵۰۰ سال کی دشمنی کو ختم کر دیا گیا۔ عرب ملکوں اور ایران کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کئے جیسے ہمسایوں میں ہونے چاہئیں۔ بلغاریہ سے بھی خاصے اطمینان بخش تعلقات تھے۔

۱۹۳۰ء میں ترکی کی خارجی پالیسی کا نقشہ یہ تھا

روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات جاری تھے

برطانیہ عظمیٰ سے جو دشمنی جنگ آزادی کے دوران میں تھی اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اور دونوں ملکوں میں صریحاً دوستی ہو گئی

ترکی اور فرانس کے درمیان مسئلہ ہیٹے پر نزاع تھی، جب یہ مسئلہ باہمی گفت و شنید سے طے ہو گیا دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے لگے۔

ترکی جمہوریت اور اطالیہ کے درمیان تعلقات مختلف اوقات میں تبدیل ہوتے رہے۔ یوں تو باہمی ملاقاتیں سرکاری طور پر جاری رہیں اور دونوں ملک مختلف اوقات میں باہمی دوستی کا اظہار کرتے رہے۔ لیکن مسولینی کی توسیع حکمت کی پالیسی اور [illegible] دوہری بلند بانگ تقریروں سے ترک دل میں کھٹکتے تھے۔ آخر ایک بوتر دونوں ملکوں کا طرز عمل ایک دوسرے کے ساتھ یکایک مخالفانہ ہو گیا، اور باہمی اعتماد ختم ہو گیا۔ جنگ حبش کے دوران میں ترکی نے اطالیہ کے خلاف کارروائی کرنے کی تجویز کے بارے میں اقوام عالم کے فیصلے کی تائید کی، اور برطانیہ عظمیٰ کے مجوزہ فوجی اقدام کی حمایت کی۔

۱۹۳۷ء تک جرمنی سے ترکی کے تعلقات زیادہ تر اقتصادی تھے۔ عظیم اقتصادی بحران کے بعد جو ۱۹۲۹ء میں شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے۔ ترکی کو بھی دوسرے ملکوں کی طرح بیرونی تجارت کے بارے میں منصوبہ بندی کی پالیسی پر عمل کرنا پڑا اور بیرونی سکے کے حاصل کرنے میں اسے جن مشکلات کا سامنا ہوا، انھوں نے اسے جرمنی کے ساتھ اور زیادہ تجارتی تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔

ترکی کی ترقی اور ان اصلاحات کو جو اس نے نا[illegible] ہیں ریاستہائے متحدہ امریکا ہمدردی کے ساتھ [illegible] رہا ہے۔ جمہوریت کے ابتدائی [illegible]

جو ترکی میں ریاستہائے متح[illegible]

ترکی عوام کی نئی طرز ز[illegible]

ہماری ہمت اف[illegible]

اور جنرل [illegible]

ایک نا[illegible]

[illegible]

صلح نامہ [illegible]

پر نظر ثانی کی [illegible]

میں زبردستی [illegible]

روس سے وہ ذرا [illegible]

ریاستوں کے جنگی جہا[illegible]

بشرطیکہ ان کا وزن بحر [illegible]

بحری طاقت سے زیادہ نہ بڑھ [illegible]

کی تصدیق نہیں کی تھی۔ اب صلح نامہ [illegible]

(باقی صفحہ [illegible])

بچوں کا ملک

ثریا قمر

(آپ نے بہت سے ملک اور شہر دیکھے اور ان کے حالات پڑھے ہوں گے لیکن ایسا ملک کم دیکھا اور کم پڑھا ہوگا جہاں صرف چھوٹے چھوٹے بچے بستے ہوں۔ ان ہی کا راج ہو اور ملک کا سارا کاروبار وہ خود چلاتے ہوں۔ آئیے آج آپ کو ایسے ملک کی سیر کرائیں)

عجیب و غریب ملک بلگریڈ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک سرسبز وادی کے دامن میں آباد ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں صرف ۸ سال سے ۱۴ سال تک کے بچے رہتے ہیں۔ اور اس کا نام "بچوں کا ملک" ہے۔ اس کی آبادی ۵ ہزار ہے۔ یہاں کے باشندے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوشنما مکانوں میں رہتے ہیں اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ ننھے منے بچے اپنے ملک کے سارے کام خود ہی بڑے انہماک، خوش اسلوبی اور قابلیت سے انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ کے معمولی کاموں کے علاوہ یہ اپنی ریلیں چلاتے ہیں، اپنی پولیس چوکی کا انتظام کرتے ہیں۔ شہر کے نظم و ضبط کو قائم رکھتے ہیں اور ڈاک تار کا بندوبست کرتے ہیں۔

بچوں کے اس ملک کو بلگریڈ سے ملانے کے لئے چھ میل لمبی ایک چھوٹی ریلوے لائن بنائی [illegible] جس پر ایک چھوٹی سی گاڑی چلتی ہے۔ اس گاڑی پر کام کرنے والے بھی یہی [illegible] ان کو ریل کے کام سے اتنی دلچسپی ہے کہ ہر ایک کی دلی خواہش [illegible] انتخاب ہو جائے۔ چنانچہ ان میں اپنی اہلیت ثابت کرنے [illegible]

[illegible] مقصد یہ ہے کہ بلگریڈ کے یہ چھوٹے بچے شہر [illegible] اور باہر کی کھلی فضا اور صاف ستھری [illegible] کا ایک حصہ صاف کر کے سفید لکڑی [illegible] کے نقشے خود بچوں نے اپنی پسند اور مرضی [illegible] سکتا۔ ہر ایک کو اپنی پسند [illegible] کے خیال سے کام کرتے وقت [illegible]

[illegible] کے لئے اپنی مجلس عاملہ، مجلس [illegible] تن دہی، ذمہ داری اور [illegible]

[illegible] جہاں وہ اپنے ناموروں [illegible] کی بڑی بڑی تصویریں [illegible]

[illegible] کے لئے مل جل کر رہنے اور [illegible] تاکہ یہ سب اوصاف ان کے [illegible] حقیقی زندگی میں برت سکیں۔

[illegible] یوگوسلاویہ میں اب خاصے بڑے پیمانے [illegible] لئے اس بچوں کے ملک میں ضرور بھیجا جاتا [illegible] مل جل کر زندگی گذارتا ہے۔ اور اس طرح اس [illegible] کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

[illegible] نہیں دیتے، بلکہ ان کو پورا موقعہ دیتے ہیں [illegible] پسند کے مطابق کریں۔ اس طرح ان میں خود اعتمادی [illegible] صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی [illegible] ہے تو کوئی ڈرائیوری کے، کوئی گارڈ کا کام کرتا ہے تو کوئی [illegible] وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو کسی کو قلمدان نیابت ملتا ہے [illegible] کوئی تھانیدار۔ غرض شہر سے متعلق ہر قسم کے انتظامی، عاملانہ اور [illegible]

انسانی زندگی کا مقصد

جیٹھانند

انسانی زندگی بے مقصد نہیں۔ اگر زندگی بغیر مقصد کے ہوتی تو روئے زمین پر انسان کی زندگی کا کوئی مطلب ہی نہ ہوتا اور اس دنیا میں پیدا ہونا نہ ہونا اس کے لئے ایک سا ہوتا۔ حیوان اور انسان کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ حیوان کے پاس فقط جسم ہے، دماغ نہیں۔ لیکن انسان کو خداوند تعالےٰ نے دونوں چیزیں جسم اور دماغ بخشے ہیں۔ حیوان کی زندگی کا دارومدار محض فطری جبلتوں پر ہے یعنی عقل وہاں بہت تھوڑا کام کرتی ہے۔ لیکن انسان میں عقل ہی سب کچھ ہے۔ یہی عقل اس کے دماغ کا بہترین حصہ ہے، اور اسی کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے۔ بعض اوقات اس کا درجہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں تہذیب کی ساری برکتیں انسان کے دماغ کی اختراع ہیں

یوں دیکھنے میں انسان کی زندگی بھی اسی طرح بسر ہوتی ہے جیسے حیوانوں کی بچپن میں وہ کھیل کود کا شوقین ہوتا ہے۔ جب جوانی آئی تو اس کی خواہشات بھی جوان ہو جاتی ہیں۔ اور وہ گرہست آشرم میں اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ جیسے بھونرا کنول کے پھول پر اتنا مست ہوتا ہے کہ جب تک وہاں سے اٹھنے کا خیال کرتا ہے تو پھول بند ہو جاتا ہے اور بھونرا اس کے بیچ میں رہ جاتا ہے۔ بڑھاپا آتا ہے۔ اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ جوانی کی شوخیاں اور امنگیں مفقود ہو جاتی ہیں، ہاضمہ خراب، حوصلہ پست آخر دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ بس یہ انسان کی زندگی کا نقشہ ہے، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد صرف یہی ہے تو واقعی اس میں اور دوسری مخلوق میں فرق نہیں، لیکن انسان سب سے افضل مانا گیا ہے۔ اس لئے اس کا مقصد بھی اعلیٰ اور افضل ہونا چاہئے۔

ایک مہذب انسان کا فرض ہے کہ وہ ذاتی فائدے کی بجائے جماعتی فائدے کو مطمح نظر بنائے۔ اس لئے اگر ہم اس سوال پر غور کریں۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو اس کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا اعلیٰ اور حقیقی مقصد ہے۔ دنیا میں انہی لوگوں نے کامیاب اور مطمئن زندگیاں بسر کی ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈال کر ابنائے جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا۔ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم خیال کیا جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالمگیر قبولیت حاصل کی اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا۔ وہی ایثار پسند اور اخلاق پیشہ ارباب فکر و نظر تھے جو سارے جہان کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے کسی نے خوب کہا ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

خدا کے بندوں سے محبت کرنا ہی خدا سے محبت کرنا ہے۔ انسان کی فلاح و بہبود ہی ان بزرگوں کا نصب العین تھا جنھوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کی بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے۔ اور اپنی خودی کو عالم انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

سوامی رام تیرتھ صاحب بھی کہتے ہیں:۔ "ایشور کا نظارہ اپنے جذبات میں ہو سکتا ہے اگر انسان اس اصول کو سمجھتا [illegible] اور اس پر عمل کرتا ہے تبھی وہ انسان کہلانے کا حق دار ہے۔ یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔

ص [illegible] کام یہی چھوٹے بچے کرتے ہیں اور اتنی خوبی اور خوش اسلوبی سے کہ کسی ترقی یافتہ شہر کے مقابلے میں برا نہیں ہوتا۔ بلکہ نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

(ترجمہ)

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۲۰ | ۸ نومبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سیّد عابد حسین

محبّت کا قانون

مہاتما گاندھی

(۱۹۳۱ء میں گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان جارہے تھے۔ جہاز میں شام کی پرارتھنا کے بعد وہ مختلف مسئلوں پر گفتگو کرتے تھے اور لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے تھے ایک دن کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے)

"جان بوجھ کر یا بے جانے ہوئے ہم روزمرہ ایک دوسرے کے ساتھ عدم تشدد سے پیش آتے ہیں۔ میں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ زندگی ہلاکت کے درمیان قائم رہتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہلاکت کے قانون سے برتر ایک قانون موجود ہے۔ اسی قانون کے ماتحت منظم معاشرے کا وجود ممکن ہے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکتی ہے، جب قانون حیات یہی ٹھہرا تو ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں بھی اسی کی پابندی کرنا چاہیے۔ جہاں کہیں کوئی نزاع پیش آئے، جب کبھی آپ کا کسی حریف سے مقابلہ پڑ جائے اس پر محبت کے ذریعے فتح حاصل کیجئے۔ میں نے بڑے بھلے طریقے سے اپنی زندگی میں اس قانون پر عمل کیا ہے اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ میری ساری مشکلیں حل ہوگئی ہوں، مگر یہ میں نے ضرور دیکھا کہ محبت کے قانون سے جتنا کام چلتا ہے، ہلاکت کے قانون سے ہرگز نہیں چلتا۔ ہندوستان میں ہم نے اس قانون کی عملی درآمد بہت بڑے پیمانے پر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے میرا یہ دعویٰ نہیں کہ عدم تشدد کا پیام تیس کروڑ آدمیوں تک پہنچ چکا ہے، لیکن یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جتنی دور تک اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ پیام پہنچا ہے اور کوئی آج تک نہیں پہنچا ہم سب مساوی حد تک عدم تشدد کے پابند نہیں رہ سکے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے یہ محض ایک طرز عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر بھی آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ملک نے عدم تشدد کے سایۂ عاطفت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا" عدم تشدد کی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اچھی خاصی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، اسے اپنی روزمرہ کی زندگی کا ضابطہ بنانا پڑتا ہے، خواہ دل چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو۔ اس کی مثال سپاہی کی زندگی کی سی ہے۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ جب تک خود ہمارا دل سچے دل سے ساتھ نہ دے، خالی خولی ظاہری عمل محض دھوکے کی ٹٹی ہے، اس سے انسان خود بھی نقصان اٹھاتا ہے، اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ کمال کا درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دل اور جسم اور زبان میں جیسی چاہیے ویسی ہم آہنگی ہو، لیکن اس میں ہمیشہ سخت ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مجھے یہ نہیں کہ غصہ نہ آتا ہو مگر میں قریب قریب ہمیشہ اپنے جذبات کو ضبط کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر میرے اندر ہمیشہ یہ کشمکش موجود رہتی ہے کہ ہر لحظہ اور ساعت اپنے ارادے سے عدم تشدد کے قانون پر عمل کروں۔ ایسی کشمکش سے انسان کی قوت بڑھتی ہے، عدم تشدد قوی کا حربہ ہے۔ کمزور کے عدم تشدد میں تو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں بناوٹ نہ ہو۔ خوف اور محبت میں تناقض ہے۔ محبت جو دیتی ہے آنکھ بند کرکے دیتی ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ عوض میں کیا ملے گا محبت ایک طرف ساری خدائی کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف خودی سے لڑتی ہے اور آخر میں کل جذبات پر غالب آتی ہے۔ میرا اور میرے ساتھ کام کرنے والوں کا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہر مسئلہ حل ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ہم جی میں ٹھان لیں کہ حق اور عدم تشدد کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانا چاہیے۔ کیونکہ حق اور عدم تشدد میرے نزدیک ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

محبت کا قانون کشش ثقل کے قانون کی طرح اپنا عمل کرتا رہتا ہے خواہ ہم اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں جس طرح ایک سائنس داں قوانین فطرت سے مختلف طریقے سے کام لے کر جادو کے سے کرتب دکھاتا ہے وہ شخص بھی جو قانون محبت سے علمی صحت کے ساتھ کام لے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز کرشمے دکھا سکتا ہے کیونکہ عدم تشدد کی قوت فطرت کی مادی قوتوں سے کہیں زیادہ عجیب اور پر اسرار ہے۔ جن لوگوں نے ہمارے لئے محبت کا قانون دریافت کیا وہ آج کل کے سائنس دانوں سے بڑے سائنس داں تھے۔ البتہ ہماری تحقیق ابھی یہاں تک نہیں پہنچی کہ ہر شخص اس قانون کے عمل کا پورا مشاہدہ کرسکے، اگر اسے وہم کہئے تو میں تو اسی وہم میں مبتلا ہوں۔ جتنا میں اس قانون پر عمل کرتا ہوں، اتنی ہی مجھے اپنی زندگی اور کائنات کی ترتیب خوشنما اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مجھے وہ سکونِ قلب اور اسرار فطرت کا وہ عرفان حاصل ہوتا ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
محبت کا قانون	مہاتما گاندھی	۱
کشمیر کا خط	سیلانی	۲
علی گڑھ (۲)	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴
۲۔ پاکستان		۵
مشرقی دنیا	ا، س	۶
منزل شوق (نظم)	عبادت بریلوی	۷
اقبال کی پینک	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
اہنسا اور مہاتما گاندھی	اثر لکھنوی	۹
محبت اور نفرت	باقر رضوی	۹
ترکی	قاسم الحسنی	۱۰

کشمیر کا خط
نیا کشمیر (۴)
"سیلانی"

سری نگر

میں نے پچھلے خطوں میں بار بار "عوامی حکومت" اور "نیا کشمیر" کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں یہاں عوام و خواص سب کی زبان پر ہیں، خواص کا لب و لہجہ ذرا طنزیہ ہوتا ہے اور عوام کا فخریہ۔

"عوامی حکومت" کا مطلب بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہاں بھی جنتا راج: عوامی حکومت کا دور دورہ ہے، البتہ "نیا کشمیر" کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس خط میں کروں گا۔ اس لئے کہ کشمیر کی عوامی حکومت کا یہی معاشی اور سیاسی پروگرام ہے۔ جس کی کامیابی یا ناکامی پر شیخ عبد اللہ کی ترقی پسند عوامی حکومت کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہے۔

شیخ صاحب اور ان کے رفقائے کار نے ایک ایسے زمانے میں عوامی حکومت کشمیر میں قائم کی جب مہاراجا کی حکومت کا بوسیدہ نظام جبر و استبداد کی انتہا کو پہنچ کر لوٹ رہا تھا، پورے کشمیر پر چاروں طرف سے پاکستانی قبائل کا خون ریز اور تباہ کن حملہ ہو چکا تھا اور بلا تفریق مذہب و ملت ہر کشمیری کی جان و مال، عزت اور آبرو خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اس نازک زمانے میں خونخوار سرحدی قبائل کا مقابلہ شیخ صاحب کی قیادت میں نہتے اور کمزور کشمیریوں نے اس بہادری اور ہمت سے کیا کہ اس کی داد خود ان کے دشمنوں سے لینی چاہئے جنھیں کشمیر کو تاراج کرنے میں بالآخر ناکامی ہوئی۔

لیکن سرحدی قبائل کے ابتدائی حملے کی ناکامی کے بعد کشمیر کا مقابلہ "دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت" سے شروع ہوا، اور وہ ہنوز جاری ہے۔ اس جنگ کے زمانے میں ظاہر ہے کہ حکومت کشمیر کا اصلی کام اس جنگ کو جیتنا ہے۔ کشمیر کے خاص حالات میں اس جنگ کے خود بخود دو محاذ بن گئے ہیں۔ ایک "فوجی محاذ" ہے اور دوسرا "سیاسی محاذ"۔ کشمیر کی یہ خوش قسمتی ہے کہ شیخ عبد اللہ کی قیادت کی بدولت حکومت ہند نے کشمیر کا الحاق منظور کر لیا اور کشمیر کا ساتھ دیا۔ چنانچہ کشمیر کا فوجی مورچہ اب حکومت ہند کا فوجی مورچہ بلکہ پورے ہندوستان کا قومی فوجی مورچہ بن گیا ہے۔

کشمیر کی یہ جنگ "مگر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت" سے ہے، جو کشمیر کے قومی اتحاد اور یکجہتی کو توڑنا چاہتی ہے، اور کشمیر کو بھی جو اس وقت سارے ہندوستان کے لئے ایک ترقی پسند عوامی حکومت اور متحدہ قومیت کا نمونہ بن گیا ہے فرقہ پرستی کے نام پر رجعت پسند پاکستانی ریاست میں زبردستی شریک کرنے کے لئے آمادہ "جہاد" ہے۔

کشمیر کے لئے مگر فخر و مباہات کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی اور جہالت کے دور میں جب حکومت برطانیہ کی فرقہ وارانہ سیاست اور اس کی فرقہ نوازیوں کی بدولت پورا ہندوستان فرقہ پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گیا تو صرف کشمیر ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں مہاراجا اور اس کے فرقہ پرست برہمنوں کے باوجود اور مسلم لیگ اور اس کی فرقہ پرست مسلم کانفرنس کی انتہائی مفسدانہ کوششوں کے باوجود شیخ عبد اللہ کی نیشنل کانفرنس اور اس کا متحدہ قومی محاذ قائم رہا اور قوم پرستی کے مقابلے میں فرقہ پرستی کو شکست ہوئی۔

شیخ عبد اللہ کی قیادت کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی فرقہ وارانہ سیاست کے تاریک ترین دور میں کشمیر کے متحد مسلم عوام کا متحدہ قومی اور سیاسی محاذ قائم رکھا، اور ان کے حقیقی اور مشترکہ سیاسی اور معاشی مسائل کو عوام کے سامنے رکھ کر ان کی سیاسی رائے عامہ کی تربیت کی، اور انھیں فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے دھوکے اور فریب سے بچا لیا۔

چنانچہ عوامی حکومت کے قیام کے بعد عوامی حکومت نے عوام ہی کی فلاح و بہبود کی طرف سب سے پہلے توجہ کی۔ اور اپنا "نیا کشمیر" کا پروگرام پیش کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا:۔

۱۔ زمینداری کا خاتمہ کیا جائے۔

۲۔ زمین پر کاشتکار کا حق ملکیت تسلیم کیا جائے۔

۳۔ صنعت اور زراعت میں امداد باہمی کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔

۴۔ پوری مملکت میں اوپر سے لے کر نیچے تک پنچایتی راج قائم کیا جائے۔

لیجئے وہی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی عوامی حکومت!! اور پھر جنگ کا زمانہ! قبائلیوں کا حملہ! پاکستانیوں کا "جہاد"! اور عوامی حکومت کا یہ انقلابی اور اشتراکی پروگرام! ان طفلانہ تجویزوں کی خوب ہنسی اڑائی گئی۔ لیکن مذاق اڑانے والے ابھی تک جی بھر کے ہنسنے نہ پائے تھے کہ حکومت نے آرڈیننس اور کونسل آرڈرز، فرامین اور اعلانات کے ذریعے مجوزہ اصلاحات کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۴۸ء سے شروع کر دیا۔

سب سے پہلے "جاگیرداری" کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ اور ساری معافیاں بحق سرکار منسوخ کر دی گئیں۔ ان معافیوں پر سب سے بڑی جاگیر چنینی کی تھی۔ اس کا رقبہ کوئی ۹۵ مربع میل اور آبادی بارہ ہزار تھی، اور جبر، ظلم، استبداد میں غالباً بدنام سے بدنام ریاستوں میں بھی یہ جاگیر اپنی آپ مثال سمجھی جاتی تھی۔

یہ اور اسی طرح کی اور بے شمار چھوٹی بڑی جاگیروں کے خاتمے سے عوامی حکومت کے خزانے میں تقریباً ۶ لاکھ کی آمدنی کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن اصل فائدہ تو یہ ہوا کہ غریب کاشتکاروں کی گردن سے جاگیرداری کی غلامی کا طوق اتر گیا۔

جاگیرداری کے خاتمے کے بعد عوامی حکومت نے مقرریوں کو ختم کیا، یہ ایک قسم کی نقد جاگیریں تھیں جو کسی خدمت کے صلے میں یا کسی سابقہ جاگیر کے بالعوض عطا کی گئی تھیں، بالعموم یہ مقرریاں "سیاسی" خدمات اور سیاسی مصالح کے پیش نظر عطا کی جاتی تھیں۔ ان مقرریوں میں ایک جرمی ناانصافی کا طریقہ یہ رائج ہو گیا تھا کہ جاگیردار اگر چاہے تو وہ نقد رقم کی بجائے ایک مقررہ شرح یعنی ۱۲ روپے فی من کے حساب سے غلہ یا جنس کا مطالبہ اپنے کاشتکاروں سے کر سکتا تھا، خواہ بازار میں جنس کا نرخ دس روپے فی من ہو۔ ظاہر ہے کہ [illegible] جب غلہ کا نرخ بہت زیادہ چڑھ گیا تو جاگیردار بجائے نقد کے جنس وصول کرتا تھا، اور اس سے جو نقصان کسان کو ہوتا تھا وہ اس مثال سے بآسانی سمجھ میں آ جائے گا کہ ایک جاگیردار کی مقرری، ایک ہزار روپے تھی تو وہ اپنے کاشتکار سے اس کے بالعوض بشرح ۱۲ روپے فی من گیارہ سو من غلہ کا مطالبہ کر سکتا تھا، اور بازار میں اس کی قیمت بازار کے نرخ سے گیارہ ہزار روپے مل جاتی تھی۔

عوامی حکومت نے ان مقرریوں کو ختم کر دیا اس کے علاوہ اس فائدہ کے جو کسانوں اور کاشتکاروں کو اس سے ہوا، حکومت کو بھی تقریباً دو لاکھ کی بچت ہوئی۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی کسانوں اور غریبوں، مزدوروں اور کاریگروں کے سر پر مہاجنی قرضے کا ناقابل برداشت بوجھ لدا ہوا ہے، اور کسی مستقل انتظام سے پہلے فوری طور پر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مقروض طبقے کو تھوڑی سی مہلت مل جائے کہ وہ پیش نظر اصلاحات سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے اندر اتنی سکت پیدا کر لے کہ آئندہ قرضوں کی ادائیگی کے لئے اگر کوئی منصفانہ قوانین بنائے جائیں تو یہ غریب طبقہ ان کی تعمیل بھی کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس لئے حکومت نے ایک خاص حکم کے ذریعے کاشتکاروں اور کسانوں، جلاہوں اور پارچہ بافوں، نانبائیوں اور دستکاروں اور مزدوروں کے خلاف مقدمات قرض کی جملہ کارروائیوں کو ایک سال کے لئے روک دیا ہے۔

اس طرح کاشتکاروں کے خلاف بیدخلی کے مقدمات کی کارروائیاں بھی روک دی گئی ہیں۔

عوامی حکومت نے "مزید غلہ پیدا کرو" کی تحریک کے سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ وہ تمام سرکاری اراضیات جو غیر مزروعہ اور بیکار پڑی ہوئی ہیں وہ سب بٹائی پر ان مزدور کسانوں کو دی جائیں جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے یا ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو دی جائیں جن کی کاشتکاری قلت زمین کی وجہ سے نفع بخش نہیں ہے۔ امید ہے کہ کچھ عرصے میں اس طریقے سے چھ سات لاکھ کنال زمین زیر کاشت آ جائے گی، اور اس کی پیداوار میں بھی کم از کم بارہ لاکھ خروار کا اضافہ ہو جائے گا۔

کشمیر کی عوامی حکومت کا بنیادی اصول پنچایتی راج ہے لیکن اس جنگ کے زمانے میں عام انتخابات کے ذریعے نمائندہ حکومت کی تشکیل کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ر نومبر سنہ ۴۸ء

علی گڈھ

(۲)

کیا ہے ــــ اور ــــ کیا ہو سکتا ہے

پچھلے تین سال میں جس بے دردی سے ارباب سیاست نے مسلم یونیورسٹی کو اپنی اغراض کا آلۂ کار بنایا اس کی مثال فسطائی جرمنی اور اٹلی میں بھی مشکل سے ملے گی۔ بہت سے پرجوش اور پرخلوص نوجوانوں میں مجنونانہ سیاسی ہیجان پیدا کر کے انسانیت اور شرافت کے جذبات معطل کر دیئے گئے۔ نظم و ضبط کی حالت اس قدر ابتر ہوگئی کہ استادوں کا کیا ذکر ہے۔ وائس چانسلر تک شورہ پشت طلباء اور مسلم لیگ کے پرچہ نویسوں سے جو یونیورسٹی کے اندر موجود تھے لرزتے تھے۔

مگر قانون قدرت ہے کہ بحران کی حالت زیادہ دن تک باقی نہیں رہتی۔ تقسیم ہند کے بعد ہی یہ دماغی بخار اتر گیا اور ردعمل کی کیفیت شروع ہوگئی۔ پاکستان کے نقیب جنھوں نے یہ سودا محض ثواب کے لئے نہیں بلکہ نفع کے لئے کیا تھا پاکستان چلے گئے۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ وہاں ان کو یہاں سے زیادہ قیمت ملے گی۔ مگر وہ سیدھے سادے مخلص لوگ جو بے سوچے سمجھے جذبات کے سیلاب میں بہہ گئے تھے حیرت اور مایوسی کے گرداب میں چکر کھانے لگے۔

اب مسلم یونیورسٹی کی حالت یہ ہے جیسے شدید بخار اترنے کے بعد جسم پر نقاہت طاری ہو جاتی ہے، ہاتھ پاؤں سنسنانے لگتے ہیں، آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، سر چکرانے لگتا ہے۔ اس کے اندر عالی شان عمارتیں ہیں، ساز و سامان ہے، قابل استاد ہیں، ہونہار طلبہ ہیں، مگر اس کے باوجود ایک ایسا خلا ایک ایسا سناٹا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ بھی نہ ہو جیسے کوئی بھی نہ ہو۔ افسردگی، یاس، خوف، بے دلی، بیزاری، جن میں سے ایک ایک چیز جسم اور روح کے لئے مہلک ہے چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی مقصد نہیں رہا جو اپنی طرف کھینچے، کوئی امید نہیں رہی جو سہارا دے کر آگے بڑھائے۔

حالانکہ مقصد بھی ہے اور امید بھی۔ مقصد وہی ہے جس کے لئے سرسید نے اب سے ۷۰ سال پہلے ایم۔ اے۔ او کالج قائم کیا تھا، یعنی عہد وسطیٰ کی ذہنی تاریکی سے نکل کر عہد جدید کی روشنی میں آنا، زندگی کے جمود کو توڑ کر ترقی کی راہ میں قدم بڑھانا، علمی نظر، جمہوری روح، شخصی اور جماعتی زندگی کی تنظیم و ترتیب، غرض وہ صفات جن کی بدولت مغربی قوموں کو پچھلے چار سو سال میں اس قدر فروغ ہوا تھا، ہندوستانی قوم میں پیدا کرنا۔ اس کے علاوہ اور مقصد بھی ہیں جو سرسید کے وقت تک واضح طور پر دنیا کے سامنے نہیں آئے تھے یعنی معاشی اور سماجی ظلم کو مٹا کر انصاف کا نقشہ جمانا۔ قومیت کی تنگ دیواروں کو توڑ کر بین الاقوامی اتحاد کی بنیاد رکھنا۔ جب تک یہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے موجود ہیں کوئی اعلیٰ تعلیم کا ادارہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔

اب رہی امید۔ بے شک پرانے مقاصد کے ساتھ جو علی گڈھ پر جاگیرداری ذہنیت نے مسلط کر دیئے تھے۔ پرانی امیدیں ختم ہو گئیں۔ یہ امید نہیں رہی کہ علی گڈھ مسلم فرقہ پرستی کا گڈھ بن سکے گا۔ یہ امید نہیں رہی کہ وہ سیاسی رجعت پسندی کے ذریعے سے بیرونی حکومت کا تقرب، اور تہذیبی رجعت پسندی کے ذریعے سے تاریک خیال طبقے میں ہر دل عزیزی حاصل کر سکے گا۔ مگر نئے مقاصد، نئی امیدیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ امید باقی ہے کہ علی گڈھ مسلم ترقی پسندی کا مرکز بن جائے گا۔ یہ امید باقی ہے کہ مسلم یونیورسٹی علم کی، جدت خیال کی، جمہوریت کی، معاشی اور سماجی انصاف کی، بین الاقوامیت کی راہ میں ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے دوش بدوش چل سکے گی بلکہ شاید اُن سے دو قدم آگے رہے گی۔

یہ امیدیں ہم کو اسی بنا پر ہیں جس بنا پر اوروں کو علی گڈھ کی طرف سے مایوسی ہے ــــ کہ یہ مسلمانوں کا ادارہ ہے۔ اوروں کی مایوسی کہتی ہے کہ مسلمان اب ہندوستان میں پنپ نہیں سکتے اور پنپنے نہیں دیئے جائیں گے۔ ان کی طرف سے اکثریت کے دل میں جو غبار ہے وہ کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ ان کو نفرت کی، شک اور شبہے کی، خوف کی فضا میں دبی ہوئی اور سہمی ہوئی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ علی گڈھ مسلمانوں کے نمایندہ تعلیمی ادارے کی حیثیت سے خاص طور پر دشمنی اور تعصب کا نشانہ بنا رہے گا۔

مگر ہمارا خیال ہے کہ اب جا کر ہندوستان میں مسلمانوں کے پنپنے کے دن آئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے خود فریبی کے پردے ہٹ گئے ہیں اور ان کی زندگی کی حقیقتیں زیادہ صاف نظر آنے لگی ہیں۔ ان کے سامنے انگریزوں کے اور "اسلامی ملکوں" کے جھوٹے سہاروں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اب انھیں خدا کی ذات پر اور اپنے آپ پر بھروسا کرنا ہے۔ اگر طوفان حوادث کے مکتب میں انھوں نے لطمۂ موج کو سیلی استاد سمجھ کر وہی سبق لیا جو لینا چاہئے تو وہ اب کبھی شخصی خاندانی یا طبقہ داری فائدے کے لئے استبداد اور رجعت کی قوتوں کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ ہمیشہ انصاف اور ترقی کی قوتوں کا۔ وہ ایک بار پھر دنیا کو یاد دلا دیں گے کہ ایک زمانے میں وہ علمی نظر اور جمہوری روح، معاشی اور سماجی انصاف کے علم بردار سمجھے جاتے تھے۔ اگر ہمارا یہ خواب صحیح نکلا تو ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم وطنوں میں تعصب، نفرت اور حقارت کی جگہ، محبت، قدر و عزت، کی نظر سے دیکھے جائیں گے اور علی گڈھ مسلمانوں کے مرکزی تعلیمی ادارے کی حیثیت سے خاص طور پر مقبول اور محبوب ہوگا۔

بزم بے تکلف

(۴)

"ہاں، مولانا، وہ اس دن آپ نے لیڈر کی قسمیں بتانی شروع کیں اور بیچ میں کڑک ہو گئے آخر بات کیا تھی؟"

"آپ کے سوال کے ساتھ ہی جواب بھی صادر ہو جاتا تھا، اس لئے میں نے کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا۔"

"واللہ یہ صادر کی خوب کہی، اتنی عربی سمجھ لیتا ہوں مگر یہ تحصیل حاصل کس ضلعے میں واقع ہے؟"

"جی تحصیل حاصل یہ ہے، جیسے کوئی احمق کو حماقت کی ترغیب دے۔"

"یعنی آئینہ کو آئینہ بتلائے۔ دیکھئے مولانا اب آپ بڑھ چلے، پھر شکایت نہ کیجئے گا۔"

"جی میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ہر نوع کے لیڈروں کے افعال و خواص سے اچھی طرح واقف ہیں تو پھر مجھ سے ان کی اقسام کیا پوچھتے ہیں۔ آپ کو مسمّیٰ سے مطلب ہے یا اسم سے؟"

"جی مجھے تو اسم مسمّیٰ، مسماۃ سبھی سے مطلب ہے اپنی اپنی جگہ سبھی کام دیتے ہیں، دیکھئے مولانا بات یہ ہے کہ جب کوئی چیز کھانا نہ ہو، چیز کا جوہر اچھی طرح کھلتا نہیں۔ آپ سچا، اصلی، حقیقی لیڈر کہئے۔ مگر وہ بات کہاں جو ٹکسالی میں ہے۔ اسی طرح لیڈروں کی جو قسمیں ٹکسال باہر ہیں، ان کے لئے بھی ایسے ہی چھپتے ہوئے نام بتا دیجئے آپ کو دعا دیں گے کہ خدا بھوک اور ہاضمے میں ترقی دے۔"

"یہ تو اس معاشی ضیق کے زمانے میں بد دعا ہوئی۔ خیر تو ہم الفاظ کے قیاس پر لیڈروں کی اقسام متعین کر رہے تھے غیر مستند الفاظ میں پہلی قسم متروک لفظوں کی ہے۔"

"واہ واہ متروک بھی خوب ہے۔ اترا شخص، مردک، نام جھپٹی ہوئی پھلجڑی، طلاقی جورو، پرانا ٹائم ٹیبل، پچھلے سال کی جنتری، ان سب فقروں کا نچوڑ ایک متروک کے لفظ میں آگیا، آپ کو تو کبھی کاہے کو سابقہ پڑا ہوگا، ہم جیسے گناہ گاروں پر، جو اپنے گھر کھانا کھلاتے ہیں متروک لیڈر اکثر نزلے کی طرح گرتے ہیں۔"

"یعنی آپ نے ان کو ترک کر دیا، وہ آپ کو ترک کرنا نہیں چاہتے۔"

"جی ہاں مولانا کیا بتاؤں کمل نہیں چھوڑتا۔ صرف مہمان داری کی بات ہو تو بھی غنیمت ہے۔ کسی طرح چوری کر کے ڈبلے کا پیٹ پورا کیا جائے مشکل تو یہ ہے کہ دربارداری اور تیمارداری بھی کرنی پڑتی ہے۔"

"دربارداری تو خیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے بغیر لیڈر کے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

پچھلا ہفتہ :— ا۔ ہندوستان

افواہ بے بنیاد ہے

مسٹر ا وِلبھ بھائی پٹیل جن کی ۷۴ ویں سالگرہ ۳۱ اکتوبر کو سارے ملک میں بڑے زور و شور سے منائی گئی بمبئی میں حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق فوجی گورنر میجر جنرل چودھری اور دوسرے ذمہ دار افسروں سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بارے میں اخباروں میں یہ افواہیں آ رہی ہیں کہ حکومت ہند اعلیٰ حضرت نظام کو معزول کرکے شہزادہ برار کو ان کا جانشین بنانے کے مسئلے پر غور کر رہی ہے۔ لیکن شری وی۔ پی مینن نے جو ریاستوں کے معاملات میں حکومت ہند کے مشیر ہیں اس کی قطعی تردید کر دی ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس قسم کی کوئی تجویز حکومت کے پیش نظر نہیں ہے۔ حکومت کے باضابطہ اعلان سے کانفرنس کے فیصلوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ فوجی انتظام ابھی کچھ عرصے تک اور قائم رکھا جائے گا، اور اس عرصے میں رائے دہندوں کی فہرستیں تیار کرکے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے ابتدائی مرحلے طے کئے جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انڈین یونین اور حیدرآباد کے آئندہ تعلقات کے بارے میں آخری اور قطعی سمجھوتہ عوام کی نمائندہ آئین ساز اسمبلی سے کیا جائے گا۔ ادھر حیدرآباد میں اسٹیٹ کانگریس کے اندرونی جھگڑوں کو ختم کرکے اسے ایک مضبوط اور منظم پارٹی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بلدے اور اضلاع میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں اسٹیٹ کانگریس کے ممبر بن رہے ہیں۔ اب قریب قریب ساری ریاست میں کامل امن و سکون کی فضا پیدا ہو گئی ہے اور لوگ عام طور پر فوجی حکومت کے رویے سے مطمئن ہیں۔ اس بات کو لندن ٹائمز تک مانتا ہے جو حیدرآباد کے معاملے میں حکومت ہند پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتا رہا ہے۔ اس نے اپنے یکم نومبر کے اڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ حیدرآباد کی فوجی حکومت بڑی "سمجھداری" سے کام لے رہی ہے۔ ریاست کے مسلمان اور ہندو ملازم اپنے اپنے کام پر واپس آ گئے ہیں اور نئی حکومت کے ساتھ پورا اتحاد عمل کر رہے ہیں۔ مسلمان یہ سمجھ گئے ہیں کہ انھیں ملک کے انتظام میں ہندوؤں کو شریک کرنا ہے اور ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی ہے کہ حکومت ہند حیدرآباد میں نہ کسی فرقے سے انتقام لینا چاہتی ہے اور نہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دینا چاہتی ہے بلکہ اسے صحیح معنی میں غیر مذہبی جمہوری نظام قائم کرنا مقصود ہے۔ آہستہ آہستہ فوجی انتظام کی جگہ سول انتظام لے رہا ہے اور جنوب مشرقی گوشے کے سوا جہاں کمیونسٹ اب تک شورش برپا کر رہے ہیں سب کہیں حالات سکون پر آ گئے ہیں۔

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی غالباً اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے دور ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی لیکن پاکستان میں ہند کے ہائی کمشنر شری پرکاش صاحب اور ڈپٹی ہائی کمشنر سردار سمپورن سنگھ صاحب جن سے زیادہ دونوں ملکوں کے حالات کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا یہ کہتے ہیں کہ ان کے باہمی اختلافات کا دور ہونا کچھ ایسا زیادہ دشوار نہیں۔ شری پرکاش صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں حکومتیں اپنے اپنے ملک کی اقلیتوں کو مطمئن کرنے کی سچے دل سے کوشش کر رہی ہیں اگر عوام بھی ان کا ساتھ دیں تو یہ کوشش پوری طرح کامیاب ہو سکتی ہے۔ مشرقی بنگال میں بھی حکومت نے حال میں تمام سرکاری افسروں کو تاکید کی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور ان کی پریشانی اور خوف کو دور کیا جائے۔ سردار سمپورن سنگھ صاحب نے بھی جو ڈپٹی ہائی کمشنر کی حیثیت سے اپنی ایک سال کی مدت پوری کرنے کے بعد لاہور سے رخصت ہو رہے ہیں یہ امید ظاہر کی کہ جوں جوں ہندوستان اور پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ حل ہوتا جائے گا غم و غصے کی وہ فضا جس میں مصلحت اور دوستی کا جذبہ پنپنے نہیں پاتا چھٹتی جائے گی لیکن ان کے نزدیک دونوں ریاستوں میں کشیدگی کی ذمہ داری سب سے زیادہ کشمیر کے مسئلے پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر دونوں حکومتیں چاہیں تو یہ مسئلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس میں "دونوں چاہیں" کی شرط بڑی بے ڈھب ہے۔ اگر پاکستان کی حکومت نے یو۔ این۔ او کمیشن کی تجویز مان لی ہوتی تو یہ تجویز پوری ہو جاتی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، صلح کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

گاندھی کا پیام نہرو کی زبان سے

پیرس کی خبروں سے معلوم ہوا تھا کہ یو۔ این۔ او اسمبلی کے صدر ڈاکٹر ایوٹ کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اسمبلی کے جلسے میں پنڈت نہرو کی مجوزہ تقریر کا انتظام نہیں ہو سکے گا، اور پنڈت جی ۲ نومبر کو قاہرہ روانہ ہو جائیں گے۔ اس سے اسمبلی کے ممبروں کو سخت مایوسی ہوئی اور انھوں نے بہت اصرار کیا کہ پنڈت جی چند روز ٹھہر جائیں اور صدر کی واپسی کے بعد کسی مناسب موقع پر اسمبلی کو اپنے خیالات سے مستفید کریں مگر موصوف نے اپنی ضروری مصروفیات کی وجہ سے اس کو منظور نہیں کیا۔ یکم نومبر کو ڈاکٹر ایوٹ کے پیرس واپس آنے کے بعد یہ اتفاق ضرور شروع ہوا ادھر اتفاق سے وہ امریکی جہاز جس پر پنڈت جی قاہرہ روانہ ہونے والے تھے موسم کی خرابی کی وجہ سے نہیں آیا چنانچہ پنڈت نہرو ایک دن اور ٹھہر گئے۔ میکسیکو کے اس رزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد جس میں دنیا کی سب قوموں سے باہمی اختلافات کو سمجھوتے کے ذریعے طے کرنے کی اپیل کی گئی ہے ہندوستان کے وزیر اعظم نے دنیا کی پارلیمنٹ سے خطاب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ کے انتخاب صدارت کا نتیجہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ رہا تھا جس کا ہر شخص کو انتہائی اشتیاق تھا لیکن سب لوگوں نے نہایت گہری توجہ اور دلچسپی سے اول سے آخر تک پوری تقریر سنی اور اس سے بہت متاثر ہوئے پنڈت جی نے آزاد ہندوستان کی طرف سے یہ اعلان کرنے کے بعد کہ وہ ایشیا کے ایک ایک ملک کو بیرونی حکومت سے آزاد کرا کے اور نسلی تعصب کا خاتمہ کرکے رہے گا۔ گاندھی جی کے فلسفے کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کیا "میں ایک ایسے ملک سے آ رہا ہوں جس نے ایک طویل جد و جہد کے بعد، اگرچہ وہ جد و جہد پر امن تھی اپنی آزادی حاصل کی۔ اس سارے عرصے میں ہمارے جلیل القدر رہنما کی تلقین یہ تھی کہ ہم صرف اپنے مقاصد ہی کو نہیں بلکہ ان ذریعوں کو بھی پیش نظر رکھیں جن سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ صرف مقصد کا اچھا ہونا کافی نہیں۔ یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے ذریعے اچھے ہوں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اچھے سے اچھا مقصد بھی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتا کہ ہماری آنکھوں میں خون اترا ہوا ہو اور ہمارے دلوں پر غم و غصے کے بادل چھائے ہوئے ہوں ...... ہم نفرت اور تشدد کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور خواہ کتنی ہی قابلیت اور ذہانت سے بحث کرتے رہیں اس چکر سے نہیں نکل سکتے جب تک کہ ہم دوسرے ذریعے نہ اختیار کریں۔ اگر یہ چکر چلتا رہا تو صرف یہی نہیں کہ دنیا [illegible] تباہی پھیلے گی بلکہ کوئی ایک ملک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا ...... یہ ضرور ہے کہ ہمیں ہر قسم کے جارحانہ اقدام کی مزاحمت کرنی چاہیئے اگر جارحانہ حملے کا اندیشہ ہو تو ہمیں مدافعت کرنی ہی ہے لیکن ایسا کرتے وقت ہمارا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہونا چاہیئے۔

بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۴)

حب جاہ کو تسکین نہیں ہوتی مگر تیمارداری کیسی؟ کیا ہر متروک لیڈر کا مریض ہونا لازمی ہے؟"

"لازمی تو میں جانتا نہیں مگر ہوتا یہی ہے متروک لیڈر مریض بھی ہوتا ہے اور مجروح بھی۔" اس کے قلب میں حسد کا مرض ہوتا ہے خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ کبھی کم نہیں ہوتا بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس کے سینے میں حسرت کے ناسور ہوتے ہیں جو کبھی بھرنے میں نہیں آتے۔"

"تو پھر ایسے مریض اور جریح کی تیمارداری کرنا بڑا ثواب ہے۔"

"ثواب نہیں مولانا سخت عذاب ہے تیمارداری تو اس کی ثواب ہے جو بیماری کی دوا چاہتا ہو جسے زخم کے مرہم کی تلاش ہو۔ جس شخص کو اپنے ناسور کی نمائش کرنے میں لطف آتا ہو، جو دوسروں کے چرکے لگا کے خوش ہوتا ہو، جسے زہر اگلنے سے تسکین ہوتی ہو۔ اس کی تیمارداری روح کو بیمار کر دیتی ہے۔"

"آپ اور یہ سنجیدہ گفتگو بڑے تعجب کا مقام ہے۔"

"معاف کیجئے، میں بھول گیا تھا کہ آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

۲۔ پاکستان

(کسی ملک کی رائے عامہ کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے وہاں کے اخبارات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس بار ہم "نئی روشنی" میں پاکستان کے اخبارات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ انتخاب میں ہم اس بات کو پیش نظر رکھیں گے کہ ناظرین کو پاکستان کی صحیح کیفیت اور وہاں کے ترقی پسند عناصر کی رائے کا اندازہ ہو سکے۔)

برطانیہ اور پاکستان

معاصر محترم "ڈان" کا خیال ہے اور یہ خیال ہمارے نزدیک دور از قیاس بھی نہیں کہ پنڈت نہرو کی آج کل لندن میں جو آؤ بھگت ہو رہی ہے، اور موصوف کی تعریف میں برطانوی سیاست داں جس طرح سے رطب اللسان ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان کو نظرانداز کر کے ہندوستان سے معاملہ کرنے کا سوچ رہے ہیں، نیز گذشتہ ایک سال میں ہندوستان نے پاکستان پر جو پے در پے زیادتیاں کی ہیں، برطانوی حکومت کو اس کا مطلق احساس نہیں اور وہ حسب عادت اس فریق سے سمجھوتہ کرنے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے، جو مضبوط ہے، اور جس کی ناراضگی سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

"ڈان" نے برطانیہ کی اس روایتی طوطا چشمی کا ذکر کرتے ہوئے اسے خوب سنائی ہیں اور آخر میں اہل پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اب تک ہم برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو ضرورت سے زیادہ "قدرتی" بتلاتے رہے۔ ہم نے ضرورت سے زیادہ بے خیالی سے برطانیہ کی دوستی یا اس کی غیر جانب داری کے دعاوی پر اعتماد کیا۔ ہم بڑی خوش فہمی سے اب تک یہ سمجھتے رہے کہ برطانیہ سے تعلقات رکھنا مفید رہے گا لیکن اب ضرورت ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو بدلیں، اور خود اپنی آنکھوں سے اردگرد کی دنیا کا جائزہ لیں اور اس سے اپنے حلیف ڈھونڈھیں" اس سلسلے میں "ڈان" کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو اپنے ہم سایہ روس سے تعلقات قائم کرنا چاہئیں اور اسے برطانیہ کی عینک سے نہیں، بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے دماغ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

"ڈان" کی اس رائے سے پاکستان کے بیشتر اخبارات نے اتفاق کیا ہے، اور گذشتہ ایک سال سے برطانیہ کا پاکستان کے ساتھ جو رویہ رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے سب نے برطانیہ دوستی کے مسلک کو ختم کرنے کی رائے دی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں محض جذباتی طور پر غم و غصے کا اظہار کافی نہیں، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے تو ہم اپنے قریبی ہم سائے سے باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم کریں، اور پھر ترکستان کی اشتراکی ریاستوں سے جن کی آبادی تمام کی تمام مسلمان ہے ہمارے تمدنی اور ثقافتی تعلقات ہوں، اور ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ گذشتہ پچاس سال سے ہم جو برطانوی اثرات میں گھرے ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمارے ہاں کے بعض لوگوں کی ذہنیت جس طرح بگاڑ دی ہے اس کا توڑ ہو سکے گا۔ اور ہم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنے اور اپنے مفاد کے لئے دوست اور حلیف چننے کے قابل ہو جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مشرقی ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں ہندوستان سے کہیں زیادہ ہمیں آسانیاں میسر ہیں۔ لیکن ضرورت صرف نقطۂ نظر کے بدلنے کی ہے۔ خدا کرے "ڈان" کی تنبیہہ اس معاملے میں کارآمد ثابت ہو اور پاکستان اپنی آزاد خارجی پالیسی بنانے کی طرف توجہ کرے۔

آفاق ہفت روزہ، لاہور
(مورخہ ۲۴ اکتوبر)

وزیر اعظم سرحد کا غیر دانشمندانہ رویہ

پیر صاحب مانکی شریف کے خلاف وزیر اعظم سرحد خان عبدالقیوم خان نے جو الزامات لگائے ہیں، ان کے جواب میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ:۔

"مدت سے سننے میں آ رہا تھا کہ صوبہ سرحد میں پاکستان اور مسلم لیگ کے حامیوں کے درمیان پارٹی بندی زوروں پر ہے لیکن اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ دھڑے بندی کا یہ طاعون اتنی خطرناک صورت اختیار کرے گا جو وزیر اعظم سرحد کے حالیہ بیان کے بعد سامنے آیا ہے۔ پیر صاحب مانکی شریف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ قابل نفرت ہیں۔ ایک ذمہ دار آدمی سے ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان کی اُمید نہ تھی۔ انتخاب اور استصواب رائے کے زمانے میں پیر مانکی شریف کی مساعی اور ان کی ان تھک کوششوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس شخص نے سُرخ پوشوں کو شکست دے کر سرحد میں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا اور جس کی بدولت آج خود مسٹر عبدالقیوم وزارت عظمیٰ کی کرسی پر متمکن ہیں۔ آج اس کے خلاف الزامات لگائے جا رہے ہیں کہ وہ سُرخ پوشوں سے سفارش کر کے حکومت کا تختہ الٹنے کی فکر میں ہیں۔

پیر صاحب مانکی کا خلوص اور امانت و دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہے اگر وہ اقتدار کے خواہش مند ہوتے تو وزیر وزارت کی پیش کش کو نہ ٹھکراتے۔ وہ ایک مقدس نصب العین سے کر لیگ میں شریک ہوئے ہیں، اور وہی مطمح نظر آج بھی ان کی ساری جد و جہد کا محور ہے تماشہ یہ ہے کہ جس وقت خان عبدالقیوم پیر مانکی شریف پر سُرخ پوشوں کے ساتھ سازش کرنے کا الزام عائد کر رہے ہیں، عین اسی وقت پیر صاحب مانکی شریف سرخ پوشوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بلا شرط مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔

وقت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ دوست بنایا جائے۔ نہ یہ کہ اپنے دوستوں کو کاٹ کر دشمنوں کی صفوں میں اضافہ کیا جائے میں مانتا ہوں کہ حکومت کے لئے احتیاطاً تحفظ بھی بے حد ضروری ہے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ پارٹی کے مفاد کے سامنے مصالح عامہ کو بھلا دیا جائے یا لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اگر کانگریس اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھال سکتا ہے تو کسی سرخ پوش شخص یا جماعت کو سبز پرچم کے نیچے آنے سے کون روک سکتا ہے؟ میں اُمید کرتا ہوں کہ خان عبدالقیوم خاں اپنی پالیسی پر نظر ثانی فرمائیں گے اور اس قسم کے غیر دانشمندانہ اور غیر سنجیدہ بیانات دے کر ایسے نئے فتنوں اور ہنگاموں کو دعوت نہ دیں گے جن پر قابو پانا بڑی سے بڑی طاقت کے لئے بھی سخت دشوار ہوتا ہے۔

پیر صاحب مانکی شریف سرحد کی ایک اہم طاقت ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کے پجاری ہرگز نہیں۔ ان کا مشن تنفیذ قانون شریعت ایک مبارک اور مقبول مشن ہے جس کی تائید عامۃ المسلمین کرتے ہیں اور کسی فرد مسلم کی جرأت نہیں کہ اس سے صاف انکار کر دے۔ اگر پیر صاحب پر اس قسم کے الزامات رکھ کر اس مشن کو کمزور کرنا مقصود ہے تو پھر یہ تمام فدا کاران آئین اسلامی کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہو گا۔ میں گمان نہیں کرتا کہ مسٹر عبدالقیوم جیسا ذمہ دار اور زیرک آدمی معاملے کو ایسی نازک حد تک لے جانا پسند کرے گا۔ صوبے کی نیز پاکستان کی بہتری اسی میں ہے کہ ذمہ دار اور ملت کے با اثر خادم باہمی تعاون سے اسٹیٹ کا سب کاروبار چلائیں۔ اسی میں اس کی جیت ہے اور اسی میں اس کی زندگی ہے۔

نشان راہ ہفتہ وار کراچی
مورخہ یکم اکتوبر

مغربی پنجاب کی وزارتی ہوائیں

سندھ کی طرح مغربی پنجاب کے وزارتی معاملات بھی مدت سے پیچیدہ شکل اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس میں رد و بدل کی افواہیں آئے دن اُڑتی رہتی ہیں۔

تازہ خبر ہے کہ خان افتخار حسین خاں ممدوٹ وزیر اعظم مغربی پنجاب کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی موجودہ وزارت میں رد و بدل کر کے اسے مضبوط تر اور معتمد علیہ بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن وہ اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ حریم وزارت سے کس کس کو نکالیں اور کس کس کو لیں افواہ ہے کہ خان ممدوٹ میاں ممتاز محمد دولتانہ کو اپنے ساتھ لینے پر رضامند ہیں لیکن میاں دولتانہ اپنے ساتھ ملک فیروز خاں نون کو بھی لانے کے خواہش مند ہیں اور ملک صاحب یہ چاہتے ہیں کہ بیگم شاہ نواز بھی ان کی رفیقۂ وزارت ہوں، لیکن خان ممدوٹ کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ میاں ممتاز دولتانہ کی خاطر کس کس کو بھرتی کریں۔ اور کس کس کو جواب دیں۔

پہلے کی طرح وزارتی الجھن کا یہ معاملہ پھر گورنر جنرل پاکستان کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ تاکہ اس گتھی کو جو مہینوں سے الجھی ہوئی ہے سلجھایا جا سکے۔ ہمیں ان وزارتی جھگڑوں سے جو اندر ہی اندر چل رہے ہیں کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور کس

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مشرقی دنیا

برما کی شورش جاری ہے

برمی وزیر خارجہ نے جو فی الحال لندن میں تشریف رکھتے ہیں ارشاد فرمایا ہے: اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ برما کے باغیوں کو کوئی مالی مدد بیرون ملک سے مل رہی ہے، لیکن اس کا پتہ چلا ہے کہ بیرونی "مشورہ" ضرور مل رہا ہے۔" بہت سے لوگوں کے نزدیک تو ان کا اتنی بات کہہ دینا باغیوں کا تعلق ایک بین الاقوامی سازش سے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو جو واقعات کو کوئی خاص عینک لگا کر دیکھنے کے عادی نہیں اس سے تشفی نہیں ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب تک اس سلسلے میں جس فریق کا ذکر "مشیر کار" کی حیثیت سے آیا ہے وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی ہے جسے خود اپنے وطن میں چین سے بیٹھنا مشکل ہے۔ اس کی طرف سے یہ اندیشہ نکلنا کہ وہ دوسروں کے مسائل میں کوئی نمایاں حصہ لے سکتی ہے۔ ایسی بات ہے جو دل کو ذرا مشکل سے لگتی ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ خود برما کی حکومت اپنے شہریوں کو کچلنے کے لئے باہر سے مدد لے رہی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ افواہیں گرم ہیں کہ برمی حکومت نے برطانیہ سے برما کے باغیوں کو کچلنے کے نیک کام میں مدد مانگی ہے۔ برمی وزیر خارجہ صاحب نے اس سے تو انکار کیا ہے کہ برمی حکومت فوجیں مانگ رہی ہے، لیکن یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلحہ کی درآمد کے ذریعے انھیں بیرونی امداد مل رہی ہے۔ یہی نہیں" برطانوی ملٹری مشن سے برمی حکومت کو" مدد اور فنی مشورے" مل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات بھی وزیر خارجہ کے منہ سے نکل گئی ہے انھوں نے لندن کی اس پریس کانفرنس میں بتایا کہ برما میں معمولی حالات ایک سال کے اندر اندر پیدا ہو سکیں گے، یعنی باغیوں کی سرکوبی میں کم سے کم ایک سال لگے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ برما کے عوام حکومت کی سست رفتاری سے بددل ہوگئے ہیں۔ اور برما کی موجودہ صورت حال اس جانے بوجھے تاریخی سبق کا اعادہ ہے کہ جمہوریت کے نام لیوا جماعتی اغراض کو اہمیت دینے لگ جائیں تو اس کے خلاف ردعمل ناگزیر ہے۔ اس درد کا علاج برطانوی بندوقیں نہیں ہیں نہ ہی بانسے وعدوں کا اعادہ اس سلسلے میں مفید ہوگا۔ وزیر خارجہ نے نئے انتخابات کا وعدہ کیا ہے جس کی تاریخ کا یقین نہیں انھوں نے برما کو اشتراکی جمہوریت بنانے کے ارادہ پر بھی زور دیا ہے۔

چین کی قومی حکومت ڈگمگا رہی ہے

چین میں چیانگ کائی شک کا ستارہ گردش میں ہے۔ تازہ ترین خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ مکڈن پر چینی کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ چینی حلقوں کا خیال ہے کہ منچوریا میں قوم پرستوں کی اس ناکامی سے چین کی خانہ جنگی کے فیصلے کے دن قریب آگئے ہیں۔ ایک خبر کی رو سے ان حالات سے گھبرا کر امریکہ میں یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ حکومت دریائے یانگ سی کے مغرب میں صوبوں کے گورنروں کو براہ راست مدد دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیانگ کائی شک کا زوال اتنا قریب آگیا ہے کہ اب یہ سوچنا بھی ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ اس اقدام سے مرکزی حکومت کو شدید دھچکا لگے گا۔ امریکہ کی صدارت کے امیدوار ڈیوی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کے برسر اقتدار ہونے کے بعد چین کو مزید مدد دی جائے گی (اب تک ۴۰ کروڑ ڈالر دئے جاچکے ہیں!) کہا یہ جا رہا ہے کہ قومی فوجیں دیوار چین کے قریب جنرل فو کی سربراہی میں کمیونسٹوں سے آخری لڑائی کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ جنرل سموجیانگ کی مرضی سے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ امریکہ سے جو اسلحہ اب آئیں گے، اب انھیں امریکن جہاز براہ راست شمالی چین تک پہنچا دیں گے، امریکہ کی نگرانی میں جو چینی فوجیں تربیت پا رہی ہیں ان سے بھی بہت کچھ امیدیں ہیں اس طرح کے دو ڈویژن جو ابھی شینشن وغیرہ پہنچی ہیں، ان کے متعلق بیرونی مبصروں کا خیال ہے کہ یہ چین کی بہترین اور سب سے زیادہ بہادر فوجیں ہیں! ایسی تربیت یافتہ فوجوں کا پچھلا تجربہ تو کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے، لیکن اصل سوال یہ نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ چین کی خانہ جنگی میں قوم پرستوں کی کامیابی کی ساری امید اب امریکہ سے کمک ملنے پر منحصر ہے۔ یہ مدد اگر دی گئی تو اسے جمہوریت کے نام پر جائز بتایا جائے گا۔ لیکن کیا یہ ایک ملک کے اندرونی مسائل میں مداخلت نہ ہوگی؟

کوریا کی "جبری جمہوریت"

مغربی جمہوریت نوازوں کو عام طور پر اور امریکہ کو خاص طور پر ایشیا میں اپنی جمہوریت دوستی کا ثبوت دینے کا ایک اور موقع مل گیا ہے۔ یہ نیا میدان عمل کوریا ہے۔ کوریا کی فتح کے بعد اس کے دو حصے کر دئے گئے تھے ایک پر روس کی عارضی نگرانی تھی اور دوسرے پر امریکہ کی۔ اس عارضی نگرانی سے دونوں ملکوں نے مختلف قسم کے کام لئے۔ روس نے ایک ایسے نظام حکومت کی بنا ڈالنے میں عوام کی مدد کی۔ جس کی حفاظت کے لئے وہ خود تیار ہو جائیں۔ امریکی اقتدار نے رجعت پسندی کو شہ دی۔ انتخاب کا ایک ڈھونگ رچایا گیا جس کے متعلق یو۔ این۔ او کے کمیشن نے کچھ اچھی رائے ظاہر نہیں کی۔ اور اس نئے "نظام" کی حفاظت کا فرض امریکہ کے سر آ پڑا۔ اس لئے کہ اسے جنوبی کوریا کے عوام کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ ۱۹ اکتوبر کو روسی فوجیں شمالی کوریا سے جانا شروع ہوگئیں۔ جمہوریت دوستوں نے شور مچایا کہ یہ بھی ایک روسی چال ہے گو اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ ایسی چال وہ خود کیوں نہ چل سکے کہ جنوبی کوریا کے لوگ اپنی حفاظت آپ کر سکتے یا کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔

کوریا کے قوم پرستوں نے ایک نئی حکومت بنائی ہے جس کے ممبر جنوبی کوریا سے تعلق رکھتے ہیں اور جمہوریت دوستوں کے ڈر سے اپنے وطن سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ جنوبی کوریا میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور اس کا الزام روسیوں کے سر رکھا جا رہا ہے۔ "باغیوں" کے ساتھ امریکن علاقے کے بہت سے فوج اور پولیس کے سپاہی ہوگئے ہیں اور انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ پریذیڈنٹ ریی نے جنھیں امریکہ کی نگاہ کرم نے صدر بنوایا ہے جنوبی کوریا میں مارشل لا نافذ کر دیا ہے ظاہر ہے وہ مدد مانگیں گے اور یہ مدد انھیں ملے گی۔ روپے اور سیاست سے جو نہ ہو سکا وہ اب امریکہ کو فوجوں کی مدد سے کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات تو تصور میں بھی آ نہیں سکتی کہ کوریا کے بسنے والوں کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ یہ فوجی کارروائی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ علاقہ بہت بڑا ہے۔ رسل و رسائل کی سہولتیں ناکافی اور امریکہ کو طویل عرصہ تک لڑائی لڑنے کے لئے فوجیں مہیا کرنے میں دقت ہوگی اور لارڈ اسٹرابو کے الفاظ میں امریکہ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ حق خود اختیاری میں آزادی کا یہ تصور بھی شامل ہے یا نہیں کہ جو ملک چاہے سرمایہ داری کے خلاف یا سوشلسٹ حکومت بنا سکے" امریکہ کا فیصلہ معلوم ہے اور یہ بھی طے ہے کہ امریکہ کے دوست اس فیصلے کے جواز کی دلیلیں ڈھونڈھ ہی نکالیں گے۔

انڈونیشیا کو نیا خطرہ

ڈچ پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پر بحث ہو رہی ہے جس کی رو سے ڈچ حکومت کو انڈونیشیا میں اپنی نئی اسکیم پر عمل کرنے کا حق ہوگا۔ اسکیم یہ ہے کہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کو نظر انداز کر کے باقی عناصر کی مدد سے ایک وفاقی حکومت قائم کی جائے مگر اس سیاسی چال کا دوسرا پہلو ذرا زیادہ خطرناک ہے۔ بٹاویا میں ڈچ فوجوں نے شکایت شروع کر دی کہ وسط جاوا کے ڈچ اقتدار کے علاقہ میں باہر کے لوگ بہت آنے لگے ہیں۔ ڈچ وزیر خارجہ بٹاویا آئے ہیں۔ ان کی اس آمد کے دو مقصد بتائے گئے ہیں۔ جمہوری حکومت سے دوبارہ گفتگو شروع کرنے میں اپنی موجودگی سے مدد دینا" جاوا کی نازک صورت حال کا بچشم خود مطالعہ فرمانا یہ شکایت اور یہ آمد شاید انڈونیشیا میں ڈچ پیش قدمی کا پیش خیمہ ہیں۔ ڈچ حکومت کے پیش نظر غالباً یہ اسکیم ہے کہ انڈونیشیا کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ حملہ کا پہلا نشانہ اگر کمیونسٹ ہوں تو لوگوں کو یہ یقین دلانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ لڑائی دراصل جمہوریت کی خاطر ہے، ایسا حملہ جمہوری حکومت کے لئے بڑے امتحان کا وقت ہوگا۔ اگر اس نے اندرونی دشمن کے خوف سے بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے دیا تو مستقبل کا مؤرخ انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں اسے غداری کا ملزم ٹھہرانے پر مجبور ہوگا۔ ادھر کمیونسٹوں کا بھی امتحان ہے کہ وہ ملک کی خاطر پارٹی کو تھوڑی دیر کے لئے بھول سکتے ہیں یا نہیں۔

چیانگ کائی شک اب چلے؟

ادھر چین کی کیبنٹ نے استعفا دے دیا ہے ادھر مسٹر ڈیوی جن سے مدد کی بڑی امیدیں تھیں امریکہ کے صدارت کے انتخاب میں ناکام رہے اب جنرل سو چیانگ کا خدا حافظ۔ (ا۔ س)

منزلِ شوق

عِبادتؔ بریلوی

(۱)

یوں ہی جگ بیتے، مدتیں گذریں!
کاروانِ حیات چلتا رہا
نغمۂ شوق بھی مچلتا رہا
شاہ راہیں، اُداس اُداس خموش
شوق سے منزلوں کو تکتی رہیں
منزلیں آئیں اور گذرتی گئیں
منزلِ شوق پھر بھی آئی نہیں!

(۲)

شاہ راہیں، اداس اداس خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں!
بعد مدّت کے کاروانِ حیات
ایک منزل پہ آج آیا ضرور
نغمہ اک آرزو نے گایا ضرور
منزلِ شوق پھر بھی آئی نہیں!
زندگی تشنہ کام و تشنہ دہن
خستہ حال و شکستہ پیراہن
شاہ راہوں پہ آج بھی ہے نڈھال
زخم خوردہ ہے کائناتِ حیات
زہر اگلتی ہے آج "شاخِ نبات"
نور کو تیرگی نے گھیرا ہے
موت کا ہر طرف بسیرا ہے
نور تو ہو گیا ہے جاں کو وبال
آج بھی طرح زندگی ہے وہی
سالہا سال مدتوں جو رہی
وجہِ خوں گشتگیٔ فکر و خیال
باعثِ دل گرفتگی و ملال
صبحِ صادق نظر جو آئی تھی
صبحِ کاذب کی روشنی نکلی

یہ زبوں حالی و پریشانی
زندگی کی فسردہ سامانی
خوں رُلاتی ہے شاہ راہوں کو!
اور منزل کو بھی ہے حیرانی

(۳)

شاہ راہیں اُداس اُداس، خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں
ہے شب و روز ان کو بس یہ خیال
"اس اندھیرے میں یہ تھکے راہی
راہ کس طرح لیں گے منزل کی
منزلِ شوق و بزمِ کیف آگیں
آئے گی بھی کبھی نظر کہ نہیں"
ہے شب و روز ان کو بس یہ خیال
شاہ راہیں اداس، اداس، خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں

(۴)

شاہ راہوں کی اس اُداسی میں
باوجودِ فضائے تاریکی
آج بھی مشعلِ جنوں کو لیے
عزم اور آرزو کی مے کو پیے
باصد "افسوں گری" و زندہ دلی
کاروانِ حیات چلتا ہے
نغمۂ شوق بھی مچلتا ہے
—— نورِ ظلمت ہی سے اُبلتا ہے
چلتا جائے گا کاروانِ حیات
چلتے جائیں گے رہروانِ حیات
منزلِ شوق آ ہی جائے گی
منزلِ شوق کو تو آنا ہے
تیرگی کی فسردہ سامانی
خوں رُلاتی ہوئی سی ویرانی
لاکھ بن جائے سنگ راہ گذر!

افیون کی پینک

ڈاکٹر سید عابد حسین

جن بزرگ کی کتھا میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں ان کا نام مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ گاؤں بھر اُنھیں "تمھارے صاحب" کہتا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو "تمھارے صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے، یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسے بات کی تکیہ بنا لیا تھا۔ جہاں زبان رُکی اور انھوں نے اس بات کا سہارا لیا، اس لئے ان کا یہی نام پڑ گیا تھا۔ ہاں جی چاہے تو ان کا تھوڑا سا حلیہ سن لیجئے۔ تھوڑا سا اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے، بلکہ ان کا حلیہ تھا ہی ذرا سا ٹھنگنا قد۔ اکہرا بدن، دُبلا چہرا، سانولا رنگ، خشخشی ڈاڑھی، سر پر پٹھے، اللہ اللہ خیر سلا۔ کپڑے بھی واجبی ہی پہنتے تھے۔ نیچا کرتہ، اونچا پاجامہ یا کبھی لنگی سر پہ رومال لپٹا ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ روز لگاتے تھے۔ سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے تھے۔

"تمھارے صاحب" کبھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ قریب کے کسی گاؤں میں ان کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی، جو مقدمہ بازی میں ٹھکانے لگ گئی۔ اس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح رہتے تھے۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے تھے۔ ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو حقہ بھر کر پلانا، دوسرے بازار سے سودا سلف لانا۔ سودا چکانے میں ان کی انوکھی عادت یہ تھی کہ ہمیشہ دوکان دار کی سی کہتے تھے۔ مثلاً خربوزے والا آیا ہے اور زنانی ڈیوڑھی پر اس سے بھاؤ چکایا جا رہا ہے۔ یہ حضرت بھی موجود ہیں، بیچنے والا سیر کے چار پیسے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو پیسے کہہ رہے ہیں۔ ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا تھا: "نہیں تمھارے صاحب یہ، یہ خربوزے تو چار ہی پیسے سیر کے ہیں"۔ اور جو کسی نے کہا کہ تم بیچ میں کیوں بولتے ہو تو بھولے پن سے فرماتے تھے "تمھارے صاحب وہ تو آپ ہی چار پیسے سیر کہہ رہا ہے، ہم نے کہا تو کیا بُرا کیا"۔ ان کی سادگی کا ایک اور ثبوت لوگ اس بات کو جانتے تھے، کہ آپس کے رشتے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، سچ پوچھئے تو ہمارے خاندانوں کے رشتے ہوتے ہی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ اسی برس کی بڑھیوں کے سوا کسی کو زبانی یاد نہیں رہتے۔ بڑے بڑے حسابیوں کو سلیٹ پنسل کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور نتیجہ پھر بھی صفر ہی نکلتا ہے۔ مگر تمھارے صاحب اس معاملے میں اوروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ پھپی کی خلیا ساس کو نانی اور بیوی کے بہنوئی کو نندوئی غرض اسی طرح الٹکل پچو رشتے بتا دیا کرتے تھے۔ ہم سب بچے ان کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے اور ان کے جواب سُن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔

ایک بار اُن سے پوچھا "کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اس کی کون ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے اس درزی کے دادا کا نام، ولدیت، سکونت، عمر کی تحقیق کی، پھر اس کی پوتی کا نام اور عمر پوچھی۔ یہ سب چھان بین کرلینے کے بعد فرماتے ہیں "بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم۔ اُسی سے پوچھ لو"۔

شادی انھوں نے کم عمری کے زمانے میں کرلی تھی، بیوی تعداد میں ایک تھیں، مگر مقدار میں ان سے چوگنی، اور پھر تیز مزاج، اس لئے یہ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ بال بچے تھے نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اس لئے محبت کا جذبہ اور جانوروں کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ بکریاں، مرغیاں طوطے، مینا، تیتر، بٹیر، غرض بیسیوں جانور پال رکھے تھے اور ان سے بہت مانوس تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے، اور نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اس کی روح حیوانی اسی جانور کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو "تمھارے صاحب" کی روح چڑیا خانے سے کم نہ ہوگی۔

"تمھارے صاحب" کی، رقت قلب، بھولے پن اور مسکینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ افیون کا شغل کرتے تھے، دن میں دو وقت دوپہر کو اور رات کو گھلا کرتی تھی۔ اور ہمارے ہیرو دو ایک بے فکروں کے ساتھ افیون کی چسکیاں پیتے تھے، اور حقے کے دم لگاتے تھے۔ مگر ان کے ساتھی ہمیشہ نئے نئے ہوا کرتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ آس پاس کے گاؤں میں جو شخص کہ اس چیز کے قابل نظر آیا اسے چند روز اپنے پاس سے افیون پلاتے تھے اور جب وہ پکا ہوگیا تو اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اُن کے پاس افیون آتی کہاں سے ہے، اس لئے کہ خریدتے اُنھیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اُن سے پوچھئے تو مسکرا کر چپ ہو رہتے تھے کوئی بہت اصرار کرے تو ایک قطعہ پڑھ دیا کرتے تھے جو ٹھیک یاد نہیں، کچھ اس طرح کا تھا۔

اے کہ جاپان کے خزانے سے
چینیوں کو افیم دیتا ہے
دوستوں کو کرے گا کب محروم
دشمنوں کی خبر جو لیتا ہے

اس تعارف کے بعد میں آپ کو "تمھارے صاحب" کی ایک دن کی گفتگو سناتا ہوں جو میرا اصل مقصود ہے۔ اس سے آپ کو ان کی سیرت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا، اور اگر آپ مختصر قصہ غم سے کہ دل رکھتے ہیں تو آپ کو بڑی عبرت و بصیرت حاصل ہوگی۔

ہوا یہ کہ ایک دن "تمھارے صاحب" میٹھے ٹکڑے زیادہ کھا گئے، فصل تھی ملیریا کی، معدہ جو خراب ہوا تو جاڑے بخار نے آ دبایا۔ فصلی بخار کی بے چینی تو آپ جانتے ہیں، اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے، بیماری کے بڑے کچے تھے، سمجھے کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔ لوگوں کو پکارنے لگے کہ میرے پاس آکر میری آخری باتیں سُن لو۔ گھر کے بڑوں نے اسے بخار کی بڑ سمجھ کر کچھ توجہ نہیں کی۔ البتہ بچے آن کر جمع ہوگئے۔ مگر ان کو انھوں نے ڈانٹ کر بھگا دیا، کچھ دیر کے بعد، ہمارے ایک عزیز دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے تھے، بیمار کی یہ حالت دیکھ کر اُن کو ترس آیا اور آکر بیٹھ گئے "تمھارے صاحب" تو موقع کے انتظار میں تھے، انھوں نے فوراً اس درد ناک لہجے میں جو افیونیوں سے مخصوص ہے اپنی کہانی شروع کردی۔

"سنو تمھارے صاحب، آج ہم تم سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ہم نے آج تک کسی سے نہیں کہیں، ہماری عمر کچھ کم ساٹھ برس کی ہوئی۔ اگر بقرعید تک زندہ رہتے تو پورے ساٹھ برس کے ہو جاتے۔ جوانی میں ہم پر وہ مصیبت پڑی جس سے ساری زندگی برباد ہوگئی۔ ہمارا گھر قریب کے گاؤں میں تھا۔ جس کا نام ہم نہیں بتاتے بزرگوں کے وقت سے گاؤں میں ایک پٹی چلی آتی تھی والد کے انتقال کے بعد اس کے مالک ہم تھے، چین سے اور آبرو سے بسر ہو رہی تھی۔ اتفاق کی بات گاؤں کے نمبردار سے ایک معاملے میں دشمنی ہوگئی۔ وہ اپنے زمانے کا پکا جعل ساز تھا۔ اس نے ہمیں دق کرنے کے لئے ایک جعلی دستاویز تیار کی اور اپنے ایک بیٹھوے سے ہم پر نالش کرادی۔ یہ اُمید اُسے بھی نہ تھی کہ ڈگری ہو جائے گی، مگر ڈگری ہوئی اور ہائی کورٹ تک بحال رہی۔ ہماری زمین گھر بار سب کچھ بک گیا، اور ہم روٹیوں کو محتاج ہوگئے۔ خدا بھلا کرے اس ڈیوڑھی کا جس نے ہمیں اس طرح رکھا، جیسے اپنوں کو رکھتے ہیں مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے دل سے ان مصیبتوں کا صدمہ خصوصاً زمین کے چھن جانے کا غم مٹ گیا توبہ کرو۔ تمھارے صاحب، تم بھی زمیندار کے بیٹے ہو اور زمین کی قدر جانتے ہو۔ اس دنیا میں جہاں کسی چیز کو دم بھر قرار نہیں ایک ہی چیز ہے جو سیکڑوں، ہزاروں سال باقی رہتی ہے اور وہ زمین ہے۔ اسی پر ہم پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر دفن ہوتے ہیں۔ زمین کی جو محبت انسان کے خصوصاً زمیندار کے دل میں ہوتی ہے اس کی تھاہ نہیں۔ مدت تک ہمارا یہ حال رہا کہ کھیتوں کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی اور انھیں یاد کرکے تڑپتے تھے۔ نمبردار سے اور اس کے بیٹھوے سے بدلہ لینے کی تدبیریں ہر وقت سوچا کرتے تھے، مگر لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ ہمیں نفرت تھی اور طاقت بھی ان دنوں ذرا کم تھی، یہی صورت سمجھ میں آتی تھی کہ ان کمبختوں پر آسمان پھٹ پڑے یا بجلی گر پڑے مگر یہ اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔

دوسرا ہوتا تو اس غم میں تمھارے صاحب، کھانا، پینا چھوڑ دیتا، مگر ہم بہت صبر سے کام لیتے تھے۔ اور گاؤں میں رہ کر دل بہلانے اور غم غلط کرنے کی جو تدبیریں ہو سکتی ہیں وہ کرتے تھے، مگر دل کی کلی کسی طرح نہ کھلتی تھی پیر خاکسار شاہ صاحب یہاں تشریف لائے، تو ہم اُن کے مرید ہوگئے اور ان سے اپنا درد دل بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ دنیا کو چھوڑ دو اور مولا سے لو لگاؤ۔ نماز روزے کی تاکید کے ساتھ انھوں نے چلہ کھینچنے اور پیر کے نام کا ورد کرنے کی ہدایت کی۔ نماز تو خیر ہم پڑھتے ہی تھے، مگر روزہ ہمیں کبھی راس نہیں آیا۔ جب

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اہنسا اور مہاتما گاندھی

اثر لکھنوی

(پروفیسر این اے نکم کے مضمون کا خلاصہ)

گاندھی جی کی تعلیم عدم تشدد یا اہنسا کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے نہ صرف بلند تر تھا بلکہ مبتدا کی نفی کرتا تھا، اور ان کی زندگی میں ناقابل فہم ہوتا تھا۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گاندھی جی کو اس دشواری کا علم یا احساس نہ تھا یا بلکہ حصۂ ثانی کا وجود میں آنا محض اتفاق تھا کیونکہ مدت ہوئی وہ کہہ گئے تھے۔

"میں نے ہندوستان کے سامنے اہنسا کی وہ شدید ترین صورت کبھی نہیں رکھی۔ آپ یہی فرض کر لیجئے کہ میں اپنے آپ کو اہنسا کی وہ قدیم تعلیم پیش کرنے کا اہل نہیں جانتا، گو میرے ذہن نے اس کا مکمل طور پر احاطہ کر لیا ہے اور اس کی اہم معنویت میری گرفت میں آگئی ہے، لیکن یہ تعلیم اب تک میری زندگی کا جزو نہیں بن سکی ہے، اور میری شکتی کا راز اسی میں ہے کہ میں جتنا ہے وہ راہ اختیار کرنے کو نہیں کہتا جس کا میں نے خود بار بار تجربہ نہ کر لیا ہو۔"

(مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں صفحہ ۱۰۹۶ طبع چہارم) ہمارا دعویٰ ہے کہ گاندھی جی نے اس شدید قسم کا اہنسا کا مظاہرہ دہلی کے برت میں کیا۔ جو لوگ کلکتہ والے برت کو بغور دیکھ چکے تھے تاڑ گئے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پھر بھی اس برت کے اچانک فیصلے سے بہتوں کو اچنبھا ہوا۔ ہم نے ٹھنڈے دل اور جوش کے ساتھ اہنسا کی ابتدائی حالت کا معائنہ کیا تھا، اور یہ بھی معلوم تھا کہ جنوبی افریقہ میں اس کی پہل کیوں کر ہوئی لہٰذا ہم نے چون وچرا کے بغیر گاندھی جی کو اہنسا کا سچا عامل تسلیم کر لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی تحریک عدم تشدد میں بھی تغیر ہوا تھا۔ پہلے یہ مجہول مقاومت تھی، پھر یہ بے تشدد مدافعت بن گئی۔ دونوں میں فرق ہے، تاہم بہت ہی ... اس پر بھی کوئی معترض نہ ہوا، اور ان کے حسب منشا طریق کار میں ضروری ترمیم کر لی۔ ابتدائی تعلیم کا لب لباب تھا کہ جو تمہارا ہے لو، البتہ تشدد کو دخل نہ دو۔ لیکن اسی اصول کی شد ید ترین تعلیم سے اکثر لوگ چکر میں پڑ گئے۔ بلکہ جز بز بھی ہوئے، کیوں کہ اس کا مقصد تھا کسی حالت میں تشدد نہ کرو۔ اور اس کا دستور العمل تھا "جو کچھ تمہارا ہے وہ بھی دے دو"۔ یہ مطالبہ تھا اس علو ہمتی، محبت اور سخاوت کا، ان صفات کا گاندھی جی کا ضمیر جن کا مندر تھا۔ گمان ہوتا ہے کہ دہلی کے برت کے وقت گاندھی جی کو یقین تھا کہ اب وہ اس قدیم پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ افسوس ہم لوگ راستے میں تھک کر بیٹھ گئے اور اتنی دیر لگائی کہ ان کے ساتھ ان بلندیوں تک رسائی نہ ہو سکی۔

یہ بات نہ تھی کہ گاندھی جی واقعات کا کھوج لگانے میں ہم سے پیش پیش تھے بلکہ انہیں واقعات کو ان کے صحیح نتائج کی روشنی میں جانچنے کا ملکہ تھا۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہماری زندگی کو اجتماعی ہونا چاہئے۔ ہم سب مل کر ایک دنیا ہوں ورنہ ہمیں جینے کا کوئی حق نہیں سائنس بھی اسی کی تائید کرتا ہے جس کے دریافت کردہ حقائق میں مستثنیات کو دخل نہیں لہٰذا ہم یہ بہانہ نہیں کر سکتے کہ راستی مطلق اور مستقل اقدار کے ماحول سے بیگانہ ہیں ....

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ گاندھی جی نے سیاسیات اور مذہبیات کو گڈمڈ کر دیا اور ان کی سیاسی تعلیم نے مذہب کو خطرے میں ڈال دیا۔ اگر انھوں نے دونوں کو سمونا چاہا تو اس امید پر چاہا کہ سیاسیات جسے افلاطون نے ذلیل ترین پیشہ یا مشغولیت قرار دیا تھا۔ اس کے پیرو اس طرح کام کریں کہ وہ پجاری بن جائیں اور سیاست کو مذہبی تقدس حاصل ہو جائے۔ گویا جو کچھ سیاست کے نام پر کیا جا رہا ہے خدا یا ایشور کی موجودگی میں اور اس کو حاضر و ناظر مان کر کیا جا رہا ہے۔ سچا مذہبی شخص بھی یہی کرتا ہے۔ یہ دراصل گاندھی جی کے مخالفین ہیں جنہوں نے مذہب اور سیاست کا خلط مبحث کیا ہے اور اپنے مذہبی معتقدات کو سیاست کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

ایک عظیم روح فنائے جسم کے بعد پوری شان کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کرتی ہے لوگوں کو رحم دلی کی طرف مائل کرتی ہے تاکہ ان کی زندگی مطلق یا اجتماعی بن جائے اور رحم دلی کے بغیر اس کیفیت کا ظہور پذیر ہونا محال ہے۔

گاندھی جی کی ہتیا کے سلسلے میں ہم یہ غور کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تشدد کے امکانات کتنے وسیع ہیں۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں پر جو اہنسا کے اصول کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے واضح ہو گیا کہ عدم تشدد ہی واحد حقیقت اور راستی ہے اور اسی ڈگر پر چلنے سے جہانیت ...

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

"محبت اور نفرت"

باقر رضوی

انسان قدرت کا ایک ذی روح اور صاحب ادراک شاہکار ہے فطری تقاضے اور جبلتیں اس کے بیشتر افعال کا سرچشمہ ہیں۔ اسے بھوک لگتی ہے، پیاس معلوم ہوتی ہے جسمانی آرام کی خواہش ہوتی ہے کبھی کبھی اس پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ بگاڑے کچھ بنائے۔ اس کی تمنا ہوتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے، وہ اپنے جنسی جذبے کی تسکین ڈھونڈھتا ہے اس کے دل میں رقابت اور مسابقت کی آگ بھڑکتی ہے ان تمام خواہشوں اور تقاضوں کی تسکین، تکمیل مسرت کا اور عدم تکمیل غم کا باعث بنتی ہے۔

پھر انسان کے ذہن میں پچھلی یادیں اور پرانی باتیں محفوظ رہتی ہیں۔ ان یادوں کا دامن گذشتہ کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست سے بندھا ہوا ہے اور فتح و شکست سے خوشی اور ناخوشی کا احساس وابستہ ہوتا ہے۔ یہ پچھلی یادیں اور پرانی باتیں امتداد زمانہ اور ماحول کے زیر اثر دوسرے جذبات سے ایسی خلط ملط ہو جاتی ہیں کہ ان کا تجزیہ سخت دشوار ہے

غیر شعوری طور پر گذشتہ واقعات کی یاد چھپائے رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان شعوری طور پر تمناؤں کے خاکے بناکر ان میں رنگ آمیزی کرتا اور آرزوؤں کا جال پھیلاتا ہے کہ مقصد برآری کے بعد شاد کام ہو سکے۔ تمناؤں کے پھول کھلنے کے ساتھ ہی ساتھ بیم ورجا کا کانٹا بھی اس کے دل میں کھٹکنے لگتا ہے۔ اسے یہ خیال آتا ہے کہ دیکھئے عنقائے مدعا شکار ہوتا ہے یا نہیں۔

ان مقدمات کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ انسان کے تمام افعال کی بنیاد بلا استثنا محبت اور نفرت ہی محبت اور نفرت ہی کی دو مٹ زمین سے اس کے تمام اقدار کے گلے پھوٹتے اور برگ و بار لاتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول، جبلت اور خواہش کے زیر اثر جن چیزوں سے رغبت رکھتا یا کراہت کرتا ہے وہ اس کے حرکات و سکنات اور قول و فعل سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انسانی افعال کی تحلیل کیجئے تو آپ کو بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ فلاں انسان کو کس لئے فلاں چیز سے رغبت اور فلاں چیز سے نفرت ہے۔ وہ کیوں بعض مسائل سے جی چراتا اور بعض موضوعات پر ہر وقت بحث و مباحثہ کے لئے تیار رہتا ہے۔

انسانی زندگی مجموعہ ہے، نسلی وراثت، گذشتہ تجربات، غیر شعوری تقاضوں، شعوری آرزوؤں اور محبت و نفرت کا۔ جذبات و احساسات حیات کا تانا بانا ہیں۔ یہی زندگی میں رنگ آمیزی کرنے اس پر نقش و نگار بناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حیات انسانی مرکب ہے تین چیزوں سے (۱) محبت (۲) نفرت (۳) وہ امور جو جذبات و نفرت کی تکمیل میں رخنہ اندازی کرتے اور شعور پر چھاپہ مارتے ہیں۔

نفرت کی حیثیت ثانوی، منفی اور سلبی ہے، یعنی یہ محبت کی عدم تکمیل سے وجود میں آتی ہے اس طرح محبت کو جو اہمیت حاصل ہے اس میں مبالغہ آمیزی نہیں کی جا سکتی، انسان ابتداءً کسی چیز سے نفرت نہیں کرتا اُسے ان چیزوں سے نفرت ہوتی ہے جو اس کی مطلوب و محبوب کے حصول میں رکاوٹ ڈالتی اور اس کی محبت کی بیل کو منڈھے چڑھنے نہیں دیتی، نفرت محبت کا رد عمل ہے۔

تخیل کی مدد سے انسان سابقہ تجربات کی روشنی میں مستقبل کی عمارت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ انسان میں جو روحانی عنصر ہے وہ اخلاقی اقدار مرتب کرتا ہے۔ وہ حسن، صداقت اور معدلت کے عینی تصورات قائم کرتا ہے اور ان اقدار کو قائم و دائم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ایک ایسی دنیا کی تصویر بناتا ہے جہاں حسرت ہی حسرت ہو اور جہاں انسانیت، خلاقی اقدار کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہو، حکومت الٰہیہ کا تصور بھی اسی روحانی عنصر کی ایک شکل ہے، بعض لوگوں نے خدا کے روحانی تصور کو اپنے ذہن کی سرزمین سے جلاوطن کر کے انسانیت کو اس کی جگہ دی ہے اور دنیا کا ایک ایسا خاکہ بنایا ہے جہاں انسان مختار کل اور مالک اعلیٰ ہوگا۔ یہ لوگ صرف انسانی وحدت اور عظمت کے قائل ہیں۔ اس روحانی مابعد الطبیعیاتی اور عینی تصور کے لئے انسان اپنی ہستی قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، اور اپنے ملک قوم، عزت، انصاف حق اور انسانیت کے لئے جان دینے میں گریز نہیں کرتا۔ انسان کی پوری تاریخ تہذیب و تمدن کا عروج و زوال۔ مذاہب کے خیرہ کن نشیب و فراز اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کی مختلف کوششوں کی تصویریں ہیں۔ انسان ہمیشہ ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھتا رہا ہے۔ دیکھئے یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہو۔ خواب دیکھنے کی یہی خواہش اس کی روحانیت پر دلالت کرتی ہے، مارکس شیلر نے کیا خوب کہا ہے "انسان ایک مریض جانور ہے، جانور کی حیثیت سے اس کا یہ مرض انسانی حیثیت سے اس کی صحت کی دلیل ہے۔"

ترکی

ایک طائرانہ نظر

(۲)

پریسیڈنٹ عصمت انونو

(ترجمہ از سید قاسم الحسنی)

ستمبر ۱۹۳۹ء میں اس وقت جبکہ پولینڈ کی جنگ زوروں پر تھی، ترکی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان دوستی کے معاہدے کے لئے گفت و شنید کا آغاز کیا گیا جو تیزی سے جاری رہا۔ اس تجویز کی رو سے برطانیہ عظمیٰ اور فرانس نے یہ شرط منظور کی کہ ترکی کو طے شدہ مقدار میں سامان حرب مہیا کیا جائے اور یہ کہ اسے روس کے خلاف جنگ میں نہ گھسیٹا جائے اسی عرصے میں دوستانہ معاہدے کی تکمیل کی نیت سے روس نے ترکی وزیر خارجہ کو ماسکو مدعو کیا......

وزیر خارجہ ۲۵ ستمبر کو ماسکو پہنچے۔ اور ۱۷ اکتوبر کو واپس آئے۔ ابتدائی گفت و شنید بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہی، لیکن ترکی کے ساتھ معاہدہ دوستی کی تکمیل کرنے سے پہلے روسیوں نے یہ شرط پیش کی کہ برطانیہ کے ساتھ ترکی کا جو معاہدہ ہے اس میں کچھ ترمیم کی جائے۔ ترکی نے برطانیہ عظمیٰ اور فرانس سے مذکورہ بالا ترمیمات کے لئے کہا۔ طویل گفت و شنید کے بعد برطانیہ اور فرانس ان پر راضی ہوگئے۔

چنانچہ ترکی نے محسوس کیا کہ روس کے ساتھ معاہدے کی تمام شرائط پوری ہوگئی ہیں۔ اس وقت روس نے صلح نامہ مانٹریو کے سلسلے میں اپنے فائدے کی ایک ترمیم پیش کی علاوہ بریں اس نے جرمنی کے متعلق صلح نامہ میں ایک استثنا کو شامل کرنے کی خواہش کی۔ ان نکات کے منظور کئے جانے پر اس نے کہا کہ ابھی دو ایک باتیں اور بحث طلب ہیں۔ اس بالکل نئی اور غیر متوقع صورت حال نے ترکی اور روس کے مابین صلح نامہ دوستی کی گفت و شنید میں رکاوٹ ڈال دی اور وزیر خارجہ سراج اوغلو ماسکو سے چلے آئے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو انقرہ میں ترکی برطانوی فرانسیسی معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔ سرکاری تقریروں کے ذریعے پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے روس ناراض ہوگیا۔

سب جانتے ہیں کہ اس سال یعنی ۱۹۴۰ء کے دوران میں فرانس نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور برطانیہ عظمیٰ تنہا اپنی حفاظت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی سال رومانیہ نے اپنے دروازے جرمنوں کے لئے کھول دئے۔ فرانس نے برطانیہ عظمیٰ کے حلیف ترکی کے بعض مقبوضات پر قبضہ کر لیا اور شام پر اپنا اقتدار قائم رکھا۔ اسی زمانے میں راشد علی نے عراق میں بغاوت شروع کی اس طرح ترکی اپنی شامی اور عراقی سرحدوں پر مخالفوں میں گھر گیا۔ ترکی جمہوریت کے لئے سب سے اہم واقعہ جرمنی کا نہایت تہدید آمیز سیاسی حملہ تھا۔ فرانس پر قبضہ کرنے کے بعد جرمنی نے چند دستاویزات شائع کیں جن کا مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ ترکی روس کی مخالفت میں فرانس اور برطانیہ کو مدد دے رہا ہے۔

روس، فرانس، برطانیہ عظمیٰ اور ترکی کی دوستی پر پہلے ہی سے خفا تھا۔ اب جو جرمنوں نے فرانسیسی دستاویزات شائع کیں اس کے معنی یہ تھے کہ وہ ایک کشیدہ سیاسی ماحول میں نہایت سرگرمی سے ترکی اور روس میں جنگ کرانے کی کوشش کر رہے تھے، اور ترکی کو تنہا دیکھ کر انھیں یقین تھا کہ رومانیا کی طرح وہ بھی ہونے والے روسی حملے سے بچنے کے لئے ان کی طرف مائل ہوگا۔ ترکی نے ان حالات کا سکون سے مقابلہ کیا۔ اور روسیوں کو اطمینان دلایا کہ اس کی حکمت عملی پاک صاف ہے۔ شائع شدہ دستاویزات جعلی ہیں۔

جرمنوں کی توقعات کے خلاف ترکی ان کی طرف جھکنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ روس کے برعکس اکتوبر ۱۹۴۰ء میں یونان پر اطالوی حملے کے بعد اس نے اپنی حکمت عملی کا اعلان تازہ عزم اور جرأت کے ساتھ کیا۔

یکم نومبر ۱۹۴۰ء کو ترکی کے صدر نے مجلس ملی کبیر کے سامنے ایک تقریر میں برطانیہ عظمیٰ کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان دیا: "یہ کہنا میرا عین فرض ہے کہ اس وقت جبکہ برطانیہ عظمیٰ مشکل حالات میں اپنی بقا کے لئے بہادرانہ جدوجہد کرنے پر مجبور ہے۔ دوستی کے وہ رشتے جنھوں نے ہمیں اس سے باندھ رکھا ہے مضبوط اور ناقابل شکست ہیں۔"

۱۹۴۱ء کی بہار میں، بلقان میں جرمن فوجیں داخل ہوگئیں اور یونان اور یوگوسلاویہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ترکی سمندر اور خشکی پر جرمنی اور اطالیہ سے گھر گیا۔ جرمنوں نے خشکی اور ہوا کے راستے ترکی سے گذر کر شام اور عراق کی مدد کے لئے پہنچنے کی انتہائی کوشش کی......

اپریل ۱۹۴۱ء میں ترکی نے اپنی تمام فوجوں کو تیار کر لیا تھا اور اپنی قوت کو تھریس اور ایجین کے ساحل پر مجتمع کر دیا تھا۔ بلقانی ملکوں کی شکست کے بعد وہ صبر و استقلال کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ دریائے مرلق کے پلوں کو اڑا کر اس نے اپنی فوجوں کو جو تھریس میں جمع تھیں اندر کی طرف دفاعی لائنوں پر پیچھے ہٹا لیا۔ یہ تھی فوجی صورت حال، تاہم اس نے جرمن مطالبات کے ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔ رومانیا کے قبضے کے بعد روس اور جرمنی کے عارضی دوستانہ معاہدے کے ختم ہو جانے کے آثار نظر آ رہے تھے ۱۹۴۱ء کے سرما میں دونوں ملکوں کے سیاست دانوں نے ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کیا، اور ترکی کے خلاف خصوصیت سے افواہیں پھیلائی گئیں۔ فروری اور مارچ ۱۹۴۱ء میں روس اور بلغاریہ میں زور شور سے گفت و شنید ہو رہی تھی۔ سرکاری حیثیت سے چند روسی افسران کے بلغاریہ جانے کے بعد بلغاریہ میں ترکی کے خلاف بہت سے افسانے پھیلائے گئے۔ غرض ہر چیز سے ترکی پر حملہ کی تیاری کا پتہ چلتا تھا اس عرصہ میں انگریز شام اور عراق میں لڑ رہے تھے، اور کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ اس خطرناک موقع پر جرمنوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ ترکی پر حملہ نہیں کریں گے اور ایک عہدنامہ دوستی کی تجویز پیش کی۔ ترکی نے اعلان کیا کہ وہ اس معاہدہ پر راضی ہو جائے گا، اس شرط پر کہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ اس کے معاہدہ دوستی میں خلل نہ پڑے

جرمنوں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ جرمنوں نے ترکی پر اپنے حملے کو کسی آئندہ مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ ترکی نے اپنی حفاظت اور اپنے دوستوں کے مفاد کے لئے مہلت حاصل کرنے کو غنیمت سمجھا۔

جب جرمن فوجیں روس پر مسلسل حملے کر رہی تھیں اور افریقہ میں مصر پر بڑھ رہی تھیں، اس سارے عرصے میں ترکی جرمنوں کو راستہ نہ دے کر اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ ترکی نے معاہدۂ مانٹریو کے مطابق ایک طرف تو اطالوی بیڑے کو بحر روم سے بحر اسود میں جانے کی اجازت نہیں دی اور دوسری طرف اپنی تمام فوجوں کے ساتھ اچانک ہونے والے بری یا بحری حملے سے اپنی سرحد کی حفاظت کی۔ روس اور برطانیہ عظمیٰ جرمن حملوں کو روکتے ہوئے عرب ملکوں کے ذریعے ایران تک اپنے آمد و رفت کے راستوں کی حفاظت کر رہے تھے اور دشمن کے خلاف جنگی محاذوں پر اپنی تمام قوتیں استعمال کر رہے تھے۔

۱۹۴۱ء کے آخر میں جب امریکہ پر حملہ ہوگیا تھا اور وہ جنگ میں داخل ہو چکا تھا تو تینوں بڑے حلیفوں نے ترکی کے معاملے میں دلچسپی لینی شروع کی اور وہ اس کے طرز عمل سے مطمئن تھے۔

۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو امریکن صدر نے بیان دیا کہ چونکہ ترکی کی حفاظت امریکہ کی جدوجہد میں مدد دے رہی ہے وہ اس کی اُدھار پٹہ سے مدد کرے گا۔ اور ۱۹ جنوری ۱۹۴۲ء کو حکومت روس نے انقرہ میں اپنے سفیر کے ذریعے ترکی حکومت کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ ترکی کے طرز عمل سے مطمئن ہے اور اس کی رائے میں یہ طرز عمل قابل ستائش ہے۔ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں محوری ریاستیں ترکی کے بارے میں اپنے ارادوں پر متفق نہ ہو سکی تھیں۔ اطالیہ نے محسوس کیا کہ اس کی تمام مصیبت کی وجہ یہ ہے کہ محوری فوجیں ترکی کو روند کر خشکی سے عرب ملکوں میں نہیں گھسیں۔ جاپان بہت بے چین تھا کہ ترکی پر حملے کر کے جرمنوں کو جلد بحر ہند تک پہنچ جانا چاہئے۔ العالمین کی جنگ کے زمانے میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ترکی کو الٹی میٹم دینے پر سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے۔ ان تمام مقصودہ تبدیلیوں کا دار و مدار ایک بات پر تھا اور وہ یہ تھی کہ محوری فوجیں زبردستی ترکی سے گذر سکیں۔ مگر یہ نہ ہو سکا ترکی جمہوریت جنگ کے چوتھے سال میں اپنے محدود مالی ذرائع سے اپنے علاقے کی حفاظت کر کے بہت بڑی خدمت انجام دے رہی تھی جس کے لئے روس اور انگلستان کو مشکور ہونا چاہئے۔

جرمن العالمین سے اور اسٹالین گراڈ سے پیچھے ہٹے۔ امریکی فوجیں افریقہ میں اتریں (نومبر ۱۹۴۲ء) اور اس طرح سے ۱۹۴۲ء ختم ہوا۔ جب ۱۹۴۳ء کے شروع میں مسٹر چرچل ادنہ آئے تو انھوں نے اس کا اعلان کیا کہ وہ ترکی کے طرز عمل کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ صدر روزویلٹ سے مکمل سمجھوتہ ہونے پر کیسابلانکا سے آئے تھے۔

مسٹر چرچل نے ترکی کو کافی سامان حرب مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ ترکی نے مشرق کی طرف جرمنوں کی مزید پیش قدمی کو روک دیا تھا......

اتحادی مقاصد کی سب سے بڑی خدمت ترکی نے ۱۹۴۲ء کے شروع میں انجام دی۔ جرمن اور اطالوی جو پورے یورپ پر قابض تھے مشرق وسطیٰ میں داخل نہ ہو سکے، سیاسی اور فوجی دونوں اعتبار سے اس نے جنگ کے نتیجے پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

۱۹۴۳ء سے بحر روم اور روس کے محاذ پر اتحادیوں کی پیش قدمی شروع ہو گئی۔ بڑی طاقتوں کے رہنما ملاقاتیں کر رہے تھے اور ان میں سے ہر ملاقات میں ترکی کے مسئلے پر بھی بحث ہوتی تھی۔

۱۹۴۳ء کے اختتام پر طہران کی ملاقات میں فیصلہ ہوا کہ ترکی سے شریک جنگ ہونے کے لئے کہا جائے۔ اور یہ فیصلہ ترکی تک پہنچا دیا گیا۔ ترکی صدر کو قاہرہ میں مدعو کیا گیا اور وہاں اس نے اس موضوع پر صدر روزویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم سے تبادلہ خیالات کیا۔ ترکی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہونے پر اصولاً متفق ہو گیا۔ اس نے پہلے ۲۰۰۰ ہزار ٹن سامان جنگ کی ایک مقررہ مقدار کا مطالبہ کیا تاکہ وہ جرمن یلغاری متوقعہ حملے کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

ایک برطانوی حربی وفد انقرہ آیا اور اس موضوع پر تفصیل سے تبادلہ خیالات ہوا۔ انگریز ترکی کو وہ سامان جس کی اُسے ضرورت تھی مہیا نہ کر سکتے تھے۔ جو کچھ وہ مہیا کرنے پر تیار تھے ترکی اُسے کافی نہیں سمجھتا تھا جس انداز سے یہ گفتگوئیں ہوئیں وہ نہایت افسوسناک تھا۔

فروری ۱۹۴۴ء میں انقرہ کی گفت و شنید بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے ختم ہو گئی۔ اور ترکی کے خلاف مغربی ملکوں کے اخبارات میں نکتہ چینی شروع ہوئی۔ گذشتہ ۵ سال بھلا دئے گئے۔ اگست ۱۹۴۴ء میں برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ نے ترکی سے جرمنی کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی تعلقات منقطع کرنے کو کہا۔ ترکی نے منظور کر لیا بلکہ جنگ میں فوراً شرکت کی طرف بھی میلان ظاہر کیا......

فروری ۱۹۴۵ء میں برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ کی درخواست پر ترکی نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ وہ اقوام متحدہ کا ایک رکن ہو گیا اور سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔

ان سالوں کے دوران میں ترکی کا سب سے اہم مسئلہ روس کے ساتھ اس کے تعلقات کا رہا ہے۔ روس نے مارچ ۱۹۴۵ء میں ترکی کو اطلاع دی کہ دونوں میں ۱۹۲۵ء سے جو دوستانہ معاہدہ ہے اور نومبر ۱۹۴۵ء میں ختم ہونے والا ہے وہ موجودہ صورت حال کے مطابق نہیں ہے اور اپنی شرائط میں زبردست تبدیلیاں چاہتا ہے۔ ترکی نے اتفاق کیا لیکن یہ نئی شرائط ایک عرصے تک نہیں بتائی گئیں۔ آخرکار جون ۱۹۴۵ء میں زیر بحث شرائط کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی مگر وہ ترکی کے لئے بہت مایوس کن تھی۔ اس عرصہ میں روس نے ریڈیو پر ایک نفسیاتی جنگ چھیڑ دی۔ اتحادی مقصد کی جو خدمات ترکی نے انجام دیں اور جو قربانیاں اس نے جنگ میں کیں ان کا کوئی ذکر مئی اور جون ۱۹۴۶ء میں نہیں کیا گیا۔ یہ سب باتیں

بالکل بھلا دی گئیں۔ ترکی نے غیر منصفانہ اور غیر ذمہ دارانہ الزامات کے اس طوفان جراءت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۴۶ء کے موسم گرما میں تین بڑی طاقتوں نے صلح نامہ مانٹریو پر نظر ثانی کی غرض سے ترکی کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا فیصلہ پوٹسڈام میں کیا برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا اور صلحنامہ مانٹریو پر نظر ثانی کئے جانے کی خواہش ظاہر کی۔

روس نے بھی اپنے ۷ اگست ۱۹۴۶ء کے مراسلہ میں اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا۔ اس نے ایک بالکل مختلف تجویز پیش کی اور وہ یہ تھی کہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف بحر اسود کی طاقتیں آبنائے کے انتظام پر بحث کریں اور آبنائے کی حفاظت ترکی اور روس مشترکہ طور پر کریں۔ ایک دوسرے مراسلے میں روسیوں نے اس کی تصدیق کی ترکی نے ان مطالبات کو منظور نہیں کیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ خود صلحنامہ میں تجویز کئے ہوئے طریقے کے مطابق نظر ثانی ہونی چاہئے۔

یہ ہے روس اور ترکی کے تعلقات کی موجودہ صورت حال اور امید ہے کہ آیندہ سب معاملات اقوام متحدہ کے اختیار کئے ہوئے "امن اور صلح" کے مطابق طے ہوا کریں گے۔ ۱۹۴۶ء سے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے ترکی سلامتی اور استحکام کی ایک مفید قوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان ترکی سے دوستانہ تعلقات کی اہمیت کو اور اس کی خدمات کی قدر و قیمت کو دوسرے ملکوں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتا ہے۔

امریکہ کو بھی ترکی کی حکمتِ عملی کے درست ہونے پر اب زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اقتصادی اور مالی نقطۂ نظر سے دوسری جنگ عظیم نے ترکی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ترکی نے اپنے تمدنی حالات درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اس نے تہذیب کے ہر میدان میں نئے ادارے قائم کئے ہیں اور وسیع پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس نے جراءت کے ساتھ اراضی کے متعلق اصلاحات کی ہیں اپنی سیاسی زندگی میں اس نے بالواسطہ عام حق رائے دہی کو قبول کر لیا ہے، اور سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئی ہیں۔

ترکی اپنے مزدور طبقے کی تنظیم کی غرض سے دور رس اصلاحات نافذ کر رہا ہے۔ اس وقت تک مختلف قسم کے بیموں کو رواج دینے کے لئے قوانین نافذ کئے گئے ہیں اور کام کی تقسیم اور تنظیم اس طریقے پر ہو رہی ہے جیسی مغربی جمہوریتوں میں ہے۔

کشمیر کا خط

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

پھر بھی چونکہ حکومت عوام ہی کے نمایندوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے اس لئے جہاں تک بآسانی ممکن ہے اوپر سے لے کر نیچے تک عوام کے ہی نمایندوں کو حکومت کے انتظام میں شریک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

عوامی حکومت کے ایک خاص حکم کے ذریعے ہر تحصیل میں ایک تحصیل کونسل قائم کی جا رہی ہے۔ تحصیل نیشنل کانفرنس کا صدر اس کونسل کا چیرمین اور تحصیلدار اس کا داعی مقرر کیا جاتا ہے۔ چیرمین اور داعی کے علاوہ کونسل کے دیگر اراکین کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ مقرر کی گئی ہے۔ اس کونسل کا کم از کم ایک جلسہ ہر مہینہ ہوتا ہے، اور اس کونسل کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ ہر بات پر نظر رکھے کہ عوامی حکومت کے احکامات کی تعمیل اس کی پالیسی اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔

تحصیل کونسل کے اوپر ضلع کونسل قائم کی جاتی ہے ضلع کونسل کا چیرمین، ضلع نیشنل کانفرنس کا صدر اور اس کونسل کا داعی وزیر وزارت ہوتا ہے۔ باقی ضلع کی جملہ کونسلوں کے چیرمین اس ضلع کونسل کے ممبر ہوتے ہیں۔

اس وقت تحصیل کونسل کے ممبران کا تقرر جنرل سکریٹری کشمیر نیشنل کانفرنس اور صدر صاحبان ضلع اور تحصیل نیشنل کانفرنس کی سفارشات پر وزیر مال کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل تحصیلوں میں کونسلیں قائم ہو چکی ہیں۔

۱۔ اننت ناگ	۲۔ بارا مولا	۳۔ پلوامہ
۴۔ کلگام	۵۔ ہندواڑہ	۶۔ بڈگام

ایک اور اہم اصلاحی قدم جو اٹھایا گیا ہے وہ ذیلداروں اور نمبرداروں کا انتخاب ہے۔ ریاست کشمیر میں یہ اسامیاں ہر دیہات کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی حیثیت زمینداروں اور جاگیرداروں جیسی ہو گئی تھی۔ اور باپ کے بعد بیٹے کو یہ اسامیاں وراثتاً ملا کرتی تھیں اور پھر یہ دونوں عہدہ دار اپنے افسران بالا کو خوش رکھ کر دیہاتوں پر بادشاہت کیا کرتے تھے۔

عوامی حکومت نے اب ذیلداروں اور نمبرداروں کا تقرر بھی دیہات کے عام انتخاب کے ذریعے کر دیا ہے۔ اس قرارداد نے پہلی بار دیہات دیہات عوام کو یہ محسوس کرا دیا کہ کشمیر میں سیاسی انقلاب ہو گیا ہے اور قوت، طاقت اور اختیارات سب عوام کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ یہی عوامی حکومت ہے۔ اور عوامی حکومت کے نئے کشمیر کی یہی اساس ہے۔ اسی لئے شیر کشمیر کا "نیا کشمیر" عوام کے لئے پیام زندگی ہے اور خواص کے لئے پیام موت! شیر کشمیر کی کمان میں یہی ایک تیر ہے جس سے وہ بیک وقت مہاراجہ بہادر اور پاکستان کے رجعت پسندوں اور مجاہدوں کا کامیابی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ پس ماندہ عوام کو ان کے پیروں پر کھڑا کر رہے ہیں، ان کو طاقت اور قوت دے رہے ہیں۔ اور پھر یہی عوام عوامی حکومت زندہ باد کشمیر زندہ باد! شیر کشمیر زندہ باد کے بے ساختہ نعروں سے اپنی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور شیر کشمیر کی قیادت کا اعتراف کرتے ہیں!

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت : یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۴۸

چندہ : سالانہ ۶ ، ششماہی ۳

افیون کی پینک
(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

کبھی روزہ رکھا تو دن چڑھتے سے پیٹ میں کچھ عجیب گھٹن سی ہونے لگتی تھی اور شام تک بڑھتی جاتی تھی ، اس بیماری کی دوا کسی حکیم نے نہ بتائی ۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ پیر صاحب کا نام نا کسا تھا جب اس کی رٹ لگاتے تو ٹی اور اس سے زمین کا خیال آتا اور ہمارا زخم ہرا ہو جاتا ۔ پیر جی سے عرض کیا تو وہ بہت خفا ہوئے اور ہمیں مردود شیطان کہہ کر نکال دیا ۔ اس کے بعد تمھارے صاحب ، تحصیل میں ایک فرق امین جو شاعر تھے ، انھوں نے رائے دی کہ تم شعر کہا کرو ۔ پھر دیکھنا کہ زمین کے سوا تمھیں زمین آسمان کی سدھ نہیں رہے گی شاعری کا مادہ تو ہم میں ہمیشہ سے تھا ، چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ تم ہر بات میں شاعری کرتے ہو ۔ مگر موزوں شعر اب تک نہ کہا تھا اب جو کہنا شروع کیا تو بڑے جھگڑے پڑ گئے ۔ لوگوں نے عجیب عجیب الزام لگائے ۔ کہنے لگے تمھارے صاحب فلاں شعر جو ہے وہ سرقہ ہے ، ایک شاعر اس مضمون کو انھیں لفظوں میں کہہ گیا ہے کوئی پوچھے تمھارے صاحب ہمارا اس میں کیا قصور ہے ؟ شرارت اس شاعر کی ہے جس نے ہمیں پھنسانے کے لئے پہلے ہی سے یہ مضمون کہہ دیا اور پھر انھیں لفظوں میں ۔ اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی یعنی عشق سو وہ بھی ہم نے کر دیکھا صبح شام پنگھٹ پر جاتے تھے اور گاؤں کی نازنینوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے تھے جیسا کہ عاشقوں کا قاعدہ ہے ہم کبھی آہ سرد بھرتے تھے ، کبھی سسکتے تھے کبھی روتے تھے کبھی جگر تھام کر بیٹھ جاتے تھے ۔ مگر تمھارے صاحب ان نیک بختوں کا برتاؤ بالکل قاعدے کے خلاف تھا ، انھیں چاہئے تھا کہ ہمیں ترچھی نظروں سے دیکھتیں ، پلکوں کے تیر کھیروں کی کٹاریں چلاتیں مسکراہٹ کی بجلیوں سے جلا دیتیں ہونٹوں کے امرت سے جلا دیتیں مگر یہ تو ہمیں دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتی تھیں اور ہمیں پانی کے چھینٹوں سے بھگو دیتی تھیں ۔ خیر اس میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا ، اگرچہ جاڑوں میں ذرا تکلیف ہوتی تھی ۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ ہماری طبیعت تھوڑی بہت بہلی رہی مگر تقدیر کو یہ بھی گوارا نہ تھا ۔ "وہ" جو آئیں تو انھوں نے عشق کی قطعی ممانعت کر دی چلئے چھٹی ہوئی ۔ اب تمھارے صاحب کا برا حال ہو گیا ۔ زمین کا غم پھر نشتر کی طرح چبھنے لگا اور دشمنوں سے بدلہ کا خیال کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا ، اب پھر ادھر کے چکر ہونے لگے ۔ ہم اپنے کھیتوں کے پاس نہیں جاتے تھے ، دور سے دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے ۔ اگر یہ وحشت چند سال اور رہتی تو خدا جانے ہمارا کیا انجام ہوتا ، مگر خدا کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا کہ ایک باکمال جوگی ادھر آ نکلا ، ہم تو ایسے لوگوں کی تلاش ہی میں رہتے تھے ۔ فوراً اس کی خدمت میں پہنچے ، اس نے ہم کو دیکھ کر کہا ، بابا تیرا دکھ بڑا بھاری ہے ، اس کو جیون سنکٹ کہتے ہیں ، یہ بیماری اس طرح ہوتی ہے کہ یہ جیون سنسار آدمی کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو جاتا ہے کہ نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے ۔ جب ایک آدمی کی یا پورے سماج کی تن من کی طاقت گھٹ جاتی ہے اور دنیا کا بوجھ نہیں گھٹتا تو زندگی نہ سنبھالے سنبھلتی ہے اور نہ چھوڑے چھوٹی جاتی ہے ۔ اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ اپنے میں اتنی شکتی پیدا کی جائے کہ جیون چیلا بن کر ہمارے آگے ڈنڈوت کرے ، یا پھر اسے مایا کہہ کر چھوڑ دیا جائے اور اپنے لئے دھیان گیان کا ایک مندر بنا لیا جائے جس میں ہم بھولے کو گیان سمجھے ہوئے ، نیند کو شانتی جانتے ہوئے ہنسی خوشی دنیا سے چلے جائیں ۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں ، تو نہ تو شکتی رکھتا ہے اور نہ گیان کے قابل ہے اس لئے میں تجھے ایک گٹکا دیتا ہوں جس کے کھانے سے تو دم بھر میں اپنی زمین کیا ساری زمین کی فکر سے چھوٹ جائے گا اور تن کی دنیا کے جھمیلوں سے چھوٹ کر من کی دنیا کی سیر کرے گا ، اور آپ ہی آپ مزے لے گا ۔ یہ کہہ کر اس نے ہمیں ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی

گولی دی ، جانتے ہو تمھارے صاحب ، یہ کیا چیز تھی ؟ یہ وہی تھی جسے دنیا والے افیم کہتے ہیں ۔ مبارک تھی وہ گھڑی جب ہم نے درد کی دوا پائی ورنہ لا دوا پایا تھا ۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی ہمیں زمین کی یاد نے ، بدلے کے خیال نے ، دنیا کی فکر نے نہیں ستایا ، کبھی کبھار ذرا سی بے چینی ہوتی ہے مگر جہاں افیون حلق سے اتری اور ہمارے اندر آرام کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں ۔ چین کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نرم نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ جھولا جھلا رہا ہے ۔ پھر زمین سے آسمان تک خاموشی ، سکون ، امن و امان چھا گیا ، ذرے ذرے میں صلح و آشتی اور محبت بس گئی ۔ اور ہماری روح بے خودی کی آغوش میں پہنچ کر بے خبری کا لطف اٹھانے لگی ، آج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وقت آن پہنچا ہے ، اور روز روز کے سونے جاگنے ، ڈوبنے ، اچھلنے سے نجات پا کر ہم ابدی نیند کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں ، اس لئے ہم نے تمھیں اپنی کہانی سنا دی کہ تم اسے سب ہندوستانی بھائیوں تک پہنچا دو ۔ اور انھیں وہ نسخہ بتا دو جس نے ہمارے سارے دکھ درد کو دور کر دیا اور ہماری زندگی کی مشکل کو حل کر دیا جسے عمر بھر ایک بار بھی یہ نعمت نصیب ہو گئی وہ قیامت تک اس کی لذت نہیں بھول سکتا ۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی پینک کے رات دن ۔۔۔ اونگھا کریں تصور جاناں کیے ہوئے

پاکستان
(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

مقصد کی خاطر ہو رہا ہے ۔ عوام اور پاکستان کی بہبود کے زاویہ نگاہ سے ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی پنجاب میں ایک مضبوط ، با اثر اور فرض شناس وزارت قائم ہو جو صحیح طور پر صوبے کے نظم و نسق کو سنبھالنے اور چلانے کی اہلیت رکھتی ہو ۔

رد و بدل کا مقصد اگر یہ ہے کہ بڑے بڑے آدمی عہدوں کی تقسیم پر برابر کے حصہ دار بن سکیں ۔ تو ہمیں اس سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہو سکتی ۔ یہ صورت وزرا کی تعداد کو بڑھانے اور ان برائیوں کو جو موجود ہیں المضاعف کرنے پر منتج ہو کر رہے گی ۔

مغربی پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ یہاں وزارتی الجھنوں کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے ہی میں نہیں آتا ۔ (مغربی پاکستان روزنامہ لاہور ۔ مورخہ ۳۰ نومبر)

"اہنسا اور مہاتما گاندھی"
(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

کی منزل تک رسائی ہو سکتی ہے ۔

یہیں سے گاندھی جی کی حکمرانی شروع ہوتی ہے ۔ اس عہد زریں کا آغاز ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان بلا کسی تفریق اور امتیاز کے احترام کے ساتھ جمنا کے کنارے ان کی سمادھی پر خراج عقیدت پیش کریں گے ۔ اس مقام پر جہاں سے وہ بہتی اور بل کھاتی ہوئی دوام سے ہمکنار ہونے کو بڑھتی ہے اور اس طرح ثابت ہو گا کہ گاندھی جی کے لئے کل انسانیت سوگوار ہے ، سوگوار ہی نہیں بلکہ ان کی زیر بار احسان ہے ۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں ۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دیں ۔ ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ ان کو نہ مل سکے ۔ "منیجر"

طابع و ناشر :۔ عبد اللطیف اعظمی بی اے (جامعہ)

۔۔۔ جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۲۱ | ۱۶ نومبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

شہادتِ حسینؑ

مولانا ابوالکلام آزاد

اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اسلاف پرستی کی صحیح اصول پر اسلامی تعلیم دیتا ہے۔ اس اسی صحیح اصول کے مطابق چاہیئے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعہ شہادت کے اندر عزم و استقلال، صبر و ثبات، استبداد شکنی، قیام جمہوریت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود ہیں ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں ساری و جاری کر دیں۔

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات میں ایک عظیم الشان بصیرت بھی موجود ہے، جس کا سلسلہ مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے۔

دور ابراہیمی میں بیٹے نے باپ کی، بی بی نے شوہر کی، بھائی نے بھائی کی دعوت حق پر لبیک کی صدا بلند کی اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر پیش آئیں، ان میں برابر کے شریک رہے۔ سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جادۂ روحانی کی طرف قدم بڑھایا اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے لخت جگر کو ایک وادی "غیر ذی زرع" میں ڈال دیا۔ جہاں کئی سو میل تک آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی جس کے لئے خداوند تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا تو انھوں نے باپ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے خاندان کی اعانت و رفاقت شریک رہی چنانچہ جب ان کو شعلۂ طور کی زبان سے بشارت نبوت دی، تو ان کی بی بی اُن کے ساتھ تھیں بلکہ ان کے لئے وہ آتش کدۂ طور سے آگ لینے گئے تھے۔

لیکن وادی ایمن میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ ایک برق خاطف تھی جو فرعون کے خرمن ظلم و استبداد پر گرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا کی صورت میں ان کو یہ صاعقۂ ہلاکت دیا اور انھوں نے اپنے بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا، تو خدا نے اُس کو پورا کیا۔

چنانچہ حضرت ہارون نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا اور دعوت موسوی کے ہمیشہ شریک و امین رہے۔

حضرت موسیٰ کے بعد اس سلسلے کو اور ترقی ہوئی۔ پہلے خدا کے ایک صالح بندے نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا، لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی کے جام مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے لئے سولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا اس کی جانب بلا کسی باک کے بڑھے ....

لیکن اسلام کے زمانے تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوئی تھیں وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں یعنی انبیا نے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنی اولاد یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جو ایک یہ ابتدا تھی، مگر اس کی تکمیل شریعت اسلام پر موقوف تھی چنانچہ اسلام نے جس طرح عقائد و عبادات اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی، اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔ اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا صرف شخصی طور پر جو قربانیاں کی گئیں وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا لیکن اس کا موقع ہی نہ آیا۔ حضرت عیسیٰ سولی کی طرف بڑھے لیکن بچا لیے گئے۔ آج تک تمام خاندان نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلۂ انبیا میں نہیں نظر آتی تھی نہ صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصد نبوت کا ساتھ دیا ہو بلکہ جانشین خاندان نبوت کے اکثر انصار و ارکان راہ حق میں قربان ہو گئے ہوں۔

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لئے جو ہاتھ بڑھے تھے وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور مذہب کی قربانیاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ اس لئے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا وقت آیا تو خاندان نبوت کے زن و مرد، بال بچے غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا اور جس سرزمین کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ سے نہیں، بلکہ اسلام کی اصلی حقیقت سے ہے یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا، اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو پہنچ کر گم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندان نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اجڑتا رہا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھر بار چھوڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آوارہ گردی کی، اور نبوت محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدان کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
شہادت حسینؑ	مولانا ابوالکلام آزاد	۱	چاندنی رات (نظم)	اختر انصاری	۷
حسینؑ اور انسانیت	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲	رباعیات	باقر رضوی	۷
امریکہ میں صدر کا انتخاب (اداریہ)		۳		ڈاکٹر سعید بریلوی	۷
بزم بے تکلف		۳	اکبری نشتر	طالب الہ آبادی	۸
پچھلا ہفتہ ۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴	اے کاش (افسانہ)	عبداللطیف اعظمی	۹
۲۔ پاکستان	ع، ل	۵	ہم صفیروں کی آواز		۱۰
۳۔ باہر کی دنیا	م، م		ازبکستان کے قومی کھیل	عبدالستار	۱۱

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ نومبر ۱۹۴۸ء

امریکہ میں
صدر کا انتخاب

۲ نومبر سے ۴ نومبر تک ساری دنیا کی نظریں امریکہ کے صدارتی انتخاب کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پچھلے زمانے میں جتنے اندازے کئے گئے تھے، ان کی بنا پر یہ بات یقینی معلوم ہوتی تھی کہ ریپبلکن پارٹی کے امیدوار مسٹر ڈیوی بڑی اکثریت سے منتخب ہوں گے۔ مگر ۴ نومبر کو ہر شخص یہ سن کر حیرت میں رہ گیا کہ ڈیموکریٹ امیدوار مسٹر ٹرومین کو کوئی تیس لاکھ ووٹوں سے کامیابی ہو گئی ہی نہیں بلکہ دونوں آئین ساز مجالس میں ان کی پارٹی کی معقول اکثریت رہی۔ اور امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں سے ۳۰ میں ڈیموکریٹ گورنر منتخب ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسٹر ٹرومین کو اپنی پالیسی پر عمل کرنے میں جو آئینی رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں وہ دور ہو گئیں اور اب وہ زیادہ آزادی سے کام کر سکیں گے۔

اس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہہ امریکہ کے اخبارات یہ کر رہے ہیں کہ روشن خیال تعلیم یافتہ طبقے، مزدور طبقے اور نیگرو جماعت کے علاوہ جن سے پہلے ہی سے امید تھی، بہت سے زمیندار کسانوں نے بالکل خلاف توقع ڈیموکریٹ پارٹی کا ساتھ دیا۔ چونکہ مسٹر ٹرومین میں وہ غیر معمولی قابلیت اور ذاتی کشش جو روز ویلٹ آں جہانی میں تھی نہیں ہے اس لئے ان کا زراعتی طبقے میں سے کچھ لوگوں کی تائید حاصل کر لینا یقیناً یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ان کی پالیسی کو پسند کرتے ہیں اور رجعت پسندی کا زور جو امریکہ میں پچھلے دو سال میں بہت بڑھ گیا تھا اب کچھ گھٹ رہا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر ٹرومین کی پالیسی کیا ہے اور امریکہ کو وہ آئندہ چار برس میں کس راہ پر چلائیں گے۔

جہاں تک اندرونی معاملات کا تعلق ہے مسٹر ٹرومین اپنی پالیسی کا بڑی جرأت اور استقامت سے اعلان کرتے رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ زراعت، صنعت اور تجارت کی نگرانی میں، قیمتوں کے مقرر کرنے میں، درآمد اور برآمد کے ضبط میں ریاست کا کافی دخل رہے۔ اور سرمایہ داروں کے نفع خوری کی خواہش کو قابو میں رکھا جائے۔ ان کا اصرار ہے کہ نیگرو جماعت کو شہریت کے پورے حقوق حاصل ہوں اور سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے اس کے ساتھ کامل مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ غرض عام طور پر وہ مسٹر روز ویلٹ مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

البتہ بیرونی معاملات میں کچھ عرصے سے ان کا رویہ تلون کا رہا ہے۔ کبھی انھوں نے یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ جنگ کا فوری خطرہ ہے اس لئے بری، بحری اور ہوائی فوج میں بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی جائے گی اور کبھی یہ اطمینان دلایا کہ ابھی لڑائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آج روس کو دوستانہ گفتگو کا پیام دیا اور کل اس کی ایسی تاویل کر دی کہ ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ادھر اتحادیوں کے اور روس کے جھگڑے کو فیصلے کے لئے یو۔ این۔ او کی پنچایت میں پیش کیا اور ادھر مارشل اسٹالین سے صلح کی گفتگو کرنے کے لئے اپنا ایک خاص ایلچی بھیجنے پر تیار ہو گئے۔ ان کی اس دو رنگی کی وجہ یا تو ارادے کی کمزوری ہو سکتی ہے یا کوئی سیاسی مصلحت۔ پہلی بات اس وجہ سے قرین قیاس نہیں کہ اگر ان کا ارادہ کمزور ہوتا تو ان کی اندرونی پالیسی اس قدر صاف اور مضبوط نہ ہوتی اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ بیرونی پالیسی میں یہ ظاہری تضاد دراصل اصول اور مصلحت کا تضاد ہے۔ شاید مسٹر ٹرومین بھی روز ویلٹ کی طرح اصولاً روس کے ساتھ مصالحت کا برتاؤ کرنے کے حامی ہیں لیکن شک اور خوف کی فضا کی وجہ سے جو دنیا میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی اور امریکہ میں الیکشن کے زمانے میں خاص طور پر پھیلائی گئی تھی وہ اس پر مجبور تھے کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی جنگ کا نعرہ لگاتے رہیں۔ اب الیکشن کا بخار اترنے کے بعد امریکہ میں لوگوں کی طبیعت سکون پر آ جائے گی اور مسٹر ٹرومین کو اپنا اصلی خیال ظاہر کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ ہمارا حسن ظن ان کی صلح پسندی کے بارے میں صحیح ہے یا نہیں

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں مسٹر ٹرومین اور ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی پر اطمینان ظاہر کیا جا رہا ہے۔ انگلستان کی لیبر حکومت کو یہ فکر تھی کہ امریکہ میں قدامت پسند ریپبلکن پارٹی برسر اقتدار آ گئی تو اس کے ساتھ کیسے نباہ ہو سکے گا، دور ہو گئی۔ مغربی یورپ کے ملکوں کا یہ اندیشہ جاتا رہا کہ امریکہ میں انقلاب حکومت کے بعد یورپ سے دلچسپی کم ہو جائے گی اور مسٹر مارشل کا یورپ کی معاشی امداد کا منصوبہ پورا نہ ہو سکے گا۔ ایشیائی ملکوں کی یہ خلش مٹ گئی کہ کہیں امریکہ کی ریپبلکن حکومت موجودہ حکومت سے بھی زیادہ نو آبادیوں کے معاملے میں سامراجی ریاستوں کی حمایت نہ کرنے۔ یہاں تک کہ روس کو بھی جس کے نزدیک ڈیموکریٹ اور ریپبلکن ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انتخاب کے نتیجے سے خاصی خوشی ہوئی اس لئے کہ وہ کتنا ہی کہے کہ دونوں پارٹیاں بالکل ایک سی ہیں مگر دل میں ضرور سمجھتا ہے کہ ریپبلکن پارٹی جس پر بڑے سرمایہ دار حاوی ہیں ڈیموکریٹک پارٹی سے کہیں زیادہ اس کی دشمن ہے۔

صرف چین ایک ایسا ملک ہے جہاں چیانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں کو انتخاب کے نتیجے سے مایوسی ہوگی اس لئے کہ مسٹر ڈیوی نے شمال کے کمیونسٹوں کے مقابلے میں قومی حکومت کو براہ راست زیادہ سے زیادہ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اب مسٹر ٹرومین کے وزیر خارجہ مسٹر مارشل نے بھی یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ بہت جلد کمیونسٹوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے چین کو کافی مدد دیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اپنا وعدہ پورا بھی کریں مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ چیانگ کائی شک کی آمرانہ حکومت کے قیام کو قائم رکھنا پسند کریں گے یا زیادہ جمہوری اور ترقی پسند عناصر کو سہارا دے کر ابھاریں گے۔

غرض امریکہ کے انتخاب صدارت کے نتیجے نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس سیاسی اور معاشی بحران کے باوجود جو پچھلی جنگ نے پیدا کر دیا ہے دنیا صحت عقل کی راہ سے زیادہ دور نہیں ہٹی ہے۔

بزم بے تکلف

"اچھا صاحب ایک ہوا مستند یا ٹکسالی لیڈر، ایک متروک لیڈر دو کے دو ہی قسم، اب آگے چلئے۔"

"علیٰ ہذا القیاس"

"دیکھئے مولانا آپ نے پھر دھاندلی کی، عربی میں نخرا نے کی ٹھہری تھی۔"

"آپ کے لئے تو عربی کا ہر لفظ لاحول ہے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کو آپ غیر مانوس یا غریب کہہ سکتے ہیں۔"

"بھئی واہ! کہاں غیر مانوس، کہاں غریب، آپ نے دونوں کو "یا" کی آلپین سے نتھی کر دیا۔ غیر مانوس لیڈر تو اپنے محل میں میز فرش کی طرح قالین پر دھرا رہتا ہے غریب لیڈر بچارا غریبوں کی جھونپڑیوں میں ان کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتا ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں یہاں غریب عرفی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔"

"جی میں عرفی، لغوی، سماری، حافظ تو جانتا نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ غریب تو غریب ہی ٹھہرا اسے جیسے چاہئے استعمال کر لیجئے۔"

"خیر اس نزاع لفظی کو چھوڑئے، آپ غیر مانوس ہی کہئے"

"اچھا تو غیر مانوس لیڈر"

"معاف کیجئے گا، اب دائرہ میرا ہے مجھے کہنے دیجئے۔ غیر مانوس لیڈر جاپانی میکاڈو کی طرح جاہتا ہے کہ لوگ اسے سات پردوں کے اندر طاق میں بٹھا کر دور سے پوجا کریں، اس کا سمرن بہت ہوتا ہے، درشن بہت کم۔ اس کا سکہ اس کے نام سے چلتا ہے چہرے سے نہیں"

"آپ نے تو لیڈر کو بالکل لات و ہبل بنا دیا۔"

"تو بہ کیجئے، بھلا میں ایسی حرکت کر سکتا ہوں، اس کی امت مار مار کے بھرکس نہ نکال دے۔"

"ایسے لیڈر کے پیچھے تو لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں مولانا۔ جتنا وہ آپ کو دور کھینچتا ہے اتنے ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں جتنا وہ دتکارتا ہے، اتنی ہی دم ہلاتے ہیں۔"

"اور جو کہیں پردہ اٹھ جائے!"

"تو بس قیامت ہی آ جائے۔"

پچھلا ہفتہ: ا۔ ہندوستان

آخری مرحلہ

۴ نومبر سے مجلس آئین ساز کا اجلاس شروع ہوگیا ہے جس میں ہندوستان کے آئین کی منظوری کا آخری مرحلہ طے ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی تقریر میں بڑی قابلیت سے حسب ذیل بنیادی اصول سمجھائے جن کو سامنے رکھ کر آئین کا مسودہ مرتب کیا گیا ہے۔

۱۔ ہندوستان مختلف ریاستوں کا ایک وفاقی یونین ہوگا جس میں مرکز کے اختیارات بہت وسیع ہوں گے۔ یہ اختیارات ۹۱ مدوں پر مشتمل ہوں گے جن میں خاص خاص مدیں دفاع، مواصلات (ڈاک تار، ریل وغیرہ)، امور خارجہ، ہوں گے۔ اس کے علاوہ بعض مدوں میں اختیارات مرکز میں اور صوبوں میں (جو ریاستوں کے نام سے موسوم ہوں گے تقسیم ہوں گے مثلاً عدالت۔ ریاستوں کی اپنی عدالتیں بھی ہوں گی مگر وہ مرکزی سپریم کورٹ کے ماتحت رہیں گی۔

۲۔ دیوانی فوجداری کے بنیادی قوانین اور شخصی قانون (پرسنل لا) میں سارے ملک میں یکسانی قائم رکھی جائے گی شہریت ریاستوں کی الگ الگ نہیں ہوگی بلکہ ہر ریاست کے باشندے کو پورے ہندوستان کی شہریت حاصل ہوگی۔

۳۔ سارے ملک کے لئے ایک مشترک سول سروس ہوگی۔

۴۔ طرز حکومت پارلیمنٹری یعنی وزرا پارلیمنٹ کے ممبر ہوں گے اور اس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

اب تک آئین کے مسودہ کے بارے میں عام بحثیں ہو رہی ہیں۔ سب سے پہلا اعتراض جو رد کردیا گیا سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے تھا کہ موجودہ اسمبلی جسے رائے دہندوں کی محدود تعداد نے منتخب کیا ہے پوری جنتا کی نمائندہ نہیں اس لئے اسے آئین بنانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اور متضاد اعتراضات کئے گئے مثلاً مرکز کے اختیارات بہت زیادہ ہیں یا بہت کم، اقلیتوں کے لئے تحفظات نہیں ہونے چاہئیں یا جتنے اب ہیں اس سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئین کے بڑے بڑے اصولوں کے بارے میں زیادہ اختلاف نہیں ہوگا اور وہ بغیر کسی رد و بدل کے منظور ہو جائیں گے۔ البتہ ضمنی مسائل، مثلاً قومی زبان، صوبوں کی زبان کے لحاظ سے تقسیم اور اقلیتوں کے حقوق وغیرہ کے بارے میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوں گی، اور ان کے طے کرنے میں بڑی دیر لگے گی۔ اس لئے یہ امید کہ آئین آخر دسمبر تک مکمل طور پر منظور ہو جائے گا کچھ موہوم سی نظر آتی ہے۔ زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ معرکے کا معلوم ہوتا ہے جنوبی ہند کے ممبروں کا زور شور سے مطالبہ ہے کہ پندرہ سال تک مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ کی زبان بدستور انگریزی رکھی جائے۔ ادھر ہندی ساہتیہ سمیلن کے ہم خیالوں اور ہندوستانی پرچار سبھا کے ہم خیالوں میں ہندی اور ہندوستانی کے لئے رسہ کشی ہو رہی ہے۔ اس وقت تو اسمبلی میں یہ بحث ملتوی کردی گئی ہے اور دونوں فریق اسمبلی کے ممبروں میں اپنے اپنے خیال کی اشاعت کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہندی کے حامی چاہتے تھے کہ زبان کا مسئلہ پہلے ہی دن پیش ہو اور جو زبان قومی زبان قرار پائے اسی میں آئین کا مسودہ سنایا جائے۔ مگر اس کی اجازت نہیں ملی۔ اصل مسودہ انگریزی میں لکھا گیا ہے، اور اسی میں پڑھ کر سنایا جائے گا جب قومی زبان کی دفعہ کی باری آئے گی تو ہندی اور ہندوستانی کا معرکہ پھر گرم ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمہور کی بہت بڑی اکثریت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانی جو ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ملک کی قومی زبان ہو۔ لیکن اس وقت تعصب کی فضا میں وہ طبقہ جس کے پاس لاؤڈ اسپیکر ہے جمہور کی آواز کو دبا سکتا ہے، اور دبا رہا ہے

یہ تو بہت اچھا ہی

آئین کے بارے میں ایک بڑی خلش یہ تھی کہ کہیں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی واپسی کے بعد اس رزولیوشن میں جسے آئین ساز اسمبلی نے جنوری ۱۹۴۷ء میں بنیادی مقصد کے بارے میں پاس کیا تھا، ترمیم کا قصہ نہ چھڑ جائے۔ اسمبلی نے یہ طے کردیا تھا کہ ہندوستان ایک اقتدار اعلیٰ کی حامل آزاد ریپبلک کی حیثیت رکھے گا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پنڈت نہرو نے کامن ویلتھ کے وزرا کی کانفرنس کے بعد جو بیان دیا تھا کہ ہندوستان کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں سے قریبی اور گہرے تعلقات رکھنے پر تیار ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ریپبلک نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر پہلے ہی تجویز کر چکے تھے کہ بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں سے "ریپبلک" کا لفظ ہٹا کر اس کی جگہ "ریاست" کا بے رنگ لفظ رکھ دیا جائے۔ اس لئے ہر شخص بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ دیکھیں پنڈت جی لندن سے واپس آکر اس گفتگو کے بارے میں جو وہاں ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے مسئلے پر ہوئی کیا رپورٹ دیتے ہیں، اور اس کی بنا پر ہندوستان کے آئین میں ترمیم تجویز کرنی پڑتی ہے۔ شکر ہے کہ موصوف کی پہلی تقریر کے بعد جو ۸ نومبر کی اسمبلی کے سامنے ہوئی ساری خلش مٹ گئی۔ اس تقریر کے خاص نکتے جو مذکورہ بالا مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ لندن کی کانفرنس میں ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی گئی۔ البتہ برطانوی وزیر اعظم اور کامن ویلتھ کے دوسرے مدبروں کے نجی ملاقات میں گفتگو ہوئی۔

۲۔ یہ گفتگو تبادلہ خیالات تک محدود رہی، کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ فیصلہ خود اسمبلی کو مناسب وقت پر کرنا ہوگا۔

۳۔ ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے مسئلے کو ہندوستانی آئین کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ آئین صرف اپنی اندرونی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر بنایا جائے گا۔ اسمبلی کو بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں ترمیم کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اگر ہندوستان کی آزاد ریپبلک کی حیثیت میں کسی تبدیلی کا سوال نہیں ہے تو ہند اور کامن ویلتھ کے تعلقات کا مسئلہ محض خارجی پالیسی کا مسئلہ رہ جاتا ہے جسے اسمبلی پنڈت جی کی رہنمائی میں بغیر ہیجان خیز اور طوفان انگیز بحثوں کے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد طے کر سکتی ہے۔

کیا کچھ رنگ بدل رہا ہی

لیاقت علی خاں صاحب نے لندن سے واپسی کے بعد ۸ نومبر کو جو تقریر کی اس کی ابھی تک صرف ایک مختصر سی رپورٹ آئی ہے۔ جہاں تک اس مجمل اطلاع سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کشمیر کے بارے میں ان کا لہجہ خاصا معقول اور معتدل ہے فرماتے ہیں "میں نے پنڈت نہرو پر اور دوسرے حضرات پر جنھوں نے کشمیر کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اچھی طرح واضح کردیا کہ اس مسئلہ کا منصفانہ فیصلہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کشمیر کے لوگوں کا یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شرکت کرنے کے بارے میں آزادی سے اظہار رائے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان بھی جمہوریت کا قائل ہے اور پاکستان بھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے، کیا یہ بڑی بے انصافی نہ ہوگی کہ کشمیر میں لاکھوں انسانوں کی رائے کو نظر انداز کیا جائے اور انھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے؟"

اگر تقریر میں اس کے بعد کشمیر پر پاکستان کے قدرتی حق کا "پینتیس لاکھ مسلمانوں اور دنیا کی سب سے بڑی ریاست" کا اور "خون کے آخری قطرے" کا کوئی ذکر نہیں ہے تو نہایت خوشی کی بات ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب نے اب مصالحانہ لہجہ اختیار کرلیا ہے اور اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ کشمیر کمیشن کی مدد سے یا اس کی مدد کے بغیر ہندوستان اور پاکستان میں کوئی سمجھوتے کی صورت نکل آئے گی، اس لئے کہ ہندوستان کی حکومت نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا اور آج تک اس پر قائم ہے کہ کشمیر کے معاملے کا آخری فیصلہ وہاں کے جمہور کی رائے سے ہوگا۔ لیکن لیاقت علی خاں صاحب کی معقول پسندی اور صلح جوئی کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب عام رائے شماری کی شرائط کا سوال اٹھے گا اگر انھوں نے اس وقت بھی کشمیر سے پاکستانی فوجوں کے ہٹانے سے انکار کیا اور ہندوستانی فوجوں کے ہٹانے پر اصرار کیا یا یہ پخ لگائی کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کو ہٹا کر یو۔ این۔ او۔ کی حکومت قائم کی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان کی صلح کی باتیں محض باتیں ہی باتیں ہیں۔"

(ع۔ ح)

۳۔ باہر کی دنیا

چین کا نقشہ بدل رہا ہے

جو لوگ چین کی حالت سے واقف نہیں ہیں اور خانہ جنگی کے دونوں فریقوں کی فوجی نقل و حرکت کو نقشے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش برابر نہیں کرتے رہے ہیں ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ چین کے شہر اور آبادیاں جو اب تک ہیں جن میں نیشنلسٹ اور کمیونسٹ دونوں لڑ رہے ہیں۔ جہاں لڑائی ختم ہوتی ہے ان کی تعمیر ہو جاتی ہے وہاں لڑائی لگتی ہیں۔ کچھ عرصے تک شاید حقیقت بھی یہی تھی لیکن اب رفتہ رفتہ ملک دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ یانگ ٹسے پر اور اس دریا کے جنوب میں نیشنلسٹوں کا پورا قبضہ ہے۔ یانگ ٹسے اور پیلا انگ ہو کے درمیان جو علاقہ ہے اس کے زیادہ بڑے حصے پر نیشنلسٹوں کا تسلط ہے۔ مگر اس کا ساحل تقریباً سارا کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس علاقے کے وسط میں وہ نانکنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہوانگ ہو کے شمال میں نیشنلسٹ فوجیں تین چار شہروں میں محصور ہیں، اور پائی پنگ اور تین تسین کا کاروبار اور ان کے گرد تھوڑا سا علاقہ ان کے پاس ہے۔ باقی سب کمیونسٹوں نے فتح کر لیا ہے۔ منچوریا پر پہلے ہی سے کمیونسٹوں کا روسیوں کی مدد سے قبضہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے دار السلطنت مکڈن میں نیشنلسٹ قدم جمائے ہوئے تھے۔ مکڈن اسلحہ سازی کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے، اور چونکہ شروع میں سمندر سے مکڈن تک رستہ تھا نیشنلسٹ فوجیں اطمینان سے مقابلہ کر سکتی تھیں، لیکن یہ رستہ بند کر دیا گیا، ہوائی جہازوں کے ذریعے بہت بڑی فوج کے لئے جنگ کا سامان اور رسد پہنچانا نیشنلسٹ حکومت کے بس کی بات نہیں تھی، اور آخرکار مکڈن فتح ہو گیا۔ اب غالباً چین کا وہ پورا حصہ جو یانگ ٹسے کے شمال میں ہے نیشنلسٹ حکومت کے ہاتھ سے جلد نکل جائے گا۔

مارشل چیانگ کائی شک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مکڈن کا فتح ہو جانا نیشنلسٹ حکومت کے لئے ایک بھاری شکست ہے۔ مگر ابتک چین کی حالت کو درست کرنے کی صرف دو تدبیریں ان کی سمجھ میں آئی ہیں، ایک یہ کہ چین کی حکومت ان کے اپنے ہاتھ میں رہے دوسری یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے کمیونسٹوں سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ کمیونسٹ مصالحت کی پیشکش کر چکے ہیں۔ مگر مصالحت کے ذریعے وہ حکومت اور اس کی پالیسی میں کچھ تبدیلیاں کرانا چاہتے تھے، اور یہ مارشل چیانگ کو منظور نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے چین کی حالت سدھارنے سے زیادہ انھیں اپنے شخصی تسلط کو قائم رکھنے کا خیال ہے، اور اسی کے لئے وہ کمیونسٹوں سے لڑ رہے ہیں۔

مارشل چیانگ کی پشت پر وہ زمیندار اور سرمایہ دار ہیں جو کمیونزم کے عروج سے پہلے چین کی معاشی اور سیاسی زندگی پر پورے حاوی تھے، اور جو اب اپنی پونجی اور زمین اور حیثیت کو بچانے کے لئے کمیونسٹوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چاہے اس میں ملک برباد ہو جائے۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے وہ مارشل چیانگ کی جگہ اپنا لیڈر بنا سکیں، اور ان کا پورا طبقہ ان اخلاقی خوبیوں سے خالی ہے جو ملک اور حکومت کو معاشی حالت سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔ چین کا چور بازار اس وقت مندا نہیں پڑا جب جاپان سے جنگ ہو رہی تھی، ملک کا تھوڑا ہی سا حصہ آزاد تھا۔ اور یہ بھی ہر چیز کے لئے دوسروں کا محتاج تھا۔ اس چور بازار کا کاروبار اب اور بھی فروغ پر ہے۔ چین کے پرانے سکے کی قیمت اس قدر گر گئی تھی کہ معاشی نظام کو سنبھالنے کے لئے ایک نیا سکہ جاری کیا گیا، مگر اس کی قیمت بھی گرنے لگی ہے۔ زندگی کی بنیادی ضرورتیں نفع اندوزی کا ذریعہ بنالی گئی ہیں، اور اخلاق اور سیاست کے کسی اصول میں اتنی بھی قوت نہیں ہے کہ نفع اندوزی کی بے پناہ ہوس کو انسانیت کی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ کر سکے۔ قومی معیشت کا اس طرح بگڑ جانا ممکن نہ ہوتا اگر حکومت ان خرابیوں کو گوارا نہ کرتی اور چور بازار کے فروغ کو اس انقلاب پر ترجیح نہ دیتی جس کا نمونہ کمیونسٹوں کی معاشی تنظیم میں نظر آ رہا ہے۔ چین میں شاید سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ نئی معاشی تنظیم کا کوئی خیال دل میں لایا اور زبان سے بیان کیا جائے۔ چین کے نوجوان جن کی ہمت اور استقلال نے جاپانیوں کو عاجز کر دیا تھا اور جو جنگ کے بعد صرف اس کا مطالبہ کر رہے تھے کہ معاشی تنظیم میں قوم کے مفاد کو مقدم سمجھا جائے، خاموش کر دیئے گئے، اب نیشنلسٹ حکومت کی پشت پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد اور مارشل چیانگ کی مصلحتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مارشل چیانگ کا اب بھی یہ عزم ہے کہ چین سے کمیونسٹوں کا نام و نشان مٹا دیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں آٹھ برس لگیں گے لیکن آٹھ برس میں چین کا کیا حال ہو جائے گا؟

انڈونیشیا میں پھر جنگ چھڑ رہی ہے؟

کمیونسٹوں پر ہمیشہ شبہہ کیا جاتا ہے کہ وہ روسی سیاست کے آلۂ کار ہیں۔ ایسے الزام لگانا آسان ہے، اور انھیں ثابت کرنا ——— اور ان کا جواب دینا ——— بہت مشکل ہے۔ کہیں کمیونسٹ ہی ایسی جماعت ہوتے ہیں جو رجعت پسندی اور خود غرضی کے مقابلے پر آتی ہے کہیں کمیونسٹوں کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ رجعت پسندوں سے پہلے ان لوگوں سے لڑیں جو انقلاب چاہتے ہیں، مگر کمیونسٹ مارکے کا انقلاب نہیں چاہتے۔ انڈونیشیا میں کمیونسٹوں نے ایک بہت ہی نازک وقت پر قومی حکومت سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ وہ اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن قومی حکومت کو انھوں نے بہت کمزور کر دیا۔ اب ڈچ حکومت پھر پیش قدمی کرنے والی ہے، اور پچھلی مرتبہ کی طرح اس دفعہ بھی وہ اسے پولیس کی کارروائی قرار دے گی۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت نے یو، ان، او سے مداخلت کی درخواست کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ اگر وقت پر مدد نہ کی گئی تو انڈونیشیا سے ربڑ اور تیل ملنے کی کوئی امید نہ کرنی چاہیئے۔ ڈچ حکومت نے اپنی طرف برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی حکومتوں اور بڑے سرمایہ داروں سے کوئی معاملہ کیا ہوگا۔ اب تک وہ اپنا ہاتھ روکے ہوئے تھی اس لئے کہ مغربی دنیا کے حالات ایسے نہیں تھے کہ جنگ کا کوئی نیا منصوبہ شروع کیا جائے۔ جب برطانیہ نے ملایا میں کمیونسٹ گروہوں کے خلاف علانیہ فوجی کارروائی کی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہولینڈ انڈونیشیا کی قومی حکومت سے نہ لڑے جو خود سوشلزم کی طرف مائل ہے اور کسی وقت بھی بنیادی انقلاب پر کمربستہ ہو سکتی ہے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین کی کرامات

امیدواروں کو اپنے اور اپنی ہر دلعزیزی کے متعلق ہمیشہ مغالطہ ہوتا ہے اور جب کسی انتخاب سے ہزارہا آدمیوں کی سیاسی ترقی وابستہ ہو تو اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ عام رائے کس کو عزت افزائی کا مستحق سمجھے گی۔ امریکہ کے انتخاب صدارت میں ایسا معلوم ہوتا تھا سب مسٹر ڈیوی کے ساتھ ہیں۔ پریسیڈنٹ ٹرومین کو ان کی اپنی ڈیموکریٹک پارٹی کے وہ لوگ جو "صدر گر" مانے جاتے تھے گلے کا طوق سمجھتے تھے، پارٹی کے جلسے میں جب امیدوار کو منتخب کرنا تھا انھوں نے بڑی بددلی اور ہچکچاہٹ کے بعد پریسیڈنٹ ٹرومین کو نامزد کیا۔ جب امیدوار میدان میں آئے تو پریسیڈنٹ ٹرومین کی نااہلی کا چرچا کیا جانے لگا، تقریباً تمام بڑے رسالے اور اخبار، اور ڈاکٹر گیلپ جن کا پیشہ ہے کہ قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بتاتے رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہے، کیا نہیں چاہتی، ایک زبان ہو کر کہنے لگے کہ پریسیڈنٹ ٹرومین کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ انتخاب کا نتیجہ پریسیڈنٹ ٹرومین کے سوا سب کے اندازے کے خلاف نکلا۔ تب اس کی توجیہیں کی جانے لگیں۔ معلوم یہ ہوا کہ متحدہ ریاستوں میں "عام آدمیوں" کی اپنی رائے بھی ہے اور یہ اخباروں کی رائے سے ایک الگ چیز ہے۔ مسٹر ڈیوی کو بڑے سرمایہ داروں کی، اپنی پارٹی کی اور ممتاز اخباروں کی تائید حاصل تھی، عام آدمیوں کو، جن میں بہت بڑا حصہ مزدوروں کا تھا، یہ شبہ تھا کہ مسٹر ڈیوی مال دار طبقے کے اثر میں رہیں گے انفلیشن کو دور کرنے کی خاص کوشش نہ کریں گے، اور مزدوروں کی مخالفت کریں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ انھیں ایسا صدر نہیں چاہیے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین اپنی ذاتی کوشش سے منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی پارٹی کے ممتاز لوگوں کا ان پر کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دینا پڑے۔ اس لئے وہ بہت آزاد ہو گئے ہیں، اور ان کی قسمت سے کانگرس میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی کی اکثریت ہے۔ کوئی غیر معمولی صلاحیت کا آدمی ہوتا تو وہ اس موقع سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا، لیکن اب تک پریسیڈنٹ ٹرومین نے اپنے وزیروں کے انتخاب میں کوئی بڑی غلطی نہیں کی ہے اور امریکہ کی سیاست اس وجہ سے کمزور نہ پڑے گی کہ اس کا کام کرنے والے اچھی قابلیت کے لوگ نہیں ہیں۔

"امریکہ کی آواز"

جب سے کانگرس کی ایک کمیٹی نے یہ رائے دی ہے کہ ریڈیو کے ذریعے پروپیگنڈا کرنے میں فائدہ ہے، کانگرس نے اس کام

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

چاندنی رات کا ایک منظر

اختر انصاری

دیکھ اگر ہے چشمِ بینا، دیکھ اے دنیائے دوں
یہ شبِ مہ کا نظارہ دیکھ لے دنیائے دوں

ڈھیر کوڑے کا ہے یہ یعنی غلاظت کا جہاں
گندے پانی اور کیچڑ کی عفونت کا جہاں
اس کی رگ رگ میں بھری ہے کس بلا کی گندگی
سڑتی لاشوں میں نہ ہوگی اس بلا کی گندگی
گجگجاتے رینگتے ناپاک کیڑے بے شمار
دور سے بھی دیکھنا جن کا طبیعت کو ہے بار
اس غلاظت کی بتائے کوئی کیا تفصیل حال
مارے بدبو کے گزرنا بھی اُدھر سے ہے محال
یہ وہ شے ہے دھیان سے بھی جس کے اُبکائی سی آئے
خلد میں بھی سوچئے سے اس کے اُبکائی سی آئے
ڈھیر کوڑے کا ہے یہ یعنی غلاظت کا جہاں
گندے پانی اور کیچڑ کی عفونت کا جہاں

اس کو اپنے نور میں نہلا دیا ہے چاندنے
اس پہ حسن سیمیا برسا دیا ہے چاندنے
ہاتھ کرنوں کے بڑھا کر لے لیا ہے گود میں
بے تکلف پاس آکر لے لیا ہے گود میں

دیکھ اگر ہے چشمِ بینا، دیکھ لے دنیائے دوں
یہ شبِ مہ کا نظارہ دیکھ لے دنیائے دوں

رباعیات

معما؟

اضداد کا مجموعہ یہ عالم کیوں ہے؟
گلشن میں یہ امتیاز باہم کیوں ہے؟
غنچہ کیوں عمر بھر ہنسا کرتا ہے؟
سرتاپا المِ حیاتِ شبنم کیوں ہے؟

ایک سوال

وجہ یاس و ملال کس سے پوچھوں؟
سوکھے پھولوں کا حال کس سے پوچھوں؟
دنیا میں بہار بھی کبھی آئے گی۔
چبھتا ہوا یہ سوال کس سے پوچھوں؟

وجہ تسکین

آئینۂ دل کو جگ مگا کر دیکھو
اشکوں کو آنکھ سے گرا کر دیکھو
تسکین نہ ہوجائے تو میرا ذمہ
تاروں کو زرا نظر اُٹھا کر دیکھو

— باقر رضوی

انا للہ

اللہ سے کس نے واسطہ رکھا ہے
مذہب کا بس اک بُت سا بنا رکھا ہے
سب کرتے ہیں نام کی اسی کے پوجا
اللہ کو طاق میں بٹھا رکھا ہے

— ڈاکٹر سعید بریلوی

اکبری نشتر

(۱)

کیا اکبر کا کلام باقی رہے گا؟

طالب الہ آبادی

اکبر الہ آبادی لسان العصر تھے، زمانے کی زبان۔ ان کا رنگ چوکھا تھا، ڈھنگ انوکھا۔ ان کی ظرافت خالی خولی ہنسی دل لگی اور ٹھٹھول نہ تھی۔ وہ اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ کہہ دیتے تھے۔ ان کا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سیکڑوں شعر زبانوں پر چڑھ گئے دلوں میں اتر گئے۔ بھارت درشن نے کونے کونے میں مسکراہٹ کی لہریں دوڑا دیں۔

ہمارے مورث بندر رہے ہوں یا نہ رہے ہوں یہ جھگڑے کی بات ہے مگر یہ بات سولہ آنے ٹھیک ہے کہ ہم نقال ہیں۔ نقل کرنا ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ بوڑھیا مردوں کی طرح بچے بوڑھوں کی اور بڈھے نوجوانوں کی نقل کرتے رہتے ہیں۔ اکبر کے اچھوتے رنگ کی نقلیں بھی بڑا مارے سے کالے پانی تک اور کلکتہ سے پشاور تک ہوئیں۔ مگر نتیجہ رہے مور مور، چلا جب چال کوا ہنس کی اپنی بھی بگڑا۔ نقل تو ہوئی مگر ظرافت یا تو کھسیانی ہنسی بن کر رہ گئی یا پوپلی عورت کی مسکراہٹ۔ شاعری نے اس میدان میں بڑے بڑے سورما خم ٹھونک ٹھونک کر اترے مگر لوٹے ہی پیٹے۔

مچھلی کے بچے کو تیرنا، چڑیا کی کو پھدکنا اور کبوتر کو الٹا پلٹی کون سکھا سکتا ہے؟ دل لگی اور ہے دل کی لگی اور ایٹم کو ایتھر کی نزاکت، سینٹ کو پھولوں کی لطافت ملے تو کیسے!

ناکام نقالوں کی فہرست بڑی لانبی چوڑی ہے، آزادی سہی پھر بھی بات بات پر دفعہ ۱۴۴ لگائی جاتی ہے۔ نگاہوں پر مہر ہوتی ہے، زبانیں کیلی جاتی ہیں ورنہ میں گنواتا جاتا، آپ گنتے جاتے۔

اکبری نشتر نے سماجی پھوڑوں کو چھیڑ دیا، ہلکی سی چبھن، میٹھی سی گدگدی ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء کے بہت پہلے سے جو مواد اور کالا خون جم چکا تھا وہ فوارہ بن کر پھوٹ نکلا۔ روگیوں کی آنکھیں کھل گئیں قدریں بدلنے لگیں۔ اکبر کا مزاحیہ کلام کاغذی نشتروں کا ایک چلتا پھرتا ہسپتال تھا جو زبان بہ زبان نگاہ بہ نگاہ بھارت کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔

ان نشتروں میں کلوروفارم، ایتھر اور کوکین کوٹ کوٹ کر بھری تھی، چھیڑ چھاڑ میں ایسا جادو تھا کہ آپریشن ضرور ہوئے مگر نہ تو زخموں کے لئے مرہم ہی کی ضرورت پڑی نہ سفوف اور ٹنک وان کی جراحی کے ساتھ ہی ساتھ زخم بھی بھرتے چلے گئے۔

اکبری نشتر آنکھوں سے دلوں میں اترتے چلے گئے محفلوں، صحبتوں، جلسوں، مکالموں، مباحثوں، گلدستوں، رسالوں، مجلوں، صحیفوں، اخباروں، اور جریدوں میں دھوم مچ گئی۔ ہزاروں شعر سینوں میں محفوظ ہو گئے زبانوں پر چڑھ گئے۔

اکبر اپنے زمانے میں جتنے مقبول ہوئے ویسی شہرت صرف اسے گنے خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ یہ تو داتا کی دین ہے جسے چاہے دے، جب چاہے دے، کسی کا کیا اجارہ!

شاعری اور ہے تک بندی اور۔ عروضی گورکھ دھندے اور ہیں، فطری جوہر اور۔ یہ تو ایک وجدانی کیفیت ہے جو ہمیشہ ظرف کی مناسبت سے عطا ہوتی رہی ہے۔ یہ ملکی سماجی، مذہبی، مدنی، اولی، مکانی اور زمانی ہر قید سے آزاد ہے۔ اصلی شاعری جسم بدل سکتی ہے، لباس تبدیل کر سکتی ہے مگر مر نہیں سکتی مٹ نہیں سکتی۔ بھارت بڑا شاعر خیز ملک ہے، آج بھی بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں مردم شماری سے زیادہ ناظم اور تک بند آپ کو مل جائیں گے۔

خم خانۂ جاوید یا اور اسی قسم کے دوسرے تذکرے اٹھا کر دیکھئے تو ہر صفحہ کو زغریاں دکھائی دے گا جس میں ہزاروں ناظم سیدھے مدفون نظر آئیں گے یہ ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جس کی لہروں میں، گردابوں میں، جوار بھاٹے میں کروڑوں تک بند روز ڈوب ڈوب کر تہہ نشیں ہو جاتے ہیں۔

آپ ہی اپنے دل پر دایاں یا بایاں ہاتھ رکھ کر سچ بتائیے کہ آپ کو کتنے شاعروں کا کلام یاد ہے اور کتنا یاد ہے۔ خوب یاد رکھئے کلام یاد نہ ہونا کیول حافظے کی کمزوری نہیں صرف وہی کلام یاد رہتا ہے اور رہ سکتا ہے جس میں امرت رس بھرا ہوا ہو ورنہ دماغ تحت شعور کے گودام میں ہر قسم نقش کوڑے کباڑ کی طرح پھینکتا جاتا ہے۔

اکبر کا کلام فانی ہے یا باقی۔ مٹتا جائے گا یا زمانے کے ساتھ ابھرتا آئے گا، اس کا سچا فیصلہ تو نہ آپ کر سکتے ہیں، نہ ہم۔ یہ کچھ اور بات ہے، زمانہ اور کیول زمانہ مستقبل اور صرف مستقبل ہی آئینہ بن سکتا ہے، مگر قرینے، تیور، اور رنگ ایسے ہیں کہ ہمیں "ہاں" کہنا ہی پڑتا ہے۔

جو لوگ اکبری نشتروں کو فانی کہنے کی جسارت کرتے ہیں وہ سب سے بڑی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اکبر نے موجودہ حالات کی کھوکھلی بنیادوں پر فلک بوس عمارتیں کھڑی کر لی ہیں، جہاں حالات بدلے نیو سرکی، بوجھ پڑا، اور پوری تعمیر تاش کے پتوں کے بنائے ہوئے محل کی طرح دھڑا دھڑ مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

یہ دلیل مضبوط بھی ہے، وزنی بھی۔ مگر اکبری تعمیر کی بنیادیں، سائنٹفک ہیں، کھوکھلی سہی، کمزور نہیں ہیں۔ اکبری پل گنگا پیلے والا پل نہیں کہ ہلکی سی باڑھ آئی اور چین بول گیا ذرا بوجھ پڑا اور قلفی ہو گئی۔ اکبری پل ہوڑہ کا آہنی پل ہے جس میں نہ تو کوٹھیاں گلائی گئی ہیں نہ ستون ہیں۔ ایک میل لانبا پل ہوا میں معلق قائم ہے جس پر آدمی، گھوڑا گاڑیاں، موٹر اور ٹرامیں ہر وقت اسی طرح اور اسی آسانی سے گزرتے رہتے جیسے اسفلٹ کی پختہ سڑک پر۔ اکبری نشتر حالات کا نتیجہ ضرور ہیں مگر حادثات کا اثر ان پر نہیں ہو سکتا۔

اگر اکبر آج سے سیکڑوں برس پہلے واقعات پر اپنی بنیادیں رکھتے تو وہی حشر ہوتا جو علم موسیقی سے واقف نہ ہونے والوں کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ پکا گانا، راگ راگنیوں کی موشگافیاں سننے لگتے ہیں، یہی نہیں اگر اکبر مقامی حالات پر زور نہ دیتے تو ساری دلکشی دھری کی دھری رہ جاتی۔

میرا خیال ہے اور بہت پختہ خیال کہ اکبری نشتروں میں عالمگیر صلاحیتیں ہیں۔ وہ باقی رہے گا مگر مجھے یہ اصرار نہیں کہ آپ بھی میرے ہم خیال بن جائیں۔ بس اتنی تمنا ضرور ہے کہ فہرست پڑھ کر کتاب پر تنقید نہ فرمائیں، جوہری بن جائیں، اکبری جواہر پاروں کو کسیں، پرکھیں، تراش خراش، آب تاب، رنگ ڈھنگ، سنگ وزن، نور اور مادہ کی پوری پوری جانچ کر کے جو فیصلہ بھی چاہیں کریں، مگر دوسروں کو مجبور نہ کریں کہ یا تو آپ کی ہاں میں ہاں ملائیں یا جہنم میں جائیں۔ ہومر ہوں یا حافظ، ملٹن ہوں یا فردوسی، میر ہوں یا غالب، انیس ہوں یا شیکسپیئر تلسی داس ہوں یا بالمیکی، ٹیگور ہوں یا اقبال، ہر لافانی شاعر کے کلام میں ماحول کی بجلیاں، موجودہ فضا کی ہوائیں اور حالات حاضرہ کے نقوش آپ کو حرفوں کے جوڑ بند میں دکھائی دیں گے۔ مگر ان سب کو منظم رکھنے والا جوہر وہی ہے جو سب میں مشترک ہے اور رہتی دنیا تک عالمگیر سچائی بن کر باقی رہے گی۔

مائی کو پوت کی اب مطلق خبر نہیں ہے
اسٹیمروں سے مل کر انداز گنگ بدلا

اکبر کی شاعری نے جب آنکھیں کھولیں تو ہماری سیاسی سماجی، مذہبی اور مدنی، وہ دھرتی بجلیاں بدلتی ہوئی فضا اور دہکتی ہوئی غلامی کی چتاؤں میں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ یورپ کا سیلاب تھا کہ امنڈتا چلا آ رہا تھا ہماری ہزاروں برس کی تہذیب تھی کہ مٹتی چلی جا رہی تھی، دریا اور کشتی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور رہے گا بالم ہو یا بجرا، بوٹ ہو یا اگن بوٹ چلتے ہیں چلتے رہیں گے، رہے انداز وہ بدلتے رہیں گے۔

جب تک گنگا میں پانی، پانی میں یونہی لہریں، لہروں میں روانی اور روانی میں ترنم رہے گا۔ اکبر کے اس شعر کا جادو بھی کسی نہ کسی روپ میں چلتا رہے گا۔

دیکھئے تو اس ترشے ہوئے ہیرے میں ہزاروں پہلو ہیں، اور ہر پہلو سے نور کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ جتنا سوچئے گا تو اتنا ہی مزہ آئے گا۔ گنگ، اسٹیمر، مائی اور پوت سب ہماری ہی دنیا کے ہیں، مگر نہ جانے کس ملک کے رہنے سہنے والے ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں کہاں جا رہے ہیں ...... کون جانے؟

یہ نشتر سیاسی پلیٹ فارم بھی ہے، سماجی چمن بھی جب کبھی دنیا میں کسی جگہ اسٹیمر اور گنگ والی کیفیت پیدا ہوگی، اکبری نشتر کے نقوش تازہ ہو جائیں گے۔ شیراز کے سحر کلام شاعر حافظ نے بھی انقلاب کی تصویر اپنے ماحول سے اتر کر آج سے چار سو برس پہلے کھینچی ہے، مگر آج بھی رنگ و روغن، اثر و گداز میں کوئی کمی نہیں اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ دور میں شاعر نے ہمارے ہی سماج کے لئے پیشین گوئیاں کی ہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے کہ اکبر ہوں یا حافظ شاعر کسی زمانے میں ہوا ہو کسی زبان کا ہو، عالمگیر سچائی کو نہ زوال ہے نہ فنا۔

اے کاش ـــــ

عبداللطیف اعظمی

مجھے بچپن سے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ اسکول کی عمارت میں، اچھی اچھی تصویریں دیکھتا، تو میرا شوق انگڑائیاں لیتا۔ جی چاہتا اے کاش میں بھی ایسی ہی تصویریں بنا سکتا۔

میرا شوق کچھ تو فطری تھا اور کچھ ماحول کا نتیجہ۔ میں جس فلیٹ میں رہتا تھا اس میں ایک آرٹسٹ بھی رہتے تھے۔ وہ تھے تو ایک آفس میں ہیڈ کلرک مگر تصویریں اور کتابوں اور رسالوں کے لئے ڈیزائن بھی بنایا کرتے تھے اس سے ان کو کچھ زائد آمدنی ہو جاتی تھی اور اس بڑھتی ہوئی گرانی میں، اس سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ ہمارے یہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا، ان کی باتوں کو سن کر اور ان کی تصویروں کو دیکھ کر دل بے چین ہو جاتا کہ میں بھی کسی طرح مصور بن جاؤں۔ اور جب میں اسکول میں داخل ہوا تو اتفاق سے وہاں بھی تصویروں کی بڑی کثرت تھی، کمروں اور برآمدوں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں، جن پر ان کا نام، ان کی عمر اور کلاس لکھی ہوتی۔ یہ دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ میری بھی یہاں بہت سی تصویریں لگی ہوں اور ان پر میرا نام ہو

میں جب ذرا بڑا ہوا اور ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا تو والدہ نے ایک دن میرے اس شوق کا جوزف صاحب سے ذکر کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ کبھی کبھار میری تصویروں کی اصلاح کر دیا کریں۔ انھوں نے اسی دن مجھے بلا بھیجا۔ پہلے تو اپنی سب تصویریں دکھلائیں اس کے بعد معاملے کی گفتگو آئی۔ انھوں نے سوال کیا "کیوں تم تصویروں کی تخلیقی نقل کر لیتے ہو؟"

"تخلیقی نقل؟! میں سمجھا نہیں" میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔

"یہی کہ تم کسی تصویر کو سامنے رکھ کر اس طرح بنا سکتے ہو کہ وہ نقل بھی ہو، اور اس میں اُپج بھی ہو؟"

"ابھی میں بالکل مبتدی ہوں، صحیح طور پر نقل بھی نہیں کر سکتا۔ اُپج تو بڑی بات ہے۔ اور پھر میں تو پنسل سے کام کر رہا ہوں، آپ کی طرح آئل پینٹنگ کا کام کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔"

"پنسل کو تم حقیر نہ سمجھو، اس سے بڑے بڑے کام انجام دئے جا سکتے ہیں۔ خیر تمھارے پاس کوئی البم ہے؟"

ـــــ "اچھا تو ایک البم بنا لو اور مشہور لوگوں اور اچھے اچھے مناظر کی تصویریں جمع کرو، اور ان کی نقل کرنے کی مشق کیا کرو۔"

"نقل کرنے کی؟!" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں نقل کرنے کی، ابتدا میں اس کی سخت ضرورت ہے" ... اس کے بعد انھوں نے الماری میں سے ایک بڑا سا البم نکالا اور میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ "دیکھو، میں نے ان سے تصویر بنانا سیکھا ہے اور اب بھی ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔"

"تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ آپ ان سے نقل کرتے ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ہاں، مگر تخلیقی نقل" انھوں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا "بناتے وقت ان کو سامنے رکھتا ہوں، مگر دماغ صرف نقل نہیں کرتا، کچھ نئی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے۔"

"لیکن" میں نے رکتے رکتے کہا "اچھے آرٹسٹ شاید ایسا نہیں کرتے؟" اس ڈر سے کہ کہیں میرے اس سوال سے ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگی ہو، میں نے کہا "میں اپنی رائے نہیں دے رہا ہوں بلکہ آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

"بھئی تم بہت ہی سادہ لوح ہو۔" انھوں نے ایک فراخدلانہ قہقہہ لگا کر کہا۔ "سب ایسا ہی کرتے ہیں، صرف آرٹسٹوں پر موقوف نہیں، شاعر، فسانہ نگار، جرنلسٹ سب یہی کرتے ہیں۔ شاعر دوسروں کا دیوان سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں، اگر کسی نے اتفاق سے چوری پکڑ لی تو "توارد" کی آڑ میں بچ نکلے۔ اچھے اچھے مصنف بے تکلف دوسری زبانوں کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ دوسری زبان انھوں نے سیکھی ہی اسی لئے ہے، صحیفہ نگار تو اس معاملے میں سب سے آگے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اخبار یا رسالے کی ترتیب کا گر اسی میں ہے کہ دوسروں سے چیزیں لے لی جائیں اور حوالے گم کر دئے جائیں۔ پنجاب میں اس فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کا باقاعدہ "قینچی سروس" نام پڑ گیا ہے اور ہر اخبار والا فخر یہ کہتا ہے کہ اس کی "قینچی سروس" بڑی کامیاب ہے۔ پھر اگر ہمارے آرٹسٹ دوسروں کے خیالات اور تصورات کو چرا لیتے ہیں تو ان پر کیوں اعتراض کیا جائے۔ خیر بات لمبی ہو گئی، میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر تم جلد ہی کامیابی اور شہرت چاہتے ہو تو قینچی سروس کی طرح "البم سروس" شروع کر دو۔ دیکھو کس قدر جلد تم ایک کامیاب آرٹسٹ ہو جاتے ہو۔"

مسٹر جوزف سے، ان کے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے چلا آیا، اور کچھ عرصے تک اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی، مگر طبیعت کسی طرح اس پر تیار نہ ہو سکی۔ مجبوراً جوزف صاحب کی "تخلیقی نقل" کو چھوڑ کر، میں حسب معمول پھر پارک اور آس پاس کے دیہاتوں میں چلا جاتا، اور مختلف مناظر اور دیہاتی لڑکیوں کے اسکیچ بناتا۔

ایک روز حسب معمول، شہر سے باہر ایک بہت ہی دلکش پارک میں بیٹھا اسکیچ کر رہا تھا۔ میں اپنے کام میں کچھ ایسا مستغرق تھا کہ مجھے آس پاس کی بالکل خبر نہیں تھی، یکایک میرے پاس ایک سائیکل رکی۔ "ونڈرس پلیس کو کون سی سڑک جائے گی؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

میرے کان میں آواز ضرور آئی۔ آواز کی شیرینی بھی محسوس ہوئی۔ مگر میں تصویر کے بنانے میں کچھ ایسا کھو گیا تھا، کہ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ یہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے۔

"مہاشے، میں آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں" اس نے چند لمحے کے بعد پھر پوچھا "اگر زحمت نہ ہو تو ذرا بتا دیجیے کہ ونڈرس پلیس ــــــ"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔

"آپ بڑے کج خلق معلوم ہوتے ہیں" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

"اور آپ؟" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا "آپ کو سجھائی نہیں دیتا ــــــ"

میں نے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آدھا جملہ حلق ہی میں پھنس کر رہ گیا۔

"ہاں، ہاں فرمائیے، سجھائی نہیں ــــــ"

"جی ــــ جی ــــ جی نہیں، میرا مطلب تھا ــــــ ہاں تو آپ کو ونڈرس پلیس ــــــ" پھر میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"کیوں آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" گویا اس نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔

"جی ــــ ہاں، میں سوچ رہا تھا ــــ معاف کیجیے گا ــــ اصل بات یہ ہے کہ میں نے کچھ دن ہوئے ایک تصویر بنائی تھی، وہ آپ سے ہو بہو ملتی ہے بس میں یہی سوچ رہا تھا ــــ معاف کیجیے گا اگر میں نے ــــــ"

"جی نہیں، بھلا آپ کوئی سخت بات کہہ سکتے ہیں، آپ آرٹسٹ جو ٹھہرے ــــ ہاں ذرا اپنی ایک آدھ تصویر تو دکھائیے۔ کہیے اس میں تو آپ کو تامل نہیں ہے؟"

"تامل کیا ہوگا، مگر تصویریں کچھ ایسی ہیں، کیا کیجیے گا دیکھ کر؟"

"اچھا! آپ تو تکلف میں شاعروں سے بھی دو قدم آگے نکلے، آخر کیوں نہ ہو، آرٹسٹ بھی تو بڑی حد تک شاعر ہی کی طرح نازک مزاج ہوتا ہے۔ اگر آپ کو تکلف ہے تو میں خود ہی دیکھے لیتی ہوں ــــ یہ ہیں تصویریں نا؟ ــــ بھئی! یہ تو اچھی خاصی ہیں، لیکن ــــ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں، کہ اگر آپ کسی اچھے آرٹسٹ کو دکھا دیں، تو ان میں جان پڑ جائے۔ میرے پتا جی بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں، اگر پسند کریں تو آپ ان کو دکھا دیجیے، وہ آپ کی مدد کر کے بہت خوش ہوں گے۔"

"بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تصویریں اس قابل نہیں ہیں کہ کسی اچھے آرٹسٹ کو دکھائی جائیں۔"

"جی، چھوڑیے بھی ان تکلفات کو، آپ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ذرا اپنی پنسل تو دیجیے اپنا پتہ لکھ دوں ــــ یہ لیجیے پتا، تو آپ آئیں گے نا؟ ــــ ہاں کل شام کو میں آپ کا انتظار کروں گی۔

اچھا بے مہندہ"

وہ آگے بڑھ گئی تو مجھے یاد آیا کہ راستہ تو میں نے بتایا ہی نہیں، میں نے دوڑ کر آواز دی، "ارے ذرا سنئے راستہ تو معلوم کر لیجیے"

"شکریہ! مجھے معلوم ہو گیا، آپ اپنی تصویر بناتے وقت اس کا خیال رکھئے گا کہ آپ کے خیالات میں پھر خلل نہ پڑے۔ ٹوٹے ہوئے تاروں کو پھر سے جوڑیے اور اپنی تصویر کو مکمل کر ڈالیے، اچھا ٹاٹا"

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا "کیا واقعی

اس کے والد آرٹسٹ ہیں! کہیں اس نے مذاق تو نہیں کیا، ان پنجاب کی لڑکیوں کا کیا بھروسہ بڑی چنچل ہوتی ہیں۔ سنا ہے کہ لاہور میں مردوں کو خوب بے وقوف بنایا کرتی تھیں، اور اب دلی میں آگئی ہیں۔ تو یہاں بھی وہی شرارتیں کریں گی ——— مگر اس کی سنجیدگی اس کی ہمدردی ——— اس کا خلوص، یہ سب شبہ سے بالا ہے ——— اور ہاں اس نے اپنے پتا کا جو نام لکھا ہے اسے بھی تو میں سن چکا ہوں ——— خوب یاد آیا پچھلی مرتبہ آرٹ کی نمائش میں جس تصویر کو پہلا انعام ملا تھا اس کے بنانے والے کا کچھ ایسا ہی تو نام تھا ——— ٹھیک ہے یہی نام تھا۔ یہاں کے مصوروں کو شکایت بھی تھی کہ انھیں محض ریفیوجی ہونے کی وجہ سے انعام ملا ہے ——— بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ مجھے ضرور جانا چاہیئے"

دوسرے روز اسکول میں میرا بالکل جی نہیں لگا۔ کتاب کے ہر صفحہ سے ایک شرخ چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا تھا۔ کانوں میں ایک سریلی آواز گونج رہی تھی، ایک ایک منٹ گذارنا مشکل ہو گیا۔ خدا خدا کر کے اسکول ختم ہوا اور میں بھاگم بھاگ گھر آیا، نہایا، کپڑے بدلے۔ اور جوزف کے کمرے میں جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا، ڈرتا جھجکتا داخل ہوا۔ وہ موجود نہیں تھے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کا ایم نیٹا لا چند تصویریں جن پر انھیں ناز تھا لے کر تھیلے میں رکھیں اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ خوش قسمتی سے مکان بغیر کسی دقت کے مل گیا، دستک دی تو شانتی گویا انتظار ہی میں تھی۔ پہلی ہی آواز پر دروازہ کھلا اور سامنے ہاتھ جوڑ کر استقبال کیا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں پتا جی کو اطلاع کرتی ہوں" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ ڈرائنگ روم دیسے تو معمولی تھا۔ مگر تصویریں بڑی نادر اور شاندار تھیں۔ میں ان کے دیکھنے میں کچھ ایسا محو ہوا کہ کسی کے آنے کی مجھے مطلق خبر نہیں ہوئی۔ کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو یکا یک میں چونک پڑا۔

"کہو کیا اتنے غور سے دیکھ رہے تھے؟ کیوں یہ تصویر کیسی ہے؟"

"بھلا میری رائے بھی کوئی رائے ہے۔ مجھے تو ابھی مصوری کی ابتدائی باتیں بھی معلوم نہیں ہیں ——— میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے مصور سے ———"

"خیر خیر ان تکلفات کی ایسی ضرورت نہیں۔ ہاں! دیکھو شانتی چا ر لائی ہے آؤ چار پر باتیں ہوں گی۔ اپنی تصویریں تو لائے ہو نا؟"

شانتی دوسری چیزیں لانے، باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ انھوں نے اسے آواز دی! وہ ایک پلیٹ میں کیک کی قاشیں لے کر آئی۔ وہ مجھے دیں، اور بقیہ میز پر رکھ کر اپنے پتا کے ساتھ میز پر جھک کر تصویریں دیکھنے میں لگ گئی۔

"اور کل کی تصویریں، جو تم نے مجھے دکھائی تھیں؟ انھیں نہیں لائے؟"

اس کے اس سوال پر میں گھبرا گیا، اور جی چاہا کہ حقیقت کا اعتراف کر لوں، لیکن یکا یک اس کے پتا نے مجھے اپنی گھبراہٹ چھپانے کا موقع دے دیا۔

"بہت اچھی ہیں ——— ہاتھ میں صفائی بھی خوب ہے ——— سادگی تو غضب کی ہے ——— خصوصاً تمھاری عمر کے لحاظ سے تو بہت ہی اچھی ہیں۔"

وہ تعریف کر رہے تھے، اور میرا برا حال تھا۔ انھوں نے میری پریشانی دیکھی، تو کسی سوچ میں پڑ گئے۔

"کل جو تصویریں میں نے دیکھی تھیں، ان میں اور ان میں تو بڑا فرق ہے ——— زمین آسمان کا!"

شانتی کا یہ تبصرہ ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر لگا، اور میں چکرا سا گیا۔ ابھی میں سنبھلا نہیں تھا کہ اس کے پتا نے کہا

"ہاں، ہیں تو بہت اچھی مگر ان میں تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اچھا شانتی ذرا اسکیچ کا سامان تو لانا۔ یہ ایک تصویر میرے سامنے بنائیں گے، اور میں ان کو بتاتا جاؤں گا۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میرا اسکیچ کریں۔" یہ کہہ کر شانتی بھاگی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، زینے کی طرف نگاہ ڈالی تو دروازہ ابھی تک کھلا تھا کچھ اسی سے امید ہوئی اور میں بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ نیچے پہنچ کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو شانتی زینے سے آواز دے رہی تھی "ارے کیا کر رہے ہو، ٹھہرو، ذرا سنو بھی!" اس کے پتا بالکنی سے جھانک رہے تھے۔ ور ان کے ہاتھ میں مسٹر جوزف کی تصویریں تھیں، اور میرے ہاتھ میں کیک کے دونوں ٹکڑے ابھی تک موجود تھے۔ ... کتنا دل دوز تھا، یہ منظر!!

(انگریزی سے ماخوذ)

ہم صفیروں کی آواز

جناب ایڈیٹر صاحب نئی روشنی!　　　جے ہند

آپ کا اخبار میں شروع سے بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں، واقعی آپ لوگوں نے اس اخبار کو نکال کر ملک اور زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو میں کوئی اچھا ہفتہ وار اخبار نہیں تھا۔ آپ نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ مجھے اس اخبار سے اتنی دلچسپی ہوئی ہے کہ میں نے اس کے خریدار بنانے کی بھی کوشش کی تھی، مگر ایک تو اتنا علمی اور سنجیدہ اخبار پڑھنے والوں کا ملک میں کال ہے۔ دوسرے مجھے یہ لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ ہماری رگ رگ میں تعصب اور ایک دوسرے سے نفرت اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ بہت سے لوگ محض اس لئے نہیں خریدتے کہ اس کے چلانے والے مسلمان ہیں۔ لیکن اس اتھاہ تاریکی میں تھوڑی سی بہت روشنی موجود ہے۔ ورنہ جینا دوبھر ہو جاتا۔

معاف کیجئے گا آپ کی مصروفیت میں، میری ان بے سرو پا باتوں سے خلل پڑے گا۔ لیکن آج آپ کے اخبار کا ایڈیٹوریل "اردو کے حامیوں سے" پڑھ کر اس قدر خوشی ہوئی کہ میں اپنے ان ٹوٹے پھوٹے خیالات کو لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

مجھے اس سے دلچسپی نہیں کہ اردو کہاں کہاں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے کے فی صدی ہیں، لیکن اس کا مجھے پکا یقین ہے کہ جہاں بھی بولی جاتی ہے وہاں یہ سب کی زبان ہے، ہندو، مسلم، سکھ سب کی، بغیر کسی تفریق اور بغیر کسی امتیاز کے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسے کسی ایک فرقے کی زبان قرار دے کر دیس نکالا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے مجھے کسی اور صوبے سے مطلب نہیں، صرف پنجاب کے بارے میں سوچتا ہوں کیا آج تک کبھی پنجاب کے کسی چھوٹے سے حصے میں بھی ہندی نے رواج پایا ہے یا عام طور پر لوگوں نے اس سے کوئی دلچسپی ظاہر کی ہے۔ پھر آج مشرقی پنجاب میں سرکاری زبان ہندی کو قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے!! سوا اس کے کیا کہا جائے کہ ہم تعصب اور انتقام کے جذبے میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں۔ اگرچہ یہاں کی سرکاری زبان ہندی قرار دے دی گئی ہے مگر مجھے امید نہیں کہ یہ جنتا کی زبان بن سکے گی۔ تعصب کا جنون جب کم ہو گا تو اس وقت ——— کم از کم مجھے تو یہی توقع ہے۔ حکومت کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی ہو گی۔ پنجاب نے اردو کے بہترین لکھنے والے پیدا کئے ہیں ان میں سکھ، ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ہوپندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی کیا ان لوگوں کی کتابیں پڑھنے والے مشرقی پنجاب میں نہیں رہیں گے؟! میں تو اس قدر مایوس نہیں، معلوم نہیں آپ کی کیا رائے ہے۔

"اردو کا ایک پرستار"

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب نئی روشنی

تسلیم

میں آپ کا اخبار نئی روشنی شروع سے منگاتا ہوں، اسے پڑھ کر مجھے بڑی مسرت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے، میری اور میرے بہت سے احباب کی رائے میں یہ اخبار انڈین یونین کے مسلمانوں کے لئے جنھیں ہماری پچھلی سیاست تاریکی کے گہرے غار میں چھوڑ گئی ہے مشعل راہ سے کم نہیں۔ خصوصاً آپ کے تازہ پرچے کے ایڈیٹوریل میں یہ پیراگراف پڑھ کر۔

"مگر ہمارا خیال ہے کہ اب جا کر ہندوستان میں مسلمانوں کے پنپنے کے دن آئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے خود فریبی کے پردے ہٹ گئے ہیں اور ان کو زندگی کی حقیقتیں زیادہ نظر آنے لگی ہیں۔ ان کے سامنے انگریزوں کے اور "اسلامی ملکوں" کے جھوٹے سہاروں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اب انھیں خدا کی ذات پر اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہے..."

دل کو بڑی تقویت ہوئی، یہ امید کی ایک کرن ہے جو نئی روشنی نے ہمیں دکھائی ہے، اور مجھے یقین ہے مسلمانوں کے مایوس دلوں میں اسے پڑھ کر ایک نئی زندگی کا احساس پیدا ہو گا۔

مش۔ ا، بریلی

ازبکستان کے قومی کھیل

عبداللہ خار

ازبکستان کا کوئی قومی جشن اور تہوار بغیر "الک" کے پورا ہی نہیں ہوتا۔ "الک" شہسواری کا ایک مقابلہ ہوتا ہے، جس میں سینکڑوں لوگ شامل ہوتے ہیں اور ہزاروں تماشائی اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس قسم کی گھوڑسواری کا رواج یہاں صدیوں سے چلا آتا ہے اور اس کے بعض قوانین وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ بنتے چلے گئے ہیں، جو بادی النظر میں کچھ آسان معلوم ہوتے ہیں۔

ہر الک کے لئے جو سب سے پہلی چیز درکار ہوتی ہے وہ کھلا میدان ہے جہاں نہ کوئی درخت ہو اور نہ جھاڑیاں۔ میدان کی حدود کے نشان پہلے ہی بنائے جاتے ہیں۔ کھیل میں جتنے زیادہ لوگ شامل ہوں مقابلہ اتنا ہی مزے دار ہو جاتا ہے۔ اور کھیل بھی دیر تک چلتا رہتا ہے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے تمام کھلاڑی ایک خاص چبوترے کے سامنے نصف دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بیچ میں پھر مردہ بکری یا گائے کا بچہ پھینک دیا جاتا ہے جس کا سر اور ٹانگیں نہیں ہوتیں اسے "الک" کہتے ہیں۔

کھیل شروع کرنے کے لئے "کارنائی" بجائی جاتی ہے جن کی آواز میلوں دور تک سنی جا سکتی ہے ہر شہسوار الک کو جھپٹنے کے لئے دوڑتا ہے۔ بغیر گھوڑے سے اترے سوار کو الک اٹھا کر دوسرے سواروں کے گھیرے سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔

جب درجنوں کھلاڑی ایک ہی الک کو اٹھانے کے لئے ایک ساتھ جھپٹتے ہیں اور انھیں گھوڑے کی پیٹھ پر سے ہی جھک کر درجنوں گھوڑوں کی ٹاپوں سے بچ کر الک کو اٹھانا اور اپنی زین پر رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے تو یہ کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن اس کھیل کا مشکل حصہ اور ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زیادہ تجربہ کار کھلاڑی جن کے پاس بہترین گھوڑے بھی ہوتے ہیں کھیل کی ابتدا میں الک حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے گھوڑے کی تیز رفتاری پر یقین کر کے مقابلہ پر اس وقت آتے ہیں جب کوئی اور بکری کو لے کر بھاگنے لگتا ہے۔

لیکن آئیے پہلے ہم اس کھیل کے طریقے بیان کر دیں۔ جو سوار الک لے لیتا ہے اسے ایک بار پورے میدان کا چکر لگانا ہوتا ہے اور یہ کھیل کا سب سے زیادہ خطرناک لمحہ ہوتا ہے اس وقت گھوڑے کی ہوشیاری اور سوار کی چابک دستی کا امتحان ہوتا ہے جو سوار "الک" لے جا رہا ہوتا ہے اسے تمام سواروں سے آگے دوڑنا چاہئے اور اگر وہ یہ نہ کر سکے جو پھر اسے ہی پھرتی اور ہوشیاری سے ان سے بچ کر نکلنا چاہئے یا پھر محض طاقت کا استعمال کر کے آخری حد کے پار گذرنا چاہئے۔

کھیل کے دوران میں بڑی تیز جھڑپیں ہوتی ہیں اور جب اختتامی حد آ جاتی ہے تو اور بھی تند ہو جاتی ہیں "الک" ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا ہے اور سواروں کے جھنڈ میدان کے ایک سرے سے دوسرے تک دوڑتے ہیں کبھی کبھی جب کوئی سوار بکری لئے جا رہا ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ خود کسی صورت سے بچ کر نہیں نکل سکتا تو وہ "الک" کو اپنے کسی دوست کے پاس پھینک دیتا ہے اور پھر سے بچ کر نکل جانے میں مدد دیتا ہے، اب پھر مقابلہ گرما گرم ہو جاتا ہے۔ الک پھر چھینا لیا جاتا ہے۔

جو سوار اختتامی حد پار کر جاتا ہے وہ پھر الک کو زمین پر پھینک دیتا ہے۔ اسے فاتح قرار دے دیا جاتا ہے اور انعام ملتا ہے۔ دوبارہ مقابلہ پھر سے شروع کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر خاص چھٹیوں میں مقابلہ دن بھر ہوتا رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی دوسرے روز تک جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ الک کے منتظمین نے کتنے انعام رکھے ہیں۔ کھلاڑی بدلتے رہتے ہیں اور جو تھک جاتے ہیں وہ شامل نہیں ہوتے۔ گھوڑے بھی تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔

"الک" ختم ہونے سے پہلے تمام کھلاڑیوں کی دوڑ ہوتی ہے اور جو اس میں جیت جاتا ہے اسے انعام کے علاوہ "الک" بھی دے دیا جاتا ہے۔ رواج یہ ہے کہ اسے گھر نہیں لے جایا جاتا بلکہ اسے وہیں بھونا جاتا ہے اور تمام کھلاڑی مل کر کھاتے ہیں۔

"الک" میں حصہ لینے کے لئے محض یہی کافی نہیں کہ کھلاڑی عمدہ شہسوار ہو بلکہ گھوڑا بھی ایسا ہونا چاہئے جو سبک رفتار ہو اور مقابلے کی سختی برداشت کر سکتا ہو "الک" کے گھوڑوں سے کھیتوں میں کام نہیں لیا جاتا، اور نہ ہی انھیں گاڑیوں میں جوتا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں صرف بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے پاس ہی "الک" کے گھوڑے ہوتے تھے، معمولی کسان کو تو محض نمائش بینی پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا یا اگر کسی گھوڑے کا مالک بہت بوڑھا یا بیمار ہوتا تھا تو اسے کرائے کے گھوڑے کی حیثیت سے رکھ لیا جاتا تھا لیکن مقابلے میں اگر وہ جیت جاتا تو انعام کا حق دار نہیں ہوتا تھا، انعام اور فتح کی شہرت گھوڑے کے مالک کی ہی ہوتی تھی۔

سوویت انقلاب سے پہلے بڑے بڑے زمیندار یا مالدار تاجر الک کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور وہی انعامات مقرر کرتے اور تمام اخراجات برداشت کیا کرتے تھے۔ عام طور پر جب کوئی خاندانی جشن ہوتا تھا تو "الک" کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ دعوت عام طور پر لڑکے کے ختنے ہونے کے جشن کے موقع پر ہوتی تھی۔ "الک" سے دعوت کی تیاری اور مدعو کرنے والے کی عزت میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

اب تو حالات بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ بہترین گھوڑے پنچایتی کھیتوں کی ملکیت میں یا بالفاظ دیگر تمام کسانوں کی ملکیت میں کوئی بھی کسان جسے شہسواری کے کھیلوں میں دلچسپی ہوتی ہے وہ "الک" میں شامل ہو سکتا ہے۔ ان مقابلوں کو اب اور ہی موقعوں پر منعقد کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تو تہواروں یا فصل کی خوشیاں منانے کے موقعوں پر "الک" منعقد کئے جاتے ہیں۔

پچھلے سال موسم خزاں میں میں نے ایک "الک" دیکھا جو یخان آباد پنچایتی کھیت کی جانب سے فصل کی کامیابی کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔ فرغانہ کی وادی میں یہ پنچایتی کھیت کپاس کی کاشت کے لئے بہت مشہور ہے۔ اس "الک" کی خبر مقامی ریڈیو سے براڈ کاسٹ کی گئی۔ مقامی اخبارات میں کئی کئی روز تک اس کے متعلق مضامین اور خبریں شائع ہوتی رہیں۔ مقررہ دن کئی ہزار تماش بین میدان میں جمع ہو گئے۔

ایک کسان نے مذاق میں کہا "اب دیکھیں سعادت خانم یہاں کپاس کیسے کاشت کرتی ہیں؟" بات دراصل یہ تھی کہ جہاں الک کا میدان بنایا گیا تھا اس کے ایک حصے میں سعادت خانم کے جتھے نے کپاس کی کھیتی کی تھی اور اس فارم سے انھوں نے سب سے زیادہ کپاس حاصل کی تھی۔ چلتے پھرتے چلتے خانے، طعام خانے اور کھلونوں کی دکانیں کھیل کے میدان میں آ گئی تھیں۔ اس "الک" کو دیکھنے کے لئے ضلع کے ۲۷ پنچایتی کھیتوں کے ہزاروں لوگ آئے تھے اور مقابلے میں ۳۰۰ کھلاڑی حصہ لے رہے تھے۔

پہلے زمانے میں کھیل شروع ہونے سے پہلے زمیندار اور جاگیردار زرق برق پوشاکوں میں ملبوس پورے میدان کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اب پنچایتی کھیت کے کسان، پنچایتی کھیت کے افسران، عمدہ فصل حاصل کرنے والے کسانوں کے جتھوں کے لیڈر عمدہ گھوڑوں پر سوار بہترین پوشاکوں میں ملبوس میدان میں آتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں ایک بیس سالہ خاتون تھیں۔ جو عمدہ ریشمی پوشاک میں ملبوس تھیں۔ یہ تھیں سعادت خانم، انھیں دیکھتے ہی فوٹوگرافروں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

جب یہ لوگ مجمع کے پاس پہنچے تو نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے اور ضلع کے تمام پنچایتی کھیتوں کے وفد نے [illegible] آباد کے پنچایتی کھیت کے صدر کو [illegible] پادری اس کے بعد پھر آتش بازی چھوڑی گئی۔ اس کے بعد [illegible] کی تیز آواز گونج اٹھی اور الک شروع ہو گیا۔ انعامات میں دو [illegible] دس تھان ریشمی کپڑا، شکاری بندوقیں وغیرہ تھیں۔ پڑوس کے پنچایتی کھیتوں کی طرف سے بھی کچھ اور انعام شامل کر دیے گئے تھے۔ پہلا مقابلہ دو گھنٹے تک ہوتا رہا اور آخر میں ایک بیس سالہ نوجوان نے اختتامی حد پار کر لی اور اسے ایک بندوق انعام ملی۔ دوسری بار "[illegible]" کے پنچایتی کھیت کے ایک ممبر کو ایک سائیکل انعام ملی مقابلہ دن بھر ہوتا رہا اور پھر دوسرے روز بھی جاری رہا۔ تیسرے روز بارہ کلومیٹر کی آخری گھوڑ دوڑ ہوئی اسے کمیونزم پنچایتی کھیت کے ایک پچپن سالہ بوڑھے نے حاصل کیا اور اسے ایک نئی چمک دار موٹر سائیکل ملی۔

(ماخوذ)

براہ کرم خط لکھتے وقت، اپنا پتہ "انگریزی" میں لکھئے

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارہ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت یکم ۸، ۱۶، ۴۸
چندہ :- سالانہ ۶ر ششماہی ۳ر

حسین اور انسانیت

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے، یہ شہید حق تاج و تخت کو لینے نہیں نکلا ہے۔ تاج و تخت لینے والے لفار الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے تاج و تخت چاہنے والے یک سوئی سے شہادت کا قصد کرکے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہید حق اس سستی "کامیابی" کے لئے نہ نکلا تھا جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بے گانہ کر دیتی ہے۔ "کامیابی" چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکے سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلے سے پہلے کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر سب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربانی کا تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کرکے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں، عورت اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے جوان بیٹے کو اپنے آگے راہی ملک بقا کیا جاتا ہے۔ شیر خوار پیاس سے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا ... دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے۔ ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں، ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں، رسیوں سے باندھا جاتا ہے۔ طوق پہنائے جاتے ہیں، ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ حق پرستی کا سب سے موثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی، سستی و وقتی کامیابی اس کی جلو میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں، اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینے سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی انسانیت کی ضمانت ہے، یہی شہادت حسین کا ماحصل ... سی سے حسین انسانیت کے محسنین اعظم میں ہیں، اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

اکبری نشتر

(بسلسلہ صفحہ ۸)

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر | پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں | طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم

یا جیسا فردوسی کہتا ہے :-

پرستار زادہ نیاید بکار | اگرچہ بود زادۂ شہریار

فطرت کے نباض شاعر بہت دور تک دیکھتے ہیں۔ اکبر کا بھی یہی عالم ہے۔ الفاظ تو صرف سمجھانے کا ذریعہ اور لباس ہوتے ہیں۔ حقیقت چیز ہی اور ہے، اپنے ہی جسم اور اپنی ہی روح کو دیکھ لیجئے۔

باہر کی دنیا

(بسلسلہ صفحہ ۶)

کے لئے ضروری خرچ منظور کرنا شروع کر دیا، اور اب "امریکہ کی آواز" ساری مغربی دنیا میں گونج رہی ہے، اور ان ملکوں تک پہنچ رہی ہے جہاں کمیونسٹ حکومتوں کے سرکاری بیانات کے سوا اور کچھ سننے کی اجازت نہیں۔ روسی اپنی طرف تین بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے دنیا کے دل اور دماغ کو فتح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ امریکہ کی آواز بھاری رہتی ہے یا روس کی، غالباً دنیا والے دونوں کی باتیں سن کر کوئی ایسا فیصلہ کرتے ہوں گے جو کسی ایک کے حق میں نہیں ہوتا۔ البتہ یو، این، او میں روس کی ادا کچھ ناپسند کی جانے لگی ہے۔ موسیو ویشنسکی ذاتی طور پر خوش طبع اور ملنسار ہوں گے اور خواہ مخواہ لوگوں کی توہین نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن یو، این، او کے جلسوں میں وہ جس طرح گالی گلوج کرتے ہیں اور متحدہ ریاستوں اور برطانیہ پر طرح طرح کے الزام لگا کر تجویزوں کو رد کرتے ہیں۔ اس سے غیر جانب دار قوموں کے نمائندوں کو کچھ یقین سا ہو گیا ہے کہ روسی کسی معاملے میں دوسری قوموں سے اتحاد عمل نہیں کرنا چاہتے اور کمیٹیوں اور مشوروں میں صرف اس نیت سے شریک ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے رہنما بھی ان پر یہی الزام لگاتے ہیں۔ روسیوں نے اپنا انداز نہ بدلا تو ممکن ہے غیر جانبدار قومیں متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی حامی بن جائیں اور روسی یو، این، او پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ لڑائی بس زبانی ہے۔ لیکن جو اس لڑائی میں جیت جائے اس کا اصلی معاملوں میں بھی پلہ بھاری رہنے گا

برلن میں کچھ نہیں ہو رہا ہے

موسیو ویشنسکی نے یو، ان، او میں بیان کیا ہے کہ برلن کا بلوکیڈ نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ بیان صحیح ہے تو برلن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہاں ہوائی جہازوں کے ذریعے سامان نہیں پہنچایا جا رہا ہے، اور آئندہ کے لئے تدبیریں کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کے باوجود متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے ہوائی محکمے جاڑوں کے لئے انتظام کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کے لئے آزمائش کا وقت یہی ہے۔ وہ جاڑوں بھر برلن میں کھانے پینے کا سامان پہنچاتے رہے تو روسی مرعوب ہوں گے اور شاید کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ ورنہ ان کی ہیکڑی اور بڑھ جائے گی، اور وہ برلن کو خالی کرائے بغیر نہ مانیں گے۔

م ، م

پاکستان

(بسلسلہ صفحہ ۵)

سیاسی تدبر سے زیادہ جذباتی خدمت سے کام لیا اور بجائے اس کے کہ وہ مجلس دستور ساز کے فیصلے کا انتظار کرتی، اس نے اپنے رجحانات کا اتنا واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ اب اس کا اس سے رجوع ناممکن سا نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی لیڈروں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق جو انگریزوں سے معاملہ کرنے میں ہمیشہ مفید رہتی ہے دل کی بات دل میں رکھی اور اپنی قیمت بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ جہاں ایک طرف ہمارے وزیر اعظم نے کامن ویلتھ کے ساتھ تعلق رکھنے کے حق میں بہت کچھ کہہ ڈالا، وہاں دوسری طرف ہندوستان کے وزیر اعظم بالکل خاموش رہے اور اس بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہی ....

(آفاق ہفت روزہ، لاہور)

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۲ | ۲۴ نومبر سنہ ۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

اخلاقی تصور اور اشتراکیت

جواہر لال نہرو

زندگی کا اخلاقی تصور میرے لئے بڑی کشش رکھتا ہے اگرچہ منطقی حیثیت سے اس کو صحیح ثابت کرنا مجھے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی کا صحیح ذرائع پر زور دینا مجھے پسند آیا اور میرے خیال میں ہماری عمومی زندگی کو اُن سے جو برکات حاصل ہوئیں ان میں یہ بہت بڑی برکت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال نیا نہیں لیکن ایک اخلاقی اصول کو عمومی زندگی میں اتنے بڑے پیمانے پر استعمال کرنا یقیناً ایک نئی چیز ہے۔ اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ در اصل ذرائع اور مقاصد ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے بلکہ ایک جسم نامی کی طرح باہم وابستہ ہیں۔ آج کل کی دنیا میں جو صرف مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے اور ذرائع کو نظر انداز کر دیتی ہے ذرائع پر اس قدر زور دینا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے۔

مارکس اور لینن کے مطالعے نے میرے ذہن کو بہت متاثر کیا اور اس کی وجہ سے میں تاریخ کو اور موجودہ واقعات کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ تاریخ اور معاشرتی ارتقا کے طویل سلسلے میں ایک معنویت ایک ترتیب نظر آنے لگی، اور مستقبل کی تاریکی ایک حد تک دور ہو گئی۔ سوویٹ یونین کے اصلی کارنامے بھی بڑے شاندار ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ روس کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی یا میری سمجھ میں نہیں آئی اور اس میں ابن الوقتی اور قوت پرست سیاست کا بہت گہرا رنگ دکھائی دیا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ممکن ہے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا وہ جذبہ جو وہاں ابتدا میں موجود تھا اب کسی حد تک مسخ ہو گیا ہو۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انقلاب روس نے انسانی سماج کو ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا، اس میں وہ ولولہ پیدا کر دیا جو کسی کے دبائے نہیں دب سکتا اور اس نئے تمدن کی بنیاد قائم کر دی جس کی تعمیر ہونے والی ہے میں اس قدر انفرادیت پسند واقع ہوا ہوں اور شخصی آزادی کا اس قدر دل دادہ ہوں کہ مجھے حد سے زیادہ تنظیم اچھی نہیں لگتی، پھر بھی یہ مجھے ایک صریحی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک پیچیدہ اجتماعی نظام میں انفرادی آزادی کو محدود کرنا ضروری ہے اور شاید فرد کو حقیقی آزادی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اجتماعی زندگی پر اس طرح کی پابندیاں عائد کی جائیں، چھوٹی آزادیوں کو اکثر بڑی آزادی پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ مارکسی فلسفہ کی بہت سی باتوں کو میں آسانی سے قبول کر سکتا ہوں، مثلاً ذہن اور مادے کی وحدت، مادے کا حرکیاتی تصور، جدلیات کا یہ نظریہ کہ تغیرات کے سلسلے میں ارتقا اور طفرے، عمل اور ردّ عمل، علت اور معلول اثبات نفی اور ترکیب کا قانون کارفرما ہے یہ فلسفہ مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتا اور بہت سے سوالوں کا جو میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں جواب نہیں دے سکتا۔ غیر محسوس طور پر میرا ذہن ایک تصوری نقطۂ نظر جو ویدانت کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے، اختیار کر لیتا ہے مجھے مارکسی فلسفے سے جو اختلاف ہے وہ ذہن اور مادے میں فرق کرنے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا تعلق اس حقیقت سے ہے جو ان دونوں کے ماورا ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو اخلاقیات کے پس منظر میں دیکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی نقطۂ نظر تغیر پذیر ہے یعنی ذہنی نشو و نما اور تہذیبی ارتقا پر منحصر ہے۔ یہ زمانے کے ذہنی ماحول کے سانچے میں ڈھلتا رہتا ہے لیکن اس کی تہ میں کچھ اور بھی ہے، بعض بنیادی رجحانات یا اصول جو بڑی حد تک پائدار ہیں ....

میں نے اشتراکی نظریے کے بنیادی اصول تو قبول کر لئے لیکن میں ان جزوی اختلافات کے چکر میں نہیں پڑا، جو اس نظریے کے ماننے والے آپس میں رکھتے ہیں۔ میں ہندوستان کی اشتراکی جماعتوں کی اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ وہ اپنی قوت کو نظری مسائل کی باریکیوں پر لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتی ہیں۔ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، زندگی بہت پیچیدہ ہے اور جہاں تک ہم اسے اپنے موجودہ علم کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں منطقی ترتیب سے خالی ہے اس لئے وہ کسی بندھے ٹکے نظریے کے چوکھٹے میں نہیں سما سکتی۔

میرے نزدیک حقیقی مسائل وہ ہیں جو ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں:- انفرادی اور اجتماعی زندگی، سازِ ہستی کی ہم آہنگی، فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا توازن افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کی درستی، نوع انسانی کا روز بروز بلند تر اور برتر مدارج پر فائز ہونا جماعت کی مسلسل نشو و نما، فرد کی پیہم ترقی، ان مسائل کے حل کرنے میں سائنس کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے یعنی مشاہدے کا علم صحیح کا غور و فکر اور استدلال کا طریقہ۔ ممکن ہے کہ حق کی تلاش میں یہ طریقہ ہمیشہ کام نہ دے سکے۔ اس لئے کہ آرٹ، شاعری اور روحانی واردات کے بعض پہلو بظاہر کسی اور دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور سائنس کے معروضی طریقوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ وجدان کو اور عرفان حقیقت کے دوسرے طریقوں کو ایک سرے سے رد نہ کریں۔ خود سائنس میں ان سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کسی حالت میں ہمیں اس صحیح معروضی علم کے لنگر کو نہ چھوڑنا چاہئے جو عقل اور تجربے اور عمل کی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں ہم تفکر کے اس بحر بے پایاں میں ڈوب کر نہ رہ جائیں جو زندگی کے مسائل سے اور انسانوں کی ضرورتوں سے بے نیاز اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ زندہ فلسفہ وہ ہے جو موجودہ مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
اخلاقی تصور اور اشتراکیت	جواہر لال نہرو	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
ہندوستان اور پاکستان (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ع، ل	۵
۳ باہر کی دنیا	″	۶
حسین	روش صدیقی	۷
غزل	اثر لکھنوی	۷
غزل	حسرت موہانی	۷
اب تو جاپان کی جان چھوڑو	مشتاق احمد	۸
زبان کی بساط پر ایک چال	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۹
دیہی اور گھریلو صنعتیں	پروفیسر محمد عاقل	۱۰
وکٹوریا والا (افسانہ)	منہاج محمد خاں	۱۱

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

وضع احتیاط

میں نے کسی گزشتہ اشاعت میں "دستور زبان ہندی" کی مخالفت کی تھی، لیکن میں اب اس میں ایک چھوٹی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کی زبان بندی تو نہیں لیکن ان کے انداز بیان پر اور تقریروں، اعلانوں کی تعداد پر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے! یہ کہنا تو شاید صحیح نہ ہو کر تقسیم ہند کی ذمہ داری محض بیان اور جواب بیان اور جواب الجواب کے ان سلسلوں پر ہے جو گزشتہ آٹھ دس سال سے ہمارے سیاسی حلقوں میں بہت مقبول ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آپس کی مخالفتوں اور تلخیوں کو بڑھانے میں ان کا بھی بہت ہاتھ ہے اور میرے خیال میں سوائے مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے ہمارا کوئی چوٹی کا لیڈر ایسا نہیں (قائدین کو چک کا تو کیا ذکر ہے!) جو اس بارے میں ضبط و اعتدال کی منزل سے آگے نہ بڑھا ہو۔ لیکن خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا، کم سے کم آیندہ کے لئے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیڈروں کو وضع احتیاط کی ضرورت ہے، ممکن ہے اس سے بعض لیڈروں کا (بقول غالب) "دم گھٹنے لگے" لیکن ان کے ملک زیادہ اطمینان کے ساتھ سانس لے سکیں گے۔ اس زبان کی بے اعتدالی کی دو حالیہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

جنگ یا صلح

مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی پہلے ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں بڑی اہمیت رکھتے تھے اب پاکستان میں ان کی حیثیت ایک نیم سیاسی نیم مذہبی لیڈر کی ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس کو وہاں کے لوگ اور حکومت بھی توجہ کے ساتھ سنتی ہے۔ ایک اخبار کی روایت ہے کہ حال میں انھوں نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "کشمیر کا مسئلہ مجلس اقوام میں طے نہیں ہو سکتا اس کا فیصلہ تو میدان جنگ میں ہوگا" کیا مولانا کو یہ اندازہ نہیں کہ آج کل کے زمانے اور آج کل کے حالات میں اس اطمینان کے ساتھ جنگ کی تلقین کرنا نہ انسان دوستی ہے نہ اسلام دوستی۔ نہ پاکستان دوستی ہے نہ کشمیر دوستی۔ عقل، مصلحت، اخلاق، مذہب سب کا تقاضا اور اصرار ہے کہ متنازع مسائل کو خوش اسلوبی کے ساتھ باہمی بحث کے ذریعے طے کیا جائے کیونکہ سر پھٹنے اور خون بہنے سے کسی مسئلے کے حق و ناحق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، کیا انھوں نے کبھی سوچنے کی زحمت بھی گوارا کی کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں واقعاً ایک باقاعدہ جنگ چھڑ گئی تو اس کا اثر دونوں ملکوں کے باشندوں اور ان کے مستقبل پر کیا پڑے گا جن کی بھلائی وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یقیناً چاہتے ہوں گے؟ کیا ان جنگ کے شوقین سورماؤں کو (جو دونوں ملکوں میں زبان اور قلم سے جنگ کرنے میں مصروف ہیں) ان تمام تباہیوں اور مصیبتوں کا ابھی تک پوری طرح احساس نہیں ہوا جو تقسیم ہند اور اس کے ساتھ کے فرقہ وارانہ فسادوں کی وجہ سے پیش آرہی ہیں کہ وہ میدان جنگ میں "بہادری" دکھانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ کیا دو ہمسایہ قوموں کی لڑائی، جس کے لڑنے والوں میں بھی دونوں طرف سے مسلمان شامل ہیں، "جہاد" کا حکم رکھتی ہے؟ کیا ہم میں سے ہر ایک کو کبھی اپنے ہر قول و فعل کی کڑی جواب دہی کرنی نہ ہوگی؟

شیریں کلامی یا سخت زبانی

ابھی حال میں سردار پٹیل بمبئی گئے تھے وہاں انھوں نے کئی تقریریں کیں، اور عام طور پر ان کا لہجہ معتدل رہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے تجربے نے ان میں ذمہ داری کا ایک نیا احساس پیدا کیا ہے لیکن اپنی ایک تقریر کے دوران میں انھوں نے (اخباروں کی رپورٹ کے مطابق) ایک ایسی بات کہی جس کو کسی طرح سراہا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے پاکستان کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:-

ہم اپنے اندرونی معاملوں میں کسی قسم کی دخل اندازی گوارا نہ کریں گے خواہ اس کی وجہ سے ہندوستان ختم ہو جائے یا پاکستان ختم ہو جائے یا دنیا کا خاتمہ ہو جائے! ہاں اگر پاکستان اپنی قبر کھودنا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کی پوری آزادی ہے۔"

مجھے بہت افسوس ہے کہ ایسے الفاظ سردار پٹیل کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے ملک کی بڑی سیوا کی ہے آزادی کے لئے قربانیاں کی ہیں حکومت سنبھالنے کے بعد ریاستوں کے مسئلے کو غیر معمولی تدبر کے ساتھ سلجھایا ہے۔ اس لئے ان کی ملک میں بڑی پوزیشن اور اثر ہے انھیں اپنے ایک ایک لفظ کو تول کر استعمال کرنا چاہئے کیونکہ عوام پر اور ملک کی بین الاقوامی پوزیشن پر اس کا اثر پڑتا ہے، لیکن ان کے اس بیان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو قابل گرفت ہیں

۱:- "اندرونی معاملوں میں دخل اندازی" واقعاً ایک بری بات ہے لیکن اس کے سلسلے میں اپنے ملک کی بلکہ ساری دنیا کی بازی لگا دینا، احساس تناسب سے بعید ہے۔

۲:- آج کل کی دنیا میں جب تک سب قومیں اپنے اختیار مطلق میں کچھ ردو بدل اور کمی کرنے کو تیار نہ ہوں گی، بین الاقوامی امن ناممکن ہے۔ اس لئے یہ "اندرونی معاملات" کا منتر ذرا زیادہ نہیں جپنا چاہئے۔ اس لفظ کے پیچھے بڑی بڑی ہٹ دھرمیوں اور بے انصافیوں نے پناہ لی ہے۔ آخر جنوبی افریقہ کا عذر بھی اپنے ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کے متعلق یہی ہے کہ یہ ہمارا "اندرونی معاملہ" ہے۔ ورحقیقت کوئی معاملہ اندرونی یا بیرونی ہونے کی وجہ سے "محرمات" میں شامل نہیں ہو جاتا، دنیا میں اصل تقسیم ایک ہی ہے، یعنی فلاں بات قرین انصاف ہے یا خلاف انصاف، باقی تمام تقسیمیں نفس کا دھوکا ہیں۔

۳:- پھر ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم واقعی بے تعلق رہ سکتے ہیں، اگر پاکستان اپنی قبر کھودنا چاہے؟ یا پاکستان بے تعلق رہ سکتا ہے، اگر ہندوستان اپنی قبر کھودنا چاہے۔ جب ہٹلر اپنی حرکتوں سے جرمنی کی قبر کھود رہا تھا تو بہت سے ملک اسی طرح اظہار بے تعلقی کرتے تھے لیکن اس کا خمیازہ ساری دنیا کو بھگتنا پڑا یا نہیں؟ آج تو ساری قومیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں جس طرح بدن میں خون پہنچانے والی شریانیں۔ کسی ایک کو کاٹ دیجئے اور پھر قانون قدرت کا تماشہ دیکھئے۔ اس لئے ہم تو اگر کسی قوم کو بھی اپنی قبر کھودتے دیکھیں گے خواہ وہ اپنی ہو یا دوسری، تو اس کو روکنے کی، راہ راست پر لانے کی کوشش کریں گے اور ہمارا طریقہ کار ہوگا۔ وجا دلہم بالتی ہی احسن

بین الاقوامی تعلقات اور ذمہ داریوں کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کے بہترین سیاست دان بھی اس خیال کے ہیں حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریروں میں خصوصاً مجلس اقوام کے سامنے اس بات کو بار بار واضح کر دیا ہے کہ باوجود مجلس اقوام کی ناکامیوں کے ہندوستان کو اس کے اصولوں اور آدرشوں پر عقیدہ ہے اور وہ اس کو مستحکم کرنے کے لئے پوری کوشش کرے گا۔ اسی طرح (یہ ایک دلچسپ حسن اتفاق ہے یا حسن تدبیر!) راجہ جی نے سردار پٹیل کو جو پیغام محبت ان کی سالگرہ کے روز بھیجا تھا (اور یہ شاید وہی دن ہے جب انھوں نے یہ تقریر کی) اس میں انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو جو مشورہ دیا ہے وہ ہمارے لیڈروں کے لئے قابل توجہ ہے تاکہ ہندوستان کا نام قوموں کی محفل میں بلند اور نیک رہے۔

"آزادی مل جانے کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو ہندوستان میں زیادہ دلچسپی اور تعلق خاطر پیدا ہو گیا ہے۔ جب یہاں انگریزوں کی مطلق العنان نوکر شاہی حکومت تھی تو یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس کا زیادہ نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اب ہماری ہر بات پر دنیا کے سیاست دانوں اور اخبار نویسوں کی تنقیدی نظر ہے .... ہمیں اپنی نئی اور آزاد حکومت کی تعمیر میں بہت سے پیچیدہ اندرونی معاملات کو حل کرنا ہے لیکن آج اس تمام کام میں ہمیں ایک سخت گیر بلکہ کسی حد تک معاندانہ بین الاقوامی رائے کے ساتھ سابقہ ہے .... حکومت انگریزی کے خلاف مدتوں جدوجہد اور احتجاج کرنے کی وجہ سے ہم شیریں کلامی کی عادت کھو بیٹھے ہیں .... آپ کو اور ہمارے وزیر اعظم کو اس وجہ سے ایک کافی مشکل مرحلہ کا سامنا کرنا ہے ...."

میر کارواں

ہمیں امید ہے کہ شیریں کلامی اور معقول پسندی کا جو بلند معیار گاندھی جی نے قائم کیا تھا اور جو ہمارے گورنر جنرل نے ان سے ورثہ میں پایا ہے (بلکہ شاید

بقیہ صفحہ ۱۴ پر

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ نومبر ۱۹۴۸ء

ہندوستان اور پاکستان

اگلے مہینے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندے مل کر ان مسائل پر غور کرنے والے ہیں جن کا حل ہونا دونوں ملکوں کے تعلقات کو سدھارنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سے تو کوئی معقول پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ کشیدگی دونوں حکومتوں کے لئے نہایت مضر ہے بلکہ اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کشیدگی کی وجہ سے دونوں بہت سے تعمیری کاموں کو نظر انداز کر کے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کر رہے ہیں، اسی کی وجہ سے دونوں کی باہمی تجارت بہت کم ہو گئی ہے اُدھر سے بہت سی ضروری چیزیں مثلاً غلّے کے اِدھر آنے میں رکاوٹ ہے اِدھر سے دوسری ضروریات مثلاً کپڑے کے اُدھر جانے پر پابندیاں ہیں جس سے دونوں جگہ گرانی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسی کی وجہ سے امن سلامتی کا عام احساس جو صنعتی اور کاروباری ترقی کے لئے لازمی ہے پیدا نہیں ہو سکتا اس کی وجہ سے ایک کروڑ سے زیادہ پناہ گزینوں کی املاک اور جائداد کا مسئلہ جس کے طے ہونے پر ان کی بحالی موقوف ہے طے ہونے نہیں پاتا۔ غرض اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نیزے کی دو نوکیں دو آدمیوں کے سینوں میں جو آمنے سامنے کھڑے ہیں چبھ رہی ہوں اور ہر ایک اپنے سینے کا زور لگا کر دوسرے کو ڈھکیلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کشیدگی کی وجہ کیا ہے؟ یوں تو بہت سے چھوٹے چھوٹے جھگڑے روز پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر وہ آپس کی بات چیت سے بڑی جلدی طے ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بس ایک کشمیر کا جھگڑا جس کے طے ہونے کی کوئی صورت نہیں نکلتی باہمی تعلقات کو سدھرنے نہیں دیتا تو پھر یہ کشمیر کا جھگڑا کیسے طے ہو؟

یہ بات دونوں حکومتیں بار بار کہہ چکی ہیں کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ وہاں کے باشندوں کی رائے سے طے ہونا چاہئے یہاں تک تو دونوں میں اتفاق ہے۔ اختلاف اس امر میں ہے کہ رائے شماری کا طریقہ کیا ہو۔ پہلے پاکستان یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی فوجیں کشمیر سے واپس بلا لی جائیں شیخ عبداللہ کی حکومت کو معزول کر دیا جائے۔ ریاست کو اقوام متحدہ کے نامزد کئے ہوئے لوگوں کے انتظام میں دے دیا جائے اور انھیں کی نگرانی میں رائے شماری ہو۔ ہندوستان کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے سرحدی قبائل کا لشکر اور پاکستانی فوج ریاست کی حدود سے ہٹا لی جائے، اس کے بعد اقوام متحدہ کے ناظروں کی نگرانی میں رائے شماری کا مناسب انتظام کرنے پر غور کیا جائے۔ جب دو خود مختار ریاستوں میں اس طرح کا اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ بین الاقوامی پنچایت کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ چنانچہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کی طرف سے ایک کمیشن ہندوستان اور پاکستان دونوں کی رضامندی سے آیا اور اس نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تجویز کی کہ پاکستان اپنی فوج کشمیر سے ہٹا لے باقی فوجیں لڑائی بند کر دیں اور پھر رائے شماری کی شرطیں طے کی جائیں۔ پاکستان نے پہلا ہی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس لئے ساری گفت و شنید ختم ہو گئی اور کمیشن ناکام واپس گیا۔ اب اگر ہندوستان اور پاکستان کی مجوزہ کانفرنس میں اس مسئلے پر کوئی نتیجہ خیز گفتگو ہو سکتی ہے تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کی حکومت رائے شماری کی کسی معقول اور قابل عمل تجویز کو مان لے اور ان مطالبات پر اصرار نہ کرے جنھیں کشمیر کمیشن رد کر چکا ہے۔

ہمارے خیال میں دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان ابھی تک اپنی اقلیت کو مطمئن نہیں کر سکا ہے۔ خصوصاً مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں بڑی بے چینی ہے، اور وہ لاکھوں کی تعداد میں ترک وطن کر کے مغربی بنگال آ رہے ہیں جس سے ہندوستان کی حکومت کو بڑی دقتیں پیش آ رہی ہیں اور خود مشرقی بنگال کی معیشت کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پاکستان کا آئین ابھی تک نہیں بنا ہے۔ یہاں تک کہ ریاست کے بنیادی مقاصد اور اس کے شہریوں کے بنیادی حقوق بھی تعین نہیں ہوئے ہیں۔ ہر طرف اسلامی ریاست کا نام لیا جا رہا ہے اور اس کی مختلف تعریفیں کی جا رہی ہیں۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ یہ اسلامی ریاست ترکی کی طرح ہوگی جہاں لوگ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ مگر ریاست کا کوئی مذہب نہیں، شام، ایران اور مصر کی طرح ہوگی جہاں سرکاری مذہب اسلام ہے، لیکن غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل ہیں یا نجد، حجاز اور یمن کی طرح ہوگی جہاں جمہوریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اور غیر مسلموں کا تو ذکر ہی کیا ہے خود مسلمانوں کو بھی مکمل بنیادی حقوق نہیں دئے گئے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ پاکستان میں غیر مسلم شک اور شبہے کی حالت میں ہیں جو ذرا سی تحریک سے خوف کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں ہم ہندوستان میں دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستانی ریاست کے غیر مذہبی اور جمہوری ہونے کا اعلان کیا گیا مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لئے اکثریت کے مساوی حقوق منظور کئے گئے اور ذمہ دار ارباب حکومت اور قومی لیڈر ایک عرصے تک ان کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے تب جا کر ان کو کسی قدر اطمینان ہوا اور ان کے قدم اس ملک میں ٹکے۔ یہی طرز عمل پاکستان میں بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں سچے دل سے یقین ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت اور ہندوستانی حکومت یہ چاہتی ہے

٣

٣ ہے کہ دونوں ریاستوں میں اختلافی مسائل میں معقول اور باعزت سمجھوتا ہو جائے اور جلد سے جلد دوستانہ اور خوش گوار تعلقات قائم ہو جائیں۔ اگر پاکستان کے نمائندے بھی یہی خواہش دل میں لے کر آئیں تو مجوزہ کانفرنس ضرور کامیاب ہوگی اور ہندوستان اور پاکستان کو یہ موقع ملے گا کہ فرضی بیرونی خطروں کی طرف سے مطمئن ہو کر حقیقی اندرونی خطروں کا یعنی رجعت پرستی سیاسی اور معاشی بے انصافی استحصال اور نفع خوری کا مقابلہ کریں جو چپکے چپکے دونوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

بزم بے تکلف

"بہت اچھا مولانا، خدا آپ کو بہشت نصیب کرے لگے ہاتھوں لیڈروں کی اور قسموں کے نام بھی بتا ڈالئے۔"

"میری جان بخشی کیجئے، آپ تو قضائے مبرم کی طرح پیچھے پڑ گئے مجھے مدرسے کو دیر ہوتی ہے، طلاب منتظر ہوں گے۔"

"اجی طلاب کو جُلاب پھر دیجئے گا، پہلے میری تضائے حاجت تو فرما دیجئے۔"

"بھئی الفاظ کی قسمیں تو بے شمار ہیں، مجھ سے کیا حماقت سرزد ہوئی کہ الفاظ کے قیاس پر لیڈروں کی تقسیم شروع کر دی۔"

"مولانا حماقت نہیں، آپ سے عقل مندی سرزد ہو گئی۔ لفظوں اور لیڈروں میں بڑی مشابہت ہے۔ دونوں حرفوں کے بنے ہوتے ہیں"

"خیر سنئے۔ غیر مستند الفاظ کی دو اور بڑی قسمیں ہیں جو قابل ذکر ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ، ان کے مقابلے میں غیر مستند لیڈروں کی بھی دو اور قسمیں عامی اور سوقی قرار دی جا سکتی ہیں۔"

"عامی تو میں سمجھ گیا یعنی ٹکسالی لیڈر کا خوردہ یا ریزگاری، مگر اس کو آپ نے غیر مستند کیسے کہہ دیا ہے وہ ٹکسالی کی طرح سولہ آنے لیڈر نہ سہی مگر ہے تو اسی کی کسر، آخر اکنّی، چونی، دوانی، اکنی، ادھنا، خالی پیٹ کا پیسہ۔ یہ سب بھی تو ٹکسال ہی میں گھڑے جاتے ہیں جیسے خریدے کے بغیر عام ضرورت کی چیزوں کا ہاتھ آنا مشکل ہے، اسی طرح عامی لیڈروں کے بغیر عوام کو ہاتھ میں لینا اور ہاتھ میں رکھنا دشوار ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ عامی لیڈر بڑے لیڈر کا بھونپو ہے جو اس کی آواز کو پھیلاتا اور پھیلاتا ہے۔"

"خیر، یہ تو ہوا عامی لیڈر، مگر مولانا دوسری قسم کا نام آپ نے سوقی بتایا تھا، یہ سوقی کیا بلا ہے؟"

"سوقی وہی جسے آپ بازاری کہتے ہیں۔"

"یا اللہ تیری پناہ! بازاری لیڈر خطرۂ جان، خطرۂ ایمان خطرۂ ہندوستان، خطرۂ پاکستان۔ آگ کھاتا ہے، انگارے اگلتا ہے۔ بس بوتا ہے، بس کے روکھ اُگاتا ہے۔ نعرے اس کا دعوے گالیاں اس کی دلیل، بھڑکانا اس کا کام، لڑوانا اس کا کھیل، جان کی بازی لگاتا ہے، اپنی نہیں، دوسروں کی جان کی، سر کا سودا کرتا ہے اپنے نہیں، دوسروں کے سر کا، کوئی جیتے یا ہارے اس کے پو بارے، کوئی جئے یا مرے، اس کے دام کھرے۔"

"ماشاء اللہ آپ تو جوش خطابت میں، شاعری فرمانے لگے خیر اب مجھے اجازت دیجئے، بہت دیر ہو گئی۔"

"مگر مولانا مقطع کا بند تو رہ گیا، لفظ کی ایک قسم مہمل بھی تو ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں مہمل لیڈر ——"

"اسے اپنا تخلص سمجھ لیجئے۔ السلام علیکم۔"

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

اس طومار سے کیسے نمٹیں

آئین ساز اسمبلی میں جیسا ہمارا خیال تھا، جزوی اور ضمنی مسائل پر بحثیں زور و شور سے ہو رہی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مختلف ممبر جو ترمیمیں پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے۔ اگر سب ترمیموں کو گفتگو کا پورا موقع دیا جائے تو اسمبلی کو اپنا اجلاس دو تین سال تک مسلسل جاری رکھنے کی ضرورت ہے اور جو بیچ بیچ میں وقفے ہوں جیسے کہ اب تک ہوتے رہے ہیں تو شاید دس بارہ سال لگ جائیں۔ وہ تو کہیے بڑی خیریت ہوئی کہ بنگال کے باریک بیں ممبر نذیر الدین احمد صاحب کی ایک ہزار ترمیموں کا پلندہ ریل کے سفر میں چوری ہو گیا، ورنہ ترمیموں کی تعداد سوائی ہوتی۔ ایک صاحب نے تو اسمبلی میں کہہ دیا کہ ان چوروں نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ کاش کچھ من چلے پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ کا بستہ بھی غائب کر دیتے۔

اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ کانگریس پارٹی کے جلسوں اور دوسری نجی صحبتوں میں ترمیم پیش کرنے والوں کو سمجھا بجھا کر مکرر اور غیر ضروری ترمیمیں حذف کر دی جائیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس طرح ترمیموں کی تعداد تین سو اور چار سو کے درمیان رہ جائے گی، اور ان پر بحث کا سلسلہ ۱۵ر جنوری تک ختم ہو جائے گا۔ فرض کیجیے صرف تین سو ترمیمیں رہ جائیں۔ تب بھی یہ توقع خوش فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ ان سے اسمبلی اتنی جلدی نبٹ لے گی۔

اب تک صرف ایک ترمیم ڈاکٹر امبیڈکر کی اسمبلی کے سامنے آئی جو کسی حد تک اہمیت رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی صوبے کے حدود میں کوئی تبدیلی کرنی ہو تو انڈین یونین کا صدر صوبے کی مجلس آئین ساز کی رضامندی سے کر سکے گا، اور کسی ریاست کی حدود میں رد و بدل کے لیے اسے ریاست کی رضامندی حاصل کرنی ہوگی۔ بہت سے لوگوں نے صوبے اور ریاست میں فرق کرنے پر اعتراض کیا مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی رو سے ریاستوں کی حیثیت صوبوں سے الگ ہے۔ آخر ترمیم منظور ہو گئی۔

مگر زیادہ جوش و خروش کا اظہار اس قسم کی ترمیموں میں کیا گیا کہ انگریزی مسودے میں بھی ہندوستان کے لیے "اسٹیٹ" کے بجائے "پردیش" کا لفظ استعمال کیا جائے، "انڈیا" کے بجائے "بھارت" یا "بھارت ورش" رکھا جائے۔ "اسٹیٹ" کو تو وزیر اعظم نے بچا لیا مگر "انڈیا" پر بڑا سخت حملہ تھا۔ اس کو پنڈت گووند ولبھ پنت نے اس وقت اس طرح ٹالا کہ پہلے ملک کے دستور منظور ہو جانے دیجیے نام پھر تجویز کر لیجیے گا۔

ابھی تک تو جتنی ترمیموں پر گرم جوشی سے بحث ہوئی ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اسمبلی کے بہت سے ممبروں کو آئین کے مضمون سے زیادہ اس کی زبان سے، ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے زیادہ اس کے نام سے دلچسپی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر انہیں اپنے اس خیال میں ترمیم کرنی پڑے۔

مشرقی بنگال کی پہیلی

مشرقی بنگال کی حکومت نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی اپنی سی کوشش کی کہ وہاں کے ہندو باشندے بہت بڑی تعداد میں مغربی بنگال کی طرف ہجرت کر رہے ہیں، لیکن اب یہ چھپائے نہیں چھپتی۔ حال میں بی۔ بی۔ سی نے اپنے کراچی کے نامہ نگار کا بیان نشر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی مرکزی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں بے چینی ہے اور لوگ بڑی تعداد میں ترک وطن کر رہے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ پچھلے مہینے دس لاکھ تو نہیں البتہ تین لاکھ آدمی مشرقی بنگال سے مغربی بنگال منتقل ہوئے ہیں مگر یہ تعداد بھی کچھ کم نہیں، اور پاکستان کی حکومت محسوس کر رہی ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مشرقی بنگال کی معاشی حالت جو پہلے سے خراب ہے نہایت ابتر ہو جائے گی۔ اسی لیے لیاقت علی خاں صاحب مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کے لیے پہنچے ہیں۔ وہ ہجرت کے اسباب کی تحقیقات کریں گے اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہیلی جسے بوجھنا ہے دراصل یہی ہے کہ اب جبکہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فساد کا زور گھٹ چکا ہے اور خود مشرقی بنگال میں تو بالکل ہی ٹھنڈا پڑ گیا ہے وہاں سے لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ بی۔ بی۔ سی کے نامہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی وجہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی ہے جو کشمیر کی جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کشیدگی تو سال بھر سے ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اس کا اثر اس قدر شدت سے خاص اس وقت ظاہر ہو رہا ہے اور وہ بھی مشرقی بنگال میں جو کشمیر کے محاذ سے تقریباً دو ہزار میل دور ہے۔ دوسرے لوگوں نے اور کئی وجہیں بتائی ہیں یعنی معاشی حالت کی خرابی، گرانی، بد امنی اور وہ بے اطمینانی جو غیر مسلموں کو اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے معاملے میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں موجود ہیں اور ان کا ہجرت کے مسئلے سے تعلق ہے، لیکن یہ بھی نئی نہیں بلکہ بہت دن سے ہیں اور ان کے اثر سے جو ہجرت ہو رہی ہے وہ چھوٹے پیمانے پر آہستہ آہستہ ہو رہی ہے۔ اس بھگدڑ کا جو پچھلے مہینے مچی ہے کوئی نیا اور جداگانہ سبب ہونا چاہیے۔ اس سبب کا تعین یقینی طور پر تو مقامی تحقیقات ہی سے ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک باہر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے مشرقی بنگال کے غیر مسلموں کے غیر معمولی خوف اور خفگی کی وجہ یہ ہے کہ کچھ دن سے فتنہ پرداز لوگ شری پیارے لال اور ان کے ساتھیوں کو جو نواکھلی کے علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھائی چارہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ستانے پر تل گئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حضرات پر مقدمے دائر کیے گئے ہیں جن میں شاید ایک مقدمہ قانون اسلحہ کی خلاف ورزی کے سلسلے میں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شری پیارے لال اور ان کے رفیق گاندھی جی کے ساتھ نواکھلی پہنچے تھے، ایک عرصے تک ان کی سرکردگی اور نگرانی میں کام کر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی ان ہی اصولوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی نیک نیتی، خلوص، ہمدردی، ایثار اور ان تھک محنت کو ہندو مسلمان سب سراہتے رہے ہیں اور خود مشرقی بنگال کی حکومت یہ اعتراف کر چکی ہے کہ انہوں نے فرقہ وارانہ اتحاد اور امن و سکون کے قیام میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جب تک ناظم الدین صاحب وزیر اعظم تھے ان حضرات کے تعلقات حکومت سے بہت خوشگوار رہے اور فریقین ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناظم الدین صاحب کے ہٹنے کے بعد حکومت کی پالیسی یا طرز عمل میں کوئی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ امن کے نقیب اپنا کام نہیں کر سکتے اور اس چیز نے مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں جنہیں ان کی وجہ سے بڑا ڈھارس تھا مایوسی اور گھبراہٹ پیدا کر دی ہے۔

پس پردہ کچھ ہو رہا ہے

کشمیر کے بارے میں لیاقت علی خاں صاحب کی تقریر کے بعد جس کا ہم نے پچھلے پرچے میں ذکر کیا تھا یہ خبر آئی ہے کہ "آزاد کشمیر" کی حکومت کے صدر سردار ابراہیم اور صدر اعلیٰ چودھری غلام عباس صاحب نے کراچی پہنچ کر کئی روز تک لیاقت علی خاں صاحب سے گفتگو کی۔ ادھر پاکستان کے اخباروں میں تقسیم کشمیر کی کچھ ساختہ بے ساختہ مخالفت بڑے زور شور سے ہو رہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم کی بنا پر سمجھوتے کی کچھ بات چیت ضرور ہو رہی ہے۔ حال میں ہندوستانی فوج کو کشمیر کے شمالی سرحدی علاقے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور جنوبی مغربی سرحد کی طرف بھی اس کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان حفاظتی کونسل سے شکایت کرنے والی ہے کہ آپ کے اس اعلان کے باوجود کہ ہندوستان یا پاکستان کو کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنی چاہیے جس سے فضا اور بگڑے اور صلح کی گفتگو میں رکاوٹ پیدا ہو، ہندوستان نے کشمیر میں اپنی فوجی تیاریاں بہت بڑھا لی ہیں اور اپنی سرگرمیوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے پاکستان کی یہ شکایت اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ حفاظتی کونسل کے بھیجے ہوئے کمیشن کی صلح کی شرائط کو خود اسی نے رد کیا تھا، عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔ مگر بہر حال یہ علامت اچھی ہے کہ پاکستان کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ فضا بگڑنے نہ پائے اور صلح کی گفتگو میں رکاوٹ نہ پڑے۔

---

۲ - پاکستان

ریاستوں کا اب تک وہی حال ہے

پچھلے دنوں آل پاکستان سٹیٹس لیگ کا کراچی میں اجلاس ہوا جس میں پاکستانی ریاستوں کی حالت اور ان کی اصلاح و ترقی کے متعلق بحث و گفتگو ہوئی۔ معاصر پاکستان ٹائمز لاہور کے رپورٹر نے جو اسے اطلاع بھیجی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجلاس میں پاکستانی ریاستوں کی عام حالت کے متعلق انتہائی بے اطمینانی بلکہ تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ آزادی کو پندرہ مہینے ہو چکے ہیں، مگر پاکستانی ریاستوں کی کروڑ پانچ ملین آبادی شخصی حکومت کے ماتحت ہے اور انھیں آزادی کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ پاکستان میں شامل ہونے والی دس ریاستوں میں سے ایک میں بھی عوامی وزارت نہیں ہے۔ وہاں کی میونسپلٹیوں تک میں عوام کے نمائندے نہیں ہیں۔ اسٹیٹس مسلم لیگ کے ذمہ دار حضرات کے بیان کے مطابق تمام ریاستوں میں حکومت کی طرف سے سیاسی اور سماجی کام کرنے والوں کی مخالفت کی جاتی ہے۔ سرحد کی ریاستوں میں لیگی رضاکاروں کو کام کرنے کی اجازت نہیں، بلوچستانی ریاستوں میں مزاحمتیں پیدا کی جاتی ہیں، بعض دوسری ریاستوں میں پاکستان نیشنل گارڈ کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خیرپور میں پاکستان نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اسٹیٹس لیگ کے سکریٹری محمد محمود صاحب نے فرمایا کہ ہماری آزادی کو پندرہ مہینے ہو چکے ہیں مگر ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے بارے میں ہماری ریاستی وزارت کا طرز عمل بالکل وہی ہے جو برطانوی عہد حکومت میں تھا۔

چنانچہ ایک تجویز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرحد کی ریاستوں میں جو زیادتیاں کی جا رہی ہیں ان کی تحقیق کے لئے ایک غیر سرکاری وفد بھیجا جائے۔ اسٹیٹس مسلم لیگ کے کاموں میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، اور وہاں کے عوام پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں ان پر بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا اور وزیر اعظم پاکستان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کریں۔ ایک دوسرے ریزولیوشن میں ان تمام ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے مطالبے کو دہرایا گیا ہے۔

عبدالقیوم خاں کی تازہ تصنیف

صوبہ سرحد میں قیوم خانی وزارت سے لیگی کارکنوں کو عام طور پر شکایت ہے اور ان کی بے اطمینانی مخالفت کی حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ ویسے تو لوگوں کی شکایتوں کی فہرست بہت طویل ہے مگر ان کی موٹی موٹی دو تین باتیں یہ ہیں۔ یہ وزارت صوبے کے مسائل خصوصاً غذا کی دقتوں کو حل کرنے سے قاصر رہی۔ وزارت کو برسر اقتدار رکھنے اور عوام کی بے اطمینانی اور بے اعتمادی کے ڈر سے مسلم لیگ کی ممبر سازی کو صرف وزارتی پارٹی کے حامیوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ صوبے میں تحریر و تقریر کی آزادی کو بالکل کچل دیا گیا ہے۔ اس تیسری شکایت کے متعلق کچھ دن ہوئے پاکستانی معاصر امروز لاہور نے "سیفٹی ایکٹ اسمبلی میں" کے عنوان سے اداریہ لکھا تھا، اس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"صوبائی اسمبلی میں وزیر اعظم صوبہ سرحد نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے حق میں جو دلائل دئے ہیں۔ ان کا اجمال یہ ہے کہ خان عبدالغفار خاں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے تھے اور ان کی سرخ پوش جماعت ایک سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے بموجب پاکستان میں بے چینی اور بدامنی پھیلا رہی تھی۔ موجودہ حالات میں اس قسم کی سرگرمیاں اس مملکت کے لئے خطرناک اور ان کے محرک ملک و قوم کے دشمن ہیں، لہٰذا حکومت کو ان عناصر سے عہدہ برآ ہونے کے لئے غیر معمولی اختیارات اور ہنگامی قوانین سے مسلح ہونا چاہئے۔

پبلک سیفٹی ایکٹ کے بارے میں ہمارا نقطۂ نگاہ مزید کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ ہم نے بارہا لکھا کہ جو لوگ سلطنت کے دشمنوں اور قوم و ملک کے خلاف سازش کرنے والوں کے خلاف یقیناً سخت اور عبرت آموز چارہ جوئی کرنی چاہئے۔ لیکن یہ فیصلہ کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت مجرم ہے، پولیس کے حکام یا نظم و نسق کی مشینری پر چھوڑ دینا متمدن اور جمہوری ممالک کے مروجہ طرز حکومت اور خود ہماری روایات کے منافی ہے۔

ہماری رائے سے کوئی انصاف پسند اختلاف نہیں کر سکتا کہ کسی فرد کے جیل کے اندر یا باہر رہنے کا فیصلہ پولیس کے انسپکٹر کی نسبت عدالت کا جج زیادہ صحت کے ساتھ کر سکتا ہے۔ پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نظم و نسق کی جو مشینری ہمارے حصہ میں آئی ہے اُسے ہمارے ملک کے غیر ملکی مالکوں نے اپنی مخصوص ضروریات کے پیش نظر بنایا تھا۔ ...... ہماری مشینری کو احتساب سے بے نیاز کر کے لامحدود خصوصی اختیارات سونپ دینا، اگر ایمانداری سے غور کیا جائے تو ملک و قوم کے لئے تخریبی عناصر کی آزادی سے کم خطرناک نہیں۔ جمہوریت اور شہری حقوق کی آڑ میں کسی فرد یا کسی جماعت کو مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی آزادی ہرگز نہیں ملنی چاہئے لیکن یہ بھی انصاف سے بعید ہے کہ حفاظتی تدابیر کے بہانے نظم و نسق کو کامل اختیار دے دیا جائے کہ جسے چاہے جیل میں ٹھونس دے اور اس کے خلاف کوئی داد نہ فریاد۔

کشمیر کی تقسیم کا چرچا

یہ عجیب بات ہے کہ جب شیخ عبداللہ نے کبھی کشمیر کی تقسیم کی تجویز پیش کی اور نہ ہندوستان کے کسی ذمہ دار شخص نے، مگر پاکستان میں تقسیم کشمیر کی مخالفت میں آج کل زور شور سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان اب سمجھ گئی ہے کہ آخر کار اسے بانٹ لینے کے اصول پر عمل کرنے کی فکر ہو رہی ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے بعد، لندن کے بعض حلقوں سے تقسیم کشمیر کے حق میں پیچ در پیچ طریقوں سے آوازیں بلند ہوتی سنائی دے رہی ہیں جن سے ہم نوٹس لئے بغیر صرف نظر نہیں کر سکتے۔

پاکستان کی افواج قاہرہ کے پہلے انگریز کمانڈر انچیف جنرل سر فرینک میسروی نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ نسلی، مذہبی، اقتصادی اور جغرافیائی اعتبارات سے کشمیر پاکستان کا ایک حصہ ہے اور اگر وہاں آزادانہ استصواب رائے کرایا جائے تو وہاں کے باشندوں کی غالب اکثریت اپنے ملک کو پاکستان کے ساتھ شامل کرنے کے حق میں رائے دے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے صوبہ جموں کے جنوب مشرقی گوشے کو اپنی مذکورہ صدر رائے سے مستثنیٰ قرار دے کر تقسیم کشمیر کا شوشہ چھوڑ دیا۔ پاکستان کو جنرل میسروی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے پاکستان کا حق تسلیم کیا مگر ساتھ ہی جموں کے جنوب مشرقی گوشے کو کشمیر سے الگ کر دینے کی بات لگا دی تاکہ تقسیم کشمیر کے حامیوں کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ایک دن پہلے بی بی سی پر ایک انگریز نے مسئلہ کشمیر پر تقریر نشر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کشمیر کے ملک کی استصواب رائے عامہ کی خاطر پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر حصے سے جداگانہ طور پر دریافت کیا جائے کہ وہ کس ملک میں شامل ہونے کا خواہاں ہے۔

ہم ان شوشوں پر جو لندن کے فتنہ پسند حلقوں کی طرف سے چھوڑے جا رہے ہیں تشویش کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

(مغربی پاکستان لاہور)

وزارت کی جنگ زرگری

مغربی پاکستان کے تینوں صوبوں کی وزارتوں کے خلاف بڑی شدت سے ایجی ٹیشن ہو رہا ہے۔ صوبہ سرحد کی وزارت کے متعلق ہی روشنی کی گذشتہ اشاعت میں ہم ایک پاکستانی معاصر کا اقتباس پیش کر چکے ہیں اور اس مرتبہ بھی پیش کر رہے ہیں۔ مغربی پنجاب کی وزارت کو پاکستان کے گورنر جنرل نے ہدایت کی کہ خان ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خاں کو کابینہ میں شامل کر کے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ ممدوٹ وزارت مستعفی ہو گئی تھی اور خان ممدوٹ دولتانہ صاحب اور نون صاحب سے گفت و شنید کر رہے تھے، مگر ایک دم سے انھوں نے نیا پینترا بدلا۔ لاہور کے پانچ اخباروں کے ایڈیٹروں کو اپنی شکایات کے لئے ساتھ لے کر ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور گورنر جنرل سے یہ حکم لے آئے کہ وہ نئی وزارت اپنی مرضی کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نئی وزارت کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ پرانے وزیروں میں صرف شیخ کرامت علی الگ کئے گئے

(بقیہ صفحہ ۶)

۳- باہر کی دنیا

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

چین کی خانہ جنگی اب تیزی سے خاتمہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سال کے ختم سے پہلے چیانگ کائی شک کی حکومت ختم ہو جانے کی۔ چیانگ کائی شک کی فوج میں شکست خوردگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ حوصلے چھوٹ چکے ہیں، کردار گر چکا ہے، عوام مایوس ہو چکے ہیں اور نظام کی کڑیاں قریب قریب ٹوٹ چکی ہیں۔ مارشل لا اور دوسری سختیوں سے گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیا جا رہا ہے، مگر کب تک؟!

اب جنرل سمو کو میدان جنگ میں مات صاف دکھائی دے رہی ہے، اس لئے وہ میدان سیاست میں آ رہے ہیں۔ وہ بہت جلد یو۔ این۔ او۔ میں یہ شکایت پیش کرنے والے ہیں کہ روس کمیونسٹوں کی فوجی امداد کر رہا ہے اور یہ بات چین اور روس کے معاہدہ ۱۹۴۵ء کے خلاف ہے۔ جنرل سمو کو شاید امید ہے کہ اس طرح وہ شاید چین کی خانہ جنگی کو روس اور امریکہ کا مسئلہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر یہ مسئلہ یو۔ این۔ او۔ میں پیش ہوا تو ممکن ہے کہ روس اور امریکہ میں کچھ تلخی بڑھ جائے لیکن یہ لڑائی روس اور امریکہ کی لڑائی ہو جائے، اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

بہر حال چین کی اندرونی ابتری اور جنرل سمو کی فوج کی عام بے دلی کے پیش نظر اب باہری امداد، شاید بہت زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکے گی۔ چیانگ کی فوجیں برابر پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ سیچو کی شکست کے بعد کسی ایک جگہ بھی ان فوجوں نے ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا۔ چنانچہ شمال کی طرف سے راجدھانی نانکنگ کو کمیونسٹ ۱۶۰ میل کے فاصلے پر رہ گئے ہیں۔ سوچاؤ کے متعلق متضاد خبریں آ رہی ہیں، کمیونسٹ ریڈیو کا بیان ہے کہ اس پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے اور چینی حکومت کے محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہنگٹن ٹونگ نے اس کی تردید کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نانکنگ کو فی الحال خالی کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سوچاؤ پر واقعی کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے تو صرف ٹینگ پو ایک ایسا مقام رہ جائے گا جو نیشنلسٹ فوجوں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں سے راجدھانی محض ۱۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ ۸۰ ہزار کمیونسٹ فوج جنرل لیو پچنگ کی سرکردگی میں ٹینگ پو کی طرف بڑھ رہی ہے اور ہونان کی سرحد ینگ چنگ اور ان ہوئی تک پہنچ گئی ہے۔ اس وقت سوچاؤ کے مشرق میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، اور امید ہے کہ اس جنگ کے نتائج دور رس ہوں گے۔

ہنوز روز اول

فلسطین کا مسئلہ مہینوں سے یو۔ این۔ او۔ میں پیش ہے مگر اب تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ اس درمیان میں بارہا عارضی طور پر

نیشنلسٹ علاقہ
کمیونسٹ علاقہ
پیکنگ
منچوریا
نانکنگ
شنگھائی
ہونان
ہوپی

لڑائی بند ہوئی مگر عرب اور یہودی دونوں ایک دوسرے پر لڑائی جاری رکھنے کا الزام لگاتے رہے۔ متعدد تجویزیں پیش ہوئیں مگر دونوں نے یا دونوں میں سے کسی ایک نے نامنظور کر دیں۔ لڑائی پھر جاری ہو گئی۔

اب تک لڑائی میں یہودیوں کا پلہ بھاری رہا ہے۔ طاقت، تنظیم، جنگی چالیں، منصوبہ بندی، غرض ہر لحاظ سے نقیب اور بیرشبہ عربوں کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور فلسطین کے عرب حصے کا صدر مقام غازا اس وقت خطرے میں ہے۔ اگرچہ عرب بڑے جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ان کی اندرونی حالت قابل اطمینان نہیں ہے جن عرب ریاستوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ان میں یکجہتی اور اتحاد مفقود ہے۔ ان میں صرف نقطۂ نظر ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ مقصد اور نصب العین میں بھی اختلاف ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک نہ تو فوجی کارروائیوں میں کامیابی ہوئی اور نہ سیاسی کوششوں میں۔ اور ان پر فلسطین کے مہاجرین کا ایک ایسا بوجھ آن پڑا ہے جسے وہ تنہا نہیں اٹھا سکتیں۔ اس کو حل کرنے کے لئے بین اقوامی اعانت اور تعاون کی ضرورت ہے اور اب تک اس اعانت اور اشتراک کے حاصل کرنے میں عرب ناکام رہے ہیں، لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کے بعد فلسطین کے بارے میں اس کے طرز عمل میں تبدیلی ہوگی اور شاید اس وقت یو۔ این۔ او۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائے مگر ابھی تک اس کے آثار نظر نہیں آتے۔

۱۶ر نومبر کو حفاظتی کونسل نے یہودیوں اور عربوں دونوں کو مستقل صلح کی گفتگو کرنے کا حکم دیا ہے۔ عرب ممالک مصر شام اور لبنان نے یہودیوں سے کسی قسم کی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لبنانی ڈیلیگیٹ کے الفاظ میں وہ اس وقت تک کسی تجویز پر عمل نہیں کر سکتے۔ جب تک یہودی صلح نامہ کی پوری طرح تعمیل نہ کریں اور عارضی مصالحت کے زمانے میں انھوں نے جو جگہیں حاصل کر لی ہیں ان سے اپنی فوجیں ہٹا کر ابتدائی محاذوں پر واپس نہ لے جائیں۔ عرب نمایندوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ہر اس تجویز کی مخالفت کریں گے جس میں کسی صورت میں بھی فلسطین کو تقسیم کیا جائے گا اور یو۔ این۔ او۔ کے کسی حکم کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک وہ فلسطین کی اکثریت کی رائے کو ملحوظ نہیں رکھے گا۔ دیکھئے حفاظتی کونسل کے اس حکم کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اب تک ہوتا رہا ہے یا وہ دونوں حریفوں سے اس کی تعمیل کرا لیتی ہے۔

اس سے بھی کچھ نہ ہوا

۲۲ر اکتوبر کو یو۔ این۔ او۔ کی سیاسی کمیٹی میں، میکسیکو کا ایک ریزولیوشن پاس ہوا تھا جس میں بڑی طاقتوں سے اپنے اختلافات دور کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس کمیٹی میں روس بھی شریک تھا۔ اس کے بعد یو۔ این۔ او۔ کے سکریٹری جنرل موسیو ٹرگوی لی اور پریذیڈنٹ ڈاکٹر ایوٹ کی مشترکہ اپیل شائع ہوئی جس میں برلن کے تعطل کو دور کرنے کے لئے ازسر نو کوشش کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ روس نے ملاقات اور گفتگو کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی شروع سے یہی خواہش ہے، چنانچہ اسی کے پیش نظر اس نے برلن اور اس کے ساتھ پوٹسڈم کے فیصلے کے مطابق جرمنی کے تمام مسائل پر بحث و گفتگو کے لئے وزرائے خارجہ کی میٹنگ کی تجویز کی تھی، لیکن روس جس طرح ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے مغربی طاقتیں تیار نہیں ہیں، چنانچہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے اب اپنے جواب بھیج دئے ہیں، اور تینوں نے تقریباً ایک ہی سی بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس پیچیدہ مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ اسے حفاظتی کونسل پر چھوڑ دیا جائے۔ گویا اس طرح پانچ مہینے سے جو مسئلہ الجھا ہوا ہے اور حل ہونے میں نہیں آتا اس کی ذمہ داری حفاظتی کونسل پر آ گئی ہے۔ در اصل مغربی طاقتیں اب تک اسی پر اڑی ہوئی ہیں کہ برلن کی ناکہ بندی ہٹانے کے بغیر مزید گفتگو نہیں ہو سکتی۔

پاکستان (بسلسلہ صفحہ ۵)

اور سب موجود ہیں، نئے وزیروں میں ایک چودھری فضل الٰہی ہیں اور دوسرے شیخ محمد حسن۔ شیخ محمد حسن جرمانے کی رقم ادا کرنے کے بعد چارج لے سکیں گے۔ ملک فیروز خاں نون نے اپنے تازہ بیان میں ممدوٹ صاحب کی بدعہدی کی شکایت کی ہے اور میاں دولتانہ نے پوری وزارت پر بدعہدی کے علاوہ نالائقی، بے اصولی اور کمزوری کے الزامات بھی لگائے ہیں۔ خان ممدوٹ ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ دونوں کیبنٹ میں اس کے اندر پھوٹ ڈالنے کی نیت سے شریک ہونا چاہتے تھے مگر ان کی یہ چال نہیں چل سکی۔ غرض اس بحث نے بہت بھونڈی اور رکیک شکل اختیار کر لی ہے۔

(سیّد الشہدا)
حسینؑ

روشؔ صدیقی

حجّت الحق و شہید الشہدا ہست حسینؑ
منظرِ عظمتِ آیات خدا ہست حسینؑ
جاں بہ معبود سپردہ بہ سجودِ معبود
یعنی زندہ کنِ آئینِ وفا ہست حسینؑ
ذاتِ او، شاہد و مشہود و شہید یزداں
قبلہ و قبلہ گر و قبلہ نما ہست حسینؑ
اہرمن، کشتہ شد از ضربتِ الا اللہ آتش
تو مپندار کہ مقتولِ جفا ہست حسینؑ
مشہدِ عشق بہ تسلیم و رضائش نازد
بالیقیں کعبۂ تسلیم و رضا ہست حسینؑ
اہلِ بیداد و جفا را، بہ دُعا یاد کند
وارثِ اسوۂ محبوب خدا ہست حسینؑ
جز خدا، ہیچ نخواہد، بہ رہِ عشق خدا
بخدا خاصۂ خاصانِ خدا ہست حسینؑ
عرش پرسید قرار دل کونین کجاست
کربلا گفت کہ "مصروف دعا ہست حسینؑ"
اے ملول شب عاشورہ بروں شو ز حجاب
پاک کن چشم کہ خود صبح بقا ہست حسین

برترم از فلک انجم و خورشید روشؔ ؛ مسند آرائے حریم دل ما ہست حسینؑ

غزل

اثرؔ لکھنوی

کیا زمانہ تھا کہ جب تم مجھ کو مضطر دیکھتے
زیرِ لب کچھ کہتے چپ رہتے مکرر دیکھتے

تم کو رحم آتا، ضرور آتا، اگر پرسش کے بعد
شوق کی بے دست و پائی کا بھی منظر دیکھتے

ہوش میں کیا آئے وہ دیوانہ تم جس سے کہو
"اب تو دل کڑھتا ہے تم کو خاک بر سر دیکھتے"

تیرے سجدے میں جو ہوتا کچھ بھی اے زاہد خلوص
تم کو جھک جھک کر در و محراب و منبر دیکھتے

دیکھنے والوں سے کہہ دو، دیکھنا آتا اگر
منظر ہستی سے بالا ایک منظر دیکھتے

یاد ایامِ جنوں کا نام تھا ذوقِ خبر
ذرے ذرے میں ترا پیغام مضمر دیکھتے

اُن کے آنے کی بندھی تھی آس جب ہم نشیں
صبح ہو جاتی تھی اکثر جانبِ در دیکھتے

ہائے اُن کی شوخیاں اور شوق کی رسوائیاں
دیکھتے تھے وہ ہمیں ہم ان کو کیونکر دیکھتے

اب دلِ مشتاق کو ان سے یہ شکوہ ہے اثرؔ
جب اِدھر دیکھا ہی تھا تو آنکھ بھر کر دیکھتے

غزل

مولانا حسرتؔ موہانی

اس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے

محفوظ یہ ہے راز ترے لطفِ ستم کا
اغیار میں چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بولے تو یہ بولے وہ تقاضائے کرم پر
یوں ہی سہی اچھا، نہ کیا ہے نہ کریں گے

نسبت ہے تعارف کی جو اُن سے وہ رہے گی
تخصیص کا دعوےٰ نہ کیا ہے نہ کریں گے

اغیار کے قابو میں بھی یہ قول ہے اُن کا
حسرتؔ سے تو پردا نہ کیا ہے نہ کریں گے

اب تو جاپان کی جان چھوڑو

ترجمہ: مشتاق احمد

امریکی فوج اس وقت جاپان پر ... جاپانیوں کی قسمت کی مالک ہے ... جو انتہائی مفتی، کفایت شعار، سپاہیانہ حکم کی پابندی کرنے والی اور جس کے قبضے میں اس وقت روس کو چھوڑ کر ایشیا کے سب سے بڑے صنعتی کارخانے ہیں جہاں جاپان کی ایک نمائندہ حکومت قائم ہے اور پچھلی جنگ کے زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔

جاپانیوں کی ان خوبیوں کے علاوہ خود ان کا دیس اپنی جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے جنگی مقاصد کے لئے نہایت ہی اہم ہے۔ یورپ میں جو حیثیت انگلستان کی ہے وہی حیثیت ایشیا میں جاپان کی ہے۔ انگلستان نے اپنی اسی جغرافیائی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر یورپ کی پچھلی لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور جرمنی کو شکست دی۔ اسی طرح اگر خدا نخواستہ چین مع منچوریا دشمن کی جھولی میں جا پڑا، اور ہمیں جاپان سے پھرنا پڑا تو جاپان کا جزیرہ ہمارے لئے ناگزیر ہو جائے گا۔ اسی کو اپنی بری اور بحری فوجوں اور سمندری بیڑوں کا گڑھ بنا کر ہم پوری ایشیا کے ملکوں کے خلاف جو سب کے سب "بہنیے" اور "ہتھوڑے" کے اثر میں ہیں، ہم فوجی کارروائیاں کر سکیں گے۔ امریکی فوجوں نے اس وقت تک کئی بڑے ہوائی اڈے بھی بنا لئے ہیں، جہاں بڑے بڑے بم بار جہاز اتر سکتے ہیں اور کافی مقدار میں جنگی سامان بھی جمع کر لیا ہے۔

جو طاقت بھی جاپان کی قسمت کی مالک ہوگی اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ وہ راتوں رات لاکھوں سیکھے ہوئے آدمیوں کی ایک فوج کھڑی کر سکتی ہے۔ یہ جاپانی افواج کے وہ آدمی ہوں گے جنھیں امریکی قبضہ آور افواج نے نہتا کر دیا ہے۔ ان تمام لوگوں کی فہرست مع نام اور پتہ ٹوکیو میں موجود ہے۔

جاپان کے ملک کی اہمیت اور جاپانیوں کی ان گنوں کا روسیوں کو پورا پورا علم اور احساس ہے۔ اسی لئے جاپانیوں کو اپنے ساتھ ملانے اور انھیں جیتنے کے لئے روسیوں نے ان تھک پروپگنڈا شروع کر دیا ہے۔ روسی اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ جاپانیوں کو جنھیں صدیوں سے یہ تعلیم ملتی رہی ہے کہ آنکھیں بند کر کے حکم کی پابندی کرو، امریکہ کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جاپان پر قبضہ کرنے کے لئے انھوں نے اسی طرح کا سخت پروپگنڈا شروع کر دیا ہے، جیسا کہ چیکوسلوواکیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور پولینڈ پر قبضہ کرنے سے پہلے انھوں نے شروع کیا تھا۔ سارے دن طاقتور روسی ریڈیو امریکنوں کی برائیاں اور کمزوریاں نشر کرتے رہتے ہیں، اور اسی طرح جاپانیوں کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ کوئی امریکن پروگرام ایسا نہیں ہوتا جس کی روسی فوراً کاٹ نہ کرتے ہوں۔ جاپان کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر "سان زونا زاکا" ہیں ایک پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے روس کے اسکولوں میں ان کی بڑھیا تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ ہر مہینہ اسی خطہ مردم خیز سے پچاسوں جاپانی تربیت یافتہ ایجنٹ جاپان پہنچتے رہتے ہیں، جہاں سان زونازاکا ان کا سواگت کرتے ہیں۔ اور پھر انھیں اسی کام پر لگا دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ماہرین فن پروپگنڈہ اور مزدور لیڈر تیار کریں۔

اس وقت جو جاپان کی سب سے بڑی مزدور سبھا ہے اس کے ممبروں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ یہ سبھا کمیونسٹ پارٹی کے اثر میں ہے۔

افواہ باز اور پمفلٹ باز دن رات اس دقیانوسی قصے کو دہراتے رہتے ہیں کہ امریکنوں نے جرمنی کے خلاف ایٹم بم صرف اس لئے استعمال نہیں کیا کہ وہ انھی کے بھائی بند سفید اقوام کے لوگ تھے۔ اور جاپان کے سر پر صرف اسی لئے یہ پہاڑ توڑا کہ انھیں "زرد قوم" کو تنہا کرنا مقصود تھا۔ جاپانیوں پر جو روئے زمین پر سب سے زیادہ قومی حس رکھنے والے لوگ ہیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس پروپگنڈے کا کیا اثر پڑ رہا ہوگا۔

> جو طاقت بھی جاپان کی قسمت کی مالک ہوگی وہی مشرق بعید کے ملکوں پر قبضہ رکھ سکتی ہے۔ ہمارے قبضے کے مضر اثرات سے فائدہ اٹھا کر روسی، جاپان میں اپنا قدم جما رہے ہیں۔ اگر ہم جاپان کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو اسے فوراً خالی کر کے جاپانیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں، تاکہ جاپان سے معاشی بدحالی دور ہو۔ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کا بس یہی ایک موثر طریقہ ہے۔

روسیوں کے برخلاف امریکنوں کے حق میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً امریکن قبضے کے ابتدائی زمانے میں کمیونسٹوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ شہنشاہ جاپان کو پھانسی دے دی جائے۔ یہ ان کی ایک بڑی سیاسی بھول تھی۔ جاپانیوں نے اس مطالبے کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ جاپانیوں کے دلوں میں اس حقیقت نے بھی کانٹے بو رکھے ہیں کہ روسیوں ہی کے بغلی گھونسے نے انھیں ترقی کے آسمان سے تنزل کی زمین پر لا پٹخا ہے اگرچہ مک آرتھر کی روشن خیالی اور ان کے حسن انتظام نے بہت سے جاپانیوں کا دل موہ لیا ہے، اور ان کی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ ہو گئی ہیں۔

> فاضل مضمون نگار رچرڈ ... جاپان میں امریکن چیمبر آف کامرس کے صدر ہیں۔ پچھلی جنگ میں مختلف حیثیتوں میں انھوں نے جاپان میں کام کیا ہے۔ جاپانی زبان پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ اس طرح جاپانیوں اور اپنے امریکی افسروں سے ملنے جلنے اور ان کے رجحانات کو سمجھنے کا انھیں بہت زیادہ موقع ملا ہے۔

لیکن امریکہ ان حقیقتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے انھی سب باتوں کو دیکھتے ہوئے، حالات کو سب سے زیادہ سمجھنے والے شخص جنرل مک آرتھر نے ایک برس ہوئے اعلان کیا تھا کہ جاپان پر قبضہ کا مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے اب جاپان کے ساتھ ہمیں فوراً سمجھوتہ کر لینا چاہیے وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم بوریا بستر باندھ کر جاپان سے چل دیں"۔ لیکن سب سے زیادہ جان کار شخص کے اس اعلان کے باوجود ہمارا قبضہ بدستور جاری ہے۔ اس کی قیمت آپ کو معلوم ہے ہم کیا ادا کر رہے ہیں؟ ساڑھے سینتیس لاکھ روپیے (۳۷۵۰۰۰۰ روپے) روزانہ! اور اس پر ستم یہ کہ اتنی زیادہ قیمت ادا کرنے کے باوجود ابھی جاپان میں وہ فضا قائم ہے جس میں کمیونزم کو سب سے زیادہ فروغ ہوتا ہے یعنی معاشی بدحالی اور حکمراں طاقت کی مخالفت!

جاپان بس ایک بھک منگوں کا دیس بن کر رہ گیا ہے اس کی زندگی کا سارا دارومدار اس خیرات پر ہے جو امریکہ سے اس کو ملتی ہے۔ سرکاری افسروں کی فوج کی فوج جاپان کی سیاسی اور معاشی زندگی میں قدم قدم پر ٹانگ اڑانے کے لئے موجود ہے۔ ملک کا سارا نظام کنٹرولوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جاپان اس وقت ایسے ایسے کنٹرول اور معاشی تحریکوں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے جن کے نام ہم نے امریکہ میں سنے بھی نہیں۔ یہی طرح طرح کے کنٹرول جاپانیوں کی معاشی ترقی میں سنگ راہ ہیں اور انھیں کسی طرح پنپنے نہیں دے رہے ہیں۔

ان تمام امریکی تاجروں کا جو اس وقت جاپان میں بیوپار کر رہے ہیں یہ متفقہ خیال ہے کہ ایک مضبوط اور دولت مند جاپان ہی کمیونزم کے پھیلاؤ کے خلاف بہترین ضمانت ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر جاپان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ شاید چند سال تک امریکہ کو جاپانیوں کی کھانے پینے کی چیزوں سے مدد کرنی پڑے۔ لیکن جاپان کچھ ہی عرصے میں صرف اپنی بیرونی تجارت کے نفع سے یہ قرضہ مع سود ادا کر دے گا۔

وہ لوگ جو اس بات سے خوف کھاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور ترقی یافتہ جاپان امریکہ کے لئے خطرہ بن جائے گا انھیں یہ آسان اور سیدھی سادھی سی حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ اس زمانے میں کوئی قوم جنگ نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے پاس لوہا اور تیل نہ ہو۔ اور جاپان کے پاس ان دولتوں میں سے ایک بھی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جاپان کو سول ضرور توں

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

زبان کی بساط پر ایک چال

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ہم اُردو رسم الخط نہیں چاہتے!

اردو والوں کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ اپنے رسم الخط کی بازی لگا کر زبان کا میدان جیت لیں مجلس قانون ساز کے اُن تمام ممبروں کو جو اردو یا ہندوستانی کی ترقی یافتہ شکل سے دلچسپی رکھتے ہیں، چاہئے کہ ہندوستانی زبان کے ریزولیوشن میں اردو رسم الخط کی بجائے رومن کی پرزور سفارش کریں۔ ہندی والے شوق سے دیوناگری رکھیں۔ ہندیونین کی اُردو کے لئے رومن رسم الخط پاس ہونا چاہئے۔

بعض لوگ شاید اسے نعرۂ مستانہ سمجھیں لیکن یہ بساطِ زبان پر "دو اسپ وہ ناآرام دہ" والی چال ہے۔ یہ ایک کھلی چال ہے۔ اس لئے ہندی والے بھی اسے مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھیں گے۔ اس کا مقصد کسی خاص زبان کو بچانا مقصود نہیں بلکہ جن ترقی پسند لسانی رجحانات کی اردو زبان نمائندگی کرتی ہے۔ وہ صرف رومن رسم الخط اختیار کرنے ہی سے محفوظ کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستانی کے صحیح مفہوم کی ضمانت اسی طور پر ہو سکتی ہے۔ اور صرف اسی طرح ہم اپنی عام فہم زبان کو سنسکرتیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بچا سکتے ہیں۔ نہ صرف سنسکرت، فارسی اور عربی کی دست اندازیوں کا بھی یہی واحد علاج ہے۔ ہمیں یقین ہے رومن رسم الخط کی تائید جنوبی ہند سے بھی ہوگی۔ شاید اس طرح ہم وہ کام کر سکیں جس کا تصور بھی پاؤ صدی تک پاکستان میں پیدا نہ ہوگا۔

ہندیونین کی اردو کے لئے رومن اختیار کر لینے میں کئی فائدے منصور ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ آپ غیر ترقی پسند لسانی رجحانات کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکیں گے "رومن ہندوستانی" کی حیثیت نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک بیرونجات میں بہت بلند ہو جائے گی۔ اس کے فی الفور اختیار کرنے میں چنداں دقت بھی نہیں اٹھانا پڑے گی ہماری موجودہ تعلیم یافتہ نسل رومن سے بخوبی واقف ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں جو اردو رسم الخط سے تو واقف ہیں اور رومن سے بالکل ناواقف۔ اس میں شک نہیں کہ آنے والی ایک اور نسل کو دونوں رسم الخطوں کا بار اٹھانا پڑے گا لیکن چونکہ ہندوستان کی تعلیمی حالت ابھی خشت اول کے مدارج میں ہے اس لئے اس مشکل کو بھی آسان بنایا جا سکتا ہے۔

موجودہ اردو رسم الخط میں ادبی اور علمی سرمایہ اتنا زیادہ نہیں کہ اسے رومن میں منتقل کرنے کے لئے لامحدود ذرائع اور وسائل کی ضرورت پڑے۔ اردو زبان کی منتخب اور جیدہ کتب کو بآسانی رومن میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ذہن نشیں رہنا چاہئے کہ رومن اختیار کرنے کے بعد طباعت اور اشاعت ٹائپ اور پریس کی غیر معمولی سہولتیں ہاتھ آ جائیں گی۔ جن کی موجودگی میں تبدیلی قالب کا یہ عمل بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کتب کے روپ رنگ میں جو انقلاب پیدا ہوگا وہ علیحدہ۔ تعلیم کو عام کرنے کی جو سہولتیں پیدا ہو جائیں گی سو مزید۔

رومن کے ناتے سے یورپی زبانوں کی علمی اور مختلف اصطلاحات کو بھی خوبصورتی سے اپنایا جا سکے گا۔ یہ ایک قطعی امر ہے کہ ہندوستان انگریزی سے اپنا پیچھا بھی عرصے تک نہیں چھڑا سکے گا۔ شاید اعلیٰ تعلیم کے لئے اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ رومن کے ذریعے ہمارا وقار علمی دنیا میں بھی بڑھ جائے گا۔

جس طرح بساطِ شطرنج پر کھلاڑی محض دو اور مخالف کرنے والے زیادہ جمع ہو جاتے ہیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو لسانیاتی مسائل پر بھی دماغ سے زیادہ دل سے سوچنے کے عادی ہیں۔ اس تجویز پر جز بز ہوں گے۔ میں اُن کے جذبات کا احترام کرتا ہوں اس لئے کہ کسی تمدنی مسئلے میں محض سائنٹفک ہونا بھی تعصب ہے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم ایک انقلابی دور سے گذر رہے ہیں۔ اس وقت اُردو کیا عام فہم ہندوستانی کی بقا کا سوال ہے۔ پھر یہ کہ ایک انقلاب کا مقابلہ دوسرے انقلاب ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

بساطِ زبان پر ذرا غور تو کیجئے کہ آپ اپنے رسم الخط کے مہرے دے کر کیا کچھ بچا سکتے ہیں؟ درحقیقت مات بچا سکتے ہیں۔ اگر اُردو والے اصلاح شدہ (اصلاح شدہ اس لئے کہ اس کو اپنے گوں کا بنانے کے لئے کچھ تبدیلیاں اور اضافے کرنا ضروری ہیں) رومن کو اپنا لیں تو صورتِ حال یہ ہوگی کہ اردو والوں کی تحریر کو وہ بڑا طبقہ بھی شوق سے پڑھے گا جو اردو رسم الخط سے بالکل ناواقف ہے لیکن رومن بخوبی جانتا ہے۔ اسی طرح آپ کی زبان کا دائرہ خودبخود وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں جنوبی ہند کے باشندے خاص طور پر آ جاتے ہیں۔ پاکستان والے شاید ابھی عرصے تک اپنے رسم الخط پر اڑے رہیں۔ لیکن وہاں بھی رومن رسم الخط سے واقف لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ موجود ہے۔ ہنگامی اور اردو کی حیثیت کا منطقی نتیجہ بھی شاید رومن رسم الخط ہی کی شکل میں نکلے۔

ہندیونین میں دیوناگری کے مقابلے میں اس وقت اردو رسم الخط کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ لیکن اردو رومن کا چولا اختیار کر کے ایک نئی توانائی حاصل کرے گی۔ اس وقت یہ دنیا والوں کے سامنے ہندوستان کی سب سے بڑی ترقی پسند زبان ہوگی۔ اندھی جذباتیت کے تحت شاید دیوناگری کے پجاری عرصے تک رومن کی اہمیت کو نہ پہچانیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہندیونین کے اردو والوں نے اگر اس رسم الخط کو اختیار کر لیا تو وہ یہاں کی زبانوں کو ضرور متاثر کریں گے۔ ہندی کے لئے نہیں تو کم از کم اس ملک کی دوسری زبانوں کے لئے وہ یقیناً مشعل بردار بن جائیں گے۔

میری اس تجویز کا محرک نہ تو کسی قسم کا "بغض" ہے اور نہ شانِ دار "پسپائی" کا جذبہ۔ بساطِ زبان کی یہ کھلی چال تھی جو میں نے بیان کر دی جو "گنبھیر" ہیں وہ اسے تعبیر معنی پہنانے کی کوشش نہ کریں۔ اس سے کسی خاص فرقے یا مخصوص زبان کا مفاد مقصود نہیں۔ اگر کسی کو مات دینا پیش نظر ہے تو وہ غیر صحت مند لسانی رجحانات ہیں جو آج زبان کے سائے کو مسخ کر رہے ہیں جن کی مخالفت چاروں طرف سے ہو رہی ہے۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ اردو کا موجودہ روپ قائم رہ جائے گا تو ہندوستانی زبان کا صحیح گہوارہ بھی بن سکے گا۔ ہندوستانی اگر رومن اختیار کرے گی تو اس کی فرہنگ کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا اور اس طرح زبان کی گتھی تھوڑے عرصے کے اندر خود بخود سلجھ جائے گی۔

اب تو جاپان کی جان چھوڑو (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

کہ اسے بھی ہوائی جہاز کی آسائیوں سے محروم کر دیا ہے! بس مٹھی بھر بندرگاہ کے انسپکٹر اور جاپان کے ساحل کی رکھوالی کرنے کے لئے ہمارے چند جہاز اس بات کی کافی ضمانت ہو سکتے ہیں کہ جاپان امن کے لئے خطرہ کا باعث نہیں ہوگا۔

ان حالات میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ جاپان کمیونزم کے پودے کے لئے جس کی جڑیں ابھی نازک اور کمزور ہیں زمین شور بن جائے تو بس ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ جنرل مک آرتھر کے خیال کے مطابق ہمیں جاپان کو فوراً خالی کر دینا چاہئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں تھوڑی سی فوج محض یہ دیکھنے کے لئے چھوڑ دی جائے کہ جاپان جنگ کی تیاریاں تو نہیں کر رہا ہے جو لوگ اس پالیسی کی مخالفت صرف اس خیال سے کرتے ہیں کہ ہماری فوجیں ہٹ گئیں تو روسی فوجوں کو جاپان تک پہنچنے کی سپاٹ سڑک مل جائے گی۔ ان سے میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت ہماری جتنی فوجیں جاپان میں موجود ہیں وہ روس کے کسی سخت حملے کو تو روک ہی نہیں سکتیں! ہاں بس اتنی خرابی اور ہوگی کہ وہاں جو اس وقت ۲۰ ہزار امریکن بچے اور عورتیں ہیں ان کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

ہم نے جاپان کو ایک جمہوری قانون دے دیا ہے اور اس قانون کے اندر رہ کر ترقی کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچا دیئے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے۔ اب جاپان کے سر سے دست شفقت اٹھا لینا ہی جاپان پر احسان ہوگا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم جاپانیوں کو اس کا موقع دیں کہ وہ اس قانون کے ڈھانچے کے اندر رہ کر اپنی قسمت خود بنائیں۔ ان کی کوششوں کا جو کچھ بھی نتیجہ نکلے گا، چونکہ وہ ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے اسے دوام ہوگا۔

دیہی اور گھریلو صنعتیں

پروفیسر محمد عاقل

۴۔ اکھل بھارتیہ گرام ادیوگ سنگھ

نئی روشنی کی پچھلی اشاعت میں ہم نے چرخہ اور کھادی کی صنعت اور اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی تھیں۔ اس اشاعت میں ہم ایک اور غیر سرکاری ادارے یعنی گرام ادیوگ سنگھ کے بارے میں کچھ حالات پیش کریں گے۔ اس ادارے کو بھی گاندھی جی کی رہنمائی حاصل تھی اور اسے بھی کانگریسی خیال کے لوگ چلا رہے ہیں۔

گاندھی جی ترقی کو گاندھی جی دیہات سدھار کی قومی تحریک کا ایک لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ اس کے ذریعے وہ گاؤں کو یہ سکھانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی مدد آپ کریں۔ اپنی عزت خود کریں محنت کی عظمت کو پہچانیں اور سادہ اور ایمانداری کی زندگی کی قدر کریں۔ ان کی اسکیم میں چرخہ کی وہی جگہ ہے جو نظام شمسی میں سورج کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ گاؤں کے سارے ہنر اور دھندے اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ دستی چرخے کے جتنے لوازم ہیں انھیں دیہات ہی کے اندر فراہم کیا جائے اور اس سے متعلق جتنے بھی کام ہیں ان سب کو گاؤں کے اندر ہی کیا جائے تاکہ وہاں روزگار کو بڑھایا جا سکے۔ لیکن چرخے کے علاوہ دوسری صنعتوں کو بھی اگر کسی علاقے کے مقامی حالات کے لئے موزوں ہوں ترقی دینی چاہیئے۔

اس مقصد کو سامنے رکھ کر کانگریس نے ۱۹۳۴ء میں دستی کتائی کی مرکزی صنعت کے علاوہ ملک کی مختلف مردہ اور قریب المرگ صنعتوں کو دوبارہ زندگی دینے اور گرام سدھار کو ترقی دینے کے لئے اکھل بھارتیہ گرام ادیوگ سنگھ کو قائم کیا۔

اس سنگھ نے اپنے لئے جو فوری پروگرام بنایا اس میں اس نے اپنی توجہ کو صرف ان صنعتوں تک محدود رکھا جن کا اثر آبادی کی بڑی تعداد کی روزمرہ کی زندگی پر پڑتا تھا اور لوگوں کی غذا کی اصلاح کے کام کو بھی اپنے مشاغل میں داخل کر لیا۔

گرام ادیوگ سنگھ کا مقصد یہ ہے کہ مقامی کچے مال سے کام لیا جائے اور مقامی ہنر اور محنت کی مدد سے اس مال سے بنی ہوئی چیزیں تیار کی جائیں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے سلسلے میں جن صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ان کے کام کے مختلف طریقوں کی نسبتی کارکردگی اور لاگت میں کمی پیدا کرنے کے امکانات کا جانچنا بھی ضروری ہوا۔ ان تحقیقات سے سنگھ کو یہ موقع ملا کہ وہ آٹے اور ہاتھ سے کٹے ہوئے چاول کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے پبلک کے سامنے آٹا پیسنے کی بستی چکی اور ان کی اور موسلی کے ترقی یافتہ نمونے پیش کر سکے۔ اس ذیل میں تیل نکالنے کے لئے بیل سے چلنے والی گھانی کو ترقی دینے کے لئے جو تحقیقات کی گئی وہ خاص طور پر مفید ثابت ہوئی۔ اس سے ایک طرف تو کارکردگی بڑھ گئی ہے اور دوسری طرف بیل پر زور بہت کم ہو گیا ہے۔ سنگھ شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کی سفارش کرتی ہے اور سنگھ نے تاڑ کے رس سے جب کہ اس میں خمیر نہ پیدا ہوا ہو گڑ بنانے کی کوشش کی ہے اور اس غرض کے لئے بمبئی، صوبہ متوسط اور بہار کے صوبوں میں تحقیقات گاہیں اور نمائش گاہیں قائم کی ہیں۔

سنگھ نے جن اور دوسری صنعتوں کی طرف توجہ کی ہے وہ یہ ہیں۔ دیسی چیزوں سے صابن بنانا۔ شہد کی مکھی پالنا، چمڑہ کمانا اور رنگنا اور کاغذ بنانا۔ سنگھ اور کانگریس سے تعلق رکھنے والے دوسرے اداروں کی طرف سے دستی کاغذ کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے کاغذ بنانے کی صنعت کو گھریلو صنعت کی حیثیت سے ترقی کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے جو مانگ بڑھی ہے اس کے جواب میں پیداوار کو بڑھانے اور بہتر کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس کے لئے وردھا میں اور بعد میں صوبوں کی امداد کی وجہ سے دوسرے صوبائی مقامات میں بھی تجربے اور تحقیقاتیں کی گئی ہیں۔ دوسری بڑی جنگ کے شروع ہونے اور اس کی وجہ سے باہر سے آنے والے کاغذ اور لبدی کی درآمد میں کمی ہو جانے کی وجہ سے دستی کاغذ کی مانگ اور زیادہ بڑھ گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں دستی کاغذ اور اس کی قسم کو بہتر بنانے کے لئے کوششیں کی گئیں۔ مقامی کچے مال سے لبدی کے تیار کرنے کے لئے سنگھ نے قدرتی طاقت سے چلنے والی مشینوں کے استعمال کو بھی اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ اس سے صنعت کے اندر روزگار میں اضافہ ہوتا ہو اور مشینوں پر یا تو سرکار کا قبضہ ہو یا کسی ایسے ادارے کا جو نفع نہ کماتا ہو۔

چمڑے کی صنعت کو پہلے صرف گاؤں میں چلایا جاتا تھا لیکن اب چند سال سے اس کام کو مرکزی طور پر کیا جانے لگا ہے۔ سنگھ کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کے علاقے میں رنگنے اور چمڑا تیار کرنے کے جو مرکز تھے ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی انتظام کیا جائے کہ چمڑے کی تیاری میں بہترین سائنس کے طریقے اختیار کئے جائیں۔

سنگھ کے سامنے نصب العین یہ ہے کہ دیہات سدھار کے لئے نیز خاص خاص صنعتوں کے لئے مثلاً دستی کاغذ سازی، تیل نکالنے یا شہد کی مکھی پالنے کے لئے ماہر کارکن تیار کئے جائیں۔ چرخہ سنگھ کا بھی ایک مرکزی ودیالیہ سیوا گرام میں ہے۔ ریفریشر کورس اور چھوٹی مدت کے تربیتی دستوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

۵۔ سری نکیتن (وشوا بھارتی)

شاعر ٹیگور نے بھی اپنے خاص رنگ میں دیہی اور گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ کی۔ لیکن ان کا انداز گاندھی جی سے مختلف تھا۔ گاندھی جی کے دل پر گاؤں کی غریبی نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ لیکن شاعر ٹیگور کے لئے گاؤں کی زندگی اور اس کے گرد و پیش کی بدصورتی اور بے کیفی ایک سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ دیہات خوش حال ہوں یا خوب صورت اس قسم کا سوال اگر ان سے کیا جاتا تو انھیں خوب صورتی کو ترجیح دینے میں کبھی بھی تامل نہ ہوتا۔ گاؤں کو خوب صورت بنانے کے لئے وہ عالموں شاعروں اور صناعوں سب کو مل کر کام کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس مقصد کے ماتحت انھوں نے ۱۹۲۲ء میں بول پور وشوا بھارتی کے ساتھ ساتھ ایک دیہات سدھار کا ادارہ "سری نکیتن" بھی قائم کیا۔

اس ادارے کے کاموں کو چھ عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے یعنی

۱۔ زراعت
۲۔ صنعت
۳۔ فلاح دیہات
۴۔ امداد باہمی
۵۔ اسکاؤٹوں کی تنظیم
۶۔ تعلیم

زراعتی شعبہ کے ساتھ ایک ڈیری بھی قائم کی گئی۔ اسی طرح ایک مرغی خانہ بھی قائم کیا گیا۔ صنعتوں کے سلسلہ میں طلبا کو بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بننے والوں کو ڈزائنوں کو بہتر بنانے، ترقی یافتہ کرگھوں پر بننا اور امداد باہمی کے ذریعے کچے مال کو خریدنا اور پیداوار بیچنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کا کام، بڑھئی کا کام، مٹی کے برتن بنانا، جلد سازی، سوزن کاری، درزی کا کام وغیرہ بھی سکھایا جاتا ہے، دیسی رنگوں کے بارے میں بھی تحقیقات کی گئی ہے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟ (بسلسلہ صفحہ ۲)

ان کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی ہے) ہمارے لیڈر اس کا احترام کریں گے۔ اپنے جائز مطالبات کو مضبوطی کے ساتھ پیش کرنا بالکل مناسب ہے۔ لیکن ان کو زبان کی تیزی اور درشتی سے آلودہ کرنا ان کی قوت میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ ان کو کمزور کرتا ہے۔

ہندوستان کا کارواں آج کل خستہ اور پاشکستہ ہے۔ وہ بھی نہایت سخت آزمائشوں سے گذر رہا ہے۔ اس کی منزل بہت دور ہے جس نے بڑوں بڑوں کے ایمان اور قدموں کو ڈگمگا دیا ہے۔ جو لوگ ہمارے "میر کارواں" بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں انھیں نگاہ بلند کا عصا، سخن دل نواز کا جامہ اور جاں پرسوز کی کلیمی لے کر کارواں کی راہبری کرنی چاہیئے۔

وکٹوریا والا

منہاج محمد خاں

معلوم نہیں آپ نے بمبئی شہر دیکھا ہے یا نہیں۔ اگر آپ نے بمبئی دیکھا ہے تو اس کی سیاہ چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں بھی دیکھی ہوں گی جن کی پشت پر پڑا ہوئے کی دو متوازی پٹریاں پیر تسمہ پا کی طرح سوار رہتی ہیں اور جن پر بجلی کے کھمبے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صلیب کی میخیں ہوں، جنھیں سڑکوں کے سینے میں ٹھونک دیا گیا ہو۔ اور پھر جہاں آپ نے ان پر موٹروں، بسوں، اور ٹرامسوں کو چلتے دیکھا ہوگا وہاں کچھ تانگے نما "کی گاڑیاں دیکھی ہوں گی، جن کے پچھلے پہیے بڑے ہوتے ہیں اور اگلے پہیے چھوٹے جیسے چلتا پھرتا مصنوعی ایکہ، یا نفیس قسم کی اونٹ گاڑیاں۔ لیکن ان کے آگے اونٹ نہیں بلکہ ایک بڑا سا گھوڑا جتا جاتا ہے بمبئی میں اسے وکٹوریا کہتے ہیں۔ وکٹوریا ایک انگریزی ملکہ کا بھی نام تھا۔ لیکن ہمیں یہاں صرف گاڑی سے مطلب ہے اور خاص طور پر اس کے چلانے والے سے، جس کی وردی خاکی ہوتی ہے، جو بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی لگاتا ہے، جس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا ہے۔ بمبئی کے سارے وکٹوریا والے یہی وردی پہنتے ہیں۔ پہلے پہل جب میں نے ان کو دیکھا تو سمجھا کہ بمبئی کے سارے وکٹوریا والے مسلمان ہیں۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ تھا۔ آج میں اسی وکٹوریا والے کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

یہ ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتہ کا واقعہ ہے۔ صحیح تاریخ مجھے یاد نہیں۔ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور فاشست قوتیں پسپا ہو رہی تھیں۔ بنگال کے ہولناک قحط کو بھی ایک سال ہو چکا تھا، لوگ جنگ اور کشت و خون، چیزوں کی گرانی اور اشیائے خوردنی کے راشن سے تنگ آچکے تھے، اور جلد ہی کسی ایسی صبح کے منتظر تھے، جب سورج کی پہلی کرن کے ساتھ امن کا اعلان ہو، اور لوگ محسوس کر سکیں کہ آج ایک نئی زندگی شروع ہوئی ہے، جب غلامی، مفلسی اور جنگ و جدال عہد پارینہ کی باتیں ہو جائیں .... میں اس زمانے میں کاٹن ٹیکسٹائل کے جنگی محکمے کے دفتر میں کام کرتا تھا، ایک کوڈنگ کلرک کی حیثیت سے۔ دفتر بالکل ساحل کے قریب تھا۔ ساحل اور دفتر کے درمیان بندرگاہ کی دیوار حد فاصل کا کام کرتی تھی۔ عمارت کی دوسری منزل سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سمندر کی نیلی چھاتی پر جا بجا کشتیاں اور موٹر بوٹ ادھر سے اُدھر تھرکتے رہتے تھے، کچھ دور پر بڑے بڑے جنگی جہاز پڑے ہوئے تھے اس دن مجھے ہلکا ہلکا بخار چڑھا ہوا تھا۔ میں اپنی میز پر بیٹھا سمندر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میرا ٹمپریچر بڑھ گیا۔ میں نے سپروائزر سے چھٹی مانگی، اپنا بوسیدہ سا ہیٹ اُٹھایا اور لفٹ سے نیچے اُتر کر سڑک پر آگیا۔ سامنے ہی ایک وکٹوریا کھڑی تھی، اور وکٹوریا والا اپنی نشست پر بیٹھا اونگھ رہا تھا ــــ میری آواز پر وہ چونک پڑا، اور اُتر کر لڑکھڑاتا ہوا میرے پاس آیا۔ جب میں نے اس کی شکل دیکھی تو میری طبیعت مالش کرنے لگی۔ وہ شکل مجھے اب تک یاد ہے بلکہ میرے ذہن پر نقش ہے جیسے ایلورا کے غاروں کی کوئی غیر فانی شکل جو پتھر پر کندہ ہو ــــ سیاہ جیسے پہاڑی کوا۔ موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے کلّے۔ بڑی بڑی خوفناک لیکن متوالی آنکھیں، چھوٹے چھوٹے گھنگریالے بال جو اس کی لال رنگ کی گندی ٹوپی کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ ٹوپی کے نچلے کنارہ پر جیسے کسی نے گن اخوان تھوپ دیا تھا، خاکی کوٹ پر جا بجا آڑے، ترچھے پیوند لگے ہوئے تھے۔ بغلیں کوٹ کی پھٹی ہوئی تھیں جن میں سے ایک دھاری دار قمیص نظر آرہی تھی۔ کوٹ کی ایک جیب بھری ہوئی سی تھی، خاکی پاجامہ نسبتاً اچھی حالت میں تھا، لیکن صفائی اسے بھی نہیں چھو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہنسا، جس سے مجھے سخت کوفت ہوئی، جاہل، ناشائستہ" میں نے اپنے جی میں کہا۔ اور اس نے کہا "آیئے بابوجی! بیٹھیے کہاں جانے کا ہے؟ ــــ" میں نے کہا سائیکلی اسٹریٹ۔ بائیکلہ جاؤں گا اور صرف ایک روپیہ دوں گا ــــ"

ایک روپیہ بائیکلہ کے لئے بہت کم تھا وہ دو روپے سے کسی طرح بھی کم نہ لیتا تھا۔ پھر اس زمانے میں امریکنوں نے بھی اپنی فیاضی سے وکٹوریا کا کرایہ بہت بڑھا دیا تھا، لیکن نہ جانے اس وقت وکٹوریا والے کے دل میں کیا آیا کہ وہ ایک روپیہ لینے پر راضی ہو گیا ــــ "بابوجی جو جی میں آئے وہ دے دینا" اور پھر "کیا بابوجی کچھ بیمار ہے" ــــ

میں نے کہا "ہاں بخار آگیا ہے ــــ" یہ کہہ کر میں وکٹوریا میں بیٹھ گیا اور اس نے گھوڑے کو ہانک دیا۔ ابھی ہم پہلے موڑ تک بھی نہ جانے پائے تھے کہ وکٹوریا والے نے بیٹھے بیٹھے اور میری طرف دیکھے بغیر کہا "بابوجی، یہ افریقہ میں کالے اور گورے کی کیا گڑبڑ ہے" یہ سوال ایک وکٹوریا والے کی طرف سے بہت ہی غیر متوقع تھا۔ میں نے سادگی سے کہا "معلوم نہیں لیکن تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں کالے اور گورے کی گڑبڑ ہے؟"

کہنے لگا "جی ہمارا باپ بولتا تھا کہ ادھر گورے لوگ کالوں کے ساتھ بڑا ظلم کرتے، آج اخبار والا بھی یہی چیخ رہا تھا .... جی بات یہ ہے کہ میرا دادا افریقہ کا تھا، حبشی، اور ایک صاحب کے یہاں بیراگیری کرتا تھا۔ جب صاحب بمبئی آیا ــــ اور اسے جی زمانہ ہو گیا ــــ تو ہمارا دادا بھی اس کے ساتھ چلا آیا اور میرا باپ بھی، جو اس وقت لونڈا ہی تھا ــــ جی ہمارا باپ بولتا تھا کہ جب صاحب کے یہاں ہمارا دادا کام کرتا تھا، تو جی بڑے مزے سے رہتے تھے، عیش تھا۔ ویسے تنخواہ تو معمولی تھی مگر اوپر سے خوب مل جاتا تھا .... اے ہیٹ والا بابو! دیکھ کے چلو نا ذرا !! .... روڈ کا ٹھیکہ کر لیا ہے کیا؟ .... فٹ پاتھ چھوڑ کر روڈ پر چلتا .... ہاں تو بابو ــــ"

وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ پھر جیسے اُسے چھینک آتے آتے رُک گئی، اُس نے ناس کی ڈبیا نکالی۔ دو چٹکیاں ناک میں ڈالیں اور پھر چھیں، چھیں، چھیں، چھیں۔ پھر اُس نے بیڑی کا بنڈل نکالا اور پیچھے ہاتھ کرکے اور میری طرف دیکھے بغیر بنڈل پیش کیا۔ میں نے معذرت ظاہر کی ــــ "سگریٹ پیتے ہو؟" اس نے اپنی بیڑی جلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا "میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔"

"کبھی کبھی؟ کبھی کبھی تو میں بھی پی لیتا ہوں، ہی ہی، ہی، ہی۔ میرا مطلب ہے بابو، سگریٹ نہیں دارو .... ہائے کیا چیز ہے جالم .... پر بابو مقدر والوں کو ملتی ہے، دارو پر ہی کیا ہے ہر چیز ــــ سب اپنا دانہ پانی لے کر آتے ہیں ــــ اب میری جورو اور لڑکی ہی کو دیکھو نا، جب تک ان کا دانا پانی میرے پاس تھا، میرے پاس رہیں، جب اُٹھ گیا، چلی گئیں۔ حرام زادیاں۔ میں نے دو سال ہوئے اُنھیں گھر سے نکال دیا ...."

"گھر سے نکال دیا ....؟ مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس زمانے میں میں مل میں کام کرتا تھا۔ رات پالی .... میں ادھر رات کو کام پر جاتا، اور وہ اُدھر اپنی کمائی کرتی تھیں۔ کمائی سمجھتے ہو نا بابوجی! ــــ میں تو شروع ہی سے تاڑ گیا تھا .... دونوں کہتی تھیں، کپڑے بنا کر دو، تیل لا کر دو، پاؤڈر لا کر دو، میم بننا چاہتی تھیں سالیاں .... حبشنیں کہیں کی ــــ کپڑے بنا کر دو .... کپڑے کہاں سے بنا کر دوں۔ میں بولا میرے کپڑے دیکھو، سال بھر سے دو جوڑے استعمال کر رہا ہوں، تم پاوڈر منگاتی ہو، میں دو دو ہفتے داڑھی نہیں کھرچواتا .... پھر لونڈیا تین مہینے کے لئے بستر پر پڑ گئی کہتی تھی مجھ سے چلا نہیں جاتا ــــ رات بھر کھوں کھوں کرتی تھی ــــ اب میں کہتا ہوں بابوجی یہ مقدر نہیں تو کیا .... اور اب اگر میں کبھی کبھی دارو پیتا ہوں تو کون سا بُرا کرتا ہوں .... اور دارو کون نہیں پیتا۔ چال میں سبھی پیتے ہیں ــــ مقدر کی بات ــــ آپ جیسے بابو لوگ اونچے اونچے فلیٹوں میں رہتے ہیں اور بڑھیا شراب پیتے ہیں ...."

میں نے جلدی سے کہا "میں اونچے فلیٹ میں نہیں رہتا .... مجھے صرف ۵۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، اور بڑھیا شراب کے کیا معنی مشکل سے گذر بسر ہوتی ہے ــــ"

"ارے بابو کیوں بنتے ہو۔ ہیٹ پہننے والوں کو ۵۵ روپے تنخواہ نہیں ملتی .... ہم سے پوچھو، دن بھر وکٹوریا چلاتا ہے، رات کو گھوڑے کی لید سونگھتا ہے اور ٹھرا دارو پیتا ہے اور مالک کی گالیاں سنتا ہے اور ...."

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر

تاریخ اشاعت یکم ، ... ، ۱۹ ، ۴۷

ڈاکٹر سید عابد حسین ـ صالحہ عابد حسین ـ عبد اللطیف اعظمی چندہ :- سالانہ مےر ششماہی للعہ

پاس سے گھڑگھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرام گزری اور اس کی آواز میں وکٹوریا والے کا جواب ڈوب کر رہ گیا۔ اب ہم کرافورڈ مارکٹ سے آگے نکل چکے تھے، یہاں پر دوسری سمت کو جانے والی ایک وکٹوریا کے کوچبان نے اس وکٹوریا والے پر ایک فقرہ کسا " ادبے فارس روڈی، کدھر؟"

"چپ بے ٹھینی کے ـــــــ" اس نے بھی اتنی ہی بلاغت سے جواب دیا۔

مجھے اب وکٹوریا والے کی باتوں میں دلچسپی ہو چلی تھی، وہ یقیناً ایک عظیم الشان اور پرا سرار شخصیت کا مالک تھا، میں نے سوچا اگر یہ وکٹوریا والا نہ ہوتا تو ایک زبردست ادیب ہوتا ـــــــ

"تم اپنے باپ دادا کی بات کر رہے تھے" میں نے اسے دوبارہ گفتگو پر اکسانے کے لئے کہا۔

"ان کی ماں کی ...."

میں سکتہ میں رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب اس کے ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ایک لمحے کے بعد اس کا غصہ اتر گیا۔ اور اس نے قدرے نرم لہجہ میں مجھے اس طرح مخاطب کیا ـــــــ "بابو میرا رنگ کالا ہے میرے باپ کا بھی کالا تھا اور میرا دادا تو خالص حبشی تھا۔ میں پوچھتا ہوں اس نے گورے کی نوکری کیوں کی؟ .... افریقہ گوروں کا ملک نہیں، پھر گورے افریقہ کیوں آئے۔ اور انھوں نے میرے دادا کو نوکر کیوں بنایا .... گرچہ میرا دادا ہی ذلیل ہوگا۔ اگر وہ گوروں کا بیرا نہ بنتا، اگر ہندوستان نہ آتا، اگر میرا باپ ہندوستان کی ایک رنڈی سے شادی نہ کرتا تو میں .... فارس روڈی کیوں کہلاتا ـــــــ یہ تھا، وکٹوریا والا جو ابھی گیا ہے بابو، ایک نمبر کا حرامی ہے۔ اس سے کئی دفعہ میری مار پیٹ ہو چکی ہے .... مگر یہ ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا ـــــــ کمینہ کہیں کا ـــــــ پر بابوجی میرا باپ بولتا تھا کہ ہماری سات پیڑی، سب جنگلوں میں رہتی تھیں، سب برابر کے لوگ ہوتے تھے، جنگلوں میں آزاد پھرتے تھے، اور جانوروں کا شکار کرتے تھے، کسی کا دینا نہیں تھا، کسی کا لینا نہیں تھا۔ کسی گورے کی چاکری نہیں تھی ـــــــ پر میرا دادا ہی ذلیل تھا، کمینہ تھا وہ گورے کا بیرا کیوں بنا؟ ـــــــ آج مجھے یہ بات بار بار یاد آتی ہے پھر سوچتا ہوں کہ گورے ہی افریقہ کیوں آئے، ہندوستان کیوں آئے، انھیں کالوں کی بستی سے ایسا کون سا پریم ہو گیا؟ واہ رے مقدر، بٹیا دھیرے، بٹیا دھیرے، ٹک ٹک ٹک ٹک"

وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے گھوڑے سے باتیں کرنے لگا۔

"میں نے کہا" تم نے نہیں سنا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور افریقہ بھی ایک قیمتی چڑیا ہے۔ اور پھر چڑیا خواہ سونے کی ہو یا گوشت پوست کی، اسی کی ہوتی ہے جس کے پاس جال ہو گوروں کے پاس ایسا ایک جال تھا، اسی لئے وہ افریقہ اور ہندوستان آئے۔ آج کل یہ جو جنگ چل رہی ہے نا۔ یہ بھی چڑی ماروں کی آپس کی جنگ ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۴ء میں جو جنگ ہوئی تھی وہ بھی چڑی ماروں کی جنگ تھی بس مصیبت یہ ہے کہ اس جنگ میں ہم جیسے شریف لوگ بھی پھنس جاتے ہیں، اور پھنسے بغیر چارہ کار بھی نہیں ـــــــ"

بابوجی آپ تو لکچر دینے لگے۔ ہماری یونین کا سکریٹری بھی ایسا ہی لکچر دیتا ہے ـــــــ کہتا ہے کہ یہ بڑے بڑے پیٹ والے ہمارے دشمن ہیں یہی جنگ کر رہے ہیں اور پچھلے سال بنگال میں انھی نے تیس لاکھ آدمیوں کو بھوکا مارا۔ مجھے یقین نہیں آتا، اپنے اپنے مقدر کی بات ہے" ایک فوجی لاری فراٹا بھرتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔ جس میں کچھ انگریز فوجی تھے اور وہ سب مل کر کوئی کورس گا رہے تھے۔ وکٹوریا والے نے مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ جواب میں میں بھی مسکرا دیا لیکن یک لخت اس کے ہونٹوں کا تبسم اڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سنجیدگی آ گئی۔ اس نے چہرہ پھر سامنے کر لیا۔ بس تھوڑی دور اور رہ گیا ہے۔ اب دائیں ہاتھ کو مڑ لینا" میں نے اس کی توجہ کو ہٹانے کے لئے کہا

لیکن غالباً اس کے جذبات کا پیالہ اب لبریز ہو چکا تھا۔

"لیکن بابوجی، اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں" اس نے اپنی پوری متانت لیکن مکمل بے فکری کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ آجکل امریکنوں سے خوب کماتا ہوں اور چائے پانی میں اڑا دیتا ہوں۔ بابو زندگی دو روزہ ہے۔ میں ہی آخر کیوں غم کروں .... وہ ذلیل ہیں .... کمین ہیں سالیاں .... باپ دادا کی عزت کو ڈبو دیا .... میرے تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہاتھ سے نکل گئے .... کتنے سندر بچے تھے بابو .... اگر آپ کی طرح انھیں کوئی پڑھاتا تو کل کو وہ بھی بابو بن سکتے۔ مگر اب وہ دلالی کرتے ہیں۔ اپنی بہن کی دلالی، اپنی ماں کی دلالی .... اور امریکنوں کو بلاتے ہیں، گوروں کو بلاتے ہیں۔ وہ گورے جنھوں نے میرے باپ دادا کے ملک پر قبضہ کیا۔ میرے دادا کو بیرا بنایا اور اسے ہندوستان لایا۔ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں .... ایک ....

میں نے کہا "بس روک لو" پھر میں وکٹوریا سے نیچے آیا اور اسے بھی اترنے کو کہا، سانکلی اسٹریٹ کی وہ عمارت آ چکی تھی جس میں میں رہتا تھا۔ میں نے اسے کرایہ دیتے وقت ہدایت کی ـــــــ "دیکھو اتنے زور زور سے باتیں نہیں کیا کرتے ـــــــ سارے راستے لوگ سنتے آئے ہیں" لیکن جیسے اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ پھر یک لخت وہ میرے اور قریب آ گیا، اور آہستہ سے بولا "بابوجی نمبر نوٹ کر لیجئے پندرہ سے، نمبر پندرہ، فارس روڈ"

چلتے وقت میری نظر اس کے کوٹ کی جیب پر پڑی جس میں سے ایک بوتل کا سر جھانک رہا تھا۔ بوتل غالباً شراب کی تھی۔

طابع و ناشر :- عبد اللطیف اعظمی بی اے (جامعہ)

مطبوعہ :- حیدر پریس، دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۳ | یکم دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

معلم ——— اور ——— مہاتما

(مہاتما گاندھی)

(جن دنوں گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے لندن تشریف لے گئے تھے مشہور طریق تعلیم مانٹیسوری میتھڈ کی موجد مادام مانٹیسوری بھی وہاں موجود تھیں اور بچوں کا ایک چھوٹا سا مدرسہ چلا رہی تھیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو بلا کر اپنا مدرسہ دکھایا تھا۔ اس موقع پر معلم اور مہاتما نے جو تقریریں کی تھیں ان کا خلاصہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں)

مادام مانٹیسوری نے فرمایا :-

"میں اپنے شاگردوں کو اور دوسرے صاحبوں کو جو یہاں موجود ہیں، مخاطب کرنا چاہتی ہوں، مجھے آپ سے ایک بہت بڑی بات کہنا ہے۔ آج ہمارے درمیان گاندھی کی روح، وہ مہاتما جس سے ہر شخص خوب واقف ہے، مجسم موجود ہے۔ یہ آواز جسے سننے کا شرف ہمیں حاصل ہوگا وہ آواز ہے جو ساری دنیا میں گونجتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محبت سے کہتے ہیں اور اپنا پیام صرف اسی آواز سے نہیں بلکہ اپنی ساری زندگی سے ادا کرتے ہیں یہی انوکھی بات ہے کہ جب اس کا موقع آتا ہے تو ہر شخص کان لگا کر سنتا ہے"

"میرے محترم گرو! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ آواز جسے آج آپ کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا ہے، لاطینی نسل کے ایک فرد کی آواز ہے۔ یہ اس عظیم الشان شہر روما کی آواز ہے جو مغرب کے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہے۔ کاش میں یہاں مغرب کے افکار اور زندگی کو مجسم کرکے مشرق کی خدمت میں پیش کر سکتی! ...."

مہاتما گاندھی نے اس کے جواب میں یہ تقریر کی :-

"خاتون محترم، آپ کے الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں نہایت عاجزی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات کو سراپا محبت بنانے کی جس بھلی کوشش جو مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا ہوں میرے دل سے لگی ہے کہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کروں میرے نزدیک وہ عین حق ہے اور مجھ پر اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اگر حق کی معرفت حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیے کہ محبت کے قانون پر چلوں، چاہے اس میں میری جان بھی کام آ جائے اور چونکہ خدا نے مجھے بچے بھی عطا کئے ہیں اس لئے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محبت کا قانون جیسی اچھی طرح چھوٹے بچوں سے سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کسی اور طریقے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ بچوں میں خلقی طور پر وہ شرارت نہیں ہوتی جو بری کہی جا سکے۔ اگر والدین بچے کی نشوونما کے زمانے میں یعنی اس کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد اچھا سبھاؤ رکھیں تو یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بچہ خود بخود حق کے قانون اور محبت کے قانون پر چلے گا۔ میں آپ کے سامنے یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ میری پرشور زندگی میں کیا کیا دور گذرے ہیں۔ لیکن میں سچائی اور عاجزی سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ جس حد تک میں نے اپنی زندگی کے اندر خیال، قول اور فعل میں محبت کو برتا اسی حد تک مجھے وہ سکون قلب جو حد ادراک سے باہر ہے، حاصل ہوا میرے دوست اکثر میرے سکون قلب کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ وہ مجھ پر رشک کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ انمول چیز کیسے پائی میں انھیں اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکا کہ جو سکون آپ کو میرے دل میں نظر آتا ہے وہ میری اس کوشش کی بدولت ہے کہ محبت کے قانون پر جو ہماری فطرت کا سب سے برتر قانون ہے، عمل کروں۔

ہم بھی ہندوستان کے غریب سے غریب بچوں کی تعلیم کے تجربے کر رہے ہیں، معلوم نہیں کہ ہمیں کہاں تک کامیابی ہو۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ان بچوں کو جو چھ ہے کے سے بلوں میں رہتے ہیں سچی جاندار تعلیم دی جائے مگر اس کے مادی وسائل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

لے دے کے ہمیں معلموں کی رضاکارانہ مدد کا آسرا ہے۔ لیکن جب میں معلموں کی تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ہیں خصوصاً اس قسم کے معلم جن کی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے ہر بچے کی طبیعت کا مطالعہ کرکے اسے اپنے بل کھڑا کرکے اسے ذاتی عزت کا احساس دلا کر اس کی بہترین صفات کو ابھاریں۔ آپ یقین کیجیے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے دل میں مجھ سے اور آپ سے زیادہ عزت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم عجز و انکسار سے کام لیں تو ہم زندگی کے بڑے بڑے سبق سن رسیدہ اور عالم فاضل حضرات سے نہیں بلکہ انھیں بچوں سے جو نادان کہلاتے ہیں سیکھ سکتے ہیں حضرت عیسیٰ کے اقوال میں یہ قول سب سے بلند و برتر حقیقت رکھتا ہے کہ حکمت شیر خوار بچوں کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے اور میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ اگر ہم شیر خوار بچوں کے سامنے عاجزی اور معصومیت کے ساتھ جائیں تو ہم ان سے حکمت کے نسخے سیکھ سکتے ہیں۔

اب آپ کا زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں میں نے آپ کے سامنے بس وہی بات کہی ہے جو اس وقت میرے دل میں چبھ رہی تھی یعنی اس نازک مسئلے کے انسانی پہلو کا ذکر کیا ہے کہ ان کروڑوں ہندوستانی بچوں کی بہترین صفات کس طرح ابھاری جائیں۔ لیکن اگر میں نے کوئی سبق سیکھا ہے تو یہ کہ جو چیز انسان کے نزدیک محال ہے وہ خدا کے آگے بچوں کا کھیل ہے ...."

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
معلم اور مہاتما	مہاتما گاندھی	۱	مہاتما گاندھی کی یاد میں (نظم)	یحییٰ اعظمی	۷
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲	مہمیز	باقر رضوی	۷
اقوام متحدہ کا ادارہ	(اداریہ)	۳	غزل	سحر رامپوری	۷
بزم بے تکلف		۳	اکبر اور انقلاب	طالب الہ آبادی	۸
پچھلا ہفتہ ۱۔ ہندوستان	ع ۔ ح	۴	ایران کا تعلیمی نظام	عبدالحلیم ندوی	۹
۲۔ پاکستان	ع ۔ ل	۵	پناہ گزیں بچے	پروفیسر پریس رام	۱۰
۳۔ باہر کی دنیا	ع ۔ ل	۶	ڈاکٹر شاردا (افسانہ)	احسن عثمانی	۱۱

قیمت فی پرچہ ۲ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

زبان کی جنگ

میں نے قومی زبان کے مسئلے کا ذکر اس کالم میں ایک دفعہ سے زیادہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں بہت سے لوگ جو تنگ نظری اور عاقبت ناشناسی دکھا رہے ہیں اس کی وجہ سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، اور اس بات سے دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ تو ایک ایسا صاف معاملہ ہے کہ اس بارے میں دانشمندی رواداری، مصلحت شناسی اور انصاف سب کا ایک ہی تقاضا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ اس میدان میں آکر اچھے اچھوں کے اور بڑے بڑوں کے قدم اکھڑتے ہیں اور ان کا دماغی توازن درہم برہم ہو گیا ہے تو علاوہ ذاتی رنج کے ملک کے مستقبل کی طرف سے فکر پیدا ہو جاتی ہے اور سوچتا ہوں کہ آخر ہم کدھر جا رہے ہیں؟

بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس ہمارے دیس کے بڑے قابل عزت بزرگوں اور بلند پایہ مفکروں میں سے ہیں جن کی شرافت، وسیع مشربی سیرت کی مضبوطی اور مطالعے کی گہرائی کا سب اعتراف کرتے ہیں۔ اگر زبان کے معاملے میں ملک میں درجن بھر لوگوں سے بے تعصبی کی توقع ہو سکتی ہے تو ان میں سے ایک انہیں ہونا چاہئے لیکن ابھی حال میں ایک اخبار میں اس مسئلے پر ان کی رائے پڑھ کر ہمت کی کمر سی ٹوٹ گئی۔ اگر پراگندہ پریشان خیالی اور تعصب کا طوفان ڈاکٹر بھگوان داس کی عمر بھر کی ریاضت کو بہا کر لے جا سکتا ہے تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے۔ ایک تعلیمی رسالے میں ان کے خیالات اس طرح چھپے ہیں

"جب تک ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔ میری رائے یہ تھی کہ ہماری راشٹر بھاشا میں ہندی اور اردو کا میل ہونا چاہیے، یعنی وہ ہندوستانی ہونی چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں سب جماعتوں اور مذہبوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ زبان اور دونوں رسم خط سکھانے چاہئیں۔ لیکن اب کہ ہمارے ملک کی تقسیم ہو گئی ہے، میری اتنے ہی وثوق کے ساتھ یہ رائے ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں میں خالص ہندی کو جو سنسکرت سے نکلی ہوئی ہے۔ صرف دیوناگری رسم خط میں تمام طلبہ کو لازماً پڑھانا چاہیے۔ ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کو اس کی پوری آزادی ہوگی کہ وہ اپنے گھر وں پر اور اپنے خرچ پر بچوں کو کوئی دوسری زبان یا رسم خط سکھائیں"!!

ان چند سطروں میں اس درجہ پریشان خیالی، نامواقفیت اور تہذیبی فسطائیت کا اظہار ہے کہ پھر یقین نہیں آتا کہ یہ ڈاکٹر بھگوان داس کے الفاظ ہیں۔ اس لئے میری اس تنقید کا مخاطب عبارت کے مصنف کو سمجھئے اور دعا کیجئے کہ وہ ڈاکٹر صاحب نہ ہوں!

۱۔ تبدیلی رائے کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ سرے سے مہمل ہے۔ کیا ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے، زبان تہذیب، علم و ادب اور شرافت و معقولیت کے وہ اصول بدل جانے چاہئیں جن کو ہم نے سوچ سمجھ کر، ٹھونک بجا کر اختیار کیا ہے؟

۲۔ کیا اس بٹوارے کی وجہ سے، ان کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کی زبان بدل جائے گی جو ہندوستانی ریاست کا ایک اٹل جزو ہیں اور جن کی زبان اُردو ہے۔ کیا ان سب کو تقسیم ہند کے جرم کی یہ سزا دینا سیاسی معقول پسندی اور رواداری کا ثبوت ہے کہ ان کی زبان ملک بدر سمجھی جائے گی۔ اس کو سرکاری مدرسوں میں کوئی جگہ نہ ملے گی، بلکہ ملک کی مشترک زبان میں ان کا جو حصہ ہے اُسے بھی نظر انداز کر دیا جائے گا؟ کیا ایسا کرنا ملک کے مجوزہ دستور کی خلاف ورزی نہیں جس میں ملک کی ہر زبان اور ہر رسم خط اور ہر لسانی اقلیت کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے؟

۳۔ کیا ایسی پالیسی اختیار کرنا ہندوستانی تہذیب کے مستقبل کے ساتھ دشمنی اور پرائے شگون کے لئے اپنی ناک کٹانا نہیں ہے؟ کون پڑھا لکھا شخص اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ موجودہ ہندوستان کی زبان اور ادب میں اردو سیکھنے والوں کا جن کی صف اول میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ کس قدر نمایاں حصہ ہے اور اس کو اس طرح مٹانے کی کوشش نہ صرف انصاف کا خون کرنا ہے بلکہ ہندوستانی ادب اور تہذیب کے عزیز سرمائے کو کم مایہ بنانا ہے؟

۴۔ اور پھر یہ زبان کی "شدھی" کرنا، اس کو کسی خاص مذہب کے ساتھ وابستہ کرنا، کہاں کی سمجھداری ہے "ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کو آزادی ہوگی" یعنی ہندوؤں کی زبان تو اصولاً ہندی ہونا چاہیے، ان کے لئے تو کسی دوسری زبان یا رسم خط سکھانے کا سوال ہی نہیں۔ (سرشار، چکبست، شرر، پریم چند، کرشن چندر، جواہر لال، تیج بہادر سپرو، سروجنی نیڈو، کشن پرشاد کول، فراق، پنڈت سندر لال وغیرہ یا تو ہندو نہیں ہیں یا انھیں گذشتہ گناہوں سے توبہ کرکے آئندہ کبھی اُردو کو اپنی زبان نہ سمجھنا چاہیئے!) کم سے کم جن لفظوں میں یہ زور دیا گیا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ہندو کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو کوئی دوسری زبان یا رسم خط (صرف اُردو ہی نہیں!) سیکھنے دے۔

۵۔ کس قدر فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ یہ اجازت دی گئی ہے کہ دوسرے مذہب والے اپنے گھر پر اور اپنے خرچ پر کوئی دوسری زبان یا رسم خط سکھا سکتے ہیں! یعنی (بالفاظ دیگر) ہم ان تنگ دل لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے پورے اختیارات استعمال کرکے یہ حکم نافذ کریں کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر پر اور اپنے خرچ پر کوئی دوسری زبان سکھائے گا تو ہم اُسے پولیس کے سپرد کریں گے، ہم تو صرف یہ حکم سنا رہے ہیں کہ سرکاری مدرسوں میں اور حکومت کے خرچ پر (جس کی آمدنی غالباً سبھی جماعتوں سے وصول کی جاتی ہے۔ کوئی دوسری زبان نہیں پڑھائی جائے گی!

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک طرف تو ہم ایک آزاد جمہوری غیر مذہبی ریاست قائم کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں جس کے لئے ہمارے محبوب لیڈر گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں نے جان کی بازی لگا دی ہے اور جن کے آدرشوں کا ہم دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف زبان جیسے اہم اور جنتا کی دلچسپی کے معاملے میں تنگ نظری کی ایک ایسی مثال قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہ ملے گی۔ یہاں سیکڑوں برس مسلمانوں کی حکومت رہی، سو برس سے زیادہ انگریزوں کی حکومت رہی، ان میں سے کسی کو جمہوری ریاست ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ ان کی اپنی اپنی سرکاری اور درباری زبانیں تھیں جن کو انھوں نے نافذ کیا تھا لیکن مسلمانوں نے کبھی ہندی یا سنسکرت یا کسی دوسری زبان کے ساتھ بے انصافی کا یہ سلوک روا نہیں رکھا۔ انگریزوں نے باوجود اپنی تنگ نظری اور احساس برتری کے کبھی اردو یا ہندی یا گجراتی یا بنگالی کی تعلیم کی ممانعت نہیں کی سرے سے اُن کے وجود سے انکار نہیں کیا (بعض اہل علم کا آج یہ کہنا ہے کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے۔ غالباً میر، غالب، انیس، اقبال، حالی، پریم چند سب ذہنی واہمے ہیں!) کیا ادب اور تہذیب کے میدان میں اس تنگ نظری کو اختیار کرنے کا شرف بیسویں صدی میں ہمارے ملک کے اعلیٰ ترین دماغوں کو حاصل ہوگا؟ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ پاکستانی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کے سخت ترین مخالفوں نے فرقہ وارانہ علیحدگی اور تنگ نظری کی اس ذہنیت کو اپنا لیا جس کے خلاف وہ برسوں تک جنگ کرتے رہے تھے۔ ان دوستوں سے میری با ادب درخواست ہے کہ "صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک" اس نشے میں کوئی ایسی بات نہ کیجئے جس سے بعد میں آپ کو بھی نقصان اور خفت ہو!

دِل نوازی کا سلیقہ

چند روز ہوئے لاہور ریڈیو اسٹیشن کھولا تو کوئی گلنے والا اقبال کا یہ شعر پڑھ رہا تھا:-

مسلمانوں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
محبت حسن عالم گیر ہے، مردانِ غازی کا!

شعر سن کر دل تڑپ اٹھا۔ کاش یہ محض خوش فہمی کا ادعا نہ ہوتا بلکہ حقیقت ہوتی۔ کاش پاکستان کے ارباب سیاست جو مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے خالق ہیں اپنے قول اور فعل سے "دل نوازی کے اس سلیقے" کا تھوڑا سا ثبوت دیتے۔ کاش وہ یہ جانتے کہ راہ حق کی طرف بلانے کے لئے بھی قرآن نے "موعظہ حسنہ" کی شرط لگائی ہے، "لغو کے پاس سے گذرنا ہو تو اس کے لئے "کرامت کے ساتھ گزر جانے کی" تلقین کی ہے اور حرف بد کو زبان پر لانے کی ممانعت کی ہے۔ لیکن انھوں نے تو زبان اور قلم کی تلوار کو کھڑکھڑانا ہی جہاد سمجھ لیا ہے۔ دل نوازی نے ان کی سیاست کی اصطلاحات میں جگہ نہیں پائی۔

[illegible] میں یوم اقبال کے موقع پر تقریر کرتے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم دسمبر ۱۹۴۸ء

اقوام متحدہ کا ادارہ

انجمن اقوام (لیگ آف نیشنز) کی ناکامی کے بعد بہت سے لوگ یہ اُمید چھوڑ بیٹھے تھے کہ قوموں کے آپس کے جھگڑے پنچایت کے ذریعے سے طے ہو سکتے ہیں۔ مگر بعض سرپھروں کے سر میں یہ سودا باقی رہا، وہ بین الاقوامی پنچایت کے خیال کی اشاعت کرتے رہے اور اس کی تلقین بڑھتی رہی۔ چنانچہ دوسری عالم گیر جنگ کے دوران میں جب امریکہ اور انگلستان سب ملکوں کے لوگوں کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں کوئی جمہوری طریقہ برتنا چاہتے ہیں انھوں نے فسطائیت کی مخالف ریاستوں کی ایک برادری قائم کی اور اس نے رفتہ رفتہ ایک باضابطہ ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح زمانے کے تقاضے نے اور اینگلو سیکسن ریاستوں کی سیاسی مصلحت نے مل کر پرانی انجمن اقوام کو نئے سرے سے ایک نئی شکل میں جنم دیا۔ اس نئے ادارے کا حلقہ پرانی انجمن سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس میں روس ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور ایشیا کی بہت سی قومیں بھی جو انجمن اقوام میں نہیں تھیں، شریک ہیں، یوں سمجھئے کہ جرمنی، اٹلی اسپین اور چند چھوٹے چھوٹے ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے سبھی ملک اس کے ممبر ہیں۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ماتحت کمیٹیاں جو ممبر ملکوں میں سیاسی، معاشی، تہذیبی، معاشرتی تعاون پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ ادارے کی عام مجلس (جنرل اسمبلی) کا اجلاس تو سال میں ایک بار دو تین مہینے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر کمیٹیاں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ ان میں حفاظتی کمیٹی (سکیورٹی کونسل) سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ادارے کا اصل کام یعنی ملکوں کے باہمی جھگڑوں کو پنچایت کے ذریعے طے کرنا اسی کے سپرد ہے۔

اقوام متحدہ کے دوسرے ماتحت اداروں اور کمیٹیوں سے دنیا کی رائے عامہ بڑی حد تک مطمئن ہے لیکن سکیورٹی کونسل سے لوگ عام طور پر مایوس نظر آتے ہیں۔ اس پر سستی، کمزوری، قوت فیصلہ کی کمی کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ اصل میں ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ دوسرے اداروں کے اور سکیورٹی کونسل کے کام میں کیا فرق ہے اور اس کی راہ میں کیا مشکلات حائل ہیں ورنہ ہم خود بے انصافی کے مرتکب ہوں گے۔ دوسرے اداروں کا مقصد یہ ہے کہ سب ملکوں کے نمائندوں کو جمع کر کے تبادلۂ خیالات کا موقع دیں، آپس کے تجارتی، تہذیبی اور معاشرتی تعلقات کے بارے میں ایسے اصول طے کریں اور ایسی تجویزیں سوچیں جن میں سب کا بھلا ہو۔ لیکن سکیورٹی کونسل کو یہ ناگوار فرض انجام دینا پڑتا ہے کہ ریاستوں کی خود غرضی کی اور ان جارحانہ کارروائیوں کی جو ایک ریاست دوسری ریاست کے خلاف کر رہی ہو یا کرنے والی ہو روک تھام کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اداروں کا کام آسان ہے اور اس کا کام نہایت مشکل ہے۔

اب ذرا اس کی ساخت اور آئین پر غور کیجئے اور یہ بتائیے کہ اگر اس کی کارروائی میں سستی تلوّن اور کمزوری نظر آتی ہے تو اس کا کیا قصور ہے۔ وہ گیارہ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ ہر سال نکل جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے آ جاتے ہیں۔ صدر ہر مہینے بدلتا رہتا ہے۔ کسی تجویز کی منظوری کے لئے یہ ضروری ہے کہ گیارہ ارکان میں سے کم سے کم سات اس کی تائید کریں جن میں پانچوں بڑی طاقتوں روس، امریکہ، انگلستان فرانس اور چین کے نمائندوں کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی اگر ان پانچوں میں سے ایک بھی کسی تجویز کو رد کر دے تو وہ نامنظور سمجھی جائے گی، چاہے باقی دس اس کی تائید کریں۔ اس کو ویٹو کہتے ہیں۔ روس اسی شرط پر شریک ہوا ہے کہ اس کو ویٹو کا حق دیا جائے اور اس سے برابر کام لیتا رہتا ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ جس مجلس میں ہر مہینے نیا صدر آئے۔ اس کی پالیسی میں تھوڑی بہت تبدیلی برابر ہوتی رہے گی یا نہیں، جس مجلس کو ہر معاملے میں ایسی راہ نکالنی پڑے جس پر پانچوں بڑی ریاستیں اور دو اور ریاستیں متفق ہو جائیں اس کی کارروائی سست ہوگی یا نہیں اور جس مجلس کے پاس اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے خود اپنی کوئی قوت نہ ہو اس کے طرز عمل میں قدرتی طور پر کمزوری ہوگی یا نہیں۔ اب رہی جانب داری اور بے انصافی تو یہ عیب سکیورٹی کونسل میں اتنے ہی زیادہ یا اتنے ہی کم ہیں جتنے انسانی فطرت میں ہیں۔ بے شک امریکہ اور انگلستان اس پر حاوی ہیں اور اس کو ہر معاملے میں ان کے مفاد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روس اور امریکہ کو بھی شرا حضوری [illegible] کسی نہ کسی حد تک اپنے مفاد کو مفاد عامہ کے لئے چھوڑنا پڑتا ہے۔

شاید آپ یہ کہیں کہ ایسی بے جا شرطیں سکیورٹی کونسل کے دستور میں کیوں ہیں؟ بات یہ ہے کہ صرف ان ہی شرطوں پر پانچ بڑی ریاستوں کا خصوصاً روس کا اقوام متحدہ میں شریک کرنا ممکن تھا اور سب کو شریک کئے بغیر اندیشہ تھا کہ یہ بھی پرانی انجمن اقوام کی طرح بے کار ہو کر رہ جائے گی؟

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قیام امن کی اس سست اور کمزور مشین سے کیا فائدہ؟ اس نے اتنے دنوں میں انڈونیشیا، فلسطین، کشمیر، برلن کے مسائل میں سے کون سے مسئلے کو حل کر لیا ہے جو آئندہ کے لئے اس سے کوئی اُمید رکھی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک سکیورٹی کونسل اب تک کسی مسئلے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

بزمِ بے تکلّف

آئیے آئیے میر صاحب اب تو مہینوں کیا برسوں آپ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پہلے آپ کو عید کا چاند کہتے تھے اب دم دار ستارہ کہنا پڑے گا۔"

"یہ دُم دار ستارہ کیا معنی؟ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ ایک تو محاورہ غلط ہے دوسرے اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے؟"

"ارے توبہ معاف کیجئے گا، میں نے محاورہ سمجھ کر نہیں استعارہ سمجھ کر لکھا تھا۔ مگر بڑا غضب تو یہ ہوا کہ ذم کا پہلو نکل آیا۔ اب کیا ہوگا! ذرا اچھی طرح دیکھ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہو گیا ہو؟"

"دھوکا کیا ہوتا کھلی ہوئی بات ہے۔ ایک تو دُم ذکر یوں ہی قبیح ہے اور پھر دم دار ستارے میں تو قباحت کے علاوہ نحوست بھی آ گئی۔"

"قباحت کو تو خیر صبر کر لیجئے مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ مگر یہ نحوست آپ کی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"پھر وہی شرارت کی باتیں۔ میری نحوست کا ذکر ہے یا دم دار ستارے کی۔"

"توبہ کیجئے میر صاحب میری کیا مجال کہ آپ کی نحوست کو کچھ کہوں، میں تو دم دار ستارے کی نحوست سے انکار کر رہا ہوں۔"

"انکار کیا ہے، تم تو شیطان کی شیطنت سے بھی انکار کر دو گے۔ غضب خدا کا صریحاً دیکھ رہے ہو کہ ادھر دم دار ستارہ نکلا، اُدھر بمبئی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ طوفان آیا وہ طوفان آیا کہ بس خدا کی پناہ اور پھر بھی اس منحوس ستارے کی نحوست سے انکار کرتے ہو۔"

"قربان جائیے آپ کے اس بھولے پن کے۔ بمبئی کا طوفان آپ کے خیال میں دُم دار ستارے کا دم چھلا تھا۔ ستارہ تو ساری دنیا میں دیکھا گیا اور اس کی نحوست کی تان صرف بمبئی پر آ کر ٹوٹی۔ اور یہ جو ہندوستان اور پاکستان میں ایک کروڑ آدمیوں پر خانہ بربادی کی قیامت ٹوٹی اور اب چالیس کروڑ آدمیوں پر مہنگائی اور بھوک کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور یہ جو یورپ کے اوپر جنگ کی قیامت ٹوٹی اور اب کومن فارم اور مارشل ایڈ کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اسے بھی آپ دُم دار ستارے کی نحوست کہیں گے؟"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"اپنے اعمال کی شامت کہئے، اپنی حماقت، جہالت اور [illegible] کہئے وہ دن گئے جب انسان اپنے کرتوت شیطان کے سر منڈھ دیا کرتا تھا یا دُم دار ستارے کی دم سے باندھ دیا کرتا تھا۔ اب قانون اور آئین کا زمانہ ہے۔ سوچ سمجھ کر جینا چاہئے اگر آپ نے شیطان پر یا دم دار ستارے پر ایسے بے سروپا الزام لگائے تو وہ لیو این، اور یو این نالش کر دیں گے اور چودھری ظفر اللہ کو اپنا وکیل بنا لیں گے بیٹھے بٹھائے م

آپ سے اور یکتی میں مجھ کیا تو پھر کیا کیجئے گا ——— تم تو ہو مسخرے اور مجھے مسخرے پن سے چڑ ہے سو اسی لئے تم سے ملتے ہوئے گھبراتا ہوں ——— بولے کہنے نوع تو ہے [illegible] میرا تیرا میل نہیں

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

یہی ٹھیک ہے

جب آئین ساز اسمبلی کے ذمہ دار ممبروں نے دیکھا کہ آئین پر بحث، ہستیلان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو انھیں مجبور ہو کر عمل جراحی سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے یہ تجویز سوچی کہ صدر کو اختیار دیا جائے کہ

(۱) جو ترمیمیں محض لفظی یا نحوی ہوں یا محض صورت سے تعلق رکھتی ہوں معنی پر اثر انداز نہ ہوتی ہوں انھیں پیش کرنے کی اجازت نہ دے

(۲) بحث کے لئے صرف ان ترمیموں کو منتخب کرے جو زیادہ جامع اور مناسب ہوں۔ بقیہ ترمیموں کے بارے میں بغیر بحث کے ووٹ لے لے۔ کئی ممبروں نے اس پر سختی سے احتجاج کیا خصوصاً نذیر الدین احمد صاحب نے جن کی ایک ہزار ترمیمیں جو ڑی جانے کے بعد بھی ڈیڑھ ہزار اور باقی ہیں اور پروفیسر کے ٹی شاہ نے جو بہ قول خود اپنی ترمیمیں ذہن کی تجوری میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر اکثریت نے بڑی مردنگی سے کام لے کر اس تجویز کو منظور کر لیا اس کے علاوہ اب اسمبلی کے اجلاس کا وقت بھی بڑھایا جا رہا ہے۔ اس لئے کچھ کچھ امید ہوتی ہے کہ شاید آئین کی سب دفعات پر بحث کانگریس اسمبلی پارٹی کی مقرر کی ہوئی تاریخ ۲۶ جنوری سے پہلے ختم ہو جائے اور جس دن انیس سال پہلے غلام ہندوستان نے جنگ آزادی کا حلف اٹھایا تھا اسی دن آزاد ہندوستان اپنے قومی آئین کی وفاداری کا حلف اٹھا سکے۔

آئین ہے یا ضابطہ قانون

کہا جاتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں مذاق ظرافت بہت کم ہے۔ دراصل اس کی تہہ میں احساس تناسب کی کمی ہے جس کا اظہار ہماری زندگی کی بہت سی چیزوں میں ہوتا ہے۔ ہم کلیات اور جزئیات میں، اصول اور فروع میں فرق نہیں کرتے اور چھوٹی بڑی باتوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت پچھلے ہفتے اسمبلی کی بحثوں میں اچھی طرح مل گیا۔ ہندوستانی ریاست کی رہنمائی کے لئے جو اصول تجویز کئے گئے ان میں جہاں یہ اہم اور اساسی اصول تھے کہ معاشی جمہوریت قائم قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور نظم و نسق کی عمارت کا سنگ بنیاد گاؤں کی پنچایت کو سمجھا جائے وہاں یہ نیک ہدایت بھی تھی کہ نشہ بندی کی جائے۔ اس دفعہ میں کہ عدالت کو عاملہ سے الگ رکھا جائے ہماری اسمبلی یہ اضافہ کرنا چاہتی تھی کہ اس اصول کا نفاذ تین سال کے اندر کر دیا جائے، اس پر وزیر اعظم نے لوگوں کو سمجھایا کہ جزئیات کو آئین میں دخل کرنے سے اس کی عظمت و شان کم ہو جائے گی۔ ترمیم نا منظور ہو گئی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نشہ بندی نہایت ضروری ہے مگر اور بھی بہت سی ضروری چیزیں ہیں مثلاً جوئے اور سٹے کو روکنا نفع خوری اور چور بازاری کو روکنا، سود خواری کو روکنا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں آئین میں نہیں آ سکتیں اور نہیں آنی چاہئیں۔ ان جزئیات پر اصرار کرنے کے بجائے اگر ہماری اسمبلی معاشی جمہوریت کی مبہم اصطلاح کی تھوڑی سی تشریح پر زور دیتی تو اچھا تھا۔ معاشی جمہوریت اور معاشی انصاف تو ہٹلر کی قومی سوشلسٹ پارٹی بھی تسلیم کرتی تھی مگر اس کی تعبیر جس طرح کی گئی وہ سب کو معلوم ہے۔ ہمارے ملک میں معاشی جمہوریت کی راہ میں جو قوتیں حائل ہیں ان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے علاوہ ہماری سیرت کا یہ عیب بھی ہے جسے میں نے احساس تناسب کی کمی کہا ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں میں جن پر رسمی اخلاق و مذہب کا ٹھپا ہوتا ہے اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ مذہب و اخلاق کے اصل اصول کو بھول جاتے ہیں وہ اصول یہ ہے کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں سب کو خدا کی زمین پر زندگی کی ضروریات میں سے اتنا حصہ ملنا چاہیے کہ وہ انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ بے شک ہمارے آئین کے بنیادی حقوق کے باب میں اس مضمون کی ایک دفعہ موجود ہے۔ لیکن اصولی ہدایات کے سلسلے میں اس طرف بھی کچھ اشارہ ہونا چاہیے تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ملک کے معاشی نظام کی کیا شکل ہوگی۔

بیا کہ نوبت صلح است و آشتی و صفا

ہندوستان اور برطانوی دولت مشترکہ کے تعلق کے مسئلے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی غور کر چکی ہے۔ اور اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کے حل کرنے کا ایک اصول طے ہو گیا ہے اور وزیر اعظم کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کریں۔ امید ہے کہ دو ہفتے کے اندر اندر پنڈت نہرو آئین ساز اسمبلی کو وہ اصول بتائیں گے جس کی بنیاد پر برطانیہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اس کی منظوری حاصل کریں گے۔ پھر وہ کانگریس کے اجلاس جے پور میں اس مسئلے پر تقریر کریں گے۔

اب تک جو اندازہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے خیال میں ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ سے کم و بیش وہی تعلق رکھنا چاہیے جو اب ایرا (آئرلینڈ) کا ہوگا۔ ایرا کی مجلس قانون ساز نے ابھی ابھی اپنے آئین میں دو بڑی تبدیلیاں کی ہیں ایک یہ ہے کہ وہ ایک خود مختار ری پبلک ہوگا اور دوسری یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات برطانیہ کی معرفت نہیں بلکہ براہ راست ہوں گے۔ سچ پوچھئے تو اس کے بعد آئرلینڈ اور برطانیہ میں کوئی رشتہ نہیں رہا۔ مگر اس کے باوجود وزیر اعظم مسٹر اٹیلی اور آئرش وزیر اعظم مسٹر کاسٹلو نے اعلان کیا ہے کہ ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک میں غیر ملکی نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ان کو خاص حقوق حاصل ہوں گے اسی قسم کا تعلق آئرلینڈ کے ساتھ رکھنے کا اعلان ہندوستان اور نیوزی لینڈ کی طرف سے بھی ہوا ہے اور دولت مشترکہ کے دوسرے ملکوں کی طرف سے ہونے والا ہے اگر ہم اس تعلق کی نوعیت پر غور کریں کہ در اصل یہ اس قسم کا دوستانہ معاہدہ ہے جیسا خود مختار ملکوں کے درمیان پہلے بھی ہوا کرتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے شہریوں کو خاص مراعات دیں گے ہمارے خیال میں اگر ہندوستان کا برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے ساتھ جو دولت مشترکہ کے رکن ہیں اس قسم کا دوستانہ رشتہ مستقل طور پر قائم رہے تو کوئی ہرج نہیں بلکہ بہت خوشی کی بات ہے ہندوستان کی بیرونی پالیسی یہی ہے اور یہی ہونی چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کے ساتھ رشتۂ محبت سے وابستہ ہو اگر اس کی ابتدا وہ برطانیہ اور اس کے ساتھی ملکوں سے کرتا ہے تو گویا اس کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے دل میں کینہ نہیں جو بد سلوکیاں اس کے ساتھ کی گئیں ان کی تلافی ہو جانے کے بعد وہ انھیں معاف کر سکتا ہے اور بھول سکتا ہے۔ البتہ ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے معاہدے دولت مشترکہ کے ہر ملک سے الگ الگ کئے جائیں اور وہ دو طرفہ ہوں، مثلاً جنوبی افریقہ کے ساتھ معاہدہ ہو تو صاف صاف یہ شرط کر لی جائے کہ ہندوستانی نسل کے لوگوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے وزیر اعظم جنھیں ہندوستان کی عزت دل و جان سے عزیز ہے اس نکتے کو پیش نظر رکھیں گے۔

نیا رہبر، نئی منزل، نئی راہ

۲۸ نومبر ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے بہ اتفاق رائے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جس کی پوری اہمیت باہر سے دیکھنے والوں کو شاید اس وقت محسوس نہ ہو لیکن چند سال میں صریحی طور پر ظاہر ہو جائے گی۔ اس فیصلے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے رجعت پرست طبقے نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ برطانوی حکومت کا بند ٹوٹنے کے بعد وہ اب سیاسی، معاشی اور ذہنی ترقی پسندی کی رو کو علی گڑھ تک پہنچنے سے کسی طرح نہیں روک سکتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو اب سے بہت پہلے نظر آ جانی چاہیے تھی مگر ارباب غرض کو ان کی غرض اس طرح اندھا کر دیا کرتی ہے کہ اب بھی ہمارے ملک میں بہت سے لوگوں کو یہ کھلی ہوئی حقیقت دکھائی نہیں دیتی اور وہ ٹوٹے ہوئے بند کی جگہ مٹی کی دیواریں کھڑی کر کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں۔ ہم مسلم یونیورسٹی کورٹ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کی آنکھیں دیر میں سہی مگر کھل تو گئیں جہاں تک طلبہ اور اسٹاف کا تعلق ہے ان میں سے اکثر کے لئے یہ ایک دلی آرزو کی تکمیل ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ ان کو نیا رہبر، نئی منزل، نئی راہ مبارک۔

اقوام متحدہ کا ادارہ

بسلسلہ صفحہ (۳)

کو حل نہیں کر سکی لیکن اس کی وجہ سے کئی بار جنگ کے شعلے بھڑکتے بھڑکتے دب گئے اس کی وجہ سے متعدد مرتبہ وہ حریفوں کو انتہائی اشتعال کی حالت میں جب وہ جنگ کا مہلک قدم اٹھانے والے تھے اور رکنے میں اپنی ذلت سمجھتے تھے اس کا موقع مل گیا کہ اس کے روکنے سے عزت کو ہاتھ سے دئے بغیر رک جائیں اور اپنے جھگڑوں کو پر امن طریقے پر حل کرنے کی کوشش کریں۔

کیا دو سال کی زندگی میں یہ کارنامہ کم ہے؟ انصاف سے کہئے؟

۲۔ پاکستان

سندھ کی وزارت ابھی باقی ہے

مغربی پنجاب کے وزارتی جھگڑوں اور ضمناً صوبہ سرحد کی وزارت سے خود مسلم لیگ پارٹی کی بے اطمینانی کے متعلق "نئی روشنی" کی پچھلی اشاعت میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب رہی تیسرے صوبے ———— سندھ کی وزارت تو اس پر بھی وہاں کے عوام کو بھروسہ نہیں ہے۔ چنانچہ کافی دنوں سے اس کے خلاف لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسے پاکستان کی مرکزی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔ اس لئے باوجود عوام کی شکایتوں کے وہ ابھی تک باقی ہے عرصہ ہوا، خواجہ ناظم الدین صاحب بعد لیاقت علی خاں نے شکایتوں اور الزامات کی چھان بین کرنے کے لئے گورنر سندھ کو مقرر کیا تھا اور اس فیصلے کے فوراً ہی بعد وزیر اعظم سندھ پیر الٰہی بخش صاحب نے ایک بیان میں اس پر اطمینان اور گورنر سندھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، آج کل گورنر سندھ، صوبے کے اہم مقامات کا دورہ کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں وہ الزامات کی تحقیقات کر رہے ہیں یا وزارت کی مخالفت کو دور کرنے کی کوشش۔ وہاں کے وزارتی الجھاؤ کے سلسلے میں معاصر پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار کراچی نے اپنے اخبار کو جو اطلاع بھیجی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"سندھ وزارت کے خلاف وہاں کے پریس نے جو جدوجہد شروع کی تھی وہ اسی جوش و خروش سے جاری ہے۔ جو اخبارات ابتدا میں الگ تھے، اب وہ بھی شریک ہو گئے ہیں، صرف سندھی "مجاہد" وزارت کی حمایت کر رہا ہے جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ وزیر اعظم پیر الٰہی بخش کا پروردہ ہے۔ سندھ گورنمنٹ کی اس وقت سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد حیدرآباد سندھ منتقل ہو جائے۔ اس نزاع کی دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔ ابھی تک سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی میں کسی قسم کا اختلاف ظاہر نہیں ہوا ہے اور سندھ کے وزیر اعظم روز بروز بڑھتے ہوئے الزامات کا جواب دینے کے بجائے سندھی عوام کی حمایت کا برابر دعوے کر رہے ہیں لیکن یہ صورت حال غالباً دیر تک باقی نہیں رہے گی۔"

سندھ میں پناہ گزینوں کی حالت زار

پچھلے دنوں مغربی پنجاب کے کیمپوں سے تقریباً دو لاکھ کے قریب پناہ گزین سندھ بھیجے گئے تھے۔ کراچی کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی حکومت نے ان کی بحالی کے سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا اور یہ بے چارے مارے مارے ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔

پناہ گزینوں کی بحالی کا مسئلہ سارے پاکستان کا مسئلہ تھا، اور یہ کسی ایک صوبے کا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت سندھ نے اس معاملے میں اپنے فرائض کو صحیح طور پر سر انجام نہیں دیا۔ سندھ سے جو غیر مسلم گئے اور جو بھی وہ زمینیں، جائدادیں چھوڑ کر گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان میں پناہ گزینوں کو آباد کیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ ان زمینوں اور کارخانوں کو وہاں کے بڑے بڑے زمینداروں نے ہتھیا لیا ہے۔ اور اب ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس پر قابض رہیں اور پناہ گزینوں کو اپنے ہاں آنے نہ دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پناہ گزینوں کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ اور ان کی بحالی میں نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں دیتے بلکہ الٹا ان کے خلاف منافرت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔

مرکزی حکومت کے وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین نے اپنے ایک بیان میں ایسے لوگوں کو متنبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ جو شخص بھی خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر کیوں نہ ہو مہاجرین کی بحالی میں مخل ہوگا، اُسے سختی سے کچل دیا جائے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس تنبیہ کا عملی نتیجہ کیا نکلتا ہے اور سندھ کے بڑے زمیندار اس معاملہ میں مرکزی حکومت کے ساتھ کہاں تک تعاون کرتے ہیں۔"

(آفاق، لاہور)

ملیریا سے تباہی

مغربی پنجاب کے ایک بہت بڑے حصے میں ———— مانٹگمری، سیالکوٹ، گجرانوالہ، شیخوپورہ اور ملتان کے بعض علاقوں میں بہت شدید ملیریا پھیلا ہوا ہے اور معاصر پاکستان ٹائمز کے بیانات کے مطابق "ہزاروں آدمی روزانہ مر رہے ہیں اور دیہاتوں کے لاکھوں مریض دوا کے لئے ترس رہے ہیں۔" اس نامہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض گاؤں ایسے بھی ہیں جہاں بغیر کسی مبالغے کے سب کے سب بیمار ہیں نہ کوئی تیمارداری کرنے والا ہے اور نہ کوئی جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والا ہے، اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ نہ تو دوائیں ہیں اور نہ ڈاکٹر اور نہ امید۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مریضوں کا یہ سیلاب لاہور کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ لیکن یہاں کے ہسپتال بھی بھر چکے ہیں۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ روزانہ ۵۰ سے ۷۵ فی صدی تک مریض جنرل وارڈ سے مایوس اور ناکام واپس جاتے ہیں اور ٹی بی وارڈ سے ۹۰ فی صدی۔ اور یہ سب کے سب یا تو گھروں پر بغیر ڈاکٹر اور دوا کے مر رہے ہیں یا سڑکوں پر۔ مغربی پنجاب کی وزارت کے لئے یہ بہت ہی ابتلا اور آزمائش کا موقع ہے۔ دیکھنا ہے کہ وہ اس موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے لوگوں کی قیمتی جانوں کو بچانے کی طرف فوری توجہ کرتی ہے یا اپنی وزارت کو مضبوط کرنے میں لگی رہتی ہے۔

فریاد!

"پاکستان کی خارجی پالیسی ایک معما بن گئی ہے۔ ایک ناقابل فہم راز، ایک عقدۂ لاینحل ———— موت و زیست کے دوراہے پر کھڑا ہوا ———— ہر پاکستانی متحیر ہے کہ بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کا تمارو کون ہے؟ ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا پاکستان قائم ہوئے لیکن روس میں پاکستان کا سفیر ابھی تک مقرر نہیں ہوا ہے حالانکہ ہندوستان کا سفیر وہاں مدت سے کام کر رہا ہے۔ پیرس میں نہرو نے ویشنسکی کی لمبی ملاقات کی۔ لیکن مسٹر لیاقت علی کی ویشنسکی سے ملاقات کی کوئی خبر نہیں آئی ہے . . . .

نئے خطرے سامنے ہیں۔ منزل دور ہے اور سفر میں کوئی ساتھ نہیں ہے بین الاقوامی زمانے میں یہ تنہائی نہایت خطرناک ہے وزیر اعظم پاکستان سے لندن میں ایک نامہ نگار نے سوال کیا کیا عرب ریاستوں کا ایک بلاک یا سلسلہ تعلق قائم کرنے کا کوئی سوال ہے؟ وزیر اعظم پاکستان نے جواب دیا کہ "پاکستان دولت مشترکہ کا ایک رکن ہے اور وہ ہرگز کوئی مسلم بلاک نہیں ہے اگر آپ کا یہ مقصد ہے کہ ہم اسلامی ممالک سے کوئی سیاسی دھڑا بندی کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔"

وزیر اعظم پاکستان کے اس بیان پر ہم خود کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ لیکن لندن میں مسلم برادرہڈ (اخوان المسلمین) نے وزیر اعظم پاکستان سے سوال کیا ہے جو حسب ذیل ہے:۔

جنوبی افریقہ جس نے دولت مشترکہ کے ممالک میں سب سے پہلے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا، اور برطانیہ جو عربوں کے مصائب کا اول اور آخر ذمہ دار ہے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مصائب کا بھی اور آسٹریلیا جہاں کوئی پاکستانی اپنے رنگ کی بنا پر شہری تک نہیں بن سکتا اور کنیڈا جو امریکی صیہونیت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ سب کس طرح ایسی برادری قرار دئے جا سکتے ہیں جس کی رکنیت پاکستان جو ایک اسلامی ملک ہے قبول کرے۔"

. . . . . . ان حالات میں پاکستان جس نازک مرحلہ پر کھڑا ہے، وہ فوری توجہ کا طلب گار ہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پاکستان کی خارجی پالیسی کیا ہے؟!"

(روزنامہ انجام، کراچی)

روس کا گیہوں مشرقی پاکستان میں

مشرقی پاکستان کی غذائی حالت ایسے بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ مگر پچھلے مہینوں سیلاب کی وجہ سے کوئی بیس لاکھ ایکڑ کاشت کو نقصان پہنچا جس سے تقریباً ڈھائی لاکھ ٹن دھان تباہ ہو گیا۔ اس اچانک تباہی اور غیر متوقع نقصان سے اناج کی قیمت ایکدم سے کئی گنی بڑھ گئی اور عوام کی دقتوں میں کئی چند اضافہ ہو گیا۔ ابھی حال میں چار لاکھ من روسی گیہوں وہاں بھیجا گیا ہے اس سے اناج کی قیمتوں پر خفیف سا اثر پڑا ہے۔ حکومت پاکستان نے کراچی اور بعض دوسرے مقامات سے مزید گیہوں اور چاول بہت جلد بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح مشرقی پاکستان کا بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا

(ع۔ ل)

۳- باہر کی دنیا

مختصر غیر ملکی امداد جس کی اُمید

دو ہفتے کی چھٹی منانے کے بعد پریذیڈنٹ واشنگٹن واپس آگئے ہیں جن اہم مسائل کا ان کو فیصلہ کرنا ہے ان میں چین کی مدد کرنے کا مسئلہ سب سے مقدم ہے واپسی کے بعد سب سے پہلے انھیں ورنہ کلارک کی رپورٹ ملی ہوگی۔ جسے انھوں نے چین کے دورہ کے بعد مرتب کیا ہے مسٹر کلارک کی چین کی امداد کے متعلق رائے سب کو معلوم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر چین کو کمیونزم سے بچانا ہے تو ضروری ہے کہ (۱) فوراً اور وسیع پیمانے پر ہر قسم کے سامانِ جنگ اور ہتھیار سے براہ راست اس کی مدد کی جائے۔

(۲) اتنی مالی امداد دی جائے کہ اندرونی بجٹ کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو جائے اور سکہ کا اُتار چڑھاؤ کم ہو جائے۔

(۳) اخراجات کی دیکھ بھال اور سخت نگرانی کی جائے۔

لندن ٹائمز کے نامہ نگار۔ پیکنگ (چین) کی تازہ اطلاع یہ ہے کہ چین کی مزید امداد کے سلسلے میں جنرل میک آرتھر جنرل سیمو چیانگ کائی شیک سے گفتگو کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کمیونزم کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کس قدر سامان جنگ اور رقم کی ضرورت ہوگی۔ امریکہ کے ماہرین کا یہ عام خیال ہے کہ چین کی ہوائی کمان امریکی افسروں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مشورہ کا کوئی موثر اور کارگر طریقہ اختیار کیا جائے۔ ورنہ امریکا کی امداد چین کے "مرد بیمار" کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

کانفرنس سے کام نہیں چلے گا

چین میں کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے جمہوری طاقتیں بڑی پریشان ہیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ اگر چین میں کمیونسٹ راج قائم ہو گیا تو پھر جنوب مشرقی ایشیا کو کمیونزم سے بچانا ناممکن ہو جائے گا ملایا ابھی سے کافی متاثر ہو چکا ہے، ہانگ کانگ پر کمیونسٹوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، بنکاک کے تیس ہزار کمیونسٹوں کی وجہ سے سیام بھی خطرے میں ہے برما میں اگرچہ کمیونسٹ بڑی حد تک دبا دئے گئے ہیں مگر چین کی کامیابی سے یہاں کی تحریک کو تقویت ملے گی، بلکہ ممکن ہے کہ وہ شمالی برما کا جسے چینی نقشے میں چین کا علاقہ دکھایا جاتا ہے مطالبہ کریں، فرانسیسی ہند چینی میں، کمیونسٹوں نے قومی تحریک پر قبضہ کر لیا ہے۔ انڈونیشیا میں بھی کمیونسٹ پارٹی ایک زندہ اور طاقت ور جماعت ہے غرض پورا جنوب مشرق ایشیا کمیونزم کا گہوارہ ہوتا جا رہا ہے اور اگر چین انھوں نے فتح کر لیا یا کچھ حصے میں بھی باقاعدہ اور مضبوط حکومت قائم کر لی تو پورا جنوب مشرقی ایشیا ایک مضبوط مرکز ہو جائے گا۔ انھیں باتوں پر سوچ بچار کرنے کے لئے ابھی حال میں سنگاپور میں برطانوی سیاسی مدبرین اور جنوب مشرقی ایشیا کے نوآبادیات کے گورنروں کی دو روزہ کانفرنس ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے اب کمیونزم کے مسئلے کو کانفرنسوں سے حل کرنا مشکل ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری اور بڑی مضبوط ہیں۔ اس کا پھیلاؤ صرف جنوب مشرقی ایشیا ہی تک محدود نہیں ہے، دنیا کا بڑا حصہ اس کے زیر اثر ہے۔ اس لئے محض طاقت کی دھونس سے یا طاقت کے استعمال سے اسے دبانا ممکن نہیں ہے۔ عقلمندی اس میں ہے کہ جن بیماریوں کو دور کرنے کے لئے کمیونزم کی حالت سے زیادہ تیز اور خطرناک دوا تجویز کی گئی ہے ان کا کوئی معقول اور معتدل علاج تلاش کیا جائے۔

روس کی نئی چال

روس نے جس غرض سے برلن کی ناکہ بندی کی تھی وہ بظاہر اب پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور مغربی طاقتیں اس سردی میں بھی ہوائی جہاز سے ضروریات زندگی مہیا کرنے میں پچھلے سال کی طرح کامیاب رہیں تو روس کو بساطِ سیاست پر کوئی نئی چال چلنی پڑے گی۔ امریکہ کے "نیوز ویک" کا خیال ہے کہ روس مشرقی جرمنی سے بہت جلد اپنی فوجیں ہٹا لے گا اور اپنا علاقہ جرمن کمیونسٹوں کے حوالے کر دے گا۔ اس خیال کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ جرمن کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری اخبار "نیا جرمنی" نے ابھی حال میں لکھا تھا کہ "جرمن عوام اور دنیا کی امن کی خاطر سوویٹ ملٹری حکومت کو ختم کیا جا رہا ہے .... روسی قبضہ کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔"

جرمنی کے برطانوی کمانڈر نے اس کی تصدیق کی ہے کہ روس جرمنوں کی کوئی چار لاکھ فوج تیار کر رہا ہے جو بکتر بند گاڑیوں اور بھاری مشین گنوں سے مسلح ہوگی۔ روس اپنی فوجیں ہٹاتے وقت اپنا علاقہ اُن کے حوالے کر دے گا۔ صرف ایک معمولی محافظ فوج برلن میں باقی رہے گی۔ لیکن اگر دوبارہ قبضہ کرنے کی ضرورت پڑی تو اس کی بھی پیش بندی کر لی گئی ہے۔ پولینڈ کی سرحد ہے، کم سے کم وقت میں بڑی سے بڑی فوج بھیجی جا سکے گی اس چال سے مغربی طاقتوں کے خلاف روس کا یہ نیا ہتھکنڈا زیادہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے اور جو مقصد برلن کی ناکہ بندی سے پورا نہیں ہوا تھا وہ شاید اس طرح پورا ہو جائے۔

ڈیگال کا زور بڑھ رہا ہے

ابھی حال میں فرانس کے ایوان اعلیٰ کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ان ۲۶۹ نشستوں میں سے جن کے لئے انتخاب ہو چکا ہے، ۹۹ جنرل ڈیگال کے حامیوں نے حاصل کی ہیں اور کمیونسٹوں کی تعداد ۸۵ سے گھٹ کر صرف ۱۶ رہ گئی ہے۔ نوآبادیوں کے نمائندے، جو ابھی منتخب نہیں ہوئے ہیں، کمیونسٹوں کی تعداد میں شاید ہی کوئی اضافہ کریں۔ ان میں سے بیشتر جنرل ڈیگال کے حامی یا ریڈیکل سوشلسٹ یعنی کسی قدر قدامت پسند ہوں گے۔ جنرل ڈیگال اب یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ وہ نیشنل اسمبلی کا بھی دوبارہ انتخاب کرائیں اور اس میں اتنی نشستیں حاصل کر لیں گے کہ ایک مضبوط اور دیرپا حکومت قائم کر لیں۔

نیشنل اسمبلی کے مقابلے میں جمہیر (ایوان اعلیٰ) کے اختیارات بہت محدود ہیں، لیکن اگر کوئی تعطل پیدا ہوا، تو ممکن ہے وہ اسمبلی کو توڑ کر دوبارہ انتخاب کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔ بہرحال آئندہ کے چند ہفتوں میں صحیح حالت کا اندازہ ہو سکے گا کہ نیشنل اسمبلی کے الیکشن کا سوال کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ آیا ڈیگال کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے یا موجودہ حکومت ہی کو جیسے تیسے کام چلانا ہوتا ہے۔ فرانس کی وزارتیں بہت جلد جلد بدلتی رہتی ہیں مگر وزیر بیشتر وہی لوگ رہتے ہیں۔ جو نیا خطرہ پیدا ہوا تھا کہ کمیونسٹوں کی مخالفت حکومت کا کام بند کر دے گی وہ کسی حد تک دور ہو گیا ہے اور یہ بھی ایک بڑی بات ہے۔

کوئی خوش کوئی خفا

پریذیڈنٹ ٹرومین کی کامیابی پر مختلف ملکوں نے مختلف اور متضاد اثرات قبول کئے ہیں۔ امریکہ کے مشہور ہفتہ وار "نیوز ویک" نے اپنی تازہ اشاعت میں تمام اہم ملکوں کے ردعمل کی تفصیل شائع کی ہے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کے متعلق اس نے لکھا ہے:

"منگل کی رات کو لندن کے عوام حسب معمول اپنے کام اور خرید و فروخت میں لگے تھے۔ امریکن کالونی میں صرف مٹھی بھر آدمی انتخاب کے نتیجے کے انتظار میں رات کو جاگتے رہے۔ بدھ کے دن سہ پہر کو یہ لوگ شراب میں مست، پریشاں مو، خستہ حال، قہوہ خانوں میں دودھ اور برانڈی کے سہارے پر کان لگائے بی بی سی کی خبروں کے بلیٹن سن رہے تھے برطانوی حکومت کے ارکان امریکی رجعت پسندی کی شکست پر باغ باغ تھے ان کا خیال تھا کہ مغربی براعظم میں بائیں بازو کا زور بڑھ رہا ہے اور ۱۹۵۰ء کے الکشن میں، یہاں سوشلسٹوں کی کامیابی کے لئے یہ اچھا شگون ہے۔ لیبر لیڈروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امریکہ کے مزدور طبقے نے قیمتوں کے کنٹرول، مزدوروں کی پابندیوں کی تنسیخ۔ شہری حقوق اور سماجی تحفظ کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ اور دل ہی دل میں فخر کرنے لگے کہ ہم نے امریکہ کو جمہوری اشتراکیت کا راستہ دکھایا ہے۔ قدامت پسندوں میں سے اکثر اپنی تشویش کو چھپانے میں ناکام رہے مگر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے عام طور پر ضبط سے کام لیا، ایک کارخانے کے مالک نے اپنے ایک امریکن دوست سے کہا: مصیبت یہ ہے کہ تم امریکہ کے لوگ دراصل چاہتے ہی نہیں کہ کوئی حکومت ہو۔"

غریب ہنری والس کو سوائے کمیونسٹوں کے کسی نے نہیں پوچھا۔ سوائے ہوٹل میں ایک حجام نے ایک امریکن سے کہا "کوئی اور شخص بھی تو امیدوار تھا۔" (ع، ل)

مہاتما گاندھی کی یاد میں

محمد یحییٰ اعظمی

صد حیف دل کو ضبط کا یارا نہیں رہا
تسکین غم کا کوئی سہارا نہیں رہا

آنکھیں ہیں پُرنم کہ آج اُٹھا محسنِ حیات
غم ہے کہ غم گسار ہمارا نہیں رہا

روشن تھا دہر جس سے وہ قندیل بجھ گئی
بھارت کی آنکھ کا تھا جو تارا نہیں رہا

خاکِ وطن تھی جس کی ضیاؤں سے جلوہ ریز
وہ حق کی روشنی کا منارا نہیں رہا

بزمِ وفا ہے دیپ سے سونی پڑی ہوئی
روحانیت کا انجمن آرا نہیں رہا

اس بیسویں صدی میں مثلِ کرشن و بدھ
جس نے زمانہ اپنا گذارا نہیں رہا

صدیقی تھا جس پہ حکمت و روحانیت کا درس
حق کا وہ اک لطیف اشارا نہیں رہا

حق کے لئے وطن کے لئے، قوم کے لئے
سب کچھ کیا تھا جس نے گوارا نہیں رہا

لاٹھی کو ٹیکتا ہوا سرتا قدم جہاد
تھا جو مصافِ حق میں صف آرا نہیں رہا

دنیا کی مشکلات و موانع کے سامنے
جو آج تک کبھی نہیں ہارا نہیں رہا

روکا تھا جس نے وقت کا طوفاں گذر گیا
پھیرا تھا جس نے دہر کا دھارا نہیں رہا

دے کر جہانِ عصر کو پیغامِ آشتی
خود جس نے بار بار پکارا نہیں رہا

اُجڑے چمن کو جس نے نوید بہار دی
خاکِ وطن کو جس نے سنوارا نہیں رہا

وہ جس کی رام دھن میں تھے دھارمک زمزمے
وہ جس کو حق کا نام تھا پیارا نہیں رہا

دردا وہ حق شناس و حق آگاہ اُٹھ گیا
امن و سلامتی کا نقیب آہ اُٹھ گیا

مہمیز

باقر رضوی

جہاں تیرہ و تاریک میں مہر مبیں ہو جا
کتابِ زندگی میں ایک حرفِ دل نشیں ہو جا

فزوں کرنا ہیں تجھ کو حسن کی رعنائیاں ہمدم
تبسم بن نہیں سکتا اگر چینِ جبیں ہو جا

مریضِ دہر کے منہ کا مزا تجھ کو بدلنا ہے
ہلاہل پی نہیں سکتی ہے دنیا انگبیں ہو جا

تجھے تخمِ محبت سے نئے پودے اُگانا ہیں
جلا دے خرمنِ تہذیب برقِ آتشیں ہو جا

بساطِ قلب پہ ہر روز تازہ انقلاب آئے
قدم سے تیرے سرنگوں زلزلوں کی سرزمیں ہو جا

جہاں میں اہلِ دل کچھ سوچ کر منت کشِ غم ہیں
خدا توفیق دے تجھ کو اگر اندوہ گیں ہو جا

شک و شبہات رہبر ہیں گزرگاہِ تجسس میں
نہ ہو گر جرأتِ تشکیک محتاجِ یقیں ہو جا

غزل

سحرؔ رامپوری

یہ اگر سچ ہے کہ دل اس غم کے شایاں ہو گیا
موت کہتے ہیں کسے جینے کا ساماں ہو گیا

جو بھی کچھ ہو، دیکھنا ٹھہرا ہی رنگِ داستاں
وہ پشیماں ہو گئے، یا میں پشیماں ہو گیا

پھول مہکے تھے کہ وہ یاد آ گئے، دل رو دیا
مفت ہی میں اہتمامِ شامِ ہجراں ہو گیا

معترف ہوں، زندگی سے بڑھ کے کیا ہوگا کرم
منفعل ہوں، میں ہی ثابت تنگ داماں ہو گیا

جانے کیا دیوانگی میں کہہ گیا پھولوں سے میں
دیکھتا ہوں کچھ سے کچھ رنگِ گلستاں ہو گیا

ڈوبنے والے سے کچھ ہی دور تھا ساحل، مگر
دیکھتے ہی دیکھتے، موجوں سے طوفاں ہو گیا

میری شامِ غم کے بارے میں ستاروں سے کہو
دل کے داغوں نے جہاں کو دی، چراغاں ہو گیا

اکبری نشتر

(۲)

اکبر ــــــ اور ــــــ انقلاب

طالب الہ آبادی

کہو یہ رندانِ ایشیا سے کہ بزمِ عشرت سے ٹھاٹھ بدلیں
اٹھان کھٹولا ہے اب مسہری کا، کتنی پنڈلی، جان کی وہ کھڑی ہی
حریم ناز کی جگہ ڈریسنگ روم، جیب پڑیا کی جگہ پاوڈر، نیم نرم گلوریوں اور زانو تکیوں کی بجائے کُشن، پیچوان کی جگہ سگریٹ ہر چیز میں آسانیاں۔ ہر سامانِ تہذیب حاضرہ کا آئینہ دار۔ اور پھر تکلفات کے بجائے بے تکلفی۔ نرمی و آہستگی کے بجائے تیز روی۔ اگر اب بھی ایشیا والوں کی آنکھ نہ کھلی تو ظاہر ہے کہ یورپ والے ہوائے عشرت میں پرّاں نظر آئیں گے۔ اور ایشیائی غریب انسان اپنی ہتھیلیوں پر شُغ رُغ کرتے دکھائی دیں گے۔

جو گزرو گے اِدھر سے میرا اُجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے، بغل میں گورا بارک ہے

گورے ہندوستان سے دو دو برس مہمان رہ کر رخصت ہو گئے۔ مگر ان کے آثار و نقوش اب بھی باقی ہیں اور یہ نشتر تو آج سے ۲۰، ۲۵ برس پہلے کا ہے اس وقت تک تو کم و بیش ہر جگہ کا یہی عالم تھا۔ انقلاب زندہ باد! مسجدیں پاکیزگی کا مخزن سہی، نورِ ربانی کا خزانہ سہی عمارت تو اینٹ، پتھر، لکڑی لوہے کا ہی مجموعہ ہے۔ لوگوں کی بے نیازیوں اور زمانے کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کب تک ہو سکتا ہے۔ نہ مرمت نہ دیکھ بھال۔ لطف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ایسے میں یہی نتیجہ ہونا چاہئے تھا جو ہوا۔

مغرب کی لیڈیوں نے اسٹیج کو سنوارا
بجنے لگا پیانو چپ ہو گیا چکارا

چکارا چپ ہوا تو دلارام سارنگی ستار، جل ترنگ اکتارہ بھی خاموش ہو گئے۔ اب پھر بولنے لگے ہیں، اور امید ہے کہ بہت جلد اپنی روحانی منزلوں تک پہنچ کر قوالی، سماع بھجن اور پوجا ارچنا کی زینت بن سکیں گے۔

اکبری نشتر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نفس فسانہ ادیبوں کی طرح وہ کبھی صرف واقعات کی تصویر کشی کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ خود ساختہ مصلح کی طرح خواہ مخواہ ہر بات پر اچھائی برائی کی مہریں نہیں لگاتے۔ روشن اور تاریک پہلو ایک ساتھ دکھا کر معنی خیز خاموشی اختیار کر لیتے ہیں تاکہ آپ خود سوچیں اور فیصلہ کر لیں۔

عقل سپرد ماسٹر، مال سپرد آں جناب
جان سپرد ڈاکٹر، روح سپرد ڈاروِن

تعلیم جیون کا سنگھار ہے، مگر اکبری نشتر اس دور کا مظہر ہے، جب تعلیم کا مقصد صرف اتنا تھا کہ بدیسی حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اچھے دفتری منشی پیدا ہو سکیں۔ حاکم ایک مٹھی سہی مگر سارے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے، اور ہر کلیدی نقطے پر جمے ہوئے تھے۔

بانال وہ ہر پھر کر مختلف ٹیکسوں کی نذر ہو کر بڑی حفاظت سے سرکاری خزانے کی زینت بن جاتا تھا۔ مختلف منزلوں سے گذر کر چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح کہیں کا کہیں پہنچ کر جذب ہو جاتا تھا۔ یہی سہی صحت تھی اس کے ہر موڑ پر ڈاکٹر صاحب کے سہارے کی ضرورت پڑنے لگی، کھانسی آئی مکسچر تیار، بخار آیا گولی کی بھرمار، آیور وید اور طب یونانی کو کون پوچھے؟

ہو چکا ہے آج تک بس چار عناصر کا ظہور
آپ اب برباد و خاک و نار رہنے دیجئے

جان ڈاکٹر کے سپرد کیسے نہ ہو۔ جراحی کی چابک دستیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ دانت میں درد ہو تو دانت اور آنت میں الجھن ہو تو آنت نکال دیں۔ آنکھ، غدود، گردے یا اسی قسم کی دوہری دوہری چیزیں جو فطرت نے جذبہ فیاضی میں فالتو بنا دی ہیں اس میں سے ایک ایک نکال کر کام چلا دیتے ہیں۔ ایک پھیپھڑا خراب ہونے لگا تو فوراً ماؤف کر دیا۔ آدمی بچ گیا۔ ڈھچر ہو گیا مگر سانس لیتا رہتا ہے۔ جان سب کو پیاری ہے۔ ناک کٹ جائے تو پروا نہیں، اچھی سی سوتواں ناک جوڑ دی جائے گی۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے موتیوں کی لڑی مل جائے گی ہاتھ اور پاؤں بدل دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ روح البتہ بیچاری یوں ہی رہ گئی اور مادہ پرست دنیا میں اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔

غریب ہندوستانی روحانیت کے سہارے جی رہے تھے۔ یورپ کی ستم ظریفی دیکھئے۔ روح کا نام ہوا اسے متحرک ہو گیا گھڑی کے پرزوں کی ترکیب سے جس طرح گھڑی میں جان آ جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اعضائی ترتیب سے ہم میں روح موجود رہتی ہے۔ ڈارون صاحب نے تو کمال ہی کر دیا، ایک حکیمانہ نظریہ ارتقا سے ثابت فرما دیا کہ ہمارے مورث اعلیٰ لنگور اور بندر تھے۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

مگر خمِ خانۂ تہذیب کے دل دادہ اس نئی کشید کو اچھوتی کیوں کر رہنے دیتے۔ یورپ سے آئی ہوئی اور آسمانوں سے اتری ہوئی ایک ہے۔ یہ نظریہ بھی جست و خیز سے بھرا ہوا، سرعت اور رفتار میں سمویا ہوا تھا۔ اب جوانی دیوانی نہیں۔ بڑھاپا چھا رہا ہے۔ چہرہ ڈھل رہا ہے۔ مگر ٹھاٹھ وہی ہے، آن بان وہی اور ظاہر ہے کہ جب تک شیر، ہاتھی، شتر مرغ یا کوئی اور عظیم الجثہ جانور ہمارا مورث قرار نہ پائے بندر ہی بندر اسلاف میں نظر آئیں گے۔
جب ہر چیز دوسروں کے سپرد ہو گئی تو پھر
پڑھے گنگناتے تھے لالہ نرنجن

نہ آنکھوں میں انجن نہ دانتوں میں منجن
چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے
کہاں کھینچ لے جائے گا ہم کو انجن

قافیہ نمائی سمجھئے یا خیال آرائی۔ شاعر کے پاس الفاظ کے سوا اور کوئی ذریعہ خیالات کے اظہار کا نہیں ہے۔ انقلابی دور میں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ لالہ نرنجن سے کوئی خاص ہستی مقصود نہیں، نہ ہو سکتی ہے۔ نام تو محض مثالی طور پر ہوتے ہیں۔ مولوی نظر ہوں یا منشی برق، پنڈت ترویدی ہوں یا ملا عالم۔ نام پر نہ جائیے۔ نگینہ پرکھئے۔

لوشن ہی اور زنک لوشن، سرمہ اور انجن کی جگہ، ٹوتھ پاوڈر، منجن کے بجائے استعمال ہوں تو سادگی اور بچپن کا زمانہ کیوں یاد نہ آئے، اور فضا میں "کہار" کیوں نہ سنائی پڑے۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

جب سر پر آ جاتی ہے تو انسانی فطرت ہے کہ ہر مصیبت جھیل لی جاتی ہے۔ لسان العصر اکبر کی دوربین نگاہیں انقلاب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مدتوں پہلے امید کی روشن تصویریں دیکھ لیتی تھیں۔

عزیزانِ وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس
چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

ہم پر کچھ روز انگریزیت اور مسلط رہتی تو حقہ کا نام نہ رہ جاتا، پان ڈھونڈھے سے نہ ملتا، مگر وہ تو کہئے کہ ہم بال بال بچ گئے۔

دیکھئے تو جہاں کوئی مزاحیہ پہلو کسی چیز میں نظر آیا اکبر اس سے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں دوسروں کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔

یہ اپنی گو شمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی
زباں آتی ہے اس کو سیج ہے لیکن کان جاتا ہے

سنتے ہیں مکتب کے مولوی بڑے تنگ دل ہوتے تھے، بچوں سے چلمیں بھرواتے، پاؤں دبواتے، پانی کھنچواتے اور جب غصہ آتا تو نیم کی پتلی قمچیوں سے زائد کھال ادھیڑ دیتے۔ گزشتہ میں بھی کچھ باقیات الصالحات ابھی تک ہیں جو کہنے کو تو انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں مگر طبیعت میں پیمانہ [illegible] اور مزاج میں بے جا تانا شاہی اب بھی موجود ہے لطف [illegible] جب ان سے کہا جاتا ہے کہ معصوم اور نادان بچوں کو پیٹنے [illegible] نقصان ہی نقصان ہے تو ان کے گلے سے نیچے یہ بات [illegible] ہی نہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو افتاد طبیعت ہے اور کچھ [illegible] ایسے بے سلیقہ مولوی کی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو [illegible] وہ اپنے بچپن میں خوب پٹ پٹا کر ایسے حیا ہو چکے [illegible]

شکر ہے کہ محکمہ تعلیم نے بہ دیر سہی اکبری نشتر سے سبق [illegible] اور اب بید بازی اور ڈنڈے بازی موقوف ہو گئی ہے بچوں کی تربیت کا اصلی راز یہ ہے کہ آپ ان کو ان کی سمجھ کے مطابق [illegible] کی طرف مائل کر دیجئے، ورنہ ممکن ہے کہ گھونسے اور چپت سے آپ کے وحشیانہ جذبے کو تسکین ہو جائے مگر بچہ جسمانی اور روحانی طور پر ناکارہ ہو کر سماج پہ ایک بوجھ بن جائے گا۔

ایران کا تعلیمی نظام (۱)

عبد الحلیم ندوی

رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت سے پہلے (بیسویں صدی سے قبل) ایران کی تعلیمی دنیا پر پوری طرح غیر ملکیوں کا قبضہ تھا، خاص ایران میں جتنے بھی ترقی یافتہ اور نئے قسم کے تعلیمی ادارے تھے ان کی بنیاد انھیں لوگوں نے رکھی تھی، اور یہی ان کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رضا شاہ پہلوی نے برسر اقتدار آنے کے بعد بہت کچھ کیا لیکن پچھلی حکومت نے بھی اس سلسلے میں اپنی بساط بھر موثر قدم اٹھائے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دار الفنون جیسی مشہور یونیورسٹی کا قیام اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۱ء میں دوسرا مدرسہ تبریز میں حکومت نے اپنے صرفے سے قائم کیا جس میں ایرانی اور یورپی اساتذہ دونوں کام کرتے تھے، فوجی تعلیم کے لئے اب تک کوئی مدرسہ نہ تھا، چنانچہ حکومت نے ۱۸۸۳ء سے اس کی ابتدا کی، اور اصفہان میں پہلا فوجی مدرسہ بنایا اور پھر دوسرا مدرسہ ۱۸۸۶ء میں طہران میں بنایا۔ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے بھی اب تک غفلت سے کام لیا گیا۔ حکومت نے اس کو محسوس کیا اور ۱۸۹۷ء میں سب سے پہلا لڑکیوں کا مدرسہ آذربائی جان کے ایک مقام پر کھولا گیا ——— پچھلی حکومت نے اپنی بساط بھر ان سب کاموں کی ابتدا تو کی لیکن باقاعدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں۔ اس کام کو رضا شاہ پہلوی نے انجام دیا۔

رضا شاہ پہلوی نے زمام حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ کی اور قومی مدرسوں کے لئے ایک مجلس تعلیمی تشکیل دی جس میں اس زمانے کے اکثر مشاہیر اور ماہرین تعلیم شامل کئے گئے۔ اس مجلس نے اپنے اہتمام میں مدرسوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے ہی سارے ملک میں مدرسوں کا جال بچھا دیا۔ ان میں سے بعض میں مفت تعلیم دی جاتی تھی اور بعض اقامتی تھے۔ مجلس نے جو مدرسے قائم کئے ان میں سے اکثر خاص مضامین کی تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک مدرسہ تھا جہاں عربی، فارسی، حساب اور حروف تہجی کے لئے ایک ایک سال کی میعاد مقرر تھی، اس مدرسے میں چودہ استاد تھے، اور اوسطاً ڈھائی سو طلبا پر ایک ڈاکٹر تھا جو ان کی طبی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان مدرسوں کے علاوہ وزارت خارجہ کی ہدایت سے پولیٹیکل سائنس کے ایک کالج کا افتتاح ہوا، اور ۱۹۰۰ء میں زراعت کے اسکول کا جس میں بلجیم کا ماہر فن ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔

۱۹۰۶ء کے انقلاب میں تعلیمی میدان میں تو کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا، البتہ جو کچھ پہلے کیا جا چکا تھا اس کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان جو تعلیمی قوانین بنے ان کی رو سے مدرسوں کی دو قسمیں کر دی گئیں: ایک تو عوام کے قائم کردہ، جس میں مکاتب قرآن شریف، مذہبی درس گاہیں، قومی درس گاہیں اور مشن اسکول شامل تھے دوسرے وہ اسکول جن کو حکومت نے اپنے خرچ سے قائم کیا تھا اور وہی براہ راست ان کا انتظام کرتی تھی۔ ایسے مدرسوں کی اب تک ملک میں کمی تھی۔ مگر اب خاصی تعداد میں اس قسم کے مدرسے قائم کئے گئے۔ نئے قانون کی رو سے ابتدائی مدرسوں میں غیر ملکی اساتذہ رکھنے کی بھی ممانعت کر دی گئی (اور یہ قدم روس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے بچنے کے لئے اٹھایا گیا تھا) البتہ ثانوی اور اعلی مدرسوں میں وہ برابر پڑھاتے رہے اور اب تک پڑھا رہے ہیں۔ نئی حکومت نے تعلیم کے مطالعے کے لئے اس سال ۳۰ طالب علموں کو باہر بھیجا۔ ثانوی مدارس کا نصاب تعلیم اب تک پوری طرح مرتب نہیں ہوا تھا حکومت نے اس کام کو بھی پورا کیا۔

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے پچھلی تمام حکومتیں غافل رہی تھیں، موجودہ حکومت نے ایران کی تاریخ میں پہلی دفعہ لڑکیوں کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کے اعداد و شمار دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس سال ایران میں ۷۰ اسکول لڑکوں کے جن میں ۸۴۴ لڑکے تعلیم پاتے تھے اور ۴۷ اسکول لڑکیوں کے تھے جہاں ۲۱۸۷ طالبات تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اسی سال حکومت نے لڑکوں کے لئے دو مزید ثانوی اسکول قائم کئے جن میں ۱۵۴ لڑکے پڑھتے تھے اور تین اعلی کلیات جہاں ۱۵۷ طلبا زیر تعلیم تھے۔

۱۹۱۹ء میں تعلیمی رقم دوگنی کر دی گئی اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت پر یہ ذمہ داری رکھی گئی کہ وہ تعلیم کو قومی نقطۂ نظر سے نئے سرے سے منظم کرے۔ اس تنظیم جدید میں عام رجحان یہ تھا کہ ملک کے سب مدرسوں کو براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا جائے۔ غیر حکومتی تعلیمی اداروں کو آزادانہ کام کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن ان پر چند پابندیاں ضرور عائد کر دی گئیں۔ ایک تو یہ کہ ایسے مدرسوں کے اساتذہ کا معیار تعلیم حکومت کے مدرسوں کے اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری یہ کہ ان مدرسوں کی عمارتوں، ساز و سامان اور فرنیچر کا معیار وزارت تعلیم کے اسکولوں کے معیار سے کم نہ ہونا چاہئے، اور تیسری پابندی یہ تھی کہ ان مدرسوں میں بھی وہی نصاب تعلیم پڑھایا جائے جو حکومت کے مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، مثلاً فارسی، عربی، تاریخ ایران اور جغرافیہ ایران۔ نصاب کی یہ پابندی اس لئے عائد کی گئی تھی کہ ان مدرسوں کے لڑکے بھی ریاست کے امتحان میں بیٹھ سکیں ۱۹۲۳ء میں غیر ملکی ابتدائی مدرسوں میں ایرانی بچوں کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ اور تمام مدرسوں میں ذریعہ تعلیم فارسی زبان مقرر ہوئی۔ حکومت کو تعلیم قرآن کے مکتبوں پر قانونی پابندیاں عائد کرنے میں تو بہت زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وہ حفظان صحت کے اصولوں کا اور صفائی و ستھرائی کا تھوڑا بہت خیال رکھنے لگے۔

ایران میں وزارت تعلیم ۱۹۱۱ء میں وجود میں آئی، اس کے تین مختلف شعبے تھے، اور سب سے اہم شعبے کے ذمہ ابتدائی ثانوی اور اعلی تعلیم کا انتظام تھا، ایک اور شعبہ مجلس تربیت جسمانی کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ اسی طرح قوم کی تعمیری اور تاریخی خزانوں کی حفاظت اور انتظام کی ذمہ داری کے لئے بھی ایک الگ شعبہ رکھا گیا۔

موجودہ زمانے میں سارے ایران کو ۲۴ تعلیمی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ہر صوبے میں وزارت تعلیم کا ایک منتظم رہتا ہے جس کا تقرر عموماً طہران سے ہوتا ہے۔

۱۹۲۲ء میں حکومت نے دس افراد پر مشتمل ایک تعلیمی بورڈ بنایا جس میں ثانوی اور اعلی مدرسوں کے اساتذہ اور صدر مدرسین شامل تھے۔

ایران میں چار قسم کے اسکول ہیں۔ ایک کنڈرگارٹن، دوسرے ابتدائی مدارس (دیہی اور شہری)، تیسرے ثانوی مدارس اور چوتھے اعلی تعلیم کے مدرسے (کالج) حاضری سب اسکولوں میں لازمی ہے لیکن اوسط بہت کم رکھا گیا ہے چنانچہ قانون کی رو سے شہر کے طلباء کا اوسط ۵۰ فی صدی ہو تو کافی ہے۔ اور گاؤں کے طلباء کے لئے اس سے بھی کم۔ تعلیمی سامان یہاں کے سب مدرسوں میں بہت اچھا ہے۔ اور سب کے سب عمارتیں قسم کے فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ ہیں ان مدرسوں کے اپنے کتب خانے بھی ہوتے ہیں جن میں معیاری کتابیں اور مفید نقشے ہوتے ہیں۔

کنڈرگارٹن کی طرف حکومت کو ضابطہ تعلیم بناتے وقت توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، یہاں سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ایک کنڈرگارٹن کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر پورے پندرہ سال تک اس کے لئے کچھ نہ کیا جا سکا۔ البتہ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے اس طرف توجہ کی۔ سب سے پہلا کنڈرگارٹن اپنی نگرانی اور صرفے سے طہران میں بنوایا اور اب ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور بچے قومی منصوبہ تعلیم کے ماتحت زیادہ سے زیادہ ان مدرسوں میں داخل کئے جا رہے ہیں۔ کنڈرگارٹن کا نصاب تعلیم ۴ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور ۷ سال کی عمر میں ختم ہوتا ہے۔ ان مدرسوں میں لڑکوں کو ۳ سے ۵ گھنٹے تک مشغول رکھا جاتا ہے اور انھیں ساز کی آواز پر موزونیت کے ساتھ حرکت کرنا، ورزش، گانا، ناچنا اور خوش الحانی سکھائی جاتی ہے۔ آخری سال میں پڑھنے کا معمولی نصاب شروع ہوتا ہے جس میں الف، بے سکھائی جاتی ہے اور آسان لفظوں کے ہجے یاد کرائے جاتے ہیں۔ سات برس کی یہ مدت پوری ہو جانے کے بعد لازمی تعلیم کی منزل شروع ہوتی ہے، اور لڑکا کسی ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ابتدائی مدرسوں کا نصاب تعلیم چھ سال کا ہے اور طلبہ کو ایک ایک سال ہر درجے میں پڑھنا پڑتا ہے۔ ایران کے مدرسوں میں چھٹیاں بہت ہوتی ہیں۔ ملک کے جن حصوں میں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں سال بھر میں تقریباً ۲۰۰ دن پڑھائی ہوتی ہے اور جنوبی علاقے میں تو صرف ۱۰۰ دن کا اوسط پڑتا ہے۔ طالب علموں کے لئے پڑھائی کے اوقات میں ۱۹۳۵ء سے ایک مخصوص وردی مقرر ہوئی۔ لڑکے بھورے رنگ کے فلالین کا سوٹ اور لڑکیاں خاص قسم کے بلاؤز پہنتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

پناہ گزیں بچے

پروفیسر پرس رام

قوموں میں باہمی جنگ چھڑ جاتے، ایک ملک کے اندر خانہ جنگی کے حالات پیدا ہو جانے اور بنی نوع انسان میں نسلی امتیاز کا غیر معمولی احساس پیدا ہو جانے سے آج کروروں انسان اپنے آبائی مسکن سے اکھڑ کر نئے وطن کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ حالات پاکستان اور ہندوستان میں تو سوا ڈیڑھ سال ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن یورپ میں عام طور پر اور مشرقی یورپ میں خاص طور سے پچھلے دس سال سے بھگدڑ مچی ہوئی ہے اور بڑی بڑی آبادیاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو سال کے مہذب انسان میں پھر سے خانہ بدوشی کی عادت واپس آگئی ہے۔ انسانی تاریخ میں خانہ بدوشی کا یہ نیا دور کب تک رہے گا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے انسان کے ماحول اور اس کے خیالات اور جذبات پر کیا اثر پڑے گا؟ اس انقلاب کے اندر قدرت کا کیا مقصد پنہاں ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں، جن کا صحیح جواب ڈھونڈنا ہمارے لئے اشد ضروری ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنا محض ایک علمی اور عقلی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ ان سوالوں کے صحیح جوابات ملنے پر ہی یہ بے وطن، بے گھر لوگ پھر سے اسی طرح بسائے جا سکتے ہیں۔

لیکن ان سوالوں کا جواب دینا کسی ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اپنے مسکن سے ان اکھڑے ہوئے لوگوں میں ہر عمر اور ہر پیشے کے مرد اور عورت شامل ہیں۔ ان کی ذہنیت کا مشاہدہ سب لوگ نہیں کر سکتے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں ہر ایک قسم کے لوگوں کا توجہ اور تفصیل سے مشاہدہ کیا جائے اور ان مشاہدوں کو یک جا کر کے ان پر فلسفیانہ انداز سے غور کیا جائے، اور ان کی نوعیت کو سمجھا جائے۔

اس مضمون میں ہم بچوں کی ذہنیت کی ان اہم تبدیلیوں پر بحث کریں گے جو ان میں اپنے گھر، ماں باپ اور اسکول سے زبردستی الگ ہو جانے پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں لاکھوں بچوں کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے مثلاً پولینڈ کے بہت سے بچوں کو نواب صاحب نوانگر نے اپنے یہاں پناہ دی۔ ہندوستان کے دوسرے بہت سے حصوں میں بھی ایسے بچے عارضی طور پر لائے گئے۔ لندن میں بمباری کا خدشہ ہونے کی وجہ سے کئی ہزار بچوں کو لندن سے باہر کیمبرج اور دوسرے حصوں پر بھیج دیا گیا تھا۔ معلموں، ڈاکٹروں اور علم نفسیات کے ماہروں نے ان بچوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے کے نتائج سے ان کی تعلیم و تربیت میں بڑی مدد لی۔ اس مضمون میں ہم انھیں کے مطالعے اور تحقیق کا خلاصہ پیش کریں گے۔

پناہ گزیں بچوں کی تربیت

۱۹۴۰ء میں جب لندن چھوٹے بچوں سے خالی کرا دیا گیا، تو موسم سرما کے شروع ہوتے ہی ان بچوں نے لندن واپس جانے پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کو بچوں کے اس اصرار سے تکلیف پہنچی۔ کیوں کہ ان بچوں کے لئے لندن واپس جانے میں خطرہ تھا، لیکن ان خطروں کا علم ہو جانے کے باوجود ۵۰ فی صدی بچے لندن واپس لوٹ گئے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ لندن واپس جانے پر کیوں مصر ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ سردی کے موسم میں بمباری نہیں ہو سکتی، وغیرہ۔ جب ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ لندن سے دور چلے آنے پر انھیں کن کن باتوں کی کمی محسوس ہوتی ہے، تو انھوں نے بتایا کہ کیمبرج میں وہ پالتو جانور، وہ مشاغل اور وہ دوست نہیں، جو لندن میں ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جب ایک اسکول کا اسکول لندن سے باہر لے جایا گیا تو اس اسکول کے بچوں میں واپس جانے کا اشتیاق اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ ان بچوں میں جو انفرادی طور پر لندن سے باہر بھیجے گئے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بمباری، مکانوں کے جلنے اور عام تباہی سے بچوں کے دل و دماغ بہت کم متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر آر۔ بی گرد لندن کے اس حصے میں رہتے تھے جہاں بڑی کثرت سے بمباری کی گئی تھی۔ اس شدید بمباری کے زمانے میں وہ کوئی سولہ مہینے تک وہاں رہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں کو ہوائی حملے کے وقت تہہ خانوں میں بارہا پناہ لینی پڑی ہوگی۔ مگر ان کا بیان ہے کہ جسمانی تھکاوٹ کے باوجود اس علاقے کے بچوں کے اعصاب پر بالکل اثر نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں وطن سے دور بھیجے جانے اور ماں باپ سے الگ کئے جانے پر بچے فساد اعصاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ابتدا میں بچے کی دنیا صرف اس کی ماں ہوتی ہے اور وہ اسی دنیا میں مگن رہتا ہے، مگر جوں جوں وہ بڑھتا ہے ماحول اور آس پاس کی چیزوں سے اُسے دلچسپی ہوتی جاتی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی یہ دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو محبت اور وابستگی ماں سے تھی وہی آس پاس کی مختلف چیزوں اور اس جگہ سے ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اسے وہاں سے الگ ہونا پڑتا ہے تو اُسے وہی رنج اور دُکھ ہوتا ہے، جو ماں سے جدا ہوتے وقت ہوتا ہے۔

چار پانچ مہینے کی عمر میں ماں سے بچے کا تعلق بہت گہرا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر اس کی عام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں تو وہ کبھی نہیں روئے گا۔ اسی وجہ سے اس عمر کے بچے نئی جگہ اور نئے لوگوں میں بھیجے جائیں تو تھوڑی دیر تو وہ بے چین ہوں گے مگر بہت جلد مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن پانچ مہینے سے زیادہ عمر کے بچوں میں ماں کی محبت نسبتاً زیادہ اور ڈیڑھ سوا ڈیڑھ سال کی عمر میں بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اس عمر میں ماں کی جدائی بچے کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عمر کے بچوں کو ان کی مائیں جدا ہوتے وقت کوئی کھلونا یا مٹھائی کا ٹکڑا یا رومال دے گئی تھیں، تو یہ بچے اسے اپنے ساتھ چپٹائے رکھتے تھے۔ اور جدا ہونے کے فوراً بعد جو انھوں نے رونا شروع کیا تو وہ گھنٹوں جاری رہا اور اس جدائی سے ان بچوں کو جو صدمہ ہوا وہ بہت سخت تھا۔ لیکن بچوں میں جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بے تابی بھی بہت ہوتی ہے چنانچہ ان بچوں نے کچھ گھنٹوں کے بعد نئی نرس یا عورت کے ہاتھ سے کھانا پینا وغیرہ قبول کر لیا۔ لیکن یہ بات ضرور تھی کہ وہ کھاتے وقت کھلانے والی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی اس طرح ہل جانے اور نئے ماحول اور نئے لوگوں میں گھل مل جانے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بچوں پر ماں کی جدائی کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا، ان کا بار بار زکام، انفلوئنزا اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا دل اور جسم ماں کے متلاشی ہیں اور بیماری اس ابھرتے ہوئے جذبے اور ضرورت کی ناکامی کا اظہار ہے۔ اس عمر کے بچے جب لندن واپس نہ بھیجے گئے تو ان کا رویہ اپنی ماں سے بالکل اجنبی لوگوں کی طرح تھا۔ اپنی کتابوں اور اپنی عام چیزوں کو پہچانتے، لیکن ماں سے گھلنے ملنے میں جھجک اور تامل ہوتا۔

ماں باپ سے جدا ہونے پر تین سال اور پانچ سال کے بچوں کا رویہ ڈیڑھ دو سال کے بچوں کے رویے سے ذرا مختلف تھا۔ اس عمر کے بچوں میں ماں باپ کے خلاف تھوڑا بہت کینہ ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ماں باپ کسی نہ کسی بات پر بچے کو ٹوکتے یا حکم دیتے ہیں اور حکم عدولی پر انہیں سزا دیتے ہیں۔ بچے ان سزاؤں سے بہت ناخوش ہوتے ہیں، اور ان کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ سزا دینے والا ختم ہو جائے۔ اس وقت انھیں ماں باپ کی محبت یاد نہیں رہتی۔ لیکن جو سزا انھیں دی جاتی ہے وہ یاد رہتی ہے اور اس سے بچے بہت ناراض رہتے ہیں۔ ماں باپ سے علیحدگی کے وقت اس قسم کے بچوں کو گناہ کا احساس پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ میں نے ماں کے لئے دل میں بد دعا کی تھی اسی لئے ماں تو لندن کی بمباری میں مرنے چلی گئی ہے اور مجھے یہاں چھوڑ گئی ہے۔ کاش کہ میں یہ بد دعا نہ کرتا ——— یہ جدائی میرے بُرے خیالات کا نتیجہ ہے۔ کاش وہ مرنے کو نہ جاتی، بلکہ مجھے کچھ ہو جاتا ——— وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں بچے کے دل میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب تک ماں غیر حاضر رہتی ہے بچے کے دل میں ماں کے متعلق بیماری اور موت کے وہم پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ان سے رنجیدہ رہتا ہے۔ لیکن جب ماں پاس آ جاتی ہے تو اس سے بالکل بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے اور پھر جب ماں ملنے کے بعد جدا ہونے لگتی ہے تو پھر رونا دھونا شروع کر دیتا ہے۔

یہ تو ہوئی بچوں کی جدائی کے فوراً بعد کی حالت۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ اس حالت میں کوئی تبدیلی بھی پیدا ہوتی ہے؟

چھوٹی عمر کے بچے تو نئے حالات میں آہستہ آہستہ خوش اور بشاش نظر آنے لگتے ہیں اور اگر کچھ خلش اور بے چینی باقی رہتی ہے تو وہ نیند غائب ہو جانے اور زکام وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ذرا بڑی عمر کے لڑکے خیال پرست بن کر شیخ چلی کی دنیا میں رہتے اور شیخ چلی کے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ڈاکٹر شاردا

(۱)

احمد حسن عثمانی

کمرہ کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ گھنٹے کی لرزتی ہوئی آواز کمرہ کی فضا میں ڈوب رہی تھی کہ شاردا اپنی کتاب بند کرتی ہوئی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی، جہاں وہ بڑی دیر سے بیٹھی مطالعہ میں مشغول تھی۔

چاروں طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی ــــ صرف سڑکوں پر کبھی کبھی بیل گاڑی کے چلنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی اور گاڑی بانوں کے کیف پرور نغمے غبار آلودے میں، اس کے ساتھ مل کر ایک لطیف ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے۔ شاردا کی ماں سیتا بغل کے کمرہ میں گہری نیند سو رہی تھی۔

شاردا سوچنے لگی۔ اسے بھی اب سو جانا چاہئے اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی ــــ رات آدھی سے زیادہ آ گئی تھی، وہ کچھ دیر سوچتی رہی ــــ

دفعتاً اسے خیال ہوا کہ نیچے جاکر پھر ایک بار سونے سے پہلے اپنے مریضوں کو دیکھ لے۔ آخری کمرہ کی مریضہ کی حالت اس کے لئے فکر و پریشانی کا باعث تھی ــــ اس کے آج ہی صبح کو بچہ ہوا تھا اور ہوتے ہی مر گیا تھا۔ ماں کی حالت بھی ناقابلِ اطمینان تھی، یہی سوچتے سوچتے شاردا نے ایک شال اوڑھی اور کمرہ سے باہر گیلری پر آ نکلی۔

بڑی ہی حسین سرد رات تھی، چاند کا نقرئی گیند ساری کائنات کو اپنی دودھیا شعاعوں میں نہلا رہا تھا۔ شاردا مسحور ہو کر چند لمحے تک خاموش ساکت کھڑی رہی ــــ اس کی آنکھیں اس نظر فریب گولے کو گھور رہی تھیں جو صاف، شفاف نیلے سمندر میں بڑی شان سے تیر رہا تھا دم بھر میں ہزاروں خیالات اس کے ذہن میں آئے اور گذر گئے ـ نیچے نرسوں کے بولنے کی مدھم آواز چپ چاپ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

بارہ سال سے اس کے نفس کی گہرائی میں کچھ دلدوز تصورات رفتہ رفتہ گھر کر رہے تھے ــــ جن کو آج شام کا ایک واقعہ بڑی بے دردی سے کرید کر سطح پر لے آیا۔ عہدِ رفتہ کے سارے واقعات اس کے ذہن پر چھا گئے اور وہ حسرت و کرب کے ملے جلے جذبات میں محو ٹھنڈی سانس لینے لگی۔

وہ سوچنے لگی ــــ اس بے شمار دولت سے اُسے کیا فائدہ؟ یہ تمام ساز و سامان اُس کے کس کام کا جس پر بہت سی عورتیں رشک کرتی تھیں؟ اس کی تو پوری زندگی کو ایک شدید دھچکا لگ چکا تھا، اس جان فرسا واقعے سے جو بارہ سال پہلے ہوا تھا اور جس کی یاد آج شام سے پھر تازہ ہو گئی تھی ــــ

شاردا سندر پور کی مشہور و معروف ڈاکٹر تھی اور ایک جدید طرز کے خوب صورت نرسنگ ہوم کی مالک تھی، آس پاس کے علاقے میں دور دور تک اس کی پریکٹس کا سکہ جما ہوا تھا۔ خود اس کے اپنے ذاتی صفات ــــ کیف پرور حسن، سحر طراز مسکراہٹ اور پر خلوص حسنِ اخلاق اپنے اندر ہزاروں مریضوں کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے ــــ دولت اس کے قدموں پر نثار تھی اور شہرت اس کے سر پر نچھاور۔ مگر اس کی زندگی میں کوئی کیف نہ تھا ــــ اندر سے کھوکھلی تھی۔ ایک بند ناریل کی طرح جس کا گودا اندر ہی اندر سوکھ گیا ہو۔

شاردا نرسنگ ہوم کے بالائی منزل پر اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک باورچی اور ایک نوکر بھی تھا۔ مگر یہ دونوں رات کو چلے جایا کرتے تھے۔ نرسیں اور مریض نیچے کی منزل میں رہتے تھے جو ایک جدید طرز کی وسیع عمارت تھی نیچے پندرہ کمرے سادہ سامان سے آراستہ تھے۔ ان میں کل ۳۰ مریضوں کی جگہ تھی اور دس نرسیں اور آیائیں بھی وہیں مریضوں کی خبر گیری کے لئے رہتی تھیں ــــ

گذشتہ شام کا واقعہ شاردا کی نظروں میں نئے سرے سے پھرنے لگا ...... ایک بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ صبح کے سب کاموں سے فراغت پاکر شاردا اپنے مشورہ کے کمرہ میں ایک نرس سے گفتگو میں مشغول تھی ــــ کہ ٹھیک اسی وقت ایک موٹر دھیمی رفتار سے پھاٹک پر آ کر رک گئی ــــ

شاردا نے نرس سے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا ــــ "یہ کوئی نئی مریضہ معلوم ہوتی ہے" ــــ وہ گھبرا رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے گی۔ اس لئے کہ نرسنگ ہوم پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا اور اب کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔

ایک لمحہ بعد مریضہ خود کمرہ میں داخل ہوئی ــــ ایک سن رسیدہ عورت کے ساتھ جو اس کی ماں یا ساس معلوم ہو رہی تھی۔ مریضہ ایک حسین جوان عورت تھی مگر وہ حاملہ تھی اور اس کا حمل پورے دن کا معلوم ہوتا تھا، جبھی تو وہ اتنی کمزور تھی کہ بغیر سہارے کے چلنا بھی محال تھا۔ شاید اس ضعیف عورت میں کافی طاقت نہ تھی اس لئے فوراً ہی ایک نرس آگے بڑھی اور اس نے سہارا دے کر مریضہ کو کرسی پر بٹھا دیا۔

شاردا نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد بندھے ٹکے سوالات جو ڈاکٹر مریضوں سے کیا کرتے ہیں شروع کر دئے۔ مریضہ نے ــــ جو ایک تعلیم یافتہ لڑکی معلوم ہو رہی تھی ــــ سوالات کا مفصل جواب دیا جن کو سن کر شاردا کا دل حسرت ناک تصورات سے اندر ہی اندر کانپنے لگا ــــ

"میرا نام سبھدرا ہے" لڑکی نے کہا۔ "اور میرا خاوند سری کرشن ایک ریلوے انجینیر ہے، اس کی بدلی یہاں کی ہو گئی ہے۔ ہم لوگ آج ہی پہنچے ہیں۔ ماتا جی مجھ کو بچے کی ولادت کے لئے مدراس لے جا رہی تھیں ــــ مگر ہم نے یہاں کی تعریف سنی۔ اور میرے شوہر نے زور دیا کہ میں فوراً آپ سے ملوں ــــ اسی لئے ہم لوگ یہاں حاضر ہوئے ہیں" اتنا کہہ کے وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئی ــــ

شاردا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ایک عجیب کرب سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے بھی کوشش کرکے مریضہ کی مسکراہٹ کا جواب ہنس کر دیا اور کہنے لگی ــــ

آپ کی بڑی مہربانی ہے جو یہاں آئیں ــــ آپ کو بچے کی ولادت کے لئے کوئی دو ہفتے میں میرے نرسنگ ہوم میں آجانا چاہئے ــــ میں امید کرتی ہوں کہ ایشور کی کرپا سے سب کام اچھی طرح ہو جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے ضعیف عورت سے مخاطب ہو کر کہا ــــ

"جی ہاں! ڈاکٹر! آپ صحیح فرما رہی ہیں" ــــ بوڑھی عورت نے ایک پوپلی ہنسی کے ساتھ جواب دیا ــــ یہ سبھدرا کی چوتھی اولاد ہے، اور ہر مرتبہ وہ مرتے مرتے بچی۔ اب کی بار میرا داماد اور میں خود بہت زیادہ پریشان ہوں ــــ کھانا، پینا اور سونا مشکل ہو گیا ہے"

"کیا سب بچے زندہ ہیں؟" شاردا نے دریافت کیا۔

"نہیں ایک بھی نہیں۔ ضعیفہ نے حسرت بھرے انداز میں کہا ــــ میں چاہتی ہوں کم سے کم یہی بچ جائے ــــ اور سب سے زیادہ تو مجھے سبھدرا کی فکر ہے۔ یہ کسی طرح اس مرحلہ سے صحیح و سلامت گذر جائے ــــ

"ایشور مدد کرے گا۔ آپ فکر نہ کریں" ــــ شاردا نے کہا "میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی"۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر! آپ کی ملاقات ہی سے ہمارے دل پر سے آدھا بوجھ اتر گیا"

یہ کہہ کر سبھدرا جانے کے لئے کھڑی ہو گئی "آپ کو کوئی خاص مرض نہیں ــــ صرف کمزوری ہے، یہ ٹونک لیجئے اور ایک ہفتہ بعد پھر مجھ سے ملئے، اور اگر اسی درمیان میں کوئی تکلیف محسوس ہو تو فوراً مجھے اطلاع دیجئے ــــ میں حاضر ہو جاؤں گی ــــ میرے خیال میں بچہ دو ہفتے کے اندر ہی ہو جائے گا ــــ"

شاردا نے نسخہ بوڑھی عورت کے ہاتھ میں دے دیا بڑی بی میز پر پانچ پانچ کے دو نوٹ رکھتے ہوئے بولیں ــــ فیس حاضر ہے ڈاکٹر"

"اتنی جلدی کیا ہے؟" شاردا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "میں اپنی فیس آپ کے ناتی کے ہونے کے بعد لوں گی" اور وہ بڑے دل کش انداز میں ہنسنے لگی۔

"جیسی آپ کی رضی ڈاکٹر، مجھے بھی امید ہے کہ یہ ناتی ہی ہوگا" ضعیفہ نے نوٹ واپس لیتے ہوئے کہا اور دونوں موٹر کی طرف چل دیں۔ جاتے وقت ایک بار پھر ان لوگوں نے لیڈی ڈاکٹر پر جس نے ان کے دلوں کو مسحور کر لیا تھا مسکراہٹ بھری نگاہ ڈالی۔

شاردا موٹر کو تکتی رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی ــــ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور غم کا بوجھ دل میں لئے اوپر اپنے کمرہ میں چلی گئی ــــ

اس کے ذہن میں گذرتا ہوا زمانہ پھرنے لگا ــــ سب بارہ برس پہلے کا زمانہ ......

شاردا کا باپ اس کو اور اس کی بیوہ ماں کو نہایت ہی ابتر حالت میں چھوڑ کر اچانک اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس وقت شاردا کی عمر ۱۶ برس تھی۔ وہ پنچھی ابھی

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر :- ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت :- یکم [illegible] ۱۹۴۸

چندہ :- سالانہ ۶ ششماہی للعہ

ہائی اسکول سے فارغ ہوئی تھی ۔ وہ اس وقت ایک کشیدہ قامت، دل کش اور نہایت حسین لڑکی تھی۔

اس کی ماں ستاما کا بھائی پشوپتی ایک دولت مند آدمی تھا ــــــ اس کے پاس کافی زرعی جائداد تھی ــــــ لیکن وہ اپنی بیوہ بہن اور اس کی لڑکی کی کفالت کا تو کیا ذکر ہے ذرا سی مدد کے لئے بھی تیار نہ تھا۔

شاردا شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی ۔ اس کی ماں کا دل اپنی بے بسی اور بے چارگی پر خون ہو رہا تھا

پشوپتی کا لڑکا سری کرشن اس وقت بی اے میں تعلیم پا رہا تھا ستاما کی یہ کوشش تھی کہ اپنے بھائی کو شاردا اور سری کرشن کی نسبت پر تیار کرے۔

بے چاری شاردا اپنی شادی کے معاشی پہلو سے بے خبر تھی ۔ وہ پہلے ہی اپنے ممیرے بھائی کو دل دے چکی تھی جو دولت و ثروت کے نشے میں چور اس کی معصوم محبت پر ہنستا تھا وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی شادی کو نفع کا کاروبار بنانا چاہتا تھا۔

پشوپتی نے اس نسبت کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ پہلے تو وہ اس پر غور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کیونکہ وہ اپنی بہو ایسی لڑکی کو بنانا چاہتا تھا جو کم از کم دس ہزار کی تھیلی لے کر آئے لیکن کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا کہ اپنی رانڈ بہن کی خاطر شاردا کو سری کرشن کی دوسری بیوی بنانے میں بغیر جہیز کے بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا"

ستاما کا خون کھولنے لگا ــــــ اس ذلت آمیز برتاؤ کی وجہ سے جس نے اس کے دل کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا ــــــ وہ بغیر ایک لفظ کہے اس کے گھر سے نکل گئی اور اس نے عہد کر لیا کہ آج سے اس چوکھٹ پر قدم نہ رکھے گی اور واقعی اس نے پھر کبھی اپنے بھائی کی صورت نہ دیکھی

اس کے پاس جو کچھ زیور بچ رہا تھا سب بیچ ڈالا ۔ اور ایک امیر گھرانے میں کھانا پکانے کی نوکری کر لی ۔ اس طرح وہ اپنی لڑکی کی تعلیم جاری رکھنے کے قابل ہو سکی۔

اپنی ماں کی اس قربانی کا جو اس نے اپنی لڑکی کے لئے کیا تھا شاردا کے روئیں روئیں میں احساس تھا ۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سخت مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھی اپنی تعلیم میں جوش و خروش سے منہمک رہی ــــــ اسے بڑی شان دار کامیابی ہوئی شروع سے ہر امتحان میں اول آتی رہی۔

اب وہ ایک مشہور ڈاکٹر تھی جس کے گھر دولت بھی تھی اور ثروت بھی لیکن اس کے دل میں ایک اجڑا ہوا ارمان ایک سوکھی ہوئی تمنا کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی ۔ جس کے اظہار کا وہ کوئی راستہ نہ پاتی تھی ۔ اسے زندگی بے کیف اور پھیکی معلوم ہوتی تھی ــــــ

آہستہ آہستہ یہ احساس زور پکڑنے لگا ــــــ وہ بہت چاہتی تھی کہ اسے دبا دے ، کچل ڈالے مگر اس کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوتیں ــــــ ایسے موقعوں پر جب اس کے احساس میں حد سے زیادہ تناؤ ہوتا ضبط و تحمل کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا اور رات کی تنہائی میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بند چشمے بے اختیار پھوٹ پڑتے ــــــ اور اس کا تکیہ تر بتر ہو جاتا ــــــ (باقی آئندہ)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بسلسلہ صفحہ ۲)

ہوئے قائد اعظم نے کہا تھا " میرے پاس کوئی حکومت نہیں ہے لیکن اگر ہوتی اور کوئی شخص مجھ سے پوچھتا کہ تم اس حکومت کو چھوڑنا پسند کرو گے یا اقبال کو، تو میں ہرگز اقبال کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتا ۔ میں اپنے پاکستانی دوستوں کے سامنے یہ مشکل سوال نہیں رکھتا ۔ وہ اپنی حکومت بھی رکھیں اور اقبال کو بھی رکھیں ، اگر اقبال کسی کی ملکیت ہو سکتا ہے لیکن اس حکومت کو چلانے میں وہ اقبال کے کلام اور فکر سے ! جو اسلام کی بہترین تفسیر ہے کیوں سبق نہ لیں اور دوسری قوموں کے سامنے سیاست کی ایک بہتر مثال کیوں نہ پیش کریں !

پناہ گزین بچے

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

سے منصوبے سوچا کرتے ہیں ۔ وہ اپنے خاندان کی بزرگی کا خیال اور ماں باپ کی تحریر کا تصور کر کے مسلسل ایسی خیالی دنیا میں رہنے لگتے ہیں اور یتیم نرسوں یا دیکھ بھال کرنے والی خالاؤں سے گھل مل نہیں سکتے ۔ لیکن ان کی یہ دبی ہوئی خواہش یا شکایت ان میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا کر دیتی ہے جو عام طور پر پسند نہیں کی جاتیں ۔ مثلاً سوتے میں بستر پر پیشاب کر دینا ، تتلا کر بولنا دوسرے لڑکوں سے بات بات پر لڑنا جھگڑنا ۔ بہت سی چیزیں جمع کرنے کا سودا وغیرہ اور جب جدائی کا صدمہ زیادہ ہوتا ہے تو باہری دنیا سے آنکھیں بند کر کے ہر وقت ماتم اور سوگ کرنے والی شکل بنائے رکھنا بچوں میں عام پایا گیا ہے۔

مذکورہ خرابیاں صرف پناہ گزین بچوں ہی میں نہیں ہوتیں بلکہ کارخانوں میں کام کرنے والی عورتیں بھی اپنے بچوں سے لمبے عرصے کے لئے جدا ہوتی ہیں تو یہ طویل جدائی چھوٹے بچوں کے لئے مصیبت ہو جاتی ہے اور ان میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے ۔ ان باتوں کا تعلق مستقبل کے دور سے بھی ہے جس میں عورتیں گھر سے باہر نکل کر کام کریں گی جس میں نرسری اسکول زیادہ تعداد میں ہوں گے سوال یہ ہے کہ پناہ گزین بچوں کے مشاہدے سے ہم چھوٹے بچوں کی تربیت کے متعلق کیا سیکھ سکتے ہیں ؟

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ بچے کے نشو و نما اور اس کی تربیت کے لئے ماں کا وجود اور اس کا قرب بہت ضروری ہے ۔ اگر بچوں کو ان سے جدا ہونا بھی پڑے تو انھیں یک لخت جدا نہیں کرنا چاہئے ۔ اگر یہ جدائی آہستہ آہستہ ہو تو بچے کی دنیا میں وہ زلزلہ نہیں آئے گا جو پناہ گزین بچوں کی دنیا میں آتا ہے ۔ اگر کارخانوں میں عورتوں کو کام کرنا ہی ہے تو وہ شیرخوار بچوں سے ملتے رہنے کا کوئی مناسب انتظام کریں اگر ان باتوں پر دھیان نہیں دیا گیا تو ان نتائج کے لئے تیار رہنا چاہئے جن کا ہم نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں ۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ آپ کو نہ مل سکے

طابع و ناشر :- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ [illegible]

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۴ | ۴ دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے

شمس العلما مولوی نذیر احمد

میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب بھی تلوار کے بل بوتے پر نہیں چلا۔ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بیتے پر۔ یہ سُن کر تو مسلمانوں نے کان کھڑے کئے ہوں گے اور نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہر مذہب کے لوگوں نے کہ آج تو دم اس کا عقیدہ کُھل پڑا کہ نفس مذہب کی نسبت کہتا ہے کہ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صداقت کے بل بوتے پر۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ سب مذہب سچے اور برحق ہوں۔ ہاں ہاں میں پکار کے کہتا ہوں کہ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بوتے پر۔ اور میری مراد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس میں صداقت کا انش یعنی جزو نہ ہو۔ جتنے مذہب دنیا میں ہیں وقت اور مقام کے لحاظ سے سب کے سب آدمی کی اصلاح اور اس کے فائدے کے لئے چلے ہیں اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ فائدے اور صداقت اور نیکی کا انش ضرور ہے جو ان کو چلائے جاتا ہے مثلاً اگر ہندو اس ملک میں گائے کی تعظیم مذہباً کرتے ہیں تو اس میں یہ فائدہ مضمر ہے کہ اس ملک میں کوئی جانور گائے بیل سے زیادہ آدمی کو فائدہ رساں نہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے جس سے گھی اور مکھن اور پنیر اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں بنتی ہیں۔ بیل کے بارے کھیتی نہیں ہو سکتی مرے پیچھے بھی اس بچارے کی کھال کام دیتی ہے۔ کسی اور جانور کا نام لو جس سے آدمی کے اتنے سارے کام نکلتے ہوں۔ اس کی پوری پوری حفاظت ہو نہیں سکتی تھی۔ تاوقتیکہ مذہباً اس کو مقدس نہ مانا جائے یا گنگا جمنا کی تعظیم بلکہ تمام دریاؤں کی کہ ان سے زراعت کی آبپاشی ہوتی ہے جان داروں کی زندگی پانی پر موقوف ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ* ۔ لیکن یہ باتیں اس وقت سوجھتی ہیں۔ جب مزاجوں میں سازگاری ہوتی ہے۔ نہیں تو

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد

عیب نماید ہنرش در نظر ....

ہر ایک مذہب کے احکام اور قواعد وقت اور مقام کے لحاظ سے ضرور کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی ہیں۔ دوسرے مذہب کے لوگ اس مصلحت پر نظر نہ کرکے ان سے پرخاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ایک عجیب بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ صرف لفظی اختلاف لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بس کرتا ہے ورنہ ہم بہت سی نیکیوں کو مذاہب میں باوجود اختلاف مشترک پاتے ہیں۔ خاص کر وہ جن پر تمدن کا مدار ہے جھوٹ بولنا، شراب پینا، جوا کھیلنا، چوری کرنا، لوگوں کو ناحق ستانا وغیرہ وغیرہ سب مذہبوں میں ممنوع ہیں۔ اور ممنوع نہ ہوں تو تمدن ایک دن قائم نہ رہے۔ مسلمانوں کی نماز، ہندوؤں کی پوجا پاٹ۔ ان کی زکوٰۃ، ان کا دان پن، ان کے روزے، ان کے برت، ان کا حج، ان کا تیرتھ۔ ان کا رحم، ان کی دیا، کیا یہ مماثل نیکیاں نہیں ہیں۔ اور کیا ایک ہی تحریک ایک ہی ارادے ایک ہی قصد سے صادر نہیں ہوئیں۔ مگر ہندو مسلمان کی اذان سننا نہیں چاہتا۔ مسلمان ہندو کے سنکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ سنو کان لگا کر سنو۔ میں اسی بات کو جو ابھی کہہ چکا ہوں پھر ایک بار اعادہ کرتا ہوں تاکہ تم لوگوں پر حجت الٰہی تمام ہو۔ اور میرا مطلب اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے غرض کسی مذہب کی کوئی بات لو اس کو پاؤ گے کہ وقت اور مقام کے لحاظ سے اس میں کچھ آدمی کا فائدہ ہے اس میں نیکی ہے۔ اس میں صداقت ہے۔ چونکہ لوگ اس مرم کو نہیں سمجھتے۔ اسی سے اختلاف پیدا ہوتے ہیں اسی سے مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں وہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ سب کی منزل مقصود ایک ہے اور رستے مختلف۔ ممکن ہے کہ کوئی ٹیڑھی اور غلط راہ چلتا ہو۔ مگر اس کی غرض و غایت تو وہی ہے جو سیدھی اور صحیح راہ پر چلنے والے کی ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ہم اس سے ناخوش ہوں، اس سے عداوت کریں، اس کے آزار کے درپے ہوں ہم کو اس پر رحم کرنا چاہئے اور ظاہر ہے کہ ناخوشی اور رحم میں بہت بڑا فرق ہے۔ رحم کی شان ہی دوسری ہوتی ہے نہ تو تو میں میں اور گالی گلوچ اور لاٹھی پونگا اور لڑائی جھگڑا اور ہنگامہ و فساد جیسا کہ ہو رہا ہے یوں سمجھو کہ مثلاً دنیا میں ہر شخص معاش کا جویا ہے تو اس کے لئے کوئی نوکری کرتا ہے، کوئی تجارت، کوئی زراعت کوئی ایک پیشہ، کوئی دوسرا پیشہ، کوئی کچھ کوئی کچھ، لیکن لوہار درزی سے نہیں لڑتا کہ تو بھی آہنگری کیوں نہیں کرتا۔ زمیندار سوداگر کا دشمن نہیں کہ تو گاؤں کیوں نہیں لیتا۔ نوکری پیشہ سوداگر سے ناراض نہیں کہ تو نوکری کیوں نہیں اختیار کرتا۔ اسی طرح بعینہٖ اسی طرح مذہب کیا چیز ہے کہ ہر ایک شخص نجات چاہتا ہے، ایک ہندو دھرم ہے کہ وہ اسی کو مکش کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے، کوئی عیسائی ہے، کوئی یہودی لیکن معاش کے ذرائع کے اختلاف پر نہ لڑیں اور نجات کے ذرائع کے اختلاف پر لڑیں۔ یہ کیوں؟ فرض کرو کہ ایک شخص صریحی غلطی پر ہے تو تمہاری بلا سے اپنا سر کھائے۔ اور اگر انسانی ہمدردی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تو ویسے احمق کم ہوں گے جو اس عذر کو تسلیم کر لیں گے۔ ہمدردی کی یہی ایک علامت تو نہیں ہے اگر واقعی دل میں ہمدردی ہے تو وہ تمہاری تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہونی چاہئے کہ کسی کو ننگا بھوکا نہ دیکھ سکو۔ کسی کو مبتلائے مصیبت نہ دیکھ سکو نہ یہ کہ آپ پہنو شال دوشالے تمہارے پڑوسیوں کو کمبل بھی نصیب نہ ہو۔ تم ہر روز تداخل اور بدہضمی کے علاج میں رہو، تمہارے ہمسائے اور جان پہچان بلکہ دور کے قرابت دار فاقے کریں۔ (لکچروں کا مجموعہ جلد دوم)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے	مولانا نذیر احمد	۱
جمہوریہ چین	عبداللطیف اعظمی	۲
مسلم یونیورسٹی کا نیا دور (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ ۱۔ ہندوستان	ع ۔ ح	۴
۲۔ پاکستان	ع ۔ ا	۵
۳۔ باہر کی دنیا	۔ ۔	۵
مرحلے نظم	روش صدیقی	۶
غزل	مرزا احسان احمد	۶
غزل	آل احمد سرور	۶
عیب بھی کرنے کو	مشتاق احمد	۸
مچھر	[illegible]	۹
ایران کا تعلیمی نظام	عبدالحلیم ندوی	۱۰
ڈاکٹر شاردا (افسانہ)	احمد حسن عثمانی	۱۱

قیمت فی پرچہ ۳ر

جمہوریہ چین

عبداللطیف اعظمی (۱)

۱۹۱۱ء میں چین میں انقلاب آیا۔ کوئی چار ہزار برس کا بوسیدہ سامراجی نظام ختم ہوا، اور اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ یہ انقلاب اس طرح کا نہیں تھا۔ جیساکہ روس میں ہوا، بلکہ بڑی حد تک انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے ملتا جلتا تھا یعنی یہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف نہیں تھا بلکہ ایک خاص قسم کے جاگیرداری نظام حکومت کے خلاف تھا جو چار ہزار سال سے چین میں قائم تھا۔ انقلاب کے بانی عوام نہیں تھے، بلکہ ملک کے سربرآوردہ سیاست داں جو جاگیرداری نظام کی جگہ ایک ایسے نظام حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے جس میں عوام کو بڑھنے، ترقی کرنے اور حکومت کے اہم معاملات پر اثر ڈالنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اس انقلاب میں داخلی اور خارجی دونوں اسباب کام کر رہے تھے۔ داخلی اسباب دو تھے۔ پہلا سبب منچو خاندان کا زوال ہے۔ چی ان لنگ (۱۷۳۶-۹۶ء) کے بعد جتنے شہنشاہ گذرے سب کے سب نااہل اور حکومت کے لئے بالکل ناموزوں تھے اس لئے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال نہ سکے، اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ تیپنگ اور باکسر بغاوتیں ان کی نااہلی ہی کا نتیجہ تھیں۔ جن سے چین کے سامراجی نظام کی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ دوسرا سبب سامراجی ملکوں کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے چینیوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی، اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس میں اور شدت پیدا ہوتی گئی۔

خارجی اسباب میں اہم سبب یہ تھا کہ منچو حکومت دوسرے ملکوں سے تعلقات قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ سلطنت کی وسعت میں برابر کمی ہونے لگی، خارجی ملکوں کو امتیازی حقوق دینے میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا۔ اور حکومت کی کمزوری اور بدانتظامی سے عوام نہایت بددل اور پریشان تھے۔ یہ آثار ملک کے لئے بہت ہی خطرناک تھے۔ اس لئے محبان وطن کی ایک جماعت ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے کمربستہ ہو کر میدان عمل میں آئی۔ اسی درمیان میں پڑوسی جاپان کو روس کے مقابلے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سے چین کے لیڈروں کو بڑی تقویت ملی اور عوام کے حوصلوں میں بلندی، اور ارادوں میں استحکام پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سوچا کہ جاپان کی طرح وہ بھی اپنے یہاں کی سامراجی حکومت کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے داخلی اصلاحات کا مطالبہ کیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ حکومت ان کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو انھوں نے خفیہ انقلابی جماعتیں بنائیں۔

انقلابی جماعت کی تنظیم اور اس کی رہنمائی کا کام سن یات سین نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ انقلاب کے لئے ایک طرف اگر ملک کے اندر لوگوں کو منظم کیا تو دوسری طرف ان چینیوں سے جو بیرونی ملکوں خصوصاً امریکہ اور جاپان میں تھے براہ راست تعلق پیدا کیا، اور جنگ آزادی کے لئے انھیں بھی آمادہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ سن یات سین کی یہ دور اندیشی بعد میں بڑی کام آئی۔ اور انقلاب چین میں ان سے بڑی مدد ملی۔

سن یات سین نے کینٹن پر قبضہ کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی، اور بغاوت کے جرم میں ان کو بارہا جلاوطنی کی سزا ملی۔ مگر محض ایک اتفاقی واقعہ سے انقلاب کی راہ کھل گئی اور حکومت کا تختہ الٹنے میں انھیں بڑی آسانی ہو گئی۔ ۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ووچنگ (صوبہ ہوپی) میں وائسرائے کے قتل کی ایک سازش پکڑی گئی۔ سازش کرنے والوں نے عجلت اور مایوسی میں بغاوت کر دی اور چند ہی گھنٹے کی لڑائی میں ان کا پورے شہر پر قبضہ ہو گیا۔ وائسرائے بھاگ گیا، اور صوبہ جاتی حکومت کا بڑا حصہ انقلابی جماعت سے مل گیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی شاہی حکومت نے جنرل ین چانگ کی سرکردگی میں تیس ہزار کی فوج روانہ کی۔ لیکن ان کے پہنچنے تک صوبے کے بہت سے شہروں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے اور بہت سے صوبے بھی بغاوت میں شریک ہو چکے تھے۔

حالات کی نزاکت اور انقلابیوں کی بڑھتی ہوئی کامیابی سے گھبرا کر پرنس ریجنٹ نے نامزد نیشنل کونسل کو بہت سے حقوق دئے۔ دستور کا اعلان کیا، جس میں شہنشاہ کے اختیارات کم کر کے اُسے محض برائے نام باقی رکھا گیا تھا، اور حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب مجلس آئین ساز کو دے گئے تھے۔ اس نے یان شی کائی کو جسے اسی سال وزارت امور خارجہ سے علیحدہ کیا گیا تھا دوبارہ وزیراعظم مقرر کیا۔ اور خود الگ ہو گیا۔ یان شی کائی چین کی جدید فوج کا بانی تھا۔ اس لئے کمانڈر اور فوج سب کے سب اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے صوبوں میں وہ وائسرائے کے منصب پر بھی فائز رہ چکا تھا اس لئے شاہ پسندوں کو توقع تھی کہ نئے وزیراعظم کے ان اثرات کی وجہ سے عوام کا موجودہ جوش ٹھنڈا ہو گا، تو اُن کی بہت بڑی تعداد شاہی حکومت کی حامی ہو جائے گی۔

یان شی کائی جس وقت اپنے وطن ہونان سے پکنگ پہنچا، تو انقلاب نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ تقریباً تیرہ صوبے بغاوت میں شریک ہو چکے تھے اور قریب قریب نصف سلطنت متاثر ہو چکی تھی۔ دریائے یانگ سی کے جنوب میں انقلاب بے قابو آگ کی طرح ایک ضلع سے دوسرے ضلع اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ شنگھائی اور بہت سے شہروں کی عمارتوں اور دفتروں پر جمہوریت پسندوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جن پر سونے کے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:-

"منچو شہنشاہیت کو ختم کر دو"

اگرچہ انقلابیوں کو بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی اور ملک کے بہت بڑے حصے پر ان کی حکومت تھی مگر فوجی اور مالی دونوں حیثیتوں سے وہ شاہ پسندوں کے مقابلے میں کمزور تھے۔ شمالی فوج جو اب بھی شہنشاہ یا نئے وزیر اعظم کی وفادار تھی، انقلابی رنگ روٹوں یا جنوبی فوج کے مقابل میں زیادہ منظم اور بہتر تربیت یافتہ تھی۔ چنانچہ جب ہانکو کے قریب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا تو شاہی فوج نے ہانکو اور ہن یانگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کا سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ووچنگ پر بھی اس کا قبضہ ہو کر رہے گا۔ اس سے انقلابیوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی مگر اسی موقع پر دونوں جانب سے صلح کی خواہش ظاہر کی گئی۔ (دسمبر ۱۹۱۱ء) چنانچہ [illegible] سے نمائندے بھیجے گئے اور شرائط صلح پر غور کرنے کے لئے شنگھائی میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ انقلابیوں کا شہنشاہ کی حکومت سے دست برداری اور جمہوریہ کے قیام پر اصرار تھا اور شاہ پسندوں کا یہ اصرار تھا کہ طرز حکومت ایک نیشنل کنونشن کے ذریعے طے کیا جائے۔

یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو نانکنگ میں جمہوری حکومت کا اعلان ہوا۔ ڈاکٹر سن یات سین صدر بنائے گئے باغی صوبوں کے نمائندوں کی ایک اسمبلی بنائی گئی جسے جمہوریہ کی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عارضی دستور کا مسودہ تیار کیا گیا اور اس کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ اس موقع پر یان شی کائی نے حسب ذیل اعلان کیا۔

"مجھے اس میں شبہ ہے کہ چین کے عوام اس وقت کسی جمہوری نظام کے لئے موزوں ہیں یا موجودہ حالات میں چینی عوام کو جمہوری حکومت دینا مناسب ہو گا...... محدود شاہی حکومت ہی موجودہ حالات پر زیادہ آسانی سے قابو پا سکتی ہے۔ کم وقت میں ایک مضبوط اور دیرپا نظام قائم کر سکتی ہے۔ بہ نسبت ایسے طرز حکومت کے جسے ابھی تجربے کی منزلوں سے گذرنا ہے اور جو کم از کم موجودہ حالات میں چین جیسے ملک کے لئے بالکل ناموزوں ہے .... میں موجودہ شہنشاہ کو باقی رکھنے کی حمایت محض اس لئے کر رہا ہوں کہ میں دستوری بادشاہت کا قائل ہوں مجھے یقین ہے کہ صرف شہنشاہ ہی ہم میں ایک ایسی ہستی ہے جس پر پوری قوم متفق اور متحد ہو سکتی ہے .... میں چاہتا ہوں کہ اس نازک موقع پر چین کو اس تباہی سے جس کی طرف وہ تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے اور ان خرابیوں سے جو جمہوری نظام منظور کرنے کے بعد پیدا ہوں گی بچا لیا جائے۔"

مگر جمہوریت پسند اس اپیل کے بعد بھی اپنے مطالبے پر قائم رہے اور مکمل جمہوریہ سے کم پر کسی طرح تیار نہیں تھے۔ اس گفت و شنید میں جنوری (۱۹۱۲ء) کا پورا مہینہ ختم ہو گیا۔ بالآخر یان اور جمہوریت پسندوں کے درمیان طے پایا کہ شاہی خاندان کو ...... ولہ کی سالانہ پنشن ملا کرے گی، شہنشاہ کو پیکنگ کے شاہی محل میں رہنے کی اجازت ہو گی اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

یہ انقلاب اگرچہ کامیاب رہا۔ اور جمہوریت پسندوں کے رہنما اور انقلاب کے اہم بانی سن یات سین جمہوریہ چین کے صدر بھی چن لئے گئے۔ لیکن شمالی فوج شاہی خاندان کی وفادار تھی اور اس کے کمانڈر انچیف یان شی کائی شہنشاہیت کو بالکل ختم کرنے کے مخالف تھے۔ دوسرے وہ خود صدر بننا چاہتے تھے۔ اس لئے ان تمام کامیابیوں کے باوجود انقلابیوں کی راہ میں ایک "سنگ گراں" موجود تھا۔ اس "سنگ گراں" کو راہ سے ہٹانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تو مجبوراً جمہوریت پسندوں کو یان شی کائی سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور سن یات سین کی جگہ اسے صدر مقرر کیا گیا (۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء) مگر انھیں یقین تھا کہ یان شی کائی جمہوریت کا مخالف ہے اس لئے انھوں نے دستور میں ایسی قیدیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء

مسلم یونیورسٹی کا نیا دور

۲۰ر نومبر ۱۹۴۸ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کتابِ زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا وائس چانسلر منتخب ہونا کوئی معمولی یا سطحی تبدیلی نہیں بلکہ یہ بڑی گہری اصولی تبدیلی ہے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں اس تعلیم گاہ کو اصول اور مصلحت کی مشترک راہ پر چلاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نصف صدی کے دوران میں وہ اصول کی سیدھی ڈگر سے دور ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں یہ بالکل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور وہ خالص مصلحت کی ٹیڑھی میڑھی راہوں سے بھٹکنے لگی۔ اب پورے پچاس برس کے بعد اُسے ایسا رہنما ملا ہے جس کے بارے میں ہر شخص کو یقین ہے کہ وہ اُسے نئے سرے سے اصول کی شاہراہ پر چلائے گا جس کے ساتھ مصلحت کی پگ ڈنڈیاں کہیں نہ کہیں آکر مل جاتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ سر سید نے اُس انقلاب کا جو اُن کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان میں ہو رہا تھا جائزہ لیا تو ان کو یہ نظر آیا کہ ہندوستان میں عہدِ وسطیٰ سلطنتِ مغلیہ کے ساتھ دم توڑ رہا ہے اور عہدِ جدید سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ اس کی جگہ لے رہا ہے۔ ترقی پسند مصلح کی حیثیت سے اُنھوں نے عہدِ جدید کا اور مصلحت اندیش مدبر کی حیثیت سے برطانوی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ عہدِ جدید سے ان کو یہ امید تھی کہ اس کی علمی اور افادی روح کی بدولت ہندوستان میں ذہنی اور مادی ترقی کی لہر دوڑ جائے گی اور برطانوی حکومت سے یہ توقع تھی کہ وہ ایک رعایا پرور اور روشن خیال حکومت ثابت ہوگی اور اس کے سائے میں ملک میں سیاسی وحدت، امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔ اس لئے جب انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کی تعمیرِ نو کے لئے علی گڑھ کالج قائم کیا تو اس کی بنا اصولاً ذہنی تجدید کی علم برداری پر اور مصلحتاً برطانوی حکومت کی وفاداری پر رکھی۔ مگر ان کے چند رفیقوں کو چھوڑ کر عام طور پر مسلمانوں کا اونچا اور متوسط طبقہ جس کے لئے اور جس کی مدد سے سر سید نے کالج بنایا تھا ان کے اصول کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے تو صرف یہ مصلحت پسند آئی تھی کہ نئی تعلیم کے ذریعے مسلمان نوجوانوں کو حکومت کی خوشنودی اور قرب حاصل ہو اور ملازمتیں میسر آئیں۔ پھر بھی جب تک سر سید زندہ رہے اصلاح و ترقی کی مختلف تحریکیں ان کی ذات سے وابستہ رہیں اور ان کا اثر کالج پر بھی پڑتا رہا۔

سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کا رشتہ ان ترقی پسندانہ تحریکوں سے کٹ گیا۔ اس نے اپنے اصول کو یعنی ذہنی تجدید کی علم برداری کو ترک کر دیا۔ صرف مصلحت سے یعنی حکومت کی وفاداری سے سروکار رکھا۔ حالانکہ اب وہ اُمیدیں جو سر سید نے برطانوی حکومت سے باندھی تھیں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ اس نے سطحی سیاسی وحدت اور جبری امن و امان ضرور قائم کیا تھا، مگر خوش حالی تو در کنار اس کی معاشی پالیسی نے ہندوستان کی دستکاریوں کو برباد کر کے اُسے اور خستہ حال کر دیا تھا، عام طور پر ملک کے متوسط طبقے نے بیرونی حکومت کے جُوے کو اُتار پھینکنے کے لیے آزادی کی تحریک شروع کر دی تھی اور مہاتما گاندھی نے عوام کو اس میں شریک کر کے اُسے جاندار اور پُر زور قومی تحریک بنا دیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے اس مخصوص طبقے نے جو علی گڑھ پر قابض تھا اپنے آپ کو اور اپنی تعلیم گاہ کو ملکی زندگی کی عام رو سے الگ رکھا۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں جب کالج کے جسمِ اجتماعی میں ایک بار دوبارہ [illegible] حرارت کی گردش محسوس ہونے لگی [illegible] مسلمان نوجوانوں کی رگوں میں گردش کر رہا تھا تو اس بازو کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج فالج زدہ ہو کر رہ گیا۔ مگر چونکہ باقی اعضا خصوصاً آلاتِ ہضم اپنا کام کر رہے تھے۔ اس لئے بظاہر حیاتِ جسمانی میں کوئی خلل نہیں پڑا۔

بغیر کسی اصول اور مقصد کے محض مصلحت کے سہارے علی گڑھ کی تعلیم گاہ تقریباً نصف صدی سے زندگی گذار رہی تھی۔ اس کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی تھی، مگر مرنے نہیں پائی تھی، وہ بے مقصدی سے اتنی تنگ آ گئی تھی اور مقصد کے لئے اس قدر بے قرار تھی کہ جب مسلم لیگ کے اربابِ سیاست نے سیاسی جنگ میں شکست کھا کر حرکتِ مذبوحی کے طور پر پاکستان کا نعرہ بلند کیا تو اس تعلیم گاہ نے جو اب یونیورسٹی بن چکی تھی بے سوچے سمجھے اسی کو اپنا مقصد بنا لیا۔ تھوڑے دن کے لئے اس کے اندر ایک عارضی ہیجان پیدا ہوا اور بڑھتے بڑھتے بحران کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر تقسیم ہند کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے محسوس ہوا کہ یہ سارا جوشِ جنون محض سودائے خام تھا۔ اب ردِ عمل شروع ہوا اور ساری فضا میں مایوسی اور افسردگی چھا گئی۔

یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے دیکھا کہ مقصد تو کچھ راس نہیں آیا اس لئے پھر مصلحت کی طرف رجوع کیا اور نئی حکومت کے ساتھ پیمانِ وفا باندھنے کو تیار ہو گئے۔ مگر ان پر بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اب مصلحت کی کشتی بغیر اصول کے لنگر کے طوفانِ حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب حکومت محض ملک و قوم کے عام مقاصد کا آلۂ کار ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جب تک ان مقاصد کا ساتھ نہ دیا جائے حکومت کے ساتھ تعاون ممکن نہیں اور اگر ہو بھی تو بے معنی اور بے کار ہے۔

اس لئے ۲۰ر نومبر ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی کورٹ نے یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کے ایک فرزندِ رشید ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو ابتدا سے ملک و قوم کے عام مقاصد متحدہ قومیت اور سیاسی اور معاشی جمہوریت کے حامی ہیں وائس چانسلر بنایا جائے۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب کو سر سید کے تجدید و اصلاح کے مقصد، مولانا محمود الحسن کے دیانت و تقویٰ کے مقصد اور گاندھی جی کے حق اور عدمِ تشدد کے مقصد کی علم برداری کا فخر بھی حاصل ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کے چھوٹے سے معمل میں ان سب عناصر کو سمو کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کا مرکب تیار کرنے کا تجربہ کیا ہے اور اس میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لئے ہماری یہ اُمید بے جا نہیں کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی قبول کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور اب وہ اپنی زندگی کی بنیاد عارضی مصلحت و منفعت کی جگہ پائدار اخلاقی اصول اور ذہنی اور روحانی اقدار کی چٹانوں پر رکھے گی جس سے مصلحت اور منفعت کے چشمے خود بخود پھوٹ نکلیں گے۔

بزم بے تکلف

ع اپنے سے کر، غیر سے الفت ہی کیوں نہ ہو

معلوم نہیں غالب مرحوم کو یہ نصیحت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس لئے کہ یہی تو ایک فرض ہے جسے عام طور پر لوگ آپ ہی آپ بڑے ذوق شوق سے ادا کرتے ہیں۔ اگر کچھ خدا کے بندے ایسے ہوں بھی جنھیں اس بارے میں تاکید کی ضرورت ہو تو ہمارے نہال صاحب یقیناً ان میں سے نہیں ہیں۔ نہال صاحب کو اپنے آپ سے سچی اور گہری محبت ہے۔ وہ اپنی صورت کے عاشقِ زار ہیں۔ مگر غیرت مند، خود دار عاشقوں کی طرح اپنا رازِ محبت [illegible] چھپ کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں اور [illegible] ہیں۔ [illegible] کی کوتاہ بین نظر کو ان کے چہرے میں جو چکنی رنگت، فراخ دہانے، کشادہ، ہموار، ناک اور بانکی ترچھی آنکھوں میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا۔ مگر لیلےٰ را بچشمِ مجنوں باید دید۔ نہال صاحب کو آئینے میں انسان کا عکس نہیں بلکہ حسن و جمال کی لوٹ نظر آتی ہے۔ جسے دیکھ کر ان کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

نہال صاحب کے کان بڑے حساس ہیں ہر آواز جو ذرا سی سخت یا کرخت، تیز یا بھاری، پھٹی ہوئی یا بیٹھی ہوئی ہو ان کو زہر لگتی ہے۔ مگر اپنی آواز کا زیر و بم، شد و مد، قبض و بسط انھیں اتنا پسند ہے کہ ہر وقت منہ ہی منہ میں گنگناتے رہتے ہیں، اور دل ہی دل میں مزے لیتے رہتے ہیں اور جہاں موقع مل جائے بے دھڑک گا پڑتے ہیں۔

رنگ روپ اور سر تال ہی پر موقوف نہیں وہ اپنی آن بان، سج دھج، چال ڈھال، غرض ایک ایک ادا پر سو سو جان سے قربان ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ نہال صاحب محض صورت کے بندے ہیں۔ وہ اپنے جمالِ ظاہری سے کہیں زیادہ اپنے حسنِ باطنی کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی جوہر شناس آنکھ اپنی سیرت میں ایسی ایسی خوبیاں دیکھتی ہے جنھیں غیر کی نظر مشکل سے پرکھ سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا اپنے ساتھ حسنِ سلوک، اپنی ہمدردی، دل نوازی، دل داری، دل جوئی، اپنے عیبوں سے چشم پوشی اپنی خطاؤں سے درگذر، ہر مصیبت میں اپنا ساتھ دینا، ہر مشکل میں اپنے کام آنا۔ ان صفاتِ حسنہ کی وجہ سے وہ اپنی پرستش اس خشوع و خضوع کے ساتھ کرتے ہیں کہ بالکل ع صنم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم کے مصداق بن کر رہ گئے۔

نہال صاحب کے عشقِ بے مثال کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی کو ان سے رقابت نہیں، وہ بلا شرکتِ غیرے اپنے محبوب کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اکتا کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں۔ ع کاش کوئی رقیب بھی ہوتا۔

پچھلا ہفتہ :- ہندوستان

آئین سازی کا کام چل نکلا

معلوم نہیں آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر نے جو آج کل صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اپنے نئے اختیارات برتنے یا نہیں برتے۔ بہر حال اسمبلی کے کام کی رفتار اب اچھی خاصی ہو گئی ہے۔ مگر یہ امید چھوڑ دینی پڑی کہ پوری بحث ۲۶ جنوری تک ختم ہو جائے گی۔ اب یہ طے ہوا ہے کہ ۱۳ دسمبر سے ۲۳ دسمبر تک اسمبلی کا سیشن کانگریس کے سالانہ جلسے کی وجہ سے ملتوی رہے اس کے بعد تھوڑے دن اور کام کرکے دو تین مہینے کے لئے ملتوی ہو جائے۔ بیچ میں یکم فروری سے شاید وسط اپریل تک اسمبلی مجلس وضع قوانین کی حیثیت سے کام کرے گی۔ یہ خیال ابھی تک باقی ہے کہ دستور کی منظوری کے بعد رائے دہندوں کے حلقے بنانے اور فہرستیں تیار کرنے کا عمل چار مہینے میں ختم ہو جائے اور نئے دستور کے مطابق انتخابات ۱۹۴۹ء میں جاڑوں سے پہلے کرلئے جائیں، لیکن غالباً اس پروگرام میں بھی ترمیم کرنی پڑے گی اور انتخابات ۱۹۵۰ء کے شروع میں ہوں گے۔

پچھلے ہفتہ اسمبلی نے بنیادی حقوق کی کئی اور دفعات پر بحث کی۔ دفعہ ۹ کے ذریعے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے کسی باشندے کے ساتھ چھوت چھات نہیں برتی جائے گی۔ اور اس قسم کا برتاؤ قانونی قابل سزا جرم ہوگا جس کوشش میں گاندھی جی نے اپنی عمر صرف کردی وہ اب جا کر پوری ہوئی دفعہ ۱۲ کے سلسلے میں یہ تجویز منظور ہوگئی کہ نہ ہندوستان کی ریاست خود اپنے باشندوں کو خطابات تقسیم کرے گی اور نہ ان کو دوسری ریاستوں کے دئے ہوئے خطاب قبول کرنے کی اجازت ہوگی۔ صرف فوجی اور علمی اسناد اور اعزازی القاب کو اس قاعدے سے مستثنےٰ کیا گیا۔ دفعہ ۱۳ پر جس میں شخصی آزادی کا ذکر ہے بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ ہتھیار رکھنے کی عام آزادی تجویز کی گئی مگر منظور نہیں ہوئی۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن جرائم کی بنا پر فرد کی آزادی چھینی جا سکتی ہے ان میں سے سڈیشن (حکومت کے خلاف شورش انگیزی) کو خارج کر دیا گیا۔ اس طرح قومی حکومت نے اس ناپاک ہتھیارے کو جس کے ذریعے بدیشی حکومت اپنے مخالفوں اور نقادوں کا گلا گھونٹ کرتی تھی ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔

انیسویں دفعہ پر (جو مذہبی آزادی سے تعلق رکھتی ہے) بحث کے دوران میں یہ ظاہر ہوا کہ فرقہ پرستی کے ان ہولناک مظاہروں کی وجہ سے جو پچھلے دو سال میں ہمارے ملک میں ہوئے۔ کچھ لوگوں کو مذہب کے نام ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو سچ مچ یہ تحریک پیش کردی کہ اس دفعہ کو حذف کر دیا جائے یعنی آئین مذہب کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرے کسی مذہب کے لوگوں کو مذہبی تبلیغ کا حق دینے کی تو کئی ممبروں نے مخالفت کی ایک مسلم ممبر کی اس تجویز پر لوگ بہت محظوظ ہوئے کہ اس قسم کی سب علامات کو ممنوع قرار دیا جائے جن سے کسی شہری کا مذہب ظاہر ہوتا ہو۔ اس دفعہ پر رائے دو شنبہ ۶ دسمبر کو لی جائے گی۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ پوری دفعہ جس کی رو سے ہر شہری کو مذہب کے معاملے میں عقیدے عمل اور تبلیغ کی اجازت دی گئی ہے بغیر کسی ترمیم کے منظور ہو جائے گی۔

صلح کی باتیں اور لڑائی کی گھاتیں

سرسری نظر سے دیکھنے میں یہ عجیب غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں کشمیر میں لڑ رہی ہیں اور اس لڑائی کے جلد ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف ۶ دسمبر سے دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کی کانفرنس شروع ہو رہی ہے جس میں (مسئلہ کشمیر کے سوا) سب اختلافی مسائل کو دوستانہ بات چیت کے ذریعے سے طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صورت حال کا مطالعہ غور سے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ دراصل کشمیر کی لڑائی کا فیصلہ ہو چکا ہے ہندوستانی فوج ریاست کے زرخیز اور آباد حصوں پر قبضہ کر چکی ہے اور مغرب میں سرحد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر پہنچ گئی ہے۔

اس سے آگے بڑھنے کی کوشش وہ اس وجہ سے نہیں کرتی کہ کہیں جنگ کی باڑھ اسے پاکستان کی سرحد کے اندر نہ پہنچا دے اور وہ پاکستان پر جارحانہ حملہ کرنے کی ملزم نہ قرار دی جائے اب حکومت پاکستان نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم کشمیر کے مسئلے کو رائے شماری کے ذریعے طے کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان اس کا فیصلہ فوجی طاقت سے کرنے پر تلا ہوا ہے پھر بھی وہ پاکستانی فوجوں کو کشمیر سے ہٹانے پر راضی نہیں ہوتی۔ یہ سمجھ کر کہ اس سے اس کا مقدمہ جو سیکورٹی کونسل میں پیش ہے کمزور ہو جائے گا۔ اسے اب تک یہ امید باقی ہے کہ سیکورٹی کونسل کشمیر کے مسئلے کا کوئی ایسا حل تجویز کر دے گی جس میں پاکستان کی بات رہ جائے۔

غرض کشمیر کی لڑائی اب لڑائی نہیں رہی بلکہ

ع۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

کا معاملہ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے دونوں ریاستوں کے درمیان دوسرے مسائل کے متعلق دوستانہ گفتگو کرنے میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔

کانفرنس میں جن چیزوں پر بحث ہونے والی ہے۔ ان میں غیر منقسم ہندوستان کی تقسیم، پناہ گزینوں کی املاک، تجارتی مال کی آمد و رفت اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ مسائل وہ ہیں جن پر دونوں ریاستوں کی موجودہ اور آئندہ فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے ہمیں امید ہے کہ دونوں طرف کے نمائندے وقتی سیاسی جذبات کے اثر سے آزاد ہو کر عقل و انصاف کی روشنی میں ان سب مسائل پر غور کریں گے۔ خوش قسمتی سے پاکستانی وفد کے لیڈر غلام محمد صاحب اور ہندوستانی وفد کے لیڈر گوپال سوامی آئنگر صاحب دونوں کی علمی اور ذہنی تربیت سیاست کی پرشور طوفانی فضا میں نہیں بلکہ نظم و نسق کی پرسکون فضا میں ہوئی ہے اس لئے امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں یہ کانفرنس جس کے متعلق یہ اندازہ ہے کہ دو ہفتے تک چلے گی، ذمہ داری اور مصلحت بینی کے ساتھ کام کرے گی اور سب نزاعی امور کا معقول اور قابل عمل فیصلہ ہو جائے گا۔

صاف گوئی بہر حال اچھی ہے

کانگریس کے محترم لیڈر اور حکومت ہند کے ڈپٹی پرائم منسٹر سردار ولبھ بھائی پٹیل اپنی صاف گوئی کے لئے مشہور ہیں اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ان کا لہجہ سخت اور تلخ ہوتا ہے اور اس سے ان لوگوں کو جو اس خاص موقعے پر ان کی تنقید کے موضوع ہوں قدرتی طور پر تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر سب معقول اور منصف مزاج آدمی یہی کہتے ہیں کہ سردار کے الفاظ نرم اور معتدل ہوتے تو بہت اچھا تھا مگر ان کی یہ عادت بہر حال قابل قدر ہے کہ اپنی دل کی بات بے تکلف صاف صاف کہہ دیتے ہیں اور دوست دشمن کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتے۔ تقسیم ہند سے کچھ دن پہلے سے گذشتہ ستمبر کے وسط تک ان کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں کی مسلم لیگی اور پاکستانی ذہنیت ہندوستان کے امن اور سلامتی کے لئے خطرناک ہے اور اس کا اظہار وہ ہر موقعے پر کرتے رہے۔ ہندو مہا سبھا اور آر، ایس، ایس کے بارے میں بہت دن تک ان کی رائے یہ تھی کہ ان انجمنوں کا مقصد محض ہندوؤں کے جان و مال کی حفاظت ہے اس لئے وہ ان کے طریق کار کی تو مذمت کرتے تھے مگر ان کے مقصد کو جائز قرار دیتے تھے۔ لیکن جب واقعات اور حقائق نے ان کو ان دونوں معاملوں میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا تو انھوں نے اس تبدیلی کا کھلم کھلا اعلان کر دیا، حیدر آباد کی مہم کے دوران میں ہندوستان کے مسلمانوں کا جو معقول طرز عمل رہا اس کو انھوں نے صاف اور واضح الفاظ میں سراہا اور اس کے بعد کئی تقریروں میں یہ اعتراف کیا کہ اب انھیں مسلمانوں پر شبہ نہیں رہا۔ اسی طرح انھوں نے یہ بھی مان لیا کہ آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہاسبھا کے بارے میں ان کا حسن ظن غلط تھا۔

ابھی ۲ دسمبر کو گوالیار میں سردار نے عام جلسے میں جو تقریر کی ہے اس کے بعض فقروں سے ان کے موجودہ خیالات کا پوری وضاحت کے ساتھ اندازہ ہوتا ہے انھوں نے فرمایا "کانگریسی حکومت پر یہ الزام لگانے والے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرتی ہے ہندو مہاسبھا اور آر، ایس، ایس وغیرہ کے لوگ ہیں..... قاہرانہ حکومت کے حامیوں کا وہی انجام ہوگا جو راون کا ہوا۔ اگر کوئی مسلمان ریاست کا وفادار نہ ہو تو ریاست اس سے نبٹ لے گی۔ کسی فرد کو اس سے کوئی سروکار نہیں وفادار مسلمانوں کے ساتھ سگے بھائیوں کا سا برتاؤ کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم وفادار مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ستایا کرو تو پھر اس آزادی پر حیف ہے۔ ہمیں ایسی فضا پیدا کرنی ہے جس میں ہر شخص اطمینان اور سلامتی کے ساتھ رہ سکے......

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آر، ایس، ایس والے ستیا گرہ شروع کرنے والے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ جن کے دلوں میں زہر بھرا ہے وہ ستیا گرہ کیا کریں گے۔ ہم نے ان کے دلوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے تشدد اور فریب کا راستہ اختیار کیا میں انھیں بتائے دیتا ہوں کہ ہمارے پاس اس دھمکی سے نبٹنے کے لئے سارے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

۲- پاکستان

صنعتی ترقی کی رفتار خاصی ہے

پاکستان کی صنعتی ترقی کے متعلق وزیر صنعت فضل الرحمن صاحب نے کراچی کے مسلم چیمبر آف کامرس کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس میں معاصر پاکستان ٹائمز کے الفاظ میں مشکلات اور دقتوں کا ذکر زیادہ ہے اور کامیابی کا بہت کم۔ پچھلے سال دسمبر میں صنعتی ترقی کے لئے جن منصوبوں کا اعلان کیا گیا تھا ان میں ہائڈرو الکٹرک اسکیموں کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی اور اسی منصوبے پر بڑی خوش آئند توقعات قائم کی گئی تھیں لیکن اب ایک سال کے بعد وزیر صنعت فرماتے ہیں کہ وسائل اور ماہرین فن کی کمی کی وجہ سے یہ اسکیم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس ایک سال میں صرف یہ ہوا ہے کہ ایک مشہور انجنیر کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں۔ وزیر صنعت کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد چھوٹی مدت اور لمبی مدت کا منصوبہ تیار کرلیں گے۔ انھوں نے پاکستان کے لوگوں سے درخواست کی ہے کہ ابھی کچھ عرصہ اور مشرقی پنجاب کی بجلی کا محتاج رہنے پر صبر کریں۔

پاکستان کے قائم ہونے کے بعد ساڑھے نو مہینے میں ۱۲۱ کمپنیاں قائم کی گئیں جن کا منظور شدہ سرمایہ ۶۴ء۱۶۱ کروڑ تھا۔ لیکن اس سرمایے میں سے بہت کم استعمال میں آیا اور عام لوگوں سے جو رقم وصول کی گئی وہ ۵۰ لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ پاکستان کے ایک "ماہر معاشیات" نے اس کا عذر یہ بیان کیا ہے کہ "یہ ابتدائی زمانہ تھا، اور زندگی پرسکون اور اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ مسلم مہاجرین کی کثرت اور غیر مسلم کارخانہ داروں کے چلے جانے کی وجہ سے صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔" یہ خیال اس لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کے تین مہینوں ——— جولائی، اگست اور ستمبر میں کافی ترقی ہوئی ہے صرف سندھ میں ۱۹ نئی کمپنیاں کوئی ۴ملین کے سرمایے سے قائم کی گئی ہیں۔ ان میں تین کپڑے بننے اور روئی اوٹنے کی کمپنیاں اور ایک طیارہ بازی کی کمپنی اور سات لوہے کے برتن بنانے کے کارخانے شامل ہیں۔ مغربی پنجاب میں ۷ملین کے منظور شدہ سرمایے سے ۹ فیکٹریاں مشرقی بنگال میں ۱۳ ملین کے جاری شدہ سرمایے سے ۱۳ فیکٹریاں اور صوبہ سرحد میں ۲۵ لاکھ کے منظور شدہ سرمایہ سے ایک شکر کی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ اس ایک سال کی مدت میں یہ رفتار سست ضرور ہے۔ مگر کچھ بہت زیادہ مایوس کن نہیں۔ بشرطیکہ حکومت پاکستان کی توجہ اسی طرح برابر قائم رہے

ہندوستان اور ہم

ہمارے اکثر اخبارات اپنے پڑھنے والوں کے لئے جو ذہنی خوراک مہیا کر رہے ہیں اس کا کچھ اندازہ آپ ذیل کی سرخیوں سے لگاسکتے ہیں:۔

۱۔ چین میں کومن ٹانگ پارٹی کی شکست اور اشتراکیوں کی فتح نے ہندوستان میں اشتراکیت اور سرمایہ داری کی کشمکش کے لیے راستہ صاف کردیا۔

۲۔ ہندوستان میں سیاسی جماعتیں اس درجہ مختلف الخیال ہیں کہ ان میں اتحاد عمل پیدا کرنا عقلاً محال ہے۔

۳۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے اب اقتصادی حالت کو سنبھالنا دشوار ہے۔

۴۔ کشمیر میں ہندوستان کا جانی اور مالی نقصان اس کثیر پیمانے پر ہورہا ہے کہ اسے ہندوستان زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کرسکتا

۵۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہوچکے ہیں کہ ان میں مفاہمت پیدا کرنا ہندوستانی مدبروں کے لئے ناممکن ہے۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری خبریں روزانہ ذرا الفاظ بدل کر، اور زیادہ سے زیادہ "سنسنی خیز" بناکر قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور اس فن میں ایک اخبار دوسرے اخبار کو مات دینے کی بیش از بیش کوشش کرتا ہے۔ اور سنا گیا ہے کہ جس روز اس قسم کی کوئی "سنسنی خیز" خبر اخبار میں موجود نہ ہو تو اس دن اس اخبار کی فروخت گر جاتی ہے۔ اور دوسری اشاعت کے لئے اس اخبار کے عملے کو ایسی خبریں ایجاد کرنے کے لئے زیادہ دیر تک شب بیداری کرنی پڑتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمیں ہندوستان کی بدحالی سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے؟ اگر ہندوستان میں اشتراکیت اور سرمایہ داری میں جنگ ہونے والی ہے تو اس چپقلش سے پاکستان کو کیا فائدہ ہوگا؟ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا اختلاف خیال اس درجہ شدید ہوگیا ہے کہ اب وہ متحد نہیں ہوسکتیں تو اس سے پاکستان کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ کیا پاکستان کی مالی خوش حالی کسی طرح بھی ہندوستان کی اقتصادی ابتری سے دور کا تعلق بھی رکھتی ہے؟ کیا جہاد کشمیر میں حصہ لینے والے مجاہدین صرف اس لئے جنگ جیت لیں گے کہ بعض اخباروں کی رائے میں کشمیر میں ہندوستانیوں کا جانی اور مالی نقصان کثیر پیمانے پر ہورہا ہے؟ کیا مجاہدین کشمیر کے بازوؤں کو مضبوط کرنے کے لئے ان خبروں سے زیادہ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں؟ اور کیا ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات کی کشیدگی ہمیں کسی طرح بھی فائدہ پہنچا سکتی ہے؟

یہ سوالات اخبار پڑھنے والے سنجیدہ طبقے کے ذہن میں قدرتاً پیدا ہونے چاہئیں اور اگر یہ تسلیم کربھی لیا جائے کہ سب خبریں سچی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک بدیہی امر ہے کہ پاکستان کا استحکام، اس کی ترقی اور اس کی خوش حالی ہندوستان کی داخلی چپقلش خانہ جنگی یا اقتصادی انتشار سے ہرگز وابستہ نہیں ہوسکتی۔ کسی ملک کی ترقی کی عمارت دوسرے ملکوں کی تباہی و بربادی کے خرابے پر تعمیر نہیں ہوا کرتی۔ اس کی ترقی یا تنزل کے اسباب خود اس ملک کے باشندوں کی اپنی سیرت و کردار، مقاصد اور ارادوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے وہ ادارے جو عوام کی ذہنیت کو بنانے کا کام بڑی آسانی اور نہایت خوبی سے کرسکتے ہیں۔ عوام کو لوریاں دے دے کر سلا رہے ہیں اور تعمیر ملت کا کام التوا میں پڑ رہا ہے۔ ان خبروں کی بار بار اشاعت ایک طرف تو ہمارے ہم وطنوں کے دلوں میں یہ خیال پختہ کردیتی ہے کہ ہمارا ہمسایہ ملک ہمارا ایسا ازلی دشمن ہے جس سے کبھی خوشگوار تعلقات ہو ہی نہیں سکتے اور ہمیشہ ہمیشہ اس کی تباہی و بربادی کی داستانیں سننے کے لئے منتظر رہنا چاہیئے۔ حالانکہ پاکستان اور ہندوستان کے بااثر اداروں اور شخصیتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہیں کہ ان دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات روز بروز استوار سے استوار تر ہوجائیں اور یہ دونوں اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھیں، بھلائیاں پھیلانے میں ایک دوسرے کی معاونت کریں اور امن جیسی نایاب شے کو حاصل کرنے کے لئے دونوں مل کر جد و جہد کریں۔ اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ روز بروز یہ ملک بعض نادان دوستوں کی غلط روش کی وجہ سے ایک دوسرے سے بعید تر ہوتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے بسنے والے ہندوستان کی کمزوریوں کی داستانیں سن کر غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو طاقتور سمجھ رہے ہیں، اور اپنے وطن کی فلاح و بہبود کی طرف سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں

ہندوستان سے قطع نظر۔ یہ صورت حالات خود پاکستان کے لئے اچھے نتائج نہیں پیدا کرسکتی۔ ہمارے پریس کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے صرف سچی خبریں مہیا کرے۔ ہوسکتا ہے کہ شروع شروع میں بعض اخباروں کی اشاعت کم ہوجائے۔ مگر فطرت انسانی ابھی اتنی مسخ نہیں ہوگئی ہے کہ اس میں بھلے اور برے کی تمیز پیدا نہ ہوسکے اور یہ تمیز پیدا ہوجانے کے بعد جھوٹے سکے زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔

(نشان راہ کراچی)

رائے عامہ کی کامیابی

مسلم لیگ کی موجودہ وزارتوں کی رجعت پسندانہ پالیسی کے خلاف، مغربی پنجاب کی رائے عامہ کو پچھلے دنوں بڑی شاندار کامیابی ہوئی ہے۔ مغربی پنجاب میں پراونشل لیگ کے صدارتی انتخاب میں وزارتی نمائندے علاء الدین صاحب صدیقی کے مقابلے میں میاں ممتاز محمد دولتانہ کامیاب رہے معاصر روزنامہ "مغربی پاکستان" لاہور نے اس کامیابی پر لکھا ہے کہ "وزارتی پارٹی کی یہ شکست فاش ہمارے زاویہ نگاہ سے بہت مبارک فال ہے"

سندھ میں بھی وزارت کو ایک معاملے میں زک اٹھانی پڑی۔ جن پانچ اخبارات نے وہاں کی وزارت پر نااہلی اور بددیانتی وغیرہ کے الزامات لگائے تھے ان کی اشاعت صوبائی حکومت نے بند کردی تھی مگر چودھری خلیق الزماں صاحب کی مداخلت سے حکومت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ سندھ کی وزارت کا دعویٰ ہے کہ عوام اس کے ساتھ ہیں اور اخبارات کی خصوصاً "ڈان" کی مخالفت صرف ذاتی اغراض کی بنا پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔

ع۔ ل

۳- باہر کی دُنیا

چین کا دیوالہ نکلنے کو ہے

پچھلے ہفتہ میں، چین کے متعلق بڑی متضاد خبریں آتی رہی ہیں ایک دن یہ خبر آئی کہ کمیونسٹ فوجیں فلاں محاذ پر بہت آگے بڑھ گئی ہیں، تو دوسرے دن یہ اطلاع تھی کہ قومی حکومت نے کمیونسٹوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک روز یہ معلوم ہوتا کہ قومی حکومت اپنی راجدھانی چھوڑ کر بھاگ رہی ہے تو دوسرے دن یہ کہا جاتا کہ نہیں یہ غلط ہے۔ لیکن قومی حکومت کی پریشانی نانکنگ اور شنگھائی میں عام وحشت، لوگوں کا بڑی تعداد میں جنوبی علاقوں میں بھاگ کر جانا اور مادام چیانگ کائی شک کا امریکہ پہنچنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اب قومی حکومت کے قدم بُری طرح ڈگمگا رہے ہیں۔

اس وقت فوجی ناکامیوں سے بھی زیادہ سخت مصیبت قومی حکومت پر معاشی انتشار اور بدحالی کی ہے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تقریباً ٹوٹ چکا ہے۔ گرتی ہوئی دیوار روکنے کے لئے نیا سکہ جاری کیا گیا تھا مگر یہ علاج بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ گرانی بڑھتی جارہی ہے۔ چوربازاری، نفع خوری اور ذخیرہ اندوزی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے بنگال سے کہیں زیادہ بڑے قحط کا اندیشہ بڑھتا جارہا ہے۔ خود جنرل سیمو کے حوالی موالی جو بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں ان حالات سے دل برداشتہ اور مایوس ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب امریکہ کی امداد بھی چیانگ کائی شک کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ قومی حکومت کے وزیر اعظم ونگ ون ہو کو فوجی شکست سے زیادہ معاشی خرابیوں کی وجہ سے مجلس (لیجسلیٹو یان) کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

چین کے عام رجحانات کو دیکھتے ہوئے لندن ٹائمز کے نامہ نگار نے ایک اور خطرہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو قومی مفاد کے لئے اس سے کہیں زیادہ مضر ہے کہ سارے ملک پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے پہلے پورا چین ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت تھا۔ مگر انقلاب کے بعد ملک میں [illegible] چھوٹی بہت سی نیم [illegible] اور چین کی سیاسی وحدت ختم ہوگئی۔ چیانگ کائی شک نے اپنے دورِ شباب میں جو اچھے کام کئے۔ ان میں ایک یہی تھا کہ انھوں نے چین کو پھر سے کومنتانگ کے جھنڈے کے نیچے متحد کردیا۔ اب اس اتحاد کی جڑیں بھی اکھڑ رہی ہیں۔ بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ چاہے عارضی طور پر ہی، مگر ڈر ہے کہ چین بہت سی نیم آزاد ریاستوں میں بٹ جائے گا۔

غذا نہ ہوگی تو جنگ ہوگی۔

اگرچہ اس وقت عام خیال ہے کہ دنیا تیسری جنگ کی طرف قدم بڑھا رہی ہے مگر اس کے ساتھ ہر ملک اور ہر شخص جنگ کی مخالفت بھی کر رہا ہے۔ لیکن یہ مخالفت اس وقت تک بے کار ہے جب تک ان اسباب کو دور نہ کیا جائے جو دنیا کو جنگ کی آگ میں دھکیل رہے ہیں۔ یہ اسباب اگر غور کیا جائے تو سیاسی سے زیادہ معاشی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آدھی سے زیادہ دنیا فاقے کرے گی اور طرح طرح کی تکلیف اُٹھائے گی تو جو ملک دولت مند اور خوش حال ہیں، وہ بھی چین کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔ اس وقت مغرب کے چند گنے چنے ملکوں کے سوا ساری دنیا معاشی بدحالی میں مبتلا ہے اور ان میں ایشیائی ملکوں کی حالت خاص طور پر بڑی ہی قابلِ رحم ہے لیکن یورپ کے ان سرمایہ دار ملکوں نے انسانیت دوستی کے تمام دعووں کے باوجود ایشیا کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یو این او کی دو کمیٹیوں، غذا اور زراعتی کمیٹی (ایف، اے، او) اور معاشی کمیشن برائے ایشیا و مشرقِ بعید (ای، سی، اے، ایف ای) میں پچھلے دنوں اس مسئلے پر غور کیا۔ معاشی کمیشن میں مارشل ایڈ کی طرح "ماسٹر پلین" کے نام سے ایک پنج سالہ پروگرام منظور ہوا ہے اور طے پایا ہے کہ ایشیا اور مشرقِ بعید کی معاشی بحالی اور صنعتی ترقی کے لئے ۲۰۰۰ ملین ڈالر کا فنڈ جمع کیا جائے اسی طرح ایف، اے، او میں ایشیائی ممالک کو زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایشیا کے بیشتر ممالک میں زراعتی پیداوار کے بڑھانے کے بہترین امکانات موجود ہیں۔ ان ملکوں میں صدیوں سے توسیعِ کاشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اگر سائنٹیفک ذریعے استعمال کئے جائیں تو صرف یہی نہیں کہ ایشیا کی غذائی حالت درست ہو جائے گی بلکہ یورپ کی غذائی حالت پر قابلِ لحاظ اثر پڑے گا۔ اس کے ساتھ جیسا کہ ہندوستانی ڈیلیگیٹ نے کہا ہے کہ جنگ کے زمانے میں تقسیمِ غذا کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہ بدستور جاری رہنا چاہیے اور اناج کے نرخ میں اتنی کمی کرنی چاہیے کہ غریب ممالک آسانی سے خرید سکیں۔

ویٹو کے چکّر سے نکلنا محال ہے

یو، این، او میں روس کو بھی شریک کرنے کے لئے اس کی یہ شرط مان لی گئی تھی کہ اس کو اور چار بڑی طاقتوں کو ویٹو (تنسیخ، ناطق) دیا جائے۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ بڑی غلطی ہوئی۔ اس حق سے فائدہ اُٹھا کر روس جس کارروائی کو چاہتا ہے التوا کر دیتا ہے۔ اور مغربی طاقتیں خود اپنے بنائے ہوئے جال میں کچھ اس طرح پھنس گئی ہیں کہ بظاہر اب اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک ۲۸ مرتبہ روس نے ویٹو استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کئی مرتبہ اس نے اس حق کو اپنی حفاظت میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بارہا اس نے اس حق کا بیجا استعمال کیا ہے اور اس کی وجہ سے دنیا کی رائے عامہ اس کے خلاف ہو گئی ہے اور لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یو، این، او کی ناکامی کی بڑی وجہ روس کا ویٹو ہے۔ اگرچہ روسی نمائندے وشنسکی نے اس کا معقول جواب دیا ہے، اور انڈونیشیا اور فلسطین وغیرہ کی مثالوں سے اس الزام کی تردید کی ہے لیکن روس کے ویٹو سے، یورپ کے بڑے بڑے معاملات کے حل میں جو اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں اور روس اور مغربی طاقتوں کے اختلاف کی خلیج جس قدر وسیع ہو گئی ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نیز ویٹو جمہوریت کی روح کے، جس کا علمبردار روس اپنے آپ کو کہتا ہے، سراسر خلاف ہے۔ مثلاً پچھلی مرتبہ برلن کا مسئلہ پیش ہوا تھا، تو روس اور یوکرائن کے علاوہ تمام ممالک اس کے حق میں تھے مگر روس کے صرف ایک ویٹو نے تمام رایوں کو بے کار کر دیا۔ رہی یہ اندیشہ صحیح ہے کہ یو، این، او میں مغربی طاقتوں کی بھاری اکثریت ہے اگر ویٹو کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہوگی تو حفاظتی کونسل میں روس کی آواز، نقارخانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائے گی۔ ممکن ہے روسی نمائندے وشنسکی کا یہ الزام بھی صحیح ہو کہ یو، این، او میں روس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور یہ ادارہ روس کے خلاف سازش کرنے والوں کا ایک اڈہ ہوگیا ہے اگر یہ شکایتیں صحیح ہیں تو روس کے لئے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جہاں تک ممکن تھا کبھی کبھی دب کر بھی، بڑے بڑے مسئلوں کو حل کرنے میں پورے تعاون اور اشتراکِ عمل سے کام کرتا اور اگر واقعی مغربی طاقتیں محض اپنی اکثریت سے کام لیتیں۔ تو ایسے موقع پر روس الگ ہو جاتا تو دنیا کی اخلاقی حمایت اُسے حاصل ہوتی۔ مگر موجودہ صورتِ حال نہ تو روس کے لئے مفید ہے اور نہ یو این او کے لئے

ابھی حال میں یو، این، او کی چھوٹی پولٹیکل کمیٹی میں چار بڑی طاقتوں کی یہ تجویز پاس ہوگئی ہے کہ ایسے مسائل میں جن کا تعلق طریقِ کار سے ہو ویٹو کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ ان مسائل کی تعداد بھی بتا دی گئی ہے۔ جو ۳۵ ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ بھی اصل مسئلے کا حل نہیں ہے۔ حفاظتی کونسل میں جس وقت یہ مسئلہ زیرِ بحث لانے کی کوشش کی جائے گی تو روس ویٹو کا تیر ستم ہوئے خیر مقدم کے لئے تیار ہوگا۔ اب تو اس گتھی کو سلجھانے کی کنجی روس کے ہاتھ میں ہے مغربی طاقتوں کے لئے اس کنجی کو چھین لینے کی کوئی قانونی صورت نظر نہیں آتی۔

انڈونیشیا کی گفتگو ٹوٹ گئی

انڈونیشیا اور ڈچ حکومت کے درمیان سمجھوتے کی جو بات چیت ہو رہی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ ریپبلکن وزیرِ اعظم ڈاکٹر ہٹا اور ڈچ نمائندوں میں تقریباً تمام اہم مسائل پر اختلاف تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اختلاف ڈچ اور انڈونیشیا کی فوجوں کی مشترکہ کمان پر تھا۔ اور دراصل بات اسی پر ٹوٹی ڈاکٹر ہٹا چاہتے تھے کہ انڈونیشیا کی ڈچ فوج بھی انڈونیشیا کی قومی حکومت کے مقرر کئے ہوئے کمانڈر انچیف کے ماتحت رہے۔ مگر ڈچ نمائندے اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اگرچہ ڈیلیگیشن کے لیڈر مسٹر سٹین نے جاتے وقت امید ظاہر کی ہے کہ جلد ہی پھر گفتگو ہوگی مگر جب تک نقطۂ نظر کا یہ شدید اختلاف موجود ہے۔ اس وقت تک کامیابی کی امید [illegible] کا خیال ہے کہ ڈچ حکومت یا تو انڈونیشیا کے بغیر ہی نگراں حکومت بنائے گی یا پھر وہ دوبارہ پولیس کارروائی کرے گی۔ ع، ل

مرحلے

روشؔ صدیقی

جہانِ آب و گل، اربابِ جاں کی آزمائش ہے
یہ بت خانہ ترے حسنِ گماں کی آزمائش ہے

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح، خضرِ کارواں کی آزمائش ہے

سہارا لے لیا ہے زندگی نے فکرِ درماں کا
سکونِ دردمندانِ جہاں کی آزمائش ہے

حرم نادیدہ۔ بت خانہ گریزاں، برہمن رہبر
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے

سنبھلنا اے دلِ حسرت زدہ، اب اس کی محفل میں
فغاں کے ساتھ، آدابِ فغاں کی آزمائش ہے

گوارا کر رہا ہوں، قیدِ زندانِ حوادث کو
سمجھتا ہوں دلِ بے خانماں کی آزمائش ہے

گریزاں ہو رہا ہے دامنِ شب، شمع لرزاں ہے
کسی کے وعدۂ نامہرباں کی آزمائش ہے

زمانے کا تغافل ہو کہ خود اپنی کم آمیزی
بہر صورت، خلوصِ دوستاں کی آزمائش ہے

بہار آتے ہی حسنِ لالہ و گل خود عیاں ہوگا
خزاں تک ہی نقابِ گلستاں کی آزمائش ہے

غمِ انساں، سکوتِ مرگ سے مانوس کیا ہوتا
خدا وندا! حیاتِ جاوداں کی آزمائش ہے

بہت الزام تھے اب تک مری پرہیزگاری پر
مگر اب دامنِ پیرِ مغاں کی آزمائش ہے

سمجھتا کوئی ہے در پردہ دل کو دیکھنا ہے یہ
مرا خاموش رہنا، آسماں کی آزمائش ہے

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
تمھارے التفاتِ ناگہاں کی آزمائش ہے

بہت میں نے ستم ہائے جہاں کے ناز اٹھائے ہیں
مری آشفتگی، سارے جہاں کی آزمائش ہے

بہت ہی ناتواں ہیں شعلہ ہائے شمعِ آزادی
روشؔ! اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے

غزل

مرزا احسان احمد

حریمِ حسن میں رکھ کر قدم، دل پر نظر کیسی
جمالِ حق کے آگے نقشِ باطل پر نظر کیسی

یہاں ہر گام پر درکار ہے ایثار و جانبازی
جنونِ عشق میں یہ سود و حاصل پر نظر کیسی

خبر تجھ کو نہیں، ذوقِ طلب برباد ہوتا ہے
بڑھائے جا قدم اپنا، یہ منزل پر نظر کیسی

ترے ذروں میں گرمِ رقص ہے، خود برقِ لاہوتی
پریشاں ہو غبارِ قیس، محمل پر نظر کیسی

جمال گوہرِ مقصود کیا آئے نظر تجھ کو
سمٹتے ہیں یہ بازو کیوں یہ ساحل پر نظر کیسی

نگاہیں کر فروغِ جلوۂ بے رنگ سے روشن
یہ خورشید و مہ و انجم کی محفل پر نظر کیسی

سمجھ ان کے زرا رنگِ نوازش ہائے پنہاں کو
یہ حسرت سے شکستِ شیشۂ دل پر نظر کیسی

تری فطرت میں ہے سرمستی سیلِ رواں مضمر
خود اپنی راہ پیدا کر، وسائل پر نظر کیسی

یہ اہلِ ہوش و حکمت میکدے میں دیکھتے آ کر
کہ دیوانے بھی رکھتے ہیں مسائل پر نظر کیسی

رگِ جاں میں تری اک برقِ عالم سوز ہے پنہاں
یہ انبارِ خس و خاشاکِ باطل پر نظر کیسی

غزل

آلِ احمد سرورؔ

غمِ جاناں غمِ دوراں کے ہیں کتنے نشتر
لیکن اب بھی میرے سینے میں لہو باقی ہے

قیدِ گیسو کے سوا اور ہیں قیدیں کیا کیا
سرکشی کی ترے عشاق میں خو باقی ہے

جن کا تھا مجھ کو جنوں یہ وہ بہاریں تو نہیں
میری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

آج شعلوں کی لپک ہے نہ شراروں کا وہ رقص
خاک میں میری مگر ذوقِ نمو باقی ہے

تلخیٔ زیست کے باوصف یہ کیا ہے کہ سرورؔ
فکر میں مستیٔ صد جام و سبو باقی ہے

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

مشتاق احمد

فساد ——— چیز بری تو ضرور ہے۔ لیکن کچھ اتنی بری ہو اور روح فرسا بھی نہیں اگر ڈھنگ اور سلیقے سے کی جائے اور اشتعال کے باوجود خوش مذاقی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے ہم جو اس لفظ سے اتنے چونکنے اور خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور اخبار کے صفحوں پر "کلکتہ میں فساد" کی سرخی دیکھ کر، زخم خوردہ ہرن کی طرح چوکڑی بھرنے کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فساد خود اتنا خطرناک ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جیسے ہماری زندگی کے روزمرہ کے کام مثلاً بحث مباحثے، مناظرے، شادی، بیاہ یہاں تک کہ ہم لوگ میں مصافحات گفتگو کے طریقے بھی شعریت، ڈھنگ اور سلیقے سے عاری ہیں۔ اسی طرح ہمارے فساد کرنے کا طریقہ بھی خوش مذاقی اور نفاست سے خالی ہے۔ جسے چاہا جہاں پکڑ لیا اور چھرا گھونپ دیا نہ اس کا خیال کہ شکار بوڑھا ہے یا جوان، بچہ ہے یا عورت، نہ اس کا پاس کہ ہم یہ حرکت اپنے محلے میں کر رہے ہیں یا "چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا" کی ہتھیورتی کے مطابق شہر کے ہر محلے میں خدائی فوج دار بنے گھوم رہے ہیں۔ پھر چھرا بھونکنے یا پتھر سے سر پھوڑنے میں انتہائی پھوہڑ پن اور بدمزاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نہ آنکھ دیکھتے ہیں نہ کان، جہاں چاہا "دست شفقت" پھیر دیا۔ حالانکہ ہم میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے آٹھویں جماعت بھی پاس کی ہے "فرسٹ ایڈ" کی تعلیم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جسم کے جراحت پذیر حصے کون کون سے ہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم کی یہی تو خرابی ہے کہ ضرورت کے وقت کام آ کاٹ جاتی ہے!

تو جیسا کہ میں نے کہا یہ لفظ اتنا پر ہول یوں ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی قومی خصوصیت کے مطابق فساد کرتے وقت ذرا بہت ہی بے ڈھنگے پن اور بدمزاقی کا ثبوت دیتے ہیں نازک سی چیز سر کو پھوڑنے کے لئے اینٹ کا ادھا کافی ہے لیکن چلیں گے یہ گتے کا گماسے کر۔ مرغی کے ذبح کرنے کے لئے بھی چھری تیز کر لیں گے لیکن آدمی کو ذبح کرنے کی مہم پر اس شان سے روانہ ہوں گے کہ ہاتھ میں پرکھوں کے زمانے کی زنگ آلود تلوار اور بنیسی کے نیچے زنگ آلود چھری۔ بھلے آدمیوں سے اتنا بھی نہیں بن پڑتا کہ چلتے چلتے تو ذرا اسے تیز کر لیں۔ ابھی دہلی کے پچھلے فساد کا ذکر ہے کہ اتفاق سے میں کچھ ایسے ہی بھلے مانسوں کے نرغے میں گھر گیا۔ ایک صاحب جن کے چہرے سے وحشت نمایاں، زبان پر موٹی موٹی گالیاں، میری طرف تیزی سے جھپٹے اور چھرے کے پے بہ پے وار کرنے شروع کر دئے۔ آپریشن میرا ہو رہا تھا لیکن گھبراہٹ سے ہاتھ آپ کا بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ایک وار بھی جو قاعدہ کا لگا ہو پھر بھلا آدمی چھرا بھی ایسا چھانٹ کر لایا تھا جس کی نوک تک غائب تھی۔ وہ بدن میں ڈھنگ کے خوب صورت گول سوراخ کرنے کے بجائے بس گوشت کو اس طرح پھاڑ رہا تھا جیسے کوئی چاقو سے تربوز پھاڑے!

تو اگر اس مار پیٹ والے فساد میں ہم اتنی بدمذاقی بدسلیقگی کا ثبوت نہ دیں تو اس لفظ کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جانے والی کیفیت جاتی رہے گی۔ کیونکہ ہلکے قسم کے اور ذرا ڈھنگ کے فساد تو ہماری زندگی میں روزانہ ہی ہوتے رہتے ہیں، جنھیں ہم "جھگڑا" یا "تو تو میں میں" کہتے ہیں۔

مناظرے تو خیر اسی کے لئے مخصوص ہیں ہی۔ لیکن کیا شادی بیاہ اور بحث مباحثے میں بھی فساد کی شان نہیں پائی جاتی؟ کیا مہر کی رقم طے کرتے وقت لٹھم لٹھا کی نوبت نہیں آتی۔ رشتے ناتے نہیں ٹوٹ جاتے۔ آئی بارات واپس نہیں چلی جاتی۔ کیا دلھن کی بدائی گاؤں کے نوجوانوں کے مضبوط بازوؤں اور لاٹھیوں کی مدد کے بنا ہی ہو جاتی ہے؟ یہی حال بحث مباحثہ کا بھی ہے۔ کیا اپنی زبان کی تیغ جوہر دار، اور تیز و تند الفاظ کی گولیوں کی بوچھار سے ہم مخالف کا سینہ چھلنی چھلنی نہیں کر دیتے؟ اپنے اعتقاد، یقین خیال، رائے۔ یہاں تک کہ اپنے شک و شبہات کے لٹھ سے دوسروں کے یقین اور اعتماد کے ساغر کو چور چور نہیں کر دیتے؟ اپنی خداداد اور بے پناہ قوت تنقید سے بڑے بڑے آدمیوں کے کام کو چشم زدن میں خاک میں نہیں ملا دیتے؟ یہاں تک کہ دو آدمی آپس میں دوستانہ گفتگو بھی اتنے زور شور سے کرتے ہیں اور اس شد و مد سے ایک دوسرے کے خیال کی تائید کرتے ہیں کہ پڑوسیوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں راجندر کمار صاحب وہ اتنے زور سے رازدارانہ گفتگو کرتے ہیں کہ آس پاس تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ چند روز ہوئے وہ میرے ساتھ چاندنی چوک میں جا رہے تھے، انھوں نے مجھ سے ایک بالکل پرائیوٹ اور راز کی بات کہی لیکن اس بلند آہنگی کے ساتھ کہ راہ چلنے والوں نے گھبرا کر مڑ کر پیچھے دیکھا اور چوکڑی بھرنے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن ہمارے ہاتھوں کو اینٹ کے گموں اور زنگ آلود تلواروں سے خالی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے فساد تو ہم اٹھتے بیٹھتے روز چھوٹتے ہی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں اتنا بے ڈھنگا پن نہیں ہوتا، خوش مذاقی سے بالکل عاری نہیں ہوتے، نہ اتنے عالم گیر ہی ہوتے ہیں بلکہ ہر فریق اپنی اپنی برادری، فرقہ اور محلے کی حد میں رہتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے فساد اتنے پر ہول اور رونگٹے کھڑے کرنے والے نہیں ہوتے، اور ہم انھیں جھگڑا یا بحث کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن خدا بھلا کرے مصر کے فسادیوں کو کہ وہ مار پیٹ والے فساد میں بھی ڈھنگ، سلیقہ اور نفاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سر پھوڑنے والے فساد بھی زندگی کے پر لطف جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ قاہرہ کی ایک گلی میں فساد ہو رہا ہے اور قریب ہی دوسری گلی میں برقعہ پوش عورتیں اپنے بچوں کے لئے کھلونے اور باورچی خانے کے لئے پیاز، لہسن خریدنے میں مشغول رہتی ہیں۔ انھیں اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ اس گلی والوں کو اس گلی میں فساد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس کا بھی پورا یقین ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی طرح اس گلی والے اتنی غیر شاعرانہ ذہنیت نہیں رکھتے کہ چونکہ اس گلی والے فساد کر رہے ہیں لہٰذا ہم بھی اس کا سلسلہ شروع کر دیں۔ فسادی اتنے باسلیقہ اور وقت کے پابند ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم فلاں وقت اور فلاں جگہ فساد کریں گے چنانچہ وقت کی پوری پابندی کے ساتھ مقررہ جگہ پر فساد شروع ہو جاتا ہے اور یہ نہیں کہ فساد شروع ہو گیا تو بس اس کی لاش پر گدھ کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ کھانے کا وقت آ گیا، اپنے اطمینان سے فساد کے پروگرام کو ختم کر ہوٹل میں گھس گئے یا دنبہ کی لاش سے چمٹ گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ابھی کچھ ہی دن ہوئے ایک غیر ملکی صاحب کی ایک مصری فسادی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انھوں نے اس فسادی کی ذہنی کیفیت کو بڑے پر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ بچارے غیر ملکی فساد کے پروگرام کی خبر تھی نہیں گھومتے پھرتے شام کے قریب ضلع عماد الدین کے ایک شہر میں جا نکلا۔ سر شام ہی اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لگ بھگ ساری دکانیں بند ہیں، صرف مصریوں کی چند شراب کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ اتنے میں پولیس کا ایک جوان سر پر ٹین کا خود رکھے ایک ہاتھ میں ڈھال سنبھالے دوسرے میں لاٹھی تولتا ہوا ایک طرف کو تیزی سے لپکا۔

غیر ملکی صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک گلی میں مڑا۔ گلی بالکل سنسان تھی، سوائے ایک بھلے مانس کے جو جسم پر ایک سفید چغہ ڈانٹے سر پر ترکی ٹوپی جمائے، ایک ہاتھ میں اینٹ کا ادھا لئے کچھ گھبرائے کچھ پریشان، نیم فیصلہ کن انداز میں گلی میں پریڈ کر رہے تھے۔

"سیدا" (آداب عرض) میں نے کہا۔

"سیدا" فسادی نے شرافت سے جواب دیا۔

وہ کچھ اتنا نراس تھا اور اتنی تنہائی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے سوچا کہ لاؤ اس کی کچھ مدد کر دوں۔

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کس کی تاک میں ہیں آپ؟"

"کسی مخصوص آدمی کی نہیں" اس نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ ......" میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، چنانچہ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ "فساد" راستہ بھول گیا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"اے وا" (بالکل یہی) اس نے نرمی سے جواب دیا۔

میرا دل ذرا نرم واقع ہوا ہے، مجھے یہ دیکھ کر رحم آیا کہ بے چارا فسادی فساد کی کھوج میں سرگرداں ہے اور فساد صاحب لاپتہ۔ غریب اس اینٹ کے ادھے کو مفت میں ڈھوئے ڈھوئے پھر رہا ہے۔

میں نے خوش ہو کر کہا "میرا خیال ہے کہ اس وقت سلیمان پاشا میں ضرور فساد ہو رہا ہوگا۔ اگر آپ وہاں تشریف ......"

اس نے انکار میں سر ہلایا، اور مجھ اجنبی پر ترس کھاتے ہوئے مسکرایا، گویا وہ بہ زبان خاموشی مجھ سے کہہ رہا تھا:

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مچھر

سخی حسن نقوی

سب جانتے ہیں کہ موسیقی ایک جادو ہے۔ پھر ہندوستان کی موسیقی فنی اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسے استاد گذرے ہیں جنہیں اپنے فن میں اتنا کمال حاصل تھا کہ دیپک راگ چھیڑتے تو آگ لگ جاتی اور میگھ راگ الاپتے تو مینہ برسنے لگتا تھا۔ لیکن ہم بیسویں صدی میں رہنے والوں کو یہ سب باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اسی لئے کچھ لوگوں کا یہ خیال درست نہیں۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آج کل مذاق بدل گئے ہیں، لیکن یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ موسیقی رو بہ زوال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذاق ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اسی لئے یہ بھی ممکن ہے کہ آج کل لوگوں کا رجحان فنی موسیقی سے ہٹ کر فلمی گانوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دراصل کسی فن کی ترقی یا تنزل سرپرستوں پر منحصر ہے جو خوش قسمتی سے فن موسیقی کو ہر زمانہ میں حاصل رہے۔ بہت پرانے زمانے میں گپت شاہوں نے اور درمیانی دور میں مغلوں نے اس فن کی سرپرستی کی۔ دورِ حاضرہ میں اس کام کو میونسپلٹیوں نے سنبھال لیا ہے چنانچہ آج کل کی موسیقی کا تان سین مچھر ہے جو اپنے گانے سے دن رات ہماری تواضع کرتا رہتا ہے۔ فرض کیجئے کسی وقت میں خدانخواستہ موسیقی کے اہل فن کا فقدان بھی ہو جائے تو گھبرانے کی بات نہیں، کیونکہ ماشاء اللہ استاد مچھر سین بہرحال کہیں جانے والے نہیں ہیں اور اب تو میونسپلٹیوں کے حسن انتظام سے ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مچھر اپنا سریلا نغمہ رات کو سنانے کا عادی ہے، اول تو مچھر کئی کئی مچھروں کے ساتھ کورس میں گانا پسند کرتا ہے اور جب تنہا گاتا ہے تب بھی اس قدر خود اعتمادی کے ساتھ گاتا ہے جیسے آپ بس اسی کا گانا سننے کے لئے گوش بر آواز تھے۔ قدرت نے ہر ذی روح میں علیحدہ صلاحیت رکھی ہے۔ مچھر کو صرف کان میں گانے کا ملکہ عنایت کیا ہے۔ اس کے گانے کو ہم ایک کان سن کر دوسرے کان نہیں اڑا سکتے۔ کیونکہ جب ہم اسے ایک طرف سے رخصت کرنے کے لئے "شب بخیر" کہتے ہیں تو وہ جھٹ دوسرے کان میں آکر وہ راگ الاپنے لگتا ہے۔ یہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ یہ وہی مچھر ہے یا کوئی اور۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بعض اوقات کان کے دروازہ پر گانے والوں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ گویا کان پور میں شادی رچائی جا رہی ہے اور باہر بھانڈوں کا ناخواندہ گروہ انعام مانگنے کھڑا ہے۔

گانا بجانا مچھر کا ایک شوقیہ مشغلہ ہے جس سے وہ کبھی کبھی دل بہلا یا کرتا ہے۔ ورنہ اس کا آبائی پیشہ سپہ گری ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اس کے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔ بے شک وہ ایک بہادر سپاہی کی طرح جان جوکھوں میں ڈال کر ہر وقت انسان جیسے قوی الجثہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ لیکن وہ عربی طرز کی انفرادی لڑائی کا قائل ہے۔ میدان میں آکر رجز خوانی کے بعد فوراً مبارز طلبی کرتا ہے اور پھر جنگ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کی ہمت، دلیری اور عالی ظرفی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ تنہا حملہ کرتا ہے اور وار کرنے سے پہلے ہمیشہ حریف کو خطرہ کی اطلاع دے دیتا ہے۔ دشمن کو آگاہ کئے بغیر حملہ کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کا حملہ نہایت خطرناک ہوتا ہے جس کا جواب دینا مذاق نہیں ہے۔ اچھے اچھے پہلوان اس کے سامنے کان ٹیک چکے ہیں۔ انسان تو خیر چیز ہی کیا ہے مچھر کی وہ ذات ہے جس کے مقابلے میں شیر جیسا خونخوار درندہ پناہ مانگ چکا ہے۔ وہ چاہے تو آپ سے ناک رگڑوا سکتا ہے۔ کبھی آپ کو کان کھجانے پر مجبور کر دے۔ کبھی ران، کبھی آپ داہنی کروٹ لیں، کبھی بائیں۔ اس کی مرضی ہو تو ذرا سی دیر میں آپ کو لہو لہان کر دے۔ آپ سر سے پاؤں تک زخموں میں چور چیختے ہی رہیں اور وہ آپ کی ہیئت کذائی پر قہقہے لگایا کرے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان بغیر ہاتھ پاؤں مارے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اپنی سی وہ بھی کرتا ہے۔ جھنجھلا جھنجھلا کر مچھر پر وار کرتا ہے۔ لیکن مچھر ایک ماہر کھلاڑی کی طرح بپھرے ہوئے سانڈ کے حملے کو خالی دے کر اس طرح پینترا بدلتا ہے کہ وار خود اپنے اوپر آ جاتا ہے۔ انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک منظر کوئی نہیں۔

انسان اگر عاجز ہے تو مچھر کے مقابلے میں۔ آج انسان نے دنیا کی ہر چیز کو تسخیر کر لیا ہے، آگ پانی، ہوا سب اس کے قبضے میں ہیں نہیں تو مچھر۔ اب تک جو طریقے مچھر پر قابو پانے کے لئے ایجاد ہوئے ہیں وہ اس کو مارنے میں نہیں صرف دور بھگا دینے میں کامیاب ہوئے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا کہ "فلٹ" قسم کی دوائیاں سب بیکار ہیں۔ ان سے مچھر چند گھنٹوں کے لئے ادھر ادھر چھپ جاتا ہے، مرتا نہیں ہے۔ "اگر" اور "لوبان" کی دھونی سے انھوں نے بھاگنا چھپنا بالکل چھوڑ دیا۔ کیونکہ آپ سمجھئے، پھر بھی ایٹم کے دور میں رہنے والا مچھر ہے اور ان دقیانوسی طریقوں سے کب کا واقف ہو چکا ہے۔ رہ گئی مچھر دانی اس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ مچھر ہم سے دور رہیں۔ لیکن مچھر کو اس کے اندر گھسنے کا طریقہ ایجاد کئے عرصہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد مچھر اس کے اندر ایسا پھنستا ہے جیسے چوہے دان میں چوہا۔ پھر جو مچھر ایک بار اندر چلا جاتا ہے وہ کاٹ کاٹ کر قیمہ سی تو کر ڈالتا ہے۔ گویا مچھر دانی خود اپنے پھانسنے کا جال بن جاتی ہے۔ سنتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں مچھر ہوا سے بھاگا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کے مچھروں نے حفظان صحت کے جدید اصول پر کاربند ہو کر اپنا قد و قامت اور وزن اس قدر بڑھا لیا ہے کہ پچھتر فی صدی مچھر بہت تیز آندھی کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کو بہت موٹے تازہ مچھر دیکھنے کا اشتیاق ہو تو علی گڑھ چلے جائیے جہاں مچھروں کی پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ علوم کی طرح علی گڑھ بہترین قسم کے مچھروں کا مرکز اور یونیورسٹی مچھروں کا اعلیٰ ترین پہلوان بنانے کی بہترین نرسری ہے۔

اپنے پیدائشی قیام کو بھول جانا ایک کمزوری ہے جو انسان اور مچھر میں یکساں پائی جاتی ہے۔ مثلاً گاؤں کے کسی مفلس گھر میں پیدا ہونے والا آدمی جو کسی بڑے سے عہدے پر پہنچ جاتا ہے وہ اپنے گھر، عزیزوں، حتیٰ کہ ماں باپ تک کو بھول جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال مچھر کا ہے۔ مچھر شہر کی گندی نالیوں اور کوڑا گھروں میں جنم لیتا ہے۔ لیکن وہ بہت جلد اس گندہ جگہ کو چھوڑ کر عمدہ، ور نفیس مکانوں میں رہنے لگتا ہے۔ اسے گندگی سے سخت نفرت ہے۔ اسے امیروں کے سجے سجائے عالی شان مکانوں پر قبضہ کرنے میں مزا آتا ہے۔ اگر آپ کو مچھروں کی کسی "نئی بستی" کی زیارت کرنی ہو تو کسی دن کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑے کو معمولی سی جنبش دے دیجئے۔ مچھروں کا جم غفیر آپ کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔

مچھر اور انسان کی دشمنی بہت پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری مچھر پر ہے۔ لیکن مچھر کے نزدیک اس کا الزام انسان کی گردن پر ہے۔ مچھر کا کہنا ہے کہ اخباروں پر چونکہ انسان کا قبضہ ہے اس لئے اسے مچھروں کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا خوب موقع مل گیا ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اس میں تھوڑا تھوڑا قصور دونوں ہی فریق کا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ آخر مچھر ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔ غالباً اس سے زیادہ تو اس کا تصور نہیں کہ وہ ہمارے خون کی ایک معمولی بوند نکال کر اپنے جسم میں ڈال لیتا ہے اور بس۔ سو یہ بہت سے انسان بھی کرتے ہیں بلکہ وہ تو اپنے بھائیوں کا خون چوس چوس کر ادھ مرا کر دیتے ہیں۔ ہر طاقتور کمزور کو دباتا ہے، امیر غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔ زمیندار کاشتکار کو ستاتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدوروں کا گلا گھونٹتے ہیں اور ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے۔ پھر مچھر بیچارے کی کیا شکایت!

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی تو سوچنا ہے کہ ہمارے خون کا وہ معمولی قطرہ ہی اس کی واحد غذا ہے اسی کے سبب سے وہ جیتا ہے اور وہی اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ نہ وہ بے ضرورت مانگتا ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ مانگتا ہے۔ ایک بوند گھٹ جانے سے ہم دُبلے نہیں ہوتے۔ البتہ وہ موٹا ہو جاتا ہے۔ ہمارا وزن کم نہیں ہوتا اس کا بڑھ جاتا ہے۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اسے فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر باہمی مفاہمت کی اس سے بہتر کون سی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم مچھر کے سامنے خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیں۔ اگر ہم واقعی بڑے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اپنے طرز عمل سے ایثار کی تعلیم دیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مچھر کے مقابلے میں غیرت اور وقار قائم رکھنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔

ہندوستان (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

وسائل موجود ہیں۔

"اب میں مہاسبھا کی طرف آتا ہوں۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد مہاسبھا کے چھکے چھوٹ گئے ....
اس نے یہ دانش مندانہ فیصلہ کیا کہ سیاست کو ترک کر دے اب ۸، ۱۰ مہینے بعد وہ پھر اپنا پروگرام بدل رہی ہے اور سیاست میں داخل ہونا چاہتی ہے ....
ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں فرقہ وارانہ جماعتوں کو سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھنے دیں گے ....
ہم ضرور چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لے۔ مگر اس کا نقطہ نظر فرقہ پرستانہ نہیں بلکہ سیاسی ہونا چاہئے۔

ع، ح

ایران کا تعلیمی نظام (۲)

عبدالحلیم ندوی

ایران میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا اور اب اس کا رواج بہت عام ہو گیا ہے لیکن لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں تھوڑا سا فرق رکھا گیا ہے۔ چنانچہ لڑکے فارسی رسم الخط، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ (خصوصاً ایران کا) اور ابتدائی عربی پڑھتے ہیں۔ لڑکیوں کے نصاب میں چند درسی مضامین کم ہیں اور ان کے بجائے سینا، پرونا اور ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے۔ نصاب تعلیم میں جو کتابیں مقرر ہیں ان کو وزارت تعلیم اپنی نگرانی اور انتظام میں چھپواتی ہے اور یہی سارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ پورے قومی منصوبے تعلیم میں مکمل یکسانی ہم آہنگی اور اتحاد برقرار رہے اور اس اسکیم پر سختی سے عمل بھی کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کے مدرسوں کی طرح ایرانی مدرسوں میں طلبہ کو سالانہ ترقی نہیں ملتی۔ بلکہ یہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب طالب علم چھ سال کی مدت ان مدرسوں میں گزار لیتا ہے اور مقررہ نصاب تعلیم ختم کر لیتا ہے تو خود بخود آخری جماعت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس جماعت میں پہنچنے کے بعد معمولی استعداد کے طالب علم کو بھی ثانوی کے داخلے کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت مل جاتی ہے۔ جب تک کوئی طالب علم اس مدرسے کا سرٹیفکٹ نہ حاصل کرے اسے کوئی بڑی ملازمت نہیں مل سکتی۔

برخلاف ابتدائی تعلیم کے ثانوی تعلیم لازمی نہیں ہے۔ ابتدائی مدارس سے صداقت نامے حاصل کئے ہوئے طلبہ کو بھی چھوٹی موٹی نوکریاں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ثانوی کا نصاب تعلیم ۱۹۲۸ء میں پہلے پہل مرتب ہوا۔ یہ نصاب چھ سال میں ختم ہوتا ہے جب طالب علم یہ مدت پوری کر لیتا ہے تو یونیورسٹی میں داخل ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں اگر یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہیں تو انھیں آخری سال "داخلہ یونیورسٹی" کا ایک خاص نصاب پڑھنا پڑتا ہے۔ ان مدرسوں میں شروع کے تین سال کا نصاب تو سب کے لئے عام ہے لڑکے لڑکیوں سبھی کو زبانیں، ریاضی، سائنس، جغرافیہ اور تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور لازمی مضامین کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ بھی کچھ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، چنانچہ لڑکوں کو علم طبیعیات، علم کیمیا، اور اعلیٰ ریاضی پڑھائی جاتی ہے اور لڑکیوں کو بنیادی سائنس، تربیت اطفال اور سینا پرونا۔ خالی اوقات میں کھیل کود، موسیقی اور دوسرے تفریحی مشاغل کا پروگرام ہوتا ہے۔

ایران میں ثانوی تعلیم مفت نہیں دی جاتی۔ لیکن فیس بہت کم رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ حکومت کے ادنیٰ ملازمین کے لڑکوں اور ابتدائی میں امتیاز سے امتحان پاس کرنے والے لڑکوں کو رعائتیں بھی دی جاتی ہیں۔ ثانوی کی اس ادنیٰ مدت تعلیم کو پوری کر لینے کے بعد طالب علم ثانوی اعلیٰ میں داخلہ لے سکتا ہے، کسی ٹکنیکل اسکول میں جا سکتا ہے یا اگر وہ ملازمت کرنا چاہے تو اول درجے کی ملازمت بھی مل جاتی ہے۔

ثانوی اعلیٰ آخری تین سال، درجہ تخصیص ہے۔ اس تین سالہ نصاب کا اہم مقصد یہ ہے کہ طالب علم یونیورسٹی یا پیشہ کی تعلیم کے اعلیٰ مدرسے میں داخلہ کی تیاری کرے۔ اس کے علاوہ اس کی سند لینے کے بعد حکومت کی دوسرے درجے کی ملازمت کا بھی حق مل جاتا ہے اور جرمنی، فرانس اور بعض برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں میں داخلہ بھی ہو جاتا ہے۔ نصاب کو دو اہم حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک آرٹ کا حصہ دوسرا سائنس کا۔ ادب میں عربی، فارسی غیر ملکی زبانیں تاریخ جغرافیہ اور فلسفہ پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں ریاضی علم طبیعیات، کیمیا، سائنس اور کسی غیر ملکی زبان کی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس تعلیم کو مکمل کر لینے کے بعد حصہ ادب کے طلبہ یونیورسٹی کے شعبہ ہائے ادب یا قانون میں داخلہ لے سکتے ہیں اور سائنس کے طلبہ شعبہ سائنس ٹکنیکل یا میڈیکل میں جا سکتے ہیں۔ یا اگر وہ چاہیں تو ان اعلیٰ مدارس میں داخلہ لے سکتے ہیں جن کا بنیادی اور اہم مقصد اساتذہ کی تربیت ہے۔ ثانوی کے ان مدارس کے علاوہ انہیں جیسے اور دوسرے مخصوص فنون کے بھی الگ الگ مدارس ہیں۔ مثلاً کمرشیل اسکول، ٹکنیکل اسکول، مذہبی مدارس۔ ان سب مدرسوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ حسب صلاحیت اور رجحان طلبہ کو یونیورسٹی کے شعبوں کے لئے تیار کریں اور اسی کے ساتھ کسی نہ کسی پیشے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک میں استانیوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب لڑکیاں فن تعلیم میں اختصاص اور نفسیات کی تعلیم مکمل کر لیتی ہیں تو ان کو مستند استانیاں مان لیا جاتا ہے دوسری صورت میں ان کو ایک خاص نصاب پڑھ کر "داخلہ یونیورسٹی" کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے یا کسی ٹریننگ ہائی اسکول سے ڈگری یا نرسنگ کے مختلف کالجوں کے امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے نہیں جانا چاہتیں ان کے لئے ابھی حال ہی میں ایک دو سالہ مخصوص نصاب مقرر کیا گیا ہے جس میں مقررہ مضامین کے علاوہ دستکاری گھرداری۔ تربیت اطفال اور حفظان صحت کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

طہران یونیورسٹی کا ضابطہ ۳۰ مئی ۱۹۳۴ء کو منظور ہوا ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کی مبارک تاریخ کو جو متمدن ایران کا ایک درخشاں دن ہے۔ رضا شاہ پہلوی نے اپنے ہاتھوں سے اس یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا اس وقت سے کر آج تک اس کا "یوم تاسیس" پورے ملک میں تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بہت عمدہ اور عالی شان نقشے بنائے گئے اور شروع ادب، سائنس علم الادویہ، قانون اور صنعت، ۵ شعبوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ پھر ایک چھٹے شعبہ "دینیات" کا اضافہ مسجد سپہ سالار میں ہوا جس کی تعمیر ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی ساتواں شعبہ فنون لطیفہ کا ابھی حال ہی میں بڑھا ہے۔ شعبہ طب کی مرکزی عمارت کی تکمیل مارچ ۱۹۳۹ء میں اور شعبہ قانون کی ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ ان کے علاوہ دوسری عمارتیں جن میں طلبہ کے کلب کی عمارت، قہوہ خانہ اور دار الاقاموں کی عمارتوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یونیورسٹی کے ان شعبوں کے پاس اپنے کتب خانے ہیں جن میں ۱۵ ہزار سے زائد کتابیں رہتی ہیں۔ ان شعبوں کو اپنے نصاب کی کتابیں خود چھپوانے کی سہولتیں حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں۔ یونیورسٹی کی نگرانی ایک بورڈ کرتا ہے جو پرنسپل نائب پرنسپل، شعبوں کے صدروں اور شعبے کے نمائندہ پروفیسر پر مشتمل ہوتا ہے اس بورڈ کے علاوہ ہر شعبہ کا اپنا الگ بورڈ بھی ہے جس میں اس شعبہ کے پروفیسر اور لیکچرر ہوتے ہیں یونیورسٹی میں چند غیر ملکی اساتذہ بھی ملازم ہیں۔ ایرانی اساتذہ میں سے تقریباً سب یورپ کے تربیت یافتہ ہیں۔ طلبہ میں ایرانیوں کے علاوہ عراق کے شہر نجف، استنبول، ہندوستان اور سوویٹ یونین کے شائقین علم بھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ نادار طلبہ کو عموماً مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد دار الاقاموں میں رہتی ہے۔ طہران یونیورسٹی کے علاوہ صوبوں میں بھی یونیورسٹیاں قائم کرنے کی تجویزیں زیر غور ہیں۔

ادھر کچھ زمانے سے طہران میں دوا سازی کے اسکولوں اور صنعتی کارخانوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے چنانچہ دوا سازی کے شعبے میں داخلہ لینے کے لئے ایک الگ نصاب تعلیم مرتب ہوا ہے جس کی مدت تعلیم ایک سال ہے۔ اس کے بعد اصلی نصاب تعلیم شروع ہوتا ہے جو پانچ سال میں ختم ہوتا ہے اسی اسکول میں نسخہ بندی اور دندان سازی کے اسکول بھی اب ملحق کر دیئے گئے ہیں۔ فن صنعت کا نصاب چار سالہ ہے۔ اس میں کیمیا، مشینری، بجلی، سول انجینیرنگ اور کان کنی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

شعبہ قانون کا نصاب تین سال میں ختم ہوتا ہے جس میں وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو پہلے پولیٹکل سائنس کے کالج (۱۸۹۹ء) میں اور لا کالج (۱۹۲۱ء) میں اور کامرس کالج (۱۹۲۳ء) میں پڑھائے جاتے تھے۔ سائنس اور آرٹس میں (جو اعلیٰ استادوں کے مدرسوں سے ملحق ہیں) بالترتیب ۱۰ اور ۷ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ سند حاصل کرنے کے لئے سائنس کے شعبوں میں تین مضامین کے اندر اور آرٹس میں چار مضامین کے اندر کامیابی حاصل کرنی ضروری ہے۔ فنون لطیفہ میں طلبہ کو اختیار ہے چاہیں تو فن تعمیر لیں، چاہیں تو مصوری یا نقاشی۔ آخر میں ایک تین سالہ دینیات کا بھی نصاب ہے جس میں فلسفہ، مذہب اور ادب کی تعلیم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کے بعد طلبہ تیسرے درجے کی ملازمت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

جدید منصوبہ تعلیم سے پہلے جو طلبہ کو باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اب یونیورسٹی ان کی طرف خاص دھیان دے رہی ہے۔ چونکہ ایران میں ماہرین کی کمی بہت ہے اس لئے غیر ملکی تربیت اب بھی بہت سے مضامین کے لئے ضروری اور اہم سمجھی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک جو طلبہ یورپ میں تربیت کے لئے گئے، ان کے سامنے کوئی خاص اسکیم یا مقصد نہیں تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اس طرف خاص توجہ دی گئی اور دس لاکھ ریال کی رقم صرف اس کام کے لئے منظور ہوئی۔ اس کے بعد چھ برس تک کے لئے اسی قدر رقم اور منظور ہوئی چنانچہ اس رقم سے ہر سال ۱۰۰ طالب علم ہر سال باہر بھیجے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت جنگ اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے خرچ سے طلبہ کو بھیجتے رہتے ہیں اپنے ذاتی خرچ سے جانے والوں کی بھی تعداد خاصی ہوتی ہے۔

(باقی)

ڈاکٹر شاردا

(۲)

احمد حسن عثمانی

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ شاردا اپنے مریضوں کو دیکھنے کے بعد اوپر اپنے کمرے میں آ چکی تھی اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور گیلری میں آ گئی۔

ستارے ایک ایک کر کے چمکنے لگے تھے، اور ٹھنڈی ہوا کے جاں فزا جھونکے چل رہے تھے۔

نیچے کے کمرے سے کسی بچے کے رونے کی مدھم آواز اوپر پہنچ رہی تھی ساتھ ہی کبھی کبھی نرسوں کے بہلانے کی آواز بھی آ جاتی ——— لیکن یہ آوازیں کسی خواب پریشاں کی اڑتی ہوئی دھجیاں معلوم ہو رہی تھیں ——— اس غریب لڑکی کو جو منڈیر پر جھکی ہوئی خود ہی اپنے جگر پاش تصوریات کی تاریک دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ بڑی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑی رہی ——— بت کی طرح ——— اور اس وقت ہوش میں آئی جب کسی نرس کے قدموں کی تیز تیز چاپ نے اسے خواب سے بیدار کر دیا ———

"کیا ہے نرس؟ ——— کوئی ارجنٹ کیس ہے؟" اس نے ہانپتی ہوئی نرس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں، ڈاکٹر! یقیناً کوئی ارجنٹ کیس ہی ہے۔ نیچے ایک صاحب موٹر لئے کھڑے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ان کی بیوی سخت علیل ہے۔"

"بہت اچھا، میں پانچ منٹ میں آئی۔ تم اوزار اور بال وغیرہ اور سب سامان موٹر میں ٹھیک کر دو۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا میری سے کہہ دو کہ وہ مریضوں کی خبر گیری کرے۔ آیائیں اور دو نرسیں بھی اس کی مدد کریں گی۔ انھیں تاکید کر دو کہ خوب ہوشیار رہیں۔ کہیں سو نہ جائیں۔"

جلد جلد یہ ہدائتیں دے کر شاردا اپنے کمرے میں تیار ہونے چلی گئی ——— اور نرس بھی "بہت اچھا" کہتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

یہ واقعہ ایک ڈاکٹر کی زندگی میں انوکھا نہیں تھا۔ اس لئے شاردا نے اس پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ اس نے اپنی ماں کو جگایا اور کہا کہ وہ ایک "ارجنٹ کال" پر جا رہی ہے ——— اور ہاتھ میں آلہ لئے ہوئے نیچے اتر گئی۔

ایک شریف صورت انسان نیچے برآمدہ میں کھڑا اوپر سیڑھی تک رہا تھا۔ اس کا ہاتھ گھبراہٹ سے کانپ رہا تھا چھت سے بجلی کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی شاردا کا دل دھک سے ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی ——— وہ دل میں ایک ٹیس سی محسوس کرنے لگی اور دماغ پر ایک تکلیف دہ بوجھ۔

یہ وہی سری کرشن تھا ——— اس کا ممیرا بھائی ——— جس نے اس کے معصوم دل کو چند ہزار روپے کی حقیر رقم کے لئے کچل ڈالا تھا۔

شاردا چند لمحے خاموش ساکت کھڑی رہی ——— اپنے ہیجانی احساسات اور طوفانی جذبات کو ضبط کرنے کے لئے ——— اور جب وہ اچھی طرح ان پر قابو پا چکی تو اس نوجوان کی طرف بڑھی جس نے ابھی تک اس کو نہ دیکھا تھا۔

شاردا کے چہرے پر ضبط اور اطمینان تھا، جب اس نے سرد کاروباری لہجے میں کہا "میں تیار ہوں چلئے۔"

حیرت و استعجاب کی ملی جلی کیفیت میں وہ مڑ کر کہنے لگا ——— "ارے، معاف کیجئے گا۔ ڈاکٹر ——— میں نے آپ کو دیکھا نہیں ——— ہاں تشریف لے چلئے" ———

اس کی نگاہیں شاردا کے چہرے پر گڑ گئیں، اور اس کی آنکھوں میں پہچاننے کی کیفیت جھلک اٹھی۔ ملاقات کی اس غیر متوقع صورت نے اس پر بجلی سی گرا دی۔ اور وہ بے حس و حرکت رہ گیا۔

"تم ...... تم شاردا؟ ...... کیا تم شاردا ہو؟ ...... شاردا! ...... اس کی زبان سے یہ الفاظ گھٹے ہوئے اور ٹوٹتے ہوئے لہجے میں ادا ہوئے۔ شاردا ایک حقارت آمیز انداز سے ہنسی۔

"ہاں" اس نے آہستہ سے مگر صاف اور شستہ آواز میں کہا۔ "میں وہی غریب شاردا ہوں ——— تمھاری پھوپھی کی لڑکی ——— افلاس کی ماری ——— جس سے تم صرف روپے کی خاطر نفرت کرتے تھے ———

خیر! یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ——— موٹر میں آ جائیے۔ ہمیں چلنا چاہئے ———"

اس کے ساتھ ساتھ وہ موٹر میں ایک نرس کو لے کر بیٹھ گئی۔ سری کرشن بھیگی بلی کی طرح چپ چاپ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا۔ اور موٹر روانہ ہو گئی ———

دو ہفتے بعد ———

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ شاردا اپنے ٹیبل پر بیٹھی مریضوں کا نسخہ لکھ رہی تھی۔ ایک نسخہ اس نے میری کے سپرد کیا جو قریب ہی کھڑی تھی 'میری' اس نے کہا "اگر کوئی سبھدرا کے گھر سے آئے تو اس کو یہ نسخہ اور یہ چٹ دے دینا۔ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

وہ اوپر چلی گئی اور نہانے کے بعد ماں کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت سیڑھی پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

"پھوپھی" سری کرشن چلایا، جیسے ہی وہ کمرہ میں داخل ہوا شاردا کے غصہ اور نفرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اس پر حقارت بھری نگاہ ڈالی ——— مگر پھر فوراً ہی اس نے اس کی طرف سے نظریں موڑ لیں ———

غریب ضعیف سیتا ماں آنکھیں پھاڑے تکتی رہی ——— اس نوجوان کی طرف جس نے اس کو "پھوپھی" کہہ کر پکارا تھا۔ گذشتہ ۱۲ سال میں سری کرشن بہت بدل گیا تھا۔ اسی لئے اس کی کمزور نگاہیں اسے فوراً پہچاننے سے قاصر تھیں ——— ———

"کیوں پھوپھی! ...... کیا آپ مجھے نہیں پہچانتیں" اور وہ خصوصیت کے انداز سے اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔

مگر سیتا ماں کی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں ——— "ارے ...... ارے تم سری کرشن ہو؟ ...... ہاں ...... ہاں ...... سری کرشن ہی تو ہو ...... بیٹا تم کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ شاردا! یہ تمھارے ماموں کے لڑکے سری کرشن ہیں۔ کیا تم انھیں نہیں پہچانتیں؟"

غریب بوڑھی سیتا ماں کا چہرہ مسرت آفریں مسکراہٹ سے کھل گیا۔ ماضی کے دل خراش واقعات کو وہ بھول چکی تھی۔ ——— اور سچ مچ سری کرشن کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔

"میں اور سری کرشن کو نہیں جانتی ——— میں نے تو فوراً پہچان لیا۔" ——— شاردا نے حقارت اور طنز کے ساتھ جہاں تک اس سے ممکن تھا کہا ——— اور وہ کھانے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیتا ماں ابھی ہنس ہنس کر بول رہی تھی۔ شاردا نے ہاتھ دھویا اور کمرہ سے باہر نکل گئی ———

وہ ایک کتاب لے کر اپنے کمرہ کی کھڑکی پر چپ چاپ بیٹھ رہی۔ کتاب اس کی گود میں کھلی تھی اور اس کا ذہن ماضی کے کہر میں مصروف سفر تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے عہد رفتہ کے تمام واقعات سیلاب کی طرح امنڈنے لگے ——— اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ———

چند منٹ بعد سری کرشن اپنی پھوپھی سے باتیں کر کے باہر کے کمرہ میں آ گیا اور اس نے کہا "شاردا! یہ تمھاری فیس ہے" اور اس نے نوٹوں کا ایک ٹھوک اس کے سامنے بڑھایا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں ایک اشارہ۔

شاردا زخمی شیرنی کی طرح اچھل پڑی اور آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہاتے ہوئے صاف مگر سرد لہجے میں بولی ———

"شاردا ...... مجھے شاردا نہ کہو ——— میں نے یہ نام بہت ہی عزیز دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے ——— اور تم اس دائرہ سے باہر ہو۔ ——— تمھارے لئے میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں یاد کر لو ——— اور ہاں تمھارا روپیہ؟ ——— اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ میں تمھارے روپے کو ہاتھ لگانا بھی پاپ سمجھتی ہوں تمھارا اور تمھارے روپے کا تصور ہی میرے لئے قابل نفرت ہے۔"

شاردا بول رہی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ بارہ برس کا دبا ہوا غم و غصہ پھوٹ پڑا ہے۔ اس کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی اور اس کا جوان جسم غصہ سے لرز رہا تھا ———

سری کرشن کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ ایک منٹ تک بت بنا رہا۔ مگر فوراً ہی اس میں خود اعتمادی کا جذبہ لوٹ آیا اور وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسا ——— اور آہستہ سے بولا ———

"تو یہ کہئے ——— یہ اسی کا غصہ ہے۔ ہے نا؟ میں تمھارے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں ——— اب بھی تو وقت ہاتھ سے نہیں گیا ——— تم جوان ہو۔ میں بھی جوان ہوں۔ اگرچہ میری شادی ہو چکی ہے ——— لیکن تم سے بھی شادی کر سکتا ہوں۔ میں" ...... وہ جملہ پورا نہ کر سکا تھا کہ شاردا برس پڑی ——— اس کی آنکھیں غصہ سے چمک رہی تھیں ———

"بے شرم ...... بے حیا" وہ دانت پیستی ہوئی بولی ——— "تمھیں کچھ خبر ہے ——— کیا بک رہے ہو ——— اپنے ذہن میں یہ تخیل رکھتے ہوئے بھی شریف بنے پھرتے ہو۔ دنیا تمھارے حیوان کو ڈھونڈے

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

۱۲

نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت یکم ... ۱۹۶۲ء

چندہ: سالانہ ... ششماہی ...

بھری ہے۔ اور ہماری پاگل سماج اور اس کے اندھے قوانین تمھیں اپنی پناہ دیتے ہیں
تم تو ذلت اور حقارت کی سطح سے بھی نیچے گر چکے ——— دور ہو جاؤ ——— تم نے روپے
کے لئے میری زندگی ملیامیٹ کر ڈالی اور اب اس لڑکی کی زندگی بھی تباہ کرنی چاہتے ہو جس نے تمھارا
گھر روپے سے بھر دیا ——— اب تم کمینہ پن مجھے سکھانا چاہتے ہو۔ ذلت و حقارت کے
پتلے! ہٹ جاؤ میرے سامنے سے قبل اس کے کہ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹے اور میں آپے سے
باہر ہو جاؤں ——— یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا اور دوسرے ہی لمحہ میں کمرہ سے
باہر چلی گئی ——— اس کا پورا جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔

مسٹر کرشن اس ہیبت ناک غصہ سے پس کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے غم و غصہ کی کانپتی ہوئی تصویر
کو آہستہ آہستہ دور ہٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس درست ہوئے
——— اور وہ خاموشی سے سر جھکائے سیڑھی سے نیچے اتر گیا ———

"مسٹر کرشن" سیتا ماں نے باورچی خانے سے پکارا "آج رات کے کھانے پر ضرور آنا
دیکھو بھولنا نہیں"

بہت اچھا، پھپھی، بھتیجے نے موٹر میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا ——— ایک منٹ
بعد موٹر جا چکی تھی۔

شاردا کھڑکی پر بیٹھی موٹر کو دیکھتی رہی ——— جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔
ایکا ایکی وہ اٹھی اور اوندھے منہ بستر پر جا کر گر گئی ——— اس کا جوان تندرست
جسم دبی ہوئی سسکیوں سے کانپ رہا تھا ——— اور آنکھ سے آنسوؤں کے جھرنے
تکیے پر جاری تھے۔ (ترجمہ)

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

(بسلسلہ صفحہ ۸)

بدھو تمھیں اتنا نہیں معلوم کہ وہ میرا فساد نہیں۔ میں دوسروں کے فساد میں کیوں ٹانگ اڑاؤں۔
یہ کیا نازیبا حرکت ہے"

"سرکار" (کیا وقت ہے) اس نے مجھ سے پوچھا
میں نے اسے وقت بتایا۔ اب وہ بہت زیادہ پریشان اور بے چین نظر آ رہا تھا۔
میں نے اچانک پوچھا "اچھا آپ کا تعلق اس فساد سے تو نہیں جو قصر الائیل میں ہو رہا ہے؟"
اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے اینٹ کے ادھے کو سر تک بلند کیا اور مسرت سے بولا
"لے وا، لے وا (ہاں، ہاں)"
وہ فساد تو کوئی دو گھنٹے ہوئے ختم ہو چکا" میں نے پرسکون انداز میں کہا۔
اس کا منہ لٹک آیا۔ چہرے سے شادمانی کی دمک کافور ہو گئی "افسوس میں وقت پر نہ پہنچ سکا
اور فساد کم بخت مجھے جل دے گیا۔ افسر اعلیٰ تک جب میری رپورٹ پہنچے گی تو خدا ہی بہتر جانتا ہے
میرا کیا حشر ہوگا۔ کس منحوس کا منہ دیکھا تھا صبح صبح!"
میں نے شفقت سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا، اور ہنس کر کہا "خیر پھر سہی، غم نہ کھاؤ۔ آؤ
چلو کچھ پئیں پلائیں"
وہ فوراً راضی ہو گیا۔ ہم دونوں قریب ہی "پٹری ہیوبارمنڈل" کے صدر دفتر کے پاس ایک
ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ایک پولیس کے جوان نے ہم دونوں کو خوش خلقی سے سلام کیا اور ہم اندر
جا کر بیٹھ گئے۔

میں نے آرڈر دیا "بہترین شراب کے دو گلاس" اور پھر بیرے سے کہا آپ کے اس اینٹ
کے ادھے کو منیجر کے پاس جمع کر دو"
میں نے بغیر کسی استعجاب اور حیرت کے اینٹ کے ادھے کو ان شریف زادے کے ہاتھ سے لیا۔

دیکھا آپ نے وہاں کے فسادی خواہ مخواہ کا ہڑبونگ نہیں مچاتے بلکہ ڈھنگ، سلیقہ اور
اپنے بنائے ہوئے قاعدے قانون کی پابندی کے ساتھ فساد کرتے ہیں۔ اپنے اپنے مقررہ علاقہ
میں وقت کی پوری پابندی کے ساتھ فساد کیا، فساد ختم ہو گیا، اپنے مزے سے کسی ہوٹل میں کھانا
کھایا شراب پی اور پھر

دھو دیئے دھبے جامۂ احرام سے

جی ہاں، سلیقہ ڈھنگ اور خوش مذاقی غیر شائستہ کاموں میں بھی ایک شاعرانہ حسن
پیدا کر دیتی ہے۔

جمہوریہ چین

(بسلسلہ صفحہ ۲)

اور پابندیاں لگانے کی کوشش کی جن سے حکومت کے جملہ اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہوں
اور صدر مع کابینہ کے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو۔ یان شی کائی پورے اختیارات کے
ساتھ ملک پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس میں اور پارلیمنٹ میں کش مکش شروع ہو گئی
اور اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ شنگھائی میں عام بغاوت ہو گئی یا دوسرے لفظوں میں دوسرا
انقلاب پھوٹ پڑا۔ لیکن شمالی فوج کی مدد سے بہت جلد بغاوت پر قابو پا لیا گیا اور تین ہفتے
کے اندر اندر امن ہو گیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔ اس غیر معمولی کامیابی سے یان شی کائی کا
رعب لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کو، جو بغاوت کے زمانے
میں پیکنگ سے باہر چلے گئے تھے واپس آنے کی ہمت نہیں ہوئی، اور جنھوں نے بغاوت میں
کھلم کھلا حصہ نہیں لیا تھا ان کے رویے میں اعتدال اور مزاج میں نرمی پیدا ہو گئی۔ یان شی
کائی کو جب کسی شدید مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا تو اس نے دستور کا بعض وہ حصہ جو صدر
کے انتخاب سے تعلق رکھتا تھا منظور کرا کر صدر کے انتخاب کا اعلان کر دیا اور ۶ / اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پارلیمنٹ
کے دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں یان شی کائی کو جمہوریہ کا پہلا صدر چن لیا گیا۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں
اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ
کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے۔ ورنہ ممکن ہے پرچہ آپ کو نہ مل سکے "منیجر"

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی (دہلی جامعہ)

مطبوعہ جدید پریس، دہلی

نئی روشنی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۵ | ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۸ء سنہ ۶ | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

یورپ کی ترقی اور ایشیا کا جمود

جواہر لال نہرو

نشاۃ ثانیہ نے یورپ کے دماغ کو بہت سی ان زنجیروں سے آزاد کر دیا جن میں وہ اب تک جکڑا ہوا تھا اور بہت سے ان ذہنی بتوں کو توڑ دیا جن کی اب تک پوجا ہوتی رہی تھی۔ نشاۃ ثانیہ کو بالواسطہ اس میں دخل ہو یا نہ ہو یورپ میں بہرحال خارجی تحقیقات کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ جذبہ ان تمام باتوں کا جو قدیم سے سند مانی جاتی تھیں اور جن کی بنیاد محض خیال آرائی قیاس پر تھی، شدید مخالف تھا۔ فرانسس بیکن نے اسی زمانے میں لکھا تھا کہ "انسان کے فکر و عمل ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور دونوں تقریباً یکساں ہیں۔ پھر بھی ہم محض خیالی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں، یہ عادت بہت پرانی ہو چکی اور بڑی تباہ کن ہے۔ اس کے پیش نظر ہمیں چاہئے کہ اپنے علوم کی عمارت ایسی بنیادوں پر قائم کریں جن کا تعلق عمل کے ساتھ ہو اور ... علوم کا عملی حصہ ایسا ہو جیسے مہر ہوتی ہے کہ اس سے جو نقش کاغذ پر چھپتا ہے وہی نقش خیال کی شکل میں چھاپنے والے کے ذہن میں بھی محفوظ ہوتا ہے۔" اس کے بعد سترھویں صدی میں سر ٹامس براؤن نے لکھا "ہم نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ جو چیزیں قدیم سے چلی آئی ہیں ان کو سند سمجھیں یہ چیز علم کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی ہے اور اس نے حقیقت کا ہمیشہ گلا گھونٹا۔ اس کی مضرت اس وقت اور بھی زیادہ ہو گئی جب ہم نے اپنے عقائد کی بنیاد قدامت پرستی پر رکھی۔ جو ذرا بھی سوچنے کا عادی ہے وہ یہ حقیقت پا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے کے لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اندھا دھند ماضی کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس اندھی تقلید کے خلاف خواہ عقلی دلائل کتنے ہی قبول نہ ہوں وہ انھیں ماننے کو تیار نہیں جو لوگ ہمارے زمانے سے بہت دور ہیں ان کی تصانیف پر خود ان کے زمانے کے لوگوں نے بھی تنقید کی اور ان کے فوراً بعد جو لوگ ہوئے وہ بھی ان پر تنقید کرتے رہے۔ لیکن ہمارے وقت میں آکر وہ تنقید سے بالاتر سمجھی جانے لگی ہیں اور حالت یہ ہے کہ جو چیز موجودہ زمانے سے جتنی زیادہ دور ہے حقیقت سے اتنی ہی زیادہ قریب سمجھی جاتی ہے میرا تو خیال ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور حقیقت کے راستے سے بہت دور جا پڑے ہیں۔"

اکبر کا عہد سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے جبکہ یورپ والے فطرت کی طاقتوں کو مسخر کرنے میں مصروف تھے اور فطرت کی اس تسخیر کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک انقلاب انگیز ترقی رونما ہو رہی تھی۔ اپنی نئی تحقیقات کی وجہ سے یورپ آگے بڑھنے لگا۔ ابتدا میں قدم آہستہ آہستہ بڑھا لیکن رفتار برابر تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گئی اور یورپ والوں نے ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ اس وقت جبکہ یورپ قدرت کی طاقتوں سے اس طرح فائدہ اٹھا رہا تھا اور نئی نئی طاقتیں معلوم کرتا جا رہا تھا۔ ایشیا جمود اور سکوت کی حالت میں تھا۔ یہاں اب بھی وہی قدیم رسمی طریقہ جاری تھا جس میں بس انسان کی جسمانی محنت اور مشقت پر ہر چیز کا دارومدار تھا۔

ایسا کیوں تھا؟ ایشیا کی وسعت پر نظر کرتے ہوئے اس سوال کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا، اس کے ہر ملک پر اور خصوصاً ایسے بڑے ملکوں پر جیسے چین اور ہندوستان ہیں ہمیں الگ الگ نظر ڈالنی چاہئے۔ چین یقیناً اس زمانے میں بھی بہت تہذیب یافتہ تھا اور بعد میں بھی رہا۔ یورپ کا کوئی ملک بھی ایسا نہ تھا جو اس وقت چین سے زیادہ مہذب ہو۔ ہندوستان بھی اپنی آب و تاب رکھا رہا تھا، صرف یہی نہیں کہ یہاں ایک پرشوکت دربار تھا بلکہ یہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت بھی ترقی پر تھیں۔ ایک ہندوستانی سیاح کو بہت سی باتوں میں یورپ کے ملک ہندوستان کے مقابلے میں پست اور نامہذب معلوم ہوتے۔ اس کے باوجود یورپ میں ایک ایسی خوبی تھی جو ہندوستان میں نہ تھی، اور وہ یورپ کی فطرت کو مسخر کرنے کی کوشش تھی جو یورپ میں ہر جگہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

کسی تہذیب کے زوال کا اصلی سبب خود اس کی اندرونی کمزوریاں ہوتی ہیں، بیرونی حملے نہیں ہوتے۔ اس کی ایک کمزوری یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوششوں کے سلسلہ میں وہ اپنا سارا سرمایہ ختم کر چکی ہو اور بدلتی ہوئی دنیا میں پیش کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی نئی چیز باقی نہ ہو، یا وہ لوگ جو اس تہذیب کے حامل ہوں اپنی خوبیاں کھو چکے ہوں اور اپنے اندر اس تہذیب کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ہی نہ رکھتے ہوں۔ یا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے اس کی سماجی تہذیب اس قسم کی ہو کہ ایک خاص مقام تک تو وہ ترقی میں مدد دے اور اس کے بعد رکاوٹ پیدا کرتی ہو اور جب تک اس رکاوٹ کو دور نہ کر دیا جائے یا خود اس تہذیب کی نوعیت میں کچھ ضروری تبدیلی نہ کی جائے ترقی ناممکن ہو۔ ہندوستان کا زوال تو ترکوں اور افغانوں کے حملوں سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، کیا ان حملہ آوروں کی آمد اور نئے خیالات نے جو اُن کے ساتھ آئے اور پرانے ہندوستان سے بغل گیر ہوئے کوئی نئی اجتماعی ہیئت پیدا کی اور قوم کے ذہن کو آزاد کر کے اس کے قوائے عملی کو تحریک دی؟ کسی حد تک تو یہ ہوا، آرٹ، فن تعمیر، مصوری، موسیقی اور طرز معاشرت میں تبدیلی واقع ہوئی لیکن یہ تبدیلیاں سماج کی گہرائیوں تک نہ پہنچیں، لم و بیش سطح ہی پر رہیں اور ہیئت اجتماعی جیسی تھی ویسی رہی بلکہ بعض باتوں میں تو اور بھی زیادہ بے لوچ ہو گئی۔ افغان اپنے ساتھ ترقی کے کوئی نئے عناصر نہیں لائے، انھوں نے جو نظام پیش کیا وہ ایک فرسودہ جاگیرداری اور قبائلی نظام تھا۔ ہندوستان کا جاگیری نظام اس قسم کا تو نہ تھا جیسا یورپ میں تھا پھر بھی یہاں راجپوت قبیلوں کی جو ملک کے دفاع کے سلسلہ میں ہندوستان (بقیہ صفحہ ۴ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
یورپ کی ترقی اور ایشیا کا جمود	جواہر لال نہرو	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
جامعہ ملیہ اب کیا کرے گی؟ (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴
۲۔ پاکستان	ع، ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع، ل	۶
غزل	اختر انصاری	۷
بابو (گیت)	مسعود حسین خان	۷
خواب آزادی کی تعبیر	یحییٰ اعظمی	۷
غزل	خلیل الرحمٰن اعظمی	۷
جمہوریہ چین	عبداللطیف اعظمی	۸
موزہ افسانہ	ایک روسی ادیب	۹
روس یا امریکہ	سید انوار الحق حقی	۱۰
ہم صفیروں کی آواز		۱۱

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

جمہوریت کے اس دور میں کسی ملک کی ذہنی ترقی، خوش حالی اور تہذیب کا اندازہ لگانے کے لئے یقیناً صحیح معیار یہ ہے کہ اس کے عام لوگوں کا ذہنی، مادی اور اخلاقی معیار کیا ہے۔ لیکن یہ معیار اسی وقت بلند ہو سکتا ہے جب وہاں زندگی کے ہر شعبے میں بہت سے ایسے بلند پایہ لوگ ہوں جنھوں نے نہ صرف کسی خاص فن میں کمال حاصل کیا ہو بلکہ وہ انسانیت کے اعتبار سے (میں اس لفظ کی تشریح کسی دوسرے لفظ سے نہیں کر سکتا) ایک اعلیٰ شخصیت کے مالک ہوں۔ ان کی سیرت اور کاموں میں ہمیں اس اونچے آدرش کی جھلک نظر آئے جس کی جانب قوم کو قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ آپ کارلائل کی طرح ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) کے قائل ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ہم نے ابھی آزادی کے دور میں قدم رکھا ہے اور ہماری نسل کو بہت سے بڑے بڑے اور کٹھن مسئلوں کا سامنا کرنا ہے۔ تاریخ کے اس چوراہے پر پہنچ کر میرے ذہن میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ نسل کے (جس کو ملک کی قیادت اب اپنے ہاتھ میں لینی ہے) بڑے آدمی کہاں ہیں؟ میں چاروں طرف دیکھتا ہوں لیکن نظر مایوس ہو کر واپس آ جاتی ہے اور اس قد و قامت کے انسان نہیں دکھائی دیتے جیسے گذشتہ نسل نے پیدا کئے تھے، اور جن کی قیادت کا زمانہ اب ختم ہونے کو آیا ہے۔ یاد رکھیئے کہ اس نسل کی ساری زندگی سیاسی غلامی میں گذری تھی۔ بعض نے اس کو رضا و رغبت سے بعض نے جبراً قبول کیا۔ اور بعض نے اس کے خلاف جد و جہد کرنے میں اپنی زندگیاں گذار دیں۔ ان میں سے کسی کو آزادی کی فضا نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کی ذہنی تشکیل اور تربیت کا جو زمانہ تھا یعنی اس صدی کا آغاز۔ اس وقت انگریزی حکومت کا ذہنی اور سیاسی اقتدار اپنی تمام پابندیوں اور ہتھکنڈوں کے ساتھ ملک پر مسلط تھا اور قوموں کی غلامی کے زمانے کے بارے میں ہمارے حکیم اور شاعر اقبال کی تشخیص یہ تھی۔

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

یہ تو کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ اقبال کی یہ تشخیص غلط ہی کیوں کہ اس زمانے میں ہم نے بہت سے ایسے اہل فکر و عمل پیدا کئے (خصوصاً سیاست کے میدان میں) جنھوں نے وہ فقط بہت قابلیت سے غلاموں کو غلامی پر رضامند کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھیں مشاہیر عالم کی صف اول میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا تو ذکر کیا ہے۔ ان کی ذات تو ایک الگ حیثیت رکھتی ہے اور ان کو کسی خاص زمانے کے ساتھ وابستہ کرنا درست نہ ہوگا۔ لیکن ان کے علاوہ بھی آپ غور کریں تو آپ کو مشاہیر کا ایک سلسلہ ملے گا جس پر ہر ایک ملک ناز کر سکتا ہے: ٹیگور، اقبال، آزاد، محمد علی، اجمل خاں، سروجنی نائیڈو، انصاری، داس، سپرو، جناح، گوکھلے، مالویہ، رادھا کرشنن، بوس، جواہر لال نہرو، راج گوپال آچاریہ (ضروری نہیں کہ آپ ان سب کے ہم خیال ہوں، لیکن ان کی بڑائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا)، لیکن ان کے بعد؟ وہ مشاہیر کہاں ہیں جو ان کی جگہ لے سکتے ہیں؟ جو آئندہ دس سال میں اس ملک کی ذہنی اور سیاسی اور اخلاقی رہنمائی کریں گے؟ میں یہ جانتا ہوں کہ سیاست کی جدید تحریکوں نے کچھ ہونہار نیتا پیدا کئے ہیں، سائنس کے میدان میں بعض ماہرین خصوصی نے کامیابی کے ساتھ بین الاقوامی شہرت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ادب اور عربی میں بعض نئے لکھنے والوں نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ہے اور بعض نئی راہیں نکالی ہیں۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ابھی ان کو پختگی تک پہنچنے اور اپنی قوتوں کا پورا اندازہ اور استعمال کرنے میں مدت لگے گی۔ لیکن باوجود ان ولولہ دینے والے خیالات کے ذہن کی ترازو ان کے وزن کو تولتی ہے، اور چنداں مرعوب اور متاثر نہیں ہوتی۔ میرے دل میں ان میں سے بعض کے لئے کافی احترام ہے لیکن ان کی حیثیت ان کے پیش رووں کی سی نہیں۔ ان سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کو نئی قدریں بخش سکیں گے۔ اسے نئی جستجو سے، نئی وسعتوں سے آشنا کر سکیں گے۔ بے نفسی اور بلند نظری کے ساتھ کام کر کے قوم کی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ بہت تامل کے ساتھ، لیکن خلوص اور ادب سے کہتا ہوں کہ غالباً ہماری موجودہ نسل نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے علاوہ کوئی غیر معمولی بلند اور متنوع شخصیت پیدا نہیں کی، جو انسانیت کی کسوٹی پر ہمارے پیش رووں کے مقابلے میں پیش کی جا سکے۔ لیکن بقول شخصے اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ اور ایک ابابیل کے آ جانے سے گرمی کا موسم شروع نہیں ہو جاتا۔۔۔۔۔۔ پھر بتایئے کہ ہماری مشکلوں کا پہاڑ کس طرح پھوٹے گا۔ اور ہمارے وطن کے باغ کے گوشے گوشے میں کس طرح بہار آئے گی؟

ہمیں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس انسانی کال کا کیا سبب ہے اور اس کو دور کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے خود ان کے اسباب کا ابھی طرح اندازہ نہیں۔ میں نے حال میں ایک مقتدر لبرل لیڈر سے اس مسئلے کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ کانگریس نے زمینداریوں کو ختم کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اور اردو انگریزی زبان کی جو مخالفت کر رہی ہے اس کا اثر موجودہ نسل کے معیار پر پڑا ہے! وجہ کی معقولیت پر بحث کرنے کے بجائے میں نے ان سے کہا کہ زمینداریاں تو ابھی ختم نہیں ہوئیں اور انگریزی کی "مخالفت" ابھی دو سال پرانی بھی نہیں اور میں جس نسل کا ذکر کر رہا ہوں اس کی تعلیم و تربیت اب سے ۲۰، ۲۵ سال پہلے ہوئی تھی لہٰذا یہ تو قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ کانگریس کی ان "حرکتوں" کا سایہ ان پر اس قدر پہلے پڑا ہو۔ اس پر انھوں نے

یہ اہل علم کی محفل ہے

عبداللطیف اعظمی

قومی زبان کے بارے میں ملک کے مقتدر رہنما سوائے چند کے جس طرح عام رو میں بہے جا رہے ہیں اس سے متعلق نئی روشنی کی کسی پچھلی اشاعت میں اسی کالم میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس مہینے کے پہلے ہفتہ میں دلی یونیورسٹی کی دعوت پر یونیورسٹی اساتذہ کی ایک کانفرنس ہوئی تھی یہ کانفرنس استادوں کی تھی جو عام طور پر عملی سیاسیات سے الگ رہتے ہیں اور جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہر مسئلے کو علمی نظر سے دیکھیں گے اور دلائل کی ترازو میں تولیں گے اس لئے میں بڑی امیدوں کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوا تھا۔ مگر یقین جانیے کہ سیاست کے سطحی لیڈروں سے ملنے اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے بعد جو مایوسی ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ اس کانفرنس سے ہوئی۔

اس کانفرنس میں کوئی ۰۰ نمایندے شریک ہوئے تھے اور سب کے سب یونیورسٹیوں اور کالجوں کے منتخب استاد تھے اور بڑی بڑی ڈگریوں کے حامل۔ زیر بحث مسئلہ یہ تھا ——— جس کے لئے وہ دور دور سے سفر کی تکلیفیں اٹھا کر آئے تھے کہ یونیورسٹی میں انگریزی کی بجائے ذریعہ تعلیم کیا ہو؟ توقع تھی کہ یہ اساتذہ کرام جو سیاست کی ہنگامہ خیز فضا میں نہیں بلکہ علم و تعلیم کی پرسکون فضا میں سوچنے اور غور کرنے کے عادی ہیں۔ اس اہم مسئلہ پر علمی اور فنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالیں گے، سیاست والوں کی جو اس وقت دورا ہے پر کھڑے ہیں۔ رہنمائی کریں گے اور اس نازک موقع پر ملک کو صحیح مشورہ دیں گے۔ لیکن ان کی تقریریں لگ بھگ اسی معیار کی تھیں جو گاندھی گراؤنڈ میں عام طور پر ہوا کرتی ہیں۔ جنوب کے نمایندوں کے علاوہ ہر شخص تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھا۔ چنانچہ تقریروں میں ہندوستان کی غیر معروف سے غیر معروف زبانوں کا ذکر آیا، لیکن اگر نہیں آیا تو اردو کا گویا ہندوستان میں اس نام کی کوئی زبان ہے ہی نہیں کسی رسم خط کی اچھائیوں اور نقائص سے ایک شخص بھی اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے رومن رسم خط کی حمایت کی اور زیادہ تر دیوناگری رسم خط کی۔ مگر وجہ کسی نے نہیں بتائی عربی اردو رسم خط کا یہاں بھی ذکر نہیں تھا۔ کئی کئی سو کی تنخواہ پانے والے۔ تنخواہ اور گرانی الاؤنس کے اضافے کے لئے اسی طرح تقریر کرتے تھے جس طرح تانگہ یونین اور ٹرام یونین میں کی جاتی ہیں۔ جب یہ ان لوگوں کا حال ہے جو آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کے نگراں اور آزاد ہندوستان کی تعلیمی کشتی کے ناخدا ہیں تو دوسروں سے کیا امید باندھی جا سکتی ہے!!

چاہیئے تو یہ کہ لوگ علمی اور تعلیمی مسائل میں حکومت کی رہنمائی کریں اور جب کبھی حکومت حق پر مصلحت کو ترجیح دے تو ایسے صحیح بات بتلانے میں سب سے پیش پیش ہوں۔ (بقیہ صفحہ پر)

۴ نے بات بدل دی۔ لیکن معاملہ جہاں کا تہاں ہے۔ فرمایئے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ دسمبر ۱۹۴۸ء

جامعہ ملیہ اب کیا کرے گی؟

(۱)

یہ سوال باہر سے جامعہ کے ہمدرد اور اندر سے خود جامعہ والے کر رہے ہیں۔ بیرونی ہمدردوں کا سوال اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہونے کے بعد جامعہ ملیہ سے قطع تعلق کر لیں گے اور وہ اپنی زندگی کے اس نازک دور میں، ان کی رہنمائی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کا جواب مختصر اور آسان ہے۔ **ذاکر صاحب بدستور شیخ الجامعہ رہیں گے اور اپنے وقت کا ایک معقول حصہ جامعہ کی خدمت میں صرف کرتے رہیں گے**

خود جامعہ والوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہونے کی وجہ کچھ اور ہے۔ ان کے ذہن میں پچھلے سال تک یہ خیال تھا کہ ہندوستانیوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کے لئے ایک مکمل یونیورسٹی بنائیں گے، جو بیرونی حکومت کے اثر سے آزاد اور قومیت اور وطنیت کے جذبات سے معمور ہو گی۔ ہندوستان کے آزاد ہو جانے اور قومی حکومت ہو جانے کے بعد صورت حال بدل گئی ہے۔ اب قومیت یا وطنیت جرم نہیں رہی۔ ہندوستان کی ہر یونیورسٹی ان جذبات سے معمور ہو گئی ہے یا رفتہ رفتہ ہو جائے گی اس لئے جامعہ کے کارکن اس ادارے کے مستقبل کے بارے میں دو باتوں پر غور کر رہے ہیں:-

(۱) کیا اب بھی اس ادارے کو حکومت کے اثر سے آزاد رہنے کی ضرورت ہے؟

(۲) کیا اب بھی اس کا نصب العین یہی رہنا چاہیئے کہ وہ عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کی ایک مکمل یونیورسٹی بن جائے؟

پہلے سوال کا جواب دینے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ جامعہ نے حکومت کے اثر سے آزاد رہنے کا بنیادی اصول کن وجوہ سے اختیار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ میں جب جامعہ ملیہ قائم ہوئی تھی، تو اس کا خاص مقصد یہی تھا کہ ملک کے نوجوانوں کو خصوصاً مسلمانوں کو قومیت اور وطنیت کی فضا میں تعلیم دے اور چونکہ حکومت غیر ملکیوں کی تھی اور وہ ان تعلیم گاہوں میں، جو اس کے زیر اثر تھیں، قومیت اور وطنیت کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتی تھی، اس لئے جامعہ حکومت کے اثر کو اپنے مقصد کے لئے مہلک سمجھ کر اس سے دور رہنا چاہتی تھی۔ لیکن آگے چل کر جامعہ نے حب قوم اور حب وطن کے علاوہ گاندھی جی کے فیضان سے ایثار اور سادگی کے مقاصد کو اور ذاکر صاحب کی برکت سے نئے تعلیمی تجربات کے مقصد کو بھی اپنایا تو اس کا حکومت کے اثر اور سرکاری نظام تعلیم سے الگ رہنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ اس لئے کہ اس بے لوچ ڈھانچے کے اندر اساتذہ کے معیار زندگی، مدرسے کی عمارت ساز و سامان، تعلیم کے اصول، طریقہ اور نصاب، غرض ہر چیز کے بندھے ٹکے ضابطے ہیں۔ جن سے سر مو تجاوز کی اجازت نہیں۔ جامعہ والوں کی کم و بیش درویشانہ سادگی، ان کا مروجہ تعلیمی ہیئت سے انحراف اور تعلیمی بدعتوں کا شوق اس ڈھانچے کے اندر کسی طرح نہیں کھپ سکتا تھا۔

اب ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اس کا خوف تو نہیں رہا کہ حکومت کا اثر قومیت اور وطنیت کے جذبات کے منافی ہو گا۔ مگر یہ کھٹکا باقی ہے کہ وہ جامعہ کو سرکاری نظام تعلیم کے شکنجے میں کس کر اس کی روح کو کچل دے گا۔ ہاں اگر حکومت کا اثر صرف اتنا ہو کہ وہ تعلیمی ماہروں سے جامعہ کے معیار تعلیم کی جانچ کراتی رہے۔ جیسے وہ تین چار سال پہلے کرا چکی ہے اور اس کے عوض جامعہ کی سند کو تسلیم کرے تو اس میں ارباب جامعہ کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ اصول تعلیم، طریق تعلیم، اور نصاب تعلیم کے معاملے میں جامعہ بالکل آزاد رہے گی۔ جہاں تک امداد کا تعلق ہے حکومت جامعہ کو جوبلی کے موقع پر سات لاکھ کا یک مشت عطیہ دے چکی ہے اور اب اس نے ۳۰ ہزار کی سالانہ رقم بھی دینی شروع کر دی ہے۔ دونوں طرح کی امداد بغیر کسی شرط کے دی گئی ہے اس لئے جامعہ نے بجا طور پر شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔ ہمیں امید ہے کہ اسی طرح کی فراخ دلی اور وسعت نظر حکومت جامعہ کی سند کو تسلیم کرنے میں بھی دکھائے گی، اور اس کی تعلیمی آزادی میں مداخلت کئے بغیر ہر طرح اس کی ہمت افزائی کرے گی جس طرح ترقی یافتہ جمہوری ملکوں میں نئے تعلیمی تجربے کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ نئے حالات میں جامعہ کو اپنے کام کا دائرہ کتنا رکھنا چاہیئے۔ کیا اس کا نصب العین اب بھی وہی ہے گا کہ رفتہ رفتہ ایک مکمل یونیورسٹی بن جائے جس میں علوم و فنون کے سب شعبے، صنعتوں اور پیشوں کی تربیت کے سب ادارے موجود ہوں؟

ہمارے خیال میں جامعہ کی نشو و نما جس طرح اب تک ہوتی رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اب اس نصب العین کو ترک کر دیا جائے، اور جامعہ اپنے دائرہ عمل کو زیادہ محدود و واضح اور متعین کر لے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جامعہ جس مقصد سے قائم ہوئی تھی، اس میں رفتہ رفتہ توسیع ہوتی۔ جاننے والے جانتے ہیں جامعہ کی بنیاد خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں اس طرح پڑی کہ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کی دعوت پر ایم اے او کالج علی گڑھ کے کچھ من چلے استاد اور طالب علم جن میں ذاکر حسین خاں بھی تھے کالج چھوڑ کر نکل آئے اور انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی جس کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے دست مبارک سے ہوا۔ اس وقت صرف ایک ہی مقصد پیش نظر تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک آزاد درسگاہ ہو جو بیرونی حکومت کی سیاسی اور ذہنی غلامی سے آزاد ہو۔ جہاں وہ علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کر سکیں۔ جہاں ان میں سچی مذہبی روح کے ساتھ سچی قومی اور وطنی روح پیدا ہو سکے۔ علی گڑھ میں جامعہ ملیہ چار برس تک اس مقصد کو اچھی طرح پورا کرتی رہی جو مسلمان اور ہندو

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

بزم بے تکلف

(ا، ب ریل میں انٹر کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے ہیں)

ا:- غضب خدا کا دسمبر کے شروع میں یہ سردی! ہاتھ پاؤں کیا ہوش و حواس تک جم کر رہ گئے۔

ب:- (اخبار پر نظر ڈال کر) جی ہاں، کل کے موسم کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ دلی میں درجہ حرارت گر کر ۵۰ تک پہنچ گیا۔

ا:- درجہ حرارت؟ بہت معقول! ارے درجہ برودت درجہ مصیبت، درجہ ہلاکت نہیں کہتے۔ لوگ سردی سے اکڑ کر رہ گئے، اور آپ درجہ حرارت لئے پھرتے ہیں۔

ب:- تو صاحب میں اس کے لئے کیا کروں علمی اصطلاح یہی ہے۔

ا:- بجا ارشاد ہوا، ہم بھی جانتے ہیں کہ علمی اصطلاح یہی ہے۔ مگر علم کے ساتھ کچھ اخلاق کا بھی تو خیال رہنا چاہیئے۔

ب:- آپ تو کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں، میں نے کون سی بد اخلاقی کی۔

ا:- ہائے یہی تو آپ نہیں سمجھتے۔ جب لوگ جاڑوں مر رہے ہوں تو درجہ حرارت کا نام لینا بد اخلاقی کیا بے دردی ہے خواجہ میر درد فرماتے ہیں۔ ع۔ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ب:- اس طرح سے تو زبان کھولنا مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً اس میں یہ پیش گوئی ہے کہ اگلے تین چار روز میں سات کی سردی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس کا ذکر کرنا تو آپ کے نزدیک اور بھی بے دردی ہو گی۔

ا:- آہ ظالم یہ کیا کہہ دیا۔ ع۔ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے ارے بے دردی کیسی یہ تو قساوت ہے قساوت۔ کس بے پروائی سے فرماتے ہیں کہ اور بڑھ جائے گی سردی۔ اور اس اخبار پر خدا کی مار۔ اسے کوئی اور خبر چھاپنے کو نہیں ملتی تھی۔

ب:- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی عقل پر ہنسوں یا روؤں۔

ا:- ہنسئے ہنسئے، روئیں آپ کے دشمن۔ بس ہنسنے ہی کی کسر رہ گئی ہے۔

ب:- ارے بندۂ خدا کیا سردی میرے یا کسی کے کہنے سے پڑتی ہے۔ کیا فطرت کسی کے الفاظ کی تابع ہے۔

ا:- بے شک ہے ورنہ شاعر وہ فال بد حال والی بات کیوں کہتا۔ مگر یہاں اس کا ذکر نہیں۔ فطرت کے تو خمیر میں بے مروتی ہے۔ انسان کیوں بے دردی بن جائے۔

ب:- تو آپ چاہتے کیا ہیں علمی تحقیقات بند کر دی جائیں موسمیات کا محکمہ بند کر دیا جائے۔ سردی گرمی کا ذکر تک نہ آئے۔

ا:- یہ کس کم بخت نے کہا ہے۔ آپ علمی تحقیقات موسمیات جس قسم کی آپ اور بات چاہیں شوق سے کریں مگر ذرا انسان کے جذبات و حسیات کا تو خیال رکھئے۔ اگر اس قسم کی منحوس خبر سنانا ایسا ہی ضروری ہو تو دو چار ہمدردی کے کلمے تو کہہ دیا کیجئے۔ مثلاً افسوس یہ کہتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے کہ یہ سردی جو تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے اور تیز ہونے والی ہے۔ "آہ کس دل سے کہا جائے کہ اس قہر کی سردی کے بعد قیامت کی سردی پڑنے والی ہے"۔

ب:- بہت اچھا، اب خیال رکھوں گا۔ مگر اس وقت کس منہ سے کہوں کہ میرا اسٹیشن آگیا۔ مجھے اترنا ہے۔

پچھلا ہفتہ: ا۔ ہندوستان

عمارت کی نیو بھر گئی

پہلے کے مقابلے میں آئین سازی کا کام خاصا تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ شہریوں کے بنیادی حقوق کی دفعات (۷ تا ۲۷) منظور ہوچکی ہیں۔ سب سے زیادہ دفعہ ۲۴ کے جو حق ملکیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دفعہ پر بحث آئندہ کے لئے اٹھا رکھی گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جب اس کی باری آتی ہے تو کانگریس پارٹی کا جو کبھی اشتراکیت کی حمایت کا دعوے کرتی تھی کیا رویہ رہتا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ دفعہ ضمانت کرتی ہے کہ کوئی شخص اپنی ملکیت سے خلاف قانون محروم نہیں کیا جائے گا، اور کوئی ایسا قانون نہیں بن سکے گا جس کی رو سے کسی قسم کی ملکیت بغیر معاوضے کے منضبط کی جا سکے۔

جہاں تک اور بنیادی حقوق کا تعلق ہے آئین کے مسودے میں ہر فرد کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق جو دنیا کی کوئی جمہوری ریاست اپنے شہریوں کو دیتی ہے تجویز کئے گئے تھے ان میں اضافے کا کوئی سوال ہی نہ تھا البتہ ان کی تعبیر اور تشریح کے بارے میں بحث کی گنجائش تھی اور کافی بحث ہوئی۔ سب سے زیادہ جوش کے ساتھ دفعہ ۲۵ کا خیر مقدم کیا گیا جس میں بنیادی حقوق پر عمل درآمد کرانے کے لئے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کی طرف رجوع کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ دفعہ ہر فرد اور ہر جماعت خصوصاً اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ ان کے بنیادی حقوق کا احترام کرنا یا نہ کرنا حکومت وقت کی مرضی پر منحصر نہ ہوگا جو سیاسی مصلحتوں سے اور اکثریت کے تعصبات سے متاثر ہو سکتی ہے بلکہ وہ ان حقوق کو حاصل کرنے کے لئے عدالت عالیہ سے رجوع ہو سکیں گے جس سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خالص حق و انصاف کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گی۔

آئین کے مسودے میں زیادہ ترمیمیں تین حضرات پیش کرتے ہیں۔ ایک نذیر الدین احمد صاحب ہیں جو زیادہ تر لفظی اور قانونی موشگافیاں کرتے ہیں۔ ان کو عموماً صدر اپنے خاص اختیارات کی بنا پر ان ترمیموں کو پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور اگر اتفاقاً دے بھی دی تو اسمبلی بغیر بحث و مباحثے کے انہیں رد کر دیتی ہے۔ دوسرے پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ ہیں جن کی اکثر ترمیموں کی تہ میں یہ اصول ہے کہ ہندوستان کا آئین برطانوی نہیں بلکہ امریکی آئین کے طرز پر بنایا جائے۔ اس میں عاملی اختیارات صدر کو حاصل ہوں، کیبنٹ پارلیمنٹ کے ممبروں پر مشتمل نہ ہو بلکہ صدر کے نامزد کئے ہوئے اشخاص پر جو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ نہ ہوں اور اس کے ووٹ سے ہٹائے نہ جا سکیں۔ یہ بات شروع میں پانچ روز کی بحث کے بعد طے ہو چکی ہے کہ ہندوستان کی حکومت برطانیہ کے پارلیمنٹری اور کیبنٹ سسٹم کے مطابق ہوگی۔ مگر پروفیسر شاہ نہایت استقلال سے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ ہر موقع پر ایسی ترمیمیں پیش کرتے رہیں جن سے آئین کا سارا ڈھانچہ ہی بدل جائے۔ لوگ ان کی فاضلانہ تقریروں کو صبر سے سنتے ہیں۔ اخلاقاً ان کی منطقی تقریروں کا منطقی جواب دیدیتے ہیں ترمیم پیش ہوتی ہے، اور نامنظور ہو جاتی ہے۔ تیسرے لاری صاحب ہیں جو اس سعی لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں کہ اقلیتوں کے مخصوص حقوق کی حفاظت کے لئے آئین میں خاص دفعات کا اضافہ کرائیں۔ ان کی گرمی تقریر سے تھوڑی دیر کے لئے اسمبلی کی سرد فضا میں کچھ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر لوگوں کو ان سے کچھ ایسی ضد ہو گئی ہے کہ ان کی معقول بات بھی سننے کو تیار نہیں ہیں اور وہ اپنی طرف سے اس ضد کو کم کرنے کی نہیں بلکہ بڑھانے ہی کی کوشش کرتے ہیں۔ دفعہ ۲۳ کے سلسلے میں جس کی رو سے ہر جماعت کو اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق دیا گیا ہے، لاری صاحب چاہتے تھے کہ حکومت پر یہ ذمہ داری عاید کی جائے کہ ہر مدرسے میں جہاں طلبہ کی ایک معقول تعداد اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہے وہ اس زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کرے۔ اس مطالبے کی معقولیت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا خود ڈاکٹر امبیڈکر نے تسلیم کیا کہ اس کا پورا کرنا حکومت کا صریحی فرض ہے۔ مگر انھوں نے اسے آئین میں شامل کرنے کے بجائے حکومت کی فرض شناسی پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور لاری صاحب کی ترمیم نامنظور ہو گئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر صاحب سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر کل بنیادی حقوق کے مسئلے کو حکومت کی فرض شناسی پر چھوڑ دیا جاتا تو کتنی آسانی ہو جاتی اور کتنا وقت بچتا۔

بنیادی حقوق کی بحث ختم ہو جانے کے بعد عاملہ کی تشکیل اور اختیارات کی بحث شروع ہوئی اور دفعہ ۴۱ اور ۴۲ جن میں صدر کے عہدے اور اختیارات کا ذکر ہے بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد منظور ہو گئیں۔ ۲۴ر دسمبر سے اسمبلی کا اجلاس دو ہفتہ کے لئے ملتوی ہو گیا۔

گیا۔

شکر ہے کچھ تو عقل آئی

ہند اور پاکستان کے نمائندوں کی کانفرنس دہلی میں جاری ہے۔ جو کمیٹیاں مختلف مسائل کو طے کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ وہ آج ۱۳ر دسمبر کو اپنی رپورٹیں کانفرنس کے سامنے پیش کریں گی۔ کانفرنس کی کارروائیوں کو بڑے اہتمام سے مخفی رکھا گیا ہے تاکہ اخبارات کی جا و بیجا تنقید سے اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔ اور کامل سکون کی فضا جو ان نازک مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے ناگزیر ہے میسر آسکے۔ پھر بھی اتنا اندازہ ہوا ہے کہ اب تک بات چیت کا انداز دوستانہ ہے اور دونوں طرف سے سمجھوتے کی پوری کوشش ہو رہی ہے۔ سب سے زیادہ دقت مہاجرین کی جائداد کے معاملے کو طے کرنے میں پیش آرہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا تصفیہ اس وقت نہ ہو سکے۔ پھر بھی اگر اور سب مسئلے خصوصاً اقلیتوں کے حقوق کا اور ان کی مزید ہجرت کو روکنے کا مسئلہ طے ہو جائے تو بہت بڑی بات ہو گی۔

تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے

ایک مہربان نے بہار سے ایک مفصل خط لکھا ہے جس میں یہ شکایت کی ہے کہ ہم نے "مشرقی بنگال کی پہیلی" کے عنوان سے جو نوٹ لکھا تھا اس میں اس صوبے سے غیر مسلموں کی ہجرت کی ساری ذمہ داری مشرقی بنگال اور پاکستان کی حکومت کے سر ڈال دی۔ انھوں نے اس خط میں تصویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مغربی بنگال کے سیاسی لیڈروں کی باہمی رقابتوں اور سازشوں کو بہت بڑا دخل ہے ہم اس خط کو بڑی خوشی سے شائع کرتے مگر چونکہ ہند اور پاکستان کی کانفرنس میں جو دہلی میں ہو رہی ہے۔ یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور فریقین کی طرف سے اپیل کی گئی ہے کہ اس زمانے میں مابہ النزاع مسائل کے بارے میں اخبارات خاموشی اختیار کریں۔ اس لئے سردست اس ارادے کو ملتوی کرتے ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ ہجرت کے مسئلے کا کوئی معقول حل نکل آئے گا۔ اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا تو ہم نہ صرف خط کو شائع کریں گے بلکہ مشرقی بنگال کی پہیلی کو بوجھنے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں گے۔

سمجھائیں گے کیا؟

لیک سکسس سے یہ اطلاع آئی ہے کہ یونائیٹڈ نیشنز کے کشمیر کمیشن نے اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جو ہند اور پاکستان میں کشمیر کے معاملے میں مصالحت کرانے کی کوشش کرے گا۔ یہ بجائے خود ایک خوشی کی بات ہے کہ گفت و شنید کا سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا پھر شروع ہو رہا ہے۔ گو پچھلے تجربے کو نظر میں رکھتے ہوئے کامیابی کی امیدیں یا نہیں کے برابر ہیں۔ ہوتا ہے۔ دو حریفوں کے بیچ میں کسی تیسرے شخص کا پڑنا اسی حالت میں مفید ہوتا ہے جب دونوں کسی قدر صبر و سکون کے ساتھ اس کی بات سننے کو تیار ہوں، لیکن یہاں یہ حال ہے کہ کشمیر کا نام آتے ہی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور عقل رخصت ہو جاتی ہے، اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں پاکستان کے بہت سے ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار اخباروں کا رویہ بہت زیادہ قابل اعتراض ہے۔ ان پر تو کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے ہسٹیریا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور دماغی توازن ڈانوا ڈول ہو جاتا ہے۔ کیا ان کو بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ اس قسم کی مزاجی کیفیت میں سمجھوتے کی گفتگو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

ع۔ ح

یورپ کی ترقی اور ایشیا کا جمود

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

کی جان تھے کسی حد تک جاگیری طریقہ ہی پر تنظیم ہوئی تھی۔ مغل نیم جاگیری نظام لے کر آئے لیکن ان کی مرکزی مطلق العنانی بہت مستحکم تھی۔ یہی مطلق العنانی راجپوتانہ کے مبہم جاگیرداری نظام پر فتحیاب ہوئی۔ البتہ اکبر کا متلاشی اور رسا ذہن اگر ادھر متوجہ ہوتا اور وہ ان واقعات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا جو دنیا کے دوسرے حصوں میں رونما ہو رہے تھے تو عجب نہ تھا کہ سماجی تبدیلی کی بنیاد پڑ جاتی لیکن وہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش میں حد سے زیادہ مصروف رہا اور سب سے بڑا مسئلہ اس کے سامنے یہ تھا کہ کسی طرح اسلام جیسے تبلیغی مذہب کا رعایا کے قومی مذہب اور رسم و رواج سے سمجھوتہ کرائے اور اس طرح قومی اتحاد پیدا کرے۔ اس نے مذہب کی تعبیر عقلی دلائل سے کی اور تھوڑی ہی دیر کے لئے تو ہندوستانی منظر میں اس نے قابل تعریف تبدیلی پیدا کر دی۔ لیکن اس کا عملی طریقہ اسی طرح ناکامیاب رہا جس طرح یہ دنیا میں ہمیشہ ناکامیاب رہا ہے۔

غرض اکبر بھی ہندوستان کی ہیئت اجتماعی میں کوئی بھی تبدیلی پیدا نہ کر سکا اور اس کے بعد تو ذہنی تجسس اور تبدیلی کی وہ فضا جو اس نے پیدا کی تھی ختم ہی ہو گئی۔ اور ہندوستان پھر اپنی اسی سکون اور جمود کی حالت پر آگیا۔

۲۔ پاکستان

غذائی حالت قابلِ اطمینان نہیں

ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان کو ان تمام دقتوں سے دوچار رہنا پڑا جو ایک نئی حکومت کو بہرحال پیش آتی ہیں۔ لیکن ان پیچیدہ اور مشکل مسائل میں ایک بات کا پاکستان کو ہر نوع اطمینان حاصل تھا وہ یہ کہ اناج کا پاکستان کو توڑا نہیں تھا۔ مگر پچھلے دنوں برسات کے موسم میں سیلاب سے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دونوں حصوں کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کی وجہ سے پاکستان کی مشکلوں میں اناج کی کمی کا بھی اضافہ ہوگیا۔ حکومت پاکستان نے روس سے گیہوں کا انتظام کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ابھی حالت تسلی بخش نہیں ہے معاصر پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق قحط اور فاقے سے بچنے کے لئے صرف مغربی پنجاب کو ساٹھ ہزار ٹن اناج کی ضرورت ہوگی۔ معاصر مذکور کا بیان ہے کہ دیہات کی بھاری اکثریت مخمصے [illegible] اور تنگی میں گذر کر رہی ہے اور اس پنجاب میں جو سارے ہندوستان کو بہترین گیہوں مہیا کرتا تھا، آج چند گنے چنے ابیرون [illegible] ہے۔ اس وقت کراچی میں روس سے گیہوں آیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کی فوری ضرورت تو پوری ہو جائے گی۔ مگر آئندہ ابھی اور دقت پڑے گی۔

وزیر غذا [illegible] صاحب آج کل سرحد کا دورہ کر رہے ہیں انھوں نے سرحد کی وزارت کو بارہ ہزار ٹن سندھ اور خیرپور سے فوراً اور سولہ ہزار ٹن روسی گیہوں میں سے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ مغربی پنجاب نے بھی چند دن ہوئے، وزیر صوبہ سے جو اس وقت [illegible] میں تھے، ٹیلیفون کے ذریعے پندرہ ہزار ٹن گیہوں کا مطالبہ کیا ہے۔

گھریلو صنعتیں

صنعتی ترقی کے لئے بڑے بڑے کارخانوں کا قیام بعض مجبوریوں کی بنا پر کسی زمانے میں بے شک ناگزیر ہوا کرتا تھا، مگر آج یہ مجبوریاں اس لئے باقی نہیں کہ ان کلوں اور مشینوں کو حرکت میں لانے والی قوت و توانائی بجلی کی صورت میں چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بھی ہر جگہ پہنچ سکتی ہے اور اس طرح بڑے بڑے کارخانوں کی جگہ گھریلو صنعتیں بڑی آسانی سے پر کرنے لگی ہیں اور قبل از جنگ کے جاپان نے اپنے یہاں کی گھریلو صنعتوں کے نظام کو کامیابی سے چلا کر دکھا دیا ہے کہ منصوبہ بندی اور ہم آہنگی کے انتظامات مفقود نہ ہوں تو ان صنعتوں کے ذریعے بڑی سے بڑی چیزیں بھی کم سے کم لاگت پر تیار کی جا سکتی ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط نہیں کہ پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے بڑے بڑے کارخانوں کے قیام کے بجائے گھریلو صنعتوں کی ترویج افادیت میں کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے پھر کوئلہ سے بڑی حد تک محرومی، ہائڈرو الیکٹرک کی تخلیق کے وسیع امکانات اور ان سب سے زیادہ ہماری معیشت کا زراعت سے اتنا تعلق یہ سب چیزیں گھریلو صنعتوں کی ترویج کو مفید ہی نہیں ضروری بنا دیتی ہیں ....

یہ خبر ہمارے لئے پیام مسرت ہے کہ آئی ہے کہ مرکزی حکومت پاکستان بھر میں گھریلو صنعتوں کو منصوبہ بندی اور ہم آہنگی کے اچھے انتظامات کے ساتھ رائج کرنے کی ایک بڑی مہم عنقریب شروع کر رہی ہے۔

ڈان کے نامہ نگار نے بتلایا ہے کہ اس سکیم کے سلسلے میں حسب ذیل کام اب تک عمل میں آیا ہے۔

(۱) گھریلو صنعتوں کی ترقی کی غرض سے جاپان کے طریق عمل کا مطالعہ کرنے کے لئے ترقیات و رسد کے سابق ڈائرکٹر جنرل کو مرکز نے جاپان بھیجا ہے۔

(۲) مرکز نے ان صنعتوں کو پنپنے کا موقع دینے کے لئے دوسرے ممالک سے درآمد ہونے والے مقابلے کے مال پر ناجائز محصول عائد کرنے کا فیصلہ کیا ہے

(۳) گھریلو صنعتوں کو رواج دینے کے لئے ان کی سرپرستی کی جائے گی اور نیز بجلی اسکان حکومت انھی صنعتوں کی پیداوار کو خریدے گی۔

روزنامہ "سفینہ" لاہور

پاکستان کی ریاستیں

کچھ عرصے سے برابر اس قسم کی خبریں آرہی ہیں کہ پاکستان کی ریاستوں کے باشندوں میں حق طلبی کا جو ولولہ پیدا ہو رہا ہے اس کے کچلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چترال اور امب وغیرہ میں ریاستی مسلم لیگ کے عہدہ داروں پر جو کچھ گذر چکا ہے، اس سے سب لوگ اچھی طرح واقف ہیں، اب لس بیلا کی ریاستی مسلم لیگ کے ارکان بھی اس قسم کے حالات سے دوچار ہو رہے ہیں۔

دراصل ریاستوں کے متعلق شروع سے مسلم لیگ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ہمیں ان کے معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک طرف پاکستان جیسا انقلابی مطالبہ تھا دوسری جانب ریاستوں کی رعایا کے بارے میں یہ بے التفاتی کہ انھیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ لیگ کی اس حکمت عملی نے جو بنیادی طور پر غلط تھی۔ آگے چل کر پاکستان کے لئے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ کشمیر کا مسئلہ بھی جو اس وقت ہمارے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ ہماری اس حکمت عملی کی پیداوار ہے۔ اگر ہم شروع میں ریاستوں کے معاملات سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنے کا فیصلہ نہ کر لیتے تو نہ تو کشمیر کے معاملے میں ہمیں اتنی پریشانیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ نہ پاکستان کی ریاستوں کے باشندے ان مشکلات سے دوچار ہوتے جن سے وہ آج دوچار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ہماری ریاستیں جو پاکستان کی سرحدوں پر پھیلتی چلی گئی ہیں عجائب خانوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جہاں ایک فرسودہ نظام حکومت کی یادگاریں۔ اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ برطانوی حکومت نے ان پرانی یادگاروں کو اس لئے قائم رکھا کہ [illegible] اس کے مقاصد کے لئے بہت مفید [illegible] وہ نہیں چاہتی تھی کہ ریاستوں میں اسی قسم کا نظام حکومت رائج کیا جائے جو برطانوی ہند میں رائج ہے۔ [illegible] کے علاوہ ایک [illegible] برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے طرز حکومت میں ایک واضح فرق قائم رہے تاکہ ایشیائی انداز حکمرانی پر مغربی طرز حکومت کی برتری ثابت کی جا سکے۔ اگرچہ خود ہندوستان کی برطانوی حکومت میں [illegible] نقائص تھے، لیکن [illegible] تقابل سے اس کی خوبیاں اس طرح ابھر آتی تھیں کہ اس کے اکثر عیب دب کر رہ گئے تھے۔

برطانوی حکومت کے ختم ہو جانے سے ہماری ریاستوں کی وہ حیثیت نہیں رہی جو پہلے تھی [illegible] پاکستان کی ریاستیں [illegible] پاکستان کا جزو ہیں۔ ان کے باشندے پاکستانی ہیں اور انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو پاکستان کے دوسرے باشندوں کو حاصل ہیں۔ تاہم ابھی تک پاکستان کی ریاستوں اور دوسرے اجزا کا فرق دور نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ریاستوں کے نظام حکومت کے مسئلے کو اس وقت تک کے لئے اٹھا رکھنا چاہیئے جب تک دستور ساز اسمبلی اپنا کام شروع نہیں کرتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک دستور نہیں بنتا کیا ریاستوں کے باشندوں کی وہی حالت رہے گی جو اب ہے۔ پاکستان اور پاکستان کی ریاستوں کے نظام حکومت میں اسی قسم کا فرق رہے گا جو برطانوی عہد حکومت میں بعض مصلحتوں کے پیش نظر ملحوظ رکھا گیا تھا تعجب ہے کہ ریاستوں کی وزارت نے آج تک اس سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ ہمیں ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے نظام حکومت میں ریاستوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ وہ پاکستان ہی کے آئینی سانچے میں ڈھل جائیں گی یا ان کے لئے کوئی نیا قالب وضع کیا جائے گا۔ ہمارے وزراء اس مسئلے پر اظہار خیال کر چکے ہیں لیکن ریاستوں کے مستقبل کا مسئلہ ابھی تک ان کے فکر و نظر کے دائرے سے باہر معلوم ہوتا ہے

ہمیں افسوس ہے کہ ریاستی مسلم لیگ نے جو پاکستان کی ریاستوں میں حق طلبی کی جدوجہد کی علمبردار سمجھی جاتی ہے اس سلسلے میں اپنے فرائض پورے نہیں کئے۔ وہ ابھی مصلحت اندیشیوں کے پھیر میں پڑی ہوئی ہے اور غالباً یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکی کہ وہ ریاست کے باشندوں کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے یا اس پر والیان ریاست کے باشندوں کے حقوق کی حفاظت کا فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ [illegible] ریاستی مسلم لیگ کے ان ارکان کی جانب نہیں جو مختلف ریاستوں میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ البتہ ہمارے نزدیک ریاستی مسلم لیگ کے لیڈروں کی روش ضرور محل نظر ہے۔ [illegible] پاکستان کی سٹیٹ منسٹری سے اب تک [illegible] کی وضاحت کرا لینی چاہئے تھی کہ ریاستوں کو کس قسم کے آئینی سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ ریاستی مسلم لیگ کے لیڈر اگر اب تک ریاستوں کے باشندوں کے حقوق کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کرا سکے تو اس سے لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس مجلس کے قیام سے اس کے سوا اور کوئی چیز مقصود نہیں کہ بعض لوگ [illegible] کے مشغلہ میں مصروف رہیں۔

امروز، لاہور

صوبہ میں جنگلات اور درختوں کی کمی

[illegible] کی رپورٹوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ہمارے صوبے میں درختوں کی شدید قلت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز اینڈمن کی سیاہی [illegible] بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں مجموعی رقبہ کا کم از کم ۲۰ فی صدی حصہ درختوں سے آباد ہوتا ہے لیکن مغربی پاکستان کے ہر صوبہ کے بمشکل ۳ فی صد حصہ میں درخت پائے جاتے ہیں محکمہ جنگلات اس بڑی خامی کو دور کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اس نے درختوں کی آبادکاری کا ایک باقاعدہ پلان تیار کر لیا ہے جو آئندہ اسمبلی میں مسودہ قانون کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔

"نوائے وقت" لاہور۔

۳۔ باہر کی دنیا

کیا صلح ہونے والی ہے؟

اگرچہ چین کے محاذ پر ابھی جنگ ہو رہی ہے، مگر دراصل اب اس میں جان نہیں رہی تقریباً سارے اہم محاذ ٹوٹ چکے ہیں اور کومن تانگ حکومت کی راجدھانی سخت خطرے میں ہے۔ یہ بھی خبریں آ رہی ہیں کہ چیانگ کائی شیک نانکنگ سے فارموسا بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ نیشنلسٹ حکومت اپنے پورے علاقے میں مارشل لا نافذ کر کے اس بات کا بہرحال اقرار کر چکی ہے کہ اب حالات اس کے قابو سے باہر ہیں۔

امریکہ کی سرد مہری کی شکایت کرنے اور اس سے مدد مانگنے کے لئے مادام چیانگ واشنگٹن گئی ہیں۔ ان کی آمد پر امریکی اخبارات کا اظہار رائے کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ تو صرف "ہیرلڈ مارننگ یونین" نے امریکی حکومت کو چین کی مدد پر آمادہ کرنے کے لئے کمیونسٹ خطرے پر زور دیا ہے وہ لکھتا ہے

"چین میں کمیونسٹوں کی کامیابی تمام ایشیا کے لئے خطرناک ہے۔ اگر چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا تو سارا ایشیا سوویٹ کے اثر میں آ جائے گا اور اس کی وجہ سے یورپ کو زیر اثر رکھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا"۔ دوسرے عام طور پر اخبارات نے مادام سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے عملی مشکلات اور موجودہ حالات کو سامنے رکھا ہے مثلاً واشنگٹن اسٹار نے لکھا ہے

"اگر مادام اس لئے یہاں آ رہی ہیں کہ امریکہ سے نیشنلسٹ حکومت کے لئے زیادہ سے زیادہ امداد کے لئے درخواست کریں، تو ۱۹۴۸ء کے مقابلہ میں انھیں مایوسی ہوگی یہ بات نہیں ہے کہ ہم چین کی حالت نازک نہیں سمجھتے یا ہماری حکومت کمیونسٹوں کے مقابلے میں نیشنلسٹ حکومت کی کامیابی نہیں چاہتی یا جنرل سمو اور ان کی قابل تعریف بیوی سے امریکہ کو کوئی ہمدردی نہیں رہی دراصل ہمیں یہ ڈر ہے کہ امریکہ کی یہ ساری امداد ضائع جائے گی ...... ہمارے ذرائع بہرحال محدود ہیں اور ہم مغربی یورپ کی بحالی کے لئے کافی رقم صرف کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یقیناً ہمیں یہ سوچنے کا حق ہے کہ آیا نیشنلسٹ چینی حکومت کو امداد دینا، جبکہ اس نے ہماری امداد سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا ہے مناسب ہوگا یا نہیں جب تک ہمیں یقین نہ ہو جائے کہ ہماری امداد بے کار نہیں جائے گی اس وقت تک خاطر خواہ امداد کرنا مشکل ہے"۔

کافی انتظام کرنے کے بعد، مادام کی پریذیڈنٹ ٹرومین سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کی تفصیلات تو نہیں معلوم۔ البتہ یہ خبر آئی ہے کہ واشنگٹن میں مادام کی معرفت اور نانکنگ میں امریکی سفیر کے ذریعے چیانگ کائی شیک پر صلح کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ چیانگ کو اگر نانکنگ کی لڑائی میں کچھ بھی قابل ذکر کامیابی ہو جائے گی تو وہ صلح کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ اپنا کھویا ہوا وقار اور شرائط صلح میں کچھ بہتر شرطیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ نیشنلسٹ وزیر اعظم ڈاکٹر سن فو ایسے لوگوں کی حکومت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو امن اور صلح کے حامی ہیں۔ غرض لڑائی [illegible] امید ان [illegible] چل رہی ہے۔ اور ایشیا کی نظریں چین کے سیاست دانوں پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

رہی سہی امید بھی گئی

پچھلے دنوں، انڈونیشیا کی بات چیت ٹوٹ جانے پر ڈچ ڈیلیگیشن کے لیڈر مسٹر سامین نے دوبارہ گفتگو شروع ہونے کی امید ظاہر کی تھی۔ ریپبلکن حکومت نے یو، این کی خیر سگالی کمیٹی کے ذریعے مزید گفتگو کے لئے کچھ نئی تجویزیں بھی پیش کیں۔ مگر جیسا کہ ہمیں شبہ تھا ڈچ حکومت کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہے اور اس نے جمہوری حکومت کی شرکت کے بغیر ہی انڈونیشیا میں عارضی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہاں کی صورت حال خاصی نازک ہو گئی ہے۔ کوئی ایک سال ہوا ڈچ حکومت کی پولیس کارروائی کے بعد دونوں میں بات چیت کے ذریعے اختلافی مسئلوں کو حل کرنے کے لئے ایک سمجھوتہ ہوا تھا جو معاہدہ رنویل کہلاتا ہے کچھ اس کی وجہ سے اور کچھ یو۔ این کی خیر سگالی کمیٹی کی وجہ سے، دونوں میں کوئی بڑی جھڑپ نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس بات چیت کے آخری طور پر ٹوٹ جانے سے، دونوں میں پھر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر جنگ ہوئی تو اس کا پورا مشرق بعید پر گہرا اثر پڑے گا۔ چین میں کمیونسٹوں کی کامیابی پر مغربی طاقتیں کافی پریشان ہیں۔ اب اگر انڈونیشیا میں جنگ چھڑی تو سیام، ملایا اور برما وغیرہ میں کمیونزم کے پھیلنے کے لئے سازگار فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے امید تو ہے کہ مغربی طاقتیں ڈچ حکومت کو کوئی بڑی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دیں گی مگر حالات بہرحال قابل اطمینان نہیں ہیں۔

فرینکو کیا فرماتے ہیں

حال ہی میں امریکہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار "نیوز ویک" کے نامہ نگار کے سوالوں کے جواب میں جنرل فرینکو نے بہت سی دلچسپ باتیں کہیں جن سے یورپ کی موجودہ سیاست پر، ہٹلر کے پرانے دوست کے نقطۂ نظر سے روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس گفتگو کا ایک بڑا حصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نامہ نگار:۔ ابھی حال میں بعض سیاسی حلقوں نے تجویز کیا ہے کہ اسپین کو امریکہ کے اتحادیوں میں شامل کر لینا چاہئے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

فرینکو:۔ اتحاد سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ سیاسی یا فوجی؟

نامہ نگار:۔ تجویز میں خاص طور پر فوجی اتحاد کے لئے کہا گیا ہے۔

فرینکو:۔ اسپین کو کوئی بین الاقوامی معاہدہ کرتے ہوئے اپنی رائے عامہ کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ جنگ کے بعد اسپین سے مغربی طاقتوں کا سلوک بہت ہی خراب رہا ہے ہماری توہین کی گئی اور ہمارے وقار کو صدمہ پہنچایا گیا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ دونوں ملکوں میں دوستی کے امکانات موجود ہیں دراصل اگر برطانیہ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاتا تو دوستی کا یہ رشتہ کبھی کا قائم ہو چکا ہوتا۔ جب کبھی امریکہ نے اسپین سے ہمدردی ظاہر کی۔ برطانیہ بیچ میں کود پڑا اس کی رائے عامہ اس کے خلاف ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جنگ سے پہلے بین الاقوامی سیاست میں اسے لیڈری حاصل تھی وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے۔

نامہ نگار:۔ برطانیہ کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کے پیش نظر کیا یہ صحیح ہے کہ آپ امریکہ سے براہ راست بات چیت کریں گے نہ کہ مغربی یونین کی معرفت؟

فرینکو:۔ ہاں، یقیناً۔ اس کے علاوہ مغربی یونین میں ہے کون، سوا انگلستان کے، ایک فرانسیسی بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس کا ملک میدان جنگ بنا دیا جائے۔ ابھی حال میں فرانسیسی اور اسپینی جنرلوں میں جو گفتگو ہوئی ہے اس میں فرانسیسی جنرل نے اصرار کیا ہے کہ آئندہ مدافعت کا بنیادی محاذ رہائن اور ایلبے دریاؤں کی لائن ہو۔ یہ خیال اصولی طور پر بہت مناسب ہے کہ میدان جنگ ملک کے باہر ہو، مگر مصیبت یہ ہے کہ فرانس رہائن، ایلبے لائن پر بھی فوجیں بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس نے برطانیہ کو آمادہ کرنا چاہا مگر وہ بھی اس کے لئے کچھ زیادہ بے چین نہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں جنرل سیمو نے فرمایا کہ مغربی یورپ کی مدافعت میں سوئٹزرلینڈ سے بھی، مدد لینی چاہئے۔ حملہ کی صورت میں اس کی پہاڑیوں اور چٹانوں کی مدد سے ایک ناقابل تسخیر محاذ بنایا جا سکتا ہے اور آسٹریا، شمالی اٹلی جرمنی اور فرانس کے لوگ وہاں پناہ بھی لے سکتے ہیں۔ اور اس طرح وہاں سے غیر محدود مدت تک لڑائی جاری رکھی جا سکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے لوگوں کو حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ ابھی حال میں ہمارے چند افسروں نے وہاں کے افسروں سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ تیسری جنگ عظیم کے موقع پر بھی وہ غیر جانبدار رہیں گے حالانکہ آئندہ جنگ میں کوئی ملک بھی لڑائی سے الگ نہیں رہ سکے گا۔ آئندہ لڑائی میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ باقاعدہ لڑائی کے بعد گوریلا جنگ ہوگی۔ اور وہ سالہا سال میں فیصلہ کن ہوگی۔ پچھلی لڑائی کے زمانے میں بعض جرمنوں نے مجھے بتایا کہ جرمنی کی شکست اس وقت شروع ہوئی جب اس نے مخالف یورپی ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ نپولین نے بھی خاص کوشش کے اسپین پر قابض ہو گیا تھا۔ مگر گوریلا لڑائی نے اسے اسپین چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

نامہ نگار:۔ کیا آپ کے خیال میں امریکہ نے روس کی طاقت کا جو اندازہ لیا ہے وہ زیادہ ہے۔

فرینکو:۔ جی ہاں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ روس کی طاقت اتنی نہیں ہے جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم نے جو معلومات حاصل کی ہے وہ یہ ہے کہ روس کی ہوائی طاقت، توپ خانہ اور ٹینک تو اچھے ہیں مگر پیدل فوج کی حالت بہت گری ہوئی، اور حوصلہ بہت ہی پست ہے۔

غزل

اختر انصاری

وہ جل اُٹھی مرے پیام کی آگ
پیش کرتا ہوں پھر کلام کی آگ

آرزو کے جنونِ خام کی آگ!
اُف مرے سوزِ ناتمام کی آگ!

بن گئی گلشنِ بہشت آخر
عشق کے داغ لالہ فام کی آگ

ہے فغاں آگ میرے سینے کی
جیسے شمشیر ہے نیام کی آگ

بادۂ آتشیں ہے میرا لہو
کیا کروں گا میں لیکے جام کی آگ

نظمِ عالم کو پھونک سکتی ہے
میرے افکار کے نظام کی آگ

زیرِ دیوار اب ترا جینا کیا!
بجھ گئی جلوہ ہائے بام کی آگ

تابشِ صبح بن کے پھیلے گی
یہ سلگتی ہوئی سی شام کی آگ

زندگی کی ہوس ہے پھر مجھ کو
دل میں بھڑکی ہے انتقام کی آگ

انجمن کیوں نہ جل اُٹھے آخر؟
آگ! پھر وہ مرے کلام کی آگ

باپو

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

یہ کس نے زہر پیا!
تجھ کو جِلانے، مجھ کو جِلانے
دَور پڑا وہ بات نبھانے

جیون دان دیا!
یہ کس نے زہر پیا!
بکھرے جاتے تھے دیوانے
بیچ میں آیا سب کو بچانے
ہنس ہنس گھاؤ سیا!
یہ کس نے زہر پیا!
جس کی ہتھیا میں بھی تھا ہت
شاعر کی آنکھوں نے امرت
اس کو نذر کیا!
یہ کس نے زہر پیا!

خواب آزادی کی تعبیر

یحییٰ اعظمی

وطن میں آج یہ کیسا ہے دورِ آزادی
کہ ذرہ ذرہ ہے اس عہد کا فریادی
کہیں شرافت و اخلاق کی ہے پامالی
کہیں ثقافت و تہذیب کی ہے بربادی
بسے گی پھر نہ کبھی اس زمیں پہ صدیوں تک
اُجڑ چکی ہے جو انسانیت کی آبادی
نہ دیکھی ہوگی کبھی چشم قوم و ملت نے
متاعِ مجد و شرافت کی ایسی بربادی
ہماری پستی و دوں فطرتی کی حد یہ ہے
کہ ہم نے اوج و ترقی کی ہر بنا ڈھا دی
ستم ہے یہ کہ نہیں وہ بھی آج ہیں محفوظ
ہر ایک فرد کے تھے جو حقوق بنیادی

یہی ہیں دوستو! کیا آج اس کی تعبیریں
کبھی وطن نے جو دیکھا تھا خوابِ آزادی

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

ابھی تو راہ پہ لانا ہے ایک عالم کو
ابھی مجھے غمِ ہستی کے ناز اٹھانے دو
جو آج تک کبھی ساحل کا خواب پا نہ سکے
انھیں فسردہ سی موجوں میں ڈوب جانے دو
کبھی کبھی انھیں اشکوں سے جل اُٹھے ہیں چراغ
ابھی تو غم کے ستاروں کو جھلملانے دو
چمن پہ آج بھی ہے ایک گرد سی چھائی
گھٹا کے سائے میں پھولوں کو مسکرانے دو
ابھی تو کتنے ہی افلاک سرنگوں ہوں گے
بلا کشانِ محبت کو سر اُٹھانے دو
ہے ٹوٹنے ہی کو اب یہ طلسم بادہ کشی
ابھی تو جلوۂ ساقی کو آزمانے دو

• کرم کے بھیس میں اکثر ستم بھی ہوتا ہے
نقاب اب رُخِ محبوب سے ہٹانے دو

جمہوریہ چین

(۲)

عبداللطیف اعظمی

یان شی کائی نے صدر منتخب ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے ان تمام ممبروں کو جو انقلابی جماعت کومن تانگ سے تعلق رکھتے تھے علیحدہ کر دیا اور ان کی خالی نشستوں کے لئے نئے انتخاب کا اعلان کیا مگر یہ انتخاب کبھی بھی عمل میں نہیں آیا۔ اس کے بعد عارضی دستور کی نظر ثانی کے لئے ایک کونسل نامزد کی گئی۔ ذمہ دار کابینہ ختم کر دی گئی اور صدر پارلیمنٹ کی بجائے قوم کے سامنے جواب دہ سمجھا گیا، وزیر اعظم کو سکریٹری آف اسٹیٹ بنا دیا گیا اور کابینہ کے تمام ممبر اس کے ماتحت کر دئے گئے۔ سینٹ کے ممبر جنھیں صوبہ جاتی اسمبلیاں منتخب کیا کرتی تھیں نامزد کئے جانے لگے اور ایوان ادنیٰ کے اختیارات بہت زیادہ محدود کر دئے گئے۔

ایوان نمائندگان کا اجتماع چونکہ ابھی زیر غور تھا اس لئے انتخاب کے نئے قانون کی رو سے، سینٹ کو پارلیمنٹ کے فرائض انجام دینے کا حق دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں صدارتی انتخاب کا جو قانون شائع کیا گیا تھا، اسے منسوخ کیا گیا اور اس کے بجائے دوسرا قانون منظور ہوا جس میں صدر کو اپنے تین جانشین نامزد کرنے کا حق دیا گیا، جن میں سے کسی ایک کو پارلیمنٹ صدر منتخب کر سکتی تھی۔

مطلق العنانی کا یہ دور ۱۹۱۶ء تک قائم رہا۔ یان شی کائی نے اپنے مخالفین کو بے اثر کرنے یا ختم کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی اور جب راستہ بڑی حد تک صاف ہو گیا تو سرکاری ملازموں اور فوج کی مدد سے خود شہنشاہ بن گیا۔ انقلابی اگرچہ کافی کمزور ہو چکے تھے، مگر شہنشاہیت کے دوبارہ قیام سے ان میں پھر سے زندگی پیدا ہو گئی اور یونان میں انھوں نے بغاوت کر دی۔ چند مہینوں میں آس پاس کے بہت سے صوبوں نے مرکزی حکومت سے تعلقات منقطع کر لئے اور یان شی کائی کے حامی بھی بہت بڑی تعداد میں اس بغاوت میں شریک ہو گئے۔ اس سے یان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور بزرگوں کا بیان ہے کہ اسی صدمہ میں ۱۹۱۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

یان شی کائی کے انتقال کے بعد جنرل لی یان ہنگ جمہوریہ کا صدر منتخب ہوا مگر اس وقت ملک میں عجیب ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یان کے مضبوط ہاتھوں کے اٹھتے ہی فوجی گورنروں کو اپنی من مانی کرنے کا پورا پورا موقع مل گیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کر دیا، اور ان محصولوں کے علاوہ جنھیں بیرونی ممالک وصول کرتے تھے۔ مثلاً نمک کا ٹیکس، بقیہ تمام مالیہ روک لیا۔ اس وجہ سے مرکزی حکومت تقریباً دیوالیہ ہو گئی جس علاقے پر ابھی مرکزی حکومت کا اثر باقی تھا، اس کا انتظام کرنا اور مرکزی فوج کی تنخواہ دینا ناممکن سا ہو گیا۔ یہ انارکی ممکن ہے جلد ختم ہو جاتی۔ مگر جاپان کا مفاد اس میں تھا کہ

یہ انتشار اور لامرکزیت زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رہے۔ اس لئے جب کبھی کوئی جماعت امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوتی نظر آتی، تو جاپان اس کے مخالفوں کی مدد پر آمادہ ہو جاتا۔

یہ سب کچھ اگرچہ ہو رہا تھا، مگر محبان چین اپنی کوششوں سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں جمہوریت پسند انتہائی جنوب میں ڈاکٹر سن یات سین کی صدارت میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ حکومت محض دو صوبوں پر مشتمل تھی۔ ایک کوانگ تنگ جس کا دارالسلطنت کینٹن تھا، دوسرا کوانگ سی۔ شروع شروع میں تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ پورے جنوب پر حاوی ہو جائے گی، مگر صوبہ ہونان کے قریب شمالی فوج کے جنرل او پائی فو نے ان انقلابیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

ادھر چین خانہ جنگی میں مبتلا تھا ادھر خارجی مسائل خصوصاً وہ جو جنگ عظیم کے بعد پیدا ہو گئے تھے روز بروز پیچیدہ ہوتے جاتے تھے۔ چین جنگ عظیم میں اتحادیوں کی طرف سے محض اس لئے شامل ہوا تھا کہ جنگ کے بعد اس کی بین اقوامی حیثیت نسبتاً مضبوط ہو جائے گی، مگر طاقت طاقت کے سامنے جھکتی ہے۔ کمزور چاہے کتنا ہی مظلوم اور حق پر کیوں نہ ہو اس کا دنیا میں مشکل ہی سے کوئی حامی اور مددگار رہتا ہے۔ چنانچہ لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ، مسٹر ولسن صدر امریکہ اور کلیمانشو وزیر اعظم فرانس نے مشرق میں جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور چین کو جاپان کے رحم و کرم اور تالیف قلوب کے لئے چھوڑ دیا۔

ظاہر ہے کہ ان تقسیم اقتدار کے فیصلے کے سامنے چینی حبشی کمزور اور غیر منظم حکومت کو [illegible] تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ گو یہ ہے کہ جاپان پر ہر حال اثر پڑا تھا، چنانچہ جاپان کے خلاف چینی عوام کے دلوں میں شدید نفرت پیدا ہو گئی، اور انھوں نے جاپان کی تجارتی مصنوعات کا نہایت کامیاب بائیکاٹ کیا۔ ساتھ ہی ایک طرف جاپان کے خلاف یہ کوششیں جاری تھیں، دوسری طرف شمال کے فوجی عہدیدار ذاتی مفاد کے لئے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے۔ اس کا بین اقوامی حالات پر بھی خاصا اثر پڑا۔ امریکہ اور جاپان کے تعلقات چین کے مسئلے پر اس قدر خراب ہو گئے کہ علانیہ جنگ کی گفتگو شروع ہو گئی۔ برطانیہ کا جاپان سے فوجی معاہدہ تھا اس لئے وہ عجیب مصیبت میں پڑ گیا کیونکہ امریکہ کا [illegible] اور اس کا دوست۔ ان حالات میں صدر ہارڈنگ نے بڑی طاقتوں کی واشنگٹن میں ایک کانفرنس بلائی۔ یہ کانفرنس نومبر ۱۹۲۱ء سے فروری ۱۹۲۲ء تک ہوتی رہی۔ اس میں سات معاہدے مرتب ہوئے جن میں سے ایک چین سے متعلق ہے جو نو طاقتوں کا معاہدہ کہلاتا ہے۔ اس پر برطانیہ، امریکہ، فرانس، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال، جاپان اور چین کے نمائندوں نے دستخط کئے۔ اس کی رو سے چین کی انتظامی اور ملکی سالمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام ملکوں کے لئے مساوی طور پر چین کا دروازہ کھلا رہے گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی طاقتوں نے "کھلے دروازے" کی پالیسی کو تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ واشنگٹن کانفرنس نے جاپان کو مجبور کیا کہ وہ سائبیریا سے اپنی فوجیں واپس بلا لے، اور شانٹنگ میں چین کو مراعات دے

نیز اینگلو جاپانی اتحاد کو منسوخ کر دیا گیا۔

واشنگٹن کے معاہدوں کے بعد چین کو اندرونی اصلاحات کرنے اور باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرنے کا موقع ملا مگر بدقسمتی سے ۱۹۲۴ء میں پھر شمال میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لئے پیکن گئے۔ مگر بدقسمتی سے ۱۵ مارچ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اور چین ایک مخلص رہنما اور بے لوث خادم سے محروم ہو گیا۔

ڈاکٹر سن یات کے انتقال کے بعد، کچھ عرصہ تک تو کومن تانگ میں یکجہتی اور شیرازہ بندی رہی۔ مگر بہت جلد پھوٹ پڑ گئی، اور دو پارٹیاں قائم ہو گئیں۔ ایک دایاں بازو، دوسرا بایاں بازو۔ عام طور پر حکومت کے عہدہ دار دائیں بازو کے حامی تھے۔ کچھ اس لئے کہ وہ اصلاحات کے مخالف تھے، اور کچھ اس لئے کہ وہ اصلاحات سے پہلے حکومت اور فوج کو مضبوط اور دیرپا بنانا چاہتے تھے۔ بائیں بازو میں کمیونسٹ تھے جنھیں جنوری ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر سن نے کومن تانگ میں شامل کر لیا تھا۔ یہ چین کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں یکسر انقلاب چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چین کے انقلاب سے اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ جب تک کہ فوج جمہوریہ چین کے ماتحت نہ ہو اور ملک بیرونی اثرات سے آزاد نہ ہو جائے۔ چیانگ کائی شیک کو جو دائیں بازو کے حامیوں میں سے تھے۔ سب سے زیادہ سیاسی اتحاد کی فکر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اب روسیوں کی مدد کی چین کو چنداں ضرورت نہیں ہے اس پالیسی کی وجہ سے انھیں برطانیہ اور امریکہ کی حمایت حاصل تھی۔ لندن، واشنگٹن اور پیرس انھیں دوسرا کمال اتاترک بننے کی تو اجازت دے سکتے تھے مگر ان کا دوسرا لینن یا سٹالن بننا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

بائیں بازو کے لیڈر ڈاکٹر سن یات سین کی بیوہ اور وانگ چنگ وی تھے اور دائیں بازو کے ہو ہان من۔ ہو ہان من کا کچھ عرصہ کے بعد انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ چیانگ کائی شیک نے لی، اور بعد میں وانگ کو شکست دے کر کومن تانگ کے صدر ہو گئے۔ صدر بننے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے کومن تانگ سے کمیونسٹوں کا صفایا کرنا شروع کیا۔ ان کا زور سے ان کو نکال باہر کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیدیا اور ۱۹۲۸ء میں قومی حکومت نانکنگ منتقل کر دی۔ ان کارروائیوں سے اس میں شک نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی قریب قریب ختم ہو گئی، مگر اس سے کمیونسٹ دل برداشتہ ہونے کے بجائے اپنی تنظیم میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے بالآخر چیانگ کائی شیک کو ان کی قوت توڑنے کے لئے باقاعدہ فوج کشی کرنی پڑی اور چین کی سوویٹ حکومتیں ۱۹۳۶ء تک ان کا مقابلہ کرتی رہیں۔ جب یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہوتا نظر نہ آیا اور دوسری طرف جاپان کی دست برد کا سلسلہ بڑھنے لگا تو دسمبر ۱۹۳۶ء میں کچھ لوگوں نے چیانگ کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا۔ بالآخر مادام چیانگ کی کوششوں اور ان کے تدبر سے قومی حکومت اور کمیونسٹ پارٹی میں صلح ہوئی اور ۲۵ دسمبر کو چیانگ رہا کئے گئے۔ اس صلح سے خانہ جنگی ختم ہوئی اور پورا چین ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں جمہوریہ چین کا مکمل دستور شائع کیا گیا اور تعمیری کاموں کا ایک جامع پروگرام بنا کر نہایت تیزی سے کام شروع کر دیا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

موزہ

(روسی دفتری حکومت کا طنزیہ خاکہ)

ایک روسی ادیب

جی ہاں۔ ٹرام کے اندر موزہ کھونے میں لگتا ہی کیا ہے ایک طرف سے لوگوں نے دبا دیا۔ پیچھے کھڑے ہوئے کسی مسٹنڈے نے آپ کے ربر کے موزے کی ایڑی پر اپنا پیر دھر دیا۔ آپ آگے بڑھے اور موزہ غائب! موزہ کھینچ یا ٹھوکر کھا کر گرنا ایک ہی بات ہے۔ اور صاحب میرا موزہ تو ایسا کچھ جھٹ پٹ پیر سے کھنچ گیا ——— بس آنکھ جھپکی اور مال غائب۔ نہ کچھ کہہ سکا نہ سن سکا۔

جب ٹرام میں بیٹھا تھا تو دونوں ربر کے موزے موجود تھے۔ ٹھیک درست۔ مجھے ایسا یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ میں تو جانوں سوار ہوتے وقت میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھ بھی لیا تھا، کہ صاحب موجود تھے

مگر ٹرام سے اترا ہوں تو ایک موزہ وہ جو مجھے زیادہ پسند تھا۔ موجود ہے، مگر دوسرا غائب۔ کتاب بھی وہ موجود ہے، پاتابہ بھی تھا ہی، پتلون، حاضر جناب، مگر موزہ غائب یہ کیا کیجئے۔ آپ کچھ ٹرام کے پیچھے دوڑ تو سکتے نہیں۔ ناچار دوسرا موزہ بھی اتارا اور اسے اخبار میں لپیٹ آگے بڑھا۔ جی میں سوچا کام ختم کرلوں، تو موزہ کی تلاش کی فکر کروں گا۔ چیز تھی کام کی۔ کام کی چیز کو کوئی یوں تو ہاتھ سے دے نہیں دیتا۔ جیسے تیسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ ہی نکالوں گا۔"

کام کر چکا تو تلاش شروع کی۔ پہلے اپنی جان پہچان کے ٹرام چلانے والے سے مشورہ کیا۔ اس نے فوراً ہی بڑی امید دلائی۔ کہا "شکر کرو۔ شکر کہ موزہ ٹرام میں کھویا۔ اور کہیں کھویا ہوتا۔ تو میں کیا بتاؤں میں کسی اور کی طرف سے کیا کہہ سکتا۔ مگر بھائی ٹرام میں کھونا تو، تو مقدس امر ہے۔ ہمارا گم شدہ چیزوں کا دفتر، کیا پوچھتے ہو ایسا ہی کہ بس، پہنچے اور چیز موجود۔ سچ کہتا ہوں مقدس معاملہ ہے مقدس۔"

میں نے کہا "اچھا بھائی، تمھارا بہت بہت شکریہ تم نے تو میرے سر سے بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ اس لئے کہ بھائی موزہ بھی تو تقریباً نیا تھا۔ چمل چمل۔ زیادہ سے زیادہ تین چار ٹرے گذرے ہوں گے۔"

میں دوسرے ہی دن گم شدہ چیزوں کے دفتر میں گیا پوچھا "دیکھو، کھویا ہوا موزہ بھی واپس مل سکتا ہے؟ ٹرام میں پیر سے نکل گیا تھا، ٹرام میں۔"

"کیوں نہیں، مل کیوں نہیں سکتا۔ کیسا موزہ تھا؟"

میں نے کہا "معمولی قسم کا موزہ ہے، نمبر ۱۲"

جواب ملا "ہمارے یہاں اسی ۱۲ نمبر ناپ کے بارہ ہزار موزے ہیں۔ اپنے موزہ کی ذاتی صفات بتائیے"

میں نے جواب دیا "صفات ذاتی بھی یہی معمولی قسم کی ہیں۔ ایڑی البتہ لوٹی ہوئی ہے اور اندر کا استر ——— ہاں استر ہے نہیں، گھس کر نکل گیا ہے۔"

انھوں نے کہا "ٹھیک ان صفات کے بھی ہزار سے اوپر موزے یہاں ہیں۔ تمھارے موزہ میں کوئی خاص علامات نہیں ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں ہیں، خاص علامات ہیں۔ انگوٹھے کے پاس سے چونچ یوں سمجھئے کہ بالکل پھٹ گئی ہے۔ ایڑی جگہ مشکل ہی سے کچھ سہارا دیتا ہے۔ اور پیچھے کی طرف تلا بھی نہیں، ہاں تقریباً ختم ہی سا ہے۔ جی ہاں، گھس گیا ہے لیکن پہلوؤں پر، ہاں پہلوؤں پر بالکل ٹھیک ہے، لیا گیا گذرا نہیں، ابھی چل سکتا ہے۔"

فرمایا "ٹھہرو، ہم دیکھتے ہیں۔" جو اندر سے نکلے تو میرا موزہ لئے ہوئے۔ واہ واہ! خوشی سے میرا دل کیا کیا اچھلا ہے۔ کیا مسرت تھی! جی میں میں نے کہا "ریاست کا بھی کیا انتظام ہے! اور واہ، کیا لوگ ہیں۔ کیا کیا زحمت انھوں نے اٹھائی۔ اور سب میرے ایک موزہ کے لئے۔" میں نے ان سے کہا "جیتے جی آپ کا شکرگذار ہوں گا، لائیے، تو میں ابھی اسے پہن لوں۔"

جواب ملا "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمھارے نام موزہ نہیں جاری کر سکتے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ تمھارا موزہ کھویا تھا؟"

میں نے کہا "میں کہتا ہوں! میں نے ہی کھویا تھا۔ میرا ہی ہے۔"

انھوں نے کہا "بہت ممکن ہے، لیکن ہم اسے جاری نہیں کر سکتے۔ ایک صداقت نامہ بدیں مفاد کہ تم نے ہی یہ موزہ کھویا تھا۔ محلہ کی کمیٹی کا صداقت نامہ لے آؤ تو ہمیں زیادہ دوڑ دھوپ کرنی نہیں، مزید ضابطہ کی کارروائی بغیر موزہ تمھارے نام جاری کر دیں گے۔"

"ارے لوگو" میں نے کہا "معزز ساتھیو! غریب محلہ کی کمیٹی کو اس کی کیا خبر وہ تو واقعہ سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ تو غالباً صداقت نامہ نہ دیں۔"

انھوں نے کہا "نہیں دیں گے کیوں نہیں صداقت نامے دینا ان کا کام ہے۔"

میں نے حسرت سے ایک نظر اپنے موزہ پر ڈالی اور باہر نکل آیا، دوسرے دن محلے کی کمیٹی کے صدر کے پاس گیا۔ عرض کی "صداقت نامہ دے دیجئے۔ وہ میرا موزہ ختم ہوا جاتا ہے۔"

انھوں نے فرمایا "مگر یہ بات سچ بھی ہے کہ تمھارا موزہ کھویا تھا۔ کسی اور کا موزہ تو پہن کر تو آزمانا نہیں چاہتے؟"

میں نے کہا "بخدا میں نے ہی کھویا تھا۔"

انھوں نے فرمایا "اچھا تو بیان حلفی داخل کرو۔"

میں نے بیان کا فارم پر کیا۔ دوسرے دن پھر حاضر ہوا تو صداقت نامہ مل گیا۔

یہ صداقت نامہ لے کر گم شدہ چیزوں کے دفتر پہنچا اور ان لوگوں نے واقعی مزید ضابطہ کی کارروائی کے بغیر میرا موزہ مجھے دے دیا۔ اور اب کہ موزہ پھر میرے پیر میں تھا۔ کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ جی میں کہہ رہا تھا "دیکھ لو۔ ریاست کا بھی کیا انتظام ہے۔ کسی پسماندہ غیر ترقی یافتہ ملک میں کیا کوئی میرے موزہ کے لئے اتنا وقت صرف کرتا اور اتنی زحمت اٹھاتا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ بس اسے ٹرام سے اٹھا کر پھینک دیتے، اور معاملہ ختم ہوتا لیکن یہاں ابھی عرض دیئے مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہے اور میرا موزہ مجھے واپس مل گیا۔ کیا انتظام ہے، واہ کیا انتظام ہے!"

لیکن ایک کسر ہو گئی۔ اس ایک ہفتہ کی دوڑ دھوپ میں وہ ایک موزہ جو مجھے زیادہ پسند تھا، وہ کھو لیا۔ میں اسے کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبائے دبائے پھرتا تھا۔ اور اب گردن تک تو یاد نہیں آتا کہ کہاں بھول آیا، مگر اصل مصیبت یہ ہے کہ، ٹرام میں نہیں بھولا۔ افسوس ٹرام میں نہیں بھولا۔ اب اسے کہاں ڈھونڈتے جاؤں۔

لیکن پھر بھی کیا مضائقہ ہے۔ وہ دوسرا موزہ تو ہے اور میں نے اسے اپنے کمرے میں آتش دان کے اوپر رکھ دیا ہے جب زندگی سے ذرا تھک جاتا ہوں تو اس پر ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکریں مٹ گئیں اور جی ہلکا ہو گیا، دل میں کہہ لیتا ہوں "واہ رے نظم، واہ رے انتظام!"

جمہوریہ چین

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

جولائی ۱۹۳۷ء میں جاپان نے چین پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ ملک ابھی کمزور تھا، ایک طویل بیماری سے ابھی اٹھا تھا مگر اس حملے سے سب اختلافات بھی ختم ہو گئے اور پوری قوم ایک جان اور ایک دل ہو کر وطن کی مدافعت میں لگ گئی۔ اس اتحاد اور یک جہتی ہی کا نتیجہ تھا کہ جاپان جیسی عظیم الشان طاقت چین جیسے کمزور ملک کو شکست نہ دے سکی۔ بالآخر ۱۹۴۵ء میں جب جاپان کو اتحادیوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو چین کو بھی اس طویل لڑائی سے نجات ملی۔

اگرچہ اس لڑائی میں چین بڑی بہادری سے لڑا تھا مگر اس کا کچومر نکل گیا، اور زندگی کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ ضرورت تھی کہ ملک کے سارے رہنما چاہے وہ کمیونسٹ ہوں یا نیشنلسٹ معاشی بحالی اور عام تعمیری کاموں میں لگ جاتے۔ مگر چین کی قسمت میں ابھی اور خانہ جنگی لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ کومنتانگ اور کمیونسٹ پارٹی میں پھر اختلاف ہو گیا، اور ۱۹۴۶ء کے شروع میں دونوں میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی۔ اس وقت سے یہ لڑائی اب تک جاری ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے کمیونسٹ تیزی کے ساتھ فتح پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سال کے ختم ہونے تک چین کو اس خانہ جنگی سے نجات مل جائے گی۔

خانہ جنگی تو بہرحال دیر سویر ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے بعد چین کے عوام کو دیرپا امن بھی نصیب ہو گا۔ اس کے متعلق فی الحال یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ چین میں اب تک جتنی خانہ جنگیاں ہوئی ہیں ان کا منجملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب بیرونی ملکوں کی غیر معمولی دلچسپی اور ان کا اپنا مفاد بھی ہے۔ یہ مفاد اب بھی ہے اور روس اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے اختلافات نے اس کو اور اہم بنا دیا ہے۔ گو اس وقت امریکہ بظاہر چین کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے مگر مادام چیانگ کا امریکہ جانا خطرے سے خالی بھی نہیں۔

روس یا امریکہ؟

(۱)

سید انوار الحق حقی

(ہم اس سے قبل پروفیسر زما اشرف کا ایک مضمون پیشتر شائع کر چکے ہیں۔ مسئلے کی اہمیت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ہر خیال کے ارباب فکر اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔)

ظاہری امن و اتحاد کے باوجود آج دنیا دو سیاسی جتھوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور دونوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ روز بروز زیادہ وسیع اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں جتھوں کا دعویٰ ہے کہ وہ امن و امان کے خواہاں ہیں اور ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ نئی جنگ کے خطرے اور شہنشاہیت اور آمریت کے خلاف جد و جہد کر کے سب قوموں کی "آزادی" کی حفاظت کی جائے، جمہوریت کی ترقی، استحکام اور فسطائیت (فاشزم) کی جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے تمام جمہوریت پسند طاقتوں کو یکجا اور متحد کیا جائے۔

موجودہ بین الاقوامی سیاسی کشمکش اور بحران کی وجہ سے یہ سوال نہایت ہی اہم ہو گیا ہے کہ آزاد ہندوستان کی خارجی پالیسی کیا ہے، اور کیا ہونی چاہیئے۔ ان دونوں سیاسی جتھوں میں سے کون ہم سے قریب تر ہے اور ہماری جگہ "جمہوریت پسندوں" کے کس کیمپ میں ہے۔ ملک کے سامنے جتنے مسائل اور مشکلات ہیں، ان میں سب سے زیادہ وقت طلب اور نازک مگر نہایت ہی اہم سوال ملک کی خارجی پالیسی کا ہے۔ خود ہمارے داخلی مسائل اور ان کے حل کا خارجی پالسی سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ اس وقت ہم نے شاہراہ آزادی پر قدم رکھا ہے۔ ہمارے لئے نہایت ہی ضروری اور ناگزیر ہے کہ ہم غور و فکر سے کام لے کر یہ فیصلہ کریں کہ بین الاقوامی سیاست میں ہمارا رویہ کیا ہوگا اور "جمہوریت پرست اور امن پسند قوتوں" کے ساتھ ہمارے کیا تعلقات ہوں گے۔ ملک کی فلاح و بہبود اور امن و امان کا دار و مدار بڑی حد تک اسی فیصلہ پر ہے۔

پنڈت نہرو نے ہندوستان کی خارجی پالسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہمارا ملک آزاد اور غیر جانب دار روش اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق کسی سیاسی گروہ بندی سے نہ ہوگا۔ وہ بڑی طاقتوں کے کسی بلاک میں شامل نہیں ہوگا۔

اس میں شک نہیں، ہندوستان کی شاندار اور تاریخی روایات کے مطابق پنڈت نہرو کا نظریہ نہایت ہی بلند اور قابل تعریف ہے۔ اور اگر دنیا کے سیاست داں انھیں زریں اور اخلاقی اصولوں پر عمل کرتے ہوتے تو موجودہ بحران کا وجود بھی نہ ہوتا۔ ہم لوگ ایک ایسی فردوس ارضی کے شہری ہوتے جہاں بقول مہاتما گاندھی نہ فوجیں ہوتیں اور نہ اسلحہ۔ ہر صنعت میں اور پیداوار صنائع کیا جاتا۔ سب کی بھلائی چاہنا اور کسی کی برائی نہ چاہنا نہایت اعلیٰ اور عمدہ اصول ہے۔ اور بڑی خوشی اور فخر کا مقام ہوگا اگر ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہندوستان دنیا میں امن، اتحاد اور آشتی پیدا کر سکے۔ مگر ایک وزیر خارجہ کے سامنے صرف بین الاقوامی مسائل ہی نہیں ہوتے، اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کا اولین فرض قومی مفاد اور ملک کی بیرونی خطرے اور حملوں سے محافظت ہے، اور کسی ملک کی بیرونی پالسی اسی وقت صحیح اور کامیاب کہی جا سکتی ہے جب بین الاقوامی جھمیلوں میں پڑنے کے ساتھ ساتھ قومی مفاد اور ملک کی حفاظت کے نصب العین کو نہ بھلایا جائے۔ اسی نظریہ اور نصب العین کے تحت ہندوستان کو بھی اپنی خارجی پالسی کی تشکیل کرنی چاہیئے۔

جہاں تک ہمارے ذمہ دار ارباب حکومت اور سیاسی رہنماؤں کا تعلق ہے، ان کی تقریروں اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی خارجی پالسی کے دو بنیادی مستحکم اصول ہیں:-

(۱) بین الاقوامی گروہ بندی سے احتراز۔

(۲) امن عالم اور اتحاد اقوام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا اور ایسی تحریکوں کی مدد کرنا جن کا مقصد دنیا میں امن و اتحاد قائم کرنا ہے۔

مگر یہ نصب العین کیونکر حاصل ہوں گے؟ اس سوال کا جواب ابھی تک واضح طور پر نہیں دیا گیا۔ غالباً ہمارے سیاسی رہنماؤں کو یو۔ این۔ او پر پورا اعتماد اور حفاظتی کونسل کی کامیابی کی پوری امید ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقوام متحدہ کا نصب العین امن اور اتحاد قائم رکھنا ہے اور حفاظتی کونسل کا یہ مقصد ہے کہ وہ ہر ایسی اور چیز کی روک تھام کرے جس سے امن عالم میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے لیکن تصور اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آخر یو۔ این۔ او کا اولین فرض کمزور قوموں کی مدد کرنا ہے یا نہیں؟ لیکن کیا یو۔ این۔ او درحقیقت اس قدر متحد اور منضبط ہے کہ وہ کسی کمزور ملک یا قوم کی صحیح معنوں میں کوئی خدمت اور مدد کر سکے یا اسے کسی بڑی طاقت کی دراز دستی سے بچا سکے؟ اس سوال کا جواب انڈونیشیا، ویت نام اور فلسطین زبان حال سے دے رہے ہیں۔ انڈونیشیا اور ویت نام اپنی قومی آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ مگر اس جنگ آزادی میں یو۔ این۔ او نے ان کی کچھ بھی مدد نہ کی۔ ہزاروں مجاہد جاں بحق ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ لاکھوں روپیہ روز گولہ بارود کی نذر ہو رہا ہے۔ اور حفاظتی کونسل نہایت اطمینان سے بحث مباحثہ اور تقریری مقابلوں میں مشغول ہے۔ انڈونیشیا کی طرح کشمیر کے لئے بھی ایک کمیشن بنا دیا گیا تھا جس نے وہاں کراچی اور سری نگر میں دعوتیں اڑائیں۔ سیر و تفریح کی اور چل دیا۔ یہاں ہر چیز منافعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یو۔ این۔ او کا نصب العین اور فرض جو کچھ بھی ہو، موجودہ صورت میں وہ ایک تفریحی ذنکل اور ڈبیٹنگ سوسائٹی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ قومی مفاد کی خاطر ہندوستان کے لئے ضروری اور لازمی ہے کہ وہ یو۔ این۔ او پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اپنے طور پر دوسرے ملکوں سے رابطہ بڑھائے اور مضبوط رشتے قائم کرے۔

باہمی معاہدے اور دوستانہ تعلقات بین الاقوامی سیاست میں بہت کافی اثر اور وزن رکھتے ہیں۔ قومی مفاد کی حفاظت کے معاملے میں صرف دوستوں کے اعلیٰ اخلاق اصول یا زبانی اور دلی ہمدردی سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ ان کے سیاسی اثرات اور اقتصادی اور فوجی دباؤ سے بھی کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بین الاقوامی گتھیاں دعا کے خیر سے نہیں بلکہ ناخن سیاست سے کھلتی ہیں۔ اس سلسلے میں البانیہ اور برطانیہ کی موجودہ نزاع پر غور کیجئے۔ اگر روس نے البانیہ کی پشت پناہی نہ کی ہوتی تو اب تک برطانیہ نے معاملے کو اپنے حسب مرضی طے کر لیا ہوتا اور نہ معلوم وہ جہازوں کو ڈبونے کے الزام میں البانیہ سے کتنا تاوان لیا گیا ہوتا اور پھر جو سیاسی معاشی مراعات حاصل کی جائیں وہ الگ۔ نومبر ۱۹۲۴ء میں جب سوڈان کے گورنر جنرل سر لی اسٹاک کو قاہرہ کے دہشت پسندوں نے قتل کیا تھا تو مصر کو جرمانے میں نہ صرف پانچ لاکھ پونڈ دینا پڑے بلکہ اسی کے ساتھ سوڈان سے اپنی تمام فوجوں کو واپس بلانا پڑا اور دریائے نیل کے سلسلے میں جو پابندیاں تھیں وہ اٹھانی پڑیں۔ اس طرح ایک فرد کے قتل کی پاداش میں مصر کو عملی طور پر سوڈان سے دست بردار ہونا پڑا جس کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہا ہے۔ مگر یہاں دو جنگی جہاز غرق ہوئے۔ اور بڑا جانی و مالی نقصان ہوا۔ پھر بھی انگریز "برطانوی شیر" کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً اس کو بین الاقوامی عدالت کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرنا پڑا! اسی طرح فلسطین میں اپنے عزم و جوش اور دوسروں کی امداد کی بنا پر یہودیوں نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ۱۹۱۴ء میں جرمنی اور آسٹریلیا کو یقین ہوتا کہ سربیا کی مدد روس، فرانس اور برطانیہ کریں گے تو کبھی الٹی میٹم دے کر جنگ کے شعلوں کو نہ بھڑکاتے۔ اسی طرح اگر ہٹلر کو برطانیہ کی پالیسی کے بارے میں غلط فہمی نہ ہوتی تو وہ ہرگز پولینڈ میں پیش قدمی کر کے دوسری جنگ عظیم کی ابتدا نہ کرتا۔

اپنی بقا اور حفاظت کے واسطے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے دوستانہ تعلقات کو بڑھائے خاص کر بڑی طاقتوں سے مضبوط اور مستحکم رشتے قائم کرے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس وقت دنیا میں صرف دو یا تین ہی بڑی طاقتیں ہیں اگرچہ حفاظتی کونسل میں برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس اور چین کو مستقل نشستیں دے کر ان کو بڑی طاقت مان لیا گیا ہے مگر دراصل روس اور امریکہ اور ان کے بعد برطانیہ ہی بس قابل ہیں کہ ان کو بڑی طاقت کہا جائے۔ فرانس اب تک اپنے اندرونی اختلافات اور داخلی مسائل کی بنا پر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔ چین اپنی خانہ جنگی کی وجہ کر خود ہمدردی اور مدد کا محتاج ہے۔ اس لئے ہندوستان کے سامنے دراصل بقیہ تین بڑی طاقتوں سے اپنے تعلقات کو خوش گوار بنانے اور مستحکم کرنے کا مسئلہ ہے اور اسی پر ملک کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔

کمزور قوموں کی بد قسمتی سے دنیا اس وقت دو مخالف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ دوران جنگ میں جو اتحاد اور یک جہتی بڑی طاقتوں میں تھی وہ اب اختلاف بلکہ بغض اور نفرت کی صورت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ بظاہر کوئی صورت ایسی نظر نہیں آتی جس سے دونوں گروہوں

میں صفائی ہو جائے اور دلی اتحاد قائم ہو سکے۔ دراصل اس جنگ عظیم نے فرانس اور برطانیہ کی طاقت اور عظمت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب سیاسی اور فوجی اعتبار سے صرف روس اور امریکہ ہی صف اول کی بڑی طاقتیں ہیں جنگ سے قبل ان دونوں ممالک کا بین الاقوامی سیاست میں کوئی خاص اثر یا درجہ نہیں تھا لیکن اب انہی طاقتوں کی حکمت عملی پر دنیا کے امن اور ترقی کا دارومدار ہے۔

اس کشیدگی کے ماحول میں تنہا ہونا بھی نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ تاریخ عالم بتاتی ہے کہ کسی ملک کی غیر جانبداری کا فیصلہ فریقین جنگ اپنی فوجی ضرورتوں اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کرتے ہیں۔ اس میں اس ملک کے باشندوں کی خواہش اور خوشی کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اگر جنگ میں شریک ہونا یا نہ ہونا اپنے اختیار کی بات ہوتی تو دوسری جنگ عظیم میں بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک اور ناروے کبھی شامل نہ ہوتے۔ [illegible] سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کی طرح ان کی یہ خواہش اور خوشی تھی کہ وہ میدان جنگ نہ بنیں۔ لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ اس میں شک نہیں کہ جغرافی اعتبار سے ہندوستان زیادہ بہتر اور مضبوط حالت میں ہے۔ پھر بھی یہ اپنی جگہ پر اٹل حقیقت ہے کہ آئندہ جنگ عظیم میں شریک ہونا یا نہ ہونا ہمارے ارادے اور خوشی پر نہیں بلکہ فریقین جنگ کی مصلحتوں اور ضرورتوں پر منحصر ہوگا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اول تو جنگ کا زمانہ قریب میں کوئی امکان نہیں اور اگر جنگ چھڑ بھی گئی تو یہ دیکھ کر کہ جنگ کا فوری سبب کیا ہے اپنے حق پرستانہ مسلک کے مطابق ہندوستان اس فریق کا ساتھ دے گا جو حق پر ہوگا اس کو زیادہ کرنا دہی اور [illegible] عاقبت اندیشی کیا ہو سکتی ہے؟ یہ حضرات جنگ کے اسباب اور اس کے بہانے میں فرق نہیں کر سکتے۔ محض اتفاقی واقعات کی بنا پر بھی قوموں میں جنگ نہیں ہوتی۔ ان اسباب کا جو جنگ کے شعلوں کو بھڑکاتے ہیں مطالعہ کرنے کے اس انتظار کی ضرورت نہیں کہ لڑائی چھڑ جائے۔ ان کا مطالعہ پہلے سے کیا جا سکتا ہے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کو یہ توقع رکھنے کا حق ہے کہ ہماری خارجی پالیسی واضح اور غیر مبہم اور ہمارے سیاسی تعلقات صاف اور مستحکم ہوں۔ خاص کر موجودہ نازک اقتصادی دور میں جبکہ ضروریات زندگی کی کمیابی اور اشیا کی چڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے ایک بحران اور پریشانی کا عالم ہے۔ ہمارے لئے سیاسی تعلقات کے بارے میں یکسوئی سے فیصلہ کر لینا ناگزیر ہے۔ ہندوستان آزاد تو ہو گیا ہے لیکن صنعتی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے ہم بڑی حد تک دوسروں کے محتاج ہیں۔ اس لئے سیاسی تعلقات قائم کرنے سے پہلے ہمیں یہ بھی دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے کہ ملک کی آزادی اور خود مختاری کو قائم رکھنے اور زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی کے لئے کون کون ممالک ہمارے [illegible] معاون ہو سکتے ہیں اس بات کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ امداد دیتے وقت دوسروں کی یہ خواہش اور شرط ہوتی ہے کہ بوقت ضرورت ہم ان کی حفاظت و بقا کے لئے ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کریں۔ آج کل کے کشیدہ سیاسی ماحول نے یہ واضح کر دیا کہ اس وقت روس اور امریکہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں ایک سے دوستی کے معنی دوسرے کی مخالفت مول لینا ہے۔ جس طرح ایک وقت میں ایک سوار دو گھوڑوں پر نہیں بیٹھ سکتا بالکل اسی طرح ان دونوں ملکوں کی دوستی اور اعتبار بیک وقت حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے سے ہم کسی طرح نہیں بچ سکتے کہ اپنی سیاسی آزادی، قومی ترقی اور ملک کی حفاظت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کس سے زیادہ قریبی اور گہرے تعلقات قائم کریں

(باقی آئندہ)

یہ اہل علم کی محفل ہے!

(بسلسلہ صفحہ ۲)

مگر عہد غلامی میں جو ذہنیت پیدا ہو گئی ہے، اس میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا ہے، سوچنے کا ڈھنگ وہی، معیار وہی، انداز وہی، دل وہی، دماغ وہی، پھر کوئی نئی بات پیدا ہو تو کیوں کر۔

اس وقت آزاد ہندوستان میں ترقی یافتہ ملکوں کی طرح علم اور تعلیم عام کرنے کی تجویزیں زیر غور ہیں بلکہ کوشش بھی شروع ہو گئی ہے اور بہت جلد اعلیٰ تعلیم کی بھی انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم ہندوستان کی کوئی زبان ہوگی۔ چاہے وہ قومی زبان ہو یا مقامی زبانیں۔ اگر تعلیم زبان اور ادب کے بارے میں ملازمتوں اور میونسپلٹی اور اسمبلی کی نشستوں کی طرح تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا گیا تو اس سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ ادبی سرمایہ چاہے

ہم صفیروں کی آواز

جناب ایڈیٹر صاحب! تسلیم

"ہم صفیروں کی آواز" پڑھ کر چند سطریں لکھنے کی جرأت ہوئی۔

نئی روشنی کے اجراء کا اعلان پڑھتے ہی خوشیاں دل میں مچلنے لگیں بے تابی کی انتہا نہ رہی کہ کہیں جلدی پرچہ ہاتھ لگے.........

جس گروہ سے یہ پرچہ نکلتا ہے وہ تعلیمی دنیا میں ایک انفرادیت اور خصوصیت رکھتا ہے، اور اس کی پشت پر ایک عظیم الشان تاریخ ہے خلوص کی، ایثار کی، استقلال کی اور صحیح مقاصد کی۔ میری عمر تیس سال کی ہے۔ عمر کے بیسویں سال سے شعوری سن شمار کرتا ہوں۔ دس سال کے عرصے میں جتنے ہفتہ وار اخبار دیکھے۔ شاید سب سے اعلیٰ نئی روشنی ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس پرآشوب زمانے میں ایسا پرچہ نکلا ہے جو ملک کے تاریک گوشوں میں نئی روشنی پہنچا رہا ہے۔ غیر ملکی اس پرچہ کو پڑھ کر ہندوستان کے اخباری معیار کے متعلق بڑی اچھی رائے قائم کریں گے۔ کاش ایسے پرچے زیادہ تعداد میں نکلتے۔

ذیل کے مخلصانہ معروضات پر آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:-

(۱) پرچے کی رنگ برنگی "سیاہیوں" میں سے ایک سیاہی مستقل ہو تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں سبز رنگ کی سیاہی بہتر رہے گی۔

(۲) سرورق پر ماضی و حال کے مشاہیر کے مضامین قابل قدر تبرک ہیں۔ یہ عنوان زیب و زینت کو دوبالا کر دیتا ہے، اور پہلی نظر پڑتے ہی ذہن و قلب پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

(۳) بزم بے تکلف" زندگی کی خشک سنجیدگی میں ظرافت کا لطف پیدا کرتی ہے، مگر ظرافت ایک ہی صحبت میں نقد وصول ہو جانی چاہیئے۔ "لیڈر سے طبیعت اکتا گئی" ہر قسط میں تجسس آخر تک رہا۔

(۴) پچھلا ہفتہ اب تک تشنی بخش نہیں۔ پاکستان پر طنز کا رنگ گہرا ہے، ہندوستان پر ہلکا۔ اس سے صحافتی انصاف میں شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۵) باہر کی دنیا"۔ جرمنی کے متعلق ادارے کی معلومات محدود ہیں۔ ایشائی ممالک پر زیادہ روشنی پڑنی چاہیئے۔

(۶) نظم:- ملک کے اچھے اور بڑے شعراء کی نظمیں آپ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اب تک "نئی روشنی" نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔

(۷) افسانہ:- ادارہ یقیناً اپنا افسانہ شائع کرے۔ لیکن ملک کے مشہور و معروف افسانہ نویسوں کے افسانوں سے ابھی پرچہ محروم ہے۔

(۸) اقتصادیات:- پروفیسر محمد عاقل صاحب کے مضامین جامع، مفید اور وقتی اقتضا کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان سے رسالہ برابر فائدہ اٹھائے تعجب ہے ذاکر صاحب اب تک کوئی اقتصادیات کا مضمون شائع نہیں ہوا۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اقتصادیات کے قابل استاد موجود ہیں۔ ان کے مضامین بہ آسانی حاصل ہو سکتے ہیں۔

ادبی مضامین اگرچہ ہمارا تہذیبی سرمایہ ہیں لیکن صرف ادب ہی سے عوام کا بیڑا پار نہیں ہوگا۔ نظم و نثر پر مذاقی کپڑا مقدم ہے۔ اس کی چیخ صبح سے شام تک سنائی دیتی ہے۔ والسلام

نئی روشنی کا بہی خواہ

علی احمد صدیقی۔ کلکتہ

بکریہ۔

آپ نے "نئی روشنی" نکال کر ملک کی بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ عرصے سے تمنا تھی کہ اردو میں کوئی ایسا ہی مفید اخبار جاری ہو۔ سو شکر ہے کہ آپ نے اسے پورا کیا۔

خاکسار

نیاز فتح پوری

[illegible] کسی زبان اور کسی رسم خط میں ہو۔ کسی مخصوص فرقہ کا نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم اور تمام ملک کا ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا، قومی سرمایہ کا نقصان ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:۔ یکم ۔ ۸ ۔ ۱۹۴۸
چندہ:۔ سالانہ ؁ ششماہی للعہ

جامعہ ملیہ اب کیا کرے گی؟

(بسلسلہ صفحہ ۴)

نوجوان اس میں سے تعلیم پاکر نکلے۔ ان میں سے بعض نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور قومی سیاست، قومی تعلیم اور عام قومی زندگی میں مفید قومی خدمات انجام دیں۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں قومی تحریک کا جوش ٹھنڈا پڑنے کے بعد جامعہ میں طالب علموں کی تعداد بہت کم ہوگئی اور اس کی مالی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ مولانا محمد علی اور دوسرے بزرگ اسے بند کرنے پر تیار ہوگئے لیکن جامعہ کے نوجوان طلبہ اور اساتذہ خصوصاً خواجہ عبدالمجید شیخ الجامعہ کی ہمت مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری صاحب کی دستگیری نے جامعہ کو بند ہونے نہیں دیا۔ وہ علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دی گئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جو یورپ سے تعلیم پاکر اور اپنے ساتھ دو اور رفیقوں کو لے کر لوٹے تھے، شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔

اس وقت جامعہ کے کالج میں چند اسے گنے طلبہ تھے۔ اسکول میں بھی صرف ۵۰۔۶۰ لڑکے تھے۔ مگر بہر حال وہ اب اس درس گاہ کا جزو اعظم بن گیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دیکھا کہ موجودہ حالات میں کالج میں ترقی کی گنجائش نہیں اس لئے انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز اسکول کو بنا لیا۔ اس میں جدید تعلیمی طریقوں کو رواج دیا، اور اپنے طور پر نئے تجربے شروع کئے۔ تھوڑے دن میں جامعہ اسکول کی عام شہرت ہوگئی اور اس میں طالب علموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ۱۹۳۸ء میں جب مہاتما گاندھی نے بنیادی تعلیم کی تجویز پیش کی تو معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ کے مدرسے میں پہلے سے کم و بیش اسی اصول پر تعلیم ہو رہی ہے اس لئے مہاتما جی نے ذاکر صاحب کو نیشنل ایجوکیشن بورڈ کا صدر اور جامعہ کے دو اور نمائندوں کو اس کا ممبر مقرر کیا۔

جامعہ ملیہ میں بنیادی طریق تعلیم کا ٹریننگ اسکول قائم ہوا اور اس نے عام طور پر بنیادی تعلیم کی قومی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ جب حکومت نے بنیادی تعلیم کو صوبہ دہلی کے سارے دیہات میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے جامعہ کے ٹریننگ اسکول سے بیش بہا مدد ملی اور اب تک مل رہی ہے۔ ثانوی تعلیم کے میدان میں بھی جامعہ مفید تجربے کرتی رہی۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کے کام میں نئے تعلیمی تجربات کو اہم حیثیت حاصل ہوگئی۔ اعلیٰ تعلیم کے مقصد نے وسائل اور توجہ کی کمی سے ضمنی حیثیت حاصل کرلی۔ جامعہ کالج کا مقصد یہ رہ گیا کہ جامعہ کے مدرسوں اور تعلیم بالغان کے کام کے لئے معلم فراہم کرے۔

اس عرصے میں ارباب جامعہ کے تصور زندگی میں بھی مہاتما گاندھی کے اثر سے ایک بہت بڑی تبدیلی ہو چکی تھی۔ یوں تو جامعہ کے اساتذہ ابتدا سے بہت کم تنخواہوں پر کام کرتے تھے لیکن ۱۹۲۶ء میں وسائل کی وجہ سے ان کی تنخواہیں اتنی کم ہوگئی تھیں کہ مشکل سے گذر اوقات کے لئے کافی تھیں۔ اس کمی کو یہ من چلے ایک عارضی مصیبت سمجھ کر خوشی سے برداشت کرتے تھے لیکن چند سال بعد جامعہ کی مالی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ پھر اس کے بند کرنے کا سوال اٹھا تو انھوں نے جامعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی تنخواہیں اور کم کر دیں اور سمجھ لیا کہ قومی خدمت کرنے والوں کو عمر بھر عسرت سے زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ان میں سے بعض تو معاہدے کے ذریعے سے اس کے پابند ہیں کہ بیس سال تک ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں لیں گے لیکن عملاً کسی کو بھی اس سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایثار اور سادگی جو جامعہ کے کارکنوں نے ابتدا میں ضرورت سے مجبور ہو کر اختیار کی تھی اب ان کی زندگی کا ایک بنیادی اصول بن گیا ہے۔

اس جائزے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جامعہ کا مقصد، کارکنان جامعہ کا ذہنی اور اخلاقی مزاج رفتہ رفتہ بدل گیا ہے

(باقی آئندہ)

طابع و ناشر عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ۔
مطبوعہ جدید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۶ | ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

چترنجن داس کا ترک تعاون

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ

سب کو معلوم ہے کہ کلکتہ کی اسپیشل سیشن میں داس نے مہاتما جی کے نان کوآپریشن کی مخالفت کی تھی لیکن اس پر بھی کلکتہ جیسے مقام تک میں کثرت رائے مہاتما جی کے نان کوآپریشن کو حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد باوجودیکہ نوجوانان بنگال خود سرکاری مدارس سے علیحدہ نہ ہوئے تھے تاہم وہ داس کی تقریروں پر نکتہ چینی کرنے سے نہ چوکتے تھے اور عجب نہیں ہے کہ اس صورت حالات نے داس کو مجبور کیا ہو کہ وہ بار بار عالم تنہائی میں اپنی سیاست کا احتساب کرے۔ تاہم داس مروت کا پتلا تھا اور اس پر اپنے گرد و پیش کے لوگوں کا ہمیشہ بہت اثر ہوا کرتا تھا اور داس کے پرانے سیاسی رفقائے کار سب مہاتما گاندھی کے سیاسی زہد خشک سے بیزار تھے۔ اس لئے جب داس بنگال کی ایک بڑی جماعت کو لے کر سنہ ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتوں میں ناگپور آیا تو اس وقت وہ مہاتما جی کی نان کوآپریشن کے موافق نہ تھا بلکہ بابو بپن چندر پال ہی کا ہم رائے تھا......

میرا ارادہ تھا کہ میں اپنی خدمات نان کوآپریشن کے ایک بے ضابطہ مبلغ کی حیثیت سے مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کروں اور داس کو ان کا اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کروں لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں داس کلکتہ میں نہ تھا البتہ مسز داس موجود تھیں اور میں اور شوکت ان سے ملنے ۱۴۸ رسا روڈ کو گئے تھے لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ جونہی داس ناگپور آئے گا، میں اس کی شہ رگ کو چمٹ جاؤں گا اور اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک کہ وہ نان کوآپریٹر نہ ہو جائے یا پھر میرے ہی خیالات کو نہ بدل دے......

میری تبلیغی مشن کی ابتدا اس طرح نہیں ہوئی تھی کہ میں داس سے نان کوآپریشن کی خوبیاں بیان کرتا اور کوآپریشن کی مذمت کرتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی کبھی موتی لال جی داس کے پاس ہوتے اور نان کوآپریشن کی بحث اس شد و مد سے ہوتی کہ ایک اجنبی کو ان دونوں ماہران قانون میں دھینگا دھینگی ہو جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگتا، اور ایسے اوقات میں مجھے بہت کچھ دونوں کی منت سماجت اور ثالث بالخیر کے فرائض کی انجام دہی کرنا پڑتی۔ میرا اپنا تبلیغی مشن بحث کے طریقۂ استدلال و وکالت سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے صرف ایک چیز پر زور دیا تھا اور وہ یہ تھی کہ داس بیرسٹری چھوڑ دے اور لاکھوں کی سالانہ کمائی پر لات مار دے۔ بظاہر یہ انگریزی مثل کے مطابق گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر داس نے دنیا پر لات مار دی تو پھر مہاتما جی کا سیاسی زہد خشک بھی اسے کچھ ایسا مرعوب نہ ہوگا۔

داس کے سب دوست اس معاملے میں میرے خلاف تھے، وہ کہتے تھے کہ داس کی کمائی سے سینکڑوں محبان وطن فکر معاش سے سبکدوش ہو کر آج قومی کام کر رہے ہیں۔ داس نے اگر وکالت چھوڑ دی تو ان کا کیا حشر ہوگا اور اس خزانہ کے بغیر سیاسی جدوجہد کرنے کے روپے کے بغیر سیاست خود کس طرح چل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے جواب میں میرا یہی کہنا تھا کہ داس کی مالی امداد سے کہیں زیادہ اس کی قربانی کا ملک اور ملکی سیاست پر اثر پڑے گا اور اگر اس کے بعد قومی کام کرنے والوں کو یا خود داس کو روپیہ کی ضرورت پڑی تو داس کے لئے بمقابلہ بنک کے بھیک کے ٹھیکرے میں کہیں زیادہ دولت سمٹ کر آ جائے گی۔ بنگال میں داس نے جس دن گداگری اختیار کی اس دن کسی کو اس کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔ کاش ناگپور میں مسز داس موجود ہوتیں تو مجھے ان کی تائید یقینی حاصل ہو سکتی۔ لیکن خدا نے باوجود ان کی غیر حاضری کے بھی مجھے کامیاب کیا۔ خود داس سے اس مسئلے پر مجھے زیادہ گفتگو کرنے کی نوبت نہیں آئی، اور نہ اس کی ضرورت تھی، جو کچھ کشمکش تھی وہ داس کے دوستوں اور سیاسی شرکائے کار کے ساتھ تھی، اس دوران میں میں بار بار مہاتما جی کی خدمت میں جاتا تھا اور بار بار داس کے پاس آتا تھا اور نان کوآپریشن کے ریزولیوشن کے مختلف مسودے ادھر سے ادھر لے جاتا تھا، ایک شب رات کے تین بجے کے قریب جب میں مہاتما جی کے پاس سے داس کے پاس آیا تو داس نے مجھے علیحدہ لے جا کر کہا کہ محمد علی تمہاری رائے ٹھیک تھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بیرسٹری کو ترک کر دوں.......

جس وقت داس نے مجھے اپنا یہ فیصلہ سنایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتنی مسرت ہوئی، اور مسرت کے ساتھ میرا دل کس قدر فخر کرنے لگا کہ مجھ جیسا ادنیٰ شخص ایک اتنی بڑی قربانی کا محرک ہوا، میں اسی وقت داس سے لپٹ گیا اور اس کے گالوں کو بار بار بوسہ دیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ داس کی قربانی کتنی بڑی ہے، کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے داس نے اپنی بیرسٹری کے آخری سال میں کم و بیش پانچ چھ لاکھ روپے کی آمدنی پر انکم ٹیکس دیا تھا۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ داس کے پاس کافی سرمایہ ہوگا اور آئندہ زندگی ایک مالدار شخص کی طرح بخوبی بسر کر سکے گا۔ لیکن ابھی مجھے معلوم ہونا تھا کہ داس کی قربانی میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ داس نے مجھے بتایا کہ میں ڈھائی لاکھ کا مقروض ہوں۔ یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور دل ہی دل میں پچھتانے لگا کہ میں نے کیا غضب کیا کس شخص سے وکالت چھڑا دی، لیکن داس نے کہا "کچھ پروا کی بات نہیں میرا مکان موجود ہے، اسے بیچ ڈالوں گا تو قرضہ ادا ہو جائے گا......"

مگر ملک کا قرضہ تو اس نے سنہ ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ کی اسی شب میں رات کے تین بجے چکا دیا تھا جس شب اس نے مجھے اپنا فیصلہ سنایا کہ اس نے بیرسٹری چھوڑ دی۔ دنیا پر لات مار دی اور دامن جھاڑ کر فقیروں کی طرح اپنی اور اپنے ملک کی نجات کے لئے چل کھڑا ہوا۔

اس فیصلے کے بعد مہاتما جی کے نان کوآپریشن سے پورا اتفاق چند لمحوں کی بات تھی۔

"مضامین محمد علی"

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
چترنجن داس کا ترک تعاون	مولانا محمد علی	۱
دسمبر علی گڑھ میں	"تماشائی"	۲
جامعہ ملیہ اب کیا کرے گی	(ادارہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: (۱) ہندوستان	ع۔ح۔	۴
(۲) پاکستان	ع۔ل	۵
(۳) باہر کی دنیا	ع۔ل	۶
تجدید یوم آزادی (نظم)	اقبال احمد سہیل	۷
بالک ہٹ (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۸
ایران کا تعلیمی نظام	عبدالحلیم ندوی	۹
سرسید کے تعلیمی خیالات	عبداللطیف اعظمی	۱۰

۱۵- دسمبر
علی گڈھ میں
ایک تماشائی کے قلم سے

کل راجا جی مسلم یونیورسٹی دیکھنے آئے۔ ذاکر صاحب ان سے پندرہ دن پہلے آچکے تھے۔ آج کچھ ایسا محسوس ہوتا ہو جیسے اب کسی اور کے آنے کی ضرورت نہیں۔ اب لوگ خود بخود آئیں گے۔ نہ آئیں گے تو ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ شاید خود ہی گھاٹے میں رہیں!

"میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کرلیا" مدتوں سے تاریخوں میں پڑھتے چلے آئے تھے۔ ان فقروں کی ولدیت، قومیت، سکونت بتلانے کی ضرورت نہیں اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ یہ ذاکر صاحب نے بھی کر دکھائیں مگر "عرف" میں "آگیا" سے!

ذاکر صاحب کا آنا، موسم بہار کا آنا تھا، جب اچھا ہونے چھا کہلے، اچھا دیکھنے کی اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے، ایسا نہ کیجئے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں دو شعر بے اختیار یاد آتے ہیں۔

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں
در بہاراں ہمہ تو بیت ز صبا می آید!

یہ شعر کبھی میں نے ذاکر صاحب ہی سے سنا تھا، اور دوسرا

زہے لطافت پروازِ ابر بہار
کہ ہرچہ در دل با دست از زمیں پیداست!

غالب کا ہے جو مجھے یاد رہ گیا۔ دونوں بے اختیار یاد آئے اس لئے اُمید یہی ہے کہ یہ جب یاد بھی ہوتے ہوں گے۔

ہر جگہ کا دستور ہے، علی گڈھ کا بھی، کہ جب کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو جلسے، دوڑ دھوپ، حاضر باشی دعوتوں، تقریروں کا تانتا بندھ جاتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں ہم نے یہ کرکے بازی جیت لی جس کے لئے یہ سب کیا جاتا ہے وہ بھی یقین کر لیتا ہے کہ اس نے بازی جیت لی۔ ظاہر ہے ایسی بازی میں جیت کس کی ہوتی ہوگی ذاکر صاحب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ سب بے کار ہے کیسی بازی اور کیسا جیتنا کھیل ہی سب کچھ ہے، شاید کھیل بھی نہیں صرف کھلاڑی! ان کا "شامل فرمانا" اور "رونق افروز ہونا" کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ وہ کام کرنے لگے، ہر کام ہر ایک کا کام، گھومنے لگے، بات چیت کرنے لگے، ہنسنے لگے، جو کام کرنا نہیں جانتے تھے یا کام کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بھی کام کرنے لگے۔ اس لئے کہ ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے میں جو مزہ اور ولولہ تھا وہ کام سے جی چرانے میں نہ تھا، چھوٹے بڑے یا افسر ماتحت کی تفریق "ذہن کی اُلجھن اور اخلاق کی خامی سے آتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے آپ کو "ہمدم دیرینہ" کی حیثیت سے پیش کیا کہ ان کے ساتھ کام کرنا ہی بڑا کام ٹھہرا، پھر تفریق کیسی، اُلجھن کس لئے اور خامی کیوں؟

ذاکر صاحب پر دوست دشمن سبھی ہمیشہ سے بھروسا کرتے آئے ہیں۔ آج سے نہیں ان کی طالب علمی کے زمانے سے۔ علی گڈھ میں وہ اجنبی نہ تھے، وہ علی گڈھ میں دیر سے پہنچے تھے، اس لئے کہ دور سے آئے تھے۔ اُن کے آجانے سے سب نے محسوس کیا کہ جیسے علی گڈھ میں زندہ رہنے اور زندگی دینے کی استعداد باقی ہے۔ یہی نہیں بلکہ علی گڈھ اپنی استعداد اور اپنے کردار سے کھوئے کھوئے کا معیار متعین کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہر چھوٹے بڑے نے نئے سرے سے پیمان وفا باندھا، اپنے سے، اپنوں سے۔ ذاکر صاحب سے اور اس سے جس سے ان میں سے ہر ایک وابستہ تھا، بڑی خوشی اور خود اعتمادی سے، جو جہاں تھا، جیسا تھا اُٹھ کھڑا ہوا، جو ہو سکا اور جتنا ہو سکا اس نے کر دکھایا۔ بازار مصر میں، متاع کنعانی کے لئے، زال و زلیخا، دونوں، سبھی آموجود ہوئے۔

بڑے لوگوں کی آمد ہوتی ہے تو بڑی زحمت و تیاری کرنی پڑتی ہے۔ علی گڈھ نے مہمانوں کا خیر مقدم ہمیشہ بڑی خوش دلی اور ولولہ سے کیا ہے۔ خصوصاً یہاں کے طالب علموں نے۔ لیکن ذاکر صاحب کی وائس چانسلری میں راجا جی کی پذیرائی ہونے کا کچھ اور ہی انداز تھا جس کا احساس رہ رہ کر چپہ چپہ پر ہوتا تھا۔ ہر شخص چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا تعلق اس تقریب سے ہو یا نہ ہو، یہ محسوس کرتا تھا اس سے جو کچھ ہو سکے کرنا چاہئے جی نہ چرانا چاہئے جی چرانا یا بے دردی کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا روزہ رکھتے ہوئے چھپ کر کوئی ایسی بات کرلی جس سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہو یا ٹوٹ جائے۔ دو ہفتے تیاریوں میں ختم ہوئے، جو جہاں تھا اس فکر اور اس کوشش میں تھا کہ علی گڈھ روشن، شگفتہ، صاف، صحت بخش اور صحت مند نظر آئے۔ کام مشترکہ ذمہ داری پر ہونے لگا بغیر کسی کے کہے سنے، کوئی نہ کہتا نہ سنتا کہ یہ کام میرا نہیں دوسرے کا ہے۔ ہر کام ہر ایک کی محنت اور محبت کا محتاج تھا۔ ہر شخص اسکو پورا کرنے اور پورا دیکھنے پر تلا ہوا تھا سب جانتے تھے کہ اس کی کامیابی اور ناکامیابی خود اس کی کامیابی یا ناکامیابی تھی!

یونیورسٹی کا چپہ چپہ جیسے بیدار ہونے لگا تھا۔ کہنگی گندگی بے سلیقگی دور کی جانے لگی، جھاڑ جھنکار صاف کیا گیا، ناہمواریاں ہموار کی گئیں۔ گرد پر مسلسل پانی چھڑکا گیا۔ کیسی ہی دور افتادہ اور گمنام گوشہ میں کیوں نہ چلے جائیے، معلوم ہوتا تھا کہ صفائی کرنے والوں کا تصرف رہ چکا ہے۔ ایک دن احباب میں سے ایک نے بڑے تعجب سے تذکرہ کیا کہ فلاں جگہ جدھر بمشکل کسی شخص کا ذہن منتقل ہوتا، صفائی ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے فلاں روز سورج نکلنے سے قبل ذاکر صاحب وہاں دیکھے گئے تھے! یونیورسٹی میں جہاں کہیں جو کتبہ نصب تھا اُسے روشن اور مجلیٰ کیا گیا، بعضوں کے چہرے سے گران کا ترجمہ کیا گیا۔ کواڑ، کھڑکی، روشندان کے شیشے جھلکائے گئے، دیواروں سے گرد غبار داغ دھبے دور کئے گئے۔ باغ اور لان کو سیراب کیا گیا، روشیں درست کی گئیں۔ ہر مقام پر حسب ضرورت بڑی پابندی اور کثرت سے ڈی ڈی ٹی کی گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یونیورسٹی کا تمام رقبہ تازگی اور صحت مندی کے سانس لینے لگا ہے اور بغیر کسی کے بتائے سب کے دل میں یہ بات آئی کہ صفائی خود آرائش ہے، اور صاف رہنا، صاف کرنا اور صاف رکھنا آرٹ، عبادت، تفریح سب کچھ ہے!

پروگرام میں گورنر جنرل کا یونین میں استقبال شامل نہ تھا

[illegible] تھا [illegible] جنرل یونین [illegible] نہیں گیا [illegible] سرداریاں اور [illegible] کی [illegible] ہو [illegible] ذاکر صاحب نے طلبہ سے [illegible] کوشش کرو [illegible] جنرل [illegible] فرمائیں لیکن یہ صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ [illegible] طور پر اُمید نہیں دلا سکتے تھے کہ ایسا ہو بھی جائے گا۔ لیکن ایسا ہو گیا۔ گورنر جنرل کی اس آمادگی پر طلبہ خوش ہو گئے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ گورنر جنرل نے ان پر بھروسہ کیا اور جب ان پر بھروسہ کیا گیا تو پھر وہ میزبان بن گئے۔ [illegible] میزبان بن جانا ہے [illegible] ہی [illegible] کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

نتیجہ فی الفور ظاہر ہوا۔ ذاکر صاحب نے طلبہ اور اپنے آپ دونوں کو آزمائش میں ڈال دیا، اور اپنے شرائط پیش کرنا اور بے چون وچرا تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ طلبہ سے کہا گیا کہ اسٹریچی ہال میں ان کی بیٹھنے کی مقررہ تعداد داخل کی جائے گی خود یونین ہال میں زیادہ لوگ نہ آسکیں گے۔ اسٹریچی ہال اور یونین دونوں میں گورنر جنرل کی تقریر باہر چند سیکنڈ لوگوں کے ذریعے سننے پر اکتفا کرنا ہوگا، ایسی حالت میں نہ شور مچانا چاہئے نہ دوڑ بھاگ کرنی چاہئے۔ گورنر جنرل کے قریب پہنچنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے۔ اگر کسی رسم یا تقریب میں شرکت یا خود گورنر جنرل کی دید بھی نصیب نہ ہو تو صبر کرنا ہوگا۔ اگر وہ گورنر جنرل کو دیکھنا چاہیں یا ان کو قریب سے خوش آمدید کہنا چاہیں تو اسٹریچی ہال کے سامنے دو رویہ قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ اور انتظار کریں اور راجا جی گذریں تو اظہار خوشی کرلیں، لیکن نظم اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہ پڑنا چاہئے۔ امتحان شروع ہو گیا۔

صبح سے شام تک اور دن چھپے سے رات گئے تک جوہلی کے میدان میں گارڈ آف آنرز کو ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ نہ وقت دیکھا جا رہا ہے نہ آرام، نہ عافیت نہ کھانا نہ پینا، نہ تفریح نہ تفنن۔ چھوٹے بڑے، قوی، کمزور، خوشہ گرد سب اس دھن میں مبتلا کہ رکاوٹ ہو یا وقت، گارڈ آف آنرز تو گارڈ آف آنرز کے اندازہ معیار کا دیا جائے گا۔

۱۵ دسمبر کو دن گیارہ بجے کے قریب نظام میوزیم کے قریب گارڈ آن کر کھڑا ہو گیا، شکل صورت، سج دھج ساز و سامان کے اعتبار سے تو یہ اتنے نمایاں اور ممتاز نہ تھے جتنا باقاعدہ فوجوں میں گارڈ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن گورنر جنرل کی آمد پر اُن کے افسر نے کڑک کر حکم دیا تو گارڈ نے جس تیور اور تہور اور مشینی باقاعدگی لیے بندوقوں کی نمائش [illegible] دی کہ ماہرین فن بھی متحیر رہ گئے۔ اور ان کو مشکل سے یقین آیا کہ یہ صرف چند دنوں کی مشق کا نتیجہ تھا۔

ایک کہن سال فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے، نحیف ہو گئے تھے۔ ایک کم سن طالب علم اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا ارے بھئی فلاں کو دیکھا کل تک تو اسے سیدھی بندوق پکڑنی نہ آتی تھی، آج ایسا اکڑا ہوا ہے! بوڑھے افسر نے کہا: بیٹے ادھر آؤ! میں تم کو ایک لطیفہ سناؤں مسلسل چالیس سال تک فوج میں نوکری کی ہے اور کرائی ہے، ہمارے مرنے کا کوئی میدان خالی نہیں دیا ہے۔ ہر قوم، ہر خطہ کی فوجوں کے نوجوانوں کا سابقہ رہا۔ تمہارے لوگ بڑی جلدی تربیت حاصل کر لیتے ہیں اور ڈسپلن قائم رکھنے میں بے نظیر ہوتے ہیں۔ یہ میری تعریف نہیں ہے بلکہ ان لوگوں نے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ر دسمبر ۱۹۴۸ء

جامعہ ملیہ
اب کیا کرے گی؟

(۲)

جیسا کہ آپ نے دیکھا ابتدا میں جامعہ کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم کو قومیت اور وطنیت کے رنگ میں رنگ دے اور قوم کو ایک قومی یونیورسٹی دے کر دکھائے، وہ اپنے بس بھر اسے حاصل کرنے میں لگی رہی، لیکن حالات کے تقاضے سے اسے زیادہ توجہ اور محنت دوسرے مقصد پر صرف کرنی پڑی جو ان سے تجربے چل کر اختیار کیا تھا یعنی اپنے معلموں میں سادگی اور ایثار کی روح پھونکنا اور یہ اُپج پیدا کرنا کہ وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں نئے نئے تجربے کریں۔ یہ آخر الذکر مقصد اب جامعہ کا رحجان بن گیا ہے، اور اس نے جامعہ والوں کے ذہن اور سیرت کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ہندوستانی یونیورسٹی کے شارع عام پر چلنا جامعہ کے لئے اب نہ ضروری ہے اور نہ ممکن ہے۔ اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ اس نئی راہ پر چلتی رہے جو اس نے اپنے لئے نکالی ہے، البتہ اپنی منزل کا تعین زیادہ وضاحت سے کرے، اور اپنے سفر کی رفتار زیادہ تیز کر دے۔

اعلیٰ تعلیم کی ایک عام درس گاہ بننا جامعہ کے لئے ضروری نہیں۔ ایسی درس گاہیں ملک میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان میں جو بڑا عیب تھا کہ وہ قومی اور وطنی روح سے خالی تھیں، وہ زمانے کے انقلاب سے دور ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ یہ فرض محال جامعہ مروجہ طرز کی ایک مکمل یونیورسٹی بننا چاہے بھی تو نہیں بن سکتی۔ جو وسائل اس کے لئے درکار ہیں وہ فراہم نہیں ہو سکتے۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں رہی کہ وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ایک اور عام تعلیم کی یونیورسٹی بنانے کے لئے روپیہ دے سکیں۔ جامعہ کے غیر مسلم ہمدردوں، ہندوستانی ریاستوں یا حکومت ہند سے بھی دہلی میں ایک دوسری یونیورسٹی کے لئے مدد ملنا مشکل ہے۔

مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پچھلے بیس سال کے عرصہ میں جامعہ کے لوگوں پر دو حقیقتوں کا انکشاف ہوا جس نے ان کے قومی خدمت کے تصور کو اور ان کے زندگی کے نقشے کو بدل دیا۔ مہاتما گاندھی سے انھیں یہ بصیرت حاصل ہوئی کہ قوم کروڑ غریبوں کا اور قومی تعلیم ان ہی غریبوں کی تعلیم کا نام ہے۔ معلم اگر سچی قومی خدمت کا حوصلہ رکھتا ہے تو اسے ہندوستانی عوام کی تعلیم کے عظیم الشان اور مقدس مشن کو پورا کرنے میں حصہ لینا چاہیئے، اور یہ وہ اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کی زندگی عوام سے قریب تر ہو۔ جامعہ والے سادگی اور تیاگ کے اس معیار پر تو نہیں پہنچ سکے جو گاندھی جی اور ان کے آشرم نے اختیار کیا تھا مگر پھر بھی عام اسکولوں اور کالجوں کے معیار سے اس کے استاد اور طالب علم بہت سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ذاکر صاحب سے اہل جامعہ کو یہ سبق ملا کہ تعلیم کا اصل جوہر بچوں کو مفید معلومات اور فنی مہارت بہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ ان کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنا، ان کی عملی صلاحیتوں کو ابھارنا تاکہ ان میں اور ان کے طبیعی اور سماجی ماحول میں وہ زندہ رشتہ قائم ہو جائے جس پر ذہن کی تربیت اور سیرت کی تعمیر کا دارومدار ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم کے جدید طریقوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلم اپنے طور پر نئے نئے تجربے کرتا رہے۔ چنانچہ جامعہ کے معلم اپنی اپنی بساط کے مطابق یہ کوشش کرنے لگے کہ بندھے ٹکے ضابطوں کے بجائے ذاتی مشاہدے اور اُپج سے کام لیں، خود بھی کر کے سیکھیں اور لڑکوں کو بھی اس کی عادت ڈالیں۔

جامعہ والوں کی یہ عوام دوستی اور سادگی، ان کی آزاد روی اور جدت پسندی، ان کی رسمی تعلیم کے ضابطوں سے وحشت، اداری اور دفتری نظم سے بے نیازی عام یونیورسٹیوں کے خالص علمی اور منطقی ڈھانچے میں سرکاری نظام تعلیم کے بے لوچ چوکھٹے میں نہیں سما سکتی۔ وہ تو سماجی خدمت اور تعلیمی تجربے کے ایک مخصوص ادارے ہی میں کھپ سکتی ہے۔

جامعہ ایسا ہی ادارہ ہے اور اُسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ اسے اب شعوری طور پر یہ مقصد اپنے سامنے رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے اسکولوں کے اندر تخلیقی عمل کی فضا میں نئے تعلیمی تجربے کرے گی، اور جو طالب علم اسکول سے فارغ ہو کر جامعہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے ان کو اپنے آرٹس کالج میں سماجی خدمت کے کاموں خصوصاً معلمی کے لئے مناسب ذہنی تعلیم اور ٹریننگ کالج میں فنی تعلیم دے گی، اپنی اردو اکاڈمی میں خاص طور پر تعلیم کے نظری اور عملی پہلو پر کتابیں لکھوائے گی، اور نئی تعلیم کے مدرسوں کے لئے نصاب تیار کرائے گی۔ اپنے کام میں توسیع بھی اُسے ان ہی حدود کے اندر کرنی چاہیئے اگر وسائل میسر آئیں تو چھوٹے بچوں کی قبل درسی تعلیم (کنڈرگارٹن مانٹیسوری وغیرہ کے طریقے پر) نفسیات تعلیم خصوصاً ذہانت کی جانچ کے ادارے کھولنا چاہیئے۔

یہ مقصد کوئی چھوٹا مقصد نہیں ہے۔ اگر جامعہ "نئی تعلیم" کی ایک اچھی تجربہ گاہ بن جائے، بنیادی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کے لئے ایسے معلم اور دیہات سدھار مزدوروں کی فلاح و بہبود کی سرکاری اور غیر سرکاری اسکیموں کے لئے ایسے کارکن پیدا کر سکے جو اپنے کام کے لئے مخصوص فنی قابلیت اور اُپج رکھتے ہوں اور اسی کے ساتھ خدمت اور ایثار کے جذبات سے معمور ہوں تو وہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں حصہ لے گی، اس شہرت کو قائم رکھے گی، جو اسے دیس بدیس میں حاصل ہو گئی ہے، اور ان توقعات کو پورا کرے گی جو ملک اور قوم نے اس سے قائم کی ہیں۔

اگر اس نے اس کام کے کرنے کا فیصلہ کیا جس سے ملک کی ایک بنیادی ضرورت پوری ہوتی ہے، تو مالی مشکلیں اس کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈال سکیں گی۔ آزاد ہندوستان اس چشمے کو جو قومی زندگی کی جڑوں کو سیراب کرتا ہے کبھی سوکھنے نہیں دے گا۔

بزم بے تکلف

(۱)

(حکیم صاحب کا مطب۔ فرش بچھا ہے، مسند رکھی ہے، مسند خالی ہے۔ حکیم صاحب کا شاگرد مسند کا کونا دبائے بیٹھا قلم بنا رہا ہے۔ ایک مریض داخل ہوتا ہے۔)

مریض۔ آداب عرض ہے حکیم صاحب۔

شاگرد۔ آئیے آئیے حکیم صاحب محل سرا میں ہیں، ابھی تشریف لاتے ہیں۔

مریض۔ آپ بھی مریض ہیں۔ میں سمجھا حکیم صاحب ہیں۔

شاگرد۔ آپ کی پہلی تشخیص بھی غلط اور دوسری بھی، میں طب کا طالب علم ہوں۔ ابھی تکمیل نہیں کی ہے۔ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھتا ہوں۔

مریض۔ تو یہ کہیے آپ نیم حکیم ہیں۔

شاگرد۔ آپ کا کام تمام کرنے کے لئے کافی ہوں۔ کہیے کیا شکایت ہے۔

مریض۔ ایک شکایت ہو تو کہوں، میں تو سراپا شکایت ہوں ؎

پر ہوں شکوے سے میں یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

شاگرد۔ تو حضرت معاف کیجئے حکیم صاحب خود ہی چھیڑیں گے آپ کی مضراب انھیں کے پاس ہے۔

مریض۔ (گھبرا کر) مضراب کیسی؟ یہ تو ضَرَبَ یَضرِبُ کا صیغہ معلوم ہوتا ہے۔ مارا اس نے۔ مارتا ہے، اور مارے گا۔

شاگرد۔ جی بس ان کی انگلیاں مضراب ہیں۔ جہاں انھوں نے نبض کے تاروں کو چھیڑا آپ کا باجا خود بخود بجنے لگے گا۔ لیجیے حکیم صاحب آ گئے۔

حکیم صاحب۔ قریب تشریف لائیے۔ میں آپ کی نبض دیکھتا ہوں۔ آپ کا حال۔

مریض۔ کیا عرض کروں حکیم صاحب عجب دردیست در معدہ ——

حکیم صاحب۔ نثر میں ارشاد ہو۔

مریض۔ ارشاد کیا خاک ہو، آپ نے تو ہتے پر ٹوک دیا۔

حکیم صاحب۔ تفصیل طویل کو ترک کیجئے، مختصر فرمایئے۔

مریض۔ قبلہ ابھی میں نے کون سی مطول بیان کی ہے جو آپ مختصر کی فرمائش کرتے ہیں۔ غضب خدا کا برسوں کی بیماری اور آپ چاہتے ہیں کہ چند لفظوں میں اس کا حال بیان کر دوں۔ اچھا اب آپ ہی پر چھوڑتا ہوں جو کہیے وہ کہہ دوں۔

حکیم صاحب۔ معدہ کا حال۔ آنتوں کا فعل، اشتہا، اجابت۔

مریض۔ اللہ رے اختصار! بہت خوب! سنیئے معدہ کا حال ناگفتہ بہ، آنتوں کا قول و فعل دونوں ناقابل اعتبار، اشتہا کا بھوکا ہوں، اجابت کی دعا کرتا ہوں۔

حکیم صاحب۔ فم معدہ میں کچھ درد کی خلش بھی ہے؟

مریض۔ فم معدہ میں درد کی خلش، حضور فم معدہ میں قلب معدہ میں روح معدہ میں درد کی خلش نہیں بلکہ درد کا سیلاب ہے، درد کا طوفان ہے ؎

درد ہے یہ یا کوئی طوفاں ہے
ہم تو اس معدہ کے ہاتھوں مر چلے

حکیم صاحب۔ (شاگرد سے مخاطب ہو کر، نکھو، نسخہ لکھواتے ہیں جس کے الفاظ سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ شاگرد

(بقیہ صفحہ ۱۱)

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

صبح اُمید

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کی کانفرنس کئی بار منعقد ہوئی اور ہر بار یہی اعلان ہوا کہ جتنے مسائل میں اختلاف تھا وہ سب طے ہو گئے اس سے صلح پسندوں کے دلوں میں اُمید کا دیا کچھ دن کے لئے جل اُٹھتا تھا اور مایوسی کے گھپ اندھیرے میں تھوڑی سی روشنی پیدا کر دیتا تھا، مگر آخر میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ جو فیصلے ہوئے تھے ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ فریقین ایک دوسرے کو الزام دے کر تسکین حاصل کرتے تھے۔ مگر ان کروڑوں بدنصیب انسانوں خصوصاً پناہ گزینوں کو جو دونوں ریاستوں کی باہمی کشمکش میں پسے جا رہے ہیں۔ اس سے کوئی تسکین نہیں ہوتی تھی کہ قصور اس فریق کا نہیں بلکہ اس فریق کا ہے۔ لیکن اس مرتبہ ہند اور پاکستان کی جو کانفرنس نئی دلی میں ۶ دسمبر سے ۱۴ دسمبر تک ہوئی اس کے متعلق سرکاری اعلانوں سے اور غیر سرکاری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت کامیاب رہی۔ اب کی بار دونوں فریق دل میں یہ ٹھان کر آئے تھے کہ نہ صرف مَن سمجھوتہ کرنا ہی بلکہ اس پر عمل بھی کرنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو فیصلے کیے ان کو نافذ کرنے کے لئے ذمہ دار کمیٹیاں بھی بنا دیں اور ایک میعاد بھی مقرر کر دی ہے ظاہر ہے کہ اندازہ ٹالنے کے نہیں بلکہ کام کرنے کے ہیں۔ جن باتوں کا تصفیہ ہوا ہے ان میں اقلیتوں کے حقوق ان کی بڑے پیمانے پر ہجرت، فوجی اسٹور اور دوسرے سامان کی تقسیم، تجارتی مال کی آمد و رفت، حد بندی کے جھگڑے اور مہاجروں کی املاک، غرض کشمیر کے مسئلے کو چھوڑ کر اور سب مسئلے شامل تھے ایک نہایت اہم اور مفید فیصلہ یہ ہوا ہے کہ فریقین کے نمائندوں کی ایک پریس ایڈوائزری کمیٹی بنائی جائے اور وہ اس بات کی نگرانی رکھے کہ دونوں ریاستوں میں کتابوں، اخباروں، ریڈیو اور فلم کے ذریعے سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور اشتعال کے جذبات نہ بھڑکائے جائیں۔ خواجہ ناظم الدین صاحب نے جو تقریر پاکستان اسمبلی میں کی اور غلام محمد صاحب نے جو بیان اس کانفرنس کو دیا دونوں کا لہجہ مصالحت آمیز اور پر اُمید ہے۔ کشمیر کے بارے میں ناظم الدین صاحب کا یہ کہنا کہ اب اس بے معنی جنگ و جدل کو بند ہو جانا چاہیے اور اس کے دو تین دن کے بعد کشمیر کمیشن کے ایک رکن ایک بدل رکن اور صدر یو این او کے خاص نمائندے کا نئی دلی پہنچنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس گتھی کے سلجھنے کا بھی کچھ امکان نظر آتا ہے۔ صبح اُمید کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صبح کاذب ہے یا صبح صادق۔ بہرحال صبح کاذب بھی صبح صادق کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

گاندھی جی کا پیام ابھی زندہ ہے

جے پور میں انڈین نیشنل کانگریس کا پچپنواں اجلاس بڑی شان سے منعقد ہوا اور کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اجلاس کئی باتوں کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا تھا

(۱) کانگریس کا عام اجلاس کئی سال کے بعد ہو رہا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے صرف ڈیلیگیٹوں کا مجمع میرٹھ میں ہوا تھا پچھلے سال فساد اور بدامنی کی وجہ سے کانگریس کا جلسہ ہو ہی نہیں سکا اس درمیان میں یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ کانگریس اب باقی رہے یا نہ رہے، اور اگر رہے تو اس کا جلسہ حسب دستور قومی میلے کی شکل میں ہوا کرے یا وہ محض ایک سیاسی پارٹی کے نمائندوں کی کاروباری کانفرنس بن جائے۔ اجلاس جے پور یہ پیام دے گیا کہ کانگریس باقی رہے گی اور اسی قومی میلے کی شکل میں باقی رہے گی جو سالہا سال سے لاکھوں ہندوستانیوں کے قلب و روح کو مسرت اور قوت بخشتا رہا ہے۔

(۲) یہ ایک ہندوستانی ریاست میں نیشنل کانگریس کا پہلا جلسہ اور اس بات کا اعلان تھا کہ قومی تحریک نے ریاستوں کا مورچہ بھی سر کر لیا۔

(۳) تقسیم ہند اور ان ہولناک واقعات کے بعد جو اس کی وجہ سے پیش آئے یہ کانگریس کا پہلا عام اجلاس اور اس بات کا امتحان تھا کہ نہرو گورنمنٹ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ عوام کے دل میں کتنی جگہ رکھتی ہے۔

(۴) گاندھی جی کی شہادت کے بعد یہ اُن کے سیاسی پیرووں کا بڑا اجتماع تھا۔ سال بھر میں یہ پہلا موقع آیا تھا جب اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ گاندھی جی کا پیام کانگریس والوں کے دل میں زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جلسے کی کارروائی سے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ کانگریس کے عام ممبروں کو وزیر اعظم جواہر لال نہرو پر اب بھی اتنا ہی اعتماد اور ان کے ساتھ اتنی ہی محبت اور عقیدت ہے جتنی پہلے تھی اور اس کا بھی ثبوت مل گیا کہ لوگ گاندھی جی کو اور ان کی تعلیم کو پہلے ہی کی طرح بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ کانگریس کے صدر ڈاکٹر پٹا بھی ستیا رمیا نے اپنے خطبے کے شروع میں اور آخر میں والہانہ جوش سے گاندھی کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا۔ سارا خطبہ اسی شان کا تھا جیسا گاندھی جی کے ایک سچے پیرو کار کا ہونا چاہیے خصوصاً قومی زبان کے بارے میں انھوں نے جس اخلاقی جرأت کے ساتھ سنسکرت آمیز ہندی کی مخالفت اور ہندوستانی کی حمایت کی اس کا اظہار اس لسانی تعصب کے دور میں گاندھی جی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ سب سے اہم رزولیوشن جو کانگریس میں پیام کے نام سے پاس ہوا۔ ہندوستان کو یاد دلاتا ہے کہ جو آزادی اسے حاصل ہوئی ہے وہ گاندھی جی کی بدولت ہوئی ہے اور ہندوستانیوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ از سرِ نو صدق دل سے گاندھی جی کے اصولوں پر چلنے کا حلف اٹھائیں فرقہ پرستی اور تعصب سے توبہ کریں اور سیاسی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے کمزوروں، غریبوں کے لئے سماجی اور معاشی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرا اہم رزولیوشن ملک کی بیرونی پالیسی کے بارے میں تھا اس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال کی پوری پوری تائید کی گئی کہ ہندوستان کو محکوم ملکوں کے آزاد کرانے میں اور کمزور قوموں کی حفاظت میں امکانی مدد کرنی چاہیئے۔ سب بیرونی طاقتوں سے اچھے تعلقات خصوصاً برطانیہ کامن ویلتھ سے وہی تعلق رکھنا چاہیے لیکن اپنی بیرونی پالیسی کو کسی بدیسی ملک یا گروپ کا پابند نہیں بنانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ فرقہ پرستی کی مخالفت، پناہ گزینوں کی امداد اور دوسرے مسائل کے بارے میں جو اس وقت درپیش ہیں کئی رزولیوشن منظور ہوئے جن میں عام طور پر حکومت کے رویئے کی حمایت کی گئی۔ سبجکٹس کمیٹی میں ایک تحریک کے سلسلے میں ایسی ترمیم پیش کی گئی اور منظور ہو گئی۔ تھی جس میں حکومت کے ارکان پر عدم اعتماد کا پہلو نکلتا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے دوسرے دن اس پہلو کی طرف توجہ دلائی تو بہت بڑی اکثریت سے ترمیم رد کر دی گئی۔ تحریک یہ تھی کہ کانگریس کے کارکنوں کو جن میں صوبوں کی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان بھی شامل ہیں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے دیانت داری اور فرض شناسی کی مثال قائم کریں کچھ من چلے نوجوانوں نے یہ ترمیم پیش کی کہ اس ہدایت میں صوبوں کے اور مرکز کے وزیروں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اس وقت جلسے میں پنڈت نہرو اور دوسرے بڑے لیڈر موجود نہیں تھے۔ گرماگرم بحثوں کے بعد ترمیم منظور ہو گئی۔ دوسرے دن پنڈت نہرو نے بتایا کہ وزارتیں بغیر پارٹی کے کامل اعتماد کے قائم نہیں رہ سکتیں۔ اگر کانگریس کو وزارتوں پر عدم اعتماد کا اظہار کرنا ہے تو اچھی طرح سمجھ بوجھ کر صاف صاف کرنا چاہیے۔ جلسے نے زبردست اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ رزولیوشن سے وزرا اور اسمبلی کے ممبروں کے الفاظ نکال دیئے جائیں اس کا خطاب عام کانگریسیوں سے ہو جن میں سبھی شامل ہیں۔ کسی طبقے یا جماعت کا ذکر خصوصیت سے نہ کیا جائے۔ اس طرح کانگریس نے بالواسطہ حکومت پر کامل اعتماد کا رزولیوشن پاس کیا۔

جے پور کانگریس نے صریحی طور پر ثابت کر دیا کہ کانگریس کے عام ممبروں کے دلوں میں گاندھی جی کا محبت اور خدمت کا پیام زندہ ہے۔ اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کانگریسی لیڈروں کے طبقے میں بعض کے ذہنوں پر سرمایہ داروں اور فرقہ پرستوں کا جتنا اثر پچھلے دو تین سال میں ہو گیا تھا وہ اس وجہ سے تھا کہ اس عرصے میں کانگریس کی عام رائے کے صحت بخش اثر سے محروم رہے تھے۔ جے پور میں انھیں اچھا خاصا دماغی مسہل مل گیا ہے۔ خدا کرے اس سے ان کی طبیعت درست ہو جائے۔

۵ار دسمبر، علی گڈھ میں (بسلسلہ صفحہ ۲)

مجھے بتایا جن کی رائے پر فوجیں گھٹائی بڑھائی جاتی ہیں، محاذ پر بھیجی جاتی ہیں یا واپس بلائی جاتی ہیں۔ بوڑھے افسر نے تھوڑی دیر تک تامل کیا، اس کے بعد پوچھا، جانتے ہو، ایسا کیوں ہے؟ لڑکے نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ نہیں جانتا تھا۔ افسر نے کہا" امام کے پیچھے صف باندھ کر نماز پڑھنے سے یہ آیا ہے۔ اور صرف حق کے حضور میں جھکنے سے آیا ہے۔ کسی اور بات سے نہیں آیا ہے۔ روزہ کو پیچھے سے ہزار پردوں میں بھی نہیں توڑتے۔ جب تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو عہد و پیمان کو کیسے توڑو گے، یہی وہ باتیں ہیں جن سے مسلمان ممتاز رہے ہیں۔ سامنے کے گارڈ آف آنرز پر تعجب نہ کرو، ان فتوحات پر نظر کرو جو تم نے بے تیر و تفنگ بے کرو شر لوگوں کے علوم پر لوگوں کے تعصب پر، لوگوں کے دل و دماغ پر اپنی نظر کی بلندی قلب کی وسعت، فکر کی گیرائی اور نیت کی پاکیزگی سے حاصل کی جو کہیں تمھاری کج نظری اور کم ظرفی سے بے نور نہ ہو جائے لیلا (باقی)

۲- پاکستان

مکتوب کراچی

سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدارتی انتخاب میں کھوڑو صاحب کی فتح کی خبر آپ نے پڑھی ہوگی اس واقعہ نے یہاں اچھا خاصا تہلکہ مچا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتخاب سے دوران پہلے تک سوائے چند افراد کے کھوڑو صاحب کا کامیاب ہونا تو در کنار کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ تھا کہ وہ الکشن لڑ سکے۔ سچ پوچھئے تو کھوڑو صاحب کی یک سر غیر متوقع کامیابی کا سہرا صوبائی مسلم لیگ کے آرگنائزر غلام نبی پٹھان صاحب کے سر ہے۔ بات یوں بتائی جاتی ہے کہ چودھری خلیق الزماں صاحب جو یہاں کے باخبر حلقوں میں "شاطر فرقہ پوش" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ پٹھان صاحب کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ اس سے چودھری صاحب کے دو مطلب تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کو صدر بنوا کر پیر الٰہی بخش وزارت کے سر پر "خبردار نہیں تو ...." قسم کی لاٹھی تان دیں۔ کیونکہ غلام نبی پٹھان صاحب کچھ عرصے سے پیر وزارت کے شاکیوں میں ہو گئے تھے۔ دوسرا مطلب یہ تھا کہ موجودہ وزارت سے اعلانیہ غیر مطمئن شخص کو شہ دے کر صوبائی صدارت کی مسند کو محمد ایوب کھوڑو کی حسرت سے محفوظ کر لیں۔ چودھری صاحب نے پاکستان میں "قائدانہ" مستقبل میں چار اشخاص کی جو بلیک لسٹ تیار کی ہوئی ہے اس میں میاں افتخار الدین کے بعد دوسرا نام کھوڑو صاحب کا بتایا جاتا ہے۔ مگر کیا کہنے ہیں غلام نبی پٹھان صاحب کے "شاطر فرقہ پرستی" کو دھتا بتا دیا کہ اب یاران طریقت مشفقانہ انداز میں انہیں خود "ابلیس سیاپوش" کہہ کر داد دے رہے ہیں۔ انتخاب کے لئے کاغذات داخل کرنے کا وقت پٹھان صاحب نے ۲۰ر دسمبر دن کے ۱۲ بجے تک کا مقرر کیا اور آخری لمحوں تک چودھری صاحب کو یقین دلاتے رہے کہ "حضور مطمئن رہیں، کھوڑو کو لیگ کونسل کے اجلاس میں پھٹکنے تک نہیں دیا جائے گا۔ آپ کی دعا اور خدا کے فضل سے صدارت کا شرف آپ کے اس تابعدار کو ہی حاصل ہوگا۔"

تسلیموں رکھتے ہوئے ان خوش آیند الفاظ کی گونج ابھی چودھری صاحب کے کانوں میں باقی تھی کہ پٹھان صاحب نے چپکے سے وقت کی میعاد سات گھنٹے اور بڑھا دی اور جب چند ایک منٹ باقی رہ گئے، یعنی شام کے سات بجے کے بعد کھوڑو صاحب کے کاغذات امیدواری آہستہ سے جیب سے نکال کر فائل کر دئے اور خود اپنے کاغذات کو چندی چندی کر کے پھینک دیا۔ دو تین اور جو دیگر امیدوار تھے، جب انھوں نے سنا کہ پٹھان صاحب نے کھوڑو صاحب کے لئے میدان صاف کر دیا ہے تو خواہ مخواہ کی خفت سے بچنے کی خاطر اپنے کاغذات واپس لے لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے ۷ بج کر ۱۰ منٹ کے بعد سوائے کھوڑو صاحب کے اور کوئی میدان میں باقی نہ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح ۱۰ بجے مولانا دینا ہال میں صوبائی لیگ کے صدر کا انتخاب ہونا تھا۔ راقم الحروف بھی بحیثیت پریس نمایندہ کے وہاں موجود تھا جو دلچسپ رنگ اس اجلاس میں دیکھا وہ تو ایک پورے مکتوب کا مواد ہے۔ مختصر ہوا یہ کہ صدارتی افسر رضوان اللہ صاحب نے جب دوبارہ امیدواری کے کاغذات طلب کئے تو پانچ درخواستیں آئیں جن پر ووٹ لئے گئے۔ لیکن پٹھان صاحب کی چال سیاسی نفسیاتی دونوں لحاظ سے اپنا کام کر چکی تھی، چنانچہ کھوڑو صاحب بھاری اکثریت سے سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس معرکہ میں چودھری صاحب یا پٹھان صاحب کون زیادہ گہرا "سیاسی" ثابت ہوا، یہ تو آپ خود فیصلہ کر چکے ہوں گے۔

اب ذرا کھوڑو صاحب کی سیاست کا بھی ایک "ترقی پسند" نمونہ ملاحظہ ہو۔ صدارت سنبھالتے ہی صوبائی لیگ کونسل کے جو ارکان انھوں نے نامزد کئے ان میں چار نام قابل ذکر ہیں۔ بیگم لیاقت علی، بیگم ہارون، بیگم وسیم، اور بیگم خلیق الزماں۔ جی ہاں، خود میاں "خلیق الزماں" کو بھی نامزد کر ڈالا ہے۔ لیکن سنا جا رہا ہے کہ چودھری صاحب اس مار کو چپ چاپ نہیں پی جائیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ پیر الٰہی بخش گروپ کو اکسا کر دوسری "متوازی" لیگ سندھ میں بنوا ڈالیں یا کسی ذریعہ سے کھوڑو کے انتخاب کو ناجائز قرار دے دیں۔ (کھوڑو صاحب نے صدارت سے استعفا دے دیا۔ ع۔ ل) اس سلسلے میں ایک بات عرض کرنا ضروری ہے کہ کھوڑو میں چاہے کچھ بھی نقائص رہے ہوں یا اب بھی ہوں، لیکن حقیقت ہے کہ صوبے کے عوام و خواص کی بہت بھاری اکثریت اُن کی شخصیت سے متاثر ہے اور ان کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کی خواہاں ہو چلی ہے خصوصاً ان کے مقدمہ کے دوران میں جو بیانات انھوں نے اپنی صفائی میں دئے، اور غلام حسین الٰہی بخش

سازشنے جو بیز [illegible] پیش کئے ہیں اس کے بعد سے تو مہاجرین کے دل بھی اُن کی طرف سے کچھ صاف ہو گئے ہیں اس لئے اور دیسے بھی کھوڑو صاحب سیاسی جوڑ توڑ میں کم "چودھری" نہیں ہیں۔ خلیق الزماں صاحب بآسانی ان کو نہ ہلا سکیں گے۔ آفاق، لاہور

صدارت اور وزارت

۱۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو مغربی پنجاب اسمبلی کے اہم ارکان نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر خان ممدوٹ اور اس کے سکریٹری چودھری نصر اللہ خاں کو لکھا ہے کہ وہ جلد سے جلد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس منعقد کریں تاکہ اس میں رشوت ستانی، نظم و نسق کی خرابی، اناج کی کمی، کنبہ پروری، اور مہاجرین کی تکالیف کو دور کرنے کے لئے تجاویز پر غور ہو سکے۔

خدا کرے اسمبلی پارٹی کا مطلوبہ اجلاس جلد منعقد ہو۔ اور اس میں ہمارے ان نمایندوں کو خدا اتنی توفیق دے کہ وہ اپنے اپنے گروہ کے لئے اقتدار حاصل کرنے یا اسے بحال رکھنے کی بجائے عوام کے بھلے کی خاطر کچھ سوچ بچار کر سکیں جنھوں نے انھیں کبھی اپنا نمایندہ چنا تھا اور جن کے نام سے یہ گروہ وزارتیں بنانے یا انھیں برقرار رکھنے کے لئے پیش پیش رہتے ہیں۔

اس اجلاس سے اگر وزرا میں اتنا بھی احساس پیدا ہو سکے کہ وہ مطلق العنان نہیں بلکہ ان سے بھی باز پرس کی جا سکتی ہے تو ہم اسے بڑی کامیابی سمجھیں گے، اور اگر اس اجلاس سے مقصد صرف خان ممدوٹ کی جگہ کسی دوسرے پارٹی لیڈر کو چننا ہے تو ہمارے خیال میں اس طریقہ کار سے نفع کی بجائے شاید نقصان زیادہ ہو اور وزارتوں کی شکست و ریخت کے معاملے میں مغربی پنجاب بھی سندھ نہ بن جائے........

اب اگر اسمبلی پارٹی کے مطلوبہ اجلاس کے بعد اور وزرا کو کہنے سننے کے باوجود خرابیاں بدستور باقی رہتی ہیں اور وزارت کی طرف سے ان کو دور کرنے کی کوشش نہیں ہوتی، تو آیندہ فروری میں بجٹ سیشن کے شروع میں، قاعدے اور معمول کے مطابق جب پارٹی کا اجلاس ہوگا اور اس میں آیندہ سال کے لئے لیڈر کے انتخاب کا مسئلہ پیش کیا جائے گا، تو اس وقت پارٹی بہت آسانی سے کسی دوسرے آدمی کو یہ خدمت سونپ سکتی ہے۔ اور اس درمیانی مدت میں صوبے کے عوام میں اتنا شعور پیدا کر دیا جائے کہ اگر وزارت ان کی مرضی کے مطابق نہ چلے، تو اس کے لئے برسر اقتدار رہنا ناممکن ہو جائے۔ یہ کام مسلم لیگ کا ہے اور صدر مسلم لیگ کو اس کی ذمہ داری لینی چاہیئے۔

ہمارے خیال میں اگر اس طرح یعنی عوام کا اعتماد حاصل کر کے اور ان میں شعور پیدا کرنے کے بعد وزارت کو بدلا گیا تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے بعد دوسری جو وزارت آئے گی عوام اسے من مانی کرنے کا موقع نہیں دیں گے اور وہ خالی خولی وعدوں سے زیادہ دیر تک انھیں ٹرکا نہیں سکے گی اور خود اسمبلی کے ارکان کو بھی احساس ہوگا کہ وہ بھی کسی کے سامنے جواب دہ ہیں اور ان سے بھی باز پرس ہو سکتی ہے۔ ورنہ اگر ارکان اسمبلی کی دھڑا بندیوں سے ہی وزارتیں بدلی جاتی ہیں، تو اس سے عوام کا بھلا نہ ہوگا

آفاق، لاہور

صنعت

اب تک ہمارا ملک بالکل زرعی ہے۔ ہندوستان میں جب صنعتی ترقی کا آغاز ہوا تو ایک خاص پالیسی کے ماتحت پاکستان یعنی مسلمان اکثریت کے علاقوں کو اس فیض سے بالکل محروم رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت تمام صلاحیتوں اور ضروری اشیا کے ہوتے ہوئے بھی ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ ہمارے ہاں تا حد نظر کپاس کے کھیت لہلہاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں سوتی کپڑا بنانے کی ملیں صرف دس ہیں مشرقی بنگال کی وسعتیں پٹ سن سے آباد ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جوٹ کا ایک کارخانہ نہیں، ہمارے ہاں بنگال صوبہ سرحد کے اور مغربی پنجاب کے بعض حصوں میں جنگلات تو ہیں لیکن ان کی لکڑی سے ہم ابھی تک صنعت قائم نہیں کر پائے۔ پاکستان میں بھیڑ، بکریوں کی کثرت ہے، چنانچہ ہم اون دوسرے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں لیکن ہم خود اون کے کپڑے کو ترستے ہیں۔ ہمارے ہاں چرم سازی کے کارخانے کل تین ہیں شکر سازی کے کارخانے نو سے زیادہ نہیں، ان کے علاوہ ہمارے ہاں کارخانوں کی کل کائنات یہ ہے۔ سینک مل ۴۔ سیمنٹ ۵۔ انجن ۳۔ شیشہ سازی ۴۔ اونی مل ایک۔ ٹیرزل صاف کرنے کا کارخانہ ایک۔ رولنگ فیکٹری ۱۸۔ ریلوے ورکشاپ ۴۔ ۳۔ آٹا پیسنے کے کارخانے ۱۲۔ کھیل کا سامان ایک۔ ان کے علاوہ برقی اشیا، ادویات، آلات سازی، سوت بنانے، بنوسے نکالنے اور جوٹ پریس کرنے کے کچھ کارخانے بھی موجود ہیں، لیکن مجموعی حساب سے پاکستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد ہزاروں تک ہی محدود ہے، اس کے مقابلے میں ہندوستان میں ایسے مزدوروں اور صنعتی کام کرنے والوں کی تعداد دس لاکھ ہے۔

خام اشیا کی موجودگی کی وجہ سے ہمارے ہاں مندرجہ ذیل صنعتیں قائم ہو سکتی ہیں۔

جوٹ کے کارخانے، سوتی کپڑے کے کارخانے، چمڑے کے کارخانے، اونی کپڑے

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

۳- باہر کی دنیا

انڈونیشیا پر ڈچ کا حملہ

بالآخر وہی ہوا جس کا ہم نے پچھلے دنوں نئی روشنی میں اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یعنی ڈچ حکومت نے انڈونیشیا پر حملہ کر دیا اور تمام بڑے بڑے ریپبلکن لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ ریپبلکن اگرچہ انڈونیشیا کی عوامی جماعت ہے اور جنتا کی ناقابل شکست طاقت اس کی پشت پر ہے مگر ڈچ حکومت کی فوجیں جدید ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہیں، اس لئے وہ کافی آگے بڑھ چکی ہیں اور انھوں نے ریپبلکن راج دھانی جوگ جاکارتا پر قبضہ کر لیا ہے، مگر وہاں کی جنتا کی مرضی کے خلاف نہ تو ان کی کامیابی دیرپا ثابت ہوگی اور نہ وہ وہاں اپنی حکومت قائم کر سکیں گے۔ ڈچ حکومت کا حملہ صرف انڈونیشیا کے خلاف نہیں ہے، بلکہ تمام ایشیا کی آزادی کے خلاف ہے۔ وزیر اعظم جواہر لال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ہندوستان اس نازک موقع پر خاموش نہیں رہ سکتا، ایشیا بیدار ہو چکا ہے، اور اس کے کسی حصہ پر سامراجی قبضہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ امید ہے کہ وزیر اعظم کی یہ آواز نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے ایشیا میں پوری توجہ سے سنی جائے گی۔ اور ایشیائی ممالک انڈونیشیا کی لڑائی کو اپنی لڑائی سمجھیں گے۔

سماٹرا

بٹاویہ

سورابیہ

جوگ جاکارتا

چین میں فیصلہ کن جنگ کی تیاری

چین میں نیشنلسٹ حکومت کو امریکہ سے جو امید تھی وہ اب تک پوری نہیں ہوئی۔ ایک خبر آئی تھی کہ امریکہ چین میں نیشنلسٹوں اور کمیونسٹوں کی مشترکہ حکومت کرانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی بھی امریکہ نے سرکاری طور پر تردید کر دی، مادام چیانگ نے امریکہ جاتے وقت اپنی ایک نشری تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر کمیونسٹ چین میں جیت گئے، تو اس سے امریکہ کو بھی بہت بڑا نقصان ہوگا۔ چین کے جانے سے پورا ایشیا ہاتھ سے نکل جائے گا" امریکہ کے بعض اخبارات نے بھی اس پر زور دیا تھا کہ چیانگ کو مدد نہ دینے کے معنی ہیں کہ پورے ایشیا کو روس کے حوالے کر دیا جائے" اس کے باوجود اب تک امریکہ نے کوئی غیر معمولی مدد نہیں دی ہے اور نہ اپنی پچھلی پالیسی میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ کمیونسٹ فوجیں برابر بڑھ رہی ہیں، نیشنلسٹ حکومت نے مجبور ہو کر اپنی راج دھانی بھی تبدیل کر دی ہے اور نانکنگ سے کوئی ۴۰ میل کے فاصلے پر، مدافعت کی تیاری کی جا رہی ہے۔ جانکار حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ آخری محاذ ہے جہاں فیصلہ کن لڑائی ہوگی۔ اگر یہاں نیشنلسٹ حکومت کے قدم اکھڑ گئے تو پھر کہیں اور جمانا ناممکن ہوگا۔

محفل برخاست

یو، این کی جنرل اسمبلی کا تیسرا اجلاس بارہ ہفتہ کے بعد ختم ہو گیا۔ اس بارہ ہفتہ میں دنیا کی اس سب سے بڑی پنچایت نے کیا کیا؟ اور ان بڑے بڑے مسئلوں کو، جو دنیا کے امن کے لئے خطرہ ہیں، حل کرنے میں کامیاب رہی یا نہیں؟ یہ سوال ہے جو ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

اس طویل مدت میں، اس میں شبہ نہیں کہ اس نے بہت سے چھوٹے موٹے مفید کام بھی کئے ہیں، مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے ان مسئلوں کو حل کیا جو آج دنیا کو نئی جنگ کی آگ میں ڈھکیل رہے ہیں، برلن کی ناکہ بندی، ایٹمی طاقت، فلسطین، انڈونیشیا یہ مسئلے ہیں جن سے دنیا کا امن ہر وقت خطرے میں ہے۔ لیکن ان میں سے ایک مسئلہ بھی طے نہیں ہوا۔ مسز پنڈت نے پیرس کی ایک پریس کانفرنس میں بالکل بجا طور پر شکایت کی ہے کہ "دنیا کی یہ پنچایت غلط راستے پر چل گئی ہے جو قومیں اس کی رکن ہیں وہ مسئلوں کو اصول کی ترازو میں نہیں تولتیں، بلکہ ذاتی مفاد کی عینک سے دیکھتی ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ پچھلی جنگ کی تباہی سے کسی نے سبق نہیں لیا۔ وہ مسئلے جو جنگ کا سبب بنتے ہیں اس لئے حل نہیں ہوئے کہ لوگوں کے دلوں میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔"

یو، این، او اگر واقعی دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے تو اسے ایشیائی ملکوں کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے جب تک ان ملکوں کی معاشی حالت درست نہیں ہوگی۔ اور جو ملک اب بھی سامراج کے شکار ہیں، ان کو صحیح آزادی نہیں ملے گی، اس وقت تک جو امن قائم کیا جائے گا وہ حقیقی نہیں، مصنوعی اور وقتی ہوگا۔

یو این، او کی ان ناکامیوں کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال پھیل گیا ہے کہ تیسری جنگ ناگزیر ہے اور یو، این، او اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ یو، این، او کی جنرل اسمبلی کے صدر ڈاکٹر ایوٹ نے ابھی حال میں ایک بیان دیا ہے جس میں اس عام خیال کی تردید کی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ دنیا کے عوام یو، این، او کی پشت پر ہیں، اگر بڑے بڑے لیڈر ان مسائل کو جو آج امن کے لئے خطرہ ہیں حل کرنے میں ناکام رہیں گے تو ان کی لیڈری بھی ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال کی بھی تائید کی ہے کہ اگر یورپی ممالک ایشیا کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر اور رویہ نہ بدلیں گے، تو اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوں گے۔ ڈاکٹر ایوٹ کا یہ بیان، اس میں شبہ نہیں کہ بہت ہی امید افزا ہے لیکن افسوس ہے کہ موجودہ حالات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

پاکستان (بسلسلہ صفحہ ۵)

کے کارخانے، چمڑے کے سامان کے کارخانے شکر سازی کے کارخانے، کھیلوں کا سامان بنانے کے کارخانے، ان کے علاوہ گیہوں اور چاول دودھ ترکاری اور پھلوں کی اشیاء کی صنعتیں قائم ہو سکتی ہیں، ڈیری فارموں کا جال بچھایا جا سکتا ہے، نمک سے کاسٹک سوڈا ایلم اور ہائڈرو کلورک ایسڈ بنائے جا سکتے ہیں، ریمنٹ، شیشے، سگریٹ، برتن، مچھلی اور تیل کی صنعتیں بھی قائم کر سکتے ہیں۔

پاکستان خام اشیاء کی اعلیٰ منڈی ہے صنعتیں نہ ہونے کی وجہ سے ان اشیاء کو اپنے ملک میں نہیں کھپایا جا سکتا۔ چنانچہ انھیں دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے، کسی ملک کی خوش حالی کا معیار اس کی اشیاء کے برآمد اور درآمد کے فرق سے پرکھا جاتا ہے اگر برآمد درآمد سے زیادہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس ملک کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔

(فرور بنگ کراچی)

براہ کرم خط لکھتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

تجدیدِ یومِ آزادی

مولوی اقبال احمد خاں سہیل

(یہ نظم ۱۵ر اگست ۱۹۴۸ء کو اعظم گڈھ میں پڑھی گئی)

مہِ نو ابر سے نکلا مسرت کی کلی آئی
سرورِ عام کا پیغام لے کر صبحِ عید آئی
ابھی تیج آ رہی ہے اس سے پہلے یہ نوید آئی
مبارک جشنِ آزادی کی تقریبِ سعید آئی

ہوا صیاد رخصت آج یہ گلزار اپنا ہے
گورنر جنرل اپنا ہے سپہ سالار اپنا ہے

یہ مانا آج بھی ہر چیز کی بیحد گرانی ہے
وہی خود غرضیاں ہیں دیس کی سیوا زبانی ہے
دلوں میں کھوٹ ہے لب پر صفا کی کہانی ہے
سبق برطانیہ کا ہے زباں ہندوستانی ہے

نظامِ کہنۂ سرمایہ داری اب بھی قائم ہے
غریبوں کا غمِ بے روزگاری اب بھی قائم ہے

زبانوں پر ابھی تک داستانِ پاسبانی ہے
بلند و پست میں اب تک بھی باہم سرگرانی ہے
ابھی تک مسلم و ہندو میں کچھ کچھ بدگمانی ہے
زباں کی کشمکش اب تک حجابِ درمیانی ہے

مگر آثار ہیں یہ سب اسی دورِ غلامی کے
نتیجے ہیں یہ سودائے وطن خواہی کی خامی کے

دھوئیں سے جنگ کے مسموم ہے آب و ہوا اب تک
دلوں میں زخمِ تقسیمِ وطن کا ہے ہرا اب تک
غبارِ مغربیت سے مکدر ہے فضا اب تک
کئی صدیوں کا کوڑا کچھ نہ کچھ ہے بچ رہا اب تک

مگر یہ سب اندھیرا جلد ہی اب مٹنے والا ہے
پھر اس کے بعد صدیوں تک اجالا ہی اجالا ہے

ہمارا دورِ آزادی ہے طفلِ شیرخوار اب تک
کہ دیکھی ہے جہاں میں ایک ہی فصلِ بہار اب تک
رہے حالاتِ گرد و پیش گو ناسازگار اب تک
مگر پھر بھی ترقی ہی پہ ہے یہ ہونہار اب تک

خدا رکھے یہ بچہ کچھ دنوں میں جب جواں ہوگا
تو دنیا بھر میں آزادی کا میرِ کارواں ہوگا

ہمیں معلوم ہے برسات کا موسم جب آتا ہے
زمیں میں جان پڑ جاتی ہے سبزہ لہلہاتا ہے
وہی مینہ جو زمیں سے لالہ و سنبل اگاتا ہے
وہی سیلاب کی بربادیاں بھی ساتھ لاتا ہے

نکل آتے ہیں ہر سو جان لیوا جانور سارے
فنا ہو جاتے ہیں موسم بدلتے ہی مگر سارے

یونہی ساون میں جب برسا یہاں بارانِ آزادی
یکایک لہلہا اٹھا بہارستانِ آزادی
کچھ ایسے جوش سے اٹھا تھا وہ طوفانِ آزادی
کہ گوشوں سے نکل آئے بداندیشانِ آزادی

مگر شعلوں سے شمعِ حق کے وہ کب بجھنے والے تھے
انھیں جلنا پڑا جب چیونٹیوں نے پر نکالے تھے

ہمیں شکوے کا کیا حق جب ہماری ہی حکومت ہے
نہ مسلم کی، نہ ہندو کی، یہ جمہوری حکومت ہے
یہ اپنا دیس اپنا راج ہے اپنی حکومت ہے
یہ آزاد و جواہر لال نہرو کی حکومت ہے

فدا اس کی حفاظت میں ہم اپنی جان کر دیں گے
وطن پر سب متاعِ زندگی قربان کر دیں گے

بالک ہٹ

صالحہ عابد حسین

وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں بچپن اور نوجوانی پہلے پہل ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ اس بارہ تیرہ سال کے معمول سے زیادہ لمبی قامت نوجوان کے تندرست سڈول جسم میں گرم خون کی گردش شروع ہوگئی ہے اور وہ سب کے سب نوعمر لڑکوں کی طرح اپنے آپ کو کڑیل نوجوان سمجھنے لگا تھا۔

اسکول سے واپس آتے ہوئے جب وہ اچانک ٹھوکر کھاکر گر پڑا تو اس نے اپنے گھٹنے کی چوٹ کی ذرا سی بھی پروا نہیں کی۔ فوراً کود کر کھڑا ہوگیا، اور اپنے پاجامے پر لگی ہوئی گرد جھاڑنے لگا۔ کہیں اسے کسی نے گرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا؟ کوئی اس پر ہنس تو نہیں رہا ہے؟

جب وہ گھر پہنچا تو چائے تیار تھی، اور اس کے ابا، امی اور بڑا بھائی، تینوں چھوٹے بھائی سب کے سب میز کے گرد بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے، وہ بھی ہاتھ منہ دھوکر خاندان کے خوش دل مجمع میں شامل ہوگیا۔

رات کی دعا پڑھتے وقت اُسے اپنے گھٹنے میں کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہوئی، مگر اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اتنی سی چوٹ پر ہائے وائے کرنا لڑکیوں کا شیوہ ہے نہ کہ اس جیسے "گبھرو" نوجوان کا۔

اگلے دن صبح وہ اٹھا تو ٹانگ کا درد اور بڑھ گیا تھا مگر اس نے اب بھی کسی سے نہیں کہا۔ حسب معمول صبح سب لوگ ساتھ ساتھ سیر کو گئے۔ ناشتہ کیا، پھر فارم میں کام ہوتا رہا اور پھر وہ اسکول چلا گیا۔ واپسی پر ٹانگ کا ورم اور بڑھ گیا اور اب تکلیف سہارنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر اس کی قوتِ ارادی اور قوت برداشت کی یہ تک تھی کہ وہ درد سے ہار مان لے۔ وہ بیماری سے جنگ کرتا رہا اور کسی کو اس کی تکلیف کی خبر نہ ہوئی۔ ان پیاروں بھائیوں کو بھی نہیں جن کے ساتھ وہ ایک ہی کمرے میں سوتا تھا۔ وہ امی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سے ان کا ایک بچہ مرا تھا وہ دوسرے کی بیماری سے بہت پریشان ہو جاتی تھیں۔

چوتھے دن وہ پلنگ سے نہیں اٹھ سکا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ ابا اور امی کچھ پیسے کی خرید فروخت کے لئے شہر چلے گئے تھے، اور گھر پر بچوں کا راج تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹا رہا، اور دوسرے بھائیوں نے کھانا پکایا اور سب نے لطف سے کھایا۔ وہ تکلیف سے کتنا ہی بے چین ہو پر یہ اُسے گوارا نہ تھا کہ بھائیوں کی خوشی میں کھنڈت ڈالے۔

لیکن رات کو جب ابا اور امی شہر سے واپس آئے تو دیکھا کہ وہ تیز بخار میں بھن رہا ہے، اور اس کا پاؤں گھٹنے سے اوپر تک سوج کر کُپا ہو گیا ہے۔

امی کے دل پر جو کچھ گزری پر پچھلے صدمے نے انھیں اور زیادہ مستقل مزاج بنا دیا تھا۔ انھوں نے فوراً پانی گرم کرکے پاؤں کی سینکائی شروع کر دی اور رات بھر سر پر ٹھنڈے پانی کا کپڑا رکھتی رہیں۔

پرانے دوست اور خاندانی ڈاکٹر نے جب صبح آکر اس ذہین اور تندرست لڑکے کی یہ حالت دیکھی تو اس کے ماتھے کی لکیریں اور زیادہ گہری ہوگئیں اور چہرے پر فکر و تردد کے آثار نظر آنے لگے۔ انھوں نے آہستہ سے کہا "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں"

"کیا مطلب ڈاکٹر صاحب؟"

ڈاکٹر نے کہا "مطلب یہ کہ لڑکے کی جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے"

ڈاکٹر نے اگرچہ یہ الفاظ بہت آہستہ سے کہے تھے مگر وہ جوان توجہ اور غور سے ڈاکٹر کے ہونٹوں کی حرکت کو دیکھ رہا تھا، فوراً اس کا مطلب سمجھ گیا۔ "ہرگز نہیں، ڈاکٹر صاحب! میں ہرگز اپنی ٹانگ نہیں کٹواؤں گا۔ میں اپاہج بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے مرنا منظور ہے مگر اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"دیر کرنا خطرناک ہے، جتنی زیادہ دیر ہوگی ٹانگ کو اور زیادہ اوپر سے کاٹنا پڑے گا" ڈاکٹر نے ابا سے کہا۔

"کبھی نہیں! ہرگز نہیں، آپ میری ٹانگ نہیں کاٹ سکتے ...." اس کی آواز میں استقلال اور غصے کا رنگ ملا جلا تھا۔

امی نے اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں بیٹے کی طرف پھیر لیں اور سر جھکا لیا .... ڈاکٹر نے ابا اور امی دونوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور باہر جاکر دونوں کو سمجھانے لگا کہ اس کی جان اسی قیمت پر بچائی جا سکتی ہے کہ اس کو اپنی ٹانگ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہونا پڑے۔ امی کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ ابا گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے .... اندر سے اس کی آواز سنائی دی "بھائی .... بھیا ـــــ ذرا مہربانی کرکے میرے پاس آنا ـــــ" بڑا بھائی بھاگتا ہوا چھوٹے مریض بھائی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی درد اور کرب سے لرزتی ہوئی بلند آواز باہر سنائی دی "بھیا اگر میں بے ہوش ہو جاؤں .... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اب اس درد کو زیادہ نہیں سہار سکتا ـــــ تو تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ان لوگوں کو میری ٹانگ نہ کاٹنے دوگے ـــــ وعدہ کرو ـــــ وعدہ کرو بھائی"

اور جب وہ کمرے کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ چودہ سالہ بڑا بھائی اپنے پورے قد کو تانے دروازے میں کھڑا ہے ـــــ چھوٹے بھائی کی حفاظت کے لئے۔ اس نے اپنی آنکھیں ڈاکٹر کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ "نہیں آپ اس کی ٹانگ کو چھو بھی نہیں سکتے ڈاکٹر صاحب"

"لیکن بیٹے ـــــ تم جانتے ہو اس کا نتیجہ؟ تم بعد میں پچھتاؤ گے اپنی اس ضد پر"

"کچھ بھی ہو .... پر میں وعدہ کر چکا ہوں ـــــ میں اسے زبان دے چکا ہوں کہ اس کی ٹانگ نہیں کٹنے دوں گا .... میں اپنی جان دے دوں گا پر اس کی ٹانگ .... نہیں، نہیں ـــــ تم نہیں کاٹ سکتے اسے ـــــ"

بیمار کی ضد اور دوسرے کی ہٹ دونوں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر ماں اور باپ دونوں یہ سمجھ لیتے کہ بچے کی جان صرف اسی صورت میں بچائی جا سکتی ہے کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں خود بھی اس کا پورا یقین نہیں۔

"ڈاکٹر صاحب! آج رات اور دیکھ لیں ـــــ شاید اس کی حالت بہتر ہو جائے اور ٹانگ نہ کاٹنا پڑے"

دو دن اور دو رات مسلسل بڑا بھائی چھوٹے بھائی کے پلنگ کے پاس بیٹھا رہا، وہ کھانا کھانے تک کے لئے وہاں سے نہ ہٹا۔ سونا اور آرام کرنا تو بڑی بات ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر کو اندیشہ تھا، ٹانگ کا ورم اور بخار اور زیادہ بڑھ گیا۔ چھوٹا بھائی بالکل بے ہوش تھا مگر بڑا بھائی اپنی ہٹ پر قائم تھا ـــــ اس لئے کہ وہ بھائی سے وعدہ کر چکا ہے، اور ہرگز اس کی ٹانگ نہ کٹنے دے گا۔ .... اس لئے کہ بھائی کا لنگڑا ہو کر زندہ رہنا اس کی موت سے زیادہ بھیانک تھا ـــــ اور سب سے زیادہ اس لئے کہ ابھی اس نے امید کا دامن نہ چھوڑا تھا ـــــ اسے ڈاکٹر سے زیادہ اپنے خدا پر بھروسہ تھا ـــــ وہ ضرور اچھا کر دے گا اس کے پیارے بھائی کو۔

ابا اور امی بے قرار تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے ڈاکٹر کا کہنا مان لیا تو ان کے دونوں بیٹے زندگی بھر انھیں معاف نہ کریں گے ـــــ چھوٹے کی ہدایت اور بڑے کی ضد ـــــ وہ خوب سمجھتے تھے ان کی طبیعت کو ـــــ

ڈاکٹر آتا اور غصہ اور مایوسی سے ہونٹ چباتا اور پاؤں پٹکتا چلا جاتا ـــــ ایک مرتبہ وہ غصے میں پکار اٹھا "یہ قتل ہے، صریحی قتل ـــــ میں برداشت نہیں کر سکتا اس کو" غصے میں وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور دروازہ اس کے پیچھے زور سے بند ہوگیا ـــــ

ان کے دل میں بھی ذرا دیر کے لئے یہی خیال آیا، واقعی کیا وہ اپنے ہاتھوں اُسے مار رہے ہیں۔ دوسرا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا تو کیا ان کا فرض نہیں کہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کریں اور اُسے ٹانگ کاٹ دینے دیں ....

لیکن اچانک ـــــ تینوں کے دل میں ایک وقت ایک اور خیال آیا؟ "کیا وہ خدا پر بھروسہ چھوڑ بیٹھے؟ صرف ڈاکٹر پر بھروسہ کر رہے ہیں؟ کیا وہ اس کے دادا کی بیماری کا واقعہ بھول گئے جب سب بڑے ڈاکٹروں کے خیال کے برخلاف وہ اچھے ہوگئے تھے ـــــ کیا خدا کو یہ مشکل ہے کہ وہ اُسے اچھا کر دے؟"

وہ تینوں حضورِ قلب اور اعتماد کے ساتھ پلنگ کے پاس ہی دو زانو ہو کر اس کی صحت اور سلامتی کے لئے اپنے رب سے دعا مانگ رہے تھے۔ مایوسوں کا آخری سہارا اسی قادر مطلق کی ذات ہے۔

ماں اور باپ، بڑا بھائی اور چھوٹے بھائی سب کے سب صبح شام، دن اور رات پروردگار سے اس کی صحت کے لئے دعا مانگتے رہے اور ایک اور رات ـــــ اس امید و بیم کی حالت میں کٹ گئی

اگلے دن ڈاکٹر نے آکر جب اس کی ٹانگ کا معائنہ کیا تو امید کی ہلکی سی ایک کرن اس کی آنکھ میں چمکی ورم اتر رہا تھا، وہ آنکھیں کھولے مسکرا رہا تھا اور سارا خاندان بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکر ادا کر رہا تھا ـــــ

ڈاکٹر سوچ رہا تھا، اس کی تندرستی کی وجہ کیا ہے؟

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ایران کا تعلیمی نظام (۳)

عبد الحلیم ندوی

۱۹۳۵ء میں حکومت کی طرف سے جو اعداد و شمار شائع کئے گئے تھے، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ۳۹۶ طلبہ باہر کے ملکوں سے واپس آگئے تھے اور ۲۵۰ طلبہ اس وقت تک زیر تعلیم تھے۔ باہر سے آنے والوں کی مجموعی تعداد (جن میں حکومت کے ارسال کردہ مختلف شعبوں کے طلبہ اور نجی سب شامل ہیں) ایک ہزار پانچ سو سے اوپر تھی۔ حکومت کے علاوہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کو بھی ایک معین تعداد ہر سال انگلستان میں تکنیکل تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی قوم کے بہت سے نامور اور ہر دل عزیز رہنماؤں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں بھی تعلیم پائی ہے، طہران یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعیات کے پروفیسر اور مینہ وار سکے ہسپتال کے صدر بھی وہیں کے تعلیم یافتہ ہیں۔

ان سب کوششوں کے باوجود ایران میں تربیت یافتہ کی بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ملک میں بھی ٹریننگ کا معقول انتظام کیا جائے۔ ویسے تو آج سے بہت پہلے یعنی ۱۹۱۸ء میں ہی استانیوں اور استادوں کی تربیت کے لئے کچھ مدرسے قائم ہوگئے تھے، لیکن ان سے کام نہیں چلتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس طرف پوری توجہ دی گئی اور معلموں کی تربیت کا قانون منظور ہوا۔ اس قانون کی رو سے ۲۵ ٹریننگ اسکول کھولنے کی اسکیم بنائی گئی جہاں پانچ سال کا نصاب رائج کرانا تھا۔ چنانچہ دو ہی سال کے عرصے میں (۱۹۳۶ء) ۹ مدرسے استادوں کے لئے اور دو استانیوں کے لئے کھل گئے، جن میں ۶۹۰ طلبہ تعلیم حاصل کرنے لگے، اور ۶۲ اساتذہ تھے۔ اس کے بعد ٹریننگ اسکول اسی منصوبے کے ماتحت قائم ہوئے اور روز بروز ہو رہے ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت پورے ملک میں ۳۰ مدرسے چل رہے ہیں، اور طلبہ کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ معلموں کی ٹریننگ کی اسکیم میں ہونے والے اساتذہ کے لئے خاص خاص رعایتیں اور سہولتیں بھی رکھی گئی ہیں۔ تاکہ زیادہ لوگ تعلیم کو اپنا پیشہ بنانے پر آمادہ ہوں ان مدارس میں داخلے کے لئے عام تعلیمی معیار تو ثانوی کی مکمل سند ہے لیکن اس سے کم لیاقت والوں کو بھی لے لیا جاتا ہے۔ یہاں کے وہ طلبہ جن کی عمریں ۲۰ سال کی ہو جاتی ہیں ابتدائی مدرسوں میں معلمی کے لئے رکھ لئے جاتے ہیں۔ البتہ طہران میں جو اعلیٰ ٹریننگ کالج ہے اس میں البتہ ثانوی سے کم لیاقت رکھنے والے کو داخل نہیں کیا جاتا۔ اس کالج کے پڑھے ہوئے ثانوی مدرسوں میں پڑھاتے ہیں۔ کالج کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ ملک کے ثانوی مدارس کے لئے اساتذہ مہیا کرے۔ اس کالج سے طہران یونیورسٹی کے آرٹس اور سائنس کے شعبوں کو بھی ملحق کر دیا گیا ہے، جہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ۸۰ مقیم طلبہ بھی تھے۔ اس کالج میں داخلے کے امیدواروں کو خواہ وہ یونیورسٹی سے آئے ہوں

یا کسی ثانوی مدرسے سے، آٹھ مقررہ مضامین میں سے کسی ایک میں اختصاص ضرور کرنا پڑتا ہے۔ فارسی زبان یا جغرافیہ میں ادب اور تاریخ میں یا فنون تعمیر میں، غیر ملکی زبانوں میں یا فلسفہ میں تعلیمی نظریات میں یا ریاضی میں، طبیعیات و کیمیا میں یا حیاتیات میں۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے لڑکیوں کے داخلے پر پابندی تھی۔ لیکن اب وہ ہٹالی گئی ہے اور وہ لڑکوں کی طرح اس کالج میں داخلہ لے سکتی ہیں۔ ہاں ان کو داخلہ سے پہلے امتحان داخلہ کا ایک مخصوص کورس پڑھ کر اس میں کامیابی حاصل کرنی ضروری ہے، اور ۱۹۳۶ء سے ان کے لئے ایک خاص مضمون بنیادی سائنس کا بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ یوں تو یہ کالج طہران یونیورسٹی ہی کا ایک جز ہے لیکن اس کا نظم و نسق الگ ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے جو چھ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے، اپنے معمل اور اقامت خانے ہیں، اپنا الگ کتب خانہ ہے اور علیحدہ کھیل کا میدان ہے۔ اس کالج سے ۱۹۳۵ء تک ۶۱۲ طلبہ فارغ ہو کر نکل چکے تھے اور ۵۵۰ اس سال زیر تعلیم تھے۔

اساتذہ کی ملازمت کے یہاں ۱۰ گریڈ ہیں اور ہر استاد کو دو سال سے لے کر تین سال تک ہر گریڈ میں رہنا پڑتا ہے، عموماً ۵۵ سال کی عمر میں پنشن دے دی جاتی ہے۔

صنعتی تربیت کو بھی جو وزارت صنعت کے زیر اہتمام ہے خاص ترقی ہو رہی ہے۔ ابتدائی مدارس میں جہاں دری بافی، پارچہ بافی اور فرنیچر سازی بڑھئی گری کے کام نصاب کی رو سے سکھائے جاتے ہیں صنعتی تربیت کی بڑی ضرورت تھی لیکن ابھی ان مدارس میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔

البتہ ثانوی منزل میں اس کا خاصا اہتمام ہے۔ صنعتی مدرسوں میں داخلہ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جب طالب علم ابتدائی پاس کر کے ثانوی کے معیار پر آ جاتا ہے تو صنعتی اسکول میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ ایران میں صنعتی مدرسے تو بہت ہیں مگر ان میں سب سے مشہور انڈسٹریل اسکول ہے۔ ان اسکولوں کا نصاب تعلیم چھ سال میں ختم ہوتا ہے۔ چار سال تو عام نظریات اصول اور پھر عملی فن سکھایا جاتا ہے۔ آخر کے دو سال کسی خاص پیشے کی تربیت کے لئے مخصوص ہیں، تاکہ طالب علم چاہے تو کالج سے نکلتے ہی اپنا پیشہ شروع کر دے۔ جو طلبہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے ایک صنعتی کالج بھی ہے جس کا نصاب تین سال کا ہے اور اس میں چار مضامین پڑھائے جاتے ہیں، میکانکس، کیمیا، معدنیات اور فلزیات۔ طالب علم کو اختیار ہے کہ ان میں سے جو مضمون چاہے لے، نظری حیثیت سے مذکورہ مضامین میں سے ایک مضمون پڑھ لینے کے بعد طالب علم کو ایک سال کسی چالو کارخانے میں جا کر عملی مشاہدہ اور عملی کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ صنعت و حرفت کے اور بہت سے مدرسے ہیں جن میں سے بعض میں دری بافی، نقش سازی، کتابوں کے سرورق کی آرائش، میناکاری، ٹائل بنانا اور کپڑا

بننا سکھایا جاتا ہے، یہاں کی مصنوعات کارخانوں کے مال کا مقابلہ کرتی ہیں۔ یہ تو ان صنعتوں کے مخصوص مدارس کا ذکر تھا۔ ان کے علاوہ یہ سب فن "طہران آرٹس کالج" میں بھی سکھائے جاتے ہیں۔ رنگ سازی کے لئے بھی حال ہی میں ایک اسکول بنا ہے۔ اس اسکول کے فارغ لڑکے، قالین، کپڑے اور روئی کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب درسگاہیں خاص طور سے لڑکوں کے لئے بنائے گئے ہیں، لڑکیوں کے لئے بھی الگ ایک صنعتی اسکول بنایا گیا ہے جس کی عمارت اتنی شاندار اور خوبصورت ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔

ہم نے اب تک ان مدارس کا ذکر کیا جنہیں محکمۂ تعلیم نے اپنے انتظام اور اپنے خرچ سے قائم کیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری وزارتوں نے بھی اپنے صنعتی ادارے قائم کئے ہیں اس قسم کے اسکولوں میں سے "اسکول آف کامرس" اینڈ اکونومکس اور "اکیڈمی آف میوزک" سے وزارت تعلیم کو بڑی دلچسپی ہے۔ اول الذکر کی سند کو اعلیٰ ثانوی کی سند کے برابر سمجھا جاتا ہے، اور اس کا تین سالہ نصاب پڑھ لینے کے بعد طالب علم شعبۂ قانون اور شعبۂ معاشیات میں داخلہ لے سکتا ہے۔

"ادارۂ موسیقی" میں طلبہ کو بچپن سے داخل کیا جاتا ہے۔ شروع کے چھ سال میں ابتدائی نصاب پڑھایا جاتا ہے جس میں موسیقی کے کچھ نظریات بتائے جاتے ہیں اور عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ چوتھے سال سے نصاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے اور یہ درجہ اختصاص کہلاتا ہے۔ اس منزل کے بعد ایک تیسری منزل اس سے بھی اعلیٰ آتی ہے جس کا نصاب چار سال کا ہوتا ہے جب طالب علم اس کو بھی پاس کر لیتا ہے تب اس کو موسیقی کی سند دی جاتی ہے۔

حکومت نے زراعت کو فنی نقطۂ نظر سے ترقی دینے اور سائنٹیفک اصولوں پر کاربند ہونے کے لئے قراج میں ایک زراعتی اسکول بھی قائم کیا ہے۔ اس کے ساتھ مویشیوں کا کالج بھی۔ ان کالجوں میں طلبہ کو دو تین سال رہنا پڑتا ہے جب نظری تعلیم ختم ہو جاتی ہے تو پھر کسی تجربہ گاہ میں جا کر عملی تجربہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ چاہیں وہ اصول تعلیم اور نفسیات کا ایک نصاب ختم کرنے کے بعد کسی ابتدائی زراعتی اسکول میں معلمی کا کام کر سکتے ہیں۔

وزارت حرب نے اپنے افسروں کی تربیت کے لئے طہران میں ایک "ملٹری کالج" قائم کیا ہے۔ اس کالج میں داخلہ لینے کے لئے فوجی ثانوی مدارس کی سند پیش کرنی ضروری ہے۔ یہ فوجی مدارس حکومت نے تبریز، مشہد، اصفہان، شیراز اور کرمان شاہ میں قائم کئے ہیں۔ طہران فوجی کالج کا نصاب تعلیم دو سال کا ہے جس میں پیدل فوج، توپ خانے اور کمسریٹ کی نگرانی اور فوجی انجینیروں کا کام سکھایا جاتا ہے جب طالب علم اس نصاب کو پورا کر لیتا ہے تو اس کو لفٹیننٹ کی سند دی جاتی ہے۔ وزارت مواصلات اور وزارت داخلہ نے بھی مخصوص قسم کے کالج الگ کھولے ہیں۔ ان سب کالجوں میں تعلیم مفت ہوتی ہے، بہت سے مقیم طلبہ بھی رکھے جاتے ہیں، اور مستحق طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔

اب حکومت کے قائم کئے ہوئے عام مدرسوں کی تعداد

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

سرسیّد کے تعلیمی خیالات

عبداللطیف اعظمی

سرسید ہمارے تعلیمی ہراول کے پہلے جنرل ہیں۔ انھوں نے ہماری تعلیمی کشتی کی اس وقت ناخدائی کی، جب وہ ساحل سے کوسوں دور اور سخت طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ بزرگوں کے قلم و دل آزاد ہیں۔ وہ سرسید کے متعلق جو چاہیں لکھیں لیکن ان حالات میں جن میں سرسید نے قوم کی بقا و حیات کے لئے انگریزی تعلیم و تمدن کو ضروری سمجھا اور انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو، ہندوستان کی دوسری تعلیموں پر ترجیح دی۔ اگر ہمارے نقادوں کو اس زمانے کے مسئلہ تعلیم کو حل کرنا ہو تو یقین ہے کہ ان کے قلم کی سیاہی خشک اور زبان میں لکنت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید نے جس تعلیم اور طریق تعلیم کو مسلمانوں میں رواج دیا اور ان کی حیات و بقا کے لئے ضروری سمجھا، وہ نہ تو ہندوستان کی تمدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور نہ قومی زندگی کی اصل ضرورتوں اور روزمرہ کی احتیاجوں کو پورا کرتا ہے لیکن اگر اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نظام تعلیم کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ سرسید کو جس وادی سے گذرنا پڑا ہے، وہ چاروں طرف سے کانٹوں سے گھری ہوئی تھی، اس لئے یہ کہنا کہ ان کا دامن کہیں الجھا نہیں، بہت بڑی جسارت ہو گی۔ مگر اُسے طے کر لینے پر تحسین نہ کرنا بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔

سرسید کی تعلیمی خدمات کی ابتدا مرادآباد میں ایک فارسی مدرسے کے قیام سے ہوتی ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد ہی فارسی اور اردو وغیرہ کی تعلیم کے متعلق ان کی رائے بدل گئی۔ اور انھوں نے حکومت سے سفارش کی کہ "گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی اسکول جاری رکھے"۔ مگر مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا، عیسائی ہو جانے کے مرادف ہے، چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو جاری کرنا چاہا تو مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی اور اس کے حاصل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر سرسید نے ضروری سمجھا کہ انگریزی اسکول اور کالج قائم کرنے سے قبل مسلمانوں کے دل میں انگریزی زبان و علوم کی اہمیت اور اس کی علمیت جاگزیں کی جائے، اور انگریزی سے علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں منتقل کر کے، ان کے دل میں مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت بٹھائی جائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے متعدد مقامات پر سوسائٹیاں قائم کیں ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا، اور اس میں انگریزی کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ سرسید نے بنیاد رکھتے وقت ایک مبسوط تقریر کی تھی۔ تقریر نہایت موثر اور ان کے جذبات کی پوری پوری آئینہ دار ہے۔ انھوں نے آخر میں فرمایا تھا کہ

"اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی ہے، تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے بیشک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں، جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے، ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں، کہ تو نے ہمارے دل کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا، جو صرف ہمارے ہی لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد بھی بہت سی نسلیں آنے والی ہیں، ان کے لئے بھی روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے، تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے، تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اس تحریر سے تعلیم کے متعلق سرسید کے خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ مگر ان کی نیت کا خلوص اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی خواہش ہر ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

سرسید انگریزی تعلیم اور جدید طریق تربیت پر بہت زور دیتے تھے۔ مگر خود ان کے ذہن میں اس کا کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک انھوں نے جو اسکول قائم کئے تھے، ان میں انگریزی محض برائے نام تھی جو ان کے عزائم کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھوں نے سوچا کہ کسی دارالعلوم یا یونیورسٹی کو قائم کرنے سے قبل یورپ جا کر بچشم خود وہاں کے نظام تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھا جائے اور اس کے مطابق ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں اس غرض سے یورپ روانہ ہوئے۔ جب انگلستان پہنچے تو وہاں کی دنیا ہی الگ نظر آئی۔ گئے تھے محض نظام تعلیم اور طریق تربیت کے مطالعے کے لئے مگر وہاں کی ترقی اور بھائی ہی کو دیکھ کر حریص طبیعت بے چین ہو گئی، دل نے چاہا کہ اگر یہ جنت ہندوستان میں منتقل نہیں ہو سکتی تو ایسی وہاں کیوں نہ قائم کی جائے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوب صورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا کہ کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا، سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں دہی جلنا ہے یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بے جا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی معلوم نہیں ہوتی"

قیام کے طول کے ساتھ دل کی بے چینی بڑھتی گئی۔ جب سیل جذبات پر قابو نہ رہا تو تحریک کی صورت میں بہہ نکلے۔ مگر سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ لوگوں کا غم و غصہ اور مشتعل ہو گیا۔

۱۷ ماہ کے بعد انگلستان سے واپس آئے، آتے ہی کالج کے قائم کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ مشکلات پہاڑ کی طرح سد راہ ہوئیں۔ مگر سرسید کی طبیعت کوہ کنی میں فرہاد سے بھی بازی لے گئی۔ بالآخر انھوں نے تمام ناسازگار حالات پر قابو حاصل کر لیا اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں کالج کی بنیاد رکھی۔

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اب سرسید کی ذمہ داریاں اور ان کے مشاغل بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انھیں انجام دینا مشکل تھا۔ اس لئے ملازمت سے پنشن لے لی اور کلی طور پر کالج کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے کالج کو ترقی دینے اور مسلمانوں میں انگریزی کی اشاعت کرنے کے لئے جان توڑ کوششیں کیں ایک منٹ بھی توقف اور غفلت میں ضائع نہیں کیا اور کر سکے بھی تو یوں کر

ہاں رہ عشق ہست و گنجشکن ندارد بازگشت
جرم راہیں جا عقوبت ہست و استغفار نیست

گو سرسید یورپ سے بہت زیادہ مرعوب تھے۔ اس کی ہر چیز کی تقلید کو ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ مغربی علوم و فنون میں پوری دست گاہ رکھیں بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ مغربی معاشرت اختیار کر لی جائے اس پر انھوں نے اپنی متعدد تقریروں اور تحریروں میں زور دیا اور اس کی مخالفت پر بہت تاسف ظاہر کیا۔ لیکن اس غلو کے باوجود وہ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو نصاب تعلیم کا ضروری جز سمجھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اگر ایک طرف اسلامی علوم و معارف میں بہترین دست گاہ رکھتے ہوں تو دوسری طرف مغربی علوم اور مغربی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ اگر ایک طرف قرآن و حدیث کے حامل ہوں، اور مسلمانوں کی امامت و قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں تو دوسری طرف بیرسٹری اور ججی وغیرہ کی بھی صلاحیت ہو، غرض وہ ایک ایسا دارالعلوم یا یونیورسٹی چاہتے تھے جس کے طالب علم

در کفے جام شریعت ۔ در کفے سندان عشق

کی مکمل تفسیر ہوں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو مخاطب کر کے کہا تھا:۔

"یاد رکھو، سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم دونوں باتوں (یعنی علم و اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کی عزت ہو گی"

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی تو اس کے منجملہ اور مقاصد کے یہ مقاصد بھی بہت اہمیت

ہے

۱۔ انگریزی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں، ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔
۲۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام بطور خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا، وغیرہ۔

[illegible] عیں اہل پنجاب نے جالندھر میں سرسید کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا تھا، اس کے جواب میں سرسید نے ایک تقریر کی تھی، جس سے ان کے نظریۂ تعلیم کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس تقریر کا قدرے طویل ٹکڑا کسی اور مناسب جگہ آئے گا۔ اس کے چند فقرے یہاں ملاحظہ ہوں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ:-

"فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔"

سرسید مغربی تعلیم کے نتائج و اثرات سے بے خبر نہ تھے وہ جانتے تھے کہ اس کی اشاعت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات جگہ لے لیں گے۔ مذہبی عقائد کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی، لوگوں میں دہریت، نیچریت اور لامذہبیت کا رجحان ترقی کر جائے گا۔ اس کے انسداد کے لیے ان کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں نقلاً نہیں بلکہ عقلاً اس قسم کے شبہات اور اعتراضات کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو امت میں ایک جدید فتنہ کی باعث ہوئی۔ مگر ان کی نیت قطعی صاف تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے بچانے کے لئے جو مغرب سے آ رہا تھا اور جس کے راستے میں خود بھی معاون تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس قسم کی ایک تفسیر لکھی جائے۔ اس کے متعلق ان کی ایک طویل تقریر کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:-

"میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں گا، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصل مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے، بلکہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرے پر لگ گئی ہیں، یا دانستہ لگا دی گئی ہیں۔

میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرے سے ان سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا وعدہ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ [illegible] مقدس اور باعلم لوگوں کا ہے [illegible] مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے [illegible] ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ اسلام سے کس قدر مخالف ہیں [illegible] میرا فرض تھا کہ جہاں تک ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو [illegible] اسلام کی حمایت کروں [illegible] نورانی چہرے کو لوگوں کو دکھلا دوں [illegible] کانشنس کہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔"

سرسید نے مذہبی تعلیم کی حمایت کی اور اسے نصاب تعلیم میں داخل کیا، مگر عربی زبان کو نصاب میں قطعی جگہ نہیں دی گئی۔ غالباً [illegible] میں احیاء العلوم عربیہ کے نام سے علی گڈھ کالج میں ایک تحریک شروع کی گئی۔ یہ ایک انگریزی پروفیسر کی مرہون منت تھی۔ اس کے لوگ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ایما سے شروع کی گئی ہے۔ نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔ مگر کسی صاحب نے اس کی مخالفت میں "ریڈیکل" کے فرضی نام سے علی گڈھ منتھلی میں ایک مضمون لکھا اور ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ عربی علوم و فنون اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے۔ ان مخالفتوں کی وجہ سے یہ تحریک سرسبز و شاداب نہ ہو سکی۔ (باقی آئندہ)

ایران کا تعلیمی نظام

(بسلسلہ صفحہ ۵)

بہت بڑھ گئی ہے اور خرچ میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ [illegible] میں [illegible] ریاست سے خرچ ملنے اور نجی امداد کی مجموعی رقم جو ان مدارس پر خرچ ہوئی [illegible] ریال کے درمیان تھی۔ اس مقابلہ میں [illegible] میں صرف [illegible] رقم [illegible]۔

ایرانی حکومت تعلیم کو صرف بچوں اور نئی نسل ہی تک محدود رکھنے کے قائل نہیں بلکہ بوڑھوں اور بڑوں کو بھی اس نعمت سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ [illegible]

اس طرف بھی خاص توجہ دی جانے لگی ہے۔ سب سے پہلے ملک کے سارے مدارس کو ہدایت کی گئی کہ وہ تعلیم بالغان کے لئے شبینہ مدرسوں کا انتظام کریں۔ تعلیم بالغان کا معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ طالب علم اتنا پڑھ لکھ لے کہ اخبارات کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ بالغوں کا نصاب تعلیم دو سال کا ہے۔ اور اس کی سند کو درجہ چہارم ابتدائی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ سال میں کم سے کم ۹۰ راتوں کی حاضری ضروری ہے۔ پہلے سال پڑھنا لکھنا اور سادہ حساب سکھایا جاتا ہے اور دوسرے سال معلومات عامہ اور حفظان صحت، حساب اور مدنیات کی تعلیم ہوتی ہے۔ ایرانی تاریخ و جغرافیہ اور نظم و نثر کے انتخابات بھی نصاب میں شامل ہیں۔ [illegible] کے آخر تک اس قسم کے ۲۱۳۳ درجے کھل چکے تھے۔ اور ۹۷۱۵۷ لڑکے استفادہ کر رہے تھے۔ [illegible] میں ایران کی جو تعلیمی کیفیت تھی وہ بلحاظ عمر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس سے عام تعلیمی حالت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

۱۸ سال کی عمر تک ۲۱۸۳۴ لڑکے۔ ۱۸ سے ۲۵ سال تک ۲۸۹۳۲ طلبہ۔ ۲۵ سے ۳۰ سال تک ۱۹۲۲۲۔ ۳۰ سے ۳۵ سال تک ۱۷۶۲۴۔ ۳۵ تا ۴۵ ۱۸۸۳۲۔ ۴۵ تا ۵۵، ۹۰۷۹ اور ۵۵ سال سے اوپر کی عمروں کے لوگوں کا تناسب ۲۷۹۰ تھا۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۳۷۷۰۳ ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی کاروبار میں لگے ہوئے ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تعلیمی ترقی بہت بڑھ گئی ہے لیکن ابھی تک اعداد و شمار نہیں مل سکے ہیں۔

بزم بے تکلف

(بسلسلہ صفحہ ۳)

لکھتا ہے۔)

مریض۔ لیجئے اب وظیفہ ہونے لگا۔ خدا جانے نسخہ کی نوبت کب آئے گی؟
شاگرد۔ (مریض سے) یہ نسخہ لیجئے۔ رات کو بھگو دیا کیجئے، اور صبح تڑکے پی لیا کیجئے۔
مریض۔ (نسخہ دیکھ کر) اوہ، کوئی تیس، چالیس دوائیں ہوں گی۔ دوسرے سے [illegible] اور اپنی طرف سے یہ طول! کیوں جناب اس نسخہ کی کیا قیمت ہوگی؟
شاگرد۔ [illegible] رہے [illegible] آنے میں بندھ جائے گا اور جگہ [illegible] نہیں گے۔
مریض۔ [illegible] ہوگا۔
شاگرد۔ [illegible] تین چار پیسے ہیں۔
مریض۔ بجا ہے، ذرا مجھے قلم دوات، کاغذ عنایت ہو۔
حکیم صاحب۔ [illegible]؟
شاگرد۔ شاید کوئی ناگفتہ بہ حال لکھنا ہوگا۔
مریض۔ (حساب لگاتا ہے) چار آنے روز۔ سال تین سو ساٹھ دن کا مان لیجئے۔ چار دن کا ایک روپیہ ہوگا۔ تین سو ساٹھ کو چار سے تقسیم کیا۔ نہیں یہ کیوں کروں۔ پھر چار سے ضرب دینا ہوگا۔ تین سو ساٹھ روپے ہوگئے (حکیم صاحب سے) حضرت! بقرط زماں! میری جان بخشی کیجئے۔ میں ایسے علاج سے باز آیا۔ تین سو ساٹھ [illegible]
حکیم صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔ [illegible] نے مزاحاً چار پیسے کہہ دئے، آپ نے باور کر لیا۔ آپ خیر سے اس نسخہ کو استعمال کیجئے۔
مریض۔ جی ایسے چونسے میں نے بہت دیکھے ہیں۔ میری ساری عمر آپ ہی حضرات کے علاج میں گذرتی ہے (اٹھ کر) بس اب اجازت ہو۔

(چلا جاتا ہے)

شاگرد: ۔ خس کم جہاں پاک

پردہ گرتا ہے

(باقی آئندہ)

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں
[illegible] کی قلت کی وجہ سے نئی روشنی کی زائد کاپیاں بہت [illegible] چھپتی ہیں اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ [illegible] تو [illegible] اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

اِدارۂ تحریر:- ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ۸ ، ۱۹۴۸

چندہ :- سالانہ ۵ ششماہی للعہ

بالک ہٹ

(بسلسلہ ۸)

یہ کوئی معجزہ تھا جو دعاؤں سے ظہور میں آیا۔ دونوں بھائیوں کی بالک ہٹ کی لاج خدا کو رکھنی منظور تھی یا مریض کی قوتِ ارادی و قوتِ برداشت کا کرشمہ تھا یا خود اس کی تشخیص کی غلطی؟

اور پورے خاندان کے ڈاکٹر کے اور سب سے زیادہ بڑے بھائی کے لئے وہ دن کیسا روشن، کیسا حسین، کتنا پرمسرت تھا، جب تین ہفتہ بعد وہ زرد اور کمزور لیکن ہمت اور استقلال کی زندہ مورت، اپنی دو [illegible] ٹانگوں پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان تھا۔ [illegible] کی آنکھیں شکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ چھوٹے بھائی کے چہرے پر عزم و استقلال کا رنگ [illegible] رہا تھا۔ آج وہ پھر کار زارِ حیات میں حصہ لینے کے لئے بڑھا ہوا تھا۔ —— زندگی میں ایک دوسرے کے قوتِ بازو بنا رہنے کا مبارک عزم۔

اور یہ لڑکا جو اپنی ٹانگ سے محروم ہونے سے بال بال بچا وہ سور ما ہے جسے آج ساری دنیا جنرل اکبر حیدر خاں کے نام سے جانتی ہے۔

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی

طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۳ | ۱۶ جنوری سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

صبح امید

مولانا ابوالکلام آزاد

انسانوں کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کی محتاج ہوتی ہیں، اور اُن کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے، جو گو زندہ ہے، مگر حرکت کرنے کے لئے کسی بیدار کن صدا کا محتاج ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام نشو و ارتقا کی قوتیں ابتلا و وقت غفلت رہیں۔ ان کو کبھی جگانے والا اور کوئی ہشیار کرنے والی صدا نصیب نہیں ہوئی۔ قوموں کی زندگی کی اصلی قوت چند نفوس خاص کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان کی بیداری سے تمام ملت بیدار رہتی ہے اور ان کی غفلت سے تمام ملت پر غفلت چھا جاتی ہے۔ لیکن بدبختی سے مسلمانوں کے رہنماؤں کا یہ حال رہا ہے کہ

او خویشتن گم است، کرا رہبری کند..................

ہندوستان میں گذشتہ نصف صدی کے اندر بیسیوں تغیرات ہوئے۔ تعلیمی رفتار کو خواہ کتنا ہی سست کہا جائے مگر ترقی رفتار سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی چیز شب و روز کے ساتھیوں کی حرکت تھی، اور کوئی نظر ایسی نہ تھی جس کے سامنے سے قافلے گذرتے ہوں، اور شہسواروں کی اڑائی ہوئی گرد سے غبار آلود نہ ہوئی ہو۔ ضرور تھا کہ غافل دلوں میں اُمنگ اور حرکت کی گدگدی پیدا ہوتی، اور ساتھیوں کو دوڑتا دیکھ کر بلا قصد بھی پاؤں حرکت کرنے لگتے۔ مگر بدبختی یہ تھی کہ لگام ان ہاتھوں میں تھی، جو لگام سے لگام کا نہیں بلکہ زنجیر کا کام لیتے تھے اور بیداری کے قدرتی ولولوں اور اُمنگوں کو ہمیشہ اپنی مصنوعی خواب مقناطیسی کے عمل سے دبا دینا چاہتے تھے، دلوں میں جوش اُٹھتا تھا، اور آنکھیں راہ مقصود کو ڈھونڈتی بھی تھیں، لیکن جوش یا تو دبا دیا جاتا تھا یا اس کے لئے ایک غلط مصرف پیدا کر دیا جاتا تھا جس میں خرچ ہو کر، ضائع ہو جاتا تھا اور تلاش راہ کی خواہش کو یا تو بڑھنے سے روک دیا جاتا تھا یا پھر ایک پرپیچ و خم راہ ضلالت سامنے کر دی جاتی تھی، تاکہ جستجوئے منزل کا قدم اسی میں بھٹک کر رہ جائے..................

لیکن ہم نے جاگنے میں دیر کی تھی، تو قدرت نے جگانے میں اور زیادہ دیر نہ کی۔ پیچھے بعد دیگرے چند واقعات و تغیرات نے بھی ظہور کر کے تنبیہ اور غفلت شکنی میں مدد دی اور الحمد للہ کہ اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں تو مایوسی کی جگہ اُمید کے اثر کو غالب پاتے ہیں، گو ابھی تک کوئی اصلی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نہ تو پچھلی راہ سے پورے قدم ہٹے ہیں اور نہ آئندہ کے لئے کوئی نئی راہ متعین ہوئی ہے۔ اب تک جو تغیرات ہوئے ہیں، صرف ذہن اور دماغ تک محدود ہیں اور وہ بھی کوئی کامل تغیر نہیں، بلکہ صرف ایک جنبش ہے، جو دماغوں کے جمود نے محسوس کی ہے، اور پھر جو کچھ بھی ہے کسی متحدہ رشتے میں منسلک نہیں اور اب تک اتحاد اور مبادلۂ آرا کی قوت سے محروم ہے۔ تاہم ہر حرکت کی ابتدا جنبش سے اور ہر عمل کا آغاز ذہن و خیال سے ہوتا ہے۔ برسوں کی نیند کے متوالے اگر ابھی کروٹ بھی لے رہے ہیں تو اُٹھ کر بیٹھ جانے کے لئے جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ شب کی سرمستیوں کا ابھی کچھ نہ کچھ اثر تک تو خمار رہے ہی گا۔ عجب نہیں کہ نئے موسم کے آنے تک کچھ زمانہ تذبذب کی بے عنوانیوں کا بھی گذرے۔ لیکن ہر حال میں عقل و ہوشمندی حزم و احتیاط اور اعتدال و توسط کے ساتھ نظر عواقب امور پر رہنی چاہیئے..................

یہ حالات یقیناً اُمید افزا ہیں، اور تغیرات نے نئی بنیادیں رکھنی شروع کر دی ہیں مگر اب سب سے مقدم بات، یہ ہے کہ اس انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو..................

ہمیں گذشتہ افسانے کو ختم کر کے، آئندہ کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ اب ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ پچھلی راہ صحیح نہیں تھی.................. گو ایسے بھی ہیں جو اب بھی زبان سے اپنی پچھلی ضلالت کا اقرار کرتے ہوئے شرماتے ہیں، لیکن اگر دلوں کو ٹٹولا جائے تو کوئی بھی نہیں جو تزلزل اور جنبش محسوس نہ کرتا ہو۔ اس لئے اب تمام قوت غور و بحث اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ آئندہ کے لئے کون سی راہ اختیار کی جائے اور اس کا نظام اور مقصد کیا ہوگا؟.................. ہم اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہر اصلاح و تغیر کے لئے اصلی کام جنبش کا پیدا کر دینا اور گرا ہی کے قفس کا دروازہ کھول دینا ہے۔ جب حرکت پیدا ہوگی اور قفس کی قید سے باہر نکلیں گے، تو پھر خود ہی اپنے لئے کوئی نہ کوئی آشیانہ ڈھونڈھ لیں گے۔ یہ بالکل سچ ہے اور جو لوگ آج قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کو ہرگز اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو گڑھے سے نکال کر اس کے لئے کوئی نیا محل بھی تیار کر دیں۔ یہ کام ان کا نہیں ہے، ان کا اصلی فرض یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے کہ پانی بند ہے، اس کا بند توڑ دیں، جب وہ چلے گا تو خود اپنا راستہ نکال لے گا۔ اور اگر خود نہ نکال سکے گا تو پھر انجینیر آئیں گے، اور اس کے لئے ایک مستقیم نہر کا خط کھینچیں گے۔

یہ اصلاح کے تقسیم عمل کا ایک سچا اصول ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے لئے وہ قومیں موزوں ہیں جن کے یہاں تقسیم عمل کے لئے دماغوں اور ہاتھوں کی کمی نہیں ان کے یہاں ایک دماغ صرف نقاد ہوتا ہے جو صرف نکتہ چینی کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ عمارت کی دیواریں اس جگہ کجی ہے۔ پھر دوسری جماعت معماروں کی ہوتی ہے، وہ دیوار کو ڈھا کر از سر نو اٹھاتی ہے مگر مسلمانوں میں اصلی سوال دماغ اور رائے ہی کا نہیں، بلکہ آدمیوں کا ہے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں آدمی نہیں اور آدمی مشینوں میں ڈھل نہیں سکتے، پس ہم کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی پر نظر رکھنی چاہیئے اور اس لئے ہر شخص کو صرف اپنا فرض ہی نہیں دیکھنا چاہیئے، (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

فہرست مضامین

صبح اُمید	مولانا ابوالکلام آزاد	۱
۱۵ دسمبر علی گڑھ میں	"تماشائی"	۲
کشمیر کی عارضی صلح	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع ۔ ح	۴
۲۔ پاکستان	ع ۔ ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع ۔ ل	۶
تابش سہیل	اقبال احمد سہیل	۷
ابھی تو تند ہے طوفاں	خلیل اعظمی	۷
غزل	باقر مہدی	۷
اردو ادب کی رفتار	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۸
روزہ دار	سید تقی حسن نقوی	۹
اندھی بچی (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۱۰
روسی عورت	عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی	۱۱

قیمت فی پرچہ ۳؍

۱۵ - دسمبر

علی گڑھ میں

(۴)

(ایک تماشائی کے قلم سے)

گورنر جنرل کو ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری دی جا چکی، تو مسٹر چانسلر نے کنووکیشن کے ختم ہونے کا اعلان کیا، اور اراکین کورٹ کی طرف سے ایڈریس پیش کرنے کی تقریب شروع ہوئی۔ گذشتہ کم و بیش ۵۰ سال میں اکابر کو بے شمار سپاسنامے دیئے گئے، لیکن یہ ایڈریس مخصوص نوعیت کا تھا، رسمی باتوں کا تذکرہ نہ تھا، لہجہ سائلانہ یا انداز فدویانہ نہ تھا، کسی طرح کی ہائے وائے نہ تھی۔ ضرورتوں یا معذوریوں کی فہرست پیش نہیں کی تھی۔ اپنے حوصلوں اور اپنی ذمہ داریوں کو بتایا تھا۔ لیکن میں پیش بیانی سے بچ کر سپاسنامے کے مختصر اقتباسات دینا چاہتا ہوں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ اپنے آپ کو کس سطح سے پیش کر رہا تھا اور کس سطح پر اس کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔ اقتباسات یہ ہیں:-

"....... ہمیں اپنی ریاست کے شہریوں کو فکر و عمل کی نئی راہوں پر ڈالنا اور ان کی شخصیتوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کے اہل ثابت ہوں گے اور ہم کو ملک کے بہترین عناصر کی تائید حاصل ہوگی۔ ہر قدم پر ہمارے دلوں میں حوصلہ اور ہمارے حوصلوں میں یہ احساس موجزن رہے گا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ملک کی اصلاح و فلاح کے لئے ہے اور اسی میں ہمارے عمل کی اہمیت و عظمت مضمر ہے۔ ملک کی تہذیبی ترقی میں اس ادارہ نے بڑا کام کیا ہے۔ یہ ادارہ آئینہ دار ہے سرسید اور ان کے رفقائے کار کی سرگرمیوں اور منصوبوں کا اور ترجمان ہے اس ترقی پذیر اور ترقی پسند تحریک کا جو "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم ہے۔"

"بانی اعظم نے اس ادارہ کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اس کی غرض و غایت اور مستقبل کے بارے میں بجا طور پر فرمایا تھا کہ آج ہم نے جو بیج بویا ہے کیا معلوم کل وہی ایک تناور درخت ہو جائے جس کی شاخیں برگد کی طرح آہستہ آہستہ زمین کے سینے میں اپنا گھر کریں اور پھر ان کی جڑوں سے نئے اور جاندار پودے نکل آئیں۔ اُمید ہے وہ دن بھی آئے جب یہ کالج یونیورسٹی بن جائے اور اس کے نونہال ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل جائیں اور وطن کے کونے کونے میں بے لاگ تحقیق، وسیع رواداری اور "بے لوث اخلاق" کے پیامبر بن جائیں۔"

"یہ ایک بلند مقصد تھا جو اس درسگاہ کے بانیوں کے پیش نظر تھا۔ لیکن اسے ایک ایسی سوسائٹی میں برگ و بار لانا آسان نہ تھا جو رسوم و قیود کی اسیر ہو چکی تھی اور اپنے تاریخی فریضے یا احساس کو یک قلم بھلا چکی تھی۔ بایں ہمہ علی گڑھ اپنے نصب العین کے لئے جدوجہد کرتا رہا اور بڑی حد تک کامیابی سے دوچار ہوا، لیکن غیر ملکی تسلط اور رجعت پسندی کے ان عوامل نے جو اس تسلط کے ساختہ پرداختہ تھے، جہاں ہمارے ملک کی پوری ادارتی زندگی کو اپنی طرف کھینچا وہاں علی گڑھ بھی ان کی زد میں آیا اور یہ ادارہ ان راستوں پر جا پڑا جو اس کے بانیوں کے بلند نصب العین سے منحرف تھا۔ لیکن علی گڑھ کا "افضل صلح" اپنے بانیوں کی توقعات سے ہم کنار ہونے اور رہنے میں ہمیشہ سرگرم رہا۔ علی گڑھ کو بہت نشیب و فراز سے گذرنا پڑا اور بہت سے خطروں اور نزاکتوں کا سامنا رہا، لیکن ایسے مواقع پر ہمیشہ اس نے اپنے میں ایسی لچک اور دبنے اُبھرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ اس کی کشتی صحیح و سالم ساحل مراد کی طرف چل نکلی۔"

"اگر اس یونیورسٹی کو آج اس آزمائش کا سامنا ہو کہ وہ اپنی قدروں اور اپنے طریق کار پر فراست و تدبر کے ساتھ نظر ثانی کرے تو ہم کو یقین ہے کہ علی گڑھ کی حقیقی روح اپنے آپ کو ایسی تبدیلیوں سے سازگار کر سکے گی جو آزادی کے فرائض اور ذمہ داریوں کا حق ادا کرنے میں معاون ہوں گی، اور اس طور پر ہماری قومی زندگی میں وہ مربوط، ہم آہنگ، حسین اور استعداد آفریں صلاحیتیں راہ پائیں گی جن سے ایک ایسی دنیوی ترقی پذیر جمہوری ریاست کی تشکیل ہوگی جس میں "بے لاگ تحقیق، وسیع رواداری اور بے لوث اخلاق" کا سہ گانہ نصب العین ظہور پائے گا اور برگ و بار لائے گا۔"

"سرسید اعظم جو کچھ کرتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ ان کے بیشتر کاموں کی یہ امتیازی خصوصیت تھی۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مقصد کو وسیلہ مقصد سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بے لاگ تحقیق کی روح کو بیدار کرنا چاہتے تھے، اور ایسی رواداری پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہن بے لوث ہو، اور جہاں شہریت کا شعور بروئے کار ہو اور ایسے اخلاق کی پرورش کرنا چاہتے تھے جو آزاد شخصیت اور روایتی خوبیوں کے سرچشمے سے پھوٹا ہو، وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ ان کا یہ نصب العین اس وقت تک کامیاب نہ ہوگا جب تک کہ ایک ایسا ادارہ قائم نہ کیا جائے جہاں بالارادہ ان مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے۔ سرسید نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کا بچشم خود مطالعہ کیا اور بعض ضروری تبدیلیوں کے ساتھ انگریزی اقامتی نظام تعلیم کے بنیادی عناصر پر اس درسگاہ کی بنیاد رکھی جو آج مسلم یونیورسٹی ہے۔"

"یہ ایک کوشش تھی مشرقی تہذیب اور مغربی علوم و فنون کے بہترین عناصر کے ایک ایسی فضا میں امتزاج کی جہاں شخصیت کی ہمہ جہت پرداخت کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ چنانچہ علی گڑھ نے ایسے نوجوان پیدا کئے جنھوں نے نہ صرف ملک کے نظم و نسق میں نام پیدا کیا بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے نقوش چھوڑے۔ سرسید کی تعلیمی مساعی کی مستقل مشعل راہ ہندو مسلم یکانگت تھی۔ چنانچہ اس درسگاہ کے دروازے شروع ہی سے ہر ملت اور ہر فرقے کے لئے کھلے رہے۔ شاید یور اکسلنسی کو یہ معلوم کر کے مسرت ہو کہ اس درسگاہ کا پہلا گریجوئٹ ایک ہندو نوجوان تھا!"

آگے چل کر عرض کیا گیا تھا کہ:

"ان باتوں کے گوش گذار کرنے سے ہمارا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ یور اکسلنسی ہماری ضروریات سے ہماری قومی حکومت کو آشنا فرمائیں۔ حکومت کے وسائل پر ان دنوں جیسا فشار ہے اس کا ہم کو کامل احساس ہے۔ ہم کو یقین دہانی کی بھی ضرورت نہیں کہ حکومت حتی الوسع علوم و فنون کی ترقی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گی۔ در اصل ہم ایک طور پر اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ جمہوری معاشرے میں یونیورسٹی تعلیم کا جو مقصد ہے اس سے ہم پورے طور پر آگاہ ہیں۔"

"ہمیں اپنے نوجوانوں کی فطری صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب کا سامان فراہم کرنا ہے تاکہ ہمارا ہر شہری ان مختلف النوع فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے جو اس پر عائد ہوں گے۔ ہم کو اس یونیورسٹی نیز ان نوجوانوں کے لئے جو اس کی امانت میں دیئے گئے ہیں اہلیت کا بلند ترین معیار قائم کرنا ہے۔ ہم کو کار زندگی کے مقصد کو شخصیت کے بلند نصب العین سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ انسان با مسرت اور با مقصد زندگی اسی وقت بسر کر سکتا ہے جب وہ ان صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور اس کا اظہار کسی کارنامے کی شکل میں کر سکے جن سے فطرت نے اُسے بہرہ مند کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو اپنے آپ میں ایسا جذبہ بھی پیدا کرنا پڑے گا جو ایسی قدروں کی پرورش و پیروی کر سکے۔ جن کا ان کے ذاتی مفاد سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، ان کی زندگیاں اجتماعی و اخلاقی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بن جائیں اور وہ ... کے درپے نہ ہوں، کمال کے متلاشی بنیں۔"

"تمام تعلیمی اداروں بالخصوص یونیورسٹیوں کے یہ فرائض میں سے ہے کہ وہ نوجوانوں میں اطاعت و ضبط کا شعور پیدا کریں اور اُن کے رگ و پے میں اس عینیت کی روح پیوست کر دیں جو ذی استعداد شہری کو برگزیدہ انسانی مقاصد کا خدمت گذار بناتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر یہ مزید ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جس مذہب اور تہذیب کی نمائندگی سے ممتاز ہے اس کو اسے ہندوستانی شہریت اور جمہوریت میں سمونا اور جلوہ آرا کرنا ہے۔ ہم کو اس کا کامل یقین ہے کہ اس نئے ہندوستان کی تعمیر و تہذیب میں جو انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کا علمبردار ہوگا ہمارا دین کسی تخریبی نقص کا باعث نہیں بلکہ اس سحر آگیں مہم کی تکمیل میں عزم و حوصلہ کا ایک فیضان جاریہ ثابت ہوگا۔"

"ہم یور اکسلنسی کو یقین دلاتے ہیں کہ یونیورسٹی اس شاندار اور شریفانہ مقصد کے لئے دل و جان اور صدق و صفا سے کوشاں رہے گی اور یہ درسگاہ وہ دار العلوم

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ر جنوری ۱۹۴۹ء

کشمیر کی عارضی صلح

صلح کا پیام جو نیا سال کشمیر اور جموں کے چالیس لاکھ باشندوں کے لئے لایا ہے، وہ دراصل ہندو پاکستان کے چالیس کروڑ باشندوں کے لئے زندگی کا پیام ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ دونوں ہمسایہ ملکوں میں دشمنی اور نفرت کی قوتوں کا زور گھٹ گیا ہے، اور ان لوگوں کی بات سنی جانے لگی ہے جو شروع سے اس حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی لڑائی اسپین و چین کی خانہ جنگی کی طرح ایک خوفناک وبا ہے جسے فوراً روک دینا چاہئے ورنہ قوی اور ضعیف، غالب اور مغلوب سب کو ہلاک کر دے اور سارے براعظم کو اجاڑ کر رہے گی۔

ہندوستان میں نفرت کی اندھی قوتوں کو مہاتما گاندھی نے اپنی جان دے کر اور جواہر لال نے اپنی جان کو، اور جان سے بھی زیادہ عزیز شہرت اور ہر دل عزیزی کو خطرے میں ڈال کر شکست دی۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ دسمبر ۱۹۴۸ء اور جنوری ۱۹۴۹ء کے دو مہینوں میں یہ خطرہ یہ اندیشہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں کھلم کھلا بڑے پیمانے پر جنگ چھڑ جائے گی۔ شروع دسمبر ۱۹۴۸ء میں صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کشمیر کی وادی کا بڑا حصہ حملہ آوروں سے خالی کرا چکی تھی، لیکن پھر بھی مخالف فوجیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ جاڑے کے زمانے میں ہندوستان سے کمک اور سامان پہنچنا بہت مشکل تھا۔ مخالفوں کو پاکستان سے ہر قسم کی مدد آسانی سے پہنچ رہی تھی۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ پاکستان کی ایک بڑی فوج حملہ آوروں کے ساتھ مل کر ہندوستانی فوج کی عافیت تنگ کر دے گی۔ بظاہر ہندوستان کے لئے کشمیر میں شکست سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ مغربی پنجاب پر حملہ کر دے تاکہ پاکستان کو اپنے بچاؤ کے لئے کشمیر سے ہٹنا پڑے۔ بعض مصلحت پرست بزدلوں کی رائے تھی کہ ہندوستان کشمیر کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان چھڑا لے۔ بہت سے فرقہ پرست کوتاہ اندیشوں کا اصرار تھا کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے چاہے اس کے ساتھ خود بھی تباہ ہو جائے اور دنیا کی رائے عامہ کو اپنا مخالف بنا لے۔ مگر امن اور جمہوریت کے علم بردار جواہر لال نہرو نے ان دونوں راہوں کو چھوڑ کر تیسری راہ اختیار کی۔ انھوں نے کشمیر کے معاملے کو یو، این، او کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں بھی بڑے خطرے تھے۔ مگر جواہر لال کو اپنے حق بجانب ہونے پر اور انسانیت کی حق پسندی پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ ان خطروں کو برداشت کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان پر جنگ جو فرقہ پرستوں کی طرف سے جن کا اس وقت بڑا زور تھا اس قیامت کی لعن طعن ہوئی کہ دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مگر دھن کے پورے بات کے پکے جواہر لال نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے اس دلیرانہ اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ پاکستان کشمیر میں بڑے پیمانے کی فوجی کارروائی کرنے سے باز رہا اور ہندو پاکستان کی بڑی جنگ ٹل گئی۔ اس کے بعد وسط جنوری میں ایک اور نازک وقت آیا۔ ہندوستان مالی سمجھوتے کے ذریعے سے پچاس کروڑ کی جو رقم پاکستان کو ادا کرنے کا پابند تھا اس کی ادائگی میں تامل کرنے لگا۔ اس وقت پاکستان کی مالی حالت اس قدر ابتر تھی کہ اگر اسے یہ رقم نہ ملتی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یقینی تباہی سے بچنے کی خاطر موہوم کامیابی کی امید میں اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان سے لڑ جائے۔ اس وقت گاندھی جی نے ہند کی عزت اور نیک نامی کی حفاظت اور ہند و پاکستان دونوں کو بڑے پیمانے کی جنگ کے مہلک خطرے سے بچانے کے لئے بھاری حکومت پر اثر ڈال کر پچاس کروڑ کی رقم ادا کرا دی اور اٹھتے ہوئے طوفان کو فرو کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر ہندوستان میں جنگ جو فرقہ پرستوں کے سارے طلسم ہی کو توڑ دیا۔

اس طرح ہندوستان میں نفرت اور دشمنی کی قوتوں کو ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو فیصلہ کن شکست ہو چکی تھی۔ مگر پاکستان میں ان کا زور بدستور تھا اور کسی کو ان کے مقابلہ کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر گیارہ مہینے کے عرصے میں واقعات کی ٹھوس منطق نے پاکستان کے لوگوں پر اچھی طرح ثابت کر دیا کہ جس راہ پر خود ان کے ملک کے مذہبی اور سیاسی مجنوں اور مغربی ملکوں کے سرمایہ دار انھیں چلا رہے ہیں وہ سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرنے لگے جو کشمیر کے مسئلے کو پنچایت کے ذریعے سے پرامن طریقے پر طے کرنے کے حق میں تھے۔ عارضی صلح کا اعلان جو یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو ہوا ہے بجائے خود ایک روح افزا مژدہ ہے لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے اندر پاکستان کی اخلاقی اور روحانی صحت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نفرت، جہالت، ہٹ دھرمی، جنگ جوئی کا زہریلا مادہ کم ہو رہا ہے۔ دانشمندی، مصلحت بینی، صلح جوئی کا صالح عنصر ابھر رہا ہے۔

غالباً ابھی وہاں مرض اور صحت کی قوتوں میں ایک شدید کش مکش ہو گی جن لوگوں نے نفرت کا گیت گا کر لڑائی کا ڈنکا بجا کر قوت و اقتدار حاصل کیا ہے وہ صلح کی جڑ کاٹنے کے لئے ایک بار جان توڑ کر کوشش کریں گے لیکن اگر پاکستان کے صلح پسند لیڈروں نے ہمت اور استقلال سے کام لیا تو خدا ان کی مدد کرے گا۔ پاکستان کے عوام آخر میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ ان کوتہ اندیش کور باطن، خود پرستوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوں گے اور ایک دن وہ سچی ہر دل عزیزی حاصل کریں گے جو ان بدنصیبوں کو کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی ہو گی۔

بزم بے تکلف

ہمارے خطیب صاحب باتیں کرنے کے قائل نہیں۔ جلوت و خلوت میں مستی و ہوشیاری میں، خواب و بیداری میں ہمیشہ تقریر فرماتے رہتے ہیں۔ بات اور تقریر میں جو فرق ہے وہ آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے اور اگر نہ جانتے ہوں تو کسی پاکستانی قائد یا ہندوستانی نیتا کے پاس چلے جائیے اور کہئے "مہ سے مجھے بتا دیجئے"۔ مختصر یہ کہ بات کی جاتی ہے، تقریر چھانٹی جاتی ہے۔ بات کا سر پیر ہوتا ہے، تقریر کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر، بس دھڑ سے لڑھکتی چلی جاتی ہے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے، تقریر میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔ بات اپنے پیٹ میں نہیں پچتی، تقریر دوسرے کو ہضم نہیں ہوتی۔

آپ لاکھ چاہیں کہ خطیب صاحب کو تقریر کا موقع نہ دیں، ایسا موضوع چھیڑیں جس میں پھیلنے کی گنجائش نہ ہو، مگر وہ پھیل ہی پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ حضرت موسیٰ کے پیرو ہیں جن سے اللہ میاں نے صرف اتنی بات پوچھی تھی کہ موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے" حضرت بجائے اس کے کہ عصا کا نام لے کر چپ ہو رہتے لگے "عصائیات" پر تقریر کرنے۔ آپ کی خطیب صاحب سے پہلی ملاقات ہو اور آپ انجان بن کر پوچھیں "آپ کا اسم شریف؟" کوئی دوسرا ہو تو اپنا نام اور ولدیت یا زیادہ سے زیادہ ولدیت کی ولدیت بتا کر بس کرے مگر ہمارے خطیب صاحب فرمائیں گے "جی کیا عرض کروں عرف میں تو میں خطیب کہلاتا ہوں مگر والدین کا رکھا ہوا نام نہیں ملیر علمی کا بخشا ہوا لقب ہے، وہاں عجیب دستور ہے کہ لوگوں کو خصوصاً دلچسپ لوگوں کو ان کے اصلی نام سے نہیں پکارتے، بلکہ کسی صفت کی بنا پر جو ان میں واقعی موجود ہو یا محض ازراہ مخول اس کی طرف منسوب کی جاتی ہو اس کو ایک لقب سے ملقب کر دیتے ہیں اور ہمیشہ اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ اصلی نام قلت استعمال سے متروک اور رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر کہاں تک مناسب ہے۔ آخر نام رکھنے کی علت غائی کیا ہے .... اللہ میاں کی طرح آپ کو بھی خلاقاً ساری تقریر سننی پڑتی ہے بلکہ آپ کے لئے تو اور مشکل ہے کہ جب مقرر سے آنکھیں چار ہو جائیں تو سنجیدگی سے سر بھی ہلانا پڑتا ہے۔ جب خطیب صاحب کا پہلا خطبہ ختم ہو چکتا ہے تو آپ ڈرتے ڈرتے دوسرا سوال کرتے ہیں "دولت خانہ" بظاہر اس کا جواب کسی طرح ایک خانے سے زیادہ نہیں ہو سکتا مگر خطیب صاحب پوری بساط کھول دیتے ہیں "ارے صاحب آپ نے بھی کیا بات پوچھی ؎

گھر بار سے کیا فقیر کو کام
کیا لیجے چھوڑے گاؤں کا نام

دراصل میرے بزرگ اکبر اعظم کے زمانے میں حکیم ابوالفتح شیرازی کی تحریک پر نیشاپور سے ترک وطن کر کے ہندوستان روانہ ہوئے .... آپ کا دم سوکھ جاتا ہے کہ الٰہی خیر خدا جانے مبتدا سے خبر تک کن کن منزلوں سے گزرنا پڑے۔ جب خطیب صاحب نیشاپور سے آگرے کی مسافت زمانی اور اکبر اعظم کے عہد سے (بقیہ صفحہ ۴ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

بمبئی کے ہردل عزیز لیڈر، بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبدالحمد بریلوی اتوار ۹ جنوری کو رات کے پونے ۹ بجے قلب کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کر گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ دل کی بیماری انھیں ۱۹۴۲ء سے شروع ہوئی۔ پچھلے سال کے وسط میں بہت شدید دورہ ہوا تھا، مگر یورپ سے واپسی کے بعد بظاہر ان کی صحت سنبھل گئی تھی اور وہ حسب معمول اپنی گوناگوں خدمات نہایت محنت اور انہماک سے انجام دے رہے تھے۔ ۸ جنوری کی رات تک بالکل اچھے تھے۔ ۹ کی صبح کو یکایک قلب کا دورہ پڑا۔ شام کو ۷ بجے گورنر جنرل کی پریس کانفرنس میں وہ خود شریک نہیں ہو سکے مگر ان کا لکھا ہوا خیر مقدم کا خطبہ ان کی طرف سے پڑھا گیا۔ اس کے پونے دو گھنٹے بعد اس دنیا کو خیرباد کہہ کر عالم آخرت کو سدھار گئے۔

۱۰ جنوری کی صبح کو زینت منزل کی سامنے صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور بمبئی کے وزیر اعظم تو مرحوم کے عزیزوں کو پرسہ دے کر چلے گئے مگر دوسرے وزرا، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور بمبئی کے ہر طبقے اور ہر حلقے کے ممتاز لوگ، ہر سیاسی پارٹی، ہر پبلک ادارے کے نمائندے جو اپنے محبوب شہری کا آخری دیدار کرنے کو آئے تھے آخر تک ٹھہرے رہے اور جنازے کے ساتھ قبرستان کو گئے۔ جنازے کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔ آگے آگے سیوادل کے والنٹیر، اس کے پیچھے محبت اور عقیدت کے پھولوں سے لدا ہوا تابوت اور پھر عزاداروں کا مجمع جس میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سکھ کندھے سے کندھا ملائے جا رہے تھے۔ کوئی اجنبی دیکھتا تو سمجھتا کہ اگر یہ بادشاہ کا نہیں تو کم سے کم وزیر سلطنت کا جنازہ ہے لیکن وہ میت ایک غریب جرنلسٹ کی تھی جس کے پاس نہ قوت و اقتدار تھا نہ مال و دولت، نہ جاہ و حشم، نہ کچھ ایسا علم و فضل بس ایک دل تھا نرم، رقیق، حلیم، شریف، درد آشنا، محبت بھرا دل، اور ایک قلم تھا سچا، کھرا، متین، محتاط، معتدل، متوازن قلم۔ اسی دل اور قلم کی طاقت سے اُس نے اپنے شہر اور اپنے ملک کو مسخر کر لیا تھا۔

خلقش بہ اتفاق متانت جہاں گرفت

خدا اس صاحب دل اور صاحب قلم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اس کے بال بچوں، عزیزوں کو اور ان دوستوں کو جو اسے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے صبر جمیل عطا فرمائے۔

کیا اتحاد مشرق کی بنیاد پڑ رہی ہے؟

فروری ۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی کوشش سے نئی دہلی میں پہلی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، مگر اس کا مقصد تہذیبی، معاشرتی اور کسی حد تک معاشی تھا۔ اس وقت تک یہ خیال نہ تھا کہ ایشیائی ملکوں کا کوئی سیاسی جتھا الگ بنا دیا جائے۔ لیکن جب انڈونیشیا میں ولندیزیوں نے بڑی دیدہ دلیری سے جمہوری حکومت کو کچل کر رکھ دیا اور اقوام متحدہ کی انجمن سوائے رزولیوشن پاس کرنے اور کاغذی گھوڑے دوڑانے کے کچھ نہ کر سکی تو ایشیا کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں اس کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے نمائندے مل کر بیٹھیں اور اپنی آزادی اور سلامتی کی تدبیریں سوچیں۔ ہندوستان نے پنڈت نہرو کی رہنمائی میں پھر پیش قدمی کی اور مشرقی ملکوں کی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا، جو ۲۰ جنوری سے نئی دہلی میں شروع ہوگی اس میں قریب قریب تمام ایشیائی ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کا وعدہ کیا ہے صرف تھائی لینڈ (سیام) کے مارشل سونگگرام کو یہ ڈر ہے کہ کہیں مغربی طاقتیں خفا نہ ہو جائیں کانفرنس میں شریک ہونے میں تامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کانفرنس کی وجہ سے یو، این، او کی قوت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہندوستان کی حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جا چکا ہے کہ ابھی تک اقوام متحدہ کے توسط کے بغیر کوئی عملی کارروائی کرنے کی تجویز پیش نظر نہیں ہے۔ دراصل اس کانفرنس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ انڈونیشیا کے جمہور اور ان کی جمہوری حکومت کا گلا گھونٹنے کی وجہ سے سارے ایشیا میں غم و غصے کا ایک طوفان اُٹھ رہا ہے اگر اس سے بھی یو، این، او کی رگ حمیت حرکت میں آئے۔ اس کے ٹھنڈے خون میں کچھ گرمی پیدا ہو، اور وہ ہالینڈ پر سیاسی اور معاشی دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہے تو ظاہر ہے کہ اہل ایشیا کے اس جوش و خروش سے اسے اور تقویت پہنچے گی۔ لیکن اگر اس نے دنیا کی نصف آبادی کے شدید اور گہرے جذبات کی کچھ پروا نہ کی اور اسی طرح ہالینڈ کو ڈھیل دیتی رہی تو یقیناً ایشیائی قوموں کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو چاہے وہ تھوڑی ہو یا بہت منظم کر کے اپنا ایک الگ سیاسی جتھا بنائیں اور اپنے آپ کو مغرب کی سامراجی قوتوں کے پنجۂ غضب سے بچانے کے لئے جان توڑ کر کوشش کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ایشیائی قوموں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ان کا ایک ہم آہنگ سیاسی جتھا بننا بہت مشکل ہے، اور اگر بن بھی جائے تو کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ہوگا، لیکن اگر یو، این، او کی یہی نیاز مندی یا بے بسی کا یہی حال رہا تو ایک نہ ایک دن یہ ہو کر رہے گا۔

انتخاب یا انقلاب؟

آئین ساز اسمبلی مجوزہ ریپبلک کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، مجلس وزرا، مرکز کے اور صوبوں کے ایوان زیریں اور ایوان بالا کے انتخابات کے متعلق کل دفعات کو منظور کرنے کے بعد ۸ جنوری سے ملتوی ہو گئی۔ فروری اور مارچ میں اس کا اجلاس قانون ساز مجلس کی حیثیت سے ہوگا، جس میں وہ ۱۹۴۹ء کے بجٹ پر اور مختلف قوانین کے مسودوں پر غور کرے گی۔ آئین سازی کے کام کے لئے اس کا آخری اجلاس ۱۵ مئی ۱۹۴۹ء سے شروع ہوگا۔ اُمید پرور لوگ کہتے ہیں کہ اسمبلی ۱۵ اگست تک آئین کے مسودے پر بحث ختم کرے گی اور آزادی کی دوسری سال گرہ کے دن ہندوستان کا نیا آئین مکمل ہو جائے گا، لیکن ہم جیسے شکی آدمیوں کو یقین نہیں آتا۔ ابھی تک آئین کی دفعات میں سے ۱۰۲ منظور ہوئی ہیں اور ۲۰۳ باقی ہیں جن میں سے بعض پر معرکے کی بحثیں ہونے کا قوی امکان ہے۔ بھلا یہ قیل و قال تین مہینے کے اندر ختم ہو سکتی ہے، لیکن کچھ بھی ہو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ نئے انتخابات آئندہ سال ضرور ہوں گے اور ۱۹۵۰ء کی کسی نہ کسی تاریخ کو ہندوستان کی نئی بااقتدار ریپبلک قائم ہو جائے گی۔ چونکہ آئین کا وہ حصہ جو انتخابات سے تعلق رکھتا ہے منظور ہو چکا ہے اس لئے اسمبلی نے ایک رزولیوشن کے ذریعے سے مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستیں تیار کرنے کا کام شروع کر دیا جائے اور نئے انتخابات ۱۹۵۰ء میں جتنے سویرے ہو سکے کر لئے جائیں۔

اب ذرا یہ سوچئے کہ آنے والے انتخابات اپنے اندر کتنے انقلابی امکانات رکھتے ہیں۔ اب تک جن لوگوں کو صوبوں کے انتخابات میں رائے دینے کا حق ہے ان کی تعداد لگ بھگ پونے دو کروڑ ہے۔ اب ہر عاقل، بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا یعنی تقریباً اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ووٹروں کی تعداد دس گنی سے زیادہ ہو جائے گی۔ کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ یہ سولہ سترہ کروڑ ووٹر کس پارٹی کو ووٹ دیں گے۔ بے شک قیاس یہی کہتا ہے کہ باوجود ان شکایتوں کے جو عوام کو کانگریسی حکومت سے پیدا ہو گئی ہیں گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور دوسرے محترم لیڈروں کے نام کی کشش سے کانگریس اب بھی بہت سے ووٹ کھینچ لے جائے گی۔ ہمیں ناموں کی تاثیر سے انکار نہیں۔ لیکن حقائق و واقعات کی تاثیر کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جو قیامت کی گرانی آج کل ہے وہ ہر طبقے والے ووٹر کی زندگی پر اثر ڈال رہی ہے اور بعض کے لئے تو سوہان روح بن گئی ہے۔ لوگ عام طور پر کانگریسی حکومت کو کسی نہ کسی حد تک قصوروار سمجھتے ہیں کہ اس نے گرانی کو دور کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار نہیں کی۔ اس کے علاوہ کانگریس کے بعض کارکن اور لیڈر اپنی مذموم حرکتوں کی وجہ سے اپنی ساکھ کھو چکے ہیں اگر کانگریس آنے والے انتخابات میں یقینی کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کی حکومتوں کو گرانی اور بے روزگاری دور کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہیے اور اس کے پارلیمنٹری بورڈ کو اپنے اُمیدواروں کو چھانٹنے میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے کسی ایک فرقہ پرست یا بد دیانت یا بدچلن آدمی کو کانگریس کا ٹکٹ نہیں دینا چاہیے۔

بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۳)

قاسم رضوی کے عہد کا فصل زمانی طے کر کے اپنے موجودہ وطن تک پہنچے ہیں تو آپ میں کوئی اور سوال کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی اور آپ حیدرآباد والوں کی طرح "حاضر ہوتا ہوں" کہہ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر یہ تو سوچئے کہ جب خطیب صاحب کا خطبۂ نکاح پڑھا گیا ہوگا اور قاضی نے ان سے پوچھا ہوگا "مسماۃ ——— بنت ——— کو بہ عوض ۴ ذرہ مہر سکۂ رائج الوقت آپ کے عقد میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو منظور ہے؟" تو انھوں نے کیا جواب دیا ہوگا!

۲۔ پاکستان

التوائے جنگ کا خیر مقدم

کشمیر کی جنگ کے التوا کا، پاکستان کے اخبارات نے عام طور پر خیر مقدم کیا ہے بعض اخبارات نے دبے لفظوں میں حکومت پاکستان پر تنقید کی ہے کہ اگر انھی شرطوں پر آج جنگ بند کرنے کا اعلان کیا گیا ہے صلح کرنی تھی تو اس سے بہت پہلے یہ صلح ہو جانی چاہیئے تھی۔ بعض نے حکومت ہند کی نیت پر شبہہ ظاہر کیا ہے، لیکن بیشتر اخبارات نے اس پر اطمینان اور خوشی ظاہر کی ہے۔ پاکستان ٹائمز نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کشمیر کی جنگ سے ہندوستان و پاکستان دونوں پر اقتصادی حیثیت سے بہت بڑا بوجھ تھا اور سیاسی نقطۂ نظر سے دونوں کے تعلقات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جاتے تھے، اس لئے لازمی طور پر اس خبر سے دونوں ملکوں کے عوام کو خوشی اور اطمینان محسوس ہوا ہے۔" راولپنڈی کے ایک ہفتہ وار اخبار "بسنت" نے لکھا ہے:۔

"آخر وہ مبارک ساعت آپہنچی جبکہ ہندوستان اور پاکستان نے کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے پرامن وسائل اختیار کرکے ...... کشمیر میں لڑائی بند کردی ...

جنگ بند ہونے کی خبر سے دونوں ملکوں کے عوام کو بے پایاں خوشی ہوئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان الہ آباد کے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کررہے تھے کہ آپ نے عوام کو کشمیر میں جنگ بند کرنے کی خبر سے مطلع کیا تو حاضرین نے بے پناہ خوشی کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان میں بھی لڑائی بند ہونے کی خبر کو لوگوں نے خوشی سے سنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی بعینہ ایسی ہی جیسے دو سگے بھائی دست و گریباں ہو جائیں جو کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں۔"

روزنامہ مغربی پاکستان لکھتا ہے:۔

"ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کے حکم کا انتظار کئے بغیر باہمی رضامندی سے محاذ کشمیر پر کی تمام جنگی سرگرمیاں بند کر دیں، کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ کشمیر کمیشن یا حفاظتی کونسل نے اس مسئلہ کو مصالحانہ طریقے سے حل کرنے کے سلسلے جو تجاویز وضع کی ہیں وہ منصفانہ ہیں اور فریقین انھیں آبرومندانہ طریق پر قبول کرسکتے ہیں۔ جہاں تک جنگی سرگرمیوں کے تعطل یعنی جنگ بند کر دینے کا تعلق ہے دنیا بھر میں اس خبر کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور کون ہے جو جنگ و جدال کی نمائش کو برا کہنے کے لئے تیار ہو۔"

اس اخبار نے آگے چل کر لکھا ہے

"اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنڈت جواہر لال نہرو، یو، این، او کے حلقوں سے اپنے اہم مطالبات منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ پاکستان کو اپنی فوجیں باہر نکالنی پڑیں گی اور غیر ریاستی مجاہدین کو بھی ترغیب دینی ہو گی کہ وہ محاذ جنگ سے پیچھے ہٹ آئیں۔ لیکن ہندوستانی فوجوں کی ایک معین تعداد آخر دم تک ریاست میں موجود رہے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے مدبر یو، این، او کے حلقوں کو اس بات کا قائل نہیں بنا سکے کہ ریاست کے اندر ہندوستانی فوج اور ہندوستانی عناصر کی موجودگی بھی اسی طرح غیر آئینی ہے جس طرح پاکستان کی افواج اور غیر ریاستی مجاہدین کی موجودگی کو غیر آئینی سمجھا جارہا ہے ...... متعلقہ حلقوں کی طرف سے اس مطلب کی توقعات ظاہر کی جارہی ہیں کہ کشمیر کی جنگ کا تعطل ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو خوش گوار سے خوش گوار تر بنانے کے لئے سازگار فضا پیدا کردے گا۔ ان توقعات کی کامیابی بہت کچھ اس نیت پر موقوف ہے جس کے ساتھ دونوں حکومتوں کے مدبر تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ساعی ہوں گے۔"

مشرقی بنگال میں انتقال اراضی

پچھلے سال کے شروع میں مشرقی بنگال کی اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ ہے کہ ایک خاص حد سے اوپر حقیقی "خاص" زمینیں ہیں۔ ان کو سرکاری طور پر حاصل کرکے کھیت مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں میں تقسیم کر دیا جائے جب بڑے بڑے زمینداروں کو یقین ہو گیا کہ خاص زمینوں کا کافی حصہ ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا تو انھوں نے مقررہ حد سے اوپر کی زمینیں فروخت کرنی شروع کردیں۔ یہ زمین وہ لوگ خریدنے لگے جن کے پاس تجارت اور دیگر ذرائع سے کافی روپے آتے ہیں یا وہ لوگ جن کی خاص زمینیں مقررہ حد سے کم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس وقت مجوزہ قانون منظور ہو کر نفاذ میں آئے گا اس وقت زرعی مزدور اور کم زمین والے کسانوں میں تقسیم کرنے کے لئے حکومت کے پاس تقسیم کے لئے بہت کم زمین ہو گی۔ گورنر مشرقی بنگال نے اب کہیں جا کر یعنی ۱۴ر دسمبر سے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے جس کی رو سے "خاص" زمینوں کی خرید و فروخت روک دی گئی ہے لیکن اس سے پہلے کافی زمینیں فروخت کی جا چکی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ایک اور آرڈیننس کے ذریعے ان تمام زمینوں کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے دے جو پچھلے آٹھ نو ماہ میں بیچی گئی ہیں۔ ان زمینوں پر صرف کھیت مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں کا حق ہے۔

بڑے بڑے زمینداروں نے حکومت کی مجوزہ اسکیم کو ناکام بنانے کے لئے اپنی خاص زمینیں فروخت کر دی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان کے خلاف اقدام کرنے اور اس قسم کی تمام فروختوں کو ناجائز قرار دے دے۔ ورنہ وہ کھیت مزدور اور کم زمین والے کسانوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

تعلیم سے بے التفاتی

کسی ملک کی تعمیر کے لئے سب سے ضروری چیز اس کی آیندہ نسلوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ پاکستان کی بنیاد ایک نئے عقیدے اور نئے اصول کار پر رکھی گئی تھی۔ ضرورت تھی کہ اس عقیدے اور ان اصولوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے دل و دماغ میں سمونے کی کوشش کی جاتی تاکہ نئی قوم وجود میں آسکتی، اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک نئی مملکت بن سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے:۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن بدقسمتی سے اب تک ہمارے کارفرماؤں نے پاکستان کی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ بس ایک آدھ کانفرنس ہو گئی ہے جس میں ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کوئی واضح پالیسی معین نہیں کی گئی اور نہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اہل پاکستان کی آنے والی نسلوں کی ذہنی تربیت کن طریقوں پر کی جائے گی۔

اور تو اور تعلیمی مسائل کی طرف لوگوں کی عام دلچسپی بھی نہیں بڑھی، اور نہ اس سلسلے میں ذمہ دار اشخاص نے کوئی خاص کوشش ہی کی ہے؛ بلکہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پہلے سے حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور تعلیم کے مسئلے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جارہی ہے کراچی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہاں تعلیمی درس گاہوں کو تجارتی کاروبار کی طرح چلایا جارہا ہے، اور روپے والے نفع کی خاطر ان میں روپیہ لگاتے اور ان سے نفع کماتے ہیں اور حکومت کا یہ حال ہے کہ تمام سندھ میں صرف ایک ہی ٹریننگ کالج ہے اور اس میں طلبہ کی تعداد اتنی ہے کہ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

سنا ہے پشاور کا ٹریننگ کالج اس لئے توڑ دیا گیا ہے کہ وہاں ٹریننگ حاصل کرنے والے لڑکے نہیں تھے، اور مزید بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ قوم کے نوجوان تعلیم کی طرف زیادہ راغب نہیں ہیں اور اس معزز پیشے میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہی۔

جس ملک میں تعلیم کا یہ حال ہو، اور نوجوان معلمی کو اپنی شان سے گرا ہوا پیشہ سمجھتے ہوں، وہ ملک ترقی کرچکا۔ اور ان کی آیندہ نسلیں سنور چکیں۔ آج پاکستان کو سب سے زیادہ زور تعلیم پر دینا چاہیے بلکہ سچ پوچھیے تو پاکستان کے بقا کا سارا دارومدار صحیح تعلیم پر ہے۔ تعلیم ہی وہ اساس ہے جس پر کسی ملک کی عمارت کو کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ہمارے کارفرماؤں نے تعلیم کے ساتھ اس طرح بے اعتنائی برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان ہمیشہ ایک پس ماندہ ملک رہے گا اور ہم مہذب اور ترقی یافتہ قوموں میں حقارت کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

ہفت روزہ آفاق، لاہور

مجلس قانون ساز کا التوا

پاکستان پارلیمنٹ کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گیا۔ اس مختصر سی مدت میں اس نے کئی اہم بل منظور کئے۔ ان میں کراچی میں مکانات کی راشن بندی اور چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے انسداد کے بل پر کافی گرما گرم مباحثے ہوئے۔ ایک بل کے ذریعے قانون کی توسیع و ترقی کا انتظام مرکزی حکومت کے سپرد کر دیا گیا اور فنانس کارپوریشن کے قیام کا بل اور اسٹیٹ ڈیوٹی بل سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دئے گئے۔

کراچی میں مکانات کی راشن بندی سے شہر کے ہر باشندے کو دلچسپی ہے اور اس کی طرف کراچی کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر ہاشم رضا کئی ماہ قبل مبہم سا اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ ابہام اب بھی قائم ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ

بقیہ صفحہ ۴۲

۳- باہر کی دنیا

مشرق وسطیٰ پر لڑائی کے بادل

فلسطین کے جنوبی علاقہ نغیب میں، مصری اور اسرائیلی حکومتوں میں عارضی صلح ہو جانے سے توقع پیدا ہوئی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ شاید اب صلح و آشتی سے حل ہو جائے، مگر برطانیہ کے پانچ ہوائی جہازوں کو اسرائیلی حکومت نے گرا کر امن عالم کے لئے ایک نیا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ برطانوی فوجیں حرکت میں آ چکی ہیں، اور فلسطین کی سرحد سے قریب شرق اردن کی بندرگاہ عقبہ میں ان کی لامعلوم تعداد موجود ہے، اور اسرائیلی علاقوں سے برطانوی باشندے منتقل کئے جا رہے ہیں۔ تل ابیب کی ایک اطلاع ہے کہ روس نے اسرائیلی حکومت کو فوجی امداد کی پیش کش کی ہے۔ غرض ایک بڑی جنگ کے تمام اسباب مہیا ہو گئے ہیں۔ اگر سیکورٹی کونسل نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی فوری قدم نہ اٹھایا تو برطانیہ اور اسرائیل کے یہ اختلافات دور رس نتائج کے باعث ہوں گے۔

وفد پارٹی حکومت میں شریک ہوگی

مصر کی بڑھتی ہوئی دہشت پسندی اور فلسطین کی نئی صورت حال نے مصر کے رہنماؤں کو مجبور کیا کہ وہ آپس کے سیاسی اختلافات دور کر کے مصر میں مضبوط حکومت بنائیں۔ مصر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت وفد پارٹی لگ بھگ پانچ سال سے وزارت میں شریک نہیں ہے اس نے بعض شرائط کے ساتھ حکومت میں شرکت کا وعدہ کر لیا ہے۔

وفد پارٹی کی مصر میں مقبولیت کے لحاظ سے تقریباً وہی حیثیت ہے جو کانگریس کی ہندوستان میں ہے۔ مصر کو جو کچھ بھی آزادی نصیب ہوئی ہے اس کے حصول میں وفد پارٹی کے رہنماؤں کا نمایاں اور ممتاز حصہ ہے۔ وفد پارٹی مصر کی سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے بڑی عوامی جماعت ہے۔ اس کی شرکت کے بعد توقع ہے کہ مصر کی حکومت میں نئی جان اور نئی امنگ پیدا ہو جائے گی اور دہشت پسند عناصر کو دبا کر جہاں اندرونی امن وامان کے قیام میں سہولت پیدا ہوگی وہاں بین الاقوامی سیاست میں بھی ترقی پسندی کو راہ ملے گی۔ مشترک حکومت ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس کی امید بہت کم ہے کہ وفد پارٹی کو اپنے ارادوں میں پوری پوری کامیابی ہوگی اور اس نے مصری قوم سے اب تک جو وعدے کئے ہیں انھیں پورا کر سکے گی۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کے رہنما نحاس پاشا کے تعاون سے مصر کو بہت کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ امید ہے کہ نحاس پاشا نے جس طرح لڑائی کے زمانے میں مصر کی کشتی کی ناخدائی کی تھی اسی طرح آج بھی جب کہ مصر کی کشتی طوفانی موجوں میں گھری ہوئی ہے، ساحل مراد تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے۔

سرخ چین کی خارجی پالیسی

چیانگ کائی شیک مصالحت کے لئے کئی مرتبہ خواہش ظاہر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ملک اور قوم کے مفاد کی خاطر، اس نے جلاوطنی "تیاگ" کے لئے بھی تیار ہو گئے ہیں، مگر کمیونسٹ ہیں کہ ان کی ان "قربانیوں" سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے اور برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ جنرل سیمو اب بوریا بستر باندھ کر فارموسا بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ نیشنلسٹ حلقوں کو موہوم سی امید ہے کہ ان کے چلے جانے کے بعد وزیر اعظم سن فو کو شاید سمجھوتے کی کوششوں میں کامیابی ہو۔ حالانکہ کمیونسٹ ریڈیو نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ انقلاب کو کامیابی نصیب ہو رہی ہے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنا چینی عوام کو دھوکہ دینا ہے اور چین کے رجعت پسندوں اور امریکہ کے سامراج پرستوں کو تقویت پہنچانا ہے۔ ظاہر ہے اس جواب کے بعد مصالحت کی امید کرنا حد سے زیادہ سادہ لوحی ہے۔

چنانچہ سیاسی حلقوں میں یہ فرض کر کے کہ سمجھوتہ کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا چین کی سیاست کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جا رہا ہے کہ کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں کے سیاسی رجحانات کس قسم کے ہوں گے؟ آیا نئی حکومت مکمل طور پر روس کے اثر میں ہوگی یا مارشل ٹیٹو کی حکومت کی طرح، چین کے قومی مفاد کو سامنے رکھ کر آزاد پالیسی پر کاربند ہوگی۔

بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ چینی کمیونسٹ کومن فارم کے زیر اثر ہیں اور شمال یا منچوریا کا گروپ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے، روس کی قیادت اور پالیسی کے ماتحت ہوگا مگر کچھ بین اقوامی سیاست کے جانکار ایسے بھی ہیں جو اس خیال سے متفق نہیں ہیں ان کا کہنا ہے کہ چین کے قومی مسائل کمیونسٹوں کو مجبور کریں گے کہ وہ روسی رہنمائی سے انکار کر کے، مشرق بعید کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ وہ اس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ چین میں کمیونسٹ پارٹی کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر عوام کی بھاری اکثریت کمیونزم کے اصولوں اور نظریوں سے ناواقف ہے۔ اسے روس سے بھی کوئی گہری عقیدت نہیں انھوں نے کومن تانگ کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت، حکومت کی نااہلی چور بازاری کی کثرت اور گرانی کی زیادتی سے اکتا کر کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دیا ہے اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ روس کی ماتحتی بھی قبول کر لیں۔ نیز کمیونسٹوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جس طرح بیرونی سرمایہ کی حفاظت کی ہے اس کے پیش نظر بھی یہ خیال بعید از قیاس نہیں کہ سرخ چین اپنی قومی اور بین اقوامی سیاست میں آزاد پالیسی پر کاربند ہوگا۔

پاکستان

بسلسلہ صفحہ ۵

راشن بندی کس اصول کے تحت ہوگی، نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں راشن بندی سے ہمدردی کے ساتھ ہی خوف بھی پایا جاتا ہے، لیکن بڑے بڑے فلیٹ اور حویلیوں کے رہنے والوں میں خوف کا یہ منظر خاص طور پر قابل دید ہے لیکن سچ پوچھئے تو دولت مندوں کا یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے۔ انھوں نے جس طرح پگڑیاں دے دے کر مکانوں پر قبضہ کیا ہے اسی طرح وہ حکومت کراچی کی بد انتظامی اور اس کے عملے کی خود غرضی اور رشوت پرستی سے فائدہ اٹھا کر ان پر بلا شرکت غیرے قابض بھی رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نئے قانون سے اگر کسی پر ضرب پڑے گی تو وہ دوسرے ہی ہوں گے۔

پاکستان کی مجلس قانون ساز کے اجلاس کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ پہلے اجلاس کے بعد کسی اجلاس میں تمام ممبروں نے شرکت نہیں کی اور بعض اوقات تو ۳۰، ۲۵ سے زیادہ حضرات تشریف لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے نمائندے مجلس قانون ساز اور مجلس دستور ساز کے اجلاس کو سیر و تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، نہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور نہ ملکی اصلاح سے ان کو دلچسپی ہے۔ (آفاق لاہور)

تابشِ سہیل

اقبال احمد سہیل

ہوا کن کے پرتوِ عارض سے اب یہ حالِ نظر
کہ وہ بھی محو ہوئے دیکھ کر جمالِ نظر

نظر ہی رہ نہ گئی کیا ہو احتمالِ نظر
وہ خود سما گئے آنکھوں میں اب مثالِ نظر

وہ حسن ہے ہمہ تن آپ ہی سوالِ نظر
یہیں تو عشق کہاں اور کہاں مجالِ نظر

بس اک نظر نے یہ ساری قیامتیں ڈھا دیں
نظر کو ہائے اب آیا نظر مآلِ نظر

ہے ایک ذرۂ ناچیز بھی ور آغوش
کمالِ جلوہ کہوں اس کو یا کمالِ نظر

تمھارے جلوۂ رنگیں کی سب ہیں تعبیریں
بہارِ جاں، چمنِ آرزو، جمالِ نظر

ستم یہ اور ستم حسن کی پشیمانی
نظر نے بڑھ کے جگر دوز انفعالِ نظر

مجھے تو دہر کی ہر شے حسیں نظر آئی
عمیمِ حسن ہے یا پرتوِ جمالِ نظر

دیارِ حسن میں لفظوں کا انتظار ہے جرم
یہاں تو فرضِ محبت ہے امتثالِ نظر

وہ میری عرضِ تمنا پہ چینِ پیشانی
وہ میرے شکوۂ ہجراں پہ انفعالِ نظر

وہ اس جبیں کے تبسم پہ بیقراریِ شوق
وہ اس نگہ کے ترنم پہ وجد و حالِ نظر

حریمِ راز کا ہر گوشہ چھان ڈالا ہے
جنونِ شوق میں اللہ رے کمالِ نظر

بس اک نگاہ کے بعد آج تک یہ عالم ہے
نظر تو کیا کبھی آیا نہیں خیالِ نظر

تمھارے خاک نشینوں کی شان کیا کہنا
فلک بھی کانپ اٹھے دیکھ کر جلالِ نظر

حیا کے ساتھ ہو شوخی، ادب کے ساتھ ہو شوق
کمالِ حسن و محبت ہے اعتدالِ نظر

انھیں کا فیضِ نظر ہے سرور میں غم میں
کہیں جمالِ نظر ہے کہیں جلالِ نظر

حجابِ قدس تک اب تو ترا گذر ہی سہیل
خدا نظر سے بچائے یہ زورِ بالِ نظر

ابھی تو تندیِ طوفاں

خلیل الرحمٰن اعظمی

ابھی غموں میں نمایاں ہے زندگی کا فریب
ابھی تو راہ میں حائل ہے ایک پردۂ رنگ
مگر یہ منزلِ جاناں، ہوائے وادیِ شوق
سکوت میں ہے لیے آج اک نیا آہنگ

دھندلکوں کی گود میں سوتا ہے اب بھی رقصِ شباب
ہوس نے سازِ جوانی پہ گیت گائے ہیں
دعائے نیم شبی، یہ طلسم آہوں کا
ابھی تو ذہن پہ تاریکیوں کے سائے ہیں

فروغِ حسن، یہ صہبائے آتشیں کا گداز
ضیائے ماہ میں اب بھی نزولِ شبنم ہے
اگرچہ بدلی ہے گیسوؤں کی آرائش
مگر ابھی تو مری کائنات برہم ہے

مسرتوں کو نیا آئینہ دکھانا ہے
ابھی جہاں میں لہو کے چراغ جلنے دو
ان آنسوؤں ہی سے نکھرے گی شاہراہِ حیات
ابھی تو تند ہے طوفاں مجھے سنبھلنے دو

غزل

باقر مہدی

میکدے پر خون برساتی گھٹائیں چھا گئیں
زندگانی کی بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

درد و غم بھولے [illegible] شام و سحر [illegible]
آج تیرے غمگساروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

کوئی شمعِ نو تمنا کے [illegible] کیا [illegible]
حسن کے رنگیں شراروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

کوئی طوفاں بھی نہیں، کوئی تلاطم بھی نہیں
اپنے شوریدہ کناروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

اک خلا ہی اور ہجومِ یاس کا عالم بھی ہے
اب جنوں کے ریگزاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

عشق کی پلکوں پہ خونِ دل لرزتا ہے ابھی
ٹوٹنے والے ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

اُردو ادب کی رفتار

جون تا ستمبر ۱۹۴۸ء

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

نقاد کا ایک قدم ادیب کے حجرے کے اندر ہوتا ہے، تو دوسرا اس کے باہر۔ ایک طرف وہ بیرونی ہواؤں کے رخ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف اس ریشم کے کیڑے کی کشیدہ کاری کو بھی گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا ہے۔

ظاہر ہے تین مہینے کے مختصر عرصے میں کوئی نامحرم کیا بتا سکتا ہے کہ اس ریشم کے کیڑے پر کیا گذری، وہ تو اس کی ادبی تخلیق کے سہارے صرف اس قدر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کے ذہن کی کون سی چنگاریاں کن ہواؤں سے دہک اٹھیں اور کن سے کجلا گئیں۔

اس سہ ماہی میں سیاسی رہنماؤں کی تیز گامی کا ہر ادیب کو احساس رہا۔ قتیل شفائی کی "چبھتی بات" یہی کفن اوڑھ لو! ہمارے شاعروں کا عام جذبہ رہا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو جلاوطنی، خانماں بربادی جو ابتدا میں گرم چوٹ کی طرح معمولی معلوم ہوئی تھی، سرد ہو کر ٹیس پیدا کرنے لگی ہے۔ سیماب، بیمور اور انجمل دگنجراب کے افسانے بننے کی بجائے اب مہاجرین کی ہجرت کی سچی کہانیاں بنتی جا رہی ہیں۔ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی پکاروں سے شش محل کے سونے والے چونک پڑے ہیں۔ سیاسی داؤں پیچ سے ہر صاحب دل متنفر ہے۔ شاعر چیختا ہے ع

مسعود باغ ہند میں کیا آگئی بہار

ہم سے تو اس بہار میں گایا نہ جائے گا

رینگتے غم، سلگتے آنسو، بھیگی پلکیں، ڈوبتی آنکھیں اور ٹھنڈی چوٹیں شاعری کا موضوع بنی ہوئی ہیں، اسی ماحول میں ہمارا ادیب اور شاعر سانس لے رہا ہے۔ اسی کے خام مواد سے اپنے فن کی واردات انگیز کر رہا ہے ادھر حوادث کے پہیوں کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کی اڑائی ہوئی دھول میں لپٹا ہوا شاعر ذروں میں آفتاب و ماہتاب ڈھونڈھ رہا ہے۔ زخم کو خندہ اور چوٹ کو مسکراہٹ میں تبدیل کر رہا ہے۔ زندگی کی راہیں الجھتی جا رہی ہیں، لیکن شاعر امید کے سہارے انھیں برابر سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعری کے حق میں بس یہی ایک امید افزا بات ہے کہ جب دنیا پر گرد و غبار چھا جاتا ہے اور انسانی معاملات کو سلجھانے والے دیدہ ور تک مات کھا بیٹھتے ہیں تو اس وقت بھی چشم شاعر وحشت کدے میں ستاروں کو ڈھونڈھتی ہے!

اردو کا شاعر پچھلے چند مہینوں کے سیاسی رستاخیز میں اپنے اس منصب سے بے خبر نہیں رہا اور بلا تفریق مذہب و ملت اس نے ہمیشہ خدا لگتی بات کہی۔ خالص سیاسی نقطۂ نظر سے بھی جس توازن اور ٹھیراؤ کا ثبوت ہمارے ادیبوں نے دیا ہے۔ اس سے سیاست داں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس سہ ماہی میں مجموعی اعتبار سے ادبی تخلیقات کی تعداد پچھلے سہ ماہی سے سوا رہی ہے۔ افسانہ کسی قدر کم اور شعر زیادہ مقبول رہا ہے۔ واقعہ سخت ہوتا ہے تو شعر ہی کام بھی آتا ہے۔ چیخ ہی نغمہ بن جاتی ہے۔ ان تین مہینوں میں خالص عشقیہ غزل کسی لائق اعتنا نوجوان شاعر کی نہیں دکھائی دی۔ پرانوں نے بھی لالہ و گل کے پردوں میں نہ جانے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں۔ اثر لکھنوی تک کی غزلوں سے دشنہ و خنجر اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لکھنوی غزل کو شمشیر بانہہ میں لئے دیکھ لیں تو بڑی بات ہے۔ حضرت جگر کی "فکر جمیل" بھی آج کل "خواب پریشاں" بنی ہوئی ہے۔ ع

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا

بہار میرے لئے اور یہی تہی دامن!

آپ نے دیکھا تہی دامنی کا یہ احساس کس کس رنگ میں ہمیں ستا رہا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو ان نوجوان شعرا کے کلام میں مل جائے گی جو آپ کے دامن کو بھر دینا چاہتے ہیں۔ جنھوں نے جمال اور زندگی کا توازن عصر جدید کے نئے مذہب اشتراکیت میں ڈھونڈھا ہے میری مراد مخدوم، فیض، علی سردار، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور تاباں فتح گڑھی سے ہے۔ مخدوم کبھی کے سیاسی بن کر شاعری سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ فیض اشتراکیت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اس کی دلکش شاعرانہ شخصیت کا یہ عجیب انداز محبوبی ہے کہ ہر ادبی ٹولی انھیں اپنا سمجھتی ہے۔ لیکن وہ کسی ایک کا نہیں بنتا۔ علی سردار، ساحر، کیفی اعظمی اور تاباں نے البتہ خود کو ایک خاص تحریک کے حوالے کر دیا ہے اس میں تاباں اور کیفی اس کے لشتہ بن کر رہ گئے۔ علی سردار اور ساحر کے یہاں البتہ خون جگر ملتا ہے۔ اس سہ ماہی میں اس ٹولی کی سب سے کامیاب نظم علی سردار کی "خون کی لکیر" ہے۔ علی سردار کی شاعری میں زیر و بم، سیاسی واقعات کے مد و جزر کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ وہ دباؤ پر کام کرتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اشتراکی رندوں میں سب سے بڑا رند یہی شخص ہے۔ وہ پچھلے چند سال میں اپنے ساتھیوں سے کئی زینے اوپر چڑھ چکا ہے۔

سیاسی واقعات کے ان جھکولوں سے ہمارے افسانہ نگار بھی غافل نہیں رہے۔ شاعر کی بہ نسبت افسانہ نگار کا میدان زیادہ وسیع اور اس کا مواد کثیر ذرائع سے فراہم ہوتا ہے۔ اسے فرصت کار بھی زیادہ حاصل ہوتی ہے اس سہ ماہی میں کرشن چندر، احمد عباس، عصمت اور اشک سبھی نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ کرشن چندر کے یہاں طنز کا عنصر برابر بڑھ رہا ہے۔ احمد عباس اور اشک کی فن کارانہ صلاحیتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوتی ہے مجموعی حیثیت سے اس سہ ماہی کے افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت موجودہ بے عقیدہ دور میں طنز کے لئے جس قدر یاس کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ان میں موجود ہے۔

اس دوران میں بے شمار رسائل نے ۱۵ اگست کو آزادی نمبر بھی نکالے۔ ادبی اعتبار سے یہ زیادہ لائق ذکر نہیں۔ ادب حادثات اور لمحات سے بحث نہیں کرتا۔ وہ تو محض لمحات جاودانی کو اپنی چٹکیوں میں پکڑ لیتا ہے۔ اگر یہ صورت ظہور میں نہ آئے تو وہ صحافت کے چلتاؤ روپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

صحافتی دنیا میں یہ واقعہ اہم ہے کہ پچھلے مہینے جوش ملیح آبادی نے آج کل کے مدیر کی حیثیت سے بازگشت کی۔ اگست کے شمارہ میں تین گواہوں کے دستخطوں کے ساتھ اس رسالے کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے "اگر میں آجکل کے باب میں بڑی بڑی امیدیں نہ دلاؤں اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے"۔

میرے خیال میں اس قسم کے اعتذار کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آجکل یا ماہ نو جیسے نیم ادبی رسائل سے ہم اور زیادہ توقع بھی نہیں کر سکتے، تاہم آجکل کے لئے جوش کا ورود "ان کے ورود جاناں" سے کم نہیں۔

اسی سہ ماہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ماہنامے نیا ادب نے بمبئی سے دوسرا جنم لیا ہے۔ اس کے نکلتے ہی ہمارے ادبی اکھاڑے میں پھر جان سی پڑ گئی ہے، اور اس نے حسب معمول اپنے اداریہ میں رجعت پسند ادیبوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ یہ چھیڑ چھاڑ اردو ادب کے لئے عبرت آموز بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ عام طور سے اس قسم کے مسائل جو نیا ادب یا نظام کے پرچے میں مسلسل نکل رہے ہیں، خالص علمی نقطۂ نظر سے گمراہ کن ہیں، دشنام طرازی ہی علمی سطح پر جا کر استدلال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کا استدلال بھی دشنام سے مملو ہوتا ہے۔ اس کا ایک نہایت مذموم اثر یہ ہوا ہے کہ ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے مباحث اپنی تمام عفونت کے ساتھ پھر بہک اٹھے ہیں، دونوں گروہوں کے پہلوانوں کے پیچھے بڑھاوا دینے والے چھٹ بھیوں کے دل کے دل ہیں۔ کبھی نعرہ لگتا ہے کہ ادیب کے لئے کسی حد تک فاشسٹ ہونا ضروری ہے۔ تو کوئی دوسرے کے خیالات کو لایعنی، بے ہودہ، سڑے ہوئے اور انحطاط پذیر (یہ الفاظ نیا ادب کے اداریہ سے لئے گئے ہیں) کہتا ہے اشتراکی ادیبوں پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہے۔ دوسری طرف غیر اشتراکی ایک انقباضی کیفیت میں اینٹھے پڑے ہیں۔ اس ادبی گروہ بندی نے ہمارے تنقیدی نقطۂ نظر کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ عام رجحان بت شکنی کی طرف ہے یا پھر برادرانہ تنقید ہوتی ہے جس میں انجمن ستائش باہمی کا سا انداز دکھائی دیتا ہے۔ ادب میں بت شکنی کی ضرورت کو میں بھی محسوس کرتا ہوں اس لئے نہیں کہ میں زہر طنز کا شکار ہو گیا ہوں، بلکہ اس وجہ سے کہ ہمارے ادب میں بہت کچھ کرکرا ہے، جسے پھٹکنا اور چھاننا ہے۔ حلقۂ یاراں پر پیار بھری تنقید یا اپنے سے انصاف کرنا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن کسی کی عظمت کو ناپنے کے لئے خود گرین جانا بہت مشکل بات ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۱ پر

روزہ دار

سنجی حسن نقوی

"دار" لفظ نہیں بہروپیہ ہے جو معنی خیز خاصیتیں رکھتا ہے اور نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ایک وہ "دار" جو اکیلا رہنے کا عادی ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ انا الحق کا دعوے دار اسی دار پر چڑھایا گیا تھا۔ دوسرے وہ دار" جو ساتھیوں کی جلو میں چلنا پسند کرتا ہے۔ یہ عربی الاصل ہے۔ اور دار الحمن اور دار العلوم کو اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ایک ہندوستانی "دار" جو عربی "داروں" سے مختلف ہے۔ ہندوستان آکر اس کی عادتیں اور مزاج سب بدل گئے۔ نت نئے ساتھی ملے اور نیا نیا ماحول۔ ہندوستانی تو بن گیا مگر کسی سے دب کر نہیں رہا۔ وطن میں ساتھیوں کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی تھا، یہاں آکر اکڑ کر چلنے لگا، اور ساتھیوں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔ یہ خود اس کا زور تھا یا ساتھیوں کی کمزوری کی گواہی تھانہ دار پہرہ دار دیں گے۔ نسلی اعتبار سے روزہ دار بھی انھیں کا بھائی بند ہے۔ لیکن قومیت کے لحاظ سے اس کی شان انفرادی حیثیت رکھتی ہے ہندوستانی ...... "داروں" اور ہندوستانی روزہ داروں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ مثال کے طور پر تھانہ دار اور پہرہ دار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں۔ البتہ ہر روزہ دار بہ یک وقت پہرہ دار تھانہ دار وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس میں لفظ پیچھے اور "دار" آگے رہتا ہے۔

سالنامہ کی مردم شماری کی رو سے ویسے تو ہندوستان کی ۲۵ فی صدی آبادی پر روزہ فرض کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس میں سے رکھنے والوں کی تعداد گھٹ کر کوئی ۵ فی صدی یا اس سے بھی کم رہ گئی ہے۔ گویا باقی لوگوں پر روزہ معاف ہے۔ اگر معاف کیا نہیں گیا ہے تو انھوں نے خود معاف کر لیا ہے۔ بہر حال روزہ داروں کی تعداد میں روز بروز کمی آتی جا رہی ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ گرمی کا موسم، چلچلاتی دھوپ، پہاڑ جیسا دن، تن بدن میں آگ، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ پیاس کی شدت، اور نہ جلنے کیا کیا۔ اس کے علاوہ رمضان میں بہت سی متعدی قسم کی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ نزلہ زکام اور کھانسی تو خیر عام ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعضوں کو دردِ سر اور دردِ گردہ کی شکایت بھی ہونے لگتی ہے۔ کچھ لوگ عذر کرتے ہیں، روزے رکھتے وہ جن کے پاس دودھ گھی کھانے کو پیسے ہوں کسی پر روزہ اس لئے معاف رہتا ہے کہ اس کے پاس ٹائم پیس نہیں جس کی مدد سے وہ سحر کو اٹھ سکے۔ لیکن علم لدنی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کی جڑ ایمان کی کمزوری ہے۔

جس طرح روزہ دار کے حروف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اسی طرح قسم کے اعتبار سے تمام روزہ دار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض روزہ دار عادتاً صرف روزہ دار ہوتے ہیں نمازی نہیں ہوتے ان کا کہنا ہے کہ روزہ اور نماز علیحدہ علیحدہ عبادتیں ہیں۔ روزہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روزہ بے جھول رہتا ہے۔ لیکن بعض کی رائے میں نماز پڑھنے سے روزہ ٹوٹتا نہیں البتہ جھوجھرا ضرور ہو جاتا ہے۔ کچھ روزہ دار "خاموشی زر ہے" کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں تو کچھ "گویائی سیم ہے" کو نصب العین قرار دیتے ہیں۔ بعض روزہ نہیں رکھتے، اللہ اور اس کے بندوں پر احسان کرتے ہیں۔ مزاج کے خلاف ذرا ذرا سی بات پر گھر والوں اور اڑوس پڑوس سے جھگڑا مول لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور بہت سے تو ریل گاڑی کے اس زریں اصول کو بھول بیٹھتے ہیں جس میں بالخصوص مسافروں کو اور بالعموم ہر شخص کو (اور اس میں روزہ دار کا بھی کوئی استثنا نہیں) یہ ہدایت کی گئی ہے "مت تھوکو۔ اس سے بیماری پھیلتی ہے۔"

رمضان کی صبح عید کی شام کی طرح بے رونق اور اداس ہوتی ہے۔ رمضان کا دن رات میں، اور رات دن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ روزہ دار دن میں سونا اور رات میں جاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اصل میں وہ دن میں بھی سوتے نہیں سونے کا نام کرتے ہیں ان کے لئے خواب و بیداری ہم معنی بن جاتی ہیں۔ روزہ داروں کے سونے، اونگھنے یا جاگنے کی حالت میں روزہ خوروں کا فرض رہتا ہے کہ خود نہ سوئیں بلکہ روزہ داروں کو سلائیں یا دوسرے لفظوں میں کوے ہانکیں۔

البتہ رمضان کی شام اور عید کی صبح، رمضان کی صبح اور عید کی شام کا جواب ہوتی ہیں۔ عید کی صبح "صبح اودھ" کی طرح شگفتہ اور رمضان کی شام، "شام بنارس" کی مانند پر کیف و پر بہار ہوتی ہے۔ رمضان میں شام کو روزہ دار طرح طرح کی افطاریاں کھاتے ہیں، اور عید کی صبح کو نہا دھو کر نئے نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ لیکن روزہ خور ان تمام نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ وہ روزہ داروں کا منہ تکتے ہیں، خون جگر پیتے ہیں اور روزہ کھاتے ہیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں روزہ دار عام طور پر نیت خراب ہو جاتے ہیں۔ افطار سے قبل روزہ داروں کی بدحواسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کھانے پر گریں۔ تو تین دن کی غذا پیٹ میں ڈال لیں گے۔ پینے پر آئیں گے تو پیٹ کو مٹکا بنا لیں گے اور رات بھر ڈکاریں لیا کریں گے۔ حقہ کے شوقین اس زور سے سلفہ کھینچیں گے کہ حقہ کے کشوں پر دو آتشہ کے گھونٹوں کا شبہ ہونے لگے گا۔

روزہ داروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے روزہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر روزہ کھولنا پسند کرتے ہیں۔ اور جب بہت سے روزہ دار ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو آپس میں اس قسم کی بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "افوہ! کس قدر سخت گرمی ہے!" دوسرا گویا ہوتا ہے "آج پیاس زیادہ رہی!" تیسرا ٹانگ اڑاتا ہے "آج کا روزہ سخت گذرا!" چوتھا رائے دیتا ہے "بارش کی سخت ضرورت ہے" رند مشرب بول اٹھتا ہے "اگر یہی سیل و نہار ہیں تو بندہ کا کل سے استعفا" مولوی صاحب فرماتے ہیں "کفر کفر! روزہ فرض ہے!"

اس گھر سے بچنا چاہیئے جس میں میاں بیوی دونوں روزہ سے ہوں۔ ذرا سی بات میں سارے محلہ کو سر پر اٹھا لیں۔ آن کی آن میں گھر کی چہار دیواری کو پانی پت کا میدان بنا دیں۔ معمولی سی شکایت پر میاں بیوی کے دل "ٹوکیو اور سین فرانسسکو" کی دوری اختیار کر لیں۔ ایک دوسرا منظر ملاحظہ ہو۔ بیوی کی آنکھیں سوجی ہیں، میاں کا منہ پھولا ہے۔ ایک طرف بیوی جلی ہوئی لکڑی بنی پلنگ پر پڑی ہیں دوسری طرف میاں جلا ہوا حقہ بغل میں دبائے کھڑے ہیں۔ یا پھر، بیوی میکے جانے کی تیاری میں مصروف ہیں اور میاں پردیس بھاگنے کے لئے بستر باندھنے میں مشغول ہیں۔ لیکن یاد رکھئے جانے والا دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے دونوں گھر چھوڑ دیں اور میاں محلہ والوں اور بی بی پڑوسنوں سے لڑنے کے لئے نکل جائیں۔ لیکن افطار تک روٹھے ہوئے ضرور من جائیں گے۔ نہ بی بی میکہ جائے گی نہ میاں پردیس کیسے اور کیوں کر منیں گے یہ میاں جانیں یا بی بی۔

روزہ داروں کی طرح روزہ کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک روزہ ایک ڈاڑھ کا ہوتا ہے۔ اس میں دوسری ڈاڑھ سے کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسے اکثر بچے رکھتے ہیں یا وہ بوڑھے اور جوان رکھتے ہیں۔ جو ظاہر میں روزہ دار اور اصل میں روزہ خور ہوں، وہ بھی روزہ ہی ہوتا ہے جس سے ملکوں کو آزادی مل جاتی ہے۔ جیل جانے والے ستیہ گرہی اسے "مرن برت" کہتے ہیں۔ اس میں اور عام روزہ میں یہ فرق ہے کہ اس کا رکھنے والا عرف عام میں روزہ دار نہیں "لیڈر" کہلاتا ہے۔

جانکار لوگ کہتے ہیں روزہ مفید ہے۔ جس طرح سال کے سال مشینوں کی صفائی کی جاتی ہے اور تیل دیا جاتا ہے اسی طرح جسم انسانی کی مشین کو جہاد بالنفس کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے اور روحانیت کا تیل دیا جاتا ہے ممکن ہے اس قول میں سچائی کا بھی کوئی پہلو ہو، لیکن روزہ دار کا تجربہ بہر حال اس کے خلاف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ روزہ دار کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس سے بیٹھنے کو کہئے کھڑا ہو جائے گا ہنسانے کی کوشش کیجئے رو دے گا۔ کام لیجئے سو جائے گا بات کیجئے پھاڑ کھائے گا۔ اس کا قول تو یہ ہے کہ روزہ میں نیند اڑ جاتی ہے۔ عقل کم ہو جاتی ہے۔ معدہ سڑ جاتا ہے۔ وزن گھٹ جاتا ہے۔ وہ روزہ کی مادیت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک روزہ فرض ہے۔ وہ روزہ رکھ کر کسی پر احسان نہیں کرتا اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ وہ عبادت برائے عبادت کا قائل ہے۔ عبادت برائے جنت کا نہیں۔

تصحیح پچھلی اشاعت میں صفحہ ۷ پر مولانا حسرت موہانی کی غزل میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ہم مولانا سے معذرت خواہ ہیں۔ صحیح شعر درج کئے جاتے ہیں، ناظرین ٹھیک کر لیں۔

ہر دل میں ہے خواہش تری ہر سر میں ہے سودا ترا
آئینہ دارِ عشق ہے، خود حسن بے ہمتا ترا
معذور ہے تابِ نظر، مجبور ہیں اہلِ بصر
مستور حق ہے سربسر، اے نورِ جاں جلوا ترا
تیری جفا بھی ہے وفا، منظورِ اربابِ صفا
یعنی بہ فتوے رضا جائز نہیں شکوا ترا

اندھی بچی

صالحہ عابد حسین (۱)

نذیر بڑا اچھا باورچی تھا۔ اسے ہندوستانی انگریزی دونوں طرح کے کھانے پکانے آتے تھے۔ اس کے ہاتھ کا کھانا جس کے منہ کو ایک مرتبہ لگ گیا پھر کسی دوسرے کا پکایا ہوا کھانا اس کے لئے بالکل پھیکا اور بدمزہ ہوجاتا تھا۔ مگر نذیر کا مزاج بہت نازک تھا، کسی کی کڑوی بات یا ٹیڑھی نظر وہ بالکل برداشت نہیں کرسکتا تھا، فوراً اپنا بوریا بستر باندھ اپنا حساب لے چلتا بنتا۔ پھر چاہے کوئی کتنا ہی سمجھائے وہ کسی کی ایک نہ سنتا تھا۔ اسی لئے ہمیشہ اس کے مالک سب گھر والوں کو منع کرتے رہا کرتے تھے کہ دیکھو نذیر کو کچھ نہ کہنا۔ آپ جانئے زبان کا مزہ بری چیز ہے، انسان شاید اپنے پیٹ سے بھی زیادہ اپنی زبان کے ہاتھوں بے بس ہوجاتا ہے۔

جب نذیر کی پہلی شادی ہوئی تو وہ تیرہ چودہ برس کا کم عمر چھوکرا تھا۔ اور اس کی بیوی مشکل سے سات آٹھ سال کی بچی ہوگی۔ دونوں ہر وقت ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آپس میں مارپیٹ روٹھنا، منانا ہوتا رہتا۔ نذیر کی بیوی راجو بڑی بھولی صورت کی بچی تھی اور جوان ہوکر تو ایسی خوب صورت نکلی کہ جو دیکھتا دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا، اور نذیر تو دل وجان سے اس پر فدا تھا۔

نذیر کا باپ بھی باورچی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا موروثی فن بڑی محنت سے سکھایا اور بیس اکیس برس کی عمر میں اسے کھانے پکانے میں ماہر کردیا۔

بیس برس کی عمر میں نذیر کے پہلا بچہ ہوا، خوب موٹا تازہ اور خوب صورت بالکل راجو کا ہم شکل۔ دادا دادی اس پر جان چھڑکتے تھے نذیر ہمیشہ سے بچوں کا دلدادہ تھا، اپنے بچے پر تو پروانہ وار نثار رہتا۔ دو سال بعد اس کے ایک لڑکی اور ایک سال بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوا سب کے سب خوب صورت تندرست اور ہنس مکھ، نذیر کی خوشی کا کیا پوچھنا؟ وہ ایک "صاحب" کے ہاں نوکر تھا، اس کی ساری تنخواہ بچوں کے کھلونوں بچوں کے "چیپن اپیل" سوئٹروں اور ٹوپیوں اور بیوی کے زیور اور ریشمی کپڑوں میں صرف ہوتی تھی۔ کھانے پینے کا سب خرچ ماں باپ خود اٹھاتے تھے وہ گھر کی سب فکروں سے آزاد بےفکری اور مسرت کی جنت میں زندگی بسر کررہا تھا۔ آٹھویں دن وہ "صاحب" سے ایک دن کی چھٹی لے کر گھر آتا، اور بیوی بچوں اور بڈھے ماں باپ سے جن کا وہ اکلوتا بیٹا تھا مل جاتا، اس ہنس مکھ اور خوش دل نوجوان کے آتے ہی گھر میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی گھر والے چھ دن تک اس کے آنے کی گھڑیاں گن گن کر کاٹتے۔

اچانک گاؤں میں فصلی وبا پھیلی اور تین چار دن کے اندر اندر اس کا باپ ماں اور بڑا لڑکا چٹ پٹ ہوگئے۔ نذیر کو خبر ملی تو روتا پیٹتا گھر آیا۔ راجو کا صدمے سے برا حال تھا پہلے بیوی سے مل کر خوب رو دیا۔ پھر اسے تسلی تشفی دی، گھر بند کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اپنے "صاحب" کی کوٹھی پر آگیا جہاں اسے ایک کوٹھری رہنے کو مل گئی۔

اب نذیر کے سر ساری ذمہ داریاں اور خرچ آپڑے، اس پر ماں باپ اور بچے کا صدمہ سوہان روح، ہر وقت رنجیدہ اور متفکر رہتا۔ راجو کو بھی اب وہ آرام و بےفکری کہاں نصیب ہوتی، جو ساس سسر کے زمانے میں میسر تھی۔ دن بھر گھر کا کام، بچوں کی پرورش، کھانا پکانا اور رات کو جب تھکا ہارا نذیر بیگا کھلا کر واپس آتا تو گھنٹوں اس کے پاؤں دبانا، غرض اس طرح کی بہت سی ذمہ داریاں اس پر آپڑی تھیں۔

راجو کے پیٹ میں پھر بچہ تھا.......... اس کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ ادھر دونوں بچے روز کچھ نہ کچھ بیمار رہنے لگے تھے۔ اسی حالت میں راجو کے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا...... نذیر نے بہت دوڑ دھوپ کی "صاحب" نے ڈاکٹر کو بلاکر بھی دکھایا مگر راجو کی زندگی کے دن پورے ہوچکے تھے۔ سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں چار بچوں کی پیدائش نے یوں ہی حد سے زیادہ کمزور کردیا تھا۔ اب جسم میں زہر پھیلنے کا بہانہ ہوگیا اور وہ ننھے بچوں اور عاشق زار شوہر کو تنہا چھوڑ کر ناشاد نامراد دنیا سے چل بسی۔

نذیر بچارا اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پہلے پانچ برس کی دلاری لڑکی نمونیہ کی نظر ہوئی اور بیس پچیس دن بعد چھوٹا لڑکا چیچک کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نذیر گنوار اور جاہل، بچے کا علاج دوا کچھ نہ کیا، ٹونے ٹوٹکے کرتا رہا اور اس ڈر سے صاحب اور میم صاحب سے بھی چھپایا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھائیں گے اور ڈاکٹر نے جیسے اس کی بیوی اور بچی کو مار دیا اس بچے کو بھی مار دے گا۔ بچے کے مرنے کے بعد اس کی حالت بالکل پاگلوں کی سی ہوگئی۔ کس کا پکانا کہاں کا کھانا۔ اس پر ایک مدہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ سارے دن بیوی بچوں کی قبروں پر پڑا روتا اور سر دھنتا رہتا۔ میم صاحب نے ہفتہ بھر انتظار کیا کہ خانساماں کی حالت سنبھلے اور وہ پھر کام شروع کرے، آخر انھوں نے بیرے کو بلاکر نذیر کا حال پوچھا۔ بیرا مدت سے نذیر کا مخالف تھا نذیر ایمان دار تھا اور بیرے کو سودے میں سے پیسے رکھنے کا موقع بہت کم دیتا تھا۔ اس نے میم صاحب سے کہا کہ نذیر تو باؤلا ہوگیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جڑ دیا کہ اس کے بچے کو چیچک نکلی تھی۔ مگر اس نے آپ سے چھپایا۔ یہ سن کر میم صاحب کے حواس غائب ہوگئے۔ اوہ ان کے بنگلے میں چھوت والی بیماری سے موت ہوجائے اور وہ بے خبر رہیں؟ پہلے تو انھوں نے بیرے کو خوب ڈانٹا کہ تو نے ہمیں اطلاع کیوں نہ کی۔ بیرے کو الٹی اپنی فکر پڑ گئی بڑی مشکل سے جھوٹی سچی باتیں بناکر اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر معاملہ سیدھا کیا۔ میم صاحب نے نذیر کو قبرستان سے بلایا اور اس کا حساب کرچلتا کیا اور اسی وقت ہیلتھ آفیسر کو بلاکر تمام کوٹھی اور شاگرد پیشہ کو "ڈس انفکٹ" کرایا۔ پھر بھی میم صاحب کئی دن تک بدحواس رہیں۔

نذیر نے لاپرواہی بلکہ بےحسی سے برطرفی کا حکم سنا اور سلام کرکے وہاں سے اپنے گاؤں چلا آیا۔ وہ اب نوکری کرے تو کیوں اور کس کے لئے۔ وہ رات دن گھر میں منہ اوندھائے پڑا رہتا، اکثر گاؤں والے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کبھی کوئی بڑھیا آکر زبردستی کچھ کھلا پلا دیتی، کبھی خود نذیر دو ایک موٹی موٹی روٹیاں پکاکر پیٹ کے دوزخ کو بھر لیتا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ نذیر کی پھوپی گاؤں میں سے کسی نے نذیر کا حال کہلا بھیجا۔ وہ بچاری بہت دور رہتی تھی مگر کسی طرح بھتیجے کے پاس پہنچی۔ اس کے ساتھ اس کی سوتیلی نواسی بھی تھی جس کی عمر کوئی ۱۷، ۱۸ سال کی ہوگی۔

پھوپی پہلے تو بھتیجے سے مل کر بہت روئی پیٹی پھر رفتہ رفتہ اسے تسلی دلاسا دے کر اور سمجھا بجھا کر راہ پر لائی۔ نذیر بھی اب اداس، اجاڑ، تنہا زندگی سے اکتا گیا تھا ذرا پھوپی کے آنے سے دل بہلا۔ دس پانچ دن پھوپی نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلاکر ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ اب نذیر کا دوسرا بیاہ ہوجانا چاہئے۔ نذیر پہلے تو انکار کرتا رہا مگر آخر میں سب کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنی رضامندی دے دی۔ پھوپی نے زیادہ انتظار نہ کیا، اگلے ہی دن اپنی سوتیلی نواسی سے نذیر کا نکاح کردیا۔ وہ بچاری بہت دنوں سے اس فکر میں تھی کہ کوئی بر ملے تو اس لڑکی کے ہاتھ پیلے کردے مگر غریب لاوارث لڑکی نہ کچھ لینے کو نہ دینے کو بر کیسے جڑتا۔ اب ایسا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔

نئی بہو ہنس مکھ محنتی اور اطاعت گذار لڑکی تھی سانولا رنگ، معمولی ناک نقشہ۔ نذیر کی نظروں میں راجو کی صورت بسی ہوئی تھی بھلا اس کی شکل اسے کیا پسند آتی؛ پھر بھی اپنی بےکیف زندگی سے وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ زندگی کی یہ نئی تبدیلی اسے خوش گوار اور پرسکون محسوس ہوئی۔ پھر بہو خوب صورت نہ ہو مگر چڑھتی جوانی نے اسے دل کش ضرور بنا دیا تھا۔ نذیر کچھ دنوں کے لئے اس میں کھو گیا۔ پھوپی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بھتیجے کا گھر بسا کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔

نذیر کا مزاج صدموں نے اب بالکل بدل دیا تھا وہ ذرا ذرا سی بات پر جھلاتا، مارنے پر تل جاتا۔ بیوی کو حکم تھا کہ اس کی بغیر اجازت کہیں آنا جانا تو کیا ہلے بھی نہیں۔ مگر بہو ایسی اطاعت گذار اور بےزبان لڑکی تھی کہ سب باتیں خاموشی اور خوشی سے برداشت کرلی اور شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہ لاتی۔

کچھ دن بعد نذیر نے ایک جگہ نوکری کرلی اور بیوی کو ساتھ لے گیا۔

نذیر کی نئی بیوی کا نام کبھی کسی کو معلوم نہ ہوا اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ بڑی سادگی سے جواب دیتی "بیگم صاحب ہم کا جانیں ہمارا نام کا ہے؟ جب ہم لڑکوری رہن تو سب بٹیا بٹیا کہت رہن۔ جب ساوی بھئی تو سب بہو بہو کہن، اب خنساماں جی ہمیں خنساماں کہت ہیں" چنانچہ اسے خود نذیر اور سب لوگ خنسامن بلکہ "کھنسامن" کہتے تھے۔

(باقی آئندہ)

صبح امید (بہ سلسلہ صفحہ ۱)

بلکہ اپنے امکان اور مقدور پر نظر رکھنی چاہیے.......... اس وقت کام کرنے والوں کو خود ہی تجویز پیش کرنی چاہیے خود ہی قوم میں اس کی دعوت پھیلانی چاہیے اور پھر کوشش کرنی چاہیے کہ ہوسکے تو خود ہی اس تجویز کو عمل تک پہنچائیں اور اگر نئی تلاش کی دعوت دی ہے تو خود ہی اس کو ڈھونڈھ کر سامنے بھی کردیں۔ (مضامین ابوالکلام آزاد)

رومی عورت

عبدالرحمن ناصر اصلاحی جامعی

رومیوں نے اپنے سامراجی اور جمہوری کسی دور میں بھی محبت کو پروان نہیں چڑھایا۔ ان کی عورتیں سوت کاتتی تھیں، گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور باپ کی طرح اپنے شوہروں کی تعظیم کرتی تھیں۔ سنہ ۔۔۔ء سے پہلے ان کے یہاں طلاق کا رواج نہیں تھا۔

رومی عورت ایک طرح سے اپنے شوہر کی تابع تھی مگر علمی حیثیت سے وہ یونانی عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد تھی اور اپنے شوہر سے اس کا تعلق کہیں زیادہ گہرا تھا۔ اس کا طرز معاشرت بالکل اپنے شوہر کا سا ہوتا۔ گھر میں وہ برابر کی شریک ہوتی، شوہر کے جواب کا خیر مقدم کرتی۔ اس کی تمام ضروریات زندگی کا لحاظ رکھتی اور اپنے فرائض سے خوب واقف ہوتی بڑے ضبط، اعتدال و احتیاط سے زندگی بسر کرتی۔

رومی دولت کی بہت زیادہ پرستش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر چیز سے بلند مقام دولت کا تھا۔ ان کا فوجی اور مذہبی طبقہ اور عام لوگ بڑی خشک اور عسرت کی زندگی گذارتے تھے۔ ان کی کفایت شعاری کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، وہ صرف قوت کے سامنے سر جھکانا جانتے تھے۔ ان کے یہاں شاعر اور آرٹسٹ کا کہیں گذر نہیں تھا وہ محض مذہب، تنظیم اور جنگ کے دل دادہ تھے۔

آگے چل کر رومیوں نے یونانی اخلاق و عادات کو اپنایا، اور اس میں اس قدر غلو کیا کہ پھر یہی اخلاق و عادات ان کی تباہی و بربادی کا سبب بن گئے۔ روم میں شاعروں کا طبقہ اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ یونان پر غالب آیا، اور یہ سب شعرا یونانی گلشن ادب کے خوشہ چیں تھے۔ اور آرٹسٹ تو سب کے سب یونانی نسل ہی کے تھے۔

رومیوں کا سب سے بڑا ہیرو قیصر جولیس خاندانی شرافت کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا اور اسی طرح انٹنی بھی کوئی ہونہار انسان نہیں تھا۔ کلوپیٹرا جو ایک بے پناہ نسوانی سحر اور غیر معمولی عقل و خرد کی مالک تھی، تھوڑے دنوں تک قیصر سے محبت کرتی رہی اور ایک طویل مدت تک اس نے مارک انٹنی کو اپنے اشاروں پر نچایا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس حسین صید محبت کا کیا حشر ہوا؟ اور اس نے کس طرح کلیوپیٹرا کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ عزت و آبرو، ملک و وطن غرض اپنی ہر چیز محبت کی نذر کر دی۔

کلیوپیٹرا کا مشرقی سحر، اس کے چاہنے والے پر اس طرح چھا گیا کہ پھر اس کا کوئی اپنا ارادہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ اس فن سے خوب واقف تھی کہ کس طرح اس کی نگاہوں میں ہمیشہ نئی بنی رہے۔ اور محض اپنی ایک رات کے اندر اس کو نت نئے جلوے دکھاتی رہے۔

یہ تو مشرقی عورت کا انداز تھا، اور رومی عورت؟ اس میں بالکل سلیقہ نہیں تھا کہ مردوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

کلیوپیٹرا کے افسانے جب رومیوں تک پہنچے تو مشرقی عورت کے اخلاق کے متعلق غلط تصور قائم ہوا، رومی عورتوں نے سمجھا کہ مشرقی عورت محض اپنی جنسی خوبیوں کی بدولت اپنے مردوں پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور ان کا مطمح نظر لطف اندوزی کے سوا کچھ نہیں۔

مشرقی عورت کی بابت اس غلط بدگمانی نے خود رومی عورتوں کو گمراہ کر دیا اور اس غلط تصور کی تقلید میں وہ گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل آئیں، عفت کو خیرباد کہا میاں بیوی کے فرائض کا مذاق اڑایا، اور اپنی قوم کے زوال کے لئے راہ صاف کر دی۔

قیصر اگسٹس کی لڑکی بے راہ روی میں ضرب المثل بن گئی جس کی وجہ سے باپ نے اس کو شہر بدر کر دیا تاکہ خود اس کی عزت پر دھبہ نہ آسکے۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ بلند اخلاق کی ساری بنیادیں ایک ایک کرکے مسمار ہوگئیں، لوگوں کے عادات و اطوار خراب ہوگئے۔ خود اعتمادی کی روح مردہ ہوگئی، محاسن اخلاق کو برائیوں میں شمار کیا گیا۔ غرض کوئی ایسا نشان ہدایت باقی نہیں رہ گیا جسے دیکھ کر لوگ صحیح راہ پکڑ سکیں۔

اس طرح رومی سوسائٹی کے جسم میں زوال کے جراثیم گھس گئے، اور پوری سوسائٹی مریض ہوگئی، مصنفوں اور نقادوں نے آنے والے خطرے سے بار بار آگاہ کیا، مگر کسی نے کان نہیں دھرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز علی الصباح رومیوں نے اپنی سرحدوں پر بربریوں کے ہتھیاروں کی جھنکار سنی، اور آن کی آن میں رومی شہنشاہیت ختم ہوگئی۔

(عربی سے ترجمہ)

۱۵ر دسمبر علی گڈھ میں (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

نئے سرے سے اس نصب العین سے پیمان وفا باندھتی ہے اور اسے بروئے کار لانے کا عزم کرتی ہے جو اس کے بانیوں کے پیش نظر تھا یعنی ہندوستان رواداری، روشن خیالی، آزادی اور حقیقی جمہوریت کی سرزمین ہوگی۔ یہ نصب العین ہمارا فرض بھی ہے اور ہمارے لئے بشارت بھی"۔

حاضرین نے یہ ایڈریس بڑے سکوت و احترام سے سنا۔ اور جب ختم ہوا تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہر شخص نے یہ محسوس کیا ہو کہ علی گڑھ کی ترجمانی بڑی دیانت اور دلیری سے کی گئی تھی۔ سب سے عجیب لیکن خوش گوار بات یہ تھی کہ ہر شخص لطف و فراغت سے اپنی اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو یہ اندیشہ نہ تھا کہ ریلے میں اس کا پاؤں اکھڑ جائے گا یا گرنے پر بھیڑ کے ہجوم میں اسے آٹے کی طرح گوندھ ڈالا جائے گا۔ میں نے بعض بڑے لوگوں کو معمولی اور دور افتادہ جگہوں پر بیٹھے دیکھا۔ جن کے بشرے سے ہرگز یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر یہ حالت شاق گذر رہی تھی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو مجھے یقین ہے یہ لوگ یا تو منتظمین کو مار ڈالتے یا اپنے اپنے گھروں پر جا کر بیوی بچوں کو تہ تیغ کر ڈالتے۔ خواتین کافی تعداد میں موجود تھیں باپردہ بھی اور بالجہر بھی۔ ایک دوست نے کہا "یہ کیا بات ہے آج خواتین کی طرف لوگوں کا دھیان کم معلوم ہوتا ہے"۔ پاس ہی ایک سوکھے سلکے بید مجنوں سے جو ایک کرسی پر نصب تھے آواز آئی "سورہ فاتحہ بھی تو ختم ہوتا ہے آمین کا"

اردو ادب کی رفتار (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اردو ادب کے اس سہ ماہی کی بات ادھوری رہ جائے گی، اگر ہم ہفتہ وار نئی روشنی کا ذکر نہ کریں جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی ادارت میں دلی سے نکلنا شروع ہوا ہے یہ کسی سیاسی گروہ کی پیروی نہ کرتے ہوئے سوشلسٹ نقطۂ نظر سے ہندوستانی سیاست پر تنقید کرتا ہے یہ ایک "اخلاقی سماج" کی داغ بیل ڈالنے کا دعوے دار ہے۔ اس کے اجرا پر کچھ لوگوں کا ماتھا ٹھنکا۔ بعضوں نے بغیر سوچے سمجھے اسے اپنے اوسط درجے کے ذہنی نظریوں کے مطابق نہ پاکر لغو اور مہمل بتایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ جامعہ والوں کی غیر ضروری مفاہمت کا پرچار ہے۔ انھیں اس کا دھیما اور غیر جانب دارانہ انداز بالکل پسند نہ آیا، انھیں اس کی مفاہمت کی پالیسی میں کمزوری اصلاحی جد و جہد میں انقلاب دشمنی اور نرم لب و لہجہ میں وہ خود فریبی نظر آئی جس کا نام نہاد سوشلزم اکثر شکار ہو جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ ایک دو تین چار پرچے نظر سے گذرے تو محسوس ہوا کہ کوئی ہمارے تلخ دہن میں نبات گھول رہا ہے، متزلزل عقیدوں کو پختہ کر رہا ہے۔ بات سیدھے سادوں میں لیکن پتے کی کہہ رہا ہے۔ دنیا اوروں کی طرح انسان پرستی کے لئے واویلا نہیں کرتا، انسان دوستی کی کھری تعلیم دے رہا ہے۔ اس کا مقصد نفرت کے اس زہر کو خارج کرنا ہے جو پچھلے چند سالوں کی سیاست کے ذریعے ہماری رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ یہ زہر چاہے فرقہ وارانہ نفرت کا ہو یا طبقاتی نفرت کا۔ اگر فرقہ وارانہ نفرت پر قدغن کی جا سکتی ہے تو طبقاتی کا جواز کس لئے ڈھونڈھا جا رہا ہے؟ نئی روشنی اسی گہرے عقیدے کے ساتھ نکالا جا رہا ہے "نفرت سے ہمیں سر نہیں ہوتیں۔ عزم سے ہوتی ہیں۔ یہ عزم حق بینی اور حق پرستی سے پیدا ہوتا ہے۔ نفرت کی آنچ سے گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور روشنی نہیں ہوتی اس عہد کو گرمی سے زیادہ روشنی کی ضرورت ہے"۔

نقطۂ نظر سیاسیات کے نئی روشنی کے اجرا کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ "بزم بے تکلف" میں ظرافت کا ایک مخصوص علمی اور فلسفیانہ انداز ملتا ہے۔ ہمارے مصلحین کی اگر یہی کاوش کامیاب رہی تو ہمیں یقین ہے کہ سیاسی پاک بینی اور نظر کی صحت کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں گرمی کی جگہ روشنی آ جائے گی۔ منہ کی کڑواہٹ اور دلوں کا غبار دور ہو جائے گا نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ محبت جس میں توانائی بھی ہوتی ہے اور شوکت بھی جو کسی کمزوری کی بنا پر نہیں پیدا ہوتی بلکہ اعتماد اور یقین کے سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی)

مژدہ مزدور کو کہ چھایا ہے
کشت ویراں پہ ابر گوہر بار
باغ عالم بدلنے والا ہے
دیکھ یہ انقلاب کے آثار

اقبال

۴ موقع کہاں سے آئے؟

(باقی آئندہ)

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

اِدارۂ تحریر:- ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی
تاریخ اشاعت:- یکم [illegible]
چندہ:- سالانہ ۔۔ ششماہی

دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)
مطبوعہ:- حید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۵ | یکم فروری ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید عابد حسین

نوحۂ غم

سیسیلیا میریلیس

(برازیل کی مایۂ ناز شاعرہ کا یہ مرثیہ پرتگالی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں نئی روشنی" کے لیے یونیسکو کے "خزینۂ ادب" کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ ہم مصنفہ اور یونیسکو کے شکریے کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ شائع کرتے ہیں)

آسمانی نغمہ تھم گیا، شاعری کا دریا رُک گیا
میرے خواب کے ہنستے پھولوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر گئی
جدھر دیکھو اخباروں کے ورق اُڑتے پھر رہے ہیں
"وہ لوگوں کو آشیرباد دیتا ہوا مارا گیا"

رات کے گھن گھور اندھیرے میں ایک چیخ سنائی دی
جیسے کسی پنچھی کی دکھ بھری کوک
میں جاگ پڑی اور کسی دور دیس میں
ایک ان جانی جگہ کے کھوج میں بھٹکنے لگی
اچھا! تو یہ تو تھا جس نے اپنے لہو کی آخری بوندوں کے ساتھ
ڈوبتی ہوئی آواز میں ٹھنڈا سانس بھرا تھا؟
یہ تیری سوکھی ہڈیاں تھیں جو موت کے جھٹکے میں یوں سرسرا رہی تھیں
جیسے جھٹ پٹے وقت بانس کی نازک ٹہنیاں ؟
"شری متی شری متی، انسان بڑے وحشی ہیں"

وہ ستیاگرہ کے دن جب گھر گھر چرخا چلتا تھا ....

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
نوحۂ غم	سیسیلیا میریلیس	۱
ہندوستان گاندھی جی کے بعد (اداریہ)		۳
بزم ماتم		۳
پچھلا ہفتہ :- ۱- ہندوستان	ع ۔ ح	۴
۲- پاکستان	ع ، ل	۵
۳- باہر کی دنیا	ع ، ل	۶
نظر کی کوتاہیاں	سید اختر علی تلہری	۷
عزم پرواز	تیغ الہ آبادی	۷
میرے بعد	سیدہ فرحت	۷
چند لفظ گاندھی جی کے بارے میں	آلڈس ہکسلے	۸
گاندھی جی کی سادگی	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۰
شیو کا باغ (افسانہ)	سید علی عباس حسینی	۱۱
کتب خانے کے آداب	امتیاز علی عرشی	۱۴
کشکول	سید سخی نقوی	۱۵

قیمت فی پرچہ ۳ر

وہ سنہری ریشم کے لچھوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے ہار موتیم رہ "بنسے تا ترم کی سے
دارجلنگ کی چائے میں سفید گلاب کی پنکھڑیوں کی بوباس ہے ....
اے گلیو، اے سٹرکو، اے گلیو، اے سٹرکو،
جانتی ہو دنیا کے دوسرے سرے پر کون مارا گیا ؟
ساری دنیا کے کالے رنگ کے اچھرو تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم
کہ یہ وقت تمھارے لئے آنسو بہانے کا ہے ؟

"اے مگو، تو کیسی سریلی آواز میں [illegible]
[illegible]
مگر بہت سی [illegible]"

شام کی ہوا تار کی دہکتی ہوئی خبر کو اور دہکا رہی ہے۔ لوگ پڑھتے ہیں
ان کی آنکھیں ایک ایک حرف پر اٹکتی ہیں جیسے بچے کہانی کے ہجے کریں
اور وہ پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہم سب آگے بڑھ جاتے ہیں
اور ہم میں جو لوگ اندھے سے اندھے ہیں
ان کی نظر اور روح کے بیچ میں بھی ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے

ہمارے ہاں بھی پانچ بجے ہیں، اور مجھے تمھارا نام
ہزاروں چائے کی پیالیوں میں شخص کوئی نہیں پیتا
ان پیالیوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں لکھا ہوا نظر آ رہا ہے
"یہ شخص کیا چاہتا تھا" ۔ "یہ دنیا میں کس لئے آیا تھا"
"میری بساط ایک مٹی کے پیالے سے زیادہ نہیں
جسے اس بڑے کمہار نے گھڑا ہے
جب اسے میری ضرورت نہیں رہے گی اٹھا کر پٹک دے "

اس نے تجھے پٹک دیا۔ ایک دم سے، ایک دم سے
ابھی تو لہو کی کچھ بوندیں اندر رہ گئی تھیں
ابھی تو تیرا دل پوری طرح نچوڑا نہیں گیا تھا
اے جرأت و ہمت کے خیالی پیکر
اے گلاب کے چھوٹے سے پھول جو حد سے زیادہ کھل کر بکھر گیا ہے
اور ایک سوتی کپڑے کی چادر میں لپٹا ہوا ہے
مقدس کتابوں کی تلاوت کے درمیان ....

شام کی ہوا ہند اور برازیل کے درمیان آ رہی جا رہی ہے
اور کسی طرح نہیں تھکتی
بھائیو اہنسا پرم دھرم
مگر سب کی جیبوں میں بندوقیں ہیں جن سے دھواں نکل رہا ہے
در اصل ایک تو ہی تھا جس کے پاس
نہ بندوقیں تھیں، نہ جیبیں اور نہ جھوٹی باتیں
تیری تو ایک ایک نس نہتی تھی
تو گذرے ہوئے کل اور آنے والے کل سے آزاد تھا
"شری متی، شری متی انسان بڑے وحشی ہیں"

ہوا نے تیری جان لی اور مجھے ادھ موا کر دیا
یہاں نہ جھنڈے ہیں نہ وردیاں ہیں
بس ایک روح ہے اس ٹوٹی پھوٹی دنیا میں

ہند کی عورتوں کی کمر جھک گئی جیسے آہوں کی گٹھری ہو
تیری چتا جل رہی ہے، گنگا تجھے بہا کر دور لے جائے گی
تیری مٹھی بھر راکھ جسے لہریں لپٹ لپٹ کر چومیں گی

اور سورج پانی سے لے کر خدا کو
اس کی قدرت کے نامحدود ہاتھوں کو سونپ دے گا

"شری متی، شری متی انسان بڑے وحشی ہیں"
تو خدا کو کیا بتائے گا [illegible] انسانوں کا حال
جنھیں تو نے دیکھا ہے، جنھیں تو نے برتا ہے
شاید ایک چھوٹی سی بکری میٹھی یادوں کو تازہ کر دے

ہوا تانڈی کی خبر لا رہی ہے۔ لوگ سوانگ رچ کر پھر رہے ہیں
آج کل یہاں (اور سب کہیں) سوانگ میلا کا سماں ہے
دیوانگی اور نفس پرستی کی آوازیں کرنٹی کمانوں کو کھینچتی ہیں
مجمع کا شور سیمنٹ کی ہزاروں منزلوں میں گونج رہا ہے
مہاتما چپ چاپ مر جاتے ہیں اور اپنے قاتلوں کو اشیرباد دیتے ہیں۔
تال بیل کی آخری آواز جا کر آسمان کے سناٹے میں مل جاتی ہے

میرے درخت کے پتے جھڑ رہے ہیں، میں دیکھ رہی ہوں
کہ تنہائی مجھ سے ملنے کو آ رہی ہے
بادلوں کے دل ۔ تیز رو نشانیوں کی طرح اُڑ رہے ہیں
ہوا بادلوں کو سمیٹتی ہے، ہاتھیوں کی فوج کو کھدیڑتی ہے
دوڑو، لوگو دوڑو! اس دُبلے پتلے مہاتما کی مدد کو
جو تم سے سچی محبت کرتا تھا

حسن اور شجاعت کی امانت میری گود میں آ رہی ہے
تیرے دل کے اور میرے دل کے بیچ میں کون سی لہریں تھیں
کہ تیرے خون کے بہنے سے میرا خون بے چین ہے

ہوا لوگوں کو ان کے کام کے، ان کے پاپ کے رستوں پر چلا رہی ہے
حیرت اور تجسس کے جذبوں کو، بے پروائیوں کو قہقہوں کو لئے ہوئے جا رہی ہے
وہ ہر ایک کو ڈھکیل کر اس کے گھر پہنچا دیتی ہے
اور اس کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے
ہوا شعلوں کو تیز کر دے گی، ہوا ہلکی راکھ کو اڑا لے جائے گی
اس کے بعد اندھیرا چھا جائے گا اور لوگ بہت روئیں گے
آخر کار وہ آنسو بہہ نکلیں گے جن کو تم نے
صبر و سکون کے بند باندھ کر روک رکھا تھا

"ایشور تجھ سے کہے گا بیٹا، انسان بڑے وحشی ہیں
ہم بہت کشٹ اٹھا چکے، آؤ اب ان کو چھوڑ دیں
تاکہ یہ عالم فساد کی طرف لوٹ جائیں تاکہ سمندر پھر ابلنے لگے
تاکہ یہ جائیں اور آ جائیں، پھر جائیں اور پھر آ جائیں
آ میرے آکاش کے محلوں سے انسانی غلطیوں کی خونی جنگ دیکھ
اب اس کی ضرورت ہے کہ دنیا پھر آغاز کی طرف لوٹ جائے۔
میں بھی اب آنکھیں بند کئے لیتا ہوں
اسی لئے میں نے حکم دیا تھا کہ تو ہنسا کے ہاتھ سے مسل دیا جائے
اب انسان ہی نہیں رہے جنھیں تیری خدمت درکار ہو
میرے ساتھ تو بھی دم چھوڑ دے اس وقت تک کے لئے
جب ہم پھر آنکھیں کھولیں جب انسان ہمیں پکارے

ہوا ایشور کے شبدوں کو پھیلا رہی ہے ہزاروں شعلوں کی زبانوں سے
اور تیری بوڑھی ہڈیوں کی راکھ کے ہزاروں پھولوں سے، او مہاتما!

ریو دو جنیرو ۔ برازیل ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم فروری ۱۹۴۹ء

ہندوستان گاندھی جی کے بعد

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ گاندھی جی کی آنکھ بند ہوتے ہی ہندوستان نے یہاں تک کہ کانگریس اور کانگریسی حکومت نے بھی ان کی تعلیم کو بالکل بھلا دیا۔ ملک نے اس راہ کو چھوڑ کر جس پر گاندھی جی اُسے چلانا چاہتے تھے بالکل مخالف راہ اختیار کر لی۔ اس بات میں کچھ صلیت ضرور ہے مگر مبالغہ کے انبار میں اس طرح چھپ گئی ہے کہ اسے ڈھونڈھ کر نکالنا مشکل ہے۔ مبالغہ چاہے نیک نیتی سے کیا جائے یا بدنیتی سے ایک حد سے آگے بڑھ کر سچ کو جھوٹ بنا دیتا ہے۔ آج گاندھی جی کی پہلی برسی کے دن سال بھر کے واقعات کا سرسری جائزہ لے کر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ اعتراض کہاں تک صحیح ہے۔

آئیے پہلے یہ سمجھ لیں کہ گاندھی جی کی تعلیم کے بنیادی اصول کیا تھے اور وہ اپنی رحلت کے وقت ہندوستان کو کس راہ پر چلا رہے تھے۔ گاندھی جی نے اپنی تعلیم کی بنا ستیہ اور اہنسا، حق اور عدم تشدد پر رکھی تھی۔ ان دونوں اصطلاحوں کے مذہبی فلسفیانہ تصور سے قطع نظر کر کے ہم یہاں صرف ان کے اخلاقی اور عملی پہلو کا ذکر کریں گے۔ اس لئے کہ گاندھی جی کی مذہبی اور فلسفیانہ تعلیم صرف ان کے خاص خاص پیرووں کے ایک چھوٹے سے طبقے تک محدود تھی جس چیز کو انھوں نے سارے ملک کے سامنے پیش کیا تھا اور کانگریس سے منوایا تھا وہ اس کا اخلاقی اور عملی پہلو تھا۔ اس لحاظ سے حق کے معنی انھوں نے یہ سمجھائے تھے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح سیاست میں بھی ادنے اور ناپاک مقاصد کے بجائے اعلی اور پاک مقصد کو سامنے رکھنا چاہیئے، اور یہ مقصد ان کے نزدیک ایک ایسی سماج بنانا تھا جس میں ہر شہری کے ساتھ یکساں قانونی، معاشرتی اور معاشی انصاف کیا جائے۔ عدم تشدد کا مفہوم انھوں نے یہ بتایا تھا کہ اور مقاصد کی طرح سیاسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بھی ذرائع ایسے اختیار کرنے چاہئیں جو بجائے خود پاک اور جائز ہوں ان ذرائع میں ان کے نزدیک اعلیٰ ذریعہ روحانی طاقت کا اور ادنے ذریعہ جسمانی طاقت کا استعمال تھا۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد گاندھی جی نے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کو موجودہ مسائل پر منطبق کر کے ملک کے سامنے آیندہ چند سال کے لئے یہ لائحہ عمل رکھا تھا۔

۱۔ ہندوستان کو ایک آزاد، غیر مذہبی جمہوری ریاست بنایا جائے۔

۲۔ فرقہ وارانہ فساد کو ختم کر کے مذہبی تعصبات کو مٹا کر ملک کے سب باشندوں میں محبت اور اخوت کا رشتہ قائم کیا جائے۔

۳۔ گرانی اور چور بازاری کی روک تھام کی جائے۔

۴۔ ملک کی تعمیر نو میں دیہات سدھار اور گھریلو صنعتوں پر زیادہ زور دیا جائے۔

۵۔ ہندوستان اور پاکستان کی کشیدگی کو دور کر کے دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

۶۔ پناہ گزینوں کے مسئلے کا عارضی حل اس طرح ہو کہ ان کے لئے مکان اور کام مہیا کیا جائے اور اس کا قطعی حل اس طرح ہو کہ ہند اور پاکستان میں ان کی واپسی کے لئے سازگار فضا پیدا کی جائے۔

اب ہم ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر دیکھتے ہیں کہ ہندوستان نے اس کے بارے میں گاندھی جی کی ہدایتوں پر کہاں تک عمل کیا ہے۔

۱۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ سے اس طرح کا تعلق رکھے گا کہ اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست میں بالکل آزاد ہوگا۔ یہ گاندھی جی کی منشار کے عین مطابق ہے۔ آئین ساز اسمبلی نے غیر مذہبی جمہوری ریاست کا اصول تسلیم کر لیا ہے۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے ارکان ریاست اور ممتاز کانگریسی لیڈروں نے اس اصول کو ملک میں اس قدر مقبول بنا دیا ہے کہ اب کوئی شخص مذہبی یا فرقہ وار ریاست کا نام لینے کی جرأت نہیں کرتا۔

۲۔ فرقہ وارانہ فساد ختم ہو گیا۔ کبھی کبھی خود غرض مفسد اس آگ کو نئے سرے سے بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ مذہبی تعصب ختم تو نہیں ہوا مگر بہت کم ہو گیا۔ عام فضا ایسی ہو گئی ہے کہ جن لوگوں کے دل میں زہر بھرا ہے وہ کھلم کھلا زہر اگلنے سے ڈرتے ہیں۔ محبت اور اخوت پیدا کرنے کی دشوار مہم جاری ہے۔ اس کی راہ میں اب بھی رکاوٹیں ہیں جن میں ایک بڑی رکاوٹ زبان کا مسئلہ ہے اس کی وجہ سے مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے اور دوسرے صوبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ملنے نہیں پاتے۔

۳۔ گرانی اور چور بازاری کا مسئلہ ہماری حکومت اور کانگریس کی دکھتی رگ ہے۔ غلہ اور کپڑے کا کنٹرول جو گاندھی جی کی کوشش سے ہٹا دیا گیا تھا اب پھر قائم ہو گیا ہے۔ یہ تو خیر اچھا ہی ہوا۔ اس لئے کہ بغیر کنٹرول کے گرانی اور چور بازاری کے خلاف جہاد صرف گاندھی جی ہی کر سکتے تھے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن کوئی دوسرے مؤثر ذریعے بھی اختیار نہیں کئے جا رہے ہیں حکومت نے پیداوار بڑھانے کی اسکیمیں بنائی ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر تسلی دے رہی ہے کہ جب یہ عمل میں آجائیں گی تو قیمتیں کم ہوں گی۔

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

بزم ماتم

سال بھر گذر گیا۔ زمیں اپنے محور کے گرد گھوم کر پھر اسی نقطے پر پہنچ گئی جہاں ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ چوٹ دل پر آج ہی لگی ہے، جیسے مہاتما گاندھی کی شہادت کی خبر ابھی ابھی آئی ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہے، دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو گیا اور اب کیا ہونے والا ہے۔

گاندھی جی کی موت ہزاروں آدمیوں کے لئے ذاتی صدمہ ہے۔ ان کا سچا ہمدرد، دلی دوست، شفیق بزرگ جو ان کا دکھ درد سنتا تھا، ان کی دنیاوی مشکلوں، اخلاقی اور روحانی الجھنوں پر غور کرتا تھا، ان کو بے لاگ مشورے اور بے غرض مدد دیتا تھا، دنیا سے اٹھ گیا۔ اب کون ان کی دستگیری کرے گا؟

یہ ہندوستان اور پاکستان کے کروڑوں آدمیوں کے لئے قومی صدمہ ہے۔ ہندوستان کا محبوب رہنما جو اس کی سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا تھا، اس کے آپس کے جھگڑوں کو چکاتا تھا، اس کو نیکی اور سچائی کی راہ پر چلاتا تھا، اس کے غریبوں اور کمزوروں کا پشت پناہ، اس کے بے کسوں اور بے بسوں کا سہارا تھا، رخصت ہو گیا۔ اب کون اس کی ہدایت کرے گا؟ پاکستان کا سچا خیر خواہ جو اس کے جائز حقوق کی حمایت کرتا تھا، اسے اس کی برائیوں پر متنبہ کرتا تھا۔ اس کی اچھائیوں کا اعتراف کرتا تھا، اس کے اور ہندوستان کے درمیان دشمنی اور نفرت کے دریا پر دوستی کا پل باندھنے کی کوشش کر رہا تھا، رحلت کر گیا۔ اب کون اس کا حوصلہ کرے گا؟

یہ کل انسانیت کے لئے ایک عالم گیر المیہ ہے۔ اہنسا کا پجاری ہنسا کا شکار ہو گیا محبت کا مبلغ نفرت کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب کون اہنسا اور محبت کا نام لے گا؟

گاندھی کے دوستو اور پیروؤ، صبر کرو اور دل کو مضبوط رکھو۔ وہ تمھیں اس کے سپرد کر گیا ہے جو اس کا اور تمھارا سب کا مالک، حافظ اور مددگار ہے۔ وہ تمھارے اندر وہ چراغ روشن کر گیا ہے جس میں تم خود اپنی راہ ڈھونڈھ لوگے۔ وہ طاقت پیدا کر گیا ہے جس سے تم آپ اپنی مدد کر دوگے۔

ہندوستان والو ہمت نہ ہارو اس کا جسم جل کر راکھ ہو گیا مگر اس کا دل اس کی روح موجود ہے، تمھیں تمھارے ہی اندر چھپی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ تم ہی میں سے تھا باہر سے نہیں آیا تھا۔ اس دل کو اس روح کو ڈھونڈھ نکالو اور اسے اپنا رہنما بناؤ۔ پاکستان والو غم نہ کرو اس نے جانے سے پہلے محبت کا بیج بو کر دوستی کا پودا اُگایا تھا، اور جاتے جاتے اپنے خون سے سینچ گیا۔ اب تم میں اور ہم میں جو امن اور انصاف کے پرستار ہیں وہ اس پودے کو کم سے کم اپنے پسینے ہی سے سینچتے رہیں تو

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ

سر تیج بہادر سپرو کے ساتھ تہذیب، اخلاق، شرافت اور وضع داری کی ایک دنیا اٹھ گئی۔ مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کا ایسا موزوں اور معتدل مرکب جیسا ان کی ذات میں نظر آتا تھا بہت کم دیکھا ہوگا۔ مشرق کی مروت، حیا، سلامت روی، کسر نفسی، دردمندی، رقت قلب، مغرب کی صاف دلی، صاف گوئی، ضبط و تحمل، اعتدال اور توازن نے مل کر ایک ایسی سجل، سگھڑ اور سڈول شخصیت تعمیر کی تھی جس میں "انسانیت" کے یونانی نصب العین کے مطابق اخلاقیات، جمالیات کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ اب بھی ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر ایسے لوگ ہیں اور ہوتے رہیں گے جن میں یہ صفات الگ الگ موجود ہوں گی، لیکن ان کا وہ دلکش مجموعہ جو تیج بہادر سپرو کی شخصیت میں تھا۔ عالمگیر لڑائیوں سے پہلے کی پرسکون فضا ہی میں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس شورش اور کشمکش کے زمانے میں نہیں ہو سکتا۔

سپرو صاحب نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو زبردست حصہ لیا ہے اس سے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے سوا بہت کم لوگ واقف ہیں۔ تدبیر جنگ کے بڑے بڑے نقشوں کے بنانے میں اور اس سلسلے میں آئینی قانون اور بین الاقوامی قانون کی گتھیوں کو سلجھانے میں انھوں نے وہ گراں بہا خدمات انجام دی ہیں جو قومی جنگ کے دوسرے سپہ سالاروں کی خدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ یہ ان کی خودداری اور خود شناسی تھی کہ انھوں نے مجلس مشورہ کو اپنا اصل مقام سمجھ کر اس سے باہر جنگ کے عملی میدان میں قدم نہیں رکھا۔ ملک کی بدقسمتی سے ایسے وقت جب ہماری نئی ریاست کو ان کی رہنمائی کی شدید ضرورت تھی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہم ان کی پاک روح کے سامنے محبت و عقیدت کا خراج پیش کرتے ہیں۔ ان کے لئے مغفرت کی اور ان کے سپوت بیٹوں اور دوسرے عزیزوں کے لئے صبر کی دعا کرتے ہیں۔

مرتا کیا نہ کرتا!

یو پی کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں مدرسوں کی ہڑتال کو اب بہت دن ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس شدید گرانی کے زمانے میں ان غریبوں کا حال زار قابل رحم ہے۔ دوسرے محکموں کے ملازم اگر اپنے ضمیر کا خون کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ دست غیب کی مدد سے اس تنگی میں کچھ فراخی پیدا کر لیتے ہیں مگر بچارے دیہاتی مدرسوں کے لئے تو ایمان بیچ کر پیٹ بھرنے کی راہ بھی بند ہے۔ اس لئے اگر وہ عاجز آ کر ہڑتال کرنے پر آمادہ ہو گئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ان کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہڑتال اور وہ بھی مدرسوں کی۔ صرف لوگوں کو اپنی جائز شکایات کی طرف توجہ دلانے کا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے حکومت اور سماج پر دباؤ ڈالنے کا کوئی مؤثر طریقہ نہیں ہے۔ یہ اخلاقی سوال اپنی جگہ پر ہے کہ مدرسوں کے لئے جن کا کام ہی ایثار و خدمت ہے۔ اس طرح کا دباؤ ڈالنا جائز اور مناسب ہے یا نہیں مگر خالص عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تب بھی دیہاتی مدرسوں میں تعلیم بند ہو جانے سے کسی پر کوئی دباؤ نہیں پڑتا۔ ابھی تک ہمارے ملک میں اس شدید نقصان کا احساس جو لاکھوں بچوں کی تعلیم چند مہینوں تک رک جانے سے پہنچتا ہے بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ اس لئے مدرسوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ان کی ہڑتال کا مقصد پوری طرح حاصل ہو چکا ہے۔ عام طور پر ملک کے لوگوں کو اور حکومت کے ارکان کو ان سے ہمدردی ہے جس کا اندازہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی لکھنؤ کی تقریر سے ہوتا ہے اب ان کو اپنی ہڑتال بند کر دینی چاہئے ورنہ وہ ستیا گرہ نہیں رہے گی بلکہ لڑائی بن جائے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مدرس اس نازک زمانے میں اپنی قومی حکومت سے لڑائی نہیں چھیڑنا چاہتے اور پھر ایسی لڑائی جس میں جیتنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور

شری وی۔ پی مینن کے بھوپال سے واپس آنے کے بعد ریاستوں کی وزارت کی طرف سے جو کمیونکے شائع ہوا ہے اس کا مفہوم اوپر کے مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل اخباروں کے پروپاگنڈا سے اسٹیٹس منسٹری کو جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ بھوپال میں فرماں روا اور عوام میں کشمکش ہے وہ شری مینن کے بھوپال جانے سے اور صورت حال کا مطالعہ کرنے سے دور ہو گئی انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ کانگریس کی دو پارٹیوں کے اقتدار کی کشمکش ہے جن میں سے ایک برسر حکومت ہے اور دوسری اسے حکومت سے ہٹانے کے درپے ہے چاہے اس میں ریاست کا مستقل وجود ہی ختم ہو جائے۔ ان میں سے کون بھوپال کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اس کا اندازہ تو مشکل ہے لیکن یہ بات صریحی ہے کہ حکومت کی مخالف پارٹی میں ہندو مہا سبھا کا عنصر بھی شامل ہے اور وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال کا یہ فرمان کہ ریاست کی رائے عامہ اپریل سے پہلے پہلے ایک آئین ساز اسمبلی منتخب کرے، اور یہ اسمبلی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ اصول جمہوریت کے عین مطابق ہے اور نواب صاحب کی پوزیشن کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی تحریک کا جاری رکھنا بے کار ہے اور ذرا سی بے احتیاطی سے دونوں پارٹیوں کے لئے ساری ریاست بلکہ کل وسط ہند کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے شری مینن نے شورش کے فوراً بند کر دینے پر زور دیا ہے۔ ان کی اور نواب صاحب کی کوشش ہے کہ انتخابات سے پہلے ہی سمجھوتے کی کوئی معقول صورت نکل آئے اور اس میں کامیابی کی بہت کچھ امید ہے بہر حال جب اسٹیٹس منسٹری اور فرمانروا میں پوری یکجہتی ہے تو بھوپال کی حالت کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔

ہندوستان گاندھی جی کے بعد

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

۴۔ کئی صوبوں میں دیہاتی پنچایتوں کا نظام قائم ہوا ہے اور محدود حکومت خود اختیاری کی بنا پڑ گئی ہے۔ دیہات سدھار کا بھی تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے لیکن دراصل یہ حکومت کے بس کی بات نہیں۔ کانگریس کو سیوا گرام کی انجمنوں کی مدد سے یہ کام انجام دینا چاہئے۔ اس پر غور ہو رہا ہے مگر ابھی تک کسی بڑی مہم کے آثار نظر نہیں آتے۔ جہاں تک گھریلو صنعتوں کا تعلق ہے گاندھی جی کا یہ اصول کبھی بھی عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا کہ ان میں طاقت سے چلنے والی مشینوں سے کام نہ لیا جائے۔ اب حکومت ہند کی پالیسی یہ ہے کہ بجلی کی نئی اسکیموں کے ذریعے دیہات میں گھر گھر بجلی پہنچائی جائے اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں بجلی کی طاقت سے چلائی جائیں۔ یہ پالیسی بظاہر گاندھی جی کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لیکن دراصل اس کی روح وہی ہے جسم زمانے کے تقاضے سے بدل گیا ہے۔

۵۔ ہندوستان اور پاکستان کی کشیدگی بڑی حد تک دور ہو چکی ہے اور دوستانہ تعلقات قائم ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

۶۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا، اور ہو بھی نہیں سکتا تھا زراعت پیشہ لوگ تو ہندوستان کی معیشت میں کھپ گئے لیکن شہروں کے رہنے والے جو مغربی پنجاب سرحد اور سندھ میں صنعت، تجارت اور دوسرے پیشوں میں لگے ہوئے تھے ابھی لاکھوں کی تعداد میں باقی ہیں جنھیں اطمینان سے رہنے اور کام کرنے کا موقع نہیں ملتا جیسا گاندھی جی کا خیال تھا ان کی مشکل کا حل یہی ہے کہ انھیں پاکستان واپس جانے کی سہولتیں ملیں۔ ان میں سے بہت سے ہیں جن کی جگہ وہاں کی معیشت میں اب خالی ہے۔ اگر امن اور رواداری کی فضا ہو تو یہ خوشی سے واپس چلے جائیں گے ان کے بدلے وہاں سے ایسے مسلمان دست کار اور پیشہ ور واپس آ سکتے ہیں جن کی یہاں کھپت ہو جائے گی۔ مگر یہ کام دونوں ریاستوں کے اتحاد عمل ہی سے انجام پا سکتا ہے اس اتحاد عمل کا رجحان ہندوستان میں بہت کچھ موجود ہے پاکستان کی حالت کا ہم صحیح اندازہ نہیں کر سکتے غرض مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں ۴

۴ کہ ہندوستان، کانگریس اور کانگریسی حکومت نے گاندھی جی کی تعلیم کو فراموش نہیں کیا۔ ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کی خواہش ہے اور ایک حد تک چل بھی رہے ہیں مگر بغیر ان کی شخصی رہنمائی کے قدم رک رک کر جھجک جھجک کر پڑ رہے ہیں اور کبھی کبھی ڈگمگا بھی جاتے ہیں۔

۲- پاکستان

قوم سے منظوری لینے کی ضرورت

پاکستان کی مرکزی حکومت نے پچھلے دنوں دو ایسے اہم فیصلے طے کئے ہیں جو ملک و ملت کے حاضر و مستقبل کے لئے درجہ اول کی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں فیصلوں کے ساتھ پاکستان کی موت و حیات اور ہماری آزاد مملکت کی عزت و آبرو کا سوال وابستہ ہے۔ اور ان فیصلوں کے نتائج حاضر و مستقبل میں پاکستان کے ہر فرد کی زندگی پر انقلاب آفریں اثر ڈال کر رہیں گے۔

ایک فیصلہ تو وہ ہے جو ہماری مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد نے کشمیر کے متعلق ہندوستان اور کشمیر کمیشن کے ساتھ طے کیا ہے .... اور اس فیصلے کی ان آھریحات نے جو ہندوستان اور پاکستان کے ذمہ دار حلقوں کی طرف سے اپنے اپنے عوام کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں جمہور پاکستان کو حد سے زیادہ مضطرب اور پریشان کر دیا ہے۔ عام لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری حکومت کے ارباب حل و عقد یو، این، او کے حلقوں سے تسلی بخش فیصلہ حاصل کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں

دوسرا فیصلہ متروکہ جائدادوں کے تبادلے اور فروخت کے متعلق ہے۔ اس فیصلے نے مہاجرین کے گھروں میں جو ہنگامہ فریاد برپا کر دیا ہے اس کی صدائے بازگشت مغربی پنجاب کے اخبارات کے کالموں میں گونج رہی ہے۔ اس فیصلے کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کے رو سے غیر ملکیوں کو یعنی ان لوگوں کو جو اب ہندوستان کے باشندے بن چکے ہیں، پاکستان کے گھروں میں آنے ان گھروں کی تلاشی لینے، سامان اٹھا لے جانے اور (اپنی) مالکانہ حیثیت سے ڈرانے دھمکانے کے حقوق دے دئے گئے ہیں اور تبادلہ اور فروخت کی کھلی اجازت دے کر مہاجرین کو ہمیشہ کے لئے خانہ بدوشوں اور خانماں برباد لوگوں کا ایک گروہ بنانے کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری قضا و قدر کے ان فرشتوں کو جنھیں ملت کی رائے عمومی نے مرکزی اقتدار کے آسمانوں پر بٹھا رکھا ہے، ملک اور قوم کے متعلق ہر قسم کے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا فرض منصبی یہ بھی ہے کہ اپنے فیصلوں کو نافذ العمل بنانے سے پہلے ملت اور جمہور سے ان کے متعلق مہر تصدیق حاصل کر لیا کریں۔ ایسے اہم فیصلوں کے متعلق جو پاکستان اور اس کے عوام کے حاضر و مستقبل کے لئے درجہ اول کی اہمیت رکھتے ہیں۔ قوم سے منظوری حاصل کرنا از بس لازمی ہے۔ اس لئے ہماری رائے ہے کہ جب تک ہماری مرکزی حکومت ان دونوں فیصلوں پر جمہور ملت کی تصدیق حاصل نہ کرے، انھیں نافذ العمل بنانے سے محترز رہنا چاہیئے۔ جمہور ملت سے تصدیق نامہ حاصل کرنے کا ایک طریق قومی پارلیمنٹ کے کھلے اجلاس یا بند کرے والے اجلاس میں پیش کر کے منظوری حاصل کرنے کی سعی کی جائے یہ عام آئینی طریقہ ہے۔ لیکن ان فیصلوں کی اہمیت کے پیش نظر ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے ملت کے ایسے نمایندہ اجتماع سے منظوری لی جائے جو پارلیمنٹ سے زیادہ وسیع ہو۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے مرکزی اور صوبائی مجالس وضع قوانین کے ارکان کا ایک بڑا اجتماع منعقد کیا جائے اور اس اجتماع کے سامنے یہ دونوں فیصلے منظوری یا استرداد کے لئے پیش کئے جائیں۔

(روزنامہ مغربی پاکستان، لاہور)

سیاسی کش مکش

پاکستان کے قیام کے بعد جہاں اور اہم سوالات فکر کو دعوت دے رہے ہیں وہاں یہ بھی ایک اہم سوال موجود ہے کہ پاکستان کو جمہوری بنیادوں پر مضبوط کرنے کے لئے کس قسم کے سیاسی اصولوں اور مطمح نظر کی حامل عوامی جماعت بنائی جائے۔

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ ۱۹۴۵ء کے الکشن سے ہوئی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کانگریس میں مہاسبھائی عناصر کے غالب آ جانے کی وجہ سے خلافتی کارکنوں اور دیگر مسلم کارکنوں نے اس مردہ جماعت میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ قائد اعظم کی ذات اس کی کامیابی کا باعث بنی۔ مگر ایک بنیادی خامی یہ رہی کہ یہ جماعت نعروں جلسوں اور تجاویز کی حد تک محدود ہو گئی۔ اس میں رجعت پسند، سرکار پرست اور سرمایہ دار طبقے مسلط ہو گئے، مخلص قومی کارکنوں کی طاقت ختم ہوتی چلی گئی چند قومی کارکنوں نے صاحب اقتدار طبقے کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند عناصر کی یہ جد و جہد ناکامیاب ثابت ہوئی، اور تقسیم ہند نے اس جد و جہد کو کچھ عرصہ کے لئے خاموش کر دیا۔

پاکستان کی مسلم لیگ کی نشو و نما جب ہونی شروع ہوئی تو اس میں بھی پرانی غلاطتیں اپنی پوری طاقت سے آنی شروع ہو گئیں۔ وہی سرمایہ داروں کی، سرمایے کے بل پر بوگس ممبر شپ بوگس پرائمریاں بنا کر برسر اقتدار آنا۔ وہی رجعت پسند عناصر، اقتدار اعلی کے لئے سازشیں کرنا۔ کراچی جہاں ہندوستان کے چارہ چیدہ قومی کارکن موجود تھے وہاں ایک ایسی مسلم لیگ قائم ہو گئی جس کی بنیاد اسی پرانے سانچے میں ڈھلی تھی۔ سندھ کا انتخاب بھی مقبول ثابت نہ ہوا سرحد کے انتخابات میں بھی خون خرابے کی توقعات ہیں۔ پنجاب کے الکشن میں گولیاں چلیں، غرض پاکستان کی مسلم لیگ کو جس قدر عوام میں مقبول ہونا تھا اور عوام کی نمایندگی کرنا تھا وہ اس معیار پر پوری نہ اتر سکی۔ آج پھر ترقی پسند مخلص قومی کارکنوں میں حرکت پیدا ہو رہی ہے آج وہ پھر رجعت پسند عناصر سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہیں۔ اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ پاکستان سے قبل پاکستان کے حصول کا نعرہ تھا ایک دلکش مطمح نظر تھا، آج کوئی دلکش مطمح نظر اور ہمت افزا نعرہ پاکستانی مسلم لیگ کے پاس موجود نہیں ہے عوام سابق بے عمل لیڈروں کی وجہ سے بے وجہ قربانیوں کا شکار ہو کر کسی حد تک متنفر ہیں اور جب مسلم لیگ ایک آزاد پاکستان کی مسلم لیگ کی قدروں سے گر گئی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام کے لئے کسی قسم کی دلکشی کا باعث بن سکے، چونکہ دس سالہ کش مکش میں مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے نعرے لگانے کے کسی حد تک عادی ہو چکے ہیں اس لئے وہ لیگ کے لیڈروں پر بھروسہ کر کے چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے۔ مگر اس کے امکانات کم ہیں کہ وہ زیادہ عرصے تک فکر و عمل نہ دیں کافی گنوا چکے ہیں، کافی لٹ چکے ہیں۔ اب چند افراد کے اقتدار اور ذاتی منفعت کے لئے وہ کسی قسم کی قربانی کے لئے تیار ہیں نہ سکت باقی ہے۔

اب معلوم ہوا ہے قومی کارکنوں کی ایک جماعت عوام کے جذبات کے مطابق عملی اقدام کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہے چند تجاویز پر غور ہو رہا ہے۔ پہلی یہ ہے کہ ایک کل پاکستان متوازی مسلم لیگ بنائی جائے۔ دوسری تجویز مسلم لیگ میں ایک ترقی پسند گروپ بنایا جائے جو اقتدار پسند طبقے کے خلاف جد و جہد کرے، تیسرا خیال مسلم لیگ کی بجائے ایک دوسری جماعت کی تشکیل کرنے پر مرکوز ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلے میں حیدر آباد میں قومی کارکنوں کی ایک کنونشن منعقد ہونے والی ہو غالباً جس میں ان تمام خیالات کا اظہار ہوگا اور کسی نتیجے پر ترقی پسند قومی کارکنوں کا اجتماع پہنچ سکے گا۔　　خورشید کراچی

مغربی پنجاب میں گورنری راج

پاکستان کے گورنر جنرل نے مغربی پنجاب میں دستور حکومت پاکستان کی دفعہ ۹۲ الف نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ وزارت موقوف ہو گئی، اسمبلی توڑ دی گئی اور صوبائی نظم و نسق کا کلی اختیار اس وقت تک کے لئے گورنر مغربی پنجاب کو دے دیا گیا جب تک نئے انتخابات کے ذریعے سے نئی اسمبلی قائم نہیں ہو جاتی۔

گورنر جنرل پاکستان کا یہ اقدام اس لحاظ سے خوش آیند ہے کہ اس نے خان ممدوٹ اینڈ کمپنی کی اس اجارہ داری کا خاتمہ کر دیا جس نے بد نظمی، اقربا نوازی خویش پروری، لوٹ کھسوٹ اور غلط بخشیوں کی صورت میں مغربی پنجاب کے صوبے کو اندھیر نگری بنا رکھا تھا۔ اس اجارہ داری نے وزارتی اقتدار پر متمکن ہونے کا مقصد ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ ملک و ملت اور جمہور کے مفاد کی طرف سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی جائیں، جمہور کی مشکلات کی طرف توجہ دینے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں۔ رائے عامہ نے انھیں اقتدار کی جس مسند پر براجمان کر دیا ہے اس کا مقصد ہی لوٹ کھسوٹ ہے اور اس مسند پر متمکن رہنے کا واحد طریق یہ ہے کہ غلط بخشیوں کے بل پر اپنے حامی بنانے کے درپے رہو۔ (مغربی پاکستان لاہور)

۳- باہر کی دنیا

خیر اتنا تو ہوا

ایشیائی کانفرنس کا باہر کی دنیا پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ رائے عامہ اگرچہ پہلے ہی سے انڈونیشیا کے حق میں تھی۔ مگر اس کانفرنس کے بعد کچھ مغربی ملکوں کے نمائندے جو پہلے گول گول باتیں کہا کرتے تھے اب ذرا واضح اور قدرے زور دار لفظوں میں انڈونیشیا کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ اس کانفرنس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ سیکیورٹی کونسل نے اس کی نئی سفارشات کو مان لیا ہے۔ ۲۹ جنوری کو اس نے ایک رزولیوشن میں اقوام متحدہ کا ایک کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو دونوں فریقوں کا مصالحت اور ۱۵ مارچ سے پہلے ایک عارضی فیڈرل حکومت کے قیام میں ہر طرح کی مدد اور سہولت بہم پہنچائے گا۔ کونسل نے اس کی بھی سفارش کی ہے کہ یکم اکتوبر تک نئے انتخابات ہو جانے چاہئیں اور یکم جولائی ۱۹۵۰ء سے پہلے پہلے ہائے متحدہ انڈونیشیا کو تمام اختیارات سونپ دئے جائیں۔

ہالینڈ کے نمائندے ڈاکٹر وان روئن نے اس فیصلہ پر بڑی کڑی نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ یہ بہت سخت اقدام ہے اور ایک ملک کے گھریلو معاملے میں مداخلت کرنا ہے۔ دوسری طرف روس کے نمائندے نے مغربی طاقتوں کو بہت سخت برا بھلا کہا ہے اور ان پر الزام لگایا کہ یہ کچھ کرنا نہیں چاہتے اور ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جس سے ڈچ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان ملکوں نے انڈونیشیا کے مسئلے کو حل کرنے کی کبھی بھی دل سے کوشش نہیں کی۔ اور اب بھی جو کچھ کر رہے ہیں وہ دکھاوے کے لئے یا دنیا کی رائے عامہ سے مجبور ہو کر۔ مغربی طاقتوں کے طرز عمل سے ایشیا سے جو طوفان اٹھنے والا ہے اس کا برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بیون نے ابھی حال میں دار العوام میں ذکر کیا ہے۔ ڈچ نمائندہ ڈاکٹر وان روئن نے بھی سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان اور ان ملکوں کو جو ایشیائی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، مخاطب کر کے اپنے خلوص کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ مغربی طاقتیں نوآبادیات اور توسیع مقبوضات کی پالیسی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

برطانیہ پینترا بدل رہا ہے

مصر اور اسرائیل کی بات چیت بہت کامیابی کے ساتھ جاری تھی مگر نقب کے مسئلہ پر دونوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اور عارضی طور پر بات چیت ٹوٹ گئی ہے۔ مصر چاہتا ہے کہ سیکیورٹی کونسل کے نومبر کے فیصلے کے مطابق نقب کا علاقہ اسے ملنا چاہئے۔ مگر یہودی اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اصل میں فلسطین کا مسئلہ جس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد بالکل نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ عربوں اور یہودیوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ برطانیہ اور امریکہ کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ان دونوں ملکوں کے مفاد میں وہاں ایک حد تک تصادم ہوتا ہے اسی لئے یہ ساری کشمکش ہے جس وقت ان دونوں میں کسی قسم کی مفاہمت ہو جائے گی۔ اس وقت مصر اور اسرائیل میں بھی صلح ہو جائے گی اور عرب ریاستیں بھی خاموش ہو جائیں گی

ابھی حال میں دار العوام میں فلسطین کے مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی مسٹر چرچل کی مخالفت تو خیر کوئی نئی بات نہیں مخالف پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے یہ ان کا فرض ٹھہرا مگر خود لیبر پارٹی کے بعض ممبروں نے اپنی حکومت کی پالیسی پر اعتراضات کئے اور رائے شماری کے وقت ان کی ایک خاصی تعداد ایوان سے غائب رہی مسٹر بیون نے اعتراضات کے جواب میں عربوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ مگر اس مخالفت کا فوری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ برطانیہ نے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس سے ایک طرف اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کے ساتھ برطانیہ کی ہمدردی کسی اصول کی خاطر نہیں تھی۔ اور جس وقت مشرق وسطی میں اس کا اپنا مفاد محفوظ ہو جائے گا وہ عرب ریاستوں کو چھوڑ کر الگ ہو جائے گا یا انہیں سمجھوتے پر مجبور کر دے گا تو دوسری طرف اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ امریکہ سے اگر مفاہمت نہیں ہو سکی ہے تو اب ہونے والی ہے اس کے بعد دیکھئے فلسطین کا مسئلہ جو مدتوں سے سیکیورٹی کونسل کے درد سر کا باعث بنا ہوا ہے۔ منٹوں میں حل ہو جائے گا

برما پھر ڈانوا ڈول ہے

تھاکن نو کی حکومت، کچھ دن ہوئے مستعفی ہو گئی اور اس کے فوراً بعد وسط برما میں کرن قبیلوں اور حکومت میں وسیع پیمانے پر کوئی چالیس میل کے محاذ پر لڑائی چھڑ گئی ہے۔

کرن برما کے ایسے وسیع اور زرخیز ترین علاقے میں اپنی الگ اور خود مختار حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جہاں برمیوں کی کافی تعداد آباد ہے اور جو چاول کی پیداوار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں برمی حکومت سے ان کی بہت دنوں سے بات چیت ہو رہی تھی۔ اس مہینے کے شروع میں خبر آئی تھی کہ مصالحت کے قوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ کرن قبائل کے بیرونی دوستوں کو پسند نہیں آئی اور انھوں نے ان کو پھر بھڑکا کر لڑنے پر آمادہ کر دیا۔

بزم ماتم

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

یہ بہت جلد ایک تناور درخت بن جائے گا جسے زمانے کی مخالف ہوا کے جھکڑ اکھاڑ نہ سکیں گے۔

اے عالم انسانیت مایوس نہ ہو وہ اپنا اہنسا اور محبت کا پیام صرف کاغذ کے صفحات پر نہیں بلکہ زمانے کی لوح پر نقش کر گیا ہے۔ آنے والی نسلوں میں بہت سے ایسے ہوں گے جو اس پیام کو پڑھیں گے اور گنیں گے۔ اور کچھ ایسے بھی نکل آئیں گے جو اسی کی طرح اس پر عمل کر کے دکھا دیں گے۔

ظاہر میں گاندھی مر گیا مگر حقیقت میں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔
ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام او

نظر کی کوتاہیاں

سید اختر علی اختر تلہری

بندۂ زر کو حرم کا پاسباں سمجھا تھا میں
رہزنِ ملت کو میرِ کارواں سمجھا تھا میں

جو نہیں تھا محرمِ اسرارِ عشقِ پاک ذوق
بدنصیبی سے اُسے پیرِ مغاں سمجھا تھا میں

غور سے دیکھا تو وہ تھا مستِ پندارِ خودی
جس کو فخرِ دودمانِ قدسیاں سمجھا تھا میں

وہ تو نکلا اور بھی اوہام کے زیرِ نگیں
جس کو میرِ مجلسِ دانش وراں سمجھا تھا میں

ایک بجلی ایک تندی سے جو بچ سکتے نہ تھے
ان خس و خاشاک کو آرامِ جاں سمجھا تھا میں

الاماں یہ ذوقِ عرفاں کی مرے کوتاہیاں
رشکِ کعبہ ہی کو اس کا آستاں سمجھا تھا میں

اللہ اللہ یہ فریبِ وہم کی عشوہ گری
خاکدانِ دہر کو اپنا مکاں سمجھا تھا میں

اب جو دیکھا تو جہاں کی وسعتوں کی حد نہ تھی
چار دیوارِ عناصر کو جہاں سمجھا تھا میں

تھی وہ اپنی ہی نظر کے ذوق کی جلوہ گری
جس کو رنگینیِ روئے گلرخاں سمجھا تھا میں

جب کھلیں آنکھیں تو وہ تھا حسرتوں کا اک مزار
اپنے دل کو کامگاروں کا مراں سمجھا تھا میں

ہوش جب آیا تو ان میں بھی نہ پایا کوئی کیف
نغمہ و مے کو نشاطِ جاوداں سمجھا تھا میں

بال و پر جب ہو گئے بیکار تب آنکھیں کھلیں
وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں

چند نوحے نکلے اس کے زمزموں کی کائنات
عندلیبِ خوش نوا کو شادماں سمجھا تھا میں

غور سے دیکھا تو نکلے خار بھی جانِ چمن
ان گلوں ہی کو متاعِ گلستاں سمجھا تھا میں

جادۂ عرفاں میں ان کی ضو بکھر کر رہ گئی
عقل و دانش کو چراغِ رہرواں سمجھا تھا میں

اب کھلا یہ بھی تھے اندازِ نظر کے شعبدے
جن کو اخلاق آج تک سود و زیاں سمجھا تھا میں

عزمِ پرواز

تیغ الہ آبادی

اپنی پستی کے تصور سے نہ ہو افسردہ
مخزنِ فسرقِ اُفق پر کلہِ کج کی طرح
ڈوب جانے دے اگر ایک کرن ڈوب گئی
مسکرا دوست اُبھرتے ہوئے سورج کی طرح

تیرا اقبال نہ ساکت ہے، نہ جامد، نہ اُداس
حسرتیں اب بھی وہی جوش لئے بیٹھی ہیں
مرد اُمیدوں کے نزدیک ہی اے رہروِ زیست
منزلیں گرمیِ آغوش لئے بیٹھی ہیں

اک نئے عہد کی اُمید، نئی صبح کی ضو
مسکراتے ہیں اندھیرے میں چراغاں کتنے
زیست کے جامۂ صد چاک کا ماتم کیسا
زیرِ تخلیق ہیں خلاق گریباں کتنے

سو چکے وقت کے سینے میں جواں انگارے
یہ تری شعلہ نوائی کا نیا دور سہی
عزمِ پرواز کی توہین سے مایوس نہ ہو
ایک بار اور سہی اور سہی اور سہی

میرے بعد

سیدہ فرحت

آپ رہنے کے نہیں مجھ سے خفا میرے بعد
عفو ہوگی مری ایک ایک خطا میرے بعد

یاد رکھ اے مجھے ہنس ہنس کے رلانے والے
خوں رلائے گی تجھے میری وفا میرے بعد

رنگِ رُخ پھولوں کا اُڑ جائے گا ماتم سے مرے
ہوگی افسردہ گلستاں کی فضا میرے بعد

روز و شب نوحہ کرے گی مرے غم میں بلبل!
آہیں بھرتی ہوئی آئے گی صبا میرے بعد

غم کدے میں نہ رہی آہ وہ رونق باقی
در و دیوار سے آئے گی صدا میرے بعد

ہے یہ افسوس نشیمن نہ مرا پائے گی
در بدر بھٹکے گی پھر برقِ بلا میرے بعد

موت کا غم نہیں بس ایک قلق ہے فرحتؔ
درد ہو جائے گا پہلو سے جدا میرے بعد

چند لفظ گاندھی جی کے بارے میں

آلڈوس ہکسلے

(اس مضمون کے حقوق محفوظ ہیں۔ سب سے پہلے یہ "ویدانتا اینڈ دی ویسٹ" بابت مئی، جون ۱۹۴۸ء جلد ۱۱، نمبر ۳ میں چھپا تھا۔ اب یونیسکو کے "خزینۂ ادب" کی معرفت نئی روشنی میں اشاعت کے لئے بھیجا گیا ہے۔)

گاندھی جی کی ارتھی فوجی گاڑی میں رکھ کر چتا تک پہنچائی گئی۔ جنازے کے ساتھ ٹینک اور مسلح گاڑیاں فوج اور پولیس کے دستے تھے۔ اوپر ہندوستانی ہوائی فوج کے شکاری ہوائی جہاز منڈلا رہے تھے تشدد اور جبر کے ان آلات کی نمائش اس شخص کے اعزاز میں ہو رہی تھی جو اہنسا اور روحانی قوت کا علم بردار تھا زمانے کی یہ ستم ظریفی ناگزیر تھی۔ اس لئے کہ منطقی تعریف کی رو سے قوم ایک با اقتدار جماعت ہے جس کے پاس دوسری با اقتدار جماعتوں سے جنگ کرنے کے وسائل موجود ہوں، اور جب کسی فرد کو۔ چاہے وہ فرد گاندھی کیوں نہ ہو۔ قوم کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا جائے تو وہ لازمی طور پر فوجی قوت کی نمائش کی صورت میں ہوگا۔

کوئی چالیس سال ہوئے گاندھی جی نے اپنی کتاب "ہند سوراج" میں اپنے ہم وطنوں سے یہ سوال کیا تھا "سیلف گورنمنٹ" اور "ہوم رول" سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ملک کا نظام جیسا ہے ویسا ہی رہے مگر وہ انگریزوں کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ ہندوستانی سیاسی لیڈروں اور حاکموں کے ہاتھ میں ہو؟ اگر ایسا ہے تو گویا تمہاری خواہش یہ ہے کہ شیر کے پنجے سے چھوٹ جاؤ مگر شیر کی بہیمی خصلت اپنے اندر باقی رکھو یا تم سوراج کا وہ مطلب سمجھتے ہو جو میں سمجھتا ہوں ——— کہ ہندوستانی تہذیب کے سب سے اونچے نصب العین کو عملی جامہ پہنایا جائے ان لوگوں کے ہاتھوں جو انفرادی طور پر اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوں اور اجتماعی طور پر ستیاگرہ کے اصول اور طریقے کے مطابق عمل کرتے ہوں؟

اس دنیا میں جس کی تنظیم جنگ کے اصول پر ہوئی ہو ہندوستان کے لئے اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا قریب قریب ناممکن تھا کہ وہ اور قوموں کی طرح ایک قوم بن جائے وہ لوگ جو بدیسی ظالموں کے خلاف اہنسا کی لڑائی لڑ رہے تھے ایک دم سے ایک با اقتدار ریاست کے مالک بن گئے جو تشدد کے آلات سے آراستہ تھی۔ ایک رات میں یہ انقلاب ہو گیا کہ جو لوگ قیدی رہ چکے تھے وہ جیلر بن گئے اور جو جنگ کے مخالف تھے وہ فوج کے سپہ سالار ہو گئے۔ ان کی یہ خواہش ہو یا نہ ہو مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

تاریخی نظیروں کو دیکھتے ہوئے امید کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ جب اسپین کی آبادیوں نے آزاد ہو کر مستقل ریاستوں کی حیثیت اختیار کی تو کیا ہوا تھا؟ ان کی نئی حکومتوں نے فوجیں بھرتی کیں اور آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ یورپ میں مزینی تصور پرست انسان دوست قومیت کا مبلغ تھا۔ مگر جب مظلوموں نے آزادی حاصل کی تو تھوڑے ہی دن میں وہ خود ظالم اور سامراجی بن گئے اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ جس ڈھانچے کے اندر انسان سوچتا ہے وہ اس کی فکر کے نظری اور عملی نتائج کا تعین کرتا ہے۔ اگر ہم اقلیدس کے اصول موضوعہ کو مان کر چلتے ہیں تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایک مثلث کے زاویے مل کر دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم اگر قومیت کے اصول موضوعہ کو مان لیں تو اسلحہ بندی، جنگ اور سیاسی اور معاشی قوت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت کے سوا اور کوئی نتائج نہیں نکل سکتے۔

فکر اور احساس کے بنیادی نقشے جلدی نہیں بدل سکتے۔ غالباً اس میں بہت دن لگ جائیں گے کہ قومیت کے ڈھانچے کے بجائے کوئی اور ڈھانچہ بنے جس میں انسان قومیت سے الگ ہو کر سوچ سکے۔ مگر اس اثنا میں صنعت بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ معمولی حالت میں اس ذہنی جمود پر غالب آنے کے لئے جو قومی طرز خیال نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے دو قرن بلکہ دو صدیاں چاہئے تھیں۔ مگر سائنس کی ایجادات نے جن سے جنگ میں کام لیا جاتا ہے ایسی حالت پیدا کر دی ہے کہ اگر ہم اپنی خیریت چاہتے ہیں تو ہمیں یہ ہفت خواں دو سال میں سر کرنا ہے۔ اس تھوڑے عرصے میں اس کام کا انجام پانا اگر ناممکن نہیں تو قریب قریب ناممکن ہے۔

گاندھی جی کو قومی آزادی کی لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ان کو ہمیشہ یہ امید رہی کہ ہنسا کی جگہ اہنسا سے کام لے کر اور معاشی اور سماجی زندگی میں لامرکزیت کے اصول پر عمل کر کے وہ قومیت کی کایا پلٹ دیں گے۔ ابھی تک ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی ہے۔ نئی قوم اس لحاظ سے دوسری قوموں سے مشابہت رکھتی ہے کہ وہ جبر و تشدد کے آلات سے آراستہ ہے۔ اس کے علاوہ جو منصوبے اس کی معاشی ترقی کے بنائے گئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کی صنعتی ریاست ہو جس میں بڑے بڑے کارخانے سرکار کے یا سرمایہ داروں کے انتظام میں چلائے جائیں۔ مرکز کی قوت روز بروز بڑھتی جائے مادی زندگی کا معیار اونچا ہوتا جائے۔ اس کے ساتھ یقینی طور پر (۱) وہ اعلیٰ درجے کی صنعتی ریاستوں کی طرح اعصابی الجھنیں اور نفسی جسمانی امراض بھی بڑھتے جائیں گے۔ گاندھی جی اپنے ملک کو شیر کے پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر شیر کی اس بہیمی خصلت کو جو قومیت کا لازمی جزو ہے بدلنے میں ان کی کوششیں ناکام رہیں تو کیا پھر ہمیں بالکل مایوس ہو جانا چاہئے؟ میرے خیال میں تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ واقعات کا دباؤ بہت سخت ہوتا ہے اور آخر میں سب کو اس کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ حقیقت کھل جائے گی کہ یہ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والا واقعات کی زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے تھا۔ یہ تصور پرست بڑا عملی آدمی تھا۔ اس لئے کہ گاندھی جی کی سماجی اور معاشی نظریات انسان کی فطرت اور کائنات میں اس کے مقام کے صحیح اندازے پر مبنی ہیں۔ ایک طرف وہ یہ جانتے تھے کہ تنظیم اور صنعت کی ساری ترقیاں اس بنیادی حقیقت کو نہیں بدل سکتیں کہ انسان ایک معمولی قد و قامت کا جانور ہے اور بہت سی باتوں کے لحاظ سے اس کی قابلیت بہت محدود ہے۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان جسمانی اور ذہنی حدود کے باوجود اس میں روحانی ترقی کی نامحدود صلاحیت ہے۔ گاندھی جی کے اکثر ہم عصر اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ صنعت اور تنظیم کی ترقی اس چھوٹے سے جانور انسان کو ایک فوق انسانی ہستی بنا سکتی ہے اور اس نامحدود روحانی ترقی کا بدل ہو سکتی ہے جس کا انکار آج کل ایک عقیدۂ راسخ بن گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دو رنگی مخلوق کے لئے جو حیوانیت اور روحانیت کی سرحد پر رہتا ہے کس قسم کا سماجی، سیاسی اور معاشی نظام سب سے زیادہ موزوں ہے؟ گاندھی جی نے اس کا سیدھا سادہ اور بہت معقول جواب دیا۔ انہوں نے کہا انسان درحقیقت ایسی جماعتوں میں رہتا اور کام کرتا ہے جو اس کے جسمانی اور ذہنی پیمانے کے مطابق ہوں۔ یہ جماعتیں اتنی چھوٹی ہونی چاہئیں جن میں سچی حکومت خود اختیاری اور شخصی ذمہ داری کے پنپنے کا موقع ہو اور ان کو ملا کر ایک بڑا وفاق اس طرح بنانا چاہئے کہ طاقت کے غلط استعمال کی ترغیبات موجود نہ ہوں۔ جمہوری سماج جتنی بڑی ہو اتنی ہی حقیقی عوامی حکومت کا امکان گھٹ جاتا ہے اور اسی نسبت سے افراد اور مقامی جماعتوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کم دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ الفت و محبت دراصل شخصی رشتے ہیں اس لئے وہ چیز جسے سینٹ پال نے "احسان" کہا ہے اپنے آپ کو صرف چھوٹی ہی جماعتوں میں ظاہر کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت کا چھوٹا ہونا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ اس کے ارکان آپس میں "احسان" سے کام لیں گے مگر اس کی وجہ سے "احسان" کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑی بے میل جماعتوں میں تو سرے سے اس کا امکان ہی نہیں ہوتا محض اس وجہ سے کہ اس کے اکثر ارکان کو آپس میں شخصی تعلقات قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا "جو محبت نہیں کرتا وہ خدا کو نہیں پہچانتا اس لئے کہ

خدا محبت ہے " احسان روحانیت کا ذریعہ ہے اور مقصد بھی۔ جو سماجی تنظیم ایسی ہو کہ اس کے اندر بہت سے معاملات میں احسان نہ برتا جا سکے وہ صریحی طور پر بری ہے۔

معاشی لامرکزیت کے ساتھ ساتھ سیاسی لامرکزیت بھی ہونی چاہئے۔ افراد خاندانوں اور چھوٹی چھوٹی امداد باہمی کی انجمنوں کے پاس اتنی زمین اور پیداوار کے آلات ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر سکیں اور جو بچے وہ مقامی بازار میں بیچ سکیں گاندھی جی ان آلات کو صرف ہاتھ کے اوزار تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ لامرکزیت کے اور حامی ——— اور خود میں بھی ان کا ہم خیال ہوں ——— اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے کہ طاقت سے چلنے والی مشینوں سے کام لیا جائے مگر اتنے ہی پیمانے پر افراد اور چھوٹی چھوٹی امداد باہمی کی جماعتوں کے لئے موزوں ہو۔ ظاہر ہے کہ ان طاقت سے چلنے والی مشینوں کو بنانے کے لئے بڑے بڑے کارخانے درکار ہوں گے جو اعلیٰ درجے کے تخصیص کے اصول پر کام کرتے ہوں۔ افراد کو اور چھوٹی جماعتوں کو دولت پیدا کرنے کے آلات مہیا کرنے کے لئے ملک کی مجموعی مصنوعات کا ایک تہائی ان بڑے کارخانوں میں تیار کرنا ہوگا۔ لامرکزیت کے ساتھ ساتھ میکانی کارکردگی کو قائم رکھنے کی یہ قیمت کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ حد سے زیادہ میکانکی کارکردگی آزادی کی دشمن ہے۔ اس لئے کہ اس سے ضابطہ بندی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور بے ساختہ پن باقی نہیں رہتا۔ حد سے کم میکانکی کارکردگی بھی آزادی کی دشمن ہے اس لئے کہ اس کا نتیجہ دائمی افلاس اور ابتری ہے۔ ان دونوں انتہائی صورتوں کے بیچ میں ایک معقول حد اوسط ہے جس میں ہم جدید صنعت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اور اس کی حد سے زیادہ سماجی قیمت نہ دینی پڑے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ بات یاد دلاتا ہوں کہ اگر مغربی جمہوریت کے ایک سچے علم بردار کو اپنے اصول پر عمل کرنے کا موقع ملتا تو امریکہ آج صرف ۴۸ ریاستوں کا نہیں بلکہ ہزاروں خود مختار وارڈوں کا وفاق ہوتا۔ اپنی لمبی عمر کے آخری لمحے تک جیفرسن اپنے ہم وطنوں کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ اپنی حکومت کو لامرکزیت کی آخری حد تک پہنچا دیں۔ جس طرح کیٹو اپنی ہر تقریر کو ان الفاظ پر ختم کرتا تھا۔ "کارتھیج کو برباد" اسی طرح میں ہر بات کی تان اس پر توڑتا ہوں ——— ملک کو وارڈوں میں بانٹ دو " پروفیسر جان ڈیوی کے الفاظ میں جیفرسن کا مقصد یہ تھا کہ ہر وارڈ ایک چھوٹا سا جمہوریہ ہو۔ ایک وارڈن کے ماتحت اور ان سب امور میں خود مختار ہو جن کا انتظام وہ اپنی نگرانی میں پوری ریاست یا پورے ملک کی جمہوریہ سے بہتر کر سکتا ہے .... مختصر یہ کہ وہ خود اپنے معاملات میں براہ راست حکومت کے سارے ملکی اور فوجی اختیارات برت سکے اس کے علاوہ جب کوئی اہم معاملہ پیش آئے جس کے اثر کا دائرہ زیادہ وسیع ہو تو سب وارڈوں کا جلسہ ایک ہی دن کیا جائے تاکہ ساری قوم کی مجموعی رائے معلوم ہو جائے۔ اس تجویز پر عمل نہیں ہوا مگر یہ جیفرسن کے سیاسی فلسفے کا ایک لازمی جز تھی " یہ ان کے سیاسی فلسفہ کا لازمی جز اس وجہ سے تھی کہ ان کا فلسفہ بھی گاندھی جی کے فلسفے کی طرح دراصل اخلاقی اور مذہبی تھا۔ ان کے نزدیک سب انسان پیدائش کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اس لئے کہ سب خدا کے بچے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ کچھ حقوق رکھتے ہیں اور کچھ ذمہ داریاں۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں سب سے بہتر طریقے پر خود مختار جمہوریتوں کے سلسلہ مدارج کے اندر برتی جا سکتی ہیں جو وارڈ سے شروع ہوتا ہو اور ریاست سے گزرتا ہوا وفاق تک پہنچتا ہو۔

پروفیسر ڈیوی لکھتے ہیں " مختلف زمانوں میں مختلف الفاظ رواج پاتے ہیں اور مروجہ الفاظ کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ جن الفاظ میں جیفرسن نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ سیاسی تنظیم کو اخلاقی معیار پر جانچنا چاہئے اور صرف جمہوری ادارے ہی اس معیار پر پورے اترتے ہیں، وہ الفاظ اب مروج نہیں ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید جمہوریت کو ان حملوں سے بچانا جو اس پر کئے جاتے ہیں اسی بات پر موقوف ہو کہ ہم جمہوریت کی اخلاقی بنیاد اور مقصد کا وہی نظریہ اختیار کریں جو جیفرسن نے کیا تھا۔ چاہے ہمیں جمہوریت کے اخلاقی تصور کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ دوسرے تلاش کرنے پڑیں، اس عقیدے کی تجدید کہ سب انسانوں کی فطرت ایک ہے اس کے اندر وسیع امکانات خصوصاً معقول اور سچی باتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے آمریت کے خلاف ایک مضبوط حصار کا کام دے سکتی ہے۔ مخصوص جمہوریت کے مادی فوائد

کا ثبوت دینا یا چند قانونی اور سیاسی ضابطوں کی پرستش کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں۔

گاندھی جی بھی جیفرسن کی طرح سیاست کا اخلاقی اور مذہبی تصور رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سیاسی مسائل کا جو حل انھوں نے تجویز کیا ہے وہ اس عالی قدر امریکی کے پیش کئے ہوئے حل سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ بعض لحاظ سے وہ جیفرسن سے بہت آگے بڑھ گئے۔ مثلاً انھوں نے سیاسی لامرکزیت کے ساتھ معاشی لامرکزیت پر بھی زور دیا اور جیفرسن کی اس تجویز کی جگہ کہ "ہر وارڈ میں مقامی فوج ابتدائی قواعد کیا کرے گی" ستیاگرہ کا نسخہ بتایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اخلاقی تصور زیادہ گہرا اور ان کا مذہبی تصور زیادہ حقیقت پسندانہ تھا جیفرسن کی تجویز نہیں مانی گئی۔ گاندھی جی کی بھی نہیں مانی گئی۔ یہ ہماری اور ہماری اولاد کی قسمت!

گاندھی جی کی سادگی

(۲)

ڈاکٹر سید عابد حسین

آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ پرانے زمانے کے بھولے بھالے نئے زمانے کے سیانے لوگوں کو گاندھی جی کی شخصیت کیوں اس قدر پیچیدہ نظر آتی ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھیں کہ آیا ان لوگوں کے نقطۂ نظر، انسانی فطرت کا مکمل مشاہدہ کرنے کے لئے موزوں بھی ہیں یا نہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کے حضرات کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نیکی اور ان کا خلوص کتنا ہی قابل قدر کیوں نہ ہو۔ مگر ان میں اتنی نفسیاتی بصیرت نہیں ہوتی کہ سطح کے نیچے نظر ڈال کر سیرت کی گہرائیوں کو دیکھ سکیں۔ ان میں سے کچھ تو حد سے زیادہ تعمیم کی وجہ سے، نفس انسانی کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور کچھ حد سے زیادہ تخصیص کی وجہ سے، کچھ لوگ تو تحلیل نفسی کے ریاضیاتی نظریے، کو جو ابھی اپنے محدود علاقے پر بھی پورا تسلط قائم نہیں کر سکا، نفسی زندگی کی پوری اقلیم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور باقی لوگ انسان کو مجموعی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مخصوص ٹائپ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ یہ بے چارے حقیقت میں مجبور ہیں۔ اس لئے کہ یہ پیدا ہوئے۔ مغربی تہذیب کے دور میں، جسے بے قید توسیع نے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے کہ اس کے مختلف شعبوں، اخلاق، سیاست، معیشت، آرٹ کے دائرے الگ الگ ہو گئے ہیں اور ان میں باہم ربط باقی نہیں رہا۔ اس تفریق اور تخصیص کے دور میں مصلح، عالم، فن کار نظر آتے ہیں۔ مذہبی آدمی، سیاسی آدمی، معاشی آدمی دکھائی دیتے ہیں مگر "آدمی" کہیں نہیں ملتا جب انھیں گاندھی جیسی شخصیت سے سابقہ پڑتا ہے، جس کے اندر انسانی زندگی کے مختلف دھارے مل کر ایک ہم رنگ و ہم آہنگ دریا کی طرح بہتے ہیں تو ان کی تفریقی نفسیات اس کے سمجھنے میں کام نہیں دیتی، اور ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے

ان کے لئے کیا اچھا ہو، اگر وہ گاندھی جی کی شخصیت کی دور از کار تعبیریں کرنے کے بجائے اس سیدھی سادھی تعبیر کو مان لیں، جو خود گاندھی جی نے تلاش حق میں پیش کی ہے "تلاش حق" کا مصنف درسی نفسیات کا ماہر تو نہیں ہے، لیکن اس نے مشاہدۂ نفس میں ڈوب کر اپنی سیرت کا ایسا سچا اور بے لاگ نقشہ پیش کیا ہے، جیسا اس کا کوئی سوانح نگار اب تک پیش نہیں کر سکا۔ یہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جس میں ایسی صفات ہیں، جو کمزور سے کمزور انسان کو فولاد کی طرح مضبوط بنا سکتی ہیں۔ ایک تو اس کے دل میں سچائی کی لگن ہے اور وہ سچائی کو زندگی سے الگ نہیں سمجھتا، بلکہ زندگی کا رنج [illegible] جان کر اس کے ہر گوشے میں، خواہ وہ طلب علم، کاروبار، سیاست خدمت ہو، تلاش کرتا ہے۔ دوسرے وہ سچائی کو بحث کر کے رکھنے کی چیز نہیں، بلکہ برتنے کی چیز سمجھتا ہے اور حق کی ہر جھلک کو جو اُسے نظر آتی ہے، عمل میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر ہم ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لیں تو بہت سے تناقض اور بہت سی بے ربطیاں، جو ہمیں پہلی نظر میں گاندھی جی کے قول اور عمل میں دکھائی دیتی ہیں، دور ہو جائیں۔ گاندھی جی حق کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور وہ یہ عمل گوشۂ خلوت ہی میں نہیں، بلکہ میدان جلوت میں کرتے تھے تاکہ دوسرے بھی ان کا ساتھ دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ راہ طلب کے سالک کا قدم کبھی رکتا بھی ہے، کبھی ڈگمگاتا بھی ہے، کبھی بہک بھی جاتا ہے۔ مگر جب تک اس کی نیت خالص اور اس کا ارادہ مضبوط ہے، وہ پھر پھر کر راہ پر آجاتا ہے اور منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی جھوٹے گواہوں کی گڑھی ہوئی شہادت نہیں جو بظاہر مربوط، مسلسل اور نہایت سادہ ہوتی ہے لیکن ہوشیار وکیل کی جرح میں ٹوٹ کر پرزے پرزے ہو جاتی ہے۔ وہ سچے گواہ کا رکتا، جھجکتا، اکھڑا اکھڑا بیان ہے جو بظاہر پیچیدہ اور بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ مگر اپنے اندر سچائی کی اندرونی وحدت اور حقیقی سادگی رکھتا ہے۔ ان کے عمل کی صرف یہ غرض نہیں تھی کہ کامیابی حاصل ہو، ان کے قول کا محض یہ مدعا نہیں تھا کہ لوگ اسے مان لیں، ان کا سب سے برتر مقصد سچائی تھا، اور سب مقاصد اس کے تابع تھے۔

کتب خانہ کے آداب

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۴)

کو تباہ کرتے ہیں، اور کبھی کبھار اپنی مالی ضرورت پوری کرنے کے خیال سے ایک دو کتابیں پار کر دیتے ہیں تو بہر حال یہ لوگ کم پڑھے لکھے ہیں، اونچے اخلاق اور پاکیزہ چلن کی ان سے زیادہ توقع کس طرح رکھی جا سکتی ہے۔ ہاں پڑھے لکھے ان کے سامنے خوش چلنی کا اچھا نمونہ رکھیں تو ان میں بھی کسی قدر ریس میں اور زیادہ تر اخلاقی دباؤ سے اچھی صفتیں رفتہ رفتہ پیدا ہو جائیں گی۔

یہ تو بڑی جرأت کا کام ہو کہ میں کتب خانے کو مسجد یا مندر کے برابر جگہ دوں۔ لیکن یہ میرا ایمان ہے کہ عبادت گاہوں کے بعد اگر کسی جگہ کو مقدس کہا جا سکتا ہے تو وہ یہی علمی خزانے ہیں۔ دنیا بھر کی الہامی کتابیں، نسلوں کی فلسفیانہ موشگافیاں ملک ملک کی اخلاقی تعلیم اور ہزاروں برس کی تاریخی کہانیاں، غرض انسانی زندگی سے متعلق ہر چیز اس خزانے کی چار دیواری کے اندر محفوظ ہے۔ پچھلے انسانوں کی لغزشوں اور ان کے نقصانوں کو پڑھ کر ہم اپنے آپ کو ان سے بچا سکتے ہیں اور اچھائیاں اور ان کے فائدے دیکھ کر اپنے اخلاق و عمل کو سنوار سکتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ مسجد اور مندر کی طرح انسانوں سے آباد کتب خانہ بھی بڑی حد تک اسی کتاب کے خزانے پر ہے۔ اس صورت میں کیا بجا ہے، اگر میں اور میرے ساتھ آپ بھی کتب خانوں کے سیوا کو مذہبی کام تسلیم کریں اور ان میں آتے جاتے ان تمام اخلاقی اچھائیوں کو اپنے چال چلن کا ضروری جز بنا لیں۔ جن کا لحاظ عبادت گاہوں میں آنے جانے والوں کے لئے لازمی گنا جاتا ہے۔ اگر ہم سب نے اپنی اپنی جگہ یہ عہد کیا کہ کتب خانوں کے سلسلے میں ہمارا چلن سدا اچھا ہی رہے گا اور اس عہد کو اپنے عمل سے پورا کر دکھایا، تو یہ ملک اور قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی، جو اصل میں خود اپنی ہی سیوا ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر کی گئی)

کھٹمل

(بہ سلسلہ صفحہ [illegible])

سچ تو یہ ہے کہ کھٹمل کے وجود نے ان [illegible] فنا کر کے رکھ دیا ہے جن کی بنیادیں دولت کی کمی اور اس کی زیادتی پر قائم ہیں۔ اس کے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ دکھ درد میں امیر غریب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں اقتصادی مساوات کا قائل ہے۔ اس کا معیار بلند ہے اور انتخاب منصفانہ۔ دولت کی کمی اسے متاثر کر سکتی ہے لیکن زیادتی سے وہ ہمیشہ متنفر رہتا ہے کبھی کبھی تو وہ غریبوں کا مخلص بن کر خود انتقام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ غریب اس کی خاطر کرتے ہیں اور وہ ان کی خدمت میں دن رات لگا رہتا ہے۔ کیونکہ جس کھاٹ پر غریب خراٹے لے کر رات بھر سکھ کی نیند سو سکتا ہے اس پر امیر پانچ منٹ بیٹھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا کی قوموں میں میل ملاپ قائم کیا جائے مختلف ملکوں کے بڑے بڑے لیڈر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور امن و صلح کی تجاویز پر غور کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک انسانوں اور کھٹملوں کے نمائندوں کی کوئی متحدہ کانفرنس منعقد نہیں کی گئی ان کے تعلقات اب تک کشیدہ چلے جاتے ہیں اور وہ اکثر نبرد آزما رہتے ہیں یہ طرز عمل دنیا کے امن کے لئے سخت مضر ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپس میں میل جول پیدا کیا جائے نہ انسان کھٹمل کو ماریں اور نہ کھٹمل انسان کو ستائیں۔ کھٹمل آزادی کے ساتھ چارپائیوں میں رہیں۔ لیکن انھیں چاہئے کہ "رہو اور رہنے دو" کے اصول پر عمل کریں۔ دیکھئے کھٹملوں کی طرف سے اس پیش کش کا کیا رد عمل ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کھٹملوں نے بہت جلد اپنی پالیسی کو نہ بدلا تو ایٹم کی طاقت پر گھمنڈ کرنے والا انسان ان کو تباہ کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھے گا۔

"شیو کا باغ"

علی عباس حسینی

شیو نے پیشانی سے پسینہ پونچھ کر کہا "تھک گیا بھگوان!"

برہما ہنسا، آسمان، زمین، سورج، چاند تارے پہاڑ، سمندر، سب اُس کے قہقہے کی آواز سے گونج اُٹھے۔ سامنے کھڑے ہوئے شیو بھی، اس طرح ہلنے لگے، جیسے کوئی ستار کے تار پر زور سے انگلی مار دے۔ برہما نے ان کی حالت دیکھی۔ "کیوں؟" اس نے گونج دار آواز میں پوچھا۔

"میں نے تیرے حکم سے اتنی دنیائیں تیار رکھیں اور اتنی قوتیں رہنے بسنے والی، ان کو آباد اور ... نے والی بھر دی ہیں کہ ان کی گنتی اب مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس تو ہی جس سے گنتی شروع اور جس پر ختم ہوتی ہے، ان کی گنتی جان سکتا ہے۔" انھوں نے کانپ کر کہا۔

برہما کی آنکھیں چمکیں۔ چاندوں، سورجوں، تاروں، دنیاؤں میں کوندا سا لپکا۔ اتنا تیز، اتنا چمکیلا کہ سب نے بے ساختہ آنکھیں بند کر لیں اور سب کے دل سے "برہما! برہما!" کی فریاد نکلی۔

سب کے پالنے والے برہما نے آنکھیں بند کر کے پوچھا "پھر؟"

شیو نے ڈرتے ڈرتے کہا "بس میں تجھ سے اتنی آگیا لینے آیا کہ میں اپنے لئے ایک باغ لگاؤں اور اس کے ایک کونے میں بیٹھ کر تیرے دھیان میں سب کچھ بھول جاؤں۔"

برہما نے شیو کو پیار سے دیکھا۔ دیویاں گانے لگیں، دیوتا ناچنے لگے، آسمانوں نے شبنم کے موتی برسائے، زمینوں کو کنول، موتیے، چنبیلی، جوہی کے پھولوں نے ڈھک لیا، وہ بہت ہی آہستہ سے بولا "تمھیں آگیا ہے۔"

شیو نے اپنی بنائی ہوئی دنیاؤں میں سے ایک جگہ بہت دیکھ بھال کے چنی۔ اس کے ایک حصے میں کڑی دھوپ پڑتی تھی، ایک حصہ میں بڑی برف گرتی تھی۔ اس کی ایک طرف بڑا اونچا ٹیلا تھا، دوسری طرف پانی سے بھرے ہوئے گڑھے۔ اس کے ایک کونے میں ریگستان تھا، دوسرے حصوں میں گھاس اور سبزے سے ڈھکے ہوئے میدان۔ وہاں کے ہوا کے جھونکوں میں گرمی بھی تھی، سردی بھی، خشکی بھی تھی، تراوٹ بھی۔ اس کے کسی نہ کسی گوشے میں ہر ایک وہ چیز موجود تھی جو شیو نے اپنی تخلیق کے دوران میں کہیں نہ کہیں پیدا کی تھی۔ شیو کا دل آنند سے بھر گیا۔ برہما کا دیا سب کچھ یہاں موجود تھا۔ انھوں نے اس خطہ کے سب اطراف ایک دیوار سی کھینچی اور خود سب سے اونچے ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے پھر اس زمین پر ایک نظر ڈالی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا اور آسن جما کر برہما کے دھیان میں آنکھیں بند کر لیں۔

زمین کا سینہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا، کہیں سے آم کے درخت نکلے، کہیں سے سیب اور آڑو کے پیڑ، ہر طرف پھلوں، میووں اور پھولوں کے پودے اُگ آئے۔ گڑھوں کا پانی کچھ لیکا، کچھ سڑا، سطح پر ایک جھلی سی پڑی، پھر ان میں حرکت سی ہوئی، چھوٹی بڑی مچھلیاں بنیں، کچھ تو وہیں پانی میں رہیں، کچھ کو لہروں نے خشکی میں پھینکا۔ اچھلیں، تڑپیں، مر گئیں، یا پھر کچھ سے کچھ بن گئیں۔ رینگنے والے کیڑے، بن دہان جانور، بڑے بڑے سانپ، یہ بھی گھٹے بڑھے، صورتیں بدلیں، چارپائے بنے، دوپائے ہوئے، چیلے کوے، اُچکے، پھاندے، پر پرواز نکلے اور ہوا میں اُڑنے والی چڑیاں بھی چہچہاتی درختوں پر آ بیٹھیں۔

شیو نے جو آنکھیں بند کیں تو پھر نہ کھولیں، رت بدلتے رہے، سماں بدلتے رہے، مناظر بدلتے رہے کبھی مینہ پڑا، کبھی اولے گرے، کبھی کھیتوں نے سونا اگلا، کانوں نے جواہرات۔ کبھی کال پڑا، بڑے بڑے تالاب سوکھ گئے۔ لاکھوں جاندار "ڈانگر" ہو کر مر گئے۔ کبھی بھونچال آیا۔ ہزاروں درخت گر گئے، شاخیں ٹوٹ گئیں۔ ٹھنٹھ کھڑے رہے۔ جانوروں نے ایک دوسرے کو "لکھیڑا"، نوچا، کھسوٹا، کاٹا، بھنبھوڑا، مار ڈالا، قوی نے کمزور کو کھا لیا۔ بڑے گروہ والے نے چھوٹے گروہ والوں کو دبا لیا۔ راج حکومتیں قائم کر لیں، مگر شیو نے ذرا آنکھیں نہ کھولیں۔ اور کھولتے ہی کیوں؟ انھیں نے تو یہ ساری لڑنے والی قوتیں اپنے باغ میں بھر دی تھیں۔ وہ جانتے تھے جو مشین انھوں نے بنادی ہے اس کے سارے پرزے اپنا کام کر کے رہیں گے۔

باغ کے جانوروں میں سب سے سریا، سب سے چالاک، سب سے ہوشیار ایک جانور تھا، اس کا نام تھا بندر۔ اوروں کو تو اپنی قوت، اپنے جسم، اپنے ڈیل ڈول اور لمبے دانت اور پنجوں پر بھروسا تھا لیکن اُسے صرف اپنے دماغ پر گھمنڈ تھا، اور جیسے جیسے سمے گذرتا گیا، اس کی عقل، اس کی سوجھ بوجھ بڑھتی گئی۔ اس نے دوسرے جانوروں کو پھنسانے کے لئے پھندے بنائے۔ اس نے شکار کھیلنے کے لئے نوکیلے حربے تیار کئے۔ اس کی آنکھیں تیز تھیں، اس کو پینترے خوب آتے تھے۔ وہ جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا۔ اس نے اپنی حرفتوں سے باغ کے سارے جانوروں کو دبا لیا۔ اور اس کا مالک بن بیٹھا۔

دوسرے جانور تو اس کی چالاکیوں سے ہار کر الگ الگ گوشوں میں جا چھپے لیکن خود اس کی تعداد برابر بڑھتی گئی اور جیسے جیسے اس کی قوم میں نئے نئے پنتھے نکلے انھوں نے اپنی اپنی ٹولیاں بنانا شروع کر دیں۔ وہ ایک دوسرے کا حصہ نوچ کھسوٹ کر کھا ڈالتے اور ایک دوسرے سے خوں، خوں کر کے خوب لڑتے۔ بوڑھے بندروں نے جب اُن کی روک تھام کی تو ان میں سے بہت سے خفا ہو کر باغ کی دیواریں پھاند کر دوسرے باغوں، جنگلوں اور کھیتوں میں جا بسے۔ ان جگہوں کی آب و ہوا کے اثر سے ان کی صورت شکل اور ان کا رنگ روپ بھی بدل گیا، وہ بالکل بدیسی ہو گئے۔

بہت سا سمے اور گذرا۔ شیو کے باغ کا نام دور دور پھیلا۔ یہاں کے میووں کی تازگی، یہاں کے پانی کی شیرینی اور یہاں کے پھلوں کی خوشبو کا چرچا ساری دنیا میں ہونے لگا۔ ایسے میں جہاں جہاں بھوکے ننگے تھے، وہ سمٹ سمٹ کر ادھر چلے۔ سب سے پہلے اُتر پچھم سے ایک گروہ آیا۔ یہ بھورے بندر تھے یہ باغ والوں کو کالا بندر کہتے، اور اس پر بہت گھمنڈ کرتے کہ یہ کالے نہ ہمارے جیسے سوجھ بوجھ کے ہیں اور نہ ہماری طرح تگڑے اور پھرتیلے پھر اس پر بھی اکڑتے کہ ہم نے کئی "انسان" پیدا کئے ہیں، یعنی ایسا جانور جس کی دم کر گئی تھی اور جو دو پاؤں پر کھڑا ہو کر چلتا پھرتا۔ وہ اس سے آگے انسان کے معنی نہ سمجھتے تھے حالانکہ وہ لوگ جن کی طرف وہ اشارہ کرتے وہ انسان ہی نہ تھے بلکہ انسان گر۔ انسانیت کو فروغ دینے والے۔ کالے، گورے، بھورے پیلے کا رنگ مٹانے والے۔ برہما کے پہچاننے والے، اسی کے بھیجے ہوئے، دنیاؤں کے چاند سورج! ان بھوروں نے اپنے انسانوں سے کچھ نہ سیکھا اور وہ کالے بندروں کو ذلیل کمینہ سمجھا کئے۔ دیسی بندروں کو آپس کی پھوٹ نے انھیں بھی کبھی ایک نہ ہونے دیا۔ اسی لئے بھورے بندروں نے انھیں مار کاٹ کے پورے باغ پر قبضہ کر لیا۔ کالے بندروں کے دلوں میں آہستہ آہستہ یہ بات جم گئی کہ بھورے بندر واقعی کوئی نئی قسم کی نسل ہیں اور وہ ان کا مقابلہ کرنے کی کسی طرح اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کا پورا پورا جھنڈ بھورے بندروں کو دیکھتے ہی کھسے نکال کر گردن جھکا کر بیٹھ جاتا اور جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگتا، گویا وہ کہتا "حضور ماں باپ ہیں حضور جو حکم دیں گے ہم سر آنکھوں سے بجا لائیں گے۔"

بھورے بندروں نے ان دیسی بندروں کو اپنایا نہیں، بلکہ انھوں نے اپنی نسلی برتری قائم رکھنے کے لئے اپنے ہی ساتھیوں میں سارے اچھے کام بانٹ لئے اور دیسی بندروں سے گندے اور ذلیل کام لینے لگے۔ کاموں کی اس تقسیم سے گو کالے بندر ہمیشہ کے لئے پستی میں پڑ گئے، لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض معلوم ہو گئے اور وہ ان کی انجام دہی میں لگ گیا، یوں باغ روز بروز سنورتا گیا، اور اس کی شہرت اور بھی پھیل گئی۔

دوسری جگہوں کے بندروں نے جیسے جیسے یہاں کے پھلوں کی مٹھاس کی تعریفیں سنیں، انھوں نے

اپنے اپنے جتھے اکٹھے کئے اور وہ بار بار باغ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان نئے آنے والوں میں سے کچھ پہلے بندروں نے کامیابی حاصل کی اور وہ ایک زمانے تک باغ کے پچھلے حصے پر قابض رہے، لیکن آہستہ آہستہ بھوروں نے انھیں باہر نکال دیا اور جو نہ بھاگ سکے انھیں ختم کر ڈالا۔ پھر بھی باغ کی ہریالی، پھلوں کی زیادتی اور ضروریات زندگی کے ملنے میں آسانی نے انھیں آہستہ آہستہ آرام پسند بنا دیا۔ وہ محنت سے گھبرانے لگے ان کا زیادہ وقت اونگھنے اور سونے میں کٹنے لگا۔

ان کی اس آرام پسندی کا فائدہ اٹھا کر بالکل ہی نئے قسم کے بندر باغ میں گھس آئے۔ یہ کتھئی تھے ان نئے بندروں کو دو باتوں کا گھمنڈ تھا۔ یہ کہتے ہم نے دنیا کی ساری بندر آبادی سے زیادہ انسان پیدا کئے ہیں، اور ہم سے زیادہ نہ کسی کے تیز ناخون ہیں نہ دانت۔ ان سے اور بھورے بندروں سے خوب خوب لڑائیاں ہوئیں۔ وہ بھوروں سے لڑائی میں یقینی طور پر زیادہ زبردست ثابت ہوئے، اسی لئے انھوں نے باغ پر قبضہ کر لیا، اور انھوں نے ہوشیاری یہ کی کہ کالوں کو بہت کچھ اپنا یا۔ اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ کالوں کی کافی تعداد لوٹ کر ان سے مل گئی۔ انھوں نے بھوروں کو بھی زیادہ ناخوش نہ کیا، بلکہ باغ کے انتظام میں انھیں ہمیشہ لگائے رہے۔ پھر بھی دونوں جانب دلوں میں یہ بات ضرور چھپی ہوئی موجود رہی کہ ہم کتھئی ہیں ہم ان بھوروں سے تگڑے ہیں"۔ "اور ہم بھورے ہیں، بڑے ہمارے چھپئے اور اس باغ کے خاص رکھوالے۔ کتھئی ملکش ہیں۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ!"

اب باغ کے پھل بھورے بندروں کو کم ملنے لگے ایک تو کھانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، دوسرے سارے اچھے اچھے کتھئی چھین چھین کے کھا لیتے۔ اس کا نتیجہ دونوں گروہوں پر ایک دوسرے کا الٹا پڑا۔ پہلے کے کاہل بھورے اب محنت کرنے لگے۔ اور پچھلے فاقہ کش کتھئی اب سست اور آرام پسند ہوتے گئے۔ پھر بھی کھانے بھر کو سب کو مل ہی جاتا، اور آپس میں خوں خاں، اتنی ہی ہوتی جتنی کہ فطرت مجبور کرتی، اور باہر والوں کو یہی خیال ستاتا رہا کہ ایسا باغ جہاں اس طرح ہن برستا ہو وہ ہمارے قبضے میں کیوں نہیں۔ اس لئے بندروں کا ایک خاص گروہ، جنھیں لال بندر کہتے تھے، بھیس بدل کر اس باغ میں آیا۔ اس نے یہاں کے حالات دیکھے اور اپنے بھائیوں کو یہاں کی خبریں پہنچائیں۔ ان [illegible] نے بہت سوچ کے ایک خاص قسم کی لکڑی ایجاد [illegible] جس کی طرف اشارہ کر دیتے [illegible] کی [illegible] اور اس کے [illegible] لال بندر [illegible] لکڑیاں لے کے [illegible] کتھئی [illegible] بھورے [illegible]

انھوں نے تھوڑے دنوں میں سارے بھورے اور کتھئی بندروں پر راج قائم کر لیا۔

لال بندر سب سے زیادہ چالاک نکلے انھوں نے اس باغ کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ انھوں نے اپنا پچھلا دیس نہیں بھلایا۔ وہ شیو کے باغ میں کچھ ہی دن ٹکتے۔ اور وہ جو اچھی سے اچھی چیز یہاں پاتے اسے اپنے دیس ضرور بھیج دیتے۔ انھوں نے باغ کو لوٹ کر اس کے سارے پھل، میوے ترکاریاں اپنے گھر بھیج دیں۔ وہی باغ جہاں کی زمین سونا اگلتی تھی، جہاں کے میوے اور پھل خس و خاشاک پر گر کر سڑتے اور اچھی کھاد بنتے وہی باغ جہاں کا ہر باسی موٹا تازہ آنند کی بانسری بجاتا دکھائی دیتا تھا کنگالوں کا دیس اور سوکھے ڈھانچوں کا نگر ہو گیا۔ ایک ایسا ملک جہاں کے رہنے والے بھوک سے بلبلاتے اور کچے پڑے دانے پر آپس میں کتوں کی طرح لڑتے اس پیٹ کے کارن بھورے اور کتھئی ساری اکڑفوں بھول گئے۔ اور انھوں نے ہر آن لال بندروں کا منہ تکنا، اور ان کے اشاروں پر ناچنا شروع کیا۔

شیو کے باغ کی یہ حالت دیکھ کر وہ تمام آتمائیں جو انسان بننے کا فخر حاصل کر چکی تھیں، دکھ سے چیخ اٹھیں ان کی آوازمیں اتنا درد، اتنی تڑپ تھی کہ وہ آسمان کو پار کر گئی اور اس نے برہما کے چرن چھو لئے۔ چونکہ شیو کا دھیان انھیں لنول جیسے چرنوں سے لگا تھا تھا۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، ان کی پیشانی پر تین کھڑی لکیریں پڑ گئیں۔ انھوں نے باغ کے ایک کونے کو تیز نگاہوں سے دیکھا خاک کا ایک ذرہ چمکا، کسمسایا، ابھرا، اڑا، گلاب اور لالہ کے تھالوں میں اس نے کروٹیں لیں۔ وہاں کے عطریات سے اس کا خمیر بنا۔ جوہی، چنبیلی، چمپا کا عرق اس میں ٹپکا۔ شہد کا ایک قطرہ سنبل دانے بڑے جھٹکے سے گر کر اس میں آغشتہ ہو گیا، اور وہ نرمی، شیرینی اور خوشبوؤں کا ایک پتلا سا بن گیا۔ پاربتی نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ دیوتاؤں نے بڑھ کر منتر جگایا اور وہ پتلا ایک دبلے پتلے انسان کی صورت میں اٹھ کھڑا ہوا ــــــ شیو نے اطمینان کی سانس لی، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اس انسان نے اپنے نرم اور میٹھے بول میں کالے بھورے کتھئی سارے بندروں کو للکارا "کیا کرتے ہو بے وقوفو؟ اگر اسی طرح آپس میں لڑتے رہے تو شیو کا باغ ہمیشہ کے لئے اجڑ جائے گا۔ اس باغ کے رکھوالے تم ہو، لال بندر [illegible] ان کے قدم یہاں اس وقت تک جمے رہیں گے جب [illegible] رہو گے۔ بندر ایک بار [illegible] لال بندروں سے [illegible] باغ سے [illegible] لیکن [illegible]

ہے۔ ہمارے مل جانے سے کیا ہو گا؟ ہم نہتے ہیں۔ لال بندروں کے پاس ڈسنے والی چھڑیاں ہیں جو ہم کو اگر لڑتے دیکھ کر ہمارے جسم بھر میں چھید دیں گے۔ پھر بھی وہ انسان اپنی سی کہے گیا۔ کتھئی بھر بندر اس کا کہا ماننے پر تیار رہے۔ لال بندروں نے چھڑیاں اٹھائیں۔ دھائیں، دھائیں، دھائیں۔ مگر اس انسان کے ماننے والوں نے ہنس ہنس کر سینوں میں چھید کرا لیا۔ دھرتی کانپ اٹھی ہر طرف سے شور ہوا "نہتوں پر اس طرح کا ظلم!" بھورے بندروں میں جوش پھیلنے لگا "تھوڑے سے لال بندر کس کس کے سینے میں چھید کریں گے۔ ہم ان جان دینے والوں سے پیچھے کیوں رہیں" لال بندر ان کے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ انھوں نے کئی باغوں میں راج جمایا تھا۔ اگر ہر جگہ اسی طرح سینوں میں چھید کرانے والوں کا گروہ پیدا ہو گیا تو وہ کس کس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگیں گے۔ ان کے خرانٹ جمادروں [illegible] نے سوچ کر ایک تدبیر نکالی۔ انھوں نے [illegible] میں سے ایسوں کو چن کر اپنے پاس بلایا جنھیں وہ پہلے ہی سے شیشے میں اتار چکے تھے، جو ان کا دم بھرتے تھے، جو ان کا جام پیئے تھے۔

انھوں نے کہا "ہم تم ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے پہچانتے ہیں، ہم سے تم سے سینکڑوں برس سے لڑائی چلی آ رہی ہے، نہ جانے کتنے باغوں سے ہم تمھیں مار کر نکال چکے ہیں، ہم تمھاری بہادری کے قائل ہیں، تم ہماری ہوشیاری کو مانتے ہو، اس لئے ہمارے بعد اگر کوئی راج کر سکتا ہے تو وہ تم ہی ہو۔ یہ بھورے سدا کے غلام رہے۔ یہ گوبر کے کیڑے ہیں۔ ان کو کبھی کچھ نہ آیا۔ پھر بھی آج اس بے وقوف انسان کے بہکانے سے یہ ہمارے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی اس باغ کو چھوڑنا ہی چاہتے ہیں۔ ہمارا اب یہاں جی نہیں لگتا۔ ہم نے اس کا سارا رس نکال لیا ہے۔ اب یہ صرف چھلکا ہی چھلکا ہے۔ پھر بھی اگر تم چاہو تو ہم تمھیں یہاں کا راج دلوا دیں"۔

انھوں نے کہا "اوپر ایشور ہے، نیچے آپ ہیں۔ آپ ہم سب کے ماں باپ ہیں، آپ جو کچھ حکم دیں گے، ہم سر آنکھوں سے بجا لائیں گے"۔

انھوں نے کہا "بس تم بھی اپنی قوم کو ابھارو۔ ان سے کہو جھوٹ موٹ شور مچائیں۔ دیکھو تو ہم کتنے اچھے پھل اور میوے ان بھوروں سے چھین کر تمھیں دے دیتے ہیں"۔

لال بندروں نے جو اتنی شہ دی تو کتھئی [illegible] نے وہ شور مچایا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی ان کا ایک ساتھ منہ کھلا رہتا اور سب کے سب کے منہ سے سنائی نہ پڑتا "باغ بانٹ دو! ہمارا حصہ الگ کر دو!"

انسان نے [illegible] سمجھایا [illegible] لال بندر تمھیں [illegible]

بٹ جائے گا تو تمھیں بہت تھوڑا ملے گا، اتنا بھی تو نہ ہوگا کہ تم پیٹ بھر کھا سکو۔ کیوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارتے ہو۔ تمھیں اپنے ہاتھ سے اپنا نقصان دیکھ کر ہمارا دل پھٹتا ہے۔ بھورے کتھئی دونوں ایک ہیں۔ جب تم اس باغ میں آئے تم نے اسے اپنا گھر سمجھا، تم نے یہاں کے پودوں سے کوئی بدیسی باغ نہیں بسایا۔ تم باہری لال بندروں سے اس باغ کے لئے خوب خوب لڑے ہو۔ تمھاری کئی نسلوں کی ہڈیاں گل کر اس باغ کی مٹی کا خمیر بن گئی ہیں۔ تم نے بھورے بندروں سے رشتہ ناتا کیا تم اس باغ کے اسی طرح باسی ہو جس طرح بھورے بن گئے ہیں۔ ایسے میں الگ ہونے کا خیال چھوڑ دو۔ تم اپنے حصہ سے زیادہ پھل لے لو، میوے لے لو، ترکاریاں لے لو، لیکن آپس میں ایک ہو جاؤ۔ بھائی بھائی کی طرح رہو اور اس وقت مٹھی باندھ کر لال بندروں کے منہ پر اہنسا کا گھونسا مارو!

یہ بات کتھئی بندروں کی سمجھ سے اونچی تھی، وہ اپنی [illegible] بزرگ انسانوں کی تعلیمات بھلا چکے تھے۔ انھیں تو بس لال بندروں کی ریس کرنا آتی تھی۔ ان کے لئے تو سب سے تیزی ترقی اسی میں تھی کہ لوگ انھیں دیکھ کر دھوکا کھا جائیں اور کتھئی کی جگہ لال پکاریں۔ انھیں ایسے میں بھلا وہ انسان کی کیا سنتے۔ انھوں نے کان بند کر لئے، آنکھیں بند کر لیں، بس منہ کھول دیا۔ "ہم الگ رہوا[illegible] گے! ہم الگ ہوں گے!" لال بندر پیٹھ ٹھونکتے رہے "شاباش، اسی طرح جمے رہو۔ ہم تمھیں پچھلی ساری لڑائیوں اور ساری دشمنیوں کا بدلا دیں گے، تمھارے ساتھ ایسا نیک سلوک کریں گے کہ تم بھی کیا کہو گے کہ کیسے بھلے مانسوں سے سابقہ پڑا تھا۔"

انسان سمجھاتا رہا۔ کتھئی بندر گیدڑوں کی طرح ایک ساتھ چلاتے رہے۔ بھورے تھک گئے۔ انھوں نے کہا "اچھا تم اپنا حصہ لے لو اور کسی طرح ہماری جان چھوڑ دو۔ اگر تمھارے الگ ہونے سے یہ لال بندر یہاں سے چلے جاتے ہیں تو یہ بھی سہی۔ بھائی چھوٹ جائے، ماں کے جسم کا ایک حصہ کٹ جائے مگر یہ لال بندر تو کسی طرح دفان ہوں۔"

حصہ بٹنے لگا۔ میوہ اور پھل ہی کا نہیں خود باغ کا بخرہ لگنے لگا۔ بندر تو بندر ٹھہرے، کھسوٹ شروع ہوئی۔ نوبت تو تو میں میں اور ہاتھا پائی تک پہنچ کر آگے بڑھی۔ لال بندروں نے چپکے چپکے اس جھگڑے کو پھر لگایا۔ اپنی لائی ہوئی دشمنی والی چھڑیاں بھورے اور کتھئی بندروں کو بانٹ دیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سینوں سے خوب دھوئیں بار [illegible] اور لاکھوں کی تعداد میں نہ سوکھنے والے خونی فوارے جاری ہو گئے...؟...

......عجیب بات یہ تھی کہ جہاں کہیں ان لڑنے والوں کے لہو کی ایک بوند بھی گرتی باغ میں آگ سی لگتی، پھل اور میوے سوکھ کر گر پڑتے، درخت جل کر خاک سیاہ ہو جاتے دیکھتے ہی دیکھتے باغ کے ہر حصے سے شعلے لپک لپک کر اٹھنے لگے اور جلنے اور [illegible] والوں کی چیخ اور بو سارے باغ میں اس طرح پھیلی کہ دم گھٹنے لگا۔ جہاں کہیں بھی بھورے اور کتھئی تھے ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے اور کاٹتے تھے، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اس طرح کی گندی حرکتیں کرتے تھے کہ جو نہ کبھی دیکھی گئی تھیں اور نہ سنی گئی تھیں۔ بس ہر طرف "مارو! مارو! کاٹو! برباد کرو!" کی آواز تھی، خون تھا! لو تھی! سڑان تھی!

ایسے میں نیلو کار [illegible] ایک بار سب سے اونچے درخت پر چڑھ کر پوری آواز سے چیخا "ٹھہرو! سنو!" معلوم ہوا جیسے کسی نے جادو کر دیا۔ قتل کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ لوٹ کے لئے بڑھے ہوئے قدم تھم گئے۔

اس نے بھوروں سے پوچھا "تم کسے مار رہے ہو؟"

انھوں نے کہا "کتھئی بندروں کو۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ دُشٹ ہیں، کمینے ہیں، راکشس ہیں۔ وہ باغ کے ہر کونے میں جہاں ان کی تعداد زیادہ ہے، بھورے بندروں کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔"

اس نے کہا "اچھا یہ بھی سہی، پر یہ تو بتاؤ وہاں کے کتھئی بندر دُشٹ ہوئے، اپرادھی ہوئے۔ یہاں والے کیسے ہو گئے؟ ان کو بے قصور مارنا تو کوئی دھرم نہیں۔"

"ارے یہ سب سانپ کے بچے ہیں۔ آج ان کے زہر کے دانت نہیں نکلے ہیں، کل یہ بھی ڈسنے لگیں گے۔"

وہ میٹھے لہجے میں بولا "پر مجھے تو اس باغ کے رکھوالوں نے یہی بتایا ہے کہ سانپ کو بھی نہ مارو۔ اسے بھی دودھ چاول کھلا کر اپنا بنا لو۔ اچھا اس کو بھی چھوڑو۔ تم بندروں کی سب سے بڑی ترقی ہے انسان بننا۔ تم بھورے بندر اس کا دعوے کرتے ہو "ہم نے سب سے زیادہ انسان پیدا کئے۔" کتھئی کہتے ہیں "ہم میں سب سے زیادہ انسان ہوئے۔" اور جانتے ہو انسان کسے کہتے ہیں؟ اسے جو دنیا میں سب سے زیادہ پریم اور محبت کرتا ہو، جس کی نظر میں کالے اور بھورے کتھئی میں کوئی فرق نہ ہو، جو ہر ایک کو بھائی سمجھے، جو گرے پڑے کمزور کو اپنے سے قوی پہلوان، اپنے سے اچھا سمجھے، بڑا جانے۔ وہ جو قاتل کو بھی دودھ کا پیالہ دے۔ وہ جو سینے پر سوار ذبح کرنے والے کے لئے بھی دعائے مغفرت کرے۔ وہ جو سولی پر چڑھانے والے کا بھی بھلا ہی چاہے! تم کتھئی بندروں کو دُشٹ کہتے ہو، وہ تمھیں کمینہ، بتاؤ تم میں سے انسان کون ہے؟"

کچھ سمجھدار بھورے جو اس انسان کے پاس رہتے رہتے اس کی بولی اور زبان سمجھنے لگے تھے انھوں نے اس کی بات مان لی اور اس آگ کے بجھانے میں لگ گئے، لیکن سارا مجمع سر کھجانے لگا۔ ان کا دل کچھ اور کہتا، ان کا انسان کچھ اور۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں، لیکن ان میں سے بہت سے نوجوان یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ "یہ بھی کتھئیوں سے مل گیا ہے جو کچھ کہتا ہے، اس میں انھیں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اب اس کی بات پر کان دھرنے میں سراسر نقصان ہے۔" یہ لوگ بڑی بڑی ٹولیوں میں کمین گاہوں میں بیٹھ کر کتھئی بندروں کا شکار کھیلنے لگے۔ اور انھوں نے انسان کے فرمان کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے۔

بوڑھے انسان نے یہ ساری حرکتیں بہت غور سے دیکھیں۔ اس نے کچھ سوچا اور اس نے سب کو سنا کر کہا "میں دیکھتا ہوں تم شیو کے باغ کو برباد کر کے چھوڑو گے۔ ایسے میں میرے زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ یا تو تم میرا کہا مانو کہ اب سے بھورے کتھئی، پیلے کالے کا فرق بھول جاؤ گے، تھپڑ کے جواب میں دوسرا گال بڑھا دو گے، گولی سینے پر کھاؤ گے اور اس پر پھول پھینکو گے یا پھر میں آج سے بھوک ہڑتال کر کے مر جاؤں گا! تم اس باغ کے پھل کے لئے ایک دوسرے کو مارتے ہو، میرے لئے وہ پھل زہر ہے جس کے لئے کسی کا خون بہے!"

اس نے اس دن سے فاقہ شروع کر دیا۔ باغ بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ جس کے منہ میں نوالہ جاتا حلق میں اٹک جاتا۔ میٹھے سے میٹھا پھل کڑوا محسوس ہوتا۔ پانی کا گھونٹ ٹھیک طور سے نہ اترتا۔ ہر ایک نے دوڑنا شروع کیا۔ کالے، بھورے، کتھئی، لال سب ہی نے تو خوشامد کی "فاقہ توڑئیے۔ اب ہم آپس میں نہ لڑیں گے، آپ ہی کے کہے پر چلیں گے، ہم بھگوان کو، ہم ایشور کو گواہ دے کر کہتے ہیں۔ ہم آپ ہی کی سوگند کھاتے ہیں۔"

جب لاکھوں کروڑوں بندروں نے اس طرح قسم کھائی، بات پر قائم رہنے کا یقین دلایا تو اس امن اور شانتی کے دیوتا نے فاقہ توڑا اور مسکرا کر پھلوں کا تھوڑا سا رس پی لیا۔

ہر ایک نے اطمینان کی سانس لی، باغ کا رنگ بدلنے لگا۔ لڑنے والے گلے ملنے لگے۔ لیکن لیڈروں کا گروہ خفا ہی رہا وہ بڑبڑاتا رہا "اس انسان نے تو ہمارے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ یہ چاہتا ہے ہم نے جو کچھ لوٹ مار کر حاصل کیا ہے وہ واپس دے دیں۔ نہ ہمارا باغ رہے نہ ہمارے پھل۔ سب کچھ پھر سے دوسروں کا ہو جائے۔ یہ ہمیں اپنا ہی جیسا بے وقوف انسان بنانا چاہتا ہے، ہم تو اب اسی کو مار کر سانس لیں گے۔"

انھوں نے گوشوں میں بیٹھ کر سازشیں کیں اور ان میں سے ایک پاگل "جان" پر کھیل گیا۔ بوڑھا انسان ہر روز [illegible] کا سہارا لے کر ایک بلند جگہ آکر بیٹھتا اور لوگوں کو دھیان، گیان کی باتیں بتاتا تھا، آنکھ والے اسے دیکھتے اور کان والے اس کی سنتے تھے۔ ایک دن جیسے ہی اس نے اپنے اسی اونچے استھان پر پاؤں رکھا، ایک بھورے بندر نے لال بندروں کی لائی ہوئی جادو والی چھڑی اٹھائی اور "دھائیں، دھائیں، دھائیں!" اس کے سینے پر داغ دی۔

اس زور کا واویلا مچا کہ شیو نے آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے دیکھا کہ بھورے انسان کے چھدے ہوئے سینے سے خون کا فوارہ نکل رہا ہے اور اس کی آتما سپید پروں کے سہارے ہوا میں اڑ رہی ہے۔ انھوں نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور اسے اپنے میں سمیٹ لیا———

———اور باغ میں جلے ہوئے درختوں کی جڑوں سے نئے پیڑ نکل پڑے، ٹھونٹھ ہرے ہو گئے، گلاب کھل اٹھے، کنول کی چادر پانی پر دوڑ گئی——— اور آکاش اور انگور کی بیلیں آپس میں گتھ کر ایک ہوئیں اور کہکشاں سے آنکھیں لڑانے لگیں۔

کتب خانہ کے آداب

امتیاز علی عرشی

خدا بھلا کرے ان نیک عقل والوں کا، جنھوں نے اپنی زندگیاں تج کر علم کے سمندر سے انمول موتی نکالے اور انھیں چھوٹی بڑی کاغذی کشتیوں میں سلیقے سے چن کر ہمارے لئے چھوڑ گئے۔

کاغذ کی انھیں کشتیوں کو کتاب کہا جاتا ہے، اور جس خزانے میں یہ کشتیاں رکھی جاتی ہیں اُسے کتب خانہ، پستکالیہ یا لائبریری کہتے ہیں۔ دنیا کا یہی ایک خزانہ ایسا ہے جو بیش بہا سامان رکھتے ہوئے ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے۔ آپ کو شوق ہے تو وہاں جائیے اور ان کشتیوں میں سے جو موتی پسند ہو، اٹھا کر اپنے دماغ کی الماری میں رکھ لائیے۔ کیا مجال جو کوئی آپ کو روکے یا آپ پر کبھی احسان دھرے! مزے کی بات یہ ہے کہ جو موتی آپ وہاں سے لے آئے ہیں دوسرا شخص وہاں جا کر تلاش کرے، تو اسی جگہ حفاظت سے رکھا پائے گا جہاں سے آپ چن کر لائے تھے۔

ان علمی خزانوں کا رواج دنیا میں بہت پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ جس زمانے میں بھوج پتر یا پتھر پر کتابیں لکھی جاتی تھیں، اس وقت بھی ہمدرد علم دوست والوں نے نادار پڑھے لکھوں کے لئے کتاب خانے قائم کئے۔ جب کاغذ ایجاد ہو گیا اور پہلے کے مقابلے میں آسانی سے کتابیں ملنے لگیں تو کتاب خانوں کی تعداد اور ان کے سامان دونوں میں اضافہ ہوا، چنانچہ ایشیا کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ایسا ہو جہاں ہر قسم کی کتابیں پڑھنے والے کو آسانی سے نہ مل جاتی ہوں۔ اسی لکھنؤ کا قصہ ہے کہ آصف الدولہ کے عہد میں میر عالم حیدر آبادی کے بھائی سیر کے لئے آئے تو انھوں نے صرف شاہی کتاب خانے میں کئی لاکھ قلمی کتابیں پائیں۔ دستی تصویروں اور خوش خطی کے نمونوں کی تعداد ان کے بقول، وہاں کے منتظم کو بھی معلوم نہ تھی، ہیں کے ایک حکیم مسیح الدولہ علی حسن خاں بہادر نے جو کتاب خانہ مرتے وقت چھوڑا تھا اس کے ایک حصے کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ ایسا نایاب ذخیرہ مصر و شام میں بھی نہ ہوگا۔

یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب نہ کاغذ بنانے کی مشین ایجاد ہوئی تھی نہ کتابیں چھاپنے کی۔ آج کل یورپ کی عقل مندوں کی کوشش سے چھپائی کا کام مہینوں اور برسوں کی جگہ ہفتوں اور دنوں میں انجام پا جاتا ہے، اور سینکڑوں روپے کی کتاب دو چار روپے میں مل سکتی ہے۔ پانی کی طرح علم کے سستا ہو جانے سے اب پہلی سی دشواری کتابیں خریدنے اور پبلک کے لئے عام کر دینے کے راستے میں باقی نہیں رہی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پہلے بچوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ خدا کہتا ہے میں دنیا میں رہتا تو کاغذ سڑکوں پر سے چنتا اور چاول کھاتا، چنانچہ میں نے خود اپنے بچپن میں سینکڑوں کاغذ کے ٹکڑے زمین پر سے اٹھائے ہیں اور انھیں چوم کر اور آنکھوں سے لگا کر پھینکنے والے کی گستاخی کا کفارہ ادا کیا ہے۔ اور پھر انھیں کسی دیوار کے سوراخ میں ٹھونس دیا ہے اور اب لوگ کتابیں پڑھ پڑھ کر پھینک دیتے ہیں اور بچوں پر میل بھی نہیں آتا۔

چونکہ چھاپے اور کاغذ کی مشینیں یورپ میں پہلے بنیں، اس لئے چھاپے کی کتابوں نے بھی پہلے وہیں جنم لیا ادھر وہ لوگ ترقی کے اس راستے پر تازہ دم چل رہے تھے جس پر ایشیا والے چلتے چلتے تھک چکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے عقل مندوں نے جگہ جگہ کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے انبار لگا دیئے، چنانچہ یورپ کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو، جہاں ایک دو چھوٹے بڑے کتاب خانے نہ ہوں۔ ان میں ہر فن کی کتابیں سلیقے سے الماریوں میں چنی ملیں گی، وصول معانی اور رجسٹر کھولے سے پہلے تو وہاں ہوتے ہی کم ہیں جو ہیں وہ ایسے جاہل ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی جگہوں پر جاتے کم ہیں اور اگر کبھی کبھار جی کڑا کر کے پہنچ بھی گئے تو وہاں کا مجمع ان کو ٹکنے نہیں دیتا۔

کتاب خانے کے اندر جو لوگ کام کرتے ہیں، نوکر ہوں یا ممبر، یا مہمان، ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والا سمجھے یہ سب گونگے ہیں۔ آپ باریک سے باریک مسئلے پر وہاں بیٹھ کر سوچ بچار کرنا چاہیں، تو بڑے اطمینان اور سکون سے کر سکتے ہیں۔

ملازم ایسے باادب اور مستعد کو ہر آنے جانے والا یہ جانے کہ صرف میرے ہی مزاج داں ہیں حکم کی جھٹ پٹ تعمیل کریں گے۔ اور آپ کے وقت کے کسی حصے کو ضائع نہ ہونے دیں گے۔ کتاب خانے کا منتظم اپنے ذخیرے کا پورا علم رکھتا ہوگا، آپ فہرست دیکھ کر کتاب منگانے کی جگہ خود منتظم سے دریافت کریں، تو بڑی مسرت سے مطلوبہ فن کی معتبر کتابوں اور مصنفوں کے نام آپ کو بتائے گا۔

جو لوگ وہاں پڑھنے جاتے ہیں وہ قاعدوں، ضابطوں کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ چلتے ہیں تو ایسے چپ چاپ جیسے کوئی پانی پر تیر رہا ہو، بات کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ آپ سمجھیں، کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ نہ وہاں کے عملے کو تنگ کرتے ہیں نہ ان کے کاموں میں خلل ڈالتے ہیں اور نہ دوسرے پڑھنے والوں کو اپنی چلت پھرت، بات چیت اور اٹھک بیٹھک سے ستاتے ہیں۔

خود غرض یورپ میں بھی ہوتے ہیں، مگر ان کا "خود" ہمارے یہاں کے "خود" سے بڑا اور اونچا ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی غرض بھی نسبتاً وسیع ہوتی ہے وہاں کے پڑھے لکھے نہ کسی کتاب میں سے ورق یا تصویر نکال لے جاتے ہیں، نہ جلدیں توڑ پھوڑ کر خراب کرتے ہیں اور کتاب چرانے کی عزت تو گویا ان کے نصیب ہی میں نہیں ہے۔

یہ حال وہاں کے عام کتاب خانوں کا ہے۔ رہ گئے وہ کتاب خانے جن کا تعلق یونیورسٹیوں، کالجوں یا اسکولوں سے ہے۔ اس کے عملے اور ممبروں کا چلن سچ مچ اتنا اچھا اور اونچا ہوتا ہے کہ عقل مند رشک کرتے اور بے وقوف جلے بھنے اور اپنا سا منہ لے کر رہ جائے۔

ہندستان کے بڑے کتب خانے سب میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ایک بڑی لائبریری کا میں خود نگراں ہوں۔ ان کے عملے، ممبروں، اور مہمانوں کے چلن کے متعلق میرا تجربہ کڑوا نہیں تو کسیلا ضرور ہے۔ ابھی چند سال کا واقعہ ہے کوئی صاحب ایک قلمی کتاب میں سے ایک بڑی قیمتی تصویر نکال لے گئے۔ مہمانوں پر کسی طرح کا شبہہ کر کے اخلاقی پستی کی نمائش تو ہم سے نہ ہو سکی۔ ہاں عملے کی چھان بین اچھی طرح کی مگر نتیجہ وہی ہارنا، جھک مارنا اور ہکا بکا رہنا۔

حیدر آباد کے کتاب خانے سے ایک دو قلمی کتابوں کے چوری جانے کا واقعہ اخباروں میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ کسی بزرگوار نے شاید یہ سمجھا کہ حیدر آباد کی لائبریری اس کتاب کی مناسب قدر و منزلت نہیں کرتی، چنانچہ آپ نے اس ہیرے کو اڑا بمبئی میں جا بیچا۔ کتاب کیا تھی، شیخ سعدی کی گلستاں، وہی گلستاں جسے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اچھے اخلاق و عادات سکھاتی ہے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کی کتابیں میں نے اپنی آنکھوں سے طالب علموں کے پاس دیکھی ہیں اور اس وقت دیکھی ہیں کہ یہ حضرات ان علمی اداروں سے اپنے تعلقات منقطع کر چکے تھے۔ رہ گئے قومی کتب خانے، یہ تو پبلک کی ملکیت ہی ہیں۔ اگر ان کی کتابیں ڈنکے کی چوٹ دبا کر رکھ لی جائیں، تو کس کی مجال ہے جو واپس لے سکے آپ منتظم کی حیثیت سے ان کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں بھی تو زیادہ سے زیادہ تاوان وصول کر سکیں گے کتاب پھر بھی انھی کی ملکیت رہی۔

جب کے دن خرد برد کے واقعات پیش آتے رہتے ہوں اور انھیں کا تدارک بس سے باہر ہو، تو کتاب لے کر مقررہ وقت پر واپس کرنا، جلد اور اس کے اوراق کا حفاظت سے رکھنا، جگہ جگہ کیڑے مکوڑے کا ڈھیر کر مصوری یا مضمون نگاری کی مشق سے پرہیز کرنا، کتاب خانے میں دبے پاؤں آنا جانا اور دھیمے دھیمے باتیں کرنا، یہ تو بہت معمولی باتیں ہیں۔ میں نے ایک کتاب کے اول و آخر کے سادہ ورقوں پر مسلسل عاشقانہ خط و کتابت تک لکھی دیکھی ہے۔ اب آپ سوچتے رہیے کہ پیام رسانی کی یہ ترکیب اچھی ہے یا بری، بدنام کرنے والی ہے یا پردہ پوش، بہر حال صورت واقعہ یہ کہ ضرورت کے گھر ایجاد کا نیا بچہ پیدا ہو گیا۔

جب ہمارے کتاب خانوں کے ممبر اور مہمانوں ہی میں قاعدوں اور ضابطوں کی طرف زیادہ توجہ نہ ہو تو عملے کی شکایت بے جا ہے۔ ان غریبوں کو تو اس پیشہ کی مناسب ٹریننگ بھی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ خوش اخلاقی سے پیش نہیں آتے۔ سکون اور وقت

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

کھٹمل

سید یحییٰ حسن نقوی

دنیا میں کون ایسا ہوگا جس نے برکھارت میں مست ہوکر ایک بار انگڑائی نہ لی ہو۔ اودی اودی گھٹائیں دیکھ کر کون سی ایسی زبان ہوگی جس نے پپیہے کے ساتھ "پی کہاں" کا موسمی راگ نہ الاپا ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا کر کون ایسا دل ہوگا جس میں گدگدی پیدا نہ ہوئی ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں نے برسات کی تعریف میں نظمیں لکھیں، گویّوں نے گیت گائے۔ اور اپنے اپنے رنگ میں خوب قصیدہ خوانی کی۔ تیج اگر کسی اٹھارہویں صدی کے راجہ کی کرتے تو [illegible] ہو جاتے۔ افسوس برسات نے بھی نہیں کیا کیچڑ، پھسلن، ٹڈیکا، سانپ، بچھو، ملیریا، اور سب سے بڑھ کر ——— کھٹمل۔ یہ ہیں وہ تحفے جو برساتی دربار سے ہر سال بنی نوع انسان کو ملتے ہیں کہتے ہیں کہ کھٹملوں کی جتنی پیداوار برسات کے موسم میں ہوتی ہے، اتنی سال کے کسی حصے میں نہیں ہوتی۔

کیچڑ اور پھسلن سے انسان محفوظ رہ سکتا ہے،۔ بشرطیکہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ مکانوں کی اچھی طرح مرمت کرالی جائے تو ٹپکنے سے بچنا بھی ناممکن نہیں۔ سانپ، بچھو روزمرہ کے نہیں ہوتے، اندھیرے اجالے میں کبھی کبھار سابقہ پڑ بھی جائے تو لاٹھی سے جوتے سے، یا پھر کم از کم بھاگ کر جان بچائی جاسکتی ہے۔ ملیریا اور ہیضہ کے لئے سینکڑوں انجکشن اور دوائیاں ڈاکٹروں اور حکیموں نے ایجاد کر ڈالی ہیں۔ لیکن کھٹمل جو انجکشن دیتا ہے اس کا توڑ کبھی سائنس داں سے ایجاد نہ ہو سکا۔ مثل مشہور ہے "سانپ کا کاٹا سوئے، اور بچھو کا کاٹا روئے" مگر کھٹمل کا کاٹا ان دونوں سے مختلف ہے، اس میں نہ آدمی مرتا ہے اور نہ روتا ہے بلکہ صرف دیوانہ ہو جاتا ہے، افسوس ہے کسی نے کھٹمل کی شان میں ایک آدھ مثل بھی نہ گھڑی، ورنہ یوں مشہور ہوتا، "کھٹمل لاگے، سوتا جاگے، نندیا بھاگے"۔

کھٹمل دو لفظوں "کھاٹ" اور "مال" سے مل کر بنا ہے۔ عرف عام میں کھاٹ نام ہے اس چارپائی کا جو گھٹیا قسم کے موٹے موٹے باندوں سے بنی ہوئی ہو، جس کے پائے دیسی بڑھئی کے بنائے ہوئے ہوں، اور جس میں پٹیاں اور سیرو کے بجائے سال کے بانس کے ڈالے گئے ہوں۔ "مال" لال رنگ کے ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو کہتے ہیں جو ان چارپائیوں میں رہتے ہیں اور دن رات انسان کا خون چوستے ہیں، اسی اعتبار سے لوگوں نے ان کا نام "کھٹومل" اور "پورن مل" کے قیاس پر "کھٹمل" رکھ دیا ہے۔

اب چونکہ دنیا نے کافی ترقی کرلی ہے اور لوگ نئے نئے ملک دریافت کر چکے ہیں اور ہر قوم کو نوآبادیوں کی جستجو ہے۔ اس لئے کھٹملوں نے بھی اپنے پرانے مسکنوں کے علاوہ نئی بستیاں بسائی ہیں اور ہسپتال کے نمونے کی آہنی چارپائیوں، نواڑ کی بنی ہوئی مسہریوں، میز کرسیوں حتیٰ کہ صوفوں میں بھی رہنا شروع کر دیا ہے۔ نوآبادیوں میں رہنے والے کھٹمل دیسی نہیں، اینگلو انڈین قسم کے کھٹمل بنتے ہیں اور انھیں آسانی کے لئے "کرسی مل" یا "صوفا مل" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر آپ کو کبھی رات بھر جاگنے کی ضرورت پیش آجائے تو آپ ایسا پلنگ تلاش کرلیں جس میں کھٹمل ہوں، کھٹمل آپ کو جاگنے میں کافی مدد دیں گے۔ جو لوگ شکاری نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ مچھلی اور ہرن کے شکار میں وہ لطف نہیں جو کھٹمل کے شکار میں ہے۔ کھٹمل پکڑنے کے لئے نہ آپ کو صبر و انتظار کی ضرورت ہے اور نہ کہیں بھاگ دوڑ کرنے کی۔ وہیں بستر پر آرام سے لیٹے لیٹے تماشہ دیکھئے۔ کروٹ لیتے ہی دو تین آپ کی پیٹھ کے نیچے آجائیں گے۔ اس طرح گھنٹہ بھر میں کچھ نہیں تو آپ ساٹھ ستر کھٹمل مار لیں گے۔ آپ کی پیٹھ وہی کام کرے گی جو مچھلی کے شکار میں مینڈک انجام دیتے ہیں۔ یعنی جس طرح چارے کے لالچ میں بڑی بڑی مچھلیاں کانٹے میں آ پھنستی ہیں اسی طرح آپ کی پیٹھ کے فربہ دار خون کی چاشنی کھٹملوں کو کشاں کشاں چارپائی کی دور دور کی چولوں سے کھینچ لائے گی، اور آپ کو شکار کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ بے بچھونے کے پلنگ پر نہ لیٹنا چاہئے اس صورت میں شکار تو کافی ہاتھ آئے گا۔ لیکن حالات منقلب ہو جائیں گے یعنی پہلے آپ شکاری تھے تو اب خود شکار بن جائیں گے۔

بدبو میں کوئی کیڑا کھٹمل کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کی بدبو بھی خاص قسم کی ہوتی ہے جو دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ کسی مقابلے کے امتحان میں اگر دس بدبوئیں سونگھنے کو دی جائیں تو کھٹمل کی بدبو صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ برسات کے موسم میں شمع پر جان دینے والے کیڑوں میں ایک بدبو والا کیڑا بھی ہوتا ہے۔ بس اس کیڑے کی بو باس کچھ کھٹمل سے مشابہ ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کا اصلی نام نہیں جانتے اور اسے کھٹمل کی بدبو والا کیڑا کہتے ہیں یہ بدبو ان کھٹملوں میں تیز تر ہوتی ہے جو کئی کئی دن کے بھوکے ہوتے ہیں، اور جن میں نہ خون ہوتا ہے، نہ ہڈی پسلی، نہ رنگ روپ، اور نہ کس بل۔ ان میں بس بدبو ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ ان کھٹملوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا ڈنک بہت تیز ہوتا ہے۔ ان کے کاٹنے سے انسان یکایک اچھل پڑتا ہے۔ اول تو اس قسم کے کھٹمل کا پکڑنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ جان بچانے کی آخری کوشش میں وہ دم دبا کر اس طرح بھاگتا ہے کہ تعاقب میں واقعی دقت ہوتی ہے اور اگر ہاتھ آ جائے تو مار کر کوئی لطف نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ۸۰، ۹۰ برس کے بڈھے کا گلا گھونٹ دیا، کم بخت سخت جان اتنا ہوتا ہے کہ آپ اسے جوتی سے کتنا ہی مسلیں اس پر کوئی اثر نہ ہوگا، بہت دیر میں دم توڑے گا لیکن بے بھری بوری کی طرح لچ لچا ہوکر۔ خستہ کھٹمل دیکھنا ہو تو کسی موٹے تازے کھٹمل کو پکڑ کر لیمپ کی بالائی منزل پر چھوڑ دیجئے، جل بھن کر آنکھوں آنکھوں میں نمک پارہ کی طرح کرکرا ہو جائے گا۔

نادر شاہی قتل عام کی جھلک دیکھنا ہو تو ایک دن چارپائیوں کو دھوپ میں ڈال دیجئے، لیکن دھوپ خوب کڑاکے کی ہونی چاہئے جیسی عام طور پر برسات کے موسم میں ہوتی ہے۔ پھر ایک دفعہ چارپائی کو کوئی گز بھر اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارے، کھٹملوں کی وہ بوچھار ہوگی جیسی کسی سخت آندھی میں آموں کی ہوتی ہے۔ اس اچانک یلغار سے کھٹملوں کی پر سکون بستی میں تلاطم پیدا ہو جائے گا۔ اس موقعہ پر آپ کو جوابی حملے کے لئے تیار رہنا چاہیے، کیونکہ ان کا جوابی حملہ نہایت خطرناک ہوتا ہے اور تنہا آدمی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بعض کھٹمل جو فن جنگ کے ماہر ہوتے ہیں کبھی آپ کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ اس لئے آپ کو کئی کئی بار حملہ کرنا ہوگا اور کئی آدمیوں کو ساتھ لے کر لڑنا ہوگا۔ اس طرح کیل کانٹے سے تیار ہوکر آپ لڑیں گے تو مقابلہ برابر کا ہوگا۔ تمام زمین جسم زدوں میں خون ہی خون ہو جائے گی۔ کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگ جائیں گے۔ ان لاشوں کو اٹھانے کے لئے فوراً چیونٹیاں آپہنچیں گی اور کھٹملوں کے خالی چھلکوں کو پیٹھ پر لاد کر لے جانا شروع کر دیں گی۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ کھٹمل ہمارے مقابلے میں ایک بے حقیقت شے ہے، لیکن جب اس کا داؤ چلتا ہے تو ہمیں عاجز کرنے پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے جتنے بہادر ہم ہیں اتنا ہی وہ ہے، لیکن ہمارے اور اس کے طرز جنگ میں بڑا فرق ہے، ہم براہ راست حملہ کرتے ہیں وہ چپکے سے پشت کی طرف سے وار کرتا ہے۔ ہم دوبدو اور دست بدست لڑائی کے قائل ہیں، وہ شب خون مارتا ہے، ہم کھلے میدان میں لڑنا پسند کرتے ہیں وہ گوریلا اُڑ بیچ استعمال کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ہم میں اور اس میں نسلی امتیاز کے علاوہ کوئی فرق نہیں، ہم اپنے انسان ہونے پر فخر کرسکتے ہیں تو وہ اپنے کھٹمل ہونے پر ناز کرتا ہے بے شک ہم انسان ہیں لیکن ہم کھٹمل بہرحال نہیں ہیں، بالکل اسی طرح وہ بھی صرف کھٹمل ہے اور انسان نہیں ہے۔ پھر ہمارا طرۂ امتیاز آخر کیا ہے۔ یہی نا کہ ہم اس کی جان لے سکتے ہیں، اس کے خاندان کے خاندان تباہ کرسکتے ہیں، اس کی بستیاں کی بستیاں اجاڑ سکتے ہیں بے زبان اپنے دل میں کہتا ہوگا یہ تو سیزر اور سکندر نے بھی کیا تھا۔

بقیہ صفحہ ۱۰ پر

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ نمبر ۷ | ۱۶ فروری سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

یورپ کی جدید قومیت

مولانا ابوالکلام آزاد

قومیت اپنے سادہ معنوں میں اگرچہ پہلے سے موجود تھی، لیکن موجودہ زمانے میں قومیت کے لفظ سے جن اجتماعی عقائد و جذبات کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے، یہ دراصل یورپ کے نئے عہد تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی پیدائش انسانی آزادی و حقوق کی حفاظت کے لئے ہوئی تھی، لیکن اب انسان کی آزادی و حقوق کے لئے یہی چیز سب سے بڑی مصیبت بن گئی ہے۔

از منۂ وسطیٰ کے بعد جب یورپ نے کروٹ بدلی اور نئے تمدن کی نشوونما شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی قسم کی اجتماعی زندگی بھی نشوونما پانے لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک طرف علم اور آزادی کی روح تمام یورپ میں پھیل رہی تھی۔ دوسری طرف شخصی حکومتوں کا استبداد اور اجنبی تسلط کا ظلم اپنی تمام پرانی روایتوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی کشمکش شروع ہوگئی۔ ایک طرف شاہی تاج و تخت اور اس کے غیر محدود دعوے تھے۔ دوسری طرف علم و آزادی کے پیدا کئے ہوئے نئے نئے اصول اور نئے نئے ولولے تھے۔ تاج و تخت کے مقابلے میں جب عوام کے جذبات آزادی جوش میں آئے تو خود بخود ایک نہایت موثر اور طاقت ور نقطۂ وجود میں آگیا۔ یہ لفظ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن اس کے ساتھ نئے معانی جو لوگوں کو معلوم نہ تھے، اب ہر شخص کے سامنے آگئے۔ یہ لفظ "قوم" تھا اور یہ انکشاف قوم ہونے یعنی قومیت کا انکشاف تھا۔

اس وقت تک عوام کا اعتقاد یہ تھا کہ طاقت کا مرکز شاہی تاج و تخت ہے، اب طاقت کا نیا مرکز نمودار ہوگیا۔ جو خود انہی کے اندر پوشیدہ تھا، مگر انہیں خبر نہ تھی یہ قوم اور قوم ہونے کی طاقت تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یکایک صورت حال میں ایک عظیم انقلاب ہوگیا یعنی رعیت کی جگہ قومیت نے لے لی۔ اب عوام رعیت نہ تھے، قوم تھے، جب تک وہ رعیت تھے ساری قوت شاہی اور شاہیت میں مرتکز تھی، اب وہ قوم ہوگئے تو ساری قوت انہی میں سمٹ آئی۔ صرف اتنی تبدیلی نے دنیا کی اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ بدل دیا.........

یورپ کی جدید قومیت کے عناصر انسانی آزادی و حقوق کے مواد سے حاصل کئے گئے تھے، اس کا ظہور ہجوم کے لئے نہیں بلکہ دفاع کے لئے ہوا تھا۔ یہ دراصل پورے معنوں میں دفاعی قومیت تھی۔ جو شاہی استبداد اور اجنبی تسلط کا مقابلہ کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ ایک طرف مظلوم اور پامال رعایا اٹھی، تاکہ بادشاہوں اور امیروں کے ظلم و ستم کے مقابلے میں قومی حق کا علم بلند کریں، دوسری طرف کمزور قوموں نے سنبھالا لیا تاکہ اجنبی حکمرانی کا مقابلہ کرنے کے لئے مرکز قومیت میں اپنی منتشر قوتیں جمع کرلیں......

لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا انسانی آزادی و حقوق کے تمام اصول جو ان قومیتوں کا مایۂ خمیر تھے، دنیا میں قائم ہوگئے؟ کیا امریکہ کے اعلان آزادی اور انقلاب فرانس کے اعلان حقوق انسانی کے مبادیات نے دنیا کی تمام قوموں کے لئے حق و آزادی کی نعمت مہیا کردی؟ کیا واقعی طاقت کی جگہ حق کا اور استبداد کی جگہ آزادی کا دعوے تسلیم کرلیا گیا؟

دنیا نے حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھا کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی، وہی قومیتیں جو انسان کے انفرادی و قومی حقوق کی حفاظت اور دفاع کے لئے وجود میں آئی تھیں، کچھ دنوں کے بعد انسانی آزادی و حقوق کی پامالی و اتلاف کا ذریعہ ہوگئیں۔ ان کی ابتدا دفاعی قومیت سے ہوئی تھی، لیکن ان کا ظہور ہجومی قومیت کی شکل میں ہوا، جماعتی تنگ نظری، وطنی غرور و کبر اور قومی برتری و اقتدار کے تمام جذبات ابھر آئے اور انسانی آزادی و حقوق کے مبادیات و اصول اس لئے رہ گئے کہ ہر قوم صرف اپنے لئے ان کا نفاذ چاہے اور اپنے سوا سب کو ان سے محروم دیکھے۔

ضروری تھا کہ اس حالت کا ردِ عمل پیدا ہو۔ "ہجومی قومیت" کا مجنونانہ غلو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب دنیا کا تغیر پسند مزاج زیادہ عرصہ تک اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ انیسویں صدی ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی کہ اس کے آثار شروع ہوگئے۔ سوسائٹی کے نچلے طبقوں نے دیکھا کہ آزادی اور مساوات کی اتنی ہنگامہ آرائیوں کے بعد حقیقی آزادی اور مساوات بدستور مفقود رہیں۔ موجودہ نظام قومیت خود آزادی و مساوات کی راہ میں روک بن گیا ہے۔ نئے دور سے پہلے دنیا کا استبداد اور غیر مساویانہ امتیاز چند افراد اور خاندانوں میں محدود تھا۔ اب وہ بڑے بڑے گروہوں میں پھیل گیا ہے اس لئے حق و مساوات کے مقابلے میں طاقت اتنی سمٹی ہوئی اور مرکزیت کی حالت میں نہیں ہے، جس قدر پہلے تھی۔ تاہم جہاں تک انسانی آزادی و مساوات کا تعلق ہے، نوع انسانی اب بھی اس سے اسی طرح محروم ہے جس طرح پہلے تھی۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
یورپ کی جدید قومیت	مولانا ابوالکلام آزاد	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
طالب علم، استاد اور حکومت (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۴
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع۔ ج	
۲۔ پاکستان	ع۔ ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع۔ ل	۶
غزل	اثر لکھنوی	۶
غزل	عشرت حسین ردولوی	۷
غزل	باقر مہدی	۷
عورت	نضا ابن فیضی اعظمی	۷
بے ایمانی کی باڑھ	ک۔ ج	۸
امن پسندوں کی کانفرنس	مشروالا	
حیدرآباد کی تقسیم کا معاشی پہلو (۲)	ڈی ونکاٹیب	۹
برگ و زیست (افسانہ)	تاج النساء خانم جہانی	۱۰
قینچی		۱۱

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالکؔ ہندی

سیاست اور اخلاق

گذشتہ چند ہفتے کے سیاسی واقعات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دو سال سے ملک جس جنون کی کیفیت میں مبتلا تھا وہ اب ختم ہونے لگی ہے، اور ہمارے قائم راہِ راست کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انجمن اقوام میں حکومت ہند کا رویہ، کشمیر کا سمجھوتہ، ہند اور پاکستان کی گذشتہ کانفرنس کا ڈھنگ ان باتوں کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات کی بہتری انڈونیشیا کانفرنس کا انعقاد، ان کا تمام واقعات کے سیاسی پہلو پر تبصرہ کرنا میرا مقصد نہیں۔ لیکن ان کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے جس کو سمجھنا نہ صرف ارباب سیاست کا بلکہ تمام شہریوں کا فرض ہے۔ سیاست کی چال عام طور پر یہ رہی ہے کہ اس کی مصلحتوں اور ضرورتوں کو اخلاق اور صداقت کی بندشوں کا پابند نہیں کرنا چاہئے لیکن نوعِ انسان کے بہترین معلموں کا ہمیشہ یہی اصرار رہا ہے کہ اخلاق اور انصاف کے اصولوں کی گرفت سے زندگی کا کوئی شعبہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی قوم اس صداقت کو بھلا دے گی تو یہ اس کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ گاندھی جی کی اصلی عظمت اور ان کے پیغام کی اہمیت یہی ہے کہ اس گم کردہ راہ زمانے میں انھوں نے عقل و دنیا داری کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اور "عملی" سیاست والوں کے طنز اور اعتراض کو انگیز کر کے اس ابدی صداقت پر زور دیا اور بتایا کہ اس کل جنگ میں بھی آخری جیت اخلاقی عمل کی ہی ہو سکتی ہے اور جو ظاہری جیت خلاف اصول ترکیبوں سے حاصل ہو وہ دراصل جیت نہیں بلکہ ایک خطرناک ہار ہے۔ راجا جی نے جن کی نظر اور سمجھ ہمیشہ معاملے کی تہ کو پہنچ جاتی ہے ابھی چند روز ہوئے گاندھی جی کی برسی پر جو پیغام دیا ہے اس کا ایک جملہ بہت بلیغ اور اہم ہے کیونکہ وہ گاندھی جی کی تعلیم کے مغز کو چند لفظوں میں بیان کر دیتا ہے:

"ان کے اپدیش کا بنیادی خیال یہ تھا کہ عمل کے میدان میں ہمیں اپنی طرف سے ایک طرفہ طریقے پر کوشش کرنی چاہئے عام اس سے کہ دوسرے کیا کرتے ہیں اور ان میں کیا خرابیاں اور کمزوریاں ہیں۔"

خوشی کی بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نے ملک کی عام پالیسی کی تشکیل میں جہاں تک ہو سکا اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے، جہاں تک ہو سکا، اس لئے کہ انھیں اپنے ساتھیوں کو اور جنتا کو ساتھ لے کر چلنا ہے!) اور اس طرح خود کو گاندھی جی کی سیاسی جانشین ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک اخلاقی جانشین بھی ثابت کر سکے

دکھا دیا ہے۔ انھوں نے انجمن اقوام کے جلسے میں قوت اور طرفداری کی چند بندیوں اور تعصبوں سے پہلو بچا کر دوسروں کے سامنے اس اخلاقی اصول کو پیش کیا اور کم سے کم نظری حیثیت سے اس کی اخلاقی قیادت کا شرف حاصل کر لیا۔ کشمیر کے معاملے میں "عملی" سیاست والوں کو ان کی پالیسی پر اعتراض تھا۔ بعض کو اس بات پر کہ انھوں نے یہ مسئلہ انجمن اقوام میں کیوں پیش کیا (اور شروع شروع میں ان کا یہ اعتراض ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا!) اور بعض کو یہ شکایت تھی کہ وہ معاملے کا دو ٹوک فیصلہ کرنے کے لئے پاکستان کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیوں نہیں کر دیتے! لیکن واقعات کی بعد کی روش نے ان کے طرز عمل کی تائید کی۔ اصول کی خاطر افراد کی طرح قوموں کو بھی خطرے میں پڑنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اور ہر معاملے میں ایک بیوپاری کی تنگ ذہنیت کا مظاہرہ بالکل نامناسب ہے ...... اگر موجودہ صورت حال کسی ان جانے سبب سے بگڑ نہ جائے تو امید ہوتی ہے کہ بین الاقوامی سیاسی اخلاق کی پاسداری کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم کی پالیسی نے دونوں ملکوں کی جنگ کو بھی روک دیا ہے اور کشمیر کے پیچیدہ مسئلے کے حل کی بھی ایک صورت نکل آئی ہے۔ اسی طرح بہت سے دوسرے معاملات میں بھی پاکستان کے ساتھ معقول پسندانہ گفتگو اور مفاہمت کی کوشش کا نتیجہ بھی اچھا نکلا ہے اور اس کا پاکستان کے ارباب سیاست کی ذہنیت پر اچھا اثر پڑا ہے ...... انڈونیشیا کی کانفرنس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری خارجی پالیسی کسی خاص قوم یا ٹولی کی پابند نہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہے اخلاق اور انصاف کا ساتھ دینا چاہتی ہے اور ضرورت پڑے تو اس راستے میں پیش قدمی کرنے کو تیار ہے ...... ہر طرف جبر اور تشدد کی یورش کی وجہ سے دنیا کی ذہنی حالت اس درجہ خراب ہو گئی ہے کہ لوگوں کو یقین نہیں رہا کہ اخلاق، شرافت، سچائی اور رواداری کی تلوار میں بھی کاٹ ہوتی ہے اور ان ہتھیاروں نے نہ کبھی ہار مانی ہے، نہ ان کو سیکا سمجھنا ٹھیک ہے۔

جب ہم اپنی گذشتہ دو سال کی حماقتوں اور بدعملیوں کا جائزہ لیں تو تصویر کے اس روشن پہلو کو بھی دیکھ لینا چاہئے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں ہم سب کا فرداً فرداً کوئی بڑا حصہ نہیں ہے اور یہ زیادہ تر جواہر لال کی ذاتی کامیابی ہے لیکن ان کو اس وقت جو مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک

اکثریت اس بارے میں کم سے کم ان سے اختلاف نہیں رکھتی یہ بھی مقام شکر ہے!

مسلمان کدھر جائیں؟

آج کل بہت سے تعلیم یافتہ اور سیاسی دلچسپی رکھنے والے مسلمانوں کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ پالیسی کیا ہونی چاہئے، اور انھیں ملک میں کس پارٹی کا ساتھ دینا چاہئے۔ ابھی حال میں ایک جگہ چند باوثوق اور باخبر مسلمانوں کو اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے سننے کا موقع ملا۔ بعض کی رائے تھی کہ مسلمانوں کی کوئی ایک متفقہ پالیسی نہیں ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہئے بلکہ انھیں اپنے اپنے اغراض و مقاصد اور اقتصادی مفاد کے اعتبار سے مختلف پارٹیوں میں شامل ہو جانا چاہئے۔ بعض کا خیال تھا کہ انھیں بحیثیت ایک جماعت کے کانگریس میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ وہ اس وقت با اقتدار جماعت ہے۔ بعض کہتے تھے نہیں، مستقبل سوشلسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہے اور انھیں اس کا ساتھ دینا چاہئے۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ انھیں دوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر ایک تیسری سیاسی پارٹی بنانی چاہئے جو سرمایہ داری اور سوشلزم میں سے کسی کا ساتھ نہ دے بلکہ حسب مصلحت قوت کا کھیل کھیلے ...... جیتنے والی جماعت کے ساتھ شریک ہو جائے۔ رائے کے ساتھ ساتھ جو دلیلیں دی گئیں وہ بھی دلچسپ تھیں۔ سوشلزم کے حامی کہتے تھے کہ ہمیں زمانے کی رفتار کو پہچاننا اور سمجھ لینا چاہئے کہ آئندہ چل کر ہر بالغ کا ایک ووٹ ہوگا، ہما لئے پیسے والوں کو بھی اپنے مفاد میں عوام کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس کے مخالفوں کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو سرمایہ دار جو زیادہ تر ہندو ہیں مسلمانوں کو ملازمتیں نہ دیں گے، لہٰذا ان کی روزی ماری جائے گی اور پھر حال ہمیں کوئی ایسی پالیسی نہیں اختیار کرنی چاہئے جس کی وجہ سے ہم ان سے یا حکومتِ وقت سے بگاڑ پیدا کریں ......

مجھے اس وقت اس چیز سے بحث نہیں کہ ہم کس پارٹی کا ساتھ دیں، لیکن میرے نزدیک اس ذہنیت کی بہت اہمیت ہے، جس کو دل و دماغ کا سرمایہ بنا کر ہم مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ملک کی تاریخ کا جو دور ابھی ختم ہوا ہے، اس میں ہماری سیاست کا منشا زیادہ تر یہ تھا کہ ہم حکومتِ وقت کی رضا جوئی کریں، اور اسی طرح چند نوکریاں اور دوسری رعایتیں حاصل کریں۔ کچھ سال سے اس کی تہ میں صرف خوف اور مخالفت کا جذبہ کارفرما ہو گیا تھا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ خون کے حرفوں میں لکھا ہوا ہمارے سامنے موجود ہے (گو اس نتیجہ کی ذمہ داری کسی ایک جماعت پر نہیں، بلکہ سب جماعتوں کے سر ہے!) اب ضرورت ہے کہ ہم ایک نئی نظر کی شمع ہاتھ میں لے کر سیاست کے میدان میں آئیں۔ اگر ہمیں اب بھی یہی فکر رہے گی کہ ہم روٹی کے ٹکڑوں کی خاطر سرمایہ داروں یا سوشلسٹوں یا حکومتِ وقت کا ساتھ دیں تو انشاء اللہ روٹی کو بھی ترسیں گے اور ایمان و صداقت بھی ہاتھ سے جائیں گے۔ (بقیہ صفحہ ۶ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ر فروری ۱۹۴۹ء

طالب علم، استاد اور حکومت

پچھلے چند سال ہمارے ملک میں جس ہیجان اور کشمکش کی حالت میں گذرے اس نے ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے مزاج کے بوڑھوں تک کے اعصاب کو متاثر کر کے رکھ دیا۔ پھر بھلا گرم مزاج سیماب صفت نوجوانوں کی اعصابی بے چینی کا کیا ٹھکانا ہے! یہی وجہ ہے کہ ہر شورش میں خواہ وہ فرقہ پرستوں کی ہو یا انقلاب پسندوں کی، نوجوان خصوصاً اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم سب سے پہلے شریک ہو جاتے ہیں۔ ان تحریکوں کے لیڈر جنھیں اپنی سیاسی مصلحتیں، قوم کی تعلیمی مصلحتوں سے زیادہ عزیز ہیں بے تامل ان طالب علموں کو آگے کر دیتے ہیں، اور عام طور پر خود قانون کی زد سے بچنے کے لئے پردے کے پیچھے چھپے رہتے ہیں۔ استاد جو خود ہی طالب علموں کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے ایک دوسرے کے خلاف یا مدرسوں کے منتظمین کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں، "باہر والوں" کی اشتعال انگیزی کو روکنے کے لئے نوجوانوں کو ضبط و نظم کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑتی ہے اور طالب علموں کو گرفتار کر کے قید کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ صورت حال نہایت ناقابل اطمینان ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے مدرسوں میں ذہنی سکون کی فضا جس کے بغیر اچھی تعلیم ناممکن ہے قائم نہیں رہ سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح میں مختلف فریقوں کا کیا فرض ہے؟

سیاسی لیڈروں سے تو کچھ کہنا قریب قریب بے کار ہے اس لئے کہ ابھی ان میں یہ بصیرت پیدا ہونے میں بہت دن لگ جائیں گے کہ تعلیم سیاست کی تابع مہمل نہیں ہے، بلکہ قومی زندگی کا مستقل وظیفہ ہے اور انھیں طالب علموں پر اثر ڈالنا ہے تو فتنہ انگیز مفسد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ادب آموز معلم کی حیثیت سے ڈالنا چاہیئے، انھیں موجودہ سیاست کا آلۂ کار نہیں بلکہ آیندہ سیاست کا ذمہ دار ہراول بنانا چاہیئے۔ لیکن ہم حکومت کو، استادوں کو اور خود طالب علموں کو جنھیں تعلیم کی مستقل حیثیت کا احساس ہے کو بتانا چاہتے ہیں کہ ان کا اس معاملے میں کیا فرض ہے۔

حکومت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ نوجوان طالب علم صحیح مقصد کی حمایت پر اُبھارے گئے ہوں یا غلط مقصد کی علم برداری پر۔ عموماً ذاتی اغراض سے بری اور سچے جوش اور خلوص سے معمور ہوتے ہیں۔ جسے وہ حق سمجھتے ہیں اُسے ڈنکے کی چوٹ پکار کر کہنے اور اس کے لئے اپنی بساط بھر تکلیفیں اُٹھانے کا جذبہ جو انسانیت کا جوہر ہے ان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ان کو دبانے کے لئے قانون کے بے رحم ہاتھ سے کام لیا جائے تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ان کی ضد، سرکشی سے پہلے یہ نایاب، بے بہا، جوہر نہایت کچل کر نہ رہ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ اپنی نادانی سے تشدد اور نقض امن پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت کو مداخلت کرنی چاہیئے۔ لیکن اُسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس پولیس سے وہ کام لے رہی ہے وہ تشدد اور نقض امن کا حد سے زیادہ وسیع تصور رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ نفسیاتی بصیرت سے محروم ہے کہ دوسرے سیاسی شورش پسندوں اور نوجوان طالب علموں میں نیت اور مزاج کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے (لفظی معنی میں) ہانکتی ہے۔

جہاں تک استادوں کا تعلق ہے۔ سب سے پہلے تو انھیں اپنا دامن اس مجرمانہ عمل سے پاک رکھنا چاہیئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی اپنے ذاتی اغراض کے لئے طلبہ کو بھڑکا کر آلۂ کار نہیں بنانا چاہیئے۔ ورنہ پھر وہ کبھی ان پر مصلحانہ اثر نہیں ڈال سکیں گے۔ دوسرے انھیں ڈسپلن کے پرانے تصور میں بہت کافی ترمیم کرنی چاہیئے اور اس کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ نوجوانوں کی زبان پر، ان کے دماغوں پر اور دلوں پر پہرے بٹھائیں اور ان کے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھالیں، ورنہ نئی نسل کی بار ماری جائے گی، اور وہ ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے ہماری طرح بونی ہو کر رہ جائے گی۔

اب رہے خود نوجوان طالب علم تو ان کے جوش اور خلوص، ان کے حوصلے اور ولولے، ان کی خالص اور پاک نیت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں، اور ان کے اس مطالبے سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ انھیں اپنے سیاسی خیالات میں کامل آزادی اور ان کے ظاہر کرنے کا پورا موقع ملے جمہوریت کا دعوےٰ کرنے والی ریاست کے اندر یہ اُن کا بنیادی حق ہے جس سے کوئی انھیں محروم نہیں کر سکتا۔ لیکن سیاسی عمل کے بارے میں وہ کامل آزادی کا مطالبہ کریں تو بے جا ہے۔ عمر کے جس دور سے وہ گذر رہے ہیں وہ سیاسی تعلیم کا سیاسی اصلاح یا انقلاب کی تیاری کا دور ہے۔ سیاسی عمل کا نہیں۔ جو لوگ انھیں اپنی توجہ اپنے مقدس فرض سے ہٹا کر بے نتیجہ شورش میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ مقدس فرض کیا ہے؟ اپنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما دینا۔ اپنے آپ کو اپنے ملک کی اور دنیا کی تعمیر نو کے لئے تیار کرنا جس کا بوجھ آگے چل کر ان کے کندھوں پر پڑنے والا ہے نئے سیاسی اور معاشی نظام کے لئے جس کے قائم کرنے کا ہمارے نوجوان حوصلہ رکھتے ہیں۔ قابل اور تربیت یافتہ آدمی بہت بڑی تعداد میں درکار ہوں گے۔ یہ انھیں میں سے نکلنے ہیں لیکن اس کے لئے انھیں بڑی تیاری کی اور بہت پتہ مار کر

کام کرنے کی ضرورت ہے۔

بزم بے تکلف

جنتا ایکسپریس کے جس ڈبے میں خاکسار نے بند کھڑکی کے کھلے منہ میں سر ڈال کر غوطہ لگایا، وہاں جمہوریت برائے رسمی تھی، یعنی جگہ کی تقسیم "سب کو برابر" یا ہر ایک کو "بہ قدر ضرورت" کے اصول پر نہ تھی بلکہ جرأت رندانہ کے حساب سے۔ کچھ لوگ اس طرح پھیل پڑے تھے کہ دوسروں کو سکڑنا ہی پڑتا تھا، بہ قول شاعر

سیٹ اس کی نہ اس کی بلکہ ڈبہ اس کا ہے
جس کی ٹانگیں تیری پسلی پر خراماں ہو گئیں

کہیں آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ پر اسباب ڈھیر تھا اور کہیں اسباب رکھنے کی جگہ پر آدمی ڈھیر تھے۔ جب میں غوطہ لگا کر ابھرا تو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد دو موٹے تھنوں کے بیچ میں ایک پاؤں گاڑی کے فرش پر اور ایک اسباب کی گٹھری پر رکھ کر کھڑے ہونے کی جگہ ملی.... ایک تو یوں ہی دم گھٹ رہا تھا اور کچھ مر نکلا جاتا تھا اور اوپر سے گھڑکیوں اور جھڑکیوں کی بوچھار ہو رہی تھی میری وہ کیفیت تھی جیسے جنوبی افریقہ میں کوئی کالا گوروں کی بستی میں جا پھنسا ہو، جس سے آنکھیں چار ہوتی تھیں وہ ڈاکٹر ملان کی طرح خون کا پیاسا نظر آتا تھا۔

یوں بارِ دگر خوف سے سارے جہاں کی صورتیں
آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں جس طرف صیاد تھا

اور میرا خوف بے بنیاد نہ تھا اس لئے کہ ایک صاحب کے خلاف، جنھوں نے میری طرح ڈبے کے دوسرے سرے پر قانون داخلہ کی خلاف ورزی کی تھی اور لڑ جھگڑ کر اپنی مداخلت بیجا کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے ڈائرکٹ ایکشن شروع ہو گیا تھا۔ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہوں، پھر بھی دل میں ڈر رہا تھا کہ دیکھئے گاڑی چلنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ مگر گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبے میں سکون ہو گیا۔ ادھر ان زبان دراز بزرگ کو جان کی امان مل گئی اور ادھر مجھ بے زبان پر جو گرم فقروں اور تیکھی نظروں کی بوچھار ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ڈاکٹر ملان کے قہر کی جگہ ڈاکٹر اسمٹس کا تحمل جھلکنے لگا میرے محدود حقوق شہریت تسلیم کر لئے گئے اور ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کی اجازت مل گئی۔ دونوں طرف سے ٹھوس اور دبیز جسموں کا جو دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی کم ہو گیا اور پیٹ میں سانس سمانے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دیس بھائیوں میں پریم کے رس کی کمی نہیں ہے مگر کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے یہ رس تاؤ کھا کر سرکہ بن جاتا ہے، اگر ہم اتنی سہار ہو کر نہ دوسروں کا تاؤ ٹھنڈا ہونے تک خود جوش میں آ کر اُبل نہ پڑیں تو ہماری زندگی کی چاشنی اتنی تیز نہ ہونے پائیں۔

پچھلا ہفتہ: ا۔ ہندوستان

دلوں کی عدالت کا فیصلہ کب ہوگا؟

۱۰ر فروری کو گاندھی جی کے قتل کے مقدمے میں فیصلہ سنا دیا گیا۔ ملزموں میں سے دو کو موت کی سزا ہوئی۔ پانچ کو عمر قید کی۔ بڈگے کو جو سرکاری گواہ بن گیا تھا رہا کر دیا گیا۔ ساورکر بری کر دیئے گئے۔

یہ بدنصیب جنھیں سزائیں ہوئیں کھلے ہوئے قاتل تھے۔ انصاف کا ہاتھ ان تک پہنچ گیا اور قانون کے شکنجے نے انھیں جکڑ لیا۔ لیکن چھپے ہوئے قاتل جنھیں ہم نے اپنے دلوں کے تاریک گوشے میں پناہ دے رکھی ہے، قانون اور انصاف کی زد میں نہیں آئے اور صاف بچ گئے۔ یہ خوفناک چھپے ہوئے قاتل جن کے ہاتھوں گوڈسے آپٹے اور ان کے ساتھی کٹھ پتلی بن گئے تھے، مذہبی اور سیاسی تعصب، ضد اور نفرت کے جذبات ہیں بہت سے دلوں کی عدالت میں ان خون خوار قاتلوں پر گاندھی جی کے قتل کا مقدمہ چل رہا ہے، ان کے خلاف صاف اور صریحی ثبوت موجود ہے لیکن عدالت فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ طرح طرح کے بہانے بنا کر ٹالتی رہتی ہے۔ اگر ہندوستانی قوم کو اور عالم انسانیت کو ان بے درد خونیوں کے شر سے محفوظ رکھنا ہے تو دلوں کی عدالت کو بھی جلد سے جلد دو ٹوک فیصلہ کر دینا چاہئے۔

اب حکومت کا امتحان ہے

بچارے دیہاتی مدرسوں نے یو۔پی میں ہفتوں تک بے روزگاری کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد اپنی ہڑتال بغیر کسی شرط کے ختم کر دی ہے۔ شری پرشوتم داس ٹنڈن نے انھیں یقین دلایا ہے کہ وہ حکومت کو ان کے ساتھ انصاف کرنے پر آمادہ کر دیں گے۔ حکومت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سارے صوبے میں بلکہ سارے ملک میں لوگوں کی ہمدردیاں مدرسوں کے ساتھ ہیں اس کے باوجود انھیں بہت سے لوگوں نے جلد سے جلد ہڑتال ختم کر دینے کی صلاح اس بھروسے پر دی ہے کہ ہڑتال ختم ہوتے ہی ان کا واجبی حق جو انھیں بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا، مل جائے گا۔

اب صوبے کی حکومت کا امتحان ہے کہ وہ اس بھروسے کی مستحق ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کی جانچ یہ ہے کہ ایک تو ان لوگوں کو صرف ہڑتال کرنے کے جرم میں کسی قسم کی سزا نہ دی جائے۔ دوسرے ان کی تنخواہوں میں اضافہ محض برائے نام نہ ہو بلکہ کم سے کم اتنا ہو جتنا صوبہ دہلی اور صوبہ بمبئی کی حکومتوں نے اپنے مدرسوں کی تنخواہوں میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کو تعمیر نو کے سلسلے میں بہت سے کام درپیش ہیں جن میں بڑی بڑی رقمیں صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن دراصل تعمیر نو کا بنیادی کام یعنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت انھیں غریب مدرسوں کے ہاتھ ہوتی ہے اور اس کام کے لئے ان کو اخلاقی اور روحانی اصولوں کے علاوہ جو بہت سے لوگ مفت مہیا کرنے کو تیار ہیں پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی درکار ہے، جس کے مہیا کرنے کی کوئی حامی نہیں بھرتا۔

کتنا فرق ہوگیا ہے!

ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ مرکزی اسمبلی میں اہم معاشی اور مالیاتی مسائل کے متعلق بہت سے قانون بغیر کسی رد و قدح کے پاس ہو جاتے تھے سمجھا یہ جاتا تھا کہ ان مسائل سے صرف صنعتی اور تجارتی طبقوں کو تعلق ہے اگر ہندوستانی تاجر، کارخانوں کے مالک کسی مسودۂ قانون کے حق میں ہیں تو اس میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں، عوام کے نمائندوں کو آنکھ بند کر کے اس کی تائید کرنی چاہیے۔ ہاں اگر کسی معاملے میں دیسی اور بدیسی سرمایہ داروں کے مفاد میں ٹکر ہوتی تو بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں، لیکن دراصل معرکہ کارزار اس وقت گرم ہوتا تھا جب سماجی اصلاح کے بارے میں کوئی مسودہ قانون پیش ہو۔ قدامت پرستوں کی طرف سے ہر اصلاحی تجویز کی مخالفت میں مذہب کا ڈنکا بجا کر قیامت کا ہنگامہ برپا کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب معاملہ الٹا ہے پچھلے ہفتہ کئی سرکاری بلوں کے علاوہ جن میں کوئی نزاعی باتیں نہ تھیں، سماجی اصلاح کے متعدد بل منٹوں میں پاس ہو گئے یا سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیئے گئے۔ بخلاف اس کے فنانس منسٹر کے اس بل پر جو بنکوں کے قانون میں چند ضروری ترمیمیں کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ تین روز تک بحث ہوتی رہی اور ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ان اصلاحی بلوں میں جو چپ چپاتے پاس ہو گئے ایک شری مدھو کا بل بابت ترمیم و ضابطہ فوجداری ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسری شادی کر لے یا کسی عورت کو گھر میں ڈال لے تو پہلی بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ شوہر سے الگ ہو جائے اور نان نفقہ لیتی رہے۔ جو بل سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کئے گئے ہیں ان میں بنارت ٹھاکر داس بھارگو کا ایک بل ہندوؤں، جینیوں اور سکھوں کی مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کو جائز قرار دینے، اور دوسرا لڑکیوں کے سن بلوغ کی حد بڑھانے کے بارے میں تھا۔ جن لوگوں کو شاردا بل کے معرکے یاد ہیں، انھیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ تجویزیں اتنی آسانی سے کیسے منظور ہو گئیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سماجی قدامت پسندی کا مورچہ کم تعلیم یافتہ طبقے میں ٹوٹ چکا ہے اور ترقی پسندی کے لئے راستہ کھل گیا ہے۔

بنکوں کے بارے میں فنانس منسٹر کے بل پر جو قیل و قال تین دن تک رہی اور ابھی اور رہے گی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ترقی پسندی نے اسمبلی میں معاشی محاذ پر مقابلہ شروع کیا ہے اور زیادہ سرگرمی اسی محاذ پر نظر آتی ہے۔ مگر ترقی پسندی کے علم بردار دو چار سے زیادہ نہیں۔ اسمبلی کے ممبروں کی بڑی اکثریت یعنی کانگریس پارٹی حکومت کی معتدل محتاط، درمیانی پالیسی کی حامی ہے۔ چنانچہ نہ اس نے شری مودی کی تائید کی جو چاہتے تھے کہ بینکوں پر منافع کی تقسیم کو محدود کرنے کی پابندی نہ لگائی جائے۔ اور نہ پروفیسر کے ٹی شاہ کا ساتھ دیا۔ جنھوں نے ساہوکاروں کے نجی کاروبار کو بھی اس قانون کے دائرے میں لانے کی تجویز اور غریبوں کے نقطۂ نظر سے دوسری تجویزیں پیش کی تھیں۔ ہاں جب بحث کی ضمن میں یہ مسئلہ اٹھا کہ امپیریل بینک کو قومی ملک بنایا جائے تو بہت سے لوگوں نے اس کی حمایت کی اور فنانس منسٹر کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ بہت جلد امپیریل بینک کے قانون میں بھی ترمیم کرنے کا بل پیش کریں گے۔

آثار قدیمہ کی جدید تنظیم

آثار قدیمہ کے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کا جلسہ ۷ر فروری اور ۸ر فروری کو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا۔ چونکہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہڑپا، موہنجو دارو، اور ٹیکسلا کے مرکز اب اس کی نگرانی میں نہیں رہے اور دوسری طرف جو ریاستیں ہندیونین میں شامل ہو گئی ہیں ان کا ایک لاکھ تین ہزار مربع میل رقبہ اس کے انتظام میں آگیا ہے اور کئی ریاستوں کے یونین جن کا مجموعی رقبہ ۱½ لاکھ مربع میل ہے اپنے آثار قدیمہ کی دیکھ بھال اس کے سپرد کرنے والے ہیں۔ اس لئے محکمے کی نئے سرے سے تنظیم کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بورڈ کے جلسے میں ذیل کی تجویزیں منظور ہوئیں جن پر کوئی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہوگا۔

۱۔ کھدائی کے سپرنٹنڈنٹ کے تحت ایک نیا اسسٹنٹ مع ضروری اسٹاف کے مقرر کیا جائے جس کا کام یہ ہو کہ ایک ایک کر کے ملک کے سب ضلعوں کا اچھی طرح جائزہ لے۔

۲۔ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مع اسٹاف کے قدیم مٹی کے برتن جمع کرنے اور ان کے نقشے تیار کرنے کے لئے رکھا جائے۔

۳۔ محکمے کی اس شاخ کے لئے جو قبل تاریخی زمانے کے آثار کی تحقیقات کرتی ہے اور جسے جنوبی ہند میں بہت سا کام کرنا ہے ایک زائد سپرنٹنڈنٹ اور اس کے ماتحت ضروری اسٹاف مقرر کیا جائے۔

۴۔ تفتیش کے کام کے لئے ایک خاص ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل مقرر کیا جائے جو محکمے کی مطبوعات اور اسٹاف کی ٹریننگ کی نگرانی کرے اور ڈائرکٹر جنرل کو تفتیش کے کام کی منصوبہ بندی اور ترتیب و ربط میں مدد دے۔

۵۔ کیمیاوی شاخ میں چار اسسٹنٹ اور بڑھائے جائیں۔

۶۔ کتبوں کی شاخ میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ شمالی ہند کے لئے، ایک جنوبی ہند کے لئے اور تین اسسٹنٹ بڑھائے جائیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

۲- پاکستان

پیر الٰہی بخش کا استعفیٰ

سندھ کے دوسرے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش بھی حریم اقتدار سے نکل گئے اور انھوں نے "برضا و رغبت تمام" اپنا استعفیٰ گورنر سندھ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پیر الٰہی بخش کی یہ علیحدگی نہ تو کراچی کے ان پانچ اخباروں کے احتجاج کا نتیجہ ہے جنھوں نے ان کی وزارتی روش کو اسی طرح ہدف تنقید بنایا تھا جس طرح ہم نے مغربی پنجاب کی وزارت کو بنا رکھا تھا اور نہ ان کا مستعفی ہونا مرکزی حکومت کی مداخلت کا مرہون منت ہے۔ پیر الٰہی بخش نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے مطالبے کے سلسلے میں بھی سر نہیں جھکایا۔ جس نے یہ کہا تھا کہ ان کی وزارت کو مستعفی ہو جانا چاہئے اور ہم ان کو اس بنا پر بھی شاباش نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے ...... صوبے کے حال پر کرم فرمائی کرتے ہوئے وزارت عظمیٰ کی کرسی خالی کر دی، بلکہ ان کا الیکشن ٹریبونل (عدالت امور انتخابات) کے فیصلے کا مرہون احسان ہے جس نے ان کو انتخابی معرکے میں بددیانتی سے کام لینے کا مجرم گردانا اور چھ سال کے لئے حق انتخاب اور حق رائے دہی سے محروم کر دیا۔ پیر صاحب نے اپنے استعفے میں یہ لکھ کر قوم کے سر پر احسان دھرنے کی کوشش کی ہے کہ میں اگر چاہتا تو مزید چھ ماہ کے لئے وزارت کی مسند پر براجمان رہ سکتا تھا۔ لیکن ایسے کہتے وقت وہ اس امر کو فراموش کر گئے کہ چھ ماہ کے لئے ایسے لوگوں کو وزیر بنایا جاتا ہے جن کو چھ ماہ کے اندر اندر کسی حلقے کی طرف سے منتخب ہو کر اسمبلی کا ممبر بن جانے کی امید ہو۔ ٹریبونل کے فیصلے نے تو چھ سال کے لئے اڈہ ہی اڑا دیا لہٰذا وہ اس فیصلے کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی وزیر نہیں رہ سکتے تھے۔

(روزنامہ مغربی پنجاب، لاہور)

صوبہ سرحد میں مزارعوں اور مالکوں کی چپقلش

اصل خطرہ جو آگے چل کر صوبہ سرحد کے امن و امان کے لئے واقعی بڑا پریشان کن ہو سکتا ہے، وہ زمین کے مزارعوں اور اس کے مالکوں کی باہمی چپقلش ہے اس سلسلے میں سرحد کے بعض اضلاع میں تصادم بھی ہو چکے ہیں۔ جہاں مزارعوں نے بٹائی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ تحصیل چارسدہ میں صوبائی حکومت زبردستی مزارعوں یعنی دخیل کاروں کو زمینوں سے بے دخل کر رہی ہے اور اس کے لئے فوج اور پولیس کی جمعیت کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت مزارعوں کو جتنا بھی چاہے دبا سکتی ہے۔ اس کے پاس طاقت ہے۔ اس کا اپنا وقار بھی ہے اور پھر مسلم لیگ کی اسے حمایت حاصل ہے لیکن مزارعوں پر یہ سختی جو نہ صرف حق و انصاف کے خلاف ہے بلکہ اس سے آگے چل کر بہت خطرناک نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ کسی اعتبار سے بھی دانشمندانہ نہیں کہی جا سکتی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے کے امن و امان میں خلل واقع ہوگا، اور لوگوں میں طبقاتی تصادم کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

تحصیل چارسدہ کے علاوہ سرحد کے ضلع ہزارہ میں بھی مزارعوں اور مالکوں کا جھگڑا چل رہا ہے اور ان نواح میں بھی مزارعوں نے مالکوں کے مطالبات ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ضلع ہزارہ کے مزارعوں کا کہنا یہ ہے جیسا کہ انھوں نے اپنی درخواست میں جو انھوں نے وزیر اعظم سرحد کو بھیجی ہے، لکھا ہے:۔

"سکھوں کے زمانے سے بہت پہلے ہمارے اور موجودہ مالکان اراضی کے بزرگوں نے مل کر موجودہ اراضی حاصل کیں، اور اپنے دیہات آباد کئے ہر شخص اپنے بنائے ہوئے مکان اور اپنی کاشت کی ہوئی زمین کا مالک تھا سب کے حقوق و مفاد انفرادی طور پر الگ الگ تھے، اور سب اپنے اپنے حصے کا مالیہ براہ راست سرکاری خزانے میں داخل کیا کرتے تھے۔"

جس وقت انگریزوں کا راج ہوا مالکان اراضی کو ہماری زمین پر کسی قسم کا مالکانہ حق نہ تھا، لیکن پہلے باقاعدہ بندوبست میں ان دولت مند اور پڑھے لکھے زمینداروں نے ہمارے بڑوں کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو ساری زمین کا مالک لکھوا دیا، اور اس کے بعد ہم ان کے مزارعے بن گئے۔

جس "مالکیت" کی تاریخی حیثیت یہ ہو اور وہ نتیجہ ہو کھلم کھلا ظلم اور صریح بے انصافی کا۔ اور پھر شریعت مطہرہ کی رو سے اس قسم کی "مالکیت" بھی جائز نہ ہو۔ نیز آج کے زمانے کے مسلمہ سیاسی اور معاشی اصولوں کے مطابق اس "مالکیت" کے لئے کوئی جواز نہ رہا ہو۔ اس "مالکیت" کو منوانے کے لئے صوبہ سرحد کی مسلم لیگی حکومت کا اپنی رعایا پر زبردستی کرنا اور سنگینوں کی مدد سے اسے مالکوں کے مطالبات ادا کرنے پر مجبور کرنا سخت زیادتی ہے۔

آج صرف سرحد میں نہیں بلکہ پورے پاکستان میں زمین کا مسئلہ سب سے بڑا، سب سے اہم اور سب سے زیادہ فوری توجہ کا مستحق مسئلہ ہے اور اس کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ

ع وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
بلکہ اس کی ہے جو اسے جوتتا، بوتا، اور اس کے لئے خون پسینہ ایک کرتا ہے

(آفاق، لاہور)

پاکستان میں انفرادی سرمایہ کی گھٹتی ہوئی رفتار

اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں نئی کمپنیوں کے قیام کے متعلق جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے ایک نہایت ہی ناگوار حقیقت واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کے تجارتی اور صنعتی کاروبار میں سرد بازاری پیدا ہو رہی ہے جو بجائے خود نتیجہ ہے اس بات کا کہ عام لوگوں کی قوت خرید سرعت کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مذکورہ عرصے میں نئی قائم ہونے والی کمپنیوں کی تعداد اور سرمایہ جولائی، اگست ستمبر اور پھر اپریل، مئی، جون، کی بہ نسبت گھٹ گیا ہے۔ اپریل تا جون ۱۹۵۰ء کے عرصے میں چار کروڑ نوے لاکھ روپے کا نیا سرمایہ لگایا گیا، اور اکتوبر تا دسمبر صرف تین کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کا، جولائی تا دسمبر ۱۹۵۰ء ۴۲ کمپنیاں قائم ہوئیں اور ۷ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا سرمایہ تجارت اور صنعت کے میدان میں داخل ہوا اور اکتوبر تا دسمبر میں صرف ۳۳ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ کمپنیوں سے مراد یہاں پر وہ کمپنیاں ہیں جن کو حکومت پاکستان کی منظوری حاصل ہوئی) اپریل تا جون میں ہر کمپنی کا اوسط سرمایہ ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ اور جولائی تا دسمبر کے عرصے میں ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ اور اکتوبر تا دسمبر میں صرف دس لاکھ روپے سے زیادہ رہا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نئی قائم ہونے والی کمپنیوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ مجموعی سرمایہ کا حجم پتلا ہوتا جا رہا ہے، اور اوسط سرمایہ فی کمپنی بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بزنس کرنے والے تجارتی نقصان کے رجحان کو سونگھ کر اپنا سرمایہ لگانے سے احتراز کر رہے ہیں۔

پھر ہماری انفرادی سرمایہ کاری کا ایک اور رجحان ہے اور وہ یہ کہ اکتوبر تا دسمبر جو نئی ۳۳ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں ان میں صرف ۱۲ صنعتی کمپنیاں ہیں اور بقیہ ۲۱ کمپنیاں محض تجارتی، جو درآمدی و برآمدی کاروبار کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انفرادی سرمایہ کاری کا غالب رجحان صنعت کی طرف نہیں ہے بلکہ محض تجارت کی طرف —— یہ ہماری قومی معیشت کی بنیادی ضرورت —— تیز رفتار صنعت کاری —— سے قطعاً غیر متعلق ہے۔ کیا اب بھی حکومت ملک کی صنعت کاری کے لئے انفرادی سرمایہ کاری پر بھروسہ کرنے سے باز نہ آئے گی؟ یہ ایک اہم اور جائز سوال ہے ہمارے ملک کا ۷۵ فی صدی سے زیادہ سرمایہ ناکارہ، جاہل اور عیاش فیوڈل طبقے کے پاس بے کار جمع ہے۔ کیا حکومت ان سے سرمایہ چھین کر صنعت کاری میں لگانے کے لئے تیار ہے؟

یا پاکستان کے خون پسینے سے کمایا ہوا یہ سرمایہ ملک کی تعمیر کی بجائے آیندہ الیکشن کے بدمعاشیوں میں تلف ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور)

یہ ریگ زار سندھ ہے اونٹوں کی ملکیت
سندھی سیاسیات بھی ہے اونٹ "فی المثل"
اس اونٹ سے نہیں تو یہ ہے پوچھنا رئیس
یہ تو بتا کہ کون سی سیدھی ہے تیری کل؟

رئیس امروہوی، کراچی

۳- باہر کی دنیا

مغربی یونین کی نئے بڑھ رہی ہے

روس اور مغربی طاقتوں کے اختلافات نے بڑھتے بڑھتے اب اعصابی جنگ کی صورت اختیار کر لی ہے اور دونوں فریق انتہائی چستی اور پوری تندہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قوموں کو اپنے ساتھ ملانے اور رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امن کے لئے امن کے قیام اور تخفیف اسلحہ کی تجویزیں پیش کی جاتی ہیں حسب مصلحت دوستی کا ہاتھ کبھی آگے بڑھایا جاتا ہے کبھی پیچھے کھینچ لیا جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی قوموں سے ڈرا پھسلا کر معاہدے کئے جاتے ہیں۔ غرض ایک بڑی لڑائی سے قبل جتنی اور جس طرح کی تیاریاں کی جاتی ہیں، وہ سب کی جا رہی ہیں۔

"شمالی اٹلانٹک پیکٹ" کی تجویز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ روس اور مغربی طاقتوں کی جتھے بندیاں پہلے سے موجود ہیں۔ اب انھیں جتھے بندیوں کو اور مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ اٹلانٹک پیکٹ مغربی یونین کی ایک توسیع یافتہ شکل ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ اس معاہدے کے ذریعے ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کو بھی مغربی یونین میں شامل کر لیا جائے۔ سویڈن ایک طویل مدت سے لڑائی جھگڑے سے الگ رہا ہے۔ یہاں تک کہ پچھلی لڑائی میں بھی جس نے تمام دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ اپنی غیر جانبداری کو باقی رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس لئے اس کی اور ڈنمارک اور ناروے کی بھی خواہش تھی کہ اپنی حفاظت اور روس اور مغربی طاقتوں کے تسلط سے بچنے کے لئے وہ اپنا ایک الگ جتھا بنائیں۔ مگر اس میں ان کو کامیابی نہیں ہو سکی۔ سویڈن اور ڈنمارک کے مقابلے میں ناروے کا جھکاؤ مغربی طاقتوں کی طرف نسبتاً زیادہ ہے اور اس کی سرحد کوئی ستر میل تک روس سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے اس رجحان سے قدرتی طور پر روس کو تشویش اور پریشانی ہے۔ اس نے ۲۹ر جنوری کو ایک طویل بیان میں، جو ۴۰ صفحات پر مشتمل تھا اٹلانٹک پیکٹ کو امن عالم کے لئے خطرناک اور اپنے خلاف جارحانہ کارروائی بتایا ہے۔ ناروے کا اس طرف جھکاؤ دیکھ کر اس نے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ اپنے علاقے میں مغربی طاقتوں کو فوجی اڈے بنانے اور ہوائی اور سمندری اڈوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے گا؟ ناروے کے وزیر خارجہ نے اس کے متعلق گول مول جواب دیا ہے اس کے بعد اس نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش کی ہے اس کے متعلق بھی ابھی تک روس کو کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ وزیر خارجہ موسیو لانگے اس وقت واشنگٹن میں مشورہ بلکہ کہنا چاہیئے کہ معاملہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں جس طرح کی بات ہوگی اسی لحاظ سے روس کو جواب ملے گا۔

روس کا مشرقی یورپ کی تنظیم اور اپنے اثر میں رکھنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ آیندہ لڑائی کو اپنی سرحد سے زیادہ سے زیادہ دور رکھے۔ لیکن اگر ناروے اٹلانٹک پیکٹ میں شامل ہو گیا تو اس کی کوئی ۷۰ میل کی سرحد خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لئے اس کے جواب میں وہ کوئی موثر کارروائی کرنے میں حق بجانب ہوگا غالباً اس کی یہ جوابی کارروائی بالٹک میں ہوگی۔ غالباً وہ آلینڈ اور آئس لینڈ پر قبضہ کرے گا۔ اور ایسی صورت میں سویڈن کی عظیم الشان بحری طاقت بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ ان حالات میں دنیا کا اور خود بحیرہ بالٹک کے علاقے میں بسنے والی قوموں کا فائدہ اسی میں ہے کہ اٹلانٹک پیکٹ میں شریک ہونے کے بجائے اپنا الگ اتحاد بنائیں۔ اور اپنی غیر جانبداری کو جس طرح ممکن ہو باقی رکھیں۔ پریذیڈنٹ ٹرومین کی یہ دھمکی اس میں شبہ نہیں کافی وزن رکھتی ہے کہ موجودہ حالات میں۔ چند چھوٹی قوموں کا اتحاد اپنی حفاظت میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ مگر جب تک حالات روس یا مغربی طاقتوں میں کسی ایک کے حصے میں شامل کرنے پر مجبور نہ کر دیں اس وقت تک اس کو آزما کر کیوں نہ دیکھ لیا جائے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

بہ سلسلہ صفحہ (۲)

میں جانتا ہوں کہ عقل دنیا دار کے پجاری عملی دنیا میں اصول پرستی کے قائل نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں غرض پرستی کا سکہ چلتا ہے اور اسی سے لین دین کرنا چاہیئے۔ وہ شاید اقبال کے اس شعر سے لطف اٹھاتے ہوں لیکن اس کی پرچھائیں اپنے عمل پر نہیں پڑنے دیتے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بڑا کام کبھی خود غرضی اور نفس پرستی کے نام پر نہیں ہوا، خوف اور اندیشے کے بل پر نہیں ہوا اگر اس قسم کی مصلحت اندیشی گاندھی جی کے پیش نظر ہوتی تو وہ کبھی حکومت برطانیہ سے ٹکر نہ لیتے، نہ کانگریس کو ایک زبردست قوت بنا سکتے نہ ملک آزاد ہوتا۔ وہ سلامتی کی تلاش میں ساحل کی عافیت کو سینے سے لگائے رکھتے ...... اگر اس قسم کے اندیشے موجودہ روس کے معماروں کے ہاتھ پاؤں اور دماغوں کی زنجیر ہوتے تو وہاں آج بھی زار روس کی حکومت قائم ہوتی ...... اور صرف آجکل کی سیاست ہی پر کیا موقوف ہے؟ ایثار، جاں بازی، اصول پرستی، جاہ طلبی پر خدمت خلق کو ترجیح سچ کی خاطر ہر قیمت ادا کرنے پر آمادگی؛ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر نہ قومیں بن سکتی ہیں نہ دنیا ترقی کر سکتی ہے۔ جب عرب میں محمد عربی صلعم نے ناحق کے خلاف اپنی آواز بلند کی تو انھیں کب یہ فکر تھی کہ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ اہل اقتدار کیسا سلوک کریں گے...

نہیں، میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ گھٹیا بیوپاریوں کی سی لین دین اور فوری نفع خوری کی ذہنیت کے ساتھ مسلمان ہندوستان میں کچھ نہیں کر سکتے (نہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ کچھ کر سکتے ہیں۔) انھیں کسی جماعت کے اندر محض چند دوٹوں کا پاسنگ بن کر نہیں جانا چاہیئے بلکہ رہنمایانہ حیثیت سے خدمت کا بیڑا لے کر، بلا تفریق مذہب و ملت ہر جماعت کی سیوا کرنے میں پہل کرنی چاہیئے اور اس سیوا کے ذریعے اپنے مخالفوں اور شبہہ کرنے والوں کے دل میں گھر کرنا چاہیئے۔ (۲) انھیں حکومت کے سیاسی اغراض کی وجہ سے کوئی خاص رعایتیں نہیں ملیں گی بلکہ ممکن ہے کہ کچھ عرصے تک ان کے ساتھ سختی یا بے اعتنائی کا سلوک کیا جائے۔ اس لئے انھیں اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی عادت ڈالنی ہے، اور اپنی اصول پرستی، سیرت کی پختگی اور خدمت کے طلسم سے شبہہ اور مخالفت کی ذہنیت کو دور کرنا ہے۔ یہ کام مشکل ہے اور دیر طلب ہے اور سیاست کی چال بازیوں کا نہیں بلکہ تعلیمی کام ہے۔ اور اس وقت یہی کام ہے جس پر ہمارے بہترین اہل فکر کو اپنی پوری توجہ صرف کرنی چاہیئے

غزل

اثر لکھنوی

مطلبِ دیر یاب نے مارا — ایک مبہم جواب نے مارا
عشوۂ کامیاب نے مارا — پے محل کے حجاب نے مارا
دیکھ کر اس نگاہ کی مستی — جوشِ موجِ شراب نے مارا
اُف شکر خندۂ لبِ نازک — غنچۂ پر گلاب نے مارا
دل کو تاکا، جگر نشانہ تھا — شوخیِ انتخاب نے مارا
ہر قدم پر عذاب کی دھمکی — وضعِ اہلِ کتاب نے مارا
سحر قدرے نہیں ان آنکھوں میں — جال پر بیول پہ خواب نے مارا
کام نکلا نہ جب تغافل سے — ناز بن کر عتاب نے مارا
مجھ سے ہی اور نہیں سخن مجھ سے — تیرے طرزِ خطاب نے مارا
زندگی تو بنو حقیقت تھی — وہم وحشت سراب نے مارا
نہ وہ در ہے نہ وہ جبینِ نیاز — سجدۂ مستجاب نے مارا

توبہ کے بعد آج پی جو اثرؔ
تیر بدئے شراب نے مارا

غزل

عشرت حسین ردولوی

نہ حال اپنا نہ کوئی قصۂ بیگانہ کہتے ہیں
سراپا درد میں ہم درد کا افسانہ کہتے ہیں

ذرا اے چشمِ عبرت دیکھ کیا رنگ زمانہ ہے
جو تھی کل تک حقیقت آج اُسے افسانہ کہتے ہیں

گل و بلبل کا قصہ ہے نہ حالِ شمع و پروانہ
کچھ اپنے دل کی بربادی کا ہم افسانہ کہتے ہیں

وہ دل جس میں تمھارے جلوۂ رعنا سے رونق تھی
وہی دل ہے کہ جس کو ہم ہی اب ویرانہ کہتے ہیں

جو باتیں آپ سے پہروں ہوا کرتی تھیں خلوت میں
وہی ہم ہیں کہ ان باتوں کو اب افسانہ کہتے ہیں

ہجومِ یاس سے گھبرا کے تنہائی کے عالم میں
ہم اپنے دل سے پہروں آپ کا افسانہ کہتے ہیں

خدارا اہلِ محشر تم بھی آ کر غور سے سن لو
ہم اُن سے دل کی بربادی کا آج افسانہ کہتے ہیں

جو مخمورِ مئے وحدت ہیں ان کو کیا خبر اس کی
کسے شیشہ، کسے ساغر، کسے پیمانہ کہتے ہیں

حقیقت ایک لیکن اصطلاحیں مختلف ہر جا
کہیں کہتے ہیں کعبہ اور کہیں بت خانہ کہتے ہیں

سکوں ممکن نہیں عشرتؔ کسی جا دیر و کعبہ میں
اُٹھو چل کر وہیں بیٹھیں جسے مے خانہ کہتے ہیں

غزل

باقر مہدی

کبھی آنسوؤں کے سہاروں سے کھیلا
مرا حوصلہ دیکھ تاروں سے کھیلا

خرد کا بھی اکثر گرفتار رہ کر
جنوں کے حسیں ریگ زاروں سے کھیلا

کہیں غم ہی غم زندگانی کا حاصل
کہیں عمر بھر کوئی تاروں سے کھیلا

دلوں پر سیاہی کا پردہ لگا کر
کوئی چھپ کے خونی اشاروں سے کھیلا

چمن میں یہ کیوں ناچتے ہیں بگولے
یہ کس کا جنوں لالہ زاروں سے کھیلا

لرز اُٹھا اپنے ہی طوفان میں دل
یہ طوفاں شکن کیسے دھاروں سے کھیلا

لگے کانپنے اب تو عشرت کدے بھی
نیا ایک طوفاں کناروں سے کھیلا

عورت

فضا ابن فیضی اعظمی

عورت، اک صورتِ حسنِ وفا، اک فطرتِ رنگین کا پیکر
اک صبحِ بنارس کا منظر
رخسار میں رنگِ لالۂ تر
آنکھوں میں کیفِ مئے ساغر
عورت، اک صورتِ حسنِ وفا، اک فطرتِ رنگیں کا پیکر

عورت ہے کہ تاروں کا نغمہ، فطرت کا ربابِ مستانہ
صہبائے حیا کا پیمانہ
ایثار و خودی کا مے خانہ
عفت کا مکمل افسانہ
عورت ہے کہ تاروں کا نغمہ، فطرت کا رباب مستانہ

عورت ہے کہ شبنم لالے پر، گلگونہ ہے عارضِ ہستی کا
پھولوں کی مہک غنچوں کی ادا
گلزار میں تتلی یا بھونرا
بیتاب اُمیدوں کی دُنیا
عورت ہے کہ شبنم لالے پر، گلگونہ ہے عارضِ ہستی کا

ہریجن کا ست

بے ایمانی کی باڑھ

ک، ج مشروالا

(ہم نے بعض بزرگوں کی رائے سے یہ طے کیا ہے کہ ہر ہفتہ "ہریجن" کے ایک یا دو سب سے اہم مضمونوں کا ترجمہ "نئی روشنی" میں شائع کرتے رہیں گے۔ اس سے اخبار کے ایک بہت بڑے مقصد یعنی گاندھی جی کے اخلاقی اصولوں کی اشاعت میں مدد ملے گی اور پڑھنے والے گاندھی جی کے خاص حلقے کے خیالات اور کاموں کی رفتار سے واقف ہوتے رہیں گے۔)

یہ کہا جا رہا ہے کہ جیسے رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں قانون کے سامنے یکساں مجرم ہیں، اسی طرح یہ کہنا چاہئے کہ چور بازار کے بھاؤ بیچنے والا اور خریدنے والا سماج کے خلاف ایک سا جرم کرتا ہے۔ یہ دلیل جو بیوپاریوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے ایک حد تک ٹھیک ہے۔ میں نے ایسے واقعات سنے ہیں کہ خود گاہکوں نے بیوپاریوں سے کہا اگر ہمیں اس سے زیادہ چیز دلا دو، جتنی قانون اجازت دیتا ہے تو ہم چور بازار کے دام دیں گے۔

مگر ملاوٹ کے بارے میں کیا کہے گا؟ جن چیزوں میں ملاوٹ ہوتی ہے کیا ان کے لئے بھی خریدنے والے کو بیچنے والے کی طرح دوش دے سکتے ہیں؟ دودھ میں ملاوٹ کرنے کی بے ایمانی مدت سے ہوتی چلی آئی ہے مگر خیر اچھا ہے کہ دودھ میں پانی کی ملاوٹ ہوتی ہے جو بے ضرر چیز ہے۔ گھی میں وناسپتی کی ملاوٹ کرنا صرف بے ایمانی ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پورا زہر نہ ہو۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ خالص تیل گھی کا بدل ہے۔ مگر اب تو کچھ دن سے تیل میں بھی ملاوٹ ہونے لگی، اور وہ بھی "سفید تیل" کی جو بالکل کھانے کے قابل نہیں اور قطعی طور پر زہریلی چیز ہے۔ یہ مٹی کے تیل کی ایک صاف کی ہوئی شکل ہے۔ میرے پاس برابر خط آ رہے ہیں، جن میں یہ شکایت ہے کہ خالص تیل کا جو کھانے کے قابل ہو ہاتھ آنا اتنا ہی مشکل ہو گیا ہے جتنا خالص گھی کا۔

کیا کاروباری لوگ دھرم کا اور اخلاق کا احساس بالکل کھو بیٹھے ہیں؟ آخر وہ اتنے بے درد، خود غرض، بے شرم کیوں ہو گئے ہیں؟ انھوں نے اپنے دیس کے لوگوں کی بھلائی سے آنکھیں کیوں میچ لی ہیں؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں ایک ایسی لڑائی تھی کہ بھائی بھائی کو مار رہا تھا۔ اس پر قابو پانے کے لئے گاندھی جی کو پوربی بنگال سے کشمیر تک "کرو یا مرو" کا پرچار کرنا پڑا اور دو مرتبہ برت رکھنے پڑے۔ انھوں نے کر دکھایا اور جان بھی دے دی۔

شاید یہ بے ایمانی کی باڑھ اور کاروبار اور دوسری چیزوں میں سماج دشمنی کی لہر بھی کچھ مخلص لوگوں سے جان کی قربانی مانگتی ہے۔ کیا کاروباری لوگوں کا ضمیر اس وقت تک نہیں جاگے گا، جب تک کوئی مخلص لوک سیوک اسے جھنجھوڑ کر نہ جگا دے؟

ہم سب کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ ہمیں اس سے اونچی اخلاقی سطح پر پہنچنا ہے، جہاں ہم اس وقت ہیں۔ ہماری موجودہ پستی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ سارا دیس اندھیر نگری چوپٹ راج بن کر رہ جائے۔ ہماری چین کی سی درگت ہوگی۔ اگر ہم نے اپنی معاشی نہیں بلکہ اخلاقی حالت نہ سدھاری۔

اس مقصد کے لئے ان سب لوگوں کو جو سروودے کے آدرش کے قائل ہیں، دل و جان سے کوشش کرنی چاہئے۔ کوئی قربانی مہنگی نہیں۔ اگر اس سے لوگوں کی اخلاقی اور سماجی حس ایک جو بھر بھی بڑھ جائے، اور میں بیوپاریوں سے جن میں سے اکثر اسی طبقے کے ہیں جس کے گاندھی جی تھے، خلوص سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ اپنے دل کی طرف کان لگائیں اور ضمیر کی آواز سنیں۔ اگر ان کے کرتوت سے دوسروں کو تکلیف پہنچی تو خود ان کی جان بھی نہیں بچے گی۔

(ہریجن سے ترجمہ)

سیواگرام میں امن پسندوں کی کانفرنس

(اس کانفرنس میں ذیل کی تجویزیں پاس ہوئیں)

۱۔ امن پسندوں کی کانفرنس سیواگرام میں ۲۰ر دسمبر سے ۳۰ر دسمبر تک ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں ہوئی جس میں ہندوستان کے سب حصوں کے چالیس سے زیادہ آدمی، اور یورپ اور امریکہ کے بھی کچھ آدمی شریک تھے۔ کانفرنس نے اس تجویز کی تصدیق کی جسے گاندھی جی نے مرنے سے پہلے پسند کیا تھا کہ دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کا جو اہنسا کے اصول کو مانتے ہیں ایک جلسہ کیا جائے۔ ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ بڑا جلسہ شانتی نکیتن میں پہلی دسمبر سے ۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک ہو، ہندوستان کے باہر کے لوگوں کے لئے یہ انتظام کیا جائے کہ وہ دسمبر کے باقی دنوں میں مذہبی، سماجی، تعلیمی اداروں میں جائیں، خاص کر ایسے اداروں میں جنھیں گاندھی جی کی زندگی اور کام سے تعلق ہے، اور اس قسم کے اشخاص سے بھی ملیں، اور اس کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں سب ڈیلیگیٹ پھر چند روز کے لئے سیواگرام میں اکٹھے ہوں۔ عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس جلسہ کی تیاریوں میں حصہ لیں اور مقامی حلقے اور کمیٹیاں بنا کر اس پر بحث کریں کہ طبقوں اور قوموں کے آپس کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے اہنسا کے اصولوں سے کیسے کام لیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ جلسہ امن عالم کے آرگنائزنگ سیکریٹری، ہیرالال بوس سے نمبر ۱ اپر ووڈ اسٹریٹ، کلکتہ کے پتے سے خط کتابت کریں گے۔

۲۔ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا سے ۵۰ کارکنوں کو، جو دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے عملی کام کر رہے ہیں، اگلے جاڑوں میں ہونے والے جلسہ امن عالم میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ ہندوستان کو دعوت دینے والے ملک کی حیثیت سے ان لوگوں کا پورا خرچ اٹھانے کا شرف حاصل ہو، جو اس دعوت کو قبول کریں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ باہر کے ڈیلیگیٹوں کے اخراجات خود ان کے ملک ادا کریں گے۔ پھر بھی ہمیں بعض باہر سے آنے والوں کا سفر خرچ اور ان کے ہندوستان کے مصارف کے لئے ڈھائی لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔ ہم ان لوگوں کو جنھیں دنیا کے امن سے دلچسپی ہے دعوت دیتے ہیں کہ اس اپیل پر دل کھول کر لبیک کہیں۔

۳۔ یہ کانفرنس اپنی حکومتوں سے اور لوگوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ بار بار اپنے آپ کو یاد دلاتے رہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے حاصل کرنے میں اہنسا کو کتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اہنسا کی ان صورتوں کو دریافت کرنے کی دل و جان سے کوشش کریں، جو موجودہ مشکلوں اور موقعوں کے لئے درکار ہیں۔ کانفرنس کو اس بات سے تردد ہے کہ تعلیمی اداروں میں فوجی تعلیم جاری کی گئی ہے۔ ہمیں یہ احساس ہے کہ ہم خود اپنی زندگی میں اہنسا برتنے میں ناکام رہے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ سب نیک نیت لوگوں کے ساتھ مل کر ایسی عملی تدبیریں اختیار کریں جن سے عام طور پر لوگوں میں خاص کر نئی نسلوں میں امن پسندی پیدا ہو۔

۴۔ اس کانفرنس کو یقین ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی برادری کی ضرورت ہے جس کا بنیادی کام یہ ہوگا کہ دنیا میں ستیہ اور اہنسا پر مبنی نظام قائم کرنے میں مدد دے۔ اس کا ممبر ہر شخص جو ستیہ اور اہنسا کو اصول زندگی کی حیثیت سے مانتا ہے ہو سکے گا۔

اس برادری کے بڑے مقصد یہ ہوں گے۔

۱۔ ہندوستان میں ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا جو ستیہ اور اہنسا پر مبنی ہو۔

۲۔ ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کرنا جن سے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

حیدرآباد کی تقسیم کا معاشی پہلو

(۲)

پی وینکٹ بھوما ریڈی

اس کے علاوہ تلنگانہ اور مرہٹواڑہ کے جملہ حالات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں علاقے جداگانہ طور پر چند خصوصیات کے حامل ہیں۔ تلنگانہ میں بارش کا اوسط زیادہ ہے آب و ہوا مرطوب ہے۔ زمین مختلف قسم کے دھان کی پیداوار کے لئے موزوں ہے۔ ذرائع آبپاشی کی سخت ضرورت ہے۔ آبادی میں اضافہ کی کافی گنجائش ہے۔ زیادہ روزگار فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ برخلاف اس کے مرہٹواڑہ میں بارش کا اوسط کم، آب و ہوا خشک، زمین، گیہوں اور تجارتی فصلوں کے لئے موزوں ہے۔ آبادی میں یہاں بھی اضافہ کی کافی گنجائش ہے۔ مگر ذریعہ معاش کم ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاتا ہے تلنگانہ چاول کے کلچر کا اور مرہٹواڑہ گیہوں کے کلچر کا علاقہ ہے جس کے گوناگوں اثرات آبادی اور معاشرے پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کے مشترکہ کلچر کا ایک خاص توازن ہے جس کو مٹانا کسی طرح مفید نہیں ہوگا۔

اب ذرا آبادی کے تناسب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کی آبادی ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ۳۶ ہزار تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ایک کروڑ ۶۳ لاکھ ۳۸ ہزار ہوگئی یعنی ۱۳٫۲ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اسی دوران میں ہندوستان میں ۱۵٫۱ فی صد کا اضافہ ہوا۔ غرض ۱۸۸۱ء سے ۱۹۴۱ء تک ۶۰ سالہ مدت میں حیدرآباد کی آبادی میں ۵۴ فی صد اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں اسی دوران میں ۳۷ فی صد اضافہ ہوا۔ اس لحاظ سے حیدرآباد کی آبادی میں ہندوستان کے مقابلہ میں کافی اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک تلنگانہ کی آبادی ۶۹ لاکھ سے ۷۵ لاکھ ۵۵ ہزار ہوگئی یعنی ۱۵ فی صد اضافہ ہوا۔ برخلاف اس کے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک مرہٹواڑہ کی آبادی ۷۱ لاکھ سے ۷۸ لاکھ ہوئی یعنی ۱۱ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

اس اضافہ شدہ آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ حیدرآباد میں کارگذار لوگوں کی تعداد میں کمی ہوگئی ہے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کے اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ۱۵ سال کے عمر والوں کی تعداد ۳۶۸ تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ۳۸۴ ہوگئی اور ۱۹۳۱ء میں ۱۵ سال سے ۵۰ سال کی عمر تک کی تعداد ۵۰۱ تھی اور ۱۹۴۱ء میں ۴۹۶ ہوگئی۔ عورتوں کا تناسب مردوں سے بڑھا ہوا ہے اور خصوصاً تلنگانہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو مرہٹواڑہ میں کم۔ یہ یہاں کی موسمی، معاشی حالات، غربت اور معاشی مرفہ الحالی اور معیار زندگی پر منحصر ہے۔ چونکہ تلنگانہ میں آب و ہوا مرطوب ہے اور مرہٹواڑہ کی آب و ہوا خشک ہے۔ عورتوں کے لئے مرطوب آب و ہوا زیادہ موافق ہوتی ہے۔ اس لئے تلنگانہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ناگزیر بات ہے اس غیر معمولی متوازن آبادی کے علاقوں کی تقسیم عدم توازن کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھتا ہے تلافی پیدا کرنے کے لئے مرہٹواڑہ اور تلنگانہ کا اشتراک عمل ضروری ہے۔ ورنہ غیر متوازن آبادی سے جن معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا ان کا حل نہایت دقت طلب ہے

زراعت اور آبادی سے متعلقہ امور پر بحث کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ تلنگانہ اور مرہٹواڑہ دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ اس کے بعد تلنگانہ اور مرہٹواڑہ کی صنعتی ترقی پر جب روشنی ڈالی جائے گی تو اس کا پتہ چلے گا کہ حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء میں جملہ کارخانے (۴۰۱) تھے تو ۱۹۴۱ء میں ۶۲۹ ہوگئے۔

تلنگانہ میں ۱۹۳۱ء میں ۱۴۰ تھے تو ۱۹۴۱ء میں ۲۵۶ ہوگئے۔ برخلاف اس کے مرہٹواڑہ ۱۹۳۱ء میں ۲۶۱ تھے تو ۱۹۴۱ء میں ۳۷۳ ہوگئے۔

اس قدر کارخانوں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود حیدرآباد میں صنعتی ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ یہاں کوئلے، چونہ، گرافائٹ، کیلسائٹ، سنگ مرمر اور دوسری اہم دھاتیں پائی جاتی ہیں۔ دریا سے سستی برقابی قوت پیدا کرنے سے ان قدرتی وسائل سے پوری طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد صنعتی اعتبار سے خود مکتفی نہیں ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے، معدنی، آبی زرعی اور میکانی وسائل سے ممکنہ استفادہ کرنا ہوگا۔ یہاں کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے روزگار کی نئی راہیں کھولنے کے لئے صنعتوں کو فروغ دینا ہوگا۔ حیدرآباد کی ۱۷ ملین آبادی میں ۴۰ ہزار افراد ایسے ہیں جو منظم صنعتوں میں کام کر رہے ہیں چھوٹے اور بڑے جملہ ۶۲۹ کارخانوں میں تقریباً ۸ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس میں معتدبہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں پر پارچہ بافی، "ریان سازی" پلاسٹک کی صنعت، کھاد کی صنعت، تیل کی صنعت، ربڑ کی صنعت، سمنٹ کی صنعت، چینی سامان تیار کرنے کی صنعت، کیمیاوی صنعت، کاغذ کی صنعت، دیا سلائی اور شکر کی صنعت اور دیگر صنعت کی ترقی کے کافی امکانات ہیں ان سے متعلق مختلف اسکیمیں حکومت کے زیر غور ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک کی ضروریات اور خام پیداوار کا لحاظ کرتے ہوئے کپاس کے دو مزید کارخانے، ریشم کا ایک کارخانہ، آہنی فولاد کا ایک کارخانہ، سنگ مرمر کی ایک کمپنی، سمنٹ کا ایک کارخانہ، شکر کا ایک کارخانہ یا ورالکحل کا ایک کارخانہ، کاغذ کا ایک کارخانہ، سگریٹ کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر جو صنعتیں قائم ہیں۔ ان کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

اس قسم کی صنعتی ترقی کے لئے مرہٹواڑہ اور تلنگانہ کی پیداوار قدرتی وسائل اور مزدوروں کی محنت سے مشترکہ طور پر استفادہ نہ کیا جائے تو ان صنعتوں کا قیام اور ان کی ترقی ناممکن ہوگی۔ صنعتی اور زراعتی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ حیدرآباد کی وحدت برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے باشندوں کو قدرتی وسائل سے پورا پورا تعاون اور اشتراک عمل کے ساتھ استفادہ کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

حیدرآباد بحیثیت مجموعی ایک ہی معاشرتی جماعت ہے۔ ہندوستان میں اس کو ایک اہم صوبے کی حیثیت حاصل ہے کہ حیدرآباد ہندوستان سے قطع تعلق کرکے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور نہ یہ معنی ہیں کہ حیدرآباد معاشی حیثیت سے پوری طرح خود کفیل بن سکتا ہے۔ صرف یہ مطلب ہے کہ معاشی حالات اور دیگر حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کے قدرتی وسائل سے کافی استفادہ کرکے زراعتی، صنعتی اور دیگر معاشی شعبوں میں اس حد تک ترقی کر سکتا ہے کہ اس کا شمار ہندوستان کے ترقی یافتہ صوبوں میں ہوسکے۔ ایک وطنی جذبہ حیدرآبادی لوگوں میں موجود ہے اور وہ اس جذبے کے تحت اس کی ترقی میں دل و جان سے اشتراک عمل اور تعاون کریں گے۔ حیدرآبادی عوام کی ایک ایسی حکومت تشکیل دی جاوے جو یہاں کے معاشی معاملات میں کافی دلچسپی لے۔ حیدرآبادیوں کے معیار زندگی میں اضافہ کرے۔ عام مرفہ الحالی کے حالات پیدا کرے۔ ملک کے ذرائع سے خاطر خواہ استفادہ اور اسی کے ساتھ انڈین یونین کے دوسرے صوبوں سے معاشی امور میں اتحاد عمل رکھے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ایک وحدت کی خوشحالی دوسری وحدتوں کی خوشحالی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے اور اس کی پستی دوسروں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ یہاں کی حکومت کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنی ترقی کی بنیادیں اس ذیلی برِ اعظم کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے سابقہ ہندوستان کے ساتھ اتحاد کے اصول پر قائم کرے۔ اس اعلیٰ اصول کی روشنی میں حیدرآباد یقیناً مستقبل قریب میں ایک ایسا مرتبہ حاصل کرے گا جس کا وہ اپنے زبردست قدرتی وسائل اور تہذیب و تمدن کے ایک گراں بہا ماضی کی وجہ سے مستحق ہے۔

مرگ و زیست

تاج العرفان عثمانی

صبح کائنات کے چہرے سے نقاب شب اٹھا کر مسکرا رہی تھی، نسیم صبح ادھر روشوں پر اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے ——— نعیم، سناٹوریم کے لان میں ایک بنچ پر بیٹھا نسیم صبح کے صحت بخش جھونکے اپنے پھیپھڑوں میں جذب کر رہا تھا ——— یکایک اٹھ کر آہستہ آہستہ روشوں پر ٹہلنے لگا اس کے چہرے سے حزن و کرب اور آنکھوں سے بے خوابی کی علامت نمایاں تھی۔ اس کی بھیگی بھیگی اور خمار آلود نگاہیں اس بات کی شاہد تھیں کہ وہ رات بھر سسکیاں لیتا رہا ہے ——— کل کے حادثے نے اس کے دل کے زخموں کو جو کہ ایک عرصے تک آلام و مصائب کے بوجھ سے دب کر سوکھ چلے تھے پھر ہرے کر دیئے تھے ——— رات بھر وہ ماضی کے دھندلکے میں بھٹکتا پھرا۔ گذشتہ دردناک اور تلخ واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن پر ابھرتے چلے گئے اور ان کی یاد کی رہزنی نے ان کو رات بھر چین نہ لینے دیا تھا نعیم ٹہلتے ٹہلتے ایک گلاب کے پودے کے قریب کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔ آخر یہ دنیا کیا ہے؟ رنج و مصیبت کے کانٹے، دکھ درد کی جھاڑیاں! ———

آلام و مصائب کا جہنم ہے یہ دنیا! ——— خصوصاً اب کی زندگی تو صحرا کی طرح بے برگ و گیاہ ہے جہاں سبزہ و گل کا نام و نشان نہیں، ہاں درد و الم کی تیکھی دھوپ اور حسرت و یاس کے کانٹے ضرور ہیں۔ ——— اور اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے ———

نعیم نئی روشنی کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ شیو پور میں رہنے لگا۔ وہیں شہلا ایک حسین جاذب نظر اور دل کش لڑکی تھی۔ جو نعیم کی منزل کی رختہ دار بھی تھی ——— نعیم اس سے محبت کرنے لگا اور شہلا اس کی محبت کا جواب محبت سے دیئے بغیر نہ رہ سکی ——— نعیم جب دیہات گیا اور وہاں شہلا سے ملاقات ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی زندگی کا وہ مبہم خلا بھرنے والا ہے۔ جسے اب تک وہ شدت سے محسوس کرتا آ رہا ہے ——— شہلا اس کی زندگی کی افق پر اولو کی طرح طلوع ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہو گئی ——— جیسے حسین چاندنی کائنات کو اپنی نورانی چادر میں لپیٹ لیتی ہے ——— اس کی زندگی شہلا کی زندگی میں مدغم ہو چلی تھی۔ اور نعیم نے اسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا ——— اور مستقبل کے خوش آیند تصور میں مست تھا۔

اب نعیم کی شادی کے تذکرے ہونے لگے تھے نعیم نے جب یہ دیکھا کہ اس کی آیندہ زندگی کا رفیق تلاش کیا جا رہا ہے تو اس نے کسی طرح اپنی خواہش والدین کے گوش گذار کر دی ——— چنانچہ اس کے والد نے شہلا کے والد، اکرم خاں کے یہاں نسبت بھیجی۔ جو معمولی رد و قدح کے بعد طے پا گئی۔ اسی دوران میں نعیم کی صحت کمزور ہونے لگی، ہلکی ہلکی کھانسی اور کبھی کبھی شام کو حرارت رہنے لگی ———

نعیم کے والدین اس کی اچانک علالت سے پریشان ہو کر علاج کی طرف متوجہ ہو گئے ———

ہر چند کہ علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی پھر بھی بیماری طول کھینچتی گئی ——— اور اس کے والدین نے چار و ناچار نسبت توڑنے کا فیصلہ کر لیا ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تعلیم سے فراغت کے بعد نعیم نے عملی دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا اور دنیائے نشیب و فراز سے واقف بھی نہیں ہوا تھا کہ سل جیسے مہلک مرض کے آہنی پنجے میں سسکیاں لینے لگا ——— اور اس کو علاج کی غرض سے سینے ٹوریم بھیج دیا گیا۔ وہاں کی آب و ہوا اس کو راس آئی، اور اس کی صحت بہت جلد بحال ہونے لگی۔ اسی عرصے میں اس نے شہلا کی شادی کی خبر سنی۔ ——— اس خبر سے اس پر بجلی گر گئی۔ اس روز وہ دن بھر مغموم رہا ——— اور اسی رات کو اس کے منہ سے پھر خون آ گیا تھا۔ جیسے اس کا دل خون ہو کر بہہ جانا چاہتا ہو ——— لیکن پھر اس نے سوچا، ٹھیک تو ہے! اس کے والدین مجھ سے شادی ہی کیوں کرتے ——— ہماری زندگی ہی کیا ستارۂ سحری جو چند گھنٹے درخشاں رہ کر صبح کو کفن لپیٹ کر روپوش ہو جاتا ہے ——— اور اس کو اس خیال سے کچھ کچھ تسکین ہونے لگی تھی۔ اور وہ اپنے دل کی آگ کو حسرت و یاس کی راکھ کے تلے دبانے میں کامیاب ہو گیا تھا ——— لیکن کل کے واقعے نے اس کے دل کے تاروں کو پھر یکبارگی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ——— اور اس کے دماغ کی ساری رگیں جھنجھنا اٹھی تھیں ———

کل نعیم کے وارڈ سے کچھ دور پر دوسرے وارڈ میں ایک مریض کا انتقال ہو گیا تھا ——— اس کے اقربا کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نعیم یہ آہ و بکا سن کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ تو ایک عجیب منظر دیکھ کر اس کے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور وہ چکرا کر کرسی پر بیٹھ گیا ——— سفید کفن میں لپٹا ہوا جنازہ رکھا تھا، اور شہلا اس کے سامنے کھڑی تھی، ——— بکھرے ہوئے بال، زرد چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھوں سے جنازہ کو تک رہی تھی! اپنے ارمان و آرزو کی لاش کو! اس کی آنکھیں گریہ خاموش میں مصروف تھیں۔ درد و الم نے اس کے آنسو خشک کر دیئے تھے، چہرے سے حسرت برس رہی تھی ——— ارشد جسے شہلا کے والدین نے بغیر پوچھے سمجھے فرض کر لیا تھا کل چند ہفتوں کی بیماری کے بعد موت کی آغوش میں جا لیٹا تھا ———

نعیم شہلا کی شادی کے بعد خوش تھا کہ اس کا محبوب مسرت اور خوشی کے گہوارے میں جھول رہا ہے اور اس کی خوشی سے خود مسرور ہو رہا تھا، لیکن یہ مسرت بھی اس کی قسمت میں نہ تھی ——— شہلا کی خوشی و مسرت اس کے سامنے مردہ ارشد کے جنازہ کی صورت میں رکھی تھی ——— اسی وقت سینے ٹوریم کے چپراسی نے نعیم کو گھر جانے کا اجازت نامہ اور ہیلتھ رپورٹ لا کر دی ———

اجازت نامہ نعیم کی انگلیوں میں لرز رہا تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گر کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔

ہریجن کاسٹ (بسلسلہ صفحہ ۸)

جماعتوں اور قوموں میں جھگڑے ہوتے ہیں۔

۳۔ ان جھگڑوں سے جو زخم پڑ گئے ہیں ان کو بھرنے میں مدد دینا۔

۴۔ قوموں میں باہمی مفاہمت پیدا کرنے اور ستیہ اور اہنسا کو ساری دنیا میں اصول زندگی کے طور پر منوانے کے لئے ایسے ذریعے اختیار کرنا جیسے شخصی تجربوں کا مبادلہ۔ جھگڑوں کو مؤثر طریقے سے مٹانے کے لئے مقامی یا عام امن کمیٹیاں بنانا۔

۵۔ امن عالم کے قیام کے لئے وہ تدبیریں اختیار کرنا جو ستیہ اور اہنسا کے مطابق ہوں۔

جلسہ امن عالم کی مجلس انتظامی سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان تجویزوں کو عمل میں لائے۔

(ہریجن سے ترجمہ)

ہندوستان (بسلسلہ صفحہ ۴)

۱۔ ڈائرکٹر جنرل کے دفتر میں فوٹوگرافی کے محکمے کی توسیع کی جائے

آثار قدیمہ کا محکمہ ہندوستان کے معدودے چند اداروں میں سے ہے جو اپنا فرض محنت اور دیانت داری سے انجام دیتا رہا ہے اور جس کا کام ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے علمی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

امید ہے کہ جدید تنظیم کے بعد اس کی مستعدی اور کارکردگی اور بڑھ جائے گی۔

قینچی

مشتاق احمد

آپ کا نام اللہ رکھا ہے۔ پابندی سے پانچوں وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ صبح صبح کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ پان میں ادکا سا کی گولیوں کا استعمال کرتے ہیں، دوسروں کا ناشتہ کھا جاتے ہیں اور "قینچی" لگاتے ہیں۔

ان الفاظ کو سمجھنے کے لئے نور اللغات کی ورق گردانی چنداں مفید ثابت نہ ہوگی، اس میں تو بس آپ کو اسکے معنی کاٹنا، کترنا، "کاٹنا" لیکن جو قینچی اللہ رکھا لگاتے ہیں وہ ان تمام معنوں سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔ ان کی قینچی اپنی جگہ پر ایک "نیا ادب" ہے۔ ایک نئی دنیا ہے جسے سمجھنے کے لئے عقل سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔

اللہ رکھا کی قینچی ہر دو دو گھنٹہ بعد لگتی ہے اور بڑے اہتمام سے لگتی ہے۔ جب مثانہ میں ایک ہلکا میٹھا درد اٹھ کے وقت معینہ کی آمد آمد کا مژدہ سناتا ہے تو خوشی سے ان کا نورانی چہرہ اور دمک اٹھتا ہے۔ ہاتھ کا کام فوراً چھوڑا ایک مخصوص جگہ سے خوب صورت، سفید، چکنا سا ایک ڈھیلا اٹھاتے ہیں، اور استنجا خانے کی طرف لپکتے ہیں اگر خدانخواستہ آپ شاعر ہوں اور اس چکنے ڈھیلے کو دیکھ پائیں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ چکنی ڈلی کے جواب میں "چکنا ڈھیلا" بھی ضرور لکھیں گے۔ کوئی تین منٹ بعد اللہ رکھا استنجا خانے سے اس شان سے نکلیں گے کہ ہونٹوں پر ایک خاص معنی خیز تبسم آنکھوں میں چمک، ایک ہاتھ سے تہمد کا ایک سرا پکڑے ہوئے، دوسرا ہاتھ "دست بہ کار" کا مصداق

استنجا خانے سے نکل کر آپ تبسم زیر لب، ادھر ادھر جائزہ لیں گے ویرانے اور تنہائی سے آپ کا جی گھبراتا ہے اس لئے جہاں چار بھائی کھڑے دکھائی دیئے گے۔ آپ ٹہلتے ٹہلتے وہیں پہنچیں گے اور وہیں چار قدم ہٹ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اب قینچی لگانے کی مہم کا آغاز ہوگا۔ اس کا خیال رکھئے کہ پوزیشن وہی ہے۔ یعنی ہونٹوں پر مسکراہٹ، ایک ہاتھ سے تہمد کا ایک سرا پکڑے ہوئے۔ دوسرا ہاتھ "دائرے کھینچ اکشن" میں مصروف ہے۔

اب قینچی چلنی شروع ہوگی۔ جوں جوں اس بات میں تیزی اور پختگی ہوتی جائے گی۔ چہرے کی شادمانی بڑھتی جائے گی۔ تبسم مسکراہٹ سے بدل جائے گا .... اب ریاضت کی دوسری منزل یعنی آپ کا پینترہ شروع ہوگا۔ یہ پینترہ یوں شروع ہوگا کہ ایسی پوزیشن میں کھڑے ہو کر آپ ڈیڑھ چال دائیں طرف سے چلیں گے، پھر ڈیڑھ چال بائیں طرف سے۔ یہ عمل بھی کوئی ۵، ۶ دفعہ دہرایا جائے گا۔ اب ریاضت کی تیسری منزل یعنی ٹہل شروع ہوگی۔ لوگوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتے جائیں گے کوئی ۵، ۶ چکر لگا کر آپ ایک جگہ رک جائیں گے۔ ایک منٹ توقف کریں گے۔ ہاتھ کو تیزی سے باہر کھینچیں گے اور چکنے ڈھیلے کو زور سے ایک طرف کو جھٹک دیں گے۔ کھنکھاریں گے۔ بلغم کو اپنے جوتے کے پاس رکھ دیں گے، اب ذرا نمایاں طور پر ہنسیں گے اور تیزی سے چھوڑے ہوئے کام کو انجام دینے کے لئے چل دیں گے۔ یہ ہوا پہلے ایکٹ کا ڈراپ سین۔

کسی کا قول ہے اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ کیا جائے تو وہ اس قابل بھی ہے کہ ٹھیک سے کیا جائے۔ قول کی صداقت پر اللہ رکھا کا پورا پورا ایمان ہے۔ آپ جب اس فریضہ کو انجام دینے پر آتے ہیں تو پوری دل جمعی سے انجام دیتے ہیں اور پورا وقت صرف کرتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ وقت مدرسہ کا ہوتا ہے۔ ان کا نہیں۔ بہر حال آپ اپنے فرض میں کوتاہی اور کمی کو ناقابل گناہ سمجھتے ہیں۔ اللہ اللہ ایک حضرت اللہ رکھا ہیں اور ایک ہم کہ دو منٹ بھی اس فریضے کی ادائیگی میں صرف کرنا وقت کا بے کار کھونا سمجھتے ہیں۔

کام تو عشق میں بہت تھے میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اس ادائیگی فرض میں سارے جہاں کی شان بھی پائی جاتی ہے نئی روشنی زدہ لوگوں کی طرح اللہ رکھا اس فریضے کی ادائیگی میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ہوٹل کے باہر بس کے اڈے کے پاس جلسہ گاہ کے قریب، اسکولوں کے صحن میں، غرض یا ہر پبلک مقام پر آپ دیکھیں گے کہ اللہ رکھا کی قینچی چل رہی ہے۔

ایک مرتبہ اسکول دیکھنے کے لئے کچھ مہمان آنے والے تھے۔ پرنسپل صاحب کا اصرار تھا کہ راستے میں ایک پتی، کاغذ کا ایک ٹکڑا دکھائی نہ دے۔ بچوں کے کپڑے بالکل صاف ہوں، فضول لوگ ادھر ادھر نہ پھر رہے ہوں۔

جب صفائی مکمل ہو چکی۔ مدرسے کے چبوترہ پر میز کرسیاں بچھا دی گئیں۔ چائے کا سامان لگ گیا۔ اور لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے کہ مہمان آنے ہی والے ہیں، یہاں بھیڑ لگائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے تو ———— اچانک ہمارا یہ شیر کچھار سے نکلا۔ مسکراتا، مچلتا، گنگناتا، ٹھیک اس جگہ پہنچا، جہاں میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چائے مہمانوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ذرا دور ہٹ کر آپ کھڑے ہو گئے، اور قینچی لگانی شروع کر دی۔ قینچی ختم ہی کرکے آپ ڈیڑھ چال کے پینترے میں مشغول تھے کہ سامنے سے پرنسپل صاحب مہمانوں کو لئے جن میں خواتین بھی شامل تھیں، آ پہنچے۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر ہمارے شیر کو دیکھا ہمارا شیر زیر لب مسکرایا، پینترے کے عمل کو مکمل کیا اور پھر اپنی گشت پر روانہ ہو گیا۔ گشت کے مقررہ چکر پورے کئے۔ ایک جگہ رکا۔ چکنے ڈھیلے کو ایک صاف ستھری جگہ دیکھ کر وہیں پھینکا، کھنکھارا، بلغم کو جوتوں کے پاس رکھ، ہنستا ہوا، وہاں سے ایک طرف کو چل دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم میں اللہ رکھا کی کمی نہیں ہے ہر گلی میں، بازار میں، سڑک پر آپ کو اللہ رکھا کے چیلے نظر آئیں گے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہ اللہ رکھا اتنی اہمیت حاصل کر لیں کہ تاج محل شانتی نکیتن اور جامعہ ملیہ کی طرح سیاح ان کی زیارت بھی کریں اور جو محروم جائیں وہ اپنے سینے پر داغ لے کر جائیں۔

یورپ کی جدید قومیت

(بسلسلہ صفحہ ۱)

اس سے بھی زیادہ یہ کہ سرمایہ داری کی طاقت نے اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ اقتدار حاصل کر لیا ہے پہلے انسانوں پر جو اختیار و تسلط صدیوں کی شاہی نسل اور امیرانہ روایت حاصل کر سکتی تھی، اب وہ اختیار چند مہینوں اور برسوں کے اندر ایک سرمایہ دار محض روپیہ کے ذریعے حاصل کر لیتا ہے اور دنیا کی صلح و جنگ اور ملکوں اور قوموں کی حکومت محکومی کی باگ فوراً اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے سوشلزم کی تخم ریزی اسی رد فعل کا نتیجہ تھی۔ اب یہ بڑھتے بڑھتے کمیونزم تک پہنچ گیا ہے اور نہ صرف لبرل کا نظام قومیت بلکہ بحیثیت اجتماعیہ سوسائٹی کا پورا نظام الٹ دینا چاہتا ہے ......

...... ان تمام لوگوں نے جن کی ذہنیت کسی قومی نظام حکومت کی غرض پرستیوں سے آلودہ نہ تھی، محسوس کر لیا کہ پچھلا نظام اب دنیا کو زیادہ عرصہ تک مطمئن نہیں رکھ سکتا۔ یورپ کے حکماء اور مفکرین میں ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو قومیت کی اس عصبیت سے اکتا گیا ہے اور قومیت کی جگہ "انسانیت" کی وسیع فضا ڈھونڈھ رہا ہے طرح طرح کے نئے نظریے اور نئی تجویزیں دماغوں میں نشو و نما پا رہی ہیں۔ دنیا کے نظام اجتماع کی نئی تقسیم اور انسانی برادری کا غیر مشروط حلقہ وقت کا سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ موضوع فکر ہے۔

اگر بحیثیت مجموعی دنیا کی موجودہ ذہنی فضا پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک موسم ختم ہو رہا ہے اور دوسرے کی آمد آمد ہے۔ جس زمانے سے ہم گذر رہے ہیں عجب نہیں مستقبل کا مورخ اس میں عہد تداخل کے آثار کی جستجو کرے۔ نہیں کہا جا سکتا نئے موسم کا پیغام کیا ہوگا؟ لیکن ضرور ہے کہ دنیا اس وقت تک جن اجتماعی دائروں میں محصور رہی ہے۔ اس سے ایک زیادہ وسیع دائرہ کی طرف قدم بڑھائے۔ کیا وہ انسانیت اور انسانی برادری کی منزل ہوگی؟ کیا دنیا اس نقطے تک پہنچ گئی ہے جس نقطہ تک اب سے تیرہ سو برس پہلے اسلام نے اسے پہنچانا چاہا تھا، مگر نہ پہنچ سکی؟ اس کا جواب صرف مستقبل دے سکتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت
یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۴۴

چندہ
سالانہ تین روپیہ، ششماہی للعہ

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی دہلی۔ جامعہ
مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۲ نمبر ۱ | ۰ر مارچ سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: سید عابد حسین

مشرق و مغرب

خالدہ ادیب خانم

جو لوگ مشرقی طبیعت کے دلدادہ ہیں، ان کا قول ہے کہ زندگی کی حقیقی قدریں ہی کے حصے میں آئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مشرق کے انسان نے اوپری چیزوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل جوہر کو لے لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روحانی قدریں زیادہ اہم اور زیادہ قابل قدر ہیں مگر کیا مشرق کے متعلق یہ قول بالکل درست ہے؟ یہ تو ہم تب سمجھتے جب انسان مجرد روح ہوتا مگر چونکہ وہ مادے اور روح سے مرکب ہے اس لئے سارا زور روح پر صرف کر دینے سے آخر میں بہت افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ مادی قدروں کو بالکل رد کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ اہل مشرق کو پہلے تو ان کے حکمرانوں نے اور پھر مادہ پرست مغرب نے دل کھول کر لوٹا۔ مشرق بس یہ رہ گیا کہ اور ملکوں کو سستے مزدور بہم پہنچائے۔ اپنی دولت ان کے حوالے کرے اور ان کا مال خریدے۔ جب یہ صورت ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرق میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مشرق کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے۔

اب مغرب کو لیجئے۔ یہاں جلیل القدر بادشاہ اور عظیم الشان عمارتیں تاریخ پر چھائی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں سے کوئی بھی مغرب کا بنا یا ہوا نہیں، مغربی تمدن اور مغربی انسان دونوں ابھی تھوڑے ہی دن پہلے صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوئے ہیں۔

مغرب نے اپنا مذہب مشرق سے پایا، حکمت و فلسفہ یونان سے حاصل کیا، اور حکومت کا نظام اور تمدن کا ظاہری ساز و سامان روما سے لیا۔ روما مغربی تمدن کا پہلا مظہر تھا جس کی عمارت مغرب کے لوگوں نے پہلے پہل مغرب ہی کی سرزمین پر تعمیر کی۔ اگرچہ اہل روما نے اپنے ذہن سے کوئی نیا تصور پیدا نہیں کیا۔ مگر موجودہ تصورات کی ترکیب انھوں نے کچھ اس طرح کی کہ ایک نیا تمدن بنا کر کھڑا کر دیا۔

سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز جو اہل روما نے خود اختراع کی وہ ان کا اصول قانون ہے۔ مشرق میں قانون خدا کا بنایا ہوا یا بادشاہ کا بنایا ہوا ہوتا تھا۔ روما میں وہ انسان کا بنایا ہوا ہوتا تھا اور جمہور کی مرضی سے بنایا جاتا تھا۔ عملاً اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی مگر اس نے زندگی کا ایک نیا تصور پیدا کر دیا۔ فرد کی نظر میں قانون کا رعب اس حد تک نہ تھا کہ اسے تقدیر کے مانند اٹل سمجھے۔ اس نے اپنے خیال کو معاشرت اور ریاست سے کبھی ہٹنے نہیں دیا اور ہمیشہ اس جد و جہد میں رہا کہ حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ ظاہر ہے کہ ایسی طبیعت کا آدمی شاہانہ ٹھاٹ میں محو نہیں ہو سکتا۔ اس کی توجہ کا مرکز ہمیشہ اس کا جسم اور دوسری مادی اشیاء رہا کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو وہ دیکھ سکتا ہے اور چھو سکتا ہے وہ اس کی نظر میں غیر محسوس چیزوں سے زیادہ قدر رکھتی ہیں۔ بعض مختصر زمانوں اور بعض مخصوص اشخاص سے قطع نظر کر کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی انسان صرف مادی قدروں کا قائل ہے۔ غور و فکر اس کے نزدیک بے معنی لفظ ہے۔ جد و جہد اور عمل حاصل زندگی ہے ....

اسی مادیت کی بدولت مغرب نے سائنس میں حیرت انگیز کرشمے دکھلائے ہیں۔ اس نے فطرت کے اسرار کا پردہ چاک کر دیا ہے اور اس کی قوتوں سے کام لے کر انسان کی راحت و آرام کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ جس طرح مشرق کے عارف نوع انسانی کی روحانی تسکین کی تلاش میں شہید ہو جاتے تھے اسی طرح مغرب کے عالم اس کوشش میں جان دیدیتے ہیں کہ اس دنیا کو اپنے بنی نوع کے لئے زیادہ آرام دہ بناویں، اور انھیں بیماریوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھیں۔

مگر مغرب کی یہ نعمت دنیا کے لئے مصیبت ہو گئی ہے۔ اس یک طرفہ اور خالص مادی ترقی نے مغرب کو اور اقلیتوں پر مسلط کر دیا ہے۔ چند صدیوں کے اندر ساری دنیا بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے پنجے میں آ گئی ہے۔ بڑے بڑے براعظم اور اس کے کروڑوں باشندے اب اسی کام کے لئے ہیں کہ اس چھوٹے سے خطے کی اطاعت میں سرگرم رہیں جو یورپ کہلاتا ہے اور جہاں مغربی انسان رہتا ہے۔

جو لوگ مغربی طبیعت کے دلدادہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقی قدریں اسی کے حصے میں آئی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ زندگی کا اصلی جوہر انسان کی مادی فطرت ہی کیا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے؟ یہ تو ہم تب سمجھتے کہ جب انسان اپنی انسانیت یا یوں کہئے کہ روح کھو بیٹھتا۔ جانوروں کی طرح اس کی ضروریات اور خواہشات محض جسم تک محدود ہوتیں۔ مگر چونکہ وہ روح اور مادے سے مرکب ہے اس لئے مادے پر سارا زور صرف کر دینے سے بھی آخرکار افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ ایسے آثار نظر آ رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کا تنزل بلکہ خاتمہ قریب ہے۔ اہل مغرب اپنے تمدن کی عمارت کو متزلزل دیکھ کر بہت ہراساں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے کون سی راہ اختیار کریں۔ قدیم مشرق کی طرح مغرب کو بھی گھن لگ چکا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے۔

(جامعہ کے توسیعی خطبات سنہ ۱۹۳۵ء)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
مشرق و مغرب	خالدہ ادیب خانم	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں	سالک ہندی	۲
بلبل ہند مر گئی ہیہات	(ادارہ)	۳
بزم بے تکلف	"	۳
پچھلا ہفتہ	" "	
۱۔ ہندوستان	ع ، ح	۴
۲۔ پاکستان	ع ، ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع ، ل	۶
نسیم شوق	ڈاکٹر قمر صدیقی	۶
غزل	باقر مہدی	۶
غزل	محمد مجتبیٰ رضوی	۷
غزل	سحر رامپوری	۷
مختصر تبصرے	سید احتشام حسین	۸
سرودرے کی تکمیل	ونو بابھاوے	۹
کھادی	سید یحییٰ حسن نقوی	۱۰
کشکول	محمد علی شاہ	

قیمت فی پرچہ ۲ ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(سالک ہندی)

مذہب، افراط اور تفریط

چند روز ہوئے بعض اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ہندوستانی ہائی کمشنر مقیم پاکستان مسٹر سری پرکاش نے کراچی سے رخصت ہوتے وقت مہاتما گاندھی کے مجسمہ پر پھول چڑھانے کی رسم ادا کرنی چاہی تھی۔ لیکن وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خاں نے اس بنا پر اس کی ممانعت کر دی کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس پر حکومت ہند نے اپنے نمائندے کو ہدایت کی کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کرے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان کے وزیر اعظم کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔

مجھے معلوم نہیں یہ خبر صحیح ہے یا غلط یا اصل میں واقعہ کچھ اور ہے اور خبر دینے والے نے اس میں جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ مجھے اس کو صحیح سمجھنے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ ظفر اللہ خاں نے غالباً اسلام کی تعلیم کا مطالعہ کیا ہے اور انھیں اس کے سمجھنے کا دعویٰ ہے۔ ان کا ایسی حرکت کرنا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا بہرحال خبر غلط ہے تو اس کی سرکاری طور پر تردید ہونی چاہیئے اور تعجب ہے کہ اب تک نہیں ہوئی۔ اور اگر صحیح ہے تو — سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ اسلام کی تعلیم میں اس فعل کا جواز کس طرح مل سکتا ہے! کیا لکم دینکم ولی دین کا یہی مطلب ہے؟ پہلا سوال تو یہ ہے کہ پھول چڑھانا کس طرح بت پرستی ہے؟ خود سر محمد ظفر اللہ کے زندہ مجسمے پر بارہا پھول چڑھائے گئے ہوں گے۔ انھوں نے اسے کیوں نہیں روکا؟ قائد اعظم کے تابوت اور ان کی تربت پر ان کے ہزاروں عقیدت مندوں اور غیر ملکی نمائندوں نے پھول چڑھائے تھے وہ بت پرستی کیوں نہ تھی؟ سندھ اور پنجاب کے مسلمانوں میں پیر پرستی اور قبر پرستی بے روک ٹوک جاری ہے جس میں بوئے شرک آتی ہے۔ وہ تعلیم کے ذریعے اس کو روک کر خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اور پھر اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں ان غیر مسلموں کو جو بت پرست ہیں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت نہ ہوگی؟ اور اس قسم کی ممانعت اس اعلان کے ساتھ کہاں تک ہم آہنگ ہے کہ پاکستان کے تمام باشندوں کو عقائد اور عبادت کے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہوگی؟ میں ان سوالوں کا جواب چاہتا ہوں، اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے یہ نافہم علم بردار ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں جو مذہب، مصلحت، خوش اخلاقی، معقولیت سب کو پس پشت ڈال دیتی ہیں؟ ......

ہندوستان کے جو معقولیت پسند لیڈر ہیں وہ شروع سے کہہ رہے ہیں اور حال میں نوابزادہ لیاقت علی خاں اور خود ظفر اللہ خاں نے اپنے پبلک بیانوں میں کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کو دوش بدوش چلنا اور ایک دوسرے کے ساتھ عزیز ہمسایوں کا سا سلوک کرنا چاہیئے۔ اس لئے رواداری اور ایک دوسرے کا دل رکھنے کی پالیسی شرافت اور مصلحت دونوں کی رو سے ضروری ہے۔ حسن اتفاق سے گاندھی جی کی ذات اور کام کا احترام ایک ایسی چیز ہے جس میں دونوں ملکوں کے باشندے کھلے دل کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اور اس طرح شبہ اور خوف اور مخالفت کے نامبارک چکر کو توڑ کر باہمی اعتماد اور دوستی کی عمارت بنا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ ممانعت کا حکم خاص طور پر افسوسناک ہے۔

برخلاف اس کے۔ ہندوستان میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جو مذہب کے معاملے میں ایک نہایت تنگ نظر رویہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ بعض سطحی اور عارضی چیزوں سے اور حال کے ناگوار واقعات سے متاثر ہو کر اسے سرے سے مذہب کی قدروں سے انکار ہے۔ اس نے بغیر کافی غور و فکر کئے بغیر ذاتی تجربے کی اس منزل میں سے گزرے جس میں مذہب کی قدر اور ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے یہ طے کر لیا ہے کہ مذہب نہ صرف ایک بیکار بلکہ ایک مضر اور خطرناک چیز ہے۔ انھوں نے یہ تو دیکھا ہے کہ تاریخ میں مذہب کے نام پر بڑے بڑے ظلم اور زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن شاید یہ نہیں سوچا کہ کون سی اچھی چیز ہے جس کا نام لے کر ظالموں نے ظلم نہیں کئے، قانون، انصاف، آزادی، جمہوریت، عوامی تحریک۔ اور یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ دنیا کی تاریخ کے بہت سے بہترین اور شریف ترین انسانوں نے اس جذبے اور اس داخلی تجربے کی عظمت اور رفعت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کی بنیاد پر اپنی مثالی زندگی کی عمارت کھڑی کی ہے۔ انھوں نے ایک "غیر مذہبی ریاست" کا مفہوم یہ نہیں سمجھا کہ ریاست مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانب دار رہے گی اور ہر عقیدے کے لوگوں کو حقوق سیاست و شہریت کے لحاظ سے ایک نظر سے دیکھے گی، بلکہ وہ اس کی ترقی اور بقا کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اختلاف مذاہب کو بلکہ مذہب کے جذبے ہی کو ختم یا کم سے کم بہت کمزور کر دیا جائے! انگریزی عہد حکومت میں ہماری سیاست کی جو افتاد رہی اس کی وجہ سے یہ بات یقیناً ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی زندگی کی بنیاد مذہب پر نہ رکھی جائے اور اس وجہ سے اس بارے میں احتیاط کی ضرورت بھی سمجھ میں آتی ہے لیکن وقتی حالات کی بنا پر اپنے احساس تناسب کو کھو دینا اور مذہب کی ابدی قدروں کو سرے سے مسترد کر دینا عقلمندی نہیں ہے۔ ابھی حال میں ایک ممتاز مسلمان جرنلسٹ نے اس بات پر اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ ٹرکی میں مذہبی احیاء کی ایک تحریک کا آغاز ہو رہا ہے اور روس میں پہلے کی طرح مذہب کی شدید مخالفت باقی نہیں رہی۔ اور خود ہندوستان میں لوگوں نے مذہب کے ساتھ وابستگی کو ابھی تک نہیں چھوڑا۔ آخر اس میں اندیشے کی کونسی بات ہے؟ مذہب کا جذبہ انسانی فطرت کی گہرائی سے اٹھتا ہے۔ وہ بھی (دوسرے جذبوں کی طرح) غلط شکلیں اختیار کرتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی غرض اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس پر بھی تشکیک و تضحیک کے حملے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو جھیلتا ہے، ان سے سیکھتا ہے اور ان کے زیر اثر پھر سے سنورتا اور نکھرتا ہے۔ اس میں روایت پرستی اور تنگ نظری کے جو پھندے پڑ جاتے ہیں، وہ اس کی فطرت کا جزو نہیں بلکہ آئینے کی گرد ہے جس کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں مذہب کو اس بے اعتنائی اور سطحی انداز میں مسترد کرنا اصل مسئلے کا حل نہیں بلکہ اس سے بچ کر نکلنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ ہندوستان میں جو لوگ بستے ہیں ان کی تہذیب اور ذہنی اور روحانی زندگی میں مذہب کا مقام بہت بلند اور اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہمیں اس کو ایک اچھی قومی اور انفرادی زندگی کی تشکیل کا ایک ذریعہ بنانا ہے۔ لہٰذا اس بات پر اعتراض کرنا کوتاہ اندیشی ہے کہ مختلف لوگ اور جماعتیں اس "حیات برتر" کی جدوجہد کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم اور قدروں میں سرچشمہ الہام تلاش کرتی ہیں۔ یہ بات نہ صرف ممکن بلکہ قرین عقل ہے کہ ایک ریاست غیر مذہبی ہو لیکن اس کے شہری مذہبیت کا صحیح جذبہ رکھتے ہوں۔ ابھی حال میں سر رادھا کرشنن نے بھی اپنی ایک تقریر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس سطحی ذہنیت پر اعتراض کیا تھا جو بغیر مسئلے کے تمام پہلوؤں کو سمجھے مذہب کی قدروں کی منکر ہو جاتی ہے۔

زبان کو سنبھالئے

پنڈت جواہر لال نے حال ہی میں ایک مضمون قومی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ جس پر میں انھیں مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ ان کی ذہنی جرأت، دیانتداری اور حق گوئی کا ثبوت ہے کہ ایک ایسے وقت جب ملک کے بہت اچھے اور سمجھدار لوگوں کا ذہنی توازن اس بارے میں ڈانواڈول ہو چکا ہے اور وہ انصاف اور عقل اور مصلحت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایک محدود اور غیر فطری زبان کو راشٹر بھاشا بنانے پر تلے ہوئے ہیں، انھوں نے صفائی اور سمجھداری اور وسیع النظری کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان اصولوں کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ جن کے مطابق

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ مارچ ۱۹۴۹ء

بلبلِ ہند مر گئی ہیہات

۲ مارچ کو صبح ۸ بجے ہوا کی لہروں نے یہ جان فرسا خبر نشر کی کہ ہز ایکسیلنسی مسز سروجنی نائیڈو گورنر یو پی کی شمع حیات پچھلے پہر بیہوشی دامانِ سحر سے بجھ گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحومہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے کی گورنر ہی نہ تھیں بلکہ ہر دل عزیز قومی لیڈر اور محبوب قومی شاعرہ بھی تھیں۔

گورنر کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے لکھنؤ میں اٹھا جس میں ہندوستان کے گورنر جنرل، وزیر اعظم، وزیر تعلیم، صوبے کے وزراء اور اعلیٰ عہدہ دار شامل تھے گومتی کے کنارے چھتر منزل کے سامنے ان کا جسم خاکی تمام آداب و رسوم کے ساتھ سپرد آتش کیا گیا۔ سارے ملک میں سرکاری دفاتر بند رہے۔ سرکاری عمارتوں پر قومی جھنڈا نیم چوب لہرایا گیا۔ آئین ساز مجلسوں میں مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کئے گئے

قومی لیڈر کا ماتم اس سے بھی زیادہ زور شور سے ہوا۔ کارخانے، مدرسے، بازار بند رہے، عام جلسے ہوئے نہ صرف کانگریس بلکہ ہر پارٹی کے لیڈروں نے تعزیتی تقریریں کیں اور پیام شائع کئے۔

مگر قوم کی محبوب شاعرہ "بلبل ہند" سروجنی کا سوگ سرکاری دفتروں اور کوچہ و بازار میں نہیں بلکہ دلوں کے خلوت خانوں میں، بانگ دہل سے نہیں بلکہ آہنگ خاموشی سے منایا گیا۔ دل ٹوٹ گئے اور ٹوٹنے کی صدا نہ آئی۔ جی بجھ گئے اور بجھنے کی آواز نہ نکلی۔ اہل درد کے پہلو میں بلبل ہند کی منظوم آہوں کے تیر پہلے ہی سے پیوست تھے اب وہ خود ہمیشہ کے لئے ان کے سینوں کے اندر دفن ہو گئیں۔

در سینہ ہائے مردم عارف مزار او

سروجنی دیوی ایک برہمن عالم پروفیسر اگھور ناتھ چٹوپادھیا کی صاحبزادی تھیں جو مشرقی بنگال کے رہنے والے اور حیدر آباد دکن میں نظام کالج کے پروفیسر تھے ۱۸۷۹ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں اور وہاں تعلیم پاتی رہیں۔ سولہ برس کی عمر میں انگلستان گئیں اور تین برس لنڈن اور کیمبرج میں رہیں۔ ان کی سیرت میں دو نمایاں صفات تھیں جن کے سانچے میں ان کی ساری زندگی ڈھلتی رہی۔ روحانی محبت اور عملی بغاوت۔ ان کی محبت ایک قدرتی چشمے کی طرح سے تھی جو زمین کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اپنے زور میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کی بغاوت ایک جوئے شیر کی طرح تھی جو تیشہ کوہکن کی جانفشانی سے پہاڑ کے جگر کو چیر کر نکالی جاتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھیں شاید شعر سے محبت ہو گئی اور اس کی خاطر انھوں نے رسمی تعلیم کے ضابطے سے بغاوت کی انگلستان میں ان کی پہلی محبت بھی سرسبز ہوئی اور ان کی بغاوت بھی۔ وہ تھوڑی سی مشق سے انگریزی میں بے تکلف شعر کہنے لگیں۔ اور انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی۔ رسمی تعلیم کے بغیر انھوں نے اپنے لئے علم و فضل کے میدان میں وہ جگہ حاصل کر لی جو اونچی سے اونچی سند پانے والوں کو بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے جیسا یا واپس آنے کے بعد ایک غیر برہمن نوجوان ڈاکٹر نائیڈو سے جن سے ان کو پہلے سے عشق تھا شادی کر لی اور اس طرح سماج اور اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس معرکے میں بھی میدان ان کے ہاتھ رہا، اور اسی سماج نے جو انھیں ذات باہر سمجھتی تھی ایک دن ان کو آنکھوں پر بٹھایا۔ بیس سال کے عرصے میں مسز نائیڈو کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے اور ہندوستان کے اندر اور باہر ان کی شاعری کا سکہ بیٹھ گیا۔

لیکن ۱۹۱۸ء میں ایک نئی محبت اور نئی بغاوت نے ان کی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ وطن کے عشق، آزادی کے عشق نے انھیں گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے ستیہ گرہ کے لشکر میں شامل ہونے اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے بغاوت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ بے مثل ہمت و استقلال سے وہ آزادی کی لڑائی لڑتی رہیں۔ قید فرنگ کی تکلیفیں اٹھاتی رہیں۔ اس راہ میں انھیں اپنا عیش و آرام، گھر بار تجنا پڑا یہاں تک کہ اپنے فن کو بھی جو ان کو دل و جان سے عزیز تھا قربان کرنا پڑا۔ آخر یہ محبت بھی پروان چڑھی۔ اس بغاوت نے بھی فتح پائی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی پرستار نے آزادی کے روئے زیبا کی پہلی جھلک دیکھی۔ اس علم بغاوت کو جو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بلند کیا تھا، حکومت کے قصر و ایوان پر لہراتا ہوا دیکھا۔

لیکن سروجنی نائیڈو کے دل میں سب سے گہرا سب سے پر زور ایک اور محبت، ایک اور بغاوت کا جذبہ تھا، وہ ہندوستان کے سب فرقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی عاشق زار تھیں اور فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف جو ایک عرصے سے ہمارے دلوں پر راج کر رہا تھا بغاوت کرنے میں انھیں سب پر یہاں تک کہ گاندھی جی پر بھی کم سے کم زمانے کے لحاظ سے تقدم حاصل تھا۔ اس میدان میں بھی انھوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں، ان کی آنکھوں نے گاندھی جی کے مقتول جسم اور غیر مقتول روح کے ہاتھوں فرقہ پرستی کی اخلاقی موت دیکھ لی۔ وہ دنیا سے خوش گئیں، سرخرو گئیں اور ہندوستان کو اپنے غم میں رنجیدہ اور دل گیر چھوڑ گئیں۔

بزمِ بے تکلف

"خدا کے لئے اب اس سرچڑھے کو ہٹاؤ۔ کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں کہ تمہارے کان خالی ہوں تو میں بھی کچھ کہوں"

"تم بھی غضب کرتی ہو۔ بجٹ کے خلاصے کا سب سے مزے دار حصہ ہو رہا تھا کہ تم نے تحریک التوا کھینچ ماری۔ مگر یہ ہیڈ فون کا نام سرچڑھا خوب رکھا۔ کیوں نہ ہو آخر کس کی بیوی ہو۔ اچھا اب میرے کان خالی ہیں، تم شوق سے بھرو۔ سرچڑھا ہٹ گیا۔ اب نک چڑھی کی باری ہے"

"بس رہنے بھی دو سچ مچ کسی نک چڑھی سے پالا پڑتا تو قدر عافیت معلوم ہو جاتی اور میں کہتی ہوں یہ پرائے بجٹ کی رام کہانی سننے سے تمھیں کیا مل جائے گا، کچھ اپنے بجٹ کی بھی خبر ہے؟ مہینے میں تین دن باقی ہیں اور گھر میں برکت ہے"

"پرایا کیوں ہوتا؟ اپنے دیس کا بجٹ ہے، اور گھر کے بجٹ سے اسے بقول شخصے گاڑھا سمبندھ ہے"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ فرض کرو کہ ہماری آمدنی تین ہزار سالانہ سے زیادہ ہے اور ہم اب تک روپے میں ایک آنہ ٹیکس دیتے تھے۔ اب ایک پیسے کی چھوٹ ہو جائے گی تو اس کا اثر ہمارے بجٹ پر پڑے گا یا نہیں؟"

"فرض کرنے کو جو چاہے کر لو، مگر تین ہزار کی آمدنی کس مسخرے کی ہے"

"دیکھو ایسے غیر پارلیمنٹری لفظ نہ کہو۔ مسخرے کو پارلیمنٹ کی زبان میں "غیر سنجیدہ معزز ممبر" کہتے ہیں خیر انکم ٹیکس سے نہ سہی دوسرے کھلے ڈھکے ٹیکسوں سے تو ہم کو تعلق ہے مثلاً لفافے کا ٹکٹ دو آنے کا اور پوسٹ کارڈ تین پیسے کا ہو جائے گا۔ شکر اور چھالیہ پر درآمد کا محصول بڑھ جانے کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں مہنگی ہو جائیں گی"

"شاباش ان بجٹ سازوں کو۔ مرے کو ماریں شاہ مدار اسی کو کہتے ہیں۔ اب تک مہینے میں تین دن برکت رہتی ہے تو اب چھ دن رہا کرے گی"

"تو پھر کچھ تخفیف مصارف کی تجویز سوچو یہ جو دن بھر پان کے نام سے چھالیہ پھنکتی ہے جیسے بھٹی میں ایندھن پھنکتا ہو۔ اس کو کم کرنا چاہئے"

"اور یہ جو دن بھر چائے کے بہانے شکر سڑکی جاتی ہے جیسے ریل کا انجن پانی سڑکتا ہے اسے بھی کم کرنا چاہیے"

"اچھا دونوں ترمیمیں بہ رضا مندی فریقین واپس۔ میں نے ایک اور تجویز سوچی ہے جسے سن کر تم پھڑک جاؤ گی۔ یہ جو اخباروں اور رسالوں کو ٹکٹ لگا کر مضمون بھیجا کرتا ہوں اور وہ اکثر بیرنگ واپس آتے ہیں ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے مضمون تھے، ہومیوپیتھک خوراک میں پوسٹ کارڈوں پر لکھ کر بھیجا کروں گا اور ایڈیٹر کو لکھ دیا کروں گا کہ اگر پسند نہ آئیں تو پتہ بدل کر ڈاک میں ڈال دیں۔ ایک تو جانے میں پیسے کم لگیں گے۔ دوسرے واپسی میں بیرنگ نہیں ہوں گے۔ کچھ ترمیم بہ اتفاق رائے منظور ہے"

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

یہ مٹھائی کا بجٹ ہے یا چپٹی کا!

پچھلے سال جب شری شان مکھم چیٹی نے ہندوستان کا بجٹ پیش کیا تو عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ فنانس ممبر سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے سرمایہ داروں کی گوں کا بجٹ بنایا سو وہ اک مرد تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا مگر اس سال ہمارے فنانس ممبر مسٹر جان متھائی ایک سابق پروفیسر ہیں۔ جن کے متعلق یہ حسن ظن تھا کہ خود غریب نہیں تو کم سے کم غریب نواز ضرور ہیں مگر جب ۲۸ فروری کو ان کا بنایا ہوا سنہ ۵۰-۱۹۴۹ء کا بجٹ سامنے آیا تو حیرت ہو گئی کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے! یہ مٹھائی کے قالب میں چیٹی کی روح کہاں سے آ گئی؟

بجٹ میں تین ارب پینسٹھ کروڑ کی آمدنی، تین ارب ساڑھے باسی کروڑ کا خرچ یعنی کوئی سوا پندرہ کروڑ کا خسارہ تھا، اس کے باوجود یہ ضروری سمجھا گیا کہ انکم ٹیکس کے معاملے میں متوسط طبقے کے ساتھ امیروں کو بھی رعایت دی جائے۔ اضافۂ سرمایہ کے ٹیکس اور سوپر ٹیکس میں تخفیف کی جائے۔ کپاس اور تیل کے برآمد کے محصول اور پٹ سن کے درآمد کے محصول کو معاف کر دیا جائے ہمارے فنانس ممبر اور ہماری کیبنٹ کی یہ سب عنایتیں کارخانوں کے مالکوں پر اس لئے ہیں کہ کسی طرح ان کو پرانے کارخانوں میں پیداوار بڑھانے اور نئے کارخانے قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے مگر وہ ایسے روٹھے ہوئے ہیں کہ کسی طرح منتے ہی نہیں۔ ۱ مارچ کو ایوان صنعت و تجارت کے جلسے میں بجٹ کی تجویزوں پر خوشنودی کا اظہار کرنے کی بجائے ناخدایان صنعت نے طرح طرح سے مزید رعایتوں کا مطالبہ کیا جیسے لاڈلے پالے بیٹے مچل مچل کے مٹھائی مانگتے ہیں۔ بھلا ان سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ نفع خوری کی ہوس کو ضبط کر کے ملک کی معاشی حالت کو سدھارنے میں حکومت کا ساتھ دیں گے۔

اب بجٹ کے دوسرے پہلو پر غور فرمایئے۔ خسارے کو پورا کرنے کے لئے بعض لعیشات پر ٹیکس بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس قیامت کی گرانی میں ان ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا جن کی زور زیادہ تر غریبوں پر پڑتی ہے۔ مثلاً پوسٹ کارڈ اور لفافے کی قیمت میں اضافہ۔ کاغذ کی کسٹم ڈیوٹی اور شکر کی چنگی میں اضافہ باریک کپڑے کے علاوہ موٹے کپڑے پر ٹیکس۔

اسمبلی میں دو دن کی بحث میں بجٹ پر خوب لے دے ہوئی اور ہونی بھی چاہئے تھی دو سال پہلے تک اسمبلی میں اعتراضوں کی باڑھ سب سے زیادہ زور شور سے محکمہ دفاع کے بجٹ پر چلتی تھی مگر اب یہ محکمہ اسمبلی کا منظور نظر بن گیا ہے۔ چنانچہ دفاعی امور کے ماہر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے ایک ارب ساٹھ کروڑ کے تخمینہ خرچ کو آج کل کے حالات میں بالکل جائز اور مناسب قرار دیا۔ ان کے اور کئی دوسرے ممبروں کے اعتراضات کا نشانہ اب حکومت کی معاشی پالیسی ہے جس نے افراط زر اور گرانی کا واحد علاج اس بات کو سمجھ رکھا ہے کہ سرمایہ داروں کی دلجوئی کی جائے۔

اب تک اسمبلی کے بجٹ کا جو رنگ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنانس بل پیش کرتے وقت مسٹر متھائی کو موجودہ تجویزوں میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی ورنہ اس سڑک پر بھی جو بظاہر بہت ہموار معلوم ہوتی ہے، گاڑی اٹک جائے گی۔

لانا ہے جوئے شیر کا

مسٹر بور اس مشن کے لیڈر ہیں جو ورلڈ بنک کی طرف سے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ انھوں نے یکم مارچ کو نئی دہلی میں ایک تقریر کی جس میں یہ امید ظاہر کی کہ یہ بنک ایشیائی ملکوں کی معاشی ترقی میں بہت اہم حصہ لے گا۔ لیکن جو شرطیں انھوں نے بنک کی طرف سے قرض ملنے کی بیان کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مدد لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بنک کسی ملک کو اس وقت تک قرض نہیں دے گا جب تک اسے ان تین باتوں کا اطمینان نہ ہو جائے۔

(الف) ملک کی عام معاشی پالیسی قابل اطمینان ہے۔

(ب) معاشی ترقی اور تعمیر نو کے کام اس طریقے سے کئے جا رہے ہیں کہ حکومت کی بنیاد کمزور ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ اور زیادہ مضبوط ہونے کی امید ہے۔

(ج) جن اسکیموں کو چلانے کے لئے قرض مانگا جاتا ہے، وہ پوری صحت کے ساتھ تیار کی گئی ہیں اور معاشی حیثیت سے اور مالی حیثیت سے معقول ہیں۔

اس کے بعد بھی ورلڈ بنک سے قرض ملنا آسان نہیں بلکہ ایک دشوار اور دیر طلب عمل ہے۔

ان لوگوں کو جو ملک کی معاشی ترقی کے لئے بیرونی امداد کی آس لگائے بیٹھے ہیں مسٹر بور کی تقریر غور سے پڑھنا چاہئے اور اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر وہ شبہ جو قدرتی طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب بین الاقوامی معاشی ادارے دنیا کے ملکوں کو اینگلو امریکن سیاست کے سنہری جال میں پھانسنے کے لئے بنائے گئے ہیں، بے بنیاد بھی ہو تب بھی یہ ادارے ہمارے مرض کی دوا نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ ہماری مدد اسی وقت کریں گے جب ہم اپنی کوشش سے اپنی معاشی اور مالی حالت کو سدھار لیں اور ہم کو ان کی مدد کی کوئی خاص ضرورت نہ رہے۔

آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را

دہلی میں ۲۶، ۲۷ فروری کو ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں کی ایک غیر سرکاری کانفرنس "پھر بساؤ کانفرنس" کے نام سے منعقد ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے سب فرقوں کے تین سو سے زیادہ نمائندے جن میں صدر کانگریس اور دوسرے ممتاز لیڈر بھی تھے شریک ہوئے۔ پاکستان سے صرف پندرہ نمائندے آ سکے۔ البتہ سردار عبدالرب نشتر، محمد اسماعیل صاحب ہائی کمشنر، فیض احمد فیض صاحب اور کچھ اور بزرگوں نے ہمدردی کے پیام بھیجے۔ کانفرنس نے جو خاص رزولیوشن پاس کیا اس میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آوارہ وطن مہاجرین کو دوبارہ ان کے اصلی گھروں میں بسائیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریل کی آمد و رفت پھر سے جاری کریں اور پرمٹ وغیرہ کی بندشیں ڈھیلی کر دیں۔

ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اس کانفرنس کی تجویزوں کی زور شور سے حمایت کی گئی ہے۔ مگر پاکستان کے اخبار اور حکومت نے عام طور پر بے توجہی سے کام لیا ہے۔ اور وہاں کے زیادہ تر اخبار اس اصل تجویز کی کہ مہاجرین اپنے اپنے گھروں میں بسائے جائیں سختی سے مخالفت کر رہے ہیں۔ کاش وہ یہ سمجھتا کہ نہ صرف انسانی ہمدردی، رحم دلی، خدا ترسی کے جذبات اور عدل و انصاف کے اصول بلکہ دونوں ریاستوں کے اغراض و مصالح بھی اس پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر سب نہیں تو بہت سے مہاجرین کو اپنے اپنے مقام پر واپس جا کر اپنے اپنے کام کرنے کا موقع دیا جائے اس کے بغیر دونوں ملکوں کی خصوصاً پاکستان کی معیشت پوری طرح بحال نہیں ہو سکتی۔ یہ سب اخبار اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہند و پاکستان میں دوستانہ تعلقات دونوں ملکوں کی ترقی بلکہ زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر تعجب ہے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ جب تک ہندوؤں اور سکھوں کے لئے مغربی پنجاب کو اور مسلمانوں کے لئے مشرقی پنجاب کو لوٹنا ممکن اور قابل عمل نہ بنا دیا جائے دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم کرنا ناممکن اور ناقابل عمل ہے۔

گاندھی جی کا چراغ جل رہا ہے

گاندھی جی کے تعمیری اداروں کے کارکن جو پچھلے سال شروع اپریل میں سیواگرام میں جمع ہوئے تھے، اس سال ۷ مارچ کو اندور کے قریب راؤ کے مقام پر آل انڈیا سروودے کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ان لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی ساری کوشش فرقہ پرستی سے جنگ کرنے میں صرف کریں گے اور ایک برس کے اندر فرقہ وارانہ ذہنیت کے بدل جانے میں ان کی جد و جہد کو بہت بڑا دخل ہے امید ہے کہ وہ اس مبارک جہاد کو آئندہ سال بھی جاری رکھیں گے۔

۲ - پاکستان

متوازن میزانیہ

غلام محمد صاحب وزیر فنانس نے پاکستانی پارلیمنٹ میں جو میزانیہ پیش کیا ہے، اس میں تقریباً چودہ لاکھ کی بچت دکھلائی گئی ہے۔ وزیر موصوف نے بجٹ پیش کرتے ہوئے ایک لمبی تقریر کی جس میں پاکستان کے پچھلے سال کی مالی حالت پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور اس پر زور دیا کہ یہ متوازن اور غریبوں کا میزانیہ ہے انھوں نے فرمایا کہ کم تنخواہ پانے والوں کا اس میں بہت کافی لحاظ رکھا گیا ہے۔ فنانس منسٹر کی طویل تقریر کے اہم حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

گذرنے والے سال میں بعض ایسے واقعات پیش آئے۔ جن کا سیاسی اور معاشی زندگی پر بڑا اب بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس کا خیال رکھتے ہوئے کہ ملک کی عام حالت پر کوئی اثر نہ پڑے، اس تعداد میں کمی کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ آیندہ سال حالت نسبتاً تشفی بخش ہوگی۔ کوئلے کی کمی کی وجہ سے اس سال بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ اور بہت زیادہ قیمت پر باہر سے خریدنا پڑا۔ ہندوستان سے اس کے لئے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر امید ہے کہ ہماری پوری ضرورت ہندوستان سے آیندہ سال پوری ہو جائے گی۔ اس درمیان میں ہم تیل اور لکڑی کے ذریعے کام چلانے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو باہر سے امداد لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ڈاکخانہ اور تارگھر کی ترقی و اصلاح کے سلسلے میں بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ایوان کو یہ سُن

میزانیہ ایک نظر میں

(آمدنی)

	پہلا اندازہ	نظر ثانی کے بعد	امسال کا میزانیہ
	۴۹-۱۹۴۸ء	۴۹-۱۹۴۸ء	۵۰-۱۹۴۹ء
مالیہ	۴۱۱۰ لاکھ	۴۷۰۰ لاکھ	۵۵۴۳ لاکھ
ریلیں، ڈاکخانے اور تارگھر	۳۷۱۵ "	۳۷۶۵ "	۳۹۰۵ "
متفرق آمدنی	۱۱۴۸ "	۱۰۹۹ "	۱۳۷۱ "
میزان	۸۹۷۳ لاکھ	۹۵۶۴ لاکھ	۱۰۸۱۹ لاکھ

خرچ

	پہلا اندازہ	نظر ثانی کے بعد	امسال کا میزانیہ
فوج	۳۷۱۱ لاکھ	۴۰۲۸ لاکھ	۴۷۲۲ لاکھ
ریلیں، ڈاکخانے اور تارگھر	۳۷۱۵ "	۳۶۸۹ "	۳۷۹۰ "
متفرق اخراجات	۱۵۴۲ "	۱۸۰۴ "	۲۲۰۸ "
میزان	۸۹۶۸ لاکھ	۹۵۲۱ لاکھ	۱۰۷۲۰ لاکھ
بچت	۵ (بچت)	۴۳	۹۹ لاکھ (بچت)

گہرا اثر پڑا۔ مخصوص سیاسی حالات کے پیش نظر جن سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ مدافعت کی طرف سب سے زیادہ توجہ کرنی پڑی، اور اس کی وجہ سے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ کرنا پڑا۔ پاکستان کی تجارتی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ برآمد کی ترقی کے ساتھ ساتھ درآمد میں بھی توسیع ہوئی اور درآمد کے متعلق حکومت کی آزاد پسند پالیسی کی وجہ سے ملک کے ذرائع نقل و حمل میں خاصی ترقی ہوئی اور ذرائع نقل و حمل کے بہتر ہونے کی وجہ سے تجارت کے جم میں خاصی مدد ملی۔ پچھلے سال میں نے ریلوے کی بعض دقتوں کا ذکر کیا تھا۔ مثلاً ملک کی معاشی ابتری مہاجرین، بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کی کثرت کوئلے کی کمی وغیرہ۔ اس کی وجہ سے امسال اندازہ سے کہیں زیادہ نقصان ہوا ہے۔ لیکن اب بڑی حد تک حالت بہتر ہو گئی ہے۔ ریلوے میں اسٹاف کی تعداد

کر خوشی ہوگی کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اور انگلستان سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے ریڈیو ٹیلیگراف کا امسال انتظام ہو گیا۔ توقع ہے کہ اس سال جلد ہی مشرقی اور مغربی پاکستان لندن اور لندن کے ذریعے امریکہ سے ریڈیو ٹیلیفون سے بھی تعلق ہو جائے گا۔"

جیسا پاکستان ٹائمز نے لکھا ہے ایک نئی ریاست کے لئے جسے بہت سے تعمیری کام کرنے ہوں اور اپنی پست معاشی سطح کو بلند کرنے کے لئے صنعتوں کو ترقی دینی ہو بجٹ کا توازن قائم رکھنا کچھ زیادہ خوشی یا فخر کی بات نہیں۔ اس کی کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ اپنی آمدنی سے کہیں زیادہ رقم ملک کے اندر سے یا باہر سے قرض لے کر ایسے کاموں میں لگاتے جن سے پیداوار بڑھتے۔ لیکن اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ غیر معمولی شرائط زر اور گرانی کی

ہم کدھر جا رہے ہیں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

قومی زبان کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ (اب بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو یہ اُن کا گناہ نہیں!) ہمیں سنسکرت کی اہمیت اور اس کی کلاسیکی عظمت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ نے ملک میں ایک جاندار اور مالا مال زبان بنانے میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔ وہ ملک کی تمام زبانوں کے خزانے میں سے اس دولت کو کھونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میری پیشین گوئی تو نہیں لیکن امید ضرور ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کے بادل چند سال کے اندر اندر چھٹ جائیں گے اور جو لوگ اس وقت فوری رنجش یا دل کی تنگی کی وجہ سے اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں وہ سیدھے راستے پر آ جائیں گے۔ جواہر لال نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "اس عام زبان کا نام کچھ بھی ہو ہندی یا ہندوستانی" یہ بات ایک طرح صحیح ہے۔ کیونکہ دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی "ہندوستان کی زبان" بلکہ "ہندی" اس کا خالص فارسی اور زیادہ سہل نام ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس وقت جو صورت حال ہے اس میں نام کے بارے میں سمجھوتا کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس وقت ان ناموں کے ساتھ خاص خاص معنی اور روایات وابستہ ہو گئی ہیں۔ "ہندی" کا مطالبہ اس وقت زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں جو قومی زبان کی بنیاد صرف سنسکرت پر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اس بارے میں رجعت پسندانہ ہے "ہندوستانی" کا نام ان لوگوں کے خیال کو ظاہر کرتا ہے جو قومی زبان میں وسعت پذیری اور کشادہ دلی کے حامی ہیں اور اس میں ان تمام لفظوں کو شامل کرنے کے لئے تیار ہیں جو زبان کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس لئے جواہر لال اور دوسرے معقول پسندوں کو نام پر اصرار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جو لوگ نام تک کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ان سے یہ توقع کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ ہندی کی بوتل میں "ہندوستانی" شراب ڈالنے کے روادار ہوں گے؟ لہٰذا حق بات کو بے دھڑک کہنا چاہیئے، اور اس کے لئے کوشش کرنی چاہیئے خواہ بقول گاندھی جی کے انسان اس راہ میں بالکل اکیلا ہو، اور اُسے اس کوشش میں اپنی ساری عمر ختم کرنی پڑے۔

۳ حالت میں بجٹ کا توازن قائم رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے اندر سے یا باہر سے کافی قرض ملنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ریاست متوازن بجٹ کے ذریعے اپنی ساکھ قائم رکھے۔ اس لئے مجموعی طور پر حکومت پاکستان کی پالیسی صحیح اور دانشمندانہ معلوم ہوتی ہے۔

۳ - باہر کی دنیا

مشرق میں مطلع صاف ہو رہا ہے

پچھلے ہفتے کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کے آسمان سے جنگ کے بادل چھٹ رہے ہیں اور امن کے سورج کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی ہے۔

فلسطین میں مصر اور اسرائیل نے صلح نامے پر دستخط کر دئے ہیں اور دوسری عرب ریاستوں سے صلح کی بات چیت جاری ہے۔ بظاہر عرب حکومتیں اسرائیل کی ریاست کو ایک بلائے آسمانی سمجھ کر چار و ناچار تسلیم کریں گی۔ ایک طرف ان کی آپس کی پھوٹ، دوسری طرف اسرائیل کو روس اور امریکہ دونوں کی مدد ایسی صورت میں نتیجہ یہی ہو سکتا تھا جو ہوا اور ہو رہا ہے۔ جب تک عرب ملکوں میں سیاسی اصلاحات نہ ہوں حکومت کو عوام کا اعتماد اور ان کی تائید نہ حاصل ہو اور ان میں باہمی اتحاد نہ ہو۔ وہ اس طرح بڑی طاقتوں کی بساط سیاست کے مہرے بنے رہیں گے۔

انڈونیشیا کے معاملے نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ ڈچ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ وہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے سب ارکان کو رہا کر دے گی، اور ان کو دوسری انڈونیشی حکومتوں (یعنی اپنے پٹھوؤں) کے ساتھ گول میز کانفرنس میں جمع کر کے انڈونیشیا کی ایک وفاقی حکومت کا نقشہ بنائے گی۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل اس کے معنی یہ سمجھتی ہے کہ ڈچ اس کے مقرر کئے ہوئے کمیشن کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کے حکم سے صریحی سرتابی اور اس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ وہ اپنے آیندہ اجلاس میں اس معاملے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے والی ہے۔ انڈونیشیا کی ہنگامی جمہوری حکومت پہلے ہی ڈچ گورنمنٹ کے اس اعلان کے خلاف احتجاج کر چکی ہے۔ مگر در اصل اب جھگڑا ڈچ گورنمنٹ اور سیکورٹی کونسل کے درمیان ہے۔ اس لئے امید ہے کہ وہ قانونی اور آئینی سطح پر رہے گا اور اسے چکانے کے لئے ہتھیاروں کی لڑائی سے کام نہیں لیا جائے گا۔

چین میں دریائے یانگسی کے شمال کے کل صوبوں پر قبضہ کرنے اور بہ قول اپنے چین کے ۴۵ کروڑ باشندوں میں سے ۲۰ کروڑ کو آزاد کرانے کے بعد اب کمیونسٹ حکومت چین کی قومی حکومت سے صلح کی بات چیت پر تیار ہو گئی ہے۔ قومی حکومت کے وزیر اعظم سُن فو نے جو خدا خدا کر کے کینٹن سے نانکنگ پہنچ گئے ہیں، اعلان کیا ہے کہ وہ دس آدمیوں کی ایک مجلس صلح مقرر کریں گے اور خود اس کے صدر ہوں گے۔ انھیں امید ہے کہ وہ کوئی دو ہفتے میں اپنی کمیٹی کے ساتھ ماؤ تسی تنگ کی حکومت سے صلح کی گفتگو کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ ابھی تک یہ کہنا مشکل ہے کہ صلح کی بات چیت اس بنیاد پر ہوگی کہ دونوں فریقوں کی ایک مشترک حکومت قائم کی جائے یا کوئی اور نقشہ بنایا جائے گا

بہر حال چونکہ دونوں علاقوں میں تجارت اور کہیں کہیں ریلوں اور جہازوں کی آمد و رفت پہلے ہی سے شروع ہو گئی ہے۔ اس لئے آثار یہی ہیں کہ صلح کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

برما میں ابھی ملک خانہ جنگی اسی شدت سے جاری ہے لیکن نئی دہلی کی کانفرنس میں جس میں ہندوستان انگلستان، سیلون، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے نمایندے شریک ہوئے تھے۔ یہ تجویز ہوئی ہے کہ برمی حکومت اور کرن قبائل میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ انگلستان میں کنسرویٹیو پارٹی کرن قبائل سے پوری ہمدردی رکھتی ہے غالباً اسی کے زور ڈالنے سے برطانوی حکومت سمجھوتے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ برمی حکومت کے لئے تو بظاہر مصالحت کی تجویز کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کرن قبائل پر ان کے انگریز دوست اتنا اثر ڈال سکتے ہیں یا نہیں کہ وہ معقول شرائط پر صلح کرنے کی ہامی بھر لیں۔

مغرب میں مورچہ بندیاں ہو رہی ہیں

واشنگٹن میں امریکہ، انگلستان، فرانس، کینیڈا، ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ میں اتحاد اتلانتک کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اب تک یورپ میں روس کے خلاف جمہوری ریاستوں کا ایک مشترک محاذ بنانے کی جتنی کوششیں ہوئیں ——— مارشل پلان، مغربی یونین، وفاق یورپ، سب کی بنیاد بہت کمزور تھی، اس لئے کہ یورپ کی ریاستوں خصوصاً فرانس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ امریکہ کی جنگی امداد کے بغیر یورپ میں کوئی اتحاد اس قابل نہیں ہو سکتا کہ آیندہ جنگ میں روس کا مقابلہ کر سکے اور امریکہ کا یہ رنگ تھا کہ وہ یورپی ریاستوں کو صرف معاشی امداد دے رہا تھا، اور ان سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ محض اپنے بل پر روس کے خلاف مورچہ بنا لیں گی۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ یورپ میں ایک مضبوط جنگی محاذ اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ خود مالی مدد کے علاوہ جنگی مدد کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہ لے۔ چنانچہ اب اتحاد اتلانتک کی تجویز نکالی گئی ہے جس میں مغربی یورپ کی جمہوریتوں کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا بھی شامل ہو رہے ہیں۔ ڈنمارک، ناروے، سویڈن پر بھی ڈورے ڈالے گئے تھے۔ مگر سویڈن نے تو صاف انکار کر دیا اور ڈنمارک اور ناروے ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ واشنگٹن کی گفتگو کامیابی سے جاری ہے، اور امید ہے کہ بہت جلد عہد نامہ تیار ہو جائے گا۔ خیال یہ ہے کہ اس کی شرائط کا اعلان ابھی نہ کیا ج

ا جائے بلکہ اس وقت جب اس پر سب حکومتوں کے دستخط ہو جائیں دیکھنا ہے کہ یہ نیا پیمان وفا حبیب کے وصل پر زیادہ زور دیتا ہے یا رقیب سے فصل پر

ع، ح

مختصر تبصرے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

ہوتی ہیں۔ بہت شکنی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ نئے ابھرتے ہوئے ہونہار ادیبوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ اس کے برعکس نئے لکھنے والے کی ابتدائی صلاحیتوں کو صحیح راہ نمائی سے تقویت پہنچانا اور عام پڑھنے والوں کو اس سے روشناس کرنا ہی اس کا کام ہے۔

بہر حال ہر کتاب کے لئے نہیں تو اکثر کتابوں کے لئے تبصرہ نگار کو فیصلہ کن انداز اختیار کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کی رائے ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پڑے ہوئے نشانات ہی قارئین کے لئے چراغ راہ بن سکتے ہیں۔ تبصرہ نگار سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ مصنف، اس کے ماحول، اس کے نقطۂ نظر، اس کے اسلوب بیان، تصنیف کی عام خوبیوں اور خامیوں کے متعلق ایسے اشارے کرے گا جس سے کتاب کے متعلق اتنا معلوم ہو جائے گا کہ کتاب کو فوراً پڑھا جائے یا کسی خاص سلسلے میں کسی خاص موقعہ پر اس کا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہے یا بالکل پڑھنا ہی نہ چاہیئے۔ تبصرہ نگار چاہے یہ باتیں کھل کر نہ کہے، لیکن اس کے اشارے ایسا ردعمل ضرور پیدا کرتے ہیں۔ کتاب کے تبصرے اور اشتہار میں فرق ہونا چاہیئے۔ اشتہار تجارتی چیز ہے اور تبصرہ ادبی۔ اشتہار کا کام ہر حالت میں گاہکوں کو گرفتار کرنا ہوتا ہے۔ تبصرہ کبھی کبھی اشتہار سے زیادہ نازک طریقے پر رہنما بن سکتا ہے اور کبھی ایک تجربہ کئے ہوئے شخص کا مشورہ بن کر دوسروں کو اس کے جال میں پھنسنے، اپنا وقت اپنا پیسہ اور دماغ ضائع کرنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس طرح تبصرہ نگاری ایک نازک اور ذمہ دار حیثیت رکھتی ہے۔

تبصرہ نگار مصنف اور قارئین کے علاوہ ناشر سے بھی واسطہ رکھتا ہے، کیونکہ کتاب کی قدر و قیمت میں اچھی طباعت وغیرہ سے بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کتاب کی ظاہری ہیئت پر بھی نگاہ رکھنا چاہیئے تاکہ اس کے مشورے ناشروں کے لئے بھی مفید بن سکیں۔ یہ چند سطریں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ کم سے کم نئی روشنی کے قارئین کتابوں کے مختصر تبصرے کو نہ تو کتاب کا اشتہار سمجھ کر پڑھیں اور نہ مصنف اور تصنیف کے متعلق حرف آخر بلکہ ایک تجربہ کار مشیر کی رائے سمجھیں جو غلط بھی ہو سکتی ہے اور نفسیاتی اختلافات کی وجہ سے ناقابل قبول بھی ——— لیکن جو پرخلوص طریقے پر کتاب اور مصنف سے متعارف کر دیتی ہے۔

نسیم شوق

روش صدیقی

وہ برق نازِ گریزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
شریکِ رگِ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دل ہے ترا مشرقِ مہ و خورشید
غبارِ منزلِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ دل تو کہاں ہو مگر یہ خواب سکوں
نثارِ زلف پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گذر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہار گل کدۂ ناز دل کشا ہے، مگر
نسیم شوق خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہے خلوتِ دل ویراں ہی منزلِ محبوب
یہ خلوتِ دل ویراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک سانس ہو آتش کدہ تو کیا حاصل
گداز شعلۂ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بغیر عشق ہے رودادِ زندگی تاریک
یہ لفظ زینتِ عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقام خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکون شوق ہو یا اضطراب شوق روشؔ
اگر بمنزلۂ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غزل

باقر رضوی

شوق آزادی میں شاخ بے ثمر ہوتی گئی
بلبل شوریدہ سر بے بال و پر ہوتی گئی

جس قدر دانائے رازِ خیر و شر ہوتی گئی
زندگانی اتنی ہی دشوار تر ہوتی گئی

گلشنِ ہستی میں فرق خار و گل بڑھتا گیا
رفتہ رفتہ چشم عالم بے بصر ہوتی گئی

چھٹتے چھٹتے چھٹ گئیں وہم و گماں کی بدلیاں
ہوتے ہوتے ہر حقیقت جلوہ گر ہوتی گئی

میرے ان کے درمیاں جتنا بڑھا میل اور ملاپ
گفتگو اتنی ہی اتنی مختصر ہوتی گئی

اتنے ہی میری طرف سے بے خبر ہوتے گئے
جتنی ان کو میری جانب سے خبر ہوتی گئی

تم گئے کیا وقت کی گردش ٹھہر کر رہ گئی
گو بظاہر روز و شب شام و سحر ہوتی گئی

الاماں فرقت کی گرمی الحذر ہجراں کی آگ
دل کچھ اس صورت سے پگھلا آنکھ تر ہوتی گئی

جو غمِ ہستی کو دل کی آنکھ سے دیکھا کیا
زندگی اس کے لئے دردِ جگر ہوتی گئی

غزل

محمد مثنیٰ رضوی

ابھی فضا میں جو پُر درد گنگناہٹ تھی
یہ میری روح کے تاروں کی تھرتھراہٹ تھی

زمانہ جاگ اُٹھا جس کے اک اشارے پر
وہ انقلاب کے قدموں کی صرف آہٹ تھی

فضائیں جس سے منور ہوئیں زمانے کی
ترے جمال کی پُر نور مسکراہٹ تھی

وہ جس سے جل اُٹھے لاکھوں کنول تصور میں
ترے خیال کی ہلکی سی گنگناہٹ تھی

وہ پچھلی رات ترا یاد آکے رہ جانا
خنک خنک سی فضا میں عجب ادا ہٹ تھی

غزل

سحر رامپوری

عجب دل کا عالم بنائے ہوئے ہیں
وہ پردے کہ جنبش میں آئے ہوئے ہیں

تعاقب نہ کرتی ہوں وہ مست نظریں
جو اپنے قدم ڈگمگائے ہوئے ہیں

مرے لب تھے اور اک حسیں پھول لیکن
وہ رخسار کیوں تمتمائے ہوئے ہیں

بچے رہ گئے ہیں جو دو چار تنکے
گلستاں کو کیا کچھ بنائے ہوئے ہیں

ہے جیسے محبت بھی فطرت کے تابع
وہ کیا سحرؔ کو بھلائے ہوئے ہیں

مختصر تبصرے

سید احتشام حسین

"کتاب بظاہر کتنی معمولی اور مانوس سی چیز ہے، مگر در اصل یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پر اسرار معجزہ ہے۔ کاغذ کے ان ٹکڑوں سے جن پر سیاہ نقوش ابھرے ہوئے ہیں ہماری آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں یا ہمیں غصہ آنے لگتا ہے۔ کبھی ہم خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، اور کبھی کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔" (میکسم گورکی)

میکسم گورکی ایک مشققت پسند طالب علم تھا جس نے کتابوں کو محض تفریح کے لئے نہیں پڑھا بلکہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ کتابوں نے اس کے خیالات کی ترتیب میں اس کے نقطۂ نظر، فلسفۂ زندگی، جمالیاتی احساس اور شعورِ حیات کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا، اگر اس کی زندگی میں کتابوں کا اتنا حصہ نہ ہوتا تو وہ اسے "دنیا کا سب سے بڑا اور پر اسرار معجزہ" نہ کہتا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہر کتاب معجزہ ہوتی ہے۔ چھوٹے اور بڑے انبیاء ہوئے ہیں اور ان کے سچے جھوٹے معجزے۔ اچھے اور برے مصنف ہوئے ہیں اور ان کی اچھی بری کتابیں، ان میں تمیز کرنے کی ضرورت ہے، جتنی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور شایع ہوتی ہیں وہ سب نہ تو پڑھی جا سکتی ہیں نہ پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ عام طور سے لوگ اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں، اور اس انتخاب میں مدد چاہتے ہیں۔ رسائل کے تبصرہ نگار اس سلسلے میں کتنی مدد کر سکتے ہیں، یہی ان سطروں کا موضوع ہے۔

رسائل اور اخبارات میں کتابوں پر مختصر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ ان مختصر تبصروں اور جامع تنقیدی مضامین میں محض اختصار اور طوالت کا فرق نہیں ہوتا بلکہ کیفیت اور کمیت میں وسعت اور مقصد میں بھی یہ مختلف ہوتے ہیں۔ مختصر تبصروں کے محدود ڈھانچے میں اہم تنقیدی مسائل، ادبی نظریات فنی تصورات کی بحثیں نہیں چھیڑی جا سکتیں، بلکہ عام ادبی نتائج کی بنیاد پر کسی کتاب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت کے مطابق یہ تبصرے طویل بھی ہو سکتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو ان میں اہم مباحث کے دروازے بھی کھولے جا سکتے ہیں، لیکن ان میں بھی اختصار مدِ نظر ہوتا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں کتاب زیرِ تبصرہ کا تنقیدی اور بصیرت افروز تعارف ہو سکے۔ تعارف کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ہر کتاب کا کوئی موضوع ہوتا ہے اور اس کا کوئی پس منظر، ہر کتاب کا کوئی مصنف ہوتا ہے اور اس کا کوئی نقطۂ نظر۔ تبصرہ نگار اس کتاب کا مطالعہ اس نظر سے کرتا ہے کہ اسی موضوع پر لکھی ہوئی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ نئی کتاب کیا حیثیت رکھتی ہے، اور مصنف نے زندگی کا کون سا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ کس طرح کہ بحث کا موضوع کتاب بن جاتی ہے اور کبھی مصنف۔ کبھی کتاب کا موضوع اور کبھی پیش کرنے کا طریقہ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ مختصر تبصرے میں کوئی بحث نہ تو طویل ہو سکتی ہے اور نہ قطعی۔ اس لئے تبصرہ نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر پہلو کی طرف مختصر مگر بلیغ اشارے کرتا جائے تاکہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے دل میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کے پرکھنے کی ذاتی خواہش بھی پیدا ہو جائے۔

ہر شخص ایسا بیدار ذہن نہیں رکھتا کہ ہمہ تن توجہ بن کر کتاب کا مطالعہ کرے۔ اچھا مطالعہ بذاتِ خود ایک فن ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ایک صاحبِ ذوق انسان بھی اچھی خاصی ریاضت کے بغیر کتاب سے اچھی طرح لطف اندوز یا مستفیض ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تبصرہ نگار سے کم سے کم یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کا ذوق پختہ، اس کی نگاہ گہری، اور اس کا مزاج منصفانہ ہوگا۔ وہ موضوع سے اچھی طرح واقف، اور اندازِ بیان کی خصوصیات کا حقہٗ آشنا ہوگا، اور اس نے اپنے ذہن کو کھلا ہوا رکھ کر کتاب کے مطالعے کے دوران میں مصنف کو اپنے خیالات اور نقطۂ نظر کی وضاحت کا پورا موقع دیا ہوگا، اس کے بیان اور اندازِ بیان کو ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش کی ہوگی اور اس کے بعد وہ جو نتائج اخذ کرے گا ان کو اپنے تبصرے میں پیش کرے گا۔ تبصرہ نگار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ مصنف یا کتاب اور قارئین کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے اس کی رائے صرف ادبی نہیں، اس کاروباری زمانے میں تجارتی اہمیت بھی رکھتی ہے اس لئے یہ سوچنا کہ کوئی تبصرہ نگار صرف اپنی ذاتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کتاب کے متعلق کوئی رائے دے گا درست نہیں، یہاں بے لاگ رائے اور ذاتی پسندیدگی کا نفسیاتی مسئلہ بھی میرے پیشِ نظر ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اچھے تبصرہ نگار کتاب کے متعلق رائے دینے میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے محض ذاتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو خیالات کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ ملک کے ذہنی مطالعہ، مصنف کی شخصیت، اہمیت اور رجحان موضوع کی اہمیت اور مصنف کے متعلق دوسروں کی رایوں کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کسی انسان کے بس میں نہیں۔

خیر یہ تو سوال تھا، تبصرہ نگار کی ادبی دیانت داری اور وسعتِ نظر کا۔ تبصرے میں عام قارئین کے مطالبات بھی چھپے ہوتے ہیں۔ کتابوں کا اوسط درجے کا شائق ایک اچھے رسالے یا اخبار اور اس کے ذمہ دار تبصرہ نگار سے ایک کتاب کے متعلق کیا کیا جاننا چاہتا ہے؟ تبصرہ نگار کے پیشِ نظر یہ بات بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ہر موضوع ہی نہیں بلکہ ہر کتاب کے متعلق واضح کرنے والی باتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک ناول پر تبصرہ مقصود ہے تو اس کے پلاٹ کا خاکہ مختصر ترین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایک مختصر افسانوں کے مجموعے کے ہر افسانے کا پلاٹ نہیں بیان کیا جا سکتا، ہاں کسی نمائندہ افسانے یا انوکھا یا انداز بیان رکھنے والے افسانے کا بیان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کسی سائنس کی کتاب کے تمام مباحث کا خلاصہ نہیں پیش کیا جا سکتا، مگر نتائج اور ان نتائج کی صحت یا افادیت کے متعلق ضرور کچھ کم جگہ میں چند ضروری باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ہر جگہ تبصرہ نگار کا طریق کار یکساں نہیں ہو سکتا اگر وہ اتنا ہی کر دے کہ پڑھنے والے کے لئے ایک ذہنی فضا تیار کر دے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔

ہر تبصرے میں کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہو جانا چاہئے کہ کتاب کا موضوع کیا ہے۔ مصنف کے خاص خیالات کیا ہیں، وہ کس تحریک سے وابستہ ہے کس کا مخالف یا موافق ہے۔ کن خیالات یا مصنفین سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کے کن عناصر کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے، اور حیاتِ انسانی کے حسن میں کس قدر اضافہ کرتا ہے۔ اسے یہ بھی ظاہر کرنا چاہئے کہ کتاب عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے یا علم انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ نئی گتھیاں پیدا کرتی ہے یا گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ موجودہ دور تمدن بہت سی عقلی اور تجرباتی تحریکوں سے وجود میں آیا ہے اور اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود اپنے طریقوں میں سائنٹیفک، اپنے عقائد میں عقل پرست، اور اپنے مقصد میں افادی ہے۔ یہ باتیں خود اپنی جگہ پر بحث طلب ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ حقیقت پسند اور قطعیت پرست بھی اپنے دلائل کی عقلی اور اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اربوں کتابوں کی اس دنیا میں ایسی کتابوں کا اضافہ جو کسی حیثیت سے مفید نہ ہوں ترقی کی دلیل نہیں۔ تبصرہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ انسانوں کے ذہن اور علم کے لئے وہ چیزیں اپنی سنجیدہ رائے سے مہیا کرے جو سرمایۂ فکر میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں، اور ان تصورات اور تخلیقات کی ہمت شکنی کرے جو مفادِ انسانی کے لئے کسی حیثیت سے مضر

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

ہریجن کا ست

سروودے کی تکمیل

ونوبا بھاوے

(راج گھاٹ دہلی میں گاندھی جی کی پہلی برسی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اچاریہ ونوبا بھاوے نے گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں کو سیدھے سادھے لفظوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا، اور گاندھی جی کی شہادت کی اہمیت سمجھائی۔ شری ونوبا نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ گاندھی جی کا قتل ہم سب کے لئے ایک چیلنج ہے کہ ہم سرودے کے نصب العین کو پورا کریں۔)

ایک سال ہوا آج ہی کے دن یہ گھڑی وہ المناک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ہم کو ہمیشہ نیاسہ بشرم سے جھکانا پڑے گا۔ لیکن یہی واقعہ ہمارے لئے ابدی فیضان کا سرچشمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی نے ہمیں جسم اور روح کا فرق سمجھایا ہے۔

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ گاندھی جی کو جو سچے اللہ والے تھے اللہ نے کیوں نہیں بچایا۔ مگر میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جیسی حفاظت قدرت کی طرف سے گاندھی جی کی ہوئی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم جو اس بات کو نہیں سمجھتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق جسم سے دوسری قسم کا ہے۔ قرآن میں آیا ہے "جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے انھیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں چاہے تم ان کو دیکھ نہ سکو" ایک اور جگہ ہے "خدا کی راہ میں موت بھی زندگی ہے اور شیطان کی راہ میں زندگی بھی موت ہے" ساری عمر گاندھی جی کی سچائی اور نیکی کی راہ پر چلتے رہے۔ اسی کی وہ اپنی قوم کو تلقین کرتے رہے۔ اور اسی تلقین کی وجہ سے قتل کر دئے گئے۔ مبارک تھی ان کی زندگی اور مبارک تھی ان کی موت!

بہت سے ولیوں نے نیکی کی راہ کی طرف ہدایت کی ہے۔ پھر بھی انسان کو ابھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ بھلائی صرف بھلائی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ابھی تجربہ کر رہا ہے کہ دیکھیں برائی سے بھی بھلائی نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اُسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ببول کے پیڑ سے آم کا پھل اور آم کے پیڑ سے ببول کا پھل کبھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ شاید پرانے زمانے میں یہ بات بھی اس کے ذہن میں صاف نہ رہی ہو لیکن اس عہد کے لوگوں کو یقین ہے کہ مادی دنیا کے لئے تو بیج اور پھل کے تعلق کا قانون ضرور صحیح ہے۔ البتہ اخلاقی دنیا میں وہ ابھی تک اس بارے میں اپنے شبہے کو دور نہیں کر سکا۔ اتنا تو وہ جانتا ہے کہ نیکی سے عام طور پر فائدہ ہوتا ہے لیکن یہ بات اس کے دل میں نہیں بیٹھی کہ خالص نیکی سے بھی بھلا ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو شخصی زندگی میں خالص نیکی کا اصول تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اسے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن جماعتی زندگی کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ تھوڑی سی بدی کی ملاوٹ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کو حق و باطل کا ملا جلا راستہ راس آتا ہے۔ گاندھی جی نے اس نظریے کو کبھی نہیں مانا۔ انھوں نے ہم سے سماجی زندگی میں بھی ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر عمل کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں جیسا تیسا سوراج مل گیا۔ جس حد تک ہم نے اُن کی ہدایتوں کی تعمیل کی اتنی تسکین قلب حاصل ہو گئی۔ رہا یہ کہ ہمارا سوراج ویسا نہیں جیسا ہونا چاہئے تھا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے اصول میں کوئی خامی تھی بلکہ یہ ہے کہ اس پر ادھورا عمل ہوا۔ ہندسے کا جو اصول ایک عام مثلث پر عائد ہوتا ہے اسے تین ضلعوں کی سب شکلوں پر عاید ہونا چاہئے۔ اسی طرح اگر یہ صحیح ہے کہ کامل پاکیزگی شخصی اور نجی زندگی میں مفید ہے تو اسے اجتماعی زندگی میں بھی مفید ہونا چاہئے۔

بعض کا خیال ہے کہ اگر ہمارے اغراض و مقاصد حق کے مطابق ہوں تو کافی ہے، چاہے ہم ان کے حاصل کرنے کے لئے کوئی ذریعے بھی استعمال کریں۔ گاندھی جی ہمیشہ اس نظریے کے مخالف رہے۔ وہ تو حق کی خاطر سوراج کو بھی قربان کرنے کو تیار تھے یہ بات نہیں تھی کہ وہ سوراج کے خواہاں نہ ہوں یا اس کو کافی اہمیت نہ دیتے ہوں جس چیز پر وہ زور دینا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ اس کے حاصل کرنے میں پاک ذریعوں سے کام لینا چاہئے۔ ساری عمر وہ سوراج کے لئے کوشش کرتے رہے۔ مگر ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ سوراج صرف ایسے ذریعوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو سچائی پر مبنی ہوں اور وہی سچا سوراج ہو سکتا۔

جو شخص کسی نصب العین کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسے مقصدوں سے زیادہ ذریعوں کے معاملے میں احتیاط برتنی چاہئے۔ اچھے ذریعے اختیار کرنا ہی دراصل مقصد کا حاصل کرنا ہے۔ اس لئے مقصد اور ذریعے کا فرق محض خیالی ہے۔ ذریعہ نہ صرف مقصد تک پہنچاتا ہے بلکہ اس کی شکل کو متعین کرتا ہے۔

سچ پوچھئے تو اپنے مقصد اور نصب العین کو ہر شخص اچھا سمجھتا ہے۔ اس لئے مقصد کی اچھائی کا دعویٰ کوئی خاص قدر و قیمت نہیں رکھتا، یہ خیال نیا نہیں ہے کہ ذریعے اور مقصد میں ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ لیکن جس پیمانے پر اس سے ہندوستان میں کام لیا گیا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ کچھ اور لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ حق و تقویٰ پر زور دینا اچھا ہے مگر عمل بہرحال زیادہ اہم ہے اگر تقوے پر زور دینے سے عمل میں رکاوٹ ہو تو نصب العین کو تھوڑا سا نیچا کر دینا چاہئے۔ ان کے نزدیک بے عملی کا تو کبھی تصور ہی نہیں کرنا چاہئے یہ بھی خبط ہے اور غلطی ہے۔ جب لوگوں کو مدت تک جیل میں رہنا پڑتا تھا تو وہ کہتے تھے "ہم جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں" گاندھی جی ان کو یہ بتاتے تھے کہ ایک پاک آدمی کی بے عملی کے اندر بھی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ گیتا نے اپنے بے مثل انداز میں کہا ہے "بے عملی میں عمل ہے" بے شک عمل بہت اہم ہے مگر حق اور تقوے اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ عمل تو انسان خاص حالات میں ترک کر سکتا ہے مگر حق کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

کچھ حضرات ہیں جو اپنے آپ کو "عملی آدمی" کہتے ہیں۔ وہ حق کو پسند کرتے ہیں مگر یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر یکطرفہ عمل خطرناک ہے۔ انھیں یہ ڈر ہے کہ اگر ہم ستیہ اور اہنسا پر قائم رہے اور ہمارے حریفوں نے ستیہ اور اہنسا سے کام نہ لیا تو ہم کو نقصان پہنچ جائے گا۔ دراصل یہ لوگ سچائی کی قدر و قیمت نہیں جانتے ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔ کیا وہ کبھی اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اگر ہمارا حریف کھانا چھوڑ دے تو ہمیں بھی چھوڑ دینا چاہئے؟ وہ جانتے ہیں کہ حریف چاہے کچھ بھی کرے غذا طاقت بخشنے والی چیز ہے۔ اگر وہ حریف کا خیال کئے بغیر کھانا کھا سکتے ہیں تو یکطرفہ سچائی اور یکطرفہ محبت سے کام نہ لینے کے کیا معنی؟ یہ بزدلی کا رویہ ہے اس طرح ایک منطقی دور پیدا ہو جاتا ہے اور بدی کا چکر بندھ جاتا ہے اسے توڑنے کے لئے انسان کو چاہئے کہ ہمت کرے محبت اور فیاضی سے کام لے، اور نتائج کا حساب نہ لگائے دراصل حق محبت اور نیکی، مثبت اور حقیقی ہے۔ باطل وغیرہ منفی اور غیر حقیقی ہیں یہ تو نور اور ظلمت کی جنگ ہے۔ اس میں نور کو کاہے کا ڈر؟

یہ ستیہ گرہ کے فلسفے کا تصور ہے جو میرے ذہن میں ہے۔ اس میں سب کا بھلا ہے اس لئے اسے سرودے کا فلسفہ کہتے ہیں۔

گاندھی جی کا قتل ہمارے لئے ایک چیلنج ہے ہم اس چیلنج کو اسی وقت قبول کر سکتے ہیں جب ہمیں حق پر کامل اعتماد ہو۔ اور اسے اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں برتنے پر تیار ہوں۔ ورنہ صرف یہی نہیں کہ ہم کو اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہیں ہو گی بلکہ شاید ہمیں چار ناچار گاندھی جی کے قاتل کے بشکہ میں شامل ہونا پڑے۔

مجھے امید ہے کہ گاندھی جی کی اس جسم فانی سے رہائی ہمیں نئی طاقت بخشے گی اور ستیہ اور اہنسا پر دل و جان سے عمل کر کے ہم سرودے کے نصب العین کے موزوں خادم بن جائیں گے۔

پر جو سچے داتا ہیں ان کا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پن کرنا اور بدے کرنا نیک سلوک
(گجراتی شاعر)

کھاج

سید سخی حسن نقوی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ پندرہ رات کے بارہ بجتے غلامی کی منحوس زنجیریں توڑ دی گئیں، اور ٹھیک بارہ بج کر ایک سکنڈ پر ہندوستانیوں نے آزادی کا پہلا سانس لیا۔ ہندوستان کی فضا میں پہلی بار آزاد ہوا کا پہلا جھونکا چلا۔ انسانوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت و رنگ و نسل مسرت کا جشن منایا، خوشی کے نقارے بجے۔ شاندار جلوس نکالے گئے۔ اسکول کے ماسٹروں اور دفتر کے کلرکوں نے خوب چھٹیاں ماریں۔ بچوں نے مٹھائیاں اور ریئسوں نے دعوتیں اُڑائیں۔ بے شک ملک آزاد ہوگیا۔ لیکن ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تعمیری کام کا دور تو گویا اب شروع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کرلیا، کچھ ہو رہا ہے، اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جو کرنا باقی ہے اس میں اہم ترین کام جس کی طرف ہمارے ارباب حل و عقد کے ذہن منتقل ہی نہیں ہوئے یہ ہے کہ ان لعنتوں کا جلد از جلد انسداد کیا جائے، جو انگریزی سامراج نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک دوسری جنگ عظیم ہے جس کی بدترین لعنت کھاج ہے جس کا آج سارے ملک میں راج ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں نے لاکھوں دوائیں ایجاد کیں لیکن کھاج کا ایسا تیر بہدف علاج ایجاد کرنے سے قاصر رہے جو ہمیں کھاج کے سامراج سے بھی خلاصی دے سکے۔

جس طرح سیاسیات میں اس مسئلہ پر کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا سیاسی مفکرین نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ روسو معاہدۂ عمرانی کا قائل ہے اور سرہنری مین نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں میراث مادری پر زور دیا ہے۔ اسی طرح علم خارش کے طالب علموں نے کھاج کے بارے میں اپنے تجربات کی بنا پر جداگانہ نظریات پیش کئے ہیں۔ بعض توہم پرست مریضوں کی رائے ہے کہ کھاج چونکہ مرض نہیں بلا ہے اس لئے پچھلے جنم میں اس کا چال چلن ضرور خراب رہا ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ کھاج انسان کے تمام جسم کو گھیر لیتی ہے اور سب سے زیادہ اسے وہ مقامات پسند ہیں جو جسم انسانی میں سب سے زیادہ گندے ہیں اور جنھیں وہ پوشیدہ رکھنا پسند کرتا ہے۔ اسی نظریے کے ماتحت وہ جادو اور ٹونے کے ذریعے سے کھاج کے قائل ہیں۔ نمک فروش پنساریوں کا خیال ہے کہ کھاج کا واحد سبب موجودہ زمانے کی شکر ہے جس میں خارش کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف شکر ملوں کے مالکوں کے نزدیک یہ آج کل کے نمک کی تاثیر ہے جو کھاج کے جراثیم کا حامل ہے۔ سیاسی سائنس دانوں کی رائے میں یہ سب نظریات غلط ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کھاج پھیلنے کا صرف ایک سبب ہے اور وہ ہے "ایٹم"۔ اس لئے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کھاج مشرق میں جاپان اور اس کے قرب و جوار میں پھیل رہی ہے اور مادر وطن چونکہ اس علاقے کے قریب ہے اس لئے وہ بھی کھاج میں مبتلا ہے۔ اسی سبب سے انھوں نے کھاج کے مرہم کا نام "ایٹم بم مرہم" رکھا ہے جس کا دعوے ہے کہ جس طرح ایٹم بم چشم زدن میں لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح یہ مرہم کھاج کے جراثیم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

آج کل دنیا کا کوئی سیاسی لیڈر اتنا مقبول خاص و عام نہیں جتنی کھاج ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس نے کھاج کو مہمان نہ رکھا ہو، اور گھر کی کوئی فرد ایسی نہیں جس نے اس کی دل کھول کر مہمان نوازی نہ کی ہو۔ جنھوں نے کھاج کی تاریخ اور سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پرانے اور اس زمانے کی کھاج میں بڑا فرق ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج کو اس کا بڑا خیال آتا تھا کہ روز روز کے آنے جانے اور آئے دن کی مہمان داری سے لوگ اکتا جاتے ہیں اور انسان ہمنشینوں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت جب وہ رخصت ہوتی تو وہ جسم کو کندن بنا کر چھوڑتی، مگر عصر حاضرہ کی کھاج جدت پسند ہونے کے ساتھ نہایت بے تکلف واقع ہوئی ہے۔ موجودہ زمانے کی کھاج نے اپنی روائتی ریت اور رسم بدل ڈالی ہے۔ اب صرف ایک دفعہ آکر اس کی تسکین نہیں ہوتی، اور جب ایک بار نازل ہو جاتی ہے تو اول تو جانے کا نام نہیں لیتی اور اگر بھول کر چلی جاتی ہے کئی کئی بار پھیرا لگاتی ہے۔ جسم کو کندن اور زندگی بنانے کی بجائے مستقل طور پر روگی بنا دیتی ہے، اور بعض کو مجسم کھاج۔

اگر کوئی پوچھے کہ آسمان میں کتنے تارے ہیں یا ہمارے سر میں کتنے بال ہیں تو جواب دینا اتنا دشوار نہیں جتنا یہ بتانا کہ کھاج کی کتنی دوائیں ہیں۔ اگر ہر مریض کو صرف ایک، دو اسکے حساب سے بھی یاد ہوتی تو سوال زیادہ بے ڈھب نہ ہوتا کیونکہ "جتنے منہ اتنی باتیں جتنے آدمی اتنی دوائیں" والا مضمون ہو جاتا اور معاملہ صاف تھا۔ لیکن یہاں تو یہ دقت ہے کہ ان دواؤں کی تعداد بتانا بھی مشکل ہے جو اکیلے ایک آدمی کو یاد ہوتی ہیں۔ کہیں بھولے سے تذکرہ کر بیٹھئے کہ آپ کھاج میں مبتلا ہیں پھر دواؤں کا ایسا پل بندھے گا کہ توڑا نہ ٹوٹے گا۔ ہر مریض اپنے اپنے تجربات بغیر پوچھے بیان کرنا شروع کردے گا، اور ان تجربات اور تحقیقات کو اس قدر زور دے کر اور جوش و خروش کے ساتھ پیش کرے گا کہ جان چھڑانی دوبھر ہو جائے گی اور آپ کھاج کی تکلیف بھول کر یہ کہہ اٹھیں گے کہ کاش ہم کھاج میں مبتلا نہ ہوتے، یعنی اتنی تکلیف وہ خود کھاج نہ رہے گی، جتنی وبال جان دواؤں کی تعداد بن جائے گی۔

کھاج کا ہر مریض علیحدہ دوا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ دو مریض ایک ہی دوا سے صحتیاب ہوئے ہوں۔ کھاج کا مریض جب شفا پاتا ہے تو وہ کم از کم بیس دوائیں استعمال کر چکا ہوتا ہے تب آخر میں کوئی ایک دوا کارگر ثابت ہوتی ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ دوا سے اچھا نہیں ہوتا وہ غسل کرتے کرتے اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ ایک دن بھول کر غسل صحت بھی کر ڈالتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں کھاج اس سے بددل ہو کر خود بخود اس کا پیچھا چھوڑ دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے انگریزی سرکار نے ہندوستان کا چھوڑا۔

دنیا میں بے شمار بیماریاں ہیں، ان میں بعض معمولی بیماریاں ہیں، بعض پھیلنے والی اور مہلک۔ نزلہ زکام اور کھانسی معمولی بیماریوں کی فہرست میں آتی ہیں، ہیضہ طاعون اور دق، متعدی اور مہلک بیماریاں ہیں، کھاج پھیلنے والی بیماری ہے مہلک نہیں، کھاج کا مریض کبھی مرتا نہیں، لیکن بیماری کی حالت میں ادھ مرا ضرور رہتا ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج صرف جاڑوں میں ہوا کرتی تھی، اور گرمی آتے ہی خود بخود اچھی ہو جاتی تھی، اب ہر موسم میں ہوتی ہے۔ ہیضہ اور طاعون موسمی بیماریاں ہیں، کھاج بارہ ماسی ہے۔

دق کی طرح کھاج کے بھی تین درجے ہوتے ہیں۔ پہلے درجے میں انسان ہاتھ کی گھائیوں اور دوسرے جوڑوں میں میں کھجانا شروع کرتا ہے۔ اس منزل میں مریض کے نفسیات یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مرض کو چھپاتا ہے، اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو فی البدیہہ مصرعہ چست کردے گا۔ "جی نہیں" اس منزل میں کھجانے میں بہت مزا آتا ہے، جی چاہتا ہے بس کھجائے جایئے۔ اور جب ہاتھ تھک جائیں تو دوسروں سے کھجوایئے۔ دوسرے درجے میں متاثر مقامات پر ننھے ننھے دانے بننے لگتے ہیں، جن میں پانی پڑ جاتا ہے۔ کھجلی میں بدستور مزا آتا ہے، بلکہ مزے کے ساتھ کھجلی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کھجانے کے لئے جوتے کا برش قسم کے آلات استعمال کرنا پڑتے ہیں، اور کھجانے کی خاطر نہایت ضروری کام کو ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔ کھجانے کے لئے ناخنوں کو بڑھا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن افسوس ناخن گھستے گھستے آدھے رہ جاتے ہیں جسم کی کھال چھل جاتی ہے اور ننھے ننھے دانوں میں پیپ پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ گویا تیسرے درجے کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوسرے درجے میں بھی مریض اپنا مرض چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے اور خارش کے دوروں کو مچھر کا کاٹا بتاتا رہتا ہے، لیکن مرض اب چھپائے نہیں چھپتا اور بے چارے کو اقبال جرم کرتے سر نیچا کرنا پڑتا ہے، تیسرے درجے میں کھجلی اور مزے میں کمی، اور تکلیف میں زیادتی شروع ہو جاتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نئی روشنی کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کو بہار کی فرحت کی خوشیاں نصیب ہوں۔ آمین اس فصل میں دیہات میں دلکش گیت گائے جاتے تھے۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ

وہ ساغر گیر و نرگس مست و برنا مرفسق
نامردی نا درم لیسے یار بے برگ و ابر رنگم

وقت کا تقاضا ہی یہ ہے۔ ارا را ائیے

ارے چپ، ارے چپ خبردار جو منہ سے کوئی بے ہودہ بات نکالی۔ مرد ودو اب تو یہاں بیٹھ کر شریف مرد آدمیوں میں کیا گاتے گاؤ گے؟

جی کیا حرج ہے ارا را را

پھر وہی گڑ گاتا ہوں جی۔

"دیکھئے دیکھئے اسن لیجئے غصہ نہ کیجئے ہاتھ رو کے رہیے تو عرض کروں۔ مورخ القفلن نے ہندوستان کی ذہنیت کے سلسلے میں" اس معصوم صاف دلی کا ذکر کیا ہے جس کے رو سے جو چیزیں بلا اعتراض ہو سکتی ہیں وہ بلا اعتراض بیان بھی کی جا سکتی ہیں ابھی تھوڑی اس شاندار قدیم زمانے کا ذکر کرتے تھے جو گاؤں پنچایتوں کی وجہ سے واپس آکر گزشتہ رونق بڑھا دے گا۔ یعنی وہی معصومیت اور صاف دلی پھر جگمگا اٹھے گی"۔

"تو اس کے معنی یہ تم نے کہاں سے نکالے کہ تم کبیر گانے لگو۔ یو مارشے لیسی زبا اشٹ پہلے ہی فرما گیا ہے کہ وہ حماقت انگیز چیزیں جو نثر میں نہیں بیان کی جا سکتیں، نظم میں یا گا کر سنائی جاتی ہیں"۔

"جی ہاں ، تو میں بھی تو نحن سے کلام موزوں کر رہا ہوں۔ ارا را را جٹ پٹ دھم، اچھا مولوی صاحب معاف کیجئے اب کبھی نہ گاؤں گا"۔

(برٹرنڈ رسل کی ایک تقریر کا خلاصہ جو وہ یونیورسٹی کی لیکچرز سروس میں بولے تھے۔ اقتباس از منڈلا ڈائجسٹ جون ۱۹۴۸ء)

الفاظ کے دو کام ہیں واقعات بیان کرنا اور جوش دلانا۔ دوسرا کام زیادہ قدیم ہے۔ جیسا کہ بچے جنتے کی فصل میں جانوروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ تہذیب کی کوشش ہے کہ الفاظ معنی زیادہ بیان کریں اور جوش کم دلائیں۔ مگر پالٹکس میں اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ گو الفاظ کے معنی لغت میں معین ہیں مگر پالٹکس میں آکر بدل جاتے ہیں۔ اسی لفظ کے معنی مختلف خیال کے لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتے ہیں۔ مگر جوش دلانے میں ایک ہی طرح کام آتے ہیں۔ آزادی کے معنی ہیں "غیر کی حکومت کا فقدان"۔ پھر اس کے معنی ہو گئے "بادشاہ کے اختیارات میں کمی"۔ جب انسانیت کے حقوق کا مسئلہ نکلا تب آزادی لفظ "آزادی" کے معنی ہو گئے کہ کن کن باتوں میں گورنمنٹ کی حکومت سے آدمی آزاد ہے؟ پھر ہیگل کے ہاتھ میں آکر اسی لفظ کے معنی ہو گئے کہ آزاد آدمی کن کن باتوں میں پالیس مقررہ دیکھیں کا حکم ملنے گا۔ آج کل لفظ "پارلیمنٹ" بھی اسی طرح کے پہلو بدل رہا ہے۔ پہلے اس کے معنی تھے جمہور کی حکومت اور اس کے ساتھ فرد کی آزادی کا بھی کچھ خیال شامل تھا۔ پھر اس کے معنی ہو گئے غریبوں کی حکومت کیونکہ غریب ہی ہر جگہ زیادہ تھے۔ پھر اس کے معنی نے نیا چولا بدلا، اور اس کے معنی ہو گئے "غیر جوار کے نمائندوں کی رائے"۔ فی الحال اس لفظ کے معنی مشرقی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں میں قرار پائے ہیں کہ ان لوگوں کی جبریہ حکومت جو کبھی غریبوں کے نمائندے تھے۔ اور اب ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دولت مندوں کو کھا جاؤ۔ سوا ان دولت مندوں کے جو "ڈیموکریسی" کے تازہ ترین معنی کو تسلیم کرتے ہیں۔ لفظوں کے معنی بدلتے جائیں۔ مگر الفاظ کا اثر وہی ہونا چاہئے جو اصلی معنی کا ہوا تھا۔ بدلے ہوئے معنوں سے پولیٹکل جھوٹ جانے ہیں کو اچھی خاصی بد دلی آتی ہے۔ الفاظ کے نت نئے معنی کے ذریعے سے ان لوگوں کو چاند میں ہوا کے ذریعے سے آدمی بھیجا ہو تو یہ رضا کار یہ کہہ کر پکاریں گے کہ "وطن، وطن الوقہ، وطن بالوقہ کو کون چلتا ہے"۔ (یعنی سلوگن وہی رہے گا، مگر مفہوم بدلتے رہیں گے اور کام چلتا رہے گا۔) سائنس اور سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم میں صحیح معنی پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ لڑکوں کو پڑھانے میں بھی اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ نہ لفظوں کے معنی حسب ضرورت بدلے جا سکیں۔ نہ ان کا اثر الٹا ہی لایا جا سکے اور اس طرح تعلیم صحیح صورت میں پیش نظر رہے۔ میرا تجربہ ہے کہ سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم اس احتیاط کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے اور اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر اس کو کامیابی سے برت بھی لیتی ہے۔ "مگر پولیٹکل میدان میں نہ جذباتی معنی پیش پیش رہتے ہیں۔"

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایک سائنٹفک فلاسفی کا جلسہ پیرس میں ہوا تھا، جہاں تمام ممالک سے بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے تھے، ان کی گورنمنٹیں ایک دوسرے پر اعتراض اور نکتہ گیری جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کرتی ہی رہتی تھیں۔ مگر یہ لوگ نہ صرف علمی سی معاملات پر صحیح رائے قائم کر لیتے تھے بلکہ ملکی جھگڑوں، آپس کی اکھاڑ پچھاڑ، رد و قدح کے نظریوں پر بھی دو ٹوک رائے قائم کر لیتے تھے اگر یہی لوگ عام ممالک کے کابینیوں میں وزارتیں پا جاتے تو شاید سب معاملات سلجھ جاتے مگر پولیٹیکل چالیں اور ایمانداری الگ الگ چیزیں ہیں۔ بدقسمتی سے مدرسوں میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی۔ وہاں تو اس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ سیاسی جوش بڑھے لغت اور ایمانداری چاہے بھاڑ میں جائے مثال کے طور پر سن لیجئے۔ آیا آئرلینڈ کو یہ حق ہے کہ وہ برطانیہ سے علیحدہ ہو جائے؟ امریکہ کا ہر ریڈیکل کہے گا "ہاں" آیا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ اس میں تو ریڈیکل کہیں گے "نہیں"۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف نظریہ ہی معاملات کو سدھار سکتا ہے، نہ صرف جوش ہی سدھار دے گا۔ لیکن اس نظریہ کی تطبیق ایمانداری سے واقعات پر ضرور صحیح نتیجے پر پہنچا دے گی۔ اگر عام دنیا کے اسکول ایک بین الاقوامی ادارے سے مل کر دئے جائیں۔ تو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔

کھاج

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

کوئی بیٹھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ کوئی اچھا خاصا ہوتے ہوئے لنگڑا ہونے کی مشق کرنے لگتا ہے کسی کا ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے۔ پھنسیاں ابل پڑتی ہیں اور تمام جسم پھوڑے والے بیگنے کی طرح کدو زدہ ہو جاتا ہے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، کم و بیش وہی تکلیف سہنی پڑتی ہے جو دق کے مریض کو۔ البتہ یہ اطمینان رہتا ہے کہ تکلیف سے مر رہے ہیں۔ سچ مچ نہیں۔

طب کے کئی مدرسے ہیں۔ ان میں دو خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک وہ جو علاج بالضد کے حامی ہیں اور وہ ایلوپیتھ کہلاتے ہیں مثلاً اگر آپ کا جسم سردی سے متاثر ہو گیا ہو تو وہ گرم دوا دیں گے تاکہ سردی کے اثرات دور ہو جائیں۔ دوسرے وہ ہیں جو علاج بالمثل کی سفارش کرتے ہیں اور وہ ہومیوپیتھ کہلاتے ہیں۔ مثلاً جمال گوٹا دست لاتا ہے تو اگر کسی کو بدہضمی کی شکایت ہو تو وہ جمال گوٹا خورد بینی مقدار میں جسم کے اندر پہنچا کر آپ کی قوت حیات کو بیدار کر دیں گے۔ دیگر امراض کی طرح کھاج کا علاج دونوں مدرسوں کے ماہرین کرتے ہیں، اول الذکر کھاج کو نفاست پسند اور آخر الذکر غلیظ اور گندہ فرض کر کے ایسی دوائیں تجویز کرتے ہیں جن کو صفائی اور خوشبو سے عمر بھر کی دشمنی ہے علاج بالضد کرنے والے یونانی طبیب گندھک تجویز کرتے ہیں جس کی وجہ سے کھاج کے مریض کے پاس بیٹھنا گویا اپنی قوت شامہ کو سخت سے سخت امتحان میں مبتلا کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ علاج بالمثل کرنے والے گلے سڑے پیشاب یا حقہ کا پانی اور گوبر وغیرہ تجویز کرتے ہیں کھاج کے مریض کے بستر اور کپڑے عجیب و غریب بو میں بسے رہتے ہیں، کھاج کی بہترین بو یا اس کو خوشبو کا نام کسی عنوان نہیں دیا جا سکتا، اور باوجود کوشش کے بدبو کے خانے میں

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
ادارۂ تحریر :-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

رکھنا پڑتا ہے۔ مریض خارش کا جسم ہمہ وقت روغن و عطر گندک میں لبالب رہتا ہے۔ اطباء کہا کرتے ہیں کہ ہر اس شخص کا جو کھاج میں مبتلا ہو چکا ہے یہ فرض ہے کہ اس کھر یا بیسو یافتہ کو جو کھاج میں مبتلا ہو، دور سے سلام کریں۔

بعض مریض جو کھاج کا علاج کرتے کرتے خود نیم حکیم کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، جو بچہ کی کیچڑ کو سب سے زیادہ مفید بتلاتے ہیں۔ لیکن جاہ رہی کھاج کہ اس تمام گندگی کے باوجود گندہ پیشہ کرنے والوں کے قریب نہیں پھٹکتی۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کوئی نچنگی کھاج میں مبتلا ہوا ہو یا کسی چمار کو کھاج لپٹی ہو یا کسی کاشتکار کو کھاج نے آ گھیرا ہو۔ کھاج جب حملہ کرتی ہے تو مولوی تو مدرسے والے پلے سا ہوکار پر یا آرام طلب نکمے اور عیش پسند زمیندار پر۔ مزدور سے اسے خاص ہمدردی ہو۔ کاش کہ سیاسی رست وقت یا کھاج ہی سے سبق سیکھ لیتی تو آج نہ جانے کتنی اقتصادی گتھیاں بیٹھے بیٹھے سلجھ جاتیں اور یہ آئے دن کے سیاسی، مذہبی، سماجی اور معاشرتی جھگڑے جن کی بنیاد اقتصادی اونچ نیچ پر قائم ہے بہت جلد ختم ہو جاتے۔

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ
مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲	نمبر ۱۱	۱۶ مارچ سنہ ۴۹ء	ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

اور پھر کیا؟

رویندر ناتھ ٹیگور

جسم ناپاک ہے ۔ دنیا فریب! اس لئے نجات کے واسطے جسم کو تکلیف دینا اور دنیا کو ترک کرنا ضروری ہے ۔ یہ تھا قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا روحانی نقطۂ نظر لیکن جدید یورپ فطری خواہشات کی انسانی دنیا اور جماعتی مقاصد میں ایک طرف اور روحانی زندگی اور اس کے ضبطِ نفس اور مراسم و مقامات میں دوسری طرف مستقل جنگ کو تسلیم نہیں کرتا اور اسے مضرت اثر جانتا ہے ۔ ہم اگر اس دنیا کے فریب ہونے پر بہت زور دیں تو اس کے نزدیک اپنے وجود کے اخلاقی مقصد کو بہت کمزور کر دیتے ہیں ۔ اس کی نظر میں سب سے شاندار موت یہ ہے کہ آدمی زندگی کی گھوڑ دوڑ میں سرپٹ دوڑتے دوڑتے گر کر مر جائے ۔

یہ ممکن ہے کہ بس دنیا پر اپنا عقیدہ جما کر، اس کی ناپائداری اور موت کے یقینی ہونے سے قطع نظر کر کے اور اپنے خیال کے مخالفوں کو مریض بتلا کر یورپ نے کچھ قوت حاصل کر لی ہو ۔ شاید اس کی وجہ سے اس کے فرزند مقابلے میں زیادہ کارگزار اور اس کی کشمکش میں فتح حاصل کرنے کے زیادہ قابل ہو گئے ہیں، جس سے زندگی ان کے خیال میں عبارت ہے ۔ اس زندگی کو اس طرح گزار کر گویا اس کا رشتہ دنیا سے کبھی ٹوٹنے والا ہی نہیں، عملی فائدے چاہے جو کچھ حاصل ہو جائیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے ۔

بے شک قدرت نے خود اپنے حیاتیاتی مقاصد کی طرف ہمارے اندر زندگی پر بڑا مضبوط عقیدہ پیدا کر دیا ہے ۔ اور یہ ہمیں موت سے بے خبر رکھتی ہے لیکن پھر بھی ہمارا وجود طبعی ہی نہیں بلکہ وہ سارا ماحول جو وہ اپنے گرد تیار کرتا ہے عین فتح و کامرانی کے وقت ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے ۔ بڑی سے بڑی دولت ختم ہو جاتی ہے اور منتشر ہو کر اپنی جگہ خلا چھوڑ جاتی ہے ۔ جشنِ فتح و ظفر کی روشنیاں ابھی جھلملاتی ہی ہوتی ہیں کہ بڑی سے بڑی سلطنتوں پر موت کی نیند چھا جاتی ہے ۔ اس حقیقت کو یاد دلائے تو جی اکتاتا ہے لیکن یہ ہے پھر بھی سچ ۔

مگر یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ ہر چند ہمارے دنیاوی تعلقات سب کے سب ختم ہونے والے ہیں، تاہم جب تک ہیں انھیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا ۔ ان کی ناپائداری کی وجہ سے اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ان کا وجود ہی نہیں تو پھر بھی یہ اپنا حق وصول ہی کر لیں گے اور بطور جرمانہ اوپر سے اور بہت کچھ بھی وصول کر لیں گے ۔ ہم ریل کے کرایے کی معافی کا دعویٰ اس بنیاد پر نہیں کر سکتے کہ ریل گاڑی میں سکونتی مکان کی سی پائداری نہیں ۔ حقیقی لیکن عارضی بندھنوں کے وجود کو نظر انداز کرنے کی کوشش ان کی بندش کو زیادہ تنگ اور زیادہ طویل بنا دیتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ تعلق اور بے تعلقی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہے اور جب یہ ہو جائے تب ہی جا کر یہ حقیقت تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں ۔ تعلق تو وہ قوت ہے جو ہمیں حقیقت کے محدود پہلو سے وابستہ کرتی ہے یعنی اس کے مظاہر کے پہلو سے ۔ بے تعلقی ہمیں حقیقت کے

یعنی پہلو یعنی اس کی لامحدود بے پایانی میں آزادی تک پہنچاتی ہے ۔ ہندوستانی تخیل کی علامات میں شیو یعنی اصل مردانہ آزادی کی روح کا نشان ہے اور شیوانی یعنی اصلی نسائی ظہور کی روح کی علامت ہے ۔ ان کے میل اور اتحاد میں عین تکمیل ہے ۔

ان متضاد قوتوں میں ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے تو انسان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ یعنی اُسے کسی خاص مقصد کے تحت کاٹنا چھانٹنا نہ چاہیئے ۔ درختوں کو صرف ایندھن کی حیثیت سے دیکھنا پورے درخت سے بے خبر رہنا ہے ۔ اسی طرح انسان کو محض اپنے ملک کے محافظ یا دولت کے پیدا کرنے والے کی حیثیت سے دیکھنا اُسے سپاہی یا تاجر بنا دیتا ہے اور ان حیثیتوں سے ان کی کارکردگی کو اس کی انسانیت کا معیار بنا دینا، یہ تخیل محدود ہی نہیں تباہ کن ہے ۔

ہندوستانی انسان کو ہر اس مقصد سے برتر و بلند تر جانتا تھا جس کا وہ خادم ہو جیسا کہ چانکیہ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ خاندان کے لئے فرد کو قربان کر دو، برادری کے لئے خاندان کو، ملک کے لئے برادری کو، اور روح کے لئے ساری دنیا کو ۔

ہمارے رشیوں نے واقعی انسانی روح کی عظمت کو خوب سمجھا تھا، ان کے نزدیک اس کی شان کے حدود کی انتہا ہی نہ تھی اس لئے انسان کا ہر محدود تخیل غلط تخیل تھا، وہ نہ صرف شہری ہے، نہ محض وطن پرست کیونکہ اس کی غیر فانی روح نہ شہریت سما سکتی ہے نہ ملک میں اور نہ اس بلبلے میں جسے "دنیا" کہتے ہیں ۔

بھرتری ہری نے جو کبھی بادشاہ تھا کہا ہے!

"مانا کہ تم نے تمام خواہشات کے سرچشمہ، خوش قسمتی کو حاصل کر لیا لیکن پھر کیا؟ اپنے دشمن کو سرنگوں کر کے اس کی گردن پر اپنا قدم رکھ دیا، لیکن پھر کیا؟ یا اگر خوش قسمتی سے اپنے گرد دوستوں کا ایک مجمع کر لیا تو کیا؟ مانا کہ اپنے فانی جسموں کو قرنوں تک زندہ رکھ سکے مگر آخر پھر کیا؟ آخر پھر کیا؟"

فہرست مضامین

اور پھر کیا؟	رویندر ناتھ ٹیگور	۱	۲۔ باہر کی دنیا	م ، م	۶
اپنی غلطیاں مان لو	مرارجی بھائی پٹیل	۲	ایک آرزو	اختر انصاری	۷
تین اصول	شری رام پکوہا	۲	غزل	فیضی اعظمی	۷
ہندوستانی مسلمان	(اداریہ)	۳	نئے اسیر کے نام	باقر مہدی	۷
بزم بے تکلف		۳	امریکی ٹیگرو	صابرہ زیدی	۸
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع ، ح	۴	سحر رامپوری	سید سفارش حسین	۹
۲۔ پاکستان	ع ، ل	۵	تبدیلی (افسانہ)	تاج عرفان عثمانی	۱۰

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہریجن کا سَت

اپنی غلطیاں مان لو

(سردار ولبھ بھائی پٹیل کی اس تقریر کا ایک ٹکڑا جو انھوں نے ۲۶ فروری کو راج گھاٹ میں کی تھی۔)

بہت سے لوگوں نے گاندھی جی کی عظیم الشان قربانی کا ذکر کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ مان لیا ہے کہ وہ امن اور محبت کے سب سے بڑے علمبردار تھے مگر کتنے لوگ ہیں خود ہندوستان میں جنھوں نے ان کی مثال کو سامنے رکھا ہے اور ان کی تعلیم پر عمل کیا ہے؟

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اپنی حالت کو سمجھیں۔ گاندھی جی انسانیت کی بھلائی کے لئے جان تک دینے کو تیار ہوگئے۔ مگر خود ہم نے بھی ان کی شہادت سے کچھ سبق لیا؟

یہی وقت ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کو محسوس کریں بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف نہ کریں۔ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ ہندوستان کا موجودہ نقشہ وہ نہیں ہے جس کا خواب گاندھی جی نے دیکھا تھا ہم ان کی خواہشوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ اس لئے کہ ہم نے وہ طریقہ جو ان کے نصب العین کے مطابق تھا اختیار نہیں کیا۔ آج ہم کو محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی بھلائی امن اور خوش حالی کی کوئی اور راہ نہیں ہے سوا گاندھی جی کے اصول اور طریقے کے۔ اب بھی ہم اپنے آپ کو سدھار سکتے ہیں اور ایک خوش دل خوش حال ہندوستان تعمیر کر سکتے ہیں۔

ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں دوستی اور یک جہتی ہو سب مل کر ہندوستان کی بھلائی کی کوشش کریں یہ ہوگا سچا خراج عقیدت راشٹر پتا کی خدمت میں۔

تین اُصول

کسی شخص کے لئے جسے باپو سے انتہائی محبت ہو ان پر لمبا چوڑا مضمون لکھنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی اور تعلیم کے اتنے بہت سے پہلو ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا، آدمی کیا لکھے اور کیا چھوڑے۔ وہ سچائی پر حد سے زیادہ زور دیتے تھے۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں اور سچ بولنے میں کتنی ہی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ ان کا اصرار تھا کہ سچی بات کہو اور نتیجے کا خیال نہ کرو۔ دوسرے لوگ جب غلطیاں کرتے ہیں تو وہ انھیں چھپانے کی یا ان کی تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گاندھی جی جب یہ محسوس کرتے تھے کہ انھوں نے غلطی کی یا ان کا اندازہ صحیح نہیں ہے تو وہ اس کا اعلان کر دیتے تھے۔ اس طرح اپنا پردہ فاش کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کی شخصیت معمولی انسانوں سے بہت بلند تھی۔ ایسا بہت ہی کم دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کے درجے کا کوئی آدمی اس طرح صاف صاف اور کھلم کھلا اپنی غلطیاں مان لے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اس وقت تک کسی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے تھے جب تک کہ انھیں دل سے یقین نہ ہو جائے کہ یہ واقعی غلطی ہے۔ کسی طرح کے دباؤ سے یا سمجھانے بجھانے سے یا دلیلوں سے وہ اس راستے سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے تھے جسے وہ سچا سمجھتے تھے۔ انھیں انسانوں کا بڑا تجربہ تھا اور سچی بات کا پتہ چلانے کا عجیب ڈھب آتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو نقصان اٹھا کر یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ ان کو دھوکا دینا کتنا مشکل تھا۔

دوسری چیز جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا یہ تھی کہ وہ ہر معاملے میں اخلاقی اصولوں پر زور دیتے تھے وہ کبھی اس خیال سے اخلاقی اصولوں کی سیدھی ڈگر سے بال بھر بھی نہیں ہٹتے تھے کہ اس راہ پر چلنے کا کیا نتیجہ ہوگا یا کتنی قیمت دینی ہوگی۔ یہاں تک کہ قانونی معاملات میں بھی وہ نہ صرف ان کے قانونی پہلو کو دیکھتے تھے بلکہ اخلاقی پہلو کو بھی۔ قانون داں ان کو مشورہ دیتے تھے کہ فلاں کام قانوناً جائز ہے مگر وہ اسے اس وقت تک نہیں کرتے تھے جب تک پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ اخلاقاً جائز ہے۔ ان سے بڑھ کر قانون توڑنے والا کوئی نہ ہوگا، لیکن انھوں نے صرف وہی قانون توڑے جن کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی شخص کو اس قانون کے توڑنے کا مشورہ دیا ہو جو صحیح اخلاقی اصولوں پر مبنی تھا۔

تیسری نمایاں چیز یہ تھی کہ سیرت کے انحطاط کے اس دور میں تعمیر سیرت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ اس کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ جو لوگ ان کے گرد و پیش ہوں اور جن لوگوں سے وہ معاملہ کریں وہ سیرت کے لحاظ سے امتیاز رکھتے ہوں، گاندھی جی میں ان لوگوں کا سا تعصب یا ناروا داری نہ تھی جو محض ذہنی صفات رکھتے ہوں۔ اور نہ محض ذہنی صفات رکھنے والے لوگ ان کی نظر میں جچتے تھے، وہ تو بلند سیرت کی قدر کرتے تھے، ان دو عالمگیر لڑائیوں کے دوران میں دنیا کے لوگوں کو سب سے بڑا نقصان سیرت کے لحاظ سے پہنچا ......

......ہر ملک میں سیرت کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا ہے، اور تو سب چیزیں کھیت میں پیدا ہوتی ہیں یا کارخانوں میں بنتی ہیں، لیکن سیرت کی تعمیر بہت آہستہ آہستہ اور بڑے اہتمام سے ہوتی ہے اگر گاندھی جی کسی شخص پر اعتبار کرتے تھے اور اس سے مشورہ لیتے تھے اور پھر انھیں یہ پتہ چلتا تھا کہ اس شخص کی سیرت کمزور ہے یا اس کا اخلاق پست ہے تو وہ فوراً اس سے کھنچ جاتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا، اس سے کم سے کم تعلق رکھتے تھے، مگر اس کے ساتھ وہ اسے اچھوت نہیں بنا دیتے تھے بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

اگر ہندوستان کے لئے کوئی اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی کو قائم رکھے اور اس آزادی سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کا سماجی اور اخلاقی اُدھار کرے تو صرف ایک ہی یقینی اور سیدھی راہ ہے جس پر چل کر ہماری اُمیدیں اور حوصلے پورے ہو سکتے ہیں اب یہ لوگوں کے اختیار میں ہے کہ وہ اس راہ پر استقلال سے چلتے رہیں یا خود غرضی اور طاقت یا دولت کی ہوس سے مغلوب ہو کر ٹیڑھے میڑھے راستوں پر بھٹکتے پھریں۔ اگرچہ ہم آج اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھ کر افسردہ اور بددل ہیں لیکن حقیقت میں اب بھی اس کا موقع ہے کہ ہمارے ملک کے ان طریقوں کو اختیار کر کے جو باپو کے نام منسوب ہیں سُراج (اچھا راج) قائم کر لیں، اور ہندوستان کو ایسی قوم بنا دیں جو امن اور ترقی کی راہ میں سب سے آگے ہو، اسی لئے میری یہ تجویز ہے کہ جو لوگ باپو کے طریقوں پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ۳۰ جنوری کو یہ حلف اُٹھائیں کہ وہ سیاسی جھگڑوں اور لڑائیوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو دل و جان سے اس کام میں کھپا دیں گے کہ لوگوں کے دل مہاتما گاندھی کے مختلف تعمیری کاموں کی طرف پھیر یں۔ اور ملک کی خدمت اس طرح کریں کہ کروڑوں آدمیوں کو جو مدت سے اپنے حقوق ملنے کا انتظار کر رہے ہیں چین اور آرام ملے۔

م۔ م۔ پکوا سا

ہریجن۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء

گاندھی جی کے حالاتِ زندگی

شری پیارے لال، گاندھی جی کی سوانح عمری مرتب کر رہے ہیں جو پانچ حصوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلے حصے میں ابتدائی حالات ہوں گے، یعنی انگلستان اور جنوبی افریقہ کے قیام اور ہندوستان کی واپسی تک دوسرے میں چمپارن اور کھیڑا کی ستیہ گرہ کی ابتدائی جدو جہد کا ذکر ہوگا۔ تیسرے میں ہندوستان کے انتہائی ہنگامہ خیز دور یعنی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء کے حالات ہوں گے اور چوتھے میں وردھا اور سیواگرام کے قیام اور دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے تک کے حالات پر تبصرہ ہوگا۔ پانچواں حصہ جسے پیارے لال اس وقت لکھ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ ضخیم اور سب سے زیادہ اہم ہوگا۔ اس میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک آغا خاں کے محل میں ۲۱ مہینے کی نظر بندی، کرپس اور کابینہ مشن نواکھالی، بہار اور دلی میں قیام امن کی کوششوں پر سیر حاصل تبصرہ ہوگا۔ نواکھالی اور بہار کے متعلق معلومات جمع کرنے اور ان کی چھان بین کرنے کا کام قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ ان تمام حصوں کو ایک ہی وقت میں یا الگ الگ چھاپا جائے، اس کے متعلق سوچا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ مارچ ۱۹۴۹ء

ہندوستانی مسلمان

(۱)

پچھلے سال کے شروع تک ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ کہاں جائیں؟ ہندوستان میں رہ نہیں سکتے، پاکستان میں کھپ نہیں سکتے، "از این سو راندہ و از آں سو ماندہ"۔ مہاتما گاندھی کی شہادت سے ان کے قلب بدل گئے اور ان کے قدم تھم گئے۔ ان پر یہ گہری حقیقت کھلی کہ مادر وطن کی آنکھوں میں قہر و عتاب کی جو لہر ان کو نظر آ رہی تھی، وہ عارضی تھی، اس کے دل میں شفقت اور محبت کا جو خزانہ چھپا ہوا ہے وہ دائمی ہے۔ ان کو یہ محسوس ہوا کہ جس سرزمین پر گاندھی نے ان کے لئے اپنا خون بہایا ہے وہی ان کا ٹھکانا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور ٹھکانا ہو ہی نہیں سکتا۔

اب دوسرا سوال ان کے سامنے یہ ہے کہ کیا کریں؟ اس سوال کا مفہوم چند آدمیوں کے ذہن میں یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد کیا ہو، مگر بہت سے لوگوں کے نزدیک صرف اتنا ہے کہ ان کے لئے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ کیا ہو؟

اس میں شک نہیں کہ روزی کا سوال بہت ضروری ہے اور بہت سخت ہے۔ جہاں تک مسلمان مزدوروں اور کسانوں کا تعلق ہے ان کی کوئی الگ مشکلات نہیں ہیں۔ شاید اس شدید نفرت اور تعصب کے دور میں جو اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے مسلمان مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ بھی تفریق برتی جاتی ہو۔ مگر یہ چلنے والی چیز نہیں ہے۔ محنت کش طبقے کا مسئلہ ایک ہے اور ایک رہے گا۔ اس کو مذہب کی بنیاد پر الگ کرنے کی کوشش انگریزوں کے زمانے میں بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی اور اب تو بالکل نہیں ہو سکتی۔

البتہ متوسط طبقے کے مسلمان اپنی الگ مشکلیں رکھتے تھے اور اب بہت بڑھ گئی ہیں۔ کاروبار میں ان کا حصہ پہلے بھی بہت کم تھا اور اب اور کم ہوتا جاتا ہے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد اوروں کے لئے دوسری راہیں کھلنے کی تھوڑی سی

بہت امید ہے۔ مگر ان کے لئے نہیں ہے۔ سرکاری نوکری جو ان کا سب سے بڑا سہارا تھا اور جس کی وجہ سے انھوں نے انگریزی کا دامن تھام رکھا تھا۔ اب انھیں تعداد کے تناسب سے ملنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ آزاد پیشوں میں بھی ان کی راہ میں غیر معمولی رکاوٹیں ہیں۔ اس طرح روزی کے دروازے بند ہوتے دیکھ کر وہ سخت پریشان ہیں۔ یہ صورت حال نہایت قابل افسوس ہے۔ حکومت کو، کانگریس کو، اور ان سب قوتوں کو جنھوں نے سیاسی اور سماجی میدانوں میں فرقہ وارانہ تعصب کی وبا کو قریب قریب ختم کر دیا ہے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے جراثیم در اصل معاشی میدان میں پرورش پاتے ہیں، اور وہیں سے سب کہیں پھیلتے ہیں۔ اگر ان جراثیم کو ہلاک نہ کیا گیا تو وبا رک نہیں سکتی۔

معیشت میں متوسط طبقے کے مسلمانوں کے ساتھ تفریق نہ کی جائے تو ان کی معاشی مشکل کسی قدر آسان ہو جائے گی، مگر حل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہر پیشے میں اپنی تعداد کے تناسب سے بلکہ اس سے کچھ زیادہ جگہ پانے کے بعد بھی ان میں سے لاکھوں آدمی بے روزگار رہیں گے۔ مسئلہ در اصل ان کا نہیں ہندوستان میں (اور پاکستان میں بھی) سارے متوسط طبقے کا ہے۔ اس لئے جب مسلمان جماعت کی حیثیت سے اپنی شدید معاشی مشکلات کو محسوس کرتے ہیں اور یہ سوچنے بیٹھتے ہیں کہ ان مشکلوں کو کیوں کر دور کریں تو سلسلۂ خیال خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے، اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کی عام بے روزگاری کس طرح ہٹائی جا سکتی ہے؟ تھوڑے سے غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ جتنے پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اب تک امیروں کی سرپرستی کے بھروسے پر چلتے ہیں اس لئے ان میں تھوڑے ہی آدمیوں کی گنجائش ہے۔ اگر کروڑوں مزدور اور کسان خوش حال ہوں اور ان پیشوں کی سرپرستی کریں جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں کرتے ہیں تو ان میں لاکھوں آدمیوں کی گنجائش نکل آئے! اب مسئلے کی صورت یہ ہو جاتی ہے کہ کیا صورت اختیار کی جائے جس سے کروڑوں عوام خوش حال ہوں؟ غرض بات جو مسلمانوں کی معاشی مشکلات سے شروع ہوئی تھی وہ ہندوستان کے عام معاشی نظام تک جا پہنچتی ہے۔

اس منزل پر پہنچنے کے بعد سوچنے والے مسلمانوں کے ذہن کو مختلف معاشی نظام اپنی اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں؟ جب وہ ان پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کا سیاسی اور اخلاقی زندگی کا تصور الگ الگ ہے۔ اب ان کے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت سے وہ ان میں سے کس نظام کو اپنے مقصد زندگی سے قریب تر پاتے ہیں! اور پھر یہ سوال کہ آخر مسلمانوں کی حیثیت سے ان کا مقصد زندگی کیا ہے؟ م

۴ غرض ان لوگوں کو بھی جو روزی کے مسئلے کو مقصد زندگی کے مسئلے سے مقدم سمجھتے ہیں بہت جلد محسوس ہو جاتا ہے کہ جب روزی کے سوال پر وہ مسلمانوں کے اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو اس کی سرحد اس سوال سے مل جاتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ اسے ہندوستان میں کیونکر حاصل کر سکتے ہیں؟

بزم بے تکلف

ص۔ خ

اگلے وقتوں کے لوگ کہا کرتے ہیں "سفر نمونۂ سقر" کوئی پوچھے حضرت آپ نے ابھی سقر دیکھا ہی کب ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اچھا غالب نے کہہ دیا ہے:

ع۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اچھا صاحب انھیں کچھ نہیں کہتے۔ مگر آپ کو تو کہہ سکتے ہیں۔ یہ بچارے چرخ چوں چوں چھکڑوں میں سفر کرنے والے کیا جانیں کہ اس ترقی کے زمانے میں سفر "وسیلۂ ظفر" ہو گیا ہے۔ جی ہاں وسیلۂ ظفر۔ یہ غریب بچاس میل دو روز کے تین چار دن میں طے کرتے تھے اور ہم بقول شخصے خرچ کے ایک ہی بینگ میں کانپور پہنچ جاتے ہیں، اور پھر کیا ٹھک ٹھک چال ہوتی ہے ریل گاڑی کی، چھک چھک چھک چھک۔ بیل گاڑی کیا خاک مقابلہ کرے گی! اور ہاں خاک پر یاد آیا کہ بیل گاڑی میں تو گرد کا کوٹا مقرر ہے۔ ریل گاڑی میں بے حساب جتنی چاہو نور اور کوئلہ اور دھواں کھاتے ہیں۔ جی کیا فرمایا آپ نے، بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی؟ اے صاحب بیٹھنے کی نہ سہی، اطمینان سے لٹکنے کی جگہ تو مل جاتی ہے۔ بھلا پرانے زمانے میں کسی کو یہ لٹکا آتا تھا کہ بیل گاڑی کے پہیے کا دھرا پکڑ کر لٹک جائے؟ اور اب کیا پوچھنا ہے۔ آزاد ہند کے شہری ایک ہاتھ سے دروازے کا ڈنڈا پکڑے دوسرے ہاتھ سے لاٹھی گٹھری سنبھالے مزے سے لٹکے چلے جاتے ہیں، اور جو ہاتھ چھوٹ جائے؟ تو اور بھی اچھا۔ دنیا کے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے۔

یہ بھی سنا آپ نے کہ ہمارے سکنڈ کلاس ریلوے منتری صاحب نے ڈیوڑھے کو سکنڈ کر دیا ہے۔ جی اور کیا ڈیوڑھے کے دام دیجئے اور ٹھاٹھ سے سکنڈ کلاس میں دیتے دباتے لڑتے مرتے چلے جائیے۔ دس روپے اور خرچ کیجئے تو سونے کی جگہ "زر رو" ہو جائے گی۔ اور آپ کو سونے کا موقع نہ سہی رات کاٹنے کا مشغلہ مل جائے گا۔ ہر اسٹیشن پر لوگ آ کر دروازہ دھڑ دھڑائیں گے اور "کھل جا سم سم" کا نعرہ لگائیں گے اور آپ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھتے رہیں گے۔

جی کیا فرمایا، زنانے سیلن میں سونے کی جگہ رزرو نہیں ہوتی؟ اس کی لم ہم سے پوچھئے۔ آپ جانتے ہیں بچاری ہندوستانی عورت کی تفریح کا ایک ہی ذریعہ

(بقیہ صفحہ ۴)

پچھلا ہفتہ:- ا- ہندوستان

صنعت بڑی نہیں ہے تجارت بری سہی

اس سال مرکزی اسمبلی نے یہ بدعت شروع کی ہے کہ ہر وزیر اپنے اپنے محکمے کا بجٹ الگ الگ پیش کرتا ہے۔ وزیر تجارت شری نیوگی نے اپنے بجٹ کے سلسلے میں ۱۹۴۹ء کے نو مہینے (اپریل تا دسمبر) کے بارے میں درآمد برآمد کے اعداد پیش کئے اور ان کا مقابلہ ۱۹۴۸ء کے ان ہی نو مہینوں کے اعداد سے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۸ء میں اس مدت میں ہندوستان نے سمندر کے راستے سے ۲۹۹ کروڑ کا مال منگایا تھا، اور ۱۹۴۹ء میں ۳۵۶ کروڑ کا منگایا۔ اس کے مقابلے میں اس نے ۱۹۴۸ء کے آخری نو مہینوں میں ۲۹۵ کروڑ کا مال سمندر کے ذریعے باہر بھیجا تھا اور ۱۹۴۹ء میں ۳۱۹ کروڑ کا بھیجا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مجموعی طور پر تجارت میں تو کافی اضافہ ہوا لیکن درآمد زیادہ بڑھی اور برآمد کم۔ ۱۹۴۸ء میں برآمد درآمد سے چار کروڑ کم تھی اور ۱۹۴۹ء میں ۳۷ کروڑ کم رہی۔ دوسرے الفاظ میں ۱۹۴۸ء میں چار کروڑ کا گھاٹا تھا، اور ۱۹۴۹ء میں ۳۷ کروڑ کا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ناقابل اطمینان ہے لیکن شری نیوگی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے تک گھاٹا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کو مشینیں اور دوسری ضروری چیزیں امریکا وغیرہ سے منگانی ہیں جن کا سکہ مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ ان ملکوں میں اپنے مال کی قیمت کم ملتی ہے اور ان کے مال کی زیادہ دینی پڑتی ہے۔ لیکن ضرورت مجبور کرتی ہے کہ وہ ان ہی ملکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کاروبار کرے۔

البتہ شری شیاما پرشاد مکرجی نے صنعت کی جو روداد سنائی وہ اس سے زیادہ امید افزا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں آئندہ سال کارخانوں کی پیداوار میں ۱۲ فی صدی سے لے کر ۱۶ فی صدی تک اضافہ ہونے کی امید ہے۔ لیکن اس کے لئے جو شرطیں انھوں نے لگائی ہیں کہ مزدور اور کارخانوں کے مالک پیداوار بڑھانے کی مہم میں حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں، ان کا پورا ہونا ذرا مشتبہ نظر آتا ہے۔ مزدوروں کے تعاون کا تو حکومت نے خود اعتراف کیا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے مقابلے میں ۱۹۴۹ء میں ہڑتالیں بہت کم ہوئیں۔ اس سال بھی چند چھوٹی چھوٹی انجمنوں کو چھوڑ کر جو کمیونسٹوں کے اثر میں ہیں، مزدوروں کی کل انجمنوں کا رویہ اس قدر معتدل اور معقول رہا کہ کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوسکتی۔ اب رہے مل مالک تو وزیر صنعت کے بیان کے مطابق حکومت نے ان کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس نے پیداوار کی مطلوب مقداریں مقرر کی ہیں اور وہ باہمی امداد کے عمل کے ذریعے سے یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ یہ مطلوب مقداریں پوری ہوتی ہیں یا نہیں" وزیر صنعت کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک کنٹرول کا تجربہ صرف کپڑے کی صنعت میں کامیاب ہوا ہے۔ پیداوار بھی بڑھی ہے اور تقسیم کا انتظام بھی بہتر ہے مگر مال کے جلد لانے لے جانے میں ابھی تک مشکلیں ہیں۔ جہاں تک دوسرے مل مالکوں کا تعلق ہے ان کے پچھلے رویے سے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں اب دیکھنا ہے کہ آئندہ ان کا کیا رنگ رہتا ہے۔ بہر حال ہمارے وزیر صنعت نے پیداوار میں اضافے کی جو توقع ظاہر کی ہے اگر وہ ان حضرات کے بھروسے پر ہے تو ہمارے لئے باعث تسکین نہیں ہوسکتی ہاں اگر ان کارخانوں کی وجہ سے جو حکومت خود کھول رہی ہے۔ مثلاً سیندری کا معدنی کھاد بنانے کا کارخانہ اور سیمنٹ کا کارخانہ، بنگلور کا ہوائی جہاز کا کارخانہ، مجموعی صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔

کہیں علاج مرض نہ بن جائے

ریل اور ڈاک کی ہڑتال کا خطرہ جو ہندوستان کے سر پر منڈلا رہا تھا اس وقت ٹل گیا ہے۔ ریل اور ڈاک کے ملازموں کی انجمنیں مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر حب وطن معاملہ فہمی اور دانشمندی سے کام لیا اور حکومت داد کی مستحق ہے کہ اس نے توڑ پھوڑ کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کیں لیکن اس سلسلے میں یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ جو لوگ محض شبہے کی بنا پر گرفتار کئے گئے ان میں اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں سیاسی پارٹیاں بعض اوقات نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ نوجوانوں کے جوش اور خلوص سے بے جا فائدہ اٹھاتی ہیں، سیاسی کارکن خود پیچھے رہتے ہیں اور طالب علموں کو بھڑکا کر آگے کر دیتے ہیں۔ اور حکومت ان سے کسی نہ کسی طرح نبٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نوخیز نوجوانوں اور پختہ کار سیاسی کارکنوں میں نیت، مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے بہت فرق ہوتا ہے اصلا ان سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ہمارے حکام اور ہماری پولیس میں وہ نفسیاتی بصیرت مشکل سے نظر آتی ہے جو نوجوانوں کو سمجھنے اور ان سے نبٹنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے یہ خطرہ ہے اور بہت شدید ہے کہ کہیں ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے معاملہ سدھرنے کی جگہ اور بگڑ جائے۔ اور نوجوانوں کی عارضی شوریدہ سری مستقل شورش پسندی بن جائے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ذمہ دار حکام، پولیس کے افسروں، اسکولوں اور کالجوں کے منتخب استادوں اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار لیڈروں کی کانفرنسیں ہوتی رہیں جن میں اس مسئلے پر مبادلۂ خیالات ہوا کرے کہ طالب علموں کے سیاسی جوش کو کس طرح حد اعتدال میں رکھا جائے تاکہ وہ خود ان کی تعمیر سیرت کے لئے اور ملک کے امن و امان کے لئے تباہ کن نہ ثابت ہو۔ نوجوان طالب علموں کو دیکھنے برتنے اور سمجھنے کا موقع سب سے زیادہ ان کے استادوں کو ملتا ہے خصوصاً ان استادوں کو جو خود بھی عمر یا طبیعت کے لحاظ سے جوان ہوتے ہیں، اس لئے طالب علموں کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی معقول اور مستقل پالیسی اختیار کرنے سے پہلے حکومت کو ان کے مشوروں سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

بیا کہ نوبت صلح است و آشتی و صفا

ہم لوگ سیاسی معاملات کو، جنگ و جدل کو بین الاقوامی کانفرنسوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں کی اہمیت ہماری نظروں سے چھپ جاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو پچھلے ہفتے کے واقعات میں جو واقعہ ہماری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالنے والا ہے وہ اتحاد انگلینڈ نہیں بلکہ اتحاد امرتسر ہے۔ ابھی چند دن ہوئے مشرقی پنجاب سے ہندو سکھ طالب علموں کے نمائندے مغربی پنجاب کے طالب علموں سے عہد وفا کرنے کے لئے لاہور گئے تھے اور وہاں سے دلشاد اور بامراد واپس آئے تھے۔ اس عہد کی تصدیق کرنے کے لئے مغربی پنجاب کے طلبہ کے چودہ نمائندے امرتسر آئے اور وہاں ۱۲، ۱۳ مارچ کو دوسری ہند پاکستان اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں اہم عملی تجویز صرف ایک ہی پاس ہوئی کہ دونوں طرف کے طلبہ بھگائی ہوئی عورتوں کو واپس کرنے کی دل و جان سے کوشش کریں گے لیکن ہندو، سکھ طالب علموں اور امرتسر کی عام آبادی نے مسلمان طلبہ کے ساتھ جس خلوص اور محبت کا برتاؤ کیا وہ بجائے خود بہت بڑی عملی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ مشرقی پنجاب میں فرقہ وارانہ فضا کے بہتر ہونے کی علامت ہے اور دوسری طرف اس فضا کو اور بہتر بنانے میں مدد دے گا۔ مغربی پنجاب کے ایک طالب علم نور احمد کا یہ بیان حیرت اور مسرت کا باعث ہوا کہ لاہور میں اس وقت ۱۸ ہزار ہندو موجود ہیں اور دیال سنگھ کالج میں کچھ تھوڑے سے ہندو طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔

بزم بے تکلف (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ہے اسے مناظرہ کہہ لیجئے یا مجادلہ یا پنج لڑانا یا تو تو میں میں۔ غریب کی زندگی کا فائدہ بیٹھا سا ہوتا ہے، ساری عمر ساس یا نند یا پڑوسن سے لڑتے لڑتے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے نیا میدان ہو، نئے حریف (یا نئی حریفائیں) ہوں نئے کرتب دیکھنے اور دکھانے کا موقع ملے اور یہ کبھی کبھار سفر ہی میں ملتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس سنہری موقع کو وہ سو کر گنوا دیں؟

۲- پاکستان

میاں افتخار الدین کی تقریر

پاک پارلیمنٹ میں بجٹ پر بحث کے دوران میں میاں افتخار الدین نے جو تقریر کی ہے اُسے تمام پاکستان میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ میاں افتخار الدین نے اپنی تقریر میں بعض بڑی معقول اور بہتر کی باتیں کہیں اور یہ بتایا ہے کہ وزیر مالیہ مسٹر غلام محمد نے کن اہم چیزوں کو بجٹ میں شامل کرنے سے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی تقریر کے طنزیہ تنقیدی جملوں سے قطع نظر ایک خاص چیز جس کا میاں صاحب نے تذکرہ کیا ہے، صنعتی ترقی کے لئے قرضہ لینے کا سوال ہے۔ میاں صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ حکومت پاکستان کو عوام سے ۵۰ کروڑ روپیہ قرض کی اپیل کرنی چاہیئے، اور اس قرض سے بڑی بڑی ملیں اور کارخانے کھولنے چاہئیں۔ صنعت کو قومی انداز میں چلانے کا ہم متعدد بار مطالبہ کر چکے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ تا حال حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی، اور گو مسٹر غلام محمد کو خود سرمایہ داروں سے شکایت ہے مگر انھوں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ اب جبکہ میاں صاحب نے ایک عملی تجویز پیش کر دی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ حکومت اس طرف توجہ کرے گی اور میاں صاحب کے نقطۂ نظر کو انگریزوں اور امریکنوں سے خائف نہ ہوگی۔

میاں صاحب کی یہ تقریر ایک اور حیثیت سے بھی قابل تعریف ہے۔ انھوں نے سخت انداز میں حکومت کے غلط اقدامات پر نکتہ چینی کر کے تعمیری تنقید کا دلچسپ دروازہ کھول دیا ہے۔ اور پاکستان میں پہلی بار صحیح اور معقول انداز میں مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ کچھ دن ہوئے ہم نے اسمبلی کی بے روح کارروائی اور ممبران کی ——— بلیٰ العقلی کی شکایت کی ہے۔ اس شکایت کا سبب ہی یہ تھا کہ پارلیمنٹ میں اس قسم کی تنقیدوں کا فقدان تھا۔ جیسی بحث پر اب میاں افتخار الدین نے کی ہے۔ میاں صاحب بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر ایک مدت سے خاموش تھے، لیکن اب انھوں نے بڑی شان کے ساتھ پھر سیاسیات میں قدم رکھا ہے۔ امید ہے میاں صاحب اپنے نئے سیاسی جنم کو باقی رکھیں گے اور اپنی مالی سرگرمیوں کے جھمیلے میں ایک بیباک و نقاد روح کا گلا نہ گھونٹیں گے

روزنامہ "جنگ" کراچی

جمہوریت کی بحالی کا اہم مسئلہ

اس میں شک نہیں کہ مغربی پنجاب میں آزادی حاصل کر لینے کے بعد جمہوری طرز کی حکومت کا پہلا تجربہ بری طرح ناکام ثابت ہوا اور وہ لوگ جن کو عوام نے صوبے کا نظم و نسق سنبھالنے اور حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے منتخب کیا تھا پرلے درجے کے خود غرض اور فرض ناشناس ثابت ہوئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس شرمناک صورت حال کا خاتمہ کرنے کے لئے جو مغربی پنجاب کے وزرائے عالی تبار اور ایم۔ ایل۔ اے صاحبان نے پیدا کر رکھی تھی، دفعہ ۹۲- الف کا نفاذ لازمی اور ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیئے کہ مغربی پنجاب کے باشندوں کو ہمیشہ کے لئے یا طویل مدت کے لئے اپنے صوبے اور اپنے ملک کے انتظامی اور حکومتی امور میں حصہ لینے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مدعا یہ تھا کہ دفعہ ۹۲ الف کے نفاذ سے لوگوں کو اپنے نئے نمائندے منتخب کرنے اور صوبے کی اسمبلی اور ذمہ دار وزارت کو از سر نو بحال کرنے کا موقع بہم پہنچایا جائے۔ غیر معمولی حالات میں آزاد ملکوں کی پارلیمنٹیں اور آئینی مجلسیں توڑ دی جاتی ہیں تاکہ رائے عامہ کو ان کی از سر نو تشکیل کا موقع دیا جا سکے اور ان اہم مسائل پر جو سیاسی بحران لانے کا موجب بنے، عامۃ الناس کا فیصلہ لیا جا سکے۔ مغربی پنجاب میں اسمبلی اور وزارت کی شکست کے اسباب علل یہ تھے کہ وزرائے کرام اور اسمبلی کے ممبران ذمہ داریوں کے لئے نااہل ثابت ہوئے جو عامۃ الناس نے ووٹ دے کر اُن کے کندھوں پر ڈالی تھیں۔ نا اہلوں کو ان کی نا اہلی کی سزا ملنی چاہیئے تھی جو انھیں مل گئی لیکن عامۃ الناس کو اتنی سخت سزا نہیں ملنی چاہیئے کہ وہ ایک طویل مدت کے لئے اپنی رائے کا حق استعمال کرنے سے محروم رکھے جائیں اور صوبے کا نظم و نسق کلی طور پر سرکاری حکام کے ہاتھ میں سونپ دیا جائے جو صرف گورنر کے سامنے جواب دہ ہیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ دفعہ ۹۲ الف کے ساتھ ہی نئے انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی جاتی، لیکن بعض مشکلات کے پیش نظر جو بدلے ہوئے حالات کا نتیجہ ہیں، نئے انتخابات کا معاملہ غیر معین مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا، اور اب کیفیت یہ نظر آرہی ہے کہ مغربی پنجاب کی آئینی اسمبلی اس وقت تک بحال نہیں ہو سکے گی جب تک گورنر کی مقرر کی ہوئی انتخابی کمیٹی، ووٹروں کی نئی فہرست بنانے کے نئے اصول تیار نہیں کر لیتی، اور حکام ان نئے اصولوں کے مطابق ووٹروں کی نئی فہرستیں بنانے کے کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا لیتے۔ انتخابی کمیٹی حق رائے دہی کے سلسلے میں عوام کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ایک سوال نامہ شائع کر چکی ہے جس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مشرقی پنجاب اور ماورائے مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کی نمائندگی حاصل کرنے کے لئے کیا طریق اور کیا معیار مقرر کیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس سوال نامے کے بہت سے سوالات ان ضمنی انتخابات سے متعلق نہیں جو مغربی پنجاب میں غیر معمولی حالات پیدا ہو جانے کے باعث کرانا پڑے گا۔ بلکہ وہ پاکستان کے اس آئین سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہماری دستور ساز اسمبلی تیار کر رہی ہے یا تیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مغربی پنجاب کے ضمنی انتخابات کے لئے جن کی ضرورت ہنگامی طور پر پیش آگئی ہے، ان مسائل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سر دست پاکستان کا نظم و نسق دستور حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے مطابق جو بعض ترمیموں کے ساتھ پاکستان کے لئے اپنایا جا چکا ہے چل رہا ہے۔ اور مغربی پنجاب کا یہ ہنگامی انتخاب بھی اسی دستور کے مطابق ہو جانا چاہیئے اور اس مشکل کو جو مہاجرین کی مخصوص کیفیت کے باعث پیش آگئی ہے کسی مناسب و موزوں طریق سے حل کر لینا چاہیئے۔ (روزنامہ مغربی پنجاب، لاہور)

باہر کی دنیا (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

وزارت کی ذمہ داریوں سے بری کر دیئے گئے ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور پریذیڈیم یعنی روس کی صدارتی کاؤنسل دونوں کے ممبر ہیں۔ اب تک ان کا وزیر خارجہ ہونا اس لئے مناسب تھا کہ حالات بدل رہے تھے اور ایسے موقع آئے دن پیش آتے تھے کہ روس کے سیاسی مقصدوں کے لحاظ سے صحیح سوال کرنے اور جواب دینے کی ضرورت تھی۔ روسی حکومت نے اب طے کر لیا ہوگا ایسے موقعے اب بہت کم آئیں گے تو موسیو مولوٹوف کے بجائے اُن کے نائب موسیو ویشینسکی کا وزیر خارجہ ہونا کافی ہے۔ موسیو ویشینسکی جمہوری ملکوں کو سخت سست کہتے ہیں تامل یا احتیاط نہیں کرتے۔ روسیوں کا اب تک کانفرنسوں اور مشوروں میں جو انداز تھا، وہ اُسے قائم رکھیں گے۔ اور چونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں میں سے نہیں ہیں، بلکہ سرکاری ملازم ہیں، انھیں کبھی اس کی ہمت نہ ہوگی کہ اپنی رائے یا مصلحت اندیشی سے کام لیں اس طرح موسیو مولوٹوف کو اب فرصت مل جائے گی کہ مارشل سٹالن کے نائب کی حیثیت سے ان کے جو فرائض ہیں ان پر پوری توجہ کریں، اور اس کی خارجی سیاست کو کسی نئے ڈھرے پر لگانے کی ضرورت ہو تو اس کا بھی انتظام کریں۔ سنا جاتا ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں روسی یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی کانگریس ہونے والی ہے۔ یہ کانگریس ۱۹۳۹ء کے بعد اب پہلی مرتبہ ہوگی۔ اس موقع پر مرکزی کمیٹی کی طرف سے روس کی اندرونی اور خارجی سیاست کے بارے میں جو بیان دئے جائیں گے ان کی بڑی اہمیت ہوگی۔ اس لئے یہ کام موسیو مولوٹوف اور موسیو موکوبان جیسے ممتاز لیڈروں کے ہی سپرد کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہمیں بہرحال نہ سمجھنا چاہیئے کہ روسی حکومت میں کسی طرح کا اختلاف پیدا ہوا ہے، اور موسیو مولوٹوف کا مرتبہ کم اور اُن کے نائب کا مرتبہ زیادہ کر دیا گیا ہے۔

نیم خوابیدہ اراکین کا جلسہ دیکھا
جب کھلی آنکھ تو جلسہ نہ تماشا دیکھا
(رئیس امروہوی، کراچی)

پارلیمنٹ کے جلسے میں گئے ہم بھی رئیس
سوتے دیکھا جو بزرگوں کو تو نیند آنے لگی

۳۔ باہر کی دنیا

کہیں اتحاد بنائے فساد نہ ہو جائے

دنیا کی سیاسی حالت اب کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ہر نیا خیال ایک نیا ہتھیار معلوم ہوتا ہے۔ اور ہر نئے ہتھیار سے بچاؤ کی سیاسی تدبیریں کی جاتی ہیں شمالی اٹلانٹک کا اتحاد چند رکاوٹوں اور غلط فہمیوں کے دور ہو جانے کے بعد اب صاف صاف تجویزوں کی شکل میں ان ریاستوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے جنھوں نے اس میں شریک ہونے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور کچھ اور ریاستیں، جو پہلے کچھ بہت آمادہ نہیں تھیں، شرکت کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ اس کے جواب میں یورپ کے کئی ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی رائیں اور اپنے ارادے ظاہر کئے ہیں اور شاید روسی وزارت میں جو تبدیلی کی گئی ہے اس کا بھی اسی اتحاد سے کچھ تعلق ہے۔ اس کے بعد جو چال چلی جائے گی یا چلی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ملک میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں کے خلاف کارروائیاں کی جائیں اور اس کا بین اقوامی سیاست پر اثر پڑے۔

شمالی اٹلانٹک کے اتحاد کی شرطیں کوئی ایک ہفتہ ہوا، واشنگٹن میں متحدہ ریاستوں کنیڈا، برطانیہ، فرانس، بلجیم، ہالینڈ اور ناروے کے خارجی معاملات کے وزیروں نے مرتب کیں۔ ان میں ابھی کچھ کاٹ چھانٹ کی جائے گی۔ کچھ لفظ بدلے جائیں گے لیکن مسودہ ان سب کی حکومتوں کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ اور اگر ان میں کسی نے آج ۱۱ر مارچ تک کوئی ترمیم نہیں کی تو یہی مسودہ اٹلی، پرتگال، ڈنمارک اور آئس لینڈ کی حکومتوں کو بھیج دیا جائے گا۔ اس اتحاد کی گیارہ شرطیں ہیں۔ جن میں سے دو خاص اہمیت رکھتی ہیں ایک یہ کہ جو ملک اس اتحاد میں شریک ہوں گے وہ جنگ کے علاوہ سیاست اور تجارت کے میدانوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اتحادیوں میں سے کسی پر حملہ کیا جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ سب پر حملہ کیا گیا ہے۔ سب اتحادی فوراً خطرے کو دور کرنے کی تدبیریں کریں گے۔ اور ضرورت ہوئی تو اس کے لئے فوجی طاقت سے بھی کام لیں گے۔ چونکہ روس کے سوا کسی کی طرف سے حملے کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روس سے بچاؤ کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ اور جو اسی بات کو الزام کی شکل دینا چاہے، وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ روس کو ڈرانے اور دھمکانے کی ایک ایسی تدبیر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوری ملک روس سے لڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ روس نے ناروے کی حکومت کے سامنے ایک معاہدے کی تجویز پیش کی تھی جس میں دونوں اس کی ذمہ داری لیتے کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے ناروے نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا اور اٹلانٹک اتحاد میں شریک ہو گیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روس اس کا کوئی سخت جواب دے گا۔ فن لینڈ اور سوئڈن کی سیاست داں مطمئن معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ روس کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے یہ دونوں اٹلانٹک اتحاد میں شریک ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

گواہ چُست

اب تک تو اٹلانٹک اتحاد کا جواب روسی حکومت نے نہیں، بلکہ فرانس، اٹلی، برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے کمیونسٹ لیڈروں نے دیا ہے سب نے اس کا خیال رکھا ہے کہ ایسی بات نہ کہیں جس سے ان پر غداری کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا جا سکے۔ مگر سب نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ان کا سیاسی اور روحانی رشتہ اپنے ملک سے نہیں بلکہ روس سے ہے، اور اگر لڑائی ہوئی تو وہ ہر طرح سے روس کا ساتھ دیں گے۔ اس ارادے کو ظاہر کرتے ہوئے ان تمام لیڈروں نے یہ بھی یقین کے ساتھ کہا ہے کہ روس کا جنگ میں پہل کرنا اور کسی ملک پر حملہ کرنا ناممکن ہے۔ پھر بھی کمیونسٹ نظریے کے اس اعلان سے ان لوگوں کا غصہ کم نہ ہوگا، جو کمیونسٹ نہیں ہیں اور اسے ایک اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ ہر شہری اپنے ملک کو دوسروں پر ترجیح دے یا کم از کم اس کی عزت اور آزادی کو بچانے کے لئے ہر مخالف سے لڑنے پر تیار ہو تو پھر کمیونسٹ لیڈروں کی کیا مصلحت تھی جو انھوں نے ایسی باتیں کہیں، کیا انھیں ایسے بیان دینے کی ہدایت کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے ملی یا انھوں نے صرف ایک دوسرے کی نقل کی یا سب ایک ساتھ اس رائے کے ہو گئے کہ مخالفوں کا ظلم سہہ کر اپنے اور اپنی پارٹی میں مضبوطی پیدا کرنا چاہیے ایسے سوالوں کا جواب دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مختلف ملکوں کے کمیونسٹ لیڈر ہر بات اپنی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی ہدایت کے مطابق نہیں کہتے، نہ ہر کام اس کے حکم سے کرتے ہیں لیکن مرکزی کمیٹی کی پالیسی پر سب کی نظر رہتی ہے اور پوری پارٹی میں بڑی یک جہتی ہے ہر ملک کے کمیونسٹ لیڈر اپنے یہاں کے حالات کا لحاظ رکھ کر پارٹی کی طاقت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں فرانس میں پچھلے سال ہڑتالیں کرائی گئیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ فرانسیسی، کمیونسٹ پارٹی زندگی کے موجودہ نظام کو بدل دے گی، مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی نے حکومت سے زور آزمائی نہیں کی ہے، پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مزدور سبھاؤں پر بہت اثر ہے اور کبھی موقع ملا تو وہ فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی سے بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوگی۔ پارٹی کے مقصد حاصل کرنے کے لئے ہر ملک کے کمیونسٹ لیڈر الگ پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ اصولی بحث چھڑتی ہے تو سب ایک سی بات کہتے ہیں۔ ہمیں اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ فرانس میں موسیو تھورے نے جو کچھ کہا اسی کو اپنے طرز پر سینور توگ لیاتی نے اٹلی میں مسٹر پولٹ نے انگلستان میں اور مسٹر فوسٹر نے متحدہ ریاستوں میں دہرایا اور غالباً اب ان ملکوں کے کمیونسٹ لیڈر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی جماعت سے ان لوگوں کو نکال دینا چاہیے، جو ان سے صرف چند باتوں میں اتفاق کرتے ہیں، جن کی وفاداری پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک کمیونسٹ سیاست پر اس تحریک کا اثر تھا جو ۱۹۳۵ء میں شروع کی گئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر ملک میں کمیونسٹ پارٹی اور دوسری ترقی پسند جماعتوں میں اتحاد قائم کر کے فاشزم کا مقابلہ کیا جائے۔ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا۔ جمہوری ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیوں نے حکومت کا پورا ساتھ دیا اور جو مخالفت پیدا ہوگا وہ جنگ کے بعد روسی سیاست کے انقلاب کی وجہ سے۔ اب شاید اس کی ضرورت دیکھی گئی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی سب سے الگ ہو جائے۔ قومیت کو بالکل نظر انداز کرے، اور اس اصول پر عمل کرے کہ جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے خلاف ہے، اس کو گوارا کرے کہ اس کے ممبروں کی تعداد کم ہو جائے اور اس کی کوشش کرے کہ اس میں ایسے ہی لوگ رہ جائیں، جو ہر حال میں روس اور مرکزی کمیٹی کا ساتھ دینے پر تیار ہوں۔

روس کے کیا ارادے ہیں؟

بعض لوگوں نے موسیو تھورے اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کے بیانوں کا سلسلہ روسی سیاست سے بھی ملایا ہے۔ روسی چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے شمالی اٹلانٹک کے اتحاد کی تکمیل نہ ہونے دیں۔ اور اسی لئے انھوں نے ہر ملک میں اس خیال کا چرچا کرایا ہے کہ اس اتحاد سے جنگ کا خطرہ بہت قریب آ جائے گا روس کا یورپ کے اتنے بڑے حصے پر قبضہ ہو گیا ہے کہ لڑائی ہوئی تو مغربی یورپ میں ہوگی، اور پچھلی جنگ کی یاد ابھی اتنی تازہ ہے کہ یہاں کی آبادی جنگ کے خیال سے سہم جائے اور ان حکومتوں سے بددل اور بیزار ہو جائے جنھوں نے جنگ کا خطرہ پیدا کیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ لڑائی کا خطرہ جتنا بڑھے گا۔ اتنا ہی جمہوری ملک اتحاد کی طرف مائل ہوں گے۔ کمیونسٹ لیڈروں نے جو بیان دیئے ہیں۔ ان کی وجہ سے شمالی اٹلانٹک کے اتحاد کی تکمیل زیادہ جلدی ہو جانا چاہیے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کمیونسٹ سیاست کوئی نئی راہ اختیار کرنے والی ہو۔ موسیو مولوٹوف، جو اب تک وزیر خارجہ اور وزیروں کی کاونسل کے سینیر نائب صدر تھے۔

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

ایک آرزو

اختر انصاری

عمر بھر ناکامیوں نے خوں پیا، اے کاش اب
دل کی ناکامی پہ خوں رونے کی فرصت بھی ملے۔
یہ کمر تو روز ہی جھکتی رہی ہے کام میں
فکر میں سر کو جھکانے کی مسرت بھی ملے
رات دن ٹھکرائے جانے کی ملی لذت بہت
چاہئے اور چاہے جانے کی سعادت بھی ملے
ہو لیا یہ بے مزہ، بے کیف جینا تو بہت
اب کسی کے عشق میں مرنے کی مہلت بھی ملے
عمر بھر جس نے پسینہ ہی بہایا اے خدا!
اب اُسے آنسو بہانے کی فراغت بھی ملے

غزل

فضا ابن فیضی اعظمی

مے کش جو تیری نرگس مستانہ دیکھتے
پھر شیشہ دیکھتے نہ وہ پیمانہ دیکھتے

اچھا ہوا کہ آپ نے بیدار کر دیا
ہم خواب آرزو ابھی کیا کیا نہ دیکھتے

لائیں کہاں سے جذب محبت میں یہ اثر
تھی آرزو کہ تم کو بھی دیوانہ دیکھتے

اپنی تباہیوں کی جو ہوتی ہمیں خبر
ہم بھول کر نہ جلوۂ جانانہ دیکھتے

کیا ہو گئے ہیں زخم وفا مندمل سے کچھ؟
کیوں آپ اب نہیں دل دیوانہ دیکھتے

دونوں جنوں میں رہتے جو آباد خوب تھا
گھر دیکھتے کبھی، کبھی ویرانہ دیکھتے

ہنگامے ختم کر دیے سب مرگ شوق نے
جیتے ہم اور تو ابھی کیا کیا نہ دیکھتے

بیٹھا ہوا ہے دیر سے در پر فضا غریب
تم ایک بار تو سوئے دیوانہ دیکھتے

نئے اسیر کے نام

باقر مہدی

(خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں)

بچھڑ کے تم سے کہوں کیا فسانۂ غم دل
جنوں میں شوق کی شمعیں بجھا سکا نہ کوئی
کہ جیسے ٹوٹ گیا ہو طلسم صبر و سکون
تلاطم غم ہستی دبا سکا نہ کوئی
خیال و خواب کی دنیا اجاڑ بیٹھا ہے
حقیقتوں سے نگاہیں چرا سکا نہ کوئی
وطن پہ ابر بہاراں یہ کیسا چھایا ہے
محبتوں کے ترانے بھی گا سکا نہ کوئی
شب دراز میں رہ رہ کے ٹوٹتے ہیں نجوم
چراغ درد وفا کیا جلا سکے گا کوئی؟
خیال کاکل و رخسار بھی بھلا بیٹھیں
جنوں نواز فسانے سنا سکے گا کوئی
حیات گرم سفر ہو کہ ولولے جاگیں
دلوں میں اک نیا طوفاں اٹھا سکے گا کوئی؟

لرز لرز اٹھیں زنداں کی جس سے دیواریں
تمھارے واسطے اب ایسے گیت گاؤں گا
سیاہ راتوں میں مشعل کا کام دے جو سکے
لہو سے اپنے چراغ وفا جلاؤں گا
ہے کیسی فصل بہاراں کہ جل گئے گلشن
نئی حیات کے رنگیں چمن لگاؤں گا
سیاہ خانوں میں خوشبو کے جل اٹھیں گے چراغ
میں قصر و ایواں کے روشن دیے بجھاؤں گا
ہزار موج حوادث سہی مگر اے دوست
غم حیات کی کشتی کو اب تو کھینا ہے
تم آج بر سر پیکار ہو، اسیر بھی ہو
مرا بھی ظلم کے طوفاں میں اب سفینہ ہے
تمھیں ہیں کاٹنی زنداں کی اجنبی راتیں
مجھے فراق میں یادوں کے دم سے جینا ہے

امریکی نیگرو اور اس کی تاریخی اہمیت

صابرہ زیدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال ۶ فروری سے ۱۴ فروری تک نیگرو تاریخ کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اس کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ امریکی تاریخ میں نیگرو قوم کے کارناموں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اس ہفتہ میں ابراہیم لنکن اور فریڈرک ڈگلس کی یوم پیدائش کی تقریبیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ یوں تو یہ ہفتہ سرکاری طور پر منایا جاتا ہے، لیکن ترقی پسند۔ نیگرو اور سفید حلقے اس پر خاص زور دیتے ہیں۔ "رنگ دار اقوام کی ترقی کی قومی انجمن" جو نیگرو جماعت ہے، اس موقع پر اپنی قوم کے مخصوص مسائل پر روشنی ڈالتی ہے اور عام پبلک کو نیگرو قوم کی اہمیت سے روشناس کرتی ہے۔

آئیے ہم بھی دیکھیں کہ امریکہ کے نیگرو باشندوں کے کیا مسائل ہیں اور انھوں نے امریکی زندگی کی تعمیر میں کیا حصہ لیا ہے۔

امریکہ میں نیگرو آبادی تقریباً ۱۸ ملین ہے جن میں سے ۵ ملین جنوبی ریاستوں میں رہتی ہیں۔ اس علاقے کو سیاہ خطّے کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے گو یہ سرکاری نام نہیں ہے، تاریخی اعتبار سے یہ نیگرو اکثریت کا علاقہ ہے۔ لیکن سیاسی شاطروں نے اس علاقے کی معاشی، سیاسی اور دوسری ضروریات کا خیال کیے بغیر اسے مختلف ریاستوں اور ضلعوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ کسی جگہ نیگرو لوگوں کا زور نہ رہنے پائے۔ وجہ یہ ہے کہ "سفید قوم کی برتری" کا راگ گانے والے نیگرو قوم کے اتحاد اور قوت کے امکان سے ڈرتے ہیں اور اس کو ہمیشہ اقلیت میں، اور دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

امریکہ کی جنوبی ریاستوں کی خوب صورتی، وہاں کے لوگوں کی شائستگی اور مہمان نوازی اور جنوبی نیگرو کی "بے فکری اور لاابالی پن" کے تصورات امریکہ میں عام ہیں۔ لیکن تصویر کے دوسرے رُخ کو جو زیادہ اہم رُخ ہے ——— چھپایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنوبی علاقہ باقی ملک کے مقابلے میں بہت پس ماندہ ہے۔ وہاں اب تک جاگیردارانہ نظام کی مخصوص خرابیاں موجود ہیں۔ لوگوں کا معیار زندگی جنوبی ریاستوں میں ملک کے دوسرے باشندوں سے بہت زیادہ نیچا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے، جہاں تعلیم کا معیار نسبتاً بہت گھٹیا ہے۔ جہاں نیگرو لوگوں کی زندگی پوری طرح محفوظ نہیں ہے، جہاں نیگرو کا قتل اور کو کلکس کلان ابھی تک ایک زندہ حقیقت ہیں کو کلکس کلان ایک دہشت پسند فسطائیوں کی جماعت ہے جو رسم غلامی کے انسداد سے لے کر اب تک برابر نیگرو قوم کی جان و مال اور عزت و آبرو پر شرمناک حملے کرتی رہی ہے اور ہر قسم کی خلاف انسانیت حرکتوں سے نیگرو قوم کو غلامی کی سطح سے بلند ہونے نہ دیا۔ ——— حکومت اور عدالت ——— خصوصاً جنوبی ریاستوں میں ——— عام طور پر اس فسطائی جماعت کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھاتی!) ان ریاستوں میں درحقیقت نیگرو لوگوں کو شہریت کے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یوں تو ملک کے کسی حصّے میں بھی نیگرو قوم کو وہ تمام مراعات اور سہولتیں میسر نہیں ہیں، جو ملک کے اور باشندوں کو ہیں، لیکن جنوب میں یہ صورت حال بہت شدید ہے، اور وہاں اس قسم کے متعصبانہ برتاؤ کو حکومت کی کھلم کھلا پشت پناہی حاصل ہے۔

چند مثالیں سن لیجیے۔ قانوناً جنوبی ریاستوں میں نیگرو اور سفید لوگ ایک علاقے میں نہیں رہ سکتے ہر شہر میں نیگرو علاقے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ نیگرو بچوں کو سفید بچوں کے اسکول میں جانے کی اجازت نہیں ہے اور نیگرو اسکولوں کا معیار دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر گھٹیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار کرنے کی جرأت انتہائی رجعت پسند اشخاص کو بھی نہیں ہے ....

صرف یہی نہیں، ریلوں اور بسوں میں نیگرو لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ الگ ہے، اور اگر کبھی کوئی نیگرو دانستہ یا نادانستہ طور پر دوسری جگہ بیٹھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ بہت ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ کوئی نیگرو شخص کسی سفید ریسٹوران میں کھانا نہیں کھا سکتا۔ نیگرو ڈاکٹر کو سفید ہسپتال میں جگہ ملنی ناممکن ہے۔ نیگرو معلم کے سفید بچوں کے اسکولوں میں پڑھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہاں تک کہ پچھلے دنوں ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک جگہ نیگرو قوم کے کتوں کو سفید قوم کے کتوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دی گئی!! اس رپورٹ کی تیاری میں مسٹر روز ویلٹ جیسے لوگوں کا ہاتھ تھا، لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں غیر ضروری مبالغے سے کام لیا گیا ہوگا۔

مندرجہ بالا رپورٹ سے ایک دلچسپ نکتہ اور واضح ہوتا ہے۔ امریکہ میں اکثر افراد اور جماعتیں ایسی ہیں جو نیگرو قوم کے خلاف تعصب، نفرت اور تفریق کے وجود ہی کو پوری طرح نہیں مانتیں، لیکن وہ لبرل مفکرین، ماہرین نفسیات اور سماجی کارکن جو اس شرمناک صورت حال کو تسلیم کرتے ہیں، وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس نسلی تعصب اور نفرت کے ذمہ دار عوام ہیں جو اپنی نااہلی اور ناواقفیت کی وجہ سے اس قسم کی انسانیت سوز حرکتیں کرتے ہیں، لیکن اس رپورٹ میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہے ——— اور ایک دفعہ پھر بتا دوں کہ اس کی تیاری میں کسی سوشلسٹ، کمیونسٹ یا انتہا پسند کا دخل نہیں ہے ——— کہ اس تعصب اور نفرت کو پیدا کرنے، پھیلانے اور برقرار رکھنے کی ذمہ داری عوام پر نہیں بلکہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام تعصب اور نفرت کے شکار نہیں ہیں۔ ہیں اور بہت ہیں! لیکن وہ مذکورہ بالا جماعتوں کے خود غرضانہ مفاد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نیگرو اور سفید قوموں کو ایک دوسرے سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ کس طرح؟ کتابوں، اخباروں، ریڈیو، فلم، غرض تمام ان ذرائع سے جو بڑے بڑے سرمایہ داروں کے قبضے میں ہیں۔ اس قسم کا پروپیگنڈا بعض اوقات بہت بھونڈا ہوتا ہے۔ مثلاً نیگرو کے بجائے نگر کا لفظ استعمال کرنا، اور اس قسم کے دوسرے طریقے، لیکن عام طور پر نیگرو قوم کے خلاف نفرت اور تعصب پھیلانے کے طریقے زیادہ تر "مہذبانہ" اور گول مول ہوتے ہیں۔ مثلاً ہالی ووڈ کے فلموں میں عام طور پر نیگرو قوم کو بے فکرا، سست، بے عمل اور ترقی کی طرف سے بے نیاز دکھایا جاتا ہے۔ ریڈیو پر اکثر ایسے "مذاق" ہوتے رہتے ہیں جن میں نیگرو لوگوں کی ان فرضی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے۔ ہر سال متعدد ایسی کتابیں نکلتی ہیں جن میں اگر نیگرو کو جرائم پیشہ نہیں تو ذہنی اعتبار سے پست اور ہر لحاظ سے پس ماندہ دکھایا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا مقصد یہ ہے کہ پبلک کو اصل صورت حال سے بے خبر رکھا جائے اور نیگرو قوم کی پس ماندگی کو اس کی فطری کمزوری اور ذہنی پستی کا نتیجہ بتایا جائے۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ سائنٹیفک تحقیقات کی رو سے اس قسم کے تمام حماقت آمیز نظریے ایک سرے سے غلط ہیں۔ ذہانت اور قابلیت کا نسل سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے .... واقعہ یہ ہے کہ جب تک نیگرو قوم کو شہریت کے پورے حقوق حاصل نہیں ہیں، اور جب تک وہ اپنے سفید اہل وطن کے مقابلے میں پس ماندہ ہیں، شمال اور مشرق کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور اجارہ داروں اور جنوب کے زمین داروں کے لئے سستی محنت کا بڑا اچھا ذریعہ موجود ہے، صرف یہی نہیں، اس طرح وہ سفید مزدوروں اور کاشتکاروں کو بھی کم اُجرت لینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں سفید اور نیگرو قوموں کے درمیان خلیج حائل رکھنے اور دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں ایک اور فائدہ بھی ہے۔ اس طرح عام لوگوں کی توجہ قیمتوں کی گرانی، مکانوں کی قلت، بے روزگاری کے خوف اور زندگی کی دوسری مشکلات ——— جن کی ذمہ دار، اجارہ دار، زمیندار اور

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

سحر رام پوری

رام پور کا ایک نوجوان شاعر

سید سفارش حسین

اس میں دو رائیں نہیں کہ رام پور بھی بلدۂ شعر ہے، اس کا بھی ایک دبستان شاعری ہے۔ رام پور نے شعراء پیدا کئے جن میں بہت سے "کھائیں گئے گیا" کی پروا نہ کرتے ہوئے رام پور ہی میں رہے، اس لئے نمایاں نہ ہو سکے، گو ان میں بعض ایسے بھی ہیں، جو اپنے کلام کی بلندی کی بنا پر اساتذہ کی صف میں آسانی سے جگہ پا سکتے تھے، لیکن جو نکل گیا وہ چمن سے نکلے ہوئے پھول کی طرح سر پر چڑھا اور عزت بھی پائی۔

رام پور کا دبستان شاعری "امیر، داغ کی متانت و شوخی، سنجیدگی اور چلبلے پن، ہمہ سرائی اور بے ساختگی، ثقافت و رندی کا حسین و جمیل سنگم ہے، جس کا چھنی چھنی رنگ دل کش ہے اور دل آویز بھی۔ سحر نے اسی بلدۂ شعر میں آنکھیں کھولیں، یہیں پلا، یہیں بچپن سے بڑا ہوا، یہیں تعلیم پائی، یہیں ملازم ہے، دوسرے الفاظ میں زندگی شروع کی اور شاید یہیں ختم بھی کر دے۔

سحر نے جب ہوش سنبھالا تو رام پور کچھ بدل گیا تھا، اور اب کہ وہ جوان ہے رام پور بہت بدل گیا ہے۔ معاشرت اور معیشت کا رنگ پلٹ چکا ہے، اس کے ہوش میں رام پور میں سیاسی مطالبے ہوئے اور ان کے لئے ہنگامے بھی۔

اس بدلے ہوئے رام پور اور اس کے بدلے ہوئے سیاسی و معاشرتی اور معیشی حالات نے سحر کے ذہنی پودے کو سینچا اور اس کے نخل طبع کی آبیاری کی ہے جہاں سے زندگی میں زندگی کے لئے کش مکش بھی کرنی پڑی، ان سب باتوں سے مل کر اس کے فن اور فن کے مقصد کی حد بندی کی ہے۔

"کیفیت نے ایک لطیف و جمیل حادثہ" جس سے بقول اس کے ہر نوجوان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جہاں اس لطیف جمیل حادثہ نے اس کے ذوق شعر گوئی کو ابھارا، ویسا ہی اس کے احساس کو بہت تیز بھی کر دیا۔ احساس کی اس تیزی میں جو شدت ہے وہ زندگی کی کش مکش اور شاید "لطیف و جمیل حادثہ" کی تلخیوں کی پیداوار ہے۔ بہرحال اس کا احساس تیز بھی ہے اور شدید بھی اسی نے اسے زندگی کے موجودہ نظام سے بیزار کر دیا ہے۔ یہ بیزاری مارکس کے فلسفے کے مطالعہ یا کسی خاص نظام زندگی سے ہمدردی کے اثر سے نہیں، گو اس کے فن اور فن کی بنیادوں میں اس کا قوی امکان نظر آتا ہے کہ اگر وہ ایسے ماحول میں پہنچ جاتا تو اثر قبول کئے بغیر نہ رہتا —— اس کی بیزاری اصل میں نتیجہ ہے اس مشاہدہ اور ذاتی تجربوں کا جو اسے زندگی میں ہوئے۔ سرمایہ داری نے نفع خوری کے جذبے کو بھڑکا کر اتنا بے لگام کر دیا ہے کہ معیشت سے گزر کر روزمرہ کی زندگی میں بھی لوگوں کے احساسات اور جذبات بیوپاری جھڑکوں سے نہیں بچتے، خلوص کی جگہ وقتی ضرورت، محبت کی جگہ جذبۂ سود و زیاں کی کارفرمائی ہے۔

اپنی نظم "تشنگی" میں زندگی کے نظام اور اس کے بیوپاری طریقوں سے سحر اپنی بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ زندگی کے نظام کو وہ زمانے کا نظام کہتا ہے۔

یہ پرستش کے اشارے یہ عقیدت کے پیام
یہ توجہ کے نظارے یہ سلاموں کے سلام
کوئی پوچھے تو بتاؤں میں اسے نام بنام
کون آیا کسی حرماں زدہ انسان کے کام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

یہ لبھاتے ہوئے فقرے، یہ رسیلی باتیں
یہ رجھاتے ہوئے انداز یہ پیاری باتیں
یہ مہکتے ہوئے الفاظ یہ میٹھی باتیں
ہے کوئی زندہ، ان سے نہ ہو زہر آب بجام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

رسمی میل ملاپ کو بیان کر کے وہ مذہب کے اجارہ داروں کا جائزہ لیتا ہے۔

یہ "خدا دوست نمائیں" یہ مقدس چہرے
یہ "حقیقت" میں یہ فرشتہ یہ "بظاہر" بندے
اس کو سمجھے محبت تو اسے مندر سے
یہی ذہنیت وہ رنگ کہ حق کے پیغام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

یہ عجب رنگ نصائح، یہ انوکھے پرچار
یہ مقدر پہ بھروسے یہ تدابیر کا ہار
یہ حکایات سے رغبت یہ روایات سے پیار
کون کہتا ہے کہ ٹوٹا ہے طلسم اوہام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

اس کے بعد سحر انسانوں کی بڑی تعداد کی زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

یہ بڑی تنگ سی گلیاں یہ جہنم سے مکان
یہ کثافت کے مساکن یہ عفونت کے جہان
یہ کشاکش کے نمونے یہ مصیبت کے نشان
ان کی صبحوں پہ نہ ہنستے ہیں محل کون سی شام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

یہ سیاہ بدکاری، یہ پریشان البشر
یہ کوئی سوختہ دل یہ کوئی تفتیدہ جگر
یہ کوئی اشک بداماں یہ کوئی خاک بسر
کب گزرتی ہوئی کاروں نے لیا ظرف سے کام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

یہ بلکتے ہوئے بچے، یہ سسکتے بوڑھے
یہ ٹھٹھرتے ہوئے شفقت، یہ بگڑتے چہرے
یہ اکھڑتی ہوئی سانسیں یہ ڈھلکتے شکے
ایسے عالم میں بھی چلتا ہے کہیں جام پہ جام
پھر بھی سنتا ہوں مکمل ہے زمانے کا نظام

سحر نے ۱۹۴۳ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی جس کا محرک ایک "لطیف و جمیل حادثہ" تھا۔ اس کی بعض نظموں میں اس حادثہ کی جھلک ملتی ہے — "ٹھوکر" میں ایک جگہ کہتا ہے۔

مگر وقت نے ایک پلٹا جو کھایا
نہ تم ہی رہیں وہ نہ وعدہ وفا کا
سنا تھا فقط مرد ہی بے وفا ہے
نہیں جانتا تھا کہ "عورت" ہی کیا ہے

ذرا بھی نہیں غم جو ٹھکرا دیا ہے
محبت ہے کیا چیز سمجھا دیا ہے
جب آئی تھی نیند اور اب جاگتا ہوں
کوئی مجھ کو چاہے تو میں بھاگتا ہوں

ایک اور نظم "اے دل" میں وہ اس غم کو بھول جانا چاہتا ہے ——

بھول جا اے دل وہ دور زندگانی بھول جا
چودھویں کا چاند، دریا کی روانی بھول جا
ولولے تھے اور اک رنگیں جوانی بھول جا
قہقہے تھے اور اک "پھولوں کی رانی" بھول جا
کیا پیام آتے تھے "تاروں کی زبانی" بھول جا
کیف میں ڈوبی ہوئی تھی زندگانی بھول جا
اعتبار عشق کی دل کش کہانی بھول جا
اعتماد حسن باقی ہے کہ فانی؟ بھول جا
مل گئی ہے خاک میں کس کی جوانی بھول جا
پڑ گیا ہے کس کی امید دل پہ پانی بھول جا
کس کو کہتا ہے جہاں تصویر حسرت سر بسر
کس پہ آہیں بھر رہی ہے زندگانی بھول جا
کس کے ہونٹوں پر لرزتی ہے ہنسی آئے ہوئے
کس کے آنسو ہیں تباہی کی کہانی بھول جا

یہ سب کچھ کہنے کے بعد سحر کیسے کہتا ہے کہ ع
"ذرا بھی نہیں غم جو ٹھکرا دیا ہے"

(باقی آئندہ)

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے نئی روشنی کا شرح چندہ حسب ذیل ہے:

سالانہ	دس روپے
ششماہی	ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ	چار آنے

(منیجر)

تبدیلی

تاج العرفان عثمانی

فروری کا آخری ہفتہ تھا ——— جاڑا اپنی تمام کپکپی، ٹھٹھراہٹ اور جمود کی کیفیات کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا ——— فضا میں موسم گرما کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ جو اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ بادِ سموم [illegible] ان ہواؤں کے دامن میں پرورش پا رہی ہے؟

——— میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے میز پر بیٹھا کتابوں سے الجھ رہا تھا۔ موسم کی بے کیفی سے طبیعت مکدر تھی۔ اور ذہن و دماغ مطالعہ کی طرف راغب نہ تھے۔ میں نے سگرٹ جلا کر منہ سے لگا لیا اور دھوئیں سے فضا میں چھلے بنانے لگا۔ یکایک دروازے پر کسی کی دستک نے مجھے چونکا دیا ——— میں کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا ——— کون صاحب ہیں، تشریف لائیے ——— دروازے کے پردے میں ذرا سی حرکت ہوئی اور میں نے وہ منظر دیکھا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا ——— الجھے الجھے بالوں والا دراز قد نصیر سامنے کھڑا تھا ——— اس کے ہونٹوں پر ایک بے کیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی ——— پل بھر میں سکتے میں رہا، پھر فرطِ مسرت سے میری چیخ نکل گئی۔ اور میں دوڑ کر اس سے لپٹ گیا ——— نصیر میرا پرانا رفیق ———

آج برسوں کی جدائی کے بعد پھر ملاقات ہوئی تھی لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں یہ محسوس کر لیا کہ وہ نصیر جو اب سے چند سال پہلے تھا۔ اب نہیں ہے اس میں ایک عظیم انقلاب ہو چکا ہے ——— اس کے شوخ و چنچال کی جگہ تفکر اور سنجیدگی نے لے لی ہے ——— ایسا معلوم ہو رہا ہے وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے۔ اور اس کے ذہن و دماغ پر غم و الم کی بدلیاں جھوم رہی ہیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ طویل سفر کی صعوبتوں نے بہت تھکا دیا ہے آرام کرنا چاہتا ہوں ——— میں نے کہا شوق سے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی تو لو! اور نوکر کو بلا کر کھانا لانے کو کہا۔ نصیر منہ ہاتھ دھونے صحن میں چلا گیا ——— نوکر نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ اتنے میں نصیر بھی منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا اور ہم دونوں کھانا کھانے لگے ———

کھانے کے دوران میں کوئی بات نہیں ہوئی ——— وہ خاموش کھاتا رہا ——— میں حیرت میں تھا کہ اس قدر باتیں کرنے والا، بات بات پر قہقہے لگانے والا نصیر، اس قدر خاموش، متین اور متفکر کیوں ہے لیکن کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا ——— کھانا کھانے کے بعد وہ سو رہا ——— اور میں ماضی کے کہرے یاد داشت کی شمع سے کریدنے لگا ——— کالج کی حسین زندگی پردۂ تصور پر ناچنے لگی۔ اور سوچنے لگا۔ نصیر جس سے بڑھ کر پورے کالج میں شگفتہ مزاج شوخ و شریر کوئی دوسرا نہ تھا ——— جس کی کالج کی زندگی ہمیشہ بے فکری، عیش کوشی اور مسرت کی لہروں پر کھیلتی رہی تھی ——— اب اس کو کیا ہو گیا ہے۔ زندگی کے ہاتھوں سے کون سا تلخ جام مل گیا جس نے اس کی مسرت کو بدمزگی سے بدل دیا ہے۔ میں دیر تک انھیں خیالات میں مستغرق رہا ———

چار بجے میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ بیدار ہو چکا تھا ——— اور پلنگ پر بیٹھا سگرٹ کے کش لگا رہا تھا ——— میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ——— میں نے کہا اگر اچھا ہو تو غسل کر لو نصیر! اس کے بعد چائے پی جائے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ——— نہا لوں تو طبیعت ذرا ہلکی ہو جائے ——— اور وہ اٹھ کر نہانے چلا گیا ———

میں صحن میں کرسی پر بیٹھا نصیر کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے میز پر چائے رکھی تھی۔ اتنے میں نصیر بھی غسل سے فارغ ہو کر آ گیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ——— غسل اور نیند نے تھکن کو بہت حد تک دور کر دیا ہے۔ میں نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو چائے پی لو! اس سے اور بھی فرحت ہو گی! ——— اور وہ سگرٹ جلا کر چائے اور دھوئیں کا امتزاج کرنے لگا ——— میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ نصیر اتنے دنوں کہاں رہے؟ کیا کرتے رہے؟ کبھی بھول کے بھی یاد نہیں کیا؟ اور اپنی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے؟ میں حیرت میں ہوں کہ کیا میں اسی کھلنڈرے نصیر سے باتیں کر رہا ہوں جو کالج کا شگفتہ مزاج نوجوان تھا ——— ؟ نصیر سگرٹ کا کش لگاتا ہوا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور سامنے خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ہاں جی ٹھیک کہتے ہو ——— اس طویل مدت جدائی کے بعد آج تم مجھ میں بہت سی اہم تبدیلیاں دیکھتے ہو گے ——— اور تمھارا ذہن اس جستجو میں ہو گا کہ آخر یہ تبدیلیاں کیوں ہوئیں ——— وہ کچھ رک کر بولا۔ بھائی! زمانے کی انقلاب آفریں ہوائیں کب کسی کو سکون بخشتی ہیں ——— تغیر پسند زمانے کی قینچی ہمیشہ کتر بیونت میں مصروف رہتی ہے ——— ہر صبح ایک عظیم انقلاب اپنے جلو میں لاتی ہے ——— وہ بولتا جا رہا تھا، جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو ——— اس نے کہا یہاں سے جانے کے بعد میں کاروبار میں اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا۔ عملی دنیا سے یہ پہلا سابقہ تھا ——— زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کا پہلا تجربہ ——— لیکن والد صاحب کی شفقت اور رہنمائی نے بہت جلد گرد و پیش سے آشنا کر دیا ——— کچھ عرصے میں انھیں کاموں میں مصروف رہا۔ وقت کی کمی تھی۔ زندگی خوشی و مسرت کی لہروں سے کھیل رہی تھی ——— وہ بولتے بولتے رک گیا، اور سامنے خلا میں دیکھنے لگا، جیسے دور افق میں اس کی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی ہوں ——— پھر رکتے رکتے بولا ——— یہیں سے ہماری زندگی کا ورق الٹتا ہے ——— رنج و محن کی آندھیاں اس زور سے چلیں کہ عیش و مسرت کی بساط الٹ کر رہ گئی ——— نئے نئے حادثے اور جاں گسل صدمے رونما ہوئے جس نے زندگی کے دھارے بدل دیے ——— جذبات و احساسات میں ایسی تلخی بھر دی جس کی کڑواہٹ ہمیشہ کام و دہن کو تلخ رکھتی ہے ——— اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ——— ایک مرتبہ میں تجارتی ضرورتوں کی وجہ سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ والد صاحب کا تار آیا۔ جلد واپس آؤ۔ میں فوراً واپس ہوا، یہاں آ کر دیکھا تو والد صاحب پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا، اور وہ بے حس و حرکت ہو چکے تھے ——— ہرچند کہ ہم لوگوں نے علاج پر زور صرف کیا، لیکن قضا و قدر کی کمان سے پیکان اجل نکل چکا تھا۔ والد صاحب اس موذی مرض کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے ——— ماں کی آغوش سے تو بچپن ہی میں محروم ہو گیا تھا۔ اب باپ کی شفقت بھی سر سے اٹھ گئی ——— ان کے انتقال نے جیسے ہماری کمر توڑ دی۔ ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ کچھ عرصے کے بعد جب تنہا ہمارے غمگین دل کو سوگواری سے فرصت ملی تو پھر کاروبار کی طرف توجہ کی ——— اور حالات کو سنبھالنے لگا ——— لیکن ایسا معلوم ہوا کہ شاید ساری برکت انھیں کے دم سے تھی ——— پھر میں نے لاکھ کوشش کی، لیکن کاروبار کی حالت سدھر نہ سکی ——— پے در پے خسارا ہونے لگا ——— ساکھ اکھڑنے لگی۔ یہاں تک کہ تمام سرمایہ اس کی نذر ہو گیا اور میں روٹیوں کا محتاج ہو گیا ——— ایسی ناگفتہ بہ حالت میں دوست احباب بھی آنکھیں چرانے لگے ———

اب صرف ایک مکان باقی رہ گیا تھا میں نے اس کو بیچ کر ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مکان کو فروخت کر دیا اور خود دوسرے محلے میں ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے کر رہنے لگا ——— اور اللہ کا نام لے کر نئے سرے سے کاروبار شروع کیا ——— اللہ کے فضل سے اب کی کاروبار کی حالت سدھرنے لگی ——— میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا ——— انتہائی حزم و احتیاط اور محنت سے ——— کاروبار میں جان پڑنے لگی ——— رفتہ رفتہ میں پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

اسی عرصہ میں ہمارے محلہ میں والد صاحب کے ایک پرانے ملنے والے ڈپٹی رشید احمد صاحب ریٹائر ہو کر آگئے تھے۔ ہمارے مکان ہی کے قریب ان کا مکان بھی تھا ——— والد صاحب کے ساتھ ان کے گذشتہ مراسم میں نے دیکھے تھے۔ چنانچہ ان سے ملنے گیا۔ پرانے زمانے کے وضع دار، خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے پوری حالت مجھ سے پوچھ ڈالی، والد صاحب کا انتقال، کاروبار کا بگڑنا، پھر سنبھلنا، میں نے سب باتیں شروع سے آخر تک ان سے کہہ دیں ——— انھوں نے ہماری بڑی ہمت بندھائی، علو ہمتی، بلند حوصلگی کی نصیحت ——— کچھ دیر بیٹھ کر میں چلا آیا ——— پھر ان کے یہاں اکثر آمد و رفت رہتی۔ مراسم بڑھ گئے ——— رفتہ رفتہ پردے کی قید و بند بھی ختم ہو گئی۔

ڈپٹی صاحب کی لڑکی عقیلہ، ملکوتی حسن و شباب کا نمونہ تھی، دلکش خد و خال، سحر طراز ادائیں، دلکش طرز تکلم والی حسین لڑکی، اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں کیف محبت سے مملو نظر آتی تھیں۔ اس کی بیتاب نگاہیں مجھے پیام محبت دیتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اکثر آمد و رفت اور مزاج کی یکسانیت نے ہمارے اور عقیلہ کے جذبات و احساسات کو ہم آہنگ کر دیا تھا ——— میں اس سے قریب ہوتا گیا یہاں تک کہ ہم دونوں صہبائے محبت سے مدہوش ہو گئے تھے ———

دن پر دن بیتتے گئے ——— اور ہماری محبت پروان چڑھتی گئی ——— عقیلہ کی والدہ نے کہیں ہماری محبتوں کا اندازہ کر لیا ——— یہ خبر بہار مسرت بن کر ہم لوگوں کے دل پر چھا گئی ——— اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد میری شادی عقیلہ سے ہو گئی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کاروبار کی حالت بھی بہتر سے بہتر ہو گئی ———

اس نے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا...... مرفہ الحالی اور عقیلہ کی ہم جلیسی نے میری دنیا جنت بنا دی تھی ——— اور ہم لوگ وادیٔ مسرت میں سرمست عیش و نشاط ہو گئے تھے ——— دو سال کی مدت خوشی و مسرت کے گہوارے میں ہچکولے لیتے ہوئے گذر گئی ——— صبح و شام کا پتہ نہ چلا ——— نصیر چپ ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر چائے کا ایک گھونٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں اور ٹھنڈی سانسوں کے درمیان آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ کتنی پیاری تھیں وہ گھڑیاں ——— کتنا حسین تھا وہ پر کیف زمانہ ——— جبکہ ہم عیش و عشرت کا نغمہ الاپتے ہوئے سرگرم سفر حیات تھے، اب تو وہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں ———

اس نے آنکھیں کھول دیں اور دوسرا سگرٹ جلاتے ہوئے بولا ——— اب ہم لوگوں کے درمیان ایک کھلونا آنے والا تھا ——— حسین کھلونا ——— دلکش ملکوتی نغمہ ——— ایک ننھے منے چاند کی آمد کا انتظار تھا جس کی حسین جوت ہم لوگوں کی زندگی کو روشن کرنے والی تھی ———

وضع حمل کے چند ماہ قبل ہی سے عقیلہ کچھ نڈھال اور کمزور ہو گئی تھی ——— ایک لیڈی ڈاکٹر شروع ہی سے مشورہ کے لئے مقرر کر لی گئی تھی ——— اس کی ہدایت کے مطابق تمام ابتدائی انتظامات کر لئے گئے تھے ——— عقیلہ کی نقاہت اور اضمحلال سے البتہ تردد تھا آخر وہ وقت آ پہنچا ——— خوف و مسرت کی ملی جلی فضا سارے گھر پر طاری تھی، رات سے ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا ——— اور صبح ہوتے ہوتے درد و کرب کی شدت ہو گئی تھی ——— وقت گذرتا گیا ——— تکلیف بڑھتی گئی ——— یہاں تک کہ درد و کرب کی شدت اور وضع حمل کی غیر معمولی تکلیف و تاخیر کی وجہ سے بچہ زندہ نہ پیدا ہو سکا اور نومولود دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دار البقا کی طرف پرواز کر گیا ——— وضع حمل کے بعد کی نقاہت اور کمزوری اس پر مستزاد ارمان و آرزو سے نو ماہ خون جگر ملا کر پرورش کئے ہوئے بچے کے ضایع ہو جانے سے عقیلہ پر بڑا برا اثر پڑا ——— اور وہ اس غم کو برداشت نہ کر سکی ——— وضع حمل کے چند گھنٹے کے بعد وہ بھی ہم لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر جنت کو سدھار گئی ——— ہائے افسوس

پل میں منزل پہ آ اُڑا لائے فنا کے جھونکے ۔ لطف مرگ نے ہر گام تو لینے دیتے

یہ کہتے ہوئے الفاظ اس کے حلق میں اٹک رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا ——— دور کہیں گراموفون پر ریکارڈ بج رہا تھا......

"آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اُجڑ کے رہ گیا"........

امریکی نیگرو اور اس کی تاریخی اہمیت

(بسلسلہ صفحہ ۸)

جاگیر دار کی جاگیریں ——— بنائی جا سکتی ہیں، ایسا برابر ہوتا رہا ہے۔ یہ کوئی بے بنیاد توجیہہ نہیں ہے "لڑاؤ اور حکومت کرو" بہت عام چیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نسلی محبت اور تعصب کے مظاہروں کا حکومت اور سرمائے کے ارباب حل و عقد کی طرف سے سخت محاسبہ کیا جاتا۔ لیکن واقعات کی شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے کے اگلے مضمون میں اس کی توضیح کے لئے کچھ مثالیں پیش کروں گی اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ فی الحال نیگرو تاریخ کی اہمیت سے متعلق دو چار باتیں کہہ دوں۔

نیگرو قوم کا امریکی تاریخ میں بہت نمایاں حصہ ہے۔ امریکی زندگی اور کلچر نیگرو قوم کی خدمات کے بغیر نامکمل ہے۔ امریکی تہذیب کے ابتدائی دور میں جب نیگرو لوگ امریکہ آئے نہیں بلکہ لائے گئے تھے۔ امریکی براعظم اس قوم کی محنت کے پسینے سے سیراب ہوا۔ امریکہ کی تاریخ نیگرو لوگوں کے خون دل سے لکھی گئی ہے، دوسرے جفاکش اور بہادر امریکی عوام کے ساتھ نیگرو قوم کا بھی امریکی زندگی کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔

انسداد غلامی سے پہلے نیگرو قوم کی متعدد انفرادی اور جماعتی بغاوتیں امریکی جمہور کی آزادی پسندانہ روایات کا ایک شاندار باب ہیں۔ اکثر بغاوتوں میں سفید لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے۔ جان براؤن ان ممتاز سفید افراد میں سے ہے جنھوں نے نیگرو قوم کی آزادی کو اپنا مقصد زندگی بنایا اور اسی کے لئے جان دی۔ ابراہیم لنکن کا نام انسداد غلامی کے سلسلے میں دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اکثر نیگرو لیڈر جنھوں نے امریکی خانہ جنگی سے پہلے اور اس کے دوران میں اپنی قوم کی آزادی کی خاطر بہت کچھ قربانیاں کیں اتنے زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ان میں سے چند کا مختصراً ذکر کرتی ہوں۔

ہیرٹ ٹبمین کا نام اس سلسلے میں بہت عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی باقی عمر اپنی قوم کی آزادی کی کوشش میں بسر کی۔ اس سلسلے میں اس نے تمام ملک کا دورہ کر کے لوگوں کو اس بلند مقصد سے آگاہ کیا۔ ہیریٹ ٹبمین نیگرو آزادی کی تاریخ میں بہت نمایاں کردار ہے، اس نے بھی نہ صرف اپنی ذات کو غلامی کی لعنت سے آزاد کیا بلکہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ...۳ سے زیادہ غلاموں کو خفیہ راستے کے ذریعے بھاگنے میں مدد دی۔ فریڈرک ڈگلس کا دل بھی جذبۂ آزادی سے لبریز تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی علم کی پیاس بھی بہت شدید تھی۔ غلامی سے بھاگنے کے بعد نیگرو آزادی کی کوششوں کے ساتھ اس نے حصول علم کو بھی جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور طباع لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

جان براؤن کے اٹھارہ غیر فانی ساتھیوں میں سے ——— جو ۱۸۵۹ء کی مشہور ورجینیا کی بغاوت کے ہیرو ہیں ——— ۵ نیگرو تھے، ان میں سے صرف ایک اینڈرسن زندہ بچا۔ باقی سب لڑتے ہوئے مارے گئے یا پھانسی پائی۔ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے ان میں سے ایک نیگرو کوپ لینڈ کے الفاظ تھے "میں آزادی کی خاطر جان دے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ اعلیٰ مقصد اور کیا ہو سکتا ہے ——— میں غلامی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں"۔

علاوہ ان سیاسی لیڈروں کے جنھوں نے نیگرو قوم کی آزادی کی کوششوں میں قیادت کی مختلف علوم و فنون میں بھی نیگرو قوم ناسازگار حالات کے باوجود بہت پیچھے نہیں رہی۔ ڈاکٹر جارج واشنگٹن کارور نے علم زراعت میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ وہ غلام ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا، لیکن اس کے زرعی کیمیا کے تجربات اور اس کے علم کے سب لوگ قائل تھے۔

غرض ابتدائی دور سے کر اب تک نیگرو قوم نے بہت سے قابل ذکر اور نمایاں افراد پیدا کئے ہیں۔ فہرست بہت لمبی ہو جائے گی، اس لئے میں موجودہ دور کے چند افراد کے ذکر پر اکتفا کرتی ہوں۔

ڈاکٹر ولیم ای۔ بی۔ ڈوبائے مشہور نیگرو عالم اور مورخ ہیں، وہ نہ صرف امریکی نیگرو تاریخ کے ماہر ہیں بلکہ افریقہ اور دوسری نو آبادیات کے مسائل پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر انھوں نے بہت تحقیق کی ہے اور متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اس سال بھی نیگرو تاریخ کے ہفتے میں انھوں نے جگہ جگہ تقاریر کیں اور اپنی قوم کے مسائل سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ۸۳ برس میں ڈاکٹر ڈوبائے کا علم و عمل قابل رشک ہے۔ پال روبسن مشہور فنکار جس کی آواز نے دنیا کے مختلف گوشوں میں لوگوں کے دلوں کو مسحور کر رکھا ہے نیگرو قوم کا ایک اور درخشاں ستارہ ہے۔ یہ شاندار اور پر اثر شخصیت

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین ، صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

صرف نیگرو قوم بلکہ ہر مظلوم جماعت کا ساتھی اور ہمدرد ہے۔ اس کی گرمیِ گفتار، وسعتِ قلب اور کمالِ فن کے سب معترف ہیں۔ لینگسٹن ہیوز موجودہ امریکی شاعروں کی صفِ اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ بنجمن ڈیوس دنیا کے سب سے بڑے شہر کی حکومت میں نیگرو لوگوں کا نمائندہ ہے اور بہت قابلیت سے عوام کے مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ نیگرو قوم نے چند افراد پیدا کیے ہیں۔ پوری قوم کا امریکی زندگی میں بہت نمایاں حصہ ہے۔ امریکی نیگرو کو اپنی قابلیت اور شخصیت کے اظہار کے اتنے مواقع نہیں ملتے جتنے امریکہ کے دوسرے باشندوں کو لیکن اس کے باوجود ملک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نیگرو قوم نے اپنی خدمات اور مسلسل جدوجہد سے بہت کچھ سنوارا اور بنایا ہے جس کے لئے تمام اہل ملک کو معترف ہونا چاہیے

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی
طابع و ناشر- عبد اللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)
مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۲ | ۲۴ مارچ سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستان کی قوتِ حیات

جواہر لال نہرو

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ پرانی اور بھی بھائی تہذیبیں رفتہ رفتہ مٹ گئیں یا دفعتہً ختم ہوگئیں اور نئی طاقتور تہذیبوں نے ان کی جگہ لے لی۔ کیا زندگی کی کوئی خاص طاقت قوت کا کوئی اندرونی خزانہ ہوتا ہے جو کسی قوم یا تہذیب کو زندہ رکھتا ہے اور اس کے بغیر تمام سعی و عمل اسی طرح بے کار ہے جیسے ایک بڈھے کی یہ کوشش کہ وہ جوان بن جائے۔

آج کل دنیا کی قوموں میں سے تین میں مجھے یہ قوتِ حیات نظر آتی ہے ——— امریکی روسی اور چینی (عجب بے جوڑ مجموعہ ہے) امریکی اگرچہ ان کی جڑیں پرانی دنیا میں پیوست ہیں، حقیقت میں ایک نئی قوم ہیں۔ وہ پرانی قوموں کی بندشوں اور الجھنوں سے پاک ہیں اور قدیم روایات کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ اس لئے اگر ان میں اتنی قوت عمل اور مستعدی ہے تو کوئی تعجب نہیں۔ یہی حال کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لوگوں کا ہے۔ یہ سب کے سب پرانی دنیا سے الگ تھلگ زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔

روسی کوئی نئی قوم نہیں ہیں، لیکن ان کا رشتہ ماضی سے اس طرح منقطع ہوگیا ہے جیسے موت کے بعد ہوجاتا ہے اور انھوں نے نئے سرے سے جنم لیا ہے جس کی کوئی مثال تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ ان میں پھر سے جوانی کی قوت چستی اور مستعدی پیدا ہوگئی ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ماضی میں اپنی جڑیں دوبارہ تلاش کریں ان کی قوم ایک نئی قوم اور ان کی تہذیب ایک نئی تہذیب بن گئی ہے۔

چینیوں کی حالت ان سب سے جدا ہے۔ نہ تو وہ کوئی نئی قوم ہیں اور نہ ان کے ہاں ایسا انقلابِ عظیم ہوا ہے، جیسا روس میں۔ البتہ سات برس کی مہلک جنگ نے انھیں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ نہ معلوم اس جنگ کا اثر ہے یا دوسرے عوامل کا جو زیادہ مستقل ہیں یا دونوں چیزوں کا۔ بہرحال چینیوں میں وہ زندگی اور قوت پیدا ہوگئی ہے جسے دیکھ کر میں حیران رہ جاتا ہوں۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک ایسی قوم جس میں یہ بنیادی طاقت موجود ہے تباہ ہو سکتی ہے۔

اسی قسم کی قوتِ حیات جو میں نے چینیوں میں دیکھی کبھی کبھی ہندوستانیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، اور یوں بھی میرے لئے ان چیزوں کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنا مشکل ہے۔ شاید میری خواہش میرے مشاہدے اور خیال کو متاثر کرتی ہو۔ بہرحال میں جو ہندوستان میں مارا مارا پھرا تو اسی چیز کی تلاش میں تھا۔ اگر ان میں یہ قوتِ حیات موجود ہے تو بہت اچھا ہے اور وہ ضرور کامیاب ہوں گے اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو ہماری ساری سیاسی جد و جہد شور و غل محض ایک کھیل ہے جس سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایسا سیاسی سمجھوتا ہو جائے جس سے ہماری حالت کم و بیش پہلے کی طرح رہے یا کسی قدر بہتر ہو جائے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری قوم کے اندر دبی ہوئی قوت اور صلاحیت کے خزانے موجود ہیں اور اس کی کوشش کی کہ اس قوت اور صلاحیت کو ابھاروں تاکہ اس کے اندر از سر نو زندگی اور جوانی کا احساس پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی جو حیثیت ہے اس کو دیکھتے ہوئے وہ دنیا میں دوسرے درجے پر نہیں رہ سکتا۔ یا تو اس کی بہت بڑی اہمیت ہوگی یا پھر بالکل نہیں ہوگی درمیانی حالت میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا درمیانی حالت میں رہنا ممکن بھی نہیں۔

پچھلے ۲۵ سال میں ہماری تحریک آزادی اور برطانوی حکومت کی کشمکش میرے نزدیک اور بہت سے لوگوں کے نزدیک اس خواہش پر مبنی تھی کہ ہندوستان میں از سر نو زندگی اور قوت پیدا کر دی جائے۔ ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اپنی جد و جہد سے خود اپنے اوپر عاید کی ہوئی تکلیفوں اور قربانیوں سے، بالقصد خطروں کا مقابلہ کرکے، ظلم اور بدی کی اطاعت سے انکار کرکے ہم ہندوستان کی روح کو پھر سے گرما دیں گے اور اسے خواب گراں سے چونکا دیں گے۔ اگرچہ ہمیں بار بار انگریزوں سے لڑنا پڑتا تھا، لیکن ہماری نظر ہمیشہ اپنی قوم پر رہتی تھی ہمارے خیال میں سیاسی ترقی محض اسی صورت میں قدر و قیمت رکھتی ہے جب وہ ہمارے اس بنیادی مقصد کے حاصل کرنے میں مدد دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر ایسا طرز عمل اختیار کرتے تھے جو کوئی سیاست داں، جسے تنگ سیاسی دائرے کے اندر رہنا ہو، کبھی نہ اختیار کرتا اور ملکی اور غیر ملکی نقاد ہماری ضد اور حماقت پر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ واقعی یہ ہماری حماقت تھی یا نہیں تھی اس کا فیصلہ تو مستقبل کا مورخ ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایک بلند مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے اور دور تک سوچتے تھے غالباً موقع پرستانہ سیاست کے نقطۂ نظر سے ہم سے بہت سی حماقتیں سرزد

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہندوستان کی قوت حیات	جواہر لال نہرو	۱
زبان کا جھگڑا چکانا چاہیے	ک ج، مشرو والا	۲
ہندی مسلمان	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ:-		
۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ع، ح، ن	۵
۳- باہر کی دنیا	م، م	۶
قطعہ بر وفات بلبل ہند	رادھے شیام	۷
نذر عقیدت	سیدہ نزحت	۷
بلبل ہند	تشنہ بریلوی	۷
گاندھی جی کا نسخہ	سید اختر علی تلہری	۸
سحر رام پوری	سید سفارش حسین	۹
کشکول محمد علی شاہ فقیر		۱۱

ہریجن کا ستّ

زبان کا جھگڑا چکانا چاہئے

ک، ج، مشرو والا

۲۶، ۲۷ فروری کو راشٹر بھاشا (یعنی ہندی) پرچار سبھا کی ایک کانفرنس وردھا میں بابو گووند داس جبل پوری کی صدارت میں ہوئی۔ مدھ پرانت کے ہوم منسٹر پنڈت دوارکا پرشاد مشر نے اس کا افتتاح کیا۔ پہلے دن شری ونوبا نے اور میں نے دعوت کی بنا پر شرکت کی۔ پنڈت مشر، بابو گووند داس اور کانفرنس کے عہدہ داروں کی تقریروں کے بعد شری ونوبا سے اور مجھ سے چند لفظ کہنے کی درخواست کی گئی۔

پنڈت مشر نے اپنے ایڈریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اس مضمون پر تبصرہ کیا جو انھوں نے حال میں ہندوستان کی قومی زبان کی تعمیر لکھا ہے۔ انھوں نے کچھ ردو قدح کے ساتھ پنڈت جی کے نظریے کے بارے میں خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس نے ہندی اور ہندوستانی کے فرق کو بہت کم کر دیا ہے۔ اور اس کی بنا پر یہ جھگڑا چکایا جا سکتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ اسپشٹ (ظاہر) ہو جاتا ہے کہ ہندی پریمی پنڈت جی سے اتنی دور نہیں جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔ اس بات پر میرے بار بار زور دینے کا کارن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندی اردو اور ہندوستانی کے جھگڑے میں اپنا سمے گنوا کر ہم ہندی کے ان شتروؤں (دشمنوں) کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں جو یا تو انگریزی کا ادھپتیہ (غلبہ) قائم رکھنا چاہتے ہیں یا انیے پرانت وادی ہیں کہ ہندی کو راشٹر بھاشا کے استھان پر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔"

پنڈت دوارکا ناتھ مشر ہندی کے بڑے عالم اور شاعر ہیں۔ وہ یقیناً اس مسئلے پر وثوق سے رائے دینے کے اہل ہیں۔ بابو گووند داس اور دوسرے حضرات نے بھی، جو ان کے بعد بولے پنڈت جواہر لال کے طرز خیال کا خیر مقدم کیا اگرچہ اس گرم جوشی سے نہیں جیسے شری مشر نے کیا تھا۔

جب میرے بولنے کی باری آئی تو ان تقریروں کی بنا پر مجھے ذیل کی تجویز پیش کرنے کی ہمت ہوئی مجھے نہ تو ہندوستانی سبھا سے کوئی باضابطہ تعلق ہے اور نہ ہندی سبھا سے، اس لئے میں کسی ادارے کی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مگر مجھے مشترک زبان کے مسئلے سے دلچسپی رہی ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اس کے بارے میں جو زور شور کی بحثیں ہو رہی ہیں اور جس طرح شاندار زبان بدلی اور بنائی جا رہی ہے، اس سے نہ عام لوگوں کو فائدہ ہوگا اور نہ خود زبان کو۔ اس کی وجہ سے تو وہ دن اور دور ہوتا جاتا ہے جب یہ زبان قومی زندگی میں اپنا فرض پوری طرح انجام دینا شروع کرے گی۔ اس کی بہت سخت ضرورت ہے کہ اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوئی ترکیب نکالی جائے۔ دونوں طرف کے لوگ زبان کے نام اور اس کے ذخیرہ الفاظ کے بارے میں تعصبات اور جذبات سے کام لے رہے ہیں اور عقل جو ان کی وکالت کرتی ہے جس فریق کی طرف سے بولتی ہے اس کی موافقت میں مناسب دلیلیں ڈھونڈھ لیتی ہے۔ جن معاملوں میں تعصبات اور جذبات کا قدم درمیان میں ہو، ان میں انسان کی عقل عام پر بہی کرتب دکھاتی ہے۔ صرف زمانہ چاہے وہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، ان جھگڑوں کو طے نہیں کر سکتا بلکہ دیر ہونے میں اندیشہ ہے کہ گالی گلوچ اور مار پیٹ کی دلیلوں سے کام لینے کی نوبت نہ آ جائے۔ اسی طرح ووٹ کے ذریعے سے بھی اس مسئلے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ووٹ سے طاقت تو پیدا ہو سکتی ہے مگر دل جمعی اور دوستی پیدا نہیں ہوتی۔ ہندی ہندوستانی جیسی وسیع زبان کے لکھنے والوں کے لئے اختلاف مذاق کی بڑی گنجائش ہے ایسا بھی ہوتا ہے اور ہوگا کہ ایک ہی لکھنے والے کی مختلف تحریروں میں سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی لفظوں کا تناسب مختلف ہو۔ ہندی لفظوں کے انتخاب میں بھی لکھنے والا ہندی کے دائرے کی مختلف بولیوں اور شکلوں سے کام لے سکتا ہے۔ لکھنے اور بولنے والوں کو اس کی آزادی ہونی چاہیے کہ اپنے مذاق کے مطابق اور ان لوگوں کے لحاظ سے جن سے انھیں خطاب کرنا ہے لفظوں کو جس طرح چاہیں ترکیب دیں۔ ان کوششوں سے زبان کی ایک خاص شکل بن جائے گی۔ شاید وہ ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح جس کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں جگمگانے لگے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم لمبی چوڑی بحثوں کو ختم کر کے کام میں لگ جائیں۔ ایک کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کو چن لیں جس کی دانشمندی فراخ دلی اور بصیرت جس کے علم و فضل پر دونوں فریقوں کو بھروسا ہو اور اس سے یہ درخواست کریں کہ سروست زبان کا کوئی نام تجویز کر دے اور اس کے ذخیرہ الفاظ، اور اس کی نشوونما کی ایک ایک راہ معین کر دے، میں نے "سروست" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ہمیں اس کا فیصلہ اسی طرح مان لینا چاہئے جیسے چھوٹے پانڈو بھائیوں نے یدھشٹر کا فیصلہ اور ان سب نے اپنے اپنے موقع پر ویاس، کنتی اور کرشن کے فیصلے مان لئے تھے۔ چاہے یہ فیصلے ان کے لئے سازگار رہے یا ناسازگار، انھوں نے وفاداری اور محبت کے ساتھ ان کے آگے سر جھکا دیا اور کبھی ان کو ٹالنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح اس معاملے کو ایک چنے ہوئے پنچ کے سپرد کر کے طے کر لینا چاہیے۔

میں نے ان خیالات کو حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ (شاید میرے الفاظ ان لفظوں سے جو میں نے یہاں استعمال کئے ہیں مختلف ہوں) اور یہ رائے دی کہ چونکہ پنڈت جواہر لال کے مضمون کو ہندی مانوں نے اور سب بیانات سے جواب تک دئے گئے ہیں زیادہ پسند کیا ہے اور چونکہ وہ ہمارے وزیر اعظم ہیں اور ہم نے زبان کے نام اور شکل سے کہیں زیادہ اہم معاملات میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ان کے سپرد کر رکھا ہے۔ اس لئے دونوں فریق ان کے فیصلے کو تسلیم کر لیں۔

اس پر کسی شخص نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کا نام شریک ثالث یا واحد ثالث کی حیثیت سے پیش کیا ان کا ذکر بابو گووند داس نے اپنی تقریر میں تعریف کے ساتھ کیا تھا۔ میں دونوں صورتوں پر راضی ہو گیا شری بائل سکسینا نے جو میرے بعد بولے تجویز کیا کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو پنچ بنایا جائے۔ مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہ تھا۔ وہ آئین ساز اسمبلی کے صدر ہیں اور اگر سب لوگ یہ بات مان لیں کہ صدر کو اس مسئلے کے طے کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو یہ اس گتھی کو سلجھانے کی بڑی اچھی صورت ہے۔ میری تجویز کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ کسی طرح اس معاملے کو طے کر لیا جائے اور تینوں ہی نام جو پیش کئے گئے بہت مناسب تھے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میری تجویز عام طور پر پسند کی گئی۔ میں نے بعض ڈیلیگیٹوں کے چہرے سے اندازہ کیا اور بعض کی زبان سے سُنا کہ اگر یہ مسئلہ اس طرح طے ہو جائے تو ان کے دل سے بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔

میں اس تجویز کو دہراتا ہوں تاکہ آئین ساز اسمبلی کے ممبر اور عام لوگ اس پر غور کریں۔ عام لوگوں کو ووٹروں خیال کے عالموں پر زور ڈالنا چاہیے کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو یا سردار ولبھ بھائی پٹیل یا ڈاکٹر راجندر پرشاد یا ان تینوں یا ان میں سے کسی دو کا فیصلہ قومی زبان کے نام، ذخیرہ الفاظ اور نشوونما کے اصول کے بارے میں مان لیں۔ ہمارا ملک مشرق بعید کے بیچ میں واقع ہے۔ اور یہاں مختلف تہذیبوں کا زبانوں اور نسلوں کے لوگوں کا جمگھٹ ہے جس طرح دوپہر کا سورج اپنی شعاعیں ہر طرف یکساں بکھیرتا ہے۔ اسی طرح ہمارا حوصلہ ہے کہ ہم سرودے یعنی سب کے بھلے کے لئے کام کریں۔ یہ ہماری مشترک تہذیب اور مشترک زبان کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔ ہمارا ملک سرودے سرودیش ہے اور ہماری زبان سرودے کی سرودیشی ہونی چاہئے۔

پچھلا ہفتہ :- ا۔ ہندوستان

بجٹ گلے اُتر گیا

۱۹۴۹ء کے بجٹ پر شروع میں جو عام بحث ہوئی تھی اس سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بجٹ کسی طرح صحیح سلامت اسمبلی سے نہیں گذر سکے گا اور اس میں فنانس منسٹر کو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی ہوگی۔ لیکن پچھلے چار پانچ روز میں مختلف محکموں کے وزیروں نے کچھ معقول دلیلوں سے کچھ خوش آیند وعدوں سے ممبروں کو مطمئن کردیا اور سب محکموں کے مطالبات ایک ایک کرکے منظور ہوگئے سب سے زیادہ اثر ممبروں کی رائے پر فنانس منسٹر کی اس پیش گوئی کا پڑا کہ اپریل کے آخر سے غلہ کی قیمت میں کمی شروع ہوجائے گی، چھ مہینے میں اچھا خاصا فرق محسوس ہونے لگے گا۔ اور غلے کے سستے ہونے سے دوسری چیزیں بھی کچھ سستی ہوجائیں گی۔ پھر ان کے اس اعلان سے بھی لوگ خوش ہوگئے کہ انکم ٹیکس کی تحقیقات کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی وہ ٹیکس سے بچنے والے دولت مندوں سے ٹیکس کی رقمیں اگلوانے کا کام مستعدی سے کر رہی ہے اور وہ کمیٹی جو مرکزی حکومت کے اخراجات میں تخفیف کرنے کے مسئلے پر غور کررہی تھی بہت جلد اپنی رپورٹ پیش کردے گی۔ اور اس کی سفارشات پر عمل کیا جائے گا۔ غذائیات کے وزیر شری جے رام داس دولت رام اس بار اعتراضات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوکر آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ باہر سے غلہ منگوانا کوئی نئی بات نہیں ہے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک سوا ۱۹۲۲-۲۳ء کے ہر سال اوسطاً ۱۳ لاکھ ٹن غلہ باہر سے آتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں بھی سوا ۱۹۴۲-۴۳ء کے یہ سلسلہ جاری رہا۔ تقسیم ہند کے بعد مغربی پنجاب اور سندھ کے الگ ہوجانے سے آٹھ، دس لاکھ ٹن غلے کی اور کمی ہوگئی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ پیداوار کے بڑھانے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ۱۹۵۱ء کے بعد سوا ناگہانی صورتوں کے معمولاً باہر سے غلہ منگانے کی بالکل ضرورت نہیں ہوگی۔

بجٹ کی بحثوں کے سلسلے میں وزیر اعظم نے حکومت ہند کے محکمۂ خارجہ کی کارگذاری کا اور نائب وزیر اعظم نے محکمۂ داخلہ اور ریاستوں کے محکمے کی کارگذاریوں کا جائزہ لیا، اور پارلیمنٹ نے مجموعی طور پر ان سب محکموں کی خدمات کو سراہا۔ وزیر صحت اور وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ سے شکایت کی کہ ان کے محکموں کے لئے بہت کم رقمیں منظور کی گئی ہیں کئی ممبروں نے صحت اور تعلیم کی اہمیت کے بارے میں پر زور تقریریں کیں لیکن ایوان نے ان وزیروں کی اس درخواست کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کہ وہ حکومت پر زور ڈال کر ان کے محکموں کی مجوزہ امداد کو بڑھوائے۔ خیال تھا کہ ڈاک تار کا بجٹ پیش ہوگا تو پوسٹ کارڈ اور خط کا محصول بڑھانے کی مخالفت ہوگی اور ہوئی بھی۔ لیکن اس میں وہ پہلی سی شدت نہ تھی اور رفیع احمد قدوائی صاحب کی جوابی تقریر کے بعد تو مخالفت کا جوش بالکل ہی ٹھنڈا ہوگیا۔ رفیع احمد قدوائی صاحب نے بتایا کہ پہلے ڈاک تار سے حکومت کو چار کروڑ کی بچت ہوا کرتی تھی مگر پچھلے سال سوا دو کروڑ کا گھاٹا ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پوسٹ کارڈ کی قیمت دو پیسے ہے لیکن حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوسٹ کارڈ کی تیاری اور اسے ڈاک کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے پر سوا نو پائی خرچ ہوتے ہیں اور تین پیسے قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اب رہا خط کی عام شرح دو آنے مقرر کرنا اور زیادہ سے زیادہ خطوط ہوائی جہاز سے بھیجنا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوائی جہاز کی کمپنیاں نقصان سے چل رہی ہیں۔ ان سے ایک مفید خدمت لینے اور ان کے لئے آمدنی کا ایک نیا ذریعہ نکالنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی گئی ہے۔ پارلیمنٹ نے بظاہر ہوائی جہاز کی کمپنیوں کا قائم رکھنا اتنا ضروری سمجھا کہ اس کے لئے ان غریبوں سے بھی جن کے خط ہوائی جہاز سے بھیجے جائیں گے چھ پیسے کے بجائے دو آنے وصول کرنا جائز رکھا۔

ہماری پارلیمنٹ نے وقت بچانے کے لئے حکومت پر انتہائی اعتماد کا ثبوت دینے کے لئے محکمۂ بحالی اور محکمۂ اطلاعات کے بجٹ بغیر بحث کے پاس کردیئے اور بجٹ کو منظت بعد از جنگ کے طور پر آیندہ کے لئے اٹھا رکھا۔ حکومت پر اعتماد تو بہت مبارک ہے لیکن پارلیمنٹ کا اس کے لئے اس قسم کے طریقے اختیار کرنا جمہوریت کی ترقی کے لئے کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔

پنچ کا فیصلہ سر آنکھوں پر

ہمیں امید ہے کہ نئی روشنی کے پڑھنے والے اس پرچے میں مشر وا لا بھائی کا مضمون غور سے پڑھیں گے، کچھ عرصے سے ہندی کے بعض حامیوں کو یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ زبان کی بحث میں جو شدت اور تلخی پیدا ہوگئی ہے وہ قومی اتحاد کے لئے مضر ہے چنانچہ ان کی طرف سے کوشش ہورہی تھی کہ کوئی معقول سمجھوتا کرکے اس بحث کو ختم کردیا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے مضمون نے مسئلے کو عملی وضاحت سے پیش کرکے ان لوگوں کے لئے جو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہتے ہیں آسانی پیدا کردی۔ پنڈت روی شنکر شکل وزیر اعظم سی پی نے جو مضمون پنڈت نہرو کے مضمون کے جواب میں لکھا اس سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شدھ ہندی کو قومی زبان بنانے کے حامی پنڈت نہرو کی تجویزوں سے خوش نہیں ہوئے لیکن شری مشروالا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر ہندی کے علم برداروں نے پنڈت نہرو کے خیالات پر دلچسپی اور ہمدردی سے غور کیا۔ اس سے ہندوستانی کے حامیوں کی ہمت بڑھی اور شری مشروالا نے یہ تجویز پیش کی کہ اس جھگڑے کو طے کرنے کے لئے پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد میں سے کسی ایک کو، دو کو یا تینوں کو پنچ بنا دیا جائے اور ان کے فیصلے کو بے عذر قبول کرلیا جائے ہمیں امید ہے کہ سب معقول پسند لوگ مشروالا بھائی کی اس تجویز کی دل و جان سے تائید کریں گے جب لوگ پنچ کے فیصلے کو بے چون و چرا قبول کرنے پر راضی ہوتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کے فیصلے کو غلطی سے بری سمجھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے نقطۂ نظر پر ہمدردی سے غور کرنے۔ ان کے درمیان مشترک نقطہ ڈھونڈھ نکالے گا۔ اس کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ پنچ واقعی نزاعی مسئلے میں تعصب اور جانبداری سے بالاتر ہو یہ صفت ان تینوں حضرات میں موجود ہے۔

اِدھر یا اُدھر

کچھ عرصے سے ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات کے بارے میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ وہ بدستور فرانس کے ماتحت رہیں، خودمختار بن جائیں یا انڈین یونین میں شامل ہو جائیں۔ ہندوستان کی حکومت بار بار یہ اعلان کرچکی ہے کہ وہ اپنے ملک کی سرزمین پر کسی دوسرے ملک کے قبضے کو برداشت نہیں کرسکتی، لیکن اس نے فرانسیسی حکومت کی اس تجویز کو خوشی سے مان لیا تھا کہ خود ان مقامات کے باشندوں کی رائے سے اس مسئلے کا فیصلہ کیا جائے۔ کچھ عرصہ ہوا فرانسیسی ہند میں نئے میونسپل انتخابات ہوئے تھے اور ان کے سلسلے میں ہندوستان میں شرکت کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان فساد بھی ہوا تھا۔ بہرحال انتخابات ہوگئے اور ۲۰ مارچ کو پانڈیچری، کریکل، ماہی اور ینم کے ۲۰۰ میونسپل کونسلروں کی مقرر کی ہوئی ۲۹ آدمیوں کی ایک کمیٹی نے یہ تجویز کی ہے کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ان چاروں مقامات میں اس سوال پر عام لوگوں کی رائے لی جائے کہ وہ فرانس کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں یا انڈین یونین میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ رائے شماری کی نگرانی کے لئے فرانسیسی حکومت اور ہندوستان کی حکومت مل کر غیر جانبدار ناظم مقرر کریں گے اگر ہندوستان میں شامل ہونے کے حق میں فیصلہ ہوا تو اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے ۴۰ سال کے لئے ان علاقوں کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی کمیٹی کی اس تجویز پر میونسپل کونسلروں کی پوری کانفرنس غور کرے گی کمیٹی نے اس بات کو صاف کردیا ہے کہ وہ زیادہ زور اس پر دیتی ہے کہ ۱۱ دسمبر کو عام رائے شماری ہو دوسری تجویزیں محض سفارشیں ہیں جن پر فرانسیسی اور ہندوستانی حکومتیں غور کریں گی۔ نئی دہلی کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ حکومت ہند اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوگی کہ جب ان علاقوں کے باشندے ان کو ہندوستان میں شامل کرنے کا فیصلہ کردیں اس کے بعد بھی ان کو ۴۰ سال تک مادر وطن سے الگ رکھا جائے۔

۲۔ پاکستان

(اس وقت پاکستان میں تین اہم مسائل پر بحث چھڑی ہوئی ہے جن کے حل ہونے پر نئی ریاست کے امن و ترقی کا دارومدار ہے ایک یہ کہ پاکستان کے آئین کی بنیادی قرارداد اس اسلامی ریاست کے تصور کو پورا کرتی ہے یا نہیں جو مسلم لیگ کے سامنے تھا، دوسرا یہ کہ ممدوٹ اور دولتانہ کے باہمی جھگڑوں کو چکا کر پنجاب مسلم لیگ کی گرتی ہوئی دیوار کو ٹھونی لگانے کی جو کوشش چودھری خلیق الزماں صاحب کر رہے ہیں وہ مناسب ہے یا نہیں۔ تیسرا یہ کہ پنجاب اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں مہاجرین کو رائے دینے کا حق ملنا چاہئے یا نہیں ان تینوں کے بارے میں جو معتدل اور معقول نقطۂ نظر پاکستان کے ذمہ دار اخباروں کا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوگا)

بنیادی قرارداد

۷؍ مارچ کو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں صاحب نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے پاکستان کے آئین کی بنیادی قرارداد پیش کی تھی جسے اسمبلی نے تھوڑی سی ردوقدح کے بعد منظور کر لیا۔ اس کا نچوڑ یہ ہے:۔

"چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیر حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔

لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد خود مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے۔

جس میں اصول جمہوریت و حریت، مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔"

اس قرارداد کی علما کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی۔ اخباروں نے اب تک عام طور پر اس کے بارے میں اظہار رائے سے پہلو بچایا ہے۔ صرف مغربی پاکستان نے اس کی تائید کی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"اس قرارداد کے متعلق مختلف حلقوں میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ مسٹر لیاقت علی نے اسلامی اصول پر آئین مرتب کرنے کا اعلان کر کے وقت کی بہت بڑی ضرورت پورا کر دیا ہے بعض لوگ اس قرارداد سے خوف زدہ نظر آتے تھے غالباً ان کا خیال تھا کہ وزیراعظم پاکستان خلوص سے کام نہیں لے رہے ہیں، بلکہ عامۃ الناس کی اشک شوئی کے لئے یہ قدم اٹھا رہے ہیں، لیکن مجلس آئین ساز میں جس ڈھب پر بحث و تمحیص ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ مسٹر لیاقت علی نے جو قدم اٹھایا ہے وہ خلوص دیانت، اور متانت پر مبنی ہے اور جس منزل کی طرف یہ قافلہ چل نکلا ہے۔ یقیناً وہاں تک پہنچنے میں اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

جہاں تک قرارداد مقاصد سے اختلاف رائے کا تعلق ہے ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس کے خیال کے مطابق جہاں قرارداد میں کوئی شق مشکوک ہو اس کو سامنے لائے اور قوم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے نکتہ چینی کرے۔ اس کا حق ہر فرد اور جماعت کو پہنچتا ہے لیکن جس رنگ میں بعض علمائے دین نے مخالفت کی ہے وہ منصوبہ بے حد قابل اعتراض ہے اگر یہ صحیح ہے کہ لاہور کے چند علماء مسٹر چٹو پادھیائے سے ملے اور حزب مخالف کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے مسلمانوں کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا تو یقیناً انھوں نے نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام سے دشمنی کی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ علمائے دین چاہتے تھے وہ ہو گیا ہے جس طریقے سے وہ چاہتے تھے وہ نہیں ہوا۔ اس وقت جبکہ مرکز میں ایک وزارت موجود ہے ایک پارلیمنٹ موجود ہے۔ مجلس دستور ساز موجود ہے۔ اتنے اداروں کے ہوتے ہوئے بالکل ناممکن ہے کہ صرف چند علمائے دین کے کاندھوں پر یہ کام ڈال دیا جائے علمائے دین کو چاہئے کہ وہ اس قسم کی درپردہ سازشوں کے بجائے ببانگ دہل حکومت اور دستور ساز اسمبلی کو بتائیں کہ اسلامی آئین کی ترتیب میں کیا کچھ کرنا چاہئے۔ وہ محض اس لئے اسلامی آئین کے اصول کی مخالفت نہ کریں کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے یہ اصول پیش کیا ہے اور کسی علماء کے ادارے کی طرف سے اعلان نہیں ہوا۔ ہم کسی عالم دین کی نیت پر حملہ نہیں کرتے لیکن اتنی آرزو ضرور رکھتے ہیں کہ موجودہ بحران میں وہ حکومت اور اپنی دستور ساز اسمبلی کو موقع دیں کہ وہ اپنے خیالات کے مطابق اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے۔"

پنجاب مسلم لیگ کا جھگڑا

"لیڈروں کے متحدہ محاذ کا سوال اٹھانے سے پہلے اس امر پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے کہ بنائے اختلاف یہ تھی کہ سال گذشتہ بجٹ سیشن کے دوران میں میاں ممتاز دولتانہ نے یہ سوال اٹھایا کہ خان ممدوٹ صوبائی نظم و نسق کے دھندے کو خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں چلا رہے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کی وزارت سے الگ ہو جائیں گے مسٹر لیاقت علی خاں نے مغربی پنجاب کی وزارت کا متحدہ محاذ قائم رکھنے کے لئے متعدد کوششیں کیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں اور ممتاز نے اصلاح حال کے مقصد کو سامنے رکھ کر خان ممدوٹ کی قیادت کو آئینی طریقوں سے چیلنج کیا، اور صوبہ مسلم لیگ کونسل میں وزارتی نامزدے کو شکست دے کر مسلم لیگ کی صدارت کا منصب حاصل کر لیا۔ ازاں بعد اسمبلی کے ارکان کی ایک جماعت نے خان ممدوٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا نوٹس دے دیا اور جب بڑی لیت و لعل کے بعد فیصلے کا دن نزدیک آیا اور اس امر کا قوی احتمال نظر آنے لگا کہ اسمبلی پارٹی خان ممدوٹ کو وزارت عظمیٰ اور قیادت کے مناصب سے برطرف کر دے گی تو مسٹر لیاقت علی خاں پھر آ دھمکے اور انھوں نے فریقین سے بات چیت کرنے کے بعد گورنر جنرل سے سفارش کر دی کہ وہ دفعہ ۹۲۔ الف کی نوبت واقع کر اس ساری کش مکش کا خاتمہ کریں جو آئینی طریق سے اصلاح حال کا مقصد حاصل کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ بعض حلقوں میں مرکزی حکومت کے اس اقدام کا مطلب یہ لیا گیا کہ اگر خان افتخار حسین خاں ممدوٹ وزیراعظم نہیں رہ سکتے تو کسی اور کو بھی وزیراعظم بننے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اب مرکزی قیادت چودھری خلیق الزماں کی شکل میں یہ کہتی نظر آ رہی ہے کہ قیادت کی جس برات میں خان ممدوٹ دولہا نہیں ہوں گے اسے قیادت کی برات تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی پنجاب کے سیاسی ڈرامے کا پس منظر وہ ہے جو اوپر بیان ہوا، اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ ان لیڈروں کے درمیان اتحاد ممکن ہے۔ اگر دولتانہ نون، شوکت اور ان کے ساتھی جنہوں نے صوبے کے حالات کی اصلاح کا نعرہ لگا کر خان ممدوٹ کی قیادت کو چیلنج کیا تھا، پھر خان ممدوٹ اور ان کے غرض پرست چیلوں کے ساتھ بغل گیر ہو جائیں گے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ سال گذشتہ کی ساری کش مکشیں فضول تھیں جو صوبہ میں دفعہ ۹۲ الف کے نفاذ پر منتج ہوئیں اور وہ گورنر جنرل نے وزارت اور اسمبلی کو توڑ کر خان ممدوٹ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا لغو محض تھا، اور وہ جو مغربی پنجاب کے بچے بچے نے ایسی نادر وزارت اور ایسی عجیب اسمبلی کے پنجے سے مخلصی حاصل کر کے پر اطمینان کی سانس لی تھی، یکسر باطل تھی، پیچھے صرف چودھری خلیق الزماں ہیں جو علی بابا اور ان کے چالیس چوروں کو از سر نو قوم کے سر پر مسلط کرنا ضروری سمجھ رہے ہیں اور اس مقصد کے لئے شدر حال کر کے کراچی سے لاہور تشریف لائے ہیں۔"

(مغربی پاکستان)

"اگر اس وقت مسلم لیگ کے علاوہ کوئی اور متبادل سیاسی قیادت صوبے میں موجود ہوتی تو ہم آخری فریق ہوتے جو اتنا کچھ دیکھنے کے بعد مسلم لیگ سے چمٹے رہتے اور خلیق اور دولتانہ پر نئے سرے سے اعتماد کرنے کو کہتے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اور کچھ اور عرصے تک کسی دوسری سیاسی تنظیم کے ابھرنے کی ہمیں کوئی امید

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

۴۔ باہر کی دنیا

امن کی ضمانت یا جنگ کی دعوت

۱۸ / مارچ کو شمالی اٹلانٹک کے اتحاد کی شرطیں شائع ہوگئیں۔ فی الحال اس اتحاد میں متحدہ ریاستیں، کنیڈا، برطانیہ فرانس، بلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ شامل ہیں، اور آئس لینڈ، ناروے، ڈنمارک پرتگال اور اٹلی کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ ممکن ہے ۴/ اپریل تک جب اتحاد کی شرطوں پر اس کے بانی دستخط کریں گے، یہ پانچ ریاستیں بھی اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیں۔ اس کے بعد بھی کوئی ریاست جو مقام کے اعتبار سے شمالی اٹلانٹک کے علاقے میں ہو درخواست دے کر اتحاد میں شامل ہوسکے گی۔ اتحادیوں کی ایک مشترک کونسل ہوگی جس کے جلسے تقریباً مسلسل ہوتے رہیں گے، اور اس طرح اتحاد کے مقصدوں کو حاصل کرنے کی کوشش برابر جاری رہے گی۔

بظاہر اتحاد کی کوئی ایسی غرض نہیں ہے جس سے یہ خیال پیدا ہوسکے کہ اتحادیوں کی نیت روس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنا ہے اور مسٹر بیون نے یقین دلایا ہے کہ اتحاد کی کوئی خفیہ شرطیں نہیں ہیں۔ کسی ریاست کے اتحاد میں شریک ہونے کے لئے یہ بھی لازمی نہیں ہے کہ اس کی حکومت جمہوری طرز کی ہو، لیکن "فوجی" یا "مسلح" حملے کی وضاحت کرتے ہوئے متحدہ ریاستوں کے وزیر خارجہ مسٹر ایچیسن نے یہ مثال دی کہ اگر روس ان ہوائی جہازوں پر حملہ کرے جو برلن میں ضروریات کا سامان پہنچا رہے ہیں تو یہ ایسا معاملہ ہوگا جس میں اتحاد کی پانچویں دفعہ کے مطابق کارروائی کی جاسکے گی، یعنی وہ اتحادیوں پر مسلح حملہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کے تدارک کی تدبیریں کی جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے روس سے لڑائی ہوجائے گی بلکہ جو نوعیت ایسے کسی معاملے کی ہوگی اسی کی مناسبت اس کے بارے میں تدبیریں بھی کی جائیں گی۔ مسٹر ایچیسن نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی پیچ یا پھیر یا مغالطے میں ڈالنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ لیکن روسی اٹلانٹک اتحاد کے خلاف جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کہلوا رہے ہیں اس کی تردید بھی نہیں ہوتی۔

ہر ریاست جو اس اتحاد میں شریک ہوئی ہے اس کی شرطوں کو اپنے دستور اور قانون کے مطابق منظور کرے گی، جو کارروائیاں مشترک طور پر کی جائیں گی ان کے لئے بھی اسی طرح منظوری حاصل کی جائے گی۔ اور جیسے یہ اتحاد یو۔این کے نظام کے اندر اور اس کے ماتحت ہے ویسے ہی اتحادیوں کی تمام کارروائیاں یو۔این اور حفاظتی کانسل کے علم میں لائی جائیں گی۔ اور اس کا خیال رکھا جائے گا کہ وہ یو۔این، او کے کسی قاعدے یا اصول کے خلاف نہ ہوں۔

جمہوریت کا امتحان

اٹلانٹک اتحاد جمہوری اصولوں کے مطابق مخصوص ریاستوں کی معاشی تنظیم کا منصوبہ بھی ہے۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے خالص سیاسی پہلو کی اہمیت بھی کم ہوجائے گی۔ فرانس اور اٹلی جنگ کی حالت میں برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے لئے ایک خطرہ بن جائیں گے اگر ان کی تجارت اور صنعت کو فروغ نہ ہوا اور ملک میں بہت بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی نہ ہوئی جو اپنی خوش حالی اور اطمینان کو آزاد جمہوری نظام زندگی کا فیض سمجھے ہوں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمالی اٹلانٹک کا اتحاد روس کا مقابلہ کرنے کی ایک تدبیر ہے تو اسی کے ساتھ کمیونزم کا ایک توڑ بھی ہے، اور اتحادیوں کی اصل کوشش اس میں ہوگی کہ وہ اتحاد عمل کو کس حد تک ایک دوسرے کی بہبودی کا ذریعہ بناسکتے ہیں۔ فی الحال تو مایوسی کی وہ کیفیت جو یورپ کے جمہوری ملکوں میں نمایاں تھی بہت کچھ دور ہوگئی ہے۔ برلن کو ہوائی جہازوں سے سامان پہنچانے میں کامیابی، مارشل پلین کی تجویزوں پر عمل ہوجانا اور اب یہ شمالی اٹلانٹک کا اتحاد سب اس کے ثبوت سمجھے جاتے ہیں کہ اگر جمہوری ریاستیں کوئی قطعی فیصلہ کریں اور اس پر قائم رہیں تو ان کے بہت سے کام بن جائیں گے۔ [illegible] روس کو بھی اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ یونان کی حکومت کو متحدہ ریاستوں سے جو مدد ملی ہے اس کی بدولت مقدونیہ کے ایک پہاڑی علاقے کے سوا جہاں بلغاریہ، یوگوسلاویہ البانیہ اور یونان کی سرحدیں ملتی ہیں باقی تمام ملک میں کومیونسٹوں کی چھاپہ مار لڑائی کو ختم کردیا گیا ہے اس طرح بھی کومیونزم کے بڑھتے اثر کو روکا گیا ہے اور اب کہا جاتا ہے کہ روس اس کی وجہ سے جنوب مشرقی یورپ میں اپنی پالیسی بدلنے والا ہے۔ وہ بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور البانیہ کے ذریعے یونانی کومیونسٹوں کو مدد بھیجنے اور اس طرح یونانی حکومت کو زیر کرنے کے بجائے ایسا کی کوشش کرنے والا ہے کہ بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور یونان کے متصل سلاقوں کو ملا کر مقدونیا کی ایک نئی ریاست قائم کرے لیکن یہ ابھی ایک افواہ ہے جس کی بنیاد صرف چند قیدیوں کے بیان ہیں۔

م، م

یہ لیت و لعل مہلک ہے

چین میں کیومن تانگ کی حکومت ہاری ہوئی بازی کو کھیلنے کی کوشش کررہی ہے جس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور مجموعی طور پر چین کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ اگر صلح جلد ہوجاتی تو کمیونسٹوں کو جاپایا نظام حکومت ہاتھ آجاتا اور وہ اپنے بدنصیب ملک کی جسے برسوں کی مسلسل جنگ نے زخموں سے چور چور کردیا ہے مرہم پٹی کا کام شروع کرسکتے۔ مگر کیومن تانگ کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے صلح کی گفتگو ٹل رہی ہے۔ اور چین کے اس وسیع علاقے میں بھی جو دریائے یانگ تسی کے جنوب میں واقع ہے نظم و نسق کا شیرازہ بکھرنے لگا ہے برما اور انڈوچائنا کی سرحد سے ملے ہوئے چینی علاقے میں مقامی کمیونسٹوں نے شورش برپا کردی ہے اور بعض صوبوں کے گورنر چاہتے ہیں کہ مرکزی حکومت کا جوا اتار پھینکیں اور پہلے کی طرح خودمختار ہوکر قزاقانہ زندگی بسر کرنا شروع کردیں۔ یانگ تسی کے شمال میں کمیونسٹ فوجیں آگے بڑھنے پر تلی کھڑی ہیں لیکن ان کے ذمہ دار لیڈر جانتے ہیں کہ اگر معاملہ پر امن طریقے پر طے ہوجائے تو برسوں کی محنت جو انھیں جنوبی چین کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کے سدھارنے میں صرف کرنی پڑے گی، بچ سکتی ہے۔ اس لئے وہ صلح کی گفت و شنید کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔ اگر صلح کی بات چیت نے اتنا طول کھینچا کہ جنوبی چین میں فساد اور انتشار کی قوتیں زور پکڑ گئیں اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تو صلح کا مقصد فوت ہوجائے گا۔

کیا دھونس سے کام چل جائے گا

برما کے وسطی علاقے میں کرن قبائل اور کمیونسٹوں کو جو حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے عارضی طور پر متحد ہوگئے ہیں۔ بڑی کامیابیاں ہوئی ہیں [illegible] مانڈلے پر قبضہ کرلینے سے ان کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی ہے۔ مگر برما کی حکومت یہ ظاہر کررہی ہے کہ اب تک اس نے باغیوں کو ڈھیل دے رکھی تھی اور اب وہ سخت کارروائی کرنے والی ہے چنانچہ پچھلے ہفتہ اس نے باغیوں کو ہتھیار ڈالنے کا الٹی میٹم اس شان سے دیا تھا جیسے وہ اس کے رحم و کرم پر ہوں۔ اس دھونس کا باغیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا اور غالباً اس کی یہ غرض نہ تھی۔ اصل مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کو جن سے برما کی حکومت روپے اور سامان کی مدد لینا چاہتی ہے۔ اپنی طاقت کا یقین دلایا جائے۔ برما کے سفیر یو، اون نے جو ابھی لندن پہنچے ہیں، برطانیہ سے قرضے اور سامان جنگ کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ برما میں کرن قبائل نے مجموعی طور پر بغاوت نہیں کی ہے بلکہ ان کی آبادی کا صرف دسواں حصہ دوسرے فتنہ انگیز عناصر کے ساتھ مل کر حکومت کا مقابلہ کررہا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ برمی حکومت کو ضروری امداد مل جائے تو وہ اس شورش کو قابو میں کرسکتی ہے۔ انھوں نے اس پر بہت زور دیا کہ جنوب مشرقی ایشیا کا امن اور سلامتی اور خاص طور پر اس کی غذائی حالت کا سدھرنا اس پر موقوف ہے کہ برما میں جلد سے جلد امن قائم ہوجائے۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن بظاہر برطانیہ سے اس کا وہی جواب ملے گا جو چند روز پہلے ملا تھا کہ برمی حکومت کو اپنے مخالفوں سے صلح کرلینی چاہئے۔ اور اگر وہ اس کا فیصلہ کرے تو برطانیہ کی خدمات اس کام کے لئے حاضر ہیں۔

ع، ح

قطعہ بر وفات بلبل ہند

رادھے شام

عندلیب ہند چوں خاموش گشت
در چمن جوش نوا باقی نماند
حرف او بس دلکش و سحر آفریں
در سخن آں نغز گفتاری نماند

گشت بے او قصر دولت بے فروغ
گوہر تاج جہاں داری نماند
بود ذیشان خدمت خلق خدا
آں خدا بینی خود آگاہی نماند

قلب او روشن ز انوار خلوص
حیف صد حیف آں دل عالی نماند
اتحاد ہندو و مسلم ازو
سبحہ را آں تار زناری نماند

در سیاست تیزگام و تند رو
آں رم آہوئے صحرائی نماند
رفت از دنیائے فانی غم مخور
روح او از تن خاکی نماند
سرد شد ہنگامۂ شعر و سخن
آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

نذرِ عقیدت

سیدہ فرحت

کر دیا افسوس تجھ کو موت نے ہم سے جدا
گلستانِ ہند کی اے بلبل جادو نوا
تجھ کو فطرت سے ملی تھی ندرت فکر و خیال
تیرے گیتوں میں ہے تیری روح کا عکس جمال

ہر ادا سے تیری ذوق شاعرانہ تھا عیاں
ہر نفس تیرا تھا گویا شعر و موسیقی کی جاں
شعر ہے ہر ایک تیرا دل نشیں و دل گداز
تیرے نغموں میں عجب ہے امتزاج سوز و ساز

تھا خزانہ دانش و حکمت کا گر تیرا دماغ
دل میں تھا روشن ترے عشق و محبت کا چراغ
یاد رکھے گی ہمیشہ قوم تیری خدمتیں
فخر تیرے نام پہ کرتی رہیں گی عورتیں

شاعرہ بھی تھی، خطیبہ بھی، سیاست داں بھی تھی
نوجوانانِ وطن کی تو چہیتی ماں بھی تھی
مامتا تھی خون بن کر تیری رگ رگ میں رواں
دل ترا کتنا حسیں تھا! دختر ہندوستاں
نذر تیری روح کو! لاکھوں محبت کے سلام
تجھ کو اے دیوی! ترے اہل عقیدت کے سلام

بلبل ہند

تشنہ بریلوی

ابھی بھلا ہی زخم تازہ تھا
ابھی آنکھوں میں اشک لرزاں تھا
سازِ ہستی ابھی تھا نوحہ کناں
غم کے سائے ابھی پر افشاں تھے

بزم رنداں ابھی تو تھی مغموم
مئے گلگوں سے جام تھے خالی
تھکے ہو گئے تھے خوابیدہ
ایک افسردگی سی رقصاں تھی

کہ اچانک ان اہلِ قدرت نے
اک نیا اور ہم پہ وار کیا
چھین لی ہم سے وہ متاع گراں
جس نے دنیا میں اعتبار کیا

بلبل ہند تو ہے خاموش آج
آہ ان قافلوں کو کیا ہوگا
تیری آواز جن کی رہبر تھی
کون اب ان کا رہنما ہوگا

وحشی اور خونی آندھیوں میں بھی
تری انسانیت رہی روشن
آسماں ہٹ گئے تھے مرکز سے
تیری پیشانی پر نہ آئی شکن

کون اب دے گا ہم کو درس عمل
کون اخوت کا لائے گا پیغام
کون پیدا کرے گا سوز یقیں
دے گا تسکین کس کا طرز کلام

کون دے گا سہارا اردو کو
آسرا لیں گے کس کا شعر و ادب
کس کی تقریر اب کرے بیتاب
چٹکلے کس کے ہوں گے وجہ طرب

راہ بر تجھ سے یہ گلہ ہے ہمیں
کیوں ہمیں چھوڑا بیچ رستے پر
تھی ضرورت ابھی وطن کو تری
کاش تو باندھتی نہ رخت سفر

ہماری موجودہ سیاسی و تمدنی بیماریوں کے لئے

گاندھی جی کا نسخہ

سیّد اختر علی تلہری

آج کل ہمارے تمدنی نظام کا شیرازہ بہت زیادہ بکھرا ہوا ہے۔ ہر قسم کے تباہ کن رجحان ہمارے سماج میں پیدا ہو گئے ہیں۔ خود غرضانہ عیش و آسائش کی خواہشیں خطرناک حدود تک پھیل چکی ہیں۔ اپنے لئے دنیا بھر کی عشرتیں سمیٹ لینے نے بڑھتے ہوئے "نفسی رجحان" نے ہمیں بڑا ہی ڈراونا حیوان بنا رکھا ہے، اس حیوانیت کے گھنونے شرمناک مظاہرے اس طرح وسیع پیمانے پر ہم سے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون ہم نے ڈھٹائی سے بہایا ہے۔ ایک دوسرے کی نسوانی عفتوں کا سرمایہ بے حیائی سے لوٹا ہے۔ اب بھی ہم اپنی وحشیانہ ذہنیت کے پیدا کئے ہوئے گردن جھکا دینے والے دوسرے ذلیل اعمال کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بڑھی ہوئی چور بازاری رشوت وغیرہ کے بھیس میں لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس معاشرتی اختلال، اس سماجی راج کا بڑھتا ہوا طوفان دیکھ کر ملک کے مفکرین و مدبرین کے طبقے میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے، اور اس نے اس کے حل ڈھونڈنا شروع کر دئے ہیں۔

ایک بڑے گروہ کا خیال ہے کہ اس جان لیوا بیماری کا واحد علاج مارکس کی اشتراکیت ہے۔ اگر مارکس کا اشتراکی نظام پورے طور سے قبول کر لیا جائے تو ہماری دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے نہ یہ چور بازاری رہے نہ یہ لوٹ کھسوٹ۔

وہ اس نظریے کو بڑے بڑے عالمانہ پیرایوں میں ادا کر رہے ہیں، وہ سچے مارکسی کی حیثیت سے یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ اس قسم کی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں مذہب کے نسخے کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے اور اس نے ہماری بیماری کی تکلیفیں کم کرنے کے بجائے ہمیشہ انھیں اور زیادہ بڑھایا ہے اس لئے اسے بالکل ہی نظر انداز کر دینا چاہئے۔ لیکن کیا فی الحقیقت ان کا یہ خیال صحیح ہے؟ کیا واقعی ان کا مجوزہ مارکسی نسخہ ایسا ہے جس سے صحیح طور پر ہمارے درد کا درماں ہو سکے یا ہمارے سماج کو ہماری سیاست کو جو آزار لگ گیا ہے کیا اس سے سچ مچ روس کی اشتراکیت کی سرخ آتشیں شراب ہمیں نجات دلا سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب مسئلے کے تمام متعلقات پر نظر کرنے کے بعد نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے؟

ایک ایسا خالص مادی نظام جو "مذہب اور اخلاق" کو اپنے نقشۂ عمل میں کوئی جگہ نہ دے اور صرف "پیٹ اور روٹی" کے نعروں سے ہماری زندگی میں جو خلا ہے اسے بھرنا چاہے وہ کبھی حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا مارکس کی خالص مادی اشتراکیت سے انسان کی حدود اعتدال سے بڑھی ہوئی انفرادی و اجتماعی خود غرضی کی دست درازیاں نہیں روکی جا سکتیں۔

جب سب کچھ "پیٹ اور روٹی" ہی ہے اور مادیت ہی ہماری زمین ہے ہمارا آسمان ہے اور مذہب و اخلاق کی جگہ ہماری زندگی میں کہیں نہیں ہے تو پھر میں کوئی دیوانہ ہوں کہ دوسروں کی آسائشوں کے لئے خطروں کے راستوں میں سے گذروں اور اپنے ابنائے نوع کو فائدہ پہنچانے والی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنا سب کچھ تج دوں۔ اگر اپنے کو خطرے میں ڈالے بغیر میں اپنے کیسے سیم و زر سے بھر سکتا ہوں، خواہ اس کے لئے دولت کے اصلی پیدا کرنے والوں کو ظالمانہ طور سے کچلنا ہی پڑے تو اس سے میں کیوں باز رہوں جبکہ اس زندگی کے بعد کچھ نہیں ہے۔ اگر مجھے اپنے تلوؤں کے گھائل ہونے کا خطرہ نہیں ہے تو پھر اپنے آرام کے لئے دوسروں کے عیش و طرب کی حدود میں جابرانہ طور سے قدم رکھنے میں مجھے مادی فلسفہ کے تحت کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ صاف بات تو یہ ہے کہ "سماجی عدل و انصاف" طبقاتی مساوات یا "اشتراکیت" کا معاشرتی و اقتصادی نظام اس وقت تک مقدس بنیادوں پر قائم ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے پس منظر میں مذہب کے چشمے سے نکلے ہوئے صالح اخلاقی تصورات موجود نہ ہوں۔ انھیں اخلاقی تصورات سے ہمارے اعمال میں ایثار و قربانی کی پاکیزگی پیدا ہو سکتی ہے، اور ہم انسانیت کو صحیح معنوں میں عروج دے سکتے ہیں۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مذہب کو بہت آزمایا گیا، اور وہ کبھی ہماری زندگی کا مزاج درست نہیں رکھ سکا۔ مذہب کو تو بہت کم ان مواقع پر دخل کا موقع دیا گیا ہے۔ بیشتر تو مذہب کے بھیس میں بہیمانہ جذبات ہی کھل کھیلے ہیں۔ اور جب کبھی مذہب کے قدم حقیقتاً بیچ میں آئے ہیں تو سماج کا معاشرے کا رنگ ہی اور ہو گیا ہے۔ بہیمیت کی قوتیں دب گئی ہیں اور انسانیت کو فروغ دینے والی قوتیں ابھر آئی ہیں۔

سماجی عدل و انصاف اور طبقاتی مساوات کی حکیمانہ بنیادوں پر سلطنت قائم کرنا دوسرے لفظوں میں رام راجیہ یا حکومت الٰہیہ کی اساس رکھنا اس سیاست دانوں کے بس کی بات نہیں ہے جو ہر چیز کو محض مادی سود و زیاں کی ترازو پہ تولتے ہیں اور جن کی نگاہوں میں پاکیزہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے پاکیزہ وسائل غیر ضروری ہیں۔ خالص مادی تصورات پر سیاست کی نیو ڈال کر جنتا کے لئے پائدار آسائشیں مہیا نہیں کی جا سکتیں، آگ اور خون کے پیٹ سے پھل پھول پیدا نہیں ہو سکتے۔

مہاتما گاندھی نے زندگی کی فطرت کا یہ بنیادی فلسفہ اچھی طرح دماغ سے سمجھ لیا تھا اور دل سے محسوس کر لیا تھا ان کی آنکھوں کو یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پرماتما ایشور خدا سے رشتہ توڑ کر دھرم مذہب سے الگ ہو کر سیاست انسانی اقدار کا احترام کر ہی نہیں سکتی۔ تشدد و فریب عیاری کے راستے سے رام راجیہ کی منزل مقصود مل ہی نہیں سکتی۔ رام راجیہ کی تعمیر صالح اخلاق ہی کی اساس پر ہو سکتی ہے۔ اس لئے انھوں نے ہندوستان کے واسطے جو سیاسی پروگرام بنایا تھا وہ سچائی دیانتداری پریم اور اہنسا پر مشتمل تھا۔ اس میں کہیں بھی عیاری اور بد دیانتی کے لئے جگہ نہیں رکھی تھی۔ وہ ایسی سیاست کو جو صالح اخلاق سے منحرف ہو کر جو فتنہ و فساد قتل و غارت کا سرچشمہ بنے جس کی کامیابیوں کا نقشہ اس وقت مکمل ہو جب اس میں انسانوں کے لہو کا رنگ بھرا جائے شیطانی سیاست سمجھتے تھے۔

اگر ہندوستان گاندھی جی کی اس بلند سیاست پر برابر چلتا رہتا تو اس اونچی سیاست کی نیو کھودنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملتا اور آزادی حاصل کرنے کے بعد یہاں کا جو مہیب نقشہ بن گیا تھا وہ ہرگز نہ بنتا۔ انسانی خون کی ندی بالکل ہی نہ بہتی یہیں گاندھی جی کی پاکیزہ اخلاقی دھارمک سیاست سے انحراف کی یہ خونی سزا ملی تھی۔ وہ تو کہئے گاندھی جی کی "اہنسائی راج نیتی" اس وقت بھی آڑے آ گئی ورنہ شیطانی سیاست کا پیدا کیا ہوا یہ خون اور آگ کا طوفانی دریا نہ معلوم کیا قہر ڈھاتا۔ گاندھی جی نے نہایت شانتی کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنے دھارمک فلسفے کا بند اس قہر انگیز طوفانی دریا پر اپنی جان کی قربانی دے کر باندھ دیا۔ اس خون آشام تشدد کے سیلاب کو تشدد سے قطعاً روکا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ گاندھی جی کے اہنسا کے فلسفے ہی کا حیرت انگیز اثر تھا کہ پانڈوں اور تلواروں کی دھار کند ہو گئی اور خون بہانے والی طاقتیں دب گئیں۔ ایسی صورت میں گاندھی جی کی دھارمک سیاست کی غیر معمولی اثر انگیزی کا اعتراف ناگزیر ہے۔ اور اسے دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچنا بالکل صحیح ہے کہ ہماری موجودہ تکلیفیں بھی صرف گاندھی جی کے اس اخلاق آمیز سیاسی نسخے سے دور ہو سکتی ہیں جسے انھوں نے بڑے بڑے مذہبی نیتاؤں کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات سامنے رکھتے ہوئے ترتیب دیا تھا۔

سچ پوچھئے تو گاندھی جی اس وقت کے سب سے بڑے اشتراکی تھے۔ مگر ان کی اشتراکیت روسی اشتراکیت نہیں تھی، وہ غریبوں کے کسانوں کے مزدوروں کے سب سے بڑے ہمدرد تھے مگر ان

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

سحر رام پوری

رام پور کا ایک نوجوان شاعر

(۲)

سید سفارش حسین

سحر کی شاعری کا تانا بانا غم عشق اور غم روزگار سے مرتب ہوا ہے۔ غالب کے زمانے میں غم عشق اور غم روزگار ایک دوسرے کا بدل ہوا کرتے تھے۔ اب سحر کے وقت میں لازم و ملزوم ہوگئے ہیں۔ اسی غم عشق اور غم روزگار کے مرکب نے اس کی نظموں میں ملالت کی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ یہ داخلیت "تشنگی" میں بھی موجود ہے اور "غریب نوجوان" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے، اس میں بھی۔

سرمایہ دار دنیا　　ہنگامہ بار دنیا
با اختیار دنیا　　نخوت شعار دنیا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

طوفاں میں بہنے والا　　ہر چیز سہنے والا
کچھ بھی نہ کہنے والا　　خوددار رہنے والا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں
میری جواں امیدیں　　خواب جناں امیدیں
ہوں کامراں امیدیں　　ایسی کہاں امیدیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

مگر اس کی بعض نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے اپنا دامن چھڑا رہا ہے۔ "دو رنگی" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس میں اس کے آثار ملتے ہیں۔

اک زمانہ تھا کہ تعلیم تھی بے نام و نشاں
اک زمانہ تھا کہ تہذیب تھی بے روح و رواں

اب کہ تعلیم سے ہی عرش پہ انساں کا دماغ
اب کہ تہذیب کا ہر راہ پہ جلتا ہے چراغ

پھر بھی اٹھتی نہیں بھولے سے کوئی ایک نظر
گرلس اسکول کو جاتی ہوئی رکشاؤں پر
کیا یہ مزدور عنایت کے طلب گار نہیں
کیا یہ مجبور توجہ کے سزاوار نہیں

ایک اور نظم "بوڑھا" بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔

حسب عادت صبح صادق سے ذرا پہلے سحر
سیر کو نکلا میں نرم و گرم بستر چھوڑ کر
جا رہا تھا زندگی کا راز پانے کے لئے
بزم فطرت سے کوئی پیغام لانے کے لئے
جاڑے کا موسم تھا سحر مگر طلوع ہو رہا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ عالی شان کوٹھی کے قریب
باغ سے بچ کر، سڑک سے دور، نالی کے قریب
میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھری ہل رہی ہے بے سبب
دل ہی دل میں کہہ رہا تھا جانے اس میں کون ہے
ناگہاں حیراں بنایا اک کراہٹ نے مجھے
خوں رلایا اک مجسم کپکپاہٹ نے مجھے

سحر اس منظر کو دیکھ کر خون تو رویا مگر اس بوڑھے کو نظم کا عنوان بنانے کے سوا اسے کچھ [illegible] نہ سوجھا۔

[illegible] زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے انسان آ
آ بنا لوں میں تجھے عنوان اپنی نظم کا

میں نے کہا ہے کہ سحر میں احساس کی تیزی بھی ہے اور شدت بھی مگر ماحول سے وہ کچھ دب سا گیا ہے۔ یا ابھی اس سے جنگ کے لئے تیار نہیں۔ شاید کچھ زنجیریں ہیں جنھیں وہ ابھی توڑ نہیں سکا۔ اپنی نظم "زنجیریں" میں کہتا ہے۔

کس کی آنکھوں میں نہیں رسمی مروت کا فسوں
کس کے ہونٹوں پر نہیں لفظی محبت کا فسوں
کون سی شے میں نہیں ذہنی اذیت کا فسوں
اس قدر ذہنی اذیت ہے بتا سکتا نہیں
میں ابھی تیری طرف اے دوست آ سکتا نہیں
کون سے گیتوں میں ہے کچھ رنگ ماتم کے سوا
کون سی تانوں میں ہے کچھ تلخی غم کے سوا
الغرض دنیا نہیں کچھ اک جہنم کے سوا
یہ جہنم کیوں اسے جنت بنا سکتا نہیں
میں ابھی تیری طرف اے دوست آ سکتا نہیں
آنسوؤں کا ساتھ شب شبستانوں میں ہے
آرزوؤں کا ساحل پھولوں کے پیمانوں میں ہے
اک قیامت سی بپا افسردہ رجحانوں میں ہے
ایسے رجحانوں کا باعث؟ اب بتا سکتا نہیں
میں ابھی تیری طرف اے دوست آ سکتا نہیں
ایسی نظمیں جن میں ہوں ذروں کے بھی اونچے مقام
ایسی نظمیں جن میں ہوں موجوں کو طوفاں کے پیام
ایسی نظمیں وقت پر بس جن سے تلواروں کے کام
ایسی نظمیں کہہ تو سکتا ہوں سنا سکتا نہیں
میں ابھی تیری طرف اے دوست آ سکتا نہیں

اس جہنم کو جنت بنانے کا کام سحر کالج کے نوجوانوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اپنی نظم "کالج سے" کہتا ہے:-

منبع علم و ادب سرچشمۂ اوج و کمال
دیکھنا پیاسے نہ رہ جائیں وطن کے نوجواں
رہنمائے ہر توقع، رہبر ہر آرزو
دیکھنا رستہ بھٹک جائے نہ ان کا کارواں

یہ مدارات و مروت کو سنائیں زندگی
یہ مساوات و اخوت کی بہائیں ندیاں
یہ نہ ہو ہی کچھ کے چہروں سے امارت جلوہ ریز
کچھ کے چہروں پر ہیں غربت کے طمانچوں کے نشاں
کچھ کے جسموں پر ہے ملبوسات رنگیں کی بہار
کچھ کے جسموں پر گریباں چاک دامن دھجیاں
کچھ کی روحیں سازو سامان سکوں سے بہرہ ور
کچھ کی روحیں بے سروسامانیوں پر نوحہ خواں
یہ مٹائیں الغرض نام دو رنگی دہر سے
یہ اڑائیں صرف یکرنگی کے عالم میں نشاں

سحر یہ کام خود کیوں نہیں کر سکتا، اس کی نظم "بے عملی" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔

ہے خواب کتنا پیارا　　کشتی ہے اور کنارا
طوفاں نہیں گوارا

کتنا ہی کوئی ارماں　　دیتا رہے سہارا
طوفاں نہیں گوارا

کیا زندگی ہے اپنی　　کیا حال ہے ہمارا
طوفاں نہیں گوارا

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کو بے بس و مجبور بھی سمجھتا ہے۔

کیسی مسرور بہہ رہی ہے ندی
کتنے بشاش ہو رہے ہیں طیور
اور میں ہوں کہ سب کو اپنی طرح
سمجھے بیٹھا ہوں بے بس و مجبور

اس کی قنوطیت کا یہ عالم ہے کہ منزل مقصود کی آس تک بھی نہیں۔

وہ چلا بھونرا وہ اس نے ڈھونڈھ لی
ایک نورس، نو شگفتہ سی کلی
اور میں انساں مجھے حاصل نہیں
آس تک بھی منزل مقصود کی

بے بسی مجبوری اور یاس کا نتیجہ فرار، چنانچہ سحر کہتا ہے۔

ہوگی میرے ہی واسطے تا کے　　میری ہی زیست اس قدر بوجھل
جور ہوش و خرد کو دیکھیں گا　　اب کے چھلنے تو دو ذرا بادل

لیکن اس کی نظم "اعتماد" سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرار عارضی ہے۔

ایک پہاڑی کی چوٹی پر　　لمبی نوکیلی چوٹی پر
بیٹھے تھے دو شوخ پرندے　　ساتھ میں تھے دو سندر بچے

مادہ اڑ کر جھیل پہ پہنچی　　اک چھوٹی سی مچھلی پکڑی

بچوں نے جب آتے دیکھا　　اور اک مچھلی واسطے جھپٹا

کھول دیں اپنی ننھی چونچیں　　دینے لگے ماں کو آوازیں

مگر ماں
پیٹ بھر دینے کے بدلے　　کرنے لگی کچھ ان کو اشارے
بچے ماں کی حاصل کی ہوئی مچھلی سے پیٹ بھرنے کے
خیال میں تھے مگر ماں نے
ٹھونگیں ماریں اور پھر چیخی　　چیخی اور پھر اڑ کر چل دی

ابا کی اس کے مانند بچے　　خوش ہو ہو کر تقلید کرتے
اس کا نتیجہ
جو کچھ ان میں مچھلی کے ٹکڑے　　پہلے ہی ابھرے ابھرے سے
اب رنگین تھی ان کی دنیا
اب اپنے خود پر تھا ان کو بھروسا

ایک قطعہ میں کہا ہے
تو ہے جوان خیال جوان عزم ہوش مند
ہمت نہ توڑ کوشش ناکامیاب پر
درماندگی کی نذر نہ کر ذوق رہبری
بیداریاں نثار نہ کر ایک خواب پر
اس لئے امید ہو سکتی ہے کہ سحر اپنے کو فرار سے
بچائے گا
سحر ادب میں "تنگ نگاہی" کا قائل نہیں۔ اس کا
ایک قطعہ ہے
جو پرستار ہوں قوافی کے
جن کی دنیا رہے ردیفوں تک
ایسے احباب کی رسائی کیا
میری تخئیل کی اڑانوں تک
اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا رجحان ترقی
پسند ہے۔ مگر اُسے اُس نے فیشن کے طور پر قبول
نہیں کیا ہے۔ ایک غزل کے مقطع میں کہتا ہے۔
سحر "فسانہ شمع لحد یہ تیار حیات"
مرے خیال کی محفل میں باریاب نہیں
یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں خصوصاً غزلوں میں
روایتی ترکیبیں اور خیال نہیں ملتے پھر بھی اس کی
غزلوں میں اچھے شعر ملتے ہیں
محبت کا صلہ اور ٹھوکروں سے
اسی کا نام ہے شاید زمانہ
یہ ہنگامہ رنگ و بو کی ذہنیت
زرا کلیوں کو ہنس کر گدگدانا
کسی چنچل ہنسی نے بھی نہ جس کے ہوش اڑائے ہوں
فرشتہ ہو تو ہو لیکن وہ انساں ہو نہیں سکتا
یہ اگر سچ ہے کہ دل اس غم کے شایاں ہو گیا
موت کہتے ہیں کسے جینے کا ساماں ہو گیا
عالم یاس میں اک آس دروں لئے ہوئے مٹھاس
جس کے لئے سحر کے پاس لفظ تو ہیں زباں نہیں
نہ جانے کب سے ہیں سحر کا بھید پا کے بھی ناسمجھ بنیں گے
نہ جانے کب تک رہے یہ خامی جنوں کی ترتیب داستاں میں
یوں ہی بھلا دیا ہے تو دم پہ بنی رہی
بالکل ہی بھول جاؤ کہ انھیں ایک ہی تھا
وہ لمحے بھی بسر کرنے پڑتے ہیں

کر اشکوں سے بھی جی بہلا نہیں ہے
مجموعی طور پر سحر کی شاعری اس وقت
تشکیل پذیری کی حالت میں ہے وہ ابھی ذہنی
کش مکش اور داخلیت سے پورے طور پر دامن چھڑا
نہیں سکا ہے۔ مگر آثار بتاتے اور قرائن سے پتہ
چلتا ہے کہ وہ جلد اس میں کامیاب ہو جائے گا۔
اس کے ہاں کھلی ہوئی ترکیبیں، اچھی بندشیں
اور حسین تشبیہیں ملتی ہیں، مگر کہیں کہیں کچا پن بھی نظر
آتا ہے، اس کی نظم ڈھانچ کا ایک بند ہے
آج کلیوں میں چھپے تا کوئی بھونرا آکر
آج پھولوں میں رہے تا کوئی جھونکا آکر
آج آنکھوں میں بسے تا کوئی جلوہ آکر
آج آہوں میں بسے تا کوئی نغمہ آکر
ایک میدان میں پڑا ہے کسی چوپائے کا ڈھانچ
سحر کے فن میں ایسے امکانات نظر آتے ہیں کہ
اگر اسے مناسب ذہنی ماحول اور مطالعہ کے مواقع
بہم ہو گئے تو وہ ایک اچھا فن کار ہو سکے گا۔ لیکن مناسب
ذہنی ماحول اور مطالعے کے جواب میں سحر نے کہا ہے کہ
بد نصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں
ذوق سے لطف اندوز ہونے والوں کے پاس
جن کے متعلق سحر نے کہا ہے۔
کوئی بھی ہے نام لیوا قوم کا
کچھ بھی کہہ سکتے ہیں اُن افراد کو
فن سے لطف اندوز ہو ہر کس مگر
کیا غرض جس حال میں فن کار ہو
اس کا جواب ہے۔

پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

نظر نہیں آئی، اس لئے اگر پاک پنجاب کو انتشار سے
بچانا ہے۔ اس میں سیاسی تنظیم باقی رکھنا ہے
اور اس کے عوام کو ریت کے ذروں کی طرح ہواؤں
میں بکھرنے نہیں دینا ہے تو ہمیں لامحالہ پاکستان
مسلم لیگ کے صدر کے اس اعلان کا خیر مقدم کرنا
ہوگا۔
"مسلم لیگ کے ارکان اپنے اختلافات ختم کر دیں
آپس میں متحد ہو جائیں اور جو تخریبی رجحانات اس
وقت صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا مقابلہ کریں"
آفاق ہفت روزہ مورخہ ۱۳ مارچ

مہاجرین اور جداگانہ نمایندگی کا مسئلہ

"مہاجرین اور غیر مہاجرین۔ تاریخی تمدنی اور مذہبی
اعتبار سے ایک قوم ہیں اور ان کا وطن بھی اصلاً ایک
ہی ہے۔ نقل آبادی غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ ہے
اس لئے مہاجرین کو ایک الگ قومی وجود سمجھنا اور انھیں
جداگانہ نمایندگی دینا کسی لحاظ سے ٹھیک نہیں۔ اس سے
ملی وحدت میں انتشار پیدا ہوگا۔ اور مہاجرین بھی
نقصان میں رہیں گے۔
پاکستان کی اسلامی جمہوریت میں اقتدار و حاکمیت
کے تمام اداروں پر پاکستان کے شہریوں کا بلاتمیز و تفریق
تسلط ہونا چاہیئے۔ کسی ایسی حکمت عملی کو فروغ دینے کی
کوئی وجہ موجود نہیں ہے جس سے پاکستان کے نووارد
شہری پرانے باشندوں کے مقابلے میں کسی خسارے
میں مبتلا ہو جائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مہاجرین کو جداگانہ
نیابت، حق رائے دہندگی میں خاص مراعات دینے سے
ہماری مستقل اور متحدہ قومیت کو کوئی صدمہ تو
نہیں پہنچے گا، اور ایسے امتیازی سلوک سے مہاجرین
کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟!
مہاجرین کو علیحدہ نیابت یا خاص مراعات دینے سے ایسی
تفریق پیدا ہو جائے گی جو دن بدن ترقی کرتی ہوئی ایک
مستقل خلیج بن جائے گی۔ اجتماعی نفسیات کی رو جب ایک
علیحدہ رخ اختیار کر لیتی ہے تو اس کے بہاؤ کو روکنا آسان
نہیں ہوتا۔ یہ ایک تفریق کئی نئی تفریقوں کا باعث بنے گی۔
خود ضلعوں کے اندر علاقوں اور نسلوں کی تفریق ظاہر ہوگی
مذہبی فرقے یعنی شیعہ سنی، وہابی، احمدی وغیرہم علیحدہ علیحدہ
حقوق کا مطالبہ کریں گے۔ صوبائی تفریق کو فروغ ملے
گا جو محنت و کاوش سے کسی کر جو وحدت حاصل کی گئی ہے
پارہ پارہ ہو جائے گی۔ دنیا میں مسلمانوں کے زوال کی
تاریخ کا آخری باب قیام پاکستان نے تہہ کر دیا تھا
مہاجرین و غیر مہاجرین کی تمہید سے پھر اسی تاریخ کے
باب اول کا افتتاح ہو جائے گا۔"
آفاق ہفت روزہ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۹ء

ہندوستانی مسلمان (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ان کی تہذیبی، اخلاقی، روحانی زندگی ان کی مادی اور
معاشی زندگی صرف اسی آزادی، رواداری اور تحفظ
کی فضا میں پنپ سکتی ہے جو ایک غیر مذہبی جمہوری
اشتراکی ریاست میں پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا جو
فضا بھی ہو۔ اس میں یا تو ان کی روح مسخ ہو جائے
گی یا ان کا جسم مرجھا کر ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان اس مقصد عین
کو حاصل کرنے کے لئے اپنی کوئی ملی الگ سیاسی پارٹی بنائیں
اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ جو پارٹی غیر مذہبی جمہوری
ریاست کو نصب العین حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا چاہتی
ہے اس کا کسی ایک مذہب کے دائرے میں محدود
ہونا خود اس کے مقصد کی نفی ہے۔ اس کے علاوہ
مخلوط انتخاب کا اصول نافذ ہونے کے بعد کسی فرقہ واری
پارٹی کے لئے، خصوصاً کسی اقلیت کی پارٹی کے لئے
کامیابی کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں جو شخص ذرا سے
نام سیاسی عقل بھی رکھتا ہوگا وہ یہی سمجھے گا مسلمانوں کو
اپنی جداگانہ سیاسی پارٹی بنانے کے بجائے اس پارٹی کے
ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے جو ان کی طرح غیر مذہبی
جمہوری اشتراکیت ریاست کے خواب کو جیتی جاگتی صو
رت حقیقت بنانا چاہتی ہو۔
وہ پارٹی کون سی ہو سکتی ہے اس پر ہم آئندہ
ہفتے بحث کریں گے۔

کشکول محمد علی شاہ فقیر

مسز تاشین نفیس بیل بنت سروجنی نائیڈو کی ایک نظم "محمدان ہنر فیسٹیول" کے ایک بند کا ترجمہ سنئیے:۔

"آؤ ہم تم مل کر مارچ کی صبح کا لطف اٹھائیں۔ فضا میں گرمی ہی، تیزی اور تندی ہے، جوش اور ولولہ ہے۔ کائنات کی ہر شئے بے دھڑک، بے جھجک سرخوشی کے عالم میں زندگی کے اور محبت کے لئے مچل رہی ہے۔"

بلیک انگریزی شاعر کی ایک نظم جو تقریباً اٹھارھویں صدی کے آخری دھائے میں رکھی گئی ہے۔ یہ بالکل ہی موجودہ نسل کے حسب حال ہے۔ میں نے یہ نظم لکھنؤ کے ایک بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے شاعر سلمہ اللہ تعالےٰ کو بھیج دی۔ موصوف نے لفظی ترجمہ کرکے بھیج دیا۔ اور دو شعر اسی رنگ میں اور جوڑ دئے تاکہ اردو میں کچھ مطلب اور واضح ہو جائے۔

ڈیڑھ سو برس کی نظم اور اس میں ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ اور ینگ کا رنگ! معلوم ہوتا ہے کہ تحلیل نفسی کی عمارت کا پتھر بلیک ہی نے رکھا تھا اس جاندار الٰی میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ اب اس نظم کا نظام حسب ذیل ہوگیا۔ پہلے بلیک کا ترجمہ اس کے بعد ایک شعر استاد مدظلہ العالی کا پھر دس اشعار ایک تو سکھیے کے پھر آخری شعر ایک ذرا سے تصرف کے ساتھ استاد کا۔ لیجئے سنئے۔

بلیک

مری ماں درد سے چلاتی تھی روتا تھا باپ
میں جب اس دہر پر آشوب میں کود ا ناچار
چیتھڑا تن پہ تھا کرتا تھا میں ٹیہوں ٹیہوں
بدلی کی اوٹ سے شیطان کی جیسے للکار
جب لیا باپ نے ہاتھوں میں تو مچلا کیا کیا
تاکہ آزاد جکڑ بند سے ہوں کپڑوں کی
تھک گیا اور یہ سوچا کہ یہی بہتر ہے
ماں کی چھاتی پہ پڑے رہیے اداس اور خفا

استاد

ابتدا تھی یہی شاید مری سرتابی کی
قید ہر قسم کی ہے فطرت انساں پہ گراں

تو سکھیا

ضد ادھر روک ادھر پڑ گئی بنیا و عیوب
عیب جتنی ہوں کہ ہوں دوسرے پہلو کے عیاں
غدر معقول فرائڈ نے گناہوں کے لئے
کردئے پیش ہوئے جس سے خلائق شاداں
اثم و عدوان سے گر اب بھی کوئی شرمائے
لوگ ہنس ہنس کے کہیں اس کو کہ ہے یہ ناداں
اک طرف جوش حیات آدمی کو اکسائے
دوسری سمت سے شاباش پکارے شیطاں
فلسفی غدر و وکالت کے لئے حاضر ہے
اور سائنس کرے روگ کی تحقیق آساں
ہے مزا یوں تو گناہوں کے سبھی شعبوں میں
عشق کا لطف مگر اور گناہوں میں کہاں
ہے ذری سخت مگر قید حلال اور حرام
آنکھ سی کچھ خیر نکل جاتا ہے خوف یزداں
کر حقیقی و مجازی میں ذری کھال کھیچ
یہ تو ہے صاف ترے شوق کے خاطر میداں
لے تصوف سے مدد فلسفہ و منطق سے
دے ثبوت اس کا کہ ہے زیست سراسر تاواں
پھاند پھر چوک کے دریا میں شناور ہے اگر
احتیاطاً ہے یہ شعر مگر ورد زباں

استاد (بہ تخفیف تصرف)

قید دنیا میں رہے پیار محبت ہر دم
یہ نہ ہو تو کبھی انساں نہیں بنتا انساں

روس کی پالیسی کے اوپر ایک مرتبہ چرچل نے ایک جملہ کہا تھا، اس کا ترجمہ نئی روشنی کے ایڈیٹر کی تتبع میں کیا گیا تھا۔

جھمیلے کے میلے میں گڑبڑ جھالے کا بازار ہے۔ گورکھ دھندوں کا بیوپار ہے۔

"مسلمان، یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے بے شک یہ لوگ اپنے رب کا بنا اجر پائیں گے تو ان کو کچھ خوف ہوگا نہ کچھ غم ہوگا۔" یہ آیت (۶۲) باسٹھویں آیت آٹھویں رکوع پر سورۂ بقر میں ہے۔ اور پھر یہی آیت بہترویں (۷۲) آیت آٹھویں رکوع پر سورہ مائدہ میں ہے اور پھر یہی آیت کچھ اختلاف معنی اور الفاظ کے ساتھ سورۂ حج میں سترھویں (۱۷) آیت ہے۔ اس آیت کے منسوخ ہونے کا گمان بھی نہیں ہے، کیونکہ سورۃ مائدہ جہاں تک خیال پڑتا ہے تنزیل کی رو سے آخری سورۃ ہے۔ اور پھر یہ آیت بہ تکرار آئی ہے۔ اس آیت کے سلسلے میں لوگ پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج عبداللہ ابن یوسف علی نے "صابئین" کی بڑی تحقیقات کی ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ بہت مفسرین اختلاف کریں گے کہ لفظ "صابئین" کے معنی ہیں از روئے قیاس نیک نیت زرتشتی، وید کے ماننے والے۔ بودھ، کنفیوشس اور دوسرے اخلاق کے معلمین کے پیرو بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔

سوات

آبادی دس لاکھ، پہلے والی کا نام عبدالودود، رقبہ ۴ ہزار میل مربع۔ سنہ ۱۹۰۷ء تا لاکنڈی لڑائی میں لڑتے لڑتے ایک ولایت کا ڈھانچہ تیار ہوگیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں حکومت قائم ہوگئی۔ ٹیلیفون، بجلی[۲]

ہماری موجودہ سیاسی وتمدنی بیماریوں کے لئے گاندھی جی کا نسخہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

ہمدردی تشدد کے راستے پر چلنا شاپ سمجھتی تھی۔ ان کی زندگی کی ہر سانس کراہتی ہوئی کچلی ہوئی مخلوق کو ابھارنے میں صرف ہوتی تھی۔ مگر دوسروں کو زخم لگا کر نہیں۔ مظلوم طبقوں کی آہوں اور کراہوں سے ان کا دل بھی دکھی ہوتا تھا۔ اور وہ بھی یہ الم انگیز صورت حال ختم کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اس کی شکل ان کے نزدیک یہ نہیں تھی کہ وہ مظلوموں کی فہرست میں اور اضافہ کردیں۔ بلکہ وہ اپنے پریم کے فلسفے کے ذریعے سے ظالموں کی نفسیات بدل دینا چاہتے تھے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے اس بلند سیاسی مسلک کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں۔ حقیقت شناس معاملہ فہمی کا تو یہ فیصلہ ہے کہ ان کی اس حکیمانہ دھار مک سیاست سے اگر ہم سچے طور سے متاثر ہو جائیں تو پھر نہ رشوت کی گرم بازاری رہ سکتی ہے نہ چور بازاری کا زور شور باقی رہ سکتا ہے اور نہ فرقہ وارانہ رجحانوں کی چیرہ دستی ہمیں تنگ کرسکتی ہے۔ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر عالمی سیاست کے ذمہ دار گاندھی جی کی سیاسی زندگی کے متعلقہ ورق برابر اپنے پیش نظر رکھیں تو پھر امریکہ و روس کی موجودہ رقابتیں جو ہر وقت ایک تیسری جنگ عظیم کی دھمکی دیتی رہتی ہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ اور امن و صلح کی ہوائیں ہر وقت چلنے لگیں۔ اسے کون نہیں مانے گا کہ تشدد سے تشدد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایٹم بم یا مہلک گیسوں کے بل سے شانتی و چین نہیں ہو سکتی پھر ایسی حالت میں موجودہ مادیت کی آفریدہ ہنسا کی خوفناک قوتوں کو گاندھی جی کے اخلاقی "اہنسا" کے سوا اور کس سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے تیز نظر مفکروں نے اس حقیقت کا احساس کرلیا ہے کہ جب تک ہماری زندگی میں اخلاقی قدروں کو مناسب مقام نہیں دیا جائے گا۔ ہماری سیاسی بداعمالیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ہمارے سماج کو جو روگ لگائے جارہے ہیں انھیں دور نہیں کیا جاسکے گا۔ روسی کمیونسٹوں اور دوسرے تشدد پسند رہنماؤں کے علی الرغم انھوں نے اپنی تقریروں سے اپنی تحریروں سے اس دھارمک خیال کی تبلیغ شروع کردی ہے۔ یہ بھی گاندھی جی کے اسی اخلاقی فلسفہ کی واضح کامیابی ہے جس کا پہلا سبق یہ ہے کہ قول اور عمل دونوں میں سچے بنو، ایماندار بنو، سیاسی میدان میں جو قدم اٹھاؤ اسے اخلاقی معیار پر جانچ کر اپنا مدعا حاصل کرنے کے جو طریقے بھی اختیار کرو انہیں سچائی کی ترازو پر تول کر اور اگر تم سے اس راستے میں لغزش ہو جائے تو جرأت کے ساتھ اس کا اعتراف کرلو اور موقع کے مناسب کفارہ کی صورتیں اختیار کرو۔

ہوسکتا ہے کہ ابھی دنیا کچھ دنوں اسٹالن، ٹرومین

---

۲ تعلیم سب ہی کچھ ہوگیا۔ عبدالودود ان پڑھ تھے، اور شاید آج بھی ویسے ہی ہوں۔

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

اور چرچل کے خود غرضانہ سیاسی منصوبوں کے فریب میں مبتلا رہیگے اور نقصان اٹھائے لیکن ان کا کھوکھلا پن جلد ہی ظاہر ہو کر رہے گا اور پھر اسے اپنی زندگی کی دکان چلانے کے لئے مذہب، اخلاق ہی کے دروازے سے آسائشوں کی بھیک مانگنا پڑے گی اور اپنے روگ دور کرنے کے لئے تمام دواؤں سے تھک کر پھر اسی ہندوستانی اہنسا کے دیوتا کا نسخہ پینا ہوگا۔

ہندوستان کی قوت حیات

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

جو ظاہر ہوں گی لیکن ہم کبھی اس بات کو نہیں بھولے کہ ہمارا اصل مقصد ہندوستانی قوم کی عام سطح کو بلند کرنا ہے۔ نفسی حیثیت سے، روحانی حیثیت سے اور اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی حیثیت سے بھی ہمیں جس چیز کی فکر تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں میں یہ اندرونی قوت پیدا کر دیں پھر دوسری چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ ہمیں مغرور بدیسی حکومت کی اس شرمناک غلامی اور بزدلانہ اطاعت کا داغ مٹانا تھا جو ہم کئی پشتوں سے کر رہے تھے۔ (نیشنل ہیرلڈ)

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی (جامعہ)
مطبوعہ سعید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۳ | یکم اپریل سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید عابد حسین

اخبار نویسی اور اس کے فرائض

خواجہ الطاف حسین حالی

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب رستہ صاف ہو تو اچھلتا کودتا چلے اور جب راستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے نہ دیوار و در سے اڑ ملے چلے نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے اگر چارہ کم کر دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب نقان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔" سوداگر نے کہا" چند روز صبر کر اگر خدا تعالے نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا۔"

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہیئے۔ کیونکہ قاضی میں صرف دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔ ایک اس قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے۔ دوسرے انصاف، بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے۔

اخبار نویس قطع نظر اس کے کہ قوم کا ناصح، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے وہ ایک قسم کا تاجر بھی ہے۔ جس کو کم از کم مصارف اخبار اور اپنے حوائج ضروریہ کے لئے اپنی محنت کا معاوضہ ملک سے وصول کرنا پڑتا ہے۔ پس جس طرح آزادی، انصاف اور دیانت اس کی ذات میں ہونی ضرور ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے انداز بیان اور طرز تحریر میں ایک قوت مقناطیسی کا ہونا بھی ضرور ہے جس سے وہ پبلک کے دلوں پر فتح حاصل کر سکے۔ مگر جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں۔ جہاں ظرافت اور مسخرگی اور استہزا واقعات اور حقائق سے زیادہ مرغوب ہوں، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر پھبتیاں کہنا، اصل حسن بیان سمجھا جائے۔ جہاں گورنمنٹ پر بے جا اور اندھا دھند نکتہ چینی کرنے کا نام آزادی رکھا جائے وہاں باوجود آزادی و انصاف و دیانت کے پبلک کے دلوں کو مسخر کرنا قریب ناممکن کے معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کے دیسی اخباروں کی عام حالت گو گورنمنٹ کے نزدیک اور کیا ملک کے لائق آدمیوں کے نزدیک اب تک بہت بری سمجھی جاتی ہے لیکن جس طرح کسی بستی میں زیادہ تر بوسیدہ اور شکستہ اور کھنڈر مکانوں کا ہونا اس بستی کے افلاس پر دلالت کرتا ہے یا کسی ملک کی شاعری میں زیادہ تر ہزل، جھوٹ اور بے تہذیبی کا پایا جانا ملک کے مذاق فاسد پر گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح اخباروں کا بری حالت میں ہونا اخبار نویسوں کی بے سلیقگی کی نسبت زیادہ تر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے باینہمہ اخبار نویسوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو اگر وہ فاسد ہے تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجے کا صحیح بنا دیں۔ اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا یہ کہ ایڈیٹر میں چلانے کی لیاقت نہیں ہے بلکہ اس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے لوگ اخبار کے ذریعے سے آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش سمجھ کر جاری کر لیا ہے یا یہ کہ ایڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چونکہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے اس لئے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا بلکہ زمانے کے تیور دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کس بات کو ناپسند اور جو طریقہ ان کے مذاق کے موافق ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ پہلی صورت میں سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک بد آواز مؤذن کو کچھ دے دلا کے اذان کہنے سے روکا گیا تھا۔ اسی طرح ایسے ایڈیٹروں کے لئے لوگ چندہ کرکے کچھ تنخواہ اس شرط پر مقرر کر دیں کہ وہ مہربانی کرکے کبھی اخبار نہ نکالیں۔ انھوں نے اپنی طاقت کے اندازہ کرنے میں دھوکا کھایا ہے اور اپنے لئے پیشہ انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے جیسے کوے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی۔ لیکن دوسری صورت میں ایڈیٹر سخت الزام کے قابل ہیں، وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں اس کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ طبیب ہو کر لوگوں کو مہلک دوا دیتے ہیں ان کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو بیماروں کو دوا اور پرہیز ان کی مرضی کے موافق بتاتا ہے، اور ان کو خوش رکھنا چاہتا ہے نہ کہ تندرست کرنا، ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تماشا گر جو اچھا تماشا دکھاتا ہے، ایک خدمت گار جو ہوشیاری اور سلیقہ سے کام کرتا ہے، ایک طوائف جو اچھی طرح ناچتی گاتی ہے۔ ایک مسخرہ جو اپنے مسخرہ پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے، روپیہ کمانے میں وہ علماء اور حکماء اور اہل کمال سے اچھے رہتے ہیں۔ پس ایڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعوے کرتا ہے اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لئے اپنے اخبار کو پبلک کے مذاق فاسد کا تابع رکھنا چاہتا ہے تو وہ مذکورہ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

(مضامین حالی)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
اخبار نویسی اور اس کے فرائض	خواجہ الطاف حسین حالی	۱	۳۔ پاکستان	ص، خ	۶
			جبر حیات	اختر انصاری	۷
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک مہدی	۲	غزل	چودھری عشرت حسین	۷
ہندوستانی مسلمان	اداریہ	۳	مسیح و خضر کے نام	خلیل الرحمن اعظمی	۷
بزم بے تکلف		۳	ہریجن کا ست	ک، ع، مشہود الا	۸
پچھلا ہفتہ			پیمان وفا		۹
۱۔ باہر کی دنیا	م، م	۴	کشکول	محمد علی شاہ فقیر	۱۰
۲۔ ہندوستان	ع، ع	۵	مختصر تبصرے	سید احتشام حسین	۱۱

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

پت جھڑ

خوب صورت پتے ایک ایک کر کے گرتے جاتے ہیں اور باغ سونا ہوتا جاتا ہے۔ گاندھی، سپرو، سروجنی نائیڈو، سید حسین، انصاری جیسی شریف اور شاداب شخصیتوں سے چمن کی بہار تھی۔ یہ ایک طرف ہندوستانی تہذیب کے بہترین پھل تھے اور دوسری طرف اس کے باغ کے مالی بھی تھے۔ ان کی ذات میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کا سنگم تھا بلکہ انھوں نے مغرب کی جاندار تہذیب میں سے بھی بہت کچھ لیا تھا۔ ان کی شخصیت کا حسب توفیق، یہ کمال تھا کہ باوجود مرکزی ہندوستانی ہونے کے ان میں ایک عالم گیر انسانیت کا جلوہ نظر آتا تھا جو نسل اور وطن اور جغرافیہ کی حد بندیوں سے بلند ہوتی ہے۔ ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ اگر مستقبل کی تقدیر میں بہتر انسانوں کی تخلیق لکھی ہے تو وہ اسی قسم کے سانچے میں ڈھلے جائیں گے ...... خوش نصیب ہے وہ ملک جو دو نسلوں کی مختصر عمر میں ٹیگور، اقبال، گاندھی، سروجنی، سپرو، راجگوپال، جواہر لال، آزاد، راج گوپال آچاریہ، ذاکر حسین جیسے انسان پیدا کر سکے۔ دوسرے ملکوں نے ہم سے بہتر سائنس داں، مصنف، صناع، مصور، ماہرین فن ضرور پیدا کئے ہیں لیکن اس عرصے میں اُن سے بہتر انسان پیدا نہیں کئے ...... اکثر سوچتا ہوں کہ ان کی جگہ کون لے گا۔ اس قد و قامت کے انسان ملک کے کس گوشے میں پل رہے ہیں؟

اور انسان مرگیا!

اچھے اور بڑے انسانوں کے ذکر کے سلسلے میں مجھے ایک تازہ تصنیف کا خیال آیا جس کا میں آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اردو کے ایک نوجوان ادیب رامانند ساگر نے گذشتہ فسادوں کی قیامت سے متاثر ہو کر ایک ناول لکھا ہے جو حال ہی میں "اور انسان مرگیا" کے نام سے شائع ہوا ہے (نو ہند پبلشرز بمبئی۔ ضخامت ۲۶۲ صفحے) "متاثر ہو کر" تو ایک ہلکا سا لفظ ہے جس سے اس کیفیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا جس میں سے گذر کر مصنف نے اپنے دل اور دماغ کے خون سے اس ناول کو لکھا ہے۔ خود اسی کے الفاظ میں ناول کے مختلف کرداروں کی زندگیاں ذہنی طور پر مجھے خود بھی بنانی پڑیں۔ اُن کے ساتھ پاگل ہونا پڑا، اُن کے ساتھ کئی بار خود مرنا پڑا" اس نے لاہور میں امرتسر میں دہلی میں ان واقعات کو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے اور جسم پر جھیلا ہے وہ سب بھی دیکھا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصوں میں جو کچھ ہوا ہے یہ تصویریں اور تاثرات اس کے دل اور دماغ میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے کوئی چھرا انسان کے جسم میں پیوست ہو جاتا ہے اور ان کو نکالنے کی کوشش میں گوشت اور خون کے ٹکڑے بھی ساتھ نکل آتے ہیں۔ ساگر کے دماغ کی جلن اور دل کے خون نے ہر سطر اور ہر صفحے کو سیاہ اور رنگین بنا دیا ہے۔ اس کے دماغ کے توازن کو درہم برہم کر دیا ہے لیکن باوجود اس قنوطیت کے جس کا وہ خود معترف ہے اس روح فرسا تجربے نے بھی اس کی انسانیت اس کی انسانی قدروں کو پاش پاش نہیں کیا اور کہانی کے گھپ اندھیرے میں اس میں چند انسانی کردار آنند، کشن چندر، مولانا، رشی کے بلند میناروں کی طرح اُمید کا چراغ روشن رکھتے ہیں۔ باوجود واقعیت نگاری کے جس کا بیان خود برداشت کی حد سے باہر ہے، اس میں شرافت اخلاق اور انسانیت کی ابدی قدروں کی ایسی بے باک ترجمانی کی گئی ہے کہ ایمان اور عقیدے کی شمع بجھنے نہیں پاتی ...... ناول کا ہیرو آنند لاہور کا ایک نوجوان ہے جسے محلے کے ہندو لوگوں نے ایک ناکے پر چھپا رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کا حملہ ہونے پر اپنے "ہم قوم" بھائیوں کو خطرے سے آگاہ کرے اور ان کی طرف سے لڑے۔ رات کی تاریکی اور تنہائی میں بیٹھا ہوا آنند سوچ رہا ہے کہ اس کے "ہم قوم" دراصل کون لوگ ہیں:۔

"کیا اس محلے میں بسنے والے یہ دکاندار ساہوکار اس کی قوم ہیں جن میں سے ایک بھی شاعر نہ تھا ایک بھی شعر فہم اور صاحب دل نہ تھا جن کی بھیڑ میں گھرا ہونے کے باوجود وہ اکیلا تھا؟ کیا یہ اس کی قوم تھی جس کے افراد آگ بجھانے کی کوشش میں شہید ہو جانے والے اجیت کو ڈرپوک اور کاہل سمجھتے تھے اور خود انسان کے خون کی پیاسی برچھیاں اٹھائے پھر رہے تھے؟ ...... نہیں یہ میری قوم نہیں ہو سکتی ...... ہندوستان کے ہاں پیدا ہو جانے سے کسی قوم کی حد بندی کا تعین نہیں کیا جا سکتا کسی کی قوم اس کے ذہنی ساتھیوں پر مشتمل ہوتی ہے خواہ ساری دنیا میں اس کا ساتھی ایک ہی ہو ......

وہ اپنے ہم قوم ساتھیوں کی فہرست تیار کرنے لگا سب سے پہلا نام اس کے ذہن میں بابو لابھ سنگھ کا آیا جالندھر کانگرس کمیٹی کا صدر جسے اسی وقت قتل کیا گیا جب وہ لڑتے ہوئے فسادیوں کے عین درمیان کھڑا انھیں اخوت و محبت کا پیغام دے رہا تھا۔ بابو لابھ سنگھ میرا ساتھی تھا اشوک میرا ساتھی تھا جس نے ہمیشہ کے لیے جنگ و جدل بند کرنے کی کوشش کی۔ اکبر میرا ساتھی تھا جس نے مختلف مذاہب کو ملا کر ایک بین القومی مذہب کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ...... میرا ساتھی وہ اقبال تھا جس نے کہا تھا

تو آزادی ہی پوشیدہ محبت میں

...... اسیر امتیاز ما و تو ہونا

وہ ٹیگور جس نے کہا تھا کہ محبت پر اعتبار کرو خواہ اس کے

سے تمہیں غم کیوں نہ ہونا پڑے۔ وہ میرا ساتھی تھا جو آج بھی میرا قریب ترین رشتہ دار سہیل عظیم آبادی ہے جس نے بہار کے فسادات میں ہندوؤں کے ہاتھوں بالکل تباہ و برباد ہو جانے کے بعد لکھا ہے لوگوں کو فکر ہے کہ ہندو مر رہا ہے، مسلمان مر رہا ہے اور مجھے فکر ہے کہ ہندوستان مر رہا ہے، انسانیت مر رہی ہے اور وہ شریف جذبات مر رہے ہیں جو ہزاروں سال کے ارتقا کے بعد آدمی نے پیدا کئے تھے ...... میری قوم میں کرشن چندر شامل ہے جس نے بنگال کے درد سے دکھی ہو کر ایک چیخ بلند کی تھی اور اس چیخ کا نام تھا "ان داتا"۔

اور ایک موقع پر مولانا مسجد میں اذان دیتے ہیں۔ اس کے بعد نماز ادا کرنے سے پہلے جان پر کھیل کر چند ہندو عورتوں کو بچانے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ آنند اعتراض کرتا ہے کہ اس طرح نماز چھوڑ کر چلا جانا کہاں کا مذہب ہے۔ مولانا جواب دیتے ہیں:۔

"تم میرا مذہب نہیں سمجھ سکتے۔ صرف نماز ہی کا نام مذہب نہیں اور نہ انسان کو محض خدا کی حمد گاتے رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کام کے لئے ملائکہ اور فرشتے بہت سے تھے۔ انسان کو انسانیت کی خدمت کرنے اور خدا کی اس کائنات کو خوب صورتی، خوشی اور پیار سے بھرنے کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہی اس کا حقیقی مذہب ہے"

اور انسان مرگیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جب تک اس قسم کے خیالات زندہ ہیں اور ان کے ماننے والے موجود ہیں انسان نہیں مر سکتا!

حالی کی وصیت

اردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث اس کالم میں کئی دفعہ آ چکی ہے اور میں نے اردو کے معاملے میں ہندی والوں کو فیاض دلی کا مشورہ دیا ہے۔ اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو ہندی کی طرف وسعت قلب کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے اور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے حکومت اور "اکثریت" کے خوف یا خوشامد میں نہیں (جیسا آج بہت سے لوگ کر رہے ہیں) بلکہ خلوص نیت کے ساتھ ایک وسیع ادب اور تہذیب کا مطالعہ کرنے کے، ہندوستانی کو بنانے اور خود اردو کو مالا مال کرنے کے خیال سے ...... آج سے شاید ۶۰ سال پہلے حالی نے اس بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا میں وہ اردو والوں کی نذر کرتا ہوں:۔

"مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کے بجائے برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں ...... کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار سال سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ...... اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلے سنسکرت ......

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم اپریل ۱۹۵۰ء

ہندوستانی مسلمان

(۳)

اوپر جو بحث ہو چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مقصد غیر مذہبی جمہوری اشتراکی ریاست کے تصور کو جو ہند کے مجوزہ دستور میں پیش کیا گیا ہے عملی جامہ پہنانا ہے۔ اس لئے کہ صرف اسی ریاست کے اندر انصاف، آزادی اور رواداری کی فضا میسر آسکتی ہے جس میں ان کی روح اور جسم دونوں پنپ سکیں، یعنی ایک طرف وہ اپنی مذہبی اور اخلاقی خصوصیات کو برقرار رکھ سکیں اور دوسری طرف ملک کی عام سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی میں برابر کا حصہ لے سکیں۔ اس مقصد کے لئے مذہب کی بنیاد پر الگ سیاسی پارٹی بنانا ہر صورت میں ایک خیال محال ہے۔ اور ایسی صورت میں جب کہ انتخاب مخلوط ہو ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

کا مصداق ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو کسی غیر مذہبی سیاسی پارٹی میں شریک ہونا ہی چاہئے جو اشتراکی جمہوری ریاست کی حامی ہو۔

اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے کہ مسلمان کس پارٹی میں شریک ہوں ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ سیاسی پارٹیاں ایسے ادارے ہیں جن کے ارکان، لیڈر، مقاصد اور طریق کار بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کسی فرد یا جماعت کی کسی سیاسی پارٹی میں شرکت دائمی اور غیر مشروط نہیں بلکہ موقت اور مشروط ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کو سیاسی پارٹیوں کی موجودہ تقسیم پر ہر پہلو سے غور کرکے شرکت کا فیصلہ کرنا ہے ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ اس وقت تک کے لئے جب تک ان کی یہ تقویم باقی رہے۔ اصل مقصد جمہوری اشتراکی ریاست ہے۔ پارٹی محض ایک ذریعہ ہے اس کے حاصل کرنے کا۔ ہندوستانی ریاست کے ساتھ جو سیاسی اور معاشی جمہوریت کے نصب العین پر مبنی ہو، ابدی وفاداری کا عہد کیا جا سکتا ہے۔ کسی خاص پارٹی کے ساتھ ابدی وابستگی کا عہد نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں غیر مذہبی پارٹیاں جن میں ہر فرقے کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ اس وقت تین ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی، کانگریس پارٹی۔ ان میں سے کمیونسٹ پارٹی میں مسلمانوں کے بہ حیثیت مسلمان شرکت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ کمیونسٹ صرف ایک معاشی نظام کی حمایت کا نہیں بلکہ حیات و کائنات کے ایک خاص فلسفے یعنی تاریخی مادیت کے ماننے کا مطالبہ کرتے ہیں جو اسلام کے بنیادی عقائد کے سراسر منافی ہے۔ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اگر مسلمان کسی پارٹی کی طرف رخ کر سکتے ہیں تو وہ سوشلسٹ پارٹی یا کانگریس ہے۔

سوشلسٹ بھی کمیونسٹوں کی طرح اشتراکیت کے حامی ہیں۔ مگر ان کے اشتراکیت کے تصور کو جمہوریت کے تصور نے کسی قدر معتدل کر دیا ہے وہ ذاتی ملکیت کے مخالف نہیں صرف سرمایہ داری نظام کے مخالف ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہونے کے بعد تشدد کے طریقہ کار کو چھوڑ کر آئینی جد و جہد کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کی قیادت مخلص اور دانش مند لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو ایک مدت تک کانگریس کے دست و بازو رہے اور جنگ آزادی میں یہ گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے لڑتے رہے جمہوری اشتراکی ریاست کی منزل تک پہنچنے کے لئے ان کی رہنمائی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

لیکن لیڈروں سے قطع نظر کرکے جب پارٹی کے ارکان پر نظر ڈالیے تو کانگریس کی طرح یہاں بھی بے میل مجمع نظر آتا ہے، کچھ سچے سوشلسٹ ہیں، کچھ فرقہ پرست محض کانگریس کی ضد میں سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں، کچھ کانگریسی حکومت سے رعائتیں نہ ملنے کی وجہ سے خفا ہو کر یا اس پر دباؤ ڈال کر رعائتیں لینے کے لئے ادھر آگئے ہیں۔ کچھ خلقی مخالفت پسند ہیں جو ہمیشہ اکثریت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سوشلسٹ پارٹی میں یہ نقص ہے کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کی طرف سے آنکھیں بند رکھتی ہے اسے یہ احساس نہیں ہے کہ فرقہ پرستی اب تک ہمارے ملک میں عام ہے اسے دور کرنے کے لئے زبردست اور مسلسل جد و جہد درکار ہے۔ جب تک سوشلسٹ پارٹی ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے مسئلے کو سمجھ کر اسے بے تعصبی اور فراخ دلی سے حل کرنے کی کوشش نہیں کرے گی مسلمان اس کی طرف پوری طرح نہیں کھنچیں گے آدھی دور بڑھ کر رہ جائیں گے۔

اب کانگریس رہ جاتی ہے جس میں اس وقت مختلف اور متضاد عناصر موجود ہیں۔ جمہوری اشتراکیت کے علمبردار بھی ہیں اور لبرل جمہوریت کے حامی بھی جن کا سرمایہ داری نظام سے چولی دامن کا ساتھ ہے، بے تعصب اور فراخ دل بھی جنھوں نے ساری عمر مسلمانوں کو اپنا سمجھ کر ان سے محبت اور دوستی کا سلوک کیا ہے متعصب اور تنگ دل بھی جو مسلمانوں کو ایک بدیسی تہذیب کا حامل جان کر خالص دیسی تہذیب یعنی ہندو تہذیب میں جذب کرنا یا دبا کر اور گھونٹ کر رکھنا چاہتے ہیں یہ دونوں عناصر کانگریس کے اندر کشمکش میں مصروف ہیں مگر حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امید ہے کہ صالح عنصر فاسد عنصر پر غالب آئے گا۔ اسی امید پر گاندھی جی کے خاص پیرو اب تک کانگریس کے ساتھ ہیں اسی امید پر جواہر لال اور دوسرے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

بزم بے تکلف

"آپ نے کچھ اور بھی سنا؟ پہلے ولایت میں ہندوستان کے لئے بھرتی ہوا کرتی تھی اب ہندوستان میں ولایت کے لئے ہونے لگی"

"تو بس رہنے بھی دیجئے، آپ یوں ہی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں، بھلا ہندوستان میں ولایت بھیجنے کے لئے کن کی بھرتی ہو گی، کسان، مزدور لیڈر، شاعر یہ چار قسم کی مخلوق ہمارے دیس کی زمین پر بستی ہے ان میں سے کون ایسا خوش نصیب ہے جس کی ولایت میں مانگ ہو"

"جی ایک اور مخلوق پیڑوں پر بستی ہے جسے بندر کہتے ہیں"

"تو کیا سچ مچ ہمارے ہاں سے بندر ولایت بھیجے جا رہے ہیں؟ اجی نہیں آپ مذاق کرتے ہیں"

"نہیں واللہ مذاق کی بات نہیں یہ بین الاقوامی معاملہ ہے، ابھی کچھ دن ہوئے برطانوی پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی تھی اور پرسوں ہماری پارلیمنٹ میں کامت صاحب اور فنانس منسٹر سے نوک جھوک رہی"

"آخر سیاست دانوں کو اس مسئلے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ کیا بندروں کے ساتھ مداری بھی بلائے جا رہے ہیں؟"

"جی نہیں مداری اور ڈگڈگی کا کیا کام؟ وہاں ناچ ہندوستانی بندروں کا تھوڑا ہی ہوتا ہے، ان سے تو علمی تحقیقات میں مدد لی جاتی ہے"

"بہت معقول! کیا خوب محقق ڈھونڈھے ہیں انگلینڈ صاحب یہ بندر بتریا کیا نئی نکلی ہے جس کے ودوان ہندوستان سے بلانے پڑتے ہیں"

"آپ سمجھے نہیں بندروں سے مدد لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو علمی تجربوں میں استعمال کیا جاتا ہے"

"میں خوب سمجھتا ہوں یہ علمی تحقیقات اور تجربہ تو ایک پردہ ہے۔ دراصل ان بندروں سے علم نظری کے نہیں بلکہ حکمت عملی کے گر سیکھے جاتے ہوں گے۔ ان میں بڑا بڑا جغادری ہوتا ہے جس کی رگ رگ میں ڈپلومیسی کے سارے داؤ پیچ رچے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی بھبکی کبھی تھپکی، کبھی آنکھیں نکالنا، کبھی کھیسیں کاڑھ دینا، کبھی کھڑا ہو کر غرانا کبھی جھجک کر پیچھے ہٹنا، کبھی اچانک دھم سے آ کودنا، کبھی یکایک اچک کر چمپت ہو جانا، کبھی اس پیڑ سے اس پیڑ پر جست لگانا کبھی اس ڈال سے اس ڈال پر ہو رہنا، غرض اس کی ایک ایک ادا اپنی جگہ اور اپنے اپنے موقع پر ادا شناسوں کے لئے حکمت عملی کا ایک دفتر ہے۔ فرنگی کی فطرت دیکھئے کہ وہ ہزاروں میل سے لاکھوں روپے خرچ کرکے اس قدر لائق استاد کو بلاتا اور اس کے آگے زانوئے شاگردی تہ کرتا ہے اور ہماری شامت دیکھئے کہ ہم نے اس کے سائے کے تلے رہ کر بھی کچھ نہ سیکھا مجھے شری کامت سے پورا اتفاق ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے لئے قومی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں اسی آزادی اقتدار حکومت کے سارے پالیسی سے کام ہے کہ بندروں کی برآمد کو روکنے کا بندوبست کرنا چاہیئے"

پچھلا ہفتہ:- ۱- باہر کی دنیا

ایٹلانٹک اتحاد کا اثر

ایٹلانٹک اتحاد کی طرف سے اطمینان ہو جانے کا جمہوری ملکوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ متحدہ ریاستوں میں اس کے متعلق اندیشے ظاہر کئے گئے کہ اس سے متحدہ ریاستوں کی ذمہ داری نہ صرف بہت بڑھ جائے گی بلکہ مبہم بھی ہوگی، دوسرے ملکوں کو ڈر تھا کہ اتحاد صرف فرقہ بندی کا اعلان ہوگا اور اس کے نتیجے جمہوری ریاستوں میں ایسی یکجہتی پیدا نہ ہو سکے گی جس سے ان کی معاشی تنظیم باہمی امداد کی شکل اختیار کرے اور ان کی فوجی قوت امکانی خطروں کے لحاظ سے منظم کی جائے۔ یہ سمجھنا تو اب بھی صحیح نہ ہوگا کہ ایٹلانٹک اتحاد کے مقصد پورے ہو جائیں گے۔ لیکن اندیشے اور بدگمانیوں کا دور ہونا بھی بڑی بات ہے۔ جمہوری ملکوں میں ایک خود اعتمادی سی پیدا ہو رہی ہے اور اگرچہ ایٹلانٹک اتحاد کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ متحدہ ریاستیں جمہوری ملکوں کی سیاست پر اور زیادہ حاوی ہو جائیں گی، لیکن لوگوں کو اب اس میں اتنا نقصان نظر نہیں آتا جتنا پہلے نظر آتا تھا۔

ایٹلانٹک اتحاد ایک طرح کی فرقہ بندی ہے۔ اور فرقہ بندی کا ایک پہلو اتحاد ہوتا ہے تو دوسرا مخالفت ہوتی ہے۔ اس لئے روسیوں کا یہ کہنا کہ ایٹلانٹک اتحاد جنگ جوئی کا مظاہرہ ہے بے بنا نہیں، یورپ کے جمہوری ملکوں کو اس کی فکر تھی کہ اس الزام سے بچیں۔ انھیں ڈر اس کا تھا کہ روسی ان پر جنگ جوئی کا الزام لگا کر کہیں خود حملہ نہ کر دیں۔ اب یہ ڈر نہیں رہا ہے۔ اور شاید اس وجہ سے جمہوری ریاستوں کا رویہ بدل جائے۔ لندن میں تین مہینے تک جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ فاشسٹ اور کمیونسٹ دونوں شہر میں فساد نہ کر سکیں۔ اس ممانعت سے جمہوری زندگی کا ایک بنیادی حق تین مہینے کے لئے منسوخ ہو جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایسا کوئی حکم جاری کیا جاتا تو بہت سے لوگ [illegible] اصولاً غلط سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے۔ [illegible] وقت

تمام لیڈر اور اخبار جو فاشسٹ یا کمیونسٹ نہیں ہیں اس معاملے میں حکومت کی تائید کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ فاشسٹ اور کمیونسٹ حکومت کو دشواریوں میں ڈال کر اس کے اعتبار کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد [illegible] کی خاطر فساد کرنا ہے۔ اس طرح فاشسٹ اور کمیونسٹ جمہوری حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور جمہوریت کے معتقد ان حقوق سے دست بردار ہونے پر تیار ہیں۔ اگر دست بردار نہ ہوں تو فاشسٹ اور کمیونسٹ [illegible] کو قابو میں رکھنے کے لئے [illegible]

امن کی کانفرنس

نیویارک میں عالموں اور سائنس دانوں کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس کا مقصد دنیا میں امن قائم رکھنا بتایا گیا ہے۔ کانفرنس کمیونسٹوں کی تحریک پر کی جا رہی ہے اور جو لوگ اس میں شریک ہوں گے وہ کم و بیش کمیونسٹ خیال کے ہوں گے۔ متحدہ ریاستوں کی وزارت خارجہ نے ان نمائندوں کو آنے کی اجازت دیدی ہے جو کمیونسٹ ملکوں سے آ رہے ہیں۔ جن ملکوں کی حکومت جمہوری ہے ان کے نمائندوں کو ویزا دینے سے انکار کیا گیا ہے۔ اس رویے کی مصلحت سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ کمیونسٹ حکومتیں جسے چاہتی ہیں ملک میں آنے اور ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہیں جسے چاہتی ہیں نہیں دیتی ہیں۔ متحدہ ریاستوں میں کمیونسٹ ملکوں کے نمائندوں کو آنے کی ممانعت کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ برطانیہ کے نمائندوں کو ویزا دیا اور پھر منسوخ کر دیا گیا۔ فرانس، اٹلی اور جنوبی امریکہ کے کمیونسٹوں کو ویزا نہیں دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کمیونسٹ ملکوں کے کمیونسٹ تو اس کے حق دار مانے گئے کہ متحدہ ریاستوں میں جا کر اپنی رائے ظاہر کریں مگر جمہوری ملکوں کے کمیونسٹوں کے بارے میں یہ سمجھا گیا کہ ان کا کام صرف انھیں کی بولی بولنا ہوگا۔ اس لئے وہ کانفرنس میں شریک نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں۔ [illegible] جمہوری [illegible] کے کمیونسٹ پورے شہری بھی نہیں مانے جاتے، اس لئے کہ وہ روس کے معتقد ہیں اور ہر حال میں روسی سیاست کی حمایت کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں۔

جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کا اتحاد

ایک تجویز سننے میں آئی ہے کہ ایٹلانٹک اتحاد کے نمونے پر دوسرے اتحاد بھی ہوں اور جیسے یورپ کو روس اور کمیونزم سے محفوظ کیا جا رہا ہے ویسے ہی ایشیا کو بھی محفوظ کیا جائے۔ فی الحال اس میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ایک ہالینڈ کا یہ ارادہ کہ جس طرح بھی ہو سکے انڈونیشیا پر اپنا قبضہ جمائے۔ دوسری جنوبی افریقہ کی کوشش کہ ہندوستانیوں کو شہریت کے تمام حقوق سے محروم رکھے اور ممکن ہو تو انھیں ملک سے نکال دے۔ ہالینڈ اور جنوبی افریقہ دونوں کا رویہ نہ بدلا تو ایشیا والوں کو مغربی جمہوریت پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا اور کمیونزم کا زور نہ ہو تب بھی مغربی سیاست کی ہر طرح سے مخالفت کی جائے گی۔ انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ کے معاملے طے ہو گئے تو یہ سوال ہوگا کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی سرپرستی قبول کی جائے یا نہ کی جائے۔ یورپ اور امریکہ کی معاشی تنظیم کا نقشہ ایک سا ہے۔ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملک متحدہ ریاستوں کا اس طرح سہارا نہیں لے سکتے جیسے کہ یورپ کے جمہوری ملک لے رہے ہیں۔ یہاں متحدہ ریاستوں کی سرپرستی معاشی حکومت کی شکل اختیار کرے گی، اور یہ آزادی کی نئی فضا میں ناقابل برداشت معلوم ہوگی۔

م، م

جنگ کی آگ بجھ رہی ہے

پچھلے سال مغربی ملکوں میں تو صرف سیاسی اور اعصابی کشمکش ہو رہی تھی مگر ایشیا کے کئی حصوں میں لڑائی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اب یہاں بھی لڑائی رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ رہی ہے اور اس کی جگہ سیاست اور حکمت عملی کا مقابلہ شروع ہو رہا ہے۔ فلسطین میں امریکہ کی سیاست فی الحال کامیاب ہو گئی ہے۔ عرب ریاستوں نے اسرائیل کی جداگانہ ریاست کو ایک ناگوار حقیقت سمجھ کر مان لیا ہے اور اس کے ساتھ [illegible] ایک [illegible] کرنے کے معاہدے کر رہی ہیں۔ انڈونیشیا کے معاملے میں انگلستان اور امریکہ یو، این، او کے پردے میں ولندیزیوں کی رضا جوئی کے ساتھ ساتھ انڈونیشیوں کی تالیف قلوب کر رہے ہیں۔ ہالینڈ نے ہیگ میں گول میز کانفرنس کی جو تجویز پیش کی تھی اسے یو، این، او نے اس ترمیم کے ساتھ مان لیا ہے کہ کانفرنس اس کے مقرر کئے ہوئے کمیشن کی نگرانی میں ہوگی۔ لیکن ہالینڈ نے ابھی تک یو، این، او کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا کہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے ارکان کو رہا کر دے اور ان کا علاقہ ان کو واپس کر دے۔ ہالینڈ کے ارباب حل و عقد انڈونیشیا کے بارے میں آپس میں متحد نہیں ہیں اس لئے کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتے، ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ یو، این، او ان سے اپنی شرطیں منوانے، اور انڈونیشیا کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کیا قدم اٹھاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی [illegible] ہالینڈ کی رضا جوئی پر مجبور کر [illegible] لیکن آخر دنیا کو دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔

چین میں نئی قومی حکومت کے اور کمیونسٹ حکومت کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہو رہی ہے۔ چیانگ کائی شک اور سن فو کے بیچ سے ہٹ جانے کے بعد بظاہر کمیونسٹوں کو اطمینان ہو گیا ہے کہ ان کے جانشینوں کی طرف سے صلح کی پیشکش محض فریب نہیں بلکہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ یہ خیال اگر صحیح ہے کہ دونوں فریق دل سے صلح چاہتے ہیں تو مفاہمت کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

ع، ح

ہندوستانی مسلمان (بسلسلہ صفحہ ۳)

پرانے لیڈر کانگریس کے اندر ہیں ہمارے خیال میں اس وقت مسلمانوں کو بہ حیثیت جماعت کانگریس ہی میں جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ان کے جتنے سچے ہمدرد اور دوست ہیں قریب قریب سبھی کانگریس میں ہیں۔ اس صالح عنصر کو جو اشتراکی جمہوری ریاست کا اتحاد، رواداری اور انصاف کا حامی ہے مسلمانوں سے بڑی تقویت پہنچنے کی امید ہے۔ اس کا فاسد عنصر پر غالب آنا یقینی ہو جائے گا۔

ا۔ ہندوستان

پارلیمنٹ کی کارگذاری

بجٹ کی سب مدات کے منظور ہو جانے کے بعد فنانس بل سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تھا اس نے بعض معمولی ترمیموں کے بعد بل کے پاس ہونے کی سفارش کی ہے۔ ان میں سے ایک ترمیم میں عجیب ستم ظریفی کی گئی ہے۔ بہت سے ممبروں نے یہ شکایت کی تھی کہ معمولی ڈاک اور ہوائی ڈاک دونوں کا محصول بڑھا مقرر کرنا بے انصافی ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ معمولی ڈاک کے خطوں کا محصول نہ بڑھایا جائے سلیکٹ کمیٹی نے انصاف کی یہ صورت نکالی ہے کہ معمولی خط کے لئے دو پیسے کے اضافے کو بحال رکھا ہے مگر ہوائی ڈاک کے خط میں جو دو پیسے کی تخفیف ہوئی تھی اُسے منسوخ کر دیا ہے۔ شکایت کرنے والے کچھتاتے ہوں گے کہ یہ تو اور الٹی آنتیں گلے پڑیں۔

۲۳ مارچ کو پارلیمنٹ نے وزیر صنعت کا یہ رزولیوشن منظور کر لیا کہ کھانے پینے کی چیزوں، اونی اور سوتی کپڑے، کاغذ، پٹرول، لوہے اور فولاد، ربڑ اور موٹر کے پرزوں کا کنٹرول ایک سال تک اور قائم رکھا جائے۔ اسی طرح وزیر ریلوے کا یہ رزولیوشن بھی منظور ہو گیا کہ ریل سے مال بھیجنے کے لئے پرائرٹی کا طریقہ ایک سال اور جاری رہے۔ دوسری کارروائیوں میں قابل ذکر یہ ہے کہ شکر کی صنعت کو مزید ایک سال کے لئے اور ۱۲ اور صنعتوں کو جن میں بائسکل، سینے کی مشین، مٹی کے تیل کے لیمپ، مصنوعی ریشم کی صنعتیں اور بعض کیمیاوی چیزیں شامل ہیں دوسرے سے کر تین سال تک کے لئے تائید دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

پارلیمنٹ کے موجودہ سیشن میں زیر بحث آنے کی اُمید نہیں نظر آتی بعض خوش فہم اصلاح پسندوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس کے لئے پارلیمنٹ کا ایک خاص سیشن بلائے گی، لیکن ایسی صورت میں کہ ... سے پارلیمنٹ آئین سازی کا کام شروع کرنے والی ہے یہ خیال ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے اس اثنا میں ہندوؤں کے رجعت پسند طبقے اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ رائے عامہ کو بل کی اصلاحی تجویزوں کے خلاف ابھار دیں۔

خدا کی قدرت ہے!

برطانیہ کی کنسرویٹو پارٹی کے ڈپٹی لیڈر مسٹر ایڈن جو چیمبرلین وزارت اور چرچل وزارت میں وزیر خارجہ رہ چکے ہیں۔ کامن ویلتھ کے بعض ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے تھے اور تین دن تک دہلی میں رہ کر پاکستان تشریف لے گئے۔ انڈین کاونسل آف ورلڈ افیرز اور ہندوستان کی امور خارجہ کی انجمن کے اہتمام میں ۲۲ مارچ کو کانسٹی ٹیوشن کلب میں ان کی ایک تقریر ہوئی۔ بڑا دلچسپ منظر تھا کہ آزادیٔ ہند کا ایک پرجوش مخالف آزاد ہند کو دوستی کا پیام دے رہا تھا۔ مسٹر ایڈن کے اس دورے کے کئی مقصد سمجھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ برطانیہ اور کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں میں باہمی ربط کے رشتے کو اور مضبوط کریں دوسرے یہ کہ ان ملکوں میں قدامت پرست عناصر کو ابھاریں، تیسرے کنسرویٹو پارٹی کے آیندہ لیڈر کی حیثیت سے کامن ویلتھ کے مدبروں سے روشناس ہوں، اس لئے کہ عام خیال ہے کہ مسٹر چرچل کے بعد پارٹی کے لیڈر وہی ہوں گے بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ مسٹر چرچل کی زندگی ہی میں ان کی جگہ لے لیں۔ بہرحال اور ملکوں میں وہ جس مقصد سے بھی گئے ہوں ہندوستان آنے کی غرض جہاں تک ان کی تقریر سے اندازہ ہو سکا یہ تھی کہ ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شریک رہنے پر آمادہ کریں ان کی تقریر کے قابل قدر نکتے یہ ہیں:

(۱) اقوام متحدہ کا ادارہ (یعنی یو این او) ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکا لیکن اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، قوموں کی پنچایت کی حیثیت سے وہ قابل قدر چیز ہے۔

(۲) چونکہ یو، این، او کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جس کے بل پر وہ دنیا میں امن قائم کر سکے، اس لئے دنیا کے مختلف حصوں میں قوموں کو باہمی حفاظت کی ضمانت کے لئے علاقہ وار اتحاد قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسٹرن یونین اور اٹلانٹک یونین اسی مقصد کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ ان کا ہرگز کوئی جارحانہ مقصد نہیں۔ ایشیائی ملکوں کی حکومتیں چاہیں تو اپنے علاقے کے مجموعی تحفظ کی جنب شروع کرنے پر راضی نہیں کر سکتیں۔

(۳) انگلستان کے لوگوں کے دل میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا بہت گہرا جذبہ ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان باہر کے ملکوں سے اپنے تعلقات کا فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہے، لیکن برطانیہ کے لوگوں کی دلی خواہش یہی ہے کہ ان کے اور ہندوستان کے درمیان گہرے تعلقات قائم رہیں۔

مسٹر ایڈن کی شیریں زبانی اور موقع شناسی کی داد دینا چاہیے کہ تقریر کے بعد حاضرین کے طنز آمیز اور چبھتے ہوئے سوالات کا جواب انھوں نے ایسے انداز میں دیا کہ ذرا سی بھی تلخی اور ناگواری بھی نہیں پیدا ہونے پائی۔ رات کو کانسٹی ٹیوشن کلب کے ڈنر میں پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی تقریر میں ایک بار پھر اس بات کو صاف کر دیا کہ ہندوستان سب ملکوں سے عام طور پر اور برطانیہ سے خاص طور پر دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہے مگر اس سے زیادہ توقع اس سے نہیں کرنی چاہیے۔ خدا جانے مسٹر ایڈن کو اس تقریر سے خوشی ہوئی یا مایوسی۔ یہ اس پر موقوف ہے کہ وہ کیا توقعات لے کر آئے تھے۔

کشمیر کا معاملہ صاف ہو گیا

کچھ عرصے سے اس قسم کی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں کہ کشمیر میں رائے شماری نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان اور پاکستان آپس کے سمجھوتے سے ریاست کو تقسیم کر لیں گے۔ تقسیم کی نوعیت کے بارے میں مختلف باتیں کہی جاتی تھیں لیکن عام خیال یہ تھا کہ جو حصہ اس وقت جس فریق کے قبضے میں ہے اسی طرح رہے گا۔ معلوم نہیں ان قیاسات کی کوئی اصلیت تھی یا نہیں۔ لیکن اگر اس قسم کی کوئی گفتگو فریقین میں ہو بھی رہی تھی تو غالباً ناکام رہی ہوگی اس لئے کہ یو، این، او کے کشمیر کمیشن کی تازہ رپورٹ سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ رائے شماری ضرور ہوگی اور اس کے نتیجے کے طور پر پوری ریاست ہندوستان میں یا پاکستان میں شامل ہو جائے گی۔ رائے شماری کا انتظام کرنے کے لئے یو، این، او نے دونوں فریقوں کی رضامندی سے امیر البحر نمٹز کو ناظم رائے شماری [illegible] ... تیاریاں ... اب بہت ... ہے ... کشمیری حکومت ان کو رائے شماری کا منتظم مقرر کرنے کا حکم جاری کر دے گی اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اپریل کے اندر اندر اپنے عہدے کا چارج لے لیں گے۔ لیکن کشمیر کمیشن کی رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رائے شماری کی تیاریاں اسی وقت شروع ہو سکتی ہیں جب عارضی صلح کی شرطیں طے ہو جائیں۔ ان میں دو شرطوں پر ابھی تک اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ "آزاد کشمیر" کی فوجوں کو موقوف اور منتشر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ علاقے کا انتظام جو آج کل برائے نام سردار ابراہیم کی حکومت کے اور دراصل پاکستان کے ہاتھ میں ہے کشمیر کمیشن کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ حکومت ہند کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہیں "آزاد کشمیر" کے قائد اس سے انکار کر رہے ہیں اور حکومت پاکستان بظاہر خاموش ہے۔ ... باخبر کا اندازہ اب تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گتھی بھی سلجھ جائے گی اور رائے شماری کے لئے فہرستیں تیار کرنے اور ان لوگوں کو جو آزاد کشمیر کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں ان کے گھروں میں بسانے کا کام جلد شروع ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سال بھر میں یہ دونوں کام ختم ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت میں مدت کا کوئی اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کام شروع نہ ہو جائے اور کچھ دن تک اس کی رفتار نہ دیکھ لی جائے۔

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

پارلیمنٹ میں وزیر بحالی شری موہن لال سکسینہ نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو شرنارتھیوں کو بسانے میں پیش آ رہی ہیں۔ یہ مشکلیں چار قسم کی ہیں:

۱۔ بغیر منصوبہ بنائے ہوئے کام ٹھیک نہیں ہو سکتا، اور منصوبہ بنانے میں بڑی دیر لگتی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

۲- پاکستان

جماعتِ اسلامی کا فیصلہ

جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ کراچی میں کئی روز تک غور و فکر کے بعد پاک دستور ساز کی منظور کی ہوئی بنیادی مقاصد کی قرارداد کے بارے میں ایک مفصل بیان شائع کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

حالانکہ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے صاف اور واضح الفاظ میں یہ اعلان نہیں کیا کہ پاکستان کا بنیادی قانون قرآن و سنت ہوگا اور پاکستان ایک اسلامی حکومت ہوگا تاہم قرارداد میں جماعت اور مسلمانان پاکستان کے مطالبے کی روح کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس طرح ان کم سے کم شرائط کو تسلیم کر لیا ہے جو کسی حکومت کو اسلامی حکومت قرار دینے کے لئے ضروری ہیں۔

مجلس نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے دستور بنانے میں ان تمام روشن خیال علمائے مفکرین کا تعاون حاصل کرے جو اسلام کو بھی پوری طرح سمجھتے ہیں اور موجودہ حالات کو بھی اور جو اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اسلامی احکامات کو موجودہ حالات پر منطبق کر کے دکھا سکیں۔

صحیح اسلامی دستور کی ترتیب اور اس کے نفاذ کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کے لئے مجلس نے جماعت کے متعلقین کو حکم دیا ہے کہ وہ حکومت اور دوسرے ملی اداروں کی اصلاحی اور تعمیری جدوجہد میں ان کے ساتھ پورا تعاون کریں۔

تسنیم، لاہور

جماعت اسلامی اور قرارداد مقاصد

خدا کا شکر ہے کہ جماعت اسلامی نے اس "قرارداد مقاصد" کو جو پچھلے دنوں مجوزہ آئین کے سلسلے میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا ہے، چند شرطوں کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اس ضمن میں جماعت مذکور کی مجلس شوریٰ کی طرف سے جو بیان شائع ہوا ہے اس میں "قرارداد مقاصد" کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں بھی کی گئی ہیں جو جہاں تک قرارداد کا تعلق ہے اس سے بالکل متر شح نہیں ہوتیں مثلاً جماعت اسلامی کا یہ کہنا ہو کہ :-

"مگر اس قرارداد کے الفاظ اور ان کے مضمرات و مقتضیات کی صحیح اور منشا کے عین مطابق دستور تیار کیا جائے تو اس میں ریاست کے قانون کا ماخذ کتاب و سنت کے سوا کسی اور شے کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

قرارداد میں بالصراحت واضح کر دیا گیا ہے کہ پاکستان کا آئین پاکستانی جمہور کے نمائندے وضع کریں گے اور ظاہر ہے کہ پاکستانی جمہور میں معتدبہ تعداد غیر مسلموں کی بھی ہے اور وہ کسی صورت میں اس بات کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ پاکستان کے آئین کا ماخذ قانونی اصطلاح میں کتاب و سنت ہو۔

اس کے علاوہ مجلس شوریٰ کے بیان میں قرارداد کی بعض اور شقوں کی بھی من مانی تعبیریں کی گئی ہیں، اور لیاقت علی خاں کی پیش کردہ قرارداد اور ان کی تقریر سے بعض ایسے مطالب اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔

بہرحال ہمیں مسرت ہے کہ جماعت اسلامی آئین کے بارے میں ان فرضی بحثوں کی دلدل سے نکلی اور "قرارداد مقاصد" کے مضمرات و مقتضیات سے ایک گونہ اسے اطمینان حاصل ہو گیا اور اب اُسے اس کا احساس ہوا کہ گرد و پیش کی بیماریوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

آفاق، لاہور

سندھیوں کی آنکھ کا تارا

سندھ اسمبلی میں گذشتہ سال کے بجٹ کے حسابات کے ایک ضمنی مطالبہ پر بہت لے دے ہوئی اور اسمبلی کے بہت سے ارکان چاہتے تھے کہ سندھ کے سابق گورنر خواجہ غلام حسین ہدایت اللہ مرحوم نے مسٹر محمد ایوب کھوڑو سابق وزیر اعظم کے خلاف عدالتی تحقیقات کرانے پر جو روپیہ صرف کرایا اسے منظور نہ کیا جائے، وزیر اعظم حال نے جب اسمبلی کے ارکان کو یہ بتایا کہ اگر یہ مطالبہ زر جو صرف ہو چکا ہے منظور نہ کیا گیا تو گورنر سندھ صوبے میں دفعہ ۹۲ الف نافذ کر دیں گے اور یہ رقم سب ناپتے رہ جائیں گے۔ تو اسمبلی نے یہ مطالبہ زر منظور کیا۔ اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر محمد ایوب کھوڑو اپنے جملہ عیوب کے باوجود سندھیوں کی آنکھ کا تارا ہیں اور سندھ اسمبلی کے ارکان کی اکثریت ان عدالتی تحقیقات کو جو مسٹر کھوڑو کے چال چلن کے متعلق کرائی گئی غیر مناسب سمجھتی ہے عدالتی تحقیقات کے نتائج شائع نہیں کئے گئے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسٹر کھوڑو پر بدعنوانیوں کے جو الزامات لگائے گئے تھے وہ کس حد تک صحیح یا غلط تھے۔ لیکن سندھ کے لوگ مسٹر کھوڑو پر بڑا بسا اپنے اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں یہ کیفیت ایک معمہ ہے جس کا حل سندھیوں کا اخلاقی معیار ہی پیش کر سکتا ہے دوسرے اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔

مغربی پاکستان، لاہور

(تازہ خبر ہے کہ عدالت خاص نے مسٹر کھوڑو کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا ہے ان کو تین سال کے لئے صوبے یا مرکز کی کونسلوں کی ممبری، وزارت اور سرکاری نوکری کے حق سے محروم کر دیا گیا)

لیلائے نکوٹین سے عورتوں کی جنگ

تین برقعہ پوش عورتوں نے لاہور میونسپلٹی کارپوریشن کے ممبروں سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ "لیلائے نکوٹین" (سگرٹ) کے زہر کی محبت سے دست بردار ہو جائیں گے، بدلے میں اپنی کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

لاہور کارپوریشن کے میئر نے ایک بہت لمبے ایجنڈا کو ختم کرنے کے بعد جیسے ہی میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کیا تین برقعہ پوش عورتیں اندر داخل ہو گئیں اور ڈائس کی طرف بڑھیں ہر ایک نے "بلدیاتی شیر" سے درخواست کی کہ وہ سگرٹ پینا چھوڑ دیں اور فضول خرچی سے بچنے کی ایک مثال قائم کریں۔ ایگزیکٹو افسر نے جو خود سگرٹ نہیں پیتا۔ انگلی سے ان کی کانچ کی چوڑیوں کی طرف اشارہ کیا اور اس مطلب کا ایک مصرعہ پڑھا کہ "اے طبیب پہلے اپنا علاج کر" یہ سن کر ناصحوں نے اپنی کانچ کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں اور اپنی خالی باہیں اٹھائے ہوئے میونسپلٹی کے ممبروں سے پھر اصرار کیا کہ وہ سگرٹ پینا چھوڑ دیں۔ ممبروں نے آخر ان سے یہ مشروط وعدہ کیا کہ وہ "لیلائے نکوٹین" کی پرستش سے دست بردار ہو جائیں گے۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ سے جاگیرداروں کی بغاوت

سرحد کی کانگریس کی پارٹی کے خلاف سرحد کے مختلف بے جوڑ عناصر مسلم لیگ کے نام سے جمع ہو گئے تھے ان میں ایک تو بڑے جاگیرداروں کا طبقہ تھا اور دوسرا عوام کا طبقہ۔ یہ اس وقت تک ایک ہے جب تک ڈاکٹر خان صاحب یا عبدالغفار خاں کی مخالفت کا تھا۔ اب چونکہ سرحد میں کانگریس پارٹی کا نام و نشان نہیں ہے اور سرحد کی سیاست میں کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں جس سے ڈر کر مسلم لیگ کے ان بے جوڑ عناصر کو متحد رکھا جائے جاگیرداروں اور عوام کے نمائندے آپس میں اُلجھ گئے ہیں اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ سرحد مسلم لیگ پارٹی کا یہ اندرونی تضاد اب ظاہر ہو کر رہے گا اور مسلم لیگ دو حصوں میں یقیناً بٹ جائے گی۔

کل کا واقعہ ہے کہ سرحد کی مسلم لیگ پارٹی کے سات ارکان نے اپنے پارٹی لیڈر پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ سرحد میں جاگیرداری کو ختم کرنے کے معاملے میں تخریب پسند، اسلام کش اور اشتراکیت نواز پالیسی چلانا چاہتے ہیں اس لئے ان سات ارکان نے اپنے لیڈر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور اپنی ایک علیحدہ پارٹی جو نام کو تو مسلم لیگ ہی کہلاتی ہے لیکن علاوہ عبدالقیوم خان وزیر اعظم سرحد کے مخالف ہوگی قائم کر دی ہے۔

صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جو کچھ ہوا ہے وہ ابتدا ہے اس عام ٹکراؤ کی جو پاکستان کے ہر صوبے میں مسلم لیگی جاگیرداروں اور مسلم لیگی عوام کے درمیان آگے چل کر ہوگا (آفاق)

پاکستان اور افغانستان

کابل کے سرکاری اخبار اصلاح نے ۹ مارچ کی اشاعت میں صفحہ اول پر افغان سرکار کا ایک کمیونک شائع کیا ہے اس میں افغان گورنمنٹ نے پاکستان کے گورنر جنرل کی ایک تقریر پر احتجاج کیا ہے جو انھوں نے سرحد میں دورہ کے وقت قبائلی علاقہ کے متعلق کی تھی۔

کمیونک میں درج ہے کہ گورنر پاکستان کی یہ تقریر مسٹر جناح کے ۱۹۴۷ء کے اور برٹش گورنمنٹ کے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے وعدے کے خلاف ہے کیونکہ ان وعدوں میں قبائلی علاقے کی آزادی تسلیم کر لی گئی تھی مگر پاکستان

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

جبرِ حیات

اختر انصاری

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہمدم!
تجھے بھی دل سے بھلاؤں میں، خود کو بھی بھولوں
اُڑوں لگا کے تخیل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر ستاروں کو چھولوں

مچاؤں دھوم کبھی کہکشاں میں اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں
بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاضِ انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں

مگر اُڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں
فلک سے گر کے یہاں کس طرح جیوں گا میں

غزل

چودھری عشرت حسین

ان آنکھوں نے عجب نیرنگِ گلزارِ جہاں دیکھا
جہاں گل زیبِ دامن تھے وہیں دورِ خزاں دیکھا
کہیں کیا ہم نے جو کچھ انقلابِ آسماں دیکھا
نشیمن ہی کے ہر تنکے کو برقِ آشیاں دیکھا
ہر اک کوشش کو گلزارِ جہاں میں رائگاں دیکھا
نہ کوئی لطفِ تکمیلِ بنائے آشیاں دیکھا
لکھا قسمت کا یا تیرا ستم اے باغباں دیکھا
کہیں کیا ہم نے کس حالت میں اپنا آشیاں دیکھا
یہ ٹکڑے دل کے ہیں ان کو نہ ٹھکراؤ حقارت سے
کہ ان میں ہم نے اکثر جلوۂ کون و مکاں دیکھا
ابھی برگِ خزاں دیدہ کے آثارِ پریشاں سے
مری نظروں نے رمزِ فطرتِ ہستی عیاں دیکھا
وہ تنکے آشیاں کے جو سکونِ جانِ بلبل تھے
قیامت ہے خزاں آتے ہی اُن کو رائگاں دیکھا
کسی کی یاد میں تسکینِ دل کی اب یہ صورت ہے
اک آہِ سرد کھینچی اور سوئے آسماں دیکھا
اُسے غفلت کہوں اپنی کہ عجلت چلنے والوں کی
کھلی جب آنکھ نظروں نے غبارِ کارواں دیکھا
یہ قسمت کا کرشمہ ہے کہ عشرت جب بہار آئی
ہوا کے دوش پر ہم نے چمن میں آشیاں دیکھا

مسیح و خضر کے نام

خلیل الرحمٰن اعظمی

ابھی اُفق پہ وہی تیرگی کے پردے ہیں
مگر چراغ ترے جھلملائے جاتے ہیں
ہر ایک گام پہ سراب تو منزلوں کا گماں
غبارِ راہ کا یہ ایک آسرا تو نہیں
اجل سے لڑتے ہوئے غم کے کاروانوں کا
نشانِ زیست کہیں آج مٹ گیا تو نہیں
مری حیات کا شیرازہ منتشر تھا مگر
یہیں سے آئے تھے یہ آگہی کے افسانے
اٹھا کے ہاتھ میں اپنے لہو کا یہ پرچم
تمام رات تو جلتے رہے ہیں پروانے
ہزار کھلتے رہے پھول رہگزاروں پر
یہ ظلمتوں کا تبسم کبھی نہ راس آیا
رُکی نہ گردشِ دوراں، نہ لڑکھڑائے قدم
تھکے ہوؤں کو نہ اندازِ بے حسی آیا،
مگر یہ آج کسی کی ادائے لغزش پر
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں، شمعیں بجھتی ہیں
مرے جہاں میں یہ چارہ گری نہ کام آئی
وہ دیکھ ملتی ہیں راہیں، وہ نبضیں تھمتی ہیں

ہریجن کا سَت

اُردو سے بیر

ک. ج. مشرووالا

کیا ریلوے کی وزارت نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اردو رسم خط کو ریلوے کے اعلانات کی تختیوں اور نام کی تختیوں سے خارج کر دیا جائے۔

۲۰ مارچ کو مجھے اکولہ (برار) سے ریل میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ پلیٹ فارم سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سائن بورڈ سے اسٹیشن کا اردو نام مٹا دیا گیا ہے اور وہ کونا خالی ہے۔ سامنے کے پلیٹ فارم کے سائن بورڈ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھنے میں آیا کہ اردو حرفوں کو مٹا کر ان کی جگہ ناگری لکھ دی گئی ہے حالانکہ ناگری کا نام دو ہفتے ہونے پہلے ہی سے موجود تھا۔ آخر ایک ہی تختی پر ناگری میں دو جگہ نام ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ حرفوں کی شان کو دیکھا تو ایک کونے پر अ بمبئی کی طرز میں اور دوسرے پر یوپی کی طرز میں تھا۔ کیا ناگری نام دو جگہ لکھنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک زبان مرہٹی ہے اور دوسری ہندی۔

بات اپنی جگہ بہت چھوٹی سی ہے مگر اس سے بہت اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک محکمے میں موجودہ طریقے میں تبدیلی کی گئی ہے کہ حکومت نے ابھی تک رسم خط کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے؟ غالباً ریلوے کے وزیر کو اس تبدیلی کی خبر تک نہ ہوگی۔ لیکن اس حکم سے چاہے وہ کسی نے دیا ہو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تہہ میں رجعت پسندانہ روح کام کر رہی ہے۔

آگے چل کر چاہے جو فیصلہ ہو مگر اس افسر کو جس پر یہ حکم دینے کی ذمہ داری ہے کوئی حق نہیں تھا کہ فیصلے سے پہلے عمل شروع کر دے۔ اس کو یہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا کہ अ کی اور ناگری کے چند اور حرفوں کی شکل بدل کر یہ ظاہر کرے گویا یہ کوئی دوسری زبان ہے۔ مجھے امید ہے ریلوے منسٹر یہ حکم جاری کریں گے کہ ریلوے لائنوں پر جہاں کہیں اردو نام مٹا دیے گئے ہیں انھیں دوبارہ لکھا جائے۔

گاندھی نگارخانہ

شری کنو گاندھی نے یہ بیان شائع کیا ہے:۔

"میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ پچھلے چودہ برس میں نے گاندھی جی کے ساتھ گزارے۔ اس زمانے میں ان کو مختلف کام کرتے ہوئے اور مختلف صحبتوں اور حالتوں میں دیکھا ۱۹۳۸ء میں میں نے ان کے فوٹو لینے شروع کئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح لوگوں کو گاندھی جی کے ان حرکات و سکنات اور قلبی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاؤں جو سب سے زیادہ موثر ہوں اور ان کی مدد سے یہ سب سے زیادہ دلچسپی ڈالی گئی ہوں۔ بار بار ان کو کیمرے کے دام میں گرفتار کرنا مشکل تھا۔ لیکن جب کبھی موقع ملا میں نے اس سے [illegible] کی۔

میں فوٹوگرافر نہیں تھا اور مجھے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ فوٹوگرافی سیکھوں۔ میں تو باپو جی کے ساتھ ان کا ذاتی کام کرنے کے لئے رہتا تھا۔ انھوں نے مجھے فوٹو کھینچنے کی اجازت اسی شرط پر دی تھی کہ میرے فرائض میں خلل نہ پڑے اور خود ان کے کام میں ہرج نہ ہو اور ان کی توجہ نہ بٹے۔ ان پابندیوں کی وجہ سے اکثر تصویر کھینچنے کے اچھے اچھے موقعے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں ان کی نواکھالی کی مہم شروع ہونے کے بعد مجھے مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا اور اس طرح میں ان کے آخری وقت تک ان سے جدا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی کی آخری اور سب سے بڑی مہم کے دوران میں جو انھوں نے نکلتے، بہار اور دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے شروع کی میں ان کی کوئی تصویر نہ لے سکا۔

تصویروں کے علاوہ میرے پاس کوئی ۱۶ ملی میٹر کے فلم بھی ہیں جن میں باپو کی زندگی دکھائی گئی ہے۔ میرے پاس ہر طرف سے ان تصویروں کی مانگ آئی تھی ان کی وفات کے بعد یہ مانگ اور بڑھ گئی ہے صوبوں کی حکومتوں، میونسپلٹیوں، اسکولوں اور عام لوگوں کی فرمائشیں آ رہی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سب کو باپو سے کتنی عقیدت ہے اور وہ مجھ سے اس ذخیرے کی وجہ سے جو میرے پاس ہے کیا توقعات رکھتے ہیں۔

ان فرمائشوں کی تعمیل کرنے اور ان توقعات کو پورا کرنے کے لئے میں نے اگست ۱۹۴۸ء سے گاندھی چترالیہ کے نام سے ایک نگارخانے کی بنا ڈالی ہے۔ اس کے مقاصد یہ ہیں:۔

۱۔ گاندھی جی کی بعض سب سے اچھی تصویروں کو جو میرے ذخیرے میں ہیں بڑے سائز پر شائع کرنا۔

۲۔ ان کی اچھی اور سستی تصویروں کے بیچنے کا انتظام کرنا تاکہ کم آمدنی کے لوگ خرید سکیں۔

۳۔ جو متحرک فلم میرے پاس ہیں ان کے دکھانے کا انتظام کرنا اور اگر ممکن ہو تو ان کی کاپیاں فروخت کرنا۔

۴۔ کتابوں وغیرہ کے لئے تصویروں کی کاپیاں یا بلاک مناسب قیمت پر مہیا کرنا۔

۵۔ گاندھی جی کی ان تصویروں اور فلموں کے حاصل کرنے اور دکھانے کا انتظام کرنا جو دوسروں کے پاس ہیں۔ (مثلاً راج کوٹ کے شری تیج پال نے ازراہ مہربانی وہ فلم عنایت فرمایا ہے جو انھوں نے گاندھی جی کے ۱۹۳۹ء میں راج کوٹ جانے کے وقت لیا تھا۔)

یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ میرا نہ کبھی یہ ارادہ تھا اور نہ اب ہے کہ گاندھی جی کی ان تصویروں یا فلموں وغیرہ سے جو میں نے خود تیار کئے ہیں، یا دوسروں سے ملے ہیں روزی کماؤں۔ مجھے گاندھی جی کی تصویروں سے ان کی زندگی میں جو کچھ نفع ہوتا تھا وہ میں ان کے حوالے کر دیتا تھا یا ان کی رضامندی سے یا ان کی ہدایت کے مطابق کسی پبلک فنڈ کو بھیج دیتا تھا۔

باپو کی ہمت افزائی سے اور ان کی نگرانی میں مجھے بعض ٹریننگ کیمپ چلانے کا موقع ملا۔ میرا خیال تھا کہ اس کام کو بڑے پیمانے پر کروں اور میں نے اس کے متعلق ایک اسکیم کا مسودہ گاندھی جی کو دیا تھا اور ان کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ ان کی تصویروں سے جو آمدنی ہو اس کو اس کام میں خرچ کروں اس کے بعد بھی میرا ارادہ ہے کہ اس رقم کو سب سے پہلے اسی طرح صرف کروں۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تعمیری پروگرام کی دوسری مدوں میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب جب کہ گاندھی جی موجود نہیں ہیں ایک مجلس مشورہ مقرر کر دی جائے جو اس کام میں میری رہنمائی کرے اور اس کام میں میری مدد کرے تاکہ مجھے پہلے کی طرح لوگوں کی خدمت کرنے کی فرصت مل سکے۔ یہ بورڈ چترالیہ کا انتظام کرے گا۔ اس کا حساب رکھے گا۔ اور اس کے بارے میں سب مسئلوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی آمدنی کیوں کر خرچ کی جائے۔

میں نے یہ بیان ابھی شائع کر دیا ہے اس لئے کہ بورڈ کے مقرر ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔"

شری کنو گاندھی کو ان کے کام میں شری جمنا داس گاندھی سے مشورہ ملا کرتا تھا۔ جب سے ان کے ذہن میں وقف کرنے کا خیال آیا ہے وہ مجھ سے بھی رائے لیتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز کو عمل میں لانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ ان کا یہ بیان اس وجہ سے شائع کیا گیا ہے کہ پبلک کو ان ارادوں سے اور مقصدوں سے واقفیت ہو جائے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں

(بقیہ صفحہ ۲)

کے نہایت سہل الحصول ہیں اور جس کی شاعری نہایت لطیف اور شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اسے بھی وہ عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اردو زبان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر ہے..... اور زبان کا جو شاعر ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور بعض عربی فارسی کے تان گاڑی چلا جاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانا چاہتا ہے۔

حالی پر جنبہ داری یا خوشامد یا سیاسی مصلحت آمیزی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، ان کا یہ مشورہ ان سب کی توجہ کے قابل ہے جو اردو کو قائم رکھنا اور ہندوستانی کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔

کشکول محمد علی شاہ فقیر

سائیں کی جھولی میں بندے کا دیا، اللہ کا دلوایا کیا کچھ نہیں نکلتا۔ ایک شعر استاد جرأت کا سناتا ہوں۔ یہ ایرستاکریٹک شعر نہ روس والا کہہ سکتا ہے نہ امریکہ والا۔ یہ ہندوستان جنت نشان ہی کی سرزمین ہے، جہاں یہ پروا اگتا ہی چھکتا ہو

نالہ و آہ و فغاں سب مرادم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

"دیدی ناچت ہیں منہوں نچیوں" (میری بڑی بہن ناچتی ہے میں بھی ناچوں گی) ارے صاحب وہ جوان ہے، اس کے دل میں جوانی کا جوش ہے۔ یہ سن کا تقاضا ہے۔ امنگ ہے، ترنگ ہے۔ آپ چیاں ریزی کس برتے پر ناچیں گی۔ نہ چھب نہ تختی۔ گات نہ گولائی۔ کیا سبزہ رو سیدہ ابھرے گا۔ کیا توڑا لیں گی مگر نہیں ناچیں گی ضرور۔ اچھا ناچو خوش رہو بابا ہم اللہ کے فقیر ہم کو اس سے واسطہ؟

ہل انسان کی قدیم ترین ایجاد ہے۔ لیکن زمین ہل ایجاد سے پہلے بھی جوتی جاتی تھی اور اس وقت تک وہ سلسلہ جاری ہے، کاشتکاری کی مدد میں کیچوے کا آج بھی اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ دریائے نیل کے سیلاب میں نباتات بہہ کر آتے ہیں ان کو کیچوے کھا جاتے ہیں اور سب نجاں بہترین پانس بن جاتی ہے۔ انگلستان میں رومیوں کے زمانے کے آثار اس طرح باقی رہے کہ کیچوے اپنی مٹی سے اپنی اوپر کی زمین بنایا کئے، اور قدیم آثار نیچے دبے پڑے رہے۔ پتھر وغیرہ کے ریزے بھی اسی طرح نیچے دب جاتے ہیں۔ کیچوؤں کی پیدائش زیادہ کی جائے تو زمین زرخیز ہو جائے امریکہ میں تجربے کئے جا رہے ہیں۔

(ورلڈ ڈائجسٹ اگست ۱۹۴۸ء)

سودا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سوز

یاریوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

کدر پیا

موری انکھیاں ڈھونڈھ رہی ہیں
کدر پیا جن کا تم چاہت تھے
نا جانے کونے اور گئیں
موری انکھیاں .... (پیلو)

کہانی میں جیسے راجہ کی بیٹی بال بال گج موتی پروکر بھیسار کو جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے دریا پہاڑ، ہوائیں، فصلیں، پھل پھول، اناج

ص کے سسر و کرس۔

گھاس پھوس، درندے، چرندے، پرندے، بھارت ماتا کی لٹوں میں پروئے ہیں۔ ان جٹاؤں میں صرف کیتکی چمپا کے پھول ہی نہیں ہیں ان میں ٹھیکریاں بھی ہیں۔ انگریزی مثل ہے۔ مجھ کو چاہتے ہو تو میرے کتے کو بھی چاہو۔ اسی طرح جو کوئی اس ملک کو چاہے اس کی ہر چیز کو چاہے۔ اگر تم نے کوئی چیز چھوڑ دی تو اس معشوق کا سنبھاؤ کم ہو گیا۔ اگر ہم کو پیار کرتے ہو تو ہماری ہر بات تم کو پیاری ہو۔ معشوق کی یہی آن ہے۔ اور یہی بھارت ماتا کی آن ہے۔ پارہ ابرن سولہ سنگار میں کچھ کم ہو گیا تو ماتا رانڈ ہو گئی۔

خلاف وطن ہر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

سیفو کا ایک شعر

محبت کا زمانہ گذر چکا۔ بہار کب کی جا چکی۔ ساگر کے ہوؤں کو آنسوؤں کی خبر ہوئی ہے تو یقین رکھ تیری معشوقہ موت کی نیند میں بھی تیرے میٹھے سپنے دیکھتی ہے۔

ایک جاپانی عورت کا شعر

جیسے گہرے سمندر کا پہاڑ ہوتا ہے کہ جوار میں بھی پانی کی تہ میں رہتا ہے اور بھاٹے میں بھی۔ اسی طرح میری آستین ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی ہے۔

سات اور جاپانی اشعار

۱۔ اے شبنم کے قطرو۔ لاؤ میں اپنی مصیبت زدہ زندگی کے دھبے تم میں دھولوں۔

۲۔ راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔

۳۔ پیاری چھوٹی چڑیا یہ ننھی منی تھی پھولوں کے بیچ میں مگن ہے اس کو کیا کرو گی کھا کے۔

۴۔ دور دراز کی جھیل۔ مدتوں سے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ نہ لہر نہ ہچکولا۔
اے لو مینڈک اس میں کود پڑا

۵۔ لڑائی کا میدان ہزاروں کے خون سے رنگین بنا آج بہار کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ شکست و فتح کے خوابوں کی تعبیر یہ ہے۔

۶۔ بوڑھے سفید بالوں والے کا جنازہ باپ دادا کی ہڑواڑ میں رکھا ہے۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔

۷۔ باغ کی گھاس کے کیڑے ابھی تو توچوں چوں کر رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ تو یک بارگی چپ ہو جائے گا۔

اسے ہے ان اشعار سے تو غم کے بادل چھا گئے۔ میری محفل سے رنجیدہ نہ اٹھئے۔ ایک ہولی سن لیجئے

اور خوش خوش گھر جائیے، نہیں تو مجھ کو شرمندگی ہو گی۔

ساری ڈار دیئو موپہ رنگ کی گگر۔
لیسا دھو کہ دیا میں تو بھولے سو دیکھن لاگی ادھر
ساری ڈار دیئو.....
بن رنگ ڈارے میں جانے نہ دوں گی۔
جاتے کہاں ہو۔ کدر
ساری ڈار دیئو......

(کافی)

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

۲۔ صوبوں کی اندرونی سیاست کی وجہ سے اور اس وحشت کی وجہ سے جو لوگوں کو اجنبیوں سے ہوتی ہے ہر جگہ مقامی آبادی شرنارتھیوں کو بسانے میں مدد دینے کے بجائے اور روڑے اٹکاتی ہے۔

۳۔ خود شرنارتھیوں کو دور دراز شہروں اور صوبوں میں جانے اور نئے پیشے اختیار کرنے میں تامل ہوتا ہے۔

۴۔ شرنارتھیوں کے لیڈروں کا یہ رویہ بھی بحالی کے کام میں حائل ہوتا ہے۔ وہ حکومت پر حد سے زیادہ ذمہ داری ڈالتے ہیں، اور لوگوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حکومت کا اخلاقی اور قانونی فرض ہے کہ جو املاک وہ پاکستان میں چھوڑ کر آئے ہیں انھیں اس کا معاوضہ دے اور کاروبار شروع کرنے کے لئے روپیہ قرض دے۔

وزیر بحالی نے جو مشکلیں بتائیں ان میں سے پہلی بہر حال حل ہو چکی ہے۔ منصوبے جو کچھ بن سکتے تھے بن گئے ہیں ابھی مقامی آبادی کی شرنارتھیوں سے اور خود شرنارتھیوں کی اجنبی شہروں اور صوبوں سے وحشت اور اس کو دور کرنے کے لئے حکومت کو اور ملک کے بڑے لیڈروں کو ایک زبردست مہم شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت وحشت کا مقابلہ کرنا اور اس پر غالب آنا دراصل متحدہ قومیت کی تعمیر کا سب سے اہم فرض ہے جو ہمیں بہر حال ادا کرنا ہے۔ اگر ہم پنجاب کے رہنے والوں کو مدراس یا اڑیسہ میں بنگال کے رہنے والوں کو سی پی یا بمبئی میں نہ کھپا سکے تو کس منہ سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صوبائی اختلافات کے باوجود ہماری تہذیب اور معاشرت کی بنیادیں ایک ہیں۔

سب سے کڑی دراصل چوتھی مشکل ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک اس املاک کا مسئلہ طے نہ ہو جائے گا جو پاکستان سے آنے والے وہاں چھوڑ کر آئے ہیں ان کی بحالی کا کام کسی طرح انجام نہیں پا سکتا اور وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ توقع رکھنا کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے باہمی مشورے سے یہ حد سے زیادہ پیچیدہ گتھی سلجھ جائے گی بے جا امید پروری ہے۔ یونان اور ترکی کے درمیان اس سے کہیں کم تعداد میں تبادلہ آبادی ہوا تھا جتنی تعداد میں ہمارے ہاں ہوا ہے لیکن املاک کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے مجلس اقوام کا کمیشن مقرر کرنا پڑا اور اس نے کئی سال میں فیصلہ کیا۔ ہماری رائے میں حکومت ہند اور پاکستان کو چاہئے کہ جلد سے جلد اس معاملے کو بین الاقوامی پنچایت م

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

اور نظموں میں بھی اس نرمی گھلاوٹ اور لطافت ہے کہ ان کے مطالعے میں چاندنی اور ہلکے بہتے ہوئے دریا کی بدلی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ادھر تھوڑے دنوں سے اندر کی لوں نے جو اپنا رنگ بدلا ہے اس سے سیف بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں زندگی کے تنوع کے بجائے اس کی لطافت کو قید کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ جذبات میں گہرائی یا بلند خیالی نہیں لیکن کیف اور اثر انگیزی نے ان کی ان غزلوں کو جاندار بنا دیا ہے۔

نظمیں زیادہ تر رومانی ہیں۔ ان میں کوئی سماجی حقیقت اجاگر نہیں ہوتی مگر اس جوان دل کی امنگوں اور آرزوؤں کی ضربیں ضرور سنائی دیتی ہیں جو حالات سے آسودہ نہیں ہے۔ سیف کے موضوعات بہت نہیں ہیں۔ ان میں ہیجان اور خروش نہیں ہے مگر جو کچھ بھی ہے اس میں صداقت، شعریت اور کسک ہے۔ سیف کے استعارے خوب صورت، مصوری اور اشارے رنگین ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سیف کی شاعری ابھی اپنے لئے اور دنیائیں تلاش کرے گی اور پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کرے گی۔

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۵ | ۱۶ اپریل ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

فاقہ

مہاتما گاندھی

جن دنوں میں نے دودھ اور دال کو ترک کر کے خشک تر میوے کھانے کا تجربہ شروع کیا، اسی زمانے میں ضبط نفس کے لئے فاقے بھی کرنے لگا۔ اس میں مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ شریک تھے۔ میں اس سے پہلے بھی کبھی کبھی فاقہ کرتا تھا مگر صحت کے خیال سے۔ یہ بات مجھے ایک دوست سے معلوم ہوئی کہ فاقہ ضبط نفس کے لئے بھی ضروری ہے ....

جب میں نے یہ تجربہ شروع کیا تو اتفاق سے ہندوؤں کے ساون اور مسلمانوں کے رمضان کا ساتھ ہو گیا تھا۔ گاندھی خاندان ویشنو سماج اور شو سماج دونوں کے تہوار مناتا تھا اور وشنو مندر اور شوالے دونوں میں پوجا کرتا تھا۔ خاندان کے بعض افراد ساون کے پورے مہینے میں پرادوشہ رکھتے تھے۔ میں نے یہ طے کیا کہ میں بھی یہی کروں گا۔

یہ تجربے اس زمانے میں کئے گئے جب میں اور مسٹر کیلن باخ اور چند ستیا گرہی خاندان اپنے بچوں سمیت ٹالسٹائے فارم میں رہتے تھے۔ ان بچوں کے لئے ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان میں چار پانچ مسلمان لڑکے بھی تھے میں انھیں اس کا شوق دلاتا تھا کہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں اور اس میں ان کی ہر طرح مدد کرتا تھا خصوصاً نماز کے لئے میری بڑی تاکید تھی۔ چند پارسی اور عیسائی لڑکے بھی تھے انھیں بھی میں ان کی مذہبی رسوم کی پابندی پر راغب کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اس سال میں نے رمضان میں مسلمان لڑکوں سے روزے رکھوائے۔ میں خود پرادوشہ کا ارادہ [illegible] کر چکا تھا، ہندو پارسی، عیسائی لڑکوں کو بھی میں نے ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ایسے عمل میں جو ضبط نفس کی خاطر کیا جائے دوسروں کے ساتھ شرکت کرنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ فارم کے رہنے والوں میں سے بہتوں کو یہ بات پسند آئی۔ ہندو اور پارسی لڑکے ہر ذرا ذرا سی بات میں مسلمان لڑکوں کی تقلید نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ مسلمان لڑکے روزہ افطار کرنے کے لئے غروب آفتاب کا [illegible] تھے [illegible] سے کچھ پہلے سے کھا پی لیتے تھے تاکہ اپنے مسلمان دوستوں [illegible] اچھے [illegible] پکا کر کھلا سکیں۔ سحری [illegible] اور نہ ہی مسلمان لڑکوں کے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے اور نہ ان کی طرح پانی ترک کرتے تھے۔

ان تجربوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کو روزے کی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا اور ان میں ہمہ [illegible] اور [illegible] خلوص اور محبت کی روح [illegible] گئی۔

ہم سب لوگ جو ٹالسٹائے فارم میں رہتے تھے نباتاتی تھے۔ اس [illegible]

سچ پوچھئے تو یہ تھی کہ سب لوگوں کو میرے احساسات کی رعایت منظور رہتی جس کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مسلمان لڑکوں کو رمضان میں گوشت نہ ملنے سے یقیناً تکلیف ہوئی ہوگی۔ مگر انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بڑے شوق سے دال ترکاری کھاتے تھے اور ہندو لڑکے انھیں اکثر نئے مزے کی چیزیں جو فارم کی سادہ زندگی کے مناسب حال ہوتی تھیں، پکا کر کھلایا کرتے تھے ....

اس طرح فارم میں خود بخود ضبط نفس کی فضا پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ فارم کے اور رہنے والے بھی ہمارے ساتھ ادھورے اور پورے فاقے کرنے لگے جو ان کے لئے یقیناً سراسر مفید تھے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کے ترک لذات سے ان کے دل پر کہاں تک اثر ہوا اور خواہشات پر قابو پانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی البتہ اپنی نسبت مجھے یقین ہے کہ اس سے بے حد جسمانی اور اخلاقی فائدہ پہنچا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ فاقے اور اس قسم کی اور ریاضتوں کا سب پر یکساں اثر ہوتا ہے۔

فاقہ حیوانی جذبات کو دبانے میں صرف اسی صورت میں مفید ہے جب یہ ضبط نفس کی خاطر کیا جائے۔ میرے بعض دوستوں کا تو یہ تجربہ ہے کہ فاقے کے بعد حیوانی جذبات اور بھڑک اٹھے اور ذائقے کی قوت اور تیز ہو گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاقے کے ساتھ ہر وقت فاقے کا خیال نہ رکھا جائے تو اس سے بالکل کام نہیں چلتا۔ یہ محض خام خیالی ہے کہ اکیلا فاقہ ضبط نفس میں مدد دیتا ہے۔ یہ مضمون بھگوت گیتا کے دوسرے باب کے مشہور اشلوک میں بہت خوبی سے ادا کیا گیا ہے

"جو شخص صرف ظاہری لذات کو ترک کرتا ہے
اس کے دل سے محسوس چیزوں کا خیال ترک ہو جاتا ہے
آرزو کی خلش نہیں جاتی۔
مگر جب اسے خدا کا جلوہ نظر آ جائے،
تو یہ کھٹک بھی نہیں رہتی"

غرض فاقہ اور اس قسم کی دوسری ریاضتیں ضبط نفس کا ذریعہ ہیں اور بجائے خود کافی نہیں۔ اگر جسمانی فاقے کے ساتھ ساتھ ضبط نفس کا فاقہ نہ ہو تو اس کا انجام ریاکاری اور ہلاکت ہے۔

"تلاش حق" حصہ دوم

فہرست مضامین

فاقہ	مہاتما گاندھی	۱	وندریہ نو کی آمد	گوپی ناتھ امن	۷
ہریجن کا ست	پیارے لال	۲	لالہ و گل	خیال مینائی	۷
فلسطین کا سبق	اداریہ	۳	شورہ	باقر رضوی	۷
بزم بے تکلف		۳	[illegible] بیاری	ص، خ	۸
[illegible] ہفتہ:- ہندوستان	ع، ح	۴	جرمنی اور فرانس	عبد الحلیم ندوی	۹
-- پاکستان	ص، خ	۵	کتابوں کی باتیں	صالحہ عابد حسین	۱۰
-- باہر کی دنیا	ع، ح	۶			

قیمت فی پرچہ ۲

ہریجن کا ست

انصاف سے کام لو

پیارے لال

پنڈت نہرو نے خان بھائیوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ آپ کہیں دوسری جگہ پڑھیں گے ان کو برابر قید رکھنا مہذب دنیا کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر ایسے گناہوں کے ستائے جانے کی وجہ اپنے آپ کو اونچے سے اونچے مقصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں کوئی مثال ہے تو یہاں دونوں بھائیوں کی خصوصاً بادشاہ خاں کی ہے۔ دنیا آسانی سے نہیں بھولے گی کہ تیز مزاج نڈر پٹھانوں کو بہادروں کی اہنسا سکھانے کا معجزہ ان کے ہاتھوں ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان میں اور حکومت وقت میں چاہے جو مت بھید ہو، ان کی دیانت داری میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ وہ پاکستان کو قبول کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بٹوارے کے بعد جب میں دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے ساتھ تھا تو ایک دن ان کے نام بادشاہ خاں کا پیغام پہنچا کہ آپ ہماری طرف سے پریشان نہ ہوں ہم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ نہ آپ سے ملیں گے نہ آپ کو خط لکھیں گے تاکہ ہماری نیک نیتی میں کوئی شک نہ رہے۔ یہ کتنا بڑا ظلم اور نا انصافی ہے کہ ان پر دغا بازی اور دورُخے پن کا شبہ کیا جائے کہ وہ ایسی حرکتیں کر ہی نہیں سکتے۔ ان کو اپنے ملک سے اور اس کے رہنے والوں سے بڑی گہری محبت ہے۔ بادشاہ خاں اپنی طبیعت سے سیدھے سادے آدمی ہیں، اور بعض وقت ایسے بھولے پن کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرے کے لئے بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی نے جو ان کو اچھی طرح پرکھ چکے تھے ۱۹۳۸ء میں ان کے ساتھ صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں لکھا تھا:۔

"خدائی خدمتگار جیسے کچھ بھی آگے چل کر جیسے بھی ثابت ہوں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے لیڈر جن کو وہ بادشاہ خاں کہہ کر خوش ہوتے ہیں کیسے ہیں۔ وہ [illegible] ایک باخدا آدمی ہیں۔ وہ خدا کے وجود پر دل سے ایمان رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی تحریک تبھی کامیاب ہوگی جب خدا کی مرضی ہو۔ وہ اپنا کام دل و جان سے کرتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے لئے صرف یہی حقیقت جو ان پر کھل گئی ہے کافی ہے کہ پٹھانوں کی نجات کامل عدم تشدد کے بغیر نہیں ہو سکتی ....

وہ نہیں چاہتے کہ ان کے پٹھان سماج میں گندے بن جائیں۔ ان کا خیال ہے کہ پٹھانوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور ان کو خاص کر کے جاہل رکھا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ پٹھان اور بہادر بنیں اور بہادری کے ساتھ سچا علم بھی حاصل کریں۔

"وہ باتیں بنانا نہیں جانتے۔ انھیں بناوٹ چھو بھی نہیں گئی .... جب ٹیکسلا میں ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو ہماری آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔"

اس دورے میں ایک بار بادشاہ خاں نے گاندھی جی سے اپنے دل کا حال ایسے لفظوں میں بیان کیا جن سے ان کی سیرت کی اندرونی گہرائیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بالکل انھیں کے الفاظ ہیں جو ان کے منہ سے نکلتے ہی لکھ لئے گئے اور ان دنوں ہریجن میں شائع ہوئے تھے۔

"مہاتما جی یہ زمین جو غلے اور پھلوں سے مالا مال ہے ایک چھوٹی سی جنت ہوتی مگر افسوس آج یہ جھلس کر رہ گئی ہے۔ میرے دل میں یہ عقیدہ روز بروز راسخ ہوتا جاتا ہے کہ اس صوبے میں ہم پٹھانوں کو تباہ کرنے والی سب چیزوں سے بڑھ کر تشدد کی لعنت ہے۔ اس نے ہماری یکجہتی کو ختم کر دیا اور ہمیں خانہ جنگیوں میں مبتلا کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ آج پٹھان کی ساری قوت یہ تدبیر سوچنے میں صرف ہوتی ہے کہ اپنے بھائی کا گلا کیسے کاٹے۔ اگر ہمیں کسی طرح سے تشدد کی لعنت سے چھٹکارا مل جاتا تو اس قوت سے کیسے کیسے کام لئے جا سکتے تھے؟

"اور صوبوں میں چاہے جو صورت ہو مگر مجھے پورا یقین ہے کہ صوبۂ سرحد میں عدم تشدد کی تحریک ہمارے لئے خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ پٹھانوں کے لئے عدم تشدد کے سوا نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ میں یہ اس حیرت انگیز تبدیلی کی بنا پر کہتا ہوں جو عدم تشدد کے چھوٹے سے تجربے نے ہم میں پیدا کر دی ہے۔ مہاتما جی ہم لوگ بڑے زود رنج اور آرام طالب تھے۔ ہمارے لئے بیکار وقت گزارنا معمولی بات تھی [illegible] نے ہم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور ہمیں اتنا محنتی بنا دیا ہے کہ جس زمین سے پہلے [illegible] دس روپے کی پیداوار ہوتی تھی اس سے اب بیس روپے کی ہونے لگی ہے۔ ہم نے اب خوف سے نجات پا لی ہے۔ [illegible] انگریز سے اور ایک انگریز ہی پر کیا موقوف ہے کسی سے [illegible] نہیں ڈرتے .... انگریز خود ہمارے عدم تشدد سے ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بے تشدد پٹھان پُر تشدد پٹھانوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم عدم تشدد کا سارا نظریہ جو آپ نے ہمیں سمجھایا ہے ہضم کر لیں اور اس پر عمل کریں تو ہماری قوت اور خوشحالی کتنی بڑھ جائے! ہم تباہی کے گڑھے میں گرنے ہی کو تھے۔ مگر خدا نے اپنی رحمت سے ہمارے لئے عین وقت پر عدم تشدد کی تحریک بھیج دی۔"

ایسا شخص کبھی اس ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا جو اسلامی کہلاتی ہے۔ خان بھائی اسی مٹی سے بنے ہوئے ہیں جس سے غازی اور شہید بنتے ہیں۔ انھیں کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ان کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے وہ ہر چیز سے قطع نظر کر کے اپنے مقصد کے لئے جان بھی دینے کو تیار رہیں اسی لئے ان کو اب بھی کوئی شکایت نہیں۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا خدا کے ان نیک بندوں کا اس کے سوا کوئی مصرف نہیں ہے کہ ان کو زندہ دفن کر دیا جائے۔

اب مجھے خدائی خدمتگاروں سے دو حرف کہنے ہیں۔ ان کے لئے آزمائش کا وقت ہے۔ ان کو گاندھی جی کی یہ پیش گوئی یاد رکھنی چاہیئے جو اسی مضمون میں ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے:۔

"اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمتگاروں نے اس عقیدے سے منہ موڑ دیا جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عدم تشدد ان کے دل میں نہ تھا۔ امتحان کا موقع بہت جلد آنے والا ہے۔ اگر وہ جوش اور عقیدت کے ساتھ تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو کوئی خطرہ نہیں، جب وقت آئے گا تو وہ بہادروں کے بہادر ثابت ہوں گے۔"

عدم تشدد کے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں وہ آپ ہی اپنی سند اور آپ ہی اپنا ثمر ہے۔ وہ بے جرم تکلیفیں اٹھا کر اور ظاہر میں شکست کھا کر فتح پاتا ہے۔ یہ تیر وہ ہے جو کبھی خطا نہیں ہوتا۔

جب کی سیاست اور اب کی سیاست

ج۔ ک۔ کماراپا

...... برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں سیاسی تدبیروں کی ضرورت تھی، مگر معاشی ظلم افلاس اور بیماری کے راکھشسوں سے لڑنے کے لئے نہایت عزم و استقلال کے ساتھ تعمیری کام کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو بھی ایک واضح پالیسی معین کر [illegible] چاہیئے۔

غرض سامراجی کی سیاست [illegible] اختیار کی جائے تو ہمارا قدروں کا معیار بالکل بدل جائے گا مادی مصلحتوں کی جگہ اخلاقی انسانی اور روحانی قدروں پر زور دینا ہوگا اور [illegible] سادہ زندگی میں ان قدروں کی [illegible] پیدا کرنی ہوگی جب تک اس معاشی نظام کے آثار نظر آ نہیں ......

(گاندھی جی کے حلقے کے) تعمیری کارکن [illegible] سیاست کے میدان میں نہیں لڑایا جا سکتا ......

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

قانون سازی کی صنعت

پارلیمنٹ کا اجلاس ۱۹ اپریل کو ختم ہو گیا۔ پچھلے ہفتے اس نے جس رفتار سے کام کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قانون سازی ہمارے یہاں بڑے پیمانے کی صنعت بنتی جاتی ہے۔ اس اجلاس میں کل اکیاون نشستیں پہنے پانچ پانچ گھنٹے کی ہوئیں جن میں کوئی ساٹھ بلوں پر بحث ہوئی دو بل واپس لے لئے گئے۔ کچھ سلیکٹ کمیٹی کے سپرد ہوئے۔ کچھ رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر ہوئے اور پورے باون بل منظور ہوئے۔ روزانہ ایک بل کا اوسط اسمبلی کے پچھلے ریکارڈ میں مشکل سے نظر آئے گا۔ لیکن حیرت انگیز کارنامہ تو یہ ہے کہ تقریباً آدھے یعنی کوئی دو درجن بل آخری دو دن میں پاس ہوئے۔ ان میں سے اکثر محض جزوی ضابطوں پر مشتمل تھے اس لئے ان کے بارے میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں تھی لیکن ہمارے فرض شناس قانون سازوں نے کسی نہ کسی طرح نکال ہی لی۔ چنانچہ چائے کے کنٹرول کے متعلق بل کے سلسلے میں یہ بحث چھڑ گئی کہ چائے کے طبی خواص کیا ہیں۔

پارلیمنٹ میں کسی قابل ذکر مخالف پارٹی کا موجود نہ ہونا اس لحاظ سے تو بہت آرام دہ ہے کہ حکومت کے حسب منشا جلدی جلدی بہت سا کام ہو جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کی وجہ سے جمہوری قانون سازی کا اصل مقصد کہ معاملے کا ہر پہلو سامنے آ جائے اور جمہور کے نمائندے سوچ سمجھ کر رائے دے سکیں، فوت ہو جاتا ہے۔

ابھی ہمارے قانون ساز پانچ ہفتے آرام کرنے کے بعد ... سازوں کے ... میں اسمبلی میں ... کہا جاتا ہے کہ ۱۵ اگست تک آئین کی باقی دفعات کو پاس کر کے آئین سازی کا کام مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ... پریزیڈنٹ ... شاستری ... حکومت اور ... احمد صاحب کے ہوتے ہوئے یہ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

غالباً پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس کی ساری کارروائی میں سب سے اہم وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا وہ بیان ہے جو انھوں نے ہندوستان میں بدیسی سرمائے کے لگائے جانے کے بارے میں دیا۔ اس کے اہم نکتے یہ ہیں:-

۱- حکومت ہندوستانی کارخانہ داروں کی طرح باہر کے کارخانہ داروں سے بھی یہ توقع رکھے گی کہ وہ حکومت کی عام صنعتی پالیسی کی شرطوں کی پابندی کریں۔ باہر والوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی جو ہندوستان کے سرمایہ داروں پر نہ لگائی گئی ہو۔ حکومت اپنی پالیسی کی تفصیلات کو طے کرتے وقت اس کا خیال رکھے گی کہ وہ غیر ملکی سرمایہ کے لئے کشش رکھتی ہو۔

۲- غیر ملکی کارخانوں کو مناسب نفع حاصل کرنے کی اجازت ہوگی اور ان پر بھی وہی قواعد عائد ہوں گے جو دوسرے کارخانوں پر۔ نفع کی رقم باہر بھیجنے کے لئے سہولتیں دی جائیں گی لیکن ان کا دارومدار مبادلہ زر (ایکسچینج) کی صورت حال پر ہوگا۔ اگر حکومت کو کسی غیر ملکی کارخانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت پڑی تو منافع کی ادائیگی کے لئے مناسب سہولتیں دی جائیں گی اور اگر ان پر بالکل قبضہ کر لیا گیا تو واجبی معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

۳- حکومت اس بات کا پہلے ہی اعلان کر چکی ہے کہ ہر کارخانے میں زیادہ تر سرمایہ اور اس کے انتظام میں زیادہ تر حصہ ہندوستانیوں کا ہوگا اور یہ بھی کہہ چکی ہے کہ قومی مفاد کے پیش نظر خاص خاص حالتوں میں وہ اسے اپنے انتظام میں لے لے گی۔ یوں تو ہر معاملے کا فیصلہ اس کی مخصوص صورت حال کے لحاظ سے کیا جائے گا لیکن عام طور پر حکومت کسی ایسے غیر ملکی سرمائے پر اعتراض نہیں کرے گی جو ایک محدود مدت کے لئے مستعمل ہو رہا ہو اور جس سے ہندوستان کو فائدہ پہنچ رہا ہو۔ حکومت کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا کہ جن کاموں کے لئے مخصوص فنی قابلیت رکھنے والے ہندوستانی نہ ملیں ان کے لئے غیر ملکی ماہر رکھے جائیں مگر اس شرط پر کہ وہ کم سے کم وقت میں ہندوستانیوں کو یہ کام سکھا دیں۔

اس طرح ہمارے وزیر اعظم نے خاص طور پر برطانوی اور عام طور پر سب غیر ملکی سرمایہ داروں کو وہ دعوت دے دی جس کے وہ عرصے سے منتظر تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ فیصلہ نہایت خطرناک ہے۔ اگر ہر ہر قدم پر انتہائی احتیاط اور دور بینی سے کام نہ لیا گیا تو یہ اندیشہ ہے کہ بیرونی سرمائے کے ساتھ ساتھ بیرونی سیاسی اثرات پھر ہمارے ملک میں جڑ پکڑ لیں گے لیکن اس میں اتنا فائدہ ضرور نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ داروں میں سے جو اپنا سرمایہ اس خیال سے روکے ہوئے تھے کہ حکومت سے جو شرطیں چاہیں منوا لیں گے وہ باہر والوں کے مقابلے کے خوف سے ذرا ڈھیلے ہو جائیں گے۔

وزارت کی شطرنج

پچھلے ہفتے ہندوستان کے دو صوبوں میں جو ایک دوسرے سے کوئی ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر ہیں یعنی مدراس اور مشرقی پنجاب میں پرانی وزارتوں کی بساط الٹ گئی اور نئی وزارتیں بن گئیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ تبدیلی کسی اصول کی بنا پر نہیں بلکہ محض شخصی لسانی یا علاقہ واری رقابت کی بنا پر ہوئی ہے۔ مدراس میں تو خیر تامل ناڈ، تلنگانے اور کیرل کے نمائندوں میں پرانی رقابت چلی آ رہی ہے جس سے وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں لیکن پنجاب میں جہاں پہلے زمیندار اور غیر زمیندار میں مقابلہ رہتا تھا اب مغربی اور مشرقی پنجاب یا مقیم اور مہاجر کی کشمکش شروع ہوئی ہے۔ یہاں صوبے کی کانگریس پارٹی میں ایک گروپ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کا ہے جس میں زیادہ تر مشرقی پنجاب کے لوگ ہیں اور دوسرا لالہ بھیم سین سچر کا جو زیادہ تر مغربی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجروں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں ... ایک مدت سے ... رسہ کشی ... ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کی وزارت ڈگمگا رہی تھی۔ مگر ان کو مرکز سے سہارا مل رہا تھا اس لئے کام چل رہا تھا۔ پچھلے دنوں دونوں جماعتوں میں مصالحت کی گفتگو کامیاب ہوتی نظر آتی تھی۔ دونوں نے مل کر متفقہ طور پر ڈاکٹر گوپی چند کو از سر نو لیڈر منتخب کر لیا تھا۔ مگر پھر نہ معلوم کیا گڑبڑ ہوئی کہ سچر گروپ نے وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بار ڈاکٹر گوپی چند کو مرکز سے مدد نہیں ملی اور انھوں نے یہ دیکھا کہ صرف اپنے بل پر وزارت نہیں چلا سکتے اس لئے ان کو پارٹی کی لیڈری سے استعفا دینا پڑا اور لالہ بھیم سین سچر کثرت رائے سے لیڈر منتخب ہو گئے۔ انھوں نے نئی وزارت کے پانچ ناموں کا اعلان کر دیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ باقی دو وزیر وہ ڈاکٹر بھارگو کے گروپ میں سے لینے کو تیار ہیں۔ اگر دونوں جماعتوں میں مصالحت ہو کر ایک مضبوط اور پائدار وزارت بن جائے تو اس بدنصیب صوبے کو جس پر پناہ گزینوں کو بسانے کا بوجھ اور صوبوں کے مقابلے میں دس گنا ہے کچھ چین ملے اور اس کے وزیر سیاسی جوڑ توڑ کے بجائے صوبے کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کو سدھارنے، پناہ گزینوں کے مسئلے کو حل کرنے اور ان بڑے تعمیری منصوبوں کو پورا کرنے کی طرف جو شروع ہو چکے ہیں جیسی چاہیے توجہ کر سکیں۔

کیا یہ ہماری بدگمانی ہے

کچھ دن پہلے تک یہی خبریں آ رہی تھیں کہ کشمیر میں ڈکسن کا کام آگے بڑھ رہا ہے اور بہت جلد عارضی صلح کا اعلان ہو جائے گا۔ مگر ادھر چند روز سے کچھ رنگ بدلا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ کئی جگہ سرحد کے قریب پاکستانی فوجوں کی غیر معمولی نقل و حرکت کی خبریں آئی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کہیں کہیں انھوں نے اس خط سے جہاں ۱۹۴۹ء میں لڑائی بند ہونے کے وقت موجود تھیں آگے قدم بڑھا لیا ہے۔ سرحد پار ایسا ... اور ان کے ساتھ ... کی ... میں کچھ ... زیادہ تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تبدیلی اتفاق سے اسی وقت سے ... ہے جب مسٹر چرچل کے نائب مسٹر ... پاکستان تشریف لے گئے ہیں۔ اب نہ معلوم یہ محض ہماری بدگمانی ہے یا واقعی ان دونوں باتوں میں کوئی تعلق ہے۔

۲۔ پاکستان

مسلم لیگ کے کارکن بھی سوچنے لگے

جب تک پاک پنجاب میں مسلم لیگ کی نسبتاً بھلی وزارت قائم تھی، کوئی شخص اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت سے عوام بد دل ہو چکے ہیں لیکن ممدوٹ کا مسند وزارت سے گرنا تھا کہ دولتانہ کے لئے بھی منصب صدارت سنبھالنا مشکل ہو گیا مجبوراً اُسے بھی مستعفی ہونا پڑا۔ اب جو گورنری راج قائم ہوا اور سر فرانسس موڈی ضلع ضلع کے دورے پر نکلے اور انھوں نے ہر جگہ دربار لگانے شروع کر دئیے تو ہر شخص کو جسے تھوڑا سا بھی سیاسی شعور ہے محسوس ہونے لگا کہ صوبے میں اب کوئی قیادت نہیں رہی اور عوام پھر سرکاری افسروں اور انگریز لاٹ کو مائی باپ سمجھنے لگے ہیں اور اگر یہی روز و شب رہے تو کچھ بعید نہیں کہ صوبہ پنجاب کے مسلمانوں کی وہی حالت ہو جائے، جو ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں تھی، یعنی افسروں کی جی حضوری اور آپس میں ایک دوسرے کے دشمن، سیاسی مسائل سے بے تعلق اور برادریوں اور ذاتوں کی کشمکش میں پیش پیش۔

سیاسی خلا اور اس سے بعد میں پیدا ہونے والے تلخ نتائج کے احساس نے بالخصوص مسلم لیگ کے نوجوان کارکنوں کو بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی ماہ اپریل میں ان میں سے بعض کارکنوں کے کچھ اجتماع بھی ہوئے ہیں جن میں محض اوپر کی قیادت کی گری ہوئی ساکھ کو دوبارہ بحال کرنے کے بجائے اس بات پر غور کیا گیا کہ کس طرح کارکن عوام تک پہنچیں اور انھیں سیاسی طور پر منظم کریں۔

ان کارکنوں کے پیش نظر جہاں تک ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کم و بیش ایک ہی سا لائحہ عمل ہے۔ چنانچہ سب کا یہی کہنا ہے کہ اب خالی خولی نعرے سے کام نہیں چل سکتا اور نہ محض اسلام کا نام لے کر ہم عوام کو زیادہ دیر تک خوش رکھ سکتے ہیں اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اس وقت تو صرف معاشی پروگرام ہی سے کر ہم عوام کے پاس جا سکتے ہیں۔

(آفاق، لاہور)

لائل پور کانفرنس کے فیصلے

لائل پور۔ ۴ر اپریل مسلم لیگ کے کارکنوں کی کانفرنس نے جو کل ختم ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کے اندر ایک ترقی پسند محاذ عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بنایا جائے۔

اس کانفرنس نے پاکستان کی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ کامن ویلتھ سے الگ ہو جائے اور اپنی خارجی پالیسی (پچھ؟) کی وجہ سے بعض بیرونی طاقتوں کو پاکستان کے معاشی استحصال کا موقع ملتا ہے نظر ثانی کرے۔

(پاکستان ٹائمز)

افغانستان، پاکستان اور ہندوستان

سر الف کیرو نے جو صوبہ سرحد کے گورنر اور متحدہ ہندوستان میں محکمہ امور خارجہ کے انچارج رہ چکے ہیں لندن کی رائل ایمپائر سوسائٹی میں تقریر کرتے ہوئے تعلقات کی اس رفتار پر جو افغانستان میں اور پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے میں رونما ہو رہی ہے ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کیفیت سے جو افغانستان کے افغانوں اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں نے پیدا کر دی ہے۔ روس فائدہ اٹھا کر پاکستان کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے جس کی زد ہندوستان پر بھی پڑتی ہے۔ سر الف کیرو نے کہا کہ روس کراچی پر خلیج فارس کے بحری راہ سے حملہ کر سکتا ہے اور خشکی میں کوئٹہ اور درۂ خیبر کی راہ سے پاکستان میں داخل ہو سکتا ہے سر الف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ خلیج فارس کے بحری اور کوئٹہ اور درۂ خیبر کے بری راستوں کی مدافعت کا سارا بوجھ پاکستان کے کندھوں پر آن پڑتا ہے جو اکیلا اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا لہٰذا ہندوستان اور مہذب دنیا کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کا ہاتھ بٹائیں۔

مغربی پاکستان، لاہور

وزیر اعظم سرحد پر شدید الزامات

حضرت امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف نے ایک اخباری بیان میں صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبد القیوم خان کے وزارتی طرز عمل پر شدید الزامات لگائے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ خان عبد القیوم خان آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر ڈکٹیٹری انداز سے حکومت کر رہے ہیں اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے اخلاق کے عام معیار کو گرے ہوئے اور جمہوریت کے اصول و قواعد کے منافی طریقے استعمال کر رہے ہیں۔ پیر صاحب کے لگائے ہوئے الزامات کا لب لباب یہ ہے:

(۱) اپنے قتل کی سازش کا جو خط خان عبد القیوم خان نے اسمبلی کے ایوان میں پڑھ کر سنایا وہ جعلی تھا اور یہ سٹنٹ محض اس لئے اختیار کیا گیا کہ ممبروں کو ڈرا کر انھیں عدم اعتماد کی تحریک سے باز رکھا جا سکے۔

(۲) عبد القیوم خان نے اس تحقیقاتی کمیٹی کو توڑ دیا جو رشوت ستانی اور غلط الاٹمنٹوں کی تحقیقات کے لئے مقرر کی گئی تھی اور اس کی رپورٹ کو خفیہ رکھا۔

(۳) اپنے سیاسی مخالفین پر جبر کرنے کے لئے اس نے اسمبلی سے ایسا قانون منظور کرا لیا کہ حکومت کے عہدہ دار ...... مقدمات کی مسلیں عدالت سے چھین کر غیر معین مدت کے لئے اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔

(۴) الاٹمنٹوں کے سلسلے میں غلط بخشی، اقربا نوازی اور دوست پروری سے کام لیا گیا۔

(۵) ضلع ہزارہ اور چارسدہ میں مزارعین کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا

(۶) ضمنی انتخابات آئین و قواعد کے مطابق نہیں کرائے جاتے۔

یہ الزامات بڑی شدید نوعیت کے ہیں اور ان میں سے اکثر بادی النظر میں خالی از صحت نہیں۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعظم کو چاہیئے کہ صوبہ سرحد کو سرزمین بے آئین بنانے کی کوشش نہ فرمائیں بلکہ اپنے حسن کارکردگی کے بل پر وزارت عظمیٰ کے منصب عالی پر متمکن رہنے کی کوشش کریں۔ خان عبد القیوم خان نے اپنے مخالفین پر الزام لگایا تھا کہ وہ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بلکہ انھیں قتل کرنے کے لئے ہندوستان کے پاکستان دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ اپنے ان الزامات کو ثابت کریں اور جو الزامات دوسری جانب سے لگائے جا رہے ہیں ان کا جواب دیں۔

مغربی پاکستان، لاہور

سکھر کا بند

حکومت سندھ نے اعلان کیا ہے کہ ۳ر اور ۴ر اپریل کو پروفیسر ہیل سٹورم نے مسٹر محسن علی مرکزی محکمہ انجینئرنگ کے صدر، مسٹر محمد ہاشم گزدر ڈویلپمنٹ ایڈوائزر حکومت سندھ اور سندھ کے دو اور بڑے انجینئروں کے ساتھ بہت غور اور توجہ سے دریائے سندھ کے بند کا معائنہ کیا۔

پروفیسر ہیل سٹورم نے کہا کہ بند ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اگر مزید تحقیقات کے بعد کسی بڑی کارروائی کی ضرورت محسوس ہوئی تو ممکن ہے مرمت اور درستی کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا جائے۔

(پاکستان ٹائمز)

تیل کی تلاش

کراچی، ۷ر اپریل۔ برما آئل کمپنی بدستور مغربی پنجاب میں پٹرول کی تلاش میں مصروف ہے مگر ابھی تک اس کے دستیاب ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ خیال ہے کہ لکھرا (سندھ) کے مقابلے میں چکوال میں جس کے آس پاس پہلے ہی سے پٹرول نکلتا ہے اس کے نئے ذخیرے دریافت ہونے کی زیادہ امید ہے۔

کمپنی کی کارکردگی کی تازہ ترین رپورٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چکوال میں دو آزمائشی کنوؤں میں زیادہ تیزی سے کام ہو رہا ہے ....

صرف لکھرا کے منصوبے پر جو پچھلے سال ۲۴ مئی کو شروع کیا گیا تھا اب تک تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ یہاں کھدائی کا کام زیادہ مشکل ہے اس لئے کہ زمین کے اندرونی پرتیں دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں۔

(پاکستان ٹائمز)

۳- باہر کی دنیا

روس پر کیا اثر ہوا؟

معاہدۂ اٹلانٹک سے مغربی یورپ اور امریکا میں خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ عام خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدے سے تیسری جنگ عظیم کا خطرہ ایک عرصے کے لئے ٹل گیا ہے اور یورپ میں امن و سکون قائم ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ مسٹر بیون نے تو اپنی واشنگٹن والی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ اب ہم کوشش کریں گے کہ ایک سال کے اندر مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کے جھگڑے کو چکا دیں۔ مگر دوسری طرف روس میں اس پر غم و غصے کا اظہار کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ دراصل یہ روس اور اس کے ساتھی ملکوں پر جارحانہ حملے کرنے کی تیاری ہے۔ سوویٹ وزارت خارجہ نے قریب قریب سب ملکوں کو جنھوں نے اس معاہدے پر دستخط کئے ہیں احتجاج کا نوٹ بھیجا جسے ان سب نے رد کر دیا۔

یورپ سے جو اخبار اس ہفتے آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ روس نے صرف شکایت اور احتجاج ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ زور شور سے دفاعی انتظامات شروع کر دئے ہیں۔ موسیو مولوٹوف کو وزیر خارجہ کے عہدے سے ہٹانے کی ایک وجہ یہ ضرور ہے کہ پولٹ بیورو کے خیال میں ان کی عام بیرونی پالسی خصوصاً وہ پالسی جو انھوں نے مغربی جرمنی اور برلن کے بارے میں اختیار کی غلط تھی اور ان کو اس میں سراسر ناکامی ہوئی، لیکن ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ مرکزی دفاعی کونسل جو جنگ ختم ہونے کے بعد توڑ دی گئی تھی دوبارہ قائم کی گئی ہے اور موسیو مولوٹوف کو نائب وزیر اعظم کے علاوہ دفاعی کونسل کا صدر بنایا گیا ہے۔ ان کے مشورے سے روس کے فوجی انتظامات میں اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ فوج کے افسر اعلیٰ کا عہدہ مارشل بلگانن سے لے کر مارشل واسیلفسکی کو دیا گیا ہے یورپی روس اور ایشیائی روس کی کمان الگ الگ کر دی گئی۔ اور باہر کے ملکوں میں جو روسی فوجیں ہیں ان کا ایک مشترک جنرل اسٹاف بنایا گیا ہے۔ یورپ کے اخبار کہتے ہیں کہ یہ ساری کارروائی محض اس لئے ہے کہ خود روس میں اور اس کے ساتھی ملکوں میں جو گھبراہٹ معاہدۂ اٹلانٹک کی وجہ سے پھیل گئی ہے اُسے دور کیا جائے لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ روس کے ارباب حل و عقد کو امریکا، برطانیہ اور ان کے حلقوں کی صلح پسندی کے دعووں پر اعتماد نہیں ہے اور وہ محض مشرقی یورپ کے لوگوں کی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے دفاعی تیاریوں کا مظاہرہ نہیں بلکہ سچ مچ تیاریاں کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ اندازہ ہے کہ روس بہت جلد یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو کی طاقت کو توڑنے کی کوشش کرے گا اس لئے کہ اسے اندیشہ ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو یہ مار آستین بہت خطرناک ثابت ہوگا۔

یوسف بے کارواں

برما کے وزیر اعظم تھاکن نو نیارت نہرو سے ملنے کے لئے دہلی تشریف لائے ہیں اور اس کے بعد کراچی جا کر لیاقت علی خاں سے ملیں گے ان کا کہنا تو یہ ہے کہ بہت دن ہوئے پنڈت نہرو نے ان کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی جس کے قبول کرنے کا موقع انھیں اب ملا ہے، لیکن یہ محض حسن بیان معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ملک کو اس نازک حالت میں چھوڑ کر محض دوستانہ ملاقات کے لئے کیا آئے ہوں گے! کیا اچھا ہو اگر ان کے آنے کی غرض یہ ہو کہ پنڈت نہرو نے پچھلے مہینے جو مشورہ انھیں دیا تھا اس پر عمل کریں یعنی ہندوستان کو بیچ میں ڈال کر اپنی مخالف جماعتوں سے مصالحت کی گفتگو چھیڑیں۔ انھوں نے اپنے طور پر جو بات چیت شروع کی تھی اس کا تو کوئی نتیجہ نکلا نہیں اور اب حالت یہ ہے کہ ان کی کیبنٹ میں برما کی بڑی پولٹیکل پارٹیوں میں سے کسی کے نمائندے نہیں ہیں اور حکومت محض اس وجہ سے چل رہی ہے کہ زرد پٹی والی (سوشلسٹ) اور سفید پٹی والی (نیم کمیونسٹ) پی، وی، او پارٹی کے لوگ کیبنٹ سے الگ ہو جانے کے باوجود اس کا ساتھ دے رہے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کا ساتھ کب تک ہو سکے گا۔

چین کا گورکھ دھندا

چین میں کمیونسٹ علاقے سے تو ہمارے ہاں خبر پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور کومن تانگ کی حکومت کی طرف سے جو خبریں پہنچتی ہیں وہ اس قدر الجھی ہوتی ہیں کہ ان سے صورت حال کا سمجھنا مشکل ہے۔ یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ کومن تانگ کی فوجی طاقت قریب قریب ختم ہو چکی ہے اور اس کا معاشی اور اخلاقی دیوالہ نکل چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک حربہ باقی ہے جس کے بل پر وہ کمیونسٹوں کے آگے بلا شرط ہتھیار ڈالنے کی بجائے ان سے شرطوں کی بات چیت کر رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کے ہاتھ میں نظم و نسق کی مشین صحیح سالم دینے کے بجائے توڑ پھوڑ کر دے سکتی ہے۔ لیکن یہ حربہ اتنا کارگر نہیں کہ اس کے ذریعے سے وہ بہت اچھی شرطیں منوا سکے صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ وہ کھلم کھلا ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بچ جائے۔ مگر صلح کی بات چیت کی رفتار کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک دن خبر آئی ہے کہ کمیونسٹوں نے لڑائی بند کرنے کا حکم دے دیا اور دریائے یانگ سی کے شمالی کنارے سے اپنی فوجیں ہٹا رہے ہیں۔ دوسرے دن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فوجیں اس دریا کو پار کر کے جنوبی چین پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اسی طرح صلح کی شرطوں کے بارے میں بھی متضاد باتیں کہی جاتی ہیں۔ غالباً اصل قصہ یہ ہے کہ نانکنگ کی حکومت خبروں میں رنگ آمیزی سے کام لے رہی ہے اور گھبراہٹ میں ایسے رنگ استعمال کر رہی ہے جو ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ بہرحال حقیقت زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکتی۔

ہنوز روز اول

۲۳ مارچ کو سیکورٹی کونسل نے ہالینڈ کی تالیف قلب کے لئے ایک بہت نرم رزولیوشن پاس کیا تھا جس کی رو سے ہالینڈ کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے ارکان کو رہا کر دے اور ان سے لڑائی بند کرنے اور جوگ جاکارتا میں جمہوری حکومت کو بحال کرنے کے بارے میں ابتدائی بات چیت شروع کرے۔ اس رزولیوشن کی رو سے ہالینڈ کی تجویز کی ہوئی گول میز کانفرنس کا انعقاد ابھی موقوف رکھا گیا تھا کہ پہلے جمہوری حکومت کی بحالی کا مرحلہ طے ہو جائے۔ مارچ کے آخر میں یہ خبر بھی آئی کہ ہالینڈ کی طرف سے ایک وفد جمہوری لیڈروں سے گفتگو کرنے کے لئے جانے والا ہے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچیسن نے ایک بیان میں امید دلائی کہ انڈونیشیا کا معاملہ بہت جلد طے ہو جائے گا۔ لیکن ابھی تک ڈچ حکومت کی طرف سے کوئی عملی اقدام نہیں اٹھایا گیا۔ انڈونیشیا کی سیاسی الجھن سے فائدہ اٹھا کر وہاں انقلاب پسندوں نے پھر شورش شروع کر دی ہے اور اگر یہ الجھن اسی طرح جاری رہی تو ملک میں اور زیادہ ابتری پھیل جائے گی۔ لیکن ڈچ حکومت کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ کانوں میں تیل ڈالے اور ہاتھوں میں مہندی لگائے بیٹھی ہے۔ اب یو این او کا عام اجلاس پھر شروع ہوا ہے اور امید ہے کہ ہندوستان کی طرف سے انڈونیشیا کا معاملہ پھر اٹھایا جائے گا۔ اگر دنیا کی رائے عامہ ایک بار پھر ہالینڈ کو پکڑ کر جھنجھوڑے تو شاید وہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ ورنہ سیکورٹی کونسل کی شفقت آمیز ہدایتوں کو سن کر ٹال دینے کی تو اسے عادت سی ہو گئی ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد خبر آئی ہے کہ ہندوستان اور آسٹریلیا کی تحریک پر یو، این، او کی جنرل اسمبلی میں یہ تجویز منظور ہو گئی کہ اس اجلاس میں انڈونیشیا کے مسئلے پر بحث کی جائے۔ ۳۴ ملکوں نے جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے کے نمائندوں نے اس تجویز کی تائید کی۔ ۱۲ غیر جانب دار رہے جن میں برطانیہ اور فرانس شامل ہیں اور صرف ۳ یعنی ہالینڈ، بلجیم اور جنوبی افریقہ نے مخالفت میں ووٹ دیا۔

دورِ نو کی آمد

وداعِ تیرگی ہے مژدہ شمس کے ظہور کا
کہ پھوٹنے کو سینۂ افق سے چشمہ نور کا
ہے صوتِ زاغ پیش خیمہ نغمۂ طیور کا
نقیب ہے خمارِ یاس اُمید کے سرور کا

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

خموش تھا جو ساز اُس میں کچھ صدا تو آگئی
مگر حقیقتاً ملے ہوئے نہیں ہیں سُر ابھی
یہ تار مل ہی جائیں گے جو مضطرب ہیں فکر کی
پیام دیں گے ارغنون چنگ و نے سرور کا

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

بہار اپنے گل ہیں اپنے غنچے اپنا صحنِ باغ ہے
صراحی و سبو ہے اپنا، اپنا ہی ایاغ ہے
ہے اپنا شحنہ اپنا محتسب دم فراغ ہے
مگر اب اپنی بزم میں سوال ہے شعور کا

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

گوپی ناتھ امن

امیر اور غریب کی ابھی الگ ہیں ٹولیاں
سماج کو کئے ہیں زیر زر پرست ٹولیاں
گناہ کی کمائی سے بھری ہوئی ہیں جھولیاں
مگر فریب ختم ہے زمانہ مکر د زور کا

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

یہ شور و شر ہے عارضی نہ کوئی بے قرار ہو
کوئی شکارِ یاس ہو نہ کوئی سوگوار ہو
نظر میں جس کی وسعتیں ہوں کیوں وہ شرمسار ہو
نشان دے رہا ہے اور کچھ نظارہ دور کا

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

سُن اے وطن کے مسلم اسیرِ یاس خستہ دل
کبھی رہا تو مشتعل کبھی رہا تو مضمحل
قدم بڑھا کے بانیانِ نظمِ نو کی صف میں مل
نہ چھوڑ دامنِ اُمید حکم ہے حضور کا[1]

یہ دور ہے عبور کا یہ دور ہے عبور کا

[1] رسول اکرم

"لالہ و گل"

خیال میثائی

قفس میں تصویرِ لالہ و گل بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں
بہار شاید ہے آنے والی فضا کو رنگین پا رہا ہوں
جنون دل کا ہے اب یہ عالم کہ نئے گل کھلا رہا ہوں
کبھی تو ہنستا ہوں بے خودی میں کبھی میں آنسو بہا رہا ہوں
کہوں تو اب کیا کہوں کسی سے کہ اشکِ غم کیوں بہا رہا ہوں
جو آگ دل میں لگی ہے اس کو میں آنسوؤں سے بجھا رہا ہوں
نگاہِ برہم کی بے رخی کا مجھے تو کوئی گلہ نہیں ہے
جفا سے کیوں آپ ہیں پشیماں سکون خاطر میں پا رہا ہوں
یہی ہے عقل و خرد کا منشا یہی محبت کا ہے تقاضا
کہ ہر خلش کو رہِ وفا میں میں اپنے دل سے مٹا رہا ہوں
نہ وہ گلے ہیں نہ وہ شکایت نہ وہ خلش ہے نہ وہ تڑپ ہے
وہ قلب پر ہاتھ رکھ رہے ہیں سکون خاطر میں پا رہا ہوں
کوئی تو ساقی سے اتنا کہہ دے بہار آئی بہار آئی
چمن میں گل مسکرا رہے ہیں فضا کو مخمور پا رہا ہوں
میں باز آیا نصیحتوں سے نہ چھیڑ ناصح دلِ حزیں کو
مٹا کے ہوش و خرد کی دنیا تلاش منزل میں جا رہا ہوں
فراقِ پیہم کا رنج کب تک خیال پاسِ ادب کہاں تک
کسی کی تصویر کو اُٹھا کر سینے سے اپنے لگا رہا ہوں

"مشورہ"

باقر رضوی

بیداد جورِ حسن کا شکوہ نہ کیجئے
اپنے مذاقِ درد کو رسوا نہ کیجئے

یہ ہے غنیم خواب و خورد دشمن طرب
کم بخت دل کے ناز اُٹھایا نہ کیجئے

حاصل نہ ہوگا کچھ بھی بجز یاس بے دلی
دُنیا کی بات بات میں الجھا نہ کیجئے

ہو جائے الجھنوں سے نہ عادت گریز کی
عالم کوئی خیال سے پیدا نہ کیجئے

ٹوٹے نہ دلفریبیِ حسنِ جہاں فروز
ہر چیز کو قریب سے دیکھا نہ کیجئے

خوف کی بیماری

ص ۔ خ

خوف ایک جبلت ہے جو فطرت نے ہر جاندار میں ودیعت کی ہے اور جبلتوں کی طرح یہ بھی فرد اور نوع کی بقا میں مدد دیتی ہے۔ اس کی بدولت جانور اور انسان ان سب چیزوں سے جن سے ہلاکت یا اذیت کا اندیشہ ہوتا ہے دور رہتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا تخیل اتنا قوی ہوتا ہے یا اعصاب اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ انھیں خواہ مخواہ بے ضرر چیزوں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ یہ ایک قسم کا اعصابی خلل ہے۔ اگر آپ اس قسم کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا خوف طبعی حدود کے اندر ہے یا ان حدود سے تجاوز کر کے اعصابی کمزوری کے دائرے میں داخل ہو گیا ہے تو ذیل کے سوالنامے پر غور کر کے ایک الگ کاغذ پر جواب لکھتے جائیے۔ جتنے سوالوں کا جواب "ہاں" ہو ان میں سے ہر ایک کے پانچ نمبر شمار کیجئے۔ اگر الناہوریا کی میزان ساٹھ تک ہو تو سمجھئے کہ آپ کا خوف معمولی ہے لیکن اگر میزان ستر یا اس سے زیادہ ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ خوف اعصابی کمزوری کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور اس کو دور کرنے کی تدبیر کرلی چاہیئے۔

۱۔ کیا آپ کو اپنے کام یا ذریعہ معاش کے ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر ہر وقت لگا رہتا ہے؟

۲۔ کیا آپ کو اپنی صحت کے خراب ہونے کی فکر برابر ستایا کرتی ہے؟

۳۔ کیا آپ اپنے کسی قریبی عزیز سے خوف زدہ رہتے ہیں؟

۴۔ کیا آپ کو بوڑھے ہونے سے ڈر لگتا ہے؟

۵۔ کیا بلیوں، کتوں، گھوڑوں، گائے، بیل سے آپ کو بہت زیادہ ڈر محسوس ہوتا ہے؟

۶۔ اگر آپ کسی تنگ جگہ میں، مثلاً چھوٹی سی کوٹھری میں ہوں تو آپ کو وحشت ہوتی ہے؟

۷۔ کیا موٹر، ریل اور لفٹ میں بیٹھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں؟

۸۔ کیا آپ کیڑے مکوڑے مثلاً مکڑی، چھپکلی وغیرہ سے ڈرتے ہیں؟

۹۔ کیا گرج، چمک سے آپ سہم جاتے ہیں؟

۱۰۔ کیا اندھیرے میں اکیلے ہونے سے آپ کو ڈر لگتا ہے؟

۱۱۔ کیا آپ خاندانی ذمہ داریاں لینے سے گھبراتے ہیں، اور شادی کے ناکام ہونے کا خوف آپ پر مسلط رہتا ہے؟

۱۲۔ کیا شگون اور اوہام وغیرہ پر آپ کو عقیدہ ہے، اور اس کی وجہ سے طرح طرح کا کھٹکا لگا رہتا ہے؟

۱۳۔ کیا جب آپ مجمع میں ہوں تو بہت زیادہ بے چینی محسوس ہوتی ہے؟

۱۴۔ کیا جہاز، کشتی اور پانی سے آپ کو ڈر لگتا ہے؟

۱۵۔ کیا اسپتال جانے، دانت نکلوانے، انجکشن لگوانے سے آپ گھبراتے ہیں؟

۱۶۔ بہت زیادہ احتیاط یا کسی دوسرے کے لحاظ کی وجہ سے آپ اچھے موقع تو نہیں کھو دیتے؟

۱۷۔ جب آپ کو کسی جلسے وغیرہ میں تقریر کرنی ہو تو اس سے گھبراہٹ تو نہیں ہوتی؟

۱۸۔ آپ بلندی سے نیچے دیکھ سکتے ہیں؟ اس سے چکر تو نہیں آتا؟

۱۹۔ جب کہیں سے تار آتا ہے تو کیا آپ فوراً اچھل پڑتے ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے اور پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس میں ضرور کوئی بری خبر ہوگی؟

۲۰۔ اگر آپ کے معمولات میں فرق آجائے یا اور کوئی گڑبڑ ہو جائے تو آپ اس سے بہت سہم اور پریشان تو نہیں ہو جاتے؟

فرض کیجئے آپ کے خوف کی میزان ستر یا اس سے زیادہ ہے یعنی وہ اعصابی کمزوری کی حد تک پہنچ گیا ہو تو اس سے گھبرایئے نہیں۔ بہت سے ڈر تو ایسے ہیں کہ جہاں آپ کو ان کا احساس ہوا فوراً غائب ہو جاتے ہیں۔ البتہ بعض ذرا سخت جان ہوتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل اور ارادہ سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اگر ان دونوں چیزوں کی کمی ہو تو طبیب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

خوف کی بے شمار شکلیں ہوتی ہیں، ان میں سے بعض مشہور ہیں۔ مثلاً تنگ اور بند جگہ کا خوف اور شہر کے ان حصوں میں جہاں آمدورفت زیادہ ہو سڑک پار کرنے کا خوف۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی عجیب عجیب شکلیں ہیں مثلاً ایک نوجوان لکھتا ہے: "ایک سال سے زیادہ ہوا کہ میں کھانا تنہائی میں کھاتا ہوں، اس لئے کہ دوسروں کے منہ چلانے کی آواز کو میں برداشت نہیں کرسکتا" ایک صاحب جو خاصی بڑی عمر کے ہیں اپنے گھر سے باہر کھانا کھائیں تو انھیں متلی ہونے لگتی ہے اس سے ان کو بہت نقصان پہنچا ہے ان کو ایک بہت بڑی تنخواہ کا عہدہ مل رہا تھا جس میں لوگوں کے ہاں دعوتیں کھانا ضروری تھا، مگر انھیں انکار کرنا پڑا۔

اسی طرح اعصابی خوف کی بہت سی شکلوں کا تعلق منہ سے اور کھانے سے ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے خود وہ ڈراؤنی نہیں ہوتی، مگر لاشعور میں ڈراؤنے یا تکلیف دہ خیالات سے وابستہ ہوتی ہے۔

ایسی صورتوں میں نفسی امراض کا معالج بے مریض کو دیکھے کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس سے گفتگو کرنے کی، اس کے خوابوں کا تجزیہ کرنے کی اور بچپن کی سوئی ہوئی یادوں کو جگانے کی ضرورت ہوتی ہے...... اس لئے کہ یکایک کسی شخص کے دل میں اس طرح کا خوف پیدا ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے جسے وہ سلجھانے کے بجائے ٹال رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کے اور اس کے والدین کے تعلق کا مسئلہ ہو۔ اس سے بھی زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ جنسی زندگی کا کوئی مسئلہ ہو۔ (ماخوذ)

جرمنی اور فرانس

عبدالحلیم ندوی

(۲)

جرمنی کے مادی وسائل ہمیشہ سے فرانس کو کھٹکتے رہے ہیں۔ اس کی کوشش رہی ہے کہ جرمنی کو کم زور اور نہتا کر کے وادی رائن پر جو اس کی جان ہے قبضہ کرے چنانچہ معاہدہ ویسٹ فیلیا سے کر آج تک جتنی بھی حکومتیں برسر اقتدار آئیں قدامت پسندوں کی حکومت ہو یا انقلاب پسندوں کی۔ نپولین اول کی حکومت ہو یا تیسری جمہوریہ کی سب کا یہی طرز عمل رہا ہے۔ ۱۸۰۶ء و ۱۸۱۳ء کے درمیان رائن لیگ کا قیام، نیز چہارم اور نپولین کی سرپرستی میں فاق رائن کی تشکیل اسی مقصد سے ہوئی تھی کسی ملک کی بھلائی کا خیال محض ڈھونگ تھا۔ ان سے صرف یہ مقصد تھا کہ فرانس کی ماتحت مغربی جرمنی کی حکومتوں کو قابو میں رکھا جائے۔ اور حسب ضرورت ان سے کام نکالا جائے۔

مگر ہوا یہ کہ نپولین کو شکست ہو گئی اور فرانس کی آرزوئیں دل ہی میں رہ گئیں۔ کیونکہ رائن کا شمالی حصہ پرشا کو اور رائن لینڈ اور ویسٹ فیلیا کا علاقہ وائنا کانگریس کے فیصلے کے مطابق برلن میں شامل کر دیئے گئے اور فرانس کے حصے میں کچھ نہ آیا لیکن فرانسیسیوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ اب تو بچہ بچہ کے دل میں رائن پر قبضہ کرنے کی تمنائیں مچلنے لگیں۔ چنانچہ فرانسیسی شاعر الفرڈ دی موسٹ نے بھی اپنی ایک نظم میں اس قومی جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ ادھر پرشا کے زیر قیادت جرمنی میں قومی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور دوسری طرف ۱۸۷۰ء کی شکست نے فرانس کی اتنی ہوا اکھاڑ دی کہ باسل اور وائزمبرگ کے درمیانی علاقے سے بھی جسے لوئی چہارم کے زمانے میں اپنے قبضے میں کر لیا تھا، ہاتھ دھونا پڑا اور مستقل چالیس سال تک اس سے بے دخل رہا۔ ۱۹۱۸ء میں جب السیس اور لورین پر اس کا قبضہ ہو گیا تو پھر ان پر عمل دخل کرنے کے منصوبے بننے لگے۔

چنانچہ معاہدہ ورسائی کے موقع پر فرانس نے یہ اسکیم پیش کی کہ جرمنی کو پوری طرح غیر مسلح کر کے اس کے اسلحے کے کارخانوں پر قبضہ کر لیا جائے اور مغربی اضلاع اتحادیوں کے زیر انتظام آ جائیں مگر جرمنی کے نمائندے بڑے شاطر تھے۔ انھوں نے پورا زور لگا دیا اور رائن کے پورے بائیں ساحل اور دائیں ساحل کے ۵۰ کیلومیٹر تک اپنے قبضے میں کر لیا۔ فرانس کی اس موقع پر کچھ نہ چلی۔ [illegible] فرانس کی تجویز تھی کہ اتحادیوں کے ماتحت [illegible] جمہوریہ بنا لی جائے۔ کانفرنس نے اس [illegible] رد کر دیا۔ لیکن فرانس کو یہ [illegible] نہیں جتنا چاہتے تھے اسی لئے اس کی

اجازت دے دی کہ وہ ۱۵ سال کے لئے سار کے علاقے کو اپنے معاشی نظام میں شامل کرے۔ اور چونکہ ۱۹۱۴ء میں اس کی شمالی مشرقی کوئلہ کی کانیں تباہ ہو گئی تھیں اس لئے یہاں کی کانیں بھی اس کو دے دی گئیں۔ رائن کے بابت جو اس کی تجویز تھی اس کے بدلے میں ایک برطانوی امریکی معاہدہ تحفظ ہوا، اس معاہدے میں اس بات کی ضمانت لی گئی کہ اگر فرانس یا بلجیم کے خلاف جرمنی نے کبھی جارحانہ حملہ کیا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، دراصل یہ سب تدبیریں پیش خیمہ تھیں معاہدہ ورسائی کی جس پر عمل درآمد برطانیہ کے دارالعوام اور امریکہ کے سینٹ کی منظوری کے بعد ہوتا تھا۔ دارالعوام نے تو اسے منظور کر لیا۔ لیکن امریکہ نے مارچ ۱۹۲۰ء میں معاہدہ ورسائی اور معاہدہ تحفظ دونوں کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ اس تاریخ سے معاہدہ تحفظ کا دوبارہ نام نہیں لیا گیا۔

فرانس کی اس میں بڑی سبکی ہوئی۔ اس نے اس کا بدلہ اس طرح نکالنا چاہا کہ لوکارنو میں جرمنی سے مصالحتی گفتگو شروع کر دی۔ جرمنی کو فرانس نے یہ لالچ دی کہ رائن لینڈ سے وہ اپنی فوجیں ہٹا لے گا، بشرطیکہ جرمنی فرانس کی جدید مقبوضات پر اس کا قبضہ تسلیم کرے اور برطانیہ و اٹلی کے پیش کردہ معاہدہ تحفظ کو بھی مان لے۔ مگر یہ چال بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ اسی اثنا میں ہٹلر نے رائن لینڈ پر جبراً قبضہ کر لیا۔ اٹلی اس وقت حبش کی مہم میں مصروف تھا اور برطانیہ نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے خاموشی کو بہتر سمجھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے ہاتھ سے رائن لینڈ بھی نکل گیا اور کسی نے داد رسی نہ کی۔

غرض فرانس کی جرمنی کے بارے میں گزشتہ دونوں جنگوں کے درمیان یہ پالیسی تھی اور اس کا حشر یہ ہوا ۱۹۳۹ء میں تو فرانس کی حیثیت بالکل مدافعانہ ہو کر رہ گئی تھی اب اس نے اتحادیوں کو طاقتور بنانے اپنی فوجوں کو نئے سرے سے منظم کرنے میجینو لائن کو تیزی سے بنانے کی کوشش شروع کی۔ سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر باسل سے لے کر لگزمبرگ تک کا علاقہ تو رائن کی وجہ سے قدرتی طور پر محفوظ تھا بلجیم نے بھی اپنے مورچے ٹھیک ٹھاک کر لئے تھے صرف لگزمبرگ سے سیڈان تک کا علاقہ غیر محفوظ تھا اس لئے سوچا گیا کہ ادھر میجینو لائن بن جائے تو ہر طرف محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی اسکیم پر عمل کیا گیا۔

مگر جرمن ماہرین بھی ایک چالاک تھے انھوں نے حملہ تو ۱۹۱۴ء اور ۱۸۷۰ء کے انداز پر کیا یعنی رائن سے ہو کر بلجیم اور فرانس پر دھاوا بول دیا جائے لیکن اب کی دفعہ انھوں نے یہ جدت کی کہ ہالینڈ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بیک وقت تینوں ملکوں پر چڑھ دوڑے۔ اور اس ہوشیاری سے کہ آرڈین کا مدافعتی مورچہ ہالینڈ کا نہروں کا جال اور بلجیم کے حفاظتی مورچے سب یوں ہی دھرے رہ گئے۔ جرمنوں نے میجینو لائن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، بلکہ اس کو چھوڑ کر پانچ دن کے اندر ڈچ آبادی میں گھس گئے اور صرف ۲۰ دن میں پورے بلجیم پر قابض ہو گئے اور محض تین دن کے معرکے کے بعد انھوں نے سیڈان کے فرانسیسی مورچے کو اس اہم جگہ سے توڑ دیا جس کو فرانسیسیوں نے اپنی بلجیم کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے قائم کر رکھا تھا۔

چنانچہ جنگ کے بعد جنرل ڈیگال نے ۱۹۴۰ء میں اس کا اعتراف کیا کہ بلا شبہ پورے مغربی محاذ پر جرمنوں نے صرف ۵۰ دن میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمن افسر ایک طرف موقعہ محل اور جنگ کے اصول، حملے کے اوقات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دوسری طرف رائن لینڈ کے کارخانوں سے بھی ان کو بہت بڑی مدد ملی جنھیں جنرل فوش نے ۱۹۱۹ء میں ان کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔

آگے چل کر جنرل ڈیگال نے کہا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں کو جرمنوں کے مقابلے میں خلیج نارمنڈی سے رائن تک پہنچنے میں پورے ۱۰۰ دن لگے حالانکہ یہ ساز و سامان صنعتی ترقیوں اور فوجوں کے اعتبار سے جرمنوں سے کہیں زیادہ تھے۔ یہاں بھی جرمنوں نے اپنی پوری مہارت جنگ، فوجی تنظیم اور فن سپہ گری کا ثبوت دیا۔ دراصل پورے زمانہ جنگ میں صرف رائن لینڈ کا مورچہ ہی آخری کسوٹی ثابت ہوا۔ بلکہ بقول مارشل فوش معرکہ رائن لینڈ مدافعانہ اور جارحانہ دونوں حیثیتوں سے تاریخ کا بہت ہی عظیم الشان معرکہ تھا۔ اور اب ہمیں اس کا موقع دینا چاہئے کہ تاریخ پھر اپنے کو دہرائے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فرانس کو ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ کس قسم کا تحفظ؟ اس کی توضیح جنرل ڈیگال نے یوں کی محض کاغذی یا زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چل سکتا بلکہ مادی ضمانت دی جائے ایسی ضمانت نہیں کہ صرف فوجی اتحاد قائم کر لیا جائے اور بڑے بڑے اخراجات برداشت کر کے مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھا کر کسی نہ کسی طرح کامیابی حاصل کر لی جائے۔ ہم تو ایسا تحفظ چاہتے ہیں جس میں پیش بندی اور حفظ ماتقدم کے اصول پر کام کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جبکہ جرمنی کو قلب یورپ میں ایک طاقتور اور مرکزی حکومت بنانے کے مواقع بالکل نہ دیئے جائیں۔ کلیمانسو نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ ۲۰ ملین جرمن کچھ کم نہیں ہیں ان کی طاقت کو توڑنے اور ان میں انتشار پیدا کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جرمن سلطنت کو توڑ کر ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بنا دیا جائے جس میں مختلف علاقوں کے زیادہ سے زیادہ نمائندے رکھے جائیں۔ اور اسی کے ساتھ رائن لینڈ کو بالکل جدا [illegible] آزاد ریاست بنا دیا جائے۔

بقیہ صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ

کتابوں کی باتیں

(آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے)

صالحہ عابد حسین

گذشتہ دو ڈھائی سال میں ہمارے دیس پر جو کچھ بیت گیا اور لاکھوں آدمیوں کی تباہی اور خانہ بربادی نے ملک پر جو قیامت توڑی اس نے ہمارے ہر حساس دل اور درد مند ادیب کو متاثر کیا ہے اور تقریباً ہر ایک نے کچھ نہ کچھ اس پر لکھا ہے۔ ان میں بعض اچھے ادیبوں اور شاعروں کی چیزیں ان کے شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

اس وقت میں ان میں سے دو کتابوں کا تعارف کرانا چاہتی ہوں، یہ دونوں افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ایک احمد عباس کا زعفران کے پھول دوسرا کرشن چندر کا اجنتا سے آگے۔

احمد عباس کو عام طور پر لوگ ایک آزاد جرنلسٹ اور ترقی پسند فلم ساز کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس نے کہانیاں بھی لکھی ہیں لیکن اسے افسانہ نگاری میں اتنی شہرت حاصل نہ ہو سکی جتنی جرنلزم میں اور نہ اس کے افسانے اتنے مقبول ہوئے جتنی اس کی فلمی کہانیاں۔ لیکن پچھلے دو سال میں عباس نے کئی ایسے افسانے لکھے ہیں جن کا فنی معیار بہت بلند ہے۔ عباس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہمیشہ زندگی کی ترجمانی کی ہے اور حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے لیکن ان افسانوں میں اس کے سوا اور بھی کچھ ہے ——— اس میں خون جگر کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور فن کی پختگی اور نزاکت بھی پائی جاتی ہے۔ دوسرے ادیبوں کی طرح پچھلے سالوں کے خونیں واقعات نے عباس کے دل پر بھی بہت گہرا اثر کیا ہے، اور جو کچھ اس نے خود دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور انسان دوستی امن پسندی محنت اور عمل کے پیغام کو جوش اور خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے۔

زعفران کے پھول اس کی تین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ آخری کہانی "اندھیرا اُجالا" جو غالباً کئی سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے ایک طویل فلمی مکالمہ ہے۔ اس میں فلمی دنیا میں کام کرنے والوں کی زندگی اور اُن کے مسائل اور مشکلیں بڑی خوبی اور ہمدردی سے دکھائے گئے ہیں، لیکن اس میں وہ درد اور اثر اور فن کی خوبیاں نہیں جو باقی دو کہانیوں میں پائی جاتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ ذرا بے رنگ اور بے مزہ سی کہانی ہے۔

زعفران کے پھول کا پس منظر کشمیر ہے جنت ارضی کا مخزن گل و بلبل، بہار و شادمانی کا معدن کشمیر نہیں بلکہ وہ کشمیر جو آزادی کی راہ میں جد و جہد کر رہا ہے۔ جو شیر کشمیر کی قیادت میں اپنی غلامی، پستی اور جہالت و بدحالی کی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک نوجوان کشمیر جا رہا ہے، سری نگر سے پہلے اس کی موٹر رک جاتی ہے وہاں وہ دیکھتا ہے کہ زعفران کے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ساری فضا خوشبو سے مہک رہی ہے۔ سب کھیتوں میں کاسنی شگوفے پھیلے ہوئے ہیں لیکن ایک کھیت میں پھولوں کا رنگ سرخ ہے ——— لہو کی طرح سرخ۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے ان پھولوں کا رنگ لال کیوں ہے ——— ؟ ایک بڑھیا جو وہاں کھڑی ہے اپنے خاص انداز میں اس کی وجہ بتاتی ہے کہ کشمیر کی ایک نوجوان کنواری جان باز حسینہ نے تحریک آزادی کی جد و جہد میں اس کھیت کو اپنے خون سے سیراب کیا تھا۔ بڑھیا یا لوگوں سے اور قدامت پرستی جہالت اور غربت کا جیتا جاگتا نمونہ ——— بیٹوں اور ایک بیٹی کی قربانی کے بعد بھی اُسے یہ اندازہ نہیں ہوتا یہ سب کیوں ہوا اور کیوں ہوتا ہے۔ مگر باتوں باتوں میں وہ کشمیر کی دیہاتی زندگی، کشمیریوں کی مصیبتوں اور تحریک آزادی کی جد و جہد کی ساری داستان اپنے سادہ انداز میں بیان کر جاتی ہے .... اور آخر میں ایک کھوئے ہوئے انداز میں اپنی بیٹی زعفرانی کا ذکر کرتی ہے جو ٹھیک اپنی شادی کے دن شہادت سے ہمکنار ہوئی ہے .... جب زعفرانی کے دس سالہ بھائی کو پولیس نے گولی مار دی تو .... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول کی طرح ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں ....

پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس، مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی وہی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ اور یہ سارا مجمع اُگا ہے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی فوجی لاری کھڑی تھی ——— " اور پھر گولیاں کے تڑاخے سن کر بڑھیا اُدھر بھاگتی ہے تو دیکھتی ہے زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی ہے ....

"میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی پر مرتے دم اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی .... نہیں اس کھیت میں جہاں اب تم گل لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو ...." یہ کہانی ایک بڑھیا یا ایک گاؤں کی کہانی نہیں بلکہ سارے کشمیر کی جنگ آزادی کی داستان ہے۔

عباس نے آج تک جتنی کہانیاں لکھی ہیں اجنتا ان سب میں بہترین ہے۔ وہ نہ صرف عباس کا شاہکار ہے بلکہ اردو کے چند ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانوں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ اس میں ایک اچھے افسانے کی خصوصیات موجود ہیں اور آرٹ کے اصل مقصد کو ایک اچھوتے دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

نرمل ایک ادیب ہے جس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ بمبئی کے فساد اور خونریزی اس کا دماغی سکون اور دل کا چین چھین لیتی ہے۔ اس کی بیوی بھارتی اس کا دل بہلانے کے لئے گھر کا یہ راستہ اختیار کرتی ہے کہ سنگ تراشی اور مصوری کے بہترین نمونے دکھانے اُسے اجنتا لے جاتی ہے وہ دونوں اجنتا کے غاروں میں گھوم رہے ہیں .... گائیڈ اپنی منجھی ہوئی آواز میں رٹا ہوا سبق سنا رہا ہے۔ بھارتی آرٹ کے ان نادر نمونوں کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہے پر نرمل کی نظروں میں تو بمبئی کے ہولناک خونیں واقعات گھوم رہے ہیں ....

"خون خرابے۔ فساد دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل ———" لیکن نرمل کو اس دنیا میں بھی شانتی نصیب نہیں۔ اُسے اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا ——— نہ حسن نہ آرٹ نہ معنی نہ مقصد۔ .... یہ سب کیوں؟ یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت کیوں اور کس لئے؟ بیکار ہیں یہ سب .... بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھر پر گل کاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی .... اجنتا سے ہندوستان نے نہ کچھ سیکھا ہے نہ سیکھے گا .... اور وہ گھومتے گھومتے ایک نامکمل غار میں آتے ہیں .... گائیڈ بتاتا ہے کہ یہاں کا سارا کام ادھورا ہے ——— اور پھر ——— پھر .... چلتے چلتے نرمل وہاں اکیلا رہ جاتا ہے .... اور آدھی رات کی تاریکی میں وہ دیکھتا ہے کہ ہزاروں پرسکون چہروں والے شانت بھکشو، ہاتھوں میں چھینیاں اور ہتھوڑے لئے آتے ہیں اور خاموشی سے ادھورے کام کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں ——— نرمل ایک بھکشو کے پاس جا کر کئی سوال پوچھتا ہے اور آخر میں اس سے وہ سوال کرتا ہے جو اس کے دل میں چبھ رہا ہے .... آخر اجنتا کا مقصد کیا ہے؟ اس کا پیغام کیا ہے .... بھکشو کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ نظر آتی ہے جس میں محبت رحم اور گہرے ادراک کی چمک ہے۔ وہ خود کوئی جواب نہیں دیتا .... اس کے بجائے :-

"غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز ...... یہی تھا اجنتا کا پیام ...... زبل کو ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو ...... آبِ حیات ——— اکسیر ——— اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا ——— کھٹ کھٹ کھٹ ——— عمل، عمل، عمل ——— کام کام کام محنت محنت محنت ——— عمل سے پتھر موم کی طرح پگھلا جاتا ہے ——— عمل سے پہاڑوں کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں ——— عمل سے انسان انسان بنتا ہے ——— عمل ہی عبادت ہے، عمل خود عمل کا انعام ہے ......"

کرشن چندر آج کل کا سب سے محبوب اور مشہور افسانہ نگار ہے۔ وہ حقیقت پسند اور صداقت نگار ہوتے ہوئے بھی حسن و محبت کی رنگین دنیا میں بنا سکتا ہے اور پڑھنے والوں کے دل اور دماغ کو مسحور کرنے کا گر جانتا ہے۔ عام نوجوان افسانہ نگاروں کی طرح اس کے ہاں خشکی، بے رنگی اور الجھاؤ نہیں۔ اس کا قلم جہاں ظلم و ناانصافی، بدکاری و ہوس پرستی، تعصب و نفرت کے منظر پیش کرتا ہے وہاں محبت اور معصومیت، شرافت اور رواداری کے روح پرور منظر بھی دکھاتا ہے، اور انسانیت پر ہمارا ایمان متزلزل نہیں ہونے دیتا۔ اس نے گزشتہ چند سال میں بہت کچھ دیکھا بھالا اور سہا ہے۔ اس کے درد آشنا دل نے وہ سب کچھ محسوس کیا اور بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے جو اس کے دیس والوں کو بھگتنا پڑا ہے ......

وہ اپنے قلم سے اس کے خلاف برابر احتجاج کر رہا ہے وہ ان انسان نما حیوانوں کو، ظالم سماج کو، اس سرمایہ داری نظام کو، اس بے روح دنیا کو بدلنا چاہتا ہے۔ پچھلے سال ڈیڑھ سال میں اس نے اتنے افسانے لکھے کہ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ وہ شاید شارٹ ہینڈ میں لکھتا ہے۔ اس کے افسانوں کے ایک مجموعہ "ہم وحشی ہیں" نے سارے دیس میں ہل چل پیدا کر دی تھی۔ اس کے افسانوں کا ایک تازہ مجموعہ "اجنتا سے آگے" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے۔

ان کا موضوع زیادہ تر سماجی، طبقاتی، سیاسی اور انسانی تفریق ہے جس کی وجہ سے بیشتر انسان شرفِ انسانی سے محروم ہو گئے ہیں۔ بعض ظالم بن کر بعض مظلوم بن کر۔ ان افسانوں میں دولت پرست فیشن کی دلدادہ عورتوں اور ان کے بدکار، عیش پرست مردوں کی داستانیں بھی ہیں جو اپنے حال میں مست ہیں اور نہیں جانتے کہ دنیا کدھر جا رہی ہے اور وقت کا کیا تقاضا ہے اور اس ظلم و جبر کی داستان بھی جو زبردست اور خود غرض افراد اور گروہ کمزوروں پر توڑتے ہیں۔ ان سب کو دیکھ کر کرشن کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں زہر کی تلخی نہیں دوا کی کڑواہٹ ہے۔ اس کے قلم کا نشتر بے دردی سے پھوڑوں کو چیر چیر کر ان کا مواد سامنے لاتا ہے۔ مگر وہ قاتل کا خنجر نہیں، جراح کا نشتر ہے جو پھوڑے کو مواد سے صاف کر کے مریض کو تندرست بنانا چاہتا ہے۔

مرنے والے ساتھی کی مسکراہٹ، پھول سرخ ہیں، بت جاگتے ہیں، میرا بچہ، ادر جانور اور اجنتا سے آگے اس کے نقطۂ نظر کی بڑی اچھی نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں سے بعض بہت پر اثر ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کرشن کی افسانہ نویسی اپنے پورے فنی عروج پر اس وقت پہنچتی ہے جب وہ حسن و عشق کی حسین کہانیاں سناتا ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "پورے چاند کی رات" مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ پلاٹ تو صرف اتنا ہے کہ ایک کشمیری نوجوان اور اس کی محبوبہ چاندنی راتوں میں چھپ چھپ کر ملتے اور اپنی معصوم محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر ایک دن دونوں گھر سے فرار ہو کر ایک جنگل میں جھونپڑی بنا کر رہنے لگتے ہیں اور حسن و عشق کی دنیا اور زیادہ رنگین اور زیادہ دلکش ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دن نوجوان کسی کام سے سری نگر جاتا ہے اور واپسی پر دیکھتا ہے کہ اس کی محبوبہ ایک اور نوجوان سے اظہارِ محبت کر رہی ہے۔ دل شکستہ ہو کر وہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلا جاتا ہے اور پھر جب برسوں سال بعد واپس آتا ہے اور اتفاقاً اس کی ملاقات اپنی محبوبہ سے ہوتی ہے جو اب بالکل بوڑھی ہو چکی ہے تو اس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اس دن وہ جس نوجوان سے باتیں کر رہی تھی وہ تو اس کا بچھڑا ہوا سگا بھائی تھا!! پھر دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستانیں سناتے ہیں۔ محبوبہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ مدتوں اس کا انتظار کرتی رہی اور پھر آخر کار اس نے شادی کر لی۔ اس سادہ سے پلاٹ کو افسانہ نگار نے اپنی جادو بیانی سے بڑا دلکش اور پر اثر بنا دیا ہے ...... وہ باتیں کر رہے تھے کہ دونوں کے پوتا اور پوتی کھیلتے ہوئے آ جاتے ہیں۔

"ہم دونوں چپ ہو گئے ...... بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس آ گئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھا لیا، میں نے اس کے پوتے کو۔ اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت اور مسرت سے کہہ رہا تھا انسان مر جاتے ہیں لیکن زندگی نہیں مرتی! بہار ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن زندگی کی بڑی عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے ...... تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے۔ یہ بہار تم نے دیکھی ...... اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے لیکن زندگی پھر بھی ہو گی اور محبت بھی ہو گی اور جوانی بھی ہو گی اور خوبصورتی بھی اور رعنائی اور معصومیت بھی ......"

زندگی، محبت اور حسن کی پائداری کا کیا خوبصورت اور دلکش پیام۔

کرشن عوام کا ادیب ہے اور عوامی مسائل کو پیش کرنا اور ان کی مصیبتوں کو دکھانا اور ناانصافیوں کے خلاف جہاد کرنا اس کے قلم کا اولین مقصد! پھر بھی کرشن اصلاح و ترقی کے جوش میں فن کا خون نہیں کرتا اور اس کے بیشتر افسانے فنی خوبیوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔

جرمنی اور فرانس

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

نہ اس پر جرمنی کا قبضہ رہے اور نہ فرانس کا بلکہ یہ اور روہر دونوں کو بین اقوامی نظام کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ ان کے وسائل سے یورپ کی ساری حکومتیں یکساں فائدہ اٹھا سکیں۔ ہاں سار کو بہرحال فرانسیسی معیشت کے ساتھ وابستہ رکھنا لازمی ہے۔

یہ تھا وہ پروگرام جو فرانس نے ۱۹۴۵ء میں اتحادیوں کے سامنے پیش کیا۔ لیکن جنرل ڈیگال نے روسیوں کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا کہ لبلن کی قومی آزادی کی کمیٹی کو پولینڈ کی قانونی حکومت کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یالٹا اور پوٹسڈام کی کانفرنس میں فرانس شریک نہ ہوا اور بغیر اس کی موجودگی کے جرمنی کی موجودہ قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

فرانس کی یہ سکیمیں تھیں اور ان کے ذریعے وہ ان چار اہم مسئلوں کو حل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو رہا سہا جرمنی کے آئندہ اتحاد کا مسئلہ تھا۔ دوسرا رائن لینڈ کا، تیسرا روہر کا اور چوتھا سار کا۔ رہا سہا جرمنی کے اتحاد کے مسئلے کو صرف وہ فوجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے حل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے معاشی پیچیدگیوں پر سوچنے کی زحمت نہیں گوارا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ موسیو بیدو نے ۱۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو ایک اسکیم مرتب کی اور اسے دستور ساز اسمبلی کے سامنے ان لفظوں میں پیش کیا۔

"فرانس اور یورپ کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ جرمنی کو اتنا توڑ دیا جائے کہ وہ رائن اور ویسٹ فلیا کے معدنی وسائل کے بل بوتے پر اور ان کی خام اشیا سے فائدہ اٹھا کر پھر سر اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اس کے علاقے کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ جرمن دوبارہ انہیں استعمال نہ کر سکیں نہ تو انہیں ادھر سے راستے ملیں نہ اپنے اسلحہ کے ذخیرے بنا سکیں اور نہ کوئی مورچہ بنا سکیں۔ اسی طرح سار کی معدنی کانیں جو معاہدہ ورسائی میں فرانس کو دی گئی تھیں دوبارہ فرانس کے حوالے کر دی جائیں تاکہ فرانس اپنے نظام محاصل اور نظام زر میں شامل کر لے کہ بغیر اس کے دونوں کا معاشی نظام مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب رہا روہر وہ اپنی کوئلہ کی کانوں اور ان سے متعلق کارخانوں کی وجہ سے جن میں عام حالات میں ۵ ملین مزدور کھپ جاتے ہیں۔ دراصل یورپ کا خزانہ ہے۔ اس کی بابت حکومت فرانس کا یہ خیال ہے کہ عام انسانیت کے مفاد کے خاطر اس کو جرمنی سے الگ کر کے جداگانہ حیثیت دینی چاہیے اور معاشی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے بین اقوامی انتظام کے ماتحت رکھنا چاہیے۔"

چنانچہ روہر کے بابت حکومت فرانس نے اپنے ایک بیان میں یہ تجویز پیش کی۔

"سیاسی حیثیت سے روہر کو نہ جرمنی سے ملانا ٹھیک ہے اور نہ فرانس سے۔ اسے تو آزادی سے اپنے معاملات خود طے کر لینے چاہئیں۔ ہاں فوج کے معاملے میں اس کو کسی قسم کی آزادی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی ساری فوجیں ختم کر کے اتحادی فوجوں کو تعینات کر دیا جائے

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:۔
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت :۔ یکم ۸ ، ۱۵ ، ۲۲

چندہ :۔ سالانہ ۸ ششماہی للعہ

اس کے ساتھ دریائے رائن کے بائیں ساحل پر بھی فوجوں کی ایک مستقل اور معتد بہ تعداد ہونی چاہیئے اور بوقت ضرورت داہنے ساحل پر کچھ قبضہ رہنا چاہیئے۔"

فرانسیسی اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ جرمن رکش اگر پھر متحد ہو گیا تو یہ آس پاس کے ہمسایہ ملکوں کے لئے خطرہ کا باعث بن جائے گا۔ اور جرمنی کا مسئلہ فرانس اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے لئے اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جبکہ جرمنی کے مرکز کا مسئلہ سب سے اول طے ہو جائے۔ فرانسیسیوں کی شکایت ہے کہ اٹلی جرمنی کا یہ منصوبہ ہم نے معاہدہ ورسائی کے وقت بھی پیش کیا تھا۔ لیکن آخر تک اس پر بحث نہ ہو سکی اور معاملہ یوں ہی آج کل پر ٹل گیا۔

کلیمانسو نے بھی ولسن اور لائڈ جارج کے سامنے بعینہ یہی تجویز رکھی تھی کہ رائن پر جرمن قوتِ اقتدار ہی دے دیا جائے اور جرمن رائش کو تقسیم کرنے کے بجائے اس مرکزیت کو کم کر کے ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بنا دیا جائے اور قبل اس کے کہ مجوزہ جرمن مرکزی حکومت کام سنبھالے جرمنی کے مغربی سرحد کا فیصلہ کر کے انھیں متعین کر دیا جائے۔ (باقی آئندہ)

طابع و ناشر :۔ عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ نمبر ۱۶	۲۴ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء	ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

بھائیو! دوستو! ساتھیو!

ڈاکٹر ذاکر حسین

بھائیو، دوستو، ساتھیو! میں نے یہ تینوں لفظ جان کر بولے ہیں۔ آدمی کو آدمی کا بھائی قدرت بنا تی ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ایک دیس میں پیدا کیا ہے اسی مٹی سے ہم سب بنے ہیں۔ اسی کی مٹی میں ہم سب ملتے رہے ہیں، اسی میں پلے بڑھے ہیں اور اسی میں رہتے، چلتے، گرتے ہیں۔ اس کے تاروں سے سرگوشیاں کرنے والے پہاڑوں کی طاقت اور مضبوطی اس کے میدانوں کی مدت کے بعد زندگی بخشنے والے دریاؤں کا فیض رساں بہاؤ، اس کے جنگلوں کی عارفانہ دم کشی، اس کی چڑیوں کی چہک اس کے پھولوں کی مہک، یہ سب تم جانو کہ نہ جانو، ہمارے تمہارے سب کے رونگٹے رونگٹے میں بسے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم نے سب نے اس کے آرام اور اس کے دکھ میں ایک سا حصہ پایا ہے۔ اس کی نسیم نے سب کے ایک سی اٹکھیلیاں کی ہیں اور اس کی لو نے ہم سب کو ایک سا جھلسایا ہے اس کی زمین نے جو اگلا ہے اس سے ہم سب نے پیٹ پالا ہے اور اس کے کالوں اور قحطوں نے ہم سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان ہو یا سکھ؟ اس کے جانوروں نے تمہاری ہماری سب کی مدد کی ہے۔ اور یہاں اس کے سانپوں نے تم کو ہم کو، ہاں تم کو اور ہم کو یکساں ڈسا ہے اور تم کو ہم کو یکساں فائدہ پہنچایا ہے۔ قدرت نے جو رشتہ جوڑا ہے اسے توڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟

ہاں تم شاید کہو کہ آدمی خالی قدرت کا حصہ نہیں۔ پتھر نہیں۔ پودا نہیں، جانور نہیں ہے کہ قدرت نے جو بنا دیا وہی رہے۔ یہ آدمی ہے۔ اپنی دنیا آپ بھی بناتا بگاڑتا ہے۔ تو یہ بالکل سچ ہے۔ اسی لئے تو میں نے تمہیں دوست کہہ کر پکارا ہے۔ ہم تم کو قدرت نے ہی ایک دیس میں، پیدا کر کے بھائی ہی نہیں بنایا ہے بلکہ ہم اپنی خوشی سے مل جل کر صدیوں ساتھ رہے ہیں۔ غم، شادی میں ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں۔ آپس میں سلوک کئے ہیں، ایک دوسرے کے عیبوں سے چشم پوشی کی ہے ہنر ڈھونڈے ہیں، سیکھے ہیں، سکھائے ہیں۔ ایک نے اپنی کمی دوسرے سے پوری کی ہے۔ ایک دوسرے کو برتا ہے، پرکھا ہے، سمجھا ہے، محبت کی ہے وفاداری کی سب رسمیں نباہی ہیں۔ ایک دوسرے کے جان و دل میں جھیل رہے ہیں۔ غلامی کی لمبی اندھیری رات کو اسی ٹمٹماتے دیے کے سہارے کاٹ کر سحر کی ہے۔ آزادی کا روشن سورج نکلتے ہی کیوں دل پلٹے جاتے ہیں، کیوں نگاہیں بدلی جاتی ہیں۔ دوستو، دوستی کی رسمیں نباہو۔ دوستوں کو دشمن نہ جانو کسی عارضی جنون میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو، جنونیوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے۔ دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو۔ دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہہ اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ محبت بھروسہ اور یقین سے کام لو اور دیکھو کہ اس میں یہ پود کیسا لہلہاتا ہے، اور اس پر وفا کے پھول کھل کر کس طرح اپنی خوشبو سے کینہ اور کپٹ کی گندی فضا کو مہکا دیتے ہیں اور اپنی شفاف خوش رنگی سے شک اور شبہہ کے گدلے پن کو کیسے کاٹ دیتے ہیں۔ بھائیو، دوست بنو۔ دوستی کے حق ادا کرو، دوستی کے تقاضے پورے کرو اور پورے کراؤ۔

بھائی دوست بن جائیں تو اس عظیم الشان کام میں جو ہم سب کے سامنے ہے ساتھی بھی بن سکتے ہیں۔ دوستو دیکھو، صدیوں کی غلامی کے بعد جس نے ہمارے بدنوں ہی کو نہیں جکڑا تھا، جس نے ہمارا پیٹ ہی نہیں کاٹا تھا جس نے ہمیں وبا اور طاعون کا شکار ہی نہیں بنا رکھا تھا، بلکہ جس نے جہل اور بے علمی کے بوجھل طوق بھی ہماری گردنوں میں ڈال رکھے تھے جس میں ہم سوچنا سمجھنا بھول گئے تھے جس میں ہم سے برے بھلے کی تمیز چھن گئی تھی، جس میں ہم زہر کو امرت سمجھنے لگے تھے، جس میں ظلم سہتے سہتے ہمارے سینوں میں ظلم کرنے کے ارمان پرورش پانے لگے تھے جس میں ہم نے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسروں کو بھوکا مارنے کا ہنر پیٹ بھر کر سیکھ لیا تھا۔ جس کی شیطانی کمک پر ہم انسانوں سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ جس میں ہم نے پیسے کو خدا بنا لیا تھا، اور خود غرضی کو اپنا دھرم ایمان، جس میں ہم اپنا الو سیدھا کرنے کی خاطر مذہبی تعصبات کو بے روک ٹوک اکسانے اور بھائی کو بھائی کے اور دوست کو دوست کے خلاف کھڑا کر دینے کا ہنر سیکھ گئے تھے۔ جس نے ہمیں ٹکڑوں میں بانٹ کر ہماری قومی زندگی کو تتر بتر کر دیا تھا۔ وہ غلامی ابھی دو مہینے ہوئے کہ قانوناً ختم ہوئی ہے۔ قانوناً، عملاً تو وہ اس وقت ختم ہوگی۔ جب ہم تم سب مل کر، اپنے ایکے سے، (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
بھائیو! دوستو! ساتھیو!	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں	سالک سندی	۲
تصویر کا دوسرا رخ	(ادارہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ:-		
۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ص، خ	۵
۳- باہر کی دنیا	ع، ح	۶
میرا ایشیا	روش صدیقی	۷
جرمنی اور فرانس	عبدالحلیم ندوی	۸
بولڈز زمین	ٹالسٹائی	۹
کشکول محمد علی / شاہ فقیر		۱۱

قیمت فی پرچہ ۳؍

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالکؔ ہندی

مسلمان افسر کیا کریں؟

میرے پاس ایک دوست کا خط آیا ہے جو ایک صوبے میں سرکاری افسر ہیں۔ پندرہ سولہ سال کی ملازمت ہے۔ اور اس عرصے میں انھوں نے خاصی سمجھداری اور نیک نامی کے ساتھ کام کیا ہے۔ جب دو سال ہوئے ملک میں سیاسی جنون کا طوفان آیا اور بہت سے مسلمانوں کے پاؤں اس سرزمین سے اکھڑ گئے تو انھوں نے ثابت قدمی دکھائی اور ترک وطن کا خیال دل میں نہیں لائے۔ لیکن اب ان کی ذہنی کیفیت (جو شاید ان کی انفرادی کیفیت نہیں بلکہ بہت سے ملازمین کی ہے۔) غور اور ہمدردی کے قابل ہے۔ باوجود حکومت کے اس صریح اعلان کے کہ سرکاری ملازمت میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب برابر ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے افسران کے ساتھ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے سختی اور بے جا امتیاز کا سلوک کرتے ہیں۔ اگر کوئی راہ چلتا غیر ذمہ دار شخص کسی ذاتی مخالفت یا محض خدا واسطے کے بیر کی وجہ سے یہ مبہم شکایت کر دے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرتے ہیں تو اس کو ٹھیک سمجھ لیا جاتا ہے۔ ان کے سر پر سزا یا تنبیہ کی تلوار لٹکنے لگتی ہے، اور ان کے احتجاج کی پروا نہیں کی جاتی! گزشتہ چند سال کے واقعات اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے بہت سے افسر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ بالعموم ہر مسلمان ناقابل اعتبار ہے اور وہ ان کے خلاف شکایت سننے کو گوش بر آواز رہتے ہیں! وہ پوچھتے ہیں کہ ایسی صورت میں انھیں کیا کرنا چاہیے؟ اس عدم اعتماد کی فضا میں اچھا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ پبلک میں وقار قائم نہیں ہوتا اور خودداری الگ مجروح ہوتی ہے۔ ان کو کبھی کبھی یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی قسمت اور اپنا مستقبل ہندوستان کے ساتھ وابستہ کرنے میں غلطی تو نہیں کی۔ وہ اس بارے میں میرا مشورہ چاہتے ہیں۔

بتائیے کیا مشورہ دوں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ انھوں نے غلطی نہیں کی۔ ہندوستان میں جو نیک نیت، فرض شناس اور وفادار مسلمان ہیں ان کا فرض تھا اور ہے کہ وہ یہیں رہیں اور اپنے ہم وطنوں کا جن میں ہندو، مسلمان، سکھ شامل ہیں، خلوص اور بے غرضی کے ساتھ خدمت کریں۔ بے شک اعلیٰ حکام کا بھروسا نصیب نہ ہو تو اچھا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن سچا وقار ان کی ٹیک، ان کی دستخط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ سیوا کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، ایک مہینے یا ایک سال کی سیوا سے نہیں بلکہ برسوں تک پتہ مار کر نفس کشی کر کے سیوا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انھیں اور ان جیسے دوسرے ملازمین کو میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے فرائض بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دیں۔ اپنے کام کے ذریعے لوگوں کے دل میں گھر کریں تاکہ تنگ نظر افسر بھی آسانی سے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں، بلکہ مجبور ہو کر ان کی عزت کرنا سیکھیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں چاہیے کہ وہ مضبوطی لیکن معقولیت کے ساتھ اپنے حقوق پر اصرار کریں، کیونکہ یہ ہر شہری کا فرض ہے۔ ملک کے دستور میں یہ بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ ہندوستان ایک غیر مذہبی ریاست ہے اور بالکل اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا وطن اور ان کی ملکیت ہے جس طرح کسی اور جماعت یا مذہب کے لوگوں کی۔ اس لئے ملک کے ساتھ غداری وہ لوگ نہیں کرتے جو اپنے جائز حقوق اور کام کرنے کے موقعے اور آرام اور عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں چاہتے ہیں بلکہ وہ لوگ جو ذات پات یا مذہب یا خیال کے اختلاف کی بنا پر کسی جماعت یا گروہ کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان ملازمین کو اس اصول پر بھروسا رکھنا چاہیے، اس پر اصرار کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی شکوے، بغیر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے اپنا فرض ایمانداری کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

حافظا وظیفۂ تو دعا کردن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید!

بے شک ایسا کہنا آسان ہے، کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ کس بے وقوف کا دعوے ہے کہ دنیا میں جو کام کرنے کے قابل ہیں آسان ہیں۔ مشکل کا مقابلہ کرنا اور زیاں کی جیب سے سود حاصل کرنا انسان کا شرف اور مسلمان کی سعادت ہے۔ اگر وہ اس سے منہ پھیر لیں گے اور آسان راستوں کی تلاش کریں گے تو بھی کامیابی ہرگز ہاتھ نہ آئے گی...... علاوہ اس کے ان کے لئے اور راستہ بھی کون سا ہے؟

اس سلسلے میں ایک بات حکومت کے گوش گزار بھی کرنا چاہتا ہوں۔ حکومت کا اس وقت خاص طور پر یہ فرض ہے کہ مسلمانوں کی دل جوئی اور ان کے ساتھ مہربانی اور سمجھداری کا سلوک کرے۔ اس وقت ان میں سے بہت سوں پر ایک شکست خوردگی کی ذہنیت طاری ہے جو نہ ان کے لئے اچھی ہے نہ حکومت کے لئے۔ اگر ان میں خود اعتمادی اور قوت پیدا ہو گی تو وہ ملک کی قوت اور استحکام کا باعث ہو گی۔ حکومت کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس وقت مسلمان افسروں کا یا عام ایسی حالت ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بد سلوکی یا مسلمانوں کے ساتھ ناجائز مراعات کرنے کی جرأت کر سکیں۔ وہ تو گزشتہ حالات کی وجہ سے بہت ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف اس قسم کی جو شکایتیں آئیں ان کو بہت احتیاط کے ساتھ پرکھ کرنی چاہیے اور یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ شکایت مسلمان کے خلاف ہے لہٰذا جب تک وہ بے قصور ثابت نہ ہو اس کو (احتیاطاً!) مجرم ہی سمجھا جانا ہے۔ ممکن ہے بعض تنگ نظر لوگ اس بات پر ناراض یا حیران ہوں کہ میں نے مسلمانوں کے ساتھ ... اور دلجوئی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس بات کے ... کے لئے میں گاندھی جی کے اپدیش کا سہارا نہیں لوں گا۔ بلکہ اپنی حکومت کو جس کے لئے حکومت کرنا ایک نیا کام ہے۔ یہ حقیقت یاد دلانا چاہتا ہوں کہ رعایا کے ساتھ فیاضی کا سلوک اور دل کی فراخی کامیاب جہاں بانی کا پہلا آئین ہے۔

حقیقت بینی

لاہور کے ایک سنجیدہ ہفتہ وار اخبار میں یہ عبارت پڑھ کر خوشی ہوئی کہ پاکستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جذبات پرستی کے خطروں اور حقیقت بینی کی خوبیوں کا احساس رکھتے ہیں:-

بدقسمتی سے ہماری گزشتہ سیاسی زندگی میں نعروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کوئی قوم ہوا میں زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ بقول علامہ اقبال ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

میرے سامنے اس وقت ...... کا ایک خط ہے، جس کے آخری پیرے کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

"ان دو تم نے ٹھیک کہا کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین نے بے حد دکھ اٹھایا ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا نعرے اس کے لئے ذمہ دار نہیں؟ —— کیا یہی نعرہ بازی ہمیں آئندہ تباہی کی طرف نہیں لے جا رہی؟ کیا تم نے پاکستان مسلمانوں کو اقتصادی طور پر زندہ کرنے کے لئے لیا تھا —— یا پھر انھیں اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے بہتر ماحول پیدا کرنے کے لئے؟ —— پاکستان کے پیچھے بنیادی نقطۂ خیال کیا تھا؟ —— کیا جرمنوں نے دو جنگیں اپنے مذہب اور کلچر کے تحفظ و بقا کے لئے لڑی تھیں یا محض اپنے آسمان کی چھت کے نیچے سر چھپانے کو جگہ حاصل کرنے کے لئے؟ —— کیا لیڈر سٹوں کو، اپنے پیروں کو متذکرۃ الذکر کے مفاد میں انھیں دھوکا دینا جانتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا مذہب مذہب کہنا جب کہ ہمارا مقصود اقتصادیات ہے، درست ہے؟ —— یا پھر یہ کہ مذہب اور اقتصادیات علیحدہ علیحدہ نہیں ہو سکتے! —— یہ سب کچھ سیاسیات کی باتیں ہیں، جن سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن ہر شخص کا حق ہے کہ وہ ان چیزوں کو ذہنی نقطۂ نگاہ

سے سمجھنے کی کوشش کرے گا

هفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴؍اپریل ۵۰ء

تصویر کا دوسرا رخ

حکومت ہند کو اس کی ریاستی پالیسی کی کامیابی پر ہر طرف سے مبارک باد دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ریاستوں کے مسئلے کو، جسے برطانوی حکومت سالہا سال سے حل کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی دو سال کے اندر کامیابی سے حاصل کر لیا ہے۔ اس بات میں اصلیت ضرور ہے جس کا ہم برابر اعتراف کرتے رہے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جن کو واقعات پر تنقیدی نظر ڈال کر صحیح رائے قائم کرنے کی عادت نہیں ہے اصلیت کو مبالغے کی عینک سے دیکھ رہے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ ریاستوں کے معاملے میں کتنی گتھیاں تھیں۔ ان میں صرف ایک کو حکومت ہند نے سلجھایا ہے۔ دوسری گتھیاں سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ گئی ہیں۔

اس مسئلے کے تین پہلو تھے، سیاسی، انتظامی اور معاشی۔ سیاسی پہلو یہ تھا کہ ملک کے اندر چھوٹی بڑی سب ملا کر کوئی چھ سو نیم خود مختار ریاستوں کا موجود ہونا قومی حکومت کے لئے سخت خطرناک تھا۔ یہ سب کی سب حکومت برطانیہ کو اپنا مربی اور سرپرست سمجھتی تھیں اور اس کا دامن کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے یہ کوشش کی کہ ہندوستان دو حصوں میں نہیں بلکہ تین حصوں میں تقسیم ہو اور ہندوستان پاکستان کے علاوہ ریاستوں کا مجموعہ راجستھان کے نام سے ایک جداگانہ برطانوی ڈومینین بنا دیا جائے۔ کانگریس کی [illegible] کی وجہ سے ان کی یہ کوشش ناکام رہی تو انھوں نے چاہا کہ سب نہیں تو کم سے کم بڑی بڑی ریاستیں اپنی اپنی جگہ خود مختار بن کر بیٹھ جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ملک کی وحدت اور سلامتی کے لئے کچھ کم خطرناک نہ تھا۔ قومی حکومت نے قوت اور تدبیر دونوں سے کام لے کر ان سب کو پہلے انڈین یونین میں شامل کیا اور پھر آئندہ فتنوں کا سدباب کرنے کے لئے یہ پالیسی اختیار کی کہ ریاستوں کا مستقل وجود ہی ختم کر دیا جائے۔ اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنے صوبوں میں مدغم کر لیا اور جو باقی رہ گئیں ان کو ملا کر کئی علاقہ واری یونین بنا دئے جو کم و بیش صوبوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ مشکل اور پیچیدہ عمل مجموعی طور پر بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی سے انجام پایا۔

لیکن ریاستوں کے مسئلے کے انتظامی اور معاشی پہلو سیاسی پہلو سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ عام طور پر ہندوستانی ریاستوں میں نظم و نسق کا معیار اور اُن کے باشندوں کی اقتصادی حالت متصل صوبوں کے مقابلے میں بہت پست تھی نئے انتظامات کے بعد کچھ تو نئے بنائے ڈھرے بدل جانے کی وجہ سے اور کچھ عوامی وزیروں کی ناتجربہ کاری اور بعض صورتوں میں اُن کی نالائقی اور بددیانتی کی وجہ سے حالت بدتر ہو گئی۔ عوامی وزارتوں کی بدانتظامی، فرقہ پرستی، رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کی بہت سی مثالیں سامنے آ چکی ہیں۔ کوٹھا پور سے لے کر مدھیا پردیش تک واقعات کا ایک سلسلہ ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ حکومت ہند کا ریاستوں کا محکمہ صورت حال سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور اچھی طرح محسوس کر رہا ہے کہ جب تک ریاستیں انتظامی اور معاشی حیثیت سے کم سے کم انڈین یونین کے صوبوں کی سطح تک نہ پہنچ جائیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاستوں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جمہوریت کا جذبہ صلاح کار میں حائل ہو رہا ہے ہم نے جذبے کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ سارے ملک میں اور خصوصاً ریاستوں میں ابھی تک جمہوریت ایک جذبے کی حیثیت رکھتی ہے اس نے عقلی اصول کے طور پر ہمارے ذہن کو اور اخلاقی اصول کے طور پر ہمارے عمل کو جیسا چاہئے متاثر نہیں کیا ہے۔ یونین کے صوبوں کے لوگ تو پھر بھی کم و بیش چالیس سال سے آہستہ آہستہ جمہوری طرز حکومت کا سبق سیکھتے آئے ہیں مگر ریاستوں کے لوگ ابھی تک اس فن میں بالکل کورے ہیں۔ ان کے اس حق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ جمہوری طریق کے مطابق اپنے اوپر آپ حکومت کریں۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے ریاستوں کا نظم و نسق ان کے نمائندوں کے سپرد کر دیا ہے لیکن وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ ان کی عوامی حکومتیں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اچھی طرح نہیں اٹھا سکتیں۔ اندرونی باتوں کے لحاظ سے حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں اس لئے خود ان کو مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ اس کچھ عرصے کے لئے ہر ایک ریاست اور ریاستوں کے یونین کو صوبہ دہلی کی طرح ایک صوبہ بنا دیا جائے جس کا انتظام مرکزی حکومت کی طرف سے ایک چیف کمشنر مقامی ایڈوائزری کونسل کی مدد سے کرتا رہے جب ان کے آئین مرتب ہو جائیں اور ان کے نمائندے مشیروں کی حیثیت سے نظم و نسق کے نشیب و فراز سے واقف ہو جائیں تو جلد سے جلد عام انتخابات کے ذریعے آئین ساز مجالس بنا دی جائیں اور ذمہ دار عوامی حکومت قائم کر دی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ ریاستوں کے عوام کی بالکل یہی خواہش ہے البتہ ان کے لیڈروں کو اس ایثار پر آمادہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے حکومت کے شوق کو تھوڑے دن تک روکے رکھیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ اگر وہ خوشی سے اس پر آمادہ نہ ہوئے تو ایک دن واقعات کا جبر ان کو مجبور کر دے گا۔

بزم بے تکلف

تمھارے صاحب کا نام مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ گاؤں بھر انھیں "تمھارے صاحب" ہی کہتا ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو "تمھارے صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسے بات کی ٹیکن بنا لیا ہے۔ جہاں زبان رکی اور انھوں نے اس بات کا سہارا لیا۔ اس لئے ان کا یہی نام پڑ گیا

ہاں جی چاہے تو ان کا تھوڑا سا حلیہ سن لیجئے تھوڑا سا اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے بلکہ ان کا حلیہ ہے ہی ذرا سا۔ ٹھگنا قد، اکہرا بدن، دبلا چہرہ، سانولا رنگ، خشخشی ڈاڑھی، سر پر پٹے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ کپڑے بھی واجبی ہی پہنتے ہیں۔ نیچا کرتہ، اونچا پاجامہ یا کبھی لنگی۔ سر پر رومال لپٹا ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ روز لگاتے ہیں۔ سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے ہیں۔

"تمھارے صاحب" کبھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ قریب کے کسی گاؤں میں ان کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی جو مقدمہ بازی میں ٹھکانے لگ گئی۔ اس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح رہتے ہیں۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے ہیں۔ ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو حقہ بھر کر پلانا، دوسرا بازار سے سودا سلف لانا۔ سودا چکانے میں اُن کی انوکھی عادت ہے کہ ہمیشہ دکاندار کی سی کہتے ہیں۔ مثلاً خربوزے والا آیا ہے اور زنانی ڈیوڑھی پر اس سے بھاؤ چکایا جا رہا ہے۔ یہ حضرت بھی موجود ہیں۔ بیچنے والا سیر کے چار آنے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو آنے کہہ رہے ہیں۔ ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا ہے "نہیں تمھارے صاحب یہ خربوزے تو چار ہی آنے سیر کے ہیں۔" اور جو کسی نے کہا کہ تم بیچ میں کیوں بولتے ہو، تو بھولے پن سے فرماتے ہیں "تمھارے صاحب وہ تو آپ ہی چار آنے سیر کہہ رہا ہے ہم نے کہا تو کیا برا کیا۔" ان کی سادگی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ آپس کے رشتے ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ پھپی کی خلیا ساس کو تائی اور بیوی کی بہنوئی کو نندوئی غرض اسی طرح الٹکل پچو رشتے بنایا کرتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

پچھلا ہفتہ:۔ ۱۔ ہندوستان

وہ مبارک سلسلہ جاری ہے

تقسیم ہند اور اس کے خونی اثرات کے بعد مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے بیچ میں ایک تند سمندری حائل ہوگئی تھی۔ اس سے دونوں صوبوں کے لوگوں کو جہاں اور دقتیں ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ اپنی زیارت گاہوں میں جو نئی سرحد کے پار ہیں خاص خاص تہواروں کے موقعوں پر بھی نہیں جا سکتے۔ پچھلے سال کچھ لوگوں جن میں اخبار اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر بہت پیش پیش تھے یہ تحریک اٹھائی کہ جب کسی مذہب کا کوئی بڑا تہوار آئے تو اس کے پیروؤں کی ایک مقررہ تعداد کو دونوں حکومتوں کے تعاون سے سرحد پار ان کی زیارت گاہوں میں پہنچانے کا انتظام کیا جائے چنانچہ پہلی بار کوئی پچاس سکھ مغربی پنجاب کی حکومت کے مہمان ہوکر ننکانہ صاحب گئے۔ ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا گیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کے بعد مشرقی پنجاب اور پٹیالہ کی حکومتوں نے مغربی پنجاب کے کچھ مسلمانوں کو سرہند شریف کے عرس میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ان کی بڑی خاطر مدارات کی اس طرح یہ سلسلہ جس کا نہ صرف دونوں پنجابوں کے بلکہ عام طور پر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر بڑا خوش گوار اثر پڑا شروع ہوگیا اور اب تک جاری ہے۔ چنانچہ پچھلے ہفتے ۲۱ سکھ بیساکھی کے موقع پر حسن ابدال کے قریب پنجہ صاحب کے گردوارے کی زیارت کے لئے گئے تھے اور انھوں نے وہاں سے آکر پاکستان کے حکام کے علاوہ عام لوگوں کے دوستانہ برتاؤ کی بڑی تعریف کی اس واقعے سے اور اس قسم کے بہت سے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تعصب اور نفرت کا جو زہر پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کی رگوں میں دوڑا دیا گیا تھا، اب بہت کچھ دور ہوگیا ہے اور ارباب غرض نئے انجکشن نہ دیتے رہیں تو تھوڑے دن میں بالکل زائل ہو جائے گا۔

کشمیر کا معاملہ اٹک گیا

کشمیر کمیشن نے بہت دن تک اس بات کو چھپانے کی کوشش کی کہ صلح کی گفتگو میں کچھ پیچ پڑ گئے ہیں اور وہ آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ اب بھی اس کی طرف سے کوئی مایوس کن اعلان نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس کی خاموشی نے اس راز کو قریب قریب فاش کر دیا ہے۔ ایک خبر یہ بھی آئی ہے جس کی تصدیق ابھی تک نہیں ہوئی کہ مجوزہ سپریم ایڈمنسٹریٹر امیرل نمٹز نے صلح کی ابتدائی گفتگو کے رک جانے کی وجہ سے کشمیر آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ ہم نے پچھلے ہفتے یہ بدگمانی ظاہر کی تھی کہ کشمیر کے معاملے میں رکاوٹ پڑ جانے کو مسٹر ایڈن کے دورۂ پاکستان سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ اس میں چاہے شبہ کی گنجائش بھی ہو مگر یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ کشمیر کے معاملے میں یہ الجھن لندن کی کامن ویلتھ کانفرنس کے انتظار میں پڑی ہے یا ڈالی گئی ہے اور اس کا سلجھنا بہت کچھ کانفرنس کے نتیجے پر موقوف ہے۔ اگر ہندوستان اور برطانیہ میں آئندہ تعلقات کے بارے میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہو گیا جس سے برطانیہ کے لوگ مجموعی طور پر مطمئن ہوں تو غالباً کشمیر کی گرہ کا دھاگا ڈھیلا چھوڑ دیا جائے گا کہ کمیشن اسے کھول سکے تو کھول لے لیکن جو کہیں لندن میں مفاہمت نہ ہو سکی تو ہاتھ کی ایک جنبش سے گرہ اتنی کس جائے گی کہ کشمیر کمیشن ناخن تدبیر اسے ٹس سے مس نہ کر سکے۔

کچھ ہو تو جانیں

جب حکومت نے بیچ میں کچھ عرصے کے لئے کپڑے پر سے کنٹرول ہٹا لیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ قیمتیں ایک دم سے بڑھ گئی تھیں تو وزیر اعظم پنڈت نہرو نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر کپڑے کے کارخانے خود اپنے ایسوسی ایشن کی مقرر کی ہوئی قیمتوں سے زیادہ پر کپڑا بیچیں گے تو ان کا سارا زائد منافع جو قیمتیں بڑھ جانے کی وجہ سے ہوگا ضبط کر لیا جائے گا۔ اب صنعت اور رسد کی وزارت نے اس سلسلے میں دلچسپ انکشاف کئے ہیں بہت سے کارخانوں نے بظاہر کپڑا تو مقررہ قیمت پر بیچا لیکن اس کے علاوہ بڑی بڑی رقمیں "پگڑی" کے طور پر وصول کیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خردہ فروشی کے بازار میں موٹے اور درمیانی کپڑے کی قیمتوں میں ۶۰ سے لے کر ۷۰ فی صدی تک اور باریک کپڑے کی قیمتوں میں ۱۰۰ سے لے کر ۲۰۰ فی صدی تک اضافہ ہوا۔ حکومت نے پچھلے سال ۲۷ جولائی کو دوبارہ کنٹرول قائم کرتے وقت بتایا تھا

کہ زائد منافع

کا اندازہ ایک ارب روپیہ ہے مگر اب معلوم ہوا ہے کہ منافع اس سے کہیں زیادہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فنانس کی وزارت اس معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے تاکہ جتنا زائد نفع ثابت ہو اسے وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق ضبط کر لے۔ لیکن پچھلا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ حکومت کے محکمے جب اس قسم کی "تحقیقات" کرتے ہیں تو اس سے علم انسانی میں چاہے جتنا اضافہ ہو مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اگر حکومت واقعی اس معاملے کی چھان بین کرنا چاہتی ہے اور نگلی ہوئی رقم اگلوانا چاہتی ہے تو اسے بڑی کونسلوں کے ججوں یا اسی مرتبے اور حیثیت کے اشخاص کا ایک کمیشن اس کام کے لئے مقرر کرنا چاہئے۔

جمعیت صحیح راہ پر

جمعیتہ العلما کا اجلاس لکھنؤ جو ۱۸ اور ۱۹ اپریل کو مولانا حسین احمد صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا اس کی تاریخ میں ایک عہد آفرین اجلاس ہے اس میں جمعیت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سیاست کو قطعاً ترک کرکے اپنی ساری سرگرمیاں مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی حفاظت اور ترقی کی کوشش میں صرف کرے گی۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے خطبے میں فرمایا:۔

"سیاست سے علیحدگی کے بعد ہم جمعیتہ العلما کے پلیٹ فارم پر سیاسی مسائل سے بحث نہیں کریں گے۔ ہاں ہمارا یہ فرض ہوگا کہ ہم سوچیں کہ مسلمان کس طرح انسان بن سکتے ہیں، کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں، کس طرح ترقی کر سکتے ہیں اور کس طرح وہ اخلاق اور خصائل پیدا کر سکتے ہیں جو سید سرور رحمت مولانا رحمۃ للعالمین کا پرتو ہوں، کس طرح ایسا کردار اختیار کر سکتے ہیں کہ ملک کا گراں قدر سرمایہ بن سکیں۔"

دراصل علمائے دین کی جماعت کے لئے سیاست میں اس قدر سرگرمی سے حصہ لینا ایک عجیب و غریب بات تھی لیکن بدیسی حکومت کے دور میں گاندھی جی کی طرح جن کا کام دراصل اخلاقی اور معاشرتی اصلاح تھا، جمعیتہ بھی اس پر مجبور ہوگئی تھی کہ پہلے اس سیاسی غلامی سے جنگ کرے جو ہر قسم کی اصلاح میں حائل تھی اب حصول آزادی کے بعد جب کہ جمعیتہ کا بہت بڑا حصہ ہی اسے غیر متعلق کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور اس نے ساری توجہ اپنی اصلی کام پر صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا خدا اس کے ارادے میں برکت دے اور اس کی سعی کو مشکور کرے۔

بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۳)

گھر کے سب بچے ان کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں اور ان کے جواب سن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ ایک بار ان سے پوچھا کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اس کی کون ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے اس درزی کے دادا کا نام، ولدیت، سکونت عمر کی تحقیق کی۔ پھر اس کی پوتی کا نام اور عمر پوچھی۔ یہ سب چھان بین کرنے کے بعد فرماتے ہیں بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم، اسی سے پوچھ لو۔ شادی انھوں نے کم عمری کے زمانے میں کر لی تھی۔ بیوی تعداد میں ایک ہیں مگر مقدار میں ان سے چوگنی اور پھر تیز مزاج۔ اس لئے یہ ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ بال بچے ہیں نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے محبت کا جذبہ اب جانوروں کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔ بکریاں، مرغے، طوطے، مینا، بٹیر غرض بیسیوں جانور پال رکھے ہیں۔ اور ان سے بہت مانوس ہیں۔ حکیم کا قول ہے اور نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اس کی روح حیوانی اسی جانور کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو "تمانسے صاحب" کا طرح ایک پورے چڑیا خانے سے کم نہ ہوگی۔

۲- پاکستان

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات

اخبار اسٹار کا نامہ نگار لندن سے لکھتا ہے:- شمال کی طرف سے حملے کے خطروں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں لوگ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کی صورت حال کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں مستند حلقوں کا خیال ہے کہ کابل میں جو لڑائی کا ذکر بہت زور و شور سے کیا جا رہا ہے یہ خالی خولی دھمکی ہے۔ اس لئے کہ اگر لڑائی چھڑ جائے تو افغانستان قبائلیوں سے کوئی مدد نہیں لے سکے گا، بلکہ پوری سرحد کی آبادی اس کے خلاف کھڑی ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسری طرف سے جو افواہیں سابق شاہ افغانستان امان اللہ خاں کے بارے میں مشہور کی جا رہی ہیں وہ بھی یہاں ناقابل اعتبار سمجھی جاتی ہیں۔ امان اللہ خاں کو لوگ اب تقدیم پارینہ سمجھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ کابل کو تجارت کا جو مال آتا ہے اُسے پاکستان سے گزرنا پڑتا ہے اس لئے کابل کی حکومت کو رنہار رہ پاکستان کی طرف سے بار لینا پڑے گا۔ خبر ہے کہ پس پردہ کچھ گفت و شنید بھی ہو رہی ہے۔

(پاکستان ٹائمز)

افغانستان کے لئے خیر سگالی کا وفد

حزب اسلامی کے زیر اہتمام شاہی مسجد لاہور میں عامۃ المسلمین کا ایک شاندار جلسہ افغانستان اور پاکستان کے اختلافات کا حل سوچنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں قرار پایا کہ دونوں حکومتیں اپنے اختلافات کو قرآن پاک کی روشنی میں طے کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ خود مفاہمت نہ کر سکیں تو اپنے اختلافات کو چند علمائے اسلام سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت نور المشائخ کی عدالت میں پیش کر کے فیصلہ لے لیں اور اس فیصلے پر کار بند ہو جائیں۔

اس جلسہ نے اس مضمون کی قرارداد بھی منظور کی کہ خیر سگالی کا ایک غیر سرکاری وفد افغانستان بھیجا جائے جو دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد و اشتراک عمل کے جذبات کو ترقی دینے کی کوشش کرے۔

جلسے کی پہلی تجویز کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ معاملات باہمی افہام و تفہیم ہی سے طے ہو سکتے ہیں اور انہیں کسی ثالثی عدالت میں پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آ سکتی اور خیر سگالی کا غیر سرکاری وفد بھیجنے کی بہت معقول تجویز ہے حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ ایسے وفد کے لئے ہر قسم کی ممکن سہولتیں مہیا کرے۔

(مغربی پاکستان)

سائنس کانفرنس لاہور میں

ہال میں ڈھائی سو ڈیلیگیٹوں اور اور پر جوش تماشائیوں کے بہت بڑے مجمع کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کانفرنس کے منتظمین خصوصاً ڈاکٹر بشیر احمد جنرل سکریٹری نے پاکستان کے سائنس دانوں کی پہلی کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے کتنی کوشش کی ہو گی ....

صدر کانفرنس میاں افضل حسین نے اپنے فاضلانہ خطبے میں کہا "آج کل سائنس کا دخل قومی زندگی کے ہر شعبے میں ہے اور بین الاقوامی معاملات پر بھی اس کا تسلط ہے۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے اُس نے لوگوں کی نظروں میں پہلے سے بھی زیادہ قدر و قیمت حاصل کر لی ہے۔ یہ دور سائنس کا دور ہے اور اس میں کوئی ریاست سائنٹیفک علم کے بغیر نہیں چل سکتی ....

لیکن سائنس کی ترقی کے لئے بین الاقوامی تعاون لازمی ہے ہم اس کے قائل ہیں کہ علم چاہے کہیں حاصل کیا جائے اور کسی طرح حاصل کیا جائے سب کے لئے عام ہونا چاہیئے۔ ہمیں بین الاقوامی سائنس کی ترقی میں پورا حصہ لینا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز)

نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم

توقع ہے کہ نرسنگ کی مزید اعلیٰ تربیت کے لئے پاکستانی خواتین کا پہلا دستہ عنقریب کراچی سے برطانیہ اور آسٹریلیا روانہ ہو جائے گا۔ تجویز کیا گیا ہے مزید اعلیٰ ٹریننگ کے لئے بیس خواتین کو فوری طور پر سمندر پار بھیجا جائے۔ ان میں سے بارہ خواتین برطانیہ اور آٹھ آسٹریلیا روانہ کی جائیں گی۔ حکومت پاکستان نے پیرزادہ عبدالستار وزیر خوراک پاکستان کی صدارت میں ایک انتخابی بورڈ مقرر کیا ہے جو مناسب اُمیدواروں کا جائزہ لے گا۔ بورڈ کا اجلاس ۱۶ اپریل کو ہو رہا ہے۔

(مغربی پاکستان)

مہاجر کاشتکاروں پر زیادتی

وہ مہاجر جنھیں مغربی پنجاب میں زمینیں الاٹ کی گئی ہیں ان سے حکومت دوسروں کے مقابلے میں سہ گنا لگان وصول کر رہی ہے۔ ہمیں حکومت کے اس مطالبے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی اگر مہاجروں کو اس بنا پر سہ گنا لگان ادا کرنا پڑتا ہے کہ وہ ان زمینوں کے مالک نہیں جنھیں وہ جوتتے اور بوتے ہیں تو جو زمین مشرقی پنجاب میں چھوڑ آئے ہیں ان کا کیا ہوا۔ آخر یہ مہاجر ان زمینوں کے مالک تھے، اور انھیں ان زمینوں سے زبردستی محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ جہاں تک زمین کی ملکیت کا تعلق ہے، مغربی پنجاب کے مقامی اصحاب زمین اور مشرقی پنجاب کے مہاجر برابر ہیں اس لئے حکومت کو جو لگان ان سے وصول کرنا چاہیئے وہی لگان مہاجرین سے بھی وصول کرنے کا مجاز ہے۔ لیکن اس معاملے میں دونوں میں فرق روا رکھنا بڑی بے انصافی اور مظلوم مہاجرین پر زیادتی ہے۔

(آفاق لاہور)

اعداد و شمار

اپریل ۱۹۴۹ء تک ۳۰ لاکھ ۷۰ ہزار مہاجرین کو زراعتی اراضی پر آباد کر دیا گیا تھا، اس کے علاوہ ۷ لاکھ ۸۰ ہزار مہاجرین کو کاشتکاری میں اور ایک لاکھ ۲۴ ہزار مہاجرین دوسرے کاموں میں لگانے کے منصوبے تیار کئے جا چکے ہیں۔ پاکستان میں ۷۱ لاکھ ۴۰ ہزار مہاجرین آئے اور اس کے مقابلے میں پاکستان سے جانے والوں کی تعداد ۵۰ لاکھ ۵۸ ہزار تھی، یعنی پاکستان میں نسبتاً ۲۰ لاکھ ۸۸ ہزار زائد آدمی آئے۔

(ص، ح)

ھریجن کا ست
وزارتوں کا ٹوٹنا

ک، ج مشرو والا

ان ہی دنوں مدھیہ بھارت، مدراس اور پوربی پنجاب کے وزیروں کو اس وجہ سے ہٹنا پڑا کہ انھیں اپنی اپنی پارٹی کے ممبروں کی کافی تائید حاصل نہ تھی۔ ایک بار پہلے بھی مدراس میں اور کبھی بنگال میں یہی ہو چکا ہے۔ اخباروں میں جو روداد شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تبدیلیوں کی تہہ میں ان با اثر اشخاص کی سازشوں کے سوا اور کچھ نہ تھا جنھیں طاقت حاصل کرنے کی فکر ہے۔ اس کا بہت کم امکان ہے کہ ان میں سے کسی صوبے میں ایک فریق کے ہٹنے اور اس کی جگہ دوسرے کے آ جانے سے پالیسی میں کوئی تبدیلی ہو گی یا حالات کچھ بہتر ہو جائیں گے اس لئے جہاں تک عوام کی بھلائی کا تعلق ہے ان حکومتوں کے بدلنے سے سوا اس کے کہ لوگوں کو چہ می گوئیاں کرنے کے لئے ایک موضوع مل جائے کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلے گا البتہ یہ ضرور ہو گا کہ روز مرہ کے معاملات میں نئے لیڈروں کو اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہی سیاست کا کھیل جو ہندوستانی ریاستوں میں برطانوی عہد سے پہلے کھیلا جایا کرتا تھا، پھر شروع ہو گیا ہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ کانگریس کی اسمبلی پارٹیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ لیڈر کا انتخاب ہر سال نئے سرے سے ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ رہی اس کی خرابی سو وہ آسانی سے نظر آ جاتی ہے۔ اگر اسمبلی کا انتخاب چار یا پانچ سال کے اور لیڈر کا صرف ایک سال کے لئے ہوتا ہے تو لازمی ہے کہ اسے یہ فکر رہے گی کہ دیکھئے میں کب تک رہتا ہوں۔ اس لئے وہ کسی معاملے کا فیصلہ نہ کر سکے گا۔ خاص خاص لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کرے گا۔ کسی کو اپنی طاقت اور مرتبے سے بے جا فائدہ اٹھاتے دیکھے تو چشم پوشی سے کام لے گا

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

۳- باہر کی دنیا

منحصر غیر ملکی مدد ہوجس کی امید

برما کے وزیر اعظم تھاکن نو پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں صاحب سے ملنے کے بعد رنگون واپس چلے گئے - معلوم ہوا کہ ان کا آنا اس غرض سے نہیں تھا کہ ہندوستان کی حکومت کو بیچ میں ڈال کر اپنی مخالف پارٹیوں سے صلح کی گفتگو شروع کریں - انھوں نے اخباروں کے نمایندوں سے کہا میں نے پنڈت نہرو کی صلح کی دعوت کو قبول کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن صلح کی راہ میں مشکلیں ہیں جن کی پوری کیفیت میں نے پنڈت جی کو بتادی ہے - اپنے سفر کا مقصد تھاکن نو نے یہ بتایا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے نمایندوں کے ذریعے سے کامن ویلتھ کانفرنس کو دوستی کا پیام بھیجنا چاہتے ہیں اور اس سے مدد کی درخواست کرنا چاہتے ہیں - برما کی خانہ جنگی کے بارے میں انھوں نے پورے وثوق کے ساتھ یہ امید ظاہر کی کہ ان کی حکومت کرن قبائل اور کمیونسٹوں کی مخالفت کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے گی -

واقعی پچھلے دو ہفتے سے جو خبریں آرہی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا رُخ پلٹ گیا ہے اور اب حکومت کی فوجوں کا پلہ بھاری ہوتا جاتا ہے - آخر مارچ میں وہ مانڈلے اور میمیو سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں مگر اب انھوں نے ۹ اپریل کو مانڈلے سے ۱۳ میل مغرب کی طرف کرن قبائل کو بری طرح شکست دے کر میمیو کو واپس لے لیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ جب سے تھاکن نو نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ برما کے اندر ایک نیم خود مختار کرن ریاست کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں اور اپنی کیبنٹ میں تبدیلی کردی ہے - باغیوں کے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے - اور ان میں سے بہت سے اب حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں، چنانچہ بیچ میں یہاں تک نوبت آگئی کہ کرن قبائل ہتھیار ڈالتے ڈالتے رہ گئے -

لیکن دو سال کی خانہ جنگی نے برما کی معاشی حالت کو تباہ کر دیا ہے اور حکومت سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے - وہ بہت دن سے کوشش کر رہی ہے کہ برطانیہ سے اُسے اتنی بڑی رقم قرض مل جائے جو برما کی معاشی بحالی کے لئے کافی ہو - ابھی تک کامیابی نہ ہونے کی دو وجہیں تھیں - ایک تو برطانیہ برما کی حالت کو دیکھ رہا تھا - دوسرا ایک ایسی حکومت کو جس کا وجود خطرے میں تھا - قرض دیتے ہوئے جھجکتا تھا - دوسرے قرض کی شرطوں کے بارے میں اختلاف تھا - شاید اب تھاکن نو کو یہ اُمید پیدا ہوگئی ہے کہ برطانیہ کو جو شبہہ ان کی حکومت کی پائداری کے بارے میں تھا وہ دور ہو جائے گا اور وہ مناسب شرطوں پر قرض دے گا -

اچھا یہ بات ہے!

پچھلے دنوں شام میں اس قسم کا انقلاب حکومت ہوا جیسا جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں آئے دن ہوا کرتا ہے - ایک فوجی افسر الزعیم نے جمہوری ریاست کے صدر کو اور حکومت کے ارکان کو گرفتار کرلیا اور سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا - خیال تھا اس پر مغربی جمہوریتیں ناراضگی کا اظہار کریں گی اور نئی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گی - مگر ہوا یہ کہ اس انقلاب پر سب کہیں خصوصاً انگلستان میں دل کھول کر داد دی گئی - دیکھنے والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا اسرار ہے - فسطائیت کے اس مظاہرے پر جمہوریت اتنی خوش کیوں ہے؟ اب یہ بھید کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے - بات یہ ہے برطانیہ نے امریکا کے دباؤ سے فلسطین سے قدم ہٹا لیا ہے لیکن وہ مشرق وسطی کی سیاست سے بے دخل ہونے پر ہرگز تیار نہیں ہے - اسرائیل کی ریاست بن جانے سے غم و غصے اور خوف کی جو لہر سارے جزیرۃ العرب میں دوڑ گئی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ عربوں کا ایک محاذ اپنے زیر اثر بنانا چاہتا ہے - مصر میں برطانیہ کی مخالفت کا اتنا زور تھا کہ اس پر ڈورے ڈالنے میں کامیابی نہیں ہوئی - سعودی عرب امریکہ کے سحر میں گرفتار ہے اس لئے اس پر بھی جادو نہیں چلا - اب شرق اردن، شام، لبنان اور عراق رہ جاتے ہیں - ان میں سے شرق اردن امیر عبداللہ کی قیادت میں پہلے ہی سے برطانیہ کا حلقہ بگوش ہے - اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ باقی تین ریاستیں شرق اردن کے ساتھ مل کر ایک سیاسی وفاق بنا لیں اور امیر عبداللہ کے واسطے سے برطانیہ کے سایہ عاطفت میں آجائیں چونکہ شام اور لبنان میں جمہوری حکومتیں تھیں اور ان کا نباہ شرق اردن اور عراق کی استبدادی حکومتوں کے ساتھ مشکل تھا - اس لئے شام کی جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا - اس کے بعد غالباً لبنان کی باری آئے گی -

چاروں عرب ریاستوں کے وفاق کی گفتگو شروع ہوگئی ہے - اب دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے -

آخری حربہ

گذشتہ جنوری میں ڈربن (جنوبی افریقہ) میں ہندوستانیوں اور افریقہ کے قدیم باشندوں میں جو فساد ہوا تھا، اس کی تحقیقات کے لئے وہاں کی حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا - کمیشن کی رپورٹ حال میں شائع ہوئی ہے -

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان فسادات کی محرک حکومت یا پولیس نہیں تھی - چند یورپین باشندوں نے اس آگ کو ہوا دینے میں حصہ لیا لیکن یہ آگ ان کی لگائی ہوئی نہیں تھی - اس کے بھڑکنے کے اسباب کمیشن کے نزدیک یہ ہیں کہ افریقیوں میں کچھ تو جائز شکایتوں کی وجہ سے اور کچھ بعض شورش پسند لیڈروں کے اشتعال دلانے سے ایک سیاسی بے چینی پیدا ہو گئی تھی - ہندوستانیوں نے اس بے چینی کو بڑھانے میں دو طرح سے مدد دی ایک تو انھوں نے افریقیوں کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی، دوسرے ستیاگرہ کی تحریک شروع کر کے افریقیوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا - انھیں ہندوستانیوں کی طرف سے پہلے سے شکایتیں تھیں جن میں سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ تاجر کی حیثیت سے ان سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں - اب جو ہندوستانیوں نے یورپین باشندوں کے مساوی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا تو افریقیوں کو بہت برا معلوم ہوا کہ یہ ہماری طرح کالے لوگ گوروں کی برابری کا دعوے کرتے ہیں - اس لئے جو ہیجان ان کے اندر اُٹھ رہا تھا اس کا رُخ ہندوستانیوں کی طرف پھر گیا - آخر میں کمیشن نے یہ بشارت دی ہے کہ ابھی افریقی ہندوستانیوں سے بدلا لینے کے لئے ایک مرتبہ اور فساد برپا کریں گے -

اگر آپ ان حالات کو جواب سے تیس سال پہلے ہندوستان میں پیدا ہو گئے تھے یاد کریں تو کمیشن کی رپورٹ کے اصلی معنی آپ کی سمجھ میں آجائیں گے جنوبی افریقہ میں عام سیاسی بیداری پیدا ہو رہی ہے - افریقی اور ہندوستانی متحدہ سیاسی محاذ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں سامراجی حکومت نے سمجھ لیا ہے کہ اب اس کی خیر نہیں اُسے اپنی بقا کے لئے آخری حربہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" استعمال کرنا ہے جسے وہ اسی بے دردی سے استعمال کر رہی ہے جیسے ہندوستان میں انگریزوں نے کیا تھا -

ہریجن کا سمت - (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

اپنے محکمے کے کام کی طرف توجہ کرنے کے بجائے زیادہ وقت دوروں، تقریروں اور پارٹیوں میں صرف کرے گا -

ہونا یہ چاہیے کہ جو لیڈر ایک بار منتخب ہو جائے وہ بغیر کسی اہم وجہ کے اسمبلی کی مدت عمر میں نہ بدلا جائے - تینوں صوبوں میں سے کسی میں بھی کوئی ایسی اہم وجہ نہیں پائی جاتی -

در اصل ان تینوں وزارتوں میں جو ابھی ٹوٹی ہیں کئی رکن با اصول، بلند سیرت، قابل اور تجربہ کار سمجھے جاتے ہیں، اور ان کا حکومت سے الگ ہو جانا عوام کے حق میں ہرگز مفید نہیں کہا جا سکتا، لیکن سیاست دان اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے ہیں جسے ناواقف لوگ نہیں سمجھ سکتے اور میں ان معاملات سے ناواقف ہوں میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ واقعات ملک کے لئے اور کانگریس کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہیں -

---

میرا ایشیا

روش صدیقی

حسین خوابوں کی روشنی میں شب خیالات سے گذر کر
جہاں جہاں تھا گمانِ فردوس اُن حجابات سے گذر کر
غمِ وطن، اور غمِ زمانہ کے تلخ لمحات سے گذر کر
غمِ بشر جاگ اُٹھا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

سحر سے پہلے ہی ساحرانِ فرنگ کی نیند اُچٹ گئی ہے
کہ اُن کی زنجیرِ کم نگاہی کی اک کڑی اور کٹ گئی ہے
کمندِ ظلمات خود ہمالہ کے پاؤں چھو کر پلٹ گئی ہے
یہ صبح کی ابتدا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

بکھر گئے رنگ و نسل کے خواب، سحرِ باطل کو نیند آئی
صدا یہ مشرق سے آ رہی ہے، تمام انساں ہیں بھائی بھائی
تبسمِ جاوداں محبت ہے، خندۂ مرگ ہے جُدائی
یہ زندگی کی صدا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

یہ ایشیا کی تڑپ نہیں ہے، حیات گر کر سنبھل رہی ہے
ضمیرِ انسان کی ہر صداقت نئے تصور میں ڈھل رہی ہے
قدامتِ زندگی کے سانچے میں زندگی خود بدل رہی ہے
حجاب سا اُٹھ رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

نشاطِ پرویز سرنگوں ہے، ملالِ فرہاد جاگ اُٹھا ہے
غیورِ محکوم جاگ اُٹھے ہیں، جہانِ آزاد جاگ اُٹھا ہے
وہ صبح کی خلوتِ زر افشاں میں اک شفق زاد جاگ اُٹھا ہے
یہ قاصدِ ارتقا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

اسیرِ خود رنگ و بو کے شعلوں میں دامنِ احتساب ہوگا
مسلسل ایک نغمۂ مسرت سکوتِ غم کا جواب ہوگا
جسے بشر نے چھپا دیا تھا وہ حُسن اب بے نقاب ہوگا
یہ مژدہ برملا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

شکستِ پندار سے نگاہِ خزاں میں شرمندگی ملے گی
بہار اب جاوداں بنے گی گلوں کو پایندگی ملے گی
بہشتِ آدم کی ہر کہانی کو اک نئی زندگی ملے گی
یہ خواب سچ ہو رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

جرمنی اور فرانس

عبدالحلیم ندوی

(۲)

۱۹۴۷ء کے آخر میں فرانسیسی مدبرین نے رائن لینڈ کو خود مختار بنانے کا خیال مجبوراً ترک کر دیا۔ اسی طرح مرکزی حکومت خصوصاً مغربی جرمنی میں بنانے کی مخالفت بھی کم کر دی۔ فرانس کی جرمنی کے بارے میں اپنی پالیسی تھی وہ یہ تھی جو اس کی وزارت خارجہ نے ایک یادداشت کی شکل میں واشنگٹن، لندن اور ماسکو جنوری سنہ ۱۹۴۷ء میں بھیجی تھی۔

اس یادداشت میں پہلے کے مقابلے میں معاشی پہلو پر بہت زور دیا گیا تھا اور روہر کے قضیے کی خاص طور سے بہت اہمیت جتائی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ روہر کے "بین اقوامی انتظام" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیادی صنعتوں اور کارخانوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہو اور ان کو براہ راست انھی کے زیر انتظام ۲۰ اتحادی افسران کی نگرانی میں چلایا جائے اور ان کی مدد کے لئے ایک مختصر فوج مستقل طور سے وہاں تعینات کی جائے۔

صرف کنٹرول ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ کارخانوں کو نئی جگہوں پر منتقل کر دیا جائے کیونکہ موجودہ صورت میں تو یہ رائن ویسٹ فیلیا سے اتنے قریب ہیں کہ جرمنی کو فولاد کی صنعت میں ہمسایہ ملکوں کے مقابلے میں بہت بڑی تیاری اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے یورپ کا معاشی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی کہتے تھے کیا ضرورت ہے کہ لورین سے کچا لوہا اب بھی حسب سابق روہر لایا جائے اور جرمن کوئلہ اور جرمن کارخانوں میں فولاد تیار کیا جائے؟ ایسا کیوں نہ ہو کہ جرمنی کوئلہ لورین لے جایا جائے اور فرانسیسی کارخانوں میں فولاد بنایا جائے؟ لیکن یہ تجویز ہر اعتبار سے ناقابل قبول تھی۔ اس سے لاگت بھی زیادہ آتی اور فائدہ بھی کچھ نہ ہوتا۔

دراصل اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی اپنے بہت سے اسلحہ کے کارخانوں اور فولاد کی ملوں سے محروم ہو جائے۔ اس کے پاس صرف ایسے ہی کارخانے رہ جائیں جن میں لوہا صاف کیا جاتا ہے۔ جتنے فولاد کی اُسے ضرورت ہو وہ اپنے ملوں کی پیداوار کے علاوہ، فرانس، بلجیم یا لکسمبرگ سے لینے پر مجبور ہو جائے۔

فرانس کا کہنا تھا کہ روہر کی معدنیات کو بین الاقوامی نظام کے ماتحت کر دینے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قومی آمدنی بھی بڑھ جائے گی اور تجارتی نفع بھی خوب ہوگا۔ اس میں عدم توازن تجارت کا اندیشہ ضرور ہے لیکن اس کی تدبیر یہ ہے کہ روہر کسی تیسری طاقت کے ہاتھ مال بیچ کر جو نفع کمائے اس کا کچھ حصہ جرمنی کو دیدے۔ اس کے علاوہ جرمنی سے اتنا مال درآمد کرے کہ توازن برابر ہو جائے پھر روہر کچھ مال بلا قیمت بھی جرمنی کو دے۔ اس سے ایک طرف جرمنی کا مالیہ بڑھ جائے گا اور دوسری طرف انھیں استعمار کی آمدنی سے وہ محاصل بھی ادا کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ روہر یہاں تک کرے گا کہ قرضوں کا کچھ سود بھی ادا کر دے گا۔

فرانسیسی یادداشت میں دعوے کیا گیا ہے کہ کوئلہ اور فولاد کے کارخانوں کی تنظیم نو اور روہر کو بین الاقوامی ملکیت قرار دینے سے نہ صرف فرانس کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس سے سارا یورپ محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرف فرانس جرمنی کے کوئلے کا محتاج ہو جاتا ہے تو دوسری طرف جرمنی فرانس کے فولاد کا.....

اور اس طرح دونوں میں توازن طاقت برابر رہتا ہے بالکل یہی بات پر شینیکس نے بھی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کہی تھی کہ "یہ تو اپنی مرضی پر ہے کہ چاہے ٹونٹی کھول لیجئے یا بند کر دیجئے۔ اس جدید طریقے پر عمل کرنے کے لئے محض اس ڈر سے بہت زیادہ جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کہیں اس سے فطری طریقہ تجارت و صنعت کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ طریقہ اگر ایک مرتبہ پرامن یورپ میں رائج ہو جائے تو یہ بھی فطری ہو جائے گا، اور معاشی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس سے فرانس بہت زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یوں کہئے کہ اس کا شباب رفتہ رفتہ دوبارہ لوٹ آئے گا" اس فرانسیسی مبصر کا کہنا ہے کہ اس وقت جرمنی میں یہ دم خم نہیں ہے کہ وہ مستقبل قریب میں بہت زیادہ طاقت حاصل کرلے اور نہ اس کا خطرہ ہے کہ کسی غیر یورپی طاقت سے وابستگی کرکے نقصان پہنچا سکے۔ لیکن چونکہ روس جرمنی کو اپنے ساتھ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے اور اس مقصد کی خاطر اتحاد جرمنی کے علاوہ اس کے مشرقی علاقوں کو بھی واپس کرنے پر تیار ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی مناقشہ پیدا ہوا تو سارا جدید جرمنی مغربی اقوام کے خلاف ہو جائے گا مناقشہ کا تو سوال الگ رہا روس کا تو رجحان ابھی یہ ہے کہ وہ ایلب اور رائن کے درمیان کے علاقے پر قبضہ کرے۔ اگر کہیں یہ ہوگیا تو برطانوی اور امریکی حصے میں جو کچھ کیا گیا ہے خاک میں مل جائے گا۔ چنانچہ روس اور جرمنی کے سابقہ تعلقات پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ روسی دفتر خارجہ کی وساطت سے دونوں ملکوں کے درمیان ایک نئے قسم کے اتحاد کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔

اس صورت حال میں فرانسیسی مدبرین یہ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی یہ بہتر نہ ہوگا کہ مغربی جرمنی کے فولاد کے کارخانوں کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے؟ اور اچھی صورت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کارخانوں کو رائن کے پیچھے قائم کیا جائے تاکہ زیادہ اطمینان اور محفوظ طریقے سے وہ اپنا کام کر سکیں۔ اس میں بلاشبہ دشواریاں بہت ہیں اور کام بھی دیر طلب ہے لیکن غیر معتبر جرمنی میں سرمایہ جھونک دینے کے مقابلے میں تو یہی بہتر طریقۂ کار ہے۔ بہر حال حالات کچھ ہوں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ جرمن اس کا ساتھ دیں گے جو نہ صرف ان کی وحدت قومی کو برقرار رکھے، ان کے مشرقی علاقوں کو واپس کر دے۔ بلکہ اس کے ساتھ الساس لورین پر بھی ان کا قبضہ تسلیم کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مغرب کے ساتھ ان کی دوستی تو بالکل ناممکن ہے کیونکہ مغربی اقوام زیادہ سے زیادہ اس سے جو وعدہ کرتی ہیں، اور وہ بھی بہت مبہم اور بند الفاظ میں وہ یہ کہ ہم تمھارے معیار زندگی کو بلند کر دیں گے اور بس۔

اواخر اکتوبر ۱۹۴۷ء تک تو برطانیہ اور امریکا دونوں فرانسیسی سکیموں کی مخالفت کرتے رہے لیکن کومن فارم کی بنا اور روس کے بڑھتے ہوئے اثرات نے انھیں اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو یورپ کی معاشیات کو مستحکم و مکمل کرلیں اور اسی کے ساتھ دفاعی انتظامات بھی پورے کریں۔ چنانچہ گذشتہ سال لندن میں جو کانفرنس ہوئی تھی ان میں یہ اہم مسئلہ بھی رکھا گیا تھا کہ مغربی جرمنی کو بھی یورپ کے "تنظیم نو" کے پروگرام میں شامل کر لیا جائے۔ مارچ میں جب لندن کانفرنس مغربی جرمنی کے مسئلے پر بحث کر رہی تھی تو اینگلو سیکسن طاقتیں اور فرانس دونوں بڑی خوشی سے سمجھوتے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ بائیزونیا میں شمولیت کے معاہدہ اور مارشل پلان کی دوسری کانفرنس میں جرمنوں کو حق نمائندگی دینے پر رضامندی کا اظہار کرکے فرانس نے دو مسئلوں کو ختم کر دیا ہے۔ ایک تو روہر کو بین الاقوامی ملکیت بنا دینے کا اور دوسرا آئندہ جرمن حکومت کی تشکیل کا۔

روہر کو بین الاقوامی ملکیت قرار دینے اور معدنیات اور کانوں میں غیر ملکی افسران کی نگرانی میں کام کرانے پر فرانس کو پہلے جو شدید اصرار تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ مگر حالیہ سمجھوتے کی رو سے روہر کا تعلق ابھی جرمنی سے باقی ہے اس لئے اب فرانسیسیوں (بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر)

دو گز زمین

ٹالسٹائی

بڑی بہن اپنی چھوٹی بہن سے ملنے گاؤں آئی۔ بڑی بہن کی شادی شہر میں ایک دکان دار سے ہوئی تھی، چھوٹی کی گاؤں میں ایک کسان سے۔ دونوں بہنیں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ بڑی شہری زندگی کی اچھائیاں بیان کرنے لگی۔ کیسے آرام سے رہتے ہیں کیسے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس کے بچوں کے پاس کتنے اچھے لباس ہیں، تھیٹر جاتے ہیں، سیر گشت رہتی ہے۔ طرح طرح کی تفریحیں ہیں۔

چھوٹی بہن کو برا لگا۔ اس نے دکان داروں کی زندگی کی برائی شروع کی اور کسانوں کی طرفداری کی "میں اپنی زندگی کو تمہاری زندگی سے نہ بدلوں گی۔" وہ بولی "ہم بھلے جھونپڑے رہتے ہیں۔ پر فکر سے تو آزاد ہیں۔ تم لوگ ستا ڈھنگ سے رہتے ہو اور اکثر ضرورت سے زیادہ کما لیتے ہو لیکن پھر بھی تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سب کچھ کھو بیٹھتے ہو۔ کہاوت سنی ہوگی۔ 'نفع نقصان جڑواں بھائی ہیں۔' اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آج جو مالدار ہے کل بھیک کے ٹکڑوں کو لگ جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں یہ اندیشے نہیں۔ کسان کی زندگی بہت موٹی نہیں ہوتی، مگر لمبی ہوتی ہے۔ ہم مالدار تو کبھی نہ ہوں گے۔ مگر ہمارے پاس کھانے کو ہمیشہ کافی ہوگا۔"

بڑی بہن طنزاً بولی "بس؟ ٹھیک، اگر سوروں اور بچھڑوں کی زندگی چاہتی ہو تو تم نفاست کے طور طریقوں کو کیا جانو۔ تمہارے میاں کیسی ہی محنت کریں، تمہاری موت بھی ایسی ہی ہوگی جیسی زندگی ہے۔ بس گوبر کے ڈھیر پر اور تمہارے بچوں کی بھی۔"

"اس کا کیا؟" چھوٹی بہن نے جواب دیا "ہاں ہاں ہمارا کام موٹا ہے، بھدا ہے۔ مگر یقینی تو ہے ہمیں کسی کے آگے جھکنا تو نہیں پڑتا۔ اور تمہارے ارد گرد شہر میں طرح طرح کی رغبتیں ہیں۔ آج ممکن ہے سب ٹھیک ہو۔ مگر کل ممکن ہے شیطان تمہارے میاں کو جوئے شراب عورتوں میں پھانس دے اور بس سب کچھ تباہ ہو جائے۔ کیوں کیا اکثر ایسا ہوتا نہیں؟"

گھر کا مالک پھوم آگ تاپتا ہوا، عورتوں کی باتیں سن رہا تھا "بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے سوچا "دھرتی ماتا کو جوتتے ہیں اس لئے رہتے ہیں کہ ہم کسانوں کو وقت ہی نہیں ملتا کہ سر میں کوئی حماقت جگہ کر لے۔ لیکن ساری دقت یہ ہے کہ کافی زمین نہیں۔ اگر بہت سی زمین ہوتی تو میں تو کم بخت شیطان سے بھی نہ ڈرتا۔"

ایک دن پھوم کا زمیندار سے جھگڑا ہو گیا۔ "اگر یہ میری اپنی زمین ہوتی۔" پھوم نے سوچا "تو میں خود مختار ہوتا اور یہ سب بد مزگی نہ ہوتی۔" پھوم آ زمین خریدنے کی فکر کرنے لگا۔ ایک کسان تھا جس نے تیرہ ہزار ایکڑ زمین خریدی تھی۔ لیکن اب کچھ پریشانی میں تھا۔ اس لئے اپنے پوسٹ بیچنا چاہتا تھا۔ پھوم نے بھاؤ تاؤ کیا اور قریب قریب معاملہ طے ہو گیا۔ لیکن اسی درمیان میں ایک اجنبی آدمی اس کے یہاں گھوڑے کے لئے چارہ خریدنے آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ پانچ چھ دن کی مسافت پر بشکیروں کا علاقہ ہے وہاں بڑی اچھی اور بہت سستی زمین ہے۔ پھوم نے کچھ اور پوچھا تاچھا تو اس نے بتایا "بس ضرورت اس کی ہے کہ سرداروں سے دوستی پیدا کر لو۔ میں نے کوئی سو سوا سو کے جوڑے اور قالین دئے اور ایک پیٹی چائے کا اور جو شراب پیتے تھے انھیں شراب پلائی اور دو آنے ایکڑ سے بھی کم میں زمین لے لی۔" اس نے پھوم کو دستاویز دکھائی اور کہا "زمین دریا کے کنارے ہے اور ساری کی ساری سٹی ہے۔" پھوم کے مزید سوالات کے جواب میں بتایا کہ وہاں اتنی زمین ہے کہ سال بھر چلو تو نہ طے کر سکو اور سب کی سب بشکیروں کی ہے۔ یہ سب بھیڑوں کی طرح بھولے ہیں اور زمین قریب قریب مفت ہی مل جاتی ہے۔

پھوم جس زمین کا معاملہ کر رہا تھا وہ کافی سستی تھی۔ لیکن آدمی نے جس زمین کے متعلق بتایا تھا اس کے مقابلے میں بہت گراں تھی۔ اس لئے اس نے جس قدر رقم ادا کی تھی لے کے اجنبی کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کھڑا ہوا۔ کہیں ساتویں دن اس جگہ پہنچا۔ جہاں بشکیروں نے خیمے لگا رکھے تھے۔ اجنبی نے جو کچھ کہا تھا۔ سب ہو بہو سچ نکلا۔ یہ لوگ دریا کے کنارے میدان میں رہتے تھے۔ نہ زمین جوتتے، نہ روٹی کھاتے۔ ان کے مویشی اور گھوڑے میدانوں میں چرتے، لوگ گوشت کھاتے۔ چھاچھ اور چائے پیتے اور بانسری بجاتے۔ اس کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی۔ پھوم کو دیکھا تو سب خیموں سے باہر نکل آئے اور اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ پھوم نے شہر کی بہت سی اچھی اچھی چیزیں ان کو دیں۔ بشکیر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ بالآخر انھوں نے پھوم سے پوچھا کہ وہ کس لئے آیا ہے "میں زمین کے لئے آیا ہوں۔" پھوم نے بتایا "ہمارے یہاں زمین پر آبادی بہت زیادہ ہے اور زمین کا زور ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تمہارے پاس بہت زمین ہے اور اچھی بھی ہے۔" بشکیر آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک شخص بڑی سی لومڑی کی کھال کی ٹوپی پہنے خیمہ میں داخل ہوا۔ سب لوگ تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ پھوم کو معلوم ہوا کہ یہی سردار ہے تو اس نے اپنے بہترین تحفے اس کی خدمت میں پیش کئے۔ سردار بھی بہت خوش ہوا اور جب آئے بشکیروں سے معلوم ہوا کہ پھوم زمین خریدنا چاہتا ہے تو اس نے پھر پھوم سے کہا "بہت اچھا! تم جو زمین چاہو لے لو، ہمارے پاس بہت ہے۔"

"اگر میں بات پکی کر لینی چاہتا ہوں، تاکہ بعد میں اگر تم سے نہیں، تو تمہاری اولاد سے کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے ہم شہر چل کر باقاعدہ کاغذ لکھ دیں گے۔"

"اور قیمت کیا ہوگی؟"

"ہمارے دام ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ دن بھر کے ایک ہزار روبل۔"

"دن بھر؟! یہ کون سا ناپ ہے؟ کتنے ایکڑ ہوں گے؟"

"ہمیں اس کا حساب لگانا نہیں آتا۔ ہم تو دن کے حساب سے بیچتے ہیں۔ دن بھر میں جتنی زمین کے گرد چلو، وہ تمہاری اور دام ایک ہزار روبل۔"

پھوم کو بڑی حیرت ہوئی، اس نے کہا "مگر دن بھر میں تو آدمی بہت بڑے ٹکڑے کے چاروں طرف جا سکتا ہے۔"

سردار ہنسا "وہ سب تمہاری ہوگی۔" اس نے کہا "لیکن ایک شرط ہے، اگر تم اسی دن اسی جگہ لوٹ نہ سکے، جہاں سے چلے تھے تو روپیہ ضبط۔"

پھوم نے خوشی کے ساتھ یہ شرط منظور کر لی اور طے پایا کہ کل صبح ہی کارروائی عمل میں آئے گی۔

پھوم کو پروں کا بہت آرام دہ بستر سونے کو ملا۔ مگر رات بھر نیند نہیں آئی۔ ساری رات وہی زمین کا دھیان رہا۔ "کتنا بڑا قطعہ گھیروں گا؟" اس نے سوچا "میں تو ایک دن میں آسانی سے ۴۰ میل چل لیتا ہوں۔ دن تو آج کل بڑا ہوتا ہے۔ میل کے چکر میں کتنی کچھ زمین نہ آ جائے گی۔ خراب بیچ ڈالوں گا۔ یا کسانوں کو اٹھا دوں گا لیکن اچھی اچھی خود رکھوں گا۔ دو جوڑی بیل خریدوں گا دو مزدور اور رکھوں گا، کوئی ڈیڑھ سو ایکڑ جوتوں گا اور باقی پر مویشیوں کی چراگاہ بناؤں گا۔"

رات بھر اسی طرح کے منصوبے بناتا رہا۔ بس دم بھر کے لئے سویا تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھا اور بشکیروں کو بھی سوتے سے جگایا۔ تمام بشکیر جمع ہوئے سردار بھی آیا اور سب چھاچھ پینے لگے۔ پھوم کو چائے پیش کی، مگر وہ تو ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے کہا "چلنا ہے تو بس چلو، وقت ہو گیا ہے۔"

بشکیر تیار ہو گئے، اور سب چل کھڑے ہوئے، کچھ گھوڑوں پر، کچھ گاڑیوں میں، پھوم خود اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ میدان میں پہنچے تو صبح کی لالی دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ سب ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ سردار نے میدان کی طرف اشارہ کر کے پھوم سے کہا "دیکھو جہاں تک نظر جاتی ہے سب ہمارا ہے، اس کا جو نسا حصہ چاہو لے سکتے ہو۔"

پھوم کی آنکھیں خوشی سے تمتما اٹھیں۔ ساری کنواری زمین تھی، سب چورس جیسے ہاتھ کی ہتھیلی، سیاہ جیسی

کالی خشخاش اور جہاں گڈھے تھے ان میں طرح طرح کی چھاتی چھاتی گھاس۔ سردار نے اپنی کھال کی ٹوپی اتار کر زمین پر رکھ دی اور کہا۔ "یہ نشان ہے یہاں سے چلو اور یہیں لوٹ آؤ۔ جتنی زمین کی گرد چلو گے، سب تمہاری ہے۔" پہوم نے روپیہ نکال کر ٹوپی پر رکھا، پھر اپنا کوٹ اتارا اور بس بے آستینوں کی صدری پہنے رہا۔ اپنی پیٹی کھول کر پیٹ کے نیچے خوب کسی اور پانی کی ایک کپی پیٹی میں باندھی، ذرا بوٹ کسے اور پھاوڑا لے کر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ذرا دیر سوچا کہ کدھر جائے۔ ہر طرف کو جی للچاتا تھا۔ "کیا پروا ہے" اس نے آخر میں فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نکلتے ہوئے سورج کی طرف جاؤں گا۔"

سورج کی کرنیں مشکل ہی سے اوپر نکلی تھیں کہ پہوم اپنا پھاوڑا کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوا۔ نہ بہت آہستہ، نہ بہت تیز۔ کوئی ہزار گز جا کر رکا اور ایک گڈھا کر کے مٹی کا تودہ بنا دیا، پھر آگے بڑھا اور جب بدن ذرا کھل گیا تو اس نے قدم بڑھائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گڈھا اور کھودا۔ پہوم نے مڑ کر دیکھا تو ٹیلا سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دیتا تھا۔ لشکیرے بھی اور گاڑیوں کے چمکتے ہوئے پہیے بھی۔ اندازے سے پہوم سمجھا کہ کوئی تین میل چلا ہے اب ذرا گرمی بڑھتی جاتی تھی اس نے صدری اتار کر کندھے پر ڈال لی اور پھر چل پڑا۔ اب خوب گرمی ہو گئی تھی، اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ ناشتے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں کہا "پہلا پہر ہو چکا۔ لیکن دن میں چار پہر ہوتے ہیں اور ابھی تو بہت سویرا ہے، لوٹنا نہ چاہیے، لیکن ذرا جوتے اتار لوں۔" اس نے جوتے کھول کر پیٹی میں کھونس لئے اور آگے چلا۔ اب چلنے میں آسانی ہو گئی تھی "تین میل اور چلوں گا" اس نے دل میں سوچا "پھر بائیں کو مڑ جاؤں گا، یہ جگہ تو اچھی ہے، چھوڑتے ہوئے دل دکھتا ہے، جتنے آگے بڑھو اچھی ہی اچھی زمین آتی جاتی ہے۔" تھوڑی دیر تو سیدھا چلا اور مڑ کر دیکھا تو ٹیلا مشکل سے دکھائی دیتا تھا اور اس پر جو لوگ تھے وہ کالے چیونٹے سے لگتے تھے، اور سورج میں کوئی چیز چم چم دکھائی دیتی تھی۔ "اوہو" پہوم نے خیال کیا "بس اس طرف تو کافی دور نکل آیا، اب مڑنا چاہیے اور پسینے پسینے بھی ہو رہا ہوں، پیاس بھی سخت لگی ہے"، وہ رکا۔ ایک بڑا سا گڈھا کھودا۔ اپنی کپی کھولی، پھر پی کر ٹھیک الٹے ہاتھ کو ہو لیا۔ چلتا گیا، چلتا گیا گھاس اونچی تھی، اور دھوپ سخت تھی۔ پہوم تھکنے لگا، سورج کی طرف دیکھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا "اب ذرا آرام کر لینا چاہیے۔" بیٹھ کر اس نے تھوڑی روٹی کھائی، پانی پیا، لیکن لیٹا نہیں کہ کہیں سو نہ جائے۔ تھوڑی دیر سستا کر پھر چلا۔ پہلے تو آسانی کے ساتھ کیونکہ کھانا کھا کر ذرا بدن میں دم آ گیا تھا، لیکن گرمی بہت بڑھ گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی، لیکن وہ چلے ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ "تکلیف گھنٹہ بھر کی ہے، زندگی بھر گزارنی ہے۔" اس طرف بھی وہ خوب دور نکل گیا اور بائیں کو مڑنے ہی کو تھا کہ ایک نرکھڈ دکھائی دیا "اسے چھوڑنا تو بہت برا ہے۔" اس نے سوچا "اس میں سن خوب ہوگا۔" اس کو گھیرنے کے بعد بائیں کو مڑا، ٹیلے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت دور نکل آیا ہے اس لئے وہ تیسری طرف تیز تیز قدم اٹھا کر چلا۔ سورج کو دیکھا تو وہ کوئی آدھا اتر چکا تھا اور یہ ٹیلے سے کوئی دس میل نکل گیا تھا۔ "اگرچہ زمین کا ایک کونہ کٹ جائے گا" اس نے سوچا "لیکن مجھے اب سیدھا لوٹنا چاہیے کہیں بہت دور نہ نکل جاؤں اور یوں بہت سی زمین نکل ہی چکی ہے۔" چنانچہ اس نے جلدی جلدی ایک گڈھا کھودا اور سیدھے ٹیلے کا رخ کیا۔

پہوم سیدھا ٹیلے کی طرف چلا، مگر اب پاؤں مشکل سے اٹھتے تھے، گرمی نے اسے بھگت لیا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں کٹ کر زخمی ہو گئے تھے اور اب ساتھ نہیں دیتے تھے اور سورج برابر اترا چلا آ رہا تھا۔ "یا اللہ" اس نے خیال کیا "کہیں بہت سا لینے میں غلطی تو نہیں ہوئی؟ اگر دیر ہو گئی تو؟" اس نے ٹیلے کی طرف دیکھا اور سورج کی طرف۔ ابھی وہ ٹیلے سے بہت دور تھا اور سورج کنارے سے آن لگا تھا۔ پہوم نے قدم تیز کئے۔ چلنے میں بڑی مشکل تھی، لیکن قدم بڑھا بڑھا کر ہی رکھتا گیا، آخر میں دوڑنا شروع کیا، کوٹ پھینکا، جوتے پھینکے کپی، ٹوپی، غرض ہر چیز پھینک دی، صرف پھاوڑا رہنے دیا جس پر کبھی کبھار سہارا لے لیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا "اب کیا کروں!" اس نے پھر سوچا "میں نے بہت کی ہوس کی اور سارا کھو دیا۔ اب سورج ڈوبنے سے پہلے پہنچنا ممکن نہیں۔" اس خوف سے سانس اور بھی پھول گیا۔ وہ دوڑنے لگا۔ اس کا کرتا اور پاجامہ پسینے سے بھیگ کر بدن سے چمٹ گیا تھا اور حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ گئے تھے۔ موت کا ڈر تھا۔ مگر وہ رکا نہیں۔ "اتنی دور دوڑ کر اگر اب رکا تو سب مجھے بے وقوف بنائیں گے۔" اس نے سوچا وہ دوڑتے گیا۔ لشکیر اس کی طرف دیکھ کر چلا رہے تھے، ان کی آوازیں سنیں تو اس کی ہمت بندھ گئی۔ اپنی آخری قوت جمع کر کے دوڑتا رہا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا، ہاں بس اب ڈوبنا ہی چاہتا تھا لیکن یہ بھی اپنی منزل کے قریب ہی آن لگا تھا۔ پہوم کو ٹیلے پر وہ ہاتھ دکھائی دے رہے جو اس کی ہمت بڑھانے کے لئے لوگ ہلا رہے تھے۔ اسے زمین پر ٹوپی بھی نظر آتی تھی اور اس پر جو روپیہ رکھا تھا وہ بھی۔ "زمین تو بہت ہے" اس نے خیال کیا "لیکن میں زندہ بھی بچوں گا۔ میں نے تو اپنی قبر کھود دی قبر، اب میں اس جگہ نہ پہنچ سکوں گا۔" پہوم نے سورج کی طرف دیکھا جو زمین تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا ایک حصہ تو غائب ہو چکا تھا، جو کچھ سکت باقی تھی اس سے کام لے کر یہ پھر آگے کو جھپٹا مگر پاؤں ساتھ نہ دے سکے۔ اور وہ گر گیا، اوپر نگاہ اٹھائی تو سورج چھپ چکا تھا۔ وہ بڑبڑایا "میری ساری محنت اکارت گئی۔" اتنے میں لشکیروں کے چلانے کی آواز سنی اور اسے خیال آیا کہ اسے نیچے سورج دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اوپر ٹیلے والوں کو دکھائی دیتا ہوگا۔ خوب گہری سانس لے کر ٹیلے کے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ وہاں ابھی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اوپر چڑھ کر اس نے ٹوپی دیکھی۔ اس کے سامنے سردار بیٹھا کوکھ پکڑے ہنس رہا تھا۔ پہوم نے آخری کوشش کی، مگر پیروں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ آگے کو گرا اور ہاتھ سے ٹوپی کو چھو لیا۔

"خوب آدمی ہو" سردار بولا۔ "اس نے بہت سی زمین حاصل کی۔"

کشکول محمد علی شاہ فقیر

کارڈنل نیومین کے مضمون کا خلاصہ "شریف کا خاکہ" جو پہلے شائع ہو چکا ہے
ایک ... نذر ... آزاد

شریف کسی کو تکلیف نہیں دیتا ہے اس کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد والوں کے خیالات یا عمل میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دے۔ وہ بات اس طرح کرتا ہے گویا بجائے خود کچھ کیا کرنے کے دوسرے کی گفتگو میں شریک ہو رہا ہے۔ شریف کی کسوٹی یہی ہے کہ وہ ہزار احتیاط و کوشش کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش والوں کے خیالات کی رد کو روکے نہیں نہ ان میں جھگڑے پیدا ہونے دے۔ اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اچھے محسوس کریں اور تکلیف نہ پیدا ہونے پائے۔ وہ تمام مجمع پر اس طرح نظر رکھتا ہے کہ کسی کی بھی رعایت ہاتھ سے نہ چلنے پائے۔ اگر کوئی شرمیلا ہو تو اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ معاملات اس پر آسان ہو جائیں۔ اگر کوئی اپنے کو ٹاٹ باہر سمجھتا ہے تو اس کے دل میں یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے پوری طرح شریک کار سمجھے۔ بے تکلفی کے ساتھ درگذر سے کام لیتا ہے اور مخاطب کے دماغی کیفیات کو جانچ کر اس سے خطاب کرتا۔ ایسے کنائے کا پہلو بچایا جانا چاہئے جس کو دوسرا خلاف الطاف سمجھے یا جس سے کھرونچا لگے۔ وہ گفتگو کرنے میں اپنے کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کرتا نہ اتنا بولتا ہے کہ لوگوں پر گراں ہونے لگے۔

وہ اپنے جذبات ہلکے کر کے ظاہر کرتا ہے اور اس انداز سے احسان کرتا ہے جیسے وہ خود زیر بار ہو رہا ہے۔ وہ اپنا ذکر صرف مجبوراً کرتا ہے اور اگر اپنے اوپر سے اعتراض دور کرتا ہے تو دوسرے کی غلطیاں دکھا کر طنز کے ذریعے سے اپنی برأت نہیں ڈھونڈھتا۔ وہ غیبت اور تہمتوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ نہ یا وہ گوئی پر کان دھرتا ہے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کی نیک نیتی پر بے وجہ شک نہیں کرتا، اور دوسروں کے افعال کے معنی لگانے میں تنگ خیالی سے کام نہیں لیتا۔ وہ بحث کرنے میں چھچھورا پن نہیں آنے دیتا۔

وہ مباحثہ میں دوسرے کی فروگذاشت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔ شخصیات اور ذاتیات کو خلط ملط نہیں کرتا، نہ چوٹ کرنے کو دلیل تصور کرتا ہے اور نہ ایسا کنایہ کرتا ہے جس کو صاف صاف نہ کہہ سکے۔

وہ دشمن سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے ایک دن دوست ہونے والا ہے اس میں اس قدر صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بد تمیزیوں کو اپنی بلند نظری کے قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ وہ کینہ پروری نہیں کرتا، اور دوسرے نے اگر چوٹ کی ہے تو اس کو یاد نہیں رکھتا۔ وہ تحمل سے کام لیتا ہے۔ ضبط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور حکیمانہ نظر سے اپنی قوت برداشت کو زیادہ کر لیتا ہے۔ اور درد کو یہ کہہ کر برداشت کرتا ہے کہ پڑنے والی پڑے ہی گی وہ مفارقت پر یہ کہہ کر صبر کرتا ہے کہ نعم البدل ممکن نہیں ہے۔ وہ موت پر یوں راضی ہو جاتا ہے کہ موت حضرت آدم کی میراث ہے۔ اگر وہ کسی سے بحث میں پھنس جاتا ہے تو اس کا کمایا ہوا ذہن نیز فہم لیکن نیم تربیت یافتہ مقابل کی تند کلامی سے اپنے کو بچا لیتا ہے کیونکہ ایسا مقابل اکثر اناڑیوں کے ایسے ہاتھ مار بیٹھتے جو بجائے صاف کاٹنے کے آری کی طرح کھڑ دیتے ہیں اور موضوع بحث کو بھول کر ضمنیات میں جا پڑتا ہے جس سے مباحثے میں بجائے سلجھاؤ کے الجھاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔

شریف آدمی اپنے رائے میں صحیح ہو یا غلط لیکن ہٹ دھرمی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ وہ بڑے بڑے لفظوں کا اغلاق نہیں پیدا کرتا اور باوجود اختصار کے بات ایسی کہتا ہے جس کے معنی میں شک نہیں رہتا۔ اس کے کلام کا طرۂ امتیاز تین باتیں ہوتی ہیں۔ (۱) صفائی قلب (۲) رعایت اور (۳) درگذر۔ وہ اپنے مقابل کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر اس درآتا ہے اور اس کی غلطیوں کا سبب دریافت کر لیتا ہے۔

وہ عقل انسانی کے تنگ حدود سے بھی با خبر ہوتا ہے اور اس کی قوت کو بھی جانتا ہے۔ اس کے منصب سے واقف ہے اور اس کی خامیاں بھی اس کے پیش نظر ہیں۔

اگر وہ دہریہ ہے تو اپنے علم کی گہرائی اور وسعت کی وجہ سے وہ مذہب پر آوازے کسے گا نہ اس کی توڑ پھوڑ میں لگا رہے گا۔ اس کی عقل سلیم باوجود اس کی دہریت کے اس کو ملا اور متعصب ہونے کے عیب سے بچا لے گی۔

وہ باوجود اپنے خیالات کے تقدس اور زہد کو احترام کی نظر سے دیکھے گا اور مذہب کے شعبوں کی حفاظت تک کرے گا، کیونکہ کسی میں قدامت کسی میں خوب صورتی کسی میں فائدہ ان کے باقی رکھنے کے لئے کافی سمجھے گا۔

ایسا شخص دوسرے مذہب کے بزرگوں کی بھی توقیر کرے گا۔ گو ان کے خیالات سے اتفاق نہ کرے اس کے لئے یہ ضروری نہ ہو گا کہ اصول مذہب پر موقع بے موقع اعتراض جڑا کرے یا ان سے ہر وقت مخالفت ہی کیا کرے۔ وہ مذہبی رواداری کا ضامن ہو گا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کا فلسفہ ہر خیال کو منصفانہ نظر سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ خود اس کی طبیعت میں ایک نرمی اور لوچ ہے۔

اگر اس کا مذہب کوئی مروجہ مذہب نہیں ہے تو اس کے عقائد میں لازمی وہ بلندی۔ شان اور خوب صورتی ہو گی جس کے بغیر کوئی فلسفہ یا حکمت دنیا میں نہیں پائی جائے۔

جرمنی اور فرانس

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۹)

کا پورا زور اس پر ہے کہ مصنوعات کی تقسیم کا پورا اختیار انھیں ملنا چاہیئے۔ کارخانوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے اور جرمنوں کو بھی نمائندگی کا حق ملنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ فرانس نے مرکزی حکومت کا جو تخیل پیش کیا تھا اب واشنگٹن اور لندن دونوں جگہوں سے اس کی پوری تائید ہونے لگی۔ چنانچہ ۸ مارچ کو لندن میں جو اعلانیہ شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ "جرمنی کو دوبارہ متحد کرنے کے لئے ایک ایسی مرکزی حکومت بنائی جائے گی جو جداگانہ ریاستوں کے پورے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے پورے مرکزی اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، ۲ جون کو جو اعلانیہ نکلا ہے اس میں وزیر اعظم کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دستور ساز اسمبلی بلائے ایسی مرکزی حکومت کا خاکہ تیار کرنے کے لئے جو پوری طرح جداگانہ ریاستوں کے حقوق کی محافظ ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ جملہ مرکزی اختیارات کی مالک ہو اور افراد کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کی ضمانت کرے"۔ اب اگر معاملات طے شدہ پالیسی اور مجوزہ نقشے کے مطابق انجام پاتے رہے تو خیال ہے کہ ۱۹۴۹ء کے موسم بہار تک مغربی جرمنی میں یہ مجوزہ حکومت بن جائے گی۔

لندن کے ان معاہدوں کے ذریعے فرانس کے اصلی مطالبات اور برطانیہ و امریکا کے نقطۂ نظر میں محض ایک قسم کا سمجھوتہ ہو گیا ہے جسے مستقل نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ ان مخصوص طریقے پر دو بہت ہی اہم مسئلے حل ہو گئے جن پر نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کی بقا و حیات کا دار و مدار ہے۔ ایک تو یہ کہ لندن کے مارچ والے اور جون کے معاہدوں نے (جن کا مقصد جان بوجھ کر جرمنی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے) روہر کے وسائل کو مغربی یورپ کے نظام معیشت میں ضم کر دیا۔ اس کے علاوہ جرمنی کے ہمسایہ ملکوں کا مفاد بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور تنظیم جدید کرنے والی قوموں کی راہ میں کوئی دقت بھی نہیں پیدا ہوتی۔

بہر حال فرانسیسی اسمبلی نے معاہدۂ مارچ معاہدہ جون میں سے کسی کی بھی مخالفت نہیں کی، چنانچہ مغربی جرمنی میں ۶ طاقتوں کے معاہدہ کو منظور کرنے کی تجویز جب نیشنل اسمبلی میں ۱۷ جون کو رائے شماری ہوئی تو ۲۸۹ کے مقابلے میں صرف ۲۸۷ ووٹ آئے اور شومان کی حکومت بدلنے کے بعد جورج بیدو وزارت خارجہ سے الگ کر دئے گئے۔ (تلخیص)

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۷ | یکم مئی ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

شاعر کا رجز

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی!
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند!
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند!
پرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند!
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند!

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
شاعر کا رجز	علامہ اقبال	۱
ہر سخن کاست		۲
اقبال کا مقام	(اداریہ)	۲
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ:-		
۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ع، ل	۵
۳- باہر کی دنیا	م، م	۶
مرض اور علاج (نظم)	علامہ اقبال	۷
آفتاب شاعری	سیکش حیدرآبادی	۷
نہ ہو گا اب	یحییٰ اعظمی	۸
غزل	بیگم زاہدہ رزم نہاں	۸
غزل	بیگم صدیق حسن وفا	۸
اقبال کا ابلیس	خواجہ غلام السیدین	۹
اقبال اور شہریت	سید اختر علی تلہری	۱۱
تہذیب اور سائنس کے علمبرداروں کی کانفرنس	صابرہ زیدی	۱۳
بچے کی پرورش	سید محمد حسنین	۱۵

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہریجن کا سَت

لڑائی کا نیا محصول

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمارے دیس کی بنی ہوئی سائیکلیں انگلینڈ کی سائیکلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ انگلینڈ کی سائیکلیں امن کے زمانے میں اسلحہ بنانے والے کارخانوں کی ضمنی پیداوار ہیں۔ گویا انگلینڈ کی بنی ہوئی سائیکلوں کے استعمال کے یہ معنی ہیں کہ ہم لڑائی کی تیاریوں میں اس ملک کی معاشی مدد کررہے ہیں۔

اسی طرح ہمارے بجٹ میں فوجی تیاریوں کے لئے معاشی مدد موجود ہے، جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ یہ بتایا گیا ہے کہ سوا ایک کے باقی تمام ہوائی جہاز کی کمپنیاں نقصان سے چل رہی ہیں۔ آج کے مسافر لے جانے والے ہوائی جہاز کل کے بم برسانے والے ہوائی جہاز کا کام دیں گے۔ اس لئے لڑائی کی تیاریاں جاری رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ مسافر ہوائی جہاز خواہ اپنا خرچ نکال سکیں یا نہ نکال سکیں، ہمیں اپنے ہوائی جہازوں، ہوابازوں اور دوسرے عملے کو قائم رکھنا ہے۔ اس کے لئے بغیر فوجی بجٹ میں اضافہ کئے ہوئے کوئی سبیل نکالنی تھی۔ اس سے زیادہ آسان بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ سب خطوں کو ہوائی ڈاک سے بھیجنے کا بہانہ کرکے ڈاک کا محصول بڑھا دیا جائے اور اس طرح ہوائی کمپنیوں کو مدد پہنچائی جائے ڈاک کے یہ بڑھے ہوئے محصول دراصل لڑائی کے محصول ہیں لڑائی کی تیاریوں کے لئے ہمیں یہ جنگی محصول دینا ہی ہے۔

پوسٹ کارڈ اور لفافے میں بچت

لیکن لڑائی کی تیاریاں جاری رکھتے ہوئے بھی آدھ آنے کے پوسٹ کارڈ اور ڈیڑھ آنے کے لفافوں کی سہولت کو چھینے بغیر، پوسٹ کارڈ اور لفافوں کے سلسلے میں کفایت کے دوسرے طریقے ہوسکتے تھے۔ پوسٹ کارڈ کا سائز کچھ چھوٹا کیا جاسکتا تھا جیسا کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں ایک پیسہ کے پوسٹ کارڈوں کا تھا۔ یا کارڈ کی پشت پر لکھنے کی ممانعت کی جاسکتی تھی۔ لفافے کی قیمت بڑھانے کے ساتھ ہی اگر حکومت یہ کرتی کہ ایر میل لیٹر کی طرح کے پانچ پیسے کے "پاؤ کاغذی خط" بھی جاری کردیے تو بھی غریب طبقے کے لوگوں کی خاصی مدد ہوسکتی تھی۔ اس طرح لفافے کی قیمت کے اضافے کا غریبوں پر بوجھ نہ پڑتا۔ اصل میں اگر وزنی خطوں پر یہ محصول تولے یا سوا تولے پر پانچ پیسے کے حساب سے بڑھا دیا جاتا تو بھی کچھ محسوس نہ ہوتا۔

دراصل کروڑوں غریبوں کو نہ ہوائی جہاز سے ڈاک بھیجنے کی ضرورت ہے اور نہ وہ بھیجی جائے گی دوسری طرف اگر ان کے خانگی اخراجات میں تھوڑی سی بھی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن کی انھیں سخت ضرورت ہے تو وہ اس کی قدر کریں گے، سچ پوچھئے تو ہوائی ڈاک معمولی ڈاک سے دیر ہی میں پہنچتی ہے خصوصاً ان مقاموں پر جہاں ڈاک کچھ دور تک ہوائی جہاز سے جاتی ہے اور کچھ دور ریل سے۔ ایسے مقام سیکڑوں ہیں اور ان کے مقابلے میں ہوائی اڈے مشکل سے دو درجن۔

پوسٹ کارڈوں پر کیا لاگت آتی ہے؟

لیکن حکومت پر ایک دوسرا اہم الزام عائد ہوتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت کی طرف سے یہ بیان دیا گیا ہے پوسٹ کارڈ کی قیمت اس لئے بڑھائی گئی ہے کہ اس کی تیاری اور طباعت میں فی کارڈ ۲٫۸۰ پائی سرکار کا خرچ آ لگتا اور آدھ آنے کے پوسٹ کارڈوں کی تیاری اور طباعت پر حکومت کو ہر سال چند لاکھ کا نقصان ہوتا تھا۔ ایک حساب لگانے والے معترض نے حکومت کے اس بیان پر سخت تنقید کی ہے۔ اگر کاغذ اور طباعت کا خرچ ۲٫۸ پائی فی پوسٹ کارڈ آتا ہے تو میرا خیال ہے کہ گورنمنٹ پریس کے کارکنوں کو فضول خرچی کے الزام میں برطرف کردینا چاہیے۔" انھوں نے بمبئی کے تین چار چھاپہ خانوں میں تحقیق کرکے پتہ لگایا ہے کہ ایک کارڈ پر کل لاگت زیادہ سے زیادہ ۲ پائی ہوسکتی ہے۔ اور اگر کارڈوں کی تیاری بڑے پیمانے پر ہو تو فی کارڈ ایک پائی سے زیادہ خرچ نہیں آنا چاہیے۔

خود میں بھی تحقیق کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں شاید اصل میں لاگت ۰٫۸۲ ہونی چاہیے تھی نہ کہ ۲٫۸ پائی — بس اعشاریہ کا نشان ذرا غلط لگ گیا!

کیا حکومت اور ایم ایل اے حضرات عوام کو یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اول الذکر نے کیسے ۲٫۸ پائی فی کارڈ کا حساب لگایا اور آخر الذکر نے کیسے اس پر صاد کردیا؟ اگر ایسا غلطی سے ہوا ہے تو اس کی معافی مانگیں اور تلافی کریں۔

غیر قانونی دعوت

ایک نامہ نگار لکھتے ہیں کہ گاڈھی (گجرات) کے ستر نوجوانوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کسی ایسی دعوت میں شریک نہ ہوں گے جس میں ۵ سے زیادہ مہمان مدعو ہوں۔ اس وقت سے اب تک چار پانچ دعوتیں ہوچکی ہیں جن میں چار کو چھوڑ کر کسی نے حصہ نہیں لیا، باوجودیکہ ان میں سے بعض دعوتیں خود ان کے عزیزوں کی طرف سے ہوئیں۔ اگر دوسری جگہ کے لوگ بھی اس مثال کی پیروی کریں تو اس کا کتنا اچھا اثر پڑسکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ نوجوان اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں مذہب و اخلاق کے راستے پر چلتے تھے اور انھیں اپنے بزرگوں کے نقش قدم اور ہدایت پر چلنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب تو خود نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کو یہ سکھانا پڑتا ہے کہ راست بازی کی راہ اختیار کریں۔ یہ بات اگر ایک طرف ہماری گری ہوئی اور سقیم حالت کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف اس میں امید کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ تنزل جو ہماری معاشرت پر چھا رہا تھا۔ اب فلاح و برکت کے لئے راستہ صاف کررہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ قدم ایک اخلاقی بیداری کا ثبوت ہے یا محض جوانی کی ترنگ۔ اگر یہ اخلاقی بیداری کا ثبوت ہے تو زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی اپنے نفس پر قابو کی یہ مثال ہمیں نظر آنی چاہئے۔ لیکن یہ دیکھا جاتا ہے کہ دوسرے معاملوں کی خواہش کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سماج میں انصاف اور مساوات پیدا کرنے کے لئے خاصے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگر ذاتی اخلاق کے سدھار میں بھی اس سرگرمی سے کام لیا جائے تو ہم کیا کچھ ترقی نہیں کرسکتے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس اخلاقی بیماری کی ظاہری علامت صفائی اور سوت کاتنا ہے اور باطنی خدا کی ذات پر بھروسہ۔

نئی روشنی

ہریجن سیوک کے اردو ایڈیشن کے بند ہوجانے سے اس اخبار کے پڑھنے والوں کو بڑی مایوسی ہوئی ہے اور ہم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ کسی ایسے مناسب اخبار کا پتہ بتائیں جو اس کا بدل ہوسکے۔ جو لوگ قومی نقطۂ نظر سے اردو میں صحت مند مضامین پڑھنا چاہتے ہیں وہ "نئی روشنی" کا مطالعہ کریں۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ ان کی ضرورتیں پوری کرے گا

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم مئی ۱۹۶۵ء

اقبال کا مقام

ایک مدت سے ہمارے دل و دماغ پر سیاست اس طرح چھا گئی ہے کہ ہم کسی شخص یا کسی چیز کو سیاسی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے دیکھ ہی نہیں سکتے گاندھی جیسے عارف، سالک، مصلح، اور معلم کو جس کے آئینۂ کمال میں سیاسی عمل محض زنگار کی حیثیت رکھتا ہے اور اقبال جیسے حکیم اور شاعر کو جس کے دریائے بے تابی میں سیاسی فکر ایک موج خون سے زیادہ نہیں، ہم سیاست کے محدود پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں۔ مہاتما جی نے تو پھر بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ سیاسی جدوجہد میں گذارا، مگر علامہ بے چارے کو تو لوگ کبھی کبھار زبردستی کھینچ کر اس میدان میں لے آتے تھے اور وہ موقع پاتے ہی اپنا پیچھا چھڑا کر گوشۂ خلوت میں جا چھپتے تھے۔ کچھ انہی پر موقوف نہیں جتنے بڑے شاعروں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا سب اسی طرح سیاست سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہندوستان اور جرمنی کے مایۂ ناز شاعر ٹیگور اور گوئٹے اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے، شاعر کی شخصیت اور مرتبے کے اندازے میں اس کے سیاسی خیالات کو جو دراصل محض سیمابی جذبات ہوتے ہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیئے بلکہ صرف ان بنیادی افکار کو جو اس کی شاعری میں روح رواں بن کر سما گئے ہوں۔

اقبال کی عظمت کی بنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے معاشی اور ذہنی بحران کے اسباب پر غور کیا اور اس کا ایک معقول علاج جو ان کے دعوے کے مطابق اسلام کی تعلیم سے ہم آہنگ ہے پیش کیا انھوں نے دیکھا کہ مغرب میں لبرل جمہوریت کی بدولت انفرادیت پسندی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یوں تو زندگی کے ہر میدان میں، لیکن خاص طور پر معاشی میدان میں مقابلے کی سخت کشمکش ہے۔ ہر فرد دوسرے افراد کو بے دردی سے روندتا ہوا آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر اجتماعیت کی تحریک لوگوں کو دوسری انتہا پر لے گئی ہے اور چاہتی ہے کہ نہ صرف معیشت میں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں انفرادیت کو بالکل کچل دیا جائے۔ یہ دونوں لہریں طوفانی شدت سے ایک دوسرے سے ٹکرانے والی ہیں اور اندیشہ ہے کہ کہیں یہ ٹکر انسانیت کی کشتی کو نہ ڈبو دے۔ اقبال کو انسانیت کی سلامتی اس میں نظر آئی کہ انفرادیت اور اجتماعیت، خودی اور بے خودی میں صحیح توازن پیدا کیا جائے۔

اقبال کے نزدیک مشرقی روح میں یہ توازن پچھلے زمانوں میں خصوصاً اسلام کے ابتدائی عہد میں موجود تھا مگر اب نہیں رہا۔ دل و جان سے کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ توازن دوبارہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ اسی پر انسانیت کی نجات موقوف ہے۔ اس وقت مشرق میں انفرادیت یا خودی برے معنوں میں تو بہت ہے مگر اچھے معنوں میں بالکل نہیں، خود غرضی ہے، خود شناسی نہیں۔ فرد اپنی ذاتی غرض کو مقدم سمجھ کر اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے، مگر اپنے جوہر ذاتی کو اہم سمجھ کر اس کی تکمیل کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے اقبال نے شعر کے پردے میں یہ تبلیغ کی کہ ہر فرد کو قدرت نے جو مخصوص صلاحیتیں دی ہیں ان کو نشوونما دے کر اُسے ایک مکمل اور مضبوط شخصیت تعمیر کرنی چاہیئے اور اس سے تسخیر فطرت میں کام لینا چاہیئے۔ لیکن جہاں تک افراد کے باہمی تعلق یعنی فرد اور جماعت کے رشتے کا سوال ہے ہر ایک کو ایک ایسے اجتماعی قانون کے آگے سر جھکا دینا چاہیئے جو حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی ہو۔

یہ تھا اقبال کا پیام۔ ان کا خطاب بظاہر عالم اسلام سے لیکن درحقیقت سارے مشرق سے تھا اسی طرح جیسے گاندھی جی کا خطاب دیکھنے میں صرف ہندوستان سے لیکن اصل میں ساری دنیا سے تھا۔ عملی ضرورتوں نے اور ذہنی اور روحانی رہنماؤں کی طرح اقبال کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنی فوری اور براہ راست تعلیم کا دائرہ محدود رکھیں۔ انھوں نے اپنا پیام سب سے پہلے مسلمانوں کو پہنچایا اس لئے کہ ان کا خیال تھا مسلمان ان کے شعر کی زبان اور ان کے دل کی زبان زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں نے تو عام طور پر اقبال کی شاعری کی طرف توجہ ہی نہیں کی، صرف برعظیم ہند کے مسلمان متوجہ ہوئے لیکن حیات بخش مغز کی طرف نہیں بلکہ محض خوش نما چھلکے کی طرف۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ فلسفی شاعر کے کلام کی تہہ تک لوگ اس وقت پہنچتے ہیں جب کہ وقتی اور عارضی جذبات سے الگ ہو کر دیکھیں، اور اس میں دن لگتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور محسوس ہونے لگا ہے کہ اقبال نے اپنے زمانے کے سب سے بڑے مسئلے پر حکیمانہ نظر سے غور کیا ہے اور اگر اسے حل نہیں کیا تو کم سے کم اس کے حل کرنے والوں کے لئے فکر و احساس کی ایک نئی راہ کھولی ہے۔ یہ شرف دنیا کے صرف چند اَن گنے شاعروں کے حصے میں آیا ہے جن میں اقبال کا مقام خاصا بلند ہے۔

بزم بے تکلّف

علامہ اقبال کی گفتگو دلکشی میں ان کی شاعری سے کم نہ تھی، حکمت کے صوفیانہ رنگ پر ظرافت کا شوخ رنگ عجب بہار دیتا تھا۔

ایک بار علی گڑھ سے لاہور جاتے ہوئے دہلی کے اسٹیشن پر چند گھنٹے قیام فرمایا۔ ان دنوں علامہ شاید اپنے علم و فضل کو نظر بد سے بچانے کے لئے اپنے ساتھ ہمیشہ تعویذ کے طور پر ایک فہامہ کو رکھتے تھے جن کے فہم اور فراست کو نظر لگنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اول درجے کے ویٹنگ روم میں علامہ ایک آرام کرسی پر رونق افروز تھے۔ آس پاس نیاز مندوں کا حلقہ تھا جو موصوف کی زیارت کے لئے شہر سے آگئے تھے۔ سلسلۂ گفتگو میں فرمایا "جب دہلی سے گذرتا ہوں تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم بہت یاد آتے ہیں۔ ایک زمانے میں انھوں نے میرے لئے حب کبد کا استعمال تجویز کیا تھا۔ اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ مگر مرحوم کی یادگار کے طور پر کھایا کرتا ہوں۔" اس کے بعد فہامہ کو حکم دیا کہ اسٹیشن کے امانت خانے میں جا کر سوٹ کیس میں سے حب کبد کی ڈبیہ لے آئیں۔ فہامہ نے ایک لمبی چوڑی تقریر میں منطقی دلیلوں سے ثابت کرنا چاہا کہ یہ ہفتخوان اتنے تھوڑے وقت میں سر نہیں ہو سکتا۔ مگر علامہ کے تیور دیکھ کر چلتے ہی بن پڑی۔ آدمی بڑے مستعد ہیں، پانچ منٹ کے اندر ڈبیہ لئے ہوئے آگئے۔ علامہ نے فرمایا "آپ میں یہی تو بڑی خوبی ہے کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔" فہامہ فقرے کو کیا سمجھتے مگر بگڑ کر کہنے لگے "آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے جھوٹ موٹ بہانہ کر دیا تھا؟" علامہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "حاشا و کلا میں آپ کی نسبت کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتا اس لئے کہ جھوٹ بولنے اور بہانہ کرنے کے لئے کچھ تھوڑی سی عقل چاہیے کہ نہ۔"

اسی صحبت میں پنجاب کے ایک بزرگ کا ذکر آگیا جن کا کسی زمانے میں سیاست اور صحافت میں طوطی بولتا تھا مگر اب طوطی کے پر جھڑ گئے تھے اور آواز بیٹھ گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا "مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ ہر آدمی کو اسی نے بنایا ہے۔ مگر کبھی ہمیں تو یقین نہیں آیا کہ ——— خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اُسے شیطان نے بنایا ہے تب بھی ہم نہیں ماننے کے اس لئے کہ شیطان کی شیطنت کی بھی آخر کوئی حد ہے۔"

ایک خاصے سن رسیدہ ایم، اے ایل ایل

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

پچھلا ہفتہ: ا۔ ہندوستان

یہ غلط فہمی ہے

ہم نے جو نوٹ پچھلے ہفتے کے پرچے سے نقل کئے ہیں ان میں ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ حکومت نے اپنے کسی بیان میں پوسٹ کارڈ کی تیاری اور چھپائی کی لاگت ۲ ر ۸ بتائی تھی یہ غلط فہمی ہے۔ پالیمنٹ کے سامنے حکومت کے بیان میں شرح بتائی گئی تھی اس میں صرف تیاری اور چھپائی نہیں بلکہ پوسٹ کارڈ بھیجنے کا خرچ بھی شامل کیا گیا تھا، معلوم نہیں بھیجنے کا خرچ کا حساب کیوں کر لگایا گیا اور صحیح بھی تھا یا نہیں۔ لیکن ہریجن جیسے اونچے اخبار کے نوٹ میں جو غلطی رہ گئی تھی اس کو ظاہر کر دینا ہم نے ضروری سمجھا۔

اس لوح کا کیا کہنا!

لندن کانفرنس جس کی بہت دن سے دھوم دھام تھی، بہ خیر و خوبی ختم ہو گئی۔ اس کے فیصلے کے بارے میں کامن ویلتھ کے آٹھ ملکوں کی طرف سے سرکاری اعلان شائع ہوا ہے اس کے اہم نکتے یہ ہیں:۔

۱۔ حکومت ہند نے دوسرے ملکوں کی حکومتوں کو اطلاع دی کہ نئے دستور کے مطابق ہندوستان ایک با اقتدار خود مختار ریپبلک بن جائے گا لیکن اس کے باوجود وہ کامن ویلتھ کا پورا رکن رہنا چاہتا ہے اور بادشاہ کے منصب کو اس حد تک تسلیم کرنے کو تیار ہے کہ اس کی ذات کامن ویلتھ کے خود مختار اراکین کی آزادانہ رفاقت کی ایک علامت ہے اور اس حیثیت سے وہ کامن ویلتھ کا سردار ہے۔

۲۔ دوسرے ملک ہندوستان کی رکنیت کو اس اعلان کی شرطوں کے مطابق تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس سے خود ان کی رکنیت کی بنیاد نہیں بدلے گی۔

۳۔ چنانچہ برطانیہ، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ہندوستان، پاکستان اور سیلون یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ قوموں کی کامن ویلتھ کے آزاد اور ہم مرتبہ ارکان کی حیثیت سے امن، آزادی اور ترقی کے لئے مل جل کر کام کرتے رہیں گے۔

اس اعلان میں قانون اور آئین کے ماہر نہ جانے کیا کیا باریکیاں نکالیں گے لیکن غیر ماہر بھی اسے غور سے پڑھنے کے بعد دو چار موٹی موٹی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔

اس کانفرنس کے بعد کامن ویلتھ کی نوعیت اور مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے ارکان جن معاملات میں جس طرح اشتراک عمل کرتے تھے اب بھی کرتے رہیں گے۔ جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے اس میں کامن ویلتھ کے ملکوں کے لئے ایک دوسرے کا ساتھ دینا لازمی نہیں تھا۔ چنانچہ پچھلی جنگ میں آئرلینڈ جو اس وقت کامن ویلتھ کا رکن تھا الگ رہا تھا اور جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ اگر ایک ووٹ کی اکثریت سے لڑائی میں شرکت کے حق میں فیصلہ نہ کر دیتی تو وہ بھی الگ رہتا اس بات کو پنڈت نہرو نے لندن کانفرنس میں بہت اچھی طرح صاف کر دیا کہ کامن ویلتھ کوئی فوجی بلاک نہیں ہے۔

کامن ویلتھ کے سات ملکوں کے لئے بادشاہ کی حیثیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے وہ جس شکل میں اور جس حد تک اس کی سیادت کو مانتے تھے مانتے رہیں گے مثلاً غالباً ان کے سفیروں کے تقرر کے لئے بادشاہ کی رسمی منظوری کی ضرورت ہوگی۔ صرف ہندوستان کے لئے بادشاہ کی حیثیت بدل گئی ہے۔ جہاں تک اس کے اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات کا تعلق ہے اس کے نزدیک بادشاہ کا کوئی وجود نہیں ہوگا اور اس کا کہیں نام نہیں آئے گا۔ ہاں کامن ویلتھ کے مشترک معاملات میں بادشاہ کا نام اس کے ارکان کو ملانے والی کڑی کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ اس تبدیلی کے نتائج حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ ہندوستان اپنے لئے ڈومنین کا لفظ استعمال کرنا چھوڑ دے گا۔

۲۔ نئے دستور کے نفاذ کے بعد گورنر جنرل کا عہدہ ختم کر دیا جائے گا۔

۳۔ ہندوستان کے سفیروں کا تقرر ریپبلک کے صدر کی طرف سے براہ راست ہوگا۔

۴۔ شاید ہندوستان اپنے ان ایلچیوں کو جو کامن ویلتھ کے ملکوں میں ہیں ہائی کمشنر کے بجائے سفیر کا لقب دے۔

لیکن کامن ویلتھ کے تصور کا کچھ یا برطانوی قوم کی طبیعت کا غرض یہ لوچ داد کے قابل ہے کہ ہندوستان پارلیمانی طریقت کے عام مسلک سے ایک حد تک منحرف ہو جانے کے بعد بھی اس حلقے میں شامل رہے گا اور اسے مشترک شہریت اور تجارت وغیرہ کی وہی مراعات حاصل رہیں گی جو دوسرے ارکان کو ہیں۔

اس سے جہاں خوشی اور فخر کا احساس ہوتا ہے کہ برطانیہ اور اس کے رفیق ہندوستان سے اشتراک عمل قائم رکھنے کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہاں طرح طرح کے اندیشے بھی پیدا ہوتے ہیں برطانیہ نے ابھی تک ملایا اور دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنا سامراج قائم کر رکھا ہے کامن ویلتھ کے ملکوں میں سے کم سے کم ایک یعنی جنوبی افریقہ اب تک نسلی تفوق اور استبدادی حکومت کا قائل ہے۔ کیا کامن ویلتھ کا رکن رہ کر ہندوستان کو ایسے موقعے پیش نہ آئیں گے کہ اسے سامراج نسلی تفوق اور استبدادی حکومت کے برقرار رکھنے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد دینی پڑے؟ کیا قانونی پابندیوں کے نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس جنگ سے الگ رکھ سکے گا جس میں کامن ویلتھ کے دوسرے ملک شریک ہوں؟ یوں تو ظاہر ہے کہ ہندوستان جتنے زیادہ ملکوں سے جتنا زیادہ دوستی اور رفاقت کا تعلق اور اشتراک عمل پیدا کر سکے اتنا ہی اچھا ہے، اور موجودہ حالات میں کامن ویلتھ کے ملکوں سے اشتراک عمل کرنے میں بہت سے فوائد ہیں لیکن اسی کے ساتھ اس میں شدید اخلاقی اور مادی خطرے بھی پنہاں ہیں۔ اگر ہماری حکومت اس قدر چوکسی سے کام لے کہ ہر وقت ان خطروں کا لحاظ رکھے اور ان سے بچتی رہے تو لندن کانفرنس کا فیصلہ ہندوستان کے لئے رحمت ثابت ہوگا ورنہ سراسر زحمت بلکہ عذاب۔

۲۔ پاکستان

مغربی پنجاب کا بجٹ

اپریل ۱۹۵۰ء سے لے کر ۳۱ مارچ ۱۹۵۱ء تک مغربی پنجاب کی حکومت کے آمد و خرچ کا حسب ذیل اندازہ لگایا گیا ہے:-

مجوزہ آمدنی	۱۴ کروڑ ۷ لاکھ
مجوزہ خرچ	۱۶ " ۶۲ "
خسارہ	۲ " ۵۵ "

اس خسارے کو مندرجہ ذیل ٹیکسوں کے ذریعے پورا کیا گیا ہے:-

مہاجر ٹیکس	۵۰ لاکھ
زرعی ٹیکس	۴۰ "
بجلی کی شرح میں اضافہ	۱۴ "
فرد تفریحی ٹیکس	۱۰ "
آبیانہ کی شرح میں اضافہ	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ

ان ٹیکسوں سے حکومت کو دو کروڑ ۶۴ لاکھ کی آمدنی ہوگی اور اس سے نہ صرف ۲ کروڑ ۵۵ لاکھ کا مجوزہ خسارہ پورا ہو جائے گا بلکہ سال کے آخر میں حکومت کو ۹ لاکھ روپیہ بچ جائے گا۔

(آفاق، لاہور)

صوبہ مسلم لیگ کے نئے صدر

میاں عبد الباری اتفاق رائے سے صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ میاں صاحب مسلم لیگ کے ایک بہت پرانے کارکن ہیں اور شروع سے ہی بڑی ثابت قدمی کے ساتھ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستہ رہے ہیں۔

میاں صاحب کا انتخاب بلا مقابلہ ہوا ہے اور اس لحاظ سے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ سب گروہوں نے ان کی ذات پر اعتماد کیا مگر ہم انھیں متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس اتفاق سے ـــ ہماری رائے ہے کہ یہ اتفاق نا کشی ہے ـــ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی مشکلات ختم ہو گئیں۔ میاں عبد الباری کے سامنے بے حد مشکل اور کٹھن کام ہے۔ انھیں ایسے مشکل وقت میں لیگ کی صدارت تفویض کی گئی ہے جب اس قومی جماعت کی ساکھ اس کے اپنے لیڈروں کے ہاتھوں مٹی میں مل چکی ہے۔ اس ساکھ کو بحال کرنے کے لئے صرف خلوص ہی کافی نہیں مضبوطی کی بھی ضرورت ہے۔ ارادے اور کیرکٹر دونوں کی مضبوطی۔ اگر پس پردہ بیٹھ کر کسی دوسرے شخص کو ہی صوبہ لیگ پر حکومت کرنی ہے تو میاں عبد الباری مسلم لیگ کی ساکھ تو کیا بحال کریں گے اپنی ساکھ بھی گنوا بیٹھیں گے۔ اس وقت لیگ کو ایک ایسے صدر کی ضرورت ہے جو صرف مخلص ہی نہ ہو مضبوط بھی ہو، اور نہ صرف مخالفوں سے ٹکر لے سکتا ہو بلکہ اپنے غلط کار حامیوں کو بھی جو لیگ کو ذاتی سربلندی کے لئے آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں ناراض کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔ میاں عبد الباری بڑی کڑی آزمائش میں ڈال دئے گئے ہیں ہماری دعا ہے کہ وہ سرخرو ہوں مگر کامیابی کے لئے محض دعائیں اور نیک آرزوئیں کافی نہیں ہوا کرتیں۔

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور)

ایک اور قرار دادِ مقاصد

کراچی کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ دستور سازی کی بنیادی کمیٹی کے اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ قرار داد مقاصد کو از سر نو تیار کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک اور کمیٹی بنائی جائے۔

دستور ساز اسمبلی قرار داد مقاصد کو طویل بحث و تمحیص کے بعد منظور کر چکی ہے اور ہمارے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں یہ قرار داد پیش کر کے اپنے جوش اسلامیت کی داد ہر کہ و مہ سے لے چکے ہیں۔ اس کے باوجود یہ اطلاع بڑی حیرت انگیز ہے کہ بنیادی کمیٹی اس قرار داد کی جگہ نئی قرار داد بنانے کی ضرورت محسوس کرنے لگی تاکہ موجودہ قرار داد کی تشنگیاں دور کی جاسکیں۔ اطلاع میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی اس شرط پر نئی قرار داد مقاصد تیار کرانے کے حامی بن گئے ہیں کہ اس میں موجودہ قرار داد کے بنیادی نقاط شامل ہوں۔

کسی نامکمل شے کو مکمل اور جامع بنانے کی کوشش بری نہیں لیکن یہ نشتے بعد از جنگ ہماری دستور ساز اسمبلی کے ارکان اور قائدین عظام کی قابلیتوں کے لئے اچھی سند نہیں جنھوں نے ایک قرار داد نہایت گرمجوشی کے ساتھ منظور کر لی اور جن لوگوں نے اس کی خامیوں کی طرف اشارات کئے تھے انھیں لوگوں سے کوسوا بھی دیا۔ لیکن منظور کرنے کے بعد یہ سوچا کہ دستور سازی بچوں کا کھیل نہیں کہ مسٹر لیاقت علی خاں کی حمایت میں ہاتھ اٹھا کر اپنا فرض پورا کر لیا جائے۔ دیکھیں نئی قرار داد میں دستوری مقاصد کی تشریح و تعیین کس طرح کی جاتی ہے۔

(مغربی پنجاب، لاہور)

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟

ہمیں یہ جان کر تعجب اور افسوس ہوا ہے کہ انڈین سول سروس کے ان انگریز افسروں کو جو ہندوستان کی آزادی کے باعث واپس انگلستان واپس چلے گئے تھے دوبارہ پاکستان بلایا جا رہا ہے۔ کئی ہفتے ہوئے ہمیں اطلاع ملی تھی کہ انگریز افسروں کو واپس بلانے کی تجویز زیر غور ہے اور اس سلسلے میں گورنر پنجاب اور وزیر اعظم میں مشورہ بھی ہو چکا ہے تحقیق پر یہ خبر درست ہی ثابت ہوئی۔ گو ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گورنر پنجاب نے کس وزیر اعظم سے مشورہ کیا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان سے یا وزیر اعظم پنجاب سے؟ تاہم ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تجویز گورنر کی تھی۔ انھوں نے اس کے متعلق وزیر اعظم سے مشورہ کیا، اور ان کے قول کے مطابق وزیر اعظم اس تجویز سے متفق ہیں۔ اس خبر کی تصدیق کے فوراً بعد ہم نے ان کالموں میں مسلم لیگ کے رہنماؤں اور اپنے وزراء سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس تجویز کو مسترد کر دیں۔ یہ تجویز واضح طور پر غلط اور غیر ضروری تھی۔ اور ہمارا خیال یہ تھا کہ وزراء کو محض توجہ دلانا کافی ہوگا۔ مگر ہمیں یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تجویز مسترد نہیں کی گئی بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

(نوائے وقت، لاہور)

۳ - باہر کی دُنیا

معاہدۂ اٹلانٹک کا اثر

جب سے شمالی اٹلانٹک کے معاہدے پر دستخط ہوگئے ہیں، جمہوری ملکوں کے سیاست داں کہہ رہے ہیں کہ روس کو بڑا دھکا لگا ہے۔ اب ان کی سمجھ میں یہ بھی آگیا ہے کہ روسی سیاست کی ناکامی کب سے شروع ہوئی۔ جمہوری سیاست کب سے سنبھلنے لگی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد دو سال تک جمہوری ملک دبتے رہے۔ انھیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ روس کیا چاہتا ہے، اور وہ یہ بھی طے نہیں کرسکے تھے کہ ان کے اپنے مقصد اور مقصدوں کو حاصل کرنے کے طریقے کیا ہوں گے۔ دراصل روس نے ان پر حد سے زیادہ دباؤ ڈال کر ان میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کی، اور اسی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ روس اپنی پالیسی کو جانچنے اور اس کے بدلنے کی ضرورت پر غور کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں روسی نمائندوں کے تیور وہی رہیں گے، لیکن بعض باتیں جو پہلے بہت اہم سمجھی جاتی تھیں اب ان پر اتنا زور نہ دیا جائے گا۔ بعض باتیں جو پہلے نمایاں نہیں تھیں وہ اب سامنے لائی جائیں گی۔

جمہوری سیاست دانوں کی یہ رائے غلط ہو تب بھی بے بنیاد نہیں ہے۔ فرانس میں کمیونسٹ مارشل پلین کی مخالفت میں کامیاب نہیں ہوئے، اٹلی کے کمیونسٹ چناؤ میں ہار گئے، مغربی جرمنی کی حکومت کا الگ انتظام ہونے والا ہے، یونان میں سرکاری فوجوں اور سپہ سالاروں کی نالائقی کے باوجود امریکی مدد سے کمیونسٹوں کی چھاپہ مار جنگ ٹھنڈی کردی گئی ہے۔ فرانس، اٹلی، جرمنی میں بے چینی قائم رکھنا روسی سیاست کے ایسے کام تھے جو دوسروں کے ہاتھوں ہی انجام پاسکتے تھے۔ برلن کا بلوکیڈ خود روسیوں نے کیا تھا اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو براہِ راست چیلنج دیا تھا کہ برلن میں رہنے کا بل بوتا ہو تو رہ کر دکھائیں۔ اتحادیوں نے ہوائی جہازوں کے ذریعے سامان پہنچانے کا جو انتظام کیا وہ گرمی اور جاڑے بھر قائم رہا۔ اس میں ان کا روپیہ تو بہت خرچ ہوا، مگر وہ آزمائش میں پورے اترے، یعنی مقابلے میں جیت گئے اور روسیوں پر ظاہر ہوگیا کہ اب زیادہ چھیڑ چھاڑ کرنے کا نتیجہ لڑائی ہوگی۔ روسیوں کے لئے اس سے بھی زیادہ اندیشے کی بات یہ ہوئی کہ یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو نے کومن فارم کے خلاف بغاوت کی اور قوم نے ان کا اس طرح ساتھ دیا کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹائے نہ جاسکے۔ ہنگاریہ اور البانیہ مارشل ٹیٹو کی مخالفت پر آمادہ کئے گئے تھے۔ یہاں یہ حال ہے کہ کمیونسٹ پارٹی سے وہ لوگ برابر نکالے جارہے ہیں جو بھروسے کے قابل نہیں ہیں اور بلغاریہ کے وزیر اعظم دمتروف جیسے پرانے اور پکے کمیونسٹ لیڈر کو بیماری کے بہانے سے استعفیٰ دے کر لمبی چھٹی لینا پڑی ہے۔

روس کا رویہ

مارشل پلین کی بدولت مغربی یورپ کی معاشی حالت بہت بہتر ہوری ہے اور یہ بات ان ملکوں کی آبادی سے چھپائی نہ جاسکے گی جو اس وقت روس کے قابو میں ہیں۔ اب روسی یا تو یہ کرسکتے ہیں کہ ان ملکوں کو مغربی یورپ اور باقی دنیا سے آزادی کے ساتھ تجارت کرنے دیں یا اپنے سیاسی اور معاشی نظام کے بند ھنوں کو اور زیادہ مضبوط کریں۔ اس خبر سے کہ انھوں نے بلغاریہ، یوگوسلاویہ، یونان اور البانیہ کا تھوڑا تھوڑا سا علاقہ لے کر مقدونیا کی ریاست قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ملکوں کے کمیونسٹوں کا ایک نیا اور بہت سخت امتحان لینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھ کر کہ مغربی جرمنی کی حکومت کے لئے ایک دستور بن گیا ہے اور اتحادیوں نے اسے منظور کرلیا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ برلن کا بلوکیڈ ختم کردیں گے اور آدمیوں اور مال کے آنے جانے پر سے تمام پابندیاں ہٹالیں گے۔ خارجی وزیروں کی کانفرنسوں کا سلسلہ خود روسیوں ہی نے بلوکیڈ کا قصہ شروع کرکے بند کیا تھا اور اب اتحادی سمجھتے ہیں کہ کانفرنس کا مطالبہ اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ مغربی جرمنی کی حکومت الگ قائم نہ ہو پائے۔ بلوکیڈ سے جو نقصان ہوسکتا تھا وہ ہوچکا ہے اب روسی اُسے اٹھالیں گے تو اتحادیوں پر کوئی بڑا احسان نہ ہوگا، مگر مغربی جرمنی کے مسئلے پر نئے سرے سے بحث شروع ہوئی تو اس سے نئی دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ابھی یقین کے ساتھ کوئی نئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ مگر خارجی وزیروں کی کانفرنس ہوئی بھی تو اس وقت ہوگی جب اتحادی مغربی جرمنی میں جرمن حکومت قائم کرکے خود فوجی قبضہ رکھنے کی ذمہ داریوں سے بری ہوجائیں گے۔

کمیونزم کی باڑھ ایشیا میں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روس کو یورپ میں جو زک پہنچی ہے اس کی کسر وہ ایشیا میں نکالے گا، لیکن یہاں بھی راستہ کچھ ایسا صاف نہیں ہے۔ روس ایران سے الگ معاہدہ کرکے اُسے توڑنے کی کوشش کرچکا ہے اور افغانستان یہاں سے روسی قنصل اسی لئے ہٹالئے گئے ہیں کہ یہاں کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے اس کے برخلاف مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں زمین تیار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں بھی بڑا سوال یہ ہے کہ کمیونسٹ تحریکیں قومی تحریکیں ہیں اور صرف اپنی قومی زندگی کے مسئلوں کو سامنے رکھیں گی یا انقلابی تحریکیں جن کا اصل مقصد سرمایہ داری نظام کو مٹانا ہے اور جو انقلاب کے لئے قومی مفاد کو نظر انداز کرنا بھی ٹھیک سمجھتی ہیں۔ چین کے کمیونسٹ لیڈر ماؤ تسے تنگ اور ویٹ نام کے قومی لیڈر ہوچی منھ نے ماسکو میں تعلیم پائی ہے اور ماؤ تسے تنگ کے بارے میں معلوم ہے کہ انھیں کارل مارکس سے بڑی عقیدت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روسی سیاست سے اتنی ہی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی پالیسی کومن فورم کی ہدایتوں کے مطابق طے پائے گی۔ کومن فورم چین کے معاملوں میں دخل دینا چاہے تو ممکن ہے ماؤ تسے تنگ مارشل ٹیٹو کی طرح مخالفت پر آمادہ ہوجائیں اور چین کی کمیونسٹ تحریک خالص قومی تحریک بن جائے۔

مگر اس کا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ماؤ تسے تنگ اپنے چینی مخالفوں یا برطانیہ اور متحدہ ریاستوں سے سمجھوتا کرنے پر راضی ہوجائیں گے جو چینی کمیونسٹ بدیسی حکومتوں کے اثر اور ان کے سیاسی کاروبار کو بالکل ختم کردیں گے۔ [illegible] جو نیا مقابلہ ہو وہ ان سے ہو اور مارشل چیانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں کا کسی سلسلے میں ذکر ہوئے۔ چین کی قومی حکومت کے نمائندے صرف اپنے بچاؤ کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ قوم کے لئے کچھ نہیں چاہتے اور قوم کو ان کے ساتھ کوئی لگاؤ یا عقیدت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کمیونسٹوں کو اس کا بھی پتہ چل گیا ہو کہ مارشل چیانگ یہ دکھانے کے لئے الگ ہوگئے ہیں کہ وہ کمیونسٹوں سے گفتگو کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتے، کیونکہ قومی حکومت کے نمائندے برابر ان سے ٹیلیفون کے ذریعے مشورہ کرتے رہے ہیں۔ مارشل چیانگ یہ سوچا تھا کہ گفتگو کا کوئی نتیجہ نکلے گا تو وہ فوراً سامنے آجائیں گے اور ثابت کریں گے کہ کامیابی ان کی وجہ سے ہوئی ہے اور نتیجہ نہ نکلے گا تو ان پر ذمہ داری نہ آئے گی، اس لئے کہ وہ حکومت سے الگ ہوچکے ہیں۔ کمیونسٹ پہلے اس پر راضی تھے کہ پرانے جھگڑوں کو بھول جائیں اور اسے صلح کی ایک شرط نہ بنائیں کہ ان لیڈروں کو سزا دی جائے جنھوں نے قوم کی آبرو اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے۔ بعد میں وہ اسی شرط پر بہت اصرار کرنے لگے اس لئے کہ انھیں یقین ہوگیا کہ سمجھوتے کی خواہش کرنا اور صلح کی بات چیت کرنا مارشل چیانگ کی ایک چال ہے۔ کمیونسٹوں کے لئے بہت بہتر ہوتا اگر وہ شمالی چین میں حکومت کا نظام مضبوط کرنے کے بعد آگے بڑھتے۔ مگر انھیں اب اندیشہ ہے کہ سمجھوتہ اور صلح کرنے سے وہ صرف گھاٹے میں نہ رہیں گے بلکہ مارشل چیانگ مہلت سے فائدہ اٹھاکر ان کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کریں گے۔ انھوں نے جنگ کو دوبارہ بڑے پیمانے پر جاری کردیا ہے اور یہ جنگ مارشل چیانگ سے ہی نہیں بلکہ ان تمام بدیسی طاقتوں سے ہے جن سے مارشل چیانگ اور قومی حکومت کو مدد پہنچے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مرض اور علاج

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا!

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!

دلِ طورِ سینا و فارانؔ دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!

تمدن، تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب!

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا!!

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دلِ مرتضےٰ سوزِ صدیقؓ دے!

جگر سے وہی تیر پھر پار کر!
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

بتا مجھکو اسرار مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری آرزوئیں مری!
امیدیں مری جستجوئیں مری!

مری فطرت آئینۂ روزگار!
غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات!
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

(ساقی نامہ)

آفتاب شاعری

میکش حیدرآبادی

سونے والوں کو، پیام صبح نو، دیتی ہوئی
خواب کی دنیا اٹھی، انگڑائیاں لیتی ہوئی

مطلع مشرق پہ چمکا، آفتاب شاعری
ہر کرن جس کی بنی تارِ ربابِ شاعری

دل پہ تھا جو داغِ غفلت، اس کو آہیں دھو گئیں
خونِ مشرق میں ہزاروں بجلیاں حل ہو گئیں

ضبط کے زخم نہاں، فریاد سے بھرنے لگے
یعنی بندے بھی خدا سے گفتگو کرنے لگے

عارضِ پر نور جھلکا، گیسوئے شب رنگ سے
جوئبارِ سازِ دل نکلی، سکوتِ سنگ سے

اشکِ خونیں میں نظر آئی تبسم کی جھلک
نغمۂ بلبل بنی، خاموش پھولوں کی مہک

کارواں بڑھنے لگا تیزی سے منزل کی طرف
کائناتِ درد خود کھنچنے لگی دل کی طرف

دہر کے دھارے پہ طوفانی ہوا بہنے لگی
ناؤ مشرق کی کنارے کی طرف بہنے لگی

جاگ اٹھا مشرق، دل اقبال کی دھڑکن گواہ
واہ کا محشر لئے آتی ہے جس کے لب پہ آہ

قلبِ شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری
سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"

(س ب دس)

نہ ہوگا اب مگر اقبال سا صاحب نظر پیدا

یحییٰ اعظمی

یوں ہی ہوتے رہیں گے حشر تک شام و سحر پیدا
نہ ہوگا اب مگر اقبال سا صاحب نظر پیدا

ملا تھا تجھ کو جو روزِ ازل فیضانِ فطرت سے
کہاں ہر پیکرِ خاکی میں وہ سوزِ جگر پیدا

نہ اٹھا پھر کوئی رمزِ اَنا کا عارفِ کامل
ہوا تھا ایک تو ہی خود شناس و خودنگر پیدا

تڑپتا ہی رہے گا ذرہ ذرہ خاکِ مشرق کا
تری رنگیں نوائی نے کیا ہے وہ اثر پیدا

دیا ہے اب دِگل کو تو نے وہ درسِ ہمہ افشانی
کئے ہیں قطرۂ شبنم نے بھی اب بال و پر پیدا

کیا ملت کو پھر ذوقِ یقیں سے آشنا تو نے
ترے دم سے ہوئی پھر چشمِ باطن میں نظر پیدا

ہوئیں تجھ سے نوائے صبح میں کیفیتیں پیدا
دلِ دردآشنا میں لذتِ آہِ سحر پیدا

زسرتاپا یقیں، مستِ خودی، واقفِ خودآگاہی
کہاں اب دہر میں ہوتے ہیں ایسے باخبر پیدا

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" (اقبال)

غزل

بیگم زاہدہ رزمِ نہاں

ڈوب کر دردِ محبت میں ابھرنا ہے ہمیں
بن کے آئینۂ اخلاص سنورنا ہے ہمیں
یہی دریا کبھی پایاب بھی ہوگا لیکن
زندگی بے سر و ساماں ہی تو کیا اس کا گلہ
بند کر دے نہ تفکر کہیں سرچشمۂ درد
دل آگاہ سا دیکھا نہیں پابندِ وفا
اپنی وزدیدہ نگاہی کی قسم دیکھ تو لے
کم نہیں حسرتِ دیدار بھی لیکن اس وقت
تو بلائے تو چلے آئیں گے جس حال میں ہیں
بات سچی ہو تو کہنے میں جھجکنا کیسا
جان سے کہ کھٹکتا ہوا کانٹا نکلے

ایسے دریا کے یوں ہی پار اترنا ہے ہمیں
بن کے اک جلوۂ ایثار نکھرنا ہی ہمیں
آج طوفان تلاطم سے گذرنا ہی ہمیں
نقدِ الفت لئے دنیا سے گذرنا ہی ہمیں
اس لئے حس رگ ادراک میں بھرنا ہی ہمیں
اس تصور سے دھڑکتا ہے کہ مرنا ہی ہمیں
تیری تصویر مکمل ابھی کرنا ہے ہمیں
کم نگاہی کا گلہ آپ سے کرنا ہے ہمیں
تجھ سے ملنے کو نہ بننا نہ سنورنا ہی ہمیں
نہ خدا اس لئے کہلائے کہ مرنا ہی ہمیں
یہ بھی الجھن نہ رہے دل میں کہ مرنا ہی ہمیں

اپنے سینے میں نہاں دل نہیں اک شعلہ ہے
اسی شعلہ میں تو جل جل کے نکھرنا ہی ہمیں

غزل

بیگم صدیق حسن وفا

کچھ سوچ رہے آتنا کیوں آغاز کا دیوانہ
انجام سے بے پروا ہوتے نہیں فرزانہ

افتادِ محبت سے آگاہ تو تھا لیکن
آغاز کا شیدا تھا انجام سے بیگانہ

دیکھ اے نگہ عالم تاثیر تغافل دیکھ
جو آج زباں زد ہے ہر تیرا ہی فسانہ

فرعون کی شہرت ہی اک موسیٰ عمراں سے
سجدوں سے مرے چمکا سنگِ درِ جانانہ

منزل پہ پہنچ کر بھی گم کردۂ منزل ہوں
ہے میرے تجسس کا یہ مختصر افسانہ

ہے عزم کی کوتاہی محتاج سبو ہونا
کم ظرفی ہمت سے آباد ہے میخانہ

اس دورِ تلاطم میں اک بزم سجائیں گے
بے ساغر و بے ساقی، بے بادہ و پیمانہ

خود اپنے تصور سے ہے بزم کی رنگینی
میرے لئے یکساں ہی کعبہ ہو کہ بت خانہ

ایسا نہ ہو یہ آنسو پلکوں سے ٹپک جائیں
اے ضبط سہارا دے، ہے ختم پہ افسانہ

خود شوق کی بے باکی تھی وجہ فروغِ حسن
ہے شمع کی آرائش بے تابیٔ پروانہ

بے بادہ و بے منزل ہو جائے وفا پھر سے
اتنی تو اجازت دے اے رہبرِ فرزانہ

اقبال کا ابلیس

خواجہ غلام السیدین

ریڈیو والوں کی فرمائش تھی کہ میں "اقبال کے ابلیس" کے بارے میں ایک تقریر کروں اور میری اس فرمائش سے ذرا سرسری ملاقات ہے۔ اس لئے فرمائش کی تعمیل مشکل معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت میں اسی سوچ میں تھا کہ غالباً آنکھ لگ گئی۔ اور جب خواب ہی میں آنکھ کھلی تو ڈاکٹر اقبال کی لاہور والی کوٹھی تھی، وہ اپنے برآمدے میں ایک چھوٹے سے مونڈھے پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے اور اتفاق سے کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ میں داخل ہوا تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا۔ "آئیے سیدین صاحب! (وہ اپنے چھوٹوں سے اسی طرح مخاطب ہوتے تھے)، کہئے خیریت تو ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں، خیریت تو ہے لیکن ایک مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ایک کمزوری کے لمحے میں ایک ایسے مضمون پر تقریر کرنے کا وعدہ کر لیا ہے، جس کے متعلق اول تو کافی واقفیت کا دعوےٰ کر نہیں سکتا اور اگر کروں بھی تو ذرا خطرناک ہو!" چہرے پر ہلکا سا تبسم آیا اور پوچھا "یعنی؟" میں نے کہا "اقبال کا ابلیس" خوب ہنسے کہنے لگے "مضمون تو کسی کو اچھا سوجھا ہے، لیکن تقریر کہاں کرنی ہے؟" عرض کیا "ریڈیو پر" یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "یہ ریڈیو والے بھی بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔ زمین والوں کو چھوڑتے ہیں، نہ آسمان والوں کو۔" میں نے موقع کو غنیمت جان کر پوچھا کہ "ابلیس کا شمار آپ کون سے زمرے میں کرتے ہیں۔ زمین والوں میں یا آسمان والوں میں؟" کہنے لگے "زمین والوں میں، اگر آسمان والوں میں سے ہوتا تو وہاں کے لطف اور سکون اور بے کاری کو چھوڑ کر اس شور و شر اور ہنگاموں سے بھری ہوئی دنیا میں کیوں آتا؟ اس کی تو فطرت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ فرش کو عرش پر ترجیح دے۔" میں نے قطع کلام کر کے کہا کہ "آپ اس بارے میں اس کی فطرت کو کیوں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس نے حکم الٰہی کی نافرمانی کی، اور مشیت الٰہی نے اسے جنت سے نکال کر زمین پر پہنچا دیا۔" کہنے لگے "بھئی تم نے تو پریس والوں کی طرح مجھے انٹرویو کرنا شروع کر دیا۔ میں ابلیس کی شخصیت پر حکم کی حیثیت تھوڑا ہی رکھتا ہوں۔" میں نے عرض کیا کہ "تصنیف کو مصنف ہی اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے آپ کی جانب رجوع کیا ہے۔" کہنے لگے "واہ! یہ تو تم نے کفر کی بات کہہ دی۔ ابلیس تو مشیت الٰہی کی تصنیف ہے! اسے میری طرف کیوں نسبت دیتے ہو؟" میں نے فوراً تقریر کے عنوان کے پیچھے پناہ لے کر کہا "جناب ریڈیو والے اس ابلیس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے یا کم سے کم وہ سرکاری طور پر اس دلچسپی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں تو اس ابلیس سے دلچسپی ہے جو آپ کی شاعری اور آپ کے دماغ کی تخلیق ہے، اور جس کا ذکر بار بار آپ کے کلام میں آتا ہے اور مجھے بھی اس وقت اسی ابلیس سے سروکار ہے۔" ڈاکٹر صاحب ٹھہرے نکتہ نواز اس دلیل کو تو تسلیم کر لیا۔ لیکن یہ عذر پیش کیا "بھئی شاعر بحیثیت شاعر کے کوئی علمی مقالہ پیش نہیں کرتا بلکہ وقتی الہام اور کیفیت کے مطابق جو خیال یا جذبہ یا نکتہ ذہن میں آ جاتا ہے اس کو شعر کے قالب میں ڈھال کر بیان کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے شاعرانہ تخیلات کے متعلق اخباری بیانات دیا کرے۔" میں نے باادب عرض کیا کہ "یہ اصول عام شعراء کے متعلق تو صحیح ہے لیکن چونکہ اقبال میں شعر اور فلسفے کا امتزاج کامل ہے اس لئے اس کا وقتی الہام اور اس کے بدلتے ہوئے MOODS بھی ایک وحدت خیال کے مختلف مظاہر ہیں اور ان سب میں ایک داخلی تعلق اور ہم آہنگی ہے۔" اور پھر میں نے پہلو بدل کر کہا "میں THESIS کا کب طلب گار ہوں؟ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے تصور ابلیس کے متعلق آپ چند نکتے ارشاد فرمائیں" اور پھر اس خیال سے کہ کوئی اور شاعرانہ عذر نہ پیش کر دیں۔ میں نے بغیر جواب کا انتظار کئے کہا کہ "جی ہاں میں یہ دریافت کر رہا تھا کہ آپ اس کے تنزل کے لئے اس کی فطرت کو کیوں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں؟" ہنس کر کہنے لگے کہ "یہ تو تم ابلیس کی وکالت تقریباً اسی کے الفاظ میں کرنے لگے۔ شاید تم نے "ضرب کلیم" میں ابلیس کی معذرت پڑھی ہو۔

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
تھی مری تقدیر میں زندانی نزدیک و دور
حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

مگر میرا خیال ہے کہ ابلیس کو کامل اختیار حاصل تھی اور اس نے سجدۂ آدم سے انکار کر کے اپنی عظمت اور بلندی فطرت کا ایک ثبوت دیا تھا جسے اس موقع پر بھلا کر وہ اظہار عجز کر بیٹھا اور اس وجہ سے مشیت الٰہی نے خود اس بات پر ٹوکا۔

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

"یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا انکار اور بغاوت اس کے عجز و اطاعت سے افضل ہے؟ یہ تو ذرا گستاخانہ بات ہوئی!" "یقیناً" اور مونڈھے پر ذرا آگے کو جھک کر بیٹھ گئے جس سے مجھے خیال ہوا کہ اب وہ گفتگو کے موڈ میں آ گئے ہیں۔ "اس میں کیا شک ہے؟ ابلیس کا جو تصور میں نے پیش کیا ہے اس کا اصل نکتہ ہی یہ ہے۔ لوگ غور نہیں کرتے کہ انسانی زندگی کے ڈراما میں ابلیس کا پارٹ کیا ہے؟ آدم جنت میں سکون اور عیش اور اطاعت و عبادت میں اپنا وقت بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی فرشتوں کی زندگی کی طرح محدود اور مجبور تھی۔ اگر مشیت الٰہی میں آدم کے لئے یہی زندگی ہوتی تو اس کے لئے فرشتوں کی کیا کمی تھی؟ دراصل تخلیق آدم کا منشاء اس وقت تک پورا نہ ہو سکتا تھا جب تک آدم اس بے عملی اور آرام طلبی کی جنت سے نکل کر اس رزم گاہ خیر و شر میں نہ آتے جب تک ان میں تپش اور جوش و خروش اور بغاوت کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ جب تک وہ اس سرور سے لذت آشنا نہ ہوتے جو حق و باطل کی کارزار میں پوشیدہ ہے جب تک وہ گمان کو یقین پر اور جستجو کو منزل پر ترجیح دینا نہ سیکھتے۔ یہ ابلیس کے انکار کا اعجاز ہے کہ اس نے آدم کو انسان بنا دیا اور اس کی عقل و دماغ کے سامنے لا انتہا امکانات کھول دئے۔ جبریل ایک دفعہ ابلیس کے منہ آئے تھے اور ناصح مشفق بن کر پوچھ بیٹھے تھے۔

"کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو"

ابلیس نے اس وقت جو دندان شکن جواب دیا تھا اس سے اس کے کردار اور کام دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے تو اکثر اپنے اشعار یاد نہیں رہتے لیکن تم نے بال جبریل میں ضرور پڑھے ہوں گے۔"

"جی ہاں مجھے وہ اشعار یاد ہیں اور اگر محض ابلیس کا تصور کلام میں اس قدر زور اور اثر پیدا کر سکتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا شاعری پر بھی بڑا احسان ہے۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

"ابلیس کو "اس سوز درون کائنات" کی ہمیشہ فکر ہے اور اس کے نزدیک اس جہان رنگ و بو کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ یہی سوز و ساز، درد و غم، جستجو و آرزو، جس کی کشمکش انسان کے دل میں برابر جاری رہتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نظر میں بخشے ہوئے فردوس نہیں جچتے، بلکہ وہ خود اپنی محنت اور کاوش سے، اپنے خون جگر سے، اپنے عزم اور حوصلے اور بلند ہمتی سے اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ ابلیس کے انکار ہی نے انسان کو مجبوری کی پستی سے مختاری کی بلندی پر پہنچایا ہے۔

شعلہ ہا از کشت زار [illegible] سوز مجبوری بہ مختا [illegible]

جب تک انسان اس کشمکش پیہم میں لگا ہوا ہے اور حیات کے ساتھ خیر و شر، نیکی اور بدی، عبادت و بغاوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ ابلیس مطمئن ہے، لیکن اگر وہ ابلیس کے سامنے بھی فوراً ہتھیار ڈالدے اور آسانی سے اُس کے فریب میں آجائے تو وہ صید زبوں ہے جس کی ابلیس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے وہ تو خدائے برتر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بار الٰہا! مجھے جو کچھ عظمت و شہرت حاصل ہوئی ہے وہ تیرے سامنے انکار کی ذمہ داری اٹھا کر اور انسان بھی اسی وقت اپنی فطرت کی بلندی پر پہنچ سکتا ہے جب اس میں اسی طرح انکار کرنے کا حوصلہ ہو۔

"آپ کے اس ارشاد سے میری ایک مشکل حل ہوگئی میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آپ نے ارمغان حجاز میں ابلیس کو خدا کے حضور میں نالہ کرتے ہوئے کیوں پیش کیا ہے جب وہ ایک مرتبہ بغاوت کر چکا تو اب اس اظہار عقیدت کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کی ضرورت ہے تو ان اشعار ہی سے واضح ہو جاتی ہے، کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو؟"

میں نے تعمیل کی۔

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب
ہیچگہ از حکم من سر برنتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
~~~

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب
غافلش از ذوق ابا بیگانہ
از شرار کبریا بیگانہ
صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر
فطرت او خام و عزم او ضعیف
تاب یک ضربم نیارد ایں حریف
ابن آدم چیست یک مشت خس است
مشت خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود

مجھے اشارے سے روک دیا اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جیسے بہت دور کی کوئی چیز دیکھ رہے ہوں اور چہرے پر حسرت آرزو کا ایک عجیب سا امتزاج، پھر ذرا دھیمی آواز میں فرمانے لگے "سید ین صاحب! مجھے ابلیس کی یہی ادا تو پسند ہے کہ وہ رزم کو بزم پر اور جد و جہد کو سکون پر ترجیح دیتا ہے اور سہل انگاری نہ اپنے لئے پسند ہے نہ دوسروں کے لئے۔ وہ انسانوں کو فقہا کی اصطلاح میں گمراہ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ بغاوت کا بیج ان کی سرشت میں ضرور بوتا ہے لیکن جب اس کو بہت آسانی سے فتح حاصل ہونے لگتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ شر اور شک کی تخم کاری میں اس قدر خلوص اور جانفشانی کے ساتھ جد و جہد کرتا ہے کہ اس کے مخالف خیر و برکت اور ایمان و یقین کے لئے اس قدر تکلیف نہیں اٹھاتے۔ انھیں تو ہر وقت کسی ایسے تعویذ یا دعا یا طلسم کی تلاش رہتی ہے جو ساری مشکلات آسان کر دے، جس کی مدد سے خدا سے لے کر پیسے تک ہر چیز مل جائے یعنی ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے! لیکن میں ایسے آسان راستوں کا، ایسی سہل نجات کا قائل نہیں ہوں میں تو اُس انسان کا دلدادہ ہوں جس میں بغاوت کا جوش اور ولولہ ہو، جو اس ناقص گھروندے کو توڑ کر جس میں وہ سسکتی ہوئی زندگی بسر کر رہا ہے خود اپنی دنیا تعمیر کر سکے۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

اور جب میں ابلیس کے کردار میں اس برہم زنی کا نشان دیکھتا ہوں تو میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، کیونکہ جہاں انسان کی فطرت کا ایک پہلو تسلیم و رضا ہے وہاں اس کا دوسرا رُخ تحقیق، بنا و خودی اور تعمیر و تخریب کا بھی ہے۔ ابلیس میری نظر میں اس رُخ کی مکمل نمایندگی کرتا ہے۔

عرق اندر رزم خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

جبیں میں ہزاروں سجدوں کا تڑپنا یقیناً قابل قدر ہے۔ لیکن میں کفر کی اس خودداری اور استحکام کو کیسے نظر انداز کر دوں جس کو زمین اور آسمان کی کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ ایمان و اطاعت گذاری بہت بڑی دولت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پیدائش ہی سے گلے میں زنجیر کی طرح نہ پڑی ہوئی ہو۔ بلکہ انسان کفر و انکار، گمان و شک کی تہ نشیں منزلوں میں سے گذر کر اس منزل آخر تک پہنچا ہو، جس طرح خلیل اللہ نمرود کی آگ کو جھیلنے کے بعد سلامتی اور خنکی میں داخل ہوئے تھے"۔

کس قدر بلند تھا ڈاکٹر صاحب کا یہ نصب العین، جس میں ابلیس کے ماضی اور انسان کے مستقبل کے خد و خال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا اس ذہنی تصور کو دیکھتا رہا اس کے بعد میں نے ہمت کر کے ایک سوال اور پوچھا، "ڈاکٹر صاحب! آخر ابلیس میں وہ کون سی خاص صفت تھی جس نے اس کو نہ صرف تمام فرشتوں سے مختلف بلکہ فطرت کے ابدی سکون کے لئے ایک خطرہ بنا دیا؟" "دلچسپ سوال پوچھا تم نے۔ سنو! تم انگریزی کی اصطلاح "احمقوں کی جنت" تو جانتے ہونا؟ یہ احمقوں کی جنت کیا چیز ہے؟ بات یہ ہے کہ کم ہمت لوگ کسی چیز سے اس قدر خائف نہیں ہوتے، جس قدر علم و آگاہی اور فکر و خیال سے۔ کیونکہ خیال میں تیزاب کی سی صفت ہوتی ہے جس میں عادتیں، خیالات، جذبات، توہمات، تعصبات عقائد سب گھل جاتے ہیں، لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اپنی زندگی انہیں تکیوں کے سہارے بسر کرتے ہیں، ان میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ عقل و فکر کی تیز روشنی کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے وہ جہالت اور بے اعتنائی کے سکون و عافیت کو علم کے خطروں اور ہنگاموں پر ترجیح دیتے ہیں برخلاف اس کے ابلیس میں جاننے اور سمجھنے کا تحقیق و تفتیش کا ایک بے پناہ جذبہ تھا۔ اس کی فطرت اس کو سیدھی علم کے شجر ممنوعہ کی طرف لے جاتی ہے، اور وہ بے خطر ان تمام خطروں کا سامنا کرتا ہے جو اس اقدام کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ دوسرے فرشتوں کی فطرت میں کرید اور جستجو کا مادہ ہی نہ تھا اور آدم اپنے علم اسماء کی وجہ سے قانع اور مطمئن تھے۔ لیکن ابلیس کی مثال اور ترغیب نے ان پر اس حقیقت کو فاش کیا کہ ملک معنی حد بندیوں سے آزاد ہے اور فکر و خیال پر کسی قسم کی پابندی لگانا انسانی ارتقا کے امکانات کو محدود کرنا ہے۔ اگر ابلیس علم حاصل کرنے کا جذبہ انسان میں بیدار نہ کرتا تو آج انسان تہذیب کے ابتدائی دور میں ہوتا اور ابر و باد، برق و باراں، اور ایٹم کی قوتیں اس کی غلام نہ ہوتیں۔ اسی وجہ سے وہ مبارز طلبی کے انداز میں جبریل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ہے میری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو

میں نے امید سے زیادہ پا لیا تھا، اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو ہنس کر کہنے لگے "بھئی میری رائے تو نہیں ہے کہ تم اس بارے میں ریڈیو پر تقریر کرو، کیونکہ ریڈیو زمان و مکان کا احترام نہیں کرتا اور زمین و آسمان میں فرق نہیں کرتا اور معلوم نہیں تقریر کو ابلیس کے علاوہ اور کون کون سن لے"! رائے صائب تھی۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ میں اس موضوع پر خود کوئی تقریر نہیں کروں گا، بلکہ محض اس گفتگو کا ذکر آپ کو سنا دوں گا اور بس!

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

جنھوں نے مولویوں کی سی وضع قطع اختیار کر رکھی تھی اسی سادہ لوحی کی بدولت اکثر علامہ کی شوخی طبع کا نشانہ بنا کرتے تھے۔ ایک دن یہ حضرت کسی نوجوان انگریز خاتون کو ٹیلیفون کرتے ہوئے کرسیٔ خطابی ہوئے جا رہے تھے۔ باچھیں کھلی ہوئی تھیں آنکھیں کچھ شرما رہی تھیں، کچھ مسکرا رہی تھیں خالی ہاتھ کی انگلیاں سفید ڈاڑھی سے کھیل رہی تھیں۔ انھیں علامہ نے دیکھ لیا۔ فرمایا "مولانا افسوس آپ کی یہ ساری ادائیں بے کار جا رہی ہیں آواز کو تو موج ہوا وہاں تک پہنچا دے گی مگر یہ ناز و انداز یہیں رہ جائیں گے"۔

چودھری شہاب الدین کے بارے میں علامہ اقبال کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سن لیجئے:- "چودھری صاحب کا رنگ پکا آبنوسی تھا چنانچہ جب وہ کالا سوٹ پہنتے تھے تو بقول علامہ اُن پر جامۂ اصلی کا دھوکا ہوتا تھا۔ ایک دن علامہ نے چودھری صاحب سے فرمایا "آپ کا رنگ سیاہ ہے تو کیا ہوا، یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ظاہر و باطن ایک سا ہے"۔
~~~

اقبال اور اشتراکیت

سید اختر علی اختر تلہری

بعض وہ صاحب نظر ادیب جو مارکسی فلسفے سے نظری طور پر وابستہ ہوگئے ہیں اور اس کے ساتھ اقبال کی شعر و شاعری سے بھی خاصی عقیدت رکھتے ہیں، کبھی کبھی اس کی کوشش کرتے ہیں کہ معیشت یا اقتصادیات کے متعلق اقبال کے خیالات مارکس کے اشتراکی نظریے سے ملا دیں اور کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ ان مسائل کے متعلق اس فیلسوف شاعر کے خطوط فکر مارکسی اشتراکیت سے الگ نہیں ہیں۔ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں یہ ادیب اقبال کے وہ شعر پیش کرتے ہیں جو انھوں نے سرمایہ دار کی مذمت اور مزدور کی حمایت میں زور شور سے کہے ہیں۔

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

کسی دوسری جگہ اس "مارکسی تحریک" سے متاثر ہو کر کہا ہے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی آغاز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ان اشعار سے اقبال کا سرمایہ داروں سے تنفر اور مزدوروں سے اشتراکی رنگ کا شغف واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر اقبال کے لہجے میں کہیں اشتراکیت کا رنگ اور زیادہ شوخ طریقے پر نمایاں ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور نظم میں انھوں نے انقلاب روس کے قائد لینن کو خدا کے حضور میں پہنچا دیا ہے اور اس کی زبان سے سرمایہ داروں کے مظالم کی داستان چھیڑی ہے اور مزدوروں کی وکالت کرائی ہے۔ مزدوروں کی وکالت کے جوش میں خود خداوند عالم سے یہ سوال کیا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور پھر خدا کی زبانی فرشتوں کے نام یہ قہرمانی آتشیں پیام جاری کر دیا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ان اشعار سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اقبال مارکسی نظریے کے تحت سرمایہ دار اور مزدور میں کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبتے دیکھنا چاہتے تھے اور اس لئے "روز مکافات" کے منتظر تھے۔

وہ اسے بھی درست طریق عمل سمجھتے تھے کہ قصرِ امرا کے در و دیوار ہلا دیے جائیں اور نقش کہن بالکل ہی مٹا دیے جائیں، جن کھیتوں سے کسانوں کو روزی حاصل نہیں ہوتی اس کے خوشہائے گندم ایک ایک کرکے جلا دیے جائیں۔ اس قسم کا متشددانہ طرز عمل "مارکسی اشتراکیت" ہی کے دائرے کی چیز ہے۔ ان ادیبوں کے خیال میں جب اس قسم کے تمام اشعار سامنے رکھے جاتے ہیں تو ان سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اقبال "مارکسی ڈھنگ کے اشتراکی شاعر" اور مفکر تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اقبال واقعی "مارکسی اشتراکیت" کے دلدادہ تھے اور کیا وہ اسے سچ مچ سرمایہ داری کے پیدا کئے ہوئے آلام و مصائب کا مستقل علاج سمجھتے تھے؟

اس میں شک نہیں کہ اقبال ہر اس صائب النظر مفکر کی طرح جو عام انسانیت کے آلام و مصائب کو اپنے آلام و مصائب سمجھتا ہے سرمایہ پرستی کے مخالف تھے اور اسے انسانی دنیا کے لئے لعنت سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس سرمایہ پرستی کا بیخ و بن سے جس قدر جلد استیصال کر دیا جائے اسی قدر نوع بشر کے لئے اچھا ہے مگر صرف اتنے عقیدے سے ایک انسان "اشتراکی" نہیں بن سکتا اور وہ بھی "مارکسی قبیلے" کا۔

"مارکسی اشتراکیت" اپنے حلقہ بگوشوں سے صرف اسی کا مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ سرمایہ پرستی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیں۔ اس کا سب سے پہلا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ اس کا عقیدت مند مذہب اور مذہب کے تعلیم کردہ اخلاق سے بے نیاز ہو جائے اور مارکس کی اجتماعیت کی قربان گاہ پر اپنی انفرادی حریت فکر و عمل بکمال خلوص نذر کرے۔

اقبال سرمایہ پرستی کی اس شدید مخالفت کے باوجود "مارکسی اشتراکیت" کے یہ مطالبے پورے نہیں کر سکتے، اقبال مذہب پرست ہیں۔ خدا پرست ہیں انسانی سیرت کی تشکیل و تعمیر میں "روحانی اور اخلاقی قدروں" کی اہمیت پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کے دل میں، ان کے فلسفے کے دل میں مذہبی روحانیت "صحت مند کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے فلسفے کے نبض کی ہر جنبش "عملی مذہبیت" کی منت کش معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اقبال کی سرمایہ دشمنی اور مارکس کی اشتراکیت کی راہیں ایک نہیں ہو سکتیں اور نہ ان پر چل کر ایک ہی منزل حاصل ہو سکتی ہے۔ اقبال میں سرمایہ پرستی کی مخالفت قرآنی راستوں سے آئی ہے وہ صاف کہتے ہیں۔

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو
لن تنالوا البر حتی تنفقوا
پیشِ قرآں بندۂ و مولا یکیست
بوریا و مسندِ دیبا یکیست

یہ سچ ہے کہ اقبال مارکس اور لینن کا احترام کرتا ہے اور ان کے نظریات کے وزن کو مانتا ہے لیکن وہ اپنے کو ان مادی مفکرین کا اس بارے میں ہمنوا بنا ہی نہیں سکتا کہ معاشرے کے نظام کی بنیاد صرف شکمی شور و فریاد پر رکھی جائے۔

اس سلسلے میں یہ حکیم شاعر مارکس کی مفکرانہ عظمت رکھتے ہوئے کہتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک
جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

اشعار بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کی مفکرانہ عظمت کے اعتراف کے باوجود اقبال کو اس کے فلسفۂ اشتراکیت کے "مساوات شکم" کے بنیادی پہلو سے اختلاف ہے ان کی نگاہ حق شناس میں اس پیغمبر حق ناشناس کے دین کا اصلی نقص یہی ہے کہ اس کی اساس "مساوات شکم" پر قائم ہے۔

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اس میں شک بھی کیا ہے کہ حقیقی طور پر زندگی کے مظاہر میں مفید انقلاب اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے

جبکہ وہ دلوں کی پاکیزگی کے راستوں سے آئے مساوات شکم کے دباؤ سے جو انقلاب وجود میں آتا ہے وہ کسی طرح انسانیت کے لئے تسکین کا باعث نہیں ہوسکتا۔ وہ انقلابی مزاج جو آب و گل اپنی ساخت اپنے ماحول کے لحاظ سے "روحانی قدروں سے" کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو اس سے انسانیت کے دُکھ درد کا مستقل مداواں مل ہی نہیں سکتا۔

یہ امر بالکل درست ہے کہ سرمایہ داری کا جو نظام قائم ہوگیا ہے وہ از سرتاپا معصیت پیدور ہے۔ اس نظام نے اپنے کو انسانی اور اخلاقی اقدار سے مکمل طور پر بے نیاز بنالیا۔ اس کا کام صرف غریبوں کو کچلنا اور ان کی محنتوں کے نتائج سے چند چالاک اور موقع پرست اشخاص کے لئے آسائشیں مہیا کرنا رہ گیا۔ سرمایہ داری کی ظالمانہ دست درازیوں کی یہ صورت حال برابر برداشت نہیں کی جاسکتی تھی اس کے خلاف ردعمل ہونا ناگزیر تھا۔ "مارکسی اشتراکیت" اس زوردار رد کا زوردار جنبہ ہے علامہ اقبال اشتراکیت کی یہ نوعیت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے مارکسی اشتراکیت کو سرمایہ داری کا لازمی ردعمل سمجھ کر اس کی انجذ ہنگامی افادیت کا اعتراف مختلف لہجوں میں کیا ہے۔ چنانچہ ضرب کلیم میں "اشتراکیت" کے عنوان سے اسی تاثر کے تحت چند شعر مرحوم نے لکھے ہیں۔ ان میں کا پہلا شعر یہ ہے

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی گفتار

لیکن اس اعتراف سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ وہ مارکسی تحریک کو موجودہ تمدنی آزار کا صحیح علاج سمجھتے تھے۔

جیسا ابھی عرض کیا گیا ہے ان کی نگاہوں میں اس انقلابی تحریک کے بنیادی نقائص واضح طور پر موجود تھے وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جو "انقلاب" مذہب اخلاق کی طرف سے منہ پھیر کر آئے گا جو دلوں کو پاکیزہ بنانے کا قابل نہ ہوگا جو مادی مطالبوں کا پورا کرنا ہی اپنا مدعا سمجھے گا وہ بہت جلد سرمایہ داری کی خرابیاں اپنے میں نمایاں طور پر پیدا کرے گا اور انسانیت کے لئے جلد اسی قسم کی دوسری تکلیفوں کا ساماں بن جائے گا۔

اسی خیال کے تحت علامہ اقبال نے پیغمبرانہ شعوروں سے کہا ہے

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جن ممالک میں "زمام کار" مزدوروں کے ہاتھوں میں آگئی وہاں انھوں نے بھی اچھی طرح "پرویزی حیلے" سیکھ لئے، وہی سیاسی جوڑ توڑ، وہی ہمسایہ ممالک پر حریص آز کی نگاہیں، وہی تحریر و تقریر کی پابندیاں، اپنی جماعت کے سوا دوسری تمام جماعتوں کو شودر کی حیثیت دے دینا۔ مخالفین کے ختم کرنے کے لئے سازشوں کے جال ہر طرف پھیلا دینا، غرض سرمایہ دارانہ نظام کی وہی سب ادائیں ہیں بلکہ بعض سمتوں میں اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ایک چیز اور ہے جو اقبال کو مارکسی رنگ کا اشتراکی بننے ہی نہیں دے سکتی تھی۔ اقبال فلسفۂ خودی کے مؤسس تھے، ان کا خیال تھا۔

تو کہ از نور خودی تابندۂ
گر خودی محکم کنی پایندۂ
زندگی از طوف دیگر رستن است
خویش را بیت الحرم دانستن است
آفتاب استی یکے در خود نگر
از نجوم دیگراں تابے مخر

ترشی از شیشۂ خود بادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

جس فلسفہ میں اس شدت احساس "انا" کا نام زندگی ہو اس سے لپٹی ہوئی "انفرادیت" اپنے مخصوص دشمن "مارکسی اشتراکیت" کی جماعتیت میں فنا ہوجانا کیونکر گوارا کر سکتی ہے۔ اس لئے اس تصور سے زیادہ کوئی دوسرا تصور غیر فطری نہیں ہوسکتا۔ اشتراکیت تو ایک طرف وہ تو جمہوریت کی بھی تاب نہیں لاسکتی۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اصل یہ ہے کہ اقبال فلسفیانہ فکر و نظر کا مالک شاعر ہے اس کی شاعری کے بربط و رباب سے زندگی کی سچی تنقید کرنے والے نغمے ہی نکل سکتے ہیں۔ اب وہ زندگی کسی کی ہو کہیں کی ہو وہ "پرولتاری زندگی" ہو یا "بورژوائی زندگی" وہ مزدور کی زندگی ہو یا سرمایہ دار کی۔ وہ "محرم راز درون میخانہ" ہے۔ اس کی نگاہ میں انسانی زندگی کے تمام پہلو ہیں۔ اس کی نظر اپنے چاروں طرف ناقدانہ پڑتی ہے اس لئے اس کی شاعری اس کے فلسفے کے ناپنے کے لئے اشتراکی و فسطائی پیمانوں سے زیادہ وسیع پیمانوں کی ضرورت ہے جس مرد حق آگاہ کے سامنے زندگی کے دل و دماغ کے تمام گوشے موجود ہوں اس کی شاعری کو اس قسم کے تنگ پیمانوں سے ناپنا سادہ لوحی ہے۔

باہر کی دنیا

(بسلسلہ صفحہ ۶)

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ برطانیہ کے چند جہاز کو جو یانگ سی میں تھے نقصان ہوا اور برطانیہ کو اس کی شکایت ہے کہ کمیونسٹ فوج کی توپوں نے ان جہازوں پر خواہ مخواہ گولہ باری کی۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ اس میں قصور ان جہازوں کے افسروں کا ہے۔ بہرحال کمیونسٹ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھیں غیر ملکیوں کی کوئی پروا نہیں اور غیر ملکیوں کو جنگ کے دوران میں ایسے نقصان سے جیسا کہ برطانیہ کو ہوا ہے بچایا نہیں جاسکتا۔ برطانیہ اور کمیونسٹوں کی طرف سے جو کچھ اس سلسلے میں کہا جائے گا وہ آئندہ کی فضا پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ہمیں یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ دونوں میں دشمنی ہوگئی ہے۔ برطانیہ متحدہ ریاستوں سے بھی پہلے چین کی قومی حکومت کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا، اور قومی حکومت کے رہنماؤں کی بدنیتی اور نالائقی اس طرح ثابت ہوچکی ہے کہ اب متحدہ ریاستوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ قومی حکومت کی مدد کرنے میں جو روپیہ خرچ ہوا ہے اُسے بٹے کھاتے میں ڈالنے کے بجائے کچھ اور خرچ کرکے لاگت سے تھوڑا بہت وصول کرنے کی کوشش کی جائے۔

ویٹ نام میں کیا ہو رہا ہے؟

چین کی کمیونسٹ تحریک ۲۵، ۲۶ برس پرانی ہے۔ ویٹ نام میں اتحاد اور آزادی کی تحریک کو ابھرنے کا موقع ۱۹۴۵ء میں ملا۔ جب جاپانیوں نے ملک کو چھوڑتے وقت جنگ کا پورا سامان قومی لیڈروں کے حوالے کردیا۔ ہوچی منہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تحریک ترقی کرتی رہی اور اب ایک دو شہروں کے سوا باقی ملک میں فرانسیسیوں کی حکومت وہیں ہوتی ہے جہاں وہ فوج لے کر پہنچ جاتے ہیں اور یہ حکومت اتنی ہی دیر تک رہتی ہے جتنی دیر تک فوج رہتی ہے۔ ویٹ نامیوں نے ربڑ کے درختوں کی چھال اتار کر ربڑ کے کاروبار کو بہت نقصان پہنچایا ہے چاول کی تجارت بہت کم ہوگئی ہے اور فرانسیسیوں کو فائدے کے بجائے ویٹ نام پر قبضہ رکھنے کے لئے اپنی جیب سے کافی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی فرانسیسی اس آبادی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں اب ایک آخری تدبیر سوچی گئی ہے کہ شہنشاہ باؤڈائی کو جو تخت سے اتار دئے گئے تھے پھر واپس بھیجا جائے۔ مگر شہنشاہ بھی حالات سے اتنے بے خبر نہیں ہیں کہ خالی ہاتھ جانا اور فرماں برداری کے پھندے میں کچھ نہ دینا پسند کریں۔ انھوں نے اپنی قوم کی طرف سے کچھ مطالبے کئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ منظور ہوجائیں گے۔ فرانسیسیوں نے اپنے وعدوں پر عمل نہ کیا اور باؤڈائی کو خالی خولی ٹال دیا تو اس سے قومی تحریک کو اور ترقی ہوگی۔

امن عالم کے لئے تہذیب اور سائنس کے علم برداروں کی کانفرنس

صابرہ زیدی (نیویارک)

۲۶ مارچ ۱۹۴۹ء کی شام کو، جنگ ــــ کے حامیوں، امن و جمہوریت کے دشمنوں اور سامراجیت کے ٹھیکیداروں کی مخالفانہ چیخ پکار کے درمیان نیویارک میں علم و فن کے ترقی پسند علم برداروں نے عالم گیر امن اور باہمی دوستی کی وہ سریلی تان چھیڑی جس نے دنیا کے ہر گوشے میں امن پسندوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ یہ آواز پُر خلوص تھی ــــــ اور پُر خلوص ــــــ اس لئے اتنی کامیاب ہوئی.......

اس کانفرنس میں حصہ لینے والے مختلف مذہبی اور سماجی عقائد رکھتے تھے، لیکن امن اور دوستی کا پیغام کانفرنس کا مرکزی پیغام تھا۔ شروع سے آخر تک تمام مقرروں کی اپیل یہی تھی کہ امن اور اخوت کے حامیوں کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے تاکہ دنیا جنگ کے ہولناک خطرے سے آزاد ہو سکے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ ایک تیسری عالم گیر جنگ انسانی فکر و محنت کی تمام تخلیقات علم و فن کلچر اور تہذیب ــــــ یہی نہیں بلکہ پوری انسانیت ــــ کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنگ کا خطرہ کس سمت سے آگے بڑھ رہا ہے اور زیادہ تر نمائندوں نے کم و بیش زور اور صفائی کے ساتھ جنگ کے علم برداروں کا پول کھولا اور اپنے اپنے طور پر بتایا کہ آج اہل علم کا کیا فرض ہے۔ ابتدائی سیشن میں زیادہ تر امریکی نمائندوں کی تقریریں تھیں۔ پروفیسر شیلے نے افتتاحی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے بین الاقوامی دوستی کی ضرورت پر زور دیا۔ ترقی پسند قانون داں او۔ جان۔ روگی نے امریکہ کی خارجی اور اندرونی پالسی کا گہرا تعلق ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ جس شدت کے ساتھ امریکی حکومت اعصابی جنگ میں مصروف اور اس طرح اصلی جنگ کی طرف قدم بڑھا رہی ہے اسی شدت سے امریکہ میں بنیادی شہری آزادیوں کو کچلا جا رہا ہے۔ امریکہ کی جارحانہ پالسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ہر قسم کی مخالفت اور ہر ترقی پسند تحریک پر قیدیں لگ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں روگی نے کئی مناسب مثالیں دیں۔ جرنلسٹ تھیکرے نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ روس اور امریکہ دونوں کو ایک حد تک ذمہ دار رکھتے ہیں، لیکن زیادہ قصور امریکا کا ہے۔ مثال کے طور پر تھیکرے نے اٹلانٹک پیکٹ کو پیش کیا۔ بشپ موولٹن نے بھی امن عالم کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ مذہب اس سلسلے میں بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے ....

یہ تمام مقرر پُر خلوص لوگ تھے۔ گو ان میں سے بعض سرچشمہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کا واضح تصور رکھتے ہوں .... لیکن اس سیشن کی جان تھی کیوبا کے محبوب شاعر اور عالم نکولس گیولن کی تقریر جس کا عنوان تھا "آج کی دنیا میں آرٹسٹ کا حصہ"۔ گیولن کے ہر ہر لفظ میں زور تھا، خلوص تھا اور صداقت تھی۔ اس کی تقریر دل سے نکلی تھی اس لئے دل میں گھر کر گئی۔ اس کی گہرائی نگاہ نے سوز دل کے ساتھ مل کر اس کی تقریر کو لافانی بنا دیا۔ "آرٹ کی بنیاد انا پرستی پر ہرگز نہ ہونی چاہیئے ــــــ ہو ہی نہیں سکتی ــــــ سچا آرٹ کبھی خالص تخلیق کی چار دیواری میں مقید اور ہر قسم کی انسانی "حیوت" حیات سے پاک اور بے نیاز نہیں رہ سکتا، ہیٹی کے بلند مرتبہ فرزند ترک رولان نے شاعری کے لئے جو کچھ کہا وہ تمام آرٹ پر صادق آتا ہے۔ شاعری رولان کے نزدیک محض ایک خاص عینی جوہر" نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ عام بول چال میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دور کی ترجمانی کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شاعری سماجی تعلقات کی جدلی پیچیدگیوں کی اور کسی سماج کی ارتقا کے ایک مخصوص لمحے میں اس کے سیاسی اور سماجی نظام کے تضاد اور اندرونی اختلافات کی عکاسی کرتی ہیں .... ایک صدی پہلے شاید فن کار کا "شیش محل" بندوق کی گولیوں سے بچ سکتا تھا۔ آج بمباری کے بعد اس کا نشان بھی نہ مل سکے گا .... وہ فن کار جو خود کو اپنے دور کی جد و جہد سے بالاتر سمجھتا ہے اور زندگی کے اس سخت تلاطم کو جو اس کے پاس سے گزرتا ہے، بے نیازانہ طور پر دیکھتا ہی اپنے بلند مقصد کے ساتھ غداری کا مجرم ہے .... اور وہ مقصد کیا ہے؟ عوام کے ساتھ مل کر انسانوں کی اخوت اور دوستی کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور سنوارنا کہ اس کے بغیر ذہنوں کا اتصال ناممکن ہے ــــ اور ذہنی اتصال کلچر اور تہذیب کی بقا کے لئے ناگزیر ہے! ...."

ہنگیرین ڈیلیگیشن نے کانفرنس کے لئے مندرجہ ذیل پیغام بھیجا تھا" مادی لحاظ سے ہم آپ لوگوں سے دور ہیں مگر ہماری روحیں آپ کے ساتھ ہیں، ہم آپ کو، نیویارک کو، امریکہ کو اور تمام دنیا کے امن پسندوں کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم امن و ترقی کی راہ میں ہر کوشش کے لئے تیار ہے .... ہم ہنگیرین کلچر کے نمائندے میدان امن کے امریکی مجاہدوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں .... ہنگیرین کلچر کے علم برداروں کا عقیدہ ہے کہ قوم اور انسانیت کی راہ میں دنیا کے کروڑوں محنت کشوں کے دوش بدوش اپنی پوری قوت کے ساتھ امن عالم کے لئے جد و جہد کرنا، ان کا سب سے مقدس فرض ہے۔"

کانفرنس کے ابتدائی سیشن کے بعد مختلف ذیلی مجلسوں میں تقسیم ہو گئی اور دو دن تک برابر سائنس، تعلیم، سماجی اور اقتصادی علوم آرٹ اور ادب پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا .... مذہب تعمیری صنائع اور ذہنی اور جسمانی صحت کی بھی الگ مجلسیں تھیں۔ علاوہ خاص نمائندوں کے حاضرین کو بھی اظہار خیال کے موقع دئے گئے اور سوائے چند لوگوں کے جو ارادتاً بدنظمی پیدا کرنے کے لئے آئے تھے سب نے سنجیدگی اور معقولیت سے کانفرنس میں حصہ لیا۔

تعلیمی مجلس میں واشنگٹن یونیورسٹی کے تین پروفیسر شامل تھے جنہیں باوجود قابلیت اور صلاحیت کے محض ترقی پسند خیالات رکھنے کی بنا پر یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ انھوں نے سادگی کے ساتھ اپنے کیس پیش کئے اور بتایا کہ خیالات پر قیدیں لگانے کا نتیجہ کس قدر مہلک ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈی بوائز صدر ــــ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا "امریکہ جنگ کی راہ میں گامزن ہے .... لیکن امریکی عوام باقی دنیا کے عوام کی طرح امن کے خواہاں ہیں......... اگر ہم امن چاہتے ہیں تو ہمیں امن کی جستجو کرنی چاہیئے جنگ کی نہیں .... امریکہ کے بہت سے حصوں میں امن کی تعلیم دینے والوں کو خاموش کیا جا رہا ہے یا دھمکیاں دی جا رہی ہیں .... یہ امر معنی خیز ہے کہ جنگی ہسٹیریا کے اس دور میں جنگ کے مخالفوں پر حملے کا مرکز ٹریڈ یونین اور اسکول ہیں ٹھیک انھیں میدانوں میں ہٹلر نے بھی اپنی زباں بندی کا پروگرام شروع کیا تھا .... چیکوسلاواکیہ کے نمائندے یان بور نے اپنے ملک کے تعلیمی کارکنوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "ہماری تعلیمی کوششوں کی منزل صاف ہے ــــــ ایک بہتر زندگی اور زیادہ پُر مسرت دنیا کی صبح کو بروئے کار لانا .... ہم اس کی تخلیق میں برابر مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری امن کی کوششیں پُر خلوص ہیں اور انسانی برادری کی تعلیم حقیقی اور بامعنی .... ہم امن و اتحاد کے حامیوں کی مدد کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے .... اس لئے ہم اپنا حمایت کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتے ہیں اور ترقی پسند امریکہ کا بڑھا ہوا دوستی کا ہاتھ پکڑتے ہیں"۔ پولینڈ کے نمائندے نے دوران جنگ کی "زمین دوز" یونیورسٹیوں کا ذکر کیا۔

سائنس کی مجلس میں ایک ہندوستانی ریاضی داں پروفیسر کسم بی سنے ایشیا کے عوام کی غربت کا ——— جو صدیوں کی غلامی اور فرسودہ نظام کا نتیجہ ہے ——— ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں مشکل الفاظ نہیں استعمال کرنا چاہتا، میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایشیا کی ابھرتی ہوئی، نوجوان جمہوریتوں کی طرف سامراجی طاقتیں نظر عنایت نہ کریں تو بہتر ہے۔ علم حیاتیات کے ایک پروفیسر نے جو ایٹمی جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تیسری جنگ عظیم انسانیت کو بالکل تباہ کر دے گی۔ انھوں نے بزور کہا کہ سائنس دانوں کا فرض ہے کہ جنگ کی تیاریوں کے خلاف آواز بلند کریں۔ چکوسلاواکیہ کے نمائندے کی تقریر بہت جامع اور پُرمغز تھی۔ انھوں نے سائنس کے سماجی تعلق سے بحث کی اور بتایا کہ ایک اشتراکی ملک میں کس طرح سائنس انسانیت کی خدمت کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ فلسفۂ جدلی مادیت کس طرح سائنس کی ارتقا میں اور سائنس کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی مثالیں دینے کے بعد انھوں نے اخوت اور امن کے شعر پر اور سائنس دانوں کے تعاون کی اہمیت پر اپنی تقریر ختم کی۔ ہنری والس، سابق وائس پریذیڈنٹ اور پراگریسو پارٹی کے امیدوار نے نراوائی کی سائنس کے موضوع پر تقریر کی جس میں سوویٹ سائنس داں لائی سنکو کے اکثر نظریوں سے اتفاق کا اظہار کیا اور سائنس کے تخریبی پہلو کے برخلاف اس کے تعمیری پہلو پر زور دیا۔ والس کا پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم ہوا۔ سوویٹ سائنس داں اے او پارن نے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں سوویٹ یونین کے تمام سائنس دانوں کی طرف سے کانفرنس کا خیر مقدم کرنے کے بعد ایک بہت صاف اور سلجھی ہوئی لیکن بہت گہری تقریر میں سوویٹ سائنس دانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا .... بعض نام نہاد سائنس دانوں کی خواہش ہے کہ اپنے اور باقی دنیا کے درمیان اپنے دارالعمل کی دیواریں حائل کر دیں اور اپنے شیش محل میں بیٹھے ہوئے تخلیق محض کے عمل سے محظوظ ہوا کریں ——— بغیر اس کا خیال کئے کہ ان کی تخلیق کا انسانیت پر کیا اثر پڑ رہا ہے .... لیکن ایسی خواہش سچے سائنس داں کی شان کے خلاف ہے .... ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف ایک حقیقی جمہوری ریاست ہی میں سائنس انسانیت کی مسرت اور ترقی میں اضافہ کر سکتی ہے، یعنی صرف اسی صورت میں جبکہ سائنس منافع خوری اور معاشی لوٹ کے لئے وقف نہ ہو .... دنیا کے کروڑوں سیدھے سادے عوام جنگ و غارت گری کے خلاف ہیں۔ لہٰذا سائنس کا جمہوری اور عوامی کیریکٹر ہی اس بات کا ضامن ہو سکتا ہے کہ وہ انسانیت کی خدمت میں استعمال ہوگی .... آج ہم جائز فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس صحیح معنی میں عوام کی ملکیت ہے۔ نوجوان سوویٹ سائنس دانوں کی اکثریت جفاکش کے فرزند ہیں .... باہمی تعاون سائنٹفک دریافتوں اور ایجادات کی قیمتی روایات میں سے ہیں۔ اور دنیا کے سائنس دانوں کے ہاتھوں میں امن عالم کو مضبوط کرنے اور بین الاقوامی تعاون کو بڑھانے کے بڑے بڑے اچھے مواقع ہیں۔ ...... ہم ترقی پسند امریکی سائنس دانوں ——— اور دنیا کے سائنس دانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو باہمی تعاون اور اخوت کے حصول کے لئے وقف کر دیں ...... آیئے ہم سب اپنی صلاحیتوں کو متحد کر کے اور سائنس کی تمام قوتوں کو ساتھ لے کر ان انسان دشمنوں کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جائیں جو ایک تیسری جنگ عالم گیر کی چنگاری کو ہوا دے رہے ہیں ......"

غرض یہ کانفرنس ——— جو مخلص اور ترقی پسند امریکیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور جسے غیر ملکی مہمانوں نے چار چاند لگا دئے ——— بہت کامیاب رہی۔ کامیاب صرف اسی معنی میں نہیں کہ حاضرین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بھی کامیابی کا ایک ثبوت ہے، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کانفرنس کا پیغام مدت تک لوگوں کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ مختلف قوموں کے اہل علم نے مل کر اپنے فرائض کے متعلق بحث و مباحثہ کیا اور وہ جن نتیجوں تک پہنچے وہ آج سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ صحت مند نظر آتے ہیں۔ امن عالم، جمہوریت اور آرٹسٹ کا گہرا تعلق وہ حقیقت ہے جسے مشکل ہی سے جھٹلایا جا سکتا ہے۔

(طویل مضمون کا خلاصہ)

بچے کی پرورش اور تربیت

سید محمد حسنین

یہ کچھ بہت پرانی بات نہیں جب ہر جگہ یہ عقیدہ عام تھا کہ سب والدین اپنے بچوں کو تربیت و تعلیم دینے کی فطری یا موروثی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو ایسے لباس پہنائے جاتے اس طرح رکھے جاتے اور پھر اس انداز سے ان کی دیکھ بھال کی جاتی جیسے پیشتر محل کے نازک کانچ کا ٹوٹنا ہو۔ بچوں کو موسم کی تیزی، فضا کی تازگی فرحت، ہوا کی تندی و گرمی اور فطرت کے دوسرے مظاہر سے محض اس لئے دور رکھا جاتا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ روتے بچے کو مٹھائی دے کر چپ کرنا، ناراض بچے کو خوف و ہراس دلا کر آمادہ کر لینا کھیلتے بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر مکتب بھیجنا۔ غرض ہم انھیں اپنی مرضی کے مطابق سرکس کا سدھا ہوا جانور بنا دیتے ہیں۔

ایک روشن خیال قوم میں یہ باتیں اب نادانی اور جہالت تصور کی جاتی ہیں۔ ننھے بچوں کو اب ان کی طبیعت اور رفتار کے مطابق آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اب نہ صرف ہم انھیں کھلی ہوا میں سوتا چھوڑ دیتے ہیں۔ باغ اور میدانوں میں بلا روک ٹوک کھیلنے کودنے کی اجازت دیتے ہیں بلکہ انھیں دھوپ ہوا اور بارش میں کھلے بدن دوڑتے پھرنے سے بھی بے وجہ منع نہیں کرتے۔ بچے کو قابو میں لانے کے لئے اب ہم مٹھائی اور کھلونوں کے جھوٹے وعدوں، شرواچپاتی اور بھوک کی دھمکیوں، گھڑکیوں یا تھپکیوں سے کام نہیں لیتے بلکہ آزادانہ اپنی ارد گرد کی دنیا سے خوگر ہونے کا موقع دیتے رہتے ہیں۔ اس کے نشو و نما میں طبیعت کا میلان فطری رجحان، گرد و پیش کے اثرات، تربیت میں ہوشیاری، سلوک میں نرمی و محبت سب سے زیادہ مفید و معاون خیال کی جاتی ہے۔ اس طرح بچہ روز بروز تندرست توانا اور شگفتہ ہوتا جاتا ہے۔ بچے کے لئے مفید اور کامیاب والدین ہم انھیں کو تصور کرتے ہیں جو اپنے بچے کی تربیت و تعلیم میں روایتی اور فرسودہ طریقۂ نگہداشت کے بجائے نئے صحت بخش اور سائنٹیفک اصول سے کام لیتے ہیں۔ علم کی ترقی اور ذہن کی بیداری نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہمارے بیشتر پرانے طور طریقے اور روایتی انداز و روش اور خاندانی رسم و رواج سراسر ناقص، غلط اور جہالت پر مبنی ہیں۔ اب ہم بچوں کی پرورش ان کے کھیلنے کودنے، کھلانے پلانے، پہنانے اوڑھانے سکھانے پڑھانے اور اس کی تربیت و تعلیم میں ان فرسودہ طریقوں کے بجائے سائنس سے برابر مدد لیتے رہتے ہیں۔

ہندوستان میں اکثر لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ بچے کو خوش و خرم رکھنے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور نہ کبھی اس راستے پر انھیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا بچہ خوش و خرم رہے۔ اس کا بچپن کھیل کود ہنسی مذاق اور بے فکری میں گزرے لیکن نادانی تو یہ ہے کہ اس کی عقل اور اس کی حرکات و سکنات اور کاموں کو اپنی عقل اور اپنے کاموں کے معیار پر جانچنے لگتے ہیں اور بجائے اس کے کہ بچے کے کاموں اور اس کی حرکات کو اس کی سوجھ بوجھ اور دماغ کے معیار سے دیکھیں یہ توقع کرتے ہیں کہ بچہ ان کی جیسی فہم و فراست، متانت و سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کا نمونہ پیش کرے بھلا چند ماہ کی عمر والے بچے کے چھوٹے سے دماغ سے ایسی دانائی و بلندی ممکن ہے؟ بے چارہ معصوم بچہ ہماری یہ متوقع باتیں کہاں سے لا سکتا ہے؟ بچے سے اپنی خواہش اور امید کے خلاف باتیں سرزد ہوتی دیکھ کر والدین کو بڑی کوفت ہوتی ہے اور بیشتر مغلوب الغضب والدین بچوں کی ان خلاف توقع باتوں کی وجہ سے بسا اوقات آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اس ننھی سی معصوم جان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

بچوں سے خفگی اور غصہ کرنے کا رواج عام ہے اور یہ بات کچھ فطری بھی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنی اس ذہنی کیفیت کا تجزیہ کریں تو آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بیشتر ان کاموں میں جن میں آپ بچوں کو ملزم گردانتے ہیں درحقیقت آپ ہی ملزم ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کے آراستہ اور مزین ڈرائنگ روم کے پھولوں سے سجے ہوئے گلدان کو آپ کا بچہ صاف ستھرے قالین پر گرا کر چکنا چور کر دیتا ہے یا آپ کے باورچی خانے میں گھس کر وہ دھر اُدھر سوجی کی بنی ہوئی بہترین اور لذیذ فیرینی میں مٹھی بھر نمک جھونک دیتا ہے۔ اب آپ اس کو یہ سمجھ کر ڈانٹتے ہیں کہ یہ اس کی شرارت یا طبیعت کا نقص ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ بچے کی اس غلطی کے ذمے دار خود ماں باپ ہیں۔ پھر اگر آپ اس کی اس حرکت پر کوئی سزا دیتے ہیں تو آپ ملزم کے ساتھ ساتھ اخلاقی مجرم بھی ہو جاتے ہیں جس کا معاف کرنے والا منصف صرف آپ کا ننھا بچہ ہو سکتا ہے۔

"اگر کوئی شخص علم تشریح الابدان کے مطالعے سے پہلے عمل جراحی شروع کر دے تو ہم اس کی بے باکی اور دیدہ دلیری پر حیران رہ جائیں گے اور اس کے مریضوں پر ترس کھائیں گے، لیکن اگر والدین بغیر ان کے جسمانی، اخلاقی یا عقلی اصولوں پر ذرا بھی غور کئے جن پر ان کو کاربند ہونا چاہئے تربیت اطفال کے مشکل کام کو شروع کر دیں تو ہم کو ان کی مظلوم اولاد پر رحم آتا ہے۔"

(ہربرٹ اسپنسر)

بچوں کی ضرورتوں، حاجتوں اور دلچسپیوں کو جانے اور سمجھے بغیر والدین کو ہرگز بچوں کی تربیت کی سعی نہ کرنی چاہئے۔ ننھے بچوں کو پالتو جانور سمجھنا حماقت ہے، اور والدین کا اپنی پسند و مرضی کے مطابق انھیں مشین کی طرح چلانے نہایت سخت مہلک۔ یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ہر بچہ اپنی جبلت کے اعتبار سے دوسرے بچے سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح بچے کا اپنے والدین کی فطرت سے جدا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

بچوں سے قریب ہونا اور دوستی پیدا کرنا اصول تربیت اطفال کا پہلا سبق ہے۔ بچوں کو ہمیشہ ہمدردی اور محبت کی سخت حاجت رہتی ہے اور اس کو سب والدین اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بچوں کو ہماری عقل، توجہ اور دیکھ بھال کی بھی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ والدین اپنی اولاد سے محبت کرنا تو جانتے ہیں پر بچوں سے دوستی پیدا کرنا نہیں جانتے۔ یہی وہ سب سے بڑی خامی ہے جو ہمارے تقریباً ننانوے فی صدی والدین میں نمایاں نظر آتی ہے۔

ہریجن کا ہفت

(بسلسلہ صفحہ ۲)

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لئے
کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
"پیشِ خورشید بر مکش دیوار
خواہی از صحنِ خانہ نورانی"

(اقبال)

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:- ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم، ۱۶، ۲۲

چندہ سالانہ ... ششماہی ...

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے۔

سالانہ ... ... دس روپے

ششماہی .. .. ساڑھے پانچ روپے

فی پرچہ .. .. چار آنے

منیجر

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی دہلی لے جامعہ

مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ نمبر ۱۸ | ۸ مئی سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستان کی تلاش

جواہر لال نہرو

فکر و عمل کے اس دور میں جس سے میں گذر چکا ہوں میرے ذہن پر ہندوستان کا خیال چھایا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ ہندوستان کیا ہے اور مجھے اس سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس وقت اپنے ملک کا جو مبہم تصور میرے ذہن میں تھا اس میں بعد کے تجربات سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ تصور کبھی کبھی ہلکا پڑ جاتا تھا مگر مٹتا کبھی نہ تھا۔ یہ پرانی روایات اور نئے واقعات کا ایک عجیب معجون مرکب تھا جو میرے دل میں فخر کے جذبے کے ساتھ ساتھ ندامت کا احساس بھی پیدا کرتا تھا۔ اپنے ماحول کی بہت سی چیزوں مثلاً توہم پرستانہ رسوم، فرسودہ خیالات خصوصاً غلامی اور افلاس کی حالت پر مجھے شرم آتی تھی۔

جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا اور جب میں آزادی کی جد و جہد میں شریک ہوا تو ہندوستان کا خیال ہر وقت میرے دل میں کھٹکنے لگا۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ یہ ہندوستان کیا چیز ہے جو میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا ہے، جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے اور عمل پر ابھارتا ہے تاکہ ہم اپنی اس مبہم آرزو کو پورا کر سکیں جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ابتدا میں شاید میرے عمل کا محرک شخصی اور قومی خودداری کا جذبہ اور یہ خواہش تھی، جو سب انسانوں میں مشترک ہے کہ ہم غیروں کو اپنے اوپر حکومت نہ کرنے دیں اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ مجھے یہ بات نہایت افسوسناک معلوم ہوتی تھی کہ ہندوستان جیسا ملک جو ایک قدیم ترین اور شاندار تہذیب کا وارث ہے ایک دور افتادہ جزیرے کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو اور اس کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ تھا کہ اس جبری تعلق نے ہمارے ملک کو انتہائی ذلت اور افلاس میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ خیال مجھے اور دوسروں کو عمل پر ابھارنے کے لئے کافی تھا لیکن اس سے ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا جو میرے دل میں کھٹک رہے تھے۔ جغرافی اور طبیعی پہلو سے قطع نظر کر کے ہندوستان حقیقت میں کیا ہے؟ گذشتہ زمانے میں وہ کن اصولوں کا علم بردار تھا اور اس کی طاقت کا کیا راز تھا؟ اس نے وہ اپنی اگلی طاقت کیسے کھو دی؟ کیا واقعی یہ طاقت بالکل جاتی رہی؟ آج کل وہ بے شمار انسانوں کا مسکن ہونے کے علاوہ کسی اور لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ جدید دنیا میں وہ کس طرح کھپ سکتا ہے؟

اس مسئلے کا وسیع تر بین الاقوامی پہلو میرے سامنے اس وقت آیا جب میں یہ محسوس کرنے لگا کہ کسی ملک کا اور ملکوں سے بے تعلق ہو کر رہنا نہ تو مناسب ہے اور ممکن ہے۔ مستقبل کا جو نقشہ میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان دنیا کے اور ملکوں کے ساتھ گہرے معاشی، سیاسی اور تہذیبی تعلق اور اتحاد عمل کے رشتے سے وابستہ ہوگا۔ مگر مستقبل سے پہلے ہمیں حال سے نبٹنا ہے اور حال کے پیچھے ماضی کا طویل اور الجھا ہوا سلسلہ ہے جس نے حال کو پیدا کیا ہے اس لئے میں ماضی کے مطالعے سے تعبیر نکالنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان سے مجھے قلبی تعلق تھا اور اس میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو خود بخود میرے دل کو گرما دیتی تھیں۔ پھر بھی میں اسے ایک اجنبی نقاد کی حیثیت سے دیکھتا تھا اور نہ صرف اس کی موجودہ حالت کو بلکہ بہت سی چیزوں کو جو پرانے زمانے کی یادگار تھیں ناپسند کرتا تھا۔ میرا نقطۂ نظر ایک حد تک مغربی تھا اور میں ہندوستان کا مطالعہ اس طرح کرتا تھا جس طرح کوئی مغربی دوست کرتا۔ مجھے یہ شوق تھا کہ اس کے خیالات اور اس کی ہیئت کو بدل دوں اور اسے جدیدیت کا لباس پہنا دوں۔ مگر اسی کے ساتھ میرے دل میں یہ شبہہ پیدا ہوتا تھا کہ میں جو یہ فیصلہ کرنے بیٹھا ہوں کہ ہندوستان کے قدیم ورثے کا بہت بڑا حصہ رد کر دینے کے قابل ہے، ہندوستان کو جانتا بھی ہوں یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی چیزیں ختم کر دینی چاہئیں اور ختم کر دینی پڑیں گی۔ لیکن اگر ہندوستان کے اندر کوئی پائدار اور قابل قدر جوہر نہ ہوتا تو اسے جو عظمت حاصل ہوئی وہ نہ ہوتی اور وہ ہزاروں برس تک مہذب زندگی نہ بسر کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ بیش بہا جوہر کیا ہے؟

میں وادی سندھ میں موہنجو دارو کے ایک ٹیلے پر کھڑا ہوا اپنے آس پاس اس قدیم شہر کے گھروں اور سڑکوں کو دیکھ رہا تھا جو اب سے پانچ ہزار پہلے ایک قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب کا مالک تھا۔ پروفیسر CHILDE لکھتے ہیں "وادی سندھ کی تہذیب ایک مکمل نمونہ ہے۔ انسانی زندگی کی ایک خاص ماحول سے مکمل مطابقت کا جو سالہا سال میں صبر اور محنت سے پیدا ہوئی ہوگی اس میں ہندوستان کا مخصوص رنگ نظر آتا ہے۔ اور موجودہ ہندوستانی تہذیب کی بنیاد اسی پر قائم ہے"۔ کیسا حیرت انگیز تصور ہے، کسی تہذیب و تمدن کا مسلسل پانچ چھ ہزار سال تک باقی رہنا اور وہ بھی جمود کی حالت میں نہیں اس لئے کہ ہندوستان برابر بدلتا رہا اور ترقی کرتا رہا۔

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہندوستان کی تلاش	جواہر لال نہرو	۱
ہریجن سکاست	ک۔ اگ۔ مشروالا	۲
اب مسلمان علمائے کرام کیا کرنا چاہئے	(اداریہ)	۲
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ہندوستان	ع، ح	۴
" پاکستان	"	۵
باہر کی دنیا	ع، ح	۶
پروفیسر ساہنی کا غم	آل احمد سرور	۷
حیات نو	آغا سکندر حیدر	۷
دو غزلیں	باقر مہدی	۷
نظیر اکبر آبادی	سید فارغ حسین	۸
دنیا بدل رہی ہے	سید تاج اللہ	۱۰
تشدد پسند گروہ	پروفیسر برہام	۱۱

ہریجن کا ست

اندھی محبّت نہیں بلکہ انصاف

ک۔ گ۔ مشرو والا

رائے پور سی۔ پی کے ایک وکیل صاحب لکھتے ہیں:

"اکولہ کے آس پاس ریلوے اسٹیشنوں کی تختیوں سے اردو ناموں کے مٹا دیئے جانے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے "اردو سے بیر کیوں؟" میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اب اردو سے پریم کیوں؟ کیا اب بھی ملک میں دو قوموں کے نظریئے کو زندہ رکھنا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو صرف ایک قوم، ایک قومی خیال، ایک قومی لباس اور ایک قومی زبان ہوگی۔ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ صوبوں میں تعلیم اور دوسری کارروائیاں صوبائی زبانوں ہی میں ہوں گی۔ کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ اردو کس صوبے کی زبان ہے؟ کیا کسی صوبے یا ریاست نے اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے آواز اٹھائی ہے؟

گو رسم الخط کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ پھر بھی ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جو ہندی کے تنہا مخالف نہیں، یہ اعلان کردیا ہے کہ قومی زبان کو ہندی کہیں یا ہندوستانی رسم الخط تو دیوناگری ہی ہوگا۔"

"اگر اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اکولہ کے آس پاس اسٹیشنوں کے نام گجراتی اور بنگالی رسم الخط میں لکھے جائیں تو پھر اردو میں لکھنا کیا ضرور؟ آخر اردو سے ہمیں اتنا پریم کیوں ہے جو دو قوموں کے نظریئے کی جڑ ہے۔"

میں اردو رسم الخط کی ضرورت یا عدم ضرورت کے سوال کو پھر چھیڑنا نہیں چاہتا۔ دونوں طرف سے اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس وقت اردو سے محبت کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال صرف انصاف اور ایمان داری کا ہے۔ میرا اعتراض تو یہ ہے کہ جب تک مرکزی حکومت رسم الخط کی بابت کوئی فیصلہ نہیں کرتی اس کا ایک محکمہ اپنے دائرہ اختیار سے باہر قدم کیوں رکھتا ہے؟ صوبائی زبانوں کو یہاں تک کہ انگریزی کو بھی چھوڑنے کا سوال تو الگ رہا ناگری کے حامیوں کو اتنی ہمت نہیں ہے کہ دوسرے صوبوں سے اپنے اپنے رسم الخط کو ترک کرنے کا مطالبہ کریں۔ یا اسٹیشنوں کی تختیوں سے رومن رسم الخط ہی کو مٹا دینے کو کہیں!

مجھے اس کی فکر نہیں کہ آئندہ اردو زبان یا اردو رسم الخط کا کیا حشر ہوگا۔ زمانہ بڑا کارساز ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں طرح طرح کی تبدیلیاں عمل میں لاتا رہتا ہے۔ زبان اور رسم الخط بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آج سے ہزار برس پہلے کے مسودوں اور کتبوں کو ماہرین کے سوا کون پڑھ سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص بھی آج کل طرح طرح کے رسم الخط کے روپ دیکھتا ہے، یہ یقین کرسکتا ہے کہ تامل اور دیوناگری براہمی رسم الخط سے نکلی ہیں؟ لیکن یہ واقعہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ براہمی، عربی اور رومن تینوں رسم الخط کی اصل ایک ہے۔ اس لئے نہ تو میں ناگری کو دیوتاؤں کا رسم الخط کہتا ہوں، نہ اردو کو شیطان کا اور نہ رومن کو چوروں کا۔ نہ یہی سمجھتا ہوں کہ اردو اللہ کی زبان ہے، دیوناگری کافروں کی اور رومن عیسائیوں کی۔ رسم الخط کو وجود میں لانے والا انسان ہے اس نے انھیں اپنی آسانی کے لئے وضع کیا ہے اس لئے اگر ساری دنیا کے انسانوں کا ایک رسم الخط ہوجائے تو میں اُسے خوش آمدید کہوں گا۔

مجھے افسوس تو نفرت اور دشمنی کے اس جذبے پر ہے جو موجودہ اردو دشمنی کی تہہ میں کام کر رہا ہے۔ "...... اب اردو سے یہ پریم کیوں؟" "کیا اس لئے کہ دو قوموں کے نظریئے کو اب بھی زندہ رکھا جائے؟" یہ "اب" اور "اب بھی" اس جذبے کی غمازی کرتے ہیں۔ میں اس بات کو کیوں مانوں کہ چونکہ سیاسی حیثیت سے ہم دو ملکوں میں بٹ گئے ہیں اس لئے سندھ، پارہا، بلوچستان، پشاور، کراچی، لاہور، ڈھاکہ اور یہاں کے رہنے والے اب میرے ہم وطن اور ہم قوم نہیں رہے؟ دو خود مختار ریاستوں کا وجود میں آجانے سے میرے خیال سے یہ لازم نہیں کرتا کہ میں ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو جو پاکستان میں رہتے ہیں اور اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں اپنا ہم وطن نہ سمجھوں۔ میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ جب کبھی ملک کے سیاسی نقشے میں تبدیلی ہو، میں اپنے وطن کے نظریے اور اس کے باشندوں کے ساتھ اپنے برتاؤ کو بھی بدلتا رہوں۔ یہ تبدیلیاں تو ان چند سیاست دانوں اور لیڈروں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو سیاست کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ عوام کو بھی اس کھیل میں گھسیٹ کر ہم نے اس کے عبرت انگیز نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ یہی وہ تنگ نظر اور خود غرض حضرات ہیں (ہندو مسلمان دونوں) جنھوں نے ہندو دھرم اور اسلام کا نام لے کر لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا۔ صرف دیس ہی کے نہیں بلکہ پنجاب اور بنگال جیسے صوبوں کو بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم کرایا۔ لاکھوں بے گناہوں کی زندگیاں تباہ کیں اور آخر کار ان کی ہوس کاریوں کا خاتمہ یوں ہوا کہ انھوں نے اس شخص کی جان لی جس نے انھیں غلامی کے پھندے سے نجات دلائی۔

اگر ایک منٹ کے لئے یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو اس وقت انڈین یونین کے مختلف صوبوں میں ۴ کروڑ مسلمان پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ایک حد تک اردو رسم خط ان تمام صوبوں میں موجود ہے۔ ناگری کو ابھی تک یہ درجہ حاصل نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ خود سنسکرت تمام صوبوں میں ناگری رسم الخط کے ذریعے سیکھی جاتی ہے۔

اردو کی حمایت میں آواز کون اٹھائے جب سب صوبوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے؟ اور چونکہ کوئی آواز نہیں اٹھا رہا ہے اس لئے کیا انیائے نیائے سے بدل جائے گا؟ کیا میں صرف اس وجہ سے اپنی آواز بلند نہ کروں کہ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا اثر ایک اقلیت پر پڑ رہا ہے؟ اکولہ میں جو شرارت کی گئی ہے وہ صرف تختیوں سے اردو نام ہی مٹانے تک محدود نہیں ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندی ــــــ مرہٹی جھگڑے کا بیج بھی بو دیا ہے۔ غالباً فاضل وکیل نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اگر ہندو اکثریت میں ہیں تو انھیں خوش اعتقادی اور دریا دلی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ پر یہ تو دریا دلی کا بھی سوال نہیں بلکہ یہ تو صرف نیائے اور ایمان داری کا سوال ہے۔

شہد کی مکھیاں پالئے

اگر آپ کو روزی کے اچھے ذریعے کی تلاش ہو تو گرام ادیوگ سنگھ (دیہی صنعتوں کی انجمن) مگن واڑی وردھا (سی۔ پی) کے اس اعلان کو غور سے پڑھئے۔

پالتو شہد کی مکھیوں کے بہت بڑے چھتے ۵۴ روپے چھتہ کے حساب سے مل سکتے ہیں۔ ان کے لے جانے کے لئے خریداروں کو خود یہاں آنا پڑے گا۔ شہد کی مکھیاں پالنے کا اور ضروری سامان بھی یہاں سے لیا جاسکتا ہے۔ تفصیل معلوم کرنی ہو تو مہربانی کرکے ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے۔

SECRETARY

A. I. V. I. A

MAGANVADI, WARDHA

ہندوستان کی تلاش (بسلسلہ صفحہ ۱)

اسے ایرانیوں، مصریوں، یونانیوں، چینیوں، عربوں، وسط ایشیا کے باشندوں اور بحر روم کے علاقے کی قوموں سے سابقہ پڑتا رہا، اس نے ان پر اثر ڈالا اور ان سے متاثر ہوا، لیکن اس کی اپنی تہذیب ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی کہ آج تک باقی ہے۔ اس قوت کا راز کیا تھا، اور وہ کس چیز سے پیدا ہوئی تھی۔

(تلاش ہند)

پچھلا ہفتہ: ا۔ ہندوستان

درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

پنڈت جواہر لال نہرو نے لندن سے روانہ ہونے سے پہلے انڈیا لیگ کی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا "چند مہینے میں ہندوستان ایک ریپلک —— ایک با اقتدار آزاد ریپبلک —— بن جائے گا۔ اس سے مراد ہے ہر قسم کی بیرونی اور اندرونی آزادی۔ اس آزادی کو کسی لحاظ سے محدود نہیں کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید ہماری علانیہ گفتگو کے علاوہ پردے کے پیچھے کوئی مخفیہ بات چیت بھی ہوئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی کیونکہ بعض کو یہ وہم ہے کہ ہم نے ویسٹرن یونین اٹلانٹک پیکٹ وغیرہ کے بارے میں گفتگو کی اور اس سلسلے میں قول و قرار ہوئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوئی"۔

پنڈت جی کے اس بیان کے بعد وہ شبہہ جو یہاں ہندوستان میں بھی بہت سے لوگوں کے دل میں کھٹک رہا تھا دور ہو جائے گا۔ لیکن بیان میں سب سے زیادہ قابل لحاظ فقرہ یہ ہے کہ ہندوستان چند مہینے میں ریپبلک بن جائے گا۔ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ جیسے ہی آئین ساز اسمبلی پورے دستور کو منظور کر چکے گی فوراً ہندوستان کے ریپبلک ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اور غالباً اسمبلی بیچ کے عرصے کے لئے کوئی صدر بھی مقرر کر دے گی۔ اس لئے کہ اگر عام انتخابات کا انتظار کیا جائے تو چند مہینے میں ریپبلک کا اعلان ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو ہمیں یقین ہے کہ سارے ہندوستان میں اس فیصلے کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ چاہے اسے قومی حمیت کہیے یا احساس کمتری سمجھیے۔ یہ ہر حال ہم لوگوں پر "ڈومنین" کی اصطلاح اور اس سے تعلق رکھنے والی دوسری چیزیں چاہے وہ رسمی ہی کیوں نہ ہوں بہت شاق گذرتی ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ ان سے جس قدر جلد پیچھا چھٹ جائے اچھا ہے۔ اس کے علاوہ خود دستوری قانون کے باہر کچھ بھی کہیں ڈومینین ہونے میں کچھ پابندیاں اور دشواریاں خصوصاً بیرونی تعلقات کے معاملے میں ضرور ہیں، اور انھیں جلد سے جلد دور ہونا چاہیے۔

آئنگر صاحب کی مہر خاموشی ٹوٹی

کشمیر کے معاملات پر اگر کوئی پورا عبور رکھتا ہے تو وہ شری گوپالا سوامی آئنگر ہیں جو ایک مدت تک کشمیر میں وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور جنھوں نے یو۔ این او میں کشمیر کا معاملہ پیش کیا تھا۔ لیکن یہ بزرگ اس قدر کم سخن اور محتاط واقع ہوئے ہیں کہ اس جمہوریت کے زمانے میں بھی جب وقت بے وقت تقریر کرنا ایک اضطراری فعل ہو گیا ہے بہت کم زبان کھولتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے کھولنی بھی پڑے تو سوچنے کی بات نہیں کہتے مگر اس وقت جب کہ وہ پنڈت نہرو کے بجائے وزیر خارجہ کے فرائض انجام دے رہے تھے کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ مہر خاموشی توڑنی ہی پڑی۔ لداخ کے بودھ باشندوں کی طرف سے جو وفد یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ وہ لوگ ہندوستان سے دلی تعلق رکھتے ہیں اور ہندوستان ہی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اس نے بقول اسٹیٹسمین یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ان کے علاقے کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے کا سوال ہو تو پھر وہ تبت کے ساتھ مل جانے کی کوشش کریں گے شری آئنگر نے ان کی یادداشت کے جواب میں فرمایا کہ اس وقت سارے آثار یہی ظاہر کر رہے ہیں کہ کشمیر کی ریاست "اپنی موجودہ شکل میں" ہندوستان کے ساتھ رہے گی اور لداخ کے پاکستان میں جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنے دل میں ذرا سا بھی اندیشہ نہ کیجیے اور سکون و اطمینان کے ساتھ موجودہ گفت و شنید کے نتیجے کا انتظار کیجیے۔ اگر عام رائے شماری ہوئی تو مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ پوری ریاست کے ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

اس کی بڑی ضرورت تھی

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جمہوری نظام حکومت کی کامیابی سراسر تعلیم پر منحصر ہے عوام میں تعلیم نہ ہو تو وہ اپنے ادیر حکومت نہیں کر سکتے۔ یہاں تعلیم سے مراد صرف لکھنا پڑھنا نہیں بلکہ آس پاس کی دنیا کو اپنے ملک اور سماج سے اپنے حقوق اور فرائض سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنا۔ بچوں کی تعلیم کے جو منصوبے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے سامنے ہیں وہ اگر پورے بھی ہو جائیں تو تعلیم کے عام ہونے میں کم سے کم پندرہ بیس سال لگیں گے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ اتنے عرصے تک ہمارے عوام کا جاہل رہنا کتنا خطرناک ہے۔ اور خود غرض یا شر پسند لوگ ان کو بہکا کر اور بھڑکا کر ملک کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو خرابیاں ہمارے ملک میں عام ہیں یعنی بدانتظامی رشوت، منافع خوری، چور بازاری وغیرہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتیں جب تک عوام میں اتنی سمجھ نہ ہو کہ وہ سرکاری ملازموں اور بیوپاریوں کا احتساب کر سکیں۔ اسی طرح اصلاح و ترقی کی جتنی تجویزیں سوچی جاتی ہیں وہ اس وقت تک عمل میں نہیں آ سکتیں جب تک عوام میں اتنی صلاحیت نہ ہو کہ ان کی قدر کر سکیں اور ان کے تقاضوں میں مدد دے سکیں۔

اس لئے بالغوں کی تعلیم پر جسے آج کل عام طور پر سماجی تعلیم کہا جاتا ہے زور دیے بغیر ہمارے ملک میں جمہوریت کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ اس حقیقت کو صوبوں کی حکومتیں مرکزی حکومت کے محسوس کرانے سے محسوس کر چکی ہیں اور اپنے صوبے میں سماجی تعلیم کا کام کر رہی ہیں یا کرنے والی ہیں خصوصاً بمبئی کی حکومت اپنے لائق مشیر تعلیم کے مشورے سے سماجی تعلیم کی ایک اچھی اسکیم چلا رہی ہے۔ لیکن اس بات کی بہت سخت ضرورت تھی کہ صوبوں کی رہنمائی اور ان کے کام میں تال میل پیدا کرنے کے لئے مرکزی حکومت بھی اپنے دائرہ انتظام میں سماجی تعلیم کا تجربہ کرے۔ خوشی کی بات ہے کہ مرکزی وزارت تعلیم نے اب اس طرف توجہ کی ہے۔ ۳۰ اپریل کو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ان سب سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جو دہلی میں بالغوں کی تعلیم کا کام کر رہی ہیں جن میں ایڈلٹ ایجوکیشن بورڈ، انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن اور ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کانفرنس میں تعلیمی کارکنوں نے سماجی تعلیم کے مسائل پر ہر پہلو سے غور کیا اور حسب ذیل فیصلے کئے:۔

(۱) جو لوگ صوبہ دہلی میں سماجی تعلیم کا کام کر رہے ہیں اور جو والنٹیر کے طور پر اس کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے تین ہفتے کے کیمپ کا انتظام کیا جائے۔ جس میں انھیں باقاعدہ ٹریننگ دی جائے۔ کیمپ کے کل اخراجات حکومت کے ذمے ہوں۔ کارکنوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے بعد سماجی تعلیم کی مہم زور شور سے شروع کی جائے۔

(۲) سماجی تعلیم کی اسکیم کو پوری طرح عمل میں لانے کی غرض سے صوبہ دہلی کے ڈائرکٹر تعلیمات کی مدد کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا جائے جس میں تعلیم بالغان کی غیر سرکاری انجمنوں کے نمائندے اور وزارت تعلیم کے نمائندے شامل ہوں۔

(۳) صوبہ دہلی میں سماجی تعلیم کا کام اس طرح کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ دوسرے صوبوں کے لئے نمونہ بن سکے۔

اب بھی ہو جائے تو غنیمت ہے

مغربی پاکستان سے جو پناہ گزین آئے ہیں ان میں سے تیس لاکھ سے زیادہ زراعت پیشہ مشرقی پنجاب میں بسائے گئے ہیں۔ لیکن زمینوں کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ ابھی تک عارضی ہے۔ یہ تقسیم زیادہ تر اندھا دھند بغیر کسی اصول کی پابندی کے ہوئی تھی بلکہ اکثر صورتوں میں تو لوگوں نے بغیر حکومت کی اجازت کے خود ہی جس زمین پر چاہا قبضہ کر رکھا تھا اس لئے بہت سے مستحق رہ گئے اور بہتوں کو اپنے استحقاق سے زیادہ زمین مل گئی۔ ایک مدت سے حکومت کی طرف سے وعدے ہو رہے ہیں کہ زمینوں کی تقسیم از سر نو ایک لمبی مدت کے لئے کی جائے گی کئی تاریخیں مقرر ہوئیں اور ٹل گئیں وزارتی جھگڑوں میں لوگ لپیٹے

(بقیہ صفحہ ...)

۲۔ پاکستان

مٹی کے کھلونے

آخر ہمارے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں بھی انگریزوں اور دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کی دوسری قوموں سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ پاکستانیوں کو مٹی کے کھلونے نہ سمجھو وہ بھی گوشت اور پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ ان کی رگوں میں بھی خون دوڑ رہا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ کے لئے تابعدار کی حیثیت سے کامن ویلتھ کے ساتھ چسپاں رہیں گے۔"

مسٹر لیاقت علی خاں نے کل کے بیان میں کامن ویلتھ کے نئے فارمولا کی تشریح کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا تھا کہ اس نئے فارمولا کے مطابق کامن ویلتھ کے تمام اعضا کو برابر کا درجہ حاصل ہوگا اور اس کے باوجود پاکستان مختار ہوگا کہ بجائے موجودہ کامن ویلتھ کا ممبر بنا رہے یا ہندوستان کی طرح جمہوریت کا درجہ حاصل کرکے کامن ویلتھ کے ساتھ چسپاں رہے یا کامن ویلتھ سے اپنے تعلقات منقطع کرے۔ اس حقیقت کے اعلان کی ضرورت ہمارے وزیر امور خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں نے بھی محسوس کی، اور کامن ویلتھ کی موجودہ ارتقائی شکل کی شان میں ایک تندو قصیدہ تصنیف فرماتے ہوئے کہہ دیا کہ پاکستان کو اختیار ہوگا کہ وہ موجودہ صورت میں کامن ویلتھ کا ممبر بنا رہے یا ہندوستان کی طرح جمہوریت بن کر اس میں شامل ہو یا اس سے الگ ہو جائے۔

مسٹر لیاقت علی اور چودھری ظفر اللہ خاں کے یہ بیانات احساس کمتری کا نتیجہ ہیں اور جو کچھ ہوا اس پر ان کے دلی اضطراب کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے قلوب کی کیفیت کچھ یوں نظر آرہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کی بڑی سرکار کی بارگاہ میں ان کی نیازمندیوں کی اتنی قدر نہیں جتنی پنڈت جواہر لال نہرو کے ناز کی قدر ہو رہی ہے۔ لندن والے پاکستان کو تو گھر کی مرغی باگھر سے کی چھنی سمجھ رہے ہیں لیکن ہندوستان کو وہ ہر قیمت پر کامن ویلتھ کے دائرے میں شامل رکھنے کی خواہاں ہیں۔ اور دیکھنا ہے کہ کہاں تک پاسداری ہوتی ہے۔

یہ اوقات یہ خدمت پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچا کر ادا کی جاتی ہے۔ مسٹر لیاقت علی خاں اور چودھری سر ظفر اللہ خاں نے محسوس کر لیا کہ پاکستان کو انگلستان کے ملک معظم سے وفاداری کا اظہار کرنے کے باوجود کامن ویلتھ میں ضمیمہ بردار کی حیثیت دی جا رہی ہے یا اسے تابع مہمل کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے لیکن ہندوستان کی نازبرداریاں اس حد تک کی جا رہی ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی ہر بات جوں کی توں بغیر تامل مان لی جاتی ہے اور ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شامل رکھنے کے لئے ملک معظم سے وفاداری کے اظہار کی شرط بھی اٹھا دی جاتی ہے

(مغربی پاکستان، لاہور)

معاشی کانفرنس

پہلی کل پاکستان معاشی کانفرنس میں جو افتتاحی تقریر غلام محمد صاحب نے کی اور جو خطبۂ صدارت زاہد حسین صاحب نے پڑھا دونوں کا مطالعہ وہ سب لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ کریں گے جنھیں یہ خیال ہے کہ پاکستان کی معاشی بیماریوں کا جلد سے جلد علاج کرنے کی بڑی شدید ضرورت ہے۔ دونوں مقرروں نے ہمارے ملک کی موجودہ ناقابل اطمینان حالت کا تفصیل سے جائزہ لیا اور آیندہ نشوونما کے امکانات کا ایک عام خاکہ کھینچا۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ جس مقصد کے لئے پاکستان قائم ہوا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے معاشی تنظیم از سر نو بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ زراعت کی اصلاح، صنعت کی توسیع، اندرونی اور بیرونی تجارت، اور بنک کے کاروبار کی ترقی کی اہمیت بڑے پُرزور الفاظ میں جتائی اور ان مسائل کے پیش کرنے میں جو معاشی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں بڑی صاف گوئی اور خوش بیانی سے کام لیا...........

مگر اصل سوال یہ ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کیا عملی تدبیریں اختیار کی گئیں یا کی جا رہی ہیں؟ بہت سی باتیں جو ان تقریروں میں کی گئیں نئی نہیں ہیں۔ تقریباً دو سال سے ہماری قوم کے سامنے بار بار معاشی جائزے پیش کئے جا رہے ہیں جن میں ہماری معاشی خامیوں کا تجزیہ اور ان ذرائع و وسائل کی جو بالقوہ ہمارے ملک میں موجود ہیں ایک لمبی چوڑی فہرست ہوتی ہے۔ لیکن اس عرصے میں ہماری معاشی حالت ذرا بھی نہیں سدھری بلکہ بعض باتوں کے لحاظ سے اور بگڑ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم کی زندگی میں دو سال کا عرصہ بہت ہی مختصر ہے لیکن کم سے کم اس کے لئے تو کافی ہے کہ ان بحث مباحثوں اور کانفرنسوں کے بعد کوئی واضح منصوبہ بن جاتا......... چونکہ کانفرنس کے افتتاحی جلسے کے یہ دونوں خاص مقرر معاشیات کے مکتبی ماہر نہیں بلکہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ اس لئے عام طور پر لوگوں کو مایوسی ہوگی کہ انھوں نے سارا وقت ان بیش یا افتادہ مجرد حقیقتوں کو جو بار بار دہرائی جا چکی ہیں پھر سے دہرانے میں صرف کر دیا اور یہ نہ کیا کہ خود اپنے محکموں کی کارگزاری کا کچھ تھوڑا سا ذکر کرتے اور اپنی آیندہ پالیسی کی طرف کچھ اشارہ فرما دیتے۔

پاکستان کی معیشت کے ۱۸ مہینے

ابھی پاکستان کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے وجود میں آئے مشکل سے ۱۸ مہینے ہوئے ہیں۔ اس کے معاشی استحکام میں لوگوں کو بہت شبہہ تھا لیکن اس مختصر مدت میں اس نو خیز ریاست کی معاشی اور مالی حالت کے قابل اطمینان ہونے کا ثبوت مل گیا ہے اور اس سے ان لوگوں کو جو اس کے تاریک معاشی مستقبل کی پیشگوئی کیا کرتے تھے بڑی مایوسی ہوئی ہے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی ایسی تباہی مچی کہ جمی جمائی ریاستیں بھی جڑ سے اکھڑ جاتیں، لیکن نئی ریاست کے رہنماؤں کی دانشمندی اور فراست کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے نہ صرف زبردست ابتدائی مشکلات کا سامنا کیا اور ان پر غالب آئے بلکہ پاکستان کی معیشت اور مالیات کو معقول اور مضبوط بنیاد پر قائم کر دیا تھے کا منافع اور زائد ہونا مرکزی بجٹ میں توفیر تجارت کا سازگار توازن صنعت میں فرید سرمائے کا لگایا جانا پیداوار اور روزگار کا رفتہ رفتہ بڑھنا ان سب چیزوں نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان معاشی حیثیت سے محفوظ اور مستحکم ہے اور پاکستان کے باشندوں کو اپنے ملک کے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہو گیا ہے

....

(ڈاکٹر انور اقبال قریشی
مشیر معاشی۔ حکومت پاکستان)

کیا موڈی کو ہٹا دینا چاہیے؟

جمعرات کو چودھری نصر اللہ خاں سابق سیکرٹری مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے سر فرانسس موڈی کو ہٹانے کے حق میں اور نواب احسان علی خاں مالیر کوٹلہ نے اس تجویز کے خلاف بیانات دیئے۔

چودھری نصر اللہ خاں نے فرمایا:۔ "میں تہ دل سے اس مطالبے کی تائید کرتا ہوں جو سر فرانسس موڈی کو ہٹانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں پاک پنجاب اور پاکستان کا فائدہ اسی میں ہے۔ آج صوبے میں سر فرانسس موڈی کی تائید وہ حضرات کر رہے ہیں جنھوں نے مسلم لیگ کی مخالفت میں جان لڑا دی تھی۔ یہ بجائے خود اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ لیگ ان کا (موڈی کا) رہنا پسند نہیں کرتے۔ میں مرکزی حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ سر فرانسس موڈی کو واپس بلا کر اس سازش اور انتشار کو ختم کر دے جس میں پنجاب آج مبتلا ہے۔"

نواب احسان علی خاں نے کہا: "بعض لوگوں نے جن کا دامن جرم سے آلودہ ہے سر فرانسس موڈی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی اس پروپاگنڈا سے جو ارباب غرض کی طرف سے کیا جا رہا ہے گمراہ نہیں ہوگا.........

پنجاب کی نجات اسی میں ہے کہ مجرموں کو ان کے کرتوت کی سزا دی جائے اور یہ ایک غیر جانبدار انگریز گورنر ہی کی حکومت میں ہو سکتا ہے۔"

(پاکستان ٹائمز)

ہندوستان (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

مصروف تھے کہ اس کام کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اب نئے وزیر اعظم سہروردی صاحب نے یکم جون کی تاریخ نئی تقسیم کو شروع کرنے کے لئے مقرر کی ہے۔

۳۔ باہر کی دنیا

بسم اللہ تو ہوئی

روس اور مغربی جمہوریتوں کے تعلقات میں کوئی سال بھر سے ایسا پیچ پڑ گیا تھا کہ کسی طرح کھولے نہیں کھلتا تھا، اور اس سے دنیا میں مستقل امن قائم ہونے کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا ماسکو میں وزارتی تبدیلیوں کے بعد جن کی تعبیر طرح طرح سے کی گئی، کچھ امید پروروں نے دُور سے ڈور کے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید اب روس اپنی بیرونی پالیسی کو بدلنا چاہتا ہے۔ مگر اس خیال کی ہر طرف سے ہنسی اُڑائی گئی۔ جب یہ خبریں آنے لگیں کہ روس برلن کی ناکہ بندی ہٹانے پر تیار ہے تو امن خواہوں کے دلوں میں اُمید نے پھر کروٹ لی۔ مگر یورپ اور امریکا کے اخباروں نے پھر شور مچایا کہ یہ محض روس کی ایک چال ہے۔ اس نے مغربی جرمنی کی ریاست کے بننے میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا ہے۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ نیویارک میں برطانیہ، امریکا، فرانس اور روس کے نمائندوں کی باہمی گفت و شنید کے بعد متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ جرمنی میں آمد و رفت کی وہ پابندیاں جو دونوں طرف سے عاید کی گئی ہیں ہٹا لی جائیں گی۔ ابھی کچھ جزوی مسائل کا طے ہونا باقی ہے۔ اس کے بعد نئے سمجھوتے کا باضابطہ اعلان ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ناکہ بندی ہٹانے کی تاریخ ۱۲ مئی طے ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ۲۳ مئی کو چاروں ریاستوں کے بیرونی معاملات کے وزیروں کی میٹنگ ہوگی جس میں جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں سے تعلق رکھنے والے نزاعی امور کو طے کرنے کی بات چیت جو ایک عرصے سے بند تھی پھر شروع ہو جائے گی۔

غالباً اس کے بعد بھی مغربی ملکوں کے حد سے زیادہ محتاط سیاست داں اور اخبار یہی فرمائیں گے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ناکہ بندی کے ہٹنے سے پہلے اور اس کے بعد روس کے ساتھ گفتگو میں کیا کیا اُلجھنیں اور رکاوٹیں پڑیں گی۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس عرصے میں دونوں فریقوں کے درمیان اختلافات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ان کا دور ہونا آسان نہیں، لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کو دور کرنے کی کوشش جو بالکل رک گئی تھی پھر شروع ہو رہی ہے۔

یہ وطن پرستی نہیں وطن دشمنی ہے

پچھلے ہفتے چین میں کمیونسٹ فوجیں دریائے یانگ تسے کو پار کرنے کے بعد جنوب میں دور تک آگے بڑھ چکی ہیں اور کیومن تانگ کی حکومت نے ہینگ چاؤ کے اہم شہر پر قبضہ کر لیا ہے اور شنگھائی اب اس طرح گھر گیا ہے کہ اس کے بچانے کا کوئی امکان نہیں رہا اس اہم تجارتی بندرگاہ میں جہاں چین کی اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی بے اندازہ دولت جمع ہے۔ ہراس پھیلا ہوا ہے اور ابتری مچی ہوئی ہے۔ شنگھائی کے باشندے امیروں سے لے کر غریبوں تک یہی چاہتے ہیں کہ شہر کو بغیر کسی مقابلے کے حملہ آوروں کے سپرد کر دیا جائے۔ مگر کیومن تانگ کی فوجیں چیانگ کائی شیک کے حکم سے ابھی تک اس پر تلی ہوئی ہیں کہ مقابلہ کریں گی۔ چیانگ کائی شیک ایک مشہور سپہ سالار اور جنگ کے ماہر ہیں۔ ممکن ہے کہ اور باتوں میں وہ دھوکے میں ہوں یا اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہوں مگر یہ اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ وہ لڑائی ہار چکے ہیں۔ چین کے بقیہ حصے پر کمیونسٹوں کے تسلط کو چاہے تھوڑے دن تک ٹال سکتے ہوں زیادہ عرصے تک روک نہیں سکتے۔ اس لئے اب مقابلہ کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ شنگھائی کے شہر اور سارے وسطی اور جنوبی چین کو کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دینے سے پہلے جہاں تک ہو سکے برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ جب وہ عارضی طور پر پریسیڈنٹ کا عہدہ چھوڑ کر خلوت گزیں ہو گئے تھے تو عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہوا تھا کہ وہ وطن کے فائدے کو پارٹی کے فائدے اور ذاتی حب جاہ پر مقدم رکھتے ہیں اور انھوں نے صلح کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے یہ قربانی کی ہے۔ لیکن اب معلوم ہو گیا کہ یہ ان کی ایک چال تھی کہ کمیونسٹ لیڈر کی گفتگو میں اُلجھے رہیں اور اُنھیں کیومن تانگ کی فوجوں کو نئے سرے کچھ جنگ کے لئے منظم کرنے کا موقع مل جائے۔ اس حرکت کو اگر سیاسی حیلہ سمجھ کر معاف بھی کر دیا جائے تو اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد ان کا اس طرح محض ضد میں اپنے وطن کو تباہ کرنا کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا۔

آخر یہ حیص بیص کب تک

انڈونیشیا کے معاملے میں ڈچ حکومت کا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا کسی طرح حکمت عملی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ قوت فیصلہ کی کمزوری اور تلوّن ہے۔ ساری مصلحتیں اسے اس بات پر مجبور کر رہی ہیں کہ جلد سے جلد جمہوری تحریک کے لیڈروں سے صلح کرے۔ فوجی حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں اور بڑی بڑی سڑکوں پر تو ڈچ قابض ہیں، لیکن دیہات میں ان کی عملداری نہیں ہے اور جنگلوں میں انڈونیشیوں کے بے شمار چھاپہ مار دستے موجود ہیں جنھوں نے ڈچ فوجوں کی عافیت تنگ کر رکھی ہے۔ سیاسی اعتبار سے دنیا کی رائے عامہ کا اخلاقی دباؤ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ ایشیا میں ڈچ سے جو بیزاری پھیلی ہوئی ہے اس کا اندازہ تو پچھلی جنوری میں نئی دہلی کی کانفرنس سے ہو گیا تھا۔ لیکن امریکا میں بھی ایک اچھا خاصا بڑا حلقہ زور شور سے ہالینڈ کی انڈونیشی پالیسی کی مخالفت کر رہا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ریپبلکن پارٹی کے ۲۰ سینیٹ کے ممبروں نے پریسیڈنٹ روزویلٹ پر زور ڈالا تھا کہ یو، این، او کے رزولیوشن پر عمل کرنے کے لئے فوری قدم اُٹھائیں اور سینیٹر بروسٹر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہالینڈ کو جو مالی مدد دی جا رہی ہے وہ بند کر دی جائے۔ خود انڈونیشیا میں ڈچ نے جو کٹھ پتلی مقامی حکومتیں بنا رکھی تھیں وہ اب پوری طرح قابو میں نہیں رہیں۔ چنانچہ وہ اکثر کانفرنسوں میں اپنی طرف سے جمہوری خیال کے نمائندے بھیجتی ہیں۔ ان سب باتوں کو ڈچ محسوس کر رہے ہیں اور اب ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جمہوری حکومت دوبارہ قائم کرنے اور اس سے گفت و شنید کرنے پر تیار ہیں مگر جس طرح وہ رک رک کر گفتگو کر رہے ہیں اور بات گھما کر پلٹ جاتے ہیں اس سے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ معاملہ جلدی آگے بڑھے گا۔

اس میں شک نہیں کہ انڈونیشیوں کی آپس کی پھوٹ نے انھیں کمزور کر رکھا ہے۔ کمیونسٹوں نے پھر شورش شروع کر دی ہے۔ اور وہ بدیسی فوج سے لڑنے کی بجائے جمہوری پارٹی کی فوجوں سے لڑ کر قومی محاذ کو کمزور کر رہے ہیں لیکن اس سے ڈچ زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ وہ قومی جمہوری حکومت کے قائم ہونے کو روک سکتے ہیں۔ مگر خود کوئی منظم حکومت قائم کر کے انڈونیشیا سے وہ معاشی فائدے جن کی وجہ سے وہ اُسے دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں، نہیں اُٹھا سکتے۔

کیا برما کی مشکل حل ہو رہی ہے

جہاں تک نامکمل اور مبہم خبروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے برما میں تھاکن نو کی حکومت سیاسی اور فوجی اعتبار سے کمزور ضرور ہے لیکن اتنی نہیں کہ اس کا قائم رہنا محال ہو۔ اس کی مخالف سیاسی پارٹیاں جو اس سے برسر پیکار ہیں، لال جھنڈے اور سفید جھنڈے والے کمیونسٹ، پی، وی، او کا سفید پٹی والا گروہ، اور کیرن قبائل ایک متحدہ محاذ نہیں بنا سکتے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں مگر زیادہ تر آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ اس لئے تھاکن نو کو ان سے نبٹنا زیادہ مشکل نہیں۔ اصل مشکل یہ ہے کہ مالی حالت بہت سقیم ہے اور حکومت کا خرچ نہیں چلتا۔ ملک کے چاول پیدا کرنے والے علاقے میں سے ایک تہائی برباد ہو چکا ہے۔ پٹرول اور دوسرے معدنی وسائل سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ تجارت خانہ جنگی کی حالت میں جیسی کچھ ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ اس لئے تھاکن نو ایک عرصے سے برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان سے مالی مدد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے برطانیہ سے کوئی تین کروڑ پاؤنڈ (تقریباً چالیس کروڑ روپے) کے قرض کی درخواست کی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ کامن ویلتھ کانفرنس کے سلسلے میں برما کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی مقدار اور ادائی کا طریقہ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

پروفیسر ساہنی کا غم

(نباتیات اور حجریات کے مشہور عالم کے انتقال پر چند اشعار)

آل احمد سرور

بے درد کس قدر ہے یہ دُنیائے رنگ و بو
کس کس کو مدعائے دیدۂ پُر نم کی موت ہے

ساہنی کا غم ہے جو ہر انسانیت کا غم
عزم بلند و کوشش پیہم کی موت ہے

علم و ہنر کے تاج کا موتی بکھر گیا
فطرت کے راز دار کی، محرم کی موت ہے

تحقیق سے سنوار دیا حسنِ کائنات
مشاطۂ حسینۂ عالم کی موت ہے

وہ کوہ کن کا جوش وہ شاعر کا دل کہاں
آئین شناسِ عظمتِ آدم کی موت ہے

شرمندہ جس کے سامنے دنیا کے اہل فن
ہندوستاں کے طرۂ پُر خم کی موت ہے

اس کے سوا، اب اور کہوں کیا میں اے سرور
عالِم کی موت کیا ہے، اک عالَم کی موت ہے

حیاتِ نو

آغا سلطان حیدر حیدری

مجھے جنوں نہیں کہ آندھیوں سے کھیلتا رہوں
مری نظر میں ہے حصول زندگی آشیاں !!

روایت کہن کی دل فریبیوں کو بھول جا
کہ چھیڑ دی ہیں انقلاب نے نئی کہانیاں!

نوائے انقلاب کے سروں کو کان دھر کے سُن
بجھا نہ دیں دلوں کی آگ سازِ غم کی تلخیاں!

اُفق کی روشنی ہیں کائنات جگمگا اُٹھی !!!
اُلٹ بھی دو رُخِ حیات سی گھنی سیاہیاں!

پہنچ رہے ہیں منزلوں پہ دورِ نو کے قافلے
جھٹک کے دامنِ سکوں، دکھاؤ تیز گامیاں !!

(۲) دو غزلیں

باقر مہدی

(۱)

سیاہ راتوں نے طوفاں اُٹھائے ہیں کیا کیا
محبتوں کے دیئے جھلملائے ہیں کیا کیا

بزورِ عشق حجاب نظر اُٹھا تو سکے
فریب حسن کے جلووں میں آئے ہیں کیا کیا

کسی سے جوشِ جنوں کا فسانہ کہہ نہ سکے
بنا بنا کے نشیمن جلائے ہیں کیا کیا

شب دراز میں اہل وفا نے سینوں میں
چراغ دردِ محبت جلائے ہیں کیا کیا

کہیں مسافر اُلفت کی منزلیں نہ ملیں
سنبھل سنبھل کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

(۲)

ستم ہم پر مسلسل ہو گئے ہیں
دل اپنے غم سے بوجھل ہو گئے ہیں

نہ سوزِ غم، نہ اب جوشِ وفا ہے
وہ کیوں ملنے کو بیکل ہو گئے ہیں

زمانہ کیا بھلا سکتا ہے اُن کو
محبت میں جو پاگل ہو گئے ہیں

مژہ پہ آکے انگارے بنے تھے
دلوں میں جاکے وہ حل ہو گئے ہیں

انھیں کی یاد تڑپاتی ہے مجھ کو
جو ہم میں رہ کے اوجھل ہو گئے ہیں

ہے وحشت میں یہ مجبوری کا عالم
جنوں کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

وہ اپنا کارواں ہی بھول بیٹھے
جو میر کارواں کل ہو گئے ہیں

نظیر اکبر آبادی

سید سفارش حسین

(۱)

اردو شاعری کا دربار سے تعلق اپنے کی بات یوں نہیں ہے کہ جب یہ پھلی پھولی اور پھیلی اس وقت میں کون صاحب اور کون سا ہنر تھا جس نے دربار کا سہارا اور امیروں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا ہو۔ اور کیوں نہ ڈھونڈتے؟ پیٹ سب کے ساتھ ہے۔ ہر چیز کی تان، تان پیٹ ٹوٹتی ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اردو شاعری نے کتنی جلدی آگے دیکھا اور گھٹتی ہوئی قوت یعنی "دربار" سے رشتہ توڑا، ابھرتی ہوئی طاقت یعنی "جنتا" سے ناتا جوڑا اور یہ سب اس وقت ہوا جب کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ سو ڈیڑھ سو برس میں وہ دن بھی آ جائیں گے کہ ہر فن کی "تان" "سو قیوں" اور عامیوں پر ٹوٹنے لگے گی اور یہ توڑ اور جوڑ کا کام کیا بھی اس نے جو نہ بڑا عالم تھا نہ فلسفی، مدبر تھا نہ مبصر بلکہ اس زمانے کے نچلے اوسط درجے کا محض ایک انسان مگر اس کا ذہن نفسیاتی گتھیوں سے پاک تھا۔ اس میں حسبی برائی کے خیال سے رعونت تھی نہ تمکنت اور نہ غلط چھوٹائی کے احساس سے کسی طبقے سے نفرت اور حقارت۔ اس نے اور فن کاروں کی طرح شعر کو روزی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے اور دوسروں کے دل کا بہلاوا جانا۔ اسی لئے، نہ قصیدہ کہا نہ ہجو لکھی بلکہ سچ پوچھئے تو اردو شاعری میں لکھنے کا وہ ڈھنگ نکالا، وہ اسلوب اور کلام کی وہ روش اختیار کی جو آج عام پسند ہے۔

یہ تھا نظیر اکبر آبادی کا کام جو اس نے آج سے ڈیڑھ سو پونے دو سو برس پہلے غیر شعوری طور پر مگر [illegible] پاس کے [illegible] تقاضوں سے اردو شعر کے فن میں کیا اور جس کے جرم میں شعر کے برہمنوں نے اُسے اچھوت بنا دیا۔

مگر یہ سب [illegible] ہوا کیسے؟ اس کا جواب نظیر کے زمانے، اس کے ماحول اور خود نظیر کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالنے سے ملے گا۔

نظیر کی عمر نبے، پچانوے برس کی بتائی جاتی ہے۔ گو اس نے ایک نظم میں اپنی عمر سو برس کی بتائی ہے۔

اٹھ[illegible] سو برس کی ہوئی اپنی عمر آخر
اور جھریاں پڑی ہیں سارے بدن کے اوپر
دکھلائیں جب کہ گڑی ہم میداں میں زور آ کر
رستم کو بھی [illegible] اپنے نہیں برابر
اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

ممکن ہے یہ قمری حساب سے ہو جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا۔ صحیح سن پیدائش کا پتہ نہیں ہاں سنہ وفات ملتا ہے۔ اس کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر نے تاریخ کہی ہے۔ جو میرے خیال میں اور وں سے اچھی ہے۔

چو خلد اور [illegible] فکرے طبع تاریخ
نظیر اکبر آبادی چو رفت از دنیائے انتشار
نظام نظم باہم درہم و برہم شدہ یک سر
مخمس بے سر و پا بیت بے دل، فرد بے سرشد

آخری مصرعے سے سنہ وفات ہجری میں نکلتا ہے جس کا سنہ عیسوی ۱۸۳۰ء ہوتا ہے، اس حساب سے نظیر کی تاریخ پیدائش ۱۷۳۵ء کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

اب ذرا اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی حالت پر نظر ڈالئے۔ مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی۔ صوبہ دار خود مختار ہو گئے تھے۔ امرا آئے دن ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے۔ ملک میں ہر جگہ بدامنی اور تاراج تھا۔ لوٹ مار ہوتی رہتی تھی، اور خاص خاص شہروں پر تو یہ آفت آئے دن ٹوٹتی۔ آگرہ، دلی کا تو کہنا ہی کیا۔ چنانچہ نظیر نے اپنی آدھی [illegible] تین انقلاب دیکھے۔ پہلا حملہ جاٹوں کا [illegible] لوٹ کا یہ حال تھا کہ آگرے کے قلعے کے کونے تک [illegible] تو شہریوں کے گھر کا مال و اسباب کیا چھوڑا ہوگا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی باری آئی اور آخر میں کمپنی بہادر کی۔ جس شہر میں اتنی آفتیں آئی ہوں، مصیبت کے اتنے پہاڑ ٹوٹے ہوں، وہاں کیا کچھ اکھاڑ پچھاڑ نہ ہوئی ہوگی۔ ابھی دروازے پر ہاتھی جھوم رہے تھے۔ سیلاب جو آیا سب کچھ بہا لے گیا، گھر پر جھاڑو پھر گئی۔ شہر آشوب میں نظیر نے اس کا حال لکھا ہے جس کے کچھ بند یہ ہیں:۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے منجدھار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو کاروبار بند

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ وار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

ہوتے تھے گرد و پیش جو قزاق راہ مار
پھر یاں نہیں آنے کے ہیں ڈر سے زینہار
کوتوال زردمیں خاک اڑاتے ہیں چوکیدار
ملاحوں کا بھی کام نہیں چلتا میرے یار
ناویں ہیں گھاٹ گھاٹ کی سب وار پار بند

کیوں کر بھلا نہ مانگئے اس وقت سے پناہ
محتاج ہو جو پھرنے لگے در بدر سپاہ
یاں تک امیر زادے سپاہی ہوئے تباہ
جن کی جلو میں چلتے تھے ہاتھی و گھوڑے آہ
وہ دوڑتے ہیں اور کی پکڑے شکار بند

بے رونقی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر ایک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو، نہ مالی، نہ خار بند

اس کایا پلٹ سے نظیر کا گھر بھی نہ بچا ہوگا مالی حالت یا تو پہلے ہی اچھی نہ ہوگی یا اس لوٹ مار سے خراب ہو گئی ہوگی۔ بہر حال پتہ یہی چلتا ہے غریبا مسئو گذر بسر تھی ذاتی مکان بھی نہ تھا، آگرے میں نوری دروازے ہمتائی کے پل پر کرایہ پر رہتے تھے۔

سیاسی حالت آپ نے خود نظیر سے سن لی، اب ذرا اس دور کی ثقافتی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ ہندوستان میں دو قوموں کے ایک ساتھ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نے دوسرے کو کچھ دیا اور کچھ ایک نے دوسرے سے لیا۔ کچھ اثر ڈالا اور کچھ اثر قبول کیا۔ یہ لین دین اور اثر قبول کرنے اور ڈالنے کا کام سیکڑوں برس جاری رہا جس سے زندگی کا کوئی شعبہ اور سماج کا کوئی ادارہ نہ بچا۔ پھر یہ میل جول کسی ایک جماعت یا گروہ تک محدود نہ تھا۔ اوپر سے نیچے تک سماج کے سارے طبقے اس سے متاثر ہوئے اور یہ اثر محض خیالی یا ذہنی نہ تھا بلکہ ہر طبقے نے اسے اپنی زندگی میں رچا لیا۔ جیون میں رنگ بھرا اور رہن سہن میں اسے برتا۔ اس طرح دونوں قومیں کچھ ایسی مل جل گئیں کہ من و تو کا فرق مٹ گیا، بالکل ایسے ہی جیسے گنگا اور جمنا اپنے اپنے روپ میں تربینی تک بہتی آتی ہیں تربینی پہ آ کر جب ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالتی ہیں تو پھر کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ گنگا جل ہے اور یہ جمنا جل۔ چنانچہ وحدت یگانگت اور اکتائی کا رنگ جھلک اٹھا۔ جب دل مل گئے تو ذہن کیسے الگ رہتے جس کے دماغ نے جہاں تک رسائی کی اس نے اپنے فن میں اس اکتائی کو اجاگر کیا۔ جاگیرداری نظام تھا۔ بادشاہ سے لے کر مہاراجوں اور امیروں تک نے اپنی اپنی جگہ ان فنون کی سرپرستی کی۔ مصوری، سنگیت، فن عمارت اور شعر و ادب، غرض تہذیب کا کوئی شعبہ نہ بچا جو آج بھی اس یکتائی پر گواہی نہ دیتا ہو۔ دلی، آگرہ اور راجستھان تک کیا، سارا شمالی ہندوستان ایک ہی رنگ میں رنگ گیا

یہ رنگ چھن چھن کر جنوب تک پہنچا۔ اسی کو سب ہندوستانی تہذیب کہنے لگے۔

بڑوں کی بڑی باتیں۔ مگر اس تہذیب کے بنانے میں چھوٹوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں اور غلط لگتی بات یہ ہے کہ بڑوں سے زیادہ اہم اور مضبوط حصہ عوام نے اس تہذیب کی سطح سے اپنی روزمرہ کی زندگی، بول چال، کام کاج، دکھ سکھ اور میل ملاپ کو ایسا رچا بسا کر دیکھنے والے کو کہیں فرق نہ ملا۔ مذہب الگ الگ تھے مگر رنگ ایک۔ عقیدے جدا جدا تھے مگر ڈھنگ سب کا ایک سا۔ عوام کی بولی ٹھولی نے ہی وہ زبان دی جسے ہم آج ہندوستانی کہتے ہیں۔

نظیر نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی، اسی ہوا میں سانس لیا۔ اس کا ذہنی پودا اسی ہوا میں پروان چڑھا۔ پھر آگرہ، جہاں اس شراب وحدت کی تیزی اور تندی ذرا تیز تھی اور نہ کیوں ہوتی؟ اس تہذیب کی شعوری داغ بیل اسی "بلدۂ حسن و شعر" میں ڈالی گئی۔ امیر غریب چھوٹے بڑے سب کا یہ حال تھا کہ دکھ ہوتا تو سب مل کر بٹاتے، سکھ ہوتا تو سب مل کر مناتے۔ محرم میں مسلمانوں کے تعزیے اور بیماری تو ہندوؤں کے تعزیے اور تابوت۔ میلے ٹھیلے کا تو کہنا ہی کیا۔ آگرہ کی مشہور بات، ہفتہ کے سات دن اور آٹھ میلے۔ ان میلوں میں سارے شہری شریک ہوتے۔ بعض خالص مذہبی میلوں میں بھی عوام کوئی نہ کوئی شرکت کی صورت نکال ہی لیتے۔ سکندرہ سے جہاں اکبر کا مقبرہ ہے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جمنا کے کنارے ہندوؤں کا متبرک مقام کیلاش کے نام سے مشہور ہے وہاں ایک مندر بھی ہے۔ ساون میں کیلاش کا میلہ ہوتا ہے عقیدت مند مندر پر جاتے ہیں مگر عوام کا اجتماع اکبر کے مقبرے میں ہوتا ہے۔

تیراکی کا میلہ آگرہ کا مشہور میلہ ہے۔ یہ عوام کی خوش طبعی اور حسن ذوق کا گویا نمونہ ہے۔ میلہ بھادوں میں نوچندی جمعرات کو ہوتا ہے۔ نظیر نے اس میلے کی تصویر کھینچی ہے۔ دریا چڑھا ہوا ہے تیراک اپنے فن کے کرتب اور پیشے کے ہنر دکھاتے تیرتے چلے جاتے ہیں۔ دریا کی دونوں طرف لوگوں کا ہجوم ہے۔ کہیں کہیں محفلیں بھی جمی ہوئی ہیں۔

باغ حلیم اور جو شیو داس کا چمن ہے
ان میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوے مٹھائی کھانے اور ناچ دل لگن ہے
کچھ پیرنے کی دھوم میں کچھ عیش کا چلن ہے
عشرت میں مست ہو کر ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

تیرنے والوں کے نعرے اور جے کارے سنئے:۔

کہنا ہے واں سید کبیر کی جے
اس کے بعد اپنے استاد پیر کی جے
مرد محمد کنھیا جمنا کے سیر کی جے
پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے
ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جب ذہن کے پھلنے پھولنے کے لئے ایسا ماحول اور مزاج کے ڈھلنے کے لئے ایسی روایتیں ملیں تو دل میں وسعت اور طبیعت صلح جو، بے تعصب اور مرنجان مرنج ہو جانا چاہیئے۔ اس پر نظیر کی عوام دوستی نے اس کی طبیعت میں سادگی انکسار اور قناعت کا اور اضافہ کر دیا لیکن عوام دوستی کا سب سے بڑا احسان نظیر پر یہ ہے کہ اس نے نظیر کو نہ صرف قنوطیت اور تیاگ سے بچا لیا بلکہ اُسے ہنسوڑ بنا دیا۔ عوام پر دکھ، درد، رنج و غم کا اثر مستقل نہیں بلکہ وقتی اور عارضی ہوتا ہے تھوڑی دیر کے لئے وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر زندگی اور اس کی دل فریبیاں انھیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں نظیر کا عوام سے اتنا گہرا اور گاڑھا رشتہ نہ ہوتا تو وہ بھی اوروں کی طرح فرار کا راستہ اختیار کرتا اور یہ نہ کہتا۔

لاکھوں طرح کے رنج ہی میں کھل رہے ہیں ہم

نظیر کی ساری شخصیت اس کے کلام میں جھلک رہی ہے کہ رواداری اور وسعت قلب جو اس تہذیب کی جان ہیں اس کے کلام میں اس طرح رچی بسی ہیں جیسے پھول میں خوشبو۔ جب وہ دوسرے مذہبوں کے بزرگوں کے متعلق نظم کہتا ہے تو اس میں بھی وہی زور اور وہی خلوص عقیدت ہوتی ہے جیسی کہ رسول کریم حضرت علی اور حضرت عباس سے متعلق نظموں میں۔ اس نے کرشن جی کے متعلق ایک نظم کہی ہے جس کا عنوان ہے "جنم کنھیا جی"۔ اس نظم کا ایک بند ہے:۔

پھر آیا واں اک وقت ایسا جب آئے گربھ میں موہن
گوپال منوہر مرلی دھر سری کشن کشوری کنول نین
گھنشیام مراری بنواری گردھاری سندر شیام برن
پربھو ناتھ بہاری کان للا سکھ دائی جگ کے دکھ بھنجن
جب ساعت پرگٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

کیا کرشن جی سے عقیدت رکھنے والا کوئی فرد ان سے زیادہ الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ گرو نانک کی تعریف میں جو مسدس ہے اس کا پہلا بند یہ ہے:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

اپنی نظم بنسائے رحمان میں ایک جگہ کہتا ہے:۔

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآن
عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلمان
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

حمد کا ایک بند یہ ہے

کوئی خالق باری، رب، مولا، رحمان، رحیم، اللہ نگری
کوئی الکھ روپ کرتا رکھے نرکال، نرنجن، نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کوئی دانا دنیت، ولیو اکل، کوئی راکھیں لیوت جن دپری
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

مختصر یہ کہ نظیر جس تہذیب و تمدن کی پیداوار تھے اُس میں ذہن اسی قالب میں ڈھلتا اور سیرت انھی معتدل عناصر سے بنا کرتی۔

نظیر نے اپنی علمی استعداد اور اس وقت کے مروجہ فنون سے واقفیت کا ذکر نظم میں یوں کیا ہے:۔

کہتے ہیں جس کو نظیر سنئے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں
کوئی کتاب اُس کے تئیں صاف نہ تھی درس کی
آئے تو معنی کہے ورنہ پڑھائی رواں
فہم نہ تھا علم سے کچھ عربی کے اُسے
فارسی میں ہاں مگر جانے تھا کچھ ایں و آں
لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کتاب
پختگی کے اور خامی کے اس کا تھا خط درمیاں
فرد غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اُسے
اپنے اسی شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعلیم مروجہ درس کے مطابق ہوئی مگر تکمیل نہ ہو سکی۔ کیوں؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، ممکن ہے والد حالات نے اجازت نہ دی ہو یا خود چھوڑ دی ہو۔ تعلیم ختم کر کے نظیر روزگار کی تلاش میں گھر سے نکلے پہلے بھرت پور گئے، وہاں کچھ قیام کیا مگر کام نہ بنا تو متھرا چلے گئے۔ وہاں ایک سیٹھ کے بچوں کی تعلیم پر معمور ہو گئے۔ اس طرح نظیر نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ متھرا کے قیام میں نظیر نے [illegible] کی خوب سیر کی۔ اُسے یہاں کی ہوا بہت پسند تھی۔ متھرا کے قیام نے اس کی ہندو دھرم سے متعلق معلومات میں بہت اضافہ کیا گمان غالب یہ ہے کہ نظیر کا برج بھاشا کا کلام متھرا کے قیام ہی میں مرتب ہوا مگر یہ دیوانہ یہاں زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ چند سال بعد نظیر آگرہ لوٹ آئے۔ بھاؤ یہاں مرہٹوں کی طرف سے قلعہ دار تھا۔ اس نے نظیر کو اپنا استاد بنا لیا۔ جب اس کی قلعہ داری کا خاتمہ ہوا تو یہ ایک مسلمان رئیس کے بچوں کی تعلیم پر مامور ہو گئے اور یہاں سے ان کا سلسلہ لالہ بلاس رائے کے ہاں ہو گیا جو مرتے دم تک رہا۔

نظیر نے ساری عمر معلمی کا پیشہ کیا، اسی میں اللہ نے برکت دی اور اس کی زندگی خوش حالی سے گذری۔ اُسے اس کا اعتراف ہے

فضل نے اللہ کے اُس کو دیا عمر بھر
عزت و فرحت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

(باقی آئندہ)

"دُنیا بدل رہی ہے"

سید وھاج الدین

کل اتفاقیہ یہ الفاظ مجھے سنائی دیئے۔ میں جب دستور اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک نئی عمارت بن رہی تھی۔ مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا اونچا مچان بنایا تھا ۔۔۔ تین بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔۔۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس مکان، اس مچان، ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کی باہر کے سہارے بنا سکتے ہیں؟ ۔۔۔ کیا انسان بازی لے جائے گا؟ کس طرح ہم سب مجھ میں سے اوپر اٹھ سکتے ہیں کہ نیچے والے ہمیں دیکھ کر خوش ہوں؟ ۔۔۔ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:

"دُنیا بدل رہی ہے"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک انیا لیے ہوئے کھڑا تھا۔ آنکھوں میں چمک ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک بیٹے میں ہنستے ہیں۔ ——— کہنے لگا "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا۔ ولایت کے گانے اور امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دیں گی۔ ——— دنیا بدل رہی ہے"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میرا جب کبھی بیسویں صدی "نیا زمانہ" "نئی دنیا" "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھلے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں۔ میں نے جواب دیا "ہاں! پرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پرانے چھلکے پر نیا چھلکا نکل رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانے سے پہلے تھا۔" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔ "تم نے تو دنیا تج دی ہے۔ جگ کے الٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری دھرتی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں۔" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا ———

میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں؟ ایک جیب میں وہ اتنی سونا ہے۔ دوسرے میں نیسی کسوٹی ہے اس پر کستے ہیں۔ مندر و لکیر دیکھ کر اسے کندن سمجھتے ہیں۔ اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے! اور پھر مکان، مچان اور مزدوروں کی دھن میں لگ گیا۔ یہ دو ہاتھ دو پاؤں کے پتلے، اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ سنبھالتے اوپر لے جا رہے تھے!

آج میرا دوست مجھے دن بھر شہر میں ادھر اُدھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں۔ پرانے اینٹ پتھر کے نئے استعمال! پرانی دنیا کے نئے چھلکے!! "یہ نئی سڑک ہے۔ اس پر ٹرام چلے گی" ۔۔۔۔۔۔ "یہ نیا بنک گھر ہے" "یہ نئی دوکان ہے" "یہ نئے ڈھنگ کا مدرسہ ہے" ۔۔۔۔۔۔ خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ جیسے لڑکیاں ہنس ہنس کر اپنی سہیلیوں کو کھلونوں اور پرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں۔ کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی۔ لیکن اندر اندر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا "اب بھی قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی پور بدل رہا ہے" میں ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا ———

سامنے ایک حلوائی کی دوکان تھی۔ ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گیا۔ حلوائی سے کہا:-

"لالہ دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا، کہا "ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے گاہک نہیں مانتے ۔۔۔۔۔۔" پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا، میں نے کہا "اپنا گز نہیں بدل دیتے" اس نے منہ پھیر لیا ۔۔۔۔۔۔

راستے میں ایک سپاہی ملا۔ اس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتھکڑی، آنکھ میں شرافت! میں نے کہا جمعدار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے؟" کہنے لگا "اس نے اپنے بھوکے بچوں کے لئے آٹا چرایا ہے" میں نے کہا کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا" وہ مجھے بہت بری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا ——— سچا ہے اندرائن کا پھل ہوتا ہے!

تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہنچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "سیٹھ اشرفی مل کا محتاج خانہ" ہزاروں اپاہج اور منگتے جمع تھے۔ زبردستی کے اپاہج اکام سے نکمے!! میں نے داروغہ سے پوچھا "بھائی انہیں خیرات کیوں دیتے ہو؟" کہنے لگا "نیک کام ہے سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے؟ نیک کام! دیا!! فیاضی!!! سب وہی پرانے سانچے، کہ واقعی دنیا بدل رہی ہے۔

پرانے باٹ، پرانا گز، پرانا قانونی معیار، پرانا اخلاقی معیار، دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی، اور اندر سے آتما کی وہی پرانی کھری کی سی ٹک ٹک "اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے" ———

میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اور آہستہ سے کہا "معلوم ہو گیا اب لوٹ چلو"

دھرتی آئے دن نیا سنگار کرتی ہے۔ سنسار اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے۔ پرانے باٹ گھس گھسا کر چھوٹے ہو گئے۔ بہت سے بڑے بڑے جرم ہلکے ہو گئے۔ پرانی شیشیاں، بوتلیں نہیں بدلیں۔ یہاں نئے سانچے ان میں وہی مٹی، پھر دنیا بھی کیوں نہیں بدلتی؟ بالکوں کی طرح اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونوں پر کیسے کیسے خوش ہوتے ہیں؟ ست جگ نے ست کو کہاں میں گم ۔۔۔ جاتا ہے؟ ایک مچان ۔۔۔ بنا کر دس کی تیا ۔۔۔ رہتی ہے؟ آج ۔۔۔ باتیں ۔۔۔ کیوں نہیں ۔۔۔ پرانی حلوائی کی باتیں ۔۔۔ "۔۔۔ نہیں رہے"

اب میرا دوست دھرتی کی کروٹ کا قائل نہیں رہا۔ میں اس سے کبھی کبھی ہنسی سے پوچھتا ہوں "دنیا کب بدلے گی؟" اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو۔ وہ بہت دھیمی آواز سے جواب دیتا ہے:

"جب گاہک مانیں گے"

باھر کی دُنیا

(بر سلسلہ صفحہ ۶)

اور وقت ابھی تک معین نہیں ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے ان تفصیلات کا طے کرنا برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان پر جنہیں برما کے معاملے میں خاص دلچسپی ہے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کے ایک ایک نمائندے کی ایک "سیاسی کونسل" بنا دی جائے جو برما کو ضروری سامان کی رسد پہنچانے کا انتظام کرے۔ اگر یہ مسئلے جلدی طے ہو گئے اور برما کو بر وقت مدد پہنچ گئی تو کوئی تعجب نہیں کہ موجودہ حکومت امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ فوجی طاقت سے جو امن قائم کیا جائے گا وہ پائدار نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں کہ عوام کے دلوں کو تسخیر کرنے اور ان کے جائز سیاسی مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے تھاکن نو کی حکومت کیا کر رہی ہے اگر کچھ کر رہی ہے تو دنیا کو بتائے۔ دوسرے ملکوں کی ہمدردی اور مدد حاصل کرنے کے لئے یہ بات فوجی طاقت کے مظاہرے

م سے زیادہ ضروری ہے۔

تشدد پسند گروہ

پروفیسر پرس رام

ہر جنگ کے زمانے میں خواہ وہ دو ملکوں کے درمیان ہو یا ایک ہی ملک کے دو مخالف فریقوں میں۔ ایک ایسا گروہ تیار ہو جاتا ہے جس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے فریق پر ہر قسم کا ظلم کرے اور اس کو نیست و نابود کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ باقاعدہ فوجوں کی لڑائی میں اخلاقی اصول کا کچھ نہ کچھ پاس کیا جاتا ہے لیکن یہ بے قاعدہ گروہ جو محض نفرت کے نام پر مرتب کئے جاتے ہیں اپنے مخالفوں کو ستانے میں ہر طرح کے ناجائز طریقوں سے کام لیتے ہیں۔

پچھلے پندرہ بیس برسوں میں اس قسم کے گروہ دنیا کے مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے اور ان گروہوں نے اپنے مخالفوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ جرمنی میں اس قسم کے ایک گروہ کا نام تھا "ایس ایس" بظاہر اس گروہ کا کام تھا جرمنی کے باشندوں کی آڑے وقت میں مدد کرنا۔ لیکن دراصل یہ یہودیوں کو ستانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس گروہ میں شامل ہونے والے نوجوان کھلم کھلا یہودی مصنفوں کی کتابیں شارع عام پر جلاتے، ان کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین کرتے اور انھیں بڑے پیمانے پر قتل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے۔ ایک جرمنی کیا اس قسم کے گروہ اور بھی بہت سے ملکوں میں موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گروہ کیونکر وجود میں آتے ہیں اور ان میں شامل ہونے والے لوگوں کو تشدد کی تربیت کیسے دی جاتی ہے؟

ایک جمہوریت پسند حکومت کو ایسے گروہوں کی اجتماعی زندگی کا مشاہدہ خاص طور پر کرنا چاہیئے کیوں کہ جمہوریت پسندوں کو ان گروہوں کا مقابلہ تشدد سے کرنا مناسب نہیں ورنہ ان کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان گروہوں میں وہی لوگ شامل ہوتے ہیں جو اس مقابلے کی دنیا میں اگلی نشستوں پر نہیں بیٹھ سکے۔ پس ماندہ اور سماج کے نچلے طبقے کے لوگ ہی ایسے گروہوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ایک جمہوریت پسند حکومت کو ان تمام حالات کی اصلاح کرنی چاہیئے جس سے بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے ہوں کہ اس نظام میں وہ باوقار اور باعزت زندگی سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ آج کل جو لوگ زندگی کی دوڑ میں اپنے لئے صحیح کام نہیں ڈھونڈھ پاتے وہ حاکموں اور با اقتدار لوگوں پر اپنی تباہی کا الزام رکھتے ہیں اور ایسی سیاسی پارٹی کی تلاش میں رہتے ہیں، جو انھیں با اقتدار لوگوں سے انتقام لینے میں مدد دے۔

ایک انسان دوسرے انسان کو اس وقت تک قتل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا جب تک وہ قتل کرنے کو اپنا ایمان نہ بنا لے۔ حیوانوں کو حیوانوں پر حملہ کرنے کے لئے کسی خاص دستور العمل کی ضرورت نہیں۔ ایک شیر جب کسی ہرن پر حملہ کرتا ہے تو اسے کسی بہانے یا بہلنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک انسان کسی انسان کو بلاوجہ نہیں مار سکتا۔ اسے قانون، انصاف، مذہب اور ملک کے مفاد وغیرہ کی آڑ لینی پڑتی ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ بیان کرنی پڑتی ہے۔ مقابلے کے میدان میں شکست کھانے والے افراد ایسی سیاسی جماعتوں کی مدد ڈھونڈھتے ہیں جو ان کی تشدد پسند طبیعت کے لئے عمل کا موقع پیدا کریں۔ چنانچہ بہت سی سیاسی جماعتیں اپنا پروگرام جنگ کے استعاروں اور فوجی اصطلاحوں میں پیش کرتی ہیں اور زندگی سے تنگ آئے ہوئے نوجوان انتقام لینے کے نئے طریقوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ قوم کے لئے مرنا، جبکہ قوم کی خاطر جینا زیادہ ضروری ہے، ان پارٹیوں کا نعرہ بن جاتا ہے بلکہ جان دینے کو زندگی کا نصب العین بنا دیا جاتا ہے۔ جرمنی میں تو خاص طور پر موت کو جان بوجھ کر ڈھونڈھنے کو ایک اعلیٰ اخلاقی فرض بنا دیا گیا تھا۔ پچھلے دس پندرہ سال سے جرمن لٹریچر کا رجحان یہی رہا ہے۔ یہی حال جاپان کا تھا۔ یہی حال ہندوستان میں بھی رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سڑکیں اور پل بنانے، مکانات تعمیر کرنے اور دوسرے تعمیری کاموں کی طرف توجہ کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا اور عوام کی تکلیفیں دو چند ہو گئیں۔

ان سیاسی جماعتوں میں باقاعدہ طور پر نوجوانوں کو مرنے اور مارنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ایسا نصب العین بنایا جاتا ہے جس میں نفس پرستی کی تلقین کی جاتی ہے۔ آج کل ذرائع آمد و رفت اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ کوئی نسل دوسری نسل سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتی اور موجودہ زمانے میں نسلی امتیاز کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کرنا ممکن بھی نہیں۔ لیکن ایسے نصب العین جن کی بنیاد خیال پرستی پر ہوتی ہے اپنے اندر بڑی کشش اور جاذبیت رکھتے ہیں خصوصاً ایسے نوجوانوں کے لئے جو رومانی طبیعت رکھتے ہوں۔ نوجوانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ایسی سرگرمیوں کو پسند کرتے ہیں جن میں مشکل کام اور خطرے کا مقابلہ کرنے کے زیادہ مواقع ہوں اور کوئی ڈینگ لیڈر انھیں تحکمانہ لہجے میں ایک نئے فلسفے، ایک نئے دستور العمل اور روزمرہ کی زندگی کے ایک نئے ضابطے کی تلقین کرے۔

یہ سب چیزیں جمہوریت کے منافی ہیں۔ جمہوریت میں خود سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ دوسروں پر روحانی یا ذہنی رعب جمانا نہیں بلکہ انھیں سمجھا بجھا کر خوشی سے تعاون پر آمادہ کرنے کی عادت ڈالنی ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی عمر میں ایک ایسا وقت آتا ہے جبکہ اسے فاشستی ذہنیت پسند ہوتی ہے۔ اس عمر کے لوگ دوسروں کے کندھے پر سوار ہونے والے لیڈروں کے اثر میں آ جاتے ہیں اور اپنے اندر ابھرتے ہوئے تشدد پر اپنی عقل سے قابو پانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو ایسے لیڈر کے حوالے کر دیتے ہیں جو انھیں من مانے تشدد کی اجازت دے۔ یہ ذہنی کیفیت تشدد پسند گروہوں کے ممبر بننے میں مدد دیتی ہے۔ پچھلے چند سال میں ان گروہوں کے متعلق جو کچھ پتہ چلا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کئی مہینے تک بے دردی سے دوسروں کو مارنے کی مشق کرائی جاتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ لوگ اندرونی سکون اور اطمینان سے دوسروں کو مارنے کے عادی نہ ہو جائیں اور یہ سب کچھ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی فلسفہ یا مذہب تائید میں مل ہی جاتا ہے۔ ہٹلر کا تو یہ ایمان تھا کہ "نیا انسان" زنانہ کمزوری یعنی ہمدردی اور رحم کا شکار نہیں بنتا۔ اس طرح ان لوگوں کے طرز خیال اور طرز عمل میں انقلاب ہو جاتا ہے۔ اُن کی اپنی مرضی عضو معطل ہو کر رہ جاتی ہے اور لیڈر کی مرضی ان سے غیر معمولی فوق انسانی طاقت کے کام کروا لیتی ہے۔ ان میں انسانیت اور معقولیت فنا ہو جاتی ہے۔ ان کا نفس بچے کے نفس کی طرح نامکمل رہتا ہے۔ پرانے زمانے کی قبیلہ پرستی عود کر آتی ہے۔ ان گروہوں کا وجود کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ دراصل وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ سماجی نظام انسان کو انسان بننے سے روکتا ہے۔

جب کبھی ان گروہوں کے بُرے دن آتے ہیں اور ان کی حمایت کرنے والی حکومت یا پبلک اُن کی پیٹھ ٹھونکنا بند کر دیتی ہے تو ان کے ممبر ایک دوسرے پر حملے شروع کر دیتے ہیں۔ وہی لوٹ مار، جو قوم وطن اور مذہب کے نام پر ہوتی تھی اب اپنے فائدے یا اپنے بچاؤ کے لئے شروع کر دی جاتی ہے۔ اس وقت لاکھوں نوجوان ایسے ہیں جو اس قسم کے گروہوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان میں اپنے اوپر تنقید کرنے کا مادہ بالکل نہیں رہا۔ غلط فلسفہ اُن کے ذہن میں ٹھونس دیا گیا ہے اور وہ جنون کی طرح ان پر مسلط ہے۔

اگر ایسے نوجوان کی مناسب طریقے سے تربیت کی جائے تو اُن سے قوم کے لئے مفید خدمات لی جا سکتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان فطری طور پر تشدد کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے لیکن پھر بھی انسان کی معقولیت کو بیدار کیا جائے تو اسے تشدد کے راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:- ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم - ۸ - ۱۶ - ۲۴
چندہ:- سالانہ للعہ ششماہی للعہ

اس ملک کے با اقتدار طبقہ کو اپنے آپ سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھنے چاہئیں:-
(۱) پچھلے بیس مہینے میں کتنے ایسے تجربے کئے گئے جن کا مقصد اس مسئلے کی تحقیقات کرنا ہے کہ نوجوانوں میں معقولیت پسندی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے (۲) کتنی ایسی نئی تدبیریں سوچی گئیں جن کا مقصد نوجوانوں میں تعمیری کام کا جذبہ پیدا کرنا ہو۔
اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو ہم محض زبان سے عدم تشدد کے حامی ہیں ورنہ ہم بھی اتنے ہی تشدد پسند ہیں جتنے کہ تشدد کے فلسفے کی کیبٹ میں آنے والے نوجوان۔ نوجوانوں کو بے کار چھوڑ دینا اور وہاں ان کی سوشل تعلیم کا بندوبست نہ کرنا گویا ان کو یہ بتانا ہے کہ دنیا میں آخر تشدد ہی کا بول بالا ہوتا ہے۔ وہی اجتماعی فلسفہ جو نوجوانوں کو تشدد کے رستے پر لے جاتا ہے انہیں عدم تشدد کے راستے پر لانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شہروں میں لاکھوں ایسے نوجوان ہیں جو شتر بے مہار کی طرح پھرتے رہتے ہیں اور ان کی صحیح تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں۔ یہ نوجوان تشدد پسند گروہوں کے پھندے میں پڑ کر ملک کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ ان کے لئے جمہوریت کی صحیح تعلیم کا بندوبست کریں اور ان میں شہریت کا احساس اجاگر کریں۔

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI

DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۹ | ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

متحدہ ہندوستانی قومیت

مولانا ابوالکلام آزاد

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ انہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر دیا۔ ہمارا پرانا لباس، تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔

ہماری ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔

(خطبات)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
متحدہ انسانی قومیت	مولانا ابوالکلام آزاد	۱
ہربرٹ کرسٹ	آرتھر ای، مارگن	۲
ایک ملک کو کیا کرنا ہے	(اداریہ)	۳
بزمِ بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع، ج	۴
۲۔ پاکستان	ص، ج	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع، ج	۶
ستم کی خدائی	اختر انصاری	۷
غزل	رضا ابن فیضی اعظمی	۷
غزل	عالی جعفری	۷
رباعیات	سید محمد جعفر نقوی عاصی	۷
افسانہ: یہ بچے	سید محمد حسنین	۸
اپنی جانچ کیجئے	ص، ج	۹
نظیر اکبر آبادی	سید سفارش حسین	۱۰

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ مئی ۱۹۴۹ء

اب مسلمان علما کو کیا کرنا ہے

(۳)

پچھلے پرچے میں ہم نے جمعیتہ العلماء ہند کو اس تاریخی فیصلے پر مبارک باد دی تھی کہ وہ سیاست کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی حقوق کی حفاظت اور ان کی مذہبی تعلیم کا کام کرے گی ان میں سے مذہبی تعلیم کے بارے میں ہم نے اپنے ناچیز خیالات کے پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے آج پورا کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے ہم کو یہ عرض کرنا ہے کہ اس صدی کے شروع میں علماء دین کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لامذہبی کے مرض میں گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن آگے چل کر ایک طبقے کو ریاکاری کی مہلک روحانی بیماری لاحق ہو گئی جو لامذہبی سے بھی بدتر تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں عقیدے اور عمل کے لحاظ سے مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن مسلمان عوام کی مدد سے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے مذہب کا نام جپتے تھے۔ دوسری طرف سیاسی بحران کے اثر سے عام مسلمانوں کے شعور مذہبی کا دائرہ جو صدیوں سے تنگ ہوتا چلا جاتا ہے اور سکڑ کر رہ گیا۔ آج مسلمانوں کی مذہبی تعلیم میں سب سے زیادہ اس بات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کے شعور مذہبی میں خلوص اور وسعت پیدا کی جائے۔

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے توحید کا ایک سہل، سادہ اور دلنشیں تصور پیش کیا اور اسی کے ساتھ عقیدۂ توحید کے عملی نتیجوں پر بہت زور دیا۔ وہ نتیجے یہ تھے کہ جب خالق ایک ہے تو مخلوق بھی ایک ہے۔ کائنات کے نظام میں وحدت ہے، اخلاقی قدروں میں وحدت ہے، قدرت کا ایک ہی قانون اور اخلاق کا ایک ہی قانون ہے اور وہ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے رہیں جو ایک دوسرے سے لڑتے ہوں اور الگ الگ تہذیبیں بنائیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوں بلکہ انسانوں کی ایک عالمگیر برادری اور عالمگیر تہذیب بن سکتی ہے اور بننی چاہیے۔

جس زمانے میں مسلمان توحید پر دل و جان سے ایمان رکھتے تھے انھوں نے وحدت انسانی کے قائم کرنے میں وہ کام کیا جسے دنیا کبھی نہیں بھولے گی۔ دنیا کی بہت سی تہذیبوں کے علمی، اخلاقی، تمدنی سرمائے کو لے کر انھوں نے ایک ہم آہنگ تہذیب بنائی اور بہت سی نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک ہم رنگ سماج تعمیر کی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن ایک مدت کے بعد توحید کا جوش ٹھنڈا ہونے لگا۔ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر تہذیبی لین دین کا حوصلہ نہیں رہا۔ پست ہمتی نے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دیا کہ اگر ہم دوسری تہذیبوں کے پاس گئے تو ان سے اپنے کام کی چیزیں لے کر اپنے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے ہم ان کے سانچے میں ڈھل جائیں گے اس لئے سلامتی کی تدبیر یہ نظر آئی کہ ہم اپنے گرد ایک دیوار کھینچ لیں اور اس میں محصور ہو کر بیٹھ جائیں۔ اس طرح ہم جو گروہ بندی کو مٹانے آئے تھے خود ایک گروہ بن گئے۔ دنیا کی اجتماعی تہذیب کے دھارے سے الگ ہو جانے کے بعد ہماری تہذیب نے ایک چھوٹے سے بھنور کی شکل اختیار کر لی۔ ہم اسی پر خوش ہیں کہ دریا کے ساتھ نہیں بہتے۔ اس کی فکر نہیں کہ ہم دریا کے بہاؤ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اور ملکوں کو جانے دیجئے ہندوستان کے مسلمانوں کو لیجئے ہم پر وہ پست خیالی اور تنگ نظری جو گروہ بندی کی خصوصیت ہے مسلط ہے۔ دنیا کے کروڑوں انسانوں کی صدیوں کی ذہنی اور عملی جدوجہد کو ہم اس قابل نہیں سمجھتے کہ ایک نظر ڈال کر دیکھیں تو سہی کہ اس میں کون سی چیز ہماری زندگی میں کھپ سکتی ہے اور اس کی نشو و نما میں مدد دے سکتی ہے سب کو ہم غیر اسلامی کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ مغربی علوم غیر اسلامی، ہندی فکر غیر اسلامی، نئی ذہنی اور معاشی تحریکیں غیر اسلامی۔ اور اسلامی کیا ہے؟ ہماری عہد وسطیٰ کی فرسودہ تہذیب جو اپنے زمانے میں بازنطینی، یونانی، ایرانی، ترکی اور خدا جانے کتنے غیر اسلامی عناصر سے مل کر بنی تھی۔

ہمارے علماء مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کام ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ بڑا مبارک ارادہ ہے۔ اس کے تنظیمی، مالی اور دوسرے پہلو بھی بہت غور و فکر کے محتاج ہیں لیکن اس وقت ہم صرف اسی پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی شعور میں خلوص اور وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو مذہبی تعلیم میں اخلاقی عمل کی پاک روح پھونکئے، ورنہ ریاکاری کی ناپاک روح اس کے اندر گھس جائے گی۔ دوسرے اسے عام تعلیم کی راہ کا پتھر نہ بنائیے بلکہ اس کے اندر اس طرح کھپائیے کہ اس کی روح رواں بن جائے۔ مسلمان بچوں کے دلوں میں قرآن کی تعلیم کا بیج بوئیے۔ اور اخلاقی تربیت سے اس کی آبیاری کیجئے۔ لیکن ان پودوں کو بسم اللہ کے گنبد میں پروان چڑھانے کی کوشش نہ کیجئے، بلکہ کھلی زمین پر کھلی فضا میں اور پودوں کے ساتھ اگنے اور بڑھنے دیجئے، مشرق، مغرب، جنوب، شمال کی ہوا سے حیات بخش عناصر حاصل کرنے دیجئے۔ پھر دیکھئے کیسے صحت مند، مضبوط، تناور درخت بنتے ہیں، کیسے خوش نما پھول لذیذ اور مفید پھل لاتے ہیں۔

بزم بے تکلف

"آیئے ماسٹر صاحب۔ اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے"

"کیا کہوں رائے صاحب درشن کی بھوک تو مجھے بھی بہت اٹھتی ہے۔ مگر اس راشن کی بھوک نے کہیں کا نہ رکھا"

"ارے بھائی اب رائے صاحب کہہ کر کیوں جلاتے ہو جب خطاب دینے والے ہی نہیں رہے تو خطاب کیسا؟"

"ہے ہے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں! کیا انگریز بہادر کو کچھ ہو گیا؟"

"نہیں ان کو کیا ہونا تھا۔ یہ ان ہونی تو ہماری قسمت میں لکھی تھی"

"میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔ خدا آپ کو ناگو کھے سے گنہگار رکھے۔ ایسی بری فال منہ سے نہ نکالا کیجئے"

"اس بڑھاپے میں مسخرے پن کی باتیں کرتے شرم تو نہ آتی ہوگی؟"

"آتی تو ہے مگر دور سے شرما کر لوٹ جاتی ہے خیر آپ شرم کی بات کو چھوڑئیے، یہ بتائیے کہ جب انگریز بہادر موجود ہیں تو آپ کا خطاب کیسے گھل گیا!"

"جہاں ہوں گے وہاں ہوں گے، ہندوستان سے تو گئے"

"ہندوستان سے گئے تو کیا ہیری پھیری سے بھی گئے؟ اور اب تو ہم نے کامن ویلتھ کا رشتہ منظور کر لیا ہے اور بادشاہ کو بھی اس رشتے کی علامت کے طور پر مان لیا ہے۔ آخر آپ کا خطاب بھی تو اسی کی علامت ہے پھر اسے نہ ماننے کی کیا وجہ ہے"

"ہاں ماسٹر صاحب خوب یاد دلایا۔ یہ کامن ویلتھ کا کیا قصہ ہے اور علامت سے کیا مطلب ہے"

"جی یہ سلامت کا قافیہ ہے پہلے بادشاہ سلامت ہوتے تھے، اب بادشاہ علامت ہوا کریں گے"

"پھر وہی مسخرا پن، ذرا دیر کے لئے ماسٹر سے آدمی بن جائیے اور مجھے یہ سمجھا دیجئے کہ کامن ویلتھ کا نیا رشتہ کیا ہے اور بادشاہ کو علامت سمجھنے کے کیا معنی ہیں"

"رائے صاحب میں آپ کو کیا سمجھاؤں اور کیسے سمجھاؤں یہ حقیقت کے باریک نکتے ہیں جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتے معرفت کے نازک مقامات ہیں جو نقشے میں نہیں دکھائے جا سکتے۔ دیکھنا ہے تو دل کی آنکھوں سے دیکھئے ظاہری آنکھوں سے حجاب مجاز کے پیچھے جھانکنے کی اور ظاہری ہاتھوں سے اس حجاب کو رفع کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے۔

پچھلا ہفتہ :- ہندوستان

مہاسبھا کی نئی کروٹ

ہندو مہاسبھا نے پچھلے پندرہ مہینے کے اندر کئی کروٹیں بدلیں۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے شروع میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک مدت تک سیاست سے الگ رہ کر ہندوؤں کی مذہبی اصلاح اور تہذیبی ترقی کا کام انجام دے گی۔ اسی سال اگست میں اس کی ورکنگ کمیٹی کے جلسے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے سیاسی تیاگ کی مدت ختم ہونے والی ہے اور وہ پھر سیاست میں حصہ لے گی۔ مگر ہندو ریاست کی جگہ غیر مذہبی جمہوری ریاست کی حمایت کرے گی اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے اپنا دروازہ کھول دے گی۔ دسمبر میں مہاسبھا کی کونسل نے غیر مذہبی جمہوری ریاست والی تجویز کی تو تصدیق کی مگر اس پر راضی نہیں ہوئی کہ ہندوؤں کے سوا کسی اور مذہب کے پیروؤں کو اپنا ممبر بنائے۔ ابھی چند روز ہوئے اس کی ورکنگ کمیٹی نے زمانے کے رنگ کو دیکھ کر ایک اور کروٹ لی ہے اور اپنا ایک معاشی پروگرام پیش کیا ہے جس کی خاص دفعات کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ زمین حکومت کی ملکیت ہو۔ قانون لگان میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ کاشتکار اپنی محنت کا پھل پا سکیں۔

۲۔ سب بنیادی صنعتیں قومی ملکیت ہوں۔ صنعتی مزدور کارخانوں میں حصہ دار ہوں۔

سارے پروگرام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا حصہ پنڈت نہرو اور دوسرے کانگریسی وزیروں کی تقریروں سے جن میں حکومت ہند کی معاشی پالیسی کا اظہار کیا گیا ہے، ماخوذ ہے۔ صرف کارخانوں میں مزدوروں کے حصہ دار ہونے کا نکتہ زیادہ ہے۔ مہاسبھا کے جنرل سکریٹری صاحب نے اس کی پالیسی کی تشریح کرتے ہوئے از راہ عنایت یہ بھی فرمایا کہ مہاسبھا نے اب ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان منتقل کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ ہاں وہ ان کو قومی بنانے کی کوشش کرے گی۔ ہندو راج کا خیال وہ پہلے ہی چھوڑ چکی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مہاسبھا کے لوگ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کے اندر کیوں نہیں شامل ہو جاتے۔ انھیں الگ پارٹی بنانے کی کیا ضرورت ہے اور اگر ہے بھی تو اسے صرف ہندوؤں تک محدود رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ جب تک مہاسبھا کی طرف سے ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہ دیا جائے لوگوں کو یہی شبہہ رہے گا کہ مہاسبھا کے مقاصد وہی اصلی وہی ہیں جو پہلے تھے مگر اس نے بدلی ہوئی فضا کو دیکھ کر مصلحتاً انھیں چھوڑ دیا ہے اور نئے مقاصد جن میں عوام کے لیے زیادہ دلکشی ہو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا [illegible]

یہ تسمہ بھی کیوں لگا رہے

آئین ساز اسمبلی کی اس کمیٹی نے جو ہندوستان کی پارلیمنٹ میں اقلیتوں کی نمائندگی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی ایک بڑے معرکے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے ایک عیسائی ممبر مسٹر مکرجی کی یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ پس ماندہ ذاتوں کے سوا کسی اقلیت کے لیے صوبوں کی کونسلوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں نشستیں محفوظ نہ کی جائیں۔ پہلے کمیٹی نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنے کی سفارش کی تھی مگر سکھوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ غالباً اس وجہ سے کہ سکھوں کی نمائندگی کے مسئلے میں بڑی الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کمیٹی نے مناسب سمجھا کہ مذہبی اقلیتوں کی جداگانہ نمائندگی کا قصہ ہی ختم کر دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ کمیٹی کے چالیس ممبروں میں سے صرف ایک یعنی جعفر امام صاحب نے اس تجویز کی مخالفت کی، اور سب مسلمان ممبروں نے اور سکھ ممبروں نے تائید کی۔ رہے عیسائی تو ان کی طرف سے گویا یہ تجویز پیش ہی ہوئی تھی۔

دراصل اس تجویز کا اثر زیادہ تر مسلمانوں پر پڑتا ہے۔ اس لیے کہ عیسائیوں کے لیے تو صرف بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں بہت تھوڑی نشستیں محفوظ ہو سکتی تھیں اور سکھوں کا مسئلہ محض مشرقی پنجاب تک محدود تھا۔ مسلمانوں کے لیے مختلف صوبوں میں پانچ فی صدی سے چودہ فی صدی تک اور مرکز میں کوئی ساڑھے بارہ فی صدی نشستیں محفوظ ہونے کا امکان تھا جو اب جاتا رہا۔

جب سے یہ مسئلہ چھڑا ہے مسلمانوں میں اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے مگر ایک بہت بڑا گروہ جن میں سابق مسلم لیگی بھی شامل ہیں کہتا ہے کہ جب انتخاب مخلوط ہے تو نشستوں کا محفوظ کرانا بے کار بلکہ مضر ہے۔ محفوظ نشستوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ سیاست کی فضا باقی رہے گی اور وہ مسلمانوں کے لیے مہلک ہو۔ ایسی صورت میں مسلمان نمائندے آبادی کے تناسب سے منتخب ہو کر کونسلوں میں کچھ نہیں کر سکیں گے۔ نشستوں کے تحفظ کو ختم کر دینے سے یہ توقع ہے کہ سیاست میں فرقہ پرستی کا رنگ ہلکا پڑ جائے گا اور مسلمانوں کی نمائندگی آبادی کے تناسب سے کم نہیں ہو گی اور اگر کچھ کم بھی ہو جائے تو اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اس مسئلے کے متعلق اپنی رائے کسی قدر تفصیل سے آئندہ اشاعت میں لکھیں گے۔

ہریجن کا ست (سلسلہ ۲)

اسکول میں پڑھائی بنیادی تعلیم کے پروگرام کے تحت ہو گی۔ ہر استاد اور جماعت کو مکمل آزادی ہو گی کہ کتابی تعلیم اور زندگی کے ذریعے تعلیم میں تال میل پیدا کرنے کے لیے تجربہ کرے اور سکیمیں بنائے۔

بچے مختصر تعلیمی وقفوں سے کہیں جلد پڑھ لیتے ہیں اور اس کی دلچسپ مثالیں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ہماری توجہ دوسری طرف مرکوز ہوتی ہے، پڑھائی کا سلسلہ تحت الشعور میں جاری رہتا ہے۔ اگر بچے ہفتہ میں صرف تین دن اسکول آئیں گے تو اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ ان پر جسمانی قیود کا بوجھ کم پڑے گا۔ میرے خیال میں امریکہ میں بدنظمی کا ایک سبب یہ ہے۔ انھیں اپنے خاندان اور جماعت کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملے گا اور اس طرح وہ غیر رسمی تعلیم حاصل کرتے رہیں گے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ایک محدود رقم سے زیادہ ہندوستان کے سارے بچوں کی تعلیم کی رفتار دگنی ہو جائے گی۔ امریکہ میں چونکہ بچے گھر اور جماعتی زندگی سے الگ تھلگ ہیں اس لیے روایات اور تہذیب کو بڑا سخت نقصان پہنچا ہے۔

بہت سے گھروں کا یہ حال ہے کہ اجتماعی زندگی کی روایتیں اتنی کھوکھلی ہو چکی ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں بغیر ہدایت اور نگرانی کے اپنی عمر کا جو حصہ وہاں گذاریں گے وہ ضائع ہو جائے گا، کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ہر معاملے کا فیصلہ اس کے حسب حال ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ہمیں اس کی احتیاط ضرور رکھنی چاہیے کہ ہم کہیں تہذیب کے ان عناصر کو نظر انداز نہ کر دیں جو ہماری بنیادی [illegible] فطرت بن گئے ہیں۔

ہندوستانی پرچار ودیالیہ

ہندوستانی پرچار سبھا کی اور سے ہندوستانی کی پڑھائی کے لیے ہندوستانی ودیالیہ چلایا جاتا ہے۔ یہ ودیالیہ ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء سے شروع ہو گا اور اپریل سنہ ۱۹۵۰ء تک چلے گا۔ اس میں شروع سے یعنی ہندوستانی لکھاوٹ سے ہندوستانی قابل تک کی پڑھائی ہوتی ہے۔ اس میں شامل ہونے کے لیے عرضی ۳۱ مئی سنہ ۱۹۴۹ء تک وردھا کاریالیہ میں پہنچ جانی چاہیے۔ ودیالیہ میں پڑھنے والے اپنے خرچ سے پڑھیں گے۔ بھوجن خرچ ماسک ۲۵ روپے کے قریب آتا ہے فکشن اور رہنے کا مکان مفت دیا جاتا ہے۔ قابل کے بعد کی پڑھائی کے لیے بھی [illegible] سے ورگ رہیں گے۔ جن کے ورگ میں انھیں کو داخل کیا جائے گا جو پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہندوستانی کے پرچار میں اپنی سیوا دینے کو تیار ہوں۔ اس ورگ کے لائق غریب امیدوار کو سبھا کی اور سے ماسک ۲۵ روپے کی چھاترورتی دی جائے گی۔ پینشن [illegible] رہنے کی ورستھا بھی رہے گی۔ وشیش جانکاری ہندوستانی پرچار سبھا وردھا کے دفتر سے مل سکے گی۔

(د، تھا، نانا ولی - منتری ہندوستانی پرچار سبھا وردھا)

ؔ۵ ذہانت ؔ۶ ماہر [illegible] درجہ ؔ۷ وظیفہ ؔ۸ سہولت ؔ۹ خاص معلومات

۲ - پاکستان

دولت مشترکہ اور پاکستان

کامن ویلتھ کانفرنس کی کامیابی کے بعد آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں نے بھی ایک بیان دیا ہے جو قارئین کی نظر سے گذر چکا ہوگا۔ کانفرنس کے اختتام پر لندن سے جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا تھا اس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ بننے کا اعلان کرنے کے بعد شاہ انگلستان کی رسمی اطاعت سے آزاد ہو چکا ہے مگر اس کے باوجود کامن ویلتھ کا ممبر رہے گا۔ لیکن باقی ملکوں کی کامن ویلتھ میں شرکت کی اساس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی یعنی وہ بدستور شاہ برطانیہ سے رسمی وفاداری کا اعلان کریں گے۔ ان کے گورنر جنرل رسماً بادشاہ سلامت کی طرف سے حکومت کریں گے۔ اور ممالک غیر میں ان کے سفراء شاہ انگلستان کی طرف سے اسناد نمائندگی پیش کریں گے جیسا کہ ہم کل بھی لکھ چکے ہیں۔ یہ تفاوت و امتیاز پاکستان کے باشندوں کو نفسیاتی و جذباتی طور پر بہت ناگوار گذرے گا۔ آسٹریلیا، کناڈا اور نیوزی لینڈ کی پوزیشن بالکل مختلف ہے۔ کامن ویلتھ کانفرنس کے نئے فارمولا کی سیاسی بین الاقوامی اور اقتصادی اہمیت سے قطع نظر اس کی ایک نفسیاتی اہمیت بھی ہے اور اس کا تعلق صرف پاکستان سے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان ایک ہی دن معرض وجود میں آئے تھے۔ چند ماہ بعد ہندوستان بالکل آزاد ہو جائے گا (رسماً اور عملاً) مگر پاکستان کو حیثیت ایک ڈومینین کی رہے گی۔ ایک پاکستانی اپنی حکومت سے بجا طور پر یہ پوچھ سکتا ہے کہ ہم نے اس تعلق سے کیا حاصل کیا۔ ہندوستان نے قطع تعلق کی دھمکیاں دے کر ہر ممکن حصہ داد حاصل کی۔ اور آج ہی کی نئی دہلی کی رپورٹ مظہر ہے کہ دہلی کے سیاسی حلقے پر امید ہیں کہ نئے سمجھوتے کے بعد ہندوستان کو برطانیہ اور امریکہ سے زیادہ مدد ملے گی۔ حقیقی ہندوستان نے اس کانفرنس سے پہلے بھی مراعات حاصل کیں اور اب ریپبلک کی حیثیت سے کامن ویلتھ ... [illegible]

برائے نام تعلق کے فارمولا کی منظوری کے بعد مزید مراعات حاصل کرے گا۔ مگر پاکستان کو پہلے بھی نظرانداز کیا گیا اور آئندہ بھی نظرانداز ہی کیا جائے گا۔ نئی دہلی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کو مالی امداد، ٹیکنیکل امداد اور فوجی امداد ملنے کی توقع ہے۔ یعنی روپیہ، اسلحہ اور ٹیکنیکل ماہرین ہندوستان کے لئے اور پاکستان کے لئے صرف انگریز افسر!

مسٹر لیاقت علی خاں کا بیان غالباً اس ناگوار پہلو کی تلخی کو کم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ کیونکہ اس میں اہم بات صرف یہ ہے کہ پاکستان کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نئے آئین کی تشکیل کے بعد آزاد جمہوریہ بن جائے اور کامن ویلتھ سے بالکل قطع تعلق کرلے یا ایسی ہی شرائط پر اس سے وابستہ رہے جیسی شرائط ہندوستان نے منوائی ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے ہندوستان سے تعلقات کی نئی اساس کے بعد کامن ویلتھ کے دوسرے ممبروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے بھی ایسی ہی شرائط کا مطالبہ کریں مگر رسمی حق اس وقت تک بے معنی ہے جب تک آپ اسے منوانے کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے پاس قوت تھی اس لئے اپنا حق منوا لیا۔ پاکستان کے لئے بھی صحیح رستہ یہی ہے کہ وہ ہندوستان کے مقابلے میں کم تر پوزیشن قبول نہ کرے بلکہ نئے آئین کو جلد از جلد مکمل کر کے اپنے آزاد جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دے اور کامن ویلتھ سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرے۔ ایک غیر برابر کی حیثیت سے کامن ویلتھ سے وابستہ رہنا پاکستان کی توہین ہے لیکن جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں کامن ویلتھ سے تعلقات ... [illegible] ... سے وابستگی کی نئی اساس ... [illegible] ... لئے قوت ضروری ... [illegible] ... جنگ فوج اور سول ... [illegible] خارجہ میں کلیدی اسامیوں پر ... [illegible] کا قبضہ ہے اور انہیں پاکستان کی پالیسی میں دخل حاصل ہے۔ پاکستان کی پوزیشن کمزور رہے گی اور وہ نہ کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو سکے گا نہ برطانیہ سے اپنا کوئی مطالبہ منوا سکے گا!

(نوائے وقت)

پاکستان کی غذائی صورت حال

پاکستان کی غذائی صورت حال نہایت تسلی بخش ہے اور نئی فصل کا غلہ دستیاب ہو جانے کے بعد قیمتیں بھی کم ہو کر عام سطح پر آجائیں گی۔ غلہ کی بکری ٹیکس سے مستثنیٰ کر دی گئی ہے۔ اس سے صورت حال اور بھی زیادہ اچھی ہو جائے گی۔

چند ماہ پہلے مغربی پنجاب کی حالت تشویشناک تھی لیکن مرکزی حکومت نے امداد کی اور جتنا غلہ پنجاب نے طلب کیا تھا اسے مہیا کر دیا۔ پنجاب نے حکومت پاکستان کو گیہوں اور دوسرے غلوں کی بچی ہوئی مقداریں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن سال کے خاتمے پر معلوم ہوا کہ غلہ کی بچت کے بجائے ... ٹن غلہ کی کمی ہے لہٰذا حکومت پنجاب نے مرکز سے درخواست کی کہ بیرونی ملکوں سے غلہ درآمد کر کے اس کی ضروریات پوری کی جائیں۔ مرکزی حکومت کو یقین تھا کہ ذخیرہ بازوں نے غلہ کے ذخیرے روک رکھے ہیں اور اس نے صوبے کو مطلوبہ غلہ اس لئے مہیا کر دیا کہ جب وہ وہاں پہنچ جائے گا تو قیمتیں گر جائیں گی، اور چور بازار کا کام کرنے والوں اور ذخیرہ بازوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ وہاں گذشتہ دو ماہ میں فی من قیمت میں تقریباً ۸ روپے کی کمی ہوگی........

صوبہ سرحد نے مرکزی حکومت سے ... ٹن گیہوں طلب کیا تھا جو حاصل کر لیا گیا ہے اور اسے دیا جا رہا ہے۔ پہلے صوبہ سرحد کی طرف سے ۵۰۰۰ ٹن کمی کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن اب وہ صرف ۱۰۰۰ ٹن کمی رہے گا۔

بلوچستان کو بھی کافی غلہ مہیا کر دیا گیا ہے بلوچستان میں غلہ کی قلت ہے اور اسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے باہر سے غلہ منگوانا پڑتا ہے۔ اب حکومت کی طرف سے سستے بھاؤ کا غلہ مہیا کیا جا رہا ہے۔

فراہمی کی عام قیمت ۱۰ روپے اور قیمت اجراء تقریباً ۱۳ روپے ہے۔

مشرقی بنگال کا غلہ کا سال یکم نومبر ۱۹۴۸ء سے شروع ہو کر یکم نومبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہوتا ہے مشرقی بنگال کے وزراء نے ایک حالیہ ... [illegible]

... کانفرنس میں فیصلہ ... ٹن غلہ مل جائے تو کام چل سکتا ہے اور مرکزی حکومت ... یہ مقدار مہیا کرنے کی کوشش کر رہی ہے ...... (روزنامہ پاسبان ڈھاکہ)

۳۔ باہر کی دنیا

خدا راس لائے

ہالینڈ کی حکومت نے کچھ دنیا کی خصوصاً ایشیا کی رائے عامہ سے متاثر ہوکر کچھ حالات سے مجبور ہوکر انڈونیشیا کی جمہوری حکومت سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس کی شرطیں یہ ہیں کہ جوگ جکارتا میں جمہوری حکومت دوبارہ قائم ہوگی۔ ڈچ حکومت اپنی باقاعدہ فوجوں کو اور جمہوری حکومت اپنے چھاپہ مار دستوں کو لڑائی بند کرنے کا حکم دے گی اور فریقین ہیگ کی گول میز کانفرنس میں انڈونیشیا کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ظاہر ہے کہ امن اور انصاف کے حامیوں کو اس خبر سے جتنی خوشی ہو کم ہے لیکن انڈونیشیا کا معاملہ اتنی بار بنتے بنتے بگڑ چکا ہے اور ڈچ اتنی مرتبہ بات کہہ کر مکر چکے ہیں کہ ابھی خوشی کا اظہار قبل از وقت ہے۔ سمجھوتے کی خبر کے بعد ہی یہ خبر آئی ہے کہ اس کی شرطیں ڈاکٹر بیل کو (جو ہالینڈ کی طرف سے ملک کے نمائندے کی حیثیت سے انڈونیشیا بھیجے گئے ہیں) پسند نہیں آئیں اور انھوں نے استعفا دے دیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض بڑے فوجی افسر بھی اس سمجھوتے سے ناراض ہیں لیکن بظاہر ہالینڈ کی حکومت سمجھوتے پر عمل کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک کمیٹی اس لئے بنائی ہے کہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کو باضابطہ تسلیم کرنے کے سلسلے میں قانون اساسی میں مناسب ترمیموں کا مسودہ تیار کرے۔ خدا کرے اس بار صلح کی کوشش سچ مچ کامیاب ہو اور انڈونیشیا کی آزادی کی راہ میں کوئی نئی رکاوٹ نہ پڑے۔

بغیر پراسیحت کے

آپ کو یاد ہوگا کہ اقوام متحدہ کی برادری نے ۱۹۴۶ء میں اسپین کا حقہ پانی اس جرم میں بند کر دیا تھا کہ جنرل فرانکو نے جنگ عظیم کے دوران میں ہٹلر کا در پردہ ساتھ دیا اور اس کی حکومت بالکل فاشستی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ امریکا نے اور اس کی دیکھا دیکھی اور بہت سے ملکوں نے اسپین سے سفارتی تعلقات قطع کر لئے تھے۔ جہاں تک معلوم ہے فرانکو نے ان جرائم کی جن کی وجہ سے وہ برادری سے نکالا گیا تھا، کوئی تلافی نہیں کی اور اسپین میں اب بھی فاشستی حکومت کا دور دورہ ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کمیونزم کی مخالفت کے جوش میں بہت سے جمہوریت کے دعویداروں کا دل فاشزم کی طرف سے نرم ہو گیا ہے۔ چنانچہ یو۔ این۔ او کی پولیٹیکل کمیٹی میں جنوبی امریکا کی چند ریاستوں کا یہ رزولیوشن کہ اب اسپین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی آزادی دے دی جائے۔ ۱۶ کے مقابلے میں ۲۵ ووٹوں سے پاس ہو گیا۔ ۱۶ ریاستیں جن میں امریکہ اور انگلستان بھی شامل ہیں غیر جانب دار رہیں اتنی تھوڑی اکثریت کی وجہ سے عام خیال یہ ہے کہ رزولیوشن جنرل اسمبلی میں دو تہائی ووٹ جو اس کے پاس ہونے کے لئے ضروری ہیں حاصل نہیں کر سکے گا لیکن جو لوگ فرانکو سے رشتہ جوڑنے کے لئے بے چین ہیں وہ غالباً رزولیوشن کے نامنظور ہونے کے باوجود بھی یہ کر گذریں گے۔

خس آشیاں کے لئے

جرمن قوم نے اپنے مغربی فاتحوں کے حکم یا مشورے سے مغربی جرمنی میں ایک وفاقی جمہوری ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ۹ مئی کو اس کا آئین بنیادی قانون کے نام سے آئین ساز اسمبلی میں ۱۲ کے مقابلے میں ۵۳ ووٹ سے پاس ہو گیا۔ چند روز پہلے تک اس کی مختلف پارٹیوں میں بعض اہم آئینی مسائل کے بارے میں شدید اختلاف تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجوزہ آئین کے لئے ضروری اکثریت حاصل نہ ہو سکے گی لیکن جیسے ہی یہ خبر آئی کہ روس برلن کی ناکہ بندی اٹھانے کو تیار ہے یکبارگی رنگ بدل گیا۔

اب امریکا اور یورپ کے اخبار اس معمے کو حل کرنے کے لئے بے چین ہیں کہ آخر روس نے یکایک برلن کی ناکہ بندی ہٹانے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے دیکھا کہ مغربی جرمن ریاست کے قیام کو روکنے میں برلن کی ناکہ بندی بے کار ثابت ہوئی اور اس سے فائدے کی جگہ نقصان ہو رہا ہے تو اپنی چال بدل دی۔ بعض کا خیال ہے کہ روس نے یہ قدم ایک دوسرے "سنسنی خیز" قدم کی تمہید کے طور پر اٹھایا ہے۔ اس کے بعد جب ۲۳ مئی کو وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہوگی تو روس یہ تجویز پیش کرے گا کہ چاروں طاقتیں جرمنی سے اپنی فوجیں ہٹا لیں اور پورے ملک کو خالی کر دیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ قیاس آرائیاں کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہیں۔

ستم کی خدائی

اختر انصاری

لڑائی کے دیوتا کی قربان گہہ پر
جوان خون اپنا گراتے ہیں کچھ لوگ
مشینوں میں جھونکے ہوئے خود کو دن رات
پسینے کی ندی بہاتے ہیں کچھ لوگ
کہیں تنگ و تاریک اُجڑے گھروں میں
گہر آنسوؤں کے لٹاتے ہیں کچھ لوگ

ستم ہے کہ انسان کا حال یہ ہو
یہ آنسو، یہ خون، یہ پسینہ! ستم ہے
ستم ہے اگر زیست کہتے ہیں اس کو
اگر نام اسی کا ہے جینا؟ ستم ہے
ستم ہے، ستم ہے، ستم ہے خدایا
ستم ہے حیات آفرینا! ستم ہے

کہیں یہ نہ ہو، غرق ہو کر لہو میں
ستم خود پکارے دہائی ستم کی
پسینے کی ندی بہاتے ہیں جو آج
بڑھا دیں وہ کل کو کلائی ستم کی
بہے آنسوؤں میں ستمگر کا کس بل
ملے خاک میں یوں خدائی ستم کی

غزل

فضا ابن فیضی اعظمی

کیسے گذر رہے ہیں ہم مرحلۂ حیات سے
جھانک کے دیکھ لو ذرا پردۂ کائنات سے
آنکھ ابھی ملی ہی تھی حسن کرشمہ ساز سے
ٹوٹ پڑیں قیامتیں عشق پہ شش جہات سے
تیرے کرم کا شکریہ درس فنا دگی ملا
خاک بنا دیا مجھے شعلۂ التفات سے
دولت کاوش جگر تھوڑی سی ہاتھ آ گئی
اور تو کچھ نہ مل سکا عشق کی کائنات سے
یا تو یہی ہو خدا کرے یہ کسی فتنہ کار کی
دل میں جو ہو رہا ہے اک میٹھا سا درد رات سے
راز وفا نہ چھپ سکا، طرز جفا کو کیا کہوں
کوئی مفر نہ مل سکا ہم نفسوں کی گھات سے
ہر ابھی نامرادئ راہ کی کشمکش فضول
رہرو عشق کام لے حوصلۂ ثبات سے
عقل اداشناس دے عالم جست و خیز میں
بچ تو سکوں کشاکش گمرہی حیات سے
مل کے کسی سے بڑھ گیا اور بھی دل کا اضطراب
میں تو فریب کھا گیا اُن کی ہر ایک بات سے
راہ وفا میں اے فضاؔ خستگی و الم نہ پوچھ
ڈانڈے حیات کے یہاں مل گئے ہیں ممات سے

غزل

عالی جعفری

زندگی اوج مسلسل جو نہیں کچھ بھی نہیں
آج سے بڑھ کے حسیں کل جو نہیں کچھ بھی نہیں
اس گھنے پیڑ میں سینچا ہے لہو سے جس کو
اک نئی پھوٹتی کونپل جو نہیں کچھ بھی نہیں
ٹوٹ کے لاکھ برستا رہے یہ ابر محیط
اپنے کھیتوں ہی میں جل تھل جو نہیں کچھ بھی نہیں
سعی تعمیر ہے کیا؟ کوشش تخریب ہے کیوں
اپنی انسان میں اٹکل جو نہیں کچھ بھی نہیں
ذہن انسان پہ چھایا سا غبار اوہام
نور ایقان کا ہرادل جو نہیں کچھ بھی نہیں
کیا بنا لیں گی یہ دو چار ابھرتی موجیں
ایک سیلاب مسلسل جو نہیں کچھ بھی نہیں
چشم جاناں ہے بہت خوب مگر اس میں بھی
فکر ایام کا کاجل جو نہیں کچھ بھی نہیں

رباعیات

سید محمد احمد نقوی عاصی

انداز تغافل کو ستم سمجھا ہے
بے تابی فرقت کو الم سمجھا ہے
نووارد اقلیم تمنا تو نے
آئین محبت ابھی کم سمجھا ہے

ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا معلوم
موجوں سے مفر ہے نہ کنارا معلوم
ساحل سے یوں نظارہ کرنے والو
جو ہم پہ گذرتی ہے تمھیں کیا معلوم

فطرت کا جو منشا ہے کئے جاتا ہوں
جینا نہیں منظور جئے جاتا ہوں
عاصیؔ میں مئے زیست گوارا کر کے
آلام کی تلخی کو پیئے جاتا ہوں

اُف یہ بچّے!

سید محمد حسنین

والدین کو اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بہت سی دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر بچّہ کا جھوٹ بولنا۔

بچّہ کوئی غلط یا نامناسب حرکت کرتا ہے اور پوچھنے پر صاف انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ والدین اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اسی کی حرکت ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اس حرکت پر بچّہ کو سزا دینی چاہئے یا جھوٹ نہ بولنے کی زبانی تلقین کرنی چاہئے؟ اگر ہم اس سے باز پرس نہ کریں تو کیا وہ آیندہ جھوٹ بولتا ہی رہے گا؟ کون سی قوت بچّے سے جھوٹ بلواتی ہے؟ دوسرا بچہ جو سوتے وقت پلنگ پر لیٹا اپنے چند ہم عمروں کو طرح طرح کی باتیں سُنا رہا ہے۔ کیا اس کی من گھڑت باتیں بھی جھوٹ ہی میں داخل ہیں؟ کیا ہمیں اس سے بھی ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے۔

شہزاد (چار برس کا بچہ) جب بڑے اشتیاق سے یہ پوچھتا ہے "اباجی! ننھا کہاں سے آیا ہے؟" تو کیا ہمیں اسے جھوٹا جواب دے دینا چاہئے؟ یا سادہ الفاظ میں سچی بات بتا دینی چاہئے؟ کیا اس قسم کا جواب بچے کو مطمئن کر دے گا تاکہ وہ اس موضوع پر اور زیادہ خیال نہ دوڑا سکے؟

تین چار برس کا بچہ کھیل میں یا غصّے کی حالت میں اپنے ساتھیوں، ماں یا آیا کو کاٹ کھاتا ہے۔ والدین بچّے کی اس حرکت سے خفا ہو جاتے ہیں اور آیندہ سے دوسروں کے ساتھ نہیں کھیلنے دیتے۔ کیا بچّے پر یہ قید لگانا مناسب ہے؟ وہ کیوں کاٹتا ہے؟ کیا یہ ایک غیر معمولی فعل ہے؟ ہمیں اس عادت کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

بچوں کا بستر پر پیشاب یا پاخانہ کرنا عام ہے۔ پیشاب کرنے کی عادت تو اکثر بڑی عمر تک رہتی ہے۔ چھوٹے بچے والدین کی توجہ اور احتیاط کے باوجود اپنی اس فطری لیکن بدتمیزی کی حرکت سے گھر کی صاف ستھری جگہوں کو گندہ کر دیتے ہیں۔ سزا کے طور پر کیا ہمیں ایسے بچے کو اپنے سے دور کسی گندی سی جگہ پر سُلا دینا چاہئے؟ یا آدھی رات گئے بچے کو بستر کی میٹھی نیند سے اُٹھا کر ٹھنڈے پانی کے ٹب میں کھڑا کر دینا چاہئے؟ آخر ان کی اس بدتمیزی کی عادت کو چھڑانے کی کیا صورت ہے؟

ہم اکثر چھوٹے بچوں کو اپنے مخصوص عضو سے کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں! کبھی تو وہ اکیلا اس شغل میں منہمک ہوتا ہے۔ اور کبھی دوسرے ہم عمروں کے ساتھ اس کھیل میں معروف نظر آتے ہیں۔ ایسے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیا ہمارا ایک زور کا تھپڑ یا سخت گوشمالی اس کی یہ عادت کو ترک کرنے میں مفید ثابت ہوگی؟ بچّے نے یہ شغل یا کھیل کہاں سے سیکھا؟ یہ عادت اس نے کسی اور سے سیکھی یا اُسے آپ پڑ گئی؟ اور اس کا تدارک کیا ہے؟

یہ چند ایسی عام اور معمولی مثالیں ہیں جو گھر میں نظر آتی ہیں، لیکن بعض والدین کو اُن سے مختلف اور قسم کی دوسری عجیب و غریب دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں بھی بہت اہم اور والدین کی توجہ کی طالب ہیں: مثلاً

ناہید (دو برس کی بچی) اکیلی کھانے کے کمرے میں کچھ کھیل رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں اس کی امی سلائی میں مصروف ہیں۔ ناگہاں اُن کے کانوں میں عجیب سی آوازیں آتی ہیں —— "آبلی، چک چک آبلی چک چک" وہ دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ دیکھتی ہیں کہ ناہید کے ہاتھ میں کوئلے کا ایک ٹکڑا ہے جس سے وہ کمرے کی سپید دیوار پر چھوٹے بڑے، سیدھے ٹیڑھے "۱۰" کے بے شمار نشانات لگاتی جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ مہمل الفاظ بولتی جاتی ہے۔

امی کو اب کیا کرنا چاہئے؟ کیا انھیں حسب دستور "چھی چھی، کیا کر رہی ہو ناہید؟ سب دیوار خراب ہو گئی" کہتے ہوئے بچی کے ہاتھ سے کوئلہ چھین لینا چاہئے یا "بیٹی، یہاں نہیں کھیلتے۔ چلو ہم دوسری جگہ چل کر کھیلیں" کہتے ہوئے اُسے کمرے سے باہر لے جانا چاہئے؟ کیا بچی میں اس طرح دیوار پر لکھنے کی اور سنجیدگی سے ان مہمل الفاظ کو پڑھنے کی یہ خواہش فطری تھی؟ یا کسی کا دیکھا دیکھی؟ ہمیں اس خواہش کو ٹھیک راستے پر کس طرح لگانا چاہئے؟

شمی (ڈیڑھ سال کا بچہ) کو آیا دودھ کے برتن میں دودھ پلاتی ہے۔ دودھ میں شکر گھولتے وقت وہ نادانستہ چمچہ برتن میں چھوڑ دیتی ہے۔ شمی دودھ پیتے میں اچانک چمچہ کو دیکھتا ہے اور پیتے پیتے غصّہ میں دودھ کے برتن پر ایک زور کا ہاتھ مارتا ہے۔ دودھ کی ٹونٹی اس کے منہ سے باہر آ جاتی ہے، آیا کا ہاتھ ہل جاتا ہے اور چھلکتا ہوا دودھ سارے جسم پر گر جاتا ہے۔ آیا برافروختہ ہو جاتی ہے اور شمی خفا ہو کر دودھ پینے میں ضد شروع کر دیتا ہے۔

کیا ہمیں آیا کا یہ جلا کٹا جملہ کہ اس کی برافروختگی سے اتفاق کر لینا چاہئے —— "دیکھو تو، ابھی تو دودھ کے لئے روتے تھے اور جب پلا رہے ہیں تو پھینکتے ہو!" بچّے کی یہ حرکت کیا واقعی قابلِ گرفت ہے؟ ہمیں بچّے کو دودھ پلانے کے لئے پھر کیسے رضامند کرنا چاہئے؟

نیّر (ڈیڑھ برس کا بچہ) دوسرے چند چھوٹے اور بڑے بچوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ سارے بچے بہت خوش خوش ہنستے بولتے کھانا کھا رہے ہیں۔ نیّر ماما سے "مم" طلب کرتا ہے۔ ماما اس کے منہ میں نوالے ڈالتی ہوئی پاس کے ایک بچے کا گلاس اُٹھا کر نیّر کو پانی پلانے لگتی ہے۔ گلاس دیکھتے ہی "بوآ ہم دے، بوآ ہم شے" کہہ کر نیّر پانی سے بھرے ہوئے گلاس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر منہ سے لگاتا ہے۔ گلاس بھاری ہے اور پانی سے بھرا ہوا۔ ماما خود بھی سہارا دیتی ہے۔ نیّر پانی پیتے میں دانستہ ماما کے ہاتھوں کو ہٹا دیتا ہے۔ گلاس گر پڑتا ہے۔ کھانا دسترخوان اور برتن پانی سے خراب ہو جاتے ہیں۔ ماما بگڑتی ہوئی کہتی ہے "اچھے تو ہے ہی نا اور اپنے آپ سے پینے کی ضد کرتے ہیں جاؤ اب تمھیں کھانا نہ ملے گا"۔ دوسرے بچے ماما کی خفگی پر ہنسنے لگتے ہیں۔

کیا گلاس گرا دینے پر ہمیں بچّے کو سرزنش کی ضرورت ہے؟ دوسرے بچوں کی اس حرکت پر لطف لینے کا موقع دینا مناسب ہے؟ بچّے کی یہ دانستہ حرکت بجا ہے؟

ہر عمر کا بچہ روشن آگ کو دیکھ کر بے اختیار اس طرف لپکتا ہے۔ تین چار برس کے بچّے تو جلتی ہوئی دیاسلائی بھی خود سے جلانے کو اٹھا لیتے ہیں مگر والدین بچے کو اس خطرناک خواہش سے، جب تک وہ نو دس برس کا نہ ہو لے، دور رکھنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں، لیکن جھٹ سے جل جانے والی اس عجب شے کو جلانے کی خواہش اور اشتیاق بچے میں موجود رہتا ہے۔ اس کی متجسس نگاہیں ہر اس موقع کی تلاش میں رہتی ہیں جب وہ ابا جان یا بھیا کی دیاسلائی جیب سے نکال کر جلا جلا کر خوب تماشے دیکھے۔

کیا ہمیں بچّے کے اس اشتیاق کو دور کرنے یا دبانے کی کوشش کرنی چاہئے؟ چار برس کے بچے میں روشن آگ کو دیکھنے کی خواہش پر ہمیں اسے ڈانٹنا یا مارنا چاہئے؟

مندرجہ بالا مثالیں سرسری طور پر بلا کسی تخصیص کے بیان کی گئی ہیں۔ یہ موٹی موٹی اور معمولی معمولی مثالیں دراصل والدین کی توجہ اور فکر کی سخت محتاج ہیں۔ ہم بچوں کی زندگی کی ان بے شمار ادنیٰ باتوں کے مشاہدہ و تجربے کے ذریعے تربیتِ اطفال کے لئے صحیح طریقہ کار بنا سکتے ہیں۔ بچے کی ایک ذرا سی غیر معمولی حرکت بس کا ایک ادنیٰ غیر معمولی کام اور اس کی مہمل لیکن غیر معمولی بات حقیقت میں والدین کو اصول تربیت کا سبق دیتی رہتی ہے۔ ہمیں صورتِ حال کا جائزہ لئے بنا، گرد و پیش کا اندازہ کئے بغیر اور اپنی عقل و ذہانت کو صرف کئے بغیر بچوں کی ان چھوٹی چھوٹی، ادنیٰ باتوں پر ہرگز سرزنش اور باز پرس نہیں کرنی چاہئے۔ بچے کی کسی وقتی، فوری، یا معمولی حرکت سے ہمیں فوراً کوئی قطعی نتیجہ نہ نکال لینا چاہئے۔

(بقیہ صفحہ ۹)

اپنی جانچ کیجئے

(ص، خ)

اکثر لوگوں کو یہ بات کم و بیش معلوم ہے کہ بچپن، لڑکپن اور بلوغ کا زمانہ جسمانی اور نفسی نشوونما کا زمانہ ہے۔ آج کل کی دنیا میں اگر انسان کے جذبات کی نشوونما میں خامی رہ جائے تو وہ جسمانی نقص سے کہیں زیادہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

ہمارے جذبات کی کیفیت کا اثر ہمارے خیالات اور افعال پر پڑتا ہے۔ جو رابطے ہم دوسروں کے ساتھ قائم کرتے ہیں یا جس سانچے میں اپنی معاشرتی زندگی کو ڈھالتے ہیں وہ بھی بہت کچھ ہمارے جذبات کی پختگی یا خامی پر موقوف ہے۔ یہ چیز بالکل ذاتی اور شخصی ہے اور اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اگر انسان دیانت داری کے ساتھ اپنے دل کی حالت کا جائزہ لے تو وہ اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔

ذیل کے سوالات جذبات کی پختگی کے بیس پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سچائی سے دیجئے۔ ہر جواب پر جو آخر میں دئے ہوئے نقشہ جوابات کے مطابق ہو پانچ نمبر دینے چاہئیں۔ اگر چالیس سے کم نمبر آئیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جذبات کی پختگی میں بہت کسر ہے اور اس کی رفتار بہت سست ہے۔ ۴۵ سے ۵۰ نمبر تک یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ حد سے زیادہ اپنے اندر ڈوبے رہتے ہیں۔ اور اپنے جذبات کے ظاہر کرنے میں بے جا تامل سے کام لیتے ہیں۔ ۵۵ سے ۶۰ تک نمبر اوسط درجے کی پختگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں جن کے جذبات میں ہر لحاظ سے پختگی پائی جائے۔ پھر بھی بعض کو ۶۵ یا اس سے زیادہ نمبر مل سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی شخصیت بہت سڈول اور متوازن ہے۔ چاہے آپ سوالوں کا جواب صحیح دے سکیں یا نہ دے سکیں، لیکن ان کے ذریعے سے آپ کی توجہ اپنے جذبات کی کیفیت کی طرف ہو جائے گی اور یہ بات بجائے خود ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں ایک حد تک آپ کی جذباتی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دے گی۔

۱۔ کیا آپ اپنی ذمے داریوں کو قبول کرتے اور انھیں پورا کرتے ہیں۔

۲۔ کیا آپ ایسے شخص ہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکے؟

۳۔ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں کی نظر میں آپ کی اہمیت ہے اور ان کو آپ کی ضرورت ہے اور وہ آپ سے محض آپ کی ذات کی خاطر محبت کرتے ہیں؟

۴۔ کیا آپ ایمان داری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سماج میں اور اپنے دوستوں کے حلقے میں اپنی ایک حیثیت قائم کر سکتے ہیں؟

۵۔ کیا آپ کے دل میں اپنے ماں، باپ، بہن یا بھائی یا کسی اور قریبی عزیز سے مستقل شکایت رہتی ہے؟

۶۔ کیا آپ کو اپنے ماں باپ کی محبت پر پورا بھروسہ رہا ہے؟

۷۔ کیا آپ کو اس کا شوق ہے کہ دوسروں پر حکومت کریں یا دوسرے آپ پر حکومت کریں؟

۸۔ کیا آپ فیصلہ کرنے اور اس پر عمل کرنے میں مستعد ہیں؟

۹۔ کیا آپ دنیا کو ایسی جگہ سمجھتے ہیں جس میں رہنا دلچسپ اور ولولہ انگیز ہے؟

۱۰۔ کیا آپ کی توجہ زیادہ تر اپنی ذات کی طرف رہتی ہے؟

۱۱۔ کیا آپ دوسروں کے ساتھ کسی کام میں جو باہمی فائدے کے لئے ہو، اچھی طرح تعاون کر سکتے ہیں؟

۱۲۔ کیا گذشتہ صدموں، محرومیوں اور مایوسیوں کی یاد آپ کے دل میں غم و غصے کے جذبات پیدا کرتی ہے؟

۱۳۔ کیا آپ خیال کی دنیا میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں؟

۱۴۔ کیا آپ ان لوگوں سے جو نسل، مذہب یا سیاسی خیال میں آپ سے مختلف ہوں، تعصب رکھتے ہیں؟

۱۵۔ کیا آپ کی یہ عادت ہے کہ اپنی ناکامی کا سبب کسی جسمانی نقص کو یا ایسے حالات کو جو آپ کے قابو سے باہر ہوں قرار دیں۔

۱۶۔ کیا آپ واقعات کو اصلی رنگ میں دیکھنے سے گھبراتے ہیں اور حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں؟

۱۷۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں آپ مکمل اور مطمئن زندگی بسر کر سکیں؟

۱۸۔ کیا آپ کو سگریٹ یا شراب یا کسی اور نشے کے بہت زیادہ استعمال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

۱۹۔ کیا آپ مجموعی طور پر فکروں، پریشانیوں، مایوسیوں اور گہرے خوف سے آزاد ہیں؟

۲۰۔ کیا آپ اپنے سامنے ایسا ضابطہ اخلاق رکھتے ہیں جو آپ کی سیرت اور عمل کی خود بخود کسی جبر کے رہنمائی کرتا ہے۔

(ماخوذ)

نقشہ جوابات

۱۔ ہاں۔ ۲، ہاں۔ ۳، ہاں۔ ۴، ہاں۔ ۵، نہیں۔ ۶، ہاں، ۷، نہیں۔ ۸، ہاں۔ ۹، ہاں۔ ۱۰، نہیں۔
۱۱، ہاں۔ ۱۲، نہیں۔ ۱۳، نہیں۔ ۱۴، نہیں۔ ۱۵، نہیں۔ ۱۶، نہیں۔ ۱۷، ہاں۔ ۱۸، نہیں۔ ۱۹، ہاں۔ ۲۰، ہاں

اُف، یہ بچے (بہ سلسلہ صفحہ)

ممکن ہے والدین کو بعض مشاہدے اور مواقع پر تھوڑی الجھن اور کوفت محسوس ہو، لیکن ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلہ کو فی الحال ملتوی کر دیں اور تجربے کو ذہن میں رکھتے ہوئے بچے کی حرکت کا پھر سے مشاہدہ کیا کریں۔ اس کام میں صبر اور گہرے مشاہدے کی اشد ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ والدین اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں، لیکن بچے کے لئے وقت اور ذہانت کا خرچ برداشت نہیں کرتے۔ یہ والدین اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ خود بچہ بن کر بچوں کے ساتھ زندگی گذاریں اور اپنے بچے کی زندگی کے ان دلفریب و مسرت بخش ایام کو محض اپنے لئے ایک دلچسپی اور تفریح تصور کریں۔ اور بچے کی طبیعت اور نفسیات کا بہت گہرا مشاہدہ کریں۔

آپ کہیں گے میں نے مثالوں کا تو ڈھیر لگا دیا ہے مسائل کا کچھ حل پیش نہ کیا۔ آگے چل کر میں اس کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ کوشش محض ان اصول و قوانین کی وضاحت و صراحت پر مبنی ہوگی جو حل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اصول تربیت اطفال کو آپ ریاضی اور الجبرا کا فارمولا ہرگز نہ تصور کریں جن سے آپ بآسانی و باطمینان بچے کی ہر گتھی کو فوراً سلجھا سکیں گے۔

ایک بچہ دوسرے بچے سے ذہنی اور جسمانی طور پر مختلف ہوتا ہے، معاشرتی اور تمدنی لحاظ سے بھی بچوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے؛ خود ایک گھر میں ایک ہی جگہ اور ایک ہی ماحول میں مساوی عمر و ذہن کے دو بچے ایک انداز، ایک ہی سے برتاؤ سے یکساں اثر پذیر نہیں ہوتے۔ والدین کا اپنے تجربہ و مشاہدہ سے اخذ کیا ہوا ایک اصول ایک بچے کی اصلاح میں بڑا کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے دوسرے کی تربیت و رہبری میں وہ بالکل مفید نہ ہو۔ اس لئے والدین سے میری پرزور گذارش یہ ہے کہ وہ بچوں کی سرزنش اور بار پرس میں کافی صبر، عقل اور احتیاط سے کام لیں۔

نظیر اکبر آبادی

سید سفارش حسین

(۲)

نظیر نے شعر کو روزی کا ذریعہ نہیں بنایا، وہ ان کے دل کا بہلاوا تھا۔ شاعری روزی کا ذریعہ بنی تو دربار سے اس کی قیمت ملی۔ اس لئے درباری بولی میں شعر کہے جاتے جو عوام کی بولی سے الگ سی ہی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ درباری شاعری کے اشارے اور استعارے تشبیہیں اور تلمیحیں اور بہت سے خیالات عوام کے لئے پہیلیاں تھیں اس لئے وہ شعر کے ترنم اور موسیقیت سے تو مزہ لیتے مگر معنی اور دوسرے محاسن تک ان کی نگاہ نہ پہنچتی۔ نظیر نے بڑی حد تک اس عیب کو دور کیا اور شعر کو عوام کی سمجھ بوجھ کے قریب لے آیا۔ مگر اس کی سزا بھی پائی۔

"نظیر کی شاعری میں سقم ہیں۔ اس کے ہاں غریب الفاظ اور متروکات کی بھرمار ہے۔ اس کے کلام کا بیشتر حصہ فن کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس لئے وہ شاعر نہیں اور ہے تو سوقیوں اور عامیوں کا۔"

یہ ہیں کم و بیش وہ اعتراض جو نظیر کی شاعری پر ہوئے ہیں۔ اعتراض کرنے والے اشرافی تہذیب کے رکھوالے جنھیں زندگی میں لے دے کے ایک شاعری ہی بچی تھی، جس کی حفاظت میں انھوں نے جان لڑا دی اور لڑاتے کیوں نہیں سب کچھ کھو کر اسے پایا تھا۔ یہی زندگی کا سرمایہ تھی، اس لئے بڑی کوشش سے اسے سنوارا، بڑی کاوش سے اس کے نوک پلک درست کئے۔ اب کوئی ان ذات اسے ہاتھ لگائے تو یہ بے چین نہ ہوں تو کون ہو؟ اس لئے انھوں نے شاعری کو ایسے اونچے استھان پر رکھا کر ہر کہ و مہ کا ہاتھ اس تک نہ پہنچے اور خود اس کے پروہت بن گئے۔ اسے مولوی عبدالحق کی زبان سے سنئے۔ مسدس حالی کے صدی ایڈیشن کی تقریب میں وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں ہر چیز آکر ذات بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری کی بھی خاص ذات تھی۔ وہ مخصوص طبقے اور خاص لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی، اور وہی اس کے نکات سمجھ سکتے اور اس کا لطف اٹھا سکتے تھے......

شعر یا موسیقی ہے کیا؟ یہی نہ کہ ہم الفاظ یا آواز کے ذریعے سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور لوگ اسے پڑھ کر یا سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ جو کچھ دیکھی اور سکھ سے سکھی ہوتے ہیں۔ کیا گنوار اور گنواروں کے دل نہیں ہوتا؟

...... کیا چیز ہے جو ان میں نہیں ہے، شجاعت، عشق و محبت، ہمدردی، عصمت و عفت، غیرت، ظرافت، سبھی کچھ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ یہی چیزیں بیان کریں، ورنہ زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آپ کی زبان تکلفات لایعنی سے پاک ہو۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں۔"

اعلیٰ شعر کی اس خوبی پر اب آپ نظیر کے کلام کو پرکھیے۔

نظیر کے کلام کے دو حصے ہیں۔ ایک چڑھتی عمر اور دوسرا ڈھلتی عمر کا۔ اور ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو اس نے محض اپنی تفریح طبع یا جوش طبع کے اظہار کے لئے کہا۔ دوسرے وہ جو اس نے دوسروں کی خواہش یا تفریح کی غرض سے کہا ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں رنگا رنگی ملے گی، متین، سنجیدہ، ناصحانہ، ظریفانہ اور ایسا بھی جس پر ظرافت کی قبا تنگ ہو کر کہیں کہیں چاک ہو گئی ہے۔

رہے ہیں اب تو پاس اس سج کے شام و سحر موتی
جبیں پر موتی اور سر میں ہیں موتی مانگ پر موتی
ادھر جگنو، ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی
بھرے ہیں اس پری میں بار در اب تو سراسر موتی
گلے میں کان میں نتھ میں جدھر دیکھو ادھر موتی

کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پرو لیتی ہے
نزاکت سے عرق کی بوند بھی مکھڑے کو دھوتی ہے
بدن بھی موتی، اور سر پاؤں سے پہنے بھی موتی ہے
سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی کچھ پسینے کے وہ تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے
دیا ابر گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے
بیاں ہو کس طرح سے آہ اس عالم کو کیا کہیے
تبسم کی جھلک میں یوں چمک جاتے ہیں دانت اس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشکبار دیکھ
زلف دراز، طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے جان ترا پاک صاف دل
اور خال کیا ہیں تیرے سویدائے رخ کے تل
گر زلف و دراز فہم رسا سے رہی ہے بل
لاکھوں طرح کا رنج ہی میں ہم رہے ہیں کھل
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس نہ کیا ہے جان تری چشم خوش نگاہ
اور سرو کیا ہے یہ ترا شمشاد قد واہ
گر سیر باغ چاہئے تو اپنی کر تو چاہ
حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے واہ واہ
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاوٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھماوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارہ
یا سائبان ستھرا یا بانس کا اسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا
مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گذارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات کا تحفہ:۔

پھنسی کسی کے تن میں سر پر کسی کے پھوڑے
چھاتی میں گرمی دانے اندر پیٹھ میں دو دو رہے
کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مروڑے
آتے ہیں دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

تیلی جہاں کسی نے ڈال اور کڑھی پکائی
مکھی نے وہیں یوں آ اونٹ کی بلائی
کوئی پکارتا ہے کیوں خیر تو ہے بھائی
ایسے جو کھانے ہو کیا تم کی مرچ کھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بگڑے وقت میں طوائف کو ہماری زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا۔ ہر محفل اور خوشی کے ہر موقع اس کے بغیر پھیکا رہتا۔ اس موسم میں تو ہر بات اس کے بغیر بے مزہ رہتی۔

زردار کی تو ان میں ہے بچھ رہی پلنگڑی
دلبر پری سی بیٹھی جھمکائے جوڑے بگڑی
مفلس کی کوئی مٹی یا ٹاٹ کی جھونپڑی
رنڈی ملی تو کالی یا کنجی، لولی، لنگڑی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات کی پچھیوں میں سے اہم یہ ہے:۔

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر
پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر
ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جتنے ہیں اب جہاں میں سبزی کے عشق والے
دل شاد سرخ آنکھیں سر سبز منہ اُجالے
پیتے ہیں سبز لڑکے کھاتے ہیں تر نوالے
کیا دیکھتا ہے بیٹھا او یار حسن والے
پی عاشقوں میں آکر دو رنگ کے پیالے

جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر والے
کھا کر افیم ظالم مت ہو جیو افیمی
تن سوکھ کر کھچاوے آواز ہووے دھیمی
کیوں بھنبھنا بنا ہے اے گلعذار سیمی
عاشق تو اب اسی کے من مست ہیں قدیمی
پی عاشقوں......

تاڑی و سیندھی پورا ظالم اگر پیئے گا
پھوڑے گا پیٹ تیرا یا پیشوں سڑے گا
پی کر شراب ناحق کیچڑ میں گر پڑے گا
اور یہ نشہ تو کر کے پیچھے کے قیر لڑے گا
پی عاشقوں......

گانجہ پیئے سے ہوگا تیرا شعور بُرا
اور چرس کے پیئے سے تجھ کو لگے گا کھرا
چاہے اگر تو ظالم عشرت کا ناز جھرا
تو پہن ہار باندھی اور سر پہ رکھ کے طرا
پی عاشقوں......

میں اس نشہ میں ظالم سو رنگ کے دھڑاکے
کو تیڑی کی ڈنگا پیٹ سینے کے سو کڑاکے
گر دیکھنے ہیں تجھ کو کچھ عیش کے جھڑاکے
تو جھاڑ اپنے پیچھے اور سر کو جھٹ جھڑاکے
پی عاشقوں......

نظیر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ یا کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے یا سننے والے پر وہ حالت ہو بہو طاری ہو جاتی ہے اور ذہن اسی احوال میں پہنچ جاتا ہے۔ جاڑے سے متعلق اس کی ایک مشہور نظم ہے اس کے کچھ بند پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا غم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دل ٹھوکر مار اُبھارا ہو اور دل سے ہوتی کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو، بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلے پہ کلا لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکان میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکر
جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑاکڑ اور تھر تھر
بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر
جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر
سناٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

بلدیو جی کا میلہ، آگرہ کے مشہور میلوں میں سے ہے۔ اس کی گرما گرمی کا حال نظیر سے سنئے:

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار
اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی نبکڑی کی اک طرف جھنکار
نورتن، پونچھ، انگوٹھی چھلے ہار
ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار
جس گنواری کو چاہئے دھکا مار
گر کے دے گالیاں کہے سے پکار
کیسا ٹھلا چلے ہے ڈاڑھی جار
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلہ ہے

پیٹھی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر
کوئی لیوے ہے کوئی دیوے پھیر
کوئی کمہاری لی کر رہا ہتھ پھیر
کوئی کاچھن کے چن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑن سے لڑ رہا منہ پھیر
کوئی بنئے کو مارتا ہے سیر
گالی دے، مار کوٹ، سانجھ سویر
لاٹھی پاٹھی ہے شور و غل اندھیر
رنگ ہے روپ......

عقیدت کے علاوہ ایسے میلوں میں جانے کی بڑی وجہ ایک اور بھی ہوتی ہے۔

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری
جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون نگاہ کی ڈوری
دل کو چھینے ہے سب برا جوری
دھوم نازو ادا جھکا جھوری
سج میں جیسے پیچ رسی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری
چوری کیسی کہ صاف سرزوری
رنگ ہے روپ......

نظیر کی زبان کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نے جو چیز جس کے لئے اور جس طرح کی لکھی ہے اس میں اسی کی اور اسی طرح کی زبان بھی استعمال کی ہے۔ بسنت کے متعلق اس کی دو نظموں کے کچھ حصے نیچے لکھے جاتے ہیں موضوع ایک ہے مگر قسم کے بدلنے سے زبان، خیالات اور طرز تک بدل گئی ہے۔

جوش نشاط عیش ہے ہر جا بسنت کا
ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا
باغوں میں لطف نشو و نما کی ہیں کثرتیں
بزموں میں نغمہ خوش دل افزا بسنت کا
پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں
ہے جن سے زرنگار سراپا بسنت کا
جا در پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
اے جان ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا
تشریف تم نہ لائے جو کر کر بسنتی پوش
کہئے گنا یہ ہم نے کیا کیا بسنت کا
سنتے ہی اس بہار سے نکلا نہ جی کے تئیں
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آکے کھلنا
اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنا
ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کر کے چکنا
اور ہنس کے کہا یار سے اے لٹ پھوٹا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا
اک پھول کا گیندوں کے منگایا اسے بجرا
دس من کا بنا ہار گندھا ہاتھ کا گجرا
جب آنکھ سے سورج کی ڈھلانات کا گجرا
جا یار سے مل کر یہ کہا لے مرے بجرا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

ایک ہی خیال کو دونوں جگہ جس طور پر بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل میں اگر جایا جائے تو مزہ جاتا رہے گا۔

جا در پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
اے جان ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا

اور

جب آنکھ سے سورج کی ڈھلانات کا گجرا
جا یار سے مل کر یہ کہا لے مرے بجرا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

نظیر کے یہاں الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ [illegible] نظموں کے ڈھالنے میں وہ چوکتا نہیں۔ [illegible] الفاظ [illegible] کے طریقے کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

نظیر کو شاعروں کی صف میں جگہ نہ ملی، اشرافی تہذیب کا دامن اس کے لئے تنگ تھا۔ مگر اس نے عوام کے دلوں میں جگہ بنائی۔ اُن کے سینے اس کے کلام کے دفینے تھے۔ آج جو اس کا کلام آپ کے سامنے ہے اس کے کلام کا تھوڑا سا حصہ ہے۔ میرے ایک عزیز مولوی سید عابد حسین صاحب نے کوئی سات سو غزلیں نظیر کی جمع کی ہیں نظموں کے متعلق میں صحیح تعداد اس وقت نہیں بتا سکتا اور جمع کہاں سے کی ہیں۔ انھی عوام سے تہذیب نے نظیر کو ٹھکرایا، عوام نے اسے سینے سے لگایا۔ اس کے جیتے جی تو اس کے گرد یادہ رہے۔ مرنے کے بعد اس کی قبر پر عقیدت کے پھول چڑھائے یہ بلند مرتبہ کس شاعر کو نصیب ہوا کہ اس کی قبر مرجع عوام بنی ہو۔ بسنت کے دن ہندو اور مسلمان اس کی قبر پر جمع ہوتے، محفل ہوتی اور عوام اپنے شاعر کا کلام سن کر اس کی یاد تازہ کرتے۔ نظیر کا انتقال بسنت کے دن نہیں ہوا تھا یہ دن شاید عوام نے اس لئے پسند کیا ہو کہ اس بہار شاعر کی یاد منانے کا اس سے بہتر

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:۔ یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
چندہ:۔ سالانہ ۶/ ۔ ششماہی ۳/

نہ ہندوستان میں اور نہ دوسرا بھی نہیں سکتا تھا ۔ انگریزنے جس طرح ہندوستانی تہذیب کی بنیادی اینٹوں کو آپس میں ٹکرایا اس طرح اس تہذیب کے مظاہر جہاں جہاں پائے مٹاتے ۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اس کی قبر پر جمع ہونے والے دو ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔

شرح چندہ غیر ممالک
ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی"
سالانہ ۔ ششماہی
فی پرچہ

طابع و ناشر:۔ عبد اللطیف اعظمی بی اے جامعہ
دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی
مطبوعہ جید پریس دہلی

هریجن کا ست

نواکھالی میں گاندھی شانتی مشن

پیارے لال

[illegible] میں جب گاندھی جی اپنی گرام یاترا کی مہم پر نواکھالی تشریف لے گئے تھے تو وہاں کی اقلیت دہشت زدہ اور نقل مکانی کے لئے بے چین تھی۔ ہجرت کے اس سیلاب کو روکنے اور ان لوگوں کو اپنے گھروں میں دوبارہ بسانے کی خاطر گاندھی جی نے یہ عہد کیا کہ وہ اس وقت تک نواکھالی نہیں چھوڑیں گے جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی عزت کرنا اور آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہنا نہ سکھا دیں گے۔ انھوں نے اس کا بھی اعلان کیا کہ اگر اقلیت کے تمام افراد ڈر کی وجہ سے نواکھالی کو چھوڑ دیں گے تو بھی وہ یکہ و تنہا وہاں رہیں گے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ایک شخص جو خدا پر بھروسہ رکھتا ہو، وہاں تن تنہا باعزت زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور تمام مذہبی رسوم ادا کر سکتا ہے۔ وہاں ان کی موجودگی سے حالات پر خوشگوار اثر پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا کام ختم کر سکیں انھیں بہار جانا پڑا تاکہ وہاں مسلمان اقلیت کے لئے وہی کچھ کریں جو کچھ کہ انھوں نے نواکھالی میں ہندو اقلیت کے لئے کیا تھا۔ بہار سے وہ دہلی گئے۔ نواکھالی سے چلتے ہوئے انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ اگر نواکھالی میں پھر فساد ہوا تو وہ مرن برت رکھیں گے اور ان کی غیر موجودگی میں وہاں امن و امان قائم رکھنے کی بھاری ذمہ داری گاندھی شانتی مشن پر ہو گی جو انھوں نے وہاں قائم کر دی تھی۔ انھوں نے شری ستیش چندر گپتا کو حکومت سے معاملہ کرنے کے لئے نامزد کیا۔ شری ستیش چندر گپتا مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں، اہنسا کے پکے پجاری ہیں اور نواکھالی کے گاندھی کیمپ کے جس کا مرکز کازرکھل میں تھا، انچارج تھے۔ گاندھی جی کو تین ہفتہ کے اندر نواکھالی واپس ہونا تھا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دہلی سے انھوں نے یہ لکھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "کرنا یا مرنا" کے اصول پر کاربند ہونا پڑے گا۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ جن لوگوں کو میں نواکھالی میں چھوڑ آیا ہوں انھیں بھی اپنی جگہ اسی اصول پر چلنا ہو گا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو دونوں ملکوں کے درمیان اور فرقوں کے مابین امن و سکون کو بحال رکھنے کی خاطر ان کی کامیاب قربانی نے ان کی اس مقدس ہدایت پر آخری مہر لگا دی۔

اس وقت سے گاندھی کیمپ تعمیری کاموں کے ذریعے دونوں فرقوں کی خدمت کر کے اپنی اس ہم آہنگی کو پھر سے مقدور بھر پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیمپ کے ۲۲ مرکز ہیں جن میں ۳۵ کام کرنے والے ہیں۔ ۱۱۵ آدمیوں کے علاوہ ان میں سے تقریباً سب کے سب مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں۔ سب کام کرنے والے ہم خیال، قول اور عمل میں عدم تشدد پر چلنے کا عہد کیا ہے اور سب ہندو مسلم اتحاد، ہندو قوم میں چھوت چھات کو مٹانے اور ہر ایک کی ایسی بے غرض خدمت کرنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے اخراجات تقریباً [illegible] کے اس فنڈ سے برداشت کئے جاتے ہیں جو نواکھالی کے کام کے سلسلے میں گاندھی جی کے پاس چندوں کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد ۵۰ ہزار سے کچھ زیادہ نقد چندے کی شکل میں اور کچھ جائداد بھی ملی ہے۔

کیمپ کی ممبری بلا امتیاز مذہب نسل یا رنگ ہر ایک کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ کیمپ میں مسلمان ممبر اور رضاکار بھی تھے اور ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا، لیکن ایک رجعت پسند گروہ کے ڈرانے دھمکانے، برادری سے نکالے یا باہر کرنے کے دباؤ سے انھیں الگ ہونا پڑا۔ یہ گروہ کیمپ اور اس کے کاموں کے خلاف ہے۔ کیمپ کسی بات کو چھپا کر نہیں رکھتا ہے کیونکہ اخفا اس کے عدم تشدد کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس کے دفتری کاغذات اور حساب کتاب کا بلا روک ٹوک معائنہ کیا جاتا ہے اس نے اپنی خدمات حکومت کی نذر کر دی ہیں اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون اور میل رکھنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے دو ممبروں سری ستیش چندر گپتا، اور چارو چودھری کو دیہی صنعتوں کو ترقی دینے کی کمیٹی اور ضلع اور صوبے کے "اقلیت بورڈ" میں جنھیں حکومت نے قائم کیا ہے۔ شامل کر لیا گیا ہے۔

کیمپ کی سرگرمیوں میں سے کتائی بنائی اور اس سے متعلق کاموں کی ٹریننگ سب سے اہم ہے کپڑے کی کمی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے کیمپ نے اس اسکیم کو شروع کیا ہے۔ اپنے مختلف مرکزوں کے ذریعے آج کی تاریخ تک اس نے کتائی بنائی اور رنگائی کا ہنر تقریباً دو ہزار مزدوروں اور عورتوں کو سکھایا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے کیمپ کی نگرانی میں کم سے کم ایک جوڑا دھوتی یا ساڑی بنی ہے۔ معمولی سستی چیزوں سے جو مقامی طور پر دستیاب ہو جاتی ہیں، دھنائی، کتائی اور بنائی کے آلات کے متعلق ریسرچ کرنے، انھیں تیار کرنے اور ان کو ترقی یافتہ شکل دینے کے لئے کیمپ نے کازرکھل میں ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اس نے پہلا [illegible] ایک اہم مہم شروع کی جس کا بہت جلد [illegible] اور مستقبل کے لئے بڑے امکانات [illegible]۔ لیکن بعض مفاد اہل غرض کے مخالف پروپیگنڈا اور سماجی دباؤ ڈالنے کی وجہ سے کام رک سا گیا اس نے بستی کا [illegible] کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کو شریک [illegible] کی تعمیر اور مرمت، تالابوں اور کنوؤں کی صفائی، مفت بیج تقسیم [illegible] رضاکارانہ طور پر [illegible] حاملہ ماؤں اور بچوں کو مفت [illegible] تقسیم کرنے کے لئے اس نے ریڈ کراس سوسائٹی کی مدد سے [illegible] بھاٹیالپور، گمارہ، کرپار اور [illegible] میں [illegible] کینٹین کھولے۔ دونوں فرقے کے لوگوں کی طبی مدد کے لئے کازرکھل، بھاٹیالپور اور چندر [illegible] میں شفا خانے کھول دیئے گئے تھے۔

اس نے جلاہوں کی ایک کواپریٹو سوسائٹی بھی قائم کی ہے جس کے دو ہزار سے زائد ممبر [illegible] وقتوں میں دھان اکھانے، ناریل کا تیل نکالنے، [illegible] پاؤڈر کے بنانے کاتنے اور بننے کا انتظام کر کے اس نے غریبوں کی مدد کی ہے۔ ہندوؤں میں ہر طرح کی چھوت چھات مٹانے پر اجتماعی عبادت پر اور عدم تشدد پر مبنی بھائی چارے کی شخصی مثالیں پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

شروع شروع میں اس کے کارکنوں میں صرف وہ لوگ شامل تھے جو گاندھی جی اور ستیش بابو کے ساتھ نواکھالی آئے تھے یا جو بعد میں بنگالی گورنمنٹ کی اجازت سے شامل ہو گئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی اس کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہند پاکستان دونوں ملکوں کے رہنے والے مرد اور عورت اس میں کام کرتے ہیں۔ یہ بتا دینا بھی نامناسب نہ ہو گا کہ گاندھی امن مشن کے ممبر ہندوستان میں بھی کام کرتے ہیں۔ نواکھالی امن مشن اس کا ایک اہم جزو ہے اس طرح اپنی بناوٹ، تاریخ اور کارگزاری کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے کہ اقلیتوں کی ہجرت روکنے کا اس نے بیڑا اٹھایا ہے دونوں ڈومینینوں کے تعلقات پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ کیمپ دونوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیمپ کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اس کا قائل ہے کہ دونوں ڈومینینوں کے درمیان دوستی اور سب فرقوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ وہ پاکستان کی اقلیتوں کو یہ بتاتا ہے کہ انھیں حکومت پاکستان کا وفادار رہنا چاہیے۔ اس حکومت میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ اکثریت کے لوگوں کا۔ یہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر وہ دوسروں کے مساوی حقوق کے خواہشمند ہیں تو انھیں اسی مناسبت سے ریاست کی عائد کردہ ذمہ داریوں اور فرائض کو انجام دینا چاہیے کیونکہ

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

نئی روشنی

دہلی

۲۴ مئی ۱۹۴۹ء

محفوظ نشستیں

آئین ساز اسمبلی نے جو کمیٹی اقلیتوں کے حقوق کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مقرر کی ہے اس نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ صرف ہریجنوں کے لئے صوبوں کی اور مرکز کی قانون ساز مجلسوں میں نشستیں محفوظ ہوں گی اور وہ بھی دس سال تک، اور کسی اقلیت کے لئے نشستوں کا تحفظ نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ یہ فیصلہ کمیٹی کے چالیس ممبروں میں سے انتالیس کی رائے سے ہوا ہے جن میں ہر مذہبی فرقے ہر سیاسی پارٹی کے نمائندے شامل تھے۔ اس لئے اس میں پوری اسمبلی کی رائے جھلکتی ہے اور اسے اسمبلی کے عام اجلاس میں منظور ہونا یقینی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری جمہوری ریاست میں جداگانہ انتخاب کی طرح محفوظ نشستوں کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم ابھی سچی جمہوریت سے بہت دور ہیں اور ہم میں ذات پات اور مذہب کا تعصب موجود ہے۔ ہریجنوں کے لئے عارضی طور پر نشستوں کا محفوظ کرنا اس بات کا اعتراف ہے کہ ذات پات کا تعصب ہمارے ملک میں ہے اور ابھی کچھ دن رہے گا۔ مذہبی اقلیتوں کے لئے کسی قسم کا تحفظ نہ کرنا بظاہر اس بات کا دعوے ہے کہ مذہبی تعصب ہمارے ہاں نہیں رہا؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دعوے کرنے کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا، تو پھر یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ مذہبی اقلیتوں کے لئے نشستیں محفوظ نہ کی جائیں؟

جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے اس میں دو مختلف محرک کام کر رہے ہیں۔ ہندو مہاسبھا والے اور ان کے ہم صدا جانتے ہیں کہ جتنی نشستیں اقلیتوں کے لئے محفوظ ہوں گی وہ سب کی سب ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اس لئے کہ وہ کوئی غیر ہندو امیدوار کھڑا نہیں کر سکتے۔ ان کی یہی تمنا ہے کہ نشستوں کا تحفظ ختم کر دیا جائے۔ کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی سمجھتی ہے کہ اگر اقلیتوں کی نشستیں الگ رہیں تو مخلوط انتخاب کے باوجود ان کی فرقہ وارانہ پارٹیاں اپنے اپنے امیدوار کھڑے کریں گی۔ اور کچھ لوگ [illegible]

منتخب ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ مگر اقلیتوں کے بہت ووٹ کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر الگ نشستیں ختم کر دی گئیں تو چند سر پھروں کے سوا کوئی غیر ہندو ان کی جماعت قائم کرنے کا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا دامن تھامے بغیر انتخاب کے میدان میں آئے اور جب سارے غیر ہندو امیدوار انہیں دو پارٹیوں کے ہوں گے تو سارے غیر ہندو ووٹ بھی انہی دونوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

تھوڑے سے فراخ دل اور بلند نظر بزرگ ایسے بھی ہیں جو پارٹی اور فرقے کی سطح سے اونچے ہو کر سوچتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محفوظ نشستیں غیر جمہوری ہیں اس لئے انہیں تو ختم کر دینا ہی چاہئے۔ لیکن اکثریت کو اس کی ذمہ داری لینی چاہئے کہ اقلیتوں کا نقصان نہیں ہونے پائے گا اور ان کے امیدوار بہت بڑی تعداد میں منتخب ہوں گے۔ ان میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہیں جنہوں نے اقلیتوں کی کمیٹی میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس پارٹی کے سب سے بڑے لیڈر کی حیثیت سے یہ ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔

اقلیتوں کو پنڈت جی کا شکر گزار ہونا چاہئے مگر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ سارے آثار یہی ہیں کہ آج کل کی فضا میں پنڈت جی اور ان کے ہم خیال بزرگوں کی کوششوں کے باوجود اقلیتوں کے خصوصاً مسلمانوں کے امیدوار زیادہ تعداد میں منتخب نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب اقلیتوں کو کرنا کیا ہے؟ وہ اس فیصلے کے خلاف احتجاج کریں؟ جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کا نتیجہ فرقہ وارانہ فضا کے بگڑنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ عقل اور مصلحت یہی کہتی ہے کہ جو کچھ نقصان ہو اسے صبر سے برداشت کر لینا چاہئے اور اپنی ساری اخلاقی اور روحانی طاقت اس کوشش میں صرف کر لینی چاہئے کہ خود ان کے دلوں سے اور ان کے ہندو بھائیوں کے دلوں سے فرقہ پرستی کا زہر دور ہو جائے۔ اگر ان کی نشستیں آبادی کے تناسب سے محفوظ ہو جائیں اور فرقہ پرستی کی فضا جیسی ہے ویسی ہی رہے تو ان کے نمائندے آئین ساز مجلسوں میں جا کر کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر نشستوں کا تحفظ ختم کر دینے سے یہ تاریک فضا کسی قدر صاف ہو جائے تو جو لوگ ان کے ووٹ سے منتخب ہوں گے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں وہ ان کے جائز حقوق کی حفاظت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یوں بھی جمہوریت کی ہوا میں اقلیتیں کبھی نہیں مرجھاتیں بلکہ عام طور پر صحت مند مقابلے کی کشمکش میں اکثریت سے زیادہ زور لگانے کی وجہ سے اس سے زیادہ پنپتی ہیں۔

اقلیتوں کے مستقبل کی ضمانت کاغذ پر لکھے ہوئے تحفظ نہیں کر سکتے بلکہ صرف بے تعصبی اور جمہوریت کی سچی روح کر سکتی ہے۔ یہ روح ہمارے ملک میں ضرور ہے [illegible] جہالت، خود غرضی، تنگ نظری کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور ان کو توڑنے کے لئے [illegible]

بزم بے تکلف

"کہو تمہارا درآمد برآمد کا کاروبار اچھی طرح چل رہا ہے؟"

"اسے چھوڑے ہوئے تو مدت ہوئی حضور، آزادی کے بعد سے خوشامد درآمد کا بیوپار شروع کر دیا ہے۔"

"تم بھی نکمے ہی نکلے، ایسا اچھا کام چھوڑ بیٹھے۔"

"یہ اس سے بھی چوکھا کام ہے سرکار! دیس کا مال دیس ہی میں کھپ جاتا ہے اور مانگ اتنی کہ پورا کرنا مشکل، پھر یہ دیکھئے کہ سستا کتنا ہے، جتنا مال چاہو بناؤ اور جہاں چاہو بیچو۔ نہ پرمٹ کا جھگڑا نہ چنگی کا بکھیڑا، نہ آب کاری کا ڈر۔"

"آب کاری کیا معنی، کیا خوشامد کچھ شراب کی قسم سے ہے؟"

"بے شک حضور! شراب اور وہ بھی کچھ گھڑے کی، جو چلے میں الّو بنا دے۔"

"مگر اس شراب کی قدر تو انگریز کے زمانے میں زیادہ تھی، اب تو ان لوگوں کا دور ہے جو زاہد خشک کہلاتے ہیں۔"

"انہیں خشکوں کو تو تراوٹ چاہئے سرکار! انگریز بھلا کیا خاک پیتا، وہ تو اپنے حکمرانی کے ترنگ میں بن پئے مست رہتا تھا۔ بہت ہوا تو ذرا سی ہلکی ولائتی قسم کی پی لی، وہ بھی پہروں میں چسکی لے لے کر۔ اب تو ہمارے نیتا اور ادھیکاری، قائد اور حاکم شدھ دیسی ٹھرے کا مٹکے کا مٹکا چڑھا جائیں اور پھر پیاسے کے پیاسے۔"

"مگر سب کو تو نہ کہو۔ آخر ہم بھی تو ہیں کہ خوشامد کے نام سے بھڑکتے ہیں۔ کبھی ہم کو خوشامد سے پھسلاؤ تو جانیں۔"

"بھلا حضور کا کیا ذکر ہے۔ جان کی امان ہو تو کہوں کہ بس ایک رنگ ذرا سا تاؤ کھا گیا ورنہ سرکار کو جدھر سے دیکھئے انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ وہی ان کا [illegible]، وہی تیکھے تیور، وہی روکھا چہرا، وہی کھری باتیں۔ حضور کو سمجھانے کی ہمت تو وہ کرے جس نے ولایت میں مسکا لگانا سیکھا ہو۔ ہم جیسے کڑوا تیل چپڑنے والے بھلا کیا کھا کے حضور کو رِجھا پائیں گے؟"

"خیر، اور جو کچھ بھی ہو، مگر تم آدمی کو پہچانتے ضرور ہو۔"

"خدا جیتا رکھے، اسی کی تو روٹی کھاتے ہیں حضور! جیسے قدر دانوں کی بدولت اس مہنگائی میں بھی خوب گزرتی ہے، استاد کہہ گیا ہے:

مفلس کس نمی ماند"

[illegible]

پچھلا ہفتہ:- ا۔ ہندوستان

کیا سچ مچ یہ آخری اجلاس ہے؟

۱۶ مئی سے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوگیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آخری اجلاس ہے [illegible] تک دستور کی کل دفعات بحث کے بعد منظور نہ ہو جائیں برابر جاری رہے گا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ آزادی کی دوسری سالگرہ یعنی ۱۵ اگست تک آئین سازی کا کام مکمل ہو جائے۔ لیکن پہلے تین دن کی کارروائی کو دیکھ کر کچھ امید بھی ہوتی ہے کہ شاید [illegible] یہ کام نبٹ جائے۔ لیکن [illegible] شاہ۔ شری کامت اور ہمارے نکتہ نواز قانون ساز نذیر الدین احمد صاحب نے [illegible] یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔

پہلے دو دن بڑے معرکے کے تھے اس لئے کہ اس میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے کامن ویلتھ والے رزولیوشن پر بحث تھی۔ علاوہ دو ایک سوشلسٹ ممبروں کے جنہوں نے اپنی پارٹی کی عام پالیسی کے ماتحت رزولیوشن کی مخالفت کی کچھ کانگریس کے ممبروں نے بھی اپنی مخالفت کا اظہار اس رنگ میں کیا کہ رزولیوشن کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور پروفیسر شبن لال سکسینہ نے اس مضمون کی ایک باضابطہ ترمیم بھی پیش کر دی۔ وزیر اعظم نے اپنی لمبی چوڑی تقریر میں وہ سب باتیں دہرائیں جو وہ لندن میں اور پھر دہلی پہنچ کر اپنی ریڈیو کی تقریر میں کہہ چکے تھے یعنی جو معاہدہ ہوا ہے اس میں ہندوستان کا سراسر فائدہ ہے اور کسی طرح کے نقصان کا اندیشہ نہیں، اس کی کامل آزادی میں مطلق خلل نہیں پڑتا، اس پر جنگ کی صورت میں کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں کا ساتھ دینے کی پابندی [illegible] انھوں نے ایک بار پھر [illegible] یعنی ایسے سیاسی جتھے میں شامل نہیں ہوگا جس کا مقصد صرف اقتدار حاصل کرنا ہو۔ انھوں نے ایک بار پھر اس پر زور دیا کہ ہندوستان کی پالیسی خالی خولی غیر جانب داری کی نہیں بلکہ یہ ہے کہ مخالف طاقتوں میں مصالحت کرانے اور دنیا میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ دو دن کی بحث کے بعد جس میں تھوڑے سے لوگوں نے رزولیوشن کی مخالفت میں گرما گرم اور بہت سے لوگوں نے اس کی موافقت میں شیریں گرم تقریریں کیں۔ رزولیوشن بغیر رائے شماری کے پاس ہوگیا۔ تیسرے دن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں دو ترمیمیں جو ہوم منسٹر سردار پٹیل کی غیر موجودگی میں مسٹر گیڈگل نے پیش کیں منظور ہوئیں۔ ایک کی رو سے کونسل کی مجلس وضع قوانین میں یورپین جماعت کی نمائندگی ختم کر دی گئی اور دوسری کی رو سے نظر بندوں کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں بھیجنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد آئین سازی کا کام شروع ہوا اور چھ دفعات جو مرکزی پارلیمنٹ کے قواعد وضوابط سے تعلق رکھتی ہیں منظور ہوئیں۔ چوتھے دن کام کی رفتار اور تیز ہوگئی اور پندرہ دفعات منظور ہوئیں جس بات پر سب سے زیادہ زور شور سے بحث ہوئی وہ یہ تھی کہ ممبروں کو یہ حق ہو کہ جو تقریریں پارلیمنٹ میں کریں انھیں باہر بھی شائع کر سکیں لیکن اننتھا سیانم آینگر صاحب نے اس کا بہت معقول جواب دیا کہ پارلیمنٹ کے اندر تو ممبر بہت سی ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں جنھیں باہر کہیں تو بغاوت یا ازالۂ حیثیت عرفی کے دائرے میں آجاتی ہیں اس لئے ان کو اپنی تقریریں جوں کی توں شائع کرنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ مطالبہ نامنظور ہوگیا۔ اسمبلی کا اجلاس صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک ہوتا ہے۔ یہ ترکیب خاصی کامیاب معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ جب اجلاس ۱۱ سے پانچ تک ہوتا تھا لنچ کے ابعد [illegible] گرمیوں میں اونگھتی ہوئی کارروائی ہوا کرتی تھی۔ اور اب ۱۲ بجے تک نہ تو [illegible] پیٹ کی سستی ہوتی ہے اور نہ بھوک کی [illegible]۔

اس کے سوا چارہ نہ تھا

یکم جون سے بھوپال اور یکم جولائی سے رام پور کا انتظام مرکزی حکومت کے مقرر کئے ہوئے چیف کمشنر سنبھال لیں گے۔ ان دونوں کے بیدار مغز حکمرانوں نے بہت سی ریاستوں سے پہلے اپنے ہاں عوامی حکومتیں قائم کر دی تھیں اور تمام تر یا بیشتر امور کا انتظام پرجا کے منتخب کئے ہوئے وزیروں کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ شخصی رقابتوں اور گروہ بندیوں کی وجہ سے نئی حکومتوں کو اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کانگریس کمیٹیاں روز ٹوٹنے اور بننے لگیں، اور اس کے ساتھ ساتھ وزارتوں کے ٹوٹنے اور نئے سرے سے بننے کا مطالبہ ہونے لگا۔ بھوپال میں تو کچھ دن ہوئے کانگریس کے ایک جتھے نے سول نافرمانی شروع کر دی تھی اور اس سے فائدہ اٹھا کر ہندو مہاسبھا فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے لگی تھی۔ وہ تو عین وقت پر ہز ہائی نس نواب صاحب اور شری [illegible] نے اس فتنے کی روک تھام کر دی ورنہ بڑی گڑبڑ مچتی۔ رام پور میں بھی فتنہ پرداز عناصر موقع کی تاک میں تھے۔ اس لئے موجودہ حالات میں اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ مقامی عوامی حکومتوں کو ختم کر کے حکومت ہند عارضی طور پر ان ریاستوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔

غلط فہمی دور ہوگئی

کچھ دن ہوئے یکایک یہ افواہ پھیلنی شروع ہوئی کہ کشمیر کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ کشمیر کی پوری ریاست ایک کامل خود مختار ریاست قرار دے دی جائے اور ہندوستان، پاکستان اور یو۔ این۔ او کی طرف سے اس کی آزادی کی ضمانت دی جائے۔ جو لوگ کشمیر کے معاملات سے واقف ہیں انھوں نے اس افواہ کو سراسر ناقابل توجہ سمجھا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ ایک تو موجودہ حکومت کشمیر اور نیشنل کانفرنس جو باضابطہ طور پر انڈین یونین میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے ایسی بات ہرگز نہیں کہہ سکتی دوسرے پاکستان جسے اس صورت میں اپنا سارا مقبوضہ علاقہ چھوڑنا پڑے [illegible] نہیں [illegible] کرتا تیسرے کشمیر کے [illegible] مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ وہ ان شرطوں [illegible] ریاست [illegible] کے لئے ضروری ہیں پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض ارباب غرض نے اس افواہ کو خوب پھیلایا یہاں تک کہ بعض ناواقف لوگ یہ سمجھنے لگے کہ واقعی کوئی سنجیدہ تجویز ہے جس پر غور ہو رہا ہے۔ آخر جب پچھلے ہفتے شیخ عبداللہ صاحب اور ان کے چند رفیق کار کشمیر کمیشن کی تجویزوں پر حکومت ہند کے ساتھ مل کر غور کرنے کے لئے دہلی آئے تو یہ عقدہ کھلا شیخ صاحب نے بتایا کہ بعض لوگوں نے ایک ریفرنڈم (استصواب رائے) کے دوران میں کشمیر کے مسئلے پر بحث کی تھی اور اس کے حل کرنے کی جتنی صورتیں ممکن ہیں سب کا ذکر کیا تھا۔ ان میں ایک صورت یہ تھی کہ کشمیر کو بالکل آزاد کر دیا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ یہ ان کی یا اہل کشمیر کی رائے ہے یا اسے قابل عمل سمجھتے ہیں۔ شیخ صاحب کے مفصل بیان سے جو دو تین دن ہوئے اخبارات میں شائع ہوا ہے، وہ غلط فہمی جو اصل میں پھیلائی جا رہی تھی، دور ہوگئی۔

کشمیر کمیشن کی نئی تجویزوں کا مضمون ابھی تک شائع نہیں ہوا اور خلاف معمول اخباروں نے اس کے بارے میں قیاس آرائی سے کام نہیں لیا۔ مگر یہ خبر آئی کہ ہندوستان کا جواب کمیشن کے پاس پہنچ چکا ہے اور پاکستان کا پہنچنے والا ہے۔ جہاں تک ظاہری آثار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کی امید بہت کم ہے کہ کمیشن کی تجویزوں کی بنا پر فریقین میں سردست کوئی فیصلہ ہو جائے اور عارضی صلح کا باضابطہ اعلان کیا جا سکے۔ زیادہ سے زیادہ توقع یہی ہو سکتی ہے کہ گفت و شنید کا دروازہ بند نہ ہو اور فریقین کے تعلقات جیسے ہیں اس سے بدتر نہ ہونے پائیں۔

ادھر ایک نہایت اہم بات یہ ہوئی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دہرہ دون میں صدر کانگریس نے کشمیر اور ہندوستان کے تعلق کے مسئلے کو صاف کر دیا۔ ڈاکٹر پٹابھی نے فرمایا کہ کشمیر و جموں کی ریاست ایک سالم وحدت کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ اور امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کو حکومت ہند کے سپرد کر کے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار رہے گی۔

اپنا باغ (بہ سلسلہ صفحہ ۱)

اقبال کو تمہارے ساتھ کیسی [illegible] جب نہ دیکھوں کے [illegible] سب [illegible] ہاں [illegible] سب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر کیا کریں گے اور تمہارے ساتھ پھر سرگرم پرستش ہوں گے۔ آخر چند ہی دنوں میں تم کو چشمے کا پانی بند کرنے کے بعد [illegible] پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔

(حبیب اللہ [illegible])

۲۔ پاکستان

بات کے دو پہلو

انگریز گورنر کو فوراً بدل دیا جائے نہیں اسے کچھ عرصے کے لئے اور رہنا چاہئے۔

آج کل مغربی پنجاب میں یہ بحث تمام لوگوں کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے جو لوگ انگریز گورنر کو فوراً بدلنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ آزادی کے بعد کسی صوبے کے تمام سیاہ و سفید کو ایک مطلق العنان انگریز کے حوالے کر دینا قومی توہین اور آزادی کا مذاق اُڑانا ہے۔ ممکن ہے اس سے دفتری نظم و نسق کچھ بہتر ہو جائے اور سرکاری ملازم پا وہ مستعدی سے کام کرنے لگ جائیں۔ لیکن قوم کے عام اخلاق پر اس کا برا اثر پڑے گا۔

ان کے برعکس جو لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ موجودہ گورنر کو کچھ عرصہ اور رہنا چاہئے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض لوگ طبعاً انگریز پرست واقع ہوئے ہوں اور انھیں انگریز گورنر کو برسر اقتدار دیکھ کر روحانی تسکین ہوتی ہو لیکن ان میں مخلصین ہیں اور قومی مفاد سے انھیں دلی وابستگی ہے۔ وہ ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر گورنر موڈی کو فوراً بدل دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن غلط کار اور خائن افسروں کے خلاف اس وقت تحقیقات ہو رہی ہے اور وہ قانونی شکنجے میں کسے جا رہے ہیں وہ بچ جائیں گے۔ اور ممکن ہے نئے دور میں پھر وہی برسر اقتدار آ جائیں۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ گورنری راج کسی اعتبار سے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور خواہ گورنر کے ساتھ مشیر ہی کیوں نہ لگا دئے جائیں، اس دفعہ ۹۲ الف کے دور کو تو جلد ختم ہونا چاہئے اور اس کے نتائج صوبے کی عام زندگی کے لئے بڑے ناخوشگوار ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ گورنری راج کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انتخابات جلد سے جلد ہوں اور عوام کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی پسند کے نمائندے اسمبلی میں منتخب کر کے بھیجیں۔

(آفاق لاہور)

ترقی پسند مصنفین

یکم مئی کو انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کے زیر اہتمام وائی، ایم، سی، اے ہال میں فرزندِ دہل کا بین الاقوامی دن منایا گیا جن میں بعض شعراء اور ادیبوں نے نظمیں اور مضامین پڑھے۔ ان میں اصطلاحی ترقی پسندوں کے علاوہ بیشتر ایسے حضرات بھی شامل تھے جو ان معنوں میں اپنے آپ کو ترقی پسند نہیں کہتے اور نہ ترقی پسندی کے مخصوص نظریات پر ان کو ایمان ہے۔ ان حضرات میں سے بعض ذمہ دار افراد سے ہمیں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا بیان ہے کہ اس جلسے میں جو نظمیں اور مضامین پڑھے گئے ان میں ترقی پسند یا دوسرے الفاظ میں اشتراکی رجحان تو ضرور تھا لیکن بعض حلقوں میں یہ جو کہا جا رہا ہے کہ ان میں رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعوذ باللہ... توہین کا کوئی پہلو نکلتا تھا۔ یا یہ کہ باہر کے کمیونسٹوں کو پاکستان پر چڑھ دوڑنے کے لئے للکارا گیا تھا۔ صحیح نہیں۔ اور اس سلسلے میں "ترقی پسندوں" پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں وہ غلط ہیں اور یہ ان کے ساتھ صریحاً بے انصافی ہے......

(آفاق لاہور)

نام نہاد لیڈروں کی بوچھاڑ حرکت

مغربی پنجاب کی صحافتی سیاست اب بالکل نئی روش اختیار کر چکی ہے اور بعض موقع پرست برساتی اخبار نویس ایذائی انتہائی کاوش پر چلنے کی جرأت کر رہے ہیں جو شاید ان کے چھوٹے صحافتی وقار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی، اور یہ حقیقت منظر عام پر آ کر رہے گی کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی مخالفت کے پردے میں انھوں نے کمیونزم کا جو پشتی محاذ قائم کر رکھا ہے اسے زیادہ دیر تک پروپیگنڈے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ چند روز سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف خانہ ساز صحافتی لبنا پارٹ اس کے ایک اشتہار کی حلیف اور ایک کاروباری صحافی نے جو گلی مہم شروع کر رکھی تھی اور اس میں ان کی مخصوص اغراض کام کر رہی تھیں انھوں نے آج تجارتی رقابت سے بھی دو قدم آگے نکل کر باقاعدہ ذاتی رقابت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک نووارد کوچۂ صحافت فیض احمد فیض نے لاہور کے مشہور اخبار نویس مسٹر محمد شفیع چیف رپورٹر پاکستان ٹائمز کو مختلف پسندیدہ حیلوں اور دفتری جوڑ توڑ کے ہتھکنڈوں سے مجبور کر رکھا ہے کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔

(مغربی پاکستان)

احوال واقعی

حکومت نے ایک اخبار کی جو بیرونی سرمائے سے اور بیرونی انتظام میں چل رہا تھا تین مہینے کے لئے اشاعت بند کر دی ہے پچھلے چند روز سے بعض اخبار میں یہ مسئلہ بحث اور خیال آرائی کا موضوع بنا ہوا ہے اور باقی سب اہم قومی مسائل پس پشت ڈال دئے گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ قوم کے سامنے اس وقت سب سے بڑا کام کون سا ہے پاکستان کی حفاظت یا سول اینڈ ملٹری گزٹ کی حفاظت...... اس اخبار کے مالک ہندوستان کے سرمایہ دار ہیں اور اس کی پالیسی ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو پاکستان کے باشندے نہیں ہیں...... اگر کوئی سچ مچ پاکستانی اخبار اس سے بھی بڑا جرم کرتا اور اپنی عاجزی سے معافی نہ مانگتا تو ہم خوشی سے اس کا ساتھ دیتے اس لئے کہ وہ جرم بھولے سے ہوتا اور معافی دل سے ہوتی۔ اگر یہ اخبار جس کا ذکر ہے پاکستان کے عیسائی، اینگلو انڈین، ہندو یا وہ مٹھی بھر سکھ نکالتے ہوتے جو پاکستان میں رہ گئے ہیں تو ہم اس کے لئے مسلمانوں کے اخباروں کے برابر بلکہ ان سے زیادہ حقوق کا مطالبہ کرتے۔ اگر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی حیثیت آج بھی سچ مچ پاکستانی اخبار کی ہو جاتی تو چاہے اس کے خیالات کتنے ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہوں ہمارا رویہ اس کے بارے میں وہی رہے گا جو اپنے اور ہم عصروں کے بارے میں رہا ہے

(پاکستان ٹائمز)

تعمیری پروگرام

میاں عبدالباری صدر پراونشل مسلم لیگ نے جو سارے صوبے کا دو ہزار میل کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں ایک انٹرویو میں مسلم لیگ کا تعمیری پروگرام پیش کیا جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

انھوں نے اپنے آپ کو ایک ... شخص سے تشبیہ دی جسے ... گرتا ہوا مکان ملا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مسلم لیگ کی تنظیم کو بہت سخت نقصان پہنچا ہے اور وہ صرف تعمیری پروگرام کے ذریعے سے سنبھل سکتی ہے۔

صدر مسلم لیگ نے اعتراف کیا کہ صوبے کا اس سرے سے اس سرے تک دورہ کرنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ کاشتکاروں میں بے چینی ... خصوصاً ڈیرہ غازی خاں کے ضلع ... بہت نازک حالت ہے۔ ... مسلم لیگ کے ماتحت معاشی ... جائیں گی جو زمین کے مالکوں ... کاشتکاروں کی شکایتوں ... کریں گی لیکن اسی کے ساتھ اس ... گی کہ طبقاتی جنگ کی نوبت نہ ...

جناب صدر نے اس بات پر ... ظاہر کیا کہ لیاقت علی خاں صاحب ... یہ وعدہ کہ جو حکومت دفعہ ۹۲ الف ... کے ماتحت قائم کی گئی ہے وہ مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ... پورا نہیں ہوا

اپنے تعمیری پروگرام کی تشریح کرتے ہوئے میاں عبدالباری نے فرمایا کہ "اس میں حفظانِ صحت، تعلیم، رشوت اور بددیانتی کی روک تھام، شہری ملازمت اور کشمیر کی مدد شامل ہے۔"

جب انھیں اس مطالبے کی طرف توجہ دلائی گئی کہ سابق وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے خلاف الزاموں کی تحقیق روک دی جائے تو انھوں نے فرمایا "مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ہر شخص سے خواہ کتنے ہی بڑے رتبے کا ہو ضرور باز پرس ہونی چاہئے۔ اگر اس کے خلاف لگایا ہوا الزام سرسری طور پر دیکھنے میں صحیح معلوم ہوتا ہو۔ مگر انھوں نے ان لوگوں کو ملامت کی جو اس قسم کی غیر ذمہ داری کی باتیں کرتے ہیں کہ ہر طرف رشوت اور بددیانتی کا دور دورہ ہے۔ انھوں نے کہا "ہم بحیثیت قوم اتنے بددیانت نہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں۔"

(پاکستان ٹائمز)

براہ کرم
خط لکھتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

۳- باہر کی دنیا

آنکھوں کی سوئیاں

چین کی خانہ جنگی آخری مرحلے میں ہے شنگھائی پر کمیونسٹ فوجوں کے حملے کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شنگھائی میں کیمونسٹ تانگ کی فوجوں کی کمان خود چیانگ کائی شیک کے ہاتھ میں ہے۔ انھوں نے اپنی رہی سہی طاقت سمیٹ کر شنگھائی میں جمع کر لی ہے اور شمالی اور وسطی چین کو کھو دینے کے بعد جنوبی چین کے کچھ حصے پر اپنی حکومت قائم رکھنے کی موہوم امید پر جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ مغربی یورپ اور امریکہ کے اخبار لیوشن تانگ کی طرف سے مایوس ہو کر اب یہ ہوائی اڑا رہے ہیں کہ چینی کمیونسٹ قوم پرستی میں کیومن تانگ سے کم نہیں ہیں۔ وہ چین میں روس کی مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے۔ ان کے تعلقات پہلے ہی سے سوویٹ حکومت سے کشیدہ ہیں اور ماؤ کا لیڈر ماؤزے تنگ مشرق کا ٹیٹو ثابت ہوگا۔ جس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ چین کی کمیونسٹ حکومت بیرونی طاقتوں کے ساتھ تعلقات میں بڑی احتیاط سے کام لے رہی ہے اور روس سے گہری دوستی ہونے کے باوجود وہ اس کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی برتاؤ نہیں کرنا چاہتی کہ کہیں یاران طریقت اسے روس کا حلیف قرار دے کر اس کے خلاف بھی اعصابی جنگ نہ شروع کر دیں۔ اس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ مغربی طاقتوں سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کو تیار ہے۔ بہ شرطیکہ وہ اپنی فوجیں اور جنگی جہاز چین سے ہٹا لیں۔ تازہ اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کی خارجی وزارتیں چین کی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرنے اور اس سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے مسئلے پر غور کر رہی ہیں۔

ابھی بہت سے جھگڑے باقی ہیں

۱۲ مئی کو روس نے مغربی برلن کی ناکہ بندی ہٹا لی اور وہ الجھن جس کی وجہ سے پچھلے سال یورپ میں لڑائی چھڑتے چھڑتے رہ گئی تھی دور ہو گئی۔ برلن کے دونوں حصوں کے درمیان آدمیوں کی اور مال کی آمد و رفت شروع ہو گئی، لیکن باہر سے مغربی برلن میں ریل سے اور لاریوں سے مال کے پہنچنے میں دقتیں پیش آ رہی ہیں اس لئے کہ روسی افسر معائنے اور پرمٹ وغیرہ کی سخت پابندیاں عاید کر رہے ہیں۔ شہر برلن کے انتظام کے بارے میں بھی ابھی تک بہت سے مسائل طے کرنے کو باقی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو گتھیاں سال بھر کی تنا تنی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں ان کے سلجھنے میں خاصی دیر لگے گی، لیکن پھر بھی برلن کی ناکہ بندی کے ہٹنے سے یورپ کی بلکہ دنیا کی فضا بہت صاف ہو گئی ہے۔ اور وہ لوگ بھی جن کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ تیسری جنگ ہو کر رہے گی اب مہینوں کی جگہ برسوں کا حساب لگانے لگے ہیں۔

شاباش یو، این، او

یو، این، او کی جنرل اسمبلی کا اجلاس اس بار بھی جیسی دھیمی نستعلیق چال سے چل رہا تھا اور عام خیال یہی تھا کہ جو چند روز باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اسی طرح گزر جائیں گے۔ مگر نہ جانے برلن کی الجھن دور ہونے کی برکت ہے یا کیا بات ہے کہ یکایک یو، این، او میں کچھ جان سی آ گئی اور اس نے کئی زوردار فیصلے کر ڈالے جو امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کے منشا کے خلاف نہ سہی مگر کچھ ایسے موافق بھی نہیں ہیں۔ ایک تو اس نے جنوبی افریقہ کے اس دعوے کو نہیں مانا کہ وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کے حقوق کا معاملہ اس کا گھریلو معاملہ ہے۔ یو، این، او کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں۔ اور تقریباً بہ اتفاق رائے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ جنوبی افریقہ ہندوستان اور پاکستان کو ایک گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر اس مسئلے پر غور کرنا چاہئے۔ دوسرے اس نے پولیٹیکل کمیٹی کی اس تجویز کو رد کر دیا کہ فرانکو کے اسپین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے پر جو پابندیاں یو، این، او کی ممبر ریاستوں کے لئے لگائی گئی ہیں وہ ہٹا لی جائیں۔ لیکن سب سے بڑا جرأت کا کام یہ کیا کہ انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر بیون اور اٹلی کے وزیر خارجہ کاؤنٹ اسفورزا نے اٹلی کی سابق نوآبادیوں کے متعلق جو سمجھوتا کیا تھا اسے نامنظور کر دیا۔ رزولیوشن کے اور حصے تو پاس ہو گئے تھے لیکن وہ حصہ جس میں طرابلس کا انتظام اٹلی کے سپرد کرنے کی تجویز تھی دو تہائی ووٹ نہ حاصل کر سکا اور اس کے بعد جب پورے رزولیوشن پر ووٹ لئے گئے تو وہ کثرت رائے سے نامنظور کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ یہ خبر آئی ہے کہ یاران طریقت اپنا مطلب دوسرے طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جنوبی امریکہ کی ریاستوں کی طرف سے یہ رزولیوشن پیش ہو رہا ہے کہ ان نوآبادیوں کے انتظام کے بارے میں یو، این، او کو مشورہ دینے کے لئے کئی ممبروں کی جس میں اٹلی بھی شامل ہو ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ اگر یہ تجویز جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے منظور ہو گئی تو پھر ان نوآبادیوں کی من مانی تقسیم کر لی جائے گی اور طرابلس اٹلی کے حصے میں آ جائے گا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ چال چلتی ہے یا نہیں۔

پہل کون کرے

یو، این، او کے اس فیصلے کے بعد کہ جنوبی افریقہ ہندوستان اور پاکستان کی گول میز کانفرنس ہو چند روز تک لوگوں کو اس کا شبہہ رہا کہ جنوبی افریقہ اس فیصلے کو مانے گا یا نہیں پہلے ڈاکٹر ملان سے پوچھا

(بقیہ صفحہ: پر)

ہریجن کا ستّ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

آدمی کسی بات کا حق دار اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے مناسب ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ریاست افسران یا دفاتی اہل غرض حضرات کی غلط کارروائیوں کو برداشت کریں۔ لیکن پاکستان کے شہری کی حیثیت سے انھیں اپنی شکایتوں کے تدارک کی امید پاکستان ہی سے کرنی چاہئے کسی باہری طاقت کی یا ہندوستانیوں کی مخالفت کی آس نہ رکھنی چاہئے۔ حکومت پاکستان اگر بے انصافی کرتی ہے تو پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے انھیں احتجاج کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن ان کی اس لڑائی کی حیثیت "گھریلو نزاع" سے آگے نہیں بڑھنی چاہئے کیمپ انھیں یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ تعداد کی کمی کے سبب سے انھیں حکومت پاکستان میں اپنے مستقبل کی طرف سے ہراس نہیں ہونا چاہئے۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے سبب ایک اقلیت ریاست کی ترقی کا ہراول بن گئی ہے۔ اور اس طرح اس نے اپنی قسمت بدل لی ہے مثلاً برٹش حکومت میں اسکاٹ لینڈ کے لوگ یا پھر اتنی دور کیوں جائیے جیسے ہندوستان میں پارسیوں کا فرقہ، اگر وہ اپنے آپ کو محنت ذہانت، خوش تدبیری، سچائی، ایمانداری اور بے غرض خدمت کی صفتوں سے مالا مال کر کے امتیاز حاصل کر لیں تو وہ ریاست کا ایک قیمتی سرمایہ بن جائیں گے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ ریاست کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں ریاست خود اپنی غرض کے لئے ان کی دلجوئی کرے گی۔

اس سے بہت بڑی حد تک ان کے مستقبل کا دارومدار خود انھی کے اوپر ہے۔ کیمپ والے اپنے عدم تشدد، اپنی بے غرض خدمات اور قوت برداشت کے ذریعے سے اپنی جس قدر حفاظت کر سکتے ہیں اس سے زیادہ حفاظت نہیں چاہتے۔ کیمپ کا صرف ایک حوصلہ اور ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اپنے ضمیر کی روشنی میں اور اس روشنی میں جو گاندھی جی نے دکھائی ہے ان کے مشن کو پورا کرنے کے لئے دونوں ملکوں میں اور سب فرقوں میں آپس میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ سب کے ساتھ صلح جوئی کا برتاؤ۔ ہر ایک کے ساتھ بے غرض بھلائی۔ یہاں تک کہ سارے شبہات اور عداوتیں سپر ڈال دیں اور اس کے مقاصد کے متعلق کوئی شک و شبہہ باقی نہ رہے۔ یا پھر یہ نہ ہو سکے تو اس کوشش میں اپنی جانیں دے دیں۔ یہی ایک ستیہ گرہ کے پیرو کی شان ہے۔ جو پاک فرض ان پر عائد کیا گیا ہے اسے نہ تو وہ ترک کر سکتے ہیں، اور نہ اپنی جانیں بچا کر بھاگ سکتے ہیں۔

(مترجم: مشتاق احمد اعظمی)

آج کے شاعر کا گیت

اختر انصاری

ہے میرا تغزل دل افروز | سرشارِ طرب اور وجد آموز
سرچشمہ نور اور ظلمت سوز | ہے میرا تغزل دل افروز
اشعار کی سلماؤں کی قسم!

ہے میرا نظامِ فکرِ حسیں | لبریز نشاط و کیف آگیں
گلزارِ ارم، فردوس بریں | ہے میرا نظامِ فکر حسیں
افکار کی عذراؤں کی قسم!

ہے میرا جنوں رنگین وجواں | رکھ دے جو بدل کر سارا جہاں
دنیا کو بنا دے باغِ جناں | ہے میرا جنوں رنگین وجواں
جذبات کی لیلاؤں کی قسم!

غزل

سیدہ فرحت

حسرتوں نے جب ستایا رو لئے
دل جو تڑپا سر جھکایا رو لئے
دل سنبھالا ہنس کے ٹالا غم بہت
غم پہ جب قابو نہ پایا رو لئے
کچھ نہ جب سمجھا سکے چپ ہو رہے
کچھ سمجھ میں جب نہ آیا رو لئے
دھو سکے آنسو نہ رنجِ دل مگر
درد سے جب دل بھر آیا رو لئے
جب ملا فرحتؔ نہ کوئی غم گسار
دل کو حالِ دل سنایا رو لئے

"یادِ جاناں"

نجم الحسن صدیقی نجمؔ

رنگین چاندنی میں رنگین ہیں فضائیں
جی چاہتا ہے بارش میں نور کی نہائیں
تاروں کی انجمن میں ہر سمت ہے چراغاں
شب نور کے سہارے دنیا میں ہے خراماں
فطرت نقاب اُلٹے جلوہ دکھا رہی ہے
سازِ طرب پہ ہر شے نغمہ سنا رہی ہے
تارے چمک رہے ہیں گلشن مہک رہا ہے
تاثیرِ زندگی سے جنگل لہک رہا ہے
ہر شے پہ کھیلتی ہے اُٹھی ہوئی جوانی
عالم میں وا ہے ہر سو آغوشِ شادمانی
محسوس ہو رہی ہے لیکن مجھے کمی کچھ
آنکھوں میں نجمؔ اپنی ہے آج بھی نمی کچھ
سینے میں اپنے جیسے اک آگ جل رہی ہے
اک آرزو یہ دل میں اپنے مچل رہی ہے
پر کیف ہیں ہوائیں رنگین ہیں فضائیں
ایسے میں ڈھونڈ کر ہم ان کو کہاں سے لائیں

بنا کریں گے مٹا کریں گے

سحر بدایونی

ستم کی بجلی گرا گرا کے ہمیں وہ سوزِ آشنا کریں گے
کرم سے ہم بے نیاز ہو کر ستم سہیں گے وفا کریں گے
ہے تیز صہبائے غم کا دھارا یہی نہ قسمت کا ہو اشارا
رہا ہم اُٹھتی موجوں کا لیں سہارا، پہنچ کے ساحل پہ کیا کریں گے
چمن میں پھولوں کے بانکپن میں، فلک پہ مہتاب کی کرن میں
چمکتے تاروں کی انجمن میں چھپیں وہ، ہم پا لیا کریں گے
رہے گا جب تک جنوں کا طوفاں ہمارے دل کے اُمید ارماں
حباب آسا بحدِ امکاں، بنا کریں گے مٹا کریں گے
یہ بادہ نوشی، یہ جوشِ مستی، یہ حق نوازی، یہ خود پرستی
ہر ایک ان میں ہے جزوِ ہستی ہم ان کو کیوں کر جدا کریں گے
اُمنگ پر جب شباب ہوگا، نظر میں سیدا حجاب ہوگا
رُخِ حسیں پر نقاب ہوگا ہر ایک سے وہ حیا کریں گے
لئے ہوئے دل میں اک تمنا، بنے ہوئے جستجو سراپا
رواں دواں ہم رہیں ہمیشہ پہنچ کے منزل پہ کیا کریں گے
نظامِ موت و حیات ہی کے رہیں گے تابع تمام انساں
جہاں میں مثلِ حباب دریا بنا کریں گے مٹا کریں گے
جو ہوں گے نالے اثر پہ مائل جو رنگ لائے گا جذبِ کامل
تو وہ بھی بیتاب ہو کے اے دل فسانۂ غم سنا کریں گے
نصیحتوں کا اثر نہ لیں گے سحرؔ جوانی رہے گی جب تک
کریں گے ہم اپنے دل کی لیکن ہر ایک کی سُن لیا کریں گے

سے نفع کماتے رہے۔ چاول اور گیہوں کے کھلیان اور بنگلوں کی دکانیں بھری رہیں اور لوگوں نے ان کے سامنے بےبسی کے عالم میں دم توڑ دیا۔ چشم فلک اور چشم انسان نے یہ تماشا دیکھا اور ضمیر عالم میں تہلکہ نہ ہوا! میں اپنی خوش فہمی اور ناسمجھی کی بدولت سمجھتا تھا کہ بنگال کی یہ قیامت نہ صرف ہماری آنکھیں کھول دے گی، بلکہ ہمارے دل و دماغ کی بند اور تنگ کوٹھریاں بھی کھل جائیں گی اور وہ یہ محسوس کریں گے کہ اب شرافت اور سمجھ داری کے ساتھ مل جل کر اپنی مادی اور تہذیبی زندگی کو بچانے کے لئے جدوجہد کا وقت ہے۔ مجھے یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اندر ملک کے دوسرے حصوں کے فساد اور خونریزی اور تمام تباہ و انسانوں کی حیوانیت کے مظاہرے بنگال کے قحط کو بھی بھلا دیں گے۔ قحط کے متعلق تو بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک آسمانی عذاب ہوتا ہے، گو آج کل کے زمانے میں ایسا خیال کرنا غلطی ہے لیکن بہرحال اس سے بعض لوگ ایک قسم کی تسکین حاصل کر لیتے ہیں "ہم کیا کر سکتے ہیں۔ خدا کی مرضی" [illegible] فصلیں خراب ہو جائیں اور ملک میں کال پڑ جائے۔ لیکن یہ خونریزی جو ابھی سال بھر کے اندر اندر ہوئی ہے اس کے لئے تو اس قسم کا غلط جواز بھی نہیں مل سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب اور شرافت محض ایک بیرونی ملمع تھی، ایک دھوکا یا دکھاوا تھی اور ذرا سے اشتعال پر وہ درندے نکل پڑے جو ان انسانوں کے اندر چھپے بیٹھے تھے۔ میں تو اقبال کے ان اشعار کو جن میں تہذیب حاضر پر چبھتا ہوا طنز کیا گیا ہے یہ سمجھ کر پڑھتا تھا کہ ان کا وار صرف مغرب کی قوموں پر پڑتا ہے خود ہم پر نہیں اور اس سے مجھے ایک قسم کا افسردہ اطمینان حاصل ہوتا تھا!

الناد، چوں رخ زغازۂ تہذیب برفروخت
خاک سیاہ خویش چو آئینہ وانمود
پوشید پنجہ را ز دستانۂ حریر
افسون قلم ستد و تیغ از کمر کشود
این بوالہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت
رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید
جز سفک الدماء خصیم مبین نبود!

لیکن ان واقعات سے اندازہ ہوا کہ اپنا ہمارا ملک، جس کو اپنی قدیم تہذیب اور امن پسندی اور انسان دوستی پر ناز رہا ہے۔ اس الزام سے کسی طرح بری نہیں ہو سکتا کہ حقیقت شناس ہیں ایٹم بم بنانے اور استعمال کرنے والوں اور فرقہ وار جنونوں سے حواس باختہ ہو کر عورتوں، بچوں اور نہتے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو بات غلط ہے، خلاف انسانیت ہے، رحم اور ہمدردی اور شرافت کے جذبات کے منافی ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنی ہی قابل گرفت ہے خواہ اس کے نتیجے کے طور پر ایک شخص پر ظلم ہو یا ایک جماعت پر۔ اس کی وجہ سے چند سو آدمیوں کا خون ہو یا چند ہزار کا یا چند لاکھ کا۔ لیکن آج کل عام اخلاقی احساس اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ اول تو لوگوں کو ان واقعات کی پوری اہمیت اور نزاکت کا ان کے اخلاقی اور معاشرتی ردعمل کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ عارضی ہوتا ہے اور اس کے متعلق اخباروں میں چند بیان شائع کر کے لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فرض پورا ہو گیا۔ مگر ان چند بیانات کا اس مسلسل اور خطرناک زہر کے مقابلے میں جو اخباروں کے کالموں میں ہر روز شائع ہوتا رہتا ہے اور عوام کی ذہنی خوراک کا کام دیتا ہے کیا اثر ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ کام اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں جماعتوں کے سیاسی مفاد اور چالبازیاں اور اقتصادی اور صنعتی مسائل سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ موجودہ فضا کی بدولت ہمارے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنیت بھی دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح یہی نسل نہیں بگڑی بلکہ آئندہ نسل کی تباہی اور اخلاقی ابتری کا بیج بویا جا رہا ہے۔ اگر ہمیں دراصل اس صورت [illegible] کی اصلاح مقصود ہے تو تمام نیک اور شریف [illegible] لوگوں کا جو اپنے ملک و ملت کا [illegible] یہ فرض ہے کہ پہلے وہ اپنے دل و دماغ کا [illegible] ان ابدی قدروں کے ساتھ ہموار کریں جن پر انسانی [illegible] کا دارومدار ہے اور پھر اپنی مثال اور تبلیغ اور عملی کوشش کے ذریعے مسخ شدہ ذہنوں کی سنگلاخ زمین میں ان قدروں کا بیج بوئیں۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب تمدن اور اخلاق کی بنیاد اس مرکزی جذبے پر قائم ہے کہ ہر انسان ایک قابل قدر شخصیت کا امین ہے جس کی نشوونما اور پوشیدہ صلاحیتوں کی تربیت فرد اور جماعت دونوں کا اہم ترین فرض ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی اصلی دولت نہ روپیہ ہے نہ کارخانے، نہ مکان، نہ ساز و سامان، نہ تمدنی زندگی کے مادی اور مشینی آلات۔ اس کی اصلی دولت افراد ہیں اور افراد کی دولت کیا ہے؟ ان کے دماغ کی جولانی، ان کے دل کا گداز، ان کی حسن آفرینی، ان کی قدرشناسی، ان کا سماجی احساس، ان کی خوب تر کی جستجو، ان کا جذبۂ تلاش و تحقیق۔ اقبال نے اس دولت کی طرف اپنے ساقی نامے میں اس خوب صورتی اور اثر کے ساتھ اشارہ کیا ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند اشعار آپ کو سنا دوں۔ یہ اس "متاع فقیر" کی تفسیر ہے جس نے اقبال کو فقیری میں امیر بنا دیا تھا۔

مرے دیدۂ تر کی بےخوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بےتابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
مرا دل مری رزم گاہ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
[illegible]

جس سماج میں فرد کی قدر کی جاتی ہے بعض کی نہیں بلکہ تمام افراد کی۔ کالے اور گورے کی، غریب اور امیر کی، معمولی اور غیرمعمولی کی۔ ذہین اور کند ذہن، گوشہ نشین اور آرائش محفل کی اور ان کی تربیت کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں پرامن ترقی اور آزادی کا امکان ہے لیکن جہاں باہمی تعلقات کی بنیاد نفرت، تعصب، تنگ نظری اور کشاکش پر رکھی جائے۔ جہاں چند کے فائدے میں باقی سب کا نقصان ہو، جہاں افراد کی ذاتی صفات اور صلاحیت کے بجائے ان کے نسل خاندان اور مذہب کے لیبل دیکھے جائیں اور ان کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ ایسی سوسائٹی کبھی ایک صالح اور عادل سوسائٹی نہیں بن سکتی۔ اس لئے میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت "انسانیت" ہے یعنی تمام انسانوں کی عزت کرنا کیونکہ وہ انسان ہیں۔ اس بات کا پرخلوص یقین کہ ہر شخص یا تقریباً ہر شخص کے اندر نور الٰہی کی کوئی چنگاری پوشیدہ ہے جس کو محنت اور محبت اور صبر کے ساتھ روشن کرنا سب کا مشترکہ فرض ہے۔ بسا اوقات عقل کی آنکھ اس چنگاری کو دیکھ نہیں سکتی۔ ماہر نفسیات کی نظر اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ لیکن دل اُسے محسوس کرتا ہے۔ اور محبت کی کنجی ان سات پردوں کو کھول سکتی ہے جن کے اندر یہ چنگاری چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں "نور الٰہی کی چنگاری" کے الفاظ سے چڑ کیں۔ لیکن وہ بھی اُسے اپنی جگہ پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو اس کی بدولت نہ صرف اس کی اپنی شخصیت مالا مال ہو جاتی ہے بلکہ وہ سماج کا ایک مفید رکن بھی بن سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

باہر کی دنیا

(بسلسلہ صفحہ ۲)

گیا تھا کہ گول میز کانفرنس کی تجویز کے بارے میں آپ کا ردعمل کیا ہوگا اور انھوں نے ٹالنے کے لئے یہ جواب دیا تھا کہ ابھی تو جنرل اسمبلی نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اب ڈربن کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر [illegible] جنوبی افریقہ کے [illegible] فرماتے ہیں کہ اس معاملے میں اگر ہندوستان کو [illegible] قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو خیر کوئی ایسی بات نہیں لیکن اس کے ساتھ [illegible] اس پر بھی اصرار [illegible] ہندوستان وہ [illegible] جو اس نے جنوبی افریقہ [illegible] کا [illegible] اب ہٹا لے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے مسئلے پر غور کرے گا۔ یہ جو کہیں بحث چھڑ گئی کہ پہل کس کی طرف سے ہو تو معاملہ پھر الجھ کر رہ جائے گا۔ اگر فریقین واقعی یہ چاہتے ہیں کہ گول میز کانفرنس کی نوبت آئے تو پہلے اور بعد کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہئے اور یہ دونوں باتیں کہ ہندوستان مندوبین ہٹا لے گا اور جنوبی افریقہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوگا ساتھ ساتھ طے ہو جانی چاہئیں۔

مہمان داری

صالحہ عابد حسین

انسان فطری طور پر ایک صحبت پسند مخلوق ہے۔ میل جول کا شوق ہے جس کی بدولت پہلے خاندانی ڈھانچے کی اور رفتہ رفتہ سماجی زندگی کی بنیاد پڑی۔ اسی شوق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ نہیں رہ سکتے وہ ایک دوسرے کے گھر مہمان ہو کر جاتے ہیں کہ کم سے کم تھوڑے سے دن مل جل کر رہ سکیں۔

دنیا میں مہمان داری کا سب سے زیادہ زور ایشیا میں ہے۔ مشرق والے اپنے مہمان کی خاطر مدارات کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اتنا اور کہیں نہیں ہوتا۔ ہمارا ہندوستان بھی مہمان داری کی پرانی روایات رکھتا ہے۔ اور کتنے ایسے واقعات مشہور ہیں کہ میزبان نے اپنے مہمان کی خاطر اپنی عزیز سے عزیز چیز بلکہ کبھی کبھی اپنی جان تک قربان کر دی۔ ہمارے دیس میں مہمان کا آنا فخر اور خوشی کی بات سمجھا جاتا تھا، اور اس کو آرام پہنچانا میزبان کا مبارک اور مقدس فرض۔ مہمان بھی جانتا تھا کہ اسے کس طرح رہنا اور کیا برتاؤ کرنا چاہیے، ایسی ہی خلوص اور محبت کی مہمان داری آپس کے تعلقات کو خوشگوار بناتی اور محبت کو بڑھاتی ہے۔

مہمان نوازی کی صفت ہم میں آج بھی موجود ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اب تک ان قدیم رسموں کی پابندی کر رہے ہیں، جو موجودہ زمانے اور نئے حالات سے کسی طرح میل نہیں کھاتیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ زندگی کے اور اصولوں کے ساتھ ساتھ ہم مہمان داری کے قاعدوں پر بھی نظر ثانی کریں۔

دراصل میزبان سے زیادہ مہمان کے لئے اپنی عادتوں کی اصلاح ضروری ہے۔ ہمارے ہاں کے لوگ میزبان کے فرض کو بڑی حد تک سمجھتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اچھے مہمان ثابت نہیں ہوتے۔

مہمانوں کی کئی قسمیں ہیں، رشتہ دار، دوست آشنا اور اجنبی۔ دو چار دن کے مہمان، اور ہفتوں اور مہینوں رہنے والے مہمان، بلائے ہوئے مہمان اور بن بلائے مہمان۔ بلائے ہوئے مہمانوں کے لئے میزبان پہلے سے تیار رہتا ہے، ضروری انتظامات کر رکھتا ہے اس لئے اسے ان کی مہمان داری میں زیادہ مشکل نہیں پیش آتی۔ بعض [illegible] مہمان بھی اگر اطلاع دے کر آئے تو زحمت کا سبب [illegible] نہیں بنتا۔ امیر اور اچھی حیثیت والے لوگوں کو تو [illegible] کئی کئی کمرے مہمانوں کے لئے الگ کر رکھے [illegible] سامان موجود رہتا ہے انھیں بے [illegible] مہمانوں سے کوئی زیادہ تکلیف نہیں [illegible] لوگوں کے لئے [illegible]

بھی نہیں، کھانے پینے کی چیزیں مشکل سے اپنی ضرورت بھر کی ہوتی ہیں۔ بے وقت، بے اطلاع دئے مہمان کا پہنچنا ایک مصیبت بن جاتا ہے، اور ایک طرف میزبانی کے مقدس فرض کا احساس کہ گھر آئے مہمان سے بے رخی کرنا بڑی شرم اور بدنامی کی بات ہے۔ دوسری طرف گھر میں جگہ نہیں۔ بیوی یا بچے بیمار ہیں۔ نوکر بھاگ گیا۔ یا تنخواہ کے قریب۔ گھی مل نہیں رہا۔ غرض بیسیوں مشکل کا سامنا ہے۔ لیکن مہمان آگیا ہے، چاہے کچھ ہو اس کی خاطر اور خیال کرنا ہی ہے۔ دراصل ہم لوگوں کی عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ آٹھ، دس سال تک سستا زمانہ تھا، چیزیں ہر وقت اور ضرورت کے موافق مل جاتی تھیں۔ گھروں میں گنجائش ہوتی تھی۔ نوکر آسانی سے مل جاتے تھے مہمان وقت بے وقت آئے یا کئی کئی مہمان ایک ساتھ آجائیں یا ہفتوں مہینوں رہ جائیں اتنا گراں نہ گزرتا تھا ان کو اچھے اچھے کھانے کھلا سکتے تھے اور ہر قسم کی خاطر مدارات تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر کر سکتے تھے لیکن ۹ چند سال میں ہمارے دیس میں اتنا انقلاب ہوا ہے اور ضروریات زندگی اس حد تک مہنگی اور نایاب ہو چکی ہیں کہ اچھی خاصی حیثیت والے لوگوں کے لئے اپنا دو وقت کا پیٹ بھرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ایک تو کھانے پینے کی چیزوں کا راشن اور زیادہ لینا چاہو تو بلیک مارکیٹ کے چوگنے دام، پھر پیسے کی کمی اور چیزوں کی گرانی اس کا موقع بھی نہیں دیتی کہ گھر والی وقت بے وقت کے مہمانوں کے لئے ضرورت کی چیزیں جمع رکھے۔ مگر جس وقت مہمان آجائے تو پرانی رسمیں، خاندانی روایتیں اور مہمان داری کے اصول اور قاعدے ہمارے سامنے مشکلوں کا پہاڑ بن کر آتے ہیں جن کو بہر حال طے کرنا ہے ورنہ شرم اور ذلت کی بات ہوگی۔

اول تو میزبان کو چاہیے کہ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے خاطر داری اور مہمان داری کے اصول اور قاعدوں میں اصلاح کرے۔ لیکن زیادہ ضرورت اسی کی ہے کہ مہمان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جب تک مہمان میزبان سے طرح طرح کے مطالبات کرتا رہے گا۔ میزبان کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ انھیں پورا کرے۔ ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے کہ آج وہ مہمان ہے تو کل میزبان ہو سکتا ہے، اس لئے اسے اپنے میزبان سے خاطر مدارات، آرام و آسائش کی وہ توقعات نہیں رکھنی چاہئیں، جنھیں میزبان ان کی حیثیت سے وہ خود پورا نہیں کر سکے گا۔ [illegible] شخص کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے [illegible] کے گھر گیا ہے تو [illegible]

[illegible] وقت [illegible] کے گھر آتا ہے [illegible] مہمان کرتا ہے۔

ہمارے دیس میں جن لوگوں نے مغربی تہذیب کا اثر قبول کیا ہے انھوں نے نئے حالات کے مطابق مہمان میزبانی کے قاعدے بہت کچھ بدل دئے ہیں مگر چونکہ یہ لوگ پرانی ہندوستانی روایات کے مطابق ایسے میزبان ثابت نہیں ہوتے جو اپنا تن من دھن سب مہمان پر نثار کر دے۔ بلکہ پرانی قسم کے مہمانوں کو تو ان کے طرز عمل سے بے رخی کی بو آتی ہے اور انھیں ذلت محسوس ہوتی ہے — لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے طریقۂ میزبانی میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں اور اپنے اصولوں کو ذرا سا ہندوستانی رنگ دے لیں تو اچھے میزبان ثابت ہو سکتے ہیں اور مہمان تو یقیناً وہ سب سے بہتر ہوتے ہیں — ہمارے ہاں عام دستور ہے کہ مہمان ہوتے ہیں چند پہننے کے جوڑے لئے زیادہ کیا تو ایک کمبل یا چادر رکھ لیا اور روانہ ہو گئے۔ باقی اور سب ضروریات کی ذمہ داری میزبان کے سر ہے۔ لیکن نئے تہذیب یافتہ لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنی ذاتی ضرورت کی ہر چیز صابن، منجن، تولیہ، کنگھا، کاغذ قلم، اپنا بستر، اپنی دوائیں غرض ہر وہ چیز جس کے وہ عادی ہیں اپنے ساتھ رکھیں اور میزبان کو صرف ان کے کھانے اور سونے کا انتظام کرنا پڑے — سچ پوچھئے تو یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔ ہمیں ہر جگہ کی تہذیب سے اچھی باتیں لینے میں ہرگز عار نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے دیس میں مہمان داری کی سب سے زیادہ تکلیف دہ بلکہ خوفناک صورت شادی بیاہ جیسی تقریبوں میں نظر آتی ہے۔ اول تو جس کے ہاں تقریب ہے اس کا فرض ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو بلائے اور اصرار سے بلائے، نہ بلائے گا تو زندگی بھر جلنے کٹنے سننے پڑیں گے۔ اب چاہے آپ کا گھر کتنا ہی چھوٹا، آمدنی کتنی ہی محدود، کام کرنے والے کتنے ہی کم ہوں۔ عزیز رشتہ دار تو بہر صورت آئیں گے۔ اور جتنے دن ان کا جی چاہے گا رہیں گے۔ چنانچہ آتے ہیں اور اتنے آتے ہیں کہ گھر میں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی — کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی — گھر والی کو سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی — غیر مہمان تو کچھ لحاظ کرتے بھی ہیں مگر رشتہ دار — وہ تو خدا کے ہاں سے یہ پٹہ لکھوا کر لاتے ہیں کہ وہ کسی عزیز کے ہاں مہمان جائیں تو جتنے اعتراض اور طعن کر سکتے ہوں آپ پر کریں اور جتنی زیادہ سے زیادہ خاطر کرا سکتے ہوں کرائیں یہ ان کا پیدائشی حق ہے اور آپ کا فرض۔ گھر چھوٹا ہے تو گھر والوں کا قصور، غسل خانے وغیرہ کی تکلیف ہے تو گھر والی مجرم۔ بچے شور کرتے ہیں تو گھر والی کو الزام، کھانا کھلاتے ہیں تو ہر قسم کی نکتہ چینی [illegible] برا ہے، نمک زیادہ ہے، مرچ کم ہے [illegible] نہیں — پاندان ہر وقت کھلے [illegible]

دار المصنفین اعظم گڑھ کی اپیل

"دار المصنفین اعظم گڑھ ہمارے جید عالم دین، مورخ اور ادیب علامہ شبلی مرحوم کی یادگار ہے اور ان کے سچے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کی نگرانی اور مولوی مسعود علی صاحب کے انتظام میں ایک تہائی صدی سے علوم دینی، تاریخ اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ نئے زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر ادارے نے اپیل کی ہے لیکن حقیقی سلم وہ ہر شخص سے چاہتا ہے اس کے بدلے میں گراں قیمت کی علمی دولت پیش کر رہا ہے۔ اہل نظر کے لئے یہ ایسا سودا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کا نفع ہے۔ ہمیں امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے"

دار المصنفین نے اپنی ۳۵ سال کی زندگی میں جو مذہبی، علمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے اصحاب علم پوری طرح واقف ہیں۔ اس نے اسلامیات کے ہر شاخ اور اردو زبان و ادب پر مصنفانہ تحقیق و معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا۔ غیر مذہبی خالص علمی خدمات سے بھی اس کا دامن خالی نہیں ہے۔ اس کے کاموں کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے علمی اداروں اور وہاں کے علماء محققین تک نے کی ہے۔ اس کی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اور اس نے اپنی تصانیف سے ملک میں جدید تالیف و تصنیف اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک معیار قائم اور اس کا مذاق پیدا کر دیا ہے۔

اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ اس کی مطبوعات ہیں۔ ان کی مانگ زیادہ تر پنجاب، حیدرآباد اور دلی میں تھی، اس لئے ہندوستان کی تقسیم اور پنجاب اور دلی کی تباہی اور حیدرآباد کے انقلاب کا اس کی تجارت پر بڑا اثر پڑا۔ گو اس کی کتابوں کی مقبولیت اور طلب اب بھی قائم ہے لیکن جب تک دونوں ملکوں کے درمیان رسل و رسائل کی دشواریاں دور نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کی پوری تعمیل نہیں ہو سکتی۔ بعض علم دوست ریاستوں سے جو امداد ملتی ہے وہ بھی موجودہ ریاستی انقلاب میں نہیں کہا جا سکتا کب تک قائم رہ سکے گی۔ کاغذ کا قحط، دوسرے سامان طباعت و اشاعت کی گرانی اور ملک کے اقتصادی حالات کی ناسازگاری، اس پر مستزاد ان حالات میں دار المصنفین کا کاروبار چلانا دشوار ہو رہا ہے۔

دوسری طرف ہندوستان کے انقلاب اور اس کے اثرات و نتائج نے دار المصنفین کے کاموں کو اور زیادہ ضروری بنا دیا ہے اور اس پر نئی نئی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں۔ لاہور جو اردو کا بڑا مرکز تھا، ہندوستان سے نکل گیا۔ ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ختم ہو گئی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا اردو شعبہ توڑ دیا گیا۔ مکتبہ جامعہ ملیہ حال کے ہنگامے میں تباہ ہو گیا۔ حیدرآباد کے اردو زبان اور اسلامیات کے ادارے چند دنوں کے مہمان ہیں۔ ایسی حالت میں جو ادارے باقی رہ گئے ہیں ان ہی پر اب اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمات کا مدار رہ گیا ہے اور ان کو ہر حالت میں قائم رکھنا ہے۔ اس لئے دار المصنفین انشاء اللہ اپنا کام پورے استقلال سے جاری رکھے گا۔ بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اس میں اور زیادہ وسعت دے گا۔ ابھی اس کے بہت سے پرانے کاموں سیرۃ النبی، سلسلہ تاریخ اسلام و تاریخ ہند کی تکمیل باقی ہے اور نئے حالات نے بعض نئے کام پیدا کر دئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب ہندی میں بھی اسلامی لٹریچر پیش کیا جائے اور مسلمانوں کو اندرونی اور بیرونی غیر اسلامی اثرات اور تحریکوں سے بچانے کے لئے مضامین اور کتابیں لکھی جائیں۔ یہ دونوں کام دار المصنفین کے پیش نظر ہیں لیکن ان سب کا دارومدار سرمایہ پر ہے۔ دار المصنفین تو انشاء اللہ اپنا کام کرتا رہے گا لیکن دوسروں کے بھی کچھ فرائض ہیں۔

دار المصنفین جب سے قائم ہوا ہے والحمد للہ آج تک اس نے کبھی عام چندہ کی درخواست نہیں کی، اور اب بھی وہ اس وضعداری پر قائم ہے۔ ایک دفعہ اس کو مالی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی تو اس کو بیس روپے سالانہ ممبری کی شکل میں قبول کیا تھا اور اس معاوضہ میں رسالہ معارف اور مطبوعات معاونین کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ دار المصنفین کے بعض ہوا خواہوں کی رائے ہے کہ اس طریقے کو پھر جاری کیا جائے اور چونکہ بعض قدرداں بلا معاوضہ مدد کرنا چاہتے ہیں اس لئے ممبری کی فیس بہ ترتیب تیس اور پچاس روپے سالانہ کر دی جائے۔ دونوں قسم کے ممبروں کی خدمت میں ممبری کی مدت تک رسالہ معارف اور سالانہ مطبوعات پیش کی جائیں گی یا اس قیمت کی دوسری کتابیں جن کو وہ پسند کریں گے دی جائیں گی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ممبری مستقل اور دائمی ہو بلکہ ایک دو سال کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔

اگر تیس روپے سالانہ کے پانچ ہزار ممبر بھی بن جائیں تو دار المصنفین کی موجودہ مشکلات دور ہو جائیں گی اور پرانے کاموں کی تکمیل اور نئے کاموں کے شروع کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ دار المصنفین کے قدر دانوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ تعداد آسانی کے ساتھ پوری کی جا سکتی ہے ہم کو یقین ہے کہ دار المصنفین کے ہمدرد، ہوا خواہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں ممبر سازی کی پوری کوشش فرمائیں گے اور مطلوبہ تعداد بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ یہ اردو زبان کے حامیوں اور اسلامی کلچر کے محافظوں کا بھی امتحان ہے کہ اس سے ان کی محبت کا دعوی محض زبانی ہے یا اس کے لئے وہ عملاً کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی
(ناظم دار المصنفین)

مسعود علی ندوی (منیجر دار المصنفین)

مہمان داری (مسلسل صفحہ)

سیدھی نہیں ...... پھر سب مہمان خاص طور پر عورتیں بے موقع بتانا ایکسٹرا یا ایک ننگ بھی ہیں۔ اس کا کچھ خیال نہیں کہ گھر والی پہ کیا بیت رہی ہے۔ بس بیٹھی ہیں باتیں ہو رہی ہیں۔ پان چبائے جا رہے ہیں۔ آپس میں نوک جھونک طعنے تشنے۔ لڑائی جھگڑے بھی منہ کا مزا بدلنے کو ہوتے جاتے ہیں۔ ان کا اور ان کے بچوں کا ہر کام گھر والوں کا فرض ہے ...... ان کے نوکر تک مہمان ہیں۔ جن کی ناز برداری آقاؤں سے زیادہ کرنی چاہئے اور جب یہ ہنگامہ ختم ہو گا اور خدا خدا کر کے یہ رحمت الٰہی اپنے اپنے گھر سدھارے گی تو میزبان دیکھے گا کہ گھر کی زمین پر تھوک، پیک اور گندگی، دیواروں پر سیاہی، کتھے، چونے اور دوا قلی وغیرہ کے نشانات ہیں۔ سفیدی اکھڑی، کواڑ ٹوٹے، پلنگ ٹوٹے، کرسیاں، میزیں لنگڑی، برتنوں کا صفایا، ہر مدی، ہر فرش، اور قالین زمین کی زنگ کی ہے۔ جیب خالی ہے۔ سر پہ قرض کا بھاری بوجھ ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر جہاں مہمانوں کی جہالت، بے حسی اور بے دردی کو دخل ہے وہاں میزبان کی ناعاقبت اندیشی، رسم پرستی اور ایک حد تک بد انتظامی بھی شامل ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع کی پروا کئے بغیر ایک وقت میں صرف اتنے مہمان بلائے جائیں، جن کے رہنے سہنے کھانے پینے کا آسانی اور خوبی سے انتظام کیا جا سکے اور جتنے دنوں کے لئے مہمان بلانے ہوں ان کو بتا دیا جائے۔ رہی خاطر مدارات تو وہ بھی جتنی چادر دیکھو اتنے پیر پھیلاؤ ...... دو چار وقت کے مہمان کو ایک دعوتی کھانا بھی کھلا سکتے ہیں مگر ایسے مہمان جو زیادہ دن رہیں ان پر سادگی اور صفائی سے یہ بات واضح کر دینی چاہئے کہ اب آپ مہمان نہیں، گھر والے ہیں۔ اور جو کچھ دال دلیا ہم کھاتے ہیں وہی آپ کے سامنے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ کوشش رہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے مہمان کو تکلیف نہ ہونے دیں اور نہ اس کے سامنے بد مزاجی اور بے رخی کر کے اس کی ذلت کریں، آپ اپنی جگہ کتنے ہی پریشان اور ہر کام سے تھک کر چور ہوں، مہمان پر اس کا اظہار کرنا بد خلقی ہے کہ تمہارے سبب یہ مصیبت آئی ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا میزبان سے بہت زیادہ مہمان کو اپنے اصولوں اور عادتوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اول تو ہمیں اس زمانے میں کسی کے ہاں بے اطلاع اور بے اجازت جانا نہیں چاہئے اور اگر ایسی ہی کوئی اچانک ضرورت آ پڑے تو ایک دو دن سے زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ دوسرے مہمان کو خواہ دوست ہو یا عزیز اپنے ہر کام اور ہر خرچ کا بار میزبان پر نہیں ڈالنا چاہئے۔ خاص طور پر تقریبوں کے موقعوں پر جب کہ مہمان زیادہ ہوتے ہیں اور میزبان ایک ہوتا ہے —— اگر ہم دو دن سے زیادہ کے لئے کسی کے ہاں مہمان ہوں تو خاطر تواضع کی توقع نہ

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۲۳ | ۸ جون ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

پابندی اور آزادی

رابندر ناتھ ٹیگور

یورپ آج آزادی کے گیت گاتا ہے۔ اور اس کی نظر میں آزادی کہتے ہیں دولت کمانے کی آزادی کو، لطف اٹھانے کی آزادی کو، کام کر سکنے کی آزادی کو۔ یہ آزادی بھی کوئی چھوٹی سی چیز نہیں، اور دنیا میں اسے قائم رکھنے کے لئے بہت محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے دانشور اس سے مطمئن نہ تھے، اور ہمیشہ یہ سوال اُن کے سامنے تھا کہ آخر پھر کیا؟ یہ آزادی اُن کے لئے آزادی نہ تھی، ہندوستان تو خواہشات سے اور کام سے بھی آزادی چاہتا ہے۔

آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے ارادے کو پابند کرنا ہوتا ہے کہ اس کی قوت میں انتشار نہ پیدا ہو اور اس میں وہ زور پیدا ہو سکے جو صرف پابندی سے ہوتا ہے۔ جو لوگ سیاسی آزادی کے طالب ہوتے ہیں وہ برابر اسے پابند بھی کرتے ہیں، اور خیال اور عمل کی آزادی کو بھی اس حد تک کم کرتے ہیں جہاں تک سیاسی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے اور اکثر ضمیر کی آزادی کو اس پر قربان کیا جاتا ہے۔

انگلستان کے سپاہی آزاد انسان ہیں یا محض چلتی پھرتی بندوقیں؟ اور اس کی کانوں اور کارخانوں کے مزدور؟ ان مشینوں کے ضمیمے جن پر وہ کام کرتے ہیں اور اپنے خون جگر سے سلطنت برطانیہ کے نقشے کو سرخ رنگنے میں مدد دیتے ہیں، کتنے گنتی کے انگریز ہیں جو ان کی سیاسی آزادی سے متمتع ہوتے ہیں۔ یورپ نے انفرادیت کا وعظ بہت کچھ دیا ہوگا اور اس کے لئے بہت کچھ کوشش کی ہوگی اور دنیا میں کسی جگہ کوئی فرد یورپ سے زیادہ غلام ہے؟

اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ چیستان ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یعنی آزادی پابندیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک نفع ہے جو اسی وقت ملتا ہے جب غلامی کا کافی سرمایہ لگایا جائے۔

ہندوستان کی جستجو کا مقصد بھی یہی انفرادیت تھی۔ لیکن اس محدود قسم کی انفرادیت نہیں کیونکہ وہ پھیل کر کامل آزادی و نجات تک پہنچتی ہے۔ اسی لئے اس نے اس انفرادی آزادی کو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں خاندان اور سماج کے ہر تعلق میں حاصل کرنا چاہا، اور جس طرح یورپ میں آزادی کے مطمح نظر نے میکانکی اور فوجی پابندیوں کی شکل میں ظہور کیا ہے اسی طرح ہندوستان کے مطمح نظر نے روزمرہ زندگی کی ہر جزوی بات میں پابندیاں پیدا کر دیں۔ اگر ہم اس مطمح نظر کو نہ سمجھیں جو ان پابندیوں کے پیچھے ہے اور صرف خارجی مظاہر پر نگاہ رکھیں تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں آزادیٔ فرد پوری طرح پابہ زنجیر نظر آتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی ملک میں انحطاط شروع ہوتا ہے تو اصلی چیز سے نظر ہٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ فضول جزئیات لے لیتی ہیں جو اس اصل کے گرد جمع ہو جاتی ہیں چڑیا اڑ جاتی ہے۔ خالی پنجرہ رہ جاتا ہے۔ یہی ہمارے ملک میں بھی ہوا ہے۔ ہم آج ہر قسم کی سماجی پابندیوں کو مانتے ہیں۔ لیکن وہ آزادی وہ نجات جو اس سے مقصود تھی ہمارے سامنے ہے نہ خیال میں ہے نہ عمل میں۔ میرا مقصد اس جگہ اپنے زوال کا مرثیہ پڑھنا نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان نے شروع میں اپنے سماجی نظام کی پابندیاں اس لئے تسلیم کی تھیں کہ سماج سے بالاتر ہو جائے۔ جیسے سوار گھوڑے کے لگام لگاتا ہے اور اپنے پیروں کو رکاب میں روکتا ہے تاکہ منزل مقصود کی طرف اس کی رفتار اور تیز ہو جائے۔ ہندوستان جانتا تھا سماج مقصود آخر نہیں۔ نہ انسان کی آخری جائے پناہ ہے بلکہ اس کی نجات کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اور اگر اس کی پابندیاں ان سے کٹھن تھیں جو یورپ نے اپنے اوپر عائد کر لی ہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے بہتر آزادی کی تلاش تھی اس کی موجودہ حالت تو صرف یہ بتاتی ہے کہ جھیل جتنی گہری ہوتی ہے سوکھنے پر غار اسی قدر خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔

پابندی و آزادی مقصد اور ذریعہ کے اس تضاد میں ہم آہنگی کی طرف ایشا اپانشد نے یوں اشارہ کیا ہے: "ظلمت میں ہیں جو محض محدود دنیا کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے تاریک تر ظلمت میں ہیں جو صرف غیر محدود کے پرستار ہیں جو دونوں کو قبول کرے وہ پہلے علم سے موت سے اپنے کو بچاتا ہے اور دوسرے کے علم سے حیات ابدی حاصل کرتا ہے۔"

یعنی آخرت کے حصول کے لئے بھرپور دنیاوی زندگی درکار ہے۔ خواہشات کی گردن پر کام کا جوا اس لئے رکھنا چاہئے کہ انسان خواہش سے اور کام دونوں سے بلند تر ہو جائے ...... محض ترک دنیا سے بقائے دوام حاصل نہیں ہوتی۔

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
پابندی اور آزادی	رابندر ناتھ ٹیگور	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
مصلحت کا پردہ	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ		
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴
۲۔ پاکستان	ع، ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع، ل	۶
غزل	مرزا احسان	۷
قلب مطمئن	باقر رضوی	۷
غزلیں	فرید	۷
گروہ بندی کی سیاست	کشوری لال مشروالا	۸
دیسی بانوں کے لفافے...	ونوبا بھاوے	۸
شادی کیا ہے ایک افسانہ	بچے نوف	۹

ہم کدھر جارہے ہیں؟

سالک ہندی

سشری مشرو والا

میں نے نئی روشنی کے گذشتہ نمبر میں سشری مشرو والا کا وہ مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے "اندھی محبت نہیں بلکہ انصاف" اور جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان کے جائز حقوق کی حفاظت کیوں ضروری ہے۔ میں اس مضمون پر مشرو والا کو اور مشرو والا پر ہندوستان کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ ابھی ہمارے دیش میں ایسے لوگ موجود ہیں جو غیر مقبول کلمۂ حق کہنے کو تیار ہیں۔ اردو کی مخالفت میں آج کل ملک میں ایک ایسی نامعقول فضا پیدا کردی گئی ہے کہ سمجھدار اور رواداار لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، اور آواز سنائی دیتی ہے تو ڈاکٹر رگھو ویرا کی قسم کے لوگوں کی جن کی ناواقفیت ان کے تعصب سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور جو نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال پیش کرنے کی جرأت فرماتے ہیں کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو شاید اس کے لاکھ دو لاکھ بولنے والے کہیں کہیں شمالی ہندوستان کے شہروں میں ہوں گے! اگر کسی تعلیم یافتہ ملک میں، جہاں لوگ غیر جانب داری کے ساتھ باتوں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کوئی شخص اس قسم کی جاہلانہ بات کہے تو وہ ہمیشہ کے لئے اہل علم کے دربار سے خارج سمجھا جائے اور لوگوں کی تضحیک ہی اس کی ادبی اور علمی شہرت کا خاتمہ کردے! لیکن ہمارے ملک میں تو بعض لوگ محض عوام کی جہالت کے بل بوتے پر لیڈری کرتے ہیں .... ایسی فضا میں مشرو والا اور ونوبا بھاوے جیسے لوگوں کی انصاف پسندی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے لئے بھی ہمیشہ گاندھی جی کا شکرگذار ہونا چاہیے جن کی انسان ساز صحبت میں انھوں نے تربیت پائی ہے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ "اگر نمک اپنی نمکینی کھو بیٹھے تو اس میں پھر سے نمکینی کہاں سے پیدا ہوگی" زندگی میں نمک ایسے ہی لوگوں کے دم سے ہے۔

جواہر لال کی بین الاقوامی سیاست

لندن سے واپس آکر جواہر لال نے لندن کانفرنس کے متعلق ایک تقریر ریڈیو پر اور دو تقریریں اسمبلی میں کی ہیں۔ میں اپنے مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر یہاں اس کے سیاسی پہلو سے بحث نہیں کرسکتا یعنی یہ کہ ہندوستان کے لئے کامن ویلتھ کا ممبر رہنا مناسب ہے، یا نامناسب۔ لیکن میں ان کی تقریروں کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کی میری نظر میں بڑی اخلاقی اہمیت ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ میں (بنیوں کی طرح) سودا کرنے میں ہوشیار نہیں ہوں بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں دوستی اور اعتماد کی فضا پیدا کروں میں بھی کی مخالفت، اور دشمنی کو نظر انداز کرکے دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور اس کے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر معاملات کے بارے میں رائے قائم کرنا چاہتا ہوں مجھے (GOOD WILL) عزیز ہے خواہ وہ کسی طرف سے آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کی خارجی پالیسی ایسی ہو کہ وہ دنیا کی مجروح سیاست کے زخموں پر مرہم رکھے اور باہمی شکوک اور نفرتوں کو کم کرنے میں مدد دے۔ اگر آپ ان تمام خیالات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ کو یقیناً یہ محسوس ہوگا کہ یہ موجودہ بین الاقوامی سیاست میں ایک نئی آواز اور ایک نیا طرز خیال ہے۔ اس میں دل اور دماغ کی ایک ایسی وسعت اور انسانیت نوازی کی ایک ایسی شان پائی جاتی ہے جو آج کل کے چوٹی کے مدبروں اور سیاست دانوں میں بہت کمیاب ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی تقریروں میں دل خوش کن باتیں اور اثر آفریں فقرے نہیں ہوتے وہ بعض کے ہاں یقیناً ہوتے ہیں اور بہت سے تو اس بارے میں بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں!! لیکن فرق اتنا ہے کہ جواہر لال وہی بات کہتے ہیں جو ان کے دل سے نکلتی ہے اور وہ اپنوں اور دوسروں کی مخالفت کے باوجود اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے لئے یہ ایک نیک شگون ہے کہ ملک کی خارجی پالیسی ایک ایسے دیانت دار اور شریف انسان کے ہاتھ میں ہے جو شرافت اور انسانیت کے اصولوں پر ایمان رکھتا ہے!

گاندھی پرستی

گاندھی جی ایک سچے خدا پرست انسان تھے اور خدا پرستی کی ایک شان یہ ہے کہ وہ انسان کی پوجا نہیں چاہتی۔ اس لئے گاندھی جی نے خود ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی کہ لوگ ان کو دیوتا کا درجہ دیں اور ان کے سچے پیرو اور قریب کے لوگ آج بھی اس بات کے خلاف ہیں کہ ان کی مورتیاں بنائی جائیں ان کے نام پر شہروں، سڑکوں، مکانوں شربت خانوں، اور دکانوں کے نام رکھے جائیں۔ مگر بہت سے لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں مثلاً ابھی حال میں اسمبلی کے ایک رکن نے اس تجویز کا نوٹس دیا ہے کہ ملک کے آئین میں "ہم ان تمام احسانوں کو تسلیم کریں جو پرماتما اور مہاتما گاندھی نے ہم پر کئے ہیں"۔ پرماتما اور مہاتما گاندھی کا یہ امتزاج اور آئین میں ان کے احسانوں کو درج کرکے سبکدوشی حاصل کرلینا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس پر ایک اعتراض تو یہ ہے کہ یہ امتزاج گاندھی جی بلکہ ہر سچے مذہبی آدمی کی ذہنیت کے خلاف ہے لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا اعتراض بھی ہے جو عملی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے آسان اعتراف میں ایک اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہمارا ضمیر مطمئن ہوجائے گا اور ہم بجائے گاندھی جی کے بتائے ہوئے کٹھن راستے پر چلنے اور ان کے اصولوں کا پالن کرنے کے محض ان کے گن گانے پر بس کریں گے۔ اگر آپ واقعاً گاندھی جی کا احسان ماننا چاہتے ہیں تو ان کی مورتیاں تصویریں اور ان کے نام پر عمارتیں بنانے کے بجائے ہریجنوں کی سیوا کیجئے، دوسری جاتیوں اور مذہبوں کے لوگوں کے ساتھ دوستی اور محبت کا سلوک کیجئے، عورتوں کو برابری کا درجہ دیجئے، گاؤں والوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کا سدھار کیجئے دیش میں اچھی تعلیم اور صحت کا پرچار کیجئے ....

اور جب آپ یہ سب کرلیں گے اور اپنے نفس کے جراثیم ماریں گے، اس وقت آپ کو گاندھی بھگتی کا دعویٰ زیب دے گا۔ ورنہ زاہد کے ہاتھ میں تسبیح اور لوگوں کے مال پر نگاہ، دل میں کھوٹ کپٹ اور ہونٹوں پر رام رام ٹرانے سنتے ہیں، جن سے دنیا کو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے۔ اپنے نفس کی یا سماج کی اصلاح نہیں ہوسکتی!

راج کماری امرت کور سے!

سائنس نے صرف ایٹم بم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کی بدولت بہت سی اچھی اور مفید چیزیں بھی بنی ہیں جن کی مدد سے ہماری زندگی میں بڑا خوش گوار انقلاب پیدا ہوسکتا ہے۔ ان میں سے ایک ڈی، ڈی، ٹی ہے۔ شاید آپ نے اس کے بہت سے کرشمے سنے اور پڑھے ہوں گے۔ دو مجھ سے سن لیجئے۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی بہت ملیریا زدہ علاقے میں واقع تھی اور مکھیوں اور مچھروں کی وجہ سے لوگوں کی جان عذاب میں رہتی تھی (ہم تو انھیں اس دکھ بھری دنیاوی زندگی کا لازمی جزو ہی سمجھتے ہیں!) جب ڈی، ڈی، ٹی کا ظہور ہوا تو یونیورسٹی نے ہوائی جہاز کے ذریعے اور گھر گھر اس کا استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اگر سائنس کے تجربوں کے لئے مکھی یا مچھر کی ضرورت ہوتی ہے تو ان کو تلاش کرنے میلوں جانا ہوتا ہے! دوسرا واقعہ "برٹش گی آنا" کا ہے۔ یہاں مدت سے آبادی یکساں تھی یعنی موت اور پیدائش کی شرح برابر تھی اور اس توازن کے قائم رکھنے کا سہرا مچھروں کے سر تھا جن کی بدولت وہاں ملیریا، زرد بخار اور اس قسم کے دوسرے مرضوں کی شدت تھی۔ یہ مچھر گوں کے لکڑی کے

بقیہ صفحہ ۱۱ پر

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ جون سنہ ۴۹ء

مصلحت کا پردہ

ڈیرہ دون میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کھلے اجلاس کے علاوہ ایک اجلاس پس پردہ بھی ہوا۔ اس کی کارروائی اخباروں میں نہیں آنی چاہئے تھی اور نہیں آئی۔ لیکن چند عام باتوں کے ظاہر کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا گیا۔ پہلی بات یہ کہ اس صحبت میں کانگریس کی اندرونی حالت اور کانگریسی وزارتوں کی کارگذاری پر بحث کی گئی۔ بہت سے ممبروں نے وہ شکایتیں جو مدت سے دل میں لئے ہوئے تھے صاف صاف بیان کر دیں۔ ان کا انداز ذمہ داری کا اور لہجہ معتدل تھا۔ لیکن انھوں نے اظہار حق میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ شکایتوں کے جواب میں جتنی تقریریں ہوئیں ان میں صرف پنڈت جواہرلال نہرو اور چند اور چوٹی کے لیڈروں کے بیان سننے والوں کو کسی حد تک مطمئن کر سکے اور اس کی تصدیق ہو گئی کہ کانگریس کا سارا کاروبار انہیں حضرات کی ساکھ پر چل رہا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی ریزولیشن پاس نہیں کیا گیا۔ لیکن تقریروں کے خلاصے قلم بند کر کے کانگریس کمیٹیوں کو اور وزارتوں کو بھیج دیئے گئے تاکہ وہ اپنوں کی تنقید کے آئینے میں اپنی صورتیں دیکھ سکیں۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس مایوسی اور بے دلی کے اندھیرے میں امید کی جان بخش کرن ہے۔ ذہنی اور اخلاقی مرض کی شدت میں صحت کی جان فزا علامت ہے۔ اگر ہمارے ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکے، اپنی دکھتی رگ پہچان سکے۔ اپنے دل کے چور پکڑ سکے اور اتنا ضبط بھی ہے کہ ان سب باتوں کا سر بازار ڈھنڈورا نہ پیٹے بلکہ مصلحت کے پردے کے اندر اپنوں ہی اپنوں تک محدود رکھے تو ملک کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کانگریس اس وقت بڑے نازک دور سے گذر رہی ہے جو جماعت ساٹھ برس تک شکایت نکتہ چینی اور مخالفت کا وظیفہ پڑھتی رہی ہو، قید و بند کی تکلیفیں اٹھاتی رہی ہو، لاٹھیاں اور گولیاں کھاتی رہی ہو اور اس کے ہاتھ میں ایک دم سے طاقت کا آ جانا اور طاقت بھی ایسی جسے کوئی قابل ذکر حریف چیلنج کرنے والا نہ ہو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے بہت سے افراد جن پر حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس بوجھ کو اچھی طرح نہیں سنبھال سکتے۔ ان کے لئے پرانے افسروں سے جو کچھ دن پہلے تک ان کے جلاد تھے اور اب ان کے خادم ہیں صحیح تعلق پیدا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دشواری اپنے پرانے ساتھیوں کو مطمئن رکھنے میں پیش آتی ہے جو اپنی قومی خدمت اور قربانی کا صلہ چاہتے ہیں اور بعض اوقات اپنی غرض کی دھن میں جائز اور ناجائز کے فرق کو بھول جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان نئے وزیروں اور حاکموں کو طاقت کا نشہ اندھا کر دیتا ہے اور کبھی کبھی ان کے قدم مایا کے بوجھ سے ڈگمگا جاتے ہیں۔ وہ عہدوں کے لئے اور دولت کے لئے آپس میں اسی شدت سے لڑنے لگتے ہیں جیسے اپنے دشمنوں سے اصولوں کی خاطر لڑا کرتے تھے۔ یہ سب کیفیتیں بہت سے ملکوں میں ان سیاسی پارٹیوں پر جو مدتوں معتوب اور مظلوم رہنے کے بعد یکایک قوت و اقتدار کی مالک بن گئیں گذر چکی ہیں اور اب کانگریس پر گذر رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر کانگریس کے بدخواہ خوش ہوتے ہیں اور اس کے خیر خواہ کڑھتے ہیں۔ دونوں کی نظروں میں چین کی کیومن تانگ کی تصویر پھرتی ہے جسے حکومت کے نشے نے ترقی پسندی کی چوٹی سے رجعت پسندی کے کھڈ میں گرا دیا اور اب ذلت و ہلاکت کے گڑھے میں ڈھکیل رہا ہے۔ لیکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ڈیرہ دون والے خفیہ اجلاس کی جو کچھ سن گن ملی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی کانگریس کیومن تانگ کی راہ سے بہت دور ہے۔ ابھی اس میں اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ان کمزوریوں کا احساس ان پر تنقید کرنے کی ہمت ان کو دور کرنے کی خواہش موجود ہے۔ ابھی اس میں آپس کی مخالفتوں اور گروہ بندیوں کے باوجود اتنی حمیت باقی ہے کہ ان کو غیروں سے چھپانے کی کوشش کر لی ہے۔ بعض صوبوں اور ضلعوں کی اور اکثر ریاستوں کی کانگریس کمیٹیوں پر وہ عارضے جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اس طرح غالب آ گئے ہیں کہ صحت مندی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ لیکن جب تک مرکزی کمیٹی جسے کانگریس کے جسم اجتماعی میں قلب کا درجہ حاصل ہے صحیح و سالم ہے۔ یہ امید کرنا بے جا نہیں کہ کانگریس کی رگوں میں صالح خون دوڑتا رہے گا اور فاسد خون کو ضرر پہنچانے سے پہلے نکال دینے کا امکان باقی رہے گا۔

بزم بے تکلف

(کھٹ۔ کھٹ، کھٹ کھٹ۔ آئین سازی کا کام جاری ہے)

پہلا کاریگر۔ اس گرمی نے تو بولا دیا استاد۔ معلوم ہوتا ہے سارا مغز پسینے کے ساتھ بہہ جائے گا۔

دوسرا۔ (انگڑائی لے کر) ہاں استاد کام پر دل جمتا نہیں۔ سر میں بھٹی سی چل رہی ہے۔ بدن میں کس نہیں رہا۔ ہاتھ اوچھا پڑنے لگا۔ میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں کڑیاں کچی نہ رہ جائیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آئین کی زنجیر اتنی مضبوط ہو کہ آزادی کے قیدی لاکھ چھٹکے دیں مگر زنجیر تڑا کر بھاگنے نہ پائیں۔ پھر بھلا اس موسم میں ———

استاد۔ آخر تم لوگوں کا مطلب کیا ہے؟

دوسرا۔ مطلب یہ ہے استاد کہ کچھ دن کی چھٹی ہو جائے۔ بس مینہ کا پہلا چھینٹا پڑا اور ہم لوگ پھدکتے تڑاتے آن موجود ہوں گے۔ پھر کام کھٹ کھٹ کی جگہ کھٹا کھٹ ہونے لگے گا اور اتنے دن ناغے کی ساری کسر نکل جائے گی۔

استاد۔ خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی۔ یہ بھی کوئی اسکول کالج مقرر کیا ہے۔ جہاں کام کے تھوڑے سے دن بہت سی چھٹیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں جیسے آج کل پانی میں دودھ کھو جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے جتنی مدت میں کام ختم کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا وہ کب کی گذر چکی۔ کئی بار مہلت ملی مگر پھر بھی کام ختم نہیں ہوا۔ اب آخری مہلت ۱۵ اگست تک کی ہے۔ بھلا یہ کوئی چھٹی منانے کا وقت ہے۔

(دونوں پھر ہتوڑی چلانے لگتے ہیں، مگر بے دلی سے ہلکے ہلکے۔)

ایک نوسکھیا۔ استاد قصور معاف ہو تو عرض کروں کہ اگر سارے وقت آئین گھڑنے کا کام یہی دونوں کرتے رہے اور وہ بھی اس طرح دھیرے دھیرے سم تال کے ساتھ تو میں ضرور اونگھ جاؤں گا۔ ایک تو گرمی کے مارے یوں ہی غشی سی آ رہی ہے اور پھر یہ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کی لوری سن کر بے اختیار آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ یا تو ان دونوں کی بدلی کیجئے یا پھر مجھے سونے کی اجازت دیجئے۔

پہلا کاریگر۔ استاد اسے شوق سے سو جانے دیجئے

چہ خفتہ چہ بیدار

دوسرا۔ استاد اسے ہرگز نہ سونے دیجئے گا۔ ورنہ مجھے سخت شکایت ہوگی۔ بھلا آئین سازوں کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنا کاریگری کا کمال دکھائیں اور لوگ پاؤں پسار کر سوئیں۔

نوسکھیا۔ (سوتی ہوئی آواز میں گنگناتا ہے)

سوئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں سلائے کیوں ✲

✲ خراٹے لینے لگتا ہے

استاد۔ شرع و آئین پہ مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

پچھلا ہفتہ :- ۱- ہندوستان

ٹھنڈی گرمیاں

اس سال دہلی میں گرمی معمول سے کم پڑی مگر معلوم ہوتا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کی عمارت میں اور کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں جہاں اکثر ممبر مقیم ہیں "جمہور اندیشی کی گرمی" سے درجہ حرارت غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ اس لئے کہ بعض ممبروں نے جناب صدر سے یہ درخواست کی کہ گرمی کی وجہ سے اسمبلی کا اجلاس ایک مہینے کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ جس روز یہ درخواست کی گئی اس کے دوسرے دن سے موسم یکایک بدل گیا اور گرمی بہت کم ہو گئی۔ جناب صدر جنھیں ۱۵ اگست تک آئین کو مکمل کرنے کی فکر ہے شاید یوں بھی نہ پسیجتے۔ اب جو پارہ گر گیا تو انھیں التوا کی درخواست کو رد کرنے کا خداداد موقع ہاتھ آ گیا اور انھوں نے اعلان فرمایا کہ اسمبلی کا اجلاس بدستور جاری رہے گا۔

ایک اور معزز ممبر نے جناب صدر سے شکایت کی کہ چند خاص ممبروں نے ہر تجویز، ہر ترمیم اور ہر ترمیم کی ترمیم پر بولنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے اور ہمیشہ انھیں کی آواز اسمبلی میں گونجتی رہتی ہے جس سے سننے والوں کو خواہ مخواہ نیند آنے لگتی ہے۔ انھوں نے کہا یا تو ان حضرات کو تاکید کر دی جائے کہ دو تین منٹ سے زیادہ کی تقریریں نہ کریں یا پھر ہم لوگوں کو اجازت دی جائے کہ سو کر وقت گذاریں۔ جناب صدر نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ مگر اس احتجاج کا [illegible] اثر ضرور ہوا کہ طوفان تکلم [illegible] کے لئے رک گیا۔

ان سب باتوں کے باوجود پچھلے ہفتے اسمبلی نے بہت کافی کام کر لیا۔ گورنروں کے تقرر اور ان کے فرائض اور اختیارات کے متعلق جتنی دفعات تھیں [illegible] کے بعد پاس کر دی گئیں۔ سب سے اہم ترمیم جو آئین کے مسودے میں منظور ہوئی یہ ہے کہ گورنروں کا انتخاب نہیں ہوا کرے گا۔ بلکہ انھیں ریپبلک کا پریسیڈنٹ مجلس وزرا کے مشورے سے نامزد کیا کرے گا۔ ہمارے خیال میں فیصلہ بہت مناسب ہی اس لئے اگر گورنر منتخب ہوتا تو یقیناً اسی صوبے کے باشندوں میں سے ہوتا جس میں وہ حکومت کرتی ہے اور اسی پارٹی کا ہوتا جس کی وزارت ہے۔ اس صورت میں وہ وزارت کی بدعنوانیوں کی روک تھام جو اس کا خاص فرض ہے جیسی چاہیے نہ کر سکتا تھا۔

تنہا پیش قاضی

فرانس کی حکومت کو حکومت ہند سے یہ شکایت تھی کہ اس نے ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات کی معاشی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ نئی دہلی سے اس کا یہ جواب دیا گیا تھا کہ چنگی کا جو معاہدہ [illegible] میں ہوا تھا۔ اس کی میعاد ختم ہونے کے بعد حکومت فرانس باوجود حکومت ہند کے تقاضے کے نیا معاہدہ کرنے میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس لئے مجبوراً ادھر سے مال کی درآمد پر پابندیاں عاید کی گئیں۔ اس کے ساتھ یہ جھگڑا بھی چل رہا تھا کہ فرانسیسی مقبوضات کے لوگوں سے عام رائے شماری کے ذریعے یہ پوچھا جائے کہ وہ بدستور فرانس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ حکومت ہند کی تجویز تھی کہ ان سب امور کو طے کرنے کے لئے سیکورٹی کونسل بین الاقوامی عدالت سے چند غیر جانب دار "ناظر" مقرر کرنے کی درخواست کرے، جو ہندوستان اور فرانس دونوں کے قابل قبول ہوں۔ فرانسیسی حکومت نے [illegible] حکومت ہند [illegible] اس تجویز کو پسند کر لیتی ہے۔ مگر پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنے طور پر بین الاقوامی عدالت کے نائب صدر سے درخواست کی کہ جو الزام معاشی ناکہ بندی کا وہ حکومت ہند پر لگا رہی ہے ان کی تحقیقات کے لئے غیر جانبدار ناظر مقرر کر دئے جائیں۔ جناب نائب صدر نے حکومت ہند سے پوچھے بغیر ذاتی حیثیت سے دو ناظر فرانس کے لگائے ہوئے الزام کی تحقیقات کے لئے نامزد کر دئے۔ نئی دہلی کے سرکاری حلقوں میں اس پر تعجب اور افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جج کی قرارداد ہے جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ یہ ناظر جو فیصلہ کریں گے اس کی پابندی حکومت ہند پر لازم نہیں ہوگی۔ حکومت محکمہ خارجہ کے نائب سکریٹری مسٹر بی اے مینن کو پانڈیچیری بھیج رہی ہے کہ وہ اپنے طور پر تحقیقات کریں کہ درآمد برآمد کے بارے میں جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان سے فرانسیسی مقبوضات کے لوگوں کو کیا کیا تکلیفیں ہیں اور وہ کس طرح دور کی جا سکتی ہیں۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ فرانسیسی ہند کے نئے گورنر نئی دہلی آنے والے ہیں تاکہ پنڈت نہرو سے ذاتی طور پر گفتگو کر کے تنازعی امور کو طے کر لیں۔

نئے آئین ساز

ابھی چند روز ہوئے آئین ساز اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کشمیر کے چار نمائندے اسمبلی میں طلب کئے جائیں۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے شیخ محمد عبداللہ صاحب، مرزا افضل بیگ صاحب، مولانا محمد سعید صاحب اور موتی رام صاحب کے نام کشمیر کے نمائندوں کے طور پر تجویز کئے ہیں چونکہ نمائندوں کا تقرر مہاراجہ کو وزیر اعظم کی سفارش کے مطابق کرنا ہے اس لئے یقین ہے کہ یہی چاروں حضرات نامزد ہو جائیں گے۔ ان میں سے شیخ محمد عبداللہ صاحب کے علاوہ جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں مرزا افضل بیگ صاحب بھی سیاست نظم و نسق اور قانون سازی کے میدان میں سالہا سال کا تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے دائرے میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ چاروں نئے آئین ساز کشمیر کی نمائندگی کا حق جیسا چاہئے ادا کریں گے اور ان سے اسمبلی کو اپنے کام میں قابل قدر مدد ملے گی۔

سخن گسترانہ بات

کچھ دن سے سننے میں آ رہا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ (اکالی لیڈر) نے کچھ ہندوؤں کے سمجھانے بجھانے سے اپنا ایک آئین تیار کر لیا تھی اور یہی ہمدردی پیش کر رہے ہیں کہ حکومت ہند کو یہ آئین دکھا کر سکھوں کی طرف سے مطمئن اور اس بات پر آمادہ کر دیں کہ وہ سکھوں پر سے قانونی پابندی ہٹائے اور ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈروں کو جو اب تک قید میں ہیں رہا کر دے۔ کل کے اسٹیٹسمین کا نامہ نگار خبر دیتا ہے کہ سکھ کے آئین کا مسودہ گذشتہ اپریل میں ہوم منسٹری (وزارت داخلہ) میں بھیجا گیا تھا اور پچھلے مہینے صوبوں کے وزیروں کی کانفرنس میں اس بات پر غور کیا گیا۔ اس کے بعد حکومت نے ماسٹر تارا سنگھ کو اطلاع دی کہ اس کے نزدیک اس مسودے میں چند اہم باتوں کی کمی ہے اور جب تک وہ پوری نہ ہو جائے حکومت اسے قابل اطمینان نہیں سمجھ سکتی ہے۔ وہ اہم باتیں یہ ہیں :-

(۱) اس میں ہندوستان کے سرکاری جھنڈے کا ذکر صرف ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ واضح الفاظ میں اس سے وفاداری کا اظہار نہیں کیا گیا۔

(۲) اس میں نابالغ بچوں کو ممبر بنانے کا قاعدہ رکھا گیا ہے اور سب سے بڑے لیڈر (ماسٹر تارا سنگھ) کو اپنے جانشین کے نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

(۳) فرقہ پرستی کے ترک کرنے کا اور خفیہ کارروائیوں سے باز رہنے کا اقرار جس طرح کیا گیا ہے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

نامہ نگار کا بیان ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ نے مسودے میں حکومت کی تجویز کی ہوئی ترمیمیں کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اس طرح یہ معاملہ پھر الجھ کر رہ گیا ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ماسٹر تارا سنگھ کو ایک کھلی ہوئی جمہوری انجمن بنانے پر راضی ہو گئے ہیں تو انھیں ان تجویزوں کے مان لینے میں کیا تامل ہے۔ اگر یہ خبر غلط ہے کہ انھوں نے سنگھ کو تعمیری اور جمہوری اصولوں کی بنیاد پر چلانا منظور کر لیا ہے تو دوسری بات ہے ورنہ محض لفظوں پر جھگڑنا اس حقیقت بینی اور مصلحت شناسی سے بعید ہے جو عام طور پر ۴

۴ ان کی طرف سے منسوب کی جاتی ہے۔

۲- پاکستان

سرحد عوامی مسلم لیگ

سرحد مسلم لیگ کے راہنما تقریباً ڈیڑھ سال سے عبدالقیوم خاں کی دھاندلی دیکھ رہے تھے اور اس تمام عرصے میں وہ محض اس بنا پر خاموش رہے کہ شاید مسلم لیگ نئی تنظیم کے بعد سرحدی عوام کی صحیح نمایندہ بن جائے، اور اس طرح وہ اس قابل ہو سکے کہ عبدالقیوم نے بحیثیت وزیر اعظم کے صوبہ سرحد میں جو دراز دستیاں شروع کر رکھی ہیں، اُن کا کوئی تدارک کر سکے۔ ہمیں معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ خود پاکستان مسلم لیگ کے سابق ناظم اور حال صدر چودھری خلیق الزماں نے سرحد کے بعض ممتاز مسلم لیگی راہنماؤں کو یہ اُمید دلا رکھی تھی کہ جوں ہی مسلم لیگ کی نئی تنظیم ہوئی، وہ تمام مظالم اور بے انصافیاں جو عبدالقیوم کے ہاتھوں سرحدی عوام کے ساتھ ہو رہی ہیں ختم ہو جائیں گی اور عوام اپنی نمایندہ جماعت کی بنا پر امن و اطمینان کا سانس لے سکیں گے۔

لیکن ہوا یہ کہ عبدالقیوم خاں کا چودھری خلیق الزماں سے گٹھ جوڑ ہو گیا، اور ان دونوں نے صوبہ سرحد کے سابق لیگی وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کو جو اپنی راست بازی اور شرافت کی وجہ سے اس قابل بھی نہ سمجھے گئے تھے کہ انھیں اسمبلی کا امیدوار بنایا جاتا۔ صوبے میں مسلم لیگ کی اسی طرح تنظیم کی کہ عبدالقیوم کے حامیوں کے سوا اور کوئی اس میں آ ہی نہ سکا، اور تو اور پیر مانکی شریف ایسے مسلم لیگی لیڈر سرحد کی نئی صوبہ لیگ میں کسی ذمہ دار عہدے کے قابل نہ سمجھے گئے۔ اس ضمن میں جو بے اصولیاں اور خلاف قاعدہ حرکتیں ہوئیں ان کی ایک طویل داستان ہے جس کو سرحد کا ہر شخص جانتا ہے — ظاہر ہے یہ لیگ عبدالقیوم کی لیگ تو بے شک کہی جا سکتی تھی، لیکن اسے سرحدی عوام کی لیگ کہنا سراسر ظلم تھا۔ اس لیگ کی حیثیت بالکل عبدالقیوم کی باندی کی تھی۔ اور اس میں وہی لوگ لیے گئے تھے جو اس کی ہاں میں ہاں ملا سکیں اور اس ڈھونگ کو رچانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وزیر اعظم عوام کے خلاف اس کو اپنا سہارا بنائیں، اور اس کی آڑ میں جو اُن کے من میں آیا کرے منوا لیا کریں۔

عبدالقیوم خاں اور چودھری خلیق الزماں کی اس حرکت کا قدرتی ردعمل یہ ہوا کہ جہاں لوگ پہلے عبدالقیوم کے خلاف تھے اور مسلم لیگ پر انھیں ایک گونہ اعتماد تھا اب وہ مسلم لیگ کے بھی خلاف ہو گئے اور انھوں نے مسلم لیگ اور عبدالقیوم کو ایک سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ صورت حال کسی بھی مخلص مسلم لیگی کے لیے جس نے کہ مسلم لیگ کو بنایا اور پروان چڑھایا تھا اطمینان بخش نہیں ہو سکتی تھی، اور اُسے صاف نظر آنے لگا کہ اگر حالت یہی رہی تو عبدالقیوم تو جائے گا ہی لیکن اس کے ساتھ مسلم لیگ بھی صوبہ سرحد سے ختم ہو جائے گی۔

ہمارے نزدیک پیر مانکی شریف، خان غلام محمد خاں اور اُن کے ساتھیوں کا مسلم لیگ پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو نئے سرے سے منظم کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور بجائے اس کے کہ وہ قیوم لیگ رہ کر تباہ ہوتی، اُسے وہ عوامی لیگ بنا کر زندگی بخشنے کا سامان کر رہے ہیں۔

آج سے تقریباً تین سال قبل جب اورنگ زیب خاں سابق وزیر اعظم کی بدعنوانیوں کی وجہ سے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ ایک بدنام ترین ادارہ بن چکی تھی، یہی پیر مانکی، خان غلام محمد خاں اور اُن کے ساتھی ہی تھے جنھوں نے اُسے زندہ کیا اور اس کو عوامی حیثیت دی تھی اور آج بھی یہی لوگ ہیں، جو لیگ کو جسے عبدالقیوم نے عوام میں اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے بے وقار کر دیا ہے، نئی زندگی دینے کے لیے اٹھے ہیں۔ ہم ان لیڈروں کے اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ ان کی کوششوں سے عوامی لیگ صحیح معنوں میں عوام کی لیگ بنے گی اور عوام سے ان کے دکھوں اور مصائب کا مداوا ہو سکے گا۔

(ہفت روزہ آفاق۔ لاہور)

ہڑتالوں کی دھمکیاں

اس وقت سننے میں آ رہا ہے کہ ڈاک اور تار کے محکمے کے ادنیٰ ملازمین نے نوٹس دے رکھا ہے کہ وہ ہڑتال کر دیں گے۔ اسی طرح ہائیڈرو الیکٹرک کے ملازمین کی طرف سے بھی حکومت کو دھمکی موصول ہو چکی ہے کہ ہڑتال کر دی جائے گی۔ یہ دونوں شعبے براہِ راست پبلک سے تعلق رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر ہڑتال کرنے کے سلسلے میں ان لوگوں کا فیصلہ بحال رہا تو اس سے حکومت کی نسبت عوام کو بہت زیادہ پریشانی کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور جب ہڑتال کرنے والے ہڑتال پر آمادہ ہو جائیں تو وہ عوام کی پریشانی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

ان ملازمین کا مطالبہ وہی ہے جو عام طور پر مزدوروں کا ہوا کرتا ہے ان کی تنخواہیں کم ہیں، مہنگائی زیادہ ہے وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ حکومت کی طرف سے کچھ عرصے سے وعدے وعید ہوئے۔ لیکن اب مزدور اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ انھیں وعدوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔

اگر ہڑتال ہوئی تو ہوگا یہ کہ دو چار روز ہڑتالی ہڑتال کریں گے۔ بعد ازاں حکومت کی طرف سے کوئی نہ کوئی مفاہمت شروع ہو جائے گی اور کچھ شرائط تسلیم کر کے یہ ہڑتال ختم ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہوگا تو پھر یوں کیوں نہیں کیا جاتا کہ ہڑتال شروع ہونے سے پہلے کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ اگر حکومت اپنی انتہائی مجبوریوں کے باوجود یہ اعلان کر دے کہ ان ملازموں کی تنخواہوں میں قدرے اضافہ کر دیا جائے گا یا کوئی تاریخ معین کر دی جائے کہ اس کے بعد حکومت کی حالت بہتر ہوگی اور وہ تنخواہوں میں اضافہ کر دے گی تو بدمزگی کا یک باب فی الفور ختم ہو سکتا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت پھل سبزی اور گوشت جو خاص طور پر ہمارے ملک کی پیداوار ہیں حیرت انگیز طور پر مہنگے ہیں۔ یہی حال دوسری اشیاء خوردنی کا ہے۔ گندم دیہات میں کافی سستی ہے لیکن ڈپوؤں پر مہنگی ہے۔ اگر حکومت اشیائے خوردنی کی طرف خاص توجہ دے تو ہڑتالوں اور بے چینی کا سلسلہ بہت حد تک دور ہو سکتا ہے۔

(روزنامہ مغربی پنجاب، لاہور)

کونسل نے تصدیق کر دی

۵ جون کو مسلم لیگ کونسل کا ہنگامہ خیز اجلاس منعقد ہوا اور بالآخر گرما گرم بحثوں کے بعد مغربی پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا وہ رزولیوشن جس میں سر فرانسس موڈی پر سنگین الزامات لگائے گئے تھے اور اسے فوراً برطرف کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ اس کے علاوہ دو تجویزیں اور پاس ہوئی ہیں۔ ایک میں کامن ویلتھ سے تعلقات منقطع کرنے اور دوسری میں اہم عہدوں پر پاکستانیوں کو مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے

پاکستان بننے کے بعد ایک تو لیگ میں بہت زیادہ اختلافات پیدا ہو گئے اور قائد اعظم کے بعد پاکستان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں رہی جو ان اختلافات کو دبا سکے۔ دوسرے لیگ کے سامنے کوئی ایسا نصب العین نہیں رہا جس پر عوام کو منظم اور لیگی جھنڈے کے نیچے جمع کیا جا سکے۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں لیگ سے مایوسی پیدا ہو گئی ہے اور آیندہ الیکشن میں لیگی امیدواروں کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔ مغربی پنجاب کے نئے صدر میاں عبدالباری نے اپنے حالیہ دورے میں ان باتوں کو محسوس کیا اور لیگ کو عوام میں دوبارہ مقبول بنانے کی ان کو صرف یہی ایک صورت نظر آئی کہ انگریز گورنر کو برطرف کرنے کا مطالبہ کریں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس وقت لیگ میں بڑی زندگی پیدا ہو گئی ہے اور کونسل نے کامن ویلتھ سے قطع تعلق کرنے کا مطالبہ کر کے ایجی ٹیشن کے لیے وسیع میدان مہیا کر دیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے لیگ کے اختلافات میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ مرکز کی پالیسی بنیادی طور پر ان دونوں مطالبوں کے خلاف ہے اس لیے اُمید نہیں کہ اس سے لیگ کی تنظیم میں کوئی مدد مل سکے گی۔

۳- باہر کی دنیا

کوئی اُمید بر نہیں آتی

برلن کی ناکہ بندی کے اُٹھ جانے پر عام طور پر یہ اُمید پیدا ہو گئی تھی کہ چار بڑی طاقتوں کے درمیان شاید اب کسی سمجھوتے کی راہ پیدا ہو جائے۔ مگر ۲۳ مئی سے وزرائے خارجہ کی پیرس میں جو کانفرنس ہو رہی ہے اس سے لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کانفرنس کا آغاز بہت اچھی فضا میں ...... ہوا تھا۔ چاروں وزیروں کے اتفاق رائے سے حسب ذیل ایجنڈا طے پایا تھا۔

(۱) جرمنی کا سیاسی اور معاشی اتحاد اور چار طاقتوں کا کنٹرول (۲) برلن اور اس کی کرنسی کا مسئلہ (۳) جرمنی کے لئے صلح کا معاہدہ تیار کرنا (۴) آسٹریا کے معاہدۂ صلح پر مشورہ۔ مگر جب اس پر بحث شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ دونوں گروہوں کے نظریے اور خیالات ویسے ہی ہیں جو اس کانفرنس سے پہلے تھے اور برلن کی ناکہ بندی اُٹھا لینے سے بعض حلقوں میں جو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ روس بڑی حد تک جھکنے کے لئے تیار ہو جائے گا وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔

اس پر تو چاروں وزیروں کا اتفاق ہے کہ ابھی کافی عرصے تک جرمنی پر نگرانی رکھنی ہوگی۔ مگر اس کی نوعیت کیا ہو۔ اس پر ابھی تک کسی سمجھوتہ کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ مغربی طاقتیں چاہتی ہیں کہ انھوں نے مغربی جرمنی کے لئے جو دستور تیار کیا ہے اُسے روسی جرمنی پر نافذ کیا جائے اور پورے جرمنی پر چار بڑی طاقتوں کی مشترکہ نگرانی ہو۔ اور تمام مسائل کے فیصلے کثرت رائے سے طے پائیں۔ اس تجویز کو تسلیم کر لینے کے معنی ہیں کہ روسی جرمنی کو مغربی طاقتوں کے حوالے کر دے اور ظاہر ہے وہ کسی حالت میں بھی اس پر تیار نہیں ہوگا۔ غرض کوئی پندرہ دن سے دنیا کی چار بڑے ملکوں کے نمائندے روزانہ اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک اس کے حل کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

سائرے نیکا کی آزادی

سنوسی قوم کے سردار شیخ امیر ادریس سنوسی نے، لبیا کے چھوٹے سے علاقے سائرے نیکا کی آزادی کا اعلان کر دیا ہے اور برطانیہ نے بعض شرائط کے ساتھ اس آزادی کو تسلیم کر لیا ہے۔

اس علاقے پر سال ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں کے عوام اس وقت سے آزادی کی برابر کوشش کرتے رہے مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ پچھلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے یہاں کے عربوں سے معاہدہ کیا تھا کہ لڑائی کے بعد ان کا ملک اٹلی کو دوبارہ واپس نہیں دیا جائے گا۔ ابھی حال میں جب اٹلی کی نوآبادیات کا مسئلہ پیش ہوا تو یو، این، او کی سیاسی کمیٹی نے دس سال کے لئے اُسے اٹلی کی تولیت میں دینے کا فیصلہ کر دیا۔ اس پر وہاں کے عوام نے بہت سخت احتجاج کیا اور نہایت کامیاب ہڑتال کی اس کا اثر یہ ہوا کہ یو، این، او کے عام اجلاس میں جب یہ مسئلہ آخری منظوری کے لئے پیش ہوا تو اکثریت نے اُسے منظور نہیں کیا۔

اگرچہ شیخ سنوسی نے آزادی کا اعلان کیا ہے اور ان کی سنوسی قوم اس آزادی پر بہت خوش اور بالکل مطمئن ہے۔ مگر ان کی آزادی کا تخیل شرق اردن سے زیادہ نہیں۔ خود برطانیہ نے اعلان کے ذریعے یہ بات صاف کر دی ہے کہ صرف جزوی اور اندرونی آزادی کا وعدہ کیا گیا ہے" اس لئے یہ حکومت در اصل ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں لیکن سنوسیوں نے اپنی آزادی کے لئے جو قربانیاں کی ہیں اور سابق سنوسی رہنما کو انگریزوں سے جس قدر نفرت اور عداوت تھی۔ اس کے پیش نظر اُمید ہے کہ سنوسی اپنی آزادی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گے سائرے نیکا کے اس اعلان آزادی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ شمالی افریقہ کے عربوں کے حوصلے بہت بڑھ

جائیں گے اور اگر ان کو معقول رہنما مل گئے تو وہ بھی بہت کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہانگ کانگ کی فکر

چین میں کمیونسٹوں کی غیر معمولی کامیابی سے، برطانیہ کو ہانگ کانگ میں بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے اور بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ نے وہاں بہت کافی کمک بھیج دی ہے اور وزیر دفاع مسٹر الگزنڈر حالات کا جائزہ لینے اور دفاع کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے خود ہانگ کانگ گئے ہوئے ہیں۔ "ٹائمز" کے نامہ نگار کا بیان ہے کہ اس اقدام کا عوام پر بڑا اچھا اثر پڑا ہے اور دو تین مہینے سے جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی وہ بڑی حد تک دور ہو گئی ہے۔

ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ہانگ کانگ کے متعلق چینی کمیونسٹوں کا کیا رویہ ہوگا۔ مگر عام خیال یہ ہے کہ وہ باقاعدہ حملہ نہیں کریں گے اس سے ان کی بین الاقوامی سیاست میں پیچیدگیاں اور ملک کے اندرونی نظام اور قیام امن میں دقتیں پیدا ہوں گی اس لئے وہ یا تو سرحدی علاقوں میں قزاقانہ حملے کر سکتے ہیں یا ملک کے اندر انتشار اور فسادات کرا سکتے ہیں پہلی صورت کے آثار ابھی سے پیدا ہو گئے ہیں مگر برطانیہ کو اپنی پولیس اور فوج پر اتنا بھروسہ ہے کہ اسے اس کی زیادہ فکر نہیں اسے اصل فکر اندرونی انتشار اور فسادات کی ہے۔

ہانگ کانگ میں اس وقت ٹریڈ یونین کے دو فیڈریشن ہیں۔ ایک کا تعلق کیومن تانگ سے ہے اور دوسرا کمیونسٹوں سے، جس کا وہاں کے مزدوروں پر بہت اثر ہے۔ اس نے ابھی سے گرانی الاؤنس کے اضافہ کا مطالبہ شروع کر دیا ہے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں بڑے زوروں پر کی جا رہی ہیں مگر اسٹرائک، بائیکاٹ اور فسادات وغیرہ پر قابو حاصل کرنا کافی مشکل ہوتا ہے اس لئے برطانیہ کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی ہے اور اس وقت وہ خوب چوکنا ہے تا کہ وہاں کا اندرونی انتظام اتنا مضبوط کر دیا جائے کہ کسی جماعت کو گڑبڑ کرنے کی جرأت ہی نہ ہو

غزل

دل میں ہیں آرزوئیں آنکھوں میں التجائیں
شرحِ و بیاں کی ہمت لیکن کہاں سے لائیں
اس برقِ حسن کا ہم احسان کیا اٹھائیں
رگ رگ پہ سوزِ دل سے خود بجلیاں گرائیں
بیٹھا ہوں مست و بے خود خاموش ہیں فضائیں
سنتا ہوں گوشِ دل سے لیکن عجب صدائیں

یہ بال و پر ازل سے ہیں نذرِ برق و باراں
ہم شاخِ گل پہ اپنا کیا آشیاں بنائیں
راہِ طلب میں اُن کی چلنا نہیں ہے آساں
دیوانگی کی پیدا جب تک نہ ہوں ادائیں
پھر کس سے یہ رگِ جاں کسبِ حیات کرتی
ہوتیں نہ لطف فرماں اُن کی اگر جفائیں
آمادۂ کرم ہے ان کی نگاہ لیکن
ہر نقشِ آرزو کو پہلے تو ہم مٹائیں
اُن کی نوازشوں کا عالم یہی رہا ہے
ہر لحظہ گرچہ ہم سے ہوتی رہیں خطائیں
قاتل ہیں، فتنہ گر ہیں برقِ بلا ہیں لیکن
اک پیکرِ کرم ہیں جس رنگ میں وہ آئیں
رگ رگ میں زندگی کی جس نے شراب بھر دی
اس ذوقِ تشنگی کو کیوں دیں نہ ہم دعائیں

مرزا احسان احمد

خاموش بفصلِ گل میں نغمہ سرا خزاں میں
ہم اہلِ درد کی بھی ہیں کچھ عجب ادائیں
یوں ہی رہے گا تیرہ عالم یہ قلب و جاں کا
اس شعلۂ خرد کو جب تک نہ ہم بجھائیں
ویراں جو میکدہ ہے ویراں رہے گی دُنیا
گو لاکھ اس چمن کو اہلِ ہنر سجائیں
جو سود بے زیاں کے طالب تھے عاشقی میں
وہ خاکِ نامرادی بیٹھے ہوئے اُڑائیں
میری جبین دل کے سجدے ہماں متیسر
یہ زاہدانِ خود بیں گو لاکھ سر جھکائیں
میرے مذاقِ غم کا کچھ اور ہی ہے عالم
نالے بھی ہیں ترانے، آہیں بھی ہیں نوائیں
یادِ حسینؑ میں ہم آنسو بہائیں لیکن
خونِ حسینؑ کی بھی سرمستیاں دکھائیں
آلامِ زندگی کا بس ہے علاج اتنا
اُن کی نظر کو سمجھیں اور اس سے لو لگائیں
آشوب گاہِ غم سے اُٹھیں نہ بجلیاں جب
یہ داغ ہائے دل پھر کس طرح جگمگائیں
یہ عقل مصلحت بیں احسان وہ بلا ہے
دیکھی ہیں جس کے دم سے سوز تگ کی بلائیں

قلبِ مطمئن

باقر رضوی

(والٹر ڈی لا میئر WALTER DE LA MARE کی ایک نظم کا چربہ۔)

زمانہ ابنِ مریم بن کے ہے چارہ گری کرتا
مگر کچھ زخم اس چارہ گری کی حد سے باہر ہیں
دوا کوئی نہیں ہے دہر میں ٹوٹے ہوئے دل کی
جہاں میں زخمِ اطمینان ہرگز بھر نہیں سکتا

بمثالِ سنگِ خارا قلبِ قانع سرد رہتا ہے
تخیل عقل کے گوشوں میں ہر اک جال سا بنتا
فرازِ رخ کبھی ممنونِ اثرِ حسن نہیں ہوتا
کبھی عہدِ تمنا خار بن کر دکھ نہیں دیتا

تبسم نے سکھایا ہے سبق عادات کو برسوں
اُٹھا ہے نالہ و شیون مراسم کا عصا لے کر
سرودِ دل ہے لطفِ دغم کے زیر و بم سے بیگانہ
ہے مردہ دل کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا

غزلیں

فرید

(۱)

غمِ زندگی اور کچھ بھی زیادہ
نظر تنگ ہے ہر عمل بے ارادہ
بہت دور ہی منزلِ شوق لیکن
یہ کیوں رہروِ عشق ہے پا پیادہ
زمانے کے غم کو سمجھنا بھی ہوگا
مری زندگی سے کرو استفادہ
ابھی میکدے میں کوئی خاک بہکے
وہی ظرفِ ساقی وہی کیفِ بادہ
بظاہر فرید ان کو دنیا نے سمجھا
تصنع کا دشمن طبیعت کا سادہ

(۲)

نزع میں یاد تری آئی ہے
کیا یہ فرمانِ شکیبائی ہے
جور کی تم سے شکایت توبہ
بات میں بات نکل آئی ہے
آپ کی انجمن آرائی کا
دوسرا رخ شبِ تنہائی کا
میں تو تشہیر کو شہرت سمجھوں
سوچتا ہوں تری رسوائی ہی
آج زندان میں پھر اک دھوم مچی
کیا گلستاں میں بہار آئی ہے۔

هریجن کا ست

گروہ بندی کی سیاست

کشوری لال مشروالا

مشرقی پنجاب، عظیم تر راجستھان، مدھیہ بھارت، مدھیہ پردیش، حیدرآباد اور مدراس کے حالات سے ایک ہی پارٹی کے اندر کئی گروہوں کی موجودگی سے پیدا ہونے والی ناگزیر خرابیاں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ دوسرے صوبے بھی جہاں پارٹی کی حکومت ہے اس اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ بعض صوبوں میں باقاعدہ ذمہ دار حکومت ٹوٹ چکی ہے اور بعض میں اس کی نوبت آنے ہی والی ہے۔ پاکستان کے کچھ صوبوں میں بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔

کوئی گروہ اکیلا اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس کی اکثریت ہو سکے۔ اس لئے کابینہ بنانے کے لئے طوعاً و کرہاً اسے دوسرے گروہوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے خبر ہے کہ بعض حالات میں ایسا کرنے کی ہدایت خود مرکزی حکومت نے بھی دی تھی۔ لیڈر کا انتخاب اس کی اعلیٰ صلاحیت، علمیت، کردار کی بلندی، دیانت داری اور وسیع النظری کی بنا پر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس میں اگر اعلیٰ صلاحیت موجود ہوتی بھی ہے تو وہ کامیاب سازش کرنے اور حریف گروہ کی طاقت کو توڑنے میں صرف ہوتی ہے اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے وہ نڈر اور بے باک ہو کر تمام ممکن ذرائع استعمال کرتا ہے۔ دیانت داری کے بجائے طرف داری کرنے میں مستعدی اور بے ایمانی اور بددیانتی کو نظر انداز کرنے کو اس کی اہلیت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی نظر خود اپنے گروہ اور سرپرستوں تک محدود ہوتی ہے۔

لیکن ہر شخص کی مثال دلدل کی سی ہے کسی اچھائی کا سہارا لئے بغیر اس سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ سازباز کرنے والے بھی یہ نہیں محسوس کر لیتے ہیں کہ وہ اگر کسی ایسے آدمی کو آگے نہیں لاتے جو اپنی اعلیٰ قابلیت اور علمیت کے لئے نہ سہی لیکن اپنی اچھائی، دیانت داری، جاں فشانی اور حب الوطنی کے لئے مشہور ہو تو وہ زیادہ دن نہیں چل سکتے۔ اچھائی ... ساتھ ... کی نہیں ہے جن میں کچھ اچھی ... موجود ہوں اور کچھ خرابیاں بھی۔ انھیں میں سے کسی ایک کو لیڈر بننے پر آمادہ کر لیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ لیڈری نہیں کرتا بلکہ اسے زمانہ سازوں کی رنیشہ دوانیوں کا آلۂ کار بنا پڑتا ہے وہ اپنے عہدے پر خوش بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اسے ٹھکرا بھی نہیں سکتا۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے برطانوی حکومت کمینوں اور خود غرضوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ہمارے اچھے آدمیوں کی خامیوں کی وجہ سے قائم ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک وائسرائے نے ایک بار کہا تھا کہ ہندوستان کے اچھے آدمیوں میں جب ایسی باتوں پر جنھیں وہ پسند نہیں کرتے "نہیں" کہنے کی طاقت پیدا ہو جائے گی، ہندوستان کو سوراج مل جائے گا۔ گاندھی جی اچھے آدمیوں کی اس خامی سے واقف تھے اسی لئے وہ شرکت کے ساتھ عدم تعاون کے عمل پر زور دیتے تھے۔ میری ناچیز رائے میں ہمسایوں کے مخلص اور راست باز ممبروں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ محض کسی نام نہاد ذمہ دار حکومت کو چلانے کے لئے اپنے گروہ یا گروہ کے لیڈر کے ساتھ تعاون کریں جن کی دیانت داری اور قابلیت پر انھیں پورا پورا اعتماد نہ ہو۔

اس صورت حال کا علاج کیا ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے اپنے مضمون "جمہوریت اور آئینی حکومت" میں اس کا ایک علاج پیش کیا تھا۔ میں لیڈروں اور دستور بنانے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

اس وقت عوام کی حالت بہت افسوسناک ہے۔ انھوں نے ان نمائندوں کا انتخاب اسمبلی کے ایوان میں تیغ زنی کا تماشہ دیکھنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ عوام سے گاندھی جی اور کانگریس کے نام پر ووٹ مانگے گئے تھے۔ یہ عوام کا قصور نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے نمائندوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن عوام کا اب کوئی پرسان حال نہیں ہے وہ معاشی دباؤ اور دفتر شاہی کی بدانتظامی کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ وہ کانگریس کا احترام اور اعتماد اپنے دل سے نکال دیں تو وہ حق بجانب ہوں گے۔ کانگریس کی تعریف ان خوبیوں کے لئے نہیں کی جا سکتی جن کا مظاہرہ کرنے سے وہ صرف اس لئے انکار کر رہی ہے کہ سوشلسٹ کمیونسٹ یا کوئی دوسری جماعت والے برسر اقتدار آ جائیں گے۔ کانگریس اگر ہار گئی تو وہ اس کی مستحق ہو گی، کانگریس کا جماعتی کام اس وقت جس طرح چل رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی اچھے اور دیانت دار آدمی کے لئے اس میں حصہ لینا ناممکن ہے یا تو برداشتہ خاطر ہو کر وہ خود اس سے الگ ہو جائیں گے یا بے حیائی کے ساتھ انھیں کانگریس سے خارج کر دیا جائے گا۔

ہم جس طرح کی غیر ... جمہوریت کا ارتقا چاہتے ہیں ... کے لئے ... نئی چیز ہے ... سکتے ہیں جو ... ہو لیکن ان کی بھلائی بھی چاہتی ہو۔ ہندوستان میں مطلق العنان ملوکیت عرصے سے رہی ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے حکمراں ... رہے ہیں جن کی شخصی حکومت کے باوجود عوام کو فائدہ پہنچا ہے۔

ان کی حکومت میں سخت گیری اور نیک دلی کا امتزاج دیکھ کر عوام سیکڑوں کمزور اور خراب حکمرانوں کی مطلق العنانی ان کے استبداد اور ان کی بدانتظامی کو بھول گئے۔ عوام کو اگر کل اختیاری حکومت کے شکنجے میں دوبارہ پھنسنے سے بچانا ہے تو کانگریس کو اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنی چاہئیں اور اپنے آپ کو ناپسندیدہ عناصر اور خامیوں سے صاف کرنا چاہئے۔ سازباز اور ریشہ دوانیاں کرنے والوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی جگہ کہیں اور تلاش کر لیں اور کانگریس میں رہنا ان کے لئے ناممکن بنا دیا جائے۔

گاندھی جی نے اس کے لئے ایک کسوٹی بنائی تھی لیکن اسے غیر منطقی اور خلاف عقل کہا گیا تھا۔ اسے غیر منطقی اس لئے نہیں کہا گیا تھا کہ اس پر عمل کرنا ناممکن تھا بلکہ اس لئے کہ کانگریس کے ہر ممبر کے ضمیر اور اس کے عقیدے کی آزمائش ہوتی تھی۔ اس سے بہت دنوں تک بچنا کام نکالنا ممکن نہیں تھا، اور نہ جوڑ توڑ سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ گاندھی جی کو چرخہ چلانے، چھوت چھات کو ترک کرنے اور ایسی ہی چیزوں پر اصرار تھا۔ لوگوں کو یاد ہو گا کہ پچھلی جنگ عظیم کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ کے زمانے میں گاندھی جی نے شرط رکھی تھی کہ وہی لوگ ستیہ گرہ کر سکتے ہیں جو چرخہ بھی چلاتے ہوں بہت سے آدمیوں نے انھیں دھوکا دینے کی کوشش کی اور یہ سمجھ لیا کہ وہ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں ریاکاری کا علم ہو گیا تھا لیکن انھوں نے کچھ نرمی سے کام لیا ایک بار انھوں نے کہا تھا کہ کچھ ہو میں انھیں گرفتاری کے لئے خود اپنے خرچ پر سابرمتی دہلی بھیج رہا ہوں۔ وہ جلد ہی محسوس کر لیں گے کہ ریاکاری سے کام نہیں چل سکتا۔

کانگریس نے "سرگرم رکنیت" کا سوانگ بھر کر عرصے سے گاندھی جی کی شرطوں سے بچنے کی کوشش کی ہے اس سے جماعت کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس فریب کاری کو اب ختم کر دینا چاہئے۔ سرگرم رکنیت کے لئے صرف چار شرطیں ہوں اور انھیں پورا کرنا ہر شخص کے لئے لازمی ہو، اجتماعی کتائی میں حصہ لینا ایک مہینے میں کم از کم دو لچھی سوت تیار کرنا، مہتر کا کام کرنا، اور ہر یجنوں کے ساتھ خورد و نوش۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان شرائط سے کانگریس تمام خرابیوں سے پاک ہو جائے گی۔ بلکہ یہ شرطیں اتنی سیدھی سادھی ہیں جو لوگ اپنے کو بہت عالم فاضل اور مدبر سمجھتے ہیں ان سے گریز کریں گے۔ بہت سے لوگ دوسری سیاسی جماعتوں میں چلے جائیں گے اور عارضی طور پر اگر ان کی اکثریت ہو جائے تب بھی پاک صاف کانگریس میں اتنی طاقت ہو گی کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے۔

دوسری زبانوں کے الفاظ

اپنائے جائیں

نرلیا بھاوے

راشٹر بھاشا پرچارک سبھا ایلورا (بجواڑہ) میں ونوبا بھاوے کی تقریر ۔

جنوبی ہند کے باشندوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

شادی کا پیغام

آ۔ پے چیخوف

(چوبوکوف اور لوموف - لوموف بہت بھڑکیلے کپڑے پہنے ہے۔)

چوبوکوف۔ (اٹھ کے بڑھ کے ملتا ہے) ارے پیارے تم کہاں سے؟ تمھارے دیدار سے آنکھوں کو نور قلب کو سرور حاصل ہوا۔ (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) مگر تم بھی خوب آسمان سے ٹپک پڑے، کہو کیا حال ہے؟

لوموف۔ شکریہ۔ اور جناب کا مزاج شریف؟

چوبوکوف۔ ہم بھی زندہ ہیں تمھاری دعا ہے آؤ بیٹھو ...... ہاں دیکھو ہمسایوں وغیرہ کو بھول جانا اچھی بات نہیں ہے ...... لیکن آخر اس قدر بن ٹھن کے کیوں آئے ہو۔ کیا کہیں شادی بیاہ میں جانے کا ارادہ ہے؟

لوموف۔ جی نہیں میں تو صرف آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

چوبوکوف۔ لیکن یہ بھڑک دار اچکن کیسی؟ تم کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ آج عید ہے۔

لوموف۔ دیکھئے تو اصل بات یہ ہے (اس کا ہاتھ پکڑ کر) میں آپ کی خدمت میں ایک بڑی گذارش لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کچھ دن ہوئے مجھے آپ سے مدد مانگنے کا فخر حاصل ہوا تھا...... اور آپ سے ہمیشہ کہنا چاہئے...... لیکن میں گھبرایا جاتا ہوں...... مجھے ذرا پانی عنایت فرما دیجئے۔ (پانی پیتا ہے)

چوبوکوف۔ (الگ) روپیہ مانگنے آیا ہے۔ ...... نہیں دوں گا (لوموف سے مخاطب ہوکر) لیکن بتاؤ تو کیا بات ہے؟

لوموف۔ دیکھئے نہ ...... میرے بھی ہوش حواس اڑے جاتے ہیں۔ ...... کیا حالت بن گئی ہے ...... لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف آپ میری مدد کر سکتے ہیں...... اگرچہ کہنا چاہئے کہ میں نے اپنے آپ کو کسی طرح سے اس کے قابل ثابت نہیں کیا ہے...... اور ...... اور مجھے کسی طرح سے اس کا حق نہیں۔

چوبوکوف۔ ہاں ہاں مگر بھائی بات کو اس قدر طول کیوں دیتے ہو؟ بس ایک بار کہہ دو۔ ہاں!

لوموف۔ جی ہاں۔ فوراً ایک منٹ میں ... بات یہ ہے کہ میں آپ کی صاحبزادی کو پیغام دینے حاضر ہوا ہوں۔

چوبوکوف۔ ہاں بھائی پھر سے کہو مجھے یقین نہیں آتا!

لوموف۔ میں نے اس کی جرأت کی ہے کہ......

چوبوکوف۔ (بات کاٹ کر) بھئی واہ۔ تم نے بھی میرے دل کو بہت خوش کیا .. .. (اس سے گلے ملتا ہے) میں تو بہت دنوں سے یہی چاہتا تھا ... میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی ...... (چند آنسو اس کے گالوں پر نظر آتے ہیں) اور مجھے تم سے اپنے لڑکے کے برابر محبت رہی ہے ...... خدا تم کو خوش رکھے۔ یہی میری دعا ہے ...... ارے میں یہ کیا کھڑا بک بک کر رہا ہوں۔ میرے ہوش اڑ گئے ...... میں بھی کیا خبطی ہوں ...... میں ابھی اندر جا کر ان کو بھیجتا ہوں۔

لوموف (بہت متأثر ہوکر) کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ اس فقیر کو کرم کی نگاہ سے دیکھیں گی، کیا مجھے کسی قسم کی امید ہو سکتی ہے؟

چوبوکوف۔ واہ۔ ایسے حسین اور پھر پوچھتے ہو کہ وہ راضی ہوں گی یا نہیں۔ وہ تو خود تم پر عاشق ہو جائے گی۔ میں ابھی انھیں بھیجتا ہوں۔

(باہر جاتا ہے)

(۲)

نتالیہ۔ ارے یہ آپ ہیں اور ابا جان انھوں نے اندر جا کر کہا کہ جاؤ سوداگر مال خریدنے آیا ہے۔ سلام عرض ہے۔

لوموف۔ تسلیم

نتالیہ۔ معاف کیجئے گا میرے کپڑے ایسے نہیں کہ ایک عزیز مہمان کے سامنے جاؤں، اس وقت دال آئی ہے اسے صاف کر رہی ہوں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ اتنے دنوں تک تشریف کیوں نہیں لائے۔ کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھئے (بیٹھ جاتے ہیں) کہئے کچھ پیش کروں۔ آپ ناشتہ کر چکے؟

لوموف۔ تسلیم۔ میں ابھی کھانا کھا کر آرہا ہوں۔

نتالیہ۔ سگرٹ پیجئے گا۔ یہ لیجئے دیا سلائی ہے۔ آج تو موسم اچھا ہے۔ لیکن کل ایسا پانی برسا کہ سننے میں آیا کسان کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن یہ کیا ہے۔ آپ تو بہت بڑھیا اچکن پہنے ہیں۔ کیا کہیں تماشا دیکھنے جا رہے ہیں؟ آپ کی صحت مگر آج کل کچھ اچھی ہو گئی ہے۔ مگر پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ اس قدر بن ٹھن کے کیوں نکلے ہیں؟

لوموف۔ (گھبرا کر) دیکھئے نہ، بیگم صاحب بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے، اور میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری بات بغور سنیں...... جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو تعجب ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ خفا ہو جائیں گی...... مگر میں (الگ) اُف کتنی سردی ہے!

نتالیہ۔ آخر کیا بات ہے (خاموشی) جی؟

لوموف۔ میں کوشش کروں گا کہ چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر دوں۔ میری بچپن سے آپ کے خاندان سے واقفیت ہے۔ میرے چچا اور چچی سے آپ کے والد اور والدہ کی بڑی دوستی تھی، اور اس کے علاوہ جیسا کہ آپ خود جانتی ہیں میرا چڑیا باغ آپ کے ڈھاک کے جنگل سے بالکل ملا ہوا ہے

نتالیہ۔ معاف کیجئے کا قطع کلام کرتی ہوں آپ نے کہا "چڑیا باغ میرا ہے" کیا یہ باغ آپ کا ہے؟

لوموف۔ جی ہاں، میرا ہے۔

نتالیہ۔ یہ دیکھئے چڑیا باغ تو ہمارا ہے آپ کا کہاں سے ہو گیا۔

لوموف۔ جی نہیں بیگم صاحب وہ میرا ہے۔

نتالیہ۔ ذرا سوچئے تو وہ آپ کا کب سے ہو گیا۔

لوموف۔ کب سے کیا؟ مجھے جہاں تک یاد ہے وہ تو ہمیشہ سے میرا تھا۔

نتالیہ۔ معاف کیجئے۔

لوموف۔ یہ تو کاغذات سے صاف ظاہر ہوتا ہے میری چچی کی دادی نے آپ کی پھپھی کے دادا کے کسانوں کو یہ باغ دیا تھا اس لئے کہ انھوں نے میری چچی کی دادی کے لئے اینٹیں جلائی تھیں۔ ان کسانوں نے ۴۰ برس تک اس باغ پر قبضہ رکھا لیکن جب......

نتالیہ۔ واقعات بالکل اور ہیں، آپ نے جو فرمایا یہ بالکل صحیح نہیں ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے اس باغ کو اپنا سمجھتے آئے ہیں اس میں اور بحث کرنے کی کیا بات ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔

لوموف۔ میں آپ کو کاغذات دکھا دوں گا۔

نتالیہ۔ واہ۔ واہ ہم تیس برس سے ایک باغ کو اپنا سمجھ رہے ہیں۔ اب ایک بارگی ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ باغ ہمارا نہیں۔ مجھے یہ باغ بالکل عزیز نہیں۔ لیکن مجھے اس ناانصافی پر غصہ آتا ہے۔

لوموف۔ خدا کے لئے میری بات تو سنئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، میری چچی کی دادی کے لئے آپ کی پھپھی کے دادا کے کسانوں نے اینٹیں جلائی تھیں۔ اس کے بدلے میں چچی کے دادا نے......

نتالیہ۔ چچی، پھپھی، دادا، دادی یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ باغ میرا ہے اور بس۔

لوموف۔ میرا ہے۔

نتالیہ۔ ہمارا ہے۔ چاہے دو دن تک ثبوت دیتے رہیں۔ چاہے آپ ۱۵ اچکنیں پہن کر آئیں۔ باغ ہمارا ہے، ہمارا ہے۔ میں نہ آپ کی چیز لینا چاہتی ہوں، نہ اپنی مفت میں دینا چاہتی ہوں۔ اور یوں جیسا آپ چاہیں۔

لوموف۔ مجھے باغ کی ضرورت نہیں میں تو صرف اصولاً بحث کر رہا تھا اگر آپ چاہیں تو اسے میں آپ کے نذر کر سکتا ہوں۔

نتالیہ۔ میں خود اسے دے سکتی ہوں۔ وہ تو میرا ہے۔ مگر آپ بھی خوب ہیں مجھے میری چیز دے رہے ہیں۔ یہ تو اخلاق کے خلاف

ہے۔ بلکہ بدتمیزی ہے۔

لوموف۔ یعنی آپ مجھے بے ایمان سمجھتی ہیں جو آپ کی چیز دبا بیٹھا ہے بیگم صاحب! میں نے آج تک کبھی بے ایمانی نہیں کی ہے اور کسی کی کیا جرأت ہے کہ وہ مجھ پر اس کا الزام لگائے (پانی) چڑیا باغ میرا ہے!

نتالیہ۔ جھوٹ ہے، باغ میرا ہے۔

لوموف۔ میرا ہے۔

نتالیہ۔ جھوٹ ہے۔ میں آج ہی اسے ثابت کردوں گی۔ ابھی آدمیوں کو بھیج کر اسے کٹوا ڈالوں گی۔

لوموف۔ اور میں ان سب کی گردن کٹوا ڈالوں گا۔

نتالیہ۔ آپ کی کیا حقیقت ہے؟

لوموف۔ (دل پر ہاتھ) چڑیا باغ سمجھیں آپ! میرا ہے!

نتالیہ۔ آپ اپنے گھر پر چاہے جتنا چلاتے ہوں۔ یہاں مہربانی فرما کر آدمیوں کی طرح سے بات کیجئے۔

لوموف۔ اگر مجھے اس قدر اختلاج نہ ہوتا تو میں آپ کو دکھا دیتا (چلا کر) چڑیا باغ میرا ہے۔

نتالیہ۔ میرا ہے!

لوموف۔ میرا ہے!

نتالیہ۔ میرا ہے!

(۳)

چوبوکوف۔ یہ آخر کیا ہے؟ آپ کیوں چلا رہے ہیں۔

نتالیہ۔ بھئی ان صاحب کو بتا دو کہ چڑیا باغ کس کا ہے۔ ہمارا ہے یا اُن کا۔

چوبوکوف۔ ہمارا ہے بھائی وہ تو۔

لوموف۔ جی نہیں آپ تو صرف مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں، اور میرا مذاق اُڑاتے ہیں، اچھے ہمسائے اس طرح سے پیش نہیں آتے۔ آپ ہمسایہ نہیں ڈاکو ہیں۔

چوبوکوف۔ جی آپ نے کیا فرمایا؟

نتالیہ۔ چڑیا باغ ہمارا ہے۔ میں کبھی اسے دینے پر راضی نہ ہوں گی۔

لوموف۔ یہ تو ہم کچہری میں دیکھ لیں گے۔

چوبوکوف۔ اچھا مجھے اب معلوم ہوا۔ آپ مقدمہ بلندی کے لئے ایک بہانہ نکالنا چاہتے تھے۔ کیا فسادی طبیعت ہے۔ مگر تمہارا تو سارا خاندان ہی فسادیوں اور لفنگوں سے بھرا ہے۔

لوموف۔ جناب میرے خاندان کو برا نہ کہئے۔ ہمارا خاندان بہت شریف ہے............ کم از کم ہمارے یہاں کوئی ایسا تو نہیں نکلا جو آپ کے دادا کی طرح علاقہ کورٹ کرا کے جیل خانے میں بیٹھا ہو۔

چوبوکوف۔ مگر تمہارے یہاں تو سب پاگل تھے۔

نتالیہ۔ سب، سب، سب۔

چوبوکوف۔ تمہارا دادا شرابی تھا اور تمہاری چچی ایک بڑھئی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

لوموف۔ آپ کی ماں کبڑی تھیں۔ (دل پر ہاتھ ہائے...... پانی! تمہارا باپ پیشہ ور تھا، جواری تھا۔

نتالیہ۔ اور تمہاری چچی جیسی فسادن کبھی ہوئی ہی نہیں۔

لوموف۔ بایاں پیر سو گیا.......... آپ لوگ فسادی ہیں.......... لفنگے ہیں.......... ہائے (دل پر ہاتھ) اور انتخابات کے زمانے میں...... میری ٹوپی کہاں ہے۔

نتالیہ۔ کمینہ، بے ایمان، ذلیل!

لوموف۔ (دل، ٹانگ، ٹوپی)

چوبوکوف۔ نکل جا میرے گھر سے اور پھر کبھی آیا تو خیر نہیں!

(لوموف باہر بھاگ جاتا ہے)

(۴)

چوبوکوف۔ اور دیکھو تو اس بدمعاش کی جرأت۔ تمہارے یہاں شادی کا پیغام لے کر آیا تھا۔

نتالیہ۔ کیسا پیغام؟

چوبوکوف۔ تمہارا دولہا بننا چاہتا ہے۔

نتالیہ۔ اچھا! تم نے یہ پہلے سے کیوں نہیں کہا؟

چوبوکوف۔ سیخ کا کباب کہیں کا۔ اطلس کی اچکن پہن کر آیا تھا۔

نتالیہ۔ (حسرت سے) پیغام لایا تھا! بلاؤ! واپس بلاؤ!

چوبوکوف۔ کسے

نتالیہ۔ بلاؤ! واپس بلاؤ۔

چوبوکوف۔ (ہچکچا کر) [illegible] عورتوں سے بچائے۔

(۵)

لوموف۔ میرا دل بہت دھڑک رہا ہے ٹانگ۔ [illegible] سن ہو گئی۔ جیسے میں جیسے کوئی چھری بھونک رہا ہے۔

نتالیہ۔ معاف کیجئے گا۔ ہماری گفتگو ذرا گرم ہو گئی تھی...... اب مجھے خیال آتا ہے...... چڑیا باغ واقعی آپ کا ہے......

لوموف۔ سینے میں درد ہو رہا ہے، کنپٹی پھٹی جاتی ہے.....

نتالیہ۔ باغ، باغ آپ ہی کا ہے.... تشریف رکھئے ہم غلطی پر تھے......

لوموف۔ میں تو صرف اصولاً...... مجھے باغ عزیز نہیں، صرف اصولاً

نتالیہ۔ جی ہاں بالکل بجا ہے.... آئیے اب کسی اور چیز پر گفتگو کریں......

لوموف۔ میرے پاس ثبوت کا غذات موجود ہیں۔ میری چچی کی دادی نے آپ کی پھپھی کے دادا کے کسانوں کو......

نتالیہ۔ جی ہاں، جی ہاں...... اب آپ شکار کھیلنے کب جائیں گے؟

لوموف۔ شکار کھیلنے کیا جاؤں.... میرا کتا سٹو تو مر گیا!

نتالیہ۔ کیا افسوس کی بات ہے.... ..... کیسے؟

لوموف۔ معلوم نہیں (ٹھنڈی سانس) کیا لاجواب کتا تھا۔ قیمت کو الگ چھوڑئے...... میں نے ۱۲۵ روپے کو خریدا تھا.......... مگر کتا ....

نتالیہ۔ آپ نے قیمت تو بہت دی تھی...... دیکھئے ہم نے اپنے کتے کرن کو ۸۵ روپے میں خریدا اور وہ آپ کے سٹو سے کہیں اچھا ہے۔

لوموف۔ کرن سٹو سے اچھا! آپ بھی کیا باتیں کرتی ہیں (ہنسی) کرن سٹو سے اچھا ہے!

نتالیہ۔ ارے! اس میں کیا شک اس کا جواب تو نواب صاحب کے پاس بھی نہیں۔

لوموف۔ معاف کیجئے گا۔ وہ کانا ہے، اور کلے کتے کی کوئی قیمت نہیں

نتالیہ۔ ارے! کانا۔ آپ تو معلوم ہوتا ہے آج بحث پر تلے ہیں۔ پہلے تو چڑیا باغ اپنا بتایا...... اب کہتے ہو سٹو کرن سے اچھا ہے آخر آپ ہر بات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

لوموف۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھے یا تو اندھا سمجھتی ہیں یا بے وقوف مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ آپ کا کتا کرن کانا ہے۔

نتالیہ۔ غلط ہے!

لوموف۔ [illegible] ہے۔

نتالیہ۔ (چلا کر) آپ بحث کرتے ہیں!

لوموف۔ مگر خدا کے لئے چلائیے نہیں مجھے اختلاج ہوتا ہے (چلا کر) خدا کے لئے اب بحث ختم کیجئے اور چپ ہو جائیے۔

نتالیہ۔ جب تک آپ یہ نہ مانیں گے کہ ہمارا کرن آپ کے سٹو سے اچھا ہے۔

لوموف۔ برا ہے۔

نتالیہ۔ اچھا ہے۔

لوموف۔ ہزار گونہ بدتر ہے۔ خدا کرے یہ آپ کا کرن مر جائے ٹھنڈا ہو جائے!

نتالیہ۔ آپ کا سٹو ویسے ہی مرا ہے۔ اس کے مرنے سے کیا فرق ہوگا!

لوموف۔ (رو کر) خدا کے لئے اب چپ ہو جائیے مجھے اختلاج ہوتا ہے۔

نتالیہ۔ میں اور چلاؤں گی۔

(۶)

چوبوکوف۔ اب کیا ہوا؟

نتالیہ۔ اچھے آئے۔ ان کو سمجھا دو۔ ہمارا کرن زیادہ اچھا کتا ہے، یا ان کا سٹو۔

لوموف۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کا کرن کانا ہے کہ نہیں۔

چوبوکوف۔ کچھ بھی ہو اس کا جواب کہیں نہیں۔

لوموف۔ مگر میرا سٹو تو اس سے اچھا ہے؟ سچی بات کہئے۔

چوبوکوف۔ ہاں تمہارا سٹو بھی اچھا ہے۔ مگر ذرا بڈھا ہے اور ٹانگیں چھوٹی بڑی ہیں۔

لوموف۔ (اختلاج) واقعات دیکھئے واقعات۔ پارسال کے شکار میں میرا سٹو آپ کے کرن سے کہیں آگے نکل گیا تھا......

چوبوکوف۔ جی ہاں۔ اس سبب سے کہ کسی نے اس کے لاٹھی مار دی تھی۔ اچھی چیز دیکھ کے سب ہی کو حسد ہوتا ہے۔ آپ خود حسد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ نے اس وقت یہ بحث چھیڑی ہے۔

لوموف۔ اور آپ خود کیسے ہیں۔ جاتے تو ہیں شکار کے نام سے لیکن اصل مقصد نواب صاحب کے یہاں فساد پھیلانا ہوتا ہے..... ہائے دل..... آپ فسادی ہیں۔

چبوکوف ۔ کیا میں فسادی ہوں (چلاکر) منہ بند کر۔

لوموف ۔ فسادی!

چبوکوف ۔ بدذات، سور۔

لوموف ۔ بڈھا چوہا، بے ایمان۔

چبوکوف ۔ چپ رہ نہیں تو تجھے کتے کی طرح گولی ماردوں گا، بدمعاش

لوموف ۔ سب کو معلوم ہے۔ ہائے دل آپ کی پہلی بیوی آپ کے کان کھینچتی تھی۔ آپ کو ٹھوکتی تھی ...... ہائے، ہائے میں گرا جاتا ہوں ......

چبوکوف ۔ اور تجھے عشق کرنے کے لئے ایک چمارن کے سوا کوئی نہ ملی۔

لوموف ۔ ہائے ہائے ...... دل پھٹ گیا ...... کندھا الگ ہوگیا ...... میرا کندھا کہاں ہے؟ ...... ڈاکٹر ......

چبوکوف ۔ سور، چونگا، بدمعاش ......

لوموف ۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔

نتالیہ ۔ ارے لو وہ مرگیا ...... مرگیا۔

شور و غل، پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے

لوموف ۔ آگ، آندھی پانی ...... میں کہاں ہوں؟

چبوکوف ۔ تم جلدی سے شادی کرلو اور ...... اور جہنم میں جاؤ (ہاتھ ہلاکر) بیگم صاحبہ لڑکی دینے پر راضی ہیں ......

لوموف ۔ ہائیں ...... کیا ...... کس کا؟

چبوکوف ۔ ارے وہ راضی ہیں!

نتالیہ ۔ (سانس) ابھی زندہ ہیں۔ ...... ہاں، ہاں میں راضی ہوں۔

لوموف ۔ ہاں کس کو ...... (ہاتھ ہلاکر) مجھے بہت خوشی ہوئی ...... بتایئے تو بات کیا ہے ...... ہاں جی ہاں سمجھ گیا ...... دل ...... مجھے بہت خوشی ہوئی ہے (ہاتھ چوم کر) ٹانگ بالکل سن ہوگئی۔

نتالیہ ۔ میں ...... میں بھی خوش ہوں ...... مگر اب تو مان لیجئے کہ ہمارا کتا آپ کے سٹو سے اچھا ہے۔

لوموف ۔ جی نہیں میرا کتا زیادہ اچھا ہے ......

چبوکوف ۔ ہاں اب خاندانی خوشی شروع ہوئی ...... قاضی کو بلاؤ۔

لوموف ۔ میرا کتا زیادہ اچھا ہے ......

نتالیہ ۔ ہمارا زیادہ اچھا ہے ......

چبوکوف ۔ قاضی کو بلاؤ، قاضی کو!

(پردہ)

(روسی سے ترجمہ)

ہم کدھر جارہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

مکانوں میں خوب پلتے اور بڑھتے تھے ۱۹۴۶ء میں ایک سائنٹفک مشن نے وہاں جاکر باقاعدہ ۔ ڈی، ڈی، ٹی کا استعمال کیا ۔ اور پانچ شلنگ فی نفر کے خرچ سے ملیریا بالکل نابود ہوگیا۔ اس کام کے شروع ہونے کے اٹھارہ مہینے کے اندر اندر بچوں کی شرح اموات ۲۵۰ فی ہزار سے گر کر صرف ۶۷ فی ہزار رہ گئی ہے۔ ذرا اسی واقعہ کو غور اور عبرت کی نگاہ سے دیکھئے ......

راج کماری جی! ہندوستان یقیناً ایک غریب ملک ہے۔ لیکن کوئی ملک اتنا غریب نہیں ہوسکتا کہ وہ آنکھوں دیکھے اپنے شہریوں کو مرتا اور ان کی صحت کو تباہ ہوتا دیکھے اور چند سال کے اندر اندر اس کی روک تھام کے لئے تین روپے فی کس بھی صرف نہ کرسکے ہندوستان یقیناً ایک دولت مند ملک ہے لیکن اتنا دولت مند بھی نہیں کہ اپنے بچوں کے چہروں کی سُرخی، اپنے جوانوں کی تندرستی اپنے کاریگروں کی صلاحیت عمل کے ساتھ جا کھیل سکے ۔ اور ان کو اطمینان کے ساتھ ہار سکے ۔ ڈی، ڈی، ٹی کا ذکر میں نے مثال کے طور پر کیا ہے سائنس کے ہاتھ میں آج بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کی مدد سے ہم اس ملک کی صحت کو بہتر بنا سکتے ہیں ۔ آپ کے دل میں درد ہے اور خدمت کا شوق ہے ۔ آپ کیوں فنانس کی مکڑی کے جالوں اور "سرخ فیتے" کے بند ھنوں کو توڑ کر اس بازی پر اپنی ساری قوت نہیں لگا دیتیں؟ سائنس کے انسٹی ٹیوٹ، ہوائی جہازوں کے اڈے ۔ نئے ریڈیو اسٹیشن پھر بن جائیں گے ۔ پہلے اپنے بچوں اور بہنوں اور بھائیوں کی گرتی ہوئی صحت کو تو سنبھالئے!

دوسری زبانوں کے الفاظ اپنائے جائیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

ہندی یا ہندوستانی کے جھگڑے میں نہ پڑیں کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستانی کے نام لیوا کہتے ہیں کہ عربی اور فارسی کے جو الفاظ پچھلے چھ سات سو سال میں ہندی میں گھل مل گئے ہیں ۔ انھیں باقی رکھا جائے، کیونکہ اس میں ہمارا فائدہ ہے۔

ہمیں ہندو مسلم مسئلہ اور زبان کے سوال کو خلط ملط نہ کردینا چاہیے یہ دلیل پیش کرنا صحیح نہیں ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستانی کی کوئی ضرورت نہیں رہی ملک کے دو حصوں میں تقسیم کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے دلوں کے بھی دو حصے ہوجائیں ۔ برطانوی دور حکومت سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سی ریاستیں تھیں ۔ ایک زمانے میں جب ہندوستان کے اس حصے میں پانڈیا حکومت تھی، اندھرا اور کنارٹرا پر خود مختار کرشن دیو راج راج کرتا تھا ۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی بہت سی ریاستیں تھیں ۔ اس کے باوجود ہندوستان ہمیشہ ایک ہی رہا ۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ایران اور چین کی طرح پاکستان بھی اب ہمارے ملک کا حصہ نہیں رہا اور اس کا کلچر ہمارے کلچر سے مختلف ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود اپنے جسم کو دو ٹکڑوں میں کاٹ رہے ہیں۔

ہمیں صرف عربی اور فارسی کے الفاظ کو اپنی زبان میں جذب کرنا چاہیے بلکہ دراوڑی زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنانا چاہیئے ۔ انگریزی نے دوسری زبانوں کے الفاظ کے لئے اپنا دروازہ بند نہیں کیا ۔ اس نے بہت سی زبانوں کے الفاظ اپنائے ہیں اور انھیں انگریزی کا روپ دیا ہے ۔ وہی زبان ترقی کرسکتی ہے جو دوسری زبانوں کے الفاظ کو جذب کرنے اور اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ خود سنسکرت نے بہت سے بدیسی الفاظ کو جذب کرلیا ہے پتنجلی کا کہنا ہے کہ "سنسکرتیہ سنسکرتیہ پدان اپینت تسمات سنسکرتم" یعنی سنسکرت کو جس کے معنی مہذب یا شستہ کے ہیں ۔ صرف اس لئے سنسکرت کہا جاتا ہے کہ اس میں الفاظ کو شستہ بنانے کے بعد استعمال کیا جاتا ہے ۔ ہر لفظ کو استعمال کرنے سے پہلے اس پر مناسب نظر ڈالی جاتی ہے ۔ مناسب ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے اور اسے پاکیزہ اور شستہ بنایا جاتا ہے ۔ ہمیں یہ دستور ترک نہ کرنا چاہیئے۔

مثال کے طور پر مکت (موتی) کا لفظ لیجئے ۔ موتی جنوبی ہند کے سمندر سے نکا لے جاتے تھے ۔ یہ لفظ غالباً تامل سے لیا گیا ہے اور اسے سنسکرت کا روپ دے دیا گیا ہے ۔ اسی طرح "سوورنم" (سونا) کا لفظ تامل کے لفظ "چون" سے لیا گیا ہے جو پہلے "ہون" اور اس کے بعد "سون" بنا اور سنسکرت میں سوورنم بن گیا ۔ سونے کے دوسرے ہم معنی الفاظ بھی اسی طرح بنے ہیں ۔ مثال کے طور پر "ہاٹک" کے معنی ہاٹک کا سے آنے والے کے ہیں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ کبھی کو "ماکش" کہا جاتا ہے ۔ لیکن سونا کبھی سے تو نہیں نکلتا ۔ اس لفظ نے ماہرین لسانیات کو کافی پریشان کیا ۔ لیکن ہمیں جغرافیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سونا مکسیکو میں نکلتا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ "ماکش کا" کے معنی مکسیکو کے ہیں ۔ اسی طرح "پاروجم" کا لفظ "پیرو" (جنوبی امریکا کا ایک ملک) سے نکلا ہے ۔ امریکہ میں پیرو کا تلفظ "پیرو" نہیں بلکہ پارو ہے اور "پاروجم" کے معنی پارو میں پیدا ہونے والے کے ہیں ۔ بہت سے الفاظ نے سنسکرت کا روپ اسی طرح دھارا ہے ۔ ایسا ہی ہندوستانی میں بھی ہوگا ۔ ہندوستانی کو بدیسی زبانوں سے نفرت نہیں ہوگی بلکہ وہ ان کے الفاظ کو مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد اپنے میں جذب کرے گی ۔ اس لئے آپ لوگوں کو زبان کے جھگڑے میں نہ پڑنا چاہیئے ۔ ہندوستانی آہستہ آہستہ ترقی کرکے رہے گی اس کے نام پر بھی جو بحثیں اٹھائی جاتی ہیں ۔ وہ بھی نامناسب ہیں۔

کوئی لفظ صرف بولنے کے لئے نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس کے معنی بھی ہوتے ہیں ۔ آپ جب اپنے آپ کو "ہندوستانی پرچارک" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ پورے ہندوستان میں جس میں پاکستان بھی شامل ہے اس زبان کے ذریعے اتحاد کا پرچار کریں گے ۔ ہم جہاں جہاں جائیں گے لوگوں سے یہی کہیں گے کہ ہم ایک قوم ہیں ہمارا کلچر اور ہماری تہذیب ایک ہی ہے ۔ دنیا کی قدیم ترین کتاب مقدس رگ وید نے ہندوستان کا مقابلہ بیوی سے کیا ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں اور سمندروں کے درمیان دو نوں ہوائیں چلتی ہیں اس سے ملک میں موسمی ہوائیں مراد ہیں جو ہمالیہ کی طرف سے یعنی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

۱۲

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم ، ۸ ، ۱۹ ، ۲۴
چندہ :- سالانہ ۵ ششماہی ۳ للعہ

شمال سے جنوب کی جانب اور جنوب سے شمال کی طرف چلتی ہیں۔ ہواؤں کو یوگی کے پرانائم (سانس کھینچنے اور نکالنے) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ ہندوستان کو بہت قدیم زمانے سے ایک ہی ملک سمجھا گیا ہے۔ یورپ کے باشندے ابھی تک کوئی وفاق بھی نہیں بنا سکے۔ لیکن روحانی طور پر ہم نے اسے مدتوں پہلے حاصل کر لیا تھا اس لئے پرچارکوں کا فرض ہے کہ وہ ہر جگہ محبت اور ستحاد کا پیغام لے جائیں۔ انہیں چرخا بھی چلانا چاہیئے جو تعمیری پروگرام کی علامت ہے اور اسی لئے پرچارک اسی وقت زندگی کے مکمل پیغام کا پرچار کرنے والے کہلانے کے اہل ہوں گے۔

16 JUL 1948

نئی روشنی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۲ نمبر ۳ | ۱۶ جولائی ۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

سائنس کی عظمت

جواہر لال نہرو

انسانی تہذیب کے دس ہزار برسوں کی تاریخ میں کوئی ڈیڑھ سو سال ہوا کہ سائنس اپنی وسعتوں کے ساتھ ہماری زندگی میں داخل ہوئی اور اس ڈیڑھ سو برس میں وہ اس قدر انقلاب آفریں اور طوفان انگیز ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی کوئی دوسری چیز نہ ہوئی تھی۔ سائنس کی بدولت ہم آج ایک ایسی فضا اور ایسے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو سائنس سے پہلے کے عہد سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو سائنس کی اس عظمت اور ہمہ گیری کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ حال کے مسئلوں کو مردہ اور بچھڑے ہوئے ماضی کے سہارے اور مدد سے سمجھنا چاہتے ہیں۔

سائنس نے دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنھوں نے انسانیت کو فائدہ نہیں پہنچایا ہے۔ لیکن سب سے اہم اور سب سے زیادہ امید افزا تبدیلی سائنس نے انسان میں یہ کی ہے کہ اس میں سائنٹفک نقطۂ نظر کو بڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر آدمی اب بھی ذہنی طور پر سائنس سے بہت پہلے کے زمانے میں بستے ہیں اور گو زبان سے ہم سائنس کی مدح سرائی کرتے ہیں، لیکن فکر و عمل میں اس سے قطعی بے نیاز اور بیگانہ ہیں۔ یہاں تک کہ سائنس داں بھی، جو اس مضمون کے ماہر ہیں اس محسوس اور دلکش دائرے سے نکل کر سائنٹفک طریقوں سے کام لینا بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ یہی سائنٹفک نقطۂ نظر ہے جس میں انسانیت کے مستقبل کے لئے امید ہے۔ اس کی مدد سے دنیا کا دکھ اور اضطراب مٹ سکتا ہے۔

سائنس نے اس دنیا پر مختلف سمتوں سے حملے کئے ہیں۔ اس نے اس حد فاصل کو مٹا دیا ہے جو اشیا کی دنیا کو تخیل کی دنیا سے، مادے کو روح سے الگ کرتی تھی۔ سائنس اب انسان کی روح میں داخل ہو گئی ہے۔ اس نے انسان کے تحت الشعوری وجود کا کھوج لگا لیا ہے، اور ان پوشیدہ تحریکات کی راز داں ہے جو اس کو حرکت دیتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ سائنس بدلتی رہتی ہے اور اس کی کسی چیز کو ثبات اور استحکام نہیں [illegible] سائنس کا طریقہ نہیں بدل سکتا۔ اور ہمیں اپنے فکر و عمل میں، تحقیق و جستجو میں [illegible] سیاسیات، معاشیات اور مذہب میں اسی طریقے کو اپنا رہنما [illegible] کائنات کے [illegible] ایک ذرے کی سی [illegible] انسان کا ذہن اور اس کی [illegible] اور اس سفر [illegible] انسان کی [illegible]

اس نے طاقت حاصل کی ہے، اسی نے کائنات کے بھیدوں کا کھوج لگایا ہے اور اسی نے قدرت کے تغیرات سے کام نکالے ہیں۔ انسان کا یہ ذہن اور اس کی روح زمینوں اور آسمانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اس کی قوت برابر بڑھ رہی ہے اور ہمیشہ وہ نئے جہانوں کی تسخیر کا خواہش مند ہے۔

نئے جہانوں کی تسخیر سائنس دانوں کا کام ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ سب سائنس داں اتنے جاں باز نہیں اور نہ ایسے فلسفی بادشاہ ہیں جن کا ذکر صدیوں پہلے افلاطون نے کیا تھا۔ بادشاہی تو اگر ان میں نہ ہو تو کوئی تعجب نہیں، لیکن اکثر تو ان میں فلسفہ بھی ناپید ہے اور ان کا دن بھر کا کام ایک مختصر اور خشک دائرہ میں محدود رہتا ہے جب وہ سائنس کی کسی شاخ میں مہارت حاصل کرتے ہیں (اس لئے کہ مہارت ان کے لئے بے حد ضروری چیز ہے)، تو کائنات کی وسیع تصویریں ان کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہیں اور وہ اس محدود دائرے میں گھر کر حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں ہم جن سیاسی حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سائنس داں سماجی ترقی میں اس طرح ہاتھ نہیں بٹا سکے جیسا کہ ان کا حق تھا۔ گذرے ہوئے زمانے میں جس طرح دوسروں پر خوف و ہراس طاری رہا ہے، اسی طرح سائنس دانوں کے دل پر یہ خوف مسلط رہا ہے کہ ان کی کسی بات یا کسی خیال سے حکومت ناراض نہ ہو جائے اور اس طرح ان کی سلامتی اور اقتدار خطرے میں پڑ جائے۔ ان حالات میں نہ سائنس ترقی کرتی ہے نہ سائنس داں پھلتے پھولتے ہیں۔ سائنس کو تو بڑھنے کے لئے کھلی ہوئی آزاد فضا کی ضرورت ہے اور جب اسے سماجی مقاصد کے کام میں لایا جائے تو اسے ایک ایسا مطمح نظر اختیار کرنا پڑتا ہے جس میں زمانے کی ضرورت اور سائنس کے طریقے کی پوری پوری ہم آہنگی ہو۔

ہمیں بڑے بڑے مسئلوں کا مقابلہ کرنا اور انھیں حل کرنا ہے۔ اور یہ مسئلے صرف سیاست داں حل نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ممکن ہے ان کی نظر میں وہ وسعت اور ان کے پاس وہ علم نہ ہو جس کی ان مسئلوں کے سلسلے میں ضرورت ہے۔ یہ مسئلے سائنس داں بھی تنہا حل نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ان میں کام کرنے کی وہ قوت اور نقطۂ نظر کی وہ وسعت نہیں جو ہر چیز کو اپنے دائرہ میں محصور کر سکتی ہو (بقیہ صفحہ ۲ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
سائنس کی عظمت	جواہر لال نہرو	۱
ہم صفیروں کی آواز	ساگر ہندی	۲
ہندوستان کی بیرونی پالیسی (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۴
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	م۔ ع	۴
۲۔ پاکستان	ع۔ ل	۵
۳۔ باہر کی دنیا	ع۔ ل	۶
غزل	مرزا احسان احمد	۷
غزل	ڈاکٹر مسعود حسین	۷
حسن سر براہ	فضا ابن فیضی	۷
ہانگ کانگ کی [illegible]؟	عبد اللطیف اعظمی	۸
مہربانی کر کے —!	سید حسن نقوی	۹
پیرس کا سست	مشہور والا [illegible]	۱۰
[illegible]	پرنسپل [illegible]	[illegible]

قیمت فی پرچہ [illegible]

ہم صفیروں کی آواز

سالکؔ ہندی

جناب ایڈیٹر صاحب "نئی روشنی" دہلی

نئی روشنی کا پہلا سال ختم ہونے پر میری طرف سے اور میرے جیسے بہت سے عقیدت مندوں کی طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔ ملک کی موجودہ سیاسی اور ذہنی حالت میں اس قسم کا اخبار نکالنا ایک جراءتِ رندانہ تھی۔ اس کو سال بھر تک کامیابی کے ساتھ چلانا ایک معجزہ سا ہے۔ اور اس ضمن میں مالی نقصان اٹھانے پر آمادگی ایک ایسا فعل ہے جس کی شان میں کچھ کہنا گستاخی ہوگا! میرا خیال ہے کہ آزاد کے الہلال کے بعد اس شان کا کوئی دوسرا ہفتہ وار اخبار نہیں نکلا۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس کا ظاہر بھی اس کے باطن کی طرح شاندار تھا اور نئی روشنی ابھی یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا۔

آپ نے ایڈیٹوریل میں اپنے پڑھنے والوں کے تاثرات اور ردعمل کا ذکر کیا ہے مجھے آپ کی اس پالیسی سے پورا اتفاق ہے کہ آپ نے جن اصولوں اور قدروں کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا ہے، ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے، اور محض قبول عام کی خاطر دودھ میں پانی ملا کر بیچنا ٹھیک نہیں۔ آپ قوم کے افراد کو دعوت دینا چاہتے ہیں، ان میں احتساب نفس پیدا کرانا چاہتے ہیں۔ ان کو پارٹی بندی کی ترازو کے بجائے سچائی کی ترازو کا استعمال سکھانا چاہتے ہیں، ان کی آنکھوں پر تعصب کے بجائے انصاف کی عینک لگانا چاہتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے سب بہت ناگوار اور تکلیف دہ باتیں ہیں۔ کسی مصنف نے غالباً اناتول فرانس نے لکھا ہے کہ فکر بڑی خطرناک چیز ہے، اتنی خطرناک کہ بہت سے لوگ فکر کی زحمت اور تپش اٹھانے کے بجائے موت کو ترجیح دینا پسند کریں گے! بالعموم لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ بے لاگ تنقید اور غور و فکر کی آزمائش سے بچ کر کبھی عقیدے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، کبھی عام تعصبات اور توہمات کی آگ پر ہاتھ سینکتے ہیں، کبھی اپنی آنکھ کا شہتیر چھپانے کے لئے دوسروں کی آنکھ کے تنکے گن کر دل بہلاتے ہیں۔ ان سب باتوں میں یقیناً آرام طلب دماغوں کو عارضی خوشی اور اطمینان سا حاصل ہوتا ہے لیکن یہ ذہنیت دماغی آزادی اور اخلاقی شعور کے لئے سم قاتل ہے اور اس کی بنیاد پر کسی صالح قومی تمدن کی تعمیر نہیں ہو سکتی اگر بہت سے لوگ آپ کی اس بے غرض پالیسی کو اس فرقہ بندی سے دامن بچانے کو پسند نہیں کرتے تو رد کریں، حق اور انصاف تو کبھی بازار میں جنس مقبول نہیں بنتے، پھر آپ اس سے پریشان کیوں ہوں، اس کی توقع کیوں کریں؟ شاعر نے پہلے ہی آپ کی پالیسی متعین کر دی تھی۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

مجھے یقین ہے کہ رفتہ رفتہ آپ کا حلقہ وسیع ہوگا اور قوم کے معقول طبقوں میں آپ کا اخبار اس طرح گھر کرے گا جس طرح صبح کے سورج کی روشنی آہستہ آہستہ شہر کی تاریک گلیوں اور گوشوں میں راہ کرتی چلی جاتی ہے!

اب رہا اخبار میں چاشنی اور دلچسپی پیدا کرنے کا سوال، وہ یقیناً قابل غور ہے لیکن اس میں بھی آپ کا راستہ آسان نہیں۔ دلچسپی پیدا کرنے کا ایک مجرب نسخہ تو یہ ہے کہ رسالے میں فلمی ستاروں کی رنگین تصویریں شائع کی جائیں اور فلموں کی تنقید اور نوک جھونک کا سلسلہ چلتا رہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت یا کسی خاص سیاسی جماعت پر مبالغے کے ساتھ سنسنی خیز انداز میں چوٹیں کی جائیں، جس میں موافق اور مخالف دونوں مثبت یا منفی دلچسپی لیتے ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ذرا سستے قسم کے افسانوں سے محفل ادب گرم کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ ان آزمائے ہوئے طریقوں کے روادار نہ ہوں گے، کیونکہ آپ کی بزم کے ہنسوڑپن میں بھی ایک مقطع پن پایا جاتا ہے! اس لئے آپ کو اپنی قائم کی ہوئی حدود میں دلکشی کی صورتیں پیدا کرنی ہوں گی۔ یہ کام مشکل ہے، کیونکہ ملک میں ماشاءاللہ لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن ان حد بندیوں کے اندر رہ کر دلچسپی پیدا کر سکنے والے کم ہیں۔ مگر بہر حال بعض چیزیں آپ ضرور کر سکتے ہیں۔ مثلاً مضامین میں تنوع زیادہ ہو تاکہ مختلف مذاق کے لوگوں کو اپنی پسند کی چیزیں مل سکیں۔ جہاں تک ممکن ہو ہر نمبر میں ایک اچھا افسانہ شائع کیا جائے، طبع زاد نہ مل سکے تو ترجموں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ جگہ اجازت دے تو اخبار میں خط و کتابت کا ایک کالم کھولا جائے جس میں اہم اور اختلافی مسئلوں کے بارے میں معقولیت رواداری اور شگفتگی کے ساتھ بحث کی جائے۔ کبھی کبھی غیر ملکی رسالوں میں بہت اعلیٰ قسم کے علمی ادبی سیاسی مضامین شائع ہوتے ہیں، جن کے ترجمے یا اقتباسات اہل نظر کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے (اچھی اور بری!) کتابوں پر تنقید ہر مہینے یا دو مرتبہ کی جائے تاکہ لوگوں کا ادبی مذاق اور معیار بہتر ہو سکے۔ سب سے زیادہ یہ کہ آپ کے لکھنے والے چاہے کیسے ہی سنجیدہ اور "ثقیل" مضمون سے بحث کریں، لیکن انداز بیان میں تازگی اور شگفتگی ہو اور وہ یہ سمجھ کر لکھیں کہ ہر پڑھنے والے کو اس خاص مضمون سے اتنی گہری دلچسپی نہیں جتنی خود ان کو ہے۔ اس لئے بولوں کا مال اس طرح سجا کر پیش کرنا چاہیئے کہ خریدار کو اس کے حاصل کرنے میں غیر ضروری دقت نہ ہو۔ بے شک یہ صحیح آپ کے بس کی بات نہیں اور رفتہ رفتہ آپ کے لکھنے والوں کا ایک مختصر حلقہ ضرور پیدا ہو گا، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو بعض سے چند شکائتیں کر لوں۔ آخر ڈاکٹر صاحب رشید صاحب، مجیب صاحب، قاضی عبدالغفار، احمد عباس اور (ہمت کر کے کہہ ڈالوں؟) مولانا کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس کام میں زیادہ باقاعدگی کے ساتھ آپ کا ہاتھ نہیں بٹاتے؟ ڈاکٹر صاحب کو تو میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعے رسد بہ غیر چہ باک

رشید صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کو مستقل یہ تحریر کرنے کے لئے بیٹھنا یہ ممکن نہیں کہ سا جو جی کسی دن بلایا جائے۔ آخر انھیں اور بھی تو کوئی کام ہوں گے مجیب صاحب کو یاد دلایئے کہ وہ صوبوں کے دستور کے علاوہ "کیمیاگر" اور "اقبال سے پہلی ملاقات" جیسی چیزیں بھی لکھ چکے ہیں اور اس قسم کی اور چیزیں لکھنے کے لئے مشاہیر کی وفات کا کرنا بدشگونی ہے۔ قاضی صاحب اور عباس صاحب اپنے اپنے رنگ میں عجیب چیزیں لکھتے ہیں۔ لیکن انھیں اپنی ذاتی الجھنوں کو بھول کر اس طرف توجہ کرنے کی ابھی تک توفیق نہیں ہوئی، اور مولانا بہت بڑے عالم ہیں، وزیر حکومت ہیں، مدبر ہیں، لیکن وہ ان سب چیزوں سے زیادہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ادبی عظمت ان کی سیاسی عظمت سے بھی زیادہ پائدار ثابت ہوگی۔ لہٰذا محض شکرانِ نعمت ہی کے طور پر انھیں کبھی لکھنا چاہیئے اور اگر وہ لکھیں تو ان کی سرود آور تحریر کے لئے نئی روشنی سے بہتر جام کون ہوگا؟

ایک بات اور کہہ دوں؟ اخبار کی لکھائی چھپائی ...... مگر چھوڑیئے اس قصے کو، خط پہلے ہی بہت لمبا ہو گیا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عقل اور سلیقے اور روپے کا ساتھ ذرا شاذ ہی ہوتا ہے! خدا آپ کے وسائل میں اتنی ہی فراوانی اور قوت دے جس قدر آپ کے ارادوں میں خلوص اور بلندی ہے نئی روشنی کامیابی اور فراغت کے ساتھ چلے گا تو قوم اور ملک کی خوش قسمتی ہے اگر ایسا نہ ہوا تو تاریخ کا فیصلہ نئی روشنی کے نہیں ملک کے خلاف ہوگا!

سائنس کی عظمت

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

اور اس لئے یہ سکے دونوں کے اشتراک سے اور ایک معینہ اور مستقل معاشی مقصد کو سامنے رکھ کر حل ہوں گے۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ زراعت کا مسئلہ ہے لیکن صنعت کے مسئلہ کا بھی اس سے گہرا ربط و تعلق ہے اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ قومی خدمت کے ادارے ان سب ہر چیز کو ایک ساتھ لینا ہوگا، اور ان سب کو ایک ساتھ لے کر آگے چلنا ہوگا۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن ہمیں یہ بڑا کام ضرور کرنا ہے

هفته وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ جولائی ۱۹۵۹ء

کیا ہندوستان کی کوئی بیرونی پالیسی نہیں ہے؟

ایک بہت بڑے روحانی پیشوا کی ہدایت ہے "تم تو یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے، یہ مت دیکھو کہ کس نے کہا ہے" لیکن جب سابقہ اربابِ سیاست سے ہو تو اس اصول پر عمل کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، اس لئے کہ عام طور پر یہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں اس کا مطلب اس کے عام مفہوم سے مختلف ہوتا ہے۔

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشان اور

اس لئے ان کے قول کے اصل معنی اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتے، جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ حضرات کون ہیں، اُن کے خیالات کیسے ہیں، اور ان کی غرض اور مصلحت کیا ہے؟

مثلاً یہ بات کہ ہندوستانی حکومت کی کوئی بیرونی پالیسی نہیں ہے۔ آپ آج کل بہت سنتے ہوں گے لیکن جب آپ یہ سوچنے بیٹھیں کہ اس کا مطلب کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ فقرہ عام طور پر دو قسم کے لوگوں سے سننے میں آتا ہے اور دونوں اُسے بالکل الگ الگ مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ کمیونسٹوں کی زبان پر ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی حکومت روسی جتھے میں شامل نہیں ہوتی۔ انگلستان اور امریکہ کی طرف جھکتی چلی جاتی ہے بھلا یہ بھی کوئی بیرونی پالیسی ہوئی؟" مگر جب یہ صنعتی سرمایہ داروں اور ان کے پٹھوؤں کی زبان پر ہو تو اس کے کچھ اور ہی معنی ہوتے ہیں" ہندوستان کو امریکا اور انگلستان بڑی منتوں سے اپنے جتھے میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر ہماری حکومت چاہتی ہے کہ صرف دوستی کے معاہدے پر ٹال دے۔ پھر ستم یہ کہ روس سے بھی دوستی کا دم بھرتی ہے، بھلا اس کو کوئی بیرونی پالیسی کہے گا!" غرض "بیرونی پالیسی نہیں ہے" کہ معنی یہ سمجھے جائیں کہ ایسی پالیسی ہے جو ایک طرف کمیونسٹ پارٹی کو اور دوسری طرف سرمایہ دار طبقے کو ناپسند ہے۔ سوال دراصل یہ ہے کہ کیا واقعی ہندوستان اپنے اصول اور مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس محتاط درمیانی پالیسی کے سوا کوئی اور پالیسی اختیار کر سکتا ہے؟ پہلے اصول کو لے لیجئے۔ ہمارا سیاسی اخلاق جو کچھ بھی ہے وہ مہاتما گاندھی کی تعلیم اور ان کی شخصی مثال سے ماخوذ ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ پچھلے دو ہزار سال کے عرصے میں صرف ان ہی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کی روح میں ڈوب کر اس کے اخلاقی جوہر کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن گئی۔ مہاتما گاندھی کی تعلیم جہاں تک ہندوستان کی بیرونی پالیسی کا تعلق ہے یہی ہے کہ سارے ملک کو طلب اقتدار کی سیاست (پاور پالیٹکس) سے الگ رہنا چاہیئے اور دنیا میں سچا اور پائدار امن قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے لئے خستہ و رنجور دنیا تڑپ رہی ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھنے کے بعد ہندوستان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ دونوں میں سے ایک جتھے میں بھی شامل نہ ہو۔ اس لئے کہ جہاں تک حالات اور واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں طاقت اور اقتدار کا کھیل کھیل رہے ہیں اور دونوں دنیا کو تیسری ہولناک جنگ کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیم تو الگ رہی معمولی عقل اور معمولی انسانیت بھی ان ملکوں کو جنھیں نظری تعصبات یا عملی اغراض نے اندھا نہیں کر دیا ہے اس پر مجبور کر رہی ہیں کہ جہاں تک ہو سکے دونوں جنگی صفوں سے دور رہیں اور انھیں آپس میں ٹکرانے سے روکیں اس لئے کہ یہ ٹکر قیامت کی ٹکر ہوگی۔

اب رہی مصلحت تو ہر شخص ذرا سے غور کے بعد یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا ان دونوں میں سے کسی ایک جتھے میں شامل ہونا اس کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ اگر وہ روسی جتھے میں جاتا ہے تو اس کی تجارت، اس کی صنعت، اس کی مالیات جو مغربی ملکوں کے ساتھ سیکڑوں کڑیوں سے جڑی ہوئی ہے درہم برہم ہو جاتی ہے، اور امریکی بلاک کا رُخ کرتا ہے تو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالتا ہے کہ تیسری عالم گیر جنگ چھڑنے کی صورت میں اس کا زبردست ہمسایہ روس اور دوسرا ہمسایہ چین (جو شاید اس وقت تک روسی جتھے میں شامل ہو چکا ہوگا اور اپنی اندرونی، سیاسی اور معاشی ابتری پر قابو پاکر خاصا طاقت ور بن چکا ہوگا۔) مغربی طاقتوں کی مدد پہنچنے سے پہلے اس کو اسی طرح تباہ کر کے رکھ دیں جیسے پچھلی جنگ میں جرمنی نے فرانس کو تباہ کر دیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آئیں کہ ہندوستان کو آخر میں آنے والی جنگ میں شریک ہونا پڑے اور دونوں میں سے ایک خطرے کا مقابلہ کرنا پڑے۔ لیکن اپنی آزادی اور عزت کی خاطر جان پر کھیل جانا اور بات ہے اور بغیر کسی خاص وجہ کے آنکھیں بند کر کے ہلاکت کے گڑھے میں کود پڑنا اور چیز ہے۔

اس لئے گو ہندوستان ابھی تک حکمت عملی کے فن میں طفل مکتب ہے۔ وہ لوگ جو اس کی بیرونی پالیسی کی تشکیل کر رہے ہیں اور وہ جو دوسرے ملکوں میں اس کی نمائندگی کرتے ہیں بین اقوامی سیاست کے میدان میں نئے اور ناتجربہ کار ہیں، لیکن پھر بھی اسے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی ایک متعین بیرونی پالیسی ہے، اور وہ اس کے اصول اور مصلحت کے مطابق ہے۔

بزم بے تکلف

خواجہ۔ ارے بھئی مرزا کئی دن سے مُلّا نظر نہ آئے۔ کہیں مرغیوں میں حرام تو نہیں ہو گئے۔

مرزا۔ مرغیوں میں وہ حلال کب تھے۔ اسی کا تو سارا جھگڑا ہے۔ نہ ہاضمہ درست نہ ایمان۔ مرغیاں دیکھ پاتے ہیں تو دل میں کڑکڑاتے ہیں، اور بانگ دیتے پھرتے ہیں۔

مرغ شاخ درخت لاہوتیم

شیخ۔ مرزا تم تو ہو سرکاری گواہ، یا خفیہ کے انسپکٹر جس کے بارے میں جو چاہا ہانک دیا!

مرزا۔ اور کیوں حضت آپ نے جو میرے خلاف مالک دیا، وہ کوئی بات نہ ہوئی! سرکاری گواہ بننا آسان سمجھ رکھا ہے۔ عدالت نہ مانے تو جیل خانے بھیج دے اور مانے تو عوام جہنم بھیج دیں۔ رہے خفیہ انسپکٹر ان کا کیا مرتبہ سمجھتے ہیں۔ ایک ہیں خفیہ پولس ہیں۔ ایک پھانسی پا گئے!

السلام علیکم رحمۃ اللہ برکاتہ!

بھئی ملا خوب آئے، تمھارا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا۔ عمر اور رسی دونوں دراز معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ۔ کیوں مرزا! بارلیشیں باہا ہم بازی۔

فرشی مراد آبادی۔ سبحان اللہ، جو کمی رہ گئی تھی، وہ بھی پوری کر دی۔

مرزا۔ ملا دوست یہ تو بتاؤ، آج کل کیا مقویات کھاتے اور لغویات لکھتے رہتے ہو۔

ملا۔ (گھٹ کر لیکن زہرخند کے ساتھ) مرزا صاحب! آپ کے ہاں روزے وونے کا بھی گذر ہے۔ یا محض خدمت خواتین پیش نظر ہے۔

مرزا۔ واہ ملا واہ۔ کیا قافیے نکالے ہیں نظر ادھر گذر، یہ قافیے رمضان شریف میں خواتین کی خاطر بوٹے لی جاتی ہے!

ملا۔ (زچ ہوکر، اور سب سے منہ موڑ کر) خواجہ صاحب بات یہ ہے کہ رات میں نے سوچا کہ قوم کی حالت کیسے سدھاری جا سکتی ہے۔ جو باتیں ذہن میں آئیں آپ سے تبادلۂ خیالات کرنے چلا آیا۔

فرشی مراد آبادی۔ لیکن آپ کے خیالات ذرا فاسد ہوتے ہیں۔

ملا۔ (آپے سے باہر ہو کر) یعنی چہ!

مرزا۔ یعنی چہ چہ چہ!!

فرشی مراد آبادی۔ ملا دوست خواہ مخواہ ہتھے سے اکھڑ جاتے ہو۔ فاسد خیالات سے میری مراد یہ ہے کہ وہ خیالات فسادات کے زمانے کے ہوں گے۔

ملا۔ (غضب ناک ہو کر) لیکن میں تو خواجہ صاحب سے مخاطب تھا۔ آپ بیچ میں کہاں سے کود پڑے؟

فرشی مراد آبادی۔ ملا ڈیر۔ بزم بے تکلف میں کورنش نہیں بجالاتے، بس کود پڑتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

پچھلا ہفتہ:- ۱- ہندوستان

یہ بھی ختم ہوئی

مرحوم گووند ولبھ پنت جی نے یو۔ پی اسمبلی میں زمینداری کو ختم کرنے کا بل پیش کیا ۲۰ سال ہوئے اس تجویز کو ٹنڈن جی نے صوبے کی مجلس قانون ساز کے سامنے رکھا تھا اور جواہر لال نہرو نے اس کی پر زور تائید کی تھی، لیکن اس زمانے میں زمیندار پارٹی کو برطانوی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی اس لئے اس وقت تو یہ بلا آسانی سے ان کے سر سے ٹل گئی تھی۔ لیکن اگست ۱۹۴۶ء میں یو۔ پی اسمبلی نے زمینداری کو ختم کرنے کی تجویز کو اصولی طور پر مان لیا۔ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے کمیٹی مقرر کی گئی جس میں سب پارٹیوں کے نمائندے شامل کئے گئے مہینوں تک کمیٹی نے اس مسئلے پر غور کیا اور آخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اب اس رپورٹ کی بنیاد پر یہ بل مرتب کرکے اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا ہے

بل میں انتہا پسندی سے بچتے ہوئے بیچ کا راستہ اختیار کیا گیا ہے سوشلسٹ پارٹی کے اس مطالبے کے مقابلے میں کہ زمینداری بلا معاوضہ ختم کی جائے۔ معاوضے کا اصول تسلیم کیا گیا ہے اور بڑے چھوٹے سب زمینداروں کے لئے معاوضہ کی شرح مالگذاری ادا کرنے کے بعد جو لگان زمیندار کے پاس بچتا ہے اس کا آٹھ گنا قرار دی گئی ہے لیکن چھوٹے زمینداروں کے ساتھ یہ رعایت کی گئی ہے کہ انھیں کسی دوسرے دھندے سے لگانے کے لئے سرکار کی طرف سے مزید امداد دی جائے گی جس کی رقم خالص لگان کی آمدنی کے تیس گنے سے لے کر دو گنے تک ہوگی۔ جس زمیندار کی آمدنی ۲۵ روپے ہوگی اس کو تیس گنا امداد ملے گی۔ اور جتنی آمدنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی امداد کی یہ رقم گھٹتی جائے گی۔ اور پانچ ہزار سے زیادہ آمدنی والے شخص کو یہ امداد نہیں دی جائے گی

زمینداروں کو ان کی سیر اور خود کاشت کی زمینوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ البتہ یہ پابندی لگا دی جائے گی کہ جس زمین کو وہ کاشتکاروں سے جتواتے ہوں انھیں سے وہ پانچ برس تک انھیں بے دخل نہ کر سکیں گے۔ اس کے بعد یہ شکمی کاشتکار اگر چاہیں گے تو موجودہ لگان یا مالگذاری کا پندرہ گنا ادا کرکے اس کے مالک ہو سکیں گے۔ یہی قانون ان کاشتکاروں پر بھی لگے گا جو اپنی موروثی زمین شکمی کاشتکاروں سے جتواتے ہیں

زمیندار کو معاوضہ ادا کرنے کے بعد زمین کی مالک سرکار رہ جائے گی۔ کاشتکار زمینوں کا جو لگان اب تک زمیندار کو دیتے تھے، اب وہ سرکار کو دیا کریں گے۔ لیکن اب اسے لگان کی جگہ مالگذاری کے نام سے پکارا جائے گا۔

اس بل میں کسانوں کو یہ موقع بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی زمین کو جینا، کل کارخانے لگانا یا اسے کسی دوسرے استعمال میں لانا چاہیں تو وہ موجودہ لگان کی دس گنا رقم سرکار کو ادا کرکے زمین کے پورے مالک بن سکتے ہیں۔ ایسے کسانوں کو بھومی دار کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

باقی سب کسان سیردار کہلائیں گے۔ سیردار کسانوں کو زمین رکھنے کا پورا اختیار ہوگا، لیکن وہ اسے بیچ نہ سکیں گے۔ اور نہ کسی دوسرے کام میں لا سکیں گے۔

بھومی دار اور سیردار میں ایک اور فرق یہ بھی ہوگا کہ بھومی دار کی مالگذاری سیردار کے مقابلے میں آدھی ہوگی۔

اس بل میں ایک انتظام یہ بھی رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی بھومی دار یا سیردار تیس ایکڑ سے زیادہ زمین نہ رکھ سکے گا اور نہ وہ اپنی زمین کسی دوسرے شخص کو جوتنے کے لئے دے سکے گا۔ جو ایسا کرے گا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا، اور اس کی زمین ضبط بھی کی جا سکے گی۔ البتہ بوڑھے اپاہج، بیوائیں اور نابالغ اس پابندی سے مستثنیٰ رکھے جائیں گے۔

ترکہ میں جو زمین منتقل ہوگی اس پر پابندی لگا دی گئی ہے کہ وارثوں کے درمیان بٹوارہ اس طرح کیا جائے کہ کسی کا حصہ سوا چھ ایکڑ سے کم نہ ہونے پائے۔ گویا اس طرح رقبہ زیر کاشت کی کم ترین حد کا تعین کر دیا گیا ہے۔

گاؤں کی خالی زمین، چراگاہ، جنگل، تالاب، گھاٹ، کنوئیں، پینٹھ منڈی، راستے اور آبادی بسانے کا پورا اختیار گاؤں کی پنچایت کو ہوگا۔

زمین کا نیا بندوبست ۴۰ سال کے بعد ہوا کرے گا اور مالگذاری میں اضافہ یا کمی کاشتکار کی پیداوار کو ملحوظ رکھ کر کی جائے گی۔

اوقاف کی زمینیں بھی اس بل کے ماتحت ختم ہو جائیں گی۔ سرکار ان کا معاوضہ ادا نہیں کرے گی، بلکہ اس کی جگہ ایک مقررہ سالانہ امداد دیا کرے گی۔

غرض یہ خاکہ ہے یو۔ پی کے نئے مسودۂ قانون کا۔ اسمبلی اس میں کیا ترمیم و تنسیخ کرے گی۔ یہ تھوڑے دنوں میں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اپنی موجودہ صورت میں یہ بل خاصا معقول اور معتدل معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں زمیندار اس سے زیادہ رعایت کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ سرکار انھیں ایک ارب ۴۰ کروڑ روپیہ ادا کرے گی جس میں سے ۶۰ کروڑ سب زمینداروں کو معاوضہ کی صورت میں دیا جائے گا، اور بقیہ ۸۰ کروڑ صرف چھوٹے زمینداروں کو امداد کی صورت میں۔

یہ سوال البتہ کیا جا سکتا ہے کہ موروثی کسان کو جسے اس قانون کے مطابق سیردار کے نام سے پکارا جائے گا اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد فوری طور پر کیا مالی فائدہ پہنچے گا، اسے تو اتنا ہی لگان (مالگذاری کے نام سے) سرکار کو دینا ہوگا، جتنا وہ زمیندار کو دے رہا تھا اور شاید سرکار اس کے وصول کرنے میں زمیندار سے زیادہ سخت ثابت ہوگی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ زمیندار کا ختم کرنا تو ترقی کے راستے پر پہلا قدم ہے۔ سرکار کے سامنے کسان کی ترقی کی اور بہت سی تجویزیں ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے میں اس رکاوٹ کے دور ہو جانے سے بہت زیادہ سہولت پیدا ہو جائے گی۔ سرکار کی ترقی کے کام اس کی آمدنی کے کم ہونے کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ اس قانون سے سرکار کی آمدنی بڑھے گی۔ پھر وہ کسان کی حالت کو بہتر کرنے کے لئے بہت سے کام شروع کر سکے گی۔ اس لئے ہر چند اس قانون سے فوری طور پر کسان کی آمدنی نہیں بڑھے گی، لیکن آئندہ کے لئے ترقی اور بہبود کے سینکڑوں راستے کھل جائیں گے۔

انتخاب کی تیاریاں

جب سے کلکتے کے چناؤ میں کانگریسی امیدوار ہارا ہے، سارے دیش میں ایک کھلبلی سی مچ گئی ہے۔ کانگریسیوں کو ڈر ہے کہ شاید اگلے انتخاب میں ہم نہ جیت سکیں اس لئے وہ اپنی طاقت کو مضبوط کرنے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ دوسری طرف ملک کی دوسری پارٹیوں کو یہ امید ہو گئی ہے کہ اس مرتبہ قسمت ضرور ہمارا ساتھ دے گی اس لئے وہ بھی اپنی طاقت کو بڑھانے کی فکر کر رہے ہیں

سوشلسٹ لیڈر رام منوہر لوہیا نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ایک بیان دیا ہے اس میں نہرو حکومت کی پالیسی پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ اس نے غذا کی پیداوار بڑھانے کے کام کی طرف سے غفلت برتی ہے۔ جو کام اس نے اب شروع کیا ہے وہ دو برس پہلے شروع کرنا چاہئے تھا۔ جن اعداد و شمار پر حکومت نے اپنا پروگرام بنایا ہے وہ ہرگز بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد پر غلہ اکٹھا کرنے کا جو کام کیا جا رہا ہے وہ ملک کو سخت پریشانی اور مصیبت میں مبتلا کر دے گا وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ سب باتیں کانگریس کے اعتبار کو کم کرنے اور اپنی پارٹی کی طاقت کو بڑھانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔

دوسری طرف مہاسبھا کو بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں دوبارہ شروع کرنے کا حوصلہ ہوا ہے وہ بھی اپنا محاذ مضبوط کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اس کو یقین ہے کہ پناہ گزیں ضرور اس کا ساتھ دیں گے اس لئے وہ ان علاقوں کی طرف خاص توجہ کرنا چاہتی ہے جہاں پناہ گزیں کثرت کے ساتھ آباد ہو گئے ہیں جداگانہ انتخابی حلقوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کا خیال کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے ان حلقوں میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے وہ کچھ مسلمانوں کو بھی اپنی طرف سے امیدوار بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس نے چودہ نکتوں کا ایک انتخابی منشور تیار کیا ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر مہاسبھا کو حکومت بنانے کا موقع ملا تو وہ کیا کام کرے گی اس میں سماجی عدم مساوات اور محرومیوں کو دور کرنے پر خاصا زور دیا گیا ہے۔

کانگریس پارٹی کے حامیوں میں اگر ایک طرف پنڈت گووند ولبھ پنت جی ملک کو اس بات کا یقین (بقیہ صفحہ ۶ پر)

۲۔ پاکستان

صوبہ سرحد کے نئے گورنر

صوبہ سرحد کے موجودہ انگریز گورنر کی جگہ ۱۶ر جولائی سے لفٹیننٹ کرنل صاحبزادہ محمد خورشید گورنر بن رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کا یہ بڑا مبارک فیصلہ ہے اور ہم دل و جان سے اس فیصلے کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب پٹھان ہیں اور خاص سرحد کے رہنے والے ہیں اور سرسید سرحد صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ موصوف کو نظم و نسق حکومت کا کافی لمبا تجربہ ہے اور ان کے جاننے والوں کا بیان ہے کہ سرحدی قبائل کے پیچیدہ مسائل پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ نیز وہ بڑے بہادر اور جری مسلمان ہیں اور تقسیم سے پہلے جب پنڈت جواہر لال نہرو وزیر ہند کی حیثیت سے سرحد گئے تھے تو انھیں کی بروقت مدد سے موصوف کی جان بچی تھی۔

صوبہ سرحد اس وقت جیسا کہ سب کو معلوم ہے بڑے نازک دور میں سے گذر رہا ہے۔ موجودہ وزیر اعظم کی بے تدبیری اور خود سری کی وجہ سے صوبے کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بیزاری اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ عوام وزارت سے جو بدقسمتی سے مسلم لیگ وزارت کہلاتی ہے سخت نالاں ہیں اور اس سے زیادہ نالاں وہ مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ سے ہیں۔ جو اُن کے نزدیک عوام کی نمائندہ ہونے کی بجائے اب محض وزیر اعظم کی "جیبی" لیگ بن کر رہ گئی ہے۔

اس وقت سرحد میں شہری آزادی نام کو نہیں رہی۔ لوگ عبدالقیوم کے مظالم سے سہمے ہوئے ہیں۔ مسلم لیگ تک کے قابل اعتماد کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہے نہ کوئی قانون ہے نہ کسی سے داد فریاد کی جا سکتی ہے۔ سیفٹی ایکٹ ہر شخص پر جب بھی وزارت چاہے لاگو ہو سکتا ہے وزارت کی غلط کاریوں پر ٹوکنے والوں پر جھوٹے مقدمے بنائے جاتے ہیں۔ پریس پر وزارت کا قبضہ ہے اور وہ اسی کے گن گانے پر مجبور ہے۔ خبر رساں ایجنسیوں کا کام صرف وزارت کا غلط پروپیگنڈا کرنا رہ گیا ہے۔ صوبے میں آگ لگی ہوئی ہے اور وزیر اعظم صاحب نیرو کی طرح بیٹھے بنسری بجاتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صوبہ سرحد کے پہلے پاکستانی گورنر سب سے پہلے صوبے کی اندرونی حالت کو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں شخصی طور پر موجودہ وزیر اعظم سرحد سے کوئی بیر نہیں۔ اگر نئے گورنر کی کڑی نگرانی انھیں راہ راست پر لا سکے تو ہم سے زیادہ کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ صاحبزادہ محمد خورشید خود پٹھان ہیں۔ وہ پٹھانوں کے جذبات ان کی حسیات اور اُن کے رجحانات کو جانتے ہیں۔ اب انگریز گورنر نہیں جو عوام کے مفاد سے بے پروا رہ سکتا تھا۔ ان کا فرض ہے کہ صوبہ سرحد کی حکومت کو صحیح معنوں میں عوام کی، اور عوام کے لئے بنائیں اور اگر موجودہ وزارت سے یہ ممکن نہ ہو تو وہ عوام کے دوسرے نمائندوں کو اس کا موقعہ دیں یا اگر ضرورت سمجھیں تو نئے انتخابات کرائیں تاکہ عوام کو اپنی پسند کے نئے نمائندے چننے کا موقع مل جائے۔

صوبہ سرحد کی اندرونی حالت کی درستگی کے بعد دوسرا اہم مسئلہ قبائلی علاقہ کا ہے ہمارے خیال میں جب تک ہم اس مسئلے کا صحیح حل نہیں کرتے ہماری شمال مغربی سرحد کبھی محفوظ نہیں ہو سکتی۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ایک نئی سیاست اور نئے طرز حکومت کی جس کے ذریعے قبائلی ہمارے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں اور ہم سب مل کر ایک پاکستانی ملت بن سکیں۔

صوبہ سرحد کے پہلے پاکستانی گورنر کو یہ دوسرا اہم مسئلہ بھی حل کرنا ہے۔ ان سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس مسئلہ کے صحیح حل پر پاکستان کے استحکام، اس کے استقلال اور اُس کے آیندہ اقبال کا کس قدر انحصار ہے

(آفاق - لاہور)

مشرقی پاکستان میں خوراک کی قلت

چودھری خلیق الزماں صاحب صدر پاکستان مسلم لیگ نے بیان کیا ہے کہ بنگال میں اجناس خوراک کی سخت قلت ہے اور اگر یہ قلت رفع کرنے کے لئے فوری تدابیر نہ کی گئیں تو صورت حال اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔

مشرقی بنگال پاکستان کا ایک جزو ہے حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ مشرقی پاکستان میں خوراک کی قلت رفع کرے اگر پاکستان کو غلہ میسر نہ ہوتا اور تمام پاکستان میں خوراک کی قلت یکساں ہوتی تو اس پہلو سے شکایت کرنے کا موقع نہ تھا کہ ایک علاقے کو دوسرے علاقے کے باشندوں کی مصائب کی فکر نہیں ہے مگر پاکستان میں غلہ ہے۔ بھاولپور کے کاشتکاروں کو شکایت ہے کہ ان کے غلے کی فروخت کا انتظام نہیں کیا گیا ہے اور روپیہ ہاتھ میں نہ آنے کی وجہ سے انھیں دوسری قسم کی ضروریات زندگی مہیا نہیں ہیں۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ بھاولپور کے ضرورت مند کاشتکار مجبوراً خفیہ طور پر اپنا گیہوں بہت ارزاں فروخت کر رہے ہیں اور غلہ چوری سے ہندوستان بھی جا رہا ہے۔

اجناس خوراک کی ایسی ہی قلت تھی کے جوار میں بھی بیان کی جا رہی ہے، قریب قریب قحط کی سی حالت۔

یہ کیا صورت حال ہے کہ پاکستان میں غلہ موجود ہے اور پاکستان کے بعض علاقوں کے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں؟ سوا اسکے بدنظمی اور غفلت کے اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مشرقی بنگال کے نمائندوں نے اجناس خوراک کی قلت کی شکایت کی تھی، اور پاکستان کے محکمہ خوراک پر سخت نکتہ چینی۔ وزیر خوراک عبدالستار صاحب جواب دینے کے لئے اجلاس میں موجود تھے۔ انھوں نے صاف اعلان کیا تھا کہ مشرقی بنگال کے لئے جس قدر غلے کی ضرورت ہو اس کا وہ انتظام کر دیں گے اپنے بیان کو قوت دینے کے لئے مسٹر عبدالستار نے نمائندگان مشرقی بنگال سے یہاں تک کہا تھا "دیکھئے آپ جتنا غلہ طلب کرتے ہیں اس کا انتظام میں کئے دیتا ہوں پھر یہ نہ ہو کہ اسے لینے سے آپ انکار کریں"۔ وہ وعدہ کیا ہوا جو عبدالستار صاحب نے کیا تھا اور وہ غلہ کیا ہوا جو وزیر خوراک پاکستان کے علم میں اس قدر وافر تھا کہ مشرقی بنگال لے نہیں سکتا۔

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

۲- باہر کی دنیا

برطانیہ کے لئے نیا دردِ سر

ایک سال کی مختصر مدت میں برطانیہ کو دو مرتبہ ہنگامی حالت کا اعلان کرنا پڑا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی مزدوروں میں کس قدر بے چینی اور موجودہ حالات سے بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور لیبر گورنمنٹ ان کو مطمئن کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ ہنگامی حالت کے اعلان کے بعد صورت حال بہتر ہونے کے بجائے اور خراب ہو گئی ہے اور ۱۹۲۶ء کی عام اسٹرائک کی وجہ سے برطانیہ میں جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی قریب قریب اسی قسم کی پھر صورت حال پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ بلکہ یہ اسٹرائک اگر کچھ عرصہ قائم رہی تو اس کے نتائج اتنے خطرناک ثابت ہوں گے کہ ۱۹۲۶ء میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پچھلے سال جون میں جب ہنگامی حالت کا اعلان کیا گیا تھا تو اس وقت فوج کے کام پر آتے ہی اور وزیر اعظم مسٹر اٹلی کی ریڈیو پر تقریر کے بعد اسٹرائک ختم ہو گئی تھی مگر اس مرتبہ حالت زیادہ نازک معلوم ہوتی ہے اور یہ اسٹرائک جلد ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔

اس وقت برطانیہ کے سامنے قومی اور بین اقوامی بہت اہم مسائل ہیں۔ اگر بہت جلد کوئی مناسب سمجھوتہ نہ ہوا تو موجودہ اسٹرائک نہایت دور رس نتائج کا باعث ہوگی۔

"نئی دیوارِ چین"

خبر آئی ہے کہ جنرل چیانگ کائی شک اپنی گوشہ نشینی سے باہر نکل رہے ہیں اور کوئی باقاعدہ عہدہ کے بغیر ہی نیشنلسٹ حکومت کی رہنمائی کریں گے۔

آج کل وہ کمیونسٹ سیلاب کو روکنے کے لئے ایک نئی دیوارِ چین بنانے کی فکر میں ہیں۔ ابھی حال ہی میں وہ [illegible] کے صدر سنگمن ری سے مل کر

کمیونسٹوں کے خلاف مشرق بعید کے ملکوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے بحرالکاہل کی یونین بنانے کے امکانات پر بحث و گفتگو کی اور اب وہ جلد ہی اس غرض سے جنوبی کوریا جانے والے ہیں۔

یونین کے بانیوں کو یقین ہے کہ مشرق بعید اور بحر الکاہل کے علاقے کے تمام ممالک بغیر کسی استثنا کے یونین میں شریک ہوں گے۔ انھیں یہ بھی امید ہے کہ امریکا، ہندوستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان بھی شریک ہوں گے۔ اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں مدد دیں گے۔ فلپائن کے صدر نے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ ہم امریکا سے مالی یا اخلاقی کسی قسم کی امداد کی درخواست نہیں کریں گے۔ لیکن سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اگر یہ اسکیم کامیاب ہوئی اور یونین مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی تو امریکہ اور برطانیہ اس کی امداد کرنے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہندوستان پاکستان، برما، سیام، آسٹریلیا اور دوسرے ایشیائی ملکوں پر اس کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔

چین پر نئی مصیبت

چین میں بہت بڑا سیلاب آگیا ہے جس سے لاکھوں آدمی بے گھر ہو گئے، ہزارہا آدمیوں کی جان گئی اور بہت بڑے علاقے کی زراعت تباہ ہو گئی۔ طویل خانہ جنگی کی وجہ سے چین کی معاشی حالت پہلے ہی سے بہت خراب ہے چینی کمیونسٹ اپنے مقبوضہ علاقوں میں معاشی بحالی کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب تک خانہ جنگی جاری ہے ظاہر ہے وہ اس طرف اپنی پوری توجہ نہیں دے سکتے اور جب تک چین کی نئی حکومت کی بین اقوامی حیثیت تسلیم نہیں ہو جاتی ان کو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی۔ لیکن چین کے موجودہ سیلاب کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کی فوجوں کی پیش قدمی رک گئی ہے

بلکہ ایسی مصیبت آگئی ہے جس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

ہندوستان (بسلسلہ صفحہ ۴)

دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ حالات میں صرف کانگریس ہی ملک کو امن و ترقی کے راستے پر لے جا سکتی ہے۔ دوسری کوئی جماعت ملک کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور ایک دیرپا حکومت کو بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اگر کانگریس کمزور ہو گئی تو ملک میں تباہی اور ابتری پھیل جائے گی تو دوسری طرف جناب رفیع احمد قدوائی اور شری موہن لال سکسینہ کانگریس کو ان خراب لوگوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی نازیبا حرکتوں سے کانگریس کے نام کو بٹہ لگایا ہے۔ شری شنکر راؤ دیو تعمیری پروگرام اور دیہات کے کارکنوں کی تنظیم میں کانگریس کی طاقت کا راز سمجھتے ہیں۔ کانگریس کے کارکنوں کے مختلف مقامات پر تعلیمی کیمپ منعقد کئے جا رہے ہیں۔ بہار کانگریس کمیٹی کی جماعت عاملہ نے کانگریسیوں کو بیدار اور ہوشیار کرنے کے لئے ایک بارہ نکتوں کا پروگرام بنایا ہے جس میں کانگریسیوں کو حکومت کے عہدے لینے اور کنٹرول کی چیزوں کے کاروبار کرنے سے منع کیا گیا ہے اور حکومت سے سب طرح کے کنٹرول کو ختم کرنے کی اپیل کی ہے۔ کیونکہ یہی چور بازاری اور نفع خوری کا باعث ہے۔ صوبوں میں جہاں جہاں کانگریسیوں میں باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان کو دور کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ یوپی اسمبلی کے ساٹھ اصلاح پسند کانگریسیوں نے اپنی ایک نئی جماعت بنائی ہے۔ پنڈت جی اور موجودہ وزیروں پر تو پورا اعتماد ہے لیکن جو کانگریس کو بے ایمان اور خود غرض لوگوں سے پاک کرنا چاہتی ہے۔ ۱۷ر جولائی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے جس میں کلکتہ کے انتخاب کی ناکامی کے اسباب کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی گئی ہے اس پر غور کیا جائے گا۔ اور عوام کے ساتھ قریبی رابطہ قائم (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

غزل

مرزا احسان احمد

کیسے کہوں کہ دنیا آباد ہو رہی ہے
جب قید غم سے تیرے آزاد ہو رہی ہے

ترکِ ستم سے اُن کے خوش اک جہاں ہے لیکن
یہ روحِ زندگی کیوں ناشاد ہو رہی ہے

ساغر بکف ذرا پھر اے پیرِ میکدہ اُٹھ
دنیا بغیر تیرے برباد ہو رہی ہے

آنکھوں کے سامنے ہیں گویا وہ جلوہ فرما
ہم بے خودوں میں اُن کی یوں یاد ہو رہی ہے

دنیا سے دل کو جتنا برباد کر رہا ہوں
اتنی ہی دیکھتا ہوں برباد ہو رہی ہے

اتنی بھی یہ نظر کیا حُسن آفریں نہیں ہے
کیوں یا وفصلِ گل ہیں فریاد ہو رہی ہے

یوں دیکھئے تو یہ دل گو کچھ نہیں ہے لیکن
ٹھکرا کے اس کو دُنیا برباد ہو رہی ہے

دستِ کرم کی اُن کے حاجت نہیں کچھ ایسی
یہ خاکِ دل تو خود ہی برباد ہو رہی ہے

ہم اہلِ راز اس سے کچھ بے خبر نہیں ہیں
جو اس کرم کی تہ میں بیداد ہو رہی ہے

اس جامِ مے سے بجھتی کیا دل کی تشنہ کامی
شاید کچھ اس نظر کی امداد ہو رہی ہے

کچھ ہے خبر بھی زاہد تیری متاعِ طاعت
بے شغلِ جام دنیا برباد ہو رہی ہے

جس کی چمک کی تہ میں سو ظلمتیں ہیں پنہاں
تہذیب تو یہ کیسی ایجاد ہو رہی ہے

غزل

ڈاکٹر مسعود حسین

چھیڑتے ہو تو کام کی چھیڑو
کیا خواص، اب عوام کی چھیڑو

کیوں نہ تم کو کہوں میں ننگ سفر
راہ میں جب قیام کی چھیڑو

لو! افق پر بھی پڑ گئے وہ شگاف
اب نئے صبح و شام کی چھیڑو

ہر ستارہ پگھل رہا ہو جب
آرزوئے دوام کی چھیڑو

شوقِ دل عین کبھی ہو واماندہ
کوششِ ناتمام کی چھیڑو

ہر ستارہ ہو غیرتِ مہتاب
کسی ایسے نظام کی چھیڑو

حسنِ سرِ راہ

فضا ابن فیضی اعظمی

اک حسنِ سرِ راہ، جمالِ رُخِ لالہ
اوڑھے ہوئے سر سے وہ حسین شوخ دوشالہ

دوشیزگیٔ حسن کی خوش رنگ شعاعیں
چہرے پہ بنائے ہوئے اک احمریں ہالہ

بکھرے ہوئے کچھ جام و سُبو، شیشہ و ساغر
بدمست نظر میں لئے مستی کا شوالہ

پڑھتی ہوئی سی نرگسِ بیمار کی شوخی
رنگین غزل میکدہ افروز مقالہ

جو پیے پیے مدہوش کرے ہر دو جہاں کو
لبریز اسی مے سے جوانی کا پیالہ

اُٹھتی ہوئی ہر گام نظر پر جو قیامت
الجھا ہوا ہر دامنِ نظارہ سے نالہ

کس شوخیٔ بیباک سے ہے جلوہ طراز آج
اک حسنِ سرِ راہ، جمالِ رُخِ لالہ

آہو صفت و ہوش ربا شوخ چشم و فسوں گر
تقویٰ شکن و دل کش و نوخیز و سمن بر

سیمیں رُخ و کافور عذار و گلِ نورس
نازک بدن و مہ رُخ و مہ پارہ و دل بر

نور نظر افروز، چراغِ شبِ ہستی
فردوس کی دوشیزگی، اک مرمریں پیکر

وہ وجد میں ہو جائے کہ طرب ناک اشارے
سرشار و تماشا طلب و سرمست و ستم گر

آنچل ہے کہ وہ رنگینیٔ عارض کے چراغاں
جلتا ہوا آتش کدۂ ناز جبیں پر

گیسوئے معنبر ہیں یہ رخسار پہ بکھرے
یا عرش پہ پھیلائے ہیں جبریل نے شہپر

کس شوخیٔ بیباک سے ہے جلوہ طراز آج
اک حسنِ سرِ راہ جمالِ رُخِ لالہ

غنچہ دہن و سُرخ لب و ماہ دو ہفتا
خوش وضع و شگفتہ، سہی قد، آہوئے صحرا

فردوس نظر، یاسمیں تمثال، گہر رنگ
تسکینِ دل و روح نواز و طرب افزا

چاندی کی طرح صاف جبیں، ساعد و بازو
فاراں کی تجلی کی طرح چہرۂ زیبا

وہ لطف کے دن کیفیتِ ناز سے لبریز
وہ ہر نفسِ سرد میں اک جرعۂ صہبا

بڑھتے ہوئے پیغمبریٔ حسن کے جلوے
لٹتی ہوئی بے طرح متاعِ یدِ بیضا

جھکتی ہوئی دنیا طرفِ قبلۂ ابرو
بڑھتا ہوا سوزِ حرم و دیر و کلیسا

کس شوخیٔ بیباک سے ہے جلوہ طراز آج
اک حسنِ سرِ راہ جمالِ رُخِ لالہ

ہانگ کانگ کی مدافعت

عبداللطیف اعظمی

ہانگ کانگ کا مسئلہ اس وقت برطانیہ کے لئے انتہائی پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے اور کہ کمیونسٹ چین کی آئندہ پالیسی کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے متعلق چینی کمیونسٹ مطلق اب تک خاموش ہیں۔ سرکاری طور پر انھوں نے اب تک کسی پالیسی کا اعلان نہیں کیا ہے۔ غیر سرکاری طور پر البتہ کبھی کبھی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہانگ کانگ کا مسئلہ بات چیت سے طے ہو جائے گا۔ اس درمیان میں وہ موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اس وقت ہانگ کانگ سے چینی زبان میں "واسیاتنگ پو" کے نام سے ایک روزنامہ اور انگریزی میں "چائنا ڈائجسٹ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکل رہا ہے اور "نیو چائنا نیوز ایجنسی" کے نام سے ایک روزانہ پریس سروس قائم ہے۔ ان ذریعوں سے نہ صرف وہ اپنے خاص مقاصد اور مطمح نظر کی نشر و اشاعت کر رہے ہیں بلکہ باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ جنوب چین کے چھاپہ مار دستوں کو ہر قسم کی اطلاعیں اور معلومات بھی بہم پہنچا رہے ہیں۔

اگرچہ اس وقت برطانیہ، کمیونسٹ چین کو خوش کرنے اور اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ چین کی نئی حکومت سے مطمئن نہیں ہے چنانچہ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں بھی کر رہا ہے لیکن اب تک جتنی تیاریاں کی گئی ہیں اور کمک بھیجی گئی ہے فوجی ماہرین کا خیال ہے کہ وہ ہانگ کانگ کی مدافعت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ سالہ ۱۹۴۱ء میں جب جاپانیوں نے ہانگ کانگ پر حملہ کیا تھا تو برطانوی، کنیڈین اور ہندوستانی فوجیں اور چینی رضاکار صرف کچھ روز تک انھیں روک سکے تھے۔ ہوائی اڈوں کی وہاں اب بھی کمی ہے۔ پانی کا انتظام پہلے سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض برطانوی افسروں کا خیال ہے کہ چونکہ اس وقت حالات پہلے سے بالکل مختلف ہیں ـــــــ برطانیہ کی چینی کمیونسٹوں کے مقابلے میں ہوائی اور سمندری طاقت زیادہ ہے اور ۱۹۴۱ء کی طرح وہ کسی لڑائی میں مشغول نہیں ہے۔ اس لئے وہ بغیر کسی خاص زحمت کے ہانگ کانگ کی مدافعت کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچتے وقت برطانوی افسر یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر چینی کمیونسٹ چاہیں تو بغیر کسی لڑائی کے ہانگ کانگ کو حاصل کر سکتے ہیں، یہاں کی تمام مزدور انجمنوں خصوصاً [illegible]۔ وہ اہم تجارتی سٹیشن میں جن کا ہانگ کانگ کے مزدوروں پر بہت گہرا اثر ہے۔ کمیونسٹوں کی بھاری اکثریت ہے۔ وہ جس وقت چاہیں گے عام اسٹرائک کے ذریعے نوآبادی کا پورا نظام درہم برہم کر دیں گے اور جنوب چین میں ہانگ کانگ کے سیکڑوں ملین ڈالر کی جو تجارت کی جا رہی ہے جس کی بنا پر اس نوآبادی کا وجود قائم ہے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گی۔

انھیں کمزوریوں کی وجہ سے بہت سے برطانوی افسروں کا خیال ہے کہ ہانگ کانگ میں مدافعت کی جو تیاریاں کی جا رہی ہیں، ان کی اس قدر اشاعت نہیں کی جانی چاہئے تھی۔ اس سے خواہ مخواہ کمیونسٹوں میں اشتعال پیدا ہوگا اور گفت و شنید سے اس مسئلے کو حل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ برطانوی افسروں نے مدافعت کے لئے کچھ مقامی رضاکاروں کا تعاون بھی حاصل کیا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ کو عوام کی حمایت ذرا بھی حاصل نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی امید ہے ۱۹۴۵ء میں جب برطانیہ کا دوبارہ قبضہ بحال ہوا ہے تو یہاں کے چینیوں نے بڑی خوشی منائی تھی اور برطانیہ کا بڑا شاندار استقبال کیا تھا۔ مگر یہاں کے چینیوں کی ۹۸ فی صدی آبادی میں یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کہ یہ ملک ان کا اپنا ہے۔ آج تک کوئی حقیقی کوشش نہیں کی گئی اور نہ یہاں کے غریب اور بے حال چینی مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ کی گئی۔ اس لئے عوام کے دلوں میں برطانیہ کے لئے ذرا بھی جگہ نہیں ہے۔ ان حالات کی وجہ سے مقامی کمیونسٹوں کو آئندہ کے لئے زمین ہموار کرنے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ ہانگ کانگ میں شہری آزادی بھی بڑی حد تک مفقود ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کھلم کھلا کام نہیں کر سکتی۔ بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں پر بھی بہت سخت پابندیاں ہیں۔ ٹھیک جس دن کمیونسٹ فوجیں شنگھائی میں داخل ہوئی تھیں۔ "سوسائٹیز آرڈیننس" کے نام سے ایک قانون پاس ہوا تھا اس کی رو سے وہ تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں جن کا ہانگ کانگ سے باہر کی جماعتوں سے تعلق ہے چنانچہ کیومن تانگ، اور دوسری معتدل پارٹیاں بھی بند ہو گئیں۔ اس کے علاوہ پولیس کے اختیارات بہت وسیع کر دئے گئے ہیں۔ اس وقت ہانگ کانگ کی قریب قریب وہی حالت ہے جو ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کی تھی۔ پولیس راج قائم ہے۔ معمولی شبہے پر تلاشیاں لی جاتی ہیں اور بغیر کسی مقدمے کے سیاسی مخالفوں کو جیلوں میں بند کیا جاتا ہے ان سختیوں کا بھی وہاں کے عوام پر بہت اثر ہوا ہے۔ اور برطانیہ کی مخالفت دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔

ہانگ کانگ کی مدافعت کی تیاریوں نے اس کی معاشی حالت کو بہت بہتر بنا دیا ہے۔ چینی کمیونسٹوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں بہت سے صنعتی کارخانے کھول دئے ہیں اور ان علاقوں کی معاشی بحالی کی طرف خاص توجہ دے رہے ہیں۔ لیکن ان کے پاس صرف چند جہاز ہیں اور بیرونی ساکھ تو بالکل نہیں ہے۔ روسی درآمد کا سلسلہ بہت پہلے بند ہو چکا ہے، لیکن ہانگ کانگ کے ذریعے انھیں ضرورت کی تمام چیزیں مل رہی ہیں یہاں تک کہ برطانیہ جو چیزیں روس یا اپنے بہت سے یورپی "حاشیہ برداروں" کو نہیں دے سکتا، وہ چیزیں چینی کمیونسٹوں کو بڑی فیاضی سے دے رہا ہے۔ اس لئے جانکار حلقوں کا خیال ہے کہ معاشی اسباب کے پیش نظر کئی سال تک چینی کمیونسٹ ہانگ کانگ پر حملہ نہیں کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ مزید مراعات حاصل کرنے کے لئے شاید وہ سیاسی دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں۔ وہ بھی اسی قدر جس سے "بدمزگی" پیدا نہ ہو۔ لیکن اگر کہیں تیسری لڑائی چھڑ گئی تو موجودہ مصلحت کے تمام پردے اٹھ جائیں گے اور وہ ہانگ کانگ پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت سے میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔

چین
سوچاؤ
وان تنگ
کین ٹون
کولون
وکٹوریہ
ھانگ کانگ
جنوبی چینی سمندر

پاکستان

بسلسلہ صفحہ ۵

چودھری خلیق الزمان صاحب نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ مشرقی بنگال میں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر جانس خوراک کا کنٹرول رفع کر دیا جائے تو قیمتیں گر جائیں گی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدنظمی بھی ہے۔ گورنمنٹ مشرقی پاکستان قیمتوں پر قابو رکھنے میں کامیاب نہیں ہے اور معاشرے کے دشمن وہاں غلہ چھپا رہے ہیں۔ مصنوعی قلت پیدا کر رہے ہیں اور اس طرح زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں

روزنامہ "[illegible]" کراچی

"مہربانی کر کے۔۔!"

سید سخی حسن نقوی

(۲)

اپنی جیبوں کو کچھ بھوے بھٹکے پیسوں کی خاطر اچھی طرح تلاش کرنے کے بعد میں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہیں بالکل ننگا ہوں، اور میں نے بس والے سے صاف صاف کہا: یا کریں کرایہ نہیں دے سکوں گا، اور مجھے پیسے لینے گھر لوٹنا پڑے گا: "آپ گھر کیوں جائیں" اس نے بڑے اطمینان سے کہا "کوئی بات نہیں آپ ذرا نہ گھبرائیں": "لیکن میرے پاس تو پیسہ دھیلا بھی نہیں": میں نے بہت شریفانہ انداز میں کہا "تو کیا ہوا" اس نے بے ساختہ جواب دیا "میں تو آپ کو ٹکٹ دیدوں گا۔ آپ کہاں جائیں گے؟" اور اس نے اپنے ٹکٹوں کا بنڈل کچھ اس طرح ہاتھ میں لیا جیسے وہ مجھے لندن سے ہانگ کانگ تک کہیں کا بھی ٹکٹ دینے والا ہے، بالآخر میں نے اس سے کہا "تم بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اسے اپنی منزل بتائی، اور جب وہ مجھے ٹکٹ دینے لگا تو میں نے پوچھا۔ "اور اس کا کرایہ کہاں بھیجا جائے؟" "آہ! اس کی کیا پروا۔ آپ یہیں کسی دن مل جائیں گے اور کیا": اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ خوش قسمتی سے اسی وقت میری انگلیاں جو اب تک جیب کی گہرائیوں میں غوطہ لگا رہی تھیں، یک لخت ایک شلنگ سے ٹکرا گئیں اور میں نے فوراً بس والے کا قرضہ چکا دیا۔ مگر اس بات سے اس تفریح میں جو بس والے کے طرز عمل سے ہوئی تھی ذرا بھی کمی نہ آئی۔

ایک دن بس میں بیٹھا ہوا میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ کسی نے اس زور سے میرا پاؤں کچلا کہ میں تکلیف سے چیخ پڑا مگر اوپر جو نگاہ اٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہی پرانا ہنس مکھ دوست سامنے موجود ہے "معاف کیجئے سرکار" وہ بڑی عاجزی سے کہنے لگا "میں جانتا ہوں میرے جوتے بھاری ہیں میں نے انھیں خریدا ہی اس لئے تھا کہ آئے دن میرے پیر کچلے رہتے تھے، لیکن آج میں خود دوسروں کے پیر کچل رہا ہوں۔ آپ کے چوٹ تو نہیں آئی، میں معافی چاہتا ہوں۔ چوٹ میرے بے شک آئی تھی، مگر اس نے اتنے پیارے انداز میں یہ بات ادا کی کہ دل میں تسلی سی ہو گئی اور یہی کہتے بن پڑا کہ "نہیں بالکل نہیں آئی": اس کے بعد میں جب کبھی اس کی بس پر سوار ہوتا تو وہ فوراً مل جاتا، اور اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح باتیں کرتا کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔

اس میں دو صفتیں خاص طور پر پائی جاتی تھیں۔ صبر و تحمل، اور مسافروں کو آرام و آسائش پہنچانے کا شوق میں اکثر دیکھا کرتا کہ جب بارش ہوتی تو وہ دوڑ کر بس کی بالائی منزل پر پہنچتا اور وہاں ایک مسافروں کو جا بتاتا کہ "نیچے آ جائیے اندر جگہ موجود ہے۔ بوڑھوں کے ساتھ اس کا برتاؤ اولاد جیسا تھا، اور بچوں کے ساتھ ماں باپ جیسا۔ بچوں کے لئے تو خاص طور پر اس کے دل میں بڑی گنجائش تھی اور وہ ان سے ہمیشہ ہنسی مذاق میں مصروف رہا کرتا تھا اگر بس میں کوئی نابینا ہوتا تو وہ اسے کرنٹ جگہ دینے ہی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ جب بس ٹھہرتی تو وہ اپنے ماتحت کو بلا کر کہتا "تم یہاں دیکھو میں ابھی آتا ہوں۔ اور خود بوڑھے نابینا کو سڑک پار کرانے یا اسے راستے پر لگانے جاتا۔ المختصر جب تک میں وہاں رہتا یہی دیکھتا کہ فضا میں مہربانیوں اور مسرتوں کی بارش ہو رہی ہے اور سفر گویا اخلاق و عادات پر ایک مکمل سبق کی حیثیت اختیار کر لیتا۔

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ بس والا اپنا کام بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ اگر برے عادات متعدی ہوتے ہیں تو اچھی خصلتیں بھی اپنے عمدہ اثرات سے ماحول کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگ بے ادبی کا جواب فطرتاً بے ادبی سے دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی کے مقابلے پر چڑچڑا پن دکھانا کمینہ پن کی انتہا ہے۔ اس معاملے میں جو حال موسم کا ہے وہی آداب کا۔ خوش گوار دن کا کیا کہنا، لیٹس نے کیا خوب کہا ہے "خوش گوار موسم روح میں تر و تازگی پیدا کر دیتا ہے اور میں مستانہ وار جھومنے لگتا ہوں" جس طرح اچھا موسم بے حس رگوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ہنس مکھ آدمی مضمحل سے مضمحل انسان میں گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔ اس جہت سے شریف بس والے کی گاڑی پر موسم ہمیشہ پر بہار رہتا تھا۔ اس کا ذاتی اخلاق انداز تکلم اور چال ڈھال مسافروں کا دل موہ لینے کے لئے کافی تھے، ان کی کلفتوں کو دور کر کے وہ خود اپنے کام کو ہلکا کیا کرتا تھا۔ اس کی خوش مزاجی کوئی فضول خرچی نہیں تھی، بلکہ ایسا سرمایہ تھی جس میں خسارہ کا امکان ہی نہیں۔

عرصہ ہو گیا کہ بس والا مجھے اس طرف نہیں ملا۔ شاید وہ اپنی دولت اپنے ساتھ کسی دوسری جگہ لے گیا لیکن ہماری اس بے رونق محفل میں اتنی اخلاقی وسعتوں کی بھلا کہاں گنجائش! میں اپنے اس فعل پر کہ میں نے ایک غیر معروف بس والے کی شان میں لکھا۔ مطولہ قصیدہ لکھ دیا۔ ذرا بھی نادم نہیں ہوں اگر ورڈس ورتھ جوکیں جمع کرنے والے سے دلوں کی تنہائیوں میں سبق حاصل کر سکتا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ چھوٹے آدمی ان لوگوں سے آداب نہ سیکھیں جنھوں نے اپنی شخصیت سے یہ ثابت کر دیا کہ معمولی پیشہ بھی بلند و بالا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ اُسے ہنسی خوشی کیا جائے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ جنگ نے ہمارے روز مرہ اخلاق پر جس سے کبھی پہلے فضا میں ہر وقت رس گھلا رہتا تھا، بہت برا اثر ڈالا ہے۔ اگر ہم واقعی زندگی کو ایک دوسرے کے لئے خوش گوار بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اخلاقی روایات میں از سر نو جان ڈالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن ہم چاہیں کہ قانون کے شکنجے میں کس کر ایسا کیا جائے تو یہ ممکن نہیں، پولیس اور قانون دو ایسے ادارے ہیں جو ہماری سوسائٹی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ خاص کر اس سوسائٹی کے لئے جو فرشتوں سے کچھ ہی کم درجہ رکھتی ہے۔ قانون ہمیں جسمانی حملوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے، لیکن اخلاقی وار کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور نہ لفٹ والے کا یہ رویہ کہ اس نے اخلاقی حملے کا جواب تشدد سے دیا ہمیں پہلے پیدا نے اخلاق و آداب کو بیدار کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ لفٹ والے کو اگر بدلہ ہی لینا تھا تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس شخص سے جس نے "مہربانی کر کے" نہ کہا تھا انتہائی شرافت سے پیش آتا۔ اس طریقے سے وہ اپنے اوپر بھی کامیابی حاصل کرتا اور اس بے تمیز پر بھی اور یہی وہ اصلی کامیابی ہے جو قدر و قیمت رکھتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شریف انسان وقتی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے لیکن روحانی فتح کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر رہتا ہے لطف لینے کے لئے لارڈ چیسٹر فیلڈ کا یہ مختصر سا قصہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس زمانے میں لندن کی سڑکوں پر آج کل کا سا فرش نہ تھا اس لئے بارش میں جو لوگ دیوار سے ملے ملے چلتے تھے وہ کیچڑ سے محفوظ رہتے تھے۔ ایک دن ایک شخص راستے میں چیسٹر فیلڈ سے ملا اور کہنے لگا "میں کبھی کسی بدمعاش کو سڑک کے نزدیک نہیں چلنے دیتا ہوں اور خود کبھی نہیں چلتا"۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ سڑک کے درمیان میں ہو لئے گئے۔ مجھے امید ہے کہ لفٹ والا مجھ سے متفق ہوگا کہ اگر اس نے اس شخص کو کیچڑ میں نہ دھکیلا ہوتا تو اس کا انتقام کہیں زیادہ حسین و دلکش ہو گیا ہوتا۔

(ترجمہ)

ہریجن کاست

افسوس ناک رویّہ

کلکتہ کے ضمنی انتخاب میں سرت چندر بوس کی کانگریسی امیدوار کے خلاف کامیابی نے کانگریسی لیڈروں کے کان کھڑے کر دئے اور وہ اس کے اسباب پر غور کرنے لگے۔ بعض لوگوں نے اسے بوس بابو کی ذاتی فتح سے تعبیر کیا۔ بعض نے اسے بے عنوانی، جانبداری اور عزیز پرستی کے خلاف جنتا کا احتجاج قرار دیا اور بعض نے کہا کہ یہ کانگریس کے اندر پارٹی بندی کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر وہاں کے چند ممتاز کانگریسیوں نے باقاعدہ کانگریسی امیدوار کے خلاف کام کیا تاکہ وہ موجودہ وزارت تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

لیکن نہ تو میرے پاس ایسا مواد ہے جس کی بنا پر میں ان الزامات کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکوں اور نہ مجھے اس کے تجزیے کی فکر ہے مجھے سب سے زیادہ دکھ اس برتاؤ سے ہوا جو اس الکشن کے دوران میں روا رکھا گیا۔ پہلا افسوس ناک واقعہ تو قومی جھنڈے کو جلانے کا تھا اور دوسرا شریمتی سوچیتا کرپلانی پر شرم ناک طریقے پر حملہ تھا جس میں انھیں زد و کوب کرنے کے علاوہ ان کے ساتھ بدتمیزی بھی کی گئی۔

مغربی بنگال کی وزارت چاہے ڈاکٹر بی ۔سی رائے کی سرکردگی میں ہو یا ڈاکٹر پی ۔سی گھوش یا شری سرت چندر بوس کی لیڈری میں، اصولی طور پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے اختلافات جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں نجی ہیں۔ اس لئے وزارت کی تبدیلی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن یہ سوال ضرور اہم ہے کہ ہم اپنے عوام کو کس نہج کی اخلاقی اور تمدنی تربیت دینا چاہتے ہیں؟ کیا ہم انھیں قومی جھنڈے کی توہین اور ملک کی لڑکیوں کی بے عزتی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اور یہ صرف اس بنا پر کہ جماعتی سیاست میں کچھ ایک طرف ہیں کچھ دوسری طرف۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ کون سی تہذیب ہے؟ ہندوستانی، بنگالی، روسی، جرمنی، روسی، قدیم یا جدید؟ بہر حال جو بھی ہو کیا یہ غیر اخلاقی اور بزدلانہ نہیں ہے؟ کیا یہ کسی اچھی حکومت کے قیام کا باعث یا عوام کی خوشی اور خوش حالی کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ اس الکشن کے منتظمین چاہے جس پارٹی سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ان حرکات کی بنا پر سخت قابل مذمت ہیں۔ بنگال کے لوگ ہوں یا کہیں اور کے کبھی یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اخلاق کی اس پستی کے ساتھ وہ کوئی اچھی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ وہ پارٹی جس کے نام پر قومی جھنڈے کی توہین کی نازیبا حرکت اور شریمتی سوچیتا کرپلانی کی بے عزتی کی شرم ناک بات کی گئی ہے اخلاقی طور پر ہندوستان کے عوام کے سامنے مجرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس پر معافی لازم آتی ہے۔

اس پارٹی کو نازیبا رویّے کے خراب دور رس اثرات کو اچھی طرح محسوس کرنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ کوئی پارٹی بھی اس قومی جھنڈے اور اپنی بہنوں کی توہین کے بعد اچھی حکومت کے قیام کی توقع نہیں کر سکتی۔

(کشوری لال مشروالا)

بھوک کا بھوت اور اس کا تدارک

چند مہینے ہوئے لارڈ بوائڈ اور کو حکومت ہند نے غذا کے مسئلہ پر مشورہ کے لئے بلایا تھا۔ غذا کی کمی اور اس کے اضافے کی صورتوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا، اس مسئلہ کو جنگ جیسی اہمیت دینا چاہیے۔ ہندوستان کو اضافہ پیداوار میں اسی جذبہ اور قوت کا اظہار کرنا ہے جو وہ ایک دشمن کے خلاف جنگ کرنے میں کرتا۔ اور دشمن تو ہمارے دروازے پر کھٹکھٹا رہا ہے، اور یہ دشمن بھوک کا دشمن ہے۔"

ان کے مشورے پر حکومت ہند کے محکمہ غذا نے جو منصوبہ بنایا ہے اس میں یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ ہم ۱۹۵۱ء تک اس مقصد کی تکمیل کریں گے۔

کیا غذا کے مسئلے نے جنگ جیسی نوعیت اختیار کر لی ہے؟ اور کیا حکومت ہر طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے؟ جنگ کے زمانے میں ہر کوشش اسی کے لئے ہوتی ہے۔ دوسرے امور کی اہمیت پھیکی پڑ جاتی ہے۔

کفایت شعاری اور ضبط نفس سے کام لیا جاتا ہے، اور اسراف اور عیش پرستی کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتی۔

ہمارے لیڈروں کو چاہیے کہ خود اس کام میں پہل کریں اور اس کی تکمیل کے لئے پورے اخلاق کا ثبوت دیں، اور اگر ایسا کرنا ہے تو ڈنر اور دعوتوں پر روپیہ صرف کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہماری موجودہ حالت اس بنیاد کی ضد ہے جس پر لارڈ اور نے غذا کے معاملہ میں خوش خیالی کا محل تعمیر کیا ہے۔ عوام کو اس کا احساس ہونا مشکل ہے کہ ملک میں غلّے کی کمی ہے۔ ہاں اگر ہمارے لیڈر غذائی امور میں کفایت شعاری برتیں، اور تکلیفیں برداشت کریں تو عوام کو صورت حال کا احساس ہو سکتا ہے۔

حکومت کے مختلف محکموں میں باہمی اشتراک عمل کا فقدان ہے ہر محکمہ اپنے حدود میں بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ وہ ممتاز غیر سرکاری افراد بھی جن کی پہنچ وزارت تک ہے محکمۂ وزارت سے اچھے بیج اور کھاد پانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں، اور محکمۂ غذا کو قومی سائنسی کانفرنس کی گھوڑ دوڑ لانے اور پروپیگنڈہ کرنے کے کچھ نہیں آتا اور پھر یہ سب کچھ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ جن افسروں کے ہاتھ میں ان محکموں کی باگ ڈور ہے انھیں کوئی عملی تجربہ نہیں اور جو وقت گذاری کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ اور وہ اس فن میں انھیں ملکہ ہے اس لئے اس ضمن میں پہلا قدم ان آدمیوں کی جگہ ایسے دوسرے آدمیوں کو رکھنا ہے جو اپنے کام کے ہر پہلو سے واقفیت رکھتے ہوں۔ انھیں صرف فائل پر لکیریں کھینچنا نہ آتا ہو اور معینہ وقت میں ایک مخصوص اور طے شدہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور اگر وہ معینہ وقت کے اندر مقررہ کام نہ کر سکیں تو انھیں آگے ترقی نہ دی جائے بلکہ اس جگہ سے ہٹا دیا جائے۔

نازک صورت حال سخت اقدام کی طالب ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارۂ زراعت و غذا کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر نورس ڈوڈ نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ غذا کی موجودہ صورت حال کے بہتر بنانے کے لئے دس سال کی مدت درکار ہے۔

انھوں نے ہمارے جدید ترقی پسند اور کرسی نشین زرعی اور صنعتی ماہرین کو مشورہ دیا ہے کہ مشینیں صرف زمین توڑنے کے لئے استعمال ہوں اور زمین کے کٹاؤ کو روکا جائے۔ مصنوعی کھادوں کا زیادہ استعمال ترک کیا جائے، اور ایسی فصلیں بوئی جائیں جو زمین کو زرخیز بناتی ہیں اور ان میں نمی اور نائٹروجن کو قائم رکھتی ہیں۔

انھیں یقین ہے کہ اگر ان اصولوں پر عمل کیا جائے زمین کا کٹاؤ روکا جائے، جنگلوں کو نہ کاٹا جائے اور ٹیوب ویل کا سلسلہ پھیلایا جائے تو ہندوستان کا غذائی مسئلہ حل ہو کر رہے گا۔

انھوں نے بڑی عقل مندی سے اس بات کا پتہ لگا لیا کہ ہندوستان کے پرانے زرعی اصولوں کو چھوڑ کر بڑے پیمانے پر مغربی طرز کی کاشتکاری کرنا حماقت سے خالی نہیں۔

زراعت کی صنعتی اور پیشہ ورانہ نوعیت میں بڑا فرق ہے۔ امریکہ میں زراعت کی حالت بھی موٹر کی صنعت جیسی ہے۔ اس لئے وہ زراعت کو بھی صنعتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں زراعت کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے اور اس کے لئے دوسرے طریقوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ہوٹل میں جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اس میں کفایت کو مد نظر رکھا جاتا ہے، کھانے کی اچھائی پر زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا اس کے برخلاف ایک ماں جب اپنے بچے کے لئے کھانا پکاتی ہے تو اس کے پیش نظر اور ہی اصول ہوتے ہیں، پہلی مثال کھانے کا ایک تجارتی پہلو پیش کرتی ہے اور دوسری پیشہ ورانہ۔

زراعت کے متعلق ہمارے ملک میں جو کام کیا جائے اس میں اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے یہاں

نیشنل یوتھ کانگریس

پرنسپل عبدالشکور

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی موجودہ کشیدگی سے ظاہر ہے دونوں ملکوں کے کسی بھی بہی خواہ اور امن پسند کو خوشی نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی دونوں کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کی اب تک کوئی حقیقی کوشش نہیں کی گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ نیشنل یوتھ کانگریس نے اس طرف توجہ کی ہے اور دونوں ممالک کی کسی مرکزی مقام پر ایک عظیم الشان ثقافتی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس میں دونوں ملکوں کے نوجوانوں کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرقی پنجاب، دہلی راجستھان، سنٹرل انڈیا، ہماچل پردیش، اور مدھیا بھارت کی سیاسی اور ثقافتی انجمنوں نے نیشنل یوتھ کانفرنس کے اس خیال کا خیر مقدم کیا ہے، اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یوتھ کانگریس کے خاص کارکن مسٹر ساسی بھوشن اب تک مسٹر بھیم سین سچر وزیر اعظم مشرقی پنجاب۔ مسٹر جے نرائن ویاس جنرل سکرٹری راجستھان پراونشل کانگریس کمیٹی، مسٹر جے ورگی وزیر اعظم مدھیا بھارت، اور مسٹر شاہ نواز (آئی این اے) سے مل چکے ہیں اور ان اکابرین سے انھوں نے اس یوتھ کانگریس کے اغراض و مقاصد بیان کرکے ان کی پوری پوری ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ پاکستان کے مختلف حصوں سے بھی امید افزا پیامات موصول ہوئے ہیں، اس لئے قوی امید ہے کہ یہ کانفرنس ضرور کامیاب ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کے نوجوانوں کے لئے یہ بڑا زرین موقع ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے جوش عمل سے وہ مقصد حاصل کر لیں گے جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے سب سے بڑا اور سب سے اہم مقصد ہے۔ قوم کی پرانی نسل نے ملک کے لئے آزادی حاصل کی ہے۔ اور یقیناً یہ ایسا بڑا کارنامہ ہے جس پر پرانی نسل بجا طور پر فخر و ناز کر سکتی ہے۔ البتہ یہ نئی نسل کا زرین کارنامہ ہوگا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں محبت اور یگانگت کے تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔ جس قدر وقت گذرتا جاتا ہے یہ بات زیادہ سے زیادہ روشن ہوتی جا رہی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لئے دنیا کی تاریخ کے اس دور میں ہم نوا، اور ہم آہنگ ہونا از بس ضروری ہے سیاسی ہی نہیں بلکہ اقتصادی اور تجارتی معاملات میں بھی ہم آہنگی اور یگانگت دونوں کی بہبودی اور سرسبزی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی، ورنہ خطرہ ہے کہ دونوں ملکوں کو سخت نقصان پہنچ جائے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ کم از کم اردو کے ادیب، ناول نگار شاعر اور افسانہ نویس ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اپنے فرائض پوری ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ خصوصاً ترقی پسند ادیبوں نے بڑی روشن خیالی صحت مندی اور بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے دونوں ملکوں کی نئی پود پر اس کا اچھا اثر پڑے گا، اور دونوں جگہ ایسی فضا پیدا ہوگی جس سے تعلقات کو خوش گوار بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ امید ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے رسالے اور اخبارات اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔ اور دونوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں خاطر خواہ مدد دیں گے۔

اگر نیشنل یوتھ کانگریس اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی، اور اس کی مجوزہ کانفرنس ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان مفکر، شاعر اور ادب نواز حضرات کو ایک مرکز پر لا سکی تو اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور تبادلہ خیالات کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں گے۔ پاکستان کے شاعر دہلی بمبئی اور لکھنؤ میں اپنے نتائج فکر پیش کر سکیں گے، اور ہندوستان کے شعراء لاہور، کراچی اور ڈھاکہ تک پہنچ سکیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بنارس یونیورسٹی کے چند طلباء کراچی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں اور لاہور کے چند طلباء کلکتہ اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں چند سال قیام کریں۔ موجودہ حالات میں یہ باتیں کچھ تعجب خیز معلوم ہوتی ہوں گی لیکن زمانہ مجبور کرے گا، اور نئی نسل کی قیادت میں یہ تعجب خیز باتیں بالکل معمولی اور روزمرہ معلوم ہوں گی۔

رسل و رسائل کے ترقی یافتہ ذرائع نے زمان و مکان کی حدود کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ ملکوں کی غیر فطری حدود صفحۂ قرطاس پر تو چاہے عرصے تک قائم رہیں لیکن ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ حدود بے معنی اور بے کار ہیں اور خیالات اور افکار کی رو کو ان مصنوعی حد بندیوں سے روکنا ناممکن ہے خصوصاً ایسی جگہ جہاں کے ادیب ایک طویل مدت سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے ہیں اور جن کی زبان، تصورات اور مزاج میں بڑی حد تک یگانگت اور اتحاد ہے۔

کھیل اور تفریح کے ذریعے بھی یگانگت اور محبت کے جذبات پیدا کرنے میں بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ ان سے بھی فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرنا چاہئے۔ ہندوستان کے کھلاڑی اگر نیوزی لینڈ ٹیم کو بلانے پر اصرار کر سکتے ہیں تو پاکستان کی ٹیم کو بھی مدعو کر سکتے ہیں اور پاکستان ہندوستان کی ٹیم کو اپنے ہاں بلا سکتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ابھی رائے عامہ شاید اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ نیشنل یوتھ کانگریس کو اگر سال دو سال میں اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی تو پھر رائے عامہ کو ہموار کر لینا کچھ بھی دشوار نہ ہوگا۔ دونوں ملکوں میں پہلے جو تلخی اور منافرت کے جذبات کارفرما تھے وہ اب فرو ہوتے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ خواب خیال ہو جائیں گے۔ نیشنل یوتھ کانگریس کا خیر مقدم کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہماری بہترین دعائیں اس کانگریس کے ساتھ ہیں۔

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ملاّ۔ وہ کیوں؟

مرزا۔ کیوں کا سوال نہیں، بس 'کیسے' دیکھنا ہوتا ہے۔

ملاّ۔ یعنی؟

مرزا۔ جیسے کود پڑا آتش نمرود میں عشق!

خواجہ۔ صاحبو ذرا چھری تلے دم تو لینے دو۔ ہاں ملاجی۔ وہ کیا خیالات تھے۔ جو رات آپ کے ذہن میں آئے۔

فرشی مراد آبادی۔ خیال وہ بھی خواب کا۔

مرزا۔ الٰہی توبہ!

ملاّ۔ یہ کیا؟

فرشی مراد آبادی۔ یہ بھی خواب ہی سے متعلق ہے۔

ملاّ۔ (دھاڑیں مارتے ہوئے) میں آپ لوگوں پر لعنت بھیجتا ہوں، اور اس بزم سے مستعفی ہوتا ہوں۔

سارے اراکین۔ شاباش، جزاک اللہ

سب سب ہُرّا: مبارک سلامت گویا کہ
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید!

ملاّ۔ (ہکا بکا ہو کر) یہ کیا، کیوں۔

مرزا۔ ملاّ جانی۔ آج ہی تو تم پکے ممبر بنے ہو!

ملاّ۔ (ہکا بکا سے پیوستہ) وہ کیسے؟

مرزا۔ بے تکلف ہو کر۔

خریداروں سے

جن خریداروں کو چندے کے ختم ہونے کی اطلاعیں دی گئی تھیں ان میں سے جن لوگوں کے انکاری خطوط موصول نہیں ہوئے ہیں ان کی خدمت میں وی، پی بھیجے جا رہے ہیں۔ براہ کرم ان کو وصول کرکے ممنون فرمائیے

"منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر دہلی

تاریخ اشاعت: یکم ، ۸ ، ۱۹ ، ۴۴

چندہ:- سالانہ ۶ ششماہی للعہ

ہندوستان (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

کرنے کے لئے تجاویز تیار کی جائیں گی۔

جہاں تک سیاسی جماعتوں کی موجودہ تنظیم اور ان کے اثر و رسوخ اور اعتبار کا تعلق ہے کانگریس کا ابھی تک کوئی مدمقابل پیدا نہیں ہوا ہے۔ کلکتہ کی شکست نے کانگریس کو اور زیادہ ہوشیار کر دیا ہے اور اب وہ نہایت مستعدی کے ساتھ اپنی کمزوریاں کو دور کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ صوبہ کانگریس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اس کی اکثریت اتنی زیادہ نہ رہے جتنی کہ اب ہے، لیکن بصورت مجموعی کانگریس ہی کی جیت ہوگی۔ حال میں جو میونسپل انتخابات ہونے والے ہیں ان سے اس بات کا اور اندازہ ہو سکے گا کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی، بی اے جامعہ

مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۴ | ۲۴ جولائی سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد عابد حسین

ہمارے نوجوانوں کی ذمہ داریاں

شری راج گوپال آچاریہ

ہم نے اخلاق عالم کی تاریخ کے بدترین دور میں آزادی حاصل کی ہے۔ کاش یہ آزادی ہمیں ۲۵ برس پہلے نصیب ہوئی ہوتی۔ اس صورت میں ہماری حالت آج سے بہت اچھی ہوتی۔ ہمیں آزادی اس وقت حاصل ہوئی ہے جب دنیا بہت سے پہلوؤں سے تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن ہم ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق ہی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری راہ میں مشکلات ہیں اور ہمیں نئے سرے سے کام شروع کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا کہ لوگوں کے اندر اخلاقی اور روحانی بیداری پیدا کی جائے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے۔ یہ کام اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم میں اخلاقیات پر لکچروں کی شمولیت سے نہ ہو سکے گا۔ بلکہ یہ کام ایسی سرگرمیوں کو منظم کرنے اور ایسا ضبط پیدا کرنے سے ہوگا جو نوجوانوں کے دلوں میں سچائی اور نیکی کے لئے عزت اور توقیر کے جذبات بیدار کرکے انہیں جھوٹ اور برائی سے متنفر کر دے۔ نصیحتوں کی بہ نسبت تھوڑا سا عمل بدرجہا بہتر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ایسے مرد اور عورتیں ہونی چاہئیں جن کی روزمرہ زندگی لڑکوں اور لڑکیوں کے روزانہ فرائض میں روشن خیالی اور عمل کے جذبات پیدا کرے۔ استادوں اور معلموں کا انتخاب کرتے وقت ان کی علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کے عادات و اطوار اور خیالات و عمل کا بھی خاص دھیان رکھا جائے۔ صحبت کا برا یا اچھا اثر دوررس ہوتا ہے۔

سماجی مسرت کی کنجی یہ ہے کہ مرد اور عورتیں ہر وقت خود بخود ہمدردی اور بے غرضی سے کام کریں اور غیر سماجی زاویے سے پرہیز کرنے کے عادی بن جائیں۔ جھوٹ بولنے، چوری کرنے، دھوکہ و فریب کرنے، ظلم اور حیوانی خواہشات کا شکار بننے سے ہم میں ایسی ہی حقارت پیدا ہونی چاہئے جیسی ہمیں گندی اور ناپاک غذا سے ہے۔ جسمانی صفائی کی طرح دل کی صفائی بھی اہم اور ضروری ہے۔

غیر ملکی اقتدار کے ساتھ ساتھ نوکر شاہی طرز حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس ہونا چاہئے اور انہیں بجا لانا چاہئے۔ قومی آزادی حاصل ہو جانے سے سرگرم حب الوطنی کی ضرورت ختم نہیں ہوتی۔ لیکن اب سچی حب الوطنی یہ ہے کہ خود غرضی کے دور کرنے کے لئے جہاد کے جذبے سے کام لیا جائے۔ پہلے جس طرح غیر ملکی حکومت کو ختم کرنے کا خیال ہر وقت ہمارے پیش نظر رہتا تھا، اسی طرح اب تمام مرد اور عورتوں کو ملک کی بھلائی اور بہبودی کا خیال سب سے مقدم رکھنا چاہئے۔ شہریت محض ایک پیدائشی حق ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا طرز معاشرت بھی ہے، جو تربیت اور جذبات کی صحیح پرداخت سے بنتا ہے۔

شہریت کے بغیر آزادی اور جمہوریت محض ابتری اور تاراج بن جاتی ہے۔ شہریت کے کلچر سے میری مراد انفرادی چال چلن کا ایک ایسا سانچہ ہے، جس کی مدد سے ہی جمہوریت سماجی مسرت پیدا کر سکتی ہے۔ ہم نے غیر ملکی حکومت کو مٹا دیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قانون کے احترام میں کمی ہونے دی جائے، یا حکومت اور عدالتوں کے اختیارات گھٹا دیے جائیں۔

دنیا میں کہیں بھی دیکھا جائے بدی صرف تھوڑی ہی دیر تک زندہ رہتی ہے اور کچھ وقت کے بعد نیکی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوگا میرے نوجوان دوستو یقین رکھو، پرماتما پر بھروسہ کرو، اور بہادر بنو۔ شہریت کا کلچر پیدا کرنے کے لئے کام کرو، کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنے دلوں کی آواز پر ہی قانون کا احترام کرنے والے لوگوں کی طرح سوچو اور عمل کرو۔ میری نیک خواہشات آپ سب کے ساتھ ہیں۔ دہلی ایک تاریخی اور عظیم الشان جگہ ہے۔ یہ دنیا بھر کے اہم مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کی یونیورسٹی ہند کے دار السلطنت میں واقع ہونے کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس جگہ ہماری گذشتہ عظمت کے نشانات ہمارے گرد و پیش موجود ہیں اور آپ اپنی آئندہ عظمت کے مرکزی چشموں کے بیچوں بیچ رہتے ہیں، اس لئے دہلی کے شایان شان بنو۔

(اس خطبہ کا خلاصہ جو دہلی یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کے موقع پر دیا گیا)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہمارے نوجوانوں کی ذمہ داریاں	شری راج گوپال آچاریہ	۱
سروے کلب	کشوری لال مشروالا	۲
کر کیسے (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۴
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	م، ع	۵
۲۔ پاکستان	ع، ل	۶
غزل	اثر لکھنوی	۷
عید کی مسرتیں	اختر تلہری	۷
پیام سحر	خیال مینائی	۷
مرحومہ (افسانہ)	صالحہ عابد حسین	۸
مغلوں نے ہندوستان کو کیا دیا؟	سید تقی حسن نقوی	۱۰

فی پرچہ تین آنے

ہریجن کا ست

سروودے کلب

کشوری لال مشروالا

شری کاکا کالیکر کو کسی شخص نے حسب ذیل تحریر بھیجی تھی جسے موصوف نے ہمارے پاس اس خواہش کے ساتھ بھیجا ہے کہ ہم ہریجن میں اس پر تبصرہ کریں۔

"آپ کے غور و فکر کے لئے میری ایک تجویز ہے تو اگر آپ اسے منظور کریں تو اسے مناسب اشخاص تک بھی پہنچا دیجئے۔ مجھے اس کا خیال روٹری کلب سے پیدا ہوا ہے اور میری تجویز ہے کہ ہندوستان میں سروودے کلب قائم کئے جائیں جن کا بڑا مقصد یہ ہو کہ ان کے ذریعے سے ان اصول اور خیالات کی ترویج کی جائے جن کے مہاتما گاندھی حامی تھے اور جن کی خاطر انھوں نے اپنی جان قربان کر دی۔ اس کلب کے وقتاً فوقتاً جلسے ہوا کریں جن میں اہم اور معتبر حضرات کو مدعو کیا جائے تاکہ وہ مذکورہ اصول و خیالات پر تقریریں کریں۔ اس کلب کی ممبری عام ہو اور ہر مذہب، عقیدہ، نسل اور قوم کا شخص اس کا رکن بن سکتا ہو۔ اس کا مقصد ہو بنی نوع انسان کی خدمت اور امن و آشتی اور عدم تشدد کے اصولوں کی تلقین۔ اس کی ممبری فیس بھی برائے نام ہو۔ مثلاً ماہوار ایک روپیہ یا سالانہ دس روپے۔ ہر بزرگ کو بڑے بڑے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جانی چاہیے۔

روٹری کلب اور مجوزہ سروودے کلب میں فرق یہ ہوگا کہ اول الذکر تمام تر مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے برخلاف اس کے آخر الذکر ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی روایات پر مبنی ہوگا جو موجودہ زمانے میں دنیا کی رہنمائی کر سکے۔ سروودے کلب جب کچھ ترقی حاصل کر لے تو اس کے صوبائی اور ضلع وار سرکل قائم کئے جائیں اور روٹری کلب کی طرح اس کے گورنروں کا انتخاب کیا جائے۔ مجھے مستقبل کے آئینے میں یہ نظر آ رہا ہے کہ کچھ عرصے میں یہ کلب محض آل انڈیا حیثیت اختیار کر لے گا بلکہ اس کی حیثیت بین الاقوامی ہو جائے گی اور اس وقت وہ آج کل کی ستم رسیدہ دنیا کو کسی دوسرے موجودہ ادارہ کی بہ نسبت سب سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے گا۔ اور اس کے امن و سکون میں اضافہ کر سکے گا۔"

ہمیں روٹری کلب کے قسم کے اداروں اور سروودے کلب یا گاندھیائی قسم کے اداروں کے درمیان فرق سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں لکچر، مطالعہ، مباحثہ، داستان گوئی، ڈرامہ، گیت اور ان اشیاء کی نمائش جو گاندھی جی استعمال کیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ کے لئے بھی جگہ ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ گاندھی جی والے معیار کے سماجی یا معاشی نظام میں ان چیزوں کو صرف ثانوی حیثیت حاصل ہے اور ان خیالات و اصول کی ترویج میں ان سے مددگار کی حیثیت سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن اگر ان چیزوں کو اپنے [illegible]

[illegible]

ہو لیکن اس کے ذریعے سے آپ تہذیب کی ترویج نہیں کر سکتے۔ ایک سروودے کلب تو سماجی کاموں کے ایک مشترکہ پروگرام کو لے کر ہی جاری کیا جا سکتا ہے جس کے اجزا حسب ذیل ہوں۔

۱۔ اس پروگرام کا ایک جزو یہ ہونا چاہیے کہ ہر ممبر اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز بناتا رہے جو قوم کے لئے فائدہ مند ہو۔

۲۔ اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول کو پاک و پاکیزہ رکھیں اور قوم کے طرز زندگی میں اصلاح پیدا کریں۔

۳۔ اس کلب میں کوئی ایسا کام بھی ہوتا ہو جسے ہر غریب اور بے کار شخص کر سکتا ہو اور اس طرح خودداری کو باقی رکھتے ہوئے وہ اپنی آپ مدد کر سکے۔

۴۔ اس کا چندہ ہونا چاہیے کوئی ایسی چیز جسے اس کے ممبروں نے خود بنایا ہو۔

غرض کہ ہندوستان میں سروودے کلب ایک ایسے پروگرام کے ساتھ ہی جاری کیا جا سکتا ہے جس میں کتائی کے علاوہ غلاظت اور گندگی کی صفائی کا کام بھی ہوتا ہو۔ ان باتوں کے بغیر میں کسی ایسے سروودے کلب کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کے ذریعے سے گاندھیائی افکار و خیالات کو پھیلایا جاتا ہو۔

اگر پروگرام کے یہ اجزا کسی شخص کے لئے جاذب توجہ نہ ہوں تو میرے خیال میں ایسا نام نہاد سروودے کلب ایک ڈھونگ ہوگا جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس میں بحث و مباحثہ کی خاطر فیشن ایبل جلسے ہوا کریں۔ اور رنگ رلیاں منائی جائیں چونکہ اس میں بحث و مباحثہ "گاندھی ازم" اور ہندوستانی تہذیب و روایات ہی تک محدود ہوگا اس لئے اس کا دائرہ عمل روٹری کلب سے بھی زیادہ محدود ہو کر رہ جائے گا اور اس لئے وہ اس قابل ہی نہیں ہوگا کہ روٹری کلب کے مقابلے میں اسے پیش کیا جا سکے۔ سروودے کلب کے خیال کو روٹری کلب سے مستعار لینے کے بجائے میں عرض کروں گا کہ اسے رچرڈ بی گریگ کی کتاب

"A DISCIPLINE FOR NON-VIOLENCE"

سے لیا جائے جو نوجیون پریس سے شائع ہوئی ہے۔ روٹری کلب سروودے کلب کا ڈھانچہ پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں مراسلہ نگار اور ان لوگوں سے جو مراسلہ نگار ہی کی لائنوں پر سوچتے اور فکر کرتے ہیں عرض کروں گا کہ وہ ہندوستانی تہذیب و روایات پر فخر کرنا چھوڑ دیں اور مغربی و مشرقی تہذیبوں میں فرق کرنے کی عادت کو ترک کر دیں۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ مغربی نظریے کی حدیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور مشرقی نظریے کی حد کس جگہ سے شروع ہوتی ہے اور ہم کس نظریے کے اندر ان خوبیوں کو پا سکتے ہیں جو ایک مشرقی کے نقطۂ نظر سے زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا قاتل بڑی ایمانداری کے ساتھ ضمیر کہتا ہے کہ اس بلند و بزرگ ہستی کو قتل کرنے کی ہمت اسے گیتا کے مطالعے نے بخشی ہے۔ کیا ہم مشرقی تہذیب کے اس نمونے پر فخر کر سکتے ہیں یا ہم مشرقی تہذیب ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ان افعال کو قرار دے سکتے ہیں جو خونریزی، قتل و غارت، اغوا اور آتش زنی کی قسم کے [illegible] میں سرزد ہوئے اور جن کو جائز قرار دینے کے لئے انھوں نے ویدوں، قرآن اور گرنتھ صاحب کی تعلیمات کا سہارا پکڑا یا ہم مشرقی تہذیب اس چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تفریق کو کہہ سکتے ہیں جو ہندوستان میں رائج ہے یا ان جھگڑوں کو جو فرقہ پرستی اور صوبائی اور لسانی تعصب کی بنیادوں پر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خرابیاں ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں۔ کیا یہی چیزیں ہمیں ترکہ اور ورثہ میں ملی ہیں جن کو ہم باقی رکھنا اور ان کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ہماری روایات اور مشرقی تہذیب پر ہمارا یہی گھمنڈ ہے جس کے یہ نتائج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم صحیح لائنوں پر ترقی کریں تو ہمیں غلط فخر و مباہات کو چھوڑ دینا چاہیے اور اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ ہماری مذہبی کتابوں میں خواہ کتنے ہی بلند خیالات کیوں نہ موجود ہوں اور خواہ ہمارے بعض بزرگوں کے خیالات کیسی ہی بلندی پر کیوں نہ پہنچ گئے ہوں، ہمارے عوام علم اور تہذیب کے اعتبار سے بالکل پستی میں پڑے ہوئے ہیں اور دوسرے ملکوں کے عوام کی بہ نسبت ابھی بہت پیچھے ہیں اور ہمیں ان سے بہت کچھ سیکھنا ہے ہمیں غلط فخر و مباہات بالکل ترک کر دینا چاہیے۔

تمام بنی نوع انسان ایک ہیں اور تہذیب کے اعتبار سے وہ صرف دو دائروں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک شیطانی تہذیب اور دوسری روحانی۔ شیطانی تہذیب کے خصوصیات ہیں قوت و اقتدار کی ہوس، راحت و آرام اور تزک و احتشام کی خواہش ہے۔ برخلاف روحانی تہذیب کے مقتضیات ہیں شریفانہ اوصاف، سادگی اور علو ہمتی۔ ہر ملک میں مختلف قسم کی تہذیب کے پیرو نظر آتے ہیں اور ہندوستان بھی انھیں دونوں دائروں میں بٹا ہوا ہے۔ گاندھی جی روحانی تہذیب کے نمائندہ تھے اور اس لئے ان کے نمونے دوست اور دشمن سب [illegible] دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ روحانی تہذیب ہمہ گیر ہوتی ہے وہ کسی خاص علاقہ اور رقبے میں محدود نہیں ہوتی۔ لیکن شیطانی تہذیب مقامی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے تصور کے مطابق سروودے کلب ایسا نہیں ہو سکتا جو صرف ایک ہی مخصوص علاقہ اور رقبہ کی تہذیب کے متعلق بلند خیال رکھتا ہو۔

(ترجمہ)

قومی آواز لکھنؤ

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ر جولائی ۱۹۴۹ء

کمر کسیے

ڈالروں کے ذخیرے کی کمی اور کانگریسی نیتاؤں کے اختلافات نے جن کی شکایتیں طرح طرح سے کی جاتی رہی ہیں اور جن کے نتیجے کا ایک نمونہ جنوبی کلکتے کے انتخاب میں کانگریسی امیدوار کی شکست تھی، وزیر اعظم کو ایک بنیادی ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس ضرورت کا احساس پہلے سے ہوتا اور اس کی پیش بندی کے لئے تدبیریں کی جاتیں تو ہم اپنے آپ کو صحیح معنوں میں بیدار اور آزاد سمجھ سکتے۔ مگر اب بھی اتنی دیر نہیں ہو گئی ہے کہ فیصلۂ تقدیر سے ہو، تدبیر سے نہ ہو سکے۔ ضرورت کرنے کی یہ ہے قوم اور حکومت میں یک جہتی پیدا کر کے سیاسی اور معاشی مقصدوں کو حاصل کرنے کی ہے۔ موجودہ حالت قائم رہی تو قوم کا حکومت سے وہ تعلق نہ رہے گا جو حکومت میں استقلال پیدا کرتا ہے، قوم حکومت کو گرانی، افلاس، بدانتظامی کا ذمہ دار ٹھہرائے گی، اور ممکن ہے جذبات کی رو میں وہ حکومت کی باگ ڈور ایسے نمائندوں کے ہاتھ میں دے دے جن پر کسی ایک پارٹی یا عقیدے کا اتنا بھی اثر نہ ہو گا جتنا کہ اس وقت کانگریس کا صوبائی اور مرکزی وزارتوں پر ہے۔ پنڈت جواہرلال نے غذا کے مسئلے پر جو تقریر کی ہے اس سے اور ان کے مغربی بنگال جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کو ان خطروں سے بچانا چاہتے ہیں جو اب صاف نظر آ رہے ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے کہ وزیر اعظم کی ہدایتوں پر عمل کرے اور حکومت کو ہر طرح سے سہارا دے۔ لیکن حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ صحیح تدبیریں کرے اور ان لوگوں کو جو شہریت کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں اس کا موقع دے کہ وہ اپنے حوصلے پورے کریں۔

آزاد ہند کی حکومت کو جو کام کرنے والے ورثے میں ملے ہیں وہ بیشتر فراغت اور غیر ذمہ داری کے زمانے کی یادگار ہیں۔ ان کے نزدیک حکومت کی خدمت سے کوئی خاص نسبت نہیں۔ اس لئے انھیں حکومت کے منصوبوں سے صرف قانونی تعلق ہوتا ہے۔ انھیں کامیابی کے ساتھ انجام دینے کی لگن نہیں ہوتی۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ کوئی کام خود ان کی وجہ سے نہ بگڑنے، اور ترقی کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے انھیں ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا لینے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف قوم کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے، کہ آزادی مل جانے کے بعد ہر کام حسب منشا ہو جانا چاہئے اب کسی قسم کی زحمت اٹھانے اور قربانی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مغالطے کی وجہ سے حکومت پر ایسی غیر ذمہ داری کے ساتھ الزام لگائے جاتے ہیں جو برطانوی حکومت کی خرابیوں کا نتیجہ جاکرنے کے لئے مفید ہو سکتی تھی مگر اب آزاد ہند کی حکومت کے اعتبار کو کم کر کے ہندوستان کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔

غلے کی کمی ان معاملوں میں سے ہے جو اس وقت بڑی بے چینی پیدا کر رہے ہیں اور یہ بہت ضروری تھا کہ خود پنڈت جواہرلال اس طرف توجہ کریں۔ ان کی تقریر کا بہت اچھا اثر ہوا اور ہمیں امید ہے کہ اب غذا کے معاملے میں پنڈت جی قوم اور حکومت دونوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ صحیح صورت حال کا پتہ چلایا جائے۔ بعض لوگ حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سے اعداد و شمار کا علم نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا اس لئے کہ اس کی معلومات کے ذریعے ناقص ہیں۔ مثلاً جن صوبوں کی حکومتوں نے کسانوں سے غلہ لگان کے طور پر وصول کرنے کا ارادہ کیا تھا انھیں اپنے اندازے سے بہت کم ملا ہے، مگر وہ اپنی ناکامی کا اعتراف نہیں کرتی ہیں اور اعداد کو حقیقت ظاہر کرنے کے بجائے اسے چھپانے کا ذریعہ بنا لیتی ہیں۔ غلے کے نرخ اور حکومت کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے بھی اس کا یقین نہیں ہوتا کہ غلے کے صرف اور اس کی پیداوار میں اتنا ہی کم یعنی قریب دس فی صدی کا فرق ہے جیسا کہ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں بیان کیا تھا۔ بہرحال اگر صحیح اعداد و شمار کا پتہ لگایا جائے تو شاید یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ غلے کی اتنی کمی کیوں ہے۔ اس وقت غلے کو روک کر بیٹھنے میں اتنا فائدہ ہے کہ ہمارے خیال میں پیداوار کا خاصا حصہ موجودہ نرخ کو قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے روک لیا جاتا ہو گا۔ اور اگر حکومت اس کا سراغ لگا سکے کہ غلہ کس طرح غائب کیا جاتا ہے تو اس کی بڑی نیک نامی ہو گی۔

اگر پوری تحقیق کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ باہر سے غلہ حاصل کئے بغیر کام نہیں چل سکتا تو حکومت کو اس کی کوشش کرنا چاہئے کہ غلہ ان ملکوں سے خریدا جائے جن کا سکہ گراں نہیں ہے۔ یہ کام تاجروں کے اوپر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہندوستان میں شکر کا ذخیرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ گنے کی کاشت کم ہو رہی ہے، ملیں بند ہو رہی ہیں۔ مگر حال میں برطانیہ کے ہاتھ شکر بیچنے کا موقع ملا تو اس کی اتنی قیمت مانگی گئی کہ سودا ہو ہی نہ سکا۔ اگر حکومت سرمایہ داروں کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ کم منافع پر مال بیچ دیا کریں تو وہ کسی قاعدے کے مطابق منافع کی شرح کو پورا کرنے کی ذمہ داری لے کے مال کی نکاسی کا کام کر سکتی ہے۔ لیکن یہ صورت کسی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے کہ ملک کی پیداوار ملک میں پڑی رہے، ملک والے مجبور کئے جائیں کہ اسے زیادہ قیمت پر خریدیں اور باہر کے خریدار اسے اس وجہ سے نہ لیں کہ انھیں بین قومی نرخ سے زیادہ دام دینے پڑتے ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ حکومت خود ہندوستان کے کپڑے اور شکر کو غیر ملکوں کے ہاتھ بیچ کر غلے کی کمی کو پورا کرے۔ سرمایہ داروں کو ہوس کے پنجے سے چھڑائے اور ملک کو گرانی سے نجات دلائے۔

پیداوار کو بڑھانے کی جو تدبیریں سوچی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت علمی اور صنعتی فیشن کے پھیر میں پڑ گئی ہے اور ساتھ ہی سرمایہ داروں کے نقطۂ نظر سے بے جا اثر لے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں بڑے بڑے رقبے کاشت میں لائے جا سکتے ہیں، اگر آب پاشی کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں جو اسکیمیں تیار ہو گئی ہیں یا زیر عمل ہیں وہ بہت صحیح اور مفید ہوں گی۔ لیکن ان کی تکمیل میں دیر لگے گی اور ان سے حکومت کے اس منصوبے میں کہ ہندوستان ۱۹۵۱ء تک اپنی غذائی ضرورتوں کو خود پورا کرے اگر کوئی مدد نہ ملے گی اس کے علاوہ غلے کو حاصل اور تقسیم کرنے میں حکومت کا اختیار اتنا ہی رہا جتنا کہ اب ہے تو ممکن ہے ہندوستان اعداد و شمار کے لحاظ سے خود کفیل ثابت کیا جا سکے اور بازار میں غلے کا نرخ قریب قریب وہی رہے جو کہ اب ہے۔ آب پاشی کی ان بڑی اسکیموں کے ساتھ ساتھ پیداوار کو بڑھانے کے لئے ٹریکٹر خریدنے اور کیمیاوی کھاد فراہم کرنے کی تجویزیں بھی ہیں۔ ٹریکٹر امریکہ سے آئیں گے اور غالباً کھاد جنوبی امریکہ سے۔ ٹریکٹر اور دیسی ہل کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کیمیاوی کھاد کا صحیح استعمال کیا جائے تو اس سے بھی پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نئی چیزوں کے پھیر میں پڑ کر ہم اپنے خرچ کو بڑھا لیں اور ضرورت پوری کرنے کے ان طریقوں کو نظر انداز کر دیں جو بہت کارآمد معلوم ہوتے اگر ٹریکٹر اور کیمیاوی کھاد خرید لینا اتنا آسان نہ ہوتا۔ دلی کے ایک اخبار نے کلکتہ کی مثال دے کر ثابت کیا ہے کہ اگر شہر کے میلے کو دور پھینک دینا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے کھاد بنا کر ایسے دیہاتوں تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے تو کیمیاوی کھاد کی ضرورت نسبتاً بہت کم ہو جائے گی۔ دیسی ہل بھی ایسا ناقص آلہ نہیں ہے کہ اس کے استعمال سے توبہ کر لی جائے؟ خصوصاً جب جانوروں کو ذبح کرنے کی ممانعت کی جا رہی ہے۔ ٹریکٹر اور کیمیاوی کھاد کا کاروبار سرمایہ داروں کے لئے منافع کا ذریعہ بن گیا ہے، لیکن اگر حکومت کو عام آبادی کو مصروف اور مطمئن رکھنے کا اتنا خیال ہو جتنا کہ چاہئے تو وہ پہلے آدمی اور جانور سے کام لینے کا انتظام کرے گی، اور مشین سے وہاں کام لے گی جہاں ان دونوں کا بس نہ چلتا ہو۔ یورپ کی وہ ایک ترقی یافتہ قومیں روپے اور سامان کی کمی کو قوم میں یک جہتی اور مضبوطی پیدا کرنے کا ذریعہ بنا چکی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان ان کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اپنی ضرورتوں کو پورا نہ کرنے اور زندگی میں جو انتشار نظر آ رہا ہے، اسے دور نہ کرے۔

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

گر ز در طلبی سخن دریں است

کامن ویلتھ کے ملکوں کی جو کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کامن ویلتھ کے ملک کہاں تک امریکہ سے مال منگائے بغیر اپنا کام چلا سکتے ہیں۔ انگلستان نے شروع ہی میں یہ بتلا دیا کہ وہ اپنی درآمد میں دس کروڑ پونڈ کی کمی کرنے کو تیار ہے۔ یہ کمی اس کی موجودہ امریکی درآمد کے ایک چوتھائی کے برابر ہوتی ہے۔ کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں سے بھی اس نے اسی تناسب سے کمی کرنے کو کہا ہے۔ تب ہی امریکہ اور کامن ویلتھ کے ملکوں کے درمیان تجارت میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا ہے، یعنی برآمد کم ہے اور درآمد زیادہ اُسے دور کیا جا سکے گا۔

کامن ویلتھ کے ملکوں میں سے سب نے بصورت مجموعی اپنی درآمد میں ایک چوتھائی کی کمی کرنے کے اصول کو مان لیا۔ لیکن ہندوستان نے یہ کہا کہ اس مجموعی ایک چوتھائی میں ہمارا اپنا تناسب اگر کم رہے تو اس کا کوئی خیال نہ کیا جائے امریکہ سے مال منگانے کے سلسلے میں ہماری ضرورتیں بہت شدید ہیں۔ ہمیں اناج منگانا ہے مشینیں منگانا ہیں، دراصل کم ترقی یافتہ اور زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کا معاملہ یکساں نہیں ہے ہماری زراعت اور صنعت ترقی پا جائے گی تو اس سے کامن ویلتھ ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کی معاشی ترقی اور صنعتی اور تجارتی توسیع کو فائدہ پہنچے گا۔ اس لئے ہمارے ساتھ اس معاملے میں آپ رعایت سے کام لیں۔ اسی میں سب کا بھلا ہے۔ ہم سے ڈالر نہ لیجئے اور جو چاہے مانگ لیجئے۔"

حساب دوستاں در دل

برطانیہ کو جو قرضہ ہندوستان کو ادا کرنا ہے۔ اس کے بارے میں اب پھر چلے جانے ڈھونڈھتے جا رہے ہیں۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک ممبر نے سوال کیا کہ ڈیڑھ سو ... ۳۰ ... قرضے میں سے صرف ۰۰،۴۰ ،۳۰ کروڑ پونڈ ادا کرنا باقی رہ گئے ہیں۔ اس کا جواب نفی میں دیا گیا۔ دوسرے ممبر نے سوال کیا کہ کامن ویلتھ اور امپائر کی مدافعت کے سلسلے میں انگلستان نے جو تقریباً ایک ارب ۲۰ کروڑ پونڈ کا قرضہ ہندوستان سے لیا تھا اب اس میں سے کتنا اور باقی ہے؟ اور کیا اس سب قرضے کو تنہا انگلستان ہی کو اپنے ملک کا مال بلا معاوضہ بھیج کر ادا کرنا ہو گا؟ جواب دیا گیا کہ اس سلسلے میں ہندوستان سے گفتگو جاری ہے جب ختم ہو جائے گی تو اس کے بارے میں بیان نکالا جائے گا۔ ایک تیسرے ممبر نے دریافت کیا کہ کیا انگلستان کی جانب سے جنگ کے زمانے میں جو ہندوستان کی خدمات کی گئی تھیں۔ اس کے معاوضے کا مطالبہ کرنا ابھی باقی ہے اور اس کو ملحوظ رکھا جا رہا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ایسے سب مطالبوں کا تو پچھلے سال تصفیہ کیا جا چکا ہے۔ چوتھے رکن نے کہا کہ ہم نے ہندوستان کو جاپان کا غلام بننے سے بچایا۔ اس خدمت کے معاوضے کا بل، ہندوستان کو بھیجا جائے۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ پانچویں رکن نے کہا کہ ہم سے کئی بار کہا گیا ہے کہ جنگ کے سلسلے میں ہماری طرف سے جو مطالبے ہیں انھیں آئندہ گفتگو کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے اور اب آپ یہ کہتے ہیں کہ ان کا پچھلے سال تصفیہ ہو چکا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔ جواب دیا گیا کہ مدافعت کے سامان، پنشنوں اور دوسرے مطالبوں کا معاملہ تو پچھلے سال طے کیا جا چکا ہے۔ پھر اسی ممبر نے پوچھا میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی حفاظت اور مدافعت کے سلسلے میں ہم کو جو قرض لینا پڑا کیا اس کے بارے میں ہندوستان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا؟ اس پر مخالف جماعت کے اراکین نے تالیاں بجائیں۔ لیکن سرکار کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ پہلے ممبر نے دوبارہ پوچھا کہ کیا ہندوستان لنکا اور پاکستان کی حکومتوں یا کسی اور دوسری حکومت سے کوئی درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس قرضے کے ختم کرنے میں ہماری مدد کریں اور سارا بوجھ برطانیہ کے بدنصیب محصول ادا کرنے والوں پر نہ لاد دیں؟ اس کا بھی سرکار کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

غرض، ہندوستان کے بقیہ واجب الوصول قرضے کو ٹالنے اور باتوں میں اُڑانے کے یہ منصوبے اور ارادے ہیں۔

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی ہے

انڈین کاونسل آف ورلڈ افیئرس نئی دہلی کے ایک جلسے میں، گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالٹکس اینڈ اکنامکس کے ڈائرکٹر پروفیسر گیڈگل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت کو بحران کے نام سے تعبیر کرنا تو ٹھیک نہیں ہو گا لیکن اس بات سے غالباً کسی کو اختلاف نہ ہو گا کہ حالت خاصی خطرناک ہے زندگی کے مصارف میں کمی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تنخواہ داروں اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد نہایت سختی کے دور سے گزر رہی ہے۔ ملک کی قیمتوں اور باہر کے ملکوں کی قیمتوں میں کوئی نسبت باقی نہیں رہی ہے۔

حکومت ان باتوں کو چپ چاپ بیٹھی نہیں دیکھ سکتی کہ خود بخود سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس قسم کے نمائشی چٹکلوں سے کام نہیں چلے گا کہ بنکوں میں لوگوں کی جو امانتیں جمع ہیں ان کی ادائی ملتوی کر دی جائے یا غذا اور زراعتی پیداوار کے دام اس خیال سے کم کر دئے جائیں کہ ان کی دیکھا دیکھی اور سب چیزوں کے دام بھی آپ ہی آپ کم ہو جائیں گے۔ ضرورت سوچ سمجھ کر ایک خاکے کے مطابق کام کرنے کی ہے تاکہ ایک ساتھ بناسپتی تیلوں، تلہنوں اناج، دالوں، کپاس، پٹ سن، کپڑے اور شکر جیسی چیزوں کی قیمتوں اور لاگتوں کو گھٹایا جا سکے۔ یہ کام ناممکن نہیں ہے ضرورت بس ارادہ کرنے کی ہے۔ یہ نہ کیا گیا تو سنکٹ کے بادل سر پر منڈلا رہے ہیں۔

زود پشیماں!

یو۔ پی کانگریس پارٹی کے پچاس، ساٹھ ممبروں نے اپنا جو ایک علیحدہ گروپ بنایا تھا۔ اس پر چاروں طرف سے بہت لے دے کی گئی۔ پنڈت پنت جی نے اس پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ جواہر لال جی نے بھی اسے بہت ناپسند کیا۔ اخباروں نے اس پر کڑی تنقید کی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی اس پر سخت نکتہ چینی کی گئی نیکی برباد گناہ لازم، چلے تھے اصلاح کرنے، خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اس لئے اس گروپ کے لیڈر مسٹر ترلوکی سنگھ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ شاندار طریقے پر پسپا ہو جائیں۔ چنانچہ ایک بیان میں انھوں نے کہا کہ جواہر لال جی کی اس تقریر کے بعد جو انھوں نے کی ہے میں اپنے گروپ کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور کانگریس کی خاطر میں ایک گروپ کیا ایسے ہزاروں گروپوں کو ہمیشہ قربان کر سکتا ہوں

یا دش بخیر!

راشٹریہ سیوک سنگھ اور سرکار میں جو سمجھوتہ ہوا ہے، اور اس کے نظر بند اراکین کی رہائی کا جو سلسلہ جاری ہے اور انھیں اپنے مشاغل کو دوبارہ شروع کرنے کی جو آزادی ملی ہے اس کے بعد لوگ منتظر ہیں کہ دیکھیں اب یہ کیا کرتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے مشاغل کو اصلاحی تمدنی اور ثقافتی کاموں تک محدود رکھیں گے یا سمجھوتے کے خلاف اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بھی جاری رکھنا چاہیں گے اور اپنے مقاصد کے حصول میں تشدد کو جائز سمجھتے رہیں گے بیان کیا جاتا ہے کہ اس معاملے پر سنگھ کے عام اراکین میں ایک عام پھوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی ایک خاصی بڑی تعداد سیاسی جماعت بنانے کے موافق ہے، لیکن چونکہ سنگھ چالک نے اس کو صرف تمدنی مشاغل تک محدود رکھنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لئے یہ لوگ سنگھ کو چھوڑ کر ایک نئی جماعت بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

پاکستان بسلسلہ صفحہ ۲

سلسلے میں اگر مکمل طور سے سائنسی اور خارجی مطالعہ و فکر سے کام نہیں لیا گیا تو وہ پرانی تاریخوں سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہو گی پھر اس سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(امروز۔ کراچی)

۲- پاکستان

کس کو رستگاری ہے

گورنر موڈی بھی گئے۔ پنجاب میں ممدوٹ اور دولتانہ نے سیاست کی جو بساط بچھائی تھی اس پر یہ فرنگی مہرہ بھی چند ہی دنوں میں پٹ گیا۔ اس بساط پر کوئی مہرہ بھی بہت دن نہیں چل سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ پنجابی عوام کو غیر ملکی حاکم کا تسلط گوارا نہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ موڈی صاحب تشریف لے جائیں اور اپنی گوناگوں صفات سے اپنے ہی ہم وطنوں کو مستفید فرمائیں اس لحاظ سے موڈی صاحب کی صوبے سے روانگی پنجابیوں کے لئے دلکشی کا باعث ہوگی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ موڈی صاحب کا وجود اب قومی مفاد کے لئے خطرناک ہوچکا تھا۔ انتشار اور افتراق کی وہ خلیج جس کے سبب ممدوٹ اور دولتانہ کو سیاسی موت کے گھاٹ اترنا پڑا جسے پاٹنے کی خاطر پنجاب میں ۹۲- الف کا نفاذ ہوا، موڈی صاحب کے راج میں کم ہونے کے بجائے دن بدن کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن موڈی صاحب کا جانا یا رہنا ایک جزوی مسئلہ تھا۔ بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ پنجاب کی مریض سیاست کو شفا کیوں کر نصیب ہو۔ پنجاب کے عوام کو روشنی اور امید کا راستہ کس حیلہ سے دکھایا جائے؟ پنجاب کے ہوس شیوہ جاہ پرست اور غرض پسند سیاسی لیڈروں کی دھڑے بندیاں کیوں کر توڑی جائیں؟ پنجاب کے عوام کو اجتماعی فلاح و بہبود کی تگ و دو کے لئے کس صورت سے متحد کیا جائے؟ انھیں رشوت ستانی، خویش نوازی اور ان دوسری لعنتوں سے کیونکر چھٹکارا دلایا جائے جو فرنگی حکومت ہمیں ورثہ میں دے گئی ہے؟ کیا محض موڈی صاحب کے جانے سے یہ سارے قصے طے ہو جائیں گے۔ اور پنجاب کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے؟ کیا نئے گورنر صاحب ہر مرض کا دارو اور ہر زہر کا تریاق اپنے ساتھ لائیں گے؟ کیا ممدوٹ، دولتانہ اور موڈی کے بعد اب اور کوئی گریبان چاک نہیں ہوگا اور نہ کوئی اور دامن داغ داغ، ایسا کہنا اور ایسا سمجھنا فریب دہی بھی ہے اور خود فریبی بھی۔۔

تو سوال یہ ہے کہ مرض کا علاج کیا ہے؟ علاج یہ ہے کہ پنجاب میں سیاست اور جمہوریت کا جلد از جلد اور مکمل احیاء کیا جائے۔ انتخابات کی تاریخ کا بالغ رائے دہندگی کی بنا پر فوری اعلان کیا جائے ہر سیاسی جماعت چند بھڑکتے ہوئے نعروں کے بجائے اپنا عملی سیاسی پروگرام عوام کے سامنے پیش کرے اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع کرے۔ عوام کے تمام شہری اور جمہوری حقوق کو بحال کیا جائے اور عوام کی توجہ دوبارہ ذاتی جھگڑوں کی بجائے اجتماعی مقاصد کی طرف مبذول کرائی جائے، عوام کے دکھ درد کا علاج ان کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ میں نہیں اور وہ اس وقت تک اس علاج کو عمل میں نہیں لا سکتے جب تک زمام کار ان کے ہاتھوں میں لوٹا نہیں دی جاتی۔

(امروز - کراچی)

پنجاب کا مستقبل

سر فرانسس موڈی کے استعفے کے وجوہ سے ہمیں عام حالات میں کسی بحث کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن جن معاملات کا اثر صوبے اور اس کے مستقبل پر پڑے اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ موڈی رہے یا جائے لیکن صوبے کو تو بہرحال رہنا ہے اور اطمینان سے زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ تو موڈی کی طرح استعفیٰ دے کر کہیں نہیں جا سکتا۔

اس بنیادی معاملے کے متعلق ہماری رائے کسی اعادہ کی محتاج نہیں ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مسٹر لیاقت علی خاں کے ذہن میں آئندہ کا نقشہ کیا ہے اور وہ اس بدنصیب صوبے کے حالات کی اصلاح کس طریق پر کرنا چاہتے ہیں؟ مسئلہ سر فرانسس موڈی کا نہیں سوال صوبے کا ہے۔ اس کے بچاؤ اور اس کے حالات کی درستی کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ صوبہ کیوں کر گوناگوں الجھنوں اور مصیبتوں سے باہر نکلے۔ جسے قائد اعظم مرحوم پاکستان میں کونے کا پتھر کہا کرتے تھے۔

چودھری خلیق الزماں کا نقطۂ نگاہ بڑی سمجھ میں آ سکتا ہے وہ مہاجر نہیں ہیں اپنی خوشی سے پاکستان آئے اور بظاہر اسی لئے آئے کہ جب ان کے دوسرے ساتھی یہاں برسر اقتدار ہو چکے ہیں تو وہ کیوں پیچھے رہیں؟ ایسے ایک دو نہیں سیکڑوں افراد یہاں موجود ہیں جنھیں کسی نے نہیں نکالا تھا، جن کی جائدادیں محفوظ ہیں اور وہ اقتدار کی آرزو میں یہاں چلے آئے لیکن مسٹر لیاقت علی خاں کا نقطۂ نگاہ اب تک ہم نہیں سمجھ سکے۔

(۱) اگر ان کے پیش نظر صوبے کے حالات کی اصلاح اور خرابیوں کے تمام سرچشموں کا انسداد ہے تو یقیناً اس کی صورت یہ نہیں کہ جن لوگوں کی نالائقی کے باعث حالات پہلے خراب ہوئے تھے انھی لوگوں کے ہمدرد اور رفیق اور ساتھی اب مختار بنائے جائیں۔

(۲) اگر موجودہ لیگ میں وہ لوگ بھی خاصی تعداد میں شریک ہیں جن کی وجہ سے پہلے ہولناک خرابیاں پیدا ہوئیں تو اب سب کچھ ان کے حوالے کر دینا کس بنا پر مناسب ہے؟

(۳) جن لوگوں پر الزام لگ چکے ہیں ان کی تحقیقات کیوں کر ہوگی؟ مجرموں کو ان کے گناہوں کی سزائیں کیوں کر ملے گی؟ کیا انصاف کے مقاصد کو پورا کرنے کی صحیح شکل یہ ہے کہ جو لوگ ملزم ہوں ان کے ہاتھ یا ان کے ہمدردوں اور دوستوں کے ہاتھ میں سارے معاملات کی باگ ڈور دے دی جائے؟

(۴) دفعہ ۹۲ الف کا مدعا یہ ہے کہ نمایندگانِ عوام معاملات کو سنبھالنے کے اہل نہیں رہے۔ پھر انھیں مختار بنانے یا ان کے نامزد آدمیوں کو وزیروں کا درجہ دینے کا کیا مطلب ہے۔ صورتیں دو ہوں گی یا تو دفعہ ۹۲ الف کو ختم کرنا ہوگا یا مشیروں کو وزیروں کا درجہ نہیں ملے گا۔ امتناقض چیزیں بیک وقت جاری نہیں رہ سکتیں۔

(۵) پہلے اسمبلی کے ہوتے ہوئے وزیروں نے ہر اچھی چیز کا ستیاناس کیا اور صوبے کو تباہی کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ اب اسمبلی بھی نہیں ہوگی اور مشیر فوراً وزیروں کا درجہ دے دیا جائے گا۔ کیا پانچ چھ مہینے میں لیگ اپنا دامن حوض کوثر میں دھو آئی ہے یا کیا جلال الدین عبدالباری کی فرشتگی نے ساری لیگ کو فرشتہ بنا دیا ہے؟

(۶) پنجاب وہ صوبہ ہے جس کے مسائل سب سے بڑھ کر اہم اور پیچیدہ ہیں۔ یہاں حد درجہ دیانت دار اور ہمدرد آدمیوں کی ضرورت ہے لیکن عجیب ہے کہ پنجاب ہی کے متعلق ابتلا سے اب تک بے توجہی پر عمل ہوتا رہا۔

(انقلاب، لاہور)

پاکستان کی نئی تاریخ

اطلاع ہے کہ "پاکستان ہسٹری بورڈ" نے وہ بنیادی اصول مرتب کر لئے ہیں جن کے مطابق پاکستان کی نئی تاریخ لکھی جائے گی۔ مختلف ابواب مختلف اشخاص کے حوالے کر دئے گئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ چھ ماہ کے اندر اندر نئی تاریخ تیار ہو جائے گی۔

جس تاریخ کا موضوع عہد قدیم سے لے کر زمانہ حال تک کا طویل عرصہ ہوا جو صرف ۶ ماہ کے مختصر سے عرصے میں تیار کر دی گئی ہو اور جس کے متعدد لکھنے والوں کے ذہنوں میں کوئی بنیادی ہم آہنگی اور کوئی سائنٹفک فلسفہ موجود نہ ہو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پرانی تاریخوں سے بنیادی طور پر کوئی مختلف چیز ہوگی۔ اخبارات میں جن موعودہ نئے اصولوں کا مختصر سا ذکر آیا ہے کم از کم ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پرانی ہی تاریخ میں ادھر ادھر سے کچھ ردو بدل کر کے "نئی" تاریخ مرتب کر دی جائے گی۔

کہا گیا ہے کہ نئی تاریخ سختی کے ساتھ واقعات و حقائق کے صرف بیان تک محدود رہے گی، لیکن ہمارے خیال میں یہ کافی نہیں۔ تاریخ نویسی یقیناً یہ نہیں کہ واقعات و حقائق کو بے ہنگم طریقے سے ایک جگہ جمع کر دیا جائے بلکہ ان کا اس طرح مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے کہ ان بنیادی طاقتوں اور معاشرتی و اقتصادی اسباب و علل کا اندازہ ہو سکے جو تاریخی مظاہر کو جنم دیتے ہیں۔

بورڈ کے مرتبہ اصولوں میں یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ اب تک ہمارے ذہن میں جس قسم کی تاریخ ٹھونسی گئی ہے۔ اس میں اجتماع کو نظر انداز کیا گیا ہے اور بادشاہوں اور حکمرانوں سے طالب علم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

غرض نئی تاریخ مرتب کرنے سے پہلے

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

غزل

اثر لکھنوی

تری بزم سے جو اُٹھے یونہیں بار بار آئے
کبھی عذر خواہ آئے کبھی شرمسار آئے

ترے وعدے میں ستم گر وہ غضب کی دلکشی ہے
کہ ہزار دل نہ مانے مگر اعتبار آئے

وہ ہلاک شوق جو ہے فقط اک نگہ کا مجرم
تری کج ادائیوں پر اُسے کیوں نہ پیار آئے

نہ یہ سرگرانیاں تھیں نہ یہ بدگمانیاں تھیں
وہ زمانہ پھر خوشی کا مرے کردگار آئے

سبھی ہم صفیر مل کر سر شاخ نغمہ زن ہوں
وہی روزگار پھر ہو، وہی پھر بہار آئے

یہ تلمرو محبت کی عجیب رسم دیکھی
وہی جیتے دل کی بازی کہ جو دل کو ہار آئے

فقط اک میں نہیں ہوں جسے شوق اس قدر ہے
تری آرزو میں گل بھی ہمہ تن کنار آئے

دل راحت آرزو کو خلش آشنائے غم کر
یہی ایک شکل اثر ہے کہ تجھے قرار آئے

عید کی مسرتیں

اختر تلہری

آئی ہے عید بادۂ عشرت لئے ہوئے — سامان صد ہزار مسرت لئے ہوئے
چاروں طرف ہے جلوہ نما چہرۂ بہار — ہر گلستاں ہے روح لطافت لئے ہوئے
ہر سمت ہے سرور کی محفل جمی ہوئی — دنیا ہے شادعیش کی دولت لئے ہوئے
ہر غنچہ ہے نشاط کا فردوس رنگ و بو — ہر گل ہے انبساط کی جنت لئے ہوئے
ہر چہرے پر ہیں رقص کناں شادمانیاں — ہر دل ہے اہتزاز کی نعمت لئے ہوئے
ہنس ہنس کے ہو رہے ہیں بغل گیر خاص و عام — رگ رگ میں اپنے عید کی بہجت لئے ہوئے
یہ سب ہے لیکن اختر دل خستہ و حزیں — بیٹھا ہے غم نواز طبیعت لئے ہوئے
بہلتے نہیں ہیں اس کو کرشمے فریب کے — اس کے لئے یہ جشن ہے عبرت لئے ہوئے
وہ سن رہا ہے ساز طرب سے الم کے راگ — ہے اس کی عقل چشم بصیرت لئے ہوئے
اس ازدحام عیش و طرب میں بھی وہ غریب — ہے غم زدوں سے اُنس کی فطرت لئے ہوئے
وہ جانتا ہے خوب کہ یہ لالہ زار عیش — ہے خون اہل درد کی رنگت لئے ہوئے
یہ شادکامیوں کی بہاریں ارم بدوش — ہیں آتش جحیم امارت لئے ہوئے
اے مست نائے و نوش خبردار ہوشیار — ہے انقلاب تیغ ہلاکت لئے ہوئے
یہ مستی طرب یہ مسرت کے زمزمے — ہیں تیری واژگونی قسمت لئے ہوئے

آنکھوں کو کھول دیکھ ذرا دہر کی فضا
طالع ہوا ہے مہر قیامت لئے ہوئے

پیام سحر

خیال مینائی

افق کے پار

سر و زنجیر میں جکڑا ہوا حسن مجبور — مست آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے اشکوں کی قطار
ایک بجلیوں کی حسین موج فلک سے کچھ دور — ایک انگڑائی کا انداز اُفق کے اس پار

اظہار حقیقت

مساوات و رواداری کہاں ہے — فضاؤں میں تعصب کا دھواں ہے
نہ وہ چہرے نہ وہ اگلی سی باتیں — نہ وہ اگلا سا انداز جہاں ہے

کاوش غم

صدا آتی ہے کانوں میں یہ پیہم — نہیں راحت سے کوئی اس جہاں میں
وہی ہے رازدار کاوش غم ——! — مزا آئے جسے آہ و فغاں میں

عالم انقلاب

میں نے ہر پھول کو گلستاں میں — وقف صد اضطراب دیکھا ہے
کیا تسلی ہو اس کی نظروں کو ——! — جس نے یہ انقلاب دیکھا ہے

زوال سرمایہ داری

یہ غفلت کب تلک اے زر کے پجاری — ہوا اک خواب عہد کامگاری
تری تقدیر برگشتہ ہے تجھ سے — کہ دم توڑے گی اب سرمایہ داری

تین شعر

میں اگر چاہوں بدل ڈالوں نظام کائنات — میری فطرت سر بہ سر نا آشنائے ذوق جنگ
میں کبھی گاتا نہیں "فرسودہ نغمات غزل" — میرے سینے میں نہیں ہوتی ہے ارمانوں کی جنگ
کون دیکھے مے کدہ بردوش شام انتظار — میرے پہلو میں نہیں کوئی نگار شوخ و شنگ

مرحومہ

صالحہ عابد حسین

مرحومہ، خدا اُسے بخشے۔ آج ہم میں نہیں...... مگر اس کی ان مٹ یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کی صفات اور خوبیوں کو گنانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس میں کیا نہ تھا؟ حسن دلکشی، وقار، سلیقہ، صفائی، نڈرپن، خود اعتمادی۔ وہ کون سے زنانہ اور مردانہ اوصاف ہیں جن سے وہ مزین نہ تھی۔ دنیا میں کتنی ایسی ہستیاں ہیں جو اتنی بہت سی خوبیوں کی مالک ہوں!!

ہاں اس کے مخالف اور دشمن بھی تھے جو اسے بُرا کہتے تھے۔ پر کون اس دنیا میں ایسا وجود ہوگا جس کے کچھ نہ کچھ مخالف موجود نہ ہوں، رشک وحسد، بدگوئی اور غیبت تو انسانی فطرت ٹھیری۔ اس کے مقابلے میں بھی انسان نے اپنی اس فطری کمینگی کا خوب خوب ثبوت دیا...... مگر وہ ان جاہل آدمیوں کی دشمنی اور مخالفت کی کیا پروا کرتی تھی۔ وہ ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی۔ آنکھوں میں حقارت اور حیرت کا ملا جلا رنگ نظر آتا۔ اور پھر وہ وقار اور تمکنت کے ساتھ مخالفوں کے مجمع میں سے نکل کر اپنے راستے چلی جاتی اور لوگ اس کی شان اور اندازِ خوداعتمادی سے مرعوب اور مغلوب ہوکر رہ جاتے۔ پیٹھ پیچھے کچھ بھی بکا کریں...... سامنے بڑے سے بڑے سورما کی بھی ہمت نہ تھی کہ اس کی مخالفت کرے یا اسے کوئی زک پہنچا سکے۔

ہاں...... وہ ہمارے خاندان کی فرد نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس نے بعض دلوں میں اپنی ایسی جگہ بنالی تھی، اپنی لاثانی صفات سے ایسا گھر کر لیا تھا کہ اس کا سا درجہ کسی کو حاصل نہ تھا...... گھر کا کوئی فرد اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر کوئی خودسر ناعاقبت اندیش اس کی جسارت کرتا تو اسے منہ کی کھانی پڑتی تھی۔

آج وہ ہم سے بچھڑ کر، اس عالم فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو رخصت ہو چکی ہے...... لیکن آہ ...... دل اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مانا کہ اس کا سن بہت کم نہ تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ عمر طبیعی کو پہنچ کر اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مگر اس عمر میں بھی اس کا جوانوں کا سا دم خم حسن اور تناسب اعضا، اور پھر اس کی بے مثل تندرستی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ہستی کبھی فنا ہو سکتی ہے...... بچے اور جوان اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے تھے...... شاید ہم مر جائیں مگر کیا اسے بھی موت آسکتی ہے؟ محال ہے......

اور یہ کوئی حسن ظن نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی کٹھنائیاں سہار گئی تھی۔ بیس بچوں کی پیدائش اس نے خاموشی اور خندہ پیشانی سے جھیلی تھی۔ اور اس کے جسم اور صحت پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ وبائی اور موسمی بیماریوں کو ہرایا تھا۔ حادثات کا مقابلہ کیا تھا...... ہر مرتبہ موت کے فرشتے کو شکست دے کر شکبرانہ شان سے فاتح ہوئی تھی۔ اور آج ...... آج وہی لافانی ہستی ملک الموت کا نوالہ بن گئی...... وہ آغوش قبر میں آرام کی نیند سو رہی ہے، اور اس کے چاہنے والے آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں...... اور اس کی زندگی کے مختلف دور چلتی پھرتی تصویروں کی طرح میری نظروں میں پھر رہے ہیں۔

جس دن وہ پہلے پہل اپنی ماں کے ساتھ گھر میں آئی تو ایک ننھی سی بچی تھی۔ اس کی ماں بھی اللہ بخشے بڑی خوبصورت آن بان والی تھی۔ اس کی حیثیت اگرچہ ایک زرخرید سے زیادہ نہ تھی مگر چونکہ وہ اونچے قبیلے اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور خود اسے اپنے خاندانی وقار اور ذاتی اوصاف کا پورا پورا احساس تھا، اس لئے سبھی لوگ اس کا پاس لحاظ کرتے تھے۔

اور جب چند سال بعد بڑی بی ایک رات نمونیہ کا شکار ہو کر چل بسیں، اور ان کی بچی بے ماں کی رہ گئی تو خاندان کے ہر فرد کو اس بے ماں کی بچی سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ اور بیوی جی کو تو اس پر اتنا رحم اور اتنا پیار آنے لگا کہ انھوں نے سچ مچ اُسے اپنی بچی بنا لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ محبت اس درجہ تک پہنچ گئی جسے سچا عشق کہا جاتا ہے...... وہ پاک محبت جو نفسانی خواہشات سے بالاتر ہے اور معرفت حق حاصل کرنے کا ایک زینہ! بیوی جی اس کی نیند سوتیں اور اسی کی نیند جاگتیں...... اس کا کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرتیں اور سامنے بٹھا کر کھلاتیں۔ غذا میں طاقت، صحت اور پسند کا خاص خیال رکھا جاتا...... اس کے رہنے کے لئے الگ ایک کمرہ۔ سونے کے لئے خوب صورت کھٹولا، بیٹھنے کے لئے کوچ اور پیڑھیاں، جاڑے میں اعلیٰ کشمیری چادریں اور روئی کی صدریاں یعنی وہ کون سی نعمت تھی جو اُسے نصیب نہ ہو، یوں بھی اُسے آزادی تھی کہ گھر میں جہاں چاہے جائے، جو چاہے لے کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بھی اس عیش وعشرت اور محبت کے سائے میں پل کر وہ رنگ روغن اور ہاتھ پاؤں نکالے کہ جو دیکھتا دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا......

جوان ہوئی تو ہر طرف سے اس کے پیام آنے لگے...... نوجوان اُسے ایک نظر دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتے تھے، اور کیسے نہ ہوتے؟ اس نے ہرن جیسے اعضا کا تناسب اور آنکھوں کا سحر لیا تھا۔ کبک طاؤس سے اس کی چال اُڑائی تھی۔ مہوشان کشمیر سے رنگ و روغن چھینا تھا حسن و تناسب، تندرستی اور دلکشی کا حسین امتزاج تھی...... وہ پھولوں کا رنگ اور چہک تھی!!

پیامات آتے رہے مگر بیوی جی اُسے کس دل سے اپنے سے جدا کر دیتیں...... آخر اس کے حسن کا ایک دیوانہ اس پر نثار ہو گیا کہ وہ جہاں رہے وہیں رہے اور ایک دن چپ چپاتے اس کا بیاہ ہو گیا......

...... داماد کون ہے، کہاں رہتا ہے، یہ کسی کو معلوم نہ تھا، البتہ وہ خود اپنی شادی سے بہت خوش تھی...... وہ کم سخن تھی...... نہ کبھی منہ سے کوئی چیز مانگتی، نہ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرتی، نہ اپنے منہ سے اپنے یا کسی کے بارے میں کچھ کہتی...... لیکن زبان کی اس کمی کو اس کی آنکھیں پورا کر دیتی تھیں...... وہ کالی کالی چمکتی بڑی بڑی آنکھیں! بھوک، تکلیف، رنج، سردی، گرمی، محبت، نفرت، خوشی، غم، شکریہ، احسان مندی ہر جذبے کا اظہار اس کی آنکھیں کر دیتی تھیں......

بیوی جی نے داماد کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی بچی کی شادی سے بہت خوش تھیں اور جب اُن کو یہ پتہ چلا کہ اب اس کے ثمرِ محبت میں آنے والا ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی...... اس کی اور بھی خاطر، خیال اور ناز برداری ہونے لگی۔ اور تھوڑے دنوں بعد ہی وہ ایک بچے کی ماں بن گئی......

بچی کا رنگ اگرچہ کالا تھا۔ باپ کی صورت کا اثر بھی تو آنا ہی تھا نا! پھر بھی وہ گھر بھر کی لاڈلی ہو گئی۔ اس کی غذا کا اب اور بھی خیال رکھا جانے لگا...... اچھا کھانا نہ کھائے گی تو دودھ جو نہ ہوگا...... وہ بھی اب اپنی اہمیت کا پورا اندازہ کر چکی تھی۔ بُرا یا بدمزہ کھانا چھوتی بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی ذرا اس سے بے رخی یا بدسلوکی کا برتاؤ کرتا تو جانے کیسے وہ بیوی جی سے کہہ دیتی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا...... اور اس کے مخالف کو بیوی جی کے غصے اور غضب کا شکار ہونا پڑتا۔

جب تک اُسے شہر میں رہنا پڑا تو آنا دیکھنے کی یہ آزاد منش ہستی اس گھٹی فضا میں مرجھائی ہوئی سی رہتی...... نہ سیر و تفریح کی جگہ نہ ملنے جلنے کا موقع نہ باغوں کی سیر...... لیکن خدا کا کرنا کہ اس کے نصیب سے بیوی جی شہر سے گاؤں میں اُٹھ آئیں...... نئے گھر میں بھی اس کے لئے رہنے کا الگ کمرہ اور اُٹھنے بیٹھنے سونے...... اور کھانے کے لئے ضروری فرنیچر اور سامان فراہم کیا گیا۔ وہ اس آزاد اور کھلی فضا میں بہت ہی مسرور اور مگن تھی، اس نے جب چاروں طرف نظر ڈالی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی...... چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت، جن کے وسط میں کہیں کہیں

سرخ سرخ مکان .... اِدھر اُدھر چند ننھی ننھی پہاڑیاں - دو چار چھوٹے چھوٹے باغ جن میں کھلے ہوئے گلاب اور خوشبودار نیبو کے پودے اس کو بہت ہی محبوب تھے .... اور ہر طرف اس کے قبیلے کے نوجوان اور خوبصورت افراد بسے ہوئے جن سے تعلقات بڑھانے اور دوستی پیدا کرنے کی اسے پوری آزادی تھی۔

وہ صبح کے ناشتے کے بعد بچوں کو ساتھ لے کر ٹہلنے نکل جاتی - اِدھر اُدھر کودتی، اچھلتی، خرام ناز سے سبزے کو پامال کرتی، گلابوں سے شوق فرماتی، ہرے بھرے کھیتوں کو اپنے مشق ستم کا نشانہ بنایا کرتی تھی۔ اگر بیوی جی کا کوئی آدمی ہوا اس کی حفاظت کے لئے وہ ساتھ کر دیا کرتی تھیں اور اسے روک ٹوک کرتا تو وہ چراغ پا ہو جاتی اور خفا ہو کر فوراً گھر میں جا کر منہ پھُلا کر بیٹھ جاتی تھی۔

بہت سے نوجوان یہاں بھی اس کے حسن و انداز پر فریفتہ ہو چکے تھے ——— ساری حسیناؤں کا رنگ اس کے سامنے پھیکا پڑ چکا تھا........

وہ اتنی حسین ہوتے ہوئے بھی ظالم اور بے وفا نہ تھی - ہمدردی اور محبت نوازی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اپنے کسی عاشق کا دل نہ توڑتی۔ کسی کو مایوس نہ کرتی........

اور جب شام کو وہ سہیلیوں سے پیچھا چھڑا کر اور عاشقوں کو دم دلاسا دے کر محلے والوں کی خفگی کو حقارت سے ٹھکرا کر نیبوؤں کی بھینی بھینی بو میں بسی گلابوں کی روح پرور خوشبو میں نہائی - سبزیوں اور ترکاریوں سے دامن بھرے جب وہ گھر میں داخل ہوتی تو اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا - وہ بھی سارے گھر میں اٹھلی اٹھلی پھرتی - گھر کی چیزوں کی ہر وقت کی باقاعدگی اور صفائی سے اس کا جی اکتا جاتا وہ ان کو اِدھر اُدھر بکھیر دیتی........ بے رنگ صفائی کی جگہ گندگی کی ذرا سی آمیزش اُسے بہت بھاتی تھی........ غرض کچھ دیر وہ اپنی شوخی سے گھر میں ایک زندگی اور رونق پیدا کر کے پھر ایک شاہانہ وقار کے ساتھ اپنے مخصوص کوچ پر نیم دراز ہو جاتی تو ایسا لگتا کہ کوئی حسین ملکہ دن بھر کے سلطنت کے کاموں سے تھک کر شام کو اپنے محل میں لونڈیوں اور مصاحبوں کے ہجوم میں بیٹھ کر مسکرا رہی ہو........

اب کے بچے اور بھی جلدی جلدی ہوتے ——— اور اکثر جوڑواں ——— یہ بچے بھی بالکل ماں کے قدم بقدم پیچے سپوت تھے - گھر میں بھی ان کی شوخیوں اور شرارتوں سے ہنگامہ برپا رہتا، اور محلہ پھر ان سے پناہ مانگتا........ لیکن ماں بچوں کو بیوی جی کی سرپرستی اور محبت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اپنی بڑی سے بڑی شرارت یا شوخی پر کبھی پشیمان نہ ہوتے........ یہ بچے جیسے ہی جوان ہوتے تو لڑکیاں بیاہ دی جاتیں - بیٹے کمائی کرنے نکل جاتے اور ہر طرح اپنی محسنہ کے احسانوں کا دامے درمے قدمے بدلہ کیا کرتے تھے۔

اگرچہ بیوی جی کی محبت میں غرض کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا - پھر بھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے احسانوں کا اعتراف نہ کرتیں! آخر اس کی بدولت انھیں کتنا فائدہ اور آرام پہنچتا تھا! جب کبھی گھر کا کوئی حاسد فرد یا محلے کا کوئی بدخواہ شخص اس کی شکایت کرتا تو وہ اس کی صفات اور خدمات کی اتنی تعریف کرتیں اور شکایت کرنے والے کو اتنا شرمندہ کرتیں کہ وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا آتا اور اُسے دل میں اعتراف کرنا پڑتا کہ اُس کے جو کچھ نقصانات ہوتے ہیں، پھل پھول، ترکاریاں، اور کوئی چیز ضائع ہو جاتی ہے تو اس میں دراصل اُسی کا قصور ہے........ اس نے کیوں اپنی چیز بے احتیاطی سے ڈالی........ کیوں گھر کا دروازہ کھلا رکھا؟ وہ آزاد دیس کی، آزاد قبیلے کی آزاد ہستی ہے - اس پر کیسے کوئی بندش لگائی جاسکتی ہے بھلا! یہ تو ہم لوگوں کا جو صدیوں سے غلامی اور بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں، فرض ہے کہ اپنی چیز کی حفاظت کریں - اس کا بھلا کیا قصور؟

گھر والے بھی خوب جانتے تھے کہ خواہ کچھ ہو جائے بیوی جی اس کی جدائی نہیں سہہ سکتیں - خود بیوی جی کے "گھر والے" اور بچے خواہ اس سے کتنا ہی جلیں لیکن یہ ہمت نہ تھی کہ اُسے خانہ بدر کرا دیں - وہ جان گئے تھے کہ اگر اس پر ذرا سی آنچ آئی تو بیوی جی کی جان پر بن جائے گی - اگر وہ کبھی رات پر اپنے کسی دوست کے ہاں رہ جاتی تو بیوی جی رو رو کر بُرا حال کر لیتیں کہ ضرور کسی دشمن نے اُسے مار ڈالا ہوگا اور ہر طرف اس کی تلاش میں آدمی دوڑنے لگتے........ ایک مرتبہ جانے کیا ہوا کسی عاشق سے لڑائی ہو گئی یا بیوی جی کی کوئی بات ناگوار گزری یا محلے میں کسی سے جھگڑا ہوا۔ بہرحال وہ ایک دم گھر سے غائب ہو گئی اور تین دن تک اس کا پتہ نہ چلا - سب گھر والے، گاؤں والے محلے والے اس کی تلاش میں سرگرداں تھے........ اور بیوی جی کا یہ حال کہ کھانا پینا چھوٹ گیا، روتے روتے نڈھال ہو گئیں اور دن رات پریشان پھرا کرتیں کہ ضرور اسے دشمنوں نے مار ڈالا ہے........ اور اس بنا پر وہ گھر اور باہر کے ہر فرد سے بیزار اور ناراض تھیں........ آخرکار تین دن بعد وہ ایک اندھے کنوئیں میں پڑی نیم جاں ملی........ خودکشی کی یہ کوشش اس نے کیوں کی؟ یہ کسی کو پتہ نہ چلا۔ نہ اس نے کسی کو کچھ بتایا، نہ کسی کی پوچھنے کی ہمت پڑی........ دو چار دن بعد وہ پھر اسی دم خم کے ساتھ سارے میں چوکڑیاں بھرتی، گلابوں سے شوق فرماتی، ترکاریوں کو لوٹتی پھر رہی تھی اور جن لوگوں نے اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی یا اس کے ملنے کی دعائیں مانگی تھیں وہ پینے کو کوس رہے تھے ——— اُف یہ سخت جان ظالم!! ہم نے کیوں اس کے لئے دعا مانگی!!

پچھلے کچھ دنوں سے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ اس میں اب وہ پہلا سا دم خم نہیں رہا - باہر کی سیر کی جگہ اسے گھر میں رہنا بھلا لگتا ——— جسم میں بھی اب وہ تناؤ اور چال میں وہ تیزی نہ رہی تھی - بال سفید ہو چلے ——— اگرچہ اس کی سندرتا میں اس سے زیادہ فرق نہ پڑتا تھا - بچے بھی اب بہت جلدی جلدی نہیں ہو رہے تھے ——— پھر بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی داغ جدائی دے جائے گی۔

اور پھر اچانک بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک بہت بیمار رہی - بیماری میں بھی اس کی آن بان میں فرق نہ آیا - وہ اس حال میں بھی کمرے کے اندر رفع حاجت کرنا گوارا نہ کرتی - ہر قسم کی بو سے اُسے نفرت تھی۔ کھایا کچھ نہ جاتا مگر جب بیوی جی آنکھوں میں آنسو بھر کر اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے بیٹھتیں تو وہ ان کی خاطر ذرا سا چکھ لیتی تھی ——— منہ سے ہائے یا اُف کی آواز اس نے کبھی نہ نکالی........

لیکن اس کی حالت دیکھ دیکھ کر چاہنے والوں کا کیا ذکر مخالف بھی متاثر ہو رہے تھے - پہلے پہلے گھر کی دوا دارو ہوا کی........ پھر اسپتال بھیجا گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ پیٹ میں بچہ مر گیا ہے........ سب انگشت بدنداں رہ گئے ——— اس عمر میں بچہ!!! اپنے مقصد حیات کو پورا کرنے کی ایسی لگن!! وفاداری کی یہ حد!! بیوی جی کی محبت اور اس کو بچا لینے کی خواہش نے اور شدت پکڑی........ ڈاکٹر آئے - دوائیں، انجکشن، سنک دور کرنے کے لئے سیبی زول کی گولیاں، ٹانک، مقوی غذا سبھی کچھ تو دیا گیا ——— ڈاکٹر، پڑوسی، تیمار دار، گھر والے سب کو خیال تھا کہ وہ بچ جائے گی، مگر بیوی جی کو اس کی زندگی سے مایوسی ہو چکی تھی! سچے چاہنے والے کے دل کو جدائی کی خبر پہلے ہی سے ہو جاتی ہے........ اور آخر ایک دن صبح صادق کے وقت بیوی جی کے ہاتھوں میں اس خوش نصیب اور اس لاثانی ہستی نے دو ہچکیاں لیں - حسرت سے بیوی کو دیکھا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

آہ مرحومہ!! بربری قبیلے کی تجھ جیسی حسین شوخ اور اتنے بچے دینے والی ہستی اب کہاں ملے گی؟ تو چلی گئی - پر اپنی یاد ہمیشہ کے لئے دلوں میں چھوڑ گئی - ہائے اب کون لیموں اور گلاب کھانے دوڑتا ہوا گیا گھر لے گا؟ کون کھیتوں کی ہریالی اور سبزیوں کا صفایا کرے گا........ کون سال میں تین تین بچے اور روزانہ ڈھائی سیر دودھ دے گا؟ کون اپنی شوخی اور خرام ناز سے دلوں کو برمائے گی - تیری سی لاثانی صفات کسی خاکی ہستی میں کہاں ہوتی ہیں؟

آج گلاب کھلے ہیں [illegible] نیبو [illegible] ترکاریاں [illegible] حال سے تیرے غم میں [illegible] .... آ تو یہ سرسبز کھیت یہ ہری بھری ترکاریوں کی کیاریاں پکار رہی ہیں - کہاں ہے وہ ہمیں نوازنے والی، ہمیں پامال کرنے والی؟ تو نہیں لیکن تیرے کارنامے تیرے چاہنے والے اور تیرے دشمنوں دونوں کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے

مغلوں نے ہندوستان کو کیا دیا

سید سخی حسن نقوی

دادا اور ان کا حقہ دو ایسی چیزیں تھیں جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دادا ہمارے اصلی دادا تو تھے نہیں، اور نہ کوئی ہمارے رشتہ کے دادا تھے۔ البتہ چونکہ انھیں ہمارے یہاں رہتے کئی پشتیں گذر گئی تھیں اور ہم تو ہم ہمارے ابا جان کو بھی انھوں نے گودوں میں کھلایا تھا، اس لئے ہم سب انھیں دادا کہتے تھے۔ ان کی عزت کرتے تھے اور ایک حد تک ان سے ڈرتے تھے اس لئے دادا کے ساتھ کسی قسم کی شرارت کا سوال تو پیدا ہوتا ہی نہیں تھا البتہ ان کے حقے کے ساتھ کبھی کبھی شوخیاں ہوتی رہتی تھیں، جو گویا دوسرے لفظوں میں انھیں کے ساتھ ہوتی تھیں، کیونکہ دادا اور ان کا حقہ ایک جان دو قالب کی طرح تھے۔ دادا کے نہ بیوی تھی، نہ لڑکا نہ لڑکی، اور نہ کوئی اور عزیز۔ لے دے کے ان کے ایک ہی دوست تھا، اور وہ تھا ان کا حقہ۔ چنانچہ مرتے دم تک دادا اور ان کے حقے کا ساتھ نہ چھوٹا۔ صبح سویرے اٹھ کر دادا سب سے پہلے حقے کو منہ لگاتے پھر اوروں سے بات کرتے، اور پھر دیر تک حقہ ہی سے دل بہلاتے رہتے۔ ان کی اور حقے کی بات چیت کا مطلب یا تو وہ خود سمجھ سکتے تھے یا ان کا حقہ۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں حقہ گڑگڑا کر کے سوال کرتا اور دادا کھانس کھانس کر جواب دیتے رہتے۔ بچپن میں ہمارا خیال تھا کہ حقہ سے اتنا گہرا تعلق صرف دادا ہی کو ہے، مگر بعد میں پتہ چلا کہ حقہ کو دنیا اپنا تی ہے اور کم از کم ہندوستان میں تو اس کا رواج عام ہے۔ اس رواج کی ابتدا کب سے ہوئی کیوں کر ہوئی اور کس نے کی؟ یہ سوالات اس وقت تو دل میں نہ گذرتے تھے اور اگر گذرتے بھی تو ہم ان کا جواب نہ دے سکتے تھے لیکن اب بڑے ہو کر یہ سب باتیں معلوم ہو گئیں۔ ہندوستان کو یہ تحفہ مغلوں نے دیا۔ آپ کہیں گے یہ تو کوئی عمدہ تحفہ نہیں تھا اور آپ کا کہنا ٹھیک بھی ہے، لیکن نہیں مغلوں نے ہمیں بڑے اچھے اچھے تحفے بھی دئے تھے۔

ہندوستان میں بہت سی قومیں باہر سے آئیں، لیکن ہندوستان کو جتنا مغلوں نے مالا مال کیا اتنا کسی اور نے نہیں کیا۔ مغلوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی جو حالت تھی اس کی تصویر بابر نے خود اپنے لفظوں میں اس طرح کھینچی ہے وہ لکھتا ہے " ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، انگور نہیں، خربوزہ نہیں، برف نہیں ٹھنڈا پانی نہیں، شمع دان نہیں، یہاں کے لوگ شمع کی جگہ "دیوٹ" استعمال کرتے ہیں، باغوں اور عمارتوں میں بہتا ہوا پانی نہیں، انگانوں میں [illegible]

باندھے پھرتے ہیں، عورتیں لنگی باندھتی ہیں" یہ تھی حالت اس ہندوستان کی جس کو سب سے پہلے مغلوں نے دیکھا۔ سفر کے ذرائع، رہنے سہنے کے قاعدے، کھانے پینے کے طریقے، مکانوں کی صفائی اور سجاوٹ کے انداز، وضع قطع اور لباس سب ہی بدل گئے۔ تجارت، علم و ادب، صنعت و حرفت، موسیقی، غرض زندگی کے ہر پہلو میں انقلاب نظر آنے لگا۔ ہندوستان کا گویا روپ ہی بدل گیا۔

سب جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے، اور یہاں کی زمین میں بڑی بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس زمانے کے لوگ ان خوبیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے اس لئے ان سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہاں پھلوں میں بڑھل، بھوٹ یا کٹھل ہوتے تھے، جو یہاں کی سادہ طبیعتوں کے لئے کافی تھے، بہت بڑھے تو آم کھا لیا اور وہ بھی دیسی، جیسے آموں کی برادری میں لوگ بہت سے نیچا سمجھتے ہیں۔ قلمی آم کا تو خیر اکبر کے زمانے تک رواج نہ ہوا، لیکن مغلوں نے پھلوں کی قلمیں باندھنا ہندوستان کو سکھایا اور ایران اور خراسان کے سیکڑوں لطیف پھل اور پھول سارے ہندوستان میں پھیلا دئے۔ انناس جو خوشبو اور ذائقہ کے لحاظ سے بے نظیر ہے، یورپ سے ہندوستان آیا اور آگرہ کے شاہی باغ میں کثرت سے پیدا ہونے لگا، آلو بھی مغلوں ہی کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ چنانچہ نور جہاں کے بھائی آصف خاں نے یورپ کے ایک سفیر کی دعوت کی تھی اس میں ساٹھ قسم کے کھانے تھے، ان میں ایک آلو کی ترکاری بھی تھی۔ اکبر کے زمانے میں تمباکو آیا اور اسد بیگ نے حقہ بھر کر اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے دو تین کش لگائے اور پھر کبھی نہ پیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ حقے کا رواج تمام ملک میں پھیل گیا اور باوجود جہانگیر کی سخت کوشش کے نہ رک سکا، حقہ کے لئے ہمیں تو نہیں، البتہ ہمارے دادا کو ضرور مغلوں کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے مالی باغوں میں سلیقہ اور ترتیب سے درخت لگانا نہیں جانتے تھے، مغلوں نے انھیں روشیں قائم کرنا سکھایا۔ کشمیر طرح طرح کے پھولوں کا گھر ہے۔ لیکن مغل ان سے مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے اپنے ملک سے رنگ برنگے پھول منگا کر لگوائے اور یہاں کے باغوں کو سرو، صنوبر، چنار اور بید کے پیارے پیارے درختوں سے ایسا بھر دیا کہ ان پر ایران کے چمنوں کا دھوکہ ہونے لگا۔

مغلوں نے کپڑے کی صنعت کو بڑی ترقی دی۔ ہندوستان کے لوگ سادہ واقع ہوئے تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سادہ غذا کھاتے تھے، اور سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن مغلوں نے کھانے پینے کی چیزوں اور کپڑے کی صنعت میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی۔ ملک میں جا بجا کپڑے بننے کے کارخانے کھل گئے۔ چین اور ایران سے بڑے بڑے کاری گر بلوائے گئے، جو ان کارخانوں میں کام کرتے اور نہایت عمدہ اور قیمتی کپڑے تیار کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں صرف لاہور میں ہزار سے زیادہ کارخانے جاری ہو گئے۔ نئی نئی وضع کے کپڑے تیار ہونے لگے، ریشمی اور سوتی قالین اور دریاں، مخمل، ململ، چھینٹیں، وضع وضع کے زردوزی کے کام، کشیدہ کاری وغیرہ کا رواج عام ہو گیا، اور زراعتی ملک صنعت و حرفت کے راستے پر چل نکلا۔

جب تمدن آتا ہے تو آسائش کے تمام سامان بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مغلوں نے آرام و آسائش کے ساز و سامان میں چار چاند لگا دئے اور ایک ایک چیز میں تہذیب و تمدن کی ہزاروں شاخیں پیدا کر دیں۔ ہندوستان وہ ملک ہے جس میں کسی نعمت کی کمی نہیں لیکن بعض چیزیں ایسی تھیں جن کی حقیقت سے لوگ واقف نہ تھے مگر مغلوں نے ایسی طبیعت پائی تھی کہ انھوں نے بہت سی بے کار چیزوں کو کارآمد بنا لیا، شورہ ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، لیکن کسی کو سیکڑوں برس تک خیال نہ آیا کہ شورہ سے پانی ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ شورہ سے پانی ٹھنڈا کرنے کا طریقہ اکبر کے زمانے میں معلوم کیا گیا۔ خس کی ٹٹی خاص اکبر کے عہد کی ایجاد ہے۔ لباس میں شلوار، کلاہ، قمیص، شلوکا اور کمر بند مغلوں نے رائج کیا جنھیں آج ہندو مسلمان سب استعمال کرتے ہیں زنانہ لباس اور زیور میں نور جہاں نے جدتیں پیدا کیں مغلوں سے پہلے ہندوستان میں زیور نہایت بھدے تھے۔ نور جہاں نے ان میں حسن اور نزاکت پیدا کر دی۔ چاندنی کا فرش اور گلاب کا عطر نور جہاں کی ایجادوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ جب تک نور جہاں میرے محل میں نہ آئی میں گھر کی زیب و زینت سے واقف نہ ہوا۔ اپنی سوانح عمری میں اس نے لکھا ہے کہ اکثر زیور اور لباس اور آرائش کے طریقے جو ہندوستان میں رائج ہیں، نور جہاں کے ممنون احسان ہیں۔

مغلوں سے پہلے ہندوستان میں عمدہ جانور نہ ہوتے تھے۔ ہاتھی تو خیر ہندوستان کا خاص جانور ہے، لیکن اونٹ ہندوستان کی پیداوار نہیں آج کل ریلوں اور موٹروں کے زمانے میں اونٹ بے چارے کی ناقدری ہو رہی ہے۔ لیکن مغلوں کے زمانے میں جب ریلیں اور موٹریں نہ تھیں تو اونٹ ایک نعمت خیال کیا جاتا تھا۔ پتلی پتلی اونچی ٹانگوں پر ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرح کوہان رکھا ہوا کتنا ہی بدنما معلوم ہو، اور اس بے ڈول جسم میں ایک لمبی چوڑی گردن

جڑی ہوگی کتنی ہی بھدی اور بدشکل معلوم ہو لیکن باربرداری کے کام میں اس نے اپنے لمبے چوڑے دوست ہاتھی کو شکست فاش دی تھی۔ مغلوں سے پہلے ہندوستان میں اونٹ بہت کم ہوتے تھے جو ہوتے تھے وہ باہر سے آئے ہوئے ہوتے تھے مغلوں نے انہیں کو ہندوستانی بنا دیا۔ اکبر نے اونٹ پالنے کے لئے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں اونٹ کی بہت عمدہ نسلیں تیار ہو گئیں۔ [illegible] کی طرح اکبر نے گھوڑے کی بھی اچھی نسلیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے گھوڑے چھوٹے اور ٹھگنے ہوتے تھے۔ اکبر کے نئے انتظاموں سے ہندوستانی گھوڑے باہر والوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ جہانگیر کو جانوروں سے خاص دلچسپی تھی اس نے جانوروں کا ایک عجائب گھر کھلوایا، جس میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کرکے دور دور سے جانور منگائے گئے اور ان کی پرورش، تربیت، علاج اور خرید و فروخت کے معقول طریقے بتلائے گئے جن سے اچھی نسل کے جانوروں میں کثرت سے اضافہ ہوا

مغلوں کے زمانے میں بڑی کارآمد اور مفید ایجادیں بھی ہوئیں، توپ کا استعمال ہندوستان میں سب سے پہلے بابر نے کیا، جس سے لڑائی کے میدان کا رنگ ہی بدل گیا۔ اکبر کے وقت تک توپ کی صنعت نے کافی ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ نئی نئی قسم کی توپیں اور بندوقیں بننے لگی تھیں۔ ایک توپ سترہ نال کی بنائی گئی تھی جو ایک وقت میں سترہ گولے چھوڑ سکتی تھی۔ ایک ایسی تھی جس میں جوڑیاں تھیں، اس کے حصے علیحدہ کر دیئے جاتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت انہیں جوڑ کر پھر توپ بنا لی جاتی تھی۔ اکبری دربار میں ایک حکیم نے ایک حوض بنایا تھا جس کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، کمرہ میں ہر طرف سے روشنی آتی تھی لیکن ہوا کا رخ اس طرح قائم کیا گیا تھا کہ پانی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں دس بارہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ہر وقت فرش بچھا رہتا تھا، اور کھانا بھی تیار رہتا تھا، ایک اور حکیم نے آٹا پیسنے کی ایک چکی ایجاد کی جو پانی اور ہوا کے زور سے نہیں بلکہ خود بخود چلتی تھی۔

عمارتوں کا تو خیر کہنا ہی کیا: آگرہ کا تاج محل، دلی کی جامع مسجد، فتح پور سیکری کی عمارتیں مغلوں کی شان و شوکت کی داستان اپنی زبان سے سنا رہی ہیں۔ مغلوں سے پہلے بھی ہندوستان میں بڑی شاندار عمارتیں بنتی تھیں، لیکن یہاں کے مکانات عام طور سے ایسے ہوتے تھے جن میں ہوا اور روشنی کا مشکل سے گذر ہو سکتا تھا۔ اونچے اونچے دروازے، شاندار شہ نشین، چوڑے دالان اور کھلے ہوئے روشن اور ہوادار مکان مغلوں کی بدولت ملک میں رائج ہوئے۔ عمارتوں کی طرح مغلوں کو موسیقی مصوری علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ ملک کے بہترین گویئے، بہترین مصور، بڑے بڑے شاعر مغل دربار میں جمع ہوتے اور اپنی استادی کے کرشمے دکھاتے۔ عام لوگوں کے آرام و آسائش کے لئے رفاہ عام کے مغلوں نے بڑے بڑے کام کئے، سڑکیں بنوائیں پل تیار کرائے، راستوں میں مسجدیں، کنوئیں اور سرائیں تعمیر کرائیں اور بڑے بڑے شہروں میں اسپتال کھلوائے، غلے کے گودام کھلوائے جہاں سے ہندو مسلمان سب مسافروں کو کھانا مل سکتا تھا جس ملک میں سفر کی اتنی آسانیاں ہوں ظاہر ہے آمد و رفت کے وسیلوں میں کتنی ترقی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ ان آسانیوں اور امن و امان کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران، بغداد، اور شام کی چیزیں ہندوستان کے بازاروں میں کثرت سے ملنے لگیں۔

فارغ البالی کا یہ حال تھا کہ امیر تو امیر مزدور بھی مغلوں کے زمانے میں چین اور آرام کی زندگی گذارتے تھے۔ بڑے اچھے کاریگر، بڑھئی کو دن بھر کی مزدوری تین پیسے ملتی تھی، آپ کہیں گے اور کہنا چاہتے ہیں کہ بے چارہ فاقہ ہی کرتا ہوگا، مگر آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ ہمارے آج کل کے مزدور سے لاکھ درجہ اچھی زندگی گذارتا تھا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ مغلوں کے زمانے میں چیزیں اتنی سستی تھیں کہ معمولی مزدور بھی بہت آسانی سے اپنا پیٹ پال سکتا تھا، خیال کیجئے گیہوں اس وقت پیسے کے سوا سیر ملتا تھا اور گھی پیسے کا ڈھائی چھٹانک

اب آپ ہی سوچئے کہ تین آنے پیسے پانے والا بڑھئی دو پیسے کا آٹا لاتا ہوگا ادھے پیسے میں گھی، تیل، لکڑی وغیرہ ہوگئے تو تین پیسے میں بہتر کھانا تیار ہو گیا۔ اور پھر بھی سوا دو آنے پیسے بچ رہتے ہوں گے۔ کیسا اچھا زمانہ تھا اسی لئے مغلیہ عہد کو درمیانی دور کے ہندوستان کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴
چندہ:- سالانہ ۴ شش ماہی ۲ للعہ

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز راں کمپنی

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ رمضان المبارک کے بعد حاجیوں کے پہلے جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے

ایس۔ ایس "خسرو"

وزن ۴،۲۳،۴ ٹن

بمبئی سے یکم اگست کو روانہ ہوگا

ایس۔ ایس اسلامی

وزن ۵،۸۷۹ ٹن

بمبئی سے ۲ اگست کو روانہ ہوگا

ایس۔ ایس مظفری

وزن ۴،۰۲۴ ٹن

بمبئی سے ۳ اگست کو روانہ ہوگا

کرایہ جہاز (خوراک کے ساتھ)

بمبئی تا جدہ اور واپسی

درجہ اوّل ... ... ۱۱۰۵ روپے
عرشہ (ڈیک) ... ... ۳۹۸ "

ان کرایوں میں قرنطینہ کامران کی فیس، حفظانِ صحت جدہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم ۸، روپے ۱۲ ہوتی ہے - شامل نہیں ہے۔

عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے گھروں سے روانہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کے لئے نہ لکھے۔ اس لئے کہ اصل حاجیوں کو لے جانے والے جہازوں میں نشستیں محفوظ کی جا چکی ہیں۔

حاجیوں کو ان کے اپنے مفاد کے پیش نظر مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوا لیں اور اپنے ہاں کے محکمۂ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر ان کی تصدیق کرا لیں۔

کوئی رقم پیشگی اس وقت تک روانہ نہ کی جائے جب تک کمپنی اس کے بھیجنے کی درخواست نہ کرے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ مینجنگ ایجنٹس

دی مغل لائن لمیٹڈ - ۱۶ بنک اسٹریٹ

فورٹ بمبئی

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:

سالانہ ... ... دس روپے
شش ماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

"منیجر"

شرح اشتہارات

:- ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں)

"منیجر"

آپ کی فرمائش

مشرقی طرز کے زرق برق نفیس اور نایاب کپڑوں کے لئے

مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی کو یاد رکھئے

مینجنگ ایجنٹ

اسٹنڈرڈ ملز کمپنی لمیٹڈ
انڈین بلیچنگ، ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ
نیو چائنا ملز لمیٹڈ
سورت کاٹن اسپننگ اینڈ ویونگ ملز لمیٹڈ
شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
نیو شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

کیا کیا مال تیار ہوتا ہے؟

کورا سوت اور رنگین سوت، کٹ پیس (ٹکڑے)، کوری اور دھلی ہوئی چادریں کورا دھلا ہوا، رنگا ہوا، چھپا ہوا لنکلاٹ، کوری دھلی ہوئی دھوتیاں کورا دھلا ہوا کرتے قمیص کا کپڑا، دھاری دار کرتے قمیص کا کپڑا کوری دھلی ہوئی ساڑھیاں، کورا دھلا ہوا زین، دھلا ہوا لونگی، دھلے ہوئے میز پوش، چارخانہ، دھاری دار کپڑا، چھپا ہوا وائل وغیرہ وغیرہ

ملنے کا پتہ:-

مفت لال گگل بھائی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۲۹۔ چرچ گیٹ اسٹریٹ بمبئی

طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)　　مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI ROSHNI

DELHI

جلد ۳ | نمبر ۵ | یکم اگست سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

مزید تحقیق اور تلاش کی ضرورت

مولانا ابوالکلام آزاد

ہماری تاریخ کی کہانی پرانے زمانے کے دھندلکے میں بہت دور تک جاتی ہے۔ اور موہنجوداڑو کے انکشاف نے اسے قطعی طور پر کم از کم پانچ ہزار برس پیچھے تک پہنچا دیا ہے۔ اب یہ بات طے شدہ ہے کہ سنہ مسیحی سے تین ہزار برس پہلے دریائے سندھ کی وادیوں میں ایک مکمل شہری زندگی اور شہری تہذیب موجود تھی۔ لیکن اس عہد کی تہذیب میں اور دکھنی ہند میں کوئی تعلق تھا یا نہیں اور مغربی ایشیا کے ملکوں کی تہذیب سے یہ کوئی خاص تعلق رکھتی تھی یا نہیں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور ابھی تک ان پر ایسی روشنی نہیں پڑی ہے جس سے ایک صاف جواب مل گیا ہو۔ سالہا سال سے پہلے امریکن آئل کمپنی نے بحرین اور کویت کے علاقے میں جو کام شروع کیا تھا، تو اس علاقے میں بے شمار ٹیلے دریافت ہوئے تھے جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ٹیلے جب کھودے گئے تو اندر سے پختہ قبریں نکلیں جن میں لاشیں دفن کی گئی تھیں اور لاشوں کے ساتھ زندگی کی ضرورتوں کے کچھ سامان بھی دفن کردئے جاتے تھے۔ ان چیزوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ قبریں ایک بہت ہی پرانے زمانے کی آبادی کا نشان دیتی ہیں۔ اور اس عہد کی تہذیب کی بھی کہانی سنا رہی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ اس آبادی کا زمانہ دو ہزار برس قبل مسیح سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ جن لوگوں نے ان قبروں سے نکلی ہوئی چیزوں کا مطالعہ کیا ہے، ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ ان میں ایسی علامتیں موجود ہیں جو ہندوستان کے دکنی اور مغربی ساحل اور خلیج فارس کے باہمی تعلقات کی خبر دیتی ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے ہندوستان کی پرانی تاریخ کے لئے تحقیقات کا ایک نیا گوشہ پیدا ہو جاتا ہے اور ضروری ہے کہ ہندوستان کے مورخ اس کی تحقیقات میں دلچسپی لیں۔

ہندوستان اور مغربی ایشیا کے پرانے تعلقات کا کھوج نکالنے کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ مصر، عراق اور شام کے قدیم آثار کا مطالعہ کیا جائے جنھوں نے اب خاص علموں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ کام بھی ابھی تک انجام نہیں پایا ہے اور ضروری ہے کہ کچھ لوگ اس کام کے لئے وقف ہو جائیں۔

ہندوستان کی تاریخ کا ایک دوسرا زمانہ جو مزید تحقیق اور تلاش کی گنجائش رکھتا ہے۔ دسویں صدی مسیحی کے بعد کا زمانہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب افغانستان میں غزنوی حکومت کی بنیاد پڑی اور ہندوستان کے شمال مغربی حصے تک اس کا اقتدار پھیل گیا۔ اس زمانے میں ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالت کیا تھی۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں باہمی تعلقات کیا تھے۔ اس کی پوری تصویر ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی ہے، اور بہت سے تاریخی الجھاؤ ہیں جو ابھی تک سلجھائے نہیں جا سکے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ تمام فارسی تاریخیں بھی ہمیں نہیں مل سکیں، جن کے نام بعض کتابوں میں ملتے ہیں، اور جو اس عہد کے حالات سے تعلق رکھتی تھیں۔

مغل شہنشاہی کا زمانہ نسبتاً قریب کا زمانہ ہے لیکن پھر بھی اس زمانے کو جس طرح روشنی میں آنا تھا ابھی تک نہیں آسکا ہے۔ اس زمانے کا تاریخی مواد جو ملک میں تیار ہوا تھا ابھی تک بکھرا ہوا ہے، اور اس کا بڑا حصہ گمنامی کے گوشوں میں چھپا ہے۔ انگریز مورخوں نے اس زمانے کا جو نقشہ بنایا ہے وہ بہت حد تک پریشان اور ناہموار ہے اور معاملے کی الجھنوں کو صاف کرنے کی جگہ نئی الجھنیں پیدا کر رہا ہے۔

ایک دوسرا دور بھی ہماری خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ در اصل انڈین ہسٹاریکل کمیشن کے لئے تحقیقات کا سب سے بڑا میدان رہی ہے یعنی برٹش حکومت کا دور۔ اس دور کے حالات جو اجنبی مورخوں کے قلم سے نکلے ہیں وہ اسے ہندوستان کے امن و ترقی اور خوش حالی کا عہد زریں ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی مورخ ہیں جن میں سے بہتوں نے اس عہد کے صرف تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے پچاس برس کا زمانہ ملک کی سیاسی کش مکش کا زمانہ تھا، اور قدرتی طور پر اس کی تلخیوں سے ہمارے دل و دماغ متاثر ہو رہے تھے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح برطانوی شہنشاہی کے مداحوں کو تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظر آتا تھا، ہمیں بھی صرف اس کا دوسرا ہی رخ نظر آتا۔ مگر اب وہ حالت ختم ہو چکی ہے، اور وقت آگیا ہے کہ اس عہد کے واقعات کو ایک بے لاگ مورخ کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ گورنمنٹ ان کاموں کی ضرورت سے بے خبر نہیں ہے اور وزارت تعلیم نے یہ سارے کام اپنے سامنے رکھے ہیں۔ لیکن ملک کی مالی حالت جن مشکلوں میں گھری ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم ان تمام کاموں کو فوراً انجام دے سکیں گے یا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے، لیکن امید ہے کہ بہت زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

(اس خطبہ کا خلاصہ جو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کی سلور جوبلی میں پڑھا گیا تھا۔)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت	مولانا ابوالکلام آزاد	۱
مشین اور دیہی صنعت	کشوری لال مشروالا	۲
گھر کے بھیدی	(اداریہ)	۳
بزم بے تکلف		۴
گنجینۂ ہفتہ		
۱۔ ہندوستان	م، ع	۵
۲۔ پاکستان	ع، ل	۶
۳۔ باہر کی دنیا	ع، ل	۷
سرگزشت	رونق صدیقی	۸
غزل	نجم الدین شکیب	۸
غزل	مغنی رضوی	۸
قطعات	قیصر تمکین	۸
ہندو مسلم تعلقات	ڈاکٹر سید محمود	۹
مختصر تبصرے	ڈاکٹر مسعود حسین	۱۱

ہریجن کا ست

مشینی یا دیہی صنعت

کشوری لال مشروالا

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے نجی ملکیت اور آمدنی کے نظریات سے قطع نظر کر لیں تو ہمارے ملک میں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں گے۔ ایک تو وہ جن کے خیال میں ہندوستان کی خوش حالی کا دارومدار مشینی پیداوار پر ہے اور دوسرے جن کا دیہی وغیرہ مشینی صنعتوں پر عقیدہ ہے۔ سرمایہ داروں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو اول الذکر میں عقیدہ ہے لیکن تعمیری کام کرنے والوں کو دیہی صنعتوں میں یقین ہے۔ ہر طبقہ کے کانگریسی، متوسط طبقہ کے لوگ اور دیہاتی ان دونوں طریقوں کے درمیان جھولتے نظر آتے ہیں۔ مشینی صنعت کا آج کل دنیا میں دور دورہ ہے، اور جو ترقی اس میں ہو رہی ہے وہ اتنی تیز اور زبردست ہے کہ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ دیہی اور غیر مشینی صنعت اس سیلاب کی رو میں نہیں رک سکتی۔ اس کے علاوہ مشینی صنعت نے ایسا سامان آسائش مہیا کیا ہے کہ ایک تارک دنیا بھی اس کا فائدہ اٹھانے کے لالچ سے پرہیز نہیں کر سکتا۔ لیکن صنعت میں تیز نقل و حمل اور وسل و رسائل کا نظام، کالونی، ذرائع پیداوار، بین اقوامی تجارت مالیاتی پیچیدگیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں شامل ہیں جن کا مطلب آخر میں فوجیت، اسلحہ بندی اور رضاعانہ کی جنگ ہے خواہ وہ علانیہ ہو یا نیابیند۔ اس کے معنی فسطائیت اور کمیونزم بھی ہوتے ہیں جن میں انفرادی شخصیت دبا دی جاتی ہے اور عوام اجتماعی طور پر مشین کی طرح کام کرنے لگتے ہیں۔

جب لوگ اس تصویر کو تیسری عالمی جنگ کے امکانات کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو وہ سخت خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے جرنیلوں سے لے کر معمولی شہری تک اس کا اعتراف کرتا ہے کہ انسان کی نجات گاندھی جی کے راستے پر ہی چل کر ہو سکتی ہے اور اسی لئے وہ دیہی صنعتوں کے پروگرام کو بھی تھوڑی سی جگہ دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ خواہش کمزور ہوتی ہے کیونکہ یہ خیال زیادہ نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے کہ مشینی صنعت کو کامیابی کے ساتھ بلا اس کے خوفناک نتائج بھگتے ہوئے چلایا جائے۔

کانگریسی حکومتوں کی پالیسی سے ان دونوں طریقوں کے متعلق کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ان دونوں طریقوں کو مخلوط کر کے ایک نئی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ ملک کی رائے عامہ کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم تعمیری کام کرنے والوں کو یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی کہ صرف تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے ہی لوگوں کو ہی نہیں بلکہ دیہاتیوں اور عوام کو بھی ہمارا پروگرام اپیل نہیں کرتا۔ ابھی تک جتنے کارکن ہماری طرف آئے ہیں وہ تعلیم یافتہ اور متوسط طبقوں سے ہیں اور تعمیری کام کو جو کچھ بھی امداد ملی ہے وہ بھی ان ہی لوگوں سے ملی ہے۔ جس کے سبب سے جو زبردست مقابلہ ہونے لگا ہے۔ اس کی وجہ سے عوام اور دیہاتی گاندھیائی معاشی پروگرام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ چند کاتنے بننے والوں اور دوسرے دیہی کاریگروں نے اگر یہ صنعت اختیار کر لی ہے تو محض اس وجہ سے کہ ان کے سامنے اس سے زیادہ پیسہ کمانے والا کوئی دوسرا پیشہ نہ تھا یا ان کی امداد روپیہ سے کی گئی ہے۔

ہمارے بہت سے سماجی اور معاشی مسائل زرعی پیشوں اور صنعتوں کے درمیان غلط رابطہ اور نقلی دولت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اب یہ بات تو بہت صاف ہو گئی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اس ملک کی حالت غیر محفوظ ہے جو اپنے لئے غذا پیدا نہیں کر سکتا یعنی اجناس اور دودھ۔ لیکن اجناس اور دودھ کی پیداوار کے لئے روئی، مونگ پھلی اور تمباکو کی تجارتی فصلوں کے مقابلے میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ صنعت اور قیمت کے عناصر و توازن کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ تجارتی فصلوں کی قیمت بہ مقابلہ غذائی فصلوں کے زیادہ ملتی ہے۔ اسی طرح صنعتوں میں سامان آسائش کی قیمت بہ مقابلہ ضروری سامان کے زیادہ ہوتی ہے۔ کاشتکاروں سے زیادہ اناج اور دودھ پیدا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے، لیکن جب تک ایسے حالات نہیں پیدا کئے جاتے کہ ان کو یا تو معاوضہ میں روپیہ زیادہ ملے، یا قیمت کا کوئی دوسرا معیار روپئے سے بہتر بنایا جائے یہ اپیل اسی طرح بیکار رہتی ہے جیسے کہ تعمیری کام کرنے والوں کی دیہی صنعتوں اور خود کفالتی بننے کی اپیل۔

اس مالیاتی نظام سے معاشی اقدار اور اخلاقی و سماجی قدروں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ شراب سے اتنی آمدنی ہوتی ہے کہ صرف حکومتیں ہی نہیں بلکہ سماجی کام کرنے والوں کو مکمل نشہ بندی کا پروگرام ترک کرنا پڑتا ہے، حالانکہ سماجی اور اخلاقی اقدار اٹل ہیں۔ دنیا اپنے مالیاتی نظام کے دلدل میں اس طرح پھنس گئی ہے کہ جتنا اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اتنی ہی وہ دھنستی جاتی ہے اور صرف معجزہ ہی اس کو بچا سکتا ہے۔ جنگ سے اکثر اس قسم کے معجزوں کا اظہار ہوتا ہے اس سے خوش حالی پیدا ہو جاتی ہے۔ گذشتہ عرصے میں وہ قرضہ اداکرنے کے کثرت سے روپیہ پیدا کر لیتا ہے۔

ہندوستان صدیوں سے تباہی کی حالت میں تھا اور یہ ملک برطانیہ کا قرض دار کہا جاتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کی پوزیشن اپنے قرض داروں کے مقابلے میں ایک زمانے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ قرض کبھی ادا نہ ہو سکے گا اور نجات کی زیادہ امید نہ تھی۔ لیکن چھ سال کی مدت میں وہ ہوا جو صدیوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مقروض اور قرض دار ملک اور ہمیشہ مقروض رہنے والے کسان نے صرف اپنا قرض ہی نہیں ادا کیا بلکہ ان کو فاضل رقم بھی ملی۔ یہی حالت چھوٹے پیمانے پر پہلی جنگ عظیم میں بھی ہوئی تھی لیکن اس جنگ کے بعد جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس وقت کی افراط بالکل ایسے ہی تھی جیسے کہ کسی جادوگر کے بونے کے پانچ منٹ بعد آم پیدا کیے گئے ہوں۔ دونوں جنگوں میں روپیہ نے ایک سراب بنا دیا۔

اگر روپے کا دوران درمیان میں نہ ہو تو یہ بات یقینی طور پر واضح ہو جائے۔ چھ سال جنگ میں آدمی مارے گئے۔ کارخانے تباہ ہو گئے اور مال و دولت کا بہترین ذخیرہ ضائع ہو گیا اور اگر ہم سے کچھ حاصل ہوا تو آتش گیر مادہ اور تباہی کے ہتھیار، اور لوگ بے رحمی سے روزانہ بیدردی سے پھونکا گیا۔ پچھلی جنگ میں ہندوستان کے پاس جو کچھ تھا اور جو کچھ اس نے پیدا کیا سب لے لیا گیا اور معاوضے میں روپے کا غذی نوٹوں کی گڈی اور حساب میں ہی کھاتے ملے ہم نے تجوری سے اپنی گڈی گنی اور بہی کھاتہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ اب ہم خوش حال ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ فضا میں جھنکار پیدا ہونے کے بعد سراب غائب ہو گیا ہے اور اب ہم ایک لامتناہی اور بے آب ریگستان میں بھٹک رہے ہیں۔

اسی دھوکے میں لیڈروں اور سرمایہ داروں نے بڑی صنعتی اور دوسری اسکیمیں بنائیں اور ان لوگوں کے طرز زندگی میں تخفیف کئے بغیر جو تعیش میں بسر کر رہے تھے، اور آزادی سے قبل کے دس سال میں اس میں بے حد اضافہ کر چکے تھے، ملک کے عام معیار زندگی کو اونچا کرنے کی توقع کی۔

اب چونکہ ملک کے صنعتی اور مالیاتی ڈھانچے میں کوئی زبردست تبدیلی ناممکن نظر آتی ہے اس لئے ہمیں کیونکہ دوسرا تعمیری کام تو کرنا ہی چاہئے مجھے معلوم ہوا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب کہ سوار فوج استعمال ہوتی تھی، محکمہ جنگ دیہات کے لوہاروں سے گھوڑوں کی نالیں بنواتا تھا۔ کارخانے دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور چونکہ نالیں ہاتھ سے بآسانی بن سکتی تھیں، اس لئے لاگت زیادہ ہونے کے باوجود یہ بہتر سمجھا گیا کہ یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

لارڈ بائڈ آر نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم غذائی مسئلے کو اسی طرح دیکھیں جیسے کہ جنگ کا زمانہ ہو۔ یہ مثال محض زبانی نہیں ہے ہم واقعتاً جنگ کے زمانہ میں ہیں۔ یہ جنگ بھوک، غربت کے خلاف ہے، اور اس جنگ میں صرف بڑے پیمانے پر پیداوار کی اسکیمیں نہیں ہیں، بلکہ چھوٹے فارم، کنوئیں اور

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم اگست [illegible]

کم کیسے

(۲)

ہر سیاسی پارٹی قوم کے سامنے کوئی بڑا مقصد پیش کرتی ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کے لئے تدبیریں اور جد و جہد کرتی ہے۔ کانگریس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرنا تھا اس نے ایک طرف برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف آزادی کی خواہش پیدا کرنے کے لئے سماجی اور معاشی سدھار کی تحریکیں شروع کیں۔ مہاتما جی برابر تعمیری پروگرام کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اور جو کام خود انھوں نے منتخب کئے تھے، اُن کو پھیلاتے اور ترقی دیتے رہے۔ مگر سیاست میں ان کاموں کو جو صرف خاموشی اور نیک سوچی سے کئے جا سکتے ہیں، اہمیت نہیں دی جاتی یہاں زندگی کے جو منصوبے مہاتما جی کے ذہن میں تھے ان کا اتنا چرچا نہیں ہوا جتنا کہ برطانیہ راج کی مخالفت کا، اور جہاں لوگوں میں کانگریس نے ویسی ہی بے چینی اور بیداری پیدا کرنا کافی سمجھا جیسی کہ ملک کے دوسرے طبقوں میں تھی۔ آزادی اتنا بڑا مقصد ہے کہ اس کے ساتھ اور بہت سے مقاصد ضمنی طور پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مہاتما جی کی شخصیت اور دوسری جنگ عظیم کی بدولت آزادی کے آخری مرحلے بہت جلد طے ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے ہٹ جانے سے آزادی میں جو رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی، مگر ملک کی تقسیم اور اس سے پہلے اور بعد کے حادثے نے آزاد زندگی کا جو دھندلا سا نقشہ ہمارے ذہنوں میں تھا اسے بالکل مٹا دیا۔ اس وقت ہونا یہ چاہئے تھا کہ حکومت کانگریس کے ہاتھ میں ہو اور وہ ان تمام اختیاروں سے جو صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو حاصل ہیں کام لے کر اپنے تعمیری پروگرام پر عمل کرے مگر جنگ کے بعد جو انتظامی الجھنیں پیدا ہوئیں انھوں نے حکومت کے کاموں کو جاری رکھنا مشکل کر دیا، اس کے علاوہ کانگریس کے ذمہ یہ مسئلہ کہ اختیار کن لوگوں کو دیا جائے اس مسئلے سے زیادہ اہم معلوم ہونے لگا کہ اختیار سے کیا کام لیا جائے اور کس طرح لیا جائے۔ کانگریس کا جو رضاکار اور غیر سرکاری نظام ہے وہ بھی اب تک موجود ہے اور اس میں اور کانگریسی حکومت کے درمیان فرائض کی واضح تقسیم نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح اس وقت تین کئی فریق ہو گئے ہیں، مرکزی حکومت، صوبائی حکومتیں، کانگریس کا غیر سرکاری نظام اور اس کے کارکن سرمایہ دار اور تاجر، نقاد اور تماشائی۔ ظاہر ہو جو ہیں سب سے بڑی تعداد تماشائیوں کی ہے، جو حکومت کی کارروائیوں پر تنقید کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ ان نقادوں میں، کانگریس کے وہ رکن بھی شامل ہوتے رہتے ہیں جنھیں حکومت یا کانگریس کے نظام میں بہت یا ذمہ داری یا کام کے موقعے نہیں ملے ہیں جن کے وہ مستحق ہوتے یا اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، اور اس طرح کانگریس کا نظام حکومت میں مضبوطی پیدا کرنے کے بجائے اس کی طاقت اور حیثیت کو صدمے پہنچاتا رہتا ہے۔ صوبائی حکومتوں کی نظر اپنی مشکلوں پر ہے وہ ان معاملوں کو بھی جن میں مرکز سے مدد لئے بغیر کام نہیں چلتا، پالیسی طے کرنے کا منصب بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں، اور اگر ان پر یہ الزام نہ لگایا جا سکتا کہ وہ مرکز سے اتحاد عمل نہیں کرتی ہیں، تب بھی ان میں سے ہر ایک کے اور مرکز کے عمل میں اتنا اختلاف ہے کہ وہ یک جہتی جو کانگریس پارٹی کی ہر جگہ حکومت ہونے کی وجہ سے پیدا ہونا چاہئے تھی اس وقت نظر نہیں آتی۔

قومی تحریک کے ایک دور میں سرمایہ داروں اور تاجروں نے کانگریس کا ساتھ دیا تھا، اور آزادی ملنے کے بعد انھیں معاشی زندگی کی تعمیر میں پوری طرح سے شریک ہونا چاہئے تھا مگر شاید جنگ کے زمانے میں دولت پیدا کرنے کے جو بے انداز موقعے ملے انھوں نے ان لوگوں کی نیتوں میں بگاڑ پیدا کر دیا اور یہ اس وقت سے بپھرے ہوئے ہیں جب کہ قومی حکومت نے ان کی اصل آمدنی کا سراغ لگانے اور ٹیکس کے ذریعے ان کی کمائی میں حصہ لگانے کی کوشش شروع کی۔ اب حکومت کے اصلاحی اور انتظامی منصوبوں میں سب سے بڑی رکاوٹ اسی سرمایہ دار اور تاجر طبقے کی اغراض ہیں، اور حکومت کے لئے یہ طے کر لینا لازمی ہو گیا ہے کہ وہ ان اغراض کا زیادہ لحاظ کرے گی یا اپنے فرائض کا۔

اس وقت کی حکومت ایک پارٹی کی حکومت ہے جمہوریت کے اصول اور قاعدے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ جو پارٹی برسر اقتدار رہے وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور اپنے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے وہ تمام تدبیریں کرے جن کی قانون اجازت دیتا ہے۔ کانگریس کے بعض لیڈر اصولاً اور بعض مصلحتاً اتنی چھوٹ سے بھی کام لینا مناسب نہیں سمجھتے جو یہ ظاہر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کانگریس کے خاص عقیدے ہیں اور ایک خاص مسلک ہے جس پر قائم رہنا وہ اتنا ضروری مانتی ہے کہ اس کی خاطر وہ حکومت سے دست بردار ہونے پر بھی تیار رہے۔ اس کمزوری سے خود غرض لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور عام طور پر لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ حکومت کو ملک کی ضرورتوں کا احساس تو ہے مگر ان کو پورا کرنے کی طاقت اور صلاحیت نہیں ہے۔ غذا کے بارے میں پنڈت جواہر لال نے جو اعلان کیا تھا اس میں ایک کمیٹی نے یہ ترمیم تجویز کی ہے کہ ۱۹۵۱ء کے بعد بھی غلہ کا ذخیرہ

بقیہ صفحہ ۴ پر

بزم بے تکلف

میر صاحب۔ ارماں مرزا سُنا، کوئی خاتون پکڑی گئی ہیں۔

مرزا۔ کس کے ساتھ؟

میر صاحب۔ نالائق۔

مرزا۔ اس میں کیا شک ہے۔ کسی نالائق ہی کے ساتھ پکڑی گئی ہوں گی۔

میر صاحب۔ کون نالائق۔

مرزا صاحب۔ وہی جس کے ساتھ پکڑی گئیں۔

میر صاحب۔ نہیں ظالم، کسی نالائق کے ساتھ پکڑی جاتیں تو کیا غم تھا۔ یہ امید تو رہتی کہ کبھی ہمارے تمہارے دن بھی پھریں گے۔ وہ تو .... کیا کہوں!

مرزا۔ الٰہی خیر، کہتے کہتے چپ کیسے ہو گئے۔

میر صاحب۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں!

مرزا۔ لاحول ولا قوۃ، عجب آدمی ہو۔ منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں۔ وہ تو خیر ہوئی شعر پڑھنے لگے جان میں جان آئی۔ ورنہ اس برسات میں تمہارے لئے رونے اٹھانے والے کہاں سے پیدا کرتا۔

میر صاحب۔ مرزا یار، خدا سے ڈر شعر کہاں پڑھ رہا تھا۔ صرف مصرعہ ہی تو اٹھایا تھا کہ تو لگا چور بازار قسم کی تقریر کرنے! بات یہ نہیں اور تم سے کیا تکلف یا پردہ......

مرزا۔ (بات کاٹ کر) تو پھر کوئی بے تکلف یا بے پردہ ہی ہوں گی!

میر صاحب۔ اُف ر تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

مرزا۔ اور ابھی تم تو خدا کی قسم معاف کرنا اگر میری کسی حرکت سے تم کو شعر پڑھنے کی تحریک ہوئی ہو:

میر صاحب۔ عجب شقی سے پالا پڑا ہے۔ نہ بات کرنے دیتا ہے، نہ شعر پڑھنے دیتا ہے۔

مرزا۔ اچھا بات کرو چلو اگر اس دوران میں حلق میں کسی شعر کا پھندا لگے تو بس اشارے سے پانی مانگ لینا شعر پڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔

میر صاحب۔ یہ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ افیون کے دھوکے میں ان کو بھگائے لئے جاتے تھے کہ پولیس آن پہنچی۔

مرزا۔ پھر!

میر صاحب۔ پولیس کا بیان ہے کہ یہ افیون کو بھگائے لئے جاتی تھیں۔

گیوا (پوری تان سے)

دھوئیں کی گاڑیں اُڑائے لئے جائے رے!

میر صاحب۔ اند کیوں جی اس گیوا حرامی کو کچھ نہ کہو گے۔

مرزا۔ بس میں کوئی حرج نہیں، عزا اب میں

گپوا زندگی سے قریب ہو رہا ہے

میر صاحب۔ ایسے میں تو کچھ موت سے قریب ہونا بولتے ہیں

مرزا۔ اردو میں ایسا ہوتا ہوگا۔ جبھی تو یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔

میر صاحب۔ عوامی تم جانو لیکن گپوا تو حرامی ہے۔

مرزا۔ یہ بھی تمہارا ہی بگاڑا ہوا ہے۔

میر صاحب۔ مرزا، خدا سے ڈرو۔ ایک دن اس کے سامنے جانا ہوگا۔ کوئی آقا آج کل کسی نوکر کا کچھ بگاڑ سکا ہے۔ میں تو خود پوچھ لیا کرتا ہوں۔ گپوا بتا تیری رضا کیا ہے؟ اور یہ ہمیشہ جواب دیتا ہے

"............ اب میرا انتظار کر"

مرزا۔ تو پھر یہ بتلائیے کہ افیون بالغ تھی یا نابالغ؟

میر صاحب۔ افیون کا بالغ نابالغ ہونا کیا معنی؟

مرزا۔ تعزیرات ہند میں معنی و بلاغت نہیں دیکھے جاتے، بھاگنے اور لے بھاگنے والی کی بلوغت دیکھتے ہیں۔

میر صاحب۔ تو بالغ ہی ہوگی؟

مرزا۔ وہ کیسے؟

میر صاحب۔ یوں کہ مدتوں سے حکومت کے قبضے اور تصرف میں رہی ہے!

مرزا۔ اب یہ بتاؤ کہ لئے بھاگی جا رہی تھیں یا بھگائے لئے جا رہی تھیں؟

میر صاحب۔ اللہ اکبر! بھاگنا، لے بھاگنا، بھگا لے جانا، بھگدڑ، بھگوڑا، بھاگمان، بھگوڑنا!

مرزا۔ جی اور کیا! اس کے بعد یہ بتائیے کہ خاتون اور پولیس میں کون بالغ تھا، اور کون نابالغ؟

میر صاحب۔ واللہ مرزا کیا بات پیدا کی ہے لیکن اگر پولیس عورت ہو یا عورت پولیس تو کیا کروگے؟

مرزا۔ تو پھر واللہ میر صاحب تم نے بھی کیا بات پیدا کی ہے۔

میر صاحب۔ اور کیوں جی مرزا۔ اس جھگڑے میں کہیں ہماری تمہاری بالغی نابالغی کا سوال تو نہ اٹھ کھڑا ہوگا؟

مرزا۔ جی بالکل نہیں۔ ہم لوگ تو مانے ہوئے ابلغ البلغا ہیں!

میر صاحب تو پھر اطمینان ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ میرے لئے تو برادری کا معاملہ ہے۔ غریب کو سزا ہوگی۔ تو ناک کٹ جائے گی۔ منہ دکھانے قابل نہ رہیں گے؟

مرزا۔ کٹ بھی جانے دو یار، اللہ کبھی منہ دکھانے قابل رکھے گا، تو ناک بھی واپس کر دے گا۔

میر صاحب۔ کیوں مرزا ضمانت وغیرہ ہو سکتی ہے؟

مرزا۔ یہ تو کوشش پر منحصر ہے، لیکن مجھے تو تمہاری بحث میں کچھ افادیت ادب کی جھلک نظر آتی ہے

میر صاحب۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟

مرزا۔ یہی ہاں میں کالا کسنم کی ایک شے!

میر صاحب۔ لیکن جب سے بلیک مارکٹ کا دور دورہ ہوا، یہ محاورہ متروک ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ دال ہی نہیں، اب ہر جنس میں سب کچھ کالا ہی کالا ہوتا ہے۔ ہاتھ کالا، منہ کالے، دل کالے، جھنڈے کالے!

مرزا۔ جنس کا تذکرہ کیا تو کالی آنکھ اور کالے بال کو کیسے نظر انداز کر گئے؟

میر صاحب۔ شاباش کیوں نہ ہو

آنکھ طائر کے نشیمن پر رہی پرواز میں!

اور کیوں مرزا ضمانت کا اصول کیا ہے؟ یعنی جس کی ضمانت کرو وہ اپنے قبضہ و تصرف میں!

مرزا۔ میر صاحب، اور میں کیا کہتا تھا کہ تمہاری نیت میں فتور ہے!

میر صاحب۔ قسم ہے تیری جان کی مرزا جو ایسی ویسی کوئی بات ہو۔ صرف اتنا خیال البتہ آیا کہ ضمانت کے سلسلے میں شاید کچھ اس قسم کی کوئی بات ہو جائے

مرزا۔ کس قسم کی؟

میر صاحب۔ ارے وہی۔

رات کو وہ مے پئے ساتھ رقیب کو لئے

اور مرزا تیرے جان عزیز کی قسم صرف افیم کے لئے!

مرزا۔ لیکن میر صاحب، ان عورتوں کو سودا کیا ہے۔ پہلے شوہروں کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ اب افیون غریب کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔

میر صاحب۔ مرزا، یہ حکومت کا ایک راز ہے، جس کو صرف افیون ہی فاش کر سکتا ہے لیکن تم کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ بقول شخصے تم نہ اِکّا الذی نہ آکا الذی!

مرزا۔ یعنی؟

میر صاحب۔ نہ حاکم نہ افیونی!

مرزا۔ احسنت احسنت، بفرمائید!

میر صاحب۔ یہ زبان بولوگے تو بھائی کھاؤگے جوتی تم!

مرزا۔ اور آج کل کیا کھانے کو مل رہا ہے۔

میر صاحب۔ کیوں مرزا کہیں کمیونسٹ تو نہیں ہو گئے!

مرزا۔ حضرت خوب یاد دلایا۔ اقبال نے کسی کو بتایا تھا کہ قلب اس کا مومن ہے اور دماغ کافر!

میر صاحب۔ تو آپ کو کیا؟

مرزا۔ کیوں نہیں، میرا جو پیٹ کمیونسٹ ہے۔

میر صاحب۔ تمہاری شامت بھی آ چکی ہے!

مرزا۔ آج کل اس طرح کی ہاضمہ کی شامت میں کون نہیں مبتلا ہے؟ لیکن میر صاحب یہ فقرے تو خواہ مخواہ چھوٹ گئے۔ وہ جو تم نے تریا اور تریاک کا راز بتانے کو کہا تھا، وہ تو سناؤ۔

میر صاحب۔ بات یہ ہے کہ کسی حکومت نے کوئی ایسی گیس تیار کر لی ہے کہ جس کو چھوڑ دی، بس اُسے نیک بخت نے چھوڑ دیا، اس کی تمام روحانی صلاحیتیں یک لخت زائل ہو جاتی ہیں، یوں سمجھ لیجئے جیسے چھوٹ جن کا سایہ ہٹ کے بچ گئے ہیں جس کو کسی کی برائے زندگی کا ہاتھ یا ادب بیچ بولی کہتے ہیں

نیم گٹ کئی ایر جھٹکے ہیں لنڈورے!

یہ دراصل اٹم بم کا توڑ ہے۔ اٹم بم نے تباہی اور ہلاکت انتہا کو پہنچا دی تو خدا ترس بھلا مانس نے زور لگا کر یہ نئی ایجاد کر ڈالی۔ لیکن جب بیویوں کو پتہ چلا تو انھوں نے دیکھ کوشش شروع کر دی کہ جب تک اس کا اصلی مصرف شوہروں کو معلوم ہو وہ کسی طرح اس پر قابض و متصرف ہو جائیں

مرزا گویا کہ جس طرح امریکہ نے اٹم بم پر قبضہ جما لیا اور روس تاپتا رہ گیا!

میر صاحب۔ بھئی تمہارا جیتا رہے، خوب سمجھے۔ بس اسی طرح بیویوں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ وہ اس گیس کی تنہا اجارہ دار بن جائیں۔ اور شوہر غرض کریں تو کہہ دیں، یہ ٹاپے میں!

مرزا۔ یہ تو ہوئے تمہارے گھر کے اندر والی معلّا جسے تریا چلتر کہتے ہیں۔ اس میں یہ افیون کہاں سے شامل ہو گئی، بقول شخصے

"درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا!!

میر صاحب۔ یہ بات خود بخود تمہاری سمجھ میں مشکل سے آتی، تو قصہ یہ ہے کہ جس طرح یورینیم سے اٹم بم بناتے ہیں اسی طرح افیون سے یہ گیس تیار کی گئی ہے کہ یہ افیون کا اٹم بم ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کا بم افیون ہی سے تیار کیا جا سکتا تھا۔ افیون کے شریفانہ خواص سے سبھی واقف ہیں۔ آج سے نہیں ہزاروں سال سے (جب سے نرسنگھ اپنی بےطوری پر رونا شروع کیا) آپ تو علم سے عفیف رہے ہیں لیکن جو لوگ اس سے متہم رہے ہیں وہ بتلاتے ہیں کہ مشرق کو علم، مذہب، اخلاق، فلسفہ، فنون لطیفہ، امن جوئی، تعداد ازدواج، تکثر اولاد اور تقلیل روزی میں جو عالمگیر نیک نامی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے وہ اس افیون کا صدقہ ہے۔ پہلے بم بھادیو تھے، پھر ایٹم بم کا دور آیا اب افیم بم ہے! اور تم جانو جب کسی راز کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کام پر عورت کو لگا دیتے ہیں۔ اب جو یہ پکڑی گئی ہیں تو دیکھئے کیا گل کھلاتی ہیں!

مرزا۔ "یعنی گویا کسی

گل کھلاتے گئے پھرتے اڑاتے آئے!

کمر کسیے

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

جمع رکھنے کے لئے باہر سے غلہ خریدا جائے نہیں ڈر ہو کہ کانگریس پارٹی کی اصلاح کے منصوبوں میں بھی ایسی ترمیمیں کر دی جائیں گی جن سے فاسد مادہ خارج نہ کیا جا سکے گا اور ان لوگوں کو جو کانگریس کے سیاسی اور سماجی اصولوں سے عقیدت رکھتے ہیں اس کا یقین نہ ہو سکے گا کہ حکومت کے عمل کا ان اصولوں سے واقعی تعلق ہے۔

پچھلا ہفتہ :- ہندوستان

معاوضہ ضرور دیا جائے گا

پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ اپنی جو جائداد وہاں چھوڑ آئے ہیں اس کے بارے میں غیر سرکاری رائے معلوم کرنے اور سرکار کی پالیسی سمجھنے کے لئے ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں پناہ گزینوں کے نمائندوں نے اپنی شکایتیں اور مطالبات پیش کئے اور سرکار کی طرف سے بھی کسی بات کو چھپائے بغیر سب باتیں اُن کے سامنے کھول کر رکھ دی گئیں جس کا قدرتی طور پر بہت اچھا اثر پڑا۔

پناہ گزینوں کے نمائندوں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ سرکار نے ہندوستان تقسیم اور آبادی کے تبادلے کو مانا اس لئے ہم حالات سے مجبور ہو کر اپنی جو جائداد پاکستان میں چھوڑ کر چلے آئے ہیں اس کے نقصان کے بھرنے کی ذمہ داری سرکار پر ہے۔ سرکار اسے جس طرح چاہے پورا کرے، چاہے سب پر ٹیکس لگائے، چاہے اس کام کے لئے قرض لے، چاہے پاکستان سے ہرجانہ طلب کرے، چاہے جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لے، یہ کام ہم نجی طور پر نہیں کر سکتے۔ فروری سمجھوتے سے پہلے اور اس کے بعد ہم نے نجی طور پر جائداد کے تبادلے کی کوشش کر کے دیکھ لی پاکستان نہیں چاہتا ہے، بہت سی کاروائی ہیں اس نے کہا کہ صرف مشرقی پنجاب اور مغربی پاکستان کی جائدادوں کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے بقیہ حصوں کی جائداد کا مغربی پاکستان کی جائداد سے تبادلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہند سرکار نے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ پاکستان سے کر لیا تو ہم سے تبادلے کے لئے کیوں کہا گیا۔ ہم ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں بے باقی کے بہت سے سرٹیفکٹ لینے کو کہا جاتا ہے اور طرح طرح سے روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ اس لئے سرکار اپنے طور پر ان کاموں کو خود کرے اور ہمیں ہماری جائدادوں کا معاوضہ نقد ادا کر دے تاکہ ہم یہاں اپنا کاروبار دوبارہ شروع کر سکیں۔

شری موہن لال سکسینہ نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت کی کہ سرکار نے آرڈیننس جاری کر کے کہ مشرقی پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی جائداد کا پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی جائدادوں سے لیا جا سکتا ہے فروری سمجھوتہ کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ ہندوستان نے نہیں پاکستان نے توڑا ہے، اور وہ ایک بار نہیں کئی بار سمجھوتوں کو توڑ چکا ہے۔

شری گوپال سوامی آئنگار نے یہ اطمینان دلایا کہ پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ اپنی جو جائداد پاکستان میں چھوڑ آئے ہیں اس کا معاوضہ انھیں ضرور دیا جائے گا۔ کس شکل میں دیا جائے گا، ابھی یہ ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ نقد کی صورت میں نہ دیا جا سکے ہو سکتا ہے کہ اس شکل میں نہ دیا جائے جیسا کہ پناہ گزیں چاہتے ہیں، کچھ زمین کی صورت میں دیا جا سکتا ہے کچھ دکان کی صورت میں اور کچھ شاید نقد کی صورت میں اور کچھ غالباً سرکاری تمسکات کی کسی شکل میں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ معاوضہ ضرور دیا جائے گا۔ اور اس بات کی طرف سے پناہ گزینوں کو بالکل مطمئن رہنا چاہیے۔

شری آئنگار نے سرکار کی ان مشکلات کو تفصیل سے بتلایا جن کی وجہ سے معاوضہ کا تصفیہ ابھی تک نہیں کیا جا سکا ہے۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ ہندو اور سکھ مہاجر جتنی مالیت کی جائداد پاکستان میں چھوڑ کر آئے ہیں اتنی مالیت کی جائداد مسلمان ہندوستان میں چھوڑ کر نہیں گئے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ جائداد کی نوعیت بھی مختلف ہے مثلاً مغربی پنجاب میں جو لوگ نہری زمین چھوڑ کر آئے ہیں ان کو مشرقی پنجاب میں بارانی زمین دی جا سکی ہے، یہ زمین کچھ عرصہ بعد نہری ہو جائے گی، جب وہی پانی جو اس وقت مغربی پنجاب کی نہروں میں جاتا ہے، نئی نہریں بنا کر ہندوستان میں تقسیم کیا جانے لگے گا۔ لیکن اس میں تھوڑی دیر لگے گی، اس کی پاکستان کی طرف سے سخت مخالفت کی جا رہی ہے۔

تیسری مشکل یہ ہے کہ جو جائداد یں مسلمان چھوڑ کر گئے ہیں، وہ ابھی تک ہندوستان پر تقسیم نہیں کی جا سکی ہے۔ پناہ گزینوں میں سے جو پہلے آیا اس نے جائداد پر قبضہ کر لیا۔ سرکار متروکہ کے بارے میں پوری چھان بین کرے اور یہ فیصلہ کرے کہ کتنا کس کو ملنا چاہیے تو اس سب جائداد کی از سر نو تقسیم ہو۔ فی الحال سرکار کی طرف سے اس جائداد کے متولی ضرور مقرر کر دئے گئے ہیں جو اس کا کرایہ اور لگان بھی وصول کرتے ہیں اور قابضوں کو برابر تنبیہ کرتے رہتے ہیں کہ جس جائداد پر وہ قبضہ کئے ہوئے ہیں وہ ان کی نہیں ہے لیکن وہ کس کی ہے؟ ابھی تک یہ بات بھی واضح نہیں ہے۔

فروری میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اس میں دونوں ملکوں نے اپنے اپنے پناہ گزینوں کو جو دوسرے ملک میں جائداد چھوڑ آئے ہیں، اس بات کی اجازت اور سہولت دینے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ نجی طور پر دوسرے ملک کے اپنے ہی جیسے پناہ گزینوں کے ساتھ معاملہ کر کے اپنی جائداد کا تبادلہ کر لیں۔

لیکن اس سمجھوتے کے مطابق بہت کم جائدادوں کا تبادلہ ہوا۔ شری آئنگار نے پاکستان پر یہ الزام لگایا کہ وہ جائداد کے نجی تبادلہ میں رکاوٹ ڈال رہا ہے جس سے تبادلے کا کام آگے نہیں بڑھنے پاتا۔

انھوں نے کہا کہ اس معاملے پر گفتگو کرنے کے لئے ہند سرکار کے جو نمائندے پاکستان گئے تھے اُن سے پاکستان نے سمجھوتے کو توڑنے کی شکایت کی۔ پاکستان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ابھی حال میں ہند سرکار نے جو آرڈیننس نکالا ہے وہ فروری کے سمجھوتے کے خلاف ہے۔ اس سمجھوتے میں صرف محدود علاقوں مثلاً مشرقی پنجاب اور مغربی پاکستان وغیرہ کی جائداد کو مہاجروں کی جائداد قرار دیا گیا تھا کیونکہ یہیں کے باشندے صحیح معنی میں زبردستی گھر چھوڑنے پر مجبور کئے گئے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کی جو جائداد ہے اسے مہاجروں کی جائداد کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ جائداد کے مالک خود ہندوستان میں موجود ہیں۔

ہندوستان کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ ہم نے سمجھوتے کو نہیں توڑا بلکہ اس آرڈیننس کے ذریعے ہم نے ان مسلمانوں کے خلاف کارروائی کی ہے جنھوں نے پاکستان میں خود یا اپنے رشتہ داروں کی معرفت ہندو مہاجروں کی جائداد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور ہندوستان کا بہت سا نقد سرمایہ پاکستان بھیجا ہے۔ ایسے لوگ دراصل ہندوستان کے نہیں پاکستان ہی کے باشندے ہو گئے ہیں، اور یہاں عارضی طور پر مقیم ہیں۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ مسلم مہاجروں کی ساری جائداد پر سرکار اپنی ملکیت کیوں قائم نہیں کر لیتی شری آئنگار نے کہا کہ یہ نہ صرف قانونی اعتبار سے بلکہ عملی طور پر بھی اس میں کوئی مدد نہیں ہے، کیونکہ اگر ہندوستان کی سرکار ایسا کرے گی تو پاکستان کی سرکار کو بھی ایسا کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ پھر چونکہ ہندو اور سکھ مہاجروں کی جائداد کی مالیت مسلم مہاجروں کی جائداد کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لئے اس میں ہندوستان ہی کا نقصان ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو نجی نجی جائداد ہی رہنے دینا چاہتے ہیں۔ اور جب تک سمجھوتے کی کوئی معقول صورت پیدا نہ ہو ہم پاکستان سرکار سے اس کی پیروی اپنے نجی شہریوں ہی کی طرف سے کرتے رہیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پناہ گزین اس کام میں ہمارا ساتھ دیں اور اس طرف سے پورا اطمینان رکھیں کہ ان کی جائداد کا معاوضہ انھیں ضرور ملے گا۔

ہند سرکار کے یہ بیانات جہاں تک ہند اور پاکستان کے باہمی معاملات کا تعلق ہے بہت درست اور مناسب سمجھے جا سکتے ہیں لیکن ہندوستانی مسلمانوں پر اس سب کارروائی کا کیا اثر پڑے گا اس کو سوچے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ سب سے پہلے تو خود ہندوستانی مسلمانوں سے ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دورخی پالیسی کو چھوڑ دیں وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے ہو کے نہیں رہ سکتے انھیں انتخاب کرنا ہوگا کہ وہ پاکستان کے ہیں یا ہندوستان کے۔ اس انتخاب کے بعد ان کو حق پہنچ سکے گا کہ وہ ہند سرکار

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

سرگذشت
روش صدیقی

تمناؤں کے اُن رنگیں گلستانوں سے گذرا ہوں
گماں ہوتا ہے، جنت کے خیابانوں سے گذرا ہوں
یکایک رک گیا طوفانِ جام و ساغر و مینا
کچھ ایسی تمکنت کے ساتھ میخانوں سے گذرا ہوں
مرے نقشِ قدم پر سر جھکایا ہے ستاروں نے
سحر کی روشنی لے کر شبستانوں سے گذرا ہوں
بنا دیتے ہیں جو ساحل کو بھی اک موجِ آوارہ
بہ آہنگِ سکوں ایسے بھی طوفانوں سے گذرا ہوں
نیاز بت شکن کو میں نے پہنچایا ہے کعبہ تک
غزل خوانِ حرم بن کر صنم خانوں سے گذرا ہوں
مجھے یاد آ گئی ہے داستاں فرہاد و خسرو کی
روش! جب آسماں بر دوش ایوانوں سے گذرا ہوں

غزل
نجم الدین شکیب

چلی زندگی بھر مصائب کی آری
مگر میری ہمت نے بازی نہ ہاری
جو روشن جبینی سے محروم کر دے
وہ ہے خاکبازی نہیں خاکساری
وہ زورِ جنوں ہے کہ ٹوٹیں گی کڑیاں
چلی آ رہی ہے وہ بادِ بہاری
درِ دل پہ گردن فلک کی جھکائی
لبالب دیدہ میں کی شہریاری
گذاری ہیں مے خانۂ دل میں راتیں
نگاہوں کے ساغر سے کی میگساری
تجھے حسن بخشا ہے میری نظر نے
اداؤں سے بڑھ کر نگاہیں ہیں پیاری
ہما جس کے تیرِ نظر کا ہدف ہو
ممولوں پہ کرتا نہیں وہ شکاری
محبت کا فیضان ہے اللہ اللہ!!
یہ آہیں یہ نالے یہ شب زندہ داری

غزل
مثنیٰ رضوی

کہنے کو یوں تو قید کی حد سے نکل گئے
ہے بات صرف اتنی کہ زندان بدل گئے
اب بھی اگرچہ بات وہی ہے جو پہلے تھی
لیکن ترے خیال کے پہلو بدل گئے
دیوانہ وار راہ میں بڑھنا بھی خوب تھا
گر گر کے ہر قدم پہ ہم آخر سنبھل گئے
تیرا خیال ذہن میں کیا گنگنا اٹھا
لاکھوں چراغ میرے تصور میں جل گئے
دنیا سمجھ رہی تھی جنھیں خواب کا فسوں
وہ انقلاب آج حقیقت میں ڈھل گئے
میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہٹوں راہِ شوق سے
نازک سی اس نگہ کے اشارے مچل گئے
پہروں ترے خیال سے جب کھیلتا تھا میں
وہ دن گذر گئے وہ زمانے بدل گئے

قطعات
قیصر تمکیں

بھیگی بھیگی اُداس راتوں میں — میری ویرانیاں نکھرتی ہیں
آسماں سوگوار ہوتا ہے — اشک افشانیاں سنورتی ہیں

جس طرح سوئے شبستانوں پہ مانندِ کہر
چھائی رہتی ہیں تمنائیں بہ اندازِ خمار
سایہ افگن ہیں یوں ہی وقت کے شانوں پہ ابھی
ان گنت صدیوں کی دھندلاہیں تاریک غبار

شام کی سرمئی فضاؤں میں — اک ستارہ سا جھلملاتا ہے
ہاں یوں ہی رنج و غم کی یورش میں — میرا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے

ہندو مسلم تعلقات

انیسویں صدی اور اس کے بعد

ڈاکٹر سید محمود

(۱)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کے قبضے سے ملک کی ہماری یکجہتی پر بڑی کاری ضرب لگی۔ معاشی ڈھانچہ، سماجی نظام اور سیاسی تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور نئے عناصر اور نئی طاقتوں کا ہماری زندگی میں عمل دخل ہوا جس سے ہمارے راہ میں بہت سی مشکلیں کھڑی ہوگئیں اور سماجی اصلاح و تنظیم کا کام بڑا کٹھن ہوگیا۔

ہندوستانی سماج کی تباہی

برطانیہ کی فتح سے پہلے، تمام سماجوں کی طرح ہمارا سماج بھی دو طبقوں پر مشتمل تھا، ایک رہنمائی کرنے والا، دوسرا پیروی کرنے والا۔ پہلے طبقے میں بہت گروہ تھے، اہل علم اور مذہبی پیشوا (پنڈت، مولوی سادھو، درویش، صاحب اختیار اور صاحب جائداد (فوجی اور سول ملازمین اور زمیندار) اہل دولت (ساہوکار، سوداگر، کارخانہ دار وغیرہ)، دوسرا طبقہ کاریگروں، دست کاروں، کسانوں اور مزدوروں وغیرہ پر مشتمل تھا، سرکاری ملازمین صاحب جائداد اور اہل علم کو سماج میں ایک طرح کی برتری حاصل ہو جاتی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور تمدنی رہنمائی کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی انہی کے کاندھوں پر ہوتا تھا۔ عہد وسطیٰ کی تہذیب کے بنانے والے انہی گروہوں میں سے ہوتے تھے۔ لیکن ہندوستان پر برطانیہ کے قبضے نے آہستہ آہستہ انھیں ٹھکانے لگا دیا۔

مغربی تعلیم کی اشاعت سے بھی ایک اہم تبدیلی ہوئی سماج سے قدیم تعلیم یافتہ گروہ کا گہرا اور زندہ رشتہ منقطع ہوگیا۔ اور وہ انتہائی پستی اور ذلت کے گڑھے میں جاگرے۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی جگہ پیدا ہوا اپنے خیالات سے کرا گیا جس سے ان کے اور عوام کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نیا طبقہ ہندوستانی زندگی کی روایات سے عرصے تک دلچسپی نہ لے سکا۔ اور مغرب کی بے جان نقالی کو ہی اس نے زندگی کا مقصد اور نصب العین بنالیا۔

ہندوستانی حکومت کی شکست سے سیاسی اور سماجی رہنما حکومت کے قدیم نمک خوار اور تعلقہ دار بھی تباہ ہوگئے۔ اُن کی اولاد بالکل اپاہج اور ناکارہ ہوکر رہ گئی۔ کاہلی اور عیاشی کو انھوں نے اپنا شعار بنالیا اور تھوڑی بہت جائداد جو ان کے قبضے میں رہ گئی تھی اس کی بھی ٹھیک طور پر دیکھ بھال نہ کرسکے۔ یہ بے جان کم حوصلہ اور بزدل طبقہ برطانوی حکومت کا بہت سخت حامی بن گیا، اس لئے کہ وہ ان کے لئے تن پرور زندگی کی ضمانت کرتا تھا۔ ایک ایسی زندگی جس میں نہ طاقت حاصل کرنے کا حوصلہ تھا نہ شہرت کی آرزو۔

ملکی تجارت ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی، اور اس طرح اہل دولت بھی تباہ و برباد ہوگئے۔ برطانوی حکومت نے ایسی پالیسی وضع کی اور ایسے طریقے بنائے جس سے ہندوستان کی صنعت آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو جائے۔ تاکہ ہندوستان برطانوی مال کی کھپت کا ایک وسیع منڈی بن جائے اور اس طرح ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان مقابلے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔

ہندوستانی تہذیب کی یکجہتی کا خاتمہ

لیکن برطانوی حکومت سے سب سے بڑا نقصان ہوا کہ عوام کی یکجہتی نیست و نابود ہوگئی۔ ملک کے مختلف فرقوں نے دھیرے دھیرے زندگی کا ایک مشترکہ طریقہ وضع کرلیا تھا۔ ایک کا کام دوسرے کے بغیر نہیں چلتا تھا۔ ہر گروہ یا فرقہ اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک خاندان کے ممبر کی طرح مل جل کر رہتا تھا۔ ہر ایک کے فرائض بٹے ہوئے تھے، اس لئے نہ مقابلہ کا خطرہ تھا اور نہ سماجی اختلاف کا امکان۔ مذہبوں کے اختلاف سے بھی اس اتحاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن برطانوی حکومت کے قائم ہوتے ہی سماج کا یہ ڈھانچہ تار تار ہوکر رہ گیا۔ حکومت بدلی۔ اقتدار سمٹ کر ایک مرکز کے تحت آگیا اور برطانوی حکومت براہ راست ہر گروہ اور جماعت کی سرپرستی کرنے لگی۔ تو مختلف گروہوں کے باہمی تعاون کے بھی کوئی معنی نہیں رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گروہ ایک دوسرے سے دور ہٹنے لگا۔ ہر فاتح کی قوت کا دارومدار مفتوح کی کمزوری اور پھوٹ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی قوت کے برقرار رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ کمزوری اور پھوٹ بھی ہمیشہ باقی رہے۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" فن حکمرانی کا پرانا اور آزمودہ نسخہ ہے۔ سر جان سٹراچی نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ "فارن افیرس" میں چھپا تھا۔ لکھا ہے "اس میں کلام نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اگر ذہنیت نہ ہوتی جس کا ہندو مسلم دشمنی ایک مظاہرہ ہے تو برطانیہ کا قبضہ قائم نہ ہوتا"۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام دشمنی کا آغاز غدر میں شروع ہوئی۔ اس طرح وہ اندرونی میلانات جنھوں نے ہندوستانی سماج کو تباہ کرنے میں آسانیاں پیدا کیں، برطانیہ کے زیر سایہ اور پھولے پھلے اور ہندوستانی عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی ہوکر رہ گئی۔

ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں ہمارے ملک میں دو طاقتیں کام کر رہی تھیں ایک طرف تو ہندوستان کی معاشی زندگی عہد وسطیٰ کی طرح خود کفیل اور جامد نہیں رہتی۔ دنیا کی ترقی پسند طاقتیں اور صنعت و حرفت میں نئے طریقوں کا رواج ہندوستان کو ایک معاشی وحدت میں تبدیل کردیتا ہے اور ہندوستان اس کی کوشش کرتا ہے کہ معاشی نظام کو قومی بنیادوں پر قائم کرے۔ اس طرح قدرتی طور پر اس کی خود کفالت ختم ہو جاتی ہے۔ دیہاتی علاقوں کا جمود ٹوٹتا ہے اور قدامت پسند گروہوں کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ معاشی زندگی کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماجی ڈھانچے اور سیاسی نظام میں بھی تبدیلی ضروری تھی۔ چنانچہ یہی ضرورت سماجی اور سیاسی تحریکوں کی تحریک کی روح رواں بنی۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ معاشی ترقی کو غیر ملکی حکومت سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی بلکہ اس کی طرف سے کچھ نہ کچھ رکاوٹیں ہی ڈالی گئیں۔ چنانچہ اسی صدی میں مغربی یورپ میں جو معاشی ترقی ہوئی وہ یہاں نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشی تبدیلیوں کی زبردست طاقتیں جو وجود میں آگئی ہیں، ہماری زندگی کے دھارے کو ایسے راستے پر لگا رہی ہیں جس کی منزل ایک ہے۔

دوسری طرف سیاسی اور تہذیبی طاقتوں کو کچھ اس ڈھنگ سے پروان چڑھایا گیا ہے کہ ہماری سماجی ابتری بہت عرصے تک باقی رہے گی اور لامرکزیت کی ذہنیت کو تقویت پہنچتی رہے گی۔

موجودہ اختلافات کے اسباب

آئیے موجودہ افسوسناک واقعات کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لیں یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دنوں جو شرمناک فسادات ہوئے یہ سب ماضی کی پیداوار ہیں۔ شروع ہی سے برطانوی حکومت کی پالیسی رہی ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے درمیان جتنی دوری ہوسکے پیدا کی جائے۔ چنانچہ کبھی ایک فرقہ کی طرف داری کی گئی تو کبھی دوسرے کی۔ کبھی لامذہبوں کے مذہب کے جال میں پھانسا گیا تو کبھی باہمی بغض و حسد کی آگ کو ہوا دی گئی۔ ملک کی بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور غربت نے ان فرقوں کو کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ جب تک

کر رہے ہیں اس کا اثر ملک اور خود ان پر کیا ہوگا۔

شروع ہی میں جب برطانیہ نے ہند کو فتح کرنا شروع کیا تو اسے مسلمان شہزادوں اور گورنروں سے ٹکر لینی پڑی۔ اس لئے مسلمانوں کو وہ اپنا مدمقابل اور سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگی۔ ان کا اثر توڑنے، ان کی دولت کو ختم کرنے غرض اقتدار مٹانے کے لئے ہر ممکن کارروائی عمل میں لائی گئی۔ طاقت اور امارت کے تمام ذرائع ان پر بند کر دئے گئے۔ پچھلی حکومت کے زمانے میں فوج اور محکمہ مال کی سرکاری نوکریوں میں خدمت کرکے انھوں نے جاگیریں حاصل کر لی تھیں۔ مسلمان علماء کو عدالتوں میں جگہیں دی گئی تھیں اور شاہی عنایتوں سے نوازا گیا تھا۔ برطانوی عہد میں آمدنی اور ترقی کے یہ تمام ذرائع ان سے چھین لئے گئے۔

ہندوؤں کے ساتھ خاص رعایتیں کی گئیں۔ اور ان کو بڑے بڑے علاقے دے گئے، اور وہ تمام ملازمتیں جن کے دروازے کالے آدمیوں پر کھلے ہوئے تھے، ہندوؤں کو بخش گئیں۔ اس طرح ہندو اپنے آقاؤں کے آلۂ کار بن گئے۔ مسلمان بددل اور حیران تماشا کیا کرے۔ بہت دنوں تک وہ انگریزوں سے کھنچے کھنچے رہا، اور برطانوی حکومت سے بالکل تعاون نہیں کیا۔ اس کے بدلے میں حکومت نے انھیں کچل کر رکھ دیا۔ جنوری [illegible] میں لارڈ ایلن برو نے جو اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل تھے، بھر کر فرمایا تھا کہ میں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہی ہونی چاہئے کہ ہم ہندوؤں کو اپنائیں

("UNHAPPY INDIA") ترجمہ:- مشتاق احمد

(باقی آئندہ)

ہریجن کا سچ

(بقیہ صفحہ ۲)

تالاب وغیرہ بنانے کا بھی پروگرام ہے۔ اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ غذائی مسئلے کا دیہی صنعتوں اور مویشیوں کی تعداد سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ مویشی ذریعہ پیداوار اور نقل و حمل دونوں ہیں۔ ہم نے ریلوے کی ابتدا سے قبل کے ذریعے نقل و حمل کو نظر انداز کر دیا ہے یہ ہمارے وسیع اور کثیر آباد ملک کے لئے خطرناک ہے۔ ان تمام باتوں کی کوششوں کا دوسرا مورچہ سمجھنا چاہئے۔ دوسرے مورچے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کم اہم ہے بلکہ وہ متبادل مورچہ ہے۔ اور اس کی اہمیت بھی کافی ہے۔ اس کو سر فہرست پر ٹھیک رکھنا ہے مشینوں سے پیداوار کی لاگت اور دستکاری کی لاگت کو مقابلہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن جب مفید چیزوں کی پیداوار کی زیادہ ضرورت ہو تو ہر طریقۂ پیداوار کو قائم رکھنا چاہئے۔

مالی نقطہ نظر سے بھی دیہی صنعتوں کی ترقی کی پالسی اہم ہے۔ اس بات کو یقین کرنے کے اہم وجوہ ہیں کہ کرنسی نوٹوں کی بڑی تعداد گاؤں میں محفوظ ہے۔ دیہاتیوں کے پاس نہ تو ان کے استعمال کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ سوجھ بوجھ۔ اسی لئے وہ جمع کر لئے گئے ہیں۔ ڈاک اور نقد سرٹیفکیٹ کی خریداری کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوتے۔ کسان تاجروں کی طرح سود خور نہیں ہوتے۔ اگر ان کو زمین ملے تو بخوشی اس پر روپیہ لگانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں پر چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی شروع کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ ان کو ہدایت ملے اور یقین دلایا جائے کہ اس طرح بنایا ہوا سامان فروخت بھی ہو جائے گا۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کرے۔ ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا بہتری یا قیمت میں کارخانے کے بنے ہوئے سامان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان باتوں میں بھی ترقی ہونا چاہئے۔ لیکن ان کی بھی اسی طرح ہمت افزائی ہونا چاہئے جیسے کہ غیر ملکی مقابلے کے خلاف ریلوے، کپڑے اور شکر کی ملوں وغیرہ کی ہوئی ہے۔

حکومت کو چاہئے کہ وہ شہروں کی طرح گاؤں کی زرعی اور صنعتی ہمہ گیر ترقی کا خیال رکھے جو تعمیر کے دوسرے مورچے کی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ اگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں تو ہمیں انسان اور مویشی کی اس زبردست طاقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے جو ہمیں حاصل ہے۔ اسی وقت ہم اپنی مشکلات سے نکلنے کی امید کر سکتے ہیں۔

(ترجمہ۔ قومی آواز، لکھنؤ)

مختصر تبصرے

"نراس میں آس"

ڈاکٹر مسعود حسین

"نراس میں آس" صالحہ عابد حسین کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے جو حال میں مکتبہ پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف روپے بارہ آنے۔

اس مجموعے کے تمام افسانے پچھلے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق ہیں۔ "لوٹ" جیسے "اللہ رکھے"، "وہ جس میں ابھی امر"، "پانی پت" جیسے مختلف النوع عنوانات ایک ہی محور کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ موجودہ ادب، بالخصوص افسانوی ادب، مسائل حاضرہ سے اس قدر قریب ہو گیا ہے کہ آئندہ کا مؤرخ اپنا بیشتر مواد اسی سے اخذ کرے گا۔ حال کا فن کار مؤرخ کی سی حیثیت کے بغیر ہی تاریخ کے اوراق کو مرتب کر دیتا ہے۔ وہ اشخاص و واقعات پر تاریخ کی خشک فہرست مسلط نہیں رکھتا بلکہ اپنے تخیل سے زندہ و پائندہ بنا دیتا ہے۔

پچھلے چند سالوں کے فسادات خونیں کی سچی تصویر ہمارے بعض اچھے افسانہ نگاروں نے قلم بند کی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی صالحہ عابد حسین کی پیش نظر کتاب ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانوں کا موضوع جیسا کہ کہا جا چکا ہے صرف اس قدر ہے۔ میں نے فسادات کو کیسا کر دیکھا؟ ان فسادات سے متعلق ہمارے ادیبوں کا عجیب و غریب ردعمل رہا ہے۔ بعض اوسط درجے کے بے حس قلم ایسی لکھ گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کچھ منہ میں زہر اور دشنام بھرے اس قدر اگل گئے کہ زبان اور فساد خون کا گمان ہونے لگا۔ بہت کم لوگوں نے اس پر متوازن اور سلجھی ہوئی نظر کے ساتھ لکھا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے ان فسادات کے انسانی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ جب میں انسانی پہلوؤں کا خیال کرتا ہوں تو معاً میرے ذہن میں "لوٹ" کے سردار جی آ جاتے ہیں جنہوں نے ایک مسلمان خاندان کی جان اور آبرو بچانے کے لئے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا "کس کی ہمت ہے کہ جگت سنگھ کے گھر میں آئے مہمان کو ہاتھ بھی لگائے ————— خون کی ندیاں بہہ جائیں گی ندیاں ...."

وہ بہادر وسنگھ سامنے آ جاتا ہے جس نے اپنی ساری زندگی ملک کو آزاد کرنے کی کوشش میں صرف کر دی تھی۔ کاش مصنف نے اس کا نام پنڈت جواہر لال نہ بتایا ہوتا۔

وہ بھائی بجلی بن کر نظر کے سامنے کوند جاتا ہے جو سپاہی تھا، لیکن ایک مظلوم عورت کا بھائی بن سکتا تھا جس کی خاکستر میں ابھی تک چنگاری باقی تھی۔

غرض کہ جیتے جاگتے بے شمار کردار ماضی خیال سے گزرنے لگتے ہیں۔

یہ ایک سوشلسٹ کا متوازن نقطۂ نظر ہے جو زندوں میں سائے ڈھونڈھتا ہے۔ لوگ اسے پیشہ ور مبلغ کہیں گے۔ سوشلزم سے متعلق یہی ایک راستہ ہے کہ اس کی چھاؤں میں وہ پکھا پن نہیں ہوتا جو ہر شئے کو ایک ہی رنگ میں رنگ دے۔ جو کاش زمین میں ستارے ڈھونڈھنے کی بجائے ایک ذرہ کو آفتاب بنانے کے درپے ہو۔ جو انسانیت کے نام پر فریب اور خود فریبی میں نہ تو مبتلا ہو اور نہ کرے تحقیر یہ کو جو ہمہ گیر انسانیت کی خاطر انسانوں کے گلے پر چھری چلا سکے!

صالحہ عابد حسین نے کسی بھی قسم کے رسمی پیچیدہ خصوصیات کی جگہ پھول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ تر بین الاقوامی گوشہ عشق اور حدود "سے زیادہ نہ کہہ سکیں۔ خون کا خون بہا اُن کے یہاں محض انسانی پیغام ہیں یا انسانی چیخیں۔ ان افسانوں میں وہ بار بار چیخی ہیں۔ "نراس میں آس" کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

"...بے شک ————— اس انسانیت پر جو ختم ہو رہی ہے، اس تہذیب پر جو مٹ رہی ہے، اس تمدن پر جو خاک میں ملا جا رہا ہے۔ ...."

وہ اس سے میں بہت دور تک چلی جاتی ہیں اسی طرح افسانے میں اس قدر جذباتی لہریں آ جاتی ہیں کہ فن کا رانہ احساس مجروح ہوتا ہے۔ ان کے اسی انداز تحریر کی وجہ سے اکثر افسانوں کا خاتمہ غیر تسلی بخش ہو گیا ہے۔

وہ جہاں چند فرشتہ خصلت انسانوں کی نیکیوں پر اپنے افسانے مبنی کرتی ہیں، چند بد طینت اشخاص کو سرزنش بھی کرتی جاتی ہیں لیکن نہایت احتیاط سے سیاسی جماعتوں، اداروں اور رہنماؤں کی زہرناکیوں سے دامن بچا گئی ہیں۔ سوشلسٹ تجزیہ سیاست سے یہیں مجھے اختلاف ہے۔ جس قدر جماعت نے دانش کی ضرورت اکر سکی چلے گئے "ہم وحشی ہیں" ہیں دیکھئے، بھولی ہے اس مقدار میں نہیں ملتی۔ جہاں خون سے چراغ جلائے جا رہے ہوں، وہاں انسانیت کے بے روشن سکھنے سے! وہ خاتمہ نہیں ہو گا۔ ان دلوں کی ہری بھری کرے گی۔ آندھی میں آڑ لینے میں چند تنکوں کو سینے سے چمٹا کر بچا لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس وقت مردانہ وار ان طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہے جو انسان اور انسانیت کی جیتی جاگتی روحوں کو جلا رہا ہے۔

مجھے ان افسانوں کو پڑھ کر وقتی طور پر شرافت انسانی کی روشنی ضرور ملی۔ اسی لئے میں مصنف کے تخلیق کردہ کردار "سردار جی"، "سپاہی"، "بھائی" وغیرہ کو مشعل راہ سمجھتا ہوں، اور پھر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں!

فنی اعتبار سے، فسادات سے متعلق عام افسانوں کی طرح پیش نظر افسانوں میں بھی بعض سقم پائے جاتے ہیں۔ جذبات کے بے پناہ طوفان کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا نتیجہ ایک شکست کی بے دست و پائی ہے۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ بہ سوا اس کے ان افسانوں کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ وہ اسے فنی اعتبار سے تکمیل اور ہضم کرنے کے لئے کچھ وقت اور فاصلہ کی ضرورت تھی جو مصنف کو میسر نہ ہو سکا۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ "لوٹ" سے قطع نظر بقیہ افسانوں میں مکالمہ مختصر ہے جو مکالمہ کی جان ہوتا ہے۔ اسی لئے افسانے [illegible] میں مدد ملتی ہے۔ مکالمہ تخیل کی کشیدہ کاری بنتا ہے۔ لیکن جذبات کی تقابلی [illegible] فسادات کے اکثر افسانہ نویسوں کو اتنی فرصت نہیں [illegible] کی طرف توجہ دے سکیں۔

یہ افسانے اس لحاظ سے ضرور اہم ہیں کہ ان میں فسادات سے متعلق ایک اہم اور قابل فکر نقطۂ نظر کا اضافہ ملتا ہے۔ فکری و تہذیبی تشفی ہو یا نہ ہو، قلبی تسکین کا سامان ضرور فراہم کر دیا گیا ہے۔ "پانی پت" کی سادہ کہانی اوراق تاریخ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ مصنف نے نہایت چابک دستی سے تاریخی حقیقت سے افسانوی حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔ دوسرے افسانے بھی "لوٹ"، "اللہ رکھے"، "دستگیر" بھی حقیقی واقعات ہیں جنہیں افسانوی حقیقت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں بعض اوقات واقعاتی صحت کو اس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ افسانے کا پورا آب و رنگ پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ بالخصوص "دستگیر"، "آخری سہارا" اور "بھائی" افسانوں سے کہیں زیادہ واقعاتی یا جذباتی ڈھنگ سے ہوئے ہیں۔

"نراس میں آس" بھی چند نیک بنتے ہمارا اندیشہ دور، حاضر کر سکا ہے، ایک زندگی کے صحیفے کا ورق ہے۔ شاید مصنف اس کی شہادت نہ دیں لیکن وہ اس میں اپنی زندگی کو افسانہ بنا کر پیش کرنے میں پوری طور پر کامیاب ہوئی ہیں۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

> ### ناشروں سے
> براہ کرم مفصل تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجئے۔
>
> (ایڈیٹر)

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر (دہلی)

یکم اگست ۱۹۴۷ء

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت :- یکم ، ۸ ، ۱۹ ، ۴۷

چندہ :- سالانہ ۶ ، ششماہی للعہ

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

"منیجر"

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں)

"منیجر"

نئی روشنی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۶ | ۸ راگست ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

مغربی یونیورسٹیاں

رابندرناتھ ٹیگور

جب کبھی ہم اپنی قومی یونیورسٹی کے بارے میں سوچتے ہیں تو کیمبرج، آکسفورڈ اور یورپ کی دوسری یونیورسٹیاں ہماری نگاہوں میں پھر جاتی ہیں، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہر ایک کے عمدہ اجزاء چن کر ایک مکمل یونیورسٹی بنائیں، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یورپین یونیورسٹیاں یورپ کی زندگی کے زندہ اجزاء ہیں جہاں پر ہر ایک کی نشو ونما قدرتی طور پر ہوئی ہے۔ موجودہ فن جراحی میں ناک کان یا کوئی اور عضو اگر کٹ جائے تو دوسرے شخص کے چمڑے سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے لیکن دوسروں کے متفرق اعضاء کو ملا کر ایک آدمی بنا کر کھڑا کر دینا سائنس کی دسترس سے نہ صرف موجودہ زمانے میں بلکہ آیندہ بھی باہر رہے گا۔

یورپین یونیورسٹی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں اس کے علاوہ اور کسی دوسری یونیورسٹی کا خیال بھی نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر کہ میرے ہمسائے کے ہٹا کٹا جوان بیٹا ہے قدرتاً میرے دل میں یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کاش میرے گھر میں بھی ایک بیٹا ہوتا لیکن اگر حقیقتاً میری یہ آرزو ہے کہ جوان بیٹا فوراً پیدا ہو جائے تو اس عجلت میں کسی شخص کو پکڑ لوں گا جو قد و قامت ویسا ہی رکھتا ہو لیکن وہ میرا لڑکا تو نہ ہوگا۔ بے صبری کے ساتھ نتائج کا انتظار کرنا اور تقل آمانے کی کمزوری ان دونوں باتوں نے ہمارے دل میں یہ غیر فطری خواہش پیدا کر دی ہے کہ قومی یونیورسٹی ابتدا ہی سے خوب آب و تاب کے ساتھ قائم ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہماری کوششیں اگر ضائع جاتی ہیں یا اگر کچھ ثمرات نکلتے ہیں تو ان کی مثال مٹی کے ان خوب صورت پھلوں کی سی ہے جو جسامت رنگ روپ اور شکل شباہت میں قدرتی پھلوں کی مانند ہے، لیکن انھیں کھانا تو ایک طرف، دانت سے کاٹنے کے قابل بھی نہیں۔ یہ یونیورسٹیاں جن سے ہمارے ملک کی توقعات وابستہ ہیں، مثل اُن اُبالے ہوئے انڈوں کے ہیں جن سے بچے نکلنے کی اُمید کرنا عبث ہے۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کھانا اور کھانے کے لئے برتن دونوں چیزیں انسان کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن جب کھانے کی کمی ہو تو ظروف میں بھی کفایت شعاری کرنی ضروری ہوتی ہے۔ سامانِ تعلیم کو اس قدر گراں کر دینا کہ حصول تعلیم دشوار ہو جائے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص روپیہ سے تھیلیاں خریدنے میں اپنے سارے روپے صرف کر دے۔

ہم مشرقیوں کو اپنی زندگی کے سارے مسائل آپ حل کرنے ہیں۔ ہم نے حتی الامکان اپنے طعام و لباس کو ناقابل برداشت نہیں بنا رکھا ہے اور اس کا باعث خود ہمارے ملک کی آب و ہوا ہے۔ ہم کو دیواروں سے زیادہ روزن کی ضرورت ہے۔ ہمارے لباس میں جولاہے کی کرگھے سے زیادہ ہوا اور روشنی کو دخل ہے۔ آفتاب ہمارے لئے گرمی پیدا کرنے کے وہ سامان خود مہیا کرتا ہے جو دوسرے مقامات میں غذا سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ افلاس کوئی اچھی چیز ہے، لیکن سادگی لوازمات عیش سے کہیں بہتر ہے جس سادگی کی طرف میرا اشارہ ہے وہ افراط اور فضول خرچی میں کمی کا نام نہیں بلکہ وہ کمال انسانی کی ایک علامت ہے۔ جب بنی نوع انسان میں آجاتی ہے اس وقت تمدن کی تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں یہ سادگی کا ہی فقدان ہے کہ ہماری ضروریات زندگی اس قدر کمیاب اور گراں ہو گئی ہیں۔

متمدن دنیا میں بہت سی چیزوں نے مثلاً کھانا، پینا، عیش و آرام تعلیم و تہذیب حکومت و عدالت نے اپنی اپنی مناسب حیثیتوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے مغرب انسانوں پر اس کا بار ضرورت سے زائد ہے، اور ان کے اٹھانے میں وہ تدبیر کی بجائے طاقت یا بالفاظ دیگر عقل کی بجائے بازو سے کام لیتے ہیں۔ اس کی مثال اس دیو ہیکل کے ہاتھ پاؤں مارنے کی سی ہے جو ابھی اپنے ڈباؤ سے نکلا ہے لیکن تیرنا نہیں جانتا۔ وہ اپنی بے سود کوششوں سے تالاب کا تمام پانی گدلا کر رہا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے وہ اس خیال سے خالی بھی نہیں کہ اس اظہار زور و قوت میں کچھ تدبیر کی بھی ضرورت ہے۔

مغرب میں جب سادگی آجائے گی اس وقت کاروبار، عیش و آرام، تعلیم تکلم سب آسان ہو جائیں گے۔ یہ کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس وقت تک ہم کو سرنگوں ہو کر یہ وعظ سنتے رہنا چاہیے کہ "اعلیٰ تعلیم سربہ فلک اور عظیم الشان عمارتوں ہی میں ہو سکتی ہے"!

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
مغربی یونیورسٹیاں	رابندرناتھ ٹیگور	۱
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ہندی	۲
تنقید کا حق	اداریہ	۳
بزم بے تکلف		۴
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	م۔ ع	۴
۲۔ پاکستان	ع۔ ل	۶
غزل	مرزا احسان احمد	۷
بازگشت	باقر رضوی	۷
عجب حالت ہوتی ہے!	رشید احمد صدیقی	۸
ڈاک کے نئے ٹکٹ / غذائی پیداوار کیسے بڑھ سکتی ہے /	کشوری لال مشروالا	۱۰
ہندوستانی زبانوں کا جائزہ	پرنسپل عبدالشکور	۱۱

ہم کدھر جارہے ہیں؟

سالک ہندی

چین کی تصویر

شنگھائی کے ایک غیر ملکی باشندے نے جو غالباً انگریز ہے، لندن کے ہفتہ وار اخبار "نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن" میں ایک کھلی چٹھی کمیونسٹ چین کے نیتا ماؤسی تونگ کے نام لکھی ہے جس کا مطالعہ ہم لوگوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو چین سے محبت ہے۔ اس کے دل میں چینی تہذیب کی مخصوص قدروں اور عناصر کا احترام ہے لیکن خط کا مقصد چینیوں کی بعض کمزوریوں پر سختی یعنی دل سوزی کے ساتھ تنقید کرنا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر ماؤسی تونگ نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تو ان کے تمام اصلاحی اور تعمیری منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میں اس خط کے بعض ٹکڑے ذیل میں درج کرتا ہوں:-

"میں جب پہلی مرتبہ چین پہنچا تو سب سے پہلے ننگوا کی بندرگاہ کے افسروں سے مجھے سابقہ پڑا، اس وقت سے اب تک جو مجھے تجربے ہوئے ہیں ان کے پیش نظر مجھے خیال ہوتا ہے کہ چینی عمال کے کیرکٹر کی سب سے نمایاں خصوصیت بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ ہے...... سنتا ہوں کہ آپ نے گزشتہ بیس سال کی جدوجہد کے دوران میں اپنے ماتحتوں اور کارکنوں میں ڈسپلن اور وفاداری کی روح پیدا کر دی ہے۔ آپ کے افسر دیانت دار ہیں۔ آپ کی فوج لوٹ کھسوٹ نہ کرے گی۔ آپ کی بندرگاہ کے عمال رشوت نہ لیں گے۔ ۱۹۲۶ء میں چیانگ کائی شیک اور کومن تانگ کے بارے میں بھی یہی باتیں کہی جاتی تھیں۔ اس لئے یہ لمحہ آپ کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ ان لوگوں نے بھی بلند مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا تھا اور کچھ عرصے تک ان پر عمل بھی کیا۔ لیکن جو کچھ بعد میں پیش آیا اس کے متعلق بعد میں یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ صرف قیادت کی خرابی اور لیڈروں کا قصور تھا میرا خیال ہے کہ چین میں جو کچھ ہوا اس میں جتنی ذمہ داری سونگ اور کنگ جیسے لوگوں کی ہے اتنی ہی پولیس اور محصول اور مال گذاری کے چھوٹے چھوٹے افسروں کی بھی ہے، اور آپ جو کچھ بھی کریں گے آپ کو ایسے ہی لوگوں سے کام لینا ہے جو آگ بجھانے سے پہلے اپنا شکرانہ ٹھیرانا چاہتے ہیں (ابھی گزشتہ ہفتہ انھوں نے اس سودے کو چکانے میں دو گھنٹے لگا دئے، اور اس عرصے میں بیس ہزار آدمی بے گھر ہوگئے) جو جہاز کے بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی مسافروں کو لوٹنا اور اس کے خورد و نوش کے سامان کو خرد برد کرنا شروع کر دیتے ہیں جو فوج کے سپاہی ہوتے ہوئے بے دھڑک کسان کے چاول کے ذخیرے پر (جو اس کی ساری دولت ہے) قبضہ جما لیتے ہیں اور جس مکان میں عارضی طور پر قیام کرتے ہیں اس کو فروخت کر دیتے ہیں، جو مدد آمد برآمد کے بورڈ میں کلرک اور افسر ہیں اور تجارت کے لائسنس سر بازار زیادہ سے زیادہ دام لگانے والے کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں...... یہ سب لوگ بدمعاش نہیں ہیں۔ یہ بچے دوست بن سکتے ہیں۔ ان میں وفاداری کا مادہ ہے۔ لیکن بالعموم صرف اپنے خاندان والوں کے ساتھ ان کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور ان کے سامنے بڑے بڑے افسروں اور لیڈروں کی بری مثال ہے جو انھیں گمراہ کرتی ہے۔ لیکن سب سے اہم اور افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ ایسا کرتے وقت یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی بری بات ہے اور وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔ آپ کو ایسے ہی لوگوں سے کام لینا ہے ان کی صحیح تربیت اور اصلاح کرنی ہے......

میں نے گذشتہ ایک سال میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ ایک ہزار آدمیوں کا دل توڑنے کو کافی ہے۔ لیکن لوگ جلد ایسی چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں، ان پر شکست کی ذہنیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے جو کام ہاتھوں میں لیا ہے وہ بہت مشکل، بہت صبر طلب، بہت ہمت شکن ہے اور مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں چین آپ کو بھی اسی طرح ہضم نہ کر جائے جس طرح اور بہت سے نیک نیت لوگوں کو کیا ہے...... باہر کی دنیا کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دراصل آپ کی اصلی جنگ ابھی شروع بھی نہیں ہوئی......"

اور ہماری صورت!

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ابھی حالت اس درجہ خراب نہیں ہوئی۔ لیکن آج کل جو کچھ دیکھنے اور سننے اور پڑھنے میں آرہا ہے اس کے پیش نظر مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قومی سیرت اور دیانت داری اور ڈسپلن کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کے لئے نہایت مستعدی اور سختی کے ساتھ اقدام نہیں کیا گیا تو عجب نہیں کہ یہاں بھی چین کے سے حالات پیدا ہو جائیں! کانگریس کو گاندھی جی نے ایک مضبوط ڈسپلن کی پابند، ایثار پیشہ جماعت بنانے کی کوشش کی تھی اور انھیں اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی تھی۔ اگر اس کے بہت سے ممبروں میں قومی آزادی کی خاطر قربانی کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انھیں اپنی اس بے نظیر جدوجہد میں کامیابی کیسے ہو سکتی تھی؟ لیکن آزادی ملنے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نقشہ ہی بدل گیا۔ بیشتر لوگ جو جلوس یا نمائش کے طور پر کانگریس کے ساتھ تھے اپنی "خدمات" کا صلہ چاہتے ہیں اور فوراً چاہتے ہیں اور اس کے لئے سارے ملک کو مال غنیمت سمجھ بیٹھے ہیں! انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قدم کو اچھا ہو یا برا جائز سمجھ لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ڈسپلن اور ذمہ داری، قومی مفاد اور دیانت کا احساس گم سا ہو گیا ہے۔ چند روز ہوئے ریل کے سفر میں حکومت ہند کے ایک افسر اور میرا ساتھ ہوا۔ انھیں لوگوں کا مرض تھا اور [illegible] صبر کے ساتھ سننے کی تکلیف وہ صلاحیت ہے۔ وہ سارے وقت حکومت کے کارخانے پر تنقید کرتے رہے۔ دفتروں میں چپراسی تک ڈسپلن اور فرض شناسی کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ملک آزاد ہو گیا اور اب کوئی ان کے خلاف آسانی سے تادیبی کارروائی نہیں کر سکتا! وزیر اور ممبران کونسل کو آئندہ انتخابوں کی فکر ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے جو ان کے ووٹوں پر برا اثر ڈالے۔ افسر کام میں سست پڑ گئے ہیں، اور اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ کیونکہ ترقی کا انحصار محنت، دیانت اور قابلیت پر نہیں بلکہ با اثر مربی کی دستگیری پر ہے۔ صاحبان اختیار عہدوں، ملازمتوں اور نفع کے کاموں کی تقسیم یا تو روپیہ لے کر کرتے ہیں یا اس اصول پر جس کے اصول پر اندھا ریوڑیاں تقسیم کرتا ہے وغیرہ وغیرہ"...... اگر یہ صحیح ہے (اس بارے میں اختلاف صرف مرض کی شدت کے متعلق ہے مرض کی موجودگی سے کسی کو اختلاف نہیں) تو میرے خیال میں اس طرف توجہ کرنا خوراک مہیا کرنے اور ہسپتال بنانے اور بجلی پیدا کرنے اور اسکول قائم کرنے سے بھی زیادہ ضروری ہے، کیونکہ ان تمام کاموں کے لئے دیانت دار، فرض شناس، مستعد کارکنوں اور مستعد اخلاقی سیرت کے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ان کے بغیر ہماری تمام اسکیمیں اور منصوبے ناکام رہیں گے۔ اور نیک خواہشوں کا آبگینہ خود غرضی اور بددیانتی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

پنڈت نہرو کا نسخہ

اس ضمن میں ہندوستانی تصویر کے ایک روشن رخ کو واضح کرنے کے لئے میں پنڈت نہرو کی دو تقریروں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو انھوں نے حال میں کلکتہ اور لکھنؤ میں کی ہیں، انھیں دہرانا غیر ضروری ہے، کیونکہ ان کی رپورٹ آپ اخباروں میں پڑھ چکے ہیں، لیکن اخباروں کا فرض ہے کہ وہ ان کے مرکزی خیال کی بار بار وضاحت کریں تاکہ وہ لوگوں کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ کلکتہ میں انھوں نے جرات کی صفت پر زور دیا تھا

(بقیہ صفحہ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ اگست ۱۹۵۹ء

تنقید کا حق

دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جو خوبی سے انجام پاسکتا ہو جب تک کہ اسے کرنے والے خود اور کام کو جاننے اور سمجھنے والے برابر جانچتے اور پرکھتے نہ رہیں۔ تنقید اور اعتراض میں بڑا فرق یہ ہے کہ جو تنقید کرتا ہے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ خامیوں کے ساتھ خوبیوں کی طرف بھی توجہ دلائے۔ منصوبے پورے کرنے کے جو وسائل ہوں ان پر غور کرے اور کام کو بہتر انجام دینے کے طریقے اور تدبیریں بتائے۔ اعتراض کرنے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اعتراض موثر ہوسکتا ہے مگر مفید بہت کم ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت اکثریت کی رائے کے مطابق ہوتی ہے اور جب کسی فریق کو حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے سارے مخالف اعتراض کرنے کے بہانے ڈھونڈھتے رہتے ہیں، تاکہ اکثریت کو اس کے خلاف کردیں۔ اس اعتراض میں تنقید کی صفت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ کام اور کام پر اعتراض کرنے والے دونوں ملک سے محبت اور سماجی زندگی کو ترقی دینے کا شوق رکھتے ہیں، اور اعتراض کرنے والوں پر یہ الزام لگایا جاسکے کہ ان کو سماج کے مفاد سے کوئی مطلب نہیں ہے اور صرف اپنا خیال بیان کر رہے ہیں یا کسی خاص طبقے کی اغراض کی نمائندگی کر رہے ہیں تو ان کی بات کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ جمہور کی ذہنیت درست ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ اسی اعتراض پر غور کرے جس سے حکومت کے فرائض کو بہتر انجام دینے کی لگن ظاہر ہوتی ہے اور اسی اعتراض کرنے والے کو اپنا خیرخواہ مانے جو اپنی صلاحیت کے مطابق سماج کی خدمت کرنے کی ذمہ داری لینے پر تیار ہو۔

ہندوستان کی موجودہ حکومت پر اس وقت ہر طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی ہے یہ بیزاری کی علامت تو ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم مستعد ہے اور حکومت سست، قوم اتحاد عمل پر تیار ہے اور حکومت کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق نہیں۔ اعتراض بیشتر ایسے انداز سے کیے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہری حکومت کے منصوبوں کو اپنے منصوبے نہیں سمجھتے، اور ان کی نظر میں اپنے فائدے کے سوا اور کوئی معیار نہیں۔ بعض فریق اس وجہ سے غیر مطمئن ہیں کہ حکومت ان کے منصوبوں کو اپنانے میں تامل کرتی ہے اور وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ کن معاملوں پر فوراً توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اور کون سے فی الحال ملتوی کیے جاسکتے ہیں۔ کسانوں کے حقوق کو محفوظ کرنے کے بعد یہ اتنا ضروری نہیں تھا کہ زمینداری کو منسوخ کرنے کی کارروائی بھی جلد سے جلد مکمل کی جائے۔ اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ غلے کی پیداوار بڑھانے اور پیداوار قابو میں لاکر صحیح طریقے پر تقسیم کرنے کی تدبیریں کی جائیں۔ کسانوں کا ووٹ اگلے انتخاب میں فیصلہ کن ہوگا لیکن یہیں سوچنا یہ چاہیے کہ کسانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے غلے کی گرانی برقرار رکھی جاسکتی ہے یا نہیں، اور اگر گرانی کو دور کرنا ہے تو یہ دیہاتی زندگی کے نظام میں انقلاب پیدا کرکے زیادہ آسانی سے دور کی جاسکے گی یا اصلاح میں مصلحت اور احتیاط سے کام لے کر۔ زمینداری کی منسوخی کی طرح شراب بندی کے معاملے میں بھی صوبوں کی حکومتیں شاید اپنی مرضی کے خلاف ایک خاص پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کی جارہی ہیں اور خاص اس وقت جب بہت سے تعمیری کاموں کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے حکومتوں کی آمدنی کم کی جارہی ہے اور ان کا خرچ بڑھایا جارہا ہے۔ اسی زمانے میں جب غلے کی کمی قومی زندگی کا ایک مسئلہ بن گئی ہے دودھ دینے والے اور باربرداری کے جانوروں کو زیادہ سے زیادہ لمبی مدت تک کھلانے کی ذمہ داری لے لی گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فصلوں کا ایک خاصہ حصہ تیار ہونے سے پہلے ہی آوارہ جانوروں کی نذر ہوجایا کرے گا۔ شردھا ماتا نے نئی دہلی میں اس مقصد سے برت رکھا ہے کہ دہلی میں شراب بندی کی جائے، ہندی راشٹر بھاشا قرار دی جائے اور ہندوستان کا نام "دوبارہ" بھارت ورش رکھا جائے۔ وہ اس بے جا دباؤ کا مثالی نمونہ ہے جو اس وقت حکومتوں پر ڈالا جارہا ہے۔ مگر جب عام طور پر شہریوں کے ذہن میں ترقی پسند قومی زندگی کا تصور اور دلوں میں زندگی کی تعمیر کا حوصلہ نہ ہو تو ان لوگوں کو اپنی ضد پوری کرنے کا موقع ملتا ہے جو کسی ایک دھن میں لگے ہوتے ہیں، اور اس طرح کی ضدیں جاری رہیں گی جب تک کہ جنتا اور حکومت دونوں قومی مفاد کے منصوبوں کو پورا کرنے میں دوست اور ساتھی کی طرح شریک نہ ہوجائیں۔

ہندوستان کو غذا کے معاملے میں خود کفیل بنانا ایک بنیادی منصوبہ ہے جس کی ضرورت اور اہمیت میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا۔ یہ منصوبہ حکومت کے کارکنوں کی مستعدی، کارپردازی اور انتظامی قابلیت کا امتحان ہوگا۔ قوم کے لیے بھی یہ ایک بڑی آزمائش ہے۔ اگر غلہ روکنے کا سلسلہ جاری رہا، چور بازار کا کاروبار ترقی کرتا رہا، غلے کے خرچ میں ہر ممکن کفایت نہ کی گئی اور زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کرنے کی کوشش جی توڑ کر نہ کی گئی تو اس سے حکومت سے زیادہ شہریوں پر الزام آئے گا اس لیے کہ حکومت کو کامیاب کرنا یا اس کی ساری تدبیروں کو الٹ دینا انھیں کے اختیار میں ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے ذاتی فائدے کو دیکھا اور دوسروں کی ضرورت اور ان کے حق کا خیال کرنا اپنا فرض نہ سمجھا تو حکومت کے سارے قاعدے، قانون اور انتظامات کسی کام نہ آئیں گے۔

بزمِ بے تکلف

"واللہ خان صاحب، آپ تو آج بالکل ریشہ خطمی ہوئے جارہے ہیں۔ کیا کوئی شادی کا اشتہار پڑھ لیا اخبار میں؟"

"بھئی خوب آئے، تشریف لائیے۔ ابھی اس وقت تمھیں کو یاد کر رہا تھا۔ اماں کیا کہوں، ایک گرم خبر آئی ہے آج کہ جی خوش ہوگیا۔"

"آخر وہ کون سی ایسی چٹ پٹی مسالے دار خبر ہے کہ آپ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے، ساری طبیعت پھڑکی پڑتی ہے۔ ہمیں بھی تو سنائیے یار۔"

"انجمن تحفظ حقوق شوہراں۔ کیا سمجھے؟ یعنی کہ شوہروں کے حقوق کی حفاظت کی انجمن۔"

"ماشاء اللہ کیا کہی ہے! مگر سچ مچ اس نام کی کوئی انجمن قائم ہوئی ہے؟"

"جی اور کیا۔ پوری گڑھوال میں۔ اب قدر عافیت معلوم ہوگی ان بیگمات کو۔ آخر ہم بھی بالکل مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ اپنی حفاظت کا بل بوتا رکھتے ہیں۔"

"بول بے تیرا زور، اور یہ سارا زور آزمایا جارہا ہے بے چاری کمزور عورت پر۔"

"کمزور عورت! یہ تم کس جگ کی باتیں کر رہے ہو میاں، یہ چودھویں صدی ہے۔ عورت کو کمزور کہا تو ہتک عزت کا دعویٰ ہوجائے گا۔ خیر بھئی ہم تو چلے گڑھوال، یہی ایک جگہ رہنے کی ہے۔"

"اجی بس رہنے بھی دیجیے۔ ایسے آپ کہاں کے فرہاد خاں ہیں کہ پہاڑوں سے سر ٹکراتے پھریں گے۔ ہم ایک ترکیب بتاتے ہیں۔ آپ خود ہی ان کے ماتحت شوہروں کی حفاظت کی ایک انجمن بنا لیجیے اور اس کے صدر بن جائیے۔"

"واللہ کیا بات کہی ہے۔ تو پھر آج ہی بسم اللہ ہوجائے نہ۔"

"ضرور، مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کو کن حقوق کی حفاظت کی ضرورت ہے؟"

"اجی یہی ـــ یعنی کہ بس یہی ـــ کہ بیوی بیوی رہے شوہر نہ بن جائے۔"

"یہ تو کچھ بات صاف نہ ہوئی۔"

"سبحان اللہ! یہاں تو چاند صاف ہوگیا اور آپ کے لیے ابھی تک بات صاف ہی نہیں ہوئی۔"

"اس صفائی کی داد دیتا ہوں۔ مگر کچھ کہیے تو، آخر آپ کو کیا شکایتیں ہیں؟"

"ارے بھائی مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنے دل سے پوچھو۔ اس کل جگ سے پہلے میاں بیوی کا رشتہ کیا غضب کا رشتہ تھا۔ بیوی اپنی بیوی تھی، جب جی چاہا دلار کیا، جب جی چاہا دھتکار دیا۔ صبح کو ٹھونک دیا، شام کو تھپک دیا۔ مزے میں بسر ہوتی تھی۔ ایسا تم جیسے لوگوں نے بیوی کو ایسا سر چڑھایا کہ زندگی دشوار ہوگئی۔ گھڑک کر دیکھو تو منہ پھلائے، برا بھلا کہو تو سہم جائے، ہاتھ اٹھاؤ تو قیامت مچادے اور جو کہیں ذرا سا مار دو تو بس پھانسی ہی دلا کے رہے۔"

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

پچھلا ہفتہ:-

۱- ہندوستان

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!

جب لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے عید کی خوشی کے موقع پر پاکستان کے مسلمانوں سے اپنی خدمات کا اعتراف کرانے اور ان کے اندر اپنے لئے ایک جذبۂ احسان مندی اور وفاداری پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ان کو یہ یاد دلائیں کہ وہ آزادی کی جنت میں زندگی گزار رہے ہیں جبکہ اُن کے مسلمان بھائی جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں غلامی کی دوزخ اور عذاب میں مبتلا ہیں۔ بدنصیب ہندوستانی مسلمانوں کی حالت پر ان کو ترس کھانا چاہیے۔ اور خدائے ذوالجلال کا تہ دل سے شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے انھیں اس ذلت، محرومی اور مصیبت کی زندگی گزارنے سے بچایا۔

اُن کے اس بیان میں بعض خوش فہم لوگوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور دل سوزی کا لہجہ اور انداز محسوس کیا ہے۔ حالانکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تباہ حالت تو اس سارے بیان میں ایک جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل موضوع تو لیاقت علی خاں صاحب کی قیادت میں پاکستان کے مسلمانوں کی خوش نصیبی اور خوش حالی ہے۔

چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پاکستان کے مسلمانوں کی آزادی "بادِ بہاری کا آئینہ" ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کی غلامی اس آئینے کے لئے "زنگار" کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس سے اس کی آب و تاب اور چمک دمک میں اضافہ ہوتا ہے۔

اگر لطفِ گفتگو کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ یہ بیان ہندوستان کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ بدحالی کو دیکھ کر دیا گیا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمدردی کا یہ طریقہ اس قسم کا ہے جسے "مرض رہے نہ مریض" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے وزیر اعظم صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کو دھوبی کا کتا بنانا چاہتے ہیں جو نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اپنے گھر کو کواڑ بند کرکے تالا چڑھا دیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا داخلہ پاکستان میں تقریباً روک دیا ہے۔ اب جو ہندوستان میں ہیں ان کو جنھیں یہیں رہنا ہے طعن کر کے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ تم اس ملک کے نہیں ہو۔ اس ملک میں تمھاری حیثیت اجنبی اور غلام کی سی ہے۔ ان کرم فرما محسن سے کوئی پوچھے کہ جو لوگ نے خود کا دعوے کرتے تھے وہ تو بھاگ نکلے اب جنھیں آپ غیر سمجھتے ہیں ان کو ہم نہ اپنائیں تو ہم کہاں جائیں؟ آپ چاہتے کیا ہیں؟ ہم کو صدقے کا بکرا بنانا چاہتے ہیں۔ عید کے موقع پر فطرہ ادا کیا جاتا ہے کیا پاکستان کے وزیر اعظم صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کو بطور فطرہ پیش فرما رہے ہیں؟

ہم پاکستان کے وزیر اعظم کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو باہر کے کسی ملک کی ہمدردی یا امداد کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو کسی قسم کی مدد ملنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ ہم اپنے آپ پر اور اپنے خدا پر بھروسہ کرکے جینا چاہتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی ہمدردی سے تو خاص طور پر ہمیں سخت تکلیف ہوتی ہے جو اپنی جان بچانے کی فکر میں اپنے رفیقوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم اپنا دوست انھیں سمجھتے ہیں جنھوں نے مصیبت کے وقت ہمارا ساتھ دیا جنھوں نے اس وار کو جو ہم پر کیا جا رہا تھا ڈھال بن کر اپنے اوپر لیا۔ اپنی جان دے کر ہماری جان بچائی جنھوں نے سچ اور جھوٹ، حق اور باطل، نیکی اور بدی، شرافت اور بدطینتی، محبت اور دشمنی کا فرق محض قول سے نہیں بلکہ اپنی زندگی کے عمل سے سکھایا۔ ہمیں نہ مہاسبھا کا خوف ہے نہ آر، ایس، ایس کا، ہم سب ہندوستانیوں کو چاہے ان کا کسی جماعت سے تعلق ہو اپنا دوست اور بھائی سمجھتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ بھی ہمیں دیر سویر ایسا ہی سمجھنے لگیں گے۔ پاکستان کے وزیر اعظم کو ہمارے لئے اپنی ہمدردیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس پونجی میں سے پہلے ہی وہ بہت کچھ جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر کی ہمدردی میں لٹا چکے ہیں اب جو کچھ باقی ہے اُسے اپنے ہی لئے محفوظ رکھیں، ہماری فکر نہ کریں، ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

خوراک کا مورچہ

آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۵ر اگست کو جو تیسرا یوم آزادی منایا جائے گا اس میں پورا زور خوراک کی مہم کو کامیاب کرنے پر لگایا جائے اور ہندوستان کے ایک ایک گاؤں کے ہر آدمی کو یہ بتلایا جائے کہ آزاد قومی سرکار ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لئے یہ چاہتی ہے کہ سنہ ۵۱ء تک ہندوستان اپنی خوراک کی سب ضرورتیں اپنے ملک کے اندر ہی پوری کرنے لگے۔ اس کے لئے بے جوتی زمینوں کو جوتا جائے جن زمینوں کی سینچائی نہیں ہوتی ان کے لئے جہاں تک ہو سکے سینچائی کا انتظام کیا جائے ہر قسم کے کھادوں کا استعمال بڑھایا جائے۔ اچھے بیج بوئے جائیں۔ ایسی فصلیں اگائی جائیں جن کی پیداوار فی ایکڑ زیادہ ہوتی ہے جیسے شکرقند موم پھلی اور کیلے وغیرہ اور ان کے استعمال کرنے کا لوگوں کو شوق دلایا جائے۔ پودوں کو بیماریوں اور جانوروں کے نقصان سے بچایا جائے فصل کے ذخیرہ کرنے کا انتظام بہتر کیا جائے۔ غرض دس فی صدی کی جو کمی ہے اور جس کو احتیاطاً پندرہ فی صدی کی کمی قرار دیا گیا ہے اس کو جس طرح ہو سکے دور کیا جائے۔ یہ کام ناممکن نہیں ہے ضرورت مستعدی سے اس کام میں لگ جانے کی ہے۔ کانگریس کی رہنمائی میں ملک نے آزادی کی لڑائی کے سلسلے میں جس طرح زبردست مہمیں سر کی ہیں اسی طرح اگر اس مہم کو بھی سر کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ضرور کامیابی ہوگی۔ ہمارے وزیر اعظم نے کہا ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے جیسے قومیں جنگ جیتنے کے لئے کام کرتی ہیں۔ ہمیں اس ڈیڑھ دو ارب روپے کو بچانا ہے جو باہر کے ملکوں سے اناج منگانے پر ہم ہر سال خرچ کر رہے ہیں۔ یہ روپیہ ادھر سے بچے گا تو ہم مشینیں اور ملک کی ترقی کے لئے ایسے دوسرے سامان منگا سکیں گے جن کو ہم فی الحال اپنے ملک میں تیار نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے گورنر اور وزیر اعظم نے اپنے مکان کے احاطوں میں اپنے ہاتھ سے ہل چلا کر جو مثال لوگوں کے سامنے رکھی ہے کی اگر سب عقل مندی کے ساتھ پیروی کریں تو ضرور کامیابی ہوگی۔ ہماری سب ترقیاں اس مہم کی کامیابی پر منحصر ہیں یہ مہم کامیاب ہوگی تو ہمارے ملک کی درآمد اور برآمد میں جو غیر معمولی عدم تعادل پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہوگا۔ ہماری صنعتیں ترقی کریں گی۔ روزگار میں اضافہ ہوگا۔ مصارف زندگی کم ہوں گے۔ قیمتوں کی سطح نیچی ہوگی، عام خوش حالی اور مرفہ حالی کا دور دورہ ہوگا۔ غذا کا مورچہ سر ہوگا تو باقی سب مورچے سر کئے جا سکیں گے۔

اسٹرلنگ پونجی کے بارے میں نیا سمجھوتہ

ہندوستان کے وزیر مالیات ڈاکٹر جان متھائی انگلستان سے جو نیا سمجھوتہ اسٹرلنگ پونجی کے بارے میں کر کے آئے ہیں اُسے خاصا قابل اطمینان کہا جا سکتا ہے۔ یہ سمجھوتہ کسی نئی بنیاد پر نہیں ہوا ہے۔ بلکہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اُسی میں اس کے ذریعے ضروری ترمیمیں کر دی گئی ہیں۔ یہ سمجھوتہ اسی مدت کے لئے ہے جس کے لئے پہلا سمجھوتہ تھا اور جون سنہ ۱۹۵۱ء میں ختم ہو جائے گا اس سمجھوتے کی اہم شرطیں یہ ہیں:-

(الف) سنہ ۱۹۴۹ء میں انگلستان ہندوستان کو اسٹرلنگ کے قرضے میں سے ۸۱ ملین پونڈ ادا کرے گا۔ حالانکہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس سال اس پونجی میں سے کوئی رقم نہیں دی جائے گی۔

(ب) سالانہ ادائی کی مقدار کو سنہ ۵۰ء اور سنہ ۵۱ء کے لئے چالیس ملین پونڈ سے بڑھا کر پچاس پچاس ملین پونڈ کر دیا گیا ہے۔

(ج) کھلے لائسنس کے سلسلے میں ہندوستان نے انگلستان سے مال منگایا ہے جس کے معاوضے میں اسے انگلستان کو اسٹرلنگ ادا کرنا ہے۔ لیکن اس کی رقم ابھی تک غیر معین ہے اس کو بھی انگلستان نے اسٹرلنگ پونجی

میں سے ادا کرنا منظور کر لیا ہے اور یہ رقم اوپر کی طے شدہ رقموں کے علاوہ ہوگی۔

(د) منظور شدہ اسٹرلنگ کو ڈالر میں منتقل کرنے کی ہندوستان کو بھی وہی آزادی حاصل ہوگی جیسی کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں کو ہے اور ۱۹۴۸ء کے سمجھوتہ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ ملین پونڈ کی جو پابندی لگائی گئی تھی وہ اب نہیں رہی ہے کامن ویلتھ کے مرکزی ذخیرہ میں سے وہ ان ہی شرطوں پر ڈالر حاصل کر سکے گا جن پر کہ کامن ویلتھ کے دوسرے ملک حاصل کرتے ہیں۔

کامن ویلتھ کانفرنس میں کامن ویلتھ کے سب ملکوں نے اپنی ڈالر کی درآمد کو ۲۵ فی صدی کم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ لیکن بین الاقوامی بینک سے ہندوستان کو جو ڈالر قرض میں ملیں گے اور ان کے ذریعے ہندوستان جو مال درآمد کرے گا وہ اس حساب میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔ امداد باہمی کے یہ سمجھوتے ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز کرتے ہیں اور اگر یہ جاری رہے تو امید ہے کہ ان سے دونوں ہی ملکوں کا فائدہ ہوگا۔

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

خدا کی پناہ، ایسی بیوی سے "

"خاں صاحب! مجھے اس وقت ایک مطلع یاد آ گیا۔ جب ذرا افاقہ ہو تو اس کے مطلب پر غور کیجئے گا۔

عضب کے وار تھے تیغ نگاہ بسمل کے
اماں کے واسطے اٹھے ہیں ہاتھ قاتل کے

انسداد کرنا ہوگا ...... ان جذبات کے خلوص اور ان کی صحت سے کسی کو انکار نہ ہوگا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ پنڈت جی اور ان کی حکومت ان کو عمل کا جامہ کس طرح پہنائے گی اور کون ہے جو مخالفت کو جھیل کر اور ہر دل عزیزی کو بازی لگا کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کو تیار ہے؟

(سالک ہندی)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

جس کے بغیر قومی سیرت میں ثبات اور بلندی پیدا نہیں ہو سکتی۔ "مجھے ایسے مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو صورتِ حال کے خطروں کا بہادری کے ساتھ سامنا کر سکتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی اور گھٹیا باتوں سے بلند ہو کر کام کر سکتے ہیں...... اگر ملک کے ان مسئلوں کو حل کرنے کے لئے موت کا منہ دیکھنا پڑے تو اس سے آنکھ نہ چرائو۔ گاندھی جی نے ہمیں سب سے بڑا منتر یہ سکھایا تھا کہ "خوف کو ٹھکرا دو" (اور شاید پنڈت جی کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے روشن ضمیر ہمعصر اقبال نے عرصہ ہوا لکھا تھا کہ دنیا بھر کی تمام خرابیاں خوف ہی سے پیدا ہوتی رہیں......

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می یابد فروغ
ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست)

لیکن ہم پر خوف اور لالچ کی ذہنیت طاری ہو گئی ہے اور یہ بات باہر کے تمام خطروں سے زیادہ خطرناک ہے...... کانگریس والوں کا اپنی ذات کے لئے نفع کمانے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ اس انقلاب پذیر دنیا میں ماضی کی قربانیوں کی کوئی اہمیت نہیں اگر تم قوم سے گزشتہ خدمات کے معاوضے میں پنشن حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ تمہیں نہیں ملے گی (پنڈت جی کو کہنا چاہئے تھا کہ نہیں ملنی چاہئے کیونکہ بہت سے لوگ تو پنشن پا رہے ہیں!) اگر کانگریس اس انتخاب میں ہار بھی جائے لیکن اپنی روح کے آئینہ پر زنگ نہ آنے دے تو مجھے اس ہار کی مطلق پروا نہ ہوگی......"

لکھنؤ میں انھوں نے ڈسپلن، اتحاد اور مقاصد کی بلندی پر زور دیا۔ کانگریس میں جو خرابی اور کمزوری پیدا ہوئی ہے وہ اس کے مخالفوں کے حملوں یا ان کی نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی داخلی کمزوریوں اور تنگ نظری اور پارٹی بازی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر اس کو پائندہ زندہ رہنا ہے تو انھیں آدرشوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہئے جو گاندھی جی نے سکھائے تھے ورنہ بہتر ہے کہ ہم خود اس کو ختم کر دیں یا اس کو سیاست سے ہٹا کر محض تعمیری کاموں پر لگا دیں لیکن ہمیں سیاسی کام کرنا ہے تو پھر دماغوں میں جرأت اور دلوں میں پاکیزگی پیدا کرنی ہوگی اور بددیانتی، رشوت ستانی، خود غرضی جو جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد سے بہت بڑھ گئی ہے اس کا

۲ - پاکستان

نئے گورنر کی تشریف آوری

آج سہ شنبہ مورخہ ۲ اگست کو ہمارے صوبے کے نئے گورنر سردار عبدالرب نشتر لاہور پہنچ کر اپنے نئے عہدے کا چارج لے رہے ہیں ہم اس موقع پر ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

مغربی پنجاب کے غیر معمولی حالات میں ہمارے نئے گورنر سردار عبدالرب نشتر اپنے عہدے کا چارج لے رہے ہیں کسی کی نگاہ سے اوجھل نہیں سب جانتے ہیں کہ پاکستان کی مرکزی حکومت نے آج سے تقریباً پہلے وزارتی عہد کی بدعنوانیوں اور بدنظمیوں کے سیلاب کا پانی سر سے گذرتے دیکھ کر اس صوبے میں دفعہ ۹۲ الف نافذ کر دی تھی اور صوبے کے نظم و نسق کو بلاواسطہ اپنے ہاتھوں میں لے کر وزارتی دور کی خرابیوں کی اصلاح کی مہم شروع کرا دی تھی تاکہ صوبے میں پہلے کی بہ نسبت بہتر آئینی حکومت بحال کرنے کے لیے فضا کو سازگار بنایا جائے۔

عبدالرب نشتر کو جان لینا چاہیے کہ مغربی پنجاب کے عوام کے سینے وزارتی عہد کے ارباب اقتدار کی غلط بخشیوں، رشوت ستانیوں، جنبہ داریوں، اقربا نوازیوں، دوست پروریوں، بدعنوانیوں اور بدکرداریوں کے نیزوں سے چھلنی ہو چکے ہیں۔ مغربی پنجاب کی حیات عامہ اپنے ان زخموں کے لئے مرہم تلاش کر رہی ہے۔ جسے اپنے خود غرض لیڈروں اور فرض ناشناس افسروں کے ہاتھوں پہنچ چکے ہیں۔ ان زخموں کے لئے مرہم مہیا کرنا دفعہ ۹۲ الف کے اختیارات رکھنے والے گورنر کا کام ہے۔ تاکہ عوام آئندہ انتخابات میں صحیح قسم کی آئینی حکومت کو بروئے کار لانے کے قابل بن سکیں جو کسی مخصوص گروہ کی ذاتی اغراض کو غذا دینے کے بجائے عوام کو یکساں طور پر فائدہ پہنچانے کے لئے کام کرنے والی ہو۔ (روزنامہ مغربی پنجاب، لاہور)

روس کا تجارتی وفد

ان دنوں روس کا تجارتی وفد پاکستان آیا ہوا ہے اور کراچی میں اس کی پاکستانی نمائندوں سے گفت و شنید بھی ہو رہی ہے۔ یہ وفد پشاور کے راستے آیا تھا، اور پشاور پہنچنے پر اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔

پاکستان کے عوام اس بات سے بہت خوش ہیں کہ ان کی حکومت اپنے شمالی ہمسائے کے ساتھ دوستانہ اور تجارتی تعلقات کی طرح ڈالنے میں کوشاں ہے۔ پچھلے دنوں جب لیاقت علی خاں کے ماسکو جانے کا اعلان ہوا تو ملک کے تمام اخبارات نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ خدا کرے کہ وزیر اعظم پاکستان کا سفر ماسکو دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی تمہید ثابت ہو اسی طرح روس کے تجارتی وفد کے آنے پر بھی پاکستان کے تجارتی اور غیر تجارتی حلقوں نے مسرت کا اظہار کیا ہے

روس پاکستان کا ہمسایہ ہے اور ہماری اور اس کی حدیں تقریباً آپس میں ملتی بھی ہیں اور پھر ہمارے پڑوس میں جو روسی علاقے ہیں وہ مسلمانوں کی آزاد ریاستوں پر مشتمل ہیں جن کی تہذیب و تمدن کا ہماری تہذیب و تمدن سے گہرا اور تاریخی رشتہ رہا ہے۔ مزید برآں بہت سی چیزیں ہیں جو ہمارے ہاں بکثرت موجود ہیں اور روس کو ان کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں دونوں کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ان میں تجارتی اور خوش گوار ہمسائگی کے تعلقات قائم ہوں۔ امید ہے اس تجارتی وفد سے ان کی بنیاد پڑ جائے گی۔

(زمانہ لاہور)

پنجاب اسمبلی کے ارکان قانونی شکنجے میں

حکومت پاک پنجاب اسمبلی کے سابق کرم فرماؤں ایم ایل اے حضرات کے خلاف جو تحقیقات کر رہی تھی وہ مکمل ہو گئی ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی نے ملک کے ان خادموں کو تین فہرستوں میں تقسیم کیا ہے۔ بستہ اول میں وہ حضرات ہیں جن کے خلاف غیر مسلموں کی جائدادیں خرد برد کرنے کا الزام ہے اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ ان کے متعلق مکمل شہادتیں موجود ہیں گورنر پنجاب نے کھلی عدالت میں ان کے خلاف مقدمات چلائے جانے کی اجازت دے دی ہے

دوسری فہرست میں وہ ایم ایل اے ہیں، جنھوں نے کیا تو وہی کچھ ہے، جو بستہ الف والوں نے کیا ہے مگر ان کے خلاف پولیس شہادتیں مہیا نہیں کر سکی۔

تیسری فہرست میں وہ ایم ایل اے ہیں جن کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے۔

ابھی تک تینوں فہرستیں منظر عام پر نہیں آئی ہیں کہ کون کون سے بزرگ ابھی تک معصوم ہیں اور کن کن زعماء کے ایمان داغ دار ہیں۔

(روزنامہ سعادت لائل پور)

پاکستان کے غذائی مسائل

۱۹۴۸ء میں پاکستان کے مختلف بچت والے علاقوں نے ۳ لاکھ ۳۴ ہزار ٹن اناج کا اعلان کیا جو قلت والے علاقوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے بھی زیادہ تھا، لیکن بدقسمتی سے مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال دونوں صوبوں میں شدید بارش ہوئی اور ایسے سیلاب آئے جو اس سے قبل کبھی نہ آئے تھے دریائے سندھ پر سکھر بیند میں شگاف ہو گیا۔ اس وجہ سے پاکستان کی غذائی پیداوار کو سخت نقصان پہنچا۔ مشرقی بنگال کے بچت والے اضلاع بالکل سیلاب کی نذر ہو گئے، سندھ میں دھان کی فصل کو شدید ترین نقصان پہنچا اور مغربی پنجاب کے بہت سے اضلاع کی فصلوں پر بھی اثر پڑا۔

اس قدرتی نقصان نے سوسائٹی کے دشمن عناصر کے حوصلے بڑھا دئے اور انھوں نے اپنی مذموم سرگرمیاں شروع کر دیں اور اناج کی غیر قانونی برآمد، ذخیرہ بازی اور چور بازاری کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

پاکستان کے اندرونی علاقوں میں اناج کی ذخیرہ بازاری ایک عظیم خطرہ بن گئی تھی۔ چنانچہ مختلف صوبوں اور ریاستوں نے اس کے خلاف اقدامات کئے اور اناج کے ذخیروں کی صحیح مقدار کو چھپانا یا ایک مقررہ مقدار سے زیادہ ذخیرہ کرنا جرم قرار دیدیا گیا۔ غذائی راشن میں کمی کر دی گئی اور گیہوں سے بنائی جانے والی چیزیں ممنوع قرار دی گئیں اور دعوت و تقریب میں مہمانوں کی تعداد کو محدود کر دیا گیا، صوبہ سرحد بلوچستان اور مغربی پنجاب میں گیہوں کی بہت قلت ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ پر مغربی پنجاب میں راشننگ کے نظام کے بالکل درہم برہم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے وزارت خوراک نے غیر ممالک سے اناج درآمد کرنے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ بین الاقوامی ہنگامی غذائی کونسل سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن پاکستان کو دینے کی درخواست کی گئی دوسرے ذرائع سے بھی اناج درآمد کیا گیا۔ چنانچہ اس سے گیہوں ہنگری یوگوسلاویہ اور آسٹریلیا سے اناج، جو اور گندم منگائے گئے۔

اناج کی درآمد سے چور بازاری کی قیمت بہت گر گئی اور ذخیروں کے مالکوں کو اپنا ذخیرہ باہر نکالنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جب انتہائی قلت کا اندیشہ تھا۔ قیمتیں گرنا شروع ہو گئیں اور اس نے ذخیرہ بازوں کو اچھا سبق دیا چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف صوبوں اور ریاستوں میں امسال توقع سے زیادہ غلہ کی وصولی ہوئی۔ سارے مغربی پاکستان میں راشن کا اضافہ کر دیا گیا اور اب ہر بالغ کو روزانہ ۸ چھٹانک راشن دیا جا رہا ہے اور چاول کے لازمی راشن کو منسوخ کر دیا ہے۔ یقین کے ساتھ توقع کی جاتی ہے کہ اس سال کی فصل میں پاکستان کو باہر سے گیہوں درآمد کرنا پڑے گا۔

(روزنامہ مغربی پاکستان، لاہور)

سندھ میں زرعی اصلاحات

کراچی میں تجارتی بستیوں کی تکمیل کے بعد مرکزی حکومت حیدرآباد سندھ اور سکھر میں بھی اسی قسم کی بستیاں قائم کرنے والی ہے، جن میں زرعی اصلاحات کے ماتحت جدید سائنٹفک بنیادوں پر زرعی ترقی کے منصوبے تیار ہوں گے اور کسانوں کو بڑھیا قسم کے بیج مہیا کرنے اور زرعی ماہرین کی مدد

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

غزل

مرزا احسان احمد

فضا ساری یکایک عالمِ جاں کی چمک اُٹھی
یہ ہلکی سی جنبش اے نگاہِ فتنہ گر کیسی؟
اسی کے دم سے ہے سب زندگی کی شورش و مستی
یہ دردِ غم کا شکوہ کیا! تلاشِ چارہ گر کیسی؟
نکل اس کی تمنا میں نظر جو آ نہیں سکتا
نگاہیں دیکھتی ہوں جس کو خود اس پر نظر کیسی؟
رگِ برقِ ستم میں تھیں مگر تسنیم کی موجیں
مری کشتِ تمنا ہوگئی شادابِ تر کیسی؟
جھلک تھی اک تمہاری یاد کی، تم خود نہ تھے لیکن
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ موجِ شرر کیسی؟
تجلی وادیٔ سینا کی بھی مدہوش و حیراں ہے
نمایاں آج ہے یہ تابشِ داغِ جگر کیسی؟
لٹا کر منتظر رہ سب یہ نقشِ رنگ و بو دل سے
بہار آتی ہے پھر اس پر باندازِ دگر کیسی؟
ابھی ہر گوشۂ جاں اس کی لو سے جگمگا اُٹھے
چراغِ بادہ روشن کر، دعا ہائے سحر کیسی؟
کسی نے جیسے رگ رگ میں شرابِ زندگی بھر دی
شگفتہ ہوگئی جاں موجِ غم میں ڈوب کر کیسی؟
ابھی تک عالمِ حیرت میں وا ہے دیدۂ انجم
کہ ہے ایک خاک کے ذرّے میں یہ موجِ شرر کیسی!
مجھے سمجھا ہے کتنا سادہ دل صیاد نے آخر
قفس میں لاکے رکھ دی یہ گلوں کی شاخِ تر کیسی؟

اسے تو ابتدا ہی سے محبت بجلیوں سے ہے
نہالِ عاشقی کو حاجتِ برگ و ثمر کیسی؟
شبِ غم کا نہ کر شکوہ یہ سوزِ دل کہاں ملتا
اسی سے کر سحر پیدا، تمنائے سحر کیسی؟
مٹا کر صفحۂ دل سے ہر اک نقشِ تمنا کو
حیاتِ نو یہ بخشی تو نے اے برقِ نظر کیسی!
چمک اُٹھنا مژہ پر کچھ تبسم ریز موتیوں کا
یہی ہے شرحِ غم میری، مگر ہے پر اثر کیسی؟
حقیقت یوں تو دل کی کچھ نہیں معلوم ہوتی ہے
مگر کل شورشیں عالم کی کر دیں مختصر کیسی؟
یہی تو روح کے نشو و نما کا وقت ہے ناداں!
ہجومِ برق و باراں میں یہ فکرِ بال و پر کیسی؟
ہر اک تیرِ بلا کو مسکرا کر روک لیتا ہوں
ملی ہے مجھ کو عشقِ ناتواں کی یہ سپر کیسی؟
سرِ بزمِ تشنہ کامی کی خبر کیا مے پرستوں کو
کہ دل ہے خونِ مرا کیسا! چھلکتی ہے نظر کیسی؟
جنوں ہی زندگی کی مشکلیں آسان کرتا ہے
خرد کھاتی ہے ورنہ ٹھوکریں ہر گام پر کیسی؟
مذاقِ بندگی ہے بے خودیٔ روح کا طالب
یہ احساسِ جبیں کیسا؟ یہ قیدِ سنگِ در کیسی؟
حریمِ عشق میں، ان ہونے والوں سے کوئی کہہ دے
کہ جانبازوں کی محفل میں یہ شانِ نوحہ گر کیسی؟

"بازگشت"

(ایک ادھوری نظم، جو پوری بھی ہے)

باقر رضوی

آج مضرابِ تخیل سے ہیں لرزاں دل کے تار
ناچتی ہے سامنے نظروں کے ماضی کی بہار
ذہن محوِ تمکنت ہے، حافظہ کو ناز ہے
ایک دورِ انبساط و لطف کا آغاز ہے
ناامیدی سر بہ زانو، یاس و حرماں مضمحل
بے جرم قلب منور، بے کلف مہتابِ دل
فوجِ ماہ و سال سکتے میں کھڑی ہے سامنے
وقت کی تلوار دو ٹکڑے پڑی ہے سامنے
راز کے سربند غنچوں کی چٹک ہے قلب میں
خارِ آگاہی سے ہلکی سی کھٹک ہے قلب میں
روز و شب نے گو بظاہر میری دولت لوٹ لی
ہیں نظر کے سامنے سب واقعاتِ زندگی

وہ نگاہوں کا تصادم زندگی کے موڑ پر
وہ مآلِ عشق سے اندھی جوانی بے خبر
وسوسوں کی وہ جوانی، وہ امیدوں کا شباب
ہجر کی خونی حقیقت، وصل کے رنگین خواب
غم کی وہ کالی گھٹائیں، سرخوشی کے وہ سحاب
قہقہوں کے وہ جلاجل، آنسوؤں کے وہ رباب
دل میں دھڑکن، نبض میں تیزی، نظر میں اضطراب
قلب کے ویران حجرے میں تمنا باریاب
ہائے وہ عرضِ تمنا کی مسلسل کوششیں
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کیا اس سے کہیں
ایک اک جملے کو سو سو طرح سے کرنا درست
پھر بھی ہر فقرے میں سکتہ اور ہر اک نقطہ مست

"عجب حالت ہوتی ہے!"

(دعوت دینے میں)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

(مندرجہ بالا سلسلے کی یہ تقریر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے حال میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو نشر کی تھی۔ محکمۂ نشریات کے شکریے کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے)

دعوت دینے میں حالت عجیب ہی نہیں ہوتی غریب بھی ہو جاتی ہے، بشرطیکہ دعوت دینے والے کا تعلق کسی خفیہ فنڈ یا بلیک مارکٹ سے نہ ہو۔ دعوت دینے والے بالعموم غریب ورنہ بے توف ہوتے ہیں! اگر مہمان بھی غریب ہوں تو پھر یا مظہر العجائب والغرائب! عربی میں غریب کے معنی نادر اور مسافر کے ہیں۔ یہ لفظ ہمارے دیار میں پہنچا تو اس کے وہ معنی ہو گئے جن کے بارے میں بعضوں کا خیال ہے کہ اُن کے خون سے تاج محل کی تعمیر ہوئی ہے!

ہماری زبان کے ایک مشہور پارکھ نے بتایا ہے کہ جو لفظ جس تلفظ سے جس مفہوم میں ہمارے ہاں چالو ہو گیا ٹھیک ہے چاہے وہ اپنے اصلی گھر میں کسی تلفظ سے کسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہو۔ غریب کی بدنصیبی دیکھئے جہاں گیا اس کا انجام کچھ کا کچھ ہوتا رہا۔ اب بعض دوستوں نے اس کا نیا مصرف دریافت کیا ہے۔ غریب ہی کا نہیں تاج محل کا بھی۔ غریب کا یہ تصور اپنے اصلی معنی سے عجیب تر ہے۔ یعنی جس کسی کو تاج محل بنوانا ہو وہ غریب کا خون استعمال کرے۔

اور جبکہ تاج محل کا ذکر آ ہی گیا، آئیے دیکھیں دعوت دینے میں تاج محل کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ تاج محل کی حالت اس لئے اور قابل رحم ہے کہ وہ بلائے یا نہ بلائے لوگ یوں بھی پہنچ جاتے ہیں پھر وہ بلائے بھی تو کس منہ سے۔ بلانے کا اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو، جو لوگ بلائے جائیں گے ان کی نیت اور نظر کا کیا علاج! تاج محل تو دعوت دیتا ہے اس کی کہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ محبت کا پاکیزہ حسین اور بلند تصور انسانی تخلیقی سرگرمی میں جلوہ گر ہو کر ہماری کن ان گنت معلوم و نامعلوم صلاحیتوں کو دعوت دیتا ہے، اور ہمارے آپ کے بعد آنے والی نسلوں کی نظر میں ہم کو کس درجہ گرامی اور محبوب بنا دیتا ہے۔ تاج محل ہم کو دعوت دیتا ہے اس کی کہ ہم دیکھیں کہ انسان اس پر ایمان لائیں کہ انسان کہیں کا ہو کسی نسل کا ہو کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، یگانگت کا مشترک رشتہ ضرور رکھتا ہے اور فکر و نظر کی بلندی و پاکیزگی کسی تعمیر میں منتقل ہو کر کن انسانی خوبیوں اور مبارک صلاحیتوں کو فروزاں کرتی اور ان کو تقدیس بخشتی ہے اور انسانوں کو بلا کسی امتیاز کے ترقی و تجمل کی کن مہکتی دمکتی اور لہلہاتی ہوئی وادی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ تاج محل دعوت دیتا ہے اس حقیقت کے پہچاننے کی کہ وہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ایک متوازی اور مکمل نمونہ ہے۔ راگ رنگ، رقص روپ، رمز و روایات کے کون سے نازک یا دقیق نقش نہیں جو انتہائی زیبائی و برنائی کے ساتھ اس میں جلوہ گر نہیں ہیں —— لیکن دیکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو تاج محل کے پورے وجود کو غریبوں اور ناکسوں کے خون سے آلودہ دیکھتے ہیں۔ اور خود یقین رکھتے ہوں یا نہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک مطلق العنان بادشاہ نے اپنی عیش کوشی غریبوں کی بے چارگی پر خندہ زن رہنے کی یادگار قائم کی ہے!

اس تعبیر و تصور پر غور کرتا ہوں تو ذہن میں بے اختیار یہ بات آتی ہے کہ پچھلی اور اس سے پہلے کی جنگ عظیم میں بھی جب سفاکی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور فتح یا انتقام کا جنون پورے عروج پر تھا، بے رحم سے بے رحم غارت گر بھی نوادر کو تلف کرنے کی ہمت نہ کر سکا کوئی نہ کوئی چیز باقی رہ گئی تھی جو ان کو تجاوز کرنے سے روک دیتی تھی۔ یہ تو مادی نوادر تھے، مثلاً عمارات، عبادت خانے، عجائب خانے، تصاویر، تحریریں، مقبرے اور یادگاریں وغیرہ لیکن یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسا مسلک ہے جو بڑی سے بڑی قدر اور تصور کو چاہے ان کے پیچھے کتنی ہی مبارک اور کیسی ہی مقدس روایات کیوں نہ ہوں بغیر کسی پس و پیش کے آناً فاناً خاک میں ملا دیتا ہے۔ ذہنی بربریت کی یہ بھیانک مثال بیسویں صدی کے وسط میں خاصے اچنبھے کی بات ہے! تعبیر و تلبیس کی یہی کارفرمائی رہی تو غالباً دنیا کی اچھی سے اچھی بڑی سے بڑی اور خوب صورت سے خوب صورت شے بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو غریبوں کے خون سے آلودہ یا جنسی آلودگیوں پر مبنی نہ ہو!

ایک عرصے سے کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ شاید ہی کوئی شریف آدمی خوشی خاطر کسی کو دعوت دیتا ہو۔ پھر یہ کن لوگوں کو بلائے اور کن کو نہ بلائے۔ اس لئے کہ ہوتا یہ ہے کہ جن کو بلائے وہ اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا وہ لوگ ناراض ہوتے ہیں جن کو نہ بلائے۔ میزبان کی حالت اس وقت عجیب ہوتی ہے جب بے تکلف مہمان مقررہ وقت سے دو ایک گھنٹہ پہلے ہی نازل ہو جاتے ہیں۔ جب سے راشن بندی ہوئی ہے مہمان کا دیر سے آنا تو بالکل ہی بند ہو چکا ہے بے تکلف مہمان آتے تو اس لئے ہیں کہ زائد سے زائد سگرٹ اور پان بطور کمیشن حاصل کریں اور حیلہ کریں گے کہ آپ سے کیا تکلف اپنا گھر ہے۔ آپ کا ہاتھ بٹانا تھا۔ یہی وقت میزبان کی انتہائی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں معلوم نہیں اُسے کتنے معقول اور نامعقول کام کرنے ہوتے ہیں تب کہیں وہ وقت آتا ہے جب وہ کسی قدر اطمینان و اعتماد کے ساتھ دعوت میں اپنی آبرو بچانے کے قابل ہوتا ہے۔

آنے کے ساتھ ہی موصوف ایک ایسا قہقہہ لگائیں گے جس سے میزبان کا بچا کھچا صبر و تحمل ختم ہو جائے گا۔ فرمائش کریں گے پان اور سگرٹ لائیے۔ یہ شغل شروع ہوتے ہی گھر کا کوئی کام یاد آ جائے گا جو بالعموم یہ ہوگا کہ فلاں صاحب سے وعدہ تھا کہ اسی وقت ملنے تشریف لائیں گے۔ گھر پر یہ پیغام بھیجنا چاہتے ہوں کہ وہ یہیں بھیج دئے جائیں۔ آدمی شریف اور بے تکلف ہیں۔ یہاں کھانے پینے میں مطلق تامل نہ کریں گے اور ہاں خوب یاد آیا ایک ضروری خط لکھنا تھا۔ ذرا کاغذ لفافہ منگائیے۔ آپ لانے کے لئے اٹھیں گے اور تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ پکار کر فرمائیں گے ذرا قلم بھی لیتے آیئے گا۔ آپ تین چوتھائی فاصلہ طے کر چکے ہوں گے کہ ڈھار کر آواز دیں گے، ارے بھئی ٹکٹ بھی لیتے آنا۔ آپ یہ سب لے کر آئیں گے تو وہ خط لکھنا شروع کر دیں گے۔ اب بھی خاموش نہ ہوں گے کبھی آج کی تاریخ پوچھیں گے کبھی مہینہ بھر قبل یا سال بھر بعد کی۔ الفاظ کے ہجے پوچھتے رہیں گے۔ کسی کا نام بھول گئے ہوں گے تو اس کا حلیہ یا اس کے اعمال بتا کر نام دریافت کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کا نفر کے پھٹنے کی آواز سنیں گے جیسے توڑ مروڑ کر دور پھینک دیں گے۔ بہت کچھ ہنس کر بقیہ گھگھیا کر فرمائیں گے۔ بھائی ایک مسودہ لکھ دو، میں اُسے صاف کر کے بھیج دوں گا۔ بات یہ ہے کہ میں کچھ ایسا لکھنا چاہتا تھا کہ تحریر سے نہ ہاں نکلے نہ نا۔ اس طرح کی چیز تم ہی لکھ سکتے ہو اور ہاں بھائی کوئی مذاقیہ بات بھی لکھ دینا ورنہ کم بخت بُرا مان جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ اس طرح لکھ سکتے تھے نہ کسی طرح۔ اتنی دیر میں ملازم اُن کے مہمان کو لئے ہوئے پہنچ جائے گا۔ جن کے ساتھ ایک صاحب اور ہوں گے جو خط لکھانے والے دوست کے ہاں اپنا قرض مانگنے گئے تھے اور بے شمار حاضری کے بعد آج قرآن السعدین ہوا تھا۔ دیکھتے ہی رنگ فق ہو جائے گا۔ ایک موٹی سی گالی نوکر کو اور اس سے زیادہ موٹی نووارد کو زیر لب لیکن اعماق قلب سے نکلی ہوئی دے کر جھپٹیں گے اور اس تپاک اور گرم جوشی سے نووارد سے بغل گیر ہو جائیں گے جیسے "دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے" نووارد کا تعارف مجھ سے اس طرح کرائیں گے جیسے دعوت دینا میرا پیشہ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ لوگ میرے ہاں کھانا کھائیں اور مجھ سے مذاق کریں۔ آخر میں کہیں گے خانہ ٔبے تکلف ہے۔ مزید بے تکلفی کھانے کی میز پر ہوگی۔ اس بے تکلفی کی تفصیل یہ ہے کہ نووارد کو اپنے پہلو میں بٹھائیں گے۔ ہر اچھا کھانا بار بار اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں اس کی پلیٹ میں ڈالیں گے اپنی اور دوسروں کی گفتگو کا ڈھلان نووارد کی طرف رکھیں گے۔

اس دوران میں نوکر کو خط دیں گے کہ میزبان کی

سائیکل لے کر ڈاک خانے چلا جا اور واپسی میں فلاں فلاں سامان شہر سے خریدتا آئے۔ یکایک دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر اس طرح چپ ہو جائیں گے جیسے دو چار سو روپے گھر سے جیب میں ڈال کر چلے تھے۔ راستے میں کسی نے اٹھا لئے۔ معاً ایک نادر خیال ذہن میں آئے گا۔ میزبان سے فرمائیں گے پانچ روپے نوکر کو دے دیجئے۔ میں گھر پہنچ کر بھیج دوں گا جو وہ کبھی نہیں بھیجیں گے۔ کھانا ختم ہوتے ہی یک بیک معلوم ہوگا کہ حضرت غائب ہوگئے۔ سب لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو گئے۔ لیکن نو وارد بیٹھے ہیں۔ بارہ بجے رات کے قریب معلوم ہوگا کہ یوسف گم گشتہ نے قرض خواہ سے فرمایا کہ انتظار کریں وہ ایک صاحب سے روپے لے کر پل بھر میں واپس آتے ہیں!

میری معلومات میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ نو وارد کو رات میں سوجھتا نہیں، کسی کو متعین کر دیا جائے کہ وہ روشنی لے کر ان کو گھر پہنچا آئے۔ سارے نوکر دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد سو چکے تھے۔ مجبوراً یہ خدمت مجھے اپنے سر لینی پڑی۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور [illegible] دوست کے مکان پر پہنچا۔ ساتھی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں ان کو کہاں لے گیا تھا۔ نوکر سے اطلاع کرائی کہ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ دوست کو جگا کر میری اطلاع کی۔ آنکھیں ملتے گرتے پڑتے باہر آئے تو میں نے شب کور کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا اور شب بخیر کہہ کر واپس آگیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے رات بھر ان کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور علی الصباح جب تمام گھر والے سو رہے تھے۔ یہ ان کی سب سے قیمتی اچکن پہن کر جس میں گھڑی اور فاؤنٹن پن ملفوف تھے اپنے گھر چلے گئے! کئی دن بعد ملاقات ہوئی۔ بولے آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میں نے عرض کیا ان سے کہیں زیادہ غریب!

اس تمام قصے کو دس سے ضرب دے دیجئے حاصل ضرب وہ واقعات ہوں گے جو گھر کے اندر پیش آ رہے ہوں گے بشرطیکہ خواتین بھی مدعو ہوں۔ اس موقع پر خاتون کے معنی اہل ددھیال کے ہوتے ہیں اور اہل ددھیال کے معنی خاتون ہی کے نہیں ہیں بلکہ محلے بھر کی خادمائیں اور ان کے اہل ددھیال کے ہوتے ہیں۔ اس لئے اور بھی کہ موصوفہ کی خود کوئی خادمہ نہیں ہوتی۔ اس جم غفیر کے ساتھ موصوفہ اس جبروت و طنطنے سے چڑھائی کرتی ہیں جیسے کسی مفتوحہ ملک پر قبضہ لینے تشریف لے جا رہی ہیں۔ لیک حلیہ، رفتار، گفتار، طور طریقے کسی سے آپ بالکل تمیز نہ کر سکیں گے کہ اس انبوہ میں خود موصوفہ کون اور کہاں ہیں! حسب معمول وقت سے کئی گھنٹے قبل تشریف لائیں گی، عذر یہی کہ خانہ بے تکلف ہے۔ تانگے کے دام دلوائیں گی، اور مالکۂ مکان کے کمرے پر قبضہ کر لیں گی۔ اور اس کے تمام اختیارات اور حقوق سلب کر لیں گی پھر نہایت اطمینان اور اعتماد سے فوجی احکامات صادر کرنے لگیں گی کہ

فلاں فلاں بچے کو فلاں فلاں چیز میں کھینچ باکھانے کو دو۔ فلاں فلاں کو فلاں فلاں کی گود میں دو [illegible]

باہر رہ جائیں۔ اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ یہ گویں تمام کی تمام میزبان کے لواحقین فراہم کریں گے، پھر حکم ہوگا کہ فلاں کے ابا باہر کھڑے ہیں۔ ان کو کام پر جانا ہے اس لئے ان کا حصہ ان کے حوالے کر دیا جائے اور فلاں کے ابھی کام یا لام پر سے واپس نہیں آئے ہیں، ان کا حصہ گھر بھیج دیا جائے۔ بقیہ سے کہدیں گے کہ باغ، ڈرائنگ روم، سنگار میز، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ میں پھیل جائیں۔ غارت گری شروع ہوئی۔ باغ میں پھل پھول باقی نہ رہے۔ فرش اور دیواروں پر ناک تھوک پان کی پیک یا کیچڑ کی لکیریں، ڈرائنگ روم کبڈی کا میدان یا سوئمنگ باتھ بن گیا۔ آتشدان کی کارنس پر سے کود کر مصروف [illegible] رہتے ہیں یا اس پیپرا کی کی مشق کر رہے ہیں۔ ریڈیو کی گھنڈیاں غائب اور بہ نفس نفیس فرش پر سر بسجود۔ سنگار میز کی جو چیزیں توڑ پھوڑ سے بچیں وہ خادماؤں کی نذر۔ باورچی خانے سے کھانے غائب۔ بچوں کی دوڑ اور لڑکیوں کی جھپٹ میں چینی کے برتن چکنا چور۔ بچوں کو پیٹ پیٹ کر اور موت کی بشارت دے دے کر ابھی سے اچھی چیزیں کھلائی جا رہی ہیں۔ جو چیزیں آتی ہیں اسے جھپٹ کر خود لے لیتی ہیں اور نوکرانیوں کو سکھاتی جا رہی ہیں کہ کھسکتی چلنا۔ ساتھی بچوں میں سے کوئی رویا چیخا تو میزبان اور اس کے ورثا کو ایسی صلواتیں سنائیں کہ قومی لیڈر بھی ایک دوسرے کو نہ سنا سکے۔ رخصت ہونے لگیں تو اپنے بچوں کے ہونہار ہونے کا یہ مژدہ سنا کر گھر کی مالکہ کی اشک شوئی کر دی کہ بچہ ماشاء اللہ بڑا چونچال ہے، کتنی ذرا سی جان ہے، لیکن ابا کو بات بات پر ایسی ایسی گالیاں سناتا ہے، اور انھیں کے جوتے سے ایسے ایسے جوتے رسید کرتا ہے کہ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ اسے نظر نہ لگ جائے اور اس کے ابا اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں!

میرے ایک دوست تھے جن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ [illegible] سے پہلے ہی اس جہان سے اٹھ گئے۔ عام طور پر یہ ہوتا کہ دو ایک حاشیہ نشینوں نے مل کر ان کو کسی پر عاشق کر دیا اور یہ عاشق ہو گئے بغیر یہ جانے یا پوچھے ہوئے کہ محبوب کون ہے، کہاں ہے اور ہے بھی یا نہیں۔ سازش کرنے والوں کی خاطر مدارات شروع ہو جاتی۔ معمولی سی معمولی بات بھی اشارۃً کنایۃً پوچھئے تو اس کی قیمت ایک دعوت ہوتی۔ محبوب گوشت کھانے والوں میں ہوا تو دعوت میں انڈے، مرغ اور مچھلی، سبزی کا عادی ہوا تو پوری ترکاری، مٹھائی مربے۔ ماڈرن ہے تو انگریزی کھانے۔ اونچی سوسائٹی کا ہوا تو لنچ، ڈنر، سینما وغیرہ۔ دلی یا آگرہ میں دیہاتی ہوا تو فنکار پکنک، فصل کی پکوان نہر کے کنارے کسی گاؤں میں۔ ان میں سے کسی میں محبوب کا دور دور تک پتہ نہ ہوتا، اس فریب کا پتہ لگ جاتا تو ناراض ہو جاتے اور یہ ان کی دوسری بدنصیبی تھی۔ سازش کرنے والے مشہور کر دیتے کہ وہ سب خود ان سے سخت مایوس اور بیزار ہیں۔ اسی لئے کہ انک عاشقی [illegible] جو آداب ہیں وہ انھوں نے ملحوظ نہ رکھے

اس طرح اپنے ہوا خواہوں کو رسوا کیا۔ چنانچہ ہوا خواہوں کو راضی کرنے کے لئے پھر دعوت دیتے!

اکثر یہ ہوتا کہ ان کا رقعہ گشت میں ہوتا تو جن کے نام نہ ہوتے وہ اپنے نام کا خود اضافہ کر دیتے، بعض ایسے بھی ہوتے جو اپنی پسند کے کھانے کا بھی اضافہ کر دیتے۔ وہ اس پیہ ہر ایک کو غلط انگریزی میں گالیاں دیتے، اور اپنے مکان کے باہر چبوترے پر آرام کرسی پر لیٹ جاتے، جو شخص گذرتا اسے اپنے پاس بلاتے، اور اس طرح کے مدعو ہونے [illegible] کی شکایت کرتے۔ وہ ان کا ہم زبان بن جاتا۔ اور اس خدمت کے عوض میں مدعو ہونے والوں میں اپنے نام کا اضافہ کرا لیتا۔ دعوت میں دو چار ایسے بھی ہوتے جن کا نام سرے سے کہیں نہ ہوتا۔ ان سے باز پرس کرتے تو وہ کہتا کہ فلاں صاحب نے کہا تھا ممکن ہے وہ نہ آسکیں اس لئے احتیاطاً مجھے بھیج دیا کہ جب تک وہ نہ پہنچیں میں وہ خدمت انجام دوں۔ لطف یہ ہے کہ یہ جن صاحب کی [illegible] وہ خود مدعو نہ ہوتے۔

اب بعض سازشی، میزبان کو بتلاتے کہ ناخواندہ مہمان در اصل جاسوس تھا جو حکومت کی طرف سے یہ کھوج لینے آیا تھا کہ میزبان سرکار کی زبان غلط تو نہیں بولتے۔ تو نو وارد جواب دیتا کہ وہ یقیناً جاسوس تھا۔ لیکن حکومت کا نہیں بلکہ [illegible] میزبان کے محبوب کا جس نے اس کو یہ پتہ لگانے پر مامور کیا تھا کہ وہ جا کر یہ دیکھے کہ عاشق کی حالت کیسی تھی اور اس کے ارد گرد لفنگے تو جمع نہیں رہتے۔ میزبان خفت اور سراسیمگی کی نظر سے جس میں مہمانوں کی طرف سے بدگمانی و بیزاری کی جھلک [illegible] تھی، حاضرین کی طرف دیکھتے۔ حاضرین میں سے کوئی حاضر طبع نو وارد سے جرح کر بیٹھتا کہ بتاؤ محبوب کون ہے اور کہاں ہے جس نے تم کو تفتیش پر مامور کیا ہے۔ یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب نہ میزبان دے سکتے تھے نہ مہمان نہ خود نو وارد۔ لیکن جاسوس پھر جاسوس ہوتا ہے، کڑک کر جواب دیتا۔ یہ سوال بالکل غیر متعلق ہے، تم لوگ لفنگے ہو حضرت کو عشق کراتے پھرتے ہو اور زیر بار کرتے ہو۔ میں اس کی طرف سے آیا ہوں جو خود حضرت پر دل و جان سے فریفتہ ہے، اور کئی دن سے کھانا پینا ترک کئے ہوئے ہے۔ اس کی ہمدردی میں میں بھی فاقہ کرتا آیا ہوں۔ میں نے عاشق زار سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں اس کا پیغام حضرت کی خدمت میں پہنچا دوں گا، اور کھانا بھی ساتھ لاؤں گا۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میزبان کے پہلو میں جگہ پاتا، نصف کھانا اپنے ساتھ لے جاتا اور آئندہ اس کا نام حضرت کے ہاں مدعو ہونے والوں میں سب سے اونچا ہوتا!

ڈاک کے نئے ٹکٹ

حکومت ہند نے ڈاک کے نئے ٹکٹ کے لئے جو نمونے بنائے ہیں ان پر میں اس کو ہرگز مبارک باد نہیں دے سکتا جب ہر شعبہ اور ہر کام میں کفایت شعاری کا مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے تو ہر قیمت کے ٹکٹ پر نئی تصویر بنانے کسی کو چھوٹا بنانے اور کسی کو بڑا، اور پھر ان کے لئے نئی نئی رنگ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جنگ کے زمانے کے ہم سادے سادے ٹکٹ استعمال کر رہے ہیں، ان سب پر ایک ہی طرح کی تصویر ہوتی ہے وہ سب چھوٹے چھوٹے بنائے گئے ہیں، اور ان کی قیمت کے مطابق صرف ان کے رنگ الگ الگ کر دئے گئے ہیں۔ ان سے بھی اتنا ہی کام چلتا ہے، اور حکومت کو اتنا ہی روپیہ ملتا ہے جتنا قدیم سنگ تراشی کے نمونے کے ٹکٹوں پر پیش کر سکے گا۔ ان آثار قدیمہ سے ہندوستانی فنون لطیفہ کے ماہر اب نا واقف نہیں ہیں۔

یہ ٹکٹ کیا غیر ملکیوں کے لئے بنائے گئے ہیں؟ ٹکٹ کے دام کے علاوہ ان پر کسی ہندوستانی رسم خط میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ ایک پیسے سے دو آنے تک کے ٹکٹ ہندوستان کے کونے کونے میں جائیں گے۔ جنگلوں اور دیہات میں رہنے والے دو آنے کے ٹکٹ پر نٹ راج (ناچتے ہوئے دیوتا) کو دیکھ کر یا بودھی ستو (گوتم بدھ) کے ایک خاص طرح سے بیٹھنے کی تصویر سے کیا سمجھیں گے، کیوں کہ بیٹھنے کا یہ انداز تو بادشاہوں ایسا ہے نہ کہ جوگیوں کا ایسا۔ ہمارے ملک کے عالم اگر یہ بات بھول گئے ہیں تو انھیں دوبارہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے گاؤں والے بودھ، بودھی، ستو یا نٹ راج کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں نے اسکولوں اور کالجوں میں اس طرح بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی نقلیں دیکھی ہیں اور ان کی مضحکہ خیزی کو دیکھ کر بڑا لطف آیا۔ ڈاک اور تار کے وزیر کا چپراسی ان کی لیڈی کلرک نٹ راج کے انداز میں ٹھم ٹھم کر رقص کرتے ہوئے آئے اور کوئی کاغذ ان کی خدمت میں پیش کرے تو وہ اسے پسند کریں گے یا ناپسند۔ ایک طرف تو آپ بیٹھنے، کھڑے ہونے اور چلنے کا فوجی انداز رائج کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں جسم کے مختلف حصوں کو مصنوعی طور پر طرح طرح سے گھمایا اور ٹیڑھا کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ممکن ہے کہ مورتی کے پرستار ٹکٹ پر مورتی کی تصویر بنانے پر اظہار ناپسندیدگی کریں کیونکہ لازمی طور پر اس کی بے حرمتی ہوگی اور اسے کوڑے کرکٹ میں پھینکا جائے گا۔

تمام ٹکٹوں پر پرانی چیزیں بنی ہوئی ہیں۔ ہندوستان والوں کے دلوں میں سبھا ہیں، مندر اور مورتیاں اتنی کافی سمائی ہوئی ہیں اور اس سلسلے میں ان کی مزید حوصلہ افزائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان تصویروں کو پیش کرنے سے اگر فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی مقصود ہے تب بھی ان سے کسی نئے مصور کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ اس سے صرف یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے پاس اب کوئی نیا تصور باقی نہیں رہ گیا۔ اور اس کے پاس سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ پرانی چیزوں کو دیکھ کر ان کی تعریف اور انھیں حسین کہتا رہے خواہ ان میں سے بعض بدصورت اور بھدی ہی کیوں نہ ہوں۔ ٹکٹوں پر اگر طرح طرح کی تصویریں ضروری ہی ہیں تو وہ ان چیزوں کی کیوں نہ ہوں جنھیں ہندوستان بنانا چاہتا ہو نہ کہ ان چیزوں کی جو کہ پرانی ہو چکی ہیں

ہریجن کاشت کار

کشوری لال مشروالا

غذائی پیداوار کیسے بڑھائی جائے

غلے کی پیداوار اس وقت ملک کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ حکومت کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ غذائی مسئلہ کو اس نظر سے دیکھے گویا ملک لڑائی میں پھنسا ہوا ہے کوئی بھی کام عوام کے اشتراک عمل کے بغیر بار آور نہیں ہو سکتا، لیکن یہ ضروری ہے کہ جو لوگ غلے کی پیداوار میں اس کو اکٹھا کرنے میں اور تقسیم کرنے اور ادھر ادھر بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں ان کے واسطے حکومت بہتر حالات پیدا کرے۔

اس ضمن میں جو باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں:-

۱۔ مال گذاری کو روپئے کے بجائے غلے کی شکل میں لیا جائے۔ غلے کی قیمت بازار بھاؤ سے زیادہ مقرر کی جائے اور کاشتکار سے کہا جائے کہ وہ اتنی رقم کا غلہ دے جتنی رقم وہ لگان کے طور پر ادا کرتا ہے۔

۲۔ جہاں کاشتکار کسی زمیندار کا اسامی ہے وہاں اس کے حق کو زمیندار کے حق پر فوقیت حاصل ہوگی۔ تھوڑا بہت غلہ اسامی کے پاس رہنا بھی ضروری ہے تاکہ قحط پڑنے پر زمیندار کو اس سے اس وقت تک غلہ لینے کا حق نہ ہو جب تک کہ اسامی کے پاس اپنی ضروریات کے لئے غلے کی ایک بنیادی مقدار محفوظ نہ رہ جائے۔

۳۔ جن زمینوں پر کھانے والی فصلیں پیدا کی جا سکتی ہیں ان پر نہ کھانے والی فصلوں کو پیدا نہ کیا جائے اس کو رواج دینے کے کئی طریقے ہیں:-

(الف) ان زمینوں پر زیادہ لگان لیا جائے، جن پر نہ کھانے والی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔

(ب) قرضہ، آب پاشی، کھاد، مزدوروں کے مہیا کرنے کھیتوں کے بنانے اور زرعی سہولتوں کے فراہم کرنے کے سلسلے میں ان کاشتکاروں سے رعایت برتی جائے جو کھانے والی فصلیں پیدا کرتے ہیں۔

۴۔ وسیع پیمانے پر زراعت کو اس طرح رواج نہ دیا جائے کہ چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والوں کو کھیتی کرنے میں کوئی فائدہ باقی نہ رہے۔ وسیع پیمانے پر زراعت کو صرف تجارتی اشیاء کی فصلوں تک محدود رکھا جائے۔

۵۔ کثیر مقصدی انجمن ہائے امداد باہمی کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کے ذریعے غلہ پیدا کرنے، بیچنے، تقسیم کرنے اور رکھانے کا انتظام کیا جائے، لیکن امداد باہمی کی انجمنیں بنانے اور پھیلانے میں دیر لگے گی۔ اس لئے انفرادی طور پر بھی ایسے کام کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔ مقصد بہرحال یہ ہونا چاہئے کہ کاشتکار اور اس کے جانور اور مویشی زیادہ کارآمد ثابت ہوں اور مشغول رہیں۔ گھریلو صنعتوں کی ترقی اس ضمن میں ضروری ہے۔

۶۔ جو دیہات۔ انجمنیں اور پنچائتیں، حکومت کو اضافہ پیداوار میں مدد دیتی ہیں۔ انھیں بیج کھاد، نقادی اور آب پاشی کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی جائیں۔

۷۔ اضافۂ پیداوار کی مہم میں تیز رفتاری سب سے زیادہ اہم ہے، سرکاری محکمے اپنی سست رفتاری کے باعث بدنام ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام جو چند منٹ میں ہو سکتے ہیں اس کی تکمیل میں مہینے بیت جاتے ہیں۔ اس لئے دیہاتیوں کو تحصیل اور ضلع کے دفتروں میں آنے پر مجبور ہونے کے بجائے یہ ہونا چاہئے کہ متعلقہ افسران ٹولیوں میں وقتاً فوقتاً دیہات کا دورہ کرتے رہیں اور وہیں ان کے معاملات طے کریں۔

۸۔ اگر حکومت عوام کے اشتراک عمل تعاون اور ایمان داری کی طالب ہے تو پھر سرکاری افسروں کو خود دست تعاون بڑھانا چاہئے اور اپنی ایمان داری کا نمایاں ثبوت دینا چاہئے۔ حکومت کے ذریعے جو بیج، کھاد، سیمنٹ اور لوہا وغیرہ فروخت ہوتا یا دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی میل یا خرابی نہ ہو وزن پورا ہو اور اس کی فراہمی صحیح وقت پر ہو۔

قانون یہ تو کہتا ہے کہ اگر کوئی شہری اپنے فرائض میں کوتاہی کرے گا تو وہ فلاں سزا کا مستوجب ہوگا۔ مگر یہ کہیں نہیں کہتا کہ اگر حکومت اپنے فرائض کو پورے نہیں کرتی تو اس کا کیا ہوگا۔

۹۔ جزا و سزا کے معاملے میں حکومت کا تصور بہت تو بہانہ ہے وہ اس سلسلے میں حکم چلاتی ہے، دست تعاون نہیں بڑھاتی۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہئے کہ سزائیں صرف غریبوں کو پریشان کرنے اور افسروں کی جیبیں بھرنے کے لئے ہیں، امیر اور صاحب اقتدار لوگ اس سے بچ جاتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہندوستانی زبانوں کا جائزہ

[illegible]

مترجمہ : پرنسپل عبدالشکور

(کچھ عرصہ ہوا اس مقالہ کے مصنف سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مشرقی پنجاب کے لسانی مسئلہ پر ایک یادداشت تیار کریں۔ اس یادداشت کے سلسلے میں انھوں نے ہندوستانی زبانوں اور ان کے رسم الخط کا بھی جائزہ لیا تھا۔ یہ مضمون چند خفیف تبدیلیوں کے ساتھ اسی یادداشت سے ماخوذ ہے۔)

انڈو آرین زبانوں میں سب سے زیادہ نمائندہ اور مرکزی زبان ہندی ہے۔ ہمارے زمانے کی ادبی ہندی کی بنیادی شکل گنگا جمنا دوآبہ کے شمالی حصے کی ایک بولی ہے جو بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے اور جس کا حلقہ اثر دہرہ دون کے نچلے حصے اور قسمت روہیلکھنڈ اور انبالہ کے ضلع تک پہنچتا ہے۔ اس معیاری بولی کو کھڑی بولی کہتے ہیں۔ قواعد کے ڈھانچے میں اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے چار اور بولیاں ہیں جو اس بولی سے مشابہ ہیں۔

(۱) برج بھاکا جو برج کے علاقے میں بولی جاتی ہے مثلاً علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری، متھرا، آگرہ بھرت پور

(۲) قنوجی۔ جو اٹاوہ، فرخ آباد اور کان پور کے علاقے میں رائج ہے اس کا علاقہ برج بھاکا کے رقبے سے جنوب مشرق کو واقع ہے۔

(۳) بانگرو جو بانگر کا علاقہ یعنی ہریانہ میں بولی جاتی ہے۔ اس علاقے میں، کرنال، رہتک اور حصار کے بعض حصوں اور ان جگہوں پر بولی جاتی ہے جو دریائے گھاگر کے بائیں جانب مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں واقع ہیں۔

(۴) بندیلی بولی جو بندیل کھنڈ میں رائج ہے یعنی اس علاقہ میں جو دریائے جمنا سے دریائے راپتی کے درمیان واقع ہے۔

یہ ساری بولیاں صرف ایک زبان (ہندی) کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس ہندی کو پچھمی ہندی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ زبان انڈو آرین زبانوں کا مرکز ہے۔

کوسالی

ہندی کے رقبے سے قریب ہی مشرقی سرحد کے پاس تین بولیوں کا دور دورہ ہے جو ایک اور زبان کی نمائندگی کرتی ہیں۔

(۱) اودھی جو اودھ اور الہ آباد میں بولی جاتی ہے

(۲) بگھیلی جو بگھیل کھنڈ میں رائج ہے۔ یہ اودھی سے اس قدر مشابہ ہے کہ صرف نام کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ مگر اودھی اور بگھیلی میں بعض خاص باتیں مختلف اور متفرق ہیں۔

(۳) چھتیس گڑھی۔ جو چھتیس گڑھ کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اس علاقے میں رائے پور، بلاسپور کے اضلاع ہیں۔ یہ مہاندی کی وادی کا شمالی حصہ ہے۔ ان بولیوں کو مشرقی ہندی کے نام سے نامزد کیا جاتا تھا۔ کیونکہ لسانیات کے ماہروں کے پاس اس زبان کے لئے کوئی اور موزوں نام نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء میں مشرقی زبان کے لئے میں نے کوسالی کا نام تجویز کیا تھا کیونکہ اودھ کا قدیم نام کوسالہ ہے۔ چھتیس گڑھی کے لئے دکھشینا کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے یہ نام پسند کرکے قبول کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف انڈو آرین زبانوں کے بڑے ماہر تسلیم کئے گئے ہیں۔

بہاری اور راجستھانی

کوسالی علاقے کے مشرق کو ایک اور زبان کا علاقہ ہے جسے بہاری کہتے ہیں۔ اس میں تین بولیاں شامل ہیں :-

(۱) بھوج پوری

(۲) مگاہی

(۳) میتھیلی

ہندی علاقے کے مغرب اور جنوب مغرب میں ایک اور زبان کا علاقہ ہے جسے راجستھانی کہتے ہیں۔ اس میں پانچ بولیاں شامل ہیں جو راجپوتانہ اور مالوہ میں بولی جاتی ہیں۔

کوسالی، بہاری، اور راجستھانی بجائے خود پوری مرتب شدہ زبانیں ہیں، راجستھانی، گجراتی سے ملتی جلتی ہے جس طرح بہاری بنگالی زبان سے مشابہ ہے۔ دور حاضر کے ہندی، راجستھانی کوسالی اور بہاری کے علاقے کو پہلا تاریخ کے زمانے میں مدھیہ دیس (ملک کا درمیانی حصہ) کہا جاتا تھا۔ اس زمانے کے تصورات کے اعتبار سے ہندوستان کے اس حصے کو جو مدھیہ دیس سے باہر تھا چار حصوں میں سمت کی بنا پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ مشرقی، جنوبی مغربی اور شمالی مغربی و شمالی علاقہ۔

مشرقی علاقہ میں تین انڈو آرین زبانیں پائی جاتی ہیں

(۱) بنگالی

(۲) آسامی

(۳) اوڑیہ

لسانی تحلیل سے پتہ چلتا ہے کہ آسامی بنگالی زبان کی صرف ایک بولی ہے جو معیاری بنگالی سے آسامی بولی کے مقابلے میں زیادہ ملتی جلتی ہے، خود چاٹگام کے علاقے میں درسی زبان بنگالی ہی ہے مگر آسامی زبان رفتہ رفتہ بولی کے معیار سے بلند ہو رہی ہے اور امید ہے کہ بہت جلد زبان کے مرتبے تک پہنچ جائے گی۔ یہ اس لئے ممکن ہے کہ آسامی کی تاریخی اور جغرافیائی شخصیت اپنی جگہ پر عرصے سے قائم ہے۔

جنوبی زبانیں

جنوبی علاقے میں صرف دو انڈو آرین زبانیں ہیں :-

(۱) مرہٹی، مہاراشٹرا کی اور

(۲) لنکا کی سنہالی

باقی ماندہ جنوبی علاقہ میں چار ڈراوڑی زبانوں کا تسلط ہے۔

(۱) تامل

(۲) تیلگو

(۳) کناڑا

(۴) ملایالم

مغربی علاقے میں گجراتی اور سندھی ہیں۔ یہ دونوں انڈو آرین زبانیں ہیں، گجراتی زبان راجستھانی اور برج بھاکا سے بہت مشابہ ہے۔ اور وہ کوسالی اور بہاری کے مقابلے میں ہندی سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے، پھر بھی اپنی جداگانہ وحدت پر نازاں ہے اور ہندوستان کی ایک بڑی متمول زبان تسلیم کی جاتی ہے۔

مدھیہ دیس اور شمال مغربی علاقے کے درمیان ایک دریا بہتا ہو جو اس زمانے میں گھاگر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ کم حیثیت دریا اب تک ہندی اور پنجابی زبانوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس زمانے کا ماہر لسانیات پنجابی اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ خالص پنجابی، اور لہندے دی بولی۔ اس بولی کو ایک عیسائی مبلغ نے لہنڈا کے مہمل نام سے یاد کیا ہے۔ تین اور آریائی زبانیں ہیں جو شمال مغرب میں رائج ہیں۔ گرچہ انڈو آرین خاندان سے براہ راست وابستہ نہیں ہیں مگر ان زبانوں کے علاقے ہمیشہ سے ہندوستان کا جزو رہے ہیں۔ پشتو، کاشمیری اور گھالچہ، آخر الذکر وہ زبان ہے جو پامیر کے پہاڑی علاقوں اور چترال میں رائج ہے

پہاڑی

نیپال اور مدھیہ دیس کا شمالی کنارے میں جو

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم ۰۸، ۱۹، ۷۴
چندہ:- سالانہ ۶ شش ماہی للعہ

کشمیر کے حدود سے مشرق کے جانب واقع ہے ہمالیہ کی بلندیاں پائی جاتی ہیں اس تنگ مگر طویل علاقے میں جو چمبا سے سکم تک پھیلا ہے پہاڑی زبان بولی جاتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں :- (۱) مغربی پہاڑی جو چمبا، کولو، کیونتھل اور دہرہ دون کے پہاڑی علاقہ میں بولی جاتی ہے۔

(۲) وسطی پہاڑی جو گڑھوال اور کمایوں کے اضلاع میں رائج ہے اور

(۳) مشرقی پہاڑی یا پربتیہ جو موجودہ نیپال کی زبان ہے، اس بولی کو ترقی دی جا رہی ہے کوشش ہے کہ یہ بولی ادبی شان پیدا کرنے میں کامیاب ہو، اس میں اور ہندی میں بہت کم فرق ہے۔ اب کمایوں اور گڑھوال کے علاقے میں ہندی کو درسی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے، اور ان اضلاع میں یہ زبان بہت پھل پھول رہی ہے۔

تبتی اور چینی زبانیں

کشمیر کے مشرق میں ہندوستان کے شمالی کنارے پر کانگڑے سے آسام تک بلکہ اور زیادہ مشرق میں تبت کا ملک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ جو لوگ ہمارے ملک کے شمال اور مشرقی کناروں پر آباد ہیں وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ اس نسل کے لوگوں کو (TIBETO - BURMAN) قوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کراتا بولیاں ہمالیہ کے بعض علاقوں میں بولی جاتی ہیں مگر ان کے بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

بہار، بنگال اور اڑیسہ کے پہاڑی علاقوں میں وہ لوگ آباد ہیں جن کو سنتھل، منڈا سارا اور کہاسی کہتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے ان کا نام نشنشادار رکھا تھا۔ رام چندر جی نے بن کو جاتے ہوئے ایک سبارا کی عورت سے کوئی نذر قبول کی تھی۔ اس زمانے میں اس قوم کے لوگ برما کے ساحل پر بھی پائے جاتے تھے۔ ایشیا کے جنوب مغربی ممالک میں جو ایک وسیع قوم آباد ہے اس کو اس زمانے میں آسٹرک کا نام دیا گیا ہے اس قوم کے افراد بر جواس وسیع علاقے میں کثرت سے آباد ہیں ہندوستانی تہذیب کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے شمال میں وسط ایشیا کا علاقہ ہے جہاں ترکستان واقع ہے جب سے وسط ایشیا کی آبادیات میں ترک آکر آباد ہوئے اُن کے خون میں بہت کچھ آمیزش ہو چکی ہے وہ اس قوم سے متعلق تھے جس کو قدیم زمانے میں ہونا یا ہن کہا جاتا تھا۔ قدیم میں ان کا مسکن سائبریا تھا۔ پانچویں صدی میں (بعد مسیح) اس قوم نے وسط ایشیا میں آباد ہونا شروع کیا تھا اس لواح کے قدیم باشندے سب آریہ قوم کے قدیم افراد تھے۔ اب ان کی بولیاں عرصہ ہوا ختم ہو گئیں، اس زمانے کی پرانی کتابوں اور کتبوں سے ان بولیوں کا کچھ خفیف سا حال معلوم ہوتا ہے، مگر ابھی تک یہ علم بہت محدود اور تشنہ ہے۔

ہریجن کاشت

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

انعام کا لالچ بھی کوئی اچھی چیز نہیں لیکن اگر جزا و سزا میں ایک کو منتخب کرنے کا سوال ہے تو کسی کام کی سزا دینے سے کسی کام کو کرنے پر انعام دینا زیادہ بہتر ہے، سزا کی نوعیت انفرادی ہونا چاہیے اور انعام کی اجتماعی یعنی اگر گاؤں کے باشندے کسی ہدایت پر عمل نہیں کرتے تو انھیں اجتماعی طور پر سزا دینے کے بجائے الگ الگ سزا دی جائے۔ لیکن اگر ایک ہدایت پر دیہات کے باشندے عمل کرتے ہیں تو انھیں اجتماعی طور پر ایسا انعام دینا چاہیے جو پوری آبادی کے کام آسکے۔ یہ اشتراکی عمل اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کرے گا۔

میرے یہ مشورے جامع و مانع نہیں پھر بھی ان پر عمل کرنا مفید ہوگا۔

(ترجمہ [illegible])

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

سے کاشتکاروں اور زمینداروں کو ٹریکٹر خریدنے اور انھیں اس کے استعمال کی ترغیب دینے پر بھی غور کیا جائے گا۔

مملکت پاکستان میں صوبہ سندھ خاص طور سے زرعی اصلاحات کا محتاج ہے۔ اگر اس صوبے کو زرعی ترقیات کے جدید نام لوں پر چلانے کی اسکیم کامیاب ہو گئی تو مغربی پنجاب کی طرح سندھ کی زمین بھی سونا اگلنے میں پیش پیش ہوگی۔

پاکستان کا سب سے بڑا دریا — سندھ اس صوبے کے بنجر اور ریگستانی علاقوں کو قابل کاشت بنانے میں بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زیر کاشت رقبہ بھی حکومت کی مزید توجہ کا محتاج ہے۔

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی [illegible] جامعہ
مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳	نمبر ۷	۱۶ اگست ۱۹۴۹ء	ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

آزادی کی سہولتیں اور دشواریاں مبارک

ڈاکٹر ذاکر حسین

(ذیل کی تقریر پہلے یوم آزادی کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر فرمائی تھی)

دوستو! آزادی مبارک، آزادی کی سہولتیں مبارک! آزادی کی دشواریاں مبارک! زندگی ہے اس کا گلا گھونٹنے والی، اُسے مسخ کرنے والی، پابندیوں کا ٹوٹنا مبارک۔ زندگی کی تشکیل کی کٹھن راہوں کو طے کرنے کا امکان مبارک۔ آزادی کے یہ دونوں پہلو مبارک۔ اس لئے کہ اگر اس کے ایک پہلو پر نظر رہے تو آزادی بے راہ روی ہو جائے، من مانی زندگی نرالی زندگی بن جائے۔ اور آزادی خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے۔

آزادی کسی چیز سے بھی ہوتی ہے اور کسی چیز کے لئے بھی ہوتی ہے ——— پابندیوں کا ٹوٹنا اچھا ہے۔ مگر اچھے مقاصد ہی کی خاطر دیوانوں یا پاگلوں کے بندھن کھل جانے سے انھیں آزادی نہیں ملتی۔ با مقصد، با ہوش، انسان کے راستے سے رکاوٹیں ہٹیں تو اس کی زندگی کا سفر سہل بھی ہو جاتا ہے اور زیادہ نتیجہ خیز بھی۔

ہمارے ملک کو دو روز سے آزادی کی وہ کیفیت حاصل ہے جس کے لئے وہ صدیوں ترسا ہے۔ جس کے ارمان میں اس کے بہترین دل و دماغ مدتوں بے کل رہے ہیں۔ جس کے بغیر صدیوں اپنے عمل کے سوتوں کو سوکھتے، اپنے فکر کی کلیوں کو کمھلاتے، اپنی جماعتی زندگی کے شیرازہ کو خود غرضی کے طوفان میں بکھرتے، اپنی شخصی زندگی کو بے اثری کے صحرا میں ایڑیاں رگڑتے دیکھا ہے۔ غیر ذمہ دار بے مقصدی اور انفرادی نفسی نفسی کے محشرستان میں گرم خون کو افسردہ رگوں میں سوکھتے اور جوان ولولوں کو پژمردہ دلوں میں دم توڑتے دیکھا ہے۔ غلامی کی بے بسی میں اپنے پر بے اعتمادی اور غیروں پر تکیہ کی شیطانی رسم کو رواج پایا ہے۔ اعلیٰ مقصدوں کی روشنی سے غلامی کی اندھیاری میں آنکھوں کو خیرہ ہوتے اور ان کی طرف بڑھنے کو دشوار راہ پر ساتھیوں کو تھکتے اور بچھڑتے دیکھا ہے۔ زندگی کی یہ دردناک تصویر آج ایک بھیانک خواب معلوم ہوتی ہے اور بس ہم سب اس خواب سے چونک اٹھے۔ اور زبان پر لفظ رقص کرتے ہیں، دل اچھلتا ہے۔ خون رگوں میں تیز تیز دوڑتا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ کوئی نغمہ گنگناتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ساری فضا گلابی گلابی سی نظر آتی ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔

لیکن دوستو! یہ موقع خالی خوشی کا نہیں ہے۔ غلامی کے بوجھ کے کندھوں سے اتر جانے پر ہم جو اپنے کو ہلکا ہلکا محسوس کرتے ہیں، یہ جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت زمین سے اٹھا کر ہمیں آسمان کی طرف لئے جا رہی ہے، یہ بیڑیوں سے زنجیریں کٹنے پر ہم جو محسوس کر رہے ہیں کہ شانوں پر پر نکل آئے ہیں۔ یہ سب سچ ہے۔ مگر یہ سمجھ لو کہ آزادی کی ذمہ داریاں بھی بڑی بوجھل ہیں۔

ایک تو یہ یاد رکھو کہ آزادی کسی کو اور کبھی آخری طور پر نہیں ملتی۔ یہ اسی کو ملتی ہے اور اسی کے پاس رہتی ہے جو اسے ہر روز ہر دم از سر نو حاصل کر سکے۔ ہر دم چوکس رہے، اور زندگی کے کسی لمحے میں اس کی بھی قدر سے غافل نہ ہو۔ یہ ایسی جنس نہیں کہ پالی اور سینت کر رکھ لی۔ اسے برابر پلٹتے رہنا ہوتا ہے۔ اور برابر برتنے سے ہی یہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ ہمیں صدیوں بعد یہ نعمت ملی ہے۔ ہمیں اس کی قدر جاننی چاہئے، اور وہ اس طرح کہ اسے برتیں اور اس کی حفاظت کریں۔

اس کی حفاظت کی سب سے بڑی شکل یہ ہے کہ اپنے ہر ساتھی کی سچی آزادی میں ذرا سا بھی خلل نہ [illegible] اس طرح آنے دیں جیسے اپنی [illegible] ہو۔ اس کی آزادی کی حفاظت کے لئے ہم اس طرح کمربستہ ہوں جیسے اپنی آزادی [illegible] لئے۔ یہ سب کی اچھی زندگی کی شرط، آزادی سب کی کوشش اور سب کی یکسانی سے قائم رہ سکتی ہے۔ [illegible] اپنی آزادی کو گلے سے لگائے رہے اور دوسرے کا حق تلف ہوتے دیکھ سکے اس کی آزادی [illegible] کے گلے میں غلامی کا طوق بن جاتی ہے۔ آج بالکل ہماری باری ہے اور جو اپنی آزادی سے اپنی اور اپنے سماج کی زندگی کو بہتر بنانے کا کام نہ لے اُسے بھی سمجھنا چاہئے کہ آزادی بے کاروں کے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہرتی۔

اس آزادی کو جو ہمیں ملی ہے ہمیں ایک اچھے سماج کے بنانے میں لگانا چاہئے۔ ایک اچھی سیاست، ایک اچھی معیشت، ایک اچھی تعلیم اور ایک اچھی شخصی زندگی اگر اس آزادی کا نتیجہ نہ ہو تو یہ اصلی آزادی نہ ہوگی۔ نام کو آزادی ہوگی۔ (بقیہ صفحہ ۴ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
آزادی کی سہولتیں اور دشواریاں مبارک!	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱
نظامی کفایت	کشوری لال نشتر	۲
آزادی کے بعد	اداریہ	۳
تکلف برطرف		۳
پچھلا ہفتہ ہندوستان	ع۔ح	۴
پاکستان	ع۔ل	۵
باہر کی دنیا	ع۔ل	۶
اگست کی آئی پناہیں	اقبال احمد سہیل	۷
یوم آزادی	ڈاکٹر مسعود حسین	۷
ہند مسلم تعلقات	ڈاکٹر سید محمود	۸
ہندوستان میں پنچایت راج	عبداللطیف اعظمی	۱۰
زندگی نام ہے حرکت کا	ضیاء الفاروقی	۱۱

ہریجن کا سبق

غذائی کفایت

کشوری لال مشروالا

پچھلے ہفتہ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ غلہ کی پیداوار بڑھانے اس کے وصول کرنے اور ذخیرہ کرنے کے کیا کیا طریقے ہیں اس ہفتہ کفایت شعاری کے ساتھ اناج کی کھپت اور اس کی تقسیم کے متعلق بعض نکات پیش کرتے ہیں۔

ملک کی غذائی کمی اس کی ضرورت سے دس فی صدی سے زائد نہیں بتائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اتنی سی کمی سے کوئی گہری تشویش و پریشانی نہ پھیلنا چاہیے۔ ریاضی کے قاعدے سے جانچئے تو اس کی کمی کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو بیس اونس مکمل راشن کی ضرورت ہے اس کے حصہ میں صرف دو اونس اناج گھٹتا ہے۔ چنانچہ باقی غذائی کمی کو اناج کی مناسب بچت، کفایت شعاری سے خرچ، وقتاً فوقتاً اناج کے ترک اور غذا کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے ملک کے ہر باشندے کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے، اور کیلا، شکر قند، آلو اور دوسری امدادی غذاؤں کے جسے ہر شخص پسند کر سکتا ہے تھوڑے سے سہارے کے بعد بغیر کسی جانفشانی کے اس عام غذائی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ چیزیں کافی اور ارزاں ہوں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے اس غریب ملک میں کیلا اور آلو کا کیا ذکر ترکاریاں بھی سالہا سال نہیں ملا کرتیں۔ ... یہ کہنا کہ اناج کی کمی دوسری امدادی غذاؤں سے پوری کی جا سکتی ہے ایسا ہی ہے کہ زراعتی پیداوار کی کمی کو صرف چند مویشی پال کر دور کیا جا سکتا ہے۔

غذائی اعداد و شمار پر غور کرنے سے کنٹرول اور راشن بندی وغیرہ کی ضرورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قابل ذکر کمی نہیں پڑ رہی ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر غذائی پابندیاں عاید کرنے کے خلاف متعدد دیکھنے والے حکومت پر نکتہ چینی بھی کر چکے ہیں اور ان حکام اور اشخاص کی خلوص نیت پر جو کنٹرول کے حامی ہیں شک و شبہ کرنے لگے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اعداد و شمار سے جتنی کمی ظاہر کی جا رہی ہے، عملی طور پر اس سے کہیں زیادہ کمی پڑ رہی ہے۔ عمل اور تجربہ کے آگے اعداد و شمار اکثر غلط ثابت ہوا کرتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کشش ارضی کا اصول تو یہ ہے کہ اگر ایک پتھر اور ہلکا سا پر ایک وقت کسی بلندی سے پھینکے جائیں تو یہ دونوں ایک ساتھ زمین پر گریں لیکن ایسا نہیں ہوتا جس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ خارجی اسباب و عناصر بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو ان نظریاتی نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

غلہ اور کپڑے کا مسئلہ ویسا ہی ہے جیسے آمدنی کا۔ ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ ایک ہندوستانی کی سالانہ آمدنی ایک سو اسی روپے ہے یعنی فی کس پندرہ روپے ماہوار جس کے معنی یہ ہوئے کہ پانچ افراد کے خاندان کی اوسطاً آمدنی پچھتر روپے ماہوار ہوئی۔ اگر یہ اوسطاً آمدنی واقعی حاصل ہوتی رہے تو پھر میرے خیال میں کوئی بڑی بے اطمینانی اور تشویش پیدا نہ ہونے پائے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ اوسط آمدنی محض نمائشی اور خیالی ہے۔ دراصل آمدنی کی مندرجہ ذیل قسم کی مدوں کو ملا کر آمدنی کا یہ خوش آئند اوسط نکالا گیا ہے

تعداد اشخاص	آمدنی	مجموعی آمدنی
۱	دس لاکھ روپے	دس لاکھ روپے
۱	پانچ لاکھ	پانچ لاکھ
۱۸	۰۲ء۰ لاکھ فی کس	۳۶ء۰ لاکھ
۸۰	۵۰ فی کس	۰۴ء۰ لاکھ
		۴۰ء۱۵ لاکھ

اوسطاً آمدنی فی کس ۴۰۰ء۱۵ روپے

ظاہر ہے کہ اوسط بالکل غلط اور خوش حالی کا ایک مصنوعی اور جھوٹا سا نقشہ ہے۔ اسی طرح کپڑے اور غذا کا اوسط بھی غلط ہے ان کا اوسط نکالتے وقت ان کی تقسیم کے اہم پہلو پر نگاہ نہیں رکھی جاتی اس طرح تو ملک کی غذائی پیداوار میں اگر دس فی صدی کا اضافہ بھی ہو جائے تب بھی اس کی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ ہر شخص کو کافی غذا بہم پہنچ سکے گی یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر بچت، تقسیم اور صرف کے طریقے جاری رہے تو ملک کے کروڑوں باشندے پیٹ بھر غذا نہ پا سکیں گے۔

دراصل ہماری پریشانیوں کا سبب اناج کی انتہائی قلت نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں کلکتہ میں آٹے کے سیکڑوں بورے خراب ہو جانے کی وجہ سے پھینک دیئے گئے، حالانکہ اسی کلکتہ میں دس لاکھ انسان فاقوں مر رہے تھے۔ آج بھی غیر ملکوں سے آیا ہوا غلہ جہازوں سے اتارنے اور لادنے کے وقت ٹنوں کی تعداد میں ضائع اور برباد ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۴۳ء میں جب ناگپور کے عوام فاقوں مر رہے تھے سنٹرل جیل میں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ منوں دال اور روٹیاں پھینک دی جاتی تھیں جن کے کھانے کے لئے سیکڑوں کی تعداد میں کوّے ٹوٹ پڑتے تھے۔

بے احتیاطی سے غلہ جمع کرنا، تقسیم و حمل میں دیر لگانا، کھاتے وقت اسے غذا ضائع کرنا اور اسے نامساوی طور پر تقسیم کرنا، دراصل یہی وہ خامیاں اور برائیاں ہیں جنہوں نے غذائی مسئلے کو اصل حالت سے کہیں زیادہ نازک اور تشویش ناک بنا دیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ باورچی خانے میں پکنے، دسترخوان پر چننے اور پھر کھانے میں اتنی ہی غذا ضائع جاتی ہے جتنی کہ کھانے والے کے پیٹ میں پہنچتی ہے۔

دو تین سال تک بہتر طور پر غذائی بچت کرتے رہنا کوئی ناممکن بات نہیں۔ اسے چالیس برس قبل اوسط طبقہ کے تمام افراد اور کسان نہ صرف بچت کے طریقوں سے واقف تھے بلکہ انہیں برتتے بھی تھے بلکہ جب گھر کی جنس بڑی بوڑھیوں کے ہاتھ میں تھی وہاں اس وقت بھی ایک دانہ ضائع نہیں جاتا۔ اس وقت میں اگرچہ سیمنٹ کے جدید گودام نایاب تھے لیکن کاشتکار یہ بھی جانتے تھے کہ اناج کو چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں سے کیونکر طرح محفوظ رکھا جائے۔ اب یہ حال ہے کہ غلہ کے تھوک فروش بھی ان طریقوں سے ناواقف ہیں۔

سرکاری ذخیرہ گاہوں اور ریلوے گوداموں کو ان کی شاندار عمارتوں کے باوجود غلہ برباد ہونے کی جگہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نئی روشنی کی عورت بھی اناج کے محفوظ رکھنے کے طریقوں سے ناواقف اور امور خانہ داری سے بے بہرہ ہوتی ہے مزدوروں اور کاشتکاروں کی نظروں سے اناج کا احترام اٹھ چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب گیہوں کا ایک دانہ اتنا ہی مقدس تھا جتنا خدا کی مورتی۔ اسے پیروں تلے نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ اناج کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی جاتی تھی۔ اگر ہم دسترخوان پر اس خیال سے کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ باقی کھانا پھینک دیا جائے گا تو والدین ہماری سرزنش کرتے تھے۔ اپنے آگے کا بچا ہوا کھانا چھوڑ دینا بری تربیت کہی جاتی تھی، لیکن موجودہ طریقے بالکل الٹ گئے ہیں۔ آج کل مہمان کے آگے اگر تھوڑا سا بھی کھانا چنا جائے تو وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑ دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ اور فیشن صرف بے ہودہ اور مذموم ہی نہیں بلکہ میزبان کی ہتک اور دھرتی ماتا کا ایک گناہ ہے۔

جس قوم نے غذا کو اس طرح ضائع کرنا اپنا فیشن بنا لیا ہو اسے غذائی کمی اور قحط کی شکایت کا کیا حق ہو سکتا ہے اسے قدرت کو متہم کرنے کا کیا حق ہے کہ وقت پر بارش نہیں اور فصل اچھی نہیں ہوئی۔ اس قوم کے وہ لیڈر جو غذائی بربادی کی ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں متعجب نہ ہوں گے ان کی یہ اپیلیں بے اثر جا رہی ہیں کہ زیادہ غلہ پیدا کیا جائے اور فاضل غلہ حکومت کے ہاتھ فروخت کیا جائے۔

ابھی غلہ کی تقسیم کا مسئلہ باقی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اناج پر کنٹرول ہے یا کھلے بازار میں فروخت جاری ہے اور غذائی چیزوں کی راشن بندی ہو گئی ہے یا نہیں۔ یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ چند اشخاص

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ راگست ۱۹۴۹ء

آزادی کے بعد

اچھا تو ہے بیمار مگر ضعف بہت ہے

آزادی کی دوسری سالگرہ مناتے وقت ہمارا دل فخر و مسرت کے جذبے سے معمور ہے مگر ہمارا دماغ جس کا کام سوچنا ہے اس وقت بھی چپکے چپکے سوچ رہا ہے کہ آزادی تو ہمیں مل گئی مگر اس سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ سرسری طور پر غور کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوا۔ ملک کی انتظامی حالت اور معاشی حالت بدتر ہو گئی اور اس کے اثر سے اخلاقی حالت بھی گر گئی۔ رشوت، اقربا نوازی، نفع خوری، چور بازاری کا زور بڑھ گیا۔ ہمارے بہترین عناصر جو مشترک حریف یعنی برطانوی سامراج کے مقابلے میں متحد تھے اس حریف کے ہٹتے ہی منتشر ہو گئے اور اب آپس میں لڑ رہے ہیں۔

اگر ہم اس سرسری فکر کے نتائج پر قناعت کر لیں تو ہمارے دل میں فخر و مسرت کی شمعیں گل ہو جائیں اور رنج و یاس کا سناٹا چھا جائے۔ لیکن عقل [illegible] کی خشک اور بے درد تنقید جذبات پرستوں کو بہت ناگوار ہوتی ہے ایک [illegible] خوبی یہ ہے کہ وہ خود اپنے اوپر بھی اسی خشکی اور بے دردی سے تنقید کرتی ہے۔ ہمارے دماغ کو بہت جلد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ملک کی موجودہ کیفیت کا جو اندازہ کیا ہے وہ سطحی اور ناقص ہے۔ ملک کی حالت بیماری کی نہیں بلکہ اس کمزوری کی ہے جو شدید اور مہلک بیماری سے اٹھنے کے بعد ہوتی ہے۔ جو شکایتیں اس وقت ہیں وہ کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں مگر امراض نہیں بلکہ عارضے ہیں۔ یہ جسم کو ناطاقتی کی وجہ سے لاحق ہو گئے ہیں اور جوں جوں طاقت آتی جائے گی دور ہوتے جائیں گے۔

آئیے [illegible] ملک کی موجودہ خرابیوں کو ایک ایک کر کے دیکھیں اور اس کا فیصلہ کریں کہ وہ عارضی شکایتیں ہیں یا مستقل امراض۔ سب سے پہلے بد انتظامی کو لیجئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے انگریز افسروں کے [illegible] وجہ سے [illegible] اور تجربہ کار افسروں کی کمی ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے نظم و نسق ڈھیلا اور سست ہو گیا ہے لیکن ذرا یہ بھی دیکھئے کہ آزادی سے پہلے ملک کے نظم و نسق میں ایک بنیادی خرابی تھی جس نے اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا یعنی اس کے سامنے بدیسی حکومت کا مفاد تھا جو اکثر دیس کے فائدے سے ٹکراتا تھا اب حکومت اور رعایا کی بھلائی میں ایسا بنیادی تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کو نظر میں رکھ کر دیکھئے تو افسروں میں تجربے اور قابلیت کی کمی ایک چھوٹا سا عیب معلوم ہوتا ہے۔ جو تھوڑے دن میں آسانی سے دور ہو جائے گا۔

رہی معاشی حالت۔ یہ بات ہر شخص جس نے دنیا کی حالت پر غور کیا ہے جانتا ہے کہ جس معاشی بحران سے ہم گزر رہے ہیں وہ ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کم و بیش سبھی ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں نے اس میں شدت ضرور پیدا کر دی ہے لیکن در اصل یہ ان سیاسی تبدیلیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ دوسری جنگ عظیم کا نتیجہ ہے جو ہمیں ہر حال میں بھگتنا پڑتا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس بحران کا ایسا حل جس سے ہندوستان کے عوام کی مصیبت دور ہو انگریزوں کی حکومت میں زیادہ آسانی سے نکل سکتا تھا یا اب نکل سکتا ہے۔ [illegible] اس بارے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ [illegible] موجودہ حکومت معاشی الجھن دور کرنے کی جو تدبیر اختیار کر رہی ہے اس سے کام چل جائے گا یا ہمیں خالص اشتراکی تدابیر سے کام لینا پڑے گا لیکن اس پر ہم سب متفق ہوں گے کہ اس مصیبت سے نجات پانے کی کوشش جو آزادی سے پہلے ناممکن تھی اب ممکن ہے اور نظر آتی ہے بہت کی جا رہی ہے اگر ہم کہیں کہ ان کوششوں [illegible] [illegible] نکلے گا تو یہ ایسی [illegible] جس سے جا و بے جا اعتراض ہو۔

سب سے زیادہ افسوسناک وہ اخلاقی خرابیاں ہیں جو معاشی مشکلات نے ہمارے اندر پیدا کر دی ہیں شاید انگریزوں کی استبدادی حکومت ہماری اپنی جمہوری حکومت کے مقابلے میں رشوت، عزیز نوازی، چور بازاری، نفع خوری کو دبانے میں زیادہ سختی سے کام لے سکتی اور لیتی لیکن ہم جانتے ہیں کہ حکومت ان زہریلے پودوں کو صرف اوپر سے اکھاڑ سکتی ہے۔ ان کی جڑوں کو دور نہیں کر سکتی۔ ان کا استیصال کرنے والی قوت صرف رائے عامہ کی مخالفت ہو سکتی ہے جو اب رفتہ رفتہ پیدا ہو رہی ہے ممکن ہے آزاد ہندوستان میں یہ کچھ زیادہ عرصے تک پھولتے پھلتے رہیں لیکن جب ان کے اکھاڑے جانے کی نوبت آئے گی جڑ سے اکھاڑے جائیں گے۔

آخر میں ہم [illegible] کی نا اتفاقی پر جس کا بڑا رونا رویا جا رہا ہے ایک چلتی ہوئی نظر ڈال کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مختلف معاشی اور نصب العین رکھنے والی جماعتیں دیس کو انگریزی سامراج کے پنجے سے چھڑانے کے لئے جنگ آزادی میں ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی تھیں یہ بھی قدرتی

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

تکلف برطرف

نئی روشنی کے پڑھنے والوں سے مجھے

ایک ضروری بات کہنی ہے، اخبار میں اور کہیں جگہ نہ تھی اس لئے اس تفریحی کالم کو غیر تفریحی مقصد کے لئے استعمال کرتا ہوں اور آپ سے اس کی معافی چاہتا ہوں۔

نئی روشنی جن حالات میں اور جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نکالا گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہیں۔ حالات ناسازگار تھے مگر مقاصد نہایت اہم تھے۔ بعض دوستوں نے سمجھایا کہ یہ زمانہ اخبار نکالنے کے لئے موزوں نہیں ہے، مگر احساس فرض نے تاکید کی کہ اسی ناموزوں زمانے میں یہ کام کرنے کی ضرورت ہے اور ہمت نے بڑھاوا دیا کہ اسی میں کام کرنے کا لطف ہے۔ چنانچہ اخبار نکلا اور طرح طرح کی مشکلوں کے باوجود جن کا اندازہ آپ بے کہے کر لیں تو اچھا ہے، برابر نکلتا رہا۔ اسے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی، بہت سے پڑھنے والے اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں اس اخبار کی بدولت تاریکی کی فضا میں روشنی کی کرن مرض کی حالت میں صحت کے آثار نظر آنے لگے۔ کاروباری حیثیت سے بھی نتیجہ برا نہیں رہا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے پہلے سال اتنی اشاعت ہو جانا جتنی اردو کے معقول ہفتہ وار اخباروں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ تھوڑے بہت اشتہاروں کا مل جانا بہت غنیمت ہے۔ لیکن ان بے پناہ مصارف کے مقابلے میں جو آج کل اخباروں کو خصوصاً دہلی میں برداشت کرنے پڑتے ہیں آمدنی بہت کم ہوئی اس لئے خسارہ زیادہ ہوا اور خیال ہے کہ ابھی ایک عرصے تک ہوتا رہے گا۔

کام کی دھن میں مجھے اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا کہ مسلسل خسارے پر اخبار کو چلا کر میں دو ایک دوستوں کی جیبوں پر، ساتھیوں کے مزاج پر، اور اپنی صحت پر کتنا بوجھ ڈال رہا ہوں، اتفاقاً پچھلے مہینے مجھے اپنڈکس کا اپریشن کرانے کے لئے رام پور جانا پڑا اور کئی ہفتے تک اخبار کا کام چھوڑنا پڑا۔ دوستوں اور ساتھیوں کی محبت اور عنایت سے میرے پیچھے اخبار پابندی سے نکلتا رہا، جس کے لئے میں ان کا دل سے شکر گزار ہوں۔ بستر جراحت پر اور اس کے بعد فرصت کے گھنٹوں میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ "نئی روشنی" کی حالت کا بھی اچھی طرح جائزہ لینے کا موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ جس طرح اخبار چل رہا ہے اس کا چلانا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی مالی حالت کو درست کرنے کی تدبیروں پر غور کرنا شروع کر دیا اور کر رہا ہوں لیکن پڑھنے والوں کو یہ اطلاع دے دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی معقول صورت نہ نکلی تو اخبار کو شاید بہت جلد بند کرنا پڑے گا۔ اگر ایسا ہوا تو جن حضرات کے چندے کی رقمیں اخبار پر اس وقت تک باقی ہوں گی ان کو حساب کر کے ادا کر دی جائیں گی اور جن سے اشتہار کا پیشگی معاوضہ وصول ہوا ہے ان کو واپس کر دیا جائے گا۔

سید عابد حسین

پچھلا ہفتہ :-

۱- ہندوستان

ہندی زبان اور دیوناگری رسم خط

پچھلے ہفتہ دہلی میں ہندی کے حامیوں نے اپنی پروپیگنڈا کی مہم کو جو بہت عرصہ سے جاری ہے شدت کے انتہائی نقطے پر پہنچا دیا۔ ایک کانفرنس کی گئی جس میں ہندی کے مشہور ادیب اور ماہرین لسانیات اور صوبائی زبانوں کے وہ نمائندے جن کے متعلق یقین تھا کہ ہندی کی حمایت کریں گے جمع کئے گئے اور ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ ہندی زبان دیوناگری رسم خط میں ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہیئے۔ ایک معمر قانون شناس دا ماتا ہمالیہ کی بلندیوں سے اس غرض سے تشریف لائیں کہ ہندی کو قومی زبان بنوانے کے لئے آمرن برت (مرن برت) رکھیں۔ یہ اہتمام اس وجہ سے تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں اور اس سے پہلے اسمبلی کی کانگریس پارلیمنٹری پارٹی میں قومی زبان کے مسئلے پر بحث ہونے والی تھی۔ غرض اس طول امل کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ اسمبلی کے کوئی ایک تہائی ممبر شروع ہی سے ہندی کے حامی ہیں، اور اس کی تائید میں اپیل شائع کر چکے ہیں اور ایک تہائی سے کہیں زیادہ زمانے کی ہوا کے ساتھ بہنے کو سیاست کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور چند اور دلیر ہندو مسلمان ممبروں کے سوا ارباب سیاست میں اس وقت کوئی ہندوستانی کی حمایت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے حامی تو زیادہ تر غیر سیاسی لوگ ہیں جو وقتی سیاسی جذبات سے متاثر نہیں ہوتے، جن کی نظر دور تک دیکھتی ہے اور جن کی زبان سچی بات کے کہنے سے نہیں جھجکتی۔

بہر حال ہندی کے حامیوں کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہوئی، اسمبلی کی کانگریس پارلیمنٹری پارٹی نے فیصلہ کر دیا کہ قومی زبان جو مرکزی حکومت کے دفتروں میں اور صوبوں کے باہمی معاملات میں استعمال کی جائے گی ہندی کہلائے گی اور دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے گی۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی پرجوش اور مدلل تقریروں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ ہندی کے لئے عام فہم ہونے کی قید لگا دی گئی، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک عام فہم کا کوئی معیار مقرر نہ ہو یہ قید بیکار ہے۔ اصول کے طے ہو جانے کے بعد عملی تفصیلات کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جو اس قسم کے مسائل کا فیصلہ کرے گی۔

(۱) ہندی کو انگریزی کی جگہ دفتروں میں رائج کرنے کے لئے دس سال کی مدت مقرر کی جائے یا پندرہ سال کی۔

(۲) یہ تبدیلی بتدریج ہو یا دس خواہ پندرہ سال تک انگریزی میں کام ہوتا رہے اور اس کے بعد ہندی میں ہونے لگے۔

(۳) اردو رسم خط کو بھی سرکاری کاموں کے لئے کسی حد تک استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

زبان کے مسئلے کا آخری فیصلہ آئین ساز اسمبلی کے عام اجلاس میں ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ کانگریس پارٹی اور اس کی مقرر کی ہوئی کمیٹی کی تجویزوں کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر اردو رسم خط کو بھی حسب ضرورت استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی تو ہندوستانی کے حامی تھوڑا حد تک مطمئن ہو جائیں گے، اس لئے کہ زبان کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ کسی قانون یا آئین کے زور پر نہیں چل سکتی بلکہ اسی حالت میں زندہ رہ سکتی ہے جب وہ پوری قوم کے حال اور مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور انھیں یقین ہے کہ اس کسوٹی پر صرف وہی زبان پوری اترتی ہے جو اس انتہائی تعصب کے دور میں بھی شمالی ہند کے شہروں میں عام طور پر بولی اور لکھی جاتی ہے۔

ہندوستانی شہریت کی گتھی سلجھ گئی

آئین کی وہ دفعات جن میں ہندوستانی شہریت کی شرطیں معین کی گئی ہیں بڑے معرکے کے مسائل میں سے سمجھی جاتی تھیں اور واقعی ان پر بڑا معرکہ برپا ہوا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ جنگ بعض اہم اصولی مسائل کے بارے میں نہیں تھی بلکہ صرف ایک چھوٹے سے سوال سے تعلق رکھتی تھی یعنی ان دو تین ہزار مسلمانوں کو جو پاکستان جانے کے بعد پھر ہندوستان میں مستقل قیام کی نیت سے واپس آئے ہیں شہریت کے حقوق دیئے جائیں یا نہ دیئے جائیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے پرجوش اور پر تاثیر انداز میں اور شری گوپال سوامی آئنگر اور شری الادی کرشنا سوامی آئر نے جچی تلی قانونی زبان میں لوگوں کو یہ سمجھایا کہ حق و انصاف، آئین اور قانون کی رو سے ان مسلمانوں کو کسی طرح حق شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ پنڈت جی نے ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے جنھوں نے حکومت پر مسلمانوں کی بیجا تالیف قلوب کا الزام لگایا تھا فرمایا "میں ایک بات کا جواب صاف چاہتا ہوں، کیا ان اعتراض کرنے والوں کا منشا یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے سابقہ ہو تو ایسے قاعدے برتنا چاہیئے جنھیں حق و انصاف سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں تالیف قلوب کے الزام کو تسلیم کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ حکومت کسی فرد یا جماعت کے ساتھ انصاف کرنے کے معاملے میں سیدھی راہ سے بال برابر داہنی طرف یا بائیں طرف قدم نہ ہٹائے گی۔" معترضوں کی تقریروں کا سیلاب نہ جانے کب تک جاری رہتا مگر ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر اسمبلی نے ایوان سے مشورہ کرنے کے بعد مباحثے کو ختم کر دیا اور ان بے شمار ترمیموں پر جو مختلف ممبروں کی طرف سے پیش ہوئی تھیں، ووٹ لینے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ کوئی بیس منٹ تک جاری رہا، ایوان نے سب ترمیموں کو ایک ایک کر کے رد کر دیا، اور اس سلسلے کی چاروں دفعیں بغیر کسی ترمیم کے پاس ہو گئیں۔ تعادوں کی گرما گرم اور دھواں دھار تقریروں نے دو تین روز تک ایک ہل چل برپا رکھی لیکن آخر میں معلوم ہوا کہ حکومت نے جو پالیسی پاکستان سے واپس آنے والے مسلمانوں کے بارے میں اختیار کی ہے اسے آئین ساز اسمبلی کی زبردست اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔

پہلے صفحہ کا بقیہ

اور نام کی چیزیں کام کی چیزوں کے سامنے زیادہ ٹھہرتی نہیں۔ ہماری آزادی کا نتیجہ ایک ایسا سماج ہونا چاہیے جس میں کسی کی آزادی بڑھانے کے لئے کسی دوسرے کی آزادی گھٹانے یا مٹانے کی ضرورت یا اجازت نہ ہوگی۔ جس میں ہر شخص ہر جماعت ہر تمدن کا رنگ پوری طرح نکھر سکے گا۔ ہر پھول میں اپنی پوری شادابی ہوگی اور سب پھولوں کی رنگا رنگی سے ہمارے چمن کی بہار ہوگی۔

ہم ایسا سماج بنائیں گے جس میں سیاسی آزادی کو معاشی غلامی کا گھن کھوکھلا نہ کر سکے گا۔ اس میں سیاسی آزادی بھی ہوگی اور معاشی (آرتھک) آزادی بھی۔ اس میں کوئی کسی کا خون چوس کر نہ پھل سکے گا، سب کو کام کا حق ہوگا، سب کو کام کا پھل پورا پورا ملے گا۔ اور ایک کی محنت سے دوسرا بے جا فائدہ نہ اٹھا سکے گا،

ہم ایسا سماج بنائیں گے جس میں سیاسی اور معاشی آزادی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا ایسا انتظام ہوگا کہ ہر فرد کی صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہو سکیں۔ صلاحیتوں کے بے ترتیب ابھار میں آزاد عمل سے یکسوئی پیدا ہو سکے۔ اور سیرت تربیت پائے اور پھر اعلیٰ مقصدوں کی چاکری کر کر آزادی کی فضا میں ممکن ہے یہ سیرتیں شخصیت کے بلند مرتبے کو پہنچیں کہ آزادی کے درخت کا پھل یہی اخلاقی شخصیت ہوتی ہے جس پر کائنات فخر کرتی ہے۔ فرشتے رشک کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی آزادی میں یہ کر لیا تو گویا اس کی آزادی کی ترقی اور اس کی حفاظت کا بھی پورا انتظام کر لیا۔ یہ تربیت یافتہ اخلاقی شخصیتیں ہی اپنے سماج کو برا بر اخلاقی فرض کی سیدھ میں لگائے رکھتی ہیں۔ آزاد سماج کو اچھا سماج، اچھے سماج کو بہتر سماج بناتی ہیں یہی آزاد ہستیاں زندگی کی ضمانت ہوتی ہیں جو آزاد سماج اخلاقی معیاروں پر برابر ترقی نہیں کرتا، وہ غلامی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہوتا ہے۔

دوستو! آزادی کے جنت سے غلامی کے دوزخ کی طرف بڑھنے کے راستے کو ہم اپنی پیہم محنت خلوص اور بیداری سے روک سکتے ہیں۔ مبارک ہو تحصیل آزادی اور مبارک ہو اسے قائم رکھنے اور ترقی دینے کی یہ ذمہ داری، مبارک ہوں آزادی کی پرکیف خوشیاں، مبارک ہوں اس کی بوجھل ذمہ داریاں

۲۔ پاکستان

مشرقی پاکستان کی زرعی اصلاحات

زمین داری کا مسئلہ کسی ایک صوبہ کا نہیں بلکہ پورے پاکستان کا ہے۔ مرکزی حکومت پاکستان کو اگرچہ اس کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہیں ملی ہے اور شاید ابھی انتظار ہو کہ دستور پاکستان اس کے لئے کوئی قطعی مسلک معین کرے لیکن ہر صوبہ اپنے اپنے حالات کے مطابق زمینداری کے مسئلے کو حل کرنے کی تدابیر پر غور کر رہا ہے۔

بنگال کے لئے یہ زرعی مسئلہ اس نظر سے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ وہاں کئی سال سے اجناس خوراک کی قلت ہے۔ ایک ہولناک قحط کے بعد جس کی یاد سے اب تک وہ لوگ بھی لرزہ براندام ہیں جنھوں نے صرف اس مصیبت کی داستان سنی ہیں۔ ہر سال مشرقی بنگال کے لوگ اس خوف میں بسر کرتے ہیں کہ کہیں پھر قحط نہ پڑ جائے۔ مغربی پاکستان سے غلہ جاتا ہے یا باہر سے آیا ہوا غلہ مشرقی پاکستان کو بھیجا جاتا ہے اور غلہ [illegible] تقسیم کا انتظام خراب ہونے کی وجہ سے [illegible] قدر گراں فروخت [illegible] [illegible] [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] زمینداری اور [illegible] [illegible] [illegible]

سال گذشتہ [illegible] اس مقصد کے لئے مسودہ قانون مرتب ہو گیا تھا [illegible] قانون [illegible] ارکان کی ایک خاص کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کر دی گئی تھی کہ وہ اس مسودۂ قانون پر غور کرنے [illegible] قانون [illegible] خاص کمیٹی نے اپنی رپورٹ مرتب کر لی ہے توقع ہے کہ اس پر [illegible] بحث کے لئے مجلس وضع قوانین مشرقی پاکستان کا عنقریب خاص اجلاس طلب کیا جائے گا۔

زمینداری کی تنسیخ کا اصول حکومت مشرقی پاکستان نے تقسیم ہند کے بعد ہی منظور کر لیا تھا۔ صرف یہ طے کرنا اور رہ گیا ہے کہ حکومت کس طرح زمین حاصل کرے اور آئندہ قانون لگان کیا ہو۔ سابقہ مسودۂ قانون میں کمیٹی نے بعض ترمیمات کی ہیں خصوصاً زمین داروں کو ان کی زمینوں کا معاوضہ دیا جائے گا۔ مسودۂ قانون کا بھی یہی منشا تھا اور کمیٹی بھی اس سے متفق ہے۔ لیکن ان کے معاوضے کے اندازے میں دونوں کے درمیان کچھ فرق ہے۔ کمیٹی نے اس کا خیال رکھا ہے کہ جن زمینداروں کی آمدنی کم ہے ان کو معاوضہ یکمشت یا کم سے کم اقساط میں مل جائے اور بڑے زمینداروں کے مقابلے میں زیادہ۔ مثلاً جن زمینداروں کی آمدنی ۵۰۰ روپے ہے انھیں آمدنی کی دس گونہ رقم بطور معاوضہ دی جائے اور جن کی آمدنی ایک لاکھ سے زیادہ ہے، انھیں دگنی رقم چالیس قسطوں میں۔

غیر زرعی زمینوں کے حصول اور ان کی قیمت کے متعلق بھی اس رپورٹ میں سفارشات ہیں، گویا مد نظر یہ ہے کہ لگان وصول کرنے کے تمام حقوق حکومت حاصل کرلے۔ افراد کے بیچ زمین کو لگان پر دینے کا حق بالکل گوارا نہ کیا جائے۔

ڈان، کراچی

مسٹر کھوڑو کی برأت

سندھ چیف کورٹ نے [illegible] [illegible] وزیر اعظم مسٹر محمد ایوب کھوڑو کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ [illegible] خلاف خیانت مجرمانہ اور فریب دہی وغیرہ کے جھوٹے الزام عاید کئے گئے تھے وہ جھوٹے پر مبنی تھے۔ آپ کے خلاف خاص تحقیقاتی عدالت میں [illegible] الزامات کی سماعت ہو چکی ہے [illegible] [illegible] ایک الزام کی بنا پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا اور اس مقدمہ میں آپ کو اسپیشل جج کی عدالت میں سزا بھی مل چکی تھی لیکن اب چیف کورٹ نے اس سزا کو غلط قرار دیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس برأت کے بعد صوبائی سیاست میں مسٹر کھوڑو کی پوزیشن اور بھی مستحکم ہو جائے۔ جب آپ کے خلاف کئی درجن الزامات کی تحقیقات ہو رہی تھی، اسی وقت بھی آپ نے مسلم لیگ کا صدر منتخب ہو کر اپنی صوبہ گیر سیاسی مقبولیت کا ثبوت دیا تھا اور اب تو ان کے لئے سیاسی میدان زیادہ ہموار اور زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس صورت کا سندھ کی عام سیاست خصوصاً وزارت پر انقلابی اثرات پیدا ہوں۔ کھوڑو کی رہائی کوئی معمولی واقعہ نہیں اس سے صوبہ کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

(مغربی پاکستان (لاہور)

پنچایتوں کی بحالی کی ضرورت

یو۔ پی میں ۱۵ راگست کو پنچایت راج کا افتتاح کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر یو۔ پی کے ۲۵ ہزار گاؤں کے پنچایت افسر اپنے عہدوں کا حلف اٹھائیں گے چنانچہ اس خوشی میں تمام دیہات میں روشنی کی جائے گی۔ بچوں میں مٹھائیاں بٹیں گی۔ ناچ اور گانے ہوں گے اور اس موقع کو ایک تہوار کی طرح منانے کا انتظام کیا جائے گا۔

ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دیہات کی اصلاح کا بہترین طریقہ پنچایت ہی ہے اور پنچایت ہی کے ذریعے دیہات کے عوام میں صفائی اور صحت کا احساس نیز جماعتی اور سیاسی شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف یو۔ پی کی حکومت ہے جو اصلاح دیہات کے لئے پنچایتوں کا نظام قائم کر رہی ہے اور دوسری طرف ہماری مغربی پنجاب کی حکومت ہے کہ ۱۹۳۹ء سے جو پنچایتی نظام چلا رہی ہے [illegible] ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے جیسا کہ پنچایتوں [illegible] ایک مشہور ماہر نے ایک تازہ کتاب میں لکھا ہے

"محکمہ پنچایت کی موجودہ حالت سخت قابل رحم ہے دیہات میں افواہ پھیل چکی ہے کہ محکمہ پنچایت ٹوٹ گیا۔ نہ پنچایتیں کام کر رہی ہیں اور نہ سٹاف جو اپنے مستقبل کے متعلق بے خبر ہے، کام میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

محکمہ پنچایت کی یہ حالت بڑی افسوسناک ہے اگر ہماری حکومت کو واقعی دیہات کی غریب اور بے کس آبادی سے کوئی دلچسپی ہے تو اس کو چاہئے کہ جلد سے جلد اس مفید محکمہ میں نئی زندگی [illegible] دیہاتی سرگرمیوں کا مرکز بنائے۔

محض سیاسی نعروں سے قومیں نہیں بنا کرتیں، قوم کی تعمیر ٹھوس بنیادوں پر ہونی چاہئے، اور اس کے لئے دیہات میں پنچایتوں کا قیام بے حد ضروری ہے

آفاق، لاہور

دریائے سندھ میں شدید سیلاب

دریائے سندھ میں نہایت تیزی سے پانی بڑھ رہا ہے اور اس کے دو بڑے بند حاجی پور اور بلا میں پانی کی تیزی اور زمین کے کٹنے سے بہت سخت خطرے میں ہیں۔

ڈان نے لکھا ہے کہ

"حاجی پور بند کی بربادی سے زیریں سندھ کے لئے بلکہ تمام پاکستان کے لئے سب سے بڑی تباہی ہوگی۔ فصلوں کو جو نقصان پہنچے گا وہ پچھلے سال کے نقصان سے زیادہ ہوگا۔"

آزادی کے بعد

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

بات ہے کہ آزادی کے بعد اب وہ اپنے اپنے مقاصد اور نصب العین حاصل کرنے کے لئے الگ ہو گئی ہیں ہماری آپس کی نااتفاقیاں جہاں تک ذاتی اغراض پر مبنی ہیں نہایت خطرناک ہیں اور ہماری رائے عامہ کو پوری قوت کے ساتھ انھیں کچل دینا چاہئے۔ لیکن مختلف مقاصد رکھنے والی جماعتوں کا نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا جیسی کتنا ہی ڈراؤنا معلوم ہوتا ہو اصل میں نہایت صحت بخش ہے اور اس کے بغیر آزادی اور جمہوریت پنپ نہیں سکتی۔ اصولی اختلافات جنھیں ہم آج اپنی کوتاہ نظری سے زحمت سمجھ رہے ہیں ہمارے لئے رحمت ثابت ہوگا۔

غرض جو کمزوریاں آج ہمارے اندر ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عارضی ہیں، اور اگر ہم غور سے دیکھیں تو ان کے اندر قوت کے خزانے پنہاں ہیں۔ اگر ہم نے مہاتما گاندھی کی روح کو جذب کر لیا ہے تو ہماری ان کمزوریوں [illegible] سے ایک ایک [illegible] [illegible] جائے گی۔

۳- باہر کی دُنیا

انڈونیشیا آزادی کی راہ پر

ڈچ حکومت انڈونیشیا کی تحریک آزادی کچلنے میں جب ناکام رہی، تو سمجھوتے کی بات چیت اور زیادہ سے زیادہ طول دے کر، آزادی کی گھڑی کو زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک طویل گفتگو کے بعد پچھلے ماہ اس نے انڈونیشین جمہوریہ کو ریپبلکن راج دھانی جوگ جاکارتا میں بحال کیا۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے کسی طرح لڑائی بند کرنے کی شرطوں پر سمجھوتہ ہوا۔ اور اب ڈچ دارالسلطنت ہیگ میں گول میز کانفرنس کے لئے ابتدائی گفتگو ہو رہی ہے۔ اگرچہ انڈونیشیا کی آزادی کو اب کوئی طاقت زیادہ عرصے تک روک نہیں سکتی۔ انڈونیشی مجاہدوں کی راہ میں صرف ایک ہی رکاوٹ تھی یعنی آپس کی پھوٹ۔ مگر ریپبلکن کے مقابلے میں کمیونسٹوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے اور ریپبلکن اور فیڈرلسٹ پارٹی میں سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بین اقوامی حالات کا بھی تقاضہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں امن اور سکون ہو تاکہ جمہوری ممالک یک سو ہو کر کمیونسٹ سیلاب کو آگے بڑھنے سے روکنے کی تدبیریں کر سکیں اس لئے ہالینڈ کے لئے سمجھوتے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہی لیکن پھر بھی قطرے کو گہر ہونے تک "نہ جانے ابھی کن کن منزلوں سے گذرنا پڑے گا۔

ویسے تو ڈچ وفد کے صدر ڈاکٹر وان رائن نے یقین دلایا ہے کہ ہالینڈ، انڈونیشیا کو اس سال کے ختم ہونے تک اختیارات منتقل کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہے مگر اختیارات منتقل کرنے کے لئے جو شرط بتائی گئی ہے ڈر ہے کہ کہیں وہی اختلاف کا سبب نہ بن جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ اختیارات معاہدۂ رین ویل کے مطابق منتقل کئے جائیں گے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ معاہدۂ رین ویل بعض شرطوں کی تشریح میں ڈچ اور ریپبلکن میں شدید اختلاف ہے اس معاہدہ کی پہلی دفعہ میں بعض دوسری دفعات کے علاوہ یہ ہے کہ

"ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا آزاد اور خود مختار ریاست ہوگی اور ہالینڈ انڈونیشی یونین میں برابر کا شریک ہوگا اور اس یونین کا افسر اعلیٰ ڈچ بادشاہ ہوگا۔ جمہوریہ انڈونیشیا کی حیثیت ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کی ممبر ریاست کی ہوگی۔"

اس دفعہ کی توضیح کے وقت جو سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ یونین کے افسر اعلیٰ کے اختیارات کیا ہوں گے اور ریپبلکن ریاست، کن ممبر بننے کی اور کن شرائط پر، ان کے بارے میں دونوں فریق میں سخت اختلاف ہے اور اس اختلاف کے پیش نظر ہیگ کانفرنس کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ غالباً اس قسم کے شبہات اور خدشات ریپبلکن وزیر اعظم ڈاکٹر محمد حتیٰ کے دل میں بھی ہیں اسی لئے انھوں نے تصفیع اوقات سے بچنے کے لئے دو مہینے کے اندر اندر فیصلہ کرنے پر زور دیا ہے۔

اندرونی اور بیرونی پالیسی

ڈاکٹر محمد حتیٰ نے حال میں تابڑ توڑ جو بہت بیانات دئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیگ کانفرنس کے نتائج چاہے جو بھی ہوں انڈونیشی رہنما عزم کر چکے ہیں کہ آزادی کا یہ کارواں نہ پیچھے ہٹے گا اور نہ رکے گا بلکہ حالات جو بھی ہوں ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق آگے بڑھتا ہی جائے گا انھوں نے اپنے ایک بیان میں انڈونیشی حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسی کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ بغیر کسی استثناء کے ہم تمام ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا اور تمام جتھہ بندیوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں انھوں نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کی تعریف کی اور فرمایا کہ اس مثال کو ہم اپنے لیے شمع راہ بنانا چاہتے ہیں۔ داخلی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی صنعتیں جن کا براہ راست عوام کی زندگی سے تعلق ہے مثلاً ٹیلیفون، ریلیں، بجلی وغیرہ حکومت کے انتظام میں رہیں گی لیکن اور کسی صنعت کو فی الحال قومی بنانے کا ارادہ نہیں ہے لیکن ایسی صنعتیں جن کا ملک کے مفاد سے بہت گہرا تعلق ہے، یعنی پٹرول، ربر، ٹن وغیرہ

ہریجن کا ست

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

کے پاس تو ان کی ضرورت سے زیادہ غلہ موجود ہے اور لاکھوں انسانوں کو پیٹ بھرنے کی بھی نصیب نہیں، ایک طرف تو کسی عالی شان عمارت پر مہمانوں کی ضیافت پر تین سے لے کر پانچ روپے فی کس تک صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف فقراء اور مہتران مہمانوں کے آگے سے بچے کھچے کھانے پر فاقہ مستوں کی طرح گر رہے ہیں۔ یہ چیز انسانیت کا گناہ ہے، جسے جس کی سزا دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس قسم کی دعوتیں سماج کے ساتھ دشمنی ہے۔ یہ یا تو رضاکارانہ طور پر خود بند کر دی جائیں یا قانونی حیثیت سے ممنوع قرار دے دی جائیں۔

غلہ کی صورت میں مال گذاری وصول کرنا اس غلے کو گاؤں کے مصرف کے لئے ذخیرہ کرنا گاؤں میں غلے کے کوآپریٹو بینک قائم کرنا اور ملازمین کو کچھ تنخواہ جو بہ اور تنخواہ ہیں، غلے کی صورت میں ادا کرنا ان تمام صورتوں پر عمل پیرا ہو کر بڑی حد تک منصفانہ تقسیم کا نظام جاری کیا جا سکتا ہے، غذائی چیزوں کی بچت اور انھیں کفایت شعاری سے صرف کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ان کی پیداوار بڑھانا۔ (ترجمہ: قومی آواز، لکھنؤ)

* جو اس وقت بیرونی ملکوں یا تاجروں کی ملکیت میں ہیں انھیں مساوی شرطوں پر یا تو حکومت کی شرکت میں دے دیا جائے گا یا پھر انڈونیشی تاجروں کی شرکت میں

مالی اور تاجرانہ معاہدہ یا گفتگو کرنے کے لیے ہیگ سے بہت جلد وفد انگلستان جانے والے ہیں۔

اگست کی آئی پندرھویں طرب کا پیغام عام آیا

اقبال احمد سہیل

اگست کی آئی پندرھویں طرب کا پیغام عام آیا
لگا کے سورج کے گرد چکر یہ ابلق تیز گام آیا
سمٹ گیا تیرگی کا دفتر مہم شب غم کی ہو گئی سر
اُفق پہ وہ لیکے شاہ خاور مے مسرت جام آیا
یہ دن جب اگلے برس تھا آیا بڑی امنگوں سے تھا منایا
خوشی سے ہر دل تھا جگمگایا کہ وقت نیل مرام آیا
پھر ایسے فتنوں نے سر اُٹھائے کہ اپنے بھی بن گئے پرائے
قدم ہزاروں کے ڈگمگائے وہ لغزشوں کا مقام آیا
غلامیِ غیر کی مصیبت ہوئی جو صدیوں کے بعد رخصت
تو لیکے تیغ نفاق و نفرت جنوں لئے انتقام آیا
کسی کا گھر بار لُٹ گیا ہے کوئی عزیزوں سے چھٹ گیا ہے
ادھر سے اِک بھیڑ بھاگ نکلی اُدھر ایک ازدحام آیا
بہار بنگال سندھ سرحد کہاں نہ تھا بیکسوں کا مشہد
یہ حریت کی تھی آمد آمد کہ موسم قتل عام آیا
جو مدتوں سے تھے بھائی بھائی انھیں ہوا سم [illegible]
نہ آدمیت کو شرم آئی نہ لب پہ غیرت کا نام آیا
ملی تھی جس کے سبب رہائی۔ اسی پہ پستول خود چلائی
یہ ناسپاسی یہ بے حیائی اسی کو مارا جو کام آیا
وہ دینِ انسانیت کا رہبر، خلوص ایثار کا وہ پیکر
ادب سے غیروں کے بھی جھکے سر جو لب پہ باپو کا نام آیا
دلوں میں ہے اس کی راج دھانی حیات ہے اس کی جاودانی
فلک سے ہے ابر کی زبانی یہ آج اس کا پیام آیا
سوتنتر بھارت کے نوجوانو مری شہادت کی قدر جانو
کرو مکمل وہ کام جن کو میں چھوڑ کر ناتمام آیا

یوم آزادی

ڈاکٹر مسعود حسین

میں نے آزادی کے دن دیکھا تھا
ایک سیلاب نشاط!
بگھیاں، گھوڑے، اک انبوہِ کثیر
کاریں پھولوں سے ڈھکی
اور بے کاروں کے سینے پہ اُچھلتے ہوئے ہار
اُگتی جیسے بہار!

قوم کے تازہ نہال
ہند ماتا کے سپوت، اس کے لال
آریہ ورش کے بیدار خیال
جن کا دل تنگ تھا، اور جسم نڈھال
جام میں اپنے لئے شبنم تھے
قطرے کثرت سے، ستارے کم تھے!

بی بیاں چند اداس
جن کی آنکھوں میں نہ نشہ نہ غرور
[illegible] غلامی سے جواب تک تھیں چور

سرکشی جن کے نہ سینے میں نہ دل میں بھرپور
یوم آزادی نے بخشا نہ جنھیں جذب و سرور

لالہ و گل کا وہ پژمردہ ہجوم
دیکھ کر اور بھی دل تھا مغموم
خاکِ رہ آج بھی بیدار نہ ہونے پائی!
ایسی آزادی کا آیا نہ سمجھ میں مفہوم

کیا سیلاب نشاط
ایک بھی موج نہ تھی تیز
مل کے چلتے تھے مگر پھر بھی تھے سب کم آمیز

میں نے آزادی کے دن دیکھا تھا
بلبلے چند نمودار ہوئے
سطح پر رقص کیا
پھوٹ گئے!
اور دریا کو خبر تک نہ ہوئی!!

ہندو مسلم تعلقات

انیسویں صدی اور اس کے بعد

ڈاکٹر سید محمود

ترجمہ مشتاق احمد

(۲)

انگریزوں نے ٹھیک جس طرح ہندوؤں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا، جس کی تفصیل پچھلی اشاعت میں پیش کی جا چکی ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی ہتھیانا کیا۔ تقریباً ۱۸۲۰ء میں جب مولانا سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تلقین کرنی شروع کی تو اس کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے انگریزوں نے تمام سہولتیں مہیا کیں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جو انگریزوں کے دوست اور حلیف تھے لڑنے کے لئے رضاکاروں اور مجاہدوں کی بھرتی میں برطانوی حکومت نے نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی، بلکہ خاصی مدد کی۔ لیکن جیسے ہی سکھوں کا زور ٹوٹا اور پنجاب پر پوری طرح تسلط قائم ہو گیا تو مولانا بریلوی کے ساتھیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی ——— کچھ جیلوں میں بھر دئے گئے کچھ جلاوطن ہوئے، کچھ تختہ دار پر چڑھائے گئے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انھوں نے اپنے اندر زندگی اور حرارت کا ثبوت دیا تھا۔

یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز طوفان آ پہنچا۔ اس کے لئے بھی مسلمانوں کی گردن پکڑی گئی۔ پرانے شبہات میں نئے شبہات کے اضافے کئے گئے۔ مسلمانوں کو بری طرح کچلا گیا۔ اور انتقام کی آگ کو ان کے خون سے بجھایا گیا۔ اور وہ اس بری طرح کچلے گئے کہ ذہنی اور معاشی اعتبار سے اب تک سنبھل نہیں سکے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا کہ "انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا اصل دشمن تصور کر کے انھیں بری طرح کچلا۔ چنانچہ غدر کی ناکامی ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئی" آگے چل کر وہ پھر لکھتے ہیں "فوج اور عدالتوں کی ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دئے گئے ہیں۔ عدالتوں میں یا تو انگریزوں کو رکھا جا رہا ہے یا ہندوؤں کو۔ یہاں تک کہ سرکاری گزٹ میں بھی یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ سرکاری اسامیاں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہ دی جائیں ....

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اعلیٰ حکام مسلمانوں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے اس برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو چپراسی گیری، دفتری یا کلرکی کے علاوہ اور کوئی ملازمت نہیں مل سکتی تھی"۔ یہ تھا برطانیہ کے طبقے کا عام مسلمانوں کے خلاف۔ لیکن جتنا ہی انھیں دبایا جاتا تھا اتنے ہی زیادہ ان کے دلوں میں تلخی اور غیر وفاداری کے جذبات گھر کرتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بنگال، بہار اور شمالی صوبوں میں انگریزوں کے خلاف عام تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں اور ۱۸۷۲ء میں جب گورنر جنرل لارڈ میو کو ایک مسلمان نے موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ اپنے خواب خرگوش سے بیدار ہوئے اور ان مسائل کو حل کرنے کی نئی تدبیریں سوچنے لگے ——— کچلنے کی پالیسی ناکام رہی تھی اس لئے اب سمجھوتے کی پالیسی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

مخالفت کا طوفان اور اس سے بچنے کی ترکیب

آگے ان بدلے ہوئے رجحانات نے ہندوؤں کے دلوں میں رشک و حسد کے جذبات پیدا کر دئے اور ان کے اخبارات نے مصالحت کی پالیسی کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہیں سے شک اور عدم اعتماد کا ایک مستقل جاری رہنے والا چشمہ پھوٹتا ہے۔ اس زمانے کے بہت سے مسلمان لیڈر جو پکے نیشنلسٹ تھے فرقہ پرست بن گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل بھی کام کر رہے تھے۔ معتدل اور بوڑھے بنگالی ہندو آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا عروج اور فائدہ انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں نہیں ہے۔ اسی طرح نیل کی کاشت کرنے والوں میں کالے اور سفید کے درمیان جو امتیاز برتا جاتا تھا، اس کے خلاف انھوں نے صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی اور سفید اور کالے مجرموں کو سزا دینے میں مساوات کا اور اونچے اونچے عہدوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کا مطالبہ کرنے لگے۔

دکن میں بے چینی کی سلگتی ہوئی آگ کو پونا کے مرہٹہ برہمنوں کی سرگرمیوں نے ہوا دی، ۱۸۷۲ء میں کئی سازشوں کا پتہ لگا جن سے عام بغاوت کا اندیشہ تھا۔ لوٹ مار تو باقاعدہ شروع ہو گئی۔ پنجاب میں کوکا فرقہ (سکھوں کی ایک جماعت) کے لوگ جو گاہیوں کے رنگ کے مشہور تھے، علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، مگر ۱۸۷۲ء میں حکومت انھیں دبانے میں کامیاب ہو گئی

مخالفت کے اس طوفان کو روکنے کے لئے حکومت نے چند تدبیریں اختیار کیں، جن کی تہ میں یہ اصول کام کر رہا تھا کہ ایک گروہ کے مقابلے میں دوسرے گروہ کو کھڑا کر کے توازن قائم کیا جائے، تعلقہ داروں، زمین داروں اور جاگیرداروں کو مراعات دے کر ان کی حمایت حاصل کی گئی اور قانون ساز کونسل کے جو اسی زمانے میں قائم ہو چکی تھی ایسے قاعدے اور قانون بنائے گئے کہ جس میں یہی انگریزوں کے پٹھو اونچے طبقہ کے لوگ آ سکیں۔ آنریری مجسٹریٹی کے عہدے بھی انھیں کو دئے گئے، اس کی بھی کوششیں کی گئیں کہ ان کے نوجوانوں کو عوام سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے، چنانچہ ان کے واسطے مخصوص ادارے قائم کئے گئے مثلاً اجمیر کا میو کالج۔

دوسری تدبیر یہ کی گئی کہ فوج کو از سر نو ترتیب دیا گیا۔ غدر سے پہلے کی فوج میں بنگال کی کمانڈ میں برہمنوں اور راجپوتوں کی اکثریت تھی اور مدراس اور بمبئی کی کمانڈ میں تامل تلنگو اور مرہٹہ رجمنٹوں کی تعداد زیادہ تھی۔ نئی ترتیب کے وقت ملی جلی رجمنٹوں کو توڑ دیا گیا، اور رجمنٹوں کی بنیاد ذاتوں پر رکھی گئی۔ برہمن اور راجپوت نکالے جانے لگے، ہندوستانیوں مدراسیوں اور مرہٹوں کی تعداد کم کر دی گئی اور ان کی جگہیں پٹھانوں، گورکھوں، سکھوں اور پنجابیوں سے پُر کی جانے لگیں۔

لیکن ترپ چال یہ تھی کہ تعلیم یافتہ ہندو طبقے کے بڑھتے ہوئے اثرات کی روک تھام کے لئے مسلمانوں کے ساتھ جو اب تک پالیسی رہی ہے اس میں تبدیلی کی جائے۔ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ انتہا پسندی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ البرٹ بل کی تنازع کے بعد انھوں نے ملک کے مختلف حصوں میں سیاسی جماعتیں قائم کرنی شروع کر دی تھیں۔ ہندوؤں کی اصلاحی تحریکیں، مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، اور تھیوسافیکل سوسائٹی وغیرہ ان میں قومیت اور خودداری کے احساسات کو ابھارنے لگی تھیں۔ انگریزوں کے بڑھ چڑھ کر رہنے کے سخت مطالبوں کا جواب، ہندوستانیوں کے ساتھ بھی یکساں برتاؤ کی سخت مانگوں سے دیا جانے لگا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی۔ غرض انگریزوں کے تنزل کے بادل افق پر آہستہ آہستہ چھا رہے تھے۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی ترکیب تھی وہ یہ کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا تعاون حاصل ہونے نہ پائے۔

بعض ہندو مصنفین خصوصاً بنگالی اور مرہٹے اپنے ناولوں اور ڈراموں میں مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا کرتے رہتے تھے، اور مسلمانوں کو وہ "ملیچھ اور ظالم پردیسی" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اصل اور مخفی مقصد انگریز حکمرانوں پر حملہ کرنا تھا، لیکن چونکہ وہ ایسا کھلم کھلا نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے مسلمانوں اور اُن کے اداروں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ ان تحریروں کا دونوں فرقوں پر بہت بُرا اثر پڑا۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے اور مسلمان اپنے برادران وطن کے اس ناہموار رویے سے سخت دل برداشتہ ہوئے اور ان کے دلوں میں بھی شکوک شبہات نے گھر کر لیا۔

مسٹر ڈبلو۔ ایف ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی، پہلی مرتبہ خطرے کی گھنٹی بجائی۔ مسٹر ہنٹر بنگال میں جو مالی مقدمات کے انچارج تھے، مسلسل کئی مضامین لکھے، اور اس مسئلے کی طرف حکومت کو توجہ دلائی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "عام مسلمان کسانوں پر دہابی تحریک کا جو اثر ہے اس کا بڑا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے اُن کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے" مسٹر ای۔ سی۔ بیلے نے جو ہوم ڈپارٹمنٹ میں حکومت ہند کے سکریٹری تھے، مسلمانوں کی بے چینی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ان سے مصالحت کرنے پر زور دیا تھا، انھوں نے لکھا کہ "بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے افسروں میں سے ایک بھی موجودہ وائسرائے (لارڈ میو) سے زیادہ ان زیادتیوں کی تہ کو نہیں پہنچا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی ہیں۔ اس حقیقت میں اب کسی کو شبہ نہیں ہے کہ ملک کی مسلمان پرجا کی طرف سے ہم نے غفلت برتی ہے"

(ڈبلو ایف ہنٹر)

گورنر جنرل نے اپنے ایک میمورنڈم میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں یہ نکات رکھے تھے:۔

"(۱) ایک مسلمان اس وقت تک شریف نہیں کہلایا جا سکتا جب تک وہ عربی فارسی میں تھوڑی بہت شد بد حاصل نہ کرے (۲) وہ ہندوؤں کے اسکول میں ہندو استادوں سے تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے (۳) اس لئے ہمیں تھوڑا بہت ان کے قومی تعصبات کا خیال رکھنا چاہیئے اور عربی فارسی اور اردو کو اپنے بیشتر اسکولوں اور امتحانوں میں نمایاں جگہ دینی چاہیئے۔

ان انگریزی اسکولوں میں جو مسلمانوں کے اضلاع میں قائم کئے جائیں انگریزی پڑھانے کے لئے مسلمان استاد رکھنا سود مند ہوگا......
مسلمانوں کی اس طرح بھی منصفانہ مدد کی جا سکتی ہے کہ انھیں اسکول قائم کرنے کے لئے مالی امداد دی جائے۔"

لارڈ میو نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ "موجودہ حالات میں اس طرح کی تجویز نہایت مناسب رہے گی اور اس کا مسلمانوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا"
آخر کار اس خواہش پر عمل کیا گیا کہ مسلم نوجوانوں کو "انہیں اپنی بنائی ہوئی اسکیموں کے مطابق تعلیم دینی چاہیئے" (ہنٹر) ۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تعلیمی حالت کا جائزہ لیا اور اسی کی رپورٹ کی بنا پر ۱۸۸۵ء میں حکومت ہند نے ایک جامع تجویز منظور کی جس کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔

پھوٹ کا پہلا بیج

اسی دوران میں سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایم اے او کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو بہت جلد مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز بن گیا لیکن ۱۸۵۷ء کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو خوف زدہ کر دیا تھا، وہ کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے جو حکومت کی ناراضگی کا باعث ہو۔ اس لئے مسلمانوں نے علی گڑھ کی باگ ڈور ہمدرد انگریز پرنسپلوں کے ہاتھوں میں دے دی، جو مسلمانوں کے سیاسی رہنما بن گئے اور کوئی چوتھائی صدی تک مفکر، دوست اور لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔

مسٹر بیک نے اس کام کو بڑی کامیابی سے انجام دیا مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد ان کے لئے سرکاری ملازمتوں کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی انھیں ذرا سی بھی رعایت ملتی تو ہندو پریس بڑی سختی سے اس کی مخالفت کرتا۔ غالباً اُن کا یہی رویّہ تھا جس نے سرسید احمد خاں کا دل توڑ دیا، اور ان کی یہ مایوسی انھیں انگریز پرنسپلوں کے دامن میں لے گئی۔ علی گڑھ آنے سے پہلے سرسید ہندوستان کے قومی مطالبوں کے کٹر حامیوں میں سے تھے۔ سرسُریندر ناتھ بنرجی کی علی گڑھ میں آمد پر جو شاندار استقبال انھوں نے کیا تھا اور اس موقع پر جو تقریر کی تھی اس سے اُن کے ان رجحانات کا پتہ چلتا ہے، لیکن بعد میں وہ ایسا بدلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے بڑے مخالف بن گئے۔ ان کی رہنمائی میں مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ کانگریس کا دشمن بن گیا۔ ۱۸۸۸ء میں محب وطن ہندوستانیوں کی متحدہ ایسوسی ایشن" کی بنا ڈالی گئی، جس میں وہ تمام ہندو اور مسلمان شامل تھے جو کانگریس کے خلاف تھے۔ لیکن ۱۸۹۳ء میں محڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک خالص فرقہ وارانہ جماعت کی بنیاد پڑی، جس کے مسٹر بیک سکریٹری مقرر ہوئے، یہی پھوٹ کا پہلا بیج ہے

(باقی آئندہ)

ہندوستان میں پنچایت راج

عبداللطیف اعظمی

ہندوستان ۱۵ اگست کو اپنی آزادی کی دوسری سالگرہ منانے جا رہا ہے۔ آزادی کے پچھلے دو سال میں قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں — اندرونی بھی اور باہری بھی، معاشی بھی اور سیاسی بھی، مخالفوں کی طرف سے بھی اور دوستوں کی طرف سے بھی، مگر ہمارے نیتاؤں نے بڑے صبر، ہمت اور استقلال کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کیا اور ہمارا ملک جن نامساعد حالات سے دوچار رہا ہے اس کے پیش نظر انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس سے ان کے تدبر اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان نے اپنی داخلی اور خارجی پالیسی متعین کرتے وقت جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، رئیس بتا مہاتما گاندھی کے خیالات اور تصورات کو سامنے رکھا ہے۔ پنچایت راج گاندھی جی کا محبوب ترین تصور تھا جسے وہ ہندوستان میں پورا کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "ہر گاؤں ایک خود کفیل [illegible] پنچایتی جمہوریہ ہے"۔ وہ سیاسی آزادی سے [illegible] دیہاتوں کی معاشی اور سماجی اصلاح [illegible] سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اس وقت تک بےکار ہے جب تک دیہاتوں کی ۹۰ فیصدی آبادی خود اپنے پر حکومت کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ چنانچہ ان کے جملہ مشاغل کا مرکز گاؤں ہوا کرتے تھے اور ان کے تمام اصلاحی اور تعمیری [illegible] شہروں سے زیادہ دیہاتوں کے لئے ہوا کرتے تھے۔

پنچایت راج ہندوستان میں قبل مسیح شہنشاہ وکرم کے زمانے سے رائج تھا مگر انگریزوں کے آنے کے بعد جہاں ہندوستان کی اور خصوصیات ختم ہو گئیں وہاں پنچایتی نظام بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اگر کہیں باقی رہا تو آئینی حیثیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے بالکل بےجان اور بےاثر ہو کر رہ گیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں اسے پھر زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، مگر پنچایتوں کو اختیارات بہت کم حاصل تھے اور دیہات کے لوگوں نے اس میں بہت کم دلچسپی لی اس لئے یہ ہندوستان کی زندگی میں کوئی مؤثر اور قابل ذکر حصہ نہ لے سکیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس پہلی مرتبہ برسر اقتدار آئی تو اس نے اس نظام کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی، اور اپنے مختصر دور حکومت میں اس نے پنچایتوں کے ذریعے گاؤں میں خاصی زندگی پیدا کر دی تھی۔ مگر کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے اور کانگریسی کارکنوں کے جیلوں میں چلے جانے سے یہ کام قریب قریب ختم ہو گیا۔

پنچایت کی ذمہ داریاں

۱۹۴۶ء میں کانگریس جب دوبارہ برسر اقتدار آئی تو پھر پنچایتوں کی از سر نو تنظیم کی اور قوانین کے ذریعے ان کے اختیارات اور حقوق میں اضافہ کئے۔ اس وقت ہندوستان میں تقریباً ۸۰ ہزار پنچایتیں قائم ہیں اور آئندہ ۳ سے ۵ سال کے اندر اندر ایک لاکھ پنچایتوں کو قائم کرنے کا پروگرام ہے۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ ہر گاؤں میں ایک پنچایت ہو، مگر جنتا میں تعلیم اور احساس ذمہ داری کی کمی کی وجہ سے حکومت بہت احتیاط اور پھونک پھونک کے قدم اٹھا رہی ہے۔ جوں جوں عوام میں تعلیم اور احساس ذمہ داری بڑھتا جائے گا پنچایتوں کی تعداد اور ان کے اختیارات بھی بڑھتے جائیں گے۔ اس وقت پنچایتوں کو عام طور پر حسب ذیل ذمہ داریاں سپرد کی گئی ہیں۔

(۱) صفائی اور محلات اور دریا وغیرہ کی حفاظت (۲) طبی امداد اور فرسٹ ایڈ (۳) آبپاشی وغیرہ کے لئے پانی کرنا (۴) فصل اور جانوروں کی تعداد وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانا (۵) متعدی بیماریوں کی روک تھام (۶) سڑکیں اور راستے بنوانا اور ان کی حفاظت کرنا (۷) [illegible] تعمیر کرنا اور ان کی مرمت کروانا (۸) آگ، قحط، چوری اور [illegible] وغیرہ کی روک تھام (۹) تمام چراگاہوں، قبرستانوں، [illegible] کی مشترک زمینوں کی نگرانی اور دیکھ بھال (۱۰) حکومت کی ہدایات کے مطابق دیہات کی اصلاح و ترقی کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانا (۱۱) ذرائع آبپاشی کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لئے تدابیر (۱۲) ابتدائی تعلیم۔

پنچایت کے اختیارات

پنچایتوں کو دیہاتوں کے فائدے کے لئے چھوٹے موٹے کام کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے مثلاً راستوں اور گلیوں میں روشنی کا انتظام کرنا، درخت لگوانا، جانوروں کی اچھی نسل حاصل کرنا اور ان کے لئے طبی امداد کا انتظام کرنا، کنوئیں اور تالاب کھدوانے، امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرنا اور ان کو چلانا وغیرہ وغیرہ۔

پنچایتوں کے اخراجات کے لئے زرعی مالیہ کی ایک مقررہ امداد ملا کرے گی لیکن مزید اخراجات کے لئے اگر وہ چاہیں تو ٹیکس لگا سکتی ہیں۔ یہ ٹیکس عام طور پر حسب ذیل ہوں گے۔ مکان کا ٹیکس، تفریحی ٹیکس، زیارت اور جاترا وغیرہ کا ٹیکس، کاروبار کا ٹیکس، گاڑیوں کا ٹیکس، پانی کا معاوضہ اور فیس، روشنی کی فیس، مسافر خانوں کی فیس، نالی اور پاخانے کی فیس۔

پنچایتی عدالتوں کے اختیارات کافی محدود ہیں۔ تقریباً تیسرے درجے کے مجسٹریٹ کے اختیارات ان کو حاصل ہیں، اور پچاس روپے سے زیادہ جرمانہ نہیں کر سکتیں لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی مقدمہ کسی وکیل کی معرفت پیش نہیں کیا جا سکتا اور پنچایت کے فیصلے کے خلاف کسی اور عدالت میں اپیل نہیں کی جا سکتی البتہ خاص حالات میں ضلع اور سیشن جج سے نظر ثانی کی درخواست کی جا سکتی ہے۔

صوبوں کی پنچایتیں

یو۔پی میں گیارہ لاکھ دیہاتوں کے لئے ۳۵ ہزار گاؤں پنچایتیں اور آٹھ ہزار عدالتی پنچایتیں قائم ہو چکی ہیں۔ ان پنچایتوں کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے چار سو انسپکٹر مقرر کئے گئے ہیں۔

صوبہ بہار نے اس طرف بہت بعد میں توجہ کی ہے، ابھی پچھلے سال اس نے پنچایت ایکٹ منظور کیا ہے اور ۶۸ ہزار دیہاتوں کے لئے ۱۳۷۵ پنچایتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر ابتدائی تجربوں میں کامیابی ہوئی تو پورے صوبے میں قانون نافذ کیا جائے گا۔

پنچایت ایکٹ کی رو سے ہر پنچایت سال میں دو مرتبہ منعقد ہو گی ایک خریف ختم ہونے کے بعد دوسری ربیع کے کٹنے کے بعد۔ ہر پنچایت کی ایک مجلس عاملہ بھی ہو گی جس کا مکھیا صدر کہلائے گا۔ ممبروں کی تعداد ۵ سے کر ۱۵ تک ہو گی، ان کا انتخاب تین سال کے لئے ہو گا۔ مجلس عاملہ کو حکم عدولی کی سزا میں ایک روپے سے کر سو روپے تک جرمانہ کرنے کا اختیار ہو گا۔ [illegible] کو رضاکار بھرتی کرنے کا بھی اختیار ہو گا جس میں ۱۸ سے ۳۰ سال تک کے نوجوانوں کو شرکت کرنی ہو گی۔

سی۔ پی اور برار میں ۱۹۴۵ء کے اختتام تک ایک ہزار آٹھ سو پنچایتیں کام کر رہی تھیں۔ ۱۹۴۶ء کے پنچایت ایکٹ کی رو سے پنچایتوں کے اختیارات اور منتخب کرنے والوں کی تعداد کافی محدود تھی۔ اس [illegible] ۱۹۴۶ء میں اس میں ترمیم کی گئی جس کا ۱۰ [illegible] ۱۹۴۸ء سے باقاعدہ نفاذ عمل میں آیا۔ اس کے مطابق ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، عدالتی پنچایتوں کے ممبروں کو گرام پنچایتوں کے منتخب ممبروں میں سے صوبائی حکومت نامزد کرتی ہے۔ اسی طرح اس کا صدر بھی حکومت کا نامزد ہوتا ہے اور نائب صدر کو عدالتی پنچایت کے ممبروں میں سے صدر نامزد کرتا ہے۔

اس سال کے شروع میں صوبائی اسمبلی نے حکومت کو قصبات میں بھی عدالتی پنچایتیں قائم کرنے کا اختیار دیا ہے۔ امید ہے کہ ماہ رواں کے اختتام تک سی پی اور برار کے بڑے بڑے قصبوں میں عدالتی پنچایتیں قائم ہو جائیں گی۔

مغربی بنگال میں پنچایت کے بجائے یونین بورڈ قائم ہیں جو ۱۹۱۹ء کے بنگال دیہات سلف گورنمنٹ ایکٹ کے مطابق کام کر رہے ہیں اور عملاً ان کے وہی فرائض اور اختیارات ہیں جو پنچایتوں کے ہیں۔ اس وقت مغربی بنگال کے [illegible] دیہاتوں میں ۲۲۰۰ بورڈ کام کر رہے ہیں۔ گاؤں پنچایت قائم کرنے کی اسکیم بھی اس وقت زیر غور ہے۔ تجویز یہ ہے کہ تجربے کے طور پر یونین بورڈ کے ساتھ ساتھ کچھ پنچایتیں بھی قائم کی جائیں۔

مدراس کے ۳۵ ہزار دیہاتوں میں ۲۰۰ پنچایتیں کام کر رہی ہیں۔ حکومت مدراس ہر ۵۰۰ کی آبادی پر ایک پنچایت قائم کرنے کی اسکیم پر غور کر رہی ہے۔ اور نئے گاؤں پنچایت بل کے مطابق، جو بہت جلد منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش ہونے والا ہے، ۳۰۰۰ مزید

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

زندگی نام ہی حرکت کا

ضیاء الفاروقی

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی نام ہے حرکت کا۔ سکوت ہمیں جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ مقولہ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر صادق آتا ہے۔ اگر ایک شخص حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوس ہو جائے اور تنازع للبقاء کی کشمکش سے دامن سمیٹ کر بیٹھ جائے تو کیا ہوگا۔ سوائے نامرادی اور حسرت کے سوا اس کے حصے میں کچھ نہ آئے گا۔ یہی حال جماعتوں کی زندگی کا بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بڑے انقلاب کے بعد جماعت کی زندگی میں ایک عارضی سکون اور خاموشی کا دور آتا ہے سبب یہ ہے کہ انقلاب قوم کو پچھلی صورتِ حالات سے نکال کر ایک نئی دنیا میں کھڑا کر دیتا ہے۔ قبل از انقلاب کے سارے تقاضے، سارے حالات اور پورے ماحول کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور جماعت کے سامنے نئے مسائل ہوتے ہیں۔ اس موڑ پر وہ تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے حالات کا جائزہ لیتی ہے اور اپنی ایجابی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک شاندار مستقبل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ یہ حال ان جماعتوں کا ہے جن میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں، جن کے افراد حوصلہ رکھتے ہیں، اور حالات کی دشواریوں سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔

انقلابِ فرانس کی داستان اگرچہ خون سے رنگین ہے مگر یہ امر مسلم ہے کہ یہ فرانسیسیوں کا خون ہی تھا جس نے جمہوریت کے باغ کی آبیاری کی ہے۔ اور اگرچہ ۱۷۸۹ء سے لے کر ۱۷۹۵ء تک کا دور تاریخِ فرانس کا خونی دور ہے۔ مگر اس تاریک دور میں اور پھر اس کے بعد کے دنوں میں فرانسیسی قوم نے جس زندگی کا ثبوت دیا اس کا اس کے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے۔ انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) بھی اپنے اندر فاقہ کشی، کشت و خون، ظلم و جبر اور قحط و آلام کی ایک دنیا پوشیدہ رکھتا ہے مگر یہ حالات کی اندھیاریوں میں بھی یہ انقلابی رہنماؤں کے حوصلوں اور قوتِ عمل کی روشنی تھی جس نے پوری روسی قوم کو راستہ دکھایا۔ وہ راستہ جو ایک پست اور گری ہوئی قوم کو ایک نئی تہذیب اور تمدن کی منزل پیدا کر کے کھڑا کر دیتا ہے۔

اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ انقلاب کے بعد اگر کوئی جماعت حوصلہ اور جذبۂ عمل کھو دے تو سمجھ لیجئے کہ اس نے سب کچھ کھو دیا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

آیئے اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں ہم ہندوستان کی اس جماعت کا جائزہ لیں جسے مسلمان کہتے ہیں اور جو ابھی کل تک حوصلہ کی بلندی اور ارادہ کی پختگی کے لحاظ سے کسی دوسری جماعت سے پیچھے نہ تھی جس کا ایک سیاسی پروگرام تھا اور ایک نعرہ تھا۔ (یہاں یہ بحث نہیں کہ وہ غلط تھا یا صحیح) مگر آج اس میں نہ کوئی زندگی ہے اور نہ کوئی حوصلہ۔ آخر ایسا کیوں ہوا اور اسے کہاں لے جائے گا؟

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں آزاد خیال مسلمانوں کا ایک اجتماع آزاد کانفرنس کی شکل میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ میں خوش تھا کہ کانفرنس ہندی مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مصیبت کے ان دنوں میں اجتماعیت کا یہ منظر بڑا ہی حوصلہ بخش اور امید افزا تھا۔ جمعیۃ العلماء کے رہنماؤں کی تقریریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھیں کہ

"نہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے"

کانفرنس کی تجویزوں میں مسلمانوں کو کسی غیر مذہبی سیاسی جماعت میں شمولیت کی اجازت دی گئی۔ مسلمانوں کو نئے حالات کی روشنی میں بدلنے کی ترغیب دی گئی۔ ملک کے مسائل کو قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا مشورہ دیا گیا۔ یوں سمجھئے کہ تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کا افق چمک اٹھا۔ اس کے بعد میں نے کانفرنس میں شرکت کرنے والوں سے گفتگو کی اور ان کے دلوں کو ٹٹولا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مسلمانوں کے اتنے بڑے اجتماع سے متاثر تو ضرور ہوئے مگر مطمئن نہ ہوئے۔ جو لوگ اجتماعی نفسیات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت بغیر کسی مقصد اور پروگرام کے میدانِ عمل میں گامزن نہیں ہو سکتی۔ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جو اس کے لئے اپنے اندر کشش رکھتی ہو۔ اس کانفرنس نے کوئی پروگرام نہیں دیا، کوئی نصب العین نہیں دیا، صرف یہ کہہ دینا کہ تم کسی بھی سیاسی جماعت میں شریک ہو سکتے ہو کم از کم مسلمانوں کی نفسیات اور ان کی روایات سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ مسلمان صرف ہندوستانی نہیں ہے، وہ مسلمان بھی ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا پروگرام ہونا چاہیئے جو دونوں پہلوؤں کو کچھ اس طرح سموئے کہ وہ نہ تو ہندوستان کا باغی ہو اور نہ اسلام کا۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے اور شاید اسی احساس کی کمی تھی جس نے مسلمانوں کا قومی اور اجتماعی شیرازہ ہمیشہ منتشر رکھا اور ان کے حصے میں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہ آیا۔

جمعیۃ العلماء ہند نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب سمجھتی ہے کہ وہ اپنا دامن سیاسی سرگرمیوں سے کھینچ لے اور اپنی پوری توجہ مسلمانوں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی کی اصلاح کی طرف مبذول کرے۔ مجھے جمعیۃ کے اس فیصلے سے پورا اتفاق ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس فیصلے میں لچک موجود ہے، اور ایک جماعت کا وجود خواہ وہ کسی روپ میں ہو ہمارے لئے ایک سہارا ہے۔ مگر اس فیصلے کے بعد کسی مستقل ثقافتی یا مذہبی پروگرام کا نہ ہونا مایوس کن ہے۔ اس تاریخی فیصلے کے بعد جمعیۃ کی سرگرمیاں قابلِ اطمینان نہیں۔ مجھے ان لوگوں کی نیتوں پر شبہ نہیں کیونکہ ان کا ماضی بہت شاندار اور قربانیوں سے بھرا ہوا ہے مگر جب تک کوئی ٹھوس لائحہ عمل سامنے نہ ہو مسلمانوں کے اطمینان کے لئے محض خدمات اور قربانیاں کافی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی حالت برابر گرتی جا رہی ہے، قوتِ فکر و عمل سلب ہوتی جا رہی ہے اور عوام کی اقتصادی حالت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ روٹی کی خاطر اپنا جماعتی افتخار بھی کھو دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس جماعت کی زندگی کا یہ انتہائی نازک دور ہے اور اگر اس طرف فوری توجہ نہ کی گئی تو ہمیں پچھتانا پڑے گا۔

موجودہ صورتِ حالات میں صرف جمعیۃ ہی یہ کام بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے کیونکہ اس کی راہ میں گورنمنٹ کے شکوک اور رخنہ اندازیاں حائل نہیں ہیں۔ اربابِ حکومت کے دوش بدوش انھوں نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا ہے اور قربانیاں کی ہیں۔ ان کا کیرکٹر بھی اتنا پختہ اور بلند ہے کہ وہ ہر آزمائش میں پورے اتریں گے۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی بیداری ہی مسلمانوں کے لئے پیغامِ حیات ہے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ یہ تو صرف تصویر کا ایک رخ ہے۔ یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ وہ تبدیلی جو ہمارے ملک میں تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے وہ ممکن ہے کسی حد تک ہمیں فنا ہونے سے بچالے، مگر صرف اسی پر بھروسہ کر لینا کافی نہیں ہمیں کم سے کم خاکستر کے نیچے زندہ دلی کی چنگاری کو زندہ رکھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری ثقافتی تنظیم کا کچھ نہ کچھ کام جاری رہنا چاہیئے۔ یہ کام صرف جمعیۃ کے دفاتر یا علماءِ کرام کی نشستوں اور ایسی ہی بنیادی خیالات تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اس [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

جامعہ نگر (دہلی) تاریخ اشاعت یکم، ۸، ۱۶، ۲۳

چندہ: سالانہ ۶ ششماہی ۳

ہندوستان میں پنچایت راج (بسلسلہ صفحہ ۱۰)

پنچایتیں قائم کی جانے والی ہیں۔ نئے بل کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں:-
اقلیتوں کی نشستوں کے تحفظ کا خاتمہ۔ صدر کا براہ راست انتخاب۔ ہر پنچایت میں زیادہ سے زیادہ تین عورتوں کو نامزد کرنا، پنچایتوں کی امداد کے لئے حکومت مدراس نے ایک کروڑ کی رقم منظور کی ہے۔

بمبئی کے ۲۲ ہزار دیہاتوں میں ڈیڑھ ہزار پنچایتیں ہیں اور آئندہ تین سال کے اندر اندر پانچ ہزار پنچایتیں اور قائم کرنے کی اسکیم ہے۔

غیر منقسم آسام کے ۲۲ ہزار دیہاتوں میں صرف ۲۲۰ پنچایتیں قائم ہیں۔ جو ۱۹۲۶ء کے قانون کے مطابق کام کر رہی ہیں پچھلے سال سے حکومت اس طرف خاص دھیان دے رہی ہے اور پنج سالہ اسکیم زیر غور ہے جس پر ۶ کروڑ لاگت آئے گی اس اسکیم کے مطابق ساڑھے سات پنچایتوں کے ماتحت ۴۲ دیہاتی ترقی کے مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے نیز کم از کم ۵۰ جدید قسم کے گاؤں بنانے کا بھی خیال ہے

غرض ہمیں امید ہے کہ گاندھی جی کا "رام راج" کا خواب جسے "گرام راج" بھی کہہ سکتے ہیں، آہستہ آہستہ سہی مگر حقیقت کا جامہ پہن کر رہے گا۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ رمضان المبارک کے بعد حاجیوں کے دوسرے جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے

ایس۔ ایس "مظفری"
وزن ۷۰۲۴ ٹن

بمبئی سے ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء کو روانہ ہوگا

ایس۔ ایس "محمدی"
وزن ۷۰۲۶ ٹن

بمبئی سے ۲۸ اگست ۱۹۵۰ء کو روانہ ہوگا

کرایہ جہاز (خوراک کے ساتھ)

بمبئی تا جدہ اور واپسی

درجہ اول ... ... ۱۱۰۵ روپے

عرشہ (ڈیک) ... ... ۳۹۸ "

ان کرایوں میں قرنطینہ، کامران کی فیس، حفظان صحت، جدہ کے محصول اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم ۱۰۷ روپے ۱۲ آنے ہوتی ہے۔ شامل نہیں ہے۔

عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے گھروں سے روانہ نہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کے لئے نہ لکھے اس لئے کہ امسال حاجیوں کو لے جانے والے جہازوں میں نشستیں محفوظ کی جا چکی ہیں۔

حاجیوں کو ان کے اپنے مفاد کے پیش نظر مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوالیں اور اپنے ہاں کے محکمۂ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر ان کی تصدیق کرالیں۔

کوئی رقم پیشگی اس وقت تک روانہ نہ کی جائے جب تک کمپنی اس کے بھیجنے کی درخواست نہ کرے۔

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ منیجنگ ایجنٹس

دی مغل لائن لمیٹڈ - ۱۶ - بنک اسٹریٹ

فورٹ بمبئی

آپ کی فرمائش

شرقی طرز کے زرق برق نفیس اور نایاب کپڑوں کے لئے

مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی کو یاد رکھئے

مینجنگ ایجنٹ:-

اسٹینڈرڈ ملز کمپنی لمیٹڈ
انڈین بلیچنگ، ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ
نیو جانا ملز لمیٹڈ
سورت کاٹن اسپننگ اینڈ ویونگ ملز لمیٹڈ
شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
نیو شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

کیا کیا مال تیار ہوتا ہے؟

کورا سوت اور رنگین سوت، کٹ پیس ڈنگری کپڑے، کوری اور دھلی ہوئی چادریں کورا، دھلا ہوا، رنگا ہوا، چھپا ہوا لنکلاٹ، کوری اور دھلی ہوئی دھوتیاں کورا اور دھلا ہوا کرتے قمیص کا کپڑا، دھاری دار کرتے قمیص کا کپڑا۔ کوری دھلی ہوئی ساڑھیاں، کورا دھلا ہوا زین، دھلا ہوا ٹوئل، دھلے ہوئے میز پوش، چارخانہ اور دھاری دار کپڑا، چھپا ہوا وائل وغیرہ وغیرہ

ملنے کا پتہ:- مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۲۹ - چرچ گیٹ اسٹریٹ، بمبئی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ:- جدید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ | نمبر ۸ | ۲۴ر اگست سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستان کی صحّتِ عامّہ

راج کماری امرت کور

ذیل میں راج کماری امرت کور، وزیر صحت عامہ حکومت ہند کی ایک انگریزی تقریر کا خلاصہ جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی تھی، رسالہ آج کل کے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سالہا سال میری سرگرمیاں فلاح عامہ کے کاموں سے وابستہ رہی ہیں۔ چونکہ طویل مدت مہاتما گاندھی کی خدمت میں گذارنے اور اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بیش بہا مواقع میسر آئے۔ اس طرح مجھ پر یہ حقیقت پہلے سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ واضح ہو گئی کہ ہندوستان میں خدمت خلق کا میدان بہت وسیع ہے جس طرح تپتی جھلستی دھرتی بارش کے جاں بخش چھینٹوں کی منتظر ہوتی ہے۔ اسی طرح مادر وطن اپنے بچوں کی مخلصانہ خدمت گذاری کے آب حیات کا انتظار کر رہی ہے۔

تعلیم اور صحت عامہ کے شعبوں میں قومی تعمیر کے لئے طویل اور فوری دونوں قسم کی منصوبہ بندیوں اور اُن پر عمل درآمد کے امکانات خاص طور پر بہت زیادہ ہیں۔ یہاں ہمیں ہر شعبے میں قریباً الف بے سے آغاز کرنا ہوگا، کیونکہ جب تک ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی کایا پلٹ نہ ہو جائے ہم اپنی کوششوں کو زیادہ کامیاب نہیں سمجھ سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ۸۵ فی صدی ہم وطن دیہات میں رہتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے دیہاتی زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں، اور اُن کی زندگی انتہائی مفلسی اور جہالت میں بسر ہوتی ہے۔ لیکن ہماری زندگی کا دار و مدار بہت بڑی حد تک انہی لوگوں پر ہے کیونکہ یہ ہمارے لئے خوراک پیدا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم انھیں اب تک نہ تو تعلیم دے سکے ہیں اور نہ موزوں مکانات۔ صفائی اور طبی امداد کے بارے میں وہ سہولتیں ہم پہنچا سکے ہیں جن کے یہ مستحق ہیں۔

کوئی دس سال ہوئے جب ہمارے وزیر اعظم انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے تو انھوں نے ایک منصوبہ بندی کی کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے سپرد زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تجاویز مرتب کرنے کا کام تھا تاکہ ہندوستان کے آزاد ہونے ہی یہاں کی قومی حکومت ان پر عمل درآمد شروع کر دے۔ کمیٹی تمام تجاویز مرتب کر چکی ہے۔ لیکن ہمیں آزادی بہت مہنگی پڑی۔ اس کی قیمت ہمیں اپنے ملک کی تقسیم کی صورت میں ادا کی اور اس تقسیم کے باعث ملک بھر میں ایک قیامت سی برپا ہو گئی جس کے باعث ہماری تمام سرگرمیاں خلق کے لاکھوں خانماں برباد بندوں کی امداد اور بحالی تک محدود رہی ہیں اور ہم کسی اور کام پر

کچھ قابل ذکر توجہ نہیں کر سکے۔

جہاں تک صحت عامہ کا تعلق ہے بلاشبہ ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ ایک ایسا جامع اور مستعد نظام قائم کر دیا جائے جو ہر مرد عورت اور بچے کی ضرورتوں کا کفیل ہو سکے۔ بڑے بڑے شہروں کے بسنے والے اور دور دراز دیہات کی جھونپڑیوں میں رہنے والے طبی خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کی استطاعت رکھنے والے اور غریب نادار سب کے سب اس سے یکساں مستفیض ہو سکیں۔ حفظ ماتقدم ہر صورت میں علاج سے بہتر ہوتا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ اگر رہنے کے لئے مکانوں کا ایسا انتظام ہو جائے کہ لوگوں کو تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گھس بیٹھ کر زندگی کے دن پورے کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ کوڑے کرکٹ اور گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیاں اور بدرو ئیں موجود ہوں جس سے غلاظت اور تعفن کا خاتمہ ہو جائے لوگوں کو صحت کے اصولوں کی باقاعدہ تعلیم دی جائے جس سے وہ صاف ستھرے رہنے اور مفید صحت خوراک کھانے کے گُر سے آگاہ ہو جائیں اور سب سے بڑھ کر ہر جگہ کھانے پینے کی چیزیں دودھ اور پانی کافی مقدار میں میسر آ سکیں تو بیماریاں اسی فی صدی بیماریاں خود بخود ختم ہو جائیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی پلک جھپکنے میں نہیں ہو سکتی بعض دوسرے ملکوں کی طرح ہمیں بھی اشیائے خوردنی کی قلت، بہم رسانیٔ آب کے مناسب انتظام کی قلت، تعمیری مصالحہ کی قلت، ہسپتالوں کی قلت، ڈاکٹروں اور طبی خدمات انجام دینے والوں کی قلت، ذرائع رسل و رسائل کی قلت، اور ان سب سے زیادہ روپے پیسے کی قلت کا سامنا ہے لیکن ہم نہ تو ان قلتوں سے گھبرا کر جی چھوڑ بیٹھے ہیں اور نہ یہ بات ہمارے لئے وجہ مایوسی ہے کہ ہمارے منصوبے بڑی دھیمی رفتار سے پورے کئے جا رہے ہیں۔ منزل مقصود کی طرف معمولی سے معمولی اقدام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پھر یہ بات بھی نہایت حوصلہ افزا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کو کسی چیز کی ضرورت کافی شدت سے محسوس ہو تو عام طور پر وہ اس کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں (بقیہ صفحہ ۶ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
ہندوستان کی صحت عامہ	راج کماری امرت کور	۱
سچی لگن	کشوری لال مشروالا	۲
نئی روشنی کے قدردانوں سے (اداریہ)		۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ع، ل	۵
۳- باہر کی دنیا	ع، ل	۶
آج کی رات	شمیم کرمانی	۷
نغمۂ آزاد	سیدہ نزہت	۷
ہندو مسلم تعلقات	ڈاکٹر سید محمود	۸
اصغر گونڈوی اور جدید تنقید	ڈاکٹر مسعود حسین	۹
یوپی میں پنچایت راج	ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو	۱۱

ہریجن کا ست

سچی لگن

کشوری لال مشروالا

مجھے یکم اگست لوکمانیہ تلک کی اور ۱۵ اگست مہادیو ڈیسائی کی یاد دلاتی ہے ان دونوں نے ملک و قوم کی خدمت میں اپنا دھن، من، تن سب کچھ لگا دیا۔ لوکمانیہ تلک کی موت کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا، اور اس تحریک کے ساتھ عوام نے اپنا وہ پیدائشی حق حاصل کرنے کی سرگرم جدوجہد شروع کر دی جس کے لئے لوکمانیہ برسوں سے جدوجہد کرتے آئے تھے۔ یہ تحریک منزل بمنزل بڑھتی ہوئی ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے جا ملی جس کی سب سے بڑی قربانی مہادیو بھائی کی موت کی صورت میں دی گئی اور ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ان کی موت کی تاریخ ٹھہری۔

مہادیو بھائی ۱۹۱۷ء میں گاندھی جی کے ساتھ ہوئے۔ اس سال اور بھی کئی اشخاص گاندھی جی کے ساتھ ہوئے، لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ آخر کس چیز نے انھیں گاندھی جی کے ساتھ ہونے پر مجبور کیا۔ ہم سب کے دماغوں میں ملک کی خدمت کا کوئی نہ کوئی خاکہ ضرور موجود تھا، خواہ وہ واضح ہو یا دھندلا۔

ایک بار میں نے مہادیو بھائی سے دریافت کیا کہ آخر کس چیز نے انھیں گاندھی جی کے ساتھ ہو جانے کی ترغیب دی؟ کیا وہ ہوم رول، قومی تعلیم، سودیشی اور عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہوئے ہیں یا محض مذہب اور صحافت نگاری کے لگاؤ سے گاندھی جی کے ساتھ ہوئے ہیں؟ مہادیو بھائی ڈیسائی نے اس کے جواب میں بلا تامل کہا کہ جس چیز نے ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا وہ خود گاندھی جی کی ذات ہے۔ انھیں گاندھی جی سے مل کر ایسا معلوم ہوا کہ وہ ان کے آقا ہیں جن کے لئے ان کی ساری زندگی وقف ہے۔ اس دنیا میں ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ وہ اپنی زندگی باپو کے چرنوں میں گذار دیں۔ انھیں کسی ایسی ذات کی لگن تھی جس پر وہ اپنا جسم و روح خلوص قربان کر سکیں۔ یہ ذات انھیں گاندھی جی کے روپ میں مل گئی اور انھوں نے باپو کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مہادیو بھائی ڈیسائی کیسی وفاداری اور لگن سے آخر وقت تک باپو کی خدمت کرتے رہے۔ وہ مرے بھی ان حالات میں کہ خود باپو کو ان کی کریا کرم کرنا پڑی جس کی عام طور پر ایک ہندو باپ اپنے بیٹے کے ہاتھوں توقع رکھتا ہے۔

مہادیو بھائی ڈیسائی کو گاندھی جی کی غلاظت تک دھونے سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ وہ ان کے کپڑے دھوتے۔ خطوط نقل کرتے، ان کا اسباب لاد کر لے جاتے، دوسروں کو خواہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا گاندھی جی کا پیغام پہنچاتے۔ اُن کے رسالے مرتب کرتے۔ اُن کے مضامین کا ترجمہ کرتے۔ ان کے خیالات و نظریات کی ترجمانی اور ہم رسانی کرتے۔ نازک سیاسی مسائل کے متعلق ان کی طرف سے گفت و شنید کرتے۔ غرض مہاتما گاندھی جو خدمت بھی ان کے سپرد کرتے یہ بخوشی اسے انجام دیتے اور ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لاتے کہ یہ کام تو ایسا ہے کہ گاندھی جی کو مجھ سے نہ لینا چاہئے تھا۔

جیسا کہ گاندھی جی نے خود ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کے ہریجن میں لکھا تھا "مہادیو ڈیسائی کا سب سے بڑا کردار جو میری نظر میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ موقع پڑنے پر اپنے کو صفر تک گھٹا کر لا سکتے ہیں"۔ اور باپو ان کو کس قسم کے کام سپرد کرتے تھے؟ باپو کے کہنے پر انھوں نے الہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو کے اخبار کی ایڈیٹری کی جس کے لئے انھیں جیل جانا پڑا، باردولی یوورسد میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کے سکریٹری رہے۔ بیماری کے بعد آرام کی مدت میں انھوں نے دیولالی میں ماتھر داس ترکم جی کی رفاقت کی۔ مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ لڑکوں، بوڑھوں دونوں کو ابتدائی تعلیم دی۔ ہر ممکن موضوع پر گاندھی جی کی طرف سے خط و کتابت کی۔ گاندھی جی اور ان کے ملاقاتیوں کے درمیان گفتگو کی رپورٹیں تیار کیں اور اگر ملاقاتی بطور مہمان آئے تو اُن کی تواضع بھی کی — ان کو اسٹیشن لائے یا رخصت کرنے گئے۔ مہینوں وہ واردھا سے سیواگرام تک پیدل آتے جاتے رہے۔ اپنے خلاف ان لوگوں کی شکایات پیش کیں جن کو ان کے متعلق ایک مغرور سکریٹری ہونے کی شکایت تھی۔ کیونکہ انھوں نے شکایت کرنے والے کے خط کا جواب گاندھی جی کی طرف سے نہیں بھیجا تھا، یا گاندھی جی سے ملنے والے کی ملاقات نہیں ہونے دی تھی اور گاندھی جی بھی کوئی ایسے مالک نہ تھے جو آسانی سے خوش کئے جا سکتے ان کی سختی ان لوگوں پر اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ جو ان کے پاس رہنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی ان کو رلا بھی سکتے تھے اور ہنسا بھی سکتے تھے، اور مہادیو بھائی ان باتوں سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

لیکن انسان اپنے جسم کے ساتھ کیا کر سکتا ہے جس کی صحت مندی سے خوشی اور جس سے تکلیف ہوتی ہے؟ یہی تعلق گاندھی جی اور مہادیو بھائی کا تھا جسمانی طور پر مہادیو بھائی باپو کے ہاتھ، پیر، آنکھ اور کان (بنے ہوئے) تھے، اُن میں باپو کے جذبات و دلائل کی جھلک ہوتی تھی، لیکن روحانی طور پر یہ تعلق برعکس تھا۔ مہادیو بھائی کے لئے باپو سب کچھ تھے۔ وہ باپو کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ جب انھوں نے ناامیدی اور عاجزی سے یہ سوچتے ہوئے کہ وہ باپو کی خدمت کے لائق بالکل نہیں ہیں ان کو چھوڑنے کا خیال کیا تو وہ بالکل ناکامیاب رہے۔ گاندھی جی کو چھوڑنا ان کے لئے ایسا ہی تھا جیسے کہ کوئی شخص خود اپنی کھال کھنچوا لے۔ اگر گاندھی جی کوئی ایسی بات کرنے کا اشارہ بھی کرتے جس سے ان کی صحت یا جان کو خطرہ ہوتا تو مہادیو بھائی کے لئے یہ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ اگر باپو کی جان یا صحت کے لئے کوئی خطرہ ہوتا تو پھر عقلی دلائل کا کوئی سوال نہ رہتا یہ مہادیو بھائی کے خلوص اور محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی کو برت رکھنے سے روکنے اور جنگ کے خلاف بجائے راست اقدام کے انفرادی ستیہ گرہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو لوگ مہادیو ڈیسائی کے قریب تھے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء تک لیڈروں کی گرفتاری سے پہلے وہ رات دن کس قدر بے چین رہتے تھے۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ گاندھی جی گرفتاری کی صورت میں برت شروع کر دیں حالانکہ گاندھی جی نے ان کو اور اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا تھا کہ انھوں نے اس وقت اس ارادہ کو ترک کر دیا ہے، مہادیو بھائی پر جو ذہنی بار بہت دنوں تک پڑا تھا اس سے وہ بالکل چور ہو گئے تھے اور ایک ہفتہ کے اندر وہ ایسے اچانک مرے کہ باپو باوجود قریب کے کمرے میں موجود ہونے کے بھی ان تک نہ پہنچ سکے۔

دنیا میں کسی ملک سے ایسا لگاؤ کمیاب ہے۔ دنیا میں گرو نایاب نہیں ہیں خصوصاً ہندوستان میں لیکن مہادیو ایسا چیلا بہت ہی نایاب ہے اور گاندھی جی کو جو نقصان پہنچا وہ ناقابل تلافی تھا۔ یہ بات ہر اس شخص پر واضح تھی جو ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور جس نے ان کی رہائی کے بعد ان کو برابر دیکھا تھا۔ جیسا کہ شری راج گوپال آچاریہ نے مہادیو ڈیسائی کی موت کے چار سال بعد لکھا تھا .... ہم لوگ ابھی تک اس رنج و نقصان کو نہیں بھول سکے ہیں۔ گاندھی جی کی موجودہ زندگی میں ایک ضروری ہستی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ایک عضو بیکار ہو گیا ہے ہمارا کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی چیز مہادیو کی یاد بہیں شدت سے نہ رلاتی ہو۔ وہ ایسے شخص تھے جن کی جگہ پر کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن عام حالات میں ہم کام کرنے والوں کے درمیان پڑ کر مرنے والوں کو بھول جاتے ہیں لیکن گاندھی جی کی خدمت کے ناتے مہادیو ڈیسائی کی پبلک خدمات ایسی تھیں جن کی جگہ پر نہیں کی جا سکتی"

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار نئی روشنی

دہلی

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

"نئی روشنی" کے قدردانوں سے

پچھلے پرچے میں "تکلف برطرف" کے عنوان سے ہم نے یہ اطلاع دی تھی کہ شاید مالی دقتوں کی وجہ سے اخبار کو بہت جلد بند کرنا پڑے۔ اس پر دور کے دوستوں کا ردعمل تو ابھی تک معلوم نہیں ہوا مگر قریب کے احباب نے بڑی شدومد سے اصرار کیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو اخبار کو ضرور جاری رکھا جائے۔ اگرچہ ان کے اصرار سے ہماری مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوئی پھر بھی اس خیال سے ہمت بڑھ گئی کہ کم سے کم کچھ لوگوں کو "نئی روشنی" سے اتنا انس ہو گیا ہے کہ اس کی جدائی کا تصور ان کے لئے تکلیف دہ ہے۔ ان حضرات سے یہ عرض کرنا ہے آپ اطمینان رکھئے ہم ان مشکلوں سے جو ہماری راہ میں حائل ہیں آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں اور اپنی پوری قوت سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر اس مقابلے میں آپ کی مدد کی بھی ضرورت ہے۔

سب سے بڑھ کر ہم آپ سے قلمی امداد چاہتے ہیں ہماری تجویز یہ ہے کہ اخبار کے ذہنی اور اخلاقی معیار کو نیچا کئے بغیر اسے زیادہ دلچسپ اور عام پسند بنائیں۔ آپ میں سے جو اہل قلم ہیں ان سے یہ درخواست ہے کہ عام علمی اور ادبی مسائل ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی سیاست اور معیشت سماجی زندگی کی تنقید اور اصلاح، سیاسی، مذہبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت اور تعلیم کے بارے میں مختصر مضامین، سادہ اور سلیس زبان، دل کش اور شگفتہ انداز میں خود لکھ کر یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کر کے ہمیں عنایت فرماتے رہیں۔ ترجمے کے سلسلے میں ان حضرات سے جو اردو، ہندی کے علاوہ ہندوستان کی اور زبانیں یا جرمن، فرانسیسی، اطالوی وغیرہ جانتے ہیں خاص طور پر گذارش ہے کہ "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو ان ذہنی خزانوں سے جو ان کی دسترس سے باہر ہیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، غزلیں، نظمیں اور افسانے بھی شکریے کے ساتھ قبول کئے جائیں گے جن احباب کو مضمون لکھنے کی فرصت نہ ہو وہ مسائل حاضرہ پر خطوط کی شکل میں اظہار رائے کر سکتے ہیں۔

اردو، ہندی اور انگریزی کی نئی مطبوعات میں سے بعض منتخب کتابوں پر مختصر تبصروں کی بڑی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ آپ ہماری دستگیری اس طرح کر سکتے ہیں کہ اپنے حلقہ اثر میں اخبار کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کریں۔ کم سے کم ہم کو اپنے شہر یا قصبے کے ان حضرات کے نام اور پتے ضرور بھیج دیجئے جن کے متعلق یہ خیال ہو کہ وہ نئی روشنی کو پسند کریں گے تاکہ انھیں نمونے کے پرچے بھیجے جا سکیں۔

اگر آپ میں سے کسی صاحب کا تعلق کسی صنعتی کارخانے یا تجارتی کاروبار سے ہو تو آپ سے یہ التجا ہے کہ اپنے اخبار کو اشتہار شائع کرنے کے لئے دلوائیے۔ چونکہ کئی بڑی بڑی اور مشہور و معروف کمپنیوں کے اشتہار پہلے ہی "نئی روشنی" میں شائع ہو رہے ہیں اس لئے مزید اشتہاروں کے حاصل کرنے میں غالباً کچھ زیادہ دقت نہیں ہوگی۔

غرض ہم آپ سے ہر قسم کی امکانی مدد کے لئے اپیل کرتے ہیں لیکن یہ واضح کئے دیتے ہیں کہ آپ سے اس طرح مدد کی درخواست کرنا ہمارے لئے بہت تکلیف دہ ہے یہ درخواست مجبوری سے صرف ایک مرتبہ کی جا رہی ہے۔ بار بار دہرائی نہیں جائے گی۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اگلے پرچے سے اخبار کے مضامین کی ترتیب کچھ بدل دی جائے گی اور بعض اور ترمیمیں بھی ہوں گی یعنی ہندوستانی رہنماؤں کے خیالات کے لئے پہلا صفحہ مخصوص نہیں رہے گا بلکہ اس سلسلے کے مضامین ضرورت اور مناسبت کے لحاظ سے کسی اور جگہ شائع ہوا کریں گے۔ ہم یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ اس سلسلے کو صرف بزرگان ہند تک محدود نہ رکھیں بلکہ بھی دوسرے ملکوں کے عہد قدیم اور عہد جدید کے مشاہیر کے زریں خیالات بھی نقل کیا کریں۔ "ہریجن" کے مضامین کو نقل کرنے کی پابندی اب ہم نہیں رکھیں گے اس لئے کہ اب "قومی آواز" اور دوسرے اخباروں کے ذریعے سے اردو جاننے والوں میں ان مضامین کی اشاعت ہو رہی ہے۔ البتہ جب کبھی "ہریجن" کے کسی خاص مضمون کی طرف "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو اسے اپنے ہاں دے دیا کریں گے۔ اداریے کے لئے دو کالم کی قید نہیں رہے گی بلکہ حسب ضرورت چھوٹے بڑے مضمون یا شذرات کی صورت میں لکھا جائے گا۔ بزم بے تکلف کے بارے میں بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کا خاص اہتمام نہ کیا جائے بلکہ ہلکی پھلکی دلچسپ شگفتہ گفتگو ہوا کرے۔ اب اگر اس میں بے تکلف مزاحیہ رنگ آ جائے تو کیا کہنا۔ واقعات حاضرہ پر تبصرہ تین صفحوں کے بجائے صرف دو کالم کے ایک صفحے پر ہوا کرے گا جس میں ایک کالم ہفتے ہندوستان پر ہوگا، اور دوسرا باری باری سے پاکستان اور باہر کی دنیا پر نظر کے لئے ایک پورا صفحہ وقف نہیں رہے گا بلکہ حسب ضرورت کم و بیش جگہ دی جا سکے گی۔ اس طرح جو صفحات خالی ہوں گے ان میں کئی مختصر اور دلچسپ مضمون دئے جائیں گے غرض ہم اپنی سی کوشش کریں گے کہ تماشا نہ ہا سو تیا...

بزم بے تکلف

غضب ہے کہ بھلا اس دھاندلی کا کچھ ٹھکانا ہے۔
کیسی دھاندلی، کس کی دھاندلی، کچھ بتائیے تو سہی شیخ جی؟

شیخ جی۔ تمھارے نئی روشنی والوں کی اور کس کی، بڑی مشکل سے تو اٹھوارہ اس انتظار میں کٹا تھا کہ کب اخبار آئے اور بزم بے تکلف میں سر دھرے بیٹھے اور انھوں نے کر "تکلف برطرف" لکھ مارا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

ہم۔ تو پھر اس کا کچھ تدارک کیجئے نا شیخ جی۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔

شیخ جی۔ تدارک کیا کروں دلی دور ہے، بس دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہوں۔

ہم۔ ہم بتائیں: آپ اس معاملے کو سیکورٹی کونسل میں پیش کر دیجئے۔

شیخ جی۔ کون وہ اقوام مختلفہ والی حفاظتی کونسل؟ سبحان اللہ کیا بات کہی ہے روز تو وہاں چودھری ظفر اللہ خاں پیش آیا کرتے ہیں۔ بھلا ہماری پیشی کی کیا نوبت آئے گی اور جو آئی بھی تو سوا اس کے کہ پس و پیش میں پڑ کر رہ جائیں نتیجہ کیا ہوگا؟

ہم۔ سچ ہے۔ ع
پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے
مگر یہ بتائیے کہ آپ نے تکلف برطرف کا صرف عنوان ہی پڑھا یا مضمون بھی ملاحظہ فرمایا۔

شیخ جی۔ مضمون کیا پڑھتا اس بدعنوانی کو دیکھ کر جی جل گیا اور میں نے پرچہ اٹھا کر طاق پر رکھ دیا۔ سوچا کہ جب عنوان یہ ہے تو مضمون بھی واہیات ہوگا۔

ہم۔ آپ آگے پڑھتے تو معلوم ہوتا ع نئی روشنی کا ہے یا تیل کم۔
چراغ جھلملا رہا ہے، ہوا تیز ہے۔ ڈر ہے کہیں بجھ نہ جائے۔

شیخ جی۔ خدا نہ کرے، ایسی کم ہمتی کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے، بس تھوڑا سا حوصلہ چاہیے اور تھوڑا سا استقلال۔

ہم۔ اور تھوڑا سا روغن۔ مگر شیخ جی جب آپ اس اخبار کے اتنے رسیا ہیں تو پھر کچھ مدد کیجئے نا۔

شیخ جی۔ ضرور ضرور، ع سخنے قدمے، قدمے سخنے ہر طرح حاضر ہوں۔

ہم۔ کیا کہنا ہے، دامے، درمے کو اس صفائی سے کھا گئے۔ آپ کی سخن سازی اور قدم بازی میں جو شبہہ کرے وہ کافر مگر کچھ تیل کی بات چیت بھی تو کیجئے۔

شیخ جی۔ ارے بھائی تم جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھتے نہیں یہاں کی کھیتی ماری گئی۔ تیل کس کے گھر سے لاؤں؟

ہم۔ تو یوں کہئے کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں۔ پھر نئی روشنی کو صبر کر لیا جائے؟

شیخ جی۔ میاں صاحب زادے ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، نئی روشنی کا گل ہونا کچھ ہنسی کھیل ہے۔ مگر ان خوشامدیوں کو کہیں بزم بے تکلف کا چراغ بجھ جائے تو
ع۔ محفل۔ اہل بصیرت... ہو جائے۔

پچھلا ہفتہ:-

۱- ہندوستان

بات بنتے بنتے بگڑ گئی

جب سے کشمیر کمیشن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان یہ جھگڑا چکانے میں کامیابی ہوئی کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو التوائے جنگ کے وقت دونوں فوجوں کے درمیان کون سے خطوط حد فاصل تھے، اس وقت سے کمیشن کے اور عام طور پر سب صلح پسندوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور یہ امید قوی ہو گئی تھی کہ بہت جلد عارضی صلح کی شرطیں طے ہو جائیں گی۔ اس طرح دائمی صلح کے لئے زمین ہموار ہو جائے گی۔ برابر خبریں آ رہی تھیں کہ کمیشن کے ممبر اور ہندو پاکستان کے نمائندے نئی دہلی میں جمع ہو کر ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ کانفرنس کا ایجنڈا دونوں حکومتوں کے علم میں آ چکا ہے، اور انھوں نے منظور کر لیا ہے۔ فضا بہت خوش گوار اور ساز گار ہے۔ کمیشن کے ممبروں کو یقین ہے کہ کوئی معقول تصفیہ ہو جائے گا۔ امریکا کے ایڈمرل چیسٹر نمٹز ثالث بننے کے لئے پابہ رکاب بیٹھے ہیں تاکہ رائے شماری کی تیاریاں کریں۔ آخر کانفرنس کے شروع ہونے کی تاریخ بھی قطعی طور پر ۲۲ اگست مقرر ہو گئی۔ دونوں طرف کے ڈیلی گیٹوں کے نام غیر سرکاری طور پر اخباروں میں آ گئے۔ نئی دہلی میں اجلاس کے سب انتظامات مکمل ہو گئے۔ یکایک صفحۂ اخبار پر کیا ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کا خیال ترک کر دیا گیا اور اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایجنڈا کے بارے میں دونوں حکومتوں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔

اس ٹائمیں ٹائیں فش کے معمے پر غور کرتے ہیں تو اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یا تو فضا خوش گوار ہونے کی محض مصلحت کی بنا پر ہوا باندھی جا رہی تھی یا پھر دفعتاً کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ زیادہ قرین قیاس دوسری صورت معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کی بیرونی پالیسی آج کل برسات کے موسم کی طرح نت نیا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ آج یہ بتانا کہ کل اس کا کیا رنگ ہوگا خود کراچی کے محکمہ خارجہ کے امکان سے باہر ہے۔ غالباً حکومت پاکستان آج کل اقوام متحدہ سے اور خصوصاً انگلستان اور امریکہ سے بہت ناراض ہے اور اس ناراضگی کے اظہار کی ایسی صورتیں تلاش کرتی رہتی ہے جس سے یہ دونوں ملک متاثر ہوں مگر یہ نہ ہو کہ پاکستان سے ناراض ہو جائیں۔ شاید گول میز کانفرنس کے بارے میں اس کی موجودہ پالیسی بھی خفگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ بہر حال اب یہ دیکھنا ہے کہ کشمیر کمیشن اس گتھی کو سلجھانے کی کون سی نئی تدبیر اختیار کرتا ہے۔

آر، ایس، ایس کا نیا ٹھاٹھ

شری گوالکر قید سے رہا ہونے کے بعد پہلی بار دہلی آئے ہیں اور ان کے پیرو دل کی طرف سے ان کا شاندار استقبال ہو رہا ہے۔ ابھی تک وہ اپنی تقریروں میں سیاسی بحثوں سے پرہیز کر رہے ہیں اور "ہندو قوم" کی اصلاح و تنظیم اور تعمیر سیرت پر زور دے رہے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ غلہ پیدا کرنے کی مہم میں حکومت کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں۔ مبصروں کا اندازہ ہے کہ در اصل وہ آئندہ انتخابات میں آر، ایس، ایس کو جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے زمین تیار کر رہے ہیں۔ ابھی وہ ہندوستان کا دورہ کر کے یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں کہ جمہور کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے آج کل کون سا نعرہ سب سے زیادہ کام دے گا۔ شاید مسلمانوں کی طرف انھیں اب زیادہ توجہ نہیں رہی، کچھ تو اس وجہ سے کہ مسلمان اب صیدِ زبوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور کچھ اس لئے کہ اب ایک اور حریف پیدا ہو گیا ہے جو ان کے طبقے کے مفاد کے لئے مسلمانوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے یعنی کمیونسٹ۔ یہ خبر بہت گرم ہے کہ انھوں نے حکومت کے ساتھ مل کر کمیونسٹوں کو کچلنے کی پیش کش کی ہے۔ یہ تو کچھ ایسی دور از قیاس بات نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اس پیش کش کو منظور کر لیا ہے۔ یہ افواہ کتنی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو لیکن آر، ایس، ایس اور کمیونسٹ پارٹی

دونوں کا اس چپقلش میں فائدہ ہی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے دونوں کی مقبولیت اپنے اپنے حلقے میں بڑھ سکتی ہے۔

اتحاد مشرق کی ایک نئی کڑی

۱۹۴۷ء میں جبکہ ہندوستان آزاد قوموں کی صف میں قدم رکھنے والا تھا اس نے مشرقی ملکوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی تھی۔ ایشیائی کانفرنس کا اجلاس جو فروری ۱۹۴۹ء میں نئی دہلی میں ہوا دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا موقع تھا جب تقریباً کل مشرقی ملکوں کے نمائندے اتحادِ مشرق کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ لیکن اس کانفرنس میں زیادہ تر تجارتی صنعتی اور عام طور پر اقتصادی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے مسئلہ پر بحث ہوئی تھی۔ علم و تعلیم، تہذیب و تمدن کے میدان میں مل جل کر کام کرنے اور آپس میں ربط و ضبط بڑھانے کے مسئلے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان کے اہل علم نے مولانا آزاد کی سرکردگی میں عملی قدم اٹھایا ہے۔ ۲۱ اگست کو مولانا کی دعوت پر تقریباً سو سے زیادہ حضرات جن میں ایشیائی ملکوں کے سفیروں کے علاوہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ، دہلی یونیورسٹی، جمعیتہ العلماء اور جامعہ ملیہ کے نمائندے اور دوسرے ارباب علم شامل تھے، کونسل آف اسٹیٹ کے ہال میں جمع ہوئے تاکہ انڈین کونسل آف کلچرل کوآپریشن (تہذیبی تعاون کی ہندوستانی مجلس) کے نام سے ایک انجمن کی بنا ڈالیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں انجمن کے مقاصد کا ایک خاکہ پیش کیا۔ مصر، ایران، سرا اسلامیہ انڈونیشیا اور چین کے سفیروں اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ نے ان مقاصد کی حمایت میں تقریریں کیں اور ان کو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائیں۔ آخر میں خواجہ عبد المجید صاحب اور ہمایوں کبیر صاحب نے دو رزولیوشن پیش کئے جو بہ اتفاق رائے منظور کئے گئے، ان کی رو سے انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے دستور مرتب کرنے کے لئے پندرہ اصحاب کی ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جو وسط اکتوبر تک اپنی رپورٹ تیار کر لے گی۔ آخر اکتوبر میں ایک اور کانفرنس ہوگی جس میں یہ دستور منظور کیا جائے گا اور نومبر میں اس کے ماتحت قائم کی ہوئی انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن مشرق کے ملکوں میں ذہنی اور روحانی اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی جس کے بغیر سیاسی اور اقتصادی اتحاد محض ایک بیکار بے جان ثابت ہوگا۔

قرعۂ فال.......

پناہ گزینوں کو جو مصیبتیں ہندوستان اور پاکستان میں اٹھانی پڑ رہی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جو لوگ اب تک کیمپوں میں رہتے ہیں ان کے بچوں کے لئے تعلیم کا کافی اور معقول انتظام نہیں ہے۔ ہندوستان کی حکومت ایک مدت سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور وزارت تعلیم اور وزارت بحالی میں خط و کتابت اور رد و قدح ہو رہی تھی لیکن اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ آخرکار اب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تجویز سوچی کہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کا کام ہندوستانی تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک کانفرنس ہوئی جس میں وزارتوں کے تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کے نمائندے شریک تھے اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شرنارتھی بچوں کو بنیادی تعلیم کے اصولوں پر پڑھایا جائے اور ان کی تعلیم کا سارا انتظام تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کی مدد سے انجام دے۔ تعلیمی سنگھ نے ستمبر میں بنیادی تعلیم کے کارکنوں کی ایک کانفرنس بلائی ہے تاکہ سارے ہندوستان کے شرنارتھی بچوں کی پڑھائی کے لئے ایک جامع اسکیم بنائی جائے، اور اسی کے ساتھ یہ طے کیا ہے کہ تجربے کے طور پر راجپورہ کیمپ کی تعلیم کا کام شری متی آشا دیوی سکریٹری تعلیمی سنگھ کی نگرانی میں اور فرید آباد کیمپ کی تعلیم کا انتظام شفیق الرحمن صاحب قدوائی ناظم تعلیم و ترقی (جامعہ ملیہ) کی نگرانی میں جلد سے جلد شروع کر دیا جائے۔

ان دونوں تعلیمی اداروں کے لئے یہ بڑے امتحان کا وقت ہے اگر یہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کے مسئلے کو جس نے دو برس سے حکومت کو پریشان کر رکھا ہے حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کچھ امید پیدا ہو جائے گی کہ ہندوستان کی عام ابتدائی تعلیم کا ہفت خواں بھی جو آج ناقابل تسخیر معلوم ہوتا ہے ایک نہ ایک دن سر ہو جائے گا۔

(ع، ح)

۲- پاکستان

آزادی کے دو سال

پاکستان کا معرض وجود میں آنا ہر ایک کارنامہ ہے۔ تو معرض وجود میں آنے کے بعد اس کا پیہم صدمات کو جان بر ہو جانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ بے شک مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ ابھی تک خوش اسلوبی سے طے نہیں ہوا لیکن اس دوسرے سال میں اس قدر وجہ پریشانی نہیں رہا جتنا کہ پہلے سال میں تھا اب مہاجرین کسی حد تک اپنے اپنے ٹھکانوں پر بیٹھ گئے ہیں، اور اگر ملک میں روزگار نکل جائیں کارخانے چلنے لگیں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں شروع ہو جائیں بونے اور جوتنے کے لئے اور زمینیں نکل آئیں تو جہاں مقامی آبادی کو روزی کمانے اور پیٹ پالنے کے وسائل حاصل ہو جائیں گے وہاں مہاجرین بھی کسب معاش کرنے کے قابل ہو سکیں گے، اور اس وقت بیکاری اور ناداری کی جو عام شکایت سنی جاتی ہے، اور بھکاریوں میں روز افزوں جو اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اس کا سدباب ہو جائے گا۔

اب ضرورت ہے اسے (پاکستان) مضبوط اور اس میں بسنے والوں کے لئے اس کو بلند اور نفع رساں بنانے کی اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نظم و نسق بہتر ہو۔ راعی اور رعایا کے تعلقات خوشگوار ہوں۔ حکومت محض حاکموں کے فائدے کے لئے نہ ہو بلکہ اس سے مقصود عوام کا بھلا اور ان کی خدمت ہو، لوگ خوش حال ہوں، ایک طرف حد سے زیادہ غریبی اور دوسری طرف حد سے زیادہ امیری نہ ہو سب کے لئے کام اور روزگار ہوں اور دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہو، کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے اور جس طرح ملک سب کا ہے اسی طرح حکومت بھی سب کی ہو۔ آزادی کے اس تیسرے سال میں ہمیں ان مقاصد کو حاصل کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کی صنعتی تعمیر کی طرف توجہ کی جائے ہمارے ہاں خدا کے فضل سے خام اجناس کی جو افراط ہے اُن سے ملک کے اندر کام لینے کی کوشش ہو۔ ہمارا جو زرعی نظام ہے اس کی اصلاح کی جائے اور آل پاکستان مسلم لیگ نے زرعی اصلاحات کے سلسلے میں جو سفارشیں کی ہیں ان کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔

(آفاق، لاہور)

کراچی کا حادثہ

ابھی حال میں پاکستانی دارالسلطنت میں ہندوستان کے یوم آزادی کے موقع پر محض ہندوستانی جھنڈا لہرانے پر کراچی کے کچھ شہریوں اور ہندوستانی ہائی کمشنر کے اسٹاف کے درمیان جو جھگڑا ہوا اور اس کی وجہ سے گولی چلانی پڑی اس پر ہر شخص کو افسوس ہوگا سیاسی آداب و رسوم جو بھی ہوں۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ اگر متعلقین کی طرف سے ذرا بھی موقع شناسی سے کام لیا جاتا تو یہ افسوس ناک حادثہ پیش نہ آتا۔ جہاں تک ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ کا تعلق ہے ہمیں یقین ہے کہ مرکزی حکومت اس سلسلے میں ضروری کارروائی عمل میں لائے گی۔ لیکن مقامی حکومت کی کوئی شخص مذمت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ گولی چلائے بغیر ہندوستانی ہائی کمشنر کے اسٹاف کی حفاظت نہیں کر سکی اور نہ مقامی افسروں اور عوامی لیڈروں کو بری الذمہ کیا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم کی مدد حاصل کئے بغیر وہ اس چھوٹے سے حادثے کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

(پاکستان ٹائمز، لاہور)

بلدیات کے انتخاب

صوبہ مسلم لیگ کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ بلدیات کے انتخابات میں مسلم لیگ حصہ لے گی۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات میں اب تک مسلم لیگ نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ فیصلہ پر پہنچنے سے پیشتر اس قرارداد پر کافی لے دے ہوئی۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

"میاں عبدالباری نے بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ قائم کی ہوئی ہے، وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ اسمبلی کے انتخابات میں بھی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ قوم کو ان لیڈروں پر اعتماد نہیں رہا۔ صرف بد دیانت کارکنوں کے خلاف تحقیقات سے لیگ کا وقار بحال ہو سکتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ لیگ کونسل میں بھی ایسی ممبران ہیں جن کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگوں کو لیگ کے لیڈروں پر اعتماد نہیں رہا۔ اور کونسل کی اکثریت یہ بات سمجھتی ہے کہ لیگ نے گورنر موڈی کے بارے میں جو قدم اٹھایا تھا وہ غلط تھا۔ اگرچہ لیگ کونسل کی اجتماعی حیثیت سے نیت کچھ اور ہی کیونکہ تھی لیکن عوام نے یہ سمجھا کہ صوبہ لیگ چند روں کی ٹولی کی حمایت پر اتر آئی ہے اور اس سے لیگ کا وقار ختم ہو گیا۔ بہرصورت اب پھر بد دیانت کارکنوں کی تحقیقات میں لیگ قدم اٹھائے تو اسے مقبول ہوتے دیر نہ لگے گی۔ آخر مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے الواحد جماعت ہے جس نے پاکستان حاصل کیا اور یہ توقع ہے کہ اگر ڈسٹرکٹ بورڈوں میں اس نے صحیح قسم کے نمائندے بھیجنا گوارا کئے تو یقیناً لیگ کونسل کا یہ فیصلہ بھی مستحسن قرار دیا جائے گا۔

(مغربی پاکستان، لاہور)

اجتماعی زراعت

پاک پنجاب کی حکومت نے لائل پور منٹگمری، ملتان، میانوالی اور شاہ پور کے دو سو مواضعات میں امداد باہمی کے اصول پر اجتماعی کاشت کا تجربہ شروع کیا ہے اس طرح دو لاکھ چھبیس ہزار ایکڑ سرکاری زمین زیر کاشت آگئی۔ ہر گاؤں میں امداد باہمی کی ایک سوسائٹی قائم کر دی گئی ہے۔ کل دو سو سوسائٹیاں ہیں جن میں گیارہ ہزار ایک سو ساٹھ مزارعین کے خاندان شریک ہیں ان میں سے آٹھ ہزار دو سو دس خاندان مہاجرین کے ہیں۔ زیر کاشت زمین میں اگرچہ آب پاشی کا رقبہ صرف ۲۷ فی صد ہے پھر بھی نتیجہ بہت ہی امید افزا رہا۔ پیداوار میں پچاس فی صد اضافہ ہوا۔

فی الحال یہ اجتماعی زراعت جزوی طور پر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ تخم ریزی آبپاشی اور فصل کی تیاری تو اجتماعی طور پر کی گئی ہے۔ لیکن ہر کاشتکار اپنے رقبے کی فصل کا پوری طرح مالک ہے البتہ جہاں زمین ناہموار اور ریتلی ہے وہاں کاشتکاری اجتماعی طور پر کی جا رہی ہے اور اس طرح وہ زمین جو اب تک بنجر تھی اور جس میں صرف خاردار جھاڑیاں اُگتی تھیں وہاں اب لہلہاتی ہوئی فصلیں ہیں۔ اس زمین میں حکومت ایک تہائی کی مالک ہے اور پیداوار کا چھٹا حصہ رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اسکولوں، ہسپتالوں، سڑکوں، روشنی اور مشینوں کی خریداری وغیرہ کا اس سے انتظام کیا جائے گا اور بقیہ نصف پیداوار سوسائٹی کے ممبروں پر تقسیم کر دی جائے گی۔

برکوچک پاکستان و ہند کی تاریخ میں اجتماعی زراعت کا یہ پہلا تجربہ ہے اور ہر طرح کامیاب ہے۔ امید ہے کہ پاک پنجاب کی حکومت اجتماعی زراعت کا دائرہ روز بروز وسیع کرتی جائے گی۔ یہ امر بہت خوش آئند ہے کہ اس نئے تجربے کے لئے زیادہ تر وہ زمینیں منتخب کی گئی ہیں جن میں مہاجرین آباد ہیں۔

حکومت نے ایک اور اچھا اقدام یہ کیا کہ بنجر زمین کو اجتماعی طریقے پر زیر کاشت لائی۔ اس طرح پاک پنجاب میں اس وقت دو تجربے ہو رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کاشتکاروں کا ان کی موروثی زمینوں پر مالکانہ حق تسلیم کر کے اجتماعی کاشت کا انتظام کرنا اور دوسرا سرکاری زمینوں میں کامل اجتماعیت کے ساتھ کاشت کرنا گویا زمینوں کو قومی بنانے اور افراد کی ملکیت تسلیم کرنے کے دونوں اصول بیک وقت کارفرما ہیں۔ اس طرح دونوں طریقوں کی افادیت مستقبل قریب میں نمایاں ہو جانے کی توقع ہے اور یوں مزارعین پر عملاً ثابت ہو جائے گا کہ ان کے حق میں کامل اجتماعیت مفید ہے یا جزوی۔

(ڈان اردو، کراچی)

۳- باہر کی دنیا

جرمن قومیت زندہ ہو رہی ہے

مغربی جرمن ریپبلک کے ایوان زیریں کے حالیہ انتخاب سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ جرمن قوم میں ہٹلر نے قومی برتری کا جو احساس پیدا کیا تھا وہ اب بھی اس کے دل و دماغ میں اسی طرح جاگزیں ہے۔ جمہوری قومیں ہٹلر کی شکست سے اب تک برابر جرمن قوم کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں کہ شکست اور موجودہ مصیبت کی تمام تر ذمہ داری ہٹلر پر ہے۔ مگر انھیں اپنی اس کوشش میں ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ انتخابی تقریروں میں نہ صرف یہ کہ اتحادیوں نے جرمن قوم پر جو لاکھوں ڈالر بطور امداد روپیے صرف کئے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ تمام پارٹیوں نے انھیں برا بھلا کہا اور موجودہ بڑھتی ہوئی بے کاری کا انھیں ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس انتخاب سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مغربی جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کا تھوڑا بہت جو اثر تھا وہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے صوبجاتی الکشن میں اسے ہر دس ووٹ میں سے ایک ووٹ ملا تھا۔ مگر اس مرتبہ ہر انیس ووٹ میں سے ایک ووٹ ملا اور کل ۱۹ نشستیں ملی ہیں۔

اس انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ کرسچین ڈیموکریٹس کو ملے ہیں جو آزاد تجارت کے حامی ہیں اور سماجی سیاسی اور معاشی مسائل کو مسیحی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری بڑی پارٹی سوشل ڈیموکریٹس کی ہے۔ پہلی پارٹی کو ۴۰۲ نشستوں میں سے ۱۳۹ ملی ہیں اور دوسری کو ۱۳۱۔

ان کے علاوہ دوسری اہم پارٹیوں کی پوزیشن حسب ذیل ہے:

فری ڈیموکریٹس (لبرل)	۵۲	نشستیں
بویرین پارٹی	۱۷	"
سنٹر پارٹی	۱۰	"
اکنامک ری کنسٹرکشن پارٹی	۱۲	نشستیں
جرمن پارٹی	۱۷	"
جرمن رائٹ پارٹی	۵	"
ساؤتھ شلیسوگ ایسوسی ایشن	۱	نشست
آزاد	۳	نشستیں

سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ کرسچین ڈیموکریٹس اور فری ڈیموکریٹس، داہنے بازو کی کسی ایک اور پارٹی کو ملا کر حکومت بنائیں گے اور کرسچین ڈیموکریٹس کے لیڈر ڈاکٹر اڈینار جنھیں برطانوی فوجی حکومت نے ۱۹۴۵ء میں سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا تھا، مغربی جرمن ریپبلک کے پہلے چانسلر مقرر ہوں گے۔

یورپ کی کونسل

یورپ کا اتحاد بہت پرانا خواب ہے جسے بارہا عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ مگر صحیح معنی میں کبھی بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کے لئے یورپ کے اتحاد کی طرف پھر توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ یورپ کی کونسل قائم کی گئی ہے جس کے آج کل یورپ کے وسط میں رائن کے ایک قدیم شہر اسٹراس برگ میں اجلاس ہو رہے ہیں۔ اس اسمبلی کے دو ایوان ہیں ایک ایوان اعلیٰ جسے وزیروں کی کمیٹی کہا جاتا ہے، اور جو ممبر ملکوں کی حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے گا۔ دوسرے ایوان زیریں جسے مشاورتی اسمبلی کہتے ہیں اور جس میں ممبر ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔

اسمبلی میں اس وقت دس ملک شریک ہیں۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، آئرلینڈ، ناروے اور لکسمبرگ۔ ترکی کو ابھی حال میں اس کا ممبر چنا گیا ہے اور مغربی جرمنی پرتگال، آسٹریلیا، آئس لینڈ اور یونان کے داخلے ابھی زیر غور ہیں۔

یورپ کے اتحاد کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوگی۔ اس کے متعلق فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن حالات بہر حال سازگار نہیں ہیں۔ یہ یقین ہے کہ مشرقی یورپ اس میں شریک نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کونسل سے زیادہ سے زیادہ جو فائدہ نکل سکتا ہے، تو وہ یہ کہ کمیونسٹوں کے خلاف ایک مضبوط جتھا قائم ہو جائے گا جس طرح کمیونسٹ افرات کی روک تھام کے لئے اور لڑائی کی صورت میں روس کے خلاف موثر کارروائی کرنے کے لئے بعض علاقہ وار جماعتیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً اٹلانٹک پیکٹ اور بحر الکاہل کی یونین وغیرہ، اسی طرح یہ کونسل بھی کمیونسٹوں اور روس کے خلاف مغربی یورپ کے لئے ایک مؤثر بلاک کا کام دے گی اور غالباً اس کے قائم کرنے والوں کا اس سے زیادہ کوئی اور مقصد نہیں ہے۔

شام کا انقلاب

شام میں ابھی چند روز ہوئے جو انقلاب ہوا ہے اس میں قومی اور بین اقوامی دونوں سیاستیں کام کر رہی تھیں۔ کرنل حسنی زعیم جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے حالات کا اندازہ کئے بغیر ایک ساتھ بہت سی اصلاحات کرنی چاہیں۔ مثلاً سرمایہ داری پر بھاری ٹیکس عاید کئے۔ بڑے بڑے زمینداروں پر پابندیاں لگائیں اور سماجی اصلاحات خاص طور پر عورتوں کی آزادی کے لئے سخت قوانین بنائے اور ان اصلاحات کے نفاذ میں قوم کا مزاج دیکھے بغیر انتہائی سختی سے کام لیا چنانچہ وہ اپنی انھی خصوصیات کی وجہ سے "شامی تاترک" مشہور تھے۔ اس کے علاوہ فوج میں بھی اس سخت گیر پالسی پر عمل کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور فوج دونوں ان کے خلاف ہو گئے۔ اس عام بیزاری سے فائدہ اٹھا کر ایک فوجی افسر نے کرنل زعیم اور وزیر اعظم کو گرفتار کر کے موت کی سزا دلا دی۔

بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اس انقلاب میں برطانیہ کا بھی ہاتھ ہے۔ کرنل زعیم کی خارجی پالسی برطانیہ کے مفاد سے ٹکراتی تھی۔ اس لئے اس حکومت کو ختم کرنا مشرق وسطیٰ کی آیندہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے وہ ضروری سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ عراق اور شرق اردن کے حکمران بھی کرنل زعیم کی حکومت سے مطمئن نہیں تھے اور ان کے ارادوں کو شک اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غرض اندرونی اور بیرونی بہت سے م

ہندوستان کی حقیقت عامہ

(بسلسلہ صفحہ ۱)

ملتا ہے اور آخرکار اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ حال سب سے پہلا کام بیحد دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے، اور مختلف مسائل کی چھان بین نیز انھیں حاصل کرنے کے لئے صحیح قدم اٹھانے میں بڑی مسرت ہوتی ہے۔

مہاتما جی کی ساری زندگی نوع انسان کی خدمت کے لئے وقف رہی جب کبھی انھیں اس عقیدے کی حقیقت و صداقت کا احساس ہوا کہ انسان کی زندگی کا مدار محض خورد و نوش پر نہیں ہے وہ پورے انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ پھر چونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک سماج کی بنیادیں صداقت اور عدم تشدد پر استوار نہ کی جائیں زندگی کا قیام ناممکن ہے۔ اس لئے ان کی زندگی کا واحد مقصد یہ بن گیا کہ ہر قسم اور نوعیت کے تشدد سے جنگ کی جائے اور اپنے گرد و پیش سے باطل کی تاریکی کو یکسر مٹا دیا جائے، ہم میں سے جن لوگوں کا اس نسل سے تعلق ہے جسے مہاتما جی کے چرنوں میں علم و آگہی حاصل کرنے کا خداداد موقع ملا، ان کے لئے اعلیٰ عہدے سے حاصل ہونے والے مرتبہ منزلت اور اختیارات کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور انھیں اپنے فرائض بیش از بیش تندہی اور خلوص سے انجام دینے چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ احساس عمر بھر میرا ساتھ دے گا۔ یہ کہ آزادی حاصل کر لینا بہت بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی بڑی چیز یہ ہے کہ ہم اس آزادی کے ابتدائی سالوں میں پوری تندہی اور خلوص نیت سے کام کریں۔ تاکہ ہندوستان کو ایک ایسا ملک بنا سکیں جو مہاتما جی کے محبوب اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس پریشان حال دنیا کو امن کی شاہراہ پر گامزن کر دے۔

م سیاسی اسباب اس انقلاب کے محرک ہوئے اور دیکھتے دیکھتے کرنل زعیم کی چار ماہی آمریت ختم ہو گئی

(ع۔ ل)

آج کی رات

شمیم کرہانی

(۳۰ جولائی ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے عید کے موقع پر نشر ہوئی)

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو!

دور ہوتا نہیں احساس کے ماتھے سے غبار
زیست کے رُخ پہ ریاضت کا دھواں ہے کب سے
پاس آتی نہیں ہستوں کی گلابی منزل
قافلہ زہر کی وادی میں رواں ہے کب سے
تشنگی، نقطۂ تاریک ہے، دوری کے سبب
ایسی اک راہ میں عمر گزراں ہے کب سے

راہ کی گرد کو اب غازۂ افشاں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

زندگی وقت کی ظلمت سے ہم آغوش سہی
ہے فضاؤں میں تبسم کا اثر آج کی رات
نور کا جال اندھیرے میں بکھرے جاتا ہے
ابر کی تہہ سے اُبھرتا ہوا فانوس حیات
غم کے پھیلے ہوئے سایے کو سرکنا ہوگا
چاند نکلا ہے لئے ساتھ میں تاروں کی برات

غم دوراں کو نثارِ رہ جاناں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

کس قدر بیش بہا ہے وہ خوشی کا لمحہ
بچ گیا ہے جو زمانے کے غم پیہم سے
اک کرن کانپتی مٹھی میں جو کر لی ہے اسیر
ہوتی جاتی ہے وہ ہر آن گریزاں ہم سے
دل میں سہمے ہوئے احساسِ مسرت کو لئے
سوئے ساقی نگراں، رند ہیں چشم نم سے

ساتھیو! مشعلِ مینا کو فروزاں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

نغمۂ آزاد

سیدہ فرحت

حسن کے ذوق سے عاری نہیں فطرت میری
ہر حسیں چیز کو حاصل ہے محبت میری
شعر و نغمہ سے ہے مانوس طبیعت میری
بزم تخئیل کو اکثر ہے سجایا میں نے
لطف رنگین جسیں خوابوں میں پایا میں نے

جاگ اُٹھے ہیں مگر اب مرے ادراک و شعور
اب نہیں میری نگاہوں سے حقیقت مستور
قلب ہستی میں جو رستے ہیں ہزاروں ناسور
دیکھ کر ان کو پلٹ آئے نظر ناممکن
ہو غم و درد کا دل پر نہ اثر ناممکن

گیت کی لے میں کراہوں کو دباؤں کیسے
خوشنما پردوں میں زخموں کو چھپاؤں کیسے
بزم ماتم میں بھلا جشن مناؤں کیسے
موسم گل نہیں کہہ سکتا خزاں کو کوئی
روک سکتا نہیں بلبل کی فغاں کو کوئی

پیٹ کی آگ جھلستی ہے غریبوں کے بدن
آتشِ ظلم کی ہوں نذر ہزاروں خرمن
تابشِ حسن ہو لیکن مرا موضوعِ سخن
میرا احساس نہ دے گا یہ اجازت ہرگز
کر سکے گی نہ یہ منظور طبیعت ہرگز

شاعرہ ہوں مرا دل درد سے محروم نہیں
رگِ احساس مرے قلب سے معدوم نہیں
فکر آزاد ہے فطرت مری محکوم نہیں
آنکھ جو دیکھے گی آئے گا زباں پر وہ ضرور
اپنے جذبات کی توہین نہ ہوگی منظور

بند کر سکتا نہیں کوئی بھی شاعر کی زباں
کیسے ممکن ہے لگے آگ اور اُٹھے نہ دھواں
چور زخموں سے ہو دل اور لہو ہو نہ رواں
گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
آنکھ نمناک نہ ہو لب پہ بھی فریاد نہ ہو

چوس لیں خون غریبوں کا یہ دولت والے
پیس دیں چٹکی سے کمزور کو طاقت والے
ظلم کرتے رہیں جنتا پہ حکومت والے
قلبِ شاعر ہو فگار اور وہ خاموش رہے
اپنے خوابوں کی حسیں وادی میں روپوش رہے

ساتھیو! نغمۂ آزاد سنانے اُٹھو
انقلابات کے طوفان اُٹھانے اُٹھو
زور سرمایہ پرستی کا گھٹانے اُٹھو
ہو کے بے خوف سناؤ وہ دہکتے نغمے
جن سے لَو دینے لگیں سرد دلوں میں شعلے

اب ہر انسان کو دکھ درد سے آزاد کرو
آج تک جو رہے ناشاد انھیں شاد کرو
نئے انداز سے دنیا نئی آباد کرو
کر دو ہر سمت مساوات کا اونچا پرچم
سر نہ انسان کا انساں کے آگے ہو خم

چند پھولوں ہی پہ موقوف نہ ہو شانِ بہار
بات تو جب ہے خس و خار پہ آ جائے نکھار
کہیں باقی نہ رہیں دورِ خزاں کے آثار
فرض ہے پہلے تو تزئینِ گلستاں کرنا
بلبلِ فکر کو پھر اپنی غزل خواں کرنا

ہندو مسلم تعلقات

انیسویں صدی اور اس کے بعد

ڈاکٹر سید محمود

ترجمہ۔ مشتاق احمد (۴)

مسٹر آرچی بالڈ پرنسپل مقرر ہوئے ... مسٹر ماریسن مسٹر بک کے قائم مقام مقرر ہوئے اور انھوں نے بڑی ہی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کو ہر قسم کی سیاسی تحریک سے الگ رکھا۔ انھی کے قرار کے زمانے میں لارڈ کرزن کے اشارے سے اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کی توجہ کو ہندوستان سے ہٹا کر کسی اور طرف مبذول کرا دیا جائے۔ دوسرے ممالک مثلاً ایران وغیرہ میں گرگے روانہ کئے گئے تاکہ وہاں کے دولت مند نوجوانوں کو ورغلا کر علی گڑھ لانے پر آمادہ کریں۔

اس کے بعد مسٹر آرچی بالڈ پرنسپل مقرر ہوئے انھوں نے بھی اپنی ملازمت کے دوران (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء) میں مسلمانوں کی سیاست میں نہایت اہم حصہ لیا جس وقت وہ علی گڑھ تشریف لائے ملک میں لارڈ کرزن کے خلاف سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت اعتدال پسندوں اور جی حضوریوں کو اپنے گرد اکٹھا کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کونسل میں توسیع کی جو تجویز تھی اسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ حکومت ہند اور مسلمان لیڈروں کے درمیان مسٹر آرچی بالڈ واسطہ بنے۔ وہ شملہ میں وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری سے ملے اور ان سے طے کیا کہ مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن وائسرائے بہادر سے ملے۔ انھیں ایک ایڈریس پیش کرے اور اس میں یہ درخواست کرے کہ نئے آئین میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ اس ڈیپوٹیشن کی تفصیل اور اس کے نتائج جو سر آغا خاں کی رہنمائی میں گیا تھا سب کو معلوم ہیں، اس لئے یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مسٹر گووڈمسل کے الفاظ میں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ "بالآخر فرقہ پرستوں کی جیت ہوئی، اور زمینداروں، تاجروں اور مسلمانوں کو خاص نمائندگی کا حق دیا گیا اس سے یہ امید باندھی گئی کہ یہ اقدام پیشہ ور شورش پسندوں" کا توڑ ثابت ہوگا" لیڈی منٹو نے اپنے شوہر کی سوانح عمری میں جداگانہ نمائندگی کی تجویز کے متعلق ہندوستان کے افسروں کے احساسات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں جس شام کو لارڈ منٹو مسلم لیگ سے خطاب کرنے والے تھے اسی شام کو انھیں ایک افسر کا خط ملا، اس میں لکھا تھا کہ میں حضور والا سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج ایک بہت ہی اہم واقعہ ہوا ہے۔ راج نیتی کی یہ ایک ایسی چال ہے جس کا اثر ہندوستان اور اس کی تاریخ پر برسہا برس تک پڑے گا۔ اس اقدام کا یہ اثر ہوگا کہ ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ انسانوں کا گروہ (مسلمان) باغیوں کی جماعت سے (کانگریس) یک سر الگ ہو جائے گا"

اس سلسلے میں اگر ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کردوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ جس وقت بمبئی میں نواب محسن الملک مرحوم اس ڈیپوٹیشن کا انتظام کر رہے تھے میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ میں واٹسن ہوسٹل میں نواب صاحب کے ہی ساتھ رہتا تھا اور وقتی طور پر ان کے ایک سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تمام خط و کتابت میرے ہی ذریعے ہوتی تھی۔ میں نواب صاحب سے اکثر احتجاج کرتا رہتا تھا کہ اس پالیسی کا اثر ملک پر اور آخر کار خود مسلمانوں کے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ نواب صاحب کبھی تو مجھے جھڑک دیتے ہوئے کہتے اپنے کام سے کام رکھو، اور کبھی مجھ کو اپنے ساتھ سیر کو لے جاتے۔ اس وقت مسلمانوں کی خستہ حالت کا نقشہ کھینچتے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ہار نہیں مانتا تو ایک روز طیش میں آکر کہنے لگے چونکہ میرے ایک ہی بھیپھڑا ہے اس لئے تم مجھے کمزور سمجھتے ہو۔ لیکن تم یہ بھول جاتے ہو کہ اگر میں بغاوت حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اونچا کردوں تو مسلمان میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ تم یہ بھی بھول جاتے ہو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور وہ ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جب ان کی حالت اچھی ہو جائے گی۔ اس وقت بغاوت کرنا مناسب رہے گا، مگر فی الحال تو حالات اس کی اجازت نہیں دیتے"

بہرحال فرقہ پرستی کا بیج بویا جا چکا تھا اور تیزی سے اس کی جڑیں پھیل رہی تھیں۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور اس کے حسب ذیل تین مقاصد قرار پائے:۔

(۱) مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا، اور حکومت کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

(۲) مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفاد کی نگرانی کرنا اور ان کی ضروریات کی طرف حکومت کو توجہ دلانا

(۳) لیگ کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر ایسے مخالفانہ خیالات کو پرورش نہ دینا جو دوسرے فرقوں کے لئے نقصان کا باعث ہوں۔

اسی سال ہندو مہاسبھا بھی لاہور میں قائم ہوئی، اور اس نے بھی فرقہ پروری کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ یعنی یہ کہ ہندوؤں کے مفاد اور حقوق کی نگرانی کرنا۔ مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا دونوں کا ساتھ ساتھ جنم قابل غور ہے!

مسلمانوں کی پالیسی کا سارا دارومدار ۱۸۵۷ء کے بعد تک کی زبوں حالی اور مجبوریوں کی بنیاد پر تھا۔ ان کے دلوں میں پہلا خدشہ تو یہ تھا کہ حکومت کی نظروں میں وہ کہیں دوبارہ نہ گر جائیں اور جو اسامیاں انھیں ملی ہوئی ہیں وہ جاتی رہیں۔ دوسرا ڈر جس کے بیج شروع ہی سے ان کے دلوں میں بو دئیے گئے تھے یہ تھا کہ ہندو چونکہ سیاست کے میدان میں آگے بڑھ گئے ہیں اس لئے انھیں ہڑپ کر جائیں گے۔ اس ڈر کی آبیاری انگریزوں نے جتنی سوچ سمجھ کر کی، ہندوؤں نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس سے کچھ کم نہیں کی۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس صدی کے شروع ہی میں سرکاری ملازمتوں کی خواہش اور ایک دوسرے سے ڈرنے، کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں سمو دیا گیا تھا، دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی، لیکن ان چالوں کا اثر تمام مسلمانوں پر نہیں پڑا تھا۔ اس کا ثبوت اکبر کے ان اشعار سے ملتا ہے جو انھوں نے اسی زمانے میں کہے تھے۔

کٹی رگ اتحاد ملت رواں ہے خون دل کی موجیں
وہ سمجھے ہیں اس کو آب صافی نہار ہے ہیں گھر سے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا ہیں، پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے خبر
انھیں پر مائل ہے طبع شاہیں، نشاں اب ہیں نہ پر رہے ہیں

چند سال تک مسلمانوں کی سیاست اسی ڈھرے پر چلتی رہی، لیکن آخر کار خود ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے حالات نے اس میں تبدیلی کی۔ ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم جس کے لئے اس قدر شور و ہنگامہ تھا ترک کر دی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ لگا دی اور ڈاکٹر انصاری کی رہنمائی میں ترکی کی مدد کے لئے ایک وفد بھیجا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور ترکی نے انگلستان کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ ان واقعات کا اور عام بیداری کا مسلم عوام پر زبردست اثر پڑا اور ان میں سے بہتیرے مسلم لیگ کی اس پالیسی پر شک و شبہے کی نظر سے دیکھنے لگے جس پر ۱۹۰۶ء سے عمل کر رہی تھی۔

آخر کار بے چین دلوں میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے بھی ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس طرح کانگریس کے پہلو بہ پہلو آگئی۔ ۱۹۱۶ء میں لیگ کا

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

اصغر گونڈوی اور جدید تنقید

ڈاکٹر مسعود حسین

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلش ہائے روزگار

بیسویں صدی کی "خلش ہائے روزگار" میں اصغر کی شاعری ایک "لغزشِ مستانہ" کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس شاعری کی افادیت معلوم۔ جدید تنقید، سماجی علوم پر اس قدر سہارا لئے ہوئے ہے کہ وہ "جہانِ ساز" کی گلکاریوں سے کترا کر چلتی ہے۔ اصغر کی شاعری پر تنقیدی سرمائے کے فقدان کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

اصغر ایک غلط زمانے میں پیدا ہوئے جب وہ اچھی خاصی صوفیانہ شاعری میں مشغول تھے۔ زمانہ تیزی سے کروٹیں بدل رہا تھا اس لئے اصغر کا اجتماعی شعور "خطاب بہ سلم" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شاعری میں یہ فرقہ پرستی اقبال کی پھیلائی ہوئی وبا تھی، اس میں کبھی کبھی اصغر اور جگر جیسے غزل گو بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں صالح اور صحت مند اجتماعی احساس حسرت کے یہاں "چکی کی مشقت" اور "قیدِ فرنگ" میں نظر آتا ہے۔

اصغر کی شاعری کے اصل ماخذ ہماری سماجی زندگی کے تڑپتے ہوئے مسائل نہیں۔ اس کے سرچشمے اس انفرادیت پسند ذہن سے پھوٹتے ہیں جس کے پس منظر میں ولی، خواجہ میر درد، میر، آتش اور غالب کے افکار تھے۔ اور زیادہ تلاش و جستجو کیجئے گا تو ایرانی غزل کی وہ بے پناہ تڑپ ملے گی جس کا ہر قطرہ "انا البحر" پکارتا ہے۔

اصغر نے دو عظیم جنگوں کے درمیان شاعری کی ہے۔ اُردو ادب کے لئے یہ زمانہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس دور میں ہماری شاعری کے قلب و قالب دونوں بدلے ہیں۔ غزل بھی ایک نئے رخ سے آشنا ہوئی۔ لیکن اصغر کے ماحول ان کی یک طرفہ طبیعت اور یک طرفہ طبیعت نے شاعری اور زندگی کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج حائل رکھی ہرچند اصغر اس کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ لیکن عہدِ جدید کا نقاد ان سوالات کو چھیڑے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ سوالیہ نشان قائم کرنے کے بعد ہی اس زمانے میں ماورائی شاعری کا جواز ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

میں نے اصغر کی شاعری کو ماورائی بالقصد کہا ہے۔ صوفیانہ شاعری ہو کہ عشقیہ، اصغر کہیں بھی واردات میں مبتلا نظر نہیں آتے۔ ایک فاصلہ ہر جگہ ان کے اور واردات کے درمیان ضرور نظر آئے گا۔ اسی فاصلے کی وجہ سے ان کے کلام میں

دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے

کمال درجہ کی شگفتگی آ گئی ہے۔ یہ شگفتگی براہ راست اس بے لاگی سے پیدا ہوتی ہے جو شاعر اور اس کی واردات کے مابین ہیں۔ حکیمانہ بصیرت کا راز بھی یہی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر ناقدانہ نظر ڈال سکے۔ بات بہت زیادہ الجھائی ہوئی جا رہی ہے اس لئے مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ بیسویں ہی صدی کے غزل گو شعرا کو لیجئے۔ حسرت مبتلائے واردات ہیں۔ فانی کشتۂ واردات۔ جگر اس سے مخمور ہیں۔ لیکن اصغر محض چٹخارے لیتے ہیں۔ اور دور کھڑے رہتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کی دنیا پر بھی عارفانہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ نظر کبھی کبھی ناقدانہ بھی ہو جاتی ہے۔

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے

یہ تو ہوئی اصغر کے شاعرانہ ذہن کی بات۔ اور یہ کہ وہ کس طرح تخلیق فرما ہوتا ہے۔ شاعر کے مضمونات کا جائزہ لیجئے تو وہ بھی ایک محدود اور مخصوص دنیا ہے۔ جیسے کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اصغر کی غزل "خلش ہائے روزگار" کی متحمل نہیں، وہاں تو غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے اب کی شاعری پر عہدِ جدید کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اب کی شاعری یا تو عہدِ قدیم کی یادگار سمجھی جائے گی یا دُور کے دَورِ مستقبل کی پکار۔

دُور کے مستقبل کی بات ذرا چونکا دینے والی ہے۔ معاشری مسائل ہماری تمام تر توجہ پر حاوی ہیں جن کی وجہ سے زندگی کی دوسری اقدار پس پشت ڈال دی گئی ہیں۔ لیکن پیٹ اور پیٹھ کا مسئلہ جب عمومی طور پر حل ہو جائے گا تو کیا "جہانِ راز" کی بات پھر نہ چھڑے گی، یہاں ملتا ہے آپ کو اصغر کی بظاہر بے افادہ شاعری کا جواز۔

اصغر کے شاعرانہ ذہن کی یہ کارفرمائی اگر سمجھ لی جائے کہ وہ واردات کا ایک خاص فاصلے یا بلندی سے مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے ذہن کے عام میلانات کو بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اُن کے کلام میں نفسانیت کیا حسیت تک نہیں ملتی۔ بوسہ و لب اُن کے یہاں معدوم ہے صرف رنگِ رخسار کا تذکرہ ہے۔ ممکن ہے یہ لکھنوی انداز شاعری کے خلاف ردِ عمل ہو جس کا آخری باطین حسرت کے کلام میں آنکھ مچولی کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس رجحان کو مزید تقویت اصغر کی صوفیانہ طبیعت سے ملی ہے جو بے حجابی کو بھی حجاب بنا لیتی ہے۔

بہرحال جب غزل میں حسن و عشق کی رسیلی باتوں کو بھی نہ آنے دیں اور غمِ روزگار سے بھی اجتناب کریں تو اس میں عارفانہ انداز کا آ جانا لازمی بات ہے۔ یہ عارفانہ اندازِ نظر کبھی کبھی خشک حکیمانہ اور زاہدانہ بھی ہو جاتا ہے، لیکن اصغر اس سے بچ نکلے اس لئے کہ وہ مجاز کی راہوں سے گزر چکے تھے۔ ان کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ "اصغر عشق و محبت کی ایک ایک غزل سے عملاً واقف تھے" اس کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں ادب لطیف کی تحریک نے لوگوں کو بات کرنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ اصغر کے اشعار پر غور کیجئے، انھیں کی فرہنگ میں وہ ذوق، سلیقہ، لطافت، رنگینی و رعنائی اور معتدل جذبات سے مرکب ہیں۔ ان کے یہاں تخیل اور جذبہ میں قوس و قزح کے رنگوں کا سا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اُن کے یہاں جگر اور حسرت کی بہ نسبت فکر کا عنصر زیادہ ہے وہ فانی سے دور ہوتے ہوئے بھی اُن سے قریب ہیں، دور اس لئے کہ ایک باقیات سے بحث کرتا ہے اور دوسرا نشاطِ روح اور سرودِ زندگی سے۔ نشاط اور موت یہی وہ الفاظ ہمارے مرتے ہوئے سماج کے آئینہ دار ہیں۔

اصغر کی شاعری اس لئے بھی اہم ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم اس لئے ہے کہ وہ کس طرح کہتے ہیں۔ یہ ان کا اسلوب ہی جو انھیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اس اسلوب کی تخلیق خود اُن کے معتدل صوفیانہ مزاج نے کی ہے۔ یہ حسنِ خیال، حسنِ نظر اور حسنِ بیان سے عبارت ہے۔ اصغر نے غزل کی فرہنگ میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ البتہ پرانے نگینوں کے ان چھپے پہلوؤں کو اردو غزل میں شاید آخری بار اُجاگر کیا ہے۔ اُن کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی طرف نظر کم جاتی ہے الفاظ کا صوتی اور صوری حسن ہے۔ ہر صاحبِ ذوق اس کو محسوس کرتا ہے، لیکن ادا نہیں کر پاتا۔ اصغر حسرت کی طرح اساتذۂ قدیم کے الفاظ سے نہیں چونکاتے۔ وہ موسیقی سے بھرے ہوئے الفاظ کو پاس پاس اس طرح بٹھا دیتے ہیں کہ ذہن خود بخود گنگنا اُٹھتا ہے۔ الفاظ کے صوری حسن کا تعلق فردوسِ گوش سے نہیں بلکہ جنتِ نگاہ سے ہے یہ بھی فنِ شعر کا ایک زیور ہے۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب کہ شاعری پڑھی زیادہ جاتی ہے سنی کم۔

غالب کے بعد رنگِ قدیم میں صرف اصغر کا کلام فن کار طبیعتوں کے لئے بادۂ خوش رنگ کا حکم رکھتا ہے۔ دونوں عوام کے نہیں خواص کے شاعر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے یہاں زیر و بم زیادہ پایا جاتا ہے۔ اصغر کے یہاں اعتدال

اور یکسانیت ہے۔ وہ عرش و فرش کے درمیان ایک خاص رابطہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہٹ پڑتے ہیں تو جلوۂ عام کا تذکرہ چھوڑ کر کسی شوخ کو ہم شکل تمنا بھی دیکھ لیتے ہیں۔ "رقص تمنا" "رنجش بے جا" اور بتوں کی صورت زیبا کا بھی ذکر کر لیتے ہیں۔

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا — ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

تمنا آنکھے وہ عارض میرے عرضِ شوق پر — حسن جاگ اُٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سر مژگاں کوئی

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا تم بھی تھے ساتھ ساتھ کیا — غم میں یہ کیوں سرور تھا درد نے کیوں مزا دیا

لیکن اصغر اصل میں فرش کے نہیں عرش کے شاعر ہیں۔ اس رفعت مکانی کی وجہ سے مجاز کی عشقیہ واردات بھی ایک بلند اور ارفع انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ اصغر ہمیشہ ایک خاص سطح سے بات کرتے ہیں۔ وہ صرف آسمان ہی کی بات نہیں کرتے۔ زمینی باتوں میں بھی انھیں مزا آتا ہے۔ لیکن اپنی سطح سے نیچے کبھی نہیں اُترتے۔ اسی لئے ان کی شاعری چیخ نہیں بن جاتی، ہمیشہ نغمہ اور نغمہ رہتی ہے۔ اس میں حسن و عشق سے متعلق بیانات میں ایک عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس عمومیت کی وجہ سے انداز متفکرانہ ہو جاتا ہے۔

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم — جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

میری کا ندلے ورد پر کوئی صدا نہیں — بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

یہ ارفع سطح محض اصغر کے صوفیانہ مذاق کی بدولت ہے۔ اسی سے ان کا شاعرانہ لب و لہجہ متعین ہوتا ہے۔ اسی میں ان کی مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے۔

پہلی بات کو آخر میں دہراتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ اصغر کی شاعری پر جدید تنقید کی کمند نہیں ڈالی جا سکتی۔ جدید تنقید سماجی علوم پر مبنی ہے اور انھی کی روشنی میں وہ فنی شاہکاروں کو پرکھتی ہے۔ لیکن اصغر کی شاعری کی گرہیں فرد نفسیاتی اور فنی تنقید سے کھولی جا سکتی ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین سابقہ یا آئندہ معیاروں سے کیا جائے گا۔ ہم اپنے سماجی مسائل میں اس وقت بُری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ ان سے فرار بے ایمانی بھی ہے اور بزدلی بھی لیکن اسے زندگی کی ایک مستقل کروٹ سمجھنا یہ بھی ایک خود فریبی سے کم نہیں۔ اصغر کی شاعری نشاط روح کی شاعری ہے۔ یہ ذوق نظر کا تحفہ ہے۔ جس نے اردو غزل کو غازہ بخشا۔ لطافت اور رنگ بخشا۔ اصغر نے مریض ذہن کی خستگی اور شکستگی کو مزاج غزل سے نکال باہر کیا۔ پژمردگی کی جگہ فکر و تخیل سے رنگین بنایا، باغ و بہار بنایا۔ اسی طرح کہ آتش گل کی طرح رنگ اور آنچ کا فرق ہی مٹا دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ معلوم اور نامعلوم کے درمیان جو خلا ہے اُسے پر کیا۔

ہم نے سماجی ارتقاء کے اصولوں کا کم و بیش اسی طرح احاطہ کر لیا ہے جس طرح طبعیات نے مادہ کے بعض افعال و خواص کا لیکن دونوں علوم کے انکشافات نامعلوم کی اس دل کشی کو کم نہ کر سکے جو ہر لحظہ تاریکیوں میں پیچھے کی طرف ہٹتی جاتی ہے۔ یہ کہہ کر تصوف کا جواز ڈھونڈھنا مقصود نہیں۔ لیکن علم کے خالص سائنٹفک نقطۂ نظر کے بعد بھی یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ ذہن انسانی کلی طور پر حقیقت بسیط کا احاطہ کر سکے گا یا نہیں۔ اگر نہیں کر سکتا تو اصغر جیسوں کی شاعری ہمیشہ "جہاں راز کی تعبیر کرتی رہے گی۔ دوسری صورت میں جہان فردا کو شاعری کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو
دہلی

ہند و مسلم تعلقات

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

سالانہ اجلاس کانگریس کے ساتھ ساتھ بمبئی میں منعقد ہوا اس کی کوشش کی گئی کہ لیگ کا اجلاس بمبئی میں نہ ہونے پائے۔ لیکن حکومت کی مخالفت کے باوجود اجلاس منعقد ہوا۔ لیگ کا خطبہ صدارت کانگریس کے خطبہ صدارت سے کہیں زیادہ انتہا پسند اور تنقیدی تھا۔ مولانا مظہر الحق نے جو راہ دکھائی تھی اس پر لیگ کی سیاست ایک عرصے تک چلتی رہی ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا لکھنؤ میں ملا جلا اجلاس ہوا جس میں مشہور میثاق لکھنؤ پر دستخط ہوئے۔ اس کا فوری اثر ۱۸ اگست ۱۹۱۷ء کے شاہی فرمان کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن جیسے ہی جنگ عظیم ختم ہوئی حکومت کی صلح جویانہ پالیسی جبر و تشدد میں تبدیل ہو گئی۔ رولٹ بل پاس کیا گیا اور ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام پیش آیا۔ معاہدۂ سیورس کی وجہ سے، جس میں ترکوں پر بڑی کڑی شرطیں لگائی گئی تھیں، برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کے جذبات اور زیادہ بھڑک اُٹھے۔ تین چار سال تک ہوم رول اور خلافت کے لئے ہندو اور مسلمان مل کر برطانیہ سے ٹکر لیتے رہے۔ بدقسمتی سے جیسے ہی عدم تعاون کی تحریک ملتوی ہوئی ہندو مسلم اتحاد کی کمر ٹوٹ گئی۔

اتحاد کا محل جسے گاندھی جی نے اتنی جان فشانیوں کے بعد کھڑا کیا تھا زمیں بوس ہو گیا۔ بڑی ہی مستقل مزاجی اور ہوشیاری کے ساتھ اس محل پر بمباری ہوتی رہی یہاں تک کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ——— یہ تھا اس پالیسی کا منطقی اور قدرتی نتیجہ جس پر پوری انیسویں صدی میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا تھا۔

یو پی میں پنچایت راج

ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو

(پورے ہندوستان میں پنچایتوں کے قیام کے سلسلے میں جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کے متعلق ہم ایک مضمون پچھلی اشاعت میں شائع کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ یوپی میں پنچایت راج کے متعلق، جس کا ۱۵ر اگست کو باقاعدہ افتتاح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کاٹجو گورنر مغربی بنگال کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ معاصر "روزنامہ ہند" سے شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں)

۱۵ر اگست ۱۹۴۹ء کو آزادی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر ہندوستان بھر میں بہت کچھ کہا اور لکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس موقعہ پر گذری ہوئی باتوں اور ملک کی موجودہ ابتر اقتصادی حالت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ لوگ آزادی کو تسلیم کرنے میں اس کی انتہائی معقولیت بلکہ خطرناک حالت کی طرف بھی اشارہ کریں گے محض اس لئے کہ کسی ملک کی سیاسی آزادی تولنے کی چیز یا کسی بھی شکل میں ترتیب دی جانے والی چیز نہیں ہوا کرتی کسی ملک کی سیاسی آزادی بجائے خود پروردگار سا انداز میں ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ویدوں میں کہا گیا ہے۔ کہ کسی بھی آریہ کے لئے ایک ایسی سرزمین میں رہنا عقیدہ اور دھرم کے خلاف ہے۔ جہاں کسی ظالم بدیشی کی حکومت ہو۔ اگرچہ ویدوں کے یہ الفاظ اپنی قومی بدقسمتی کے باعث کئی سو برس ہوئے ہم فراموش کر چکے ہیں۔ پھر بھی ان الفاظ کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کی کسی تفسیر کی ضرورت نہیں آج کل کے کٹھن زمانے میں جب زندگی تقریباً ایک ناقابل برداشت بوجھ بنتی جاتی ہے۔ انسان کا دماغی سکون درہم برہم ہو سکتا ہے۔ ٹھیک جس طرح ایک بالوس مریض کسی بھی عطائی حکیم کے پاس پہنچ سکتا ہے جو اس کے مرض کو بالکل اچھا کر دینے کا دعویٰ کرنے۔ چاہے اس عطائی حکیم کے علاج سے اس کا ایک اہم عضو بھی کیوں نہ ضائع ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح آج ضابطہ حیات کے ان اصولوں اور فلسفوں سے بھی خطرہ درپیش ہے جو کم سے کم وقت میں اقتصادی بدحالی کے انسداد کی امید دلاتے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ گھبراہٹ اور جلدبازی میں کہیں ہم اپنی سیاسی آزادی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں

حقیقی آزادی

بہرکیف صوبہ متحدہ میں آزادی کی یہ دوسری سالگرہ دیہاتوں کے لئے حقیقی آزادی کا پیش خیمہ ہوگی۔ طوطے کی طرح ہم مہاتما گاندھی کے اس قول کو دہراتے رہتے ہیں کہ "ہندوستان کی اصل زندگی دیہاتوں میں ہے"۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ دیہاتی باشندوں کی ستائش میں صرف منہ زبانی جمع خرچ کیا کرتے ہیں کہ انھیں بھی ووٹ دینے کا حق ہے۔ مگر دیہاتوں کو جاہل، ان پڑھ توہم پرست اور پرانے زمانے کی بوسیدہ یادگار کہہ کر ٹھکرانا آج کل کچھ فیشن سا ہو گیا ہے۔ لیکن میں اس نظریہ کی کبھی بھی حمایت نہیں کروں گا۔ چاہے وہ ایک کسان ہو یا کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور یا ایک دیہاتی دستکار میں نے بہرحال ہمیشہ اسے انتہائی عزت کی نظر سے دیکھا ہے۔ بہ حیثیت ایک ماہر کاریگر کے بھی اور بحیثیت ایک انسان کے بھی۔ اس کے اپنے دائرۂ عمل میں اسے ایک محنتی ایماندار کشادہ دل اور ایک حقیقی انسان تصور کرتا ہوں ہم اس سے جو نام نہاد برائیاں منسوب کرتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ بدترین قسم کی "مقدمہ بازی" کا شکار ہے یا یہ کہ وہ عدالتوں یا عدالت کے باہر کسی بھی با اختیار شخص کے سامنے جھوٹ بولنے پر ہر دم تیار رہتا ہے۔ میری نظر میں اس کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں۔

اس میں برائیاں پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ گذشتہ دو برس کے عرصے میں اسے انتہائی سنگدلی سے لوٹا کھسوٹا جاتا رہا۔ تا آنکہ مہاتما گاندھی ہمدردی شفا اور دوستی کا پیغام لے کر آئے۔ دیہات جا کر دیہاتیوں سے تعلقات پیدا کرنے والے ہر شخص کا مقصد صرف یہ ہوا کرتا تھا کہ ہر ممکن طریقے سے چاہے جائز ہو یا ناجائز، قانون کے سہارے ہو یا "زبردستی" جعل و فریب سے ہو یا دھوکہ بازی سے بہرصورت اس کی ذات سے روپیہ پیدا کرے۔ جس سماجی نظام میں وہ زمانہ دراز سے رہتا چلا آ رہا تھا اسے انگریزوں نے تباہ کر کے گاؤں پنچایت کی جگہ دیہاتیوں پر ایک ایسا مرکزی نظام لاد دیا جسے وہ بڑے بڑے خوش کن ناموں سے پکارتے تھے۔ اس وقت انھوں نے سوچا اور نہ سمجھا کہ ایک گاؤں والے کو کسی معمولی سے زمینی جھگڑے کے تصفیہ کے لئے اس کے گاؤں سے کافی فاصلے پر بڑی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے مجبور کرنا بے رحمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اس کا مطلب اس کی بربادی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

دراصل ایک دیہاتی بالکل سادہ دل اور امن پسند شہری ہوتا ہے۔ وہ سوائے ان لمحات کے جب اس کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو جائے ہر وقت قانون کا احترام کرتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں میں جرائم کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

سماجی انقلاب

مجھے بھروسہ ہے کہ ہمارے دیہاتوں میں پنچایت راج کا آغاز جس کا ایک عظیم الشان تجربہ یوپی میں کیا جا رہا ہے۔ ایک نیا سماجی انقلاب لائے گا۔ ہم اپنے محدود ذہن میں اس سماجی انقلاب کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں اس کا اندازہ تب ہی ہوگا جب آئندہ چند سال میں پنچایت راج کے نتائج ہمارے سامنے آئیں گے۔

کتنے تعجب کا مقام ہے کہ ایک طرف ہم ایک دیہاتی کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ ملک کے وسیع تر مفاد اور نظم و نسق کے لئے اس کی رائے بنیادی مانی جاتی ہے۔ یعنی اس کے ووٹ پر ملک کا نظم و نسق چلانے والے منتخب ہوا کریں گے۔ لیکن دوسری طرف ہم اسے اس کی بھی اجازت دینا گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنے گاؤں کا بالکل سادہ انتظام خود کرے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کے روزمرہ کے کاروبار کے چلانے کے لئے اور انصاف حاصل کرنے کے لئے ساری ذمہ داری اسی کے سپرد کر دی جائے۔ جب تک کہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا اس کی حالت اور اس طرح ہمارے ملک کی حالت سدھر نہیں سکے گی۔ اور اسی وقت دیہاتوں کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو سکے گا۔ دیہاتی باشندے کی ضروریات پوری ہونے کے لئے اس کے پاس بافراط روپیہ ہوگا، اور اسے احتیاج کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ احتیاج سے آزادی ہی سوراج کا اصل مقصد ہے۔

ہریجن کا ست

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

گاندھی جی نے اس کو برداشت کر لیا، کیوں کہ ان کا لگاؤ دوسری طرف بھی اسی طرح تھا جس طرح مہادیو بھائی کا باپ سے تھا۔ یہ ہندوستان کے عوام تھے اور ہندوستان کے ذریعے انسانیت و زندگی سے لگاؤ تھا۔ گاندھی جی، ہندوستان کے غم اور خوشی کے شریک دار تھے۔ وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، برہمن اور بھنگی کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی زندگی سوراج کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ وہ سوراج جو سب کے لئے تھا، اسی لگن سے وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ اور اپنی جان دی

ہماری آزادی اسی طرح کے زبردست تیاگ سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے ذریعے ہم اسے برقرار بھی رکھ سکتے ہیں۔

ترجمہ
"قومی آواز" لکھنؤ

ماہنامہ
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ... ۱۹۴۷ء
چندہ: سالانہ ... فی پرچہ ...

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:-

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے
(بیرنگ)

شرح اشتہارات:-

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں)

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی ... مطبوعہ ... دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۹ | یکم ستمبر ۱۹۴۹ء سنہ ۶ | ایڈیٹر - ڈاکٹر سید عابد حسین

عبادت اور آشرم

(مہاتما گاندھی)

اگر سچائی پر اصرار، آشرم کے جڑ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس جڑ کی نشوونما خاص طور سے عبادت سے ہوتی ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک شخص جتنے ہی سویرے اٹھتا ہے اتنا ہی بہتر ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ لاکھوں آدمیوں کو سویرے اٹھنا ہی چاہیئے۔ اگر کسان دیر میں اٹھتا ہے تو اس کی فصل کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔ صبح ہی کے وقت جانوروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے اور گائیں دوہی جاتی ہیں جب صورت حال یہ ہو تو پھر سچ کی بقا کے خواہش مندوں، عوام کے خادموں یا راہب اور تارک الدنیا کو ۲ یا ۳ بجے اٹھ جانا چاہیے۔ اگر یہ لوگ سویرے نہیں اٹھتے ہیں تو حیرت انگیز بات ہے دنیا کے تمام ملکوں میں عبادت گزار بندے خدا کا نام لیتے ہیں اور کسان کھیتوں میں کام کرکے خود اپنی اور ساری دنیا کی خدمت کرتے ہیں میرے نزدیک تو دونوں ہی عبادت گزار ہیں اور کسان اپنی محنت کے ذریعے غیر شعوری طور پر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی محنت کی بنا پر دنیا کا وجود قائم ہے۔ اگر وہ کھیتوں میں کام کرنے کے بجائے مذہبی فرائض کے عادی بن جائیں تو وہ اپنے فرائض سے منہ موڑیں گے اور خود کو اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو موت کے غار کی طرف لے جائیں گے۔

ہم کسانوں کو عبادت گزار سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن جہاں کہیں کسان مزدور، اور دوسرے لوگوں کو چار ناچار صبح کو اٹھنا پڑتا ہے۔ بھلا وہاں سچائی کے قدردان اور خواہاں یا عوام کے خادم دیر میں کیسے اٹھ سکتے ہیں، پھر ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ہم آشرم میں عبادت اور کام میں ایک ربط اور یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر میری رائے ہے کہ آشرم کے تمام تندرست آدمیوں کو سویرے اٹھنا چاہیئے، خواہ اس میں ان کو کچھ تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔

پھر ہم کو چند مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ عبادت کہاں ہونا چاہیئے؟ عبادت کے لئے کوئی مندر بنانا چاہیئے یا کھلے میدان میں عبادت ہونی چاہیے پھر یہ کہ ہم کو کوئی چبوترہ بنانا چاہیئے یا زمین پر بیٹھ کر عبادت کرنی چاہیئے۔ آخر میں ہم نے یہ طے کیا کہ ہم آسمان کے نیچے زمین پر بیٹھیں گے شبہہ نہیں بنائیں گے۔ آشرم میں غربت کی ہر جگہ جھلک دکھائی دینی چاہیئے آشرم کو لاکھوں غربت زدہ انسانوں کی خدمت کے لئے کھولا گیا ہے۔ اس میں غریبوں کے لئے دوسرے سے کم گنجائش نہیں ہے اس کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو قواعد کی پابندی کرسکیں۔ ایک ایسے ادارے میں عبادت گاہ کو اینٹوں اور چونے گارے سے کہیں کر تیار کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں ایک چبوترہ بنانا طے کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا گیا۔ بعد کے تجربے نے بتایا کہ چبوترہ نہ بنانے کا فیصلہ صحیح اور مناسب تھا۔ عبادت میں آشرم کے باہر کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں اور بعض وقت مجمع کو بڑے سے بڑے چبوترے پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ جو اس وقت موجود ہوتا ہے۔

چونکہ آشرم کی عبادت کی دوسری جگہ نقل کی جارہی ہے اس لئے ایسی کھلی جگہ پر عبادت کا فائدہ اب ثابت ہو رہا ہے، جہاں کہیں جاتا ہوں صبح اور شام کی عبادت ہوتی ہے۔ شام کی عبادت میں خاص طور سے اتنا مجمع ہوتا ہے کہ عبادت صرف کھلی ہوئی جگہ میں ہوسکتی ہیں۔ اگر میں کسی عبادت کے کمرے میں عبادت کرنے کا عادی رہا ہوتا تو میں اپنے دورے کے دوران میں کبھی عام عبادت کا تصور بھی نہ کر سکتا۔

اصلی سوراج کیا ہے؟

"حقیقی سوراج چند افراد کے سوراج حاصل کر لینے سے نہیں بلکہ اس وقت ملے گا جب ساری قوم میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اقتدار کے ناجائز استعمال کو روک سکیں، دوسرے لفظوں میں سوراج اس طرح حاصل ہوگا کو عوام کو تربیت دے کر ان میں اقتدار کی نگرانی کرنے اور حکومت کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے گی"

"میرے تخیل کے سوراج میں نسل یا مذہب کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا اور نہ یہ صرف پڑھے لکھوں یا دولت والوں کی املاک ہوگا۔ سوراج سب ہی کا ہوگا جس میں امیر اور اہل علم بھی شامل ہیں، لیکن زیادہ حق دار اپاہج، اندھے، فاقہ کش عوام ہیں"

"کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا سوراج اکثریت والے فرقے یعنی ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ اس سے زیادہ فاش غلطی کوئی نہیں ہوسکتی اگر ایسا ہوتا تو میں ا سے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
عبادت اور آشرم	مہاتما گاندھی	۱
اب نظر کا ہے کو آئیں گی / یہ تصویریں کہیں	خواجہ غلام السیدین	۲
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے / اچھلتا ہے کیا	اداریہ	۳
بزم بے تکلف		۳
پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان	ع، ح	۴
۲- پاکستان	ع، ل	۵
۳- باہر کی دنیا	ع، ل	۶
خیال	تیغ الہ آبادی	۷
ساحر فن	علی حماد عباسی	۷
غالب کے اردو کلام میں / فارسی عنصر	پروفیسر عبدالقادر	۸
بچہ کی پہلی جھلک	سید محمد حسنین	۱۰
عوام کی کانگریس سے بیزاری	کشوری لال شرما	۱۱
آزادی ... کے نام	وتو با بھیوے	۱۱

اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

خواجہ غلام السیدین

جب میں اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا ہوں، جس کو اب تیس سال ہو چکے ہیں تو بہت سی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک تصویر ایسی ہے جو سب سے زیادہ صاف اور سب سے زیادہ روشن ہے۔ میری اماں کی تصویر۔ یوں تو میں نے بچپن میں بہت سے عزیزوں اور بزرگوں کی محبت اور مثال سے فائدہ اٹھایا اور ان سے بہت کچھ سیکھا (مثلاً اردو کے مشہور شاعر حالی میرے نانا تھے، اور ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی شریف اور نورانی صورت دیکھ کر ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل اور دماغ میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔) لیکن میرے بچپن کی سب سے خوش گوار یاد میری اماں کی ذات ہے جس میں خدا نے دنیا بھر کی خوبیاں اور نیکیاں جمع کر دی تھیں۔ میں چند لفظوں میں ان کی سیرت کی تصویر کس طرح کھینچوں؟ انھوں نے اپنی مثال سے مجھے (اور میرے بھائی بہنوں کو) سکھایا کہ زندگی کو ایک قیمتی فرض سمجھنا چاہیے۔ اور دکھایا کہ اس فرض کو کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ وہ صبح کو چار بجے اٹھتیں۔ نماز اور عبادت سے فارغ ہوتیں، پو پھٹنے سے پہلے ہمیں جگاتیں، اسکول کے لیے تیار کرتیں، ناشتہ کراتیں اور اس وقت سے لے کر رات کے سونے کے وقت تک برابر اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ اور وہ ان کے کام کیا دوسروں کے کام ہوتے جن کو وہ اپنا سمجھ کر کرتیں۔ میں نے انھیں ہمیشہ پڑوسیوں، غریبوں، محتاجوں، فقیروں کی مدد اور ان کا کام کرتے دیکھا، بیماروں کی دیکھ بھال کرتے دیکھا، لوگوں کے قصے، جھگڑے چکاتے دیکھا۔ گھر کے محلے کے، نوکروں کے بچوں بچیوں کو پڑھاتے۔ انھیں اچھی باتیں اور گھرداری کے کام سکھاتے دیکھا۔ ان کے دل میں اپنے پرائے کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا بلکہ اگر ہم میں سے کسی کا جھگڑا کسی دوسرے کے بچے کے ساتھ ہوتا تو وہ ہمیشہ اپنوں کو روکتیں اور ٹوکتیں، اور دوسروں کا زیادہ خیال رکھتیں۔ تاکہ انصاف کا پلڑا برابر رہے۔ میں نے یہ انمول سبق انھیں کے قدموں کی برکت سے سیکھا کہ چاہے جو کچھ ہو جائے سچ اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

میرے بچپن میں بچوں کو اتنی آزادی نہ تھی جتنی آج کل انھیں حاصل ہے۔ وہ دراصل ڈسپلن کا زمانہ تھا ہم اپنے بڑوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے مثلاً مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ لیکن جب تک اپنے چچا سے اجازت نہیں لی (اور وہ بھی زبانی نہیں، ایک خط لکھ کر!) اس کو سیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی! میری دنیا زیادہ تر اپنے گھر، اسکول اور چند عزیزوں کے گھروں تک محدود تھی۔ گلی یا سڑک پر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اسکولوں میں بھی کھیل کا زیادہ رواج نہ تھا جب کھیل ہوتے تو ماں باپ کی اجازت اور استادوں کی نگرانی میں ہوتے۔ معلوم ہے ہماری بہت بڑی سیر یا ایکسکرشن کیا ہوتی تھی؟ گھر سے دو میل دور ہمارا ایک باغ تھا جس میں انار اور امرود کے بہت اچھی قسم کے پیڑ تھے اور اس سے ایک میل آگے ایک نہر تھی جو دریائے جمنا سے نکالی گئی تھی کبھی کبھی اتوار کے دن چند دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ کسی بڑے کی نگرانی میں ہم باغ اور نہر کی سیر کو جاتے تھے۔ خود تیرنا آتا نہ تھا اس لئے کاغذ کی کشتیاں بنا کر انھیں نہر میں ڈالتے اور اس طرح اپنا دل خوش کر لیتے تھے!

میرا پہلا اسکول بھی ہمارے آج کل کے اسکولوں سے مختلف تھا۔ اس میں استاد استاد تھے شاگرد شاگرد۔ (انھیں پڑھاتے لکھاتے، نصیحت کرتے ڈانٹ ڈپٹ کرتے نگران کے ساتھ مل جل کر دوستوں کی طرح نہیں رہتے تھے۔ ایسا کرنا استاد کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہمیشہ ایک ہلکے بادامی رنگ کی پگڑی باندھا کرتے تھے۔ میں نے برسوں تک انھیں کبھی اس کے بغیر نہیں دیکھا، شاید میرا یہ خیال تھا کہ وہ اسی طرح سر پر پگڑی باندھے پیدا ہوئے ہوں گے۔ اسی لئے جب ایک دفعہ میں نے انھیں گھر پر ننگے سر دیکھا اور ان کی صاف چندیا نظر پڑی تو مجھے ایسا اچنبھا ہوا جیسے ہندوستان کے شمال سے ہمالہ پہاڑ غائب ہو گیا ہو۔.......

اس اسکول میں صرف کتابی تعلیم ہوتی تھی، کوئی ہاتھ کا کام نہ کرایا جاتا تھا، کیونکہ اسے بے کار وقت ضائع کرنا سمجھا جاتا تھا، لیکن جب میں ۱۲ سال کی عمر میں اپنا مدرسہ (حالی اسکول میں داخل ہوا تو وہاں کی فضا دوسری قسم کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر ایک قابل نوجوان گریجویٹ تھے جو ہمارے کھیلوں میں شریک ہوتے تھے ہم سے دوستوں کی طرح بات چیت کرتے۔ کلاس میں خوش مزاجی کے ساتھ پڑھاتے اور مذاق کرتے۔ اس لئے جہاں ہم پہلے ہیڈ ماسٹر کی عزت کرتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے وہاں ان کے لئے دل میں محبت اور دوستی اور بھروسا تھا۔ جب میں اس نئے اسکول میں داخل ہوا تو اس کی عمارت پوری طرح نہیں بنی تھی، کام جاری تھا ہمارے ہیڈ ماسٹر اور سکریٹری دونوں تعلیم کے گر اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بہت سمجھ داری کے ساتھ کام لے کر ہم سب کو بھی اجازت دے دی کہ خالی وقت میں مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ہم اینٹیں ڈھوتے تھے۔ گارا تیار کرتے تھے، بجری اور سمنٹ ملاتے تھے اور ہمارے ہیڈ ماسٹر وغیرہ بھی اس میں ہمارے ساتھ ساتھ شریک ہوتے تھے۔ میں کیا بتاؤں کہ اس خیال سے کیسی خوشی ہوتی تھی کہ یہ ہمارا اسکول ہے، ہم نے اس کو بنایا ہے! پھر اسکول میں باغ لگانا تھا۔ اس کے لئے ہم لوگ کنوئیں پر باری باری رہٹ چلاتے اور پانی نکالتے اور اپنی بنائی ہوئی کیاریوں کو سیراب کرتے اور جب زمین سے چھوٹے چھوٹے پودوں کو سر نکالتے دیکھتے تو ایسی خوشی ہوتی جیسی کسی چترکار کو اپنی بنائی ہوئی خوب صورت تصویر دیکھ کر۔ میں جو آج کل تعلیم میں ہاتھ کے کام پر اتنا زور دیتا ہوں اس خیال کا بیج شاید میرے دل میں اسی زمانے میں بویا گیا ہو۔

میرے بچپن کے زمانے میں ہندوؤں، مسلمانوں سکھوں کے اپنے جھگڑے بالکل نہ تھے، جیسے آج کل ہم لوگوں نے دیکھے اور سنے ہیں۔ میں نے تو اپنے قصبے میں ہمیشہ انھیں دوستوں اور پڑوسیوں کی طرح رہتے دیکھا۔ وہ دل کھول کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں، شادی بیاہ میں، بیماری اور غمی میں شریک ہوتے، اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ شادی کا موقع ہوتا تو ہندو دوست مسلمانوں کے گھر آکر اور مسلمان دوست ہندوؤں کے گھر جاکر ہر طرح کا انتظام کراتے اور چاہے وہ ایک دوسرے کے ہاں کا کھانا نہ کھائیں، لیکن دل میں عزیزوں کی سی محبت رکھتے تھے! میرے ایک چچا، جو بہت بڑے مولوی اور عالم تھے، شہر کے اسکول میں پڑھایا کرتے تھے، اور ان کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہندو شاگرد تھے جنھوں نے اسکول سے نکل کر اپنی دکانیں اور کاروبار کر لئے تھے۔ جب کبھی میں ان کے ساتھ شہر کے بڑے بازاروں میں سے گذرتا تو دیکھتا کہ ان کے یہ پرانے شاگرد ان کو دیکھتے ہی کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور انھیں پرنام کرتے یا ان کے چرن چھوتے! اور خود میرے چچا کی آنکھوں میں محبت کی ایسی جھلک پیدا ہو جاتی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹوں کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے........ کبھی تو ان آنکھوں نے یہ خوش گوار منظر دیکھا تھا، اور پھر اس عمر میں نہ جانے کیا کیا دیکھا! میری دعا ہے کہ ہمارے سب بچے جو ہندوستان کی امیدیں ہیں۔ آپس میں اس دوستی اور پریم کے ساتھ رہ سکیں اور اپنی محبت اور ایکتا سے اپنے دیس کو صرف طاقت ور ہی نہیں بلکہ سچائی اور انصاف اور شانتی کا گڑھ بنا دیں!

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا (اقبال)

آج مسلمان تقریباً دنیا بھر میں معاشی اخلاقی اور ذہنی پستی میں گرفتار ہیں۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے جسے ماننے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا مگر ماننی پڑتی ہے اس کا سبب باہر سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں کا مذہب نئے زمانے کا ساتھ نہیں دیتا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں نے اپنے اونچے اور متوسط طبقے کے سیاسی اور معاشی مفاد کو اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ حقیقی مذہب کو کئی کئی جزدانوں میں لپیٹ کر اس طرح رکھا ہے کہ اسے صدیوں سے دھوپ اور ہوا نصیب نہیں ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے انقلاب کبھی کسی نئے مذہبی عقیدے کی برکت سے آتے ہیں اور کبھی نئے فلسفیانہ سیاسی یا معاشی عقیدے کی بدولت جب کسی نئے مذہب کا ظہور ہوتا ہے جس میں حرکت اور قوت ہو تو جہاں جہاں وہ پہنچتا ہے وہاں فلسفہ سیاست اور معیشت سب اپنے آپ کو کم و بیش اس کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح نئے سیاسی اور معاشی عقیدے جب دنیا میں قبول عام پا لیتے ہیں تو مذہب کو بھی ان سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے نئے حالات کی روشنی میں اپنے بنیادی اصولوں کی نئی تعبیر کرنی پڑتی ہے۔ اس سے اس کے فرسودہ قالب میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے اور وہ لوگوں کے قلب و دماغ پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے تاریخ اسلام میں آپ کو اس کی مثال یہ نظر آتی ہے کہ جب یونانیوں کے عقلی فلسفے نے اسلامی ملکوں میں مقبولیت حاصل کر لی تو مذہبی فلسفیوں نے اسلام کی عقلی تاویل کر کے اس میں تازگی اور قوت پیدا کر دی، تاریخ یورپ میں، لوتھر، کیلون اور دوسرے بزرگوں کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے عیسائی مذہب کی تعلیم کو عہد جدید کے سانچے میں ڈھالا۔ خود ہمارے ملک میں مہاتما گاندھی نے ہندو مذہب کی تعبیر زمانے کی ضرورتوں کے مطابق کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی ذہنی زندگی کو عہد جدید کے مطابق بنانے کی دو کوششیں ہوئیں۔ ایک سید احمد خاں نے ہندوستان میں کی، دوسری مصطفےٰ کمال نے ترکی میں سید احمد خاں نے مذہب اسلام کی نئی تعبیر کی طرف قدم بڑھایا مگر مخالفت سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور انھوں نے اپنی توجہ زیادہ تر اوپر کے طبقے کے لئے تھوڑے سے سیاسی اور معاشی فوائد حاصل کرنے کی طرف موڑ دی۔ سرسید کے جانشینوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کا دین و ایمان یہی ہے کہ وہ اوپر کے طبقے کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کریں۔ یہی عقیدہ تھا جس نے بڑھتے بڑھتے تحریک پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔ مصطفےٰ کمال شروع سے مذہب سے دور بلکہ اس کے مخالف رہے۔ انھوں نے چاہا کہ ترکی کو لامذہبیت کے راستے سے عہد جدید میں داخل کریں جس میں کچھ عارضی کامیابی ہوئی، مگر ان کے بعد ترکوں کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مذہب کی قوت کو ساتھ لئے بغیر زیادہ دور نہیں جا سکتے لیکن مذہب میں زندگی کی قوت پیدا کرنے کے لئے اُسے زمانے کی روشنی میں سمجھنا اور وقت کی اصلاح میں سمجھانا ضروری ہے۔

دراصل اس ضرورت کو ساری دنیا کے مسلمان بڑی بے چینی سے محسوس کر رہے ہیں جو اضطراب اور التہاب اس وقت مسلمان ملکوں میں مصر سے پاکستان تک نظر آ رہا ہے اس کی تہہ میں یہی آرزو ہے کہ اپنے مذہبی عقائد کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کے اندر ایک انقلابی قوت پیدا کریں اور اس قوت کے بل پر تجدد اور ترقی کی راہ میں قدم بڑھائیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر ملک میں حکمران گروہ ان کے پیچھے اور گہرے مذہبی جوش کو انقلاب کے رخ سے ہٹا کر رجعت کی طرف ڈھکیل رہا ہے اور ان کو یہی تعلیم دے رہا ہے کہ دین ایمان، تہذیب تمدن جو کچھ ہے وہ اوپر کے طبقے کا سیاسی اور معاشی مفاد ہے۔ اس کے مٹتے ہی اسلام مٹ جائے گا اسے انگریزوں، امریکیوں، یہودیوں، ہندوؤں یا کمیونسٹوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس کی حفاظت ان غیر مسلموں کے ہاتھ سے ایک مقدس فرض ہے جس کے لئے ہر مسلمان کو اپنا جان و مال قربان کر دینا چاہئے

ان سب ملکوں میں تعلیم یافتہ اور سوچنے والے لوگ بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو اوپر کے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے ساتھ گہرے رشتوں سے وابستہ ہیں۔ اس لئے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ مذہبی جوش کے ہیجان کو ایک مدت تک سچے تجدد یا ترقی پسندی کی انقلابی شکل میں اُبھرنے دیا جائے گا۔ وہاں اب تک ایک نعرۂ تکبیر ایک فتوائے جہاد ترقی پسندانہ تحریک کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ صرف ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں میں اوپر کے طبقے قریب قریب ختم ہو گئے ہیں تقسیم سے ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں بے شمار اور بے اندازہ نقصان (بقیہ صفحہ ۴ پر)

بزمِ بے تکلّف

(نئی دہلی میں پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے موٹروں کے احاطے کے اندر بزم بے تکلف کا نقشہ جما ہوا ہے دوب کے نرم اور سبز فرش پر آنریبل ممبروں کے ہانکنے والے (ڈرائیور) چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے گپ ہانک رہے ہیں۔ ایک چوکڑی جس میں ہر ایک الگ کھیت کا معلوم ہوتا ہے کسی اہم واقعے پر اس قدر برجستہ رائے زنی کر رہی ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو لکدزنی کا شبہ ہوتا ہے۔ آپ کا نامہ نگار ذرا سی باہر تخیل کے کان لگائے سن رہا ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر نئی مخالف پارٹی کا قیام موضوع بحث معلوم ہوتا ہے)

ا۔ ارے یار چھوڑ اس گل کو۔ نہ سٹھ نہ پنجہ۔ بارہ کی پارٹی کیا تیر مار لے گی؟

ب۔ ار ماں کیا تھرڈوں کی باتیں کرتے ہو۔ بارہ کیا کم ہوتے ہیں۔ ان کانگریس والوں کو ناکوں چنے نہ چبوا دیں تو میرا نام بدل دینا۔

ج۔ تیرا نام بدلے پیچھے اپنے کو کیا مل جائیں گا؟ ہم بیٹ (شرط) کرنا منگتا۔

ب۔ ابے تو تو سدا کا منگتا ہے، مگر یہاں کوئی داتا آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا نہیں ملنے کا۔ گھڑ دوڑ میں بازی لگاتے لگاتے جوئے کا ایسا لپکا ہو گیا ہے کہ جب دیکھو شرط بدنے کو موجود اور یہاں بدے کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔

د۔ مگر تین شو ممبر کا شو بنے بارہ کیا کر سکتا؟ امی یہ نہیں شو سمجھا۔

ب۔ تمی آج تک کوئی بات سمجھا ہے جو یہ سمجھے گا۔ سچ کہتا ہوں ایسے ایسے جانگلوؤں سے سابقہ پڑتا ہے کہ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ لوں، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے اور چلے ہیں سیاست میں ٹانگ اڑانے۔ ارے بھلے آدمیو، سمجھو ذرا کان کھول کے منہ پھیلا کے میری بات دھیان سے سنو۔ یہ تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ بارہ آدمی چاہے وہ سب کے سب سردار حکم سنگھ کی طرح تگڑے کیوں نہ ہوں تین سو کو کشتی میں نہیں ہرا سکتے اور پھر یہاں تو ان بارہ میں ہمارے پروفیسر کے، ٹی شاہ اور مولانا حسرت موہانی جیسے سینکیا پہلوان ہیں جن سے اپنا لنگر آپ نہیں سنبھلتا۔ مگر اس گول اکھاڑے کے اندر جسے اسمبلی کہتے ہیں کچھ ہاتھ پاؤں یا تیر تلوار کی لڑائی تھوڑی ہوتی ہے یہاں تو زبان کی کاٹ کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس میں ہمارے یہ دونوں بوڑھے ساونت کسی سے کم نہیں۔ ویسے تو پالا کانگریس والوں کے ہاتھ ہے، اور جب تک دوسرے انھیں چناؤ میں جیت نہ کر لیں راج پربندھ میں ان ہی کی چلتی رہے گی، پر جنتا راج کا قاعدہ ہے کہ ایک مخالف دل ہونا چاہئے جو حکومت والوں کو جھاڑتا اور (بقیہ صفحہ ۴ پر)

پچھلا ہفتہ :-

۱۔ ہندوستان

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں

آئین ساز اسمبلی آئین کے مسودے کی دوسری پڑھائی ۱۵ اگست تک ختم نہیں کر سکی اہم مسائل میں اب صرف حق ملکیت کا مسئلہ، ملک کے نام، قومی زبان وغیرہ کے مسئلے باقی رہ گئے ہیں لیکن اسمبلی کے بعض ممبروں کو خدا نے "ما عطلکی زبان" عطا کی ہے جس کی شاعر کو تمنا تھی اور جس کی تعریف میں اس نے کہا ہے

عجب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

اس لئے اسمبلی کا اجلاس ہے کہ کھنچتا چلا جاتا ہے۔ دیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قومی زبان اور صوبوں کی زبانوں کے بارے میں جن دفعوں کا مسودہ کے ایم، منشی اور شری گوپالا سوامی آئنگر نے مل کر تیار کیا ہے، اُن پر اسمبلی کی کانگریس پارٹی تین چار روز کی گرما گرم بحثوں کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ ان دفعات میں زبان کے پیچیدہ مسئلے کا معقول حل تجویز کیا گیا ہے جس میں ضمناً اردو زبان کے تحفظ کی بھی اچھی خاصی صورت نکل آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اختلاف صرف انتا رہ گیا ہے کہ جنوبی ہند کے ممبر اور ان کے ہمدرد قومی زبان میں انگریزی ہندسوں کے استعمال پر زور دے رہے ہیں اور ہندی کے حامی اس کے خلاف ہیں۔ ابھی تک مصالحت کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے شاید سردار ولبھ بھائی پٹیل کی واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ بہرحال ہندسوں کا معاملہ جزوی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ سب فریقوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ قومی زبان کو عام بول چال کی ہندوستانی سے دور نہیں ہٹنا چاہئے، اور صوبوں کی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور رسم خط کو بھی حکومت کی حمایت حاصل ہونی چاہئے۔ مجوزہ دفعات کے پاس ہو جانے کے بعد ہم ان کو نقل کر کے ان پر تفصیل سے تبصرہ کریں گے۔

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ خطرہ بہت سے لوگوں کے دل میں اس وقت سے پیدا ہو گیا ہے جب سے یہ

خبر آئی کہ ہندوستان کو ورلڈ بینک سے پہلی قرضے کی رقم ریل کے انجن اور دوسرا سامان خریدنے کے لئے ملی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وادی دامودر، بھاکرا اور ننگل کی پن بجلی کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لئے کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر (تقریباً ۲۸ کروڑ روپے) کے مزید قرضے کی گفتگو اسی بینک سے ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ہیرا کُنڈ کے زبردست منصوبے کے لئے ایک نئے قرضے کی درخواست کرنے کی تجویز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب منصوبے جن کے لئے قرض لیا جا رہا ہے ہندوستان کی زراعت اور صنعت کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں اور ان سے ملک کی خوشحالی میں بہت جلد نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو سامان درکار ہے اس کا بہت بڑا حصہ صرف امریکا ہی سے مل سکتا ہے۔ اور اس کے خریدنے کے لئے ڈالر صرف قرض ہی کے ذریعے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر بھی اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ آج کل کوئی ملک دوسرے ملک کو محض خلوص نیت سے یا صرف ... کی خاطر قرض نہیں دیا کرتا بلکہ اس کے ذریعے سے اس ملک میں اپنا سیاسی اثر قائم کرتا ہے اور اس سے اپنے مقاصد کے لئے کام لیتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس قرض کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی شاید یہ کہا جائے کہ یہ قرض کسی خاص ملک سے نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی ادارے سے لیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے شبہہ کرنے والوں کو اطمینان نہیں ہوتا اس لئے کہ ان اداروں پر امریکا کا جس قدر تسلط ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اگر حکومت لوگوں کے دل سے اس خلش کو مٹانا چاہتی ہے تو اُسے ان شرطوں کو تفصیل سے شائع کرنا چاہئے جن پر قرض لیا گیا یا لیا جا رہا ہے۔

بڑی چوکسی کی ضرورت ہے

وزیر بحالی شری موہن لال سکسینہ نے ۲۹ اگست کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

ہندوستانی مسلمانوں کو اس ضابطے سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں جو تارکین وطن کی املاک کو حکومت کے انتظام میں لینے کی متعلق جاری کیا گیا ہے یہ صرف ان لوگوں کی املاک کے لئے ہے جو ہندوستان سے ترک سکونت کر کے پاکستان چلے گئے ہیں

یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جو پالسی اس وقت مہاجرین کی جائداد کے بارے میں اختیار کی گئی ہے وہ قانونی نہیں بلکہ انتظامی ہے اور صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ دونوں ملکوں کی باہمی گفت و شنید یا بین الاقوامی عدالت کے ذریعے سے اس مسئلے کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو جائے، لیکن اس عارضی پالسی کے غلط استعمال سے لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے اور بعض صورتوں میں پہنچ رہا ہے اور ان کی شکایتیں اور شبہے اس طرح کے اعلانوں سے دور نہیں ہو سکتے دونوں حکومتوں کو انتہائی چوکسی کی ضرورت ہے کہ نیا ضابطہ مقامی افسروں اور پولیس کے ہاتھوں میں بے گناہوں کو لوٹنے اور ستانے کا ایک نیا آلہ نہ بن جائے۔ ایک تو اس ضابطے کے عمل درآمد پر حکومت کو خود کڑی نگرانی رکھنی چاہئے، دوسرے ہر صوبے میں خاص عدالتیں مقرر ہونی چاہئیں جن میں ان شکایتوں کی جو لوگوں کو اس سلسلے میں پیدا ہوں جلد اور آسانی سے دادرسی ہو سکے۔

دیکھئے

اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ہوئے ہیں، وہاں ایک فائدہ بھی ہوا، اور وہ یہ ہے کہ اُن کی مذہبیت کے سینے سے اوپر کے طبقے کے سیاسی اور معاشی مفاد کا کانٹا نکل گیا اور اب ان کے مذہبی احساس کو آسانی سے سانس لینے کا، اپنے آپ کو پہچاننے کا اور حقیقی راہِ حل ڈھونڈھنے کا موقع ملا ہے اور اب ان غریب بے مایہ مسلمانوں کو جو ہندوستان میں باقی رہ گئے ہیں سرمایہ پرستی کی کسی کھلی یا چھپی ہوئی صورت کے متعلق یہ یقین دلانا کہ یہی تمہارا مذہب ہے قریب قریب ناممکن ہے۔ اب صرف ترقی

پسند تحریکیں ان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔

یہ وقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان دنیا کے مسلمانوں کی بھی اور گھر والوں کی بھی آرزو کو پورا کریں یعنی اپنے مذہب کو آج کی روشنی میں سمجھیں اور آج کی اصطلاح میں سمجھائیں اور اسے ایک بار پھر دنیا کے لئے امن و ترقی کی زبردست قوت بنا دیں اگر انھوں نے اب بھی اس میں غفلت کی تو وہ ترقی پسند تحریکوں کے دھارے میں ذی ارادہ تیراک کی طرح تیرنے کے بجائے بے حس اور بے جان تنکوں کی طرح بہتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے اسلام کی حقیقی تعلیم کو سمجھ کر اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنا لیا تو شاید وہ انقلابی تحریکوں کو اپنے شعور، ارادے اور مقاصد کے سانچے میں ڈھال سکیں اور ان میں وہ روح معنی اور سوز باطن پیدا کر سکیں جن سے وہ اب تک محروم ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر سب کچھ کھو کر وہ اپنی روح کو، روح اسلام کو پا لیں تو سودا کچھ مہنگا نہیں رہے گا۔

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

جھنجھوڑتا رہے، نہیں تو طاقت کا نشہ ایسا بُرا ہوتا ہے کہ اچھے بھلے آدمی کی مت ماری جاتی ہے۔ اب تک تو یہ تھا کہ اِکّا دُکّا کسی نے حکومت کو ٹوکا بھی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ پر اب بارہ تیسّے مل کر ٹیں ٹیں کریں گے تو نقارچیوں کے کان تک بھی کچھ نہ کچھ آواز پہنچ ہی جائے گی کہو کچھ آیا سمجھ میں؟

ا۔ آہو سانو سمجھ آگئی

ب۔ بڑی جلدی آ گئی۔ تم کہو ماسٹر؟

ج۔ برابر بات ہے؟

ب۔ ہے نہ بالکل چورس! اور تم بابو؟

د۔ آمی کھوب شو مجھ گیا۔

ب۔ بوبڑی پھر کیا ہے! تم شب کو شبھ دو۔

ہم "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں سے معافی چاہتے ہیں کہ اخبار کی نئی ترتیب جس کا ہم نے اعلان کیا تھا اس بار عمل میں نہ آسکی، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ۸ یا ۱۶ ستمبر کے پرچے سے ضرور شروع ہو جائے (ادارہ)

۲ - پاکستان

مغربی پنجاب کی سیاست میں نیا موڑ

سردار عبدالرب نشتر گورنر مغربی پنجاب کو عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور عام طور پر یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ صوبے کی پیچیدہ اور الجھی ہوئی سیاست کو سلجھانے میں بھی وہ کامیاب رہیں گے ان کی مدد کے لئے لیاقت علی خاں صاحب بھی لاہور تشریف لائے تھے، ان کی آمد کو سیاسی حلقوں میں بڑی اہمیت دی گئی اور ان کے پانچ روزہ قیام سے وہاں کی سیاست میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔

مغربی پنجاب کا ـــ بلکہ کہنا چاہئے کہ پورے پاکستان کا آج کل سب سے اہم مسئلہ گورنر کے مشیروں کا تقرر ہے۔ ممدوٹ کی علیحدگی اور پاکستانی گورنر کے تقرر سے۔ میاں عبدالباری صدر مسلم لیگ مغربی پنجاب کے مخالفین کو کام کرنے کا نیا اور مناسب موقع مل گیا ہے چنانچہ ۸۰ ممبروں نے مشیروں کے تقرر پر غور کرنے کے لئے کونسل کو بلانے کی درخواست کی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں کونسل کو اپنے پچھلے فیصلے پر نظر ثانی کا موقع دینا چاہئے۔ بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اگر یہ مسئلہ دوبارہ زیر غور آیا تو اکثریت مشیروں کے تقرر کے خلاف رائے دے گی اور بہت ممکن ہے کہ میاں عبدالباری کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز بھی پیش ہو۔

اقتدار کی جنگ

میاں ممدوٹ کے استعفے کے بعد باتفاق رائے جب میاں عبدالباری پاک پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر چنے گئے تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر ہے مسلم لیگی قیادت کے آپس کے جھگڑے ختم ہوئے اور امید ہے کہ اب تعمیری کاموں کی طرف توجہ کر سکے گی اور عوام مسلم لیگ سے جو توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں وہ پوری ہو جائیں گی اور اس صوبے کے دن پھر جائیں گے۔

میاں عبدالباری نے تعمیری کام کے ابھی کچھ خاکے ہی بنائے تھے کہ وہ "ممدوٹ کو ہٹاؤ" کی بحث میں پھنس گئے۔ یہ بحث جس طرح اٹھی اور اس کے اٹھانے میں جو لوگ پیش پیش تھے اس سے لوگوں میں خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور مسلم لیگی قیادت بھی دو دھڑوں میں بٹ گئی اور صوبہ مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، جائنٹ سکریٹری اور مجلس عاملہ کے چند ارکان مستعفی ہو گئے۔

ممدوٹ کے جانے سے یہ ناخوشگوار بحث ختم ہو گئی چنانچہ ۱۱ اگست کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جنرل سکریٹری اور دوسرے عہدہ داروں کا باتفاق رائے انتخاب عمل میں آیا اور ایک بار پھر امید بندھی کہ مسلم لیگی رہنما مل جل کر اور متحد ہو کر صوبے کی قیادت کو سنبھال لیں گے اور اس وقت صوبے کے اندر جو خلفشار برپا ہے اس کا دور کرنے کا سد باب کریں گے۔

لیکن یہ جان کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ۱۱ اگست کو تو ہمارے یہ لیگی رہنما باتفاق رائے عہدہ داروں کو منتخب کرتے ہیں لیکن دوسرے ہی دن ان میں ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے دھڑے بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک گروہ سمجھتا ہے کہ چونکہ میری پسند کے لوگ عہدہ دار منتخب نہیں ہو سکے اس لئے دوسرے گروہ سے ٹکر لئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ اس کے لئے حلیف ڈھونڈے جا رہے ہیں۔ مختلف اغراض، ولولوں کو ابھارا جا رہا ہے۔ اندر ہی اندر جوڑ توڑ ہو رہے ہیں۔ سازشیں کی جا رہی ہیں۔ کہیں زمینداری کی حفاظت کا نام لیا جاتا ہے اور کہیں سابقہ "غداریاں" یاد دلا کر ڈرایا جا رہا ہے۔ الغرض ایک چکر ہے جو صوبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چل رہا ہے۔ تعمیری کاموں کو سب بھول گئے ہیں۔ اور اپنے گروہ کے لئے اقتدار حاصل کرنا ہر شخص کا مقصد بن گیا ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ جوں جوں انتخابات کے دن قریب آئیں گے، یہ چکر زیادہ وسیع اور زیادہ تیز ہوتے جائیں گے اور ممکن ہے ہماری ساری سیاست انھی چکروں میں مٹ کر رہ جائے اور کسی کو صوبے اور عوام کا خیال تک نہ رہے۔

(آفاق، لاہور)

مغربی پنجاب میں انتخابی تیاریاں

پاک پنجاب میں آئندہ انتخابات کی تیاریاں بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہو رہی ہیں۔ چونکہ رائے دہی کا معیار بدل جانے سے حلقوں کی توسیع ہو گئی ہے، اس لئے نئے حلقوں کی حد بندی کے سلسلے میں مختلف اصحاب دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کی کوشش ہے کہ حلقے اس ترکیب سے بنائے جائیں کہ ان کی یا ان کے امیدواروں کی کامیابی یقینی ہو جائے۔ چنانچہ انتخابی کمیٹی کے صدر کے بنگلے پر اچھا خاصا ہجوم رہتا ہے۔ اگرچہ صاحب صدر محض سفارشات ہی کریں گے اور ان کا خیال ہے کہ سفارشات میں اہم اور مقدم چیز صوبے کا مجموعی مفاد اور امیدواروں کے لئے اصطلاحی آسانیوں کا خیال ہوگا۔ تاہم ممبری کے امیدوار اور ان کے سگے نباہے اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی دھن میں ہیں۔ پرانے یونینسٹ بھی پر پرزے نکال رہے ہیں بعض اصحاب کی کوشش ہے کہ ان کی اپنی برادریوں یا برادری کی اکثریت کے مطابق حلقے بنیں اس سارے ہنگامے میں بیچارے مہاجر اپنی تقدیر کا تماشا بنے ہوئے ہیں اور مہاجرین کی طرف سے انتخابی تحقیقاتی کمیٹی میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی نامزدگی بھی تقدیر بدل دینے والی ہے، کیونکہ مہاجر ابھی نہ معاشی طور پر بحال ہوئے ہیں نہ انھیں اپنے آئینی حقوق کے متعلق کوئی خاص اطمینان ہے۔ حلقوں کی تقسیم اس بارے میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، لیکن اب تک حلقوں کی جس ترتیب کا پتہ لگا ہے وہ مہاجرین کے ساتھ انصاف نہیں کرتی خصوصاً منتقل کئے وہ علاقے جہاں مہاجرین کی اکثریت ہو سکتی ہے ابھی تک معرض بحث میں ہیں اور ان کے متعلق اطمینان آمیز فیصلہ نہیں ہوا۔ حلقوں کی تقسیم میں مہاجرین کی اکثریت کا خیال بہت اہم جز ہے۔ کیونکہ محض ایک تعداد ہی ان کے پاس رہ گئی ہے اور اگر بروقت ادھر توجہ نہ دی گئی تو دوڑ دھوپ کرنے والے حضرات بہرحال فائدے میں رہیں گے صاحب صدر کو یہ متاثر نہ بھی کر سکیں تو بھی ان کا اپنے معاشی، اور آئینی حقوق کے متعلق اطمینان ان کی کامیابی کا ضامن ہوگا۔

(سفینہ، لاہور)

کپڑا سستا، مگر بے روزگاری کا خطرہ

کپڑے اور سوت پر سے کنٹرول ہٹا لینے سے پاکستان میں کپڑے کی قیمتیں بہت گر گئی ہیں اور عوام پر اس کا نہایت خوشگوار اثر پڑا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے دیسی پارچہ بافی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا ہے اور اگر یہی کیفیت رہی تو بی۔ اے مختیار صدر فیڈریشن آف مغربی پنجاب ٹکسٹائل اینڈ ہوزری مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کے بیان کے مطابق مغربی پنجاب میں کوئی ساڑھے تین لاکھ مزدور بیکار ہو جائیں گے اور اس کا کوئی ۱۲ لاکھ پر اثر پڑے گا۔ اس صنعت میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا سرمایہ مہاجرین کا بھی ہے۔ اس لئے اس صنعت کی تباہی سے مہاجرین کو بھی بہت سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ انھی اسباب کی بنا پر مختیار صاحب نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ بدیسی کپڑے اور ہوزری کے سامان کی درآمد بالکل بند کر دی جائے اور سوت پر دوبارہ کنٹرول لگا دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی تجویز کی ہے کہ حکومت مغربی پنجاب کی چار ٹکسٹائل ملوں پر قبضہ کرے اور ان کو تین پالیوں (شفٹ) میں چلائے۔ اس طرح انھیں امید ہے کہ مغربی پنجاب میں ہاتھ کے کپڑے کے لئے جس قدر سوت کی ضرورت ہوگی وہ ان ملوں سے پوری ہو جائے گی۔

تعلیمی معیار

پاکستان کے قیام کے بعد تعلیمی معیار بلند ہونے کی بجائے گر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اسکولوں کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں ابھی تک اسٹاف کی کمی پوری نہیں ہو سکی، طلبا کی تعداد بکثرت ہے۔ مگر ان کے پڑھانے کے لئے استادوں کی کمی ہے۔ اساتذہ کرام کی کمی اس لئے ہے کہ انھیں تنخواہیں بہت کم ملتی ہیں، کئی مدارس میں جو لوکل بورڈوں کی تحویل میں ہیں انھیں دو دو تین تین ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔ معائنہ کنندگان افسران کا یہ حال ہے کہ وہ کئی اسکولوں میں دو دو، تین تین سال سے معائنہ کے لئے تشریف ہی نہیں لے گئے۔ روزنامہ سعادت، لائل پور

۳- باہر کی دُنیا

انڈونیشی یونین کیسی ہو؟

ہیگ میں گول میز کانفرنس اطمینان بخش طریقے پر ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو فریق سنجیدگی کے ساتھ اختلافی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انڈونیشیا کا مقدمہ اب تک کامیابی کے ساتھ اس لئے چل رہا ہے کہ ریپبلکن اور فیڈرلسٹ پارٹی میں پائدار اتحاد ہے، لیکن تفصیلات میں آنے کے بعد بعض مسائل میں دونوں پارٹیوں کی رایوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اختیارات کی منتقلی کے بارے میں دونوں متفق ہیں مگر یونین کے ڈھانچے کے بارے میں اب تک اتفاق رائے نہیں ہے۔ ریپبلکن ہالینڈ سے محض برائے نام تعلق رکھنا چاہتے ہیں، ٹھیک ویسا ہی جیسا ہندوستان کا برطانیہ سے ہے۔ برخلاف اس کے فیڈرلسٹ بہت پائدار اور گہرا تعلق رکھنے کے حق میں ہیں۔ بالکل یہی خیالات ہالینڈ کے نمائندوں میں بھی ہے قدامت پسند جس کی رہنمائی پروفیسر کارل رومے (کیتھولک) کر رہے ہیں۔ گہرا تعلق رکھنے کے حامی ہیں اور لیبر لیڈر موسیو ڈان ڈرس کا خیال ہے کہ یونین جس قدر کمزور ہو گی انڈونیشیا اور ہالینڈ کے تعلقات اسی قدر زیادہ اچھے اور پائدار ہوں گے۔

بہرحال یہ اختلاف رائے اس حد تک نہیں ہے کہ یہ کانفرنس ناکام رہے یا ریپبلکن اور فیڈرلسٹ کا اتحاد ٹوٹ جائے۔ مگر اس کی وجہ سے یہ خدشہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ ہالینڈ کو اپنی شرطیں منوانے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

مشرق وسطیٰ میں فوجی تیاریاں

انجمن اقوام متحدہ نے جون ۱۹۴۸ء میں مشرق وسطیٰ کو ہتھیار بھیجنے پر جو پابندی لگائی تھی اس کے اُٹھ جانے سے برطانیہ کو عرب ریاستوں کو مسلح کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا ہے چنانچہ آج کل عرب ریاستوں کی فوجوں میں نہایت تیزی کے ساتھ توسیع ہو رہی ہے اور جدید تربیت [illegible]

ان کو بیس کیا جا رہا ہے

مصر میں سب سے بڑی فوج تیار کرنے کی اسکیم بنائی گئی ہے اسی سلسلے میں بجٹ میں ۹ کروڑ ۰ لاکھ مصری پونڈ مدافعت کے لئے، تین لاکھ مصری پونڈ جدید ہتھیار کے لئے، اور ایک کروڑ مصری پونڈ جنوبی فلسطین کی مصری فوج کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ شام میں مرحوم حسنی الزعیم کا اس سال کے آخر تک ۴۰ ہزار کی ایک بہترین فوج تیار کرا لینے کا ارادہ تھا اس کے لئے انھوں نے بہت سے افسر ٹریننگ کے لئے فرانس بھیجے تھے اور خود شام میں بہت سے ٹریننگ مراکز قائم کئے تھے۔ اسی طرح لبنان میں بھی بہت تیزی سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جبری بھرتی کا قانون اس وقت زیر غور ہے۔ عراقی فوج جدید طریقوں پر تیار کی جا چکی ہے اور وزیر مدافعت راجد ارسلان نے اعلان کیا ہے کہ فوج کو جدید طریقوں پر ٹریننگ دینے کا کام بہت جلد شروع ہونے والا ہے۔ شرق اردن کی فوج کا مشرق وسطیٰ کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتا ہے مگر پھر بھی اس میں مزید توسیع کی جا رہی ہے اور برطانیہ سے بہت کافی ہتھیار بہت جلد پہنچنے والا ہے۔ غرض تمام عرب ریاستیں روس اور اسرائیل کے مقابلے کے لئے اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے اور اس کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں اور برطانیہ ان کی دل کھول کر مدد کر رہا ہے۔

اسرائیل کی جوابی کارروائی

ظاہر ہے اسرائیلی حکومت ان تیاریوں سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ تو پہلے سے چیکوسلوواکیہ کی معرفت باہر سے ہتھیار منگا رہی ہے۔ اس کے علاوہ خیال ہے کہ پانچ چھ مہینے میں ایران اور سعودی عرب سے برطانیہ اور امریکا کا تیل خلیج عقبہ سے حیفہ تک ایک نئی پائپ لائن کے ذریعے لایا جائے گا۔ ایسی صورت میں نہر سویز کی موجودہ اہمیت جاتی رہے گی اور اسرائیلی حکومت کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔

خیال

تیغ الٰہ آبادی

اُف یہ صدیوں کا دل یہ بارِ گراں
اونگھتے پیڑ، سرنگوں کلیاں
مضمحل نور، مضمحل خوشیاں

اَن گنت خواب، اَن گنت ارماں
اَدھ کھِلے پھول اَدھ کھِلی کلیاں
غمِ دوراں نہیں — غمِ جاناں

بادشاہوں کا قصۂ من و تو
تیرہ سکّوں کا تیرہ تر جادو
سُرخ تاریکیاں، سیاہ لہو

منتشر وقت، منتشر گیسو
بے اثر آہ، بے اثر آنسو
غمِ جاناں نہیں — غمِ دوراں
ذہن کی قبر، دِل کا ویرانہ

فکرِ روزی، تلاشِ میخانہ
نارسِ بے تاب، قیسِ دیوانہ
تلخ تحقیق، تلخ افسانہ

مردہ تنویر، مردہ پروانہ
غمِ جاناں ہے اور غمِ دوراں
الغرض، اِک نہ اِک غمِ گل و خار
فلسفے کا خمار، عشق کا بار
دِل کی بے چارگی، دماغ کی ہار

حسرتِ صلح، حسرتِ پیکار
کبھی تریاقِ غم، کبھی تلوار

صیدِ ابلیس، کشتۂ یزداں
حیف صد حیف حضرتِ انساں

ساحرِ فن

علی حمّاد عباسی

اپنے سینوں میں سمیٹے ہوئے تاریکیٔ شب
نور کی سمت نہ جانے کی قسم کھائے ہوئے
خشک ہونٹوں پہ لئے تشنہ لبی کی لعنت
کتنے ہی جام تصوّر کے ہیں چھلکائے ہوئے
شدّتِ درد کی بے کیف گراں باری میں
اپنے انفاس کے ہر تار کو اُلجھائے ہوئے
کوئی خواہش، نہ تمنا، نہ کوئی جوشِ عمل
روز و شب زیست کے ہنگاموں سے اُکتائے ہوئے
کسی اُجڑے ہوئے مجبور پرندے کی طرح
غم کو سمجھے ہوئے، پرکھے ہوئے اپنائے ہوئے
انھی رزّاقوں کے گراں بار سلاسل کے تلے
بنتے ہی جاتے ہیں موہوم اُمیدوں کا کفن
اُن کے خوابوں میں بھی آئی نہ سحر کی تصویر
اب بھی کھوئے سے ہیں ویرانوں میں یہ "ساحرِ فن"
اُن کے احساس کے تاریک صنم خانوں میں
فہم و ادراک و توازن کی جلا کر قندیل

ان کو معلوم نہیں رقصِ فضا ہے کیا چیز؟
پھول کھِلتے ہیں کہاں آتی ہے کب فصلِ بہار؟
مُسکرا اُٹھتے ہیں کس طرح شہابی چہرے؟
آنکھیں ہو جاتی ہیں کیوں شرم و حیا سے سرشار؟
دور تک پھیلے ہوئے غم کے شبستانوں میں
صبحِ اُمید ہوا کرتی ہے کیسے بیدار
ہو کے مزدورِ طرب نائے فردا میں مگن
کیوں نہیں کرتا کبھی اپنی شکستوں کا شمار؟
کتنے آلام و مصائب کے تلے دب کر بھی
نوعِ انسان نہ ہوئی کیسے ہزیمت کا شکار؟
کتنے ہی اُلجھے ہوئے درد ہیں انسانوں کے
جن کی پہنائی سے ہیں اُن کے یہ نغمے محروم
اُن کے گیتوں میں سسکتے ہوئے ارماں بھی نہیں
آتے ہی جلتے یہاں ڈوب گئے کتنے نجوم
کوئی نقّاد مرے کہنے سے اتنا کر دے
نورِ تنقید سے ہر سمت اُجالا کر دے

غالب کے اردو کلام میں فارسی عنصر

عبدالقادر، میسور یونیورسٹی

جیسے جیسے اردو شاعری کا ذوق لوگوں کے دلوں میں بڑھتا جارہا ہے، اسی قدر غالب کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کے شاعر کی حیثیت سے غالب کی شہرت تمام تر اس کے مختصر دیوان پر مبنی ہے جس میں درج شدہ غزلوں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس مختصر دیوان کی کئی شرحیں چھپ چکی ہیں اور نہیں معلوم کتنی اور چھپیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے محاسن اور معائب گنائے گئے ہیں، مگر اب تک شاید ہی کسی کی نظر اس کے اردو کلام میں پائے جانے والے فارسی عنصر کو ڈھونڈ نکالنے پر پڑی ہو۔

یہ بات مسلّم ہے کہ غالب فارسی کا ایک جیّد عالم تھا اور اس کو اپنی فارسی پر ناز تھا۔ اس صورت میں اردو شاعری کی طرف جب اس کی طبیعت نے رُخ کیا تو کیا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اس کی فارسی کا اثر اس کی اردو پر نہ پڑا ہو۔ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل گوئی کی تاریخ پر خامہ فرسائی کرنے والے تقریباً سب کے سب اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اس کی بنا ڈالنے والے اور پرداخت کرنے والے فارسی گو شعرا تھے، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اردو شاعری فارسی کی بیٹی ہے۔ فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر کتنا پڑا، اس پر بحث کرنا موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ بقول پروفیسر شیرانی "اگر اردو زبان کو یا یوں کہیے اردو شاعری کو اس کے نشوونما کے ابتدائی مرحلے پر فارسی کا سہارا نہ ملتا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کو اس قدر جلد ترقی نصیب ہوتی" (اقتباس از اردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۲۲)

کہا جاتا ہے کہ فارسی گو شعراء اپنے تفریح خاطر کے لیے یا تفنن طبع کے لئے اردو اشعار لکھ لیتے تھے چنانچہ امیر خسرو جن کو اردو شاعری کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے اُن کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ وہ خاقانی، انوری، فردوسی وغیرہ مستند شاعروں کی زبان کو چھوڑ کر جب ہندی فارسی آمیز پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ لکھتے تو اپنی طبیعت کو بہلانا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ امیر خسرو کے بعد جس اردو شاعر نے فارسی کا زیادہ اثر قبول کیا وہ ولی اورنگ آبادی تھا جس کے اردو دیوان کا اثر دہلی کے شعراء پر بھی پڑا اور سب نے فارسی الفاظ اور تراکیب کو ملا کر فارسی اوزان میں غزل لکھنا شروع کیا۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم نے لکھا ہے "ولی کے زمانے سے میر کے زمانے تک بلکہ آگے چل کر غالب کے زمانے تک شعراء برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان کی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ اپنی زبان میں کریں اور اس طرح اردو میں نئی ترکیبوں اور نئے محاوروں کا اضافہ کیا جانے لگا۔

دوسرے شاعروں کو چھوڑ کر ہم صرف غالب کو لیتے ہیں جس کے ابتدائی کلام میں فارسی کا غلبہ اتنا ہے کہ اس کے دوست احباب اس سے سلیس عبارت میں لکھنے کی درخواست کرتے ہیں اس کے جواب میں انھوں نے خاموشی اختیار کی، اس پر بھی لوگ انھیں تنگ کرنے لگے تو انھیں لکھنا پڑا۔

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

اور ابنائے زمانہ اور معاصرین کے نہ سمجھنے کا اس طرح شکوہ کیا ہے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس کے بعد زمانے کو آسان اور سہل مضامین کی طرف دیکھ کر سیدھے اور صاف شعر کہنے لگے تو افسوس کے طور پر انھیں لکھنا پڑا ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

غالب کا خیال اپنے اس کلام اردو کے متعلق جس میں فارسی کا غلبہ ہے مذکورۂ ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس شعر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب کو اپنی فارسی پر جتنا ناز تھا اتنا فخر ان کو اردو شاعری پر ابتدا میں نہیں تھا لیکن اردو شاعری کی روز افزوں مقبولیت نے انھیں یہ شعر کہنے پر مجبور کیا تھا کہ

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

غالب کے پرستاروں نے ان کی اردو شاعری کی اتنی قدر کی اور ابھی کر رہے ہیں کہ آج سوائے اردو غزلوں کے فارسی کلام کا مطالعہ گنتی کے چند افراد ہی کرتے ہوں گے اور پھر ان کے کلام اردو میں جس قدر جدت، شیرینی اور تناسب ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فارسی کے بے بدل ماہر تھے اور اگر وہ فارسی کے بلند پایہ ادیب نہ ہوتے تو یہ باتیں اُن کے کلام میں شاید نہ شامل ہوتیں۔

غالب کے اردو کلام میں پائے جانے والے فارسی عنصر کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ تقریباً سب غزلیں فارسی بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد فارسی ترکیبیں، فارسی بندشیں، فارسی الفاظ اور محاورات کثیر تعداد میں مستعمل ہیں۔ اکثر شعر ایسے ہیں جن میں سوائے ایک فعل کے باقی سب کلمات فارسی کے ہیں اور اس ایک فعل کو اگر بدل دیا جائے تو بجائے اردو کے وہی مصرعہ یا شعر فارسی کہلایا جائے گا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

دوسرے مصرعہ میں تھا کی جگہ "بود" لکھ دیا جائے تو یہی مصرعہ فارسی کہلائے گا۔

ایک اور شعر

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر میں سوائے ایک فعل پسند آیا کے باقی سب الفاظ اور ترکیبیں فارسی کی ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

غالب کی ابتدائی غزلوں میں اکثر ایسے شعر ملتے ہیں جن کے پہلے یا دوسرے مصرعے کے بغیر کسی تبدیلی کے فارسی کہلا سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) بیمِ گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل — پہلا مصرعہ
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(۲) بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم — دوسرا مصرعہ

(۳) وشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ — پہلا مصرعہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

(۴) رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں — پہلا مصرعہ
نالۂ مرغ سحر تیغ دودم ہے ہم کو

غالب کے ابتدائی کلام کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس نے اپنے اسلاف کے کلام سے بھی استفادہ کیا۔ اس کی مثالیں بہیں اس کے دیوان کے کئی اشعار میں ملتی ہیں چنانچہ غالب کے اردو دیوان کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کے اس شعر کو بعض لوگ بے معنی سمجھتے ہیں۔ اور ایسا اعتراض کرنے والا طبقہ وہ ہے جو فارسی سے نابلد ہے کیونکہ کاغذی کپڑے پہن کر حاکم کے آگے جانے کا خیال فارسی کے دو ایک شاعروں کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے بابا فغانی کہتے ہیں

تاکہ دست قدر از دست تو بربود قلم
کاغذیں پیرہن از دست قدر یا کہ مرا

ایک اور شعر کمال اصفہانی کا ہے۔

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد
زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

غالب کا ایک مشہور شعر ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اس شعر کا مقابلہ خواجہ حافظ شیرازی کے مذکورالذیل شعر کے ساتھ کیجیے

مرا از قدح بادۂ سرمدیست
وزیں بادہ مقصودِ من بے خودیست

غالب کے پرستار بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہی وہ شاعر تھا جس نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کو نئی نئی ترکیبوں سے مالا مال کیا، لیکن ان نئی ترکیبوں پر جن کے سبب سے غالب کو غزل گو شعرا سے بڑھ کر درجہ عطا کیا جاتا ہے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سب فارسی بندشوں سے ملو ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں چند ترکیبیں بیان کی جاتی ہیں: موئے آتش دیدہ صبر گریز پا۔ غنچہ ناشگفتہ، آب ہفت دریا۔ خندہ دنداں نما شانہ کشش وغیرہ۔

مضمون کے طویل ہو جانے کے خوف سے ایسے اشعار جن میں یہ ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں نقل نہیں کئے جاتے

لفظ وے لیکن کے معنی میں الفاظ بس کہ اور ازبس کہ وغیرہ کا استعمال ہمیں غالب کے اشعار میں نظر آتا ہے مثلاً

(۱) ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں وَلے اُن کی تمنا نہیں کرتے

(۲) لیتا ہر نیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

ازبس کہ کا استعمال:-

زبس کہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشادہ دست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

زبس کہ کا استعمال:-

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

بس کہ کا استعمال:-

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فارسی میں گر بمعنی شاید استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے مگر کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے شعر ملاحظہ ہو

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

غالب کے کلام میں مہینوں کے فارسی نام ورآنے والے اور گذرے ہوئے دن کے لئے فردا و دی بھی ہمیں ملتے ہیں مثلاً

(۱) فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

(۲) شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

(اردی بہار کا موسم اور دے جاڑے کا مہینہ جس میں خزاں ہوتی ہے۔)

تلمیحات سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں، تلمیحات کے استعمال سے شاعری میں اختصار ہوتا ہے اور وہ موثر بھی ہو جاتی ہے۔ غالب کا تعلق ہندوستان سے تھا، ہندوستان کے بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں اس کی رسائی تھی۔ دن رات ان کو ہندوستان کے رسوم نظر آتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان کے اٹل پہاڑ تھے، وسیع میدان اور کشادہ دریا اپنا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہندوستان کے گلزاروں میں قسم قسم کے پھول کھلتے تھے اور گوناگوں پرند چہچہے لگاتے تھے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے غالب کو کبھی اپنی اردو شاعری میں انھیں داخل کرنے کا خیال نہیں آیا اس کے برعکس جب کبھی ان کا ذکر کیا جاتا تو وہ ایران کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔ مختصراً اتنا کہا جاسکتا ہے کہ تلمیحات کا استعمال جہاں کہیں غالب کے کلام میں ہوا ہے اس میں ہندوستان کی جھلک نام کے لئے بھی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ فارسی گو شعرا کے کلام میں استعمال شدہ تلمیحات ہی نظر آتی ہیں، مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں:-

(۱) میرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و دارا و بہمن کو

(۲) عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

(۳) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

قدر گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

لیلیٰ اور مجنوں کا تعلق سرزمین ایران سے نہیں بلکہ عرب سے تھا۔ لیکن ان ناموں کو مانوس کرانے والے عرب نہیں تھے۔ عربوں کے کلام سے براہ راست یہ نام ہم تک نہیں پہنچے بلکہ ان کا تعارف کرانے والے فارسی گو شعرا تھے اس لئے جہاں لیلیٰ و مجنوں کے نام آتے ہیں اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی فارسی کے اثر ہی کا نتیجہ تھا۔ غالب نے بھی کئی جگہ لیلیٰ و مجنوں کے نام استعمال کئے ہیں مثلاً

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

تختِ سلیمان اور روحِ عیسیٰ جن کا ذکر ہمیں فارسی گو شعرا کے کلام میں ملتا ہے ہم غالب کو بھی استعمال کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مثلاً

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کا ایک مطرب جو فن موسیقی میں کامل تھا باربد نام رکھتا تھا۔ دیکھیے غالب نے اس نام باربد سے کیسا فائدہ اٹھایا ہے لکھا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

غالب کے اردو کلام کا بغور مطالعہ کیا گیا تو ہمیں اور بھی ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی جن پر فارسی عنصر غالب ہے۔ اسی فارسی عنصر کے غلبے کی لوگ شکایت کرتے تھے، اور جب یہ ترکیبیں عام ہو گئیں تو اس کی شاعری کو مستند قرار دیا جارہا ہے، اور یہاں تک لوگ کہنے پر اتر آئے ہیں کہ جدید اردو شاعری کی ایک جھلک ہمیں غالب ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی عنصر کے غلبے کے باوجود بھی ایک باکمال شاعر کا اردو کلام مقبول ہو سکتا ہے۔

بچہ کی پہلی جھلک

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ہلکے ہلکے آپ کی انگلی کو اپنی طرف کھینچنے لگے گا، اور اس طرح تھوڑی سی دیر میں وہ "چوسنے" کی لذت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اس شعوری عمل یعنی چوسنے سے ہم نوزائیدہ بچے کی ذہنی بیداری کا اندازہ لگاتے ہیں۔ یہی چوسنا پھر دودھ پینے میں بدل جاتا ہے۔ ننھے بچے میں بالکل ابتدا میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں وہ صرف قوت لمس ہی سے یہ دیکھتا، سنتا اور سمجھ لیتا ہے کہ اس کے پاس کیا چیز ہے؟ کیسی ہے؟ اور کیا کررہی ہے۔ منہ میں پستان کا آنا اور نکل جانا وہ صرف اسی ذریعہ سے جانتا ہے، باصرہ، سامعہ اور شامہ کی قوتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ نوزائیدہ بچے میں (فہم و فراست) کی قوت اس وقت تک بیدار ہی نہیں ہوتی جب تک وہ باصرہ، سامعہ، شامہ وغیرہ سے آشنا نہ ہو جائے۔ ماں اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ دودھ پلانے میں جب بچے کے منہ سے وہ پستان نکال لیتی ہے تو مطمئن بچہ گھبرا جاتا ہے اور پہلے آہستہ آہستہ منہ بسورتا، اور پھر رونا شروع کردیتا ہے اور جب تک ماں دوبارہ یہ نعمت ادا نہیں کردیتی وہ چپ نہیں ہوتا ——— اپنی اسی فہم و فراست سے وہ اپنی ضرورت اور حاجت کے مقررہ اور معینہ اوقات سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔

اصلی سوراج کیا ہے؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

سوراج نہ کہتا، اور اپنی پوری قوت سے اُسے روکنے کی کوشش کرتا، اس لئے کہ میرے نزدیک ہند سوراج تمام قوم کی حکومت ہے .... اس حکومت کے وزیر خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ .... انھیں ہر حال میں پورا پورا انصاف کرنا ہوگا۔

(مہاتما گاندھی)

بچّہ کی پہلی جھلک

سید محمد حسنین

بچہ پیدائش کے وقت زندگی کا پہلا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ رحم مادر کی پر اسرار و تاریک دنیا میں وہ ایک عجیب اور خاموش زندگی گذارتا ہے، وہاں کسی روشنی کا گذر ممکن نہیں۔ گرمی، سردی کی دھوپ چھاؤں سے اور ماں کے مسلسل تنفس سے وہ ایک مدھم سی آواز سے آشنا ہوتا ہوگا پر یہ ہمارا قیاس ہی قیاس ہے کہ عالم حیات میں آنے سے پہلے بچہ کسی قسم کا تجربہ حاصل کرلیتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عالم وجود میں آتے وقت اُسے چند شدید قسم کے تجربے حاصل ہوجاتے ہیں؛ ایک سخت دباؤ یا کسی موقع پر کشش کی وجہ سے وہ اپنی محدود بند اندھیری دنیا سے باہر آتا اور ہوا کی لہروں کی کھلی ہوئی سرد اور روشن دنیا میں داخل ہوتا ہے، جہاں نت نئی تبدیلیاں اور طرح طرح کی آوازیں ہیں۔ ماحول کی اس ناگہانی تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی وہ مدافعت کے طور پر سہمتے، جھجکتے، کانپتے ہوئے فوراً صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ہوا کی لہریں اس نتھنوں اور پھیپھڑوں میں داخل ہوجاتی ہیں۔ قلب کی دھڑکن بیدار ہوجاتی ہے اور ننھا زندگی کا پہلا سانس لیتا ہے اور زچہ خانہ اس کی نرم اور شیریں آوازوں سے گونجنے لگتا ہے، آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے البیلے چہرے پر ملال نہیں ہوتا، پر یہ اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں، ٹانگوں اور سرخ ملائم انگلیوں والی ہتھیلی کو اپنی پوری طاقت سے سکیڑتا اور بند کرتا ہے۔ اس نئی دنیا میں آتے ہی زور زور سے رونے لگتا ہے۔

پیدا ہونے کے بعد بچے کی حرکتیں بہت کم اور بے معنی سی ہوتی ہیں۔ زبان سے لبوں کو ہلکے ہلکے چوسنا سانسوں سے نتھنوں کو پھولانا اور سکیڑنا۔ رونے میں حلق سے آواز نکالنا، بازوؤں اور ٹانگوں کو سمیٹنا، مٹھیوں کو بھینچنا۔ انگلیوں کو ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ کھولنا اور پھر بند کرلینا اور سر کو ادھر ادھر جنبش دینا۔ الغرض نوزائیدہ بچے کی یہ حرکتیں ہمیں صاف نظر آتی ہیں وہ اپنی بند آنکھوں کو جلد نہیں کھولتا، جیسے جیسے ان ناگہانی تبدیلیوں میں ٹھہراؤ ہونے لگتا ہے، آلائش سے پاکیزگی، گود کی گرمی اور فوری سکون اُسے میسر ہوجاتا ہے۔ اور لپٹے ہوئے کپڑوں کے اندر وہ چپکے چپکے اپنی بند آنکھیں کھول کھول کر اپنے عطا کردہ چین واطمینان کی جھلکیاں لینے لگتا ہے۔ کسی کو متوجہ یا ہم کلام دیکھتے ہی وہ فوراً بڑی آہستگی سے اپنی آنکھیں موند لیتا ہے، جیسے "دور جائیے یہاں سے، مجھے آپ بالکل پسند نہیں"۔ بچہ کی پیدائش کا وقت حاملہ ہماری اولین توجہ کی مستحق ہے۔ ایک شمع دوسری کو بآسانی روشن کر دیتی ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس وقت شعلے کے سانسوں کی ایک خفیف سی تیزی بھی شمع کی لو کے لئے موت کا سبب بن سکتی ہے اور نور ظلمت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ماں اپنی قوت حیات سے ایک حیات نو کی تخلیق کرتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہے، دیکھ بھال کرنے والی کی ایک بھول زچہ بچہ دونوں کے لئے خطرناک نتائج کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس متمدن دور میں بھی جب ہمیں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں ہمارے بیشتر بدنصیب گھرانوں سے ولادت اور موت کی خبریں اکثر ایک ساتھ ہی ملا کرتی ہیں، عورتوں کو دائی گیری کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ علم ان کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر خانہ داری، سلائی یا کشیدہ کاری۔

انسان قدرت کی نگاہ میں ایک 'حیوان' ہے لیکن اس کا درجہ حیوان سے بالاتر ہے۔ انسان کی حیوان پر برتری یا فضیلت اسی وقت صاف دکھائی دیتی ہے جب پیدا ہونے کے بعد ہی بچے کی صورت پر ہماری نگاہ پڑتی ہے۔ انسانی اور حیوانی نومولودوں میں اگر ہم موازنہ کریں تو یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ اول الذکر مادرانہ توجہ و نگرانی کا ثانی الذکر سے بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ انسان کا بچہ حیوان کے بچہ کی بہ نسبت فہم و فراست سے جلد قریب ہونے لگتا ہے یہی برتری قانون قدرت میں تخلیق، تسویہ اور تقدیر کے بعد وہ چوتھا زینہ یا مرتبہ ہے جسے قرآن حکیم نے ہدایت سے موسوم کیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی

میرا مطلب یہ ہے کہ نوزائیدہ کو محض "ایک بچہ" تصور کرنا دانشمندی نہیں۔ اس میں فہم و فراست کا خلقی مادہ ہوتا ہے جس کی نمو اس کی تقدیر کے مطابق عمر کے ساتھ ساتھ اور منزل بمنزل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حیوانوں میں یہ ایک خاصی حد پر آکر تھم جاتی ہے۔ مگر انسان کی تقدیر میں اس طرح کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسے ہدایت کی قوت ودیعت کی گئی ہے اور ذہن انسانی ایک قانون ارتقاء کے تحت روز ازل سے بلند ہوتا چلا آرہا ہے اور ابد تک اُسی طرح بلند ہوتا ہی چلا جائے گا۔

چرند یا پرند کے کسی نوزائیدہ بچے کو دیکھئے، یہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو فراہم اور رفع کرنے میں مادرانہ توجہ کا بہت زیادہ طالب نہیں ہوتا، مرغی کا بچہ انڈے سے باہر نکلتے ہی ماں کو کٹ کٹ کرکے کھاتا دیکھ کر فوراً خود بھی ننھے ننھے دانوں پر چونچ لگانے لگتا ہے انسان کے بچے میں وہ حالت جب وہ دوسروں کا محتاج نہ رہے بہت جلد نظر نہیں آتی۔ ننھا بچہ گویا تالاب کا کنول ہوتا ہے جو پانی سے نکلتے ہی کھل جاتا ہے، ماں گویا تالاب ہوتی ہے اور گہوارہ اور نرسری سطح تالاب پر بہنے والی نرم رو لہریں جو ہر پنکھڑی کو بالیدہ و شگفتہ ترکرتی رہتی ہیں۔ بچے کی حالت و کیفیت کو ہمیں ان خصوصیات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے تاکہ بچہ آغاز ہستی سے ہی ماں کی رحمتوں سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہوسکے۔

انسان کے بچے کا کسی نوجوان شخص سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ دونوں ایک ہوکر بھی ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں، ان میں نہ صرف جسامت و قامت میں کھلا فرق ہے بلکہ تناسب کے مطابق بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ نوزائیدہ کا سر نوجوان کے سر سے تقریباً تین گنا چھوٹا ہوتا ہے، اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں بلکہ پورا قد نوجوان کے ایک بازو کا نصف ہوتا ہے۔ اس عدم تناسب کو دیکھتے ہوئے بھی آپ تین چار برس کے ننھے بچے پر اس لئے برس پڑتے ہیں کہ وہ ۱۹، ۲۰ برس کے نوجوان کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا؟

طبعی طور پر پیدائش کے وقت بچے کا اوسط وزن ۷ پونڈ اور قد ۱۹ انچ قرار دیا گیا ہے۔ عموماً ایک صحت مند بچے کا جسمانی تناسب اسی قاعدے کے مطابق ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بچے میں یہ تناسب نہ ہو اور وزن اور قد مختلف ہو

تین چار برس کی عمر میں بچے کی ذہنی کیفیت کا پتہ لگانا جس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے بہت دشوار ہے۔ ہماری اس کاوش میں ننھے کی خاموشی سد راہ ہوتی ہے۔ باتیں نہ کرسکنے کی وجہ سے ہم اس کی داخلی کیفیت کا اندازہ جلد نہیں لگا سکتے۔ عالم وجود میں آتے ہی وہ چند شدید قسم کے تجربوں سے دوچار ہوتا ہے جن کی نوعیت کا ہم کچھ اندازہ کرلیتے ہیں اور ہماری پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچے کے لئے سکون اور اطمینان کی فضا پیدا کریں۔

نوزائیدہ بچے کو فوراً غذا نہیں دی جاتی بلکہ اس میں کافی توقف کرتے ہیں۔ شروع شروع میں ہم بچے کو اپنی انگلی یا کپڑے کی بتی میں شہد یا انگور کا رس لگا کر چٹاتے ہیں۔ یہ جب بچے کے منہ میں پہنچتی ہے تو گویا اسے سب سے پہلا سبق ملتا ہے اپنے منہ میں دوسرے کی انگلی پاکر بچہ حیرانی، جھجک اور خوف محسوس کرتا ہے۔ منہ میں انگلی ڈالتے ہی آپ غور کریں گے کہ اس کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے اپنا منہ بسورے گا۔ اپنے لبوں سے ہولے ہولے آپ کی انگلی کو دبائے گا۔ گویا کہتا ہے چھی چھی! آپ نے میرے منہ میں یہ کیا دے دیا؟ [illegible] کی ننھی زبان کبھی انگلی سے چھوتے گی کبھی ادھر ادھر منہ میں گھومتی ہوئی تالو سے مس ہوگی، اور کبھی نیچے کے ہونٹ سے، پھر دو تین بار انگلی کو چاٹنے لگے گی تنفس کی اندرونی کشش سے پھر اس کے ہونٹوں پر ایک نرم سا دباؤ پڑے گا [illegible] (بقیہ صفحہ [illegible])

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
چندہ: سالانہ صر ششماہی للعہ

ہم نے خدا کے اس بڑے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے آج ہم مصیبت میں مبتلا ہیں۔ سوسائٹی کی محنت کرنے اور محنت نہ کرنے والوں میں تقسیم ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور پروفیسروں، طالب علموں، ججوں، وکیلوں، تاجروں اور تعلیم یافتہ اشخاص کو اس نکتہ کو سمجھ لینا چاہیئے اور کچھ نہ کچھ جسمانی محنت کرنے کا اپنے کو عادی بنانا چاہیئے۔

اگر اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو میں نے آپ کے سامنے جو بات رکھی ہے وہ ایک انقلاب انگیز بات ہے۔ اگر آپ اس پر دھیان دیں اور اس کو برتیں بھی تو محنت اور سرمائے کے ہمارے سارے مسائل طے ہو جائیں گے اور آسودگی اور فارغ البالی کی راہ کھل جائے گی (ونوبا بھاوے)

ترجمہ:- قومی آواز لکھنؤ

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۰ | ۸ ستمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید عابد حسین

کشمیر اور ہم

ڈاکٹر ذاکر حسین

جو رشتے آپس کے رہن سہن، میل جول، مل کر کچھ بنانے یا مل کر کچھ بگاڑنے، مل کر سوچنے، مل کر کام کرنے، مل کر سیکھنے سکھانے سے پیدا ہوتے ہیں، وہ سچے رشتے ہوتے ہیں، پائدار رشتے ہوتے ہیں، اور جب صدیوں تک یہ رشتے اور بڑھتے رہتے ہیں، تو پھر یوں جڑتے ہیں جیسے گوشت سے ناخن جڑا ہوتا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان کے باہمی رشتے ایسے ہی رشتے ہیں......

ہندوستانی تمدن کے جمود کو حرکت دینے، اس کو سیاسی اور تمدنی وحدت بخشنے کے لئے جب قدرت نے اسلامی عُنصر کو ہندوستانی زندگی کا جزو بنایا، تو کشمیر بھی اس کے اثر میں آیا اور اثر پذیری اور اثر اندازی کا لین دین، علم و عمل فن و ہنر میں سیکھنے سکھانے کا بیوہار صدیوں جاری رہا۔

دوستو کشمیر سے ہمارے قدرتی رشتے کو ہم کیسے گنوائے جس ساتھ پر صدیوں پر صدیاں گذر گئی ہوں۔ جو ساتھ خالی جغرافی ساتھ نہ ہو۔ خالی خدمت کا ساتھ نہ ہو۔ بلکہ جس میں ہم دونوں کی، ہندوستان اور کشمیر کی تمدنی زندگی کا ریلا رواں بندھا ہوا ہو۔ جو خوشی اور رنج، آرام اور مصیبت شکھ دکھ کا ساتھ ہو۔ اس کی تفصیل چند منٹ میں کیسے بیان ہو جائے ؟ میں نے ابھی کہا کہ رشتہ خالی جغرافی رشتہ نہیں ہے۔ جغرافی رشتے قدرتی تو ہوتے ہیں، مگر اتفاقی بھی ہوتے ہیں۔ آدمی کے ارادے کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، قدرت شیر اور بکری کو ایک ہی جنگل میں پیدا کر دیتی ہے اور زور اور کمزوری کے مقابلے کا تماشا دیکھتی ہے، اور اس تماشے میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کا بھی خیال نہیں کرتی، آدمی کا خاصہ ہے کہ اپنی سوجھ بوجھ سے ایسے مسئلوں کا حل نکالتا ہے، ناکام ہوتا ہے تو پھر سے کوشش کرتا ہے۔ ایک ڈھنگ سے یہ حل نہیں ہوتے تو دوسرے ڈھنگ سے آزماتا ہے اور اسی ادھیڑ بن میں تمدنی زندگی کی بنیادیں ڈال لیتا ہے، تمدنی رشتوں میں بندھے ہوئے آدمی، آہنی زنجیروں میں نہیں جکڑے ہوتے، ریشمی ڈوروں سے جڑے ہوتے ہیں۔

پھر حکومت کا رشتہ بھی زیادہ توجہ کے قابل رشتہ نہیں، یہ ضروری ہے کہ حکومت انسانی ضرورت ہے، مگر اس کا کام کبھی کبھی خالی بد سے بھی چلتا ہے، اچھے آدمیوں میں تو حکومت صرف نیکی کی حفاظت کرتی ہے، مگر آدمی کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں، اچھا ہے تو فرشتوں سے اونچا ہے، بُرا ہو تو جانوروں سے نیچے جا پہنچا، چنانچہ کبھی حکومت کے رشتے غلامی کے رشتے بھی بن جاتے ہیں۔ آقا اور غلام کو ایک دوسرے سے جوڑنے والے رشتے یعنی ایسے رشتے جو انسان کی شرافت، انسان کی خودداری، انسان کی آزاد روح کی نظر میں بس توڑ پھینکنے ہی کے رشتے ہوتے ہیں، ہاں جو رشتے آپس کے رہن سہن، میل جول، مل کر کچھ بنانے، یا مل کر کچھ بگاڑنے، مل کر سوچنے، یا مل کر کام کرنے، مل کر سیکھنے سکھانے سے پیدا ہوتے ہیں، وہ سچے رشتے ہوتے ہیں، پائدار رشتے ہوتے ہیں اور جب صدیوں تک یہ رشتے بنتے اور بڑھتے رہتے ہیں تو پھر یوں جڑتے ہیں جیسے گوشت سے ناخن جڑا ہوتا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان کے باہمی رشتے ایسے ہی رشتے ہیں۔

اس کا تو اب وقت نہیں کہ کشمیر اور ہندوستان کے ان رشتوں کی فہرست پیش کروں جو اس طرح ان دونوں کو جوڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ کے دھندلکے سے لے کر حال کے روزِ روشن تک جہاں نظر ڈالئے یہ رشتے موجود ہیں۔ ویدک عہد میں دیکھئے جو تصورِ کائنات، جو فلسفۂ حیات ہندوستان کے اچھوں اور نیکوں میں رائج تھا۔ اس میں کشمیر نے اچھے بھی ہمارے شریک تھے۔

اللہ واحد، ایکم، ایشور، وشوا کرمن، پرجاپتی، تد کے سامنے اس کی اور ہندوستان کی گردن ساتھ ساتھ جھکتی ہے۔ نظامِ عالم میں، قانونِ اخلاق کے کامل تسلط پر یہ دونوں ہم نوا ہیں، اس دنیا کو دونوں مرضی الٰہی کے ظہور کا میدان مانتے ہیں اور اس کے قانون محکم میں ساری کائنات کو جکڑا ہوا جانتے ہیں، قدرت کے کرشموں، دیوتاؤں کی ہستیوں، رسوم اور عبادتوں سب کو دونوں اس عالمگیر قانون کا پابند سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ویسے وہ۔ جب ہم ہندوستان والوں نے قانون کے تقاضوں کو اپنی سمجھ کے مطابق سماج کی زندگی پر لاگو کیا اور سماج کی چہار گانہ تقسیم کی تو برن آشرم دھرم ہندوستان کی طرح کشمیر کا بھی اپنا نظام بن گیا۔ ہم نے بے لاگ عمل اور تتیجہ ... سے نظر ہٹا کر فرض کو انجام دینے کا مسلک اختیار کیا تو کشمیر نے بھی اسی کو اپنایا۔ جب ہم نے ایک زندہ عقیدے کو رسم و رواج کی پست سطح پر پہنچا دیا، اور اپنی ذمہ داریوں کا جوا پجاریوں کی گردن پر رکھ دیا، تو اس روگ میں بھی کشمیر ہمارا ساتھی رہا۔ جب ہمارے اس روگ کو دور کرنے کے لئے

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
کشمیر اور ہم	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱
ہندوستان اور پاکستان	اداریہ	۲
دنیا کی رفتار :-		
۱- ہندوستان		۲
۲- پاکستان		۴
غزل	سید اختر علی تلہری	۵
بھڑک رہا ہے دیا چراغ	باقر رضوی	۵
بزم بے تکلف		۵
آدمی کھائے تو کیا کھائے		۶
آپ کا عشق و محبت کا نظریہ کیا ہے ؟		۷
جامنی رائے	ڈاکٹر وسیم الزماں صدیقی	۸
ہندسوں کا جھگڑا	مشتاق احمد	۹
نئی روشنی کے پروانے		۱۱

قیمت فی پرچہ ۳

گوتم بدھ نے اپنا پیام دیا تو کشمیر نے بھی جوش کے ساتھ اس کو لبیک کہا۔ صدیوں ہندوستان کی طرح گوتم بدھ کا حلقہ بگوش رہا جو بودھ سیاح ہندوستان کی زیارت کو آئے تو وہ بھی تشی سی اور کیا چی سی تو یعنی کشمیر کو نہیں بھولے اور پھر اس کی دل فریبی کو کیا کہئے کہ یہاں برسوں کورہ پڑتے ہیں۔ اور ایک صاحب تو مصداق تکے رہیں برین نہیں لگے کہاس ساجد کے ہاتھی سدھانے کا کام کرنے لگے ہیں۔ ہم بودھ مت کو بدلتے ہیں تو یہ بھی اس کی شکل بگاڑتا ہے۔ اس کی اصلی روح کو مسخ کرتا ہے۔ منتر کو چھوڑ کر چھلکے کے پیچھے پڑتا ہے، اس کے صاف شفاف پانی میں توہم پرستی کا میل ملاتا ہے تو پھر اصلاح شدہ ہندومت کا زور شروع ہوتا ہے، یہاں بھی، وہاں بھی، پریاگ کے میدان میں ہرش وردھن، بودھ، سوریہ اور مہیشور کی پوجا ساتھ ساتھ کرتا ہے تو کشمیر کی وادی میں بھی بودھ سنگھ آراموں کے پہلو بہ پہلو ہندو دیوتاؤں کے مندر پھر بنتے ہیں۔ ہندومت پھر ابھرتا ہے، یہاں بھی، وہاں بھی۔ شری شنکر آچاریہ نے سارے ہندوستان کو اپنے گیان کی گہرائی اور اپنے ویدانتک فلسفہ کے پھیلاؤ سے فیض پہنچایا، تو کشمیر کی فضا میں بھی ان کی آواز گونجی شری رامانج نے جب ویدانت میں بھگتی کا پیام سمویا، ہندی ادب میں غیر ویدک پنچ راتر کو ملایا، آچاریہ ابھینو گپت نے شیو کا راستہ دکھایا، تو وہ بھی اپنا تحفہ ہندوستان کو دیے کر نہیں رک گئے، کشمیر کی یاترا انھوں نے بھی کی جنوبی ہند میں شیو ائی مسلک پھیلا تو اس کے رشتے بھی صاف کشمیر سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستانی تمدن کے جمود کو حرکت دینے اس کو سیاسی اور تمدنی وحدت بخشنے کے لئے جب قدرت نے اسلامی عنصر کو ہندوستانی رنگ کا جزو بنایا، تو کشمیر بھی اس کے اثر میں آیا اور اثر پذیری اور اثر اندازی کا لین دین، علم و عمل میں، فن و ہنر میں، سیکھنے سکھانے کا بیوپار صدیوں جاری رہا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ کشمیر کا رشتہ کبھی کبھی خالی زور کا رشتہ بھی ہوتا ہے اور اس حالت میں تمدنی اعتبار سے بنجر کی سی حیثیت رکھتا ہے لیکن جب یہ اونچی قدروں کا حامل اور رسیوک ہوتا ہے تو ساری تمدنی کوششوں کو اس سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالئے تو پندرھویں صدی میں ایک شخصیت کشمیر میں دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان کے مستقبل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ۵۰۰ برس پہلے وہ کرنا چاہا جو کشمیر کے دو سپوت جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ آج کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ شخصیت ہے سلطان زین العابدین کی جسے کشمیر کا بچہ بچہ آج بھی بادشاہ کی حیثیت سے نہیں فقیر و ولی کی حیثیت سے یاد کرتا ہے اور سلطان زین العابدین کہہ کر نہیں، بڈشاہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ہندو مسلم کو ایک ریاست میں ایک سیاسی زندگی دینے کا کام اس فقیر سلطان نے کیا تھا اور بڑی خوبی اور کامیابی سے انجام دیا تھا۔ ابھی کشمیر پر دہلی کا اثر نہ ہوا تھا، دہلی حکومت کے اہم مسئلے کے حل کی تلاش میں تھا حکومت کی نمود کو بعد کی جگہ عوام کی مرضی پر چلانے کا مسئلہ، ہندو مسلم کی تفریق مٹا کر باہمی یک جہتی پیدا کرنے کا مسئلہ ہماری سیاست کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ تاریخی اعتبار سے ایک عہد آفریں کارنامہ اسی سلطان زین العابدین کا ہے۔ یوں تو وہ ہر لحاظ بڑا بادشاہ تھا اس نے کشمیر کے مادی وسائل منظم طور پر بڑھائے، کاغذ بنانے کی صنعت شروع کرائی ہندوستان کے قلمی کتابوں کے ذخیرے اس فیض کو ظاہر کرتے ہیں جو اس صنعت نے علم کو پہنچایا۔ ریشم کی صنعت کو فروغ دیا، شال بافی کی بنیاد ڈالی ہندوستان کے ہر خوش حال گھر میں کشمیری شالوں کا کوئی نہ کوئی نمونہ اس فقیر بادشاہ کی یاد آج تک تازہ کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے میوہ دار درخت باہر سے منگا منگا کر اس نے کشمیر میں لگائے، نہریں کھدوائیں اور ان مادی برکتوں کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی بے تعصبی اور رواداری کی وہ روایتیں قائم کیں جو آج بھی ہندوستانی سیاسی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں جب یہ تخت پر بیٹھا ہے تو اس کے پیش رو سکندر کے ظلم و ستم سے زچ ہو کر برہمنوں کی ایک بڑی تعداد کشمیر چھوڑ کر باہر جا چکی تھی، اس نے ان کے دلوں کو موہ لیا، سرکاری عہدوں اور کاموں میں اس نے دین و مذہب کا فرق بالکل مٹا دیا۔ پھر تو پنڈتوں نے فارسی اس وجہ سے سیکھی کہ شاعری، انشا پردازی، لغت نویسی میں آج تک فارسی پڑھنے والے اُن کے زیر بار احسان ہیں فارسی ایسی عام ہوئی کہ سارے ملک کی تہذیبی زبان بن گئی۔ ذہنی طور پر ہندو مسلمانوں قریب لانے کے لئے اس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے، موسیقی کے بڑے بڑے ماہر ہندو اور مسلمان دور دور سے آکر اس کے دربار میں جمع ہوگئے اور سچ ہے کہ اس نے اس کام کا آغاز کیا جو بعد کو زیادہ بڑے پیمانے پر اکبر اعظم نے کرنا چاہا اور جو آج بھی ہندوستانی سیاست کا مرکزی اور بنیادی تصور ہے۔

جب کشمیر مغلوں کو ملا تو اس کے ساتھ ساتھ رواداری اور بے تعصبی، ہنر پروری اور علم دوستی کی یہ روایتیں بھی انھیں ورثہ میں ملیں، کشمیر نے مغلوں سے [illegible] میں بھی ہندوستان سے بہت کچھ پایا اور ہندوستان کو بہت کچھ دیا مادی وسائل کو ترقی دینے کا کام برابر جاری رہا، پھل کے درخت، خوش نما اور خوشبودار پھول جگہ جگہ سے لائے گئے

بھانت بھانت کے نئے نئے کام شروع ہوئے جگہ جگہ سے کاریگر لاکر بسائے گئے۔ علم و ہنر کی ہمت افزائی دل کھول کر کی گئی، آئین اکبری میں اکبری دربار کے مصوروں کے نام پڑھو، تیمور نامہ کے بانکی پور والے نسخہ میں مصوری کے شاہکاروں پر مصوروں کے نام تلاش کرو تو ایک دو نہیں بہتیرے کشمیری نام پاؤگے۔ اس کے بعد جہانگیر تو کشمیر پر عاشق سا تھا اس سرزمین کا چپہ چپہ اس کا ایک ایک درخت ایک ایک پھول، ایک ایک چڑیا، اس کا ایک ایک دل کش منظر، اس کی حسن شناسی میں نقش سا تھا۔ سے معلوم تھا کہ کس جگہ کا منظر کس وقت بہترین ہوتا ہے اور یری ناگ، اچھابل، نسیم باغ، شالامار، آج بھی اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرتے وقت بھی ویری ناگ کو یاد کرتے ہوئے جان دی، اس شاہی توجہ محبت اور انہماک نے کشمیر کے علم و فن کو چار چاند لگائے تھے۔ اور شاعری میں، نقاشی میں، خطاطی میں، گلکاری میں، سونے چاندی کے کام میں، کپڑے اور لباس کے معاملے میں کشمیر سارے ہندوستان کے لئے معیار بن گیا تھا۔ اپنی بدکرداریوں، غفلتوں، تن آسانیوں اور بددیانتیوں سے جب آزادی کی دولت ہماری قوم نے کھو دی اور ہمارا عزیز دیس غلامی کی [illegible] میں مبتلا ہوا تھا اس ذلت کی تلخی بھی ہم دونوں نے، ہندوستان اور کشمیر نے۔ ایک سی چکھی۔ شمع آزادی کے گل ہونے کے بعد کیسی بھیانک رات تھی وہ، غلامی کی رات، اور کیسی لمبی رات تھی وہ، اخلاقی پستیوں کی کیسی گھٹا جھکی ہوئی تھی سروں پر اس رات میں، وطن فروشی کے عفریتوں، خود غرضی کے نہنگوں سے کیسی بھری ہوئی تھی وہ گھٹا ٹوپ رات، جھوٹ فریب، نفاق کی کیسی ہوائیں پھیلی ہوئی تھیں اس رات میں، اٹل رہی نہ رات! مگر آدم کی اولاد پر راتیں بھی آتی ہیں اور وہ انھیں جیسے تیسے سحر کرتی ہے، لیکن اس رات کی سحر اپنے آپ نہیں آتی۔ اس کے سوتوں کو سورج نے آکر خود نہیں جگایا، انھیں جاگ کر اُسے سحر کرنا ہوتا ہے۔ بہت تو سوتے ہیں پر کچھ جاگتے ہی رہتے ہیں اور انھی کو اپنے دل کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے اس کی اندھیاری میں روشنی پیدا کرنی ہوتی ہے اور اس دھیمی روشنی کو طوفان سے بچانے کے لئے جان جوکھوں میں ڈال کر جتن کرنے ہوتے ہیں، ہندوستان کے سپوتوں نے اپنے دیس کی اس رات کو اپنا تن، من، دھن سب کچھ تج کر سحر کیا تو کشمیر والوں نے بھی اس میں کسر نہیں کی۔ بلکہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو کام کانگریس نے کیا اور سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ اسی نے کیا، اس میں بھی کشمیر کا حصہ حصہ رسدی سے زیادہ ہی ہے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر جو لوگ رونق افروز ہوئے ان میں بزرگ ہستی کے سر پر یہ کانٹوں کا تاج رکھا گیا ان میں سے ایک کشمیری ہوا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان دو جگہ سیاسی قیادت کا فرض کشمیر ہی کے دو سپوت انجام دے رہے ہیں، اور اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ دونوں اس پر جتنا ناز کریں کم ہے۔ ایک کشمیری ہی آج ہندوستان کا وزیر اعظم ہے، اس دیس میں سب کی آنکھ کا تارا ایک نئی ابھرتی جمہوریت میں سچائی اور بھلی بات کا سہارا، سچ کی کڑواہٹ سے نہ گھبرانے والا اور دنیا میں سچ کے کام آنے والا، وہ جس کی بے لاگ صفائی جس کی بے باک سچائی، اچھائیوں کے لئے جس کی بے صبری برائیوں سے جس کی بیزاری، جس کی دیانت، جس کی دلیری ہمارے دیس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اور کشمیر نے خود اپنے لئے پیدا کیا ہے، ایک قائد خدمت گزار شیخ عبداللہ جیسا جس نے کشمیریوں کو ایک امید بخشی، ایک آئیڈیل دیا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی، ان کے دلوں

(بقیہ صفحہ ۴)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ ستمبر ۱۹۵۹ء

کدھر چلے
ہند اور پاکستان

محمد علی جناح صاحب کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کو ہند اور پاکستان میں تقسیم کر دو۔ اس کے بعد دیکھنا دونوں ریاستوں کے تعلقات کتنے اچھے رہتے ہیں۔ منطق کی رو سے ان کا یہ کہنا بالکل بجا تھا۔ عقل و تدبیر، ضرورت و مصلحت سب کا یہی تقاضا تھا کہ ایک جسم نامی کے یہ دونوں ٹکڑے کم سے کم اندرونی معیشت، بیرونی تعلقات اور دفاع کے بارے میں خیال اور عمل کا اتحاد رکھیں، جیسے امریکا اور کینیڈا سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود رکھتے ہیں اس لئے کہ دونوں کی سلامتی آزادی اور خوش حالی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رشتوں سے وابستہ ہے جو کسی طرح کاٹے نہیں کٹ سکتے۔ اگر آسام میں باہر سے کوئی خوں خوار دشمن گھس آئے یا اندر سے کوئی وبا پھیل جائے تو آسام کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان بھی ہلاکت سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح اگر مغربی پاکستان پر بیرونی حملے یا اندرونی بیماری کی مصیبت آئے تو دہلی سے بمبئی تک کم سے کم آدھا ہندوستان ضرور اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اسی طرح اگر دونوں ریاستوں میں سے کسی ایک میں کوئی اجنبی طاقت اس حد تک دخیل ہو جائے کہ اس کی آزادی کو سلب کر لے تو دوسری کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب رہا معاشی مفاد کا سوال تو ایک کی روئی اور پٹ سن دوسرے کے کارخانوں کی اور دوسرے کا لوہا اور کوئلہ پہلے کی فیکٹریوں کی غذا ہے۔ اس لئے اگر باہمی تجارت میں رکاوٹ پڑتی ہے تو دونوں کا شدید نقصان ہوتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان سے غلے کی برآمد ہندوستان میں نہ ہونے سے یہاں حد سے زیادہ مہنگائی ہے اور وہاں غلہ گوداموں میں سڑ رہا ہے، اور اس کے دام دیہات میں اس تیزی سے گر رہے ہیں کہ غریب کاشتکار مرا جا رہا ہے۔

لیکن جناح صاحب کا اندازہ منطق کی رو سے کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، انھوں نے نفسیات کو جو انسانوں خصوصاً جاہل انسانوں کے عمل پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ تقسیم ہند کی تحریک کے پیچھے جو قوتیں کام کر رہی تھیں، انھوں نے نفس انسانی کے سب سے قوی اور سب سے غیر معقول جذبے یعنی جذبۂ خوف کو اس شدت سے ابھارا تھا کہ وہ عقل و تدبیر، ضرورت و مصلحت، سب پر غالب آگیا تھا۔ ہندو مسلمان دونوں کو اپنی اپنی جگہ یقین ہو گیا کہ دوسرا فریق اس کو تہس نہس کرنے پر تلا بیٹھا ہے اور اس نے اس کے پورے وسائل فراہم کر لئے ہیں۔ خوف کی آنکھوں سے ان کو ایک دوسرے کی طاقت اصل سے سوگنی نظر آتی تھی؛ اسی اندھے بے تحاشا بے پناہ خوف نے ہندوستان کا بٹوارہ کرایا، اور اس بٹوارے کے دوران میں قتل و غارت فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات کے محرکوں پر غور کیجئے تو تعصب، نفرت، لالچ کے جذبات بھی نظر آتے ہیں، لیکن سب سے قوی محرک جس نے عقل کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ اور وحشت اور درندگی کو بے لگام چھوڑ دیا تھا، خوف کا جذبہ تھا۔ یوں تو یہ سیلاب خوف، تباہی اور بربادی پھیلاتا ہوا چند مہینے میں گذر گیا، لیکن اس کی بہت سی لہریں ہند و پاکستان میں سطح زمین کے اندر جذب ہو کر رہ گئیں۔ اسی زمیں دوز خوف کے اثرات ہیں جن کی وجہ سے دونوں ریاستوں کے دل ایک دوسرے سے کسی طرح صاف نہیں ہوتے اور ان کے باہمی تعلقات رہ رہ کر بگڑ جاتے ہیں۔

اس وقت سب سے بڑا نزاعی مسئلہ ہند و پاکستان کے درمیان کشمیر کا ہے۔ اسی کی وجہ سے دونوں کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے ہیں۔ دونوں اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ فوجی تیاریوں پر صرف کر رہے ہیں جس کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعمیر نو کے منصوبے رک گئے ہیں، اور پاکستان میں ان کے شروع ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بہت سے معاملات جن کو مل کر طے کرنے ہیں اور آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ ضد اور غصے کی وجہ سے الجھ کر رہ گئے ہیں جس سے دونوں ملکوں میں ڈیڑھ کروڑ پناہ گزینوں کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے، کاروبار اور صنعت پر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور معاشی حالت سنبھلنے میں نہیں آتی۔

اس کشمیر کے مسئلے کی تہہ میں یوں تو اصول اور اغراض کی گوناگوں کشمکش ہے، لیکن پاکستان کی طرف سے جو سب سے قوی دلیلیں اس دعوے کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں کہ کشمیر اسے ملنا چاہئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں بھی فساد کی جڑ وہی خوف کا جذبہ ہے۔ پاکستان کو یقین ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان کے پاس رہا تو صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب جنگی نقطۂ نظر سے غیر محفوظ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان جب چاہے گا مغربی پنجاب کے دریاؤں کا جو کشمیر سے نکلتے ہیں پانی روک کر اس کی ساری زراعت کو برباد کر دے گا۔ اس استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کے دل میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ہندوستان ان کی نئی ریاست کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور موقع پاتے ہی یہ کر گذرے گا۔ ادھر ہندوستان کو پہلے ہی دن سے پاکستان کی خارجی پالیسی کا رنگ دیکھ کر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ جس طرح اس نے سرحدی قبائل کو اکسا کر کشمیر پر حملہ کرا دیا شاید اسی طرح ایک دن زیادہ قوی اور زبردست حملہ آوروں کو ہندوستان پہنچنے کے لئے راستہ دے دے۔ اگر کشمیر پر پاکستان کا قبضہ ہو گیا تو خطرہ اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ پاکستان کا بیرونی ملکوں میں خصوصاً مسلمان ملکوں میں ہندوستان کے خلاف شدید پروپیگنڈا کرنا، اس کا اس خیال سے کہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ سے بالکل الگ ہو جائے گا، خود کامن ویلتھ میں شریک ہونے کے لئے انتہائی بے تابی کا اظہار کرنا اور اس خیال کے غلط ثابت ہونے کے بعد کامن ویلتھ سے روٹھ کر روس سے لگاوٹ شروع کر دینا ان شبہات کو اور تقویت پہنچاتا رہا۔

اس خوف اور بدگمانی میں جو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے، بہت بڑے خطرے پنہاں ہیں۔ موجودہ حالت کے تین نتیجے ہو سکتے ہیں

(۱) پاکستان روس کی طرف جھکتا چلا جائے اور ہندوستان کو انگلو امریکن بلاک کی طرف اور زیادہ جھکنا پڑے۔

(۲) ہندوستان روس سے لگاوٹ کرنے میں پاکستان کو مات دے دے اور پاکستان مجبوراً انگلو امریکن بلاک کا سہارا لے۔

(۳) دونوں انگلستان اور امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

ان تینوں صورتوں میں ہند و پاکستان دونوں کی حقیقی آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ دوسروں کی بساط سیاست کے مہرے بن جائیں گے۔ ان کے تعلقات بدستور کشیدہ رہیں گے اور یہ اندیشہ رہے گا کہ کسی دن بین الاقوامی سیاست کا بے درد ہاتھ ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ نہ کر دے۔

اس لئے ہند و پاکستان کو ابھی سے آنکھ کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ اُن کے خوف اور بدگمانی کے جذبات انھیں بے خبری میں ادھر لے جا رہے ہیں جدھر وہ ہوش و حواس کی حالت میں ہرگز نہ جاتے۔ انھیں باہمی خوف اور بدگمانی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے، جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے کہ ۴۰ لاکھ آدمیوں کو کسی کا خوف یا بدگمانی دور کرنے کے لئے بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر سے ادھر ہنکا دیا جائے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ تو خود اہل کشمیر کی مرضی اور

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

نئی دہلی۔ ۲۹ر اگست۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیر کمیشن نے ہند اور پاکستان کو صلح کی نئی تجاویز کے سلسلے میں جو رائے دی ہے کہ وہ ثالثی پر راضی ہو جائیں۔

لکھنؤ۔ ۲۹ر اگست۔ شری موہن لال سکسینہ وزیر بحالی نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ضبطی جائداد کے آرڈیننس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

نئی دہلی۔ ۳۱ر اگست۔ ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس پریسیڈنٹ ٹرومین کا ایک ذاتی پیغام پہنچا۔ اس کا مضمون صیغۂ راز میں ہے مگر خیال یہ ہے کہ اس میں انہوں نے کشمیر کے جھگڑے کو جلد ختم کرنے کی اپیل کی ہے۔

لیک سکسیس۔ ۲ر ستمبر۔ مستند ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر ٹرومین اور مسٹر ایٹلی نے ہند اور پاکستان دونوں سے اپیل کی ہے کہ ایڈمرل نمٹز کو کشمیر کا جھگڑا چکانے کے لئے غیر جانبدار ثالث مان لیں۔

پونا۔ ۳ر ستمبر۔ شری بی جی کھیر وزیر اعظم بمبئی صوبے کی اسمبلی میں یہ رزولیوشن پیش کرنے والے ہیں کہ مرکزی اسمبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ صوبے میں تارکین وطن کی املاک کے انتظام کے بارے میں قانون بنائے۔

الٰہ آباد۔ ۴ر ستمبر۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا "مجھے کشمیر کے معاملے میں پریسیڈنٹ ٹرومین اور ایٹلی کی مداخلت سے حیرت ہے .... جھگڑے کے بنیادی سبب کو چھوڑ کر ضمنی مسئلے اٹھانا مناسب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس صورت حال سے اُلجھن ہوتی ہے۔"

پاکستان

لاہور۔ ۲۷ر اگست۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کے ۸۰ ممبروں نے لیگ کے ایک جلسے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ پاکستانی گورنر کے تقرر کی وجہ سے حالات میں جو تبدیلی ہوئی ہے اُسے مدنظر رکھ کر گورنر کے مشیروں کے مسئلے پر از سرِ نو غور کریں۔

کراچی۔ ۲۷ر اگست۔ سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی ہدوسی تعلقاتِ ڈیلی گیشن کے صدر مسٹر ایرا مین سے ملے۔

کراچی۔ ۲۹ر اگست۔ پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ موروثی جاگیروں کو فوراً بغیر کسی معاوضے کے ختم کر دیا جائے اور اس بات کو بھی اصولاً تسلیم کر لیا کہ بڑی زمینداریوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔

کراچی۔ ۳۰ر اگست۔ مشرقی بنگال کے وزیر اعظم نور الامین صاحب نے بتایا کہ ان کے صوبے میں تنسیخ زمینداری کا قانون اس سال نومبر کے آخر تک پاس ہو جائے گا۔

کراچی۔ یکم ستمبر۔ اسمٰعیل چندریگر صاحب جو کابل میں پاکستان کے سفیر ہیں ۳ر ستمبر کو کراچی واپس آ رہے ہیں تاکہ افغانستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں اپنی حکومت کو رپورٹ دیں۔ اور ہرجانے کی رقم کے بارے میں جو افغانستان کو ہم باری کے واقعے کے سلسلے میں ادا کی جائے گی گفتگو کریں۔

سری نگر۔ ۲ر ستمبر۔ رائیٹر کی ایک رپورٹ کے مطابق پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر ایٹلی نے ہند اور پاکستان سے اپیل کی ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے ایڈمرل نمٹز کو حکم مان لیں۔

کراچی۔ ۳ر ستمبر۔ پاکستان کی کیبنٹ کشمیر کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے ایک غیر جانبدار ثالث مقرر کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

لاہور۔ ۳ر ستمبر۔ پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار کے بیان کے مطابق میاں عبد الباری صدر پنجاب مسلم لیگ نے میاں ممتاز دولتانہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ان کو صوبائی لیگ کی صدارت سے ہٹانے کے لئے سازش کر رہے ہیں۔

پچھلے ہفتے ہندوستان میں، ملک کی توجہ زیادہ تر دو چیزوں کی طرف رہی: مسئلہ کشمیر اور تارکین وطن کی املاک کا ضابطہ

نئی کروٹ کشمیر کے مسئلے نے غیر معمولی اہمیت اس وجہ سے حاصل کر لی ہے کہ دنیا کی دو بڑی حکومتوں انگلستان اور امریکہ کے سرداروں نے اس میں بہت گہری دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ ان دونوں کے خطوں کا مضمون صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ پھر بھی لیک سکسس کی خبر سے اتنا معلوم ہو گیا کہ اس میں ہند اور پاکستان سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو حل کرنے کے لئے ایڈمرل نمٹز کو جو رائے شماری کے ناظم مقرر کئے گئے تھے ثالث مان لیا جائے۔ اِن حضرات کا یہ اقدام عام دستور کے خلاف اور بالکل غیر متوقع ہے اس لئے پنڈت نہرو کی حیرت اور اُلجھن بجا ہے۔ پاکستان کی حکومت کا ردِ عمل بھی کچھ اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ہندوستانی حکومت تجویز کو رد کرنے سے پہلے اس پر اچھی طرح غور کر رہی ہے۔ آج ۵ر ستمبر کو پنڈت نہرو، سردار پٹیل سے ملنے کے لئے بمبئی جا رہے ہیں۔ چونکہ شیخ عبداللہ بھی ساتھ ہیں اس لئے خیال ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوگی۔ غالباً ہندوستان کی حکومت کی طرف سے اسی ہفتہ کے اندر کوئی جواب بھیج دیا جائے گا۔

یہ بات معقول ہے تارکین وطن کی املاک کے ضابطے سے نہیں بلکہ اس پر اندھا دھند عمل درآمد ہونے سے جو بے چینی ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ شری موہن لال سکسینہ کے تسلی آمیز الفاظ سے دور نہیں ہوئی۔ لیکن شری بی جی کھیر جو تجویز پیش کر رہے ہیں وہ بہت معقول ہے۔ اگر مرکزی اسمبلی اس بارے میں قانون بنا کر راہ عمل کو صاف اور متعین کر دے تو مقامی حکام اور پولیس کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع نہیں رہے گا اور جو شکائتیں روزانہ سننے میں آ رہی ہیں اُن کا انسداد ہو جائے گا۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی لاہور میں لیاقت علی خاں صاحب کے آنے سے جو اُمید بندھی تھی کہ شاید مسلم لیگ کے دونوں گروہوں میں جو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں صلح ہو جائے وہ پوری نہیں ہوئی۔ میاں عبد الباری اور میاں ممتاز دولتانہ کی کشمکش جاری ہے۔ دولتانہ پارٹی کوشش کر رہی ہے کہ صوبے کی لیگ ان ناموں کو جو میاں عبد الباری نے گورنر کے مشیروں کے عہدوں کے لئے پیش کئے ہیں واپس لے لے تاکہ ایک طرف میاں عبد الباری کی سبکی ہو اور ان کو استعفا دینا پڑے۔ اور دوسری طرف میاں ممتاز دولتانہ کو اس کا موقع ملے کہ اپنے جتھے کے لوگوں کے نام مشیروں کے عہدوں کے لئے پیش کریں۔ میاں عبد الباری نے ایک تازہ بیان میں یہ شکایت کی ہے کہ میاں ممتاز دولتانہ نے اس وعدے کے باوجود کہ وہ اقبال چیما صاحب کو صوبائی لیگ کے سکریٹری کے عہدے کے لئے کھڑا نہیں کریں گے، چپکے چپکے سازش کر کے ان کو سکریٹری منتخب کرا دیا اور یہ ساری کارروائی میاں عبد الباری کو صدارت سے ہٹانے کے لئے کی گئی۔

اطمینان کی لہر کشمیر کمیشن کی نئی تجویز اور پریسیڈنٹ ٹرومین اور ایٹلی کی اپیل سے کراچی کے سرکاری حلقوں میں بظاہر اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے غالباً حکومت پاکستان یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کی روس کی طرف جھکنے کی دھمکی رنگ لائی۔ وہ اس کا اندازہ کر رہی ہے کہ مسٹر ٹرومین کو اور مسٹر ایٹلی کو جو کشمیر کا درد ہے وہ اُٹھا ہے اس سے پاکستان کی بگڑی ہوئی بات کے بنانے میں کس حد تک مدد مل سکتی ہے۔ روس کے تجارتی ڈیلی گیشن سے گھل مل کر باتیں ہو رہی ہیں مگر آنکھیں اور کان لندن، واشنگٹن اور نئی دہلی کی طرف لگے ہوئے ہیں۔

غزل

سیّد اختر علی تلہری

اک نظر اور تجھے ذوقِ تماشا کی قسم
ذوقِ جلوہ کی قسم ذوقِ تجلّی کی قسم

عربدہ جو سہی تو ہی مری ہستی کا نظام
ذوقِ حسرت کی قسم ذوقِ تمنا کی قسم

ہاں مرے دل کو بنا عشق کے جلووں کی بہشت
تجھ کو اپنے ہی جمالِ رُخِ زیبا کی قسم

ہیں چمن تیرے شہیدوں کے لہو سے شاداب
گلِ رعنا کی قسم لالۂ حمرا کی قسم

میری نظروں میں سماتی نہیں جنت کی شراب
ساغرِ گل کی قسم آبِ مصفا کی قسم

ہے تصور سے ترے دل چمن آرائے نشاط
روئے زیبا کی قسم زلفِ چلیپا کی قسم

ہے تری مست نگاہی سے زمانہ مخمور
مے گلگوں کی قسم ساغر و مینا کی قسم

حسنِ خود بیں کی ہے شوخی کا کرشمہ دُنیا
گوشِ شنوا کی قسم دیدۂ بینا کی قسم

جلوۂ حسن کی ہوتی نہیں ہر آنکھ حریف
طورِ سینا کی قسم برقِ تجلا کی قسم

عشق معشوق میں کر لیتا ہے جلوے پیدا
چشمِ مجنوں کی قسم عارضِ لیلا کی قسم

پاکبازانِ وفا کے لئے زنداں ہے بہشت
حسنِ یوسف کی قسم عشقِ زلیخا کی قسم

حوصلے آج بھی دل کے ہیں مرے عرش مسیر
مہرِ رخشاں کی قسم عقدِ ثریا کی قسم

کوئی سمجھا نہیں اب تک ترے اختر کا جنوں
ہوش و وحشت کی قسم دانش و سودا کی قسم

بھڑک رہے ہیں چراغ

باقر رضوی

جو راز دہر کو اک خلد زار کر دے گا
خِرد کی فکرِ رسا سے ملا ہے اُس کا سُراغ

بنے گا رشکِ جناں یہ خرابۂ دُنیا
ہر ایک ذرۂ خاکی کا عرش پہ ہے دماغ

جلائی جائیں گی شمعیں سیاہ خانوں میں
بنے گا سرو چراغاں ہر اک دل کا داغ

چمن رہے گا نہ وقفِ تصرفِ شاہیں
بنیں گے سب کے نشیمن وہ ہوں زغن یا زاغ

خیالِ ناوک و پیکاں، نہ ذکر و فکرِ خزاں
چہک رہے ہیں عنادل، پھبک رہا ہے باغ

مہک رہی ہیں ہوائیں، کھلا ہے مے خانہ
بہک رہے ہیں شرابی، کھنک رہے ہیں ایاغ

نئے اُفق سے نیا آفتاب نکلے گا
لرز رہے ہیں ستارے، بھڑک رہے ہیں چراغ

بزمِ بے تکلّف

فاضل مقرر کا اصلی نام تو مرزا فہیم بیگ ہے مگر لوگ ان کو مرزا گھن گرج کہتے ہیں۔ بڑے ڈیل ڈول کے آدمی ہیں، پر لمبائی چوڑائی مٹاپے سے فشر کر کچھ ٹھگنے سی گئی ہے۔ گول مٹول دھڑ، پتلی سی لمبی گردن اور تنگ دہانہ۔ جب پالتھی مار کر تخت پر بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کسی نے کھڑا ڈھول رکھ کر اس پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ آنکھیں کسی قدر چھپلی اور چندھی اور چہرہ زرد اور بے رونق ہے عام طور پر ایسا لگتا ہے جیسے اس مٹی کے ناٹھور میں جان ہی نہیں۔ جہاں کسی نے رکھ دیا رکھا ہوا ہے مگر جہاں ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور

ع ۔ نقارۂ وغا پہ لگی چوٹ ناگہاں

دور دور تک زمین ہل جاتی ہے اور سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

ہم نے جو مرزا صاحب کو فاضل مقرر کہا اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ عام جلسوں میں جا کر تقریریں کرتے ہیں، گو قانون کی اصطلاح میں انھیں جائداد غیر منقولہ نہ کہہ سکیں مگر بچارے کششِ ثقل کے ہاتھوں ایسے مجبور ہیں کہ نقل و حرکت ان کے لئے محالِ عقلی ہو کر رہ گئی ہے، ہم نے تو جب دیکھا انھیں ان کے مکان کے احاطے میں ایک بڑے سے تخت پر جسے لوگ اُن کا پایۂ تخت کہتے ہیں، نصب پایا، وہیں تیسرے پہر سے آس پاس کے بے فکروں کا مجمع ہو جاتا ہے اور رات گئے تک رہتا ہے۔ گلی کی موریوں کی عفونت سے کر بجرا لکاہل کی سیاست تک کوئی موضوع نہیں جس پر طبع آزمائی نہ ہوتی ہو، اور سب باتوں کو تو مرزا صاحب سکر کے عالم میں چپ چاپ سنتے رہتے ہیں۔ مگر مسلمان ملکوں کا نام آتے ہی ان پر سکرات کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گلے سے ایک روح فرسا گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے جس سے ناواقف چونک پڑتے ہیں کہ شاید معدی کرب دم توڑ رہا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ محض کہ مرزا گھن گرج کے کھنکارنے کی آواز ہے اس کے بعد فوراً طوفان پھٹ پڑتا ہے " یہ تم لوگ کیا فلسطین کے بارے میں عقلی گدے لڑایا کرتے ہو۔ ہم سے پوچھو جو تحریکِ خلافت کے زمانے میں رسول اس دشتِ پر آشوب کی سیاحی کر چکے ہیں اور اپنی وحشتِ دل کے بل پر دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک ہل چل ڈال چکے ہیں۔

ع ۔ زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

کیا کہا نتیجہ اور فائدہ! تمھیں شرم نہیں آتی، بنیوں کی طرح سود و زیاں کا حساب کرتے ہو۔ مسلمان، مجاہد، غازی، مردِ خدا، مردِ مومن، مردِ حُر، کہیں نتیجے اور فائدے کو دیکھتا ہے۔

ع ۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ کون بولا کہ خود نہیں کودا دوسروں کو ڈھکیل دیا؟ نعوذ باللہ یہ شیطان کی آواز ہے جو مردِ مومن کے دل میں وسوسہ پیدا کر دیتی ہے۔ مسلمانوں میں من تو کا فرق کرنا کفر ہے۔ میں نہ سہی تم سہی، اصل چیز تو آتشِ نمرود میں کودنا ہے، متاعِ زندگی، دولتِ ہوش و خرد، سرمایۂ راحت و عافیت لٹانا ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ

ع ۔ کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

ہم جانتے ہیں کہ جزیرۃ العرب میں فتنۂ یہود کے سر اُٹھانے کا سبب کیا ہے صرف یہ ہے کہ عرب کے مسلمان میں غیرت و حمیت نہیں رہی، شجاعت و بسالت نہیں رہی اس کے دل میں درد کی لذت نہیں رہی، عشق کی حرارت نہیں رہی۔

ع ۔ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ⁂ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مانا کہ یہودیوں کی فوج بہت منظم تھی، مانا کہ ان کو روس اور امریکہ دونوں کی مدد سے زبردست مالی اور جنگی وسائل حاصل تھے۔ یہ بھی تسلیم کہ لڑائی کے جاری رکھنے میں عرب ملکوں کے لئے ہلاکت کا خطرہ تھا، لیکن مرد حر کہیں ہلاکت سے ڈرتا ہے وہ تو اس کی دال روٹی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اب یہ میاں شرق اردن صاحب انگریزوں سے سازباز کر کے شام اور عراق سے مل کر ایک متحدہ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

آدمی کھائے تو کیا کھائے

ایک زمانہ تھا کہ کھانے پینے کی احتیاط کو ہم لوگ پرانی قسم کے طبیبوں کا خبط سمجھتے تھے۔ اب کچھ دن سے جدید طب نے غذائیات کی طرف توجہ کی ہے تو پھر اتنی کی ہے کہ زندگی دشوار ہوگئی ہے۔ شاید ہی کوئی کھانے پینے کی چیز ایسی ہو جسے کوئی نہ کوئی ماہر فن زہر نہ بتاتا ہو۔ جو لوگ اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں ان کو یہ مضمون غور سے پڑھ کر بے احتیاطی اور احتیاط کے درمیان اعتدال کا نقطہ تلاش کرنا چاہئے۔

لیتے ہیں کہ کھانا صرف زندہ رہنے کے لئے ہے یہ نہ سمجھو کہ زندگی کھانے کے لئے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی چیزیں ہیں جن کو کھا کر آدمی کچھ دن زندہ رہ سکتا ہے، اور کون سی ایسی ہیں جن کو کھاتے ہی چل چلاؤ لگ جاتا ہے۔ پہلے زہر کی چند قسمیں مقرر تھیں اب اس ترقی کے زمانے میں ہزاروں قسم کے زہر نکل آئے اور ہر کھانے کی چیز میں کسی نہ کسی طرح گھس بیٹھ کر پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے تو کھانا پینا ہی چھوڑ دیا ہے، کون اپنی جان جوکھم میں ڈالے۔ جتنی چیزیں میرے لئے مفید ہیں وہ دراصل سخت مضر ہیں، یقین نہ ہو تو سائنس والوں سے پوچھ لیجئے۔

مثلاً شکر ہے اس سے جسم میں فوری چستی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پال مائیکل کا تجربہ ہے کہ جن گولف کھیلنے والوں نے دوپہر کے کھانے میں میٹھی چیزیں کھائیں وہ سہ پہر کو بہت اچھا کھیلے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ شکر میں کاربو ہائیڈریٹ بہت زیادہ ہے اور اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ جانس ہاپکن کے، ای، وی میک کولم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ہم شکر کم کھائیں تو دانتوں کو کیڑا لگنے کا اندیشہ بہت کم ہے۔

اچھا تو صاحب شکر چھوڑ دی جائے۔ مگر ذرا ٹھہرئے گا۔ اگر میرے خون میں شکر بہت کم ہوئی تو ڈر ہے کہ میں جھلا اور چڑچڑا ہو جاؤں گا، بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ جرائم کا ارتکاب کرنے لگوں مجرموں کے جسم میں شکر کی کمی پائی گئی ہے۔

پس بہتر ہے کہ ایک کھانے اور دوسرے کھانے کے بیچ میں مصری کی ڈلیاں چباتا رہوں، کسی طرح ارتکاب جرم کی خواہش تو رکے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اگر میرے جسم میں سرطان کے خلیے موجود ہوئے تو کیا ہوگا؟ کہا جاتا ہے کہ شکر کی زیادتی ان کی نشوونما کے لئے نہایت سازگار ہے، اور پھر یہ بھی سوال ہے کہ میں شکر کھانے سے موٹا ہو گیا تو جب قلب کا پہلا دورہ پڑے گا تو اتنے وزن کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسے کروں گا۔

اب آپ سمجھے کہ میں پریشان کیوں ہوں؟ پالک کو لیجئے، چاہے اس سے پٹھوں کو قوت نہ پہنچے، لیکن اس میں صحت بخش فولاد اور کیلسیم کثرت سے ہوتا ہے اور اکثر بچوں کے لئے اس کا کھانا لازمی ہے۔

لیکن مسوری یونیورسٹی کے دو حضرات فرماتے ہیں کہ میں اس فولاد کا جو پالک میں موجود ہے صرف ۲۰ فی صدی ہضم کر سکتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ پالک میں ایک ایسا چونٹا تیزاب ہے کہ وہ نہ صرف پالک سے بلکہ جو کچھ میں کھاؤں سب کے اندر سے کیلسیم چرا لیتا ہے۔ میں تو لٹ جاؤں گا!

جب میں گاجر کھاتا تھا، تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ صحت پھٹی پڑ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس میں کیروٹین ہے، جس سے میرا جسم وٹامن الف کا امرت بناتا ہے۔ مگر نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ میرا جسم اس کام میں اتنا تیز نہیں جتنا سمجھا جاتا تھا۔ سیروں گاجر کھاؤں تب جا کر کافی وٹامن بنے۔

جب ترکاریوں کی پول کھل گئی تو میں نے حیوانی غذا کی طرف توجہ کی، مثلاً انڈا۔ انڈے سے بڑھ کر بے ضرر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

کہیں اس دھوکے میں نہ رہئے گا۔ راک فیلر انسٹیٹیوٹ کے ایک محقق فرماتے ہیں کہ کچا انڈا سب سے زیادہ دیر ہضم پروٹین ہے، پھر اگر اس میں ڈھیروں پروٹین بھی ہو تو کیا فائدہ؟ اور ستم یہ ہے کہ اس کی زردی میں ایک ایسی چیز ہے جس سے شریان سخت پڑ جاتے ہیں۔

خیر اسے بھی جانے دیجئے، کافی کی ایک پیالی پینے میں تو کوئی ہرج نہیں، کہتے ہیں چوہوں کو اتنی کیفین روز دی گئی جتنی کافی کی ۲۰ پیالیوں میں ہوتی ہے اور وہ انھیں خوب راس آئی۔

وہ ہرج کیسے نہیں! کافی سے معدے میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور اعصاب اتنے کمزور پڑ جاتے ہیں کہ ذرا سی بات میں آدمی چونک پڑتا ہے۔ خیر اعصاب کی کمزوری سے بچنے کے لئے تو تھوڑی سی شکر ملانے سے کام چل سکتا ہے، مگر شکر؟ مگر یہ تو پھر وہی قصہ آ گیا۔

تنگ آ کر یہ سوچتا ہوں کہ صرف ڈبل روٹی اور پانی پر گذارہ کروں، ظاہر ہے گیہوں کی روٹی بہتر ہے۔ جن چوہوں کو یہ کھلائی جاتی ہے وہ نمونیہ کے جراثیم کی زیادہ مزاحمت کر سکتے ہیں۔

مگر یہاں بھی اگر مگر کی گنجائش ہے۔ پکی ہوئی روٹی میں گیہوں کی چکنائی، پروٹین اور وٹامین کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے اور اگر کہیں ڈبل روٹی کے صاف کرنے میں نائٹروجن ٹرائی کلورائڈ سے کام لیا گیا ہو تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ میرے جسم میں ایسی تبدیلیاں ہوں گی کہ شراب کی ہوس بڑھ جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ خمیر میں وٹامین (ب) ہوتی ہے مگر وہ جراثیم بھی ہوتے ہیں جو ہر قسم کے وٹامین کو کھا جاتے ہیں۔

خدا کے لئے یہ بتلائیے۔ پانی میں تو کوئی نقصان نہیں۔ پیٹ نہیں بھرے گا تو نہ سہی۔

بس اتنا نقصان ہے کہ صرف پانی پینے سے جسم ضروری معدنی اجزا سے محروم رہے گا، تکان کی حالت میں بہت سا پانی پی گئے تو بدن اکڑ جائے گا اور کہیں ہوکے میں لوٹے کے لوٹے چڑھا گئے تو سرسام سے بدتر حالت ہو جائے گی۔

اب آپ سمجھے کہ میں نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟......

دو دن کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ پھر یہ خیال آنے لگا کہ کہیں میں نے جلد بازی سے تو کام نہیں لیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سائنس والوں کے مضامین کے صرف عنوان پڑھ لئے، ان کی تفصیلات پر غور نہیں کیا؟ بہر حال اس طرح ہوا پھانکنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔

آپ دیکھئے تو سہی۔ پانی میں کیا برائی ہے۔ معدنی اجزا نہیں ہیں نہ سہی کسی اور چیز سے حاصل ہو جائیں گے۔ تکان کی حالت میں ذرا سا نمک ملا لیا۔ چلئے بدن کے اکڑنے سے بچ گئے۔

اور ڈبل روٹی بھی کچھ ایسی خطرناک نہیں۔ گیلے خمیر سے بے شک وٹامین ضائع ہو جاتے ہیں مگر سوکھے سے نہیں ہوتے۔ جن چیزوں کی روٹی میں کمی ہے وہ دوسری چیزوں سے پوری ہو جاتی ہے اب رہا نائٹروجن ٹرائی کلورائڈ [illegible] آج تک کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے اب وہ عام طور پر روٹی کے صاف کرنے میں استعمال بھی نہیں ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کافی بھی شروع کر دینی چاہئے میرے تو آج تک چھالے پڑے نہیں، جن لوگوں کے کافی پینے سے معدے میں چھالے پڑتے ہیں ان کا اوسط سو میں دس ہے۔ میں ان نوے میں سے ہوں، جن کو یہ شکایت نہیں ہوتی۔ اب رہا اعصاب کا معاملہ۔ یہ محض خیال ہے لوگوں کو بغیر کیفین کی کافی دی گئی، ان کو رات بھر نیند نہیں آئی، ان ہی کو دودھ میں سے چپکے سے بہت سی کیفین ڈال کر پلا دی اور وہ مزے میں رات بھر سوتے رہے۔

کچا انڈا ممکن ہے کسی قدر دیر ہضم ہو

مگر میں اسے ذرا سا پکالوں گا، اور خوب چباکر کھاؤں گا۔ اب رہا شریانوں کا سخت ہو جانا یہ ابھی تک محض ایک نظریہ ہے اور پھر مجھے کوئی انڈوں سے پیٹ تھوڑی بھرنا ہے۔

گاجر میں تھوڑی سی وٹامین (الف) تو ہوتی ہی ہے۔ اتنی نہ سہی، جتنی کلیجی اور مکھن میں ہے اور ذرا سی پالک میں اتنا زیادہ تیزاب نہیں ہو سکتا کہ وہ اتنی اچھی متوازن غذا کو خراب کردے۔

مانا کہ شکر میں وٹامین وغیرہ نہیں ہیں، مگر اسکے فائدے تو ہیں۔ دانتوں کو رگڑ کر بار بار صاف کر لیا کروں گا تو کیڑا نہیں لگنے پائے گا۔

ہاں، دو کھانوں کے بیچ میں مصری کی ڈلیاں نہیں چباؤں گا۔ ارتکاب جرم کے رجحان سے کسی نہ کسی طرح نبٹ لوں گا۔ آخر ضبط نفس بھی کوئی چیز ہے مگر سرطان، مٹاپا اور قلب کا دورہ، خدا کی پناہ! اگر زیادہ مٹھائی کھانے کی یہ قیمت ہے تو سودا بڑا مہنگا ہے۔

مختصر یہ کہ میں تو اپنی وہی متوازن غذا کی پرانی ترکیب شروع کرتا ہوں۔ مجھے شکاگو کے جید محقق اے، جے، کارلسن کے یہ الفاظ یاد ہیں۔ "اپنی معمولی غذا میں بہت زیادہ تبدیلی نہ کرو، سوا ان چند لوگوں کے جن کا مزاج انوکھا ہوتا ہے۔ ہر غذا ہر شخص کے لئے صحت بخش ہے...... انسانی غذا کی سب سے محفوظ شکل یہ ہے کہ نباتی اور حیوانی دونوں قسم کے اجزا ہوں"

سچی بات یہ ہے کہ یہ کھائے پئے رہنے کا نسخہ ہے خوب، مگر وہ جو پیٹ میں ایک کھرچن سی ہوتی ہے، اس کا کیا علاج؟

(ماخوذ)

کشمیر اور ہم

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

کو گرمایا: اپنے خلوص، اپنی قربانی، اپنی ہمت اور اپنی محنت خدمت گذاروں کا ایک گروہ اپنی قوم میں تیار کر دیا جس نے اپنی سعی پیہم سے قوم کو اس آئیڈیل کے حصول کے روبرو لا کھڑا کیا۔ ان دونوں جواں ہمت شخصیتوں کا باہمی ربط و اعتماد، ان کا اشتراک افکار اور اشتراک عمل اس وقت کشمیر اور ہندوستان کا سب سے قوی رشتہ ہے، جس کا پرتو ہر ہندوستانی اور کشمیری کے دل و دماغ پر پڑ رہا ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ہماری سیاسی زندگی کے بنیادی مسئلے کو حل کر رہے ہیں۔ یعنی ایک عمومی جمہوریت کے قیام کے لئے جس میں مذہب کا فرق، حقوق شہریت پر اثر انداز نہ ہو، وہ کر رہے ہیں، جو قوموں کے بڑے بڑے معمار کیا کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی ہماری قومی زندگی کی سب سے عظیم الشان کامیابی ہوگی۔ ہر ہندوستانی اس مقصد کے حصول میں ان کا ساتھی ہے۔

بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی

آپ کا عشق و محبت کا نظریہ کیا ہے!

واقعیت پسندی یا رومان پرستی

واقعیت پسندی کا تعلق دماغ سے ہے۔ رومان پرستی کا دل سے۔ اگر دونوں میں صحیح توازن ہو تو آپ زندگی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ذیل کے سوالوں کے جواب سوچ سمجھ کر دیانت داری سے کاغذ کے ایک پرچے پر لکھتے جائیے۔ جواب صاف ہونا چاہئے:

ہاں یا نہیں۔

۱۔ کیا تھیٹر یا سنیما میں عشقیہ سین دیکھ کر آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ پر گذر رہی ہے؟

۲۔ کیا وہ افسانے جن میں عشق و محبت کا ذکر نہ ہو آپ کے لئے بے کار ہیں؟

۳۔ کیا آپ کے لئے شادی کی تقریب ایک دلچسپ فلم سے زیادہ دلکش ہے؟

۴۔ کیا آپ کو عشق کے خیالی نقشے بنانے کا شوق ہے؟

۵۔ کیا آپ کے نزدیک عشق کا تجزیہ کرنے سے اس کی دل فریبی جاتی رہتی ہے؟

۶۔ کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ قدرت نے ہر مرد کے لئے ایک خاص عورت اور ہر عورت کے لئے ایک خاص مرد کو پیدا کیا ہے؟

۷۔ کیا آپ اسے شرط محبت سمجھتے ہیں کہ محبوب کے عیبوں سے آنکھ بند کر لی جائے؟

۸۔ کیا دوسروں کو محبت کرتے دیکھ کر آپ کا دل پھڑک اٹھتا ہے؟

۹۔ کیا آپ کے نزدیک سچا عشق ایک نظر میں ہو سکتا ہے، اور اسی وقت محسوس بھی ہو جاتا ہے؟

۱۰۔ کیا آپ کو شادیاں ٹھہرانے کا شوق ہے؟

۱۱۔ کیا آپ یہ اکثر سوچا کرتے ہیں کہ کہیں آپ نے محبوب کے انتخاب میں غلطی تو نہیں کی؟

۱۲۔ کیا آپ محبوب سے ملنے سے پہلے ملاقات کا سارا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچا کرتے ہیں؟

۱۳۔ کیا آپ ملاقات کے بعد دیر تک اس کی یاد سے لطف اٹھایا کرتے ہیں؟

۱۴۔ کیا آپ اکثر عشقیہ شعر گایا یا گنگنایا کرتے ہیں؟

۱۵۔ کیا وہ جگہیں جہاں آپ محبوب کے ساتھ رہے ہوں، آپ کی نظر میں ایک خاص طلسمی کیفیت رکھتی ہیں؟

۱۶۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ محبت دم بھر میں ہو جائے اور دم بھر میں جاتی رہے؟

۱۷۔ کیا آپ کو بڑی تمنا تھی یا ہے کہ کسی سے عشق ہو جائے؟

۱۸۔ کیا وہ شخص جس سے آپکو محبت ہے کم سے کم آپ کے لئے ایک مکمل انسان بن جاتا ہے؟

۱۹۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد عمر بھر میاں بیوی میں رومانی معاشقہ جاری رہنا چاہئے؟

۲۰۔ کیا آپ عشق کی راہ میں جاہ و منصب، مال و دولت سے ہاتھ دھونے کو تیار رہیں؟

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

ریاست یہودیوں کے مقابلے کے لئے بنانا چاہتے ہیں، کوئی پوچھے بھلا یہ داؤ پیچ مسلمان کو زیب دیتے ہیں، اور پھر انگریز سے مدد لینا۔

ع۔ حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

کاش ہم کو جزیرۃ العرب کے دورے کا موقع مل جائے۔ کیا فرمایا آپ نے؟ جی ہاں اس تخت سلیمانی پر بیٹھ کر کچھ اجارہ ہے آپ کا؟ بس جہاں سے گذرے ایک ہوئے قلندرانہ ایک نعرۂ مستانہ

ع۔ جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

یہ کس بدتمیز نے ہانک لگائی

ع۔ جو ذہن کو الجھا دے جو عقل کو چکرا دے

بس اب حد ہوگئی۔ تم لوگوں کے سامنے تقریر کرنا جن کے آگے بھینس ـــ لاحول ولا قوۃ! ان بدتمیزوں کے چکر میں پڑ کر ہم خود چکرا گئے۔

جامنی رائے

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

جامنی رائے کی مصوری کا مقصد ہی سرے سے یہ نہیں کہ چلتی پھرتی زندگی کی مایا کو پیش کرتے پھریں بلکہ یہ ہے کہ اس کی گہرائیوں کو سطحی گوناگونی سے آزاد کر کے آسان سے آسان نقشوں میں حل کر دیں۔ جامنی رائے صورت اور زندگی کو اس طرح پرکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح ایک بچہ دیکھتا اور سمجھتا ہے، جس کی آنکھیں بھرپور کھلی ہوتی ہیں اور جو اللہ کی پیاری دنیا کی ایک ایک چیز کو اس حیرت، محبت اور اچنبھے سے دیکھتا ہے کہ جو زندگی کی الجھنوں میں رفتہ رفتہ بالکل کھو جاتا ہے۔

آرٹ اور کلاکاری کو سمجھنے پرکھنے اور اس سے مزہ لینے اور سر دھننے والوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت محدود رہی ہے، لیکن رنگوں اور لکیروں کے اس گورکھ دھندے کو سمجھنے والے جس کو نئے آرٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور بھی کہیں کم ہیں۔ بہرحال جامنی رائے ہندوستان میں اسی نئے آرٹ کے پیمبر کہے جا سکتے ہیں اور اس وقت انھیں کی کلاکاری اور زندگی کا ذکر آپ سے کرنا ہے اور اس امید میں کرنا ہے کہ سننے والوں میں سبھی ایسے ہوں گے کہ اگر ان کی کلاکاری کا اثر کوئی گہرا اثر دل پر نہیں لے پاتے تو اس سے کچھ نہ کچھ آشنا ضرور ہوں گے، کیونکہ بات ساری یہ ہے کہ تصویر دیکھنے کی چیز ہے سننے کی نہیں اور جس نے دیکھا نہیں ہے اس کے لئے بلا لاکھ کچھ کہئے "ٹیڑھی کھیر" والی مثل کا حساب رہے گا۔

جامنی رائے کی زندگی کا مختصر معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں پچھمی بنگال کے ایک گاؤں بیلیاتور میں معمولی کھاتے پیتے گھر میں جنم لیا اور اسی گاؤں میں جو بانکڑہ ضلع میں بہار اور بنگال کی سرحد پر واقع ہے ان کا بچپن گذرا۔ کلاکاری اور مصوری سے طبیعت کا رجحان ایسا کچھ تھا کہ سولہ برس کی عمر میں وہ گھر سے کلکتہ کے گورنمنٹ آرٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے۔

کلاکاری میں جتنا کچھ سیکھنے بھر کو ہوتا ہے وہ انھوں نے نہیں سیکھا اور نہیں وہ مہاراج ابندرناتھ ٹیگور کی شاگردی میں رہے، جن کے دم سے ہندوستان میں نئے سرے سے کلاکاری کا چرچا ہوا اور جنھوں نے کلا کی ایک نئی ریت ڈالی جو بنگال اسکول کے نام سے مشہور ہے

لیکن جامنی رائے نے کچھ ایسی گھڑی جنم لیا تھا اور ایسی بے چین طبیعت پائی تھی کہ ان کے لئے کسی اور کی ڈالی ریت پر چل کر آرام اور اطمینان کی زندگی گذارنی ممکن نہ تھی اور اس لئے ہوا یہ کہ بنگال اسکول کے پھیکے پھیکے رنگ اور ان رنگوں میں ہلکی ہلکی باریک لکیروں کا پھندا جن میں کچھ چین جاپان کچھ اجنتا کچھ مغل اور راجپوت اسکول کے پرانے چراغ نئے کر کے پیش کئے جاتے تھے۔ جامنی رائے کی جان کو اجیرن ہوتے گئے اور وہ بنگال اسکول اور بنگال اسکول کے برتنے والوں سے منہ موڑ کر کلاکاری میں ایک نئی راہ اور نئی منزل کی تلاش میں لگ گئے۔ جان کے اس جھگڑے میں جامنی رائے نے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں اور جس ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پرائے سے بیر لے کر مدتوں گمنامی اور مفلسی میں انھوں نے مصوری کی نئی راہیں ڈھونڈھی ہیں اس کی مثال انیسویں صدی کے تین مصوروں کی زندگی میں ملتی ہے جن سے یورپ کے نئے آرٹ کی بنا پڑی، یعنی سیزان، فان گوخ اور گوگان سے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہی ہوا کہ دانے دانے کو ترس کے انھوں نے دن گذارے اور زندگی میں ان کی وہ تصویریں کوڑی مول بکیں جو اب ہزاروں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی ہیں، انھوں نے بھی یورپ کی مصوری کی پرانی راہوں کو چھوڑ کر اپنے رنگ میں ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس راہ میں بڑی حد تک افریقہ اور ایشیا کی پرانی بت تراشی اور مصوری کی بنیادوں پر اپنی تصویروں کے رنگ روپ اور نقشے قائم کئے اور جامنی رائے نے سبھی کچھ دیکھا سمجھا اور کیا لیکن آخر میں اپنی طرز کی بنیاد ان سیدھے سادے نقشوں کو قرار دیا جو بنگال کے گاؤں میں صدیوں سے مٹی کے برتنوں، دیواروں اور کھلونوں پر بنتے چلے آئے ہیں۔ کیونکہ جامنی رائے کی کلاکاری کسی ایک طرز پر محدود نہیں رہی ہے اور کبھی کبھی انھوں نے بیسیوں تصویریں اس انداز میں بھی کی ہیں کہ ان پر فان گوخ، ماتیس، کلے اور یورپ کے دوسرے نئی ریت کے مصوروں کا گمان ہو۔ لیکن ان کا اپنا انداز وہی ہے جو ان کی موٹی موٹی سیدھی سادی چند لکیروں کے گھیر کے اندر خاکے یا تصویر کی صورت میں پیش ہوتا ہے اور جس پر بنگال کی دیہاتی کلاکاری کا اثر نظر آتا ہے۔ پھر اسی دیہاتی کلاکاری کا اور زیادہ گہرا اثر ان کی ان رنگوں میں ڈوبی ہوئی تصویروں میں ملتا ہے، جنھوں نے ان کے بعد کے کام کو رفتہ رفتہ بالکل ہی گھیر لیا ہے۔ جامنی رائے کے اس آخری طرز پر جو کلا کی ایک نئی ریت ایک نئے اسکول کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں رنگوں کا نظام کتنا ہی خوب صورت اور ساتھ ہی ساتھ اچانک بے دھڑک اور زوردار ہو۔ لیکن اس میں کم و بیش ایک جیسی سانچوں میں ڈھلی کٹ پتلیاں اتاری جاتی ہیں، جن کا زندگی اور زندگی کی خوشیوں اور بربادیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور جو صرف خوب صورت کھلونوں یا رنگا رنگی سجاوٹ کے نسخوں کی حیثیت رکھتی ہیں یہ اعتراض ایک حد تک صحیح بھی ہے اور غلط بھی، غلط یوں کہ جامنی رائے کی مصوری کا مقصد ہی سرے سے یہ نہیں کہ چلتی پھرتی زندگی کی مایا کو پیش کرتے پھریں بلکہ یہ ہے کہ اس کی گہرائیوں کو سطحی گوناگونی سے آزاد کر کے آسان سے آسان نقشوں میں حل کر دیں۔ جامنی رائے صورت اور زندگی کو اس طرح پر دیکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح ایک بچہ اسے دیکھتا اور سمجھتا ہے، جس کی آنکھیں بھرپور کھلی ہوتی ہیں، اور جو اللہ کی پیاری دنیا کی ایک ایک چیز کو اس حیرت، محبت اور اچنبھے سے دیکھتا ہے جو زندگی کی الجھنوں میں رفتہ رفتہ بالکل کھو جاتا ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ کلاکار ہونا اسی کا ہے جس کی نظروں میں اس طرح گھٹے نہ پڑ جائیں اور جس کی تحیر اور اچنبھے کی حسین حس نہ ہو سکیں۔ بھرپور کھلی آنکھوں کے ذکر پر جامنی رائے کی انھیں تصویروں کی لمبی لمبی آنکھوں کا خیال آتا ہے جن کے لئے پورے چہرے کی چوڑان بھی پوری نہیں پڑتی اور جو اس طرح پر کھلی ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیں گی۔

تنقید کے دوسرے حصے پر کوئی آٹھ دس سال ہوئے میری اپنی ایک موقع پر ان سے بات چیت ہوئی تھی، یعنی جیسی کچھ بھی بات وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں مجھ سے کر سکے اس طرح میں ان تک اپنے مطلب کو پہنچا سکا۔ وہ یہ کہ جب مصور کسی ایک چربے یا سانچے پر آ کے ٹک جاتا ہے تو پھر وہ مصوری نہیں رہتی تصویر ساری اندر کر خندیاری ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے اس پر انھوں نے کچھ کہہ کر اور کچھ ہاتھ سے معانی کا اشارہ دے کر یہی بتلایا کہ یہ بھی ایک منزل ہے۔ کچھ دنوں کا اٹکاؤ۔ آگے کچھ اور ہوگا۔ کچھ اور آئے گا۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہندسوں کا جھگڑا

مُشتاق احمدُ

کانگریس اسمبلی پارٹی نے تقریباً یہ طے کر لیا ہے کہ ملک کی قومی زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک معزز ممبر نے ہندی کی جگہ ہندوستانی کا لفظ لکھنا چاہا تھا لیکن ان کی اس تجویز کو شرف قبول نہیں بخشا گیا۔ یہ اصول مان لیا گیا ہے کہ زبان کو عوام کی بول چال سے قریب ہونا چاہیئے، لیکن اگر آل انڈیا ریڈیو کے جوتشی سے ہم اس اصول کی تقدیر معلوم کرنا چاہیں تو وہ یہی بتلائے گا کہ ستارہ گردش میں ہے۔

ہندیوں کے حامیوں نے اس زبان کو پورے ملک کے سر پر تھوپنے کی جان توڑ کوششیں کی ہیں، پریس کے ذریعے پروپیگنڈا تقریریں کرکے، مضامین لکھ کر، ہندی ڈرامے بنا کر، مرنے کی دھمکی دے کر غرض کوئی طریقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ہندی کی حمایت میں ان کا کہنا ہے کہ یہ اکثریت کی زبان ہے اس لئے اسے ملک کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ ان کے ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی چونکہ تمام زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں اس لئے اسی کو قومی زبان ہونا چاہیئے۔ ہندوستانی یعنی عوام کی زبان کے وہ بہت ہی خلاف ہیں۔ ان کی دلیلوں کو ذرا سیدھے سادے آسان لفظوں میں بیان کیا جائے تو ان کا کہنا یہ ہے کہ بھلا ایسی زبان بھی ملک کی قومی زبان ہو سکتی ہے جسے سب سمجھ لیں۔ ملک کی قومی زبان کو تو سنسکرت ہونا چاہیے جس کی بنیاد پر ساری زبانوں کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس عمارت میں اس زبان کا گارا چونا کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اس کی ہیئت پہچانی نہیں جاتی۔ اور وہ عمارت اپنی الگ حیثیت رکھنے لگی ہے۔

ہندی کے حامیوں کا پروپیگنڈا کچھ اتنا شدید تھا کہ کسی جماعت نے کوئی قابل ذکر مخالفت نہیں کی پنڈت جی کا یہ خیال تھا کہ زبان کو تو عوام خود بناتے ہیں۔ اس لئے کسی ایسی زبان کو عوام کے سر تھوپنا نہیں چاہیئے جسے وہ سمجھ نہ سکتے ہوں لیکن آخر میں انھیں بھی اس پروپیگنڈے کے آگے سر خم کر دینا پڑا۔ ہاں انھوں نے اتنی بات کے منوانے پر ضرور زور دیا کہ جہاں تک ہندسوں کا سوال ہے وہ بین الاقوامی ہونے چاہئیں۔ اپنی اس تجویز کی حمایت میں انھوں نے بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک تو یہی کہ یہ ہندسے تمام دنیا میں مروج ہیں، پھر ہم کیوں نہ استعمال کریں۔ اعداد و شمار میں ان ہندسوں سے بڑی آسانی ہوگی۔ دکھنی ہندوستان کے لوگ بھی پنڈت جی کی اس تجویز کی حمایت میں ہیں۔ ان کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ لیکن انھوں نے بین الاقوامی ہندسوں کو اپنا لیا ہے اس لئے ان کا کہنا ہے کہ زبان کے معاملے میں تو ہم طرح دے گئے لیکن ہندسوں کے معاملے میں ہم بالکل نہیں دبیں گے

یہ شگوفہ سو فی صدی ہندی کے حامیوں کے لئے سنگ آمد سخت آمد والی بات ہوئی وہ تو ہندی اور صرف ہندی چاہتے ہیں۔ بین الاقوامی ہندسوں کی مخالفت میں جنھیں انگریزی میں عربی ہندسے کہتے ہیں جب انھیں کوئی معقول دلیل نہیں ملی تو انھوں نے نفرت کے آزمائے ہوئے بان کو سر کیا۔ سارے ملک میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ یہ بین الاقوامی ہندسے تو عربی الاصل ہیں۔ "عربی" ہندسے اور ہندوستان میں اپرچلت ہوں؟

اس موقع پر سنسکرت کی ایک کہانی یاد آتی ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان برہمن اپنے کندھے پر ایک نوعمر بچھڑا لادے چلا آ رہا تھا، راستے میں اسے تین بدمعاش ملے۔ بدمعاشوں نے بچھڑے کو دیکھا تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور تینوں نے صلاح کی کہ کسی طرح برہمن دیوتا کو اس بچھڑے سے محروم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ تینوں راستے میں تھوڑی تھوڑی دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ جب برہمن ایک کے قریب پہنچا تو اس نے بڑھ کر حیرت سے کہا "ارے مہاراج یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ برہمن ہوکر آپ ایک کتے کو اپنے کندھے پر لادے چلے جا رہے ہیں۔ اسے جلد پھینکئے یہ آپ کو پلیت کئے دے رہا ہے، برہمن بے چارہ یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ یہ یونہی بک رہا ہے اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی آگے گیا ہوگا کہ اُسے دوسرا بدمعاش ملا اور اس نے بھی یہی کہا۔ اب برہمن دبدھے میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ شاید کسی بدروح نے میرے ساتھ یہ دھوکا کیا ہے۔ لیکن اسے ایک بہت ہی شریف اور ایماندار آدمی نے یہ بچھڑا دیا تھا اس لئے وہ جلد کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور آگے بڑھ گیا۔ اب اسے تیسرا بدمعاش ملا اور دیکھتے ہی چلا دیا "مہاراج پھینکیے، پھینکیے آپ نے اپنے کندھے پر ایک مُردہ کتے کو لاد رکھا ہے" اب برہمن کو یہ یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا، اور اس نے بچھڑے کو اپنے کندھے سے اتار پھینکا۔

یہ ہندسے جسے آج ساری دنیا استعمال کر رہی ہے ہندوستانی ہندسے ہیں کیا بہ اعتبار ایجاد اور کیا باعتبار شکل و صورت۔ یہ ہمارا ایک ایسا نمایاں کام ہے جس نے بغیر خون بہائے ساری دنیا کو جیت لیا ہے لیکن چونکہ یورپ والے اسے عربی ہندسے کہتے چلے آئے ہیں اس لئے آج بھارت آج یہ سوچ رہا ہے کہ کیا ہم ان عربی ہندسوں کو برداشت کرلیں؟ آزادی کے بعد بھی ایسی باتیں؟

تحریر اور تقریر کے ذریعے اس کے خلاف اتنا زبردست محاذ کھڑا کر دیا گیا ہے جو اس سے ٹکرائے گا اپنا سر پھوڑے گا۔ ہر دیش سیوک یہ کہتا ہے تو کیا آپ اب بھی آپ اپنے پوتر کندھوں پر اس اجنبی زبان کا بوجھ لادیں؟ اسے تو اتار ہی پھینکنا چاہیئے۔ ہاں اس میں ہچر مچر کیسی؟

ان کا مخرج

چھاپے کی ایجاد سے پہلے رسم الخط کی طرح ہندسے بھی ہندوستان میں ہاتھ ہی کے ذریعے لکھے جاتے تھے جب چھاپے کی ایجاد ہوئی اور اس کی برکتیں یہاں بھی پہنچیں تو لوگوں نے حرفوں اور ہندسوں میں تبدیلیاں شروع کیں۔ ان میں یکسانیت پیدا کی گئی۔ اور انھیں سہل بنانے کی طرف لوگوں نے دھیان دینا شروع کیا۔ ہمارے کتنے ہی حروف ابھی عیسائی مبلغین کی وجہ سے آج تک زندہ ہیں۔ جنھوں نے مقامی زبانوں میں بائبل چھاپنے کی غرض سے ان حرفوں کو بنایا سنوارا اور ان میں یکسانیت پیدا کی۔ ان عیسائی مبلغین نے چھاپے کے حرفوں کی جو شکل بھی بنا کر پیش کر دی ہم نے اسی کو اختیار کر لیا۔ اور آج ہم یہ جانتے تک نہیں کہ ان کی اصلی شکل کیا تھی۔ بین الاقوامی ہندسوں کی شکل و صورت میں بھی چھاپے کی ایجاد کے بعد بہت کچھ ردو بدل ہوا۔ تب کہیں جا کر ان کی موجودہ شکل متعین ہو سکی۔ یورپ میں یہ عربی ہندسوں کے نام سے جانے جاتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ہندوستان کی چیز ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں عرب ان ہندسوں کو ہندوستان سے بغداد لے گئے اور اسی صدی میں عربوں کے ذریعے یہ ہندسے یورپ میں پہنچے اس لئے یورپ والے ان کو عربی ہندسے کہنے لگے۔ یہ ہندوستانی ناگری ہندسے ہی ہیں جنھوں نے موجودہ بین الاقوامی ہندسوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور آج ساری دنیا میں مروج ہیں۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یہ ہندسے کتابوں اعداد و شمار اور مستقل حیثیت رکھنے والے حوالے کے دستاویزوں میں استعمال ہوتے ہیں، انھیں صرف اس بنا پر رد کر دینا کہ ان کا نام "عربی ہندسے" ہے حماقت کی انتہا ہے یہ ہندسے ہندوستان میں برابر استعمال ہوتے رہتے ہیں ہندسے 1، 4، 6 اشوک کے کتبوں میں پائے جاتے ہیں [illegible] 2، 4، [illegible] اور 9 نانا گھاٹ کے کتبوں میں موجود ہیں۔ 7، 6، 5، 4، 3، 2 اور 9 ناسک کے غاروں میں کھدے ہوئے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے علم نجوم کے زائچے بغداد میں عربی میں ترجمہ کئے گئے، اور اس طرح عرب عالموں کو ان ہندسوں کا علم ہوا۔ [illegible]ء میں ابو جعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جس کا [illegible]ء کے لگ بھگ ایڈی لارڈ نے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا اسی نے اس کا نام "الخوارزمی کی کتاب ہندی ہندسوں کے متعلق" رکھا۔

ان انکشافات کے بعد اس میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا کہ یہ ہندسے ہندوستان کی اپنی چیز ہیں آج بھی ہم تقریباً سو برس سے ان کو جانتے اور استعمال کرتے رہے ہیں، پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں کیوں رد کر دیا جائے۔ اس وقت جو ہندسے مختلف صوبوں میں جاری ہیں، انھی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں پھر یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ہندسے جو سب کی ملکیت ہو چکی ہے ہم اس سے منہ موڑنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ ہم چاہے کچھ بھی فیصلہ کریں لیکن ہمارے آس پاس کے دیسوں میں اور ساری دنیا میں یہ ہندسے استعمال ہوتے رہیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم کم از کم اس معاملے میں اس چیز کو استعمال نہ کریں جو ہماری اپنی ہے۔ اور آج ساری دنیا میں استعمال ہو رہی ہے یا ہم اپنے حساب اور اعداد و شمار کے لئے ایسی علامتیں اختیار کریں جنھیں دنیا میں نہ کوئی سمجھ سکے اور نہ اختیار کر سکے دنیا تو دنیا خود ہندوستان میں بہت سے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں اور وہ بے چارے صرف اس لئے قبول کرنے پر مجبور کئے جائیں کہ اکثریت کا راج ہے۔

(ماخوذ)

ہند اور پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

مصلحت کے مطابق ہو تلتے اور ہمارے خیال میں ہو چکا ہے، بہر حال فساد کی جڑ یعنی خوف اور بدگمانی کشمیر کے ادھر رہنے یا ادھر رہنے سے دور نہیں ہو سکتی ہیں اس کے ریشے سالہا سال کے زہریلے پراپگنڈا کی بدولت دلوں کی گہرائی میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے اکھاڑ پھینکنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس وقت بین الاقوامی ثالثی سے فائدہ اٹھا کر یو، این، او کی ضمانت میں ایسے معاہدے ہو جائیں جن سے دونوں ریاستوں کو ایک دوسرے کی طرف سے جارحانہ حملوں کا اندیشہ نہ رہے۔

کاش وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دونوں ملکوں کی ریاست کی باگ ہے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ خوف ایک مہلک مرض ہے اور متعدی۔ اگر ایک فریق دوسرے سے بہت زیادہ خائف ہے تو

ع ۔ از آں کس تو ترسد بترس اے حکیم

کے حکم کے مطابق دوسرے کو بھی اس سے ڈرنا چاہیئے اور یہ دو طرفہ خوف جنگ و جدل کی زہریلی بیل کا بیج ہے جو ہرے بھرے پودوں کو دم بھر میں جلا دیتی ہے۔ جب تک اس بیج کو ڈھونڈھ کر برباد نہ کر دیا جائے امن و امان خوش حالی اور ترقی کے باغ کا پھولنا ممکن نہیں ہے۔

جامنی رائے (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اس کو یوں سمجھئے کہ جامنی رائے دنیا کے ان مصوروں میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں جن کو تجربہ باز کہا جاتا ہے اور پکاسو کے سوا شاید کسی نے بھی مصوری میں اتنے تجربے نہیں کئے جتنے انھوں نے۔ اسی وجہ سے پکاسو کی طرح ان کی مصوری کا بھی کوئی ایک رنگ اور ایک انداز نہیں ہے اس واسطے اگر کوئی امرت شیر گل، ہالبین یا وان گوخ کے لئے پوچھے کہ آپ کو پسند ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ ہاں یا نہیں لیکن جامنی رائے اور پکاسو پر بھی ایسا سوال کیا جائے تو اس سوال پر جواب نہیں بلکہ ایک دوسرا سوال لازم آئے گا کہ ان کا کون سا انداز۔

بات میں بات نکلتی ہے اور جامنی رائے کلاکاری کی منزلوں میں ایسی منزل ہیں، خاص کر ہندوستان کی کلا ان کی ایسی منزل ہیں کہ چند منٹ کی مدت میں طے نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی اس موقع پر بات ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں اور کہنے کی ہیں کلا کی کوئی بھی شاخ ہو یعنی ادب اور ساہتیہ، موسیقی، نرتیہ مصوری، بت تراشی، ان میں سے ہر ایک کے اندر دو چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں، ایک تو کہنے کا انداز جو بہت کچھ سیکھنے اور محنت مشقت سے آتا ہے اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے پاس کہنے کو ہے کیا اور یہ چیز کچھ خدا کی دین ہوتی ہے، اور بہت کچھ زندگی سے طرح طرح کے تجربے میں آتی ہے۔ جامنی رائے نے اپنے فن کے اندر کوئی محنت مشقت اٹھا نہیں رکھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چھٹی ان کی ڈرائنگ اور لکیروں کی بول چال میں ملتی ہے وہ ہندوستان میں کسی اور کے یہاں نہیں ملتی اور ہندوستان کے باہر بھی کم ہی کم۔ رنگوں کے استعمال میں بھی جس کے اندر جامنی رائے باہر سے آئے ہوئے نہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دیسی رنگ برتتے ہیں ان کو بڑا گیان حاصل ہے، لیکن اتنا کہنا پڑتا ہے کہ ان کے رنگ لکیروں کے گھیرے میں الگ الگ بند رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بولتے نہیں جیسے امرت شیر گل کے رنگ، اور جہاں یہ نہیں ہوتا وہاں تصویر تصویر کم رہ جاتی ہے اور رنگین ڈرائنگ زیادہ۔

اب رہی یہ بات کہ ان کے پاس کہنے کو ہے کیا۔ اسے سمجھنے کے لئے تھوڑا سا امرتا شیر گل سے موازنہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ امرتا شیر گل کے پاس کہنے کو ہیں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، مل مل کے بیٹھے ہوئے لڑکے، لڑکیاں، سنورتی ہوئی دلہنیں، چکی پیستی ہوئی عورتیں، بازار کو جاتی ہوئی نزناریوں کے جھرمٹ قشقہ کھینچے ہوئے برہمن جا رہی۔ ننھی عمر کی بیاہی بچی اور یہ سب کچھ اس طرح کا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی یہ سب صورتیں یہ سارے معاملے پہلی بار نظر سے گذرے ہوں

جامنی رائے کے یہاں زندگی کے یہ بھی معاملے کم ملتے ہیں۔ ان کے یہاں کہنے کے لئے ہے "رام بن باس" سیتا کی ستی، رادھا کا رانی، کرشن لیلا، شری چیتنیا، کرشنا بلرام، اور یہ سارے مضمون زندگی سے آگے کی زندگی کو تصویر کے گھیرے میں پاتی ہے اور لکیروں اور رنگوں کے تال سُر سے اس میں یقین نہ کرنے والوں کو بھی یقین کروا جاتی ہیں۔

اسی انداز سے ہیں ان کی کرائسٹ، مڈونا اور ماں بچے کے مضمون کی تصویریں جنھیں انھوں نے سو سو طرح سے برتا ہے اور بات کہنے کی یہ ہے کہ اس زمین میں جو صدیوں سے یورپ کی مصوری کی جیتی زمین رہی ہے، جامنی رائے نے جس طرح جڑیں پکڑی ہیں اور ان پودوں کو جس طرح اپنے جی جان سے سینچا ہے وہ بہت ہی کم مصوروں کی قسمت میں آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ آدمی جب سے تک سکے اور سمجھ سکے جب تک دل میں نہیں اترتی اس وقت تک یہ سب کسی کے پلے نہیں پڑتا اور جامنی رائے پر اس ممتا سے بھری خلق سے سینچی کہانی کا بہت ہی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

وقت پورا ہو گیا اور بات پوری کیا آدھی بھی نہ ہونے پائی، لیکن جو کچھ بھی اس وقت کہا گیا ہے اس سے شاید جامنی رائے کی ہندوستان اور دنیا کی کلاکاری میں جو منزل اور جو درجہ ہے اس کا کچھ اندازہ ہو سکا ہو۔ ایک حد تک شاید یہ بھی کہ جامنی رائے کی تصویروں میں جتنا پہلے نظر آتا ہے اس سے کچھ زیادہ نظر آنے لگے، کیونکہ اگر یہ نہ ہوا تو سارا کہا سنا بے کار رہا۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

آپ کا عشق و محبت کا نظریہ

(دیکھو صفحہ ۷)

اب یہ دیکھئے کہ آپ نے کتنے سوالوں کے جواب میں "ہاں" لکھا ہے اگر ۱۵ بار یا اس سے زیادہ لکھا ہو تو آپ پکے رومانیت پرست ہیں ممکن ہے کبھی کبھی اس میں آپ کو لطف آتا ہو مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات میں بڑی شدت ہے، آپ کے دل پر بڑی جلدی چوٹ لگتی ہے۔ اور آپ آسانی سے رنج و مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں ذرا دیکھ بھال کے قدم اٹھایا کیجئے۔ خیال اور عمل میں زندگی کے ٹھوس واقعات کو پیش نظر رکھا کیجئے۔

۱۱ سے ۱۴ تک "ہاں" کے جواب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دل تو آپ رومانیت پرست ہیں لیکن واقعیت کا تھوڑا بہت احساس رکھتے ہیں اس لئے آپ نے اپنے جذبات پر اکثر ضبط یا مضبوطی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن وقت پر آپ رومانیت ہی کے پرستار نکلیں گے۔

۸ سے ۱۰ تک "ہاں" یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کی طبیعت میں اچھا خاصا توازن ہے اور اگر کبھی کشمکش ہو تو آپ واقعات اور حقائق کی طرف جھکتے ہیں، آپ کی عقل سلیم خیال پرستی اور خیال آرائی کی باگیں تھامے رہتی ہے اور ذوق صحیح جذبات پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ اور انھیں قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا۔

۷ یا اس سے کم "ہاں" ہوں تو یہ سمجھئے کہ آپ واقعیت پرست ہیں مگر بنے ہوئے۔ آپ نے محبت سے بچنے کے لئے اپنے گرد ایک حصار کھینچ رکھا ہے شاید آپ کو تلخ تجربہ ہوا ہے۔ اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ کبھی کبھی خواب و خیال کی دنیا کی ایک جھلک نظر آئے اور آپ نے اوپر حقیقت پسندی طاری کرنے کی وجہ سے جو کھچاؤ اعصاب میں پیدا ہو گیا ہے وہ ڈھیلا ہو۔

"نئی روشنی" کے پروانے

۱۶ اگست کے پرچے میں "تکلف برطرف" کے عنوان سے جو نوٹ لکھا گیا تھا اس کے سلسلے میں ہمارے قدردانوں اور کرم فرمائوں کے بہت سے خطوط آئے ہیں ان میں سے چند کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱)

سال بھر سے کچھ اوپر ہوا ملک کے مشہور ادیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (پی، ایچ، ڈی) نے "تہذیب الاخلاق" اور "مخزن" کی طرح "نئی روشنی" کا چراغ جلایا تھا۔ اب تک جن تہذیبی و تمدنی مضامین کا یہ ہفتہ وار حامل رہا ہے محتاج بیان نہیں۔

لیکن پچھلے ہفتے "بزم بے تکلف" کی محفل اُٹھا کر "بزم برطرف" کے میدان میں بڑے درد بھرے اور ارمان بھرے لفظوں سے آگاہ کیا ہے کہ اب مالی خسارہ "نئی روشنی" کو نہ چلنے دے گا

ماتم ہے ہند کے مسلمانوں کے ذوق پر۔ دیکھ لیا آپ نے جذبۂ شوق کو۔ ملاحظہ کر لیا آپ نے احساسِ فرض کو، ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری ترجیح کا نقصان دیکھ کر ہوتی ہے۔ اپنے نقصان پر تو سر پیٹ لیا جاتا ہے۔ اف! اس قوم کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنے سود و زیاں کا خیال نہیں، اپنی آپ حفاظت نہیں ہوتی۔ ہم شاکی ہیں، حکومت اردو کو مٹا رہی ہے، اردو دفاتر سے خارج ہو رہی ہے، تعلیمی نصاب سے نکالی جا رہی ہے۔ یہ سب درست۔

لیکن ذرا سوچئے تو سہی۔ بلا سرکاری سرپرستی کے زبان یا رسم الخط باقی رہتا ہے یا خود پڑھنے لکھنے والوں کے ذوق و شوق اور فکر و نظر پر زبان اور رسم الخط کی بقا و ارتقا کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجئے۔ حکومت نے آپ کی باتیں مان لیں۔ ہو گئی اردو داخل دفتر۔ گذاری جانے لگیں عرضیاں بہ زبان اردو اور بخط اردو تو آپ نے اب یقین کر لیا کہ آپ کی زبان محفوظ ہو گئی۔ اور پہنچ گئی ترقی کی معراج پر، بعض ماہر لسانیات اور علم و دانش کے جاننے والے اس سے انکار کرتے ہیں۔

اس کے خالق آپ ہیں، اس کے محافظ آپ ہیں۔ اوج ثریا پر لے جانے والے آپ ہیں موجودہ دور بے حد انتشار اور ہیجانی کا ہے، کل کے غلام آج آزادی کے آسمان پر ہیں، نیچے دکھائی نہیں دیتا .... حق و انصاف کے طالبو! تمھاری تقدیر کے آسمان پر گھنے بادلوں سے بارش بہاراں بھی ہو گی، لیکن بربادی کی بجلیاں بھی گر سکتی ہیں

ہمارے شوق کا عالم یہ ہے کہ اردو رسالے کتابیں خرید نا تو درکنار سفر و حضر میں پڑھنا اپنی کم عقلی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی سرپرستی و اعانت کجا۔ اچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتے، تو کیا آسمان سے فرشتوں کا نزول ہو گا اور وہ اردو لکھیں گے پڑھیں گے، اور اس کی ترقی میں اپنا سر کھپائیں گے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ فضول خرچی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سال چھ ماہ کے لئے دس بیس روپے اخباروں رسالوں کے لئے خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس کو فضول خرچی سے کوئی لگاؤ نہیں اگر یہی چلن ہمارے رہے تو جینے کی تمنا سے باز آئیے۔ دوستو! نصیحت نہیں ہے دل کی آواز ہے۔ قوم کا درد ہے۔ یہ باتیں فلسفہ کی نہیں ہیں، جو فلسفی ہیں اگر سمجھائے تو اس کی باریکیاں و نزاکتیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ہم اگر ہوش میں آ جائیں ہمارا احساس جاگ اُٹھے، ہمارا فکر چلا پا جائے ہم اپنی زندگی کا راز سمجھ لیں، ہم اپنی پونجی بڑھانا چاہیں تو یقین کیجئے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے چراغ حیات کو نہیں بجھا سکتی۔

ہم جئیں گے۔ پھولیں گے، پھلیں گے۔ ہماری زندگی کی روشوں میں رنگ ہائے رنگ کے گل بوٹے ہوں گے، اور ان گلوں کی خوشبوؤں سے سارا چمن مہکتا ہی رہے گا۔

کاش ہم میں احساس ہوتا۔ احساس ایک طاقت ہے: بہت بڑی طاقت۔ آئیے اسی احساس کے بل پر "نئی روشنی" کو زندہ رکھیں۔

کلکتہ　　علی احمد صدیقی

مکرمی، تسلیم

۱۶ اگست کے "نئی روشنی" میں تکلف برطرف کر کے جو باتیں آپ نے صاف صاف کہی ہیں وہ نئی روشنی کے پرستاروں کے لئے دلی تکلیف کا باعث ہیں .... نئی روشنی کو نکال کر جو فرض آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کی اہمیت سے بھی مجھے یقین ہے کہ آپ اچھی طرح واقف ہوں گے۔ غالباً اسی فرض شناسی کا جذبہ تھا جس نے آپ کو تکلف برطرف کر کے صحیح حالات نئی روشنی کے پڑھنے والوں کے سامنے بلا کم و کاست رکھنے پر مجبور کیا۔ مجھے آپ کی دقتوں کا احساس ہے۔

زمانے کی ناسا عدت بھی پوشیدہ نہیں۔ اس سے آپ شاید پہلے ہی دن سے واقف تھے۔ ان حالات کے باوجود جس طرح مردانہ وار آپ نے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس سے ہمیں یقین تھا کہ جو قدم آگے بڑھ چکا تھا وہ پیچھے نہیں ہٹے گا، زمین ٹل سکتی تھی، آسمان حرکت کر سکتا تھا مگر آپ کے عزم و استقلال میں تزلزل ہو ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔

مگر آپ کا ۱۶ اگست والا مضمون شاید ایک ایسی ذہنیت کا علم بردار ہے جو مسلسل دقتوں اور غالباً آپ کے بستر جراحت کی آئینہ دار ہے ...... معاف کیجئے گا، میں نے آپ کے عزم و استقلال پر شک کیا ہے، در اصل مجھے یقین ہے کہ نہ آپ کے ارادہ میں تزلزل ہو سکتا ہے اور نہ آپ کی اپیل پڑھنے والوں پر رائیگاں جا سکتی ہے۔ نئی روشنی نے پڑھنے والوں کے دلوں میں اپنا گھر کر لیا ہے، اور ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو آپ کے چیلنج کو قبول نہ کر سکے، اور نئی روشنی کو باقی رکھنے کے لیے حتی الامکان کوشش نہ کرے۔

نئی روشنی کا جاری رہنا ہر لحاظ سے ضروری ہے، جو دقتیں اس کی راہ میں حائل ہیں ان سے آنکھیں بند کر لینا، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے آپ نے کھلے الفاظ میں حالات کا اظہار کیا ہے، اب یہ فرض "نئی روشنی" کے خریداروں کا ہے کہ وہ ان دقتوں کے لئے حل فراہم کریں۔

مجھے پرچے کی مالی حالت کا اس سے زیادہ اندازہ نہیں کہ خراب ہے، کس حد تک خراب ہے میں نہیں جانتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ جو تجویز میں پیش کر رہی ہوں وہ کافی نہ ثابت ہو۔ پھر بھی میرا خیال ہے کسی بڑی حد تک وہ آپ کو مطمئن کر دے گی۔ ہم میں سے ہر شخص اگر ایک سال کا چندہ بطور عطیہ اس وقت دیدے تو موجودہ مشکلیں شاید رفع ہو جائیں، لیکن خاص مدتوں سے یا عطایا سے اخبار کو جاری رکھنا امکان سے باہر ہے۔ اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر خریدار اس کی کوشش کرے کہ کم از کم ایک نیا خریدار پرچے کے لئے حاضر کیا جائے۔ اگر ہمارے کرم فرمائوں کو ۵۰ فی صدی بھی کامیابی ہوئی تو نئی روشنی پھر گل ہونے سے بچ جائے گی۔

ابتدا میں خود کرتی ہوں، منی آرڈر سے آج ہی کی ڈاک سے آٹھ روپے آپ کو بھیج رہی ہوں۔ اس کے علاوہ آپ کے لئے ایک نئے خریدار کا نام بھی بھیجتی ہوں۔ آپ پرچہ ان کے نام جاری کر دیجئے، اور چندہ کی رقم بذریعہ وی۔ پی وصول کر لیجئے۔

خدا کرے کہ بستر جراحت کی مجروح ذہنیت آپ سے کوسوں دور ہو۔

نیاز کیش

فیض آباد　　شہر آرا حسن

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم ۸، ۱۶، ۴۷
چندہ:- سالانہ ؏ ششماہی ۱؎

دفتر:- نئی روشنی جامعہ نگر، دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۱ | ۱۶ ستمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

کیا آپ
چست اور تندرست ہیں؟

ان سوالوں کے صاف اور قطعی جواب دیجئے
"ہاں" یا "نہیں"

۱- کیا آپ اس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ گہرا سانس لیں ؟
۲- جب آپ بیٹھ کر کام کر رہے ہوں، کھڑے ہوں یا چل رہے ہوں تو آپ کی کمر بالکل سیدھی رہتی ہے ؟
۳- کیا آپ روز کھلی ہوا میں تھوڑی سی ورزش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ محض چہل قدمی ہو ؟
۴- کیا آپ ہر موسم میں کمرے کی کھڑکیاں کھول کر سوتے ہیں؟
۵- کیا آپ کی دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چکھنے کی حسیں اچھی طرح کام کرتی ہیں ؟
۶- کیا آپ کے پاؤں ہمیشہ ٹھیک رہتے ہیں ؟
۷- کیا آپ کو سر کا درد بہت ہی کم ہوتا ہے ؟
۸- کیا آپ قبض سے محفوظ ہیں ؟
۹- کیا آپ کھانا عموماً وقت کی پابندی سے کھاتے ہیں؟
۱۰- کیا آپ کی غذا میں تنوع ہوتا ہے اور آپ ہر نوالے کو اچھی طرح چباتے ہیں ؟
۱۱- کیا آپ رات کو سونے سے پہلے اور صبح بستر سے اٹھ کر دانت مانجتے ہیں ؟
۱۲- کیا آپ حتی الامکان مسکّن اور خواب آور دواؤں سے بچتے ہیں ؟
۱۳- کیا آپ شراب اور تمباکو سے دور رہتے ہیں یا کم سے کم ان کے استعمال میں نہایت اعتدال سے کام لیتے ہیں ؟
۱۴- جب آپ کو مسلسل درد رہے یا طبیعت خراب ہو جائے تو آپ فوراً کسی ماہر معالج سے رجوع کرتے ہیں ؟
۱۵- کیا آپ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اتنا زیادہ کام یا اتنی زیادہ ورزش نہ کریں جس سے جسم بالکل شل ہو جائے؟
۱۶- کیا آپ کو اس کا ڈھب آتا ہے کہ جب چاہیں جسم اور دماغ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں ؟
۱۷- کیا آپ معمولاً رات کو سات گھنٹے سے لے کر دس گھنٹے تک سو لیتے ہیں ؟
۱۸- کیا آپ ہفتہ میں کم سے کم ایک بار ضرور نہا لیتے ہیں؟
۱۹- کیا آپ ہر معقول احتیاط رکھنے کے بعد پھر اس چکر میں نہیں پڑتے کہ مجھے کچھ ہو نہ گیا ہو یا ہو نہ جائے ؟
۲۰- کیا آپ کو روز کسی نہ کسی وقت ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے ؟

ہر "ہاں" کے ۵ نمبر رکھئے۔ ۷۰ سے ۸۰ تک اوسط درجے کے نمبر ہیں مگر آپ کو اس وقت تک مطمئن نہ ہونا چاہیئے جب تک ۱۰۰ نمبر نہ ہو جائیں۔ یقین مانئے آپ کا چست اور تندرست ہونا بہت کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔

فہرست مضامین

کیا آپ چست اور تندرست ہیں		۱	بزم بے تکلف		۵
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	سالک ندوی	۲	داغ انسانیت	سروش عسکری	۵
ایمان یا موت	(اداریہ)	۳	اسلامی ممالک کا تنزل	سید احتشام حسین	۶
دنیا کی رفتار ۱۔ ہندوستان		۴	فرار	باقر رضوی	۷
۲۔ باہر کی دنیا		۵	نئی روشنی کے پروانے		۸
			چہرے (افسانہ)	سید سفارش حسین	۹

قیمت فی پرچہ ۳؍

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

ارباب پاکستان کو یہ مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ انہیں سختی کے ساتھ اس نامبارک ذہنیت کے خلاف جہاد کرنا چاہئے جس کی بدولت ۱۵ اگست کو کراچی میں جھنڈے کا ناگوار واقعہ پیش آیا۔...... یاد رکھئے کہ جو سیاسی لیڈر حق کی خاطر دریا کی رو کے خلاف نہیں چل سکتا اور اخلاقی قدروں کی خاطر اپنی سیاسی پوزیشن کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ ہرگز اپنے ملک کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں جیسا پنڈت جواہر لال اپنی حق پرستی کی بدولت بار بار کہہ چکے ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کے لئے دو مختلف قانون یا اصول یا ترازو استعمال کئے جائیں...... ہمیں یقیناً ہر مذہب کے عقیدوں، بزرگوں دیوتاؤں کا احترام کرنا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری اور سیاسی امور میں کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والی چیزیں جگہ پائیں اور دوسری وہاں بار نہ پاسکیں

اِسلامی ریاست

سب معقول لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور زیادہ تر سیاسی لیڈر کہتے بھی رہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، میں بھی نئی روشنی میں اس پر بار بار زور دے چکا ہوں لیکن آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہوتا رہتا ہے جو تلخی اور مخالفت کی چنگاری کو بھڑکا دیتا ہے، اور مصالحت کی ذہنیت پژمردہ ہو کر رہ جاتی ہے ایک طرف تو کئی اختلافی مسئلے مستقل طور پر سنگ راہ بنے ہوئے ہیں، مثلاً کشمیر کا معاملہ، ترک وطن کرنے والوں کی جائداد، دریاؤں کا پانی وغیرہ، لیکن ان کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا کی سیاست اسی طرح چلتی ہے لیکن دوسری طرف جو خواہ مخواہ کی نوک جھوک چلی جاتی ہے، وہ تو سراسر عقل کے ساتھ دشمنی اور عاقبت ناشناسی ہے، مثلاً پاکستان کے وزیر اعظم کو کیا سوجھی تھی کہ عید کے مبارک موقع پر جب ایک سچے مسلمان کے دل میں صرف مسلمانوں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ساری دنیا کی طرف سے خیر شناسی کے جذبات ہونے چاہئیں (کیونکہ رمضان کے روزوں کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ روزہ داروں کے دل مخالفت بدخواہی اور دل آزاری کے جذبات سے پاک ہو جائیں) انھوں نے بیٹھے بٹھائے ہندوستان کے مسلمانوں کو غلام قرار دے دیا! کیا ان کی ہمدردی، سمجھداری سے اتنی بے تعلق ہے کہ وہ اس کا اظہار اس قدر بے ڈھنگے طریقے سے کریں کہ اس سے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی پوزیشن خراب ہو جائے؟ خیر، اس بارے میں ان پر کافی لے دے ہو چکی ہے اور میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا، لیکن نہایت ادب اور دل سوزی کے ساتھ ارباب پاکستان کو یہ مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ انھیں سختی کے ساتھ اس نامبارک ذہنیت کے خلاف جہاد کرنا چاہئے جس کی بدولت ۱۵ اگست کو کراچی میں جھنڈے کا ناگوار واقعہ پیش آیا، حکومت نے اس بارے میں جو فوری تعزیری کارروائی کی وہ ضرور قابل تعریف ہے، لیکن کافی نہیں، انھیں اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی پراپیگنڈے کے تمام ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے دلوں سے اس نفرت اور تعصب کو دور کرنا ہے جو موقع پا کر ایسی ناگوار صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کی تنگ دلی خواہ وہ پاکستان میں ہو یا ہندوستان میں یا دوسرے ملک سے زیادہ خود اس ملک کے لئے خطرناک ہے کیونکہ کسی قوم کی ترقی یا اتحاد کی بنیاد نفرت اور تخریب کے جذبے پر نہیں رکھی جا سکتی بلکہ شاید مجھے یہ کہنا چاہئے کہ رکھی تو جا سکتی ہے (اور تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے) لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ پاکستان کے وزیر اعظم نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ اگر پاکستان کے جھنڈے کی حفاظت کا وقت آئے گا تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اہل پاکستان اس وعدے کو یاد رکھیں گے اور مناسب موقع پر اس کی یاد دہانی کریں گے، لیکن بہ حیثیت ایک مسلمان کے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا اگر لیاقت علی خاں اس موقع پر یہ کہنے کی ہمت کرتے کہ اگر پاکستان میں کسی قوم کے جھنڈے کی ناجائز بے حرمتی کی گئی تو میں اس کے لئے اپنی جان قربان کر دوں گا۔ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ پاکستان کا جھنڈا کسی قوم یا ملک [illegible] اور [illegible] کا جھنڈا نہیں بلکہ حق اور انصاف اور صداقت کا جھنڈا ہے، رواداری اور [illegible] کا جھنڈا ہے اور اس کی حفاظت کا مطلب دراصل ان قدروں کی حفاظت ہے۔ بے شک اس قسم کے جذبے کا محسوس کرنا آسان نہیں اور ایک سیاسی لیڈر کے لئے اس کا اظہار بہت مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ فضا میں ان چیزوں کا فر معلوم کی [illegible] پر پڑتا ہے! لیکن یاد رکھئے کہ جو سیاسی لیڈر حق کی خاطر دریا کی رو کے خلاف [illegible] اور اخلاقی قدروں کی خاطر اپنی سیاسی پوزیشن کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہے وہ ہرگز اپنے ملک کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیا گاندھی جی نے سیکڑوں کی تعداد میں بار بار نہیں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا ہے جو دوسرے شہریوں کی طرح محفوظ اور با عزت زندگی بسر نہیں کر سکتا میرے نزدیک ہندوستان کا آزاد ہونا بے معنی ہے؟ اور کیا وقت آنے پر انھوں نے اس اصول کی خاطر اپنی جان نہیں دی؟ اور کیا جواہر لال نے اس مقصد کی خاطر گذشتہ دس سال میں اپنی جان اور اپنی پوزیشن دونوں کو خطرے میں نہیں ڈالا؟ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست ہونے کی امنگ یا کم سے کم اس کا دعویٰ ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ زبانی دعوے ذرا کم کرے اور دنیا کے سامنے عملی نمونہ زیادہ پیش کرے، خون جو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے آنکھ سے بھی تو ٹپکے!

غیر مذہبی ریاست

جس طرح پاکستان پر اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے خاص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسی طرح ہندوستان کو غیر مذہبی ریاست ہونے کی وجہ سے بہت سے معاملات میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بعض رجحانات ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو ہمارا غیر مذہبی ریاست ہونے کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں جیسا پنڈت جواہر لال نہرو اپنی حق پرستی کی بدولت بار بار کہہ چکے ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کے لئے دو مختلف قانون یا اصول یا ترازو استعمال کئے جائیں۔ انھوں نے ابھی حال میں الہ آباد کی تقریر میں ان لوگوں پر کڑی تنقید کی ہے، جو ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا ملک یا ہندو تہذیب کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اہم ہوتی ہیں مثلاً جب ہندوستان کے آزاد ہونے کی رسم منائی گئی اور پنڈت جی نے بڑے وزیر کے عہدے کو سنبھالا تو اس وقت بعض مذہبی رسمیں ادا کی گئیں حالانکہ اس وقت ایک غیر مذہبی ریاست کی صدارت کو ہاتھ میں لے رہے تھے وہ ان کی کوئی ذاتی تقریب نہ تھی، خیر تو یہ پرانا واقعہ ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ ابھی حال میں جو ڈاک کے ٹکٹ شائع کئے گئے ہیں ان میں سے ایک پر شری گنیش کی تصویر ہے، آخر اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ ہندوستان میں کروڑوں مسلمان اور عیسائی بھی ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ر ستمبر ۴۹ء

ایمان یا موت

اس وقت دنیا میں کئی قوتیں ہیں، جو نوعِ انسانی کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈھکیلنے کی کوشش کر رہی ہیں ـــــ سرمایہ داری، آمریت، نسل پرستی، مذہبی مادّیت کھوکھلی روحانیت، انسان کو اپنی زندگی اور اپنی تہذیب کی سلامتی کے لئے ان سب کا مقابلہ کرنا ہے اور وہ جیسے تیسے کر رہا ہے۔ لیکن ایک تخریبی قوت اور ہے جو ان سب سے زیادہ مہلک ہے جو چپکے چپکے اس کے جسم و روح میں زہر پھیلا رہی ہے اور اس کے جوہر حیات کو فنا کر رہی ہے۔ یہ یاس پرستی یا قنوطیت کی کیفیت ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد صرف مفتوح قوموں میں نہیں بلکہ فاتح قوموں میں بھی پیدا ہوگئی ہے اس لئے کہ اس جنگ میں فاتحوں کو بھی بڑا شدید نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ کم سے کم ان کے دل دماغ اور اعصاب کو بڑا سخت دھکا لگا ہے۔

اس عام مایوسی اور بے دلی کے کئی پہلو ہیں لیکن اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انسان کے دل میں ایمان کا جذبہ اس قدر کم زور ہوگیا ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے ایمان دراصل مذہب کی اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں خدا پر یعنی ایسی ذات پر جو سرچشمۂ حقیقت اور سرچشمۂ خیر ہے اعتقاد رکھنا، لیکن جو لوگ مذہب کے قائل نہیں ہیں وہ بھی دماغی صحت کی حالت میں کسی نہ کسی اخلاقی قدر یا متعدد قدروں پر کچھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی عقلی اور علمی توجیہ نہیں ہوسکتی اور اسے ایمان کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکتے۔

مجھے یہاں ایمان کے جس جزسے بحث کرنا ہے وہ مذہب کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں مشترک ہوتا ہے یعنی انسانیت پر ایمان۔ دونوں انسان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی پست اور گمراہ کیوں نہ ہو اس کے اندر اُبھرنے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی صلاحیت کبھی فنا نہیں ہوتی اس عقیدے کے بغیر ہماری دنیا میں جو اب تک جہالت اور وحشت، لالچ اور خودغرضی تعصب اور نفرت ظلم اور استبداد سے خالی نہیں ہے اور بظاہر ایک مدت تک نہیں ہوگی، کوئی شخص خوش نہیں رہ سکتا بلکہ سچ پوچھئے تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ اگر اُسے انسانوں کی طرف سے مایوسی ہوجائے تو یا تو وہ نوعِ انسانی کو ہلاک کرنے پر تُل جائے یا پھر اس کے سعی و عمل کا کوئی محرک باقی نہ رہے اور اسے کامل بےعملی اور بےحسی کی زندگی اختیار کرنی پڑے جو کسی طرح موت سے کم نہیں۔

یہی افسوس ناک مایوسی آج کل دنیا میں بہت سے لوگوں پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے، ان میں بعض تو کارزارِ حیات سے کنارہ کش ہوکر عیش و عشرت یا ترک و تجرد یا بیزاری اور بےعملی کی زندہ موت کے دامن میں پناہ لے رہے ہیں اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ جب انسانوں کی یا کم سے کم ان کے مخالفوں کی اصلاح کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی تو پھر اُنھیں ایٹم بم یا زہریلے جراثیم کے ذریعے سے جلد سے جلد ختم کردینا چاہیئے۔

ہندوستان بھی ضعفِ ایمان کے اس عالمگیر مرض میں مبتلا ہے۔ جو ہلاکت اور تباہی جنگ عظیم اور اس کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے کے طور پر اُٹھانی پڑی اس کی بدولت ہندوستانیوں کا عقیدہ عام طور پر انسان کی انسانیت سے اُٹھ گیا ہے۔ جغرافی علاقے، مذہبی فرقے سیاسی پارٹیاں غرض وہ سب جو ایک دوسرے سے اپنے حقوق و مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ دوسروں سے مایوس ہیں کہ وہ ان کی معقول باتوں کو ہرگز نہیں مانیں گے اور اپنے آپ سے مایوس ہیں کہ سمجھانے بجھانے سے اور اخلاقی اثر ڈالنے سے اپنے جائز مطالبوں کو کسی طرح نہیں منوا سکیں گے۔ اس لئے اُن میں سے کچھ لوگ اہلِ مغرب کی طرح اس چیز کو جسے وہ حق سمجھتے ہیں تلوار کے زور سے حاصل کرنے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں اور کچھ ہمت ہار کر سپر ڈالنے پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں

بظاہر ہندوستانی مسلمان اس وقت ان سپر ڈالنے والوں کے زمرے میں شامل ہیں ان کے ضعفِ ایمان کا یہ حال ہے ساڑھے تین یا چار کرور کی تعداد کے باوجود وہ اپنے مستقبل سے اُس سے زیادہ مایوس ہیں جتنے مٹھی بھر عیسائی یا پارسی انھیں یقین ہے کہ ان کے خلاف نفرت اور تعصب کی عام فضا جو اُن کے اور دوسروں کے مشترک تصور سے پیدا ہوئی ہے ہمیشہ اسی طرح باقی رہے گی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ساری ذہنی اور معاشی قوتیں جو قدامت پرستی اور فرقہ پرستی کے مقابلے میں صف آرا ہیں ناکام رہیں گی۔ باہر کی وسیع دنیا سے، عالمگیر ذہنی اور سیاسی تحریکوں سے سابقہ پڑنے کے بعد بھی ہندو اکثریت کی تنگ نظری کا یہی حال رہے گا اور وہ مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے دبانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ سچ ہے خود بےچارے مسلمان تو وہ اب انگریز کے جانے کے بعد کیا کرسکتے ہیں؟ جب حکومت کا تقرب حاصل نہ رہے، خدا کے حفظ و امان پر اپنی روحانی اور اخلاقی صفات پر اپنی محبت اور مروت، دیانت اور محنت، قابلیت اور لیاقت پر کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے ۱۵ر اگست ۴۷ء کے بعد اخلاقی کشش روحانی تسخیر تدبیر و مصلحت سب بےمعنی الفاظ ہوگئے ہیں!

ہمیں یہ اُمید کرنی چاہیئے کہ یہ ایک عارضی نفسی کیفیت ہے جو رفتہ رفتہ دور ہوجائے گی، لیکن خدا نخواستہ اگر یہ ایمان کی کمزوری یہ مایوسی اور نا اُمیدی مستقل حالت بن کر رہ جائے گی تو وہ قوتِ زندگی، جوہرِ حیات کو فنا کردے گی اور مسلمان عیش و عشرت ترک و تجرد یا بےزاری میں مبتلا ہوجائیں گے جن میں سے ہر ایک موت کے برابر ہے۔ یہ خطرہ اتنا ہولناک ہے کہ وہ لوگ جن کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے ان کی موجودہ حالت کی اصلاح کو محض بخت و اتفاق پر نہیں چھوڑ سکتے بلکہ انھیں شعوری اور ارادی کوشش کے ذریعے سے مسلمانوں میں سچا ایمان یعنی خدا پر، انسانیت پر اور اپنے آپ پر بھروسا پیدا کرنا ہے ٭

دنیا کی رفتار

ہندوستان

نئی دہلی، ۸ر ستمبر۔ ہندوستان کی طرف سے پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر اٹیلی کے پیغامات کا جواب بھیج دیا گیا ہے۔ اس میں تفصیل سے سمجھایا گیا ہے کہ ہندوستان نے کشمیر کے معاملے میں ثالثی کی تجویز کو کن وجوہ سے رد کر دیا۔

کلکتہ، ۱۰ر ستمبر۔ مغربی بنگال کی کانگریس اسمبلی پارٹی نے ۱۴ کے مقابلے میں ۴۳ ووٹ سے ڈاکٹر بی سی رائے پر اعتماد کا رزولیوشن پاس کیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی کہ انٹیرم منسٹری کے بارے میں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے۔

نئی دہلی، ۱۲ر ستمبر۔ کچھ معمولی تبدیلیوں کے بعد وہ رزولیوشن جو وزیر اعظم نے جبری حصول املاک کے بارے میں پیش کیا تھا پاس ہو گیا۔

نئی دہلی، ۱۳ر ستمبر۔ مغربی بنگال کی حکومت نے پنڈت نہرو کی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز مان لی ہے کہ مغربی بنگال میں عام انتخابات کرائے جائیں۔ غالباً یہ انتخابات جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوں گے۔ مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ ان میں مشترک حلقہ ہائے انتخاب ہوں، لیکن مسلمانوں اور اچھوتوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر لی جائیں۔

پچھلے ہفتہ وہ الجھن جو کشمیر کے معاملے میں مسٹر ٹرومین اور مسٹر اٹیلی کے پیغامات سے پیدا ہو گئی تھی ختم ہو گئی، زمین اور دوسری املاک کی ضبطی اور معاوضے کا معرکۃ الآرا مسئلہ جو مدت سے چھڑا ہوا تھا طے ہو گیا، بنگال کی پرانی گتھی کے سلجھنے کی ایک صورت نظر آنے لگی۔

کشمیر ہندوستان میں جو عام خفگی اس غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ امریکا اور انگلستان کشمیر کے معاملے کو طے کرانے کے لئے مداخلت کرانا چاہتے ہیں یا کسی قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں وہ دور ہو گئی، دونوں نے اس بات کو صاف کر دیا کہ وہ محض دوستانہ مشورہ دینا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کی طرف سے جو جواب دونوں صاحبوں کو بھیجے گئے ہیں ان کا مضمون معلوم نہیں لیکن اندازہ یہی ہے کہ ان سے مشوروں کا شکریہ ادا کیا گیا ہے ان کو ساری صورت حال تفصیل سے سمجھائی گئی ہے اور نرمی سے مگر نہایت مضبوطی سے ثالثی کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ پاکستان کی حکومت نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اب ثالثی کی تجویز منظور ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ مگر پاکستان کے اخباروں نے اور رائے عامہ کے دوسرے نمایندوں نے ثالثی کی تجویز کو نہایت خطرناک قرار دیا اور بڑی شدت سے مخالفت کی۔

ضبطی اور معاوضہ ہندوستان کے مسودہ دستور میں جو دفعات اس مطلب کی رکھی گئی ہیں کہ ریاست اجتماعی مفاد کے پیش نظر، کارخانوں، زمینوں اور ہر قسم کی شخصی املاک کو مناسب معاوضہ دے کر ضبط کر سکتی ہے۔ اس کی مخالفت سرمایہ داروں خصوصاً زمینداروں کی طرف سے بڑی شدت سے ہو رہی تھی اس لئے کہ زمینداری کے معاوضے کے بارے میں تجویز تھی کہ مجلس آئین ساز کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے اور زمینداروں کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق نہ ہو۔ مہینوں کی کش مکش کے بعد یہ دفعات منظور ہو گئی ہیں، اور صوبوں کی حکومتوں کو زمینداری کے ختم کرنے میں جو دقتیں پیش آ رہی تھیں، ان میں سے ایک بڑی دقت دور ہو گئی ہے۔

مغربی بنگال کی خانہ جنگی مغربی بنگال میں پارلیمنٹری کانگریس پارٹی اور صوبے کی کانگریس کمیٹی ایک مدت سے آپس میں دست و گریباں ہیں مرکزی حکومت اور کانگریس کمیٹی کی ساری کوششیں دونوں فریقوں میں سمجھوتہ کرانے کے بارے میں ناکام ثابت ہوئیں، مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جلد سے جلد عام انتخابات کرائے جائیں اور موجودہ وزارت کو توڑ کر ایک نئی انٹیرم وزارت بنائی جائے جس میں کانگریس کے ہر گروپ کی نمائندگی ہو۔ اب تک وزارتی گروپ ڈاکٹر بی سی رائے کی سرکردگی میں اس فیصلے کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اس نے رائے عامہ کے دباؤ سے [illegible] وزارت نے [illegible] تجویز کو مان لیا ہے مگر کیبنٹ میں تبدیلی کا کچھ ذکر نہیں، غالباً اس سلسلے میں ورکنگ کمیٹی کو مداخلت کرنی پڑے گی۔

باہر کی دنیا

اسٹراس بورگ، ۹ر ستمبر۔ یورپی مشاورتی کمیٹی نے یورپ کے لئے ایک اسمبلی کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔

بلگریڈ، ۵ر ستمبر۔ اطلاع ہے کہ امریکہ نے بہت جلد یوگوسلافیہ کو کومن فارم کے معاشی بلاکیڈ کے مقابلے کے لئے ۲۵ ملین ڈالر کا قرضہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بون، ۷ر ستمبر۔ آج مغربی جرمنی کی نئی پارلمنٹ کا افتتاح عمل میں آیا اور ایوان اعلیٰ کے ۴۳ نامزد ممبروں اور ایوان زیریں کے ۴۰۲ منتخب ممبروں کی موجودگی میں جرمن جمہوریہ کی شاندار تقریب منائی گئی۔

بائیں بازو کے ایک پر جوش نوجوان کارل آرنولڈ ایوان اعلیٰ کے صدر منتخب ہوئے اور کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر کونراڈ اڈیناؤ کا نام وزیر اعظم کے عہدے کے لئے تجویز ہوا ہے۔

بون، ۱۲ر ستمبر۔ فری ڈیموکریٹک پارٹی (لبرل) کے لیڈر ڈاکٹر تھیوڈر ہوئیس نئے جرمنی کے پہلے صدر منتخب ہوئے ہیں۔

ہیگ، ۱۲ر ستمبر۔ انڈونیشی گول میز کانفرنس کی سست رفتاری سے ریپبلکن لیڈر اکتا گئے ہیں، کانفرنس اب چوتھے ہفتہ میں داخل ہو رہی ہے مگر انڈونیشی اور ڈچ نمائندوں کی رایوں میں اتنا بڑا اختلاف ہے کہ موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے دو مہینے سے قبل نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہے۔

واشنگٹن، ۱۲ر ستمبر۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے فنانس منسٹروں نے آج اعلان کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر ایسی تجویزیں مرتب کر لی ہیں جن سے برطانیہ کا ڈالر کا خسارہ ۱۹۵۲ء تک پورا ہو جائے گا۔

ایشیا چین کی جنگ بدستور جاری ہے، کینٹن کے قریب نیشنلسٹ فوج کا مقابلہ کچھ سخت ہو گیا ہے چونکنگ میں چیانگ کائی شک بیٹھے ہوئے ایسی چالیں چل رہے ہیں کہ جنوبی اور مغربی چین کے کچھ حصے کو کمیونسٹوں سے بچا لیں اور ایک چھوٹی سی ریاست بنا کر اچھے وقت کے انتظار میں دن گذارتے رہیں، امریکہ کو معلوم ہوتا ہے جان بلب نیشنلسٹ حکومت میں پھر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں اس لئے کہ اس نے حکومت کو اچھی خاصی رقم امداد کے طور پر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ اس انجکشن سے مریض میں کتنی طاقت آتی ہے اور وہ کتنے دن جیتا ہے۔

انڈونیشیا کے نمایندے ہیگ کی گول میز کانفرنس میں ڈچ حکومت سے گفت و شنید کر رہے ہیں، بوڑھا سامراج نوجوان تحریک آزادی کو آئینی گورکھ دھندے میں الجھا کر ناگزیر فیصلے کو ٹالنا چاہتا ہے لیکن شاید زیادہ دن نہیں ٹال سکے گا،

یورپ یورپ کی قوموں کا جو اجتماع اسٹراسبرگ میں ہوا تھا وہ ایک چھوٹی اسمبلی قائم کر کے ختم ہو گیا ہے، متحدہ یورپ اور مشترک پارلیمنٹ کے خواب کی جو مسٹر چرچل نے دیکھا تھا، ابھی تک صرف اتنی تعبیر نظر آئی ہے کہ جمہوری یورپی حکومتوں کا ایک سیاسی کلب بن گیا ہے۔ اس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے ابھی قومیت کے پرستار راضی نہیں ہیں۔

بلقان میں یوگوسلافیہ اور کومن فارم کی اعصابی جنگ جاری ہے اور جب سے روس نے مارشل ٹیٹو کی حکومت کو کھلم کھلا اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ یہ جنگ اور بھی تیز اور شدید ہو گئی ہے۔ امریکہ معاشی امداد کے نام سے یوگوسلافیہ کو ہر قسم کی مدد دے رہا ہے۔ امریکی اخباروں کے نامہ نگار یوگوسلافیہ پر روس کی چڑھائی کی افواہیں اڑاتے رہتے ہیں۔ مگر خود مارشل ٹیٹو نے ان خبروں کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

مغربی جرمنی کے انتخابات میں قدامت پسندوں کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ سوشلسٹ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کمیونسٹ بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں، صدارت کے منصب پر ایک لبرل کا انتخاب یہ ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی جمہوریت کی راہ پر چلنا تو چاہتا ہے مگر بہت آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

اسلامی ممالک کا تنزل

سید احتشام حسین

ماضی قریب کے اسلامی مفکروں یعنی جمال الدین افغانی اقبال اور شکیب ارسلان نے اسلام کے زوال کے اسباب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے نتیجے کو سبب سمجھا اور سارے علیت پرست اور تخیل پسند مفکروں کی طرح ترقی اور تنزل کی ان مادی بنیادوں کو پیش نظر نہیں رکھا جن سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں......... مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ خودی کے بلند کرنے کا نعرہ مسلمانوں کے لئے صحیح نعرہ نہیں تھا...... سیدھی بات یہ تھی کہ اسلامی ممالک صنعتی دور میں شامل ہوں.........

محترمی تسلیم

ابھی نئی روشنی کا تازہ پرچہ ملا، اداریہ پڑھ کر بعض خیالات کے اظہار کو جی چاہا، اس خط کا مقصد اداریہ کی تنقید نہیں، بعض خیالات کا اظہار ہے جو بہت دنوں سے میرے ذہن میں کسی قدر واضح شکل میں جگہ لگا رہے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس وقت وہ سارے ممالک جنھیں اسلامی کہا جاتا ہے پستی اور تنزل کی اس منزل میں ہیں جس میں آزادی اور غلامی کی حد فاصل بھی قائم نہیں رہ جاتی۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ جب تک اس سوال کا صحیح جواب نہ ملے صورت حال کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔ بعض مفکرین اسلام کے نزدیک خلافتِ راشدہ کے بعد کا سارا زمانہ اسلام کے زوال کا زمانہ ہے اور ان مفکروں میں اقبال بھی شامل ہیں۔ گو وہ کبھی کبھی صقلیہ کے عروج، غرناطہ اور قرطبہ کے اسلامی دور "شوکت شام" اور "بغداد" سے بھی متاثر معلوم ہوتے اور ایک ایسی ذہنی ثنویت کا شکار ہو جاتے ہیں جو نیچے اتر کر امان اللہ، محمد نادر شاہ اور ظاہر شاہ کے شکوۂ خسروی سے بھی اسلام کی امیدیں وابستہ کر دیتی ہے۔ اس لئے عروج اور زوال کی حدیں معین کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہمارے ذہن میں مادی اور روحانی ترقی کے الگ تصورات ہیں اس وقت تک اس طرح کی پیچیدگیاں باقی رہیں گی۔ مسلمان بادشاہ کسی مورخ کے لئے "ہیرو آف اسلام" بن جائیں گے اور کسی کے لئے شاہی اور جاگیردارانہ نظام کے نمائندے، جن کو خاص طور سے مذہبی اور روحانی عروج سے وابستہ کرنا زیادہ صحیح نہ معلوم ہوگا۔ اس لئے میں ان صورتوں میں الجھے بغیر بعض باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

میرے الفاظ ایک بہت ہی جری، اعلان ہی نہیں بلکہ چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق بھی نظر آئیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ماضی قریب کے اسلامی مفکروں یعنی جمال الدین افغانی، اقبال اور شکیب ارسلان نے اسلام کے زوال کے اسباب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے نتیجے کو سبب سمجھا، اور سارے علیت پرست اور تخیل پسند مفکروں کی طرح ترقی اور تنزل کی ان مادی بنیادوں کو پیش نظر نہیں رکھا جن سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ افغانی اور اقبال اسلامی ممالک کے مادی زوال سے واقف نہیں تھے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی اس مادی تعبیر، واقعات کی اس جدلیت کو جانچے نہیں رکھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ تاریخ کے موجودہ دور میں اسلامی ممالک ترقی کی راہ سے کیا دور ہیں، کیا واقعی تقدیر امم "شمشیر و کتاب اول، طاؤس و رباب آخر" کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے؟ کیا ضمیر کے انقلاب سے ملکوں میں انقلاب ہو سکتا ہے؟ کیا مذہب کی بنیاد پر ممالک کے اتحاد سے مخصوص قسم کی جدید مادی قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا سماج کے اندرونی طبقاتی تضاد کو ختم کئے بغیر ایک پائدار اور مضبوط نظام زندگی کی تشکیل ممکن ہے؟ ریاستوں اور قوموں کی ابتدا اور عروج، مذاہب کی پیدائش اور ان کے اثرات طبقاتی کش مکش ذرائع پیداوار اور ان کی ملکیت ——— تاریخی طور پر انھیں سمجھے بغیر اسلامی ملک کے عروج و زوال کا راز سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اسلام دنیا میں آیا تو ایشیا کے اکثر ممالک غلامی کے دور سے نکل چکے تھے اور بادشاہتیں قائم ہو چکی تھیں، مسلمان تھوڑی سی مدت میں تاریخی تقاضوں کا ساتھ دے کر، اتحاد اور ترقی کے نئے ولولے سے معمور ہو کر آگے بڑھتے گئے۔ بادی النظر میں یہ مذہب کا عروج تھا لیکن تاریخی حیثیت سے شاہی نظام کا استقلال تھا۔ ذرائع پیداوار پر مطلق العنان حاکموں کا قبضہ تھا اور محنت کش طبقہ دبا ہوا پڑا تھا۔ جاگیردارانہ تمدن نے اپنی برکتوں اور لعنتوں کے ساتھ اپنا جال پھیلا لیا، اور عروج کے اس نقطۂ آخر پر پہنچ گیا جہاں مذہب کا سہارا لے کر پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی میں ہندوستان، ایران، ترکی نے غیر معمولی ترقی کی۔ اس سے پہلے اموی عباسی اور فاطمی حکمرانوں نے بھی اعلیٰ مطلق العنان بادشاہتوں کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا تھا، سترھویں صدی کے بعد سے یورپ کا معاشی نظام آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ وہاں کی تجارتی تنظیم نے صنعتی دور پیدا کیا۔ سرمایہ داری کا نشو و نما ہوا اور نئے نظام نے جاگیردارانہ نظام سے ٹکر لینا شروع کیا، یہاں تک اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جاگیردارانہ تمدن پسپا ہو گیا۔ اس نے خود ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ ذرائع پیداوار کی شکل بدل رہی تھی اور کسان اپنے کھیتوں سے لگے نہ رہنے کی وجہ سے دستکاری اور مزدوری کی طرف جا رہے تھے، پھر صنعتی انقلاب ہوا اور سرمایہ داری اپنے عروج کے نقطۂ آخر پر پہنچ گئی۔ جاگیردارانہ اور شاہی زندگی کے تعصبات بے جوڑ معلوم ہونے لگے یہی نہیں بلکہ ان میں زندگی کو آگے بڑھانے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی اور زندگی میں اس دور کے بچے کچھے عناصر مضحکہ خیز بن گئے۔

صنعتی سرمایہ داری نے غیر ترقی یافتہ صنعتی حیثیت سے، ملکوں کو بازار بنا لیا، اور نو آبادیوں میں تبدیل کر لیا۔ اسلامی ممالک میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی مصر ایران، ترکی، عرب، افغانستان سب اسی زوال پذیر زندگی سے چمٹے رہے۔ نہ صرف ان کی ذہنیت جاگیردارانہ اور شاہی پسند بنی رہی بلکہ وہ صنعتی دور میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ انھوں نے سائنس اور ایجادات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، گویا دنیا تاریخی طور پر جس دور میں داخل ہو رہی تھی اس میں داخل ہونے سے انھوں نے انکار کیا۔ ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں دنیا کے ہر خطہ کو ایک رشتے میں منسلک کر رہی تھیں اور اس سے علیحدہ ہو کر ایک بچھڑے ہوئے نظام سے وابستہ رہنے کے معنی غلامی تھے۔ چنانچہ سارے اسلامی ممالک کسی نہ کسی شکل میں ترقی یافتہ یورپی ممالک کے زیر اقتدار آ گئے اس کی توجیہ اور طرح کرنا غیر تاریخی اور غلط ہوگا۔ اسی لئے مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ خودی کے بلند کرنے کا نعرہ مسلمانوں کے لئے صحیح نعرہ نہیں تھا اور اگر صحیح تھا تو بہت گھما پھرا کر، سیدھی بات یہ تھی کہ اسلامی ممالک صنعتی دور میں داخل ہوں، نہ داخل ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ نام نہاد آزادی کے باوجود ان کے تیل کے چشموں پر دوسروں کا قبضہ ہے، اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں بھی آزاد نہیں۔

قدیم نظام زندگی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک میں کوئی مضبوط عوامی تحریک بھی نہیں ہے اور برسر اقتدار طبقہ اپنی موت کے ڈر سے بیرونی سامراجی اور سرمایہ دارانہ طاقتوں سے ساز باز رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ خودی کا جذبہ زوال پذیر خواص اور اعلیٰ طبقے میں اب نہیں لوٹ سکتا ہے۔ صرف عوامی قوتوں کے مضبوط اور منظم ہونے کا سوال ہے۔

اسلامی ممالک کی سیاست پر نگاہ ڈالئے تو اب بھی یہی نظر آتا ہے کہ وہاں کے برسر اقتدار طبقے بیرونی طاقتوں کی مدد سے اپنی زندگی باقی رکھنے ہی کو سب سے بڑا فرض تصور کرتے ہیں۔ مصر، ترکی، عرب، عراق ایران، افغانستان اور نو آزاد انڈونیشیا، پاکستان ہر

(بقیہ صفحہ ۔۔ پر)

فرار

باقر رضوی

زندگی کے تلخ حقائق سے بچنے، خاراشگاف مشکلات کی باد سموم سے محفوظ رہنے اور مہمات کی کڑی دھوپ سے منہ چھپانے کے لئے ہم تخیل کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں اور خواب کے سنہرے جزیرے میں جا بستے ہیں کہ وہاں شہد کی شیرینی، حریر کی نرمی اور شہتوت کے سایے کی خنکی ملتی ہے۔

اکتاہٹ پیدا کرنے والے ایک رنگ میکانکی معمولات اور زندگی کی ناگوار سرگرانیوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر افسانے پڑھتے ہیں، شعر گنگناتے ہیں اور جذباتی تقریریں سنتے ہیں۔ ہم بعض وقت پردۂ سیمیں پر سینما کے نظام شمسی کا ایسا آفتاب بننا چاہتے ہیں کہ تمام ستارے سیارے بن کر ہمارے چاروں طرف گردش کریں اور ہم سب کا مرکز تعلق ہوں۔

اگر یہ گریز اور فرار عارضی اور وقتی ہو اور مناسب حدود میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں، ماہرین نفسیات نے تو اعصابی آرام و سکون کے لئے نیند کے علاوہ جاگتے میں خواب دیکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ہیجان پرور، پرآشوب اور شور انگیز زندگی میں اس عارضی فرار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہی دلچسپیاں اگر زندگی کا ایک مستقل اور [illegible] جزو بن جائیں اور "جائے فرار" ایک مستقل "جائے قرار" کی حیثیت اختیار کر لے تو انسان ایک ذہنی مرض کا شکار ہو جاتا ہے ایک خیالی اور طلسمی [illegible] کا باشندہ بن جاتا ہے۔ پھر حقیقی زندگی [illegible] اور معمولی [illegible] کا سامنا کرتے جھجک [illegible] میں ایسا مزا آنے لگا کہ زندگی کے ڈرامے میں خود ایک چابک دست اداکار نہ بن سکے گا۔ ایسا آدمی کارزار حیات میں دلیرانہ اور مردانہ پیش قدمی تو کجا کامیابی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہ جاتا۔ وہ شان دار اور سکون بخش سپاہی کو تیغ زنی اور تیغ آزمائی پر ترجیح دے گا اور ایک سپر انداختہ اور نکمہ سپاہی ثابت ہوگا۔

بعض لوگ اپنی خیالی اذیتوں یا حقیقی تکلیفوں کا علاج "مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ" میں تلاش کرتے ہیں۔ شراب و شاہد سے نشاط حاصل کرنا ان کا مقصد نہ سہی، انھیں یک گونہ بے خودی کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ یہ بے خودی کی چاردیواری میں قلعہ بند ہو کر خود کو زندگی کے سیلاب سے محفوظ خیال کرتے ہیں، ممکن ہے دل کی "دیرینہ بیماری" اور "ناکامی" میں اس "آب نشاط انگیز" اور شاہد ہوش ربا سے وقتی افاقہ ہو جاتا ہو مگر یہ "آتش سیال" اور "آتش مجسم" دونوں مل کر زندگی کو "آتش جہنم" میں دھکیل دیتی ہیں، جہاں امن و سکون ہی نہیں خرمن ہستی بھی خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہم اپنی بعض خواہشوں، تمناؤں اور مشکلوں کو غیر شعوری طور پر دبا لیتے ہیں یا جان بوجھ کر انھیں بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی یاد ہمیں بار خاطر ہوتی ہے۔ ہم اس پر خوش ہوتے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ ہماری پریشانی دل کا باعث نہ ہوں گی، لیکن یہ تمام خواہشیں، تمنائیں اور مشکلیں ہمارے تحت شعور کے تہہ خانے میں مدفون

> اگر یہ گریز اور فرار عارضی اور وقتی ہو اور مناسب حدود میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں........"جائے فرار" ایک مستقل "جائے قرار" کی حیثیت اختیار کرے تو انسان ایک ذہنی مرض کا شکار ہو جاتا ہے ایک خیالی اور طلسمی دنیا کا باشندہ بن جاتا ہے اسے حقیقی زندگی کے کھلے میدان میں آنے اور معمولی باتوں کا سامنا کرتے جھجک معلوم ہوتی ہے۔

رہتی ہیں "ممی" کی طرح ان کے خد و خال میں بھی فرق نہیں آتا۔ یہ ان دیکھے بھوت ہماری زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈالتے رہتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ موقع مناسب پا کر یہ تحت شعور کے تہہ خانے سے شعور کی سطح پر رینگ آتی ہیں۔ ہمارا ذہن ایک میدان حشر بن جاتا ہے۔ جہاں ہر مردہ خواہش اپنا اعمال نامہ لے کر دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔ یہ دبائی ہوئی خواہش اور پس پشت ڈالی ہوئی باتیں ہمارے حرکات و سکنات کا جزو بن جاتی ہیں اور ہمارے شعور کی صحت بخش فضا کو مسموم بناتی ہیں۔

مشکلوں سے بچنے اور حقائق سے روگردانی کرنے کے لئے بعض لوگ بیمار بن جاتے ہیں لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ جو قوت تعمیری سرگرمیوں میں صرف ہونا چاہئے تھی وہ مجہولیت کا لبادہ سنبھالے رہنے میں ضائع ہوتی ہے۔ تعمیری قوتوں کا آئینہ زنگ آلود ہو کر رہ جاتا ہے اور مصائب کے پہاڑوں کو کاٹ کر "جوئے شیر" لانے کے قابل نہیں رہتا زندگی ایک "سنگ گراں" بن جاتی ہے۔

ماضی کی مرمریں شہ نشینوں اور مستقبل کے ہوائی قلعوں میں پناہ گزیں ہونے سے معمولات اور مہمات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ کامیابی کے ساتھ ان کو حل کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ انسان یا تو "رجعت پسند قنوطی" بن جاتا ہے، یا "تخیل پسند رجائی" زمانہ شناس اعتدال پسند نہیں رہتا۔ یہ دونوں کیفیتیں انسان کی نفسیاتی صحت مندی کے لئے مضر ہیں۔

زندگی جد و جہد کا نام ہے۔ جمود و سکوت موت ہے۔ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ انسان میں مقابلہ اور مطابقت کی قوت بڑھتی رہے حقائق اور مہمات و مشکلات کا صحیح حل ان کو نظر انداز کرنے اور پس پشت ڈالنے میں نہیں، روگردانی، فرار اور پسپائی میں نہیں۔ مردانہ وار مقابلہ کر کے ان پر فتح حاصل کرنے میں ہے۔

اسلامی ممالک کا تنزل

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

ایک اینگلو امریکی بلاک میں شامل ہے اور اپنی قدیم جاگیردارانہ ذہنیت سے باہر نکلنا نہیں چاہتا۔

میرا خیال ہے کہ اس انحطاط کی اصلاح مذہبی اصلاح سے نہیں ہو سکتی، یہ کوئی باطنی یا داخلی قسم کا زوال نہیں ہے، خالص مادی ہے اور یہی روحانی زوال کا بھی سبب ہے۔ اسلامی ممالک کے اضطراب کو مذہبی اصلاح کے سانچے میں ڈھالنا اس وقت پھر انھیں بے راہ کر دینا ہوگا، ہاں صرف ان جمہوری عناصر کو ترقی دینا چاہئے جو ذرائع پیداوار کو بیرونی سامراجی طاقتوں اور اوپر کے طبقوں کے ہاتھوں سے نکال کر عوام اور جمہور کے ہاتھوں میں پہنچائیں۔

باہر کی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

جن لوگوں کو انتخاب کے نتیجے سے یہ اندیشہ ہے کہ فسطائیت اور عسکریت جرمنی میں پھر سے زندہ ہو رہی ہے وہ بے جا خیال آرائی سے کام لے رہے ہیں، واشنگٹن میں برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کی مالی گفت و شنید کی کامیابی سے لندن میں خصوصاً لیبر پارٹی کے حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اس لئے کہ برطانیہ کو ایک بار پھر اپنی مالی حالت درست کرنے کی مہلت مل گئی، عام خیال یہ ہے کہ اس سے لیبر حکومت کی گرتی ہوئی ساکھ پھر چڑھ جائے گی ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لیبر حکومت اس سال کے ختم سے پہلے عام انتخابات کرانا چاہتی ہے مگر یہ بات ابھی تک تصدیق طلب ہے۔

"نئی روشنی کے پروانے"

(۲)

سلام مسنون

"نئی روشنی" کے گل ہو جانے کی احتمالی خبر آپ نے بڑی سنائی، آپ کا یہ "بزم بے تکلف" کا کالم واقعی روشنی کا ایک چنار تھا اور میں اسی ایک کالم کو پڑھتا تھا ....

آنکھیں اس اردو کو ترس رہی تھیں، جسے کہ تھوڑا بہت سیکھا تھا، سرشار، رسوا، سجاد حسین، ریاض اب جہاں کہیں ان مرحومین کی کچھ بو باس بھی محسوس ہوتی ہے، بس وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا ....

دریا باد ضلع بارہ بنکی عبدالماجد

عمی، تسلیم

میں نے تکلف برطرف پڑھا - اب ایسی خبروں پر حیرت نہیں ہوتی، رنج ضرور ہوتا ہے، شاید عادتاً ...... مجھے اب تک کبھی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ غالباً اس کے خریداروں کی تعداد بڑھ چکی ہوگی ورنہ ایسے اطمینان سے کیسے نکل رہا ہے - لیکن اپنے اس خیال پر یقین نہیں آتا تھا - کوئی مصور فلمی ہنگامہ خیز اخبار ہوتا جسے کم کر سٹرکوں پر چلا چلا کر بیچتے ہوتے تو شاید اس کی نکاسی بھی ہو جاتی! یہاں سنجیدہ رسائل کی قدر کہاں! بہرحال بند ہوا تو رنج ہوگا ....

کاش کوئی معقول مشورہ ہی دے سکتا۔

لکھنؤ احقر - احتشام حسین

اورنگ آباد، گیا

محترمی اخلی صاحب! السلام علیکم!

نئی روشنی بابت ۱۶ر موصول ہوا بزم بے تکلف میں "تکلف برطرف" کی سچی اور کڑوی بات سن کر تردد ہوا - رسالے کی اشاعت کو موقوف کر دینا میرے خیال میں اس وقت ہرگز مناسب نہیں بلکہ مجھے کہنے دیجئے، یہ شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار ہوگا جس سے تمام شائقین نئی روشنی سخت متاثر ہوں گے - موجودہ صورتِ حال میں ایک اردو رسالہ کو نشر و اشاعت میں جو دشواریاں حائل ہو رہی ہیں اسی کا مجھے اعتراف ہے، پر عزیز محترم! ایک بلند عزم کے ساتھ سرگرم عمل ہوتے ہوئے ہمیں سپر ڈال دینی ہرگز زیب نہیں دیتی۔

براہ مہربانی اشاعت موقوف کرنے کا خیال نہ لائیے۔ رسالہ کی مالی گتھیوں کو سلجھانے کی سعی کیجئے، سرکاری و نیم سرکاری اشتہارات فراہم کیجئے، شعبۂ تعلیم سے تمام اداروں میں رسالہ کی خریداری قبول کرنے کی اپیل کیجئے، ازمن ممکنات سے پرہیز نہ کیجئے

سید محمد حسنین

مکرمہ! تسلیم

"نئی روشنی" میں یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ بعض مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کا احتمال پیدا ہو گیا ہے کہ مجبوراً اسے بند کر دینا پڑے، خدا کرے یہ اس مرحلے سے عہدہ برآ ہو سکے، میں حتی المقدور اس کے لئے اپنی ہر سی علمی ادبی خدمات سے گریز نہ کروں گا۔

نیاز مند
لکھنؤ باقر مہدی

محترمی ایڈیٹر صاحب، نئی روشنی، دہلی

سلام مسنون!

۱۶ اگست کے "نئی روشنی" میں آپ کا مضمون "تکلف برطرف" پڑھ کر نہ جانے کیوں دل بیٹھ سا گیا۔ شروع میں میں نے نئی روشنی کا مطالعہ اپنے ایک دوست کے کہنے سے شروع کیا تھا، لیکن کچھ تو کچھ تو اپنی تعلیمی مصروفیات اور کچھ خانگی کاموں کی زیادتی کی بنا پر میں زیادہ توجہ و غور سے نئی روشنی کو ابتدا میں نہ پڑھ سکا۔ ادھر چند مہینوں سے میں نے نہایت غور اور توجہ سے اس کا مطالعہ شروع کیا ہے اور اس چیز کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ واقعی نئی روشنی موجودہ ماحول میں خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ بہت ٹھوس اور جامع مقاصد کو پیش نظر رکھ کر چل رہا ہے۔ مجھے اس کے مطالعے سے نہ صرف بے لاگ اور صحیح خبریں معلوم ہوئیں بلکہ آپ کے ادارتی کالم سے بہت تقویت ہی ہوا ہر سخن کا ست، بزم بے تکلف بھی آپ کی خوب ہے۔

اب جو یکایک "تکلف برطرف" پر نظر پڑی تو طبیعت بے اختیار چاہی کہ اخبار بند نہ ہو۔ آپ کی پریشانی اور مالی دشواری بالکل حق بجانب ہے اور واقعی یہ ماحول صحافت کے لئے موزوں نہیں لیکن پھر بھی میری ناقص رائے اس ضمن میں یہ ہے کہ آپ اسے بند نہ کریں بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اسے جاری رکھیں۔ مالی حل کے سلسلے میں میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کی قیمت ۲ کے بجائے ۳ کر دیجئے۔ جن لوگوں نے اس کا مطالعہ ایک بار کر لیا ہے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور اس اضافہ کو منظور کر لیں گے۔ جب آپ اس قابل ہو جائیں کہ اس میں خسارہ نہ ہو تو دوبارہ آپ نرخ گھٹا سکتے ہیں۔

ہندو یونیورسٹی بنارس مہدی حسن

کرمی جناب عبداللطیف صاحب، السلام علیکم

۱۶ر اگست کا اخبار مجھے آج ۲۳ر اگست کو ملا۔ چونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کچھ کہنا بھی نہیں ہے۔ یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اخبار کھولتے ہی حسب معمول "بزم بے تکلف" کی سرخی پر نظر پڑی جو غائب تھی، اور اس کے بجائے "تکلف برطرف" کا عنوان نظر آیا، پڑھا اور دوبارہ پڑھا، کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ نعوذ باللہ، نئی روشنی کا الوداعی پیام ہے۔ ہمیں نئی روشنی سے کتنی محبت ہے آپ کو کیا بتاؤں ہاں اگر مولوی حامد علی خاں صاحب کہیں آس پاس ہوں تو وہ آپ کو ہمارے لگاؤ کی داستان شاید سنا سکیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اخبار کے بقا کے لئے کیا تدبیر سوچتے ہیں، شاید ہم بھی اس وقت کسی کام آ سکیں۔

بمبئی نمبر ۸ مہر محمد خاں شہاب

محترمی عبداللطیف صاحب، سلام مسنون

نئی روشنی کی گذشتہ اشاعت میں بزم بے تکلف کی بجائے بعنوان تکلف برطرف ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا مضمون نظر سے گذرا جس میں نئی روشنی کی طرف سے مایوسی کا اندازہ ہوا، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ میں اس قدر شرمندہ ہوں کہ ایک خریدار بھی فراہم نہ کر سکا۔ میری تجویز ہونے والی لائبریری کمیٹی کے سامنے پیش ہو جائے گی اور نئی روشنی کی خریداری ٹکٹ لائبریری منظور کر لے گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ امام المدارس بھی خریدار بن جائے جس کی امسال توقع ہے۔ اگر خدانخواستہ نئی روشنی بند ہو گیا تو مجھے اتنا ہی رنج ہوگا جتنا کسی عزیز کی موت کا۔ اس وقت نئی روشنی جیسے پرچہ کی سخت ضرورت ہے۔ خدا کے لئے جلد ایسی تدابیر اختیار کیجئے کہ پرچہ اس تباہی سے محفوظ ہو جائے۔

امروہہ سخی حسن

واجب الاکرام جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ۱۶ر اگست کا نئی روشنی نظر نواز ہوا، اس سے آپ کی علالت اور اخبار کے مسلسل خسارہ کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے معقول آمدنی کے ذرائع نہ ملنے پر اخبار کے بند ہو جانے کے جو اندیشے ظاہر فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر دلی افسوس ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اس نازک ترین اور تاریک دور میں "نئی روشنی" فی الحقیقت "نئی روشنی" بن کر افق ادب و صحافت پر نمودار ہوا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر کہ آپ جیسے حضرات جن کی عمر کا بیشتر حصہ قوم کی مخلصانہ خدمت اور اس کی ترقی کی سعی میں بسر ہوا ہے، اپنے محدود دائرے کو چھوڑ کر اصلی تعمیری کاموں میں لگ گئے ہیں کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا مگر آپ کے ۱۶ر اگست کے "تکلف برطرف" کو پڑھ کر جو قلبی تکلیف محسوس کر رہا ہوں وہ احاطۂ الفاظ سے باہر ہے، میری دلی دعائیں آپ کے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

چولہے

سید سفارش حسین

(۱)

ایک تھا محنتی ، ایک تھی محنتن ....

کیا کہا؟ .... ایک تھا راجہ ....

ایک تھی رانی .... ٹھیک ہے ، ہماری کہانیاں تو راجہ رانی سے شروع ہوتی ہیں ، پر یہ کہانی تو اس وقت کی ہے جب راجہ تھا ہی نہیں - دنیا میں بس محنتی تھے کام کرنے والے ، محنت کرتے اور پیٹ بھرتے -

مزدور؟ نہیں اس وقت بھاڑے کے ٹٹو اور کرائے کے مزدور بھی نہ تھے - بس کچھ لوگ سب محنتی تھے محنتی کالے ، گورے ، لال ، پیلے ، سارے کے سارے محنتی - پر محنت کرتے تو اپنی اور کام کرتے تو اپنا - اپنی زمینیں تھیں ، کام کرنے کے اوزار اپنے تھے ، ڈھور ڈنگر اپنے تھے ، زندگی کا سارا سامان اپنا تھا ، سارا جیون اپنے لئے تھا ، جیتے تو اپنے لئے اور مرتے تو اپنے لئے ....

تو یہ محنتی اور محنتن اپنے گھر میں رہتے ، کرائے کے گھر تو اس وقت تھے نہیں ، اور ان کا گھر تھا بھی تو بہت بڑا ، اولاد بھی تو بہت تھی ، ویر بندوں لڑکے اور لڑکیوں کی تو کچھ مت پوچھو ، بے گنتی تھیں ، بے گنتی ، اور پھر ڈھور ڈنگر بھی تو اسی میں رہتے -

صبح سویرے ، سورج نکلنے سے پہلے کچھ کھیتوں پر چلے جاتے ، کچھ ڈھور ڈنگروں میں لگ جاتے ، جو بچ رہتے وہ گھر کا کام دھندا سنبھالتے - اس طرح سب محنت کرتے ، جب فصل پک جاتی تو بچے ، جوان ، بوڑھے ، عورتیں ، مرد سب ہی تو کام میں گھر جاتے - سانس لینے کی مہلت نہ ملتی ، فصل کٹتے ، گہاتے ، اور ناج سمیٹ کر گھر لاتے پر یہ سب کچھ یوں ہی نہ ہو جاتا ، محنت کا پھل دیکھ کر محنتیوں کا دل بلیوں اچھلنے لگتا ، بال کے بوجھ سے جھکتے ہوئے گیہوں کے سنہرے پودے کو ہوا کے ساتھ ناچتے دیکھا تھا - صبح سویرے اٹھ کر پنچھیوں کو چہکتے سنا تھا - محنتیوں کے دل میں بھی اُمنگ اٹھتی " وہ گیہوں کے پودوں کی طرح ناچتے ، پنچھیوں کی طرح گاتے اور یہ ناچ گانا اس وقت تک ہوتا جب تک ناج اٹھ کر گھر میں نہ آجاتا - پھر آم کے بور کی خوشبو سے کوئل مست ہو جاتی ، بے خود ہو کر کسی کو پکارتی ، کبھی اس ڈالی پر کبھی اس ٹہنی پر ، پپیہا اس پکار کو سنتا تو دوڑا ہوا آتا ، دونوں مل کر ناچتے ، گاتے تھے - گرمیوں کے دن کوئل کو پیاس لگتی ، ادھر ادھر دیکھتی تو زمین بالکل سوکھی ، پانی کا نام تک نہیں ، تال تلیا سب خشک ، پپیہے سے کہتی " مجھے پیاس لگی ہے "

وہ چیخ چیخ کر اس کو بلاتا ، چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھاتا تو ایک طرف سے کالے کالے بادل ، ہاتھی جیسے بھاری بھرکم ، جھومتے جھامتے اندھیری بھرے کراتے اور دم کے دم میں سارے جل تھل بھر جاتے کوئل پیاس بجھاتی اور پھر دونوں ناچنے گانے لگتے - پپیہا ان کی آواز میں ایک درد سا ہوتا ، جس سے ٹیس سی اٹھتی - بھلاؤں کے دلوں پر چوٹ لگتی ، من میں ہوک سی اٹھتی ، وہ کوئی نیم تلے اور کوئی پیپل کے نیچے اور کوئی برگد کے سائے میں کھڑی ہو جاتی ، اور دل ہی دل میں جانے کیا سوچتی ، من ہی من میں کچھ ٹٹولتی ، اور بار بار ادھر اُدھر گردن پھرا کر کسی کو ڈھونڈھتی اتنے میں کوئی آجاتا ، پیروں کی آہٹ سے یہ ڈرسی جاتی بدن سن سے ہو جاتا - دبکتے گھبرے اور سہمی آنکھوں کا رنگ اُڑ جاتا ، مگر ترت ہی اُڑا ہوا رنگ اور کھوئے ہوئے حواس پلٹ آتے - اب گالوں پر سُرخی نہ جانے کہاں سے آجاتی ، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی - جب لمبے اور بھرے بھرے بازو پھیلتے تو جیسے انگور کی بیل انار کے درخت پر چڑھ جائے - یہ نویلی ان سے کہتی " ہاں ! گھر بنائیں گی - اب کیا تھا دھوم دھڑکا شروع ہو جاتا ایک اور گھر بننے کی تیاری ، آس پاس ، ادھر اُدھر کے لوگ جمع ہوتے ، جو آتا پوچھتا ، چین بھیا کیا حال چال ہے ؟" چین ہنس کے جواب دیتا - بھیا سکھ ویسے تو چین ہی چین ہے - پر نہ جانے کیوں کچھ چنتا سی رہتی ہے ، تم کہو ؟" وہ کہتا " ویسے تو سکھ ہی سکھ ہے پر چنتا نہ جانے کیوں رہتی ہے ؟

اتنے میں ایک اور آجاتا اور وہ رہی سے کہتا " لیجے چین بھیا کیا حال چال ہیں ؟ " یہ جواب دیتا " آنند بھیا چین ہی چین ہے پر ...." وہ بیچ میں بول اٹھتا آنند ہوتے ہوئے بھی یہ چنتا نہ جانے کیوں رہتی ہے ؟"

نیا گھر بننے کی تیاریاں پوری ہو جائیں تو ناچ رنگ کی محفل جم جاتی ، نئے گھر کے سنگھی ساتھی بیچ میں بیٹھتے یہ ناچ گانا فصل کے ناچ گانے سے مختلف ہوتا ابلائیں آنکھوں میں کامنائیں لئے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ نرم نرم شاخوں کی طرح لچکتیں - نازک نازک ٹہنیوں کی طرح جھومتیں ، جوانوں کے قوی بازو لہروں سے ہم آغوش ہونے کے لئے جب ساحل کی طرح پھیلتے تو یہ موجوں کی طرح اپنا دامن بچا کر نکل جاتیں مگر دل میں کسک سی ہوتی - ناچ رنگ ختم ہوتا اس کے ساتھی کھڑے ہوتے ، پہلے سنگی ساتھی سے کہتا -

" تو نے جوبن میں جوت جگائی ہے اسے کبھی نہ بجھنے دو ل گا "

اب ساتھی سنگی سے کہتی -

" تو نے دل میں اُمید کا جو دیا جلایا ہے اُسے سدا روشن رکھوں گی "

اور پھر جیسے گنگا جمنا مل گئی ہوں ، چین سکھ اور آنند ایک طرف بیٹھے چنتا کا کھوج لگا رہے تھے - ....

رات دن پلٹا کھاتے رہے ، وقت گزرتا رہا مگر چنتا کا کھوج نہ لگنا تھا نہ لگا ، ایک دن آندھی آئی کالی پیلی آندھی ، ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے بھونچال آیا ، ایسا بھونچال جیسے اس زمین کے پر لگ گئے ہوں ، اور یہ اڑ کر سورج سے چمٹ جائے گی ، مینہ برسا بالکل لال لال جیسے خون ، ساری زمین جو خون خون ہو گئی ، آدمی ، جانور ، پیڑ ، پنچھی سب خون کے دریا میں بہہ گئے ، پھر آہستہ آہستہ آندھی چھٹی ، بھونچال تھما اور بارش رکی جب سکون ہوا - اور اطمینان ہو گیا کہ آئی ٹل گئی اور مصیبت ہٹ گئی تو پھر لوگ ادھر اُدھر سے آکر جمع ہوئے مگر حال سب کا پتلا تھا ، بس ہڈی اور کھال سوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے - سینے کی چوڑائی سمٹ سمٹا کر پسلیوں میں آگئی تھی - گال پچک گئے تھے ، بھرے بھرے بازو ، چوڑی چوڑی کلائیاں ، موٹی موٹی رانیں اور گٹھی ہوئی پنڈلیاں بالکل ایسی ہو گئی تھیں جیسے بانس کی چھڑ ، مگر چلے آرہے تھے گھسٹتے ہوئے رینگتے ہوئے ، لڑکھڑاتے ، ڈگمگاتے ، گرتے پڑتے اٹھتے بیٹھتے مگر چلے آرہے تھے اور یہ خبر تک نہ تھی کہ جا کدھر رہے ہیں اور نہ یہ معلوم تھا کہ جانا کہاں ہے - آخر چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو رستے ہو گئے تھے ، یہاں پہنچ کر سب رک گئے کیا کریں کدھر جائیں ؟ کون سی راہ اختیار کریں ؟ سب اسی سوچ بچار میں تھے کہ چین آگے بڑھا اور ایک طرف چل دیا ، پھر تو جدھر چین کا منہ اٹھا چل کھڑا ہوا ، پیا ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک آدمی کچھ اونچی سی جگہ بیٹھا دکھائی پڑا ، ذرا اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ پیچھے کھڑے ہیں ، یہ بھی ان میں مل گیا ، اونچی جگہ بیٹھا ہوا آدمی کہہ رہا تھا -

"دیکھو بھیا جو کچھ ہونا تھا سو تو ہوا پر اب آگے کی سوچو اور وہ صورت نکالو کہ ایسی مصیبت پھر آئے تو ہم تم یوں تباہ نہ ہوں"

بات چھوٹی تو تھی اور جلدی ختم بھی ہو گئی چین نے برابر والے سے اور بیٹھے والے کا نام پوچھا تو اس نے بتایا "چین سکھ" اور جب اس کا نام پوچھا تو کہا "وہ سکھ آنند"

چین کو نام کچھ سنائے سے لگے۔ پہلے ذرا بدلے ہوئے سے، اس نے سوچا شاید انتظام کے لئے ایسے ہی نام ہوں۔

سننے والوں میں سے ایک نے پوچھا "تو کریں کیا؟" چین سکھ نے جواب دیا "یہی کہ جو پیدا کرو اس میں سے تھوڑا وقت بے وقت کے لئے نکال کر الگ دھر دو، تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے، اس لئے ایک آدمی اس کی دیکھ بھال کر لیا کرے۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا، کچھ سوچا پھر سکھ آنند بولا، چین سکھ تم ہی یہ کام کرو اور کون اس کھٹراگ میں پڑے گا ہم تو ہتا ہستا کے فال ہوا کریں گے۔ چین سکھ نے کچھ سوچا، پھر تعلیل کے بیٹھا اور بولا جو تمہاری ایسی مرضی ہے تو میں تم سب کہنے سے بارہ میں پر مجھے اپنے کام کاج سے مہلت کہاں ملے گی؟"

پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا، کچھ سوچا، سوچ بچار ہوتی رہی تھا کہ ایک بولا چین سکھ کا حصہ بھی نکالو جو اسے کام دھندے سے چھٹکارا ملے۔"

یہ بات سب نے مان لی

ہرے بھرے کھیت پھر لہلائے، چاند ہنسا، تارے مسکرائے، سورج کھل کھلایا، ہوا اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ ندی گنگنائی، آب شاروں کی تان اونچی ہو گئی اور زندگی میں پھر سے بہار آ گئی۔ آم میں بور آیا، نیم پہ کچوڑی پھولی، کوئل کی پکار پپیہے کی رٹ سے کان پہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی، گیہوں کی بالیں سونے سے بھر گئیں پر نہ جانے کیوں محنتیوں کے دل بیٹھے بیٹھے سے ہی کچھ بجھا بجھا سا رہتا، بادل آئے، بارش ہوئی مگر نہ جانے کیوں بالائیں بادل کی گرج سے سہم جائیں، بجلی کی کڑک سے لرزتیں اور جب بارش ہوتی تو وہ ادھر ادھر چھپتی پھرتیں، دل میں ٹیس اٹھتی پر دب سی جاتی، من میں ہوک اٹھتی اور گھٹ سی جاتی۔ ہاں جب پورن ماشی کا چاند بنا دھو کر سولہ سنگھار کر کے نکلتا تو یہ گھنٹوں اُسے تکتیں اور ایسا لگتا جیسے اس سے باتیں کر رہی ہوں۔

پھر ایک دفعہ یہ ہوا کہ کسی کے ہاں پیدا وار کم ہوئی اور جب اس میں سے حصے نکل گئے تو ان کے پاس بہت تھوڑا اناج بچا، اتنا تھوڑا کہ گزر مشکل ہو گئی وہ کچھ پڑوسی کے چھپر پرانے ہو گئے تھے اور آگے پھنکر کی دیواریں بھی اونچی کرانی تھیں۔ ایسے کاموں میں اب اس کا جی نہ لگتا، اس نے ان سے کہا کہ میرا کام کر دو میں تمہیں اناج دے دوں گا۔ ایک کا تو اناج بالکل ختم ہو گیا تھا۔ وہ برابر والے کے گھر میں گیا اور مزدوری پر اناج نکال لایا۔ سب سوچنے لگے کہ کیا کریں، آخر سب چین سکھ کے پاس گئے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ پہلے سے بہت محنتی بیٹھے ہیں اور یہی بات چیت ہو رہی ہے، ایک سے پوچھا گیا کے بعد چین سکھ نے کہا "دیکھو بھئی، جو کسی نے کام سے تو بدلے کا اناج دے دیا، یہ اور آپس کے کرے جو کسی کے گھر سے اناج نکالے گا وہ چور ہے اور سزا پائے گا۔

محنتیوں نے چین سکھ کی باتیں سنیں تو وہ چپ سے ہوئے، پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا اور کچھ سوچا، ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ جو محنتی اناج نکال کر دیا تھا بولا "جس کا اناج نز جائے کہاں کو جمع کئے ہوئے اناج میں سے ملنا چاہئے۔" چین سکھ جلدی سے بولا "نا بھائی وہ تو وقت بے وقت کے لئے ہے، کیوں بھئی محنتیو کیا کہتے ہو؟" سب بول اٹھے "چین سکھ کی بات ٹھیک ہے، وہ تو وقت بے وقت کے لئے ہے۔"

اب دنیا میں فرعدو بھی ہونے لگے اور چور بھی چین سکھ اپنے کھیتوں اور ڈھور ڈنگروں میں مگن رہتا۔ سدا سکھ کی بنسی بجاتا، اب چنتا اور چتا کے جال میں ایسا پھنسا کہ سارا چین بھول گیا جیسے جب بیتے دن یاد آتے تو راتوں کی نیند اڑ جاتی، کھانا پینا حرام ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ گزرے دن پھر لوٹا لائے، کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

چین سکھ کے پاس اب روز کئی کئی چوری کے مقدمے جاتے، فرعدوں کے جھگڑے پہنچتے، اور لوٹ مار کی وارداتیں آتیں، اس نے بھی اپنا کاروبار بڑھا لیا تھا، اب وہ راجہ ہو گیا تھا اور سکھ آنند اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بہت سی باتیں تو سکھ آنند ہی نمٹا دیتا اور کئی تو اس تک بھی نہ پہنچتیں، سنتری اور رکھوالے ہی چکا دیتے، پھر بھی لوگوں کی چنتا دور نہ ہوئی۔

چین اب گھر کے دروازے پر آنکھیں بند کئے گہری سوچ میں بیٹھا تھا بہت گہرے خیال میں شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بیتے دن کبھی لوٹیں گے بھی؟ بیٹھے بیٹھے اندر کچھ آگ سی ہو، لیکن فوراً ہی گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے لمبی جٹا والے باباجی کھڑے ہیں، باباجی بولے "بھگوان کا نام لو بیٹا۔ بھگوان کا نام لینے سے دھرمی بن جاؤ گے بھگوان تمہاری چنتا مٹا دیں گے۔"

باباجی نے جو کچھ کہا، چین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر بھی "چنتا مٹا دیں گے" یہ الفاظ اس نے دو تین مرتبہ اپنے دل میں دہرائے، اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا، اس کے جی میں آیا باباجی سے چمٹ جائے انہیں گود میں اٹھا کر ناچنے لگے، اس نے زور سے کہا "چنتا مٹا دیں گے" اور وہ باباجی کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ باباجی نے بڑے پریم سے کہا "ہاں، چنتا مٹا دیں گے"

چین نے رکتے رکتے، جھجکتے جھجکتے کہا۔ "وہ بھگ...... وان"

اب تو چاروں طرف بھگوان، بھگوان پکارتے تھے اگر سے، اوپر، نیچے، سب بھگوان کے نام کی مالا جپتے اور مگن رہتے، بھگوان سب کی رکشا کرتے ہیں، بھگوان چنتا مٹاتے ہیں، یہی رٹ لگی رہتی پر فرعدوں اور چوروں کی تعداد بڑھتی جاتی۔

چین سکھ کا اب کوئی نام نہ لیتا، سب اُسے راجہ کہتے، اس کی چوپال پر میلہ سا لگا رہتا، ٹھٹ کے ٹھٹ جمے رہتے، کچھ فرعدو، کچھ بے گناہ، کچھ بیگار، کبھی انہیں راجہ کے گھر سے کچھ مل جاتا، کبھی راجہ انہیں سے دلا دیتا اور کبھی یہ خود مار کھاتے، اس طرح یہ اپنے دن بتاتے اور اس کے گن گاتے، راجہ بھی بڑا کائیاں ہو گیا تھا اس نے تاڑ لیا تھا، یہی لوگ وقت بے وقت کے لئے انہیں لگائے رکھتا۔ دوسرے راجہ کی گھوڑی پر اس کا دانت تھا اور وہ گھوڑی بھی ایسی ہی، گھوڑی کیا تھی پری تھی پری۔ اس نے بڑی کوشش کی، ہزاروں لالچ دئے، لاکھوں جتن کئے پر اس راجہ کو گھوڑی دینی تھی نہ دی۔ یہ بھی گھات میں لگا رہا اور ٹھان لی کہ گھوڑی نہ لی تو میرا بھی نام نہیں، پر ایک مشکل تھی وہ تھا لال راجہ اور تھا بھی بڑا سیانا، اس نے اس راجہ کے بھید بھانپ لئے تھے، گھوڑی کی طرف سے اُسے بھی کھٹکا تھا اس لئے وہ سدا چوکنا رہتا، انتظام بھی اس نے اچھا خاصا کر لیا تھا، سارے راج کی ناکہ بندی کر رکھی تھی کیا مجال کہ غیر آدمی بغیر روک ٹوک گزر تو جائے، اور گھوڑی کو تو ایسی جگہ رکھا تھا کہ پرندہ پر بھی نہ مار سکے۔ پر یہ راجہ بھی کچھ کم نہ تھا، اس نے لال راجہ کو پھانسنے کی ترکیب نکالی، اس کی ایک بیٹی تھی بہت حسین، بڑی ہی سندر جیسے چاند کا ٹکڑا، چاروں طرف اس اس کی خوب صورتی کی دھوم تھی۔ اس نے لڑکی کے بیاہ کا ڈھنڈورا پٹوایا، بیاہ کے دن بہت سے راجہ آئے، پر لال راجہ نہ آیا، اُسے پہلے ہی اس سے اندازہ تھا کہ لال راجہ نہ آئے گا، اس لئے اس نے لال راجہ کی مورتی بنوا کر محفل میں کھڑی کر دی تھی راجاؤں نے پہلے تو اپنی بہادری کے کرتب اور ہتھیار کے جوہر دکھائے۔ پھر محفل میں آئے تو لال راجہ کی مورتی دیکھ کر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ بھید کیا ہے لیکن جب لڑکی نے مالا اس مورتی کے گلے میں ڈالی تو یہ راز کھلا۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ لڑکی جس کے گلے میں مالا ڈال دے، اُسے لڑکی سے بیاہ کرنا پڑتا اگر کوئی موجود نہ ہو یا نہ آسکے تو اس کی مورتی رکھوا دیتے۔ اگر کوئی بیاہ کرنے سے انکار کر دے تو یہ لڑکی کی بڑی بے عزتی سمجھی جاتی۔ لال راجہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت گھبرایا، وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے لڑکی سے شادی کی تو اُسے تحفہ دینا پڑے گا۔ اس چال سے وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی تحفہ میں گھوڑی ہی مانگے گی اور گھوڑی وہ دینا نہ چاہتا تھا سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی، اس کے راج میں ایک بھگوان سیوک بھی تھے وہ ان کے پاس گیا اور نہ جانے کیا سکھایا کہ وہ اس کے ساتھ ہو لئے، پیچھے جٹائیں زمین پر لوٹتے

ہوئی تھیں۔ ڈاڑھی تنگے تنگے رستے صاف کرتی چل رہی تھی اور پلکیں گھٹنوں کی گرد جھاڑ رہی تھیں۔ راجہ کے ساتھ بھگوان سیوک کو دیکھ کر خلقت اُمڈ آئی، ادیبل کے دل کے دل ٹوٹے پڑتے، عورت، مرد، بوڑھے، بالے سب ہی تو تھے، پیچھے والی ہی لال، ایک جگہ بھگوان سیوک رک گئے اور اوپر کی پلکوں کو اُٹھایا، پلکوں کا اُٹھنا تھا کہ سب نے بے کارہ مارا اور زمین پر گر پڑے، راجہ نے بھی گردن جھکا لی۔ بھگوان سیوک نے پہلے سب کو آشیرباد دی، پھر ٹھیر ٹھیر کے بولے "راجہ بھگوان کا ایک روپ ہے، اس کا حکم ماننا دھرم ہے" اور انھوں نے اپنی پلکیں گرا دیں۔ زمین پر پڑے ہوئے لوگ جب اُٹھے تو انھوں نے دیکھا بس راجہ ہی راجہ ہے۔ بھگوان سیوک نہیں ہیں، لوگ زور زور سے چلانے لگے "بھگوان کی جے، راجہ کی جے"

ادھر اس راجہ نے جب اپنا جادو خالی جاتے دیکھا تو ایک نیا پینترا بدلا، بھگوان سیوک درشن دیں گے، اب کیا تھا جسے دیکھو درشن کرنے چلا آرہا ہے، کندھے پر چادر، ایک کونے میں ستو بندھے ہیں۔ منہ گرد سے اٹا ہوا، کچھ لوگ تو کئی کئی دن چل کر آئے تھے، آدمیوں کی کچھ مت پوچھو میلوں سر ہی سر دکھائی دیتے، تھالی پھینکو تو سر ہی سروں پر چلی جائے، یوں سمجھ لو کہ آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، پاس ہی ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا، بھگوان سیوک کو لے کر راجہ اس ٹیلے پر چڑھ گیا، جب بھگوان سیوک نے پلکیں اُلٹیں تو سب زمین پر گر پڑے، جن بھی زمین پر گر پڑا، مگر گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا، وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "بھگوان جنتا مٹاتے ہیں" بھگوان سیوک نے سب کو زمین پر پڑا دیکھا تو اس کا چہرہ چمکنے سا لگا۔ انھوں نے سب کو آشیرباد دی اور بہت نرم نرم کر کہا "ابلا کی بے عزتی سب سے بڑا پاپ ہے، دھرم کا پہلا کام پاپ کو مٹانا ہے" بات ختم ہوئی اور لوگوں نے زمین سے سر اُٹھایا تو دیکھا کہ بھگوان سیوک ہوا میں اُڑے جا رہے ہیں، اب کیا تھا لوگ پاگل سے ہو گئے، زور زور سے چلانے لگے "بھگوان کی جے، راجہ کی جے"!!

(باقی آئندہ)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

بلکہ بہت سے ہندو بھی ایسے ہیں جو ایک غیر ملکی ریاست کے باشندے کی حیثیت سے اس انتخاب پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقیناً ہر مذہب کے عقیدوں، بندگوں، دیوتاؤں کا احترام کرنا چاہیئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری اور سیاسی امور میں کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والی چیزیں جگہ پائیں اور دوسری وہاں بار نہ پا سکیں۔ اگر ہمارے ٹکٹوں پر گنیش کی تصویر بنائی جا سکتی ہے تو کیا منطق اور انصاف کی رو سے حکومت اس بات کے لئے تیار ہوگی کہ بعض ٹکٹوں پر حضرت عیسیٰ کی تصویر بنائے اور بعض پر کلمۂ لا الٰہ الا اللہ لکھے؟ آخر مسلمان اور عیسائی بھی تو اس حکومت میں برابر کے شریک ہیں اور اس کے پورے شہری ہیں، لیکن اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو ان کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ وہ کسی گروہ کے ساتھ خواہ وہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو کسی قسم کی پاسداری جاری رکھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندو یا مسلمان یا سکھ یا عیسائی یا پارسی پوری آزادی یا دوسرے لوگوں کے احترام کے ساتھ اپنے مذہبی اعمال اور عبادات کو پورا نہ کریں لیکن وہ اُن کی ذاتی زندگی کا دائرہ ہے، سیاسی زندگی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے...... مگر میں کسی طرح یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اگر کسی پبلک بات کا تعلق ہندو مذہب یا تہذیب سے ہو تو وہ جائز ہے اور اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لینا چاہیئے، لیکن اگر اسی قسم کی کوئی چیز کسی دوسرے مذہب سے متعلق ہو تو اس کو قابل اعتراض قرار دیا جائے، ہندوستان، پاکستان بلکہ ساری دنیا میں اکثریت کو بڑی رواداری اور دلنوازی کا سلیقہ سیکھنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ اسی میں امن اور سلامتی اور شریفانہ زندگی کا بھید چھپا ہے۔

خط لکھتے وقت، خریداری نمبر لکھنا، نہ بھولئے
(منیجر)

"نئی روشنی" کے پروانے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

آپ کے بلند مقاصد کے اور آپ کے پرچے کے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے پرچے کے خریدار زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کروں گا اور مالی امداد بھی انشاء اللہ ضرور کی جائے گی، کارِ لائقہ سے ضرور بالضرور یاد فرمائیں

فقط آپ کا ایک دور افتادہ ہمدرد

کراچی (پاکستان) عزیز الکلام

جناب منیجر صاحب، تسلیم

گذارش ہے کہ ۱۹ اگست کے پرچے میں "نئی روشنی کے قدردانوں سے" ایڈیٹوریل پڑھا، عزم بالجزم کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ بہرحال جب سے میں نئی روشنی کے بند ہونے کے بارے میں پڑھا بہت افسوس ہوا۔ آج کل ہمارے ملک کو ایسے نادر و کمیاب رسالوں اور اخباروں کی ضرورت ہے جو ملک کو صحیح راستے پر تعمیر کی طرف لے جانے والے ہوں۔ بلاشبہ "نئی روشنی" ان میں سے ایک ہے اور اس کا بند ہونا ملک کی تعمیر میں کمی پیدا ہونا ہے، بہرحال جس طرح بھی ہو نئی روشنی کو بند نہ کیا جائے، میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کی مالی امداد کے قابل نہیں اب سے ایک سال پہلے اس قابل تھا کہ کافی مدد کر سکتا تھا مگر اب زمانے کے انقلابات نے اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ کوئی امداد کر سکوں، میرے لئے یہ نئی روشنی کا زرِ چندہ بھی بارِ گراں اور اپنا پیٹ کاٹنا ہے

میں کچھ اخلاقی امداد اس طرح کر رہا ہوں کہ چند پتے لکھے دیتا ہوں، پوری امید ہے کہ یہ آپ کے خریدار ضرور بنیں گے۔

میرٹھ نور الدین احمد

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ۸ ، ۱۹۴۹ء

چندہ: سالانہ للعہ ششماہی للعہ

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے نئی روشنی کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ	دس روپے
ششماہی	ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ	چار آنے

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی بی اے ، جامعہ — مطبوعہ جید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۲ | ۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

اپنا قصور دوسروں کے سر

(اپنا قصور دوسروں کے سر منڈھ دینا بچپن کا فطری تقاضا ہے۔ اس سے بچے کو زندگی کی مشکلیں سہنے میں مدد ملتی ہے لیکن اگر انسان بڑا ہونے کے بعد بھی یہ حرکت جاری رکھے تو یہ مالیخولیا کی علامت ہے اگر وہ اس پر قابو پائے تو اس کی اخلاقی اور ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور تنزل شروع ہوجاتا ہے۔)

ایک چھوٹے سے بچے کے ہاتھ سے اس کا محبوب کھلونا ٹوٹ جاتا ہے وہ کیا کرتا ہے کہ جو کوئی اس کے پاس ہو اُسے مارتا ہے، نوچتا ہے یا اس سے چمٹ کر رونے لگتا ہے۔ چاہے وہ کہے یا نہ کہے مگر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے "تم نے مجھ سے یہ کھلونا تڑوا دیا۔"

ایک خاصی بڑی عمر کے بزرگ چھوٹی سی ہتھوڑی ہاتھ میں لئے تصویر کے فریم میں کیلیں ٹھونک رہے ہیں۔ مگر اُن کا ذہن برسر حکومت سیاسی پارٹی کی اصلی اور فرضی خامیوں کے تصور میں محو ہے۔ ہتھوڑی والا ہاتھ ذرا بہکتا ہے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی پر زور کی چوٹ پڑتی ہے۔ آنکھوں میں تارے چمک جاتے ہیں اور زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے "ہائے تیری گورنمنٹ کی ایسی تیسی!" اس سے انھیں کچھ تھوڑی سی تسکین ضرور ہوتی ہے، مگر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قصور ان کا اپنا ہے۔

مگر ایک مالیخولیا کا مریض جسے یہ خبط ہو کہ ساری دنیا اس کی دشمن ہے بچوں کی طرح خیال اور واقعے میں فرق کرنے سے معذور ہوتا ہے۔ وہ سچ مچ اپنی خطا کو دوسروں کی خطا سمجھتا ہے، اپنے عیب دوسروں میں دیکھتا ہے۔

ایک بیوی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ان کی سہیلیاں اُن کے میاں پر مرتی ہیں اور خود ان سے جلتی ہیں کہ کم بخت کو ایسا اچھا شوہر کیوں ملا۔ یہ خیال اُن کے دماغ پر اس طرح مسلط ہے کہ ہر وقت غریب شوہر کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہتی ہیں اور اس غریب کی زندگی دشوار کر دی ہے۔ دراصل ان خاتون کو اپنی کم تری کا بہت زیادہ احساس ہے اور وہ خود اپنی سہیلیوں سے (جو ان سے کم عمر ہیں اور ان کے خیال میں مردوں کے لئے زیادہ کشش رکھتی ہیں۔) جلتی ہیں اور انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنے احساس کم تری کو اپنی سہیلیوں کی طرف منتقل کر دیا ہے

کبھی کبھی ایک پوری قوم یا جماعت اپنے احساس کم تری کو دبانے دبانے اس طرح کے مالیخولیا میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ جرمن قوم ۱۹۱۸ء کی شکست کے بعد عقدہ کم تری کے پیچ میں ایسی الجھی کہ یہودیوں سے نفرت کرنا اور ان کو ستانا اس کی قومی پالیسی بن گئی اسے دل سے یقین ہوگیا تھا کہ یہودی بہ حیثیت جماعت سچ مچ نفرت اور حقارت کے قابل ہیں۔ وہ اس نفسیاتی حقیقت سے آشنا نہیں تھی کہ صرف انھیں لوگوں کو جو اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں کی تحقیر کریں، باقی سب لوگ دوسروں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا سلوک کرتے ہیں۔

فرض کیجئے ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی اس حرکت کو برا سمجھتے ہیں اور اسے سزا کے قابل جانتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انھیں افسوس بھی ہوتا ہے کہ اس کم بخت نے یہ کیا کر دیا، دوسرے کی جان لی اور اپنی جان کھوئی۔ مگر بعض لوگوں کو اس قدر طیش آتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ان کا بس نہیں چلتا کہ قاتل کو کچا چبا جائیں۔ اگر آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کے دل کی گہرائی میں خود قتل کی خواہش چھپی ہوئی ہے۔

معقول آدمی جو اپنی خواہشوں اور کمزوریوں کا پورا احساس رکھتے ہیں اور ان کو قابو میں رکھ سکتے ہیں، دوسروں کی بری حرکتوں سے آگ بگولا نہیں ہو جاتے۔ وہ نہ تو ان کی حرکتوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور نہ خواہ مخواہ ان پر لعن طعن کی بوچھار کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم اپنے عمل میں آزاد ہیں اسی طرح دوسروں کو بھی آزادی ہے کہ اپنی راہ عمل خود متعین کریں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے سامنے بڑا اونچا اور سخت اخلاقی معیار رکھتا ہے، اور اپنے دامن کو خفیف سے خفیف آلودگی سے بچانے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اخلاقی کمال کی راہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ کبھی اس کے قدم کو لغزش بھی ہو جاتی ہے۔ بس پھر (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

فہرست مضامین

۱	اپنا قصور دوسروں کے سر (ماخوذ)	۵	غزل — امن لکھنوی
۲	ہم کدھر جا رہے ہیں؟ — سالک ہندی	۶	آپ کی موت اس کی آزادی (ماخوذ)
۳	جذبات کا سیلاب — (اداریہ)	۷	مشرقی یورپ لڑائی کے بعد — ابو سالم
	دنیا کی رفتار:-	۸	مولانا مدنی — ضیاء الفاروقی
۴	(۱) ہندوستان ع، ح	۹	چہرے (افسانہ) — سید سفارش حسین
۴	(۲) پاکستان ع، ل		
۵	بزم بے تکلف		

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

سیاست کا فیصلہ تو ہوگیا۔ لیکن وقت اور قانون قدرت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ قانون قدرت تو یہ ہے کہ کسی ملک اور قوم کی زبان آسانی سے بدلی نہیں جاسکتی ......

آخر میں جیت تعصب اور تنگ دلی کی نہیں ہوگی رواداری اور فراخ دلی کی ہوگی۔ اگر ہم ان ذہنی اور اخلاقی ہتھیاروں کو اپنالیں تو باوجود اکثریت کی قوت کے میدان ہمارے ہاتھ رہے گا

قومی زبان کی جنگ

قومی زبان کی جنگ جو ہندوستان میں برسوں سے چھڑی ہوئی تھی، گاندھی جی کی برکت سے بہت مدھم پڑگئی تھی اور ان کی زندگی کی آخری حصے میں اس بات کی امید بندھ گئی تھی کہ مختلف پارٹیاں ان کے حق شناس فیصلے کو تسلیم کریں گی اور ہندوستانی ہندوستان کی زبان بن جائے گی، لیکن لیگ اور کانگریس کے جھگڑوں نے اس جھگڑے کو اور بڑھایا۔ تنگ خیال اور متعصب لوگوں کی بن آئی۔ اردو اور ہندی کی رسہ کشی میں ہندوستانی کے جان کے لالے پڑگئے، اتنے میں ملک تقسیم ہوگیا۔ ناراضگی جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں غم اور غصے کی ایک لہر دوڑ گئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب ہوگئے اور ہندوستانی کے دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر نہ صرف اردو بلکہ ہندوستانی کی مخالفت بھی زیادہ زور کے ساتھ شروع کردی، اردو کا تو یہ دوش تھا کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے" (ایسے وقت میں تاریخ اور واقعات کی چھان بین کون کرتا ہے! الزام لگاکر دہر سے بہو تر بہت سے لوگ اس کو ٹھیک سمجھنے لگیں گے۔) اور ہندوستانی کا یہ قصور کہ اس میں اردو اور فارسیا کا عنصر بھی ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کی جھلک بھی پائی جاتی ہے! اگر گاندھی جی زندہ رہتے تو وہ باوجود اس طوفان مخالفت کے اپنے استقلال سے، جو پہاڑ کی مانند تھا اور اپنی شیریں زبانی سے جو نسیم بہار کی یاد دلاتی تھی انصاف کی لاج رکھ لیتے اور ہندوستانی اپنا پد سنبھال لیتی، لیکن جب وہ خدا کو پیارے ہوئے تو بہت سے وہ لوگ بھی جو برسوں تک ہندوستان کی حمایت کرتے رہے تھے یا ووٹ حاصل کرنے کی رو میں بہہ گئے اور تعداد کی اکثریت نے معقولیت اور حق پسندی پر فتح پائی۔ نہ پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد اور مولانا آزاد جیسے بلند پایہ لیڈروں کی پیروی کام نہ آئی آچاریہ ونوبا جی کا کالیلکر اور مشروالا جیسے گاندھی بھگتوں کا اعلان حق سر تیج بہادر سپرو کی وصیت اور وہ زبان جس کی گود میں حالی اور ناظر، پریم چند اور رتن ناتھ سرشار اقبال اور چکبست، تلوک چند محروم، اکبر الٰہ آبادی اور فراق گورکھپوری کے ادب نے پرورش پائی تھی، جس کو پنجاب کے لاجپت رائے، دہلی کے کیفی، الٰہ آباد کے موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ اور بہار کے سچدانند سنہا اور بنگال کے سبھاش بوس اپنی ہی زبان جان کر بولتے تھے، جس میں آج بھی مشرقی پنجاب کا ہر ہندو اور سکھ اور دہلی، یو۔پی، بہار، سی۔پی اور راجستھان کا ہر پڑھا لکھا اور جاہل آدمی بات چیت کرسکتا ہے جسے بمبئی کے سردار پٹیل اور مرارجی ڈیسائی اپنی پبلک تقریروں میں استعمال کرتے ہیں، جس کے ذریعے کانگریس کے صدر بھی اپنا مطلب سارے شمالی ہندوستان والوں کو سمجھاتے ہیں اور جس میں مہینوں تک ہمارے محبوب لیڈر کی شیریں، بھولی بھالی اور دل لگتی آواز دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہی ——— اس زبان کا یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا کہ وہ قومی زبان بنائی جائے! فیصلہ آپ سن چکے ہیں۔ زبان ہندی ہوگی اور رسم خط دیوناگری۔ ہندوستانی کے نقطہ نظر سے ان اہل بصیرت کو ... مانوس ... آئی ہے ... بہرحال کانگریس پارٹی اور اسمبلی میں بعض ... ایسے ہیں جن کی بدولت دلی زبان سے اس بات کو مانا گیا ہے کہ اس ہندی میں ملک کی دوسری زبانوں کا حصہ بھی ہوگا (محض بنارس کے سنسکرت دانوں کی شہنشاہی نہ ہوگی) اور ان زبانوں اردو زبان کو بھی ایک زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بات اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ ہمارے ملک میں بعض جید ادیب اور عالم ایسے بھی ہیں جو اردو کو ایک زبان ہی تسلیم نہیں کرتے (خواہ وہ اس کو خاصی فصاحت کے ساتھ بولتے ہوں!) اگر تعصب عقل کے دروازے اور دماغ کی آنکھ کو بند نہ کردیتا تو غالباً کسی پڑھے لکھے تعلیم یافتہ شخص کو اس قسم کی بات کہنے کی جرأت نہ ہوتی! بہرحال موجودہ صورت یہ ہے کہ سیاست کا فیصلہ تو ہوگیا لیکن وقت اور قانون قدرت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ قانون قدرت تو یہ ہے کہ کسی ملک اور قوم کی زبان آسانی سے بدلی نہیں جاسکتی۔ ممکن ہے آپ سرکاری کاغذات اور محنت سے تیار کی ہوئی "مسودے" کی تقریروں میں ایک مصنوعی زبان استعمال کرسکیں۔ لیکن بول چال کی زبان رائج اور قبول عام ہی کی زبان ہوتی ہے۔ اس کو آپ چاہیں تو ہندی کا نام دیں لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ہی رہے گی اور اس کو بنانے میں اردو کا جو حصہ ہے اس کو حکومت کے احکام اور اسمبلی کے ریزولیوشن بھی نہیں مٹاسکتے۔ لیکن ہمیں بھی اس معاملے میں وقت اور قوانین قدرت کی دستگیری کرنی ہوگی، جو لوگ ہندوستانی زبان کے حامی ہیں اور اردو کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس وقت ایک اہم اور کٹھن فرض ہے انھیں ہندوستانی کی خدمت کو اپنے ذمے لینا چاہیئے اور اس کو بڑھانے اور پھیلانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بات ہمیشہ کے لئے بگڑ چکی ہے۔ گاندھی جی کے خاص حلقے میں ایسے لوگ ہیں جو اپنی کوشش کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں ان کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں اور یہ امید رکھنی چاہیئے کہ جب ملک کی سیاسی فضا بہتر ہوگی تو حکومت اس بارے میں ایک زیادہ مناسب پالیسی اختیار کرے گی۔ ہمیں اس سلسلے میں دو باتیں کرنی ہوں گی۔ ایک تو اردو کو زیادہ آسان بنانا ہوگا تاکہ روزمرہ کے استعمال میں وہ ہندوستانی زبان کے نصب العین کے زیادہ قریب آسکے (ادب عالیہ اور شاعری کے ضمن میں مجھے زبردستی کی ٹھونس ٹھانس اور پابندیاں پسند نہیں) اور اس غرض سے ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے مناسب اور قابل قبول لفظوں کو کھلے دل کے ساتھ اپنانا ہوگا۔ دوسرے ہمیں (یعنی ان لوگوں کو جو صرف اردو لپی جانتے ہیں۔ لیکن دیوناگری سے ناواقف ہیں) دیوناگری لپی کو سیکھنا چاہیئے اور اس کے ذریعے اردو اور ہندوستانی کی اچھی اچھی چیزوں کو ملک میں پھیلانا چاہیئے۔ ملک کے بہت سے حصوں میں اکثر لوگ صرف دیوناگری لپی ہی جانتے ہیں اور آگے چل کر سرکار کی نئی پالیسی کی وجہ سے یہ اور زیادہ پھیلے گی۔ اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس زبان کو پھیلائیں اور مقبول بنائیں جو ہمارے نزدیک ملک کی عام زبان ہے، تو ہم اپنے رسم خط کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دیوناگری میں بھی اسی زبان کے نمونے شائع کرسکتے ہیں جس میں اردو، ہندی اور ہندوستانی کی حدیں آکر مل جائیں، اور اس طرح ان نادان دوستوں کے مقابلے میں ہم ہندی کی بھی بہتر سیوا کرسکتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء

جذبات کا سیلاب
اور
حقیقت کی چٹان

عوام ہر ملک میں ہمیشہ جذبات پرست ہوا کرتے ہیں مگر ہمارے ملک میں خواص یعنی وہ لوگ بھی جنہیں علم اور عقل میں تھوڑا بہت حصہ ہے۔ اکثر عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مسلمان تو اس معاملے میں ہمیشہ سے بدنام ہیں مگر غیر سے دوسرے کبھی کبھی ان سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دو تین سال سے زبان کا مسئلہ سی۔ پی۔ بہار اور ان دونوں سے زیادہ یوپی میں جذبات کا ایک تیز اور تند سیلاب بن گیا ہے جس میں اچھے اچھے لوگ عقل و انصاف، تدبیر و مصلحت کے ساحل سے دور بہے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یوں تو تعصب اور تنگ نظری کی سبھی قسمیں ہندوستان کی وحدت اور سلامتی کے لئے خطرناک ہیں لیکن لسانی تعصب زہر میں بجھی ہوئی تلوار ہے جو ایک دن ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہلاک کر سکتی ہے۔

ہندی کے حامیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ ان تینوں صوبوں میں ایک دم سے سنسکرت سے لدی ہوئی ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا بلکہ مشرقی پنجاب میں جہاں مردوں میں ہندی جاننے والے شاید انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اسے سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کرا دیا، جس کا پوری طرح نفاذ تو نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں میں پنجابی اور ہندی کی نزاع چھڑ گئی اور ایک نیا شور و شر برپا ہو گیا۔

اسی کے ساتھ مرکز میں ہندی کو دیوناگری رسم خط میں سرکاری زبان بنانے کی مہم شروع ہوئی اور مطالبہ کیا گیا کہ ملک کا آئین ہندی میں لکھا جائے اس کی ایک ایک دفعہ آئین ساز اسمبلی میں بحث ہو اور منظور ہونے کے بعد اسی کو مستند مانا جائے۔ ایک طرف ہندوستانی کے حامیوں نے اور دوسری طرف انگریزی کے حامیوں نے جن میں زیادہ تر جنوبی ہند کے لوگ ہیں اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ یہ زبان کا جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ چند روز پہلے تک اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے آئین ساز اسمبلی میں اور خود کانگریس پارٹی میں پھوٹ نہ پڑ جائے اور ان کا سارا شیرازہ بکھر کر نہ رہ جائے، مگر آخر میں وزیر اعظم اور دوسرے ذمہ دار لیڈروں کی کوششوں سے جوش جذبات کو بڑی حد تک ٹھوس حقیقت سے مصالحت کرنی پڑی۔ یہ اصول تو مان لیا گیا کہ ہندی دیوناگری رسم خط میں مرکزی حکومت کی زبان ہوگی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہندی میں ہندوستانی اور دوسری زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ جو قبول عام کی سند پا چکا ہے شامل رہے گا اور اس میں دیوناگری ہندسوں کی جگہ بین اقوامی ہندسے استعمال ہوں گے۔ آئین کا انگریزی مسودہ جس شکل میں وہ بحث اور ترمیم کے بعد منظور ہوا ہے مستند مانا گیا اور پندرہ برس کے لئے انگریزی کو مرکز کی سرکاری زبان اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں باہمی خط و کتابت کی زبان قرار دیا گیا۔ صدر جمہوریہ کو مجاز کیا گیا کہ اس مدت کے بعد بھی جن مقاصد کے لئے وہ مناسب سمجھے انگریزی کے استعمال کو قائم رکھے۔ تیرہ زبانیں جن میں ہندی اور اردو بھی شامل ہیں باقاعدہ ہندوستانی زبانیں تسلیم کی گئیں اور صدر کو اختیار دیا گیا کہ اگر کسی صوبے میں ان میں سے کسی زبان کے بولنے والے معقول تعداد میں موجود ہوں تو ان کی خواہش پر ان کی زبان کو بھی اس صوبے کی سرکاری زبان قرار دے۔

اس قرارداد میں جو بڑے معرکوں کے بعد منظور ہو کر ملک کے آئین میں شامل کی گئی ہے، ان ٹھوس حقیقتوں کا اعتراف موجود ہے:۔

(۱) ہندوستانی کا ذخیرۂ الفاظ قبول عام حاصل ہو چکا ہے اس لئے جس زبان کا نام ہندی رکھا گیا ہے اسے یہ ذخیرہ اپنانا چاہیئے۔

(۲) انگریزی ہندوستان میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی ہے اور بین اقوامی زبان کی حیثیت سے ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ ایک مدت تک ہماری زندگی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوگا اور کچھ نہ کچھ حصہ ہمیشہ رہے گا۔

(۳) اردو کئی صوبوں میں بہت سے لوگوں کی زبان ہے ان لوگوں کی خواہش پر اسے ان صوبوں میں ایک سرکاری زبان قرار دینا چاہیئے۔

اگر ہندی کے حامیوں نے آئین ساز اسمبلی کے اس فیصلے کو ان حقیقتوں کے پیش نظر سچے دل سے مانا ہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کچھ دن کے بعد مہیب جذبات کا سیلاب گذر جائے گا۔ زبان کا مسئلہ عقل و انصاف اور تدبیر و مصلحت کے مطابق خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا یعنی قومی زبان میں ذخیرۂ الفاظ کے انتخاب میں لفظوں کی نسل اور مذہب اور رنگ سے قطع نظر کرکے صرف رواج عام اور قبول عام کو دیکھا جائے گا۔ قومی زبان کے دونوں رسم خط تسلیم کئے جائیں گے اور اسے ان صوبوں پر جہاں ترقی یافتہ مقامی بولیاں موجود ہیں زبردستی مسلط نہیں کیا جائے گا بلکہ تبلیغ کے ذریعے آہستہ آہستہ رواج دیا جائے گا۔

لیکن اگر ہندی والوں نے اس وقت آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کو محض جبراً قہراً مانا ہے اور آگے چل کر اس کو توڑنے کی نیت رکھتے ہیں تو انہیں صرف اتنی کامیابی ہو سکتی ہے کہ ہندی کو بدستور تینوں صوبوں کی سرکاری زبان بنائیں۔ اسے سارے ہندوستان کی قومی زبان نہیں بنا سکتے اور یہ کامیابی بھی اس قیمت پر حاصل ہوگی کہ مختلف جماعتوں اور علاقوں، خصوصاً شمال اور جنوب میں دار و گیر کا ایسا شدید ہنگامہ برپا ہو جائے گا کہ ہمیں اپنی آزادی کے بلکہ جان کے لالے پڑ جائیں گے، اس کا کچھ تھوڑا نمونہ ہندی کے نمائندے پچھلے چند ہفتے میں آئین ساز اسمبلی کے اندر اور باہر دیکھ چکے ہیں اس لئے امید ہے کہ اب جو کچھ کریں گے آنکھیں کھول کر کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ ان کروڑوں آدمیوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے، اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیئے یہاں سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے، جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان رہ گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ یہاں سی۔ پی اور یوپی میں اب بھی ایسے ہندو اور عیسائی خاندان موجود ہیں جو اردو کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ زمانے کا رنگ دیکھ کر خاموش ہیں، مگر اپنے بچوں کو مدرسے میں یا کم سے کم گھر پر اردو پڑھاتے ہیں۔ دہلی اور مشرقی پنجاب میں اب تک بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کی مادری اور باقی سب کی ادبی زبان اردو ہے عدالتوں اور مدرسوں میں بدستور جاری ہے، اخبار اور کتابیں عام طور پر اردو ہی میں شائع ہوتی ہیں عام فضا سے متاثر ہو کر دہلی اور پنجاب کے غیر مسلم بھی ہندی یا پنجابی کا مطالبہ کر رہے ہیں مگر ان میں ایسے باہمت لوگوں کی کمی نہیں جو اردو کی کھلم کھلا اور شدت سے حمایت کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے کی ناسازگاری کی وجہ سے ان کی آواز ان کے حلقے سے باہر نہیں پہنچتی۔ بہرحال چاہے تم جس کو کچھ بھی ہو، اب تک کروڑوں غیر مسلموں کی مادری زبان یا ادبی زبان اردو ہے اور ان میں سے اکثر اس پر آشوب زمانے میں بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس لئے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا اب بھی حقیقت اور انصاف کے خلاف ہے، اچھا تو پھر اردو کے حامی مسلم اور غیر مسلم کیا کریں! ہمارے سامنے یہ ہے کہ ملک کے آئین کی ان دفعات کا جو زبان کے بارے میں منظور ہوئی ہیں اور نیز تعلیم کے متعلق کانگریس ورکنگ کمیٹی اور حکومت ہند کے فیصلوں کا جن میں اردو کی حفاظت کی بہت کافی گنجائش رکھی گئی ہے غور سے مطالعہ کریں۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ان حقوق کو جنہیں آئین اور حکومت نے اصولاً تسلیم کیا ہے عملاً حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ آئینی تحفظات اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں، مگر کافی نہیں۔ اگر ہم عزم و استقلال، تنظیم و تدبیر کے ساتھ ان پر عمل کرانے کی کوشش کریں تو وہ سب کچھ اور اس سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کوئی نقش یا تعویذ نہیں جو خود بخود تاثیر پیدا کر سکیں۔

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

بازی گروں کی قلابازی

۱۸ ستمبر کو دنیا کی تماشا گاہ میں ایک دم سے سنسنی پھیل گئی۔ حکمت عملی کے سیانے ماہر سر اسٹیفرڈ کرپس نے جن کی ثقہ صورت کو دیکھ کر ان جان لوگوں کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ بزرگ بازی گری کے کرتب بھی دکھا سکتے ہیں، ایسی قلابازی کھائی جسے لوگ دیکھتے رہ گئے۔ بار بار یقین دلانے کے بعد کہ وہ اسٹرلنگ کی قیمت ہرگز کم نہیں کریں گے انھوں نے اٹھارہ ستمبر کو اعلان کر دیا کہ ڈالر کے مقابلے میں اسٹرلنگ کی قیمت ۳۰ فیصدی کم کی جاتی ہے۔ استاد کے ساتھ شاگردوں یعنی کامن ویلتھ کے اکثر ملکوں نے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے اپنے سکوں کی قیمت اسی نسبت سے کم کر کے اس کرتب کو دہرایا۔

پہلے پہل ہندوستان میں مالیات کے ماہر اس اچانک تبدیلی سے ایسے چکرائے کہ ان کے اُلجھے ہوئے اور متضاد بیانات سے غیر ماہروں کو اس بات کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملی کہ اس کا اثر ہندوستان میں کاروبار کی حالت پر اور قیمتوں پر کیا پڑے گا۔ مگر اب اہل الرائے حضرات کی رائے معین اور واضح ہوتی جاتی ہے کہ اس تبدیلی کے نتائج ہندوستان کے حق میں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کے اسٹرلنگ قرضے کی قیمت ڈالروں میں ۳۰ فی صدی کم ہو جائے گی۔ لیکن اُمید ہے کہ امریکہ کے کارخانے کچھ دن میں رفتہ رفتہ اپنے مال کی قیمتیں بھی کم کر دیں گے، اس لئے اسٹرلنگ کی قیمت خرید پھر اتنی ہی ہو جائے گی۔ اس درمیان میں ہندوستان جتنا مال امریکہ سے خریدے گا اس میں ضرور نقصان رہے گا۔ حکومت ہند یقین دلا رہی ہے کہ وہ امریکہ سے چند ضروری چیزوں کے سوا جن کی مجموعی قیمت بہت کم ہوگی کچھ نہیں خریدے گی۔ سب سے بڑی مد غلے کی تھی سو اس سال کا غلہ آ چکا ہے۔ آئندہ سال بہت کم باہر سے منگانے کی ضرورت پڑے گی اور وہ ڈالر کے علاقے سے نہیں منگایا جائے۔

۲۔ ہندوستان سے پٹ سن، چائے وغیرہ جو مال امریکا جاتا ہے اس کی قیمت ڈالر میں کم ہو جائے گی، لیکن قوی امید ہے کہ اس مال کی مانگ بہت بڑھ جائے گی اس لئے مجموعی طور پر ہندوستان کا فائدہ رہے گا ظاہر ہے کہ فائدہ تھوڑے ہی دن رہ سکتا ہے، کیونکہ رفتہ رفتہ دوسرے ملک بھی جو اس قسم کا مال امریکہ بھیجتے ہیں اپنے مال کے دام کم کر دیں گے اور ہندوستان کے مال کی اتنی مانگ نہیں رہے گی۔

ہمارے ملک کے اندر اشیا کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے اس لئے کہ امریکہ سے عام ضرورت کی کوئی چیز نہیں آتی، اگر دوکانداروں نے شرارت سے چیزوں کے دام بڑھائے تو حکومت سختی سے اس کا تدارک کرے گی۔

پہلی دو باتوں کو تو ماہرفن جانیں لیکن تیسری بات کے بارے میں ہمیں اپنے تجربے کی بنا پر بہت شبہہ ہے۔ ہر ایسے موقع سے دوکاندار فائدہ اُٹھا کر قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور حکومت ان کو کم کرانے کی کوشش یا تو محض دکھاوے کے لئے کرتی ہے۔ اس میں اس کی اہلیت اور ہمت نہیں کہ اپنی پالیسی کو نافذ کرنے کی تنا سب تدبیر اختیار کرے۔

کچھ شنوائی تو ہوئی

حکومت ہند نے تارکین وطن کی جائداد کے بارے میں جو ضابطہ جاری کیا تھا اس پر عمل درآمد کرنے میں کسٹوڈین کے محکمے نے اور پولیس نے جا بجا بڑی سختی، بے اصولی اور بے انصافی سے کام لیا۔ اس کی طرف ہم پچھلی دو اشاعتوں میں توجہ دلا چکے ہیں جمعیۃ علمائے ہند نے اور کچھ اور ہمدردوں نے مسلمانوں کی شکایتوں کو حکومت ہند تک پہنچایا۔ اب حکومت نے کسٹوڈین جنرل اور صوبوں کے کارکنوں کے نام ایک گشتی حکم جاری کیا ہے جس میں بڑی سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ جائدادوں کے ضبط کرنے میں من مانی یا سرسری کارروائی نہ کی جائے بلکہ پوری احتیاط، چھان بین اور ذمہ داری سے کام لیا جائے۔

پاکستان

بہ خیر گذشت

مسلم لیگ مغربی پنجاب کے صدر میاں عبد الباری اور میاں ممتاز دولتانہ کے درمیان، جو کچھ عرصے سے سیاسی رسہ کشی ہو رہی تھی اس کا بالآخر پچھلے اتوار کو فیصلہ ہو گیا اور اس رسہ کشی میں میاں عبد الباری کی جیت ہوئی، تین گھنٹے کی بحث کے بعد بالآخر ۱۳۰ کے مقابلے میں ۱۵۲ ووٹوں سے کونسل نے اپنے ۲۶ر جولائی کے فیصلے کی جس میں میاں عبد الباری کو گورنر کے مشیروں کے نام پیش کرنے کی اجازت دی گئی تھی تصدیق کر دی۔

کونسل کے پچھلے جلسے کے مقابلے میں یہ جلسہ نسبتہً پرسکون فضا میں منعقد ہوا تھا، مگر پھر بھی جلسے سے قبل جلسے کے درمیان اور جلسے کے بعد خاصہ ہنگامہ رہا، اور دولتانہ اور ان کے حامی سردار شوکت حیات خاں، بیگم شاہ نواز اور بیگم فاطمہ کے ساتھ مجمع کا رویہ نہایت توہین آمیز رہا۔ شوکت حیات خاں تو قریب قریب بے ہوش ہو گئے تھے اور لیگ کے رضا کار سالار نے ان کو مشتعل مجمع کے نرغے سے نکال کر [illegible] تک پہنچایا۔

[illegible] کونسل [illegible] فیصلے سے مغربی پنجاب کا ایک اہم [illegible] مسئلہ ختم ہو جائے گا اور غالباً مشیروں کے تقرر میں اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی، مگر جب تک مغربی پنجاب میں نئے انتخابات نہیں ہو جاتے ان دونوں پارٹیوں کی خود غرضیاں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتی رہیں گی۔ بہت سے معقول اور سمجھدار لوگ اس خانہ جنگی سے تنگ آ کر چاہتے ہیں کہ ایک تیسری پارٹی کی بنیاد پڑے جو بڑے زمینداروں کے اثر سے آزاد ہو۔ "آزاد پاکستان پارٹی" اسی مقصد کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی ہے۔ لیکن ابھی تک پاکستان کے اہل الرائے اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

سرحد میں سطحی سکون

صوبہ سرحد کی سیاست میں کچھ روز سے سکون پیدا ہو گیا ہے۔ مگر سطح کے نیچے ہیجان اور اضطراب کی کیفیت ابھی بدستور باقی ہے۔ عوامی لیگ کی مقبولیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور عبد القیوم خاں کی وزارت سے لوگ روز بروز مایوس ہوتے جاتے ہیں۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ پیر مانکی شریف کو مردان میں دو ماہ کے لئے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مغربی پنجاب کے کئی با اثر اخبار "قیومی وزارت" کی شدید مخالفت کر رہے ہیں، ان کا داخلہ صوبۂ سرحد میں بند کر دیا گیا ہے۔ بہرحال جب تک نئے انتخابات نہ ہوں عبد القیوم خاں مرکزی حکومت کی پشت پناہی سے اپنے عہدے پر جمے رہیں گے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ پر نرغہ

کچھ دن ہوئے پاکستان کے اخباروں میں ایک خبر نکلی کہ نیو یارک کے کلارنگس کارپوریشن نے ہند اور پاکستان وغیرہ میں کئی اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کو خرید لیا ہے اب کیا تھا پاکستان کے اخباروں میں غیر ملکی اخباروں کے خلاف ایک زبردست مہم شروع ہو گئی۔ امریکی سفیر نے فوراً اس خبر کی تردید کی اور یہ کہا کہ کلارنگس کارپوریشن کے نام کی کوئی فرم امریکہ میں نہیں ہے۔ مگر اخباری ہنگامہ جس کا اصل مقصد سٹیٹس مین کے اخبار کی مخالفت ہے بدستور جاری ہے بلکہ اس کی شدت اور بڑھ گئی ہے۔

صلائے عام

کپڑے کے معاملے میں پاکستان کو جو مشکلیں پیش آ رہی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے وہ خود اپنے ہاں کپڑے کی صنعت کو فروغ دینا چاہتا ہے کراچی میں ایک کپڑے کا مل جو پاکستان بننے کے بعد اپنی قسم کا پہلا کارخانہ ہے، قائم ہوا ہے۔ پچھلے ہفتے لیاقت علی خاں صاحب نے اس کا افتتاح کیا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں صنعت پر بڑا زور دیا اور فرمایا کہ "دفاع کے بعد حکومت کی سب سے زیادہ توجہ صنعت کی طرف ہے اور حکومت صنعت کی ترقی کے لئے ہر طرح کی مدد دینے کو تیار ہے

بزمِ بے تکلّف

(ریل کے دوسرے درجے میں دو سجن آمنے سامنے سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ قد و قامت کے لحاظ سے ایک کو قلمی اور دوسرے کو تخمی کہہ سکتے ہیں۔ کھلنے پینے کا اندازہ آپ کو اُن کی گفتگو سے ہوگا)

تخمی۔ (اخبار پڑھتے پڑھتے) سیٹھ جی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں، آپ کھاتے کیا ہیں ؟

قلمی۔ (کھٹی ڈکارے کر) جی نفع کھاتا ہوں، بیاج کھاتا ہوں، چور بازار کی کمائی کھاتا ہوں۔ پھر کسی کے باپ کا اجارہ ہے ؟

تخمی۔ ارے رے رے! سیٹھ جی آپ خفا ہو گئے۔ میں طعن سے نہیں پوچھ رہا تھا۔ بھلا آپ کو کیا طعنہ دوں گا۔ میں تو لختِ جگر کھاتا ہوں اور خونِ دل پیتا ہوں۔ دونوں حرام چیزیں! میں نے ایک وجہ سے یہ سوال کیا۔ اس اخبار میں ایک بڑے مزے کا خط چھپا ہے۔ کسی پنجابی بھائی نے لکھا تھا کہ حکومتِ ہند کی ملازمتوں پر تو اب مدراس کے جینئس اور کشمیر کے کول اور ہکسر قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ اس پر ایک طالب علم جنھوں نے اپنے لئے پچولیا (بروزن سنپولیا) کا لقب پسند کیا ہے لکھتے ہیں کہ بھائی جی شکایت کی کوئی بات نہیں۔ یہ سارا کھیل غذا کا ہے۔ آدمی کا جسم کیا ہے ایک کیمیا کی بھٹی

قلمی۔ (سنبھل کر) کیا کہا کیمیا ؟

تخمی۔ سیٹھ جی وہ کیمیا نہیں جس میں سدا ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ آج کل کیمیا کیمسٹری کو کہتے ہیں۔ جس میں بنولے کا کھی۔ رائی کا پربت، بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے، ہاں تو ان طالب علم کے خط کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے جسم کی بھٹی میں چاول سے اسٹارچ بنتا ہے جس بدن میں جستی

قلمی۔ انگریز ہندوستان سے چلا گیا، مگر انگریزی ہمارے پلّے کو چھوڑ گیا۔ یہ اسٹارچ کیا بلا ہے ؟

تخمی۔ سچ کہا آپ نے انگریز کا سکہ ہندوستان سے اُٹھ گیا اور امریکہ میں گر گیا مگر انگریزی کا سکہ دونوں جگہ ہی تھا ٹھپے چلتا ہے۔ اسٹارچ وہ ہے جس سے کلف بنتا ہے۔ بڑی اچھی چیز ہے جس طرح کلف سے کپڑا اسی طرح اسٹارچ سے آپ کا بدن کلف سا ہوتا ہے۔ اگر زیادہ ہو [illegible] نہیں تو [illegible] کرده جائے گا۔ [illegible] ایک اور [illegible] پروٹین ہے جو گیہوں میں [illegible] پایا جاتا ہے، لیکن گوشت وغیرہ میں [illegible] ہوتا ہے جس سے دماغ پرورش پاتا ہے [illegible] [illegible] اسی وجہ سے بہنے ہیں کہ وہ چاول [illegible] [illegible] استعمال کرتے ہیں کول اور ہکسر ان سے بھی بچ گئے ہیں ان کی غذا میں چاول روٹی، گوشت، ترکاری اور پھل غرض وہ سب چیزیں ہیں جن سے جسم اور دماغ کو قوت پہنچتی ہے پھر بتلایئے کہ دال روٹی کھانے والے کیا کھا کے ذہانت میں ان مدراسیوں اور کشمیریوں کا مقابلہ کریں گے۔

قلمی۔ اجی بس رہنے بھی دو ہم نے بھی بہت سُنا ہے کہ یہ کھاؤ اور وہ کھاؤ آدمی کھائے تو سب کچھ، مگر ہضم بھی ہو۔ یہاں معمولی پوری کچوری، ترکاری مٹھائی تو پچتی نہیں، یہ سب الم غلم کھا کر کیا حال ہوگا۔

تخمی۔ سیٹھ جی آپ خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ تلی ہوئی چیزیں اور کھوئے کی مٹھائی ہضم کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہانے کی ضرورت ہے جو دن بھر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہے گا تو پرائے مال کے سوا کچھ بھی ہضم نہیں ہونے کا

قلمی۔ پھر وہی پاجی پن کی بات، بدتمیز کہیں کا سوشلسٹ ———

تخمی۔ بس بس سیٹھ جی، سوشلسٹ ہی تک رہنے دیجئے آگے نہ بڑھئے گا نہیں تو مستقبل

غزل

گوپی ناتھ امن لکھنوی

ہم کہاں حبِ جاہ رکھتے ہیں
بہت اونچی نگاہ رکھتے ہیں

سینے میں دردِ آہ رکھتے ہیں
قدرتِ بے پناہ رکھتے ہیں

اُن کو اپنی نظر پہ ناز بجا
ہم بھی اپنی نگاہ رکھتے ہیں

غیر سے رسم و راہ کیا معنی
آپ سے رسم و راہ رکھتے ہیں

نہ کرو ذکر دوزخ و جنت
ابھی تابِ گناہ رکھتے ہیں

آپ کے دل کا حال جان لیا
کہئے کیسی نگاہ رکھتے ہیں

دل تو رکھتے ہیں اپنے سینے میں
ہاں بحال تباہ رکھتے ہیں

نقصہ آ جائے گا جو کسی چوراہے سے نہیں بچتا۔

آپ کی موت اس کی روزی

(بے چارے اتائی معالج اور اشتہاری دوا فروش کی روزی کا سہارا ہماری خوش اعتقادی ہے۔ اگر اس کی بدولت ہم جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو کون سا غضب ہو جائے گا! آخر ایک دن مرنا ہی ہے مرتے مرتے کسی کا بھلا تو کر جائیں)

افسوس ہے کہ ۹۰ ڈالر کا آلہ اسپکٹروکروم جس سے طرح طرح کی روشنیاں ڈال کر دنیا بھر کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا اب نہیں مل سکتا۔ اس کے موجد ڈاکٹر گھڈیالی کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اور وہ ہزار ڈالر والا سنوؤ تھرم خریدنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے جو بجلی کا "شاک" پہنچا کر بیمار کو تندرست کر دیتا ہے اس لئے کہ عدالت نے اس کی فروخت کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اب سرکے اور شورے کے مرکب سے جو ۳۰ ڈالر فی گیلن کے حساب سے بکتا تھا ذیابیطس کے علاج کا موقع بھی جاتا رہا اس لئے کہ وہ محسن خلائق جو یہ آب حیات بیچا کرتے تھے، جیل بھیجے جا رہے ہیں۔

مگر گھبرائیے مت، ابھی آپ اس پر مجبور نہیں ہیں کہ باقاعدہ ڈاکٹروں کے لیے علاج کی زحمت اُٹھائیں۔ ابھی بہت سے لوگ یہ دعوے کرکے آپ سے روپیہ وصول کرنے کو موجود ہیں کہ آپ کو چٹکی بجاتے اچھا کر دیں گے۔

اگر آپ کو سرطان کی شکایت ہو تو گلوکسی لائڈ یعنی گلوکسیلک ایسڈ کا ہائیڈرائڈ" ۴۰۰ ڈالر فی اونس کی شرح سے خرید لیجئے مگر کسی علم کیمیا کے ماہر سے یہ نہ پوچھ بیٹھئے گا کہ یہ کیا چیز ہے ورنہ وہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔

آپ کو ذیابیطس کی شکایت ہو یا آپ انسولین سے اور اسی کے ساتھ زندگی سے تنگ آچکے ہوں تو دو ہزار ڈالر خرچ کرکے ایک بھاپ کا حمام منگا لیجئے جو آپ کو خوشبودار ابخرات سے نہلائے گا۔ اگر ان ابخرات سے آپ کی ذیابیطس دور نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ آپ کی لاش ایسی معطر ہوگی جیسی شاید بڑے سے بڑے بادشاہ کی بھی نہ ہوئی ہو......

پھر ایک سیمنٹ کی ٹکیہ ملتی ہے جسے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے طلسمی شعاعیں نکلتی ہیں جن کی عجیب و غریب تاثیر ہے۔ اس کی بدولت آپ کی گائے دودھ دوہتے وقت چپ چاپ کھڑی رہے گی، آپ کا ملیریا جاتا رہے گا۔ غرض آپ کی ہر طرح کی مشکل حل ہو جائے گی......

ان دغابازوں، جعل سازوں کا جو آپ سے بھرپور رقم لے کر آپ کو تندرست کر دینے کا ٹھیکہ لیتے ہیں امریکہ میں ایک لشکر کا لشکر موجود ہے اور یہ سب دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹور رہے ہیں جو حضرت گلوکسی لائڈ بیچتے ہیں ان کی آمدنی ساڑھے تین لاکھ روپیے سال ہے۔ مگر ان کا شمار اس برادری میں فٹ پونجیوں میں ہے۔ سرکے اور شورے سے ذیابیطس کا علاج کرنے والے بزرگ کی آمدنی دو کروڑ دس لاکھ روپئے سال تھی۔ اسپکٹروکروم کے موجد کا کاروبار بند ہو چکا ہے۔ مگر انھوں نے اتنا کما لیا ہے کہ اب بھی کروڑ پتیوں کی صف میں شامل ہیں۔ ایک نیویارک کی خاتون نے ایک مسیحائے زماں کو جو صرف پاؤں کے انگوٹھے کو دبا کر علاج کرتے تھے چودہ ہزار روپے دیے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی رقم کے مسیحا موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ آپ ان کو جاذب کے ٹکڑے پر اپنے خون کے چند قطرے بھیج دیجئے، وہ نہ صرف آپ کا مرض بلکہ آپ کا مذہب بھی تشخیص کر دیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ بے چارے کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں، ایک بار ایک ڈاکٹر نے انھیں ایک تندرست اور پاکباز مرغے کے خون کا نمونہ بھیج دیا۔ انھوں نے جھٹ پٹ ملیریا اور سوزاک تشخیص کر دیا۔ ایک اور بزرگ دستخط دیکھ کر بیماریاں تشخیص کیا کرتے ہیں۔

مگر ان سب کے ایسے ایسے معتقد موجود ہیں کہ ان کے ایمان کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ عدالت میں ایک شخص نے حلف اُٹھا کر کہا کہ اسپکٹروکروم سے اس کی مرگی بالکل جاتی رہی۔ ان الفاظ کے کہتے ہی اس پر مرگی کا دورہ پڑ گیا اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔

جب "طلسمی ٹکیہ" کا فریب کھلا تو ہزاروں آدمیوں نے مل کر اس کے موجد کے فارم پر ہلہ بول دیا۔ مگر اسی ہنگامے میں ایک اخبار کا رپورٹر جو اس ٹکیہ کا مذاق اُڑایا کرتا تھا اس پر ایمان لے آیا۔ ایک بڑی کیمیکل کمپنی کا منیجر اس کاروبار میں روپیہ لگانے پر تیار ہو گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سیمنٹ کی ٹکیہ میں کوئی [illegible] موجود نہیں۔ [illegible] کے موجد کو [illegible] سرطان [illegible] [illegible] طلب [illegible] ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کے اعتقاد میں پھر بھی فرق نہیں آیا۔

لیکن ایک دن آتا ہے جب ان ڈھکوسلوں سے نقصان اُٹھاتے اُٹھاتے عام طور پر لوگ ان سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور ماننے والے تھوڑے رہ جاتے ہیں۔ بات عدالت تک پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے کتنے آدمیوں کی جانیں گئی اور کتنے زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ یہ تو ان واقعات کا ذکر ہے جو عدالت تک پہنچتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں المناک نتیجے ہیں جن کی سوا بھگتنے والوں کے کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

شاید آپ کو یہ خیال ہو کہ اس قسم کی دغابازیوں کو عدالتی کارروائی کے ذریعے آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے مقدمے برسوں چلتے رہتے ہیں اور اکثر ملزموں کو اتنی کافی سزا نہیں ملتی جس سے دوسروں کو عبرت ہو۔

اس کے علاوہ جیسے ہی ایک فریب پکڑا جاتا ہے کوئی دوسرا ڈھونگ شروع ہو جاتا ہے اور آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے اس کے شکار ہونے لگتے ہیں۔ جب تک عام لوگوں میں اتنی عقل نہ ہو کہ وہ جاہلوں اور دغابازوں کو پہچان سکیں ان چیزوں کو پوری طرح روکا نہیں جا سکتا۔

امریکہ میں لوگ اتنا تو سمجھنے لگے ہیں کہ شدید بیماریوں میں اتائیوں کا علاج کرانا اور اس طرح کے ڈھکوسلوں کا استعمال کرنا خطرناک ہے، لیکن جہاں تک پرانی بیماریوں کا تعلق ہے جن کے علاج میں علم طب نے اب تک بہت کم ترقی کی ہے، بہت سے لوگ اب بھی بے وقوف بننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بے چارے گٹھیا کے، پرانے ناسور کے اور دوسری بیماریوں کے مریض جن کا علاج بہت دیر طلب ہے جب ڈاکٹروں کے پیچھے پھرتے پھرتے تھک جاتے ہیں اور ان کی نظر اخبار میں "شرطیہ علاج" یا "حکمی علاج" کے اشتہار پر پڑتی ہے تو ان سے رہا نہیں جاتا۔ ذیابیطس اور سرطان کے مریضوں کا معاملہ اور بھی مشکل ہے۔ ذیابیطس والا انسولین کے انجکشنوں سے اور پرہیز سے عاجز آ جاتا ہے۔ اس کا دل ایسے شخص کو ڈھونڈھتا ہے جو اس سے کہے "انجکشن پر لعنت بھیجو اور جو جی چاہے کھاؤ پیو، میں تمہارا علاج کرتا ہوں۔" اسی طرح سرطان کے مریضوں کو جب آپریشن کی یا ایکس رے کے علاج کی بشارت دی جاتی ہے اور پھر بھی سو فی صدی فائدے کا یقین نہیں دلایا جاتا تو وہ خود بخود اس شخص کی طرف کھنچتے ہیں جو آسان اور حکمی علاج کا مدعی ہے۔

(ماخوذ)

مشرقی یورپ لڑائی کے بعد

ابوسالم

دوسری بڑی لڑائی سے پہلے مشرقی یورپ کے ملکوں کا حال، غربت اور افلاس کے لحاظ سے ہمارے ہندوستان جیسا تھا۔ ہنگری، پولینڈ، بلگیریا، چیکوسلوویکیا، یوگوسلیویا میں کسانوں کا معیار زندگی بہت ہی پست تھا، لاکھوں کھیت اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ کسان ان سے کسی طرح پیٹ بھر روٹی حاصل نہیں کر سکتا تھا، وہ فصل سے پہلے کے چند مہینے فاقہ مستی میں گذارنے پر مجبور ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں بھی جہاں پیداوار مقابلتہً زیادہ ہوتی تھی بے زمین مزدوروں کی بڑی بھاری تعداد ہوتی تھی، یہی نہیں یہ معیار زندگی لڑائی سے پہلے ہی اور بھی گرنے لگا تھا اس افلاس کے کچھ اسباب تو ثانوی تھے۔ مثلاً ۱۹۳۰ء کی کساد بازاری نے زرعی پیداواروں کے دام بہت گرا دیئے تھے اور اس سے لازمی طور پر دیہات کی آبادی کو بڑی مالی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن اصل اور بنیادی سبب، جو خود ہمارے ملک میں کارفرما ہے، یہ تھا کہ کھیتوں پر کام کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، زیادہ اس معنی میں کہ اگر ان سے کھیت پر کام نہ لیا جاتا تو اس سے زرعی پیداوار میں کمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، معاشیات کی اصطلاح میں یہ کثرت آبادی کا شکار تھے۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ان چھ ملکوں میں چھ کروڑ مجموعی آبادی میں کوئی ۲ کروڑ انسان اس معنی میں غیر ضروری تھے کہ کھیتی باڑی کو ان کے وجود سے کوئی فائدہ نہ تھا اور کھیتی باڑی کے علاوہ ان ملکوں میں اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔

لڑائی کے بعد ان ملکوں کے سیاسی نقشے میں تبدیلی ہوئی، یہاں عوامی جمہوریتوں نے جنم لیا اور ان ملکوں میں ترقی پسند حکومتیں قائم ہیں (شاید یوگوسلیویا کو اس فہرست میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔ ٹیٹو کی حکومت نے حال میں امریکہ سے قرض مانگا ہے اور دنیا کے موجودہ سیاسی پس منظر میں اس طرح کا قرض سیاست کے متعلق ایک خاص نظریے کے بغیر نہیں ملتا) ان ملکوں کے سامنے تعمیر کا کام کتنا کٹھن تھا۔ اس کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں ان مسائل کو حل کرنے میں ابھی تک کوئی قابل لحاظ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد ان سب ملکوں نے پہلا اہم معاشی فیصلہ یہ کیا کہ قومی تعمیر کا کام افراد اور انفرادی کاروبار کی برکتوں سے چھٹکارا حاصل کئے بغیر نہیں چل سکتا، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ان معاشی منصوبے تیار کئے اور ان میں صنعتی تعمیر پر خاص طور سے توجہ دی گئی کہ یہی فلاح کا اکیلا راستہ تھا اور صنعتوں میں زراعت سے فاضل آبادی کو لگائے بغیر بہتری کی امید فضول تھی، صنعت میں توسیع کے بغیر زرعی ترقی بھی ممکن نہ تھی، اس لئے کہ روزگار کے دوسرے مواقع بہم پہنچائے بغیر زرعی تنظیم از سر نو نہیں کی جا سکتی تھی۔

ابتدائی منصوبوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ساری فاضل زرعی آبادی کو صنعت میں کھپا دیا جائے۔ یہ پہلے منصوبے تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے بنائے گئے تھے۔ پولینڈ کا منصوبہ ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا، اور اس سال کے آخر میں ختم ہو جائے گا۔ باقی اور کئی ملکوں کے منصوبے دو دو سال کے لئے تھے دو تین سال کی چھوٹی سی مدت میں ظاہر ہے اتنا بڑا کام انجام دیا بھی نہیں جا سکتا تھا، اس لئے ان منصوبوں کو اس بڑے مقصد کے لئے پہلا قدم سمجھنا چاہئے ان سبھی ملکوں کا مقصد یہ تھا کہ جنگ سے پہلے کے حالات دوبارہ پیدا کر لئے جائیں، لیکن صنعتی پیداوار میں اضافوں کی تجویزیں ہیں۔ چیکوسلوویکیا کے منصوبے میں صنعتی پیداوار میں دس فی صدی، ہنگری میں ۲۷ فی صدی اور بلگیریا میں ۶۵ فی صدی کے اضافے کا پروگرام ہے۔ زرعی ترقی کی رفتار سست ہو گی کیونکہ لڑائی کے دوران میں ان ملکوں کو بعض ایسے نقصان پہنچے ہیں، جن کی تلافی فوراً نہیں ہو سکتی مثلاً منصوبہ بندی دو برس میں جانوروں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکتی اور لڑائی کی بدولت ان کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔

صنعتی پیداوار میں اضافے کے لئے ضروری ہے کہ صنعتوں میں سرمایہ زیادہ لگایا جا سکے۔ ہمارے ملک میں صنعتی پیداوار کے نہ بڑھنے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ دیس کے سرمایہ دار اپنا سرمایہ نہیں لگا رہے ہیں مشرقی یورپ کے ان ممالک کی غربی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے ہاں بھی سرمایہ کی کمی کا سوال لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا، اور ہے، لیکن انھوں نے قومی آمدنی کا بیس فی صدی سالانہ بچا کر معاشی تعمیر کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بچت کا یہ تناسب حیرت کر دینے والی بات ہے خصوصاً جب یہ یاد رکھئے کہ ہمارے ہاں اس معاملے میں ۷ فیصدی سے زیادہ کا ذکر کم سننے میں آتا ہے۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کو آج تھوڑی سی قربانی کرنا پڑے گی، اور جان بوجھ کر اپنی زندگی کے معیار کو تھوڑے دن اور نیچا رکھنا ہو گا، لیکن ایک مرتبہ صنعتیں وجود میں آ گئیں تو انھیں آنے والے دنوں میں یہ یقین ہے گا کہ ان کا معیار زندگی بدل جائے گا (مغربی یورپ میں مشرقی یورپ کے بعض "دوست" اس نادانی پر خندہ زن ہیں ایسا اس لئے ہے کہ مغربی یورپ اپنا مستقبل ڈالر کے ہاتھوں بیچ رہا ہے اور حال کو پا نہیں سکتا۔ دوسروں کے متعلق اس بات کا یقین اُسے آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ وہ مستقبل کو اپنا رہے ہیں۔

اوپر میں نے کہا ہے کہ بچت کی اونچی شرح سے معیار زندگی فوراً نہیں بدل سکے گا۔ اس میں تھوڑی سی اور ترمیم کی ضرورت ہے۔ ان منصوبوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جو غریب ترین طبقے ہیں ان کے معیار زندگی کو ضرور بدلا جائے۔ اور اس مقصد کے پیش نظر ان معاشی علاقوں کو جو بدحالی کا شکار تھے خاص طور سے توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے۔ ہر منصوبے میں ان علاقوں میں خاص طور سے سرمایہ لگانے کا پروگرام بنایا گیا ہے جہاں کی آبادی جنگ سے پہلے فاقے کا شکار ہونے پر مجبور تھی۔

اب آیئے ان منصوبوں کے نتائج پر ایک نظر ڈال لیں۔ مشرقی یورپ میں صنعتی تعمیر کی رفتار مغربی یورپ کے مقابلے میں تیز ہے ۱۹۴۸ء کے وسط ہی میں یہ ممالک صنعتی لحاظ سے لڑائی کے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ پیدا کرنے لگے تھے۔ ان سب میں ترقی کی رفتار چیکوسلوویکیا میں سب سے زیادہ سست تھی اور اس کا سبب ہمارے لئے اہم ہے۔ منصوبے کے پہلے سال میں چیکوسلوویکیا میں اتنا سرمایہ کاروبار میں نہیں لگایا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے وہاں صرف بڑے بڑے کارخانوں پر قبضہ کیا تھا۔ سرمایہ داروں نے نفع کی لالچ میں سرمایہ تھوک پر مال بیچنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں لگانا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ یہاں نفع کا امکان زیادہ تھا۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی سرمایہ کا رُخ اس طرح کے کاموں کی طرف ہے جس سے نفع زیادہ ہوتا ہے ظاہر ہے جلد تعمیر کا کام تو اس طرح نہیں ہو سکتا تھا

ان بہتر نتائج کے متعلق اہم بات یہ نہیں ہے کہ ترقی کی رفتار تیز رہی ہے بلکہ ان ملکوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ یہ ترقی مہنگائی کے بغیر حاصل ہوئی ہے، اس کے برخلاف مغربی یورپ کے ملکوں میں صنعتی بحالی کا کام اس طرح انجام پایا ہے کہ چیزوں کے دام بڑھ گئے ہیں اور اس طرح مالکوں کو زیادہ نفع کمانے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی یورپ کے ملکوں میں مزدوروں کی حقیقی اجرت میں اضافہ ہوا ہے۔

اور اب یہ ملک صنعتی توسیع کے وسیع تر پروگرام بنا رہے ہیں۔ چیکوسلوویکیا میں ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں انجینیرنگ صنعتوں کو ترقی دینے کی خاص طور پر کوشش کی جائے گی۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک چار سال میں صنعتی صلاحیت میں ۱۰ فیصدی کے اضافے کی کوشش کی جائے گی۔ پولینڈ سے ایک نیا منصوبہ بنایا جا رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ چھ سال میں صنعتی پیداوار میں دگنا اضافہ کیا جائے۔ سہ سالہ منصوبہ بندی نے چھوٹے سے ۴ سے عرصے میں تعمیر اور بحالی کا کام پورا کر دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ غلط نہیں ہوگا کہ انھی اصولوں پر چل کر ترقی کے یہ مقصد بھی پورے ہو سکیں گے

(ماخوذ)

مولانا مدنیؒ

بذاتِ خود ایک ادارہ

ضیاء الفاروقی

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی، ہر روز کا معمول اور "حق المعاد و حق العباد" کی پورے طور پر ادائیگی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان کی شخصیت کو بذاتِ خود ایک ادارہ سمجھوں۔ قحط الرجال کے اس پر آشوب دور میں اسلامی ہند کی یہ شخصیت بھولے اور بھلائے ہوئے مسلمانوں کے لئے ایک شمع ہدایت ہے، اُن کی صحبت کا ہر لمحہ ایمان کو تازہ کرتا ہے اور ان کی ہر جنبشِ نظر یقین و عمل کی پیغامبر ہے، ایسے ہی لوگ ہوں گے جن کے متعلق اقبال لاہوری نغمہ سرا ہوا تھا۔

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
"بیاباں"

اسلامی دینی علوم کی یہ ایک شان رہی ہے، اگرچہ اس کی تیرہ سو سالہ زندگی میں بڑے بڑے انقلاب آئے مگر وہ اپنی پوری آن بان سے اب تک قائم ہے۔ خود مسلمانوں میں امارت اور دنیاوی جاہ حشم کا انقلاب۔ بنی امیہ کی دینی و دنیوی ملی جلی حکومت، عباسیہ خلافت کا بنی امیہ کے خاندان اور اس کی تمام روایات سے دشمنی اور کینہ توزی، تاتار کا خونی طوفان، اسلامی دنیا کی انتشار پسندی، خود مختار حکومتوں کا وجود میں آنا اور ایک ایک کا مرکز سے الگ ہو جانا۔ سامانیوں، سلجوقیوں اور غزنویوں کا عروج و زوال، ترکوں کا اقبال اور مغلوں کا خروج۔ یہ سب کیا تھا اور اس کے کیا نتائج ہوئے؟ مورخین اسلام نے ان انقلابات اور حادثات کو ایک ایک کر کے جانچا اور تولا ہے، ایک ایک حالت کا جائزہ لیا ہے، اور اس پر فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ واقعات کی رواروی، انقلابات کا ایک منسلک سلسلہ اور قومی حادثات کی ایک مستقل رو، کس طرح شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا باعث ہوتی رہی، دنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ شاہی ایوان ان تغیرات کے سامنے نہ ٹھیر سکے اور بادشاہوں کی جگمگاتی ہوئی محفلیں ویران ہو کر رہ گئیں، مگر وہ علمائے سلف جو دینی علوم کو سینے سے لگائے رہے اور اسی کی روشنی میں باطل اور اس کی تمام ضلالتوں کا مقابلہ کرتے رہے، کس گوشت و پوست کے انسان تھے۔ کتب سیر شاہد ہیں کہ ان علماء کی بے لوث زندگیوں کے سامنے دنیا کی کوئی قوم اپنے اچھے سے اچھے افراد کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ علامہ احمد بن حنبلؒ، علامہ ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، شیخ المجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد بریلویؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ یہ ان ہزاروں بے نظیر انسانوں میں سے چند ہیں جنھیں معمولی پڑھا لکھا انسان کسی حد تک جانتا ہے۔

موجودہ دور میں اس سلسلے کی ایک کڑی مولانا مدنی ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے اور انصاف و وسیع النظری کی دولت سے مالا مال ہیں انھیں مجھ سے اتفاق کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا، یہ وہ ہستی ہے جو ایک مستقل نصب العین رکھتی ہے اور جس کا کیریکٹر زمانہ کی ساز باز اور حالات کی ریشہ دوانیوں سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ ذات ہے جو صرف اللہ کے نام کی بلندی، اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے جیتی ہے، جو قائم اللیل اور صائم النہار ہے جس کے دن "امر بالمعروف" اور جس کی راتیں "نہی عن المنکر" کی فکر میں گذرتی ہیں۔ سیاسی انقلابات اس شخص کے دامن کو آلودہ نہیں کر سکتے، یہ اس لئے کہ اس کے اعمال غرض کے شائبہ سے پاک ہیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا انقلاب ہندوستان کی کسی اور قوم کی تاریخ میں ممکن ہے کوئی بڑا انقلاب ہو، مگر مسلمانوں کی تاریخ ایسے سیکڑوں انقلاب اپنے صفحات میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ دہلی کا ہنگامہ انقلاب کی تباہی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا، تاریخ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ وہ علمائے سلف جن کی عظمت نیک نیتی، بے لوث زندگی اور ایثار و قربانی سے متاثر ہو کر یہ "مجاہد" اپنے کو "ننگ اسلاف" لکھتا ہے کس دل و دماغ کے انسان تھے نہ حکومت کے ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار ڈالتے تھے اور نہ دنیاوی حرص و طمع سے مغلوب ہوتے تھے، صرف حق کی خاطر جیتے تھے اور حق کی خاطر مرتے تھے۔ حسین احمد ایسے لوگوں کی زندگیاں سامنے رکھتا ہے اور انھیں کے اصولوں پر عمل کرتا ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے پیر اولا کو لغزش ہو جائے اور اس کی نیت میں فتور آ جائے چاہے وہ مالٹا کی جانکاہ اسیری ہو یا ۱۵ اگست کا انقلاب ہو۔

> .... موجودہ دور میں اس سلسلے (علمائے سلف) کی ایک کڑی مولانا مدنی ہیں .... یہ وہ ہستی ہے جو ایک مستقل نصب العین رکھتی ہے اور جس کا کیریکٹر زمانے کی ساز باز اور حالات کی ریشہ دوانیوں سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ ذات ہے جو صرف اللہ کے نام کی بلندی، اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے جیتی ہے جو قائم اللیل اور صائم النہار ہے جس کے دن امر بالمعروف اور جس کی راتیں نہی عن المنکر کی فکر میں گذرتی ہیں ....

یہ شخص اپنی قوتِ عمل اور کیریکٹر کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اور دنیاوی ہنگاموں سے اپنا دامن یوں بچائے جاتا ہے جیسے کہ کوئی بات نہیں کل اگر کوئی دوسرا طوفان آتا ہے تو یہ ہستی اسی طرح اٹل رہے گی جیسے سمندر کے تھپیڑوں کے سامنے سخت چٹان۔

وہ ادارہ جہاں مولانا کی ہوش و آگہی کا کم و بیش، سارا زمانہ گذرا اپنے اندر چند خصوصیتیں رکھتا ہے اور ان سے ہر باخبر شخص واقف ہے یہ ادارہ آزاد ہے۔ اس کی روح آزاد ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم دنیاوی جاہ و حشم سے بے نیاز ہو کر اسلام کا فدائی ہو کر نکلتا ہے۔

ہماری قدیم تاریخ چودھویں صدی عیسوی کے درمیان میں پھلا پھولا اور خیر المجالس جیسی مشہور کتاب کا مصنف ہے، لکھتا ہے چشتی سلسلے کے صوفیائے کرام بادشاہوں کے درباروں اور امرا کی صحبتوں سے گریز کرتے تھے مولانا کے موصوف کو بھی چشتی سلسلے میں اجازت ہے اور اس سلسلے کے بزرگوں کا فیض ہے کہ مولانا سیاسی جاہ و حشم اور حکومت کے طمطراق سے دور رہتے ہیں اور حضرت علامہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور قول

"من بندۂ فقیرم مرا از شاہاں چہ کار"

پر عمل پیرا ہیں۔

اس زیر بحث "ادارہ" میں مجھے ایک خامی نظر آتی ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر کیا کروں بات اپنی جگہ پر ہے اور یہ میری آزادانہ رائے ہے، بہت ممکن ہے کہ میری رائے صحیح نہ ہو۔ اصحاب علم سے امید ہے کہ وہ اصلاح فرمادیں گے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

چوہے

سید سفارش حسین

(۲)

چین یہ ساری باتیں دیکھ رہا تھا، پر تھا حیران اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا دل تو ڈوبا جا رہا تھا، وہ سوچتا جیسے دن پلٹ گئیں تو کیا اچھا ہو؟ اس خیال ہی سے اس کا چہرہ چمک اٹھتا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا اور اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ہوا میں اُڑا جا رہا ہو، جیسے گذرے دن سچ مچ لوٹ آئے ہوں، پھر وہ ایک دن چونک پڑتا، جیسے سوتے سوتے خواب میں ڈر کر بچہ چونک پڑے، پھر اس کا جی اُداس ہونے لگتا۔

ایک دن بہت سے ڈھول زور زور سے بجے، اتنے زور سے کہ کان کے پردے پھٹنے لگے لوگ کام چھوڑ کر گھروں میں گھس گئے کنڈیاں بند کرلیں تالے ڈال لئے، مگر ڈھول بجتے ہی رہے ڈھول بجے جب دیر ہوئی اور کہیں سے چیخ چلانے کی آواز نہ آئی تو لوگ گھروں سے باہر نکلے اور انھیں پتہ چلا کہ راجہ نے سب کو بلایا ہے۔ سب میدان میں جمع ہوئے۔ راجہ ٹیلے پر چڑھ کر بولا "پاپ کو مٹانا دھرم کا پہلا کام ہے۔ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہم پاپ کو مٹا کر رہیں گے، تم بھی قسم کھاؤ کہ یا تو پاپ کو مٹاؤ گے یا مرجاؤ گے۔" راجہ جی کی بات ختم ہوئی تو لوگ زور زور سے چیخنے لگے۔ شور کے مارے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ چین گھبرا گھبرا کر ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا، اس کا سر چکرانے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب گرا جیسے اس کے پیروں میں جان ہی نہ ہو۔

اگلے دن باجا ایسا بجا کہ سنتے ہی سب مست ہوگئے۔ چین بھی کام چھوڑ کر باجا دیکھنے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ چھیلے جوان سینہ تانے، انھیں چڑھائے ہتھیار چمکائے چلے جا رہے ہیں انھیں دیکھ کر چین بہت خوش ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، اور جب کسی نے کہا کہ وہ پاپ مٹانے جا رہے ہیں تو اس کا منہ پیلا پڑ گیا جیسے اس کے بدن میں خون ہی نہ ہو، اس کا سر چکرایا، وہ گرنے ہی کو تھا کہ ایک نوجوان نے بڑھ کر سنبھال لیا، چین کو اس پر بہت پیار آیا اس نے نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" نوجوان نے اُسے تعجب سے دیکھا اور کہا "تمھیں پتہ نہیں بابا، ہم سب پاپ مٹانے جا رہے ہیں، چین ٹھنڈی سانس لے کر بولا "پاپ کیسے مٹاؤ گے بیٹا؟" جواب میں نوجوان نے اپنی تلوار چمکائی۔ چین نے پھر پوچھا "تو اس سے پاپ مٹائے گے؟" نوجوان نے گردن ہلائی، چین ایک گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

سنتے ہیں کہ ایسا رن پڑا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، خون کے دریا بہہ گئے، سر زمین پر ایسے لڑھکتے پھرتے جیسے خزاں میں ہوا کے ساتھ درختوں کی گری ہوئی پتیاں، پھر بھی گھوڑی نہ ہاتھ آتی تھی نہ آئی، لال راجہ نے جب یہ دیکھا کہ دشمن کا پلہ بھاری ہے، اس کے آدمی گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں۔ تو اس نے اصطبل میں جا گھوڑی کے چاروں پیر کاٹ دیئے۔ اور خود بھی میدان میں مارا گیا، اس کا مرنا تھا کہ بھاگڑ پڑگئی، جدھر جس کا منہ اُٹھا بھاگ گیا پھر پکڑا دھکڑی شروع ہوئی، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لال آدمیوں کو لاتے اور قیدی بناتے۔ راجہ تو مہاراجہ ہوگیا، پر آدمی محنتی سے مزدور۔ مزدور سے چور اور چور سے بندی بن گئے، چین نے جو دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے، بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی اور ایسا لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو، وہ بے ہوش ہوگیا۔

اب تو روز خبریں آتیں، یہ راجہ اس راجہ پر دوڑا اس راجہ نے اس مہاراجہ کو مار بھگایا اور خود مہاراجہ بن گیا۔ محنتی کم ہونے لگے۔ مزدور زیادہ اور غلاموں کی اور بیچ کی تو کچھ پوچھو ہی مت، جدھر جاؤ دو چار مل جاتے، جدھر دیکھو دس پانچ نظر آجاتے چین کو ایسا لگا جیسے دنیا دوزخ بن گئی، اس کا جی نہ لگتا، اس نے سوچا اس سے تو مرنا ہی اچھا ہو رات ہو چکی تھی، چاند نکل آیا تھا، چاندنی چھٹکی بالکل گول تھی، موٹی اور گول جیسے کسی محنتی کی روٹی، اس نے سوچا ندی میں ڈوب مرے، وہ ندی کے پاس پہنچا تو اُسے ایسا لگا جیسے چاندی بہہ رہی ہو، چاند کی کرنیں لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ پانی کی تہہ میں چاند چمک رہا تھا، کانپتا، کپکپاتا سا۔ چین کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند بھی دکھی ہو رہا تھا۔ وہ ندی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ موجیں اس کے پیروں میں لوٹنے لگیں، جیسے منت کر رہی ہوں۔ چین خودکشی مت کر، جان مت دے، دھیرج رکھ، ہمت باندھ اور کوشش کر۔" پھر اس کے کان میں آواز سی آئی "نرس ہوگیا، آس چھوڑ بیٹھا۔ کیا اس سے پہلے مصیبت نہیں آئی تھی، آفتیں نہیں پڑی تھیں، خون خرابے نہیں ہوئے تھے۔ دنیا دوزخ نہیں بنی تھی۔ آج تجھے کیا ہوگیا۔ شاید تجھے اپنے پر بھروسا نہیں رہا، تیرا یقین جاتا رہا، اعتماد اٹھ گیا، ایمان کمزور ہوگیا، جان دے رہا ہے؟ مرنے کے بعد پھر؟ کیا یہ دنیا جنت بن جائے گی، سکھ چین پھر پلٹ آئیں گے؟ اگر ایسا ہے تو مر جا، ڈوب جا، جان دے دے" پھر جیسے کوئی زور سے ہنسا، کسی نے ٹھٹھا لگایا۔ چین کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے میں سے نکل بھاگے گا۔ اس کے کان گرم ہوگئے تھے۔ بھویں پسینے سے تر تھیں۔ پھر جیسے کوئی اس سے کہہ رہا تھا "پاپی، بے دھرم، جس پانی نے تیرے کھیت سینچے، سوکھے حلق کو تری پہنچائی اسے گندہ کرے گا، اپنا پاپ بس اس میں گھولے گا کہ پھر پانی کھیت نہ سینچے، کسی کی پیاس نہ بجھائے، اور اس طرح ساری دنیا اَن اور پانی کو ترس ترس کر مرجائے۔"

چین نے ایک پھریری لی، پھریری لیتے وقت اس کی گردن جھکی اور پانی میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا بالکل بھیڑئے جیسا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ ندی میں جا پڑا۔

چین کی آنکھ کھلی تو اُسے آدمی کچھ نئے سے دکھائی پڑے، ان کا قد کچھ اور سا تھا اور رنگ بھی۔ ویسے وہ تھے بالکل اُسی جیسے جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے، کوئی دوڑ کر دودھ لایا اور کوئی شربت۔ دودھ تو اتنا اچھا اور ایسے مزے کا تھا کہ اس کے جی میں آیا اور مانگے پر وہ چپ ہو رہا وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اُن کی باتیں سننے کے لئے اس نے آنکھیں بند کرلیں وہ کہہ رہے تھے "دنیا میں ظلم، زیادتی اور بے انصافی بڑھ بھی تو بہت گئی تھی، آدمی آدمی کے خون سے ہولی کھیلتا اور خوش ہوتا، انسان انسان پر ظلم توڑتا اور ہنستا۔ دھرم کا تو نام مٹ ہی گیا تھا۔"

ایک بولا "دھرم؟ پگلا کہیں کا!"

دوسرا بولا "اور راجاؤں کی تو کچھ پوچھو ہی مت، رات دن لڑائی جھگڑا آئے دن لوٹ مار اور دنگا اور روز قتل غارت!"

رات ہو چکی تھی چاند نکل آیا تھا، چاند کی ٹکیہ بالکل گول تھی موٹی اور گول جیسے کسی محنتی کی روٹی۔ اس نے سوچا ندی میں ڈوب مرے وہ ندی کے پاس پہنچا تو اسے ایسا لگا جیسے چاندی بہہ رہی ہو۔ چاند کی کرنیں لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ پانی کی تہہ میں چاند چمک رہا تھا، کانپتا، کپکپاتا سا، چین کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند بھی دکھی ہو رہا تھا وہ ندی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا، موجیں اس کے پیروں میں لوٹنے لگیں جیسے منت کر رہی ہوں چین خودکشی مت کر، جان مت دے، دھیرج رکھ، ہمت باندھ اور کوشش کر۔

ایک اور بولا " پر وہ بھی تو راجہ کا بیٹا ہے۔ اس نے راج پاٹ چھوڑ کر یہ نروان کا کھٹ راگ کیسا پھیلایا، اس میں کوئی نہ کوئی بھید ہے"۔

پہلا بولا: " لے تو بالکل گاؤدی ہے گاؤدی ارے مورکھ یہی تو بھگوان کی لیلا ہے "۔

اس پر سب نے مل کر بھگوان جی کا نعرہ لگایا، اور چین جو اب سو سا گیا تھا، چونک پڑا۔

چین گھر آیا تو اسے رنگ ہی بدلا ہوا ملا لگتا ہی پلٹ گیا تھا جیسے دیکھو پریم کی باتیں کر رہا ہے ایک دوسرے سے میل محبت ایسی جیسی سگے بھائیوں میں، دکھ درد تو نام کو نہ تھا۔ اونچ نیچ، چھوٹ چھات کا تو پتہ بھی نہ لگا کہ کدھر گئے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن اور اپنی اپنی کرنی میں مست نہ وہ کسی کا برا چاہتے نہ کوئی ان کا، نہ وہ کسی کو دکھ دیتے، نہ کوئی انھیں۔ نہ وہ کسی سے اونچ نیچ سمجھتے اور نہ کوئی انھیں نیچ سمجھتا، جو جیسے کرم کرتا ویسے پھل پاتا۔

یہ پیغام دیس دیس پہنچا، دور دور ملکوں میں گیا۔ اور ایسا لگا جیسے یہ دنیا بالکل جنت بن گئی ہو۔ کھیتوں میں پودے پھرنا چننے لگے۔ پودوں کی بھلائی کو گریں سر پر لئے کھیتوں میں کھڑی تھیں کھڑے کھڑے تھک گئیں تو ذرا دم لینے کے لئے جو ایک طرف کمر جھکائی تو دوسری کھیتوں میں کھڑے شریر پودوں نے اپنا منہ بالکل ان کے منہ پر رکھ دیا۔ انھوں نے گھبرا کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیرا، ادھر بھی کچھ شیطان تاک میں کھڑے تھے موقع پاتے ہی انھوں نے بھی وہی حرکت کی۔ اچھا اور کوٹھا غصہ آیا۔ وہ لال پیلی ہو گئیں پر کرتیں کیا بوجھ کے مارے قدم زمین میں گڑ گئے تھے، چلنا ناممکن تھا کھیت کی مینڈھ پر کھڑی ہوئی ایک اچھلا نے یہ سب دیکھا اور مسرت اور امید کے رنگ کی ملی جلی تصویر اس کی آنکھوں میں کھنچ گئی۔

چین کو اپنی پچھلی بات جب یاد آئی تو وہ دل ہی دل میں شرمندہ سا ہوتا، جھینپ سا جاتا، اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر اسے ہنسی آتی اور وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ اور دل ہی میں خوش ہوتا کہ اپنی آنکھوں سے سنسار میں سکھ اور شانتی دیکھ رہا ہے۔

دن بیتنے لگے، مہینوں، برسوں، اور برس صدیوں میں بدلنے لگے، آہستہ آہستہ نیا پیغام پہنچانے والے پرانے پڑ گئے اور آپس میں جھگڑنے بھی لگے۔ آپ ان کی ٹولیاں بن گئیں، ان ٹولیوں نے پیغام کو چھوڑ دیا اور لگے ایک دوسرے کو جھوٹا بنانے جھوٹ سچ کا یہ جھگڑا چلا تو لوگ پھر سیدھا رستہ چھوڑ ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ دنیا میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ پچھلی باتیں پھر لوٹنے لگیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے یہ دنیا برے دنوں میں پھر پلٹ جائے گی، پھر وہی مار دھاڑ، پھر وہی لوٹ کھسوٹ، پھر وہی ظلم، پھر طاقتور کمزوروں کو کچلنے لگے، زبردستوں کا ڈنڈا سروں پر ناچنے لگا جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون لاگو ہو گیا۔ پھر آدمی آدمی کو ذلیل کرتا اور خوش ہوتا، پھر انسان انسان سے جانور کا برتاؤ کرتا اور ہنستا۔ چین کو پھر بے چینی شروع ہوئی پھر اس کا سانس چڑھا اس کی بائیں آنکھ پھڑکی اور اس نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو کوئی بات ہے، کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے، اور یہ دنیا پھر اندھیرے گڑھے میں گرے گی۔ بھگوان سیوکوں نے بھی تو کچھ نہیں کیا بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہے، کوئی کوئی تو بھگوان ہی بن بیٹھا۔

ہونے والی بات ہو کر رہی، دنیا پھر ایک دفعہ پاپ کے جال میں پھنس گئی اور ایسی پھنسی کہ سب نے سمجھ لیا کہ اب اس کا سنبھلنا مشکل ہے اور تھا بھی اب تو آدمیوں کی بھی ٹولیاں بن گئی تھیں اور آدمیوں کے چھاپ بھی لگ لگی تھی۔ اب آدمیوں کو ٹولیوں سے پہچانتے یا چھاپ سے یا پھر رنگ سے۔ آدمی کو آدمی کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا تھا۔

انسان نیچے گرا اور اتنا نیچے گرا کہ جانوروں کے برابر آ گیا، جیسے وہ جانور ہی ہو گیا تھا۔ اس کے لئے بڑے بڑے اکھاڑے بنائے تھے، انسان انسان کو ذلیل سمجھتا، نیچ جانتا اور اس میں اپنی اونچائی اور بڑائی ڈھونڈھتا۔ چین کو یقین ہو گیا کہ اب یہ دنیا چلی، یہ سنسار مٹ کے رہے گا۔ یہ دنیا برباد ہو کے رہے گی، اسے خواب بھی تو ایسے ہی نظر آتے۔ آگ، بہت بڑی، بڑے زور کی دہکتی ہوئی آگ اور ساری دنیا جیسے اس آگ میں جل رہی ہو۔ آندھی بڑے زور کی اور پھر گھپ اندھیرا۔ گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ بدن پسینے میں شرابور۔ بدن ایسا گرم جیسے ابھی بھٹی میں سے نکلا ہو۔ ایک دن نہ جانے اسے کیا سوجھی، وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے آدمی کی صورت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ انسانوں سے وہ ایسا بھاگتا جیسے بھیڑئے سے بکری۔ اسی لئے وہ چھپتا چھپاتا، نظریں بچاتا، کبھی رکتا، کبھی چلتا، کبھی ٹھیرتا اور پھر چلنے لگتا، گرمی کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا دھوپ کی تیزی بھی جھلسا رہی تھی۔ پیاس سے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے ہونٹ خشکی سے تڑخنے لگے تھے، لیکن پانی کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ اس نے ایک ڈگر پکڑ لی اٹھتا بیٹھتا، گرتا، پڑتا، اس پر چلا جا رہا تھا، تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک کٹیا نظر پڑی، چھوٹی سی مگر خوبصورت کٹیا کے پاس پہنچ کر اس نے بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے سخت اور کرخت لہجے میں جواب دیا "چلے جاؤ! دور ہو جاؤ یہاں سے، گندے انسان ہمیں ویرانوں میں بھی چین نہیں لینے دیتے، ہم نے دنیا چھوڑ دی، سنسار تیاگ دیا، سکھ چین تج دیا، پھر بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اپنے پاپ میں ہمیں بھی سانا چاہتے ہیں، اپنے گناہوں میں ہمیں بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ چلے جاؤ...... چلے جاؤ...... چلے جاؤ"! چین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس کا سر چکرانے لگا آنکھوں میں اندھیرا سا آ گیا اور اس اندھیرے میں دو لفظ "پاپ"...... "گناہ" ناچ رہے تھے، گلا سوکھ گیا تھا، زبان اینٹھ رہی تھی اس سے بولا نہ گیا مگر بڑی کوشش کے بعد کچھ لفظ اس کے منہ سے نکلے۔ پیاس .... مرا ...... پانی، دیوار کے سوراخ میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا مٹی کا برتن پانی سے بھرا ہوا۔ چین نے جلدی سے پانی لیا، اس کے ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے، اس کا بس نہ تھا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سارا پانی چڑھا جائے، دیکھتے ہی دیکھتے برتن خالی کر دے کانپتے ہاتھوں سے پانی نے کر سوکھے ہونٹوں تک پہنچاتے پہنچاتے نہ جانے کتنی بار اس نے برتن خالی کیا جب برتن اس کے ہونٹوں سے لگا تو جیسے سارا پانی ایک دم چڑھا جائے گا۔ اس نے پانی منہ میں انڈیلا کچھ گرا، کچھ پھیلا، کچھ اس نے پیا، پیتے پیتے جیسے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی ہو، اس کا دم گھٹا، سانس بند ہو گئی، پھندا لگا اور برتن اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ برتن ٹوٹتے ہی اندر سے آواز آئی۔ پاپی ...... گنہگار "!

چین کو ایسا لگا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو، بدن میں مرچیں سی لگ گئیں، منہ لال اور کنپٹی سرخ ہو گئی، پیاس تھوڑی بہت بجھی پر سینے میں آگ بھڑک اٹھی، اس آگ میں جلتا اور اس کے شعلوں میں پھنکتا۔ چین وہاں سے چل پڑا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ آپ ہی آپ وہ خفا ہو رہا تھا اور کس پر اس کا اسے پتہ نہ تھا، اور اس انجانے پن پر وہ جھنجھلا بھی رہا تھا، مگر چلا جا رہا تھا، شاید اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ چلتا ہی رہے گا، نہ کہیں رکے گا، نہ کہیں ٹکے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا۔ بھوک پیاس میں بھی وہ کسی سے کچھ نہ کہے گا بس چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ چلتے چلتے پیر چلنا چھوڑ دیں، بھوک سے وہ مر ہی کیوں نہ جائے پیاس سے اس کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔ مگر وہ چلتا ہی رہے گا، چلتا ہی رہے گا اور چلتا ہی رہے گا۔ یہی سوچا۔ دل میں خیال کے ایسے ہی گھروندے بناتا اور بگاڑتا، چین اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ انجیر کے پیڑ کے نیچے اسے کچھ آدمی دکھائی پڑے۔ اس نے سوچا، پلٹ جائے راستہ بدل دے، ان کی طرف دیکھے بھی نہیں۔ وہ آدمی سے خفا تھا، انسان سے روٹھ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر چلتا رہا۔ آواز اس کے کانوں میں آنے لگی پر وہ چلتا ہی رہا۔ اب کچھ باتیں سنائی دیں، وہ رک گیا۔ اس نے سنا " آدمی پاپی ہے، جنم کا پاپی، پاپ میں لتھڑا ہوا۔ اسے پھر سے پیارا ہونا ہے میں بھگوان کا بیٹا ہوں، آدمی کے روپ میں آیا ہوں اپنی قربانی دوں گا کہ آدمی کے پاپوں کا بدلہ ہو جائے پھر یہ دنیا انسان کی دنیا بن جائے گی۔ سنسار میں سکھ چین پلٹ آئیں گے"! چین نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو وہ ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ بھگوان کے بیٹے کو اس نے دیکھا، کیسا سندر، کیسا بھولا، اس کے دل میں پریم کا ساگر موجیں مارنے لگا۔ غصّہ، روٹھن اور جھنجھلاہٹ سب کافور ہوگئے جیسے وہ پھر سے پیدا ہوگیا ہو۔ خدا کا بیٹا بولا "تم پریم کروگے، سب سے پریم۔ ایسا پریم جیسے تم اپنے آپ سے کرتے ہو۔ کسی کو ستاؤگے نہیں، تکلیف نہیں دوگے۔ آزار نہیں پہنچاؤگے، کوئی تمھارے تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی سامنے کردوگے، تم اگر اس کے لئے تیار ہوجاؤ، برداشت کی اتنی طاقت تم پیدا کرلو، پریم کی اتنی شکتی تم میں آجائے تو یہ دنیا پھر انسانوں کی دنیا بن جائے گی۔ کام ذرا کٹھن ہے۔ آسان نہیں۔ مارنے سے مار کھانے میں، پیٹنے سے پٹنے میں، ظلم کرنے سے ظلم سہنے میں، زیادہ طاقت اور زیادہ قوت چاہئے۔ نفرت کا جواب محبت سے دینا، ستانے والے سے محبت اور ظلم کرنے والے سے پریم کے ساتھ پیش آنا کوئی سہل کام نہیں، اس میں بدن کی طاقت، بازوؤں کا بل کام نہیں دیتا۔ آتما کی شکتی اور روح کی طاقت چاہئے۔"

اوروں کی طرح چین بھی ان باتوں کو سنتا رہا جیسے چھوٹے بچے کہانی سنتے ہیں۔ پھر ایک بولا: بات تو ٹھیک ہے پر ہے ٹیڑھی کھیر۔ اس کے لئے تو سچ مچ آدمی کو پھر سے پیدا ہونا چاہئے۔

بھگوان کے بیٹے کا یہ پیغام چاروں طرف پھیل گیا۔ لوگ نئے پیغام کے بھوکے تھے، اس لئے جس نے سنا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس طرح بگڑی دنیا پھر سنور گئی۔ اجڑے کھیت اور سوکھے چمن ہرے ہوگئے، پھول کھلے، کھیت اناج سے بھر گئے درخت میووں سے لد گئے اور زندگی پھر سے جوان ہوگئی۔ جوانی آئی۔ ایسی جوانی جسے دیکھ کر زندگی کو بھی پیار آگیا۔ دنیا پریم سے بھر گئی، دکھ درد، رنج و غم مٹ گئے، اور ہر طرف چین کی بنسی بجنے لگی۔ چین کو بھی چین نصیب ہوا۔ آس کے دیئے جلے، یاس کی اندھیاری دور ہوئی۔ امید کی روشنی ناامیدی کی سیاہی پر ایسی پھر گئی جیسے کالی دیوار پر چونے کی سفیدی، مگر پاپ کا دھبہ کلنک کا ٹیکہ بن کر ایسا لگا کہ چھڑائے نہ چھٹا۔ ہزاروں جتن کئے، لاکھوں ترکیبیں نکالیں مگر کسی کے کئے کچھ نہ بنا اور ٹیکا جوں کا توں۔ آخر تنگ آکر ایک دن اس نے تیاگ کی ٹھانی اور موقع پاکر گھر سے نکل گیا۔ نکلنے کو تو چین گھر سے نکل گیا، مگر دل وہیں اٹکا رہا، کبھی گھر یاد آتا، کبھی گھر کی چیزیں، کبھی کھیت کبھی ڈھور ڈنگر۔ رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ یاد دھندلی پڑتے پڑتے بالکل مٹ گئی اور اب چین گیان دھیان میں لگ گیا۔ آبادی سے دور، آدمیوں سے الگ اس نے ایک کٹیا بنائی یہی اس کی دنیا تھی، اسی میں وہ آتما کا سکھ اور روح کا چین تلاش کرتا۔ وقت گزرا، سورج نکلتا اور چھپتا رہا، چاند گھٹتا اور بڑھتا رہا۔ دوالی، بارش آئی، پھول کھلے، پت جھڑ ہوا، چین نے سرد گرم دیکھا، مگر وہ اپنے ارادہ پر ڈٹا اور اپنے خیال پر اڑا رہا۔ آخر پختگی اور پکاپن رنگ لایا اور چین جیسے دیوتا بن گیا ہو۔ آتما کی شکتی اس کے چہرے پر نور بن کر چھلکنے لگی۔ روح کی طاقت نے اس کی آنکھوں میں جلال بھر دیا۔ وہ ہلکا پھلکا تو ایسا ہوگیا کہ پھولوں میں تُل لے اور بھاری بھرکم ایسا کہ اونچے اونچے پہاڑ تھرا جائیں اور کلنک کا ٹیکہ تو ایسا گیا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ جو کہہ دیتا ہو کے رہتا اور جو کرتا تو لوگ حیران ہوجاتے کہ کیسے ہوگیا وہ چپ ہی رہتا، بولتا تو کبھی کبھار اور وہ بھی ایک دو لفظ، اکثر تو وہ اشارے ہی کردیا کرتا اور دیکھنے والے سمجھ لیتے، اس کی کٹیا کے سامنے لوگوں کا ٹھٹ لگا رہتا، کچھ بیمار، کچھ اپاہج، کچھ غرض مند اور کچھ عقیدت مند سب کے سب گھنٹوں کھڑے رہتے۔ صبح سے شام کردیتے چین جب کٹیا سے نکلتا تو وہ آنکھیں بچھاتے، مرادوں کے دامن پسارتے اور امیدوں کے ہاتھ پھیلاتے چین جس کی طرف دیکھ لیتا، دلدّر دور ہوجاتے دنیا سنور جاتی۔ عقبیٰ درست ہوجاتی، مگر سیکڑوں نامرادی لوٹ جاتے اور پھر مقدر آزماتے۔

(باقی آئندہ)

مولانا مدنی

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

یہ ادارہ "نئی بصیرت" کا قائل نہیں۔ موجودہ زمانے کے نت نئے تقاضے جو چار دانگ عالم میں ایک ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہیں اس ادارہ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے، مگر قوم کے نوجوان افراد کی گمراہی اور اسلامی مسائل کا مستقبل کسی تاریک زمانہ کی خبر دے رہا ہے۔ زمانہ حال کا مقابلہ ہم گیارھویں صدی عیسوی کے زمانے سے کرسکتے ہیں۔ وہ زمانہ جبکہ بنی عباس اور ترکی النسل بادشاہوں کے اقتدار نے یونان اور عجم کے بیمار فلسفوں [illegible] دیا تھا اور دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھ آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے۔ "یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ محدثین و فقہا علوم عقلیہ سے ناواقف تھے، اس لئے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقول انداز سے نہ سنبھال سکتے تھے اجتہاد کے چشمے خشک ہوگئے تھے، تقلید کا دور دورہ تھا۔ نئے نئے فرقے پیدا ہوئے اخلاقی انحطاط نے تمام اسلامی دنیا کو چھا لیا۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر قرآن اور سنت کا کوئی اثر نہ رہا۔ بادشاہوں کی عیاشانہ زندگی اور امراء جاگیردار طبقوں کے اسراف نے رعایا کا حال تباہ کردیا غرض عام تباہی کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ یہ حالات تھے جب امام غزالی پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم عقلیہ پر عبور حاصل کیا۔ پھر اسی میدان میں پہنچے جہاں کے لئے تیار ہوئے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی "نظامیہ بغداد" کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ وقت کی سیاسیات میں حصہ لیا، اور دنیاوی اعتبار سے ترقی کے اعلیٰ ترین اوج پر پہنچ گئے۔ مگر گرد و پیش کے حالات اور مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط نے اُن کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا کیا اور آخرش دنیاوی بندشوں کو توڑ کر نکلے اور پھر وہ تجدیدی کام کیا جس کی وجہ سے انھیں "حجۃ الاسلام" کا خطاب ملا۔

ایسے ہی نازک دور سے مسلمان گذر رہا ہے پھر میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وقت کے جاہلی فلسفوں اور بے دینی پھیلانے والے عقائد کے خلاف اعلانیہ جنگ کیوں نہیں کی جاتی، یہی "ادارہ" نئے حالات نئے دور اور اس کے کوائف کے خلاف جنگ کرسکتا ہے اور مسلمانوں کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا وقت کے ہنگاموں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریق کار نکالیں اور دیوبند کے آزاد ادارہ میں کچھ چیدہ افراد کو اپنے طرز خاص پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کریں تاکہ اُن کی یہ کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام کرسکے۔

مولانا کے عقیدت مندوں کو میں نے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے، میرا یقین ہے کہ دو ایک اصحاب ایسے موجود ہیں جو زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں ؎

گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

ہم کدھر جا رہے ہیں

(بہ سلسلہ صفحہ [illegible])

لیکن زبان کا یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب ہم [illegible] لفظوں کو [illegible] کرنے کو تیار ہوں اور [illegible] کے بارے میں کھلے دل سے کام لیں [illegible] تعصب اور تنگ دلی کی نہیں بلکہ رواداری اور فراخ دلی کی ہوگی اور اگر ہم تہذیبی اور اخلاقی ہتھیاروں کو اپنا لیں تو باوجود اکثریت کی قوت کے میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ پانی کا جھاگ دیکھتے دیکھتے غائب ہوجاتا ہے، لیکن جو چیزیں حق اور عوام کے فائدے پر مبنی ہوتی ہیں وہ باقی رہتی ہیں۔

ناشروں سے

براہ کرم مفصل تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجئے

(ایڈیٹر)

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی
ادارۂ تحریر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

اپنا قصور دوسروں کے سر (بسلسلہ صفحہ ۱)

کہا ہے ۔ قیامت ہی آ جاتی ہے ۔ اُسے خود اپنی کمزوریوں سے جو شدید نفرت محسوس ہوتی ہے وہ غیر شعوری طور پر دوسروں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے ۔ اب اس کی زبان کی کٹار سے کسی کو پناہ ملنا مشکل ہے ۔

یہ انتقال قصور نوع انسانی کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ سماج کی نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں انسان اپنے قصور دیوتاؤں کے سر تھوپ دیا کرتا تھا ، پھر ذرا گھما پھرا کر تقدیر کو اور شیطان کو کوسنے لگا ۔ یہاں تک اس نے خدا کو بھی نہیں چھوڑا ۔ ایسی مثالیں کم نہیں کہ مایوسی یا ناکامی کے بعد لوگ خدا سے بیزار یا باغی ہو جاتے ہیں ۔

عقل و دماغ کی پختگی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عمل انتقال کو ترک کر دیں اور اپنی بھلائی اور برائیوں کو اپنے ہی اندر ڈھونڈیں ۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ عمل ہماری نشوونما کا ضروری جز ہے ۔ بلوغ اور پختگی کی ایک سیڑھی ہے یہ مشکل اس وقت ہوتی ہے جب ہم اسی سیڑھی پر رک جائیں اور اوپر کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے انکار کریں ۔

(ماخوذ)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

امن کا امکان کچھ بڑھ ہی گیا

پریسیڈنٹ ٹرومین کا یہ اعلان کہ پچھلے ہفتے میں روس کے اندر ایٹم بم پھٹا ۔ بجائے خود ایک چھوٹا سا ایٹم بم تھا جس نے ساری دنیا میں خصوصاً شمالی امریکا اور مغربی یورپ میں ہل چل ڈال دی ۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ روس کے پاس ایٹم بم موجود ہونے کی خبر دنیا کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے بین الاقوامی سیاست کی صورت حال بالکل بدل جائے گی ۔ لیکن اس تبدیلی کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کے بارے میں دو بالکل متضاد رائیں ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ اب امریکی بلاک اور زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے گا اس کی وجہ سے روسی بلاک میں بھی سلاح بندی کی رفتار بڑھ جائے گی اور تیسری عالم گیر جنگ جس کا چھڑنا یقینی ہے ، اور بھی جلدی چھڑ جائے گی ۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ نہیں جب دونوں فریقوں کو یکساں خطرہ ہوگا کہ ایٹم بم کی لڑائی سے کہیں دوسرے کے ساتھ خود ہمارا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جائے تو پھر دونوں لڑائی کو ٹالنے کی کوشش کریں گے ۔ ایک تیسری درمیانی رائے یہ بھی ہو کہ لڑائی تو جلدی ہی ہوگی مگر اب اس میں ایٹم بم استعمال نہیں ہوگا ۔

اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ان دونوں تینوں رایوں میں سے کون سی صحیح ہے ، ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ آخر پچھلے دنوں لڑائی کی یہ ساری ہماہمی کیوں تھی ؟ یوں تو دو ملکوں کو ایک دوسرے سے جنگ پر اُبھارنے والی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں ، لیکن لڑائی چھڑنے کے قطعی سبب دو ہی ہوسکتے ہیں ، ایک دوسرے کی اغراض میں شدید تصادم یا ایک دوسرے کا شدید خوف ۔ جہاں تک اغراض کا سوال ہے اس وقت امریکہ اور روس میں بلاواسطہ کوئی ٹکر نہیں ہے ۔ روس کو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اپنی معاشی تعمیر نو کی ضرورت ہے اور اس میں امریکہ کسی طرح حائل نہیں ہو سکتا امریکہ اپنے سرمائے کو دنیا میں پھیلا کر افراط زر سے بچنا چاہتا ہے ۔ اس میں روس کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا ۔ اس میں شک نہیں وسطی یورپ ، بلقان ، مشرق وسطیٰ ہند و پاکستان اور مشرق بعید میں دونوں اپنے اپنے حلقۂ اثر کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ حکمت عملی کا مقابلہ طاقت ور قوموں میں ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے محض اس کی وجہ سے ان میں لڑائی نہیں چھڑا کرتی ۔ لڑائی تک نوبت اس وقت پہنچتی ہے جب اس مقابلے کی تہہ میں دونوں فریقوں کی فوری اور شدید اغراض ہوں جو بظاہر اس وقت موجود نہیں ۔ اب خوف کا معاملہ رہ جاتا ہے حقیقت میں پچھلے دنوں لڑائی کے چرچے اور لڑائی کی تیاریوں کا محرک خوف کا جذبہ تھا اور جہاں تک ہم اندازہ کر سکتے ہیں روس میں ایٹم بم تیار ہو جانے سے باہمی خوف کی شدت کم ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ لڑائی کا امکان بھی گھٹ جائے گا ۔

اس باہمی خوف کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ جیسے ہی ایٹم بم کے دو دھماکوں نے ناگاساکی اور ہیروشیما کو تباہ کر کے جاپان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا کہ یہ افواہیں سنائی دینے لگیں کہ امریکہ کے بعض فوجی ماہر اپنی حکومت کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ لگے ہاتھوں روس سے بھی نبٹ لیا جائے اس لئے کہ کبھی نہ ایک دن تو نبٹنا ہی ہوگا ۔ اس کے بعد بار بار امریکہ کے اخباروں میں یہ اندازے چھپنے لگے کہ روس کو ایٹم بم بنانے میں اتنے سال لگ جائیں گے اور اسی کے ساتھ یہ اشارے بھی کہ اس کے بعد روس سے جنگ کرنا مشکل ہو جائے گا ۔ اس وقت بہت آسان ہے ۔ اب چاہے ان حرکتوں کا مقصد واقعی امریکی حکومت کو فوری لڑائی پر آمادہ کرنا ہو یا محض روس کو دھمکانا تاکہ وہ بعد جنگ مسائل کی بحث میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے دبا رہے ۔ بہر حال روس میں اس کی وجہ سے خوف کی لہر دوڑ گئی اور اس نے تعمیر نو کے بہت سے ضروری کاموں کو ملتوی کر کے اپنی جنگی مشین کو اور زیادہ طاقت ور بنانے کے لئے پورا زور لگا دیا ۔ روس کی تیاریوں کی خبریں بڑھا چڑھا کر امریکہ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں شائع ہونے لگیں جس سے وہاں بھی خوف کا جذبہ ابھرا ۔ اور جنگ سے پسی ہوئی مخلوق مکھن کی جگہ توپوں کا مطالبہ کرنے لگی ۔ جنگی بجٹ بڑھنے لگے ۔ ایٹم بم کے دھماکوں کے مظاہرے ہونے لگے ، آپس میں فوجی مشورے اور معاہدے کئے جانے لگے ۔

اس سے روس اور خوف زدہ ہوا اس نے اپنی تیاریوں کی رفتار اور بڑھا دی اور جیسا کہ خوف میں اکثر ہوتا ہے دھمکی کا جواب دھمکی سے دینے لگا ، غرض جنگ کی تیاریوں اور دھمکیوں کا ایک چکر بندھ گیا جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا ۔

لیکن اب جب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ روس نے بھی ایٹم بم بنا لیا امریکہ میں ان لوگوں کو جو اس مسئلے میں روس کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر جنگ کہ لڑائی جلدی سے جلدی چھڑ جائے ۔ اتنی زیادہ عجلت نہیں رہے گی ۔ بعض فتنہ انگیز یہ کہہ رہے ہیں کہ ابھی روس ایٹمی اسلحہ کے مکتب میں مبتدی ہے ۔ اس نے جو بم بنایا ہو وہ زیادہ سے زیادہ ہیروشیما کے بم کے برابر طاقت رکھتا ہوگا مگر امریکہ اس سے کہیں زیادہ زوردار بم بنا چکا ہے ۔ پھر اس کے پاس بموں کی جتنی تعداد ہے روس کے پاس اس کا دسواں حصہ بھی نہ ہوگا ۔ اس کے علاوہ امریکہ کے پاس مہلک جراثیم کا ہتھیار ہے جو روس کے پاس نہیں ہے ان سب میں یہ اشارہ موجود ہے کہ کچھ ایسی دیر نہیں ہوئی ہے اگر فوراً لڑائی چھیڑ دی جائے تو امریکہ فائدے میں رہے گا ۔ لیکن بہتوں کے دلوں میں اب شبہ پیدا ہو گیا ہے کیا معلوم شاید موسیو مولوٹوف کا یہ دعوے صحیح ہو کہ روس نے ۱۹۴۷ء ہی میں ایٹم بم بنا لیا تھا ؟ شاید اس کے پاس بھی اچھی خاصی تعداد میں بم تیار ہوں ؟ شاید اس نے بھی مہلک جراثیم چھپا کر رکھے ہوں ؟ اور یہ سب نہ سہی ۔ اگر روس کے پاس کم سے کم ہیروشیما ٹائپ کے دو چار بم بھی ہوں تو امریکہ کے چند بڑے شہروں یا چند ریاستوں یا مغربی یورپ کے ایک حصے یا انگلستان کے بہت بڑے حصے کو تو تباہ کر ہی سکتا ہے ۔ جس بجلی کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر گرے گی وہ ساری دنیا کو چوکنا رکھنے کے لئے کافی ہے ۔

اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ خود امریکہ میں جنگ کے اکثر حامیوں کا جن کا جوش شجاعت ایٹم بم کے یکطرفہ استعمال پر منحصر تھا ، ارادہ ڈانواں ڈول ہو جائے گا ۔ سہمے برطانیہ اور مغربی یورپ کے ملک وہ تو اب لڑائی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھیں گے ۔ روس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے اس پر وہ خود اعتمادی جو ایٹم بم کی دریافت کے بعد اس کے اندر پیدا ہوگی ہے اچھا اثر ڈالے گی ۔ ممکن ہے حکمت عملی کے میدان میں اس کی نازک مزاجی اور بڑھ جائے لیکن اب اُسے لڑائی کی دھمکیوں کی جن سے وہ اپنے خوف کو چھپانے کے لئے کام لیا کرتا تھا ، ضرورت نہیں رہے گی ۔

صورت حال کا صحیح اندازہ آئندہ دو تین مہینے کے اندر ہوگا جو اس وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ روس میں ایٹم بم بن جانے سے دنیا میں امن قائم ہونے کا امکان کم نہیں ہوا بلکہ کچھ بڑھ ہی گیا ۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے قائم ہونے کا اعلان جو آپ اس پرچے میں پڑھیں گے اردو کے شیدائیوں کے لئے برسوں بعد اُمید کی پہلی نوید ہے جو سنائی دی ہے ۔ روشنی کی پہلی کرن ہے جو نظر آئی ہے اردو کی محبت کا دعوےٰ کرنے والوں کے لئے امتحان کا وقت آ گیا ہے ۔ زبان کے تحفظ اور ترقی کی راہ میں آہ و بکا ، نالہ و فریاد

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

دنیا کی رفتار

ہندوستان

روپے کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں کم ہو جانے کا اثر اب تک صرف امریکی چیزوں پر پڑا ہے خصوصاً امریکہ سے آنے والی دواؤں پر سونے کی قیمت بھی کچھ خفیف سی بڑھی ہے۔ لیکن پاکستانی روپے کے مقابلے میں ہندوستانی روپے کی قیمت چوالیس فی صدی کم ہو جانے کی وجہ سے دونوں ملکوں میں روپے کی آمد و رفت اور تجارتی کاروبار عارضی طور پر بند ہو گیا ہے اور آثار کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ جب تک پاکستان اپنے روپے کی قیمت یا اپنے مال کی قیمت میں کافی کمی نہیں کرے گا قریب قریب بند ہی رہے گا۔ امریکہ اور انگلستان کے مالی حلقوں کا خیال عام طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اپنے روپے کی موجودہ قیمت کو زیادہ دن قائم نہیں رکھ سکتا اسے بہت جلد اس کی قیمت گھٹانی پڑے گی۔ پاکستان اسٹیٹ بنک کے گورنر زاہد حسین صاحب نے بڑی شدومد سے کہا ہے کہ پاکستانی روپے کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ لیکن سر اسٹیفرڈ کرپس کی بدولت اس قسم کے بیانات کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

وزیر اعظم جواہر لال نہرو مشرقی پنجاب اور کشمیر کے دورے کے بعد دہلی واپس آگئے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں انھوں نے دو باتوں کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی۔ ایک تو عام لوگوں کی اس غلط فہمی کو جو پاکستانی اخباروں کے بیانات سے پیدا ہو گئی تھی دور کیا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑنے والی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ پر امن طریقے پر کرنا چاہتا ہے دوسرے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے دونوں جتھوں کو سمجھایا کہ آپس کے اختلاف دور کر کے ایک متحد جماعت کے طور پر کام کریں۔ کشمیر میں پنڈت نہرو کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا اور پچھلے چند سال میں تیسری بار سری نگر میں ان کا دریائی جلوس دھوم دھام سے نکلا جسے دیکھنے کے لئے قریب قریب سارا شہر جو دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر بسا ہوا ہے اُمڈ آیا۔ پنڈت جی نے نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو ۲۷ ستمبر سے سری نگر میں ہو رہا ہے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کی حکومت قبائلیوں کے حملے سے پہلے اعلان کر چکی ہے کہ کشمیر کے لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں گے اور وہ اپنی اس بات پر قائم ہے لیکن اس کا یہ وعدہ اہل کشمیر سے ہے۔ پاکستان یا دنیا کے کسی اور ملک سے نہیں اس لئے وہ صرف اہل کشمیر کے سامنے جواب دہ ہے۔

نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبد اللہ صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں صلح کا معاہدہ جس کی پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر ایٹلی کو بڑی فکر ہے انھیں شرطوں پر ہونا چاہئے جن میں کشمیر کے ساتھ پورا انصاف اور اس کی خواہشوں کا پورا احترام کیا جائے۔ ان شرطوں کا تعین کوئی بیرونی ثالث نہیں بلکہ اہل کشمیر کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جو جموں اور کشمیر کے دو سو نمائندوں اور ہزاروں مہمانوں پر مشتمل تھا دو رزولیوشن پاس ہوئے، ایک میں ہندوستانی فوج کی شجاعت و بسالت کی تعریف کی گئی اور دوسرے میں صوبہ سرحد کے لوگوں سے جو شہری آزادی اور جمہوری حقوق کے لئے اپنی حکومت سے آئینی جنگ کر رہے ہیں ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اس اجلاس کا خاص رزولیوشن جس میں ہندوستان کی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ یو، این، او سے اپنا مقدمہ واپس لے لے اور جموں اور کشمیر کے بقیہ حصے کو بھی دشمن سے آزاد کرائے سبجکٹس کمیٹی میں پاس ہو چکا ہے اور عام اجلاس میں پیش ہونے والا ہے۔

کشمیر کمیشن اپنی صلح کی کوششوں میں ناکام ہو کر یورپ واپس چلا گیا ہے۔ اس کے ممبر کچھ دن کے بعد جنیوا میں جمع ہو کر اپنی رپورٹ کو مکمل کریں گے اور پھر اسے لیک سکسس میں سکیورٹی کونسل کے سامنے پیش کریں گے۔ شاید اکتوبر کے آخر تک اس کونسل میں کشمیر کے معاملے پر غور کیا جائے۔ اس عرصے میں کمیشن کے فوجی مشیر بدستور کشمیر میں رہیں گے تاکہ اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں اپنی اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں کشمیر میں جنگی کارروائی کو رکوا دینا کشمیر کمیشن کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کم سے کم اس کو ضائع نہ ہونے دے۔ اس بات کی قوی امید ہے کہ ۴ چاہے ہند و پاکستان کے سیاسی تعلقات آئندہ چند مہینے میں کتنے ہی کشیدہ کیوں نہ رہیں مگر کشمیر میں جنگی کارروائی شروع نہیں ہوگی۔

باہر کی دنیا

اسٹرلنگ کی قیمت گر جانے سے یورپ اور امریکہ کے معاشی حلقوں میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی وہ سنبھلنے نہ پائی تھی کہ **پریسیڈنٹ ٹرومین نے روس میں ایٹم بم کے دھماکے کی خبر** سنائی جس سے پھر ایک ہل چل مچ گئی۔ امریکی حکومت اور دوسری اتحادی حکومتوں نے ابھی سرکاری طور پر اپنا رد عمل ظاہر نہیں کیا ہے مگر اخباروں میں اس قسم کی خبریں آرہی ہیں کہ برطانیہ بڑے پیمانے پر ایٹم بم بنانا شروع کر دے گا اور اس نے پرتگال سے کسی زبردست ہتھیار کے خریدنے کے بارے میں خفیہ معاہدہ کیا ہے۔ سب سے معقول رویہ اس بحران کی حالت میں روس کے نائب موسیو وشنسکی کا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ روس میں ایٹم بم ملنا کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ تو سنہ ۴۷ء سے بن رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں روسی حکومت اس بات پر راضی ہے بلکہ مصر ہے کہ بین الاقوامی قانون کے ذریعے سے ایٹمی قوت کے استعمال کی نگرانی کی جائے، اور ایٹم بم کے استعمال پر پابندی عائد کی جائے۔ ہندوستان کے نمائندے سر بی، این راؤ یو، این، او میں یہ تجویز پیش کرنے والے ہیں کہ ایٹمی قوت کے کنٹرول کا معاملہ پولیٹیکل کمیٹی سے نکال کر بین الاقوامی لا کمیشن کے سپرد کیا جائے جو سیاست دانوں پر نہیں بلکہ قانون دانوں اور ججوں پر مشتمل ہے۔

مغربی جرمنی میں ڈاکٹر آڈنے ناور کی حکومت نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور اس کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مشرقی جرمنی سے جو روس کے قبضے میں ہے تجارتی معاہدہ کر لیا ہے۔

ہیگ میں گول میز کانفرنس کے کام میں کچھ رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ انڈونیشیا میں بعض حلقے اس گفت و شنید سے جو اب تک ہو چکی ہے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ نیشنل مسلم پارٹی کے نمائندے ڈاکٹر سکیمان ہیگ سے واپس بلا لئے گئے ہیں تاکہ اپنی پارٹی کو ساری کارروائی جو اب تک ہو چکی ہے سمجھائیں۔ انڈونیشی ڈیلیگیشن کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر سکیمان سے جو شروع سے یونین کی تجویز کے مخالف تھے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو صحیح صورت حال سمجھا سکیں، دراصل اس کام کے لئے ڈاکٹر محمد حتےّ کو خود جانا چاہئے تھا، لیکن اگر وہ جاتے تو کانفرنس کا کام بالکل ہی رک جاتا۔ ڈچ اس فکر میں ہیں کہ اگر انڈونیشیوں میں پھوٹ پڑ جائے تو اس سے فائدہ اٹھائیں، لیکن بٹاویا میں انڈونیشی لیڈروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈاکٹر سکیمان کے واپس آنے سے گول میز کانفرنس کی کامیابی کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی پارٹی کو یونین کی اسکیم پر بعض اعتراضات ہیں وہ ان سے صحیح صورت حال معلوم کر کے ان کو نئی ہدایات دے گی۔

چین میں نیشنلسٹ حکومت کی طرف سے کمیونسٹوں کے حملے کی مزاحمت اور تیز اور سخت ہو گئی۔ ہونان اور کوانگ تنگ کے صوبوں میں اس وقت کمیونسٹوں کی پیش قدمی رکی ہوئی ہے۔ اس کی دو وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اب نیشنلسٹ ایک چھوٹے سے محاذ پر اپنی ساری قوت کو جمع کر کے لڑ رہے ہیں۔ دوسرے جنرل لن کو جو کینٹن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ فکر ہے کہ پہلے دو لاکھ نیشنلسٹ فوج کو جو اب تک ان کے عقب میں موجود ہے صاف کر لیں تب آگے بڑھیں اور شاید وہ اچھے موسم کا انتظار کر رہے ہیں جو دو مہینے بعد شروع ہونے والا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں کمیونسٹوں کی پیش قدمی رک جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کمیونسٹ مفتوحہ علاقے میں اپنی قوت کو مضبوط کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے میں مصروف ہیں۔ خیال ہے کہ ۱۰ اکتوبر کو کمیونسٹ چین میں نئی حکومت کے قائم ہونے کا اعلان کر دیں گے جس کے صدر ماؤزے تنگ ہوں گے اور صدر کے چار نائبوں میں سے ایک مادام سن یات سین بھی ہوں گی۔ سنا گیا ہے کہ برطانیہ چین کی نئی حکومت کو جلد سے جلد تسلیم کرنے کے مسئلے پر

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

بزمِ بے تکلّف

"بم بم، بم! شانتی، شانتی، شانتی!"

"ارے ہے کیا ہوا؟ میں جانوں کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ کلمہ پڑھو کلمہ۔"

"خواب تو دیکھ رہا ہوں مگر بھیانک نہیں، ایسا شیریں جیسے تمہارے لبِ نازک ——————"

"بس رہنے دو۔ مجھے یہ چوچلے نہیں بھاتے۔"

"—————— جیسے تمہارے لبِ نازک۔ تمباکو کھانے سے پہلے۔"

"اپ موئے بیچ میں بات نہ ٹالو۔ یہ شانتی کون چڑیل ہے جس کی پکار ہو رہی تھی۔"

"توبہ کرو توبہ! وہ دیویوں کی دیوی ہے، روح کی راحت، دل کا چین، آنکھوں کا نور ——"

"ارے تو وہ نورچشمی ہیں، کون، کچھ معلوم تو ہو۔"

"—— جن کے لئے انسان کا دل درد سے تڑپ رہا تھا ——"

"اور شیطان کی پسلی شرارت سے پھڑک رہی تھی۔ دیکھو مجھے جلانے کی کوشش نہ کرو۔ سچ سچ بتا دو کہ یہ نیک بخت کون ہیں جن کے لئے اس طرح پھڑک رہے تھے۔"

"ارے تم کیا سمجھ رہی ہو! وہ امن کی دیوی ہے۔ جس کے بغیر دنیا ڈر سے لرز رہی تھی کہ کہیں ایٹم بم کے ایک دھماکے میں

آ ہے دھنیا رے دنجا رے دو ڈھانے

کا معاملہ نہ ہو جائے۔"

"دنیا کو تو میں جانتی نہیں، ہاں تم ضرور از غیبی گولے کے ڈر سے بھول لئے چلے جاتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر وہ شانتی دیوی خواب میں کیا کہہ گئیں؟"

"اس نے کہا ——— خوش ہو جا میرے بھگت، روس نے ایٹم بم بنا لیا۔ بس اب میں آ گئی ہوں۔"

"لو اور سنو! میں کہتی ہوں تمہاری عقل سچ مچ بھگت ہو گئی ہے۔ جب دونوں طرف وہ موا ایٹم بم بن گیا تو امن کی امید اور گھٹ گئی یا بڑھ گئی؟"

"بڑھ گئی بیگم، تمہاری زلفِ دراز کی قسم بڑھ گئی۔ یہی تو مزے کی بات ہے فریق الف کے پاس ہتھیار ہو، اور فریق ب نہتا ہو تو الف بات بات پر میان سے باہر ہو جاتا ہے، مگر جب دونوں مسلح ہوں تو پھر ذرا سمجھ بوجھ کر لڑائی کا نام لیتے ہیں۔ تم اس کو یوں دیکھو، جیسے تمہارے پاس تیرِ نظر ہے اور ہم بچارے نہتے ہیں تو تمہارا دل یہی کہے گا نا

تیر پر تیر چلاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے

لیکن جب آئینہ سامنے ہو اور دوسری طرف بھی تیر انداز کمان میں تیر جوڑے بیس کھڑا ہو تو تمہارے تیور لڑائی کے ہوں گے یا صلح کے؟"

"باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھ لے۔ مگر تم کچھ بھی کہو ہمیں تو یہ الٹی بات معلوم ہوتی ہے کہ روس نے ایٹم بم بنا لیا اس سے لڑائی رک جائے گی۔"

"کیا کیا جائے بیگم، اس الٹے زمانے میں ہر چیز الٹی ہی ہے۔۔

ع - ہم الٹے بات الٹی، یار الٹا

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ہے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے آپ کو تصنیف و تالیف، اشاعت و تبلیغ، درس و تدریس میں کھپا دیں۔ انجمن کو ان سب کاموں کا مرکز بنایا جا سکتا ہے اور بنانا چاہیئے۔

غزل

مرزا احسان احمدؔ

اُن کی چشمِ عتاب کا عالم
کرمِ بے حساب کا عالم

روح کے انبساط کی معراج
شوقِ ناکامیاب کا عالم

ذرّے ذرّے میں دیکھتا ہوں میں
حسن کے اضطراب کا عالم

لذّتِ جستجو کہاں ملتی
خوب ہے یہ حجاب کا عالم

اک سراپا تبسمِ غم ناک
میری چشمِ پُر آب کا عالم

فطرتِ عشق کو سکون کہاں
ہر نفس انقلاب کا عالم

ایسے عالم ہیں سینکڑوں مجھ میں
کیا مہ و آفتاب کا عالم

پوچھ ہم بوریا نشینوں سے
نگہِ باریاب کا عالم

اِلتفاتِ نظر

خیال مینائی

حسن دلکش کی چارہ فرمائی
عشق نے زندگیِ نو پائی

اُن کے ہونٹوں پہ جب ہنسی آئی
برق سی اک فضا میں لہرائی

دلِ بے کس کو تم نے لوٹ لیا
اب کہاں طاقتِ شکیبائی

موسمِ گل کے یہ حسیں جلوے
ذرّے ذرّے نے زندگی پائی

مسکرا اٹھے غنچے گلشن میں
اُن کے لب پر جہاں ہنسی آئی

اللہ اللہ یہ جذبِ دل کا اثر
پھر سرِ طور برق لہرائی

چاند روپوش بدلیوں میں ہوا
جب ترے رخ پہ زلف لہرائی

یہ گلوں کا شباب ارے توبہ
حسن کی جیسے شوخ انگڑائی

نگہِ ناز کی عنایت ہے
کتنی پُرکیف زندگی پائی

وہ فضائے لطیف وہ عالم
حسنِ معصوم کی وہ انگڑائی

کہیں چھپتا ہے التفاتِ نظر
دیکھئے لب پہ وہ ہنسی آئی

تڑپ اٹھا دلِ فراق نصیب
اے خیالؔ اُن کی یاد جب آئی

ہندوستان کے قدیم باشندے

مشمی

سید سخی حسن نقوی

ہندوستان کو لوگ قوموں کا عجائب خانہ کہتے ہیں۔ جس طرح عجائب خانہ میں رنگ برنگ کی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے دیس میں رنگ برنگ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کو ملک میں ادھر اُدھر گھومنے کا موقع ملے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہاں کتنی قومیں آباد ہیں، اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ کیا ہے۔ اگر کوئی گورا ہے، تو کوئی کالا کسی کی ناک لمبی ہے، تو کسی کی چپٹی کسی کی موٹی، کوئی ہندوستانی بول رہا ہے، کوئی بنگالی، کوئی پنجابی؛ غرض جدھر جائیں ادھر نیا رنگ۔ زبان سنیے وہ علیحدہ رہنے سہنے کا طریقہ دیکھئے وہ جُدا۔ رسم و رواج پر نظر کیجئے وہ مختلف اور بدلے ہوئے۔

گھومتے گھامتے جب آپ دریائے برہمپتر کو پار کرکے شمالی آسام کے پہاڑوں میں پہنچیں گے تو آپ کو مشمی قوم کے لوگ ملیں گے۔

مشمی قوم کے لوگوں کے متعلق ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کب آئے اور ملک کے کس حصے میں آباد ہوگئے، لیکن اس میں شک نہیں کہ مشمی ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی ایک بڑی تعداد شمال کی طرف سے ملک میں داخل ہوئی اور ایک جنوب کی طرف سے آئی اور آسام کے پہاڑوں میں رہنے لگی۔

مشمیوں کے رہنے سہنے کا طریقہ، ان کے رسم و رواج اور ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑی لوگ بڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ مشمی بھی پہاڑی ہیں، اس لئے مشمی بڑے مضبوط، جفاکش اور تندرست ہوتے ہیں۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے مشمی بھی دیگر قوموں سے شکل و صورت میں مختلف ہیں۔ ان کا سینہ چوڑا، سر گول، ناک چپٹی اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ رنگ عام طور سے اجلا بلکہ اکثر سرخ ہوتا ہے اور سر کے بال سیدھے کھڑے ہوتے ہیں، ماتھے پر بالوں کو وہ چرکھوٹا کٹواتے ہیں، اور کھوپڑی پر چٹلا باندھے ہیں رہتے ہیں۔

ان کے مذہبی عقائد بھی بڑے دلچسپ ہیں مشمی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تمام دنیا ایک باپ اور ماں کی اولاد ہے، جن کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے دو بیٹیوں کی اولاد میں مشمی ہیں۔ سورج اور چاند کے متعلق ان کا عقیدہ بہت عجیب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سورج اور چاند میاں بیوی تھے۔ سورج میاں اور چاند بیوی۔ کچھ عرصے بعد ان میاں بیویوں میں لڑائی ہوگئی اور بیوی چاند نے میاں سورج سے کہا کہ اپنی روشنی اور چمک میں تھوڑا حصہ مجھے بھی دو۔ میاں سورج نے کہا۔ بیوی اگر میں گرمی تمھیں دے دوں گا تو اپنے بچوں کے یعنی انسانوں کے لئے کیا رکھوں گا۔ پھر سورج نے غصے میں اپنی بیوی کو ایک تالاب میں یا دلدل میں پھینک دیا۔ بیوی چاند جب تالاب سے باہر نکلیں تو ان کے چہرہ پر کیچڑ کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ چاند کے چہرے پر آج تک جو داغ نظر آتے ہیں انھیں دھبوں کا نتیجہ ہیں اس لئے چاند بے چارہ سورج سے ڈرتا ہے۔ اور آسمان میں اس وقت آنے کی جرأت کرتا ہے جب سورج ڈوب کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اس سے ہم اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کے مذہبی عقائد میں لڑائی جھگڑے کو کس قدر دخل ہے۔

اُن کے رسم و رواج میں بھی عجیب خصوصیات ہیں مشمی لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں دوسری قوم کے لوگوں سے شادیاں نہیں کرتے۔ ایک آدمی ایک وقت میں کئی کئی بیویاں رکھ سکتا ہے، غریبوں کو تو بھلا ایک سے زیادہ شادی کرنے کا موقع کہاں ملتا ہوگا۔ البتہ مالدار لوگ کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں ایک عجیب دستور یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد تمام بیویاں سب سے بڑے لڑکے کو مل جاتی ہیں سوائے اس بیوی کے جو اس کی ماں ہوتی ہے۔ وہ بیوی اس چھوٹے لڑکے کو مل جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں۔ قبر کی گہرائی تین فٹ تک ہوتی ہے ان کے قبرستان عام طور سے آبادی کے نزدیک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مردوں کو خوب کپڑے پہنا کر اور ہتھیار لگا کر دفن کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ قبر میں روپیہ پیسہ، کھانا، برتن، وغیرہ بھی رکھ دیتے ہیں، پھر قبر کو تختوں سے ڈھک دیتے ہیں۔ اس کے بعد اوپر پتھر چن دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین کے نیچے ہر مردے کو گھر ملتا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ قبر میں کھانے وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ مشمیوں کے تمام خاندان اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں، لیکن دو خاندان ڈگارو اور میجو پانچ دن کے بعد مردے کو اکھاڑ کر جلا دیتے ہیں۔

مشمی لوگوں کے پاس گانے بجانے کے سامان میں ڈھول کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ان کا

> ......مشمی بڑے مضبوط، جفاکش اور تندرست ہوتے ہیں......
> ان کا سینہ چوڑا، سر گول، ناک چپٹی اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ رنگ عام طور سے اجلا بلکہ اکثر سرخ ہوتا ہے اور سر کے بال سیدھے کھڑے ہوتے ہیں، ماتھے پر بالوں کو وہ چرکھوٹا کٹواتے ہیں۔ اور کھوپڑی پر چٹلا باندھے رہتے ہیں...

ڈھول چھپکلی کی کھال سے منڈھا جاتا ہے۔ ہتھیاروں میں ہتھیار تیر کمان ہے۔ لیکن یہ لوگ تیروں کو زہر میں بجھائے رکھتے ہیں۔ بعض مشمی سر پر بید کا بنا ہوا خود پہنتے ہیں۔ مشمی لوگوں کے طاقت ور ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن یہ اپنی تمام طاقت آپس میں لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جان لینا اُن کے نزدیک کوئی شکل بات نہیں ہے۔ اگر ایک خاندان کا آدمی کسی دوسرے خاندان کے آدمی کو مار ڈالتا ہے تو پشتوں تک یہ دشمنی باقی رہتی ہے۔ اور برسوں تک بدلہ لینے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اپنا سردار یہ اسی کو بناتے ہیں، جو کھاتا پیتا آدمی ہوتا ہے اور سرداری نسلاً بعد نسلاً چلتی ہے۔ یہی ان کا حاکم ہوتا ہے اور ان کے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے لیکن سردار کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ جب کوئی قتل ہوتا ہے تو قاتل کو اپنے ہاتھ سے سزا دیتے ہیں یا تو بدلہ لیتے ہیں یا قاتل کے خاندان کے کسی آدمی کو قید کرلیتے ہیں۔

یہ لوگ آپس میں تو ضرور لڑتے رہتے ہیں لیکن دوسری قوم کے لوگوں سے بڑی اچھی طرح پیش آتے ہیں اور اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کرتے ہیں اس کے باوجود تہذیب کے لحاظ سے یہ لوگ ہندوستان کی دیگر اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن تہذیب کے اثرات کو پہاڑ اور دریا نہیں روک سکتے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ تہذیب سیکھتے جا رہے ہیں اور جوں جوں تہذیب یافتہ لوگوں سے ان کا میل جول بڑھتا جا رہا ہے وہ زیادہ مہذب اور متمدن ہوتے جا رہے ہیں اور وہ دن کچھ دور نہیں جب مشمی قوم کے لوگ ہندوستان کی دوسری قوموں کے دوش بدوش چل رہے ہوں گے۔

مختصر تبصرے

دو کتابیں

سید احتشام حسین

۱- **اور انسان مر گیا**۔ از راما نند ساگر۔ ناشر:- نو ہند پبلشرز لمیٹڈ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳۔ قیمت للعہ
۲- **عرفانِ اقبال**۔ از بشیر مخفی القادری۔ ناشر:- کتاب منزل کشمیری بازار لاہور ۔۔۔۔ ے تھے ر

۱- راما نند ساگر کے دو مجموعے میرے علم میں شائع ہو چکے ہیں۔ "اور انسان مر گیا" ان کا پہلا ناول ہے جس میں پنجاب کے گزشتہ فرقہ وارانہ فسادات کا آنکھوں دیکھا حال ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں خواجہ احمد عباس کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس نے ناول سے زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اس مقدمے پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ اس جگہ اس کا ذکر کرنا ناول سے دور کر دے گا۔ اس لئے اس مقدمے کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں ہندوستان کی سیاست، آزادی، فسادات، فطرتِ انسانی کے متعلق جو رائیں دی گئی ہیں، ان سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اسے پڑھ کر احمد عباس کو "بدنیت" نہیں کہا جا سکتا۔ دیباچے کے بعد راما نند ساگر نے "عذرِ گناہ" کے عنوان سے ایک طویل سوانحی مضمون لکھا ہے جس کے مطالعے سے ان کے نقطۂ نظر اور تصورِ حیات کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور اصل قصہ پڑھتے ہوئے جگہ جگہ ساگر خود ناول کے ہیرو آنند کی جگہ لیتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات بہت سے لوگوں کی نظروں میں ادب کا موضوع ہی نہیں ہیں۔ بعض حضرات اسے صرف طنزیہ چٹکلہ بازی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض کے لئے یہ ایک جذباتی اور رومانی موضوع ہے جس سے دلکش افسانے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فسادات کے متعلق لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا تعلق بہت جلد جذبات سے ہو جاتا ہے اور لکھنے والوں کی نگاہ سطح ہی پر الجھ کر رہ جاتی ہے۔ ان محرکات تک نہیں جاتی جنھوں نے انسانوں سے ان کی انسانیت چھین لی۔ راما نند ساگر کا ناول بھی جذباتی، مثالی اور رقت پسندانہ انداز رکھتا ہے۔ اس کا ہیرو آنند ایک شاعرانہ مزاج کا تخیل پرست انسان ہے جو اس سارے طوفان میں محض چند خیالات کے سہارے اہم کردار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اخلاقی احساس و تصور کی قوت سے جسے وہ عمل کے ان مواقع پر بھی استعمال کرنا چاہتا ہے، جہاں محض خیال آرائی سے کام نہیں چل سکتا۔ مگر پھر بھی راما نند ساگر نے نہ جانے اس میں کیا دیکھا ہے کہ اسے اہم بناتے چلے گئے ہیں مثلاً نانا کی نظر میں وہ گاندھی جی سے کسی طرح کم نہیں، نرملا اٹھتے بیٹھتے اسے دیوتا کہتی ہے، اور کشن چندر مرتے مرتے اس کی خدمت اور حفاظت کی وصیت کر جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ بھی ختم ہو گیا تو انسانیت ختم ہو جائے گی۔ آنند اس قدر اہم کیسے بن جاتا ہے۔ یہ بات ناول سے سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ایک کچے جذبات کا انسان ہے جسے لاشوں لاشوں اور جلتے ہوئے مکانوں میں اپنی محبوبہ کا خیال آتا ہے اور جو ہر قدم پر مایوسی کا شکار ہو کر متضاد باتیں کرتا ہے۔ چونکہ پوری کہانی میں آنند ہی کو مرکزی جگہ حاصل ہے اس لئے وہی نظریاتی الجھن اور جذباتیت پوری کہانی پر غالب آ گئی ہے۔

راما نند ساگر نے عذرِ گناہ میں، مولانا، اوشا، آنند وغیرہ کے کرداروں کے حقیقی ہونے کی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں انسان دوستی کے جذبات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ساگر نے تمام باتیں ہمدردی کے جذبے سے معمور ہو کر لکھی ہیں لیکن یہ کردار انسانیت کے ان بھرپور تقاضوں کے ترجمان نہیں بنتے جن کے لئے فن کار محنت کرتا ہے۔ ان فسادات کے اسباب کیا تھے، ان کی تہ میں کون سے معاشی، سیاسی، نفسیاتی جذبے کام کر رہے تھے، ان میں کن قدروں کی زندگی خطرے میں تھی۔ کن عناصر نے شر کی طاقتوں کو ہوا دی، کن طاقتوں نے اس آگ کو بجھایا؟ جب تک نگاہ یہاں تک نہ پہنچے کردار کمزور اور بے روح ہوں گے۔ جہاں تک اول الذکر باتوں کا تعلق ہے ساگر کے یہاں ان کی جھلک مل جاتی ہے۔ لیکن مایوسی، خیال آرائی، بے دلی کے گہرے اثرات میں روشنی کی کرن کہیں نظر نہیں آتی اور خاتمے تک پہنچتے پہنچتے اس مایوسی کا منطقی نتیجہ آنند کے پاگل پن میں نظر آ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ساگر نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور آگ اور خون کے جس کھیل سے وہ خود گذرے وہ بہت ہمت شکن تھا۔ لیکن ایک ذمہ دار فن کار کی حیثیت سے ان کا انھیں حالات میں الجھ کر رہ جانا حقیقت نگاری کا ایک غلط تصور معلوم ہوتا ہے۔

راما نند ساگر کی یہ تخلیق زندگی کی جدوجہد میں نہ تو کوئی سہارا دیتی ہے اور نہ کسی سہارے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں انسان دوستی کے جذبات کی فراوانی ہے۔ لیکن اُن کے پیچھے کوئی نظریاتی طاقت نہیں ہے۔ ناول کا انداز بیان دل کش اور پر اثر ہے۔ لیکن اس کا یہ اثر ہونا ہی پڑھنے والے کو بھی غلط راہ پر ڈال سکتا ہے۔ کہانی کہنے کی جو صلاحیت ساگر میں ہے اس سے منفی کیفیات کے اظہار کے بجائے مثبت کیفیات کی ترجمانی کے کام لینا چاہئے تھا اور تھوڑے سے ضبط اور تھوڑے سے غور و فکر سے یہ ناول رجعت پرستی فرقہ واریت اور مایوسی کے خلاف ایک اچھا حربہ بن سکتا تھا۔ اس حالت میں تو ایک غیر تنقیدی نظر رکھنے والا قاری انسانیت اور انسانوں کے مستقبل ہی سے مایوس ہو جائے گا۔

۲- **عرفانِ اقبال**:- یہ کتاب اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے ذرا ایک الگ انداز رکھتی ہے، کیونکہ اس میں بشیر مخفی القادری نے یادداشت اور ذاتی معلومات کی روشنی میں اقبال کی صوفیانہ حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں تبرکاتِ مغموم کے نام سے سیٹھ محمد اسماعیل میمن مدراسی کی ایک نظم ہے جو انھوں نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کے ورودِ مدراس کے زمانے میں لکھی۔ یہ ایک معتقدانہ مدح کی شکل میں ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد "التماس" کے نام سے ایک طویل مضمون ہے جس میں اقبال کے تصوف کو سلسلہ قادریہ کے صوفیانہ معتقدات اور مسلک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بشیر مخفی کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے اور ان کا خیال ہے (جس کے لئے انھوں نے بہت سے حوالے دئے ہیں اور بہت سی تصوف کی کتابوں سے اقتباسات پیش کر کے ثابت بھی کیا ہے) کہ اقبال سلسلۂ قادریہ سے متاثر تھے۔ اس کے بعد کے مضمون "افشائے راز" میں بھی اقبال کے تصوف کی بحث ہے اور ان کے تصوف کو خالص اسلامی تصوف بتایا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں عجمیت، خودی اور تصورِ امامت وغیرہ کے متعلق دلچسپ مگر غیر واضح بحثیں بھی ملتی ہیں۔ آخری مضمون "افاداتِ نیازی" ہے جس میں کلامِ اقبال کی دینی اور فقہی حیثیت کے متعلق دلچسپ بحث آ گئی ہے۔

اس طرح ان تینوں مضامین میں اقبال کے صوفیانہ خیالات کے ماخذ کے متعلق کافی معلومات اکٹھا ہو جاتی ہے اگرچہ اس میں زیادہ تر قیاسی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے تصوفِ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن ان کی تنقیدی نظر نے انھیں اس میں سے کتنا قبول کرنے اور کتنا رد کر دینے پر مائل کیا تھا، یہ ایک گہری نظر اور زبردست مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال ایک طرف تو صوفیوں کی بے عملی خانقاہیت، رہبانیت اور کشاکشِ حیات سے دوری کو غلط اور غیر اسلامی ظاہر کرتے ہیں دوسری طرف بعض صوفیوں سے گہری وابستگی اور اثر پذیری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی روشنی میں اسلامی نقطۂ نظر سے تصوف مختلف مسالک میں سے بعض مسالک محلِ نظر معلوم ہونے لگتے ہیں اور اقبال خود ایک طرح کے تصوفِ جدید کے بانی بن جاتے ہیں جس کی روح رومی کے شعلۂ تخیل سے غذا پاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

چولے

سیّد سفارش حسین

(۳)

زمین گھومتی رہی، چاند، سورج چکر کھاتے رہے، راتیں بٹتی ہوئیں، پھر دن بٹھے، مگر وقت کا پہیا چکر کھا کر ایک جگہ رک سا گیا، زندگی ٹھہر سی گئی، اور جب زندگی ٹھہری تو ٹھہرے ہوئے پانی کی سی خرابیاں اس میں بھی پیدا ہوگئیں۔ دھرم میل کی ٹولیاں بن گئیں اور ایک نے دوسرے کو مٹانے اور ختم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، دھرم کے نام پر آدمی نے آدمی پر وہ ظلم توڑے، وہ قیامت ڈھائی کہ آدمیت شرما گئی۔ زندگی کو گھن آنے لگی۔ خدا کے بندے، خدا کا دم بھرنے والے بندے خدا کے بندوں کے لئے عذاب بن گئے۔ زندگی حرام اور جینا اجیرن ہوگیا۔ انسان زندگی سے اکتا گیا اور زندگی کو انسان کے نام سے قے آنے لگی، زمین کا گرنا نیچے لڑھک گیا۔

چین سمجھتا تھا کہ دنیا میں چین ہی چین ہے۔ اب جو آنکھیں کھلیں تو اور ہی دنیا دکھائی پڑی، اس کی دنیا سے کتنی بدلی ہوئی، کتنی مختلف۔ اس کا جی بے چین ہوگیا، دل رو اٹھا۔ انسان کا خون! اس کی آنکھوں سے خون بہنے لگا۔ اس کے جی میں آیا اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے۔ انسان کی درد بھری چیخیں اس سے نہ سنی گئیں، دل میں آیا کان پھوڑ لے۔ پر اس کی آتما میں شکتی تھی، روح میں طاقت تھی، اس نے سہارا دیا اور وہ پاگل پن سے بچ گیا۔ مگر دل میں کھٹک رات دن چین نہ لینے دیتی۔ کسی پہلو قرار سا نہ آتا۔ ایک چبھن سی ایک تھکن سی جس نے اس کا قرار کھو دیا۔ وہ پاک صاف تھا، گناہوں سے، برائیوں سے، مردم آزاری سے، اس کے دل میں پریم تھا، انسان کی محبت تھی، سیوا کا جذبہ تھا، مگر اس کے چاروں اور تو اندھیرا تھا۔ عام لوگ تو ویسے کے ویسے ہی تھے، پاپی گنہگار مردم آزار، وحشی، درندے، جانوروں سے بدتر۔ کیا کرے؟ زندگی میں نفسا نفسی، انسانوں میں خودغرضی، ایک دوسرے سے بے تعلقی، نہ مجھے تیری فکر، نہ تجھے میرا خیال، ایک ہی زمین پر بسنے والے ایک ہی آسمان کے نیچے رہنے والے، ایک ہی ہوا میں سانس لینے والے اور یہ دوری۔ یہ منافرت کہ ایک کی ایک کو خبر تک نہیں، اب کیا ہو؟ کٹیا سے باہر نکلا، ایسے کہ کوئی دیکھے نہیں۔ نظریں بچاتا، جنگل کی طرف نکل گیا، جیسے ایسا اس دنیا میں رہنے ہی نہیں، وہ ایک بیابان میں پہنچا، ریت کے ٹیلے، کانٹے دار جھاڑیاں، درخت کے نام تک نہیں، کہیں کھجور کے پیڑ اور بس۔ اس صحرا میں ہوا بھی تو بہت تیز چل رہی تھی اور گرم جیسے بھٹی میں سے آ رہی ہو، سورج بھی تو سوا نیزے پر آگیا تھا جیسا پگھلا جا رہا تھا اور پیاس کے مارے برا حال۔ اسے آبادی نظر آئی اور ادھر ہی کی۔ بعد اس نے باندھ لی۔ آبادی میں پہنچا ایک آدمی اس سے ملا۔ اس نے پانی مانگا، وہ مٹی کے برتن میں دودھ لایا، اس نے پیا کچھ نمکین نمکین سا۔ پیاس نہ بجھی۔ وہ آگے چلا، ایک اور آدمی ملا۔ اس سے بھی پانی مانگا، پر وہ بھی دودھ ہی لایا۔ اس نے پینے سے انکار کیا میزبان نے وجہ پوچھی، اس نے بتایا کہ ایک آدمی اس کو دودھ پلا چکا ہے، اس کی آنکھیں لال ہوگئیں مگر وہ اونٹ لایا اور چین کے سامنے اس کا پیٹ پھاڑ کر اس میں سے پانی نکالا اور اسے دیا چین اس آدمی سے ڈر سا گیا تھا، پانی سے اسے گھن آئی پر ڈر کے مارے پی گیا اور آگے چل دیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہیں، ایک شخص کچھ کہہ رہا تھا، یہ پاس پہنچا، وہ سب سے پوچھ رہا تھا۔

"تم مجھے کیسا جانتے ہو؟" سب نے جواب دیا "سچا"۔ اس نے پھر پوچھا: "مجھ پر بھروسہ ہے؟" میں نے کہا "ہاں"۔ وہ بولا "میں جو کہوں اسے یقین کروگے؟" سب نے اقرار کے لئے سر ہلائے تو اس نے پہاڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا "اس پہاڑی کے پیچھے سے بہت بڑا طوفان آنے والا ہے، ایسا کہ دنیا کی آنکھ نے آج تک نہ دیکھا ہو، عقل مند وہ جو برسات سے پہلے گھر کی مرمت کرے، تم بھی طوفان سے پہلے اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو کہ وقت پر پچھتانا نہ پڑے، کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں کہ تم کو لوہے کے چنے چبانا ہیں۔ بس یہی کہ کچھ بری باتیں چھوڑ دو، اچھی باتیں سیکھو۔ تم نے ٹولیاں بنا لی ہیں، اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ کرلیا ہے، یوں کام نہیں چلے گا۔ آدمی ایک ہیں تو راگ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ نہ کوئی بڑا نہ کوئی چھوٹا۔ نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا۔ نہ لال پیلے سے اچھا نہ سفید کالے سے بہتر۔ سب انسان ہیں اور سب برابر ہیں۔ اب تک تم نے ایک دنیا میں الگ الگ دنیائیں بنائیں۔ اب سب مل کر ایک دنیا بناؤ۔ ایک سکھی ہو تو سب سکھی نہیں ہوتے۔ ہاں سب سکھی ہوں تو ایک بھی سکھی ہوجاتا ہے۔ سب کا سکھ ایک، سب کا دکھ ایک، اس لئے کہ تم سب ایک ہو، یاد رکھو اگر تھوڑے سے بھی دکھی رہ گئے تو کسی کو بھی سکھ نہ ملے گا، اس لئے سب کے سکھ کا انتظام کرو، اور ہاں کسی کے کہنے سننے میں مت آجانا، عقل سے کام لینا اور معاملوں کو خود سوچنا سمجھنا، کام مشکل ہو تو آپس میں مشورہ کرلیا کرنا اور بس۔ تم اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے سب سے نیچے ہو، اس عیب کو نکال دو تو ایسے چمکو گے جیسے ہیرا۔"

سننے والوں میں بہت سوں نے ناک بھوں چڑھائی، منہ بنایا، کچھ نے کہنے والے کی بات مان لی۔ چین ان میں سب سے آگے تھا۔ اسے تو مرض کا علاج اور بیماری کی دوا مل گئی۔ اس کے لئے تو وہ بے چین تھا۔ مارا مارا پھر رہا تھا۔

زندگی اپنی ضرورت خود پوری کرلیتی ہے، وقت کی بات اگر کوئی نہ مانے تو وقت آپ منوا لیتا ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ کچھ آگے نکل جاتے ہیں، کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں مگر آنا پڑتا ہے سب کو اسی ڈگر پر۔ اس سے

...... تھوڑی دور ہی گیا تھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ ایک شخص کچھ کہہ رہا تھا، یہ پہنچا۔ وہ سب سے پوچھ رہا تھا۔

"تم مجھے کیسا جانتے ہو؟" سب نے جواب دیا "سچا"۔ اس نے پھر پوچھا: مجھ پر بھروسہ ہے؟ میں نے کہا "ہاں" وہ بولا "میں جو کہوں اسے یقین کروگے" سب نے اقرار کے لئے سر ہلائے تو اس نے پہاڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا اس پہاڑی کے پیچھے سے بہت بڑا طوفان آنے والا ہے ایسا کہ دنیا کی آنکھ نے آج تک نہ دیکھا ہو عقل مند وہ جو برسات سے پہلے گھر کی مرمت کرلے، تم بھی طوفان سے پہلے اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو کہ وقت پر پچھتانا نہ پڑے۔

چھٹکارا نہیں، چنانچہ یہی ہوا۔ نہ ماننے والے، نئی بات سے ڈرنے والے۔ پرانی پر اڑنے والی، گھوم پھر کر اسی راستے پر آگئے۔ اب کیا تھا۔ انسانیت ہوش میں آئی، اخوت و مساوات کے بادل چھائے تو رحمت کی بارش ہونے لگی، سوکھی کھیتیاں ہری ہوگئیں، اجڑے گھر بس گئے، بگڑے سنور گئے تو انسانیت نے ایک خواب دیکھا، نرالا، انوکھا، جس میں انسان کی حسرتوں، آرزوؤں اور صدیوں کی تمناؤں نے رنگ بھرا، دکھی انسان کے دل کی تڑپ نے نقاشی کی اور ان سب نے مل کر انسان کے اجتماعی عروج کی تصویر بنائی۔ ایسی تصویر جسے دیکھ کر فرشتوں نے بھی شرم سے گردن جھکا لی۔ اس خواب کی تعبیر سنسار نے پلٹا کھایا، دنیا نے کروٹ بدلی، چھوٹے بڑے، امیر، غریب، کالے، گورے، لال، پیلے سب ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ ایک دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ سب میں برابری، سب ایک دوسرے کے بھائی۔ دکھ ہوتا تو سب مل کر بانٹتے، سکھ ہوتا

تو سب مل کر مناتے۔ جو سب سے زیادہ سیوا کرتا وہی سب سے بڑا کہلاتا اور دلوں میں جگہ پاتا۔ پھر انھوں نے ایک دیا جلایا۔ ایک شمع روشن کی، اس کی روشنی دور دور پہنچی۔ اس دیے کے لئے تیل بھی تو دور دور سے لائے تھے، پورب سے پچھم سے۔ اس شمع کی تیاری کے لئے موم بھی تو جہاں تہاں سے اکٹھا کر لیا تھا، اب تو یہ دیا سورج کو شرمانے لگا اس شمع کی روشنی سے خورشید ماند پڑ گیا۔ دنیا اس روشنی سے جگمگا اُٹھی۔ چاروں طرف اُجالا ہی اجالا ہوگیا اور انسان نے اس روشنی میں اپنی حقیقت کو پہچانا، اپنی منزل دیکھی اور اپنا مقام جانا۔ اس حقیقت کو جان کر اس منزل اور اس مقام کو دیکھ کر انسانیت مسکرائی، آدمیت کی باچھیں کھل گئیں۔ صدیوں کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہزاروں برس کی تفریق مٹ گئی۔ انسان انسان بن گیا، آدمی آدمی ہوگیا۔

رات گئی، دن آیا، موسم بدلے، ہوا پلٹی، چاند سورج آنکھ مچولی کھیلتے رہے، گھڑی پل بنتے، مہینے سال اور صدیاں آئے اور گئے، فصلیں آئیں اور چلی گئیں، درختوں میں پھل آئے پکے اور گرے، پر کون جانتا تھا اور کسے معلوم تھا کہ آدمی خود اپنے پیر میں کلہاڑی مارے گا۔ نقصان میں اپنا نفع تلاش کرنے لگے گا اور بنا دینے کے بعد بھی اپنی عقل کو کام میں نہ لائے گا، بلکہ دوسروں کے کہنے کو اپنا سوچا سمجھنے لگے گا، اور یوں سیدھے رستے سے بھٹک کر ادھر اُدھر مارا مارا پھرے گا۔ مگر ایسا ہوا کچھ بکریوں نے بھیڑیوں کا روپ بھر لیا اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ڈگر پر ڈال دیا اپنے نفع کے رستے پر ہانک دیا اور آدمی بھی تو کان دبائے گردن جھکائے اُن کے اشاروں پر ناچنے لگے ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگے اور اسی کو دین ایمان سمجھنے لگے۔ مگر کاغذ کی ناؤ چلتی کے دن پاپ کا گھڑا تو پھوٹنا تھا۔ پہلے پہل تو بھیڑیوں کی خوب بنی، پھر آپس میں چھڑی اور بے زبان بکریاں کٹیں۔ کبھی کبھی کچھ بھیڑیے بھی کام آجاتے۔

دھرم کے نام پر آدمی کا خون پھر بہا۔ مذہب کے نام پر انسانیت کی قبا پھر چاک ہوئی اور ایسی کہ دھجیاں اُڑ گئیں۔ پھر آدمی آدمی کو کھانے لگا۔ پھر انسان انسان کا لاگو ہوگیا۔ دیے کی روشنی دھیمی اور شمع کی روشنی مدھم پڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ دیا بجھ جائے گا۔ شمع گل ہوجائے گی اور دنیا پر ایک دفعہ پھر اندھیرا چھا جائے گا۔ وہ تو کہو لال آدمیوں کو عقل آگئی۔ انھوں نے دیا سنبھال لیا، شمع اُٹھا لی اور پھر تیل موم اکٹھا کیا۔ انھوں نے دیے کی لو تیز کی شمع کو لے کر ساری دنیا میں پھرے۔ روشنی تھی تیز اس لئے وہ دیس بھی نظر آ گئے جو اب تک اندھیرے میں پڑے تھے۔ اب تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ ساری دنیا چھان ماری، سمندر کھنگال ڈالے مٹی کا ایک ایک ذرہ اور پانی کا ایک ایک قطرہ اُن کی جانچ پڑتال سے نہ بچا اور مٹی پانی ہی کیا انھوں نے تو ہوا تک میں گرہ لگا دی، اس کے کندھے پر بھی چڑھ گئے۔ پر دھن کا روگ اور قوت کا مرض انھیں ایسا لگا کہ انسانیت کی جان ہی لے کر چھوڑی۔ انسان مر گیا، انسان جیسا جانور رہ گیا۔ اس جانور جیسے انسان نے انسانوں کو جانور سمجھا، جانوروں کا سا برتاؤ کیا اور جہاں موقع لگا انھیں جانور بنا بھی دیا۔ اور ان بننے والوں کو تو دیکھو، اچھے خاصے انسان، صورت دیکھو تو بھلے آدمیوں کی، پھر جہاں ان لال انسان جانوروں اور جانور انسانوں کی آنکھ لگی کہ پھری اور یہ جانور بنے۔ پر انسان کو جانور بنانا کوئی ہنسی کھیل نہیں آدمی خود بھی جانور بن جاتا ہے۔ یہ بھی جانور بن گئے اور لگے جانوروں کی طرح لڑنے۔ اور لڑائی ہوتی تو اس بات پہ کہ کون زیادہ آدمیوں کو جانور بنائے یہ جانور بنانے کے بھی تو بڑی ترکیب سے تھے آدمیوں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ جانور بن رہے ہیں بلکہ الٹا یہی سمجھتے کہ آدمی بن رہے ہیں۔ لال جنھیں جانور بناتے اُن کی دیکھ بھال بھی کرتے، انھیں دھوپ سردی اور بارش سے بچاتے۔ پر کھانے کو اتنا دیتے کہ پیٹ نہ بھرے اور پہننے کو اتنا کہ تن نہ ڈھکے

چین اس نئی مصیبت کو دیکھ کر بہت گھبرایا، اس کی عقل کچھ کام ہی نہ کرتی۔ وہ دیکھتا، اچھے خاصے آدمیوں کی مت ماری گئی ہے، اُسے دکھ ہوتا اس نے دیکھا ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ ہے، اتنا بڑا کہ آج تک دنیا میں کسی نے دیکھا نہ سُنا۔ اس برگد کے پیڑ کے نیچے کروڑوں آدمی ہیں پھر بالکل دیکھنے کے، صورت شکل کے آدمی باقی بالکل جانور برگد کے سایے میں یہ موسم کی تکلیفوں اور دنیا کی مصیبتوں سے بالکل نچنت ہوکے رہتے، نہ کوئی کھٹکا، نہ کسی کا ڈر، ہاں اتنی بات تھی کہ انھیں روٹی پیٹ بھر کے نہ ملتی، اور نہ کپڑا پورا تن ڈھکنے کو ملتا۔ یہ تب بھی خوش تھے، جو کبھی کبھی خالی پیٹ ان کے معدے میں درد اُٹھتا اور ننگے بدن جب گرم یا ٹھنڈی ہوا انھیں تکلیف دیتی تو یہ اپنا غصہ ایک دوسرے پر ہی اتار لیتے اور بس۔ چین سے انسانوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ پر بچارا کرتا کیا، یہ تو بالکل جانور ہوگئے تھے اور جو سچ پوچھو تو جانوروں سے بھی بُرے، اُن سے بھی بدتر۔ چین کو اُن پر بڑا ترس آیا، اُسے دکھ ہوا کہ آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد اور یوں جانور بن جائے۔ اس نے اُن کے سدھار کی ٹھانی اور طے کر لیا کہ جو ہو سو ہو پر ان کو انسان ضرور بناؤں گا۔ اس نے اپنا کام شروع کیا۔ بڑی ہوشیاری سے۔ بہت سمجھ کے ساتھ کہ کہیں ان لال آدمیوں کو بُرا نہ لگے۔ لال آدمی اس وقت آپس میں لڑ رہے تھے، چین نے موقع غنیمت سمجھا اور وہ ڈھب اختیار کیا کہ لال آدمی برا ماننے کی جگہ اور خوش ہوئے اور اس سے بہت سے وعدے کر لئے۔ پر تھے سب جھوٹے اور وقتی۔ جب ان کا کام نکل گیا اور آپس کی مار دھاڑ ختم ہوئی تو انھوں نے وعدے تو ڈالے پیچھے اور آدمیوں کو جانور بنانے والی ترکیبوں کو اور کڑا کر دیا۔ جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا انھیں اور سخت کر دیا اس پر چین کو بڑا دکھ ہوا، اس سے یہ زیادتی دیکھی نہ گئی۔ وہ لال آدمیوں کو انسان سمجھتا تھا پر وہ تو جانور سے بھی بدتر نکلے۔ نہ کہنے کا خیال، نہ بات کا پاس نہ دنیا داری کا لحاظ۔ ادھر زنجیریں جو کڑی ہوئیں تو جانور بنے ہوئے انسان بھی چیخ اُٹھے۔ اور ایک دفعہ انھوں نے ارادہ کیا کہ زنجیروں کو توڑ ہی ڈالیں گے یہ غصے میں آپے سے باہر تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے تھے پر چین نے روکا، انھیں بتایا۔ اینٹ کا جواب پتھر نہیں، انھیں بتایا کہ جھوٹ کا جواب سچ ہے۔ انھیں سمجھایا تم اینٹ کا جواب پتھر سے دوگے، پتھر کا جواب گولی گولی کا جواب گولا اور گولے کا جواب ایٹم بم۔ سختی بڑھتی ہی جانے لگی، تشدد ترقی کرتے رہے گا، بات ایسی کرو جس کا جواب ہی نہ ہو۔ اہنسا کا جواب کیا ہے۔ پھر ایک دفعہ سب نے مل کر سچ اور اہنسا کا تماشہ دکھایا، ایسا تماشہ کہ لال آدمیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور ایسا لگا کہ وہ بھاگ نکلیں گے پر کام پہلا پہلا تھا اس لئے پوری طرح ہوا نہیں۔ اب لال آدمیوں کی بن آئی، انھوں نے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے، خوب حوصلے نکالے، ایک باغ میں اکٹھا کر کے خوب گولیاں برسائیں اور آخر میں ان جانوروں کو آپس میں لڑوایا، اور ٹکروایا۔ یہ منتر انھیں خوب یاد تھا، اس کام میں بڑے ماہر تھے۔ یہ ہنر انھیں خوب آتا تھا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسی منتر سے تو انھیں جانور بنایا تھا۔ یہی ہتھیار پھر اُن کے کام آیا اور بات آئی گئی ہوگئی، پھر چین کو قرار کہاں، اُسے تو چٹک لگی ہوئی تھی۔ ارادہ پکا تھا۔ وہ ڈٹا رہا۔ لال آدمیوں نے بہت سی ترکیبیں کیں، کئی پھندے ڈالے۔ پر اس نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔ اب لال آدمیوں کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے زنجیریں ڈھیلی کیں۔ ایک آدھ جو پرانی ہوگئی تھی توڑ بھی ڈالی مگر چین کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہوشیار کر لیا تھا اور وہ بھی ایسے کہ دیکھنے والے دانتوں میں اُنگلیاں دے گئے۔ لال آدمیوں نے بھی پورا زور لگایا۔ کبھی جیل بھیجتے، کبھی گولیاں چلاتے اور کبھی پھانسی دیتے غرض تشدد اور سختی کے سارے کام کرتے مگر ادھر سے سب کا جواب ایک اہنسا۔ آخر لال تھک گئے، تنگ آکر انھوں نے اور کام تو کئے بند اور اپنا پرانا ہتھیار سنبھالا۔ لوگوں کو آپس میں لڑایا، ان کا سر انھیں سے پھڑوایا۔ آپس کی اس مار کٹائی نے لال آدمیوں کا بوجھ بہت ہلکا کر دیا۔ وہ تو بس منتر لگا دیتے اور تماشا دیکھتے۔ چین نے آپس کی مار دھاڑ روکنے کی بڑی کوشش کی،

ہزاروں جتن کئے گئے مگر ایک پیش نہ گئی ویسے تو سب
اُسے بڑا مانتے، اس کا کہنا مانتے پر اس معاملے میں
ایک نہ سنتا، آخر اس مارکٹائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل
پھٹ گئے، آدمیوں کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر بھی
مصیبت کم نہ ہوئی۔

برگد کا پیڑ صدیوں کا پرانا ہو گیا تھا گھن اس
میں لگ ہی چکا تھا، جڑ اندر ہی اندر کھوکھلی ہو چکی تھی
وہ تو کچھ کھڑا ہوا تھا پر ایک بہت بڑا طوفان آیا۔
نوح کے طوفان سے بھی بڑا اور ایسا لگا کہ ساری
دنیا کو بہا جائے گا اور دنیا بہہ بھی جاتی، کچھ مقدر
ہی سے بچ گئی۔ پھر آندھی آئی۔ بڑے زور کی آندھی
کہ زمین پر قدم جمنا مشکل ہو گئے۔ اس طوفان اور آندھی
نے برگد کے پیڑ کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی اور وہ
اڑڑڑ دھم، جب وہ گرا تو اتنے زور کا دھماکا
ہوا کہ ساری زمین دہل گئی۔ پیڑ تو گرا پر اس کے سائے
میں بسنے والوں کی کچھ مت پوچھو، ان کا تو برا حال
ہو گیا، دھماکے سے پہلے تو ان کے کان بہرے ہو گئے
روشنی بھلا انھوں نے کیا دیکھی تھی، اب جو پیڑ ہٹا
اور سورج کی کرنیں چمکیں تو ان کی آنکھیں چندھیا گئیں
صاف اور پاک ہوا میں سانس لیا تو ان کا دم گھٹنے
لگا۔ اور لگے بوکھلاہٹ میں ایک دوسرے کو مارنے
پیٹنے۔ لال آدمی تو ایسے موقع کی تاک ہی میں تھے انھوں
نے مسکوٹ کی اور طے کیا کہ چلتے چلتے ایسا چرکا تو
لگا چلو کہ ان کی سات پشت یاد کریں۔ اب کیا
تھا وہ دھاچوکڑی مچی، وہ مارکٹائی، وہ قتل و
غارت، وہ لوٹ کھسوٹ کہ کبھی دیکھی نہ سنی
ننھی ننھی پتیوں اور کلیوں کو مسل کر رکھ دیا۔ نرم
نرم ٹہنیوں اور نازک نازک بیلوں کو کاٹ کے رکھ
دیا۔ گھنے پیڑوں اور تناور درختوں کی تو کچھ پوچھو
ہی مت۔ اب ان کے سر پر خون سوار ہوا
یہ وحشی ہو گئے۔ بالکل جانور، بھیڑیے جیسے
اور وہ حرکتیں کیں، ایسے ایسے بھیانک کام کئے
کہ جانوروں کو بھی شرم آ گئی، بھیڑیے بھی ڈر گئے
چین کو دیکھو جیسے پاگل ہو گئے ہوں۔ کبھی ادھر
جاتا اور کبھی اُدھر، کبھی وہاں بھاگتا اور کبھی یہاں
چیختا، پکارتا، اپنی سُریلی آواز میں گاتا، انسانیت
کے راگ الاپتا۔ آدمیت کی میٹھی راگنی سُناتا،
مگر سب ایسا جیسے کوئی بھینس کے آگے بین بجائے
آخر پاگل پن کا یہ طوفان ہلکا ہوا۔ بہیمیت کی یہ
آندھی دھیمی پڑی۔ چین کے میٹھے بول فضا میں
پھیلے۔ اس کی دل لبھانے والی آواز ہوا کے کندھوں
پر سوار ہو کر دور دور پہنچی۔ بخار ہلکا پڑا پر
اترا نہیں۔ وحشیانہ حرکتیں کم ہوئیں پر تھمی نہیں
چین کو بڑا دکھ ہوا، اس کی آتما جیسے بھٹی میں
جل رہی ہو۔ روح جھاڑیوں میں الجھ رہی ہو۔ اس سے
یہ دیکھا نہ گیا۔ اس نے جان کی بازی لگا دی
وہ جان دے کر انسانیت کے اس دھبے کو دھو
دینا چاہتا تھا۔ ابھی وہ موت کے بستر پر
زندگی سے کھیل رہا تھا کہ ایک طرف سے سُریلی
آواز آئی

"ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سنمتی دے بھگوان"

اور بھگوان نے اپنے درشن دئے، چین کو جیسے
زندگی میں سب کچھ مل گیا ہو۔ دونوں جہان کی دولت
اس نے دوڑ کر بھگوان کے چرن چھوئے۔ بھگوان نے
پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پریم سے آنکھوں
سے کی طرف دیکھا اور کہا "دھن ہے تیری ہمت کو
شاباش ہے تیری جرأت کو۔ اس اندھیارے
میں تو نے اپنا دیا روشن رکھا۔ اس طوفان میں
بھی تو چٹان کی طرح اپنی جگہ جما رہا۔ ڈانواں ڈول
وقت میں بھی تیرے قدم نہ ڈگمگائے۔ تیری زبان
ایک ہی سُر الاپتی رہی پر ذرا غور تو کر سنسار
نے کتنے پلٹے کھائے۔ دنیا نے کتنی کروٹیں لیں
اور زندگی نے کتنے چولے بدلے۔ تو نے دیکھا
انسان سیدھی راہ پا کر بھٹک جاتا ہے۔ بھٹکا دیا
جاتا ہے، منزل کے نشان پا کر بھی گم کردہ منزل
ہو جاتا۔ اسے اتنی سی بات یاد نہیں رہتی۔ زمین
ایک، زمین پر بسنے والے ایک، ان کی منزل ایک
کی ابتدا ایک، ان کی انتہا ایک تو وہ سب ایک
اس نے ٹولیاں بنا لی ہیں، چھاپیں لگا لی ہیں
طرح طرح کی ٹولیاں، قسم قسم کی چھاپیں اور
ذرا نہیں سوچتا کہ انھی ٹولیوں، انھی چھاپوں نے
اسے یہ دن دکھایا۔ اپنے اوپر آپ ہی مصیبت
لایا اور اب دور نہیں کی جاتی، کبوتروں کو دیکھو
قسم قسم کے کبوتر، طرح طرح کے ان کے رنگ
اور وضع قطع کی ان کی بولیاں پر دیکھو تو سب
کبوتر۔ لڑیں گے، بھڑیں گے، ماریں گے، پیٹیں
گے پھر سب ایک۔ اب تو اسے جانوروں سے
سبق لینے دے۔ تیرا کام ختم ہوا۔

فضا میں ایک ترانے کی آواز گونجی۔ ہوا
نے اس آواز کو بسیط فضا میں پھیلا دیا۔ ابھی
ترانے کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ دوسری
آواز ہوا کے دوش پر سوار سارے عالم میں گردش
کر گئی:-

"ہلئے رام"

اور دنیا پر تھوڑی دیر کے لئے اندھیرا چھا گیا۔

کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

نے چڑھائی کر دی اور لہاسا میں ایک مضبوط چینی
حکومت قائم کر دی۔ اس وقت سے لے کر [illegible]ء
کے انقلاب چین تک لہاسا میں متواتر منچو سلطنت
کی فوج کا پڑاؤ رہا لیکن اختیار بس نام کو تھا،
[illegible] کے انقلاب چین کے بعد تبت والوں
نے تمام چینی فوجوں اور افسروں کو مار بھگایا۔
ہندوستان کے وسیلے سے برطانیہ کے شیر نے
بھی [illegible] میں چھاپہ مارا، اور لہاسا [illegible]

اثر تبت پر قائم کر لیا۔
حکومت ہند اپنے سکم کے پولیٹیکل ایجنٹ
(موجودہ مسٹر دیال) کے ذریعے تبت کی
حکومت سے اپنے معاملات طے کرتی ہے۔
ہندوستان سے تبت تک آمد و رفت کا صرف
ایک راستہ ہے جو بنگال سے شروع ہوتا ہے
اور سکم سے گذرتا ہوا تبت تک پہنچتا ہے۔ [illegible]
میں ہندوستان نے تبت کے ساتھ لگ بھگ
ایک کروڑ کا بیوپار کیا تھا۔ تبت کے نوٹ کا
صحیح نام "سانگ" ہے۔ اور [illegible] میں اس کی
قیمت تقریباً پانچ آنے کے برابر تھی۔ لیکن عاشق
کے دل کی طرح اسے قرار نہیں ہے۔ اس کی قیمت
میں بہت زیادہ گھٹ بڑھ ہوتی رہتی ہے۔

موجودہ دلائی لاما "پیکر عقل و ہوش" اور
"بحر بے پایاں" چونکہ ابھی نابالغ ہیں، اس لئے
راج کاج کا کام ان کی طرف سے ایک ایجنٹ
چلاتا ہے۔ اس کی مدد کے لئے چار وزیروں کی
ایک کونسل ہے۔ یوں کہنے کو تو ایک قومی
اسمبلی بھی ہے جس کے نمائندے سادھو سنت اور
معمولی افسر ہیں ——— لیکن ساری دینی
اور دنیاوی طاقتیں اسی "مالک دین و ایمان" اور
"بحر بے پایاں" کو حاصل ہیں۔ اسی کی مرضی قانون
ہے۔

آپ میں خلوص کتنا ہے؟

سوال نمبر ۱ سے نمبر ۱۰ تک ہر "ہاں" کے اور
نمبر ۱۱ سے نمبر ۲۰ تک ہر "نہیں" کے ۵ نمبر شمار
کیجئے۔ اگر میزان ۸۵ سے زیادہ ہو تو کیا کہنا ہے
مگر خلوص کے ساتھ موقع شناسی سے بھی کام
لیجئے۔ اس قدر منہ پھٹ ہونا اچھا نہیں کہ خواہ مخواہ
لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگاتے پھریں۔ ۷۵ سے
اوپر نمبر اچھے ہیں۔ ۵۰ سے ۷۰ تک اوسط
درجے کے۔

۵۰ سے کم نمبر ہوں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو
بعض معاملات میں اپنا طرز عمل ضرور بدلنا چاہیے
شروع اس طرح کیجئے کہ جن اخلاقی اصولوں کے
آپ قائل ہوں ان کو قلم بند کر لیجئے، پھر ان کو اپنی
زندگی میں حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کیجئے۔

باہر کی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

غور کر رہا ہے۔ برطانوی سفیر چین کے لندن جانے
کی خبر جو ابھی آئی ہے اس قیاس کو تقویت پہنچاتی ہے۔
سیاسی مبصروں کا خیال ہے کہ واشنگٹن میں مسٹر بیون اور امریکی
وزیر خارجہ ایچیسن میں گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ
امریکہ تو نئی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرنے میں دیر
کر سکتا ہے لیکن برطانیہ کا چین میں اتنا زیادہ سرمایہ لگا
کہ اسے دیر نہیں کرنی چاہئے

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۴	۴ر اکتوبر ۴۹ سنہ ء	ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

کامن ویلتھ کا معمہ

(پروفیسر محمد مجیب صاحب انڈین کاؤنسل آف ورلڈ افیرس کی طرف سے کامن ویلتھ کانفرنس میں اور حکومت ہند کی طرف سے یو، این، او کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس سفر کے حالات و مشاہدات سے نئی روشنی کے ناظرین کو محظوظ کرتے رہیں گے۔ یہ ایفائے وعدہ کی پہلی قسط ہے۔)

۱۸ر ستمبر
ٹورنٹو

برادرم عابد صاحب،

السلام علیکم۔ پرانی دنیا کی ایک جھلک دوبارہ دیکھنے اور نئی دنیا پر نظر ڈالنے کے بعد آپ سے اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا تھا، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں آنے کا مقصد کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کرنا تھا، نہ کہ دنیا دیکھنا۔ لندن میں صرف ایک دن ذرا گھومنے کا موقع ملا۔ نیویارک کے ہوائی اڈے کے باہر قدم رکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ٹورنٹو شام کو پہنچا اور دوسرے دن سویرے نمائندوں کے قافلے کے ساتھ بگولو ان کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج سہ پہر کو وہاں سے واپس آیا ہوں اور کل نیویارک جا رہا ہوں۔ ایسے سفر میں آدمی کیا دیکھ سکتا ہے۔ بس اسباب سمیت منزل مقصود تک وقت سے پہنچ جانے کی فکر میں پڑا رہتا ہوں۔

کانفرنس میں ہر ممکن مسئلے پر بحث اور گفتگو ہوئی، اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچیں، چنانچہ ہم سب نے دس دن بحث کرنے کے بعد خلوص کے ساتھ ایک دوسرے سے کہا کہ کانفرنس بہت ہی نتیجہ خیز تھی۔ اس سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا، اور مختلف قسم کی رائیں سننے سے ہمارے ذہنوں میں وہ ہل چل گیا جو فکر کی زمین کو زرخیز بناتا ہے، لیکن اس وقت آپ کے لئے کانفرنس کی روداد کا خلاصہ لکھنے بیٹھا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔

کامن ویلتھ کا رشتہ ایسا ہے کہ اگر اس کی تعریف کی جائے یعنی اس کی نوعیت کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ یہ رشتہ اینگلو سیکسن نسل کی ریاستوں کا، جو برطانیہ کے بادشاہ کو اپنا بادشاہ مانتی ہیں، ایک طرح کا خاندانی رشتہ ہے۔ ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شامل کرنے کے لئے خاندانی کا لفظ کاٹ دیا گیا، مگر کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے شریک تھے۔ اگرچہ پاکستان نے ابھی طے نہیں کیا ہے کہ وہ کامن ویلتھ میں شامل رہے گا یا نہیں، اور اس میں آئرلینڈ کے نمائندے خاص طور سے کوشش کر کے بلائے گئے، اگرچہ آئرلینڈ کامن ویلتھ میں شامل نہیں ہے۔ بحثوں میں متحدہ ریاستوں کا ہر وقت اور ہر طرح سے ذکر آتا رہتا تھا، گویا کامن ویلتھ کا سب سے اہم رکن وہی ہے، مگر اسے دعوت نہیں دی جا سکی۔ اس لئے کہ قوموں کی اس برادری میں اسے کسی محسوس رشتے کی بنا پر شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کانفرنس کا مقصد بڑی حد تک اس سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ برطانیہ کی طرف سے اس میں کون کون شریک تھا۔ برطانیہ کے نمائندوں کے لیڈر مسٹر بٹلر تھے۔ ان کو قدامت پسند پارٹی کے لیڈروں میں مسٹر ایڈن کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ برطانیہ کی لبرل پارٹی کے مشہور لیڈر مسٹر ایسکو کی لڑکی لیڈی یونہم کارٹر تھیں۔ لوئڈ جارج کے لڑکے میجر لوئڈ جارج، سرمایہ دارانہ معیشت کے حامی اور مالیات کے ماہر لارڈ برینڈ، معاشیات کے مشہور عالم پروفیسر روبن سن، لیبر پارٹی کے دو نوجوان مگر بہت ممتاز مفکر ڈینس ہیلی اور مورس ویب، مسٹر لایونل کرٹس، جنھوں نے ہندوستان میں ۱۹۱۹ء میں دوعملی قائم کرائی تھی اور جو اب جمہوری دنیا کو ایک فیڈریشن بنانے کے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور بڑے جوش کے ساتھ اس کا پرچار کر رہے ہیں، سر ولیم فرجولڈ جو فلسطین اور وسطی افریقہ میں جج رہ چکے ہیں اور نوآبادیوں کے مسئلوں سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں، پروفیسر مین سرگھ جو کامن ویلتھ کی تاریخ اور اس کے سیاسی اور معاشی تعلقات پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ فن جنگ کے ماہر جنرل جیکب اور سنڈے ٹائمز کے مددگار ایڈیٹر مسٹر ای اے ہوڈسن جن کو برطانوی سیاست (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
کامن ویلتھ کا معمہ	پروفیسر محمد مجیب	۱	جرائم کس طرح روکے جائیں	خواجہ جلیل احمد	۷
اقبال کی وطن دوستی	غلام السیدین	۲	آخر یہ مذہب و سیاست بھید کیا؟	مہر محمد خاں شہاب	۸
ایثار و قربانی	(اداریہ)	۳	فکر و عمل	ضیاء الفاروقی	۹
پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴	منتظر (افسانہ)	محمد معین موجد	۱۰
۲۔ پاکستان	ع، ل	۴			
بزم بے تکلف		۵			
دیدہ نو	سیدہ فرحت	۵			

قیمت فی پرچہ ۳ر

اقبال کی وطن دوستی

غلام السیّدین

.........اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کا کلام تو قومیت اور حبِ وطن کے جذبے سے بھرا ہوا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور قومی جذبات کا علمبردار ہے۔ لیکن اس کے دورِ آخر میں قومیت کی جگہ اسلامیت نے لے لی اور حبِ وطن کا اس میں کہیں پتہ نہیں چلتا.........اقبال کو اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن کے بہترین عناصر سے محبت ہے۔ اس کے بہترین مفکرین اور شریف انسانوں سے عقیدت ہے اور اس وسیع حلقے میں بھرتری ہری اور گوتم بدھ سے لے کر عارف ہندی (جہاں دوست) اور گرو نانک تک سب آ جاتے ہیں۔ لیکن اقبال اس اندھی وطن پرستی اور مبالغہ آمیز قومیت سے بیزار ہے جو نسل اور رنگ اور جغرافیہ کی بنا پر انسانوں کی خدا داد وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے.........

اردو زبان کے کسی شاعر کو اپنی زندگی میں وہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت نہیں ہوئی جو اقبال کے حصے میں آئی ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ عام طور پر دنیا شاعروں، ادیبوں، مصنفوں، مفکروں کی صحیح قدر اس وقت کرتی ہے جب یہ اُن کے وجود سے خالی اور وہ خود اس کے اعتراف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی عالمگیر مقبولیت کے کئی سبب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ فنی اعتبار سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی زبان میں شیرینی اور زور اور اس کے اندازِ بیان میں ندرت ہے جس سے وہ لوگ بھی لطف لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں جو اس کے پیغام کو، اس کے دماغ کی پرواز کو، اس کے دل کی تڑپ کو نہیں سمجھ سکتے۔ الفاظ کی موسیقی اور اُن کا جادو ان پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اقبال کو اپنے ایسے عقیدت مندوں سے شکایت ہے

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

اور

رموزِ دلبری خواہد ز من
آب و رنگِ شاعری خواہد ز من

من شکوہِ خسروی او را دہم
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

لیکن یہ شکایت اس اقبال کی ہے جو فلسفی اور مفکر اور عالمِ انسانیت کی اصلاح کا مجاہد ہے۔ شاعر اقبال کو اس چیز کی شکایت کیوں ہو کہ اس کے کلام کا حسن کم نظروں کے دل پر بھی وار کر جاتا ہے! کون کافر ہے جس کو ایسے اشعار کے کیف اور سرور سے انکار ہوگا؟

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم ہر بند گسستم من
در دیر نیاز من، در کعبہ نماز من
زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من
سرمایۂ درد تو ضائع نتواں کرد

[illegible] کہ دل خیرہ [illegible] بستم من!

دوسری طرف وہ [illegible] ہیں جو اقبال کے فکر کی بلندی، اس کے پیغام کی جدت اور اس کے حیات افروز فلسفے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں (یا ان کا خیال ہے کہ سمجھتے ہیں!) اقبال نے فرد اور ملت کی زندگی کے متعلق اپنے فکرِ روشن کے نتائج کو ایک ایسے وقت پیش کیا جب نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالمِ اسلامیہ اور دنیائے مشرق کی قوموں کی صحت مضمحل ہو چکی تھی اور ان کا عزم اور ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہِ حقیقت شناس نے جو نقشہ دیکھا اسے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں فرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس صورتِ حال کو فلسفی کی نگاہ نے دیکھا۔ شاعر کے دل پر اس کی چوٹ لگی اور مفکر نے اس کی اصلاح کے لئے اپنا پیغامِ عمل پیش کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ بزم میں "اہلِ نظر" اور "تماشائی" دونوں اقبال کے معترف اور عقیدت مند ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اقبال کے معترض اور نقاد بھی ہیں اور یہ بات بجائے خود بری نہیں بلکہ ضروری ہے۔ ہر ادبی، فکری، جمالی تحریک اور کارنامے کی قدر کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جرأت کے ساتھ بیگانہ وار تنقید کی ضرورت ہے۔ اس لئے مجھے اقبال کے نقادوں سے کوئی گلہ نہیں، لیکن شرط ضرور ہے کہ جب وہ (مخالف یا موافق) تنقید کریں تو اس کی بنیاد ان حقائق پر رکھنی چاہیے جو اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ایک حق پسند نقاد کو آزادیٔ رائے کا پورا اختیار حاصل ہے لیکن ایجادِ واقعات کی اجازت نہیں! آج میں ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بعض حلقوں کی جانب سے اقبال پر وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے اور اب بھی گاہ بگاہ کیا جاتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کا کلام تو قومیت اور حبِ وطن کے جذبے سے بھرا ہوا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور قومی جذبات [illegible] لیکن اس کے دورِ آخر میں قومیت کی جگہ [illegible] نے لے لی اور حبِ وطن کا اس میں کہیں پتہ نہیں چلتا! میرے خیال میں یہ الزام لفظی اور معنوی دونوں [illegible] سے بے بنیاد ہے۔ اور جو لوگ اس اعتراض [illegible] ہیں، وہ نہ اقبال کے دورِ آخر کے کلام سے پوری [illegible] ہیں نہ حبِ وطن اور قومیت کے تصور کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کی غلط فہمی سے بحث کرنے سے پہلے آئیے ذرا مدعی کا دعوےٰ سن لیں۔

مدعی کا بیان ہے کہ اقبال نے اپنے [illegible] ایسی نظمیں لکھیں جن کو پڑھ کر [illegible] سے حب الوطنی میں تیزی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے [illegible] کا گیت

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!

یا قومی اتحاد کے نشاۃِ ثانیہ کی وہ دعوت جو "نیا شوالہ" کے نام سے موسوم ہے، جو برہمن کو اس کے پرانے بتوں کی یاد دلا کر

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

یہ اعلان کرتی ہے کہ

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور اس کی التجا کرتی ہے کہ غیریت کے پردوں کو اٹھا دے، نقشِ دوئی کو مٹا دے اور جو دل ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ان کو پھر سے ملا دے۔

یا وہ شیریں ترانہ جو ہندوستان کا قومی ترانہ ہوتا اگر باہمی مخالفتوں اور تعصب نے ملک کو دو حصوں میں نہ بانٹ دیا ہوتا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

ان کا کہنا یہ ہے کہ ان تمام جذبات اور خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اقبال نے وطن پرستی کا راستہ چھوڑ کر اسلامیت کی راہ اختیار کی، اور مسلمانوں کے خاص مسائل اور ان کی تہذیب و تمدن، ان کے فکر و عمل کے مختلف گوشوں کو اپنے ذہن کی جولانگاہ بنا لیا۔ اقبال اس دور میں کیا دعا مانگتا ہے

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

بقیہ صفحہ [illegible]

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ راکتوبر ۱۹۴۹ء

ایثار و قربانی میں کتنی بڑی قوت ہے

پچھلے ہفتے ہمارے ملک کے لوگ عید قربان اور دسہرے کے مذہبی تہوار اور گاندھی جینتی کا قومی تہوار منا رہے تھے جن حضرات نے ان تقریبوں کی ظاہری اور سطحی حیثیت سے قطع نظر کر کے ان کے معنی اور مقصد پر غور کیا ہوگا انہیں ان میں یہ بات مشترک نظر آئی ہوگی کہ یہ تینوں داستان ایثار و قربانی کی نشانیاں ہیں اور اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ ایثار و قربانی سے بڑھ کر کوئی قوت خلق خدا کے قلوب کو تسخیر کرنے والی نہیں۔

عید قربان خدا کے ایک محبوب اور برگزیدہ بندے سے نسبت رکھتی ہے جو اس کی خوشنودی کے لئے اپنے لخت جگر کا خون بہانے پر تیار ہو گیا۔ اس کے اس ایثار نے دوسری صفات حسنہ کے ساتھ مل کر اس کا روحانی مرتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ تین بڑے مذہب جن کے پیرو کل پر دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی مشتمل ہے اسے خدا کا اولوالعزم پیمبر اور اپنا محترم پیشوا مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کے لوگ یعنی مسلمان ربع مسکوں کے ہر حصے میں اس کے بے مثل کارنامے کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔

دسہرہ ایک اطاعت شعار بیٹے کی نشانی ہے جس نے باپ کے حکم کی تعمیل میں برسوں تک بن باس کی مصیبت اٹھائی اور اس قربانی کے ذریعے سے صفحۂ تاریخ پر اپنی عظمت کی مہر ثبت کر دی یہاں تک کہ کروڑوں انسان اپنے عقیدے کے مطابق خدا کی شان جمالی کا مظہر سمجھنے لگے اور اس کی یادگار کو مقدس تہوار کی حیثیت سے منانے لگے۔

گاندھی جینتی ہمارے زمانے کے ایک حق پسند حق شناس حق گو مرد خدا کی پیدائش کا دن ہے جس کی زندگی ایثار کا صاف اور شفاف آئینہ، اور موت قربانی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اس نے اپنے ۳۲ کروڑ ہم وطنوں اور دوسرے ملکوں کے بہت سے باشندوں کے دل پر عزت اور محبت کا ایسا گہرا نقش بٹھا دیا کہ اس کا یوم ولادت ہندوستان کا قومی جشن ہو گیا جو صرف اس کی حدود کے اندر ہی نہیں بلکہ دنیا کے متعدد بڑے بڑے شہروں میں منایا جاتا ہے۔ اور جس میں ان شہروں کے رہنے والے بڑے خلوص سے ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

جب گاندھی جی کے سچے عقیدت مند ان کی ولادت کے دن بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ کون سی قوت تھی جس کی بدولت اس بے نوا فقیر نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مقابلہ کر کے اُسے اخلاقی اور سیاسی شکست دی اور اپنے ملک کو اس کے پنجے سے آزاد کرایا تو ان کی بہت سی صفات سامنے آتی ہیں — ان کا عزم و استقلال ان کی تنظیم اور تدبیر، ان کی معاملہ فہمی اور بیدار مغزی ان کی موقع شناسی اور مصلحت بینی — لیکن سب سے بڑی چیز جس میں ان کی زبردست قوت کا سارا راز پوشیدہ ہے ایثار اور قربانی کی صفت ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ گاندھی جی کے نزدیک ایثار اور قربانی کی قدر و قیمت اور تاثیر و قوت اس پر منحصر ہے کہ اس کی بنا حق اور عدم تشدد پر ہو یعنی (۱) انسان جس مقصد کے لئے قربانی کرے وہ بے شک و شبہ حق ہو اور (۲) جس طریقے سے کرے وہ نفرت اور دل آزاری سے پاک ہو۔ پہلی شرط تو آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ بعض اوقات افراد اور جماعتیں اپنے ناجائز مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان قربانیوں کی وجہ سے چاہے فوری کامیابی حاصل ہو جائے مگر ان کا کوئی پائدار اخلاقی اثر باقی نہیں رہتا۔ اخلاقی قوت اُسی قربانی میں ہوتی ہے جس کا مقصد اپنوں اور غیروں سب کے نزدیک جائز اور معقول ہو۔ لیکن دوسری شرط کسی قدر تشریح چاہتی ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقصد کے لئے جو بجائے خود نیک اور جائز ہے اپنے اوپر تکلیفیں اُٹھاتا ہے لیکن اس کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے جن سے وہ اس مقصد کو منوانا چاہتا ہے نفرت اور بیزاری رچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی نفس کشی اور ستم کشی کا انداز جارحانہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مخالفوں کے جذبات کو متاثر نہیں بلکہ مجروح کرنا چاہتا ہے گاندھی جی کے اخلاقی معیار کے مطابق ایسی قربانی ہنسا یا تشدد کی ایک شکل ہے اور تشدد ہر شکل میں اخلاقی تاثیر سے خالی ہوتا ہے۔

آج دنیا میں اور خاص کر ہمارے ملک میں جس نے ابھی صرف باہر سے جمہوریت کا روپ دھارا ہے اندر سے اس کی روح کو جذب نہیں کیا، حق تلفی ناانصافی اور جور و ستم کی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں۔ گاندھی جی اپنی زندگی کے آخری سانس تک ان زبردستیوں کا مقابلہ کرتے رہے ان کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ ہندوستان کے ہر فرد اور جماعت میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ چُپ چاپ ظلم سہنا، اپنے جائز حقوق کو پامال ہوتے دیکھنا اور دم نہ مارنا، مظلومی نہیں بلکہ ظلم طلبی ہے۔ اہنسا نہیں بلکہ ہنسا کی اعانت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس پر ظلم ہو وہ اپنی حفاظت کے لئے، جس کی حق تلفی ہو وہ اپنے حق کے لئے اہنسا کے ہتھیار سے ہنسا کا مقابلہ کرے۔

بہت سے لوگ جن میں حق کی حمایت کا جوش ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ناحق کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت ہی سے ہو سکتا ہے۔ ان سے ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا ہے کہ اکثر صورتوں میں فریق مظلوم کو طاقت سے کام لینے کا مقدور نہیں ہوتا اور جب ہو بھی تو اس کی کامیابی عارضی یعنی صرف اس وقت تک کے لئے ہوتی ہے جب تک فریق ظالم اور زیادہ طاقت نہ اکٹھی کر لے لیکن جو حضرات گاندھی جی کی تعلیم سے متاثر اور اس کے قائل ہیں کہ ظلم اور ناانصافی کا مقابلہ اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر اور قربانی دے کر کرنا چاہیئے۔ ان کو ہم متنبہ کرتے ہیں کہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق حق کے لئے مقابلہ یا "ستیاگرہ" کرنے سے پہلے ایک تو اس بات کا یقین کر لینا چاہیئے کہ ہم جس مقصد کو لے کر اٹھے ہیں اس کا حق ہونا اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کوئی غیر جانبدار شخص بلکہ کوئی انصاف پسند مخالف بھی اس کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ ارادہ کر لینا چاہیئے کہ "جہد للحق" "یا ستیاگرہ" میں اپنے دل کو شخصی عداوت اور نفرت سے اور اپنے طرز عمل کو سختی اور رعونت، ضد اور ہٹ دھرمی، دل خراشی اور دل آزاری سے پاک رکھیں گے۔ ایثار اور قربانی اگر نیک اور پاک مقصد کے لئے ہو اور صلح و آشتی و صفا " عجز و انکسار، معقول پسندی اور سلامت روی کے ساتھ کی جائے تو اس میں مخالفوں کے دلوں کو تسخیر کرنے، باطل کا سر نیچا اور حق کا بول بالا کرنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ یہ سب سے بڑی حقیقت تھی جس کی شہادت گاندھی جی نے اپنی زندگی اور موت سے دی اور سب سے اہم سبق ہے جو ہم ان کی زندگی اور موت سے حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

شراب بندی

پاکستان میں شراب بندی کا بہت دنوں سے مطالبہ ہو رہا ہے۔ مگر بہت سی دقتوں کی بنا پر ابھی تک اس مطالبے کو پورا نہیں کیا جا سکا تھا کچھ عرصہ پہلے مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے لیے شراب ممنوع قرار دی گئی تھی مگر لاہور ہائی کورٹ نے اس حکم کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا پچھلے ہفتہ یکم اکتوبر اب دوبارہ شراب نوشی ممنوع قرار دے دی گئی ہے لیکن بقول معاصر پاکستان ٹائمز کے اس ممانعت میں ایسی گنجائش موجود ہے جس سے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مثلاً ہر رجسٹرڈ ڈاکٹر کو طبی ضرورت پر شراب پینے کے لیے سرٹیفکٹ دینے کی اجازت ہے اس کے علاوہ غیر مسلموں کو شراب نوشی کی عام اجازت ہے اس لئے شرابی مسلمان اس سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

آئندہ را احتیاط

کل پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری محمد یوسف کھٹک نے پاکستان ٹائمز کے نمائندے سے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ چند مہینوں میں پاکستان کی لیڈر شپ میں بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ اگلے الیکشن میں جو جنوری کے آخر میں یا فروری کے شروع میں منعقد ہوگا عوام کو اپنے صحیح نمائندے چننے کا پورا موقع ملے گا اور اس مرتبہ پچھلی غلطیاں دہرائی نہیں جائیں گی موصوف نے اس کا بھی انکشاف کیا کہ انھوں نے پیر صاحب مانکی شریف سے عوامی لیگ کو ختم کرنے اور آئندہ الیکشن میں حصہ لینے کے لیے مسلم لیگ میں شریک ہونے کی درخواست کی ہے۔

ہندوستان — دنیا کی رفتار — پاکستان

سکے کی پالیسی پر مُہرِ تصدیق

۵ اور ۶ اکتوبر کو ہندوستانی پارلیمنٹ کا خاص اجلاس اس غرض سے منعقد ہوا کہ حکومت ہند کے جس فیصلے کی رو سے روپے کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں ۴۴ فی صدی کم کردی گئی ہے اس پر غور کرے اس غور و فکر کا نتیجہ پہلے ہی معلوم تھا کہ تھوڑی بہت قیل و قال کے بعد حکومت کے فیصلے کی تصدیق کردی جائے گی۔ لیکن بحث کے دوران میں وزیر مالیات ڈاکٹر متھائی اور وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بعض دلچسپ باتیں کہیں جن سے ہماری معاشی حالت اور ہمارے دولت مشترکہ کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے ڈاکٹر متھائی نے کہا کہ اسٹرلنگ کی قیمت کم کرنے کا فیصلہ برطانیہ نے کامن ویلتھ کے دوسرے ارکان سے مشورہ کئے بغیر کیا پچھلی کامن ویلتھ کانفرنس میں سر اسٹیفورڈ کرپس کو کچھ ہدایات دی گئی تھیں مگر انھوں نے ان کی حدود سے بہت آگے قدم بڑھا کر اپنے رفیقوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ ہندوستان دو وجہ سے اس پر مجبور ہوگیا کہ اسٹرلنگ کے مقابلے میں روپے کی قیمت کو اپنی سطح پر رکھے یعنی ڈالر کے مقابلے میں گرا دے ایک تو اس کی ۵۰ فی صدی تجارت اسٹرلنگ علاقے کے ملکوں سے ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اسٹرلنگ کے ساتھ ساتھ روپے کی قیمت کو گھٹانا ضروری تھا ورنہ ان ملکوں کو ہندوستان کا مال مہنگا پڑتا اور وہ اسے خریدنا چھوڑ دیتے دوسرے کامن ویلتھ کا رکن ہونے کی وجہ سے ہندوستان برطانیہ اور دوسرے رفیقوں کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں اس پر [illegible] دیا کہ ہندوستان اپنی موجودہ معاشی حالت کے لحاظ سے دوسرے ملکوں کا [illegible] زیادہ پابند [illegible] نہ ہونا چاہئے [illegible] انھوں نے فرمایا کہ یہ حقیقت ابھی تک [illegible] واضح نہ تھی مگر اب اسٹرلنگ اور ڈالر کے قضیے کی وجہ سے اچھی طرح سے روشن ہوگئی ہے۔ اس سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ہم اپنی حالت کو سدھارنے کی کوشش کریں گے۔

ظاہر ہے کہ عام لوگوں [illegible] روپے کی قیمت بدلنے کی وجہ [illegible]

ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت کیا تدبیریں کرے گی۔ اس سلسلے میں متھائی صاحب نے آٹھ باتیں بتائیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت کفایت کی پالیسی اختیار کرے گی جس سے باہر کے سکوں کا خرچ کم ہوجائے اور ایسے قانونی اور انتظامی قدم اٹھائے گی جن سے ملک کے اندر اشیا کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں گی۔ لیکن تجربہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر قانونی اور انتظامی قدم وہ ہیں جو حکومت ایک مدت سے اٹھا رہی ہے مگر اب تک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔ مثلاً یہ تجویز کہ جن لوگوں نے جنگ کے زمانے میں بے تحاشا روپیہ کمایا اور انکم ٹیکس ادا نہیں کیا ان سے انکم ٹیکس وصول کیا جائے۔ اس میں حکومت کو اب تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ وزیر اعظم نے اپنے ۲ اکتوبر کے براڈکاسٹ میں پھر ایک بار نفع خوروں سے اپیل کی ہے کہ ٹیکس ادا کریں اور انھیں اطمینان دلایا ہے کہ اگر وہ خود ہی ادا کردیں گے تو ان کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب حکومت کی مشینری ان لوگوں کو گرفت میں نہیں لاسکتی تو اس قسم کی اپیلوں کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔

بنگال کی گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۵، ۶ اکتوبر کے جلسے میں پھر ایک بار بنگال کے جھگڑے کو نپٹانے کی کوشش کی اور پھر ناکام رہی جھگڑا یہ ہے کہ بنگال میں اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں ڈاکٹر بی سی رائے اور ان کی وزارت کے حامی اکثریت میں ہیں اور صوبے کی کانگریس کمیٹی میں وزارت کے مخالفوں کا زور ہے کانگریس کمیٹی چاہتی ہے کہ وزارت بدلی جائے اور وزیر اعلیٰ کا اصرار ہے کہ کانگریس کمیٹی کا انتخاب نئے سرے سے ہو دونوں فریق ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگا رہے ہیں لیکن ان الزاموں کا کوئی قطعی اور واضح ثبوت نہیں [illegible] کانگریس کی ہائی کمانڈ کے [illegible] دونوں میں سے کسی کے مطالبے کو منظور کرنا ممکن نہیں [illegible] جنوری [illegible] کے آخری ہفتے میں اسمبلی کا نیا الیکشن ہونے والا ہے۔ حال کے اجلاس میں ورکنگ کمیٹی نے دونوں فریقوں کے نمائندوں کو بلوا کر ان سے [illegible] کہ آپس میں مصالحت کرلیں مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ [illegible] کانگریسی آپس کے شدید اختلاف کے باوجود الیکشن [illegible] مخالفوں کا مقابلہ ایک جتھے کے ساتھ کرسکتے ہیں یا نہیں۔

دلے افتاد مشکلہا

شروع شروع میں تو پاکستانی اخبارات نے حکومت پاکستان کو بڑی شاباشی دی کہ اس نے اپنے سکے کی قیمت نہ گھٹا کر دنیا کی نظروں میں اپنا مرتبہ بہت بڑھا لیا ہے، مگر اب آہستہ آہستہ انھیں ان مشکلات کا احساس ہوتا جارہا ہے جو روپے کی قیمت نہ گھٹانے کی وجہ سے انھیں اپنے پڑوسی ملک ہندوستان اور اسٹرلنگ کے علاقوں سے تجارت کو قائم رکھنے میں پیش آئیں گی۔ پاکستان کی دو اہم پیداواروں جوٹ اور روئی کی سب سے زیادہ نکاسی ہندوستان کی منڈی میں تھی مگر موجودہ تعطل کی وجہ سے ان دونوں کی فروخت کا مسئلہ پاکستان کے لئے بڑی مشکلات کا باعث بن گیا ہے۔ اگرچہ حکومت پاکستان دوسرے ملکوں سے اس سلسلے میں بات چیت کر رہی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان سے بہتر اس کو کسی اور ملک میں منڈی ملنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح اس تعطل کی وجہ سے پاکستان کی بہت سی دیہی صنعتیں بھی بڑے خطرے میں پڑ گئی ہیں اور بے روزگاری بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر چمڑے کی صنعت کو لیجئے پاکستان میں بہت کافی چمڑا پیدا ہوتا ہے، اور مغربی پنجاب کے پانچ چمڑا صاف کرنے والے کارخانے صرف اپنے ہی صوبے کی ضروریات کو پورا کرسکتے ہیں۔ اس لئے دوسرے صوبوں کے کچے چمڑے کی نکاسی ہندوستانی منڈیوں میں ہوتی ہے۔ اب موجودہ تعطل کی وجہ سے کچے چمڑے کی فروخت کے لئے کوئی اور منڈی نہیں رہی اور چمڑے کی مصنوعات کے لئے صاف کیا ہوا چمڑا نہیں، چنانچہ ابھی حال میں ان لوگوں نے جو چمڑے سے جوتے اور دوسری چیزیں بناتے ہیں ایک یادداشت میں مرکزی حکومت کے سامنے اپنی مشکلات اور آئندہ کے خطرات پیش کئے ہیں اور پاکستان ٹائمز (لاہور) کے معاشی نامہ نگار نے لکھا ہے کہ چار پانچ کارخانوں کے سوا چمڑے کا سامان بنانے [illegible] تمام فیکٹریاں بند پڑی ہیں اور جوتا بنانے والوں کو بہت سخت نقصان ہورہا ہے۔ یہی حال چمڑے سے ثانوی تعلق رکھنے والی دوسری مصنوعات کا بھی ہے۔ مثلاً سیالکوٹ میں کھیل کا سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں بھی بہت کم مال تیار ہورہا ہے جس کی وجہ سے یہ صنعت بہت بڑے خسارے سے دوچار ہے۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بعض معاشی ماہرین نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ

(۱) دیہی صنعتوں کی حفاظت کے لئے اسٹرلنگ علاقوں کی مصنوعات کی درآمد پر بہت بھاری محصول لگایا جائے۔

(۲) صنعتی خام اشیا مثلاً کوئلہ، لوہا، اور اسٹیل وغیرہ کی درآمد پر کوئی محصول نہ لگایا جائے۔

(۳) ڈالر کے علاقوں سے جو مشینیں وغیرہ منگائی جائیں ان کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

(۴) ان ڈالر کے علاقوں میں جانے والے پاکستانی مال پر جہاں ہندوستان بھی اپنا مال بھیجتا ہے کسی قسم کا محصول برآمد عائد نہ کیا جائے۔

مختصر یہ کہ روپے کی قیمت نہ گھٹا کر حکومت پاکستان بڑے آزمائشی دور سے گزر رہی ہے اور صرف ہندوستان کے اخبارات ہی نہیں یورپ اور امریکا کے اخبارات کا بھی یہ کہنا ہے، جن میں لندن کا مشہور ہفتہ وار "اکانومسٹ" بھی شامل ہے کہ پاکستان اپنے اس فیصلے پر بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

ٹوڈی کے بعد ڈورنگ کی باری ہے

پاکستان کے نوجوانوں کو جن میں مسلم لیگی کارکن اور رہنما بھی شامل ہیں یہ عام شکایت ہے کہ پاکستانی ریاستوں میں آزادی بالکل مفقود ہے اور ظلم و زیادتی بدستور باقی ہے خاص طور پر ریاست بہاولپور کے متعلق لوگوں کو بہت سخت شکایتیں ہیں اسی سال [illegible] انگریز وزیر اعظم کرنل ڈورنگ کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں [illegible] ان کو الگ کر دینے کا مطالبہ کیا جارہا ہے اگرچہ پاکستان کی ریاستوں کا نظام اب بھی ویسا ہی ہے جیسا ۱۵ اگست [illegible] سے پہلے تھا [illegible] دوسری ریاستوں میں اس قسم کی تحریکیں بہت آسانی سے دبا دی جاتی ہیں مگر بہاولپور میں [illegible] مطالبہ [illegible]

بزمِ بے تکلّف

(اتوار کا دن، چھ بجے شام کا وقت، نہر کے کنارے سیلانیوں کا گھمسان۔ ہر طرف چہل پہل نظر آرہی ہے۔ ایک طرف ایک بنچ پر چار حضرات جنھیں آپ سفید پوش نہ کہیں تو بُرا مان جائیں گے۔ بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں۔ اُن میں سے دو کا لہجہ خاصا چٹ پٹا ہے، بلکہ کبھی کبھی مرچ اور کھٹائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ گپ شپ پر مکمل جھپ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے صاحب اس چٹنی میں تھوڑی سی مٹھاس ملا کر لوزن کا مزہ پیدا کر دیتے ہیں)

ا۔ کیا کہنا ہے اس آزادی کا۔ نہ رکھی جائے نہ اٹھائی جائے۔ چور بازاری اور مہنگائی ہے کہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گیہوں پہلے ہی شکر کے بھاؤ ہو گیا تھا۔ اب تو شکر بھی گھی کے بھاؤ بکنے لگی۔ بس ایک آزادی سستی ہے

جگ جگ جیو۔ آزادی گھول کر پیو

ب۔ تم جیسے چٹوروں کو آزادی ناحق ملی۔ اس کا ہمیں بھی افسوس ہے۔ تمھیں تو انگریزی جوتیاں چلنے میں قندِ مکرر کا مزہ آتا تھا۔ غضب خدا کا! آزادی کا مقابلہ کھانے سے کرنے چلے ہیں۔ ارے ناشکرے کہیں آزادی شکر سے تولی جاتی ہے۔
(ج سے مخاطب ہو کر) کیوں بھئی مصری لال سچ بتاؤ تمھیں آزادی زیادہ عزیز ہے یا شکر

ج۔ ارے بھیا۔ ہماری بھلی چلائی، ہمارے تو دونوں ہی میٹھے۔ شکر سے کوٹھیاں بھریں۔ آزادی سے پیٹ بھرا، اور اس میں جھگڑا کاہے کا؟ شکر ملے شکر بیچو آزادی ملے آزادی بیچو۔

ا۔ ہم سے پوچھو نا، مصری لال سے کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ بھروں کی آزادی کا پیمانہ تجوری کی روکڑ سہی، مگر غریبوں کی آزادی بے شک اسی گڑ، شکر، آٹے، دال، نون، تیل، لکڑی سے تولی اور ناپی جاتی ہے، جس آزادی سے بھوکوں کا پیٹ نہ بھرے وہ ہمارے کس کام کی؟ تم اسے نیبو نچوڑ کر چاٹا کرو۔ اب رہی انگریزی غلامی تو ہم تو خیر غلام تھے ہی تم کون سے آزادی کے دم بن گئے ہو؟ یہی نا کہ پہلے شکاری نے پنجرے میں بند کر رکھا تھا، اب پر قینچ کر کے چھوڑ دیا ہے۔

ب۔ ابھی کیوں بے پر کی اڑاتے ہو؟ ابھی ہم نے پر پرزے نکالے ہی کہاں ہیں جو کوئی ہمیں پر قینچ کرے گا۔ مگر ہماری آزادی میں کیا کسر رہ گئی ہے؟ آئین اپنا حکومت اپنی، جھنڈا اپنا، سکہ اپنا اور آزاد قوموں میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے؟

ج۔ بس رہنے بھی دو۔ اور تو اور سکے کو بھی اپنا کہنے لگے۔ شرم تو نہ آتی ہوگی؟ جو سکہ اسٹرلنگ کی دُم سے بندھا ہو، اور اس کے ساتھ کھچا کھچا پھرے اُسے کوئی آزاد کہے گا؟ انگریز کو تو خیر اپنا مال امریکہ کے سر منڈھنا ہے اور ڈالر بٹورنے ہیں، مگر تم نے کیوں بیٹھے بٹھلائے اپنے سکے کو بٹہ لگا دیا۔ یہ ڈالر کی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟

د۔ بھئی واہ! بات شکر رنجی سے شروع ہوئی اور ڈالر رنجی تک پہنچ گئی۔ اگر ہماری بات مانو تو اس ڈالر کے پھیر میں نہ پڑو، اس میں بڑے بڑے گھن چکر بن جاتے ہیں۔

ب۔ ارے میاں کیوں ڈر کے مارے مرے جاتے ہو، ہم سکے کے بیوپاری نہ سہی، مگر پھر بنئے ہیں۔ کچھ پائیں گے تو پا کر سیکھیں گے، کچھ کھوئیں گے تو کھو کر سیکھیں گے۔ آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی کو آزما کر دیکھنے کا، بڑھ کر چلنے کا، گر کر سنبھلنے کا موقع ملے۔ ہم ڈالر کے غلام ہیں نہ اسٹرلنگ کے، اپنی غرض کے بندے ہیں۔

ج۔ اور اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس سکے بانکی کی مشق میں کس پہ کیا گزر جائے گی

کون گھائل ہوا خبر ہی نہیں
آپ کی مشقِ ناز کیا کہنا

نَو بہ نَو

سیّدہ فرحت

ہو چکے ہیں یہ ترے گیت پرانے اب تو
نہ سُنا یہ گل و بلبل کے ترانے اب تو
ختم کر حسرت و حرماں کے فسانے اب تو
مطربہ! چھیڑ نیا راگ نیا ساز کوئی

دَم گھٹے جس میں وہ میخانے کی محبوس فضا
وہی ٹوٹا ہوا ساغر وہی در کا شیشا
بادہ خواروں کا یہ مجمع ہو کہ کنگالوں کا
بزمِ ساقی کا نیا اب تو ہو انداز کوئی

چین لینے نہیں دیتا دلِ شوریدہ مزاج
ہو تنوع جو طبیعت میں تو کیا اس کا علاج
زیست اور موت کے کچھ اور ہی ہوں رسم و رواج
اے فلک اب تو نیا دور ہو آغاز کوئی

اور کر کشت کو سیراب کہ حاصل یہ نہیں
چھوڑ کشتی کو نہ اپنی ترا ساحل یہ نہیں
راہ رو اور بڑھ آگے تری منزل یہ نہیں
دور سے دیتا ہے جیسے مجھے آواز کوئی

حوصلے کی ہے کمی پاؤں کی تیرے زنجیر
کر وہ تدبیر، بدل جاتی ہے جس سے تقدیر
خوفِ صیاد سے آزاد ہو لے مرغِ اسیر
چھین سکتا نہیں تجھ سے پرِ پرواز کوئی

خود فراموشی پہ مجبور رہے گا کب تک
خاک اُفتادہ و رنجور رہے گا کب تک
حسن کے سحر سے مسحور رہے گا کب تک
جذبۂ عشق دکھا تو بھی تو اعجاز کوئی

بہ سلسلہ صفحہ ۳

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
وسعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر
خودداری ساحل دے، آزادیٔ دریا دے!

یا وہ کہتا ہے:۔

نے تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

یا اس کو اپنے زمانے سے یہ شکایت ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیئے ذرا اس تنقید کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں، یہ تو بعد میں دیکھیں گے کہ اقبال کے آخری کلام میں حب وطن کا جذبہ پایا جاتا ہے یا نہیں، لیکن پہلا سوال (جس کی فنی اور ذہنی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے) یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے اور ان کی تشریح و تلقین کے لئے کسی خاص تہذیب یا ملت کو اپنا مخاطب بنا تا ہو تو کیا ایسا کرنے سے اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے یا اس کے جذبۂ حب وطن پر حرف آتا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا فن کار اپنے فن کے کمال کو اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ ان خاص قومی اور ملی اقدار میں پوری طرح ڈوب کر انھیں اپنائے جن کی آغوش میں اس نے تربیت پائی ہے۔ اقبال کو اپنا پیغام اور فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب سانچہ علاوہ اسلامی تہذیب کا سانچہ تھا جس کی بعض خاص اقدار میں اسے زندگی کے ان اصولوں اور مقصدوں کی جھلک نظر آئی جن کو وہ محض مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام عالم انسانیت کی فلاح کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے خود ایک موقع پر اس قسم کے ایک جواب کے اعتراض میں لکھا تھا۔

"میری فارسی مثنویوں کا مقصد اسلام کی وکالت کرنا نہیں ہے۔ دراصل مجھے ایک بہتر معاشرتی نظام کی تلاش میں دلچسپی ہے، لیکن اس تلاش میں یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ میں ایک ایسے نظام معاشرت کو سرا سر نظر انداز کر دوں جس کا سب سے بڑا مقصد نسل، رنگ اور ذات پات کے خطرناک امتیازات کو مٹانا ہو۔"

چونکہ اقبال کے نزدیک دورِ حاضر میں انسانیت کی نجات کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مصنوعی امتیاز کی ان دیواروں کو گرا دے جو خدا کے بندوں کی یکجہتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں۔ اور جن کو انسانوں نے بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا ہے، اس لئے وہ بار بار اپنی شاعری کی [illegible] اسلامی قدروں پر زور دیتا ہے جو انفرادی زندگی میں اپنی اور دوسروں کی خودی کے احترام اور افراد کے تعلقات میں رواداری کی تعلیم دیتی ہیں۔ دراصل عام دنیا کے لئے قابلِ غور امر یہ نہیں کہ اقبال کے فکر و جذبات کا سرچشمہ کیا ہے بلکہ یہ حقیقت کہ اس خزانے سے وہ جو جواہرات نکال کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کی قدر و قیمت کیا ہو؟ اس بارے میں ایک دفعہ سر تیج بہادر سپرو نے ایک بہت پتے کی بات کہی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بعض لوگ اقبال پر اس وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ایک اسلامی شاعر ہے۔ یہ اعتراض نہایت مہمل ہے اگر شکسپیر کی عالمگیر اہمیت اس وجہ سے کم نہیں ہوئی کہ وہ انگریز ہے اور انگریزی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کرتا ہے، اگر گوئٹے باوجود مغربی تمدن اور مسیحی تہذیب کا علمبردار ہونے کے ادب عالم کے باوجود ساری دنیا کے لئے لطف و مسرت کا سرچشمہ ہے تو اقبال کے لئے یہ جرم کیوں ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کی باتیں اور محاورے استعمال کرتا ہو اور اس کی قدروں کی اہمیت پر زور دیتا ہو؟ تہذیب کی زبان اور محاورے استعمال کرتا ہے اور اس کی قدروں کی اہمیت پر زور دیتا ہے

لیکن اس کے علاوہ ایک اور امر بھی ہے جس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اقبال کا حب وطن اس سطحی اور نام نہاد قوم پرستی سے بہت مختلف ہے جس کی تسکین نعرے لگانے سے، اپنی قوم کی جا اور بے جا حمایت کرنے سے اور دوسری قوموں کی تحقیر کرنے سے ہوتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن کے بہترین عناصر سے محبت ہے اس کے بہترین مفکرین اور شریف انسانوں سے عقیدت ہے اور اس وسیع حلقے میں بھرتری ہری اور گوتم بدھ سے لے کر عارفِ ہندی، جہاں دوست اور گرو نانک تک سب آجاتے ہیں، لیکن اقبال اس اندھی وطن پرستی اور مبالغہ آمیز قومیت سے بیزار ہے جو نسل اور رنگ اور جغرافیہ کی بنا پر انسانوں کی خداداد وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ اور انسانیت کے بہترین اصولوں کو ان نامبارک بتوں کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ اس بارے میں اقبال نے کبھی اپنے خیالات کو نہیں چھپایا۔ ان پر مصلحت اندیشی کا فریب دینے والا پردہ نہیں ڈالا اور اگر یہ جرم ہو تو اس جرم میں نہ صرف دورِ حاضر کے بہترین ادیب اور مفکر مثلاً ٹیگور، شا اور ویلز اور رومان رولاں اور سنکلیر شریک ہیں، بلکہ اسلام کی بین الاقوامیت حضرت عیسیٰ کی انسان دوستی، مہاتما بدھ کی عالمگیر محبت اور ہمدردی جو قوموں کی تمیز کو فراموش کر دیتی ہیں، ان سب پر بھی یہی الزام عائد ہوتا ہو اور اقبال اس الزام کو بخوشی قبول کرنے کو تیار ہے! دورِ حاضر پر اقبال کی سب سے سخت تنقید یہی ہے کہ اس نے قومیت کی خاطر انسانیت کو قربان کر دیا ہے سنئے۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و هفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

ابھی تک میں نے اعتراض کو صحیح فرض کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ مگر حقیقت میں اعتراض بے جا ہے، کہا جاتا ہو کہ اقبال کا آخری کلام حب وطن کے جذبے سے خالی ہو حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حب وطن کی صحیح تعبیر اور اس کا جوش جیسا اسی دور میں ملتا ہے اور ان نظموں کے مقابلے میں پہلے دور کی بیشتر قومی نظمیں ہلکی معلوم ہوتی ہیں۔ اقبال کی نظر میں وطن کے ساتھ غداری اس قدر زبردست جرم ہے کہ اس نے "جاوید نامہ" میں دوزخ کا سب سے شدید عذاب بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کے لئے تجویز کیا ہے، کیونکہ انھوں نے ملک کی آزادی کو غیر ملکیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

اور جب دوزخ نے بھی ان غدار روحوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ان کو فلکِ زحل کے قلزمِ خونیں میں پہنچا دیا۔

جاوید نامہ ہی میں ایک مقام پر زندہ رود اور [illegible] میں گفتگو ہوتی ہے اور اس وقت اقبال حب وطن کے جذبے کو اس خلوص اور جوش کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس کے [illegible] تمام بلند بانگ دعوے کرنے والے ماند پڑ جاتے ہیں

باز گو از ہند و از ہندوستاں
آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد
آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم
آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غم ما کن غمِ او را قیاس
آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

اور آخر میں اقبال کی ہندوستان کے سلسلے میں مضامین کی اس کیفیت اور نظم کے چند اشعار سنیے جس کا عنوان "شعاع امید" ہے، اور جس میں اقبال نے ایک شوخ کرن کی زبانی وطن کی خدمت کا ایک بہت بلند تصور پیش کیا ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ جس کا خزف ریزہ ہے دُرِّ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر!

یہ ہے اقبال، حب وطن سے سرشار۔ اس کی سرزمین کو اپنے اشکوں سے سیراب کرنے والا، اس کی گذشتہ عظمت کا معترف، اس کی سونی محفل کا مرثیہ خواں، اس کے سوتے ہوئے برہمن اور روتے ہوئے مسلمان سے بیزار، اس کی خدمت اور بیداری کے لئے کمربستہ، لیکن اس تنگ نظری اور جغرافیہ پرستی سے بلند جو خدمت کے جذبے کو مشرق اور مغرب، اپنے اور پرائے، کالے اور گورے، ہندو اور مسلمان کی بندشوں میں اسیر کرنا چاہتی ہے، اگر یہ سچی وطن دوستی اور وطن کی محبت نہیں ہے تو پھر اعتراض کرنے والے خود کو جنبل اور جنبلوں کو خدا سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے شاید قابلِ درگذر نہیں لیکن یقیناً قوم اور ملک اور انسانیت کے لئے خطرناک ہیں۔

جرائم کس طرح روکے جائیں

نفسیاتی نقطۂ نظر سے

(۱)

خواجہ جلیل احمد

انسداد جرائم کا مسئلہ کسی نہ کسی صورت میں ہر حکومت کے پیش نظر رہا ہے۔ نظریاتی حیثیت سے کوئی حکومت خواہ سوشلسٹ ہو یا کمیونسٹ، جمہوری ہو یا مطلق العنان حتیٰ کہ ابتدائی غیر منظم قبائل تک، کچھ ایسے قوانین ضرور وضع کرتے ہیں جن کا مقصد افراد کو نیک چلنی کی طرف مائل کرنا اور بدچلنی اور دوسرے جرائم سے باز رکھنا ہوتا ہے۔ ان قوانین میں بیشتر تعداد ایسے احکامات کی ہوتی ہے۔ جن کا مقصد جرائم کے ارتکاب کے بعد مجرمین کو سزا دینا ہوتا ہے۔ حکومت کی ابتدائی زندگی میں قوانین کا مقصد عام طور سے یہی رکھا جاتا تھا۔ بعد میں کچھ سوچ بچار کے بعد مجرمین کی اصلاح اور ذہنی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ لیکن یہ نفسیاتی علاج بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا کیونکہ عام طور سے مجرمین پختہ عمر کے ہوتے تھے جن کی مخصوص عادات اُن کی فطرت کا جزو بن چکی ہوتی تھیں، اور کسی بھی قسم کی تربیت ان عادات کو مخصوص کر کے سرزد کرنے سے قاصر رہتی تھیں۔ چنانچہ پرانے لوگوں کا مقولہ کہ چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر چور کی عادت چوری کرنے کی پڑ چکی ہے اور کسی طرح آپ نے اس کے دل میں یہ بات پیدا کر دی کہ چوری بُری چیز ہے پھر بھی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی جو عادت جڑ پکڑ چکی ہے وہ قائم رہے گی۔ چنانچہ یہ کہاوت ایک واقعہ سے ماخوذ ہے جس میں ایک چور نے چوری سے توبہ کی تھی لیکن پھر بھی لوگوں کی چیزوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا تھا۔ جب لوگوں نے اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ ”کیا اب میں اس سے بھی باز رہوں یہ تو ناممکن ہے“۔

بظاہر یہ کہاوت بالکل معمولی سی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو بہت گہری بات اس میں پوشیدہ ہے اور اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حکومت اور افراد دونوں ہی کو ابتدائی عمر میں عادات کی درستگی کی طرف زور دینا چاہیئے ورنہ بعد میں عادت کے جڑ پکڑ لینے پر اس کا ختم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ غرض یہی اور اسی قسم کی دوسری مثالیں تھیں جنہوں نے ماہرین نفسیات کو سوچنے پر مجبور کیا اور بعد غور و خوض کے انہوں نے طے کیا کہ مجرمین کو سزا دینے اور دلانے والے قوانین سے زیادہ ”انسداد جرائم“ کا مسئلہ اہم ہے۔ نفسیات کا اہم استعمال ”قانون“ میں اسی جگہ سے شروع ہوتا ہے۔

مختلف ممالک کی قانونی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے پہل مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیئے جج مقرر کیئے جاتے تھے اُن کے سامنے مجرم لایا جاتا تھا اور وہ اس کے جرم کے مطابق جو سزا مناسب سمجھتے تھے دیتے تھے یعنی بالفاظ دیگر مختلف جرائم کی مخصوص سزائیں مقرر نہیں تھیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے بُرا ہوتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر جج کے فیصلے اس کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہوتے تھے اور اکثر معمولی جرائم پر بے انتہا سخت سزائیں اور کبھی کبھی انتہائی نرم سزا دی جاتی تھی اور بعض دفعہ تو مجرم قطعاً بری کر دیا جاتا تھا۔ یہ حالت عام طور سے شخصی حکومتوں میں

> مجرمین پر جرم کی ذمہ داری عائد کرنے کے سلسلے میں نفسیات کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مجرم کی حرکات لاتعداد اندرونی اور بیرونی حالات سے متاثر ہوتی ہیں اور اکثر اس کو اپنے افعال پر قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے اس طرح اندرونی ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے مخصوص حالات میں وہ بالکل اسی طرح کی حرکات کرتا ہے جیسا کہ عام حالات میں کسی صحیح الدماغ آدمی سے سرزد ہوتیں اس لئے اس کو اپنے ہر فعل کے لئے سراسر ذمہ دار قرار دینا حماقت ہوگی۔

پائی جاتی تھی چنانچہ مثال کے طور پر ایسے بادشاہوں امیروں اور رئیسوں کے فیصلے سبھی نے سنے ہوں گے جن میں کسی برجستہ جواب پر قاتل کو رہا کر دیا گیا اور کبھی کبھی صرف معمولی سی بے باکی پر جان لے لی گئی، یہی حالات تھے، شاید جن کے مشاہدے کے بعد شیخ سعدی نے کہا تھا کہ بادشاہوں کی نوکری بڑی خطرناک چیز ہے وہ کبھی گستاخی پر انعام دیتے ہیں اور کبھی تعریف پر گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہ حالت عرصے تک قائم نہیں رہی کیونکہ انسان نے بعد میں ایسے قوانین وضع کیئے جن میں ہر جرم کی ایک مخصوص سزا قرار پائی لیکن اس طریقہ کار میں بھی بے انصافی کی گنجائش ہے کیونکہ اس میں جج کی نظر صرف جرم پر رہتی ہے، مجرم پر نہیں مطلب یہ ہے کہ مجرم کی انفرادیت پر قطعی غور کیئے بغیر صرف جرم کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ عدالت اس بات پر بھی غور کرے کہ مجرم نے کیوں جرم کیا۔ اس کے نفسیاتی اسباب کیا تھے؟ پھر یہ کہ وہ بچہ ہے یا جوان، نوجوان ہے یا ضعیف یا ادھیڑ عمر کا آدمی، عورت ہے یا مرد وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام افراد میں اپنی اپنی انفرادیت پائی جاتی ہے اور جرم کی نوعیت اور اس کی سنگینی کا احساس ان کی انفرادی حیثیت پر غور کرنے سے بالکل مختلف ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ جرائم جو جذباتی حالت میں سرزد ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں میں مختلف صورتوں اور اشتعال انگیز حالات میں پیدا ہوتے ہیں ایک شخص اگر یہ دیکھتا ہے کہ کوئی غنڈہ اس کی بہن، بیٹی یا بیوی کو اغوا کرنے کی فکر میں ہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ عنقریب لے کر زبردستی بھاگنے والا ہے اور غصہ کی حالت میں وہ اس کو گولی مار دیتا ہے تو اس کے جرم کی نوعیت یقیناً بدل جائے گی، کیونکہ وہ حالات اوروں سے مختلف تھے اور ان میں اس کو اپنے ہوش و حواس پر قابو حاصل نہیں تھا۔ لہٰذا اس کو عام قانون کے ماتحت قتل کی سزا دینا ناانصافی ہوگی۔ اب اسی نوعیت کے واقعہ قتل کو ایسی سوسائٹی (مغربی سوسائٹی) میں فرض کیجئے جہاں پر عصمت کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا جتنا ہم مشرقی کرتے آئے ہیں یا ہماری اکثریت اب بھی کرتی ہے۔ تو وہاں پر یقیناً قاتل کو قتل کی سزا دینی ہوگی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس قسم کے واقعات اس کو کبھی مشتعل نہیں کر سکتے اس کا صاف مفہوم یہ ہوا کہ اس مرتبہ اُس نے ذاتی مفاد کی بنا پر صرف حالات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے گولی چلائی ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے مجرم بچہ ہے یا جوان، کیونکہ اگر بچہ ہے تو پھر یقیناً اس کا حشر نوجوانوں جیسا نہیں ہونا چاہیئے، اور نوجوانوں اور جوانوں میں بھی اس کا فرق ضرور معلوم کر لینا چاہیئے کہ آیا اس قسم کے جرم کا ارتکاب مجرم نے پہلی دفعہ کیا ہے یا ”عادی مجرم“ ہے۔ یہ سب واقعات یقیناً ایسے ہیں جن سے سزاؤں کی نوعیت اور مدت میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اکثر مہذب ممالک میں بچوں اور عورتوں کی عدالتیں علیحدہ ہوتی ہیں جن میں بچے کی نفسیات کے ماہرین اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ آیا مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر ہو سکتی ہے تو اس کو کس قسم کی پابندی میں رکھا جائے اسی طرح عورتوں کے کچھ خاص مسائل ہوتے ہیں جن میں وہ مردوں سے مختلف ہوتی ہیں مثلاً رقابت کے مسئلے کو لیجئے، لوگوں کا عام خیال ہے کہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن سوتن کی اُسے تاب نہیں اب اس خاص کیفیت کے ماتحت اگر وہ اپنی سوتن کو زہر دے دیتی ہے تو پھر اس کو کتنی سزا دینا مناسب ہے وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے فیصلے کے لئے علیحدہ عدالتوں کی سخت ضرورت ہے۔ اسی طرح عادی مجرموں کو لیجئے۔ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں۔ کہ عادی مجرمین کی عادات کافی پختہ ہو جاتی ہیں اور اُن کے جرم چھوڑ دینے کے امکانات یقیناً کم ہیں

(بقیہ صفحہ [illegible])

آخر یہ مذہب و سیاست ہیں کیا!

مصر محمد خاں شہاب

(جس "مذہب یا سیاست" کی بنیاد رنگ، نسل، وطن، مخصوص زبان یا تہذیب یا رسم و رواج کی برتری یا فروتری پر ہوگی۔ کہ "ہم" حکومت کرنے کے لئے ہیں "دوسرے" محکوم رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اتنا ہی وہ مذہب تنگ نظر ہوگا اور وہ "سیاست" تنگ دلی اور خود غرضی کی طرف لے جائے گی۔ اور جس "مذہب یا سیاست" کی نگاہ میں ان امتیازوں کو دخل نہ ہوگا۔ اور "انسان" خواہ کسی رنگ، کسی نسل، کسی شکل، کسی رسم و رواج کا پابند یا ناپابند اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو وہ ان تمام اختلافوں کے ہوتے ہوئے۔ انسان ہی سمجھا جائے گا۔ اور اس کے انسانی حقوق مسلم اور اس کی جان و مال و عزت اور عقیدوں کا احترام مانی ہوئی بات تسلیم کیا جائے گا وہ مذہب اور وہ سیاست اپنے حقیقی مفہوم کے زیادہ قریب ہوں گے)

۱۱ ستمبر ۱۹۵۸ء کا "نئی روشنی" میرے سامنے ہے۔ اس میں کئی مضمون خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ جناب سالک ہندی کی گفتگو نے سلوک و معرفت "ہم کدھر جا رہے ہیں؟" کے عنوان سے، "اذان ماموت" کے عنوان پر اداریہ "اسلامی ممالک کا تنزل" کے عنوان سے سید احتشام حسین صاحب کا مضمون۔ ان میں سے ہر ایک پڑھنے والے کو زندگی کے کسی نہ کسی ماضی و حال کے سوال کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان مضمونوں کو پڑھ کر جو بات سامنے آتی ہے وہ مسلم اور غیر مسلم سے برتاؤ کا سوال، اسلامی حکومت کا ذہنی اور تاریخی تصور اور غیر مذہبی حکومت کا مفہوم اور روش اور اسلامی ممالک کہلانے والے ملکوں کی موجودہ پست حالت اور ان کی گزشتہ تاریخ۔ اور ہندوستانیوں میں سے مسلمان کہلانے والے ہندوستانیوں کا خوف زدہ ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان مسئلوں پر غور کرتے ہوئے بنیادی طور پر جو سوال آتے ہیں کہ آخر "مذہب" ہو یا "سیاست" ان کا مدعا کیا ہے؟ ان دونوں باتوں کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ "تاریخ" کے نام سے جو طومار کے طومار "واقعات و حقائق" یا "خرافات و افسانوں" سے بھرے پڑے ہیں۔ کیا ان کی روایتوں کی روشنی میں ماضی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آ سکتی ہے۔ آج ہمارے زمانے میں "روایت" کا حقائق سے جو تعلق ہے وہ ہم سے چھپا ہوا نہیں۔ مگر اسی پر ماضی کی روایات کو قیاس کر لیا جائے تو کیا وہ سمجھا جانے لگا بہت صحیح ہے جانتا کہ پرانی تاریخ کی تصدیق و تردید کا معیار سوائے ہماری ذاتی یا جماعتی پسند اور ناپسند کے کیا رہ جائے گا اور ہماری پسند و ناپسند نا قابل اور ہمارے لئے خوش کن ہو کر ہم دوسروں کے لئے بھی سند بن جاتی ہے، یعنی اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ میں کہتا رہوں اور آپ ہی آپ جھومتا رہوں، اور دوسرے اپنی اپنی الاپا کریں اور آپ ہی اپنی داد دیا کریں۔

ظاہر ہے کہ "مذہب" سے بیزار لوگ ماضی میں ملک کے تمام شر و فساد اور قتل و غارت اور خون خرابے کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرا دیا کرتے ہیں، لیکن ماضی کو چھوڑئے، آج دنیا دیکھ رہی ہے یا کم از کم ہمیں نظر آ رہا ہے کہ بے چارے "خونی مذہب" نے کہ جتنی خونریزی کی ہوگی اس کا ریکارڈ مشتبہ ہے۔ لیکن نام نہاد معصوم "سیاست" کے نام سے جو خون کی ہولی ہو گئی ہے اور ہوتی رہتی ہے اور اس کا ریکارڈ دنیا کے ہر گوشے میں صاف صاف اور کھلا پڑا ہے۔ جو ناروا داری "مذہب" کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہے۔ "سیاست" کی ناروا داریوں کے سامنے اس کا نام لینا خود شرما جانے کے لئے کافی ہے۔

اوپر کے اشاروں کی روشنی میں اگر میں "مذہب" "سیاست" اور ان کے تعلقات کی حقیقت پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں تو کچھ یوں آتا ہے کہ تمام تحریکیں "انسان" کی بھلائی کے لئے تھیں اور ہیں جتنا ہمارا "انسان" اور انسانیت کا تصور وسیع ہوگا اتنا ہی ہمارا مذہب اور ہماری سیاست کا تصور وسیع ہوگا۔ اور جتنا ہمارا "انسان" اور انسانیت کا تصور تنگ ہوگا اتنا ہی ہمارا مذہب اور ہماری سیاست تنگ نظری لئے ہوئے ہوں گے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس "مذہب یا سیاست" کی بنیاد، رنگ، نسل، وطن، مخصوص زبان یا تہذیب یا رسم و رواج کی برتری یا فروتری پر ہوگی کہ ہم حکومت کرنے کے لئے ہیں۔ دوسرے محکوم رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اتنا ہی وہ مذہب تنگ نظر ہوگا۔ اور وہ سیاست تنگ دلی اور خود غرضی کی طرف لے جائے گی۔ اور جس "مذہب یا سیاست" کی نگاہ میں ان امتیازوں کو دخل نہ ہوگا۔ اور "انسان" خواہ کسی رنگ، کسی نسل، کسی شکل، کسی رسم و رواج کا پابند یا ناپابند اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو وہ ان تمام اختلافوں کے ہوتے ہوئے۔ انسان ہی سمجھا جائے گا۔ اور اس کے انسانی حقوق مسلم اور اس کی جان و مال و عزت اور عقیدوں کا احترام مانی ہوئی بات تسلیم کیا جائے گا۔ وہ مذہب اور وہ سیاست اپنے حقیقی مفہوم کے زیادہ قریب ہوں گے۔

اگر اس نقطے سے "مذہب" کو دیکھا جائے، تو کسی مذہب نے انسان انسان میں دوئی نہیں برتی۔ مذہبوں اور دھرموں کا جو روپ اور نقشہ آج ہمیں نظر آتا ہے وہ رنگ و روپ اس مذہب کے ماننے والوں نے اپنی کوتاہ نظری، اپنی کمزوری اور خود غرضی کی وجہ سے اپنے مذہب کی بنیادی صداقتوں کو دے دیا ہے۔ کیونکہ جو امتیاز، اخلاقی اور صفاتی تھا اور جس کا ظہور صرف افراد کے کردار سے ہوتا تھا اُسے لوگوں نے کردار کی بجائے کچھ ناموں اور لباسوں اور کچھ ظاہری رسموں اور رواجوں کی پیروی کی طرف منسوب کر دیا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے تنگ دائروں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اور تھوڑا بہت جی چاہتا ہے بھی تو ہمت کر کے نکلنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ "سیاست" بھی یہی تھی کہ "حق" کی تائید کی جائے اور "باطل" کی تردید کی جائے۔ مگر ہماری تردید نے جو بے جا خوف کا نتیجہ ہوتی ہے "حق" کو اپنے وسیع معنوں سے ہٹا دیا۔ ہم نے اپنے اوہام خام اور مقصد فانی فائدوں کو "حق" کی گدی پر بٹھا دیا اور باطل کو اپنی کمزوریوں میں پہچاننے کی بجائے صرف تعصب دشمنان مان لیا۔ نتیجہ اس کمزوری یا کوتاہ نظری کا دنیا کے سامنے ہے۔ کہ نام مذہب اور سیاست کا ہے اور جنگ اغراض اور کمزوریوں اور خود غرضیوں اور وہموں کی ہے۔ اور انسان انسان کو لوٹ رہا ہے۔ قتل کر رہا ہے۔ اور مٹا رہا ہے اور ڈھٹائی سے نعرے لگاتے جا رہا ہے کہ "حق" میرے ساتھ ہے۔

میرے ناقص خیال میں تو اتنا ہی آتا ہے کہ بہرحال اور ہر حالت کے مقابلے میں "حق" کی پیروی اور پابندی اپنے پورے معنوں کے ساتھ سچا مذہب اور حقیقی سیاست ہے۔ جہاں تک میری محدود نظر ہے کسی آسمانی کتاب نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اسی حق کے قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ ہر دور میں ہر ملک میں اعلیٰ درجے کے انسان اپنی اپنی روشنی کے مطابق اسی ایک حق کے جام حیات بخش سے زندہ ہوئے ہیں اور دوسروں کو زندہ کیا ہے۔ جس فرد نے حق کی جتنی پابندی کی اتنا ہی وہ اونچا ہو گیا اور جتنی کمزوری دکھائی اتنا ہی وہ نیچا رہ گیا۔ اگر ہم "حق" کی صد فیصدی کرنا چاہتے ہیں۔ تو یقین کیجئے کہ ہمیں "فرقوں" میں "نا سمجھوں" تمام مذہبوں اور دھرموں کے نام لیوا ہیں، تمام مختلف الخیال سیاسی جماعتوں میں [illegible] اپنے افراد ملیں گے جن کی نگاہیں اسی نقطۂ روشن کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جن کے قدم اسی کعبۂ مقصود کی طرف بڑھتے نظر آئیں گے۔ اس وقت [illegible]

فکر و عمل

ضیاء الفاروقی

کیا خوب کہا کسی مردِ آزاد نے خدا اُس کا بھلا کرے "زندگی جب مصائب و آلام کی شدت سے زیادہ دردناک ہو جاتی ہے تو اپنی حقیقتوں اور اخلاقی قدروں سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے"۔

مجھے یاد ہے میرے ایک استاد نے ہارڈی کا مشہور ناول THE RETURN OF THE NATIVE پڑھاتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا تھا SUFFERING IS PURIFICATION. اقبال کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

انسان اگر غور و فکر کرے۔ اپنے گرد و پیش سمجھنے کی کوشش کرے، اپنے دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالے تو اس کے مصائب و آلام اُس کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتے۔ ماضی کا بیش بہا خزانہ اس کی نظرِ تصور کے سامنے ہوتا ہے، حال اپنی پوری بوقلمونیوں کے ساتھ اُس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ وہ انسان جس کی فطرت بے چین ہوتی ہے اور جو حالات کی ناسازگاریوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا نہیں جانتا، ماضی کے دفتر کو کھنگالتا ہے، حال کا جائزہ لیتا ہے اور بڑے غور و فکر کے بعد مستقبل کی تعمیر میں لگ جاتا ہے سچا انقلابی ماضی کی میراث میں جو کچھ حوصلہ بخش اور اُمید افزا ہے اُسے لے لیتا ہے اور حال کی بھی کسی ایسی چیز کو نہیں چھوڑتا جو مستقبل کی تعمیر میں کام آ سکے۔ ماضی کو حال سے ربط دینا اور مستقبل سے ملانا اُس کے بے ربط اجزاء کو رد کر دینا اور اس ترکیب سے فکر و عمل کے لئے جاندار اور متحرک مواد حاصل کرنا اسی کا نام زندگی ہے۔ فکر و عمل ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اچھی بات کہی ہے "ایک مدت سے عمل کا تقاضا میرے دل میں فکر سے جدا نہیں ہوتا بلکہ خود عمل فکر کے سلسلے کی کڑی بن جاتا ہے۔ شاذ و نادر کوئی لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ان دونوں میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فکر عمل میں آ کر تکمیل کو پہنچتی ہے اور عمل فکر کو حقیقت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ وجود کے اس لمحہ میں مجھے بھرپور زندگی کا، بصیرت اور قوت کا احساس ہوتا ہے"۔

اگر ہم ایک فرد کی تنگ حدود سے نکل کر افراد کو لیں اور پھر پوری قوم پر یہ کلیہ عاید کریں تو رشتے کی ساری کڑیاں مل جاتی ہیں۔ قوم کی بنیاد افراد پر ہے اس طرح ایک قوم جو قعرِ مذلت میں گری ہو جس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہو جس کا حال ناخوشگوار اور درماندہ ہو۔ غور و فکر اور عمل کی ہم آہنگی سے بڑے سے بڑا انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

اگر کسی قوم پر اچانک یاس اور حرماں نصیبی کے بادل چھا جائیں۔ حالات کی ناسازگاریاں اس قدر بڑھ جائیں کہ زندگی کے سارے آثار ختم ہو چکے ہوں موت کا سا جمود طاری ہو، پھر بھی اس میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کے ظلم و ستم سہتے ہیں مگر خاموشی سے تعمیری کام میں لگے ہوتے ہیں وہ نہ تو زمانے کی شکایت کرتے ہیں اور نہ وقت کی اندھیاریوں سے خوف زدہ ہوتے ہیں، وہ قدم اُٹھاتے رہتے ہیں، کیونکہ بغیر قدم اُٹھائے وہ نہیں رہ سکتے۔ تاریخ کا کوئی باب ایسا نہیں ملے گا جہاں انسانیت کے امتیازی اوصاف کو رچانے والے اور زندہ رکھنے والے یک سر معدوم ہوں۔

اب اگر کوئی قوم جو بالکل مردہ نہیں ہوتی ہے اور جس کی اخلاقی قدروں کے چراغ گو مدھم ہی سہی مگر ٹمٹما رہے ہیں اپنے ان خونِ جگر پینے والے افراد کو انھیں چراغوں کی روشنی میں پہچان لیتی ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ ساری قوم کا جمود ختم ہو جاتا ہے۔ ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ زندگی کی صبح طلوع ہوتی ہے حیات کی ساری بصیرت افروز پاں کروٹ اٹھتی ہیں اور تاریکیاں رخصت ہونے لگتی ہیں۔

غور و فکر کی معجز نمائیاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں وہ آگے بڑھتی ہیں۔ قوم کے افراد کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ایسی ہستیوں کو اپنا رہبر بنا لیں۔ فکر قوم کا تلوّن ختم کر دیتا ہے۔ وہ ایک نصب العین دیتا ہے، حوصلہ دیتا ہے اور پھر یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ظاہر ہے کہ جب نصب العین کا پتہ چل گیا تو یقیناً اس کے حصول کی تمنا ہوتی ہے۔ عمل کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر راہ کی دشواریاں دامن گیر ہوتی ہیں، طرح طرح کی رکاوٹیں قدم روک لیتی ہیں مگر فکر و عمل کی آمیزش سے جو شراب تیار ہوتی ہے اس کا سرور کوہ و بیاباں کو پرکاہ سمجھتا ہے اور سمندر کی چھاتیوں پر دندناتا ہوا دوڑتا جاتا ہے۔ زندگی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور انسانی تمنا حقیقتیں جامہ ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ علامہ اقبال نے زندگی کی تعریف ایک مصرعہ میں کر دی ہے

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

"جوئے شیر" کوہکن کا نصب العین تھا "تیشہ" اس کا جذبہ عمل "سنگ گراں" کو راہ کی دشواریوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے، جو کوہ بے ستوں سے ٹکرانے والے کے جذبہ صادق سے آشکار ہے۔

جرائم کس طرح روکے جائیں (بہ سلسلہ صفحہ)

بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے جرم کا ارتکاب پہلی مرتبہ اور وہ بھی خاص حالات کے ماتحت کیا ہے۔ غرضکہ یہ سب صورتیں اسی حالت میں پیدا ہو سکتی ہیں جبکہ "انفرادیت" کا تعین نفسیاتی طریقے سے کیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی خصوصی سزائیں ملتوی کرنا، ضمانت پر رہا کرنا، چال چلن کی نگرانی کرنے کا طریقہ اسی نفسیاتی اصول کے ماتحت رائج کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا چنانچہ جہاں پر جیوری سسٹم رائج ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ حضرات جیوری کی نفسیاتی قابلیت کتنی ہے حالات کو سمجھنے کی ان میں کتنی اہلیت ہے اور کسی مخصوص رکن کا ذاتی اثر دوسرے ارکان جیوری پر کہاں تک کام کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ

بحرمیں پر جرم کی ذمہ داری عائد کرنے کے سلسلے میں نفسیات کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مجرم کی حرکات لاتعداد اندرونی اور بیرونی حالات سے متاثر ہوتی ہیں اور اکثر اس کو اپنے افعال پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور اس طرح اندرونی ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے مخصوص حالات میں وہ بالکل اسی طرح کی حرکات کرتے ہیں جیسا کہ عام حالات میں کسی صحیح الدماغ آدمی سے سرزد ہوں۔ اس لئے اس کو اپنے ہر فعل کے لئے سراسر ذمہ دار قرار دینا حماقت ہوگی۔ اسی طرح اس کی اصلاح میں بھی انھیں باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ اصلاح دو طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ایک تو ذہنی طور پر اس کے دل میں یہ خیال پیدا کر دینا چاہئے کہ خواہ حالات کتنے ہی غیر موزوں کیوں نہ ہوں اس کو ایک مقررشدہ حد سے آگے تجاوز نہ کرنا چاہئے اور دوسری طرف اس کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ حالات جن کی بنا پر اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا آئندہ نہ پیدا ہونے پائیں ورنہ باوجود صد ہا تعلیم کے "قانونِ عادت" کے تحت وہ جرم کرنے پر مجبور رہے گا۔

موجودہ قانون عام طور سے مجرم کی ذمہ داری اور اس کو مناسب سزا دینے پر زیادہ ضرور دیتا ہے حالانکہ ان اسباب کا روکنا جو جرائم کے ارتکاب کا باعث ہوتے ہیں زیادہ ضروری چیز ہے۔ "سزا" کا مقصد بہرصورت یہی ہوتا ہے کہ اول تو مجرم کی حالت دیگر کے عبرت ہو اور دوسرے وہ دوبارہ جرم کا ارتکاب کرنے سے نہ صرف خود پرہیز کرے بلکہ اور لوگ بھی خوف کی بنا پر اس سے باز رہیں۔ یہ نقطہ نگاہ بالکل اس قدیم نظریۂ تعلیم سے ملتا جلتا ہے جس میں بچوں کو جسمانی سزا دے کر سبق یاد کرایا جاتا تھا، یعنی بالفاظ دیگر دلچسپی یا شوق کی بنا پر تعلیم نہیں ہوتی تھی اب جبکہ مہذب حکومتیں جسمانی سزا کو طریقۂ تعلیم سے علیحدہ کر چکی ہیں جرائم کے سلسلے میں تکفیر کا تصور رہنا کچھ بعید از فہم قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ مجرم کو لمبی مدت تک محبوس رکھنے سے [illegible] اصل مقصد بھی فوت ہو جاتا

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

منتظر!

(ایک فرانسیسی افسانے کا انگریزی سے ترجمہ)

محمد معین موجد بی، اے

ان دونوں کی مجموعی عمر پوری ڈیڑھ صدی کے برابر تھی۔ الگ الگ ان میں سے کوئی نہ جانتا تھا کہ ان کو دنیا میں آئے ہوئے کتنی مدت گذری۔ انھوں نے برسوں سے اس کا حساب رکھنا ترک کر دیا تھا۔

وہ ایک معمولی چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے اپنی عمر کا بڑا حصہ انھوں نے اسی مکان میں گذارا تھا۔ اگر انھیں کوئی بتا دیتا کہ وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح وابستہ نہ تھے تو یقیناً انھیں اس بات پر حیرانی ہوتی۔

جاڑا ان دونوں بوڑھوں پر کس قدر نامہربان تھا سرد ہواؤں کے جھونکے ان کے پھیپھڑوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھے، ان کی جھکی ہوئی کمریں سردی کی شدت سے سیدھی نہ ہو سکتی تھیں اور اس نامواف‍ق موسم میں ان کے چہرے پر افسردگی چھائی جاتی تھی بوڑھے دھوبی کی نگاہ روز بروز کم ہوتی چلی جاتی تھی اور اس کی سن رسیدہ بیوی کو دوران سر کی تکلیف تھی۔ موسم سرما گذر گیا۔ گرمی آگئی لیکن وہ ابھی تک غیر مطمئن تھے۔ مئی میں بھی نہ سایہ ان کی طبیعت کے لئے سازگار تھا اور نہ دھوپ ان کو پسند۔ ان کے لئے زندگی گذارنی۔ روزی کمانے کی محنت سے زیادہ مشکل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی گویا ان کے لئے محنتِ شاقہ تھی جو سویرے شروع ہوئی اور شام کو ختم۔

ایک روز جبکہ بوڑھا دھوبی اپنے مکان کے باہر خلافِ معمول بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اس کی سن رسیدہ بیوی خبر گیری کے لئے چارہ لینے باہر چلی گئی، دروازے سے نکل کر سانس لینے کے لئے وہ قدرے ٹھہر گئی۔ یہ اس کی مہم کی پہلی منزل تھی۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد اس نے ہمت کر کے سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ بوڑھا دھوبی اپنی نشست گاہ پر اسی طرح ایک سلیقہ مند بچے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی کمزور نگاہ بڑھیا کو دیکھنے سے مجبور تھی۔ پھر بھی وہ اس کے پاؤں کی آہٹ سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

ابھی وہ نزدیک کے چوک میں پہنچی تھی کہ اس کے حواس منتشر ہونے لگے۔ پھر ایک بار اپنی آنکھیں اچھی طرح سے کھولیں اور زمین پر گر پڑی۔ بڑھیا نے اپنا آخری لمحہ نہایت خاموشی سے گذار دیا۔

بے جان قالب کو دیکھ کر ایک راہ گیر ٹھہر گیا۔ ایک ننھی لڑکی بھی دوڑتی ہوئی آگئی۔ ایک نیک دل عورت اور ایک دوکان دار بھی آپہنچے۔ سب نے ترس کھا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

موت کی خبر سن کر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے دیکھتے ہی دیکھتے آدمیوں کی بھیڑ سے راستہ رک گیا۔ اس کا پیلا اور مردہ چہرہ ایک گراں قیمت تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

مجمع میں کسی نے پکارا۔ "بوڑھے دھوبی کو اطلاع دینا ضروری ہے"

پھر کسی نے کہا "نہیں نہیں بوڑھے کی بہو مارگریٹ کو خبر کرنا چاہیئے"

"وہ کھڑی ہے —— !مارگریٹ، جلد آؤ!"

مارگریٹ قریب آپہنچی —— لیکن گھبرائی ہوئی۔ اس کا ڈھیلا اور آلودہ لباس کندھوں پر سے نیچے لٹک رہا تھا سخت محنت کی وجہ سے اس کے گال سیاہ اور خشک ہو رہے تھے۔ ہاتھوں پر آبلے پڑے ہوئے تھے اور وہ انھیں لٹکائے ہوئے تھی۔

جب اس نے اپنی ساس کی نعش دیکھی —— اس کا خاوند مدت ہوئی مر چکا تھا۔ اور مارگریٹ قریب قریب اس کو بھول چکی تھی۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ ہاتھ سفید پڑ گئے —— آنکھیں حیرت کا مرقع بن گئیں۔ اس نے اپنی لانبی قمیص سے آنکھوں کو پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ غریب بڑھیا!"

وہ وحشت کی حالت میں مجمع سے مخاطب ہوئی اور نیچی نگاہ سے التجا کی۔ کہ یہ بات کسی طرح بوڑھے دھوبی تک نہ پہنچے۔ وہ خود اس کو اطلاع کرے گی۔

مجمع اِدھر اُدھر ہونے لگا اور ذرا سی دیر میں راستہ صاف ہو گیا۔

مارگریٹ نعش اٹھوا کر اپنے مکان لے آئی اور جلد ہی بستر ٹھیک کر کے بوڑھے کے پاس پہنچی۔ وہ اس وقت تک اسی جگہ برآمدے میں بیٹھا چشم براہ تھا جلد ہی کھڑکی کا دروازہ کھلا۔ اس نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔

"مارگریٹ تم ہو!" اتنا کہا اور پھر بت بن گیا۔ مارگریٹ نے قدرے تامل کے بعد کہا "دکٹر! چلو اب شام ہو گئی۔ اندر چل کے بیٹھنا چاہیئے"

بوڑھے نے ایک دردناک آہ کھینچی۔ وہ اٹھا اور کراہا۔ اس نے بار دو سالے پھیلائے اور ان کو اوپر نیچے جنبش دی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی چیز چمک رہی ہے۔

مارگریٹ سکتہ کے عالم میں بالکل خاموش کھڑی رہی۔ بے شک یہ محض اس کی روح کی پاکیزگی تھی جس نے اس کو ان تمام تکالیف کے برداشت کرنے کی قوت عطا کی۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑا اور دھیرے دھیرے اس کی رہبری کرتی گئی۔

بے کس بوڑھا بہت دیر کے بعد باورچی خانے تک پہنچ سکا۔ اس نے ہاتھ سے کرسی کو ٹٹولا اور بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی سانس کی آمد و رفت ابھی معمول پر نہ تھی۔ ایک طویل آہ کھینچ کر وہ اپنی مصیبت پر کراہنے لگا۔ جب اسے کسی قدر سکون ہوا تو مارگریٹ نے اس کی بیوی کی موت کا حال بتانا چاہا۔ لیکن اس پر پھر رقت طاری ہو گئی اور مجبوراً اسے اس جانکاہ خبر کی اطلاع دینا ملتوی کرنا پڑا۔

پھر دفعتہً چیخ اٹھا "آہ میری آنکھیں۔ کیا میں اب کبھی نہ دیکھ سکوں گا؟"

کئی گھنٹے متواتر اس نے سوائے کراہ کے اور کچھ نہ کہا۔ اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ اپنی بیوی کے متعلق دریافت کیا "بوڑھی عورت کدھر ہے؟ وہ اب کیا کر رہی ہے؟" اس آہ و بکا میں تھوڑی دیر بعد پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ اپنے حواس درست کر کے اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ اس ناامیدی میں وہ اپنا حوصلہ کھو بیٹھا۔ وہ سخت ہراساں اور پریشان ہو چکا تھا۔

بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لئے آئے کچھ اس کے سرہانے کھڑے رہے۔ کئی ایک کھڑکی سے اندر جھانکتے رہے لیکن کوئی بھی اس سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

کبھی کبھی مارگریٹ اس کو اکیلا چھوڑ جاتی۔ اور روتی ہوئی نعش کو دیکھنے چلی جاتی۔ واپس آتی تو اِدھر اُدھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔ اس کی توجہ ایک ہی وقت میں کئی طرف منعطف تھی۔ تمام زندگی کے تفکرات سے پریشان۔ مصائب سے دست و گریباں لیکن غیر مغلوب اور بہادر عورت ہر طرف دوڑتی پھرتی تھی۔ وہ رنج اور مصیبت کی عادی تھی اور سمجھتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

مارگریٹ پھر شام اور رات کے درمیانی وقفہ میں بوڑھے کے پاس آئی۔ اب اس کی طبیعت کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔

مارگریٹ نے ایک چھوٹا سا اسپرٹ لیمپ روشن کیا۔ اور اس کو میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اب بوڑھے کو اس کی بیوی کی موت سے آگاہ کر دیا جائے وہ بوڑھے کی کرسی کے سامنے بیٹھ گئی سر سے پاؤں تک اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے تھی، جیسے کوئی عرقِ ندامت سے پانی پانی ہو رہا ہو۔ اس نے جرأت کی اور

لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا "وہ اب کبھی واپس نہ آسکے گی! وہ اب واپس آ ہی نہیں سکتی !! ——— وہ یہاں سے کہیں دور جا چکی ہے !!!"

بوڑھا بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس نے نفا پر مارگریٹ کے الفاظ پر کوئی دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ بعد اس پر کسی قدر بیداری کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے مارگریٹ کو پکارا۔ وہ اس کے اتنے قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اس کو چھو سکتا تھا۔

سنو! پیاری لڑکی ادھر آؤ اور سنو! بڑھیا واپس آگئی ہے، وہ یہیں ہے میں نے اس کو ابھی یہاں دیکھا ہے۔ بالکل اسی جگہ پر جہاں تم اب کھڑی ہو۔ اس نے منتشر چیزوں کو پھر ترتیب دیا اور واپس چلی گئی۔ میں دیدہ و دانستہ ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ سنو! میں نہیں چاہتا کہ اس کو میری بینائی کے ضائع ہونے کا علم ہو جائے ——— میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا۔ یہ صدمہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔ اس کو کچھ عرصے باہر رہنے پر مجبور کرو۔ جبکہ میری بینائی پھر ہو نہ کر لے۔ خدارا کوئی ایسا طریقہ دریافت کرو۔

اسی دوران میں اس نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ٹوٹی ہوئی کسی سے بھی درد و کرب کی آوازیں نکل رہی ہیں۔

"اس کو دور بھیج دو ——— اس کو کچھ عرصے کے لئے کہیں باہر بھیج دو ——— اگر ممکن ہو تو اس سے کہو کہ وہ چند روز باہر رہے" "بہت بہتر! ڈیڈی میں اس کا انتظام کر دوں گی۔ میں یقین سے کہتی ہوں اس کو تمہاری تکلیف کی کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" میں قسم کھاتی ہوں۔

بوڑھے آدمی نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہا "تم بہت نیک دل لڑکی ہو" اور پھر ساکت ہو لیا۔

دوسرے دن مارگریٹ نے بوڑھے دھوبی کو بتایا کہ بڑھیا کو اس کے کسی رشتہ دار کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔ بوڑھا دھوبی ان تمام باتوں کو کہ کس طرح بڑھیا اپنے رشتہ دار کے پاس چلی گئی اور کس طرح وہاں وقت گذار رہی ہے بچوں جیسی دلچسپی سے بغور سنتا رہا۔ لیکن جب مارگریٹ اپنی کہانی ختم کر چکی تو کسی قدر غیر مطمئن لہجہ میں بول اٹھا "میں جانتا ہوں کہ گذشتہ شب جب میں سو رہا تھا وہ یہاں آئی تھی میں نے اس کے پاؤں کی چاپ سنی تھی۔"

مارگریٹ نے نہایت نرم لہجے میں کہہ کر ٹال دیا کہ "ہاں وہ آئی تھی، لیکن پھر واپس چلی گئی۔"

اسی طرح دو دن گذر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نحیف و نزار بوڑھے کو دیکھنے آیا۔ معائنہ کے بعد اس نے کہا "خلاف امید اس کی حالت اچھی ہے۔ بخار قطعاً نہیں اور ورم آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ کل تک اس کی آنکھیں درست ہو جائیں گی۔"

مارگریٹ ایک گوشے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی اس نے اپنی تاریک روح کی گہرائیوں میں دہرایا۔ "کل! ——— کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، لیکن حقیقت سے بے خبر اپنی رفیقہ کو اپنے نزدیک نہ پائے گا۔ کل اس کی غریب اور بیکس تیمار دار اپنی خاموشی کی وجہ سے اپنے آپ سزا پائے گی۔ بالکل ایسی ہی سزا جو وہ راز کے افشا کرنے پر پاتی۔"

جرائم کس طرح روکے جائیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

ہے کیونکہ بعض اوقات قتل کے مجرموں کو اتنے عرصے بعد فیصلہ سنایا جاتا ہے جبکہ پبلک اس واقعہ کو بھی بھول چکی ہے، اس لئے اگر اسی فرسودہ نظریہ ہی کو جاری رکھنا ہے تو حکام کا فرض ہے کہ وہ مجرمین کو جلد از جلد سزائیں دیں تاکہ فیصلہ کے اشتہار کے بعد پبلک کے جرائم پیشہ افراد کے دل میں ہیبت پیدا ہو حالانکہ بنیادی طور پر یہ نظریہ غلط ہے اصل طریقہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ مجرم کے ماحول کو درست کیا جائے اور اس کو ایسی تربیت ذہنی اور عملی، دونوں ہی دی جائیں جن سے اس کے دل میں جرائم کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

کامن ویلتھ کا معمہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

کی فساد پرور انصاف پسندی کا مثالی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نمائندے سب آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ برطانوی حکومت یا قوم کی کیا رائے ہے، اور اسی وجہ سے بحث لاحاصل رہتی تھی۔ آخر میں جب سیلون، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے بہت کہا کہ اگر ہمیں معلوم نہ ہوا کہ کامن ویلتھ کیا ہے تو اس میں شریک ہونے سے ہم کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا تو ان مسئلوں پر الگ سے رائے زنی ہوئی کہ کامن ویلتھ کی کوئی مشترک سیاسی یا معاشی پالیسی ہو سکتی ہے یا نہیں اور سب کی رائے تھی کہ نہیں ہو سکتی، گویا کامن ویلتھ کی کیفیت معلوم کرنے کے بعد ہم بھی اس رائے کے ہو گئے کہ اسے قائم تو رہنا چاہیئے مگر اس کا کسی قوم کے فکر اور عمل پر اثر نہ پڑنا چاہیئے۔

شاید بحثوں میں سب سے زیادہ لمبی اور لاحاصل معاشی مسائل پر گفتگو تھی۔ کینیڈا کے متحدہ ریاستوں سے ویسے گہرے معاشی تعلقات ہیں کہ وہ برطانیہ کی معاشی کشتی میں بیٹھنا ڈوب جانے کے برابر سمجھتا ہے، اور اسے یہ بھی گوارا نہیں کہ متحدہ ریاستوں پر کسی قسم کے معاشی یا سیاسی اعتراض کئے جائیں۔ برطانیہ یورپ سے اور اپنی نوآبادیوں سے معاشی معاملات میں الگ نہیں ہونا چاہتا مگر یہ بھی چاہتا ہے کہ کینیڈا اور متحدہ ریاستوں میں اس کا مال زیادہ خریدا جائے تاکہ ڈالروں کی جو کمی رہتی ہے وہ پوری ہو جائے۔ کامن ویلتھ کے ایشیائی ممبروں کا مطالبہ تھا کہ کامن ویلتھ ان کی معاشی زندگی کی تعمیر میں مدد کرے۔ اس مطالبے کو پہلے ٹالنے کی کوشش کی گئی، پھر جب یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر کامن ویلتھ نے کوئی ذمہ داری نہ لی تو متحدہ ریاستوں کی صنعت اور تجارت کا ہر جگہ قبضہ ہو جائے گا تو یہ بات اصولاً مان لی گئی کہ کامن ویلتھ کو ایشیائی ممبروں کی کچھ سامان اور کچھ صنعتی ماہروں کے ذریعے مدد کرنا چاہیئے۔

جن مسئلوں پر غور کیا گیا، ان میں سے ایک نسلی تعصب بھی تھا، لیڈی بونہم کارٹر نے اس مسئلے پر ایک بے مثل تقریر کی اور کہا کہ جنوبی افریقہ نے اس معاملے میں اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ مٹ جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے نمائندوں کے لیڈر ڈاکٹر مالرب بہت ہی شائستہ اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی موجودہ حکومت کی ذرا بھی حمایت نہیں کی بلکہ یہ ثابت کیا کہ وہ اکثریت کی رائے اور خواہش کے خلاف عمل کر رہی ہے اور ایسا ہرگز نہ ہو سکتا اگر ساری دنیا نے جنوبی افریقہ کو تھوڑی تھوڑی کر کے وہاں کے متعصب لوگوں کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ دیا ہوتا۔ بہرحال جنوبی افریقہ کے لوگ اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے ہیں۔ افریقی آبادی کی تعلیم اور تندرستی اور سیاسی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ نسلی تعصب رفتہ رفتہ مٹ جائے گا۔ لیڈی بونہم کارٹر سے زیادہ جوش اور خلوص کے ساتھ تقریر کرنا مشکل تھا، ڈاکٹر مالرب کا انداز معذرت اور انتہائی صلح جوئی کا تھا اس لئے یہ بحث جلد ختم ہو گئی۔ ہم لوگوں کو سر ولیم فٹز جیرالڈ سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ وسطی افریقہ کی برطانوی نوآبادیوں کے لوگ تعلیم اور تجارت میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں اور ان کو جلد سیاسی اصلاحات کے ذریعے حکومت کے سارے نہیں تو بیشتر اختیارات دئے جانے والے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر شروع سے اندیشہ تھا کہ کانفرنس ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی کا میدان بنائی جائے گی۔ پہلے ہی جلسے میں کانفرنس کے رکارڈر پروفیسر سوورڈ نے ان رسالوں کا خلاصہ بیان کرتے وقت جو کامن ویلتھ کے ممبروں نے تیار کئے تھے ایسی باتیں کہیں جن سے ہندوستانیوں کو خواہ مخواہ غصہ آ گئے، اور بحثوں کے دوران میں مسٹر ہوڈسن نے ہر ممکن طریقے سے ہندوستان اور پاکستان کو بھڑانا چاہا۔ مجھے اپنی طبیعت پر بھروسہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکٹر راؤ مزاج کے کسی قدر تیز ہیں، لیکن یہ دیکھ کر کہ پاکستانی نمائندوں کے لیڈر بخاری صاحب اور ڈاکٹر راؤ دوسرے کی غلطی فوراً پکڑتے ہیں مگر بات ہمیشہ بہت سلیقے اور مصلحت سے کرتے ہیں۔ مجھے کسی قدر اطمینان ہو گیا، پھر بھی یہ کیسے ممکن تھا کہ

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

۱۲

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت ۔ یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴
چندہ ۔ سالانہ ۔ ششماہی

ہماری کانفرنس جو تماشا دیکھنا چاہتی ہو وہ نہ دکھایا جائے ۔ کشمیر کے بہانے سے ایک جھڑپ ہوئی اور پھر بخاری صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کا اس طرح سے ذکر کیا کہ مجھ سے بھی نہ رہا گیا ۔ یہ بات البتہ خوشی کی ہے کہ لڑائی کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں کے تعلقات میں پہلے کے بہ نسبت بے تکلفی بڑھ گئی اور شاید خلوص کا بھی کچھ رنگ آگیا ۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے ۔

آپ کا مخلص
محمد مجیب

آخر یہ مذہب و سیاست ہیں کیا !

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

جنھیں ہم غیر سمجھتے ہیں وہ غیر نہیں معلوم ہوں گے بلکہ ان میں قابل نمونہ اور قابل محبت انسان دکھائی دیں گے ۔ اور خود اپنے میں اور "اپنوں" کے اندر اتنی کمیاں اور کمزوریاں دکھائی دیں گی کہ اگر خود سے نفرت نہ ہوگی تو اپنی ذلیل حالی پر رحم ضرور آئے گا ۔

فرد ہوں یا جماعتیں ، پھر وہ اہل مذہب ہوں یا اہل سیاست سب موحد اور حق پرست ہونے کے ادعا کے بل پر جیتے ہیں ۔ حکیم شیراز شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے توحید اور حق پرستی کا ایک معیار بتایا ہے جو میرے دلی مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے ۔ اس کو سامنے رکھا جائے اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر قدم پر پیش آنے والے چھوٹے بڑے مسئلے کو اسی معیار پر جانچا جائے تو یہ سیے "مذہب" اور "سیاست" کا "حق" یا "باطل" پر ہونا خود بخود کھل جائے گا ۔ اور ہم خود دیکھ لیں گے کہ کون کتنا موحد ہے اور کون کتنا حق پرست ۔ فرماتے ہیں :

موحد چہ در پائے ریزی زرش   چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس   بدین است بنیاد توحید و بس

ظاہر ہے کہ یہ مقام خالی باتیں بنانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہر لمحہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں جہاں تک ہم نے "باطل" سے پاک اور لالچ سے بے لاگ رہنے کی مسلسل کوشش کی ۔ اس کے شعور سے حاصل ہوتا ہے ۔

طابع و ناشر ۔ عبداللطیف اعظمی ایڈیٹر ، جامعہ

نئی روشنی دہلی

NAI RASANI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۵	۱۶ اکتوبر سنہ ۴۵ء	ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

زرا اپنی جمہوریت کو جانچئے

(ہم آپ یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے حامی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ سب کے ساتھ انصاف کیا جائے اور ہر شخص کو خواہ وہ کسی نسل، مذہب یا طبقے کا ہو انسان کی حیثیت سے عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ ذلت یا حقارت کا برتاؤ کرتا ہے تو ہمیں سخت ناگوار ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُسے جمہوریت چھو بھی نہیں گئی۔ مگر ہم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جو برتاؤ ہم دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں وہ کہاں تک جمہوریت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ آیئے آج اس کا جائزہ لیں۔ ذیل کے سوالات کو اچھی طرح پڑھ کر ہر ایک کا "ہاں" یا "نہیں" لکھتے جائیے اس کے بعد صفحہ ۱۰ ملاحظہ کیجئے)

۱۔ کیا آپ دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنے کو اکثر آدمیوں سے جنھیں آپ جانتے ہیں سب سے اونچا نہیں سمجھتے؟

۲۔ کیا آپ دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری جتانے کی خواہش کو ضبط کر سکتے ہیں؟

۳۔ کیا آپ کا برتاؤ ایسا ہے کہ چھوٹے بڑے سب آپ سے بے جھجک مل سکیں؟

۴۔ کیا آپ کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور سب لوگوں کو اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں جتنا اپنے آپ کو؟

۵۔ کیا آپ ایسی بات کہنے یا ایسا کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں جس سے دوسروں کو اپنی کم تری کا احساس ہو؟

۶۔ کیا آپ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ دوسروں کی غلطیوں کو درست کرتے وقت ان کو خفیف نہ کریں یا اُن کا مذاق نہ اڑائیں؟

۷۔ کیا آپ میں اتنا ظرف ہے کہ دوسروں کو اپنے سے زیادہ خوش حال دیکھ کر جلیں نہیں؟

۸۔ کیا آپ کا یہ معمول ہے کہ دوسروں کے خیالات، چاہے وہ آپ کو سخت ناپسند ہوں توجہ سے سنیں اور اُن پر ٹھنڈے دل سے غور کریں؟

۹۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ زیادتی کرتے، یا اس کی بات نہ پوچھے یا اُسے جھڑک دے تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟

کیا آپ کا دل ذات پات کے تعصب سے پاک ہے؟

کیا آپ اپنے عمل سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان بہرحال انسان ہے چاہے اس کی تعلیم کتنی اور سماجی حیثیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو؟

کیا آپ اپنے دوستوں کا انتخاب اُن کے سماجی مرتبے سے قطع نظر کرکے محض ان کی ذاتی صفات کی بنا پر کرتے ہیں؟

۱۳۔ کیا آپ اپنے پرانے دوستوں سے جن سے اب آپ کا درجہ اونچا ہو گیا ہو اسی طرح نبھاتے ہیں؟

۱۴۔ کیا آپ کسی کلب، انجمن وغیرہ میں شریک ہوتے وقت محض دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اس کا خیال نہیں کرتے کہ اس سے آپ کی سماجی حیثیت بڑھ جائے گی؟

۱۵۔ کیا آپ ایک معقول حد تک اس کے لئے تیار ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ہر جگہ چلے جائیں اور اس کی پروا نہ کریں کہ لوگ آپ کو ایک چھوٹے آدمی کی صحبت میں دیکھ کر کیا کہیں گے؟

۱۶۔ کیا آپ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں؟

۱۷۔ کیا آپ کا یہ معمول ہے کہ جو شخص تعریف کے قابل ہے اس کی تعریف کریں؟

۱۸۔ کیا آپ اپنے ماتحتوں، نوکروں اور عام طور پر ان سب لوگوں کی دلجوئی کا خیال رکھتے ہیں جو آپ کی کوئی خدمت انجام دیتے ہیں؟

۱۹۔ اگر آپ کو کسی جگہ اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے تو آپ بغیر جھلاہٹ یا جھنجھلاہٹ کے انتظار کر سکتے ہیں؟

۲۰۔ کیا آپ اس پر قناعت کرتے ہیں کہ دنیا میں تھوڑی سی فراغت اور تھوڑی بہت عزت میسر ہو؟

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
زرا اپنی جمہوریت کو جانچئے		۱	آتشی سیال	خلیل الرحمٰن اعظمی	۵
مختصر تبصرے	سید احتشام حسین	۲	ہم کس طرح دیکھے جائیں	جمیل احمد	۶
ذمہ دارانہ مخالفت	(ادارہ)	۳	کسانوں کے لئے برف خانے	ڈی۔ اس۔ سکسینہ	۸
دنیا کی رفتار			کباڑی	سید یحییٰ حسن نقوی	۹
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴	ڈاکٹر سید حسین	مشتاق احمد	۱۱
۲۔ باہر کی دنیا	ا، س	۴			
بزم بے تکلف		۵			

مختصر تبصرے

دو کتابیں

سید احتشام حسین

(۱) تحلیل نفسی ۔۔۔ از حزب اللہ ایم اے ۔ ناشر: کتاب منزل لاہور ۔ قیمت آٹھ روپے
(۲) مضامین عابد ۔۔۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ ناشر: کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی ۔ ۔ چار روپے مجلد

۱۔ اردو میں تحلیل نفسی یا تجزیۂ نفس پر ابھی اتنا کم لکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے اگر یہ لفظ نہیں تو ان کا مفہوم اور مقصود ضرور اجنبی ہوں گے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جس طرح کارل مارکس کے فلسفہ مارکسزم نے دوسرے معاشی اور تاریخی نظریات کو پس پشت ڈال دیا اسی طرح نفسیات کے میدان میں تحلیل نفسی نے نفسیات کے دوسرے مکاتب کی چمک دمک ماند کر دی، لیکن ان دونوں میں کوئی قابل ذکر ربط نہیں ہے بلکہ فلسفیانہ اور علمی نقطۂ نظر سے مارکسزم سائنس ہے اور تجزیۂ نفس بہت کچھ مفروضات کا مجموعہ۔ زیر نظر کتاب ساڑھے سات سو صفحات میں تحلیل نفسی کے اہم مباحث پر تفصیلی مواد پیش کرتی ہے۔ کتاب میں گیارہ ابواب ہیں جن میں لاشعور، خواہشات اور قوت نفسی، ارتقائے شہوانیت، جنسی تہیجات و مقاصد، قوائی الجھاؤ، نرگسیت، خواب، ضعفی بیماریاں، تحلیل نفسی کی تکنیک اور جبری اعصابی خلل کے عنوانات قائم کرکے ہر مسئلہ کی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف حزب اللہ کا انداز بیان شاعرانہ لیکن مشکل ہے۔ گو انھوں نے مثالوں کی مدد سے اپنے خیالات کو زیادہ واضح بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تحلیل نفسی کے متعلق معمولی معلومات رکھنے والوں کو اس کتاب کے سمجھنے میں دشواریاں پیش آئیں گی، میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے شروع میں تجزیۂ نفس کے متعلق عام فہم زبان میں ایسی باتیں لکھنے کی ضرورت تھی جن سے اس علم کی ابتدا اور فرائڈ کی زندگی پر روشنی پڑتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے اسے عام فہم بنانے کا خیال ہی نہیں رکھا اصطلاحوں کے ترجمے بھی آسان ہو سکتے تھے۔

تحلیل نفسی نے مذہب اخلاق، نفسیات، ادب اور فن طب وغیرہ کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ جب تک اس کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت نہ ہو جدید ادب کے ایک بڑے حصے کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تحلیل نفسی کا بنیادی عقیدہ حقیقتاً لاشعور اور جنس کے گرد گھومتا ہے جن سے بہت سے ذہنی عارضے پیدا ہوتے، اور انسان خود اپنی کش مکش کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ انسانی شعور کے علاوہ تحت شعور اور لاشعور بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شعور تو بہت کم انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے تحت شعور اور لاشعور انسانی زندگی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ لاشعور میں جنسی دباؤ کی وجہ سے یادوں کا خزانہ جمع ہوتا رہتا ہے اور وہی زندگی کی ہر ایک راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ جنسی اور شہوانی جذبہ بچے میں پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور خاندان، سماج، اخلاق، مذہب کے ڈر سے چھپ کر یا دب کر رہ جاتا ہے، کبھی کبھی بھیس بدل کر زندگی میں الجھنیں پیدا کرتا ہے کبھی پیدا ہو کر انسان کو شاعر، مصور، لیڈر یا جھکی اور شہید بناتا ہے۔ اس طرح یہ ساری نفسیات بیمار لوگوں سے کم تر متعلق انسانوں سے تعلق رکھتی ہے اور توجہ کا اصل مرکز قرار پاتا ہے اس کی جنسی الجھنیں، اس کے خواب اور خواہشیں بن جاتی ہیں، اس کا علاج یہ ہے کہ ایسے ذہنی بیماروں کو اپنا حال بیان کرنے پر آمادہ کیا جائے وہ کھل کر بیان تو نہیں کرے گا لیکن تحلیل نفسی کا ماہر اس کی زندگی کے واقعات کو ایک رشتے میں پرو کر بتا دے گا کہ اس کا ذہن کیوں بیمار ہے، لاشعور میں کون سا چور چھپا بیٹھا ہے اور جیسے ہی لاشعور کو شعور میں تبدیل کیا جائے گا، بیمار کا ذہن صحت مند ہو جائے گا۔ یہ ایک بہت ہی ناقص خاکہ ہے تحلیل نفسی کے مباحث کا۔ فرائڈ اس کے بعد ینگ اور ایڈلر وغیرہ نے اس علم میں بڑی موشگافیاں کیں اور اب دنیا کا کوئی ملک ——— روس کے سوا ——— ایسا نہیں ہے، جہاں اس سے دلچسپی نہ لی جا رہی ہو۔ روس میں اس کی جگہ اس لئے نہیں ہے کہ ایک صحت مند اشتراکی سماج میں ایسی ذہنی بیماریوں اور نفسیاتی کیفیتوں کا گذر نہیں۔ تحلیل نفسی کی بنیاد یقیناً تجربات پر ہے لیکن اس میں جبلت اور فطرت انسانی کے متعلق جو باتیں فرض کر لی گئی ہیں اور فرد کو اس کی سماجی زندگی سے جس طرح الگ کر لیا گیا ہے اس سے یہ علم ایک مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حزب اللہ نے تحلیل نفسی کی تنقید جدید سائنس اور جدید نفسیاتی تجربات کی روشنی میں نہیں کی ہے۔ مگر یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بہت سا مواد اردو میں اکٹھا کر دیا ہے اگر ان کا انداز بیان سادہ ہوتا اور وہ تھوڑی سی کوشش کرتے تو کتاب اور زیادہ دلچسپ اور عام فہم بن سکتی تھی، اس حالت میں بھی تجزیۂ نفس سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس میں اتنا مل جائے گا جتنا وہ بہت سی مغربی تصانیف سے اکٹھا کرتے کتاب صاف ستھری اور مجلد شائع ہوئی ہے اور اردو زبان میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ مضامین عابد ڈاکٹر سید عابد حسین کے مختلف اوقات میں لکھے ہوئے ادبی اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر عابد حسین کے ترجمے، تصانیف اور فلسفیانہ مضامین دیکھے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ ان کا انداز نظر کتنا غیر مبہم، سادہ، بناوٹ سے پاک اور منصفانہ ہے۔ یہی خصوصیتیں ان کے مضامین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مضامین عابد میں آٹھ ادبی اور آٹھ طنزیہ مضامین شامل ہیں۔ ادبی مضامین سبھی اہم ہیں۔ پہلا مضمون "اقبال کا تصور خودی" ہے۔ اقبال پر سیکڑوں مضامین ایسے لکھے گئے ہیں جن میں خودی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ مضمون ان سب سے زیادہ واضح اور جامع شکل میں اقبال کے خیالات کی تشریح کرتا ہے اور انھیں ترتیب دے کر پیش کرتا ہے۔ اس مضمون میں یہ کمی ضرور ہے کہ اس میں تصور خودی کی داخلیت اور تصور محض ہونے یا نہ ہونے کی توضیح اور تنقید نہیں کی گئی ہے، اگر اقبال کی خودی اپنی منطقی حدوں پر جا کر حقیقت کا جامہ پہن لے تو سماج کی کیا شکل ہوگی اگر بہت سے افراد کی خودی مکمل ہو جائے تو نیابت الٰہی کے مستحق کتنے ہوں گے اور معاشرہ کی تنظیم کس طرح ہوگی؟ حصول خودی کے مادی ذرائع کیا ہوں گے اور معاشرہ میں اس کی جدوجہد کیسی مادی یا طبقاتی کش مکش پیدا کرے گی، ان باتوں کی توضیح بھی نہیں ہوتی، تاہم اقبال کا تصور خودی سمجھنے کے لئے اس سے واضح مضمون یا مقالہ میں نے نہیں پڑھا ہے، اسی طرح اقبال پر دوسرا مضمون "عقل و عشق اقبال کی شاعری میں" نہایت سلاست سے اقبال کے خیالات کی تشریح تصورات جدیدہ کی روشنی میں کرتا ہے۔

سر راس مسعود، مولانا عبدالحق اور حکیم اجمل خاں کے مختصر خاکے ان بزرگوں کی سیرت اور کردار کو اس خوبی سے روشن کرتے ہیں کہ تفصیلات اور زندگی کے حالات و واقعات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ۱۹۳۶ء میں حالی صدی کے موقع پر رسالہ جامعہ کے لئے جو مضمون لکھا تھا وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین حالی کو نہ صرف اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ سیرت میں بھی ان سے مشابہ ہیں اس لئے انھوں نے حالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ محض تذکرہ یا خاکہ نہیں ہے بلکہ اعلیٰ پائے کا علمی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ چند صفحوں میں حالی کی سیرت، شاعری، تنقید سوانح نگاری ہر چیز کی اساسی حیثیت نمایاں ہو گئی ہے۔ "برنارڈ شا" اور "ڈراما کیا ہے" دو اور ادبی مضامین ہیں جو دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ برنارڈ شا پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے لیکن اب جو شخص بھی قلم اٹھائے گا اسے نہ صرف اس مضمون سے مدد ملے گی بلکہ اس منزل اور معیار سے آگے بڑھنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ ڈرامے پر جو مضمون ہے وہ بھی علمیت

بقیہ صفحہ ۴۴

ہفتہ وار
نئی روشنی
۱۶ راکتوبر سنہ [illegible]ء

ذمہ دارانہ مخالفت

جمہوری ملکوں میں حکومت کی ذمہ داری اس پارٹی پر ہوتی ہے جو عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرکے یہ ثابت کردے کہ ملک کا ارادہ عامہ اس کے ساتھ ہے۔ دوسری پارٹیاں جنھیں اکثریت کے پارٹی پروگرام سے اتفاق نہیں ہوتا، عام طور پر مل کر ایک متحدہ محاذ بنا لیتی ہیں جسے اپوزیشن یا مخالف پارٹی کہتے ہیں۔ مخالف پارٹی کا کام زیادہ تر منفی ہوتا ہے یعنی حکومت کی پالیسی پر تنقید کرنا، اس کے نظم و نسق کی کمزوریوں، غلطیوں اور ناانصافیوں کا پردہ فاش کرنا۔ قدرتی طور پر حکومت کرنے والی پارٹی پر ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے اس لئے کہ قوم نے ایک مقررہ مدت کے لئے اپنے اقتدار اعلیٰ کا امین بنایا جائے اور اس سے یہ توقع رکھتی ہے کہ ملک کی حفاظت کرے گی، امن و امان عدل و انصاف قائم رکھے گی۔ جمہور کی مادی فلاح اور اخلاقی صلاح کے لئے قانون بنائے گی اور ان کی تعمیل کرائے گی لیکن مخالف پارٹی بھی ذمہ داری سے بری نہیں ہوتی گو اسے فی الحال اصولی یا عملی وجوہ سے ارادۂ عامہ حکومت کے قابل نہ سمجھے مگر اس کا اہل ضرور سمجھتا ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کی اکثریت اور اس کی نمائندہ حکومت کے کاموں پر کڑی نگرانی رکھے اور اس کی کوتاہیوں سے جمہور کو آگاہ کرتی رہے۔ اس لئے حکومت لکھے یا بن لکھے آئین کی رو سے اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پالیسی کے معاملات میں مخالف پارٹی سے مشورہ لیتی رہے چاہے پھر اس مشورے کو قبول کرے یا نہ کرے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ اپنی سب کارروائیوں اور سرگرمیوں سے کسی نہ کسی منزل پر مخالف پارٹی کو مطلع کرے۔ اس کی تنقید اور اعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔

غرض مخالف پارٹی بھی کسی نہ کسی حد تک ارادۂ عامہ کی امین اور اس کی طرف سے ذمہ داری کی حامل ہے۔ اس کی حیثیت امیدوار کی سی ہوتی ہے جسے کوئی بڑا کام سپرد کرنے سے پہلے اس کی آزمائش کے طور پر کوئی چھوٹا سا کام کرنے کو دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں آزادی سے پہلے قانون ساز مجلسوں میں مخالف پارٹی کی یہ حیثیت نہ تھی۔ کانگریس کو جو بعض اوقات اکثریت میں ہونے کے باوجود حکومت سے محروم اور حزب مخالف بننے پر مجبور ہوتی تھی مخالف پارٹی کا اصلی منصب اور اس کے حقوق حاصل نہیں تھے اور باقیوں کا تو کیا ذکر ہے۔ بڑے سے بڑے اندرونی اور بیرونی معاملات یہاں تک کہ جنگ اور صلح کے معاملے میں بھی اس سے رائے نہیں لی جاتی تھی۔ کانگریسی ممبر صوبائی اور مرکزی مجلسوں میں تماشائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے جنھیں صرف اسٹیج کی سرگرمیاں نظر آتی تھیں۔ پردے کے پیچھے کا حال کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے ظاہر کرنے کا حق حاصل تھا، مگر اسی حد تک جتنا ہر تماشے میں تماشائیوں کو ہوتا ہے۔ اس حق سے وہ خوب خوب کام لیتے تھے۔ مہاتما گاندھی کی اخلاقی تعلیم کا اتنا اثر ضرور تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں نفرت اور عداوت بغض اور کینے کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے۔ مگر غم و غصے کے جذبات کو جو مایوسی اور بے بسی کی حالت میں لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں دبانا ان میں سے اکثر کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چند بڑے بڑے آدمیوں کو چھوڑ کر جو اس حالت میں بھی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے تھے عام طور پر کانگریسی ممبروں کی تقریریں مخالفانہ اور غیر ذمہ دارانہ ہوتی تھیں۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں سے گرفتاری حد تک ہر چیز کا الزام برطانوی حکومت پر رکھتے تھے اور کبھی بھولے سے بھی اس کے کسی کام کی تعریف نہیں کرتے تھے۔

ماضی قریب کی ان روایات کی وجہ سے ہماری نئی جمہوریت کے لئے دوہرا خطرہ ہے۔ ایک طرف یہ کہ کہیں اکثریت یا حکومت کرنے والی پارٹی حزب مخالف کو اسی طرح دودھ کی مکھی نہ سمجھے جیسے برطانوی حکومت کانگریس کو سمجھتی تھی اور دوسرا یہ ہے کہ کہیں مخالف پارٹیاں حکومت پر اعتراض اور تنقید کرنے میں اتنی یا اس سے بھی زیادہ غیر ذمہ داری نہ برتیں جتنی پہلے کانگریس کے بہت سے ممبروں کی تقریروں میں ہوا کرتی تھی۔

آئین ساز مجلسوں میں تو اس وقت در اصل کسی قابل ذکر مخالف پارٹی کا وجود ہی نہیں ہے لیکن ان کے باہر کانگریس کی کئی مخالف پارٹیاں یا حلقے موجود ہیں۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مخالفت کو بالکل محسوس نہیں کرتی یا اس سے متاثر نہیں ہوتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ احساس اور تاثر ان ہی پارٹیوں کے مقابلے میں ہے جو اس وقت طاقت ور سمجھی جاتی ہیں۔ اس رویے پر ہمیں اعتراض ہے کہ مخالف حلقوں کی اہمیت کا معیار طاقت کو نہیں بلکہ حق کو چاہیئے۔ جن مخالفوں کا اعتراض یا شکایت بے جا ہو کانگریس جیسی جماعت کو جو مہاتما گاندھی کا نام لیوا ہو ان کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے چاہے وہ آج کتنے ہی طاقت ور نظر آتے ہوں، لیکن جن لوگوں کی مخالفت حق پر مبنی ہے، انھیں حقیر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے وہ آج کمزور ہیں تو کل نہیں رہیں گے۔ حق میں بے پناہ طاقت ہے۔

اب کانگریس کے نقادوں کو لیجئے جن میں بعض کانگریسی بھی شامل ہیں تو ان کا طرز عمل عام طور پر بہت افسوسناک ہے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی نکتہ چینی تنقید نہیں ہوتی بلکہ تنقیص ہوتی ہے اور وہ بھی غیر ذمہ دارانہ، تخریبی، ذاتیات اور شخصیات پر مبنی اور کبھی کبھی بالکل بے بنیاد۔ ان حضرات کی مخالفت کا رنگ دیکھ کر طبیعت پر مایوسی چھا جاتی ہے کہ شاید ہماری سیاست میں ایک عرصے تک صحت مند اور ذمہ دار مخالف پارٹی نہیں بن سکتی۔

لیکن اس تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ سوشلسٹ جماعت جو پہلے کانگریس کا ایک جاندار عنصر تھی اور پچھلے سال سے کانگریس کو چھوڑ کر ایک مستقل پارٹی بن گئی ہے، ہمت اور استقامت کے ساتھ جمہوریت کی راہ پر چل رہی ہے اور اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ اگر اسے آئندہ انتخابات میں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی تو مرکزی پارلیمنٹ اور صوبوں کی مجالس میں مخالف پارٹی کے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرے گی۔ پچھلے دنوں یوپی میں یہ شکایت سننے میں آئی تھی کہ سوشلسٹ حکومت کے غلہ جمع کرنے کے کام میں اور زمینداری ختم کرنے کی مہم میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ دوسری پارٹیوں کی طرح جو کانگریس کی مخالف ہیں، سوشلسٹ پارٹی بھی محض رقابت ضد اور غصے کے جذبات سے متاثر ہے اور تعمیری تنقید کی جگہ حکومت کو بجا اور بے جا بدنام کرنے اور اس کے اچھے برے سب کاموں میں رکاوٹ ڈالنے پر اتر آئی ہے لیکن سوشلسٹ پارٹی کی جنرل کونسل کے اجلاس نے جو حال میں بنگلور میں منعقد ہوا تھا، یہ ثابت کر دیا ہے کہ چند افراد جو کچھ بھی کر رہے ہوں سوشلسٹ پارٹی بہ حیثیت جماعت ہرگز یہ تخریبی پالیسی نہیں رکھتی بلکہ جمہوری حزب مخالف کا سچا نمونہ بن کر دکھانا چاہتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کی وضاحت کر دی کہ جب تک ملک میں ذمہ دار حکومت رہے گی وہ سیاست میں پرتشدد انقلابی طریقے کے بجائے پر امن جمہوری طریقے سے کام کرے گی۔ (جس میں سول نافرمانی، ستیہ گرہ اور ہڑتال شامل ہیں) اس کے علاوہ سوشلسٹ پارٹی کے ممتاز لیڈر جے پرکاش نرائن نے یہ اعلان کیا کہ غذا کی پیداوار بڑھانے کی مہم میں ان کی پارٹی ہر طرح حکومت کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال کی رپورٹ میں جو انھوں نے کونسل کے سامنے پیش کی جہاں کانگریسی حکومت کی پالیسی پر بہت سے اعتراضات ہیں وہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ حکومت نے ہندوستانی ریاستوں کو انڈین یونین میں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

تلاشِ امریکہ

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ۹ اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور لندن میں مسٹر اٹیلی اور سر اسٹیفرڈ کرپس سے مل کر ۱۱ اکتوبر کو پریسیڈنٹ ٹرومین کے خاص ہوائی جہاز میں جو ان کو لینے کے لئے لندن بھیجا گیا تھا واشنگٹن پہنچ گئے جیسے ہی پنڈت جی نے جہاز سے اتر کر امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا، ۱۹ توپوں کی سلامی ہوئی۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا اور اپنی کیبنٹ کے وزرا اور مجلس استقبالیہ کے ممبروں کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے جو الفاظ خیر مقدم کے طور پر کہے، ان میں ایک جملہ ادبی شان رکھتا تھا حقیقت کو یہ منظر بتا کر آپ کے ملک تک پہنچنے کے لئے ایک نئی راہ کی تلاش کے سلسلے میں ہمارا ملک دریافت ہوا تھا، امید ہے کہ آپ کی تشریف آوری بھی ایک لحاظ سے امریکہ کی دریافت ثابت ہوگی۔ واقعی پنڈت جی کے سفر امریکہ سے جو مفید نتیجہ یقینی طور پر حاصل ہوگا وہ یہی ہے کہ ہمیں پہلی بار ایک ذی علم، وسیع النظر، باریک بین، انصاف پسند ایشیائی کے تاثرات نئی دنیا کے بارے میں معلوم ہوں گے اور جو بیگانگی ہمیں امریکہ والوں سے ہے وہ کسی حد تک دور ہو جائے گا بلکہ پنڈت جی کی ملنسار طبیعت کے واسطے سے ہم میں اور ان میں دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ پنڈت جی کے شاندار اور پرجوش استقبال کی خبروں سے جو روز آ رہی ہیں اس امید کو اور زیادہ تقویت پہنچی ہے لیکن اس کے علاوہ جتنی امیدیں اس سفر سے باندھی جا رہی ہیں کہ امریکہ سے ہندوستان کو صنعتی ترقی کے لئے قرضہ، فنی مشورہ اور دوسری سہولتیں ملیں گی وہ اگر موہوم نہیں تو مشتبہ ضرور ہیں، اس لئے کہ جن شرطوں پر امریکہ قرضہ دینا چاہتا ہے اور جن شرطوں پر ہندوستان لینا چاہتا ہے ان میں بہت بل ہے اور اس کا دور ہونا آسان نہیں۔ پنڈت جی کے ساتھ مالیات کے زبردست ماہر سر چنتا منی دیش مکھ مشیر کے طور پر موجود ہیں، اس لئے توقع ہے کہ وہ وزیر اعظم کو ان بھیدوں اور خطروں سے آگاہ کرتے رہیں گے جو اس قسم کے معاملات کی راہ میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں، اور غفلت یا جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

آئین سازی کی رفتار

آئین ساز اسمبلی کا کام خاصی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد عام انتخاب تک جو ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں ہوں گے، اسمبلی عارضی پارلیمنٹ کے طور پر کام کرتی رہے گی۔ مگر اس کے سب ممبر جو صوبوں کی کونسلوں کے بھی ممبر ہیں، استعفا دیدیں گے، اور ان کی جگہ صوبائی کونسلیں نئے ممبر منتخب کریں گی۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ مسلمان ممبروں کی جگہ مسلمان، سکھوں کی جگہ سکھ، اور ہریجنوں کی جگہ ہریجن منتخب ہوں۔ سب سے زیادہ معرکے کی بحث اس پر ہوئی کہ آئی سی ایس اور دوسری امپیریل سروسوں کے موجودہ ممبروں کو جو حقوق نئے آئین کے نفاذ کے وقت حاصل تھے وہ اس کے نفاذ کے بعد بھی حاصل رہیں گے۔ بہت سے حضرات نے جس میں اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی شامل ہیں، اس موقع پر ان سروسوں پر جنھوں نے برطانوی حکومت کے زمانے میں تحریک آزادی کو کچلنے کی پوری کوشش کی تھی، خوب لعن طعن کی اور انھیں دوسرے سرکاری ملازموں کے مقابلے میں زیادہ حقوق دینے کی مخالفت کی۔ لیکن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے ماتحتوں کی حمایت میں اس زور شور کی تقریر کی اور ان کی قابلیت، وفاداری اور کارگذاری کا ایسا سکہ جمایا کہ ساری مخالفت ہوا ہو گئی اور کسی کو ترمیم کے خلاف رائے دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

باہر کی دنیا

چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام نے بین الاقوامی توازن طاقت کو بہت نمایاں طور پر بدل دیا ہے۔ چینی کمیونسٹ حکومت کے لیے چوڑے ملک میں ایک کثیر تعمیری کام کرنے ہیں۔ اس لئے امن اور صلح ان کی سب سے بڑی آرزو ہوگی۔ اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں امن کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ روس نے ایٹم بم بنا لیا ہے اور اس واقعہ سے بھی سمجھدار لوگوں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اس سے امن کا پلہ بھاری ہوگا۔ امریکہ کے بعض حلقوں میں یہ بات کبھی کبھی چپکے چپکے اور بیشتر کھلے بندوں کہی جاتی رہی ہے کہ روس کے خلاف جلد سے جلد فوجی کارروائی شروع کر دینی چاہیے تاکہ امریکہ ایٹم کے اجارے سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اور روس کو نیست و نابود کیا جا سکے۔ جب تک یہ بات معلوم نہ تھی کہ روس کے پاس ایٹم بم ہے امریکہ کے عام لوگوں کو یہ یقین دلایا جا سکتا تھا کہ روسی ایٹم بم نہیں بنا سکتے ہیں۔ فوجی کامیابی کی اُمید بہت یقینی ثابت کی جا سکتی تھی پچھلی جنگ میں امریکہ کو جان کی جو قربانیاں دینی پڑی تھیں وہ روس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس لئے امریکی عوام کو جنگ کی تباہ خیزی کا پورا پورا تجربہ بھی نہیں ہے۔ انھیں یہ یقین دلا دیا جاتا کہ نئی جنگ میں تو پھر انھیں روزگار کے مواقع زیادہ ملیں گے اور سرمایہ دار اور نفع بٹور سکیں گے تو ان کے مخالف جنگ جذبہ کو بڑی حد تک کمزور کیا جا سکتا تھا۔ یہی صورت یورپ میں ممکن تھی، مغربی یورپ کے لوگوں میں اب جنگ کا جذبہ بالکل ہی سرد پڑ جائے گا۔ کیونکہ اب انھیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اگر امریکہ روس پر ایٹم بم برسا سکتا ہے تو روس لندن اور پیرس کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ یہ احساس بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دے گا۔ اور اب امن کی بات چیت زیادہ سنجیدگی اور خلوص سے ہوگی۔

فوجی میدان میں ایٹم بم کی دریافت نے جو کام کیا ہے سیاست کے میدان میں وہی نئی چینی حکومت کے قیام سے انجام پائے گا۔ چینی وزیر خارجہ نے مختلف ملکوں کو اطلاع دی ہے کہ ان کی نئی حکومت دوسرے ملکوں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار ہے۔ روس سے چینی حکومت کے تعلقات قائم بھی ہو چکے ہیں اور مشرقی یورپ کی کئی جمہوری حکومتوں نے بھی نئی چینی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ لندن سے ایک خبر آئی تھی کہ حکومت ہند بھی نئی حکومت کو جلد ہی تسلیم کرے گی کیونکہ اسے اس طرح یہ ثابت کرنے کا موقع ملے گا کہ تبت میں جو واقعات پیش آئے تھے اس سے حکومت ہند کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مسئلے میں سب سے زیادہ لیت و لعل برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے ہوگا۔ برطانیہ مشرق بعید سے گہرے تجارتی تعلقات رکھنا چاہتا ہے اور برطانوی خارجی تجارت کا مفاد بعض مرتبہ حکومت کو بڑے کڑوے گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے قیاس یہ ہے کہ برطانوی حکومت بھی جلد ہی نئی حکومت کو تسلیم کرے گی۔ اس سے ایک تو یہ امید ہے کہ چین سے برطانیہ کو تجارت کا حق مل جائے گا اور ہانگ کانگ جیسے نزاعی مسائل پر کچھ عرصے کے لئے خاموشی رہے گی۔ امریکہ میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید کوئی معجزہ چیانگ کو "چین کی قسمت" کا مالک بنا دے اور ان کے لئے یہ فیصلہ ظاہر ہے، بہت دشوار ہوگا کہ چینی کمیونسٹوں کی حیثیت کو قانوناً تسلیم کر لیا جائے۔ عملاً تو چین ان کا ہو چکا۔ اسے امریکہ بھی اب جھٹلا نہیں سکتا۔

الگ الگ ان حکومتوں کے لئے چینی حکومت کے قیام نے ایک درد سر کا سامان پیدا کر دیا ہے لیکن اس سے زیادہ درد جگر کا سامان نام نہاد متحدہ اقوام کے سامنے ہے [illegible] کا ادارہ ایک جمہوری ادارہ ہے جس میں اکثریت کے فیصلے سب پر حاوی ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنوبی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد ملک [illegible] ان کے فیصلے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیا ہے۔ پچھلے دنوں [illegible] ممبری کی درخواست کے سلسلے میں [illegible]

[illegible]

بزمِ بے تکلف

"یا اللہ خیر! یہ سویرے سویرے کون سی بلا نازل ہوئی؟ ارے! آپ ہیں؟ بھئی خوب آئے بابو صاحب۔ اس وقت آپ ہی کی ضرورت تھی۔ آج صبح تڑکے سے دل پر کچھ گھبراہٹ سی ہے اور خمیرہ گاؤ زبان جو کچھ بچا کھچا رہ گیا تھا وہ چوہے کھا گئے"

"ظاہر ہے شاعر کے گھر کے چوہے بھی خفقانی ٹھہرے۔ مگر میری آپ کو کیا ضرورت تھی؟ کیا میں کوئی خمیرہ یا معجون ہوں؟"

"واہ بابو صاحب واہ! آپ کو آج تک اپنی خاصیت کی خبر نہیں۔ اجی آپ تو طرفہ معجون ہیں۔ مزاج، قوام، چاشنی ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور پھر تاثیر کا کیا کہنا

باعثِ فرحتِ دلِ بے تاب
رافعِ قبضِ خاطرِ احباب"

"واللہ خوب کہی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معجون کی تعریف ہے یا مسہل کی؟ آخر آپ نے جلاب کا قافیہ کیوں نہیں باندھا"

"جلاب بھی کوئی باندھنے کی چیز ہے؟ آپ جس شاعر یا حکیم سے چاہئے پوچھ لیجئے۔ اچھا اب اس ذکر کو چھوڑیئے یہ بتلائیے کہ آپ کے اور پروفیسر رنگا کے دوست میاں چیانگ کائی شک کا کیا حال ہے؟"

"حال کیا ہوتا ڈٹا ہوا ہے میدان میں"

"کمال کیا آپ نے حریف تو پیچھے ڈھکیلتے ڈھکیلتے سمندر تک تو پہنچا دیا اور آپ فرماتے ہیں کہ ڈٹا ہوا ہے"

"اجی وہ موسا توں کیا ڈھکیلتا۔ ہمارے پہلوان نے آپ ہی ڈھکیلی کھائی میاں خوجی کی طرح"

"کیا کہنا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈھکیلی میں غڑاپ سے بحرچین کے اندر نہ پہنچ جائے"

"تو اس میں کون سا غضب ہو جائے گا۔ وہاں بھی میرا شیر مگرمچھ کی طرح اینڈتا پھرے گا مگر دیکھو انصاف سے کہنا۔ ایسے دم خم کسی کے دیکھے ہیں؟ مٹھی بھر آدمیوں کو لئے کشتوں میں اسی شان سے اکڑ رہا ہے جیسے اب بھی ساری چینی فوج کا سپہ سالار ہو"

"بابو صاحب جب تک سدھ بدھ نہ ہو خالی دم خم سے کام نہیں چلتا۔ آپ نے یہ نئی حرکت بھی ملاحظہ کی؟ مادام سن یات سین کی گرفتاری کا حکم صادر فرمایا ہے۔ کوئی پوچھے کہ میاں چرکٹ تم مادام کو کیا گرفتار کرو گے کہیں اس دام میں آپ ہی نہ پھنس جاؤ"

"ارے وہ بچارا تو پہلے ہی کمربندی رشتے میں جکڑا ہوا ہے سمجھئے بقول ع خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا مگر اس کی وحشت سے تو زنجیر بھی پناہ مانگتی ہے اب سنا ہے کینٹن سے چنگ کنگ کی تیاریاں ہیں"

"کیا کیا جائے

بالیدہ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"

آتشِ سیال

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب نہ ٹوٹیں گے کبھی میری اِن آنکھوں سے گہر
اب نہ کچلی ہوئی روحوں سے دھواں اُٹھے گا
اب نہ شرمائے گی ناکام اُمنگوں پہ حیات
سازِ مطرب سے نہ اب شورِ فغاں اُٹھے گا
اب نہ لے کر کبھی موہوم دھندلکوں کا غبار
وادی و کوہ سے یہ ابرِ رواں اُٹھے گا

سالہا سال یہ افسردہ خیالوں کا اُفق
لے کے آیا ہے دمکتی ہوئی صبحوں کا فسوں
موسمِ گل کے حسیں قدموں کی آہٹ سُن کر
جیب و دامن سے بھی آزاد ہوا ہے یہ جنوں

جس نے نادیدہ بہاروں کا ترانہ چھیڑا
یک بیک جیسے یہ مرغانِ چمن جاگ اُٹھے
پھول برسائے گئے کیسے یہ صحراؤں میں
چونک کر آج غزالانِ ختن جاگ اُٹھے
جیسے تخئیل میں ٹوٹی ہو کہیں اک زنجیر
جیسے خوابوں میں کبھی اپنا وطن جاگ اُٹھے

میں نے اس طرح چمکتی ہوئی ان راہوں کو
کتنی ہی بار نئی زیست کا عنوان سمجھا
ناخداؤں نے تو ہنس ہنس کے ڈبو دی کشتی
اور میں اس کو نئے دور کا طوفاں سمجھا

اب یہ دیوانے اُبھرتے ہیں اسی طوفاں سے
پھیلتی آج ہواؤں میں ہے زخموں کی مہک
میکدے آتشِ سیال سے خود جل اُٹھے
نئے انداز سے گونج اُٹھی یہ ساغر کی کھنک
آج رقصندہ ہے پھر قطرۂ شبنم پہ شرار
ایک پیغامِ بغاوت تھی یہ غنچوں کی چٹک

میری جن آنکھوں نے اشکوں کا سہارا ڈھونڈا
اب دہکتے ہیں انھیں آنکھوں میں یہ انگارے
اب نکھرتی ہے فضاؤں میں لہو کی سُرخی
اب کہاں روکے سے رُکتے ہیں یہ غم کے دھارے

جرائم کس طرح روکے جائیں

(نفسیاتی نقطۂ نظر سے)

خواجہ جلیل احمد

(۲)

موجودہ نظریۂ عدل ہر مجرم کو معصوم قرار دیتا ہے لیکن ایسا سمجھنا یقیناً صحیح نہیں ہے۔ اکثر عادی مجرمین جرم کی نوعیت اور سزا سے واقف ہوتے ہوئے بھی ارتکاب جرم کرتے ہیں اور اگر ایسا فرض بھی کیا جائے جو یقیناً نفسیاتی تعلیم کے منافی ہے مگر بھی عملاً مجرمین پر تشدد کرتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گرفتاری کے بعد پولیس مجرمین کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے جس کا قانوناً اسے کوئی اختیار نہیں۔ اس صورت حال کو بھی روکنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تو رہا قانون کا عملی پہلو لیکن جہاں تک ہمارے اصل مقصد کا سوال ہے۔ ہم کو ہمیشہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جن میں جرائم کا ارتکاب ناممکن ہو جائے۔ واقعات شاہد ہیں کہ جرائم کی کثیر تعداد معاشی دقتوں کا نتیجہ ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ہمارے پاس گزر اوقات کے لئے روپے ہوں گے تو ہم یقیناً چوری نہیں کریں گے۔ علاوہ ازیں بعض حکومتوں نے (جن میں سوویٹ روس بھی شامل ہے) اپنا معاشی نظام تسکین بخش بنا کر جرائم کی تعداد کم کر دی ہے۔ اس موقع پر مجھے کمیونزم کی تعریف مقصود نہیں۔ یقیناً اس نظام میں بہتیری خرابیاں ہیں لیکن جو اچھی بات ہے اسے ہمیں تسلیم کرنا ہی ہوگا۔ بقول جواہر لال نہرو روس کی اور کمزوریوں سے قطع نظر انھوں نے بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ یقیناً ختم کر دیا ہے۔ ہمیں اس ملک میں بھی ایسے حالات پیدا کرنا ہیں جو معاشی تکالیف کو ختم کر دیں۔ پھر اخلاقیات پر اس کا بالواسطہ اور "ارتکاب جرائم" پر براہ راست اثر پڑے گا۔ اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو شاید رسکن نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ماحول اخلاقیات کو درست کرتا ہے۔ حالات کے سدھر جانے پر پبلک کی بہبود انسانیت کی بہتری غرض کہ ہر اچھی چیز کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دور کیوں جائیے کسی دن بھوکے رہ کر خود دیکھ لیجئے اور اس کا اندازہ کیجئے کہ اخلاقی افعال کے برتنے کا زیادہ خیال دل میں پیدا ہوتا ہے یا بھوک مٹانے کا۔ ایک بھوکے سے یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عوام کی بہتری کی کوشش کر جس کی حالت خود ابتر ہو وہ کسی کے کیا کام آسکے گا۔ ہم کو اور ہماری حکومت کو اس ہمہ گیر نفسیاتی حقیقت کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے جواب میں ہو سکتا ہے کچھ لوگ مہاتما گاندھی اور دوسرے رہبران قوم و ملت کی مثال دیں۔ لیکن وہ لوگ مستثنات میں سے ہیں۔ ساری آبادی مہاتما گاندھی یا امام حسینؓ نہیں بن سکتی۔ یقیناً ہمارا آخری مقصد یہی ساری آبادی بلکہ ساری دنیا کو آخر کار اسی نمونے پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن فی الحال اس مفلوک الحالی کے زمانے میں عوام کی ذہنیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

انسان کا ہر فعل سوائے ان افعال کے جو خود بخود ہوتے ہیں اور جن کو نفسیات اور فزیالوجی ریفلکس ایکشن یا اضطراری حرکات کا نام دیتی ہے، اپنے پیچھے ایک مقصد پوشیدہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے روٹی چرائی تو یہ چوری مختلف مقاصد اور خیالات کی بنا پر کی جا سکتی ہے: اول شدید گرسنگی کی حالت میں، دوم معمولی بھوک کی حالت اور اخلاقی اور سماجی پابندیوں سے منکر ہونے کی صورت میں، سوم معمولی اشتہا اور معمولی اخلاقی پابندی کے باوجود مناسب موقع ملنے کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔ اس مثال سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ روٹی چرانے کی ایک حرکت جو بظاہر یکساں معلوم ہوتی ہے۔ مختلف مقاصد اور خیالات کے ماتحت کی گئی۔ ہر فعل کے ارتکاب کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا قانون ہر معلّی کی ایک خاص مقدار کی چوری پر یکساں سزا ہی دے گا، کیونکہ ان کے نزدیک ہر شخص اپنے فعل کا قطعی ذمہ دار ہے، بشرطیکہ وہ صحیح دماغی حالت میں ہو، اور علاوہ ازیں قانون یہ بھی فرض کرتا ہے کہ اس کو اس فعل کے جرم ہونے کا احساس تھا۔ اور وہ اس کی سزا سے بھی واقف تھا۔ حالانکہ ہو سکتا ہے ایک جاہل آدمی کسی معمولی چیز کی چوری کرے اور اس کو اس کا تو علم ہے کہ ایسا کرنا برا ہے لیکن اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے، اس سے وہ ناواقف ہو۔ بہر حال سزا کے تعین میں نفسیاتی اسباب کا خیال رکھنا پوری طرح انصاف کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ "غیر طبعی نفسیات" جو پہلی جنگ کے بعد کی پیداوار ہے اور "عام نفسیات" کی ایک شاخ ہے ایسے ایسے دماغی امراض دریافت کر چکی ہے جن کا

> ......طبعی نفسیات نے......
> ایسے ایسے دماغی امراض دریافت کر چکی ہے، جن کا مریض اکثر اوقات عام لوگوں کی طرح کام کاج کرتا ہے اس کی گفتگو، اس کی تقریر، تحریر غرضکہ کسی حرکت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دماغی مریض ہے لیکن دراصل اس کے اندر خاص حالات کی بنا پر کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی بنا پر وہ جرم کرتا ہے...... مجرمین کا دماغی معائنہ کرنے کے بعد امریکی ماہرین نے پتہ لگایا ہے کہ دماغی کمزوری اور جرم میں بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے......

مریض اکثر اوقات عام لوگوں کی طرح کام کاج کرتا ہے، اس کی گفتگو، اس کی تقریر، تحریر، غرض کسی حرکت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دماغی مریض ہے لیکن دراصل اس کے اندر خاص حالات کی بنا پر کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ جرم کرتا ہے مثلاً ایک قسم کے مریض جو جنسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں سیڈسٹ کہلاتے ہیں۔ ان کو محبوب کو تکلیف دینے، نقصان پہنچانے حتیٰ کہ قتل کر دینے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ فرانس میں ایک سیڈسٹ آٹھ، دس قتل پراسرار طور پر کرنے کے بعد گرفتار ہوا اور آپ کو سن کر شاید تعجب ہو کہ مقتول سب خوبصورت عورتیں تھیں، ان کو چھرے سے ہلاک کیا گیا تھا اور چھرے ایسے مقامات پر مارے گئے تھے جہاں سے کوئی نفسانی لذت حاصل کی جاتی ہے۔ موجودہ قانون کی رو سے اس شخص کو پھانسی ہونی چاہیے۔ لیکن نفسیاتی تحقیقات کی رو سے وہ بے قصور ہے۔ پھانسی سے زیادہ اس کے علاج کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کو مستقل طور پر محبوس کر کے پاگل خانہ بھیج دینا اس کے ساتھ مناسب انصاف ہوگا۔ اس قسم کی اور بھی بہتیری مثالیں دی جا سکتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ جج کے لئے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ نفسیات کا ماہر ہو اور اگر ایسا ناممکن ہو، جیسا کہ دراصل ہے، کیونکہ ایک ہی شخص بیک وقت قانون اور نفسیات دونوں کا ماہر نہیں ہو سکتا تو پھر ہر عدالت میں ماہرین نفسیات کا تقرر کیا جائے۔

مختلف پاگل خانوں اور دوسری تربیت گاہوں میں مجرمین کا دماغی معائنہ کرنے کے بعد امریکی ماہرین نے پتہ لگایا ہے کہ دماغی کمزوری اور جرم میں بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے چنانچہ ایک جیل میں سو مجرمین کا جو چوری، بد معاشی، اور آوارگی کی بنا پر سزایاب ہوئے تھے۔ دماغی معائنہ کیا گیا، ان میں سے صرف

ایک کو چھوڑ کر بقیہ سبھی دماغی حیثیت سے معمولی آدمی نہیں تھے، اُن میں سے ۴۳ کی ذہنی عمر اپنی اصلی عمر سے تین سے کر چھ سال تک کم تھی، ان کی جسمانی عمر کا اوسط ۸ء۱۳ تھا اور دماغی عمر اس سے تقریباً ۴½ درجہ کم یعنی ۳ء۹ تھی۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے نتائج یہ ثابت کرتے ہیں کہ جرم کے اسباب میں نفسیاتی وجوہات کتنی زبردست اہمیت رکھتی ہیں اور قانون کا یہ رویہ کہ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے کس قدر سطحی ہے۔

عورتوں اور بچوں کے جرائم پر ہمیں خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دماغی امراض ان میں جلد پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا زناکاری، طلاق، بے رحمی، اور آوارہ گردی کے مقدمات فیصل کرتے وقت منصفین کا فرض ہے کہ حالات کا بغور مطالعہ کریں، کیونکہ عام طور سے یہ جرائم دماغی کمزوری اور دوسری ذہنی علامتوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ ذہنی حیثیت سے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اور عورتیں سماج کے لئے کتنی مضر ثابت ہو سکتی ہیں، اس کا اندازہ پولیس کی رپورٹوں سے ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی ذہنی کمزوری کا پتہ اس وجہ سے کم چلتا ہے کہ وہ ایسے پیشے اختیار کرتی ہیں جن میں دماغی قابلیت کی کمی بیشی کا اندازہ نہیں ہوتا، چنانچہ اگر دماغی معائنہ کیا جائے تو بیشتر بدکار لڑکیاں اور عورتیں مختلف علالتوں میں مبتلا پائی جائیں گی۔ ایسی لڑکیاں اکثر یا تو پیشہ کرنے لگتی ہیں یا دوسری بری عادات کا شکار ہو جاتی ہیں، یہی حال لڑکوں کا ہے۔ لڑکوں میں جنسی مجرموں کی بڑی تعداد یقیناً دماغی حیثیت سے کم عمری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایل وایسی ہالنگ ورتھ نامی ایک امریکی ماہر نفسیات نے بھی اسی قسم کے اعداد و شمار دیئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی کم عمری کے باعث عموماً جنسی جرائم سرزد ہوتے ہیں۔

مجرموں کی ذہانت کے امتحانات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی ذہنی عمر مختلف جرائم کی نوعیت سے مختلف ہوتی ہے مثلاً جعل سازی کے مجرمین عام طور سے اور مجرموں کے مقابلے میں زیادہ ذہین و طباع ہوا کرتے ہیں، لیکن تقریباً نصف یا نصف سے زیادہ جنسی جرائم کے مرتکبین غبی اور ذہنی حیثیت سے کمزور ہوتے ہیں، تاہم بعض ماہرین کے تجربات شاہد ہیں کہ اکثر مجرمین ذہنی طور سے بالکل طبعی حیثیت رکھتے ہیں بہرحال ان تمام متضاد باتوں کو ملا کر یکجا غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر جرم دماغی کمزوری کا نتیجہ نہیں ہوتا کیونکہ اکثر مرد اور عورتیں جو سادہ زندگی بسر کرتی ہیں، باوجود کمزور دماغی کے جرم کی طرف مائل نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں نیویارک اسٹیٹ کمیشن آف مینٹل ڈفکٹوز کی رپورٹ کافی دلچسپ ہے۔ اس کمیشن کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ پوری آبادی میں سے تقریباً ½ فی صدی افراد دماغی حیثیت سے کمزور کہے جا سکتے ہیں۔ ان افراد کو یقیناً مجرم بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ابتدائی عمر میں ان کی ذہنی کمزوری کا پتہ لگا لیا جائے، چنانچہ اکثریت کو ایسے دماغی ہسپتالوں میں رکھا جا سکتا ہے جہاں ان کا مناسب علاج کیا جا سکے اور بقیہ نسبتاً بہتر لوگوں کو ان کے گھر ہی پر مناسب نگرانی میں رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سے قبل اس کے کہ وہ مجرم بن سکیں اُن کے مختلف درجات قائم کرکے علاج اور مناسب تربیت دینی شروع کی جا سکتی ہے۔

اس مسئلہ میں اسکول اور کالج کافی مدد دے سکتے ہیں، کیونکہ طالب علموں کا ذہنی معائنہ کرکے اور ان کے روزمرہ کے کام کے مطابق ان کو یکجا کرکے علیحدہ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں تو ابھی واقعتاً نفسیات کے محکمے کا وجود ہی نہیں ہے لہٰذا اس کی سخت ضرورت ہے کہ تقریباً ہر یونیورسٹی اور کالج اپنے اپنے نفسیاتی محکمہ جات کھولیں اور اس کام کو جلد سے جلد شروع کر دیا جائے، کیونکہ ملک میں جرائم کی روز افزوں ترقی کو روکنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔

ہیلے نامی ایک مشہور ماہر نفسیات نے ایک مرتبہ ۸۲۳ مجرمین کا دماغی معائنہ کیا اور ان کے سارے حالات دریافت کئے تو اُسے معلوم ہوا ان میں سے زیادہ تعداد تو دماغی حیثیت سے کمزور لوگوں کی تھی لیکن اس کے بعد دوسرا نمبر ایسے لوگوں کا تھا جن کے گھر کا ماحول خراب تھا۔ گھر کے ماحول کی خرابی کے علاوہ آب و ہوا جغرافیائی حالات کے اعتبار سے ملک کی طبعی حالت، موسم اور وقت کی تبدیلیاں بھی جرم کے ارتکاب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ گرمی کے موسم میں مارپیٹ، جھگڑے فساد اور دوسری قسم کی لڑائیاں عام رہتی ہیں۔ دماغی مریض بھی اس موسم میں زیادہ تشدد پر اُتر آتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جن کا مرض ہر گرمی کے شروع ہوتے ہی شدت اختیار کر لیتا ہے اور وہ پھر اس عالم میں بقول خود ہر وقت پستول لے کر لوگوں کو مارنے کی فکر میں مستعد نظر آتے ہیں لیکن برسات کے آتے ہی مرض کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سردی کے موسم میں بھی کھانے پینے کا سامان غائب کرنے اور کپڑے وغیرہ کی چوریاں مستقل طور سے شروع ہو جاتی ہیں جاڑے کی لمبی راتیں بھی ویسے چوری کے لئے کافی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ راتوں کے علاوہ موسم کی اچھائی بھی اکثر جرائم کی ترغیب دینے کا باعث ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت جسمانی توانائی بڑھ جاتی ہے اور پھر اپنے اظہار کا مناسب طریقہ نہ پا کر جرم کی طرف مائل ہو جاتی ہے شاعر صاحبان اکثر اچھے موسم میں گناہ کی لذت محسوس کرنے لگتے ہیں اور خود ہی نہیں بلکہ اوروں کو ترغیب بھی دیتے ہیں۔

ایسے میں گر گناہ نہ کرتا گناہ تھا

لیکن یہ ذوق گناہ تو ایسا ہے جس کی پیدائش افزائش اور اشاعت سوسائٹی کے لئے مضر ہونے کے بجائے مفید سمجھی جاتی ہے اس لئے پولیس کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے ہم کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جرائم کے انسداد کے لئے نفسیات کا استعمال کس قدر ضروری حیثیت رکھتا ہے۔

دو کتابیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

اور حسن کاری کا مرقع ہے جس میں مستند اور واضح خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

بعد کے آٹھ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین اپنی سنجیدہ ظرافت اور متوازن طنز کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں لیکن ان میں وہ زور نہیں جو مزاح کی صورت میں ہنسنے پر اور طنز کی صورت میں تیر کھانے یا تیر کھاتے دیکھ کر مسکرانے پر مجبور کرے۔

ڈاکٹر عابد حسین کی نثر نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور پرکاری کا میل ہے، کوئی جملہ اور کوئی فقرہ الجھا ہوا نہیں، ہر چیز صاف ستھری اور رواں دواں ہے جیسے کوئی گہری ندی صاف شفاف پانی کے ساتھ متانت سے بہتی چلی جا رہی ہو۔ فلسفیانہ انداز نظر رکھنے والوں کے یہاں جو پیچیدگی نظر آتی ہے اُس کا شائبہ تک ڈاکٹر عابد حسین کی تحریروں میں نہیں ملتا مشکل سے مشکل مقام بھی ان کے قلم سے سلجھ کر نکلتا ہے سنجیدہ نثر میں سادگی اور رنگینی کا یہ میل بڑی علمی اور ذہنی ریاضت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے ڈاکٹر سید عابد حسین نے ہمیشہ ذہنی ایمان داری اور خلوص کے اشارے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ مبالغہ ہے نہ تنگ دلی، نہ خیالی تُک بندی ہے نہ خشکی۔ ان کی نثر نگاری کے لئے سادگی، شگفتگی توازن اور گہرائی کے لفظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

ذمہ دارانہ مخالفت

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ضم کرکے ترقی کا قدم اُٹھایا ہے۔ زیادہ اخلاقی جرأت اور اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت شری جے پرکاش نرائن نے اس بات سے دیا کہ یو۔پی اور مدراس کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میں سوشلسٹ پارٹی کی ناکامی کے دھبے کو مٹانے کے لئے انھوں نے کسی حیلے بہانے کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے اس الزام کی پرزور تردید کی کہ کانگریسی حکومتوں نے عام طور پر انتخابات میں دست اندازی کرکے اور بے جا دباؤ ڈال کر سوشلسٹ پارٹی کے اُمیدواروں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے صاف صاف اقرار کیا کہ پارٹی کی ناکامی کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی تنظیم کمزور ہے اور ابھی تک عوام کو خصوصاً کسانوں کو اپنی پالیسی اور پروگرام اچھی طرح نہیں سمجھا سکی۔

ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس طوفان بے تمیزی میں جو آزادی کے بعد ہماری سیاست میں برپا ہو گیا ہے ایک صحت مند اور ذمہ دار حزب مخالف پیدا ہو رہا ہے جو جمہوریت کی کشتی کے لئے لنگر کا کام دے گا۔

کسانوں کے لئے برف خانے

ڈ، س، سکسینہ

(ڈی، ایس سکسینہ صاحب ایک پرجوش اور مخلص نوجوان ہیں، جنھوں نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اب امریکہ سے برف خانے کی صنعت میں مہارت حاصل کرکے آئے ہیں۔ اور آج کل علی گڈھ کے ایک کارخانے میں کام کر رہے ہیں۔ وہ اس صنعت کو سارے ملک خصوصاً دیہات میں پھیلانے کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں اگر نئی روشنی کے پڑھنے والوں میں سے کوئی صاحب ان سے اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو برف خانہ علی گڈھ کے پتے سے خط وکتابت کریں۔)

ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے وسیع علاقوں میں کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جو برف خانوں سے کام لیتے ہیں، روپے اور وقت کی بڑی کفایت ہوتی ہے اور وہ بڑی پریشانی سے بچ جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تھوڑی تھوڑی دور پر مشترک برف خانے موجود ہیں جہاں وہ آسانی سے اپنی چیزیں پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے سبق لینا چاہئے اور اگر ہوسکے تو سارے ملک میں برف خانوں کا جال بچھا دینا چاہئے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں صرف ذخیرہ کرنے کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اتنی غذا ضائع ہوتی ہے جو چار کروڑ اسی لاکھ آدمیوں کے لئے سال بھر کو کافی ہو۔ اس کے علاوہ اس کی بچی کچی غذا اور طرح طرح سے برباد ہو جاتی ہے۔ اگر غذا کو برف خانوں میں رکھنے کا مناسب انتظام ہو تو نہ صرف ہماری صحت میں ترقی اور کارکردگی میں اضافہ ہوگا بلکہ ہمارے پاس فاضل غذا محفوظ رہے گی جسے ہم ان سالوں میں جب فصل اچھی نہ ہو استعمال کر سکیں گے یا باہر بھیج کر اس کے بدلے اپنی ضروریات کی چیزیں یا خدمات حاصل کر سکیں گے۔

ہمارے ملک میں آج کل شاید عام رجحان یہ ہے کہ سب صنعتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ برف خانوں کی صنعت کا بھی یہی رخ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً صوبۂ متحدہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں برف خانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، ان کی مجموعی سمائی اتنی ہے کہ ۶۰۰۰۰ ۹ من آلو ذخیرہ کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے صرف ایک فرخ آباد میں ۲۲۰۰۰ من کی سمائی کے برف خانے ہیں یعنی کل صوبے کی سمائی کا چوتھائی سے زیادہ ایک جگہ جمع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے کے مقابلے میں جب کہ بیج کو محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام تھا ہی نہیں یہ اچھی خاصی ترقی ہے۔ مگر صنعت کی نشوونما کا رخ غلط ہے۔ اس لئے کہ ان بڑے برف خانوں میں جو بڑے شہروں کے اندر ہیں پھلوں اور ترکاریوں کا ذخیرہ غذا کے طور پر ہونا چاہئے۔ ان سے بیج کے ذخیروں کا کام نہیں لینا چاہئے۔ موجودہ منصوبہ بندی کو کسی طرح صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے آلو کی تقسیم صوبے میں ناہموار ہوگئی اور دیہات کو برف خانے کی صنعت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

دیہات میں ذخیرہ کرنے کا انتظام نہ ہونا اس صنعت کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ آلو جو دیہات میں پیدا ہوتا ہے شہروں میں ذخیرہ کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور پھر جب بونے کا وقت آتا ہے تو اسے دیہات میں لے جانا پڑتا ہے ایک تو یہ خواہ مخواہ بوجھ کا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ڈھونا۔ دوسرے ڈھونے کا ذریعہ بابا آدم کے وقت کا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سا بیج برباد ہو جاتا ہے، عام طور پر کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ مگر پیداوار کی مجموعی مقدار پر اس کا صریحی اثر پڑتا ہے۔

پھر بیج والوں کے منافع کا سوال ہے۔ موجودہ حالت میں دیہاتیوں کو اپنا آلو سستے سے سستا بیچنا پڑتا ہے، اور پھر بیج کے لئے مہنگے سے مہنگا خریدنا پڑتا ہے

ہمارے خیال میں ان سب باتوں سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ دیہات میں چھوٹے چھوٹے برف خانے کھولے جائیں۔ جن کی سمائی اتنی ہو کہ ایک گاؤں یا آس پاس کے دو تین گاؤں کا آلو بیج کے لئے ذخیرہ کر سکیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے برف خانے اتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے بڑے برف خانے اور ان کی قیمت اتنی کم ہوگی کہ گاؤں والے انھیں خرید سکیں۔

سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ہائیڈرو الکٹرک والوں سے اتحاد عمل کی درخواست کی جائے اور ہر ٹیوب ویل کے ساتھ ایک ایک برف خانہ کھول دیا جائے۔ اس میں اتنے فائدے ہیں:۔

۱۔ بجلی کی طاقت میسر ہوگی۔

۲۔ شروع میں اگر ٹیوب ویل چلانے والے کو تھوڑا تھوڑا معاوضہ دے دیا جائے تو وہ برف خانے کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے گا۔

۳۔ کسانوں سے میل جول میں آسانی ہوگی۔

۴۔ جگہ بہت مناسب رہے گی۔

ایک سال کے اندر اندر ہم ان ضلعوں میں جہاں ٹیوب ویل ہیں برف خانوں کا ایک جال پھیلا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم کو کسانوں سے قریبی تعلقات پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ ان کا مال کو لانے لے جانے کا خرچ بچ جائے گا۔ سستے بیج کی وجہ سے ان کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو جائے گا۔

اگر یہ برف خانے کامیاب ہوں تو پھر ہم ان میں اضافے کا اضافہ کرکے، دوسری مقامی پیداوار مثلاً آم، امرود، کیلے، ترکاریاں، انڈے پیاز وغیرہ کو ذخیرہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح کسانوں کی خوشحالی میں اچھا خاصا اضافہ ہو جائے گا اور پھر غذا کے مسئلے کو جو آج ہمارے ملک کا سب سے اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حل کرنے میں بہت بڑی مدد ملے گی کوئی شخص جس میں حب وطن کا ذرا سا شائبہ بھی ہے اس تجویز کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔

ذیل کے نقشے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ۲۰۰۰ من کی سمائی کا ایک برف خانہ آلو کے بیج ذخیرہ کرنے کے لئے کتنے میں تیار ہو سکتا ہے۔

کمرے کا سائز۔ ۲۰ × ۱۵ × ۱۵ فٹ

دیواریں۔ ۱۸ انچ اینٹ + ۴ انچ کارک + آدھ انچ سیمنٹ پلاسٹر۔

فرش۔ ۴ انچ کنکریٹ + ۴ انچ کارک + ۳ انچ کنکریٹ۔

چھت۔ ۱½ انچ لکڑی + ۶ انچ کارک۔

سامان	۵۵۰۰ روپے
ٹھنڈے کا پائپنگ اور برودت کنٹرول	۱۰۰۰ "
انسولیشن اور دروازہ	۳۵۰۰ "
عمارت	۲۰۰۰ "
لگانے کا خرچ	۲۰۰۰ "
	۱۴۰۰۰ رو

عمارت کا خاکہ

۳۵

برف خانہ

۱۵

مشین کے لئے کمرہ

۴۰

اسکیل ایک انچ = ۱۵ فٹ

کباڑی

سید سخی حسن نقوی

(.......چرب زبانی کباڑی کے کردار کا ایک اہم جزو ہے، جس کے بغیر کامیاب کباڑی بننا ناممکن ہے۔ چالاک کباڑی کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔ چیزوں کی تعریف پر آئے گا، تو زبان اس سے دو ہاتھ آگے چلے گی........ اگرچہ مال کی تعریف میں وہ کوہ کنی اور عضرتِ نفق دونوں کو نیچا دکھا دیتا ہے۔ لیکن گاہک پر مال خریدنے کے لئے کبھی زور نہیں دیتا جیسے اسے کچھ پروا نہیں چاہے خریدو چاہے مت خریدو........)

مہنگائی اور کرنسی کے پھیلاؤ سے ہندوستان ان دنوں جس اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر علمی قدریں اتنی جتنا کی ہر فرد نے محسوس کیا ہے "بہت سا کاغذ اور بہت سا افلاس ایک ساتھ پایا جا سکتا ہے" یہ الفاظ انیسویں صدی میں واشنگٹن ارونگ کی زبان سے نکلے تھے۔ لیکن مادر وطن پر یہ حرف آج بھی صادق آ رہے ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں ایک آنہ پیسے کا سوا سیر اور گھی پیسے کا ۲/۱ چھٹانک بکا کرتا۔ یہ باتیں ہمارے لئے قصہ پارینہ بن گئی ہیں۔ آج کل پورا سوا سیر آٹا آٹھ آنے میں اور ۲/۱ چھٹانک گھی روپے میں بھی میسر نہیں۔ خدا بھلا کرے بناسپتی گھی اور کنٹرولی آٹے جارج اسٹیفنسن کا جس نے موجودہ نسل کی توانائی اور صحت کے لئے یہ نیک کام کیا اختتا فلٹے کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔ مگر دماغ اسکیمیں بناتے بناتے نہیں تھکتے۔ سوچتی ہے بس کھانا شروع کر دے۔ مگر گئے گئی کے انسداد سے چارہ بھی مہنگا ہو گیا اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لوگ گئیز گئی کے ساتھ بچہ گئی کا انسداد کریں اور دختر کشی جیسی دیرینہ اور مقدس رسوم کو پھر سے زندہ کر لیں اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خودکشی پر آمادہ ہو جائیں، بغاوت کریں، جیل جائیں۔ یا ان باتوں کے لئے ہمت نہ پڑے تو پھر کباڑئی کی دکان کھول بیٹھیں اور ہو سکے تو کسی بڑے آدمی سے اس کا افتتاح کرالیں۔

کسی چھوٹے آدمی کا کباڑی کی دکان کھولنا، اور کسی بڑے آدمی کا اس کی رسم افتتاح انجام دینا، بشرطیکہ احساس کمتری موجود نہ ہو، کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ اگر سلیقے کے ساتھ کیا جائے تو ہر کام اعلیٰ درجے اور ہر پیشہ بلند حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو کباڑی کی دکان رکھتے ہوئے بھی کباڑیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کباڑیت کا عنصر تھوڑا بہت ہر جگہ پایا جاتا ہے، ریل میں، جیل میں، تھانہ تحصیل میں، سرکاری دفتروں میں، ہسپتالوں میں، عالی شان کوٹھیوں میں، فینسی ہوٹلوں میں، ڈالمیا اور برلا کے کارخانوں میں، زندگی کے ہر شعبہ میں، دنیا کے ہر گوشہ میں، حتیٰ کہ شاعر کے کلام میں، خیالوں کے لیڈر میں، لیڈروں کی تقریروں میں کس جگہ کباڑ نہیں ملتا۔ پانچوں انگلیوں کی طرح غزل کے سب اشعار یکساں طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ دس پانچ غزلیں عمدہ تو دو چار کیا ڑ خانے کے لئے ضرور ہوتے ہیں اور شاعر ان میں خاصی داد حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جن لیڈروں کو تقریر کا دورہ پڑتا رہتا ہے کبھی کبھی جذبات سے متاثر ہو کر ایسی بھی باتیں کہہ ڈالتے ہیں جو کباڑی بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں اور "یو، این، او" میں جوتیوں میں دال بٹوا دیتی ہیں۔

بعض لوگ پیدائشی شاعر ہوتے ہیں یا پیدائشی لیڈر یا پیدائشی جنرل، لیکن کوئی کباڑی کبھی پیدائشی کباڑی نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں پیشے نسلاً بعد نسل چلتے ہیں اور جس کا باپ بڑھئی ہے وہ بڑھئی اور جس کا لوہار ہے وہ لوہار بن جاتا ہے۔ اکثر حکیم اور ڈاکٹر کا بیٹا حکیم، وکیل کا بیٹا مختار اور ماسٹر کا بیٹا منشی ضرور بن جاتا ہے لیکن کباڑی کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کباڑی کا باپ کباڑی ہوتا ہے نہ بیٹا۔ بلکہ ابتدا میں تو وہ خود بھی کباڑی نہیں ہوتا اور جب کباڑی بننے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اول اناڑی اور بہت سا تجربہ حاصل کرنے کے بعد کھلاڑی کے درجے پر پہنچتا ہے۔ کسی کباڑی کو آج تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس نے بحیثیت کباڑی کے اپنی تجارت کی ابتدا کی ہو۔ کباڑی تانگہ اور ٹھیلہ والوں کی طرح دوسری شاہراہیں طے کر کے مختلف کاروبار میں اچھی طرح قسمت آزمائی کر کے، ساری دنیا کا چکر کاٹنے کے بعد، "زمین گول ہے" کا عملی ثبوت دیتا ہوا کباڑی کی منزل پر آ کر ٹکتا ہے اور کباڑی ہوتے ہوئے بھی کئی کئی دھندے چلاتا رہتا ہے۔

ہر کباڑی بیک وقت کباڑی بھی ہو سکتا ہے اور حجام بھی یا کباڑی بھی اور لوہار بھی۔ اگر آپ کو کسی ایسے حجام سے بال بنوانے کا اتفاق ہو جو بدقسمتی سے کباڑی بھی ہے تو یقین کیجئے آپ کی خوب خوب "حجامت" بن جائے گی۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حجام کباڑی جن کا بنیادی پیشہ "حجامت" اور ثانوی "کباڑیت" ہوتا ہے وہ عام طور پر کباڑ کے گاہک کو حجامت کے گاہک پر ترجیح دیتے ہیں۔ کتنے سر ادھورے کتنی داڑھیاں بے منڈی اور کتنے بال بے بنے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ گاہک بے چارہ اپنی نصف داڑھی منڈا نے بیٹھا ہے اور کباڑی صاحب ٹھاٹھ سے کباڑ خانے میں سودا چکا رہے ہیں۔ اگر کباڑی کا بنیادی پیشہ لوہار ہے تو جان لیجئے آپ کے مکان پر سب خیریت ہے۔ شہر کے چوروں اور اچکوں کو زہر سے ہلاک کر دیا گیا ہے یا پولیس کا محکمہ توڑ دیا گیا تالے کنڈی سے بے خبر رات کو پاؤں پھیلا کر سوئیے اور رات بھر خراٹے لیجئے۔ کیونکہ آپ دیکھیں اگر آپ بزاز یئے یا بساطی کی دکان پر جائیں اور وہ موجود نہ ہوں اور دکان داری کے اوقات میں دکان سے غائب ہو جائیں تو ان کی تجارت چوپٹ ہو جائے اور وہ تباہ ہو جائیں۔ بخلاف اس کے کباڑی اگر غائب رہے تو کچھ نقصان نہیں کیونکہ جب وہ نئے خزانوں کی تلاش میں نئے نئے شکار پھانسنے کی جستجو میں، چیزوں کی قیمت اصلی قیمت سے کم دے کر مال خریدنے کی فکر میں سرگرداں پھرتا ہے تو اس کا لڑکا گاہکوں کے استقبال کے لئے موجود رہتا ہے اور اگر دکان خالی پڑی رہے تو بھی کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اس پر ٹیڑھی نظر ڈال سکے اور کوئی چیز اٹھا کر چمپت ہو جائے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ قیمت کے لحاظ سے تمام چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بہری کی دکان پر مسلح سپاہی کی نگرانی میں رکھی جا سکیں۔

کباڑی کے لئے کاہل ہونا بھی ضروری ہے آپ چاہیں کسی چھوٹے موٹے شہر میں کباڑی کی دکان کھول لیں تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ تھوڑے بہت کاہل نہ ہوں اور "ٹال مٹول وقت کی چور ہے" کے قائل نہ ہوں۔ علیٰ ہذا جو کاہل ہیں ان کے لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ بے سوچے سمجھے فوراً کباڑی بن جائیں۔ ایسے لوگوں میں جو لاپروا، نکمے، لاابالی اور بیکار ہوں اور کاروبار سے کوئی خاص مس نہ رکھتے ہوں اچھے قسم کے کباڑی نکل سکتے ہیں۔ کباڑی کا نعرہ ہوتا ہے! "میں سب کچھ کر سکتا ہوں سوائے کام کے"۔

چرب زبانی کباڑی کے کردار کا ایک اہم جزو ہے جس کے بغیر کامیاب کباڑی بننا ناممکن ہے۔ چالاک کباڑی کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔ چیزوں کی تعریف پر آئے گا تو زبان اس سے دو ہاتھ آگے چلے گی۔ تعریفوں کا طوفان ایکسپریس ایسا چھوٹے گا

ڈاکٹر سید حسین

مشتاق احمد

مصر میں ہند کے سفیر ڈاکٹر سید حسین عجیب گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ اگر ذہنی ایمان داری ایک ڈپلومیٹ کی امتیازی شان سمجھی جا سکتی ہے تو ڈاکٹر سید حسین کا دنیا کے چوٹی کے مدبروں میں شمار ہو سکتا ہے۔ ایمانداری اور حق پرستی میں وہ بے مثل تھے اچھی طرح سمجھ بوجھ کر فیصلہ کرنا اور پھر اپنے فیصلے پر پہاڑ کی طرح اٹل رہنا نیز مقصد میں کامیابی کی پوری امید رکھنا نتائج کی پروا کئے بغیر اصول کی حمایت میں جان لڑا دینا۔ یہ تھی سید حسین کی شخصیت۔

گفتگو میں کبھی وہ شیریں کلامی اور حلاوت کہ ذہن مدتوں اس کے مزے لیتا رہے کبھی وہ غضب کا کھرا پن۔ وہ دو ٹوک جواب کہ مخاطب ان سے بات کرکے پچھتائے جہاں تہذیب کی دل آویزی اور اسی طرح کے بے ضرر مسائل زیر بحث ہوتے۔ ڈاکٹر سید حسین کی چھیڑی ہوئی گفتگو کے آگے بڑے بڑے فتنہ گو کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ لیکن جہاں بنیادی اصول اور مقاصد کا سوال آتا تھا وہاں تاویلیں کرنا، سمجھوتہ کرنا، اصول اور مقاصد کو خوش خلقی پر قربان کر دینا، سید حسین نے سیکھا ہی نہ تھا، وہاں تو بس دوٹوک جواب تھا۔ ادھر یا ادھر۔ مخالف اگر خود غرضی یا اوچھا پن دکھاتا تو سید حسین اس کا منہ نوچ لیتے تھے۔

ڈاکٹر سید حسین ایسے مدبر نہ تھے جو بین الاقوامی عدالت معمولی نفع و سود کے لئے معطل کرا کریں۔ لیکن ساتھ ہی اپنے ملک کا مطالبہ واضح کرنے کی بے پناہ قوت رکھتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ہندوستان کے پیغام کی کوئی غلط ترجمانی کرے۔ یہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس باقاعدہ تقرر سے کہیں پہلے ڈاکٹر سید حسین ہندوستان کے غیر سرکاری سفیر تھے، مصر، ترکی، عراق، لبنان اور شام میں آزاد ہند کا پہلا سفیر وہی شخص تھا جو امریکہ میں غلام ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے ۲۵ برس تک ان تھک کام کرتا رہا تھا۔ امریکن پبلک کو ہند کے مطالبہ آزادی سے روشناس کرتے رہنا اور برطانیہ کے پروپیگنڈے کا مسکت جواب دیتے رہنا ۲۵ برس تک ڈاکٹر سید حسین کا یہی کام تھا۔ ڈاکٹر سید حسین اپنے اس کام میں کبھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے جب آزادی کی لڑائی ختم ہو گئی تو اس ملک کا پیغام جس کی انھوں نے مدتوں خدمت کی تھی عرب ممالک میں پہنچانے کا بوجھ بھی انھی کے کندھوں پر ڈالا گیا۔

کیا وطن میں کیا وطن سے باہر ڈاکٹر سید حسین ہمیشہ ایک سپاہی تھے۔ آزادی وطن کی راہ میں لڑتے رہنا اور تھکنے کا نام نہ لینا یہی اس سپاہی کی زندگی کا مقصد تھا۔ انگلستان سے تعلیم ختم کرکے جب یہ ہندوستان پہنچے تو اپنے کو اسی دم ہند کی آزادی کی لڑائی میں جھونک دیا جو ان دنوں انڈین ہوم رول لیگ کے جھنڈے کے نیچے لڑی جا رہی تھی ۱۹۱۶ء میں یہ بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھے۔ جس کے ایڈیٹر بی جی ہارنیمن جیسے شہرۂ آفاق شخص تھے۔

نوجوان ڈاکٹر سید حسین کی وطن پرستی نے پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا دل موہ لیا۔ وہ انھیں الہ آباد لے گئے اور اپنے مشہور اخبار انڈیپنڈنٹ کی ادارت ان کے سپرد کی۔ سید حسین نے جرنلسٹ بن کر عملی سیاست کو نہیں چھوڑا بلکہ اس میدان میں بھی پیش پیش رہے چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھ خلافت وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے یہ بھی انگلستان گئے

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک شروع کی، اور سید حسین انگلستان سے امریکہ پہنچے، تاکہ اس مہان دیس کو ہندوستان کی جنگ آزادی کا مطلب سمجھائیں اور اسے اپنا ہمدرد بنائیں۔

سید حسین کے امریکہ کے طویل قیام کا صرف ایک مقصد تھا ـــــ ہندوستان کی جنگ آزادی کو ہندوستان سے باہر لڑیں۔ یہ لڑائی برابر کی نہ تھی معاملات ان کے خلاف تھے ہمدردی [illegible]، سلطنت برطانیہ کا پورا محکمہ خارجہ ان کے اور انھی جیسے چند ہندوستانیوں کے پیچھے لگا دیا گیا۔ ان غریبوں کے پاس اپنے ملک کی آزادی کی امید، اور اس پر ایمان کامل کے علاوہ اس زبردست قوت سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی اور ہتھیار نہ تھا۔

موصوف نے اہل امریکہ کو ہندوستان کی جنگ آزادی کا مقصد سمجھانے کے علاوہ اس کی عظیم الشان تہذیب و تمدن سے بھی روشناس کرایا، اس سلسلے میں انھوں نے امریکہ کی کوئی ۳۰ بڑی یونیورسٹیوں میں تقریریں کیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

نئی روشنی دہلی
ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

اس کے علاوہ وکھنی کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں دس سال تک مشرقی تہذیب کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔

ہندکا یہ سپوت ۵۵ برس تک امریکہ میں جلاوطنی بھگت کر — جسے اس نے اپنی خوشی سے مول لیا تھا — اس سرزمین کو واپس آیا جب یہ ملک آزاد ہو چکا تھا جنگ آزادی ختم ہو چکی تھی، اس لئے اب یہ سپاہی امن کا پیامبر بنا کر عرب ممالک کو بھیجا گیا تاکہ ان ممالک کو اس امن و شانتی کی خبر دے جو ہندوستان ساری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے — وہیں مصر میں ہند کا یہ ان تھک سپوت ۵ فروری کو ہمیشہ کے لئے دنیا کے جھگڑوں سے آنکھیں بند کر کے صبر و سکون کی دنیا میں جا پہنچا۔

(ماخوذ)

تاریخ اشاعت :- یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴
چندہ سالانہ ۳ روپے ششماہی ۱ روپیہ ۸ آنے
دفتر:- نئی روشنی جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی دہلی مطبع جامعہ
مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ | نمبر ۱۶ | ۲۴ر اکتوبر سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید عابد حسین

سائنس کے بچپن کے کھلونے

(اب سے سو سال پہلے سائنس کو یکایک یہ احساس ہوا کہ اس نے بچپن سے گذر کر بلوغ کی حد میں قدم رکھا ہے بہت سی نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں جنھیں دیکھ کر لوگ سائنس کی معجز نمائی پر سر دُھنتے تھے مگر آگے چل کر اُن میں سے بہت سی چیزیں بچوں کا کھیل ثابت ہوئیں۔ نمونے کے طور پر چند ایجادوں کا ذکر سنئے جن پر آپ کو ہنسی آئے گی ۔ کیا عجب ہے کہ سو سال بعد دنیا (اگر ایٹم بم کی ہلاکت سے بچ گئی) ان ایجادوں کو بھی جن پر ہم آج ہم فخر کرتے ہیں محض ہنسنے اور دل بہلانے کی چیزیں سمجھے۔)

[illegible]ء میں دنیا میں ایجاد و اختراع کی لہر بڑے زور و شور سے اُٹھی تھی، صنعتی دور ڈنکے بجاتا ہوا آن پہنچا تھا۔ لوگ ہر نئی چیز کو نعمت جانتے تھے۔ ہر موجد کو نوعِ انسانی کا محسن سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھلاتے تھے۔

اس زمانے کی بہت سی ایجادیں کاغذ کی ناؤ کی طرح تھوڑے دن چل کر رہ گئیں بعض میں واقعی خداداد ذہانت کی جھلک ہوتی تھی مگر —— بس ایک تانگ کسر رہ جاتی تھی۔ بعض محض بے تکی اور بے ہنگم تھیں۔

اکثر موجد محض اس پہ قناعت کرتے تھے کہ دوسروں کی ایجادوں میں ذرا سی ترمیم کرلیں مگر یہ ترمیمیں عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ ایک فرانسیسی بنجامن فرانکلن کی کتاب کا ترجمہ اپنی زبان میں کر رہا تھا۔ وہ فرانکلن کے برق ربا (LIGHT NING CONDUCTOR) کا حال پڑھ کر اس قدر متاثر ہوا اور اس کے دل میں بجلی گرنے کی ایسی ہیبت بیٹھ گئی کہ اس نے اپنی چھتری میں ایک برق ربا لگا لیا۔ اب یہ حضرت پیرس کی سڑکوں پر اپنی چھتری کی شام میں ایک کلس لگائے پھرا کرتے تھے اور پیچھے پیچھے ایک لمبا سا تار لٹکتا رہتا تھا۔ ان کا خبط اس قدر بڑھ گیا کہ انھوں نے اپنی ریشمی ہیٹ میں ایک دُم چھلا لگا لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گرجے کے کلس کی طرح اس پر بھی بجلی کا اثر ہو سکتا ہے۔

[illegible]ء میں ایک انگریز نے ایک جیبی چھتری ایجاد کی۔ اس میں ڈنڈا نہیں تھا بس کپڑا تھا اور تیلیوں کا ڈھانچہ۔ جہاں پانی برسنا شروع ہوا اور اس چھتری کو جیب سے نکال کر سر پر منڈھ لیا۔

ان ہی دنوں سگرٹ پینے کی ایک مشین ایجاد ہوئی تھی جس میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ لکھتے یا پڑھتے وقت آنکھوں میں دھواں نہ جانے پائے۔ یہ ایک عینک کی شکل کی چیز تھی جسے ناک پر جا کر کانوں میں اٹکا لیتے تھے۔ بیچ میں ایک ہولڈر لگا تھا جس کے ذریعے سگرٹ ہونٹوں میں لگا رہتا تھا اور ہاتھ خالی رہتے تھے۔ جب سگرٹ پینے سے جی بھر جائے تو سگرٹ کو زبان کی نوک سے ہٹا دیتے تھے اور اطمینان سے سانس لے کر، پانی پی کر، یا باتیں کر کے پھر سگرٹ کو بغیر ہاتھ لگائے زبان کی مدد کر ہونٹوں پر لے آتے تھے۔

ایک صاحب نے کمانی دار جوتے بنائے تھے جن کو پہن کر آدمی اونچائی سے بے کھٹکے کود سکتا تھا، کیا مجال جو ٹانگ ٹوٹ جائے۔

ایک نوعِ انسانی کے محسن نے گھر والیوں پر رحم کھا کر اُن کے لئے بڑے کام کی چیز نکالی تھی۔ اس نے ایک جھولا کرسی کو بیلن اور رسّی کے ذریعے ایک طرف دودھ بلونے کی متھانی سے اور دوسری طرف بچے کے پالنے سے جوڑ دیا تھا۔ گھر والی مزے میں کرسی پر بیٹھی جھولتی تھی اور مونڈے بنتی جاتی تھی۔ اُدھر مکھن نکالنے کو اور بچے کو جھولا جھلانے کا کام خود بخود ہوتا جاتا تھا۔

مشہور موجد ایڈیسن نے ایک خاتون کے لئے، جو سینے کی مشین پاؤں سے چلاتے چلاتے تھک جاتی تھیں، ایک انوکھی مشین بنائی۔ وہ انسان کی آواز کی لہروں کو قوتِ محرکہ میں تبدیل کرنے کے تجربے کر چکا تھا۔ اُن سے فائدہ اُٹھا کر اس نے مشین کے ساتھ ایک چھوٹا سا موٹر جوڑ دیا جس میں ایک اس قسم کی جھلی منڈھی ہوئی چیز لگی تھی جیسے ٹیلیفون یا مائکروفون کا دہانہ۔ یہ آلہ سینے والی کے منہ کے سامنے رہتا تھا اس کا کام بس یہ تھا کہ باتیں کرتی رہے، اس کی آواز کی لہریں موٹر کو حرکت میں لے آتی تھیں اور مشین چلنے لگتی تھی۔

اصولی حیثیت سے تو ایڈیسن کا خیال بالکل ٹھیک تھا، لیکن اس نے اس بات کو مد نظر نہیں رکھا تھا کہ انسان کی آواز میں اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۲ پر)

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
سائنس کے بچپن کے کھلونے	۱	کس کے لئے ہے	سرور عسکری	۵
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر (اداریہ)	۳	غزل	آفتاب عالم	۵
دنیا کی رفتار		عورت کا درجہ گاندھی جی کی نظر میں	صالحہ عابد حسین	۶
۱۔ ہندوستان ع، ح	۴	اقبال کے چار شعر	امتیاز علی عرشی	۷
۲۔ پاکستان ع، ل	۴	ملک راج آنند	خواجہ احمد عباس	۸
بزم بے تکلف	۵	شہرت کے تقاضے	سلطان عالم خاں	۱۰

جس کی وجہ سے مشین کی رفتار بے قاعدہ اور ناہموار رہے گی اور پھر یہ کہ خواتین بھی کبھی نہ کبھی باتیں کرتے کرتے اُکتا جاتی ہیں اور مسلسل زبان چلانے سے بھی اتنی ہی تکان ہوتی ہے جتنی پاؤں چلانے سے۔

ایڈیسن کی ہدایت کے مطابق وہ خاتون آ رہے کے سامنے شعر خوانی کرتی تھیں یا کوئی کتاب بلند آواز میں پڑھا کرتی تھیں، لیکن تھوڑے ہی دن میں وہ اس سے تنگ آ گئیں اور رسمی پائیں پاؤں کی مشین چلانے لگیں۔

ایک اور سینے کی مشین کوئی ۵۰ سال ہوئے انگلستان میں ایجاد ہوئی تھی اور بعض گھروں میں استعمال بھی ہوتی تھی۔ اس میں پہیے لگے تھے اور ایک چھوٹا سا کتا جوت دیا جاتا تھا جو کولھو کے بیل کی طرح چلتا رہتا تھا۔ مگر انسداد بے رحمی کی انجمن نے مداخلت کر کے اس مشین کے استعمال کی ممانعت کرا دی۔

بلجیم کے ایک موجد نے اس خیال سے کمرے کی گھٹی ہوئی ہوا سے سر میں درد ہونے لگتا ہے تازہ ہوا لانے کے لئے ایک لاؤڈ اسپیکر کی شکل کا آلہ بنایا تھا اس کا چوڑا سرا پلنگ کے سرہانے رہتا تھا اور پتلا سرا دیوار میں ایک سوراخ میں لگا دیا جاتا تھا اور اس کے ذریعے سے باہر سے ہوا چھن چھن کر آتی تھی پہلے تو یہ آلہ خاصی مقبول ہوئی۔ مگر کچھ دن کے بعد اس کا فیشن جاتا رہا بہت سے لوگ شکایت کرتے تھے کہ یہ آلہ جو منہ پھیلائے رات بھر سر پر کھڑا رہتا ہے اس کی وجہ سے بھیانک خواب نظر آتے ہیں اور آدمی گھبرا کر اٹھتا ہے تو اس کا سر بھونپو سے ٹکرا جاتا ہے اور اس چوٹ سے سر میں درد اس سے زیادہ ہوتا ہے جتنا گھٹے ہوئے کمرے میں سونے سے۔

ایک شخص نے ایک ہوادار آرام کرسی بنائی تھی۔ اس کے ہتھوں میں دو پنکھے لگے ہوئے تھے اور جیسے ہی آدمی کرسی پر بیٹھتا تھا پنکھے چلنے لگتے تھے۔

کچھ دن پہلے تک ریل کا سفر خاصا خطرناک تھا اکثر گاڑی پٹری سے اُتر جاتی تھی یا لڑ جاتی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے ایک فرانسیسی نے یہ تجویز سوچی کہ ڈھول کی شکل کے بہت بڑے بڑے پہیے بنائے جائیں اور اُن کے اندر مسافروں کے ڈبے ہوں ان پہیوں کا سلسلہ زمین پر لڑھکتا چلا جائے گا نہ پٹری کی ضرورت ہوگی اور نہ گاڑی لڑنے کا خطرہ۔ موجد نے اس اسکیم پر بہت کچھ خرچ کیا اور ٹرین کے نمونے بھی تیار کئے لیکن پیٹنٹ آفس نے اسکیم کو اس اعتراض کے ساتھ نامنظور کر دیا کہ اس میں کھیتوں اور راہ چلتے آدمیوں اور جانوروں کے لئے خطرہ ہے۔ ایک اور فرانسیسی نے اس سے بھی زیادہ اُپج سے کام لیا۔ اس نے یہ حکمت لڑائی کہ ریل گاڑیوں کی چھتوں پر بھی پٹریاں ہوں۔ اگر دو گاڑیوں کا سامنا ہو تو ایک دوسری پر چڑھ جائے اور وہاں سے کود کر پھر پٹری پر چلنے لگے۔

ایک صاحب نے جنہیں تجارت کے سلسلے میں بہت سفر کرنا پڑتا تھا اور ریل میں بیٹھے بیٹھے بدن اکڑ جاتا تھا، اپنے بازوؤں، سر اور گردن کو آرام دینے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ ایک لمبے سے ہُک سے دو گھیرے لٹکتے رہتے تھے جن میں وہ اپنے بازو ڈال لیتے تھے۔ اسی طرح دو گھیرے پیچھے ہوتے تھے جن کے بیچ میں ایک تکیہ لٹکتا رہتا تھا، اس پر وہ اپنا سر ٹکا لیتے تھے۔ یہ سارا بکھیڑا اسباب رکھنے کے جالی دار مچان میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہ چیز خاصی مقبول ہوئی اور بڑے پیمانے پر بکنے لگی۔ ان دنوں براعظم یورپ میں یہ منظر اکثر نظر آتا تھا کہ ایک شخص اسباب رکھنے کے مچان سے آدھا لٹکا ہوا آرام سے سو رہا ہے۔

بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عجیب و غریب ایجادوں کی ذیل میں چوہوں کے موٹر کا ذکر نہ آئے یہ بات ایک سنکی انگریز ہیٹن کی ہے جس کو ایک انوکھی قسم کا کھلونا دیکھ کر سوجھی جو جنگ نپولین کے زمانے میں ایک فرانسیسی قیدی نے بنایا تھا۔ اس شخص نے بے شغلی سے اکتا کر ایک چھوٹا سا گول پہیہ بنا لیا تھا جو ایک دھرے پر گھومتا تھا۔ اس پہیے میں چوہے کو بند کر دیا جاتا تھا جو اسے گھماتا رہتا تھا۔ اور جوں جوں اس کی رفتار بڑھتی جاتی تھی پہیے کے چکر بھی تیز ہوتے جاتے تھے۔ ہیٹن نے اس کھلونے کا غور سے مطالعہ کیا اور اسے بڑے پیمانے پر بہت بڑی تعداد میں تیار کیا۔ بہت سے گول پہیوں میں اس نے چھ زیادہ چوہے بھی ایک ساتھ بھر دئے اور پہیوں کو سوت کاتنے کی چرخیوں سے جوڑ دیا۔ تھوڑے دن بعد اس نے اعلان کیا کہ ایک چوہا دن بھر میں ۱۰ میل لمبا تار کات لیتا ہے، اور بعض بعض کی کارگزاری تو ۱۵ میل تک پہنچ جاتی ہے۔ مشین بالکل سائنس کے اصولوں پر بنی تھی۔

چوہوں کے ساتھ وہ بہت اچھا سلوک کرتا تھا، انھیں روٹی، پنیر اور شکر کھلاتا تھا۔ رات کو سب چوہوں کو پہیوں سے نکال کر ان کے اصطبل میں سلا دیا کرتا تھا۔ دو پہر کو ان کو ایک گھنٹے کی چھٹی ملتی تھی اور ہفتے میں ۶ دن کام کرتے تھے۔

اس طرح ہر چوہا سال میں ۴۵۰۰ میل تار کاتتا تھا یعنی اتنا اتنا لمبا کہ سارے برطانیہ اور آئرلینڈ کے گرد لپیٹا جا سکے۔

مگر یہ ہیٹن صاحب اپنے مزدوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے باوجود محنت کی نفسیات سے واقف نہ تھے۔ انھیں یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کے بے لطف کام سے چوہے بھی اکتا جائیں گے۔ ہوا یہ کہ چوہوں کا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کی رفتار دھیمی ہو گئی۔

سال بھر بعد حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ ہیٹن صاحب کو پہیے کے مزدوروں کے باوجود ان کو گر کے مقابلے میں جو اجرت دے کر مزدور رکھتے تھے صرف ۱۰ شلنگ کی بچت ہوئی۔

حصہ داروں نے روپیہ واپس لے لیا اور کارخانہ بند ہو گیا۔ اب ہیٹن بچارے نے اشتہار دیا کہ وہ چوہوں سے کام لینے سے پہلے انھیں باقاعدہ استقلال سے کام کرنے کی تربیت دے گا۔ اس نے ایک ٹوٹا پھوٹا گودام کرایہ پر لیا اور ۱۵۰۰ چوہوں کے لئے اشتہار دیا۔ اسے یقین تھا کہ بہت سے پہیوں کے ذریعے سے لاکھوں میل لمبے تار روزانہ کاتے جائیں گے اور خوب نفع ہوگا۔ مگر بچارہ اس اسکیم کو آزمانے نہ پایا تھا کہ موت کا شکار ہو گیا۔

کیا سر کے بالوں کا گرنا

رُک سکتا ہے؟

وہ حضرات جن کا سر بالکل صاف ہو چکا ہے اور وہ جن کے بال گرتے رہتے ہیں۔ ہر سال گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کے لئے طرح طرح کی دواؤں پر کروڑوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

لیکن طبی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پورے طور کا لو کیا ذکر ہے جو لوگوں کے گرے ہوئے بال بھی کسی قسم کی مالش، کنگھی، ہیر ٹانک، الٹرا وائلٹ ریز، وٹامین یا مقوی دواؤں کے استعمال سے دوبارہ نہیں اُگ سکتے۔

اگرچہ بال خورے اور اسی قسم کے امراض کا علاج کرنے والے بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں کوئی طبیب یا سائنس داں نہیں ان میں بس تین ہی صفتیں ہوتی ہیں۔ سر پر بال، بے محنت روپیہ کمانے کا شوق اور کاروبار کا سلیقہ۔

"استعمال سے پہلے" اور "استعمال کے بعد" کی تصویریں جو اشتہاروں میں نظر آتی ہیں، ان لوگوں کی ہوتی ہیں جن کے بال کسی لمبی بیماری یا اعصابی صدمے یا جلد کی علامت کی وجہ سے گر گئے تھے کسی دوا کے استعمال سے نہیں بلکہ قدرتی طور پر خود بخود اُگ آئے۔

ہیئر ٹانک سے صرف بال چکنے اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ اس میں معمولی دوائیں ہوتی ہیں جنھیں ہر شخص جانتا ہے جو بالوں کو اُگانے محفوظ رکھنے یا بال خورے کو دور کرنے کے لئے بالکل بے کار ہیں۔

الب سلفا گروپ (SULPHA GROUP) کی دواؤں کا استعمال بال اُگانے کے لئے شروع ہوا ہے اور یہ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے اکثر کھال میں دانے نکل آتے ہیں اور جسم کو ان کی عادت ہو جاتی ہے۔ اگر کسی انفکشن کی وجہ سے اُن کے استعمال کی ضرورت پڑے تو یہ بالکل اثر نہیں کرتیں۔ وٹامن کے انجکشن جو سر میں لگتے ہیں اور کبھی خطرناک ہوتے ہیں۔

اگرچہ یہ نظریہ بہت مشہور ہے کہ بال خورہ جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ معمولی جراثیم کو مارنے والی دوائیں اسے دور کر سکتی ہیں۔ ضرورت ایسی دوا کی ہے جو ان خاص جراثیم کو مار سکے۔

کبھی کبھی مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ سر کی مالش سے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۴ اکتوبر ۱۹۴۹ء

سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

وزیر اعظم جواہر لال نہرو دلوں کی دنیا میں سکندر اعظم کی شان سے نئے نئے شہر و دیار فتح کر رہے ہیں۔ اُن کے سفر امریکا کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دل کش شخصیت نے واشنگٹن اور نیویارک میں مشرق و مغرب کے باہمی تعصب کے طلسم کو توڑ کر امریکی عوام کے قلوب کو اسی آسانی سے موہ لیا ہے جیسے وہ ہندوستانی عوام کے دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ جیسا پر جوش اور شاندار استقبال ان کا ہو رہا ہے ایسا مغرب کے بڑے بڑے قائدوں کا تو ہوا ہوگا مگر کسی مشرقی کا آج تک نہیں ہوا تھا۔ اہل علم کے طبقے نے بھی پنڈت جی کا خیر مقدم بڑے خلوص اور تپاک سے کیا۔ جب کولمبیا یونیورسٹی کے اسپیشل کانووکیشن میں انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی سند دی جا رہی تھی تو کولمبیا اسکول آف انٹرنیشنل افیرس کے ڈائرکٹر پروفیسر ویلس نے کہا "پچھلے دو سال میں کولمبیا یونیورسٹی نے بہت سے ممتاز مہمانوں کو لبیک کہا ہے مگر ان میں سے کوئی ہمارے آج کے مہمان سے زیادہ ممتاز اور ہمارے خیر مقدم کا ان سے زیادہ مستحق نہیں تھا۔" یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ پروفیسر البرٹ جیکبس نے پنڈت جی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:-

"پنڈت جواہر لال نہرو آزادیٔ ہند کے جلیل القدر داعی اول کا مرید خاص، حریت کی پر خار راہ میں اپنے ہم وطنوں کا اولوالعزم رہنما، از سر نو زندگی پانے والی قوم کا دانش مند مشیر اور کارساز، ایک عظیم الشان ملک کے لوگوں کے ارادوں اور حوصلوں کا نامور ترجمان جس کی ذہنی قیادت نے مغرب کے گہرے علم کو مشرق کی گراں بہا میراث اور لافانی روایات میں سمو دیا ہے۔ کمزور قوموں کا حامی و مددگار، جسے عالم گیر امن اور صلح کی سچی لگن کی بدولت ساری نوع انسانی کی تنظیم اور تحسین کی دولت حاصل ہے۔ کولمبیا بڑے فخر کے ساتھ اپنے ایک ممتاز فرزند کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کرتی ہے اور سب سے بڑی عزت جو اس کے اختیار میں ہے بخشتی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کو اپنے سفر کے سب سے بڑے مقصدوں یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستان کی ذہنی اور اخلاقی ساکھ قائم کرنے اور امریکنوں اور ہندوستانیوں میں باہمی دوستی کا احساس پیدا کرنے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہو رہی ہے۔ مگر اس سے ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہندوستان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے بہت بڑے پیمانے پر مالی اور فنی امداد ملنے کی جو امیدیں ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے امریکہ سے باندھ رکھی تھیں وہ پوری ہو جائیں گی۔ اس قسم کی مدد دینا امریکی عوام اور اہل علم کے اختیار میں نہیں ہے جنھوں نے پنڈت جی کا اس جوش اور خلوص سے استقبال کیا ہے بلکہ امریکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اور جہاں تک ہم دور سے اندازہ کر سکتے ہیں یہ حضرات پنڈت جی کے خیالات اور ان کی پالسی سے زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ جو اخبارات ان کے نفس ناطقہ سمجھے جاتے ہیں وہ بہت کچھ ظاہر داری سے کام لے رہے ہیں۔ مگر ان کے لہجے سے مایوسی صاف جھلک رہی ہے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان بھی مغربی یورپ کی طرح ان کے سرمائے کا نیاز مند بار بردار اور ان کی سیاست کا آلۂ کار بن جائے گا، لیکن پنڈت جی کی مختلف تقریروں خصوصاً ان کے کولمبیا یونیورسٹی کے خطبے سے اُن کے یہ خیالات دھواں بن کر اُڑ گئے۔

ہم میں سے جو لوگ بہت خوش اعتقاد ہیں ان کو بھی یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ امریکہ کے خداوندانِ دولت ہندوستان میں ایک آزاد صنعت اور آزاد سیاست کی نشو و نما کے لئے کوئی خاص مدد دیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ پنڈت جی کے اس سفر کے بعد ہندوستان اور امریکہ میں تجارتی کاروبار جو دونوں کے لئے مفید ہو بڑھ جائے گا۔ ممکن ہے امریکی حکومت یا بین الاقوامی بنک ہمیں کچھ قرضہ بھی دے اور بعض من چلے سرمایہ دار ہمارے ہاں کچھ تھوڑا بہت روپیہ بھی لگائیں لیکن امریکی سرمائے کی ریل پیل جس سے ہماری صنعت ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اگر کسی طرح ممکن بھی تھی تو اب قطعاً ناممکن ہو گئی۔

غالباً اس سے ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کو جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ امریکی سرمایہ بڑے پیمانے پر ہندوستانی سرمائے کے ساتھ مل کر ہندوستان کا استحصال اور اس پر حکومت کرے گا اس صورت حال سے صدمہ اور مایوسی ہوگی اور شاید ان لوگوں کو بھی جو ہندوستان میں فوری صنعتی ترقی چاہتے ہیں خواہ وہ کسی کے ہاتھوں اور کسی کے فائدے کے لئے ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں قومی غیرت و حمیت کا احساس اور قومی آزادی کی قدر ہے جن کے نزدیک ملک کی خوش حالی سے مراد ایک خاص طبقے کی نہیں بلکہ عوام کی خوش حالی ہے ان کو سچی خوشی ہوگی کہ ہندوستان ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گیا۔

اگر ہم حالات کو غور سے دیکھیں تو ہندوستان مغربی یورپ کے ملکوں کی طرح امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کی ساکھ اچھی ہے اس کے پاس اندرونی وسائل کافی اور محنت کرنے والے بے شمار ہیں۔ اگر وہ اپنے مزدوروں اور کسانوں میں یہ احساس پیدا کر سکے کہ یہ حکومت ان کی ہے اور ہر معاملے میں اُن کے مفاد کو ترجیح دیتی ہے تو وہ اپنا لہو پسینہ ایک کر کے اور زمین کا سینہ چیر کر معدنی اور نباتی دولت کا ڈھیر لگا دیں گے اور اپنا پیٹ کاٹ کر وہ سرمایہ فراہم کر دیں گے جو باہر سے مشینیں اور صنعتی ترقی کے دوسرے لوازم مہیا فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے متوسط طبقے کے نوجوانوں کے دل میں ایک نئی زندگی کا جوش اور حوصلہ پیدا کر سکے تو یہ لوگ اپنے دماغ کو کھپا کر اور پتہ مار کر وہ فنی مہارت حاصل کریں گے جو صنعت کی روح رواں ہے۔ ہندوستان کا اصلی مسئلہ باہر سے مالی سرمایہ فراہم کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس جسمانی، اخلاقی اور ذہنی سرمایے سے کام لینے کا ہے جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ لیکن اس دولت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے سچے جمہوری سیاسی نظام اور اشتراکی معاشی نظام کی ضرورت ہے جس کا خواب ہم میں سے بہت سے لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ان خواب دیکھنے والوں کی وصیت اپنے سب سے بڑے قائد اور مدبر جواہر لال نہرو سے یہی ہے کہ آپ شوق سے مغربی اور مشرقی ملکوں سے خلوص اور محبت کا رشتہ جوڑیے امریکہ، انگلستان، روس اور چین کی دوستی اور اعتماد حاصل کر کے ان کے باہمی اختلافات دور کرنے اور عالم گیر امن اور صلح قائم کرنے کی کوشش کیجئے، لیکن یہ یاد رکھیے کہ آپ کی آواز میں اتنا ہی اثر ہوگا جتنی مادی اور اخلاقی قوت آپ کے ملک کے پاس ہوگی۔ اس لئے آپ کا اصلی کام یہی ہے کہ "تلاشِ امریکہ" کے ساتھ ساتھ "تلاشِ ہند" کے کام کو مکمل کیجئے، یعنی جو قوت کے خزانے آپ کی چشم بصیرت کو اپنے ملک کے اندر نظر آئے ہیں ان کو کھولنے کے لئے ایک منصفانہ سیاسی یا معاشی نظام کی کنجی تلاش کیجئے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت اور متوسط طبقے کی بے چینی دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر دو چار سال کے اندر ہندوستان کی صنعت کو غیر معمولی فروغ نہ ہوا اور افلاس اور بے روزگاری کے مسئلے کا حل نہ نکلا تو یہاں انقلاب کا زلزلہ شاید اور ملکوں سے زیادہ شدت کے ساتھ آئے گا جس میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ہماری نئی ریاست کا جو ابھی اچھی طرح بننے نہیں پائی، شیرازہ ہی نہ بکھر جائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خطرے کو روکنے کے لئے جو فوری صنعتی ترقی درکار ہے وہ بیرونی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک منصفانہ سیاسی اور معاشی نظام کے اندر جس میں سب کا بوجھ کم و بیش برابر ہو، یہ جادو ہوتا ہے کہ لوگ سخت سے سخت تکلیفیں جھیلنے پر خوشی سے راضی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں اشتراکی جمہوری نظام قائم ہو جائے یا اس کے قائم ہونے کے آثار نظر آنے لگیں تو یہی لوگ جو آج افلاس اور گرانی کی وجہ سے بے چین اور بیزار ہیں۔ ان مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کر سکیں گے اور [illegible] م

م اندرونی وسائل سے کام لے کر صنعت کی تعمیر اور ترقی کا کام جو آج اتنا کٹھن اور صبر [illegible] نتائج دیں گے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

آئین کی دوسری پڑھائی پوری ہوگئی

۱۷ر اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کا اہم اور دشوار کام جو تقریباً تین سال سے ہو رہا تھا ختم ہو گیا۔ اسمبلی کا پہلا جلسہ ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا تھا اور ابتدائی مرحلوں کو طے کرنے کے بعد اگلے مہینے اس نے مقاصد کا مشہور و معروف رزولیوشن پاس کیا تھا۔ اس کے بعد ایک سال کے عرصے میں آئین کا پہلا مسودہ مرتب ہو کر ۲۸ر فروری ۱۹۴۸ء کو شائع کیا گیا۔ اور ۴ر نومبر ۱۹۴۸ء کو ڈرافٹنگ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر امبیڈکر نے اسے اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد اسمبلی کے چار اجلاسوں میں آئین کی پہلی اور دوسری پڑھائی ہوئی اور بڑی بڑی بحثوں اور معرکوں کے بعد خدا خدا کر کے ۳۰۶ دفعوں اور ۸ ضمیموں کا یہ ضخیم آئین مکمل ہو گیا اب نومبر کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں آئین ساز اسمبلی پھر جمع ہوگی اور ۲۸ر نومبر سے پہلے تیسری پڑھائی ختم کر کے جس میں غالباً صرف لفظی اور جزوی ترمیمیں ہوں گی، آئین کو آخری بار قطعی طور پر منظور کرے گی اور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے گا۔

مشرقی پنجاب کی وزارت پھر بدلی

دنیا میں فرانسیسی قوم سیاسی تلون کے لئے مشہور ہے چنانچہ وہاں جنگ سے پہلے وزارت کی عمر ایک دو سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور جنگ کے بعد تو دو چار مہینے کی رہ گئی۔ ہمارے ملک میں مشرقی پنجاب اور مدراس اس لحاظ سے فرانس کے قریب قریب پہنچتے ہیں کہ یہاں بھی پچھلے سوا دو سال میں ان دونوں صوبوں میں وزارت تین بار بدل چکی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ فرانس میں یہ تبدیلی مختلف سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشمکش اور اصولی اختلافات کی بنا پر ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں محض ذاتی اغراض اور شخصی رقابتوں کی بنا پر۔ ابھی چھ مہینے ہوئے مشرقی پنجاب کی کانگریس اسمبلی پارٹی نے چند ووٹوں کی اکثریت سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کی جگہ سری بھیم سین سچر کو اپنا لیڈر چنا اور سچر صاحب کی وزارت قائم ہوئی جس میں کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے حکم سے ڈاکٹر بھارگو کے دو ایک ساتھی شریک کئے گئے۔ اب اس اسمبلی کانگریس پارٹی نے بہت بڑی اکثریت سے ڈاکٹر بھارگو کو دوبارہ پارٹی لیڈر منتخب کیا ہے سری سچر اور ان کی وزارت نے استعفا دے دیا اور ڈاکٹر بھارگو کو پھر نئی وزارت بنانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اب تک انھوں نے صرف سری پرتھوی سنگھ آزاد کو اپنی وزارت میں لیا ہے اور وزیروں کا انتخاب غالباً وہ پارلیمنٹری بورڈ سے مشورے کے بعد کریں گے۔ مگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کو سری سچر کے گروپ سے کسی وزیر کے لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

تارکین وطن کی جائداد کا نیا ضابطہ

مرکزی حکومت نے ۱۴ر جون کو تارکین وطن کی جائداد کے بارے میں جو ضابطہ نافذ کیا تھا اور جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو جائز شکایتیں تھیں وہ اب منسوخ کر دیا گیا ہے اور ایک نیا ضابطہ بنایا گیا ہے جس سے یہ شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ اس ضابطے میں نئی باتیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) "تارک وطن" کی تعریف میں صرف وہ لوگ آتے ہیں جو واقعی ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے یا جنھوں نے وہاں کسی تارک وطن کی جائداد جائز یا ناجائز طریقے پر حاصل کر لی ہے۔

(۲) طریق کار میں یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ کسٹوڈین اگر کسی شخص کو تارک وطن سمجھے تو ایک دم سے اس کی جائداد پر قبضہ نہیں کرے گا بلکہ پہلے اس کو نوٹس بھیج کر یہ ثبوت پیش کرنے کا موقع دے گا کہ وہ تارک وطن نہیں ہے۔

(۳) کسٹوڈین کے فیصلے کی اپیل ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اور جج کے فیصلے کی ہائی کورٹ کے بنچ میں ہو سکے گی۔

اس سے پہلے یہ سرکولر جاری ہو چکا ہے کہ جس مشترکہ جائداد کا کوئی شریک پاکستان میں چلا گیا ہے اس کے دوسرے شریک کو جو ہندوستان میں موجود ہے یہ چاہئے کہ جانے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

پاکستان

مہاجرین کے مطالبے

شیخوپورہ میں مہاجرین کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مہاجرین کی طرف سے حکومت پاکستان سے مطالبے کئے گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نے اپنی طویل تقریر میں مہاجرین کی مشکلات اور دقتوں کو بیان کیا اور حکومت پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے اب تک مہاجرین کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور وہ مہاجرین میں اور مہاجرین اور انصار میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے حکومت سے حسب ذیل مطالبے کئے:-

(۱) ہر مہاجر خاندان کو کم سے کم ۱۲½ ایکڑ زمین دی جائے۔

(۲) جب تک مہاجرین کی مالی حالت اچھی نہ ہو جائے، ان سے زمین اور مکان کے کرائے نہ لئے جائیں۔

(۳) مہاجرین سے جو ٹیکس وصول ہوں وہ صرف مہاجرین کے کام کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔

مرکزی مہاجرین کمیٹی کا جسے ابھی حال میں حکومت پاکستان نے مہاجرین کی بحالی کے لئے مقرر کیا ہے ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ یہ محض عوام کو دھوکہ دینے کے لئے بنائی گئی ہے اور چونکہ یہ حقیقی مہاجرین پر مشتمل نہیں ہے اس لئے وہ مہاجرین کے فائدے کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ انھوں نے ایک نمائندہ کمیٹی کے تقرر کا مطالبہ کیا جسے مہاجرین کا اعتماد حاصل ہو اور جو ایسے مہاجرین پر مشتمل ہو جو ابھی تک آباد نہیں کئے جا سکے ہیں۔ سہروردی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مہاجرین کو موجودہ مسلم لیگ پر بالکل بھروسہ نہیں ہے مگر پبلک سیفٹی ایکٹ کے خوف سے وہ اس کا کھل کر ذکر نہیں کرتے۔ انھوں نے پورے ملک میں نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔

شیخوپورہ کے ضلع مسلم لیگ کے صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں "مغربی پاکستان انجمن مہاجرین" کو یقین دلایا کہ وہ جب بھی مکانوں اور زمینوں کے کرایے سے مہاجرین کو مستثنیٰ کرانے کے لئے کوئی ایجیٹیشن کرے گی تو شیخوپورہ ضلع مسلم لیگ کی ان کو پوری طرح اعانت حاصل ہوگی۔

جوٹ کا مسئلہ مشکل ہوتا جا رہا ہے

پاکستانی روپے کی قیمت نہ گھٹانے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں جوٹ کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا مشرقی پاکستان کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے وہاں کے عوام کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اور پریشانی کو روکنے کے لئے وزیر اعظم پاکستان آج کل مشرقی پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کے وعدے کر رہے ہیں مگر حکومت کی سکے کی پالسی کا عوام کی حالت پر اتنا برا اثر پڑ رہا ہے کہ جب تک کوئی ٹھوس تدابیر نہ اختیار کی جائیں محض ان طفل تسلیوں سے کام نہیں چلے گا۔ حکومت پاکستان کو بھی اس کا پوری طرح احساس ہے۔ اس لئے ۲۳ر اکتوبر کو ڈھاکہ میں وزیر اعظم وزیر مال اور وزیر تجارت کی ایک مخصوص کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس میں جوٹ کے مسئلے پر جو دن بدن اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے غور کیا جائے گا۔

اخباروں کی ہڑتال

کراچی کے ایک انگریزی روزنامہ "سندھ آبزرور" کے چیف ایڈیٹر مسٹر علی محمد راشدی نے بعض اختلافات کی بنا پر سے اسٹاف کے کچھ لوگوں کو نکال دیا، اس پر ان کی ہمدردی میں ان کے دوسرے ساتھیوں نے اسٹرائک کر دی۔ منتظمین نے کام جاری رکھنے کے لئے پولیس سے مدد لی۔ پولیس نے اسٹرائک کرنے والوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا، اس سے اسٹرائک کرنے والوں کے ہمدردوں میں اضافہ ہو گیا، اور یہ "سندھ آبزرور" کی حدود سے نکل کر پورے کراچی اور پھر پورے مغربی پاکستان کا مسئلہ بن گیا ہے مسٹر راشدی نے ایک بیان میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

بزمِ بے تکلّف

"کہئے میر صاحب مزاج اچھے ہیں؟"
"مزاج تو آج کل کسی بے حس، بے حیا کے اچھے ہوں گے، بس یوں سمجھ لو کہ بگاڑ رہے ہیں۔"
"اجی آپ کیا کسی سے کم ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے کہ جئے چلے جاتے ہیں۔"
"مطلب یہ ہے کہ ہم بھی بے حیائی میں کسی سے کم نہیں۔ صاف کہو نہ، لگی لپٹی کیوں رہے۔"
"کیا مجال: بھلا میں نقل کفر کر سکتا ہوں۔"
"شاباش کافر بھی بنا دیا۔ اور خیر کچھ کہتا ہو کہہ لو۔"
"توبہ میر صاحب! آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ مگر آخر بات کیا ہے، آج اتنی بیزاری کیوں ہے؟"
"بیزاری نہ ہو تو کیا ہو؟ بی مہنگائی اور میاں کنٹرول کی بدولت دنیا کی نعمتوں سے ہاتھ دھویا۔ مٹھائی چھوٹی، پھل چھوٹے، گھی چھوٹا، مکھن چھوٹا ——"
"اور دودھ چھوٹا۔"
"لاحول ولا قوۃ! چاہے بات کرنا نہ آئے، مگر بیچ میں لقمہ ضرور دیں گے۔ دودھ بچوں کا چھوٹتا ہے یا ہم جیسے بوڑھوں کا۔"
"مگر میر صاحب جب دودھ عنقا ہو جائے اور آپ جیسے بوڑھے دودھ کے لئے ترسیں تو اس مطلب کو کس طرح ادا کیا جائے۔"
"پھر وہی ہلڑ کنا۔ عامیانہ لفظ۔ یوں کہو کہ دودھ تو اب چڑیا کا دودھ ہو گیا۔"
"واہ میر صاحب ہیں تو عامیانہ لفظ پر ٹوکتے ہیں اور آپ سوقیانہ فقرہ کہہ گئے۔ اچھا، آپ یہ بتلایئے کہ جن نعمتوں کا آپ نے ذکر کیا وہ تو سب پہلے ہی چھوٹ گئی تھیں۔ اب نئی مصیبت کون سی آئی جس سے چھٹی کا دودھ آ گیا۔"
"ہائے، ہائے تمھیں کبھی تمیز نہ آئے گی، خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ لے دے کے ایک چائے رہ گئی تھی، اب اس کے بھی چھوٹنے کی نوبت آ گئی۔ چائے کا مزا شکر سے ہے اور شکر اب نصیب دشمناں ہو گئی۔ جو دھکے کھائے لاٹھیاں اور گولیاں کھانے کا جوکھم اٹھائے وہ کنٹرول کی شکر لانے کا حوصلہ کرے۔"
"ارے! اب سمجھا کہ آپ اتنے کڑوے کیوں ہو رہے ہیں۔ نئی طبی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جسم میں شکر کی کمی ہو تو آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"
"تمھیں واللہ سچ بتاؤ، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"
"توبہ میر صاحب بھلا شکر کے معاملے میں مذاق کا کیا کام۔ آپ جس سائنس داں سے چاہئے پوچھ لیجئے۔ اور آپ خود دیکھئے نا، جب سے شکر کا توڑا ہوا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں لوگ کتنے جھگڑالو ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی سے دوست دوست سے لڑ رہا ہے۔ کہیں ممدوٹ اور دولتانہ میں گتھم گتھا ہے کہیں لونڈ خورا اور مردم خور میں، کہیں راجا اور ہرکا شم میں، کہیں بھارگو اور سچر میں اور ابھی ہم دونوں میں جھوڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔"
"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب ایسی بات ہے تو پھر ہماری دیسی سرکار دساور سے شکر کے جہاز بھر بھر کے کیوں نہیں منگا تی کہ ان دل والوں اور آڑھتیوں کا مزاج درست ہو جائے اور انھیں جھک مار کر شکر سستی کرنی پڑے؟"
"ذرا کان ادھر لایئے تو کہوں۔ دیکھئے، بڑے راز کی بات ہے۔ اپنوں ہی تک رہے۔ قصہ یہ ہے میر صاحب کہ ہماری تو ساری بدیسی پالیسی شکر ہی کی لپٹی ہوئی ہے۔ بتلایئے ہم نے سب سے پہلے دوستی کا رشتہ کس سے جوڑا؟ آسٹریلیا ——— پھر؟ انڈونیشیا۔ اس کے بعد سنتھنی بھیج کر کیسے پرچایا؟ جاپان کو۔ یہ تینوں ملک بس یوں سمجھئے کہ شکر کی کان ہیں۔ اب تک ہم اپنے دیس کے شکر چوٹوں کو ڈھیل دیتے رہے کہ شاید راہ پر آ جائیں لیکن اگر یہ اسی طرح شکر حرامی کرتے رہے تو اپنے ہم شکر ملکوں کی مدد سے ان کو بیرونی مقابلے کے کولھو میں رکھ کر ایسا پیلیں گے کہ رس نکل آئے گا۔"
"دیکھو اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تمھارے منہ میں گھی شکر ورنہ پھر
ع جھوٹے کے منہ میں آگے کہوں کیا۔"

کس کے لئے ہے!؟

سروش عسکری طباطبائی

یہ ناز یہ شوخی مری جان کس کے لئے ہے
یہ حسنِ دلاویز و جواں کس کے لئے ہے
اللہ رے یہ ابروئے خم دار کا عالم
یہ چاند یہ خنجر یہ کماں کس کے لئے ہے
اس روحِ گلستاں کا ہے رخ کون سی جانب
موجِ نفسِ عطر فشاں کس کے لئے ہے
یہ زلف یہ قشقہ یہ صفِ نشترِ مژگاں
یہ فوج یہ پرچم یہ نشاں کس کے لئے ہے
پیمانہ بکف، نغمہ بہ لب، گل بہ گریباں
یوں حشر بداماں مری جاں کس کے لئے ہے
پیدا ہے جو سینے میں چمک دردِ وفا کی
یہ گوہرِ نایاب و گراں کس کے لئے ہے
کیسی دل ناوک میں یہ بھڑکی ہے نئی پیاس
گل برگ سے ہونٹوں پہ زباں کس کے لئے ہے

غزل

آفتاب عالم

ہر طرح رنگ وہ محفل کا بدلتے ہی رہے
جام گردش میں رہا ہونٹ لرزتے ہی رہے
اس طرح لٹتا رہا گلشنِ ہستی اپنا
اُس طرف گیسوئے تقدیر سنورتے ہی رہے
ہمت و عزم کے ماتھے پہ شکن آ نہ سکی
کتنے طوفان سفینے سے الجھتے ہی رہے
ہو سکی تم سے مکمل نہ جنوں کی تصویر
یوں تو ہم رنگ طبیعت کا بدلتے ہی رہے
خضر بن کر بھی نہ پایا کوئی منزل کا سراغ
کارواں کتنے سرِ راہ بھٹکتے ہی رہے
کتنے ترسے ہوئے ہونٹوں کو سہارا نہ ملا
یوں تو ساغر تری محفل میں چھلکتے ہی رہے

عورت کا درجہ گاندھی جی کی نظر میں

صالحہ عابد حسین

گاندھی جی کے خیال میں عورت اگر کسی حیثیت سے مرد سے کم ہے تو صرف حیوانیت کی طاقت میں ورنہ انسانیت کے لحاظ سے اس کا درجہ مرد سے کم نہیں بلکہ بلند ہے ......

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور اُن کے مساوی درجہ ملنا چاہئے۔ اور اُن کو سب کاموں میں برابر کا حصہ لینا چاہئے۔ مگر اُن کی طبیعت اور سمجھ میں بلا کا توازن تھا۔ اس مقصد پر انھوں نے زور دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ عورت کا جو ایک خاص کام گھرداری اور بچوں کی پرورش اور تربیت ہے وہ کچھ کم اہم نہیں، اُن کے نزدیک یہ کام بھی اتنا ہی اہم اور قابل قدر ہے جتنا اور کوئی قومی کام اور اس صبر آزما اور کٹھن کام کے لئے عورت ہی موزوں ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کی عورت کو سماج میں بڑا اونچا درجہ حاصل تھا اور اس کو مرد کے برابر حقوق ملے ہوئے تھے۔ مگر یہ سنہری زمانہ ہمارا بہت پہلے کبھی ہوگا۔ اب تو سیکڑوں برس سے ہمارے ملک کی عورت جانوروں سے بدتر، لونڈی غلاموں سے زیادہ خراب حالت میں زندگی گذارتی رہی ہے۔ ایک ہزار برس گذرے پچھم سے ایک قوم ہندوستان میں حملہ آور کی حیثیت سے آئی تھی اور پھر یہیں رچ بس گئی اور یہاں رہ کر ہندوستانی ہوگئی۔ اس نے بہت کچھ ہندوستان سے سیکھا اور بہت کچھ اُسے سکھایا، بہت کچھ اس سے لیا، بہت کچھ اُسے دیا۔ یہ لوگ ایک نئے مذہب کے پابند اور ایک ترقی یافتہ سماجی تصور کے حامی تھے۔ اُن کے مذہب میں عورت کا درجہ بہت بلند مانا گیا تھا اور اُسے انسانیت کے سارے حقوق بڑی فیاضی سے عطا کئے گئے تھے۔ مسلمان جب تک اسلام کی حقیقی روح کو سمجھتے اور اس کے بنیادی احکام پر عمل کرتے رہے، انھوں نے سماج میں عورت کو بھی درجہ دیا جو اسلام نے اُسے عطا کیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وہ اسلامی روح سے دور ہوتے گئے، ان کے ہاں بھی عورت کے حقوق غصب ہوتے گئے اس پر محض فرائض کا بوجھ بڑھتا رہا، اور اس کا سماجی درجہ پست سے پست تر ہوتا گیا۔ اس تحریک کا اثر ہندوستان میں نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی عورت خواہ وہ ہندو تھی یا مسلمان انسانیت کے درجے سے گر گئی، وہ اپنے حقوق سے محروم، جہالت کی اندھیری کوٹھری میں قید، اپنی تنگ اور تاریک زندگی گذارتی رہی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صبر اور ہمت اور ایک حد تک خوش دلی اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے، لیکن اصل میں وہ ایک کنوئیں کے مینڈک کی طرح تھی جو اسی کو ساگر سمجھتا ہے اور اس میں مگن رہتا ہے۔ نہ باہر سے روشنی کی کرنیں اس تک پہنچتی تھیں، نہ اندر اتنی روشنی تھی کہ وہ اس میں اپنی ذات کا صحیح جلوہ دیکھے اور اپنی صفات اور امکانات کو پہچان سکے۔

لیکن گذشتہ صدی کے آخر میں جب مغربی تعلیم اور تہذیب کا ہند میں بھی چرچا ہوا تو ایک بہت محدود طبقے میں عورت کی آزادی کی آواز اٹھی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اُسے قید و بند سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لینے کا اور "تعلیم" اور "تہذیب" سے مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہئے۔ مگر اس طبقے میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو دور سے مغربی تہذیب کی چمک دمک دیکھ کر چندھیا گئے تھے اور اسی کو اپنانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے زمانے کی پڑھی لکھی، آزاد خیال اور فیشن ایبل عورتوں میں سے بیشتر بالکل تتلی بن گئیں۔ تتلی بھی ایسی جن کے نقش و نگار مصنوعی تھے اور غازے کی طرح رنگ روغن عارضی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ دراصل یہ جدید تتلی بھی جو محض زینتِ محفل بننے کی اُمنگ رکھتی تھی، اسی طرح مرد کی باندی تھی جس طرح وہ پرانی گڑیا یا جو گھر کی زینت بنا کر بٹھا دی گئی تھی۔ اُسے اپنے فعل کی صرف اسی حد تک آزادی تھی جہاں تک اس کا آزاد خیال اور تعلیم یافتہ شوہر اس کی اجازت دے .... اس کی ذاتی شخصیت اور رائے کو یہاں بھی دخل نہ تھا، کیونکہ ابھی اس کی اپنی شخصیت بن ہی نہ پائی تھی۔

میں نے یہ دو تصویریں جو دکھائی ہیں یہ بحیثیت مجموعی صحیح ہیں۔ اگرچہ ہزاروں میں چند ایسے نمونے بھی مل سکتے ہیں جن میں خود اعتمادی اور خودداری تھی جو پرانی اور نئی دونوں حالتوں میں اپنی ایک نمایاں اور ذاتی شخصیت رکھتی تھی، لیکن ان کی گنتی اتنی کم تھی کہ انھیں شاید انگلیوں پہ گنا جا سکتا ہے۔

جب گاندھی جی نے ہندوستان کی رہنمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے صرف سیاست ہی کو نہیں سنبھالا بلکہ ہر قسم کی معاشرتی اور سماجی اصلاح کا بار بھی اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھا لیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیاست پوری قومی زندگی نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے اور جب تک لوگوں کی سماجی اخلاقی اور ذہنی تربیت صحیح اصولوں پر نہیں ہوگی صرف سیاست کا کھیل نہ قوم کو آزادی دلا سکتا ہے نہ اُس کے تمام مرضوں کا علاج کر سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہمہ گیر پروگرام میں مختلف قسم کے تعمیری کاموں کو جگہ دی اور جہاں تک سماجی اصلاح کا تعلق ہے انھوں نے دوسرے سچے انسانی رہبروں کی طرح سب سے پہلے اپنی توجہ اور کوشش مظلوموں کے حقوق واپس دلانے اور پست اور کچلے ہوئے لوگوں کو اٹھانے کی طرف مبذول کی۔ ایک طرف ہندوستان کو سامراج کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے اور دوسری طرف اچھوتوں کو اونچی ذاتوں کے پنجۂ ظلم سے آزاد کرانا .... عورت کو مرد کی غلامی سے چھٹکارا دلا کر اُسے خود اعتمادی اور سچی آزادی کی نعمت عطا کرنا چاہتے تھے اور کس قدر عظیم الشان کامیابی ہوئی، انھیں اس کوشش میں! انھیں صدیوں کی ذہنیت کو بدلنا تھا، بہتے ہوئے دھارے کے خلاف تیرنا تھا لیکن انھوں نے ہر قسم کی مشکلوں اور مخالفتوں کو جھیلا اور لوگوں کے خیال اور عمل کے سانچوں کو بدل دیا۔ جب تک ہمارے دیس کا وجود دنیا میں باقی ہے وہ اپنے محسن اعظم کے احسان کے بوجھ سے دبا رہے گا۔

گاندھی جی نے ہندوستانی عورت کے لئے کیا کچھ کیا اور ان کی بدولت اس نے کیا کچھ پایا اس مضمون میں اُسے تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی صاحب قلم جو گاندھی جی کے بہت قریب رہا ہو اس بارے میں ان کے تمام خیالات اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو تفصیل سے لکھے اور اُسے دیس کے مرد اور عورت دونوں کے سامنے پیش کرے اور ان کی تعلیم کا یہ جز زیادہ سے زیادہ دیس میں پھیلایا جائے۔ میں یہاں مختصر طور پر چند موٹی موٹی اور اہم باتیں جن کی بدولت ہند کی عورت کی حالت سنبھلی اور اس کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اور خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی

گاندھی جی کے دل میں عورت کی بڑی عزت تھی وہ اسے اہنسا اور ستیہ، ایثار اور جفاکشی خدمت

اور محبت کی دیوی سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے خیال میں عورت کے لئے محض نسوانی خوبیوں کا مجسمہ ہونا (جن کی وجہ سے آج کل کی اصطلاح میں اُسے "صنف نازک" کا خطاب دیا گیا ہے) کافی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ اس کی سیرت کی تکمیل کے لئے اس میں نڈرتا، بہادری، خود اعتمادی اور عزت نفس کی ضرورت بھی ہے۔

اگرچہ گاندھی جی نے عمر بھر عورتوں کے حقوق کے بارے میں بہت سے مضمون لکھے، بہت سی تقریریں کیں، لیکن وہ جب کسی جماعت سے مخاطب ہوتے تھے تو حقوق سے زیادہ اس کے فرائض کی طرف اُسے متوجہ کرتے تھے۔ یہی اصول انھوں نے عورتوں کے بارے میں بھی اختیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ جب عورت کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا موقع ملے گا تو اسے حقوق خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ انھوں نے عورتوں کو بتایا کہ ان پر خدمت کا بار مرد سے بھی زیادہ ہے۔ عورت کا نصب العین انسانیت کی سیوا ہونا چاہئے جس میں ہر قسم کی خاندانی، سماجی، معاشرتی اور قومی خدمت آ جاتی ہے۔ سماج کا فرض ہے کہ عورت کو اس کے اس اہم فرض کی ادائیگی کا پورا پورا موقع دے اور عورت کا دھرم ہے کہ اس راہ میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کو سر کرے، اور اس ضمن میں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں انھیں خاموشی اور انکسار سے برداشت کرے۔ وہ جانتے تھے کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق غصب کئے ہیں اور انھیں اس کا تاوان ادا کرنا چاہئے مگر ساتھ ہی وہ عورتوں سے بھی مطالبہ کرتے تھے کہ وہ خود اپنی سیرت اور کردار اور جد و جہد کے ذریعے اپنے حقوق واپس لیں۔ ایک جگہ عورتوں کی آزادی کے عنوان سے لکھتے ہیں:-

"اس میں شک نہیں کہ مرد عورتوں کو نظر انداز کرنے کے بلکہ اُن کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے ملزم ہیں اور انھیں اس کا مناسب کفارہ دینا چاہئے۔ لیکن ان عورتوں کو جنھوں نے اوہام کی زنجیریں توڑ دی ہیں اور اپنے حقوق کا احساس رکھتی ہیں، خود بھی اصلاح کا تعمیری کام کرنا چاہئے......"

ان کا بالکل صاف اور واضح نظریہ تھا کہ عورت اور مرد کا درجہ اور حقوق بالکل مساوی ہیں اور انھوں نے بار بار اس کو دہرایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں عورت کے حقوق کے معاملے میں کسی قسم کی مصالحت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس پر کوئی ایسی قانونی پابندی نہیں لگنی چاہئے جو مرد پر نہ لگی ہو۔ میرے نزدیک لڑکے اور لڑکیوں سے کامل برابری کا سلوک ہونا چاہئے......"

گاندھی جی کے خیال میں عورت اگر کسی حیثیت سے مرد سے کم ہے تو صرف حیوانیت کی طاقت میں ورنہ انسانیت کے لحاظ سے اس کا درجہ مرد سے کم نہیں بلکہ بلند ہے۔

"عورت کو صنف نازک کہنا اس کی توہین ہے یہ مرد کی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ اگر طاقت سے مطلب حیوانی طاقت ہو تو اس میں شک نہیں کہ عورت میں حیوانیت مرد سے کم ہوتی ہے۔ لیکن اگر طاقت سے روحانی قوت مراد لی جائے تو عورت مرد سے بدرجہا افضل ہے......"

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور ان کے مساوی درجہ ملنا چاہئے اور ان کے سب کاموں میں برابر کا حصہ لینا چاہئے مگر ان کی طبیعت اور سمجھ میں بلا کا توازن تھا، اس مقصد پر انھوں نے زور دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ عورت کا جو ایک خاص کام گھرداری اور بچوں کی پرورش اور تربیت ہے وہ کچھ کم اہم نہیں۔ اُن کے نزدیک یہ کام بھی اتنا ہی اہم اور قابل قدر ہے جتنا کوئی اور قومی کام اور اس صبر آزما اور کٹھن کام کے لئے عورت ہی موزوں ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میں جو نظام زندگی چاہتا ہوں۔ اس میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا ہوگا اور اُسے اس کا معاوضہ ملے گا۔ عورتیں بھی ان دوسرے کاموں میں شرکت کریں گی۔ مگر ان کا اصلی کام گھر کا کام ہے ......" ایک اور جگہ انھوں نے زیادہ وضاحت سے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور یہ حصہ یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔

"میرے خیال میں جس طرح مرد اور عورت اصل میں ایک ہیں، ان کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہونا چاہئے۔ روح دونوں میں ایک ہی ہے۔ دونوں ایک سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایک کا دوسرے کی عملی مدد کے بغیر زندہ رہنا محال ہے"۔

"مگر نتیجہ ایسا ہوا کہ مرد عورت پر حکومت کرنے لگا، اور مدتوں سے کر رہا ہے۔ اس سے عورت میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اور وہ مرد کی اس خود غرضانہ تعلیم کو سچ سمجھتی ہے کہ وہ مرد سے گھٹیا ہے مگر جو عارف مردوں میں گذرے ہیں انھوں نے عورت کے مساوی درجے کو تسلیم کیا ہے"۔

"پھر بھی اس میں کوئی شبہہ نہیں کسی نہ کسی نقطۂ پر پہنچ کر دونوں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ گو اصل میں دونوں ایک ہیں مگر یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ جسمانی لحاظ سے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے دونوں کے کام بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ ماں کے فرائض جو عورتوں کی بہت بڑی اکثریت کو ہمیشہ انجام دینے پڑیں گے وہ صفات چاہتے ہیں جو مردوں میں ہونے ضروری نہیں .... عورت دراصل گھر کی مالک ہے، مرد روزی کماتا ہے، عورت اسے رکھتی ہے اور بانٹتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خبرگیری کرنے والی ہے۔ بچوں کو پالنا اس کا خاص حق ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اگر وہ خبرگیری نہ کرے تو انسان کی نسل مٹ جائے"۔

"میرے خیال میں اس بات میں مرد اور عورت دونوں کی ذلت ہے کہ عورت کو گھر چھوڑ کر گھر کی حفاظت کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور یا آمادہ کیا جائے .... گھر کو اچھی حالت میں رکھنا بھی اتنا ہی بہادری کا کام ہے جتنا اُسے باہر کے حملوں سے بچانا .... عورتیں لوہار اور بڑھئی نہیں ہیں۔ لیکن کھیتوں میں مرد عورت دونوں کام کرتے ہیں جس میں بھاری کام مرد کے ہاتھوں بٹتا ہے۔ عورتیں گھر کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں۔ وہ بھی خاندان کی قلیل آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرتی ہیں لیکن اصل کمانے والا مرد ہی ہے کاموں کی اس تقسیم کو ماننے کے بعد بھی دونوں جنسوں کے لئے قریب قریب ایک سے عام صفات ضروری ہیں ...."

(باقی آئندہ)

اقبال کے چار شعر

رضا لائبریری، رام پور ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

محترمی، تسلیم مع التکریم

امید ہے کہ آپ کا مزاج اب قرین صحت و عافیت ہوگا۔ اس خط کے ساتھ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک نظم ارسال کر رہا ہوں۔ یہ اسی ہفتے کی فتوح ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ نواب صاحب جنجیرہ (جزیرہ) بیگم جنجیرہ اور عطیہ بیگم فیضی (ہمشیرہ بیگم جنجیرہ) اور چند دیگر اصحاب کے ساتھ ۱۹۰۸ء میں یورپ کے سفر کو تشریف لے گئے تھے بیگم صاحبہ نے وقتاً فوقتاً اپنے اعزہ کے نام خط لکھے اور اس میں اپنے سفر کے واقعات سنائے۔ واپسی پر ان سب خطوں کو عطیہ بیگم فیضی صاحبہ نے "سیر یورپ" کے نام سے مرتب کر دیا۔ یہ سفرنامہ اسی زمانے میں چھپ کر شائع بھی ہوا تھا میں کئی دن ہوئے اسے پڑھ رہا تھا کہ ۱۰ر جون ۱۹۰۸ء کے واقعات میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام نظر پڑا۔ یہ ان حضرات میں سے ایک تھے جنھیں بیگم صاحبہ نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ سفرنامے میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں: (صفحہ ۷۰)

"مسٹر اقبال نے اس روز یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر میری کتاب میں درج کر دئے جنھیں یہاں نقل کرتی ہوں:

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیض آستاں بوسی سے گل بر سر قمر
روشنی لے کر تری موج غبار راہ سے
دیتا ہی لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروان قوم کو تجھ سے ہی زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدر محفل اختر قمر
شمع بزم اہل ملت را چراغ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن

اقبال مرحوم کے یہ شعر بانگ درا میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے ان کا ملنا خاصا دلچسپ نظر آرہا ہے۔ بظاہر ان کے نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بیگم صاحبہ کی تعریف میں لکھے گئے اور وہیں ان کی کتاب میں درج کر دئے گئے تھے ان کی نقل اقبال نے اپنے پاس نہ رکھی اور نہ موضوع کی عدم افادیت کے پیش نظر یاد رکھا، ورنہ ضرور بانگ درا میں چھپ جاتے۔ چونکہ ان پر نظر ثانی تک نہ ہو سکی ہے اس لئے دوسرے مصرعہ کے پہلے لفظ "دیتا ہے" میں جستی بھی نہیں ہے۔ امید ہے کہ ان تبرکات کو آپ سفرنامہ مذکورہ (سیر یورپ صفحہ ۷۰) کے حوالے کے ساتھ نئی روشنی میں شائع فرما دیں گے۔ مخلص عرشی

ملک راج آنند

ایک انقلاب پسند ادیب

خواجہ احمد عباس

ہمارے ملک کے ادیبوں میں اگر سب سے اونچا نہیں تو سب سے انوکھا مقام ضرور ڈاکٹر ملک راج آنند کا ہے۔

وہ اپنے ملک سے زیادہ غیر ملکوں میں مشہور ہیں، وہ کھدر پہنتے ہیں مگر کانگریسی نہیں ہیں۔ اُن کے سجے ہوئے گھر میں ایک طرف اگر ہزاروں برس پرانی پتھر کی مورتیاں رکھی دکھائی دیں گی تو دوسری طرف نئی مصوری کے عجیب نمونے۔ الماریوں میں آرٹ اور انقلاب۔ شاعری اور کمیونزم پر کتابیں ساتھ رکھی ملیں گی اور اگر ڈاکٹر آنند گھر پر نہ ملیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ یا تو آرٹ سوسائٹی میں مصوری پر لیکچر دے رہے ہیں یا کسی سیاسی پلیٹ فارم پر کھڑے شہری آزادی کے لئے دھواں دار تقریر کر رہے ہیں، اور اتنی دیر میں اگر دروازے کی گھنٹی بجے اور ان سے کوئی ملنے آ جائے تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی آرٹسٹ ہے جو ملک راج سے اپنی نمائش کے بارے میں صلاح کرنے آیا ہے، یا سی، آئی، ڈی کا آدمی ہے جو اُن کا پاسپورٹ ضبط کرنے آیا ہے۔

ملک راج آنند فن کار انقلابی ہے یا انقلابی فن کار ہے؟ کیا وہ دراصل فن کار اور ادیب ہے جو انقلاب اور عوامی حکومت کو زندگی کے اعلیٰ مقاصد سمجھتا ہے، اور اپنے فن کی خاطر اُن کی خدمت کرتا ہے؟ یا وہ ایک انقلابی ہے جو انقلاب کی خاطر فن سے کام لیتا ہے اور اپنے قلم کو تلوار بنا کر سرمایہ داری نظام پر حملہ کرتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب شاید خود ملک راج آنند بھی نہیں دے سکتے۔ اپنے دل اور نظریئے کو بھلا کون الگ الگ کر کے دیکھ سکتا ہے؟ اور پھر ہو سکتا ہے کہ یہ سوال بے کار بھی ہوں جیسے زندگی اور فن کے مستقل رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا اسی طرح ملک راج آنند جیسے ترقی پسند ادیب کی زندگی میں اور ان کے لکھے ہوئے ادب میں فن اور انقلاب کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

پچھلے ۲۰۔۳۰ برس میں ہمارے ملک میں جو انقلابی طوفان اُٹھے ہے وہ سب ہی کی زندگی پر اثر انداز ہوا ہے۔ ادیب اور فن کار جن کے دل اور دماغ اوروں سے زیادہ ہر بات کو محسوس کرتے ہیں بھلا کب انقلاب سے بے پروا رہ سکتے ہیں؟ ملک راج آنند (جو پشاور میں پیدا ہوئے) جس گھرانے اور جن حالات میں پیدا ہوئے وہ انقلابی تو کیا ترقی پسند بھی نہ تھے۔ ان کے والد ٹھٹھیرے تھے جو اپنی برادری کو چھوڑ کر انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر ہیڈ کلرک کے افسر ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ کسان کی بیٹی تھیں جو اپنا زیادہ وقت پوجا پاٹ میں گذارتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی لاٹھیا کے چیمپئن تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی زمین میں نہ انقلابی خیالات کے بیج پنپ سکتے ہیں اور نہ آرٹ کی محبت پروان چڑھ سکتی ہے۔

گر اسی گھرانے میں ملک کو بچپن ہی سے ایسے حالات بھی ملے جنھوں نے انھیں ادب اور انقلاب کے راستے پر ڈال دیا۔ اُن کے پتا کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور گھر میں کتابیں بہت تھیں۔ اسکول کی زندگی ہی میں ملک نے اردو اور انگریزی کی بہت سی موٹی موٹی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ڈارون، اسپنسر، ملٹن، ہکسلے، اقبال جن میں سے بہت سی وہ اس وقت سمجھ بھی نہیں مگر پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

اُن کے والد کو فن کی بھی تھوڑی بہت سمجھ تھی کیونکہ تو اُن کی برادری کے ٹھٹھیرے اور سنار سینکڑوں برس سے سونے چاندی تانبے کی خوب صورت چیزیں بناتے آئے تھے۔ امرتسر کے دربار صاحب کے گنبد پر سونے کا کام انہی کے باپ دادا نے کیا تھا اور پھر ملک کے والد کے پاس کانگڑہ کے مصوروں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں بھی تھیں اس طرح نوجوان ملک راج کو فن میں دلچسپی اور فن کی پہچان دونوں اپنے باپ سے ملیں۔

اور بچوں کی طرح ملک کا زیادہ وقت اپنی ماں کے پاس ہی گذرتا تھا، ان کی ماں کو سینکڑوں دلچسپ کہانیاں یاد تھیں۔ جو وہ اپنے بچوں کو سنایا کرتیں۔ جب کبھی ننھا ملک اپنی ننھیال جاتا تو اپنے نانا اور دوسرے کسانوں کی زبانی وہ کہانیاں بھی سنتا جو پنجابی، دیہاتی سماج کے زبانی ادب میں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کو سن سن کر ملک خود بھی کہانیاں سوچنے، بنانے اور لکھنے لگا۔

نظموں اور گیتوں کا بھی ملک کو بچپن ہی سے شوق تھا اور اقبال کی اردو نظمیں تو انھیں بہت پسند تھیں سولہ برس کے تھے کہ خود اردو میں نظمیں لکھنے لگے اسی زمانے میں انھیں ٹائیفائڈ ہو گیا اور تین مہینے تک بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ جب تک بیمار رہے کمزور رہے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل دونوں زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔ بیماری نے کتنے ہی شاعر اور فن کار پیدا کیے ہیں۔ کشمیر کے عوامی شاعر عاصی نے اپنی پہلی فارسی نظم اس وقت لکھی جب وہ خطرناک بیماری سے موت اور زندگی کے بیچ میں جھول رہے تھے۔ کرشن چندر نے اپنی پہلی کہانی بیماری کے دنوں میں لکھی۔ اسی طرح نوجوان ملک کی لمبی بیماری نے انھیں مصنف بنا دیا اور پھر وہ اپنے کالج میگزین میں لکھنے لگے اور اس کے ایڈیٹر بھی بنے۔

امرتسر سے بی اے کر کے ۱۹۲۵ء میں ملک آگے پڑھنے کے لئے ولایت گئے اور لندن یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنے کے لئے نام لکھایا۔ پڑھنے اور کھوج لگانے سے جہاں انھوں نے ہندوستان کے فلسفے کو سمجھا اور پرکھا وہ وہاں یورپ کے نئے سائنٹیفک خیالات سے بھی متاثر ہوئے اور ان کے دماغ میں بھی پرانے خیالات کے بارے میں وہی شکوک پیدا ہونے لگے جو ہر ملک کے ترقی پسند اور انقلابی ادیبوں کو پرانی دنیا اور پرانی قدروں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لندن میں رہ کر انھیں سامراج اور سرمایہ داری نظام دونوں کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ انگلستان میں اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا، اور سمجھ دار اور تھوڑے بہت ترقی پسند انگریز بھی ہندوستانیوں کو آزادی کا حق دینے کو تیار نہ تھے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے دل سامراج کی نفرت سے بھرے ہوئے تھے مگر ملک جیسے سمجھ دار نوجوانوں نے سامراج کا دوسرا روپ بھی دیکھا جب انگلینڈ کی بڑی ہڑتال میں انگریز سرمایہ داروں نے اپنی قوم اور محنت والے انگریز مزدوروں کو بالکل اسی طرح سختی سے دبایا جس طرح ہندوستان میں انگریز حکومت آزادی مانگنے والوں کو دبا رہی تھی۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء کی ہڑتال ملک راج کو سوشلزم اور مزدور تحریک کے پاس لے آئی۔

ملک راج ایک کے بعد ایک کتنے ہی ناول لکھ چکے ہیں جن میں سے کئی تو انگریزی کے علاوہ یورپ کی سب بڑی زبانوں میں چھپے ہیں نئے ہندوستانی ادیبوں میں صرف ملک راج آنند کے ناول ہی روس میں کئی لاکھ کی گنتی میں چھپے اور بکے ہیں ترقی پسند ہندوستانی تاریخ میں ملک راج آنند کا ایک شاندار مقام ہے کیونکہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام کا، قلیوں، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا سچا مذاق کھایا ہے اور ہمیں سکھایا ہے کہ جو ادب زندگی سے تعلق نہیں رکھتا وہ بے کار ہے.....

۱۹۲۹ء میں جب وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان آئے تو غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کی نئی تحریک شروع ہی ہوئی تھی۔ نوجوانی کے جوش کے ساتھ وہ اس تحریک میں کود پڑے اور لاہور میں غیر ملکی کپڑا جلانے اور غیر قانونی جلوس نکالنے پر دوسرے نوجوانوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا اور انھیں تین مہینے کی قید ہو گئی۔ جیل سے نکلنے پر انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ان جیسے ترقی پسند خیالات والے کو کوئی جگہ دینے والی نہیں اس لئے انھوں نے سوچا ولایت جاکر اپنے قلم سے ہندوستان کی آواز کو دنیا میں پھیلایا جائے

پیرس اور لندن میں رہ کر انھوں نے کئی کتابیں ہندوستانی تمدن اور ادب کے بارے میں لکھیں ایک ناول لکھنا بھی شروع کیا مگر ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کی نئی انقلابی تحریک کو پاس سے دیکھنے کے لئے وہ پھر ہندوستان لوٹے اور یہاں کئی مہینے تک گھومے وہ اچھوتوں کی بری حالت سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں ایسا لگا جیسے ہندوستان کی ساری سیاسی سماجی اور اقتصادی تاریخ ایک لفظ "ہتک" کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ انگریز ہندوستانیوں کی ہتک کر رہے تھے۔ ہندوستانی خود اپنے اچھوت بھائیوں کی ہتک کر رہے تھے۔ زمیندار اور جاگیردار کسانوں کی تذلیل کر رہے تھے اور سرمایہ دار مل مالک مزدوروں کی "ہتک"۔ پرانا جاگیرداری سماج اور نیا سرمایہ داری سماج سب انسانوں کا ہی نہیں انسانیت کی ہتک کر رہا تھا۔ ہر طرف اس "ہتک" کے خلاف دلوں میں آگ بھڑک رہی تھی اور جوالا مکھی پھٹنے ہی والا تھا۔ ان خیالات کو لے کر انھوں نے اپنا ناول (UNTOUCHABLE) اچھوت لکھا جس میں ایک اچھوت لڑکے بھکا کی زندگی کا صرف ایک دن دکھایا گیا ہے کہ اس پر کیا گذری، اس نے کیا سوچا، کیا محسوس کیا اور کیا سپنے دیکھے۔ اس ایک دن میں اس کے ساری زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس ناول میں اچھوتوں کے ساتھ زبانی ہمدردی ہی نہیں بلکہ چھوت چھات کے سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے، واپس لندن جاکر انھوں نے ایک کے بعد ایک، پورے شہر کے پبلشروں کو ناول بھیجا مگر ہر جگہ سے واپس آگیا۔ ہندوستان کے بارے میں دو قسم کے ناول ان دنوں انگریزی میں چھپا کرتے تھے، پرانے افسروں کے لکھے ہوئے جن میں شکار، شیر ہاتھی، راجہ، مہاراجہ، صاحب لوگ اور کالے کالے جانوروں جیسے ہندوستانی "نیٹو" ہوں۔ یا پھر ان ہندوستانیوں کے لکھے ہوئے جو بیسویں صدی میں بھی پرانے زمانے کے سنہری سپنوں میں کھوئے ہوئے تھے، بھلا ملک راج کے ناول کو کون پسند کرتا جس میں زندگی کا خوفناک مگر حقیقی رخ تھا......

یہ دو برس ملک نے بڑی مشکلات کے ساتھ گذارے جب لندن میں رہنے کو پیسے نہ رہے تو ایک گاؤں میں رہنے لگے۔ دو وقت کھانے کی بجائے ایک وقت کھانے لگے کئی کئی دن فاقے سے بھی گذر جاتے۔ پر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ لکھنا چھوڑا۔ اور ان دنوں میں اپنا دوسرا ناول "قلی" پورا کر لیا۔ جو ایک ایسے پنجابی لڑکے کی تصویر ہے، جو گاؤں سے نکل کر نئے ہندوستان کی سرمایہ دار سماج کی مشین میں پس کر مر جاتا ہے۔ دو برس کے بعد ایک پبلشر نے (UNTOUCHABLE) یعنی "اچھوت" چھاپنا منظور کر لیا۔ شائع ہوتے ہی کتاب اور اس کے مصنف دونوں کا بڑا نام ہوا اور پھر "قلی" نے تو سارے یورپ میں ملک راج آنند کا نام روشن کر دیا۔

جب سے ملک راج ایک کے بعد ایک کتنے ہی ناول لکھ چکے ہیں جن میں سے کئی تو انگریزی کے علاوہ یورپ کی سب بڑی زبانوں میں چھپے ہیں نئے ہندوستانی ادیبوں میں صرف ملک راج آنند کے ناول ہی روس میں کئی لاکھ کی گنتی میں چھپے اور بکے ہیں۔ ترقی پسند ہندوستانی تاریخ میں ملک راج آنند کا ایک شاندار مقام ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام کا، قلیوں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا سچا روپ دکھایا ہے، اور ہمیں سکھایا ہے کہ جو ادب زندگی سے تعلق نہیں رکھتا وہ بے کار ہے۔ اگر آج انگلستان اور یورپ میں لاکھوں پڑھے لکھے ہندوستان کی سماجی زندگی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو وہ بہت کچھ ملک راج آنند کے ناولوں ہی کا فیض ہے، دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج ہندوستان سے زیادہ ولایت والے ملک راج آنند کے نام اور کام کو جانتے ہیں ان کے بہت کم ناول ہندوستانی زبانوں میں چھپے ہیں، اردو میں صرف "قلی" حال میں شائع ہوا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک راج آنند کی کتابیں ہندی اردو ہی میں نہیں بلکہ ملک کی ہر زبان میں چھپیں۔ پڑھی جائیں اور سمجھی جائیں۔

ملک راج آنند نے ناول ہی نہیں لکھے ہر ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو سب سے پہلے انھوں نے ہی شروع کیا۔ جب اسپین میں عوامی حکومت اور فرانکو کی فاشزم کی لڑائی ہو رہی تھی، اس وقت وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اسپین گئے تاکہ وہاں کے عوام کو ہندوستان کی دوستی اور ہمدردی کا پیغام پہنچائیں دوسری بڑی لڑائی کے خاتمے پر ملک راج آنند ہندوستان واپس آگئے اور جب سے بمبئی میں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہو یا عوامی تھیٹر۔ سول لبرٹیز یونین یا امن عالم کے لئے کوئی جلسہ یا جلوس۔ فن کاروں کی کوئی کانفرنس یا ترقی پسند فلم بنانے کی کوئی کوشش۔ ملک راج ہر ایسے کام میں آگے آگے ہیں جو عوام کی بھلائی کے لئے ہو۔ یہی نہیں ان کی ہر لکھائی عوام کو انقلاب کا راستہ دکھاتی ہے ایسا انقلاب جو دنیا میں اور ہندوستان میں سامراج اور اقتصادی بے انصافی کو ختم کر دے گا اور ہر ملک میں عوامی حکومت۔ بھائی چارہ اور امن وامان قائم کر دے گا۔

ادب کے بارے میں ملک راج کی کیا رائے ہے؟ وہ کہتے ہیں "میں حقیقت نگاری کو مانتا ہوں۔ مگر ایسی حقیقت نگاری جس میں فن اور شاعری کی چاشنی بھی ہو...... ایک طرف میں چاہتا ہوں کہ ایک نیا انقلابی انسان جنم لے اور دوسری طرف ایسا فن اور ادب چاہتا ہوں جو انسانیت سے بھرپور ہو...... میں سمجھتا ہوں کہ فن کا ایک انقلابی مقصد ہے۔ فن سے ہم زندگی کو بدل سکتے ہیں........ اگر فن کار اپنے فرض کو سمجھتا ہے اور عوام کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتا ہے، اگر وہ سچائی کو پرکھ سکتا ہے اور عوام کو نئی زندگی کا راستہ دکھا سکتا ہے تو وہ سچ مچ کا انقلابی ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ ہے جو آج کی سماج کے ڈھونگ اور ڈھیچے توڑ کر ایک نئی دنیا بنائیں گے"

اگر یہ پوچھا جائے ملک راج انقلابی ہے یا فن کار تو کہنا پڑے گا کہ وہ انقلابی بھی ہے اور فن کار بھی یا یہ کہ نہ صرف انقلابی ہے نہ محض فن کار........ وہ ایک انسان ہے جو دوسرے انسانوں سے پریم کرتا ہے۔ اور ان کے ساتھ بھلائی اور ترقی کے لئے لکھتا ہے، بولتا ہے اور لڑتا ہے۔

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

والے کے حصے کی مقدار کسٹوڈین کو بتا دے اور اس کے بقدر کرایہ یا لگان ادا کرتا رہے۔ اگر موجود شریک کا حصہ زیادہ ہے تو جائداد کا انتظام اسی کے ہاتھ میں رہے

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

اس افسوس ناک واقعہ کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ میں نے پریس مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف کارروائی کرنے کی حمایت کی تھی اس لئے شری ڈالمیا کے اخبار کے حامیوں نے چند ایسے مطالبات کئے جن کا پورا کرنا میرے بس سے باہر تھا اور اس بنا پر لوگوں نے اسٹرائک کر دی۔ موصوف کے خیال کے مطابق سندھ یونین آف جرنلسٹ بھی چونکہ شری ڈالمیا کے حامیوں میں سے ہے اس لئے وہ اس اسٹرائک کو ہوا دے رہی ہے۔ لیکن مسٹر رشدی کے اس بیان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے، تمام پاکستان کے اخبار نہایت شد و مد سے "سندھ آبزرور" کے منتظمین اور کراچی کی لوکل گورنمنٹ کی مذمت کر رہے ہیں۔ اب اس جھگڑے کو پنچایت کے ذریعے طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے

براہ کرم خط وکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے

شہریت کے تقاضے

سلطان عالم خاں

> ...... شہریت کا موجودہ تصور جو قدیم شہری اور قومی ریاستوں کی میونسپلٹی سے لیا گیا ہے دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ ایک تو تخیل آزادی جس کی بنیاد قدیم اخلاقی فلسفہ اور درمیانی زمانہ کے انفرادیت کے حقوق پر ہے۔ دوسرے ایک سیاسی وحدت کی ممبری کا تخیل، جس میں پبلک فیصلوں یا تجویزوں پر امداد باہمی کے طور پر عمل ہو۔ اس ذمہ داری میں فوجی خدمت اور محصول بھی شامل ہیں......

شاید یہ بات دلچسپی سے سُنی جائے کہ سماج کا وجود بنی نوع انسان سے زیادہ قدیم ہے۔ انسان کے وجود سے پہلے اکثر جانور سماجی رہن سہن کا شعور رکھتے تھے اور اجتماعی زندگی کے فائدے حاصل کرتے تھے جس سے آہستہ آہستہ اُن کی دماغی نشوونما ہوتی رہی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے جانور اور پرند مثلاً ہرن، بھیڑ، کتے کبوتر اور شہد کی مکھیاں اپنے اپنے غول کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں اور آرام و تکلیف اور خطرہ میں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں۔ سماجی زندگی کے ذریعے ضروریات زندگی مثلاً غذا، تحفظ وغیرہ کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے، اس سے ذہنی نشوونما میں بھی امداد ملتی ہے تقسیم کار اور امداد باہمی کے ذریعے کشمکش حیات آسان بنتی ہے اور قوت عمل مضبوط ہوتی ہے۔

شہریت کا تخیل اتنا ہی قدیم ہے، جتنی سماج کی ابتدا بلکہ یوں سمجھئے کہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہر قسم کی شہریت میں کچھ عناصر مشترک ہیں۔ پہلے غیر ملکیوں غلاموں، عورتوں، بچوں اور جماعت کے بعض اور ارکان کے علاوہ جو کوئی مخصوص حق نہیں رکھتے تھے اور سب شہری نظام سلطنت میں عملی حصہ دار تھے، اس کی بنیاد پر جماعت سے کچھ حق طلب کرتے تھے، اور اس کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں رکھتے تھے۔ قدیم رومن تہذیب میں شہریت کا تصور سکونت پر نہیں بلکہ انفرادیت پر قائم تھا، لیکن ۲۱۲ء میں یہ انفرادی حق شہریت سلطنت کے تمام رقبہ میں نافذ کر دیا گیا۔

درمیانی زمانے سے انیسویں صدی کے آغاز تک شہریت کا مقصد صرف یہ تھا کہ جاگیرداری مداخلت سے تحفظ اور آزادی حاصل ہو مگر یہ کوشش بےکار سی بن جاتی تھی، اس لئے کہ شہریت کا مرتبہ متمدن ممالک مثلاً انگلستان میں صرف زمینداروں اور مالکان اراضی تک محدود تھا جو معاشی فوائد کو بلا شرکت غیرے اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے اس لئے کہ سارا سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔ سچ پوچھئے تو جاگیرداری نظام اور ذات پات کی تمیز نے بعض ملکوں میں اس پاکیزہ نظریہ کو ایک غلط عملی جامہ پہنایا اور سماج کی دشواریوں کا حل تلاش کرنے کے بجائے اس میں اور پیچیدگیاں ڈال دیں۔

قدیم دنیا شہروں کی دنیا تھی اور موجودہ دنیا کا رجحان بھی شہروں کی طرف ہے۔ درمیان میں دسویں صدی تک شہروں کا زوال رہا لیکن گیارھویں صدی سے ان میں ازسرنو زندگی کی رونق اور چہل پہل پیدا ہوئی۔ شہریت کا موجودہ تصور جو قدیم شہری اور قومی ریاستوں کی میونسپلٹی سے لیا گیا ہے۔ دو عناصر کا مجموعہ ہے، ایک تو تخیل آزادی جس کی بنیاد قدیم اخلاقی فلسفہ اور درمیانی زمانے کے انفرادیت کے حقوق پر ہے دوسرے ایک سیاسی وحدت کی رکنیت کا تخیل جس میں پبلک فیصلوں یا تجویزوں پر امداد باہمی کے طریقۂ عمل پر ہو۔ اس ذمہ داری میں فوجی خدمت اور محصول بھی شامل ہیں برخلاف اس کے اینگلو سکسن اور رومن ریاستوں کے جرمن حکومت نے شہریت کے فرائض میں جبریہ تعلیم کے قانون کو بھی شامل کر لیا تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ میں شہریت کے تصور پر وہاں کے خداوندان سیاست کی رنگینی کا کافی اثر پڑا جنھوں نے آزادی کے منشور میں "زندگی، آزادی اور آرام و آسائش کے لوازمات" شامل کر رکھے ہیں اور انھوں نے ورجینیوں کو اصولی طور پر ملکی حقوق سمجھ رکھا ہے۔ اگرچہ شہریت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن امریکہ کے چیف جسٹس ٹینے نے اس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صاف اور واضح ہے، اُن کا کہنا ہے کہ بغیر لوگوں کے قوم نہیں بن سکتی۔ کسی سیاسی گروہ کا تخیل یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی جماعت اپنے مشترکہ مواد کی خاطر کام کرے۔ فرد جماعت کا فرماں بردار بنے اور اس کے عوض میں حفاظت کا طلب گار ہو، اس رشتے کے لئے نام کی تلاش ہوئی کہ آخر فرد ریاست یا ملک کا کیا کہلائے، اس کے لئے تین لفظ استعمال ہوئے رعایا، باشندہ اور شہری۔ نام کے انتخاب میں طرز حکومت کو بڑا دخل ہے۔ موجودہ جمہوری دور میں لفظ 'شہری' کا استعمال زیادہ بڑھتا جا رہا ہے، اس سے مراد ہے قوم کا فرد اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ شہریت کا لفظ جمہوریت کے ساتھ کچھ گھل مل سا گیا ہے۔

کبھی کبھی یہ غلطی ہوتی ہے کہ شہریت سے مراد محض شہر کے بسنے والے لوگوں کے حقوق سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ بلاشبہ قدیم مصر سے لے کر موجودہ امریکہ تک انسان کی ذہنی اور دماغی نشوونما شہری رقبہ میں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ پندرھویں صدی میں روم میں سب سے بڑی میونسپلٹی تھی اور وہاں ایک نمونہ کا انتظام تھا، سچ تو یہ ہے کہ میونسپلٹی یا بلدیہ کا تخیل یہیں سے شروع ہوا لہذا آج بھی نصف دنیا رومن جورس پروڈنس (اصول قانون) کو مانتی ہے۔ انقلاب فرانس سے یونانی اور رومن شہریت کی ابتدا ہوئی۔

عام شہریت کے علاوہ غیر حقیقی شہریت بھی خاصہ درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے غیر ملکوں کو بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ شہری تسلیم کیا جاتا ہے۔ غیر حقیقی شہریت کا حق انگلستان میں کبھی پوری طرح تسلیم نہ ہو سکا، لیکن ممالک متحدہ امریکہ میں اس کی حمایت کی جاتی رہی۔

یہ امر مسلم ہے کہ شہریت کا حق دیہاتیوں کو بھی اسی طرح حاصل ہے جیسے شہر میں رہنے والوں کو۔ بالخصوص ہمارے جیسے ملک میں جہاں ۹۰ فی صدی لوگ دیہات میں بستے ہیں اور زیادہ ضروری ہے کہ امداد باہمی کا اصول جو شہریت کی جان ہے دیہات میں بھی نافذ کیا جائے۔ دنیا میں دیہاتی زندگی نہ صرف سماجی بلکہ معاشی طور پر بھی کمزور ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آبادی دیہاتوں سے شہروں کی طرف برابر منتقل ہو رہی ہے۔ فرانس اور امریکہ میں جہاں زراعت سائنس میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے منتقلی اور بھی زیادہ نمایاں ہے، مغربی ملکوں میں بلجیم اور ڈنمارک کی حکومتوں نے ایک بڑی حد تک اس کا حل تلاش کر لیا ہے اس قسم کے حل میں گھریلو صنعتوں کی ترقی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں بجلی کے ذریعے دیہاتی صنعتوں کو استحکام مل چکا ہے ہمارے ملک میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ ہمارے شہریوں کا اصل پیشہ زراعت ہے، اس سلسلے میں کاشت کا ازسرنو انتظام اور امداد باہمی کے طریقے کا رواج بڑا ضروری ہے اگرچہ ہمارے آج کے موضوع کے لئے اس پر تفصیلی بحث غیر متعلق ہے۔

ابتدائی زمانے میں گاؤں حقیقی اور پھر مصنوعی یا نباوٹی برادری کے ناطے سے بندھا رہا۔ دیہاتوں کو مضبوط بنانے اور ان کی پرانی شان واپس لانے کے لئے یہی ضروری ہے کہ دیہات میں امداد باہمی کا جال بچھ جائے۔ جاپان کی ترقی کا راز اس میں مضمر تھا کہ اس ملک کے ۸۰ فی صدی گاؤں میں امداد باہمی کی انجمنیں موجود تھیں، ہندوستان میں کاشتکاری کی قومی صفت کا مرتبہ دیا جاتا ہے

اگر گاؤں کی پچھلی تاریخ پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلی اشتراکیت کا بیج یہاں ہمیشہ سے موجود تھا اور اس کی پہلی پرورش گاہ ہندوستانی گاؤں ہی تھا۔ ایک اور چیز بھی غور طلب ہے۔ ہمارے ملک میں جرائم کی کثرت کی وجہ ہماری معاشی حالت اور افلاس ہے۔ فطرت انسانی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کام کے علاوہ اس کے لئے تفریح کا سامان بھی فراہم ہو، ان تمام مسائل کا حل صرف شہریت کی صحیح تعلیم ہی میں مل سکتا ہے، جو پڑوسی کو اس کا صحیح حق دلوا سکتی ہے۔

آج دنیا انتہائی پیچیدہ بن کر رہ گئی ہے اور شہریت کے تقاضے اور ان کا حل ہی اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے مگر اب تک اس طرف عام طور پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی ضروری تھی۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ شہریت کے متعلق لوگوں کو صحیح ٹریننگ دی جائے۔ مطلق العنان حکومتیں لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں مگر جمہوریت کا تقاضا ہے کہ عقل اور دلائل کی روشنی میں ہم رواداری کا سبق سیکھیں۔ ایک عالمگیر بھائی چارہ کی بنیاد ڈالیں اور اس کو پروان چڑھائیں۔ شہریت کی ٹریننگ کے لئے یونیورسٹیاں صحیح جگہ ہیں جہاں طالب علم اس عمر میں پہنچتے ہیں کہ ان کی عقل و شعور پختہ ہو جائیں۔ تعلیمی نصاب میں یہ ٹریننگ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں استاد کی بڑی ذمہ داری ہے، اور وہ بہت کچھ کر سکتا ہے، اس کی شخصیت اور معمولات زندگی طلبا پر بڑا اثر ڈال سکتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس کی رہائش آئندہ زندگی میں پڑوسی کے حقوق سکھانے میں بڑی معاون ہو سکتی ہے۔ نصاب میں عملی تجربات کا موقع ہونا چاہئے۔ اسکاؤٹ اور گرل گائڈ تحریک کا یہی مقصد ہے۔ ریڈیو کاسٹنگ بھی اس ٹریننگ میں امداد پہنچا سکتی ہے۔

اچھے والدین، طالب علم یا تاجر ہونے کے علاوہ جمہوریت کے شہری کے لئے کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ یہ لازمی ہے کہ اس کے دل میں پڑوسیوں اور اپنے ساتھیوں کی بھلائی کی لگن ہو۔ سماجی زندگی کا اسے پورا احساس ہو۔ اپنے ذاتی مفاد یا اپنی مخصوص جماعت کے مفاد کو عام مفاد پر قربان کر سکتا ہو۔ عام مفاد کی خاطر اپنے حصے کا پورا کام کرے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جمہوریت کا شہری آزاد رائے کا حامل ہو۔ وہ اپنے پڑوسی کے حقوق کا ویسا ہی نگہبان ہو جیسے خود اپنے حقوق کا۔ آزادی کا متوالا اور دوسروں کی انفرادیت کا احترام کرنے والا ہو اور مخالف رائے سے رواداری کا سلوک کرتا ہو۔ وہ اکثریت اور قلیت کے جھگڑوں سے مذہبی تنگ نظری اور تعصب سے پاک ہو، وہ اس پر عقیدہ رکھتا ہو کہ تبادلہ خیالات کے ذریعے رائے عامہ پیدا کرنے کا طریقہ صحیح ہے اور قوت کے استعمال کا غلط۔ ان اخلاقی خوبیوں کے علاوہ اس میں ذہنی خوبیاں بھی ہونی چاہئے۔ یہ کافی نہیں کہ وہ سچائی کا پرستار ہو، بلکہ یہ بھی جانے کہ سچائی کیسے اور کہاں ملتی ہے۔

گذشتہ سو سال میں شہریت نے ترقی کر کے ووٹ کا حق حاصل کیا۔ ابتدا میں حق رائے دہندگی محدود تھا، اور ملکیت یا کسی حد تک تعلیمی معیار پر اس کی بنیاد تھی، لیکن رفتہ رفتہ یہ حق ہر بالغ کو پہنچایا جا رہا ہے، اور اب اس میں جنس کی تمیز بھی اٹھ چکی ہے۔ عام رائے دہندہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ موجودہ سیاسیات اور معاشیات کے پیچیدہ مسئلوں پر صحیح رائے قائم کر سکے گا۔ وہ یہ رائے ضرور رکھتا ہے کہ امن و امان کا دور دورہ ہو لیکن اس کے حصول کا طریقہ نہیں جانتا۔ اس کی تمنا ہے کہ بے روزگاری کا سوال حل ہو اور معیار زندگی اونچا ہو۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ کیسے ہو۔

ایک تعلیم یافتہ جمہوریت میں ایک رائے دہندہ کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ اس کی ذمہ داریاں نہ صرف اس کے اپنے ملک سے وابستہ ہیں بلکہ تمام دنیا سے جو سائنس کی بدولت آج سمٹ کر بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ انصاف سب کے لئے یکساں ہو، وہ جانے کہ حکومت کا بنیادی اصول پنچایت ہو قوت نہیں۔ ہر بچہ کو بلا کسی امتیاز کے پوری جسمانی اور ذہنی نشو و نما کا سامان بہم پہنچنا چاہئے۔ جمہوریت کے شہری کو لازم ہے کہ بہترین نمائندہ منتخب کرے اور انتخاب کے بعد اس پر پورا اعتماد اور بھروسہ رکھے ہمیشہ انتخاب کے موقع پر ایمانداری ہمت اور قابلیت کو ترجیح دے اور ایک ذمہ دار رائے عامہ کے بنانے میں امداد کرے۔ ہو سکتا ہے یہ ایک محض آئیڈیل ہو۔ پڑوسی کے حق پہچانو۔ شہریت کا بنیادی گر ہے۔ چنانچہ مذہبی اور انسانی دونوں زاویہ نگاہ سے شہریت ایک عظیم الشان برادری کا نظریہ ہے۔ تہذیب کا گہوارہ وہیں رہا ہے جہاں قدرت نے فیاضی کے ساتھ اپنی نعمتیں اتاری ہیں۔ اسی واسطے پہلے پہل شہریت کا تخیل بھی ایسے ہی مقامات پر ظہور میں آیا۔ مصر، روم، یونان اور بابل کی تاریخ میں شہریت کے تخیلات کی جھلک نظر آتی ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی صورتوں میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں، اور رفتہ رفتہ اس کی تکمیل ہوتی گئی۔

ابتدائی دور سے انسان نے زندگی اور جائداد کے تحفظ کی ضرورت محسوس کی۔ شروع میں اسے خاندان کی تنظیم پر انحصار کرنا پڑا۔ اس کے بعد جاگیرداری نظام کا دور آیا۔ جاگیرداری سے سلطنت کا ارتقا ہوا اور شاہنشاہیت کا زمانہ آیا۔ اس کے بعد دستوری شاہنشاہی نے جنم لیا اور رفتہ رفتہ آج دنیا غیر مذہبی جمہوریت کے آغوش میں پناہ چاہتی ہے۔ پہلے سماج کی بنیاد مذہب پر رکھی جاتی تھی لیکن آج معاشیات پر رکھی جاتی ہے اس لئے شہریت کا روپ بھی بدلتا رہا لیکن بنیادی اصول برابر اپنی جگہ پر قائم ہے اور اب تو ایک مرتبہ پھر دنیا لامرکزیت کی طرف کھنچتی جا رہی ہے، جہاں سے حقیقت میں شہریت کی ابتدا ہوئی تھی۔

دیہاتی مثل ہے پاس کا نائی اور دور کا بھائی برابر ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس مقولے میں شہریت کی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ آج ہم جس نازک دور سے گذر رہے ہیں اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہم شہریت کے اعلیٰ اور پاک نظریے کو اپنائیں اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور اپنے ملک کو شاہراہ ترقی پر آگے بڑھانے کے لئے اس سے پورا پورا نفع حاصل کریں۔ ہمارے سامنے بڑے اہم اور نازک مسئلے ہیں جن کا حل شہریت کی صحیح تعلیم ہی میں مل سکتا ہے۔ شرنارتھی، چھوت چھات، صوبجاتی اور دیہاتی تعصب، فرقہ وارانہ سوال، پردہ، نابالغوں اور بیواؤں کی شادی، مشترکہ خاندان، صنعت و حرفت اور کاشت و ملکیت کا از سر نو انتظام اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے مسائل ہیں جن سے حکومت اور قومیت پر براہ راست اثر پڑتا ہے کیونکہ حکومت محض قانون کے ذریعے ان کا حل نہیں نکال سکتی۔ ان کے حل کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم صحیح شہری بنیں۔ سماج کے ہر ممبر کو اپنا ہمسایہ سمجھ کر اس کے حقوق دیں، اور حکومت اور سماج کے تئیں جو ہماری ذمہ داریاں ہیں انھیں پورا کریں اور اس کے عوض میں اندرونی اور بیرونی تحفظ اور حقوق طلب کریں جن میں ضمیر کی اور مذہبی آزادی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا اونچا اور مضبوط شہری بننا حکومت کے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔ آپ نے فرانس اور انگلستان کے شہریوں کے دوران جنگ کے کارنامے پڑھے ہوں گے، یہ شہریوں کی تنظیم تھی جس نے انگلستان کو شکست قبول کرنے سے روکا اور شکست خوردہ فرانس کو اتنے جلد پھر دنیا کے ممتاز ممالک کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

شہری کے وہ تمام فرائض گننا جو ہمسایہ کے متعلق اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں بڑا مشکل ہے۔ یہ صرف تاریخ تجربہ اور روایات کی روشنی میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ وقت کے اعتبار سے ان کی رسمی شکل بھی بدل سکتی ہے۔ مگر جہاں تک اسپرٹ اور بنیادی اصول کا تعلق ہے اس میں مطلق فرق نہیں آتا، بلکہ ایک طرح پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے اور دنیا مادیت سے بیزار ہو کر پھر شاندار ماضی کی طرف پلٹ رہی ہے جو روحانیت سے زیادہ قریب تھا اس لئے شہری کو اپنی جگہ پر پہنچنے کا سنہرا موقع ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ایک مرتبہ پھر سچائی اور اہنسا ہمارے فرائض شہریت میں ہمارے لئے مشعل ہدایت بن جائیں، تاکہ ہندوستان کی ذہنیت آفتاب بن کر چمکے۔

کیا سر کے بالوں کا گرنا رک سکتا ہے؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

کچھ روئیں سے اگ آتے ہیں مگر یہ بال نہیں ہوتے اور عموماً آدھ انچ بڑھنے کے بعد جھڑ جاتے ہیں۔

الٹرا وائلٹ ریز کا علاج اگر کسی ماہر کی نگرانی میں ہو جو اس کی حدود کو جانتا ہے اور اس کے خطروں سے واقف ہے تو اس سے تھوڑا بہت فائدہ ہو سکتا ہے مگر زیادہ توقع اس سے بھی نہیں رکھنی چاہئے (ماخوذ)

نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

شرح اشتہارات:

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں) مینیجر

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
چندہ: سالانہ ہے/ ششماہی للعہ
دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی (بی اے، جامعہ)
مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۷ | یکم نومبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

امام حسین علیہ السلام

صالحہ عابد حسین

ہزارہا سال کی تاریخ کے ورق اُلٹ جائیے مگر حسینؑ کا ثانی نظر نہیں آئے گا دُنیا میں بڑے بڑے بہادر بڑے بڑے فاتح اور سورما گذرے ہیں جنھوں نے کارھائے نُمایاں کئے لیکن زمانے کی گردش نے اِن کارناموں کو دھندلا کر دیا اور اُن کی عظمت کو مِٹا دِیا لیکن کربلا کے میدان میں جو عظیم الشان قربانی کی گئی تھی اُس کی یاد آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح تازہ ھے۔

امام حسینؑ کی شان میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

شاہ است حسینؑ، بادشاہ ہست حسین　　دین است حسینؑ، دین پناہ ہست حسینؑ
سرداد، نہ داد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

اور یہ کس حسینؑ کی شان میں ہے؟ وہ جو محمد مصطفٰے کا پیارا نواسہ ہے، جس کی شان میں ہادی برحق نے فرمایا ہے کہ "حسین منی و انا من الحسین" جس کی ناز برداری اور خاطر حضور کو بے انتہا مطلوب تھی اور جس کو آں حضرتؐ نے بارہا اپنی پیٹھ پر سوار کیا ہے۔ وہ حسینؑ جو سیدۃ النسا فاطمہ زہراؑ کا لخت جگر اور گود کا پالا ہے جس نے اُس ماں کی گود میں تربیت پائی ہے جو صفاتِ اخلاق میں محمدؐ کا دوسرا نمونہ تھیں اور جن کی جود و سخا اخلاق و مروت، ریاضت اور عبادت آج تک ضرب المثل ہے۔

وہ حسینؑ جس نے علی مرتضیٰ جیسے بہادر، سخی و فادار اور صاحب علم و فضل کے سایے میں بچپن اور جوانی گذاری اور جس کے ساتھ کھیلنے والا ساتھی حسنؑ مجتبٰے جیسا حلیم منکسر المزاج، خوش خلق اور صلح کل بھائی تھا جس انسان نے دنیا کے ایسے بے مثل اشخاص کی تربیت اور تعلیم پائی ہو اس کی صفات عالیہ کی کیا انتہا ہوسکتی ہے؟ یہی وجہ تو ہے کہ حسینؑ کی شان کرم، اُن کی شجاعت و بہادری، عظمت و بزرگی، صبر و استقلال، ایمان کی پختگی اور جن کی مظلومی اور مصیبتوں کی انتہا آج تیرہ سو برس بعد بھی دنیا کو حیرت میں ڈال رہی ہے۔

ہزارہا سال کی تاریخ کے ورق الٹ جایئے مگر حسینؑ کا ثانی نظر نہیں آئے گا۔ دنیا میں بڑے بڑے بہادر، بڑے بڑے فاتح اور سورما گذرے ہیں جنھوں نے کارہائے نمایاں کئے، لیکن زمانے کی گردش نے ان کے کارناموں کو دھندلا کردیا اور ان کی عظمت کو مٹا دیا، لیکن کربلا کے میدان میں جو عظیم الشان قربانی کی گئی تھی اس کی یاد آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح تازہ ہے۔

آخر اس واقعہ میں ایسی کیا خاص بات ہے جس سے تمام دنیا کے لوگوں پر اثر پڑتا ہے اور ساری دنیا میں حسینؑ کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ ملک عرب کی ایک معمولی سی لڑائی ہے جس میں دو شخص خلافت کے دعوے دار ہیں، اور جس میں حسینؑ کی تھوڑی سی فوج یزید کی ہزاروں کی فوج سے لڑکر ختم ہوجاتی ہے اور حسینؑ کے دشمن یزید کو فتح حاصل ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ گو ظاہر میں شکست حسینؑ کی ہوئی مگر اسی سے انھوں نے ابدی حیات حاصل کرلی۔ شہادت حسینؑ کی ہوئی اور خاتمہ یزیدیت کا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد　　(جوھر)

امام حسینؑ کی اس فتح کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے یہ جنگ حکومت اور دولت کے لیے، ملک گیری کے لئے، کسی ذاتی دشمنی یا انتقام کے لئے نہیں کی تھی، بلکہ حسینؑ نے تو اخلاق اور شرافت، آزادی اور ایمان کی سلامتی، حق کو قائم رکھنے اور باطل کو مٹانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔

یزید چاہتا تھا کہ اسلام کے روشن چہرے کو داغ دار کردے اور اسلام نے اخوت مساوات، انصاف اور جمہوریت کا جو سبق پڑھایا ہے اسے لوگوں کے دل سے مٹادے ایسے شخص کا رسول خدا محمد مصطفٰے کا جانشین ہونا مذہب اسلام کے لئے ایسا سخت خطرہ تھا جس کا خیال بھی ہولناک ہے۔ یزید نے تختِ خلافت پر قبضہ کرتے ہی مدینے کے حاکم کو حکم بھیجا کہ جلد سے جلد سب اہل مدینہ خصوصاً حسینؑ ابن علی، عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے میری بیعت لو۔ حاکم مدینہ نے امام حسینؑ کو بلاکر یزید کا پیام سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ یزید فاسق و فاجر ہے وہ اسلام (بقیہ صفحہ ۱۴پر)

فہرست مضامین

امام حسین علیہ السلام	صالحہ عابد حسین	۱	
جشن یا ماتم؟	(اداریہ)	۳	
دنیا کی رفتار:۔			
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴	
۲۔ باہر کی دنیا	ع، ل	۴	
بزم بے تکلف		۵	
شاہ شہیداں	سیدہ فرحت	۵	
اقبال کی وطن دوستی	محمد ابراہیم ڈار	۶	
مختصر تبصرے	ڈاکٹر مسعود حسین	۸	
ایک رات کا مہمان (افسانہ)	مارک ٹوین	۹	

قیمت فی پرچہ ۲ر

کے ظاہری احکام کی پابندی بھی نہیں کرتا ہے، اور اسلام کی باطنی خوبیوں سے بھی منکر ہے۔ اس کی بیعت کرنا اسلام کو خطرے میں ڈالنا ہے، اس لئے میں ایسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔ حاکم مدینہ نے یہ باتیں یزید کو لکھ بھیجیں۔ یزید نے حیلہ سازی، لالچ اور جبر غرض ہر طریقے سے لوگوں کو اپنی خلافت منوالی تھی اور اب اُسے صرف حسینؓ اور اُن کے چند اور ہم خیال ساتھیوں سے بیعت لینا باقی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر نواسۂ رسول میری بیعت کر لیں گے تو پھر کون ہے جو میرے خلیفۂ رسول ہونے سے منکر ہو سکے۔

حسینؓ کے بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ نواسۂ رسول تک نے (جن کے گھر سے اسلام نکلا ہے اور اس کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے والے ہیں) اس شخص کی بیعت کر لی یعنی (معاذ اللہ) اس کو اپنا ہادی اور رہنما مان لیا تو اس کی ہر بات اور ہر فعل کو اسلام کے موافق سمجھا جاتا اور (خدا نخواستہ) ساتھ سال کے اندر اندر مذہب اسلام اور اسلامیت دنیا سے رخصت ہو جاتی۔

حسینؓ جانتے تھے کہ یزید کے حکم سے انکار کا لازمی نتیجہ موت ہے۔ آپ راہ حق میں جان دینے کو تیار تھے مگر اس طرح کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حسینؓ نے کس مقصد کے لئے جان دی۔ آپ نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جمع کرکے اپنا مقصد بتایا اور مدینے سے مکۂ معظمہ جانے کا قصد ظاہر کیا چنانچہ آپ نے خاندان کی سب عورتوں، بچوں (سوا ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغرا کے) اور مرد عزیزوں اور چند دوستوں کو ساتھ لیا اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ وہاں چند روز قیام کے بعد کوفہ والوں کے خطوط آنا شروع ہوئے کہ یہاں آکر ہماری ہدایت کیجئے اور ہمیں گمراہی سے بچائیے۔ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں حالات دیکھنے اور لوگوں سے معاہدۂ وفاداری لینے کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، اتنے میں حج کا زمانہ قریب آ چکا تھا۔ حضرت کا ارادہ تھا کہ خود حج کے بعد روانہ ہوں مگر آپ کو معلوم ہوا کہ یزید کے بہت سے آدمی یہاں لگے ہوئے ہیں کہ چپکے سے حسینؓ کو شہید کر دیں۔ اول تو امام حسینؓ کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کی وجہ سے خاص مکۂ معظمہ میں قتل و خون ہو اور اس کی حرمت میں فرق آئے۔ دوسرے آپ جانتے تھے اگر چپکے سے آپ کو شہید کر دیا گیا تو دنیا کو خبر نہ ہوگی کہ حسینؓ کو کس نے مارا اور کیوں؟ یہ مشہور ہوگا کہ کسی دشمن نے قتل کر دیا، لیکن حسینؓ کو تو یزید کی حرکتوں کا راز فاش کرنا تھا۔ حق اور باطل، ایمان اور کفر، یزیدیت اور حسینیت کا فرق دکھانا تھا۔ حسینؓ کو تو یہ دکھانا تھا کہ جب کبھی دنیا میں حق اور باطل، انصاف اور ظلم، ایمان اور کفر کا مقابلہ ہو تو انسان کو حق، انصاف اور ایمان کی حمایت کے لئے جان، مال، آل اولاد سب کچھ قربان کر دینا چاہئے۔ حسینؓ جانتے تھے کہ اس جنگ میں انھیں ظاہری فتح نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ دنیاوی فتح چاہتے تو فوج جمع کرتے، لوگوں کو اپنی طرف کرنے کی کوشش کرتے اور پروپیگنڈا کے وہ سب اصول برتتے جو جنگ میں برتے جاتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس وہ ہر موقع پر لوگوں کو جتا دیتے تھے کہ میں لڑائی فتح کرنے کے لئے نہیں بلکہ جان دینے کے لئے جا رہا ہوں، اُن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے، بہت سی عورتیں، کم سن لڑکے اور تھوڑے جوان اور کچھ بوڑھے تھے۔ غرض امام حسینؓ اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ حج سے پہلے ہی کوفے کی جانب روانہ ہو گئے۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا اور گرمی بھی عرب کی جان لیوا گرمی اور صحرائے عرب کا سفر! گرمی اور سفر کی تکلیفیں سہتے ہوئے، جب کوفے سے کچھ فاصلے پر پہنچے تو آپ کو ایک شخص سے معلوم ہوا کہ کوفیوں نے دغا کی، اپنے اقرار سے پھر گئے اور آپ کے ایلچی مسلم کو بیدردی سے قتل کر دیا لیکن حسینؓ کے ارادے میں فرق نہیں آیا اور آپ نے وہاں جانے کا فیصلہ برقرار رکھا، تھوڑی سی دور اور گئے پہنچے تھے کہ یزید کی فوج کے ایک افسر "حر" نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ آکر حسینؓ کا راستہ روک لیا مگر اس حالت میں کہ سردار اور فوج اور گھوڑے سب پیاس سے نیم جان تھے۔ بھلا حسینؓ کسی انسان کو، خواہ وہ دشمن ہی ہو، پیاس سے بیقرار کس طرح دیکھ سکتے تھے آپ نے اپنا سب پانی حُر اور اس کی پیاسی فوج کو پلا دیا اس واقعہ نے حر کے دل پر بہت گہرا اثر کیا، پھر بھی اس نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کے حکم کی تعمیل کی اور امام حسینؓ کو اس راستے سے اپنا رُخ دوسری طرف پھیرنے پر مجبور کیا۔

محرم کے مہینے کی دوسری تاریخ تھی کہ امام حسینؓ کربلا کی سرزمین پر پہنچے۔ امام حسینؓ کے چھوٹے بھائی عباسؓ نے دریائے فرات کے کنارے خیمے نصب کئے۔ لیکن ابھی پوری طرح خیمے لگے بھی نہ تھے کہ دشمن کی فوج آ گئی، اور کہا کہ دریا کے کنارے یزید کی فوج اُترے گی آپ صحرا میں جا کر خیمے لگائیے۔ علیؓ کے بہادر بیٹے عباسؓ کو جلال آ گیا تلوار کھینچ لی اور چاہتے تھے کہ سرکش فوج کا منہ پھیر دیں کہ حسینؓ نے اپنے بہادر بھائی کو روک دیا اور کہا بھائی ہمیں ایسی معمولی باتوں کے لئے لڑنا نہیں ہے، چلو صحرا ہی میں رہیں گے خدا تو ہر جگہ موجود ہے عباسؓ نے بڑے بھائی کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور دریا سے بہت دور تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں جہاں نہ پانی کا نام تھا، نہ کسی درخت کا نشان، اوپر تپتا ہوا سرخ آفتاب تھا اور نیچے تپتی ہوئی ریت حسینؓ کے خیمے نصب کئے گئے یزید کی فوجوں پر فوجیں آ رہی تھیں اور دریا کے کنارے اُتر رہی تھیں یہاں تک کہ دور دور تک دریا پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ صحیح روایات میں یزید کی فوج کم سے کم ۳۰ ہزار تک بتائی جاتی ہے اور حسینؓ کی فوج کتنی تھی صرف ۷۲ نفوس جن میں لڑکے، جوان، بوڑھے، یہاں تک کہ ایک چھ مہینے کی جان علی اصغر تک شامل تھے۔

۷ محرم کو عمر بن سعد جو یزید کی فوج کا افسر تھا۔ شان و شوکت سے کربلا میں آیا اور امام حسینؓ کو پیام بھیجا کہ یا تو یزید کی بیعت کرو ورنہ سر کٹانے کو تیار ہو جاؤ۔ حسینؓ نے بیعت سے انکار کیا اور اُسے سمجھایا اور ہدایت کی راہ دکھانی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ یزید کا حکم ہے کہ حسینؓ سے کسی نہ کسی طرح بیعت لی جائے اور ابن زیاد حاکم کوفہ کا حکم ہے کہ اگر حسینؓ بیعت نہ کریں تو اُن کو قتل کر دیا جائے۔ بار بار حسینؓ نے ان سب کو حق کا راستہ دکھانے کی کوشش کی مگر دنیا کے لالچ اور حرص و طمع نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور دل سیاہ کر دئے تھے۔

۷ محرم کو عمرو بن سعد نے امام حسینؓ پر پانی بھی بند کر دیا کہ شاید پیاس کی تکلیف سے مجبور ہو کر بیعت پر راضی ہو جائیں۔ صحرائے عرب کا تپنا، آفتاب کی تمازت، لو کی شدت اور اس پر پانی کی نایابی!! کہتے ہیں کہ حضرت عباس نے اس صحرا میں سات جگہ کنوئیں کھودے مگر کسی میں بھی پانی نہ نکلا۔ ایک دن بچے کھچے پانی سے کام چلا دوسرے دن حضرت عباس لڑ بھڑ کر چند مشکیزے بھر لائے اور کم سن بچوں کو تھوڑا تھوڑا بہت پانی میسر ہو گیا، لیکن دسویں کی شب اور عاشورے کے دن تو پانی دیکھنے کو بھی نہ تھا۔ ۹ محرم کو ابن سعد لڑائی پر تیار تھا۔ مگر امام حسینؓ نے اس سے ایک رات کی مہلت لی تاکہ زندگی کی یہ آخری رات اپنے معبود حقیقی کی عبادت میں بسر کریں۔ رات کو آپ نے سب ساتھیوں اور عزیزوں کو جمع کرکے کہا "کل لڑائی ہے اور تم لوگوں میں سے جو اس میں شریک ہوگا اس کا مارا جانا یقینی ہے۔ یزید، ابن زیاد اور ابن سعد صرف میرے دشمن ہیں۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر کہیں جانا چاہو گے تو وہ تمھیں نہیں روکیں گے تم لوگوں میں سے جو جانا چاہے، بخوشی چلا جائے میں اجازت دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے شمع گل کر دی کہ جانے والوں کو شرمندگی نہ ہو۔ مگر حسینؓ کے ساتھی بھی اُن کی شان کے مطابق تھے، انھوں نے کہا مولا اگر ہم ستر مرتبہ زندہ کئے جائیں اور ہر مرتبہ آپ کی رفاقت میں سخت سے سخت تکلیف دے کر مارے جائیں تو وہ موت ہمیں ہزاروں زندگیوں سے بہتر معلوم ہوگی۔ غرض پہلے امام اور ان کے ساتھیوں نے رات عبادت الٰہی میں بسر کی اُدھر خیموں میں اہل بیت نے حسینؓ کی سلامتی کی دعاؤں اور اپنے عزیزی قریبوں کو سمجھانے میں رات گذاری، کوئی ماں اپنے کم سن بچوں کو ہدایت دے رہی تھی کہ دیکھو صبح سب سے پہلے ماموں پر تم جاں نثار کرنا۔ کہیں نوجوان بیوی شوہر کو جنگ کی ترغیب دیتی تھی، کہیں بیوہ ماں بیٹے کو قربانی کے لئے تیار کرتی تھی، کہیں بہنیں بھائیوں سے آخری دفعہ رخصت ہو رہی تھیں اور کہیں بیٹیاں باپ سے اور ماں جوان بیٹے سے وداع ہوتی تھی۔ آخر روز عاشور کی ہولناک صبح نمودار ہوئی حسینؓ کے منجھلے بیٹے علی اکبر نے لحن داؤدی سے فجر کی اذان دی، اندر بیبیوں نے اور باہر حسینؓ اور اُن کے رفقاء نے نماز صبح ادا کرکے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے حسینؓ خدا سے دعا کر رہے تھے کہ یارب میرے نانا کی اُمت کو گمراہی سے نکال اور ہدایت دے اور مجھے اس امتحان میں ثابت قدم رکھ۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم نومبر ۱۹۴۹ء

جشن ـــ یا ـــ ماتم؟

پھر ادھر پہ تیرہ سو سال سے محرم ہر سال آتا ہے اور کربلا کے شہیدوں کی یاد تازہ کر جاتا ہے، خصوصاً سید الشہدا امام حسینؑ کی یاد جو حق کے پرستاروں کے لئے ایک گراں بہا سرمایہ ہے، کرہ ارض کی پہنائیوں میں پھیلے ہوئے کروروں مسلمان اور بہت سے غیر مسلم اس محسن خلق کے آگے محبت اور عقیدت کی نذر پیش کرتے ہیں جس نے انسانیت کے مرجھائے ہوئے پودے کو اپنے اور اپنے پیاروں کے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا۔

لیکن حسینؑ کے عقیدت مندوں میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ بعض ان کی دل گداز مصیبتوں کو یاد کر کے روتے ہیں اور ان کے حیرت انگیز کارناموں کا خیال کر کے خوش ہوتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ جاہل عوام نے جن کی محبت کی سچائی اور عقیدت کی گہرائی میں کوئی شبہ نہیں ہے محرم کو اپنے مذاق اور ظرف کے مطابق ہولی اور دیوالی کی طرح ایک خوشی کا میلہ بنا دیا ہے۔

آئیے ذرا تھوڑی دیر کے لئے رسم و دستور سے الگ ہو کر عقل اور اخلاق کے نقطہ نظر سے اس سوال پر نظر ڈالیں کہ شہیدوں کے زندۂ جاوید کارناموں کو یاد دلانے کا کون سا طریقہ مناسب اور مفید ہے کیا ہم اُن کی شہادت کو ایک المناک حادثہ سمجھ کر نوحۂ غم کا موضوع بنائیں، یا اس کے شاندار پہلو پر زور دے کر رجز اور قصیدے کا موضوع قرار دیں۔

بظاہر دوسری بات زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ ہر شہید کا واقعۂ شہادت روح انسانی کی قوت اور عظمت کی گویا ایک جیتی جاگتی مثال ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی کمزور مخلوق جو خود اپنی خواہشات اور جذبات اور زمانے کے حالات اور واقعات کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے اور سیل حوادث میں تنکے کی طرح بہتا رہتا ہے جب دل پر رکھ لے تو چٹان کی طرح گڑ جاتا ہے موجوں کے تھپیڑے سہتا ہے طوفان سے ٹکر لیتا ہے اور چاہے ٹوٹ جائے مگر اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا، یہی گوشت پوست کا انسان جب ایمان کی بدولت سے معمور ہوتا ہے تو حق کی خاطر سر کٹا دیتا ہے، مگر باطل کے آگے سر نہیں جھکاتا اس لئے ہر شہید کا واقعۂ شہادت تحسین و آفرین کا، فخر و مسرت کا موقع ہے۔ آہ و فریاد، نالہ و بکا کا نہیں۔ اس کے علاوہ جو شخص نفسیات سے سرسری واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رنج و الم کے جذبات سے طبیعت میں پستی، قوت ارادی میں سستی اور قوت عمل میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور فخر اور خوشی کے جذبات سے ہمت بڑھتی ہے اور حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس لئے اخلاقی اصول کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہیدوں کی یاد میں صف ماتم نہ بچھائی جائے، بلکہ جشن آزادی منایا جائے۔

لیکن ذرا ٹھہرئے، اتنی جلدی فیصلہ نہ کیجئے۔ ذرا غور تو کر لیجئے کہ کیا واقعی شہیدوں کی شہادت کا تابناک پہلو اس کے المناک پہلو سے زیادہ نمایاں یا اہم ہوتا ہے؟ آپ نے یہ تو دیکھا کہ اس قسم کے واقعات ایک فرد خاص کی روحانی قوت اور عظمت کا ثبوت دیتے ہیں مگر اس کو نظر انداز کر دیا کہ ان سے عام انسانوں کی کمزوری اور کمتری ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے یہ محسوس نہ کیا کہ ان سے روح انسانی کے عالمگیر اور ابدی المیے پر روشنی پڑتی ہے کہ ساری دنیا میں صدیوں تک ناحق اور ناانصافی کا وجود چار و ناچار برداشت کیا جاتا ہے اور صرف کبھی کبھی، کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ حق اور انصاف کی خاطر جان کی بازی لگائی جائے۔

خصوصاً واقعہ کربلا امام حسینؑ اور ان کے عزیزوں اور رفیقوں کا شاندار کارنامہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا اور انسانیت کا عبرتناک المیہ ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جو ہادی برحق دنیا کے لئے اسلام کے نام سے توحید اور تقویٰ، عدل اور مساوات کا پیام لایا تھا اس کی آنکھ بند ہوئے چالیس ہی سال گذرے تھے کہ ایک ایسا شخص اس کا جانشین بن بیٹھا جس کی ساری زندگی اسلام کے پیام کی نفی تھی۔ اس کو اکثر لوگ فاسق فاجر اور بعض ملحد اور مشرک سمجھتے تھے اس نے عالمگیر برادری اور برابری کی تحریک کو اپنے خاندان یا زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سیاسی اقتدار کی تحریک بنا دیا تھا۔ اسلام کو عرب امپیریلزم کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ مگر المیہ یہ نہ تھا کہ اس نے پیغمبر اسلام کی خلافت کا دعویٰ کیا تھا، المیہ یہ تھا کہ مسلمان اس دعوے کو مانتے تھے اور جو نہیں مانتے تھے وہ اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اس پس منظر میں حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کو دیکھئے تو اس کا المناک پہلو پوری وضاحت اور شدت سے آپ کو نظر آئے گا اور آپ کا دل خود کہے گا بے شک یہ موقع رنج و الم کا ہے۔ وہ رنج و الم نہیں جو آہ و زاری میں پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔ یا دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔ بلکہ وہ جو دل میں بیٹھ جاتا ہے اور دل کو پکڑ لیتا ہے جو روح کو آلائشوں سے پاک و صاف اور ایک انوکھی اخلاقی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے جسے سوز و درد کہتے ہیں۔

سرمایۂ درد تو ضائع نہ توان کردن
اشکے کہ ز دل خیزد در سینہ شکستم من

جن حضرات کو یقینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے محرم کی عزاداری پر اعتراض ہے ان کے پیش نظر غالباً وہ پر شور سینہ کوبی ہوگی جو سطحی یا عامیانہ مذاق کے مرد اور عورتیں کرتی ہیں اور جس کا نام "ماتم" رکھا گیا ہے۔ وہ خاموش جگر کاوی نہ ہوگی جو اہل ذوق اور اہل درد کیا کرتے ہیں اور جس کا کوئی نام نہیں وہ اس اصطلاحی "رقت" کو دیکھتے ہوں گے جس سے رومال اور دامن بھیگ جاتے ہیں۔ اس حقیقی رقت سے واقف نہ ہوں گے جس سے دل اور روح کی کھیتی سیراب ہوتی ہے۔

جن مسلمانوں میں تاریخی نظر اور علمی بصیرت ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ واقعہ کربلا کی یادگار جسے محرم کی عزاداری کہتے ہیں، اخلاقی تعلیم اور دینی تبلیغ کی ایک زبردست تحریک تھی اور ایک حد تک اب بھی ہے یا اگر نہیں ہے تو بنائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم سال میں ایک بار دس دن یا کم سے کم چار دن بھی اس کشمع شہادت کی روشنی میں جو حسین ابن علی نے جلائی تھی اپنے مذہب و اخلاق کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ زمانہ جس سے ہم گذر رہے ہیں دنیا کے مسلمان خصوصاً ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے لئے سانحہ سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ ہم روحانی اسلام اور اخلاقی اسلام کے دھارے سے الگ ہو کر سیاسی اسلام کے بھنور میں سرگرداں ہیں ہم نے اپنا تصور ایک انسانی جماعت کی حیثیت سے نہیں کیا ہے جو ہر جگہ دوسری جماعتوں کے ساتھ اخلاقی رشتے سے مربوط ہے بلکہ کہیں "اکثریت" کی حیثیت سے اور کہیں "اقلیت" کی حیثیت سے اور کہیں "غالب" کی حیثیت سے اور کہیں "مغلوب" کی حیثیت سے ہمارا سارا جہاں سمٹ کر سیاسی نقطے پر جمع ہو گیا ہے۔ ہمارے نزدیک ساری زندگی کا ساری کائنات کا صرف ایک مسئلہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت رہے اور جہاں ان کی اقلیت ہے وہاں اُن کے حقوق محفوظ ہوں۔ ہماری نظر میں یہ مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ مسلمانوں کی حکومت خلق خدا کے لئے رحمت بنے عذاب نہ بنے اور مسلمانوں کے حقوق خود اُن کے لئے برکت ثابت ہوں لعنت نہ ثابت ہوں غرض ہمارا معیار اقدار آج وہی ہے جو ۶۱ھ میں عرب کے لوگوں کا تھا۔ اس وقت امام حسینؑ کی شہادت نے مسلمانوں کو روحانی ہلاکت سے بچایا تھا آج اُن کی یاد اور ان کی مثال بچا سکتی ہے۔

باھر کی دنیا

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۔۔)

لیکن ان جلسوں سے جہاں بہت سی سیاسی فائدے ہیں وہاں یہ نقصان بھی ہے کہ تمام کارکنوں کو سوشلزم کا سوچنے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ چین جیسے ملک میں جہاں افلاس اور جہالت کی کثرت ہے کسی نئی حکومت کو مقبول بنانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی نہیں جو چینی کمیونسٹوں نے اختیار کی ہے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

حفاظتی کونسل میں

یو۔ این۔ او بہت سی مجلسوں کمیشنوں اور اداروں پر مشتمل ہے مگر اس ساری عمارت کی بنیاد حفاظتی کونسل (SECURITY COUNCIL) ہے۔ یہ مجلس گیارہ ممبروں پر مشتمل ہے جن میں سے پانچ یعنی امریکہ، انگلستان فرانس، روس اور چین کو کونسل میں مستقل نشستیں حاصل ہیں۔ باقی نشستیں غیر مستقل ہیں۔ اور انتخاب کے ذریعے سے پر کی جاتی ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ جتنے ملک یو۔ این۔ او کے ممبر ہیں ان کے ایسے جھگڑے جن سے دنیا کے امن میں فوراً خلل پڑنے کا اندیشہ ہے طے کرے۔ اس سال کونسل میں تین جگہیں خالی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کینیڈا کی تھی اور ہندوستان اس جگہ کا امیدوار تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا انتخاب نہ ہونے پائے۔ انھیں یہ اعتراض تھا کہ ہندوستان نے خود اپنا مقدمہ اس پنچایت کے سامنے پیش کر رکھا ہے اس لیے اس کو پنچوں میں شامل ہونے کا حق نہیں ہے۔ اس اعتراض کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا اس لئے کہ جو ملک پہلے اس کے ممبر ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی معاملہ کونسل کے سامنے پیش نہ ہو۔ جب انتخاب ہوا تو ۵۷ ووٹوں میں سے ۵۶ ووٹ ہندوستان کو ملے۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ ایک مخالف ووٹ کس کا تھا مگر اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے لئے فخر و مسرت کا مقام ہے کہ آزاد ریاستوں کی صف میں شامل ہونے کے دو ہی برس بعد وہ اس عزت اور اعتماد کی جگہ کے قابل سمجھا گیا۔

بڑا خطرہ ٹل گیا

ہند اور پاکستان کے تعلقات آج کل اتنے کشیدہ ہو رہے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی فساد کی جڑ بن سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تین سو کشمیری نظر بندوں کی بھوک ہڑتال بڑی خطرناک چیز تھی اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بہ خیر و خوبی ختم ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ پاکستان کی حکومت نے ان نظر بندوں کو رہا کر کے امرتسر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور ادھر ہندوستان میں امرتسر اور جموں کے کیمپ میں جو پاکستان جانے والی عورتیں رکی ہوئی تھیں انھیں پاکستان جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

آساں نہیں ہی صلح تو دشوار بھی نہیں

ہند اور پاکستان کے تعلقات کا یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے جھگڑے آپس میں پیدا ہو گئے ہیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، سرحد کے بارے میں ہوں یا کاروبار کے بارے میں عام طور پر نہایت آسانی سے طے ہو جاتے ہیں۔ سمجھوتہ دونوں طرف کے چھوٹے چھوٹے عہدہ دار، بڑے بڑے افسر، صنعت کار، تاجر جن مجلسوں میں جمع ہوتے ہیں وہاں فضا عام طور پر خوش گوار بلکہ دوستانہ رہتی ہے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر معقولیت اور ہمدردی سے غور کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے عام باشندوں میں آپس میں مخالفت یا نفرت ہے اور وہ صلح کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ مخالفت یا اختلاف جو کچھ بھی ہے دو مسئلوں میں ہے ایک کشمیر کا دوسرے تارکین وطن کی جائداد کا اور ان دونوں کا ہند اور پاکستان کے عام باشندوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں، صرف چند اشخاص یا ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد سے ہے۔ اس لئے جب کبھی ان دونوں معاملوں، خصوصاً کشمیر کے معاملے میں یہ کہا جاتا ہے کہ حکومتیں اگر چاہیں بھی تو سمجھوتا نہیں کر سکتیں اس لئے کہ عوام میں بے حد جوش ہے اور اگر ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہوا تو حکومتوں کو توڑ کر اور نظم و نسق کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے اس میں شک نہیں کہ عوام میں خصوصاً پاکستان کے عوام میں کشمیر کے معاملے میں بڑا جوش ہے

بقیہ صفحہ ۹ پر

باہر کی دنیا

ایشیا کی معاشی بحالی

کوئی ۵ ، ۱۰ روز سے "ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن (ای سی اے ایف ای) کا پانچواں اجلاس سنگا پور میں ہو رہا ہے۔ صنعت اور تجارت کی کمیٹی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کی معاشی حالت اس وقت اتنی ہی خراب ہے جتنی جنگ کے زمانے میں یا اس سے پہلے تھی۔ جنگ کو ختم ہوئے چار سال ہو چکے ہیں مگر اب تک اس کی معاشی بحالی کے سلسلے میں کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا گیا تمام مشکل اور پیچیدہ مسائل اسی طرح موجود ہیں اور پچھلے تین سالوں میں کمیشن نے جو کچھ کیا ہے، اس کی حیثیت ابتدائی کوشش سے زیادہ نہیں۔

جن وجوہ سے ایشیا کی معاشی ترقی میں کوئی نمایاں کام نہیں ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تعمیر و ترقی کی کوئی اسکیم بنانے سے قبل ان خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے، جو جنگ کی وجہ سے معاشی اور سماجی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں (۲) ادائگیوں کا ناموافق توازن ابھی تک درست نہیں ہو سکا ہے (۳) ایشیائی ملکوں میں صنعتی سرمایہ کی بہت سخت کمی ہے۔

ان کے علاوہ پچھلے دس سال کی مدت میں ایشیا کی معاشی زندگی میں بہت بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں مثلاً (۱) ان علاقوں میں جہاں اناج اور کھانے پینے کی کثرت تھی اب وہاں بہت سخت کمی ہو گئی ہے۔ (۲) افراط زر اور نقل و حمل کی مشکل کی وجہ سے بیرونی تجارت میں بہت کمی ہو گئی ہے (۳) بیشتر ملکوں کے سیاسی حالات اس قدر غیر یقینی ہیں کہ صنعتوں میں لوگ روپیہ لگاتے گھبراتے ہیں۔

ان حالات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایشیائی ملکوں کی معاشی اور تجارتی حالت اس وقت تک درست نہیں کی جا سکتی جب تک ایشیا اور مشرق بعید کا یہ معاشی کمیشن، سیاسی اثرات سے الگ ہو کر خالص امن اور انسانیت کی خاطر کام نہیں کرے گا۔ ایشیا کی تعمیر و ترقی کے لئے اس وقت سب سے زیادہ زور یورپی اور امریکی سرمایہ پر دیا جاتا ہے، لیکن اس کو قبول کرنے میں سب سے بڑا خطرہ سیاسی اثرات کا ہے اگر اس بارے میں جمہوری ممالک اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی کر لیں تو معاشی کمیشن کی کامیابی یقینی ہے۔

چین میں جنتا راج

چین میں کمیونسٹوں کی پیش قدمی بدستور جاری ہے لیکن دنیا کی نگاہ اس سے زیادہ اس پر ہے کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے میں انتظام کیسا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک خصوصاً بیرونی تجارت کے متعلق ان کی پالسی کیا ہے۔

شنگھائی کے ایک قریبی گاؤں کے رہنے والے کسان سے پوچھا گیا کہ کمیونسٹ راج کی پانچ ماہی مدت کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو اس نے جواب دیا کہ "نیشنلسٹوں کے زمانۂ حکومت میں ٹکس ہی ٹکس اور کمیونسٹوں کے راج میں جلسے ہی جلسے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت چین میں کمیونسٹ جلسوں سے وہ کام لے رہے ہیں جو بڑے بڑے ہتھیاروں سے نہیں لئے جا سکتے تھے۔ یہ جلسے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو کمیونسٹ افسروں کے ہوتے ہیں جن میں پالسی کا تعین ہوتا ہے یا کسی مقررہ پالسی کی وضاحت کی جاتی ہے۔ پھر مختلف مسائل کو حل کرنے کے وسائل اور ذرائع سوچے جاتے ہیں۔ جب تک کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح بحث مباحثہ نہ ہو جائے، حکومت کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔ دوسرے عوام کے ہوتے ہیں جن میں عام جنتا کو حکومت کے بارے میں معلومات دی جاتی ہیں۔ کمیونزم کی خوبیاں بتائی جاتی ہیں، پیچیدہ مسائل کو سمجھایا جاتا ہے اور ان کے ذریعے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

اقبال کی وطن دوستی

محمد ابراہیم ڈار

اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، "شعاع امید" میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں، جاوید نامہ میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں .... اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُن کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی انھوں نے منظور کی، اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے حقوق طلبی کی مہم میں سرگرم رہے اور اُنھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں ....

اقبال کے عقیدت مندوں اور قدر دانوں کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں کہ اس بلند پایہ شاعر کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے نزدیک اس کی عظمت میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہو گویا ان کے خیال میں اقبال ایک ایسا انسان ہے جو تمام بشری کمزوریوں سے منزہ ہے اور اس کا نظام فکر ایسا جامع اور مکمل ہے جس میں کسی قسم کے نقص یا خامی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اقبال کی شاعرانہ عظمت تک کا منکر ہے۔ اس افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان ناخوش گوار باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو اقبال کی شخصیت یا ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور جو بعض حضرات کے خیال میں محل نظر ہیں۔ آج غالب کی شاعرانہ عظمت سے کس انصاف پسند کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے زبردست سے زبردست مداح کے لئے بھی یہ بہت دشوار ہے کہ نواب شمس الدین کے سلسلے میں مخبری کی ذمہ داری سے اُسے بچا سکے، ہندوستانی فرہنگ نگاروں کے ساتھ ان کے ناروا اور بے جا سلوک کی حمایت کر سکے یا آئین اکبری کی اشاعت پر اس کی نکتہ چینی کو درست بتا سکے۔ اگر یہ یا اس قسم کی دوسری خامیاں غالب کی شاعرانہ عظمت کے متعلق ہمارے تصور پر اثر انداز نہیں ہو سکیں تو اقبال کی زندگی کے بعض واقعات ہمارے دلوں سے اقبال کی عظمت و بزرگی کے خیال کو کیوں کر دور کر سکتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے ایما پر گورنمنٹ ہاؤس میں اقبال اپنی نظم "پنجاب کا جواب" سناتے ہیں جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

جو کچھ کہ ہے عطائے شہ محترم سے ہے
آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

اور اس دعا پر نظم ختم کرتے ہیں:۔

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

۱۹۲۶ء میں مرحوم سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر اقبال لاہور میں ایک الگ لیگ قائم کرتے ہیں جس کے سکریٹری وہ خود تھے، لاہور اسٹیشن پر اقبال سائمن کمیشن کا سواگت کرتے ہیں، حالانکہ لبرل پارٹی کے رہنما بھی اس کمیشن سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ یہ چیزیں اس قدر واضح اور آشکارا ہیں کہ لاکھ کوشش کیجئے ان پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان چیزوں سے شاعر اور مفکر کی حیثیت سے اقبال کی عظمت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی اقبال کی وطن دوستی ہے، جیسا کہ خواجہ غلام السیدین صاحب نے بیان کیا ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، شعاع امید میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ جاوید نامہ میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن، اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اقبال نے گوتم بدھ کو اولوالعزم انبیا کی صف میں پیش کیا ہے تو یہ ان کی اس وسیع النظری کی بدولت ہے جو مذہب، نسل اور وطن کی حدود سے بالاتر ہو کر انسانیت کی صحیح قدروں کو متعین کرنے میں ایک صاحب دل کی رہنمائی کرتی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ کے ذکر کے بعد وہ ایران کے جلیل القدر پیغمبر جناب زردشت کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی انھوں نے منظور کی۔ اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے حقوق طلبی کی مہم میں سرگرم رہے اور انھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال نے ہندوستان کے اندر اسلامی ہند کا نعرہ بلند کیا، آج کا پاکستان شاعر کے متخیلہ "اسلامی ہند" سے خواہ کتنا مختلف کیوں نہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان اسی نعرے کی صدائے بازگشت ہے، یہ سچ ہے کہ اقبال میر جعفر اور میر صادق جیسے غداران ملت سے سخت ناراض ہیں لیکن یہاں ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں نے مسلمان حکمرانوں سے غداری کی تھی اور شاید یہی وجہ اقبال کے عتاب اور ناراضی کی ہے۔ میر جعفر اور میر صادق کی مذمت کرنے کے بعد اقبال میر جعفر کی روح کو اب بھی سرگرم عمل پاتے ہیں اگرچہ وہ خود جہاں سے رخصت ہو چکا ہے:۔

کے شب ہندوستاں آید بروز
مرد جعفر زندہ روح او ہنوز
تا ز قید یک بدن وا می رہد
آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او با کلیسا ساز باز
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
پیش ازیں چیزے دگر مسجود او
در زبان ما وطن معبود او
ظاہر او از غم دین دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است
از نفاقش وحدت قومی دو نیم
ملت او از وجود او لئیم

وہ کون سا گروہ ہے جس کی طرف اقبال یہاں اشارہ کر رہے ہیں، یہ کہیں مسلمان وطن دوستوں کا گروہ تو نہیں؟ یہ کون ہے جو اہل دیر کا طوق نیاز اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے، یہ کون سا مسلمان ہے جو بقول اقبال کے وطن کو معبود ٹھہراتا ہے، یہ کون ہے جو بظاہر دین کے غم سے فگار ہے لیکن باطن میں اہل دیر کی طرح زنار بدوش ہے، یہ کون مسلمان ہے جو ملت کش ہے، جس کے نفاق کی بدولت قوم کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور جس کے وجود نے ملت کو بدبختی کے گڑھے میں ڈھکیل دیا ہے، اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہاں اقبال کے سامنے

علما اور مسلم وطن پرستوں کا وہ گروہ ہے جو ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کا حامی ہے اور جنگ آزادی وطن کی جنگ میں جرأت اور ایثار کا ثبوت بھی دے چکا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک ان کی یہ بہادری اپنے اندر حیدر کرار کی شان نہیں رکھتی بلکہ عہد جاہلیت کے عرب شاعر عنترہ کی یاد دلاتی ہے جس کا نام شجاعت کے لئے ضرب المثل ہے۔

اقبال کے اس واضح اور صریح بیان کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی حب وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔

اقبال بجا طور پر فرماتے ہیں کہ وہ ایک بہتر معاشرتی نظام کی تلاش میں ایک ایسے نظام معاشرت کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے جس کا سب سے بڑا مقصد نسل، رنگ اور ذات پات کے خطرناک امتیازات کو مٹانا ہے لیکن یہاں یہ اہم بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس نظام معاشرت کے پیرو کہاں تک اس کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ہم اکثر بلند آہنگی سے اسلام کے شاندار اصولوں کا صور پھونکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ شاندار اصول عالمگیر سچائیاں ہیں اور ہماری صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم کس حد تک ان شاندار اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اقبال کا ایک ممدوح اورنگ زیب ہے جو حکمرانی کے تمام اوصاف سے متصف ہے اور جس کی دینداری کا ہر کس و ناکس کو اعتراف ہے لیکن ہمیں اس اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اس کے ذہنی دائرے میں وہ وسعت نہ تھی جو اس جیسے عظیم الشان اور اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر شہنشاہ میں ہونی چاہئے تھی، وہ اپنے بھائی دارا کو محض اس بنا پر ملحد کہتا ہے کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت ہے۔ وہ محض صوفیوں کا حلقہ بگوش ہی نہیں بلکہ ویدانت کا بھی قائل ہے، اور تصوف اور ویدانت کے دو دریاؤں کا سنگم تیار کرتا ہے۔ دارا شکوہ، شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز کی تقلید میں "اسلام مجازی" سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، کفر حقیقی کو خوش آمدید کہتا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مثنوی سے متاثر ہو کر اقبال جاوید گلشن راز کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور جن کی شان میں وہ یہ کہتے ہیں:-

زعہد شیخ تا ایں روزگارے

نزد مردے بجاں ما شرارے

اس کے باوجود یہ دیکھ کر ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اقبال اورنگ زیب کے ہم نوا ہو کر دارا شکوہ پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں اور اورنگ زیب و دارا کی جنگ کو کفر و دین کی کارزار قرار دیتے ہیں حالانکہ بیچارہ دارا اپنے کو حنفی مذہب اور قادری مشرب بتاتا ہے اور اس کی تصنیفات سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیاء اس کے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:-

تخم الحادے کہ اکبر پرورید

باز اندر فطرت دارا دمید

اورنگ زیب ان کی نظر میں کفر و دین کی پیکار میں اسلامی ترکش کا آخری تیر ہے۔

درمیان کارزار کفر و دیں

ترکش ما را خدنگ آخریں

کور ذوقاں داستانہا ساختند

وسعت ادراک او نشناختند

اقبال کے یہاں ایک عجیب قسم کا تضاد پایا جاتا ہے دارا شکوہ تو بعض عقائد کی بنا پر ان کی نظر میں ملحد ٹھہرتا ہے، لیکن حلاج جسے محض الحاد و زندقہ کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اُن کے ایوان فکر میں خودی کا شارح اور مفسر ہے بلکہ مرگ آباد عالم میں قیامت برپا کرنے میں اقبال کا پیش رو ہے چنانچہ اس کی زبان سے کہلواتے ہیں:-

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس

محشرے بر مردہ آوردی بترس

بعینہ یہی تضاد اقبال کے یہاں حضرت مولانائے روم اور بلبل شیراز خواجہ حافظ کے سلسلے میں پایا جاتا ہے مرشد رومی کے خوان کرم سے زلہ ربائی کا اظہار وہ بار بار والہانہ شیفتگی اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن بلبل شیراز ان کی نظر میں ایک ساحر ہے جو اپنی خوش نوائی اور عشوہ آفرینی سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے وہ میخواروں کی ملت کا فقیہ اور بے چاروں کی امت کا امام ہے۔ اس کا ساغر احرار کے سزاوار نہیں اور اس کی محفل ابرار کے شایان نہیں، خواجہ حافظ پر اس درجہ عتاب اس لئے ہے کہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں۔ کیا یہی چیزیں صوفیائے کرام کے یہاں قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتیں اور کیا ملکیم پاک نژاد' کے کلام میں جا بجا ان کا ذکر نہیں ملتا، پھر حافظ پر یہ لعن طعن کیوں؟ حافظ اور اقبال کے سلسلے میں ایک بھولے ہوئے واقعہ کا ذکر دلچسپ رہے گا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں امرتسر کے نامور شاعر جناب محمد حسین عرشی نے چند فارسی اشعار میں اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے ان سے رونق ہنگامہ احرار بننے کی درخواست کی، اس کے جواب میں اقبال نے عرشی صاحب کو یقین دلایا کہ ان کا پیا نہ ہرگز نہیں ٹوٹا بلکہ بدستور سلامت ہے اور "رندان پختہ کار کے شیوہ" کی توضیح اقبال نے خواجہ حافظ کے اس شعر سے کی:-

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز

ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ہمارا مقصود اقبال کی تنقیص نہیں بلکہ اس بے جا وکالت کے خلاف احتجاج ہے جو آئے دن اقبال کے بعض قدر شناسوں کی جانب سے دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر محکوم ہندو دھرم اور تہذیب کے سرچشموں سے سیراب ہو کر اخلاقی قدروں کو جانچتے ہیں اور مرحوم چترنجن داس کے تیار کردہ میثاق بنگال کے خلاف محض اس لئے آواز اٹھاتے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور پھر بھی اُن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اقبال عہد حاضر کی وطنیت کے مخالف ہونے کی پاداش میں معتوب ٹھہرائے جائیں اور ہم انھیں اس الزام سے بچانے کے لئے ان کی وطن دوستی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کی بنا پر اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت یا ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ انسان کا کمال اس بات میں ہے کہ اس میں کم سے کم خامیاں پائی جائیں، ورنہ ایسا کامل انسان کہاں مل سکتا ہے جو تمام خامیوں سے پاک ہو، بقول ایک عرب شاعر کے:-

ومن ذالذی ترضیٰ سجایاہ کلّھا

کفی المرءَ نُبلاً أن تعدّ معائبہ

"ایسا کون شخص ہے جس کی تمام عادتیں لوگوں کو پسند ہوں، ایک آدمی کی شرافت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے عیوب گنتی کے ہوں۔"

باہر کی دُنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ان جلسوں میں بڑے سے بڑا کمیونسٹ شریک ہوتا ہے اور یہ چھ چھ سات سات گھنٹے تک جاری رہتے ہیں۔ ایک نیوز ایجنسی کا بیان ہے کہ کمیونسٹ لیڈر ان جلسوں کی وجہ سے اس قدر مشغول رہتے ہیں کہ وہ بمشکل رات کو تین چار گھنٹے سو پاتے ہیں۔

عام جلسوں میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ یہ جنتا کا زمانہ ہے چنانچہ حکومت کا نام "جنتا راج" رکھا گیا ہے، فوج کو "جنتا کو آزادی دینے والی فوج" کہتے ہیں، کرنسی کو "جنتا نوٹ" کہا جاتا ہے۔ پیکنگ کے ایک اخبار کا نام ہے "جنتا روزنامہ"

اخبارات کے ایڈیٹروں کے الگ روزانہ جلسے ہوتے ہیں جس میں اس دن کی خبروں، ان کی سرخیوں اور اداریے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے اور کمیونسٹ کارکن انھیں ہدایتیں دیتے ہیں، اسی طرح کسانوں اور مل کے مزدوروں کے بھی الگ الگ جلسے ہوتے ہیں جن میں ان کے مسائل کے متعلق تقریریں کی جاتی ہیں۔

یہ جلسے کبھی کبھی بہت طویل ہوتے ہیں چنانچہ کچھ دن ہوئے تہذیبی کام کرنے والوں نے پیکنگ میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا جو ۱۸ دن تک جاری رہا روزانہ صبح کے چھ بجے عام جلسہ شروع ہوتا تھا کھانے کے بعد مختلف گروپ کی الگ الگ میٹنگ ہوتیں اور شام کو وہ تھیٹر میں شریک ہوتے جہاں یا تو کوئی نیا کمیونسٹ ڈراما پیش کیا جاتا یا محض گانے ہوتے

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

مختصر تبصرے

"اُردو غزل"

ڈاکٹر مسعود حسین

روحِ اقبال کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی یہ دوسری ادبی پیشکش ہے ۔ جسے مصنف نے نہایت معمولی کاغذ پر اوسط درجے کی کتابت و طباعت کے ساتھ حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے ، قیمت للعہ

"اردو غزل" بقول مصنف "عام ڈگر سے ذرا الگ ہٹ کر ، غزل کا فنی اور نفسیاتی جائزہ بھی ہے اور" قدماسے زمانۂ حال تک کے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب بھی ۔ "عام ڈگر" سے غالباً مصنف کا اشارہ ان تنقیداتِ غزل کی جانب ہے جن میں یا تو فنی خم و پیچ کا شدومد کے ساتھ تذکرہ ہوتا ہے یا مغربی ادبیات کے زیر اثر غزل کی "گردن بے تکلف اور بے تکان" ماریئے کی ترغیب ہوتی ہے ۔ کبھی کبھی اجتماعی پس منظر کا نقش ناتمام بھی غزل کو مہیا کر دیا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر یوسف حسین تنقید کے ان پہلوؤں کو بیکار کئے بغیر فن کو انفرادی نفس کا ایک حسین اور پُر کار تصرف سمجھتے ہیں جو "شاعر کی داخلی کیفیات اور تمدنِ احوال" کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے "اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا" یہ بنیادی حقیقت بطریرِ اسلوبِ غزل رمز و ایما سے مرتب ہوتی ہے جو شاعری کی جان بلکہ ایمان ہیں ۔ اس لئے غزل پر تنقید کرتے وقت انفرادی نفس کی ان گتھیوں کا کھولنا ضروری ہے جن سے علامات کی تخلیق ہوتی ہے ۔ علامات سے فنی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنے مضامین کے آخری حصے میں تشبیہ ، استعارہ ، کنایہ ، مجاز مرسل وغیرہم کی پوشیدہ ایمائی برقیات پر کافی زور دیا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے حسرت کی "نکاتِ سخن" سے بعض جگہ اختلاف کرتے ہوئے بھی استفادہ کیا ہے ۔ بعض اوقات حسرت کی غیر سائنسی تنقید کا علمی جواز بھی پیش کیا ہے ۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "نکاتِ سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسنِ سخن میں شمار کیا ہے ۔ (صفحہ ۱۶۲) لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے ؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور ایمائی کیفیت ضروری ہے ۔ صیغۂ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفسِ واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے ، حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور ایمائی اثر ہوتا ہے ۔ صیغۂ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لیے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے ۔"

اس قسم کی نکتہ بینی کے نمونے "اردو غزل" میں جابجا ملیں گے ۔ مصنف اپنے مخصوص انداز میں نفس اور ماحول شاعری سے متعلق بعض پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے ۔ غزل کو شاعری کے رمز و ابہام کے متعلق مصنف کا خیال ہے " معلوم ہوتا ہے جذبۂ حقیقت اور دھوپ چھاؤں جیسا دھندلا پن پسند کرتا ہے " یہ شاعر کی نفسیات سے متعلق گہری بات ہے ۔ شاعرانہ وجدان کے وقت شعورِ تخیل کی رنگین فضاؤں میں تحلیل سا ہو جاتا ہے لیکن تخلیقی عمل کے وقت بھی ابلاغ کے حقیقی سانچوں کا شعور شاعر کو رہتا ہے ۔ دھندلا بھی ، ورنہ تخلیقی عمل ناممکن ہو جائے ۔

غزل کی صوفیانہ واردات کا سلسلہ مجاز سے ملا کر مصنف نے فکرِ بلیغ کا مزید ثبوت دیا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ عشقِ مجاز کی خواہشیں ہی معرفت کی امواجِ نشاط بن جاتی ہیں " مجازی حسن چاہے کتنا نامکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گیرائیاں عالمگیر ہیں ۔ تصوف کے سلسلے میں مصنف کے ان خیالات کے بارے میں معلوم نہیں اہلِ صدق و صفا کیا کہیں گے ، لیکن نفسِ انسانی کی عظمت کو اس سے بہتر طور پر مسلم نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ بات مصنف کی حقیقت بینی اور اس گہرے سماجی شعور پر دلالت کرتی ہے ، جو ادبی اور تاریخی نظر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے ۔

غزل کی بات جب چھڑتی ہے تو صداقت حسن اور افادہ کے مسائل خود بخود اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں "اردو غزل" اس اعتبار سے تشنہ رہ گئی ہے ۔ صرف چند بلیغ اشارے ملتے ہیں ۔ مثلاً " جمالیاتی تجربہ خود علم کی اعلیٰ ترین شکل ہے ، جس کی بدولت صداقت اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جا سکتا ہے ، اس قسم کے بیانات پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت تھی ، تاکہ مصنف کا جمالیاتی نقطۂ نظر بخوبی واضح ہو جاتا ۔ مصنف حقیقت بیں ہوتے ہوئے بھی عینیت کی طرف جھکا ہوا ہے ۔ اسی لئے شاید اقبال سے متاثر ہو کر اس نے اجتماعی مقاصد کو " انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک سے تعبیر کیا ہے " اجتماعی شعور ، عشق کی کسک " سے کہیں زیادہ عقل اور عمل کی روشنی سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہ انفرادیت کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کمان کی مانند نہیں اُبھرتا ، بلکہ عقل اور تجربے کی روشنی میں جذبات کے جھٹ پٹے سے دھنک کے رنگوں کی طرح نکھر اُٹھتا ہے ۔ اسی لئے اخلاق شخصیت کے رچاؤ سے تعمیر ہوتا ہے نہ کہ اس کی امنگ اور لپک سے !

" ڈاکٹر یوسف حسین کا عام انداز بیانیہ ہے ، وہ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر کثرت سے اشعار نقل کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی مترجمانہ اور غیر ضروری شرح بھی کرتے جاتے ہیں ، اس کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا تھا ۔ ان کی جگہ اس قسم کے خیال انگیز اور چونکا دینے والے "تنقید و تحلیل" سے پر کرنی چاہیئے تھی جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ابہام و رمز کے ارتقا پر " تمدنی احوال " سے مطلق روشنی نہیں ڈالی ۔ رمز و ایما ، فنی خم و پیچ سے بھی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کا ایک سماجی پس منظر بھی ہے ۔ ابہام ایک مخصوص سماج اور مخصوص انداز فکر سے پیدا ہوتا ہے ، دوسرے الفاظ میں بے پردہ اور در پردہ بات کہتے وقت شاعر ماحول کے تقاضوں سے بھی مجبور ہوتا ہے ۔

"اردو غزل" غزل پر جامع اور محیط کتاب نہیں "لیکن عام ڈگر سے ہٹ کر" ضرور ہے ۔ اس سے غزل کی روایت ایک مرتبہ پھر مستحکم ہوتی ہے ۔ اس کے ساتھ لگا ہوا انتخاب نہ صرف مزاجِ غزل کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ اس " ذوقیات " کی صحت کا بھی غماز ہے جو صرف رچ بس کر پیدا ہوتی ہے ۔ تنقید کی طرح انتخاب بھی ہمہ گیر نہیں ۔ بعض اوقات اچھے شعراء کے بس دو شعروں پر اکتفا کیا گیا ہے ، کچھ غزل گو نظر انداز بھی ہو گئے ہیں ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تنقید اور انتخاب دونوں میں مصنف کے پیش نظر ایک مخصوص ڈگر تھی ۔

بزمِ بے تکلف

بہ سلسلہ صفحہ ۵

ان کو تر لقمہ سمجھ کر ہڑپ کرنے کی کوشش کی ۔ آپ اُنھیں جتا دیجئے کہ ہیرا جتنا صاف شفاف اور چمک دار ہوتا ہے اتنا ہی سخت اور تیز بھی ہوتا ہے وہ سر پر سجتا ہے پیٹ میں نہیں پچتا ۔ اس کی جگہ طرت کلہ ہے شکم نہیں ۔ بس یہی چند لفظ ہمیں آپ سے کہنے تھے ۔

خدا حافظ"

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

لیکن وہ آپ ہی آپ پیدا نہیں ہوا بلکہ پروپاگنڈا کے سارے وسائل سے کام لے کر اُبھارا گیا تھا اور اگر اس کو قائم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے تو رفتہ رفتہ اعتدال پر آ جائے گا ، اور لوگ معقول بات کو سننے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے ۔

گوسبی ہوٹل میں

ایک رات کا مہمان

مارک ٹوین

(امریکی ڈالر فاشزم کی بدحواسیاں اب ایک نئی منزل میں داخل ہوگئی ہیں اب تک تو غیر امریکی سرگرمیوں کی تحقیقاتی کمیٹی امریکہ کے موجودہ شہریوں کی جانچ پڑتال کرتی تھی کہ وہ "امریکی" ہیں یا "غیر امریکی" ——— لیکن اب سُنا گیا ہے کہ ماضی کے امریکی عوام اور فن کاروں کا بھی محاسبہ کیا جارہا ہے چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ نیویارک کے تعلیمی بورڈ نے مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوین (مرحوم) کی کتاب "کنیکٹی کٹ کا ایک امریکی، شاہ آرتھر کے دربار میں" غیر قانونی یعنی غیر امریکی قرار دے دی - ذیل میں اسی مرحوم معتوب مصنف کا ایک افسانہ ملاحظہ کیجئے -)

منہاج برنا

یہ سنہ ۱۸۵۳ء کی بات ہے کہ جب میں اور میرا پیارا دوست رائیلی واشنگٹن میں اخباری نامہ نگار تھے - اس وقت کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا، طوفانی جھکڑ چل رہے تھے اور برف گر رہی تھی پنسلوانیو ینو کی طرف تھا اور ہم اپنے گرم کوٹوں کو اپنے جسم سے اچھی طرح لپیٹے تیزی سے بڑھے چلے جارہے تھے کہ دفعتہً سڑک کے ایک لیمپ کی روشنی ایک آدمی پر پڑی جو بڑی تیزی سے ہماری مخالف سمت میں چل رہا تھا گویا کوئی بڑی مہم سر کرنے جارہا ہو، لیکن ہمارے قریب پہنچتے ہی یہ شخص یک لخت کھڑا ہوگیا اور رائیلی کی طرف ہمدردی کے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا ———

"عجیب اتفاق ہے، آپ مسٹر رائیلی ہیں نا؟"

رائیلی ایک بہت ہی خندہ پیشانی اور ہنستا کھیلتا آدمی تھا، پبلک زندگی میں اُسے کافی اہمیت حاصل تھی وہ قدرے تکلف سے رُکا، پھر نو وارد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جواب دیا "ہوں، میں مسٹر رائیلی ہوں - کیا آپ میری ہی تلاش میں تھے ——— ؟"

"جی ہاں - بالکل - میں آپ ہی کی تلاش میں تھا ———" اس آدمی نے نہایت خوشی سے جواب دیا ——— "یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میں نے آپ کو ڈھونڈھ نکالا .... میرا نام لکنس ہے - سان فرانسسکو ہائی اسکول میں استاد ہوں، لیکن جوں ہی مجھے معلوم ہوا کہ سان فرانسسکو کے پوسٹ ماسٹر کی جگہ خالی ہے، میں نے طے کرلیا کہ اُسے حاصل کرکے رہوں گا، چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے ہوں"

"جی ...." رائیلی نے بہت خندہ پیشانی کے ساتھ آہستہ آہستہ کہا "جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا مسٹر لکنس .... آپ میرے سامنے ہیں .... تو آپ نے وہ جگہ حاصل کرلی؟"

"نہیں تو .... پوری طرح تو ابھی حاصل نہیں کرسکا ہوں - لیکن اب مجھے یہی کام کرنا ہے .... میں ایک درخواست لایا ہوں جس پر محکمہ تعلیمات کے سپرنٹنڈنٹ، اساتذہ اور دیگر دو سو سے زائد آدمیوں کے دستخط ہیں - اب میں چاہتا یہ ہوں کہ اگر آپ میرے ساتھ تھوڑی عنایت اور مہربانی سے پیش آئیں تو براہِ کرم میرے ساتھ پیسیفک ڈیلی گیشن سے ملنے چلیں آپ کا بڑا احسان ہوگا - اس کام کو جلد سے جلد انجام تک پہنچا دینا چاہتا ہوں اور پھر اپنے گھر واپس ہونا چاہتا ہوں ———"

"معاملہ خاصا اہم ہے ——— تو کیا آپ آج ہی رات، اسی وقت ڈیلی گیشن سے ملنے چلیں گے ———"

رائیلی نے یہ بات جس لہجے میں کہی، اس میں کسی مزاح یا طنز کا نشتر نہ تھا -

"ہاں آج رات - ہاں یقیناً، ضرور چلوں گا ——— میرے پاس زائد وقت بالکل نہیں ہے بیشتر اس کے کہ میں بستر پر دراز ہوں - میں ان سے وعدہ لے لینا چاہتا ہوں - صاحب میں باتونی آدمی نہیں کام کرتا ہوں کام ———"

"اچھا ——— تو تم صحیح آدمی سے ملے ہو تم کب آئے - ؟"

"بس کوئی ایک گھنٹہ ہوا ———"

"اور کب جارہے ہو؟"

"نیویارک کل شام اور سان فرانسسکو پرسوں صبح"

"ٹھیک ——— اچھا کل تم کیا کروگے؟"

"کروں گا کیا معنی ——— مجھے اپنی درخواست کے ساتھ پریذیڈنٹ سے ملاقات کرنی ہے اور پھر ڈیلی گیشن سے اپنا تقرر کروانا ہے - اس میں میرا خیال ہے کوئی پیچیدگی نہیں ———"

"جی ہاں، قطعی نہیں ——— یہ ٹھیک ہے - اور پھر کیا کروگے؟"

"دو بجے دن کو سینٹ کی ایگزیکٹو کا جلسہ ہوگا وہاں اپنے تقرر کی تصدیق کرانا ہے - آپ سمجھ رہے ہیں نا میری باتوں کو ——— ؟"

"ہاں، ہاں .... بالکل ...." رائیلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو .... پھر تم شام کی ٹرین سے نیویارک روانہ ہو جاؤگے اور پرسوں صبح اسٹیمر سے سان فرانسسکو کیوں ہے نا ———"

"بالکل جناب بالکل - یہی پروگرام ہے"

رائیلی نے ایک لمحے کچھ اور سوچا اور پھر بولا:

"کیا تم ایک دن ٹھیر نہیں سکتے - یا دو دن؟"

"اُفوہ - آپ بھی کمال کرتے ہیں .... یہ طریقہ کار میرا نہیں - میں وقت کو ضائع کرنے والا آدمی نہیں .... میں وہ آدمی ہوں جو کام کرنا جانتا ہے اور بے تکان کام کرتا - سمجھے آپ ———"

طوفان اپنے پورے زور شور کے ساتھ جاری تھا اور برف بڑی شدت سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ رہی تھی - رائیلی ایک دو لمحوں کے لئے بالکل خاموش ہوگیا، غالباً وہ کسی خیال میں گم تھا، کچھ دیر کے بعد وہ سر اُٹھا کر بولا "کیا تم نے اس شخص کے بارے میں کچھ سُنا ہے جو گوسبی ہوٹل میں ٹھہرا تھا .... نہیں شاید تم اس سے واقف نہیں ———"

رائیلی کچھ ہٹ کر فٹ پاتھ کے جنگلے کے قریب آگیا اور اس آدمی کو بھی جنگلے سے لگا کر کھڑا کر دیا تاکہ اُسے کھڑے رہنے میں زیادہ تکلیف نہ ہو، پھر اس نے اپنی کہانی کو بڑے مزے لے کر اور بہت آہستہ آہستہ سنانا شروع کیا گویا اس وقت وہ سخت برفانی جھکڑوں میں نہیں کھڑے تھے بلکہ موسم بہار میں کسی باغ کے سبزے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

"میں تمھیں اس آدمی کا حال سُناتا ہوں، یہ جیکسن کا زمانہ تھا اس وقت گوسبی یہاں کا خاص ہوٹل تھا، ایک سہانی صبح کو ۹ بجے کے قریب یہی شخص جس کا میں ذکر کررہا ہوں تیزی سے بہت ہی تزک و احتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، یعنی عالم یہ تھا کہ وہ ایک بہت ہی شاندار چار گھوڑوں والی رئیسانہ گاڑی میں بیٹھ کر آیا تھا جس کا کوچوان تک بہت خوش پوش تھا - گاڑی میں اپنے ساتھ وہ ایک کتا بھی لایا تھا جسے غالباً وہ بہت عزیز رکھتا تھا، اس کی گاڑی گوسبی کے سامنے میں جاکر رُکی، بس پھر کیا تھا ہوٹل کا مالک اس کا منیجر اور دیگر ملازمین دوڑے دوڑے باہر آئے تاکہ اس معزز مہمان کا خیر مقدم کریں اور اپنے ہوٹل کی زینت بڑھائیں ——— لیکن اُس نے فوراً کہا "زحمت کی ضرورت نہیں ———" وہ بہت پھرتی کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا اور کوچوان سے وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا - اس نے بتایا کہ اس وقت بہت عجلت میں ہے، کھانا کھانے تک کے لئے اس کے پاس وقت نہیں - صورت یہ ہے کہ اس کا

کچھ قرضہ حکومت پر آتا ہے جس کو اُسے وصول کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ خزانہ جائے گا، اپنا روپیہ وصول کرے گا اور پھر فوراً ہی ٹینسی واپس ہو جائے گا کیونکہ وہ بہت عجلت میں ہے۔"

"خیر صاحب۔ رات کے کوئی دس بجے وہ واپس آیا۔ فوراً ہی بستر بچھانے اور گھوڑوں کو گاڑی سے کھول کر اصطبل میں باندھنے کا حکم دیا اور کہا کہ اب اپنا قرضہ کل صبح وصول کروں گا ——— یہ واقعہ جنوری کا ہے۔ جنوری ۱۸۳۴ء کا۔ آپ مجھے و تین جنوری اور بدھ کا دن ———"

"پانچویں فروری کا واقعہ ہے کہ اس نے اپنی شاندار گاڑی فروخت کر دی اور اس کے بدلے میں ایک دوسری سستی سی گاڑی خرید لی، کہنے لگا کہ روپیہ گھر لے جانے کے لئے یہ گاڑی بھی کافی ہے، مجھے دکھاوے اور فیشن سے نفرت ہے ———

۱۱ اگست کو اس نے اپنے گھوڑوں کا ایک جوڑا بیچ ڈالا کہ میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ گاڑی کے لئے چار کے بجائے دو گھوڑے کافی ہوتے ہیں، خصوصاً پہاڑی علاقوں کے راستوں کو طے کرنے کے لئے جہاں آدمی کو بہت سنبھال کر گاڑی چلانی پڑتی ہے ...... اور پھر میرے قرضے کی رقم بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ دو گھوڑے اس رقم کو آسانی کے ساتھ گھر لے جا سکتے ہیں۔

۱۳ دسمبر کو اس نے ایک اور گھوڑا بیچ دیا۔ کہا کہ دقیانوسی گاڑی کے لئے دو گھوڑوں کی بالکل ضرورت نہیں۔ حقیقت میں ایک گھوڑا اُسے زیادہ آسانی کے ساتھ کھینچ سکتا ہے اور پھر آج کل جاڑے ختم ہو رہے ہیں۔ اور راستے ابھی اچھی حالت میں ہیں۔

۱۰ فروری ۱۸۳۵ء کو اس نے اس پُرانی دقیانوسی گاڑی کو بھی بیچ دیا اور اس کے بعد ایک پُرانی، لیکن ہلکی پھلکی بگھی خرید لی۔ کہنے لگا کہ موسم بہار کے اوائل میں راستوں کی جو حالت ہوتی ہے اور وہ جس قدر پھسلن اور کیچڑ سے بھرے ہوتے ہیں ان کے لئے تو بگھی ہی ٹھیک رہے گی اور پھر میری تو یہ دیرینہ تمنا ہے کہ کبھی پہاڑی راستوں پر بگھی چلاؤں۔"

یکم اگست کو اس نے بگھی کو بھی فروخت کر ڈالا اور اس کی جگہ ایک گھٹیا قسم کا یکہ خرید لیا کہنے لگا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن مجھے یکے میں آتا ہوا دیکھیں۔ انھوں نے ایسا یکہ اپنی تمام عمر میں نہ دیکھا ہوگا ———"

"اچھا جناب خدا آپ کا بھلا کرے۔ ۲۹ اگست کو اس نے اپنے حبشی کوچبان کو بھی بیچ دیا کہا کہ ایک یکے کے لئے کوچبان کی ضرورت نہیں اور یکے میں دو آدمیوں کی جگہ بھی بڑی تنگی سے نکلتی ہے۔ اور پھر کہنے لگا کہ یہ بھی بڑی خوش قسمتی ہے اور روز روز ایسی خوش قسمتی کس کو نصیب ہوتی ہے ... بھتیجے، ناکارہ اور ... نوسو ڈالر دیبے ... نجات حاصل کرنا چاہتا تھا ...

۱۸ مہینے کے بعد یعنی ۱۵ فروری ۱۸۳۶ء کو اس نے یکہ بھی فروخت کر ڈالا اور گھوڑے کے لئے زین خرید لی۔ کہنے لگا کہ "گھوڑے کی سواری کے ڈاکٹر مجھے ہمیشہ مشورہ دیتے رہے ہیں۔ دراصل میری صحت کے لئے شہسواری نہایت ضروری ہے اور پھر اس موسم میں راستے بڑے خراب ہوتے ہیں۔ یکے کے پہیئے کہیں بھی پھسل سکتے ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ اپنی جان کیوں خطرہ میں ڈالی جائے۔

۹ اپریل کو اس نے زین بھی بیچ ڈالا۔ بولا کہ ۹ اپریل کی بارش میں خراب ہو جانے والے گھٹیا قسم کے زین سے میری زندگی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اب مجھے اتنی مشق ہو گئی ہے کہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر آسانی سے سوار ہو سکتا ہوں۔

۲۴ اپریل کو اس نے اپنا گھوڑا بھی بیچ ڈالا۔ کہنے لگا کہ میری عمر صرف ۵۷ سال کی ہے اور اب بھی تندرست و توانا اور ہٹا کٹا ہوں اس موقع کو گھوڑے کی سواری سے ضائع کرنا حماقت ہے ———

یہ موسم ——— جس میں پیدل چلنا شائد دنیا کا بہترین اور خوش گوار ترین شغل ہے .... تازہ اور لو رس پودوں اور ہرے بھرے درختوں سے ڈھکے جنگلوں میں سے گذرنا اور پُر فضا پہاڑوں پر چلنا .... کیا کہنے ہیں اور ایسے آدمی کے لئے جو سچ مچ آدمی ہے رہی میری دولت تو جب وہ مل جائے گی تو اسے کتا بھی اٹھا کر چل سکتا ہے، لہٰذا میں کل علی الصباح ہی اٹھ جاؤں گا۔ اپنا قرضہ وصول کروں گا اور گوسبی ہوٹل کو ایک پُر جوش رخصتی سلام کرتے ہوئے پاپیادہ ٹینسی روانہ ہو جاؤں گا ———

۲۲ جون کو اس نے اپنا کتا بھی بیچ ڈالا۔ کتا لغو چیز ہے، ایک خواہ مخواہ کا بار ہے جبکہ آپ ہرے بھرے جنگلات میں ایک خوشگوار اور فرحت افزا سفر کر رہے ہوں۔ کتا ایک زبردستی کی مصیبت ہے۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ جب دیکھو گلہریوں کا پیچھا کرتا ہے۔ ہر شخص پر بھونکتا ہے۔ آس پاس کے مکانوں میں گھس جاتا ہے۔ کبھی تالاب میں گھس کر اپنے جسم کو گندہ کر لیتا ہے۔ غرض ایک مصیبت ہی مصیبت ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس وجود کے ساتھ جس کے ہوتے ہوئے فرشتے بھی پاس نہیں پھٹکتے کیوں کر نیچر کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ——— اور رہی میری دولت جو میں وصول کروں گا تو اُسے میں خود اٹھا سکتا ہوں کتا مال کے معاملے میں ذرا غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے اچھا تو یارو! خدا حافظ! میں کل صبح ہی اپنی مضبوط ٹانگوں اللہ جیتے جاگتے دل کے ساتھ ٹینسی روانہ ہو جاؤں گا ———

یہاں پہنچ کر رائیلی نے توقف کیا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ اس سکوت میں صرف ہوا کے چلنے اور برف کے گرنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ... شخص نے یک لخت ... ——— اچھا تو ...

"اچھا تو پھر ———"

"وہ آدمی میرا بہت گہرا دوست ہے۔ وہ ہر شام کو مجھے خدا حافظ کہنے آتا ہے۔ آج بھی کوئی ایک گھنٹہ ہوا وہ مجھے ملا تھا۔ وہ حسب معمول کل صبح ٹینسی روانہ ہو جائے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل ضرور اور ہر حالت میں پو پھٹنے سے پیشتر اپنا قرضہ وصول کر کے یہاں سے چل دے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت خوش تھا کہ کل وہ ٹینسی روانہ ہو جائے گا اور وہ ایک بار پھر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے مل سکے گا"

"ایک اور خاموش وقفہ ——— اجنبی نے دوبارہ اس سکوت کو توڑا ——— بس قصہ ختم ہو گیا ———"

"ہاں قصہ ختم ہو گیا ———"

"خوب ——— میرے خیال میں رات کے وقت اور ایسی رات کے وقت .... یہ کہانی کافی طویل تھی... .... لیکن اس کا مقصد ———"

"جی مقصد ؟ ——— کوئی خاص مقصد نہیں ———"

"پھر بھی۔ کچھ تو آخر ———"

"اس کا کوئی خاص مقصد نہیں۔ صرف بات اتنی ہے کہ اگر آپ کو سان فرانسسکو جانے اور اپنا تقرر کرانے کی بہت جلدی نہ ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک رات کے لئے گوسبی ہوٹل میں قیام کیجئے اور آرام سے سوئیے۔ اچھا خدا حافظ ———"

اتنا کہہ کر رائیلی میرا ہاتھ پکڑ کر چل دیا اور حیرت زدہ اسکول ٹیچر کو وہیں کھڑا کا کھڑا چھوڑ دیا۔ وہ اس وقت لیمپ کی روشنی میں برف کا ایک مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔

بے چارے کو پوسٹ ماسٹر کی جگہ نہ مل سکی۔

بقیہ سلسلہ صفحہ ۲

اور صبر کی توفیق عطا فرما، عزیز ورفقا دعا فرما رہے تھے بار الٰہی ہمیں توفیق دے کہ حسینؑ کی حمایت میں بہادری اور استقلال سے لڑیں اور جان دیں۔ اندر خواتین حسینؑ کی سلامتی کے لئے دست بدعا تھیں، اور بی بی زینبؑ سجدہ میں اپنی جان سے زیادہ پیارے بھائی کے لئے گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کر رہی تھیں۔

ابھی حسینؑ عبادت سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ فوج اشقیا کی طرف سے بہت سے تیر آکر گرے اور کئی آدمی اسی میں شہید ہو گئے۔ حسینؑ تلوار ٹیک کر کھڑے ہوئے، سب سے پہلے خیمے میں جا کر اہل حرم سے رخصت ہوئے۔ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ سارے مجاہد سر کٹانے کو تیار کھڑے ہیں۔ ان میں حبیب بن مظاہر جیسے مقدس بوڑھے بھی ہیں جو رسول اللہ کا زمانہ دیکھ چکے ہیں۔ بڑے بڑے بہادر جوان بھی ہیں۔ علیؓ کے چاروں بیٹے حسینؑ کے اپنے بیٹے۔ زینبؑ کے کم سن فرزند، حسنؑ کے دونوں لال، سب شجاعت و جرأت میں یگانۂ روزگار، نہ چہروں پر فکر نہ دل میں ہراس، حسینؑ پر اور راہ حق پر جان وارنے کے لئے ہشاش بشاش تنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہاں ان بہتر مجاہدوں میں ایک مجاہد ایسا بھی تھا جو ان لڑنے والوں کی صف میں شامل نہیں تھا، یعنی علی اصغر امام حسینؑ کا چھ مہینے کا بچہ جو جھولے میں لیٹا باپ کی نصرت کے لئے تیار تھا۔

حسینؑ مسکراتے ہوئے اپنی مختصر مگر یگانہ روزگار فوج کے قریب آئے، اُن کو صبر و استقلال کی ہدایت کی اور پھر سب کے دشمن کی فوج کے سامنے جا کر دیر تک انھیں ایمان اور حق کی راہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر سوا ایک شخص حر کے کسی کے دل پر اثر نہ ہوا، وہی حر جس نے حسینؑ کا راستہ روکا تھا اور آپ نے اس کی پیاسی فوج کو سیراب کیا تھا۔ حر حسینؑ کے خلق کی شان دیکھ چکا تھا وہ فوج مخالف سے گھوڑا اڑاتا ہوا آیا اور آکر امام حسینؑ سے معافی مانگی اور ان سے اجازت لے کر سب سے پہلے لڑ کر حسینؑ پر جان نچھاور کر دی۔ پھر تو ایک کے بعد ایک بہادر آتا حسینؑ سے اجازت جنگ مانگتا آپ اسے گلے سے لگا کر صبر کی سل دل پر رکھ کر اجازت دیتے وہ یزید کی فوج میں جاتا حسب دستور اپنا نام و نسب ظاہر کرتا، مبارز طلب کرتا، اور اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا ہوا بہت سے نا ہنجاروں کو مار کر خود بھی شہید ہو جاتا حسینؑ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے چلتے اور اس کی لاش کو لا کر صحرا میں لٹا دیتے، اتنا وقت اور سامان نہ تھا کہ دفن کر سکتے،

آخر کار یہ وقت آگیا کہ سب رفیق و انصار کے علاوہ حضرت عباسؑ علمبردار بھائی امام حسینؑ کے فرزند اور مسلم کے دو بچوں نے بھی شہادت پائی۔ اب زینبؑ کے بچے جنگ میں جانے پر مصر تھے۔ حسینؑ کو بہن اور بھانجوں سے اور زینبؑ کو حسینؑ اور ان کے بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ لیکن ماں بیٹوں کے اصرار سے مجبور ہو کر حسینؑ نے بھانجوں کو بھی اجازت دیدی یہ دونوں بہادر میدان کارزار میں نہ بھولنے والی شجاعت اور کارنامے دکھا کر شہید ہو گئے اور صابر امام کی صابرہ بہن نے بچوں کی شہادت پر انتہائی صبر جمیل دکھایا اور منہ سے اُف بھی نہ کی۔ آخر حسینؑ کی فوج میں سوا اکبر اور عباسؑ علی کے کوئی اور باقی نہ رہا۔ عباس نے خیمے میں جا کر بچیوں اور بہن زینبؑ سے رخصت لی اور ہتھیار لگا کر باہر آ رہے تھے کہ حسینؑ کی چار سال کی بچی سکینہ جسے چچا سے اور چچا کو اس سے بے حد الفت تھی، اُن کے پاس آئیں اور سوکھا مشکیزہ چچا کو دیا اور اپنے خشک لب جو پیاس سے نیلے پڑ گئے تھے اُنھیں دکھائے اور پانی کی طالب ہوئیں شجاع اور بہادر عباس تڑپ اُٹھے اور برداشت نہ کر سکے آخر بھائی سے عرض کیا، آقا اب مجھ سے بچوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی، اجازت دیجئے کہ ایک مرتبہ یہ کوشش کروں کہ بچوں کے خشک لب تر ہو سکیں۔ حسینؑ نے با دل پر درد اپنے چہیتے بھائی کو جن کو بیٹے سے زیادہ چاہتے تھے اجازت جنگ دیدی، اور حضرت عباس مشکیزہ لے کر کسی نہ کسی طرح لڑتے بھڑتے نہر فرات تک پہنچے۔ مشکیزہ بھرا اور واپس ہوئے کہ کسی طرح یہ مشک خیمے تک پہنچا دیں۔ مگر عباس کی وفا اور استقلال کی مثال کہاں ملے گی کہ تین دن کے تشنہ دہاں بہادر نے اپنے لب خشک اس لئے تر نہیں کئے کہ حسینؑ پیاسے ہیں۔ نہر سے نکلتے ہی فوج دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا، دونوں بازو شانے سے جدا ہو گئے مشکیزہ تیر سے چھد گیا، اور عباس زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد اٹھارہ برس کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر حسینؑ سے مرنے کی اجازت کا طالب ہوا اور حسینؑ نے حق کی راہ میں جان دینے کے لئے اُسے بھی اجازت دیدی۔ چنانچہ علی اکبر بھی داد شجاعت دے کر شہید ہو گئے اور وقت ظہر تھا کہ حسینؑ کی مختصر فوج کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

امام حسینؑ کی اس وقت کی حالت کون بیان کر سکتا ہے؟ ۷۲ گھنٹے کی بھوک اور پیاس اور وہ پیاس جس کا ہم آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عرب کا تپتا ہوا صحرا، ریت کے جلتے ہوئے ذروں کا اُڑنا، بدن پر لوہے کے اسلحہ جنگ جو آگ کی طرح تپ رہے تھے، دل پر ۷۲ داغ، بھائی کے غم میں کمر شکستہ، بیٹے کے صدمے سے بینائی میں فرق، اہل حرم کی بے کسی، بے بسی اور بے قراری دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے اور اس حالت میں جا جا کر پیاروں کی لاشیں اُٹھا کر لانا، یہ حسینؑ ہی کا دل تھا کہ سب مصائب کو بے مثل صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا اور سوا خدا کے شکر کے کوئی دوسرا لفظ زبان مبارک پر نہ آیا۔

یزید کی فوج مبارز طلب کر رہی تھی حسینؑ اپنی کمر پٹکے سے باندھ کر اپنی چہیتی بہن زینبؑ اور سب اہل حرم سے رخصت ہونے خیمے میں گئے۔ دیکھا بہن مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ گلے سے لگایا اور صبر کی ہدایت کی اور دوسری سب خواتین کو صبر اور خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کر کے خیمے سے باہر آنا چاہتے تھے کہ آپ کی بیوی رباب والدۂ علی اصغر اپنے نیم جاں لال کو ہاتھوں پر لئے آپ کے پاس آئیں اور کہا۔ مولا علی اصغر پیاس سے جاں بلب ہیں اسے میدان جنگ میں لے جا کر دشمنوں کو اس کی حالت دکھا دیجئے، وہ اس معصوم پر ضرور ترس کھائیں گے اور پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ڈال دیں گے امام حسینؑ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن اُسے بھی پانی نہ دیں گے۔ مگر آخری حجت یہ بھی تمام کرنی تھی۔ آپ علی اصغر کو ہاتھوں پر لئے فوج مخالف کے سامنے گئے اور کہا یہ کہ بچہ پیاس سے نیم جان ہے، کیونکہ اس کی ماں کا دودھ صدموں اور بھوک پیاس نے خشک کر دیا ہے۔ صرف چند قطرے پانی کے اُسے پلا دو۔ لیکن حسینؑ کے سوال کا جواب ایک تیر سے ملا جو حسینؑ کے بازو کو چھید کر علی اصغر کے گلے میں پیوست ہو گیا اور وہ معصوم تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر ختم ہو گیا حسینؑ نے آسمان کی طرف دیکھا کئی مرتبہ حالت بے قراری میں منہ سے نکلا "رضا بقضائہ وتسلیما لامرہ وانا للہ وانا الیہ راجعون" اور پھر فرمایا بار الٰہی حسینؑ کی یہ آخری نذر تھی۔ اُسے قبول کر۔ اب سوا اپنے سر کے میرے پاس کچھ باقی نہیں۔ اب وہ تیری راہ میں نثار کرتا ہوں آپ نے اپنی تلوار سے ایک ننھی سی قبر کھود کر بچے کو دفن کیا اور خود فوج دشمن کے مقابلے پر آئے۔ پہلے انھیں حق کی راہ دکھلانے کی ایک آخری کوشش اور کی مگر ہر بات کا جواب تیر و نیزے سے ملا حسینؑ عرب کے سب سے بڑے بہادر اور شجاع کے بیٹے اور خود بہت بڑے بہادر تھے باوجود صدموں اور ضعیفی کے آپ اس بہادری سے لڑے کہ دشمنوں کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ مگر ایک اور ہزاروں کا مقابلہ ہی کیا، آپ کے تن اطہر پر تلواروں، نیزوں اور تیروں اور پتھروں کے ہزاروں زخم لگ گئے اور زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ صحرا کی تپتی ہوئی ریت زخموں میں پیوست ہو رہی تھی، ہزار ہا شقی ننگی تلواریں لئے گرد کھڑے تھے کہ ہادی برحق کے نواسے کے کان میں عصر کی اذان کی آواز آئی، حسینؑ انتہائی کوشش اور بڑی مشکل سے قبلہ رو ہوئے اور اپنا سر مبارک بارگاہ خداوندی میں سجدے کے لئے خاک پر رکھ دیا۔ شمر ملعون یزید کی فوج کا ایک شقی القلب افسر آگے بڑھا، دیکھا حسینؑ سجدے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ سمجھا ہمارے لئے بد دعا کرتے ہوں گے، کان لگا کر سنا تو کیا سنا کہ حسینؑ فرما رہے ہیں " پروردگار میرے نانا کی اُمت کو راہ راست دکھا اور یہ گمراہ ہیں اُنھیں راہ حق پر چلنے کی ہدایت دے "

زینبؑ نے بھائی کے گھوڑے کو خالی دیکھا جس نے بیٹوں کے صدمے میں آہ تک نہ کی تھی، وہ صابرہ بے قرار ہو کر اپنے سے بے خبر ننگے پاؤں، سر کھلا ہوا، قتل گاہ کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں تو دیکھا کہ شمر نے امام حسینؑ کا سر مبارک جسم سے جدا کر دیا ہے اور اسے نیزے پر چڑھا رہا ہے۔

اے حسین ابن علیؑ! اے کربلا کے بھوکے پیاسے مہمان!! اے مجاہد اعظم، اے صابروں کے سرتاج

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۰

۱۲

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارہ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ	دس روپے
ششماہی	ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ	چار آنے

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ فی کالم
ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں

(منیجر)

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۶، ۴۲ — چندہ:- سالانہ ۶ ششماہی ۳

دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی دہلی، جامعہ

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۵ | ۸ نومبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

میر کی زندگی اور شاعری

آل احمد سرور

اناؤنسر۔ لکھنؤ میں ایک مشاعرہ ہے۔ واہ واہ کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، میر
جو یہاں نو وارد ہیں داخل ہوتے ہیں ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ
ایک پورا تھان پیتھولیے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹڑی دار تہ کیا ہوا اس میں آویزاں۔
مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائینچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت
اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار۔ دوسری طرف کٹار۔ ہاتھ میں جریب
ان کو دیکھ کر زندہ دلانِ لکھنؤ ہنسنے لگتے ہیں۔

سید صاحب: (ہنس کر) اسے بھئی زرا ملاحظہ کیجیے۔ یہ کیا حضرت خضر تشریف لا رہے ہیں۔

خان صاحب۔ صورت سے اول جلول معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا صاحب۔ بھئی یہ کون ہیں، کوئی دلی والے ہوں گے۔

سید صاحب۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ شمع ان کے سامنے آرہی ہے۔

خان صاحب۔ حضور کا وطن کہاں ہے؟

میر۔
کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ——— ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ——— رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ——— ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

مرزا صاحب۔ ارے بھئی یہ تو میر تقی میر ہیں (مجمع میں تھوڑا سا ہنگامہ) حضور ہم لوگوں کا
قصور معاف فرمایئے۔ بڑی گستاخی ہوئی۔ آپ غالباً حال میں تشریف لائے ہیں کیسے خبر
تھی کہ دلی کا آفتاب لکھنؤ میں طلوع ہوا ہے ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے۔

فہرست مضامین

میر کی زندگی اور شاعری — آل احمد سرور — ۱
(اداریہ) — ۳
[illegible] کی رفتار
ہندوستان — ع۔ ج — ۴
پاکستان — ع۔ ل — ۴
[illegible] — ۵
غزل — مرزا احسان احمد — ۵
زندگی ایک خواب مبہم ہے — باقر رضوی — ۵
مذہب اور ادب — سید اختر علی تلہری — ۶
عورت کا درجہ — صالحہ عابد حسین — ۷
محمود غزنوی [illegible] — سید [illegible] نقوی — ۹
[illegible] نفسیات کا [illegible] — خواجہ جلیل احمد — ۱۰

دیکھ کر کھلبلی ہونے لگتی ہے۔ لوگوں کو خاموشی کا اشارہ کرتے ہیں، حضرات خاموش ہو جائیے
حضرت میر تقی میر لکھنؤ تشریف لے آئے ہیں اور اپنا کلام سنانے والے ہیں۔

میر۔
الٹی ہو گئیں ساری تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ——— دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ——— یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ——— چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے ——— رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے ——— بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اُن نے تو ——— قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

سید صاحب۔ حضور کیسی مرصع غزل ہے۔ یہ شاعری نہیں اعجاز ہے۔ ہم لوگ کسی وقت حاضر
ہوں گے۔ لکھنؤ والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ریختے کا امام یہاں آیا۔

میر صاحب۔ ہاں جب چاہیں تشریف لائیے، لیکن کلام سننے کے خیال سے نہ آئیے گا

اناؤنسر۔ (سید صاحب، میر صاحب، خان صاحب، نواب صاحب مل کر میر کے یہاں حاضر
ہوتے ہیں۔ دروازے پہ آواز دیتے ہیں، ایک ماما نکلتی ہے، حال پوچھ کر اندر جاتی ہے
ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھا دیتی ہے اور ایک پرانا سا حقہ تازہ کر کے سامنے رکھ دیتی ہے۔
میر صاحب اندر سے تشریف لاتے ہیں۔)

نواب صاحب، سید صاحب، خان صاحب، مرزا صاحب۔ (ایک زبان ہو کر)
آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔

میر تقی میر۔ تسلیم۔ تشریف رکھیے۔ حقہ نوش فرمایئے (حقے کے گڑگڑانے کی آواز آتی ہے)

سید صاحب۔ ہم لوگ اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کا کلام آپ کی زبانِ مبارک سے
سنیں۔ اُس دن مشاعرہ میں سن کر اشتیاق اور بڑھ گیا۔ یہ نواب صاحب تو اس دن
سے برابر آنے کے لئے بے چین تھے۔ آپ کے شاگرد ہونا چاہتے ہیں۔

میر تقی۔ نواب صاحب! آپ امیر ہیں، اور امیر زادے ہیں۔ نیزہ بازی اور تیر اندازی کی
کثرت کیجیے۔ شہسواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے۔ آپ
اس کے درپے نہ ہوں۔

نواب صاحب۔ مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ سارا وقت اس کی نذر کرتا ہوں۔
ایک دیوان تیار کر لیا ہے۔ دوسرا تیار ہو رہا ہے۔ آپ کا تلمذ حاصل ہو جائے تو ذرۂ
بے مقدار آفتاب سے ہمسری کرنے لگے

میر صاحب۔ (کچھ خفا ہو کر) شاعری دردمندی چاہتی ہے۔ آپ لوگ عشق کیا جانیں۔ ہوس
سے آشنا ہوں گے۔ آپ کو کبھی عشق میں ناکامی ہوئی ہے؟ کبھی فراق میں انگاروں پر سوئے
ہیں؟ کبھی دنیا نظروں میں تیرہ و تار ہوئی ہے؟ کبھی کوچہ و بازار میں رسوا ہوئے ہیں؟ کبھی
ننگ و نام کو خاک میں ملایا ہے؟ آپ کیا شعر کہیں گے۔ اور میں کیا اصلاح دوں گا۔

سید صاحب۔ خیر میر صاحب آپ شاگرد بنائیں یا نہ بنائیں لیکن ہم لوگوں کو اپنے کلام کی
نعمت سے تو محروم نہ کیجیے۔ بڑے اشتیاق سے حاضر ہوئے ہیں

میر۔ بھئی میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

خان صاحب۔ حضرت یہ کیا فرمایا۔ ہم لوگ واقعی اس قابل نہیں ہیں مگر دل میں شاعری کی

قیمت فی پرچہ ۳ر

محبت تو رکھتے ہیں۔ ساری عمر شعراء کی محبت میں گذری ہے۔ بڑے بڑے زبان داں حضرات سے فیض اُٹھایا ہے۔ انوری وخاقانی کا کلام پڑھا ہے۔ قند پارسی کی شیرینی سے آشنا ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سنیں گے

میر صاحب :۔ یہ درست ہے مگر فارسی کے شعراء کی زمین اور کیس مصطلحات موجود ہیں۔ مدرسین اشخاص نے شرحیں لکھی ہیں اور میرے کلام کے لئے نقطہ محاورہ اہلِ اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم، مثلاً میرا ایک شعر ہے :

عشق بن یہ ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اب آپ حسب اتنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال تو ظاہر کر دیا پھر نہیں تھے کہ ذرا سی تقطیع میں گرتی ہے مگر اس کو کیا کیجئے تاکہ محاورہ یہی ہے۔

سید صاحب :۔ سبحان اللہ۔ حضور اس زمین میں کچھ شعر اور بھی تو ہوں گے۔

میر ۔ (ذرا نرم ہو کر) بھئی میں لکھنؤ والوں کو اپنا کلام سنانا تضیعِ اوقات سمجھتا ہوں۔ شعر سمجھتے نہیں اور داد کے شور سے آسمان کی چھت اڑائے دیتے ہیں۔ مگر آپ سخن فہم معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمین میں کوئی اور شعر یاد نہیں آتا، لیکن چھوٹی بحر کے چند شعر اس وقت یاد ہیں وہ سنائے دیتا ہوں،

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعے لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
بے ستوں کیا ہے کوہ کن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہے
ہے تصنع کہ لال ہیں وہ لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

سید صاحب ۔ قبلہ ہم لوگ آپ کے بہت ممنون ہیں آپ نے اس وقت بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے ہم لوگوں سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف فرمایئے گا۔ یہ خاں صاحب آپ کے رتبے کو کیا سمجھیں۔ آپ جیسے شعرا تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گے (سب مل کر) آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔

میر صاحب ۔ تسلیم

اناؤنسر :۔ میر صاحب آصف الدولہ کے حضور میں ہیں۔ نواب صاحب بھی موجود ہیں۔ آصف الدولہ نواب صاحب سے کہہ رہے ہیں۔

آصف الدولہ ۔ ارے بھئی دیکھو، میر کا کلام سنا ہے ویسے کئی مرتبہ تازہ غزل کی فرمائش کی میر صاحب ٹال جاتے ہیں۔ ایک دن تو انصاف غضب کر دیا۔ میں نے کہا ہمارے لئے غزل لائے۔ تیوری بدل کر فرمانے لگے کہ جناب عالی مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی اور آج غزل حاضر کر دی۔ اب میں کیا کہتا۔ میں نے کہا خیر بھئی جب طبیعت حاضر ہو کہہ دیجئے گا۔

نواب صاحب :۔ میر صاحب آج کو ارشادِ خداوندی کو نہ ٹالئے۔

آصف الدولہ ۔ دیکھئے کیسا اچھا موسم ہے۔ بنیے پر کیا بہار ہے۔ اس حوض میں یہ مچھلیاں جب اِدھر اُدھر چمک کر نکل جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے بادلوں میں بجلی تڑپ گئی۔ اس وقت تو ضرور سنایئے

میر ۔ بہت اچھا تعمیل ارشاد کرتا ہوں،

عمر بھر ہم رہے خرابی سے
دل پہ خوں کی اک گلابی سے (داد)
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے (وقفہ)
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقعہ اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

نواب صاحب ۔ پڑھئے میر صاحب۔ آپ ٹھیر کیوں گئے۔

میر ۔ بھئی نواب وزیر تو حوض کی سیر میں مصروف ہیں اور آپ مچھلیوں سے کھیلتے جاتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو شعر پڑھوں۔

آصف الدولہ ۔ آپ پڑھے جایئے، جو شعر ہو گا آپ متوجہ کرے گا۔ (وقفہ) ارے یہ میر صاحب تو بڑے نازک مزاج ہیں۔ یہ چلے کیوں گئے

نواب صاحب ۔ آپ کے اس کہنے پر کہ جو شعر ہو گا آپ متوجہ کرے گا۔ غزل جیب میں ڈال کر خاموشی سے چلے گئے۔ آدابِ شاہی کا بھی خیال نہ کیا۔

آصف الدولہ ۔ بھائی میں نے تو یہی بات کہی تھی، مگر وہ ناراض ہو گئے۔ یہ شاعر بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اتنی سی بات پر برہمی کیسی، بھئی یہ سُرخ مچھلی تو دیکھو بالکل شعلہ جوالہ معلوم ہوتی ہے۔

اناؤنسر ۔ میر صاحب، نواب صاحب کی محل سرائے کے پاس ایک مکان میں مقیم ہیں۔ نشست کے مکان میں کھڑکیاں جو باغ کی طرف ہیں بند ہیں۔ میر فکرِ سخن میں مصروف ہیں۔ سید صاحب تشریف لاتے ہیں۔

سید صاحب ۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

میر ۔ ذرا وقفے سے۔ (سر اٹھا کر) اچھا سید صاحب ہیں۔ آیئے تشریف رکھئے۔ حقہ حاضر ہے۔

سید صاحب ۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔ قبلہ یہ کھڑکیاں کیوں بند کر رکھی ہیں۔ ان کو کھلوایئے۔ ذرا باغ کی بہار دیکھ کر آپ کی طبیعت کو فرحت ہو گی۔

میر ۔ اچھا ادھر باغ بھی ہے ؟

سید صاحب ۔ قبلہ آپ نے کمال کیا، کئی برس سے آپ یہاں ہیں، مگر آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ یہ کھڑکیاں باغ کی طرف کھلتی ہیں۔ نواب صاحب اسی لئے تو آپ کو یہاں لائے تھے کہ آپ کا جی بہلے اور طبیعت شگفتہ ہو

میر ۔ اکا غذ کھڑ کھڑا کر) بھئی میں تو اس باغ کی سیر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔ آؤ بھئی سید انشا، اور تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟ آخاہ جرأت ہیں۔ آؤ بھئی بیٹھو۔

انشا ۔ ارے بھئی حافظ جی، یہ آپ میر صاحب کے قریب کہاں جا بیٹھے۔ اِدھر آیئے حضرت اب آپ غزل لئے سخن کی برابری کرنے لگے۔

جرأت ۔ معاف کیجئے گا۔ میر صاحب یہ مسخرا مجھے خواہ مخواہ رسوا کرتا ہے۔ خود ہی اس نے [illegible] اور خود ہی اب اُکھاڑ رہا ہے۔

انشا ۔ میر صاحب اس وقت میں آیا نہیں لا یہ حضرت رات سے میرے سر ہیں۔ رات مرزا کے مشاعرے میں اِن کی غزل پر بڑی داد ہوئی۔ آپ تو تشریف رکھتے تھے۔ مگر خاموش تھے۔ بس اس خاموشی پر ان کے پیٹ میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں میر سے اس کی داد لوں گا۔

جرأت ۔ حضرت آپ کے سامنے غزل پڑھنی بے ادبی ہے بے حیائی ہے۔ خیر اس بے ہودہ گو نے جو بیہودہ گوئی کی اُس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

میر ۔ ہوں

انشا ۔ دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ جھک مار رہا ہے۔ میر صاحب اب کیا کہیں۔ تم نے دلی والوں کا نام ڈبو دیا۔

جرأت ۔ ارے تو چپ رہتا ہے کہ میں اپنی جریب سنبھالوں میر صاحب آپ کا کیا خیال ہے ؟

میر ۔ تم اصرار کرتے ہو تو کہنا پڑتا ہے کہ بھئی تم شعر کہنا نہیں جانتے۔ اپنی چوما چاٹی کر لیا کرو۔ سب قہقہہ لگاتے ہیں۔

جرأت ۔ خیر اور انشا کی غزل کیسی تھی۔ یہ بھی بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا تھا۔

میر ۔ ان کے دو تین شعر بہت اچھے تھے مگر غزل مصحفی کی تھی۔ وہ غزل کے رمز سے واقف ہے۔

انشا ۔ چلیے میر صاحب آپ نے کسی کی تعریف تو کی۔ مجھ سے اس دن ایک صاحب نے بیان کیا کہ میں نے میر صاحب سے دریافت کیا۔ حضرت آج کل شاعر کون کون ہے۔ کہنے لگے۔ ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار ہے ...... اور آدھے ...... میر درد۔ انھوں نے پھر پوچھا اور میر سوز ؟ آپ نے کہا میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں۔ انھوں نے کہا آخر نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہیں۔ آپ نے جواب دیا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سنے۔ (قہقہہ) کیوں میر صاحب کیا یہ واقعہ سچ ہے ؟

میر ۔ نہیں یہ کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ میری عادت خواہ مخواہ داد دینے کی نہیں۔ لوگوں نے بد دماغ مشہور کر دیا ہے۔ نکات الشعراء جو میں نے ریختے کے شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اسے پڑھو۔ میں نے تو شاگردوں اور بعض نو آموزوں کے بھی اچھے اشعار کی تعریف کی ہے۔ سجاد کا ایک شعر مجھے بھولتا نہیں جی چاہتا ہے سونے سے لکھوں اور پڑھوں ـ

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ر نومبر ۱۹۴۹ء

کانگریس اور آر۔ ایس۔ ایس

ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے نے کہ آر۔ ایس۔ ایس کے ممبر کانگریس کے بھی ممبر ہو سکتے ہیں۔ کانگریسی حلقوں میں بڑی بے چینی پیدا کر دی ہے۔ کئی صوبے کی کانگریس کمیٹیوں نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا ہے اور ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی ہے کہ جلد سے جلد اس پر دوبارہ غور کرے۔ معترضوں کا کہنا ہے کہ جو جماعت تھوڑے دن پہلے تک ملک کے امن و امان کے لئے اس قدر خطرناک سمجھی جاتی تھی کہ اسے خلاف قانون قرار دینا پڑا، جس نے سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے سے کانگریسی حکومت کو اکھاڑنے کی کوشش کی تھی، جس کے بارے میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے امریکہ روانہ ہونے سے چند روز پہلے شبہ اور بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا وہ ایک دم سے اتنی قابل اطمینان اور قابلِ اعتماد کیسے بن گئی کہ اس کے لئے کانگریس کے دروازے کھول دئے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سارا معاملہ اول سے آخر تک نہایت مبہم اور نہایت مشتبہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ورکنگ کمیٹی کا پچھلا اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے شروع ہوا تھا اور کل اہم مسائل ان کی موجودگی میں طے ہو گئے تھے۔ لیکن آر، ایس، ایس کے ممبروں کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دینے کا مسئلہ ان کے جانے کے بعد پیش کیا گیا۔ صدر کانگریس ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ نے اس بارے میں بڑا لمبا چوڑا بیان دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سوال ایک مدت سے ورکنگ کمیٹی کی ایجنڈا پر تھا۔ اور یہ محض ایک اتفاقی امر ہے کہ اس کے پیش کرنے کی باری پنڈت جی کے روانہ ہو جانے کے بعد آئی۔ اس کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ جب صدر حکومت چند روز پہلے مجمع عام میں کہہ چکے تھے کہ ہم آر، ایس، ایس کی طرف سے ابھی تک مطمئن نہیں ہیں اور اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں تو صدر کانگریس نے اس مسئلے کو ان کی واپسی تک ملتوی کیوں نہ کر دیا۔ بظاہر اس کا فیصلہ کرنے کی کوئی ایسی جلدی نہ تھی، ڈیڑھ دو مہینے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس فیصلے کا مطلب سمجھانے کے لئے ڈاکٹر سیتا رمیہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری شری وینکٹ رائے نے جو بیانات دئے۔ ان کے لہجے میں بہت فرق ہے۔ شری وینکٹ رائے نے تو یہ کہا کہ یہ کوئی نیا فیصلہ نہیں ہے۔ صرف کانگریس کے دستورِ اساسی کی ایک دفعہ کی تشریح ہے۔ ہمارے کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا آر، ایس، ایس کے ممبر کانگریس کے ممبر ہو سکتے ہیں؟ اس قانونی سوال کا ورکنگ کمیٹی کی طرف سے قانونی جواب دیا گیا کہ جب سنگھ کو سیاست سے تعلق نہیں رہا تو اس کے ممبروں کو کانگریس میں شامل کرنے میں دستور کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ سنگھ کے ممبروں کو کانگریس میں آنے کی دعوت نہیں بلکہ اجازت دی گئی ہے۔ اور وہ بھی کارکن ممبروں کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف ابتدائی ممبروں کی حیثیت سے۔ لیکن ڈاکٹر سیتا رمیہ نے اپنے بیان میں آر، ایس، ایس کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے اور ان کے الفاظ سے نہیں تو انداز سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی گرم جوشی کے ساتھ اس کے ممبروں کا خیر مقدم کانگریس میں کرنے پر تیار ہیں۔ خدا جانے ورکنگ کمیٹی کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی صدر کا بیان کرتا ہے یا سکریٹری کا۔

دیکھنا یہ ہے کہ آر، ایس، ایس میں کون سی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کا رویہ اس کی طرف سے بدل گیا ہے۔ جب شری گول والکر رہا کئے گئے تو حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ آر، ایس، ایس اپنے دستور کو شائع کرنے اور اس میں حسب ذیل اہم ترمیمیں کرنے پر تیار ہو گئی ہے:-

۱۔ وہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔ خالص تہذیبی کام کرے گی۔
۲۔ اپنے ممبروں کی باقاعدہ فہرست رکھے گی
۳۔ نابالغ لڑکوں کو ممبر نہیں بنائے گی۔
۴۔ قومی جھنڈے کو تسلیم کرے گی، اور اس کی عزت کرے گی۔

لیکن شری گول والکر رہا ہونے کے بعد۔ اپنی تقریروں میں کئی بار یہ کہا کہ انھوں نے حکومت سے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے اور آر، ایس، ایس کے دستور یا مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ اس کا دستور اب تک قلم بند نہیں ہوا تھا۔ اب ہو جائے گا۔ سرکاری اعلان میں اور شری گول والکر کے بیان میں یہ جو اختلاف ہے اس سے لوگ الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ ان کو یہ توقع تھی کہ حکومت یا تو شری گول والکر سے مطالبہ کرے گی کہ اپنے بیان کی تردید کریں، یا پھر اپنے اعلان میں ترمیم کرے گی۔ لیکن دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہوئی، اور معاملہ گو مگو میں رہا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حقیقت وہی ہے جو حکومت کے اعلان میں ظاہر کی گئی ہے اور شری گول والکر نے آر، ایس، ایس کے دستور میں مندرجہ بالا ترمیمیں کی ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں؟ کیا ورکنگ کمیٹی نے آر، ایس، ایس کے لئے کانگریس کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لیا ہے۔ شری گووند سہائے، شری اوم پرکاش، اور دوسرے ذمہ دار کانگریسیوں کی تحریروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آر، ایس، ایس کے مقاصد اور طریق کار میں بال برابر بھی فرق نہیں ہوا ہے۔

اور فرض کیجئے کہ آر، ایس، ایس واقعی اب خالص تہذیبی انجمن بن گئی ہے، اپنے ممبروں کی باقاعدہ فہرست رکھتی ہے۔ نابالغ لڑکوں کو اپنے حلقے میں داخل نہیں کرتی، اور قومی جھنڈے کو تسلیم کرتی ہے۔ اس کے بعد حکومت کا یہ فیصلہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ جو قانونی پابندیاں آر، ایس، ایس پر لگائی گئی تھیں وہ ہٹالی جائیں۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ آر، ایس، ایس کے ممبروں کو کانگریس میں شریک ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ آر، ایس، ایس کے دستور کی وہ تبدیلیاں جن کا دعوے کیا جاتا ہے قانونی ممانعت اٹھانے کے لئے تو کافی ہیں لیکن کیا یہ ان اختلافات کو مٹا دینے کے لئے بھی کافی ہیں جو اس کے اور کانگریس کے درمیان ابتدا سے چلے آ رہے ہیں؟ کیا اس کی تہذیبی پالیسی وہی ہے جو کانگریس کی ہے؟ کیا وہ قومی تہذیب کو کسی خاص مذہب کے سانچے میں ڈھالنا نہیں چاہتی؟ کیا وہ ہندوستان کے سب مذہبوں اور تہذیبوں کے ساتھ رواداری برتنے پر تیار ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر اس کے ممبر کانگریس کی صفوں میں کیوں کر جگہ پا سکتے ہیں؟

بعض حضرات جن میں شری پرشوتم داس ٹنڈن بھی شامل ہیں یہ فرماتے ہیں کہ جب جمعیۃ العلماء کے لوگ کانگریس میں لئے جا سکتے ہیں تو آر، ایس، ایس والے کیوں نہ لئے جائیں؟ ان کے قول کے مطابق چونکہ یہ دونوں جماعتیں اپنے خاص مذہبی حلقوں میں کام کرتی ہیں اور ان کا کام سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی ہے۔ اس لئے دونوں کی حیثیت ایک ہی ہے۔ لیکن کوئی انصاف پسند آدمی اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔

جہاں تک تاریخی پس منظر کا تعلق ہے آر، ایس، ایس ابتدا سے کانگریس کی سخت مخالف بلکہ دشمن رہی ہے اور جمعیۃ العلماء اس کی دوست اور حلیف رہی ہے۔ آر، ایس، ایس نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں جہاں تک ممکن تھا روڑے اٹکائے اور جمعیۃ العلماء نے اس میں ہر طرح مدد دی۔

اب رہی موجودہ صورت حال اس میں شک نہیں کہ جمعیۃ العلماء ایک مخصوص مذہبی اور تہذیبی خدمت کرتی ہے لیکن وہ متحدہ قومیت اور مشترک ہندوستان کی قائل ہے اس لئے اس کی تہذیبی پالیسی اس قوم پرورانہ پالیسی سے جس کا کانگریس اب تک دعوے کرتی رہی ہے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ بخلاف اس کے آر، ایس، ایس خالص ہندو قومیت اور خالص ہندو تہذیب کی علم بردار ہے جسے کانگریس نے بہ حیثیت جماعت کبھی قبول نہیں کیا۔

غرض ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح کانگریس کی تاریخی روایات اور اس کی موجودہ سرکاری پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتا اس لئے مختلف صوبوں کی کانگریس کمیٹیوں کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کہ ورکنگ کمیٹی جلد سے جلد اس پر

دُنیا کی رَفتار

ہندوستان

تہذیبی اتحاد کی کانفرنس

کاٹھیاواڑ کے ایک محب وطن شری پارکھ نے ۲۵ لاکھ روپے کا ایک وقف "امرت چند امرت لال پارکھ ایجوکیشن اینڈاؤمنٹ" کے نام سے قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروؤں اور مختلف صوبوں کے باشندوں میں تہذیبی اتحاد پیدا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس وقف کی طرف سے تہذیبی اتحاد کی ایک کانفرنس ۲۶ر اکتوبر سے ۳۰ر اکتوبر تک مہابلیشور میں منعقد ہوئی، جس میں ہندوستان کی قریب قریب سب یونیورسٹیوں اور متعدد تہذیبی اداروں کے نمائندے شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح بمبئی کے وزیر اعظم شری بالا صاحب کھیر نے کیا۔ صدارت کے فرائض خواجہ غلام السیدین صاحب نے انجام دئے۔ پہلے دن کے افتتاحی اجلاس کے بعد چھ اجلاسوں میں ذیل کے مسائل پر غور ہوا۔

۱۔ ہمارے ملک کے موجودہ تہذیبی بحران مذہبی، نسلی، صوبائی تعصبات، رجعت پرستی تاریک خیالی، اجتماعی احساس اور قومیت کے احساس کی کمی۔

۲۔ قومی تہذیب اور سیرت کی ازسرنو تشکیل کے لئے مدرسوں سے کیسے کام لیا جائے؟

۳۔ اس مقصد کے لئے اخبار، سنیما، ریڈیو وغیرہ سے کیسے کام لیا جائے؟

۴۔ لوگوں میں علمی طرز فکر کیوں کر پیدا کیا جائے؟

۵۔ اس کانفرنس کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اور کیا عملی تدابیر اختیار کی جائیں؟

کانفرنس میں شریک ہونے والوں کو یہ خوشگوار احساس ہوا کہ ہمارے ملک میں تنگ خیالی قدامت پسندی اور رجعت پرستی کی قوتیں کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، وسیع النظر فراخ دل کے تعصب اور ترقی پسند لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اگر یہ حضرات متحد اور منظم ہو کر کام کریں تو اپنے مشترک مقصد کو جسے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کانفرنس کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا "استحصال سے پاک، امداد باہمی پر مبنی، اخلاقی جمہوری سماج کا قیام" ہر طرح کی مخالفت کے باوجود حاصل کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے سامنے جو عملی تجاویز پیش کی گئیں۔ ان میں سب سے اہم دو تجویزیں ہیں جو شری پارکھ اپنے وقف کی طرف سے عمل میں لانا چاہتے ہیں:۔

(۱) کسی مرکزی مقام پر ایک انسٹیٹیوٹ آف نیشنل سروس قائم کرنا اور اس میں مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے گریجویٹ طلبہ کو فرقہ داری اتحاد اور تہذیبی اتحاد کی خدمت کے لئے تیار کرنا۔

(۲) کاٹھیاواڑ میں اسی قسم کا ایک نمونے کا صوبائی ادارہ قائم کرنا جس کی تقلید دوسرے صوبے کر سکیں۔

کانفرنس کے بعض نمائندوں نے ان دونوں تجویزوں کے بارے میں مفید مشورے دئے۔ امید ہے کہ یہ بہت جلد عملی شکل اختیار کر لیں گی۔

ہم آیندہ نمبروں میں خواجہ غلام السیدین اور شری بالا صاحب کھیر کے خطبوں کا ترجمہ اور اگر ممکن ہوا تو کانفرنس کی کارروائی کسی قدر تفصیل سے شائع کریں گے۔

پاکستان

لوہے کی تلاش میں امریکہ کی مدد

امریکہ کے نہایت با اثر تاجروں اور فنی ماہروں کا ایک مشن پاکستان آیا ہے جو پاکستان کے صنعتی علاقوں کا دورہ کرے گا اور پاکستان کے لوہے کے وسائل کی تحقیقات کرے گا۔

حکومت پاکستان کے پریس نوٹ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ فنانس منسٹر غلام محمد صاحب امریکہ کی ایک مشہور فرم اسٹیل ایکسپرٹ کمپنی کے صدر مسٹر جارج اولف سے ملے ہیں جو پاکستان کی معاشی ترقی کی اسکیموں میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور انھوں نے حکومت پاکستان کی اس سلسلے میں ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مشن کا ہیڈکوارٹر لاہور میں ہوگا اور وہ کوئی ڈیڑھ مہینے ٹھہرے گا۔ پاکستان میں اس مشن کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور صنعتی ترقی کے سلسلے میں اس سے بہت بڑی بڑی توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں

بیرونی تجارت میں اضافہ

حکومت پاکستان کا بیان ہے کہ پاکستان کی بیرونی تجارت میں آہستہ آہستہ مگر قابل لحاظ اضافہ ہو رہا ہے اور ہندوستان کے بجائے دوسرے ملکوں سے ضروریات مہیا کرنے کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں جو چیزیں باہر سے خریدی گئی ہیں ان میں زیادہ تر کپڑا بننے کی مشین، ٹریکٹر وغیرہ ہیں جو زیادہ تر انگلستان، امریکہ، بلجیم، جرمنی، چیکوسلوواکیہ، اٹلی اور ہالینڈ وغیرہ سے آئی ہیں۔ اسی طرح مشل اور کچی دھات بھی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ مقدار میں خریدی گئی ہیں اور یہ چیزیں انگلستان اور امریکہ اور بلجیم سے آئی ہیں۔

ع، ل

میر کی زندگی اور شاعری

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو پس ڈوبی

بات یہ ہے کہ میرے اوپر زمانے کے جو مصائب پڑے ہیں ان کی وجہ سے کچھ طبیعت افسردہ ہو گئی ہے۔ اس لئے خاموش رہتا ہوں۔

اناؤنسر۔ میر صاحب بستر مرگ پر ہیں غشی طاری ہے۔ کمرے میں اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ یکایک روشنی کچھ تیز ہوتی ہے۔ آنکھیں کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ابتدائے شباب کے اکبرآباد کے کمرے میں پاتے ہیں۔ اُن کی محبت کی اولین و آخرین شمع۔ ان کی محبوبۂ دلنواز، جو ان کی عزیز ترین ہے وہاں موجود ہے۔ اعزہ کے ڈر اور رسوائی کے خوف سے وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔

میر۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک بار اور تمھیں جی بھر کر دیکھ لوں، پھر کسے معلوم قیامت تک ملنا ہو یا نہ ہو۔ ہائے تمھارے یہ ہونٹ

نازکی ان لبوں کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

حسینہ۔ تم نے پھر یہ چونچلے شروع کر دئے۔ اپنا وہ شعر بھی یاد ہے۔ میں جو بولا کہا کہ یہ آواز

اسی خانہ خراب کی سی ہے

(دونوں ہنستے ہیں)

میر۔ یہ دنیا بڑی بے رحم ہے۔ اسے دو دلوں کی یکجائی کبھی گوارا نہ ہوئی۔ چلو ہم تم کہیں چلے چلیں۔ اس ظلم و جبر کی دنیا سے دور، جہاں محبت ہی محبت ہو اور محبت پر یہ پہرے نہ ہوں۔

حسینہ۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ شریفوں کا شیوہ ہے۔ میں مر جاؤں گی مگر یہ ذلت گوارا نہ کروں گی۔ تمھارے بغیر موت تو ویسے ہی میرے لئے پیام مسرت ہے ابھی زہر کھا لوں گی۔ مگر بزرگوں کی آبرو کو بٹہ لگانا مجھے منظور نہیں۔

میر۔ محبت سے، عزت آبرو سے ازلی بیر ہے۔ یہاں رسوائی ہی سب کچھ ہے میں جب تمھاری یاد میں دلی کے گلی کوچوں میں خاک اڑاتا تھا اور دلی کے لڑکے مجھے چھیڑتے تھے تو اس ذلت کو عزت سمجھتا تھا۔

حسینہ۔ دلّی کے لڑکے تمھیں اس لئے چھیڑتے ہوں گے کہ تم انھیں گھورتے ہو گے

میر۔ (ہنس کر) وہ مجاز تھے تم حقیقت ہو دلی کے لڑکوں میں بھی مجھے تمھاری تصویر دکھائی دیتی تھی۔ چاند میں بھی تمھاری ہی صورت نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تم دور ہو کر بھی میرے پاس ہو۔ پھر ظالموں نے فصد دے کر میرا سہرا دل خون کیا اس کے بعد سے تم نظر نہ آئیں۔ ارے جاتی کہاں ہو، تھوڑی دیر تو اور ٹھہرو۔

حسینہ۔ جلتے ہوئے ذرا دور تک......

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اناؤنسر۔ میر ہوش میں آتے ہیں۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہیں اور اٹھنا چاہتے ہیں کہ ان کا دم نکل جاتا ہے۔ فضا میں ایک آسمانی نغمہ بلند ہوتا ہے اور ان کی محبوبہ کی زبان سے ان کے یہ اشعار سنائی دیتے ہیں۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہو وے تو پتھر ہے دل
کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

(آہستہ آہستہ نغمہ بند ہوتا ہے) (بشیر حسن لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

بزمِ بے تکلف

(شام اور وہ بھی بمبئی کی شام، سارا مغربی ساحل وکٹوریہ سے قلابہ تک بجلی کے قمقموں سے جگ مگا رہا ہے۔ بقول شخصے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر کی ملکہ کے گلے میں کہربائے قسب چراغ کا نولکھا ہار پڑا دمک رہا ہو۔ میرین ڈرائیو میں سمندر کے کنارے ایک اور جیتا جاگتا، چلتا پھرتا ہنستا کھیلتا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اس ساگر کے بیچ میں کہیں کہیں بے فکری سا کن کشتیوں کی طرح بے چین پڑی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ ایک بنچ پر ایک ادھیڑ عمر کا انگریز (ا) ایک نوجوان ہندوستانی (ب) سے گھل مل کے باتیں کر رہا ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پئیں! خدا کی شان نہیں تو اور کیا ہے؟)

ب۔ اچھا تو آپ دو برس بعد صرف یہ دیکھنے کے لئے یہاں تشریف لائے تھے کہ آپ کے پیچھے ہمارا کیا حال ہے۔ پھر آپ نے کیا دیکھا؟ یہی نا کہ ہندوستان آپ کے فراق میں تڑپ رہا ہے؟

ا۔ خیر ہمارے فراق میں تو کیا مگر کچھ بے چین آپ کا ملک ضرور معلوم ہوتا ہے۔

ب۔ کچھ بے چین؟ یہ نہیں کہتے کہ ماہیِ بے آب ہو رہا ہے۔ مگر قبلہ گورے صاحب اس بے چینی کی وجہ ہجر کی آگ نہیں پیٹ کی ہوک ہے۔ اس چیز سے آپ واقف نہیں اس کا مزا تو ہمیں خوب جانتے ہیں۔

ا۔ ابھی یہ نہ کہئے۔ وہ دور گئے جب ہماری پانچوں گھی میں تھیں اور سر کڑھائی میں۔ اب تو ہمیں بھی آپ کے حال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہے۔ مگر معاف کیجئے کا میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ جس درد سے تڑپ رہے ہیں وہ خالی پیٹ کا نہیں بدہضمی کا درد ہے۔ بات یہ ہے کہ آزادی کو آپ نگل تو گئے مگر وہ ابھی پچنے نہیں پائی۔

ب۔ واہ ری آپ کی جمہوریت! آپ کے سیاسی فلسفی تو یہ کہتے کہتے مر گئے کہ آزادی انسان کے لئے ماں کا دودھ ہے اور آپ اسے ماش کی دال سمجھتے ہیں جو کسی طرح ہضم ہی نہیں ہوتی۔

ا۔ میاں صاحبزادے جن بچوں کا ہاضمہ کمزور ہوتا ہے انھیں ماں کا دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا، اوپر کا دودھ پلانا پڑتا ہے۔

ب۔ تبھی آپ اس بچارے بچے کو اتنے دن تک اوپر کا دودھ پانی ملا کر چسنی سے پلاتے رہے، خیر اب تو آپ اسے ماں کے تھن سے دودھ کا چسکا لگ گیا ہے۔ اب بی انا لاکھ چاہیں وہ بوتل کا دودھ پینے کو ان کی گود میں نہیں آنے کا۔

ا۔ (ہنس کر) آپ اطمینان رکھئے۔ بی انا کو اپنے ہی پوت کا پالنا مشکل ہو گیا ہے۔ پرائے بچے کو وہ کیا کھلا کے پالیں گی۔ میں تو آپ کو صرف یہ جتانا چاہتا ہوں کہ بوتل کے دودھ سے لگے ہوئے بچے کو ایک دم سے ماں کا دودھ ملنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کا پیٹ بھی دکھے گا، وہ ہاتھ پاؤں بھی پٹکے گا، دودھ بھی ڈالے گا۔ آپ کو ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ع۔ عادت پڑنا سہل نہیں ہے پڑتے پڑتے پڑتی ہے۔

ب۔ مگر بچہ روز بروز سوکھتا جو چلا جا رہا ہے۔ اس کا کیا علاج ہے؟

ا۔ یہ تھوڑے دن کی بات ہے آزادی کی غذا جہاں پچنے لگی بس امرت کا کام دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رگوں میں خون، ہڈیوں میں رس، پٹھوں میں کس بازوؤں میں بل، آنکھوں میں چمک، چہرے پر رنگ آ جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آزادی اصلی ہو، بناسپتی نہ ہو۔

ب۔ آپ کے خیال میں ہماری آزادی اصلی ہے یا نقلی ہے؟

ا۔ (ہنس کر) اب یہ بھی مجھ سے پوچھئے گا۔ دیکھئے آپ کو ایک گر کی بات بتاتا ہوں۔ اصلی آزادی ذہن کی آزادی ہے۔ اور اس کی ایک ہی پہچان ہے: اپنے آپ پر بھروسا ——— اپنی رائے پر، اپنی طاقت پر، اپنی کمزوری پر، اپنی عقل پر، اپنی حماقت پر۔

غزل

حضرت احسان احمد

عشق نے دی ہے وہ نظر ایک گدائے راہ کو
پھیر دے اٹھ کے جو ابھی گردشِ مہر و ماہ کو

پھونک دے وہ مذاقِ دید، پھونک دے اس نگاہ کو
جذب نہ کر سکے جو خود حسن کی جلوہ گاہ کو

شمعِ سرِ مزار یہ عشق کا داغِ غم نہیں
اس نے عطا کیا ہے نور پیکرِ مہر و ماہ کو

پھر ستم سے چھیڑ کر دیکھ ذرا نگاہِ ناز!
میری رگِ حیات کی جنبشِ بے پناہ کو

آئیں تجلیاں نظر تجھ کو ہر ایک گام پر
وادیِ غم کی سیر کرا دے مری نگاہ کو

نشۂ بے خودی میں دیکھ شانِ عروجِ عشق کی
خاک پہ لا کے رکھ دیا شعلۂ مہر و ماہ کو

زندگی ایک خواب مبہم ہے

باقر رضوی

زندگی کا نظام برہم ہے
انگبینِ نشاط بھی سم ہے

جب کھلی آنکھ تب ہوا معلوم
زندگی ایک خوابِ مبہم ہے

ذکرِ فردوس جاں فزا ہے مگر
جاں گسل کائنات کا غم ہے

ذرہ ذرہ ہے راز سربستہ
کون دانائے راز و محرم ہے

ہیں ثبات و قرار موت کے نام
زندگی انقلاب پیہم ہے

اپنا دل ہی نہیں اداس اداس
آج رنگِ شفق بھی مدھم ہے

آب جنت ہے اشکِ غم گاہے
گاہ یہ آتشِ جہنم ہے

دردِ سوغاتِ عشق تھا لیکن
آج اس کی کسک بھی کچھ کم ہے

چاندنی، بوئے گل، ہوائے بہار
کیا جنوں خیز آج موسم ہے

مذہب اور ادب

سید اختر علی تلہری

مذہب کے سایے میں رہ کر جو "ادبی شاہکار" تیار کئے گئے ہیں اُن کے مقابلے میں وہ تصنیفات ذکر کے قابل بھی نہیں ہیں جنھیں مذہب کا سایہ نصیب نہ ہو سکا ...... اگر سچ پوچھئے تو اصلی معنوں میں مذہبی تفکر ہی نے "ادب برائے ادب" کا تصور مردود قرار دیا ہے مذہبی اثر کے تحت ہم نے یہ سمجھا ہے کہ ہماری زندگی کے تمام متعلقات کو انسانیت کی خدمت کے محور پر گردش کرتے رہنا چاہئے۔ ادب بھی زندگی کے متعلقات میں سے ہے اس لئے اُس کے رجحانات کا رُخ بھی انسانیت کی خدمت کے سمت ہونا چاہئے۔

اس طرف کچھ عرصے سے ترقی پسندانہ نگاہ کے تحت "مذہب اور ادب" "اخلاق اور ادب" کے باہمی ارتباط کے متعلق مختلف زاویوں سے نظر کی جارہی ہے۔ کچھ لوگ جن کی ترقی پسندی "فکری اعتدال" کی حدیں توڑ کر اس طرف اُس طرف بے غایت طور سے بھٹکتی پھر رہی ہے۔ مذہب و اخلاق کی "افادیت" کے خلاف بڑے شد و مد سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مذہب و اخلاق کے دائرے کے اندر رہ کر ادب پنپ نہیں سکتا ہے۔ اس میں جان نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ ادبی ارتقار کے ان نقیبوں کے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ مذہب چند جامد قسم کے اصول و قوانین کے عقائد کا مجموعہ ہے مثلاً خدا کا وجود اور اس سے لپٹے ہوئے دوسرے الٰہیاتی مسائل اور پھر کسی نہ کسی طرح اُن سے وابستہ ہو جانے والے چند بندھے ٹکے اخلاقی ضابطے اور عبادت و پرستش کے کچھ غیر نامیاتی رسوم چونکہ یہ سب چیزیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خول میں بند کردی گئی ہیں یا بند ہوگئی ہیں اس لئے دماغ ان کا پابند ہو جانے کے بعد زندگی کے ارتقا پذیر مسائل میں حصہ نہیں لے سکتا اور ظاہر ہے کہ ادب زندگی کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس زندگی کے ساتھ جو ہر آن بدلنے والی شے ہے جس کا جو گام اُٹھتا ہے وہ ارتقا ہی کے جادے میں ایک منزل سے دوسری بلند منزل کی طرف، ایسی حالت میں ادب اور مذہب و اخلاق کیوں کر دوش بدوش چل سکتے ہیں۔ مذہب رجعت پسند، ادب ترقی پسند۔ ایک زندگی کو بیخ بستہ بنانے والا، دوسرا اس میں حرکت کی بجلیاں بھرنے والا۔

اس صورتِ حال کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ ایک حقیقی شاعر اور ایک حقیقی ادیب مذہب سے دست کش ہو جائے۔ کیونکہ اسی طرح وہ زندگی میں ٹھٹھرن پیدا کرنے والے روایات و توہمات سے آزاد ہو کر چاروں طرف بڑھنے اور پھیلنے والے صالح ادب کی تخلیق کرسکتا ہے۔

اس اعتراض کا رُخ ان مذاہب کی طرف تو ہو سکتا ہے جو ما بعد الطبیعیاتی نوعیت یا متصوفانہ حیثیت اور ان سے لپٹے ہوئے چند رسمی اخلاق و عبادات کے سوا کوئی نامیاتی ذخیرہ اپنے پاس نہیں رکھتے لیکن وہ مذاہب جو ما بعد الطبیعیاتی نوعیت کے چند اساسی تصورات کے اعتقاد سے انسان کی "نفسیات" کا پس منظر صالح طور سے ہموار کرتے اور اس کی زندگی کے اخلاقی و معاشرتی و اقتصادی خاکے میں حکمت و دانش کا رنگ بھرتے اور اس طرح اُسے فکری و عملی حیثیت سے سماج کا خوش فکر و خوش کردار فرد بناتے ہیں تو اُن کے مقابلے میں یہ اعتراض بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے مذاہب تو اپنی تعلیمات کی ہمہ گیر عمومیت کے لحاظ سے زندگی کی شہ رگ میں خون بن کر دوڑتے ہیں اس لئے انھیں جامد قسم کے چند عقائد کا مجموعہ قرار ہی کیوں کر دیا جا سکتا ہے ـــــ ان کی عملی گرمی زندگی کی ہر سانس میں اُن کا عملی جوش زندگی کے دل کی ہر دھڑکن میں اُن کی عملی حرارت زندگی کے نبض کی ہر تڑپ میں موجود ہوگی ان کے قوانین میں زندگی کے تغیرات کا لحاظ قدم قدم پر ہوگا۔ انھیں تغیرات کی نسبت سے اُن کی تجربیاتی شاخیں ہر لحظہ بدلتی رہیں گی۔ وہ ارتقا کے پیمانے سے ناپے جانے کی صلاحیت رکھیں گے۔ اس حالت میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ادب و شعر مذہب کے سایے میں نہ پنپ سکیں اُن میں مذہب کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جان نہ پیدا ہو سکے، بلکہ تمام متعلقات پر نظر کرتے ہوئے زیادہ صحیح صورت حال تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ادب مذہب کی پناہ میں رہ کر زندگی کی "اعلیٰ قدروں" سے روشناس ہوتا رہے گا اور اس طرح اس میں "افادی درخشانیوں" سے جگمگاتی ہوئی رعنائیاں پیدا ہوں گی کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ مذہب کے سایے میں رہ کر جو ادبی شاہکار" تیار کئے گئے ہیں، اُن کے مقابلے میں وہ تصنیفات ذکر کے قابل بھی نہیں ہیں جنھیں مذہب کا سایہ نصیب نہ ہو سکا۔ وہ کتابیں جو اربابِ مذہب کے عقیدے میں ربانی وحی و الہام کا نتیجہ ہیں مثلاً قرآن و انجیل وغیرہ اُن کی گراں قدر تعلیمی حیثیت سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے اور ان پر محض ادبی حیثیت سے نظر کی جائے تب بھی ان کا ایک ایک جملہ حیرت و اعجاز کو چونکا دینے والا نظر آئے گا۔

یہ واقعہ خود اس کا ثبوت ہے کہ ادب اور مذہب میں مغائرت کو دور کنار مذہب ادب کو افادیت کی روح بخشتا اور اُسے صالح بناتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب نے جب سے ادب کے سر پر تربیت کا ہاتھ رکھا ہے اُسی وقت سے اُسے حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا آیا ہے اور انسانی زندگی کے دکھ درد سے اُسے رابطہ پیدا ہوا ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو اصلی معنوں میں مذہبی تفکر ہی نے "ادب برائے ادب" کا تصور مردود قرار دیا ہے۔ مذہبی اثر کے تحت ہم نے یہ سمجھا ہے کہ ہماری زندگی کے تمام متعلقات کو انسانیت کی خدمت کے محور پر گردش کرتے رہنا چاہئے۔ ادب بھی زندگی کے متعلقات میں سے ہے اس لئے اس کے رجحانات کا رُخ بھی انسانیت کی خدمت کے سمت ہونا چاہئے۔

"ادب برائے ادب" اس فریضہ کی انجام دہی سے قاصر رہتا ہے۔ اس لئے مذہب کی حدود میں اُسے جگہ ہی نہیں مل سکتی۔

یہ سچ ہے کہ "ادب برائے ادب" اور "شعر برائے شعر" اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں اور کبھی کبھی "ذوقی عیاشی" کی ان سے اچھی خاصی خاطر تواضع بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ حقیقتیں خواہ کتنی ہی خوب صورت اور دل کش ہوں اگر ان سے انسانی زندگی کی رگوں میں توانائی کا خون نہیں دوڑتا تو پھر یہ بے کار ہیں۔ "ذوقی تعیش" کے اس دل فریب سامان کو انسانی سود و بہبود کے نقطۂ نظر سے مسترد کر دینا ناگزیر ہے۔

جبکہ مذہب کی اصل غایت ہی یہ ہو کہ انسانیت کے سود و بہبود کے راستے صاف کرے۔ اس کے چہرے کو فروغِ ارتقا سے چمکانے کی سبیلیں نکالے تو پھر وہ مجبور ہے کہ دنیا کی ہر چیز کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی خدمت کے لئے وقف رکھے۔

"ادب و شعر" جب انسانیت کی خدمت کو پیشِ نظر رکھے گا اس میں "حقیقی افادیت" آجائے گی۔ اس لئے یہ دعویٰ بالکل ہی صحیح ہے کہ مذہب ہی حقیقی ادب کی پرورش کرتا ہے۔ مذہب کا جب یہ منطمح نظر ہے تو پھر اُسے رجعت پسند اور جامد و یخ بستہ کہنا ہمارے بعض ادیبوں کی ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے۔

ہمارے رند مشرب ترقی پسند ادیبوں کا یہ خیال بھی کہ مذہب "ادب و شعر" پر جو اخلاقی قیود عائد کرتا ہے، ان سے ادب و شعر کے آغوش میں پلنے والے کارناموں کے چہروں کی شادابی و شگفتگی پر اثر پڑے گا کیونکہ آزاد آب و ہوا سے محرومی اُن کے ٹھیک ٹھیک نشو و نما کے راستے میں رکاوٹ ڈالے گی، کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

عورت کا درجہ
گاندھی جی کی نظر میں

صالحہ عابد حسین

(سلسلہ کے لئے ۲۴ر اکتوبر کا پرچہ ملاحظہ ہو)

(۲)

عورت اہنسا کا اوتار ہے۔ اہنسا کے معنی ہیں انتہائی محبت اور اس سے مراد ہے دکھ اٹھانے کی انتہائی صلاحیت۔ سوا عورت کے، جو مرد کی ماں ہے اور کس میں یہ صلاحیت پورے طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اس کا ثبوت اس طرح دیتی ہے کہ بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اپنا خون جگر پلاتی ہے اور دکھ کو سکھ جانتی ہے۔ بچہ جننے کی تکلیف سے بڑھ کر دنیا میں کون سی تکلیف ہے؟ مگر وہ تخلیق کی خوشی میں اسے بھول جاتی ہے پھر وہ روز دکھ بھرتی ہے کہ بچہ روز بروز بڑھتا رہے........ اس میں یہ جوہر ہے کہ لڑنے والی دنیا کو جو امن کے آب حیات کی پیاسی ہے، امن کا ہنر سکھائے وہ رہنمائی کرسکتی ہے ستیہ گرہ کی راہ میں، جس کے لئے کتابی علم درکار نہیں بلکہ اس محبت کی ضرورت ہے جو سچی عقیدت اور دکھ اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے........"

گاندھی جی عورت کا سب سے اہم کام بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کو سمجھتے تھے مگر کہتے تھے کہ گھر کی خدمت اور قومی خدمت کے ڈانڈے کسی نہ کسی جگہ جاکر مل جاتے ہیں۔ جو ہستی گھر اور خاندان کی بے غرض خدمت کرسکتی ہے، وہ پوری خوبی اور خلوص سے قومی خدمت کا کام بھی انجام دے سکتی ہے، ایک جگہ "اہنسا" اور "ستیہ" کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

" مجھے دل سے امید ہے کہ اس راہ میں عورت مسلمہ طور پر رہبر ہوگی اور اس طرح انسانی ارتقار میں اپنے شایان شان جگہ پاکر وہ اپنے دل سے احساس کمتری دور کردے گی......."

یوں تو ہمارے دیس میں عورت ہر حیثیت سے مرد کی محکوم اور پابند تھی لیکن بیوی کی حیثیت سے اس کا درجہ سب سے بدتر اور ذلیل اور باندیوں کا سا تھا۔ گاندھی جی نے ایک طرف عورتوں کو ان کے فرائض کا احساس دلایا، خدمت اور اہنسا کی تعلیم دی، اور ساتھ ساتھ عزت نفس، خود اعتمادی اور خودداری کا گر بھی سکھاتے رہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ انھوں نے یہ بات بھی بالکل صاف کردی کہ ان کے نزدیک میاں بیوی دونوں کا درجہ مساوی اور بالکل برابر کا ہے۔

" میرے نزدیک مثالی بیوی سیتا ہیں اور مثالی شوہر رام۔ مگر سیتا رام کی لونڈی نہ تھیں۔ یا پھر دونوں ایک دوسرے کے غلام تھے...... اور جب بیوی کو یقین ہو...... کہ وہ حق پر ہے اور شوہر کی مرضی سے انحراف کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کررہی ہے تو اسے پورا حق ہے کہ وہ اپنی الگ راہ چلے اور اس کے جو کچھ نتیجے ہوں انھیں خاموشی اور عاجزی سے برداشت کرے......."

ہندی مردوں نے اپنی عظمت اور بزرگی کا سکہ جمانے کے لئے عورتوں کے ذہن میں "پتی ورت" اور "خدائے مجازی" کی قسم کے بہت سے بت بٹھا رکھے تھے۔ گاندھی جی نے ان بتوں کو پاش پاش کردیا اور اس کے بجائے دوستی، رفاقت اور مساوات کے رشتوں کا پرچار کیا۔ البتہ وہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہ کرتے تھے اور اہنسا کے مطابق مخالفت کو بہادری، عاجزی اور خاموشی سے برداشت کرنا سکھاتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

عورت مرد کی رفیق ہے اور اسے مرد کے برابر ذہنی صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں۔ اسے یہ حق ہے کہ مردوں کے چھوٹے سے چھوٹے کام تک میں شریک ہو اس کو آزادی کا بالکل وہی حق ہے جو مرد کو ہے اسے اپنے عمل کے دائرے میں وہی اونچا درجہ حاصل ہونا چاہیے جو مرد کو اپنے دائرے میں ہے۔"

گاندھی جی نے ان تمام بدسلوکیوں اور حق تلفیوں کی سختی سے مذمت اور مخالفت کی جو عورت کو حقیر اور بے حس سمجھ کر اس کے ساتھ کی جاتی تھیں۔ بچپن کی شادی، بیوگی کی مصیبتیں اور بیوہ پر جبر ستی کی رسم، پردے کی قید وغیرہ، ان سب پر انھوں نے کڑی نکتہ چینی کی اور صحیح راہ عمل پیش کی۔

بچپن کی شادی کو وہ بہت ناپسند کرتے اور اسے نسل انسانی کے لئے بہت مہلک سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کم سے کم سولہ ورنہ بیس سال کی عمر میں لڑکیوں کی شادی ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ لڑکے کی عمر اس سے بھی زیادہ ہونی ضروری ہے۔ بچپن کی شادی جسمانی نشوونما، دماغی ترقی، ذہنی صحت سب کے لئے خطرناک ہے۔ ان کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا کہ عورتوں خصوصاً کم سن لڑکیوں کو عمر بھر بیوگی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے۔

" یہ خدا کا بہت بڑا گناہ ہے کہ دو بچوں کے بندھن کو شادی کہا جائے اور جب نام کا شوہر مرجائے تو بے چاری بچی کو عمر بھر بیوہ رکھا جائے"

ایک جگہ نوجوانوں کو مخاطب کرکے ان الفاظ میں اس رسم کی مذمت کرتے ہیں:-

کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اس وقت تک اپنے اوپر یا دوسروں کے اوپر حکومت کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں، یا تیس کروڑ آدمیوں کی قوم کے مستقبل کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ جب تک کسی ایک بیوہ کو بھی زبردستی اس کی بنیادی خواہشوں کے پورا کرنے سے روکا جائے۔ یہ مذہب نہیں لامذہبی ہے......"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاندھی جی اس پر مصر تھے کہ ہر بیوہ کی شادی ہونی چاہیئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ زبردستی کسی عورت کو بیوگی کی زندگی پر مجبور کرنا بہت بڑا سماجی پاپ ہے۔

" میں نے بار بار کہا ہے کہ بیوہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی رنڈوے کو۔ اپنی مرضی سے بیوگی کی زندگی اختیار کرنا ہندو دھرم میں ایک بڑی نعمت ہے۔ لیکن زبردستی بیوگی عائد کرنا بڑی لعنت......"

"ستی" عورت سے گاندھی جی کیسی عورت مراد لیتے تھے۔

"ستی" عورت کا جوہر ہے۔ لیکن یہ عفت جان دینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ تو اس طرح حاصل ہوسکتی ہے کہ عورت اس کے لئے دن رات کوشش کرتی رہے اور اپنے کو مثالی رہے......"

ان کے نزدیک عورت کو دیواروں میں قید کرکے یا پردوں میں باندھ کر رکھنے سے اس کی عفت کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ عورت کی عفت ایک ایسا انمول اور اچھوتا جوہر ہے جو ہزاروں تحریصوں کے باوجود اور ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہ کر بھی جوں کا توں تابناک اور شفاف رہ سکتا ہے۔

"عفت کوئی ایسا پودا نہیں جسے گرم خانے میں رکھا جائے۔ یہ زبردستی عائد کرنے کی چیز نہیں اس کی حفاظت پردے کی دیواریں کھڑی کرکے نہیں کی جاسکتی۔ اسے اندر سے اوبھرنا چاہیئے۔ عفت قابل قدر اسی صورت میں ہے کہ وہ ہر بیرونی

تحریص پر غالب آسکتی ہو........"

مروجہ پردہ گاندھی جی کے نزدیک عورت کا محافظ نہیں، اس کا دشمن اور اس کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس کی ذلت کی نشانی۔ ایک جلسے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس پردے کو دیکھ کر جس کے پیچھے میری سننے والیاں بیٹھی ہوئی تھیں جن کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کتنی ہیں، مجھے بہت دکھ اور ذلت کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا ہندوستان کی عورتوں کے ساتھ مرد کتنا ظلم کر رہے ہیں کہ ایک وحشیانہ رسم سے ابتک چپٹے ہوئے ہیں جو ممکن ہے شروع میں مفید ہو مگر اب تو بالکل بے کار ہے بلکہ اس سے ملک کو بے اندازہ نقصان ہو رہا ہے....."

گاندھی جی نے عورت کے فرائض اس کے حقوق اور اس کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس میں وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی نظر انداز کرتے تھے وہ عورتوں کو ان کی کمزوریوں اور برائیوں پر بار بار متوجہ کرتے تھے۔ عورت کو بے شک آزادی کی ضرورت ہے لیکن عمل کے لئے محض بے مصرف گھومنے کے لئے یا رونق محفل بننے کے لئے نہیں۔ جدید زمانے کی فیشن پرست تتلیوں کو جو عملی اور ٹھوس کام کرنے کے بجائے فیشن اور نمائش کی غلام بن جاتی ہیں دلسپند نہ کرتے تھے۔ یوں بھی گاندھی جی کی نظر میں عورت کی عفت اور اس کا حسن اس کا زیور اور اس کی آرائش ہے۔

"عورت کا اصلی زیور اس کی عفت ہے، دھات اور پتھر کبھی حقیقی زیور نہیں بن سکتے۔ سیتا اور دمینتی جیسی عورتوں کا احترام ان کی بے داغ عفت کی وجہ سے کیا جاتا ہے نہ کہ ان کے زیوروں کی وجہ سے جن کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ پہنتی بھی تھیں کہ نہیں........."

"اس ملک میں جہاں کروڑوں آدمیوں کو فاقہ کرنا پڑتا ہے اور اسی فی صدی باشندوں کو کافی غذا میسر نہیں ہوتی۔ عورتوں کو زیور پہنے دیکھنا آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے........."

گاندھی جی نے اپنے اس عقیدے کو بار بار دہرایا ہے کہ جس خوبی کے ساتھ عورت اہنسا اور ستیہ کو اپنا سکتی ہے۔ اس طرح مرد نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ اس کی توجیہہ یوں کی ہے :-

"میں نے ان صفحوں میں کہا ہے کہ عورت اہنسا کا اوتار ہے۔ اہنسا کے معنی ہیں انتہائی محبت اور اس سے مراد ہے دکھ اٹھانے کی انتہائی صلاحیت سوا عورت کے جو مرد کی ماں ہے اور کس میں یہ صلاحیت پورے طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اس کا ثبوت اس طرح دیتی ہے کہ بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اپنا خون جگر پلاتی ہے۔ اور دکھ تو سکھ جانتی ہے۔ بچہ جننے کی تکلیف سے بڑھ کر دنیا میں کون سی تکلیف ہے؟ مگر وہ تخلیق کی خوشی میں اسے بھول جاتی ہے۔ پھر وہ روز دکھ بھرتی ہے کہ بچہ روز بروز بڑھتا رہے۔ اگر وہ اس محبت کو ساری نوع انسانی کے لئے وقف کر دے اور یہ بھول جائے کہ وہ کبھی مرد کی شہوت کا موضوع تھی یا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ مرد کے برابر اس کی ماں، اس کی پالنے والی اور اس کی خاموش رہنما کی شان سے کھڑی ہو سکے گی۔ اس میں یہ جوہر ہے کہ لڑنے والی دنیا کو جو امن کے آبحیات کی پیاسی ہے، امن کا ہنر سکھائے۔ وہ رہنمائی کر سکتی ہے، ستیہ گرہ کی راہ میں، جس کے لئے کتابی علم درکار نہیں بلکہ اس محبت کی ضرورت ہے جو سچی عقیدت اور دکھ اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے......"

اس عارف کامل نے عورت کی اصل ذات اور صفات کو پہچانا اور اس کی خوبیوں اور امکانات کا خود اسے اور دوسروں کو احساس دلایا۔ اس نے سماجی، خاندانی اور قومی زندگی کے فرائض میں ہندی عورت کی رہنمائی کی اور اس میں خود اعتمادی اور قومی لگن کی ایک نئی روح پھونک دی۔

ہمارے دیس میں گذشتہ تیس سال میں جتنی بلند پایہ اور قابل قدر دیس سیوک عورتیں ہوئی ہیں (جن پر کوئی ملک بھی ناز کر سکتا ہے) ان سب کی سیرت کی تشکیل میں گاندھی جی کا بڑا ہاتھ اور ان کی تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ میں ان میں سے کسی کا نام نہ لوں گی دسروجنی دیوی کا بھی نہیں جو اللہ کو پیاری ہو چکیں) لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس انتشار اور ابتری، خود غرضی اور نفرت کے ہولناک دور میں بھی ہماری ان بہنوں نے کتنی قابل قدر اور بے غرض خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سے کئی نے اپنی ساری زندگی لگا دی ہے اس نفرت اور تعصب کے بیج کو مٹانے کے لئے اور دیس کا دنیا میں نام بلند کرنے کے لئے اور اگر ہمارے دیس کو ذہنی اور اخلاقی مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور امن اور شانتی اور رواداری کی فضا قائم کرنی ہے جس کے بغیر کوئی دیرپا تعمیری کام نہیں ہو سکتا۔ تو اس انقلاب کے پیدا کرنے میں ہندوستانی عورت کو پہل کرنی ہوگی۔ کیونکہ ذہنیت کو بدلنا اور اخلاقی قدروں کا بیج بونا بہت کچھ انہیں کے بس کی بات ہے لیکن وہ صرف اسی صورت میں ایسا کر سکتی ہیں جب گاندھی جی کی تعلیم کو وہ اپنے لئے مشعل ہدایت بنائیں۔ اور انھوں نے پریم، شانتی، انسانیت خدمت اور سادگی کا جو اپدیش دیا تھا، اسے ملک کے کونے کونے اور دلوں کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔ ("اطلاعات" گاندھی نمبر)

مذہب اور ادب

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

سچ بات تو یہ ہے کہ حکیمانہ قسم کے اخلاقی قیود کے آغوش میں پڑھ پل کر عروسان ادب و شعر کا حسن نکھر سکتا ہے ماند نہیں پڑ سکتا۔ لیکن اگر ادب و شعر ایسی ہی چیزیں ہیں جو اپنے حسین و جمیل نظر آنے کے لئے انسانی اخلاق کی تابندگی سے بے نیاز رہنا ہی چاہتی ہیں تو یقیناً پھر ایک متمدن انسان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہوگا کہ ایسے ادب و شعر سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جو اخلاقی حسن نکھارنے والی نسبت کے چہرے کو جلا دینے والی قیدیں برداشت نہیں کر سکتے، انسانی برادری ہی سے الگ کر دیں۔ ایسے شریر ہمارا جیو اور شاعروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کی محفل سے دور جا کر اپنے "ادب برائے ادب" اور "شعر برائے شعر" کے جلسے جمائیں اور ان میں آزادی سے رقص برہنگی کے تماشے دکھائیں۔

ہمارے نئے ادیبوں نئے شاعروں کا گندے گھنونے شعر و ادب کے ذریعے سے انسانی تمدن و تہذیب کی پاکیزہ قلمرو میں متعفن چیزوں کا انبار لگانا مذہب کی نگاہ میں یقیناً مذموم عمل ہے۔ انسانیت کا خادم مذہب اسے ایک آن برداشت نہیں کر سکتا کہ صنفیاتی جذبات کے عریاں تماشے، عریاں عنوان عوام کے سامنے اس طور پیش کئے جائیں کہ ان کے استلذاذی صنفی جذبات کی دنیا میں برابر ہیجان بپا رہے اور ان کے متعلقہ جذبات سے صبر و ضبط کی صلاحیتیں بالکل سلب ہو جائیں اور اس سے بالآخر انسانیت کی صالح ارتقائی رفتار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ یقینی طور سے انسانیت کے ارتقا کا حامی مذہب ہمارے صنفیاتی میلانات میں اعتدال پیدا کرنے کے راستے تلاش کرے گا اور صنفیاتی رجحانات سے متعلقہ مسائل پر عملی حیثیت سے بحث و نظر کو جسے عورت جوئی و عیش پسندی سے کوئی واسطہ نہیں جائز قرار دیتے ہوئے "استلذاذی نقطۂ نظر" پر پابندی عائد کرے گا کہ اسی عنوان سے انسانی تہذیب و شرافت کا مزاج معتدل رہ سکتا ہے۔

آج نہیں اب سے پہلے بھی اوباشانہ جذبات کو خوبصورت لفظوں اور حسین اسالیب بیان کے لباس میں آزاد قسم کے شاعر و ادیب پیش کرتے رہے ہیں۔ مگر اس قسم کی شاعرانہ فحاشیاں جن کی نوعیت محض استلذاذی (لذت جوئی) ہے کبھی سنجیدہ حلقوں میں سراہی نہیں گئیں۔ ان پر مذہبی تہذیب و شائستگی نے ہمیشہ قدغن لگائی ہیں۔ امرؤالقیس اور ابونواس یا عبیدِ زاکانی وغیرہ نے جو صنفیاتی فحاشیاں کی ہیں ان سے نفس انسانی کی استلذاذی رجحان و میلان کی آگ بھڑکتی ہے اور کسی مصلحت کا تحفظ کئے بغیر بہیمیت کو انسانیت پر اس کے چور راستوں سے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور سماج کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے مذہب اپنی غایت کے لحاظ سے اس پر مجبور ہے کہ ایسے ادب و شعر کی تخلیق کرنے والوں کو کم سے کم انسانی معاشرے کی غیر قابل لحاظ افراد قرار دے اور ان الشعراء یتبعھم الغاوٗن کے تازیانوں سے ان کے ذوق کی تنبیہہ کرے۔

آج کل بعض من چلے ادیبوں اور شاعروں نے سگمنڈ فرائڈ کے نفسیاتی تحلیل و تجزیے کے ان اصول و قواعد کے زیر اثر جو صنفیاتی بے حیائیوں کا سرچشمہ ہیں ادب و شعر کے سونے بنانے کو بہیمانہ جذبات کے رقص برہنگی کے تماشا گھر بنا رکھا ہے اور اس بہیمانہ ادعا کے ساتھ بنا رکھا ہے کہ ان دبے ہوئے اوباشانہ جذبات کی تصویر کشی سے انسانیت کے باطن کی تطہیر ہوتی ہے۔

فرائڈ کے ان نفسیاتی افکار و نظریات ہی کی بنیاد پر

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

محمود غزنوی سے محمد غوری تک

سید سخی حسن نقوی

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم زمانہ تھا کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب دنیا کی دو عظیم الشان تہذیبیں یعنی ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں محمود غزنوی کے حملوں سے لے کر محمد غوری کی فتح تک کم و بیش دو سو برس ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں نے ہندوستان کو کس حال میں دیکھا اس زمانے کے ہندوستانی تہذیب کی کس منزل پہ پہنچ گئے تھے اور اس وقت ہمارے ملک کی مذہبی اور سماجی حالت کیا تھی۔

ہمارا آٹھ سو برس پہلے کا ہندوستان یہی ہندوستان تھا جو آج ہے۔ یہی زمین و آسمان تھے اور یہی چاند سورج اور تارے جو آج ہیں۔ ہمالیہ کی چوٹیاں برف کی سفید چادریں اوڑھے اس زمانے میں بھی آسمان سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ صاف اور میٹھے پانی والی ندیاں اتراتی، بل کھاتی شور مچاتی دور دور تک کھیتی باڑی کو سیراب کرتی سمندر کا منہ چوم لیا کرتی تھیں۔ پر وہ لوگ نہ تھے جو آج ہیں۔ نہ ان کا وہ رہنے سہنے کا طریقہ تھا، نہ لباس، نہ طرز گفتگو۔ عام طور پر لوگ داڑھیاں منڈواتے تھے اور مونچھیں لمبی لمبی اور نوکیلی رکھتے تھے۔ عورتیں ساڑھیاں پہنتی تھیں اس کے علاوہ اوپر سے ایک سفید چادر لپیٹے رہتی تھیں۔ اور سر سے پاؤں تک زیور میں لدی رہتی تھیں۔ عورتوں کا پہناوا آج کل کی عورتوں کے پہناوے سے کچھ ملتا جلتا تھا۔ خاص کر ساڑھی باندھنے کا طریقہ تو بالکل ہمارا ہی سا تھا۔ مرد بھی زیور پہنتے تھے۔ پان کھانے کا رواج عام تھا۔ لوگ گانے اور ناچنے کے بھی شوقین تھے۔ ناچ میں بجائے ساڑھی کے لہنگا پہنا جاتا تھا۔ یہ تھی تصویر گیارھویں اور بارھویں صدی کے رہن سہن کی۔

آئیے اب ذرا اس دور کے ہندوستان کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔ اس زمانے کو تاریخ ہند میں انتہائی گڑبڑ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ محمود غزنوی کے مسلسل حملے ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہر دم یہی خیال رہتا تھا کہ دیکھئے اب کی کیسی تباہی مچتی ہے۔ اس بے چینی اور انتشار کے باوجود یہاں کے لوگ علمی سرگرمیوں میں مصروف تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، اس کی وجہ یہ تھی کہ راجپوت راجہ علم و ہنر کے بہت شوقین تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔ اس لئے اس زمانے میں بہترین شاعر فلسفی، ڈراما نویس اور علم حساب و علم نجوم کے بڑے بڑے عالم موجود تھے علم ہندسہ میں انھوں نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا والوں کو گنتی تک نہ آتی تھی۔ لیکن البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوستان والوں نے گنتی کو دس سے آگے بڑھا کر انیس تک پہنچایا اور ہزار سے آگے بڑھا کر پدم اور سنکھ تک پہنچایا۔ اس زمانے کے ہندوستانیوں کو الجبرا بھی خوب آتا تھا۔ الجبرا کے ماہر ویسے تو مسلمان تھے لیکن ہندوؤں سے بھی کواڈریٹک اکویشنس آتی تھیں اور مینسوریشن میں تو انھیں کمال حاصل تھا وہ اس سے بھی واقف تھے کہ دائرے کا محیط قطر کا ۲۲/۷ گنا ہوتا ہے۔

راجپوت راجاؤں کو جتنا علم و ہنر کا شوق تھا اتنا ہی عمارتیں بنوانے کا تھا۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں مذہب کا کافی چرچا تھا اس لئے ان کی تمام تر توجہ مندر بنانے پر صرف ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شہر شہر سینکڑوں مندر بنوا کر کھڑے کر دئے تھے جن کی خوب صورتی اور شان و شوکت دیکھ کر مسلمان حملہ آور حیران رہ جاتے تھے البیرونی اس دور کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس فن میں یہاں کے لوگوں نے اس قدر کمال حاصل کر لیا ہے کہ ہمارے آدمی اُن کی بنوائی ہوئی عمارتیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور خود ویسی بنانا تو درکنار ان کی تفصیل کا بھی تو ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے۔ خود محمود غزنوی متھرا کے مندر دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ متھرا ہی کے ایک مندر کی تعریف کرتے ہوئے محمود کے خاص مؤرخ عتبی نے لکھا ہے کہ اس کے حسن و خوبی اور شان و شوکت کو نہ کسی مصنف کے قلم میں طاقت کہ ٹھیک ٹھیک بیان کر سکے اور نہ کسی مصور کو یہ قدرت کہ ان کی صحیح صحیح تصویر کھینچ سکے۔ راجہ نے مندر میں ایک تختی لٹکا رکھی تھی جس پر لکھا تھا کہ دنیا کا کوئی راجہ ایسی عمارت بنوانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس مندر کو دس کروڑ اشرفیاں خرچ کر کے دو برس کی طویل مدت میں ملک کے بہترین کاریگروں نے بنایا تھا۔

شطرنج کو دنیا بھر کے گھریلو کھیلوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت بھی شطرنج کھیلا جاتا تھا اور لوگوں کی تفریح کا عام ذریعہ تھا، لیکن گیارھویں صدی میں بھی لوگ جو شطرنج کھیلتے تھے ان کا شطرنج آج کل کے ہندوستانی شطرنج اور دوسرے ملکوں کے شطرنج سے مختلف تھا۔ بساط اور مہرے تو وہی تھے لیکن کھیلنے کا طریقہ دوسرا تھا اور چالیں بدلی ہوئی تھیں اور اُسے دو آدمیوں کی بجائے چار آدمی کھیلتے تھے۔ چال چلنے میں آج کل کی طرح آزادی نہ تھی بلکہ ایک پانسہ

......اس زمانے میں بہترین شاعر فلسفی، ڈراما نویس اور علم حساب و علم نجوم کے بڑے بڑے عالم موجود تھے علم ہندسہ میں تو انھوں نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا والوں کو گنتی تک نہ آتی تھی لیکن البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوستان والو نے گنتی کو دس سے آگے بڑھا کر انیس تک پہنچایا اور ہزار سے آگے بڑھا کر پدم اور سنکھ تک پہنچایا۔
.... راجپوت راجاؤں کو جتنا علم و ہنر کا شوق تھا اتنا ہی عمارتیں بنوانے کا تھا........ چنانچہ انھوں نے شہر شہر سینکڑوں مندر بنوا کر کھڑے کر دئے تھے جن کی خوبصورتی اور شان و شوکت دیکھ کر مسلمان حملہ آور حیران رہ جاتے تھے۔

یا ڈائس استعمال کیا جاتا تھا اور جو اس میں نکلتا وہی چال چلی جاتی تھی۔ یہ شطرنج ہمارے آج کل کے شطرنج سے پیچیدہ بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ اگر آج کل اس شطرنج کو پھر سے رواج دینے کی کوشش کی جائے تو کیا عجب ہے کہ لوگ اس کو زیادہ پسند کرنے لگیں اس شطرنج اور اس کے متعلق تمام تفصیلات کا ذکر البیرونی کی لکھی ہوئی عظیم الشان کتاب "کتاب الہند" میں ملتا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ چار دن کی چاندنی کے بعد اندھیری رات ضرور آتی ہے۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں بدھ مذہب کا بعینہ یہی حال تھا۔ وہ مذہب جو کسی زمانے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا تھا۔ اب بنگال اور مگدھ کے علاوہ کہیں نام کو نہ تھا۔ جین مذہب کا اتنا برا حال تو نہ تھا لیکن اس کے ماننے والوں کی تعداد بھی روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔ ہندو مذہب نے اپنا روپ ہی بدل ڈالا تھا۔ ویدوں اور ویدک رسوم کو لوگ بھولتے جا رہے تھے اور بت پرستی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اسی دور میں کئی مذہبی پیشوا بھی ہوئے جنھوں نے بھکتی مت کا پرچار کیا۔ ان میں رامانج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ذات پات کی بندشیں موجود تھیں بلکہ اور زیادہ سخت ہو گئی تھیں برہمنوں کا درجہ اب بھی سب سے اونچا مانا جاتا تھا۔ امیر غریب، راجہ، پرجا سب ان کی عزت کرتے تھے۔ برہمن نہ کسی دوسری ذات کی عورت سے شادی کرتے تھے اور نہ کسی دوسری ذات والے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا تو درکنار جب برہمن خود برہمنوں کے ساتھ کھانا کھاتے تو ہر ایک کے لئے علیحدہ ایک چوکھٹا دسترخوان چنا جاتا اور کھانا کھانے کی جگہ کو خوب لیپا پوتا جاتا تب کھانا کھلایا جاتا۔ گوشت، پیاز، لہسن وغیرہ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

عملی نفسیات کی فتوحات کے چند نمونے

(۱)

خواجہ جلیل احمد

نفسیات کی فتوحات اگر ایک طرف نظریاتی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں تو دوسری طرف صنعت و حرفت، طب، تعلیم، تجارت، سیاست، اقتصادیات اور دوسرے ضروری شعبۂ حیات بھی اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں ہیں۔ نفسیات کے متعلق اگرچہ ارسطو اور افلاطون ہی کے زمانے سے سمجھدار اور ذی فہم افراد سوچ بچار کرتے رہے ہیں، لیکن اس کا بہترین ارتقائی دور بیسویں صدی کی ابتدا اور بالخصوص پہلی جنگِ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے۔ موجودہ نفسیات کے رجحانات برخلاف قدیم ماہرین کے تجرباتی اور عملی حیثیت زیادہ رکھتے ہیں اور اس وقت اس علم کا زیادہ تر حصہ معمل گاہوں کے اندر تجربات میں صرف ہوتا ہے۔

نفسیات کے لئے یہ رجحان فالِ نیک ہے کیوں کہ بیسویں صدی کی مادہ پرست دنیا نظریات کی پیچیدگیوں کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جب تک اُن کی پشت پر عملی اور تجرباتی حقائق نہ ہوں۔ نفسیات کی دنیا میں نظریۂ کردار کی ابتدا بھی اس طرح ہوئی کہ افکار کی الجھنوں سے گھبرا کر امریکن ماہرینِ نفسیات کی ایک جماعت نے اس صدی کی ابتدا میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہم نفسیات کو معمل گاہوں میں منتقل کر کے اپنے تجربات کی بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے تو ہمیں اس علم کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیئے، کیونکہ روح و شعور (جو کہ قدیم ماہرین کے خاص موضوع تھے) کی حقیقت کا ادراک ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے جن کا سرغنہ واٹسن تھا ایسی نفسیات کی بنیاد ڈالی جو تجرباتی حقائق کے علاوہ ایک نقطہ بھی کسی نظرئے کا تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بہرحال یہ موقع نفسیات کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کا نہیں ہے۔ فی الحال اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر نفسیات کا وہ عملی پہلو ہے جس نے ہمارے موجودہ علم میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

اسی سلسلے میں دماغی معائنے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ دماغی معائنوں کے فوائد بے شمار ہیں۔ اول تو اس کی مدد سے کسی بھی شخص کے متعلق اس کی زندگی کے ایک مخصوص یا تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ دوسرے بچوں اور نوجوانوں کے دماغی معائنے کے بعد ان کے صحیح رجحانات کے متعلق صائب رائے دی جا سکتی ہے۔ ہمارے دور کی اور بالخصوص اس ملک کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ افراد کو اُن کے مناسبِ طبع کام نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو وہ لاعلمی کی بنا پر اپنے صحیح رجحانات کا تعین کرنے میں خود بھی قاصر رہتے ہیں، یہی حال تعلیمی اداروں کا ہے ہمارے ہزارہا اور لکھوکھا طالب علم صرف اس بنا پر ان اداروں میں ناکام رہتے ہیں کہ صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ چنانچہ وہ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا مضمون لیتے ہیں، لیکن اپنی صحیح قدر کا احساس نہ ہونے کے باعث ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیتیں پیہم ناکامیوں کو برداشت کرتے کرتے چور چور ہو جاتی ہیں اور تصورات کی شکست ان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ ایسے بد نصیب طلباء کی ایک بڑی تعداد سے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دوچار ہوتے ہیں۔

دماغی معائنے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور بچوں کی عمر کے تفاوت کے لحاظ سے ان کے معیاری ہونے کا تعین کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی "دماغی معائنہ" اس وقت تک معیاری نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ اس مخصوص عمر کے بچوں کی ایک کثیر تعداد پر اس کا تجربہ نہ کیا گیا ہو۔ ان دماغی معائنوں میں بچے کی عمر کے لحاظ سے مختلف اقسام کے سوالات زبانی، تحریری اور عملی طریقے پر پوچھے جاتے ہیں اور اگر کچھ سوالات کے جوابات ایک خاص عمر کے بچوں کی طرف سے خاطر خواہ ملتے ہیں تو وہ سوالات اس عمر کے بچوں کے لئے "معیار" قرار پاتے ہیں۔ ان دماغی معائنوں کی مدد سے ہم بچے کی ذہنی عمر کا بآسانی معائنہ کر سکتے ہیں۔ دماغی معائنوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ذہنی اور جسمانی عمروں میں کافی تفاوت ہوتا ہے اور بچوں اور بالغوں کو چھوڑ کر بقیہ سبھی معیار سے پست یا بلند ہوتے ہیں۔

دماغی معائنوں کے سلسلے میں بینٹ کا نام کافی مشہور ہے اس ماہرِ نفسیات نے ایک سال سے لے کر پندرہ اور سولہ سال تک کے بچوں کے لئے معیاری ذہنی معائنوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن کے ذریعے سے بڑی حد تک تیقن کے ساتھ کسی لڑکے یا لڑکی کی ذہنی کیفیت کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ میں نے ان دماغی معائنوں کے کچھ بچوں پر تجربات کئے لیکن افسوس اس امر کا ہے ہمارے ہندوستانی ماحول کے پروردہ بچے انگریز بچوں کے مقابلے میں ذہنی حیثیت سے بہت پیچھے ہیں چنانچہ بیشتر بچے جن کو ان کی اسی طبعی عمر کا "دماغی معائنہ" حل کرنے کو دیا گیا مختلف سوالات کے جوابات دینے سے قاصر رہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ سوالات انگریزی ماحول اور ان اشیاء سے متعلق ہیں جو یورپ میں تو عمومی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ہندوستان میں ابھی ان کا رواج اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بچہ اس شئے کے متعلق جواب دینا تو درکنار پہچاننے سے قاصر رہتا ہے یا دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے اور انگریزوں کے مابین نسلی حیثیت سے دماغی قوےٰ کا تفاوت موجود ہے بہرحال میرا تجربہ ہے کہ یہ معائنے ہندوستانی بچوں پر ناکام ہوتے ہیں۔ لیکن اس ناکامی سے اس کام کی اہمیت پر اثر نہیں پڑتا ہم ہی تھوڑی سی محنت کے بعد اپنے بچوں کی ذہنی حالت سے مطابقت رکھنے والے "دماغی معائنے" ایجاد کر سکتے ہیں۔ اور پھر ان کی مدد سے تمام تر وہی مفید کام لے سکتے ہیں جو بینٹ لسٹ "سے انگریز بچوں کے لیے جاتے ہیں۔

لیکن یہ ذہنی معائنے کسی ایک بچے پر اسی وقت ناکام رہتے ہیں جب تک مختلف اوقات اور حالات میں یہ تجربات کئی کئی بار نہ کئے جائیں۔ مثال کے طور پر ایک چھ سال کا بچہ، چھ ہی سال کے "ذہنی معائنہ" کے کسی سوال کا ایک خاص وقت میں جواب دینے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن دوسرے وقت میں جب اس کا دماغ زیادہ حاضر ہوتا ہے یا اس کو کوئی جسمانی اور ذہنی تکلیف نہیں ہوتی وہ اس کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ۹ سال کا بچہ اپنی عمر کے ذہنی معائنہ کے نو سوالات میں سے آٹھ سوالات کا صحیح جواب دیتا ہے تو ہم بحیثیت مجموعی اس کی ذہنی عمر نو ہی سال قرار دیں گے۔

زیادہ چھوٹی عمر کے بچوں کا ذہنی معائنہ کرتے وقت ہمیں بچے کے جوابات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے، کیونکہ اکثر فطری شرمیلے پن اور مرعوب کن ماحول سے متاثر ہو کر بچہ جوابات میں غلطیاں کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض شریر بچے دیدہ و دانستہ غلط جوابات دے کر ایک خاص قسم کا لطف حاصل کرتے ہیں۔

ان دماغی معائنوں کے بعد وہ بچے جو اپنی عمر کے مطابق سوالات کے جواب دینے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ غلطیوں کی تعداد کے لحاظ سے بے وقوف، احمق، غبی اور نیم مجنوں قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان بچوں کو جن کے سب جوابات صحیح ہیں اوسط یا اوسط سے بلند (ذہنی حیثیت سے) درجوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان تجربات کا عملی فائدہ یہ ہے کہ بالکل ابتدائی ایام ہی میں بچے کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کی آئندہ تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ طبی اور نفسیاتی امداد سے بہت سے غبی بچے بڑی حد تک مناسب تعلیم سے ذہین بنا دئے گئے ہیں۔

انھیں ذہنی معائنوں کی امداد سے ماہرین نے لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنی فرق کا بھی اندازہ لگایا ہے۔ اس قسم کے نتائج اخذ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی عمر اور ماحول کے بچوں یا بچیوں کو انھیں کی عمر کا "دماغی معائنہ" کیا جائے اور اس

طرح دونوں جنسوں کے نمایندوں کی ذہنی عمر کا اوسط نکال لیا جائے۔ اب اس کے بعد بآسانی ان کی ذہنی عمر کی تفریق یا مساوات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

ذہنی معائنوں سے مختلف افراد پر مختلف اوقات اور مختلف اقسام کی منشیات کے استعمال کے اثرات پر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح کی فاعل کو دو قسم کے رقیق مختلف اوقات میں پلائے جاتے ہیں، ایک تو وہ جس میں شراب یا الکوہل کی شمولیت ہوتی ہے لیکن دوسرا رقیق بالکل سادہ ہوتا ہے اور پھر فاعل کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، لیکن دوران تجربہ میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ فاعل کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کون سی رقیق میں الکوہل یا شراب کی آمیزش تھی اس کے بعد دونوں کے کام کی مقدار کا باہم مقابلہ کر کے شراب کے مضر اثرات کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

بالعموم ان لوگوں کو جو شراب کے عادی ہوں، چند دنوں یا چند گھنٹے (ان کی عادت کے لحاظ سے) تک شراب سے پرہیز کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ اس کے بعد جب ان کو شراب ملے تو اس کے پورے پورے اثرات نمایاں ہوں۔ مجھے شراب کا تجربہ نہیں لیکن سگریٹ اور سگار کے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر چند گھنٹے سگریٹ نہ ملے تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے اور جم کر کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز صحیح نہیں کہ سگریٹ سے کام کرنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات عارضی طور پر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے لیکن بالعموم سگریٹ نوشی سے حرکت تیز ہو جاتی ہے لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے فوراً ہی دل کی رفتار میں سستی پیدا ہوتی ہے اور سانس تیز ہو کے تنے جانے لگتا ہے۔ اس وقت کام کرنے کی قوت گھٹ جاتی ہے اور لیٹ کر آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بعینہ یہی کیفیت شراب کے استعمال کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

جی، ایل، مالن نے ایک امریکی یونیورسٹی کے ۱۱۵ سگریٹ پینے والے اور ۱۰۸ سگریٹ نہ پینے والے طالب علموں پر تجربے کئے۔ ان تجربوں سے پتہ چلتا ہے کہ سگریٹ پینے والوں کی دس فیصدی تعداد سالانہ امتحان میں فیل ہوئی، اور سگریٹ نہ پینے والوں میں سے صرف چار فیصدی ناکام رہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جس وقت تک میں نے سگریٹ نوشی کی ابتدا نہیں کی میں تمام امتحانات میں درجہ اول میں کامیاب ہوتا رہا لیکن سگریٹ شروع کرتے ہی حالات دگرگوں ہو گئے اور اس کے بعد کے امتحانات کے نتائج تشفی بخش نہیں رہے۔ مجھے اس امر کا احساس ہے کہ نتائج کی خرابی کی ذمہ دار صرف سگریٹ نوشی کی کثرت ہی نہیں تھی اس میں میرے لاابالی پن اور سیر و تفریح کی عادت کو بھی بڑی حد تک دخل تھا لیکن میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ لاابالی پن اسی عادت کی پیداوار تھا۔ ایم لمبارڈ نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ صرف ایک سگار کے پینے سے انسان کے کام کرنے کی قوت ۸۰ فی صدی گھٹ جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے، لیکن کم سے کم ایک گھنٹہ اس کے زائل ہونے میں لگتا ہے۔

جملہ اطبا اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے اور ہمارے ذاتی تجربات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تمباکو نوشی پھیپھڑوں کو خراب کرنے کے علاوہ براہ راست اعصاب اور پٹھوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ آپ کسی بھی تمباکو نوش کی حالت دیکھ کر کر سکتے ہیں، ہماری موجودہ نسل کی اعصابی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ تمباکو نوشی ہے۔ پروفیسر سی، ایل، ہل کا خیال ہے کہ تمباکو نوشی کے اثرات قوت حافظہ اور اعداد کے جوڑنے کی طاقت پر انتہائی مضرت رساں ہوتے ہیں۔

اسی طرح شراب، کیفین اور دوسری مضرت رساں اشیاء کے استعمال اور ان کے انسانی جسم پر مضر اثرات کی تحقیق نفسیاتی معائنوں کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں انسان کی جذباتی حساسیت اور دیگر دماغی قوتوں کا تعین بھی اسی قسم کے تجربات کے ذریعے ممکن ہے

(باقی آئندہ)

محمود غزنوی سے محمد غوری تک

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

ان کے کھانے کے قریب نہ آ سکتے تھے۔

عزت اور بڑائی کے لحاظ سے دوسرا درجہ راجپوتوں کا تھا۔ راجپوت لوگ سچائی، ایمانداری، عالی ہمتی، جاں بازی، وطن پرستی اور مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ان میں کچھ عیب بھی پیدا ہو گئے تھے۔ دو ایک رسمیں تو ان میں ایسی ڈراؤنی اور بھیانک تھیں جن کے خیال سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رسم ستی، یعنی ہر عورت کو شوہر کے مرنے کے بعد شوہر کے ساتھ چتا پر اپنے کو زندہ جلا دینی تھی۔ یہ رسم اتنی عام ہو گئی تھی کہ معمولی گھر کی عورتیں بھی ستی ہو جانے میں فخر سمجھتی تھیں۔ دوسری خوفناک رسم یہ تھی کہ لڑکی کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا تھا اور نئی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو بہت کم زندہ رہنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ تیسرے جوہر کی رسم تھی یعنی لڑائی میں مردوں کے ہارنے کے بعد تمام عورتیں اپنی عزت بچانے کے خیال سے اپنے کو زندہ آگ میں جلا کر خاک سیاہ کر دیتی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کی رسمیں اب ہمارے ملک سے بالکل جاتی رہیں۔

جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ لیکن جب کسی ملک پر تباہی آتی ہے تو اس کے لوگ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہندوستان گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں اس دور سے گذر رہا تھا۔ شمالی ہند میں اس وقت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جنھیں دلی اور اجمیر کے چوہان، جیجک بھکتی کے چندیل قنوج کے پریہار، مالوہ کے پرمار اور بنگال اور بہار کے پال اور سین خاندان کے راجپوت مشہور رہے تھے۔ مسلمانوں کا مقابلہ انھیں ریاستوں کے راجاؤں سے ہوا۔ بقول ڈاکٹر ایشوری پرشاد "ہندوستان اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی گٹھری بنا ہوا تھا" جو ڈھیلی بندھی ہو یا سرے سے بندھی ہی نہ ہو۔ بدقسمتی سے یہ ریاستیں ہمیشہ آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ ایک بار تو ایسا اتفاق ہوا کہ پرتھوی راج نے جب نارائن کے مقام پر محمد غوری کا مقابلہ کیا تو ہندوستان کے چند راجہ تو اس کا ساتھ دے رہے تھے، مگر راجہ جے چند چپ بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بلکہ الٹا خوش تھا اور پرتھوی راج کی شکست کے لئے بے چین تھا۔ چنانچہ ریاستوں کی اس کمزور گٹھری نے ۱۷ جھٹکے محمود غزنوی کے حملوں کے اور تین، چار جھٹکے محمد غوری کے حملوں کے جھیلے اور جب بس کی بات نہ رہی تو کھل پڑی۔ اس کے بعد راجپوتوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اصل میں راجپوتوں میں کچھ ایسی اندرونی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں جو ہر قوم میں زوال کے وقت پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے دوسرے یہ کہ عیش و عشرت کے عادی ہو گئے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں کوئی ایسا سردھرا نہ رہا تھا کہ جو ریاست کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں کو ایک مضبوط گٹھری میں کس کر باندھ سکتا۔ اس پر سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ اس کا مقابلہ ایسی قوم سے آ پڑا کہ جو بہادری جفاکشی اور مذہبی جوش میں اس سے کم نہ تھی اسی لئے مسلمان کامیاب ہو گئے۔ مسلمان ایک مکمل مذہب اور ایک پختہ تہذیب اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس لئے وہ دوسری باہر سے آنے والی قوموں کی طرح ہندوستانی تہذیب میں گھلے ملے نہیں اور نہ انھوں نے انگریزوں کی طرح ہندوستان کو غیر ملک سمجھا، بلکہ وہ یہاں اپنا گھر کر کے رہنے لگے۔ انھوں نے بہت سی باتیں ہندوؤں کو سکھائیں، اور بہت سی ان سے خود سیکھیں کبھی استاد بنے کبھی شاگرد، اور آج تک ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔

مذہب اور ادب

(بقیہ صفحہ ۶)

کے "نفسیاتی تحلیل و تجزیہ پر" مدعیانہ طور سے رکھی گئی ہے اور جنھیں خود اس کے بعض ساتھ کے کام کرنے والوں ییٹ وغیرہ نے مسترد کر دیا ہے۔ باطن کی تطہیر ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے زیر اثر ادب و شعر کا جو ذخیرہ وجود میں آیا ہے اس کی عفونت نے انسانی تہذیب و شائستگی کے شامہ کے لئے مستقل تکلیف و ایذا کا سامنا مہیا کر رکھا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ "صالح مذاق کے ترقی پسند ادیب و نقاد اپنے ساتھیوں کی ان عریاں نگاریوں کو جن کے پس منظر میں "استلذاذ و لذت جوئی" کے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

سا کچھ نہیں ہے بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور اُنھیں ترقی پسند ادب و شعر سے ملتے باہر کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ پسندیدہ طریق عمل ترقی پسند شعرا و ادیب مستقبل کے تابناک ہونے کی اُمید دلاتا ہے۔

سے یاد رکھنا چاہیے کہ مذہب اپنی حیثیت میں رہبانیت پسند" نہیں ہے وہ صرف انسانیت پسند" ہے اور اس دائرہ میں رہتے ہوئے وہ ادب و شعر کو آزاد فضا میں پرواز سے نہیں روکتا۔ البتہ اگر ادب و شعر اس کی "انسانیت پسندی" سے متصادم ہوگا تو وہ اس کے ساتھ رواداری نہیں برت سکتا محض استلذاذیت "انسانیت پسندی" سے متصادم ہے اس لئے وہ ایسے ادب و شعر کو جو محض استلذاذ ذہنی استلذاذ ہے روا نہیں رکھ سکتا۔ اس پر صالح ترقی پسندی کو چیں بہ جبیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دونوں کا رخ قریب قریب ایک ہی طرف ہے۔

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۹۴۸ء
دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی
چندہ:- سالانہ [illegible]
طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی دہلی (جامعہ)

نئی روشنی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۹ | ۱۶ر نومبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

یو این او کی ایک جھلک

۱۵ر اکتوبر

برادرم عابد صاحب

السلام علیکم - دہلی سے روانہ ہوتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ ہو پایا تو نئی روشنی کے لئے ہفتہ وار خط ضرور لکھتا رہوں گا۔ اور کچھ نہیں ہو پایا اور نئی روشنی کی تھوڑی سی خدمت بھی نہیں ہو سکی۔ مگر میں لکھتا تو کیا لکھتا، کینیڈا میں جو کامن ویلتھ کانفرنس ہوئی تھی اس کے بیشتر لوگ ایسے تھے جو کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں شرکت پیشے کے طور پر نہ کرتے ہوں تب بھی سال میں دو چار دفعہ ان میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ قریب قریب سب ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور جو پہلے سے نہیں جانتے تھے انھوں نے میرے نزدیک "ولی را ولی می شناسد" کے اصول کو ثابت کر دیا، اور بہت جلد گھل مل گئے۔ میری حالت آپ کو معلوم ہے، بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تب بھی چاہتا ہوں کہ کسی طرح ٹال جاؤں۔ اس کے علاوہ سری وجے راگھو چاریہ نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی اور مددگار بنا لیا۔ اور سونے کے کمرے سے کانفرنس کے ہال اور وہاں سے کھانے کے کمرے تک جانے کے لئے جغرافیہ کے جو سبق ضروری تھے وہ مجھ سے دن میں چار مرتبہ لیا کرتے تھے۔ یہاں یو، این، او میں ایسے کسی بزرگ کی خدمت کرنے کا شرف حاصل نہیں۔ باقی نقشہ وہی ہے۔ بیشتر نمایندے یو، این، او اس کے متعلق کونسلوں اور کمیٹیوں اور دوسری بین قومی کانفرنسوں میں کئی مرتبہ شریک ہو چکے ہیں، اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے لئے ہر صورت نئی، ہر بات نرالی تھی۔ اب جگہ سے اور آدمیوں سے اور کام کے طریقوں سے کسی قدر واقف ہو گیا ہوں تو آپ کو لکھنے کی ہمت ہوئی ہے۔ یو، این کے بارے میں ایک تقریر ہندوستانی میں اور ایک انگریزی میں آل انڈیا ریڈیو کے لئے کر چکا ہوں اور ان دونوں کی اصل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ان سے یو، این او کے طریق کار کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ اس وقت تک جو بڑی کارروائیاں ہوئی ہیں۔ ان کا مختصر حال سن لیجیے۔

قوموں کے نمایندے جمع ہوتے ہیں تو پہلے صدر کی طرف سے کچھ ارشاد ہوتا ہے، پھر نئے صدر کا اور سات نائب صدروں کا انتخاب ہوتا ہے، اور اس کے بعد قوموں کے نمائندوں کو اپنے جذبات ظاہر کرنے یا ایک دوسرے کی ہدایت یا تنقید کے لئے تقریریں کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ شروع میں نمائندے ذرا تکلف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسروں کی بات سن کر اپنی کہے۔ پھر صدر کو احساس ہوتا ہے کہ تقریروں کا سلسلہ اور کسی طرح بند نہ ہوگا اور وہ نمائندوں سے درخواست کرنے لگتا ہے کہ کوئی خاص بات کہنا نہ ہو تو تقریر نہ کریں۔ اسی مرتبہ متحدہ ریاستوں کے نمائندے مسٹر ایچیسن نے پہلے دن تقریر کی۔ گویا پہلی توپ داغ کر زبانی جنگ کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن لڑائی متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور روس اور اس کے ساتھیوں تک محدود رہی۔ ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر سر این، بی، راؤ کی تقریر صلح جوئی کی ایسی مثال تھی کہ پاکستانی بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے، اور باقی تقریریں بھی صلح پسندی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں عراق کے نمایندے کی تقریر ذرا لمبی اور ناصحانہ انداز میں تھی، مگر اس میں بڑی سچائی اور گہرائی تھی، اس وجہ سے وہ بہت پسند کی گئی تھی۔

۲۷ر ستمبر سے عام اسمبلی کی چھ کمیٹیوں کے جلسے ہو رہے ہیں۔ پہلی کمیٹی میں سیاسی مسائل پر بحث ہوتی ہے اور یہیں آتش باری کا تماشا بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن ایسی کوئی کمیٹی نہیں ہے جس میں روس اور اس کے ساتھی گولہ باری نہ کرتے ہوں اور اس کا جواب برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی طرف سے نہ دیا جاتا ہو۔ میں پہلے تیسری کمیٹی میں تھا جس کا میدان انسانی حقوق کے مسائل ہیں۔ یہ اب تک بردہ فروشی کے متعلق ایک قانون کے مسودے پر غور کرتی رہی ہے اور ابھی تین چار دن ہوئے اسے منظور کیا ہے۔ اس مسئلے پر بحث جاری تھی کہ میں دوسری کمیٹی میں جو معاشی مسائل پر غور کرتی ہے بھیج دیا گیا، اور پھر چوتھی کمیٹی میں جس کا حصہ ان علاقوں کے مسائل ہیں جو ٹوگولینڈ، کیمرون اور ٹینگینیکا کی طرح بعض حکومتوں کی تولیت میں دیے گئے ہیں اور جن کے مفاد کے تحفظ کے لئے تولیتی کونسل یو، این کے ایک مستقل رکن کی حیثیت سے قائم کی گئی ہے۔ چوتھی کمیٹی ابھی ایجنڈا کے پہلے مسئلے، یعنی کونسل کی سالانہ رپورٹ پر بحث کر رہی ہے۔ ہر موقع پر روس اور اس کے ساتھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ دلیلیں سنتے سنتے طبیعت عاجز آ جاتی ہے مگر اس کے باوجود اگر کبھی وہ چبھتی ہوئی بات کہتے ہیں تو اس کی انھیں داد ملتی ہے اور کوئی صحیح اعتراض کرتے ہیں تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ تولیتی علاقوں کے بارے میں جو "سیاسی" ریزولیوشن منظور ہوا ہے، اسے چکوسلواکیہ کے نمایندے نے پیش کیا، اور اسے ہم بیچ میں بیٹھنے والوں نے اپنی تجویزوں کے ساتھ ملا کر منظور کرا لیا۔ اگرچہ برطانیہ اور فرانس نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ اس کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چکوسلواکیہ کا نمایندہ ہم لوگوں سے ملتا ہے۔ باتیں کرتا ہے جھگڑتا نہیں۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
یو، این، او کی ایک جھلک	محمد مجیب	۱
مختصر تبصرے	خواجہ احمد فاروقی	۲
ماقصۂ سکندر و دارا	اداریہ	۳
دنیا کی رفتار		
۱۔ پاکستان	ع، ح	۴
۲۔ باہر کی دنیا	ع، ل	۴
بزم بے تکلف		۵
مجھے جینے دو	تیغ الہ آبادی	۵
فریب نظر اور حقیقت	منہاج برنا	۶
کاش میں جانتا (افسانہ)	ابوحاکم	۸
پبلک سے ملیے		۹
عملی نفسیات	خواجہ جمیل احمد	۱۰

قیمت فی پرچہ ۴ر

مختصر تبصرے

دو کتابیں

خواجہ احمد فاروقی

۱۔ کوکھ جلی :۔ از راجندر سنگھ بیدی۔ مطبوعہ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی نمبر (۱)، قیمت تین روپے
۲۔ ادب اور سماج :۔ از سید احتشام حسین مطبوعہ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی		قیمت دو روپے ۱۲ر

۱۔ کوکھ جلی :۔ آزادی کے ملنے کے بعد جو طوفان اُٹھا، اس میں ادب کی شمع کو روشن رکھنا، آسان نہیں تھا مگر ہمارے وہ ادیب جو معاشرت کے صحیح ترجمان اور انسانی زندگی کے سچے عکاس تھے وہ اس شمع کو مضبوطی کے ساتھ بلند کئے رہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کو اس شان سے فروزاں کیا کہ ان کی کوششوں سے گرد و پیش کی تاریکی چھٹ گئی اور دور ——— اُمید کا روشن ستارہ بھی طلوع ہوتا ہوا نظر آیا۔

راجندر سنگھ بیدی کا شمار بھی ان ہی مصنفوں میں سے ہے۔ ان کے ان مجموعے میں فن کی پختگی اور زبان کی چاشنی کم اور بہت کم ہے۔ لیکن شکست و ریخت کے اس دور میں ہم ان چیزوں کی توقع بھی نہیں کر سکتے ——— کیا کم ہے کہ ان کے افسانوں میں نیا شعور، نیا احساس، اور نیا یقین ہے۔ وہ انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔ زندگی کی تہوں کو کھولنے کے خواہشمند ہیں، وہ خرابیوں اور حقیقتوں کی تصویر کشی کرتے ہیں. سیاسی، اقتصادی اور جنسی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں سماج کے حسن اور غلاظت پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان میں صحت مند عناصر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری متنوع اور رنگارنگ زندگی کی مصوری ہی نہیں، رہنمائی کرتے ہیں اور زندگی کے خاکے میں انفرادیت ہی کا نہیں اجتماعیت کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ غرض نفسیات کی عقدہ کشائی ہماری پوشیدہ اُمنگوں اور خستہ شکستہ آرزوؤں کا اظہار ——— ان سب کی ہلکی جھلک ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

"لمس ہیں سر جیودام کی زندگی پر کیسا سخت طنز ہے وہ دراصل اس طبقہ کا نمائندہ ہے جو انگریز کی بدولت عالم وجود میں آیا اور جس کا مقصد حیات صرف انجمن آرائی اور عزت فروشی ہے۔ غریب عوام کا اس طبقہ کے ہاتھوں کیا حال ہوا ہے اور وہ کس طرح ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ سب اس آئینے میں نظر آ جاتا ہے۔ ایک اور قابل ذکر افسانہ "کوکھ جلی" ہے جو اس مجموعے میں بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سماج کے جنسی مسائل پر ایک ابدی زہر خند ہے اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل ہے گھمنڈی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ہے، اس میں اس کے طوفان خیز جنسی رجحانات کا حشر یہی ہو سکتا تھا، جو ہوا، اس کی ماں جو ایک شرابی کی بیوی رہ چکی ہے، اس کا کردار بڑی صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ صرف چند لکیروں سے پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

اس مجموعے میں ایک اور قابل ذکر افسانہ "عورت" ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بیدی نے اتنے بہت سے جذبات اس مختصر سے افسانے میں کیسے مقید کر دئے ہیں۔ ایک عورت پہلے ماں ہے اس کے بعد کچھ اور ——— وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے مادرانہ جذبات کی توہین نہیں۔ اور اگر کوئی ان جذبات کا احترام کر سکتا ہے تو وہ بہت سی مفاہمتوں کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے۔

بیدی کے تمام افسانے پڑھنے کے قابل ہیں، لیکن سب تخلیقی کارنامے نہیں ہیں مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کا فن ابھی ناپختہ اور خام ہے، ان کی زبان لکنت کرتی ہے، اور خیالات میں وہ ہمواری اور راستی نہیں ہے جو پختہ کاری کی علامت ہو، زبان کی لغزشیں اور خیالات کا الجھاؤ، قدم قدم پر ملتا ہے، لیکن ان کا نقطۂ نظر صحیح اور صحت مند ہے، اور دراصل یہی وہ نخلستان ہے جہاں بیٹھ کر پڑھنے والے کی ساری تھکن اور پیاس دور ہو جاتی ہے۔

۲۔ ادب اور سماج :۔ یہ سید احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ادب کے اہم مسائل پر غور کیا ہے، اور سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی رائے پیش کی ہے، انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ زندگی اور ادب کے رشتے کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور سماجی حقائق کو سمجھ کر زندگی کے خارجی اور داخلی رشتوں کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ "ادب کے پائدار حصوں کی قدر و قیمت متعین کریں اور آج اجالے کو اندھیرے سے الگ کر دکھائیں"۔ ان کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص پر شبہہ نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح ایک مخصوص فلسفۂ حیات کے بغیر اچھا ادب پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح اچھی تنقید بھی بغیر ایک زاویۂ نگاہ کے ممکن نہیں ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب نقاد کا ہاتھ کائنات کی نبض پر ہو اور وہ انفرادیت اور اجتماعیت کے رشتوں کو اچھی طرح پہچانتا ہو ——— احتشام حسین ان مقاصد کو تنظیم، ترتیب، انتخاب اور تعمیر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ کام بغیر فلسفیانہ کاوش اور سائنٹفک جگر کاوی کے ممکن نہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ احتشام حسین ہر جگہ ان اصولوں کے برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بعض جگہ وہ اس بلندی تک پہنچنے میں گر گئے ہیں، بعض جگہ ان کی تنقید شرح نگاری یا تاریخ نویسی کی کوشش بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں کہیں توازن اور بصیرت کی کمی ہے، اس لئے بعض مضامین چھپتے ہی باسی ہو گئے ہیں، بعض ایسی عجلت میں لکھے گئے ہیں کہ ان میں وہ تحقیق اور تلاش نہیں جو ہونا چاہئے۔ "اردو ادب میں آزادی کا تخیل" اس اعتبار سے سطحی مضمون ہے۔ بالخصوص غدر سے پہلے کے رجحانات کا جائزہ پورے طور پر نہیں لیا گیا اگر غور سے دیکھا جاتا تو مومن جیسے غزل گو کے یہاں بھی، جو کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لئے آمادہ ہے، اور فریب وصل غیر کھانے کے لئے تیار۔ آزادی کے نقوش مل جاتے، اس کی مثنوی جہادیہ جس میں غیر ملکی حکومت سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے۔ محض "عشق پردہ نشین" کا کفارہ نہیں ہے بلکہ اس دور کے سیاسی رجحانات کا مرقع ہے۔ آزادی کا مفہوم اور اس کی تعبیر بڑا مباحثہ انگیز مسئلہ ہے۔ اور ہر دور میں اس کی مختلف تفسیریں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ادب اور سیاست کی تاریخ میں ان واقعات سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ ظفر رنگون میں نظر بند رہے۔ آزردہ جیل گئے، شیفتہ کو قید و بند کی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ مولانا فضل حق کو عبور دریائے شور کی منزل ملی اور وہ انڈمان ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ صہبائی ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی قصہ خواں کو توپ سے اُڑا دیا گیا اور ان کی لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

منیر شکوہ آبادی نے قید فرنگ میں جو تکلیفیں اُٹھائیں وہ لوح تاریخ پر کندہ ہیں۔

آئے باندے میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر
تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے
ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گذرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو بیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

اس مجموعے کا ¼ حصہ حالی اور پیروی مغرب سے بھرا ہوا ہے۔ بحث یہ ہے کہ حالی کے یہاں پیروی مغرب سے مراد مغربی تہذیب کی تقلید ہے یا مغرب کی
احتشام حسین ادب کے قدیم و جدید دونوں حصوں سے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۰ر نومبر ۱۹۴۹ء

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا سفر امریکہ بخیر و خوبی سے ختم ہو گیا، اور اب وہ ۱۵ر نومبر کو دہلی واپس آ رہے ہیں۔ اس سفر کے نتیجے کے بارے میں جو خیالات ہم نے ۲۳ر اکتوبر کے ادارئیے میں ظاہر کئے تھے ان کے ماننے میں شاید پہلے بہت سے لوگوں کو تامل ہوا ہوگا مگر اب اس کی تصدیق ہوئی جاتی ہے کہ ہمارا اندازہ صحیح تھا۔ جو لوگ اس سفر کا مقصد یہ سمجھتے تھے (اور ان میں خود پنڈت نہرو بھی شامل ہیں) کہ ہندوستان کی ذہنی اور اخلاقی ساکھ امریکہ میں قائم ہو جائے، اور امریکی قوم اور ہندوستانی قوم کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو جائے۔ ان کے نقطۂ نظر سے سفر ہر طرح کامیاب رہا، لیکن جو حضرات یہ توقع رکھتے تھے کہ اس سفر کے بعد امریکی دولت کے دریا ہندوستان میں بہنے لگیں گے ان کے لئے یہ نتیجہ مایوس کن رہا۔ ان کا ردِ عمل اس سفر کے بارے میں یہ ہے:

ع۔ تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

بات یہ ہے کہ پنڈت جی کی سب سے پہلی تقریر کے بعد جو انھوں نے امریکی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کی، وال سٹریٹ کے سرمایہ داروں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہندوستان امریکی بلاک میں شامل ہونے کو یعنی امریکہ کے ساتھ مل کر روس کے خلاف محاذ جنگ بنانے کو تیار نہیں ہے اس لئے سیاسی حیثیت سے اُن کی دلچسپی ہندوستان سے کم ہو گئی۔ اب اگر وہ اپنا سرمایہ ہندوستان میں لگانے کے مسئلے پر غور کریں گے تو خالص کاروباری نقطۂ نظر سے ظاہر ہے کہ ان کے سامنے صرف ایک ہندوستان کا میدان نہیں بلکہ مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اور میدان بھی موجود ہیں اور وہاں انھیں یہ امید ہے کہ نفع کمانے کے علاوہ اپنی سیاسی مقاصد بھی حاصل کر سکیں گے۔ اس لئے قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کی نظر انتخاب ہندوستان پر مشکل سے پڑے گی۔ شاید ہی ان میں سے کچھ ایسے من چلے نکلیں جو اپنے نجی ذاتی اثر سے باہر سرمایہ لگانے پر تیار ہوں۔ اسی طرح امریکی حکومت اگر وہ ایک خود دار اور خود رائے ہندوستان کی مدد کرنے پر تیار بھی ہو تو کچھ بہت زیادہ مدد نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کے وسائل پر مارشل ایڈ وغیرہ کی وجہ سے بہت زیادہ بوجھ پڑ چکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہند اور امریکہ میں تجارتی اور مالی معاہدے کی گفتگو جاری ہے اور اس میں کامیابی کی امید بھی ہے، لیکن اس معاہدہ کا دائرہ اور پیمانہ غالباً بہت بڑا نہیں ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو طرزِ عمل ہندوستان نے اختیار کیا۔ وہ صحیح اور مفید ہے یا نہیں؟ بہت سے امریکی اور برطانوی حضرات جنھیں ہندوستان کی سچی ہمدردی کا دعویٰ ہے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان امریکی بلاک میں شریک نہ ہوا تو خود بھی اپنا نقصان کرے گا اور دنیا کے امن کو بھی ضرر پہنچائے گا ———— اپنا نقصان اس طرح کہ وہ امریکی دولت کی بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکے گا اور امن کو ضرر اس طرح کہ اس کے غیر جانب دار رہنے سے تیسری جنگ عظیم کا خطرہ کم نہیں ہوگا بلکہ کچھ بڑھ ہی جائے گا۔

دوسرے اعتراض پر ہم پہلے غور کریں گے اس لئے کہ یہ بہت اہم اور بہت سخت ہے۔ یہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ جنگ دراصل روس کرنا چاہتا ہے اور ساری دنیا امن کی طلب گار ہے۔ اس لئے روس کے خلاف تمام دنیا کے ملکوں کا جتنا بڑا جتھا بن جائے گا اتنا ہی زیادہ اس کا امکان ہے کہ وہ دب کر جنگ کرنے سے باز رہے گا۔ اگر ہندوستان اس جتھے سے الگ رہتا ہے تو گویا امن کے امکان کو کم کرنے کا مجرم ہوتا ہے لیکن ہمیں اس مفروضے کو ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک روس کی کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ تیسری جنگ چھیڑنے کا جمہوری ملکوں سے زیادہ خواہش مند ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برلن کا معاملہ اتنا اشتعال انگیز تھا کہ جنگ کسی طرح رک ہی نہیں سکتی تھی۔ دنیا کی حکمت عملی ہمیشہ اس اصول پر مبنی رہی ہے کہ اگر دنیا کی دو حکومتوں کے مقاصد یا اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں تو دونوں کی طرف سے جنگ شروع کرنے کا یکساں خطرہ رہتا ہے، لیکن کوئی اس وقت تک میدان میں نہیں کودتا جب تک اسے قوت کے زیادہ ہونے کا یقین یا دھوکہ نہ ہو۔ اس لئے جنگ کو روکنے کے لئے توازن قوت کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے یعنی اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ دونوں فریقوں کی قوت قریب قریب برابر رہے۔ کوئی اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ جنگ کی صورت میں اس کی کامیابی صریحی نظر آئے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو امریکی جتھے میں شمالی اور مغربی یورپ کی ریاستیں اور اٹلی، ترکی یونان وغیرہ شامل ہیں۔ روسی جتھے ہے جس میں اب تک صرف مشرقی یورپ کی چند ریاستیں ہیں، زیادہ طاقتور ہے۔ آئندہ اگر چین روس سے فوجی معاہدہ کرے تب جا کر دونوں جتھوں میں کچھ تھوڑا بہت توازن پیدا ہوگا۔ اس لئے جو ملک امریکی جتھے میں شامل ہو کر اس کے پلڑے کو اور جھکا دے۔ وہ امن کے امکان کو کم کر دے گا۔

یا ہندوستان جو اس سے الگ رہنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ امریکہ اور برطانیہ تو اس قدر صلح پسند واقع ہوئے ہیں کہ ان کی طرف سے جنگ کی ابتدا کا گمان بھی نہیں ہو سکتا لیکن اتنا حسن ظن دنیا کے کسی بھی ملک سے رکھنا مشکل ہے اور اگر یہ حسن ظن ہو بھی کہ وہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی جنگ کا آغاز نہیں کریں گے تو اس کو کیا کیجئے گا کہ جب جنگ کا مسالہ تیار ہو تو اس میں بغیر کسی خاص ارادے کے محض اتفاق سے بھی چنگاری پڑ کر آگ سلگ سکتی ہے اور مسالہ تیار ہونے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک فریق اتنا زیادہ قوی ہو جائے کہ اس کی کامیابی یقینی معلوم ہونے لگے۔ غرض ہمارے خیال میں تو ہندوستان اور دوسرے غیر جانب دار ملک ان دونوں جتھوں سے جن کی طاقت قریب قریب برابر ہے یا ہونے والی ہے الگ رہ کر امن کی خدمت کر رہے ہیں۔

اب رہا دوسرا اعتراض وہ یہ ہے کہ ہندوستان امریکی جتھے سے الگ رہنے کی وجہ سے اس کا موقع کھو رہا ہے کہ بے شمار امریکی سرمایہ لگا کر اپنی صنعت کو ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچا دے۔ اگر ہم اس بات کو جو بہت مشتبہ ہے، مان لیں کہ امریکہ کسی شرط پر بھی ہندوستانی صنعت کو زیادہ فروغ پانے میں مدد دے گا، اور دنیا کے بازاروں میں اپنا ایک مقابلہ کرنے والا پیدا کرے گا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس خطرے کو نظر میں رکھتے ہوئے جو ہندوستان کو جنگ کی صورت میں برداشت کرنا پڑے گا ہندوستان کو اس قیمت پر اپنی آزادی عمل بیچ دینی چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اب بھی جب روس نے ایٹم بم بنا لیا ہے اس لڑائی کی زد سے جو یورپ یا ایشیا یا افریقہ میں ہو امریکہ بہت کچھ محفوظ رہے گا اور اس کا سارا قہر ان ملکوں پر ٹوٹے گا جو میدانِ جنگ بنیں گے۔ ممکن ہے غیر جانب داری کی صورت میں بھی ہندوستان کے میدانِ جنگ بننے کا کچھ امکان ہو لیکن کسی جتھے میں شامل ہونے کے بعد تو یہ امکان یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور میدانِ جنگ بننے کے بعد ہندوستان مع اپنی اس صنعت کے، جو امریکی سرمائے کی مدد سے سالہا سال میں بنے گی دو ایک سال میں تہس نہس ہو جائے گا۔

غرض آئندہ جنگ کے خطرات ساری دنیا کے لئے اور خود ہندوستان کے لئے اس قدر ہولناک ہیں کہ ہر سمجھدار آدمی پنڈت نہرو کی اس پالیسی کی تائید کرے گا کہ ہندوستان کو جنگی جتھوں سے الگ رکھیں اور اپنی غیر جانب داری سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کریں۔ یہ پالیسی کتنی ہی دشوار اور اس کی کامیابی کتنی ہی مشتبہ کیوں نہ ہو ہندوستان کے لئے کوئی اور پالیسی ہو ہی نہیں سکتی۔

آزادی نمبر

چونکہ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کے نئے آئین کے نفاذ کا اور ہندوستانی ریپبلک قائم ہونے کا اعلان ہوگا اس لئے ادارۂ "نئی روشنی" کی خواہش ہے کہ ۲۴ر جنوری کا پرچہ "آزادی نمبر" کے نام سے نکالا جائے۔ خیال ہے کہ اس کا حجم ۲۴ سے لے کر ۳۲ صفحہ تک رکھا جائے۔ "نئی روشنی" کے قلمی معاونوں سے درخواست ہے کہ اس نمبر کے لئے مختصر اور دلچسپ مضامین، ترجمے اور نظمیں عنایت فرمائیں۔ یہ سب چیزیں ذیل کے کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں تو بہتر ہے:-

۱۔ ہندوستان کی تحریک آزادی
۲۔ تحریک آزادی کے بڑے علم برداروں کی سیرت اور سوانح حیات۔

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

معاشی اُلجھن دُور کرنے کی نئی کوشش

حکومت ہند نے ہندوستان کے صنعتی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک مرکزی مجلس مشورہ قائم کر رکھی ہے جو کارخانوں کے مالکوں، مزدوروں اور حکومت کے نمایندوں پر مشتمل ہے۔ ۱۳ر نومبر کو اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا جلسہ نئی دہلی میں وزیر صنعت ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی صدارت میں شروع ہوا جس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی شریک ہوئے۔ سردار نے ایک مختصر سی زبانی تقریر کی۔ اس کے بعد ان کا لکھا ہوا خطبہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے سنایا۔ سردار نے موجودہ معاشی بحران کے چار علاج تجویز کئے:۔

۱۔ اشیاء کی قیمتیں کم ہونی چاہئیں۔

۲۔ باہر سے مال کی درآمد گھٹنی چاہیئے تاکہ ہندوستان کے پاس دوسرے ملکوں کے سکوں کا جو ذخیرہ ہے وہ گھٹنے نہ پائے۔

۳۔ عام لوگوں میں اعتماد پیدا ہونا چاہیئے تاکہ وہ صنعت میں سرمایہ لگاتے ہوئے نہ جھجھکیں۔

۴۔ موجودہ کارخانوں کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونا چاہیئے۔

انھوں نے ان چاروں چیزوں کے لئے عملی تدبیریں بتائیں۔ تیسری شق کے بارے میں جو اس وقت سب سے اہم ہے، انھوں نے فرمایا کہ لوگ صنعتوں میں سرمایہ لگاتے ہوئے دو وجہوں سے تامل کرتے ہیں۔ ایک تو عام شکایت یہ ہے کہ براہ راست ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے دوسرے بہت سے لوگ جنھوں نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے رقمیں چھپا رکھی ہیں، ڈرتے ہیں کہ اگر ان رقموں کو نکالیں گے تو صرف یہی نہیں کہ ان پر ٹیکس ادا کرنا پڑے گا، بلکہ بدنامی بھی ہوگی اور سزا بھی پائیں گے سردار نے وعدہ کیا کہ فنانس منسٹر آیندہ بجٹ میں براہ راست ٹیکسوں کے معاملے پر نظر ثانی کریں گے اور رہی کا بھی اطمینان دلا کر لوگوں سے چھپی ہوئی رقموں پر انکم ٹیکس وصول کرنے کا لیبا [illegible]

انتظام کیا جائے گا کہ اُن کے نام ظاہر نہ ہونے پائیں۔

کمیٹی نے بہت غور و بحث کے بعد طے کیا کہ کچھ کمیٹیاں جن میں صنعت کے مالکوں مزدوروں اور حکومت کے دو دو نمایندے ہوں گے۔ ہندوستانی اور بیرونی ماہرین کی مدد سے پیداوار میں اضافے کی لمبی مدت کی اسکیم بنائیں گی۔ اور ان کے علاوہ کچھ اور کمیٹیاں اس غرض سے مقرر کی جائیں گی کہ مختلف صنعتوں کے لئے زیادہ پیداوار کی منزلیں مقرر کرکے ان تک پہنچنے کی فوری تدابیر اختیار کریں۔

اس طرح کی کمیٹیاں تو پہلے بھی بہت ہو چکی ہیں مگر اس بار ایک نئی بات سننے میں آئی ہے جس سے اُمید بندھتی ہے کہ کچھ نہ کچھ موثر ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جنھیں ریاستوں کے زبردست اور پیچیدہ مسئلے سے اب قریب قریب فرصت مل گئی ہے اپنی ساری توجہ معاشی بحران کو دور کرنے پر صرف کریں گے۔ خدا کرے اُن کا ناخن تدبیر اس گتھی کو سلجھانے میں بہت جلد کامیاب ہو تاکہ معاشی بحران بڑھتے بڑھتے معاشی ابتری تک نہ پہنچ جائے۔

وزیر اعظم کی صاف گوئی

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے لندن سے روانہ ہونے سے پہلے پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کی بیرونی پالیسی کے بارے میں ہر سوال کا جواب اس قدر صاف گوئی اور وضاحت سے دیا جس کی مثال ارباب سیاست اور خصوصاً بدیسی معاملات کے وزیروں کی تقریروں میں بہت کم ملتی ہے۔ کشمیر، ملایا، چین، انڈو چائنا، اسرائیل وغیرہ کے بارے میں جو باتیں انھوں نے کہیں وہ نئی نہیں ہیں۔ اتنی وضاحت سے نہ سہی مگر پہلے بھی کہی جا چکی ہیں، لیکن تبت کے متعلق انھوں نے پہلی بار کہا ہم تبت پر چین کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں اگر ان کے الفاظ صحیح نقل کئے گئے ہیں تو یہ ایک نہایت اہم اعلان ہے جس سے چین کی کمیونسٹ حکومت اور ہندوستان کے درمیان تصادم کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

باہر کی دُنیا

اگلے مہینے انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا

ہیگ کی گول میز کانفرنس بحیثیت مجموعی کامیاب رہی اور انڈونیشیا کو اختیارات منتقل کرنے کے لئے جو فیصلے ہوئے ہیں ان سے انڈونیشی رہنما بالکل مطمئن ہیں البتہ نیو گنی کے متعلق ابھی اطمینان نہیں ہوا ہے کیونکہ ڈچ نمایندوں نے اس کی آزادی تسلیم نہیں کی ہے۔ انڈونیشی نمایندوں نے معاہدے کی اس شق کو ابھی تک نہیں مانا ہے۔ انڈونیشیا کے آزاد ہو جانے کے بعد وہ نیو گنی کے مسئلے پر ڈچ حکومت سے مساوی حیثیت میں دوبارہ بات چیت کرنی چاہتے ہیں۔

ہیگ کانفرنس کے فیصلوں کی تصدیق کے لئے بہت جلد انڈونیشی ریپبلکن پارلیمنٹ اور ان پندرہ ریاستوں کی پارلیمنٹ کا، جو ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کی رکن ہوں گی، ایک مشترکہ کنونشن بلایا جائے گا۔ تصدیق کے بعد ان کے نمایندے ایک صدر چنیں گے۔ صدر تین آدمیوں کو نامزد کرے گا جو کابینہ منتخب کریں گے پھر ایک لیڈر چنا جائے گا جو ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کا پہلا وزیر اعظم ہوگا اس کے بعد ۳۰ دسمبر سے پہلے پہلے وزیر اعظم کا ایک نمایندہ ہیگ جائے گا اور ڈچ ملکہ سے اختیارات کی منتقلی کی باقاعدہ تحریر لائے گا۔

اس طرح آیندہ مہینے میں نئے سال سے قبل انڈونیشیا صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی سے ہم کنار ہوگا اور اپنی قسمت کا خود مالک ہوگا۔

اطالوی نوآبادیات کے متعلق فیصلہ

اطالوی نوآبادیات کا مسئلہ کئی سال سے زیر غور ہے۔ مگر ان سے مختلف بڑی طاقتوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اس لئے اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر اب یو، این، او کی سیاسی کمیٹی نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے جو جمہوریت پسندوں کے لئے بالکل اطمینان بخش تو نہیں ہے مگر موجودہ حالت میں یہی غنیمت ہے، اس فیصلے میں ہندوستانی نمایندے کی کوششوں کو بڑا دخل ہے اور [illegible] سے ہندوستان کی عزت اور وقار بڑھا [illegible]

ملکوں کی نگاہ میں بہت بڑھ گیا ہے۔

اطالوی نوآبادیات کے متعلق سیاسی کمیٹی نے فیصلے کئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

لیبیا۔ جنوری ۱۹۵۲ء سے قبل لیبیا مکمل طور پر آزاد ہو جائے گا اور لیبیا کے چار علاقوں — سائرینیکا، ٹریپولی ٹینیا اور فیضان کے نمایندوں پر مشتمل ایک نیشنل اسمبلی بنے گی جو آزاد لیبیا کے لئے دستور مرتب کرے گی

اس کام میں یو، این ہائی کمشنر اور دس ممبروں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی لیبیا کی مدد کرے گی، اس کونسل کے مصر، فرانس، اٹلی، پاکستان، برطانیہ، امریکہ لیبیا کے تینوں علاقوں کے ایک ایک نمایندے اور لیبیا کی اقلیتوں کے نمایندے ممبر ہوں گے۔

اریٹیریا کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے اور ان کے مستقبل کے متعلق مناسب اور صحیح فیصلہ کرنے کے لئے یو، این کا ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔

سمالی لینڈ کو فی الحال عارضی طور پر اٹلی کی تولیت میں دے دیا گیا اور دس سال کے بعد اس کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس فیصلے سے خاص طور پر جمہوریت پسندوں کو سخت اختلاف ہے۔ خود سیاسی کمیٹی کے ممبروں کی خاصی تعداد اس کی مخالف تھی اور وہ اسے براہ راست یو، این کی تولیت میں دینا چاہتی تھی۔ مگر آخر میں بوجوہ اٹلی کی تولیت میں دینے پر مجبور ہو گئی۔ مگر اسی کے ساتھ اٹلی پر بڑی حد تک پابندیاں عائد کی گئی ہیں جس سے اٹلی کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں۔

آزادی نمبر (بسلسلہ صفحہ ۳)

۴۔ آزادی کے ڈھائی سال میں ہندوستان کی حالت کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ

۵۔ ہندوستان کی آیندہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ

اس تجویز پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب ہماری اپیل کا خاطر خواہ جواب ملے۔

بزمِ بے تکلّف

اللہ بخشے ایک دیہاتی دوست جناب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، جب کسی صحبت یا جلسے یا تقریب سے بہت محظوظ ہوتے تھے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی چودھری زبان میں کہا کرتے تھے "بھئی آج تو بڑا چکلس آیا"۔ معلوم نہیں "چکلس" بہ قوم آب حیات مرحوم کس بیدے کی تخلیق ہے؟ مگر تخلیق ہے اور بڑی بکٹ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ بہرحال ہمیں اس لفظ کا مفہوم معلوم کرنے کے لئے کبھی لغوی تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی، اس لئے کہ مرحوم کو حالتِ "چکلس" میں دیکھ کر اس کے معنی کی صورت مجسم نظر آ جاتی تھی۔ مرحوم کے چہرے کی کیفیت اس وقت ایک خطلی اور گل غیرے کے بین بین ہوتی تھی جس میں خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ بھولا پن، کچھ کا نیاں پن، کچھ بھونکا پن، کچھ اچکا پن ملا جلا ہوتا تھا۔

یہ بھولا بسرا کے اُٹھائی یا کا تشمعی کہ پاکستان کے ایک اچھے خاصے ثقہ اخبار میں ایک خبر پڑھ کر بڑا "چکلس" آیا۔ راوی کہتا ہے کہ لائل پور اب شکار پور کا مدمقابل بن کر میدان میں آیا ہے یعنی "ویرانک انجمن" انجمن احمقانستان ہے قائم ہوئی ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کی ترقی عقلمندوں کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ احمقوں کے ذریعے ہوگی۔ خدا جانے یہ خبر کیسی ہے یا سیاسی؟ دروغ برگردنِ راوی، ہم تو فقط نقل کرنے کے گنہ گار ہیں، اور نقل را چہ عقل۔

شکارپور کا مقابلہ کرنے کا دعوےٰ کوئی اور کرتا تو احمق کہلاتا مگر جو شخص اپنے کو احمق کہتا ہو اس کو کیا کہا جائے۔؟ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ لائل پور کا احمق لاکھ احمق سہی۔ ع۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

البتہ حضراتِ لائل پور اس لحاظ سے ضرور اربابِ شکارپور پر فوقیت رکھتے ہیں کہ وہ الزامی احمق نہیں بلکہ اقبالی احمق ہیں۔ یعنی شکارپوریوں کو تو دوسرے احمق بناتے ہیں اور لائل پوری خود ہی بنتے ہیں، اُن کی یہ اخلاقی جرأت داد کے قابل ہے اور سوائے ہی سوا احمق پھپھوندوی اور حضرت بوم مرحوم کے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں، اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی حماقت سے پاکستان کا نہ سہی مگر باقی دنیا کے افلاس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سند کے لئے یہ مصرعہ کافی ہے ع۔ چو احمق در جہاں باقی است مفلس کس نمی ماند

آپ معاشیات کے جس ماہر سے چاہئے پوچھ لیجئے وہ یہی کہے گا کہ مغرب میں مفلسوں کی تعداد اسی نسبت سے گھٹتی ہے جس نسبت سے مشرق میں احمقوں کی تعداد بڑھتی ہے۔ اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ احمق کی حماقت سے دوسروں کی دولت میں تو ترقی ہوتی ہے مگر خود بدولت مورچی کے موچی رہ جاتے ہیں تو نفسیات کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ حماقت کی بدولت آدمی دنیا کی بہت سی فکروں سے آزاد رہتا ہے اور اس کی زندگی بڑے مزے میں کٹتی ہے۔ بقول ہمارے مرحوم دوست کے "بڑا چکلس آتا ہے"

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ حماقت بھی بہارِ بے خزاں ہے

اِدھر ہندوستان کی راجدھانی میں یارانِ طریقت نے ایک "انجمن ترقی ظرافت" قائم کی ہے جس کے پہلے جلسے کی صدارت حضرت شنکر دام کار تو نہ نے فرمائی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر روشنی ڈالی کہ ظرافت کے لئے خوشی اور خوش دلی لازمی نہیں کبھی کبھی بلکہ اکثر ظریف بسورتے ہوئے دل سے سکتا ہے اور وہاں زخم سے ہنستا ہے۔ تعجب انھوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ ظرافت کے لئے چاہے خوشی کی ضرورت نہ ہو مگر حماقت کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ترقی دولت سے حماقت کو جو تعلق ہے وہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ترقی ظرافت سے دے کیا تعلق ہے؟ سچ پوچھئے تو ظرافت کا کارخانہ حماقت کے کچے مال کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ منطقی استعارہ آپ کی طبع نازک پر گراں گذرے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ظرافت کا نقش حماقت کے پس منظر کے بغیر ابھر ہی نہیں سکتا۔ بقول غالب ع۔ ظرافت بے حماقت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

ہم لائل پور کی انجمن احمقان، اور دہلی کی انجمن ترقی ظرافت دونوں کا (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

یہ ہے کہ معمار اپنی تعمیر کو حقیقت میں لانے سے پیشتر اسے اپنے تصور میں دستور کرتا ہے۔ ہر محنت کے عمل کے خاتمے پر ہم وہی نتیجے کو پاتے ہیں جو محنت کش کے ذہن میں کام کے آغاز کے وقت موجود تھا"

جب کاڈول یہ کہتا ہے کہ "شاعری کچھ معاشی سی چیز ہے" تو ہمیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کام کے بغیر کوئی معاشی جدوجہد تکمیل نہیں پا سکتی۔ اور کام "وہ عمل ہے جس کے ذریعے انسان دنیا کو اس صورت میں بدلتا ہے جس کا وہ فطرتاً خواہش مند ہے گویا دنیا کو وہ ایک "انسانی" دنیا بناتا ہے اور اس طرح خود اپنے کو بھی بدلتا ہے۔

"شاعری کچھ معاشی چیز ہے" کے معنی یہ ہیں کہ اگر کام کے ذریعے مقاصد کو سوچنے کی قوت نہ حاصل ہوتی اور پھر مزید کام کے ذریعے ان کا حصول ناممکن ہو تو شاعری کا وجود بھی امکان سے خارج ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور قریبی رشتے کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ کاڈول نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ معاشی جدوجہد ایک شعوری جدوجہد ہے، جبلی نہیں۔ انسان کا کام محض جبلت سے نہیں چلتا ہے بلکہ اس کے لئے جیسا کہ مارکس نے کہا ہے دانستہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، تاہم کام کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اُسے جبلت ہی فراہم کرتی ہے کیونکہ ہماری ساری قوت کا سرچشمہ ہمارا طبعی جسم اور اس کی جبلتیں ہیں۔ یہ جبلتیں انسان میں جو طاقت پیدا کرتی ہیں وہ صرف تبدیلی کے طویل عمل کے ذریعے وجود میں آتی ہیں۔ اس طویل عمل کے عرصے میں جبلتیں جذبات میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور جذبات خیال اور شعور کے مقاصد کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ انسان کی طاقت کا اس طرح جبلی سے شعوری بن جانا معاشی جدوجہد کا ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ ایک طرف تو معاشی جدوجہد کے نتیجے میں عمل سے مکمل تر ہوتی جاتی ہے، اور دوسری طرف معاشی جدوجہد کی ایک لازمی شرط ہے۔

شاعر اس تبدیلی کا ایک مظہر ہے جس میں انسان کی جبلی طاقت شعوری طاقت بن جاتی ہے۔ اور یہی شاعری کی معاشی تعبیر ہے۔

اپنے اس خیال کی وضاحت کے لئے کاڈول بالکل ابتدائی سوسائٹی کے فصلی گیت Harvest Song اور اس کی اہمیت کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انسان طبقوں میں منقسم نہیں ہوا تھا ——— تاہم اس زمانے میں بھی اس کی ضرورت تو بہرحال تھی ہی کہ اناج حاصل کرنے کے لئے زمین میں بیج ڈالنے سے پیشتر زمین کو تیار کیا جائے ——— اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ یہ ضروری تھا کہ انسان کی جبلی طاقت یہ خدمت انجام دے۔ لیکن انسان کی کوئی جبلت اُسے اس محنت پر رضاکارانہ طور پر آمادہ نہیں کرتی ——— اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ انسان اپنی جبلتوں کو محنت میں بدلنے کے لئے ان کو ہموار اور آمادہ کرے اور اپنے جذبات کو یکجا کر کے انھیں مفید راہ پر یعنی معاشی راہ پر لگائے (صفحہ ۲۷) یہ تھا فصلی گیت کا کام۔

یہ گیت اس زمانے کے انسانی ذہن میں اجتماعی کھیتی باڑی کے متعلق ایک خیالی تصویر کھینچتا تھا۔ اس تصویر میں زمین کو بونے، غلہ اُگنے، کھلیانوں کے غلے سے لبالب بھر جانے اور فصل کے متعلق دوسری تمام دلچسپیوں اور مسرتوں کے بارے میں بہت ہی صاف اور اثر انگیز نقشے کھینچے جاتے تھے، اور اس طرح وہ مقصد جس کے لئے جبلی طاقت کو ہموار کرنا ہوتا تھا تکمیل پا جاتا تھا۔

"جب آدمی حالت رقص میں ہوتا ہے یا جب موسیقی کی لہریں اس کی سماعت کے گرد حلقہ ڈال دیتی ہیں یا شعر کی کیفیت اُسے مسحور کر دیتی ہے تو وہ زندگی کی موجودہ حقیقتوں سے کٹ کر ایک ایسی حالت میں جا پہنچتا ہے جہاں اس فصل کا شائبہ تک نہیں ہوتا جو ابھی نہیں بوئی گئی، لیکن ساتھ ہی وہ جس نئی دنیا میں پہنچتا ہے وہاں یہ سب چیزیں خیالی طور پر اپنا وجود رکھتی ہیں۔ یہ خیالی دنیا اس کے لئے حقیقی بن جاتی ہے اور اس حد تک کہ جب موسیقی ختم ہوتی ہے تو یہ بوئی فصل اس کے سامنے ایک عظیم حقیقت بن کر آتی ہے اور پھر یہ حقیقت فصل کے تیار کرنے میں ایک زبردست محرک کا کام کرتی ہے (اور وہ چاہتا ہے کہ اس حقیقت کو اس حقیقت میں بدل دے جو اس نے خیال کی دنیا میں دیکھی تھی، جہاں لہراتے ہوئے ہرے بھرے کھیت، مسکراتے ہوئے گیہوں کے خوشے، اور غلے سے لبالب کھلیان نظر آتے تھے، اور وہ خوشیاں اور مسرتیں دکھائی دی تھیں جو فصل کے استعمال کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ مترجم) چنانچہ وہ اپنی طاقت کو جمع کرتا ہے اور مشقت اور عرق ریزی سے فصل کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے" (صفحہ ۲۷)

جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے کام کا کیا مقصد ہے (اور ساتھ ہی اس کی افادیت بھی۔ مترجم) تو اس کی تمام جسمانی طاقتیں اس کے مقصد کے حصول کے لئے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ "شعر ایک نئے مقصد کے لئے انسان کے دل کو آمادہ کرتا ہے ———"

شاعری یہی نہیں کہ تصور میں حقیقی فصل کا نقشہ کھینچ کر انسان کو اس بوئی فصل کی تیاری میں لگاتی ہے بلکہ ساتھ ہی یہ اس میں ایک ہیجانی جذبہ پیدا کرتی ہے جس سے اس میں اور اس جیسے دوسرے انسانوں کے درمیان اشتراک عمل میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، وہ مل جل کر ایک مشترک مقصد کے لئے کام کرتے ہیں اور یہ اشتراک معاشی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے ———

چونکہ شاعری اجتماعی جذبے کو بیدار کرنے اور اُسے ایک راہ پر لگانے کا نام ہے اس لئے یہ اس حقیقت کی سرحد سے پرے جس کو یہ وجود میں لانا چاہتی ہے ایک اور حقیقت کی نمائش کرتی ہے (صفحہ ۳۰) یہ نہ صرف فصل کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ساتھ ہی اس نئی اجتماعی انسانی زندگی کو بھی پیش کرتی ہے جو فصل کے استعمال سے پروان پائے گی اور باقی رہے گی ——— کیونکہ شاعری اس قدر غلہ اور فصل کو اتنی ٹھوس اور حقیقی شکل میں پیش نہیں کرتی، جتنا کہ وہ اس جذباتی، معاشرتی اور اجتماعی نفسیاتی رشتہ کو پیش کرتی ہے جو قبیلہ اور فصل کے درمیان ہوتا ہے" (صفحہ ۳۰)

"شاعری کچھ معاشی سی چیز ہے" کا مطلب یہ ہے کہ شاعری وہ معاشی جدوجہد ہے جس نے الفاظ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ کام کی روح کو ظاہر کرتی ہے۔ کام جو بظاہر بہت مشقت اور عرق ریزی سے وابستہ معلوم ہوتا ہے اور اس طرح یہ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کام ہی ہوتا ہے جو دنیا کو بدلتا ہے اور پھر ہمیں بھی بدل دیتا ہے۔ شاعری اور معاشی جدوجہد ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی عمل کے مختلف پہلو ہیں۔ دونوں ہی کے ذریعے (نہ تنہا ایک کے ذریعے نہیں) انسان اپنے کو انسان بناتا ہے اور اپنی دنیا کو ایک انسانی دنیا۔ یہی اصلی انسانی جدوجہد ہے اور اس کے ذریعے آدمی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرتا ہے۔

اس عمل سے وہ اس حد تک آزاد ہو جاتا ہے کہ وہ فطرت کی دنیا میں ایک مقصد کی ضرورت کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ یعنی یہ کہ کھیت بونے کے لئے زمین کو تیار کیا جائے اور اس میں ہل چلایا جائے اور اُگتی ہوئی فصل کی نگرانی کی جائے۔ اس طرح وہ فطری قوتوں میں ایک ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس قابل ہو جاتا ہے کہ یہ قوتیں اس کی خدمت انجام دیں۔ اس طرح وہ اس حد تک آزاد ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں ایک ضرورت کو تسلیم کرنے لگتا ہے، یعنی جبلی قوت کو شعوری قوت میں بدل دینے کی ضرورت۔ یہ جبلی قوت جو اس کے اپنے مقرر کئے ہوئے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس میں طبعی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ بقول کاڈول شعوری جبلتوں کی ضرورت کا تسلیم کرنا ہے۔ اور بجائے خود جبلتوں کی تبدیلی ہے۔ یہ آزادی کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اور خود آزادی کی ایک شکل بھی ——— آرٹ نفس انسانی کے عرفان کی ایک شکل ہے اور اپنی جگہ انسانی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ———

(صفحہ ۲۹۸) (باقی آئندہ)

کاش میں جانتا (بہ سلسلہ صفحہ ...)

کر رہا تھا۔ پولیس نے مجمع کو منتشر کرنا چاہا لیکن وہ صرف سڑک کو سواریوں کی آمد و رفت کے لئے خالی کرا پائی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جڑواں بھائیوں کو چور دروازے سے نکال دینا چاہتی تھی لیکن وہ دونوں اس پر راضی نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ——— نہ جانے دونوں میں سے کون تھا ——— کہاں بس کر دیا گیا ہوں نا؟

پھر یہ واقعہ ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کیسے۔ اگرچہ میں صرف ۶ فٹ کی دوری پر تھا۔ مجمع آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک جڑواں بھائیوں میں سے ایک کسی طرح بیک چیتی ہوئی بس کے سامنے آ گیا۔

اس کے حلق سے خرخراہٹ کی سی ایک چیخ نکلی، اور بس وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا سر مسٹر پارکر کے سر کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ——— آسمانی عذاب؟

لاش کے پاس دوسرا ملزم کھڑا ہوا چلا چلا کر رو رہا تھا ——— کون جانے وہ قاتل تھا یا بے گناہ؟ کوئی کبھی

———

* کبھی نہ بتا سکے گا ——— اے کاش میں جانتا۔ (ترجمہ)

کاش میں جانتا

ابو حاکم

قتل کا ایسا عجیب و غریب مقدمہ میں نے اپنی عمر میں نہیں دیکھا تھا۔ اخبارات نے اسے اپنی سرخیوں میں پیکنہم کے مقدمے سے تعبیر کیا تھا۔ اگرچہ نارتھ وڈ اسٹریٹ جہاں بوڑھی عورت کو قتل کیا گیا تھا پیکنہم میں نہیں تھی۔

جب سرکاری وکیل نے مقدمہ پیش کیا تو حاضرین میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے اس کا خفیف سا امکان بھی نظر آتا ہو کہ ملزم جو ہتھکڑیاں پہنے کٹہرے میں کھڑا تھا سزا سے بچ جائے گا۔

وہ ایک بہت مضبوط اور بہت بدصورت آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں خونی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری طاقت اس کی رانوں میں سما گئی ہے ——— بدصورت آدمی کو کوئی نہیں بھلا سکتا ——— اور یہ ایک بہت اہم نکتہ تھا۔ اس لئے کہ تاج کی طرف سے چار گواہ پیش ہوئے جو ملزم کو نہیں بھولے تھے، اور جنھوں نے اسے چھوٹے سرخ رنگ کے مکان سے نارتھ وڈ اسٹریٹ میں بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

مسز سالومن سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں کہ انھوں نے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ سمجھیں یہ انھیں کا دروازہ ہے۔ وہ فوراً کھڑکی کے پاس گئیں اور ایڈم کو (ملزم کا نام یہی تھا) مسز پارکر کے گھر کی سیڑھیوں پر دیکھا وہ اسی وقت باہر آیا تھا اور دستانہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا بھی تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نے ہتھوڑا سامنے کے دروازے سے بچے کے درخت کے تنے میں پھینک دیا۔ پھر بھاگنے سے قبل اس نے مسز سالومن کی کھڑکی کی طرف دیکھا ——— شاید اس ڈر سے کہ ممکن ہے کوئی اسے دیکھ رہا ہو ——— اور اسی حرکت کی وجہ سے گلی کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ گیا ——— وہ ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں ڈر سے کھلی ہوئی تھیں، بالکل اس جانور کی طرح جسے مارنے کے لئے کونے میں اٹھایا جا رہا ہو۔

میں نے مسز سالومن سے بعد میں گفتگو کی جو قدرتی طور پر اس مقدمے کے حیرت انگیز فیصلے کو سن کر خوف سے سہمی ہوئی تھیں، اور میرا خیال ہے یہی حال سب گواہوں کا تھا۔ ہنری جو فلیٹ اسٹریٹ سے دیر میں واپس آ رہا تھا، اور جس کی موٹر نارتھ وڈ اسٹریٹ کے نکڑ پہ چراغ اور خوف زدہ ایڈم دیکھتے دیکھتے بچا تھا، اور بوڑھا وہیلر جو کرسی گرنے کی سی آواز سے جاگ گیا تھا، اور فوراً اٹھ کر مسز سالومن کی طرح اپنی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تھا ———

اس نے بھی ایڈم کی شکل دیکھی اور جب وہ مڑا تو اس کی خوفناک آنکھیں اور پریشان چہرہ گلی میں ایک دوسرے چراغ نے بھی دیکھا تھا۔

قسمت بھی طرح طرح اس کی مخالف تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے دن دہاڑے یہ قتل کیا ہو۔

"میں جانتا ہوں" سرکاری وکیل نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "وکیل صفائی اپنی بحث میں یہ دعویٰ کرے گا کہ ملزم کی شناخت غلط کی گئی ہے۔ ایڈم کی بیوی بھی آپ سے کہے گی کہ ایڈم ۱۴ فروری کو ۲ بجے رات کے وقت اس کے پاس تھا۔ لیکن جب آپ سرکاری گواہوں کی باتیں سن لیں گے اور غور سے قیدی کا حلیہ ملاحظہ کر لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دل میں غلط شناخت کا خیال بھی نہ لائیں گے۔"

لاش پانے والے سپاہیوں اور اس کا معائنہ کرنے والے سرجن کی گواہیوں کے بعد مسز سالومن کی پکار ہوئی۔ وہ ایک مثالی گواہ تھی۔ رحم، ایمانداری اور فکر کے جذبات اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ خطرے سے بے نیاز ہو کر بے دھڑک بولی۔ اس کے دل میں کسی طرح کا کینہ نہ تھا اور نہ اسی اس اہمیت کا احساس تھا کہ وہ مرکزی عدالت فوجداری میں ایک سرخ گون پہنے ہوئے جج کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اس کے الفاظ بڑے غور سے سن رہا ہے ——— اس نے کہا "ہاں میں سیڑھی سے نیچے اتری، اور میں نے پولیس اسٹیشن کو فون کیا"

"اور تم اسی آدمی کو عدالت میں دیکھ رہی ہو"

اس نے اپنے سامنے خونی آنکھوں والے بے ڈھنگے آدمی کو کٹہرے میں دیکھا جو اسے سختی کے ساتھ اپنی غیر جذباتی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا۔ "یہی آدمی ہے"

"تمھیں بالکل یقین ہے"

اس نے سادگی سے کہا۔ "جی مجھ سے غلطی نہیں ہو سکتی"

"اچھا شکریہ" جج نے وکیل صفائی کو جرح کو کہتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ نے بھی قتل کے مقدموں میں اتنی ہی بار شرکت کی ہے جتنی میں نے تو آپ پہلے سے سمجھ جائیں گے کہ وکیل صفائی کیا رویہ اختیار کرے گا۔"

"مسز سالومن! تمھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایک شخص کی موت اور زندگی تمہاری شہادت پر منحصر ہے"

"مجھے یاد ہے"

"تمہاری بینائی بالکل درست ہے"

"مجھے کبھی چشمے کی ضرورت نہیں پڑی"

"تم ایک پچپن سالہ عورت ہو"

"نہیں، چھپن سال"

"اور پھر بھی تم نے اس آدمی کو سڑک کے دوسرے کنارے سے دیکھ لیا"

"جی، ہاں"

"یہ رات کے دو بجے کا وقت تھا، اور تب تو تمھاری آنکھیں بہت ہی اچھی رہی ہوں گی"

"نہیں جناب۔ چاندنی چمکی ہوئی تھی اور جب آدمی نے اوپر دیکھا تو روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی"

"اور تمھیں بالکل شبہ نہیں کہ جو آدمی تم نے دیکھا وہ یہی قیدی تھا؟"

مجھے معلوم نہیں وکیل کیا بات کہنا چاہتا تھا کہ اس جواب کے علاوہ جو اسے ملا اور کسی جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔

"ذرا بھی شبہ نہیں حضور، یہ چہرہ ایسا نہیں جسے بھلایا جا سکے"

وکیل نے مڑ کر حاضرین پہ نگاہ کی، پھر بولا "عدالت میں جو لوگ موجود ہیں انھیں غور سے دیکھنے کو، تم بسا توۃ مانو گی؟" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد خود ہی آواز دی۔ "ذرا مسٹر ایڈم کھڑے ہو جاؤ" اور پیچھے سے ایک مضبوط، قوی ہیکل، خونی آنکھوں والا آدمی کھڑا ہو گیا ——— وہ کٹہرے والے ملزم کی ہو بہو تصویر تھا۔ اس کا لباس بھی وہی تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ، اور دھاری دار ٹائی۔

"اب مسز سالومن خوب سوچ لو، کیا اب بھی تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ جس آدمی کو تم نے مسز پارکر کے باغیچے میں ہتھوڑا پھینکتے ہوئے دیکھا تھا وہ یہی قیدی ہے، اور یہ آدمی نہیں جو اس کا جڑواں بھائی ہے؟"

وہ قسم ہرگز نہیں کھا سکتی تھی، اس نے ایک پر نظر ڈالی اور پھر دوسرے پر، اور ایک لفظ بھی نہ بولی۔ وہی بے رحم وحشی جو کٹہرے میں ہاتھی مارے بیٹھا تھا، وہی حاضرین عدالت کے پیچھے کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا، دونوں مسز سالومن کو غضب ناک آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مقدمہ ختم ہو گیا، کوئی گواہ قسم کھانے کو تیار نہ تھا۔

اس طرح وہ آدمی کمزور شہادت کی وجہ سے بری کر دیا گیا، لیکن مجھے اس سے واسطہ نہیں کہ قتل اس نے کیا یا اس کے جڑواں بھائی نے، یا اسے سزا ملا یا نہیں، مجھے تو یہ بتانا ہے کہ اس غیر معمولی مقدمے کا انجام ایسا غیر معمولی ہوا جو خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ میں مسز سالومن کے ساتھ عدالت سے باہر آیا اور ہم مجمع میں گھس گئے جو ان جڑواں بھائیوں کا انتظار

(بقیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

پرل بک سے ملئے

زہرہ سیّدین

پرل بک امریکہ میں پیدا ہوئی۔ چھوٹی سی عمر میں اس کے والدین جو مشنری کی حیثیت سے چین جا رہے تھے، اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کا بچپن کا زمانہ دریائے ینگ سی کے کنارے شہر چانگ کیانگ میں گذرا۔ پندرہ برس تک اس کی تعلیم و تربیت اس کی ماں ہی نے کی۔ اور پرل بک کو ادب سے جو لگاؤ ہے اس کا سہرا اس کی ماں ہی کے سر ہے۔ پرل بک کا بیان ہے کہ میری ماں ہی نے مجھے اس حسن سے آشنا کیا جو الفاظ اور اُن کے معنی میں جھلکتا ہے۔

امریکہ میں اُس نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ گریجویٹ بنی اور پھر چین واپس چلی آئی۔ ۱۹۱۷ء میں اس کی شادی ایک نوجوان امریکن ڈاکٹر جان بک سے ہوگئی۔ ڈاکٹر بک بھی ایک مشنری تھا جو کاشتکاری کا کام کرتا تھا۔ پرل نے خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ اس ملک میں کام شروع کر دیا۔ جسے وہ اپنے وطن کی طرح عزیز رکھتی تھی اور جس میں اُسے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گذارنا تھا۔ آیندہ پندرہ سال، سے نان کنگ ہی میں اپنا گھر بنانا تھا، اور اپنی دونوں بیٹیوں کی پرورش کرنی تھی۔ اسی یونیورسٹی میں وہ ادب کی پروفیسر مقرر ہوئی اور اس نے اپنی مشہور و مقبول کتابیں لکھیں۔

اس نے چینی کسانوں کو اپنی بنجر زمینوں کی کاشت میں جان توڑ کوشش کرتے دیکھا، اور ان افلاس زدہ مردوں اور عورتوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جو اپنی مصیبتوں کی رواداری، سمجھداری، خلوص اور وفاداری سے برداشت کرتے تھے۔ اس کی لاثانی کتاب "گڈ ارتھ" اس گہرے مطالعے کا پھل ہے اور یہ وہی کتاب ہے جس نے امریکی ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ اس پر مختلف انعامات دیے گئے۔ اس کا ایک بہت مقبول فلم بنایا گیا اور ۱۹۳۸ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلی امریکن خاتون تھی جسے یہ بے مثال اعزاز نصیب ہوا اس کی بعض اور تصانیف ہیں جن پر انعامات دیے گئے اس کے ماں اور باپ کی مشہور سوانح عمریاں The Exile اور Fighting Ange[l] شامل ہیں۔

اس کا مقصد اس پیچیدہ دنیا کے مسائل کو ان کی حقیقی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اس نے بچوں کی بہادری کی تصویریں، بچوں کی کہانیاں اور کتابوں میں لکھی ہیں۔ اس کی ایک کتاب میں ایک جاپانی لڑکے کی کہانی ہے جس نے اپنا سارا گھر طوفان میں تباہ ہوتے دیکھا، لیکن اس سخت صدمے کے باوجود اس نے اپنی زندگی کی نئے سرے سے تعمیر کی۔ اس کتاب پر اسے وہ خاص انعام ملا جو بچوں کی کتابوں کے لئے رکھا گیا ہے۔

ایک مرتبہ پرل نے کہا تھا کہ میں اگر ناول نہ لکھوں تو خوش اور مسرور نہیں رہ سکتی۔ مجھے ان کی شہرت اور مقبولیت کی پروا نہیں ہے۔ میں ان بدقسمت لوگوں میں سے ہوں کہ جب تک کسی ناول کے لکھنے میں مصروف نہ ہوں یا لکھنے کی تیاری نہ کر رہی ہوں مجھے اپنی زندگی خالی خالی سی لگتی ہے۔ اس کی تصانیف ۲۸ ناول اور ۲۳ بچوں کی کتابوں پر مشتمل ہیں جن میں کچھ سوانح عمریاں ہیں۔

پرل بک نے بہت مختلف ممالک کے دلچسپ لوگوں سے ملاقات کی ہے۔ اور ان کے خیالات کو اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ اس نے روس کے متعلق اپنی کتاب Talk about Russi[a] ماشا سکلوٹ سے ملنے کے بعد لکھی ہے جو ایک امریکن اخبار فروش کی روسی بیوی ہے۔ اس نے اپنا مقالہ American Argum[ent] مشہور نیگرو مغنی پال روبسن کی بیوی ایسلانڈا سے ملاقات کے بعد لکھا۔ کئی سال بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں اس کا ایک اور بہترین ناول Kinsfolk چھپا اس ناول کا پس منظر امریکہ اور چین سے لیا گیا ہے یعنی وہ دو ملک جن سے وہ بخوبی واقف ہے۔

۱۹۳۲ء میں اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ اس نے مشنری کے کام سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۳۴ء میں اُس نے اپنے پہلے شوہر ڈاکٹر بک سے طلاق حاصل کر لی اور جان ڈے پبلشنگ کمپنی میں کام شروع کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں اس کی شادی رچرڈ والش سے ہوگئی جو اس پبلشنگ کمپنی کے صدر اور رسالہ "ایشیا" کے ایڈیٹر ہیں۔

پرل بک دیہاتی زندگی کو دل سے پسند کرتی ہے شہروں کی زندگی کو وہ قریب قریب غیر مہذب اور وحشیانہ زندگی سمجھتی ہے۔ ہفتے میں صرف دو دن وہ نیویارک رہتی ہے۔ والش اور مسز والش کے پانچ لے پالک بچے ہیں۔ پرل کی اپنی دو بیٹیاں ہیں، اور چھ نواسے، نواسیاں ہیں۔ اس نے مشرقی پنسلوینیا میں ایک چھوٹے سے خوب صورت مقام پر چار سو ایکڑ زمین لے کر اپنا گھر بنا لیا ہے پرل چینی طریقوں سے بنجر زمین کو زرخیز بنانے کا گر جانتی ہے۔ اس نے دو سال تک کاشتکاری کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اب والش کے پاس گائیں، سور، بھیڑیں، خرگوش اور اصیل مرغ ہیں۔ یہ چیزیں ان کے اور اُن کے ساتھیوں کی خوراک کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ اس کے اپنی پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت ہوتی ہے۔

یہ سب کام زیادہ تر پرل بک خود ہی کرتی ہے اور اس کے علاوہ بہترین چینی کھانا بھی پکا سکتی ہے۔ فارم ہاؤس کے گرد جو صحن ہے وہ چینی وضع کا ہے اس کے پاس کچھ چینی فرنیچر بھی ہے جن میں وہ ڈیسک بھی شامل ہے جس پر بیٹھ کر نان کنگ میں اس نے "گڈ ارتھ" لکھی تھی۔

پرل کا دن بہت مصروفیت میں گذرتا ہے وہ صبح چھ بجے اُٹھ کر سب سے پہلے باغبانی کرتی ہے۔ پھر دوپہر تک لکھتی رہتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ چینی میں سوچتی ہے اور پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرتی جاتی ہے۔ دوپہر کا وقت پڑھنے، کھیتی کی دیکھ بھال کرنے اور اپنے بچوں کے کام کے لئے مخصوص ہے۔ شام کو زیادہ تر ایسٹ ویسٹ ایسوسی ایشن کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک تہذیبی ایسوسی ایشن ہے جس کی بنیاد خود پرل نے رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ اور ایشیا کے باشندوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کی جائے

(ترجمہ)

دو کتابیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی سلامت روی اس ہنگامہ و آشوب میں بھی قائم رہی ہے ممکن ہے حالی نے اس ترکیب کے لکھنے میں غلطی کی ہو یا جدت برتی ہو، لیکن جن لوگوں نے حالی کا صحیح مطالعہ کیا ہے وہ پیروئ مغرب سے مراد مغربی شاعری کی تقلید ہی لے سکتے ہیں اور کچھ نہیں مغربی تبریزی شاعر تصوف کا ذکر قطعی بے محل اور مہمل سی بات ہے۔

"اردو ڈرامہ" اور "غالب" دونوں مضمون دلچسپ ہیں دونوں میں خارجی تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے احتشام حسین ادب کو سماجی پس منظر کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اصول ادب اور زندگی کی نشو و نما کے عمل کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ان تنقیدی مضامین کی ایک اہمیت ہے۔ لیکن اب ہم اردو کے ایسے بلند پایہ نقادوں سے جیسے کہ احتشام حسین ہیں، یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تنقید پر کوئی مستقل تصنیف پیش کریں گے اس کے علاوہ ہر وہ مضمون جو کسی رسالے کے لئے لکھا جائے، کتاب میں شامل کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اگر وہ شامل ہی کیا جائے تو نظر ثانی کے بعد۔ افسوس ہے کہ مصنف کو اس کی مہلت نہیں مل سکی۔

جائے۔ اور جس غزل یا نظم کے اثرات دیر پا ہوں اس کو بہترین قرار دیا جائے مفہوم کا مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ بعض غزلیں یا نظم انسان کو عارضی ہیجانی اور سطحی طور پر متاثر کرتی ہیں اور بعض کا اثر شدید اور دیر پا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں ہنگامے کا شائبہ نہیں ہوتا۔ بعض جنسی جذبات کو براہ راست اپیل (متاثر) کرتی ہیں اور بعض صرف دل کے نازک تاروں (صرف شاعرانہ زبان میں) کو چھو لینے پر اکتفا کرتی ہیں۔ بعض فلسفیانہ اور صوفیانہ نکات انسان کو اس مادی دنیا سے بلند کر کے تصور کے عالم بالا میں پہنچا دیتے ہیں اور بعض سطح زمین سے ایک قدم اوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ لہٰذا تجربہ کرنے کے قبل اس بات کا تعین کر لینا چاہئے کہ کن کن کیفیات اور تاثرات کو نظم یا غزل کی عمدگی کا معیار قرار دیا جائے گا اور اس کے بعد سائنسی بنیاد پر ان کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس قسم کے تجربات کے قبل معمول کے چنائے میں کافی احتیاط برتنی چاہئے اور نفسیاتی تجزیے کے بعد صرف مستند اور غیر مریضانہ ذہنیت کے مالک افراد کو منصفین کا درجہ دینا چاہئے میرا خیال ہے کہ بعض لوگ بالکل جاہل اور کندۂ ناتراش افراد کو بحیثیت منصفین ترجیح دیں گے۔ کیونکہ ایسے افراد کے فیصلے عصبیت سے پاک اور سہرا ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعری اصطلاحی چیز ہے اور اس کو پسند یا ناپسند کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لئے منصفین کی حیثیت سے فنکاروں ہی کا انتخاب زیادہ مفید ہوگا۔ حالانکہ بعض حالات میں ان کے ذاتی نظریات اور تعصبات ان کی قوت فیصلہ کو ضرور متاثر کریں گے۔ لیکن اس کا علاج اس طرح ممکن ہے کہ ان کو حتیٰ الامکان ذاتی تعصبات کو پرے رکھ دینے کی ہدایت کر دی جائے۔ ان تجربات کو قطعی سائنسی حیثیت دینے کے لئے ہمیں مختلف معمولوں پر مختلف اوقات میں تجربہ کرنا ہوگا اور صرف یہی نہیں بلکہ ہر ایک معمول کو ایک خاص نظم مختلف اوقات میں سنائی جائے گی۔ تاکہ غلطی کا کم سے کم امکان ہو، مختلف اوقات پر تجربے کے دہرانے کی افادی حیثیت یہ ہے کہ بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان کی طبیعت پژمردہ ہوتی ہے اس وقت شعر کیا بڑی سے بڑی دنیاوی مسرت دل کو خوش کرنے سے قاصر رہتی ہے، لیکن کچھ لمحات میں جب طبیعت حاضر رہتی ہے معمولی سے معمولی شعر میں مزا آ جاتا ہے۔ اس لئے مختلف اوقات کے نتائج کا اوسط نکال کر ہر فرد کے انفرادی فیصلہ کا تعین کیا جائے گا۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ افراد کے جمالیاتی ذوق کے تعین کے لئے سانس کا اتار چڑھاؤ اور خون کی گردش کی تیزی یا سستی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سانس کی گہرائی اور رفتار کے تعین کے لئے نموگراف نام کا ایک آلہ استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح نبض کی رفتار اسفگموگراف سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ ان آلات کی مدد سے کافی صحیح حد تک جمالیاتی ذوق پر جسمانی اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پروفیسر مائیرس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو تیز قدمی کے عادی ہیں اس راگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جس میں آواز کا زیروبم شدید ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

یو، این، او کی ایک جھلک

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

روسیوں کو اپنی کوئی تجویز منظور کرانے کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ تقریریں کرتے ہیں، ووٹ دیتے ہیں اور جلسہ ختم ہوتے ہی خدا جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔

دنیا کو زیادہ دلچسپی ان معاملوں سے ہے جن پہلی کمیٹی میں بحث ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اس تجویز سے کہ ایٹمی قوت کے استعمال کا مسئلہ بین قومی عدالت میں پیش کر کے اس کا عدالتی فیصلہ کرایا جائے۔ سب کو بہت اطمینان ہو گیا۔ اس لئے کہ سب اس بحث سے عاجز آ گئے تھے لبیا کے معاملے میں بھی ہندوستان کی تحریک سے بعض بنیادی باتیں بحث سے پہلے ہی مان لی گئیں۔ گفتگو بیشتر موضوع کے قریب ہی رہی اور اب امید ہے کہ دو ایک روز میں لبیا کے بارے میں خاطر خواہ فیصلہ ہو جائے گا۔ اس درمیان میں جنوبی امریکہ والوں نے یہ کہہ کر کہ ہم پہلے یہ منوالیں کہ اٹلی کو سومالی لینڈ کا متولی مقرر کیا جائے گا تب لبیا کے معاملے میں ہندوستان، برطانیہ اور متحدہ پاکستان کی تجویز کو منظور کریں گے۔ سب کو ذرا گھبرا دیا۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ لبیا، ایریٹریا اور

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

سومالی لینڈ کے مستقبل پر الگ غور کیا جائے گا اور اس کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ ملتوی ہی نہ رکھا جائے گا، جب تک کہ سب کے بارے میں سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ اریٹریا کے مستقبل پر عام گفتگو کے دوران میں پاکستان اور حبش کے درمیان ذرا چشمکیں ہو گئیں۔ اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا۔

آپ کا مخلص
محمد مجیب

بزمِ بے تکلف
بسلسلہ صفحہ ۵

خیر مقدم کرتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہند اور پاکستان کے اینٹھے ہوئے تعلقات کو درست کرنے کا مسئلہ جسے انجمن اقوام کی حکمت اور فطرت اب تک حل نہیں کر سکی ہے، ان دونوں انجمنوں کی حماقت اور ظرافت سے حل ہو جائے ✚

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۳۰	۲۴ر نومبر ۴۵ سنہ ع	ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

لو ، اِن کے جلسے میں

پروفیسر محمد مجیب

اس دنیا میں جہاں آئے دن کسی کی کسی سے لڑائی ٹھنتی ہے اگر ایسا اِدارہ بن جائے جس کا مقصد لڑائی کی روک تھام کرنا ساتھیوں کی طرح رہنے کے گُر سکھانا ہو تو اس پر کوئی بھروسا نہیں کرتا ، جسے دیکھئے وہ کہتا ہے کہ سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے روپئے اور زور سے گولے بارود سے اور بم سے ، یعنی دوسرے کو تباہ کرنے کی طاقت سے ہوتا ہے ۔لیکن جب لڑائی کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے ، جانیں ضائع ہوتی ہیں ، ملک برباد ہوتے ہیں تو پھر سب ہائے ہائے بھی کرنے لگتے ہیں

وہ آدمی بڑا بدقسمت ہے جسے دیکھنے کو آنکھیں نہ ملی ہوں ، مگر وہ لوگ جو دنیا میں سبھی کچھ دیکھ سکتے ہیں ۔ اپنی آنکھوں کا حق ادا نہیں کرتے ۔ ہم پاس کی چیز کو دیکھنے میں تو دور کی چیز کو بھول جاتے ہیں ، دور کی چیزوں پر نظر جاتے ہیں تو اس طرح کہ آس پاس جو کچھ ہے وہ غائب ہو جائے ، سوچنے والے اور کام کرنے والے اکثر اسی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں کہ وہ قریب اور دور کی بات کو ایک ساتھ نہیں سوچتے ، آج کا کل ایک زمانے کا دوسرے زمانے سے جو سمبندھ ہے اُسے زبردستی توڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس توڑ پھوڑ کے بغیر کوئی چیز نہیں بن سکتی ، کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا اس دنیا میں جہاں آئے دن کسی کی کسی سے لڑائی ٹھنتی ہے ، اگر ایسا ادارہ بن جائے جس کا مقصد لڑائی کی روک تھام کرنا ، ساتھیوں کی طرح رہنے کے گر سکھانا ہو تو اس پر کوئی بھروسا نہیں کرتا ، جسے دیکھئے وہ کہتا ہے کہ سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے روپئے سے اور زور سے ، گولے بارود سے اور بم سے ، یعنی دوسرے کو تباہ کرنے کی طاقت سے ہوتا ہے لیکن جب لڑائی کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے ، جانیں ضائع ہوتی ہیں ملک برباد ہوتے ہیں تو پھر سب ہائے ہائے بھی کرنے لگتے ہیں ۔ دنیا کے پالن ہار سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں کسی طرح عذاب سے بچا ، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہیں ، دوستی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں ، اور پھر جیسے ہی لڑائی بند ہوتی ہے ، زندگی راہ پر آ جاتی ہے سب امن و دوراندیشی کی باتوں پر ہنسنے لگتے ہیں ، کہتے ہیں کہ صبر اور شانتی سے کام نکالنے کی کوشش کرنا بے کار ہے ۔ اصل چیز طاقت ہے ، طاقت ۔

۱۹۱۹ء میں جو لیگ قائم ہوئی تھی وہ اسی وجہ سے بے اثر ہو گئی ۔ طاقت والوں کے دل سے یہ خیال کیسے نکلتا کہ اصل چیز طاقت ہے ۔ جب سب کا بھروسا طاقت ہی پر تھا ، مگر آپ کو یاد ہے کہ یہی طاقت ور قومیں کیسی پریشان ہوئیں جب لیگ کی ساکھ جاتی رہی اور ہر ایک کو اپنے بچاؤ کی فکر کرنی پڑی ۔ یو ، این کو قائم ہوئے چار سال ہوئے ہیں اور ابھی سے بعض سیاست داں جن کی باتوں کا بہت اثر ہوتا ہے دبی آواز سے کہنے لگے ہیں کہ اس نظام سے کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچ سکتا ، اس لئے کہ جمہوری اور کمیونسٹ قوموں کا اختلاف بہت بڑھ گیا ہے ۔ اب یہ دنیا کے سمجھ دار لوگوں پر ہے کہ ایسی بات نہ مانیں ، یہ دیکھ کر کہ یو ، ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا اس پر بھروسا کرتے اور تھوڑا تھوڑا کرکے اس کے اثر کو بڑھاتے رہیں ۔ نہیں تو پھر دنیا تباہی کے اتھاہ غار میں گر جائے گی ، اور اب تباہی کا ایسا سامان تیار ہو رہا ہے کہ شاید کوئی بھی دیس سلامت نہ رہ سکے گا ۔

طاقت ور جمہوری قوموں کو شکایت ہے کہ یو ، ان میں اُن کی بہت سی باتیں مانی نہیں جاتی ہیں ، اور جو مانی جاتی ہیں وہ اتنی حجت اور تکرار کے بعد کہ اس سے انھیں تسلی نہیں ہوتی ۔ یہاں روس اور دوسری کمیونسٹ قوموں کے نمائندے جو جی میں آتا ہے کہتے ہیں ، ان کے اعتراض ہمیشہ ایک ہی ڈھنگ کے ہوتے ہیں ۔ ان کو صرف اپنی بات کہنے سے مطلب ہوتا ہے ۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ اپنی بات کہہ کر اور دوسرے کی سن کر ، کچھ رکھ کر ، کچھ چھوڑ کر کسی ایسے نتیجے پر پہنچیں جسے سمجھوتا کہا جا سکے ۔ اس طریقے کو وہ چار سال سے برت رہے ہیں ، اور اس کے آثار نظر نہیں آتے کہ وہ اپنی عادت کو بدلیں گے ۔ حفاظتی کونسل میں وہ کوئی تجویز پاس نہیں ہونے دیتے جو ان کی مرضی کے خلاف ہو اور تجویزوں کو نامنظور کرنے کے حق سے وہ ۲۷ مرتبہ فائدہ اُٹھا چکے ہیں (بقیہ صفحہ ۱۲پر)

فہرست مضامین

یو ، ان کے جلسے میں	پروفیسر محمد مجیب	۱
گاندھی جی فلسفی اور ادیب	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو	(اداریہ)	۳
دنیا کی رفتار :-		
۱- ہندوستان	ع ، ح	۴
۲- پاکستان	ع ، ل	۴
بزم بے تکلف		۵
آنسوؤں کا گیت	قضا اعظمی	۵
بچے اور ان کی جبلت	سید محمد حسنین	۶
ٹھڈی (افسانہ)	راج رتنم	۷
فریب نظر (درحقیقت)	منہاج برنا	۱۱

قیمت فی پرچہ ۳ر

گاندھی جی ——— فلسفی اور ادیب

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

دراصل گاندھی جی کے فلسفے میں کوئی خیال نیا نہیں۔ یہ سب تصورات قدیم ہندی فلسفے میں پائے جاتے ہیں۔ نئی چیز وہ ربط ہے جو گاندھی جی نے ان میں پیدا کیا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کی ایک ایک کڑی کو اپنی زندگی میں عمل اور تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد قابلِ قبول سمجھا۔ مشہور حکیموں میں گاندھی جی سے پہلے فلسفے کے اصول روزمرہ کی عملی زندگی سے اخذ کرنے کی خصوصیت سقراط میں پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں اور بھی باتیں ہیں مشترک جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دونوں کے ہاں فلسفے کی بحثوں میں زندگی کی حرکت اور حرارت ہے جس کی وجہ سے اس کی حدود ادب سے مل جاتی ہیں۔

اگر ہم فلسفی اور ادیب کی منطقی تعریف کے جھگڑے میں نہ پڑیں اور سیدھے سادے لفظوں میں ان دونوں اصطلاحوں کا مطلب سمجھانا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں فلسفی وہ ہے جو دنیا کی اور انسانی زندگی کی حقیقت کو خواہشات اور جذبات سے الگ ہو کر مجرد ذہنی تصورات کی مدد سے سمجھے اور سمجھائے، اور ادیب وہ ہے جو اس حقیقت کو فکر، احساس اور آرزو کی سموئی ہوئی نظر سے دیکھے اور دکھائے۔ جب تک انسانی ذہن میں تازگی، سادگی اور بے ساختہ پن موجود تھا فلسفی اور ادیب دونوں زندگی اور دنیا کا براہِ راست مشاہدہ کر کے اپنی ذاتی فکر کے نتیجوں کو فلسفے اور ادب کے نام سے پیش کرتے تھے مگر جب یہ ذہن روایات کے بوجھ میں دب کر جولانی اور اُپج سے محروم ہو گیا تو فلسفی اُسے کہنے لگے جو روایتی فلسفے کے چشمے سے اور ادیب اُسے جو روایتی ادب کی عینک سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرے۔ فلسفی اور ادیب کا یہ تصور لوگوں کے ذہن میں اتنا جم گیا ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو دنیا اور زندگی کا عکس کتابوں کے دھندلے آئینے میں دیکھنے کے بجائے ان کا سیدھا اور صاف مطالعہ کرے تو وہ اسے فلسفی اور ادیب کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک بے ضابطہ سوچنے والا اور بے قاعدہ لکھنے والا مان لیں گے۔ گاندھی جی بھی ان فلسفیوں اور ادیبوں میں سے ہیں جن کے فلسفے اور ادب کو ہم رسم و روایات قاعدے اور ضابطے کے پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے، صرف اصلیت اور حقیقت کے کانٹے پر تول سکتے ہیں۔

جہاں تک گاندھی جی کے فلسفے کا تعلق ہے ظاہر ہے اس پر اس مختصر مضمون میں تفصیلی بحث تو ہو نہیں سکتی ہم صرف اُن کے حیات و کائنات کے بنیادی تصور پر ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُن کی فلسفیانہ فکر کا موضوع اور مقصد کیا ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں "وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے، جس کی آرزو اور سعی میں تیس سال سے بے چین ہوں، معرفتِ نفس، دیدارِ الٰہی، حصولِ موکش ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے، یہی میری زندگی ہے۔ میری تحریر و تقریر کا، میری ساری سیاسی جدوجہد کا یہی مقصد ہے"

اس کے معنی یہ ہیں کہ عہدِ قدیم کے مشرقی فلسفیوں کی طرح گاندھی جی کے ہاں بھی فلسفے اور مذہب کی حدود الگ الگ نہیں ہیں بلکہ اُن کے موضوعِ فکر میں مابعد الطبیعیات اور الٰہیات ایک دوسرے سے ملے جلے ہوتے ہیں، اور ان کا مقصد صرف نظری نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ عہدِ جدید کے فلسفی ان چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ الٰہیات سے انھیں عام طور پر دلچسپی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو وہ صرف سرچشمۂ حقیقت کا پتہ چلانے تک محدود ہوتی ہے مگر گاندھی جی اس کے علاوہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا پتہ چلانے کے بعد روحِ انسانی کو وہاں تک پہنچانے اور سعادتِ ابدی کا وہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں جسے مذہب کی اصطلاح میں نجات کہتے ہیں۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ موضوع اور مقصد کے لحاظ سے تو گاندھی جی کی فکر عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے لیکن سوچنے کا طریقہ انھوں نے ایسا اختیار کیا ہے جو عہدِ جدید کی علمی تحقیق کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ فلسفے کی تعریف میں عہدِ جدید کی یہ خصوصیت سمجھی جاتی ہے کہ بیکن سے لے کر کانٹ تک مفکروں کے ایک پورے سلسلے نے نظریۂ علم کے مسائل پر غور کر کے تجربے اور مشاہدے کے طریقِ تحقیق کی نشو و نما دی۔ یوں تو یہ طریقہ یونانیوں کے ہاں موجود تھا اور عربوں نے اسے خاصی ترقی دی تھی، لیکن عہدِ وسطیٰ میں اسے ترک کر دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ بے سروپا خیال آرائیوں میں پڑ گیا اور حقیقی علمی ترقی رک گئی۔ عہدِ جدید کے ہراولوں نے اسے پھر سے زندہ کیا اور تکمیل کو پہنچایا اور اس کے فیض سے علومِ طبیعی نے جو سائنس کہلاتے ہیں حیرت انگیز ترقی کی۔ گاندھی جی نے جدید فلسفے یا سائنس کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ لیکن جب وہ بیرسٹری کا ڈپلوما لینے کے لئے انگلستان گئے تو انھوں نے اصولِ قانون کا مطالعہ کیا اور اپنے خداداد ذوقِ صحیح کے بدولت علمی طریقِ فکر کو اپنا لیا۔ جتنی چیزیں علمی مشاہدے کے لئے ضروری ہیں ——— احساسِ ذمہ داری، ذہنی دیانت، صبر، احتیاط، جذبات اور خواہشات سے الگ ہو کر ہر چیز کو معروضی نظر سے دیکھنا۔ اپنے مشاہدے کے نتائج کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے اصلیت میں ڈوبی ہوئی سادگی کے ساتھ بیان کرنا۔ غرور اور ادعا کے بجائے عاجزی اور انکساری سے کام لینا ——— وہ سب گاندھی جی میں اسی حد تک موجود تھیں جتنی آج کل بڑے سے بڑے فلسفی یا سائنس داں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اُن کے مذہبی جذبے نے ان صفات میں اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ وہ ان تجربوں کے متعلق جو انھوں نے تلاشِ حق میں کئے فرماتے ہیں:-

میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں میں انھیں اس سے زیادہ قابلِ وثوق نہیں سمجھتا جتنا ایک دیانت دار سائنس داں اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ بہت صحت کے ساتھ خوب سوچ بوجھ کر ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے تجربے کرتا ہے، مگر پھر بھی اسے یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اسے حاصل ہوئے وہ آخری اور قطعی ہیں بلکہ وہ ان میں ترمیم اور اصلاح کی گنجائش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدۂ باطن سے کام لیا ہے۔ اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے۔ لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ آخری اور قطعی یا خطا سے بری ہیں۔ البتہ اتنا دعویٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لئے یہ نتیجے بظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لیا ہے کہ کس نتیجے کو قبول کروں اور کسے رد کر دوں۔ اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئی اس پر عمل کیا۔"

اس جدید علمی طریقِ فکر سے کام لیتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی دو تہائی زندگی تلاشِ حق میں صرف کی۔ اس کے نتائج کو انھوں نے مختلف تقریروں اور تحریروں میں عام طور پر عملی مسائل کے سلسلے میں بیان کیا ہے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو مسلسل اور مدلل نظریوں کی لڑیوں میں پرونا رسمی اور مکتبی فلسفیوں کا کام ہے۔ مگر گاندھی جی کے بنیادی تصور کا جو سرسری خاکہ پیش کیا جاتا ہے اس سے اتنا اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے اور اس سے نہ صرف مذہبی اور اخلاقی بلکہ علمی فائدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی کے فلسفے کا لبِ لباب آپ کو ذیل کے ٹکڑوں میں مل جائے گا۔

(۱) "میرے نزدیک حق اصل اصول ہے جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں یہاں حق سے مراد

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ر نومبر ۱۹۴۹ء

موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

یوں تو کوئی تیس سال سے لیکن خاص طور پر پچھلے پانچ برس سے ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دل و دماغ پر سیاست چھائی ہوئی ہے، یہ ایک قدرتی بات ہے، اس لئے کہ یہ زمانہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں زبردست سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا ہے جن سے قوموں کی زندگی میں کایا پلٹ ہو رہی ہے مغرب کے بڑے بڑے سامراج لڑ کٹ گئے اور ٹوٹتے جاتے ہیں، مشرق کی بہت سی قومیں غلامی کا جوا اتار کر آزاد ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ دونوں جگہ زندگی کے مختلف نئے پرانے سیاسی اور معاشی نظام آپس میں ٹکرا رہے ہیں، اس لئے ہر ذی حس آج کل یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟ سیاسی اور معاشی زندگی کے یہ مختلف دھارے مجھ پر میرے ملک پر اور دنیا پر کیا اثر ڈالیں گے؟ مجھے فرد کی حیثیت سے اور جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ان میں سے کس کا ساتھ دینا چاہیئے، اور کس سے دور رہنا چاہیئے؟

سیاست سے یہ گہری دلچسپی سمجھ دار نوجوانوں میں خاص کر طالب علموں میں اور بھی زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ بھی قدرتی بات ہے۔ نوجوانوں کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا دل قلب زندگی کی ہر ایک حرکت کے ساتھ دھڑکتا ہو اور طالب علم کا کام ہی یہ ہے کہ اس جذباتی تاثر کو منضبط کرے اور فکر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ ہمارے معلم اور رہنما کہا کرتے ہیں کہ طالب علموں کو سیاست سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان کو سیاسی معاملوں پر غور اور بحث نہیں کرنا چاہیئے۔ تعلیم اگر زندگی کے لئے تیار کرتی ہے تو وہ سیاست کو جو زندگی کا ایک نہایت اہم جزو ہے کیونکر نظر انداز کر سکتی ہے۔ ہندوستان اب ایک آزاد جمہوری ریاست ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی سیاست کی تشکیل کسی چھوٹے سے "گٹ" کی مرضی سے نہیں بلکہ عام شہریوں کی رائے سے ہوگی پھر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ طالب علم جن میں سے بعض بلوغ کی عمر کو پہنچ کر ابھی سے ریاست کے شہری بن چکے ہیں اور باقی بہت جلد بننے والے ہیں، اپنے ملک کے اور دنیا کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اور ان کے متعلق رائے قائم کرنے کی کوشش نہ کریں؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آج کل طالب علموں کو سیاست سے جو تعلق ہے وہ اس قسم کا قدرتی اور صحت مندانہ تعلق نہیں جس کا ہم نے ذکر کیا۔ ہمارے ہاں تو پچھلے چند سال سے یہ رجحان نظر آتا ہے کہ طالب علموں کی الگ الگ انجمنیں سیاسی پارٹیوں کے سایہ عاطفت میں بنیں، اور ان کے آلہ کار کے طور پر سیاسی تبلیغ یا سیاسی ایجی ٹیشن کا کام کریں۔ یہ رجحان جس کے پیدا کرنے کی ذمہ داری کسی ایک پارٹی پر نہیں بلکہ سب پر ہے۔ نہایت قابل اعتراض اور تعلیم اور سیاست دونوں کے لئے نہایت خطرناک ہے۔

تعلیم کے لئے تو اس کا خطرناک ہونا ظاہر ہے عملی سیاست بڑی ہیجان انگیز چیز ہے۔ جوش میں بھرے ہوئے اور خلوص میں ڈوبے ہوئے نوجوان پر یہ بخار کی طرح چڑھتی ہے، اور اس کے جذبات اور خیالات میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ احساس میں اعتدال اور جذبات میں ضبط و توازن جس کا پیدا کرنا، ذہنی تربیت کا بڑا مقصد ہے، غائب ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنے [illegible] مشاغل کے لئے وقت نہیں ملتا اور ملے بھی تو سیاسی کام کی گرماگرمی کے بعد، ایسی ٹھنڈی چیزوں میں جی نہیں لگتا۔ اس طرح اس کے زمانہ تعلیم کی انمول گھڑیاں گذر جاتی ہیں اور جب وہ بے ضبط سہرت اور بے ربط دماغ لے کر زندگی میں داخل ہوتا ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ نعرے لگانے کے سوا کسی کام کا نہیں رہا۔ نہ معلوم کتنے ہونہار نوجوانوں کی زندگی کے کھنڈر آج ان نیتاؤں کو دعا دے رہے ہیں جنھوں نے ان کی بنیادیں مضبوط ہونے سے پہلے ان پر عملی سیاست کی عمارتیں کھڑی کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ سیاسی رنگ کی انجمنوں میں بٹ جانے کی وجہ سے طالب علموں کی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کی وہ طاقت جو اپنی تنظیم کو مکمل کرنے، اپنی مشکلوں کے حل کرنے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے اور اپنی بساط کے مطابق ملک کی تعمیری خدمت کرنے میں صرف ہونی چاہیئے تھی، آپس کے جھگڑوں میں ضائع ہو رہی ہے۔

سیاست کے لئے یہ رجحان اس وجہ سے خطرناک ہے کہ اگر طالب علموں کی انجمنیں سیاسی پارٹیوں کے ہاتھ میں آلہ کار کی طرح کام کرتی رہیں تو ہمارے ملک میں بھی مصر کی سی حالت ہو جائے گی، یعنی سیاست نوجوانوں کی شوریدہ سری ہنگامہ آرائی اور ان کے جذبات کے تلوّن کا ایک کھیل بن کر رہ جائے گی۔

اس لئے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوئی کہ سارے ہندوستان کے طالب علموں کی ایک جماعت نیشنل یونین کے نام سے بننے والی ہے جس کی رہنمائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر کی حیثیت سے کریں گے۔ اس انجمن میں ہر سیاسی خیال کے طالب داخل ہو سکیں گے، لیکن اس کی جدوجہد بالکل غیر سیاسی یعنی خالص تعلیمی اور تعمیری ہوگی۔ انجمن کے بانیوں میں بعض مقتدر سیاسی لیڈروں یعنی ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ نریندر دیو اور بالیسچے پرکاش نرائن کے نام بھی ہیں جس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ انجمن اپنے وعدوں کے باوجود عملی سیاست سے الگ نہ رہے۔ لیکن ذاکر صاحب جیسے مخلص معلم کی رہنمائی اس بات کی ضامن ہے کہ انجمن پر سیاسی رنگ نہیں چڑھنے پائے گا، اور اس کو کسی پارٹی کا آلہ کار نہیں بننے دیا جائے گا۔ ذاکر صاحب کا عقیدہ اور عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہر نوجوان کی شخصیت کا پورا احترام کیا جائے اور اسے محض ذریعے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ بجائے خود ایک مقصد سمجھا جائے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے طالب علموں کے سیاسی خیالات میں بلکہ ان کے زندگی کے نظریوں میں بھی اختلافات موجود ہیں، لیکن ان کے باوجود دو باتیں ان میں مشترک ہیں اور ہمیشہ رہیں گی:- ایک یہ کہ وہ طالب علم ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اس لئے جو مسئلے صریحی طور پر طالب علموں کے اور ہندوستانیوں کے مجموعی مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ بے شمار ہیں —— ان پر سب مل کر غور کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیئے۔ جو کام یقینی طور پر ان کی جماعت کے لئے اور سارے ملک کے لئے مفید ہیں انھیں سب مل کر انجام دے سکتے ہیں اور دینا چاہیئے اس لئے طالب علموں کے نیشنل یونین کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اب رہی یہ بات کہ اختلاف خیال کی وجہ سے یونین کے مختلف گروہوں میں ایک کشمکش رہے گی، اور کبھی کبھی دار و گیر کی نوبت بھی آ جائے گی سو یہ خطرہ ایسا ہے جسے برداشت کرنا چاہیئے اور سچ پوچھئے تو یہ کوئی خطرہ بھی نہیں، کشمکش اور دار و گیر زندگی کی علامت اور زندگی کے محرک ہیں، اگر نیت نیک ہو اور نوجوانوں کی نیت عموماً نیک ہوتی ہے تو بہت سے ذہنی اور سیاسی اختلافات کے باوجود عام مقاصد کا اشتراک اور صدر کی دلکش شخصیت مجوزہ نیشنل یونین کے اندر مختلف عناصر کے درمیان ربط کا کام دے گی۔ اور ان کو ایک رشتے میں منسلک رکھے گی۔ "کثرت میں وحدت" جو ہندوستان جیسے ملک کی قومی زندگی کی بنیاد ہونی چاہیئے، ابھی تک ایک آرزو، ایک دعا، ایک خواب ہے۔ کیا اچھا ہو کہ طالب علموں کا نیشنل یونین اس آرزو کی تکمیل، اس دعا کی قبولیت، اس خواب کی تعبیر کی ایک جھلک دکھا دے۔

یوہان وولف گانگ گوئٹے آسمان شعر کے ان روشن ستاروں میں سے ہے جن سے سارا عالم کسب نور کرتا ہے گوئٹے ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو اس کی ولادت کی دو صد سالہ یادگار دنیائے ادب میں منائی جائے گی خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے، امید ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں اور علمی مجلسیں بھی اس معاملے میں مسلم یونیورسٹی کی تقلید کریں گی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

حسن تاویل

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ۱۷ر نومبر کے اجلاس میں جس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے، اپنے آر، ایس، ایس والے فیصلے کی ایک نئی اور عجیب تاویل کی ہے کانگریس کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ اس فیصلے سے لوگوں کو بے وجہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، اس میں تو صرف کانگریس کے دستور کی ایک دفعہ کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا تھا کہ ہر شخص جو ۲۱ برس یا اس سے زیادہ عمر کا ہو اور کانگریس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو اس کا ممبر ہوسکتا ہے خواہ وہ آر، ایس، ایس کا ممبر ہی کیوں نہ ہو، لیکن ظاہر ہے چونکہ دستور کی ایک اور دفعہ کی رو سے کوئی شخص جو کانگریس کا ممبر ہو، سیوا دل کے سوا والنٹیروں کی کسی جماعت کا ممبر نہیں ہوسکتا، اس لیے آر، ایس، ایس کا کوئی ممبر کانگریس میں اسی وقت شریک ہوسکتا ہے جب وہ آر، ایس ایس سے، جو والنٹیروں کی ایک جماعت ہے استعفا دے دے۔ اس تاویل کو پڑھتے میں ممکن ہے سر میں تھوڑا سا چکر آجائے مگر اس کا مطلب صاف ہے کہ کوئی شخص آر، ایس، ایس کا ممبر رہتے ہوئے کانگریس کا ممبر نہیں ہوسکتا، اگرچہ وہ صوبائی کانگریس کمیٹیاں جنھوں نے ورکنگ کمیٹی کے پچھلے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا تھا یہ چاہتی تھیں کہ آر، ایس ایس کو صاف الفاظ میں فرقہ دار سیاسی جماعت قرار دے کر اس کے ممبروں کو کانگریس میں لینے سے انکار کیا جائے اور ورکنگ کمیٹی نے اس بات سے پہلو بچا کر اس کے غیر کانگریسی والنٹیر جماعت ہونے کی بنا پر انکار کیا ہے، لیکن بہرحال عملاً نتیجہ ایک ہی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ جو اندیشے کانگریس کے بہت سے ممبروں کے دل میں پیدا ہوگئے تھے کہ وہ اپنے بنیادی اصول کو بدل رہی ہے دور ہوجائیں گے

لازمی پس اندازی

حکومت ہند نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کی رہنمائی میں گرانی اور افراط زر کا مقابلہ کرنے کو جو نئی اسکیم بنائی ہے اس کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ سرکاری ملازموں کو اپنی تنخواہ کا ایک حصہ بچا کر جمع کرنا چاہئے۔ مرکزی حکومت کے ملازموں کے بارے میں یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ ڈھائی سو سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کو تدریجی پیمانے کے مطابق روپے میں ایک آنے سے لے کر تین آنے تک پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر جمع کرنے ہوں گے کہا جاتا ہے کہ ڈھائی سو سے کم پانے والوں کے لئے بھی ۱½ فی صدی سے لے کر ۴ فی صدی بچانے کا حکم ہونے والا ہے مرکزی حکومت نے صوبوں کی حکومتوں اور مل مالکوں، تاجروں وغیرہ سے بھی اپیل کی تھی کہ اپنے ملازموں کے لئے بھی لازمی پس اندازی کا قاعدہ جاری کریں۔ معلوم ہوا ہے کہ کاروباری حلقوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ جیسے ہی مرکزی حکومت ڈھائی سو سے کم پانے والوں کے بارے میں احکام جاری کردے گی۔ وہ بھی اپنے کل ماہانہ تنخواہ پانے والے ملازموں پر لازمی پس اندازی کی وضعات عاید کردے گی۔ غالباً صوبوں کی حکومتیں میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، یونیورسٹیاں اور دوسرے غیر سرکاری مدرسے بھی اس معاملے میں حکومت کی تقلید کریں گے۔

پھر ایک روشنی کی کرن

وزیراعظم جواہر لال نہرو نے امریکہ سے لوٹتے ہوئے لندن کی پریس کانفرنس میں کشمیر کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس میں مصالحت کا اشارہ موجود تھا، مگر لہجے کی تیزی اور تندی کی وجہ سے لوگوں کو زیادہ محسوس نہیں ہوا انھوں نے اپنی ۲۰ر نومبر کی تقریر میں اس بات کو بالکل صاف کردیا ہو کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو جنگ کے ذریعے سے طے کرنا ہندوستان اور پاکستان کے لیے مہلک سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ نہ صرف یہ مسئلہ بلکہ وہ سب مسئلے جن کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات بگڑ گئے ہیں گفت و شنید کے ذریعے سے طے ہوجائیں۔ وہ کسی بیرونی قوت کو سرپنچ بنانے کے لئے تیار نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی "بچولیا" بن کر مصالحت کرانا چاہے تو اس کا خیر مقدم کریں گے۔ آثار کہہ رہے ہیں کہ شاید پاکستان کی طرف سے اس کا کچھ امید افزا جواب ملے گا مگر ابھی یقین سے

پاکستان

"اسلامستان" کا حشر

چودھری خلیق الزماں صاحب اسلامستان کی تحریک کے سلسلے میں اسلامی ملکوں کا دورہ ختم کرنے کے بعد اس مہینے کی آخری تاریخوں میں واپس آنے والے ہیں، ان کے آنے سے پہلے ہی پاکستان کے ترقی پسند اخبارات مثلاً پاکستان ٹائمز وغیرہ ان کی تحریک کی بڑی شدت سے مخالفت کر رہے ہیں۔ معاصر ڈان ان کے مشن کے متعلق بہت نمایاں خبریں شائع کیا کرتا تھا مگر بقول خود اظہار رائے سے کتراتا رہا۔ اب اس نے بھی اپنے اداریہ میں چودھری صاحب کے طریق کار پر شدید نکتہ چینیاں کی ہیں اس کے اعتراضوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"چودھری صاحب کے مشن کا یہ بنیادی مقصد تھا کہ وہ اسلامی ملکوں کے عوام اور ان کے لیڈروں سے ملیں گے، مگر وہ چند ہی دنوں کے بعد اس راستے سے ہٹ گئے اور عوام کے بجائے حکومتوں سے ملنا انھوں نے زیادہ پسند کیا۔ انھیں صرف اسلامی ملکوں میں بھیجا گیا تھا مگر وہ لندن پہنچ گئے اور کامن ویلتھ ریلیشن ڈیپارٹمنٹ اور دفتر خارجہ کی معرفت اسلامی ملکوں سے تعلقات کا مسئلہ حل کرنے لگے۔" ان اعتراضات کے بعد اس نے لکھا ہے کہ "چودھری صاحب کا مقصد چاہے کتنا ہی اچھا اور ان کی نیت چاہے کتنی ہی نیک رہی ہو مگر ان کے اس مشن کا نتیجہ پاکستان کے حق میں مفید سے زیادہ نقصان دہ نکلا ہے!"

صنعتی ترقی کے لئے پہلا قدم

وزیر صنعت چودھری نذیر احمد صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کی صنعتی ترقی کے امکانات اور اس کی اسکیموں کا نہایت تفصیل سے تجزیہ کیا اور فرمایا کہ حکومت پاکستان صنعت کو اس قدر ترقی دینا چاہتی ہے کہ وہ ملک کی ضرورتیں بھی پوری کرسکیں، اور بیرونی منڈیوں میں دوسری صنعتوں کا مقابلہ بھی کرسکیں صنعتیں دو طرح کی ہوں گی

(۱) بڑی صنعتیں مثلاً ہائیڈرو الکٹرک بندرگاہوں کی توسیع، فیکٹریوں کا قیام وغیرہ۔ (۲) دیہی صنعتیں ...

موصوف نے تیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تیل کی تلاش و جستجو بہت بڑے علاقے میں جاری ہے، اور اب تک جو تیل دریافت ہوا ہے وہ خاصا اچھا ہے اور اس نے مجموعی پیداوار میں کوئی ۲۵ فی صدی اضافہ ہوا ہے، مگر پھر بھی اس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اب تک جو کچھ ہوا ہے اُسے ہم غنیمت تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کی بنیاد پر تخیل اور امید کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔

جوٹ کی موجودہ پالیسی نقصان دہ ہے

مسلم چیمبر آف کامرس کے صدر سخاوت حسین صاحب نے حکومت پاکستان کی پٹسن کی نئی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس پالیسی سے ہندوستان کو اور بیچ کے دلالوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا اور پٹسن کی کاشت کرنے والوں کو زبردست نقصان پہنچے گا۔" معاصر پاکستان ٹائمز کے خاص نامہ نگار نے ڈھاکہ سے اطلاع دی ہے کہ سکے کے موجودہ تعطل سے اب تک کم از کم بیس لاکھ من جوٹ ناجائز طور پر ہندوستان بھیجا جاچکا ہے جس سے ۸۰ لاکھ روپے کا حکومت پاکستان کو نقصان پہنچا ہے۔ نامہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ حکومت نے ۲۳ روپے فی من خام جوٹ کی قیمت مقرر کی ہے لیکن عام طور پر دس روپے سے بارہ روپے فی من کے حساب سے بک رہی ہے اور یہ قیمت بھی ہندوستانی سکے میں ادا کی جاتی ہے" وزیراعظم لیاقت علی خاں صاحب نے ڈھاکہ میں بیان دیا تھا کہ خود حکومت پاکستان اپنی ایجنسیوں کی معرفت جوٹ خریدے گی۔ نامہ نگار مذکور نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ اس کو یہ شکایت ہے کہ نہ تو مرکزی حکومت، اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی کوشش کر رہی ہے اور نہ صوبجاتی حکومت ہی اس طرف توجہ دے رہی ہے۔

ے نہیں کہا جاسکتا۔

بزمِ بے تکلف

"خیر تو ہے میر صاحب، یہ آج سرِ اقدس پر کیا اُفتاد پڑی۔ آخر اس کا سر پوش کیا ہوا؟"

"بس رہنے دو اپنا مسخراپن۔ ایک تو یوں ہی صبح سے چہرے پر چرکا لگ رہا ہے، اوپر سے تم زخموں پر نمک چھڑکنے کو پہنچ گئے۔ آج ان کم بخت بندروں نے ناک میں دم کر دیا۔ ایک بالائی چکھ گیا، دوسرا انگھا اٹھا لے گیا۔ تیسرا ٹوپی لے بھاگا۔"

"ارے معاف کیجئے گا میر صاحب۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آں ڈارون سے بھی آپ کا مذاق کار تشنہ ہے۔ مگر یہ ٹوپی اتارنے کی دل لگی اچھی نہیں۔ ایک تو آبرو کا معاملہ ہے دوسرے آپ کا فرقِ مبارک اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔"

"ہو جائے گا تو ہو جانے دو ہم آپ بھگت لیں گے۔ ع بر سرِ اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد۔ مگر تم لوگ اپنی خبر مناؤ۔ سنا ہے ہمارے اس سن پکٹ پرانت میں جمآریہ ورت ہوتے ہوتے رہ گیا، بندروں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ لکھنؤ تو خیر ہمیشہ سے بہت بڑی بندر گاہ ہی، مگر اب کچھ لکھنؤ پر موقوف نہیں، جہاں جائیے میاں ملو براجتے ہیں۔ دیکھو میں کہے دیتا ہوں کہ اگر زمینداری کے ساتھ ساتھ اس بندر گردی کو ختم نہ کیا تو ہم سب لوگوں کو جو اپنے کو انسان کہتے ہیں یہاں سے دُم دبا کے بھاگنا ہوگا۔"

"میر صاحب اس مقدمے کا یک طرفہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے فریق کی بھی سننی پڑے گی۔ فرض کیجئے آپ تھوڑی دیر کے لئے بندر بن جائیں اور میں ——"

"کیا کہا، میں بندر بن جاؤں؟"

"نہیں توبہ، الٹی بات کہہ گیا۔ بندر میں بنتا ہوں، آپ تھوڑی دیر کے لئے انسان بن جائیے۔"

"یہ تھوڑی دیر کے لئے کیا معنی؟"

"خیر جتنی دیر کے لئے آپ کا جی چاہے، مطلب یہ کہ دونوں فریقوں کی نمائندگی ہو جائے۔ اچھا اب یہ فرمائیے کہ آپ لوگ جو ابھی چند ہزار سال آسٹریلیشیا اور مغربی یا شمالی ایشیا سے یہاں آن مرے ہیں کس حق سے ہم کو جو اس دیس کے پراچین باسی ہیں ختم کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہم اشرف مخلوق ہیں۔ زمین کی بادشاہی ہمارا حق ہے۔ جانوروں میں سے جو ہمارے کام کے ہیں انھیں ہم رہنے دیں گے۔ جو بیکار یا مضر ہیں انھیں ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں، اپنے اشرف مخلوق ہونے کی کوئی عقلی دلیل پیش کیجئے۔ آپ کے میاں ڈارون نے ارتقا کا سند بندر تک تو ٹھیک پہنچایا۔ اس کے بعد بہک گئے، اور انسان کو جو بندر کا بگڑا ہوا چربا ہی اشرف مخلوق سمجھ بیٹھے۔ انھیں یہ نہ سوجھا کہ ارتقا کا پہیہ بندر پر پہنچ کر رک گیا۔ اب الٹا چل رہا ہے۔"

"پہیہ الٹا چلے یا سیدھا تمھارا دماغ ضرور چل گیا ہے۔ نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بک رہے ہو، کہنے لگے انسان بندر کا بگڑا ہوا چربا ہے۔ بھلا بندر کیا کھا کے انسان کا مقابلہ کرے گا!"

"خیر چربے والی بات تو آپ کے پلے پڑی، مگر قصور معاف، اس سائنس کے زمانے میں تو آپ کو یہ کہنا زیب نہیں دیتا کہ بندر کیا کھا کے ——"

"اب تم اتنے بھی بندر نہیں ہو کہ محاورہ نہ سمجھو۔ مطلب یہ ہے کہ کہاں انسان کہاں بندر۔ ذرا ہیئت کو ملاحظہ کیجئے۔ چیاں سی آنکھیں لئے، دُم لٹکائے، لمبی سی تھوتھنی نکالے، چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑے ہیں، اور ادائیں دیکھئے ادھر کودے اُدھر پھاندے، اس کا منہ چڑایا، اس کو بھبکی دی، یہ کھا گئے وہ لے بھاگے۔ بھلا کوئی بات بھی انسانیت کی ہے، چلے ہیں انسان کا مقابلہ کرنے۔"

"مگر ذرا اپنی بر زخ بھی تو آئینے میں دیکھئے، کوڑیوں سی آنکھیں، گھونگا سا منہ، دھونکنی سی ناک، دم کا پتہ نہیں، دو پاؤں پر پھدک رہے ہیں، پھر آپ کی حرکتیں اِدھر لڑ کر آئے، اُدھر اُٹھ کے پہنچے، اس سے جھک جھک، اس سے بک بک، اپنے ماما سے کاٹا، اسے پٹی پڑھائی، اُسے جھانسا دیا، بھلا کوئی بات بھی آدمیت کی ہے۔ چلے ہیں بندر کا مقابلہ کرنے۔"

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

آنسوؤں کا گیت

فیض الحسن فضا اعظمی

اب بھی زخم میں سرمایۂ رنگینیٔ شوق
زخم ابھر آئے ہیں جو دل پہ دکھانے دو ابھی
اپنے ان آنسوؤں سے کھیل رہا ہوں میں بھی
انھیں بہتے ہوئے شعلوں میں نہانے دو ابھی

غم کے طوفان میں ذرا ڈوب ہی جانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

زندگی جنتِ دل اب ہے نہ فردوسِ نظر
موسم افسردہ بیرنگ یہ سہمی ہوئی رات
انھیں نغموں میں ہے سامانِ سکونِ خاطر
انھیں نغموں میں تڑپتے ہیں کچھ آثارِ حیات

اپنے ہی آنسوؤں کے گیت سنانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

اس غمِ شوق کے انداز پہ قربان مرا دل
دل میں پیدا ہے وہی درد وہی سوز و گداز
دل میں بیتابیٔ غم کی وہی پھر لہر اٹھی
آج جنبش میں پھر آنے ہی کو ہے پردۂ ساز

ساز کے ٹوٹے ہوئے تار ملانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

یہ بھی ہوتا ہے محبت میں خبر کیا تھی مجھے
دو جہاں آنکھ میں ویران بنا دے گا کوئی
غم کے رستے ہوئے ناسور عطا کر کے مجھے
زیست کو موت کا سامان بنا دے گا کوئی

ٹھیرو! بڑھتے ہوئے شعلوں کو بجھانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

اک امانت تھی جو وقت آنے پہ دے دی تجھ کو
چیز تیری ہی تھی دل کوئی یہ اپنا تو نہ تھا
اپنی مرضی سے میں خود عشق میں برباد ہوا
میری بربادی میں کچھ تیرا اشارہ تو نہ تھا

اپنے گھر اپنے ہی ہاتھوں سے جلانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

میری بھیگی ہوئی پلکوں پہ شرر پارۂ دل
سرِ کوثر بھی وہی شعلے لپک آئے ہیں
یہ سلگتے ہوئے ناسور، یہ جلتے ہوئے داغ
میں نے سینے میں کچھ آتش کدے سلگائے ہیں

دل کے گرمائے ہوئے داغ دکھانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

خاک پر کھینچ کے رکھ دیتا ہے تصویرِ بہار
ایک قطرہ بھی جو آنسو کا ڈھلک جاتا ہے
چاہتا ہوں کہ سنبھالوں مگر اس کوشش میں
بارہا آنکھوں کا پیمانہ چھلک جاتا ہے

اے فضا! تلخیٔ ایام بھلانے دو ابھی
مجھ کو چھیڑو نہ ابھی اشک بہانے دو ابھی

بچّے اور اُن کی جبلّت

سیّد محمد حسنین

(۱)

بچوں میں خاص خاص باتیں اور کیفیتیں ہوا کرتی ہیں جنھیں ہم مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں لفسیات نے ہر انسانی کیفیت کی تشریح اور تجزیہ کیا ہے اور سب کی مخصوص ناموں سے تخصیص کردی ہے۔ میں ان تمام کیفیتوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ صرف انھیں بیان کروں گا جو علم تربیت کے نقطۂ نگاہ سے لائقِ ذکر ہیں۔

• بچے کی مخصوص کیفیتوں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ جبلّت، خصلت اور عادت۔

جبلت بچے کی وہ کیفیت ہے جو پیدائشی ہوتی ہے اور جو سیرت انسانی کا خاصہ ہے۔ مثلاً تجسس خودسری نیز اسی طرح خوف، غصہ، ضد اور نفرت کے جذبات بچے میں قدرتی طور پر موجود رہتے ہیں۔ خصلت بچے کی وہ کیفیت ہے جو جبلتوں سے داخلی ربط تو رکھتی ہے مگر جس کی بالیدگی و افزائش ماحول اور صحبت کرتے ہیں۔ جبلتوں کی نمو اور افراط و تفریط میں آبائی وراثت کا پورا دخل ہوتا ہے مگر اچھی اور بری خصلت بچہ ماں کے دودھ کے ساتھ نہیں پیتا۔ ان کا محرک در پردہ کوئی جبلت ہو سکتی ہے۔ پر ان کی نما اور ارتقا ماحول اور صحبت کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ بے باکی، دلیری، نڈرپن یا دشمنی، عداوت، نفرت وغیرہ ماحول اور صحبت سے نہیں ملا کرتے۔ بلکہ بچہ انھیں والدین سے بطور میراث پاتا ہے۔ جبلت و خصلت کے علاوہ بچے میں ایک اور قسم کی کیفیت بھی ملتی ہے جسے عادت کہتے ہیں مثلاً مٹی کھانا، کاٹنا وغیرہ۔ یہ کیفیتیں گرچہ نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں مگر علم تربیت میں بھی ان سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ شخصیت کی تعمیر میں ان کا عمل اور ردِعمل بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں ان کیفیتوں سے والدین کو پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ یہ کیفیتیں بچے کے مستقبل کے لئے اچھی بھی ہیں اور بُری بھی، ان کے افراط و تفریط اور عمل و ردِعمل سے باخبر رہنا چاہیے اور کسی ایک کیفیت کی نمو یا بالیدگی میں اعتدال کا لحاظ بہر حال لازمی ہے۔

۱۔ تجسّس

یہ واقعہ ہے کہ عالم حیات میں آتے ہی بچہ اس دنیا اور اس کی ان جانی باتوں سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ اپنی مختلف قوتوں کے سہارے وہ اس نئی دنیا سے جلد سے جلد واقف ہو جائے۔ بچے کی اس کوشش یا "تلاش" کو تجسس سے موسوم کرتے ہیں۔ تجسس بچے کی فطرت میں داخل ہے۔ جو عمر کی افزائش اور ذہن کی بیداری کے ساتھ تحقیق کا انداز اختیار کر لیتا ہے ——— اس جگہ اس کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ ہماری آج کی یہ حیرت ناک ترقی اسی تحقیق کا کارنامہ ہے.....

بچے میں تجسس کی کارفرمائی اس کے پیدا ہوتے ہی ہمیں صاف نظر آتی ہے۔ جب ماں کا پستان اس کے منہ میں داخل ہوتا ہے، بچہ اپنی زبان سے اس اجنبی شے کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ بعد میں کسی کھیلنے کی شے ملتے ہی وہ فوراً اُسے منہ میں لے جا کر اس کی لذت سے باخبر ہونے کی سعی کرتا ہے۔ بھرتی ہوئی جلنے والی دادا جان کی لمبی سپید خوش نما داڑھی، ابا جان کی دھوپ کی عینک یا کانوں میں جھولتے ہوئے ماں کے آویزے پر بے ساختہ ہاتھ مارنا اسی جذبۂ تجسس کا عمل ہوتا ہے۔ اس وقت دوسری قوتیں تجسس میں مدد و معاون نہیں ہوتیں، باتوں کے سمجھنے، سننے اور دیکھنے میں اس کا تجسس قوت لمس ہی سے کام لیتا ہے۔ عمر کے ساتھ پھر اس کی دوسری قوتیں بیدار ہونے لگتی ہیں۔ ان کی بیداری جذبۂ تجسس کو تیز اور تیز تر کرتی جاتی ہے۔ بچے کے اگلے چار پانچ سال بہت تیز جذبۂ تجسس میں گذرتے ہیں۔ سامنے آنے والی ہر چیز تحقیق و تلاش پر اُسے اکسایا کرتی ہے۔ "یہ کیا ہے؟ کیسی ہے؟" اس کے چھوٹے سے دماغ میں یہ سوالات خواہ مخواہ اُٹھا کرتے ہیں، اور موقع ملتے ہی وہ اس کی شناسائی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹے بچوں کے جذبۂ تجسس کی بڑی قدر کرنی چاہیے بچے میں تجسس کا جذبہ جس قدر تیز ہوگا، بچہ اسی قدر ذہین و فہیم ہوگا، ماں کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بچے کے سوالات کو جہاں تک ہو سکے حل کر دیا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ جواب نہ ملنے کی وجہ سے اس کا دماغ تشنہ رہے اور وہ متفکر یا ملول نظر آئے۔

بڑی عمر کے بچوں کو اس کا پورا موقع دینا چاہیے کہ ان کا جذبۂ تجسس خود حرکت میں آئے اور اپنی ذاتی تحقیق و تلاش کی روشنی میں وہ خود اندازہ حاصل کرسکیں ہاں، اس کا خیال ہمیشہ رکھنا چاہیے کہ انھیں اپنی دیباں مشاہدات میں اچانک مہلک اور خطرناک اشیاء کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ تین چار برس کے بچے کو بلیڈ، چھری یا آگ وغیرہ سے آشنا کرانا زبردست حماقت ہوگی۔ بلاشبہ، یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو دیکھنے پر اس کا جذبِ تجسس تیز تر ہو جاتا ہے، مگر دانشمندی یہ ہے کہ اس کی آسودگی یا سیرابی میں عجلت کو راہ نہ دی جائے۔

پانچ چھ برس کے بعد بچہ ان کی ضرر بخش نوعیت سے آپ ہی واقف ہو جاتا ہے۔ اونچی عمر سے اندازے یا تجربے میں کم سے کم اذیت دیتی ہے اور ہماری باریک یا پیچیدہ بات کے سمجھنے میں اسے اپنے بڑھتے ہوئے

جبلّت و خصلت کے علاوہ بچے میں ایک اور قسم کی کیفیت بھی ملتی ہے جسے عادت کہتے ہیں مثلاً مٹی کھانا، کاٹنا وغیرہ۔ یہ کیفیتیں گرچہ نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں، مگر علم تربیت میں بھی ان سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ شخصیت کی تعمیر میں ان کا عمل اور ردعمل بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں ان کیفیتوں سے والدین کو پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

دماغ سے بڑی مدد ملتی رہتی ہے۔

۲۔ خودسری

خودسری بچے کا ایک اہم حق ہے جو ہمارے حقِ آزادی سے ملتا ہے۔ اپنے زورِ تخیل کے بموجب ہم اپنے طائرِ آزادی کو بے قید و بند چھوڑ دینے کے ہمیشہ متمنی رہتے ہیں۔ یہ بلند پروازی یا "خودی" لازماً اس طرح دوسروں کے "مفاد" یا خواہشوں سے ٹکرا جاتی ہے، پھر بہت سی پابندی، مجبوری، لاچاری اور بے کسی کی دیواریں حائل نظر آتی ہیں اور ہم مختلف کیفیتوں کا شکار ہو جاتے ہیں ہمارے عام جذبات مثلاً نفرت، حقارت، عداوت، بغاوت، مسرت، موانست وغیرہ کا الحاق عدمِ تکمیل یا نیم تکمیل کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں

بقدرِ پیمانۂ تخیل ہے سرور ہر دل میں ہے خودی کیا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا

ہمارا احساسِ آزادی، ہمارے عہدِ طفولیت کا پروردہ اور بالیدہ جذبہ خودسری ہوتا ہے۔ قدرت بچے کو یہ جذبہ پیدائشی دیتی ہے۔ عالم حیات میں آتے ہی بچہ ابتدائی زندگی میں خود کو بیگانہ محسوس کرتا ہے۔ جذبۂ تجسس سے "نئے" کی تلاش و تحقیق پر اکساتا ہے، خودسری اس کی رہبری کرتی ہے۔ اور بچہ ماں، باپ بھائی، بہن اپنا پرایا اور دوسرے تمام بڑوں کی ہدایت اور تعاون سے بے نیاز ہو کر آزادانہ اقدام کی جرأت کرنے لگتا ہے۔ تین چار برس کے بچوں میں یہ جذبہ اسی قدر تیز ہوتا ہے کہ بچہ اپنے ہر کام میں دوسروں کا ذرا سا اشتراک بھی ناپسند کرتا ہے۔ اپنے دودھ کے برتن گلاس، یا کنجی والے خوب صورت کھلونوں کو خود سے پکڑنے یا چلانے کی اس کی بے اختیار کوشش اسی جذبۂ خودسری کا عمل ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا۔ ایسے مواقع پر آپ کا دانستہ یا نادانستہ تعاون اسے کس قدر جلد برافروختہ کر دیتا ہے۔ بچوں کی خودسری کو والدین کو اچھی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، کیونکہ اس جذبے کی کارفرمائی سے بچہ میں خود اعتمادی کی قوت مضبوط ہوتی ہے۔ اس کی خودسری اسے راہ میں آنے والی الجھی باتوں کی گتھی کو سلجھانے پر آمادہ اور متحرک کرتی رہتی ہے۔ ہر کامیابی یا ناکامیابی اُسے سچے تجربات سے مالا مال کرتی رہتی ہے۔ ماں کو چاہیے کہ بچوں کو ان کی مرضی کے بموجب اقدام کرنے دے۔

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ٹڈی

راج رتنم

اندھیری رات اور اندھیری ہو گئی۔ آسمان نے چیخنا شروع کر دیا جیسے کسی دیوتا کی چھاتی میں درد اٹھا ہو۔ پچھم پورب سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ جو دم بھر میں کچھم کی پہاڑیوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں پھیل گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑے اور مکان ایک آفت میں گھر گئے۔ پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھک جاتے، اور پھر اپنی شاخیں اوپر اٹھاتے جیسے کوئی دشمن کے حملے سے بچنے کے لئے اپنے ہاتھ اٹھاتا ہو۔ بجلیاں سائیں سائیں کرتیں اور پوری طاقت سے اپنے تیغے زمین میں گاڑ دیتیں۔ بجلی کی کڑک سے ساری فضا دہل جاتی۔

گاؤں والے ایک دن پہلے تک سوکھے کے ڈر سے کانپ رہے تھے۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے تو تے لیکن بھوت پریت کی طرح آن کی آن میں غائب ہو جاتے۔ کھیتی دھوپ کی تیزی سے پہلے پیلی ہو گئی اور پھر جھلس کر کالی پڑ گئی تھی۔ آموں کے بور جو چاندی کی طرح نکھر کر اپنی بہار دکھاتے کب کے سوکھ چکے تھے۔ سوکھا پڑنے کے ڈر سے گاؤں والے چڑچڑے ہو گئے تھے، اور بات بات پر لڑنے لگے تھے۔ سرجو اہیر نے ایک دن اپنی عورت کو اتنا پیٹا کہ وہ روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ رحمت حجام نے عنایت خاں کو کئی بار ناک کٹنے کی دھمکی دی، کیونکہ عنایت خاں کی بیوی نے رحمت کے پیٹھوں کی کیاری پر پان کھا کر تھوک دیا تھا۔

اب جو بارش ہوئی تو سارے گاؤں کا سبھاؤ بدل گیا۔ سرجو کی عورت پہلے سے ہنستی ہوئی گھر لوٹ آئی۔ اس کے پاس بلانے کے لئے کوئی بھی صاف ساڑھی نہیں پھر بھی وہ کھلی جا رہی ہے۔ رحمت نے بھی اپنے استرے کو بند کر کے رکھ دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "ہٹا دو اس جھگڑے کو۔ اب تو پیٹھوں پر سے پان کی لالی دھل ہی جائے گی۔"

کاشی اپنی دکان میں بیٹھا بارش کا تماشا دیکھ رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ "ہاں ہاں اب سب کا کام بن جائے گا۔" پھر اسے چھپر کی مرمت کا خیال آیا اور اس نے اپنی بیوی کو آواز دی "ارے او ——— تلسی کی ماں ——— ذرا وہ تسلہ اٹھا دے ——— چھپر چو رہی ہے، اس کے نیچے رکھوں گا۔ جب پانی تھم جائے گا تو مرمت ہو جائے گی۔" تسلہ ٹپکتی ہوئی چھپر کے نیچے رکھ کر وہ چٹائی پر لیٹ گیا۔ تسلے میں گرتی ہوئی پانی کی بوندوں نے ستار چھیڑ دیا اور وہ اس موسیقی کا مزا لیتے لیتے سو گیا۔

کاشی سو کر اٹھا تو اس کی بیوی بڑبڑا رہی تھی آنکھیں ملتے ملتے اس نے ڈانٹ کر کہا "ارے کیا بکواس کر رہی ہے؟" "تمھیں کیا تم پاؤں پسار کر سوتے رہو گھر گرے یا رہے تمھاری بلا سے۔" "کچھ بتلائے گی بھی یا چیختی ہی جائے گی؟" "کیا بتاؤں پانی تسلے میں سے بہہ کر سرہانے تک پہنچ گیا۔ سارا گیہوں بھیگ گیا ہے اب یہ بچے کھائیں گے کیسے؟" "اچھا اچھا تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

باہر موسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ گرد دھل جانے سے درختوں کی پتیاں بھالے کی نوک کی طرح چمک رہی ہیں اور زمین سے ایک سوندھی مہک نکل کر ساری فضا میں پھیل رہی ہے۔ کاشی کے اپاہج پاؤں میں بھی جینے کی امنگ پیدا ہو رہی ہے۔

گاؤں کی عورتوں نے کنوؤں اور آس پاس کی ٹیلوں پر کپڑے دھونے شروع کر دئے ہیں۔ ننگ دھڑنگ بچے پانی میں کھیل رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ کنتی دلہن دودھ کا گھڑا لئے چلی جا رہی ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے کہ کہیں کیچڑ میں پاؤں نہ پھسل جائے۔ اس طرح چلنے سے اس کی چال میں ایک عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے دھوتی کا پلو کمر کے گرد کس کر باندھ رکھا ہے جس سے اس کے گٹھیلے جسم کا ابھار صاف دکھائی دے رہا ہے۔ کنتی کو دیکھ کر کاشی نے چھیڑنے کے لئے گانا شروع کر دیا "تو ری پتلی کمر بل کھائے نہ جائے۔"

"کہو کنتی رانی کدھر چلیں؟ آج تو کاشی دادا کا دل بھی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔"

"ارے جا جی! کمری جا اپنا کو سنبھالو دیکھو ان کا دل ڈانوا ڈول ہو رہا ہے، نہیں دوسرا بیاہ رچانے لگیں۔"

کنتی آگے بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اب وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی ہے۔ بیاہ؟ ہاں اس کی سہیلی راج ونتی کا بیاہ اب کی لگن میں ہوگا۔ لڑکے کے باپ نے راج ونتی کے گھر والوں سے سب باتیں پکی کر لی ہیں۔ فصل کٹنے کے بعد گانوں میں ڈھولک بجے گی۔

کنتی کے جانے کے بعد کاشی سوچنے لگا "یہ خوشیاں آئیں کہاں سے؟ کل تو چاروں طرف سنسان اداسی اور چڑچڑاپن تھا، آج یہ خوشی کے سوتے کہاں سے پھوٹ نکلے؟ آج تو میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے ناچنے لگوں۔ کاش میرے پاؤں ٹھیک ہوتے۔" اس کا دل بیٹھ گیا، جیسے مور ناچتے ناچتے اپنے بھونڈے پاؤں دیکھ کر پروں کو سمیٹ لے "ہاں یہ خوشیاں آئیں کہاں سے؟ دل کی گہرائیوں سے؟ نہیں نہیں دھرتی ماتا کے پیٹ سے!" اس کی آنکھیں پانی سے بھرے کھیتوں کی طرف اٹھ گئیں۔

کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ برسات کا گرم پانی کسانوں نے گھٹنے چھو رہا تھا اور وہ کیچڑ میں لت پت تھے، لیکن وہ کسی اور خیال میں مگن تھے، ان کے ایک ہاتھ میں چابک تھا اور دوسرا ہاتھ ہل کی مٹھی پر۔ بیل صدیوں کی غلامی کا جوا گردن پر رکھے پسینے میں نہائے ہل گھسیٹ رہے تھے۔ دور ٹھاکر صاحب کے فارم سے ٹریکٹر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ بیل اس آواز سے کبھی کبھی چونک پڑتے۔

کسانوں کے ننگے بدن بھی پسینے سے تر بتر تھے سورج کی تیز کرنیں ان میں خاص چمک پیدا کر رہی تھیں ایک کسان نے اپنا ہل روکا اور اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے کے بعد پھر ہل چلانے لگا۔ کہیں کہیں لوگ کھیتوں میں بیج ڈال رہے تھے۔

کاشی کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ کاش اس کے پاس بھی زمین ہوتی تو وہ بھی اسے جوتتا، بوتا اور پھر فصل کاٹتا، پھر اسے بیتے ہوئے دن یاد آنے لگے جب وہ اپنے باپ کے کھیت میں کام کیا کرتا تھا، مگر اس کے باپ نے قرضے سے تنگ آ کر زمین بیچ دی تھی اور جو رقم بچ رہی تھی۔ اس سے ایک دکان کھولی تھی اور اب باپ کے مرنے کے بعد وہی اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ یہ چھوٹی سی دکان تھی جس پر دال، جو، نمک گیہوں، تیل وغیرہ بکتا تھا۔ ایک بار بڑی سی موٹر اس کے گاؤں میں آئی تھی، اس نے چلتے کے بنڈل خریدے تھے اور موٹر کے صاحب نے بہت سے واموں کچھ ٹین کے ڈبے بھی اس کے ہاتھ بیچے اور کہا تھا "ان میں ولایت کے پھل ہیں۔" مگر ان ولایتی پھلوں کی بکری بھلا ہندوستان کے گاؤں میں کیا ہوتی۔ سو کاشی ان سے دکان کی سجاوٹ کا کام لیتا تھا۔ ان پر رنگ برنگ کے پھلوں اور پھولوں کی تصویریں تھیں۔ کاشی انھیں اپنی دھوتی سے صاف کرتا اور سلیقے سے جہاں تہاں رکھ دیتا۔ ایک بار گاؤں کے زمیندار رام لکھن سنگھ نے ایک ٹین خریدا تھا، لیکن سنا کہ دوسرے دن کاشی پر بڑی ڈانٹ پڑی اور وہ پٹتے پٹتے بچا کیونکہ ٹین کے پھل کھانے کے بعد رام لکھن سنگھ کو قے ہو گئی تھی۔ توبہ! یہ ولائتی پھل کیسے خراب ہو جاتے ہیں!

کاشی کی دکان پر کپڑا بھی بکتا ——— جاپانی مارکین، کانپوری چادریں اور ساڑھیاں مل کی بنی ہوئی۔ ایک طرف کچھ کھدر کے تھان بھی رکھے تھے ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے ہوئے۔ ان پر بھی ٹین کے ڈبوں کی طرح گرد زیادہ جمتی ایک بار رام لکھن سنگھ کے بیٹے کو جو کالج میں پڑھتے تھے کپڑے کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے کاشی ہی کی دکان سے کھدر کے تھان منگوائے۔ لیکن جب وہ دسہرے کی چھٹی میں گھر آئے تو کاشی کو پھر ڈانٹ سننی پڑی، اور وہ پٹتے پٹتے بچا، اس لئے کہ کھدر اتنا گلا ہوا تھا کہ دو تین بار دھلنے کے بعد کپڑے پہننے کے قابل نہیں رہے۔

آج اسے اپنے باپ کا کھیت بہت یاد آ رہا تھا

زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو نکل کر اس کے دل میں یہ حسرت پیدا کر رہی تھی کہ کاش وہ بھی زمین جوتتا بیج بوتا اور فصل کاٹتا۔

"دھرتی ماتا بڑی دیالو ہے، جہاں کسانوں کا پسینہ گرتا ہے وہاں سونے کی بالیاں اُگل دیتی ہے۔"

آج اس کی دوکان پر غیر معمولی بھیڑ تھی۔ کسانوں کو یقین ہو گیا کہ اب فصل اچھی ہوگی۔ اور فصل پک چکی ہوئی۔ گاؤں کے کھیت دیکھتے ہی، پکے سنہرے بالیوں سے لد گئے۔ ہوا چلتی تو کھیت میں سے ایسی آواز آتی کہ معلوم ہوتا دھرتی ماتا گنگنا رہی ہو۔

"ارے سورج، سنا ہے آج تمہارے کھیت میں کٹائی ہو رہی ہے"

"ہاں کاشی چاچا"

کھیت سے عورتوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں جن میں محبت اور اطمینان کے شعلے ہوتے تھے۔ ہر آدمی کے ہاتھ میں ہنسیہ تھا، لوہے کا کالا ہنسیہ جو سنہرے سپاہیوں کے پرے کے پرے صاف کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ ہنسیہ چلانے والے ہاتھ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد رُکتے، ماتھے سے پسینہ پونچھتے، ہنسیے کی دھار دیکھتے، اور پھر حملہ شروع کر دیتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کھیت میدان ہو گیا اور کسانوں نے کٹی ہوئی فصل کے گٹھے سمیٹنے شروع کر دئے۔ اتنے میں پہاڑی کی طرف سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں سارے گاؤں کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں۔

کاشی نے ایک گاؤں والے سے پوچھا "یہ گڑگڑاہٹ کاہے کی ہے؟ کیا آندھی آ رہی ہے؟"

اب لوگوں کی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں کوئی لال رنگ کا کیڑا تھا، اس کی ٹانگیں نکلی تھیں، اور منہ سے لار ٹپک رہا تھا۔ وہ نکل بھاگنے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا، پاؤں مار رہا تھا اور اپنے سوکھے جبڑے چلا رہا تھا۔ کوے اور چیلیں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور ان ٹڈیوں کو کھانے میں مصروف تھیں۔ دور پہاڑی کی چوٹی پر کالے رنگ کا بادل چھایا ہوا تھا، اس سے بڑی بھیانک آواز آ رہی تھی۔

"اچھا تو ہماری تین مہینے کی محنت کا یہ نتیجہ ہونا تھا؟" کسان دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔ کاشی بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی ایکڑ کھیت تھے جن میں اب تک ہنسیہ نہیں لگا تھا۔ اس نے کسانوں کے پریشان اور محنت سے تھکے ہوئے چہروں پر نظر دوڑائی جو ان بے رحم حملہ آوروں کو دیکھ رہے تھے اور اس کا دل بھر آیا۔

کسان نے ٹڈی کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور اُسے چیر کر پھینک دیا۔ گاؤں کے مرد عورت جوان، بچے اور بڑے بڑے بانس لئے ہوئے نکل آئے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح اپنی فصل بچانی تھی؛ لیکن اب نہ تو کوئی گا رہا تھا، نہ ہنس رہا تھا، سب کے چہروں پر ڈر کا سایہ تھا۔ پہاڑی پر چھایا ہوا بادل دھیرے دھیرے پھیلنے لگا اور سنسناہٹ بڑھنے لگی۔ بوڑھی عورتیں رو رہی تھیں، مرد کٹائی میں مصروف

بھگوان سے دیا کی پرارتھنا کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ بن کٹے کھیتوں کو حسرت بھری نظر سے دیکھتے اور ایک لمبا سانس لیتے۔

"اب کیا ہوگا؟"

"بھوکوں مریں گے اور کیا ہوگا"

"بھگوان ہم پر دیا کر، تو ہی ان داتا ہے"

اور پھر یکا یکی ہوا کا تیز جھونکا آیا اتنا تیز کہ پیڑوں کے تنے چرچرانے لگے اور گاؤں کے کئی چھپر اُڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب آندھی رُکی اور گرد چھنٹی تو کسانوں نے پہاڑی کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا لیکن اب آسمان صاف تھا اور پہاڑی کے پیڑ جھوم رہے تھے۔ ٹڈی دل ہوا ہو گیا تھا۔

کاشی نے ہنسنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جیسے اس کی اپنی فصل بچ گئی ہو۔ سارے گاؤں سے ہنسنے، گانے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں

کاشی دوکان پر چڑھ رہا تھا کہ دور سے ٹھاکر رام لکھن سنگھ آتے دکھائی دئے۔

"آج، ہم سب کی جان بچ گئی۔ بھگوان نے بڑی دیا کی، نہیں تو ساری فصل نشٹ ہو جاتی"

ہاں سرکار، بھگوان نے بڑی دیا کی، نہیں تو سب بھوکے مر جاتے"

اب کی مال گذاری دینے میں بھی بڑی مشکل پڑتی جن کے کھیت بچ بھی جاتے وہ بھی ٹڈی کا بہانہ کر کے لگان دینے میں آنا کانی کرتے"

"ہاں مہاراج"

کاشی کے چہرے سے خوشی کی چمک جاتی رہی اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رام لکھن سنگھ زمیندار، سکھ دیو ساہوکار اور تحصیل کے لال پگڑی والے چپراسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو کاشی؟" رام لکھن سنگھ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں سرکار۔ میں سوچ رہا تھا کہ سورج نے کس پھرتی سے ایک ٹڈی کو پکڑا، اور کس صفائی سے اس کی دونوں ٹانگیں چیر کر پھینک دیں"

(تامل سے ترجمہ)

بچے اور اُن کی جبلت

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

اس کی خودسری میں مداخلت نہ کرے۔ ہاں اپنے نرم مشورے سے ہلکے ہلکے اُسے روشنی دکھائے تاکہ وہ اچھائی، برائی یا نیکی بدی کا خود ہی اندازہ کر سکے۔

۲۔ خوف

خوف کا جذبہ کم و بیش ہر انسان میں موجود رہتا ہے اس کی افراط و تفریط، علم اور بے علمی پر موقوف ہے خوف کا تعلق براہ راست ہماری اپنی شخصیت سے ہوتا ہے؛ ہماری شخصیت جتنی علم کی روشنی سے محروم ہوگی ہم میں خوف کی زیادتی ہوگی اور جتنی نیر علم سے منور ہوگا جذبہ خوف ہم سے دور رہے گا۔ گاؤں کے باشندے چڑیلوں اور بھوت پریت سے خوف کھاتے ہیں، غیر تعلیم یافتہ انجانی اور انوکھی باتوں سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں، چھوٹے بچے ہوّے سے ڈر جاتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ قدیم کے رہنے والے سورج اور چندر گرہن کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے، الغرض یہ خوف محض ہماری کم علمی کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب اشیا کی نوعیت حقیقت یا خاصیت سے واقف ہوتے ہیں، ہمارا خوف دور ہو جاتا ہے۔

ہماری یہ دنیا نہ صرف ہم بڑوں کے لئے بلکہ بچوں کے لئے بھی بڑی نرالی، انوکھی اور عجیب، عجیب باتوں کا ایک گورکھ دھندا سا ہے۔ بچے کے سامنے آنے والی ہر نرالی شے خوف کے جذبے کو حرکت میں لاتی ہے جو شروع میں ہلکا ہوتا ہے اور بہت خفیف، ہم اسے "جھجک" کہہ سکتے ہیں یہ جھجک اس وقت تک دور نہیں ہوتی جب تک بچہ اپنی مختلف قوتوں کے سہارے اس کی بے ضرر نوعیت سے آشنا نہ ہو۔ مردہ تتلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بچہ جھجک محسوس کرتا ہے جب وہ سمجھ لیتا ہے کہ بے ضرر ہے تو اس نئی شے سے اس کا خوف جاتا رہتا ہے، کپڑے کا بنا ہوا بڑا سا ہاتھی، شیر، بندر یا کوئی اور جانور، یا کنجی پر چلنے والا کوئی عجیب کھلونا دیکھ کر شروع شروع میں یقیناً بچے کو خوف معلوم ہوتا ہے، اسی طرح بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، ہوا کے جھکڑ وغیرہ سے بچے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ماں کو چاہئے کہ بچہ جس شئے سے جھجک یا خوف محسوس کرے، اسی شئے سے اُسے مانوس کرائے، اور اس کی لاعلمی دور کرے۔

عام طور پر چھوٹے بچے تاریکی سے خوف زدہ ہوتے ہیں، کچھ بچے گھر کی کسی صورت یا کسی شخص کی آواز سے بھی خوف کھاتے ہیں، اُن کے اس خوف کو دور کرنے کا بہتر طریقہ صرف یہ ہے کہ انھیں اس کی بے ضرر نوعیت سے باخبر کر دیا جائے۔

بیشتر مائیں بچے کو قابو میں لانے کے لئے اس کے جذبۂ خوف کو اُبھار دیتی ہیں، اسے خیالی ہوّے وغیرہ سے اس طرح ڈراتی ہیں کہ وہ سہم کر ان کی بات مان لیتا ہے، لیکن یہ طریقہ نہایت خطرناک ہے، بچے کی شخصیت اس سے سخت مجروح ہوتی رہتی ہے، جو آگے چل کر اسے بودا اور کم زور، ڈرپوک، اور بیمار بنا دیتی ہے۔

بچوں کے خوف کو اس کی خودسری اور جذبۂ تجسس سے بہت جلد دور کر سکتے ہیں؛ اس لحاظ سے بھی ماں کو ان کے احساس خودسری اور جذبۂ تجسس کی بڑی قدر کرنی چاہئے۔

(باقی آئندہ)

گاندھی جی — فلسفی اور ادیب (بسلسلہ صفحہ ۱)

لفظوں کی سچائی نہیں بلکہ خیال کی سچائی بھی ہے اور سچائی بھی ہمارے ادراک کی اضافی سچائی نہیں بلکہ حق محض جو ابدی یعنی خدا کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں کیونکہ اس کے نور کی تجلیاں بے شمار ہیں۔ ان کے تصور سے مجھ پر رعب اور حیرت طاری ہوتی ہے، اور میں ایک لمحہ کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں۔ لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔

(ب) مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آ گئے ان سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرہ بے نور ہے۔ سچ پوچھئے تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سا پرتو ہے، مگر اتنا وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اہنسا کی تکمیل کر چکا ہو۔"

(ج) "حق وہ روح کل ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان اس کے جلوے کی تاب تب ہی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔"

(د) ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیۂ نفس کے ناممکن ہے۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے اہنسا کے قانون کی پابندی محض خیال خام ہے۔ جو شخص عفت سے محروم ہے اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیہ نفس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے پاک نفسی میں خارلنے بڑی تاثیر دی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیہ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خیال قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ محبت اور عداوت، رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔"

اگر آپ مندرجہ بالا عبارتوں کے مطلب پر غور کریں تو آپ ان سے گاندھی جی کے تصور کائنات اور فلسفۂ زندگی کے بارے میں حسب ذیل نتیجے اخذ کر سکتے ہیں۔

(ا) زندگی اور کائنات کے یہ سب مظاہر جو ہر نیا رنگ بدلتے رہتے ہیں، آنی و فانی، عارضی اور اعتباری ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں حقیقت صرف اس وجود مستقل اس جوہر ابدی میں ڈھونڈھنی چاہیئے جو ان سب بدلتے ہوئے مظاہر کی تہہ میں ہے اور خود کبھی نہیں بدلتا، یہی وہ ہستی ہے جو ہم کو اور ساری دنیا مظاہر کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے جسے مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں اس کی بہت سی شانیں ہیں، لیکن ہماری عبادت اور محبت کی سب سے زیادہ مستحق شان حقیقت یعنی حق محض ہونے کی شان ہے

(ب) وحدت وجود کے اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان کل مخلوق کو جن میں وہ خود بھی شامل ہے ایک ہی وجود حقیقی کے اجزاء مان کر ایک رشتۂ اتحاد و محبت میں مربوط جانے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھے۔"

(ج) اگر انسان کے نزدیک کل مخلوق ایک ہی نور ابدی کا پرتو ہے اور اپنی جان کے برابر عزیز ہے تو کسی جاندار کو کسی قسم کا دکھ دینا محض دکھ دینے کی خاطر یا تکلیف پہنچانا محض تکلیف پہنچانے کی خاطر ایسا ہے جیسے اپنی جان پر یا معاذ اللہ حق تعالےٰ پر ظلم کیا جائے۔ اس لئے جو انسان اہنسا سے کام لیتا ہے وہ در اصل اس رشتۂ اتحاد سے جو سے کل مخلوق کو اور خالق سے مربوط کرتا ہے ناواقف دوسرے الفاظ میں خود اپنی حقیقت کا اور حقیقت مطلق کا نامحرم ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ معرفت نفس اور معرفت حق کے لئے ہنسا کو ترک کر کے اہنسا کو اختیار کرنا لازمی ہے۔

(د) ہنسا یا تشدد غصے، نفرت، شہوت اور اسی قسم کے شدید جذبات و خواہشات سے پیدا ہوتا ہے۔ اہنسا یا عدم تشدد کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو ان آلودگیوں سے پاک کیا جائے۔

(ہ) یہ تزکیہ نفس بہت مشکل کام ہے، اس کے لئے انسان کو خیال قول اور عمل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہونا چاہیئے۔ کامل ضبط نفس اور سکون قلب اہنسا کی اور اہنسا کے ذریعے سے ستیہ یا معرفت حق کی پہلی سیڑھی ہے۔

یہ ہے گاندھی جی کے فلسفے کا نچوڑ۔ در اصل اس میں کوئی خیال نیا نہیں۔ یہ سب تصورات قدیم ہندی فلسفے میں پائے جاتے ہیں نئی چیز وہ ربط ہے جو گاندھی جی نے ان میں پیدا کیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کی ایک ایک کڑی کو اپنی زندگی میں عمل اور تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد قابل قبول سمجھا مشہور حکیموں میں گاندھی جی سے پہلے فلسفے کے اصول روز مرہ کی عملی زندگی سے اخذ کرنے کی خصوصیت سقراط میں پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں اور بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دونوں کے ہاں فلسفے کی بحثوں میں زندگی کی حرکت اور حرارت ہے جس کی وجہ سے اس کی حدود ادب سے مل جاتی ہیں۔

گاندھی جی کی تحریروں کی ادبی خصوصیات ان کی فلسفیانہ خصوصیات سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ان کے نزدیک ادب محض تفریح اور تفنن کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کا کام زندگی کی اعلیٰ قدروں ستیہ اور اہنسا حق اور عدم تشدد کی ترجمانی اور تبلیغ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں نفس مضمون کے مقابلے میں زبان اور اسلوب بیان کی اہمیت کچھ کم ہے۔ زیادہ اہتمام وہ اس کا کرتے ہیں کہ جو بات کہی جائے وہ سچی ہو، اور اپنی سچائی کی وجہ سے دل کو لگتی ہو۔ اس کی اتنی فکر نہیں کرتے کہ اسے کس ڈھنگ سے اور کس زبان میں کہا جائے۔ خالص ادبی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی کتاب لکھنا گاندھی جی کے رفیق ان کے لئے اور وہ خود اپنے لئے اس حد تک قابل اعتراض سمجھتے تھے کہ انھیں اپنی آپ بیتی تلاش حق لکھتے وقت خاص طور پر معذرت کرنی پڑی کہ یہ اس طرح کی آپ بیتی نہیں جیسی عام طور پر لکھی جاتی ہیں بلکہ محض ان تجربوں کی روداد ہے جو مصنف نے تلاش حق میں کئے۔ اعتراض اُن کے ایک ساتھی نے ان لفظوں میں کیا تھا۔

یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیتی مغربی ملکوں کا دستور ہے۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سوا ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہوا ہے، کسی نے آپ بیتی لکھی ہو۔ اور آپ لکھیں گے کیا؟ فرض کیجئے کہ آج آپ جن اصولوں کے قائل ہیں انھیں کل ترک کر دیں، یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں وہ بدل جائیں تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے ہیں وہ دھوکے میں پڑ جائیں گے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہیں کہ آپ ابھی اس قسم کی کتاب نہ لکھیں، بلکہ کبھی نہ لکھیں؟

گاندھی جی اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں جو آپ بیتی کہلاتی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں تجربے کئے ہیں، ان کی کہانی سنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ میری ساری عمر انھیں تجربوں میں گذری ہے، اس لئے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی، لیکن اگر کتاب کے ہر صفحے میں سوا ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں ایسی آپ بیتی لکھنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا دھوکا ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لئے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن پھر بھی گاندھی جی اپنے اس عام اصول کے ماتحت کہ اچھے مقصد کے لئے وسائل بھی اچھے ہونے چاہئیں، معنی کے مقابلے میں صورت مواد کے مقابلے میں ہیئت یعنی نفس مضمون کے مقابلے میں طرز بیان کی اہمیت کو گھٹا نہیں سکتے تھے انھوں نے بڑے اہتمام اور کوشش سے اپنی زبان اور اسلوب کو ایسے سانچے میں ڈالا جو ان کے مقصد کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھا۔ چونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد حق گوئی اور حق جوئی تھا اس لئے سب سے زیادہ زور وہ اسلوب بیان کی سادگی اور اصلیت یعنی حقیقت نگاری پر دیتے تھے۔ اپنی جنوبی افریقہ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس طرح آج ینگ انڈیا" اور "نوجیون" میری زندگی کا آئینہ ہیں ان دنوں "انڈین اوپنین" تھا۔ ہر ہفتے اس میں اپنی ارادات قلب کی داستان اپنے درد دل کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیہ گرہ کے عمل اور اصول کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی سنہ ۱۹۱۴ء تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گذارا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون نہ لکھا ہو، مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان مضامین میں ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو

یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ اخبار نویسی میرے لئے ضبطِ نفس کی تربیت تھی، اور میرے دوستوں کے لئے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ۔ نقادوں کو اس پر اعتراض کا بہت کم موقع ملتا تھا بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "ینگ انڈیا" اور "ہریجن" کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"میری اول سے آخر تک یہی کوشش رہی کہ حق کا جو جلوہ مجھے نظر آیا اور جس طرح نظر آیا اسے بے کم و کاست بیان کروں۔ "ستیہ" کے بعد گاندھی جی انسانی خدمت کو اپنی تحریروں کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے اس لئے ان کا اسلوبِ بیان بھی اہنسا کی روح سے معمور ہوتا تھا۔ وہ کبھی شدتِ جذبات کی رو میں نہیں بہتے تھے۔ ہمیشہ ضبط، سکون اور توازن قائم رکھتے تھے۔ انھیں اپنی عمر میں بہت سی برائیوں کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ بہت سے حریفوں سے تحریری لڑائی لڑنی پڑی۔ لیکن کبھی انھوں نے اپنی عبارت کو بدگوئی، سخت کلامی، طعن، طنز، تضحیک یا تمسخر سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اس بات کی انتہائی کوشش کی اور اکثر اس میں کامیاب ہوئے کہ اُن کے الفاظ مخاطب کو سمجھائیں، قائل اور متاثر کریں یا زیادہ سے زیادہ چونکائیں اور جھنجھوڑیں مگر اس کا دل نہ دکھائیں۔ اس کی خودداری کو ٹھیس نہ لگائیں۔ وہ جانتے تھے دوسروں کی دل آزاری کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا غرور یا خود پسندی سے کام لے کیونکہ اس میں مخاطب کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔

تلاشِ حق کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

جو کچھ میں ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں اگر اس میں سے کسی چیز میں پڑھنے والے کو غرور کا شائبہ بھی نظر آئے تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ میری تلاش میں کوئی کھوٹ ہے اور جو جھلک مجھے نظر آیا کرتی ہے وہ محض ایک سراب ہے۔ چاہے مجھ جیسے سیکڑوں کی شہرت خاک میں مل جائے۔ مگر حق کا بول بالا رہنے۔"

بحث خاصی طویل ہوگئی اور اس پر بھی ہم موضوع بحث کی اوپری سطح کو چھونے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔ اس لئے ہم اس مضمون کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں جو حضرات فلسفے کو خالص ذہنی موشگافیوں اور ادب کو محض جمالی سخن آرائیوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ان کو گاندھی جی کی فلسفیانہ اور ادیبانہ اہمیت کے بارے میں شبہہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ فلسفے اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار، اس کی بنیادی ضرورتوں کا ترجمان اور اس کی اعلیٰ قدروں کا خادم سمجھتے ہیں ان کو اس بات کے ماننے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا کہ گاندھی جی عہدِ حاضر کے سب سے بڑے اخلاقی رہنما، مصلح اور معلم ہونے کے علاوہ ایک سچے فلسفی اور ادیب بھی تھے۔

یو۔ این کے جلسے میں

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

مگر اسمبلی کے ۵۹ ووٹوں میں سے ان کے صرف چھ ووٹ ہیں اور یہاں ہر تجویز ان ملکوں کی رائے سے منظور ہو سکتی ہے۔ جو ہر معاملے پر آزادی سے غور کرتے ہیں۔ یو۔ این کی آزادی یہی جان ہے اور یہ بحث اور ووٹ دینے کے وقت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ بحث میں ہر بات کہی جا سکتی، اسمبلی اور کمیٹیوں کے جلسوں کے بعد قوموں کے نمائندے ایک دوسرے سے ملتے اور سمجھوتوں کے لئے زمین تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی نامناسب نہیں ہے، کیونکہ اس کا دارومدار بھی رائے دینے کی آزادی پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوری اور کمیونسٹ قوموں کی جو پارٹی بندی ہوگئی ہے وہ یہاں پوری پوری نظر آتی ہے۔ مگر یہاں کے فیصلوں پر ان قوموں کی رائے کا جو ہندوستان کی طرح آزادی سے رائے دینا چاہتی ہیں بہت اثر پڑتا ہے، اور یہ اثر سیاست کے اور کسی میدان میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ جمہوری ریاستوں کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ دنیا کا سدھار قوموں کے اتحادِ عمل سے ہی ہو سکتا ہے، اور جب قوموں کی ایک پارٹی نے مخالفت کرنا اپنا دھرم بنا لیا ہو تو پھر اتحادِ عمل کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہمیں بھی قسم کھا لینا چاہیے کہ جو کچھ کریں گے مخالفت میں کریں گے۔ اس وقت یو۔ این سے یہ بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے کہ وہ قومیں جو اپنے آپ کو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے پر مجبور سمجھتی ہیں ایسے ادارے کے جلسوں میں شریک ہونے پر مجبور ہیں، جہاں سب کی باتیں سُنی اور جانچی جاتی ہیں۔

بہتر تو یہ ہوتا کہ یو۔ این کے لئے کوئی ٹاپو الگ کر دیا گیا ہوتا۔ اس میں اس کے کام کرنے والوں اور اس میں اس کے شریک ہونے والوں کے رہنے کا انتظام ہوتا اور ٹاپو میں اسی کا حکم چلتا۔ نیویارک جیسے شہر کی چہل پہل میں قوموں کے نمائندے کچھ کھوئے سے جاتے ہیں۔ یو۔ این کی اصل حیثیت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ مگر جو فیصلہ کیا جا چکا ہے اس پر اب بحث نہ کرنا چاہیے۔ جو کچھ طے ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے۔ یو۔ این کی اپنی الگ عمارت بن رہی ہے اور سال ڈیڑھ سال کے اندر تیار ہو جائے گی۔ اس میں اس کے دفتر ہوں گے کتاب گھر ہوگا۔ جلسوں کے لئے ہال اور کمرے ہوں گے، اور کھانے پینے اور مل کر بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لئے جگہیں ہوں گی۔ جلسوں کے وقت اب جو رونق ہوتی ہے وہ بہت بڑھ جائے گی اور سلیقے سے کام کرنے میں اس وقت جو دشواریاں ہوتی ہیں وہ نہ رہیں گی۔ اصل میں یو۔ این کی کارگزاری کا بہت بڑا حصہ اس کے دفتر کا کام ہے۔ جس نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو کہ یہ دفتری کام کتنی پھرتی اور عقلمندی سے انجام پاتے ہیں اور ضروری معلومات کس طرح خود بخود فراہم کر دی جاتی ہیں۔ وہ دفتر کے کام کرنے والیوں کی پھرتی اور سمجھ، ادھر آتی، ادھر جاتی پلٹنوں کو سمجھے گا کہ چلتے پھرتے گلدستے ہیں جن سے یو۔ این کی عمارت کو سجایا گیا ہے، بے شک یہ سجاوٹ ہے۔ مگر ایسی سجاوٹ کہ جس سے بڑے کام بھی نکلتے ہیں۔ یہ نہ ہوتی تو قوموں کے نمائندے مارے مارے پھرا کرتے کوئی بات دقت پر نہ کہہ سکتے، اور کوئی بحث ختم نہ کر پاتے۔ اب وہ کوئی غلط بات کہتے ہیں یا غلط الزام لگاتے ہیں تو اس میں انھیں کا قصور ہوتا ہے۔ یو۔ این کے گلدستے دنیا کے گلدستے ہیں جن کے رنگوں اور مہک سے آنکھ اور دماغ کی روشنی بڑھتی رہتی ہے۔

لیکن یو۔ این کے دفتر، اور ان دفتروں کے سارے کام قوموں کے نمائندوں کے لئے دنیا میں اتحادِ عمل کو ترقی دینے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ یو۔ این کی حیثیت اور اثر کو بڑھاتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایسی سبھا ہو جائے جس کے فیصلے ساری دنیا کے لئے قانون کا حکم رکھتے ہوں، اور ان فیصلوں میں حق اور انصاف کی وہ پوری شان ہو جس کے سامنے ہر آدمی کا سر خود ہی جھک جاتا ہے ٭

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

"بھئی واللہ تم نے اپنا پارٹ نبھا دیا، نقالی تو بندر کے حصے میں آئی ہے۔ انسان کی ایک ایک چیز کی نقل اُتارتا ہے، اگر ہو سکتا تو لفظوں کو بھی اسی طرح دُہراتا، تم ضرور پہلے بندر رہ چکے ہو اور تمھیں اس جنم کی حرکتیں اب تک یاد ہیں"

"میر صاحب ایک بات آپ کو بتاتا ہوں کبھی پینک میں سوچئے گا۔ یہ بندر جو انسان کی حرکتوں کی نقل کرتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اس کی اپنی پرانی بھولی ہوئی حرکتیں ہیں، انسان کو کرتے دیکھتا ہے تو اسے یاد آ جاتی ہیں"

"فریب نظر اور حقیقت"

(۲)

مِنہاج برنا

یہاں تک بحث کا موضوع غیر طبقاتی سوسائٹی تک محدود تھا۔ طبقاتی سوسائٹی میں کاڈول نے شعر کے کام کی دو تعبیریں پیش کی ہیں اور اس میں سرمایہ دار انگلستان کی مثال کو سامنے رکھا ہے۔

پہلی اور زیادہ اہم تعبیر کے مطابق شاعری اب بھی آزادی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن یہ آزادی محض ایک فریب ہے ــــــــ

یہ روسو کا بنایا ہوا فریب ہے: آدمی آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر جگہ پابند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی آزاد پیدا نہیں ہوا۔ وہ صرف اپنی زندگی کی جدوجہد سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ آزادی کا یہ فریب بورژوا طبقہ کی تاریخی کارگزاری کا نتیجہ ہے (ہندوستان میں آزادی کا یہ فریب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سامنے لایا ــ مترجم) بورژوا طبقہ جاگیردارانہ نظام کی ساری معاشی پابندیاں توڑ دیتا ہے اور آزاد منڈی اور آزاد مقابلہ پیدا کرتا ہے۔ آزاد مقابلہ اپنے نتیجے میں چھوٹے کارخانہ داروں کو ختم کرکے بڑے سرمایہ داروں کو وجود میں لاتا ہے۔ بورژوا طبقہ جاگیردارانہ حکومت کا تختہ الٹتا ہے، اور ایک بہت مضبوط اور مستحکم مرکزی بورژوا ریاست کی بنیاد رکھتا ہے، اور اسے آزادی سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ آزادی دراصل مٹھی بھر سرمایہ داروں کی ہوتی ہے۔ اس سارے عمل کے نتیجے میں لاکھوں اُجرتی غلام پیدا ہوتے ہیں جن کے لئے بورژوا آزادی کے کوئی معنی نہیں۔ اُن کے لئے یہ آزادی کی نفی ثابت ہوتی ہے۔ آب سراب بن جاتا ہے اور حقیقت فریب میں مبدل ہو جاتی ہے۔

بورژوا سوسائٹی کے اس تضاد کا اظہار شاعری میں بھی ملتا ہے۔ جس طرح ایک بورژوا فرد خود کو ایک انفرادیت پسند کی حیثیت سے ان تمام اجتماعی بندھنوں کے خلاف برسرپیکار دیکھتا ہے جنھوں نے فطری انسان کو باندھ رکھا ہے۔ اسی طرح بورژوا شاعر بھی بہ حیثیت ایک انفرادیت پسند کے یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنی خودی کی معرفت کے لئے کوشاں ہے ــــــــ اس کوشش میں اس کو اپنی ذات تمام خارجی حقائق پر حاوی آجاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی خارجی حقیقتیں اس کے رومانی تصورات سے ٹکراتی ہیں اور پھر اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی آزادی ایک فریب تھی۔ چنانچہ وہ خود کو تنہا پاتا ہے۔ یہ تنہائی اس کی بے ثباتی اور دلفریب آزادی کی ایک لازمی شرط ہوتی ہے۔ وہ اپنی روح سے ہر اجتماعی اور معاشرتی شئے کو خارج کر دیتا ہے اور وہ خود اپنی نظر میں ایک ادنیٰ، حقیر، کھوکھلا اور غیر محفوظ انسان بن کر رہ جاتا ہے ــــــــ (صفحہ ۱۰۶)

لیکن بورژوا آزادی کے تضادوں سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں سوائے نئی سوشلسٹ آزادی کے۔ اور جب تک شعراء بورژوا ہیں وہ کیٹس کی طرح حرف حقیقت سے گریز کر سکتے ہیں جو شعر کے غیر فانی شہپروں پر اڑ کر ایک پرسکون، سایہ دار، سحر انگیز دنیا میں گم ہو گیا تھا، وہ رومانی دنیا جو حقیقی دنیا کے بالمقابل ہمیشہ موجود رہتی ہے ــــــــ (صفحہ ۹۴)

"حسن سچائی ہے اور سچائی حسن ــــــــ تمھیں دنیا میں بس اسی قدر معلوم ہے، اور اتنا ہی جاننے کی ضرورت بھی ہے"

دنیا اور اس دنیا کے واقعات کی طرف توجہ نہ کرو۔ کیٹس کہہ رہا ہے۔ ایک یونانی مرتبان کی خوبصورتی ہے، جو زمانے کی دست برد سے باہر ہے۔ مطمئن ہو جاؤ ــــــــ یہ جانتے ہوئے کہ حسن ہی وہ تنہا سچائی ہے جو اہمیت رکھتی ہے۔ گویا اس تعبیر کے مطابق بورژوا شاعری، بورژوا طبقہ کے دھوکوں کا اظہار ہے اور اُن کے جھوٹ اور فریب کا ردعمل ہو۔ بورژوا شاعر اپنے طبقہ کے خیالات کا اظہار کرتا ہے کاڈویل نے شیلے کے متعلق بھی یہی کہا ہے اور اُس کے پرومیتھیس کو ایک حامل مشین سرمایہ دار کی علامت قرار دیا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے مقام پر کاڈویل یہ بھی بتاتا ہے کہ "بورژوا شاعری کا فریب پیدا آور قوتوں اور پیدا آور رشتوں کی کش مکش کا نتیجہ ہے۔ (صفحہ ۱۰۴) یہ کشاکش جو نہ صرف بورژوا طبقہ کو بلکہ ساری بورژوا سوسائٹی کو مستقبل کی حقیقت کی طرف لے جاتی ہے، اور اس سے دوچار کرتی ہے وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ بورژوا شاعری کی انفرادیت پسندی نہ صرف ایک خاص شاعر کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے بلکہ یہ اپنے عہد کے اجتماعی جذبات کی عکاس بھی ہوتی ہے" (صفحہ ۷۱) بورژوا شاعری اپنی سوسائٹی کی ساری جذباتی زندگی کو ایک دیوہیکل "انا" میں مرکوز کر دیتی ہے۔ یہ انا اور خودی سوسائٹی کے بورژوا ممبروں میں مشترک ہوتی ہے۔ (صفحہ ۷۰)

اس تعبیر کے مطابق بورژوا شاعری ان معنوں میں بورژوا نہیں ہے کہ یہ بورژوا طبقہ کے خیالات کو پیش کرتی ہے ــــ شیلے کا کردار پرومیتھیس بس محض ایک حامل مشین سرمایہ دار ہی کی تمثیل نہیں۔ بورژوا شاعری اس لئے بورژوا ہے کہ یہ ساری بورژوا سوسائٹی کا اظہار ہے۔ یہ صرف ایک طبقہ کے خیالات کی نمایندہ نہیں بلکہ معاشرہ کے مختلف جنگ آزما طبقوں کا کلی عکس ہوتی ہے۔ جن میں ایک طرف سرمایہ دار بھی شامل ہیں، اور دوسری طرف مزدور بھی (یہ اور بات ہے کہ بورژوا شاعروں میں سے بعض ایک طبقہ کی زیادہ نمایندگی کریں اور دوسرے طبقہ کی کم، یہ ان کے شعور پر منحصر ہے ۔ مترجم)

اوّل الذکر تعبیر کے مطابق بورژوا شاعری بورژوا فریبوں کی سرحد کو پار نہیں کر سکتی۔ دوسری تعبیر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بورژوا شاعری (یعنی بورژوا شاعروں میں سے بعض شاعر) اس سوسائٹی کا بھی تصور کر سکتی ہے جو بورژوا سوسائٹی کے پیٹ سے بورژوا طبقہ کی مرضی کے خلاف پیدا ہو رہی ہے۔ کاڈویل کے مطابق شیکسپیر نے اپنے ڈراما ٹمپسٹ میں پیغمبرانہ انداز میں کمیونزم کے عہد کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ لہٰذا بورژوا شاعری کا فریب نہ صرف بورژوا آزادی کا فریب ہی ہے بلکہ ابتدائی انسانی معاشرہ کی شاعری کی طرح یہ نئی سوسائٹی کی ایک جھلک بھی ہے ــــــــ اس نئی حقیقی اور اعلیٰ آزادی کی جھلک جسے معاشی جدوجہد معرض وجود میں لائے گی۔

کاڈویل کی ان دونوں تعبیروں میں سے مجھے دوسری تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ اس کی کتاب کے بنیادی افکار کے مطابق ہے۔ اب ہمیں بورژوا شاعری کا مطالعہ اس سوال کو اپنے ذہن میں رکھ کر کرنا چاہیے کہ کیوں کر بورژوا شاعری بورژوائی فریب آزادی کے ادراک کی سمت جو لازماً ناممکن ہے اجتماعی جذبات کی رہنمائی کرتی ہے؟ اور پھر ساتھ ہی یہ سوال کہ کس طرح بورژوا شاعری اجتماعی جذبات کو مستقبل کی حقیقی آزادی کے تصور سے روشناس کراتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کے جواب کے لئے تاریخ سے رجوع کرنا ضروری ہے جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بورژوا طبقہ کی انقلاب پسندی کے خاتمے کے ساتھ آزادی کا جو والی تصور بھی اپنی اہمیت کو بدل دیتا ہے اور اپنی قدر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے

لیکن میرا خیال ہے کہ بورژوا شاعری کی اہمیت اور قدر آیندہ زمانوں میں بھی باقی رہ سکتی ہے اور وہ محض اس بنیاد پر کہ بورژوا شاعری صرف بورژوا کا اظہار نہیں بلکہ ساری بورژوا سوسائٹی کا اظہار ہے۔ انگریزی شاعری انگریزی قوم کے خیالوں کا اظہار ہے جو مختلف متضاد تاریخی قوتوں کا مجموعہ ہے، ہمیں اپنی تہذیبی اور قومی روایات کو سمجھنے اور ان میں سے اچھے حصے کا وارث بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مذکورہ سوالوں پر غور کریں۔

کاڈویل کی یہ تصنیف طبقاتی شعور کو تیز کرتی ہے جب ہم کام کو شاعری کے آئینے میں منعکس دیکھتے ہیں

ہفتہ وار **نئی روشنی** دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

فریب نظر اور حقیقت (بہ سلسلہ صفحہ ...)

اور شاعری میں کام کے حقیقی مقصد کو پاتے ہیں تاکہ خود کو اور اس دنیا کو زیادہ خوب صورت اور انسانیت تاب بنائیں تو ہم سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف زیادہ شدت سے اور بہتر طریقے پر جنگ کر سکتے ہیں کیونکہ اس نظام میں کام کا مقصد فوت ہو رہا ہے اور کام کرنے والوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ نہ صرف اس قدر زائد سے جس کو وہ پیدا کرتے ہیں محروم کئے جاتے ہیں بلکہ اس دنیا سے بھی جو اُن کے کام کے نتیجے میں پیدا ہونی چاہئے اور اس تبدیلی سے بھی جو ان کی شخصیت میں ہونی چاہئے تھی۔ آج کی شاعری کی خوب صورتی اس نظام کی خوفناکی اور شدت کی عکاسی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اشتراکیت کے لئے کیونکر لڑ سکتے ہیں۔ اشتراکیت جو نیا کام اور نئی شاعری لا رہی ہے۔ اس کا سمجھنا ہماری سیاسی سرگرمیوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ میرا مطلب نہیں کہ ہر شخص اس کے لئے فریب و حقیقت کا مطالعہ لازمی ہے اور نہ یہ کہ ہمیں شاعری کے حق میں سیاست سے دست بردار ہونا چاہئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہماری سیاست نامکمل رہے گی اگر ہم شاعری کی اس روح کو جسے کاڈول نے پیش کیا ہے نہ سمجھیں اور اسے اپنی فہم کا ایک جزو نہ بنا لیں۔ ہماری سیاست اس لئے نامکمل ہوگی کہ ہم اپنی قوتوں کو کم سمجھیں گے اور انسانیت اور عوام سے متعلق ایک ادنیٰ تصور قائم کر سکیں گے۔ عوام جو محنت کرتے ہیں جس سے وہ دنیا اور اپنی ذات کو بدل لیتے ہیں، ہر محنت کی عظمت، بلندی اور اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ صرف عظیم شاعری ہی اسے الفاظ میں بیان کر سکتی ہے صرف عظیم شاعری ہی عوام کی تخلیقی قوت کی ترجمان بن سکتی ہے۔ ہومر، شیکسپیئر، ملٹن اور شیلے کی شاعرانہ عظمت ان کے زمانے کے عوام کی عظمت سے منسوب ہے کیونکہ ان شاعروں کا کام عوام کے کام کی سچی زندگی کے ساتھ زندہ رہے گا۔ ہمارا کام ہے کہ ہم سوسائٹی کو بدل ڈالیں تاکہ یہ سرمایہ دارانہ عہد جس میں عوام کے کام کو دناءت اور پستی سے منسوب کیا جاتا ہے اور اُن کی طاقتوں کو غلط راہ میں استعمال کیا جاتا ہے، ختم ہو جائے تاکہ محنت کشوں کی تخلیقی قوتیں اشتراکی سماج کے قیام میں صرف کی جائیں۔

تاریخ اشاعت: یکم ۸، ۱۶، ۲۴ — چندہ: سالانہ ۵ر، ششماہی ۳ر
دفتر "نئی روشنی" بانگر، جامعہ، دہلی
طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی (بی اے، جامعہ) — مطبوعہ: جید پریس دہلی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ نمبر ۲۱ | یکم دسمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

اہل علم کی آواز

(۲۰ نومبر کے "نئی روشنی" میں تہذیبی اتحاد کی کانفرنس کا ذکر کیا گیا تھا جو ۲۴ اکتوبر سے ۳۰ اکتوبر تک مہابلشور میں منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اور تہذیبی اداروں کے نمایندوں پر مشتمل تھی مندرجہ ذیل اعلان کو جو کانفرنس کے بعد شائع کیا گیا ہم ہندوستان کے اہل علم کی آواز کہہ سکتے ہیں)

اس وقت ہماری تہذیب ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، اور اس کی بہت سی اہم سماجی، ذہنی اور اخلاقی قدریں خطرے میں ہیں، اس کی وجہ سے ہماری قومی زندگی کی بنیادیں کمزور ہوگئی ہیں، اور ہماری شہری زندگی اور دیانت کے معیار پست ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی علامتیں ہمیں چاروں طرف ملتی ہیں، اور کوئی شخص جس میں سماجی نظر اور سماجی احساس ہے انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ سب لوگ جو ملک کے خیرخواہ ہیں اور اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کے خواہشمند ہیں، جن میں استاد، ادیب، مفکر، فن کار سب شامل ہیں۔ اس صورت حال پر غیر جانبداری کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ہم سب نے جو اس کنونشن میں شریک ہوئے، بہت سے ان بنیادی مسئلوں پر بحث کی جو اس نازک زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور کافی غور و بحث کے بعد ہم نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کو مندرجہ ذیل بیان کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ ہم سب بحیثیت مجموعی اس بیان سے اتفاق رکھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اپنے دیس میں ان خیالات کا ہر مناسب طریقے پر پرچار کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہمارے بہت سے شریک کار جو تہذیب کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں، ان میں سے بعض خیالات کو بالکل بدیہی بلکہ پیش پا افتادہ کہیں۔ لیکن اس سے تو محض اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ موجودہ صورت حال اس قدر نازک ہوگئی ہے کہ اس قسم کے خیالات کا باضابطہ اعلان کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اس بات کا دکھ بھرا احساس ہے کہ ہماری زندگی میں کچھ مدت سے بعض ایسے رجحانات نمودار ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے یہ قدریں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔

۱۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ باوجود ہم ذہنی اختلافات کے ہم سب انسان دوستی کے ایک مشترک مقام پر جمع ہوکر ان قدروں کو قائم کرنے کے لئے مل جل کر کوشش کرسکتے ہیں اس [illegible] کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ہر انسان کو بحیثیت انسان کے قابل احترام سمجھیں اور اس حق کو تسلیم کریں کہ اس کی شخصیت اور صلاحیتوں کو پھلنے اور پھولنے کا بہترین موقع ملنا چاہیے۔

۲۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کے مکمل ارتقا کے لئے تمام ضروری مادی اور ذہنی سہولتیں مہیا کی جائیں، ساتھ ہی ایسے سماجی ادارے یا اجتماعی تحریکیں جو اس ارتقا کے راستے میں حارج ہوں، انسان دوستی اور آزادی کی روح کے منافی ہیں۔

۳۔ ہم حقیقی قومی اتحاد اور ایک جاندار قومی تہذیب کی نشو و نما کے لئے سماجی انصاف کو ایک شرط لازم سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر قومی اتحاد مصنوعی اور عارضی ہوگا، اور اس کی بنیاد جبر پر ہوگی، اور قومی تہذیب میں نہ وسعت ہوگی نہ قوت۔ سماجی انصاف کا مطالبہ یہ ہے کہ عوام کے مادی اور ذہنی معیار کو اونچا کیا جائے، اور اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اور دوسرے تعلیمی ادارے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں جو تعلیم یافتہ طبقے اور عوام میں حائل ہوگئی ہے۔

۴۔ ہمارے خیال میں مادی اور روحانی قدروں کو ایک دوسرے کی نقیض سمجھنا اور ایک کو مغرب سے اور دوسری کو مشرق سے وابستہ سمجھنا بالکل غلط اور غیر مناسب ہے ایک اچھی سماجی زندگی کے قیام کے لئے ہر قوم کے واسطے ایک معقول مادی اور تمدنی نظام اتنا ہی ضروری ہے جس قدر اخلاقی اور تہذیبی قدروں پر ایمان اور اگر ہم ان میں سے ایک کو بھی نظر انداز کریں گے تو اس سے زندگی کی تکمیل کا امکان جاتا رہے گا۔

۵۔ ہم تاکید کے ساتھ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہمارا تہذیب کا تصور جامع اور وسیع ہونا چاہیے جو ہر قسم کی ملکی، نسلی، جغرافی اور لسانی تنگ نظری کو مسترد کرے اور ہر قسم کے صالح تہذیبی عناصر کا خیر مقدم کرے۔ ہمیں کثرت میں وحدت کا جلوہ پیدا کرنا ہے، لیکن اس وحدت کا مفہوم یکسانی نہیں بلکہ وہ اختلافات کو کھلے دل سے قبول کرتی ہے، اور ان کو سمجھنے، پرکھنے اور جہاں تک ہوسکے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

۶۔ خود اپنی تہذیب کا مطالعہ کرنے میں ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے اس اجتماعی ورثے کی صحیح تنقید کریں۔ نہ ماضی کو محض اس وجہ سے رد کرنے کے قابل سمجھیں کہ وہ گذر چکا ہے نہ ایک رومانی اور احمقانہ انداز میں رجعت پسند ماضی کا نعرہ لگائیں بلکہ ماضی اور حال میں، اندر اور باہر سے جو عنصر بھی قابل قدر معلوم ہو ان کا خیر مقدم کریں۔ اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو ہمیں ان تمام لسانی، اجتماعی اور فرقہ وارانہ تعصبات کو یک قلم مسترد کرنا ہوگا جو ہماری تہذیب پر حاوی ہوگئے ہیں اور جن کی وجہ سے قومی زندگی میں سخت اختلافات اور

(باقی صفحہ ۸ پر)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
اہل علم کی آواز	...	۱
دو ہندی کتابیں	سید احتشام حسین	۲
ہمارا آئین	(اداریہ)	۳
دنیا کی رفتار:-		
۱- ہندوستان	ع۔ ح	۴
۲- باہر کی دنیا	ا۔ س	۴
بزم بے تکلف	...	۵
سوز ناکام	سروش شکستی	۵
غزل	باقر مہدی	۶
بچے اور ان کی عادت	محمد حسین	۶
لیڈی کمال کا اسکیچ	صالحہ عابد حسین	۷
سنگ و خط	ضیاء الفاروقی	۹

قیمت فی پرچہ ۳ر

مختصر تبصرے

دو ہندی کتابیں

سید احتشام حسین رضوی

۱۔ **شعر و شاعری** :۔ از ایودھیا پرشاد گویلیہ۔ ناشر :۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کاشی۔ قیمت ۶ مجلد
۲۔ **میکسم گورکی** :۔ از مہیندر رائے۔ ملنے کا پتہ :۔ انڈین بک ڈپو، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت ۳ مجلد

۱۔ لسانی نقطۂ نظر سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ بنیادی طور پر ہندی اور اردو ایک ہیں۔ حالات نے ان کے ارتقائی شکلیں مختلف کر دیں۔ اس لئے اگر تعصبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک زبان کا جاننے والا دوسری زبان نہ صرف آسانی سے سیکھ سکتا ہے بلکہ سیکھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندی اردو کے مسئلے پر شدید اختلاف کے باوجود اس حقیقت کو تمام انصاف پسند ہندوستانی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کے ارتقا میں ہندوؤں کا اور ہندی کی ترقی میں مسلمانوں کا اتنا اہم حصہ رہا ہے کہ ان زبانوں کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر زبانوں کو مذہبی کہا جانے لگے تو سارا فلسفۂ لسان غلط ہو جائے گا۔ دونوں زبانیں ایک ہیں اس لئے ان کا ایک ساتھ مطالعہ بڑے مفید نتائج برآمد کرے گا۔

بہر حال اس وقت ہندی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے یہاں یہ جذبہ تیزی سے پیدا ہو رہا ہے کہ وہ ہندوستان کی ایک بہت ہی اہم اور ترقی پسند زبان یعنی اردو کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں جتنی بھی کتابیں نظر سے گذری ہیں ان میں انصاف پسندانہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ایک طرف تو لوگوں کے ذہن تعصبات سے پاک نہیں ہیں اور دوسری طرف لکھنے والوں کا اردو ادب کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں کا پتہ کسی کتاب کے مطالعہ سے چل سکتا ہے۔ شعر و شاعری یعنی کتاب زیر تبصرہ بھی اس عیب سے پاک نہیں۔ یہ کتاب چھ سو بیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس میں اردو شعرا اور شاعری کے متعلق چند مباحث ہیں اور سب سے اہم چیز دس ابواب میں اکتیس مشہور شعرا کا انتخاب ہے۔ ابواب تاریخی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں جن میں میر تقی میر سے لے کر موجودہ دور کے نوجوان شعرا تک کی اچھی نظمیں اور غزلیں انتخاب کی گئی ہیں۔ دس حصے جن عنوانات کے ماتحت مرتب ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں :-

ابتدا، ترقی، افتتاح، تسلسل، روشنی
نیا سویرا، بیداری، سعی کامران، ترقی پسندی
اور مزاج تغیر ہیں۔

یہ عنوانات خود اپنے دائرۂ انتخاب کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ چند اہم شعرا چھوٹ گئے ہیں لیکن جو کتاب میں شامل کئے گئے ہیں ان کے انتخاب سے مؤلف کے وسیع مطالعہ اور سخن فہمی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مشکل عربی، فارسی الفاظ کے معنی فوٹ نوٹ میں دے دئے گئے ہیں جس سے کم اردو جاننے والوں کو سہولت ہوگی۔ کتاب کی ترتیب میں کافی سلیقہ برتا گیا ہے اور طباعت بھی قابل تحسین ہے ہندی میں غالباً اردو کا یہ سب سے اچھا اور نمائندہ انتخاب ہے اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے انتخاب پر اضافہ ہے۔

شعرا کے انتخاب کے علاوہ جو ابتدائی تعارفی صفحات ہیں، ان میں البتہ بہت سی بحث طلب باتیں اٹھائی گئی ہیں۔ کتاب کا سنسکرت، پالی اور ہندی کے مشہور عالم راہل سانکرتیاین نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ بہت سی زبانوں کے عالم ہونے کے باوجود راہل جی نے اردو کے بدیشی ہونے کا ذکر کیا ہے وہ مختلف تمدنوں کے ارتباط اور تہذیبی اثرات کے تداخل سے واقف ہیں، پھر بھی انھیں یہ شکایت ہے کہ اردو نے فارسی کا اثر قبول کر لیا اور میں فارسی، عربی کے الفاظ اور فارسی بحروں کے انتخاب کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے گویا یہ سب کچھ ہندوستانی تہذیب کی دشمنی میں کیا گیا ان کے خیال میں اردو کے شعرا نے ہندی بحروں کا "بائیکاٹ" جان بوجھ کر کیا۔ یہ خیالات علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ثابت ہوں گے۔ موصوف نے خود ہی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی میں ہندوستانی موسیقی کا "بائیکاٹ" نہیں کیا۔ کیا موصوف اس کا سبب بتا سکیں گے کہ مسلمانوں نے صرف شاعری ہی میں کیوں ہندوستانی اثرات کو قبول کرنے سے انکار کیا اور موسیقی، تعمیر اور مصوری میں اختلاط کا عمل کیوں جاری رہا؟ یہاں راہل جی کی علمیت پر جذباتیت کا غلبہ ہے، اسی طرح اور بعض باتیں بحث طلب ہیں، لیکن اس مختصر سے تبصرے میں ان سے الجھنا ممکن نہیں ہے۔

خود مؤلف نے بھی ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو کو اردو کا جنم داتا قرار دیا ہے اور خسرو کے کارناموں کو ہندوستانی تمدن کا جز مانا ہے۔ لیکن اردو کے عروج کو بدیسی کہا ہے۔ یہاں بھی وہی غلطی ہے یعنی زبان پر جو تمدنی اثرات تاریخ کے ناگزیر تقاضوں سے پڑتے رہے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے اس جگہ اس مسئلے کو چھیڑنے کا موقع نہیں کہ اردو کی ترقی کو ہندوستانی قومیت اور تہذیب کی [illegible] دیکھا جائے، ورنہ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اردو کی ترقی کسی قسم کے مذہبی جذبے سے وابستہ نہیں تھی۔ گویلیہ صاحب نے اردو غزل کے متعلق اور علامات و اشارات شاعری کے متعلق بھی بعض باتیں ایسی کہی ہیں جنھیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کا یہ انتخاب وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے [illegible] میں اس کی غلطیاں درست کر لی گئیں اور انتخاب میں چند اور نئے شعرا کو شامل کر لیا گیا تو یہ کتاب ایک بے نظیر تالیف ثابت ہوگی۔

کتاب کی زبان ہر جگہ یکساں نہیں ہے، کہیں آسان ہے کہیں مشکل۔ ذرا سی محنت سے یہ خامی بھی دور کی جا سکتی تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندی ادب میں یہ انتخاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ سری مہیندر چندر رائے نے ہندی میں میکسم گورکی کی سوانح عمری لکھ کر ہندی ادب میں ایک دلچسپ کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ کتاب بنگالی زبان میں شائع کی تھی، پھر ہندی میں ترجمہ کر کے انڈین پریس الہ آباد سے شائع کی ہے۔ ہندی ترجمے میں بیڈھب بناری (ہندی کے مزاح نگار شاعر) نے بھی ان کی مدد کی ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے اور انداز بیان بہت ہی دلکش ہے۔ مصنف کے سامنے میکسم گورکی کی خود نوشت سوانح عمری تھی، کیونکہ ترتیب اور انداز بیان میں اسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ گورکی کا نام ہندی اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی اب تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ انقلاب روس نے جس اشتراکی حقیقت نگاری اور انسان دوستی کو جنم دیا گورکی اس کا مجسمہ تھا۔ اس کی ساری زندگی ایک انقلابی زندگی تھی۔ اس کا وجود اس حقیقت کا واضح اعلان تھا کہ عوام سے رشتہ جوڑ کر ادیب کے قلم میں غیر معمولی توانائی آ جاتی ہے۔ گورکی ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جس کی مالی اور اخلاقی حالت بہت خراب تھی اس نے بچپن میں زندگی کے بہت سے تجربے حاصل کر لئے، بہت سے پیشے اختیار کئے۔ بہت سی سیاسی انجمنوں میں حصہ لیا، بہت سے سفر کئے، بہت پڑھا اور بہت کچھ لکھا۔ تجربہ اس کا معلم اور ماحول اس کا مدرسہ تھا۔ حالات نے اسے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، لیکن اپنی محنت سے اس نے دنیا کے اہم ترین علوم اور بہترین مصنفین کا مطالعہ کیا اور مصنف کی حیثیت سے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ دنیا کے اعلیٰ مصنفوں، مفکروں اور انسان دوستوں کی جو فہرست بھی بنائی جائے گی اس میں گورکی کا نام ضرور ہوگا۔ اس لئے گورکی کی زندگی کا مطالعہ ناول سے زیادہ دلچسپ اور تاریخ کے زیادہ سبق آموز ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کے آخری دو صفحوں نے مصنف کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ یوں تو سیاسی حالات کے تجزیہ میں مصنف نے کئی جگہ لغزشیں کی ہیں لیکن گورکی کی موت کا تذکرہ کر کے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم دسمبر ۱۹۴۹ء

ہمارا آئین

ہمارے مشترک فکر و تصور کا آئینہ

خدا کا شکر ہے کہ ہماری آئین ساز اسمبلی کی تین سال کی محنت ٹھکانے لگی اور ہندوستان کا آئین تیسری پڑھت کے بعد آخری شکل میں منظور ہوگیا۔ اسمبلی کے موجودہ اجلاس میں جو ۱۴ نومبر سے ۲۶ نومبر تک رہا کوئی سو اسو ممبروں نے اپنی اپنی رائے آئین کے بارے میں ظاہر کی جس میں معروضی تنقید بہت کم، شاعری بہت زیادہ تھی اور اس شاعری میں قصیدہ، مناجات، رجز، ہجو ملیح، ہجو قبیح، واسوخت، مرثیہ، غرض تعریف اور مذمت شکر اور شکایت کا کوئی رنگ چھوٹنے نہیں پایا سرسری نظر سے دیکھنے والے کو حیرت ہوگی کہ جس آئین کے بارے میں اتنا شدید اختلاف رائے ہے وہ قریب قریب اتفاق رائے سے کیونکر پاس ہوگیا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اختلاف رائے بہت کچھ تو محض گرمیٔ محفل کی خاطر ہے اور جتنا حقیقی ہے وہ ان چھوٹے چھوٹے حلقوں کی طرف سے ہے جو ملک کے آیندہ سیاسی معاشی اور تہذیبی نظام کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد تصورات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اصولاً موجودہ آئین کو ناقص قرار دیتے ہیں، لیکن عملی مصلحت کے لحاظ سے اس کو غنیمت جانتے ہیں کہ آئین اگر اس سرے پر نہیں آیا جس پر وہ لانا چاہتے تھے دوسرے سرے پر بھی نہیں پہنچنے پایا، یہ بیچ کی راہ جسے آئین سازوں نے اختیار کیا ہے، ایسے تصورات پر مبنی ہے۔ جو ہر مذہب خیال کے لوگوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں، ایک جمہوری ریاست کے آئین سے ہم اس سے زیادہ اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔

آئین کے بنیادی تصورات پر بحث کرنے سے پہلے ہم ان اعتراضوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو آئین پر کئے گئے ہیں، چھوٹے چھوٹے اعتراض تو بے شمار ہیں۔ ان کا ذکر کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت ہے۔ ہم صرف بڑے بڑے اعتراضوں کو لیں گے۔

وہ اعتراض جو نذیر الدین احمد صاحب اور دو ایک اور خوردہ گیر ممبروں نے کیا ہے کہ آئین کی زبان درست اور چست نہیں یا اس کی ترتیب ڈھیلی اور بے ربط ہے وہ صریحی طور پر بے بنیاد ہے۔ عام طور پر موافق اور مخالف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آئین کی دفعات نہایت قابلیت صحت و وضاحت اور سلیقے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ آئین بنانے والوں سے جو کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں مگر اس کے قلم بند کرنے والوں نے اپنے فرض کا پورا پورا حق کر دیا ہے۔

اب رہا یہ اعتراض کہ آئین ضرورت سے زیادہ کڑا ہے، اس میں لوچ بالکل نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ اگر ہم صرف ایک خاکہ بنا دیتے اور حسب ضرورت اس میں رفتہ رفتہ رنگ بھرتے تو اچھا تھا تاکہ ہمیں بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے روز روز آئین میں ترمیم نہ کرنی پڑتی۔ لیکن کیا کیا جائے یہ ہمارے قومی مزاج کا معاملہ ہے۔ ہم انگریزوں اور امریکیوں کی طرح تجربے کے نہیں، فرانسیسیوں کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ منطق کے قائل ہیں ہمارے ذہنوں نے دھرم شاستر اور فقہ کے آغوش میں تربیت پائی ہے جہاں ہر ممکن اور ناممکن صورت حال کے لئے پہلے سے قاعدے اور ضابطے بنا دئے جاتے ہیں، ہمارے بہت سے آئین سازوں کو تو اس تفصیل کے بعد بھی اجمال کی شکایت رہ گئی ہے، ان کا بس چلتا تو احکام غسل اور آداب طعام کو بھی آئین میں شامل کر دیتے

اسی طرح یہ اعتراض بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ آئین میں مرکزی حکومت کو بہت زیادہ اختیارات دے دئے گئے ہیں جس کی وجہ سے صوبوں کی خود اختیاری کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ واقعی اگر یونین کا صدر اپنے خاص اختیارات کا جو اسے آئین نے دئے ہیں بے جا استعمال کرے تو صوبوں کی حکومتیں محض کٹھ پتلی بن کر رہ جائیں گی۔ لیکن آئین میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان اختیارات سے صرف ہنگامی حالت میں کام لیا جائے گا، جب صوبے کی حکومت کے معطل ہو جانے یا امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا شدید خطرہ ہو اپنے ملک کے اور عام طور پر دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان خطروں پر قابو پانے کا انتظام کرنا مقدم تھا صوبوں کی داخلی خود اختیاری کو خطرہ جب پیدا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ آخر مرکزی پارلیمنٹ کے ممبروں کو صوبوں کے باشندے ہی منتخب کریں گے اور یونین کا صدر اور اس کی اسی کیبنٹ مرکزی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات غصب کر کے بیٹھ جائیں، اور پارلیمنٹ ان سے کچھ نہ کہے۔

بعض حضرات کو یہ شکایت ہے کہ آئین مہاتما گاندھی کے فلسفے کے مطابق نہیں بنایا گیا، یہاں فلسفے سے اُن کی مراد غالباً صرف معاشی نظام ہے اس لئے کہ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے مہاتما گاندھی کوئی الگ فلسفہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ مغرب کی لبرل جمہوریت کے قائل تھے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ موجودہ آئین نے گاندھی جی کے معاشی نظام کو جو خود کفیل دیہی معیشت پر مبنی تھا اختیار نہیں کیا، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کانگریس نے جو گاندھی جی کی اپنی پارٹی تھی، کبھی بہ حیثیت جماعت اس نظام کو قبول نہیں کیا تو آئین ساز اسمبلی سے جو مختلف پارٹیوں پر مشتمل ہے یہ توقع کیوں کر کی جا سکتی تھی۔ ہاں سیاسی اور سماجی جمہوریت کی اخلاقی روح جس حد تک مہاتما گاندھی اُسے کانگریس والوں اور عام ہندوستانیوں کے اندر پھونکنے میں کامیاب ہوئے تھے، ہندوستان کے آئین میں بھی موجود ہونی چاہئے تھی، اور ہے۔

اسی قسم کا اعتراض ایک دوسرے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ہمارا آئین ہم کو سیاسی آزادی اور مساوات دینا چاہتا ہے، اور اس کے لئے کچھ انتظام بھی کرتا ہے، لیکن معاشی آزادی اور انصاف کا صرف نام ہی نام لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہم کو کچھ بھی نہ دے سکے گا۔ اس لئے کہ سیاسی آزادی بغیر معاشی آزادی کے محض ایک بے معنی لفظ ہے۔ اس اعتراض میں اتنی اصلیت ضرور ہے کہ آئین لبرل جمہوریت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اشتراکی جمہوریت کی اس میں محض اتنی سی جھلک ہے کہ حکومت کو مفاد عامہ کے لئے زرعی اور صنعتی املاک "مناسب معاوضہ دے کر" ضبط کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کا قائم کرنا مقاصد میں داخل نہیں کیا گیا اس لئے یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ صنعت کو قومی ملک بنانے کا اختیار محض صفحۂ کاغذ تک موجود رہے کبھی برتا نہ جائے۔

ان سب باتوں کے باوجود آئین میں وہ خوبی موجود ہے جو عملی حیثیت سے اس کی ساری کوتاہیوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ وہ ان لوگوں کے زیادہ سے زیادہ اشتراک خیال پر مبنی ہے جنھیں ہندوستان کی رائے عامہ کا نمایندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ وہ کامیابی سے نافذ ہو سکے گا۔ کتنا ہی اچھا آئین بنا دیا جاتا اگر اسے رائے عامہ کی تائید حاصل نہ ہوتی تو محض بیکار تھا۔

بہت سے حضرات جو ہماری طرح اشتراکی جمہوریت کے حامی ہیں اس پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کے اشتراک خیال کو یہ آئین ظاہر کرتا ہے وہ ملک کی آبادی کی ایک چھوٹی سی پرت کے نمایندے ہیں عوام کے نمایندے نہیں ہیں۔ ہم ان حضرات سے یہ عرض کریں گے اب تک جتنے چھوٹے بڑے انتخابات، کونسلوں میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ہوئے، ان سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عوام انھیں لوگوں کے ساتھ ہیں، آپ کے ساتھ نہیں ہیں، جس دن آپ نے عوام کو ساتھ لے لیا، آپ اسی آئین کے ذریعے سے یا اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے ملک میں ایک جمہوری اشتراکی نظام قائم کر لیں گے۔ آئین کو محض ضد میں بُرا کہنا آپ کو زیب نہیں دیتا، یہ جیسا بھی ہے ہمارے اجتماعی دل و دماغ کے فکر و تصور، احساس و وجدان، حوصلے اور آرزو کا آئینہ ہے اگر ملک اس سطح تک پہنچ جائے جہاں یہ آئین اسے پہچانا چاہتا ہے تو اوپر اُٹھنا بہت آسان ہو جائے گا، اس لئے آپ اس کی مخالفت کرنے کے بجائے یہ کوشش کیجئے کہ اس کے نافذ کرنے کی قوت آپ کو حاصل ہو جائے۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے جو خود بری نہیں ہوتیں صرف دوسروں کے ہاتھ میں بری معلوم ہوتی ہیں ٭

دنیا کی رفتار

ہندوستان

آئین منظور ہوگیا

۲۶ نومبر کو آئین ساز اسمبلی نے ہندوستان کے نئے آئین کو جو ایک متیدہ ۳۹۵ دفعات اور آٹھ تعلیقات پر مشتمل ہے منظور کرلیا۔ وہ منظر جب اسمبلی کے اراکین اپنی تین سال کی محنت کو سوارت ہوتے دیکھ کر ایک دوسرے کو، صدر اسمبلی کو اور وزیر قانون شری امبیڈکر کو مبارک باد دے رہے تھے بڑا پر اثر تھا۔

آئین کی چند دفعات تو فوراً نافذ ہوگیا ہیں اور باقی کا نفاذ ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ ہند کے نئے پریسیڈنٹ کے انتخاب کے بعد ۲۶ جنوری سے ہوگا۔ فوراً نافذ ہونے والی دفعات میں سے زیادہ تر ایسی ہیں جن میں ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو پرانے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے نئے آئین کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پیدا ہوں گے اور ان کے حل کرنے کا اختیار پریسیڈنٹ کو دیا گیا ہے اور ایک دفعہ ۳۹۲ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عارضی پریسیڈنٹ کے انتخاب تک موجودہ گورنر جنرل پریسیڈنٹ کے فرائض انجام دیں گے۔

ادھر آئین مرکزی اسمبلی میں منظور ہوا اور ادھر ریاستوں کے ہر یونین کے راج پرمکھ نے اور نظام حیدر آباد نے یہ اعلان کردیا کہ وہ بھی اس آئین کو منظور کرتے ہیں اور اس کی تعمیل کا اقرار کرتے ہیں۔ اس طرح اب ریاستوں کے مجموعوں کی اور حیدر آباد کی قانونی حیثیت بالکل وہی ہوگئی جو انڈین یونین کے صوبوں کی ہے۔

آئین کی ایک دفعہ جو اسی وقت نافذ ہوگئی یہ ہے کہ نئے انتخابات تک موجودہ آئین ساز اسمبلی مرکزی پارلیمنٹ کے فرائض انجام دیتی رہے گی۔

کسانوں کا ہلّہ

۲۵ مارچ کو لکھنؤ میں کسانوں کا ہلّہ جو سوشلسٹ پارٹی کے اہتمام میں ہونے والا تھا پر امن طریقے سے ہوگیا۔ کئی ہزار کسانوں کا منظم مجمع جس کے آگے آگے آچاریہ نریندر دیو ایک جیپ میں سوار اور پیچھے پیچھے چار ہاتھی سوشلسٹ پارٹی کے جھنڈوں سے آراستہ چلے جارہے تھے۔ گومتی کے کنارے سے روانہ ہوکر شہر کی گلیوں میں سے ہوتا ہوا کونسل ہاؤس تک پہنچا اور وہاں سے امین آباد جاکر جلسے میں شریک ہوا۔ اس مظاہرے کا مقصد حکومت کی خاتمہ زمینداری کی موجودہ پالیسی کے خلاف احتجاج بتایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کا مطالبہ یہ ہے کہ سارے صوبے میں زمینداری یک دم سے بغیر زمینداروں کو معاوضہ دیے ہوئے ختم کردی جائے اور کسانوں کو بغیر لگان میں اضافہ کئے ہوئے زمین کی ملکیت کے حقوق حاصل ہوجائیں۔ قاعدے سے تو ایسے مطالبہ کی تائید سارے صوبے کے دیہات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہونی چاہیے تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر کسان حکومت کی عملی مشکلات کو سمجھتے ہیں، اس لئے اس پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتے، پھر بھی حکومت کو اس مظاہرے سے سبق لے کر اپنی پالیسی میں ایسی ترمیمیں کرنی چاہئیں کہ خاتمہ زمینداری کی حد سے زیادہ سست رفتار جو خود زمینداروں خصوصاً چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے تیز ہوجائے۔

دو جواں ہمت بوڑھے

پچھلے ہفتے صدر کانگریس ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ کی ستر سالہ اور ہریجن سیوک سنگھ کے روح رواں شری اے وی ٹھکر کی اسّی سالہ سالگرہ دلی میں منائی گئی۔

ڈاکٹر سیتا رمیہ آزادی کی فوج کے ان سپہ سالاروں میں ہیں جنہوں نے طبل و علم اور نعرۂ جنگ کے بغیر چپکے چپکے بہت سے معرکے سر کئے ہیں نہ صرف اپنے وطن آندھرا دیس میں بلکہ ہندوستانی ریاستوں میں تحریک آزادی کا سلسلہ چلانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شری اے وی ٹھکر جو عام طور پر ٹھکر بپا کے نام سے مشہور ہیں ایک دوسری جنگ آزادی کے ہیرو ہیں جو ہریجنوں کو سماج میں برابر کا حصہ دلانے کے لئے خود اپنے ملک کی قدامت پسندی اور تاریک خیالی کے خلاف لڑی گئی۔

خدا ان جواں ہمت بوڑھوں کی عمر اور حوصلے میں برکت دے۔

باہر کی دنیا

مان نہ مان......

برطانوی دارالعوام میں پچھلے دنوں بیرونی مسائل پر جو مباحثہ ہوا ہے اس نے ایک بار پھر چین کی کمیونسٹ حکومت کے ملنے جلنے کے سوال کو بحث کا موضوع بنا دیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ مغربی یورپ کی حکومتیں اسے ناگزیر مصیبت سمجھتے ہوئے بھی چین کی نئی حکومت کو تسلیم کرلیں گی۔ برطانیہ کے متعلق تو سبھی کا خیال تھا کہ چینی حکومت کو تسلیم کرنے میں اس کی طرف سے دیر نہ ہوگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے ان سطروں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ اپنے تجارتی مفاد کے پیش نظر برطانوی حکومت یہ کڑوا گھونٹ جلدی پی لینے پر آمادہ ہوجائے گی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانیہ کے کم و بیش سبھی سیاسی حلقوں کی رائے اس کی حمایت میں ہے، لیکن امریکہ کی مرضی ابھی یہ نہیں تھی۔ امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کا اپنا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ چینی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے لیکن امریکہ میں ابھی ایسے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ہے جو اس موہوم امید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید "چین کی قسمت" پر پھر چیانگ کا قابو ہوسکے اور یہ لوگ وہ ہیں جن کا بہت اثر ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات آسانی سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ برطانیہ کی قطعاً آزاد حکومت کو بھی ان کے ابرو کے اشاروں کی وجہ سے رک جانا پڑا ہے لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے پر [illegible] ہے، اس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اس سلسلے میں ایک بات [illegible] برطانوی ماہرین کی جو کانفرنس ابھی کچھ دن ہوئے سنگاپور میں ہوئی تھی اس نے بھی چینی کمیونسٹ حکومت کے تسلیم کر لینے کا مشورہ دیا ہے مگر چینی میں فرانسیسی نمائندہ [illegible] البتہ اس کے خلاف مشورہ دیا ہے بعض اس کا اندیشہ ہوگا کہ اس طرح چینی کمیونسٹ کا اثر شاید ہند چین میں زیادہ تیزی سے پھیل جائے۔ ایک بات جو غیر جانب دار خارجی سیاست کے دعووں کے پیش نظر بالکل سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنے پڑوس کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔

مہاجن کا دباؤ

پچھلے دنوں برطانوی دارالعوام نے فیصلہ کیا کہ لوہے اور فولاد کی صنعت کو قومی ملکیت کے تحت لانے کے سوال کو ملتوی کردیا جائے۔ یہ بات تو بظاہر برطانیہ کی اندرونی سیاست سے تعلق رکھتی ہے جس سے ان کالموں میں بحث نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن اس مسئلے کا ایک پہلو ایسا ہے جو ایک بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ امریکہ کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ سوشلزم پر تقریباً ایک سال پہلے ایک امریکی مصنف کی ایک بڑی اچھی کتاب شائع ہوئی تھی، اس میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت گلابی اشتراکیت سے آگے نہیں بڑھ پائے گی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ امریکہ سوشلزم کو برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ہم بھی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ شاید ہمارے ملک کے پیٹ بھرے طبقہ کو یہ نتیجہ بالکل پسند نہیں آئے گا، لیکن ہندوستان کے عوام کی بہبود کے پیش نظر اس نتیجہ پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ ہم نے امریکہ سے قرض لیا تو صرف وہی کرنے کی اجازت ملے گی جو امریکہ کو پسند آئے (مثلاً یہ کہ ہم صنعتوں کی توسیع میں زیادہ جلدی نہ کریں۔ امریکہ سے اس کو منگوائیں۔ وغیرہ وغیرہ)

انڈونیشیا کی آزادی

[illegible] انڈونیشیا کی [illegible] نے [illegible] کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے [illegible] پارٹی بھی شامل ہے مسلم پارٹی کی سیاست کا [illegible] پہلو [illegible] گیا ہے [illegible] پر زیادہ روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات کچھ زیادہ ترقی پسند نہیں ہے۔ سوشلسٹوں نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے گو وہ اس کی مخالفت بھی نہیں کریں گے۔ غیر جانبداری کا یہ رویہ بھی ملکوں میں سوشلسٹ پارٹیوں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ عام طور پر قطعی فیصلہ نہ کرپانے کے لئے بدنام ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

بزمِ بے تکلف

یوں تو دلی نے اس تین چار برس میں طرح طرح کے کھیل تماشے دیکھے۔ بڑے بڑے دنگل ہوئے، نئے نئے سرکس آئے، لندن کی بڑی پنچایت کی ٹھک منڈلی آئی، وزیروں کا طائفہ آیا، میاں ماونٹ بیٹن آئے، بی آزادی آئیں مگر ان سب چیزوں کا لطف ہمارے لیڈروں نے اٹھایا۔ ہمارے پلّے تو مار دھاڑ کے سوا کچھ بھی نہ پڑا، ہاں جب کامن ویلتھ سے جو کا روپ سے بھی آگے ہے کرکٹ کے کھلاڑی آئے تو سارے شہر میں ہل چل مچ گئی، ہر طرف چرچا ہونے لگا کہ لو میاں اب مزا آئے گا، گوروں اور کالوں میں سر میدان دو دو ہاتھ ہوں گے اور معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

پالی کے دن ساری دلی کھیل کے میدان کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ ہم جیسے لوگ بھی جو کرکٹ میں بالکل کورے ہیں سیل کے شوق میں جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے بیچ میں تین تین میخیں آمنے سامنے گڑی ہیں۔ دونوں طرف میخوں کے سامنے ایک ایک گورا ہاتھ میں تھاپی لئے کھڑا ہے اور ان دونوں کے آس پاس گیارہ کالے صاحب سارے میدان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم حیران کہ یہ میخیں کیسی ہیں اور دو اور گیارہ میں مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جی میں آیا کہ کسی سے پوچھیں، مگر پھر سوچا لوگ ہنسیں گے کہ کرکٹ کی الف بے تک تو جانتے نہیں اور کھیل دیکھنے کو آ موجود ہوئے۔ ذرا دیر صبر سے دیکھتے رہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کھیل کا سر کدھر ہے اور دُم کدھر ہے۔ آدمی ہم سمجھدار ٹھیرے، آخر تھوڑی دیر میں تاڑ ہی گئے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف کے دو آدمی چوڑی چوڑی تھاپیوں سے مسلح ہوتے ہیں اور دوسری طرف کے گیارہ نہتے رہتے ہیں۔ ان گیارہ میں سے دو باری باری سے ان تھاپی والوں کو گیند کھینچ کر مارتے ہیں کہ ان کی ٹانگ یا کمر یا سر توڑ دیں۔ گیندیا جب گیند پھینکتا ہے تو اس کے پاس ایک ڈاکٹر سفید جھاڑ جھولا پہنے زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے تیار رہتا ہے۔ سامنے کا تھاپی والا، تھاپی سے فقط اپنا بچاؤ نہیں کرتا بلکہ گیارہ نہتوں میں سے کسی کا نشانہ باندھ کر گیند کو اس زور سے مارتا ہے کہ لگ جائے تو بن موت آ جائے۔ نہتا جس کی طرف گیند جاتی ہے کوشش کرتا ہے کہ صاف بچ جائے اور اگر یہ نہ ہو سکا تو آنکھ ناک بچا کر گیند کو ہاتھ سے روک لیتا ہے۔ اتنی دیر میں دونوں تھاپی والے ادھر سے اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ کھیل میں بہت سی باریکیاں ہیں جو آپ کو پھر کبھی بتائیں گے۔ اس وقت تو ہم نے موٹی موٹی باتیں بیان کر دی ہیں۔

اب اُس دن کے کھیل کا حال سنئے ہماری طرف کا ہر گیندیا گورے کی کبھی داہنی ٹانگ کبھی بائیں ٹانگ، کبھی کولہے، کبھی گردن کو تاک تاک کر گیند پھینکتا تھا مگر بڑی ہوشیاری کے ساتھ کہ کہیں میخوں میں نہ لگ جائے نہیں تو گورا سر پیر سلامت لے کر پالے سے چلا جائے گا۔ اُدھر تھاپی والا گورا سارے بدن کا زور لگا کر گیند کو تھاپی سے مار کر نہتے ہندوستانیوں کے سینے یا سر پر رسید کرنا چاہتا تھا اور ہمارے بھائیوں کی کوشش یہ تھی کہ انھیں گیند کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ اس میں شک نہیں کہ گورے تھے بڑے پچیت۔ کبھی بھولے سے چوٹ کھا جائیں تو اور بات ہے نہیں تو جھٹ پٹ پینترا بدل کر ہمارے وار ہمیں پر الٹ دیتے تھے۔ پر ہمارے کھلاڑیوں کا کیا کہنا۔ بڑی پھرتی سے گیند کو جھکائی دے کر بے داغ بچ جاتے تھے اور وہ جھناتی ہوئی پالے کے باہر چلی جاتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ گیند کو ہاتھ سے روکنے کی نوبت آئی ہو۔ اب رہی چوٹ تو ایک کے سوا کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ غرض گوروں کا گیند کو تھاپیوں سے مارتے مارتے اور میخوں کے درمیان ادھر سے اُدھر دوڑتے دوڑتے دم ہی تو نکل گیا۔ فقط دو بار ہمارے گیندیوں سے چوک ہو گئی۔ گیند اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر میخوں میں جا لگی اور دو گورے جان بچا کر میدان سے رفو چکر ہو گئے۔ باقی دو کو ہمارے نہتے کھلاڑیوں نے ایسا رگیدا، ایسا رگیدا کہ پناہ مانگنے لگے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں بار انھیں میخوں سے میخوں تک ڈبل مارچ ویسل کرنی پڑی۔ سورج ڈوبنے لگا تو اُن کی جان چھوٹی۔ کھیل ختم ہوا، ہم خوش خوش گھر آئے کہ چلو میاں آج کرکٹ بھی دیکھ لیا۔

سوزِ ناتمام

سروش عسکری طباطبائی

جذب ہے خام ابھی، سوز ہے ناکام ابھی
کامیابی کا محبت میں نہ لے نام ابھی

نذرِ نومیدیٔ جاوید ہوئی جاتی ہے
دل میں باقی تھی جو اک حسرتِ ناکام ابھی

نگہِ شوق تو ہے صرف نظارہ اے دوست
جانِ مشتاق ہے حسرت کشِ پیغام ابھی

تو جو چاہے تو نگاہِ غلط انداز سے ہے
کارِ صد شیشہ و صد ساغر و صد جام ابھی

یہ جو اک لغزشِ رنگیں ہے فضا میں محفوظ
چپ رہا تھا کوئی دیوانہ ترا نام ابھی

لوٹ لی جھوٹی تسلی سے کسی نے وہ بھی
تھی تڑپنے میں جو اک لذتِ بے نام ابھی

عشق منزل سے بھی کوسوں نکل آیا آگے
عقل گمراہ ہے سرگشتۂ اوہام ابھی

کامیابی کا نہ مفہوم بدل دوں تو سہی
دلِ ناکام سے لینا ہے مجھے کام ابھی

خشک ہے سیلِ مصائب تنک آبی سے سروش
اور مرا ذوق ہے لب تشنۂ آلام ابھی!

غزل

باقر مہدی

جہاں رنج و محن میں رہ کر جسے کسی کی خبر نہیں ہے
ہزار انساں بنا پھرے وہ مگر کبھی وہ بشر نہیں ہے

بدل گیا ہے نظامِ الفت جنوں کا دامن رفو ہوا ہے
مگر فریبِ خرد وہی ہے دلوں پہ کچھ بھی اثر نہیں ہے

وہی پرانے ہیں عہد و پیماں وہی ہیں سوزِ دروں کے عنواں
جو زندگی کو سنوار سکتی ابھی تری وہ نظر نہیں ہے

وہ شورِ طوفاں ہے تیرگی میں پناہ مشکل ہے روشنی میں
یہ کس کی کشتی ہے ڈوبنے کو کہ ناخدا کو خبر نہیں ہے

نہ جوشِ آوارگی رہا ہے نہ شوقِ منزل ہے دل میں باقی
ہیں ڈگمگائے ہوئے قدم یوں کہ جیسے ذوقِ سفر نہیں ہے

ہزار ماہ و نجوم چمکے حسین صبحیں بھی آئیں لیکن
غمِ محبت کو جو مٹا دے ابھی وہ شام و سحر نہیں ہے

سو گرو جی کو بلا لینا اور سب تیاریاں مکمل ہوں ـــــ"

"ارے او جمنی! سنتی نہیں، کیا کان پھوٹ گئے ہیں؟"
"کیا ہے ماں؟" بڑبڑاتی ہوئی جمنی باہر سے کوٹھری میں داخل ہوئی۔ "رانی کہاں ہے ـــــ کب سے اُسے نہیں دیکھا" بیمار ماں اپنی چھوٹی لاڈلی بچی کو بڑی دیر سے نہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔
"جانے ماں جی کہاں گئی۔ دوپہر مجھ سے روٹی مانگ رہی تھی پر آٹا تو تھا ہی نہیں، بس دو بھٹے جو باندھا جو بعد سے لئے پکا دیے تھے۔"
"تو کیا وہ سارے دن بھوکی رہتی ہے؟"
"نہیں تو ماں۔ میں نے اُسے مٹی دے دی تھی کہ دانے بھنا کر کھالے ـــــ تب سے وہ واپس ہی نہیں آئی۔"
"ارے تو رات ہو گئی مزے سے بیٹھی رہی ـــــ اتنا نہ ہوا کہ چھوٹی بہن کی خیر خبر لیتی۔ جب سے میں بیمار پڑی نگوڑی کی مٹی خراب ہو" جمنی جو سارے دن بھوکی پیاسی محنت کر کے اس وقت ذرا سانس لینا چاہتی تھی جھنجھلا پڑی۔
"تو میں کیا کروں؟ کس کس کو دیکھوں! میں بھی آخر جان رکھتی ہوں ـــــ سویرے سے سانس بھی تو نہیں لیا۔ ـــــ ابھی سوت دے کر آئی تو دو روپے ملے ہیں اب تو راشن کی دوکان بھی بند ہو گئی ہو گی۔ پڑوسن سے آٹا مانگوں گی تو کہیں جا کر پیٹ کی آگ بجھے گی ـــــ" ماں کو بیٹی پر رحم آ گیا ـــــ "ارے میری بچی میں کیا کروں ـــــ ساری مصیبت تجھ پر پڑ گئی ـــــ اچھا آٹا لا کر پہلے ذرا رانی کو دیکھ آ ـــــ کہیں سیٹھ جی کے ہاں نہ چلی گئی ہو۔ جب سے اُن کا بچہ بیمار ہوا روز اس کی رٹ لگی رہتی ہے۔ ساتھ کھیلتے تھے نا ـــــ" "وہاں اُسے تو بڑی چھوت والی بیماری ہے" جمنی نے فکر مند ہو کر کہا۔
"اچھا جا، جا کر دیکھ تو کہاں گئی ـــــ"
جمنی نے ماں کو تسلی دی، کوٹھری کا دروازہ برابر کیا اور پڑوسن سے یہ کہہ کر کہ "ماسی ذرا ماں کا خیال رکھنا" باہر نکلی۔ سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی اور رات اپنی کالی چادر دھیرے دھیرے آکاش پر ڈالتی جا رہی تھی۔ گاؤں کے گھروں سے دھواں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں پھیل رہا تھا اور سیاہی میں ایک دودھیا رنگ کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں دروازوں کی ٹوٹی چوکھٹوں اور پرانی کھڑکیوں کی درزوں میں سے ہلکی روشنی جھانک رہی تھی ـــــ رات کی سرد ہوا نے جمنی کے مضبوط اور جوان جسم میں بھی کپکپاہٹ پیدا کر دی اور اس نے اپنی پھٹی چادر کو اپنے گرد زور سے لپیٹ لیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے گھروں کو پیچھے چھوڑتی سیٹھ کی حویلی کے پاس پہنچ گئی۔ حویلی کے باہر کچھ عجیب سا سناٹا تھا اور اندر بھی ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جمنی نے ڈرتے ڈرتے صحن میں قدم رکھا حویلی کے کمروں کی طرف ایک نظر ڈالی جہاں بند دروازوں میں سے روشنی کی کرنیں نکلنے کی کوشش کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ رستے میں جمنی کی سکھی رکمی گھٹنوں میں سر دیے شاید اونگھ گئی تھی۔ رکمی اور جمنی میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ اور دونوں میں خوب گھٹ گھٹ کر فرصت کے وقت میں باتیں ہوا کرتیں۔ اپنے اپنے کام اور محنت کی باتیں غریبی اور بھوک کی باتیں ـــــ اپنے موٹے اور پرانے کپڑوں اور سیٹھانی کی کلائی اور زمیندارنی کے ریشم کے کپڑوں اور موٹے موٹے سونے کے زیوروں کی باتیں اور پھر گاؤں کے رنگین مزاج نوجوانوں کی پیار بھری نظروں کی باتیں اور پھر ـــــ اس بیاہ کی باتیں جن کی چاہ ان کے جوان اور ارمان بھرے دل محسوس کرتے تھے۔ مگر رکمی کو وہ جلدی اس کی سیدھ نظر نہ آئی تھی۔ جمنی نے پیچھے سے جا کر رکمی کے دونوں کندھوں پر زور سے ہاتھ رکھ دیے وہ چونک پڑی "کون ـــــ ارے تو جمنی ـــــ"
"ہاں میں ہوں ـــــ یہ آج کیسا سناٹا ہے ـــــ سب کہاں گئے؟"
"رسو تیا چھٹی پر گیا ہے ـــــ باقی جانے سب کدھر ہیں ـــــ"
"حویلی میں بھی سب چپ چاپ ہیں ـــــ للو راجہ کیسے ہیں؟"
"بہت بیمار ہے ـــــ آج گرو جی اس کے اچھے ہونے کے لئے منتر جپ رہے ہیں ـــــ"
"تو اندر نہیں گئی؟"
"مجھے کسی نے جانے نہیں دیا ـــــ سیٹھ سیٹھانی میں جانے کس بات پر بڑی لڑائی ہو گئی ـــــ وہ جب سے اندر کمرے میں پڑی رو رہی ہیں سیٹھ نے باہر سے تالا لگا دیا ہے ـــــ"
"تو یہ اتنے بڑے سیٹھ کی بیوی بچاری ـــــ اتنی دکھی ـــــ رکمی اس سے تو ہم غریب ہی اچھے ـــــ"
"ہاں اور کیا ـــــ پر یہ تو بتا تو یہاں اس وقت کیسے آئی۔ ماں کو اکیلا چھوڑ کے؟"
"کیا کہوں رانی سے میرا بس نہیں چلتا جانے کہاں پھرا کرے ہے ـــــ دوپہر کی گئی اب تک نہیں آئی۔ میں صبح سے بھوکی پیاسی ماں کے کام میں لگی رہی۔ پھر سوت پورا کر کے دے کر آئی تو ماں نے کہا رانی کو ڈھونڈ کر لا ـــــ یہاں تو نہیں آئی تھی رانی؟"
"ہاں ہاں شام کو اُسے میں نے دیکھا تو تھا۔ ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لئے کھا رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہاں سے ملی مٹھائی، کہنے لگی منیم جی نے دی ہے .... ذرا دیر تو کھیلتی رہی پھر جانے کہاں چلی گئی؟"
"اب بتا میں کہاں جاؤں، اتنے وقت اُسے ڈھونڈنے مجھے تو ماں کی بیماری اور اس لونڈیا کی شیطانی نے ......"
جمنی کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ حویلی کی طرف سے ایک بچے کی چیخ سنائی دی ـــــ جمنی اچھل پڑی "کون ـــــ یہ کون چیخا" پھر ایک دردناک، خوف سے بھری باریک سی آواز فضا میں گونجی ـــــ ارے میری ماں ـــــ میری ما ـــــ میں جلی جلی ـــــ"
"ہائے یہ تو میری رانی ہے ـــــ میری رانی ـــــ"
بدحواس جمنی ننگے پاؤں حویلی کی طرف بھاگی۔ چادر جسے ماں کے ڈر سے ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹے رہتی تھی دور جا گری تھی، پاگلوں کی طرح جمنی اور رکمی وہاں پہنچیں اور جس بند کمرے میں سے چیخ سنائی دے رہی تھی بری طرح اُسے بھڑ بھڑا ڈالا۔ ہاتھوں سے، لاتوں سے اور سر سے ـــــ معلوم ہوتا تھا جمنی آج اس کمرے کے کواڑ، اس حویلی کی دیواریں ـــــ اس ظالم پوشیدہ سماج کے ایوان توڑ کر رکھ دے گی ـــــ چند منٹ کی جان توڑ کوشش کے بعد ایک کواڑ ٹوٹ کر کھلا اور اس کے ساتھ ہی جمنی منہ کے بل اندر جا پڑی ـــــ مگر فوراً ہی اٹھی اور جھپٹی۔ اس نے نہ تو سیٹھ کو دیکھا جو ایک طرف کھڑا کانپ رہا تھا اور نہ جلے ہوئے بتاشے جیسے گرو جی جو کمرے میں ایک آسن پر بیٹھا کچھ بڑبڑا رہا تھا اور جمنی کی طرف سرخ سرخ خوفناک آنکھوں سے گھور رہا تھا نہ اس منیم کو جو اس کی لاڈلی بہن کی مدھم ہوتی چیخیں بند کر رہا تھا۔ نہ اس کی نظر رانی کے ریشمی کپڑوں پر پڑی جن میں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے، اور نہ اس پلنگ اور بند ... پر اس کے معصوم اور مرجھائے ہوئے جھلسے چہرے پر اب بھی چمک رہا تھا ـــــ اس کی نظر اپنی ننھی جان پر چند لمحوں کے لئے گڑی کی گڑی رہ گئی جو زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی اور پھول سے چہرے پر موت کی سیاہی بکھر چکی تھی ـــــ ایک بھیانک چیخ جمنی کے منہ سے نکلی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے رانی کی طرف بڑھی مگر قبل اس کے کہ اس تک پہنچے غش کھا کر گر پڑی۔

کئی گھنٹے بعد جمنی نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ رکمی اپنے زانو پر سر رکھے اس کے منہ میں چمچے سے دودھ ڈال رہی ہے، اور اس کی ماں اپنی چارپائی پر پڑی ٹکٹکی لگائے چھت کو تک رہی ہے ـــــ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی ـــــ آنکھیں ہر قسم کی حس سے نا آشنا ـــــ اور جمنی کو سارے ہولناک واقعات یاد آ گئے ـــــ اس نے زور سے ہائے کا نعرہ بلند کیا اور رکمی کے گلے میں بانہیں ڈال کر چیخ چیخ کر رونے لگی ـــــ مگر ماں اسی طرح چھت کو تک رہی تھی ـــــ تکے جا رہی تھی۔

عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ رکمی کا بیان ہو چکا تھا بظاہر جوش اور مضبوط دلائل سے پُر ـــــ کیسے بچی کو مٹھائی کا لالچ دیا گیا، اُسے کپڑے پہنائے گئے۔ کئی نوکروں کو بہانے سے باہر بھیج دیا گیا اور
پھر اسی دن صبح سیٹھ اور سیٹھانی کی لڑائی.........
پھر جمنی عدالت کے کٹہرے میں آئی ....
لمبے لمبے روکھے بال بکھرے ہوئے، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں سوجی اور آنسوؤں سے بھیگی......... پھٹے کپڑوں میں اپنی اٹھتی جوانی کو عدالت کے لوگوں کی نگاہوں سے بچانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی سترہ سالہ غمزدہ دوشیزہ ـــــ اس کا ایک ایک لفظ درد اور سچائی میں ڈوبا ہوا تھا ـــــ کتنے آدمیوں کی آنکھیں اس کا بیان سن کر پُرآب ہو گئیں ....
پھر سیٹھ کی طرف سے صفائی کے گواہ پیش ہونے شروع ہوئے۔ جنھوں نے بڑے بڑے ثبوت دیے کہ جمنی اور رکمی سیٹھ جی کے دشمنوں کی آلۂ کار ہیں اور اسے بے گناہ پھنسانا چاہتی ہیں۔ ورنہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ سیٹھ جی بچے کی صحت کے لئے کچھ ٹوٹکے منتر کر رہے تھے کہ پڑوس کی یہ بچی وہاں پہنچی اور اتفاق

(بقیہ صفحہ ... پر)

سقراط

ضیاء الفاروقی

سقراط ایک فلسفی تھا، معلم اخلاق تھا اور ایک مذہبی آدمی تھا۔ لیکن وہ رسم و رواج اور روایات کا دشمن تھا ......وہ سڑکوں پر، بازاروں میں، تھیٹروں میں جوانوں سے ملتا اور ان کو زندگی کے راز بتاتا۔ نیکی و بدی کی ماہیتوں پر روشنی ڈالتا اور اس طرح نوجوانوں میں ایک فلسفی کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کرتا اس نے نوجوانوں کی موجودگی میں اس زمانے کے بڑے بڑے فلسفیوں کی زندگیاں ادھیڑ کر رکھ دیں اور بتایا کہ ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے ......

آج سے تقریباً چوبیس سو سال پہلے کی بات ہے یونان کے شہر ایتھنس میں ایک بت تراش رہتا تھا اس کی بیوی دائی کا کام کرتی تھی۔ اس دائی کے بطن سے ۴۶۹ ق۔م میں سقراط پیدا ہوا۔ والدین کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا ان کی شہرت کا سبب بنے گا۔ یہ لڑکا بڑا ہوا اس نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم کی تحصیل و تکمیل کی سنگ تراشی میں مہارت حاصل کی، وطن کی خدمت کی ایتھنس کی فوج میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے سرباز‌ی کے امور انجام دیئے۔ رکن فرائض کی ذمہ داریاں کو سنبھالا اور آخر میں لامذہبی اور نوجوانوں کو خراب کرنے کے جھوٹے الزام میں زہر کا پیالہ پیا۔

تاریخ کا یہ ایک انوکھا پہلو ہے کہ صداقت کیش روحوں کو ہمیشہ مصائب و آلام کی تنگ گھاٹیوں سے گذرنا پڑا۔ ایسے لوگ زمانے کے ساتھ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے انھوں نے ظلم سہے، مصیبتیں جھیلیں، گالیاں کھائیں، قید خانوں کو آباد کیا، پھانسی کے تختے پہ چڑھے زہر کا پیالہ پیا، مگر سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور عارضی آرام و راحت جھوٹی شہرت و عظمت کی خاطر انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگایا، وہ ایسے طبائع لے کر آئے تھے کہ ان کے لئے زمانہ سازگار نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر وہ زمانے کے اوپر سے گذر گئے

طبعے بہم رساں ز بسازی بعالمے

یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

سقراط بھی ان لوگوں میں سے تھا جو زمانہ اور حکومت کے ساتھ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، اس کا علم اس کی استقامت اور اس کی صداقت یہ سب کی سب تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لی ہیں۔ آج یونان کی پہاڑیاں اور ندیاں اپنے دامن میں آثار قدیمہ کی وہ بیش بہا یادگاریں لئے ہوئے ہیں جنھیں سقراط نے دیکھا تھا، جہاں اس نے فطرت کی رنگینیوں سے لطف اٹھایا تھا مگر ان یادگاروں کا سب سے زیادہ روشن پہلو وہ ہے جہاں اس نے انسانی فطرت کی رنگینیوں اور اخلاقی قوت کی ہمہ گیری کی تصویر کھینچی ہے۔ تاریخ اُسے بھلانا چاہے تو بھی نہیں بھلا سکتی ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جس زمانے کا یہ قصہ ہے، اس وقت یونان کا ہر شہر ایک ریاست ہوا کرتا تھا۔ شہر کے لوگ اپنی حکومت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ یہ لوگ منتخب ہو کر شہر کے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ ایتھنس ایک بڑا اور مشہور شہر تھا، آج بھی یہ پورے یونان کی تخت گاہ ہے۔

سقراط ایک فلسفی تھا، معلم اخلاق تھا، اور ایک مذہبی آدمی تھا، لیکن وہ رسم و رواج اور روایات کا دشمن تھا، وہ ان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا جو اہل ایتھنس کے خدا تھے، بلکہ ایک ایسی طاقت پر ایمان رکھتا تھا جو سب سے اعلیٰ، قادر مطلق اور پوشیدہ ہے یونان والے اُسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سڑکوں پر، پارکوں میں، تھیٹروں میں جوانوں سے ملتا اور ان کی زندگی کے راز بتاتا۔ نیکی اور بدی کی ماہیتوں پر روشنی ڈالتا اور اس طرح نوجوانوں کے دماغوں میں ایک فلسفی کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے نوجوانوں کی موجودگی میں اس زمانے کے بڑے بڑے عالموں کا خاکہ اڑایا بڑے بڑے فلسفیوں کی زندگیاں ادھیڑ کر رکھ دیں اور بتایا کہ ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو نیکیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ سمجھتے تھے اور تمام لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھتے تھے، اس کی جرح کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ اس کا انداز گفتگو نرالا تھا۔ وہ اسٹیج پر آکر تقریریں نہیں کرتا تھا بلکہ بات چیت کا قائل تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی نوجوانوں میں بھی سوالات کرنے کی عادت ہو گئی۔ وہ سقراط کی باتیں سنتے اور گھر جا کر اسی کے انداز گفتگو کی نقل کرتے اور اس طرح اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو پریشان کرتے، وہ لوگ جو سقراط کی نکتہ رسی کی تاب نہیں لا سکتے تھے اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے اس پر لامذہبی اور جوانوں کو خراب کرنے کا الزام لگایا۔ حکومت نے بھی افترا پردازوں کا ساتھ دیا اور

اس طرح تاریخ کا وہ عظیم الشان مقدمہ وجود میں آیا۔ جو غیر فانی ہے اور جس کی یاد اب بھی صداقت کے علمبرداروں کے لئے حوصلہ افزا ہے۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالتی تحقیقات کے لئے اُسے جج کے سامنے آنا پڑا۔ وہ آیا اور اس نے کہا۔

"ہم وطنو! میری عمر اس وقت ستر سال کی ہے میں اپنی زندگی میں پہلی بار عدالت میں لایا گیا ہوں۔ مجھے عدالتی آداب و روایات سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس لئے میری کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا۔ ہاں میرے الفاظ پر غور کرنا جو تمھیں سچائی اور صداقت کی تعلیم دیں گے۔ میرے اوپر یہ الزام ہے کہ میں بدعتی ہوں، عوام کے معتقدات میں دخل دیتا ہوں۔ نئے آسمان اور نئے زمین کی باتیں کرتا ہوں اور برائی کو اچھائی ثابت کرتا ہوں میرے دوستو! میری یہ بدنامی اس وجہ سے ہے کہ میں ایک خاص قسم کی فہم و ادراک کا حامل ہوں، وہ فہم و ادراک جو انسان کا حصہ ہے، میں نے دیکھا کہ وہ اشخاص جو اپنے کو عاقل و دانا کہتے ہیں۔ احمق اور نادان ہیں اور وہ جنھیں سوسائٹی میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں ہے صاحب فہم اور عقلمند ہیں۔"

غرض سقراط نے ایک طویل تقریر کی، مگر ججوں کی جماعت مطمئن نہ ہوئی اور اُسے موت کی سزا دی گئی۔ موت کا پیغام سن کر سقراط مطلق نہ گھبرایا۔ اس نے کہا کہ میں مرنے جا رہا ہوں۔ ہر آدمی پر زندگی کے آخری لمحات میں کچھ حقیقتیں منکشف ہو جاتی ہیں، اور اس میں پیغمبرانہ خصوصیات ابھرتی ہیں۔ آج جبکہ میں موت کی آغوش میں ابدی سکون حاصل کرنے جا رہا ہوں، اے اہل وطن! میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے بعد تم پر ایک بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ موت سے بھی زیادہ ہیبت ناک اور جانکاہ۔ تم نے مجھے اس لئے یہ سزا دی کہ تم اپنے معائب پر پردہ ڈال لو، مگر یہ پردہ چاک ہو کر رہے گا، وہی نوجوان جن کی بربادی کا سہرا میرے سر ہے، تمہاری زندگیوں کا خاتمہ کر دیں گے اور تمھیں اپنے اعمال کی سزا دیں گے تم اپنے معائب اور قبائح کو چھپانے کے لئے ایک شریف النفس آدمی کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہو، یہ وہ جرم اور گناہ ہے جس کی پاداش میں تمھیں جلد ہی اپنا سر دینا ہوگا۔ یہی میری پیشین گوئی ہے۔

موت میرے لئے ایک نعمت ہے۔ موت یا تو لاشیئت اور عدم و فنا حالت ہے اور یا روح کا ایک دوسری دنیا میں ہجرت کر جانا ہے۔ اب اگر پہلی بات صحیح ہے تو موت ایک ایسی نیند کے مانند ہے جو خوابوں کی دنیا سے آزاد ہے۔ اور اس طرح ایک غیر زمینی سکون کی آرامگاہ ہے زندگی کی تمام راتیں اور ان کے حسین خواب سب کے سب اس ایک ابدی نیند پہ قربان اور اگر موت نام ہے روح کے ہجرت کر جانے کا، تو یہ بھی ایک نعمت ہے موت کے بعد میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاؤں گا جہاں نہ آہ اور سچائی کا خون نہیں ہوتا، جہاں سکون ہی سکون ہے جہاں اس دنیا کے ظالم اور ریاکار ججوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا وہ دنیا جہاں مقدس اور صداقت کیش روحوں سے ملاقات ہوگی۔ اس لئے اگر مجھے بار بار بھی مرنا پڑے تو یہی میرے لئے سعادت ہے۔ پہلا

اے ججو! موت کا مقابلہ بہادری اور اُمید سے کرو اور جان لو کہ ایک اچھے اور نیک انسان کو نہ تو زندگی میں کوئی غم ہے اور نہ موت ہی میں کوئی خسارہ۔ خدا اسے نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا وقت آ چکا ہے اس لئے مجھے مرنا چاہیے۔ میں اپنے ججوں سے ناراض نہیں ہوں اور نہ مجھے غم و غصہ ہے اب ہم اور تم جدا ہوتے ہیں، تم اپنی راہ جا رہے ہو اور میں نے اپنا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں مرنے جا رہا ہوں اور تم زندہ رہو گے میری موت اچھی ہے یا تمہاری زندگی اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ وہ دانا و بینا ہے۔

اس کے بعد وہ قید خانے کی چار دیواری کے اندر پہنچا دیا گیا، یہاں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے وہ زندگی جو فنا ہونے والی تھی اور جس کا موت سے درمیانی فاصلہ صرف ایک ماہ کی مدت تھی، اس مختصر سی زندگی میں جو قید خانے سے شروع ہوتی ہے انسانی فرائض اور اخلاقی احساسات کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ آپ کہیں گے کہ جب اس کے لئے موت کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا تو یہ ایک ماہ کا وقفہ کیسا۔ اسے کیوں یہ چند ایام زندہ رہنے کو مل سکے اس کی ایک وجہ ہے جو سرتاسر روایاتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ لمحات اسے میسر نہ آتے تو اس کے کیرکٹر کا ایک اہم پہلو باقی رہ جاتا اور روحانیت اور اخلاقی معلومات کی ایک دنیا پردۂ خفا میں سوتی رہتی۔ سقراط کی فرصت کے یہ چند لمحے انسانیت کی خوش قسمتی سے یوں میسر آئے کہ اہل ایتھنز کا یہ عقیدہ تھا کہ (تھیسیس) ایک جہاز میں سوار ہو کر سات لڑکوں اور سات لڑکیوں کے ساتھ کریٹ بھاگ گیا تھا اور اس طرح اس نے اپنی اور ان سب کی جان بچائی تھی انھوں نے اپالو سے منت مانگی تھی کہ اگر وہ محفوظ رہے تو وہ ہمیشہ ایک مشن ڈیلس کو بھیجا کریں گے۔ وہ اس وقت تک ان روایات کے قائل تھے۔ وہ زمانہ ان کے لئے بڑا متبرک تھا اور اس مدت میں کسی کو موت کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سقراط کی موت ایک ماہ بعد واقع ہوئی، کیونکہ اس زمانے میں یونانیوں کا یہ متبرک تہوار تھا۔

قید خانے میں کم بیش اُسے ایک ماہ رہنا پڑا یہ زمانہ اس نے بڑے اطمینان سے گزارا۔ اب وہ قید خانے میں اپنے دن گزار رہا ہے، اس کے احباب اور تلامذہ آتے ہیں، ملاقات اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ موت سے ایک یا دو دن پہلے کی بات ہے صبح کا سہانا وقت ہے، اس کا ایک عزیز شاگرد اور متمول دوست اس کو جہاز واپس آنے کی خبر دینے آیا ہوا ہے۔ اس کا نام کریٹو ہے۔ وہ سقراط اور کریٹو میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔

سقراط۔ کریٹو آج بہت سویرا ہے۔ تم اس وقت کیوں آئے ہو ابھی سورج بھی طلوع نہیں ہوا، آخر جیلر نے تمہیں آنے کی اجازت کیسے دی۔

کریٹو۔ سقراط! وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے، ایک بار میں نے اس کے ساتھ احسان کیا تھا۔

سقراط۔ تمہیں آئے ہوئے دیر ہو گئی ہوگی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں جگا لیا۔

کریٹو۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ کس قدر گہری نیند سو رہے ہیں مجھے حیرت ہے کہ وہ شخص جس کی زندگی پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور جسے زہر کا پیالہ پینا ہے، وہ کیسے اتنے سکون کے ساتھ سو سکتا ہے۔ میرا تو یہ عالم ہے کہ اس کے تصور ہی سے میں کانپ اٹھتا ہوں۔

سقراط۔ اس آدمی کو موت کے آجانے سے ملول نہیں ہونا چاہیے جو میری عمر کو پہنچ گیا ہو۔

کریٹو۔ مگر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ عموماً لوگ ضعیفی میں موت کی آمد سے پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اطمینان سے نہیں مرتے۔

سقراط۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ تم نے یہ نہیں بتلایا کہ تم اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو۔

کریٹو۔ میں آپ کو ایک خبر سنانے آیا ہوں جو المناک اور پُردرد ہے۔ وہ چاہے آپ کے لئے اتنی دردناک نہ ہو۔ مگر آپ کے احباب کے لئے بڑی ہی دل شکن اور حوصلہ فرسا ہے۔

سقراط۔ کیا جہاز واپس آگیا ہے اور مجھے مرنا ہے۔

کریٹو۔ ابھی نہیں لیکن مجھے قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جہاز کل تک پہنچ جائے گا۔ اور کل کا دن آپ کی ستر سالہ زندگی کا آخری دن ہوگا۔

سقراط۔ کوئی غم نہیں اگر خدا کی یہی مرضی ہے۔

کریٹو۔ آہ سقراط! وقت کم ہے، اور میری یہ عرض ہے کہ آپ یہاں سے فرار ہو جائیں۔ لوگ تیار ہیں آپ کو کہیں دور پہنچا دیں گے۔ آپ کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ہمارا جو بھی حشر ہو ہم اسے برداشت کر لیں گے آپ ہماری خاطر اپنی جان نہ گنوائیے۔ سارے انتظامات ٹھیک ہیں، دنیا ہمیں کیا کہے گی کہ ہم اپنے ایک عزیز دوست کے کام نہ آسکے۔ یہ ہماری بزدلی اور لاپروائی پر محمول کیا جائے گا۔ اس میں ہماری بڑی بدنامی ہوگی، آپ تھسلی چلے جائیے وہاں میرے دوست ہیں وہ آپ کو آرام سے رکھیں گے، آپ کو اپنی بیوی اور بچوں کا واسطہ، للہ اٹھئے اور میرے ساتھ چلئے، صرف آج کی رات باقی ہے، ورنہ اس کے بعد سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں ہاتھ آئے گا۔

سقراط خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ اس وقت وہ ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہوا ہے جس کا ایک راستہ اسے نیکی اور عظمت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا بدنامی اور تباہی کے غار کی طرف۔ اس کا ضمیر بول اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر مجھے سو بار جینا اور مرنا پڑے تب بھی میں راہ مستقیم سے اپنے قدم نہیں ہٹا سکتا، مجھے ایذائیں دیں، کوڑے ماریں اور ہر وہ تکلیف پہنچائیں جو انسانی طاقت پہنچا سکتی ہے۔ مگر میں صداقت کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنے خیالات اور افکار کو غلط دھارے پر نہیں ڈال سکتا۔

مجھے اسیر کریں یا مرا گلا کاٹیں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

دنیاوی علائق کی محبت اور فرزند کے پیار کی تلخی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ دنیا، بیوی بچے، احباب و اعزہ، ساز و سامان ہیچ ہیں، [illegible]

ان کی حقیقت نہیں، مگر صداقت یہ وہ جوہر ہے جس پر سیکڑوں زندگیاں نثار، ہزاروں علائق قربان اور لاکھوں تمنائیں فدا۔ وہی مرد، مرد کہلائے جانے کا مستحق ہے جو وقت کی اندھیاریوں اور حالات کی تاریکیوں میں بھی انسانی عظمت کے روشن پہلو کو داغدار نہیں ہونے دیتا اور اپنے دامن کو آلودگیوں سے یوں بچا لیتا ہے جیسے کبھی ان دشواریوں سے اسے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔

قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو سچائی کی خاطر جان دیتے ہیں اور صد آفریں و تحسین ان اشخاص پر جو حق کے لئے خندہ پیشانی کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

جانتا ہوں مسکرانا سب کو آتا ہے مگر
تیغ کے سائے میں آ کر مسکرا سکتا ہے کون

نادان ان کا مذاق اڑاتے ہیں، ضمیر فروش ان کی قربانیوں پر تمسخر کرتے ہیں" اصحاب رخصت " اپنی ناتوانی اور درماندگی کی پناہ لیتے ہیں اور کم ہمت وقت کے ساتھ چلنے کی فلاسفی کی اشاعت کرتے ہیں۔ ان ناعاقبت اندیشوں کو اس مقام کی کوئی خبر نہیں۔ یہ شہیدان صداقت ابدی سکون و راحت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس حقیقت سے واقف ہوتے تو موت کی تمنا کرنے لگتے اور زہر کے پیالوں کو بغیر ہچکچاہٹ کے ہونٹوں سے لگا لیتے۔

عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است
عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما

یہ لوگ مر جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہیں مرتے۔ یہ لوگ زمانے کی ریت پر اپنے وہ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے اندر درس عبرت کی ایک دنیا رکھتا ہے اور ان کا ہر عمل حقائق و معارف کا دفتر ہوتا ہے، یہی ان کی غیر فانی زندگی ہے

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سقراط نے کہا کہ میرے پیارے دوست اگر میں فرار ہو جاتا ہوں تو سوسائٹی اور اسٹیٹ کا جرم کرتا ہوں جن برائیوں کے خلاف میں ہمیشہ جہاد کرتا رہا آج انھی کا ارتکاب کروں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں اس خدا کے سامنے کیسے حاضر ہو سکوں گا۔ جو حاضر و ناظر ہے۔ میں ان روحوں کو کیسے منہ دکھلاؤں گا جو میرا انتظار کر رہی ہیں۔ اس موت کو برائیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ کریٹو! یہ میرے ضمیر کی آواز ہے۔ اب تمہارا کچھ کہنا فضول ہے، مجھے چھوڑ دو خدا کی مرضی پر اور دیکھو کہ مجھے وہ کہاں لے جاتی ہے۔

دوسرے دن جو اس کی موت کا دن تھا، تمام احباب جمع ہوئے۔ بیوی بچے بھی آئے تمام دن مجلس رہی۔ اثنائے گفتگو میں کریٹو نے سقراط سے دریافت کیا کہ اس کی تجہیز و تکفین کیسے کی جائے گی۔ سقراط نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ جس طرح تمہیں آسانی ہو مگر میں پہلے تمہارے ہاتھ لگ جاؤں۔ آہ کریٹو! میں اتنی دیر سے کہتا رہا وہ تم سمجھ نہ سکے۔ میں نے بار بار کہا کہ [illegible] کسی اور دنیا میں جا رہا ہوں۔ تم [illegible] کے بعد [illegible] سقراط [illegible]

میں کہیں اور ہوں گا، جہاں فنا نہیں، جہاں موت نہیں اور جہاں بقا اور ابدیت کے چشمے ابلتے ہیں۔ اے لوگو جان لو اور گواہ رہو کہ میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ اور تم میری نعش کو جس طرح چاہنا دفن کرنا۔

اس کے بعد وہ اٹھا اور غسل کے لئے ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کے بعد جب وہ باہر آیا تو سورج غروب ہو رہا تھا اور تقدر درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے پاس آیا ان سے کچھ باتیں کیں اور انھیں گھر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیلر آیا اور اس نے کہا:

"سقراط! مجھے یقین ہے کہ تم دنیا کے سب سے اچھے آدمی ہو۔ جتنے لوگ اب تک یہاں آئے ان سب میں تم سا شریف النفس شخص میں نے کسی کو نہیں پایا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے بھلا نہ کہو گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب میں زہر کا پیالہ لاتا ہوں تو لوگ مجھ سے ناراض ہوتے ہیں اور مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حکومت کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں، میں تو نوکر ہوں" اس کے بعد وہ منہ پھیر کر واپس چلا گیا۔

سقراط نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "تم کتنے اچھے اور خلیق ہو۔ تمھاری شرافت تمھارا اخلاق یہ سب کا سب ناقابل فراموش ہے۔"

کریٹو نے کہا: "سورج ابھی پہاڑی پر چمک رہا ہے، کچھ لمحات باقی ہیں میں نے دیکھا ہے کہ لوگ زندگی کے آخری لمحات میں اپنی تمام آرزوؤں کو پوری کرنے کی سعی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جب مرنا ہی ہے تو جی کی ہوس تو نکال لیں، کوئی کھاتا ہے، کوئی پیتے پیمانوں کی جگہ خم کے خم لنڈھاتا ہے، اور کوئی اپنی جان تمنا کی آغوش میں لیٹ کر اس کے آنسوؤں سے اپنے دامن کو تر کرنا چاہتا ہے!

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقصم چنیں میانۂ میدانم آرزوست

سقراط نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو ان باتوں پر عمل کرتے ہیں، ٹھیک کرتے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح وہ فائدے میں رہیں گے۔ میری دانست میں اس زندگی کا لطف ہی کیا جو پہلے ہی مٹ چکی ہو۔ اس اثنا میں زہر کا پیالہ آ چکا تھا، سقراط نے اُسے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا۔

اس طرح اپنے زمانے کے سب سے بڑے، سب سے سچے اور سب سے زیادہ شریف النفس انسان کا خاتمہ ہو گیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اہل علم کی آواز

(بسلسلہ صفحہ ۱)

ناگواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔

۷۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ تمام تعلیمی اور سماجی ذرائع سے کام لے کر ہمیں اپنے ملک میں ایک جمہوری انداز نظر پیدا کرنا چاہیے، جس کا نصب العین یہ ہو کہ یہاں ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست اور ایک امداد باہمی پر مبنی معاشرے کی بنیاد ڈالے جس میں تمام شہریوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں، اور ان میں ذات پات، رنگ نسل، جنس، مذہب، سماجی حیثیت یا سیاسی خیالات کی وجہ سے کوئی بے جا امتیاز روا نہ رکھا جائے۔

۸۔ ہمارا یقین ہے کہ کوئی قدر زندگی میں ایک فعال قوت نہیں بن سکتی جب تک وہ افراد اور جماعتوں کے تجربے کی بھٹی میں سے نہ گذرے۔ آج کل ہمارے اصول اور عمل، ہمارے خیالات اور ہمارے افعال میں ایک خلیج حائل ہے جو بڑھتی جاتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم نظری طور پر جن اصولوں اور خیالات سے عقیدت رکھتے ہیں انھیں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ ہمارے عمل کے لئے قوت محرکہ بن سکیں۔

۹۔ ہمارا یقین ہے کہ آزادی خیال نہ صرف صنعتی، سماجی اور اخلاقی ترقی کے لئے ضروری ہے بلکہ شرف انسانی کا ایک لازم جزو ہے۔ سماجی اور تعلیمی اداروں میں آزادی خیال کی قدر اور اس کے لئے گنجائش ہونا چاہیے اور اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ میں قوت تنقید کو بیدار کرنا چاہیے۔ اور ان میں ایک معقول پسند سائنٹیفک ذہنیت کی پرورش کی جانی چاہیے کہ وہ اپنی زندگی اور کام کے ہر شعبے میں استعمال کر سکیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم غیر جانبدار ہو کر سوچیں یعنی اپنے خون کی گرمی کے بل بوتے پر نہیں بلکہ اپنے دماغ سے اور اس طرح خود کو ایک حد تک نامعقول تعصبات، توہمات اور جنبہ داری سے محفوظ رکھیں۔

۱۰۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم کوئی بلند قومی مقصد اور نصب العین اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک افراد کی سیرت میں دیانتداری اور اعلیٰ معیاروں کے ساتھ لگن پیدا نہ ہو۔ گذشتہ زمانے میں ہماری تعلیم کی توجہ زیادہ تر نظری چیزوں پر رہی ہے اب ضرورت ہے کہ سیرت کی تربیت پر زیادہ زور دیا جائے۔

۱۱۔ ہمارے خیال میں ضروری ہے کہ ہم ملک میں فرقہ وارانہ، صوبائی یا علاقہ وارانہ ذہنیت پر زور دینے کے بجائے ایک قومی ذہنیت پیدا کرنے پر زور دیں اور اپنی تعلیم گاہوں اور دوسرے اثر آفریں اداروں کو اس مقصد کے لئے کام میں لائیں۔

۱۲۔ چونکہ اس لفظ یاتی انقلاب کی جدوجہد میں سب سے زیادہ حصہ ہمارے استادوں کو لینا ہے۔ اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ان کا مادی اور ذہنی معیار کافی بلند کیا جائے۔

دو ہندی کتابیں

(بسلسلہ صفحہ ۲)

ہوئے تو مہندر چندر رائے نے لفظ بہ لفظ روس کے دشمنوں کے الفاظ دُہرا دیئے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر وہ یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ گورکی کو اسٹالین نے زہر دلوایا۔ حالانکہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ گورکی بوڑھا تھا، دق کا مریض تھا اور مدت سے بیمار تھا۔ آخری وقت میں نمونیہ کا شکار ہو گیا۔ لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ اسی اسٹالین نے اپنا دشمن اور مدمقابل سمجھ کر راہ سے ہٹا دیا۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر اس کتاب میں غلط بیانی سے بھرے ہوئے دو صفحے نہ ہوتے تو یقیناً یہ کتاب ہندی ادب میں ایک اہم جگہ حاصل کر سکتی تھی۔ آخری دو صفحوں کا انداز بیان بھی پوری کتاب سے مختلف اور کمزور ہے، بنگالی کتاب میں یہ حصہ نہیں تھا۔ ہندی میں بڑھایا گیا ہے۔

نئی روشنی
دہلی
ادارۂ تحریر
جامعہ نگر (دہلی)
ڈاکٹر سید عابد حسین — صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۲۲ | ۸ر دسمبر ۴۷ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

تہذیب کو کیوں کر بچائیں

خواجہ غلام السیدین صاحب کا خطبہ صدارت جو ۲۶ر اکتوبر کو مہابلیشور کی تہذیبی اتحاد کی کانفرنس میں پڑھا گیا۔

(۱)

اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی آفرینی کرے یا مادے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے! کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے۔ کاغذ پر روشنائی یا فضا میں خیال آفریں جملے بکھیرے جو جنگ کے شور و شغب میں طوطی کی آواز بن جائیں یا ان امیدوں کا نوحہ پڑھے جو یاسی ہوگئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل؟ پیادہ فوج کے دستے کے مقابلے میں ایک نقاد کی کیا حیثیت ہے؟

اگر ہم ان قدروں کو بدلنا چاہتے ہیں جو آج کل کی دنیا میں راسخ ہوگئی ہیں اور خود اپنی قوم کے دل و دماغ میں سے وہ ناگوار اور نازیبا رجحانات خارج کرنا چاہتے ہیں جو انہیں مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں تو موجودہ صورت حال کے لئے ہمیں اپنی ذمہ داری کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہئے، اس کی اصلاح کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کرنے چاہئیں ....

اس مجلس کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میں آپ سب دوستوں کا پرتپاک خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ کوئی رسمی جملہ نہیں بلکہ درحقیقت مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اتنے بہت سے حضرات اور خواتین جو اپنے افراد اور حیثیت سے کام کر کے ہماری ذہنی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں، اس مسئلے پر غور اور تبادلۂ خیال کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ایک مروجہ قسم کی کانفرنس نہیں بلکہ کچھ ایسے کم و بیش ہم خیال لوگوں کا دوستانہ اجتماع ہے جن کو تعلیم اور تہذیب کے مسئلوں میں دلچسپی ہے، اور جو اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنی قومی زندگی کی بہترین قدروں کی حفاظت کریں اور ان کو مستحکم بنائیں اور زمانے کے جو نئے تقاضے اور مطالبات پیدا ہوئے ہیں ان میں اور قومی ذہنیت میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ یاد رکھئے کہ اس وقت صرف ہمارا ہندوستان ہی ایک انقلابی دور میں سے نہیں گزر رہا ہے بلکہ ہم جس دنیا میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں بھی سائنس، صنعت و حرفت اور جنگ کے نئے اور خوفناک طریقوں نے پرانے مسئلوں کو ایک بالکل نئی شکل دے دی ہے۔ اگر ہم خود کو اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ کر سکے اور ان مسئلوں کو معقول طریقے پر حل نہ کر سکے تو ہم نہ اپنی آزادی کو قائم رکھ سکیں گے، نہ اس میں معنی پیدا کر سکیں گے، نہ ترقی کر سکیں گے، نہ دنیا کے سامنے کوئی قابل قدر چیز پیش کر سکیں گے۔ ہماری تاریخ کا جو دور ابھی ختم ہوا ہے اس میں ہم سیاسی لحاظ سے بڑی حد تک بے بس تھے اور ہر قسم کی پالیسی کا تعین ایک بدیشی حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ اس صورت حال کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ ہم میں ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ ذہنیت پیدا ہوگئی جسے مستقبل کی تشکیل کی کوئی خاص فکر نہ تھی اور جس نے ملک کی باگ ڈور پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ بے شک بہت سے لوگ اور بعض جماعتیں ایسی تھیں جن پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن میں اس وقت عام مروجہ ذہنیت کا ذکر کر رہا ہوں جس کو اس میں شک تھا کہ منظم اور اجتماعی کوشش سے کوئی خاص نتیجہ نکل سکتا ہے اور وہ بہت اطمینان سے تمام خرابیوں اور کمزوریوں کی ذمہ داری بدیشی حکومت کے سر ڈال دیتی تھی۔ لوگ نہ صرف سیاسی غلامی کے مضر اثرات بلکہ خود اپنی کمزوریاں اور ناکامیاں بھی اسی کھونٹی پر لٹکا دیتے تھے، لیکن اب آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ صورت حال بالکل بدل گئی ہے اور اب ہمیں اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں کی پوری ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔ اس کے لئے ہمیں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زیادہ پہلے سے زیادہ گہری تنقیدی نظر سے احتساب نفس کرنا ہوگا اور اپنے قومی مسائل کو زیادہ فعالانہ طریقے پر حل کرنا ہوگا۔ اس کانفرنس کو بلانے کا ایک بڑا جواز یہ ہے کہ ہمیں ان نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے جو سیاسی اور انتظامی حکام کے ساتھ ساتھ استادوں، مصنفوں اور مفکروں کو بھی درپیش ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ اس دنیا میں جہاں ہر طرف قوت کی کشمکش اور اسی کا اختیار ہے، جہاں جبر اور تشدد کی حکمرانی ہے اور ایٹم بم دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ ہم لوگوں کا جن کے ہاتھ میں قلم اور زبان کے سوا کوئی اور طاقت نہیں یہ خیال کرنا کہ ہم واقعات کی یورش کو روک سکتے ہیں یا ان کے دھارے کو بدل سکتے ہیں۔ ایک بے جا ادعا اور خود پسندی ہے۔ میں بہت ادب اور انکسار کے ساتھ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
تہذیب کو کیوں کر بچائیں	غلام السیدین	۱
مختصر تبصرے	اسد اللہ کاظمی	۲
امن کیسے قائم ہو؟	(اداریہ)	۳
دنیا کی رفتار:		
۱۔ ہندوستان	ع، ح	۴
۲۔ پاکستان	ع، ل	۴
بزم بے تکلف		۵
اشارہ	پرورش صدیقی	۵
روشنی	م، و، باغی	۵
نفسیات اور تجارت	خواجہ جلیل احمد	۶
بچے اور ان کی جبلت	محمد حسنین	۸
لیپ چا	محمد حبیب اللہ	۸
امریکہ دنیا پر کیوں چھایا ہوا ہے؟	محمد امین	۹

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ دسمبر ۱۹۴۹ء

دُنیا میں امن کیسے قائم ہو؟

نومبر کے آخری ہفتے میں کلکتے میں آل انڈیا پیس کانگریس کا اجلاس ہوا اور دسمبر کے پہلے ہفتے میں شانتی نکیتن میں ورلڈ پیسفسٹ میٹنگ شروع ہوئی۔ دونوں کا مقصد مشترک ہے یعنی اس مسئلے پر غور کرنا کہ دنیا کو جنگ کے خطرے سے بچانے کے لئے اور سچا امن قائم کرنے کی غرض سے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، لیکن جن جماعتوں کی طرف سے یہ جلسے منعقد ہوئے ان کے اصول و عقائد اور ان کے طریق کار میں بہت فرق ہے

پیس کانگریس کمیونسٹ خیال کے لوگوں کی طرف سے ہوئی جو سمجھتے ہیں کہ جنگ سرمایہ داری نظام کا ایک لازمہ ہے اور اس کو روکنے کی آخری اور قطعی تدبیر یہ ہے کہ ساری دنیا میں سرمایہ داری نظام کی جگہ کمیونسٹ نظام قائم ہو جائے۔ جہاں تک جنگ کے فوری خطرے کا تعلق ہے ان کے نزدیک خطرہ یہ ہے کہ انگلو امریکی بلاک سوویٹ روس اور اس کے ساتھی ملکوں پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کی روک تھام اس طرح ہو سکتی ہے کہ دنیا کے اور ملک انگلو امریکن بلاک کا ساتھ نہ دیں۔ موجودہ پیس کانگریس مقامی ہے اور اس کا خطاب خاص طور سے ہندوستانیوں سے ہے اس کا خیال ہے کہ ہندوستانی انگلو امریکی بلاک میں شامل ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی رائے عامہ اس پالیسی کی مخالفت کرے اور اس میں انفعالی طریقہ کار نہیں بلکہ فعالی (ACTIVE) طریقہ اختیار کرے جس کی وہ تشریح نہیں کرتی۔

ورلڈ پیسفسٹ میٹنگ یورپ اور امریکہ کی پیسفسٹ انجمنوں اور ہندوستان کے گاندھی وادیوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ مغربی پیسفسٹ عام طور پر عیسائیت کا مذہبی عقیدہ اور عیسائیت کا جمہوری عقیدہ رکھتے ہیں وہ جنگ کا سرچشمہ موجودہ اقتصادی نظام کو نہیں بلکہ قوموں کی باہمی نفرت، لالچ اور ملک گیری کی ہوس کو سمجھتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ تلقین اور تبلیغ کے ذریعے سے قومی اور نسلی تعصبات کو مٹانے لالچ اور ہوس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جنگ کے زمانے میں وہ یہ منفی اقدام کرتے ہیں کہ خود فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نیک نیتی قابل قدر ہے اور انھوں نے قوموں کے درمیان دوستی اور برادری کے جذبات پیدا کرنے کی دل سے کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے جس کا انھیں خود بھی احساس ہے کہ وہ اب تک جنگ کو روکنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ اس سال ہندوستان میں جمع ہوئے ہیں کہ گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر ممکن ہو تو گاندھی وادیوں کے ساتھ مل کر اپنی جماعت کی از سر نو تنظیم کریں۔

شانتی نکیتن کی میٹنگ میں جو کارروائی اب تک ہوئی ہے اس سے ان حضرات کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ عام مقصد اور جذبات کی ہم آہنگی کے باوجود گاندھی وادیوں کا عقیدہ اور طریق کار ان سے بہت کچھ مختلف ہے شری کمار اپّا نے میٹنگ کو بتایا کہ اہنسا کا فلسفہ بھی تشدد کو موجودہ اقتصادی نظام کے اندر مضمر سمجھتا ہے اور جنگ کو اس کا نتیجہ جانتا ہے۔ انھوں نے اور سیوا گرام کے حلقے کے دوسرے مقرروں نے اس پر زور دیا کہ کامل امن کے لئے ضروری ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کے مرکز بند نظام کے بجائے لامرکزی اقتصادی نظام قائم کیا جائے جس میں چھوٹے چھوٹے دیہی علاقے معاشی حیثیت سے خود کفیل ہوں انھوں نے اس پر بھی روشنی ڈالی کہ ظلم استبداد، معاشی لوٹ اور جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ستیہ گرہ کا طریقہ محض انفعالی مقاومت کا نہیں بلکہ فعالی مزاحمت کا ہے مگر اس میں تشدد سے کام نہیں لیا جاتا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ مغربی امن پسند گاندھی وادی اہنسا کو کس حد تک اپنانے کے لئے تیار ہوتے ہیں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاشی نظام کو قبول کر لیں جو گاندھی جی کے نام سے منسوب ہے اور جس کے علم بردار آج کل شری کمار اپّا ہیں لیکن اگر وہ صرف ستیہ گرہ کا طریق کار ہی اختیار کر لیں تب بھی یہ امید ہو سکتی ہے کہ ان کی تحریک میں ایک نئی جان پڑ جائے گی اور ان کی کوششیں قیام امن میں پہلے سے زیادہ موثر ہوں گی۔ شاید ہندوستان کے گاندھی وادی بھی اختلافات کے باوجود ایک حد تک ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کو تیار ہو جائیں۔

امن کے مسئلے کے مستقل حل جو کلکتے اور شانتی نکیتن کی کانفرنسوں میں پیش کئے گئے ہیں ایک دور دراز منزل کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان فلسفوں کو ماننے والے جن پر یہ حل مبنی ہیں اپنی اپنی راہ پر چل کر امن کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور آنے والا زمانہ بتائے گا کہ ان کی کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔ لیکن اس وقت تو امن کی بھوکی دنیا امن مسئلے کا کوئی فوری حل چاہتی ہے خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ اس وقت تو لوگ اس آرزو میں تڑپ رہے ہیں کہ تیسری جنگ عظیم جس کا خطرہ کچھ دن پہلے تک ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا اور اب بھی پوری طرح دور نہیں ہوا ہے زیادہ سے زیادہ مدت کے لئے ٹل جائے تاکہ ہمیں اطمینان سے بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹنے کا، اجڑے ہوئے گھروں کو بسانے کا ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا اور انسانیت کے سینے میں تعمیر اور تخلیق کے مایوس جذبوں کو ابھارنے کا موقع ملے۔

امن قائم کرنے کی جو فوری تدبیر کلکتے کی پیس کانگریس نے بتائی ہے اس کے ہمیں صرف اتنے حصے سے اتفاق ہے کہ ہندوستان کو انگلو امریکی بلاک سے الگ رہنا چاہئے۔ ہمارے خیال میں وہ اب تک الگ ہے اور حکومت کی قطعی پالیسی ہے کہ آئندہ بھی الگ رہے پھر بھی رائے عامہ کو اس معاملے میں چوکس رہنا چاہئے اور ہر اس چیز کی مخالفت کرنی چاہئے جو ہمارے ملک کو کسی فوجی جتھے میں ڈھکیل دے یا کسی بیرونی طاقت کا آلۂ کار بنا دے۔ شانتی نکیتن کی کانفرنس ابھی شروع ہی ہوئی ہے لیکن اس میں کسی نے ضمنی طور پر ایک تجویز پیش کی ہے جو گہرے غور و فکر کی محتاج ہے تجویز یہ ہے کہ امن پسندوں کی جماعت ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کشیدگی کو دور کرنے اور ان میں مصالحت کرانے کی کوشش کرے اگر اس خیال کو وسعت دی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ امن پسندوں کو ان سب ملکوں میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے جن کے آپس میں ٹکرانے کا اندیشہ ہے۔ امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ اس وقت یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی قوموں پر ایک دوسرے کا خوف آسیب کی طرح سوار ہے اور ہر قوم میں ایسے ارباب غرض موجود ہیں جو اپنے فائدے کے لئے منظم پروپاگنڈہ کے ذریعے سے اس خوف کو اور بھڑکا رہے ہیں۔ امن پسند جماعتیں عام طور پر اپنی ساری طاقت اس کوشش میں صرف کرتی ہیں کہ مختلف قوموں کو تخفیف اسلحہ پر آمادہ کریں۔ ظاہر ہے کہ جب تک ان قوموں پر خوف کا بھوت چڑھا ہوا ہے اس قسم کی اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ امن پسند اپنے اپنے ملک میں جھوٹ کی اس مہم کا مقابلہ کریں جس کے ذریعے سے دوسرے ملکوں کی فوجی تیاریوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے من گھڑت افسانے پھیلائے جاتے ہیں۔ فولاد اور یورینیم کے اسلحہ سے پہلے اعصابی جنگ کے ہتھیاروں کو جو ریڈیو، اخبار اور اشاعت کی دوسری ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں کُند کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر امن پسند ستیہ گرہ کی روحانی طاقت سے کام لے کر اپنے اپنے ملک میں جھوٹ اور افترا پردازی کے شیطانی لشکر کا مقابلہ کریں تو یہ امن کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

شب رو ہوائی ڈاک کا معرکہ

کچھ دن سے اخباروں میں حکومت ہند کی وزارت رسل و رسائل کے خلاف ایک زبردست مہم چھڑی ہوئی تھی کہ اس نے رات کی ہوائی جہاز کی سروس سے ڈاک بھیجنے کا جو انتظام کیا ہے اس کی وجہ سے ہوائی جہازوں کی کمپنیوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ وزارت نے ہوائی جہاز سے ڈاک لانے لے جانے کا ٹھیکہ ایک نئی کمپنی کو دے کر پرانی کمپنیوں کی حق تلفی کی۔ اس کے علاوہ نئی سروس کے شروع ہونے کی وجہ سے پرانی کمپنیوں میں مسافروں کی تعداد کم ہو گئی ہے اور ان کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے۔ اس مہم کا زور اتنا بڑھا کہ پارلیمنٹ میں روہنی کمار چودھری صاحب کی طرف سے شب رو ہوائی ڈاک کو بند کر دینے کی تجویز بھی پیش ہو گئی مگر وزیر رسل و رسائل رفیع احمد قدوائی صاحب نے جو مفصل اور مدلل بیان پارلیمنٹ میں دیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ حکومت پر جو الزام لگائے جا رہے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ حکومت نے نئی کمپنی کو ٹھیکہ دینے سے پہلے پرانی کمپنیوں سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے مقررہ کرایے میں کمی کرنے پر تیار ہوں تو ٹھیکہ ان ہی کو دیا جائے گا لیکن سب نے ایک سرے سے انکار کر دیا اور یہ عذر پیش کیا کہ جو کرایہ گورنمنٹ دینا چاہتی اس پر سروس چلانے میں سراسر نقصان رہے گا۔ قدوائی صاحب نے اعداد و شمار کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ نئی کمپنی اسی کم کرائے پر کامیابی سے سروس چلا رہی ہے۔ پرانی کمپنیوں کو اس کی وجہ سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ حکومت کے خلاف یہ سارا ایجی ٹیشن حکومت ہند کے ایک پرانے افسر کی کوشش سے ہو رہا ہے جو اب ٹاٹا کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں ہیں۔ پارلیمنٹ کا پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ ہوائی کمپنیوں کی شکایتیں بے اصل ہیں اور حکومت کا فیصلہ مناسب تھا۔ چودھری صاحب کی تجویز بغیر رائے لئے ہوئے ملتوی کر دی گئی۔

حالت سدھر رہی ہے

۵ دسمبر کی پریس کانفرنس میں وزیر اعظم کی زبان سے پہلی بار یہ بات سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ملک کی معاشی حالت رفتہ رفتہ سدھر رہی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنے اس قول کی تشریح نہیں کی لیکن دوسرے سوالوں کے جو جوابات انھوں نے دئے ان سے ان پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو غلے کی پیداوار بڑھانے کی مہم کامیاب ہو رہی ہے۔ صوبوں کی حکومتوں کو غذائی مسئلے کی اہمیت کا پورا احساس ہو گیا ہے اور وہ اسے حل کرنے میں اپنے سارے وسائل سے حکومت کی مدد کر رہے ہیں۔ دوسرے کارخانوں کے مالک جو پہلے جو حکومت کی معاشی اسکیموں میں ہر طرح روڑے اٹکاتے تھے اب حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔ چھپے ہوئے سرمائے پر انکم ٹیکس ادا کرنے کے بارے میں گفت و شنید ہو رہی ہے اور اس گتھی کے جلد سلجھنے کی امید ہے۔ اس کے علاوہ تجارتی مال کی درآمد برآمد کی جو رپورٹ حال میں شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برآمد اچھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ستمبر کے مقابلے میں اکتوبر کے مہینے میں کمیاب سکوں کے ملکوں میں تین کروڑ روپے کا مال زیادہ بھیجا گیا۔ اس تین کروڑ میں سے دو کروڑ کا اضافہ ڈالر کے ملکوں کو جانے والے مال میں ہوا ہے۔ ان سب باتوں سے امید ہوتی ہے کہ ہمارا معاشی بحران انتہائی نقطے پر پہنچ کر اب افاقے کی طرف مائل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ابھی مرض کے دور ہونے اور صحت کے عود کرنے کی منزل بہت دور ہے حکومت نے اپنے اخراجات کو کم کرنے، دریاؤں کے بند باندھ کر بجلی پیدا کرنے، نئے کارخانے قائم کرنے کی جو تجویزیں مرتب کی ہیں ان کے پورے ہونے سے پہلے گرانی اور بے روزگاری کے مسئلے…

پاکستان

اسلامی ملکوں کی معاشی کانفرنس

پاکستان اپنے قیام کے بعد ہی سے اس کوشش میں تھا کہ اسے اسلامی ملکوں کی قیادت اور سیادت حاصل ہو جائے اسی طرح جیسے ہندوستان کو عملاً ایشیائی ملکوں کی قیادت مل گئی ہے۔ اسی سلسلے میں مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں صاحب اسلامستان کی تحریک کا پیام لے کر اسلامی ملکوں میں گئے اور انھوں نے اسلامی ملکوں کے نمائندوں سے براہ راست بات چیت کی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اسلامی ملکوں کی معاشی کانفرنس بھی ہے جو ۲۵ نومبر سے کراچی میں ہو رہی ہے اس کانفرنس میں ترکی، مصر، ایران، عراق، سعودی عرب، انڈونیشیا، مسقط، عمان، افغانستان، شام، الجیریا، لیبیا، ٹیونس اور جزائر مالدیپ کے نمائندے شریک ہوئے ہیں اور پاکستان کو توقع ہے کہ اس کانفرنس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔

وزیر مالیات غلام محمد صاحب نے اپنے طویل خطبے میں اسلامی ملکوں کا بہت تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں تسلیم کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی اسلامی ملکوں کی حالت بہت پست اور گری ہوئی ہے اور خوش قسمتی سے جن ملکوں کو سیاسی آزادی حاصل ہے وہ معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ موصوف نے اگرچہ اس پر زور دیا کہ "ہمارا مغربی جمہوریتوں اور روسی بلاک میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوگا" جہاں معاشی اور صنعتی تنظیم کا ذکر کیا ہے وہاں مغربی سرمایہ اور مغربی ماہرین فن کو دعوت عام بھی دی ہے اور اسی کے ساتھ یہ خوش فہمی بھی ظاہر کی ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں مغربی سرمایہ اور مغربی فنی ماہروں کی امداد قبول کرنے سے ہماری سیاست یا مختاری پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

کانفرنس کی تجویزیں

کانفرنس نے جو مختلف کمیٹیاں مقرر کی تھیں انھوں نے کچھ عملی تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے چند اہم تجویزیں یہ ہیں

(۱) مسلم ریاستوں کا ایک بین الاقوامی معاشی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ وہ اندرونی اور بیرونی تجارت، صنعت، کان کنی، انشورنس، بری، بحری اور ہوائی آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دے۔

(۲) ان ریاستوں کے موجودہ زمینداری اور ملگان داری کے نظام میں اسلام کے احکام کے مطابق ترمیم کی جائے، تاکہ کاشتکاروں کو غلامی اور بیگار سے نجات ملے اور ان کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو۔

(۳) زراعت میں مشینوں سے کام لیا جائے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لئے سائنس کے مختلف وسائل استعمال کئے جائیں۔ جنگلوں کی ترقی اور توسیع پر خاص زور دیا جائے۔

(۴) مالیات کے پیچیدہ مسائل، قومی بجٹ، شرح مبادلہ وغیرہ پر ابھی غور نہ کیا جائے بلکہ بین الاقوامی ادارے کے قائم ہونے کا انتظار کیا جائے۔

(۵) سرمائے اور محنت میں پورا تعاون ہو اور مزدوروں کو زندگی کی کل ضروریات مہیا کی جائیں۔

(۶) مسلم ریاستیں ایک دوسرے سے ترجیحی برتاؤ کے اصول پر تجارتی معاہدے کریں۔ سکے، وزن اور پیمانے وغیرہ کا اعشاری نظام اختیار کیا جائے۔

(۷) مسلم ریاستوں میں صنعتی اور فنی ماہروں کا شمار کیا جائے اور ان کا ایک مشترک خزینہ ہو جن میں سے ہر ریاست کی ضرورت کے مطابق ماہرین فن مہیا کئے جائیں، سب مسلم ریاستیں سائنس اور صنعت کی تعلیم کی اسکیمیں باہمی مشورے سے بنائیں تاکہ تعلیمی اداروں میں غیر ضروری خرچ اور تکرار نہ ہو۔ حکومتوں سے درخواست کی جائے کہ صنعتی تعلیم اور سائنس کی تعلیم کے لئے کافی روپیہ مہیا کریں۔

۴ دسمبر کی شام کو کانفرنس کا جو جلسہ ہوا اس میں مختلف کمیٹیوں کی رپورٹیں جن میں مندرجہ بالا تجویزیں پیش کی گئی تھیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

بزمِ بے تکلّف

"لو بی مبارک ہو۔ ہمارے دیس کا آئین بن گیا"
"بس رہنے دو اپنی مبارک سلامت۔ تمھیں تو ہر وقت دیس کی دھن رہتی ہے کچھ گھر کی بھی خبر ہے۔ نہ آٹا دال ہے، نہ ڈلی کتھا ہے، چولھا ٹھنڈا پڑا ہے پاندان اجڑا ہوا ہے۔ آئے وہاں سے آئین بن گیا"
"ہے ہے کیسی بُری فال منہ سے نکالتی ہو، خدا تمھارے پاندان کو مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے"
"تمھاری ان مسخرے پن کی باتوں سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے"
"چلو چولھا گرم ہونے کا سامان تو ہو گیا۔ اب غصے کو تھوک دو۔ میں ابھی پاندان اور دیگچی لے جاکر بنیے کے ہاں گروی رکھتا ہوں اور آٹا، دال، ڈلی، کتھا لاتا ہوں مگر پہلے اسمبلی کا ایک لطیفہ سن لو۔ تمھیں میرے سر کی قسم"
"سچ کہتی ہوں میں سر پیٹ لوں گی۔ لڑکا مدرسے سے دن بھر کا بھوکا آ رہا ہوگا، اور تمھیں لطیفے سوجھ رہے ہیں"
"اری نیک بخت آج اخبار کے دفتر سے ساڑھے دس روپے لایا ہوں سمجھیں؟ مبلغ ساڑھے دس روپے نقد جس کے آدھے سوا پانچ روپے ہوتے ہیں تمھارے لاڈلے لڑکے نے جسے تم بھوکا سمجھ کر غم کھا رہی ہو اٹھنی راستے ہی میں ہتھیالی اور چاٹ خرید کر کلڑے کھڑے چٹ کر گیا۔ باپ بچارا وضع دار ٹھیرا۔ بازار میں کیسے کھاتا۔ ہونٹ چاٹ کر رہ گیا۔ چار روپے اُسے اور دیئے کہ جنس خرید کر لائے۔ چھ روپے جیب میں ہیں۔ کہو اب بھی لطیفہ سنو گی یا نہیں"
"کیسے نہ سنوں گی۔ جانتی ہوں کہ جب تک موا لطیفہ حلق میں اٹکا رہے گا نہ تم کو چین آئے گا اور نہ مجھے چین لینے دوگے۔ اچھا جلدی سے اگل دو، پھر میں جاکر چولھا جلاؤں"
"واہ ری تقدیر! کیا جل ککڑی بیوی ملی ہے لطیفہ اس انداز سے سنیں گی جیسے کُنین کا انجکشن لگ رہا ہو۔ خیر تو راوی لکھتا ہے کہ اسمبلی میں کئی دن سے ہمارے آئینی بندوقچی مشت بعد از جنگ کے طور پر دنادن زنّاٹے کی تقریریں داغ رہے تھے۔ ان میں ایک آسام کی سرحد ی کے سورما ہیں جن کے منہ سے دھواں دھار جوش میں اُبلتی ہوئی تقریریں سُن کر آتش فشاں کے دہانے کا شبہ ہوتا ہے۔ مگر اس مرتبہ وہ کچھ ایسے موڈ میں تھے کہ بس ایک چھوٹی سی پھل جھڑی چھوڑنے پر قناعت کی۔ فرمانے ہیں کہ آئین میں گائے اور عورت کی حفاظت کا تو اہتمام کیا گیا ہے مگر گائے اور عورت سے حفاظت کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی"
"بس یہی لطیفہ تھا جو پیٹ میں نہیں سماتا تھا وہ جو اللہ کی سوربا بھی تمھارے ہی بھائی ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے ..... بے ....."
"ہم سمجھ گئے۔ بے لگام کہنا چاہتی ہو"
"تمھاری سمجھ پر اللہ کی سنوار۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ مردوے کس مٹی کے بنے ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے بس مخلوق سے حفاظت کی ضرورت"
"خیر شکر ہے کہ تم نے عورت کی بے زبانی کا دعوے نہیں کیا۔ اب رہی بے بسی یہی تو وہ سان ہے جس پر چڑھنے کے بعد عورت کی زبان میں اس قیامت کی کاٹ آجاتی ہے کہ خدا کی پناہ"
"تو کاٹ دو نہ اس کی زبان۔ بس اسی کی کسر ہے"
"توبہ توبہ تم بھی کیسی کل جبھی ہو! زبان کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ ہاں اگر ایٹم بم کی نگرانی کے لئے کوئی کمیشن مقرر ہو تو ......"
"تم سے جیالا لکھی کی نگرانی بھی سونپ دی جائے۔ اچھا اب میری جان چھوڑو مجھے کھانا پکانا ہے، تم اپنے دوستوں میں جاکر لطیفے بگھارو"

اشارہ

روشن صدیقی

تیری منزل ترے دل میں ہے، ستاروں میں نہیں
رنگ و بو، تیرے لہو میں ہے، بہاروں میں نہیں
تیرے دامن میں یہ شعلے ہیں شراروں میں نہیں
زندگی، کیا انھیں مبہم سے اشاروں میں نہیں؟
کیوں خود اپنی ہی تجلّی سے گریزاں ہے تو
بے خبر روحِ صنم خانۂ امکاں ہے تو

"روشنی"

(م۔ و۔ باغی)

اپنی دیوانہ خرامی کی میں کھاتا ہوں قسم
تیری دنیا میں کبھی اب نہ اندھیرا ہوگا

تیرے اُترے ہوئے چہرے پہ نہ ہوگی رونق؟
تجھ پہ ہنستے ہی رہیں گے یہ محلات بلند؟
تیری رگ رگ میں سما جائے گا افلاس کا غم؟
لُٹتی ہی جائے گی مخمور جوانی تیری؟
یوں ہی کھویا رہے گا تیری سیتا کا سہاگ؟
سب یوں ہی بھوک کی دنیا میں تڑپتے ہوں گے؟
تیری تقدیر پہ روئے گا شفق خونیں اشک؟
لمحہ لمحہ تیرے سینے سے دھواں اٹھے گا؟
یوں ہی رہ رہ کے ترے گام میں لغزش ہوگی؟
اپنی دنیا میں بھٹکتا ہی پھرے گا اے دوست؟

وہ افق پر تری منزل کا ستارا چمکا
تیری نبضوں میں جوانی کی روانی آئی
وہ پڑی بام فلک پر تری آہوں کی کمند
وہ ہوئی صبح وہ گردوں کی ہلیں زنجیریں
دیکھ وہ آہنی صدیوں کے شکنجے ٹوٹے
اب زمانے میں اُجالا ہی اجالا ہوگا

اپنی دیوانہ خرامی کی میں کھاتا ہوں قسم
تیری دنیا میں کبھی اب نہ اندھیرا ہوگا

نفسیات اور تجارت

خواجہ جلیل احمد

(۱)

تجارتی دنیا کی جواب تک "شعبہ ہائے کامرس" اور "اقتصادیات" کی دست نگر سمجھی جاتی تھی موجودہ علم نفسیات کی جدید ترین فتوحات میں سے ہے۔ یوں تو کہنے کو "اقتصادیات" خریدنے والے اور بیچنے والے کے رشتوں سے بحث کرتی ہے لیکن درحقیقت فریقین کی صحیح فطرت کا اندازہ لگانا نفسیات ہی کی قسمت میں تھا۔ اقتصادیات نے ہمیں بتایا تھا کہ اشیاء ضرورت کی تقسیم اس انداز سے ہونی چاہیے اور اس تقسیم کے لئے ایسے ویسے حربے استعمال کرنے چاہئیں کہ خریدار کو مجبوراً بیچنے والے کے دام تزویر میں گرفتار ہو جانا پڑے۔ خواہ اس میں کیسا ہی اور کتنا ہی خسارہ کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ یہ نظریہ نارو ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی استبدادانہ تھا کیونکہ اس میں خریدار کو ہمیشہ جھلنا پڑتا تھا لیکن نفسیات نے بروقت ہماری امداد کی اور انسانی فطرت کا تجزیہ و مطالعہ کرکے خریدار اور فروخت کنندگان کے مابین اس جبری رشتہ کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن تجارت کی ترقی کے لئے بہرحال ان دونوں پارٹیوں کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا ضروری تھا۔ لہذا اس کا حل یہ تجویز ہوا کہ بیچنے والا اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے کہ اُسے صرف اپنے مال کو فروخت ہی نہیں کرنا ہے بلکہ خریدار کو اس کی حسب حیثیت ایسا مال مہیا کرنا ہے جو نہ صرف اس کی ضرورت کا کفیل ہو سکے بلکہ اس سودے سے اُسے دلی اطمینان نصیب ہو اور لُٹ جانے کا احساس ختم ہو جائے۔ یہ نظریہ اگر ایک طرف انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر مبنی تھا تو دوسری طرف اُسے ذہنی عدم دیانت داری کا خاتمہ کر دیا۔ اب بیچنے والا عوام کو مال مہیا کرنے کا ذریعہ ہی نہیں رہا بلکہ وہ صحیح معنوں میں عوام کا خادم ہو گیا اور اپنے خریداروں کی صحیح ضرورت کا پتہ لگانے کی خاطر اس کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ اس کے جملہ فرائض میں سے ایک اہم فریضہ قرار پایا لیکن ضرورت کنندگان کا یہ ذہنی انقلاب اس وقت تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا جب تک ان میں خود اپنی فطرت اور عام انسانی فطرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت نہ ہو اور یہ کام صاف ظاہر ہے بلا نفسیاتی تجربات کی امداد کے ناممکن ہے لہذا تجارت کے مسئلے میں نفسیاتی علم کا حصول ناگزیر ہو گیا ہے۔

جیسا ہم کہہ چکے ہیں اقتصادیات اور نفسیات دونوں ہی خرید و فروخت کے مسئلہ کو اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اول الذکر اگر فروخت کنندہ کو خریدار کی طرف نظر جمائے رکھنے کی ہدایت کرتی ہے تو نفسیات خریدار کی خواہش کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ ایک غریدار کی جیب پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور دوسری اس کی خواہش کو پورا کرتی ہے اور معاوضے میں مناسب رقم قبول کرتی ہے۔ بہ نظر ظاہر دیکھنے سے دونوں کا مقصد ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک اخلاقیات سے قطع نظر صرف مال کی فروخت کا انتظام کرتی ہے۔ دوسری مال کی نکاسی کے ساتھ ساتھ خریدار کو تسکین بھی بخشتی ہے۔ یہ تسکین کس طرح حاصل ہوتی ہے "قدرے دقیق مسئلہ ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ نفسیاتی نظائر کا پیرو اپنے مال کے فروخت کا اشتہار دیتے وقت صرف انھیں نفسیاتی حربوں سے کام لیتا ہے جو خریدار کے دل میں صرف انھیں خواہشات کو ابھار سکے جن کے حصول کی اس میں مقدرت ہے۔ ورنہ اگر پروپیگنڈے اور غلط قسم کی اشتہار بازی سے اس کے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوئی جس کے حصول کی سعی اس کو نان شبینہ کو محتاج بنا دے گی تو اس کے لئے مشتہر موردِ الزام ہوگا۔ بالعموم ہمارے صنعتی ادارے اس قسم کے لچر اور بازاری حربے عوام کو بہکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سادہ لوح اور ان پڑھ لوگ ان کے جال میں پھنس کر اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی بھی کھو بیٹھتے ہیں اور بعد میں اس حرکت پر پشیمان بھی ہوتے ہیں، کیونکہ انھوں نے ایک مخصوص شے کو کچھ اور سمجھ کر خریدا تھا لیکن وہ نکلی کچھ اور۔ یہ اول درجے کی بددیانتی ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسے مشتہرین کو گرفت میں لینے والے قوانین وضع کرے تاکہ پبلک کو دھوکا دینے کا امکان کم ہو جائے۔ میرے خیال سے ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہزارہا اشتہارات سے جن کی بنیاد جھوٹ اور بے ایمانی پر ہوتی ہے۔ بخوبی واقف ہوگا۔ اس لئے ہم خواہ مخواہ مثالیں دے کر مضمون کو طویل نہیں کرنا چاہتے۔ بہرحال موجودہ تجارتی نفسیات اس حرکت کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے اور سچائی اور دیانت داری کو بنا رہبر بنا کر ایسے اشتہارات سے کام لیتی ہے جو عوام کے دل میں چیزوں کی خرید کی خواہش تو ضرور پیدا کر سکیں لیکن ان کو کسی مغالطے میں نہ مبتلا کریں۔ یہی سبب ہے کہ نفسیاتی نظائر کے پیروؤں کے قائم کردہ اداروں کے یہاں سے جو چیزیں خریدی جائیں گی وہ خریدار کی خواہش کے مطابق اس کی ضروریات کو رفع کریں گی، اور اس سے اُسے دلی تسکین حاصل ہوگی

بالعموم انسان کی اکثر و بیشتر خواہشات کا سرچشمہ اس کی فطری جبلتیں ہوتی ہیں جو کہ خلقی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً قوت نمو کو لیجئے ہر انسان فطری طور پر جینا چاہتا ہے اور اچھی طرح جینا۔ اب اس اچھی طرح زندگی بسر کرنے کے لئے اُسے سارے لوازمات برتنے پڑتے ہیں۔ اس جبلت کے تحت میں کھانا کھانا، کپڑے پہننا، غرض کہ چھوٹی اور بڑی ہزاروں ہی باتیں آ جاتی ہیں۔ اسی طرح خطرہ سے بھاگنا اور اظہار خودی بھی انسانی جبلتوں میں شامل ہیں ان جبلتوں کے بھی اپنی اپنی جگہ پر ہزارہا مطالبات ہوتے ہیں اور ان مطالبات کو مختلف ماحول اور سوسائٹیاں مختلف ناموں سے یاد کرتی ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ خواہشات اور مطالبات جو براہ راست جبلتوں کی تحریک کے مرہون منت ہوتے ہیں اکثر مسخ شدہ صورت میں ہمارے اور دنیا کے سامنے آتے ہیں اور بعض حالات میں تو ان کی شکل اتنی تبدیل ہو جاتی ہے کہ ان کی اصلیت کا پتا چلانا ہی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن کڑی سے کڑی ملا کر اور تسلسل قائم کرکے ہم ان کے سرچشمہ یا منبع کو دریافت کر سکتے ہیں۔

ہمارے یہ مطالبات بیشتر حالات میں اتنے غیر واضح اور مبہم ہوتے ہیں کہ ہم اپنے اندر صرف ایک بے چینی سی محسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو اس کا پورا پورا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جن کو اختیار کرکے ہم اپنی بے چینی کو دور کر سکتے ہیں خیال کے طور پر جنس کے جذبے اور اس سے متعلقہ مطالبہ محبت کو لیجئے۔ ابتدائی محبت میں واقعی ایک عجیب سی خلش اور بے چینی رہتی ہے۔ خواہ مخواہ طبیعت گھبراتی ہے۔ اور کسی کام میں جی نہیں لگتا اور تھوڑی سی شاعرانہ تعلی ہی سہی لیکن بے اختیار زبان پر یہ یا اسی کی قسم کے دوسرے اشعار آ جاتے ہیں:۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اور ہم اس "مخصوص درد" کی کوئی دوا نہ پا کر بے چین اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ جگر کے یہ اشعار :۔

بے تاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں
بے نام سی اک یاد ہے کیا جانیے کس کی
بے وجہ تگ و تاب ہے معلوم نہیں کیوں
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی ہی تہہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

اسی کیفیت کے آئینہ دار ہیں اور صرف انھیں اشعار پر کیا منحصر ساری کی ساری غزل اسی غیر مبہم اور غیر واضح مطمح نظر کے اظہار کا نمونہ ہے۔ لیکن یہ مطالبہ صرف اولین محبت میں اپنی غیر واضح شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے بعد میں ہم اپنی نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کرکے اس مسئلے کا حل دریافت کر لیتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "ملاقات محبوب" یا "وصل محبوب" کے سوا اس بیماریِ دل کا درماں اور کچھ نہ تھا۔

بالکل اس رومانی کیفیت سے ملتے جلتے اور غیر شاعرانہ جبلتوں کے مطالبات ہوتے ہیں مثلاً بھوک کو لیجئے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دو کتابیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر مرنے والوں سے
بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

لیکن محض بغاوت پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ زندگی اور تخلیق بغاوت کے علاوہ کچھ اور بھی طلب کرتی ہیں بغاوت تعمیر شاید کر سکے تخلیق نہیں کر سکتی۔ تخلیق کے لئے بغاوت کے علاوہ تعاون کی، اپنے گرد و پیش سے تنفر کے علاوہ اس کے صحیح فہم و ادراک کی بھی ضرورت ہے بغاوت جبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے پاس وہ ایمان و ایقان ہو جو زمانے کی بے ربطگی میں ربط۔ اس کی بے راہ روی میں آئین اور اس کے خلفشار میں سکون پیدا کر سکے پچھلے دو صدیوں سے انسان نے اس ایمان و ایقان کو سیاسی آئین میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے۔ بتلانے کی ضرورت نہیں وقت کے رجحانات کی وجہ سے سردار جعفری بھی آخر کار ایک سیاسی آئین ہی میں دنیا کے سارے امراض کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کے قلب و نظر ایک ایسے سیاسی آئین کی طرف مرکوز ہوتے ہیں جس کی شریعت ان تمام باتوں کا دعویٰ کرتی ہے جن کے خواب نوجوان شاعر دیکھتا ہے اس امر سے قطع نظر کہ سیاسی آئین کہاں تک اس درد کا درمان ہو سکتا ہے۔ شاعر ایسے آئین کی طرف مائل نظر آتا ہے جسے اس کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں، نہ اس کو اس کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس آئین کی کار فرمائی دیکھ سکے۔ اس آئین کے متعلق جو کچھ اس کی معلومات ہیں وہ صرف ان تفسیروں پر مبنی ہیں جو اس آئین کے خداوندوں نے اپنے پیرو کار اور معتقدین کے لئے لکھی ہیں۔ یہ تفسیریں موجودہ زمانے کی ابتری پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ ایک مخصوص نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ نظام ٹوٹا اور اس کی جگہ ہمارے نظام نے لی تو دنیا کی ساری بیماریاں زندگی کی ساری گتھیاں دور ہو جائیں گی مجھے اس وقت اس دعوے کی صداقت سے بحث نہیں۔ البتہ یہ دیکھنا ہے کہ اس ایمان بالغیب کا نوجوان شاعر اور اس کے فن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ شاعر اس سیاسی آئین کو لبیک کہتا ہے۔ اس میں اسے ایسے ایقان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو شاید اس ظلمت کو جو اب تک اس کے ذہن اور تخیل کو محصور کئے ہوئے تھی دور کر دے۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ یہ ایقان کتابی ہے اکتسابی نہیں۔ یہ نہ دماغ اور شعور کی قدرتی پیداوار ہے، نہ کسی صاحب دل کی نظر کیمیا اثر کا معجزہ ہے بلکہ حالات حاضرہ کا ردعمل ہے۔ ذہن کی ایک پرواز ہے جس میں گریز کے انداز کار فرما ہیں۔ بہرحال شاعر کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ اس کی دل کی دنیا جاگ اٹھتی ہے اس نئے ایمان کا اظہار شاعر طرح طرح سے کرتا ہے کبھی کہتا ہے

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لاکر تخت پر قیصر کے دہقاں کو
میرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خوں سے سرمایہ داروں کے

سرمایہ داری، خون، دہقاں، مزدور، انقلاب اب لوازمات شاعری بن جاتے ہیں۔ غالب کو اگر مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے بادہ و ساغر کی ضرورت پڑتی تھی تو سردار جعفری کو حق گوئی کے لئے اشتراکیت، پرولتاریت درکار ہیں۔ لیکن یہ بادہ بھی نیا اور ساغر بھی نیا اور شاعر بھی ان لوازمات کو برتنے کے لئے بھی مزاولت اور ریاض چاہیے۔ نوجوان شاعر اس لئے ان نئے ساز و سامان کا استعمال اس صفائی اور چابکدستی سے نہیں کر پاتا جس طرح غالب اپنے بادہ و ساغر کا کرتا ہے۔

سردار جعفری کا اسلوب بیان، اُن کی شوخیٔ تخیل۔ ان کی شعریت، ان لوازمات کا بار مشکل سے اٹھا پاتی ہیں۔ انداز بیان کا ستھرا پن اور توازن بگڑ جاتا ہے تخیل، ذہنی کاوشیں اور فلسفۂ اشتراکیت کی موشگافیوں میں پھنس کر اپنی شوخی اور سبک رفتاری کو بڑی حد تک کھو دیتا ہے۔ شعریت شدید جانب دارانہ پروپیگنڈا کی شکار ہو جاتی ہے۔ ادھر دنیا کا نقشہ جلد جلد بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ روس کا جرمن سے مردانہ وار مقابلہ برلن کی فتح۔ روسی سپاہیوں کی بے مثال بہادری، روس کی اقتصادی ہمت ان سب کا اثر نوجوان شاعر پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اور وہ آخر کار لال شاعر، سرخ پرچم کا شاعر۔ اشتراکیت کا شاعر بن جاتا ہے۔ اب کبھی وہ بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت پر خوش ہوتا ہے کبھی تلنگانہ کے کسانوں کی سرفروشیوں پر مسرت کے شادیانے بجاتا ہے کبھی لینن کی عظمت کے گیت گاتا ہے کبھی روسی سپاہی کی بہادری پر درود بھیجتا ہے، اور کبھی انقلاب چین کو حیات نو کا پیش خیمہ گردان کر وجد کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"اب ہوا چین کا نام گنگناتی ہے
اب فضا چین کے نام پر مسکراتی ہے

اور

چین سب سے بڑا گیت سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، ایک امنگ، اک عزم ہے

لیکن یہ سب کہتے ہوئے شاعر کا لب و لہجہ تلخ و تند ہو جاتا ہے کبھی کبھی تو اس کی آواز میں ہسٹریائی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان شکستہ اور زبان زخم خوردہ ہو جاتی ہے۔ خیالات گنجلک اور غیر مربوط، تصورات مبہم اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور شعریت مجروح ہوتی جاتی ہے۔ مجموعے کی چند ابتدائی نظمیں مثلاً تذبذب مزدور لڑکیاں، انتظار نہ کر، وہم و خیال کو ملاحظہ کیجئے اور ان کا مقابلہ دوسری نظموں مثلاً خواب، سیلاب چین وغیرہ سے کیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ ان تمام باتوں کا شاعر کے فن پر کیا اثر پڑا ہے۔

مستقبل بتائے گا کہ سردار جعفری اس منزل سے کب اور کیوں کر نکلتے ہیں۔ اگر اُن کی شعریت ان کی موجودہ جانبدارانہ شاعری سے عہدہ برآ ہو سکتی تو امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ ایک دن اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے غالب کہتا ہے

عشاق فریب حق و باطل سے جدا ہیں

نوک نشتر۔ کنھیا لال صاحب کپور کے

مضامین کا مجموعہ ہے۔ مجھے ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں نے کپور صاحب کی دو پہلی کتابیں۔ سنگ و خشت، اور شیشہ و تیشہ نہیں پڑھیں۔ نوک نشتر ہی ان کی پہلی کتاب ہے جس سے متلطف ہوا ہوں۔

میں اپنے کو ہرگز ہرگز ان صاحب بصیرت حضرات میں تصور نہیں کرتا جو محض لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ جاتے ہیں۔ نوک نشتر کے نام سے بس میں اتنا ہی سمجھا کہ ہو گی کسی ترقی پسند کی کوئی نئی کتاب۔ ان حضرات کے اختراع کا پیشہ سے قابل ہوں کتابوں کا نام بھی تجویز کرتے ہیں تو ایسا کہ خواہ مخواہ آدمی کی نگاہ اور جیب پر چوٹ لگے۔ میں نے یہی سب کچھ سوچ کر کتاب اٹھا لی۔ اور پہلا مضمون برج بانو شروع کیا۔ پہلے دو صفحوں تک تو یہی سمجھتا رہا کہ فسادات کی کوئی داستاں ہو گی۔ لکھنے والا انسانوں کی بہیمیت کا نقشہ کھینچ کر ثابت کرے گا کہ یا تو ہم لوگ آزادی کے قابل نہیں تھے یا ہمیں آزادی کی سخت قیمت ادا کرنی پڑی یا دلوں میں جو ان فسادات سے ناسور پڑ گئے ہیں ان پر آنسو بہائے گا، صف ماتم بچھائے گا اور سینہ کوبی کر کے مضمونوں کو ایک اضطرابی نعرہ پر ختم کر دے گا۔ لیکن دو ہی صفحے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایں چیزے دیگر است جہاں نہ فسادات کے خونی مناظر کی عکاسی ہے نہ قتل و غارتگری کے افسانوں پر خون کے آنسو ہیں بلکہ کچھ ایسی لطیف اور مزے دار چٹکیاں ہیں جن سے پڑھنے والا ایک ہی وقت میں تلملا بھی اٹھتا ہے اور محظوظ بھی ہوتا ہے جو رلاتی بھی ہیں اور ہنساتی بھی

کپور صاحب ہنسا ہنسا اور رلا رلا کر بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں، اور کڑوی سے کڑوی بات بھی اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا بدمزہ نہیں ہوتا۔ طنز کی اس سے بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ برج بانو میری رائے میں طنز کی ایک کامیاب مثال ہے۔ اس میں طنز کے نشتر کا اس چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے کہ معمولی شروع میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے نشتر چبھایا جا رہا ہے۔ اس کے جراحت کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب پورا نشتر پیوست ہو جاتا ہے۔ لیکن نشتر سے جو ٹیس پیدا ہوتی ہے اس میں بھی ایک لذت ہے۔ بہرحال برج بانو ایک کامیاب طنز ہے اس کی کامیابی کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ کپور صاحب ایک ہوشیار جراح کی طرح جانتے ہیں کہ نشتر کہاں تک لگایا جا سکتا ہے۔ برج بانو کو وہ جہاں لا کر ختم کرتے ہیں ٹھیک وہی مقام ہے جہاں اُسے ختم ہونا چاہیے تھا۔

اس میں اگر ایک فقرہ کا بھی اضافہ ہو جاتا تو طنز کا سارا اثر اور کیف جاتا رہتا۔

طنز ایک ایسا نازک آلۂ حرب ہے کہ اس کا استعمال کرنے والا اگر ہوشیار نہیں تو خود اپنے ہاتھ زخمی کر لیتا ہے۔ اس کے ہاتھ سبک اگر نہ پڑیں تو خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ صاحب طنز کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ وہ نہ صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے نہ اس کی نقاشی وہ تو صرف رگ پکڑتا ہے۔ اور اس میں ایسی چٹکی لیتا ہے کہ سارے جسم کو اس رگ کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ دبے ہوئے اور پوشیدہ پھوڑوں کو تلاش کر کے ان پر نشتر لگاتا ہے تاکہ گندہ مواد سطح زخم پر آ جائے اور اس کا اندمال ہو سکے۔ کپور صاحب اس نشتر کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ ان کے ہاتھ منجھ گئے ہیں۔ نوک نشتر میں شاید ہی کوئی کپور صاحب کے ہاتھوں سے بچا ہو۔ "سخن فہم" میں۔ مشاعرہ اور مشاعرے سے زیادہ ایسے پرگو شاعروں پر ایک ضرب کاری لگائی گئی ہے جن کے سینے پر اپنے کلام کا اس قدر شدید بوجھ ہوتا ہے کہ اس کو ڈھیلا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایسے شاعروں کو کون نہیں جانتا۔ ہمیشہ پُر رہتے ہیں۔ اک ذرا چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے "سخن فہم" ایک پر لطف اور سبق آموز طنز ہے۔ اس کا اختتام البتہ ذرا کھنچ گیا ہے اور کچھ آپے باہر ہو گیا ہے۔ شاید شمن صاحب کے کلام کا جادو اتنا اثر کر گیا کہ کپور صاحب اپنی چابک دستی بھول گئے "شن شن شان" ذرا ضرورت سے زیادہ واضح ہو گیا اتنا واضح کہ اس میں طنز کی سادگی اور پرکاری کافور ہو گئی۔ "شہید اور غنڈے" "ہجرت کے فائدے" "فلم ڈائرکٹر کے نام" "زندہ باد" طنز کے چند کامیاب نمونے ہیں۔ ان سب میں بلا کی چوٹیں ہیں۔ "فلم ڈائرکٹر کے نام" مختصر لیکن جامع طنز موجودہ فلم سازی کی "بدنامیوں اور رسوائیوں پر" قابل قدر چیز ہے۔ مجموعی طور پر "نوک نشتر" طنزیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے پیش لفظ میں کپور صاحب نے دھمکی دی ہے کہ اب وہ ایک مدت تک کوئی کتاب نہیں لکھیں گے۔ خدا کرے وہ اس دھمکی کو پورا نہ کر سکیں۔ آمین

بچے اور اُن کی جبلت

(۳)

محمد حسنین

۶۔ نفرت

طنز، تحقیر، بغض، کینہ، عناد کی شاخیں نفرت کے تنے سے پھوٹتی رہتی ہیں۔ شروع شروع میں یہ جذبہ نفرت کی صورت میں نمودار نہیں ہوتا، بلکہ ناپسندیدگی خفگی اور چڑ کی منزلیں طے کرتا ہوا نفرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بچوں کے ساتھ بڑوں کی ضد بچہ میں نفرت کا بیج بوتی ہے جس قدر ہم کسی بات پر جسے بچہ ناپسند کرتا ہے یا جس میں کوئی دلچسپی یا کشش اُسے نظر نہیں آتی اصرار کرتے ہیں اسی قدر بچے میں اس بات سے چڑ اور نفرت بڑھنے لگتی ہے ——— بچہ اپنا جوتا اُتار پھینکتا ہے اس میں اُسے کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔ ماں چاہتی ہے کہ وہ ننگے پاؤں نہ رہے۔ ماں کی خواہش بلاشبہ قابل قدر ہے۔ وہ بچے کے جوتا پہننے پر اصرار کرتی ہے جوتا اُتار پھینکنے پر اس کی تنبیہ کرتی ہے اور کبھی خفا ہو کر اسے کھیلنے سے اُٹھا لیتی ہے۔ دونوں پیروں کو اچھی طرح دھو کر زبردستی جوتا پہنا دیتی ہے۔ یہ سب باتیں بچے کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں۔ ناپسندیدگی یا رضامندی سے بچے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ چڑنے کڑھنے لگتا ہے۔ ماں کی زبردستی یا ضد اس کی کڑھن کو تیز اور تیز تر کرتی جاتی ہے، اور آخر جوتا ماں سے نفرت کا سبب بن جاتا ہے۔

نفرت بھی خوف، غصہ اور ضد کی طرح جسمانی کمزوری سے تیز ہو جاتی ہے۔ وہ بچے جو پیدائشی کمزور لاغر یا کسی جسمانی نقص کا شکار ہیں۔ نفرت کے جذبے سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ بدرنگ، بدشکل بدوضع یا لاغر بچے حسین شکیل، خوبصورت جمیل یا تندرست بچوں کی صحبت میں وہ لطف نہیں اُٹھاتے جو کالے، کن کٹے، لولے، لنگڑے بچوں کی صحبت میں حاصل کرتے ہیں۔ ایسے بچوں میں دوسرے بچوں سے ان کی نفرت کا سبب محض ان احساس کمتری ہوتا ہے۔

بچے کی کسی بات سے یا شے سے ناراضگی کو جلد سے جلد دور کر دینا چاہئے۔ اس لئے کہ بچے کی یہ مخصوص انفرادی کیفیت عمر کے بڑھتے ہی مستقل ہونے لگتی ہے اکثر تعلیم یافتہ لوگ بڑی عمر میں بھی کسی معمولی روزمرہ کی چیز سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کے درمیان اروی کا قلیہ یا بیگن کا بھرتہ دیکھ کر بلا مبالغہ ان کی اشتہا پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ ان کی اس نفرت کا اگر ہم کھوج لگائیں تو اس کا سلسلہ بچپن تک پہنچے گا، اسی طرح بچوں کا کسی خاص مضمون کو ناپسند کرنا آگے چل کر اُن کے عزم و عمل میں سدِ راہ بن جایا کرتا ہے۔ ہماری قوم میں بیشتر طلبہ کی ریاضی سے وحشت بچپنے کی اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔

۴ مثال کے لئے جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کا نام لینا کافی ہے جس نے یورپ کو تہ و بالا کر دیا بلکہ ساری دنیا میں ہلچل ڈال دی جن لوگوں نے اس کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح بچپن کے ناگوار اثرات نے اس کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکا دی اور بغض و عناد، حسد اور کینے کے جذبات جن کا نفرت سے چولی دامن کا ساتھ ہے پیدا کر دئے۔ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد ساری جرمن قوم میں ضد، غصّے اور بیزاری کی ایک عام کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس بے پناہ نفرت نے جو ہٹلر کے سینے میں بچپن سے پرورش پا رہی تھی اپنی قوم کی اس غیر معین کیفیت کو یہودیوں، جمہوریت پسندوں اور اشتراکیوں سے نفرت کی معین شکل دے دی اور ان کی سیرت اور اخلاق کو بالکل مسخ کر دیا۔

لیپ چا

شیخ حبیب اللہ

سائنسی ذرائع آمد و رفت نے ہماری دنیا کو تنگ کر دیا ہے۔ با ایں ہمہ بیسیوں اپنے گمنام گوشے اسی دنیا میں موجود ہیں جہاں عجیب و غریب اشیا اور حیرت انگیز خلقت مشہور ہے۔ ان انجانی خلقت میں لیپ چا بھی ہیں جو ہمالیہ کی ترائیوں میں بسراج مان ہیں۔ اب ان کی تعداد قلیل ہے۔ کیوں کہ قوی تر قوموں کی دست درازیوں نے انھیں اور بھی گمنام گوشوں میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ اول اول اہل تبت نے اس قوم پر حملہ کیا اور انھیں وادیوں میں ڈھکیل دیا۔ جب تب بتیجلے جگہ خالی کی تو نیپالیوں نے اپنا سکہ جما لیا۔ یہی سبب ہے کہ اب لیپ چا صرف نامعلوم وادیوں اور پہاڑیوں میں پائے جاتے ہیں۔

لیپ چا شرمیلے اور تنہائی پسند ہوتے ہیں وہ پیدائشی قدرت پسند ہیں انھیں زراعت کے فن سے واقفیت نہیں۔ ان کی آبادی سکم اور کلیم پونگ میں پائی جاتی ہے۔ سکم کے لیپ چاؤں نے اپنے قدیمی کلچر کو برقرار رکھا ہے۔ مگر کلیم پونگ کے لیپ چا نیپالیوں میں ضم ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان رشتہ مناکحت ہے۔ پادریوں نے بھی ان کے درمیان تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے اور انھوں نے انگریزی پڑھنا بھی شروع کر دیا ہے۔

ہر چند کہ ان میں تہذیب حاضر کی روشنی نہیں پہنچی ہے مگر شاید یہ اسی ظلمت کا طفیل ہے کہ وہ خوش و خرم ہیں۔ یہ لوگ ہنوز اسی قدیم کاشت کاری پر عمل پیرا ہیں یعنی اونچی زمینوں میں جوار باجرا بوتے ہیں اور وادیوں میں تھوڑا بہت چاول۔ جہد للبقا نے انھیں بھائی چارگی اور آپس کا میل جول سکھا دیا ہے وہ تھوڑے پر قناعت پذیر ہیں اور کبھی انھیں وافر اناج اور کافی مویشی حاصل ہو جاتے ہیں تو پھر خوب سیر شکم ہو کر کھاتے ہیں۔ اُن کا کوئی مذہب و عقیدہ نہیں اور یہی سبب ہے کہ پادری اپنی تبلیغ میں بہت کامیاب ہیں۔ یہ قوم اتنی توہم پرست ہے کہ انھیں ہر ٹیلے، پہاڑ اور چشمے میں فوق البشریت نظر آتی ہے۔ ان میں بھی ایک پجاری ہوتا ہے جس کا کام صرف تقریب منانا اور قربانی کا جانور کاٹنا ہوتا ہے۔ اچھے اور بُرے کی انھیں تمیز تو ہے۔ مگر نجات کیا ہے انھیں معلوم نہیں لیپ چا کسی فلسفی کے تخیل کی خلقت نہیں اور نہ انھوں نے اپنی زندگی کو کسی تنظیمی جماعت کے ذریعے تشکیل کیا ہے بلکہ ان کی زندگی، تجربے کی نہائی پر پٹ کر تیار ہوئی ہے انھیں سائنس و فن سے لگاؤ نہیں۔ ان کی زندگی سادہ معمولی ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات بھی سادہ و معمولی ہیں، اور اسی میں ان کی خوشی جھلکتی ہے

(ماخوذ)

دُنیا پر امریکہ کیوں چھایا ہوا ہے؟

محمد امین

آج ساری دنیا پر امریکہ ہر لحاظ سے چھایا ہوا ہے۔ شمالی کرہ ہو خواہ جنوبی، مغربی ہو یا مشرقی ہر طرف اور ہر دشت میں امریکہ ہی امریکہ کی دھوم مچی ہوئی ہے ہمارے ملک میں پہلے امریکہ کا چرچا کم تھا لیکن وزیر اعظم کے وہاں جانے سے یہاں بھی آج کل اخباروں میں امریکہ ہی کے ڈھول پٹ رہے ہیں۔ پچھلی جنگ سے پہلے برطانیہ ایک لحاظ سے دنیا پر چھایا ہوا تھا لیکن دوران جنگ میں اس کے اقتدار کی بنیاد ڈانوا ڈول ہو گئی اور جنگ ختم ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے نمبر کی طاقت بن کر رہ گیا۔ اس درمیان میں امریکہ آگے بڑھتا رہا اور اپنے قدرتی ذرائع کو جنگ کے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا۔ اندرونی طور سے وہ اپنے حلقۂ اثر کو دن بدن بڑھاتا رہا اور خاموشی سے بہ حیثیت ایک بین الاقوامی قوت کے برطانیہ کی جگہ کو پر کرتا رہا۔ آج اس کا شمار دنیا کی سب سے بڑی طاقت میں ہے۔

کیا وجہ ہے کہ دوران جنگ میں امریکہ اتنی تیزی سے ترقی کر گیا اور جنگ ختم ہونے کے بعد سے اب تک وہ دنیا کے بہت سے ملکوں پر چھا چکا ہے اور بہتوں پر قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے؟

معاشی اور صنعتی نقطہ نظر سے پایہ کی بات یہ ہے کہ جس ملک میں اچھے قسم کا کوئلہ اور لوہا کثرت سے پایا جاتا ہے وہ ملک ایک نہ ایک دن ضرور ترقی کرتا ہے امریکہ کی معدنیات کا نقشہ اٹھا کر اگر ہم دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں پر مشرقی پلیٹو کے علاقے میں کئی سو میل ایک ایسا خطہ ہے جہاں کوئلہ ہی کوئلہ پایا جاتا ہے۔ یہاں سے کوئلہ لاکھوں ٹن نکالا جاتا ہے اور امریکہ کی مختلف صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں دنیا کے ذخیرہ کا [illegible] فی صدی کوئلہ موجود ہے۔ یہ کوئلہ گھٹیا اور بے کار نہیں ہے۔ بلکہ خوبیوں کے لحاظ سے لوہے کو گلانے کے لئے بہت ہی مؤثر اور مفید ہے۔

بڑی جھیلوں کا علاقہ امریکہ میں بھلا کون نہیں جانتا۔ یہاں جھیل سوپیریر کے جنوب اور مغرب میں زمین کی تہہ کے اندر لوہے کی ان گنت کانیں ہیں۔ کوئلے کی طرح یہاں کا لوہا بھی بہت عمدہ اور پایہ کا ہوتا ہے۔ بڑی جھیلوں کے ذریعے ذرائع آمد و رفت میں بڑی آسانی ہے چنانچہ جلد ہی کوئلہ جھیلوں کے راستے سے کوئلے کی کانوں کے قریب آنے لگا۔

یو، ایس، اے (معدنیات)

لوہا

کوئلہ

پٹرول

کوئلہ اور لوہے کے اتصال سے یو، ایس، اے میں لوہے اور فولاد کی صنعت ابھر آئی۔ ابتدا میں لوہے کی صنعت کا مرکز کوئلہ کی کان کا علاقہ رہا اور پٹس برگ اس کا خاص شہر تھا، لیکن جوں جوں پانی اور ریلوں کے ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہوئی حالات بدلنا شروع ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد کوئلہ اب لوہے کے علاقے میں جانے لگا جھیلوں کے راستے سے کوئلہ ڈولتھ اور شکاگو تک بآسانی پہنچ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولتھ اور شکاگو سے لے کر پٹس برگ تک کا تمام علاقہ لوہے اور کوئلے کی صنعت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ جھیلوں کے کنارے جو شہر آباد تھے وہاں پر بھی دونوں دھاتوں کے میل جول سے لوہے اور فولاد کی صنعت ابھر آئی اور تیزی سے ترقی کر گئی۔

دوران جنگ میں لوہے کی صنعت سے اسلحہ و ہتھیار تیار کرنے میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور ہر محاذ کو ٹینک، مشین گن، ہوائی جہاز، گولہ بارود اور جیپ سے امریکہ نے پاٹ دیا۔ جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی سارا کا سارا صنعتی نظام بدل گیا، اور امریکہ نے ٹینک، مشین گن اور جیپ کے بجائے ٹریکٹر، انجن اور بسیں تیار کرنا شروع کر دیں۔ موجودہ زمانے کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے اپنے یہاں کا تیار شدہ مال ہر ملک میں بھیجنا شروع کر دیا۔ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے شکست کھا جانے کے بعد دنیا کا بازار اس کے لئے کھلا تھا۔ برطانیہ کی کمر ٹوٹ چکی تھی اس لئے دیکھتے دیکھتے امریکہ تمام دنیا کی تجارت پر چھا گیا۔

لیکن امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کا دار و مدار صرف لوہے اور کوئلے کی صنعت پر نہیں ہے بلکہ بہت حد تک پٹرول یعنی مٹی کے تیل کو بھی دخل ہے۔

ارضیات کے ماہروں کا اندازہ ہے کہ دنیا میں مٹی کے تیل کا ذخیرہ بہت محدود ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ موجودہ خرچ کے لحاظ سے بمشکل بیس پچیس سال تک چل سکتا ہے اس کے بعد تیل کے اور ذخیرے اگر نہیں معلوم ہوئے تو سمجھئے کہ ساری دنیا میں پٹرول کا کال پڑ جائے گا اور پھر پتہ نہیں کہ کیا ہو۔ بہرحال یوں سمجھئے کہ جو کچھ بھی تیل کا ذخیرہ موجود ہے اس کا دو تہائی حصہ یو، ایس، اے میں ہے۔ لیکن چونکہ پٹرول کا خرچ وہاں سب سے زیادہ ہے اس لئے امریکیوں کو یہ فکر لگ گئی ہے کہ کہیں انھیں کے تیل کے چشمے سب سے پہلے نہ خشک ہو جائیں۔ چنانچہ جس دن کہ یہ احساس وہاں کے ماہرین اور سرمایہ داروں کو ہوا اسی دن سے ان لوگوں نے تیل کے نئے نئے چشمے معلوم کرنے کے لئے اور ملکوں میں جد و جہد شروع کر دی۔ حال میں عرب کی سرزمین میں تیل کے بہت سے نئے چشمے معلوم کئے گئے ہیں اور اس کی وجہ سے امریکہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

یو، ایس، اے میں سب سے زیادہ پٹرول ٹکساس کی ریاست میں نکالا جاتا ہے۔ اس کے بعد کیلی فورنیا کا نمبر ہے۔ بہت سا تیل راکی پہاڑ اور اپلیچین پلیٹو میں بھی ہے اور وسطی میدان کے مغربی علاقے میں بھی۔ یوں سمجھئے کہ یو، ایس، اے میں اس سرے سے اس سرے تک تیل کے چشمے ہی چشمے ہیں اور ان کا ذخیرہ اربوں گیلن ہے۔

یو، ایس، اے میں اور بھی بہت سی دھاتیں پائی جاتی ہیں مثلاً سونا، چاندی، تانبا، جستہ اور یورینیم۔ راکی پہاڑ کا علاقہ ان دھاتوں کے لئے مخصوص ہے اور اندازہ ہے کہ ابھی اور بھی بہت سی قیمتی دھاتیں وہاں پوشیدہ ہیں جو ذرائع آمد و رفت کی آسانی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتی رہیں گی، اور یو، ایس، اے کو خوش حال بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

یو، ایس، اے میں ہر قسم کی فصل، غلہ ہو خواہ خام پیداوار ہر چیز بہت افراط سے ہوتی ہے۔ وہاں کی آب و ہوا اور دوسرے جغرافیائی حالات ایسے ہیں کہ وہاں ہر فصل کے لئے ایک ایک خطہ مخصوص ہے۔ یو، ایس کے وسطی میدان میں اگر ہم جنوب سے شمال کی طرف جائیں تو کھیتوں میں ہمیں کئی طرح کی فصلیں لہلہاتی ہوئی ملیں گی بالکل جنوب میں خلیج میکسیکو کے ساحل کے ساتھ ساتھ گنے اور چاول کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ ذرا اوپر کی طرف [illegible] آب و ہوا میں تبدیلی محسوس ہوگی اور بارش کم ہوتی جائے گی۔ چنانچہ گنے اور چاول کی کاشت سے متصل شمال کی طرف [illegible] اس علاقے میں مشرقی پلیٹو اور راکی پہاڑ کے درمیان دریائے

مسی سی پی کے بیسن میں کپاس ہی کپاس کے کھیت ملیں گے کپاس کی کاشت یہاں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے۔ اور یہاں کی کپاس دنیا میں سب سے عمدہ مانی جاتی ہے زیادہ تر اس سے بہترین قسم کے سوتی کپڑے تیار ہوتے ہیں۔ سوتی کارخانے اس خطہ کے مشرقی حصے میں شمال سے جنوب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئلہ اور کپاس دونوں آس پاس پائے جانے کی وجہ سے بڑی آسانی ہے۔ ایک نہیں ہزاروں کارخانے ہیں جو نہ صرف سوتی کپڑا بناتے ہیں بلکہ مصنوعی ریشم اور کپاس کی ملاوٹ سے ایک خاص قسم کا چمکدار کپڑا تیار کرتے ہیں۔ جو ہمارے ملک میں بھی بہت رائج ہے۔

روئی کے خطے سے ذرا اور شمال کی طرف بڑھئے تو ہم ایک ایسے خطے میں داخل ہوں گے جہاں کے قدرتی حالات گیہوں اور مکا کی فصل کے لئے بہت موزوں ہیں چنانچہ اس علاقے میں گیہوں اور مکا دونوں کی کاشت باری باری سے ہوتی ہے۔ ذرا اور اوپر کی طرف چلئے تو موسم سرد ہوتا جائے گا اور گیہوں کے بدلے مکا کی کاشت مخصوص ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ ہم ایک ایسے خطے میں پہنچ جائیں گے جہاں صرف مکا ہی مکا نظر آئے گا۔ اس علاقے میں نہ صرف یہ کہ مکا کی فصل اعلیٰ پیمانے پر تیار ہوتی ہے بلکہ لاتعداد سوروں کی بھی پرورش ہوتی ہے۔ مکا کی جڑ سوروں کی غذا کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ چنانچہ فصل کٹ جانے کے بعد سور مع اپنے بچوں کے کھیتوں میں ہانک دئے جاتے ہیں اور وہ خود بخود اپنے تھوتھنوں سے زمین کھود کھود کر مکا کی جڑوں سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ چھ مہینے کے اندر اندر سور کے بچے بڑے ہو کر موٹے تازے اور ہٹے کٹے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ شکاگو بھیج دئے جاتے ہیں جو دنیا میں گوشت کی صنعت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ سور مشین کی مدد سے ذبح کئے جاتے ہیں اور ان کا گوشت ڈبوں میں بھر کر امریکہ کے دوسرے علاقوں میں اور باہر کے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ امریکہ کی صنعتی ترقی کا اندازہ تھوڑا بہت اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہاں سور کے جسم کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی، بجز اس چیخ کے جو ذبح کرتے وقت اس کے منہ سے نکلتی ہے۔ شکاگو نہ صرف گوشت کی سب سے بڑی منڈی ہے بلکہ وہ یو، ایس، اے کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اور وسطی میدان میں تجارتی معاشی اور صنعتی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا مرکز۔

بڑی جھیلوں اور مکا کے خطے کے درمیان ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کی آب و ہوا گھاس کی پیداوار کے لئے بہت موافق ہے چنانچہ یہاں گائے بھینس لاتعداد پائی جاتی ہیں، اور ان سے دودھ، پنیر، مکھن، کریم لاکھوں پونڈ حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں پر زیادہ تر مویشی دودھ حاصل کرنے کے لئے پالے جاتے ہیں، اور سارا کام سائنس کی مدد سے جدید طریقے پر ہوتا ہے۔ اس خطے میں مرغیاں بھی بہت پالی جاتی ہیں، اور ان کے انڈے بہت افراط سے ہوتے ہیں۔

کپاس، مکا اور گیہوں اور خالص مکا اور مویشی کے خطے سے ذرا مغرب کی طرف چلئے تو ہمیں حالات بدلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سالانہ بارش کم ہوتی جائے گی۔ اور سردیوں کی شدت بڑھتی جائے گی۔ یہاں کی مٹی کالی ہے، اور گیہوں کے لئے بہت موزوں۔ لہٰذا وسطی میدان کے جو راکی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے شمال سے جنوب تک گیہوں ہی گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اوپری حصے میں فصل بہار کا گیہوں اور جنوبی حصے میں فصل سرما کا گیہوں سائنس کے جدید طریقے پر لاکھوں ٹن پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کے کسان اور زمیندار بہت سا گیہوں اپنے مویشیوں کو بھی کھلاتے ہیں، اور اس کے باوجود ہر سال لاکھوں ٹن ان کے پاس بچ رہتا ہے۔

وسطی میدان کا مغربی حصہ جو راکی پہاڑ سے متصل ہے زیادہ خشک اور پہاڑی ہے۔ قدرتی حالات تو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہاں بھی کسی فصل کی کاشت ہو۔ لیکن امریکہ کے لوگ سائنس میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ انھوں نے گیہوں کی ایک ایسی قسم پیدا کر لی ہے جو خشک موسمی حالات برداشت کر سکتی ہے اور بخوبی اُگ سکتی ہے۔ چنانچہ اس حصے میں بھی خشکی کو برداشت کرنے والا گیہوں بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اس لئے مغرب کی جانب قدرتی حالات بھیڑوں کے لئے موزوں ہیں۔ چنانچہ یہاں لاکھوں بھیڑ پالی جاتی ہیں اور ان کا اون مشرقی پلیٹو کے سوتی اور ریشمی اور اونی علاقے کے شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں کے کارخانوں میں اونی کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

اب ذرا وسطی میدان سے مشرق کی طرف چلئے آہستہ آہستہ آپ مشرقی پلیٹو سے گذر کر بحر اوقیانوس کے ساحل پر آ جائیں گے۔ یہ ساحل شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے اور خاصا لمبا چوڑا میدان ہے۔ اس کی مٹی میں زیادہ تر ریت ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ یہاں بھی کوئی مفید چیز پیدا ہو سکتی ہے ذرا مشکل ہے۔ لیکن یو، ایس، اے کے کسان اس قدر عقل مند، ہوشیار اور جفاکش ہیں کہ اس ریتیلی مٹی کو بھی انھوں نے بے کار نہیں چھوڑا۔ سال میں بارش یہاں بہت کافی ہوتی ہے اور مٹی میں تھوڑی بہت کھاد ملا دینے سے وہ زرخیز ہو جاتی ہے چنانچہ سارا کا سارا ساحلی میدان رسیلے اور چھوٹے چھوٹے پھلوں اور سبزیوں کی کاشت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ مشرقی پلیٹو سے نیچے اُترتے ہی شمال سے جنوب تک بڑے بڑے شہروں کی ایک قطار ہے۔ ان شہروں میں چھوٹے اور رسیلے پھلوں اور سبزیوں کی بڑی بڑی منڈیاں ہیں۔ ساحلی علاقے میں شمال سے جنوب تک حالات ایسے ہیں کہ سب سے پہلے جنوبی حصے میں پھل اور سبزی کی فصل تیار ہوتی ہے۔ موٹر اور ٹرک میں بھر کر جلدی سے ان کو شمال کے بڑے شہروں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس موسم میں چونکہ وہاں فصل تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے جنوبی حصے کے کسان منہ مانگا دام وصول کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ موسم کی تبدیلی ساتھ ساتھ جنوب سے شمال کی طرف فصل پکتی جاتی ہے اور کٹتی جاتی ہے اور یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔

ساحلی میدان کا درمیانی حصہ جو مشرقی پلیٹو کے دامن میں ہے وہاں کے موسمی حالات اور زمین کی ساخت دونوں تمباکو کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہیں پہلے پہل یہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی جگہ تمباکو نے لے لی اور کپاس کی کاشت مغرب کی طرف سمٹ گئی۔ یہاں تمباکو زیادہ تر مصنوعی کھاد کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے، اس کا خاص مرکز ورجینیا کی ریاست ہے اس لئے ورجینیا کا تمباکو دنیا بھر میں مشہور ہے۔

آئیے اب ذرا تازہ پھلوں کا جائزہ لیں، انگور، سیب، ناشپاتی، سنترے، لیموں اور ہزاروں انواع و اقسام کے پھل بے شمار ہوتے ہیں۔ مغربی ساحلی علاقے میں بحر الکاہل کے کنارے یو، ایس، اے کی مشہور ریاست کیلی فورنیا ہے اس ریاست میں خاص بات یہ ہے کہ اس کی آب و ہوا بحر رومی ہے، یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہاں بارش سردیوں میں ہوتی ہے۔ آب و ہوا موافق ہونے کی وجہ سے اس ریاست میں ہزاروں طرح کے لذیذ خوش ذائقہ اور عمدہ پھل کروڑوں لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ انگور سے شراب بنتی ہے اور انگور کو خشک کر کے کشمش اور منقہ تیار کیا جاتا ہے۔ کیلی فورنیا سے ہزاروں پونڈ انگور، کشمش، منقہ، سیب، آڑو، سنترے، لیموں اور دوسرے پھل، مشرقی شہروں میں اور باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

بحر الکاہل کے ساحل پر مچھلی بھی بہت پکڑی جاتی ہے۔

یو، ایس، اے (زراعت)

۱	چاول کا خطہ
۲	کپاس کا خطہ
۳	مکا اور گیہوں کا خطہ
۴	مکا کا خطہ
۵	مویشیوں کا خطہ
۶	گیہوں کا خطہ
۷	سبزی اور رسیلے پھل کا خطہ
۸	تمباکو کا خطہ
۹	بھیڑوں کا خطہ
۱۰	پھلوں کا خطہ

الاسکا جو شمالی مشرقی کینیڈا کا ایک حصہ ہے۔ یو، ایس، اے کا ایک علاقہ ہے اور مچھلیوں کے لئے بہت مشہور ہے۔ یو ایس، اے میں کئی طرح کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں کے جنگلات بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ راکی پہاڑ کے مشرقی اور مغربی دونوں ڈھلوان جنگل سے ڈھکے ہوئے ہیں جس کی لکڑیاں بڑے بڑے کارخانوں میں ہزاروں چیزیں بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، بحرالکاہل کے ساحل پر واشنگٹن کی ریاست میں ایک قدرتی پارک ہے جس کا نام یلو اسٹون نیشنل پارک ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یہاں بجز گھاس اور جھاڑیوں کی کاٹ چھانٹ کے کوئی چیز بھی مصنوعی نہیں ہے۔ اس پارک میں ہم مقابل ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے اور دوسرا گرم پانی کا۔ چنانچہ اگر آپ کبھی یو، ایس، اے جائیں اور ٹھنڈے اور گرم پانی کا لطف لینا چاہیں تو ان چشموں میں باری باری غسل کرکے تجربہ کیجئے۔ وہاں کی سبزی اور منظر بے حد حسین اور عجیب ہیں۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں ہالی وڈ ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں قدرتی سینری کا کیا کہنا ہے۔ اسی لئے یہاں کی فلم سازی کی صنعت دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہاں سے ہزاروں فلم تیار کرکے دنیا کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے اور اس طرح امریکہ کی بیرونی تجارت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے

بجلی بھی یو، ایس، اے میں خاصے بڑے پیمانے پر پیدا کی جاتی ہے۔ آبشار نیاگرا اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا قدرتی آبشار ہے اور اس سے کروڑوں کیلو واٹ بجلی کی طاقت حاصل کی جاتی ہے اور شمالی مشرقی شہروں میں استعمال ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مشرقی پلیٹو کے دامن میں جتنے شہر آباد ہیں ان کا الگ پاور ہاؤس ہے۔ راکی پہاڑ کے علاقے میں بھی کافی بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

آب پاشی کا بندوبست یو، ایس، اے کے بعض علاقوں میں اپنی آپ مثال ہے۔ آپ نے ٹینسی ویلی اتھارٹی کا نام سنا ہوگا۔ اس کا یہ نام دریائے ٹینسی سے لیا گیا ہے۔ ٹینسی ویلی اتھارٹی ایک ایسا منصوبہ ہے جس سے بیک وقت بجلی کی طاقت حاصل کی جاتی ہے آب پاشی ہوتی ہے سیلاب کی روک تھام کی جاتی ہے اور کروڑوں ایکڑ زمین پر نہایت عمدہ قسم کی کاشت کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ یہ اسکیم عمل میں آئی دریائے ٹنی سی ایک بہت ہی خطرناک دریا تھا۔ ہر سال اس کے بیسن میں ایک بہت بڑا سیلاب آتا تھا اور اس کی زد میں بہت سے گاؤں اور قصبے آکر بہہ جاتے تھے۔ علاوہ اس کے اس کی وادی میں قدرتی موسلادھار بارش اور سیلاب سے ہزاروں من زرخیز مٹی بہہ جاتی تھی اور زرخیز میدان دن بدن بنجر ہوتا جاتا تھا۔ کاشتکاری غیر یقینی تھی اور اس علاقے کے کسان جاہل، سست اور مفلوک الحال تھے۔ صدر روزویلٹ نے اپنے انجنیروں کی مدد سے اس بلا کو روکنے کی تدبیر کی اور عوام کا روپیہ خرچ کرکے دریائے ٹنی سی پر بہت سارے باندھ بندھوائے اور سارے کے سارے علاقے کو سیلاب کی بلا سے بچا لیا۔ آج اس علاقے کے کسان یو، ایس، اے میں سب سے زیادہ خوش حال اور روشن خیال ہیں۔

اسی طرح کیلی فورنیا کی وادی میں بھی آب پاشی کی بڑی بڑی اسکیمیں کام کر رہی ہیں، اور ان سے نہریں نکال کر سینچائی کا کام لیا جاتا ہے۔

الغرض امریکہ میں قدرتی ذرائع اور وسیلے افراط ہیں، اور امریکہ بیک وقت ان سب سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ علاوہ اس کے وہاں کے لوگ تعلیم یافتہ سائنس داں اور محنتی ہیں۔ یہاں بڑے بڑے سرمایہ دار ماہرین اور منظم بھی ہیں جو دن رات اپنے ملک کو نئی راہ پر لے جانے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں اور کروڑوں ڈالر صرف کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہاں کا ایک معمولی قلی روزانہ ۸۰ روپے کماتا ہے، اس کی ہمت دیکھئے کہ وہ ان روپیوں کو زمین میں دفن نہیں کرتا بلکہ روز کی روز آمدنی خرچ کرتا رہتا ہے چنانچہ امریکہ میں لوگ کہتے ہیں کہ روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے۔

امریکہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کام بھی شروع کرتا ہے اس میں پوری پوری مہارت حاصل کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ نئی نئی چیزوں کی ایجاد میں بھی لگا رہتا ہے۔ اس نے ایٹم بم ایجاد کیا، ٹیلی ویژن ایجاد کیا۔ اندرونی طور سے دل کی دھڑکن گھبرانا اور پریشانی کو معلوم کرنے والی مشین ایجاد کی۔ مصنوعی بارش کا طریقہ معلوم کیا اور ریگستان کو لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل کرنے کا ڈھنگ بتایا ان سب باتوں سے امریکہ کی ساکھ اور بھی قائم ہے۔

قدرتی ذرائع صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کے لحاظ سے وہ اس قدر مالا مال ہے کہ باوجود بے شمار خرچ کے اس کے پاس اربوں ڈالر ہر سال بچتا ہے اور اس کی دولت بڑھتی رہتی ہے، دولت مند ہوتا جاتا ہے، اسی لئے وہ ہر ملک کو ادھار دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور روس کے خلاف اپنے حلقۂ اثر کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

تہذیب کو کیونکر بچائیں؟

(بسلسلہ صفحہ ۱)

اس خیال کی ہمت کو چیلنج کرتا ہوں اور اس کے مقابلے میں اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں جو بہت پرانی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے) کہ خیال میں جنگ کے خوفناک ترین ہتھیاروں سے زیادہ طاقت ہے اور انسانوں کے معاملات کا آخری فیصلہ انسان کی قوت فکر ہی کر سکتی ہے نہ کہ وہ آلات جو اس فکر نے اختراع کئے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں امریکہ کے مشہور رسالے نیو ریپبلک نے اس حقیقت کو نہایت واضح طور پر بیان کیا تھا اور اس کے الفاظ اس قابل ہیں کہ انہیں اس موقع پر دہرایا جائے۔

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنیٰ آفرینی کرے یا مادے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے! کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے کا غذ پر روشنائی یا فضا میں خیال آفریں جملے بکھیرے جو جنگ کے شور و شغب میں طوطی کی آواز بن جائیں۔ یا ان امیدوں کا ملبہ پڑھے جو باسی ہوگئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل؟ پیادہ فوج کے دستے کے مقابلے میں ایک بقاو کی کیا حیثیت ہے؟ .... لیکن حقیقت یہی ہے کہ توپوں کے مقابلے میں آخری دلیل انسان کی قوت فکر ہی ہے۔ بندوق کا تصور انسان کے ذہن ہی میں پیدا ہوا تھا۔ فوجوں کی نظم و ترتیب اسی کا کارنامہ ہے۔ جنگی جہازوں کا وجود فزکس اور کیمسٹری کی ترقی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انسانوں ہی نے تخریب کا یہ حیرت انگیز مرقع تیار کیا ہے۔ جنہوں نے اس کا خواب دیکھا اس کو خیال کی قوت سے عملی شکل دی اور اس کو منظم کر دکھایا۔ لیکن اب یہ طاقت ان کے بس سے باہر ہوگئی ہے اور اس پر ایسی پوشیدہ قوتوں نے اپنا قبضہ کر لیا ہے جن کو انسان سمجھ نہیں پائے۔ اور وہ اسے اس وقت تک رام نہ کر سکیں گے۔ جب تک وہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ نہ کرلیں کہ ہمیں اس تخریب کے دیو کا سر کچلنا ہے اور ایک ایسے تمدن کی تنظیم کرنی ہے جو پوری طرح ان کے قابو میں ہوگا، اور کوئی مشین اس کے ساتھ غداری نہ کر سکے گی۔ ایک تلوار کے بنانے میں اتنی ہی قابلیت کی ضرورت ہے جتنی ایک ہل کے بنانے میں، لیکن تلوار پر ہل کو ترجیح دینے کے لئے انسانی قدروں کو زیادہ معقول سمجھ درکار ہے۔ یہ جانتے ہوئے ہم قوت فکر کو بے کار سمجھ کر چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ کتنی ہی کمزور اور ناپختہ ہو اس کے سوا اور کون سی قوت ہے جو جنگ کی حماقتوں اور مشتعل جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری زندگی کیسی غیر محفوظ بنیاد پر قائم ہے اور ہماری تہذیب اور تمدن کس قدر کم مایہ تنگ نظر اور غیر محتاط ہیں۔ لیکن ہم مستقبل کو اس طرح بہتر نہیں بنا سکتے کہ جہالت اور خوف کے اندھیرے میں پہلے سے زیادہ ٹھوکریں کھائیں۔ اگر ماضی میں ہمارا فکر بے بس اور ناکارہ رہا ہے تو ہم فکر کا دامن چھوڑ کر خود کو نہیں بچا سکتے۔ کیونکہ بد اعمالیوں اور غلط کاریوں کے نامبارک حلقے کو توڑنے کا محض ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اس پر برابر بے لاگ اور بے امان تنقید کرتے رہیں۔ دراصل جنگ کا گناہ اور ذمہ داری ان تمام لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی زندگی بے فکری کے ساتھ بسر کرتے رہے ہیں جنہوں نے کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو اپنی بے معنی مصروفیتوں میں اس طرح پھنسے رہے کہ انھیں دنیا کی کوئی فکر نہیں ہوئی۔ جو آگے بڑھتے ہوئے ڈرتے تھے انقلاب سے ڈرتے تھے .... ایک جھوٹے اور فریب دہ امن کے خواہاں تھے اور کبھی ایک معقول زندگی کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں ہوئے!"

یہ خیالات صرف امریکہ ہی پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر صادق آتے ہیں اور یہ آج بھی اتنے ہی برمحل ہیں جیسے ۱۹۱۵ء میں تھے۔ اگر ہم ان قدروں کو بدلنا چاہتے

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین
عبد اللطیف اعظمی

ہیں جو آج کل کی دنیا میں رائج ہوگئی ہیں اور اپنی قوم کے دل و دماغ میں سے وہ ناگوار اور نازیبا رجحانات خارج کرنا چاہتے ہیں جو انھیں مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں تو موجودہ صورت حال کے لئے ہمیں اپنی ذمہ داری کو خلوص دل سے قبول کرنا چاہیئے اور اس کی اصلاح کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ ممکن ہے ہمیں اس میں کامیابی ہو، ممکن ہے نہ ہو، لیکن کوئی شخص زندگی کے ساتھ پہلے سے شرطیں نہیں کر سکتا اور در اصل ایک پر خلوص کام کرنے والے کے لئے کسی نیک مقصد کے لئے کام کرنا کامیابی سے زیادہ اہم ہے اس لئے ہمیں بے جا انکسار اور یاس پرستی اور شکست کی ذہنیت کو ترک کرکے اس بات کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنی پوری قوت سے کام لے کر ایک اخلاقی اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جو اس سیاسی انقلاب سے بھی زیادہ ضروری ہے جو ابھی ہمارے ملک میں ہوا ہے۔

(باقی آئندہ)

نفسیات اور تجارت

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

بچہ بھوک سے بے چین ہوتا ہے تو روتا ہے اُسے خود اپنی اس کیفیت کا احساس نہیں ہے وہ صرف بے چینی سی محسوس کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ لیکن ہوشیار ماں سمجھ جاتی ہے کہ اس کے لال کو اس وقت بھوک ستا رہی ہے وہ فوراً دودھ سے اس کی بے چینی کا علاج کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں بچہ اپنے مطالبات کے پورا کرنے میں دوسرے کی امداد کا دست نگر ہوا۔ لیکن یہ کیفیت صرف بچوں ہی پر طاری نہیں ہوتی۔ بعض اوقات نوجوان اور مسن اصحاب بھی اپنے مقصد کا تعین کرنے میں قاصر رہتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے کپڑے پھٹ گئے ہیں اب تن پوشی کے لئے اُسے کپڑے خریدنے ہیں۔ بے شک کپڑے خریدنے کی خواہش اس کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہے۔ لیکن کون سا کپڑا اس ضرورت کو پورا کرنے کا کام دے گا۔ اس مسئلے میں اس کا نظریہ غیر واضح ہے (جہاں دیدہ اور تجربہ کار اشخاص اس کلیہ کے مستثنیات ہیں، کیونکہ وہ اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر ابتدا ہی سے کپڑے کا ذہنی خاکہ تیار کر لیتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا فیصلہ بھی پروپیگنڈے اور اشتہارات کا مرہون منت ضرور ہوتا ہے) لہٰذا وہ کپڑا بیچنے والوں کے پروپیگنڈے سے جو زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کسی دوست کی صلاح سے متاثر ہو کر ایک مخصوص کپڑا خرید سکتا ہے یا وہ رسائل کے اشتہارات یا دوکاندار کی چرب زبانی سے مرعوب ہو کر کسی خاص کپڑے کے لئے اپنی رائے دے سکتا ہے۔ بہر صورت اس خرید و فروخت میں پروپیگنڈے کا دخل کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوگا۔ نفسیات انسان کی اسی غیر متعین اور مبہم ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر فن پروپیگنڈا کو تجارت میں استعمال کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تاریخ اشاعت:- یکم ۸، ۱۶، ۲۲
چندہ سالانہ للعہ ششماہی للعہ
دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی
طابع و ناشر - عبد اللطیف اعظمی دہلی لے جامعہ

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد۲ نمبر۲۳ | ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

تہذیب کو کیوں کر بچائیں

(۲)

اس جد و جہد میں ہمارے پاس ایک بہت بڑی دولت ہے۔ مہاتما گاندھی کا کام، ان کی یاد اور ان کی روشنی کی رہ نمائی...... گاندھی جی نے ہمیں ایک نیا راستہ دکھایا تھا اور انھوں نے ہمارے لئے اخلاقی اور روحانی قدروں اور عمل دانش مندی کی ایک بیش بہا دولت چھوڑی ہے۔ انھوں نے ان دیواروں کو توڑا جو عوام اور خواص لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں اور باقی لوگوں کے بیچ میں حائل تھیں اور اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چل کر عوام اور خواص دونوں میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کریں کہ ان دو مختلف لفظوں کا استعمال بھی بڑی حد تک غیر ضروری ہو جائے۔

اس جد و جہد میں ہمارے پاس ایک ایک بہت بڑی دولت ہے مہاتما گاندھی کا کام، اُن کی یاد، اور ان کی روشنی کی رہ نمائی۔ میں محض رسمی طور پر یا آج کل کے رواج کی پابندی کی خاطر اس موقع پر گاندھی جی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس وجہ سے کہ تا ہوں کہ ان کی شخصیت میں ہمیں موجودہ صورت حال کو سمجھنے اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے بڑی واضح ہدایت ملی ہے۔ انھوں نے ہماری تاریخ میں دو بڑے بڑے کام کئے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور مربوط بھی۔ ایک طرف تو انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد کی اور ایسی شان دار عدم تشدد کی جنگ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، اور انھیں اپنی زندگی ہی میں اس کی کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ بجائے خود ایک ایسا کارنامہ تھا۔ چالیس کروڑ بندگان خدا کو آزاد کرانا اس کی وجہ سے تاریخ کے ایوان میں ان کے لئے ایک بلند مقام محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن در اصل وہ ایک سیاسی لیڈر سے بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک مصلح، ایک معلم، ایک نئے پیغام کی آواز بھی تھے اور انھیں لوگوں کے ذہنی اور داخلی انقلاب کی بھی اتنی ہی فکر تھی جتنی سیاسی انقلاب کی، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سیاسی انقلاب بھی اسی وجہ سے چاہتے تھے کہ اس کے بغیر سماجی اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سیاسی آزادی کے بغیر ہندوستان اپنی مخصوص اور بہترین تہذیبی، اخلاقی اور روحانی روایتوں کے مطابق زندگی کی تشکیل نہیں کرسکتا اس لئے ان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نہ صرف آزاد ہو بلکہ اس آزادی کا اہل ثابت ہو۔ اس دوسرے اور زیادہ بڑے کام میں انھیں مقابلۃً محدود کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ایک حیرت انگیز حد تک سیاسی جنگ کو تشدد اور نسلی نفرت کی آلودگی سے پاک رکھا اور در اصل تعجب کی بات یہ نہیں کہ کبھی کبھی لوگ اس بلند معیار سے نیچے گر گئے جو گاندھی جی نے ان کے سامنے رکھا تھا بلکہ یہ تعجب کی بات ہے کہ اس قدر کم ایسا ہوا! لیکن لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے جہاد میں ان کی کامیابی دو وجہوں سے محدود رہی۔ جب کوئی قوم جنگ آزادی میں مصروف ہوتی ہے تو لوگوں کی توجہ زیادہ تر اس کے سیاسی رُخ پر لگی رہتی ہے اور یہی صورت حال ہندوستان میں تھی۔ اس دوران میں اخلاقی قدروں کی علم برداری تو زیادہ تر گاندھی جی اور ان کے ایک چھوٹے سے ایک مخصوص حلقے کے حصے میں تھی، اس لئے عام لوگوں کو زیادہ تر سیاسی ستیاگرہ کی، مل جل کر احتجاج کرنے، قانون توڑنے اور بہادری کے ساتھ اس کی سزا بھگتنے کی تربیت ملی۔ یہ چیزیں سیاسی جد و جہد کے ہنگامے میں بہت مفید اور ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن جب آزادی کے بعد قوم کے سماجی نظام کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو یہ مقابلۃً کم ضروری اور کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اس منزل پر پہنچ کر کامیابی کے لئے ضبط کے ساتھ اور مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے، خود اپنے بنائے قانون کا احترام کرنے کی ضرورت ہے معاملات میں رواداری اور باہمی لین دین کی ضرورت ہے اور ذاتی فائدے کے مقابلے میں اجتماعی فائدے کو مقدم رکھنے کی

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
تہذیب کو کیوں کر بچائیں ؟	خواجہ غلام السیدین	۱
چین کی خانہ جنگی کا آخری دور	(اداریہ)	۳
دنیا کی رفتار:-		
ہندوستان	ع ، ح	۴
۲- باہر کی دنیا	ا ، س - ع ، ل	۴
بزم بے تکلف	...	۵
اور وقت نے کہا (نظم)	باقر رضوی	۵
کرشن چندر کی کہانی	خواجہ احمد عباس	۶
فائوسٹ اور اقبال	یحییٰ ممی	۷
نفسیات اور تجارت	خواجہ جلیل احمد	۹

قیمت فی پرچہ ۳

ضرورت ہے یہ صفات مختلف تعلیمی اور سماجی اداروں کے ارادی اور غیر ارادی اثرات کی مدد سے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اگر ہندوستان کی آزادی کا مطلع فرقہ وارانہ فساد، خوں ریزی اور نفرت کی وجہ سے مکدر نہ ہوا ہوتا تو لوگ آزادی کے نئے دور میں ایک خاص امنگ اور تعمیر کا حوصلہ لے کر داخل ہوتے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے ہی دن سے ملک کو فرقہ وارانہ فسادات، شرنارتھیوں کی مصیبتوں، قانون کی خلاف ورزیوں اور اقتصادی نظام کی ابتری سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے خود آزادی کم سے کم عارضی طور پر خطرے میں پڑ گئی اور تمام آفتوں نے لوگوں کے خون سے اس نئی آزادی کی یاد تک بھلا دی۔ اگر گاندھی جی کچھ اور زندہ رہ جاتے تو وہ اپنی حیات بخش اور پختہ کار شخصیت کی پوری طاقت اس مقصد کے لئے استعمال کرتے اور ان کی محبت، دانش مندی اور روحانی فیض کی بدولت ہماری قومی زندگی میں سے زہر کا اثر زائل ہو جاتا اور ہماری قوم کی روحانی صحت خطرے میں نہ پڑتی۔ لیکن یہ نعمت ہماری قسمت میں نہ تھی۔ تاہم داراگست کے بعد جب چند مہینے تک ان کی روشنی ہمارے ملک کو منور کرتی رہی تو ان ہی کی ذات تھی جو ہمارے اور اس ہیجان، انتشار اور شر کے بیچ میں ایک دیوار بن کر حائل ہوگئی تھی جو ہندوستان اور پاکستان میں پلیگ کی طرح پھیل گیا تھا۔ یہ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ اگر گاندھی جی اس وقت اس آگ میں نہ کود پڑتے اور امن اور شرافت کی خاطر اپنی جان کی بازی نہ لگا دیتے تو صرف مسلمانوں کی اقلیت ہی کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان اور اس کی بہترین قدروں اور آدرشوں کا کیا حشر ہوتا جس وقت سارا ہندوستان آزادی کا جشن منا رہا تھا (جس حد تک بھی ان حالات میں لوگ ایسا کر سکتے تھے)، تو خدا کا یہ ناتوان بندہ، یہ سالک راہ، بنگال کے گاؤں گاؤں مارا پھر رہا تھا کہ فرقہ وارانہ فساد کی آگ کو بجھائے، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ ملک کے ایک ایک گھر اور ایک ایک جھونپڑی میں اور لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اس جنگ کو جاری رکھنا اور اس میں فتح حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کم از کم اتنا تو کیا کہ عارضی طور پر اس جنون کے سیلاب کو روک دیا اور قوم کو سانس لینے کی اتنی مہلت مل گئی کہ وہ اپنی روحانی قوتوں کو مجتمع کر سکے جس طرح ایک سانس اکھڑے مریض کو آکسیجن سے کر اتنی مہلت مل جاتی ہے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے ایک اور جد و جہد کر سکے۔

ایک دوسرا نفسیاتی سبب بھی تھا جس کی وجہ سے انھیں اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ہم لوگوں میں ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو آزادی کی حفاظت اور قیام کے لئے ضروری ہیں تو یہ ایسی حالت میں اچھی طرح نہیں ہو سکتا جب وہ سیاسی غلامی کی منزل میں ہوں۔ بے شک ان کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے اور شاید کچھ تھوڑے لوگوں میں وہ پیدا بھی ہو جائیں، لیکن عام لوگوں میں آزادی کی صفات اور ذہنیت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انھیں آزادی کی فضا میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ لہٰذا یہ توقع کرنا غلط ہے کہ چالیس کروڑ لوگوں کو آزاد اور جمہوری اداروں کا عملی تجربہ حاصل کئے بغیر آزادی اور جمہوریت کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اب وہ وقت ہے کہ ہم وہ تجربہ حاصل کریں۔ اگر آزادی نارمل حالات میں حاصل ہوتی تو ہم سہولت کے ساتھ یہ تجربہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن موجودہ حالات میں ہم لوگوں کی ذمہ داری جو استاد اور معلم اور ذہنی قیادت کا کام کرنے والے ہیں بہت [illegible] کٹھن ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس صورت حال پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کریں اور یہ طے کریں کہ بد دیانتی اور انتشار کی جو قوتیں زور پکڑ رہی ہیں ان کو روکنے کے لئے اور ملک میں دیانت داری اور باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لئے ہم کیا تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے ہمیں ایک معیار اسے دکھایا تھا اور انھوں نے ہمارے لئے اخلاقی اور روحانی قدروں اور عملی دانش مندی کی ایک بیش بہا دولت چھوڑی ہے۔ انھوں نے ان دیواروں کو توڑا جو عوام اور خواص لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں اور باقی لوگوں کے بیچ میں حائل تھیں۔ اور اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چل کر عوام اور خواص دونوں میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کریں کہ ان دو مختلف لفظوں کا استعمال بھی بڑی حد تک غیر ضروری ہو جائے۔

میں اس وقت ان بحثوں کا جو آپ کریں گے پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ مسئلے کی جو تصویر میرے ذہن میں ہے اسے آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ میرے خیال میں اس کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ ہمیں مصمم ارادے کے ساتھ اور منظم طور پر تنگ نظری، تعصب اور مذہبی جنون کے مختلف رجحانات سے لڑنا ہے جنھوں نے ہماری تخلیقی قوتوں کو شل کر دیا ہے گو ہماری سماج پر ایسے دور گذرے ہیں جب معاشرتی امتیازات اور ناانصافیوں کا زور تھا مگر مجموعی طور پر ہمارے ہاں انسانیت اور رواداری کی کمی نہیں رہی اپنی تاریخ کے بہترین زمانوں میں ہم نے ان فلسفیانہ اور مذہبی خیالات کو جو مختلف ملکوں سے آئے بدیسی سمجھ کر رد نہیں کیا بلکہ ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بنا لیا۔ اور جب کبھی ہم نے ان صحت مند روایات کو ترک کر دیا تو ہم تنزل اور پستی کے گڑھے میں گر گئے ہمارے بڑے بڑے اہل قلم اور اہل فکر۔ گاندھی، ٹیگور، اقبال، رادھا کرشنن نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی عظمت اور ترقی کا زمانہ وہی تھا جب اس نے اپنے دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھے اور اس کا تنزل اسی وقت سے شروع ہوا جب اس نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر نئے تہذیبی عناصر اور رجحانات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر یہ اصول پہلے صحیح تھا تو آج کل جب زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور سائنس اور صنعت نے ساری دنیا کے لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے، اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے ہر تحریک جو تفریق اور تعصب پر زور دیتی ہے خواہ وہ فرقہ پرستی ہو یا صوبہ پرستی، ہندوستان کی حقیقی تہذیبی روح کے منافی ہے اور اس سے ہماری سیاسی اور اخلاقی قوت کے گھٹنے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں اپنے اسکولوں اور کالجوں اور تہذیبی اور تبلیغی اداروں کے ذریعے سے اس بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ تہذیبی اور مذہبی اختلافات ہماری بنیادی قومی وحدت کو برباد نہ کریں۔ بجائے خود ان چیزوں میں برائی نہیں۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ [illegible] کو اپنے صوبے سے، اپنے مذہب سے [illegible] محبت ہو، لیکن سچی محبت کا دائرہ تنگ نہیں بلکہ بہت وسیع ہوتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان چیزوں کی محبت قومی وحدت یا انسانی وحدت کے وسیع تر مقاصد کی راہ میں حائل ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ایک محدود اور قریب کے مقصد کی لگن آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے اور لوگوں کو مشترک تعصبات اور اختلافات کی بنیاد پر جلد متحد کیا جا سکتا ہے لیکن معلم کا تو کام ہی یہ ہے کہ تنگ تصورات کی جگہ وسیع تصورات، اور قریب کے مقصد کی جگہ دور کے مقصد کی تلقین کرے اور غلط راہ لے جانے کی بجائے خواہ وہ کتنی ہی سہل اور دل کش کیوں نہ ہو کٹھن اور دشوار لیکن صحیح راہ دکھائے۔ معلم میں اور معمولی سیاسی مبلغوں میں یہی فرق ہے۔ وہ لوگوں کے تعصبات اور اندھے جوش سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا کام اسی طرح بنتا ہے کہ لوگ جو بات کہتے ہوں اسی کو اور اونچی آواز میں کہیں مگر سچا معلم اور مفکر دھارے کے ساتھ بہنا اور عام تعصبات کی ہم نوائی کرنا ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ صحیح قدروں کی تلقین کرے۔ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے تاکہ ان پر اثر ڈال سکے، لیکن ان کی تعریف کی پروا نہیں کرتا۔ اس میں دھارے کے خلاف تیرنے کی ہمت ہوتی ہے یا ہونی چاہئے اگر ہم اپنے اندر ایک سچے معلم کی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں تو سارے نفسیاتی وسائل سے جو ہمیں میسر آسکیں، ہمیں اپنے نوجوانوں میں روشن خیالی، وسعت نظر اور رواداری پیدا کرنی چاہئے۔ میں بہت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ اگر ہم مضبوطی کے ساتھ اس چیز کی جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں حمایت کرنے اور اس چیز کی جسے غلط سمجھتے ہیں مخالفت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو ہم ہرگز معلمی منصب کے لائق نہیں ہیں۔

دوسرا مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہماری شہری زندگی کا عام معیار گر رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری پبلک لائف میں رشوت ستانی، عزیز نوازی اور بد دیانتی کا زور ہے، ہماری کارکردگی گھٹ گئی ہے، ہم میں ضبط اور تعاون کی صلاحیت نہیں۔ ان سب چیزوں کے خلاف ہمارے لیڈر بار بار احتجاج کر چکے ہیں۔ میں اتنا سادہ دل نہیں ہوں کہ ان سب بیماریوں کو جن کی جڑیں ہمارے سماجی اور معاشی ماحول میں ہیں، واحد علاج تعلیم اور تلقین کو سمجھوں۔ لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایک مکمل سماجی اور معاشی نظام بھی

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

چین کی خانہ جنگی کا آخری دور

چین میں کومن تانگ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کی خوں ریز لڑائی جو ۲۳ سال سے جاری تھی کومن تانگ کی کامل شکست پر ختم ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ کومن تانگ کی حکومت جو اب تک چار راج دھانیاں بدل چکی ہو اب چوتھی راج دھانی چنگ کو چھوڑ کر جزیرہ فارموسا میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس کے قائم مقام صدر جنرل لی امریکا گئے ہیں تاکہ پھر ایک بار امریکی حکومت سے سامان جنگ اور مالی امداد کے لئے درخواست کریں اور خیال ہے کہ چیانگ کائی شیک جنھوں نے مصلحتاً صدارت کے عہدے سے چھٹی لے لی تھی، پھر سے صدر کے فرائض سنبھال لیں گے۔ ظاہر ہے کہ کومن تانگ حکومت کا بر اعظم سے بھاگ کر ایک جزیرے میں پناہ لینا گویا قطعی شکست کا اعتراف ہے غالباً اس کے بعد وہ متفرق فوجیں جو جنوب کے دو صوبوں میں اور شمال مغرب میں کومن تانگ کی طرف سے لڑ رہی تھیں ہمت ہار بیٹھیں گی اور ہتھیار ڈال دیں گی۔ اب چیانگ کائی شیک کو لے دے کے یہ امید رہ گئی ہے کہ انھیں امریکہ سے اتنی مدد مل جائے جس کے سہارے وہ اچھے دنوں کے انتظار میں فارموسا میں قدم جمائے رہیں۔ بظاہر امریکا سے مدد ملنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ پھر بھی چونکہ چیانگ کائی شیک کے پاس کافی سونا اور تھوڑی بہت بحری اور ہوائی قوت ہے اس لئے شاید وہ ایک مدت تک فارموسا میں رہ سکیں۔ لیکن ان کا بحری اور ہوائی بیڑہ بھی بہت سی خشکی کی فوجوں کی طرح ان کو چھوڑ کر کمیونسٹوں سے جا ملا تو انھیں فارموسا سے بھی بھاگنا پڑے گا اور اپنے بے ملک کی حکومت کسی غیر ملک مثلاً جزائر فلپین میں لے جانی پڑے گی۔

چین کی خانہ جنگی ایشیا کے دوسرے ملکوں کے لئے باعث عبرت ہے۔ موجودہ صدی کی دوسری چوتھائی میں چین کے عوام نے ملک کی استبدادی حکومت اور ملکی سامراجی نظام سے تنگ آ چکے تھے کومن تانگ (نیشنلسٹ پارٹی) ڈاکٹر سن یات سین کی رہنمائی میں جمہوری انقلاب اور کنگ چن تانگ (کمیونسٹ پارٹی) سوشلسٹ انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں ان دونوں نے متحد ہو کر کمیونسٹوں کی مدد اور مشورے سے انقلابی قوتوں کی نئی تنظیم کی۔ تین سال کی کشمکش کے بعد پیکنگ کی استبدادی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور جمہوریہ چین کی بنا ڈالی۔ مگر اسی چیانگ کائی شیک نے جو کومن تانگ کے داہنے بازو کا لیڈر تھا بائیں بازو کے خلاف بغاوت کر کے نانکنگ میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی اور کمیونسٹوں اور دوسرے انتہا پسندوں کو بے دردی سے کچلنا شروع کیا۔ کومن تانگ کے بائیں بازو سے تو بہت جلد اس کی مصالحت ہو گئی مگر کمیونسٹ پارٹی کے وجود کو وہ کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کچھ عرصے تک جنوبی چین میں کومن تانگ سے چھاپہ مار لڑائی لڑتی رہی۔ اس کے بعد اس نے جنوب سے ہجرت کر کے شمال مغربی چین کے ایک چھوٹے سے علاقے میں جس کی سرحد سوویٹ روس سے ملتی تھی اپنی ایک جداگانہ حکومت قائم کر لی اور اپنے افسروں کو روس میں فوجی ٹریننگ دلا کر ایک مضبوط فوج تیار کرنا شروع کی۔

اب چیانگ کائی شیک نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا کہ کمیونسٹوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں بجائے اس کے کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی قوت ملک کے اہم معاشی مسائل، قحط، افلاس، بے روزگاری بھوک کے حل کرنے میں صرف کرتے، انھوں نے سارا زور چینی کمیونسٹوں کی چھوٹی سی ریاست کو مٹانے کی کوشش میں لگا دیا۔ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر جاپانیوں نے منچوریہ پر حملہ کر دیا۔ کمیونسٹوں نے یہ پیش کش کی کہ مشترک بیرونی دشمن سے لڑنے کے لئے وہ کومن تانگ سے تعاون کرنے کو تیار ہیں مگر چیانگ کائی شیک نے ان کو جاپانیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے ان سے نبٹ لیں پھر جاپانیوں کو دیکھ لیں گے۔ کئی سال تک چین کی صورت حال یہ رہی کہ جاپانی فوجیں نئے نئے علاقوں پر قبضہ کرتی جاتی تھیں اور کومن تانگ کی فوجیں ان سے لڑنے کے بجائے کمیونسٹوں سے لڑ رہی تھیں۔ خود چیانگ کائی شیک کے بہت سے ساتھی اس پالیسی کے خلاف تھے۔ مگر چیانگ کی زبردست شخصیت کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ آخر جب جاپانی بالکل سر پر پہنچ گئے اور کومن تانگ کی حکومت کو بھاگ کر چنگ کنگ میں پناہ لینی پڑی تو چیانگ کے رفیقوں نے انھیں زبردستی اس پر آمادہ کیا کہ کمیونسٹوں سے صلح کریں اور ایک متحدہ قومی محاذ بنا کر جاپانیوں سے لڑیں۔ مگر پھر بھی انھوں نے اپنی بہترین فوج کو جو جدید ترین امریکی سلاح جنگ سے مسلح تھی۔ جاپانیوں کے مقابلے میں بھیجنے کے بجائے شمال مغرب میں رکھا تاکہ کمیونسٹوں کی نگرانی کرتی رہے۔ اُدھر کمیونسٹ اندرونی خطروں کی پرواہ نہ کر کے بڑی بے جگری سے جاپانیوں سے لڑتے رہے اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کومن تانگ سے زیادہ محب وطن ہیں، پھر کومن تانگ امریکی مدد سے کرامریکہ کی نیاز مندبن گئی اور کمیونسٹوں نے روس سے دوستی کے باوجود اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں لی اور اُسے اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا اسی وقت سے چین میں کومن تانگ کے مقابلے میں کمیونسٹوں کو زیادہ ہر دل عزیزی حاصل ہونے لگی۔ اس کے بعد جیسے جیسے نیشنلسٹ چین میں معاشی ابتری بڑھتی رہی عوام کمیونسٹوں کی طرف اور زیادہ مائل ہوتے گئے۔ جاپان کی شکست کے بعد کمیونسٹوں کو منچوریہ میں بہت سا سامان جنگ ہاتھ آ گیا اور ان کی قوت بہت بڑھ گئی۔ مگر چیانگ کائی شیک نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور اسی زعم میں رہے کہ کمیونسٹوں کو مٹا کر رہیں گے۔ ان کے بہت سے ساتھی چاہتے تھے کہ کمیونسٹوں سے صلح کر لی جائے اور کمیونسٹ بھی ابتدا میں اس پر آمادہ تھے مگر چین کا سرمایہ اور جاگیردار طبقہ جو کومن تانگ پر حاوی ہو گیا تھا۔ چیانگ کی زبان سے برابر انکار کرتا رہا۔ نیشنلسٹ چین کی معاشی حالت روز بروز بگڑتی گئی عوام میں شورش اور بغاوت بڑھتی رہی اور خود کومن تانگ کی فوجیں اس کا ساتھ چھوڑ کر کمیونسٹوں سے ملتی رہیں۔

یہ ہے ایک سرسری جائزہ واقعات کے اس سلسلے کا جس کا انجام ہم دیکھ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے چین میں خانہ جنگی اکثر جگہ ختم ہونے پر آتی ہے اور قومی وحدت کے آثار نظر آنے لگے ہیں لیکن اس وقت جب ملک کی تھوڑی بہت صنعت ہی نہیں بلکہ تجارت اور زراعت بھی تباہ ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے علاقے فقر و فاقے کا شکار ہیں اور جا بجا بد امنی اور لوٹ مار کا دور دورہ ہے۔ نئی حکومت کمیونسٹ ہونے کے باوجود روس کی ابتدائی غلطیوں سے بچ کر احتیاط اور سلامت روی سے قدم اٹھا رہی ہے اور امید ہے کہ بہت جلد ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھال لے گی۔ پھر بھی اُسے ملک کی معاشی زندگی کے معیار کو ہندوستان جیسے ملک کی سطح تک پہنچانے کے لئے بھی برسوں کی کوشش اور محنت درکار ہے۔ اس لئے اس کے نادان دوستوں اور دشمنوں کا یہ پروپاگنڈا بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ برما انڈو چائنا ہندوستان یا پاکستان پر محض تبلیغی جہاد کے لئے حملہ کرے گی۔ موجودہ حالت میں اس کا یہ قدم اٹھانا خودکشی سے کم نہیں ہوگا اور جو حقیقت بینی اور مصلحت اندیشی اس نے اب تک دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقدام خودکشی کی ہرگز مرتکب نہیں ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی حکومت چین کی نئی حکومت کو جلد سے جلد تسلیم کرنے پر تیار ہے۔ برطانیہ کا ارادہ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ صرف امریکہ اب تک حیص بیص میں ہے۔ لیکن واقعات کی منطق اتنی زبردست ہوتی ہے کہ دیر سویر سب اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ◆

ہندوستان — دنیا کی رفتار — باہر کی دنیا

ہندوستان

مردم شماری اور انتخابات

معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری ۱۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو ہو گی۔ اس کی بنا پر یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی پارلیمنٹ اور صوبوں کی کونسلوں کے نئے انتخابات کہیں اپریل ۱۹۵۱ء میں ہو سکیں گے۔ اس لئے کہ مردم شماری سے کئی مہینے پہلے ایک بہت بڑا عملہ اس کام میں لگا رہے گا اور انتخابات کے لئے مزید عملے کا رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں حکومت کو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ انتخابات اکتوبر یا نومبر ۱۹۵۰ء میں ہو جائیں تاکہ جو نئی حکومت بنے وہ ۱۹۵۱ء کا بجٹ خود تیار کرے یا کم از کم اس میں اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کر سکے۔ اس طرح آئندہ کے لئے ایک اچھی مثال قائم ہو جائے گی اور معمولی حالات میں ہر نئی حکومت اپنا آئندہ سال کا بجٹ خود بنایا کرے گی۔

ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات

یہ دیکھ کر کہ چندر نگر کی رائے شماری کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں نکلا فرانسیسی حکومت اپنے بقیہ مقبوضات میں جو ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہیں رائے شماری کرانے میں کچھ زیادہ مستعدی نہیں دکھا رہی ہے۔ پہلے رائے شماری کی تاریخ ۱۱ دسمبر مقرر ہوئی تھی مگر وہ ملتوی کر دی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہند اور فرانس کی حکومتوں میں رائے شماری کے انتظامات کے بارے میں بھی اختلاف تھا۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ رائے شماری مارچ ۱۹۵۰ء میں ہو گی اور جہاں تک اس کے انتظام کا تعلق ہے بہت سے امور دونوں حکومتوں کے اتفاق رائے سے طے ہو گئے ہیں۔ خصوصاً نگرانی کا مسئلہ جس پر سب سے زیادہ جھگڑا تھا۔ اب یہ تجویز ہے کہ بارہ نگراں دونوں کے مشورے سے مقرر کئے جائیں گے جن میں سے چار ایشیائی ملکوں کے ہوں گے کچھ تھوڑا سا اختلاف اب بھی باقی ہے مگر امید ہے کہ وہ بھی بہت جلد دور ہو جائے گا اور رائے شماری کے مزید التوا کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔

ذرا صبر سے کام لیجئے

جب سے حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ مدراس کے بارہ ضلعوں کو الگ کر کے اندھرا کا صوبہ بنایا جائے گا لسانی صوبوں کی تحریک بہت زور پکڑ گئی ہے۔ بمبئی کے کنڑی بولنے والے علاقے کے لوگوں کو جو اپنا کرناٹک کا صوبہ الگ بنانا چاہتے ہیں اتنا جوش آ گیا کہ انھوں نے عملی احتجاج شروع کر دیا چنانچہ ان کے پندرہ نمائندوں نے بمبئی کی آئین ساز کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور مرکزی پارلیمنٹ کے دس ممبروں پر بمبئی کے وزیر شری پاٹل اور حکومت مدراس کے وزیر شری ڈاکٹر سبھی زور ڈالا جا رہا ہے کہ استعفا دے دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کرناٹک کا صوبہ بننے کی تجویز انتظامی اور مالی حیثیت سے قابل عمل اسی وقت ہو سکتی ہے جب میسور کی ریاست بھی اس میں شامل ہو اور جہاں تک اندازہ کیا گیا ہے میسور کے لوگ اس پر راضی نہیں ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ کرناٹک کے صوبے کا مطالبہ کرنے والے اہل میسور کو اپنا ہم خیال بنائیں آخر اس قسم کے احتجاج کا جو یہ حضرات کر رہے ہیں مقصد کیا ہے؟ یہی نہ کہ حکومت کرناٹک الگ صوبہ بنانا منظور کر لے؟ یہ مقصد پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے اس لئے کہ کانگریس کی بنائی ہوئی لسانی صوبوں کی سب کمیٹی بھی اور حکومت ہند بھی اس اصول کو منظور کر چکی ہے کہ ہر بڑا علاقہ جس میں ایک زبان بولنے والے بستے ہیں الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ مگر اس کی ضروری شرط یہ ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ پہلے ان صوبوں کے معقول اور مناسب نقشے بنا لئے جائیں اور ان کی حد بندی کے سلسلے میں موجودہ صوبوں میں جو جھگڑے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے انھیں باہمی گفت و شنید سے طے کر لیا جائے۔ اندھرا کے لوگوں نے اسی شرط کو پورا کر دیا۔ انھوں نے حد بندی کے [illegible] معاملے میں تامل ناد کے لوگوں سے سمجھوتا کر لیا اور مدراس کا شہر جھگڑے کا باعث [illegible] ہو گئے۔ جو لوگ ان کی ریس میں الگ صوبے مانگ رہے ہیں انھیں اس معاملے میں بھی ان کی تقلید کرنی چاہئے کہ صبر و تحمل کے ساتھ عملی دقتوں کو جو ان کی راہ میں حائل ہیں دور کرنے کی تدبیریں کریں کہ دقتیں احتجاج اور استعفوں سے حل نہیں ہو سکتیں۔

باہر کی دنیا

چین کی نئی راجدھانی

سال بھر میں پانچویں مرتبہ دار السلطنت بدل کر چیانگ کی "قومی" حکومت اب چین کی سرزمین سے باہر فارموسا میں پناہ گزیں ہو گئی ہے۔ اور اب وہاں سے لڑائی جاری رکھے گی۔ ایک اندازے کے مطابق قومی حکومت کی فوج میں تین چار لاکھ سپاہی باقی ہیں۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو ان کی مدد سے چین پر دوبارہ قبضہ کرنے کی امید دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن قومی حکومت نے فارموسا میں سمجھ سوچ کر پناہ لی ہے۔ فارموسا جاپان کے قبضہ میں تھا۔ اسے چین کے سپرد یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ صلح نامے میں اس کے باقاعدہ منتقل کر دیے جانے کا فیصلہ ہوگا۔ جاپان سے ابھی تک کوئی صلح نامہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے قانونی موشگافیوں کی گنجائش ہے۔ امریکہ کے بعض حلقے عرصے سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھ رہے ہیں لیکن اگر یہ اعلان کیا گیا کہ فارموسا چین کے زیر نگیں نہیں تو چیانگ کی قومی حکومت اس کے دفاع کے لئے فارموسا سے جنگ جاری نہ رکھ سکے گی۔ اس صورت میں فارموسا پر اگر کمیونسٹوں نے حملہ کیا تو اس کے دفاع کے لئے کوئی اور صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ امریکہ یا اور کوئی ملک ڈان کوکزاٹ بننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ خصوصاً اس لئے کہ چین میں چیانگ کا دوبارہ لا بٹھانا اب کسی کے بس میں نہیں ہے۔ جنرل لی امریکہ بظاہر چیانگ کی مرضی کے خلاف تشریف لے گئے ہیں۔ ممکن ہے اختلاف کی یہ نمائش اس امید پر مبنی ہو کہ امریکہ لی صاحب سے زیادہ امید ہو البتہ کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ ان کا مقصد تو بہر حال یہی ہے کہ فارموسا کی موجودہ غیر واضح قانونی حیثیت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

سرخ چین کا سیاسی محاذ

اس سلسلے میں ایک خبر سے بعض حلقوں میں بڑی پریشانی پھیل گئی ہے وہ خبر یہ تھی کہ مشرق بعید میں ایک اور کومن فارم بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اس نئے ادارے کے مقاصد میں ایک بات یہ ہے کہ کومن فارم پڑوس کے ملکوں کی جنگ آزادی میں زیادہ سے زیادہ مدد دے گا سرخ چین کی فوجیں ہند چینی کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اس لئے اس سے سب سے زیادہ اندیشہ فرانس کی جمہوری حکومت کو ہونا چاہئے۔ لیکن ہندوستان کے بعض اخبارات اس خبر پر بہت چراغ پا ہیں۔ بات محض اتنی سی ہے کہ کامن ویلتھ کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس کولمبو میں ہونے والی ہے اور جو ان گنت مشورے ہو چکے اور ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر سرخ چین کو ایک سیاسی محاذ بنانا ہوگا۔ ورنہ اتنی بات تو معمولی سمجھ کے آدمی کے دماغ میں آ جانی چاہئے کہ نئے چین کے سامنے جو تعمیری کام ہے وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ اسے پورا کرنے میں چین کو اپنی تمام صلاحیت اور ساری طاقت خرچ کر دینی ہوگی۔

"جمہوری ملکوں کی جمہوریت"

متحدہ اقوام کے جنرل اسمبلی نے کثرت رائے سے ایک تجویز پاس کی جو

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

بزمِ بے تکلف

حضرت دیوان غالب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ظاہر ہے کہ محشرِ خیال، محض دھوکہ دینے جانے کی ترکیب ہے مطلب دراصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ ایک بزمِ بے تکلف ہے۔ اکیلا بیٹھا ہو تب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے من کے اندر ایک انجمن سجی ہوئی ہو۔ ابھی پرسوں کا ذکر ہے ہم گھر رہ کر جنگل کی طرف نکل گئے جیسے تو مستیغر چوکی چھ واڑھی کی طرح کچھ یوں ہی سا تھا مگر سناٹا غضب کا تھا۔ انسان کا تو کیا ذکر ہے کوئی قیس تک نظر نہ آیا کہ ہم اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسکین دیتے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ہم نے سوچا خیر دو نہ سہی ایک ہی سہی ذرا بیٹھ کر تو دیکھیں کیسی گزرتی ہے ابھی تھوڑی ہی سی دیر میں صحرا نوردی کا مزا اچھی طرح چکھ چکے تھے۔ جوتے کی کیلیں ارسنیاں کا کام دے رہی تھیں۔ خیر ایک جگہ جھاڑی گھنی دیکھ کر جا بیٹھے اور عین خیالات میں ڈوبے غوطہ کھا رہے تھے ان میں بالکل ڈوب گئے۔ اب آپ مانیں یا نہ مانیں مگر ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے اندر ایک "میں" نہیں بلکہ کئی "میں" ہیں اور ان میں آپس میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ گفتگو لمبی تھی جو تھوڑی بہت یاد رہ گئی ہے آپ کو سناتے ہیں:-

ا۔ بھلے آدمی تجھے شرم نہیں آتی اپنا سارا وقت بے کار کھوتا ہے۔ جب دیکھو بیٹھا اونگھ رہا ہے یا گپ شپ کر رہا ہے۔

ب۔ کیا خوب! وہ بے چارہ مشاہدۂ نفس میں مصروف ہو تو تمہارے نزدیک اونگھنا ہوا۔ مبادا رہ خیال کرے تو گپ شپ ٹھہری۔

ج۔ اجی رہنے بھی دو بڑے روحانی رقند کی کا مریض بھلا کیا مشاہدۂ نفس کرے گا اجی مبادا رہ خیال کی بھی ایک ہی کہی۔ اس کے خیالات وہ کھیسے سکتے ہیں جنہیں کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ گھوم پھر کر اسی کے پاس آجاتے ہیں۔

د۔ میاں اصل بات یہ ہے کہ اس بے روزگاری کے زمانے میں بچارا کرے تو کیا کرے۔

ا۔ کرے یہ کہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ دوڑے دھوپے۔ روزگار نہ سہی اس کی تلاش ہی سہی۔ کچھ شغل تو ہو۔ بیٹھا مکھیاں تو نہ مارے۔

ب۔ افسوس اس زر پرست دنیا میں زر کی تلاش میں مارا مارا پھرنا بھی مفید شغل سمجھا جاتا ہے۔ مگر بیٹھ کر مکھیاں مارنا جس سے حفظانِ صحت میں مدد ملتی ہے بے شغلی کہلاتا ہے۔

ج۔ ارے تو یہ کوئی سچ مچ کی مکھیاں تھوڑی ہی مارتا ہے۔ خیالی مکڑی کا جالا بن کر خیالی مکھیوں کا شکار کرتا ہے۔

د۔ بھئی ذرا تو ترس کھاؤ اس بچارے پر جسے زمانے کی چکی نے پیس ڈالا ہے

ا۔ اس نالائق نکمے نکھٹو کو تم بچارا کہتے ہو۔ تہذیب کا آدمی مزدوری بھی کرتا تو پیٹ بھرنے کو مل جاتا۔ دوسروں کے لئے نہ سہی کم سے کم اپنے لئے تو کچھ کرے۔

ہم یہ بکواس سن کر دل ہی دل میں کھول رہے تھے۔ آخر ضبط نہ ہوا اور ہم نے بگڑ کر کہا۔ "ایسے نالائق نکمے نکھٹو کے لئے جیسے کہ ہم ہیں، ہم کیوں کچھ کریں؟ مانگنے دو بھیک۔ کرنے دو فاقے، ہماری جوتی سے!"

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ سنسان جنگل تھا اور ہم تھے۔

——— اور وقت نے کہا؟

باقر رضوی

غزلوں کے سنانے کا یہ ہنگام نہیں ہے
سوئی ہوئی مخلوق کو نعروں سے جگا دے
مینا کی نہ حاجت ہے نہ بادہ کی ضرورت
اب دمِ شمشیر سے اب پیاس بجھا دے
رکھ ساز سے مطلب، نہ ترنم سے علاقہ
جنگاہ میں تلوار کی جھنکار سنا دے
افسانۂ ماضی کو نہ کر یاد خدا را
اب حال کی دکھتی ہوئی باتوں سے مزا دے
"——— اگر اب بھی تو ………"
بوسوں پہ جو گائے تھے محبت کے ترانے
ہوں یاد اگر اب بھی تو للہ بھلا دے
آرائش و تزئین کا یہ وقت نہیں ہے
اب سر سے کفن باندھ لے ہتھیار سجا دے
غازہ نہ لگا چہرۂ تابندہ پہ زنہار
دنیا کے رخِ زرد کو گلنار بنا دے
سلجھائے گا اُلجھے ہوئے بالوں کو کہاں تک
اب دہر کی بگڑی ہوئی زلفوں کو بنا دے
اب شمعِ شبستاں نہ جلا بزمِ طرب میں
اس پر جو مصر ہوں انہیں محفل سے اٹھا دے
بے جستہ جو الفاظ ہیں حاجت نہیں ان کی
اب آتشِ الفاظ سے اک آگ لگا دے
ہے چہرۂ دنیا پہ گناہوں کا پسینہ
للہ اسے تیغ کے دامن کی ہوا دے
آتا ہی نیا دور بدل جائے گی دنیا
سونے دے امیروں کو غریبوں کو جگا دے

کرشن چندر کی کہانی

خواجہ احمد عباس

کرشن چندر نے سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ کشمیر کی سندر وادیوں سے لے کر بمبئی کی گندی چالوں تک اس کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ اس نے "ایکسٹرا گرل" کی کہانی لکھی ہے اور "کالو بھنگی" کی کہانی بھی۔ بنگال کے کال کی کہانی بھی اور "پانچ روپے کی آزادی" کی کہانی بھی ...... اس "غالیچہ" کی کہانی بھی جس پر جوانی نے شراب لنڈھائی ہے۔ اور اس "لال باغ" کی کہانی بھی جہاں انسان نے انسان کا خون گرایا۔ "پشاور ایکسپریس" کی بھیانک کہانی بھی۔ اور "پورے چاند کی رات" کی مدھر پریم بھری کہانی بھی ...... یہاں تک کہ جب وہ دنیا کی ہر چیز کی کہانی لکھ چکا تو اس نے "کہانی کی کہانی" بھی لکھ ڈالی ....

ہاں تو کرشن چندر نے اتنی بہت کہانیاں لکھی ہیں مگر اس کی کہانی اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ ویسے کہا جا سکتا ہے کہ کرشن کی ہر کہانی ایک ڈھب سے اس کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں ایک نیا جنم لیتا ہے اور جب اپنے بنائے ہوئے کیرکٹر کو مارتا ہے تو ساتھ میں خود بھی مر جاتا ہے۔ پھر اگلی کہانی میں پیدا ہوتا ہے۔ نت نئی کہانیاں لکھنا بھی تو آواگون کا ایک چکر ہے ....

کرشن چندر کی کہانی کسی نے نہیں لکھی۔ خود اس نے بھی ابھی نہیں لکھی اور نہ میں اس وقت یہ لمبی کہانی لکھنے بیٹھوں گا۔ مگر جو کوئی کرشن چندر سے ملا ہے اس نے یہ کہانی پڑھی "نہیں تو" دیکھی ضرور ہے۔ یہ کہانی قدرت نے کرشن کے چہرے پر برس کے ساتھ گہری ہوتی ہوئی لکیروں میں لکھدی ہے، اور میرا اپنا خیال ہے کہ یہ کہانی کرشن چندر کے قلم سے لکھی ہوئی سب کہانیوں سے زیادہ دلچسپ، رومانی اور ڈرامے سے بھری ہوئی ہے۔

پندرہ سولہ برس ہوئے جب کرشن نے لکھنا شروع کیا تو وہ کرشن چندر ایم اے کہلاتا تھا۔ بڑھیا سوٹ پہنا کرتا تھا اور ہر کتاب کے ساتھ اس کے خوب صورت چہرے کی تصویر ضرور ہوتی تھی جس کی چلبلی بڑی آنکھیں، کالے چمکدار بال اور گوری رنگت نے بہت سے دل موہ لئے۔ اب اس کے بال سوکھے سخت اور کھچڑی ہوچکے ہیں اور اُڑنے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں دنیا میں نہ جانے کیا کچھ دیکھ کر اندر کو دھنس گئی ہیں ان کے ارد گرد کالے حلقے پڑ گئے ہیں مگر عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے بھی وہ اسی طرح چمکتی ہیں۔ اس کے کبھی کے جوان اور ہشاش بشاش چہرے پر سوچ پریشانی محنت اور دوڑ دھوپ نے گہری لکیریں ڈال دی ہیں۔

کرشن چندر کی عمر ابھی ۳۶، ۳۷ برس ہی کی ہے۔ اسے لکھتے ہوئے مشکل سے سولہ برس ہوئے ہوں گے۔ مگر اس عرصے میں اس نے کوئی بیس کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی کہانیوں کا ترجمہ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دوسرے ملکوں کی کئی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ اس کے اردو ناول کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندی ایڈیشن نکل رہا ہے۔ کوئی اردو یا ہندی کا پرچہ ایسا نہیں جو کرشن کی کہانی چھاپنا اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتا ہو۔ مگر کرشن چندر ابھی تک "مہا لیکھک"، اور کیا "بڑا لیکھک" بھی نہیں بنا۔ اسے اپنے بڑے پن کا بالکل احساس نہیں ہے نہ اسے اپنی کہانیوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنے بچوں سے ...... مگر نہ وہ اپنے بچوں کے لاڈ کرتا ہے اور نہ اپنی کہانیوں کے۔ بچوں کی دیکھ بھال ان کی ماں کرتی ہے اور کہانیوں کے لاڈ پیار ان کے پڑھنے والے۔ خود کرشن کی زبان سے اس کی کہانیوں کی تعریف میں آپ کبھی ایک لفظ نہ سنیں گے، وہ ابھی تک اپنی تخلیقوں سے پورے طور سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لئے اس کی تحریر میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا اور اس کا آرٹ ابھی تک پروان چڑھ رہا ہے۔

کرشن چندر ایک مشہور ادیب ہونے کے باوجود ہمارا آپ جیسا انسان ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے ہیں۔ جرنلسٹ رہا ہے۔ ایڈیٹری کی ہے۔ کالج کے لڑکوں کو پڑھایا ہے۔ ریڈیو کی نوکری کی ہے۔ فلم کے لئے مکالمے لکھے ہیں۔ خود ڈائرکٹ کیا ہے۔ بیکاری اور غریبی کے مزے چکھے ہیں۔ پریم بھی کیا ہے اور شادی بھی۔ دل لگایا بھی ہے اور توڑا بھی ہے اور جوڑا بھی۔ انقلابیوں کا ساتھ بھی دیا ہے اور شاعروں کی محفل میں بھی وقت گنوایا ہے۔ وقت پڑنے پر کانگریسیوں کا ساتھ بھی دیا ہے، سوشلسٹوں کا بھی کمیونسٹوں کا بھی۔ وہ ہر ترقی پسند اور انقلابی پارٹی کے ساتھ ہے۔ مگر کسی پارٹی میں نہیں ہے۔ وہ دھرم، مذہب، ذات پات کے بندھنوں سے آزاد ہے۔ سامراج اور فرقہ پرستی کا دشمن ہے، جنتا اور لوک راج کا ساتھی۔

اس نے ہزاروں روپے کمائے ہیں، اس سے زیادہ خرچ کئے ہیں۔ ہمیشہ قرض کے جال میں جکڑا رہتا ہے، پھر بھی ہر ترقی پسند پرچے کے لئے مفت کہانی لکھنے کو تیار رہتا ہے۔ اس کی ناک کی ہڈی بڑھی ہوئی ہے، اور اسے ہمیشہ زکام رہتا ہے۔ اس کی ٹانگیں دبلی ہیں۔ بیوی اکثر بیمار رہتی ہے، اور وہ ان کا علاج کرنے میں اتنا ہی لاپرواہ ہے جتنا اپنا علاج کرانے میں ...... اس کے ارد گرد دو قسم کے آدمیوں کی بھیڑ رہتی ہے، وہ جن سے وہ روپے قرض لیتا رہتا ہے اور وہ جنہیں وہ قرض دیتا رہتا ہے .... وہ ہمیشہ سفید قمیص اور اونی پتلون پہنے نظر آتا ہے۔ کوٹ اس کے پاس ہے ہی نہیں اور اس کی جیب میں کبھی روپے سوا روپے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ("پانچ روپے کی آزادی" بہت کم ہی نصیب ہوتی ہے ...) ...... یہ اور بات ہے کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ مگر کہانی لکھنے کے لئے سب سے بڑھیا کاغذ کا رائٹنگ پیڈ چاہئے۔ گھٹیا کاغذ پر اس کا قلم چلتا ہی نہیں۔ وہ ٹائم ٹیبل سے کبھی کام نہیں کرتا، لکھنے پر آئے تو ایک دن میں پوری کہانی لکھ ڈالے نہیں تو پندرہ دن تک ایک لفظ نہ لکھے۔ باتیں جتنی چاہے کرا لیجئے اور دنیا کے کسی موضوع پر ...... پالیٹکس، لٹریچر، فلم، ڈراما یا محض گھریلو گپ شپ ....

غرض کرشن چندر میں کوئی خاص بات نہیں ہے بس معمولی سیدھا سادھا آدمی ہے، ہم آپ جیسا۔ شاید اسی لئے اس کی کہانیوں میں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمیوں کے جیون کی اتنی سچی تصویر ملتی ہے ٭

فاؤسٹ اور اقبال

یحییٰ امجی

(جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے کی ولادت کا دو صد سالہ جشن ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہت سے ملکوں کے ادبی حلقوں میں منایا گیا ہم یحییٰ امجی صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس موقع کے مناسب ذیل کا مضمون جس میں گوئٹے کے نظریۂ زندگی کا مقابلہ اقبال کے تصور حیات سے کیا گیا ہے عنایت فرمایا۔)

(۱)

اس مقالہ کا مقصد صرف ان نظریات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو گوئٹے کے فاؤسٹ اور کلام اقبال میں مشترک محسوس ہوتے ہیں اور جن کے درمیان ایک سرسری نگاہ ڈالنے پر بھی ایک ایسا ربط یا تعلق نظر آتا ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
فاؤسٹ جس کا شمار دنیا کی بلند ترین فلسفیانہ نظموں میں ہوتا ہے گوئٹے کی تصانیف میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی عظمت کا بڑا راز یہ ہے کہ شاعر نے کمال وضاحت اور جامعیت کے ساتھ فلسفہ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ اقبال کی فاؤسٹ سے دلچسپی کا ثبوت پیام مشرق کی نظم جلال و گوئٹے سے ملتا ہے۔

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبت افتاد با پیر عجم

شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصۂ پیمان ابلیس و حکیم

گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو فلک صید آستی در یزداں شکار

فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہان کہنہ را باز آفرید

سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ

ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

داند آں کو نیکبخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

ہمیں کلام اقبال اور فاؤسٹ میں حیرت انگیز یک رنگی نظر آتی ہے وہی عقل و دل کی کشمکش میں دل کی فضیلت فیضان عشق کے ذریعے حقیقت کے مشاہدے کی تجویز شیطان کا تصور بحیثیت ایک تخلیقی قوت کے جو صراط مستقیم سے بھٹک گئی ہے اور ایک سراپا امید اور قوت افزا پیغام حیات۔
اس یک رنگی کا سبب گوئٹے اور اقبال کی ذہنی مماثلت ہے۔ دونوں شاعر حیات ہیں۔ دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے۔ دونوں عقل و دانش کے مزاج داں ہوتے ہوئے بھی وجدان کے قائل ہیں۔ دونوں جد و جہد کو زندگی اور خفتگی کو موت سمجھتے ہیں اور دونوں انسانی زندگی کے لامحدود امکانات اور نفس انسانی کی کائنات میں فوقیت کے قائل ہیں جن کا اظہار خود علامہ نے پیام مشرق میں فرمایا ہے۔

ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تابدار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار

کلام اقبال اور فاؤسٹ سے بعض اساسی تصورات خصوصاً نظریہ حیات، تصور علم اور تصور شیطان کو لے کر اقتباسات کے ذریعے مقابلہ کرنے سے مذکورۂ صدر حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

نظریۂ حیات

گوئٹے ہنگامۂ ہستی کو محض کسی اندھی مشیت کی تخلیق نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کا نظام سمجھتا ہے، وہ مواد حیات کو بند غم جان کر توڑنا نہیں بلکہ روحانی ترقی کی ایک منزل سمجھ کر اس سے مانوس ہونا چاہتا ہے، زندگی باوجود اس کلفت و کشاکش کے اس کے نزدیک ایک نعمت ہے جس میں جمال پیدا کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس کا ذوق نظر اس امر کا خواہاں ہے کہ ہم اپنی شرافت نفسی اور بلندی کردار کے جوہر سے تہذیب و شائستگی کا ایک حسین اور خوش نما پیکر تیار کریں۔
اقبال کے روح ارضی کے استقبالیہ نغمہ کی طرح شیطان کا (جو گوئٹے کے نزدیک روح ارضی کا حلیف ہے) یہ نغمہ،

"افسوس! صد افسوس
تو نے مسمار کر دیا
خوب صورت دنیا کو
اپنے زبردست گھونسے سے
ٹوٹ گئی، ریزہ ریزہ ہو گئی
ایک دیوتا نے اسے پاش پاش کر دیا!
ہم اس کے ٹکڑوں کو
عدم کی طرف لے جا رہے ہیں
اور اس برباد حسینہ پر
نوحہ کر رہے ہیں۔
اے زمین کے سورما بیٹے
اسے نئی شان سے تعمیر کر
اپنے سینے میں اپنے دل میں
اس کی پھر سے بنیاد رکھ
زندگی کا ایک نیا دور
روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں"

جس کی بدولت فاؤسٹ کے دل میں پھر زندہ رہنے کی خواہش عود کر آتی ہے۔ گوئٹے کی رجائیت اور ایک پر امید اور خوش نما مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔
تہذیب و شائستگی کے اس حسین اور خوش نما پیکر کی بافت کے لئے انسان کو اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرنا اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہنا، ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنا اور اس طرح راہ طلب میں آگے بڑھتے رہنا ایک امر ناگزیر ہے۔ وہ آسمان سے روشن ترین ستارہ مانگتا ہے اور زمین سے بہترین نعمتیں قریب و بعید کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اس کے اضطراب قلب کو تسکین ہو۔
اس بے قراری اور بے چینی، اس سعی پیہم اور اور جد و جہد مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون روح انسانی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ شیطان سے معاہدہ کرتے وقت فاؤسٹ کے یہ الفاظ
"اگر میں کبھی چین سے بستر کاہلی پر لیٹوں تو میں اپنی جان ہارا۔ اگر تو کبھی بہلا پھسلا کر مجھے میری زندگی سے مطمئن کر دے اور عیش و عشرت سے دھوکا دیدے تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو۔ میں یہ شرط لگاتا ہوں"
گوئٹے کے فلسفۂ عمل کی روح رواں ہے۔
اس راہ طلب میں روح انسانی کو نور ہدایت کی ضرورت رہتی ہے اور گوئٹے کے نزدیک وہ نور الوہیت ہے یہ محبت، عقیدت اور تسلیم و رضا کا ابدی جوہر ہے جو کل کائنات میں جاری اور ساری ہے اور جس کی جھلک یہ عاشق کو اپنی معشوق کی صورت دسہرت میں نظر آتی ہے" اگر فاؤسٹ روح انسانی شیطان (جو لذت پرستی اور خالص عقل کا [illegible] مجسمہ ہے اور انکار و نفی کی روح) پر غالب آ سکتا ہے کو غم [illegible] کی مدد سے جو جوہر الوہیت [illegible] ہے۔
اقبال بھی گوئٹے کی طرح ایک سراپا امید قوت افزا اور اخلاقی تصور پیش کرتا ہے اور نیابت الٰہی کے منصب جلیل کو حاصل کرنے کا وہی طریقہ

بتلاتا ہے جو گوئٹے کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات کو اپنی مخصوص اصطلاح خودی کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ حیات کی اصل خودی ہے جس میں بقا کے دوام کی صلاحیتیں مضمر ہیں۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اس کی زندگی عمل اور جد و جہد ہے۔ وہ غیر خفتہ تحرک ہے اور اپنے ارتقا اور نشو و نما کا سامان پیدا کرتی ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ......زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس راہ میں مقام بے محل......ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اجل آرزوؤں اور مقاصد سے پیدا ہوتا ہے اور بلند سے بلند تر مقام پر پہنچنے کا اضطراب طالب خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

تکمیل خودی یا منصبِ الٰہیہ کو حاصل کرنے کے لئے گوئٹے کی طرح اقبال کے یہاں بھی ایک راہ نما کی ضرورت ہے اور وہ راہ نما عشق ہے۔ عشق سے مراد اس مردِ کامل کی محبت ہے جو خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ تاکہ اس برتر شخصیت سے تکمیلِ خودی کا راز سیکھے اور اپنی قوت کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

گوئٹے اور اقبال کے نظریہ حیات میں ذہنی مماثلت ہوتے ہوئے بھی ایک فرق ہے۔ جہاں تک شرافتِ نفسی اور بلندیٔ کردار کے جوہر سے تہذیب و شائستگی کا ایک حسین پیکر تیار کرنے کا تعلق ہے وہ جن ساتھ ساتھ ہیں۔ جن اقبال آگے بڑھتا ہے اور اس پیکر سے ایک زندہ جاوید تمدن اور عالمگیر انسانیت کی بنیادیں اٹھاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

تہذیب کو کیوں کر بچائیں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

جو ابھی بہت دور معلوم ہوتا ہے —— بجائے خود نا لڑکوں کے دل و دماغ کو نہیں بدل سکتا بلکہ ان کے ساتھ شعوری تعلیمی کوشش بھی ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے معلموں اور تعلیمی اداروں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا ہے۔ وہ امتحان اور نصابِ تعلیم کے جھگڑوں میں گرفتار اور اپنے مخصوص مضامین

کے مطالعے میں محو رہتے ہیں اور انھیں اس کی فرصت نہیں ملتی کہ طالب علموں کے سامنے آج کی دنیا کا ایک مکمل اور مربوط نقشہ پیش کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ اس میں ان کی جگہ کہاں ہے یا ان میں تہذیبی قدروں اور معیاروں کا احساس پیدا کر سکیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے طالب علم کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد عموماً کس احساس سے ...... ہوتے ہیں۔ محنت اور دیانت داری سے کام کرنے اور سنجیدگی طور پر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آگے چل کر وہ سستی، نااہلی اور سطحی پروپیگنڈا کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ہماری قوم کی یہ نفسیاتی کیفیت ہے جس سے ہمیں نپٹنا ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہماری قومی زندگی میں جو بے راہ روی پچھلے دنوں دیکھنے میں آئی یعنی سیاسی پارٹیوں کی تفرقہ پسندی ان کا اختلافات سے فائدہ اٹھا کر فساد برپا کرنا۔ ان کی تنگ خیالی تعصب اور رجعت پرستی محض سیاسی مظاہر نہیں ہیں بلکہ گہری نفسی اور اخلاقی بیماری کی علامتیں ہیں۔ جس چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے والے افراد یا سیاسی جماعتوں کی کش مکش سمجھتے ہیں اس کی تہ میں مختلف تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی کش مکش ہے۔ معلم کی حیثیت سے ہم اس جنگ میں جو عقل، تہذیب، رواداری، انسانیت کی قوتوں اور تعصب، تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھی ماضی پرستی کی قوتوں میں ہو رہی ہے۔ خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس لڑائی میں مہاتما گاندھی کی حکمت و بصیرت اور جواہر لال کی شجاعت کے ساتھ پاک صاف ہتھیاروں سے جی توڑ کر لڑیں۔

باہر کی دنیا (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

جس میں جنوبی افریقہ کی حکومت سے کہا گیا ہے کہ اس کی تولیت میں جو نو آبادیاں ہیں وہ ان کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا رہے۔ اس تجویز کی مخالفت کرنے والوں میں سرِفہرست دنیا کے تین سب سے بڑے جمہوریت پسند ملک ہیں۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس۔ ظاہر ہے جنوبی افریقہ کو جب ایسی شہ مل رہی ہو تو پھر وہ کسی کو کیوں خاطر میں لائے؟ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایسا کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی کی یہ ہمت کہ وہ نو آبادیات کے مسئلے پر بحث کی اجازت دے اور ایک آدمی کو یہ موقع دے کہ وہ کھلی آنکھوں دیکھی بات سنائے اس بات پر برطانیہ بہت خفا ہے۔ مدت ہوئی پنڈت نہرو نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا "سامراج شاہی بہت سخت جان ہے اور برطانوی سامراج خاص طور سے"۔ اب پنڈت جی کا خیال ہے کہ برطانیہ میں سامراجی طاقت بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ چوری چوری سے گیا، ہیرا پھیری سے تو نہیں؟

ا، س

تبت بیدار ہو

تبت میں اس وقت اگرچہ سکون ہے اور پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کے حملے کے ڈر سے وہاں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی وہ فی الحال دور ہو گئی ہے مگر پھر بھی حکومت پوری احتیاط اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ سرحدوں کی نگرانی کر رہی ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے خطرے کے مقابلے کے لئے تیار ہے۔

چین نے تبت پر اپنی سیادت اور حکمرانی کا ہمیشہ مطالبہ کیا ہے اور تبت کے لوگوں نے اس سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ چینی کمیونسٹوں نے بھی اس مطالبے کو دہرایا ہے۔ وہ تبت کو عوامی ریپبلک کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جیسا کہ پیکنگ سے اعلان کیا گیا ہے کمیونسٹوں کے پروگرام میں امسال اس پر قبضہ کرنا بھی شامل ہے۔

چینی کمیونسٹ تبت کے شمال میں سنکیانگ (چینی ترکستان) پر اور مشرق میں کم کم، جے کندو، ڈرگے، لی تانگ، اور بے تانگ کے اضلاع پر قبضہ کر چکے ہیں اور اب تک تبت پر حملہ نہ کرنے کے حسب ذیل اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

روس
منگولی عوامی ریپبلک
سن کیانگ
(چینی ترکستان)
چین
تبت

(۱) خود چین میں کمیونسٹ حکومت کو ابھی مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں کافی وقت لگے گا (۲) سرخ چین کو فی الحال تبت سے کوئی مادی مدد نہیں ملے گی (۳) ایک ایسے ملک میں جہاں کافی اناج پیدا نہیں ہوتا بہت بڑی فوج رکھنی پڑے گی (۴) زبردستی قبضہ کرنے سے بہت سے ملک مخالف ہو جائیں گے جس سے بین اقوامی سیاست میں بہت سی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔

اس لئے چینی کمیونسٹ، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے نسبتاً سہل اور محفوظ طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یعنی تبت پر حملہ کرنے سے پہلے ملک کی طرح پانچویں کالم کے ذریعے اپنے لئے پوری طرح زمین ہموار کر لینی چاہیے ہیں تبت کے آس پاس جن علاقوں پر ان کا قبضہ ہے ان میں بہت کافی تعداد میں ایسے تبتی بھی ہیں جن پر کمیونسٹوں کا پورا بھروسہ ہے۔ جس وقت حالات اجازت دیں گے چینی کمیونسٹ ان کو تبت میں داخل کر دیں گے اور وہ وہاں ایسے حالات پیدا کریں گے کہ بغیر کسی بڑی لڑائی کے تبت پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

اگرچہ تبت کی فوج کے پاس کافی تعداد میں نئے ہتھیار نہیں ہیں لیکن پھر بھی اس نے کافی تیاری کر لی ہے اور حکومت کو امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسرے ملکوں سے اس کو ہر طرح کی مدد حاصل ہو گی۔

نفسیات اور تجارت

(۲)

خواجہ جمیل احمد

ہر انسان ایک مخصوص عمر گذارنے کے بعد عادات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے ...... نفسیات انسان کی اسی عمومی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اسی فطری قانون کو نظر رکھ کر کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخصوص مال عوام کو پسند آگیا ہے اور وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں تو وہ باوجود ذہنی مخالفت کے اس کی خرید جاری رکھیں گے۔

پروپیگنڈے اور اس کے اثرات سے جو یقیناً ایک نفسیاتی مسئلہ ہے ہم بعد میں بحث کریں گے اس کے قبل خریدار کی چند نفسیاتی خصوصیات کا ذکر مقصود ہے مثلاً انسانوں میں مختلف "عادات" کے ہمہ گیر اثرات کو لیجئے۔ ہر انسان ایک مخصوص عمر گذارنے کے بعد عادات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سگریٹ نوشی شروع کرتا ہے۔ ابتدا میں تو بلاشبہ وہ سگریٹ کی مختلف اقسام کا ذائقہ چکھتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ ایک مخصوص سگریٹ کو پسند کرنے لگتا ہے اور دوسروں پر اس کو ترجیح دیتا ہے۔ تھوڑے عرصے تک اس سلسلے کو قائم رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اگر اس مخصوص برانڈ کے سگریٹ کے علاوہ اور دوسرے سگریٹوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اس سے زیادہ بہتر قسم کے سگریٹ پینے سے احتراز کرتا ہے۔ نفسیات انسان کی اسی عمومی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اسی فطری قانون کو نظر رکھ کر کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخصوص مال عوام کو پسند آگیا ہے۔ اور وہ اس کے عادی ہوگئے ہیں تو وہ باوجود ذہنی مخالفت کے اس کی خرید جاری رکھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر سائیکلوں کو لیجئے۔ ہرکولیس سائیکل نے اپنی پائداری اور خوب صورتی کی بنا پر اتنی شہرت حاصل کی کہ آج بھی اگر کوئی نئی سائیکل خریدنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے ہرکولیس کی قیمت دریافت کرتا ہے حالانکہ جرمنی کی بائیسکلیں بھی مضبوطی میں ہرکولیس سے کم نہیں ہوتی تھیں یہی حال کم و بیش ہندوستان میں تمام امریکن اور انگریزی سامان کا ہوا خواہ پروپاگنڈے کے اثر سے یا واقعیت کی بنا پر عوام کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان دو ممالک کا مال ہندوستانی مال کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہوتا ہے اسی شہرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ باوجود تحریک آزادی اور ملکی مال کے استعمال کے نعروں کے آج بھی جب ہندوستان آزاد ہے ہم میں سے بیشتر احباب ان دونوں ممالک کے مال کو ہندوستانی مال پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح جاپانی مال ہندوستان میں اپنی کم قیمت کی بنا پر بدنام ہوا اور ایسا بدنام ہوا کہ کمزوری اور گھٹیا پن کا دوسرا نام جاپانی قرار پایا۔ حالانکہ میں نے ذمہ دار اور معتبر افراد سے سنا ہے کہ جاپان کی اٹھارہ اٹھارہ روپے کی بائیسکلیں کافی عرصے تک کام دے جاتی تھیں جب کہ امریکن اور برٹش بائیسکلوں کی قیمت اس کی چوگنی اور پنج گنی تھی۔ یہ کیا تھا صرف انسانی دماغ کے عادت کے تحت ایک مخصوص سمت میں کام کرنے کا مظاہرہ۔

ممکن ہے اور امکان کا کوئی سوال نہیں یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگ اس کلیہ کے مستثنیات میں سے ہوتے ہیں لیکن عام طور پر پبلک عادت کی پابند ہوتی ہے اور اگر سو اشخاص میں سے اسی یا پچاسی (حالانکہ میرا خیال ہے کہ ۹۹ فی صدی افراد عادات کے غلام ہوتے ہیں) آدمی بھی ایسے نکل آئے جو مخصوص عادات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تو پھر کارخانہ دار کا پوبارہ ہے اور وہ بلا خسارے کے خوف کے مال تیار کر سکتا ہے۔

بعض لوگ جو اس نقطۂ نظر کو مبالغہ آمیز سمجھتے ہوں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان عادات اور فطری خواہشات کے ماتحت خریداری نہیں کرتا بلکہ وہ عقل سے کام لے کر اور سوچ بچار کر کے کسی خاص شے کی خریداری کا فیصلہ کرتا ہے لیکن ذرا اپنی روزانہ خرید پر ایک نظر ڈالئے اور سچے دل سے بتائیے کہ کتنی دفعہ آپ نے کسی چیز کی خرید میں منطقانہ استدلال سے کام لیا ہے ممکن ہے بعض لوگ جذبات کی رو میں نہ بہتے ہوں اور خریداری میں "عادت" کی پابندی سے بچ کر عقل کا استعمال کرتے ہوں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کتنے فی صدی ہے؟ اور کیا یہ تعداد نظر انداز نہیں کی جا سکتی بھئی بیچنے والا تو صرف اتنے میں خوش ہو جائے گا کہ صرف پچاس فیصدی اشخاص اس کی چیز کو پسند کرتے ہیں بالعموم اوزاروں، آلات اور اس قسم کی دوسری اشیاء کی خریداری آدمی سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات نے اس کا بھی حل نکال لیا ہے۔ وہ ان غیر دلچسپ ہتھیاروں اور اوزاروں کا دنیا کی دیگر عجیب اور پسندیدہ اشیاء سے

ایسا رشتہ قائم کر دیتے ہیں کہ بلا خریداری کے بن نہیں پڑتی مثال کے طور پر کسی گل دان کو لیجئے۔ یوں تو کسی بھی گلاس کی شکل کی چیز میں پھول باسانی رکھے جا سکتے ہیں اور میرے خیال سے ایسے گلدان میں مقابلتہً کافی پھول آ سکیں گے اور پانی کی بھی گنجائش زیادہ ہوگی لیکن اسی بھدے گلاس کی کمر اگر ذرا مخروطی رکھ دی جائے تو پھر نہ صرف اس کی دلکشی دوبالا ہو جائے گی بلکہ وہ ہاتھوں ہاتھ بک جائے گا اس وجہ سے اس کی کمر کی ساخت انسانی کمر کی ایسی ساخت سے ملتی جلتی ہے جو تمام لوگوں کو پسند ہے۔ اسی طرح بعض غیر دلچسپ کتابوں کے سرورق کی دیدہ زیبی ان کی فروخت کا باعث ہوئی ہے۔ یہ دیدہ زیبی صرف مخصوص اور پسندیدہ رنگوں کی آمیزش اور کسی عجیب جمالیاتی منظر کے استعمال سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

دراصل کسی چیز کی فروخت کا دارومدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ بیچنے والا پبلک کے دل میں کتنی خواہشات کو اپنے پروپاگنڈے اور اشتہارات سے ابھار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ خواہشات اتنی طاقت ور ہیں کہ انسان کو اس چیز کے خریدنے پر مجبور کر سکیں یا نہیں۔ مثلاً غذا کی خواہش، محبت کی تمنا اور بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت بلند ترین اور طاقتور ترین خواہشات میں سے ہیں کیونکہ یہ براہ راست طاقت ور جبلتوں سے متعلق ہیں اسی طرح مہمان نوازی اور سیر و تفریح کی خواہشات اس سے کم تر درجے کی ہیں۔ اب اگر مشتہرین نے اول الذکر قسم کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کو اپیل کرنے کی کوشش کی ہے تو یقیناً ان کا پروپاگنڈا کامیاب ہوگا اور مال خاطر خواہ فروخت ہوگا۔ مثال کے لئے لکس صابن کو لیجئے۔ بالعموم "لکس" کے اشتہار میں ایکٹرسوں کی خوب صورتی کا ذکر ہوگا جن کا حسن مشتہرین کے نقطۂ نظر سے محض لکس سوپ کی بدولت برقرار ہے یا لکس سوپ ہم جنسوں میں شہرت و عزت اور محبوبہ کی نظر میں پسندیدگی کا باعث ہوگا کیوں کہ یہ جلد کی حسین تہوں کو ان کی قدرتی حالت میں قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح محض افغان اسنو کے استعمال سے حسن و ملاحت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا جو اور کریموں اور پاؤڈروں کے استعمال سے ناممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ خواہشات انسان میں کافی طاقت ور ہوتی ہیں، اس لئے ان کی تحریک ہوتے ہی خرید و فروخت شروع ہو جائے گی۔ اکثر فروخت کنندگان اسی نظریے کے ماتحت تصاویر سے اشتہارات کا کام لیتے ہیں مثلاً کسی فلم ایکٹرس (نرگس، گیتا بالی، ثریا وغیرہ) کی ایک عمدہ سی تصویر رنگین کاغذ پر کھنچوائی اور اس کے نیچے یہ لکھ دیا کہ یہ ہمیشہ افغان اسنو یا لکس سوپ استعمال کرتی ہے خواہ اس غریب کو ان دونوں چیزوں سے کوئی سروکار نہ ہو اور وہ کوئی تیسری "حسن افزا" شے کا استعمال کرتی ہو لیکن ناممکن ہے کہ یہ نفسیاتی حربہ کام نہ کرے۔ لوگ تو عقل کے پیچھے ڈنڈا لے کر پھرتے ہیں وہ فی الفور بلا تحقیق کے دونوں چیزوں کی خرید شروع کر دیں گے۔ لیکن یہی طریقہ کار بعض دفعہ انتہائی ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر تصویر کے

بنانے یا انتخاب میں غلطی کی گئی ہو۔ اسی طرح بعض مضحکہ خیز ہستیوں کا چلا چلا کر کسی شئے کا پروپاگنڈا کرنا عوام کو اس شئے کی خرید پر مجبور کرنا کیسا اس سے برگشتہ کر دیتا ہے اس لئے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے عملی طریقے پر زیادہ زور دینا چاہئے۔

علاوہ ازیں عوام کی ذہنی اور مالی استطاعت کا خیال رکھنا بھی مشتہرین کا فرض ہے کیونکہ اگر انھوں نے ایسے الفاظ یا تصاویر کے ذریعے اپنے مال کا پروپاگنڈا کیا جس کا سمجھنا عوام کے لئے دشوار ہے تو پھر کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ دیگر یہ کہ مختلف الطبائع ہونے کے باوجود بالعموم عوام کچھ خاص چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور کچھ کو ناپسند، اس اہم حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ خاطر خواہ کامیابی دشوار ہوگی۔

یہاں تک کہ ہم نے زیادہ تر خریدار کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اب ہم مختصراً فروخت کنندگان کا بالخصوص جن میں مختلف کمپنیوں کے ایجنٹ صاحبان شامل ہیں، ذکر کریں گے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری چیز انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا علم ہے چنانچہ ایجنٹ یا فروخت کنندہ جتنا زیادہ انسانی فطرت کو سمجھتا ہوگا اتنا ہی اس کی کامیابی کا امکان ہے "دوست کیسے بنائے جائیں" نامی کتاب کے مصنف نے ایک ایجنٹ کا قصہ بیان کیا ہے جو عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے، اور تجارتی معاملات میں مشعل ہدایت کا کام کر سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ یہ ایجنٹ جس بیمہ کمپنی کے لئے کام کرتا تھا اس کے سارے ملازمین میں اس کے فروخت کردہ حصے سب سے زیادہ ہوتے تھے۔ کمپنی کا مالک اس کی دیانت داری اور قابلیت کا بے انتہا معترف تھا اور اس کی ذات پر فخر کرتا تھا ایک دن اس کے جی میں آئی کہ لاؤ اس کی کامیابی کا راز تو معلوم کر لیں چنانچہ اس نے اس کو بلایا کہ بھئی تم کون سا نسخہ لوگوں کو رام کرنے کا استعمال کرتے ہو اس پر وہ مسکرایا اور جواب دیا کہ" میں دن میں جتنے لوگوں سے ملتا ہوں ان کے نام گھر کا پتہ، بال بچوں کی کیفیت، علالت و تندرستی کے متعلق معلومات غرض کہ ایک ایک چیز تفصیل وار نوٹ کر لیتا ہوں۔ اب اگر میرے کسی گاہک کا لڑکا بیمار ہے اور میری اس سے پندرہ دن بعد ملاقات ہوئی تو میں پہلے اس کے لڑکے کی خیریت دریافت کرتا ہوں، یہ چیز یقیناً کاروباری سطح سے بلند ہے اور اس شخص کے دل میں میری وقعت بڑھ جاتی ہے، اور وہ یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ باوجود چند ملاقاتوں کے اس شخص کو میرا کتنا خیال ہے اسے میرا ہی خیال نہیں بلکہ میرے گھریلو معاملات میں بھی اسے دلچسپی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری، تیسری ملاقات پر بلا مزید دباؤ کے وہ حصے خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح میں لوگوں کی دلچسپیوں، اور دیگر مصروفیات کے متعلق معلومات فراہم کر لیتا ہوں اور ان سے ملنے پر نوٹ بک کی مدد سے یا حافظہ ہی سے کام لے کر انھیں چیزوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح ان کی دکھتی رگ پکڑی جاتی ہے اور مجھ سے بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان یا دوست کی طرح سے ملنے لگتے ہیں اور دوستی کے بعد ایک معمولی سی چیز یعنی کاروباری بات چیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور میرا کام بن جاتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ خوش اخلاقی سے انسان دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور تجارت جیسے خشک پیشے میں تو اسی کی مدد سے شیرینی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس اہم گیر اصول کی حقیقت کو پرکھنا ہو تو کسی بھی شہر میں جن دوکانداروں کا کام اچھا چل رہا ہو ان کو دیکھئے۔ ننانوے فی صدی اصحاب ایسے ملیں گے جو انتہائی با اخلاق ہیں برخلاف اس کے بد اخلاق انسان ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں فرض کیجئے کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی شخص ان کے یہاں سے وہ چیز خریدتا بھی ہے جو اوروں کے یہاں نہیں ملتی تو پھر بھی خریدار کے دل میں اس کی طرف سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ خدا سے چاہتا ہے کہ کاش دوسروں کے یہاں وہ چیز ملنے لگے۔ تو وہ اس کی دوکان پر تھوکے بھی نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندو دوکاندار اس مسئلے میں مسلمانوں سے کہیں بلند ہیں۔ ان کے اخلاق کی وسعت خواہ وہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو بلند ترین تجارتی معیار پر پوری اترتی ہے۔ برخلاف اس کے بالعموم مسلمان دوکاندار انتہائی کج خلق اور بد تمیز ہوتا ہے۔ اس کو اس کی بھی تمیز نہیں ہوتی کہ گاہک سے کس طرح بات کرنی چاہئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اوروں سے تجارت میں پیچھے رہتا ہے۔ کاش کہ ان بدبختوں کو اب بھی ہوش آئے۔

تجارتی معاملات میں نفسیات کا بہت کافی دخل ہے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ تجارت ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر نفسیاتی اصول کام نہ کر رہے ہوں۔ مقالے کے طوالت کی خوف سے ہم "مشتے نمونہ از خروارے" کے قول پر عامل ہو کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۳	نمبر ۲۴	۲۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء	ایڈیٹر : ڈاکٹر سید عابد حسین

چالیس کے بعد ورزش کیا معنی؟

جب آدمی چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو جسم کو ایک پر لطف سکون کا احساس ہو جانا چاہئے۔ لیکن لاکھوں اعصابی مزاج کے امریکی کسی طرح اس پر تیار نہیں ہوتے کہ قدرت کو اپنا کام کرنے دیں۔ بدقسمتی سے ان کا ایمان ہے کہ ورزش تو انھیں کرنی ہی چاہئے۔ میں بحیثیت طبیب کے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عمر میں ورزش غیر ضروری ہے ......

امریکہ میں بہت سے لوگوں کو ورزش کا شوق خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ عجیب مضحک طریقے سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو توڑ مروڑ کر دائرے اور زاویے بنایا کرتے ہیں۔ وہ اتوار کو ہفتہ بھر کا گولف اکٹھا کھیل ڈالتے ہیں۔ شام تک ان کا دم نکل جاتا ہے اور آکر بستر پر اس طرح گرتے ہیں کہ منہ سے بات نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو یہ حرکتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انھیں اچھی لگتی ہیں اور بعض اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے انھیں سکون ملے گا اور اس سے ان کی فکریں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

۱۹۴۳ء میں امریکہ میں صحت جسمانی تربیت اور تفریح کے ایسوسی ایشن نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، جس نے امریکی طبی ایسوسی ایشن کی مدد سے ورزش کے بارے میں ایک رپورٹ مرتب کی ہے۔ اس رپورٹ میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ چالیس سال سے زیادہ عمر والوں کے طبی معائنے سے یہ ظاہر ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ جتنی ورزش کرتے ہیں اس سے بہت کم کرنی چاہیے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ورزش کرنی ہی ہے تو کم سے کم اس کا یقین کر لیجئے کہ آپ کی صحت اسے برداشت کر سکتی ہے اور یاد رکھئے کہ محض تندرستی کا احساس اس کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ تندرست ہیں ہر سال مکمل طبی معائنہ کرانا ضروری ہے۔

چالیس سال کی عمر کے بعد ورزش کو منہ کا نوالہ نہ سمجھنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ وہ چست اور تندرست ہیں اور اس چستی اور تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے ورزش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اکثر المناک ہوتا ہے۔

اگر آپ ورزش کا ارادہ کریں تو اپنے قلب کا خیال رکھئے۔ اسے زیادہ سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ بڑا محنتی مزدور ہے مگر اتنا تھک نہیں ہو [illegible]

اگر آپ نے پہلے کبھی ورزش نہیں کی ہے تو ادھیڑ عمر میں اس کمی کو پورا کرنے کی امید نہ رکھئے۔ چالیس سال کی عمر کا آدمی اگر اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لئے یا اپنے آپ کو رستم وقت ثابت کرنے کے لئے ورزش شروع کرے تو وہ رستم نہیں شیخ چلی کہلائے گا۔

آپ کو گولف کھیلنے میں لطف آتا ہو تو ضرور کھیلئے مگر سہولت اور اطمینان سے لیکن اگر اس خوف سے کہ گھر پر کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا اور بیوی ڈانٹ بتائے گی آپ سرپٹ بھاگیں اور ہانپتے کانپتے گھر پہنچیں تو کھیلتے وقت بھی اور کھانا کھاتے وقت بھی آپ اپنے قلب پر بوجھ ڈال رہے ہیں۔

کھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مزے لے لے کر کھیلئے۔ مزے سے لے کر نہائیے اور سیر و تفریح کرتے ہوئے گھر پہنچ کر گرم گرم کھانا کھائیے۔

ادھیڑ عمر والے کو اپنی قوت احتیاط سے خرچ کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ اس میں اب وہ نوجوانی کا لوچ نہیں رہا ہے۔ ۶۰ برس کی عمر کے آدمی میں ۳۰ سال کے لڑکے کے مقابلے میں کام کرنے کی قوت آدھی رہ جاتی ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادھیڑ عمر کے آدمی بالکل ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں۔ اگر صحت ٹھیک ہو تو معتدل ورزش میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تھوڑا سا گولف کھیل لیجئے، ذرا دیر تیر لیجئے، اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایک دو سیٹ ٹینس کے کھیل لیجئے، گھنٹہ بھر باغبانی یا چہل قدمی کر لیجئے۔ غرض اس قسم کی ہلکی ورزشیں جائز ہیں مگر اس سے زیادہ [illegible] الحفیظ۔

اب آپ کو تندرست اور چست رہنے کے لئے سب سے اچھی ورزش بتا دوں جب آپ کھانے کی میز پر بیٹھیں اور کوئی بھوک سے زیادہ کھانے پر اصرار کرے تو آپ اپنے سر کو ایک بار بائیں طرف سے داہنی طرف کو جنبش دیجئے اور پھر بائیں طرف سے داہنی طرف کو۔

یہی اچھی صحت کا نسخہ ہے اور یہی لمبی عمر کا۔ زندگی گھڑ دوڑ نہیں ہے۔ اس دوڑ میں وہی جیتے گا جو سست ہے اور دبلا پتلا۔

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

فہرست مضامین

چالیس سال کے بعد ورزش کیا معنی؟		۱	بزم بے تکلف		۵
گاندھی اور اقبال	یحییٰ امجد	۲	آزمائش	فضا ابن فیضی	۵
مسلمان ملکوں کی معاشی کانفرنس (اداریہ)		۳	تہذیب کی صبح	سید یحییٰ حسن نقوی	۶
دنیا کی رفتار			روس کی طاقت کا راز	محمد امین [illegible]	۷
۱۔ ہندوستان	ع۔ ح	۴	ایک خبر	[illegible]	۹
۲۔ پاکستان	ع۔ ل	۴	روشنی اور اس کی تصنیف		

فاؤسٹ اور اقبال

(۲)

یحییٰ اعظمی

نظریۂ علم

گوئٹے ہمیشہ عمل کی تلقین کرتا ہے اور اس کی کتابی دانش بے بضاعتی پر توجہ دلاتا ہے۔ عقل زندگی کے رازہائے سربستہ کو افشا نہیں کر سکتی اس لئے وہ عقل کے مقابلے میں دل کو سراہتا ہے۔ فاؤسٹ کی زبانی واگنر کو جب وہ علم کی تعریف میں رطب اللسان ہے وہ یہ کہہ کر جھڑک دیتا ہے: "کیا کتاب وہ مقدس سرچشمہ ہے جس کے دھاروں سے تمہاری پیاس ہمیشہ کے لئے بجھ جائے گی نہیں! سچی تسکین اور لذت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو دل سے"۔ اس پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہے کہ کائنات کے اندرونی نظام سے واقف ہونے، مبدأ حیات اور قوت تخلیق کا معاہدہ کرنے کے لئے جو ادھر کا بھی اشارہ ہونا لازمی ہے۔ بغیر اس کے نظام فطرت دن کی روشنی میں بھی ایک راز سربستہ رہتا ہے۔ فاؤسٹ جب سائنس کے آلات سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"اے سائنس کے آلات تم بھی میرا منہ چڑاتے ہو، تمہاری چرخیاں اور دندانے تمہارے پرزے اور کمانیاں مجھ پر ہنستی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں حقیقت کے دروازے پر کھڑا ہوں اور تم اس کی کنجی ہو، تمہاری ساخت تو بڑی پیچ دار ہے، مگر قفل کا کھٹکا تس سے مس نہیں ہوتا۔ نظام فطرت دن کی روشنی میں بھی ایک راز سربستہ ہے اور جو حقیقت تیرے ذہن پر خود بخود منکشف نہ ہو اس پر بیرم اور پیچ کا زور نہیں چلتا ..... کیا اچھا ہوتا کہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی ان چھوٹی چیزوں کے درمیان عرق ریزی میں نہ کھوتا" تو وہ اسی حقیقت کا اعادہ کرتا ہے۔

گوئٹے کے نزدیک طلب حقیقت کی جو آگ روح انسانی میں بھڑکتی ہے وہ علم کے چھینٹوں سے نہیں بجھتی، کتابی علم کی طرف سے جو بے اعتمادی اس کے دل میں پائی جاتی ہے اس کا اظہار فاؤسٹ کے ان اشعار سے اچھی طرح ہوتا ہے۔

"افسوس اے فاؤسٹ! تو نے فلسفہ، قانون
اور طب کی خاک چھانی اور ستم تو یہ ہے
کہ دینیات میں بھی سر کھپایا مگر کم بخت،
سادہ لوح! تو جہاں تھا وہیں ہے ایک قدم
بھی آگے نہیں بڑھا؛ تو فاضل کہلاتا ہے
بلکہ علامہ اور دس سال سے اپنے شاگردوں
کو انگلیوں پر نچاتا ہے حالانکہ تو جانتا ہے
کہ علم انسان کی پہنچ سے باہر ہے ہائے یہ
خیال مجھے سوہان روح ہو گیا ہے"

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگا کہ گوئٹے عقل کا دشمن ہے۔ عقل کو بھی زندگی کا خادم شمار کرتا ہے اور ایک بہترین خدمت انجام دیتا ہے۔ اسے اس کا احساس ہے کہ عشق کے جنون تخلیق و عمل پر اگر عقل کی روک نہ رہے تو تمام انسانی معاملے درہم برہم ہو جائیں۔ یونان قدیم کی مشہور حسینہ ہیلن (جو کلاسکی روح کی مظہر ہے) اور فاؤسٹ (جو رومانی جرمن روح کی مثال ہے) کے وصال کے پردے میں یہی بات کہنا چاہتا ہے۔

اقبال جو خود عقل و دانش کا مزاج داں ہے اور اس کی رگ رگ سے باخبر ہے، عقل کے لئے کچھ اس طرح کا خیال رکھتا ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے، عقل اسباب و علل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر حقیقت کو بھلا دیتی ہے

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگاں باز میدان عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

تمدن کا انحصار اس کی تخلیقی قوت پر ہوتا ہے اور اقبال کے نزدیک ایک ایسا تمدن جو خالص عقلیت پر مبنی بہت جلد غیر تخلیقی ہو جائے گا۔

بایں ہمہ اسے عقل کی اہمیت کا اقرار ہے اسے احساس ہے کہ زندگی میں جو توازن اور ہم ربطی پائی جاتی ہے وہ عقل ہی کی بدولت ہے۔ اگر عشق کے جنون تخلیق و عمل پر عقل کی روک نہ رہے تو سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جائے گا۔ انسانی عمل کو سعادت کی راہ پر لگانے کے لئے عقل و عشق کا امتزاج ایک بدیہی امر ہے۔

غربیاں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمسر شود
نقش بند عالم دیگر شود

اور اس طرح عقل جو خدمت انجام دیتی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

تصور شیطان

شیطان گوئٹے کے نزدیک عشرت حیات اور قوت عمل کی روح کا ایک جزو ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں زندگی کی محبت اور عمل کا ولولہ پیدا کرے مگر اپنی خلقت کی خاص کوتاہی کے باعث وہ دونوں باتوں میں حد سے گذر گیا ہے، عشرت حیات کے سرور نے اسے بے قید جسمانی لذتوں کا پرستار اور قوت عمل کے لئے نے اسے تخلیق ایزدی کا حریف بنا دیا ہے۔ بایں ہمہ گوئٹے کے نزدیک انسانی کے ارتقاء کے لئے شیطان کا ہونا ضروری ہے اور وہ سماے غیبی کے ذریعے "جب تک انسان راہ طلب میں ہے اس کا بھٹکنا لازمی ہے۔ انسان کا دست عمل جلد سو جاتا ہے، اور اسے آرام کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لئے ہم اسے تیرا سا مصاحب دیتے ہیں جو اسے ہلائے اکسائے اور شیطانی قوت تخلیق دے۔" فاؤسٹ میں اسی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔

اسے احساس ہے کہ زندگی کی یہ تمام ہنگامہ آرائیاں شیطان ہی کی بدولت ہے، شیطان اور فاؤسٹ کے مکالمے میں شیطان کا یہ دعوے

"اے زمین کے بے کس فرزند میرے بغیر
تیری زندگی کا کیا حال ہوتا؟ میں نے تجھے برسوں
تخیل کے خرافات سے محفوظ رکھا، میں نہ ہوتا
تو کرۂ ارض سے تو کب کا کھسک گیا ہوتا۔"

اسی نظریے کی تائید کرتا ہے

شیطان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے مقابلے کے لئے بھی خدا سے ایک حریف پختہ تر مانگتا ہے اسے جب ایک بندۂ صاحب نظر مل جاتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ فاؤسٹ کو بہکانے کی اجازت ملنے پر اس کے یہ الفاظ "میں تیرا شکر گذار ہوں۔ مُردوں سے بیوپار کرنے کا مجھے خود شوق نہیں مجھے تو جیتا جاگتا انسان چاہئے، لاشوں سے بیزار ہوں، میں ایسوں سے دور رہتا ہوں۔ مرے ہوئے چوہوں سے بلی کو کیا کام" اس کی اولوالعزمی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اقبال بھی شیطان کو بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت اور اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے، ابلیس کی نافرمانی میں اقبال کو اس دنیا کی رونق، خیر و شر کی تمام کش مکش اور محفل ہستی کی تمام ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے۔ "تسخیر فطرت" میں ذات باری سے شیطان کا خطاب اس حقیقت کی اچھی طرح عکاسی کرتا ہے۔

نوری نادانیم سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات
من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم
پیکر انجم ز تو گردش انجم ز من
جاں بجہاں اندرم زندگی مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں تو دہم
تو بہ سکوں رہزنی من بہ تپش رہبرم

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء

مسلمان ملکوں کی معاشی کانفرنس

جب سے پاکستان بنا ہے، اس کے ارباب اختیار اس فکر میں تھے کہ ان عرب اور غیر عرب ملکوں کو جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کریں۔ اس اتحاد کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: تہذیبی، سیاسی اور معاشی۔ تینوں ہی صورتوں پر غور کیا گیا، مگر قابل عمل صرف تیسری صورت معلوم ہوئی۔

جہاں تک تہذیبی اتحاد کا تعلق ہے ایک حد تک وہ پہلے سے موجود ہے۔ سب کا مذہبی عقیدہ کم و بیش ایک ہے لیکن اس سے آگے اتحاد کی راہ میں ایسی رکاوٹیں ہیں جن کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔ ان میں سے اکثر ملک صدیوں سے جاگا نہ قومیت کا بہت قوی اور گہرا احساس رکھتے ہیں۔ عرب ملکوں کو چھوڑ کر اور سب کی زبان، طرز معاشرت، ذوق جمال الگ الگ ہے۔ ایک بہت بڑا فرق ان میں یہ ہے کہ جدید مغربی تمدن کے ساتھ ان کا رویہ بہت مختلف ہے۔ کوئی اسے آنکھ بند کر کے ایک دم سے قبول کرنے کو تیار ہے کوئی حیص بیص میں ہے کہ قبول کرے یا نہ کرے اور کوئی اسے وبائی مرض سمجھ کر اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ جب تک یہ اختلاف موجود ہے مسلمان ملکوں میں اتنا تہذیبی اتحاد بھی نہیں ہو سکتا جتنا یورپ اور امریکہ کے ملک آپس میں رکھتے ہیں۔

سیاسی اتحاد اور بھی زیادہ مشکل بلکہ سردست ناممکن نظر آتا ہے۔ چھوٹے ملک بڑے ملکوں سے سیاسی اتحاد کا رشتہ قائم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے اندر ضم ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ملکوں میں سرحدی علاقوں کے بارے میں رقابتیں ہیں جیسے پاکستان اور افغانستان میں، ایران اور ترکی میں، شرق اردن اور مصر میں، سعودی عرب اور یمن میں پھر امریکہ اور انگلستان کا مسلمان ملکوں پر کھلا ہوا اور چھپا ہوا اثر اتنا ہے کہ وہ اس اتحاد کو روک سکتے ہیں اور روکیں گے۔ پاکستان کی حکومت نے ان مشکلات کو محسوس کر کے سیاسی اتحاد کا خیال چھوڑ دیا۔ مگر چودھری خلیق الزماں جن کی سیاسی نظر اتنی کمزور ہے کہ کھلی ہوئی حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے "اسلامستان" کا پیام لے کر عراق سے انگلستان تک سب "اسلامی" ملکوں میں ہو آئے۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے ایک طرف سے ہندوستان اور دوسری طرف سے روس کے خطرے کا ہوا دکھلاتے پھرے، مگر چند سر پھرے غیر ذمہ دار لوگوں کے سوا کسی نے ان کی تحریک اسلامستان کی تائید نہیں کی۔ ان کی ناکام کوشش سے صرف ایک فائدہ ہوا۔ اس خیال کی مزید تصدیق ہو گئی کہ مسلمان ملکوں کا سیاسی اتحاد ناقابل عمل ہے۔

صرف تیسری صورت یعنی معاشی اتحاد کی تجویز ایسی تھی جس میں حکومت پاکستان کو امید کی جھلک نظر آتی تھی۔ اکثر مسلمان ملک خالص زراعتی ہیں۔ بعض میں معدنی دولت بھی ہے۔ لیکن صنعت برائے نام ہے اور ابھی ایک مدت اس کی ترقی کا امکان بھی نہیں ہے پاکستان میں تھوڑی سی بہت صنعت موجود ہے اور اسے ترقی دینے کے کچھ وسائل بھی ہیں۔ اس لئے مسلمان ملک جو اور ملکوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے قریب ہیں اگر معاشی میدان میں مل کر کام کریں تو اس میں ان سب کا فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی یہ پالیسی ہے کہ ایشیائی ملکوں کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے مارشل ایڈ کے پیمانے پر تو نہیں مگر ایک چھوٹے سے پیمانے پر مدد دے تاکہ وہ سیاسی اور معاشی حیثیت سے اس کے دائرہ اثر میں آ جائیں۔ اس کے لئے وہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ مغربی یورپ کی طرح یہاں بھی معاشی گروپ بن جائیں اور ان میں باہمی تعاون ہو۔ جنوب مشرقی ایشیائی گروپ سے ابھی وہ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہا ہے اس لئے کہ وہ بغیر ہندوستان کی شرکت کے نہیں بن سکتا اور ہندوستان ذرا سرکش معلوم ہوتا ہے۔ مشرقی وسطی اور متصل ملکوں کا "اسلامی گروپ" بنانا زیادہ سہل اور کارآمد نظر آتا ہے۔ اس سازگار حالات کو مدنظر رکھ کر پاکستان نے "اسلامی ملکوں کی سیاسی کانفرنس" منعقد کی، جس کی کارروائی آپ اخباروں میں پڑھ چکے ہیں۔

کانفرنس اس لحاظ سے بہت کامیاب رہی کہ اس میں افغانستان سے لے کر ٹیونس اور الجیریا تک سب مسلمان ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور انھوں نے ان سب ملکوں کے معاشی مسائل اور ان کے حل کرنے کی تدبیروں پر غور کیا، ان کا ٹھوس نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی تعاون کے لئے ایک مستقل ادارہ بن گیا جس کے صدر پاکستان کے وزیر مالیات غلام محمد منتخب ہوئے لیکن معاشی تعاون اور معاشی اتحاد میں فرق ہے۔ معاشی اتحاد کے لئے کم سے کم شرط یہ ہے کہ باہمی تجارت کی راہ میں درآمد برآمد کے لیسنس اور محصول وغیرہ کی جتنی پابندیاں ہیں وہ اٹھا دی جائیں۔ یہ مسئلہ چھیڑا تھا مگر اس پر غور کرنا اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا۔

بہرحال معاشی تعاون کی جو تجویزیں اس کانفرنس میں منظور ہوئی ہیں ان سے آگے چل کر جب پاکستان کی صنعت فروغ پانے لگے گی خود اس کو اور دوسرے مسلمان ملکوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ اس وقت بھی دو فائدوں کی امید ہے۔ ایک یہ کہ آپس میں تجارت کچھ بڑھ جائے گی۔ دوسرے یہ کہ امریکہ سے مدد ملنے میں آسانی ہوگی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کانفرنس کے ختم ہونے میں امریکہ سے مسٹر میک گی پاکستان پہنچے اور انھوں نے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے دوستانہ جذبات کا اظہار کیا اور اسی کے ساتھ لیاقت علی خاں صاحب کو امریکہ جانے کی دعوت ملی۔

یکم جنوری ۱۹۵۰ء سے "نئی روشنی" کی طباعت اور اشاعت کا انتظام مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ اخبار کو صورت کے لحاظ سے زیادہ خوشنما اور دلکش اور مضامین کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جائے۔ نئے سال سے کئی چیزیں نئی شروع ہوں گی

۱۔ "نئی روشنی" کے مدیر کا ایک ناول "آزادی کی زنجیریں" جس میں موجودہ زمانے کے ایک نوجوان کی نفسیاتی کش مکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بہ اقساط شائع ہوگا۔

۲۔ عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کی سیاست اور عام حالت پر مستند مضامین جن کے لکھوانے کا خاص انتظام کیا گیا ہے ہر دوسرے تیسرے ہفتے چھپتے رہیں گے

۳۔ دو ہفتے میں ایک بار اور ضرورت ہوئی تو ہر ہفتے "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کے مختصر مراسلات مسائل حاضرہ اور علمی ادبی مسائل کے بارے میں شائع کئے جائیں گے

۴۔ صرف وہی خطوط چھاپے جائیں گے جنھیں ادارہ منتخب کرے۔ لمبے خطوں کو مختصر کر کے دیا جائے گا۔ عبارت میں حسب ضرورت جزوی اصلاح بھی کی جائے گی۔

۵۔ پڑھنے والے مختلف مسائل کے بارے میں جو سوالات کریں گے ان کے جواب ادارے کی طرف سے یا اگر زیادہ پیچیدہ ہوئے تو ان مسائل کے ماہرین کی طرف سے شائع کئے جائیں گے۔ یہاں بھی انتخاب سے کام لیا جائے گا۔ صرف ان سوالات کے جواب دئے جائیں گے جو عام دلچسپی کے ہوں۔

"نئی روشنی" کی مالی حالت ابھی تک قابل اطمینان نہیں ہے لیکن قدر دانوں کی ہمت افزائی نے ہماری ہمت بڑھا دی ہے اور ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے گا ہم اسے جاری رکھیں گے۔ پھر بھی جب تک کوئی اخبار اپنا خرچ خود نہ نکالے چند دوستوں کی امداد سے نہیں چل سکتا اور نہ اسے چلنا چاہئے۔ ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والوں میں سے جو حضرات یہ محسوس

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دنیا کی رفتار

ہندوستان

کشمیر کا قضیہ

کشمیر کمیشن کی رپورٹ بمع اختلافی نوٹ کے شائع ہوئی اور سیکورٹی کونسل کو اس پر غور کرنے کا موقع ملا۔ مختصر رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ کمیشن جنگ رکنے میں تو کامیاب رہا، لیکن ہندوستان پاکستان میں سمجھوتہ کرانے میں اسے کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہونے کی امید ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کمیشن کو توڑ دیا جائے اور دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کا کام کسی ایک شخص کے سپرد کیا جائے۔ رپورٹ کے ساتھ وہ اختلافی نوٹ تھے ایک بلجیم کے نمائندے کا جس نے لکھا ہے کہ کشمیر کی طرف سے ہند کی آئین ساز اسمبلی میں چار نمائندوں کا نامزد کیا جانا قانوناً درست تھا لیکن سیاسی حیثیت سے نامناسب تھا دوسرا چیکوسلواکیہ کے نمائندے کا جس نے کمیشن کی ناکامی کے دو سبب بتائے ہیں۔ (۱) اس نے دونوں فریقوں کو راضی رکھنے کے خیال سے دو اہم سوالات یعنی آزاد کشمیر کی فوج، اور شمالی سرحدی علاقے کے بارے میں خاص کرکے ایسی گول گول باتیں کیں جن کا مطلب حکومت ہند نے کچھ سمجھا اور حکومت پاکستان نے کچھ اور (۲) اس نے گول میز کانفرنس کو جس پر دونوں ملک راضی ہوگئے تھے بے وجہ ملتوی کرا دیا اور مسٹر اٹیلی اور اس کے بعض ممبروں نے پریسیڈنٹ کو چپکے سے اشارہ کردیا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کرکے ثالث مقرر کرنے کی رائے دیں اور پھر یہی تجویز اپنی طرف سے بھی پیش کردی حالانکہ سیکورٹی کونسل نے جو ہدایتیں دی تھیں ان کی رو سے اسے اس قسم کی تجویز پیش کرنے کا حق تھا اور نہ مسٹر اٹیلی اور پریسیڈنٹ ٹرومین کو۔ اس نوٹ سے کمیشن کے باہمی اختلافات اور اس کے طریق کار پر روشنی پڑتی ہے اور یہ اچھی طرح ظاہر ہوجاتا ہے کہ حکومت ہند ثالثی کی تجویز کو رد کردینے میں بالکل حق بجانب تھی۔

سیکورٹی کونسل کا یہ اقدام قابل تعریف ہے کہ اس نے رپورٹ کے بارے میں تشدد دکھایا اور بے نتیجہ بحثوں کے چھڑنے سے پہلے اپنے پریسیڈنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ ہند اور پاکستان کے نمائندوں سے گفتگو کرکے اس کی کوشش کریں کہ وہ سیکورٹی کونسل کی طرف سے کسی ایسے شخص کے تقرر کو خوشی سے منظور کرلیں جو ان میں مصالحت کرا دے۔ اصل بات یہ ہے کہ کشمیر کے قضیے کو توڑنے اور واقعات کی منطق نے قریب قریب طے کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ کوئی مصلحت بیں اور موقع شناس آدمی جس پر فریقین کو اعتماد ہو بیچ میں پڑ کر یہ سمجھائے کہ حقیقت کو تسلیم کر لینا کمزوری نہیں بلکہ بڑی مضبوطی اور دانشمندی کی بات ہے۔

ہندو کوڈ بل

ہندوستانی پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں سب سے بڑا اور معرکے کا مسئلہ ہندو کوڈ بل کا ہے جیسا کہ ہم پہلے ایک بار کہہ چکے ہیں یہ بل پچھلے چند سال میں کئی بار اسمبلی کے سامنے آچکا ہے۔ اس بل کے مخالف اسمبلی کے اندر اور باہر تعداد میں کم ہیں مگر ان کی مخالفت اس قدر شدید ہے کہ اب تک حکومت اس کو نظر انداز کرکے بل کو قانون بنا دینے میں پس و پیش کرتی رہی اور معاملہ برابر ٹلتا رہا مگر اس بار وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے مضبوطی کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ حکومت بل کو ملتوی نہیں ہونے دے گی۔ اور اگر اسمبلی نے اسے منظور نہ کیا تو استعفا دیدے گی۔ مگر وہ مخالفوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس پر راضی ہوگئے ہیں کہ ایک کمیٹی جو دونوں فریقوں پر مشتمل ہو بل پر نئے سرے سے غور کرے اور اس کی کوشش کی جائے کہ جزوی ترمیموں کے بعد اسے اتفاق رائے سے پاس کیا جائے۔

مگر جیسا کہ وزیر اعظم نے اپنی ۱۹ دسمبر کی تقریر میں فرمایا اس وقت حکومت کو زیادہ اصرار اس پر ہے کہ ہندوؤں کا سماجی قانون ایک کوڈ کی شکل میں آجائے اور یہ اصول مان لیا جائے کہ آئین ساز مجلس اس میں حسب ضرورت ترمیم کرسکتی ہے۔

پاکستان

ناقابل تلافی نقصان

پچھلے ہفتے پاکستان میں دو ایسے حادثے ہوئے ہیں جن کا غم انگیز یاد ایک عرصے تک بھلائی نہ جاسکے گی۔ ایک تو کراچی سے کوئی ۵۰ میل کے فاصلے پر ہوائی جہاز کا نہایت اندوہناک حادثہ پیش آیا جس میں وہ مسافروں میں سے ایک بھی نہ بچ سکا۔ ان میں پاکستان کے دو قابل اور ہونہار نوجوان جنرل اور پانچ عرب ملکوں ——— ٹیونس الجیریا، مراقش، مصر اور دمشق ——— کے نمائندے بھی تھے جن کے غم میں پورا عالم اسلام شریک ہے۔

دوسرا واقعہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی اچانک وفات ہے آپ برصغیر ہند کے چوٹی کے عالموں میں سے اور پاکستان کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا حصہ خالص مذہب کی خدمت میں گذرا۔ اگرچہ آپ جمعیتہ العلماء کے اہم عہدہ دار رہے تھے پھر بھی سیاست سے بڑی حد تک الگ رہے، مگر جب مسلم لیگ کا بہت زیادہ زور بڑھا، تو آپ بھی اس میں شریک ہوگئے اور آپ نے جمعیتہ العلماء کے مقابلے میں جمعیتہ الاسلام کی بنیاد رکھی۔ آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے بھی ممبر تھے، اور لوگوں کا بیان ہے کہ آپ ہی کی کوششوں سے "بنیادی قرارداد" میں اسلام کا نام آیا ہے

غرض دونوں فوجی جنرلوں اور مولانا عثمانی کی وفات سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم اپنے پڑوسی کے اس غم میں پوری ہمدردی کے ساتھ شریک ہیں۔

پہلے روس یا امریکہ؟

جس زمانے میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر ٹرومین کا دعوت نامہ ملا تھا، اسی زمانے میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں کو روس کا دعوت نامہ ملا۔ اس وقت عام طور پر اس کو جوابی کارروائی سمجھا گیا تھا۔ مگر معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر وزیر اعظم ابھی تک ماسکو نہیں جاسکے ہیں۔ اب انہیں امریکہ سے بھی دعوت نامہ ملا ہے جسے انہوں نے قبول فرما لیا ہے اور مئی میں جانے کا پروگرام بھی بن گیا ہے۔ اس سے ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات کو ایک دلچسپ موضوع بحث مل گیا ہے۔ لیاقت علی صاحب پہلے روس جائیں گے یا امریکہ؟ اس سلسلے میں بعض اخبارات نے قیاس آرائی کی ہے کہ وزیر اعظم پاکستان کے ابھی تک روس نہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے چند مقاصد تھے جن کے بارے میں روس کی طرف سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا، توقع ہے کہ ان دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات قائم ہوجانے کے بعد اس سلسلے میں پھر گفتگو ہوگی۔ روس میں پاکستانی سفیر شعیب قریشی صاحب ماسکو پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے کہ روسی سفیر بھی بہت جلد پاکستان آجائے گا۔

قیوم خاں کی مخالفت جاری ہے

صوبہ سرحد میں رائے عامہ کو دبانے اور عبدالقیوم خاں اور ان کی وزارت کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو ختم کرنے میں لیگ کی حکومت اپنی تمام سختیوں کے باوجود بالکل ناکام رہی ہے۔ چند ضمنی انتخابات ہونے والے ہیں اس لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے لیاقت علی خاں ابھی حال میں صوبہ سرحد کا دس روز کا دورہ کرکے کراچی واپس ہوئے ہیں۔ حسب معمول اس دورے میں بھی انہوں نے عوام کی توجہ کو دوسری مسائل خصوصاً کشمیر کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی ہے مگر عوامی لیگ کے رہنما اور کارکن جس سرگرمی اور استقلال سے کام کر رہے ہیں اس کے پیش نظر امید ہے کہ وزیر اعظم صاحب زیادہ عرصے تک عوام کی توجہ کو اصل مسائل سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے

ع۔ ل

بزم بے تکلف

"خیر تو ہے شیخ جی، آپ کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا نصیب دشمناں مجھلی بکری کی طبیعت پھر کچھ ناساز ہو گئی؟"

"نہیں جی بکریاں تو خدا کے فضل سے سب اچھی ہیں۔ یہ بکری کی بیماری نہیں آدمی کا آزار ہے جس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آدمی کی نہ کہیے۔ اس لئے تو اللہ میاں کا بھی ناک میں دم کر دیا۔ ایسا ظلوم و جہول تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"کیا خوب آپ بھی کیا سمجھے ہیں۔ بھلے آدمی آخر آدمی کے بشر کے سوا کچھ اور بھی تو معنی ہیں؟"

"اچھا سمجھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ بھی اہل پنجاب کی طرح آدمی کو مرد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔"

"ارے مرد آدمی کچھ تو عقل سے کام لے، میں کوئی عورت ہوں جو مرد کے ظلم کی فریاد کرتا پھروں گا؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

"اب تو مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تم حماقت سے نہیں شرارت سے کام لے رہے ہو، تمھیں نہیں معلوم کہ آدمی نوکر کو کہتے ہیں۔"

"ارے توبہ! آپ نوکر کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر شیخ جی آپ کا نوکر تو دیکھنے میں آپ سے بھی زیادہ جنتی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے آپ کا ناک میں دم کیسے آ گیا؟"

"تم گھسیٹے کو کہہ رہے ہو، وہ بچارا تو کئی مہینے ہوئے مر گیا۔"

"ع ۔ افسوس کہ موت نے گھسیٹا۔ پھر اب مرحوم کی گدی کس نے سنبھالی ہے؟"

"اسی کا ایک بھتیجا ہے وفائی۔ مگر جتنا وہ مستعد اور بے عذر تھا اتنا ہی یہ مکرا اور حجتی ہے۔ فرماتے ہیں میاں بکریاں نہ چراؤں گا یا تو گھر کا کام کرا لیجئے یا بکریاں چروا لیجئے اب بتائیے میں کیا کروں۔ اس عمر میں خود بکریاں چراؤں؟"

"خیر عمر کی تو کوئی بات نہیں۔ آخر گھسیٹے مرحوم بھی آپ کی طرح پچاس کے لگ بھگ تھے، اور بکریاں چراتے تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ یہ ریش و فش بکریوں کی صحبت میں دیکھا جانا مناسب نہیں۔ لوگ نہ معلوم کیا سمجھیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آزادی غریبوں کی کیا درگت بنائے گی۔ آدمیوں کو ایسے دن لگے ہیں جیسے وہ آقا ہوں اور ہم نوکر۔"

"شیخ جی آزادی بچاری سے آپ کیوں خفا ہیں، نوکر شاہی تو انگریزوں کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ مگر ایک بات تو جیوں، انصاف سے کہیے گا۔ اب کسی آدمی سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ صبح اٹھ کر آپ کے بچوں کے پوتڑے دھوئے۔ آپ کے لئے پانی کا سبیتا کرے، ناشتہ تیار کرے، برتن دھوئے، مسالا پیسے، بازار سے سودا لائے کھانا پکائے۔ دوپہر سے ڈنڈا لیے، بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرے، کساؤں اور مالیوں سے جھک جھک کرے اور شام کو گھر گئے تو پھر وہی صبح کا سا چکر آدھی رات تک چلتا رہے، آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا۔"

"تو یہ کوئی انوکھی بات تھوڑا ہی ہے۔ آخر گھسیٹے مرحوم بھی تو آدمی تھا۔ وہ یہ سب کام کرتا تھا یا نہیں؟"

"شیخ جی آدمی تو تھا مگر یہی سب کام کرتے کرتے بچارا مرحوم ہو گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ وفائی بھی جلدی سے وفات پا جائے۔"

"موت زندگی تو خدا کے ہاتھ ہے۔ اس پر کس کا اختیار ہے؟"

"شیخ جی یہ اختیار کبھی کبھی بندے کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک گوشت پوست کے انسان سے مسلسل اٹھارہ گھنٹے کام لے وہ ملک الموت نہیں تو اس کا داہنا ہاتھ ضرور ہے۔"

"توبہ! تم نے تو میرا دل ہلا دیا مگر کام تو آخر ہونا ہی ہے، میں کروں تو کیا کروں۔" م

"ہم بتائیں آپ یہ کیجئے کہ آدمی کو آدمی سمجھئے، خود بھی آدمی بن جائیے اور اس کا بوجھ بٹائیے۔"

آزمائش

فضا ابن فیضی

نہ تن کی آزمائش ہے نہ سر کی آزمائش ہے
محبت دردِ دل، خونِ جگر کی آزمائش ہے

حزف کی انجمن میں لعلِ تر کی آزمائش ہے
یہ دنیا ہی فریبِ خیر و شر کی آزمائش ہے

کشاکش جلوۂ و ظلمت کی ہے صرف اس قدر یعنی
گریبانِ شب و جیبِ سحر کی آزمائش ہے

ہر ایک تخریب میں خوش رنگیٔ تعمیر پنہاں ہے
خزاں بھی موسمِ دیوانہ گر کی آزمائش ہے

ابھی تہذیب اپنے دورِ طفلی سے گزرتی ہے
ابھی دنیا میں تہذیبِ بشر کی آزمائش ہے

ستارے تیری ہی شوخیٔ نظارہ کا پرتو ہیں
فلک تیرے ہی آہنگ سفر کی آزمائش ہے

مہ و انجم ترے دامن کی زینت ہیں مگر ناداں
یہ دوری تیری پروازِ نظر کی آزمائش ہے

تو اپنے عصر کا روح الامیں ہے بے خبر انساں!
فرازِ عرش تیرے بال و پر کی آزمائش ہے

لبِ ناقوس سے ابلا ہے پھر ایک شور دہریت
سرودِ ممبر و محراب و در کی آزمائش ہے

ضرورت کی فضا میں شعلۂ ایجاد ہے رقصاں
شکستِ آئینہ، آئینہ گر کی آزمائش ہے

وہ ایک سرجوش بیداری جسے ہم موت کہتے ہیں
اسی خوابِ حیاتِ مختصر کی آزمائش ہے

رکا ہے کارواں اپنا سیاست کے دوراہے پر
خضر کا امتحاں ہے راہ بر کی آزمائش ہے

غلط ہوتا ہے کب آخر غمِ دورِ ملوکیت
مئے جمہور کے کیف و اثر کی آزمائش ہے

دوا ہوتی ہے جتنی کچھ مرض بڑھتا ہی جاتا ہے
نگاہِ دوربینِ چارہ گر کی آزمائش ہے

کھلے جاتے ہیں ٹانکے اور بھی کچھ ضرب سوزن سے
نہ پوچھو اضطرابِ بخیہ گر کی آزمائش ہے

مزاجِ خسروی برہم ہے کیوں میری فقیری پر
فقیری سطوتِ تاج و کمر کی آزمائش ہے

تمدن زہر کا اک ساغرِ لبریز ہے ساقی!
ترے بادہ کشانِ معتبر کی آزمائش ہے

مکان و لامکاں میں لے فضا دیوانگی میری
جمودِ دانشِ اہلِ نظر کی آزمائش ہے

تہذیب کی صبح

سید سخی حسن نقوی

ہزاروں برس پہلے ایک آدمی تھا، دیکھنے میں تو سچ مچ آدمی تھا مگر عادتیں سب جانوروں جیسی تھیں، ہماری اور تمہاری طرح وہ اور اس کے بچے دو پاؤں پر سیدھے کھڑے ہو سکتے تھے۔ ہماری طرح اس کے دو ہاتھ، دو ٹانگیں، کان، آنکھیں اور سب باتیں ویسی ہی تھیں جیسی ہماری ہیں، مگر نہ اس کے سر پر ٹوپی تھی نہ پیر میں جوتا نہ بدن پر لتا۔ ننگ دھڑنگ ادھر ادھر ڈھوروں کی طرح چارے کی تلاش میں آوارہ پھرتا تھا۔ اگر اس قسم کا جانور انسان آج ہمارے باغ میں گھس آئے تو ہم اسے فوراً کانجی ہاؤس میں بند کر دیں۔ مگر اس وقت نہ کانجی ہاؤس تھے، نہ بند کرنے والے۔ وہ تھا اور اتنی بڑی عظیم الشان دنیا، اس کے لئے آسمان کے سوا دوسری چھت اور زمین کے علاوہ کوئی اور بچھونا نہ تھا، شیر چیتے، ہاتھی اور دوسرے خوفناک جانور اس وقت بھی موجود تھے، اس لئے وہ جان بچانے کے لئے پہاڑ کی کھوؤں اور غاروں میں جا گھستا تھا۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر ہمارے سونے کے کمرے میں ہاتھی گھس آئے تو ہم کتنے گھبرائیں۔ غاروں میں جنگلی جانور بھی گھس آتے تھے اور اس کی نیند کو خراب کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ ڈر کے مارے درختوں پر چڑھ جایا کرتا تھا اور بعض اوقات خوں خوار جانوروں کے خوف سے اسے ساری رات وہیں بسر کرنی ہوتی تھی اور پیڑ کے گدے اس کے لئے نرم نرم بچھونے کا کام دیتے تھے۔ اس کے کھانے پر عام طور سے پھل پھلار ہوا کرتے تھے۔ اور جب پھل نہ ملتے تو بے چارہ درختوں کے پتے چاب کر گذارہ کر لیا کرتا تھا، اپنی بیگم صاحبہ اور بچوں سے ان کی گفتگو سننے کے قابل ہوا کرتی تھی، عجیب خیانہ آوازیں نکال کر یا سیٹیاں بجا بجا کر وہ آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور کتنا لطف آتا ہوگا جب ان کے بچے صبح صبح اٹھ کر اپنے ابا جان اور اماں جان کو بجائے تسلیم اور نمستے کے خیاؤں خیاں سلام کرتے ہوں گے۔

آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان ہزاروں برس پہلے کے انسان اور جانوروں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ مگر جس عقل کی مدد سے انسان آج دنیا کا مالک بن لیا ہے وہ اس میں ہزاروں برس پہلے بھی موجود تھی اور سچ پوچھئے تو یہ عقل ہی ایسی چیز ہے جس نے حیوان اور انسان میں فرق پیدا کر دیا ہے، اس لئے ہم لوگ اس شخص کو جس میں عقل نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے الّو اور گدھے کا خطاب دے دیا کرتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ بچوں کو چور سپاہی کھیلنا یا گڑیاں کھیلنا کس نے سکھایا ہے تو وہ جواب دیں گے کہ ہمارے بڑوں نے۔ بلکہ جو کام وہ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہی کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح انسان نے بھی وہی کرنا شروع کر دیا جو جانور کرتے تھے۔ مثلاً جانور گھاس پھوس اور درخت کے پتے کھاتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی وہ بھی کھانے لگا۔ جانور غاروں میں چھپتے تھے وہ بھی غاروں میں چھپنے لگا۔ عقل اس میں موجود تھی اس لئے ضرورت پڑنے پر جب اس نے اپنی عقل کو استعمال کیا تو اپنے آرام کے لئے ایسی چیزیں معلوم کر لیں جو اس کے لئے بڑی ضروری تھیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اس نے معلوم کی وہ آگ تھی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ کبھی کبھی جنگلوں میں آپ ہی آپ آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ جن یا بھوت نہیں لگاتے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ دو پتھروں کے آپس میں ٹکرانے سے شعلہ نکلتا ہے اور آس پاس کے سوکھے گھاس پھوس آگ پکڑ لیتے ہیں اور جنگل کا جنگل بھڑک اٹھتا ہے، شاید آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ریل کے پہیئے جب پٹری سے رگڑ کھاتے ہیں تو چنگاری نکلا کرتی ہے۔ اور دور کیوں جائیے۔ ابھی ابھی تجربہ ہو جائے گا۔ انگلی کو ہتھیلی پر گھسئے تو انگلی گرم ہو جاتی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ایک دن رات کے وقت انسان نے شیر کو بھگانے کے لئے موٹا سا پتھر پھینک کر مارا ہو اور وہ پتھر کسی دوسرے پتھر سے ٹکرایا ہو اور شعلے سے آس پاس کی سوکھی گھاس جلنے لگی ہو۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس قسم کے تجربے سے وہ آگ بنانا سیکھ گیا۔ اس طرح جب پہلی بار آگ جلی ہوگی تو اس نے ضرور یہ کوشش کی ہوگی کہ یہ بجھنے نہ پائے اور وہ خود اس کی بیگم صاحبہ اور اس کے بچے آگ میں برابر خشک پتیاں اور لکڑیاں ڈالتے رہے ہوں گے، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے یہ بھی سیکھ لیا کہ وہ پتھروں کو رگڑ کر جو شعلہ نکلے اسے سوکھی گھاس پر ڈالیں اور جب چاہیں آگ بنا لیں۔

جو آرام ہمیں بجلی کی روشنی، بندوق اور ہیٹر پہنچا رہے ہیں وہ ہزاروں برس پہلے کے لوگوں کو آگ نے پہنچایا۔ جاڑے میں وہ اور اس کے بیوی بچے آگ سے تاپتے تھے۔ ان کے غاروں میں اندھیرا اور ٹھنڈ رہتی تھی۔ آگ سے وہ انھیں گرم اور روشن کر لیتے تھے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ خونخوار جانور آگ سے ڈر کر اس کے پاس نہ پھٹکتے تھے۔ اور رات کو اسے ڈر کے مارے پیڑ کے گدوں کی ہوا نہ کھانی پڑتی تھی، اور غار کے سامنے جب وہ آگ جلا دیتا تھا تو جانور اس کو دق نہ کرتے تھے اور وہ اطمینان سے رات بھر پاؤں پھیلا کر سوتا رہتا تھا۔

آگ جلانا کیا سیکھا انسان ترقی کے راستے پر پڑ گیا، ہمارے آپ کے لئے آگ کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن میری بات مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ ریل، ہوائی جہاز اور ریڈیو کے موجد سے ہمارا آگ کا موجد کسی طرح کم نہ تھا۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور انسان نے اپنی عقل سے کام لیا، اس نے ایک اور بڑی زبردست اور حیرت انگیز ایجاد کر ڈالی۔ یہ چاقو کی ایجاد تھی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بھی کوئی ایجاد تھی، اور واقعی چاقو ہم لوگوں کے لئے نہایت ہی معمولی چیز ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کا شمار دنیا کی بڑی سے بڑی ایجادوں میں ہونا چاہئے کیونکہ اس ایجاد سے اس نے نہ معلوم کتنی اور چیزیں معلوم کر لیں۔ چاقو اس طرح ایجاد ہوا کہ انسان پھل پھلار یا مچھلیاں کھایا کرتا تھا۔ بعض پھل ایسے ہوتے ہیں جو دانت سے نہیں توڑے جا سکتے، اور ان کے لئے چاقو کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اخروٹ جیسے سخت پھلوں کو دو پتھروں سے توڑ لیا کرتا تھا۔ موٹے اور گول پتھر کو اگر توڑ کر اگر دو ٹکڑے کر دئے جائیں تو دونوں حصوں کے کناروں پر بڑی تیز دھار بن جاتی ہے۔ اگر آپ اس کے کناروں پر ذرا زور سے انگلی پھیر دیں تو آپ کی انگلی کٹ جائے۔ اور خون بہہ نکلے۔ کیونکہ اس کا کنارہ چاقو کی طرح بالکل تیز ہوتا ہے۔ ایک دن اتفاق سے اخروٹ توڑنے میں پتھر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور انسان نے یہ معلوم کر لیا کہ موٹے اور گول پتھر کا کنارہ ٹوٹنے کے بعد تیز ہوتا ہے، اس کے بعد ایک عرصے تک پتھر کے ٹکڑوں کی دھار سے گوشت اور پیڑ کی پتیاں اور شاخیں کاٹنے کا کام لیتا رہا۔ اصل میں یہی اس کا پہلا چاقو تھا۔ مگر یہ ایسا تھا کہ اگر کہیں ہم دیکھ پائیں تو کبھی بھی اسے چاقو کہنے کے لئے تیار نہ ہوں، انسان بھی اس سے خوش نہ تھا۔ اور زیادہ دن نہ گذرے کہ اس نے ایک اور چیز معلوم کر لی۔ اگر ہم موٹے گول پتھر کو توڑ کر ٹکڑے کر دیں تو وہ ٹکڑے نہایت عمدہ پتریوں کا کام دیں گے جب انسان نے یہ معلوم کر لیا تو اس نے باقاعدہ پتھر کی چھوٹی چھوٹی تیز پتریاں چھیلنا گیا، اور ان پتریوں سے وہ بہتر چاقو بنانے لگا۔ جو اس کے پہلے چاقو سے زیادہ تیز اور عمدہ تھا۔ موٹے موٹے ٹکڑوں سے وہ ایک ایسی چیز بنانے لگا جسے ہم کلہاڑی کہتے ہیں چلتے چلتے اسے ایک اور چیز معلوم ہو گئی وہ یہ کہ پہلے جب اسے چاقو بنانا ہوتا تھا تو جو ٹکڑے عمدہ ہوتے انھیں وہ رکھ لیتا۔ اور انھیں کام میں لاتا اور باقی ٹکڑوں کو بیکار سمجھ کر پھینک دیا کرتا تھا۔ اب اس نے یہ معلوم کر لیا کہ جن ٹکڑوں کو وہ پھینک دیا کرتا تھا انھیں بھی کام میں لایا جا سکتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا تو ضرور ہنسا ہوگا اور سخت غصہ آتا ہوگا۔ اب وہ ان ٹکڑوں کو پھینکنے کی بجائے کام میں لانے لگا۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ایک شعر

ضیاء الفاروقی

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو آزادی ملی اور وہ خواب جو الہلال اور البلاغ کے صفحات خطبات اور مکتوبات میں دیکھا اور دکھایا گیا تھا شرمندۂ تعبیر ہوا۔ گویا ہندوستان کو منزل مل گئی اور قافلہ رک گیا۔ کانگریس کی انقلابی سرگرمیوں کا پھیلاؤ سمٹنے لگا یا یوں کہئے کہ موجیں ساحل پر پہنچ کر منتشر ہونے لگیں۔

بطبع ہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

غالباً ۱۹۴۶ء کی جولائی تھی۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک نوٹ بک دکھائی جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے آٹوگراف تھے۔ میں نوٹ بک کے صفحات الٹتا رہا۔ ایک صفحہ پر نظر جم گئی۔ اس پر ابوالکلام آزاد لکھا ہوا تھا اور ایک شعر پیغام عمل دے رہا تھا۔ شعر یہ تھا:-

بطبع ہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

ناظرین اگر اجازت دیں تو اس شعر کی تفسیر خود مولانا کے الفاظ میں بیان کر دوں۔ "غبار خاطر" میں اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:-

"پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا۔ ناچار دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا ؎

کار مشکل بود ما برخویش آساں کردہ ایم

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار [illegible] ہیں وہ نہ تو راہ کی مشکلوں [illegible] سے ناآشنا ہوتے ہیں [illegible] اور درماندگیوں سے بے خبر [illegible] تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں، کیونکہ قدم اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے امتیازیوں کے ساتھ بار بار ان کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامن عزم و ہمت سے الجھ جاتی ہیں، تاہم ان کا سفر جاری رہتا ہے وہ زمانے کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے لیکن زمانے کے اوپر گذر جا سکتے تھے اور بالآخر نیا زمانہ گذر جاتے ہیں۔"

اس شعر نے میرے دل و دماغ کی دنیا بدل ڈالی اور اگر میں اس مبارک جولائی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے اپنی ذہنی اور شعوری ارتقا کا حال معلوم ہے اور میں ایمانداری سے معترف ہوں کہ یہ شعر میرے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام تھا، دعوت عمل تھا، تازیانۂ حرکت تھا۔ اس سے پہلے میں ایک شدید قسم کا فرقہ پرست تھا، تنگ نظر تھا اور رجعت پسندی ہی میں مسلمانوں کی بقا دیکھتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے مولانا کی کوئی تصنیف نہیں دیکھی تھی۔ شعر نے دل میں وہ گداز پیدا کر دیا جو دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ صفحۂ قرطاس پر زندگی کے نقوش بکھیرنے والا کسی عظیم شخصیت کا مالک ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے میں نے مولانا کی تمام تصنیفیں پڑھ ڈالیں اور پھر کیا ہوا، دھندھلی تھیاں سلجھیں، تاریکی چھٹی اور زندگی کی صبح طلوع ہوئی، اب راہ صاف دکھائی دینے لگی تھی، اور اگرچہ منزل کا پتہ نہ تھا مگر مطمئن تھا کہ سڑک سیدھی ہے اور کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ مولانا کے مطالعے سے مجھے جو بصیرت ملی اس نے مجھے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء [illegible] علی گڑھ کی دنیا میں اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھنے کا حوصلہ دیا اور میں نے اس رو کے خلاف [illegible] کا اعلان کر دیا جس کے تیز دھارے پر پورا [illegible] بہا جا رہا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی ملی اور وہ خواب جو "الہلال" اور "البلاغ" کے صفحات، خطبات اور مکتوبات میں دیکھا اور دکھایا گیا تھا، شرمندہ تعبیر ہوا۔ گویا ہندوستان کو منزل مل گئی اور قافلہ رک گیا۔ کانگریس کی انقلابی سرگرمیوں کا پھیلاؤ سمٹنے لگا یا یوں کہئے کہ موجیں ساحل پر پہنچ کر منتشر ہونے لگیں۔ انقلاب کے بعد ہندوستان نئے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ مسلمان کی جرأت رندانہ سلب ہو گئی ہے۔ ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پہچان نہیں سکتا۔ اپنے حقوق اور اپنے فرائض کے حدود میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جذبۂ عمل یکسر مفقود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی سے موت کا منتظر ہے۔ [illegible] حالات مولانا کو آواز دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مسجدیں، ممبر اور پلیٹ فارم انھیں پکار رہے ہیں مگر ہر پکار، ہر آواز، ہر چیخ صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی ایک ہوتی ہے اور اپنی وہ زندگی مولانا گذار چکے تو مندرجہ بالا شعر کی تردید ہوتی ہے۔ جو اپنے پیغام اور اپنی روح کے لحاظ سے ابدی معلوم ہوتا ہے اور جس کی پکار قید زمان و مکان سے آزاد ہے اور شاید یہی آفاقی تصور تھا جو آٹوگراف دیتے وقت مولانا کے سامنے ایک نصب العین کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا اس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں مولانا کے سیاسی افکار اس جدید تشکیل میں کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں۔ "بسازی بعالمے" اور "از سر عالم تواں گذشت" کے لئے ہمیں موجودہ زمانے کی کشمکش کو سمجھنا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے آگے دیکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ نئے مسائل میں ڈوب کر ابھرنا ہے۔ اپنی "قوت تسخیر" سے کام لینا ہے اور ایک نیا جہان بنانا ہے۔

فاوسٹ اور اقبال

(بسلسلہ صفحہ ۲)

آدم خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو پیر شود در برم

اقبال کا شیطان بھی گوئٹے کے شیطان کی طرح ایک باوقار اور پر عظمت ہستی ہے۔ اسے بھی کمزور انسان سے بیوپار کرنے کا شوق نہیں۔ جاوید نامہ میں نالۂ ابلیس

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب
صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر
ہیچ گہہ از حکم من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
از [illegible] صید سے مرا آزاد کن
طاعت دیروزۂ من [illegible] کن
پست از و آں ہمت والائے من
وائے من اے وائے من اے وائے من
بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریف پختہ تر باید مرا
آں چناں تنگ از فتوحات آدم
پیش تو بہر مکافات آدم
اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے یابم کہ شاید در شکست

اس کی ہمت بلند اور وسعت نظر کا بین ثبوت ہے۔

خاتمۂ کلام پر اس بات کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصد یہ نہیں کہ اقبال کے بعض افکار کے ماخذ کی تلاش کر کے اس کے درجہ کمال میں کوئی کمی پیدا کی جائے، اقبال ان مفکر شاعروں میں سے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

"روشنی" اور اس کا مصنف

مختار احمد

تیغ کی شاعری اتنی ہی جان دار ہے جتنا اس کا تخلص فرسودہ ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک عجیب تضاد ہے جو اس کی روزمرہ زندگی کا ایک پہلو بھی ہے! اُس کے حلق سے چائے اس وقت تک نہیں اترتی جب تک وہ ٹھنڈا پانی نہ پیتا جائے۔ اس کی سیاسی نظمیں پڑھئے۔ آپ کی نگاہیں اس سیلاب سے دو چار ہوں گی جو گرجتا، گونجتا، چٹانوں اور پہاڑوں سے ٹکراتا، لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی رومانی نظمیں دیکھئے۔ اُن آنسوؤں کی طرف نگاہ اُٹھائیے جو ستاروں کے رخساروں سے ڈھلک کر رات کے سینے پر جھلملا رہے ہیں۔

یہ بات عرصے تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شخصیت دوہری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اتنی متضاد شخصیت! آرا کی اجنبی سڑکوں پر جو شخص بجھے ہوئے چہرے اور جھکی ہوئی آنکھوں سے گمنام آسودگی کی تلاش کرتا ہو، جو شخص اپنے سینے میں ایک بیکراں سناٹے کا گھنگھور اندھیرا لے کر یونیورسٹی کی سڑکوں پر رات رات بھر "روشنی" کی تلاش میں گھومتا ہو، وہی شخص اتنے الجھے ہوئے ذہن کا طالب علم اور اتنے عظیم سیاسی آہنگ کا نباض کیوں کر ہو سکتا ہے؟ پہلے مجھے یہ شبہ ہوا تھا کہ کہیں ایک شکستہ محبت، سیاست سے انتقام تو نہیں لے رہی ہے۔ لیکن پھر میرے لئے یہ چیز معمہ بن گئی کہ تیغ رومانی دور سے گذر کر سیاسی دور میں نہیں آیا وہ اب تک رومانی اور سیاسی دونوں نوع کی نظمیں لکھتا ہے۔

میں ذاتی رموز کا احترام کرتا ہوں لیکن شاید تیغ کو خود اس کی کوئی پروا نہیں۔ لاہور کے رسالے کائنات میں اس نے مختصر سوانح حیات لکھتے ہوئے کہا ہے۔

"میں نے آج تک اپنی نظموں میں کبھی جھوٹ نہیں بولا........"

یہ بات اگر سچ ہے (اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے سچ نہ سمجھیں) تو آئیے ہم "روشنی" کے مصنف کی ذہنی تاریخ مرتب کریں۔ اگر مصنف نے نظموں کے نیچے اُن کی تاریخ لکھ دی ہوتی تو شاید اس ترتیب میں زیادہ آسانی ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

رومانی نظموں میں سے صرف ایک نظم "جبلت" نشاطیہ ہے اور باقی تمام حزنیہ۔ "جبلت" کے پہلے چار شعر یہ ہیں:۔

اس کی بے باکیوں میں غصہ تھا
اس کے غصے میں پیار تھا ساقی
آج اس نوبہار کے رُخ پر
کس غضب کا نکھار تھا ساقی
ایک سرکش امنگ سینے میں
اس طرح اپنا سر اُٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں
اُس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی

لیکن شاید یہ ناچتا ہوا لمحہ عظیم وقت کی برنائیوں کا دھوکا تھا" اس لئے کہ اور کسی نظم میں اس تاثر کا اشارہ بھی نہیں۔ اس کے بعد انتہائی المیہ نظمیں آتی ہیں ——"جستجو" "خودکشی" "ایک المیہ کردار سے" "مجھے مر لینے دو" "احساس" "خود فراموشی" وغیرہ —— "خود فراموشی" میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی ہمیں تلاش تھی

اب اندھیرا ہی اندھیرا میرے سینے میں
روشنیٔ عزم چراغاں کا جگر توڑ گئی
جس پہ رکھ دی تھی محبت نے مہ و خور کی اساس
وہ کرن بھی مرے حالات سے منہ موڑ گئی

....

اور ——
کس کی جرأت ہے کہ تجدید کا اظہار کرے
ہاں مگر اس سے یہ ادنیٰ سی شکایت ہے ضرور
اک چرائے ہوئے ناپاک تبسم کے عوض
اس نے بیچا ہے سلگتے ہوئے اشکوں کا غرور

.... خود فراموشی میں ہی یہ دو شعر بھی ہیں ——
آج کل حسن بھی ہے دولت و ثروت کا غلام
آج کل عشق بھی جاگیر ہے سرمائے کی

اور ——
چند مایوس سی چیخوں میں ڈھلے جاتے ہیں
مرے نغمے، مرے آنسو، مری آہیں، مرا فن

ان اشعار کے یہ معنی نکلتے ہیں۔

۱۔ شاعر کا محبوب سرمایہ دار طبقے کا فرد ہے۔
۲۔ شاعر اس سے پیشتر کم از کم ایک لمحہ کے لئے اپنے محبوب کی غلط فہمیاں دور کر سکا ہے۔
۳۔ لیکن محبوب نے اس کے سلگتے ہوئے اشکوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اُسے ٹھکرا دیا ہے۔
۴۔ اور نہ صرف ٹھکرا دیا ہے بلکہ اس کے عوض ایک ناپاک تبسم خرید لیا ہے۔

غزلوں کے یہ شعر سنئے:

اس کرے پہ جس پہ سبھی کر چکی تھی زندگی
چھا گئیں تھیں موت کی خاموشیاں کل رات کو
کون یہ گانے دیپک لے کر لاپروائی سے گذرا تھا
اور بھی بڑھنے لگا سناٹا اور بھی گہرے ہوئے سائے

ذرا سا سکوں تو میسر ہوا ہے وہ اگلی سی بے چینیاں تو نہیں ہیں
یہ مانا اسے زندگی ہم نہیں کہہ سکیں گے مگر نسبتاً زندگی ہو

اس نوجوان عصر ترقی پسند میں
وہ کہنہ یادِ وقت پامال ہے آج بھی
سینہ بہ رنگ عام سنبھلتا نہیں ہنوز
نغمہ بہ طرز خاص پریشاں ہے آج بھی

ان اشعار کے بعد شاید اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں اپنے بیان کے ثبوت میں اور کچھ کہوں........ اور نہیں مجھے تیغ کے رومانی شعور اور سیاسی آہنگ کا راز معلوم ہوتا ہے۔

اگر میرا خیال غلط ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ لیکن ان نظموں کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک سرمایہ پرست محبوب سے محبت کا انجام اتنا بھیانک نہ ہوتا تو ہم تیغ سے کسی اچھا سیاسی نظم کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیغ کی بعض سیاسی نظمیں بالکل صفر ہیں۔ "ہندسی" "تار بدلے گئے" "طوفان سے پہلے" "طلسم ٹوٹ گیا" اور "سیاسی مخبر" جیسی عظیم نظموں کے مصنف نے "حرمت عظمت" اور "آزادی کی پہلی سالگرہ" جیسی گھٹیا نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں تیغ نے سیاست سے شکستہ محبت کا انتقام نہیں لیا ہے، اس کی زیادہ تر سیاسی نظموں میں ایک ایسا ذہن جھلکتا ہے جس نے طبقاتی کش مکش کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، اسے سوچا اور سمجھا ہے اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دی ہے ——

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ تیغ صرف اشتمالی ہی نہیں بلکہ مارکسی نظریے کا حامی ہے۔ "الحاد" کا اتنا بے باکانہ اظہار اردو شاعری میں غالباً اب تک نہیں ہوا ہے........ جوش ملیح آبادی بھی "خدا" کے متعلق یہی راستہ اختیار کرتے رہے

ع گر ہے تو تعجب جو نہیں ہے تو تعجب

انھوں نے جہاں "نئی حمد" اور "ارتقا" لکھی ہے وہاں "میں حیدری ہوں حیدری" اور ——"کیا نما زِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ" جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ تیغ جوش سے یقیناً متاثر ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی بہار یہ انداز ہے جو جوش کے کلام میں ہے، لیکن اس کے باوجود کافی تنوع اور گہرائی بھی —— ہم اپنے عقائد کی بنا پر اسے غلط کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔

"طلسم ٹوٹ گیا" ایک سیاسی نظم ہے۔ لیکن اس کے پہلے دو بند اسی فلسفے کی ترجمانی کرتے ہیں کہ "سرمایہ داروں نے خدا کے تصور کو استحصال کے لئے ایجاد کیا اور فائدہ اُٹھایا۔

بلندیوں پہ شراروں کی گفتگو سن کر
ستارے کانپ رہے تھے کہ جانے کیا ہوگا
فضا میں گونج اُٹھا قہقہہ امارت کا
برا ہمن نہ ہلا گر، تو پھر خدا ہوگا

خدا ہی تھا کہ مہر و قمر کے دریچوں سے
بہ صد غرور، بہ صد ناز، مسکراتا رہا
اسی کے فیض سے دنیا میں مالدار انساں
لہو کے اشک بہا کر غریب تا رہا

اور "انسان پیدا ہو گیا" تو بڑے ہنگامے پیدا کر چکی ہے۔ کانپور کی انجمن اتحاد المسلمین نے اس پر فتوے پاس کئے۔ گورکھپور میں تحفظ مسلمین کے ادارے نے شور مچایا۔ الہ آباد کے "الانصاف" نے لمبے چوڑے مضمون شائع کئے۔ اور ساغر نظامی تک نے لکھا کہ "نظم بے حد دلچسپ ہے .... اس کے بعض اشعار میں بلا کی توانائی ہے۔ لیکن اس دور میں اتنی فیصلہ کن باتوں کی لیے اجازت دی جا سکتی ہے؟" دلتّیا نے اپنی نظم پر ساغر کا یہ ریویو پڑھ کر ہنستے ہوئے کہا تھا ——— فیصلہ کرنے کا وقت تو یہی ہے۔ کل تو سب یہی کہیں گے جو میں آج کہہ رہا ہوں"۔

تیغ کی بعض نظموں میں انانیت ہے۔ یہ انانیت کم موقعوں پر سطحی اور زیادہ تر جگہوں پر بہت لطیف ہے۔ "ایک المیہ کردار سے" کے یہ اشعار سنئے :-

مری خودی بھی ہے زخمی تری خودی کی طرح
مرا ضمیر مگر تابناک شعلہ ہے
ترا مزار ہے اینٹوں کا ایک نقش بلند
مرا مزار مرا دل ہے میرا چہرہ ہے

تری نظروں سے غم بیکراں جھلکتا ہے
مری نگاہ غم بیکراں کا ساحل ہے
تجھے بھی کاش مری طرح یہ خبر ہوتی
کہ ضبط فن کے تقاضوں کی پہلی منزل ہے

جو زہر پی نہ سکا تو حیات سے ڈر کے
وہ زہر اب بھی بدستور پی رہا ہوں میں
شدید کرب میں تو نے تو خودکشی کر لی
شدید تر غم ہستی میں جی رہا ہوں میں

تیغ کی آواز میں چیخیں اور نعرے نہیں ہیں بلکہ اس میں خلاقانہ ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ ستاروں کی خنکی ہے۔ اس کی مشہور نظم "روشنی" کی تابناک کرنیں اس کا بہترین ثبوت ہیں ؎

میری ہمدم مرے خوابوں کی سنہری تعبیر
مسکرا دے کہ مرے گھر میں اجالا ہو جائے

عجیب سی بات ہے کہ جس کلام میں سسکتی ہوئی جوانیوں، بلکتے ہوئے بچوں اور فاقہ زدہ انسانوں کا اصلی حالت کا ذکر ہو اسے پروپاگنڈا کہہ دیا جاتا ——— اور جو شاعر گردو پیش کے حالات سے منہ موڑ کر اپنی ایک الگ سی دنیا بساتا ہے۔ اسے ادب اور آرٹ کا خدا قرار دیتے ہیں ——— اس کے جواب میں، میں تیغ ہی کا وہ جملہ جو اس نے ساغر کے ریویو کو دیکھ کر کہا تھا یہاں دہراؤں گا ——— "کل تو سب یہی کہیں گے جو میں آج کہہ رہا ہوں ——— لیکن آج؟"

چالیس کے بعد ورزش کیسی؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

یہ غلط فہمی عام طور پر پھیل گئی ہے کہ موٹے آدمی کو اپنا وزن کم کرنے کے لئے زیادہ دیر تک سخت ورزش کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خواہ مخواہ موٹا آدمی رات کو ڈٹ کر کھانا کھاتے تھے، سگار جلا کر منہ میں رکھتے تھے اور فرماتے تھے "میں کچھ موٹا ہو گیا ہوں ذرا ٹہل آؤں تاکہ زائد غذا تحلیل ہو جائے"۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس زائد غذا کے تحلیل ہونے کے لئے کوئی ۲۰ میل چلنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں بس اتنی بات کہنی ہے کہ اگر آپ کو موٹاپا اعصاب کو سکون دینے کے لئے ورزش کرنے کا خیال آئے تو جا کر تھوڑی دیر پلنگ پر چپ چاپ لیٹ جائیے اور جب تک یہ خیال دل سے دور نہ ہو جائے لیٹے رہیے۔

(ماخوذ)

تہذیب کی صبح

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

تو جو ٹکڑے ذرا بڑے اور چپٹے ہوتے تھے اُن کی مدد سے جانوروں کی کھالوں سے چربی اتارا کرتا تھا جو ٹکڑے پتلے اور نوکیلے ہوتے تھے ان سے کھالوں میں سوراخ کرکے اُنھیں ایک دوسرے سے باندھ دیتا۔ اب لوگ وہ بہت ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ کیونکہ وہ کپڑے بھی پہننے لگا۔ چاہے وہ کھال کے ہی ہوتے تھے اور جگہ جگہ کھال کے پتلے پتلے فیتوں سے بندھے ہوتے تھے پتھر کے جو ٹکڑے سب سے تیز اور عمدہ ہوتے تھے ان سے وہ تیر کی نوک بناتا تھا اور پھر یہ نوک ایک پتلی سی لکڑی میں لگا کر وہ تیر بنانا سیکھ گیا۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اُسے کمان کے ذریعے تیر چلانا بھی آ گیا۔ اب اُسے کھانا تلاش کرنے میں اتنی دقت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس اب تیر کمان موجود تھے۔ اور وہ جب چاہتا جانوروں کو مار کر ان کا گوشت مزے سے کھا لیا کرتا تھا اگر بڑے جانور جیسے شیر یا چیتا اُسے ستانے کی کوشش کرتے وہ جھٹ اپنا تیر کمان نکال کر ان پر تیر چلاتا جانوروں کے لئے یہ ایک نئی چیز تھی، چوٹ کھا کر وہ چیختے چنگھاڑتے ہوئے بھاگتے اور اسے اکیلا چھوڑ جایا کرتے تھے۔ ان باتوں کو اگر کوئی بڑی بوڑھی سن لیں تو کہے یہ بھی خاک پتھر زمانہ تھا کہ جو چیز دیکھو پتھر کی، چاقو پتھر کے، کلہاڑیاں پتھر کی، تیر کمان پتھر کے، ہر چیز پتھر کی۔ اس لئے ہم تاریخ میں اس زمانے کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔

جب ہم دفتر کے کام پر سے لیٹتے ہیں تو ہمارا کتنا دل چاہتا ہے کہ ہم تھوڑی بہت تفریح کریں کھیلیں، کودیں، سنیما جائیں یا ریڈیو میں اچھے اچھے گانے یا مزے مزے کی کہانیاں سنیں۔ اتنے پرانے زمانے میں ان چیزوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انسان کو روٹی تک ٹھیک نصیب نہ ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی جب اسے کوئی کام کرنے کو نہ ہوتا تو وہ تفریح بھی کیا کرتا تھا اور کسی طرح سے اپنا دل بہلاتا تھا۔ اس نے پتھر کی باریک باریک سوئیاں بنا رکھی تھیں۔ ان سوئیوں کی مدد سے وہ اپنے محل کو سجایا کرتا تھا یعنی اپنے تنگ اور تاریک غاروں کی چھتی اور صاف دیواروں پر طرح طرح کی شکلیں بنایا کرتا تھا آپ جانتے ہیں کہ ایک رنگین تصویر بنانا بہت آسان ہوتا ہے ایک رنگی تصویر کو ہم بھی بہت آسانی سے بنا سکتے ہیں لیکن ہماری طرح اس کے پاس پنسلیں اور برش نہ تھے اور نہ قلم نہ کاغذ نہ رنگ اس لئے وہ اپنی پتھر کی سوئیوں سے فرصت میں بیٹھ کر جانوروں کی تصویریں کھودا کرتا تھا۔ یہ شکلیں بعض غاروں میں آج تک موجود ہیں یہ بڑی بھدی اور بھونڈی ہیں اور کوئی انھیں اگر دیکھے تو نہ معلوم کتنا ہنسے۔ لیکن زیادہ ہنسنا ٹھیک نہیں ہے اور ہمیں اس انسان کا زیادہ مذاق نہ اڑانا چاہیئے۔ کیونکہ ذرا یہ بھی سوچئے کہ یہی انسان ہمارا سب کا دادا تھا۔

تو ہمارے یہ عجیب و غریب دادا جان بڑے چالاک بھی تھے۔ آپ نے یہ تو سن لیا کہ خونخوار جانوروں سے جان بچانے کے لئے کبھی تو وہ ڈر کے مارے پیڑ پر چڑھ جایا کرتا تھا۔ ذرا سمجھ آئی تو پتھر پھینک کر مارنے لگا۔ اس کے بعد تیر کمان سے لڑنے لگا۔ مگر اس کے دقیانوسی تیر کمان سے بھلا شیر چیتے کہاں قابو میں آتے ہوں گے۔ اس لئے وہ ان کے مارنے کے لئے ایک عجیب ترکیب کرتا تھا۔ وہ یہ کہ کسی وقت جب اُسے کوئی ڈر نہ ہوتا تو اطمینان سے بیٹھ کر ایک گہرا سا گڑھا کھود دیتا۔ اس گڑھے کے اوپر بہت معمولی اور کمزور ٹہنیاں رکھتا۔ ان ٹہنیوں پر گھاس پھوس پھیلا دیتا، ایسے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہاں کبھی کوئی کھلا تھا۔ جانور غریب بھلا ان چالاکیوں کو کیا جانیں ایسے نہ ہوں تو اُنھیں جانور کون کہے۔ وہ تیر کھا کر غصے میں اس گڑھے پر سے گذرتے۔ جوں ہی اس پر پہنچتے دھڑام سے اندر۔ پھر اوپر کھڑے کھڑے وہ خوب ہنستا، قہقہے لگاتا۔ اپنی زبان میں خوشی کے گیت گاتا۔ اور نہ معلوم کیا کیا کرتا ہوگا اور اوپر سے اس غریب جانور کی اتنی مرمت کی جاتی کہ وہ بے چارہ ساری چوکڑیاں بھول جاتا۔ اور ساری عمر کا کھایا پیا اگل دیتا۔ اس زمانے میں ایک جانور ہوتا تھا جیسے میمتھ کہتے ہیں۔ یہ جانور بڑا ہی خوفناک تھا۔ ڈیل ڈول میں ہاتھی سے بھی زیادہ اس کے مارنے کے لئے انسان نے اسی قسم کے جال تیار کیے تھے، اس جانور کے پھنسنے کا حال ہمیں غار کی ایک بھدی اور پیچیدہ تصویر سے ہی ہوا ہے۔

یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب تہذیب کا دن نکلنا بس شروع ہی ہوا تھا۔ صبح کا وقت سہانا ہوتا ہے تہذیب کی کہانی بھی اتنی ہی دلچسپ تھی۔

نئی روشنی

دہلی

नई रोशनी देहली

اس پرچے میں

اردو کا مستقبل (مسلسل اول) ڈاکٹر سید عابد حسین

خط نستعلیق امتیاز علی عرشی

آزادی کی زنجیریں رسل

اور دوسرے دلچسپ مضامین

اڈیٹر

ڈاکٹر سید عابد حسین

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین
صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

ہفتہ وار نئی روشنی

دہلی

چندہ سالانہ مے
ششماہی للعہ

تاریخ اشاعت
یکم، ۸، ۱۶، ۲۴

نمبر ۱	یکم جنوری ۱۹۵۰ء	جلد ۴

اُردو کا مستقبل

رالف رسل

مجھے نہیں معلوم آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا یا نہیں کہ میں انگریز ہوکر اردو کا مطالعہ کر رہا ہوں اور غالباً عمر بھر کرتا رہوں گا........ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کے سب سے بڑے کارنامے شاعری اور مختصر افسانے تک محدود ہیں۔ میری بےحد خواہش ہے کہ ان کے علاوہ اردو مصنفین اچھی اچھی ناولیں پیدا کرسکیں۔ مجھے یہ نقطہ نظر پیش کرنے میں ذرا باک نہیں کہ ناول ادب کی اونچی سے اونچی صنفوں میں سے ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اور کوئی صنف نہیں ہے جو اردو ادب کے خزانے میں اس درجہ قابل قدر اضافہ کرسکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو کی عالم گیر ساکھ بڑھا سکتی ہے

(جناب رالف رسل صاحب انگلستان کے رہنے والے اور کیمبرج کے گریجویٹ ہیں۔ جنگ کے زمانے میں آپ فوج میں ہندوستان آئے اور زیادہ تر آسام کی طرف رہے۔ اسی زمانے میں انھیں ہندوستان سے اور اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو سیکھنا شروع کی۔ یہاں سے واپس جاکر انگلستان میں "اسکول آف اورینٹیل سٹڈیز" میں اردو کے جونیر لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اب ان کو ایک ادارے نے وظیفہ دے کر ہندوستان بھیجا ہے کہ وہ اردو ادب کا مزید مطالعہ کریں۔ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ موصوف اچھی خاصی رواں اردو میں گفتگو کرسکتے ہیں۔ انھیں اردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو ان کی اس تقریر سے ملے گا جو انھوں نے دہلی کالج میں کی تھی، اور "نئی روشنی" میں اشاعت کے لئے اس کی ایک کاپی عنایت کی ہے جسے ہم شکریے کے ساتھ جوں کی توں چھاپ رہے ہیں)

مجھے نہیں معلوم آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا یا نہیں کہ میں انگریز ہوکر اردو کا مطالعہ کر رہا ہوں اور غالباً عمر بھر کرتا رہوں گا لیکن یہ میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان میں میرے سب دوستوں نے محسوس کیا کہ یہ بات بہت عجیب و غریب ہے۔ لوگ بار بار پوچھتے تھے کہ "آخر اردو کیوں؟ اردو کیوں پڑھ رہے ہیں آپ؟" چونکہ غالباً آپ بھی اپنے دل میں یہی سوال پوچھتے ہوں گے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سوال کا جواب فوراً دوں۔

اس کا ایک بہت آسان جواب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اردو پڑھنے سے میں روزی کماتا ہوں۔ لیکن یہ ایک ایسا واضح پہلو ہے جسے نظر انداز کرتا ہوں میرے اردو پڑھنے کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں اور میں اس وقت ان ہی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے سمجھنے کے لئے ادب کی کچھ ایسی عام باتوں کا اظہار کرنا ضروری ہے جو صرف اردو تک محدود نہیں۔

آج کل ہر ملک کی تہذیب ایک عالم گیر تہذیب کا جزو بنتی جارہی ہے ترقی یافتہ قوموں کے ممتاز ادبی کارنامے تو عرصہ ہوا محض ان قوموں کی نجی ملکیت نہیں رہے شیکسپیر کے ڈرامے، سروانتیز کی ناول، "ڈان کوئکسوٹ" تالستائی کی WAR AND PEACE یہ ایسی تصانیف ہیں جو ساری دنیا میں مشہور ہیں اور دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آگے چل کر ہر قوم اور ہر زبان عالم گیر تہذیب کے خزانے میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرے گی۔ اور اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ کسی ایسی زبان کے بارے میں جو لاکھوں آدمی بولتے اور لکھتے ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پڑھنے کے لائق نہیں۔ اردو ایک ایسی ہی زبان ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ بہ نسبت انگریزی ادب کے بہت مختصر ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں قابل قدر تصانیف نسبتاً کم تعداد میں ملتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اگر ہم اردو ادب کے صرف ان نئے رجحانات پر نظر ڈالیں جن کی عمر ابھی سو سال سے زائد نہیں ہے اور جن کی قدر کرنے میں مغرب کی قومیں اتنی دشواری کا احساس نہیں کرتیں تو یہ تعداد اور بھی

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ	مضمون	مصنف	صفحہ
اردو کا مستقبل	رالف رسل	۳	نعت	سیدہ فرحت	۷
خطِ نستعلیق	امتیاز علی عرشی	۴	غزل	باقر مہدی	۷
انسانیت کا جنم دن	(اداریہ)	۵	شامی سیاست کی نیرنگیاں	عبدالحلیم ندوی	۸
دنیا کی رفتار			آزادی کی زنجیریں (ناول)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹
(۱) ہندوستان	ع۔ ح	۶	خلق محمدی	صالحہ عابد حسین	۱۲
(۲) باہر کی دنیا	[illegible] ح۔ اس	۶			
بزم بے تکلف		۷			

قیمت فی پرچہ ۳ر

کم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود اردو ادب میں بہت سی تصانیف اب بھی موجود ہیں جن کی قدر انگریز پبلک فوراً کر سکتی اگر انھیں انگریزی ترجموں کے ذریعے پڑھ سکتی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آگے چل کر جب میں اردو ادب میں کافی استعداد بہم پہنچا لیا گا تو میں اور دوسرے انگریز جو مجھ سے اردو پڑھیں گے ترجمے کا یہ کام خوش اسلوبی سے اختیار کر سکیں گے۔ اور اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے خود اردو مصنفین بھی اس کام میں شرکت کریں گے۔ فی الحال کم از کم یہ ہو سکتا ہے کہ میں انگریز طلباء کی مدد اور حوصلہ افزائی کروں تاکہ وہ اردو ادب اردو ہی میں پڑھنا شروع کر دیں۔

چونکہ اس وقت آپ نے مجھے اردو زبان اور اردو ادب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے میں بعض ایسے مسئلوں پر اظہار خیال کرنے کی جسارت کرتا ہوں جس میں کافی اختلاف رائے ہونے کی گنجائش ہے۔ یعنی

۱۔ ہند اور پاکستان میں اردو کا مستقبل۔
۲۔ اردو رسم الخط کا مسئلہ۔
۳۔ اردو ادب کی خامیاں۔

اس وقت مجھے اختصار سے کام لینا پڑے گا اس لئے میں اپنی رائے صاف صاف اور بے تکلف بتانا چاہتا ہوں چنانچہ ممکن ہے کہ آپ بعض جگہ میرے ساتھ اتفاق نہ کر سکیں۔ پھر بھی میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں مانیں گے۔

دو برس پہلے ہندوستان کی تقسیم کے بعد اردو کو ہند میں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ فسادات میں بے شمار انسانوں کا قتل و غارت تو ایک طرف۔ اردو بولنے والے لوگ کافی تعداد میں ہند چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور نظام تعلیم کے ذریعے سے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں کہ ہند میں اردو کا نام و نشان تک نہ رہے۔ اس کے بجائے ایک خاص قسم کی ہندی ٹھونسی جا رہی ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ جا بے جا لائے جا رہے ہیں۔ اس معاملے میں میں اس قدر کہہ کر بس کروں گا کہ اردو کا مٹانا وہ آسان کام نہیں ہوگا جو اس کے دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔ کوئی زندہ زبان قانون اور حکومت کے ذریعے سے مٹائی نہیں جا سکتی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی شہادت یورپ کی تاریخ میں بکثرت مل سکتی ہے۔ لیکن میں ساتھ ہی ساتھ یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر زبان کی اصلی طاقت اہل زبان کی بولی ٹھولی میں رہتی ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک ہند کے اردو مصنفین کے لئے یہ بات پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ ان رشتوں کو اور بھی مضبوط کریں جن کے ذریعے ادبی زبان عام بولی کے ساتھ وابستہ ہے جو مصنف عام بول چال کی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اردو کے ترقی کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فارسی اور عربی الفاظ اس میں شامل کئے جائیں وہ گویا زبان کی جڑوں میں کلہاڑی مار رہا ہے اور اس طرح غیر محسوس طریقے پر اپنے ان دشمنوں کی مدد کر رہا ہے جو اردو کا ستیاناس کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اب ہند میں اردو کا مٹنا ناگزیر ہے نہ صرف یہ بلکہ پاکستان میں بھی اس کے پھلنے پھولنے کی امید نہیں ہو سکتی کیونکہ دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا پنجابی سرزمین میں پنپنا ناممکن ہے۔ میں اس رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ اس قدر میں ضرور مانتا ہوں کہ پنجابی اور دوسری زبانوں کا اثر اردو پر پڑے گا اور رفتہ رفتہ اس کی شکل میں تبدیلی ہو جائے گی۔ لیکن میرے نزدیک یہ رونے دھونے کا مقام نہیں ہے۔ کسی زبان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے جوں کی توں رہے بلکہ اس کا ترقی کرنا ناگزیر ہے۔ ترقی کے دوران میں بیرونی اثرات سے بچ نکلنا بھی ممکن نہیں۔ رہا دہلی اور لکھنؤ کا سوال تو کافی عرصہ ہوا آپ کے نقاد مولانا حالی نے کہا تھا کہ اگر یہ دونوں شہر آگے چل کر اعلیٰ درجے کا ادب اسی کثرت سے پیدا نہ کر سکیں جس قدر پہلے کرتے تھے تو ان کی وہ مرکزی حیثیت جو اب تک رہی ہے ختم ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کو ماننا پڑے گا کہ تقسیم سے بہت دن پہلے اردو کے دوسرے مرکز — خصوصیت کے ساتھ لاہور — بن چکے تھے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ بعض اوقات یہ بات بیری [illegible] میں نہیں آتی کہ زبان کے بگڑ جانے [illegible] ہے۔ کیا [illegible] ہر زبان ایک قسم کا آلہ کار ہے اور آخر میں صرف اہل زبان [illegible] (بقیہ صفحہ [illegible] پر)

خطِ نستعلیق

مولوی امتیاز علی عرشی

اردو زبان جس خط میں لکھی جاتی ہے وہ نستعلیق کہلاتا ہے۔ یہ لفظ دراصل "نسخ" اور "تعلیق" دو عربی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ روزمرہ کی بول چال میں "نسخ و تعلیق" کو پورا ادا کرنا مشکل تھا۔ اس لئے زبان کی خرادنے "خ" اور "و" کو چھیل کر ہلکا پھلکا سا لفظ "نستعلیق" بنا لیا۔

یہ لفظ جن دو لفظوں سے مرکب ہے وہ بھی دو مستقل خطوں کے نام ہیں۔ ان میں کا پہلا آج تک زندہ اور عربی زبان کے لکھنے میں کام آتا ہے۔ "تعلیق" کا چلن بہت دن ہوئے کہ جاتا رہا۔

یہ دونوں خط ایک اور خط سے بنے ہیں جو عام طور پر "کوفی" نام سے مشہور اور مدت سے متروک ہے۔

کوفی خط اس عربی خط کی اصلاحی شکل کا نام ہے جو عرب میں اسلام سے پہلے سے مروج تھی۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کوفہ حکومت کا مرکز اور علوم و فنون کا مخزن قرار پا چکا تھا اس لئے قدیم خط نے بھی وہاں اپنے پر پرزے درست کئے، اور اسی کی نسبت سے "کوفی" کہلانے لگا۔

اس خط میں اونچائی کم اور گولائی نادار دتھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے اہرام کی بنیادیں بھر کر چھوڑ دی گئی ہیں یا بھاری بھر کم ہاتھ پاؤں، کھردرے جوڑ پیوند اور سپاٹ ناک نقشے والے بونوں کی پلٹن پرا جمائے کھڑی ہے۔

دسویں صدی عیسوی تک پہنچ کر میل جول سے عربوں کے معیار حسن میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی آ گئی۔ اس کا اثر فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں کی طرح خط پر بھی پڑا۔ اس صدی کے آخر یا گیارھویں کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابن مقلہ نے اس مسالے سے تین نئے خط ثلث، محقق اور توقیع نکالے اور پھر ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی کم کرنے سے خط نسخ پیدا کیا۔ ابن مقلہ نے اسی پر بس نہ کی بلکہ محقق میں نزاکت بڑھا کر "ریحان" اور "توقیع" میں سادگی اور روانی زیادہ کر کے "رقاع" بھی ایجاد کیا۔ مگر ان سب میں "نسخ" کے اندر رعنائی زیادہ تھی اس لئے فن کاروں نے سب سے زیادہ اس کی طرف توجہ کی اور چودھویں صدی عیسوی میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھوں اس خط کے حسن کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں جس قدر خطاط گذرے ہیں وہ سب کے سب یاقوت کے متبع اور پیرو ہیں۔

یوں تو عبداللہ صیرفی، عبداللہ طباخ ہروی اور شمس کاتب شیرازی وغیرہ اس سلسلے کے مشاہیر میں گنے جاتے ہیں مگر شمس شیرازی کا اثر اتنا بڑھا کہ خط نسخ کا ایک انداز "شیرازی نسخ" کے نام سے عرصے تک زبان زد رہا۔

نستعلیق کا دوسرا جز "تعلیق" عربی میں "حاشیہ" کا مترادف ہے۔ کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں اہل علم برجستہ کچھ جملے کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے اور انھیں "تعلیقات" کہتے تھے۔ عموماً یہ یادداشت اپنے ذاتی استعمال کے لئے لکھے جاتے تھے۔ اس بنا پر معمولی سادہ خط میں ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اس سادہ و رواں انداز تحریر کے اصول اور ضابطے بنا کے اور اسے "خط تعلیق" کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر صرف "تعلیق" رہ گیا جس طرح زبان اردو نے معلی نے رفتہ رفتہ صرف "اردو" کی شکل اختیار کر لی۔

خواجہ میر علی تبریزی نے جو پندرھویں صدی کے مشہور خطاط ہیں "تعلیق" میں "نسخ" کی باضابطگی، نزاکت اور لوچ کی جگمگ آمیزی کر کے اس کا نام "نسخ و تعلیق" رکھا۔ یہ نام کچھ ایسے مبارک وقت میں تجویز دیا گیا تھا کہ تعلیق سادہ سے خطوں کا ناسخ نہیں تو سب پر حاوی ضرور ہو گیا اور اتنا عام ہوا کہ آئندہ اسی سے مختلف شکستہ وغیرہ اختراع کئے گئے۔

خط نسخ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی وارد ہو گیا تھا مگر [illegible] ہندوستان پہنچ کر ایک [illegible] تک [illegible] (بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم جنوری ۵۸ء

انسانیت کا جنم دن

انسان کی پیدائش کو ہزاروں سال ہو چکے ہیں لیکن انسانیت کا تصور ابھی وہی تین ہزار سال پہلے وجود میں آیا ہے اور اگر ہم اس کی سب سے وسیع شکل کو لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصور اب سے کوئی ساڑھے تیرہ سو سال پہلے محمد عربی کے ساتھ پیدا ہوا۔ اس لئے جو لوگ ۱۲ ربیع الاول کو آں حضرتؐ کی عید میلاد منائیں گے انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسی کے ساتھ وہ انسانیت کا جنم دن بھی منا رہے ہیں۔

انسانیت کے تصور کا ایک اہم جز یہ خیال ہے کہ ساری دنیا کے انسان ایک ہیں اس لئے کہ ان کی آفرینش ایک جوہر سے ہوئی ہے۔ ان کی فطرت اور طبیعت ایک ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد اور قانون ایک ہے۔ اس تصور کی گود میں نوعِ انسانی کی عالم گیر برادری کا نصب العین انسان کے ذہن میں آہستہ آہستہ پرورش پا رہا ہے۔

ابھی انسانی وحدت کا خیال عمل سے بہت دور سہی مگر کم سے کم نظری حیثیت سے وہ آج دنیا کے اونچے تعلیم یافتہ طبقے میں عام ہو گیا ہے اور آپ کو بالکل معمولی یا افتادہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ انسان کے ذہن نے اسے بڑی مشکل سے رفتہ رفتہ قبول کیا۔ عالم گیر مذہب یعنی بودھ مت، یہودیت اور عیسائیت نے آہستہ آہستہ اس کے لیے زمین تیار کی اور اسلام نے محمد عربی کی زبان سے پہلی بار صاف اور قطعی طور پر یہ اعلان کیا کہ سارا عالم انسانیت ایک ہے اور اسے ایک ہی ازلی، ابدی قانونِ اخلاق کی پابندی کرنی ہے۔ اس لئے کہ اس سارے عالم کو پیدا کرنے والی اور اس پورے قانون کو بنانے والی ایک ہی ذاتِ سرمدی ہے۔ عقیدۂ توحید، وحدتِ انسانی کی راہ میں بہت بڑا قدم تھا۔ جب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر علاقے اور ہر قبیلے کے پیدا کرنے والے یا پالنے والے دیوتا الگ الگ ہیں۔ سب انسانوں کے ایک ہونے کا تصور کسی طرح ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا جب اس عقیدے کے سب سے بڑے معلم پیغمبر اسلام نے ایک بار مذہب کی زبان میں نوعِ انسانی کی وحدت کا سبق پڑھا دیا تو تہذیب، سیاست اور معیشت کی زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا مقابلتاً آسان ہو گیا ہے۔ اور آج دنیا کے بڑے بڑے دماغ اسی کی کوشش میں مصروف ہیں۔

آں حضرتؐ نے وحدتِ انسانی کا صرف نظری درس نہیں بلکہ اس کی عملی تعلیم بھی دی۔ ایک طرف آپ نے عرب کے لوگوں کو جو قبیلوں اور جرگوں میں بٹے ہوئے تھے اور جن کی زندگی خانہ جنگی میں بسر ہوتی تھی اتحاد کے رشتے میں پرو کر ایک برادری کی شکل بخشی جس میں نسب درجے طبقے کا کوئی امتیاز نہ تھا ایسے زمانے میں جب کہ معاشرے یا سماج کی تنظیم مذہب کی بنا پر ہوا کرتی تھی اور مختلف مذہبوں کے پیروؤں میں برادری تو درکنار دوستی کا تعلق بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے عرب کے غیر مسلموں کو، جنھوں نے آپ کی اور آپ کے مشن کی انتہائی مخالفت کی تھی نہایت فراخ دلی کے ساتھ عربی معاشرے میں مناسب جگہ دی۔ دوسری طرف نسل، رنگ اور مقام کی تفریق کو مٹا کر ایک بین الاقوامی برادری کی بنا ڈالی جس میں مغولی، شامی، ایرانی، حبشی عربوں کے ساتھ گھل مل کر اس حقیقت کی ایک زندہ مثال بن گئے کہ نوعِ انسانی فطرت کے لحاظ سے ایک ہے اور جو دیواریں نسلیں اور قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں وہ آسانی سے گرائی جا سکتی ہیں۔

انسانیت کے تصور کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ انسان دنیا میں فوق طبعی یا طبعی قوتوں کا کھلونا نہیں بلکہ ایک آزاد ہستی ہے جو علم اور عقل کی مدد سے فطرت کی تسخیر اور زندگی کی تشکیل کر سکتا ہے۔ یہ علمی تصورِ زندگی دوسرے ملکوں اور دوسرے زمانوں خصوصاً یونان کے کلاسیکی عہد میں بھی ظہور کر چکا تھا۔ مگر عرب کے اسلامی عہد میں نئی آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوا۔ نبی امیؐ کے فیضِ تعلیم نے بادیہ نشین عربوں میں وہ سچی سائنٹفک روح پیدا کر دی کہ انھوں نے انسانی فکر و نظر کو اوہام کی قید سے چھڑا کر آزاد کر دیا اور علم کے میدان میں تحقیق اور مشاہدے کی راہ کھول دی۔ انسان کی علم دوستی نے جو مذہب کی تاریخ میں ایک نئی چیز تھی، عربوں میں اور دوسری قوموں میں جنھوں نے اسلام قبول کیا، علم کی ایسی سچی لگن اور لگن پیدا کر دی کہ صدیوں تک وہ علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں اور ایک حد تک انھیں کے اثر سے یورپ میں نئی ذہنی زندگی کی لہر اٹھی جو نشاۃ ثانیہ کہلاتی ہے۔

اس لئے جب ہم ۱۲ ربیع الاول کو محفلِ میلاد میں اس ذاتِ گرامی کے سامنے ہدیۂ نیاز و ستائش پیش کریں جس نے دنیا میں انسانیت کی شمع روشن کی تو ہمیں ان صفات کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے جو انسانیت کے مفہوم میں داخل ہیں اور صدقِ دل سے عہد کرنا چاہیے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے گا ہم ان صفات کو اپنانے کی کوشش کریں گے۔ ہم اپنے قلب میں اتنی وسعت پیدا کریں گے کہ اس میں انسانی وحدت کا تصور سما سکے اور اس تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ہمیشہ اپنے ہم وطنوں یا میلوں کو خواہ وہ کسی نسل اور کسی طبقے کے ہوں ایک ایسے سماج میں متحد کرنے کی کوشش کریں گے جو سیاسی آزادی، معاشرتی مساوات اور معاشی انصاف کی بنا پر قائم ہو اور اس کے بعد اس اخوت کے دائرے کو اور زیادہ وسیع کرتے چلے جائیں گے یہاں تک ساری نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے۔

ہم اس تعصب اور نفرت، اس خود پسندی اور خود بینی اس لالچ اور خود غرضی کو مٹانے کی کوشش کریں گے جو انسان کو انسان سے، بھائی کو بھائی سے لڑاتی ہے۔ ہم انسانی فکر کو وحشت اور جہالت، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی زنجیروں سے چھڑا کر اس کا موقع دیں گے کہ عقل اور تجربے کی رہنمائی میں تحقیق و ترقی کی منزلیں طے کرے۔

انسانیت کے معلم کی خدمت میں اس سے بہتر خراجِ عقیدت پیش نہیں کر سکتے کہ انسانیت کا بھولا ہوا سبق خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔

"نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو ایک مدت سے ان صفحات میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ شاید ان کو یہ شکایت ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے انھیں اپنے رشحاتِ قلم سے سیراب کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ پورا نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ سال کے شروع سے ڈاکٹر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وائس چانسلری کے علاوہ یونیورسٹی کمیشن کی ممبری کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کا سفر کرتے رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے کمیشن کا قصہ ختم ہوا تو آٹھ، نو مہینے کی محنت شاقہ کے اثر سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اس کے باوجود انھیں یونیورسٹی اور دوسرے اداروں کے کام کی نمٹانے کے لئے کئی ہفتے دس، بارہ گھنٹے روز کام کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ نومبر کو انجماد خون کی وجہ سے قلب کے درد کا دورہ ہوا۔ خدا کے فضل سے دورہ ہلکا تھا اور جلد گذر گیا مگر ڈاکٹروں نے یہ رائے دی کہ منجمد خون کے تحلیل ہونے اور نظامِ جسمانی کے طبعی حالت پر آنے میں تین مہینے لگ جائیں گے۔ اس عرصے میں کام کا تو کیا ذکر ہے نقل و حرکت اور بات چیت بھی کم سے کم کرنی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت روز بروز سنبھل رہی ہے مقررہ مدت میں پانچ ہفتے گذر چکے ہیں۔ سات ہفتے باقی ہیں۔ آپ حضرات بھی ہمارے ساتھ دعا فرمائیے کہ شافیِ مطلق ڈاکٹر صاحب کو صحتِ کلی عطا فرمائے اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ جو وعدہ آپ سے کیا تھا اُسے پورا کریں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ابھی سات ہفتے تک ڈاکٹر صاحب کو ملاقات اور خط و کتابت کی قطعی ممانعت ہے اس لئے کوئی صاحب مزاج پرسی کے لیے علی گڑھ تشریف نہ لے جائیں اور خود ڈاکٹر صاحب کو خط نہ لکھیں بلکہ ان کی خیریت علی گڑھ کے دوسرے حضرات سے معلوم کر لیا کریں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

صدر کون ہو؟

جمہوریہ ہند کی تاسیس کے ، جو ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہونے والی ہے اور سب مراحل تو طے ہو چکے ہیں مگر نہایت اہم مرحلہ باقی ہے یعنی صدر کا انتخاب ۔ آئین ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے سامنے اس وقت دو نام ہیں ایک شری راج گوپال اچاریہ کا ، دوسرا ڈاکٹر راجندر پرشاد کا۔ خدنہ یہ دونوں بزرگ جن میں گاندھی جی کے ایثار ، اور بے نفسی کا بہت کچھ موجود ہے، انتخابی معاملے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے کے لئے میدان خالی کر دے لیکن کانگریس پارٹی اس معاملے میں دو گروہوں میں بٹ گئی ہے ایک راجا جی کو صدارت کے منصب کے لئے زیادہ موزوں سمجھتا ہے اور دوسرا راجن بابو کو۔ معلوم ہوا ہے کہ ۲۵ دسمبر کو سردار پٹیل کے گھر پر اسمبلی کے ۱۲ کانگریسی ممبر انتخاب صدر کے معاملے میں مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ پنڈت نہرو بھی موجود تھے۔ صورت حال جس پر بحث کی گئی یہ تھی کہ جلد سے جلد تین اہم ترین عہدوں یعنی جمہوریہ کی صدارت ، نیشنل کانگریس کی صدارت اور نیشنل پلاننگ کمیٹی کی صدارت کے لئے تین آدمیوں کو نامزد کرنا ہے اس پر سب متفق تھے کہ ان میں سے دو عہدوں کے لئے راجہ جی اور راجن بابو کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مگر اس بارے میں کہ کون کس کے لئے زیادہ موزوں ہے اختلاف رائے تھا۔ سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ، مگر کوئی بات طے نہیں ہو سکی۔

ہمارے خیال میں سب سے زیادہ اہمیت نیشنل کانگریس کی صدارت رکھتی ہے اب تک کانگریس ایک ہمہ گیر قومی جماعت تھی۔ اس میں وہ سب لوگ جو ملک کو بدیسی حکومت سے آزاد کرانا چاہتے تھے شامل تھے جہاں تک اثباتی سیاسی اور معاشی پروگرام کا تعلق ہے اس کے ممبر عام اصولوں میں متفق تھے مگر بہت سے اہم معاملات میں اختلاف رائے بھی رکھتے تھے لیکن جب سے ملک آزاد ہوا ہے کانگریس حکمراں سیاسی پارٹی بن گئی ہے جس کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ اندرونی اتحاد اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہ ہم آہنگی اس وقت موجود نہیں ہے اور اس کے نہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جن سے نہ صرف کانگریس کو بلکہ عام طور پر ملک کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے لہٰذا کانگریس کو جلد سے جلد اپنی نئی تنظیم کرنی ہے اس کے لئے ایک ایسے صدر کی ضرورت ہے جو قابل اور مخلص ہونے کے علاوہ کانگریس میں ہر دل عزیز بھی ہو۔ قابلیت اور خلوص تو اور لوگوں میں بھی ہے لیکن جو ہر دل عزیزی راجن بابو کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں اس لئے وہ کانگریس کی صدارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ کانگریس والوں کے باہمی اختلاف کو دور کرنے ، ان میں گاندھی جی کی اخلاقی روح نئے سرے سے پھونکنے اور خدمت و ایثار کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے راجن بابو ہی کی ضرورت ہے۔

جمہوریہ ہند کی صدارت کا کام راجا جی بہت اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں سچ پوچھئے تو گورنر جنرل کی حیثیت سے بھی انہیں کم و بیش صدر جمہوریہ ہی کے فرائض انجام دینے پڑے اور انھوں نے نہایت خوبی سے انجام دے ان کی مصلحت بینی دور اندیشی ، تدبر ، آئینی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت کا اچھی طرح امتحان ہو چکا ہے ۔ صدر جمہوریہ کے لئے یہی صفات درکار ہیں۔

اب رہی نیشنل پلاننگ کمیٹی کی صدارت ہماری رائے میں اس کا حکومت کی معاشی پالیسی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ خود وزیر اعظم یا وزیر مالیات یا منصوبہ بندی کے ایک مخصوص وزیر کو اس کا صدر ہونا چاہئے۔ کسی اور شخص کو یہ منصب دینے سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔

باہر کی دنیا

ایک اور معرکہ سر ہوا

آزادی کی لڑائی میں جو مشرق کی محکوم قومیں اپنے مغربی حاکموں سے لڑ رہی ہیں انھیں انڈونیشیا کی آزادی سے ایک اور شاندار فتح نصیب ہوئی ہے ۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسٹرڈیم میں ملکہ جولیانا نے اس فرمان پر دستخط کر دئے جس کی رو سے ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کو ایک آزاد جمہوریہ تسلیم کر لیا گیا۔ ادھر جاکرتا میں انڈونیشیا کے قائم مقام وزیر اعظم نے ہالینڈ کے گورنر جنرل سے ملکی اور فوجی حکومت کا جائزہ لے لیا۔ اس جشن آزادی کی تیسری رسم نئی دہلی میں منائی گئی جہاں انڈونیشیا کے وکیل ڈاکٹر سدر سانو نے پنڈت نہرو کی موجودگی میں انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کیا اور ہندوستان نے پنڈت جی کی قیادت میں انڈونیشیا کی آزادی میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس کا تہ دل سے اعتراف کیا۔

اس میں شک نہیں کہ آزادی کے اس رسمی اعلان کے بعد حقیقی آزادی کے حاصل کرنے میں انڈونیشیا کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہے لیکن امید ہے کہ انڈونیشی قوم کی ہمت اور استقلال اور ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کی مدد سے وہ ان سب مشکلوں پر جلد سے جلد قابو پا لے گا۔

(ع ، ح)

شہر بھر میں اونٹ بدنام

لندن میں ایک بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس کی سب کمیٹی نے کومن فارم پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ سارے ایشیا میں خانہ جنگی برپا کر رہی ہے۔ "عین اس وقت جب بوڈاپسٹ میں کومن فارم کی مغربی شاخ کے ترجمان امن عالم کے لئے آواز اٹھا رہے تھے۔ مشرق میں اس کی شاخ خانہ جنگی کرانے میں مشغول تھی"۔ اس سلسلے میں چند ملکوں کا بھی نام لیا گیا ہے جیسے ، برما ، ملایا ، ہند چینی وغیرہ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کی خانہ جنگیوں کی تمام تر ذمہ داری مغربی ملکوں پر ہے چین میں چیانگ کو امریکہ نے جو مدد دی ہے اس کا عشر عشیر بھی ماوزے تنگ کو روس سے نہیں ملا۔ برما کو کومن ویلتھ کے مختلف ملکوں نے چوری چھپے نہیں علانیہ مدد دی ہے۔ ہند چینی میں قوم پرستوں کی بغاوت دبانے کے لئے فرانس نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ سب سے آخر میں ملایا کو لیجئے۔ ملایا میں برطانوی کمشنر میلکم میکڈانلڈ صاحب نے ابھی مجبور ہو کر اعتراف کیا ہے کہ ملایا میں باغیوں کو باہر سے کوئی مدد نہیں ملی ہے۔ اتنے ثبوت کے باوجود مشرق کی بے چینی کے لئے روس کو ذمہ دار ٹھہرانا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی نظر میں روس کا وجود ہی دنیا میں فساد کا باعث ہے۔

سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

کولمبو میں کامن ویلتھ کے ملکوں کی کانفرنس ہو رہی ہے (ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ کانفرنس کے لئے کولمبو کو کیوں چنا گیا؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ کولمبو کی بڑی فوجی اہمیت ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ سیلون برطانیہ عظمیٰ کا ایسا ہی گاڑھا حلیف ہے اور سنانائیکے صاحب وفاداری میں آغا خاں کے ہم پلہ ہیں۔ لیکن سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ کانفرنس اس کے علاوہ اور ہوتی تو کہاں ہوتی؟ پاکستان کی کوئی جگہ چنی جاتی تو حکومت ہند کی سبکی ہوتی اور اگر ہندوستان میں کوئی جگہ چنی جاتی تو اس میں پاکستان کی بے عزتی تھی اور ایک ایسے شوہر کی طرح جو دو بیویوں میں مکمل مساوات کا قائل ہو برطانیہ نے اس جھگڑے کو یوں حل کیا ہے کہ ایک تیسری جگہ چن لی۔

کولمبو کانفرنس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مشرق میں کمیونزم کے خطرے کا کیوں کر مقابلہ کیا جائے۔ ادھر امریکن ذمہ دار افسروں کی بھی ملتوی شدہ کانفرنس جلد ہی ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس کے سامنے بھی موضوع بحث یہی ہے۔ برطانیہ کے لئے کمیونزم کے خلاف جہاد میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ حکومت کے پاس اتنے پیسے نہیں۔ امریکہ سے رقم مل سکتی ہے، لیکن اس کے بعد امریکہ کا اثر اور امریکہ کی تجارت بڑھے گی۔ برطانیہ کی معاشی زندگی

(بقیہ اسی صفحہ کے دوسرے کالم میں)

برآمد پر مبنی ہے اور مشرق برطانیہ کے مال کے لئے سب سے بڑا بازار۔ اس لئے برطانیہ میں کوئی بھی اس تصور سے پوری طرح خوش نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں کمیونزم کو امریکہ شکست دے۔ اس لئے کہ برطانیہ کا تو اثر اس طرح ختم ہو جائے گا۔ کامن ویلتھ کانفرنس یہ طے کرنے کے لئے بلائی گئی ہے کہ ایسی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ نہیں کہ کمیونزم کا سانپ بھی مر جائے اور برطانوی اقتدار کی لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

بزمِ بے تکلف

"آئیے آئیے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔ مزاج شریف؟"

"اماں کیا مزاج شریف۔ ایک تو یوں ہی سلگ رہے ہیں اور اوپر سے تم اور بھی جلاتے ہو۔"

"یا اللہ خیر! آج تو مزاج پوچھتے ہی بھڑک اُٹھے۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں اچھی طرح مزاج پرسی ہوئی ہے۔ آخر بات کیا تھی؟"

"بات کیا ہوتی وہی کم بخت کوڈ بل کا جھگڑا۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس کی وجہ سے رارنہ مچی ہوئی ہو۔ کہیں میرے منہ سے نکل گیا کہ اگر یہ بل منظور ہو گیا تو عورتیں ہاتھ سے گئیں۔ بس پھر کیا تھا۔ شری متی آئیں تو جائیں کہاں۔"

"اچھا تبھی ——— خیر اب کیا کہوں۔ دوست کا بھانڈا پھوڑنا اچھا نہیں۔"

"بھانڈا پھوڑنا کیا معنی! کوئی میں نے جوتیاں کھائی ہیں جو تم بھانڈا پھوڑو گے۔"

"جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔ مگر بھئی کیا دبنگ عورت ہے ہماری بھاوج بھی۔"

"کیا بک رہے ہو، تم جیسے آج کل کے داڑھی مونچھ منڈے جورو کی جوتیاں کھاتے ہوں گے۔ تبھی تو چار ابرو کے ساتھ چندیا کا بھی صفایا ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے مرد بیوی کو لونڈی بنا کر رکھا کرتے ہیں۔"

"وہ تو آپ کی صورت سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ بہ لکھنؤ کے کمہار بھی غضب کرتے ہیں، کیا ساٹھا پاٹھا فرمائشی مرد بنایا ہے۔ بے شک حضور کی چوتھی نئی نویلی ضرور لونڈی بن کر رہتی ہوگی۔ مگر یہ چندیا نالا معاملہ صاف ہو جانا چاہیے۔ آپ اپنی لٹ پٹی پگڑی اتاریئے۔ میں اپنی گاندھی کیپ اتارتا ہوں، دیکھیں کس کے بال صاف ہیں۔"

"خیر میں تمھاری طرح بال کی کھال نہیں نکالتا۔ میں تو سیدھی سی بات جانتا ہوں کہ قدرت نے عورت کو مرد کی تابعداری کے لئے پیدا کیا ہے۔"

"کیا سیدھی سی بات ہے جیسے چرخے کا تکلا۔ کیوں حضرت عورت کو مرد کی تابعداری کے لئے پیدا کیا ہے؛ اور مرد کو کاہے کے لئے؟ عورت کی چوکی داری کے لئے۔"

"بے شک اگر مرد اپنا چوکی داری کا فرض اچھی طرح انجام دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی کہ سڑک، بازار، پارک، جلسہ، پارٹی، کلب، جدھر دیکھئے برقعے جک رہے ہیں ساڑھیاں پھڑک رہی ہیں۔ سینما جائیے تو وہاں بھی موجود۔ کہیں انصاف سے کہو کہ یہ مخربِ اخلاق فلم ......"

"اس قابل ہیں کہ عورتیں دیکھیں؟ ہرگز نہیں، مگر کیوں حضرت آپ نے کیا اپنے اخلاق کا بیمہ کرا لیا ہے کہ آپ ان مخربِ اخلاق فلموں کو بے دھڑک کھلی آنکھوں نگل جاتے ہیں؟"

"ہماری اور بات ہے ہم مضبوط سیرت رکھتے ہیں عورت کمزور دل و دماغ کی ہوتی ہے۔"

"حضرت قصور معاف ہم نے تو اکثر یہی دیکھا ہے کہ مضبوط سیرت کے مرد بُری طرح لڑھکنی کھا جاتے ہیں۔"

"تو تمھارا کیا مطلب ہے کہ مرد پردے میں بیٹھ جائیں؟"

"جی نہیں! میرا مطلب ہے کہ مرد اپنی آنکھ اور زبان کو تہذیب سکھائیں تاکہ عورتیں پردے میں بیٹھنے پر مجبور نہ ہوں۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ یہ ابدی حقیقت ہے۔"

"سبحان اللہ کس غضب کی تحقیق کی ہے آپ نے! کیا باون تولے پاؤ رتی کی بات کہی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اس حقیقت سے انکار کرے۔ بے شک مرد مرد ہے، عورت عورت ہے۔ شرم شرم ہے۔ بے شرمی بے شرمی ہے۔ انصاف انصاف ہے، بے انصافی بے انصافی ہے۔ اگر ان ابدی حقیقتوں کو ہم آپ یاد رکھیں تو پھر سارا جھگڑا ہی مٹ جائے نا۔"

نعت

(بہ حضور خاتم المرسلین)

سیّدہ فرحت

زمانے میں فضائے نور پھیلاتے ہوئے آئے
جہاں میں رحمتوں کے مینہ برساتے ہوئے آئے

تجلّی سے رُخِ روشن کی عالم جگمگا اُٹھا
مقابل میں مہ و خورشید شرماتے ہوئے آئے

سُنایا نغمۂ توحید چھیڑا ساز وحدت کا
پیامِ حق رسول اللہ پہنچاتے ہوئے آئے

پڑے تھے مدتوں سے اہلِ عالم خوابِ غفلت میں
نبیؐ ان نیند کے ماتوں کو چونکاتے ہوئے آئے

رہے گا تا قیامت زیرِ احساں طبقۂ نسواں
رہائی زندہ در گوری سے دلواتے ہوئے آئے

عطا کی عزت و عظمت حیاتِ نو ہمیں بخشی
سیہ بختی ہماری دور فرماتے ہوئے آئے

غزل

باقر مہدی

خوشی شادیانوں میں گم ہوگئی ہے
فغاں آشیانوں میں گم ہوگئی ہے

حقیقت سے نظریں ہٹا لینے والو
نظر آسمانوں میں گم ہوگئی ہے

نہ جوشِ جنوں ہے نہ دردِ وفا ہے
محبت فسانوں میں گم ہوگئی ہے

کہیں خود فریبی میں جلتی محبت
کہیں راز دانوں میں گم ہوگئی ہے

جہاں خونِ ناحق سے رنگیں چمن ہیں
بہاراں جہانوں میں گم ہوگئی ہے

جو منزل پہ جانے کی دل میں لگن تھی
نئے کاروانوں میں گم ہوگئی ہے

شامی سیاست کی نیرنگیاں

عبدالحلیم ندوی

"تاریخ اپنے کو دہراتی ہے" کتابوں میں تو پڑھا تھا۔ پر اب تک آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ اب شام میں تین مرتبہ ان آنکھوں نے تاریخ کی تکرار دیکھ لی۔ اور وہ بھی صرف نو مہینے کی مدت میں۔

مگر یہ انقلاب یوں ہی نہیں ہو گئے۔ ان کے چند بنیادی اسباب تھے۔ جن کا لازمی نتیجہ بھی ہونا تھا۔ اور صرف شام ہی پر منحصر نہیں ہے جس ملک میں بھی ایسے حالات ہوں گے وہاں بھی اس قسم کے انقلاب آسکتے ہیں۔

"تاریخ اپنے کو دہراتی ہے" کتابوں میں تو پڑھا تھا، پر اب تک آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ اب شام میں تین مرتبہ ان آنکھوں نے تاریخ کی تکرار دیکھ لی اور وہ بھی صرف نو مہینے کی مختصر سی مدت میں۔ شام کے لوگ ایک رات کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹے اور جب صبح آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ نہ وہ زمین ہے، نہ وہ آسمان دنیا بدل گئی ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ اور سب سے بڑا انقلاب یہ کہ رات بھر میں حکومت بدل گئی ہے کل جس کی حکومت میں وہ سوئے تھے آج اس کا سر نہ معلوم کس گمنام جگہ میں خاک و خون میں لتھڑا تڑپ رہا ہے اور اس کی حکومت کا ایک معمولی افسر اس کی جگہ راج پاٹ کا مالک ہے۔ کرنل حسنی زعیم نے رات بھر میں فوج کی مدد سے صدر اور وزیر کو قتل کر کے اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ اب حکم ان کا ہے۔ سکہ ان کا ہے، اور اقتدار ان کی پارٹی کا۔ عوام کا کیا وہ تو محکوم ہوتے ہیں۔ حکومت بدلی انقلاب ہوا پر ان کی حالت تو نہیں بدلی۔ ان کی زندگی میں تو انقلاب نہیں آیا۔ انقلابیوں نے جلسہ کیا۔ یہ لوگ بھی گئے۔ انھیں مبارک باد دی، کرنل زعیم زندہ باد کے نعرے لگائے۔ ان کے شعراء نے مدحیہ قصیدے پڑھے اور مقرروں نے تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ جلسہ برخواست ہوا اور سب کرنل سے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کی امیدیں باندھ کر رخصت ہو گئے۔

مگر مشکل سے پانچ ماہ گذرے ہوں گے شام کے لوگ اسی طرح اطمینان سے کھانا کھا کر رات کو اپنے اپنے بستروں پر لیٹے اور صبح حسب معمول جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ پھر آج زمین و آسمان کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ آج پھر رات بھر میں تماشہ ہو گیا ہے۔ آج پھر حکومت بدل گئی، حاکم بدل گئے۔ ان کی رعایات بدل گئیں۔ مگر وہ۔ وہ نہیں بدلے ہیں۔ وہ اب بھی محکوم ہیں۔ پہلے ہی کی طرح۔ بس پٹہ بدل گیا ہے اور اب کرنل زعیم کے اقتدار سے نکل کر سامی الحناوی کی قیادت میں آگئے ہیں۔ کرنل حسنی زعیم نے رات بھر میں سابقہ حکمرانوں کو قتل کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ آج ان کے مخالفین نے چار گھنٹے میں ان کا اور ان کے معتمد وزیر محسن البرازی کا خاتمہ کر کے اپنا سکہ چلا دیا ہے اور سب سے عبرت خیز منظر وہ تھا جب صدر کی رہائشی مکان کے جس پہرے دار نے کرنل حسنی زعیم کے سامنے صدر دروازہ کھولا تھا کہ وہ سابق صدر کو پکڑ کر قتل کریں اسی نے آج کرنل کے مخالفین کے لئے دروازہ کھولا کہ وہ کرنل کو پکڑ کر کے جائیں اور سر تن سے گھاٹ اتار دیں۔ اور پر لطف بات یہ کہ اب وہ اپنے عہدے پر اسی اعتماد کے ساتھ برقرار ہے۔ اور اسی محافظ نے ان کے گولی ماری جو ان کی جان بچانے کا ذمہ دار تھا۔ اور آج وہ پہرے صدر کی جان کا محافظ ہے۔ اس کو کہتے ہیں انقلاب زمانہ، اور یہ ہے تاریخ کو اپنے کو دہرانا!

ممالک اسلامیہ میں شام کی سیاسی فضا عہد خلفائے راشدین ہی سے بہت انقلاب پرور اور ہنگامہ خیز رہی ہے اور شاید شامیوں میں اب بھی یہ خصوصیت باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شام ایسے چھوٹے سے ملک میں اتنی جلدی دو اتنے اہم خونیں انقلاب ہو گئے۔ مگر یہ انقلاب یوں ہی نہیں ہو گئے۔ ان کے چند بنیادی اسباب تھے جن کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور صرف شام ہی پر منحصر نہیں ہے جس ملک میں بھی ایسے حالات ہوں گے وہاں بھی اس قسم کے انقلاب آسکتے ہیں۔

گذشتہ دوسری جنگ عظیم نے دنیا کو جو تحفے دئے ہیں ان میں سب سے زیادہ تلخ تحفہ اشیاء کی حد سے زیادہ گرانی اور چیزوں کی کمیابی ہے۔ یہ حالت کم و بیش ہر ملک میں رہی ہے اور اب بھی ہے اور جن ملکوں کے وسائل دولت اتنے وسیع نہیں ہیں کہ وہ اپنی کفالت خود کر سکیں وہاں اس کی وجہ سے بہت انتشار اور ہنگامہ برپا ہے۔ شام بھی انھیں ملکوں میں ہے جہاں وسائل اتنے وسیع نہیں ہیں کہ سارا ملک فراغت کے ساتھ گذر بسر کر سکے۔ چنانچہ ایک سال سے وہاں گرانی کا یہ عالم ہے کہ گیہوں اور گیہوں کا آٹا اور اس سے بنی ہوئی چیزیں عنقا ہو گئی ہیں اور دوسری چیزیں جو ان کے بجائے استعمال کی جا سکتیں وہ بھی خال خال نظر آتی تھیں۔ اس سے عوام اور خواص کو سخت تکلیف ہوئی۔ کھانے کی کمیابی نے پیٹوں میں آگ لگا دی اور یہ آگ سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور پھر حکومت کے ایوانوں سے ٹکرائی۔ حکومت چونکی اور ایک قانون کے ذریعے ذخیرہ کرنے والوں پر سخت پابندیاں عاید کر دیں مگر صرف پابندیوں سے کہاں کام چلتا ہے، چنانچہ نتیجہ صفر رہا۔ اب حکومت نے یہ اسکیم بنائی کہ غلہ خریدا جائے، اور سستے داموں فروخت کیا جائے۔ پر سوال تھا سرمایہ کا۔ اس کے لئے یہ ترکیب کی گئی کہ فوج، پولیس اور دوسرے محکموں کے ملازمین کی تنخواہوں میں کمی کر کے روپیہ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اس اسکیم پر عمل ہوا۔ مگر اس ہمدردی بچاؤ اسکیم سے وزراء نائبین اور بڑے بڑے عہدے داروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ جس سے فوج میں بہت بددلی پھیل گئی۔ اس کے علاوہ اس سے گرانی پر بھی کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ بلکہ جتنی چیزیں سستی نہیں ہوئیں اس سے زیادہ تنخواہوں میں کمی ہو گئی تھی اور اس سے پریشانی بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئی۔ پھر اسی زمانے میں مصری فوجیں فلسطین سے معرکے سے واپس آئیں تو ان فوجوں نے دیکھا کہ ملک فاروق نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا ان کی بہادری کی تعریف کی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ ان کے مقابلے میں شام میں یہ برتاؤ نہ ہوا تھا۔ اس سے بددلی اور بڑھی اور ساری فوج حکومت سے سخت متنفر ہو گئی۔ اور ہر دستے میں بغاوت کے جذبات پھیل گئے۔ بس کسر صرف اس کی تھی کہ کوئی اس جوالا مکھی میں آگ لگا دے، پھر آپ ہی آپ وہ پھٹ پڑے گا۔ اور یہ کام کیا کرنل حسنی زعیم نے انھوں نے بھانپ لیا کہ موقع آگیا ہے تو وہ آگے بڑھے اور چار پانچ فوجی افسروں کو ساتھ لے فوجی گاڑیوں کا ایک دستہ اپنے ہم رکاب لے کر صدر کے سرکاری رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور آناً فاناً انھیں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر کے فوجی حکومت کا اعلان کر دیا۔ عوام اس حکومت سے پہلے ہی سے بیزار تھے وہ خوش ہوئے کہ اچھا ہوا۔ اب شاید ہماری بدحالی دور ہو جائے۔ اور کرنل زعیم ہماری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیں گے

آزادی کی زنجیریں

(پہلا باب)

(۱)

ظفر نے اب انیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس کی کاٹھی خاصی تھی۔ مگر بچپن میں سال ڈیڑھ سال کی مسلسل بیماری اور حکیموں کے پرہیز نے ایسا توڑ دیا کہ کبھی اچھی طرح پنپنے نہ پایا۔ جب تک ماں زندہ رہیں اُسے سینے کا نوالا کھلاتی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ باپ شیر کی نگاہ دیکھتے تھے۔ ظفر کا حساس دل اُن کی بے جا سختی سے کڑھتا تھا اور یوں بھی وہ خلقی طور پر "درون نگر" واقع ہوا تھا یعنی طبیعت کا رُخ اندر کی طرف تھا اور اُسے خیال کو سینے اور فکر کو پالنے کی عادت تھی۔ اس لئے اس کے بدن پر کبھی بوٹی نہ چڑھ سکی۔ ورزش کا عادی ہونے کی وجہ سے وہ چستی اور پھرتی میں اپنے ہم عمروں سے کم نہ تھا لیکن اس کے چہرے پر عموماً نوجوانی کی تازگی اور اچھلاہٹ کی جگہ ایک افسردگی اور سنجیدگی سی چھائی رہتی تھی۔ اس کی حسین صورت کو اس دل گیری کی کیفیت نے اور دلکش بنا دیا تھا البتہ اس کی عمر پہلی نظر میں کوئی چار پانچ برس زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں لکھنے کی میز کے پاس کرسی کی پشت سے ٹیکا ہوا آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا اور اس کے ماتھے پر فکرمندی اور اُداسی نے معمول سے زیادہ گہری شکنیں ڈال رکھی تھیں۔ ابھی دو دن ہوئے میٹرک کے امتحان میں اس کی کامیابی کی اطلاع آئی تھی۔ لیکن اس خبر سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی اس لئے کہ اس کے استادوں میں سے اکثر کو اس کے اول درجے میں پاس ہونے کی توقع تھی اور وہ ہوا دوسرے درجے میں۔ خود ظفر کو امتحان کے بعد اول درجہ تو درکنار سرے سے پاس ہونے ہی کا یقین نہ تھا۔ اس لئے کہ اس کے ریاضی کے دونوں پرچے بہت خراب ہوئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ تیسرے درجے میں نکل جاؤں تو بہت غنیمت ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل کے کسی کونے میں اول درجے میں پاس ہونے کی امید چھپی ہوئی تھی اس لئے کہ جب اس نے اخبار میں اپنا رول نمبر دوسرے درجے میں پاس ہونے والوں کے زمرے میں دیکھا تو اُسے ایک گونہ مایوسی ہوئی اور پھر جب اس کے ساتھیوں اور استادوں نے اُسے مبارک باد دینے کے بجائے اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا تو اس کی مایوسی اور بڑھ گئی۔

لیکن اس وقت اس کی اداسی کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ اسکول کی تعلیم کے دوران میں ہمیشہ کالج کا خواب دیکھتا رہا۔ ودیاپور کے ہائی اسکول کی بند فضا میں اسے ایک گھٹن سی محسوس ہوتی تھی اور اس کے قوائے ذہنی کو اچھی طرح بڑھنے اور پھیلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ استاد جیسے امدادی مدرسوں میں ہوتے ہیں، زیادہ تر ارزاں بہ علت۔ راضی بہ رضا۔ کتب خانے میں کتابیں کل دو تین سو اور وہ بھی ایسی کہ نصاب میں داخل یا داخل ہونے کے لائق۔ ریڈنگ روم میں صرف اخبار لیڈر، ڈسٹرکٹ گزٹ، رہنمائے تعلیم اور استادوں کی حاضری کا رجسٹر۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اب رہا گھر تو وہاں ظفر اپنے والد کی درشت مزاجی اور سخت گیری کی وجہ سے اور بھی دبا دبا بند بند رہتا تھا، اور اس کی طبیعت میں وہ اُپج اور جولانی نہیں پیدا ہونے پاتی تھی جو اس بات کی علامت ہے کہ ذہن اور روح کے سوتے کھل گئے ہیں اور زندگی کا چشمہ تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اس کے والد مظفر حسین صاحب نے اپنے زمانے میں انٹرنس تک سب امتحان عمل حفظ کے زور سے پاس کئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کے نقش قدم پر چلے اگر وہ کبھی اسے نصاب کے باہر کی کوئی کتاب پڑھتے یا اپنے شوق سے کچھ لکھتے دیکھ لیتے تو پھر کیا تھا ایسے گرج گرج کر برستے کہ بے چارہ ظفر سہم کر رہ جاتا۔ برسوں سے وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتا تھا کہ جب اسکولوں کی تعلیم ختم کرکے کالج میں جاؤں گا تو وہاں ہم مذاقوں کی صحبت ہوگی۔ کتابیں ہوں گی اور میں ہوں گا۔ والد صاحب قبلہ نہیں ہوں گے۔ لیکن دو دن ہوئے جب کامیابی کی خبر آنے کے بعد والد صاحب کا سامنا ہوا تو ظفر کی آرزوؤں اور اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مظفر حسن جو محبت پدری کی وجہ سے ظفر کو کند ذہن اور بدشوق سمجھتے تھے اور اس کے تیسرے درجے میں پاس ہونے کی بھی بہت کم توقع رکھتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ وہ حسن اتفاق سے دوسرے درجے میں آگیا ہے بے حد خوش ہوئے اور فرط مسرت سے کہہ اُٹھے "واہ ظفر میاں تم نے تو کمال کر دیا۔ بتاؤ کیا انعام لوگے؟" ظفر کو ایسے لمحے اپنی ماں کے مرنے کے بعد بہت کم نصیب ہوئے تھے جب والد صاحب خوش اور مہربان ہوں اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ڈرتے ڈرتے کہا "ابا جان میرا انعام یہی ہے کہ آپ آگے پڑھنے کے لئے کالج میں داخل کرا دیجئے" یہ الفاظ سن کر مظفر صاحب کی تیوری پر بل پڑ چلے تھے۔ مگر غصہ آتے آتے رہ گیا۔ انھوں نے رنجیدگی ہوئی آواز میں جو غصے کے رنج میں بدل جانے کی علامت ہے کہا "کاش میں اس قابل ہوتا! بیٹا، کیا تمھیں میری مالی حالت کا بالکل اندازہ نہیں؟ سو روپے ماہوار پنشن ہے نہ جانے کیسے کام چلاتا ہوں۔ میں نے تمھیں انٹرنس تک پڑھا دیا۔ اسی کو غنیمت سمجھو۔ تمھارے ہیڈ ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ کالج کی تعلیم میں چالیس پچاس روپے مہینہ خرچ ہوتا ہے۔ آخر میں یہ چھ سو روپے سال کس کے گھر سے لاؤں؟ کالج وا لج کا خیال چھوڑو۔ اب تمھیں نوکری کرنی ہے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ میرا ایک مدت سے خیال ہے کہ تم انٹرنس کر لو تو تمھیں سب رجسٹراری کے لئے نامزد کرانے کی کوشش کروں۔ میرے زمانے میں تو انٹرنس پاس سعی و سفارش سے نائب تحصیل دار ہو جاتے تھے۔ آج کل سب رجسٹرار بھی ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ خوش قسمتی سے ہوبرٹ صاحب جو میری نوکری کے آخری زمانے میں مرزاپور میں جنٹ تھے، ہمارے ضلع میں کلکٹر ہو کر آئے ہیں میں پچھلے مہینے سلام کرنے گیا تھا تو میں نے اُن کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ بندہ زادہ انٹرنس پاس کرلے تو آپ کو زحمت دوں گا کہ جج صاحب سے کہہ کر اُسے سب رجسٹراری کے لئے نامزد کرا دیجئے بولے اس کی عمر کم ہے۔ مگر خیر دیکھا جائے گا۔ انگریز اتنا ہی کہہ دے تو بہت ہے۔ اگر انکار نہ کرے تو اقرار سمجھو۔ میں کل ہی ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی سے الہ آباد جاتا ہوں اور انشاء اللہ صاحب سے وعدہ لے کر لوٹوں گا" ظفر یہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ اُس نے اپنے ذہن میں کالج کی زندگی کا جو خیالی قصر مدت سے بنا رکھا تھا وہ ایک دم سے مسمار ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ایک لق و دق چٹیل میدان نظر آنے لگا۔ عام طور پر اس کی یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ جب اس کے والد کسی بات کا دو ٹوک فیصلہ کر دیں تو اس کے بعد ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔ مگر اس وقت انتہائی مایوسی نے اس میں یہ جرأت پیدا کر دی تو اس نے کہنا شروع کیا، "مگر سنئے تو ابا جان ———" بھلا ابا جان کو یہ برداشت کہاں کہ بیٹا مشیت پدری میں دم مار سکے۔ ان کا غصہ جسے رنج کے حربے نے تھوڑی دیر کے لئے روک دیا تھا، ایک دم سے بھڑک اٹھا "بس اگر مگر کچھ نہیں۔ جو ہم نے کہہ دیا وہ ہو کر رہے گا۔ بدتمیز کہیں کا۔ ہم سے کہتا ہے سنئے تو گویا ہمارا کام سننا ہے! تو اپنے برے بھلے کو ہم سے بہتر سمجھتا ہے؟ جا وضو کرکے دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھ۔ خدا کی دین ہے کہ دوسرے درجے میں پاس ہو گیا ورنہ تجھ میں یہ قابلیت تھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟"

ظفر کے دل پر ایک ایک لفظ تیر کی طرح لگا۔ وہ رنج غصے اور غیرت سے کانپتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ اسے افسوس ہوا کہ شکرانے کی نماز پہلے ہی پڑھ چکا تھا، ورنہ اب ہرگز نہ پڑھتا اور باپ کی عدول حکمی کرکے اپنے مجروح دل کو اور کچھ نہیں تو ایک قسم کی غیر فطری تسکین ہی دے لیتا۔

دو روز سے ظفر اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ وہ کالج میں پڑھ سکے، اور نوکری کے جھمیلے سے بچ جائے۔ اُدھر اُسے کالج کے طالب علموں کی

زندگی جسے وہ آزادی اور ذہنی راحت کی زندگی سمجھتا تھا، اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ادھر نوکری کے خیال سے اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ اس کی حجاب آگیں، خلوت پسند طبیعت اور اعصابی مزاج کے لئے ایسا کام جس میں ہر وقت اجنبیوں سے سابقہ ہوتا ناقابل برداشت تھا۔ سب رجسٹراری کے فرائض کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہ تھا۔ اس کا تخیل یہ بھیانک نقشہ کھینچتا تھا کہ اس کے سامنے میز پر طرح طرح کے چیتھڑوں کا انبار ہے، زمیندار اور مہاجن اسے گھیرے کھڑے ہیں اور تقاضا کر رہے ہیں کہ "ہمیں سب رجسٹرار کر دو"۔ نوکریوں میں سب سے کم خوفناک اسے معلمی کی نوکری معلوم ہوتی تھی لیکن جو میٹرک پاس ماسٹر اس کے اسکول میں تھے انہیں اتنی کم تنخواہ ملتی تھی اور ایسے پھٹے حالوں رہتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو مشکل سے اس قسم کی ملازمت پر آمادہ کر سکتا تھا اور اگر کر بھی لیتا تو اپنے والد کو کیسے راضی کرتا؟

کچھ تو عمر اور طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ اس ہیبت اور وحشت کی وجہ سے جو اس کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے بیٹھی ہوئی تھی اس نے گھر کے معاملات سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا تھا اس لئے اسے اپنے باپ کی آمدنی اور خرچ کا پورا اندازہ نہ تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ جب مظفر حسین صاحب اب سے نو برس پہلے پنشن لے کر دریاپور میں آئے تھے تو گھر میں چار نوکروں کے بجائے دو نوکر رہ گئے تھے۔ ایک ماما اور ایک خدمت گار۔ اور تیسرے چوتھے دن کی دعوتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن کھانے پینے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا، خاصی آرام کی زندگی گزرتی تھی۔ ہاں چار برس بعد جب اس کی ماں کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا اور کم و بیش سال بھر جاری رہا تو گھر کی زندگی کا معیار گرنے لگا، اور ان کے انتقال کے بعد بڑی تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے والد نے جنہیں بیوی سے بے حد محبت تھی اپنے تھوڑے سے اندوختے کے علاوہ آبائی جائداد کا [illegible] ان کے علاج میں اور پھر فاتحہ سوئم کی رسموں میں صرف کر دیا اور اب ان کی کل کائنات سو روپے ماہوار پنشن اور ڈھائی تین سو سالانہ جائداد کی آمدنی رہ گئی تھی۔ اگر ان کی گھر والی زندہ ہوتیں تو اس میں بھی اچھی خاصی طرح کام چلا لیتیں، لیکن مردانہ کارخانہ رو رو کر چلتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس کے والد شاید اس وجہ سے اتنا کم خرچ کرتے ہیں کہ اس کی تعلیم کے لئے روپیہ بچا کر رکھیں مگر اس دن کی گفتگو سے اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے پتہ چلا کہ میر صاحب اب اتنے تنگ دست ہو گئے ہیں کہ اسے آگے پڑھانے کا خرچ نہیں اٹھا سکتے

اس وقت اس کا قوی اور بے قید تخیل عجیب عجیب نقشے بنا رہا تھا فرض کرو اس کی مرحوم ماں اس کی تعلیم کے لئے میاں سے چھپا کر اپنے بھائی کے پاس روپیہ جمع کرا گئی ہوں (پانچ ہزار؟ نہیں پانچ ہزار کی کیا ضرورت ہے تین ہزار بہت کافی ہیں) اور پھر ماموں کا خط آتا ہے بلکہ وہ خود ہزار میل کا سفر کر کے اسے مبارکباد دینے آتے ہیں اور (روپے کی پوٹلی نہیں تین ہزار کی پوٹلی تو بہت بھاری ہوگی، ماموں جان جیسے مرزا پھویا سے اٹھائی بھی نہ جائے گی) نوٹوں کی گڈی جس میں سو سو روپے کے تیس نوٹ ہیں اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں، "لو بیٹا یہ تمہاری ماں کی امانت ہے آج میں اس سے سبکدوش ہوتا ہوں" مگر یہ نقشہ کچھ بنتا نہیں اس لئے کہ ظفر اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر ماموں جان کے ہاتھ میں اس سے دس گنی رقم بھی اپنی پرائی کسی کی ہوتی تو وہ کبھی کے اس سے گھوڑدوڑ میں سبکدوش ہو چکے ہوتے۔ اچھا یہ نہ سہی۔ اس کے پاس جیب خرچ کے بچے ہوئے پانچ روپے ہیں وہ لاٹری میں ٹکٹ خریدتا ہے نمبر ۱۰۷، دلی میٹرک کے امتحان میں اس کا رول نمبر تھا۔ اخبار میں لاٹری کا نتیجہ آیا ہے، وہ کانپتے ہاتھوں سے اخبار کھولتا ہے۔ ایک ایک کرکے سب صفحے دیکھ جاتا ہے۔ نتیجہ کہیں نظر نہیں آتا، پھر دیکھنا شروع کرتا ہے، ارے یہ پہلے صفحے کے بیچوں بیچ چوکھٹے کے اندر موٹے حرفوں میں کیا ہے؟ اول انعام دس ہزار روپے نمبر ۱۰۷۔ اب وہ بقیہ سات ہزار روپے کا مصرف سوچنے کی الجھن میں پڑ گیا اور بڑی دیر تک الٹ پھیر کرتا رہا۔

یہ خیال آرائی کا سلسلہ دوپہر کے کھانے کے بعد سے جاری تھا اور نہ جانے کتنی دیر اور جاری رہتا مگر اب ایک بلند آواز نے اس طلسم کو توڑ دیا "ارے یار ظفر کیا سو رہے ہو؟" ظفر نے چونک کر دیکھا تو ہردیال دروازے میں کھڑا تھا۔ ظفر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور زور سے آنکھیں ملتا ہوا جیسے واقعی سو رہا تھا اس نے ہردیال کو اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک کرسی میز کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

ہردیال اس کے شفیق استاد ماسٹر شیو دیال صاحب کا لڑکا تھا [illegible] دریاپور کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے [illegible] ہردیال بچپن سے ایک دوسرے کے ہم ساتھی [illegible] بڑی گہری دوستی تھی۔ ہردیال دوہرے بدن کا پست قامت لڑکا تھا اس کا رنگ کالا اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ مگر نقشہ اچھا تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ظرافت کی شوخی نے اس کی صورت میں ایک خاص کشش پیدا کر دی تھی۔

ہردیال نے ظفر کے چہرے کی حالت دیکھ کر کہا "ظفر کیا بات ہے؟ تم اس قدر رنجیدہ اور پریشان کیوں ہو؟ اسی لئے نا کہ تمہارا فرسٹ کلاس مارا گیا؟ بھائی اس کا تو سارے اسکول کو اور سب سے بڑھ کر پتا جی کو بڑا افسوس ہے مگر اب اس کا رنج چھوڑو اور انٹر کرنے کا [illegible] ایف اے میں تم یونیورسٹی بھر میں فرسٹ آؤ گے۔ تمہارے جیسے ذہین لڑکے ہوتے کہاں ہیں کمبخت جیومیٹری کے پرچے تھے ہی ایسے غضب کہ نہ جانے کتنے خواہ مخواہ لڑھک گئے ہوں گے۔ مجھے پتا جی نے آدھی رات تک امتحان سے [illegible] تو اکثر رات رات بھر جگایا ہے اسی ریاضی کے لئے، پھر بھی میرا پہلے پرچے میں ایک سوال اور دوسرے میں دو سوال غلط ہو گئے۔ نہ جانے کیسے فرسٹ کلاس رہ جاتا ورنہ بالکل امید نہیں رہی تھی۔"

ظفر:۔ نہیں ہردیال بھائی مجھے فرسٹ کلاس نہ آنے کا کچھ زیادہ خیال نہیں۔ میری ریاضی واقعی بہت کمزور تھی۔ پاس ہو گیا یہی غنیمت ہے۔

ہردیال:۔ خیر یہ تو تم نے سعادت مندی کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اگر یہ بات نہیں تو پھر محرمی صورت بنائے کیوں بیٹھے ہو۔ کیا مظفر چچا نے پھر دوسرا جھاڑ دی؟

ظفر:۔ کاش وہ مجھے مار لیا کرتے مگر اس طرح ذلیل نہ کرتے۔ جانتے ہو پرسوں کیا ہوا۔ امتحان کا نتیجہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے مانگ کیا مانگتا ہے۔ میں نے کہا مجھے کالج میں داخل کرا دیجئے۔ فرمایا کالج کا چالیس پچاس روپے مہینے خرچ میں نہیں اٹھا سکتا۔ تجھے نوکری کرنی ہو گی میں کلکٹر صاحب سے کہہ کر سب رجسٹرار کرا دوں گا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس طرح جھڑک دیا جیسے کوئی کتے کو دھتکارتا ہے۔ میری زندگی تباہ ہو رہی ہے اور میں دم نہیں مار سکتا۔ بولا اور گلا گھونٹ دیا گیا۔ خدا ایسا باپ بھی کسی کو نہ دے"

ہردیال:۔ ارے میاں کیوں ناشکری کرتے ہو۔ باپ جیسا بھی ہو بہت غنیمت ہے اسے سینت سینت کر رکھنا چاہئے۔

ع۔ گیا باپ پھر ملتا تو آتا نہیں

اور یہ تم نے کیا کہا کہ ایسا باپ خدا کسی کو نہ دے ہمارے ملک میں تو سبھی باپ بیٹوں کو روئی کی طرح دھنکتے ہیں، اور کیوں نہ کریں، آخر ان کے باپوں نے بھی تو ان کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ وہ اصل مع سود کے ہم کو ادا کر دیتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔ یہ تو تم دنیا سے نرالے بیٹے ہو جو باپ کی جھڑکیاں کھانے کو ذلت سمجھتے ہو، ہاں یہ ہم نے سنی کہ آگے پڑھانے پر راضی نہیں، نوکری کرانا چاہتے ہیں۔ میں پتا جی سے کہوں گا، وہ انہیں سمجھائیں تو شاید مان جائیں۔

ظفر:۔ کیسے مان جائیں گے؟ وہ کہتے ہیں چالیس پچاس روپے مہینہ کس کے گھر سے لاؤں؟

ہردیال:۔ اجی یہ سب نہ کرنے کی باتیں ہیں ورنہ ایسی کون سی مشکل ہے، پچاس وچاس کچھ نہیں سب ملا کر بیس، چالیس کا خرچ ہے۔ اب بھی تمہارے کھانے کپڑے، فیس اور کتابوں پر پچیس سے کیا کم خرچ ہوتا ہو گا؟ پندرہ ہی روپے تو زیادہ ہوئے، سال میں ایک سو اسی۔ اچھا پچیس روپے کی حامی بھر لیں۔ باقی روپے کا انتظام ہو جائے گا۔

ظفر:۔ آخر کیسے؟

ہردیال:۔ وہ پوچھیں تو بتا دوں۔ منڈی کے پاس ان کا جو ٹوٹا مکان بے کار پڑا ہے اس کی زمین

کچھ نہیں تو آٹھ سو کو ضرور بک جائے گی۔ چلو چار برس کا خرچ تو نکل آیا۔ اگر اس کے بعد ایم اے کرنا چاہو گے تو کچھ اور جتن کریں گے۔

ظفر: کہیں ان کے سامنے اس کھنڈر کے بیچنے کا ذکر نہ کر دینا۔ ابا جان نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے دادا نے مقدمہ بازی میں ہزاروں روپیہ ضائع کرکے صرف یہ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان جیتا تھا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ یہ ہمارا آبائی مکان ہے جس میں ہمارے بزرگ پہلے پہل آکر رہے تھے۔ تم نوکری کرکے روپیہ جمع کر لوگے تو اس کو پھر سے بنوائیں گے تاکہ بزرگوں کا نام نہ مٹنے پائے۔

ہردیال: یار یہ بزرگوں کا نام بھی عجیب ڈھکوسلا ہے۔ کوئی پوچھے بزرگوں کا نام اینٹ پوست کے مکان سے رہے گا یا اس سے روشن ہوگا کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر عالم فاضل بنے۔ خیر تم اپنا جی نہ کڑھاؤ۔ میرے خیال میں یہ سب رجسٹرار والی بات تو ہوائی ہوائی نہیں اٹھارہ برس کی عمر میں تمہیں کوئی کیسے نامزد کرے گا، ایسے تو خوب صورت بھی نہیں۔

ظفر: یہ تو ابا جان خود کہتے تھے کہ کچھ دن پہلے انھوں نے کلکٹر سے ذکر کیا تھا تو اس نے کہا کہ تمہارے لڑکے کی عمر بہت کم ہے مگر خیر دیکھا جائے گا۔ ابا جان نے اسے اقرار سمجھا۔

ہردیال: واہ رے خوش اعتقادی۔ اس بچارے نے طریقے سے انکار کیا اور آپ اقرار سمجھ رہے ہیں۔ یار انگریز اچھا خاصا انسان ہوتا ہے مگر ہم جیسے لوگ اسے بھی اپنی طرح بن مانس بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ سب رجسٹراری سے ہاتھ دھو رکھو۔ ہیں اپنے ہاں کوئی چھوٹی موٹی جگہ دے دوں گا یا شاید کوئی کام سکھانے کو بھیج دیا جاتا ہو۔ بہر حال پتا جی کل سہ پہر کو شہر سے واپس آنے والے ہیں۔ انھیں یہ قصہ معلوم ہوگا تو ... ہی منظفر چچا سے مل کر انھیں سمجھائیں ...

ظفر: ابا جان بھی اسی گاڑی سے آئیں گے۔ اگر سب رجسٹراری کی کوشش میں کامیابی نہ ہوئی تو غالباً نوکری کے بارے میں ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ ایسی صورت میں ہیڈ ماسٹر صاحب سمجھائیں تو شاید کچھ اثر ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو مانتے تو بہت ہیں مگر سچ پوچھو تو مجھے کچھ امید نہیں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے کہ بنتی ہوئی بات بگڑ جائے گی۔

ہردیال: دوست تم تو بڑے بھاری جوتشی ہو کر شخص اپنی قسمت کا سب حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ذرا میرا ہاتھ جانچ کر بتا دو کہ میری کے شادیاں ہوں گی۔

ظفر: ایک بھی نہیں۔ تم جیسے مسخرے سے کون لڑکی شادی کرے گی۔

ہردیال: (کرسی سے اٹھ کر) یہ نہ کہو، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ اچھا چلو ذرا ندی کی طرف ہو آئیں دیکھیں رات کی بارش کے بعد کتنا پانی بڑھا ہے۔

ظفر پر ہردیال کی خوش دلی اور امید پروری کا اس سے زیادہ اثر ہوا جتنا وہ ظاہر کر رہا تھا۔ دراصل اس کی طبیعت کی لہر اب بھنور سے ندی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ رنج و افسردگی کے وقار کو اتنی جلد کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مظلومانہ انداز سے اٹھا اور اچکن ٹوپی پہن کر ہردیال کے ساتھ ہو لیا۔ (باقی آئندہ)

شامی سیاست کی نیرنگیاں (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

کرنل حسنی زعیم صاحب جتنے ہوشیار فوجی ... ہوں جنگوں میں انھوں نے جیتنے کا رزم سے نمایاں انجام دئیے ہیں۔ ... مصری اخباروں کے وہ ماہر سیاست داں نہ تھے۔ انھوں نے برسر اقتدار آتے ہی چن چن کر مخالفوں کو اپنی حکومت سے نکال دیا اور فوج کے بل بوتے پر بالکل فوجی قسم کی حکومت قائم کر لی۔ چنانچہ "آخر ساعت" (ایک مصری ہفتہ وار اخبار) کے ایک نمائندے نے کہا کہ آپ جو حکومت کے پرانے کارکنوں کو نکال دیتے ہیں تو پھر آپ کو حکومت کے گُر کون بتلائے گا اور مشکل موقعوں پر آپ کی رہنمائی کون کرے گا؟ تو کرنل نے بڑے انداز سے جواب دیا کہ "نپولین کے پاس بھی تو مشیر نہ تھے اور پھر بھی اس نے دنیا میں وہ کر دکھایا جس کو تم بھی جانتے ہو" اور پھر اسی انداز سے انھوں نے حکومت کرنی شروع کی۔ قانون کے مطابق انھوں نے انتخاب کرایا اور خود ہی صدر جمہوریہ بن گئے اور ان کی حکومت کو سارے ممالک عربیہ اور یورپ کے ملکوں نے تسلیم کر لیا۔ لیکن قوم اور فوج تو اس وقت دل سے تسلیم کرتی جب وہ ان کے درد کا درماں تلاش کرتے۔ گرانی اور چیزوں کی کمیابی اور خود شام کی عالم ... انھوں نے وعدے کئے اور لوگ ... کا انتظار کرتے رہے۔ مگر وہ ... اور پھر انھوں نے عیش و عشرت کی محفلیں گرم کرنی شروع کیں۔ مصری اخبارات کا تو کہنا ہے کہ فسق و فجور میں وہ اس قدر بڑھ گئے کہ انتہا نہ رکھی۔ رشوت اور لوٹ کھسوٹ کا ایسا بازار گرم کیا کہ کبھی دیکھا نہ گیا۔ اقربا پروری میں اس قدر فیاضی دکھائی اس کی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ عوام اور فوج ان سے بھی ناامید ہو گئی اور پھر انقلاب کے کالے اور گھنے بادل شام کی فضا پر منڈلانے لگے اور ایک دن فوجیوں نے طے کیا کہ کرنل کی حکومت کا بھی تختہ الٹ دیا جائے۔

اور کرنل ایک رات شام کے ایک سب سے اچھے ہوٹل میں رقص و سرود کی محفل جمائے ہوئے جام شراب و ناب و ذوق صدائے چنگ کے مزے لے رہے تھے کہ یہ فوجی اٹھے کہ اسی عالم بدمستی اور عیش کوشی میں ان کو دنیا سے رخصت کر دیں۔ مگر عین موقع پر رائے بدل گئی اور دوسرے دن صبح سویرے جب کرنل خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے، بیس پچیس فوجی لاریاں ان کے محل کے سامنے آکر رکیں اور فوج نے پورے محل کا محاصرہ کر لیا، دربان سے کہا گیا کہ پھاٹک کھول دو۔ اور اس نے فوجی سلام کیا اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، باغی محل میں گھس گئے۔ کرنل کو بیدار کیا اور باہر لا کر ایک لاری میں بٹھا کر راستہ لیا۔ بغاوت کی بھنک کرنل کے کان میں بھی پڑ چکی تھی مگر اس نزاکت کا احساس نہ تھا۔ اب وہ سارا ماجرا سمجھ گئے۔ مجبوراً اپنے کو باغیوں کے حوالے کر دیا۔ اور وہ انھیں لے کر ایک غیر معلوم جگہ پہنچے اور انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ پھر ان کے وزیر محسن البرازی کی باری آئی اور ان کے ساتھ بھی یہی ڈراما کھیلا گیا پھر باغیوں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

سامی الحناوی سے ایک مصری نامہ نگار نے پوچھا کہ اتنی جلدی یہ انقلاب کیسے ہو گیا؟ پہلے تو انھوں نے اس سلسلے میں کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر بولے کہ "آپ صحافیوں کا کام تو صحیح تاریخ مرتب کرنا ہی ہے نا؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں ہم لوگ سمجھتے تو یہی ہیں"۔ میں نے کچھ اور پوچھا تھا آپ شاید بھول گئے۔ "نہیں نہیں" حناوی نے اپنی پروقار آواز میں کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم تاریخ کو اس طرح لکھنا چاہتے ہو جس طرح اسے ہونا چاہیے تو تم بھی بعض اخباروں کی طرح یہ لکھ دو کہ کرنل حسنی زعیم اپنے مخالفوں کی گولی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور اس نے چلا کر کہا کہ میں بہادر اور مرد کی موت مرنا چاہتا ہوں میں زندگی میں بھی شیر رہا اور مرتے وقت بھی شیر کی طرح جان دوں گا۔ اور میرا بھی جی چاہتا ہے کاش تاریخ اسی طرح لکھی جاتی لیکن افسوس! واقعہ ہوا اس طرح نہیں۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ... اس کا اسے احساس ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ نشے ... میں دھت تھا۔ وہ اپنے قاتلوں کے سامنے کھڑا رہا تھا۔ ... کی وجہ سے نہیں، میں اس کی بہادری پر شک نہیں کرتا، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ انقلاب کی رات جو ... تھی اس میں اس نے اتنے جام چڑھائے تھے کہ ابھی تک اس کا خمار نہیں اترا تھا۔"

غرض باغیوں نے کرنل کو بڑی بیدردی سے قتل کر دیا اور اس طرح بڑے سکون اور بغیر کسی تلاطم کے اتنا بڑا انقلاب صرف چار گھنٹے کے اندر ہو گیا۔

اب عارضی طور پر سامی الحناوی صدارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ شام کے بہت معزز اور باوقار ڈپلومیٹ میں ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جو کچھ بھی کریں گے سوچ سمجھ کے اور حسن تدبیر سے کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے جدید انتخابات کرائے جن میں عرب ملکوں کی تاریخ میں پہلی بار عورتوں نے بھی رائے دی۔

لیکن ... دسمبر کی صبح شام کے لئے ایک نئے انقلاب کا پیام لائی۔ ایک بار پھر فوج کرنل عابد شیشکلی کی کمان میں اٹھی اور اس نے سامی الحناوی اور ان کے برادر نسبتی ... نائب وزیر خارجہ کو گرفتار کر لیا۔ کرنل شیشکلی نے ریڈیو ...

خُلقِ محمدیؐ

صالحہ عابد حسین

آں حضرتؐ کی سیرت اتنی پختہ، مکمل اور زندگی کے ہر حصے پر حاوی اور آپ کا اخلاق ایسا وسیع اور بلند تھا جس کی مثال تاریخ میں شاذو نادر ھی ملے گی۔ کلام الٰہی کی ساری تعلیم اگر کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھنا ھو تو اس کے لئے آں حضرتؐ سے زیادہ مکمل نمونہ نظر نہ آئے گا۔ آپ کی تو ساری زندگی تفسیر ھے کلام مجید کی۔ کیا ھمارا یہ فرض نہیں کہ ھم اپنے مذھب کی جامع اور مانع کتاب اور اپنے رھنما کی سیرت پر غور و فکر کریں اور اس تعلیم کو سمجھیں جو ھمیں اسلام نے دی ھے۔ کیا دنیا میں بہت سی قوموں کی گمراھی کی یہی وجہ نہیں ھے کہ انھوں نے اپنے رھنماؤں کو خدا کا درجہ دے دیا اور ان کو پوجنے لگیں ان کی تعلیم سے بیگانہ ھوتی گئیں اور کیا یہ حقیقت نہیں ھے کہ ھم بھی اسی راہ پر جا رہے ھیں

ربیع الاوّل کا مہینہ دنیا کے محسنِ اعظم، ہادیِ برحق، رحمۃ اللعالمین، محمد مصطفٰےؐ کی پیدائش کا مہینہ ہے یوں تو اس مہینے میں ساری دنیا کے مسلمان اس مبارک موقع پر خوشی کے جشن مناتے اور محفل میلاد منعقد کرتے ہیں لیکن ہم اس دور کے مسلمان اپنے مذہب کی روح سے کچھ ایسے بے گانہ ہوگئے ہیں کہ کبھی سنجیدگی سے یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اسلام اور اس کی اصلی تعلیم اس کی روح کیا ہے۔ ہم اتنا بھی تو نہیں کرتے کہ اسلام کے پیام بر اور مسلمانوں کے ہادی و رہنما محمد مصطفٰےؐ کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں۔ آں حضرتؐ نے نہ صرف اپنی تعلیم بلکہ اپنی ذاتی مثال سے بھی اسلام کی تعلیم کا ایسا مکمل نمونہ پیش کیا ہے کہ صرف اسی کو جان کر ہم اسلام کے بنیادی اصول اور تعلیم اور اس کی روح کو بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔

آں حضرتؐ کی سیرت اتنی پختہ، مکمل اور زندگی کے ہر حصے پر حاوی اور آپ کا اخلاق ایسا وسیع اور بلند تھا جس کی مثال تاریخ میں شاذو نادر ہی ملے گی۔ کلام الٰہی کی ساری تعلیم اگر کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھنا ہو تو اس کے لیے آں حضرتؐ سے زیادہ مکمل نمونہ نظر نہ آئے گا۔ آپ کی تو ساری زندگی تفسیر ہے کلام مجید کی۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ ہم اپنے مذہب کی جامع اور مانع کتاب اور اپنے رہنما کی سیرت پر غور و فکر کریں اور اس تعلیم کو سمجھیں جو ہمیں اسلام نے دی ہے! کیا دنیا میں بہت سی قوموں کی گمراہی کی یہی وجہ نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے رہنماؤں کو خدا کا درجہ دے دیا اور ان کو پوجنے لگیں اور ان کی تعلیم سے بے گانہ ہوتی گئیں اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم بھی اسی راہ پر جا رہے ہیں۔ ہم اپنے مذہبی پیشواؤں کا احترام تو بہت کرتے ہیں بلکہ اس احترام کو پرستش کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں، لیکن اس تعلیم اور اس کردار کا پرتو بھی ہماری سیرت میں مشکل سے نظر آتا ہے جو ہادیٔ برحق نے ہمیں دی تھی۔ ہم یا تو مذہب کی تعلیم اور روح کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مذہب ہی سے بیزار ہوگئے ہیں یا پھر محض چند عبادتوں اور رسموں کا نام ہم نے اسلام رکھ لیا اور یہ بھول گئے کہ اسلام دینِ فطرت ہے جس کی تعلیم زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور وہ ہر زمانے ہر ملک اور ہر دور میں ہمارا رہنما رہا ہے اور آئندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اگر آج دنیا میں مسلمان تباہ حال ہیں۔ ذلت و پستی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں ان کا اخلاق اور سیرت گھٹیا ہے تو ہرگز اس کا سبب مذہب اسلام نہیں بلکہ اسلام سے بے گانگی یا اس کی تعلیم سے روگردانی ہے۔ اگر مسلمان بھی اپنے نبی کو ایک مافوق الفطرت ہستی سمجھ کر ایک طرح سے انھیں پوجنے نہ لگتے اور ان کی تعلیم اور ان کی سیرت کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنی سیرت اور معاشرت تعمیر کرتے تو ان کی آج یہ حالت نہ ہوتی جو ہے اور اب بھی اگر ہم لوگ اسلام کی اصلی اور صحیح تعلیم کو سمجھیں، قرآن پاک کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں اور شارحِ قرآن کی سیرت کو پڑھیں اور اس کو مشعلِ راہ بنائیں تو پھر دنیا میں سربلند اور سرخرو اور باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔

اس مضمون میں خلقِ محمدیؐ کا کچھ ذکر کرنا چاہتی ہوں، میں اس میں خلقِ محمدیؐ کے صرف اس پہلو کا ذکر کروں گی کہ آں حضرتؐ کا دوسروں سے کیا سلوک تھا۔

ہر شخص کی سیرت کا اندازہ زیادہ تر اس سے لگایا جاتا ہے کہ دوسروں سے اس کا برتاؤ کیا ہے! اگر وہ ہر دل عزیز ہے تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہوگا کہ اس کا اخلاق پسندیدہ ہے۔ آں حضرتؐ کو زندگی بھر جتنے لوگوں سے واسطہ پڑا اپنے ہوں یا غیر عورتیں ہوں یا بچے، غریب یا امیر، غلام ہو یا مہمان ہر واسطہ والے سے آپ کا سلوک ایسا تھا کہ وہ آپ کے مداح اور جاں نثار رہتے۔ یہاں تک کہ جانی دشمن بھی۔ در اصل آپ کی تعلیم کے دشمن تھے، لیکن ذاتی طور پہ آپ کی اعلیٰ سیرت اور بہترین اخلاق کے معترف تھے۔

ہر وقت ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ نہ صرف محبت، عنایت اور احسان کا تھا بلکہ اپنی ساری عظمت و بزرگی کے باوجود آں حضرتؐ ان میں اس طرح گھل مل کر رہتے تھے کہ ذرا سی برتری یا بڑائی کا احساس کسی کو نہ ہونے دیتے تھے۔ اجنبی لوگوں کے لئے یہ پہچاننا مشکل ہوتا تھا کہ ان میں پیمبر اور بادشاہ کون ہے؟

پیمبر اسلام کی تقریباً ساری زندگی غربت اور محنت میں بسر ہوئی۔ جب کبھی ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع آتا تو آپ ساتھیوں کا ہاتھ بڑی خوشی اور اصرار سے بٹاتے بلکہ اکثر گھٹیا کام اپنے ذمے لیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر سب کو مل کر کھانا پکانا تھا تو آپ نے لکڑیاں چن کر لانے کا کام کیا، ایک اور موقع پر مسجد کی تعمیر کے وقت اینٹیں ڈھو ڈھو کر لائے۔ آپ سب کے ساتھ کھاتے، ساتھ بیٹھتے، کسی کی کوئی بات ناگوار گزرتی یا کسی سے تکلیف پہنچتی تو خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے۔ کوئی نازیبا بات دیکھتے تو نرمی سے سمجھا دیتے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں عدل و انصاف کا معاملہ آپڑتا تو پیارے سے پیارے دوست اور عزیز سے عزیز ساتھی کے ساتھ بھی رتی بھر رعایت نہیں کرتے تھے۔

انسان کو عام طور پر اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے کد اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے لیکن رحمۃ اللعالمین بجائے نفرت کے ان سے بھی شفقت اور رحم کا برتاؤ کرتے تھے۔ مخالفوں نے دشمنی کی انتہا کر دی تھی کون سی گستاخی اور بدسلوکی تھی جو اسلام کے دشمنوں نے پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ روا نہ رکھی ہو مگر آپ ہمیشہ صبر اور خاموشی سے اُن کو سہتے۔ نہ کبھی دشنام دی، نہ بُرا کہا، نہ بدلہ لیا اور اسی کے ساتھ کبھی ان سے دبے بھی نہیں اور ہر حالت میں دعوت اسلام اور اعلانِ حق کو قائم رکھا۔

اور جب مخالفوں کی بدسلوکی نے مکے میں اعلان حق کو ناممکن بنا دیا تو آپ مدینہ ہجرت کر گئے وہاں بھی بعض لوگوں نے جن میں عرب کے کچھ بدو اور اکثر یہودی شامل تھے آپ کے ساتھ بدسلوکی گستاخی اور وعدہ خلافی کی اور آپ کے دشمنوں کا ساتھ دیا لیکن ہمیشہ محمدؐ کا برتاؤ ان کے ساتھ بھی عنایت اور نرمی کا رہا، اس لئے اکثر ایسا ہوتا کہ مخالف آپ سے لڑنے، بحث کرنے یا محض آپ کو برا بھلا کہ

اپنا طیش ٹھنڈا کرنے کے لئے آتا۔ لیکن جب خلق محمدی کا جلوہ دیکھتا تو شرمندہ اور تائب ہوجاتا۔ کتنے لوگ اس طرح ایمان بھی لائے ہیں۔ مکے کی فتح کے بعد جب آپ مکے میں داخل ہوئے تو وہ سب لوگ جنھوں نے برسوں تک آپ کی دشمنی اور ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا آپ کے قبضے میں تھے۔ رحمۃ اللعالمین نے اس وقت بھی وسعت قلب اور عفو و کرم کا مظاہرہ کیا، اور دشمنوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے اعلان کر دیا کہ جو اسلام لے آئیں اور جو اسلام نہ لائیں، مگر اطاعت قبول کرلیں، ان سب کو امان ہو۔ لڑائی ایمان اور کفر، حق اور باطل کے درمیان تھی جب حق کو فتح ہوئی، باطل نے شکست کھائی اور ایمان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو ہادیٔ دو جہاں کا مقصد پورا ہوگیا۔ اور وہ سب مصائب جو آپ نے اُن کے ہاتھوں سہے تھے حرف غلط کی طرح قلب مبارک پر سے محو ہوگئے۔ بڑے بڑے متعصب یورپین مؤرخ بھی اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ محمد مصطفٰےؐ نے سب سے بڑی جو لڑائی جیتی اس میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا گیا۔

دنیا امیر غریب، کم حیثیت اور بڑی حیثیت میں سدا فرق کرتی آئی ہے اور انسان کی عزت اور درجہ زیادہ تر پیسے کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، لیکن اسلام کی سب سے بڑی تعلیم یہی تھی کہ سب انسان برابر ہیں اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ رنگ نسل، دولت، اثر، اقتدار ان میں سے کوئی بھی ایک کو دوسرے پر برتری نہیں دے سکتی ——— ہاں فضیلت اور بزرگی کا معیار صرف ایک ہے ——— اور وہ ہے تقویٰ، یعنی نیکی جس کے کام اچھے اور نیکیاں زیادہ ہیں وہ دوسروں سے برتر ہے۔ آں حضرت نے اپنی مثال سے عرب جیسی نسل و دولت کی پرستار اور گھمنڈی قوم کو مساوات کا ایسا سبق سکھا دیا تھا کہ بڑے سے بڑے سردار اور دولت مند کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی غریب یا کم درجے کے آدمی کو اپنے سے گھٹیا سمجھے اور ذلت کا برتاؤ کرے۔ آں حضرت ہمیشہ غریبوں اور کم حیثیت لوگوں کا احترام بڑے لوگوں سے زیادہ کرتے۔ اصحاب صفہ جو مفلس مسلمانوں کا ایک گروہ تھا۔ آں حضرتؐ کو بہت عزیز تھا اور دن رات ان کی بہبودی کی فکر میں رہتے تھے اور اُن سے عزیز بھائیوں کا سا سلوک فرماتے تھے۔

غلاموں کی حالت اس زمانے میں جانوروں سے بھی کہیں بدتر تھی۔ ان پر دنیا بھر کے مظالم توڑے جاتے تھے جن کی نہ کہیں داد تھی نہ فریاد۔ آں حضرت نے اپنی تعلیم اور اپنے طرز عمل سے انھیں انسان کا رتبہ عطا کیا۔ غلاموں کو اپنی اولاد کے برابر [illegible] سمجھا انتہائی تاکید کی کہ جو خود کھاؤ انھیں کھلاؤ جو خود پہنو انھیں پہناؤ اور غلاموں کو آزاد کرنا بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ آپ خود ان لوگوں سے بے انتہا محبت اور عنایت سے ملتے اور برابری کا سلوک کرتے تھے آپ کے ایک غلام زید تھے جنھیں آں حضرت بے حد چاہتے تھے یہاں تک کہ لوگ انھیں ابن محمد کہنے لگے تھے۔ غلامی کی لعنت دور کرنے کی آپ کو اس قدر فکر تھی کہ آخری وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے کہ غلاموں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔

آں حضرتؐ کی ساری زندگی فقر و عسرت میں گزری۔ آخری زمانے میں جب مسلمانوں کی حالت اتنی خراب نہ رہی تھی اس وقت بھی آپ صبح سے شام تک اپنی آمدنی کا ایک ایک پیسہ خیرات نہ کر لیتے آرام نہ کرتے، لیکن اس حالت میں بھی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ مہمان کو دیکھ کر آپ کو دلی اور روحانی مسرت ہوتی۔ جو کچھ گھر میں حاضر ہوتا سب مہمان کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ اپنا بستر اسے سونے کے لئے دیتے اور اپنے ہاتھ سے خود اس کا سارا کام کرتے مثال کے طور پر ایک واقعہ سنئے۔ ایک عرب بدو مہمان آیا۔ آں حضرتؐ نے اس کو کھانا کھلایا اور رات کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے بستر دھو رہے ہیں جسے بدو گندہ کر گیا تھا۔

عورت کی اسلام سے پہلے ساری دنیا میں بڑی ابتر حالت تھی۔ اس کی نہ کوئی ذاتی شخصیت تھی نہ حقوق اسے سچ پوچھئے تو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا وہ محض ایک بے حس جاندار کھلونا تھی جسے مرد اور سماج جیسے چاہے استعمال کرتا تھا۔ مگر اس محسن انسانیت نے عورت کو ذلت کے گڑھے سے نکالا۔ مرد کے ظلم و ستم سے چھٹکارا دلایا اور انسانیت کے سارے حقوق اُسے عطا کئے۔ آں حضرتؐ کے پاس اکثر عورتیں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے یا محض عقیدت کی بنا پر حاضر ہوتی تھیں۔ آپ بڑی خندہ پیشانی سے اُن سے ملتے۔ ہر سوال کا جواب دیتے اور عزت و احترام کا برتاؤ کرتے۔ آپ کی رضاعی ماں اور بہن آتیں تو اپنی چادر اُن کے بیٹھنے کے لئے بچھا دیتے۔ آپ بار بار کہتے تھے کہ عورتوں سے محبت، نرمی، عدل اور مساوات کا برتاؤ کرو۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والوں سے اچھا ہے۔

بچوں سے آں حضرتؐ کو خصوصیت کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ اور بچے بھی آپ پر جان دیتے تھے راستے میں بچوں کو کھیلتا دیکھتے تو ٹھہر جاتے اور ان سے باتیں کرتے۔ سر پر ہاتھ پھیرتے۔ ان کے کھیلوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے اور بچوں سے ان کی پسند اور مذاق کی گفتگو فرماتے۔ سفر سے واپس تشریف لاتے تو رستے میں جو بچے ملتے ان کو اپنے اونٹ پر بٹھا لیتے۔ کوئی قصور کسی بچے سے ہو جائے تو کبھی سزا یا ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے تھے بلکہ شفقت کے ساتھ سمجھا دیتے تھے۔ بچوں کو گلے لگانے، پیار کرنے کندھوں پر سوار کر لیتے اور یہ محبت محض اپنے [illegible] اور مسلمانوں کے بچوں تک ہی [illegible] نہ تھی بلکہ مشرکوں اور دشمنوں کے بچے بھی اس میں شریک تھے۔

مکے سے ہجرت کے بعد جب آپ پہلی مرتبہ مدینے میں داخل ہوئے تو ننھی ننھی بچیاں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ آپ نے پوچھا "تم مجھے پیار کرتی ہو؟" بچیوں نے کہا "ہاں رسول اللہ ہم آپ کو پیار کرتے ہیں" آپ نے فرمایا "میں بھی تمھیں پیار کرتا ہوں" ایک مرتبہ ایک بدو عرب آیا تو اس وقت آپ کسی بچے کو پیار کر رہے تھے، اس نے حیرت سے کہا "آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ میرے دس بچے ہیں، مگر کبھی کسی کو پیار نہیں کیا؟" آں حضرت نے فرمایا " اللہ تعالےٰ اگر تمھارے دل سے محبت چھین لے تو میں کیا کر دوں؟" آں حضرت یوں تو ہر بچے کو چاہتے تھے مگر اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ کے دونوں صاحب زادوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے تو آپ کو بے حد ہی محبت تھی اور ان کے ساتھ آپ اس طرح کھیلتے جیسے خود بچہ ہوں۔ اُن کی خاطر کبھی اونٹ بن جاتے انھیں اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتے اکثر گود میں لے کر مسجد جاتے اور نماز میں بچے آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے تو آپ سجدے کو طول دیدیتے تھے وہ بیمار ہو جاتے تو آپ بے کل ہو جاتے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا ہمیشہ خیال رکھتے

آپ کا قول ہے "حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔ امام حسینؑ کے بارے میں اکثر فرمایا "حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں جس نے حسین کو چاہا اس نے گویا مجھے چاہا" آں حضرت کو اپنے اکلوتے لڑکے ابراہیمؑ سے بھی بڑی الفت تھی۔ جب وہ ننھی سی عمر میں فوت ہوگئے تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار اشک جاری تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوا پوچھا "حضور روتے ہیں؟" فرمایا " یہ تقاضائے بشریت ہے" یعنی میں رسول خدا ہونے کے ساتھ آخر باپ بھی تو ہوں اور باپ کا محبت بھرا دل میرے سینے میں بھی تو موجود ہے۔

کسی کی سیرت کا بالکل صحیح اندازہ اس کی گھریلو زندگی ہی سے ہو سکتا ہے جوانی کے زمانے میں آں حضرتؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی تھی جو آپ سے عمر میں تقریباً پندرہ سال بڑی تھیں۔ جوانی کے پندرہ سال آپ نے اُن کے ساتھ بسر کئے، اور ان سے اس قدر محبت تھی کہ ان کی وفات کے بعد بھی ہمیشہ اُن کا ذکر بے حد محبت اور احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کی کئی شادیاں ہوئیں آپ کا برتاؤ ہر بی بی کے ساتھ اس قدر محبت اور عزت کا اور ساتھ ہی عدل کا تھا کہ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ آپ ہمیشہ ان سے خوش مزاجی خندہ پیشانی، نرمی اور محبت کا سلوک کرتے تھے۔ سوا ان حکموں کے جو اسلام نے عورت پر عائد کئے ہیں اور جن کی پابندی کے لئے آپ ہر عورت کو ہدایت فرماتے تھے۔ آپ اپنے ذاتی کام کرنے اور اپنے حکم منوانے پر کسی بی بی کو مجبور نہ کرتے تھے۔ آپ اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑے دھو لیتے، اپنا جوتا سی لیتے۔ بکریاں دوہ لیتے، بازار سے سودا [illegible] لے آتے اور [illegible] گھر کے کام [illegible] کر لیتے [illegible] آپ کو

عارضہ تھا، آج کل کے تو اکثر مسلمان مردوں کو بیوی کے ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ سے کام کرنا کسر شان سمجھتے ہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے ہادی برحق ایک نہیں کئی کئی بیویوں کی موجودگی میں اپنے سارے ذاتی کام اپنے دست مبارک ہی کرتے تھے ۔ اس زمانے میں بھی جب آں حضرت کو ہزاروں قومی اور دینی اور ملکی کام اور مسائل نبٹانے اور سلجھانے پڑتے تھے آں حضرت کی تمام بیویاں اس پر متفق ہیں کہ آپ کا سلوک بیویوں سے بہترین تھا آپ کے خلق عظیم کا ایک اکمل ثبوت یہ لیجئے سب عزیزوں سے بھی آں حضرت بڑی محبت رکھتے تھے ۔ اپنے دادا عبدالمطلب، چچا ابوطالب اور چچی فاطمہ بنت اسد سے ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا ۔ اور ان کی ہر تکلیف اور ضرورت رفع کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ چچا زاد بھائی کی تعلیم و تربیت کا بار خود اٹھایا ۔ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سے بےانتہا الفت تھی ۔ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں ان سے ملتے اور واپس آتے تو سب سے پہلے بیٹی سے ملنے جاتے ۔ وہ آتیں تو کھڑے ہوکر تعظیم دیتے ۔ گلے لگاتے ۔ پیار کرتے ۔ ان کی تکلیف سے پریشان اور خوشی میں خوش ہوتے بیٹی داماد میں رنجش ہوجاتی تو صلح کرا دیتے اور اس سے بہت خوش ہوتے ۔ اپنے دوسرے عزیزوں سے بھی ہمیشہ محبت اور احسان سے پیش آتے تھے ۔ غرض جس طرح آپ کا سلوک دوسروں سے بہترین تھا اسی طرح اپنے قریب ترین رہنے والے عزیزوں سے بھی اتنا ہی اچھا تھا ۔

جناب رسول اللہ کے خلقِ عظیم کی ایک مکمل تصویر چند جملوں میں جناب علی مرتضیٰ نے کھینچی ہے ۔ وہی علی جو پیدائش کے دن سے لے کر آن حضرت کے آخری وقت تک ہردم آپ کے ساتھ رہے اور آپ کی تعلیم اور تربیت سے پورے طور پر بہرہ یاب ہوئے ۔ جو سب سے پہلے ایمان لائے اور ہمیشہ اسلام کی بقا اور پیمبر اسلام کی حفاظت میں سینہ سپر رہے آپ آں حضرت کے خلق کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے، تنگ دل سخت مزاج، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، بحث مباحثہ ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا اور بےکار کی بات کے پیچھے پڑنا آپ کی عادت کے خلاف تھا ۔ نہ کسی کو برا کہتے نہ کسی کا عیب پکڑتے اور نہ دوسروں کے اندرونی معاملات کی ٹوہ میں رہتے تھے ۔ بات مسکرا کر اور خندہ پیشانی سے کرتے، دوسروں کی گفتگو صبر اور سکون سے سنتے کوئی آپ کی تعریف کرتا تو پسند نہ فرماتے، ہاں اگر کوئی آپ کے احسان اور انعام کا شکریہ ادا کرتا تو خاموشی سے سن لیتے کسی کی بات نہ کاٹتے ۔ دوسروں سے اپنے کو ممتاز نہ ظاہر کرتے ۔ آپ حد درجہ فیاض، راست گو، نرم طبع تھے، لوگ آپ کو ایک نظر دیکھ کر مرعوب ہوجاتے لیکن جیسے جیسے زیادہ آشنا ہوتے آپ سے بےحد محبت کرنے لگتے ۔

اردو کا مستقبل

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

اس آلے کو زیادہ کارگر بنائے گا یا نہیں ۔ اگر انھیں معلوم ہوجائے کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو پہلے زبان میں موجود نہ تھیں کام آسکتی ہیں تو انھیں پورا اختیار ہے کہ وہ انھیں اپنا میں اور بولی اور ادبی زبان دونوں کے تار و پود میں انھیں ملائیں ۔ اگر آج انگریزی دنیا کی سب سے پرمعنی اور لچک دار زبانوں میں سے ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انگریزی بولنے اور لکھنے والے کبھی دوسری زبانوں سے جھجکتے نہیں تھے بلکہ بیسیوں زبانوں میں سے ____ جن میں آپ کی اردو بھی شامل ہے ۔ الفاظ بلا تامل اپناتے چلے آئے ہیں ۔

بہ صاف ظاہر ہے کہ اردو کے مستقبل کا فیصلہ زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والے واقعات کی روشنی میں ہوگا ۔ لیکن ہر زبان اور اس کے مصنفین ظلم و جور کا مقابلہ اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے بین الاقوامی تعلقات مضبوط ہوں ۔ چنانچہ ہر اس چیز کی تائید کرنی چاہئے جس کے ذریعے سے اردو کا رشتہ دنیا کی زبانوں اور ادب کے ساتھ زیادہ مضبوط ہوجائے ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر میری رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے لیکن پھر بھی مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو رسم الخط ایک ایسی ہی رکاوٹ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غیر ملکی طالب علم کے لئے اس طرح کی اور کوئی رکاوٹ ہوتی ہی نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس رسم الخط میں اردو زبان کی آوازیں اچھی طرح ادا نہیں ہو سکتیں ۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں صرف لسانیات اور صوتیات کا دخل نہیں ہے بلکہ اور بہت سی باتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے لیکن آخر میں ان ہی لسانی حقیقتوں کا حاوی ہونا ضروری ہے مصنفین مجبور ہوجائیں گے کہ اس مسئلے کو حل کریں ۔ میرے نزدیک اس کا حل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا رسم الخط اختیار کیا جائے جو رومن ٹائپ پر مبنی ہو اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں میں بہت کچھ کہنے کو تیار ہوں ۔ لیکن شاید اس کا موقع یہ نہیں ۔

آخر میں اردو کی عام وسعت کے موضوع پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کے سب سے بڑے کارنامے شاعری اور مختصر افسانے تک محدود ہیں میری بےحد خواہش ہے کہ ان کے علاوہ اردو مصنفین اچھی اچھی ناولیں پیدا کرسکیں مجھے یہ نقطۂ نظر پیش کرنے میں ذرا باک نہیں کہ ناول ادب کی اونچی سے اونچی صنفوں میں سے ہے میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اور کوئی صنف نہیں ہے جو اردو ادب کے خزانے میں اس درجہ قابل قدر اضافہ کرسکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو کی عالم گیر ساکھ بڑھا سکتی ہے ادب کی کوئی دوسری ایسی صنف نہیں جس کے ذریعے آپ کے مصنفین آپ کی سماج کے ہر پہلو کی اتنی مکمل تصویر کھینچ سکیں جتنی کہ ناول ۔ یہ بھی ایک قابل لحاظ بات ہے کہ وہی شخص جسے آپ کی سماج سے خاصی واقفیت حاصل ہو آپ کے ادب کی دوسری شاخوں کی قدر کرسکے گا ۔ یہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں صرف ادبی وجوہ کو دخل نہیں ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ اردو مصنفین ہر قسم کی مشکل دور کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے ۔

خطِ نستعلیق

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

خط بہاری کہلاتا ہے ۔ اس میں ثلث اور توقیع کی آمیزش کے ساتھ کسی قدر کوفی کی شان بھی پائی جاتی ہے اور پٹھانوں کی عمارتوں کی طرح سادگی و قوت کا مظہر معلوم ہوتا ہے ۔

اکبر کے ابتدائی عہد سے شیرازی نسخ کا اثر بڑھتا نظر آتا ہے یہاں تک کہ نادرشاہ کے حملۂ ہندوستان کے بعد شیرازی ہندی کی امتزاجی شکل پیدا ہوجاتی ہے جس کے سب سے بہتر لکھنے والے قاضی عصمت اللہ خاں دہلوی تھے ۔ بہاری اور دہلوی انداز کے ساتھ کشمیری اسکول کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ کشمیر کی آب و ہوا اور لطافت دلکشی نے اکثر ایرانیوں کو اپنی طرف کھینچا ہے ۔ خود کشمیریوں میں بھی جمالیاتی ذوق اور صنعت و فن کاری کا زبردست ولولہ پایا جاتا ہے ۔ انھوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے ایرانیوں سے فن خطاطی سیکھ کر ایک نئی راہ نکالی ۔ اس طرز خط میں دہلوی کی سی نزاکت نہ تھی کشمیریوں نے اس کمی کو نقاشی سے پورا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور گل کاری میں ہندیوں سے بازی لے گئے ۔

نستعلیق خط بابر کی آمد ہندوستان سے بہت پہلے یہاں روشناس ہوچکا تھا ۔ چنانچہ امیر خسرو مرحوم کی مثنویوں اور دواوین کے چند ایسے نسخے کتاب خانہ رامپور میں محفوظ ہیں جو پندرھویں صدی میں ہندوستان کے اندر لکھے گئے تھے مگر اس کی حقیقی ترقی اور عام رواج اکبری عہد کے ایرانی خطاطوں کی بدولت ہوا ۔ جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے میں بھی دیسی اور پردیسی خطاط اس فن کی آبیاری کرتے رہے مگر جس خطاط کا سلسلہ آئندہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا وہ ایران کے شہرہ آفاق استاد میر عماد حسنی کا بھانجا اور شاگرد آغا عبدالرشید دیلمی ہے ۔ یہ عہد شاہ جہاں میں وارد ہند ہوا اور تا آخر بادشاہ کی قدردانی کے سایے میں فن کی خدمت کرتا رہا ۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ماحول نے عمادی شان میں بھی جدت پیدا کی اور ایک تیکھا انداز لکھنوی نام سے اس بزم میں شریک ہوا ۔ میر عیوض علی ملیح آبادی کے ساتھ یہ رنگ رام پور پہنچا اور اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے عوام و خواص سب اس خانوادے کے سلسلۂ شاگردی میں منسلک ہیں ۔

اس رنگ کے مشہور استاد الٰہی بخش مرجان رقم اور محمد علی خاں خوش رقم ہیں میر احمد حسن مرحوم نے بھی جو منشی علی محمد خاں مرحوم کے استاد تھے الٰہی بخش مرجان رقم ہی سے اصول فن سیکھے تھے مگر بعد میں عمادی شان میں لکھنے لگے تھے ۔

خط نستعلیق اپنے نوک پلک کی انتہائی نزاکت اور قطع و دمات کی سخت اصولی پابندیوں کے باعث روزمرہ کی ضرورت میں آسانی سے کام نہ آسکتا تھا ۔ اس لئے محمد شفیع ثانی ایک خوشنویس نے عہد شاہ جہاں میں ایک خط "شفیعا" نام سے ایجاد کیا ۔ یہ نستعلیق کے دائروں کو لمبا کرنے اور بعض حرفوں کو دوسروں کے ساتھ خلاف اصول ملا دینے اور شوشوں کی باریکی کو کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے ۔ ہندوستانی منشیوں نے شفیعا کو اور رواں کرنا چاہا تو نتیجہ شکستہ یا گھسیٹ کی شکل میں نکلا یہ خط دیگر خطوط کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو اردو شاعری میں مرزا غالب کے نسخہ حمیدیہ کے اشعار کی ہے کہ جتنا آسان کرنے کی کوشش کیجئے اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے چنانچہ شکستہ

(بقیہ پہلے کالم کے نیچے)

ص کے ماہروں کی تحریر کا پڑھنا ناواقف کے لئے کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں ۔

یکم جنوری ۱۹۵۰ء

Registered No. D. 207.

نئی روشنی

NAI RASHNI

DELHI

طابع و ناشر:— عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ:— جید پریس دھلی

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین ۲

شادی کی تربیت

پروفیسر محمد یوسف عباسی ۲

سنہ ۱۹۴۹ ء کا جائزہ (اداریہ) ۳

دنیا کی رفتار:—

(۱) ہندوستان ع ۰ ح ۴

(۲) پاکستان ع ل ۴

بزم بے تکلف ۵

ذوق بلا سروش عسکری طباطبائی ۵

پرانا چین

سید سخی حسن نقوی ۶

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)

ڈاکٹر سید عابد حسین ۷

یہ ہے حکومت اسرائیل

عبدالحلیم ندوی ۹

ڈاکٹر سید عابد حسین

شادی کی تربیت

پروفیسر محمد یوسف عباسی

نفسیات کے مشہور عالم ایڈلر نے شادی کی یوں تعریف کی :-

"شادی مخالف اصناف کے ایسے دو افراد کا تعمیری فریضہ ہے جو باہم زندگی بسر کرنے کا عزم اور اپنی زندگی کو سازگار بنانے کی تمنا لئے ہوئے ہوں"

شادی کی اس سے بہتر تعریف کیا ہو سکتی ہے، اس میں سارے اہم نکات روشن اور واضح کر دئے گئے ہیں پہلے تو باہمی اشتراک اور کشش سے شادی کامیاب ہوتی ہے اور دوسرے شادی محض عشق بازی سے بلند و بالا ہے، اصل میں ادارۂ ازدواجیت کی بنا دیں بچوں کے تحفظ اور بقا کے جذبہ پر ہے۔ حیوانات کے بچوں کے برعکس انسانی بچہ کافی عرصہ تک والدین کا دست نگر رہتا ہے اس لئے لازمی تھا کہ فطرت کوئی ایسا ضابطہ زندگی وضع کرتی جس کی رو سے والدین بچے کے دوران طفولیت تک ہی نہیں بلکہ اس کے شباب اور اس کے آزادانہ کسب معاش کے وقت تک دونوں باہم وابستہ رہیں۔ والدین کے درمیان محض جنسی کشش کا رشتہ ایسا مضبوط نہیں ہو سکتا کہ پائندہ ازدواجی اتحاد کا ذریعہ ہو سکے۔ امتداد زمانہ سے ایسا بندھن کمزور ہو جاتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ مرد اور عورت قانونی معاہدہ کی رو سے اکٹھے رہنے اور بچوں کی نگہداشت اور پرورش کی ذمہ داری کے پابند ہو جائیں۔ مذہبی رسوم سے یہ معاہدہ پختہ تر ہو گیا۔ چنانچہ مرد و عورت کی قانونی ذمہ داریاں مقدس مذہبی فریضہ بن گئیں۔ اس طرح شادی سوسائٹی کے پسندیدہ طریقے کے مطابق جنسی تسکین کا ذریعہ ہی نہ رہی بلکہ خاندانی زندگی اور بچوں کی تربیت اور تحفظ کی ضمانت بن گئی۔

شادی میں جنسی تعلقات کا مسئلہ بھی کسی صورت سے کچھ غیر اہم نہیں ہے، بلکہ دوسرے رشتوں کی طرح یہ بھی ایک مضبوط رشتہ ہے جس میں مخالف اصناف کے دو افراد منسلک ہوتے ہیں۔ کامیاب اور پائدار شادی کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت جذباتی جسمانی اور ذہنی سطح پر ہم آہنگ ہوں۔ دونوں میں باہم کئی تصورات اور مشاغل مشترک ہوں۔ دونوں جذبات کے بندھن میں ایک دوسرے سے وابستہ ہوں اور جسمانی طور پر باہمی تسکین و راحت کا ذریعہ بنیں یہی تین رشتے شادی کے ایوان کی بنیاد، دیواریں اور چھت ہیں۔

شادی محض عشقیہ اتحاد سے برتر ہے یہ زندگی کے ہر موقف پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے دو توق سے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ شادی کی تیاری کب شروع ہو؟ شادی سے پہلے تو ایک طرح مسلسل تیاری کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس دور میں سب سے اہم بات بچوں کو جنسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت ہے تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ وہ شادیاں جو محض جنسی غیر آہنگی کی وجہ سے ناکام رہیں ان میں مرد اور عورت کو زمانہ طفولیت میں کسی قسم کی جنسیاتی تعلیم نہیں دی گئی تھی یا شومئی قسمت سے وہ غلط تعلیم کا شکار ہو گئے تھے، وہ جوان ہوئے تو شدت سے یہ محسوس کرنے لگے کہ جو چیز ان کے رگ و ریشے میں کروٹ لے رہی ہے ناقابل فہم، ذلیل اور مضر ہے وہ شرمسار اور خاموش رہنے لگے۔ چنانچہ بلوغت عشق بازی اور شادی کے بعد بھی اس خفتہ غیر شعوری احساس میں جو عہد طفولیت میں چپکے چپکے پرورش پاتا رہا، کوئی تبدیلی نہ ہوئی ان کی نظروں میں جنسی تعلقات بدستور مکروہ اور گھناؤنے رہے۔ ان کی زندگی کراہت اور ہمدردی کے خلاف مسلسل کشمکش تھی جس سے امتزاج ناممکن تھا، اس لئے ان کی شادی اور "جنسی سطح" پر ٹوٹ گئی۔

ظاہر ہے کہ شادی کی تربیت بچپن سے شروع ہوتی ہے۔ اس تربیت کو سن بلوغ تک ملتوی کر دینے کے نتائج دور رس اور ضرر رساں ہوتے ہیں تجسس بچے کے ابتدائی سوالات سے جنسیاتی تعلیم کا آغاز ہونا چاہیئے۔ پانچ سالہ بچہ اکثر بڑے گہرے تجسس اور تحیر کا اظہار کرتا ہے۔ میں اپنی بہن سے کیوں مختلف ہوں، بلی کے بچے کہاں سے آتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے.......

سن بلوغ میں شادی کی تیاری کا آغاز منگنی سے شروع ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے موجودہ سوسائٹی میں صنفی آزادی کی وجہ سے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے آسانی سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ اب یہ تکلف سمجھا جاتا ہے کہ زندگی کے ایسے اہم معاملات کے متعلق رسمی خاموشی اور سنجیدہ بے اعتنائی اختیار کی جائے، مرد اور عورت شادی، اولاد اور اولاد کی تربیت کے متعلق خاصی آزادی سے تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں۔ ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں انھیں کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔ بہت کم جوڑے ایسے ہوتے ہیں جو اولاد کی خواہش سے عاری ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کئی لوگ ازدواجی مسرت کو طویل کرنے کے لئے اولاد کے خواہاں کچھ دیر کے بعد ہوتے ہیں۔

[illegible] عمر کی اولاد کے حق میں اور خلاف کافی دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شادی کے ابتدائی دو ایک سالوں میں عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کا پائندہ طور پر استوار کرنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس عرصے میں انھیں ایک دوسرے کی شخصیت کے کئی گوشوں کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس اثناء میں ان پر پدریت اور مادریت کی گراں بار ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں تو شاید ان کو زندگی اجیرن ہو جائے۔ چنانچہ شادی کا پہلا ایک سال ذہنی، جذباتی، جنسیاتی ہم آہنگی میں حائل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ قدرت پر چھوڑ دینا چاہیئے لیکن عام طور پر اس مسئلے کا فیصلہ ذاتی خواہشات کی بجائے معاشی عوامل سے ہوتا ہے۔ شادی کے اور خانہ داری کا آغاز گھریلو میزانیہ کے لئے ایسا گراں بار ثابت ہوتا ہے کہ اولاد کے خواہش مند کئی جوڑے بھی اس ذمے داری کو مالی حالت کی سازگاری تک ملتوی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اولاد سے مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات مستحکم ہو جاتے ہیں کسی دانشمند نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ عشق و محبت میں سب چیزیں معمہ نظر آتی ہیں اور اس چیستان کا حل بچہ ہوتا ہے۔

یہ کیسی حیران کن بات ہے کہ زندگی بھر کے ساتھی کے انتخاب میں مرد اور عورت ایک دوسرے کی پدرانہ اور مادرانہ صفات کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ مرد کی نگاہ انتخاب عموماً عورت پر اس لئے پڑتی ہے کہ اسے اس کے حسن میں کوئی خاص جاذبیت اور ناقابل بیان جمالیاتی کشش نظر آتی ہے، اور اتنی سی بات پر وہ اسے شریک حیات بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ شوق میں اسے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ میری دل ربا محبوبہ بچوں کی کیسی ماں ہو گی۔ لڑکیاں بھی فوری جذبات میں یہ فکر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ یہ مرد میرے بچوں کا کیسا باپ بنے گا؟ حالانکہ اچھے والدین بننے کی صلاحیت پر ہی ازدواجی زندگی کے اچھے مستقبل اور مسرت کا انحصار ہوتا ہے۔

فریقین کو شادی کی موزونیت کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ایک دوسرے کی صحت کا اندازہ کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ اگر فریقین میں سے کوئی بھی کسی مزمن مرض میں مبتلا ہو تو اس کا اثر اولاد پر ہی نہیں ہو گا بلکہ ازدواجی زندگی کی تمام آسودگی اور رنگینی پھیکی پڑ کر رہ جائے گی۔ گھریلو فرائض کا بار گراں تندرست اور صحت مند کے کندھوں پر ہو گا اور اس بچارے ہی کو اکیلا ان مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ دائمی مریض سے نباہ بڑا جانگسل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی غیر معمولی صبر و تحمل والا مرد ایسی آزمائش میں پورا اُتر سکے۔ مقابلتاً عورتیں مادرانہ جذبات اور کمزوری قلب اور ہمدردی کی وجہ سے ایسی زندگی نباہنے کی زیادہ اہل ہوتی ہیں، لیکن ایسی عورتیں بھی گنتی کی چند ہوتی ہیں۔

فطری امر ہے کہ مرد اور عورت شادی سے قبل [illegible]

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ رجنوری ۱۹۵۰ء

سنہ ۱۹۴۹ء کا جائزہ

بارہ مہینے کی مدت قوموں کی زندگی میں ایک لمحے سے اور دنیا کی تاریخ میں ایک دقیقے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے لیکن بعض عبوری دور ایسے ہوتے ہیں جب سال بھر میں قوموں کی تقدیر اور دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اس وقت ہم ایسے ہی ایک دور سے گذر رہے ہیں۔ اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ جس طرح زمین کی پرتوں کے دبنے یا اُبھرنے سے زلزلہ آتا ہے اور دم بھر میں بڑے بڑے خطوں کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ اسی طرح سیاسی قوتوں یا معاشی طبقوں کے اُتار چڑھاؤ سے جنگ چھڑ جاتی ہے اور تھوڑی سی مدت میں پورے ملکوں بلکہ اقلیموں کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اس حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں کہ زلزلے کے گذر جانے کے بعد بھی اس کے اثرات خاص زلزلے کے مقام کے آس پاس دور تک اور دیر تک سطح زمین میں کامل سکون پیدا نہیں ہونے دیتے اور اسی طرح جنگ کے ختم ہونے کے بعد بھی جنگ کے نتائج لڑنے والے ملکوں کے علاوہ دوسرے ملکوں میں کئی سال تک حالات کو معمول پر نہیں آنے دیتے۔ چنانچہ دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے کے چوتھے سال بعد ۱۹۴۹ء کے شروع میں لڑائی کا شدید زلزلہ گذر چکا تھا مگر یونان، انڈونیشیا، انڈو چائنا برما اور سب سے بڑھ کر چین کو برابر جھٹکے پر جھٹکا لگ رہا تھا۔ اس کے علاوہ برلن کے مسئلے کے سلسلے میں ایک نئے جوالا مکھی کے پھٹ پڑنے کا کچھ اندیشہ باقی تھا۔ مگر سال کے ختم ہوتے ہوتے ان سب ملکوں کی بحرانی کیفیتیں دور ہوگئیں اور دنیا کی سیاسی سطح برما اور انڈو چائنا کے سوا اور سب کہیں قریب قریب سکون پر آگئی۔

۱۲ مئی کو روس نے مغربی برلن کی معاشی ناکہ بندی ختم کر دی۔ مغربی جرمنی کو انگلستان اور امریکہ نے ایک جداگانہ ریاست کی حیثیت دے دی اور روس نے اس کڑوے گھونٹ کو بہت منہ بنا کر پی لیا۔ مغربی جمہوریتوں خصوصاً فرانس میں روس کے خوف سے جو بے چینی تھی وہ معاہدۂ اٹلانٹک اور معاہدۂ بروسلز کے ذریعے سے بہت کچھ دور ہوگئی۔ ان معاہدوں کی بنا پر ایک طرف خود مغربی جمہوریتوں کا اور دوسری طرف مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کا متحدہ دفاعی محاذ بن گیا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اپنے حلیفوں کو مارشل ایڈ کے علاوہ سامانِ جنگ مہیا کرنے کی بھی ذمہ داری لے لی۔ اُدھر یونان میں چھاپہ مار کمیونسٹ فوجوں کا زور ٹوٹ گیا اور یونانی حکومت مضبوطی سے جم گئی۔

اب ایشیا پر نظر ڈالئے تو گذشتہ سال کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ چین کی خانہ جنگی جو بائیس سال سے جاری تھی عملاً ختم ہوگئی، اور اس بد نصیب ملک کو جسے جاپان کے حملے اور آپس کی کشمکش نے تباہ کر دیا ہے اس کا موقعہ ملا کہ سیاسی اتحاد اور معاشی خوش حالی کی نئی راہ پر چل کر قسمت آزمائی کرے۔ کیمونسٹ ماؤ تسے تنگ کی حکومت چین کی باگ چیانگ کائی شیک کے ہاتھ سے چھین کر آگئی ہے صرف ہینان اور فارموسا کے جزیرے ان تک محفوظ رہ گئے ہیں اور وہاں بھی اُس کا ٹھہرنا امریکہ کی مدد پر موقوف ہے جس کا اب تک یقین نہیں۔ دوسرا واقعہ جس کی اہمیت دیکھنے میں اس سے کم معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل کم نہیں ہے۔ انڈونیشیا کی آزادی ہے۔ اس کی وجہ سے بحرالکاہل میں مغربی سامراج کی جڑیں ہل گئی ہیں اور جنوب مغربی ایشیا سے لے کر جنوبی افریقہ تک قومی آزادی کی تحریکوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ برما کا سیاسی بحران بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے، مگر معاشی بحران بدستور ہے اور نظم و نسق کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں ہے انڈو چائنا میں فرانسیسیوں نے باؤ ڈائی کی حکومت کو ایک حد تک خود اختیاری دے دی ہے لیکن جہاں تک باہر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کامل آزادی کی تحریک ڈاکٹر ہو چی من کی سرکردگی میں برابر ترقی کر رہی ہے ملک کے بڑے حصے پر ہو چی من کا قبضہ ہے اور اس کی فوجیں کامیابی سے باؤ ڈائی اور فرانسیسیوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ فرانس کی رائے عامہ فرانسیسی فوجوں کو انڈو چائنا سے واپس بلا لینے پر اصرار کر رہی ہے۔ اس لئے کہ فرانس کی معاشی حالت اس جنگی مہم کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔

اب ہندوستان آئیے تو یہاں بھی سیاسی حیثیت سے حالات سکون پر آگئے ہیں۔ نئی ریاست نے ان خطروں پر جنھوں نے دو سال پہلے اس کی جڑوں کو ہلا دیا تھا قابو پا لیا ہے۔ ریاستوں کا پیچیدہ مسئلہ قریب قریب حل ہو چکا ہے۔ بہت سی ریاستیں قریب کے صوبوں میں ضم ہو چکی ہیں، باقی کو ملا کر چھوٹے بڑے یونین بنا دیئے گئے ہیں جو قریب قریب انڈین یونین کے صوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف میسور، حیدرآباد اور کشمیر جداگانہ ریاستوں کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہیں اور بھوپال مرکزی حکومت کے ماتحت ایک چھوٹا سا صوبہ بن گیا ہے۔ ممکن ہے ابھی کچھ اور تبدیلیاں ہوں مگر وہ خالص انتظامی ہوں گی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے ریاستیں انڈین یونین کے ڈھانچے میں اچھی طرح کھپ گئی ہیں۔ آئین سازی کا اہتمام بالستان کام ختم ہو چکا ہے اور نیا آئین ۲۶ رجنوری نافذ ہو کر ہندوستان کو دنیا کی آزاد جمہوریتوں کی صف میں کھڑا کر رہا ہے۔ بیرونی تعلقات کے مرحلوں کو بھی جو ایک نئی ریاست کے لئے ہفت خواں سے کم نہیں ہوتے، ہندوستان نے کامیابی سے سر کر لیا ہے۔ برطانوی کامن ویلتھ سے اپنے تعلقات قائم رکھنے کے ساتھ اس نے سب بڑے بڑے ملکوں کے ساتھ دوستی کا رشتہ جوڑ لیا ہے اور دنیا میں اپنی اخلاقی ساکھ قائم کر لی ہے پنڈت نہرو کے سفر امریکہ کے بعد یہ ساکھ اور بڑھ گئی ہے۔ صرف ایک کمی رہ گئی ہے کہ پاکستان کے ساتھ جو کل تک ہندوستان کے جسم کا ٹکڑا تھا، اور جغرافی وحدت کے رشتے سے آج بھی اس سے وابستہ ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کے تعلقات سدھرنے کے بجائے اور بگڑ گئے۔ سیاسی مسائل میں یہ سب سے اہم مسئلہ ہے جسے ۱۹۵۰ء میں حل کرنا ہے۔

غرض ۱۹۴۹ء کے آخر میں روس اور امریکہ کی کشمکش کی وجہ سے آئندہ جنگ کا خطرہ تو باقی رہا مگر بالفعل دنیا میں بڑی حد تک سیاسی امن اور سکون نظر آنے لگا۔ البتہ جہاں تک معاشی حالات کا تعلق ہے اس گڑبڑ اور بے چینی میں جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔ بے شک مغربی یورپ میں مارشل ایڈ کی وجہ سے صنعت اور تجارت میں خاصی جان پڑ گئی تھی، لیکن انگلستان کے سکے کی قیمت کم ہونے سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ پچھلے چند ہفتوں میں امریکہ اور انگلستان کا اتحادِ عمل جس پر دنیا کے معاشی مسئلے کا حل بڑی حد تک موقوف ہے، کچھ ڈھیلا سا ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انگلستان میں پارلیمنٹ کا اور امریکہ میں کانگریس کے بہت سے ممبروں کا نیا انتخاب ہونے والا ہے اور صنعت و تجارت پارٹی پالٹیکس کے جھگڑوں میں اُلجھ گئی ہے۔ ایسا ہے کہ چند مہینے کے بعد جب سیاسی مطلع صاف ہو جائے گا، دونوں ملکوں کے اقتصادی تعلقات پھر اسی طرح استوار ہو جائیں گے اور مغربی دنیا کی معاشی الجھن کو دور کرنے کی کوشش اور آگے بڑھے گی۔

ایشیا کی معیشت میں جو ابتری دوران جنگ میں پڑ گئی تھی وہ بدستور باقی ہے۔ عرب ممالک ایران اور افغانستان میں گرانی اور بے روزگاری میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ برما کی حالت بھی بہت ناقابل اطمینان ہے۔ چین اور انڈونیشیا میں تو ظاہر ہے کہ جنگ کی تباہ کاریوں نے معاشی زندگی کا سارا شیرازہ ہی منتشر کر دیا ہے۔ ایشیا کے بڑے ملکوں میں پاکستان اور ہندوستان کی حالت کچھ دن پہلے تک دوسروں کے مقابلے میں بہت غنیمت تھی، مگر جب سے ہندوستان نے اسٹرلنگ کے ساتھ اپنے روپئے کی قیمت کم کی اور پاکستان نے نہیں کی، ان دونوں ملکوں کا باہمی کاروبار قریب قریب بند ہو گیا ہے جو دونوں کی معیشت کے لئے نہایت خطرناک ہے اور اس سے دوسرے ایشیائی ملکوں کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ۱۹۵۰ء میں ایشیا کی معاشی حالت کا سدھر جانا

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ہندوستان — دنیا کی رفتار — پاکستان

چین کی نئی حکومت تسلیم کرلی گئی

۳۰ دسمبر کو حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کی طرف سے یہ اعلان ہوگیا کہ ماؤزے تنگ کی حکومت کو چین کی باضابطہ حکومت تسلیم کیا جاتا ہے۔ دستور کے مطابق کسی نئی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے تین ضروری شرطیں ہیں۔ ایک تو وہ ملک کے بڑے حصے پر قابض ہو، دوسرے اس کا نظم و نسق باقاعدہ اور منظم ہو، تیسرے وہ اور ملکوں سے تعلقات قائم کرنے اور بین الاقوامی قوانین کی پابندی کرنے کے لئے تیار ہو۔ چین کی کمیونسٹ حکومت ان تینوں شرطوں کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ ہینان اور فارموسا کے جزیروں کو چھوڑ کر سارے چین پر ان کا قبضہ ہوگیا ہے۔ چارجنگ کیومن تانگ کی فوجیں اب تک مقابلہ کررہی ہیں۔ مگر اس مقابلے کی حیثیت اب حرکت مذبوحی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک مفتوحہ علاقے میں نظم و نسق قائم کرنے کا تعلق ہے نئی حکومت کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ اس لئے کہ تقریب قریب سب صوبوں میں مقامی حکومتوں نے خوشی سے اس کی اطاعت کرلی اور انتظامی مشین کو اچھی خاصی حالت میں اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب رہا بین الاقوامی تعلقات کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا سوال تو کمیونسٹ حکومت کی وزارت خارجہ نے سب ملکوں سے اپیل کی ہے کہ اسے تسلیم کرلیں اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کریں۔ اس لئے بظاہر کسی کو اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن امریکہ جو ماؤزے تنگ کی کامیابی کو اپنی شکست سمجھتا ہے ابھی تک اس کی حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس لئے دوسرے ملک بھی ہچکچا رہے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت نے اس معاملے میں پیش قدمی کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ درحقیقت اپنی خارجی پالیسی کو بیرونی اثرات سے آزاد رکھنا چاہتی ہے اور گو وہ امریکہ کی دوستی کی دل سے قدر کرتی ہے لیکن محض اس کی خاطر اپنے ہمسایہ ملکوں سے دشمنی مول لینے پر تیار نہیں ہے۔ امید ہے کہ اب برطانیہ اور کامن ویلتھ کے دوسرے ممبر بھی نئی چینی حکومت کو بہت جلد تسلیم کرلیں گے اور شاید کچھ اور ملک بھی اس کی ہمت کر ڈالیں۔

تجارتی کشاکش ڈھیلی پڑ رہی ہے

ہندوستان اور پاکستان میں شرح مبادلہ کے سلسلے میں جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی وہ کئی مہینے تک بڑھتی ہی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کاروبار تقریب قریب بند ہوگیا۔ پچھلے ہفتے یہ اور غضب ہوا کہ پاکستان نے جوٹ کی پانچ لاکھ گانٹھیں جو شرح مبادلہ کے بدلنے سے پہلے خریدی جا چکی تھیں، مشرقی بنگال سے برآمد کرنے کی ممانعت کردی اور ۶۰ ہزار گانٹھیں جو آسام سے ریل کے ذریعے کلکتے روانہ کی گئی تھیں اور مشرقی بنگال سے گذر رہی تھیں، بیچ میں ٹھہرالیں۔ اس کے علاوہ کچھ ریلوے کا سامان بھی جو مغربی بنگال آرہا تھا روک لیا۔ اس کے جواب میں ہندوستان نے پاکستان کو کوئلہ دینا بند کردیا۔ دونوں ملکوں کے لوگ اس صورت حال کو حیرت اور افسوس سے دیکھ رہے تھے اور دل میں ڈر رہے تھے کہ دیکھئے یہ سلسلہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ حکومت پاکستان نے اس افسوسناک صورت حال کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اپنے محکمہ تجارت اور جوٹ بورڈ کے سکریٹری فاروقی صاحب کو حکومت ہند کے افسروں سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا۔ ۲ جنوری کو یہ خبر ملی ہے کہ گفت و شنید کامیابی سے جاری ہے، حکومت پاکستان نے ۶۰ ہزار جوٹ کی گانٹھیں اور ریلوے کا سامان جو بیچ میں رکا ہوا تھا فوراً بھیجنے کا حکم دے دیا ہے اور جوٹ کی ان پانچ لاکھ گانٹھوں کے بارے میں جو ابھی تک روانہ نہیں ہوئی ہیں، اپنی کڑی شرطوں کو نرم کردیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فاروقی صاحب نے یہ بات بھی چھیڑی ہے کہ دونوں ملکوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے، اور کل بحث طلب معاشی مسائل پر جن میں شرح مبادلہ کا مسئلہ بھی شامل ہے بحث کی جائے۔ اگر پاکستان سے وہ سب سامان جو روک

(بقیہ چوتھے کالم پر)

جوٹ کا مسئلہ اسمبلی میں

کچھ اوپر آٹھ مہینے کے وقفے کے بعد ۲۳ دسمبر کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا ہے۔ پہلے دن اپوزیشن پارٹی کی طرف سے جوٹ کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے تحریک التوا پیش کی گئی۔ شری دت نے تحریک التوا کو پیش کرتے ہوئے حکومت پر الزام لگایا کہ پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے سے جو الجھاؤ جوٹ کے مسئلے میں پیدا ہوگیا ہے اسے حل کرنے کی حکومت پاکستان نے کوئی حقیقی کوشش نہیں کی اس کی وجہ سے جوٹ کے کاشتکاروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ سکے کی تخفیف سے قبل عام طور پر ۲۷ روپے سے ۳۲ روپے فی من کے حساب سے جوٹ فروخت ہوتا تھا مگر اب جوٹ کی قیمت گر کر ۱۵ روپے فی من تک پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے مزید تفصیل پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مشرقی پاکستان میں جوٹ کی اوسط سالانہ پیداوار ۴۰ ملین من ہے جس میں سے اب تک کم از کم ۲۰ ملین من ۱۵ روپے فی من کے حساب سے فروخت کیا جاچکا ہے۔ یعنی تقریباً ۳۰ کروڑ کا نقصان جوٹ کے کاشتکاروں کو پہنچا ہے۔

دو گھنٹے کی بحث کے بعد تحریک التوا نامنظور ہوئی۔

مغربی پنجاب اور مرکز میں رسہ کشی

پاکستان دستور ساز اسمبلی میں آج کل ایک اور مسئلے پر بڑی گرماگرم بحث ہورہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں مغربی پنجاب کو ۵۰ لاکھ مسلم مہاجرین کے آنے کی وجہ سے جو پانچ زائد نشستیں دی گئی ہیں ان کو صوبے کی اسمبلی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں کس طرح پُر کیا جائے؟ مرکزی حکومت چاہتی ہے کہ موجودہ غیر معمولی حالات میں خود دستور ساز اسمبلی، مغربی پنجاب کے نمائندوں کا انتخاب کرے۔ مغربی پنجاب کے ممبروں کی بہت بڑی تعداد کو اس طریقۂ انتخاب سے بہت سخت اختلاف ہے۔ ان کی رائے ہے کہ (۱) موجودہ دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں چند ناگزیر اسباب کی بنا پر پورے جمہور کی رائے نہیں لی جاسکتی تھی۔ اس لئے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے جس سے اس کی غیر جمہوری ساخت میں اور نمایاں ہو جائے (۲) انتخاب میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ کوئی ایسا شخص منتخب نہ ہو جائے جسے مغربی پنجاب کے عوام کا اعتماد حاصل نہ ہو (۳) مغربی پنجاب کے بعض مسائل میں مرکزی مداخلت سے صوبے میں پہلے سے کافی بے چینی اور بے اطمینانی موجود ہے۔ اس انتخاب کے موقع پر اس کا پورا خیال رکھا جائے کہ اس میں مزید اضافہ نہ ہو۔

مغربی پنجاب کے ممبروں کو ڈر ہے کہ اگر دستور ساز اسمبلی کو انتخاب کا موقع دیا گیا تو ایسے اشخاص منتخب ہوجائیں گے جن کو مغربی پنجاب کے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے مثلاً نواب مشتاق احمد گرمانی جو دس مہینے کی مدت میں کہیں سے منتخب نہ ہونے کی وجہ سے ابھی حال میں مرکزی حکومت سے الگ ہوگئے ہیں۔ اور محمد نواز خاں جو ابھی حال میں ڈپٹی منسٹر مقرر ہوئے ہیں۔ مغربی پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری نے اس الجھاؤ کا حل یہ پیش کیا ہے کہ صوبائی لیگ کونسل کو اختیار دیا جائے کہ صوبائی حکومت سے مشورہ کرکے ان نشستوں کے لئے نام پیش کرے۔ دستور ساز اسمبلی اور اس کے باہر مسلم لیگ کے حلقوں میں ابھی تک یہ مسئلہ زیر بحث ہے میاں عبدالباری وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب سے ایک مرتبہ مل چکے ہیں اور دوبارہ ملنے والے ہیں۔ انھوں نے وزیر اعظم صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر کسی کو پچھلے دروازے سے اسمبلی میں لانے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج بہت برے ہوں گے۔

ع، ل

لیا گیا ہے۔ ہندوستان پہنچ گیا تو قوی امید ہے کہ مجوزہ کانفرنس کے لئے سازگار فضا پیدا ہوجائے گی اور یہ ناگوار الجھن جس سے دونوں ملکوں کا سخت نقصان ہورہا ہے دور ہوجائے گی

ع، ح

بزمِ بے تکلف

"کیوں صاحب۔ یہ جو کہا کرتے ہیں
آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر"
اس سے کیا مطلب ہے۔ قیافہ کیا چیز ہے؟"
"آپ قیافہ نہیں جانتے، ارے بھائی لفافے کا قافیہ ہے
خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں میں مطلب پوچھ رہا ہوں اور آپ قافیہ بتا رہے ہیں۔"
"ہائے افسوس سائنس کی تعلیم نے آپ کا ادبی ہاضمہ اتنا کمزور کر دیا ہے کہ کوئی چیز پچتی ہی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ دوسرے مصرعے کے چوہن سے پہلا مصرعہ سمجھ لیں، مگر آپ کو تو ادر قراقر ہونے لگا۔ اچھا اب سنئے قیافہ چہرے مہرے کو کہتے ہیں اور اس علم کو بھی جس کے ذریعے سے ہم آدمی کا چہرہ مہرہ دیکھ کر اس کی طبیعت اور سیرت کا اندازہ کرتے ہیں۔"

"لاحول ولاقوت، اس اٹکل پچو اندازے کو جو کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط آپ علم کہتے ہیں۔ خیر اب تو یہ بتائیے کہ چہرے کے ساتھ آپ نے جو مہرے کا لفظ استعمال کیا اس کے یہاں کیا معنی ہیں؟"

"واللہ بس سائنس والوں کی یہی ادا ہمیں پسند ہے۔ کوئی چیز بھی ہو، تہہ تک پہنچے بغیر نہیں رہتے۔ آپ کے سامنے لیتے ڈر لگتا ہے مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مہرہ ناک کو کہتے ہیں جو چہرے کا سب سے نمایاں حصہ ہے اور جس سے آدمی کی سیرت کا پتہ چلانے میں سب سے زیادہ مدد ملتی ہے۔"

"لیجئے اور سنئے۔ چہرے سے تو خیر کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہو بھی سکتا ہے ناک سے بھلا سیرت کا کیا پتہ چلے [illegible] بات ہے۔"

"[illegible] آپ [illegible] پڑھے ہیں۔ [illegible] ایک چیز [illegible] مفروضے [illegible] کے طور پر آپ کے سامنے یہ خیال پیش کرتا ہوں کہ ناک آدمی کی سیرت کی کنجی ہے۔ پہلے آپ اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ پھر تجربے کی کسوٹی پر کسئے۔ اس کے بعد آپ کو تردید یا تائید کرنے کا حق ہوگا۔ ماہرین حیوانات کا خیال ہے کہ انسان کی سیرت پر اس کے دوران خون کا اور دوران خون پر طریق تنفس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ طریق تنفس بڑی حد تک اس آلۂ تنفس کی ساخت پر موقوف ہے جسے عرف عام میں ناک کہتے ہیں۔ اس وقت میں نظری تفصیلات کو چھوڑ کر عملی نتائج کا ذکر کرتا ہوں جو اس مفروضے کی بنا پر مشاہدے کے ذریعے حاصل کئے گئے ہیں۔ ماہرین قیافہ بینی نے ناک کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں۔ اور ہر قسم کو انسان کی طبیعت کے ایک خاص رجحان کا نمائندہ قرار دیا ہے۔

افسوس ناک، شوم ناک یا نم ناک ان لوگوں کی ہوتی ہے جو بڑے رقت [illegible] کرتے ہیں [illegible] ان پر چھاتے ہیں عموماً ان کی ناک کی نوک پر عرق انفعال کے قطرے جھلکتے ہیں جنہیں شاعر کبھی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔

درد ناک یا غم ناک عام طور پر شدت الم سے سرخ اور دفور رقت سے بہتی رہتی ہے۔ خلق بے بسی اور مظلومی ظاہر کرتی ہے۔

اندیشہ ناک یا خطر ناک وہ ہے جو خطرے کو دور سے سونگھ کر سکڑنے اور پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔ بزدلی کی علامت ہے۔

ہولناک یا وحشت ناک وہ بھیانک دورا ہے جس کی شان میں شاعر نے کہا ہے۔ ع دو نتھنے [illegible] عدم کے ناکے۔ اس کی ایک [illegible] یہ ہے کہ اس کے اندر سے سوں سوں کی جگہ سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔ کمبھ کرن کے جسم اور راون کی روح کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

غضب ناک چڑھی ہوئی، چھن پھنائی ہوئی، آگ برساتی ہوئی (بقیہ صفحہ [illegible])

ذوقِ بلا

سردش عسکری طباطبائی

کس قدر نکھرا ہوا ذوقِ بلا رکھتا ہوں میں
شام ہی سے شمعِ غم خانہ بجھا رکھتا ہوں میں

ڈر گیا ہوں ابنِ آدم کے حسد سے اس قدر
خود سے بھی تیری محبت کو چھپا رکھتا ہوں میں

لاکھ کاموں میں ترے غم کی پرستش کے لئے
زندگی سے روز کچھ لمحے چرا رکھتا ہوں میں

آج بھی ترکِ تعلق تشنۂ تکمیل ہے
آج بھی تیرے ستم کا آسرا رکھتا ہوں میں

کچھ نہ دینا ہی مجھے دینا ہے قصہ مختصر
حوصلہ حدِ عنایت سے سوا رکھتا ہوں میں

کس طرح تیری تمنا کا بھلا دعویٰ کروں
[illegible] رکھتا ہوں میں

تیرا غم باقی [illegible] عالم میں تو باقی رہے
اس لئے [illegible] تباہی کو روا رکھتا ہوں میں

ہر قدم راہِ محبت میں [illegible] منزل آفریں
اپنی کوشش ہی میں کوشش کا صلا رکھتا ہوں میں

دل نگہدارِ محبت، لب امینِ مدعا
نغمۂ خاموش ساز بے صدا رکھتا ہوں میں

کب چلا آئے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز
دیدۂ دل کے کواڑوں کو کھلا رکھتا ہوں میں

ناز جس کے خود اٹھاتے ہیں حسینانِ جہاں
دل ہی پہلو میں وہ کافر ماجرا رکھتا ہوں میں

داد دے ہاں عصمتِ ذوقِ طلب کی داد دے!
شوق کو ارمان کی حد سے جدا رکھتا ہوں میں

دیکھئے بر آئے کب وہ حسرتِ فردا سرشت
زندگی کی ہر خوشی جس پر اٹھا رکھتا ہوں میں

تہذیب کے گہوارے

پُرانا چین

سبطی حسن نقوی

اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں چینیوں نے دنیا کے اور لوگوں سے پہلے سیکھ لی تھیں لیکن سب کچھ انھوں نے اپنے آپ سیکھا اور اُن کا مُلک خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رہا چینی تہذیب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے نہ کسی سے فائدہ اُٹھایا اور نہ کسی کو پہنچایا اسی لئے کہتے ہیں کہ چین تہذیب کے درخت میں ہمیشہ سوکھی شاخ کی طرح رہا - اس وجہ ہے کہ چین چاروں طرف پہاڑوں، سمندروں اور ریگستانوں سے گھرا ہوا ہے - یہی وجہ ہوئی کہ چینیوں کی تہذیب ہمیشہ باہر کے اثرات سے محفوظ رہی - اور انھوں نے اپنے خاص طرز پر زندگی گذاری۔

دیوارِ قہقہہ کا ذکر ہم نے اکثر بڑے بوڑھوں سے سُنا تھا۔ دیوارِ قہقہہ کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی تھی کہ اُسے جو دیکھتا ہے ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ لاکھوں آدمی ہنستے ہنستے ہلاک ہو گئے۔ لیکن یہ سب غلط ہے۔ دراصل جسے دیوار قہقہہ کہا جاتا تھا وہ چین کی بڑی دیوار ہے جو اب تک موجود ہے اور جسے چین کے ایک قدیم بادشاہ ہوانگ ٹی نے بنوایا تھا۔

چین کی بڑی دیوار کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ چونکہ چین کے شہنشاہ شی ہوانگ ٹی نے اسے حضرت عیسیٰؑ سے کوئی دو سو چودہ برس پہلے بنوایا تھا۔ لیکن چین کی تاریخ اس سے بہت پرانی ہے۔ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ چین کی تہذیب دنیا میں سب سے قدیم ہے۔ افسوس ہے کہ چین کی پرانی تاریخ ہمیں زیادہ نہیں معلوم اور ہم یہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ چینی دریائے ہوانگ ہو اور یانگ سی کی وادی میں کب اور کس طرح آکر بس گئے، لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب کا سورج جب یورپ میں نکلنا شروع ہوا تو چین میں تہذیب کا دن کافی چڑھ چکا تھا۔

ہوانگ ہو اور یانگ سی کی وادی میں رہنے والے نہ معلوم کس وقت سے مستقل کھیتی باڑی کرنے والوں کی طرح رہتے سہتے تھے۔ بہت قدیم زمانے میں یہ لوگ گاؤں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ سور پالتے تھے۔ سوت کاتنے اور کپڑا بننے سے اچھی طرح واقف تھے۔ برتن بنانا ان کی خاص صنعت تھی۔ اتنے قدیم زمانے میں بھی ان کے بنائے ہوئے برتن بہت سڈول اور خوبصورت ہوتے تھے۔ بعض تو آج کل کے چینی برتنوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ اوزار بھی بناتے تھے، کیونکہ اوزاروں کی مدد کے بغیر یہ تمام چیزیں بننی ناممکن تھیں۔ ان کے اوزار پتھر کے بنتے تھے۔ بعض سلیٹ کے بنائے جاتے تھے۔ کلہاڑی اور چاقو پتھر کے اور تیر کی نوک سلیٹ کی بنتی تھی۔ بعض ہڈی کی بھی بنائی جاتی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے چینی بڑے کاریگر لوگ تھے۔

بہت پرانے زمانے سے چینیوں کو لکھنا پڑھنا بھی آتا تھا۔ تہذیب کے نورانی تڑکے میں چینیوں نے کچھ اشارے اور حروف ایجاد کر لیئے تھے جن کے ذریعے سے مختلف الفاظ اور خیالات وہ تحریر میں ظاہر کرنے لگے تھے۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کی باتوں کو سمجھ سکیں۔ رفتہ رفتہ انھوں نے تصویروں کی ایک خاص قسم کی لکھائی ایجاد کر لی۔ آج کل کی چینی زبان اسی کی بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں چینیوں نے دنیا کے اور لوگوں سے پہلے سیکھ لی تھیں لیکن سب کچھ انھوں نے اپنے آپ سیکھا اور ان کا ملک خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رہا۔ چینی تہذیب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے نہ کسی سے فائدہ اُٹھایا، اور نہ کسی کو پہنچایا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ چین تہذیب کے درخت میں ہمیشہ سوکھی شاخ کی طرح رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین چاروں طرف پہاڑوں، سمندروں اور ریگستانوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینیوں کی تہذیب ہمیشہ باہر کے اثرات سے محفوظ رہی۔ اور انھوں نے اپنے خاص طرز پر زندگی گذاری۔ چینی زبان ہی کو دیکھ لیجئے دنیا کی تمام زبانوں سے الگ ہے۔ بعض زبانیں داہنی سے بائیں کو لکھی جاتی ہیں بعض بائیں سے داہنی طرف کو لکھی جاتی ہیں، لیکن چینی زبان کی چال سب سے نرالی ہے۔ وہ اوپر سے نیچے کو لکھی جاتی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ چینیوں نے جو کچھ سیکھا نہ کسی دوسرے کی مدد سے نہیں بلکہ خود سیکھا پھر بھی ہزاروں برس پہلے ان کی ترقی دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے زراعت معلوم کرنے والے اور مندر اور عمارتیں بنانے والے چینی ہی تھے

حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار سات سو برس پہلے چین میں ایک بادشاہ گذرا ہے جس کا نام ہوانگ ٹی - یہ بڑا عقلمند بادشاہ تھا۔ اس نے سڑکیں تعمیر کرائیں۔ جہاز بنوائے اور تمام سلطنت کو باقاعدہ محکموں میں تقسیم کر کے ہر محکمے کے سپرد جداگانہ فرائض کئے۔ اس بادشاہ کی ملکہ بھی بڑی ہوشیار تھی۔ اس کا نام تھا سی لنگ شی۔ ریشم کا کپڑا اسی ملکہ نے معلوم کیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ریشمی کپڑے سب سے پہلے چینیوں نے پہننے شروع کئے۔ قطب نما بھی چینیوں کو بہت پرانے زمانے میں معلوم ہو گیا تھا۔ ۱۱۲۲ قبل مسیح میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا، موجودہ کوچن چین سے چین کے دربار میں کچھ سفیر آئے ہوئے تھے۔ واپسی میں وہ بے چارے راستہ بھول گئے اس لئے چین کے وزیر اعظم نے ایک ایسا رتھ سفر کرنے کے لئے دیا جو جنوب کا راستہ بتاتا تھا اس کی مدد سے وہ اپنے وطن پہنچے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی اتنے پرانے زمانے میں قطب نما سے واقف تھے اور اُسے استعمال بھی کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ سے تقریباً ۱۷، ۱۸ سو برس پہلے چین سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ یہ ریاستیں ایک شہنشاہ کے ماتحت تھیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بادشاہ شہنشاہ کو فوجی امداد دینے پر مجبور تھے۔ اسی قسم کا نظام پرانے مصر میں بھی موجود تھا اس نظام کو فیوڈلزم یا نظام جاگیرداری کہتے ہیں۔ یہ نظام اسی وقت کامیاب ہو سکتا تھا جب شہنشاہ کوئی مضبوط آدمی ہوتا۔ اگر شہنشاہ کمزور ہوتا تو چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کو آپس میں لڑنے اور بغاوتیں کرنے کا خوب موقعہ مل جاتا تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی قبل مسیح تک ہوانگ ہو یانگ سی کی وادی میں کوئی چھ ہزار چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ چین کی تاریخ میں یہ "گڑبڑ کا زمانہ" کہلاتا ہے۔

چین کے دو بڑے بڑے معلّم کنفیوشس اور لاؤزے اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے چینیوں کو نیکی، ایمانداری اور ہمدردی کے اصول سکھائے۔ کنفیوشس کا خیال تھا کہ دنیا میں نیک وہی بن سکتا ہے جو سماج کے ساتھ بھلائی کرے۔ کنفیوشس کا قول ہے کہ "یہ میرے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

آزادی کی زنجیریں

پہلے باب کا خلاصہ: ظفر میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کی دلی آرزو ہے کہ وہ ایف اے میں داخلہ لے۔ لیکن اس کے والد مظفر حسن اپنی مالی حالت کی وجہ سے اُسے آگے پڑھانے سے انکار کر دیتے ہیں اور نوکری کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ظفر کو اس کا سخت صدمہ اور غصہ ہے۔ وہ اسی حالت میں بیٹھا ہے کہ اس کا دوست ہردیال آکر اُسے تسلی دیتا ہے اور اُمید بندھاتا ہے کہ ظفر کے استاد جو ہردیال کے والد ہیں مظفر حسن کو اس پر راضی کرلیں گے کہ وہ ظفر کو آگے پڑھائیں۔ ظفر کو کچھ اُمید بندھتی ہے۔

(۲)

میر مظفر حسن صاحب کی سیرت اور مزاج کا جو تصور ظفر کے ذہن میں تھا وہ یک طرفہ اور ادھورا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک سترہ برس کا لڑکا جو خود حد سے زیادہ زود حس اور خلوت پسند ہو اور اوپر سے باپ کی کڑی نگرانی کی وجہ سے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع بہت کم پاتا ہو، انسانی فطرت کا مکمل اور معروضی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس کا بے قید تخیل اصلیت کا ایک ہلکا سا خاکہ لے کر اس کے اندر کہانیوں میں سنی ہوئی یا کتابوں میں پڑھی ہوئی فرضی سیرتوں کے رنگ بھر دیتا ہے اور اس پیکرِ خیال کو جیتا جاگتا انسان سمجھ لیتا ہے۔

میر مظفر حسن صاحب رئیسوں کے ایک پُرانے خاندان کی یادگار تھے جو دو پشت پہلے دریاپور تحصیل کے پچپن گاؤں اور خود دریاپور کے ایک بڑے حصے کا مالک تھا۔ میر صاحب کے دادا سخاوت مہمان نوازی اور وضع داری میں مشہور تھے۔ سائل چاہے مستحق ہو یا غیر مستحق اُن کی سرکار سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا عالم، شاعر، طبیب، عامل، نجومی، رمّال، جفار دور دور سے آتے تھے اور مہینوں مہمان رہتے تھے۔ ان میں سے وہ جن کا جی واپس جانے کو نہیں چاہتا تھا یہیں رہ پڑتے تھے۔ خود رئیس کو اپنے خیال میں ہر قسم کے علوم و فنون میں دخل تھا اور یہ سب حضرات اس خیال کی تائید کرتے تھے۔ ان اربابِ کمال کے علاوہ اور بہت سے لوگ جو محض شرفا کہلاتے تھے اس خدمت پر مامور تھے کہ رئیس کے سامنے اظہارِ حق کرتے رہیں یعنی اس پر اس کے اوصاف جتاتے رہیں جن سے وہ خود اچھی طرح واقف نہ تھا۔ یوں تو اس ڈیوڑھی پر ہمیشہ بڑی رونق رہتی تھی مگر خاص طور پر عشرۂ محرم میں پڑھنے والے اور سننے والے مہمانوں کی وہ ریل پیل ہوتی تھی کہ خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو جاتا تھا۔ ریاست کا کاروبار شیخ عنایت اللہ کے سپرد تھا جو خود ایک چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ عام انتظامی سلیقے کے علاوہ ان میں بڑا کمال یہ تھا کہ ریاست کا خرچ آمدنی سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو وہ رئیس کو پریشانی میں ڈالے بغیر پورا کر دیتے تھے۔ بڑی سے بڑی رقمیں زیادہ سے زیادہ سود پر قرض لینے دستاویزیں، رہن نامے اور بیع نامے لکھوانے اور رجسٹری کرانے کے مراحل وہ چٹکی بجانے میں طے کر دیتے تھے۔ جب میر صاحب کے والد نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد شیخ صاحب سے ریاست کا جائزہ لیا تو حساب آئینے کی طرح صاف تھا موضعوں میں سے بائیس بیع ہو چکے تھے، پچیس رہن تھے اور آٹھ سالم گاؤں قرض کے بار سے محفوظ تھے۔ ریاست کے نئے مالک نے شیخ صاحب کی عمر بھر کی خدمات کی یہ قدر کی کہ ان پر بدانتظامی، بے ایمانی، دغا بازی غرض طرح طرح کے مکروہ الزام لگائے اور انھیں کھڑے کھڑے نکال دیا۔ شیخ صاحب کو اب نوکری کی پرواہ نہ تھی اس لئے کہ ان کی ذاتی جائداد میں ان کے حسنِ انتظام سے حیرت انگیز اضافہ ہو گیا تھا مگر اپنے آقا زادے کی ناقدری اور ناشکری کا سخت صدمہ ہوا اور اس غم میں گھل گھل کر چوراسی برس کی عمر میں رحلت کر گئے۔

میر صاحب کے والد بڑے ہوش گوش کے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کے سب پالما لوں کو رخصت کر دیا، محرم کے خرچ اور دوسرے مصارف میں آمدنی کے لحاظ سے تخفیف کر دی اور شان و شوکت کو چھوڑ کر آرام و اطمینان کی زندگی پر قناعت کی مگر آخر عمر میں وکیلوں کے بہکانے سے مقدمہ بازی کے پھیر میں پڑ گئے اور کھوئی ہوئی ریاست کو واپس لینے کی فکر میں رہی سہی جائداد بھی کھو بیٹھے۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے لئے صرف ایک گاؤں اور قصبے کی تھوڑی سی جائداد چھوڑ گئے۔ بڑے بیٹے اظہر حسن کو انھوں نے علوم دین کی اور چھوٹے بیٹے مظفر حسن کو میٹرک تک انگریزی کی تعلیم دلائی تھی۔ اظہر حسن والد کے انتقال کے تھوڑے ہی دن بعد تعلیم کی تکمیل کے شوق میں اپنی اور اپنے چھوٹے بھائی کے حصے کی جائداد رہن رکھوا کر عراق چلے گئے اور ایک عرصے تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی پھر یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے وہاں شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مظفر حسن بیس سال کی عمر میں کارزارِ حیات میں حصہ لینے کے لئے اکیلے اور نہتے رہ گئے۔ انھوں نے نازو نعمت کے گہوارے میں نہ سہی مگر راحت و فراغت کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کا مزہ اب تک نہیں چکھا تھا، دو سال پہلے وہ علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے آئے تھے اور اپنے طور پر قانون کا مطالعہ کر کے وکالت کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے جس کے لئے اس وقت تک ڈگری وغیرہ کی قید نہ تھی، یکایک والد کے انتقال اور بڑے بھائی کی ہجرت کی وجہ سے انھیں امتحان کا خیال ترک کر کے گھر کے معاملات کی طرف توجہ کرنی پڑی انھوں نے اپنے والد کے وفادار کارندے اجودھیا پرشاد کو بلوا کر جائداد کے کاغذات دیکھے تو معلوم ہوا کہ جو تھوڑی بہت جائداد رہ گئی ہے وہ اظہر حسن رہن رکھ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ رہنے کی حویلی بھی مکفول ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اب ایک پیسے کی بھی آمدنی نہیں رہی اور مظفر حسن کو اپنا اپنی بیوہ پھوپی اور ان کی لڑکی کا بوجھ اُٹھانے کے لئے اپنی قوتِ بازو سے کمانا پڑے گا۔ انھیں اپنے عزیزوں سے کسی قسم کی مدد کی اُمید نہیں تھی اس لئے کہ ان کے والد نے آخر عمر میں مقدمہ بازی کے سلسلے میں سب سے لڑائی مول لے لی تھی۔ اب رہے مرحوم کے دوست احباب ان میں سے کسی سے مظفر حسن واقف نہ تھے اس لئے کہ وہ بہت چھوٹی عمر میں پڑھنے کے لئے علی گڑھ بھیج دئے گئے تھے۔ اجودھیا پرشاد نے بتایا کہ مرحوم نے آخر عمر میں اپنے سب احباب سے قطع تعلق کر لیا تھا کیونکہ وہ اُنھیں مقدمہ بازی سے منع کرتے تھے۔ پھر بھی ان میں بعض ایسے وضع دار ہیں کہ وہ ضرور اس کے سر پر ہاتھ رکھیں گے خصوصاً بھگوت دیال صاحب وکیل جو مرحوم کے بچپن کے دوست ہیں۔

مظفر حسن جب وکیل صاحب سے ملے تو وہ واقعی اس قدر شفقت سے پیش آئے جیسے اُن کے حقیقی چچا ہوں۔ بڑی دیر تک اپنے مرحوم دوست کا ذکر کرتے رہے۔ بیچ میں کئی بار ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آواز بھرانے لگی۔ انھوں نے مظفر کو اطمینان دلایا کہ اظہر نے مشترکہ جائداد کو رہن رکھنے کی جو کارروائی کی ہے وہ بالکل خلاف قانون ہے اور آدھی جائداد ضرور واپس مل جائے گی۔ مظفر حسن نے کہا ایک تو میں یوں بھی مقدمہ بازی کے چکر میں جس نے ابا جان کو تباہ کیا پڑنے سے گھبراتا ہوں دوسرے میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں، مقدمہ کیسے لڑوں گا۔ اور فرض کیجئے کہ کہیں سے روپیہ مل جائے تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ قانون کی آڑ میں اپنے ضمیر کے خلاف کام کروں۔ جب بھائی صاحب نے پوری جائداد پر روپیہ قرض لیا ہے تو میں آدھا قرض ادا کئے بغیر آدھی جائداد کیسے واپس لے لوں؟ وکیل صاحب یہ سُن کر مسکرائے "شاباش بیٹے، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم ایسے سمجھدار اور دیانت دار ہو مگر تم گھبراؤ نہیں میں وکیل ضرور ہوں پر اس قسم کا نہیں جو قانون کی چھری سے انصاف کو ذبح کرنے کی ترکیبیں سوچتے ہیں۔ دیکھو میاں تمھارے بھائی صاحب قبلہ نے زرعی جائداد اور حویلی کو پچاس ہزار روپے میں رہن رکھا ہے۔ جائداد کا منافع دو ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہے اس لئے اس کی قیمت پچاس ہزار سمجھ لو۔ حویلی شہر میں ہوتی تو ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی تھی۔ مگر یہاں بھی ۴۰ ہزار تو مل ہی جائے

گا۔ اب اگر رہن نامہ منسوخ ہو جائے تو تم یہ کر سکتے ہو کہ حویلی لو اور آدھی زرعی جائداد کو ۶ ہزار میں بیچ کر بچاس ہزار اپنے بھائی کا قرض ادا کر دو اور اس طرح تمہارے لئے ایک ہزار سالانہ منافع کی جائداد اور پندرہ ہزار نقد بچ جائے گا ۔ کہو کیسی رہی ؟ رہا مقدمہ لڑنے کا جھگڑا تو اس نے چاہا اس کی ضرورت ہی نہیں ہوگی ۔ لالہ سانول داس جن کے پاس جائداد رہن ہے، آج کل ایک خاص مقدمے میں میرے پیچھے میں ہیں ۔ ان کو اونچ نیچ سمجھا کر عدالت کے باہر معاملہ کرنے پر راضی کر لوں گا ؟

اس دن سے بھگوت دیال صاحب مظفر حسن کے سرپرست بن گئے ۔ انھوں نے لالہ سانول داس سے سب معاملات [illegible] سلونی سے طے کرا دیئے مظفر کو ہزار بارہ سو روپے سال کی آمدنی کی جائداد اٹھارہ ہزار روپے نقد واپس دلوا دئے ۔ اس حویلی کی جگہ جس کا سنبھالنا مظفر حسن کے بس کی بات نہ تھی انھیں دس ہزار میں ایک اچھا خاصہ معقول مکان خرید دیا ۔ اور باقی آٹھ ہزار کی رقم بنک میں جمع کرا دی ۔ انہی کے مشورے سے اپنے والد کے دوست مسٹر میکفرسن سے جو بنارس میں کمشنر تھے جا کر ملے اور ان کی سفارش سے نائب تحصیلداری کے لئے نامزد ہو گئے ۔ ایک سال کے بعد جون پور میں نائب تحصیل دار مقرر ہو کر چلے گئے ۔

[illegible] ۲۱ سال کی عمر میں ان کی شادی حیدرآباد کے ایک وکیل کی صاحب زادی سے ہو گئی ۔ قسمت سے بیوی ایسی ملی جو صورت، سیرت، مزاج، تعلیم اور سلیقے کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھی ۔ مظفر حسن کو بیوی سے والہانہ عشق تھا اور وہ اُن سے بھی گہری خاموش محبت رکھتی تھیں ۔ اب ان کی ازدواجی زندگی راحت و مسرت کی ایک بہتی ہوئی ندی تھی مگر درد و الم کی لہروں سے خالی نہ تھی ۔ ان کی بیوی کی صحت ہمیشہ خراب ہی رہتی تھی ۔ ان کے سات بچوں میں ظفر کے سوا کوئی زندہ نہ رہا ۔ اسی وجہ سے مظفر حسن نے ملازمت کے ۳۰ سال پورے ہو جانے کے بعد پنشن لے لی حالانکہ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۱ برس کی تھی ۔ اور وہ چار برس اور نوکری کر سکتے تھے ۔

پنشن لے کر دریا پور آ کر قیام کرنا میر مظفر حسن کے لئے سہل نہ تھا جس جگہ ان کے باپ دادا رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہ چکے ہوں، وہاں ایک معمولی آدمی کی طرح رہنا، جن عزیزوں نے مصیبت کے وقت ان سے بے رخی اور بے مہری کا برتاؤ کیا تھا ان کے درمیان زندگی بسر کرنا میر صاحب پر بہت شاق گذرا مگر کرتے کیا جائداد ذاتی مکان جو کچھ تھا، سب تھا ۔ یہاں آنے کے بعد چار سال بہت غنیمت گذرے ۔ میر صاحب کی بیوی کو دریا پور کی آب و ہوا راس آ گئی اور ان کی صحت مقابلتاً بہتر ہو گئی ۔ ظفر کو وہاں ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا ۔ یہ مدرسہ میر صاحب کے محسن لالہ بھگوت دیال صاحب کی یادگار میں ان کے بیٹے شیو دیال صاحب نے قائم کیا تھا اور خود سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر اس کے ہیڈ ماسٹر کا کام کر رہے تھے ۔ میر صاحب نے لالہ شیو دیال صاحب اور قصبے کے دو ایک اور معزز آدمیوں کے سوا کسی سے تعلقات نہیں رکھے ۔ البتہ تحصیل کے اور ضلع کے حکام سے ان کا میل جول رہتا تھا ۔ عدالت میں اسیسر اور دیال اسکول کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے ۔ غرض اچھی خاصی آرام اور عزت کی زندگی بسر کرتے تھے ۔

مگر یکایک تقدیر نے ان سے آنکھیں پھیر لیں ۔ ان کی بیوی کا مرض عود کر آیا اور ان کی صحت روز بروز گرنے لگی ۔ میر صاحب نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا یہاں تک کہ اپنے عمر بھر کے اصول کے خلاف قرض لے کر اور پھر اپنی جائداد کا بڑا حصہ فروخت کر کے حکیموں اور ڈاکٹروں کی نذر کر دیا ۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان کی بیوی سال بھر کی شدید بیماری کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں ۔

میر صاحب کی تند و پرشور طبیعت سے لوگوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنی محبوب بیوی کے صدمے میں رو رو کر ہلاک ہو جائیں گے ۔ لیکن خلاف توقع ان کا غم شعلۂ جوالہ بننے کے بجائے آتش خاموش بن کر رہ گیا ۔ ان کو ایک چپ سی لگ گئی اور ایک مدت تک [illegible] دنیا کو چھوڑ دیا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] زندگی سے نکلا ۔ اپنا معمولی رنگ اختیار کر لیا ۔ لیکن ان آدمیوں کو جو میر صاحب کو قریب سے دیکھتے تھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت میں اب وہ تاؤ نہیں رہا ۔ وہ بے تکلف صحبت میں اب بھی کھلکھلا کر ہنستے مگر ان کے قہقہوں میں اب وہ جھنکار نہ تھی ۔ غصے میں اب بھی ڈانٹتے تھے مگر آواز میں وہ ڈپٹ نہ تھی ۔ زندگی کے دھارے میں شورش شور تھا نہ زور نہ تھا ۔ اگر ان کے دل میں رنج و حسرت کے سوا کوئی زندہ جذبہ باقی تھا تو وہ بیٹے کی محبت تھی ۔

(باقی آئندہ)

تہذیب کے گہوارے

(بسلسلہ صفحہ ۶)

ناممکن ہے کہ میں دنیا کو چھوڑ کر پرندوں اور جانوروں سے میل جول پیدا کروں جن سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں ہے ۔ پھر میں کس سے ملوں ؟ لاچار اور مجبور لوگوں سے زیادہ کون میری توجہ کا مستحق ہو سکتا ہے ۔ اس وقت چاروں طرف گڑبڑ پھیلی ہوئی ہے مجھے اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے "

ہندوستان میں گوتم بدھ کی تعلیم کا بھی بالکل یہی زمانہ تھا ۔ یہ لوگ آج دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی تعلیم ہمارے پاس اب تک موجود ہے ۔ اب سے دو ہزار چار سو برس پہلے کی باتیں چینی بڑی آسانی سے بھلا سکتے تھے ، لیکن ایسا نہیں ہوا ، یہ کنفیوشس اور لاؤ تسے کی تعلیمات کا اثر ہے کہ چینی صبر و قناعت ، تحمل ، بردباری اور خوش اخلاقی میں آج تک ممتاز ہیں ۔ چین اپنا طرز حکومت اور حکمرانوں کو بدل ڈالے ، لیکن اچھی عادتوں کے جو نقوش ان کے دلوں پر قائم ہو چکے ہیں وہ مٹ نہیں سکتے ۔

فیوڈل نظام چین میں تقریباً ۱۵ صدیوں تک جاری رہا لیکن شی ہوانگ تی چین کا پہلا شہنشاہ تھا جس نے حضرت عیسیٰ سے دو سو سال پہلے اس نظام کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے چین میں پہلی بار ایک مرکزی حکومت قائم کی ۔ چین کی بڑی دیوار اسی بادشاہ نے تاتاریوں کے حملے روکنے کے لئے بنائی تھی ۔ یہ دیوار تین [illegible] میل سے زیادہ لمبی ہے اور آج دنیا کے سات عجائبات میں شمار کی جاتی ہے ۔ یہ تو ایک سرسری خاکہ ہے پرانے چین کی تہذیب کا جس نے ہوانگ ہو اور یانگ تسی کی وادی کے گہوارے میں پرورش پائی ۔ دنیا کی اور تہذیبوں کی طرح اس پر بھی مصیبتیں نازل ہوئیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اتنی مصیبتیں دنیا کی کم قوموں نے جھیلی ہوں گی ، جتنی چینیوں نے جھیلیں ۔ لیکن وہ ہمیشہ امن پسند اور صلح جو رہے ۔ مصیبتوں نے انہیں مفلس ضرور بنا دیا ، لیکن سچ تو یہ ہے کہ صحیح معنوں میں جسے تہذیب کہتے ہیں وہ ایک بڑی حد تک چین ہی میں تھی ۔ ان باتوں کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ چین کی تہذیب نے سب سے پہلے جنم لیا ، سب سے پہلے جوان ہوئی اور سب سے بعد تک زندہ رہے گی

(آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے)

۱۹۴۹ء کا جائزہ

(بسلسلہ صفحہ ۳)

باتوں پر موقوف ہے ۔ ایک یہ کہ چین اور انڈونیشیا بہت جلد اپنے ہاں پائدار امن و امان اور مستحکم نظم و نسق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور ایشیائی ملکوں سے تجارتی تعلقات پیدا کریں ۔ دوسری یہ کہ ہندوستان اور پاکستان میں جو نئی کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے اور کم سے کم ویسے تعلقات جیسے چار پانچ مہینے پہلے تک تھے قائم ہو جائیں ۔ بہرحال ایک خیال ہے جس سے یہ امید بندھتی ہے کہ ۱۹۵۰ء دنیا کے لئے معاشی بہتری کا پیام لے کر آئے گا جنگ کی حالت میں قومیں ایک عارضی جنون میں مبتلا ہو کر اس حقیقت کو بھول جایا کرتی ہیں کہ کم سے کم معیشت کے میدان میں کسی نہ کسی حد تک اتحاد عمل ان کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے لیکن امن کی فضا کے بحال ہوتے ہی انھیں یہ بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا ہے اور تخلیق، تعمیر اور تعاون کا شوق پھر سے ابھر آتا ہے ۔ امن کی فضا باوجود امریکہ اور روس کی جنگ زرگری کے ۱۹۴۹ء میں بڑی حد تک پیدا ہو گئی ہے ۔

کیا عجب ہے کہ ۱۹۵۰ء میں امن و معاشی بہتری کے [illegible] حاصل ہونے لگیں ۔

یہ ہے حکومتِ اسرائیل

(ایک مصری اخبار نویس کے تاثرات)

عبدالحلیم ندوی

کہنے کو فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور اس دعوے کے ساتھ کہ "ہم مشرق و مغرب کے بازاروں کو اپنی مصنوعات سے بھردیں گے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت اس وقت عربوں کے چلے جانے سے ایسی معاشی اور ملکی الجھنوں میں مبتلا ہوگئی ہے کہ اس کے بنائے کچھ نہیں بنتا۔ نو وارد یہودی نہ قانون کا احترام کرتے ہیں۔ نہ ملکی دولت بڑھانے کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ ایک نراج کا سا عالم ہوکر رہ گیا ہے۔

چند مہینوں کی بات ہے۔ کرۂ ارض پر ایک نئی حکومت وجود میں آگئی ہے، جسے حکومت اسرائیل کہتے ہیں۔ یہ حکومت فلسطین میں قائم ہوئی ہے فلسطین وہ پاک سرزمین ہے جہاں بیت المقدس واقع ہے اور جس میں صدیوں سے عرب رہتے چلے آئے ہیں۔ ادھر کوئی سولہ، سترہ سال سے یہودیوں نے دعوے کرنا شروع کیا کہ اس سرزمین کو ہمارا وطن ہونا چاہیئے۔ اور اس پر حکومت ہماری ہونی چاہیئے۔ عربوں نے اس کی مخالفت کی، جنگ ہوئی جس میں ساری عرب سلطنتوں نے حصہ لیا۔ ہزاروں عربوں نے اپنی جانیں دے دیں کہ اس ارض پاک کو یہودیوں سے بچالیں، لیکن امریکہ اور انگلستان کی کوششوں اور آخر میں اسلامی ممالک کی نا اتفاقیوں اور خود غرضیوں کی وجہ سے آج وہاں یہودی حکومت قائم ہوگئی۔ ساری عربی فوجیں وہاں سے ہٹ آئیں اور وہاں کے عرب باشندوں کو مجبوراً اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا اور اب سڑکوں پر زندگی گذار رہے ہیں۔ فلسطین کی وہ معزز خواتین جنھوں نے عیش و عشرت کی گود میں آنکھیں کھولیں، وہ آج مصر، شام اور عراق کی سڑکوں پر ایک پیسے کے لئے ہاتھ پھیلاتی پھرتی ہیں، اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کے لئے کپڑے کے لئے ترستی ہیں۔

کہنے کو فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور اس دعوے کے ساتھ کہ "ہم مشرق و مغرب کے بازاروں کو اپنی مصنوعات سے بھردیں گے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت اس وقت عربوں کے چلے جانے سے ایسی معاشی اور ملکی الجھنوں میں مبتلا ہوگئی ہے کہ اس کے بنائے کچھ نہیں بنتا۔ نو وارد یہودی نہ قانون کا احترام کرتے ہیں نہ ملکی دولت بڑھانے کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نراج کا سا عالم ہوکر رہ گیا ہے۔

ابن غوریون جو اس حکومت کے صدر ہیں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "اسرائیلی حکومت بے قوم کی حکومت ہے"۔ اس جملے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ دولت اسرائیل کے شہری اپنی حکومت کا کہا نہیں مانتے۔ اور ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، اور اب اندرونی حالات کا جائزہ لینے سے پتہ چلا کہ ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ واقعی جو لوگ یہاں آئے ہیں وہ اپنی عادات اطوار رہن سہن، کھانے پینے اور بول چال میں ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کو ایک قوم کسی طرح نہیں کہا جاسکتا بلکہ اب کی مردم شماری کی کمیٹی نے اس سال جو رپورٹ دی ہے اس میں بتایا ہے کہ دولت اسرائیل میں اس وقت ۶۳ مختلف قومیتوں کے لوگ آچکے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی کوئی وجہ تشابہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہیئت امم متحدہ میں شرکت کرنے والی قوموں سے بھی زیادہ قومیتیں آکر آباد ہوگئی ہیں یوں تو فلسطین میں صیہونی حکومت قائم ہونے کے بعد ساری دنیا کے سمٹ کر یہودی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اکثریت بلقان، وسطی یورپ، امریکہ، یمن، جرمنی، مغرب و دریلون سے آئے ہوئے یہودیوں کی ہے اور ابھی تقریباً ۱۲۰ ہزار یہودی چین سے آنے والے ہیں اور ان میں وہ یہودی شامل نہیں ہیں جو فلسطین ہی کے باشندے ہیں اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے، گویا فلسطین اس وقت قوموں کا عجائب خانہ بن گیا ہے۔ بھانت بھانت کی شکلیں اور نت نئی زبانیں سنائی دیتی ہیں۔ اب مختلف قوموں کے اس بے میل کو ایک قوم کہا جائے تو کیسے، پھر جب ان سب میں کہیں بھی مرکز اتصال نہیں ملتا۔ وطنیت اور قومیت کے متعلق تو آپ نے سن ہی لیا، لیجئے زبانوں کی بھی سن لیجئے۔ اس وقت فلسطین کی اس چھوٹی سی آبادی میں بلا مبالغہ دسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں مگر زیادہ تر رواج جرمنی، انگریزی، پولونی، اطالوی اور رومی زبان کا ہے۔ زبانوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ملکی انتظام چلانے، دفاتر کی کارروائیوں کو کارآمد کرنے اور احکامات جاری کرنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی تو حکومت نے اس بوقلمونی کو عبرانی زبان سرکاری بنا کر مٹانا چاہا تو اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ ہر طبقہ اس کی کوشش کرے کہ اس کی زبان سرکاری بنے۔ چنانچہ حکومت عاجز آگئی اور اس نے اس اسکیم کو ختم کردیا۔ ایک قومیت کے لئے نسل اور زبان کا اتحاد ضروری ہے، سو آپ نے نسل کو دیکھ ہی لیا کہ کوئی میر گھاٹ کا ہے تو کوئی تیر گھاٹ کا، اور زبان کو بھی ملاحظہ فرمالیا کہ کوئی ایطالی بولتا ہے تو کوئی تورانی۔ مذہب البتہ بہت بڑا مرکز ہے اور قومیت کی ایک ٹھوس بنیاد، سو اس کا عالم اس حکومت میں یہ ہے کہ باہر سے جتنے یہودی آئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لا مذہب ہیں اور جو تھوڑے بہت پابند بھی ہیں تو بس برائے نام، یہاں ان کو کوئی مذہبی جذبہ کھینچ کر نہیں لایا تھا بلکہ صرف یہ خیال کہ ہماری حکومت ہوگئی، زندگی چین سکون سے بسر ہوگی۔ ہم ایک وطن کے مالک ہوں گے۔ ملک ملک پھرنے اور ہر جگہ سے نکالے جانے کی بے عزتی سے نجات پا جائیں گے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ انسانوں کے اس جم غفیر کو جس میں کوئی مرکز اتحاد نہیں ہے ایک قوم کیسے کہہ دیا جائے! اور پھر ہمارے کہنے سے حقائق تو نہیں بدل جائیں گے اور ان نو وارد یہودیوں کا یہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ برتاؤ یہ ہے کہ ان کو ملازموں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں اور کسی جگہ ان کو گھسنے نہیں دیتے، دفتروں، سرکاری کاموں اور حکومت کے محکموں سے دھڑا دھڑ نکال رہے ہیں۔

حکومت اسرائیل کے بننے میں جس طرح امریکہ اور انگلستان کا شروع سے ہاتھ رہا ہے اس طرح اس کے چلانے میں بھی ان کی مدد اور کوشش کا بہت دخل ہے۔ اب تک ان ممالک سے ہر قسم کی امداد ملتی رہی ہے، لیکن اب جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں یہ ممالک اپنے ہاتھ کھینچتے جارہے ہیں اور آخر میں تو امریکہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ "اب تم اپنی ضروریات اپنے ملکی وسائل ہی سے پوری کرو"۔ چنانچہ اسی سال (۱۹۵۶ء) اس نے ۳۰ ملین ٹن گیہوں کم کردیا۔ ادھر ممالک اسلامیہ نے حکومت اسرائیل کا بائیکاٹ کر رکھا ہے، نہ تجارت کرتے ہیں، نہ کسی قسم کا لین دین۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگی اور محاصل کی آمدنی صفر کے برابر ہوکر رہ گئی ہے۔ حکومت کو اپنے کام چلانے ہیں۔ اس نے اسی تناسب سے ٹیکس بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ کمپنیوں اور کارخانوں اور کاروباریوں پر تقریباً ۷۵ فی صدی ٹیکس لگا دیئے گئے ہیں

ظاہر ہے یہ لوگ یہ رقم اپنی جیب سے تو ادا کریں گے نہیں انھوں نے اسی تناسب سے چیزوں کی قیمتیں بڑھا دی ہیں۔ چنانچہ اس عرصے میں کھانے پینے کی چیزوں کے دام پانچ گنے بڑھ گئے ہیں۔ گوشت تو بازار میں عنقا ہو گیا ہے۔ اگر کسی کو مل گیا اور وہ بھی بلیک مارکیٹ سے چوگنے دام دے کر تو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ مرغی کی قیمت یہاں ڈھائی گنیاں (مصری) ہو گئی ہے اور معمولی کبوتر یہاں ... گنیوں میں ملتا ہے۔ اسی طرح ایک انڈے کی قیمت دس قرش یعنی دس آنے سے کچھ زیادہ ہے۔ نئی کار کے دام چار ہزار گنیاں ہیں اور پرانی ایک ہزار سے کم میں نہیں مل سکتی اور معمولی لوٹ پھوٹ کی مرمت میں دو سو گنیوں سے کم نہیں صرف ہوتے۔ اسی طرح شکر، تیل، پنیر اور خصوصاً پیٹرول کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ تصور نہیں ہوتا۔

ادھر جب چیزیں گراں ہوئیں تو مزدوروں نے اپنی مزدوری بھی بڑھا دی کہ گذشتہ شرح میں ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا تھا۔ چنانچہ اب کم سے کم دو گنیاں میں ایک مزدور کام کرتا ہے اور بعض بعض تو تین گنی سے کم پر بات نہیں کرتے۔ باربرداری سے چارہ کہاں مجبوراً تاجر ان سے کام لیتے اور ان کی اجرت بھی چیزوں کی قیمت میں بڑھا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چیزیں اور مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ حکومت ان پر زور نہیں ڈال سکتی کہ اس کے کام بھی انھیں کے بل بوتے پر چل رہے ہیں۔

اب حالت سدھرے تو کیسے؟ جو لوگ باہر سے آئے ہیں وہ اس میں بڑی مدد کر سکتے تھے۔ مختلف قسم کے کام کر کے، ملکی کاروبار میں حصہ لے کر، بن محنتی اور بے کار زمینوں پر کاشت کر کے کھانے کی تکلیف کو بہت حد تک کم کر سکتے تھے۔ مگر یہ لوگ اس کے لئے بالکل تیار نہیں۔ حکومت بننے سے پہلے عرب کسان زمینوں کو جوتتے بوتے اور غلہ پیدا کرتے تھے۔ اب ان کے جانے کے بعد زمینیں بے کار پڑی ہیں، ان میں اتنا پیدا ہو سکتا ہے کہ کھانے کی تکلیف اس قدر نہ رہے۔ لیکن یہ نو وارد کھیتی باڑی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حکومت اگر ان کے ذمے یہ کام کرتی ہے تو یہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے کام کریں گے اور جو لوگ راضی ہوتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بغیر مشینوں اور آلات کے کھیتی باڑی کے کام کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ہمیں مشینیں سپلائی کیجئے تو ہم زمینیں لیں، جوتیں بوئیں۔ حکومت کی مالی حالت اتنی سقیم ہو کہ ٹیکس لگانے کے بعد بھی کام نہ چلے اور بغیر وعدے کے نوٹ چھاپنے پر مجبور ہو، وہ بھلا مشین کہاں سے خریدے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری زمینیں بے کار پڑی ہیں، اور تھوڑا بہت جو غلہ مل سکتا تھا، اس سے بھی محروم ہے۔

باہر سے آنے والے یہودیوں میں اکثریت غریب طبقے کی ہے جن کے پاس نہ ٹکا ہے، نہ کوڑی۔ یہ آکر بجائے ملکی دولت بڑھانے کے ملک پر بار ہو گئے ہیں

بڑے تاجر اور امیر اول تو یہاں آئے نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں کے مقابلے میں امریکہ میں روپیہ کمانے کے مواقع زیادہ ہیں۔ اور جو آئے ہیں وہ اپنا روپیہ لگاتے نہیں اور بخل میں یہودی قوم بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے، اب کاروبار میں روپیہ کون لگائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئے کاروبار بھی نہیں کھل رہے ہیں کہ اسی سے لوگوں کو روزی کا سہارا ملے اور کسی طرح پیٹ بھرنے اور بری بھلی زندگی گذارنے کا موقع مل جائے۔

دولت اسرائیل میں سیاسی حالت بھی بہت امید افزا نہیں ہے۔ یہاں ۲۰ سے زائد سیاسی پارٹیاں ہیں، اور دو بڑی۔ ایک داہنا اور دوسرا بایاں۔ اور ان دونوں میں حکومت کے لئے رسہ کشی ہوا کرتی ہے اور ان کے چرچے اس قدر عام ہیں کہ ہر ہوٹل اور قہوہ خانے میں، ہر سڑک، ہر موڑ اور ہر گھر میں بس اسی کے چرچے رہتے ہیں اور کبھی حالت اتنی قابو سے باہر ہو جاتی ہے کہ پولیس بھی سنبھال نہیں پاتی۔ کچھ تو اسی وجہ سے کہ یہودی لوگ قاعدہ قانون کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے، اور بہت کچھ اس وجہ سے کہ پولیس کے لوگ بھی انھیں دونوں گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ داہنے اور بائیں بازو والوں کی سرگرمیوں کے علاوہ ان دنوں کمیونسٹوں کی سرگرمیاں بھی بہت تیز ہو گئی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ موجودہ حکومت کو ناکام کر کے ماسکو کے طرز کی حکومت قائم کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا پروپیگنڈا اندرون سے کیا جا رہا ہے اور اس میں کمیونسٹ حکومت روپیہ پیسے سے امداد کر رہی ہے۔

فوج کی حالت بھی جسے "ہاجانا" کہتے ہیں، کچھ اچھی نہیں۔ نہ اب ان میں تنظیم رہی ہے نہ اطاعت و حکم برداری۔ جب سے جنگ ختم ہوئی ہے فوجیوں پر بہت برا اثر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یا تو تم پھر سے جنگ کا اعلان کر دو۔ ورنہ ہمیں اپنے ہم وطنوں میں بھیج دو۔ ہم تو یہاں اسی لئے آئے تھے کہ جنگ کر کے سارے عرب ملکوں کو فتح کریں گے۔ ہم یہاں فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرنے تھوڑے آئے تھے۔"

غرض حکومت اسرائیل اس وقت ہر قسم کی مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے۔ نہ حکومت کی حالت اچھی ہے، نہ عوام کی، نہ سیاسی فضا پر سکون ہے اور نہ ملکی حالت۔ اسی حالت میں اگر انگلستان اور امریکہ سہارا نہ دیں تو شاید اس حکومت کی نیا مشکل ہی سے پار ہو گی۔ (تلخیص)

شادی کی تربیت

(بہ سلسلہ صفحہ)

ارمان بھرے دلوں میں محبت اور شعریت کے دھندلکے میں ایسے کھوئے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوب صورتی اور دل کشی کے سوا انھیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چاہے ان کے تصورات آسمانِ محبت کی بلندیوں سے پرے محوِ پرواز ہوں ان کے پاؤں حقیقت پسندی اور ٹھوس واقعیت کی چٹان پر جمے رہنے چاہئیں اور رنگین لمحات، دزدیدہ نگاہیں لطیف جذبات کیسے ہی دل کش کیوں نہ ہوں ازدواجی زندگی کی تعمیر کے لئے محض ایسے شاعرانہ جذبات ناکافی ہیں کامیاب متاہل زندگی کے لئے مزاج کی ہم آہنگی اور بنیادی نظریاتِ زندگی پر اشتراک ضروری ہے۔ مذہبی رجحان کی عورت کی زندگی مادیت پرست مرد کے ساتھ اجیرن ہو جائے گی، اسی طرح جذبۂ پدری سے بھرپور مرد کی ایسی عورت سے کیسے بسر ہو سکتی ہے جو ذاتی آزادی اور مشاغل کو خانہ داری اور بچوں کی نگہداشت جیسے اہم فرائض پر ترجیح دے۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ مرد اور عورت شادی ان ٹوٹ بندھن میں گرفتار رہنے سے پہلے ایک دوسرے کے رجحانات اور زندگی کے متعلق ردِعمل سے واقف ہوں۔

جب مرد اور عورت آخری طور پر شریکِ زندگی کا انتخاب کر لیں اور اس امر کا تہیہ کر لیں کہ وہ زندگی کے اس سفر کو کامیاب بنائیں گے تو اس ابتدائی مرحلے پر انھیں دورانِ سفر کی صعوبت اور صبر آزما رکاوٹوں سے ضرور آشنا ہونا چاہئے۔ وہ رستے کے خارزاروں سے کیوں کر دامن بچا کر چلیں اور کیسے ان رکاوٹوں کو دور کریں جو کئی بیش رووں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئیں اور جن سے ان کی زندگی کی راہیں ہمیشہ کے لئے مسدود ہو گئیں۔ متاہل زندگی کی شاہراہ کے یہ سنگِ گراں جہالت اور غیر بردباری ہیں۔ چنانچہ شادی کے قطعی فیصلے سے پیشتر ازدواجی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا فریقین کا فرض ہے بالخصوص یہ کام مرد کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ شادی کے اولین دنوں میں ذمہ داری کا زیادہ بوجھ اسی کے کندھوں پر ہو گا۔ (آفاق، لاہور)

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ)

کمزور طبیعت والوں کی جنھیں ضعف کی شدت سے اتنی برداشت نہیں ہوتی کہ ناک پر مکھی بیٹھنے دیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ غصے کے گھوڑے پر چڑھے ہیں حالانکہ دراصل غصہ ان پر چڑھا ہوتا ہے۔

عبرت ناک پوری یا آدھی کٹی ہوئی ؟ ان من چلوں کی جو طلاق کے مقدموں میں مدعا علیہ یا فوجداری کے مقدموں میں مستغیث ہوتے ہیں۔

طرب ناک یا فرح ناک گل زنبق کی طرح کھلی ہوئی، ہنستی ہنساتی ہوئی۔ بزمِ بے تکلف کے بادہ نوشوں کی جو زندگی کی تلخ کامیوں کو دور کرنے کے لئے خوش طبعی کی مے شیریں کے دو گھونٹ غنیمت سمجھتے ہیں اور مزے سے لے کر پیتے ہیں۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ — مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی

دہلی

नई रोशनी देहली

۳

فہرست مضامین

یہ تبند کیا چیز ہے ۲

مصر ترقی کی راہ پر — ادارہ ۲

دنیا کی رفتار ـــ

۱ ہندوستان ـــ ع ا ح ۴

۲ باہر کی دنیا ـــ ا س ۴

بزم بے تکلف ۵

غزل — سحر رامپوری ۵

بھری بہار میں بھی ہم تو مسکرا نہ سکے
مشیر علوی ۵

خوف و ہراس — وقار رضوی ۶

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)
ڈاکٹر سید عابد حسین ۷

گرم کپڑے — صفاء الفاروقی ۹

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ نیند کیا چیز ہے؟

نیند ایک دم سے نہیں آیا کرتی۔ وہ خوش نصیب بھی جو تکیے پر سر رکھتے ہی غافل ہو جاتا ہے، دراصل جسمانی سکون کی کئی منزلوں سے گزرتا ہے اور رفتہ رفتہ سوتا ہے۔ پہلے بڑے عضلات جن سے ہم پیٹھ، ٹانگوں، بازوؤں اور گردن کو جھکاتے اور موڑتے ہیں، ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اس کے بعد ہاتھ پاؤں انگلیوں اور انگوٹھوں کو حرکت دینے والے چھوٹے عضلات کی باری آتی ہے۔ سب سے زیادہ دیر ہونٹوں، بھوؤں اور پلکوں کے ننھے ننھے پٹھوں کے ڈھیلے ہونے میں لگتی ہے یعنی انھیں سب سے پیچھے نیند آتی ہے۔

اسی طرح حواس بھی ایک ایک کر کے معطل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو شعوری حرکت میں قوت اور سمجھنے کی قوت زائل ہوتی ہے، پھر دیکھنے کی اور اس کے بعد سننے کی۔ چھونے کی حس سب سے آخر میں سوتی ہے۔ جاگتے وقت یہ ترتیب الٹ جاتی ہے، یعنی اپنے کانوں میں آوازیں آنے لگتی ہیں اور اس کے بعد حرکت کی قوت بیدار ہوتی ہے۔

ایک ماہر نفسیات والٹر مائلس نے تجربے سے معلوم کیا کہ سونے کے لئے آنکھیں بند کرنا ضروری نہیں۔ اس نے اپنے ٹائپسٹ کو بڑی دیر تک سونے نہیں دیا۔ آخر بے چارہ آنکھیں کھولے ہوئے بلکہ پھیلائے ہوئے سو گیا۔

بہت سے لوگ عضلات کے ڈھیلے ہونے سے پہلے اونگھتے ہیں۔ اونگھنا بیداری اور خواب کی درمیانی منزل ہے۔ جو لوگ کھانے کے بعد اونگھا کرتے ہیں انھیں اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ رات کو نیند نہیں آتی۔ ان کی غنودگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ کھا جاتے ہیں اور خون دیر تک دماغ کے بجائے معدہ میں جمع رہتا ہے۔ اس لئے ایک خاص سکون محسوس ہوتا ہے اور آنکھیں بھاری ہو جاتی ہیں اگر وہ تھوڑی دور ٹہل آئیں یا کسی کھیل یا دلچسپ شغل میں مصروف ہو جائیں تو فوراً ہی غنودگی کی کیفیت دور ہو جائے گی۔

سب سے گہری نیند پہلے گھنٹے میں ہوتی ہے۔ چور اس بات کو جانتے ہیں، اس لئے چوری کے واقعات زیادہ تر گھر والوں کے سو جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہوتے ہیں۔ پہلے گھنٹے کے بعد کئی گھنٹے نیند ہلکی رہتی ہے۔ تین بجے رات کے قریب ذرا دیر کے لئے گہری ہو کر پھر ہلکی ہو جاتی ہے۔ پچھلے پہر پانچ بجے کے بعد گہری نیند کا ایک اور ہلہ ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش سے کر مرنے کے وقت تک دماغ سے برابر بجلی کی خفیف سی لہریں نکلتی رہتی ہیں جب وہ سوتا ہے تو ان لہروں کی قوت کم ہو جاتی ہے۔

جب تک خون دماغ میں جمع رہے اچھی طرح نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر اینجلو موسو نے ثابت کیا ہے کہ اگر سونے والے کی آنکھ کے پپوٹے پر روشنی کی ایک کرن بھی پڑ رہی ہو تو دماغ میں زیادہ خون کھنچ کر آ جاتا ہے اور اعصابی نظام میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ دماغ میں خون نہ جمع ہو اور گہری نیند ہو تو سونے سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے ایسا کام نہ کیجئے جس میں زیادہ سوچنا پڑے۔

سوتے وقت قلب کی حرکت سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ مردوں میں یہ خون کے دباؤ کی کمی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے فرض کیجئے شام کو چھ بجے آپ کی نبض ایک منٹ میں ۷۰ کی رفتار سے چل رہی ہے اور آپ اسی وقت پڑ کر سو جاتے ہیں تو آدھی رات تک نبض کی رفتار ۵۴ رہ جائے گی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ پھر بڑھے گی۔ ۲۱ دن سے لے کر چھ مہینے تک کے بچے کی نبض کی رفتار عام طور پر جاگنے میں ۱۴۰ اور سونے میں ۱۲۱ ہوتی ہے۔

ایک ڈاکٹر کا تجربہ ہے کہ سونے میں خون کھال میں بھر جاتا ہے، اور اندرونی اعضا میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اضطراری افعال پر بھی نیند کا اثر پڑتا ہے گردوں وغیرہ کا فعل بہت سست ہو جاتا ہے، معدہ کا کام رک جاتا ہے، اور ہضم کرنے والی رطوبت کم ہو جاتی ہے۔ ٹمپریچر جاڑے میں ۹۵ اور گرمی میں ۹۷ رہ جاتی ہے

امریکہ میں ایک پلنگ کے گدے بنانے والی کمپنی کی تحریک سے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر جانسن اور ان کے مددگاروں نے ڈیڑھ سو مختلف پیشوں کے مردوں اور عورتوں کا جن میں ہر قسم کی صحت رکھنے والے لوگ شامل تھے نیند کی حالت میں مشاہدہ کر کے ان حرکات و سکنات کو قلم بند کیا۔ ان کی رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ کا ایک اوسط باشندہ ۸ گھنٹے روز سوتا ہے۔ یہ ۸ گھنٹے پانچ پانچ منٹ کے ۹۶ وقفوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں ۳۶ بار اپنے جسم کی پوزیشن بدلتا ہے، کبھی سیدھا چت لیٹتا ہے، کبھی ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے، کبھی قینچی بن جاتا ہے، کبھی جھکے دستے کا چاقو اور کبھی گٹھری۔

کمرے کے ٹمپریچر کا نیند پر بہت اثر پڑتا ہے جن بالغوں کے سونے کے کمرے کا ٹمپریچر ۶۰ سے ۶۴ ڈگری تک تھا، وہ آٹھ، دس گھنٹے سوئے۔ جب ۵۲ سے ۵۰ ڈگری تک رہ گیا تو انھیں دس بارہ گھنٹے نیند آئی، لیکن جب ٹمپریچر بڑھا کر ۷۰ سے ۷۵ تک کر دیا گیا تو تین سے پانچ گھنٹے تک سو سکے لیکن بوڑھے لوگوں کو عموماً ۷۰ سے کم ٹمپریچر میں نیند نہیں آتی۔

سونے اور جاگنے کے بیچ کی حالت کو کچی نیند کی حالت کہتے ہیں۔ اس میں انسان سب کچھ دیکھتا اور سنتا بلکہ سمجھتا بھی ہے۔ لیکن اگر بعد میں پوچھا جائے تو بتا نہیں سکتا کہ اس نے کیا دیکھا یا سنا۔ یہ کیفیت عموماً تین چار گھنٹے کی نیند سے اٹھنے کے بعد ہوتی ہے۔ اگر بہت دیر تک سونے کے بعد ہو تو بیماری کی علامت ہو سکتی ہے۔

۲۵ سال اور ۴۰ سال کی عمر کے درمیان عام طور پر یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ آج کل کے بعض ماہرین نفسیات اس کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ ہمارا نفس ہم سے کہ نیم شعوری طور پر آنکھ کھول کر صبح کا ناگوار چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔

یہی توجیہہ نیند کے دورے کی بھی ہو سکتی ہے۔ اکثر کسی شدید جذباتی صدمے کے بعد آدمی غیر معمولی طور پر گہری نیند سوتا رہتا ہے۔ نپولین عموماً چار پانچ گھنٹے روز سے زیادہ نہیں سوتا تھا۔ ایک بار پے در پے ۱۶ لڑائیاں جیتنے کے بعد سترھویں لڑائی میں اسے شکست ہو گئی اور مسلسل ۳۶ گھنٹے سوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ شکست کے نتائج کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نیند کی مدہوشی کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ بعض حواس پورے بیدار ہو جاتے ہیں بعض آدھے اور بعض سوتے رہتے ہیں۔ یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کسی کو سوتے سے ایک دم اٹھا دیا جائے، اور بچوں میں بڑوں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں انسان خطرناک حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔

سوتے میں چلنا اس سے بھی مختلف ہے۔ اکثر لڑکپن میں دیکھنے میں آتا ہے لیکن اعصابی مزاج کے لوگوں میں یہ عادت بلوغ کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ نیند میں چلنے والا سن سکتا ہے، لکھ سکتا ہے، چکھ سکتا ہے اور اس کی چھونے کی قوت تو خاص طور پر تیز ہوتی ہے۔ جب وہ گرتا ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو عموماً اس کے چوٹ نہیں آتی جس کے معنی یہ ہیں کہ نیند کی وجہ سے اس کے عضلات ڈھیلے ہوتے ہیں۔ تحلیل نفسی کے ماہر اسے ممنوع چیزوں کی خواہش سے منسوب کرتے ہیں۔ تحلیل نفسی کے جتنے تجربے کئے گئے ان میں اس کا تعلق عشق و محبت سے پایا گیا۔ اکثر نیند میں چلنے والے اپنے آپ کو اپنا محبوب فرض کر لیتے ہیں۔ کبھی اس کے کپڑے پہن لیتے ہیں، کبھی اس کی حرکات و سکنات کی نقل کرتے ہیں ✤

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ر جنوری ۵۰ء

مصر
ترقی کی راہ پر

آج جبکہ دنیا کے ترقی یافتہ ملک بعض تیزی سے بعض آہستہ آہستہ لبرل جمہوریت سے اشتراکی جمہوریت کی طرف بڑھ رہے ہیں مسلمان ملکوں میں عام طور پر شخصی حکومت اور جاگیرداری نظام کا دور دورہ ہے یوں کہنے کو تو اکثر مسلمان ملک آئین کے پابند ہیں اور جمہوری پارلیمنٹری طرز حکومت رکھتے ہیں لیکن دراصل جمہوریت محض اوپر کے ڈھانچے تک محدود ہے اندر وہی استبدادی روح کارفرما ہے۔ مصر میں جب سعد زاغلول پاشا مرحوم نے وفد پارٹی کی بنیاد رکھی تو ان کے سامنے ملک کو برطانوی سامراج کے اثر سے آزاد کرانے کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ اس میں سچی آئینی حکومت قائم ہو۔ وفد کی حیثیت مصر میں کم و بیش وہی تھی جو ہندوستان میں نیشنل کانگریس کی تھی۔ اس میں سب وطن پرست عناصر شریک تھے ان کے سیاسی اور معاشی خیالات میں اختلاف تھا لیکن انھیں اس کا پوری طرح احساس نہیں تھا اس لئے کہ برطانوی سامراج سے نپٹنے کے فوری مسئلے نے ان کی ساری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ جب ان کی متحدہ کوششوں سے برطانیہ اس پر مجبور ہو گیا کہ مصر کو اپنے سیاسی تسلط سے آزاد کر دے تو وفد پارٹی کو نئی صورت حال پیش آئی جو آج انڈین نیشنل کانگریس کو پیش آ رہی ہے یعنی اس کے ترقی پسند عنصر اور رجعت پسند عنصر داہنے بازو اور بائیں بازو میں اندرونی سیاست کے بارے میں اختلاف اور طاقت کے لئے کش مکش شروع ہو گئی۔ داہنے بازو نے وفد سے الگ ہو کر "حزب سعد" کے نام سے ایک الگ پارٹی بنا لی۔ نوجوان شاہ فاروق نے جنھیں علمار کی حمایت حاصل تھی اس کش مکش سے فائدہ اٹھا کر "حزب سعد" اور داہنی طرف کی دوسری پارٹیوں کا ایک مشترک محاذ بنا لیا اور وفد پارٹی اکیلی رہ گئی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے شاہ فاروق قدامت پسند پارٹیوں کے گٹھ جوڑ کی مدد سے حکومت کر رہے تھے اور وفد پارٹی نحاس پاشا کی سرکردگی میں مخالف پارٹی کی حیثیت رکھتی تھی جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں جن پر جرمنی اور اٹلی سے ساز باز رکھنے کا شبہہ ہو سکتا تھا وفد پارٹی کو تقویت پہنچائے اس لئے کہ وہ اصولاً اور عملاً سچے دل سے فسطائیوں کی مخالف تھی۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے اپنا اثر ڈال کر نحاس پاشا کی وزارت بنوائی۔ برطانوی حکومت اور وفد پارٹی کا تعاون عارضی اور فوری اغراض پر مبنی تھا لیکن اس کی وجہ سے مخالفوں کو موقع مل گیا کہ نحاس پاشا اور ان کے پیرووں کو دل کھول کر بدنام کریں۔ اس پروپاگنڈا سے وفد پارٹی کی ہر دل عزیزی کو بہت نقصان پہنچا اور شاہ پسندوں اور رجعت پسندوں کی سازشوں کی وجہ سے وہ زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکی۔

اب پھر شاہ فاروق کا طوطی بولنے لگا اور کٹھ پتلی وزارتیں بننے بگڑنے لگیں جو اپنے آپ کو قوم کے اعتماد کا مستحق ثابت نہ کرنے کی وجہ سے باربار بدلتی رہتی تھیں یہ مصر کی تاریخ کا نہایت تاریک دور تھا جمہوریت کے پردے میں استبداد کی حکومت تھی۔ مذہبی مجنونوں کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ وہ انتخابات میں حکام کی مدد سے یا چشم پوشی سے دہشت انگیزی کو کام میں لاتے تھے اور عوام کی حقیقی رائے کو ظاہر ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا اوروں کا تو کیا ذکر ہے وزیر بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھے۔ کئی وزیر اعظم کھلم کھلا قتل کئے گئے یا مرگ مفاجات کا شکار ہو گئے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اندرونی نظم و نسق بھی بگڑ گیا۔ اور بیرونی پالیسی بھی چوپٹ ہو گئی۔ برطانیہ کے خلاف زبانی اور قلمی جہاد ہوتا ہی رہتا تھا لیکن کسی دوسرے ملک سے بھی دوستی کا مضبوط رشتہ قائم نہیں کیا گیا۔ عرب لیگ کے ذریعے سے اتحاد کا جو موقع ملا تھا اس سے دانش مندی کے ساتھ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ سب سے افسوس ناک غلطی فلسطین کے معاملے میں ہوئی۔ حکمت عملی کی لڑائی پر جس میں کامیابی کی بہت کچھ امید تھی قناعت نہ کر کے حکومت مصر بے سوچے سمجھے میدان جنگ میں کود پڑی جہاں اسے حریف کی قوت سے نہیں بلکہ اسے اپنے حلیفوں کی خود غرضی سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس آخری دھچکے نے مصر کے عوام کی قوت برداشت کو ختم کر دیا اور ان میں حکومت کے خلاف ایسا ہیجان اٹھا جو کسی طرح دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ نئے انتخابات میں جو جنوری کے پہلے ہفتے میں ہوئے حکومت کو دباؤ سے کام لینے کی ہمت نہیں پڑی، اور رائے عامہ اپنے آپ اظہار کر کے رہی۔ اب تک ۲۳۵ میں سے قریب قریب دو تہائی حلقوں کا نتیجہ معلوم ہوا ہے ان میں کوئی دو تہائی نشستیں وفد پارٹی کو ملی ہیں اور باقی تین چار پارٹیوں میں تقسیم ہو گئی ہیں۔ امید ہے کہ آخر میں وفد کے ممبروں کی تعداد دو سو تک پہنچ جائے گی بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ جائے۔ انتخابات کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ موجودہ وزیروں میں سے بہت سے اپنے وفدی حریفوں کے مقابلے میں بری طرح ہار گئے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مصر نے وفد پارٹی کو اتنی بڑی اکثریت کے ساتھ منتخب کر کے ترقی کی راہ میں ایک بڑا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن ابھی وفد پارٹی کو ہندوستان کی کانگریس پارٹی کی طرح دو بڑے خطروں کا مقابلہ کرنا ہے ایک تو اپنے رجعت پسند حریفوں کی مخالفتوں اور سازشوں کا دوسرے خود اپنی سست روی اور سہل انکاری کا۔ لبرل جمہوریت نے جو وفد پارٹی کا اور کانگریس پارٹی کی بڑی اکثریت کا مطمح نظر ہے۔ معاشی عدم مداخلت کے فلسفے کی گود میں پرورش پائی ہے اس لئے وہ عام طور پر اس کی قائل ہوتی ہے کہ ملک کی معیشت کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور طلب و رسد کے قدرتی قانون کے ماتحت نشوونما پانے دے۔ یہ عدم مداخلت کی پالیسی وہاں چل سکتی تھی جہاں سرمایہ داری نو آبادیوں کو لوٹ کر خود اپنے فائدے کے ساتھ اپنے ملک کے عوام کی خوش حالی بھی روز بروز اضافہ کر رہی تھی، لیکن آج مصر اور ہندوستان جیسے ملکوں میں جنھیں اپنے ہاں کے غریبوں کا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے ملکوں کو لوٹنے کا موقع حاصل نہیں ہے، اس پالیسی سے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ یہاں تو ہر حکومت کو اگر انسانی ہمدردی اور احساس فرض کی خاطر نہیں تو کم سے کم اپنی بقا کے لئے جلد سے جلد ایسا معاشی منصوبہ بنانا اور نافذ کرنا ہے جو عوام کی بے حد پست مادی سطح کو کچھ اونچا کر سکے اور ان میں ذہنی اور اخلاقی ترقی کا ولولہ پیدا کر سکے۔

امید ہے کہ نحاس پاشا کی وزارت کے زمانے میں ہند اور مصر کے تعلقات اور زیادہ گہرے اور خوش گوار ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ دونوں ملکوں کی حکمراں پارٹیوں اور ان کے لیڈروں میں ایک مدت سے دوستی چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ ایک بار وفد کا ایک خاص ڈیلی گیشن کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی شریک ہو چکا ہے۔ مصر نہ صرف عرب ملکوں میں بلکہ سارے مشرق وسطیٰ میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اگر مصر و ہند میں پائدار دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے تو اتحاد ایشیا کا خواب جو ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملک دیکھ رہے ہیں بہت جلد حقیقت بن سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے اعلان کر چکے ہیں ۲۶ر جنوری کا "نئی روشنی" جشن جمہوریت کی رعایت سے جمہوریت نمبر ہوگا اور خاص اہتمام سے نکالا جائے گا اس بار اخبار کے تیار کرنے اور چھپوانے میں زیادہ دیر لگے گی اس لئے ۲۶ر جنوری کا پرچہ ۲۶ر سے پہلے پڑھنے والوں کی خدمت میں نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ پرچہ بہت بڑی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ لیکن خیال یہ ہے کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گا۔ نئی روشنی کے مستقل خریدار اگر اپنے ...

دنیا کی رفتار

ہندوستان

کیا ترازو کا پلڑا جھک رہا ہے؟

وزیر تجارت [illegible] نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ نومبر کے [illegible] میں ہندوستان سے [illegible] مال برآمد ہوا [illegible] کی مجموعی قیمت [illegible] قیمت [illegible] زیادہ تھی اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] روپیے [illegible] ملک [illegible] ہندوستان کا مال زیادہ خرید [illegible] [illegible] کا بھی [illegible] پر ہم [illegible] کم مال منگایا [illegible] کی قیمت گھٹنے [illegible] ہوا ہے [illegible] [illegible] [illegible] تجارت [illegible] ہندوستان [illegible] [illegible] چند مال [illegible] کم کر دیے گئے لیکن برآمد کم کرنے کی پالیسی برابر جاری رکھی جائے تو اس سے مستقل فائدہ ہو سکتا ہے۔ [illegible] وقت [illegible] ہوگی [illegible] کہ مشینوں اور دوسری اشیاء [illegible] سوا ہندوستان کی زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہیں اور چیزوں کی برآمد کا پرمٹ دینے میں بڑی سختی برتی جائے گی۔ لیکن اس بارے میں کسی لمبی مدت کی پالیسی کا اعلان نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس کی بہت سخت ضرورت ہے۔ [illegible] جب سودیشی کی تحریک [illegible] تھی تو [illegible] زور دیا تھا کہ تحریک منفی نہیں مثبت ہے یعنی اس کا مقصد انگلستان یا دوسرے ملکوں کی صنعت کو نقصان پہنچانا [illegible] بلکہ اپنے ملک کی صنعت [illegible] [illegible] اور اپنا خرچ کم کرنا ہے۔ [illegible] حکومت کو چاہئے کہ [illegible] کی [illegible] [illegible] اور [illegible] تجارت [illegible] مستقل پالیسی بنائے "جہاں تک حالات اجازت دیں" کی شرط ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ کوئی ملک تجارت کے معاملے میں سراسر یک طرفہ کارروائی نہیں کر سکتا۔ اگر اسے اپنا مال دوسرے ملکوں کو بھیجنا ہے تو ان ملکوں سے مال منگانا بھی پڑتا ہے۔

ہندوستان کا میوہ — پھوٹ

یو۔ پی کانگریس اسمبلی پارٹی کے دونوں فریقوں میں جو رسہ کشی ایک مدت سے چلی آ رہی ہے اس نے بڑی ناگوار صورت اختیار کر لی ہے۔ [illegible] کو اسمبلی پارٹی کی مجلس عاملہ اور [illegible] کانگریس کمیٹی کا ایک مشترکہ جلسہ سردار [illegible] کی صدارت [illegible] اس غرض سے ہوا کہ پارلیمنٹ [illegible] صوبے کے [illegible] نشستیں [illegible] ۲۶ جنوری [illegible] [illegible] [illegible] ممبر منتخب [illegible] [illegible] اس جلسے [illegible] آدمیوں کی [illegible] ۵ نشستوں کے [illegible] امیدوار نامزد کرنے کا اختیار [illegible] دیا جائے۔ اس کے بعد پوری اسمبلی پارٹی کا جلسہ ہوا جس میں یہ تجویز باضابطہ پیش کی گئی۔ ایک فریق نے جس میں شری گپتا جی [illegible] وزیر اور شری جگن پرشاد راوت پارلیمنٹری سیکریٹری بھی شامل تھے اس تجویز کی مخالفت کی اور اس پر اصرار کیا کہ انتخاب کمیٹی پر نہ چھوڑا جائے بلکہ پوری پارٹی امیدواروں کو نامزد کرے لیکن جب یہ بات نہیں مانی گئی تو ایک روایت کے مطابق [illegible] اور دوسری روایت کے مطابق [illegible] ممبر اٹھ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات اس قدر خفا ہیں کہ کانگریس پارٹی سے استعفا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر ان کا استعفا اہم مسائل کے بارے میں اصولی اختلاف کی بنا پر ہو تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن اگر محض شخصی جھگڑوں یا چھوٹے چھوٹے اختلافات کی وجہ سے [illegible] کانگریس کے [illegible] اور مخلص کارکن شامل [illegible] استعفا دینے کا خیال [illegible] [illegible] ملکہ یو۔ پی کانگریس کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔ بدقسمتی سے جتھے بندی کا مرض ہر صوبے کی کانگریس میں پھیل گیا ہے۔ چنانچہ بنگال، مدراس اور پنجاب میں آپس کی کشمکش کی وجہ سے کئی بار وزارت بدل چکی ہے۔ لیکن اس کی نوبت وہاں بھی نہیں آئی تھی کہ جو فریق اقلیت میں ہو وہ سرے سے کانگریس پارٹی ہی کو چھوڑ دے

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

باہر کی دنیا

نحاس پاشا پھر آ گئے

لڑائی کے بعد پہلے انتخاب میں مصر کی مشہور قوم پرست جماعت "وفد" نے دوسری جماعتوں کے مقابلے میں بہت ہی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اب مصری پارلیمنٹ میں وفد پارٹی کو ایسی اکثریت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اپنی حکومت بنا سکتی ہے۔ چناؤ سے پہلے وفد کے [illegible] مصطفےٰ نحاس پاشا نے اعلان کیا تھا کہ اگر ان کی جماعت کو اتنی اکثریت حاصل نہ ہوئی کہ وہ اپنی وزارت بنا سکیں تو وہ حکومت میں کسی اور جماعت کے ساتھ شرکت نہیں کریں گے۔ ان سطروں کے لکھنے کے وقت چناؤ کے پورے نتائج سامنے نہیں ہیں لیکن اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ وفد کو کُل تھائی دو سو نشستیں حاصل ہو جائیں گی۔ مصری پارلیمنٹ میں ممبروں کی تعداد پچھلی پارلیمنٹ کے برخاست ہونے کے وقت بڑھا دی گئی تھی۔ نئی پارلیمنٹ میں کل ۳۱۹ ممبر ہوں گے۔ ان میں سے ۲۰۰ نشستوں پر قبضہ کر لینے کے بعد وفد پارٹی دوسری پارٹیوں سے بے نیاز ہو جائے گی۔

وفد کی یہ شاندار کامیابی پارٹی کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ۱۹۴۵ء کے چناؤ میں وفد پارٹی نے اس وجہ سے حصہ نہیں لیا تھا کہ ملک میں شہری حقوق پر کڑی پابندیاں تھیں۔ ملک معظم شاہ فاروق اور مصطفےٰ نحاس میں نبھی نہیں تھی مصطفےٰ نحاس جمہوریت کے دلدادہ اور ملک معظم زیادہ سے زیادہ [illegible] شہنشاہ کے حقوق دینے کے قائل۔ شاہ فاروق نے اس سے پہلے [illegible] میں پال رکھی تھیں [illegible] انتخاب میں نحاس پر بددیانتی کا الزام لگایا گیا تھا اور اس طرح انھیں بدنام کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی۔ لیکن محض اسے کافی نہ سمجھ کر چناؤ کو محض ایک "ڈھونگ" بنا دینے کے انتظامات پورے کر دئے گئے تھے۔ نحاس نے اس ڈھونگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اس پس منظر میں وفد کی موجودہ

کامیابی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ملک میں اس کی مقبولیت اب اتنی زیادہ ہے کہ اسے شکست دینے کی کوشش کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ چناؤ بغیر سرکاری مداخلت کے عمل میں آیا۔

نحاس پاشا کی وزارت ابھی کچھ دن بعد بنے گی۔ ابھی بعض حلقوں میں دوبارہ انتخاب ہونا ہے کیونکہ ان حلقوں میں کسی امیدوار کو ۵۰ فی صدی ووٹوں کی اکثریت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ نحاس کا پروگرام کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن بعض باتیں [illegible] [illegible] سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ ملک معظم وفد کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ روا رکھیں گے "قبل مشرقی سیاست کی سازشوں اور جوابی سازشوں میں گہری دلچسپی لیتا رہا ہے نحاس سے شاہ فاروق کو ذاتی طور پر بھی شکایتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کشمکش کا پہلا عنوان یہی ہو۔ جہاں تک دوسرے عرب ممالک سے تعلقات کا مسئلہ ہے نحاس کے رویئے میں اور موجودہ پالیسی میں شاید کوئی نمایاں فرق نہیں ہوگا۔ لیکن بیرونی سیاست میں تبدیلی ہوگی۔ برطانیہ سے صلح نامے اور سوڈان کے معاملے میں نحاس خار کھائے بیٹھے ہیں اور قیاس یہ ہے کہ اس حیثیت سے ان کی کامیابی مسٹر بیون کے لئے بڑے دردِ سر کا باعث ہوگی لیکن بیرونی سیاست کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب نحاس کی معاشی حکمتِ عملی میں ملے گا۔ مصری معیشت کا بنیادی سوال ہمارے ملک کی طرح غربت ہے۔ اس غربت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بہت [illegible] آتی ہیں جہاں کسانوں کو پینے کا پانی بھی نصیب نہیں اور جانور اور آدمی [illegible] ایک ہی تالاب سے جس کا پانی گندا ہوتا [illegible] اور صحت کے لئے بہت ہی نقصان دہ پانی پیتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ شہر کے لوگ نے تجارت وغیرہ کے ذریعے دولت کمائی ہے روئی کی کاشت اور فروخت سے زمیندار دولت مند بن گئے ہیں لیکن مصر کی غریب اکثریت کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا وفد کے معاشی رجحانات کیا ہیں؟ اس کے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

بزمِ بے تکلّف

"بھئی خوب آئے میر صاحب۔ یہ دیکھئے گرما گرم دھواں دار چائے ابھی بن کر آئی ہے۔ مگر نمک کی بنی پڑے گی استاد۔ شکر کی تو آپ جانتے ہیں بڑی کت ہی برکت ہے۔ ہاں آپ جیب میں پڑیا رکھ لائے ہوں تو اور بات ہے"

"خدا نہ کرے نصیب دشمناں۔ میرے پاس شکر کیوں ہوتی مجھے بھی کوئی چور بازار کا چودھری مقرر کیا ہے"

"توبہ کیجئے چودھری چور بازار کیا چیز ہیں۔ ہم آپ کو ملا شور بازار سمجھتے ہیں۔ لائیے پھر نمک کی چائے نوش فرمائیے"

"نہ بھائی نمک کی ہم سے نہ پی جائے گی شیخ کشمیر کی تقلید تم ہی کو مبارک ہو۔ ہم تو شیخ اٹلی کے پیرو ہیں۔ جب سے شکر نایاب ہوئی ہے کھیا میں گڑ چھوڑ لیا کرتے ہیں"

"واللہ بڑا ظرف ہے آپ کا میر صاحب۔ آپ کو اس کی پروا نہیں کہ گڑ کی چائے پر لوگ فقرے کسیں گے"

"اجی ہم خود حرفوں کے بنے ہوئے ہیں، ہمیں فقروں کا کیا ڈر ہے"

"اچھا میر صاحب۔ آپ تو بڑے دور بین بلکہ میر بین ہیں۔ یہ بتلائیے کہ کھانے پینے کی چیزوں کا یہ توڑا کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں"

"آخر ختم ہو تو کیسے ہو۔ ہمارے چھوٹے بڑے منجھلے نیتا سبھی کہہ رہے ہیں کہ پیداوار بڑھاؤ، ہم بھی چیختے چیختے تھک گئے۔ مگر کیا جنتا ہے کہ سنتی ہی نہیں"

"میر صاحب چیخنے سے کیا ہوتا ہے آپ لوگ کر کے دکھائیے تو جنتا پر کچھ اثر بھی ہو"

"لو اور سنو بھلا ہم کس چیز کی پیداوار بڑھائیں ہم تو بس بچے پیدا کر سکتے ہیں"

"یہ تکمی کاشت تو ماشاء اللہ آپ کے یہاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہے مگر ضرورت بچوں کی نہیں چیزوں کی پیداوار بڑھانے کی ہے، اس کی کوئی چلتی ہوئی ترکیب نکالئے تو سرکار آپ کو نیشنل پلیننگ کمیٹی کا پردھان بنا دے گی"

"ارے میاں ہم کو کون پوچھتا ہے۔ اگر ہم سے رائے لی جاتی تو آج کہیں ہائے ہائے کیوں ہوتی، وہ ترکیب بتلاتے کہ ساری مشکل چٹکی بجاتے حل ہو جاتی"

"تو بتلائیے نا میر صاحب۔ کچھ معلوم تو ہو کہ وہ کون سا جادو کا عمل ہے؟"

"اچھا تو لو تم بھی کیا یاد کرو گے ہماری سرکار نے کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے بن بجلی کی بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں مگر اس پر دھیان نہیں دیا کہ ہمارے پاس طاقت کا ایک اتھاہ قیمتی خزانہ ہے جو بے کار خرچ ہو رہا ہے بلکہ آنکھ بند کر کے لٹایا جا رہا ہے۔ اگر اس طاقت کو جہت کر اس سے کام لیا جائے تو نہ جانے کتنے کارخانے ٹیوب ویل اور بن بجلی چل سکتے ہیں۔ بھلا بوجھو تو وہ کون سی طاقت ہے؟ ـــــ بس رہ گئے؟ سنو وہ اس بھاپ کی طاقت ہے جو ہمارے گورنروں، منسٹروں، مرکز اور صوبوں کی کونسل کے ممبروں اور بڑے بڑے نیتاؤں، سدھارکوں اور پرچارکوں کی گرما گرم دھواں دھار لکچر بازی سے پیدا ہوتی ہے۔ فقط ایک مرکزی اسمبلی میں بھاپ کا وہ زور ہوتا ہے کہ اگر دروازے کھلے ہوئے نہ ہوں تو اسمبلی کی عمارت کا گنبد اسی طرح اڑ جائے جیسے کبھی ابلتی ہوئی ہنڈیا کی چپنی اڑ جاتی ہے، تم خود سوچو کہ ایک انجن کی بھاپ سے پوری کھچا کھچ بھری ہوئی ریل گاڑی چلتی ہے تو کیا اتنے انجنوں کی بھاپ اکٹھا کر کے دیس کی گاڑی نہیں چلائی جا سکتی۔ مگر افسوس ہے اتنے قیمتی دماغوں اور پھیپھڑوں کی طاقت سے جو الفارعل بھاپ پیدا ہوتی ہے اس سے صرف بل پاس کرنے کا کام لیا جاتا ہے جس کے لئے ایک پھونک کافی ہے۔ بولو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"سچ اور جھوٹ تو اللہ جانے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا بہت خوب کہا۔ اب ایک کام کیجئے۔ شری گیڈگل کو اپنی یہ رائے لکھ کر بھیج دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ جیسے دیس کے سچے بھاپ خواہ کی دل سے قدر کریں گے"

غزل

سحرؔ رام پوری

اب اُن کے "غم" کو بھی اک "یادگار" کہتا ہوں
کہاں ہے گردشِ لیل و نہار، کہتا ہوں

یہ خوش گمانیِ احساس اسے خدا سمجھے
خزاں کے جور کو لطفِ بہار کہتا ہوں

اک احتیاط ہے جس کے سبب ہیں خشک آنکھیں
اک اضطراب ہے جس کو قرار کہتا ہوں

دلِ حزیں کی اچانک شگفتگی کی قسم
نہ راہ بھول گئی ہو بہار کہتا ہوں

یہ انقلابِ محبت بھی ہے عجیب سحرؔ
کہ خود کو ایک شبِ انتظار کہتا ہوں

بھری بہار میں بھی ہم تو مسکرا نہ سکے

مشیر علوی

فسانۂ غم پیہم اُنھیں سنا نہ سکے
لگی تھی آگ جو دل میں اُسے بجھا نہ سکے

وفائے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
تمھارا نام بھی اپنی زباں پہ لا نہ سکے

نہ راس آئی رہائیِ قفس نصیبوں کو
یہ بد نصیب چمن میں بھی مسکرا نہ سکے

ہزار ذوقِ نظر پر تھا اعتماد ہمیں
حریمِ قدس کا پردہ مگر اٹھا نہ سکے

یہ تیز و تند ہوا میں یہ مستقل جھونکے
ہم اپنی شمعِ تمنا کبھی جلا نہ سکے

حیاتِ عشق یہی ہے کہ ڈوب کر اُبھرے
وہ خوش نصیب تھے کشتی کو جو بچا نہ سکے

مبارک اہلِ چمن کو یہ منظرِ دلکش
بھری بہار میں بھی ہم تو مسکرا نہ سکے

حیاتِ عشق میں ایسا بھی اک مقام آیا
کہ ان کو حالِ دلِ غم زدہ سنا نہ سکے

وہی خلش وہی بیتا بیاں ہیں جنت میں
مشیرؔ ہم تو یہاں بھی سکون پا نہ سکے

خوف و ہراس

باقر رضوی

بچپن کا دوسرا سال اپنے دامن میں خوشی کے لاتعداد پھول لاتا ہے۔ بچہ اس دوران میں بولنا اور چلنا سیکھ جاتا ہے۔ اب وہ بڑی سرعت سے اشیاء کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مسرتوں سے بھری اس دنیا میں ہر ہر چیز کو دیکھنے کی شمع اس کے دل میں جل اٹھتی ہے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کا رنگ روپ، پانی کی روانی، ٹڑیوں کا شور و غل، بازار کی چہل پہل، تانگوں اور موٹروں کی دوڑ دھوپ ہر شے لطف کی حامل ہوتی ہے اور مسرت کا پیغام دیتی ہے۔ بچہ اپنی صلاحیت کے مطابق ہر سامنے آنے والی چیز کی ماہیت کو سمجھنے کی دھن میں لگا رہتا ہے "میں یہ چیز دیکھنا چاہتا ہوں اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟" کا جملہ بار بار اس کی زبان پر آتا ہے۔ ہر وقت پنگوڑے میں پڑے رہنے کی سابقہ اذیت سے نجات ملتی ہے اور چلنے اور دوڑنے کی نو یافتہ قوت اسے کیف و سرور کی ایک دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ ہاضمہ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور زندگی ایک "مسرت انگیز مہم" معلوم ہوتی ہے۔

ان نئی قوتوں کے ساتھ ساتھ ایک نامعلوم خوف اور ایک نا آشنا اور مبہم سے ہراس کی بھی تخلیق ہوتی ہے، ماحول اور گرد و پیش بدل جانے کا یہ فطری نتیجہ ہے اور اسی بنا پر بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ خوف و ہراس کے جذبات پیدائشی اور فطری نہیں اکتسابی اور نقلی ہیں۔

بہادری اور شجاعت کے معاملے میں بچے ایک دوسرے کے معلم ہوتے ہیں۔ اسکول میں وہ بزدلی کی مذمت اور بہادری کی تعریف سنتے ہیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ بہادر بنیں۔ کتابوں میں بہادری اور دلیری کے قصے اور کہانیاں بھی ان کو اس پر اکساتی ہیں۔ بچوں میں اس جذبے کی تشکیل معمولی واقعات و حادثات پر اظہار ہمدردی نہ کرنے سے ہو سکتی ہے۔ یہ بات شاید آپ کے تجربے میں بھی آئی ہو کہ بچہ بھاگ رہا ہے، اس کو ٹھوکر لگی وہ گرا، معمولی سی چوٹ آئی۔ کسی نے بڑھ کر ہمدردی کا اظہار کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ برخلاف اس کے اگر اس واقعے سے چشم پوشی کیجئے کچھ خیال ہی نہ کیجئے کہ کیا ہوا تو بچہ گرد جھاڑ کر کھڑا ہو گا اور ہنسی خوشی پھر اپنے کھیل میں لگ جائے گا۔

ہمدردی کی عادت خود بُری چیز نہیں۔ اس کی کمی یا زیادتی اور غلط استعمال اس کو برا یا اچھا بناتا ہے۔ اکثر عورتیں جو دوسرے طریقوں سے خود کو توجہ کا مرکز نہیں بنا سکتیں وہ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بناوٹی بیماری کا ڈھونگ رچا لیتی ہیں، کسی کو بھوت پریت ستاتے ہیں، کسی پر جنوں کا سایہ ہو جاتا ہے، اکثر ہسٹریا کے دورے سے بھی اسی لئے معرض وجود میں آتے ہیں۔

انسان بہرحال ایک نقال جانور ہے۔ اگر آپ اپنے بچے کو نڈر بنانا چاہتے ہیں تو اس کے سامنے کبھی اپنے خوف و ہراس کا اظہار نہ کیجئے۔ جو بچے اندھیرے سے ڈرتے ہیں یا جنھیں مکڑی، چھپکلی اور ایسے ہی چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس ڈر کو اپنے بھائی بہن، باپ، ماں اور دائی کھلائیوں سے سیکھتے ہیں۔

انجانی اور بظاہر بعید از فہم اشیاء کا خوف مادی خوف سے مختلف ہے گو اس خوف کی ابتدا بھی نقل ہی سے ہوئی تھی۔ مگر اب ذہنوں میں اتنا رس بس گیا ہے کہ اس پر فطری ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ توہمات کی بنیاد بھی اسی پر ہے، یہ خوف سورج گرہن، چاند گرہن، طوفان، زلزلہ، طاعون وغیرہ کی اصلیت اور حقیقت سے ناواقفیت اور مافوق الفطرت امور پر بلا رد و قدح ایمان لانے سے جاہل اور غیر تعلیم یافتہ انسانوں کے دلوں میں جگہ پاتا ہے۔ یہ جذبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مضر ہے، بچپن سے اس کی انتہائی کوشش کرنا چاہیے کہ یہ زہریلا بیج بچوں کے دلوں کی نرم و نازک اور قابل قبول زمین میں نشو و نما حاصل نہ کرے ایک دفعہ جڑ پکڑ لیتا ہے تو اس کا اکھاڑ پھینکنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کا سب سے کارگر علاج اجنبی چیزوں کی اصل حقیقت اور غرض و غایت کو سیدھے سادے عام فہم طریقوں سے مثالوں کے ذریعے بچوں کے ذہن نشین کرا دینا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بچے ابتدا میں جس چیز سے ڈرتے ہیں بعد کو اس کی حقیقت معلوم کر کے اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

توہمات اور بعید از قیاس اشیاء کا خوف جہالت کا نتیجہ ہے۔ انسانیت کی خواہش علم کی تشنگی بڑھاتی اور توہمات کی بیخ کنی کرتی رہی ہے۔

اس ضمن میں سب سے کٹھن سوال موت کا ہے۔ بچے کو جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کیڑے مکوڑے اور جانور مرتے ہیں اور وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ [illegible] آس پاس افراد کا بھی شاید یہی حشر ہو۔ یہ ذہنی سوالات تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پیدا کرتا ہے۔ ان سب سوالات کا معقول اور تسکین بخش جواب دینا والدین اور معلمین کا فرض ہے۔ ایک مذہبی آدمی کے لئے جو حشر و نشر کا قائل ہو، روح پر یقین اور جنت و جہنم پر ایمان رکھتا ہو۔ ان سوالات کا جواب دینا مشکل نہیں، لیکن مشکل اس کی ہے جو سرے سے ان کا قائل ہی نہ ہو اگر بدقسمتی یا خوش قسمتی سے آپ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں تو بچے کو بتائیے کہ موت ایک خواب ہے، ایسا خواب جس سے آدمی کبھی بیدار نہیں ہوتا جس طرح کھلونے ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان بھی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، بے کار ہو جاتے ہیں اور اسی ٹوٹ پھوٹ کا نام موت ہے۔

مگر یہ گفتگو کرتے وقت کسی قسم کے انہماک دکھانے یا زور دینے کی ضرورت نہیں، آپ خود یہ باتیں نہ اٹھائیے، اگر بچہ پہل کرتا ہے تو خاطر خواہ جواب دے کر اسے مطمئن کر دیجئے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی لگے ہاتھوں تذکرہ کر دیجئے کہ آپ کو اس قسم کی گفتگو میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اگر بچہ ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہے تو وہ خود ہی کبھی اس کا تذکرہ نہ کرے گا ——— اور سچ تو یہ ہے کہ ان گتھیوں کو سلجھانا بچوں کیا جوانوں اور بوڑھوں کے لئے بھی سعی لا حاصل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

ہمیں امید ہے کہ یوپی کے کانگریسی جن کی یک جہتی اور مستعدی کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی اس جھگڑے کے روگ کو جو کانگریس کی ساری تنظیم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے، جلد سے جلد دور کر کے دوسرے صوبوں کے لئے ایک اچھا نمونہ پیش کریں گے

کاش یہ دائرہ وسیع ہو جائے

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں یہ بتایا ہے کہ بنگال اسمبلی کے انتخابات جو فروری میں ہونے والے تھے ملتوی کر دئے گئے ہیں۔ اسمبلی کی کانگریس پارٹی صوبے کی کانگریس کمیٹی اور دوسرے سیاسی حلقے اس بات پر متفق ہیں کہ جب اس سال کے آخر میں یا آئندہ سال کے شروع میں سارے ہندوستان میں عام انتخابات ہونے والے ہیں تو بنگال میں چند مہینے کے لئے اسمبلی کا عارضی انتخاب بالکل بے کار ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کھلی ہوئی حقیقت بنگال کے سیاست دانوں کی سمجھ میں آ گئی۔ مگر اس سے بھی زیادہ خوشی اس کی ہے کہ مدت کے بعد ایک ایسا موقع آیا جب بنگال کی کانگریس اسمبلی پارٹی اور کانگریس کمیٹی میں کسی مسئلے پر اتفاق رائے ہوا۔ کیا اچھا ہو کہ اس اتفاق رائے کا دائرہ اور وسیع ہو جائے اور سب کانگریسی مل کر بنگال کے نازک معاشی مسئلے کو جس کی وجہ سے عام پریشانی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے حل کرنے کی کوشش کریں۔

آزادی کی زنجیریں

گذشتہ قسطوں کا خلاصہ:-

ظفر ایک نوجوان لڑکا ہے جس نے میٹرک پاس کیا ہے اور کالج میں داخل ہونا چاہتا ہے مگر اس کے والد کی مرضی ہے کہ وہ ابھی سے نوکری کرے میر مظفر حسن ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے دادا باپ بھائی نے قریب قریب ساری جائداد ٹھکانے لگا دی تھی اور انھیں خود سرکاری نوکری کرنی پڑی تھی اب وہ پنشن کے بعد گھر پر مقیم تھے ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اکلوتے بیٹے ظفر کے سوا اور کوئی قریبی عزیز نہ تھا۔ وہ بیٹے کو بہت چاہتے تھے مگر اس پر سختی اور ڈانٹ ڈپٹ اس قدر رکھتے کہ اُسے اُن کی محبت کا احساس نہ ہوتا تھا۔

(۳)

ظفر کو میر صاحب اپنی بیوی کے سوا دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے۔ ظاہر ہے کہ سات بچوں میں جو بچہ جیتا بچا ہو وہ باپ کو کتنا عزیز ہوگا۔ بچپن میں میر صاحب اس کے اتنے لاڈ کرتے تھے کہ کبھی کبھی ان کی بیوی کو ٹوکنا پڑتا تھا کہ تم تو اسے بالکل بگاڑ دوگے۔ مگر جب وہ سیانا ہوا تو میر صاحب نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے خاندانی پدری کے روائتی تصور کے مطابق اس کی تربیت میں سختی شروع کی۔ ابتداء میں ان کی جھڑکیاں اور جھڑکیاں بناوٹی ہوتی تھیں مگر چونکہ قدرتی طور پر تیز مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے بہت جلد انھیں سچ مچ غصہ آنے لگا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دس برس کی عمر میں بچے کی شخصیت کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آنے لگا جو خود میر صاحب کی شخصیت سے بہت مختلف تھا اس لئے ان کے خیال میں یہ بات انوکھی اور غیر فطری تھی۔ انھیں اس تبدیلی سے جو ظفر کے اندر ہو رہی تھی کوفت اور الجھن ہوتی تھی۔ وہ اکثر چپ چاپ اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ اگر کوئی صدمہ پہنچے تو رونے یا فریاد کرنے کے بجائے گھٹ کر اور بجھ کر رہ جاتا۔ اگر کسی چیز کو جی چاہے تو اس کے لئے ضد کرنا اور مچلنا تو درکنار اپنی خواہش کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور بہت کھود کرید کے بعد پتہ چلتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میر صاحب ان سب باتوں کو ضعف عقل اور ضعف ارادہ کی علامت سمجھتے تھے ان کے نزدیک عقل اور ارادے کو قوت پہنچانے کا بلکہ ہر طرح کی اخلاقی تربیت کا ایک ہی ذریعہ تھا مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ۔ مار پیٹ انھوں نے شروع کی تھی مگر جب یہ دیکھا کہ بچے کا کمزور جسم اس کو نہیں سہہ سکتا اور پھر ماں کو اتنا سخت صدمہ پہنچتا ہے کہ ان کی صحت پر اثر پڑتا ہے تو اس کو چھوڑ کر صرف زبان کی مار پر قناعت کرنی پڑی۔ مگر جتنا وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے قریب لانا چاہتے تھے اتنا ہی وہ دور ہوتا جاتا تھا۔ جب تک ظفر کی ماں زندہ رہیں ان کے ذریعے سے باپ بیٹے میں کچھ تھوڑا بہت ربط باقی رہا اور وہ ایک دوسرے کو کسی حد تک سمجھتے رہے مگر ان کے انتقال کے بعد دونوں میں اجنبیت اور بُعد بڑھتا گیا۔ باپ بیٹے کو پست فہم، پست ہمت اور گھنا، بیٹا باپ کو نا انصاف، بے درد اور بے مہر سمجھنے لگا۔

ظفر کو انسانی فطرت میں درک ہوتا تو اس پر یہ حقیقت کھلتی کہ میر صاحب کے غیظ و غضب کے طوفان جن کی اس کو بجا طور پر شکایت تھی، ان کے کمال محبت کے ثبوت تھے۔ ان کا زندگی سے جو رہا سہا تعلق باقی تھا وہ اس کی وجہ سے اور اس کے ذریعے سے تھا جس طرح ان کی سچی اور گہری خوشی صرف اس چیز سے ہوتی تھی جسے وہ ظفر کے لئے اچھا سمجھتے تھے۔ اسی طرح تیز اور شدید غصہ صرف اس بات پر آتا تھا جسے وہ اس کے حق میں برا جانتے تھے۔ ان کے دل میں اگر کوئی ولولہ پیدا ہوتا تھا تو اس وقت جب اس کی کامیابی اور ترقی کے لئے کوشش کرنی ہو مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی اچھائی، برائی، ترقی، کامیابی کا معیار وہ اپنی رائے کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصولاً اولاد کو ماں باپ کے سامنے اپنی رائے رکھنے کا کوئی حق نہ تھا خصوصاً ظفر کو تو وہ کسی بڑے معاملے میں رائے قائم کرنے کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ ان کی مرضی کے آگے سر تسلیم جھکانے میں ذرا سا بھی تامل کرتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے وہ اس کے اختلاف رائے کو محض ضد سمجھتے تھے اور وہ بھی حماقت اور کمزوری کی ضد جس سے انھیں چڑ تھی۔

میر صاحب نے ظفر کو نوکر رکھوانے کی تجویز محض اس وجہ سے پیش کی تھی کہ ان کے لئے اس کی مزید تعلیم کا خرچ اُٹھانا دشوار تھا بلکہ وہ نوکری کو اس کی مادی اور اخلاقی فلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے اُسے آگے پڑھانے میں انھیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس کے کمزور جسم و دماغ سے کالج کی تعلیم کا بھاری بوجھ مشکل سے اُٹھے گا اور اگر مر پڑ کر اس نے پانچ چھ برس میں بی۔اے کر بھی لیا تو پھر وہی نوکری کا سوال ہوگا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر میں اس وقت تک زندہ نہ رہا یا وہ حکام جن کے ہاں میری رسائی ہے چلے گئے تو ڈھنگ کی نوکری بھی نہ ملے گی۔ پھر ایک بڑا اندیشہ انھیں یہ تھا کہ کہیں کالج کی آزاد فضا میں ظفر اخلاقی یا سیاسی آوارگی میں پڑ گیا تو دین دنیا کہیں کا نہ رہے گا۔ اس لئے ابھی سے نوکری کا جوا اس کی گردن پر رکھ دیا جائے اور شادی کی رسّی سے کس دیا جائے تاکہ سیدھی لیکھ پر چلتا رہے۔ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔ شادی کا ذکر انھوں نے ابھی تک ظفر سے نہیں کیا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی نسبت بچپن سے اپنی رشتے کی بھتیجی زاد بہن حسینہ سے ہو چکی تھی۔ اور بظاہر وہ اس نسبت کو پسند کرتا تھا۔ صرف حسینہ کے ماں باپ کو راضی کرنا تھا کہ وہ جلد شادی کر دیں۔ لڑکی سولہ برس کی ہو چکی تھی اور اس سال اس نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا تھا، اس لئے اس کے والدین کو اس کی شادی میں تامل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت الہ آباد کے سفر میں میر صاحب کے پیش نظر کلکٹر صاحب سے ملنے کے علاوہ یہ چیز بھی تھی کہ اپنی پھوپی زاد بہن عقیلہ بیگم اور بہنوئی میر صفدر علی انجینیر سے جو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے بدل کر الہ آباد آئے تھے، مل کر شادی کی تاریخ طے کر لیں۔

کلکٹر صاحب کی ملاقات مایوس کن ثابت ہوئی۔ وہ اس پر اصرار کرتے رہے کہ لڑکے کو ابھی نوکری کے بندھن میں نہ جکڑو، بلکہ آگے پڑھاؤ۔ میر صاحب ان سے یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ لڑکا آگے پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتا ورنہ پھر نوکری کی قابلیت بھی مشتبہ ہو جاتی اس لئے انھوں نے اپنی مالی حالت کی خرابی پر زور دیا اور صاحب کو یقین دلایا کہ میں اس کو کالج میں پڑھانے کا خرچ نہیں اُٹھا سکتا، اس پر انھوں نے فرمایا کہ سب ججی شپ داری کے لئے اول تو ظفر کا نامزد ہونا مشکل ہے اس لئے اس لئے کہ اب اس عہدے کے لئے ایف۔اے اور بی۔اے پاس درخواستیں دیتے ہیں اور اگر نامزدگی ہو بھی جائے تو تقرر کے لئے دو تین سال انتظار کرنا ہوگا۔ انھوں نے یہ ترکیب بتائی کہ لڑکے کو میرے دفتر میں کام سیکھنے کے لئے بھیج دو وہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی مشق کرنے تو میں اپنے اردلیوں اور اسٹینو گرافر کرا دوں گا۔ مگر یہ میر صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کا لڑکا محض کلرک ہو کر رہ جائے۔ وہ ایسی جگہ چاہتے تھے جس کی کچھ حیثیت ہو۔ اس لئے وہ صاحب کی عنایت کا شکریہ ادا کر کے اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ میں غور کر کے اور احباب سے مشورہ کر کے عرض کروں گا۔

بہن بہنوئی سے مل کر انھیں [illegible] تو [illegible] نہیں [illegible] میں کچھ ہوا [illegible] [illegible]

بات پر ہوئی کہ ان کی توقع کے خلاف میاں بیوی دونوں نے لڑکی کی شادی جلد کر دینے سے انکار کر دیا اور افسوس اس کا ہوا کہ انھوں نے انکار کی ایک وجہ یہ بتائی کہ لڑکی خود ابھی شادی کرنے پر راضی نہیں صفدر علی بولے "بھائی صاحب تعجب ہے آپ جیسا روشن خیال آدمی اور بچپن کی شادی کو اچھا سمجھے۔ اور سب باتوں کو جانے دیجئے تو ان دونوں کی تعلیم کا کیا ہوگا؟ میں حسینہ کو کم سے کم بی اے پاس کرانا چاہتا ہوں اور ظفر تو ظاہر ہے ابھی بہت دور تک جائے گا۔ شادی کے بعد تعلیم لڑکوں کی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے اور لڑکی کی تو ممکن ہی نہیں۔ ظفر کو شاید آپ آمادہ کر لیں مگر حسینہ تو ہرگز نہ ماننے کی کہ اس کی شادی ابھی سے کر دی جائے رو رو کر جان دے دے گی۔" عقیلہ بیگم نے کہا "بھائی آپ کا ضرور جی چاہتا ہوگا کہ خالی گھر کسی طرح جلدی آباد ہو مگر یہ بھی تو سوچئے کہ اب گڑیا گڑیا کے بیاہ کرنے کے دن گئے۔ لڑکی آپ ہی کی ہے اور آپ ہی کے ہاں جائے گی۔ مگر اتنی سمجھ اور سلیقہ تو آ جائے کہ گھر بار کو سنبھال سکے اور اللہ رکھے ظفر کو بھی ابھی آگے پڑھنا ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں لینا ہے۔ بھابی مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اسے ولایت بھیجوں گی۔ ماشاء اللہ بڑا ذہین اور قابل بچہ ہے خود دیکھئے گا اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔ اگر آپ نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں تو اس کی پڑھائی میں کھنڈت پڑ جائے گی۔ مگر یہ تو بتائیے کہ آپ اسے ایف اے میں پڑھنے کے لئے الہ آباد بھیجیں گے نا؟ یا علی گڑھ کا خیال ہے؟ میں تو کہتی ہوں الہ آباد ہی اچھا ہے۔ یہاں گھر پر آرام سے رہے گا۔ کالج کچھ دور نہیں، بائیسکل پر چلا جایا کرے گا۔"

میر مظفر حسین کو یوں تو ان میاں بیوی کی سبھی باتیں ناگوار ہوئیں مگر بڑا دھچکا یہ لگا کہ صفدر علی نے شادی کے معاملے میں لڑکی کی مرضی کا ذکر کیا۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان کی مرحومہ بیوی نے اس زمانے میں جب مسلمان لڑکیوں کا مدرسے میں داخل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا میٹرک تک اسکول میں پڑھا تھا اور اس کے بعد گھر پر تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی قابلیت کا معیار کسی طرح بی اے سے کم نہ تھا اور میر صاحب کو ان کے مقابلے میں اپنی کم استعدادی پر شرم آیا کرتی تھی۔ بہن بہنوئی کے اس فیصلے نے کہ وہ لڑکی کی شادی ابھی نہیں کریں گے اور اسے بی اے تک پڑھائیں گے ان کے سارے منصوبے کو بگاڑ دیا۔ مگر انھیں اس میں اعتراض کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ صفدر علی کا یہ جملہ کہ لڑکی اس وقت شادی کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوگی ان کے دل پر تیر کی طرح لگا۔ وہ صفدر علی سے برسوں سے نہیں ملے تھے اور انھیں یہ خبر نہ تھی کہ وہ اتنے آزاد خیال ہو گئے ہیں کہ لڑکی کی شادی کے معاملے میں اس کی رائے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ میر صاحب کو اس سے انکار نہ تھا کہ شرع اسلام نے نکاح کے لئے ایجاب و قبول کو لازمی قرار دیا ہے۔ مگر وہ اسے ایک قانونی شرط سمجھتے تھے جو قاضی کے سامنے لڑکے کی "ہاں" اور لڑکی کی "ہوں" کہہ دینے سے پوری ہو جاتی ہے۔ شادی کو سچ مچ لڑکے لڑکی کی مرضی پر منحصر کرنا، ان کے نزدیک ہندوستان کی فضا میں جہاں وہ پردے کی رسم کی وجہ سے ایک دوسرے کی صورت تک نہیں دیکھ سکتے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ صفدر علی کی باتوں سے ان کے دل میں یہ کھٹکا بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں ان کی آزاد خیالی کا خبط اس حد تک تو نہیں پہنچ گیا کہ لڑکی کا پردہ بھی چھڑا دیں۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو انھیں دل پر پتھر رکھ کر یہ نسبت توڑنی پڑے گی جس وقت ان کی بہن بول رہی تھیں تو وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھے کہ انھوں نے ان کی گفتگو پر دھیان نہیں دیا البتہ آخری جملہ جو عقیلہ بیگم نے کسی قدر بلند آواز سے کہا تھا ان کے کان میں پڑا اور انھوں نے چونک کر کہا "ابھی میں نے اس کی آئندہ تعلیم کے بارے میں کچھ طے نہیں کیا۔ سوچ کر فیصلہ کروں گا" ظاہر ہے کہ وہ ان دونوں کے سامنے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ ظفر کو اعلیٰ تعلیم کے قابل نہیں سمجھتے اور نہ یہ کہ اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اسے کالج میں پڑھانے کا خرچ نہیں برداشت کر سکتے۔

اب دریاباد جانے والی گاڑی کا وقت قریب تھا اور یوں بھی مصلحت اسی میں تھی کہ زیادہ دیر نہ ٹھیریں اس لئے کہ میر صاحب ان خیالات کو جو ان کے دل میں گذر رہے تھے ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اس طرح گفتگو کرنا کہ سننے والے کو ان کے اصلی خیالات کا پتہ نہ چلے ان کی طبیعت اور عادت کے خلاف تھا اس لئے انھوں نے صفدر علی کہا "بھئی میری تو بڑی خواہش تھی کہ اس فرض سے جلد سبکدوش ہو جاؤں اس لئے کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، جینے سے دل سیر ہو چکا ہے صرف اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جی رہا ہوں۔ مگر تمھارا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ ابھی دونوں کی عمر بہت کم ہے۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ حسنو کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ مگر ایسے وقت آنا ہوا کہ وہ موجود نہ تھی۔ دیکھو عقیلہ جب وہ اپنی سہیلی کے ہاں سے واپس آئے تو میری طرف سے پیار کرنا اور یہ دس روپے مٹھائی کے لئے دے دینا۔" بہن نے روپے لے کر آداب کیا میر صاحب نے اُن کو گلے لگایا۔ صفدر علی سے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

دریاباد کے اسٹیشن پر جب میر صاحب سیکنڈ کلاس سے اترے تو ماسٹر شیو دیال انٹر سے اترتے ہوئے نظر آئے۔ میر صاحب نے لپک کر انھیں سلام کیا اور کہا

"بھائی صاحب مجھے ظفر کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنا ہے اجازت ہو تو کل صبح حاضر ہوں۔"

لالہ صاحب بولے: "نہیں بھائی میں خود اسکول جاتے ہوئے آ جاؤں گا، تمھارا گھر تو میرے راستے میں پڑتا ہے اور یوں بھی ظفر کو تسلی دینا ہے۔ اس کا فرسٹ کلاس مارا گیا۔"

(باقی آئندہ)

باہر کی دُنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

متعلق بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی طرح اس میں کئی طرح کی رائیں رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ وفد میں ایک دایاں بازو ہے جو موجودہ معاشی نظام کو بدلنا نہیں چاہے گا۔ کچھ لوگ بیچ کے راستے کی برتری کے علمبردار ہیں۔ ایسا شاید کوئی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ انتہا پسند یا ایسی بنیادی غلطیوں کا خواہش مند ہے جنھیں انقلابی کہا جا سکے، ایسے خیالات کے لوگ ملک میں شاید موجود ہی نہیں۔ اور اگر ہیں تو ان کی آواز نقارخانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی چنانچہ میں سوشلسٹ پارٹی اور فلاح پارٹی نا کامیابی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اس لئے مستقبل کے متعلق یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ نحاس کی حکومت حکومت ہند کی طرح ایک مخلوط معاشی پالیسی پر عمل کرے گی مصر مشرق قریب میں صنعتی ملکوں میں خاصا اہم ہے اور صنعتی ترقی مصر کی معاشی بہتری کے لئے ناگزیر، اس لئے ہوگا شاید یہ کہ صنعتی ترقی کے لئے مصر کے رہنما امریکہ کا سہارا ڈھونڈھیں گے۔ اور مصر کی خارجی پالیسی چاہے ہیوں صاحب کے لئے تکلیف دہ ہو تو ہو انیگلو امریکن بلاک کے لئے پریشان کن نہیں ہو سکتی۔ ویسے بین الاقوامی سیاست میں مصر کیا اور اس کی اہمیت کیا! لیکن لوبان، او میں ایک حد کی حد تک انیگلو امریکن بلاک کو پریشانی نہیں ہوگی۔

جبر ٹلک گئی نخل آرزو کی

چیانگ کی اُمید کا آخری سہارا ابھی جاتا رہا بعض حلقوں کی بہت ہی شدید کوششوں کے باوجود پریذیڈنٹ ٹرومین نے فارموسا میں چینی "قوم پرستوں" کے آخری قلعہ کی حفاظت کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے۔ امریکہ کے ایک سابق صدر ہوور صاحب نے امریکہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ فارموسا پر امریکہ خود قبضہ کر لے اور اس طرح اس کی مدافعت کی ذمہ داری خود اپنے سر لے لے۔ فارموسا پر اگر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا تو فلپائن کے لئے "بڑا خطرہ ہے"۔ اور فلپائن آزاد ہوتے ہوئے بھی امریکہ کی اپنی شکارگاہ ہے۔ مستقبل میں اگر کوئی لڑائی ہوئی تو فارموسا کی جنگی اہمیت ہوگی، اور دشمن کے ہاتھ میں پہنچ جائے تو امریکہ کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے لیکن فارموسا پر قبضہ کر لینے میں بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چیانگ اس جزیرے میں اتنے نامقبول ہیں کہ انھیں عرصے تک وہاں پیر جمانا مشکل ہوگا۔ انھیں وجہوں سے امریکہ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لئے کہ امریکہ چین میں آخر دم تک جمہوریت کی حفاظت کرے گا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چین کو معاشی امداد ملتی رہے گی۔ ایک سابق امریکی قونصل جنرل نے بتایا ہے کہ چیانگ کا خزانہ ختم ہو رہا ہے انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ چیانگ کے لئے طویل عرصے تک جنگ جاری رکھنا ممکن نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

جن کے بدن پہ ٹھنڈی شیروانی بھی نہ تھی۔ کتنے ایسے تھے جو صرف ایک پتلی قمیص اور ایک بوسیدہ دھوتی یا پاجامے ہی میں خوش تھے، اور اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا کہ اسی طرح یہ بے چارے انسان ــــ نشاط و انبساط کی محفلوں سے ٹھکرائے ہوئے سادہ لوح انسان۔ کسی نامعلوم امید کے سہارے زندگی کی پُرپیچ راہوں پر چلے جا رہے ہوں گے۔ ان کی بھی تمنائیں ہوں گی آرزوئیں ہوں گی۔ یہ بھی محبت کرتے ہوں گے۔ انسانی جذبات اور خلقی احساسات کی دھاراؤں میں بہتے ہوں گے مگر ــــ مگر دل پکڑ کر رہ جاتے ہوں گے۔ صبر کرتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کو بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہوتا ہے ــــ

کتنے ایسے تھے جن کے پاس ستر پوشی کے لئے صرف ایک کپڑا تھا اور وہ اپنے ننگے چوڑے سینے سے نومبر کی ابر آلو فضا کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہ سینے عادی تھے غمِ روزگار سہنے کے۔ زمانے کی مخالف ہوا اور ملل نے انھیں مضبوط بنا دیا تھا۔ بھلا نومبر کی تیز ہوا ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ وہ یہ سب دیکھتا ہوا سوچتا ہوا کالج کمپاؤنڈ میں داخل ہوا اور چند قدم چلنے کے بعد بڑے لکچر روم کے سامنے والے برآمدے میں آ گیا۔ یہاں وہ ایک گرم کپڑے والے صاحب۔ لوگ سگریٹ کے دھوئیں اُڑا رہے تھے۔ وہ سب اس کے ہم جماعت ہی تھے۔ مگر اس وقت انھوں نے اس کو نہیں پہچانا اس لئے کہ اس کے جسم پر ٹھنڈی شیروانی تھی۔ پاجامہ بھی ٹھنڈا تھا اور پیر میں ایک ٹھنڈی سی چپل تھی۔ مگر اوروں کی طرح اس کا دل ٹھنڈا نہیں تھا، اس میں گرمی تھی، بلا کی گرمی۔ وہ گرمی جو آہستہ آہستہ سلگتی رہتی ہے اور ایک دن شعلہ جوالہ بن کر اپنے گردوپیش کو بھی جلا ڈالتی ہے۔ پھر اس کی خاکستر سے ایک نیا جہاں پیدا کرتی ہو پھر اس گرمی کے سامنے گرم کپڑے والے راکھ بن کر ہواؤں میں اُڑ جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان گرم کپڑے والوں کا پورا نظام ہوا میں اُڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک نئی دنیا بستی ہے جہاں کے انسان گرم کپڑوں سے ناآشنا نہیں ہوتے مگر وہ گرم کوٹوں کے نیچے ایک گرم تڑپتا ہوا اور بے چین دل رکھتے ہیں۔

ــــ برآمدے سے وہ لکچر تھیٹر میں داخل ہوا سب کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ان نگاہوں کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ بارہا اس نے ان نگاہوں کو دیکھا تھا۔ وہ خاموش تھا اور ان نگاہوں کا جواب بے نیازانہ انداز میں اپنی غیر معمولی متانت سے دیتا جو ایسے موقعوں پر اور دلکش ہو جاتی تھی، دیتا ہوا پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ اُسے گرم کپڑوں میں ڈھکے ہوئے انسان نظر آئے۔ اس نے ریحانہ کو بھی دیکھا جس کا اندازِ دلربائی نرالا تھا اور جو کلاس میں نہ تو خود لکچر سنتی تھی، اور نہ دوسروں کو سننے دیتی تھی۔ اُس سے گفتگو کرنے کے لئے عمدہ قسم کے سوٹ، کریپ سول کا جوتا اور کریم آلود چہرے کی ضرورت تھی۔ بھلا جمیل کو کہاں موقع مل سکتا تھا۔ اس وقت وہ عمدہ قسم کی ساری زیبِ تن کئے ہوئے تھی اور اس پر سرخ رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ یوں تو وہ حسین تھی ہی مگر اس وقت تو عالم ہی دوسرا تھا۔ بجلی کی روشنی میں تو وہ الف لیلہ کی کوئی پری معلوم ہو رہی تھی۔ گرم کپڑے والوں کی نگاہیں ریحانہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی سہیلی سے باتیں کرتی رہی۔ آخر وہ کیوں ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتی۔ وہ بھی گرم کپڑا پہنے ہوئے تھی۔ پھر وہ عورت تھی اور اس وقت تو حور معلوم ہو رہی تھی چائے کے بعد تقریر شروع ہوئی۔ تقریر اچھی اور واقعی بصیرت آموز تھی، اور اگر وہ آج اپنے ٹھنڈے کپڑوں سے شرما کر نہ آتا تو گھاٹے میں رہتا۔ تقریر کے بعد لوگ ہال کے باہر نکلے۔ کوئی سائیکل پر کوئی موٹر پر، کوئی تانگہ پر۔ مگر وہ تخیل کے پروں پر۔

ــــ نومبر کی اس رات کا تصور بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ جمیل دل و دماغ کی کشاکش سے گذر رہا تھا اُسے اس بھیانک تصور کے ساتھ ساتھ دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ جہاں وہ یکہ و تنہا امید و بیم کے دشوار گذار راستوں سے گذر رہا تھا نومبر کی اس تاریک اور بھیانک رات کے ساتھ انسانیت کی ایک مورتی کی یاد بھی وابستہ تھی۔ وہ یکایک لوٹ سے اُٹھی، جمیل اُٹھ بیٹھا اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ انسانیت اپنی پوری جلوہ گری کے ساتھ سامنے آ گئی۔ اس کے کانوں میں آواز آئی "جمیل۔ سوئٹر کا یہ حقیر تحفہ قبول کرو۔" جمیل نے سوچا ــــ مگر اس مرتبہ اُس کے چہرے پر مایوسی نہیں برس رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک خاص تبسم کی تابانی نے لے لی تھی، جو انسان کی اپنی "قوتِ تسخیر" اور صلاحیتِ تعمیر کی گہرائیوں سے آشکارا ہوتی ہے۔ شیلا کتنی اچھی لڑکی ہے۔ آخر اس کا مجھ سے کیا ناتا۔ وہ خود مصیبت کی ماری ہوئی ہو اپنے گھر والوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر اور اپنا وطن چھوڑ کر دلی آئی ہے وہ تنگدست ہے۔ بے چاری کے پاس کوئی اوور کوٹ بھی تو نہیں اور پھر اس زمانے میں ــــ اور نومبر کی رات میں ــــ کیمپ کی زندگی۔ الامان۔ مگر نہیں ابھی انسان نہیں مرا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو رچانے والے ابھی زندہ ہیں۔ یہ لوگ اس مردِ درویش کے مانند ہیں جو ہوا کی تندی اور تیزی کے باوجود اپنا چراغ جلاتے رہتے ہیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے شیلا سے کہا تھا "آخر آپ ایک مسلمان مفلس پر یہ کرم کیوں کر رہی ہیں؟ آخر نام کے مسلمانوں ہی نے اس کے ماں باپ کو مارا تھا اس کے اکلوتے بھائی کو اس کی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔" شیلا نے کہا تھا "میں مسلمان پر کرم نہیں کر رہی ہوں۔ میں ایک انسان کے کام آ رہی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ انسان ہیں، ذہین ہیں، متین ہیں اور آپ ــــ" "خیر" اس نے بات کاٹ کر کہا تھا "اور آپ؟" "کچھ نہیں" وہ بضد ہوا تھا اور آخر شیلا نے کہا تھا "اور آپ حسین ہیں۔ آپ کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ سردی بڑھ رہی ہے میں نے یہ سوئٹر آپ کے لئے تیار کیا ہے کہ کہیں آپ جیسا انسان سردی کا شکار نہ ہو جائے۔" پھر اس نے پوچھا تھا "اور گرمی روزگار سے مجھے بچانے کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟" شیلا نے کتنی متانت سے کہا تھا "اسی کے لئے دامنِ اُمید کی ٹھنڈی ہوائیں ہیں" ــــ جمیل سوچتا رہا، کتنی اچھی لڑکی ہے شیلا۔ ان گرم کپڑے والی لڑکیوں سے بہت اچھی، جن کے چہروں پر چمک تو ہوتی ہے مگر دلوں میں قبر کی سی سردی اور تاریکی ہوتی ہے ــــ شیلا کی یاد نے گرم کپڑوں کا غم غلط کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کو اپنی دنیا جگمگاتی ہوئی نظر آئی۔ انسانیت ہنستی ہوئی نظر آئی اور پھر ــــ شیلا مسکراتی ہوئی نظر آئی ــــ نہ معلوم کب اسی "عالمِ لاہوتی" میں اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

(بقیہ بسلسلہ صفحہ ۸)

چیانگ کی حکومت چراغِ سحر ہو چکی ہے جو لمحوں میں بجھا چاہتی ہے۔ لیکن امریکہ اس تنوع کے عالم کو طول دینے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہا ہے تاکہ چین کی نئی حکومت یک سو ہو کر دنیا کے پانچویں حصہ آبادی کی بہبودی کے کام نہ کر سکے۔

یادش بخیر باؤدائی صاحب کو فرانس نے آزاد کر دیا ہے۔ ویٹ نام کا وہ علاقہ جو باؤدائی صاحب کے پاس ہے ملک کے پانچویں حصے سے زیادہ نہیں اب یہ علاقہ فرانس کی حکومت کے زیرِ سایہ ہو کر بھی آزاد کیا جائے گا۔ باؤ وائی نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا ہے اور نئی حکومت بننے والی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس حکومت میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہوں گے جو اب سے پہلے کٹھ پتلی حکومتیں بنانے کے دلچسپ مشغلے میں حصہ نہ لے سکے تھے اس حکومت کو پہلے سے ہی امریکہ اور برطانیہ کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہے۔ ایک خبر یہ ہے کہ جیسے ہی یہ حکومت بنی یہ دونوں جمہوریت دوست حکومتیں اُسے تسلیم کر لیں گی۔ چین کی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرنے میں کتنے لیت و لعل سے کام لیا جا رہا ہے۔ حالانکہ چینی کمیونسٹوں کے خلاف ان کے دشمن بھی اب یہ نہیں کہہ پاتے کہ انھیں عوام کی مدد حاصل نہیں ہے، اور باؤدائی کی کٹھ پتلی حکومت کو حکومت کے بننے سے پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ اس کے دوست بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسے عوام میں کوئی مقبولیت حاصل ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ایک فرانسیسی ترجمان نے اعلان کیا ہے کہ اگر ہند چینی پر حملہ کیا گیا تو فرانس فوراً مجلس اقوام متحدہ کے سامنے اپنی شکایت لے جائے گا - یہ دراصل پیش بندی کی جا رہی ہے - کمیونسٹ چین اور ہند چینی کی سرحد ملتی ہے پہلے تو اسے بند کرنے کی کوشش کی گئی - لیکن ۵۰۰ میل لمبی سرحد کو کیسے بند کیا جاتا - اب اس لئے سے اگر ڈاکٹر ہوچی من کو تھوڑی بہت مدد ملی تو اسے جارحانہ کارروائی بنایا جائے گا - کہا جاتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ نے فرانس کو یقین دلایا ہے کہ ہند چینی میں اگر فرانس کے اقتدار کو کوئی صدمہ پہنچنے کا امکان ہوا تو یہ دونوں ملک اس کی پوری مدد کریں گے ، اور ایسا کرنا ضروری بھی ہے - ہند چینی میں اگر کمیونسٹ برسر اقتدار آ گئے تو ملایا میں برطانیہ کے لئے دقتیں بڑھ جائیں گی اور آپ جانتے ہیں برطانیہ کو قدرت کی طرف سے یہ مشن عطا ہوا ہے کہ مشرق کے غیر مہذب علاقوں تک تہذیب کا پیام پہنچایا جائے - اسے نوآبادکاری کہئے تو یہ آپ کی جہالت ہے - اس لئے کہ امریکہ کے ایک پروفیسر ڈاکٹر جیسپ نے جو کمیونزم کے خلاف مورچہ بنانے کے سلسلے میں امریکہ کی طرف سے آج کل مشرق بعید کا دورہ کر رہے ہیں ، فرمایا ہے - ملایا میں برطانوی اقتدار نوآبادکاری نہیں

(ا ، س)

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
چندہ سالانہ ۲ روپے:- ششماہی ۱ روپیہ
دفتر:- "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی
طابع وناشر:- عبداللطیف اعظمی بی ۔اے جامعہ
مطبوعہ:- جید پریس دہلی

نئی روشنی

देहली

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی
سالانہ چندہ ۶
جمہوریت نمبر
۲۴ جنوری سنہ ۵۰ء
جلد ۲ نمبر ۲
جمہوریت نمبر

صلہ ہے تیری ریاضت کا صبحِ آزادی

روش

اے بھارت کی امر آتما، اے ہند کی لافانی روح۔

جو سدا دکھ سہہ کر ہنستی، آگ میں تپ کر نکھرتی رہی، جو محبت کی جادو سے غیروں کو اپناتی، دشمنوں کو دوست بناتی رہی، جو ہر حال میں حق کو ڈھونڈتی، اور ہر رنگ میں پاتی رہی، جو اسی کی دھن میں جی جی کے مرتی اور مر مر کے جیتی رہی۔

اے مہاتما گاندھی

آج ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے دن جبکہ ہندوستان پابندی کے آخری بندھنوں کو توڑ کر فخر و ناز، ذوق و شوق اور عجز و انکسار کے ساتھ دنیا کی آزاد جمہوریتوں کی صف میں کھڑا ہو رہا ہے ہم بے اختیار تجھ کو یاد کرتے ہیں اور تیرے سامنے نیاز و عقیدت کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ یہ دن جس کے لئے ہم برسوں سے تڑپ رہے تھے ہمیں صرف تیری بدولت حاصل ہوا ہے۔ یہ بات ہم بے سمجھے بوجھے جذبات کے جوش اور خیالات کی رو میں نہیں کہہ رہے ہیں اس لئے کہ تو نے ہمیں جذبات کو ضبط کرنا، خیالات کو جانچنا اور پرکھنا اور لفظوں کو تولنا سکھا دیا ہے۔ ہم سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں اور ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر آج سے ۳۰ برس پہلے تو نے ہندوستان کی سیاست کی باگ اپنے ہاتھ میں نہ لی ہوتی تو ہمیں ایک مدت تک غلامی کی ذلت سے چھٹکارا نہ ملتا۔ ہم غریب تھے، جاہل تھے، ہم میں آپس میں پھوٹ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری ہمتیں پست تھیں اور ہمیں اپنے اوپر بھروسا نہ تھا۔ ہم میں سے کچھ من چلے سیاسی انجمنوں میں گرمیٔ محفل کے لئے تقریریں کرتے تھے اور کچھ بگڑے دل حکومت کو چھیڑنے کے لئے چھوٹی موٹی شورشیں اٹھاتے تھے۔ جو کھوٹے تھے وہ آخر میں اپنی پوری قیمت پانے کے بعد حکومت کے ہاتھ بک جاتے تھے اور جو کھرے تھے وہ قیدِ فرنگ میں گھٹ گھٹ کر مر جاتے تھے اور ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ یہ تھی ہماری سیاسی تحریک کی حقیقت۔ در اصل آزادی کا تو نام بھی ہماری زبان پر بہت کم آتا تھا اور آتا بھی تھا تو ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور ہم اپنے اوپر آپ حکومت کریں کبھی ہمارے خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ ہمیں نہ صرف آزادی کے عملی امکان میں بلکہ اس کے اخلاقی جواز میں بھی شبہ تھا ہمارے دل میں خیال بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز کی حکومت سے سرتابی قانونِ اخلاق بلکہ قانونِ قدرت سے سرتابی ہے۔ ہم پر ایک بے پایاں ہمہ گیر خوف مسلط تھا، برطانوی حکام کی قوت اور قدرت کا خوف، اپنے ماضی اپنے حال اور اپنے مستقبل کا خوف، ایک دوسرے کا خوف اور خود اپنی دبی ہوئی کچلی اور روندی ہوئی شخصیت کا خوف۔ تو نے اپنی تعلیم سے اور اس سے کہیں زیادہ اپنی مثال سے ہمیں یہ سکھایا کہ اپنے نفس سے غلامانہ احساسِ کمتری کو اور بزدلانہ نفرت و کدورت اور تعصب کو دور کریں تاکہ ہمیں اپنے آپ سے خوف اور وحشت نہ رہے اور ہمارے اندر خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ جن لوگوں نے تیرے فیضِ نظر سے مجاہدۂ نفس کی یہ منزل طے کر لی وہ ہر طرح کے خوف سے بھی آزاد ہوگئے۔ وہ تیرے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر تاریخ اور تقدیر سے، زمانے اور ماحول سے خود اپنے دیس کی مخالف قوتوں سے اور برطانوی سامراج کی بے پناہ طاقت سے نبٹنے کو تیار ہوگئے۔ ان کا ہتھیار اہنسا تھا جو صبر اور ضبط، ایثار اور قربانی، دل سوزی اور محبت کے امتزاج سے بنا تھا۔

اس سے لڑنے اور یہ لطف تھا کہ فتح تو فتح شکست میں بھی جیت تھی۔ تو نے اہنسا کی کئی لڑائیاں لڑیں اور باہر سے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوا کہ تو سب میں ہار گیا اس لئے کہ بظاہر بدیسی حکومت کی قوت اور اقتدار، حشمت اور جلال میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن ہر مرتبہ تیری اور تیرے ساتھیوں کی مظلومیاں اور قربانیاں جن پر صبر اور ضبط نے غضب کی دھار رکھ دی تھی دیسی اور بدیسی دشمنوں کے دل میں اترتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں کم اور انگلستان میں زیادہ۔ فریب کا طلسم جو انگریزوں نے باندھ رکھا تھا کہ وہ ہندوستانیوں پر ان کی مرضی سے اور ان کی بھلائی کی خاطر راج کرتے ہیں، دھواں بن کر اڑنے لگا۔ ادھر حریف کا اخلاقی مورچہ ٹوٹ رہا تھا اور ادھر آزادی کے نہتے سپاہیوں کے دلوں میں یہ جاں بخش اور جاں فزا خیال مستحکم ہوتا جاتا تھا کہ وہ حق پر ہیں اور حق کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اس اخلاقی جنگ کا وہی نتیجہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ انگریز اپنی ساری طاقت کے باوجود ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ہندوستانی اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اپنی قسمت کے معمار بن کر آج ایک آزاد با اقتدار جمہوریت کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں۔

اے خدا کے حق شناس، حق گو، حق کوش بندے

سچائی کی لگن جو تو نے ہمارے دل کو لگا دی ہے ہمیں اس اعتراف پر مجبور کرتی ہے کہ مجموعی طور پر ہم آج بھی آزادی کے شایان اور جمہوریت کے قابل نہیں ہیں۔ ہم میں سے اکثر میں وہ ساری خرابیاں جہالت، تاریک خیالی، کاہلی، خود غرضی، بددیانتی، تنگ نظری، فرقہ پرستی، صوبہ پرستی — جنھوں نے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ آج بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نظم و نسق ڈھیلا ہے، ہماری معاشی حالت پست ہے اور ہماری سیاسی زندگی ابتر ہے۔ ہماری شدتِ احساس یہ بھیانک تصویر دکھاتی ہے تو ہمارے دل پر مایوسی اور آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی ہے لیکن جب ہم تیری تعلیم کے مطابق جذبات سے الگ ہو کر بے لاگ نظر سے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو اس مایوسی میں امید کی، اس تاریکی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ تو ہماری سب برائیوں کو دور نہیں کر سکا لیکن تو نے ہمیں اچھائی اور برائی میں فرق کرنا سکھا دیا ہے۔ تو نے ہماری نظر میں صحیح اور اونچے معیار قائم کر دیئے ہیں جن پر ہم اپنے اربابِ حکومت و انتظام، اربابِ علم و سیاست اور اربابِ صنعت و تجارت کو پرکھتے ہیں۔ اگر اسی کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو بھی ان ہی کڑی کسوٹیوں پر کسنے لگے تو ہماری موجودہ بے چینی بڑی مبارک، بڑی مقدس بے چینی ثابت ہوگی، کیونکہ اس کی خلش اس پر مجبور کر دے گی کہ خود اپنے اندر بھی اور ملک کی عمومی زندگی میں بھی ان برائیوں کے خلاف جہاد کریں اور انھیں جڑ سے اکھاڑ کر رہیں۔

اس جہاد میں خدا کی توفیق، تیری یاد اور تیری مثال ہماری رہنمائی کرے گی۔

روحِ جمہوریت

سالک ہندی
جامعہ نگر دہلی

میں نے حال ہی میں امریکی مصنف البرٹ مالٹنر کا ایک ناول پڑھا ہے جس کا نام ہے "سائمن مک کیور کا سفر"۔ سائمن ایک ۶۵ سال کا بوڑھا ہے اس نے تمام عمر نل لگانے کا کام کیا ہے جس کے معاوضے میں اب اسے ایک تھوڑی سی پنشن ملتی ہے اور وہ اس کے سہارے ایک افلاس زدہ بورڈنگ ہاؤس میں زندگی کے باقی دن کاٹ رہا ہے لیکن اس کے دل اور دماغ میں ابھی جان ہے اور کام کرنے کا حوصلہ وہ ایک عضو معطل بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ کسی طرح جوڑوں کے درد کا علاج کرائے جس نے اسے بے کار کر دیا ہے۔ دوبارہ کوئی کام کرنا شروع کر دے تاکہ اسے پھر سے یہ احساس ہو کہ وہ ایک باکار شہری ہے وہ اتفاقاً ایک لیڈی ڈاکٹر کا ذکر سنتا ہے جو اس کے قصبے سے ہزار میل دور رہتی ہے اور اس بیماری کے علاج میں خاص مہارت رکھتی ہے۔ ہاتھ پاؤں سے محتاج، چلنے پھرنے سے معذور، ۶۵ سال کا یہ جوان ہمت بوڑھا جس کی جیب میں صرف تین چار روپے ہیں (اور وہ بھی اس نے اپنے جیسے مفلس دوستوں سے قرض لئے ہیں!) وہاں تک پیدل کھڑا ہوتا ہے۔ کتاب اس کے اس سر پھرے سفر کی داستان ہے جس میں مصنف کی گہری نظر، ہمدردی اور تخیل نے نسل انسانی کے تاریخی سفر کا نقشہ کھینچ دیا ہے وہ لمبا، نہ ختم ہونے والا سفر جس کی منزل کا ایک دھندلا سا تصور ہے اور راستے میں بے شمار رکاوٹیں ہیں جہاں کچھ لوگ ہیں جو مدد کو ہاتھ بڑھاتے ہیں اور دوسرے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے مقصد کا سہارا لئے ہوتا، بھٹکتا، کبھی راستہ کھوتا، کبھی راستہ پاتا اپنی منزل کی طرف قدم بڑھائے چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ انسان اکیلا نہیں، اس جیسے اور بے شمار مسافر بھی اس راستے پر جا رہے ہیں جن میں سے بعض تھک کر رہ جاتے ہیں، بعض بھٹک جاتے ہیں۔ بعض مصیبتوں اور آزمائشوں کی یورش سے پاگل ہو جاتے ہیں اور بعض کو دوسرے لوگ روندتے اور کچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور بعض دھن کے پکے بڑھے چلے جاتے ہیں ...... ان کی طرح سائمن بھی ہمت نہیں ہارتا وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے اور جب وہاں اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی اور اس کی بیماری لاعلاج ثابت ہوتی ہے تو وہ ہار مان کر بیٹھ نہیں جاتا، بلکہ اپنا مقصد بدل کر ایک دوسری جدوجہد شروع کر دیتا ہے ......

میرا مقصد یہاں کتاب کا خلاصہ بیان کرنا نہیں، بلکہ ایک معمولی انسان کی حیثیت سے سائمن کا تعارف کرانا ہے۔ وہ معمولی انسان جس کی قسمت کو بنانے کا دعوےٰ مذہب اور فلسفہ اور سیاست صدیوں سے کرتے آئے ہیں لیکن جس کی زندگی آج تک محرومیوں کا شکار ہے ......

سائمن کو کئی سال سے ہر رات ایک بھیانک خواب دکھائی دیتا تھا جس نے اس کی نیند کو سکھ اور چین سے محروم کر دیا تھا خواب کا نہ بدلنے والا نقشہ یہ تھا کہ رات کا وقت ہے اور وہ ایک سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ دور سے ایک موٹر لاری کی تیز روشنی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ جواب دے دیتی ہے اور وہ لاری کے راستے میں سے نہیں ہٹ سکتا، یہاں تک کہ وہ اس کو کچل دیتی ہے اور اس کا بھاری پہیہ اس کے سینے پر چڑھ جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف بہت سے آدمی جمع ہو جاتے ہیں سب کے سب بے درد اور سنگ دل۔ جو اس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ وہ چلا جاتا ہے۔

"لوگو میں ایک انسان ہوں، تم میری مدد نہیں کرتے؟" اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔

وہ پھر چیختا ہے: "آخر ذرا سی شرافت دکھانے میں تمہارا کیا جاتا ہے؟ یہ تو معمولی بھائی چارے کا تقاضا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ لفظ سنا ہے"

...... خاموشی!

پھر بہت مایوسی کے لہجے میں کہتا ہے "خدارا میری مدد کرو۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے"۔

چاروں طرف سے بے رحم آوازیں آتی ہیں

"ارے یہ تو ایک جھینگر ہے"

وہ کہتا ہے: "کیا کہا؟ میں جھینگر نہیں ہوں میں تو ایک انسان ہوں۔ عیسائی ماں باپ کی اولاد۔ آئرلینڈ کے ایک گرجا میں مجھے بپتسمہ دیا گیا تھا"

جواب ملتا ہے "چپ رہ اے کھٹمل"

"ارے لوگو، مجھے تو خدا نے دنیا میں اپنی صورت بنا کر بھیجا تھا۔ تمہاری شرافت کو کیا ہو گیا ہے؟"

ایک شخص کہتا ہے: "اچھا تمہارا یونین کی ممبری کا کارڈ کہاں ہے؟"

"کیا؟ کارڈ؟ دیکھو یہ ہے۔ میں پٹرول اور گیس ورکرز یونین کا ممبر ہوں" قہقہہ!

"میں قسم کھاتا ہوں میں نے اس سارے علاقے میں تیل کے نل بچھائے تھے۔ لیبک میں تیل نکالنے کا سٹیشن بنایا تھا، میری تصویر اخبار میں چھپی تھی"

سرد مہری سے "تم سڑک پر کیوں گئے۔ اپنے بل سے باہر کیوں نکلے، یہاں تمہارا کیا کام تھا؟" پھر حقارت کے ساتھ "کچل ڈالو اس بدبخت، بے کار جھینگر کو۔ یہ ایک طفیلی ہے کوڑے کے ڈھیر کے قابل!"

(۲)

جمہوریت کا بنیادی خیال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان جھینگر یا کھٹمل یا چوہے کی مانند نہیں انسان کی حیثیت سے ہر شخص ہماری محبت، خاطر داری اور احترام کا مستحق ہے اور سماج کا فرض ہے کہ اس کی مکمل نشوونما کا بہترین انتظام کرے جب کسی سماج میں ایسے افراد یا جماعتیں موجود ہیں جو مفلس اور محتاج اور جاہل ہیں، جن کو زندگی کی مادی اور تہذیبی دولت میں سے اپنا حصہ نہیں ملا جو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جب تک ایک بھی ایسا آدمی موجود ہے اور سماج اس کی طرف سے غافل ہے اس وقت تک جمہوریت کے تمام دعوے جھوٹے ہیں۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی ملک میں انتخاب کا طریقہ رائج ہو جاتا ہے اور اسمبلیاں قائم ہو جاتی ہیں تو وہ ایک جمہوری ریاست بن جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک خطرناک دھوکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ باوجود ان تمام اداروں کے، وہ ملک جمہوریت کی روح سے اتنا ہی محروم ہو جس قدر کوئی آمریت! آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں بلکہ گاؤں اور قصبوں میں بھی ایسے محتاج بیمار، بے دست و پا فقیر دیکھے ہوں گے جو بالکل بے بس سڑک کے کنارے پڑے رہتے ہیں اور راہ چلتوں سے چند پیسوں کی بھیک مانگتے ہیں تاکہ اپنے جسم اور روح کے بے معنی سے تعلق کو قائم رکھ سکیں: وہ جسم جو بیماریوں کا گھر ہے اور وہ روح جس میں ایک بھیانک خلا کے سوا کچھ نہیں رہا! لیکن حکومت اور سماج دولت والے اور اختیار والے، دل والے اور دماغ والے کوئی بھی اس سماجی ناسور کا علاج نہیں کر پاتے۔ وہ کبھی کبھی اپنے ضمیر کی خلش دور کرنے کو تھوڑی سی خیرات دے دیتے ہیں یا کہیں کہیں ان لاکھوں محتاجوں میں سے چند کے لئے کوئی ادارہ، کوئی محتاج خانہ کھول دیتے ہیں مگر ایسا کرنے سے سماج کی ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے ماتھے پر سے اخلاقی کلنک کا ٹیکہ دور نہیں ہو سکتا اور صرف محتاجوں اور فقیروں پر کیا منحصر ہے؟ سماج میں اور بہت سے طبقے ایسے ہیں جن کی مادی حالت کچھ بہتر ہے لیکن وہ بھی اپنے انسانی مقام سے اتنے ہی دور ہیں ...... مثلاً کارخانوں کے مزدور جن کی روز مرہ کی زندگی اس مشین کے رقص بے معنی کا عکس ہے جس کے پرزوں کی گردش کی وہ دیکھ بھال کرتے ہیں۔ گاؤں کے کسان، جن کی زندگی کی دلکش رومانی تصویریں تو آپ کو ہمارے بعض افسانہ نگاروں

اور ناول نویسوں کے یہاں ملیں گی، لیکن تلخ حقیقت ان گاؤں میں تلاش کرنی ہوگی جو گندگی، بیماری اور جہالت کا گھر ہیں۔ متوسط طبقے کے کلرک اور استاد اور نوکری پیشہ لوگ جن کو معاش کی فکر اس قدر پریشان رکھتی ہے کہ وہ زندگی کی دوسری قدروں کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے اور آپس کی چھین جھپٹ اور اقتصادی جد و جہد کی وجہ سے ایک آزاد، بے فکر اور باہمی رفاقت کی زندگی کے لطف ہی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان میں وہ دولت مند اور بے کار طبقہ بھی شامل ہے جس نے کبھی کسی مفید کام میں حصہ نہیں لیا جس کو عام زندگی کی جد و جہد میں شریک ہونے کی عزت نصیب نہیں ہوئی ...... یہ سب افراد اور جماعتیں اپنے شرف انسانی سے محروم ہیں۔ ان کو سوسائٹی نے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ ایک معقول سماجی نظام کے اندر رہ کر کام اور محنت، فرصت اور فراغت سے لطف اٹھا سکیں اور انسانی زندگی کے حقیقی معنی اور مقصد کو سمجھ سکیں۔ سائمن کو اپنے بھیانک خواب میں یہ آواز سنائی دیتی تھی کہ وہ ایک جھینگر یا کھٹمل ہے، ان لوگوں کو جاگتے میں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ایک مسرور اور مصروف اور امن و آشتی کی زندگی نہیں بلکہ بچھوؤں اور سانپوں کی سی زندگی ہے جس میں وہ ایک دوسرے کو ڈستے اور ڈنک مارتے رہتے ہیں اور ان کا انجام وہی کوڑے کا ڈھیر ہے! انسان کا روشن فکر، اس کی تلاش حق، اس کا احساس حسن، اس کے دل کا گداز، اس کی یہ جستجو کہ "خوب سے ہے خوب تر کہاں" اس کی انصاف پسندی، اس کا جذبۂ تخلیق جو اس کو خالق کائنات کا شریک کار بنا دیتا ہے، یہ تمام چیزیں جو انسان کا مخصوص شرف ہیں ان تمام بدنصیبوں کے لئے کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ ان کے ساتھ زندگی نے جو سودا کیا ہے اس میں سراسر گھاٹا ہی گھاٹا ہے، اس کی تلخیاں، غم، کمینیاں اور محرومیاں تو ان کے حصے میں آئی ہیں مگر اس کی بلندی اور روشنی اور شیرینی ان سے دامن بچا کر نکل گئی ہے! جمہوریت ایک بے فیض دھوکا ہے اگر وہ ان تمام محروموں کے خالی پیمانوں کو زندگی کی شراب سے نہ بھر سکے۔

اگر ہم ہندوستان میں ایک سچی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہاں کے سب بسنے والوں کے دل میں انسانوں کی محبت اور احترام پیدا کرنا ہوگا، صرف انھیں تیس کروڑ انسانوں کے لئے نہیں جو اس دیس میں رہتے ہیں بلکہ ساری دنیا کے ڈھائی ارب انسانوں کے لئے، اور اپنے تمام اداروں اور منصوبوں اور اپنی قومی پالیسی کی بنیاد اسی جذبے پر رکھنی ہوگی۔ انسانیت کی طرح جمہوریت کی بنیاد بھی محبت اور ہمدردی ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ ہر قسم کی نفرت اور تنگ نظری اور تعصب اس کے دشمن ہیں۔ جنگ اور جنگ کا جذبہ خواہ وہ دل اور دماغ کے میدان میں ہو یا جغرافیہ کے میدانوں میں انسان کی انسانیت کو افسردہ اور تہذیب کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے اور جمہوریت سب کچھ جھیل سکتی ہے، لیکن رواداری کے بغیر اس کا کام نہیں چل سکتا۔ ایسی رواداری جو زمین اور آسمان کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ برٹرنڈرسل نے حال ہی میں ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "جب کبھی ہم کسی قسم کی اجتماعی نفرت کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں، خواہ وہ کمیونسٹوں کی طرف سے ہو یا امریکہ والوں کی، عربوں کی طرف سے ہو یا یہودیوں کی، ہم جنگ کو قریب لانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ انسان کی بہت بڑی بدنصیبی ہے کیوں کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایسی قوتیں اور ایسے ہتھیار ہیں کہ وہ ان کی مدد سے "فرشتوں کی زبان سے بول سکتا ہے" ایٹم کے سربستہ رازوں کو کھول سکتا ہے۔ موسیقی کے ذریعے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہے اور فکر و جذبات میں ایسی بلندی حاصل کر سکتا ہے جو اس نے کبھی حاصل نہیں کی .... اگر انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ انسان کو پہچاننے لگے، یہودی، یونانی، بندے اور آزاد، سیاہ اور سفید کو نہیں بلکہ انسان کو، تو وہ عظمت اور مسرت دونوں حاصل کر سکتا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس کے سامنے صرف ایک ذلیل اور مصیبت بھری زندگی کا مستقبل ہے اور بس"! ہندوستانی جمہوریت کے بنیادی اصول بھی یہی ہوں گے اور یہی ہونے چاہئیں اگر ہم محض سیاسی اور معاشی تدبیروں کے چکر میں پھنس جائیں گے اور لوگوں کے دل اور دماغ میں ان قدروں کے چراغ روشن نہ کریں گے تو ممکن ہے جمہوریت کا ڈھانچہ ہمارے قبضے میں آ جائے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی روح ہاتھ نہ آئے گی۔

(۳)

ہندوستان میں اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں جن کو دور کرنا ہوگا یہاں ذات پات کے بندھن ڈھیلے ضرور ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک ٹوٹے نہیں اور ذات پات اور جمہوریت میں ایک اٹل بیر ہے۔ رنگ اور نسل اور خاندان کا امتیاز بھی خاصی حد تک ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ ہماری مروجہ تہذیب جس کو روا بیتاً اپنی روحانی قدروں پر ناز رہا ہے گذشتہ دو سو برس تک غلامی کی گردش میں رہ کر اس قدر تبدیل ہو گئی ہے کہ وہ آج افراد کو انسانیت اور شرافت کی ترازو میں نہیں تولتی بلکہ سونے چاندی کے باٹوں سے تولتی ہے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کی دولت اور قوت و اختیار کے اعتبار سے کرتی ہے دولت کی یہ پوجا اس مساوات اور اخوت کے راستے میں حائل ہوتی ہے جس کا قائم کرنا جمہوریت کا مقصد اعلیٰ ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام نے اس رجحان کو اور زیادہ تیز کر دیا ہے۔ مذہب کے ٹھیکہ داروں نے مذہب کی حقیقی روح کو بھلا دیا ہے اور لوگوں میں باہمی تعصب اور ناروا داری کے جذبات پیدا کر کے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے اور بجائے اس کے کہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے یہ سمجھیں کہ وہ الگ الگ راستوں سے ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ انھوں نے خیال کے اختلاف کو نفرت اور عداوت کے لئے وجہ جواز سمجھ لیا ہے! اقبال نے "فرشتوں کے گیت" میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

حقیقی جمہوریت کا کام یہ ہوگا کہ وہ خدا کے بندوں کو ان شکاریوں کے پھندے سے نکال کر آزادی کے اس مقام پر پہنچائے جہاں وہ اپنی عقل کی روشنی میں اپنا راستہ دیکھ سکیں اور اپنی سماجی زندگی اور تہذیب و تمدن کی عمارت کو مخالفتوں کے بجائے رفاقتوں کے ستون پر قائم کر سکیں وہ مال مست امیروں میں فرض کا احساس پیدا کرے گی اور ان کو کام اور محنت کی عزت کرنا اور اس میں شریک ہونا سکھائے گی اور فقیروں کو ان کی حال مستی سے نکال کر ان میں خودداری اور حق شناسی پیدا کرے گی۔ وہ ہر قسم کے تصرف کو مٹانے کی کوشش کرے گی، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو افراد اور سماج میں مختلف قسم کی ذہنی اور اخلاقی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ وہ مساوات قائم کرنے کی تدبیریں سوچے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ سب لوگ علم یا عقل یا صلاحیتوں کے اعتبار سے برابر ہیں اور افراد کے فطری اختلافات کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ وہ سب کو اپنی اپنی فطرت کے مطابق ترقی کرنے کے یکساں مواقع دے گی اور اس مساوات کے قائم کرنے میں جو سماجی یا معاشی رکاوٹیں پیش آئیں گی ان کو جرأت کے ساتھ دور کرے گی وہ ہر فرد کے دل میں اس احساس کا چراغ روشن کرے گی کہ خدمت دنیا میں سب سے بڑی سعادت ہے اور ہر وہ شخص عزت کا مستحق ہے جو اپنی تربیت یافتہ صلاحیتوں کو سماج سیوا میں لگائے۔ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ ہر شخص کو ایسا کام کرنے کو ملے جو اس کی صلاحیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس کے معاوضے میں اسے سماج کی مادی اور ذہنی پونجی سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا جائے یعنی یہ جمہوری سماج وہ سب دیا بہتر، باتیں کرے گی جن کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ بعض سمجھدار سرمایہ دار تک ناگزیر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد اعلیٰ محض سیاسی قوت حاصل کرنا یا دولت بڑھانا یا علم پھیلانا نہ ہوگا بلکہ انسان کا فروغ اس کی نشو و نما اس کے ذرے کو آفتاب بنانا ہوگا، کیونکہ انسان ہی وہ پیمانہ ہے جس سے زندگی کا جلال و جمال اس کی کامیابی اور ناکامی اس کا خیر و شر، اس کا حق و باطل ناپا جاتا ہے، اور وہی زندگی اچھی زندگی ہے جو اس کی محرومیوں کو دور کرے اس کی شخصیت کو سرسبز و پرسوز بنائے۔ اور اس کی تخلیقی قوتوں کی اس طرح تربیت کرے کہ وہ اپنی دنیا کو اپنے تخیل کے حسین سانچے میں ڈھال سکے یہ ہی میری نظر میں "روح جمہوریت" کا تصور ہے۔ اگر جمہوریت کا جسم اس سے منحرف ہو تو یہ جسم کی بدبختی ہے اور روح کا قصور نہیں ✦

سروجنی

روشن صدیقی

سروجنی آبروئے مشرق، نگارِ مشرق، بہارِ مشرق
جسے بنایا ضمیرِ یزداں شناس نے رازدارِ مشرق
کبھی سوادِ حرم سے گزری، صنم کدوں کا جمال لے کر
کیا کبھی دیر میں اُجالا حرم کی شمعِ جلال لے کر
وہ محرمِ رازِ عشق جس نے جمالِ وحدت کے گیت گائے
خلوصِ گوتم، گدازِ عیسیٰ، نویدِ رحمتؐ کے گیت گائے
وہ جس نے انسانیت کو مذہب، خلوصِ دل کو حیات سمجھا
خدا کی مخلوق سے محبت کو حاصلِ کائنات سمجھا

وہ جس نے زہرِ حیات کی تلخیوں کو شہد آفریں بنایا
ہر ایک غم کو غمِ محبت کا حسن دے کر حسین بنایا
نفس نفس شعلۂ فروزاں، مگر نگاہوں میں کیفِ شبنم
لطافتِ غم کی چھاؤں میں وہ مسرتِ جاوداں کا عالم
معاشرت کا طلسم توڑا تھا اُس نے افسونِ دوستی سے
دلوں کی بستی کو جگمگایا تھا صبحِ صادق کی روشنی سے
کبھی سیاست کے دستِ ویراں کو عزتِ گلستاں بنایا
ہوئی ضرورت تو نکہتِ گل کو شعلۂ بے اماں بنایا

زبانِ مغرب میں دردِ مشرق کا ترجماں اور کون ہوگا
لباسِ ظاہر میں حسنِ باطن کا رازداں اور کون ہوگا
نوائے آزادیٔ وطن کو عطا کیا سوزِ جاودانی
بجھا گیا آتشِ غلامی کو اس کا اندازِ گل فشانی

وہ جس کی رنگینیٔ تکلم سے رزم گاہوں میں پھول برسے
بنا دیا اُس نے شامِ زنداں کو صبح، بیداریٔ نظر سے
وہ عارفِ خویش نظر کہ خود آگہی کو تھا اعتبار اس کا
وہ رہبرِ کارواں کہ منزل کو بھی رہا انتظار اس کا

رواں دواں، رنگ و نور کا آبشار تھا اس کے زمزموں میں
ہمالیہ کی بلندیوں کا وقار تھا اس کے زمزموں میں
وہ سحرِ نغمہ کہ غرقِ انوار کر دیا گردِ زندگی کو
جگا دیا سوزِ زندگی کو بڑھا دیا دردِ زندگی کو
وہ نالۂ درد جس نے روحِ حزیں کو جامِ سرور بخشا
وہ سوزِ دل جس نے وادیٔ غم کو صبحِ جنت کا نور بخشا
بلند تھی فکرِ عیش و غم سے وہ مسند آرائے زندگانی
اُسے یقیں تھا کہ لمحہ لمحہ ہے حاصلِ عمرِ جاودانی
رہی حوادث سے رزم آرا، مگر جبیں پر شکن نہ آئی
وہ جس چمن میں ہوئی غزل خواں خزاں قریبِ چمن نہ آئی
وہ بلبلِ ہند، روحِ نغمات، جس کی ہر سانس موجِ نکہت
وہ شاعرہ جس کی زندگی تھی تمام تر نغمۂ محبت
جمالِ منزل دکھا کے ہم کو خود اپنے خوابوں میں کھو گئی وہ
ہوئی تھی بیدار جس کے آنچل سے اُس گلستاں میں سو گئی وہ
رہے گا عشق و وفا کی محفل میں تذکرہ صبح و شام اس کا
خلوص و ایثار کی زباں پر ادب سے آئے گا نام اس کا

یومِ جمہوریت کا عہد

سیدہ فرحت

ہمیں مسحور کر سکتے نہیں ماضی کے افسانے
بھلا کس کام کے ہیں اب پرانے یہ صنم خانے
شرابِ نو کے ناقابل ہیں یہ شیشے یہ پیمانے
ہمیں اے ہم نشیں دنیا نئی تعمیر کرنا ہے

ازل کے روز سے انساں ہے جس کو دیکھتا آیا
ہر اک فکر و عمل پہ جس کا آتا ہے نظر سایا!
ہزاروں سال سے جو ذہنِ انسانی پہ ہے چھایا
ہمیں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا ہے

رُخِ فطرت سے ہم ایک ایک پردے کو اُٹھائیں گے
جو دھبے دامنِ ہستی پہ ہیں ان کو مٹائیں گے
ہم اب انسانیت کے نقش کو واضح بنائیں گے
کتابِ زندگی کی اب نئی تفسیر کرنا ہے

وہ جن کی ذات نے دنیا کو اک دوزخ بنایا ہے
وہ جن کے ظلم نے انسانیت کو خوں رلایا ہے
جنہیں تہذیب کے رنگیں حجابوں نے چھپایا ہے
جہاں میں ان غلط کاروں کی اب تشہیر کرنا ہے

بھرے ہیں پیٹ جن کے سینکڑوں کو مار کر بھوکا
بنا لاشوں پہ مزدوروں کی قصرِ عیش ہے جن کا
ہزاروں کو ہے جن زرّیں قباؤں نے کیا ننگا
ہمیں اُن کے لیے تجویز اب تعزیر کرنا ہے

پیامِ زندگی دینا ہے مزدوروں کسانوں کو
ہمیں اب بخشنا ہے چین سب بے چین جانوں کو
بنانا ہے عوامی اب زمینوں کارخانوں کو
بدل ڈالے جو تقدیریں وہ اب تدبیر کرنا ہے

مبارک باد جواہر لال

خواجہ غلام السیدین

(یہ خط خواجہ صاحب نے تھوڑے دن پہلے پنڈت جی کی ساٹھویں سالگرہ کی مبارک باد میں کھلی چٹھی کے طور پر لکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جو لوگ ہندوستان میں نئی تعلیم کی داغ بیل ڈال رہے ہیں اُن کی نظر میں جواہر لال کی سیرت ہی وہ نمونہ ہے جسے سامنے رکھ کر معلم جمہوری ہند کے نشادلو کی تربیت کرنی ہے۔ ہم نے اس کی اشاعت آج کے دن کے لئے اُٹھا رکھی تھی جو جواہر لال کو ہزاروں جنم دنوں سے زیادہ عزیز ہے۔)

محبی پنڈت جی!

آج کے مبارک دن آپ کے دیس میں کروڑہا آدمی جو آپ کو دل سے چاہتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے بے شمار باشندے جو آپ کی سچی عزت کرتے ہیں مل کر آپ کی خدمت میں محبت اور عقیدت کا خراج پیش کر رہے ہیں۔ میرے لئے فخر و مسرت کا باعث ہے کہ مجھے بھی اس فرض کے ادا کرنے میں شریک کیا گیا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ حال میں آپ کے بارے میں دیس اور بدیس میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی نئی بات کہنے کی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ ارباب حکومت و اقتدار کی تعریف کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے اس لئے کہ لوگ دل سے نکلی ہوئی سچی تحسین کو بھی خوشامد سمجھ لیتے ہیں۔

کتنا خوش قسمت ہے ہندوستان کہ اس میں ایک ہی قرن کے اندر مہاتما گاندھی اور جواہر لال کے پائے کے دو آدمی پیدا ہوئے۔ مہاتما جی اس اخلاقی اور سیاسی بلندی پر پہنچ گئے تھے جس کے سامنے کوئی اور لیڈر نظر میں نہیں جچتا تھا۔ آپ کی عظمت کا پیمانہ یہ ہے کہ انھیں کے دامن تربیت میں پرورش پا کر اور انھیں کی چھائی ہوئی شخصیت کے سایے میں بڑھ کر آپ نے نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں اپنے لئے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی جو انسانی سیرت کے بڑے مبصر تھے اور جن لوگوں سے ملتے تھے ان کی قدر و قیمت کو ایک نظر میں پرکھ لیتے تھے آپ کو کبھی اپنا "وارث" نہ بناتے۔ اگر وہ آپ کو اس مشکل منصب کے لائق نہ سمجھتے اس لئے کہ یہ منصب نہ صرف سیاسی حکمت و فراست اور انتظامی قابلیت چاہتا ہے —— یہ صفات تو شاید دوسروں میں بھی آپ کے برابر مل جائیں۔ —— بلکہ اس کے لئے ایک اعلیٰ نصب العین بے داغ دیانت داری، اخلاقی قدروں کے گہرے احساس، انصاف پسندی کے سچے جوش اور خدا کے بے کس اور غریب بندوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ یہی صفات تھیں جنھوں نے گاندھی جی کو مہاتما بنایا تھا۔ اگرچہ یہ توقع بے کار ہے کہ کوئی اور شخص ان صفات میں اُن کی برابری کر سکے گا۔ تاہم آپ کے سخت سے سخت نقادوں

> مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی جو انسانی سیرت کے بڑے مبصر تھے اور جن لوگوں سے ملتے تھے اُن کی قدر و قیمت کو ایک نظر میں پرکھ لیتے تھے آپ کو کبھی اپنا "وارث" نہ بناتے اگر وہ آپ کو اس مشکل منصب کے لائق نہ سمجھتے اس لئے کہ یہ منصب نہ صرف سیاسی حکمت و فراست اور انتظامی قابلیت چاہتا ہے بلکہ اس کے لئے ایک اعلیٰ نصب العین، بے داغ دیانت داری، اخلاقی قدروں کے گہرے احساس، انصاف پسندی کے سچے جوش اور خدا کے بے کس اور غریب بندوں کی حمایت کی ضرورت ہے ...... آپ کے حصے میں عمل کا جوش تخیل کی بلند پروازی اور حق اور انصاف کی لگن آئی ہے ....
>
> مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ ان صفات کو جان کے برابر سمجھیں گے اس لئے کہ یہی آپ کا مخصوص اور بے بہا عطیہ ہے جو آپ نے ہندوستانی سیاست کو بخشا ہے .....

نے بھی اس سے انکار نہیں کیا کہ یہ سب یا ان میں اکثر صفات آپ کی ذات میں بڑی حد تک موجود ہیں قدرت نے آپ کو غیر معمولی خوبیوں کا مجموعہ بنایا ہے —— وراثت ایسی جس نے آپ کو بیدار اور حساس ذہن اور دلکش شخصیت بخشی تعلیم ایسی جس نے آپ کے جوہر قابل کو اُبھارا اور چمکایا۔ دوستیاں اور تعلقات غیر معمولی طور پر اچھے اور رنگا رنگ جنھوں نے آپ کے تجربے اور احساس قدر کو مالا مال کر دیا۔ سب سے بڑی چیز جو آپ کو ملی وہ بے غرض اور بے لوث دیانت ہے جس کے بغیر اچھی اور بڑی صفات بھی سماج کے لئے خطرہ بن جاتی ہیں اور وہ ان تھک محنت اور جفاکشی جس کے بغیر بڑے سے بڑے فضائل محض دکھاوے کی بے مصرف چیز بن کر رہ جاتے ہیں۔ آپ مسلسل یہی کوشش کرتے رہے کہ تربیت اور ریاضت کے ذریعے اپنے آپ کو اس بڑے کام کے لئے تیار کریں جو آپ کو کرنا تھا۔ تعلیم کی رو سے آپ سائنس داں، ذاتی انتخاب کی رو سے سیاست داں اور مؤرخ اور فطری صلاحیت کے لحاظ سے مصنف اور ادیب ہیں۔ قومی سیاست کی مجبوریوں نے آپ کو ایک ان تھک مقرر اور جہاں گشت مسافر، ایک شورش پسند باغی اور ملک معظم کے قید خانے کا قیدی بنا دیا۔ وہاں آپ کو اپنی شدید مصروفیت سے جبری "فرصت" مل گئی۔ اور اس کا موقع ہاتھ آیا کہ اس مسلسل مشاہدۂ نفس سے کام لیں جو عام طور پر آپ کے ہم پیشہ سیاست دانوں کی پرواز خیال اور ہمت سے باہر ہوتا ہے۔ اس طرح آپ کی من چلی اور رنگا رنگ زندگی میں مختلف اور متضاد دسیرتوں کے عناصر موجود ہیں۔ مرد فکر اور مرد عمل، تصور پسند فلسفی اور عمل پرست سیاست داں قومیت کا پر جوش حامی اور بین الاقوامیت کا سچا پرستار، اصولی اشتراکی اور عملی انفرادیت پسند جو اپنے آپ کو کسی "پارٹی لائن" کی زنجیر میں نہیں جکڑتا۔ غیر مذہبی قومیت کا علم بردار اور اسی کے ساتھ ایسا عقیدت مند جس نے مہاتما گاندھی کے اثر سے آنکھ بند کر کے (اور شاید غیر شعوری طور پر) ان قدروں کے آگے سر جھکا دیا جس کو ہم بے تکلف روحانی بلکہ مذہبی کہہ سکتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی شخصیت کے اندر یہ سارے مختلف عناصر گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں یا نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو مجھے یہ شبہ ہے، اور خود آپ کی تحریروں سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ کبھی کبھی آپ کو ان متضاد رجحانات کو ترتیب اور ربط دینے میں بڑی سخت مشکل پیش آتی ہے۔ لیکن کیا یہ کوئی بری بات ہے؟ بے شک ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھیں ایک سیدھی سادی مضبوط طبیعت زیادہ پسند ہے جس کی آنکھوں پر اندھیری چڑھی ہوئی ہوں اور جو ایک وقت میں ایک ہی منزل کو دیکھے اور ناک کی سیدھ میں اس کی طرف بڑھتی چلی جائے۔ مگر میں ذاتی طور پر اس ٹائپ کو پسند نہیں کرتا اس لئے کہ انسانی شخصیت کا بھید اور اس کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بہت سے مختلف بلکہ متضاد رنگوں کا گوناگوں مرقع ہو اور جب تک اس کے اندر حق و انصاف کی بنیادی روح موجود ہے اور اس کے من کے مندر میں شرافت اور محبت کا چراغ جلتا ہے۔ اس اختلاف اور تضاد سے جو حقیقت میں ایک زود حس اور پرخلوص طبیعت کا اپنے زمانے کے پیچ در پیچ ماحول کے مقابلے

میں ردِّ عمل سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سیاست اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ایک بندھی ٹکی لیکھ پر چلتے ہیں تو اس میں کچھ عارضی فائدے بھی ہیں، لیکن نوعِ انسانی کی بدنما رنگ تاریخ میں ہم یک رُخے مجنونوں اور کٹر پنتھیوں کے ہاتھوں اتنی مصیبتیں اُٹھا چکے ہیں کہ اب ایسے آدمیوں کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔

اس دل و دماغ اور اس عملی تجربے کے ساتھ آپ نے اس بڑے ملک کی سیاسی رہنمائی اور حکومت کی ذمہ داری لی۔ میرے لئے کئی وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ جو کام آپ نے صدرِ حکومت کی حیثیت سے ایسے حالات میں انجام دیا جس میں دوسرے کی کمر ٹوٹ جاتی یا اعصاب ماؤف ہو کر رہ جاتے، جائزہ لوں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جو لوگ آپ پر سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ اگست ۱۹۴۷ء اور نومبر ۱۹۴۹ء کے بیچ کے عرصے میں آپ نے یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا، وہ حقیقت میں غیر شعوری طور پر آپ کی خدمت میں بہت بڑا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ان کا یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دو سال میں ایک سیاسی اور سماجی معجزہ دکھا سکتے تھے اور صرف یہی نہیں کہ حکومت میں اتنی قدرت ہے کہ جب چاہے قومی زندگی کا سارا نقشہ بدل دے بلکہ آپ تنہا حکومت کی اور ملک کے نظم و نسق کی من مانی تشکیل کر سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھولے پن کا عقیدہ کہاں تک معقول اور صحیح ہے، بہرحال مجھے یہاں سیاسی مسائل سے بحث نہیں کرنی ہے، میں تو آپ کو دوسرے پس منظر میں دیکھنا چاہتا ہوں جس میں آپ کی مخصوص صفات اچھی طرح اُجاگر ہو جائیں۔

دہلی میں فرقہ وارانہ جنون کی آگ بھڑک رہی ہے شریف اور امن پسند لوگوں کی زندگی دشوار ہو گئی ہے اس لئے کہ قانون کا راج اُٹھ گیا ہے جو اچھے ہیں وہ سہم کر دبک کر رہ گئے ہیں، باقی سب لوگ یا تو خود فساد میں شریک ہیں یا چشم پوشی کر رہے ہیں۔ آپ اپنی جان پر کھیل کر اور اپنے سیاسی مستقبل کو داؤں پر رکھ کر اس شان سے بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑتے ہیں اور بہت سی بے بس عورتوں اور بچوں کی جان بچاتے ہیں، کہ دیکھ کر روح خوش ہوتی اور دل بڑھتا ہے۔ پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کا دہلی میں ہجوم ہے، انھوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اُٹھائی ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ مقامی حکومت اور مرکزی حکومت اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس زبردست مسئلے کے حل کرنے سے قاصر ہے۔ آپ ان سیاسی طوفان کے مارے ہوئے بدنصیبوں کے لئے نہ صرف اپنے گھر کے بلکہ اپنے دل کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ آپ کو خبر ملتی ہے کہ جامعہ کا مشہور مکتبہ جل رہا ہے آپ تڑپ کر وہاں پہنچتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ نفرت و غصّے سے اندھے فسادیوں نے خاموش اور بے زبان کتابوں تک کو نہیں چھوڑا۔ آپ خود اپنی کتاب تلاشِ ہند کی ایک جلتی ہوئی کاپی کو ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑے ہیں، اور آپ کی آنکھوں میں حسرت و اندوہ جھلک رہا ہے۔ آپ امورِ ریاست کی فکروں کے بوجھ سے دبے ہوئے اپنے کتابی چہرے پر سنجیدگی کی تہہ جمائے کھوئے ہوئے بیٹھے ہیں، آپ کے آس پاس لوگ زور شور سے باتوں میں مصروف ہیں مگر آپ کو کچھ خبر نہیں، اتنے میں چند بچے آ جاتے ہیں اور آپ کا سارا فکر و تردّد ہوا ہو جاتا ہے۔ آپ کا چہرہ انسانی محبت کے تبسم سے دمک اُٹھتا ہے۔

کئی سال کی بات ہے کہ آپ ایک پارٹی میں تین چھوٹی چھوٹی بچیوں سے ملتے ہیں اور اس لطف و عنایت سے جو آپ نے بچوں کے لئے مخصوص کر لی ہے اُن سے باتیں کرتے ہیں وہ جوشِ مسرت سے بیتاب ہیں کہ اس جواہر لال نہرو کو جو ایک قرن سے بچوں اور جوانوں کا ہیرو رہا ہے، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔ اور پھر چند روز کے بعد انھیں تین کشمیری ہار تحفے کے طور پر پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس یاد فرمائی کا نقش اُن کے دل سے عمر بھر نہیں مٹ سکتا۔ کس قدر مشکل ہے کہ انسان ریاست میں جسے جاننے والے "گندا کھیل" کہتے ہیں، اور جو اکثر بھلے آدمیوں کے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہے سر سے پیر تک ڈوبا ہوا ہو اور پھر بھی اس میں محبت اور شرافت اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قدر باقی رہے جو زندگی میں بڑی بڑی چیزوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ بڑے آدمی اور طاقتور آدمی سے کہیں زیادہ مشکل بھلا آدمی بننا ہے اور سب سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ انسان ان تینوں کا مجموعہ بن جائے اس لئے کہ طاقت انسان کو بگاڑتی ہے اور اس کی روح کو جھلس دیتی ہے آپ نے اپنی تقریروں میں بار بار کہا ہے کہ آپ کی قوم کی محبت نے آپ کے دل میں عاجزی اور خاکساری پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ خاکساری کا احساس آپ کو اس بات سے ہونا چاہیے کہ قدرت نے آپ کو بڑائی اور طاقت عطا کی، لیکن اس کی وہ قیمت نہیں لی جو وہ دوسروں سے لیا کرتی ہے یعنی آپ کو اس کے بدلے اپنی نیکی اور شرافت کی قربانی نہیں دینی پڑی۔

آپ نے تاریخ میں ایک اونچی جگہ حاصل کر لی ہے ——— نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی تاریخ میں ——— مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر قناعت نہیں کریں گے اس لئے کہ بھلا آپ جیسی طبیعت کے انسان کو اس کی کیا پروا کہ کل تک مصیبتوں کی بوچھار تھی اور آج اعزاز و اکرام کی بارش ہے۔ آپ کو ابھی ملک کے لئے دنیا میں ایک عزت کی جگہ حاصل کرنی ہے اور یہ بات اسے محض آپ کی نیک نامی کے طفیل حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے اسے اپنے ضمیر سے نبٹنا ہو اور اپنے جسم کو ہر قسم کے زہر سے جو اس میں پھیل گیا ہے پاک کرنا ہو ——— یعنی فرقہ پرستی صوبہ پرستی، تہذیبی تعصب اور خود غرضی سے ———

اس جہاد میں آپ ہی کو ہماری قیادت کرنی ہے ہمیں اپنی سماج کو جمہوریت اور مساوات کی بنیاد پر قائم کرنا ہو جس میں خدا کی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کی بھی عزت کی جائے اور سیاست کی ساری قوتیں اس کے اس حق کی حفاظت میں صرف ہوں کہ وہ زندگی سے پورا لطف اُٹھا سکے۔ آپ تیس بتیس سال سے غریبوں کے حقوق کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ نے اس ملک کے سیاسی ذہن میں معاشی مسائل کا شعور پیدا کیا ہے اس لئے یہ آپ ہی کا منصب ہے کہ جو غیر معمولی قوتِ عمل آپ کو ودیعت کی گئی ہے اس سے کام لے کر منصفانہ سماجی نظام قائم کریں۔ ہمارے ملک کو زندگی کے ہر میدان میں اپنی کارکردگی کا معیار بڑھانا ہے ——— صنعت و حرفت میں، محنت و دستکاری میں، علم اور تعلیم میں۔ آپ نے شروع سے جب سے کہ آپ کو الہ آباد میونسپلٹی اور کانگریس آفس سے واسطہ پڑا، بڑی شدت سے کارکردگی کے اعلیٰ معیار پر زور دیا۔ اس لئے آپ ہی کو ہماری قومی کارکردگی کے بڑھانے کی تدبیر کرنی ہے۔ میرے خیال میں ہمارے اندر سب سے زیادہ کمی ایسی چیز کی ہے اور وہ ہمیں بہرحال پوری کرنی ہے۔ آپ کو ہمارے نظم و نسق اور کاروبار اور روزمرہ کی زندگی میں امانت داری اور دیانت کی روایات قائم کرنی ہیں۔ اس لئے کہ ان سب چیزوں میں بڑی خطرناک ابتری پیدا ہو گئی ہے صرف ایسا ہندوستان جس کے نقطۂ نظر میں رواداری اور انسانیت ہو جس کی دیانت داری کا معیار بلند ہو دنیا کی توجہ اور عزت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ فرض بھی ادا کرنا ہے کہ دنیا کو اس ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے روکیں جس کی طرف وہ آنکھ بند کئے دوڑی چلی جا رہی ہے۔ آج جبکہ دنیا مل کر ایک ہو گئی ہے صرف ہندوستان یا امریکہ یا برطانیہ کی تلاش اور تسخیر کافی نہیں ہے۔ آپ ہی نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم نے ساری دنیا کو نہ اپنایا تو کچھ نہ کیا۔ مشرق یا مغرب، شمال یا جنوب الگ الگ بالکل بے معنی ہیں آپ سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو جنھیں خوف اور شک اور بدگمانی نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے، اتحاد اور دوستی کے رشتے میں مربوط کریں۔

آپ نے دیکھا ابھی بہت کام کرنے کو ہے اور آرام لینے کا موقع نہیں ہے۔ آپ کی بلند اور بے لاگ اصول پرستی آپ کی بے دماغ دیانتداری، آپ کی ہمہ گیر انسان دوستی اور آپ کی بے نفسی، آپ کی وسعتِ نظر اور ہمت و حوصلہ، ہماری اُمید کا لنگر اور عمل کا سہارا ہے۔ اس ملک میں بہت سے ہیں جو ہمیں موقع پرستی خود غرضی طاقت کی سیاست اور فوری فائدے کی ——— جو خوشنما الفاظ میں مصلحت اندیشی کہی جاتی ہے ——— تلقین اور ہر معاملے میں احتیاط کی تاکید کرتے ہیں، شاید ایسے لوگ بھی قوم کی زندگی میں اپنی جگہ رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کے حصے میں عمل کا جوش، تخیل کی بلند پروازی اور حق و انصاف کی لگن آئی ہے جس میں آپ کے ساتھ اربابِ سیاست نہیں، بلکہ اربابِ فکر، شاعر اور مصنف اور فلسفی شریک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ ان صفات کو جان کے برابر سمجھیں گے۔ اس لئے کہ یہی آپ کا مخصوص اور بیش بہا عطیہ ہے جو آپ نے ہندوستانی سیاست کو بخشا ہے۔ اور خطرہ ہے کہ کہیں حکومت کے بوجھ میں دب کر اس کو سر...

(بقیہ صفحہ پر)

نئے میدان اور نئی راہیں

آزاد ہند کے نوجوانوں کے لئے

پروفیسر محمد عاقل

ہماری نئی نسل کی آزادی سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اس کے لئے ترقی اور خوش حالی کے کون سے نئے راستے کھلیں گے جو اب تک بند تھے؟ اس کی اُمنگوں اور حوصلوں، چھپی ہوئی صلاحیتوں اور دبی ہوئی قابلیتوں کو اُبھرنے اور پھلنے کے کون سے نئے موقعے ملیں گے جو اب تک میسر نہیں تھے؟ یہ سوال قدرتی طور پر ہمارے نوجوانوں اور ان کے سرپرستوں کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان کا ہم کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دے سکیں تو سمجھنا چاہئے کہ ہماری آزادی سپھل ہوئی ورنہ نہیں۔

برطانیہ کی حکومت کے زمانے میں گورنر جنرل سے لے کر کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس تک اور کمانڈر انچیف سے لے کر سارجنٹ تک اور بینک اور کمپنیوں کے مینجنگ ایجنٹ سے لے کر فورمین تک اکثر اونچی تنخواہ اور ذمہ داری کے عہدے انگریزوں کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ان تک رسائی بڑی مشکل سے ہو پاتی تھی اور ان پر پہنچنے کے بعد ان سے چمٹے رہنے کے لئے بڑی ملت فروشی اور عزتِ نفس کی قربانی کرنا پڑتی تھی۔ ایک تو یہ سب عہدے انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستانیوں کے لئے کھل گئے ہیں دوسرے خارجی تعلقات اور بحری اور ہوائی مدافعت کا کام حکومت برطانیہ اپنے طور پر انجام دیتی تھی اور ہندوستان کی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اب جبکہ ہندوستان آزاد ہو گیا ہے ایک طرف سفیروں، قنصلوں، تجارتی اور ثقافتی نمائندوں کی ایک بہت بڑی تعداد دوسرے ملکوں میں رکھنا ضروری ہو گیا ہے، دوسری طرف بحری اور ہوائی بیڑے کو بھی وسیع کیا جا رہا ہے۔ جنگی سامان کے کارخانے بھی ملک میں بنائے جا رہے ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور کو بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ ان سب کاموں کے لئے مختلف قابلیت کے لوگ درکار ہوتے ہیں اور ہمارے نوجوانوں کے لئے اس میدان میں اپنی قسمت آزمائی کا بڑا موقع نکل آیا ہے۔

تیسرے انگریزوں کی غیر ملکی حکومت نے اپنے فرائض بہت مختصر اور محدود سمجھ رکھے تھے۔ ہندوستان کی معاشی، تمدنی، اخلاقی اور روحانی ترقی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ہندوستان کے لوگ مفلس تھے، ان کی زراعت، صنعت اور تجارت ترقی یافتہ حالت میں نہ تھی، ان کی صحت اور تعلیم کا معیار گرا ہوا تھا، ان میں توہم پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی اخلاقی حالت اچھی نہیں تھی۔ لیکن ان سب باتوں سے اُسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ آزاد ہندوستان کی قومی حکومت ان چیزوں کی طرف سے آنکھ بند نہیں کر سکتی۔ اُسے تو ان خرابیوں کی اصلاح کرنا ہوگی اور اس کام کے لئے اُسے نوجوانوں کی خدمات درکار ہوں گی۔

سب سے پہلے زراعت کی اصلاح و ترقی کے کام کو لیجئے۔ یہ کام تین طرح کے نوجوانوں کی مشترکہ کوشش سے انجام دیا جا سکے گا۔ سب سے اول کسانوں کے لڑکے ہوں گے جو کھیتی باڑی کے نئے طریقوں کو سیکھیں گے اور پھر اپنے کھیت پر جا کر انھیں عملی جامہ پہنائیں گے۔ یہ بنیادی اور بعد بنیادی مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہوں گے اور آبادی کے ایک بہت کثیر حصے پر مشتمل ہوں گے۔

دوسرے مختلف قسم کے وہ کارکن ہوں گے جن کے سپرد یہ کام کیا جائے گا کہ وہ زراعت سے متعلق جدید ترین تحقیقاتوں کو کسانوں تک لے جائیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو زراعتی، توسیع، اشتہار اور نمائش کا کام کریں گے اور یہ سرکاری یا نجی اداروں کے ملازم ہوں گے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ مرکزی اور صوبے کی حکومتوں کو اس قسم کے جن آدمیوں کی آئندہ دس سال میں ضرورت ہوگی وہ حسب ذیل ہیں۔

کھیتی کے لئے

۲۰ ہزار فیلڈ اسسٹنٹ بیسک اسکول میں کامیاب امیدواروں کے تربیت یافتہ

۱۰ ہزار انڈر گریجویٹ ۔ زراعتی مدرسوں کے فارغ التحصیل

۱½ ہزار گریجویٹ ۔ زراعتی کالجوں کے فارغ التحصیل

۳۰۰ گزیٹیڈ آفیسر ۔ زراعتی کالجوں کے فارغ التحصیل

مویشی کی افزائش نسل کے لئے

۲۰ ہزار اسٹاک مین

۔ انسپکٹر

۵۰۰ گزیٹیڈ آفیسر

تیسرے وہ لوگ ہوں گے جو کھیتی اور مویشی کی افزائش نسل کے سلسلے میں اعلیٰ علمی تحقیقات اور تجربوں کے کام میں پورے وقت لگے رہیں گے۔ ان کا کام سب سے زیادہ اہم ہوگا اور ان کی قابلیت بھی سب سے اعلیٰ ہوگی۔

اسی جگہ دیہات کی اصلاح و ترقی کے دوسرے کاموں کا بھی ذکر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

ہندوستان کے زیادہ تر حصے میں گاؤں کی زندگی ہر کبھی انسانوں کے رہنے کے لائق نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہندوستان کے چھ لاکھ گاؤں میں چند ہزار شاید ایسے نکل آئیں جنہیں اس بیان سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا۔ ورنہ بصورت مجموعی یہ بیان صحیح ہے۔ جب تک گاؤں کی حالت نہ سدھرے ہندوستان کی حالت نہیں سدھر سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہاتی زندگی کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ اس قسم کے کام کو فروغ دینے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ چیز ہے کہ لوگوں کے سامنے ترقی یافتہ دیہات کا ایک مکمل نمونہ رکھا جائے جسے دیکھ کر وہ آسانی سے سمجھ سکیں کہ انھیں اپنے دیہات کو آئندہ کیا شکل دینی ہے۔ اس قسم کے نمونے کے دیہات پہلے بنانا چاہئیں اور پھر دیہات کی تعمیر نو کے کام کو ایک تحریک کی صورت میں شروع کرنا چاہئے۔ اس تحریک کو غیر سرکاری رضاکارانہ اور امداد باہمی کے اصول پر اگر چلایا جا سکے تو اس سے دیہات کے لوگوں کی جس طرح تربیت کی جا سکے گی وہ دوسرے کسی طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ یہ سارا کام ہمارے نوجوانوں کے حوصلوں اور ہمتوں کو للکار للکار کر اپنی طرف بلا رہا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس قسم کی تحریکوں کو چلانے میں کامیابی ہوئی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ صبر اور مستقل مزاجی کے ساتھ اگر یہی کام ہندوستان میں بھی کئے جائیں تو ان میں کامیابی نہ ہو۔

اگر معقول قانون سازی اور نمونے کے چند دیہات قائم کرنے کے بعد اس تحریک کو چلایا جائے گا تو یہ اتنی تیزی کے ساتھ پھیلے گی اور گاؤں کے پلین بنانے والوں، حفظانِ صحت کے انجینئروں، مکان تعمیر کرنے والوں اور ترقی دیہات کے سینکڑوں اور دوسرے کام کرنے والوں کی مانگ اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ اس کے پورا کرنے کے لئے ہمیں آسانی سے آدمی نہ مل سکیں گے۔

ترقی دیہات کے اس کام کو گاؤں والوں پر زبردستی لادنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ ہر سال نئے نمونے کے دیہاتوں کے بنانے کا کام بغیر خاص کوشش کے کیا جاتا رہے گا۔ جب ندیاں اور وادیوں کے منصوبے مکمل ہوں گے۔ جب ملیریا میں گرفتار علاقے رہنے کے لائق بن جائیں گے۔ جب نئی نئی زمینیں کاشت میں لائی جائیں گی تو وہاں نئے گاؤں بسائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان نئے گاؤں کو پرانے گاؤں کے نمونے پر ہرگز نہ بننے دیا جائے گا۔ یہ نئے اور اصلاح شدہ نمونے کے ہوں گے۔ مرکزی اور صوبے کی حکومتوں کو اپنے اسٹاف میں کچھ لوگ ایسے رکھنے ہوں گے جو ان نو آباد گاؤں کو نئے نمونے کا بنا سکیں گے۔ جب نئے نمونے کے یہ گاؤں بن جائیں گے تو ان سے ارد گرد کے گاؤں سبق حاصل کر سکیں گے۔

اس تحریک کو آگے بڑھانے میں یونیورسٹی کمیشن کی مجوزہ دیہاتی یونیورسٹیاں اور ان سے متعلق دیہاتی کالج بہت بڑا حصہ لے سکتے ہیں۔ دیہات کے ہر قسم کے مسائل کا ان درسگاہوں میں مطالعہ کیا جائے گا اور ان کے حل تلاش کئے جائیں گے اور پھر یہاں جو چراغ روشن کئے جائیں گے وہ دیہات کی ہمہ گیر تاریکی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

دیہات کی تعمیر نو کے سلسلے میں نئے نئے پیشے وجود میں آئیں گے اور نئی نئی تحقیقاتوں کے دروازے کھلیں گے۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند پیشوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پانی کی دیکھ بھال کرنے والے انجینیر۔

زمین کو بہتر بنانے والے انجینیر۔

درجہ حرارت کو قابو میں رکھنے والے انجینیر۔

غلّا کو محفوظ رکھنے والے ماہر۔

کھیتی کی بے کار پیداوار کو کارآمد بنانے والے انجینیر۔

دیہی صنعتوں کے بارے میں مشورہ دینے والے ماہر۔

دیہات میں انتظام عامہ قائم کرنے والا عملہ۔

دیہات میں بیماروں، محتاجوں وغیرہ کی امداد و اعانت کا کام کرنے والا عملہ۔

دیہات کی زمینوں اور مکانوں کے نقشے بنانے والے۔

دیہاتی ڈاکٹر وغیرہ اور ان کے مددگار۔

دیہاتی یونیورسٹیوں میں جن مسائل کے بارے میں خاص تحقیقات کی جائے گی ان میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

اخلاقی تحقیقات یعنی اس بات کی کھوج کرنا کہ دیہی زندگی کے صحیح مقاصد کیا ہونا چاہئیں اور ان کے حصول کے صحیح ذرائع کیا ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے اور موثر زندگی بسر کرنے میں کون سے رسم و رواج اور محرکات حائل ہیں اور باہمی رواداری معاملے کی صفائی اور خوش گوار انسانی تعلقات کے قائم کرنے کے لئے کون سے شرائط اور حالات ضروری ہیں۔

نفسیاتی تحقیقات یعنی اس بات کی کھوج کرنا کہ ہندوستان کے دیہی ذہن میں زندگی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرتے رہنے کی مستقل خواہش کیوں نہیں پائی جاتی۔ کیا وہ طریقے جنھیں رابرٹسن نے چین میں اختیار کرکے وہاں کے کسانوں میں بیداری پیدا کی، ہندوستان میں اختیار نہیں کئے جا سکتے۔

اجتماعی علم الانسانی اور ثقافتی تحقیقات یعنی دیہات کے موجودہ سماجی پس منظر کے بارے میں کھوج۔

آبادی کے بارے میں تحقیقات یعنی آبادی کن اسباب کی وجہ سے ہندوستان کے دیہات میں بہت زیادہ بڑھتی جارہی ہے اور اس کو محدود رکھنے کے لئے کون سے طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں اور آبادی کے معیار صحت اور ذہانت کو کس طرح بلند کیا جاسکتا ہے۔

دیہاتی نظم و نسق کے بارے میں تحقیقات یعنی دیہات میں کم خرچ سے کس طرح نظم و انتظام قائم کرنا ممکن ہے۔

دیہی معاشی تحقیقات۔ یعنی نظام حقیت اراضی محاصل، طریقہائے فروخت، مالیات زر، سرکاری جائداد اور قدرتی وسائل کا انتظام ان سب کے بارے میں تحقیقات کہ کس طرح دولت آفرینی کی کمی کو دور کیا جاسکتا ہے۔

دیہات کے قدرتی وسائل کے بارے میں تحقیقات دیہات میں بے شمار چیزیں ایسی موجود ہیں جن کو بےکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے یا نظرانداز کر دیا جاتا ہے ان سب کی اہمیت کے بارے میں کھوج کرنا

دیہی صنعتوں کے بارے میں تحقیقات

مکان تعمیر کرنے کے مسالے کے بارے میں تحقیقات۔

زراعتی تحقیقات۔

غرض یہ سارے کام ایسے ہیں کہ جو ہمت والے نوجوانوں کے لئے ایک دعوت عمل ہیں۔

دیہات اور زراعت کے ان کاموں سے نظر ہٹا کر جب شہر کی صنعتوں کی جانب نظر کی جاتی ہے تو وہاں بھی کام کرنے کے بے شمار مواقع نظر آتے ہیں آج ہندوستان کے لوگ یا تو آرام و آسائش کے بے شمار سامانوں کے وجود سے ناواقف ہیں یا واقف ہیں تو ان میں سے زیادہ تر چیزوں کو باہر سے منگاتے ہیں۔ اگر سماج کی ضرورتوں کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں ایک طرف اگر باورچی خانے کے برتنوں، دفتر کے ساز و سامان، چھوٹی چھوٹی مشینوں مثلاً ٹائپ رائٹر، ایڈنگ مشین، ترازو، فوٹو کھینچنے کا سامان، فاؤنٹن پن، پنسل، چاقو، چشمے معلوں کا سامان، بجلی اور روشنی کا سامان ہینٹ شیشے، وارنش، دوائیں بے شمار قسم کی بوتلیں، بکس اور دوسرے چیزوں کو رکھنے والے انتظامات وغیرہ شامل ہیں تو دوسری طرف جسم کی زینت و آرائش کے بے شمار سامان مثلاً دانت مانجھنے کے برش، کنگھے، کھلونے، کھیل کے سامان وغیرہ ہیں۔ دفتر اور مدرسوں کا فرنیچر ہے۔ لوہے اور پیتل وغیرہ کا سامان ہے مثلاً تالے، اسپرنگ زنجیریں، کانٹے، اور بہت سے دوسرے دھات کے بنے ہوئے سامان۔ پھر مختلف قسم کی ٹوپیاں اور پہنانے لباس اور جوتے۔ فن جراحی کے اوزار اور سامان دندان سازی کے ساز و سامان اور اسی طرح کی اور دوسری چیزیں جن کی فہرست بہت طول طویل ہو جائے گی۔

اس قسم کی ساری چیزیں ہندوستان میں تیار ہونا چاہئیں اور ہماری یونیورسٹیوں اور انجینیری کے مدرسوں کو ان چیزوں کے تیار کرنے کے لئے ہمارے نوجوانوں کو تیار کرنا ہوگا اور ہمارے نوجوانوں کو ہمت کرکے ان کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا اور کام کرکے کام کو سیکھنا ہوگا۔ ان میں سے اکثر کام چھوٹے پیمانے پر چلائے جاسکتے ہیں

ہمارے انگریز حکمرانوں نے ہمیں یہ باور کرادیا تھا کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور یہاں صنعت و حرفت کی ترقی ممکن نہیں ہے چنانچہ ہم برطانیہ کے عہد حکومت میں اپنے ابتدائی آلات و اوزار کے ذریعے کھیتی کی پیداوار حاصل کرنے میں لگے رہے کچا مال برآمد کرتے رہے اور بنا ہوا مال باہر سے منگاتے رہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ نقل و حمل اور خبر رسانی کے ذرائع کی تعمیر کے لئے جتنا ساز و سامان ضروری تھا یا جو ڈیزائن اور نقشے فراہم کرنا تھے یا اس سلسلے میں ماہروں کے مشورے حاصل کرنا تھے یا کوئی علمی تحقیقات کرانا تھی یہ سب کام بھی باہر ہی کیے جاتے تھے۔

مثلاً ہندوستان میں سینکڑوں شہر تعمیر کئے گئے شہروں میں پانی کی فراہمی کے انتظامات کئے گئے۔ پانی کی نکاسی کے لئے بندوبست کئے گئے بجلی گھر اور روشنی کی فراہمی کے انتظامات ہوئے۔ لیکن ان کے پلان اور ڈیزائن سب باہر کے فرموں نے بنائے۔ اس طرح سینکڑوں میل ریل کی لائنیں اور کارخانے تعمیر کئے گئے۔ ان سب کے ڈیزائن باہر سے حاصل کئے گئے۔ اس طرح بڑی صنعتوں کی تعمیر کے سلسلے میں مثلاً پارچہ بافی، شکر اور سن کے کارخانوں کے لئے مشینیں باہر سے حاصل کی گئیں اور جب یہ مشینیں گھس گئیں تو ان کے بدلے نئی مشینیں بھی باہر سے منگائی گئیں۔ ان کی مرمت بھی باہر ہی سے کرائی جاتی رہی۔ ہندوستان میں ان کی تعمیر تجدید مرمت اور ان کے ڈیزائن اور پلین بنانے کے سلسلے میں کوئی تحقیقات اور انتظام نہیں کیا گیا۔ بن بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں یہی ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہم ہر چیز کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو اس کمی کو دور کرنا ہوگا ہمیں انجینیری کے بہت سے مدرسے اور کالج کھولنا ہوں گے اور ان میں اپنے نوجوانوں کو تعلیم دینا ہوگی۔

انجینیری کے پیشے نے ہمارے زمانے میں بہت پیچیدہ شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کی بے شمار شاخیں ہوگئی ہیں اور ان میں کام کرنے والے لوگ مختلف طبقوں اور درجوں میں بٹ گئے ہیں ہمیں جن لوگوں کی ضرورت ہوگی ان کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

۱۔ ڈرافٹس مین، فورمین اور کرافٹس مین

۲۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ اور ڈیزائنر ڈرافٹس مین۔

۳۔ مال تیار کرنے، کارخانے کو چلانے، اسے قائم رکھنے اور مال کو فروخت کرنے والے انجینیر۔

۴۔ انجینیر جو خود سائنٹسٹ بھی ہوں یعنی ڈیزائن بنانے اور ترقی دینے والے انجینیر۔

۵۔ اعلیٰ درجے کے منتظم اور نگراں۔

پہلے درجے کے لوگ صنعتی اور پیشہ کے مدرسوں سے حاصل کئے جاسکیں گے اور ان کو ہمیں بڑی تعداد میں قائم کرنا ہوگا یا موجودہ مدرسوں میں پیشہ اور صنعت کی تعلیم کو رواج دینا ہوگا۔

دوسرے درجے کے لوگوں کے لئے ٹکنکل اور دوسرے اعلیٰ صنعتی اسکولوں کو قائم کرنا پڑے گا۔

بقیہ صفحہ ۲۴

اے مرے ہم سفرو

معین احسن جذبی

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اُجالے کے سماں ملتے ہیں
وہی دیوانگیٔ شوق، وہی تیشۂ غم
راہ چلیے تو وہی کوہِ گراں ملتے ہیں
آج بھی کلیوں کے رخسار سے اُڑ جاتا ہے رنگ
آج بھی پھول ملول و نگراں ملتے ہیں
آج بھی ریگِ بیاباں کے تپش زاروں میں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں
آج بھی جسم اُسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اُسی طرح تپاں ملتے ہیں
آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا دھوکا جن پر
آج بھی لب ہیں کہ سرگرمِ فغاں ملتے ہیں
آج بھی سر سے گذر جاتی ہیں امواجِ بلا
آج بھی اپنے اُبھرنے کے نشاں ملتے ہیں
اُن کے ہر وعدۂ الطاف کی رنگینی میں
کتنے نادیدہ ستم ہائے گراں ملتے ہیں
اُن کی محفل میں نہ بہکے ہوئے سیمیں نغمے
اب تو کچھ دن سے بہ اندازِ فغاں ملتے ہیں
اے مرے ہم سفرو اس کو تو منزل نہ کہو
آندھیاں اُٹھتی ہیں، طوفاں یہاں ملتے ہیں
یوں گوارا ہے یہ خوں بارِ اُفق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

عہدِ نو کی طرف

جعفر علی خاں اثر

اے دلِ حسرت نشاں اے نوحہ خوانِ زندگی
دیکھ تو پہنچا کہاں ہے کاروانِ زندگی
اب وہاں بیداریاں ہیں اب وہاں سرگرمیاں
ڈیرے ڈالے تھا جہاں خوابِ گرانِ زندگی
جاگ اُٹھے خوابیدہ جذبے روح نے انگڑائی لی
پا گئی اب تک سستی غفلت میں عنانِ زندگی
موت اک خوابِ پریشاں ہے جو دیکھا جا چکا
زندگی جب سے ہوئی ہے ترجمانِ زندگی
ہے بہیمیت کے بدلے حکمراں، روحانیت
اللہ اللہ چشم بد دور یہ عزوشانِ زندگی
ولولے سے جوش، غیرت سے حمیت ہم کنار
کس قدر عشرت فزا ہے امتحانِ زندگی
جس کی ایک اک موج میں ہے وسعتِ کونین گم
جوش کھاتا ہے وہ بحرِ بیکرانِ زندگی
تفرقہ پرداز تھیں جو جو وہ رسمیں اُٹھ گئیں
رہ گیا جوہر فقط، روحِ روانِ زندگی
مذہب و ملت کی آویزش فسانہ ہو گئی
ہے سرِ اہلِ نیاز اور آستانِ زندگی
منتشر جو تھے ہوئے وہ سب عناصر متحد
مٹ گئے سب اختلافاتِ جہانِ زندگی
ایک مقصد کے ہوئے تابع سیاست کے اصول
اور اصول ایسے کہ جو ہیں پاسبانِ زندگی
جز رواداری و یک جہتی نہ کچھ باقی رہا
"آدمیت" سے لگے دینے نشانِ زندگی
آگیا۔ ہاں آگیا، برجِ شرف میں آگیا
مطلعِ انوار، مہرِ ضوفشانِ زندگی
منتظر اک عہدِ نو ہے خیرمقدم کا اثرؔ
چونک اور لبیک کہہ اے سرگرانِ زندگی

دیوانے

غلام ربانی تاباںؔ

یہی وحشی، یہی سودائی، یہی دیوانے
ایک دن معرکۂ شوق بھی سر کر لیں گے
عشق۔ ہاں عشق کو سمجھا ہی نہیں ہے تم نے
حسن۔ ہاں حسن کو پابندِ نظر کر لیں گے
یوں ہی جلتے رہے جلتے رہے آہوں کے چراغ
رات کو رونقِ تنویرِ سحر کر لیں گے
آج خونابہ فشاں اشک چکاں ہیں آنکھیں
کل مگر تکملۂ ذوقِ نظر کر لیں گے

یہی وحشی، یہی سودائی، یہی دیوانے
محبسِ غم کی فصیلوں کو نگوں کر دیں گے
زندگانی کو سکھائیں گے ادا جینے کی
عقل کو تابعِ فرمانِ جنوں کر دیں گے
سازِ ایام رواں اور رواں کر دیں گے
لذتِ سوز فزوں اور فزوں کر دیں گے
آخ نہ اک روز اُلٹ جائے گی فطرت کی نقاب
اہلِ محفل پہ عیاں رازِ دروں کر دیں گے

یہی وحشی، یہی سودائی، یہی دیوانے
ذرے ذرے کو ستاروں کی ضیا بخشیں گے
اور آئینۂ ہستی کو جلا بخشیں گے
باغِ عالم میں بہاروں کو بقا بخشیں گے

ہندوستان کا دستور

پروفیسر محمد مجیب

جب سے دنیا میں جمہوری حکومت کا رواج ہوا ہے ایسے دستور بنائے جاتے رہے ہیں جن کا مقصد ان اصولوں اور حالتوں کو محفوظ کرنا تھا جو جمہوریت کے لئے لازمی مانے جاتے تھے۔ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں بہت مشکل سے آئی کہ دستور کا اصولاً صحیح ہونا کافی نہیں ہے، اس لئے کہ انسانی زندگی کا مدار صرف اصولوں پر نہیں ہوتا۔ حکومت جمہوری ہو تو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوتا ہے کہ آزادی کے تمام عناصر اُسے قائم رکھنے اور ترقی دینے کے ارادے پر متفق ہوں اور بنیادی باتوں میں حتی الامکان جبر نہ کیا جائے۔ اس طرح اصول کے ساتھ مصلحت کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایک تیسری چیز عادت بھی ہے۔ جو آبادی یا جماعت شخصی حکومت کی عادی ہو اس کے لئے ایک ایسا دستور بنا دینا مناسب نہیں جس میں شخصیت کے لئے بالکل گنجائش نہ رکھی گئی ہو اور حکومت کا طریقہ محض اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ ہو۔ اچھا دستور وہ ہے جسے اصولی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ لوگ صحیح سمجھتے ہوں۔ جس میں جماعتی زندگی کی خصوصیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو اور جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو اپنی عادت یا طبیعت کے خلاف نہ چلنا پڑے۔ دستور میں اتنا لوچ ضرور ہونا چاہئے کہ وہ اصلاحی تحریکوں کی راہ میں رکاوٹیں نہ ڈالے۔ مگر وہ خود اصلاح کا محرک نہیں بنایا جا سکتا۔

ہندوستان کا دستور دراصل ۱۹۳۵ء سے بنایا جا رہا ہے اگرچہ پہلا نقشہ جسے کسی حد تک مکمل کہہ سکتے ہیں ۱۹۳۵ء کا دستور تھا۔ اس کے بنانے والوں کو ہندوستان کی قومی زندگی، آزاد شہریت کے تصور اور رفاہ عام کے منصوبوں سے بحث نہیں تھی، انھوں نے صرف ایسی حکومت کا ڈھانچہ بنایا جو عملاً ہندوستانی کہی جا سکتی تھی۔ اور ساتھ ہی انھوں نے وفاقی نظام کی طرح بھی ڈال دی۔ [illegible] تک یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان [illegible] حکومت کا اختیار دینا پڑے گا اور یہ حکومت [illegible] اختیار [illegible] وفاقی ہی ہو سکتی ہے۔ [illegible] وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار کو متعین کرنے [illegible] بہت اچھی صورت اس طرح نکال لی گئی تھی کہ ان معاملوں کی فہرستیں بنائی گئیں جن کے بارے میں صرف وفاق کو یا صرف ریاستوں کو یا دونوں کو باہمی مشورے سے قانون وضع کرنے کا حق دیا تھا۔ اور اس طرح ایک بحث کو جو محض اصولی ہوتی اور برسوں تک جاری رہ سکتی تھی قانون سازی کے تفصیلی اور محدود مسئلوں کی شکل دے دی گئی۔ [illegible]

کا دستور بناتے وقت تمام ترقی یافتہ ملکوں کے دستور سامنے رکھے گئے۔ مگر سب سے زیادہ ۱۹۳۵ء کے دستور کا سہارا لیا گیا کیونکہ یہ ڈیڑھ سو برس کے تجربے کا ماحصل اور موجودہ حالات کا آئینہ تھا۔

آزاد ہندوستان کے دستور میں جمہور کی آزادی اور ریاست کے نئے فرائض کو نمایاں کرنا ضروری تھا۔ جمہور کی آزادی کو محفوظ کرنے اور ہر شہری کو برابر کی حیثیت دینے کے لئے ہر بالغ مرد اور عورت کو ووٹ کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں کم از کم ۸۵ فی صدی ان پڑھ بھی ہے اور جاہل بھی، لیکن جمہوریت کو معیار مانا جائے تو جتنا خطرہ اس اکثریت کو رائے دینے کا حق دینے میں ہے اس سے کہیں زیادہ خطرہ اسے شہریت کے بنیادی حق سے محروم رکھنے میں ہے۔ سیاسی لیڈر یہ دیکھیں کہ انھیں صرف آبادی کے پانچویں حصے پر اثر ڈالنا ہے تو باقی حصہ ووٹ ہی سے نہیں بلکہ حکومت کی توجہ سے بھی محروم رہے گا۔ موجودہ صورت میں سیاسی لیڈر مجبور ہیں کہ پوری آبادی پر نظر رکھیں اور جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں انھیں جلد سے جلد اس قابل بنائیں کہ وہ سیاسی معاملوں میں دلچسپی لے سکیں۔ ہر بالغ مرد عورت کو ووٹ کا حق دینے کے علاوہ ریاست پر شہریوں کی بہبودی کے لئے مناسب تدبیریں کرنے کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ ہر شہری کا حق ہے کہ وہ تعلیم پائے اس کے روزگار کا انتظام کیا جائے۔ اسے کام کی مناسبت سے معاوضہ ملے، اور نسل، مذہب یا جنسیت کی بنا پر کوئی ایسا امتیاز نہ کیا جائے جس سے اس کو نقصان پہنچے۔ ریاست اور حکومت کو کسی خاص مذہب یا تہذیب [illegible] نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہر مذہب کے لوگوں کو اس کا حق دیا گیا ہے کہ وہ مذہبی تعلیم کا انتظام کریں، اور اپنے مذہب کی تعلیم [illegible] آزادی کے ساتھ عمل کریں بشرطیکہ [illegible] کوئی بات اخلاق اور تہذیب کے خلاف نہ ہو [illegible] سے امن عامہ [illegible] خطرہ پیدا نہ ہو [illegible] اسمبلی کی اکثریت [illegible] اور وسعت [illegible] [illegible] نہیں [illegible] قانون کے ذریعے طے ہونا [illegible] اسی طرح شراب بندی اور گاؤکشی کی ممانعت [illegible] دستور میں اس کی حیثیت حکم کی سی نہیں ہے بلکہ ہدایت کی سی ہے۔ غیر مذہبیت کے دعوے کو بہت کم [illegible] کر دیتی ہے۔ [illegible] وفاقی حکومت [illegible]

کی گئی ہے ہندوستان کو ریاستوں کا ایک اتحاد قرار دیا گیا ہے۔ اور حکومت کے اختیارات ریاستوں اور اتحاد یعنی وفاقی حکومت کے درمیان تقسیم کئے گئے ہیں۔ وفاقی حکومت صدر، پارلیمنٹ، اور عدالت عالیہ یا وفاقی عدالت پر مشتمل ہوگی۔ ریاستوں میں ایک گورنر ہوا کرے گا، ایک قانون ساز مجلس اور ایک ہائی کورٹ۔ وفاقی اور ریاستی حکومت کا نقشہ ایک سا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ پریزیڈنٹ کا اختیار سب پر حاوی سمجھا جائے گا ناگہانی خطرے کی حالت میں اسے مداخلت کا حق ہوگا اور ریاست کا گورنر ایسے بلوں کو جنھیں وہ ریاست یا شہریوں کے لئے مضر سمجھتا ہوگا پریزیڈنٹ کی منظوری کے لئے بھیج سکے گا۔ ریاستی حکومتوں کی ساری کارروائیاں گورنر کے نام سے ہوا کریں گی۔ وفاقی حکومت کی ہر کارروائی پریزیڈنٹ کے نام سے ہوگی۔ اس کے علاوہ پریزیڈنٹ عزت اور حیثیت میں سب سے برتر ہوگا، اور غیر ملکوں کے سفیر اپنی سندیں اسی کے سامنے پیش کیا کریں گے۔

پریزیڈنٹ کو اتنی عزت اور اختیار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ متحدہ ریاستوں کی طرح ہندوستان کی وفاقی حکومت کا عملی اختیار پریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہوگا۔ حکومت تو وزیر کریں گے، اور وزیر اس پارٹی یا ان پارٹیوں کے نمائندے ہوں گے جنھیں پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہوگی۔ پریزیڈنٹ اس پارٹی کے لیڈر کو جو تعداد یا اثر کے لحاظ سے سب پر حاوی ہوگی وزیر اعظم مقرر کرے گا اور باقی وزیروں کو وزیر اعظم کے مشورے سے نامزد کرے گا جیسے کہ برطانیہ کا بادشاہ کرتا ہے اور اگرچہ قانوناً وزیر اس وقت تک کام کریں گے جب تک پریزیڈنٹ مناسب سمجھے حقیقت میں وزارت پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ اور اگر پارلیمنٹ کی اکثریت اس کے خلاف ہو جائے تو وہ پریزیڈنٹ کی خدمت میں استعفا پیش کر دے گی۔ متحدہ ریاستوں میں پریزیڈنٹ کو ایک انتخابی مجلس چنتی ہے۔ مگر خود اس مجلس کے اراکین کا انتخاب اب پارٹی کی بنا پر ہوتا ہے [illegible] پارٹی کے نمائندوں کو مجلس انتخاب میں اکثریت حاصل ہو جائے اسی کا امیدوار پریزیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عملاً تمام شہری پریزیڈنٹ کو منتخب کرتے ہیں اور اس وجہ سے حکومت کا اتنا اختیار جتنا کہ متحدہ ریاستوں کے دستور [illegible] پریزیڈنٹ کو دیا گیا ہے نامناسب نہیں۔ ہندوستان کے صدر کا انتخاب شہری براہ راست یا بالواسطہ نہیں کریں گے اور اسے سارے ملک کے شہریوں کا نمائندہ بنانے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی بھی نہیں تھا۔ پریزیڈنٹ کا انتخاب پارلیمنٹ اور ریاستوں کی قانون ساز مجلسوں [illegible] ایوان زیریں کے اراکین مل کر کریں گے گویا وہ ایسا شخص ہوگا جسے ملک کی کم و بیش تمام پارٹیاں پریزیڈنٹ بنانے پر راضی ہوں۔ وہ وفاقی وزارت کا نگراں ہوگا مگر اسے وزارت کے کاموں میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا وہ زیادہ سے زیادہ مجلس وزارت کو ایسے معاملے پر غور کرنے کی ہدایت دے سکے گا جو کوئی وزیر مجلس کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہو اور مجلس اسے اس کا موقع نہ دیتی ہو۔

آج سے ہند (بھارت)

ایک با اقتدار وفاقی ریپبلک ہے

قانون سازی کے
کُل امور تین فہرستوں میں تقسیم ہیں
(۱) یونین کی فہرست
(۲) مشترک فہرست
(۳) ریاست کی فہرست

یونین

سب ریاستوں نے
(جن میں نو صوبے، کئی ریاستوں کے یونین حیدرآباد، میسور اور کشمیر شامل ہیں مل کر ایک یونین بنا لیا ہے)

اسپیکر

پریسیڈنٹ
میعاد انتخاب پانچ سال
عاملہ کے کل اختیارات کا حامل
بری بحری اور ہوائی فوجوں کا سپریم کمانڈر

وائس پریسیڈنٹ

عوام کا ایوان

وزیروں کی مجلس

ریاستوں کا ایوان

وزیر اعظم

= ۲۵ ممبروں کے

= ۲۰ ممبروں کے

مجموعی طور پر عوام کے ایوان کے سامنے جواب دہ

پارلیمنٹ کا اجلاس کم سے کم سال میں دو بار ہوگا وہ ان تمام اُمور کے بارے میں قانون بنائے گی جو یونین کی فہرست یا مشترک فہرست میں ہوں قومی مفاد کے تقاضے سے ہنگامی صورت حال میں یا ریاستوں کی رضامندی سے ایسے امور کے بارے میں بھی قانون بنا سکتی ہے جو ریاست کی فہرست میں داخل ہیں۔

ریاست

اسپیکر

گورنر یا راج پرمکھ
جسے پریسیڈنٹ مقرر یا تسلیم کرے

چیرمین

قانون ساز اسمبلی

وزیروں کی مجلس

قانون ساز کونسل

چیف منسٹر

مجموعی طور پر قانون ساز اسمبلی کے سامنے جواب دہ

ہر ریاست کی قانون ساز اسمبلی ان امور کے متعلق قانون بنا سکتی ہے جو ریاست [illegible]

وفاقی پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں آبادی کی نمائندگی کرے گا، ایوانِ بالا ریاستوں کی۔ دونوں ایوانوں کا اختیار برابر ہوگا۔ سوا اس کے کہ مالی معاملوں کے متعلق بل پیش کرنے کا اختیار صرف ایوانِ زیریں کو ہوگا، اور ایوانِ بالا ایسے معاملوں میں صرف مشورہ دے گا۔ کسی مالی بل کو آخری اور قطعی طور پر نامنظور نہ کرسکے گا۔ اس کے علاوہ اگر ایوانِ بالا کسی تجویز یا بل کو جسے وزارت نے پیش کیا ہو اور ایوانِ زیریں نے پاس کردیا ہو نامنظور کرے تو وزارت استعفیٰ دینے پر مجبور نہ ہوگی۔ اس طرح ایوانِ زیریں کی حیثیت تقریباً ویسی ہی ہوگی جیسی کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں دارالعوام کی ہے۔ اسے ایک خاص اہمیت اور مرکزی مقام حاصل ہوگا، اور وہ ملک میں یکجہتی قائم رکھ سکے گا۔

عدالتی نظام میں بڑی تبدیلی یہ ہوگی کہ عدالتِ عالیہ ان تمام مقدموں کی سماعت کرے گی جو اب تک پریوی کونسل میں جایا کرتے تھے، وہ دستور کی تشریح کرے گی اور ضرورت کے وقت پریذیڈنٹ کو دستور سے متعلق معاملوں میں مشورہ دے سکے گی۔

ہندوستان کے نئے دستور پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ وہ بہت لمبا ہے۔ یہ اعتراض بیجا نہیں۔ اس لئے کہ جمہوری ریاست کے شہریوں کے لئے دستور سے واقف ہونا، اسے سمجھنا اور اس کی عزت کرنا ضروری ہے۔ دستور اتنا طویل ہو کہ شہری عام طور پر اسے دیکھ کر گھبرا جائیں تو یہ مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ہندوستان ایک وفاقی ریاست ہے اور وفاق کے رکنی ارکین کے بعض باہمی معاملے ایسے ہیں کہ اگر انھیں طے کرنے کے قاعدے پہلے سے مقرر نہ کردیئے جاتے تو بعد میں جھگڑے ہوتے۔ اب ان کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔ دستور کو عام فہم بنانے کے لئے اس کے خلاصے تیار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی حیثیت ویسی تو نہ ہوگی جیسی کہ اصل دستور کی، مگر شہریوں کو دستور سے واقف کرانے کے لئے یہ کافی ہوں گے۔ طوالت کا اعتراض اور قوی ہوجاتا، اگر ایسے معاملوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہوتی جن میں تفصیلی ہدایتوں سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے کہ پریذیڈنٹ اور وزارت کے تعلقات، مگر دستور نے ایسے معاملوں کو لیڈروں اور سیاست دانوں کی مصلحت اندیشی پر چھوڑ دیا ہے اور یہی مناسب بھی تھا۔ پریذیڈنٹ کا اثر بڑی حد تک اس کی شخصیت پر منحصر ہوگا۔ وزیر اعظم صحیح معنوں میں جنتا کی اکثریت کا نمائندہ ہوا تو وہ حکومت پر حاوی رہے گا اگر محض پارٹی کا لیڈر ہوا تو وہ ایک ہر دلعزیز پریذیڈنٹ کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔

دستور مختصر ہو یا مفصل، اصل میں ایک خاکہ ہوتا ہے جس میں رفتہ رفتہ تجربہ اور عمل سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ ہندوستان کا دستور ایسا خاکہ ہے جس میں رنگ بھرنے کی خاصی آزادی ہے۔ اس نے ذاتی ملکیت کو محفوظ کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ریاست پر ایسی ذمہ داریاں ڈالی ہیں جو ملکیت کے حق کو کسی حد تک نظرانداز کئے بغیر پوری نہیں کی جاسکتی ہیں۔ دستور کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ سماجی زندگی کی کسی خاص شکل کو قائم رکھے اور اس کا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ ایک بہتر فرضی نظام کے لئے زمین تیار کرے۔ اس نے قوم کے لئے عمل کی آزادی تجویز نہیں کی ہے مگر اس کا موقع ضرور رکھا ہے کہ آزاد ہندوستان آزادی کے ساتھ اپنے لئے بہترین مسلک تلاش کرسکے۔

نئے میدان اور نئی راہیں

(بسلسلہ صفحہ ۹)

تیسرے درجے کے لوگ انجنیری کے کالجوں یا یونیورسٹیوں سے حاصل کئے جاسکیں گے۔ دراصل انجنیر کا لفظ انھی لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

چوتھے درجے کے لوگ تیسرے درجے ہی سے ترقی کرکے اپنے آپ کو نمایاں اور ممتاز کرتے ہیں۔ ان میں ایجاد و اختراع کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے اور اکثر یہ سائنس والوں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہتے ہیں۔

پانچویں درجے کے لوگ دراصل انتظامی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں اس لئے ان کے لئے انجنیری کے فن سے واقفیت لازمی نہیں ہوتی۔ اس میں وکیل، ساہوکار اور سیاسی رہنما بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر انتظامی قابلیت کے ساتھ ساتھ انجنیری کے فن سے واقف ہو تو ایسا شخص زیادہ کامیابی اور اعتماد کے ساتھ نگرانی اور انتظام کرسکتا ہے۔

اس وقت ہمارے انجنیری کے کالجوں سے جو گریجوایٹ نکل رہے ہیں اور جنھیں ہماری اوپر کی تقسیم کے لحاظ سے کم و بیش تیسرے درجے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی تعداد ایک ہزار ایک سو تیس ہوتی ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اسی درجے کے جن انجنیروں کی آئندہ پانچ تا دس سال کی مدت میں حکومت کے سول محکموں کو جس میں فوجی محکمے شامل نہیں ہیں ضرورت ہوگی ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار سالانہ سمجھی جاسکتی ہے۔ سرکار کی طرف سے جو نئے ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کھولے جارہے ہیں ان سے امید ہے کہ تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوجائے گا اور ہمارے نوجوانوں کے لئے اس میدان میں بھی بہت سے مواقع نکل آئیں گے۔

انجنیری کے فن میں جو بہت سی شاخیں نکل آئی ہیں ان کا کچھ اندازہ ذیل کی تقسیموں سے کیا جاسکے گا:۔

۱۔ عام انجنیرنگ

۲۔ سول انجنیرنگ

(الف) فنِ تعمیر (آرکیٹکچر) کی

(ب) تعمیرات کی

(ج) آب پاشی کی

(د) صفائی کی نالیوں اور نلوں کی

(ہ) ریلوے سول

۳۔ بحری تعمیرات اور سمندری انجنیرنگ

۴۔ کیمیاوی انجنیرنگ

(الف) مٹی اور چینی کی چیزیں بنانے سے متعلق

(ب) ایندھن سے متعلق

(ج) دھات سے متعلق

(د) معدنیات کو مصنوعہ شکل دینے والی

(ہ) پٹرول کی

۵۔ مشین کی انجنیرنگ

(الف) ہوائی جہاز کی

(ب) ریلوں کی مشین کی

(ج) خود حرکی موٹروں کی

۶۔ بجلی کی انجنیرنگ

(الف) خبررسانی کی (تار اور بے تار برقی)

(ب) بجلی کی ریلوے کی

۷۔ کانوں کی انجنیرنگ

(الف) کان کھدائی کی

(ب) جیو فزیکل پراسپیکٹنگ

(ج) معدنیات کی کھوج کی

۸۔ صحت عامہ سے متعلق انجنیرنگ

۹۔ صنعتی انتظام

۱۰۔ صنعتی انجنیرنگ

۱۱۔ زراعتی انجنیرنگ

ان سب شعبوں کے لئے آزاد ہندوستان کو بڑی تعداد میں انجنیر درکار ہیں۔

صنعت سے آگے بڑھ کر جب تجارت، تعلیم، تفریحات اور کارخانوں کی نگرانی اور انتظام، مذہبی تعلیم، جسمانی تربیت و تعلیم اور دوسرے بہت سے کاموں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں بھی نوجوانوں کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا وسیع میدان ہے۔ نیشنل کیڈٹ کور کے نام سے جو ایک نیم سرکاری فوجی تنظیم ہے اسی نمونے پر سوشل کیڈٹ کور کو بھی بعض صوبوں میں قائم کیا گیا ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ سماجی اصلاح و ترقی کے کام کرنے والوں کی ایک منظم اور باضابطہ جماعت تیار کی جائے۔

نوجوان عورتوں کے لئے بھی خانگی معاشیات، تیمارداری، تعلیم اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں مخصوص اور ان کے علاوہ مردوں کے دوش بدوش ہر میدان میں بے شمار مواقع موجود ہیں۔۔۔ یہ شیخ چلی کے منصوبے نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد سرکاری اور غیر سرکاری عملی اسکیموں پر ہے جن میں سے بعض بن چکی ہیں، بعض بن رہی ہیں۔ بعض پر اگلے دو ایک سال میں عمل ہونے والا ہے بعض پر شروع ہوگیا ہے اور بعض کو عمل میں لانے میں صرف یہ دقت ہے کہ ان کے لئے سیکھے ہوئے لوگ موجود نہیں ہیں۔

غرض اب کام کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی لگن کی ہے محنت، مستقل مزاجی اور نیک سوچ بچار کے ساتھ ہمارے نوجوان جدھر بھی لگ جائیں گے اپنی ترقی کے لئے راستہ صاف کرتے جائیں گے اور آنے والی نسل کے لئے ان کے ہموار کئے ہوئے راستے پر چلنے میں اور بھی زیادہ آسانی ہوگی۔ اب ہم اپنی قسمت کے مالک خود ہوگئے ہیں۔ اب ہم کسی دوسرے پر اپنی پستی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ یا تو ہمیں الزام کو اپنے سر لینا ہوگا یا ایسے کام کرنا ہوں گے جن سے ہم اپنے آپ کو اس سے بری کرسکیں۔

ہمیں یقین ہے ہندوستان کے نوجوان اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے اور اپنے آپ کو ان بے شمار ذمہ داریوں کے لئے تیار کرکے نئے ہندوستان کی تعمیر میں اپنے شایانِ شان حصہ لیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے منصوبہ بندی کی، سرمائے کی اور مشینوں کی ضرورت ہے مگر سب سے بڑھ کر ان دماغوں کی ضرورت ہے جو منصوبے کو پورا کریں، سرمائے سے صحیح کام لیں اور مشینوں کو چلائیں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

ایک مسئلہ تو طے ہوا

شری راجا گوپال چاری کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد جمہوریہ ہند کی صدارت کے لئے ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انتخاب یقینی ہے۔ راجندر بابو کی بلند پایہ شخصیت ہر اونچے سے اونچے منصب کا بوجھ اٹھا سکتی ہے اور ان کے انتخاب کا متفقہ طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ صدارت کا مسئلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا مگر یہ مشکل ابھی تک حل نہیں ہوئی کہ کانگریس کے لئے ایسا صدر کہاں سے آئے جو اس کی تنظیمی اور اخلاقی اصلاح کر سکے۔ راجاجی شاید ملتک کمیشن کی صدارت کو منظور کر لیں مگر جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے اب وہ پارٹی پالٹیکس کے جھگڑوں میں پڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کانگریس کی صدارت کے لئے جن بزرگوں پر نظر پڑتی ہے وہ سب کے سب وزارت یا گورنری کی کرسیوں پر رونق افروز ہیں کیا ان میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنی کرسی چھوڑ دے یا جسے اس کی کرسی چھوڑ سکے؟

لکھنؤ کا فرقہ وارانہ فساد

لکھنؤ جیسے امن پسند شہر میں فرقہ وارانہ فساد کا ہونا سخت افسوس کی بات ہے فوری سبب کچھ بھی ہو مگر اصلی چیز وہی ہے جو عام طور پر اس قسم کے فسادات کی تہہ میں کام کر رہی ہے یعنی رجعت پسند طبقہ اس طرح بد امنی پھیلا کر ان ترقی پسند عناصر کو شکست دینا چاہتا ہے جنھوں نے ملک کو آزاد کرایا ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ لکھنؤ میں معاملہ جلد رفع دفع ہو گیا۔ حکومت نے پورے طور پر صورت حال پر قابو پا لیا اور ذمہ دار اصحاب کی کوششوں نے باہمی اعتماد کو بھی بحال کر دیا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان فتنہ انگیز عناصر کا بھی قلع قمع کر دیا گیا جنھوں نے فسادیوں کو شہہ دی تھی۔ حکومت، کانگریس اور ملک کی سب ترقی پسند جماعتوں کا فرض ہے کہ کم سے کم فرقہ پرستی کو دور کرنے کے لئے تو مل جل کر کام کریں ورنہ یہ مشترک دشمن ان میں کسی کو پنپنے نہیں دے گا۔

کیا بنگال کی حالت سنبھل جائے گی؟

پچھمی بنگال خصوصاً کلکتے کی حالت دو تین سال سے نہایت ناقابل اطمینان ہے کلکتہ ہندوستان کے صنعتی اور تجارتی نظام میں قلب کی سی حیثیت رکھتا ہے جب تک یہاں فساد اور بد امنی کا سلسلہ جاری رہے گا ہندوستان کا کاروبار جیسا چاہئے چل نہیں سکتا۔ پچھلے دو سال میں صوبائی حکومت کی قیام امن کی کوششیں صریحاً ناکام رہیں مرکزی حکومت نے شاید جمہوریت کے نظری اصولوں یا نامعلوم عملی مصلحتوں کی بنا پر یہاں کے معاملات میں زیادہ دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک بار وزیر اعظم جواہر لال نہرو کلکتہ گئے تھے اور کچھ توقع پیدا ہوئی تھی کہ اصلاحی تدبیریں اختیار کی جائیں گی لیکن ڈاکٹر بی سی رائے کے یورپ سے واپس آنے کے بعد مرکز نے پھر عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کر لی۔ اب مدت کے بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل کے کلکتے جانے سے مایوسی کے اندھیرے میں دوبارہ امید کی کرن نظر آئی ہے۔ کلکتے اور عام طور پر پچھمی بنگال کی موجودہ صورت حال کے چار سبب ہیں جن کی طرف سردار پٹیل نے بھی اپنی تقریروں میں اشارہ کیا ہے۔

(۱) صوبائی ذہنیت (۲) معاشی ابتری، (۳) کانگریس والوں کی آپس کی پھوٹ (۴) کانگریس کے مخالفوں کی فتنہ پردازی

پہلی تین چیزوں کی وجہ سے سازگار فضا میسر آ گئی ہے۔ یوں تو یہ چاروں اسباب نہایت اہم ہیں لیکن ان کی جڑ معاشی پریشانی اور بے روزگاری ہے۔ یقین ہے کہ سردار پٹیل کی کوششوں سے کم سے کم عارضی طور پر حالت سدھر جائے گی۔ اگر اس سے فائدہ اٹھا کر مزدوروں کی شکایتوں کو دور کرنے اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو کام سے لگانے کی کوئی تدبیر نکالی جا سکے تو یہ عارضی افاقہ پائدار ہو سکتا ہے۔

پاکستان

جنگ دونوں کے لئے مہلک ہے

پچھلے نومبر میں ہندوستان کی وزارت خارجہ کی طرف سے حکومت پاکستان کے پاس یہ تجویز بھیجی گئی تھی کہ دونوں ریاستیں اس بات کا باضابطہ اعلان کر دیں کہ آپس کے جھگڑوں کو براہ راست یا کسی بیچ والے کی معرفت گفت و شنید کر کے یا ثالثی کے ذریعے طے کر لیں گی اور کسی صورت میں بھی جنگ کا طریقہ اختیار نہیں کریں گی۔ اس کے سلسلے میں نور احمد صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لیاقت علی خاں صاحب نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں کہا کہ واقعی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ مہلک ہے۔ حکومت پاکستان نہ صرف اس پر راضی ہے بلکہ یہ اس کی دلی خواہش ہے کہ جن معاملات پر دونوں ریاستوں میں نزاع ہے ان کا منصفانہ فیصلہ جلد سے جلد ہو جائے اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ دونوں میں پائدار صلح کا صرف یہی ایک طریقہ ہے یہ تو تمہید ہوئی اب مطلب کی بات سنئے "حکومت پاکستان اس تجویز کا خیر مقدم کرتی ہے۔ لیکن اس کے خیال میں محض اس اعلان کی جو عام لفظوں میں کیا جائے قدر و قیمت مشتبہ ہے۔ ایسے فارمولا کی ضرورت ہے جسے دونوں جب التعمیل مان لیں۔ یہ توقع دلانے کے بعد کہ شاید اب وہ ایسا فارمولا پیش کریں گے جو دونوں کو اچھی طرح جکڑ دے گا انھوں نے نزاعی امور کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی جس میں جوناگڑھ کا معاملہ بھی شامل ہے اور ہر ایک کے فیصل کرنے کا ایک طریقہ بھی تجویز کر دیا کہ کون سا معاملہ بین الاقوامی عدالت میں جائے اور کون سا ثالثی کے ذریعے طے ہو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر وہی بحث چھڑ جائے گی کہ اس معاملے میں ثالثی کی گنجائش ہے اور کس میں نہیں اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ پنڈت نہرو کی تجویز کا مقصد یہ ہے کہ اس طویل مدت کے دوران میں جو ان معاملات کے طے کرنے کے لئے درکار ہے دونوں ملکوں کے باشندوں کے دل سے جنگ کا خوف دور کر دیا جائے جو ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ تعلقات، تجارت صنعت کوئی چیز بھی سدھرنے میں نہیں آتی۔

افسوسناک حادثہ

۱۴ر اپریل کو صوبہ سرحد کے قابل اور تجربہ کار گورنر صاحب زادہ محمد خورشید یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کی موت صوبہ سرحد کی موجودہ نازک حالت میں پاکستان کے لئے بڑا شدید نقصان ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کراچی میں ان کا ماتم ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے ہوا اور سرکاری طور پر ۱۴ دن کے سوگ کا اعلان کیا گیا۔ ان کی جگہ عارضی طور پر خان محمد ابراہیم خاں جو ڈلس کمشنر سوبہ سرحد گورنر مقرر ہوئے ہیں چند روز بعد مستقل گورنر کا تقرر ہوگا۔ اس سلسلے میں کئی نام لئے جاتے ہیں سب سے زیادہ امکان صاحب زادہ محمد سعید خاں کے تقرر کا معلوم ہوتا ہے۔

کھوڑو نے پھر زور باندھا

اس ہفتہ کی سب سے زیادہ سنسنی خیز سیاسی خبر سندھ سے آئی ہے کھوڑو صاحب حج سے واپس آنے کے بعد سندھ کے سیاسی ڈکٹیٹر بن گئے ہیں۔ یوسف ہارون صاحب پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ مولا بخش صاحب کو الگ کر کے کھوڑو گروپ کے دو آدمیوں کو اپنی کیبنٹ میں لے لیں۔ میر غلام علی تالپور نے جو یوسف ہارون کو اس ارب میں ... کی ۔۔۔ ممبروں نے دستخط سے کر کے ... ملے اور یہ دعوے کیا کہ اکثریت انہیں کے ساتھ ہے اس لئے انھیں وزیر اعظم بنا لیا جائے۔ مگر یہ چال الٹی پڑی۔ کھوڑو اور یوسف ہارون مل گئے اور میر غلام علی اکیلے رہ گئے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ یوسف ہارون نئی وزارت بنائیں گے جن میں پرانے وزیروں میں سے صرف وہ اور میراں محمد شاہ رہ جائیں گے اور ان کے علاوہ کھوڑو گروپ کے دو آدمی قاضی فضل اللہ اور غلام نبی پٹھان ۴

۴ اور ایک یا دو اور نئے وزیر ہوں گے ادھر پیر الٰہی بخش کا مطالبہ ہے کہ اسمبلی توڑ دی جائے اور نئے انتخابات ہوں۔

شمع آزادی کے پروانے

صالحہ عابد حسین

آج ہم آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔ ہمارا ملک دو سو سال کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد جمہوریت کی حیثیت سے دنیا کے آزاد ملکوں کی صف میں کھڑا مسکرا رہا ہے اور ہم فخر و مسرت سے پھولے نہیں سما رہے .... لیکن اس جوش مسرت میں ہمیں کھو نہیں جانا چاہیئے .... بلکہ یہ سوچنا چاہیئے کہ آزادی کی یہ نعمت ہمارے دیس کو کیسے ملی۔ کیسے دیس کے لاکھوں کروڑوں باسیوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی حاصل کرنے کا جو عہد کیا تھا اسے کس اٹل ارادے اور مضبوط عزم کے ساتھ پورا کر دکھایا۔ کس طرح ہر رکاوٹ کو جو اس راہ میں حائل ہوئی دور کیا، ہر دکھ ہر ذلت ہر مشکل کو جو پیش آئی خندہ پیشانی سے جھیلا مگر اس راہ سے قدم نہ ہٹایا ——— کتنی جانیں اس راہ میں نچھاور ہو گئیں۔ آج وہ مقدس ہستیاں ہمارے درمیان موجود نہیں مگر ان کی روحیں ضرور دیس کی آزادی پر خوش ہو رہی ہوں گی۔ ہمیں آج کے مبارک دن ان محترم روحوں کے سامنے یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہم محض اس آئینی آزادی پر جو اُن کی محنت اور کوشش سے حاصل ہوئی ہے قناعت نہ کریں۔ بلکہ اپنے دیس کو جہالت پستی اور افلاس کے گڑھے سے نکال کر ظلم اور ناانصافی کے پنجے سے چھڑا کر سچے معنوں میں ایک آزاد ملک بنائیں، اور وہ عزت اور شان بخشیں جو ایک آزاد جمہوریت کا حق ہے۔

ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے جن لوگوں نے کام کیا ان میں سے بڑے بڑے رہنماؤں اور لیڈروں کے نام اور کام تو سبھی جانتے ہیں لیکن اُن ان گنت سیوکوں کی قربانیوں سے کتنے لوگ واقف ہیں جو شمع آزادی پر خاموش پروانوں کی طرح نثار ہو گئے .... دنیا نے نہ جانا کہ وہ کون تھے لیکن دراصل آزادی کی دولت اُنھیں گمنام سپاہیوں کی بدولت ہندوستان کو نصیب ہوئی .... شمع آزادی کے اُن خاموش پروانوں میں دیس کی لاکھوں عورتیں بھی شامل ہیں جن میں سے بیشتر کے نام بھی کوئی نہیں جانتا اور ان کی کٹھنائیوں اور مصیبتوں کا تو اندازہ بھی کرنا مشکل ہے جو اس راہ میں انھیں جھیلنی پڑی ہوں گی۔ ان میں ہزاروں ایسی تھیں جنھوں نے آزادی کی کشمکش میں بذات خود حصہ لیا، سیاسی تحریک میں کام کیا، ستیہ گرہ کی، لاٹھیاں کھائیں جیل گئیں۔ اور لاکھوں ایسی تھیں جنھوں نے سالہا سال اپنے پیاروں کی جدائی کا دکھ سہہ کر اور تنہا زندگی کی مشکلوں کو جھیل کر آزادی کی مقدس جنگ میں بالواسطہ شرکت کی۔

اس دیس میں سروجنی دیوی جیسی نامور خاتون بھی پیدا ہوئی جس کی ادبی اور علمی قابلیت کی دنیا بھر میں دھاک تھی۔ جس کے قدموں پر شہرت و عزت بوسہ دیتی تھی، جو خوش ذوقی اور ظرافت، خلوص اور رواداری، عالی ظرفی اور بلند ہمتی، بے غرضی اور بے تعصبی، رواداری اور مساوات کا ایک حسین مرقع تھی جس کی مثال دنیا میں کم ملے گی

اور ہاں ہندوستان نے ماتا کستوربا جیسی پاکیزہ ہستی کو جنم دیا، جس نے اپنے پتی کے کٹھن اصولوں اور بلند مقاصد کو اپنایا اور پچاس سال تک باپو کے دیش سیوا کے ہر کام میں برابر کی شریک رہی۔ اس سے لوگ واقف ہیں، لیکن کیا اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مستقل مزاج بی بی نے اپنی عادتوں اپنے رسم و رواج، اپنے عقیدوں اور توہمات اور اپنے مذہبی نظریات کو جن کی انھیں بچپن سے تعلیم دی گئی تھی کس طرح چھوڑا یا نئے سانچے میں ڈھالا ہوگا؟ انھیں گاندھی جی کے نئے اصولوں کو اپنانے اور وہ کٹھن زندگی بسر کرنے میں کیا کچھ ذہنی کشمکش اور جسمانی تکلیف سہنی پڑی ہوگی؟ لیکن اس باعزم خاتون نے جب یہ دیکھ اور سمجھ لیا کہ مہاتما جی جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں، وہ حق کی تلاش میں ہیں اور خدا کی معرفت اور محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ان کے نزدیک خلق خدا کی محبت اور خدمت ہے تو وہ دل و جان سے ان کی ہم نوا ہو گئیں، اور آخری دم تک اُن کا ساتھ دیا۔

آج بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں "بی اماں" مرحومہ یاد ہوں لیکن اس بوڑھی اور جوان ہمت بی بی کا بھی تحریک آزادی میں بڑا حصہ ہے ۱۹۲۰ء میں جب خلافت کمیٹی اور کانگریس مل جل کر کام کر رہی تھی اور ہندو مسلمان ایک دل اور ایک جان ہو کر آزادی کی تحریک میں شریک تھے۔ مولانا محمد علی کی بوڑھی ماں نے بھی جو اس وقت سارے دیس کی "بی اماں" تھیں اس میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ وہ پردہ دار ضعیفہ برقعہ اوڑھے، منہ کھولے شہر شہر، گاؤں گاؤں گھومتی تھیں اور ہزاروں مردوں اور عورتوں کے مجمعوں میں تقریریں کرتی تھیں۔ ان کی سیدھی سادی تقریر میں اُن کے جوش اور خلوص کی بدولت ایسا اثر ہوتا تھا کہ سننے والوں میں ملک کے لئے ایثار و قربانی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی، عورتوں خاص کر مسلمان عورتوں میں آزادی کا احساس بیدار کرنے اور آزادی کی تحریک سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کرنے میں "بی اماں" کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس صاحب عزم بوڑھی مجاہدہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے خوشی سے اپنے جوان ہمت شیر دل بیٹوں کو وطن کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور ماں کی مامتا کو آزادی کی محبت پر قربان کر دیا۔ اسی کی مثال اور فیض تربیت نے مولانا محمد علی مرحوم جیسا آزادی کا شیدائی اور پرستار پیدا کیا جن کی زبان پر زندگی کے آخری چند لمحوں میں یہ بھی الفاظ تھے کہ اگر میرا دیس آزاد نہ کیا گیا تو میں غلام ملک میں واپس نہ جاؤں گا۔

اور پھر کیا ہمارا دیس کملا جا نثار، جان ہار کملا کو بھلا سکتا ہے؟ کملا نہرو .... جواہر لال کی رفیقۂ حیات ...... ناز و نعم کی پلی، عیش و عشرت کی گود میں کھیلی ہوئی نوجوان لڑکی ——— جس نے جوانی کے بہترین سال، جب ہر عورت کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے، اپنا ایک گھر بنائے اور اس میں مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کرے، اپنے محبوب شوہر کی جدائی میں کاٹے ——— اس نے محبت کی آگ میں سلگ سلگ کر اپنی ہڈیاں جلا ڈالیں مگر اپنے اولوالعزم شوہر کو ایک بار بھی اس بڑے کام سے نہ روکا جس کی بدولت کملا کو جواہر دیکھنے کو بھی نہ ملتا تھا۔ اس نے ایک بار بھی یہ مطالبہ نہ کیا جو اس کا حق تھا کہ اس کا پتی اپنی بیوی بچی کی محبت اور رفاقت کا حق بھی ادا کرے ——— اس نے سمجھا کہ اس وقت ہندوستان کے ہر سپوت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر محبت، ہر آرام ہر آرزو کو بھول کر دیس کی خدمت اور اس کو آزاد کرانے کی ان تھک کوشش میں سرگرم رہے ——— شاید یہ بھی سوچا ——— کہ آزادی کے بعد ہی وہ دن آئے گا جب وہ اپنے میاں کے ساتھ رفاقت و محبت کی پرسکون دل کش زندگی بسر کر سکے گی۔ وہ اپنی کمزوری اور بیماری کے باوجود خود بھی میدان عمل میں کود پڑی۔ اس نے تحریک آزادی میں پورا حصہ لیا، لاٹھیاں کھائیں اور جیل کی کوٹھری کی "دل کشی" زندگی کا وہ لطف اٹھایا جو اس کا شوہر ہمیشہ اٹھاتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا نازک جسم اس بار کو نہ سہہ سکا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہو گئی۔ اور قید سے چھوٹنے پر بھی کچھ عرصے کے عارضی افاقے کے بعد برابر بیمار رہی اور آخر کار ——— آزادی کے عشق اور جواہر لال کی محبت میں سرشار، یہ دیوی بھرپور جوانی میں اللہ کو پیاری ہوئی۔ کملا نہرو نے آزادی کا سورج طلوع ہوتے نہ دیکھا۔ لیکن وہ خود ہمیں اس کی جاں بخش کرنوں میں جھلکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

ہم سروجنی اور کستوربا، بی اماں اور کملا اور ایسی اور تھوڑی سی محترم نامور ہستیوں کا نام جانتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ لاکھوں وہ عورتیں بھی ہیں جنھوں نے نام و نمود کی پروا کئے بغیر خاموشی سے دیس کی سیوا کی اور آزادی کی تحریک میں کام کیا۔ انھوں نے خاندان اور سماج کی جھڑکیاں

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

بزم بے تکلف

لال بجھکڑ کو تو سنا ہی تھا، چودھری جنڈیل کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جنڈیل تو ظاہر ہے جرنیل کی خرابی ہے اور چودھری محض نسبت کا فتور ہے۔ اس لئے کہ دراصل یہ وراثت کے چلا ہے اور نام کے بہادر ہیں [illegible] لیکن پیدائش یقینی کہ تعلیم [illegible] ایک بھی نہیں کہہ سکتے ہیں [illegible] اس [illegible] بہادر کا کوئی تصور نہیں تھا بچار پس میں تین چار برس اپنے چچا کے ساتھ شہر میں رہے وہاں چھری تعلیم میں گرفتار ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب کڑیل جوان اور اڈیل ٹٹو سلام پر بھیجے جا رہے تھے یہ بھی مہاجن کے سود اور بیوی کے بول مع سود سے جان چھڑانے کے لئے فوج میں بھرتی ہو کر فرانس چلے گئے۔ وہاں اور تو سب چیزیں انھیں پسند آئیں، مگر جرمنوں کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی کہ وہ مسترہ انچ کے دہانوں کی توپوں سے گولے پھینکتے تھے۔ رائفل کی گولیوں تک تو خیر

ع برسر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد

کا معاملہ تھا یعنی وہ خندق میں چھپے ہوئے سپاہیوں کے سروں پر سے گذرتی چلی جاتی تھیں۔ مگر یہ کم بخت توپ کے گولے تو میدان کو خندق اور خندق کو میدان بنا دیتے تھے۔ چودھری بڑے رقیق القلب آدمی تھے۔ بعض اپنے اوپر بڑا قلق آیا کہ ہائے یہ تو وہی قصہ ہوا کہ گھر چھوڑ تماشے جائے، ناحق چوٹ چلا یا کھائے۔ اگر کوئی گولا ادھر آن پڑا تو ہم بچارے مفت میں مارے گئے۔ دراصل وہ بچارے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے آئے تھے۔ مگر یہاں اس کا ڈول نظر نہیں آیا۔ اس لئے انھوں نے یہ ترکیب کی کہ لہو لگا کے شہیدوں سے خارج ہو گئے۔ یعنی ایک دن موقع پا کے چاقو سے اپنے داہنے ہاتھ کی کلمے کی انگلی کاٹ ڈالی اور "ان فٹ" ہونے کی وجہ سے "ڈس چارج" کر دیے گئے۔ مگر لام سے لوٹ کر انھوں نے اپنے جنگی کارناموں کا ایسا لام باندھا کہ نہ صرف ہمارے گاؤں میں بلکہ آس پاس کے دیہات میں چودھری جنڈیل کے نام سے مشہور ہو گئے۔ فرانس جانے سے پہلے انھوں نے اپنا کرگھا ہمسائے کو ٹھیکے پر دے دیا اور کھیت بٹائی پر دے دیے تھے۔ وہی انتظام اب بھی قائم رکھا، اس لئے کہ یہ نفیس نفیس بٹائی یا کھیتی کا کام کرنے سے ان کی شان جنڈیلی میں فرق آتا تھا۔ اب ان کا عام شغل ہر قسم کے علمی، عملی مسائل کا تانا باناتا اور حاضر مشغل مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کی زمین میں ہل چلانا تھا قریب قریب روزانہ شام سے رات گئے تک گاؤں کی چوپال میں ان کی پریس کانفرنس ہوا کرتی تھی جس میں وہ تہ بازاری سے کر جور بازاری تک، اور زمینداری کے خاتمے سے لے کر دنیا کے خاتمے تک ہر قسم کے دلچسپ مسئلوں کو حل کیا کرتے تھے۔

اس سیاق و سباق کے ساتھ اب چودھری جنڈیل کی ایک پریس کانفرنس کا حال سنئے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کا دن گذرنے کے بعد شام کو حسب معمول چودھری صاحب چلم سے لو لگائے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ آج مجلس میں غیر معمولی چہل پہل تھی اور سب کی زبان پر آجادی دن کا چرچا تھا جو صبح کو زور شور سے منایا جانے والا تھا۔ سننے میں نمبردار کے لڑکے نے جو شہر میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا کسی سے کہا "وہ کل معمولی آزادی کا دن تھوڑی ہے جو ہر سال ہوا کرتا تھا۔ کل تو جمہوریت کا دن ہے"۔ لوگ لڑکے کی طرف متوجہ ہوئے تو چودھری گھبرائے کہ لو یہ تو ہمارا ایک حریف پیدا ہو گیا۔ جھٹ سے بول اٹھے "سچ کہتا ہے بچہ۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے بڑا جہیں عالم دیتا ہے۔ ہاں بیٹا کل جمہوریت کا دن ہے۔ آؤ تمھیں جمہوریت کا حال بتائیں۔ ہم تو پھر آئے ہیں اور بلایت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں۔ پھرانس میں بڑی خوبصورت اور سستی ہوتی ہے مگر جرا نازک ہے ہاتھ لگانے سے ٹوٹتی ہے۔ بلایت کا مال موٹا اور مہنگا سہی پر ہے بڑا مجبوت۔ ہتھوڑے سے بھی توڑنا چاہو تو لچک جائے پر ٹوٹنے کا نہیں۔ جرمن اور پھرانس میں جمہوریت ہی کی تو ساری لڑائی تھی ہوا یہ کہ پھرانس کی جمہوریت کو دیکھ کر جرمن کے منہ میں پانی بھر آیا اس نے کہا میں تو اسے چھین کر رہوں گا سچ مچ وہ ایسا تگڑا جوان تھا کہ پھرانس بچارا بوڑھا اس کے آگے کیا ٹھہر سکتا تھا۔ انگریج، امریکہ، روس سب نے سوچا کہ یہ تو بری بات ہے آج پھرانس کی جمہوریت چھن گئی تو پھر کل ہماری چھن جائے گی۔ بس بھیا سب مل کر جرمن پر پل پڑے اور مارتے مارتے بھرکس نکال دیا۔ مگر وہ نپٹا ایسا لاتو کہ بیس اکیس برس پیچھے ہٹلر کا بھیس بنا پھر آن دھمکا اور اب کی بار تو بچارے پھرانس کو دبوچ کر بیٹھ گیا۔ پھر اللہ تمھارا بھلا کرے اسی انگریج، امریکا اور روس کے تگڑم نے مل کر بڑی مشکلوں سے جمہوریت کو چھڑایا تھا۔ جمہوریت ایسی چیز ہے کہ سب کی رال اس پر ٹپکتی ہے۔ یہ جو کانگریس اور انگریج کی رسہ کشی ہے لڑائی جھگڑے تھی نا سو اسی جمہوریت کے پیچھے۔ کانگریس کہتی تھی ہمیں جمہوریت منگا دو نہیں تو اپنا رستہ سنبھالو ہم اپنی آپ بنا لیں گے آخر کو وہی ہوا۔ انگریج چلا گیا اور کانگریس نے دلی میں ایک کارخانہ کھول جلدی جلدی اپنی دیسی جمہوریت گھڑ ڈالی۔ اسی کا دیس میں تہوار منایا جائے گا یہیں بھی۔"

نمبردار کا لڑکا کچھ تمسخر کچھ حقارت کے انداز سے یہ لکچر سن رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اس نے بات کاٹ کر کہا "چودھری جی تم ساری رام کہانی سنا گئے گر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں یہ کہ تمھاری 'جمہوریت' ہے کیا چیز؟"

اب چودھری جنڈیل آئیں تو جائیں کہاں۔ برس ہی تو پڑے "ارے کم بخت کو ڑھ مغج تیسنا سنی انگریجی پڑھ ڈالی اور آج تک اتنا نہ مالم ہوا کہ جمہوریت کیا چیز ہے؟ نمبردار صاحب تجھے پڑھا کر بھی کھو دیا، چل دور ہو میرے سامنے سے"۔

شمع آزادی کے پروانے (بسلسلہ صفحہ ۱۱)

اور تانے تشنے سہے، بچوں کی محبت کو چھوڑا، گھروں پر سکون اور باامن زندگی کو خیر باد کہا اور اپنے مردوں کے ساتھ میدان کارزار میں کود پڑیں۔ انھوں نے لاٹھیاں کھائیں۔ بدزبان اور اجڈ سپاہیوں اور افسروں کی بدزبانیاں اور بدتمیزیاں برداشت کیں۔ جیل کی سختیاں جھیلیں ـــــ اس لئے کہ ان کا ملک غلامی کی لعنت سے آزاد ہو جائے۔

اور پھر ـــــ عورتوں کا ایک گروہ بھی ہے ـــــ جن کے پیروں میں سیاسی غلامی کی بیڑیاں اور گردن میں سماجی کینیزی کا طوق تھا ـــــ وہ اس طرح جکڑی ہوئی تھیں کہ ہل نہ سکتی تھیں۔ وہ خود دیس کی آزادی کی تحریک میں کام نہ کر سکیں۔ لیکن بالواسطہ انھوں نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ وہ مائیں جنھوں نے اپنے لاڈلے بیٹوں کو آزادی کی راہ میں نچھاور کر کے اپنی ممتا کی بھینٹ دی ہے، وہ بہنیں اور بیٹیاں جن کے بھائی اور باپ اس راہ میں شہید ہوئے ہیں۔ وہ سہاگنیں جن کے شوہروں نے آزادی کی تحریک میں اپنے کو کھپا دیا تھا ـــــ انھوں نے اپنے چین اور آرام کو اپنی گھریلو زندگی کی مسرتوں اور راحتوں کو اپنے عشق و محبت کے ارمانوں کو آزادی کی دیوی کے آگے بھینٹ چڑھایا ہے ـــــ ذرا تصور کیجئے اُن بے بس، بے زبان عورتوں کے دل کی حالت کا جن کے پیارے دیس کے لئے کام کر رہے ہیں، تکلیفیں سہہ رہے ہیں اور وہ ان کا ساتھ نہیں دے سکتیں، مرد سیاسی کام میں لگے ہیں اور گھر میں بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں۔ وہ جیل میں بند ہیں اور ان کی بوڑھی مائیں اور جوان بیویاں ان کی جدائی کے روح فرسا لمحات گھروں کے قید خانے میں بند کاٹ رہی ہیں ـــــ اور پھر یہ بھی ہوا ہے کہ مرد مار ڈالے گئے ہیں، شہید ہو گئے ہیں، اور ان کے گھروں کی عورتیں زندگی بھر کے لئے زندہ در گور رہ گئی ہیں۔ یہ سب جان لیوا، روح فرسا تکلیفیں آخر انھوں نے اسی لئے تو چپ چاپ برداشت کیں کہ ان کا ملک غلامی کی سے چھٹکارا پائے اور اسے آزادی کی نعمت حاصل ہو۔

ان نامور اور گمنام، مشہور اور خاموش و بے زبان ہستیوں کی خدمت میں جنھوں نے اپنی مسرتیں اور راحتیں اپنی زندگیاں، اپنی جانیں آزادی کی راہ میں قربان کیں۔ ہم دلی عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

اے شمع آزادی کے پروانو! تمھارا دیس ہمیشہ تم پر فخر کرتا رہے گا! کاش وہ اس قابل بن سکے کہ تمھاری مقدس روحیں اس پر فخر کریں ؞

ادب کی تخلیقی تنقید

سید احتشام حسین

نقاد غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ ادیب کے محرکاتِ تخلیق کا پتہ لگائے۔ ان سرچشموں کا منبع تلاش کرے جہاں سے ادیب نے زندگی حاصل کی ہے۔ اس فلسفے کو ڈھونڈھ نکالے جو ادیب کے خیالوں کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً ایک منزل میں تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ وادیِ کوہسار میں جانا پڑے گا۔ لیکن اس کا کام وہیں ختم نہیں ہوجائے گا بلکہ آگے بڑھ کر وہ ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کرکے اس کے حقیقی خیالات اور معاشی تعلقات کا پتہ چلائے گا۔ ادیب کی جانبداری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تمدن میں ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔ یہ سارے کام محض تشریح یا تاثر کے اظہار سے ممکن نہیں ہیں۔ ان کے لئے نقاد میں خود ایک تخلیقی قوت کی ضرورت ہے۔

ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوششیں ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔ سب سے پہلی پرکھ تو خود ادیب اور شاعر کی ہوتی ہے، جس نے اپنے جذبات، خیالات اور تجربات کو ترتیب دے کر، خاص اسلوب اور لطافت سے پیش کیا لیکن تخلیق کرنے والے کی وہ تنقیدی صلاحیت جو وہ ابتداءً اپنے خیالات کی تہذیب و تنظیم میں صرف کرتا ہے، بعض نفسیاتی اثرات اور وفورِ جذبات کی وجہ سے کافی نہیں ہوتی، پھر بھی یہ صلاحیت جتنی قوی ہوگی تخلیقی کارنامہ اسی قدر اعلیٰ اور بے داغ ہوگا۔ ادیب اور شاعر کی تنقیدی قوت اس کی تخلیقی قوت کے ساتھ جاری رہتی ہے، اس کا عمل الگ سے نہیں ہوتا۔ اس لئے اصطلاحی اور فنی مفہوم میں اُسے تنقید نہیں کہا جاتا۔ فن کی حیثیت سے تنقید اس وقت شروع ہوتی ہے جب کسی تخلیقی یا علمی کارنامے کے متعلق کسی اور کی طرف سے اظہارِ خیال کیا جاتا ہے، گو خود فن کی تخلیقی نوعیت بھی بحث کا اہم موضوع بنی ہوئی ہے لیکن وہ الگ حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اگر کروچے اور اس کے ہم خیالوں کو پیشِ نظر رکھ کر فن سے وہ اظہار مراد لیا جائے جو فن کار کے شعور اور ادراک میں پیدا ہوتا ہے تو پھر درحقیقت تنقید کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ کروچے کے نقطۂ نظر سے فن کی تکمیل خیال ہی میں ہوجاتی ہے، اس کا کاغذ پر آنا یا لفظوں میں ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ خود ہمارے اردو شعراء میں جوش ملیح آبادی نے فن اور تنقید کے اسی تعلق کو ان اشعار میں پیش کیا ہے ؎

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیبِ ادب
ڈھل کے گو وہ گوہرِ غلطاں کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاجِ زرفشاں
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں
شاعری کا خانماں ہے نطق کا لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں
لوگ جن کی جاں گدازی سے ہیں دل تڑپے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
جام میں آتے ہی اُڑ جاتی ہے شاعر کی شراب
ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

یہ تنقید اور فن کا ایک انوکھا اور غیر معمولی تصور ہے اور الگ بحث کا محتاج۔ یہاں فن اور ادب کا عام تصور پیشِ نظر ہے۔ ادب لکھنے والے کے خیالات کا وہ اظہار ہے جسے وہ سماج کے دوسرے افراد تک پہنچانے کے لئے ایسے ذرائع سے نمایاں کرتا ہے، جسے سماج کے دوسرے افراد سمجھ سکیں یا کم از کم سمجھنے کی کوشش کر سکیں۔ ایسے ادب کی تنقید کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کا جواب دینے میں تنقید کے نہ جانے کتنے طریقے وجود میں آئے۔ جس طرح تخلیقی ادبی کارنامے سے مصنف کے تصورِ کائنات کا پتہ چلتا ہے اسی طرح طریقۂ تنقید کے استعمال سے نقاد کے تصورِ زندگی اور فلسفۂ حیات کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ جس طرح نقاد ادب کو پرکھے گا، ادیب سے جس قسم کی امید لگائے گا، جس طرح کے مطالبے کرے گا ادب اور زندگی میں جس نوع کا تعلق چاہے گا وہی اس کے تصورات کی غمازی کرے گا۔ اگر کوئی ادیب ان خیالات کو ادب اور فن کی مکمل شکل سمجھتا ہے جو اس دل میں ہیں وہ گویا اس رابطے کا پتہ نہیں دینا چاہتا جو ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان قائم ہوتا ہے وہ یا تو اپنی تخلیقات کو پرکھ سے بالاتر سمجھتا ہے یا تنقید سے ڈرتا ہے۔ لیکن عام زندگی میں اس سے مفر ممکن نہیں۔ جس نے بھی کچھ لکھا ہے اور اُسے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ تنقید سے بچ نہیں سکتا چاہے وہ تنقید کی کوئی نوعیت کیوں نہ ہو۔

ادیبوں کے علاوہ نقادوں کا بھی ایک گروہ ہے جو اس سلسلے میں ادیبوں کی ہمنوائی کرتا رہا ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید نگار کا کام ادب کے متعلق رائے دینا نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کو دہرا دینا ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت طاری ہوئی تھیں۔ اس گروہ کی نمائندگی تمام تاثر پسند نقاد کرتے ہیں لیکن اس کی سب سے واضح نمائندگی امریکہ کے ایک مشہور نقاد اسپنگارن نے کی ہے اور اس کا نام تنقید جدید اور تخلیقی تنقید رکھا ہے۔ اردو میں بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس نقطۂ نظر کے حامی، پیرو اور ترجمان موجود ہیں۔ تاثراتی تنقید مختصر لفظوں میں یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ ادب محض تاثر ہے اور اس کی تنقید بھی محض ان تاثرات کا مجموعہ ہے جو کسی کتاب کے پڑھتے وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ان ادبی نتائج اور اسکو سماجی اقدار کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اسپنگارن نے انھیں تصورات کو ایک خاص شکل دے کر اس کا نام تخلیقی تنقید رکھ دیا۔ یہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شعور سے الفاظ کے معنی کس طرح متعین ہوتے ہیں۔ اسپنگارن کی تنقید کے لئے تخلیقی کی صفت استعمال کرنا خود تخلیق کے مفہوم کے متعلق الجھن پیدا کرتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ کسی کتاب کو پڑھنا اور اس سے لطف حاصل کرنا ہی اصل تنقید ہے۔ اسی پرلطف اثر پذیری کو تنقید کہنا چاہیے۔ ایک کتاب پڑھ کر ہم اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا! بعض دوسرے نقادوں نے یوں کہا ہے کہ تنقید کا اصل کام ان کیفیات کی بازآفرینی ہے جو کسی شاعر یا ادیب پر گذری تھیں۔ اسی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر بعض نقاد کتابوں کی تشریح اور تفسیر کو تنقید سمجھنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تنقید اور تشریح میں بڑا فرق ہے۔ اس کے علاوہ ان تاثرات کا پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ممکن بھی نہیں ہے جو خاص طرح کے محرکات کے ماتحت کسی شاعر یا ادیب پر طاری رہ چکے ہیں۔ اس لئے تنقید کا یہ نظریہ ذاتی ذوق اور فیصلے سے بچنے کا محض ایک ذریعہ ہے، تنقید نہیں ہے۔

اسپنگارن نے اسے تخلیقی کیوں کہا ہے یہ بھی بہت دلچسپ اور پر لطف بحث ہے۔ وہ لکھتا ہے اگر ہم لوگ تاثرات کے معاملے میں حساس ہوں اور ان کا اظہار کرنے پر بھی قادر ہوں تو ہم میں سے ہر شخص ایک نئی کتاب کی تخلیق کرے گا جو اس کتاب کی جگہ

حاصل کرے گی جس سے ہم نے وہ تاثرات حاصل کئے تھے۔ فن کا سکے تاخرات کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اسپنگارن کے خیال میں تخلیقی تنقید ہے۔ وہ صاف صاف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ادب یا تنقید کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی اخلاقی یا سماجی مقصد کا اظہار کرے یا اُسے آگے بڑھائے۔

ان خیالات پر تفصیل سے تنقید کی جاسکتی ہے ان کے محرکات تلاش کئے جاسکتے ہیں اور امریکہ کی سیاسی طبقاتی کش مکش میں غیر جانب دار رہنے کے رویے کی حقیقت پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اسپنگارن کے خیالات سے منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب میں موضوع اور مفاد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اچھے، بُرے، غلط، صحیح جس تصور پر مصنف نے کتاب کی عمارت کھڑی کی ہے یہ اسی پر نقاد سے بھی ایک کتاب اسی طرح لکھنے کا مطالبہ ہے کہ ان تصورات کی اچھائی برائی بحث اور سقم معرض بحث میں نہ آویں۔ غیر جانبداری کا یہ رویہ نقاد سے اس کا ہتھیار چھین لیتا ہے لیکن اسپنگارن کے سے نقاد یہی چاہتے بھی ہیں کہ وہ غیر جانبدار رہیں اور دنیا کو صحیح حالات سے بے خبر رکھیں۔ صورت یہ ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ساری دنیا میں سرمایہ اور محنت کی جنگ تیز ہوگئی اور محنت کشوں نے روس میں اپنی حکومت قائم کرلی تو امریکہ میں ایسے ادیب نقاد اور مفکر اپل پڑے جنھوں نے طبقاتی کشمکش کی اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور سرمایہ داری کے قلعہ کو محفوظ رکھنے کے لئے عوام کے ذہن کو بھلاوے میں رکھنا چاہا۔ اسپنگارن وغیرہ امریکہ کی سیاسی زندگی میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ادب کے معاملے میں اس طرح غیر جانبدار رہ کر وہ حاکم طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ہر ملک کے ادیب اور نقاد جب حالات کو بہتر بنانے والی عوامی جدوجہد سے دور رہنا چاہتے ہیں تو یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور دھوکا دینے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی طرف نہیں ہیں۔ ادیب اور نقاد کو طرفداری اور جانبداری سیاسی اور سماجی اقدار کی تبلیغ اور تلقین سے کیا واسطہ لیکن ہر نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ ان کا منطقی رویہ کس کی حمایت کرتا ہے اور کس کا طرفدار بن جاتا ہے۔

اسپنگارن اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ تنقید نگار کو غلطی اور صحت کے متعلق رائے نہیں دینا چاہیئے۔ یہ نقاد کا نہیں فلسفی کا کام ہے۔ یہاں بہت سے نفسیاتی سوال پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کسی باشعور ادیب یا نقاد کا کسی مسئلے کے متعلق کوئی رائے نہ رکھنا کس طرح ممکن ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ادب اظہار ہے تو یقیناً کسی چیز، بات، خیال، مقصد یا خواہش کا اظہار ہوگا اور اگر پڑھنے والا بھی اپنا کوئی شعور رکھتا ہے تو وہ بھی ان باتوں، خیالوں اور خواہشوں کے متعلق کوئی رائے رکھتا ہوگا جس کا ادیب کی رائے سے متفق ہونا لازمی نہیں۔ ایسی حالت میں اسپنگارن کے خیال کے مطابق یا تو تنقید سے دست بردار ہو جائے گا یا اپنی رائے کو زبردستی دبا کر مصنف کی رائے میں مدغم کر دینا ہوگا۔ یہ بات کہاں تک قابل عمل ہے یا ہو سکتی ہے، یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔ پھر یہی نہیں ہے، اصل سوال ایسی تنقید کی اہمیت اور افادیت کے متعلق پیدا ہوتا ہے جو تنقید کسی تاثر کے متعلق محض تاثر ہے وہ اصل تاثیر کا کتنا دھندلا زور اور جوش رکھتی ہوگی۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی مصنف کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی تنقید اس کی بالکل رہنمائی نہ کرسکے گی اور اس کی اہمیت اور افادیت معدوم ہوجائے گی۔ تخلیقی تنقید کا یہ نظریہ ایک بے حقیقت، کمزور اور ناکارہ فلسفہ پر مبنی ہے۔ اس میں افلاطون کے اس خیال کا زور بھی موجود نہیں ہے جس سے اس نے شاعری کو معمولی نقالی قرار دے کر غیر اہم ثابت کرنا چاہا تھا۔ یہ تنقید تنقید ہی نہیں ہے چہ جائیکہ تخلیقی تنقید۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسپنگارن نے "تخلیقی تنقید" کا لفظ صحیح استعمال نہیں کیا اور محض ایک لفظی گھروندا کھڑا کیا ہے تو ادب کی تخلیقی تنقید سے کیا مراد لینا چاہیئے؟

اوپر کی چند سطروں میں "ادب" "تخلیق" اور "تنقید" تینوں لفظوں کے متعلق اشارے کئے جاچکے ہیں، اس لئے اب جو کچھ کہا جائے گا اُسے انھیں اشاروں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ ادیب کوشش کے باوجود بے تعلق نہیں رہ سکتا کیونکہ اس کے شعور کی ترتیب میں جن خارجی، مادی اور سماجی عناصر نے حصہ لیا ہے وہ اس کی بے تعلقی کے منافی ہوں گے۔ ہاں ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ بعض حالات کے ماتحت کوئی شخص اپنی شعوری طاقت سے ان عناصر سے مقابلہ کرکے اپنے لئے نئے ذہنی سامان فراہم کرلے اور اپنے خیالوں کو نئی طرح ترتیب دے لے۔ اگر یہ بات محض خیالی ہوگی تو اس کی جڑیں گہری نہ ہوں گی اگر سماجی شعور پر مبنی ہوگی تو دیرپا اور گہری ہوگی۔ اس کی ایک سادہ مثال یہ ہے کہ متوسط طبقے کا کوئی باشعور انسان اپنے طبقے کے مفاد کے نقطۂ نظر سے عوام کا دشمن بھی ہوسکتا ہے اور سماجی حالات طبقاتی تضاد اور محنت کش طبقے کی فتح کے خیال سے اپنے طبقے کی ثنویت اور دوعملی سے آزادی حاصل کرکے عوام کا دوست اور ساتھی بھی بن سکتا ہے۔ دونوں حالتوں میں شعور کی تشکیل دو طرح ہوئی ہے لیکن دونوں حالتوں میں تاثر کے لئے خارجی اسباب اور اُن کے داخلی نتائج موجود ہوں گے۔ ادیب کا ذہن اچھائی بُرائی، نیک و بد، خیر و شر کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا، اپنے اصل خیالات اور مقاصد پر پردے ڈال سکتا ہے، عقائد کو منطقی اور فلسفیانہ شکلیں دے سکتا ہے، انداز بیان کی رنگینیوں سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرسکتا ہے متضاد تصورات میں بیچ کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرسکتا ہے لیکن یہ نہیں کرسکتا کہ زندگی کے ہر مسئلے پر خاموش رہ جائے یا ایسی رائے دے کہ اس کے رجحان کا پتہ ہی نہ چل سکے اگر کوئی ادیب یا نقاد ایسا سمجھتا ہے تو وہ یا تو خود فریبی کا شکار ہے یا دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

جو بات ادیب کے لئے درست ہے وہی ایک باشعور نقاد کے لئے بھی ٹھیک ہوگی۔ اگرچہ دونوں کے ذہنی عمل کی شکلیں مختلف ہوں گی۔ نقاد بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ ادب کے محرکات تخلیق کا پتہ لگائے۔ ان سرچشموں کا منبع تلاش کرے جہاں سے ادیب نے زندگی حاصل کی ہے۔ اس فلسفے کو ڈھونڈھ نکالے جو ادیب کے خیالوں کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً ایک منزل میں تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ ہر وادی و کہسار میں چلنا پڑے گا۔ لیکن اس کا کام یہیں نہیں ختم ہو جائے گا بلکہ آگے بڑھ کر وہ ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کرکے اس کے حقیقی خیالات اور معاشی تعلقات کا پتہ چلائے گا۔ ادیب کی جانبداری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تمدن میں ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔ یہ سارے کام محض تشریح یا تاثر کے اظہار سے ممکن نہیں ہیں۔ ان کے لئے نقاد میں خود ایک تخلیقی قوت کی ضرورت ہے جو تنقید کو بھی ادبی حیثیت عطا کرے جس میں نقاد کے انداز نظر سے جان آجائے اور جو کسی مصنف، تصنیف یا ادبی کارنامے کا تذکرہ ہونے کے باوجود انسان کے سماجی اور فلسفیانہ شعور میں اضافہ کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیادوں کو ڈھونڈھ کر ادیب کی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرے اور ادیب کی رہنمائی اور گمراہی، سماجی شعور اور تخیل پرستی کا جائزہ لے۔ اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔

مبارک باد جواہر لال

(بسلسلہ صفحہ ۶)

کی آب و تاب نہ جاتی رہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ "جہاں بصیرت نہ ہو وہاں قوموں کے لئے ہلاکت ہوتی ہے" اگر وہ بصیرت جو گاندھی جی میں تھی اور آپ نے ان سے ورثے میں پائی ہے آپ کی شمع راہ بنی رہے تو مجھے پوری اُمید ہے کہ یہ کالے بادل جو آسمان پر چھائے ہوئے ہیں چھنٹ جائیں گے۔ افق مشرق سے ایک تابناک صبح نمودار ہوگی اور ہماری قوم سیاسی اور روحانی ہلاکت سے محفوظ رہے گی۔

خدا آپ کو دیر تک سلامت رکھے تاکہ آپ آنے والی صبح کے نقیب کی خدمت انجام دیں۔

آزادی کی زنجیریں

(میر مظفر حسین ایک بگڑے ہوئے رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور تحصیل داری سے پنشن لے کر خانہ نشین ہوگئے ہیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے ظفر نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے اور اس کی یہ آرزو ہے کہ آگے پڑھے مگر اس کے والد جو انتہائی محبت کے باوجود اپنی مرضی کے سامنے بیٹے کی خوشی کی پرواہ نہیں کرتے اُسے نوکر رکھانا چاہتے ہیں وہ کلکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں تاکہ بیٹے کو سب رجسٹراری کے لئے نامزد کرا دیں۔)

(قسط ۴)

ظفر امید و بیم کی حالت میں اپنے والد کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا، وہ جانتا تھا اگر کلکٹر نے سب رجسٹراری دلوانے کا وعدہ کرلیا تو پھر میر صاحب کسی طرح اُسے آگے پڑھانے پر راضی نہ ہوں گے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ ان کی کوشش ناکام رہے۔ جب میر صاحب کا تانگہ گھر کے آگے آکر رکا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ دیر سے ارادہ کر رہا تھا کہ جب وہ آئیں گے تو میں خود جاکر ان کا اسباب تانگے سے اتاروں گا۔ نوکر کو ہاتھ نہ لگانے دوں گا۔ مگر وقت پر ہمت نے جواب دے دیا۔ اس نے ایک کتاب کھول کر سامنے رکھ لی اور میز پر کہنیاں ٹیک کر اور سر جھکا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے بہت گہرے مطالعے میں مصروف ہے مگر کان دوسری طرف لگے ہوئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد رحیم بخش کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اس نے کمرے کے دروازے کے سامنے آکر باہر ہی سے آواز دی "میاں الہ آباد سے آگئے آپ کو بلاوت ہیں" ظفر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر سنبھل کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا میر صاحب کے کمرے کی طرف چلا۔ دیکھا کہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ظفر نے جھک کر سلام کیا اور آرام کرسی کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

میر صاحب۔ جیتے رہو۔ کہو اچھے تو رہے میرے پیچھے، درد سر کا دورہ تو نہیں ہوا۔

ظفر۔ جی بالکل اچھا رہا۔

میر صاحب۔ بھئی کلکٹر صاحب سب رجسٹراری کو تو ٹال ٹول بتاتے ہیں، کہتے ہیں ٹائپ وغیرہ سکھا دو تو اپنے دفتر میں جگہ دے دوں گا۔ صفدر علی اور عقیل سے ملا تھا ان دونوں کا اصرار ہے کہ تمھیں آگے پڑھاؤں۔ وہ تو حسینہ کو بی اے کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں عقیلہ کہتی تھیں کہ ظفر الہ آباد میں پڑھے، اور ہمارے گھر پر رہے۔

ظفر کو ایسا معلوم ہوا جیسے پھانسی کا پھندا گلے سے نکل گیا۔ اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے نزدیک بہت مدبرانہ انداز میں کہا "مگر ابا جان پھپی کے ہاں رہنا تو ٹھیک نہیں ان پر اپنا بوجھ کیوں ڈالا جائے۔"

میر صاحب۔ (بھڑک کر) کیا خوب! ایک تو آپ نے یہ فرض کرلیا کہ میں آپ کو ضرور آگے پڑھاؤں گا۔ دوسرے یہ کہ الہ آباد بھیجوں گا اور پھپی کے گھر رکھوں گا۔ اس لئے مجھے یہ تعلیم ہو رہی ہے کہ یہ بے غیرتی کی بات ہے ایسا نہیں ہونا چاہئے بیٹے اگر تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ میں نے تمھیں کالج میں پڑھانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ کل صبح ماسٹر شبیہ الحسن صاحب آئیں گے تو ان سے مشورہ کرکے طے کروں گا کہ تمھارے لئے کیا کیا جائے۔ لو چائے پیو۔

ظفر کا دل جو میر صاحب کی گفتگو کے ابتدائی حصے کو سن کر ڈوبنے لگا تھا پھر ابھر آیا۔ اُسے یقین تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب ضرور آگے پڑھانے کی رائے دیں گے۔ اور ان کی رائے کا میر صاحب پر بہت اثر ہوگا۔ لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مالی مشکل کس طرح حل ہوگی کھنڈر کو بیچنے کی جو تجویز میر زاہد علی نے اُسے بتائی تھی نہ جانے ماسٹر صاحب کو بتائی گئی یا نہیں؟ کیا ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اُسے پسند کریں گے اور میر صاحب کو راضی کرلیں گے۔

بعض خیالات میں محو میر صاحب کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ دریا پور کے تحصیل دار عبدالحمید صاحب ملنے کے لئے آگئے۔ انھیں معلوم ہوا تھا کہ میر صاحب کلکٹر صاحب کے سلام کے لئے گئے ہیں وہ برابر اسی انتظار میں تھے کہ وہ لوٹ کر آئیں تو ان سے مل کر حج کے ثواب میں شریک ہوں۔ جب میر صاحب کی واپسی کی اطلاع ملی تو ان سے صبر نہ ہوسکا اور اسی وقت پہنچ گئے۔

میر صاحب۔ آئیے، آئیے رحیم بخش، تحصیل دار صاحب کے لئے تازی چائے بنا کر لاؤ۔

عبدالحمید۔ چائے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ابھی پی کر آیا ہوں۔ کہئے اب کی بہت دن کے بعد الہ آباد کا پھیرا ہوا۔ کیا کوئی مقدمہ تھا۔

میر صاحب۔ اجی توبہ کرو۔ میری تو مقدمہ بازی سے روح فنا ہوتی ہے، اور اب جائداد ہی ایسی کیا رہ گئی ہے کہ مقدمے لڑنے کی ضرورت ہو۔ ہوبرٹ صاحب میرے پرانے مربی ہیں ان سے ظفر کی نوکری کے لئے کہنے گیا تھا۔

عبدالحمید۔ پھر انھوں نے کیا فرمایا۔

میر صاحب۔ کہتے ہیں میرے پاس بھیج دو، میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سکھوا کر اپنے دفتر میں رکھ لوں گا، مگر میں لڑکے کو کلرکی کرانا نہیں چاہتا۔ خاندان کی رہی سہی آبرو بھی مٹی میں مل جائے گی۔

عبدالحمید۔ میر صاحب آپ اتنے تجربے کار آدمی ہوکر ایسی بات فرماتے ہیں۔ صاحب کلکٹر کا اسٹینو گرافر کوئی معمولی کلرک ہوتا ہے۔ صدر میں، دورے میں، کچہری کے دن، تعطیل کے دن ہمیشہ، ہر جگہ صاحب کے ساتھ رہتا ہے ہر چھوٹا بڑا معاملہ اس کے علم میں ہوتا ہے صیغۂ راز کے کاغذ اس کے ہاتھ سے ٹائپ ہوتے ہیں، ہوشیار اور مزاج دان ہو تو ناک کا بال بن جائے۔

میر صاحب۔ بجا ہے چوبیس گھنٹے کی غلامی کرکے ناک کا بال اور آنکھ کی پتلی بن بھی جائے تو بھی رہا وہی کلرک کا کلرک۔ دوسرے کی تال پر بیٹھا ہوا طبلہ بجاتا ہے۔

عبدالحمید۔ (ہنس کر) طبلہ بجانے کی آپ نے خوب کہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم سبھی دوسرے کی گت پر ناچتے ہیں، کیا چپراسی، کیا کلرک، کیا افسر۔

میر صاحب۔ ناچتے ہوں گے۔ ہم نے کبھی اپنی یہ گت بننے نہیں دی۔

عبدالحمید۔ آپ کی اور بات ہے۔ آپ کے خاندانی وقار کی وجہ سے بڑے بڑے افسروں کی کور دبتی تھی۔ آپ نے جس شان سے تحصیل داری کی وہ اب ڈپٹی کلکٹروں کو بھی نصیب نہیں۔

میر صاحب۔ میاں خاندانی وقار کا نام ہی نام ہے بگڑے رئیسوں کی اولاد کا کچھ دن تک لوگ لحاظ کرتے ہیں، پھر کوئی بات بھی نہیں پوچھتا آدمی کی عزت کارگزاری اور دیانت داری سیرت اور ارادے کی مضبوطی سے ہوتی ہے۔

عبدالحمید۔ سچ فرمایا آپ نے، دیانت داری بڑی چیز ہے۔ میں اس معاملے میں ہمیشہ سے بہت سخت ہوں۔ نہ کبھی ایک پیسہ رشوت لیا نہ ماتحتوں کو لینے دیا۔

میر صاحب۔ بہت خوب۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

آپ رشوت لیتے ہوں یا نہ لیتے ہوں مگر ماتحتوں کو نہیں لینے دیتے۔ یہ تو کرامات ہے۔

"فردوس بنا سکتے ہیں"

باقر رضوی

نوعِ انساں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں
ہم زمانے کو رہِ راست پہ لا سکتے ہیں

رہِ ہستی میں جو بے فیض ہیں مانند غبار
ابرِ رحمت کی طرح چرخ پہ چھا سکتے ہیں

گلشنِ دہر میں ہیں رنگ پریدہ لیکن
رُخِ کونین پہ سونا سا چڑھا سکتے ہیں

آج جو مصلحتاً منہ کو سیئے بیٹھے ہیں
کل وہ آفاق میں اک دھوم مچا سکتے ہیں

دور کرنے کے لئے پست و بلندِ ہستی
ہم تہِ تیغ و سرِ دار بھی جا سکتے ہیں

جن کی نظروں میں ہے مستقبلِ روشن کا سرور
نقدِ جاں تک وہ مسرت سے لٹا سکتے ہیں

بغض و نفرت سے یہ دنیا ہے جہنم یکسر
مہر و الفت اسے فردوس بنا سکتے ہیں

جمہوریت نو کا طلوع

یحییٰ اعظمی

اک نیّرِ نو سینۂ مشرق نے اُچھالا
ہے جس کی شعاعوں سے ہر اک سمت اجالا

ہیں اک سحرِ تازہ کے آثار ہویدا
ہونے کو ہے اب ظلمتِ گیتی کا ازالہ

لہرائے گا جمہوریتِ نو کا پھریرا
اب ساحلِ مدراس سے تا کوہِ ہمالا

جو خاک تھی کل تک ابھی پامالِ غلامی
رفعت میں وہی آج ہے گردوں سے بھی بالا

صدیوں کی غلامی کی شبِ تار ہے رخصت
مشرق کے شبستانوں میں چھایا ہے اُجالا

ہے مہرِ جہاں تاب کی اب تو مقابل
جو شمع سحر تک ابھی تیتی تھی سنبھالا

ظلمت کدۂ ہند میں کیوں ہو نہ چراغاں
سر جیبِ اُفق سے مہِ تاباں نے نکالا

معمور ہے ہر گوشۂ دامانِ وطن آج
کرتا ہے نثار اوجِ فلک لولوئے لالا

اللہ رے یہ طالعِ مشرق کی بلندی
حیرت میں ہے مغرب کا بھی اب عالمِ بالا

آساں نہ تھا جس بارِ امانت کا تحمل
صد شکر وطن نے ہے اُسے آج سنبھالا

آزادی کی زنجیریں

(بسلسلہ صفحہ ۲۰)

عبدالحمید۔ اسے مبالغہ نہ سمجھئے گا۔ ابھی مجھے دریا پور آئے چار ہی مہینے ہوئے ہیں۔ مگر تحصیل کے عملے سے لے کر پٹواریوں تک پر ایسی کڑی نگرانی رکھی ہے کہ رشوت کا کاروبار ہی بند ہو گیا۔

میر صاحب۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن اگر پٹواری بھگت بن گئے تو سمجھئے قیامت قریب ہے۔ کہئے آپ کی مستقلی کا کیا ہوا؟ آپ لوگ گریجوایٹ ہیں اور پھر اتنے دیانت دار، کب تک آپ کو قائم مقامی میں ڈالے رکھیں گے۔

عبدالحمید۔ میر صاحب اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت ہے۔ آپ ہوبرٹ صاحب بہت ملتے ہیں۔ آپ کلمۂ خیر کہہ دیں تو کام بن جائے مجھے آپ کے تشریف لے جانے کے بعد خبر ہوئی ورنہ آپ سے عرض کر دیتا۔ خیر اب کی بار سہی۔

میر صاحب۔ بھئی عبدالحمید آپ ہوبرٹ صاحب کو نہیں جانتے ورنہ یہ فرمائش نہ کرتے۔ ان کو اس کی بڑی چڑ ہے کہ کوئی ان کے ماتحت کی سفارش اُن سے کرے۔ صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ تم میرا کام مجھے سکھا رہے ہو۔ اپنے ماتحتوں کی کارگزاری اور استحقاق کو میں زیادہ جانتا ہوں یا تم۔

عبدالمجید۔ پھر بھی آپ اپنے طریقے سے ان کے کان میں بات ڈال سکتے ہیں۔

میر صاحب۔ بہت اچھا میں اب کی ملاقات اُن سے کہوں گا کہ عبدالحمید صاحب کو قائم مقامی کرتے دو سال ہو گئے، آپ ان کو مستقل کیوں نہیں کرتے۔

عبدالحمید۔ ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ وہ سمجھیں گے میں اُن کی شکایت کرتا پھرتا ہوں۔

میر صاحب۔ پھر غلط کیا سمجھیں گے۔ بے شک آپ شکایت کرتے ہیں اور کرنی چاہئے، اور ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کو شکایت ہے۔

عبدالحمید۔ خیر جو آپ مناسب سمجھیں مگر یہ خیال رہے کہ کہیں مجھے فائدے کے بجائے الٹا نقصان نہ پہنچ جائے۔

میر صاحب۔ بہر حال میں تو یہی کر سکتا ہوں۔ ان کو آپ کے معاملے کی طرف توجہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر اس پر موقوف ہے کہ معاملے میں کتنی جان ہے۔

عبدالحمید۔ (کسی قدر مایوسی کے ساتھ) جی ہاں بس میں اتنا ہی چاہتا ہوں۔ اچھا اب اجازت دیجئے پھر حاضر ہوں گا۔

میر صاحب۔ بہتر ہے۔ خدا حافظ۔

(باقی آئندہ)

فہرست مضامین

صلہ ہے تیری ریاضت کا — اداریہ — ۲
روحِ جمہوریت — سالک ہندی — ۳
سرحتی (نظم) — روش صدیقی — ۵
یومِ جمہوریت کا عہد (نظم) — سیدہ فرحت — ۵
مبارک باد جواہر لال — خواجہ غلام السیدین — ۶
نئے میدان اور نئی راہیں — پروفیسر محمد عاقل — ۸
اے مرے ہم سفر (نظم) — معین احسن جذبی — ۱۰
عہدِ نو کی طرف (نظم) — جعفر علی خاں اثر — ۱۰
دیوانے (نظم) — غلام ربانی تاباں — ۱۰
اشتہار — ۱۱
ہندوستان کا دستور — پروفیسر محمد مجیب — ۱۲
دنیا کی رفتار:
۱۔ ہندوستان — ع، ح — ۱۵
۲۔ پاکستان — " " — ۱۵
شمع آزادی کے پروانے — صالحہ عابد حسین — ۱۶
بزمِ بے تکلف — ۱۷
ادب کی تخلیقی تنقید — سید احتشام حسین — ۱۸
آزادی کی زنجیریں — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۲۰
فردوس بنا سکتے ہیں (نظم) — باقر رضوی — ۲۱
جمہوریت کا طلوع (نظم) — یحییٰ اعظمی — ۲۱
اشتہارات — ۲۲

ہم ہندوستان کے لوگ

اس عزم صمیم کے ساتھ کہ ہندوستان کو ایک
باافتدار جمہوری ریپبلک بنائیں

اور

اس کے باشندوں کے لئے

سماجی، معاشی اور سیاسی ——— **انصاف**

خیال، اظہار رائے عقیدے اور عبادت کی **آزادی**

حیثیت اور مرتبے کی ——— **برابری**

حاصل کریں

اور فرد کی عزت اور قوم کے اتحاد کے لئے

ان میں **باہمی اخوت** کا رشتہ قائم کریں

اور اپنی **آئین ساز مجلس** میں آج ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو

اس آئین کو منظور کرتے ہیں، قانون کی حیثیت دیتے ہیں

اور اپنے آپ کو عطا کرتے ہیں

طابع و ناشر: — عبد اللطیف اعظمی (بی۰اے جامعہ)

مطبوعہ: — جید پریس دہلی

یہ

ملک کے حاکم ہیں

اور

قوم کے خادم ہیں

Republic Number

NAI ROSHNI

DELHI

24th January, 1950.

CONSTITUTION

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

آزادی کی زنجیریں — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۲
انڈونیشیا کا پیام اور پیام بر — اداریہ — ۳

دنیا کی رفتار

(۱) ہندوستان — ع ' ح — ۴
(۲) باہر کی دنیا — ع ' ل — ۴

بزم ماتم — ۵

ڈھارس (نظم) — شمیم کرہانی — ۵
ہندوستان کا اعلان جمہوریت (نظم) — سید اختر علی تلہری — ۵
اپنی اپنی عینک سے — صالحہ عابد حسین — ۶
۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء سے ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء تک — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۸
اقبال اور احتشام — ضیاء الفاروقی — ۱۰

ڈاکٹر سید عابد حسین

آزادی کی زنجیریں

(میر مظفر حسن ایک بگڑے ہوئے رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحصیل داری سے پنشن لے کر خانہ نشیں ہو گئے ہیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے ظفر نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے اور اس کی یہ آرزو ہے کہ آگے کالج میں پڑھے مگر اس کے والد جو انتہائی محبت کے باوجود اپنی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلنے دیتے۔ وہ اسے نوکر رکھانا چاہتے ہیں اور کلکٹر صاحب کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ظفر کو سب رجسٹرار کرا دیں مگر کلکٹر انکار کر دیتے ہیں اور میر صاحب کچھ مایوس واپس آتے ہیں، ان کی گفتگو سے ظفر کو کچھ امید بندھی ہے کہ شاید وہ اسے آگے پڑھنے پر تیار ہو جائیں۔)

(قسط ۵)

میر صاحب اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور ظفر خیالات میں ڈوبا ہوا برآمدے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ اس گفتگو کو سن کر اپنے والد کی عزت اس کی نظر میں بڑھ گئی۔ اس کو پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ میر صاحب نے سرکاری نوکری میں اپنی خودداری اور شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا، لیکن دوسری طرف عبدالحمید صاحب کی باتوں سے اسے بڑی عبرت ہوئی "کیا واقعی عام طور پر لوگ ملازمت میں بندر یا ریچھ کی طرح ڈگڈگی پر ناچتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں؟ اور نچانے والے؟ ان کو محسوس نہیں ہوتا کہ اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کر کے وہ خود ذلیل ہوتے ہیں؟" یہ سلسلہ آگے چلتا لیکن اس مستقل فکر نے جو ان دنوں ظفر کے دماغ پر مسلط تھی اس کے خیالات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ میر صاحب کی گفتگو کے رنگ سے اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ انھوں نے اسے سرکاری نوکری کرانے کا خیال اس وقت چھوڑ دیا ہے مگر اب یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں میر صاحب ہار کر ہیڈ ماسٹر سے یہ نہ کہیں کہ ظفر کو اسکول میں مدرسی کی جگہ پر رکھ لیجئے یا خود ہیڈ ماسٹر صاحب یہ تجویز نہ پیش کریں۔ یوں تو وہ ہمیشہ میری ہمت افزائی کیا کرتے تھے کہ کالج میں جا کر تمھارے جوہر چمکیں گے۔ مگر شاید فرسٹ کلاس نہ ملنے کی وجہ سے ان کا خیال بدل گیا ہو۔ ہردیال نے ان سے کہا تو ہوگا لیکن اگر ان کو اب میری قابلیت پر بھروسا نہیں رہا اور وہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے قابل نہیں سمجھتے تو ہردیال سر پٹک کر مر جائے وہ ہرگز نہ مانیں گے اور فرض کیجئے ہیڈ ماسٹر صاحب اب بھی مجھے کالج بھیجنے کے موافق ہوں اور ابا جان کو سمجھائیں مگر اس کا کیا یقین ہے کہ ابا جان ضرور مان لیں گے۔ اگر انھوں نے انکار کر دیا تو؟ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا، اور ابا جان تو انھیں اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتے ہیں۔

امید و بیم کی کشمکش میں ظفر کی رات بڑی بے چینی میں گذری۔ وہ طرح طرح کے پریشان خواب دیکھتا رہا۔ امتحان کے ہال میں بہت دیر میں پہنچا ہے۔ دوڑنے کی وجہ سے ہانپ رہا ہے اور پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔ نگراں اسے اندر جانے سے روک رہے ہیں۔ مگر نہیں یہ تو اس کے والد ہیں جو اسے بڑی سختی سے ڈانٹ رہے ہیں۔ اس کا کان پکڑ کے لے جاتے ہیں اور اس کی سیٹ پر بٹھا دیتے ہیں۔ وہاں میز پر ایک طرف ٹائپ رائٹر رکھا ہے دوسری طرف طبلہ ہے .... ہیڈ ماسٹر میر صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ مدرس کی تو کوئی جگہ خالی نہیں مگر منشی لچھمی نرائن صاحب کو میں الگ کر رہا ہوں وہ ٹائپ سست کرتے ہیں۔ ظفر ریاضی میں بہت کمزور ہے مگر اس کام کے لئے اچھا ہے ....

کالج کے دفتر میں ظفر کاؤنٹر پر فیس کے روپے گنتا ہے تو پندرہ روپے کم ہیں۔ محاسب کہتا ہے جب تک پوری فیس نہ ہو تمھارا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ ہردیال دوڑتا ہوا آتا ہے اور روپے کاؤنٹر پر رکھ دیتا ہے مگر محاسب کہتا ہے کہ اب دفتر بند ہو گیا۔ سال بھر بعد کھلے گا ....

صبح تڑکے ظفر کی آنکھ کھلی تو اس کے آدھے سر میں شدت سے درد تھا مگر ناشتے پر اس نے میر صاحب کو اپنی حالت کا پتہ نہیں چلنے دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میر صاحب سخت پریشان ہوں گے اور فوراً اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جائیں گے۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہاں دیر ہو گئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب آ کر چلے جائیں گے اور اس کا معاملہ ادھر میں رہ جائے گا۔

ظفر کو ہیڈ ماسٹر صاحب سے اتنی عقیدت تھی اور ان کی رائے پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ ان کا فیصلہ جو کچھ ہو بالکل صحیح ہوگا۔ اگر واقعی وہ یہ کہہ دیں کہ ظفر کا آگے پڑھنا مناسب نہیں تو اس کا دل صدمے سے پاش پاش ہو جائے گا مگر اس کے اندر وہ بغاوت کا جذبہ نہیں پیدا ہوگا جو اپنے والد کے مقابلے میں پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ اسکول میں مدرس کے طور پر کام کرنے کا حکم دیں گے تو وہ خوشی اور شوق سے نہ سہی خاموشی اور صبر سے تعمیل کرے گا۔ مگر خدا کرے اس کڑے امتحان کی نوبت نہ آئے جس میں ناکامی ذلت، اور کامیابی مصیبت ہو۔

ماسٹر شیودیال کی غیر معمولی شخصیت سے صرف ظفر ہی نہیں بلکہ ان کے سب شاگرد اور دوست بہت متاثر تھے۔ صورت، قد اور لباس کے لحاظ سے ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا دیکھنے والے پر رعب پڑے۔ بلکہ پہلی نظر میں ان کی مجموعی ہیئت کچھ مضحک سی معلوم ہوتی تھی۔ متوسط قد، منحنی جسم، لمبوترا چہرا، زردی مائل رنگ، پتلی لمبی مونچھیں، داڑھی منڈی ہوئی۔ جاڑے گرمی ہمیشہ موٹے، سوتی کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا چھوٹا کوٹ اور اسی کپڑے کا تنگ مہری کا پاجامہ پہنتے تھے اور سر پر پگڑی باندھتے تھے۔ سردی میں گلے میں گلوبند ورنہ رومال بندھا رہتا تھا۔ چھتری ہمیشہ، ہر موسم میں بغل میں دبی یا ہاتھ میں کھلی ہوئی ہوتی تھی۔ خاص چیز جو کچھ تھی ان کی آنکھوں میں تھی۔ آنکھیں کچھ ایسی بڑی نہ تھیں مگر ان میں ذہانت کی چمک، خودداری کے سکون، محبت کی گھلاوٹ اور سیاست کی کھٹک نے ایک عجیب کشش اور تاثیر پیدا کر دی تھی۔ عمر کوئی ساٹھ برس کی تھی مگر صحت اتنی اچھی تھی کہ ساٹھ سے کم معلوم ہوتے تھے۔

ماسٹر صاحب کائستھوں کے ایک پرانے خاندان سے تھے۔ ان کے والد بھگوت دیال صاحب اپنے زمانے کے ممتاز اور ہر دلعزیز وکیل تھے انھوں نے شیودیال صاحب کو ایم اے تک تعلیم دلائی تھی جو ان دنوں بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ شیودیال صاحب کو آسانی سے ڈپٹی کلکٹری مل سکتی تھی مگر انھوں نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت پسند کی اور گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ فتح پور میں ہیڈ ماسٹر رہے اور پھر انسپکٹر مدارس ہو گئے مگر ماسٹر کا لقب شروع سے ان کے نام کے ساتھ ایسا چپکا کہ کبھی الگ نہ ہو سکا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد ماسٹر صاحب نے ملازمت سے پنشن لے لی اور مرحوم کی یادگار بھگوت دیال ہائی اسکول قائم کیا۔ اس کام میں ماسٹر صاحب کو بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ سب سے پہلے روپے کا سوال تھا۔ ماسٹر صاحب نے قصبے اور تحصیل کے زمینداروں، ساہوکاروں، وکیلوں اور سرکاری ملازموں سے چندہ وصول کرنے کی کوشش کی مگر جس دریاپور نے جنگِ عظیم میں حکومت کو پورے دو لاکھ چندہ دیا تھا وہ ماسٹر صاحب کو پانچ ہزار بھی نہ دے سکا۔ حکام سے مدد چاہی تو انھوں نے یہ کہا کہ پچھلے دو سال سے تمھاری تحصیل میں کانگریس کا بہت زور ہو گیا ہے۔ دریاپور میں اسکول قائم ہوا تو وہ سیاسی ایجی ٹیشن کا اڈا بن جائے گا اس لئے اس خیال کو چھوڑ دو۔ مگر ماسٹر صاحب آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی چھوڑی ہوئی نقد رقم کے علاوہ جائداد کا ایک حصہ فروخت کر ڈالا۔ اور اپنی ایک قیمتی زمین پر جو قصبے کے باہر اسٹیشن کے قریب تھی چالیس پچاس ہزار روپیہ خرچ کر کے اسکول کی عمارت بنوائی اور ضروری سامان مہیا کیا۔ اس کے بعد اسٹاف کو فراہم کرنا تھا اور اسکول کا خرچ اتنے دنوں چلانا تھا کہ محکمۂ تعلیم سے امداد مل جائے۔ ماسٹر صاحب نے اپنی جائداد کی آمدنی، اپنی پنشن سب اسکول کو لگا دی، ماسٹر جیسے بھی ملے رکھ لئے اور خود ان کے ساتھ محنت کر کے ان کو کام چلانے کے قابل بنایا۔ سرکاری امداد کے معاملے میں مقامی حکام نے روڑے اٹکائے مگر محکمۂ تعلیم کے لوگوں پر ماسٹر صاحب کا اتنا اثر تھا کہ انھوں نے معقول رقم مقرر کرا دی جب اسکول چل نکلا تو حکام ضلع ازراہِ عنایت ان کی سرپرستی کرنے لگے۔

(بقیہ صفحہ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

جلد ۴ | یکم فروری ۵۰ء | نمبر ۵

انڈونیشیا کا پیام اور پیام بر

دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرق کے محکوم ملکوں میں سب سے پہلا ملک جس نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر محکومی کی کال کوٹھری سے نکل کر آزادی کی کھلی ہوا میں سانس لی، انڈونیشیا تھا۔ انڈونیشی آزادی کی تحریک دراصل ایک قرن پہلے یعنی پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے وقت شروع ہو چکی تھی۔ اس کے لیڈروں کو اس کا اعتراف ہے کہ انھوں نے یہ تحریک ہندستان کی جدو جہد سے خصوصاً گاندھی جی کی جان بخش اور جاں فزا شخصیت سے متاثر ہو کر شروع کی تھی اگرچہ اصولی طور پر اس کی تہہ میں اہنسا کا فلسفہ نہ تھا لیکن عملاً یہ بھی کم و بیش تیس سال تک عدم تشدد کی راہ پر چلتی رہی اس لئے کہ اس کے سوا کامیابی کی اور کوئی راہ نہیں تھی۔ اس کے لیڈر بھی ہندوستانی لیڈروں کی طرح جیل خانوں میں قید و بند کی مشقتیں اٹھاتے تھے اور وہاں سے نکل کر پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے یعنی اس عقیدے کی تبلیغ کرنے لگتے تھے کہ اپنے وطن کو غیر ملکی حکومت کے تسلط سے آزاد کرانا ہر انڈونیشی کا مقدس فرض ہے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جاپان اور مغربی جمہوریتوں میں جنگ چھڑ گئی اور ۱۹۴۲ء میں جاپانی فوجوں نے ڈچ فوجوں کو شکست دے کر کل جزائر انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا۔ غالباً جاپانیوں کو اندازہ تھا کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور ایک دن ڈچ برطانیہ اور امریکا کی مدد سے انڈونیشیا کو واپس لے لیں گے اس لئے انھوں نے انڈونیشی قومی تحریک کی ہمت افزائی کی اور جب وہ وقت آیا کہ انھیں وہاں سے ہٹنا پڑا تو وطن پرستوں کی ایک فوج بنا کر اور اسے بہت سا سامان جنگ دے کر گئے تاکہ وہ ڈچ اتحادیوں کا مقابلہ کرے۔ اس طرح انڈونیشیا کو موقع مل گیا کہ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو ایک آزاد ریپبلک ہونے کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد چار سال تک انڈونیشی ریپبلک اور ڈچ حکومت کے درمیان فوجی اور سیاسی کش مکش جاری رہی جس میں اس کو بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑے۔ حکمت عملی کے میدان میں ہندستان نے جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں انڈونیشی ریپبلک کی دل و جان سے مدد کی یہاں تک کہ قریب قریب ساری دنیا کی رائے عامہ کو انڈونیشیا کی آزادی کا حامی بنا دیا اور ڈچ حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انڈونیشیا کو ڈچ یونین کے اندر ایک آزاد ریپبلک کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اس جشن آزادی کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے راج کماری امرت کور وزیر صحت مبارک باد کا پیام لے کر گئی تھیں۔ جمہوریہ انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر عبدالرحیم سکارنو نے اپنی تاریخی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ انڈونیشیا کی آزادی میں ہندستان اور اس کے لیڈر جواہر لال نہرو نے قابل قدر امداد دی۔

محبت کے اس قرضے کو چکانے کے لئے اب ڈاکٹر سکارنو بیگم سکارنو کے ساتھ انڈونیشیا کی طرف سے سچی اور گہری دوستی کا پیام لے کر نئی دلی تشریف لائے ہیں۔ ان معزز مہمانوں نے ۲۶ جنوری کو جشن آزادی کی تقریبوں میں شرکت کی اور ابھی چند روز تک یہاں قیام کر کے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کریں گے اور ہمارے قومی لیڈروں سے مل کر اپنے اور ہمارے ملک کے درمیان رفاقت کا پائدار رشتہ قائم کریں گے۔

۲۴ جنوری کو نئی دلی پہنچنے کے چند ہی گھنٹے کے بعد ڈاکٹر سکارنو اور بیگم سکارنو سفر کی تکان کے باوجود اپنے میزبان پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ جامعہ ملیہ تشریف لائے۔ انھوں نے جامعہ کے ہر شعبے کا نہایت دلچسپی کے ساتھ معائنہ کیا اور اس کے استادوں کے ساتھ چائے نوش فرمائی اس ایک گھنٹے کی مختصر مدت میں بھی دیکھنے والوں کو تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر سکارنو میں جنھیں انڈونیشیا کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں اور نصف کروڑ غیر مسلموں نے اپنی آزاد ریاست کا سردار بنایا ہے اور ان کی رفیق زندگی بیگم سکارنو میں اسلامی اخلاق اور جمہوری سادگی کی وہ کون سی شان ہے جس نے انھیں کروڑوں دلوں کی تسخیر کی قوت بخشی ہے۔

مختصر الفاظ میں ڈاکٹر سکارنو کے حالات زندگی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں سے ان کا تعارف کراتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحیم سکارنو ۶ جون ۱۹۰۱ء کو جاوا کے ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہائی اسکول تک کی تعلیم انڈونیشیا کے ڈچ اسکولوں میں پائی، پہلی جنگ عظیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ہالینڈ گئے اور وہاں سے انجینیری میں ڈاکٹر کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ اپنی قوم کی غلامی کا احساس اور آزادی کی آرزو ابتدا سے ان کے دل میں موجود تھی ہالینڈ سے واپسی کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ اپنی دل کش شخصیت اور بے مثل خطابت کی بدولت انھیں تحریک کی رہنمائی حاصل ہو گئی اور ۱۹۲۶ء میں انھوں نے ڈاکٹر محمد حتّے کے ساتھ مل کر انڈونیشی نیشنل پارٹی قائم کی۔ اس پارٹی کی بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے اس کے لیڈر ڈچ حکام کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر سکارنو قید کر لئے گئے اور انھیں چار برس کی قید ہو گئی۔ مقدمے کے دوران میں جو بیان انھوں نے دیا تھا اس نے گاندھی جی کے مشہور کراچی والے بیان کی طرح تاریخی شہرت حاصل کر لی۔ جیل میں دو سال کا زمانہ انھوں نے اسلامی علوم اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں کے مطالعے میں گذارا۔ اس کے بعد حکومت نے ان کی بقیہ سزا معاف کر کے ان کو رہائی دے دی۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد انھوں نے اور زیادہ جوش اور شدت کے ساتھ اپنی سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں اور ۱۹۳۳ء میں دوبارہ گرفتار کر لئے گئے۔ اس بار ڈچ حکومت نے شاید انھیں عمر بھر قید رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر انقلاب زمانہ نے ان کی مدد کی اور دس سال کی اسیری کے بعد ۱۹۴۲ء میں جب جاپانیوں نے سماٹرا پر قبضہ کیا تو ڈاکٹر سکارنو رہا کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ان کی زندگی کی تاریخ انڈونیشی تحریک آزادی کے نشیب و فراز کی تاریخ ہے جس کی طرف ہم اس مضمون کے شروع میں چند لفظوں میں اشارہ کر چکے ہیں۔

آخر میں ہم ہند کے معزز مہمان اور اُن کی اہلیہ محترمہ کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان کے کل باشندے خصوصاً سب ہندوستانی مسلمان اس خیر مقدم میں ہمارے ساتھ شریک ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہند اور انڈونیشیا میں سچی، گہری اور پائدار دوستی قائم ہو جائے۔

دونوں ملکوں میں علاوہ اہل مشرق کی عام خصوصیات کے ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں جگہ عہد قدیم کی ہندو تہذیب اور عہد وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کے میل سے ایک ہند تہذیب بنی تھی اور دونوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح اس مشترک تہذیبی سرمایہ کو عہد جدید کے سانچے میں ڈھال کر ایک قومی تہذیب کی تعمیر کریں۔

اقبال اور احتشام

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ہیں" اقبال کی شاعری محض ایک شبستانِ دیوانگی نہیں، اس کی غرض محض "عمر رفتہ کو آواز دینا" نہیں، یہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا عہد کرتی ہے، پھر اس تعمیر کے لئے بنیادیں بھی استوار کرتی ہے یہ محض حدیث دلبری، یا دہ و مینا و جام، یا جل ترنگ کی نہیں بھی، لہو ترنگ، خار اشتاقی اور شکوہ نصرت کی سکھاتی ہے۔ یہ محض جدائی کی داستان نہیں، افسوں و افسانہ نہیں، اس میں ایک فکر ایک مرکزی تصور، ایک نظام حیات، آفاقیت روح عصر، موجودہ دور کے نت نئے مسائل کا احساس غرض بیسویں صدی کی زندگی کی ساری روح جلوہ گر ہے۔

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

آئین کا پہلا امتحان

۲۶ جنوری کو ہمارا نیا آئین نافذ ہوگیا اور ہندوستان نے ایک "غیر مذہبی جمہوری ریپبلک" کی حیثیت حاصل کرلی۔ نئے آئین کی تمہیدی دفعہ میں جس پر اس ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے یہ الفاظ موجود ہیں "خیال، اظہار رائے عقیدے اور عبادت کی آزادی"۔ عجیب اتفاق ہے کہ عین آئین کے نفاذ کے وقت ایک ایسا معاملہ اُٹھ کھڑا ہوا جس میں رواداری کے اس بنیادی اصول کا امتحان درپیش ہے۔ اجودھیا کی قدیم بابری مسجد کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ جھگڑا چھیڑ دیا ہے کہ یہاں سیکڑوں سال پہلے مندر تھا جس کی جگہ مسجد بنا دی گئی اس لئے یہ عمارت ہندوؤں کو واپس مل جانی چاہیے۔ کیونکہ اربابِ غرض اس موقع سے فائدہ اُٹھانا اور سارے ملک میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اس لئے انھوں نے اجودھیا اور آس پاس کے علاقے میں ہندوؤں کو بھڑکا کر خطرناک صورت حال پیدا کردی ہے۔ حکومت نے اس وقت فساد کو روکنے کے لئے مسجد پر پولیس کا پہرہ لگا دیا ہے اور مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھنے کی ممانعت کردی ہے۔ مسلمانوں نے انتہائی غم و غصے کے باوجود قابلِ تعریف ضبط سے کام لیا ہے اور اپنی شکایتوں کو مقامی حکام صوبے کی حکومت اور مرکزی حکومت تک پہنچانے کے سوا اور کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت اور کانگریس پارٹی کو اس معاملے کی اہمیت اور نزاکت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنی ساری اخلاقی اور سیاسی قوت سے کام لے کر اس فتنے کو جلد سے جلد فرو کرنے کی کوشش کرے گی اور مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرے گی۔ اُسے معلوم ہے کہ ساری دنیا کی آنکھیں اس وقت ہندوستان کی طرف لگی ہیں کہ وہ جمہوریت کی کٹھن راہ پر کس طرح چلتا ہے۔ اگر پہلا ہی قدم ڈگمگا گیا تو پھر جمہوریت کا خدا حافظ۔

معاشی منصوبہ بندی

ہم ان صفحات میں بار بار لکھتے رہے کہ ہندوستان کی پہلی قومی حکومت نے اس نازک عبوری دور میں جب کہ ابھی انگریزی حکومت کے قدم اکھڑنے کے بعد ملک میں بدامنی اور انتشار کی قوتوں کا زور تھا اپنے فرائض کو مستعدی اور دانش مندی سے بجا کر مسائل کو حل کرلیا لیکن دوسرے ایک پناہ گزینوں کی بحالی کا دوسرا معاشی الجھن کا وہ اب تک حل نہیں کرسکی۔ پناہ گزینوں کے معاملے میں تو پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ زراعت پیشہ لوگ قریب قریب سب بسا دئے گئے اور کام سے لگا دئے گئے اور دوسرے لوگوں کی بحالی کے لئے کئی مفید تجویزیں مرتب ہوگئی ہیں اور ان پر تھوڑا بہت عمل بھی شروع ہوگیا ہے لیکن ملک کی معاشی مشکلات کو دور کرنے کے لئے متفرق بے ربط اور بے ترتیب کارروائیوں سے قطع نظر کوئی منظم کوشش اب تک نہیں کی گئی۔ شکر ہے کہ اب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جو عام پالیسی کے معاملے میں حکومت کی مشیر ہے اس کمی کو محسوس کرلیا ہے اور اپنے پچھلے جلسے میں یہ رزولیوشن پاس کیا ہے کہ حکومت کو معاشی منصوبہ بندی کے لئے ایک نیشنل پلیننگ کمیشن بنانا چاہیے اور صنعت کی انفرادی اور اجتماعی ملکیت کے بیچ میں ایک قابلِ عمل راہ نکالنی چاہیے۔ اس بیچ کی راہ کے بارے میں ہم اس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتے جب تک اس کی تفصیلات ہمارے سامنے نہ آجائیں لیکن پلیننگ کمیشن کی تجویز کا دل سے خیرمقدم کرتے ہیں ہمیں امید ہے کہ کمیشن جلد سے جلد مقرر ہوکر کام شروع کردے گا تاکہ اس سال کے آخر تک عام انتخابات سے پہلے اپنی تجویزوں کو مرتب کرلے اور وہ رائے دہندوں کے سامنے پیش کی جاسکیں۔ اگر کمیشن نے ملک کی معاشی مشکلات کا کوئی معقول حل پیش کیا اور اسے رائے عامہ کی تائید حاصل ہوگئی تو نئی حکومت جو انتخابات کے بعد بنے گی خود اعتمادی اور مضبوطی کے ساتھ کمیشن کی تجویزوں کو نافذ کرسکے گی اور اگر اربابِ غرض اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گے تو عوام کی طاقت انھیں شکست دے سکے گی۔

باہر کی دنیا

برطانیہ میں الیکشن کی تیاریاں

۲۳ فروری کو برطانیہ میں عام انتخابات ہونے والے ہیں کنسرویٹو پارٹی کے لیڈر مسٹر چرچل کمیونزم کے ہوّے سے ڈرا کر الیکشن جیتنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پہلی نشری تقریر میں اس پر زور دیا ہے کہ سوشلزم کمیونزم کا مقابلہ کرنے میں سب سے کم زور ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ انھوں نے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی مثال سے جہاں ابھی حال میں سوشلسٹ حکومتوں کو انتخابات میں ناکامی ہوئی ہے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یورپ میں سوشلزم بالکل ناکام رہا اور یورپ کی عوام سوشلسٹ نظامِ حکومت کو پسند نہیں کرتے۔ الیکشن مینفسٹو میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو دور کرنے اور آزاد تجارت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

امریکہ کے پچھلے الیکشن میں پریس کا اندازہ جس طرح غلط ثابت ہوا ہے اس کی وجہ سے برطانوی انتخاب کے بارے میں لوگ پیشین گوئی میں ابھی احتیاط سے کام لے رہے ہیں مگر پچھلے تجربات اور موجودہ حالات کے پیشِ نظر عام خیال ہے کہ کنسرویٹو پارٹی جیسی رجعت پرست جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہوگی۔

وفد پارٹی سے اُمیدیں

وفد پارٹی کی شاندار کامیابی سے مصر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، سیاسی معاشی، سماجی تعلیمی غرض زندگی کے ہر شعبے میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ نظر آ رہا ہے۔ مارشل لا ختم کردیا گیا ہے پریس کو آزادی دے دی گئی ہے اور بہت سے سیاسی قیدی رہا کردئے گئے ہیں۔ ایک اطلاع ہے کہ اخوان المسلمین پر سے بھی پابندی اُٹھائی جانے والی ہے۔ قومی سیاست کی طرح بین اقوامی سیاست میں بھی ترقی پسندی اور سوجھ بوجھ سے کام لیا جا رہا ہے۔ برطانیہ اور مصر کے تعلقات پر از سرِ نو گفتگو کی جانے والی ہے یہ مسئلہ ذرا الجھا ہوا اور مشکل ہے اس لئے برطانوی الیکشن سے قبل کوئی تصفیہ ہونا مشکل ہے لیکن مشرق وسطیٰ کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر برطانیہ میں چاہے جو بھی پارٹی برسرِ اقتدار آئے مصری رائے عامہ آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکے گی۔ عرب ملکوں کے مصری نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی گئی ہے۔ عرب ملکوں میں اس وقت مضبوط اتحاد اور یک جہتی کی سخت ضرورت ہے اس کا احساس بھی کم و بیش ہر جگہ موجود ہے۔ اگر مصر نے اس معاملے میں تدبّر اور دور اندیشی سے کام لیا تو کامیابی کے کافی امکانات موجود ہیں۔ وفد پارٹی نے صنعت کو ترقی دینے اور گرانی کو کم کرنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ اگرچہ اس معاملے میں کامیابی مشتبہ ہے۔ لیکن اگر کچھ بھی کامیابی ہوئی تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ غرض وفد پارٹی سے نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور اس سے بڑی اُمیدیں باندھی جا رہی ہیں۔ دیکھئے وفد پارٹی ان کو کہاں تک پورا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

جنوبی کوریا کی امداد نامنظور مگر ـــ

اس بات پر کہ امریکی کانگریس نے جنوبی کوریا کی امداد کا بل نامنظور کردیا ہے۔ تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اگر چین میں امریکی پالیسی کی ناکامی سے کانگریس کے ممبروں میں جو احساسات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر یہ غیر متوقع یا تعجب خیز نہیں۔ کانگریس کے ممبر چاہتے ہیں کہ امریکہ صرف انھیں ملکوں کی مدد کرے جہاں امداد کا منشا پورا ہونے کا یقین ہو جنوبی کوریا کے حالات۔ ان کے نزدیک اطمینان بخش نہیں ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ چین کی طرح یہاں بھی ان کی رقم ڈوب جائے گی مگر پریسیڈنٹ ٹرومین اور سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ایچیسن کا خیال ہے کہ اگر جنوبی کوریا کی جلد سے جلد کافی مدد نہ کی گئی تو نہ صرف کوریا میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی امریکی پالیسی کو سخت نقصان پہنچے گا۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے ایک بیان میں کہا ہے کہ امریکہ کی شروع سے یہ پالیسی رہی ہے اور امریکی عوام نے اس کی حمایت کی ہے کہ جہاں بھی امریکی امداد سے قومی آزادی کو برقرار رکھا جا سکے، وہاں ص

ص مناسب رقم سے مدد کی جائے۔ چنانچہ مسٹر ٹرومین کو امید ہے کہ کانگریس اس امداد کی منظوری دے دے گی۔ (ع۔ ل)

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء سے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء تک

ڈاکٹر سید عابد حسین

ہمیں اپنی داستان سلسلۂ زمانے کے ایک خاص نقطے یعنی جنوری ۱۹۳۰ء کے چھبیسویں دن سے شروع کرنی ہے۔ لیکن تاریخ کی لکیر کھینچنے میں یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اُسے کسی خاص نقطے سے شروع کر کے صرف آگے کی طرف لے جائیں۔ تھوڑی سی پیچھے کی طرف بھی کھینچنی پڑتی ہے۔ اس لئے داستان سے پہلے ایک مختصر سی تمہید اُٹھانا ضروری ہے۔

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا زوال یوں تو سترھویں صدی کے آخر سے ہونے لگا تھا لیکن مخصوص طور پر ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے شروع ہوا، اور غدر ۱۸۵۷ء میں تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس سو سال کے عرصے میں انگریز تاجروں کی جماعت ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا سیاسی تسلط بڑھاتے بڑھاتے قریب قریب سارے ہندوستان کی مالک بن گئی۔ یہاں تک کہ اس نے سلطنت کے اس درخشاں ہیرے "کو تاج برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ اب تک ہندوستانیوں کو اپنے سیاسی درجے کا شعور ہی احساس نہیں تھا مگر اب ان پر یہ بات اچھی طرح کھل گئی کہ وہ صرف ایک بدیسی بادشاہ کی رعایا نہیں بلکہ ایک پوری بدیسی قوم کے محکوم بنا دئے گئے ہیں۔ اس کا اثر عوام پر یہ پڑا کہ ایک طرف ان پر انگریز حاکموں کا رعب چھا گیا اور دوسری طرف اُن سے دہشت اور ایک حد تک نفرت پیدا ہو گئی۔ اوپر کا طبقہ پہلے خوف اور مصلحت سے اطاعت کا اظہار کرتا رہا اور پھر یہ دیکھ کر کہ بدیسی حکومت اُسے مٹانا نہیں بلکہ اُبھارنا اور اس کی مدد سے حکومت کرنا چاہتی ہے دل سے حلقہ بگوش ہو گیا۔ متوسط طبقے میں انگریزی تعلیم یافتہ جو عام طور پر ملازمت پیشہ، وکالت پیشہ اور زمیندار تھے ایک تو ذاتی مفاد کے نقرئی تاروں سے اور دوسرے ذہنی مرعوبیت اور تقلید کی آہنی زنجیروں سے نئی حکومت کے ساتھ بندھ گئے۔ مگر قدیم طرز کی تعلیم پانے والے خصوصاً مذہبی طبقے جو نئے نظام کو اپنے عقائد روایات اور معاشرت کے لئے بھی اور اپنی قدر و منزلت اور روزی کے لئے بھی خطرناک سمجھتے تھے، عموماً اس کے مخالف اور اس سے متنفر رہے۔ زیادہ ہمت اور شدت کے ساتھ اس مخالفت کا اظہار مسلمانوں کی طرف سے ہوا جس کی نمایاں مثالیں وہابیوں کی تحریک اور دیوبند کی طرف میں نظر آتی ہیں۔ اس مخالفت کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ مسلمان ایک عرصے سے مغربی تعلیم سے دور رہے۔

اور ہندوستان میں مغربی تعلیم زیادہ تیزی سے پھیلی اور تعلیم یافتہ لوگ سرکاری ملازمت اور وکالت میں کھپنے کے بعد تجارت، صحافت اور دوسرے پیشے جو حکومت کے اثر سے آزاد تھے اختیار کرنے لگے اس طرح ایک آزاد اور متوسط طبقہ پیدا ہوا جو انگریزی تاریخ اور ادب کے مطالعے کی بدولت جمہوری خیالات سے متاثر تھا۔ اور آزادی کا ایک ہلکا اور دھندلا سا تصور رکھتا تھا۔ اس نے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی جس کا یہ مطلب تھا کہ ملک کے انتظام میں رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو بھی شریک کیا جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کانگریس کی تحریک میں ایک دم سے بہت زیادہ شدت اور وسعت پیدا ہو گئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں، ایک یہ کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس سے کانگریس کو بڑی تعداد میں پر جوش سیاسی کارکن ہاتھ آ گئے دوسری یہ کہ مہاتما گاندھی کے ہندوستان آ جانے سے ایک ایسا لیڈر مل گیا جس نے سیاسی تحریک میں اخلاقی روح پھونک دی اور اس میں عوام کو شریک کر کے اس کی طاقت بہت بڑھا دی۔

اب مشکل یہ تھی کہ تحریک آزادی جو بنگال ایجی ٹیشن کے زمانے میں تخویف اور تشدد کے طریقوں کی ناکامی دیکھ چکی تھی ایک غیر ذمہ دار حکومت کے ظلم اور جبر کا مقابلہ کیسے کرے۔ مہاتما گاندھی نے اس مشکل کو ستیہ گرہ کے اخلاقی ہتھیار کے ذریعے سے حل کیا۔ ان کا ایک زبردست کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کو بھی تحریک آزادی میں کھینچ لیا۔ مسلمانوں میں بھی اب مغربی تعلیم تھوڑی بہت پھیل چکی تھی، اور ایک چھوٹا سا آزاد متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا اسی زمانے میں انگریزوں نے ترکی کی سلطنت کو ختم کر دیا تھا اور مسلمان ملکوں پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزوں کی مخالفت کا دبا ہوا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں نے انھیں سمجھایا کہ انگریز مسلمانوں کو اس لئے غلام بنانا چاہتے ہیں کہ اُن کے سمندر کے راستے محفوظ رہیں اور وہ ہندستان پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو مسلمان ملکوں کی آزادی بھی بچ جائے گی۔ اس طرح تحریک خلافت کا جو مسلمان ملکوں کی آزادی اور اتحاد کے لئے قائم کی گئی تھی اور کانگریس کی تحریک آزادی کا سنگم ہو گیا اور انگریزی حکومت کے خلاف ایک متحدہ قومی محاذ بن گیا۔

کانگریس اور خلافت کی ستیاگرہ کی تحریک دو تین سال تک بڑے زور شور سے چلتی رہی، آخر برطانوی حکومت اور خود ہندوستان کی رجعت پسند قوتوں نے مل کر اُسے عارضی طور پر دبا لیا۔ اس کے رد عمل سے آزادی پسند حلقوں میں بے دلی اور افسردگی چھا گئی۔ مسلمانوں میں یہ رد عمل اس وجہ سے اور زیادہ شدید تھا کہ خود ترکوں نے تحریک خلافت کو ختم کر دیا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے حامیان خلافت کو بڑا سخت دھکا لگا اور ان کی سیاست کا سارا نقشہ بگڑ گیا۔ کانگریس کی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہو گیا۔ اعتدال پسند کانگریسیوں کا ایک گروہ سوراج پارٹی کے نام سے مرکزی کونسل اور صوبوں کی کونسلوں میں چلا گیا تاکہ بارہا آزمائے ہوئے آئینی جدوجہد کے طریقے کو پھر آزمائے۔ مہاتما گاندھی اور اُن کے ساتھ محبان وطن کی ایک بڑی جماعت کانگریس سے الگ سی ہو گئی۔ اور اپنا سارا وقت عوام کی خدمت کے تعمیری کاموں میں صرف کرنے لگی۔ مولانا محمد علی کانگریس سے روٹھ کر گھر بیٹھ گئے۔ مسلمان ایک ذہنی الجھن میں پڑ گئے جس سے فائدہ اٹھا کر آغا خاں اور سر فضل حسین کی رجعت پسند مسلم کانفرنس اور جناح صاحب کی اعتدال پسند مسلم لیگ ان کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دونوں میں سے کوئی عام مسلمانوں میں مقبول نہیں ہوئی۔

۱۹۲۷ء میں کانگریس کے جواں سال جواں ہمت لیڈر جواہر لال انگلستان سے واپس آئے اور انھوں نے مدراس کانگریس میں کامل آزادی کا رزولیوشن پاس کرا کے اس افسردہ جماعت میں ایک نئی روح عمل پھونکنی چاہی مگر آگے چل کر معلوم ہوا کہ کانگریس نے یہ رزولیوشن یوں ہی بے سوچے سمجھے پاس کر دیا تھا ورنہ اصل میں وہ اب تک اعتدال پسندوں کے اثر میں تھی۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ نے جس میں قریب قریب سب پارٹیاں شریک تھیں سیاست کے میدان میں کچھ تھوڑی سی زندگی پیدا کر دی۔ سوراج پارٹی اور لبرل پارٹی نے یہ سمجھ کر کہ سائمن کمیشن کے کامیاب بائیکاٹ کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی قوت کا احساس پیدا ہو گیا ہے، نہرو رپورٹ کے نام سے درجہ نوآبادی کی بنا پر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کی ایک تجویز پیش کی۔ کلکتہ کانگریس میں نہرو رپورٹ پر غور کیا گیا۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی بھی موجود تھے۔ ان کی رائے سے یہ رپورٹ ۳۱ دسمبر کو اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ اگر برطانوی

حکومت نے ایک سال کے اندر اس کی سفارشوں کو نامنظور کیا تو کانگریس اس رپورٹ کو منسوخ کر دے گی، اور کامل آزادی کا مطالبہ از سر نو پیش کرے گی۔ ایک سال کی مدت ختم ہونے پر لاہور کانگریس نے جس کے صدر جواہر لال نہرو تھے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو رات کے بارہ بجے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ کانگریس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے عملی جد و جہد شروع کرے گی۔

اس بار کامل آزادی کا مطالبہ محض ایک کاغذی تجویز نہیں بلکہ ہندوستان کی دل کی آواز تھی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو سارے ملک میں یوم آزادی منایا گیا اور کروڑوں مردوں اور عورتوں نے یہ حلف اٹھایا:-

"ہم یہ عقیدہ رکھتے کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اس کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسر ہوں جو زندگی کے لئے ضروری ہیں تاکہ اسے پنپنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ اس نے اپنی بنا اس پر قائم کی ہے کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے۔ اس لئے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کر لے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے۔ ہم سے جو محصول وصول کئے جاتے ہیں وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے ۲۰ فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کئے جاتے ہیں اور تین فی صدی نمک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کسان کم سے کم سال میں چار مہینے بے کار رہتے ہیں۔ اور دستکاری کا شغل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں، برخلاف دوسرے ملکوں کے یہاں ان برباد شدہ صنعتوں کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی کہ کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑ گیا ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا بنا ہوا مال ہے۔ چنگی کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی، بلکہ مسرفانہ حکومت کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس ڈھب سے مداخلت کی گئی کہ کروڑوں روپیہ ملک سے کھنچ کر باہر چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا جتنا برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعے سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوئے ہمارے بڑے سے بڑے آدمی کو بدیسی حکومت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلا وطن کر دئے گئے اور انھیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی گئی اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ ہم مجموعی طور پر چوکیداری اور محرری پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے چھڑا کر ڈانواڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھن جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا، اور بیرونی فوج کی موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا، اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے، بلکہ اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے ملک کو برباد کیا اس کی اطاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ نہیں ہے اس لئے ہم یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور سول نافرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول نہ ادا کرنا بھی شامل ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں، محصول دینا بند کر دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لئے جو ہدایت دے گی ان پر عمل کریں گے۔"

(باقی آئندہ)

(اطلاعات جمہوریت نمبر، لکھنؤ)

(بقیہ بسلسلہ صفحہ ۷)

میں بھرے قومی جھنڈا لئے اسکول میں آئے جہاں استادوں کی میٹنگ ہو رہی تھی اور انھوں نے اس جھنڈے کو اسکول کی عمارت پر نصب کرنے پر اصرار کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انھیں نرمی سے سمجھایا کہ یہ ایک سیاسی پارٹی کا جھنڈا ہے اور اسکول کسی پارٹی کا نہیں ہے اس لئے اس کا یہاں لگانا مناسب نہیں۔ انھوں نے کہا میں آزادی کے جوش کا جو تمھارے دلوں میں اور ملک کے لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں موج زن ہے احترام کرتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے اسکول کی عمارت پر یونین جیک کبھی نہیں لہرایا جائے گا۔ اگر میری زندگی میں قومی حکومت قائم ہو گئی تو میں اپنے ہاتھ سے اس کا جھنڈا یہاں لہراؤں گا۔ ورنہ تم کو میری وصیت ہے کہ تم جہاں ہو یہاں سے آکر جو ہیڈ ماسٹر اس وقت ہو اس کے ہاتھ سے قومی جھنڈا نصب کرانا۔

ماسٹر صاحب کی تعلیم و تربیت لڑکوں میں عام اخلاقی اور ذہنی صفات پیدا کرنے میں تو بہت کامیاب تھی مگر ان کے انفرادی رجحانات کو ابھارنے میں کوئی خاص مدد نہیں دیتی تھی۔ مدرسے میں دو ایک کھیلوں کے سوا اور کوئی مشاغل نہیں تھے اس لئے جن لڑکوں کو قدرت نے ذوق عمل یا ذوق جمال عطا کیا تھا جن میں تخلیق کا ملکہ یا خدمت کا جذبہ تھا انھیں اپنی شخصیت کو نشوونما دینے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ اس سانچے میں جو ماسٹر صاحب نے بڑی محنت، احتیاط اور کاری گری سے بنایا تھا اچھی طرح نہیں ڈھل سکتے تھے بلکہ دب کر اور بھنچ کر رہ جاتے تھے۔ ظفر بھی ان ہی لڑکوں میں سے تھا۔ اسے ماسٹر صاحب سے اور ان کے اسکول سے وہ روح پرور فیضان حاصل نہ ہو سکا جو وہ چاہتا تھا لیکن جو صحت بخش تربیت ملی اس کے لئے وہ ان کا دل سے احسان مند تھا۔

(باقی آئندہ)

شکریہ اور معذرت

بعض حضرات کے مضمون اور نظمیں جمہوریت نمبر کے لئے اس وقت پہنچیں جب پرچے کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ ادارہ ان کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ معذرت کرتا ہے کہ ان کے عطیوں کو جمہوریت نمبر میں جگہ نہ دی جا سکی مگر ہم ان سب کو بہت جلد شائع کریں گے۔

اقبال اور احتشام

ضیاء الفاروقی

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

سید احتشام حسین صاحب ایم اے اردو کے مشہور ترقی پسند نقاد ہیں۔ اُن کے تنقیدی مضامین شاہد ہیں کہ موصوف کی نظر ادب، آرٹ اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر گہری پڑتی ہے۔ اور کبھی کبھی ادیبوں افسانہ نگاروں اور شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ کچھ اس طرح پکڑتے ہیں کہ بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ چند دنوں کی بات ہے میں نے اُن کی کتاب "روایت اور بغاوت" کا ذکر سنا۔ میرا خیال تھا کہ مصنف نے روایت اور بغاوت کے متعلق کوئی سنجیدہ اور مبسوط کتاب لکھی ہے۔ مگر سخت مایوسی ہوئی جب میں نے اس کتاب کو ان مضامین کا مجموعہ پایا جو وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اہلِ ذوق واقف ہیں کہ یہ مایوسی کس قدر تلخ ہوگی۔ میں متوقع تھا کہ موصوف نے روایت اور بغاوت کے موضوع پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہوگی اور اس طرح یقیناً اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہوگا۔ کتاب کو دیکھنے کے بعد مجھے کہنا پڑا کہ ظاہر و باطن میں بڑا فرق ہوتا ہے اور کسی کا "بیرون" دیکھ کر "اندرون" کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کتاب کے اکثر مضامین میرے دیکھے ہوئے تھے، ایک مضمون نظر سے نہیں گذرا تھا "روحِ اقبال پر ایک نظر"۔ "روحِ اقبال" تو میں نے پڑھی تھی مگر اس پر احتشام صاحب کی "نظر" نہ دیکھی تھی۔ میں نے مضمون شروع سے آخر تک دو بار پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مصنف نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے اور احتیاط کے ساتھ روحِ اقبال کا تجزیہ کیا ہے مگر بعض مقامات پر الجھ کر رہ گئے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو انھوں نے نقاد نہیں مانا ہے اور اُن کو کلامِ اقبال کے شارح اور مفسر کی حیثیت دی ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی اپنے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے دیباچہ میں تنقید کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ [illegible] کہ تنقید تخلیقی ہونی چاہئے میں سمجھتا کہ اس کا مقصد محض انشائیات کی باز آفرینی ہے جو شاعر پر گذر رہی تھیں۔ [illegible] جب تک تخلیقی عنصر شامل نہ ہو نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اُسی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی آواز معلوم ہوتی ہے جس نے کہا تھا کہ "جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے" اور جسے ہڈسن نے دوسرے لفظوں میں کہا ہے کہ "سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لئے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیقی ہے"۔ "روایت اور بغاوت" کے مصنف نے باز آفرینی کے لفظ پر گرفت کی ہے اور بہت شاندار الفاظ میں کہا ہے کہ "ظاہر ہے کہ جو تنقید صرف ان تصورات، محسوسات اور تخیلات کی باز آفرینی ہی کو اپنا منتہائے نظر جانتی ہے جس سے شاعر کو واسطہ پڑا تھا، اس تنقید کا مقصد تشریح اور تفسیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے"۔ باز آفرینی میں مسئلے کے دونوں پہلو آ جاتے ہیں۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ شاعر کو بھی ان دونوں پہلوؤں سے واسطہ پڑا ہو اور بڑے غور و فکر اور تنقیدی نظر کے بعد کسی ایک پہلو کو نظم کر دیا ہو۔ اقبال صرف شاعر ہی نہیں مفکر اور فلسفی بھی ہیں اور اُن کے دواوین ان کے افکار کا ماحصل ہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اقبال کے متعلق ہمدردانہ ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اقبال کی شخصیت سے بے جا طور پر مرعوب ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقبال کا کلام جس فلسفہ اور جس مذہب کی تفسیر ہے۔ اس سے اُن کا پورا پورا اتفاق ہے، اقبال نہ تو مسلمانوں کے شاعر تھے اور نہ کائنات کے وہ اسلام کے شاعر تھے، اور اسلام کے فلسفۂ تمدن نظامِ حیات اور مابعد الطبیعاتی تصورات میں کائنات کی فلاح دیکھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اسلام میں ہر دور اور ہر سماج کی کشاکش کا مداوا موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اسلام تک ایک دور دراز راستے سے پہنچے ہیں اور نٹشے نے کانٹ اور شوپنہار کے جس فلسفہ کا تجزیہ کر کے ایک مثبت فلسفے کی بنیاد ڈالی تھی اقبال نے اس کا جواز اسلام جیسے اخلاقی مذہب میں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقبال کو جدید بھی کہتے ہیں اور قدیم بھی۔ احتشام صاحب بھی معترف ہیں کہ وہ دین کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے تھے اس طرح اقبال کے فلسفۂ زندگی، فلسفۂ تمدن اور مابعد الطبیعاتی تصورات پر تنقید اقبال کے تصورات کی تنقید نہ ہوگی بلکہ اس دین کی تنقید ہوگی جس کے لئے اقبال ذمہ دار نہیں ہیں۔ اقبال نے یہ کہہ کر بحث ہی تمام کر دی ہے

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال کا انفرادی طور پر اپنا کوئی فلسفہ نہیں تھا انھوں نے مغرب اور مشرق کے نظریات کا ایک خوش گوار مرکب تیار کیا تھا اور اس طرح نہ تو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے باغی تھے اور نہ مغربی تاثرات سے متنفر تھے۔ انھوں نے مغربی نظریات کو وہاں تک اپنایا جہاں تک وہ اسلام کی "روح" کا ساتھ دے سکتے تھے اور اس طرح انھوں نے کسی حد تک موجودہ زمانے میں امام غزالی کا کام کیا۔

ہمارے محترم مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اقبال کے ہاں ادب اور قواعدِ زبان اور محاورے کی غلطی نکالنا اقبال کی کمزوری یا توہین نہیں ہے بلکہ اس زبان اور نسل کی توہین ہے جو اقبال کی دنیا میں صرف یہی تلاش کر کے مطمئن ہے اور اس طاقت کو نہیں دیکھتی جو نسلوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ احتشام صاحب اس طاقت کا اقرار کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ وہ اقبال کی شاعری میں اور کیا چاہتے ہیں اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ انھوں نے یہ کہہ کر اقبال کو اس مفکر اور مصلح کا درجہ دیا ہے جو اپنے زمانے کی سماجی کشمکش، تمدنی تصادم اور نظریاتی کشاکش پر بھرپور نظر رکھتا ہے کیونکہ بغیر اس "نظر" کے تقدیر بدل دینے والی طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی اقبال بھی اپنے ایقان و ایمان کے باوجود شک میں مبتلا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

یہ جو عالمِ رنگ و بو میں نگہ الجھی ہوئی ہے یہ اقبال کی نگہ نہیں ہے بلکہ ان مادہ پرستوں کی نگاہ ہے جو اسلام کے الہیاتی تصورات سے الگ ہو کر زندگی کے مسائل اور اُن کے حل پر غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے توہمات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال تصوف کو بھی کسی اور نظر سے دیکھتے تھے اُن کے تصوف اور حافظ شیرازی کے تصوف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک، عمل مسلسل حرکت سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو و آرزو میں زندگی اور اس کی کامرانیاں دیکھتا ہے اور دوسرا یاس پستی اور قنوطیت کی تعلیم دیتا ہے۔ تصوف کے سوز و گداز کی یہی چاشنی تھی جس سے انھیں فغانِ صبح گاہی اور نالۂ نیم شبی میں لذت ملتی تھی اور جو مقامِ شوق کی منزلِ اولیں ہے اس پر اُن کا ایمان تھا!

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

احتشام صاحب کی رائے میں اقبال خود منزل کا تعین نہیں کر سکے اور اس سلسلے میں وہ اُن چند اشعار کو پیش کرتے ہیں جو اُن حوصلہ مند اصحاب کے لئے جو کوشش ناتمام اور سعیٔ پیہم ہی میں زندگی اور اس کی ساری بلندیاں دیکھتے ہیں۔ راہ بھی ہیں،

رہبر بھی ہیں اور منزل بھی ہیں۔

احتشام صاحب اس تصوریت پر معترض ہیں کہ اقبال کے مقابلے میں عشق کو فضیلت دیتے ہیں میرے عزیز دوست کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اقبال جس فلسفے اور مذہب کا پیرو تھے وہاں کچھ ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں عقل کی موشگافیاں اور علم کی مصلحت آمیزیاں عمل کی راہ میں حائل ہوتی ہیں اور عشق کی معجز نمائیاں ہی ممد و معاون ہوتی ہیں اور یہ کہتے وقت تاریخ کا بیش بہا خزانہ میرے سامنے ہے جس میں بیسیوں مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں عشق بے خطر ہو کر آتش نمرود میں کود پڑا ہے اور شوق نے علم و عقل کی رنگین نوائیوں سے بے نیاز ہو کر ہزاروں کربلا کی دعوت دل گداز کو قبول کیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ روز ازل سے ہی اس عشق کی تلقین کرتا ہے۔

روز ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ۔۔۔ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔۔۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

احتشام صاحب کو اگر یہ شکایت ہے کہ اقبال فرد اور جماعت میں کوئی دائمی ربط نہیں قائم کرتے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان لوگوں کو یقیناً مایوسی ہوگی جو یورپ کے موجودہ جمہوری نظام اور ڈکٹیٹر پرولتاری امریت میں بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبود دیکھتے ہیں اور مغرب کی سیاسی سماجی اور مذہبی تحریکات کو جوں کا توں مان لیتے ہیں۔ اقبال نے انسان کامل کی آرزو کی ہے۔ خودی کے تصور میں اقبال کا علو کسی انفرادی نقطۂ نظر کا ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ اسی "فلسفۂ خلافت" کی تشریح ہے جہاں جمہوری نظام اور مجلس شوریٰ کے وجود کے باوجود خلیفہ کو اپنے عقل اور گردو پیش کے حالات کے مطابق انفرادی صورت پر فیصلے کا کامل اختیار دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال موجودہ جمہوریت سے مطمئن نہیں ہیں۔

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں ۔۔۔ بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال کو اس بات کا یقین تھا کہ مرد کامل چند ہی ہوتے ہیں، مگر ہونے ضرور ہیں جو پوری نسل کو اس جذبۂ عمل اور مقام شوق کی تلقین کرتے ہیں جو ان کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔

خودی میں ڈوبتے ہیں اور ابھر بھی آتے ہیں ۔۔۔ مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں

اقبال نے مسلمانوں کی زبوں حالی ان کی ذہنی پستی اور تمام عالم اسلامی کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور وہ جانتے تھے کہ اس وقت اہل مغرب کا مقابلہ وہ کسی طرح نہیں کر سکتے مغرب علم کا جویا، نئی تحقیقات میں سرگرم اور حوصلہ مند تھا۔ عمل کا جذبہ اور عالم پر حکمرانی کا حوصلہ یورپ والوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے اواخر تک وہ تمام عالم پر چھا گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسلامی نظام حیات پر مغربی تمدن کو ترجیح دیتے تھے اور شاید کسی مقام پر انھوں نے اس مسئلے کو پیچیدہ نہیں بنایا تھا۔ ہر کہیں وہ مغرب سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو علم و عمل پیدا کرنے کی بھی ہیں کیونکہ جب تک مسلمان جویائے علم اور سرگرم عمل نہ ہوگا اسلامی نظام حیات کا قیام ناممکن ہے وہ نظام حیات جس کی برتری اور افضلیت کا اعلان اقبال کا ابلیس اس طرح کرتا ہے۔

کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ ۔۔۔ سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد ۔۔۔ یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

پھر وہ اپنے مشیروں کو حکم دیتا ہے ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے ۔۔۔ تا بساط زندگی میں اس کا سب مہرے ہوں مات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر ۔۔۔ جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ۔۔۔ ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے ۔۔۔ پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اس سے بڑھ کر اسلامی نظام حیات کی برتری کی تشریح اور کیا ہو سکتی ہے اب اگر خود ہی کوئی سخن گسترانہ بات کے لئے مسئلے کو پیچیدہ بنالے تو اس میں شاعر کا کیا قصور یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو اسلام کا فلسفۂ تمدن، فلسفۂ حیات اور مابعد الطبیعاتی تصورات سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں، اقبال کے دواوین میں تنقید و تنقیص کے بعد بہت سے پہلو نظر آئیں گے اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ اقبال کی تنقید نہ ہوگی۔

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

ادارۂ تحریر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ جید پریس دہلی

طابع و ناشر:۔ عبداللطیف اعظمی (بی اے، جامعہ)

پندرہ روزہ

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

بنگال کو بچاؤ! (اداریہ) ۲

بزم بے تکلف

ایک نظم عبادت بریلوی ۳

خزاں کے پھول خلیل الرحمان اعظمی ۳

دنیا کی رفتار

(۱) ہندوستان ع ' ح ۴

(۲) باہر کی دنیا ع ' ل ۴

جامعہ میں جشن جمہوریت ۵

ادبی تبصرہ خواجہ احمد فاروقی ۶

اردو دوست اب کیا کریں ؟

پروفیسر راجندر ناتھ شیدا ۷

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)

ڈاکٹر سید عابد حسین ۹

اڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

ہفتہ وار

نئی روشنی

دہلی

ادارۂ تحریر:

ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

جلد ۳ | ۱۷ فروری ۱۹۵۰ء | نمبر ۷

بنگال کو بچاؤ

کچھ عرصے سے مشرقی اور مغربی بنگال سے فرقہ وارانہ فسادات کی تشویشناک اطلاعیں مل رہی ہیں۔ پہلے یہ خبریں آئیں کہ مشرقی بنگال کے خاص حصوں میں اقلیت کے ساتھ زیادتیاں کی گئیں جن کی وجہ سے مشرق سے مغرب کی طرف ہجرت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ ان میں سے بعض خبروں کی مشرقی بنگال کے ذمہ دار کانگریسی لیڈروں نے تردید کی۔ مگر کچھ ایسی بھی تھیں جن کی کسی قابل اطمینان ذریعے سے تردید نہیں ہوئی۔ اخبارات نے سب کو یکساں اہمیت دی اور بہت نمایاں طریقے سے شائع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی بنگال میں مرشد آباد کے ضلع میں گڑبڑ شروع ہوئی۔ اگرچہ حکام کی مستعدی سے وہ زیادہ بڑھنے نہیں پائی۔ اس کے بعد کلکتے میں جہاں عام طور پر لوگوں میں سیاسی اور معاشی بے چینی موجود ہے اور کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ فساد بادہ فرقہ وارانہ فساد کی طرف ڈھل گیا اور آتش زنی اور چھرے بازی کے واقعات ہونے لگے۔ اس کا رد عمل ڈھاکے میں ہوا اور وہاں بھی کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے جہاں تک اخباروں کی خبروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے دونوں طرف کی حکومتیں فساد کو دبانے کے لئے سختی سے کام لے رہی ہیں اور دونوں کے نمائندے مل کر اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس خطرناک صورت حال کو کیونکر قابو میں لایا جائے۔ حکومت ہند کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے عوام سے امن اور سکون کی التجا کی ہے۔ پنڈت نہرو نے کہا ہے "میں کلکتے کے شہریوں، مغربی بنگال کے لوگوں اور پناہ گزینوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ بد امنی کے مظاہروں کو جلد سے جلد ختم کر دیں اور حالات کے معمول پر آنے میں مدد دیں اس کے بعد ہم نئے مسائل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جیسے ہم نے پرانے مسائل کا مقابلہ کیا تھا اپنی متحدہ طاقت سے اور ان مقصدوں اور اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن کے ہم ہمیشہ پابند رہے اور جن پر ہمارے ملک کی عظمت کا انحصار ہے۔"

سردار پٹیل نے بھی وزیر اعظم کی اپیل کی تائید کی اور اس بات پر زور دیا کہ پناہ گزینوں کی مدد کرنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ ان کا بدلہ لینے کے لئے دوسرے کو ستایا جائے۔ اس سے ان کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ اور نقصان ہوگا۔ بعضوں نے کہا کہ حکومت ہند سرکاری طور پر پاکستان کی حکومت سے تقاضا کر رہی ہے کہ مشرقی بنگال میں اقلیتوں کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے اور جو لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر آ گئے ہیں ان کو واپسی کی سہولتیں دی جائیں۔

جب تقسیم ہند کا چرچا شروع ہوا تو بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ جھگڑے سب سے پہلے بنگال ہی میں شروع ہوئے تھے۔ لیکن مہاتما گاندھی کی کوششوں کی برکت تھی کہ وہ فتنے جو کلکتے اور نواکھالی میں اٹھے تھے زیادہ پھیلنے نہیں پائے اور تقسیم کے بعد بنگال کے دونوں حصے اس صوبہ گیر قتل و غارت سے محفوظ رہے جس نے پنجاب کے جسم و روح کو بری طرح گھائل کر دیا۔ پچھلے تین سال میں مغربی اور مشرقی بنگال میں فرقہ وارانہ آویزش کے چھوٹے چھوٹے واقعات تو ہوئے لیکن مجموعی طور پر ہندو مسلمانوں کے تعلقات کچھ ایسے برے نہیں رہے۔ یوں تو باہمی منافرت کا یہاں بھی زہر موجود تھا لیکن وہ کا و دہن تک محدود رہا۔ رگ و پے میں اترنے نہیں پایا۔ ارباب غرض نے بار بار یہ پروپگنڈا کی مہم شروع کی کہ مغربی بنگال میں مسلمانوں کے ساتھ یہ ہوا اور مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ وہ ہوا لیکن ہر مرتبہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ خبریں یا تو بالکل بے بنیاد یا بہت مبالغہ آمیز ہیں۔

اب بہت دن کے بعد پھر دونوں طرف سے یہ شور اٹھا ہے مغربی بنگال کے بارے میں ہمارے اخبارات نے آسانی سے تحقیق کر لیا کہ مثلاً مرشد آباد میں فساد ہوا ضرور لیکن بہت چھوٹے پیمانے پر اور بہت جلد دبا دیا گیا۔ لیکن مشرقی بنگال کے بارے میں ہمارے پاس صحیح خبریں معلوم کرنے کے کافی وسائل نہیں ہیں۔ اس لئے افواہوں کا زور ہے اور ان سے سخت اشتعال پیدا ہو رہا ہے چنانچہ کلکتے میں فساد کی آگ شدت سے بھڑک اٹھی ہے اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک طرف حکومت بنگال نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ مفسد عناصر کو سختی سے کچلے گی اور دوسری طرف پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے عوام سے اپیل کی ہے کہ صبر و سکون سے کام لیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے کی طرح شری پی، سی گھوش اور دوسرے کانگریسی لیڈر مشرقی بنگال جا کر صحیح حالات معلوم کریں اور اقلیتوں کی جائز شکایتوں کو مشرقی بنگال کی حکومت کے کانوں تک پہنچا کر ان کو دور کرانے کی کوشش کریں۔ جہاں ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہاں کی حکومت اور ذمہ دار لیڈر فرقہ وارانہ فسادات کے خطرے کو پورے طرح محسوس کرتے ہیں اور انھیں روکنے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں چنانچہ جو سرکاری وفد مشرقی بنگال کی حکومت سے گفتگو کرنے ڈھاکہ گیا ہوا تھا اس نے آکر بیان دیا ہے کہ وہاں امن قائم کرنے کی پوری کوشش ہو رہی ہے اور دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی مشترک کانفرنس میں اقلیتوں کی حفاظت اور فساد کی روک تھام کے لئے مؤثر تدبیریں اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ادھر فضل الحق صاحب جن کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ مشرقی بنگال کے گورنر ہونے والے ہیں امن اور دوستی کا پیام لے کر کلکتے آئے ہیں۔ صرف اس بات کی کمی محسوس ہو رہی ہے کہ پاکستان کی مرکزی حکومت نے ابھی تک اس اہم معاملے میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم اور دوسرے لیڈر بھی بنگال کے فتنے کو دبانے کے لئے اپنا سارا اثر استعمال کریں گے۔

جہاں تک ہندوستان کی دوسری ریاستوں کا تعلق ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کو چاہئے کہ بنگال کے واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھیں اور اس خوف و ہراس کی لہر سے متاثر نہ ہوں جو اضطراری طور پر پھیل رہی ہے یا خاص کر کے پھیلائی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنگال میں بھی فرقہ وارانہ فساد کا وہی طوفان اٹھنے والا ہے جو پنجاب میں ۱۹۴۷ء میں اٹھا تھا اور چونکہ مشرقی بنگال میں جو ہندو اور مغربی بنگال میں جو مسلمان اس سے متاثر ہوں گے ان کی تعداد پنجاب کے فساد زدہ ہندو مسلمانوں سے دگنی ہے اس لئے اس طوفان کا اثر اور بھی زیادہ شدید اور ہولناک ہوگا۔ لیکن اگر آپ ذرا غور کریں تو پنجاب اور بنگال میں اور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء میں بہت فرق ہے اور جہاں تک قیاس کام دے سکتا ہے۔ پنجاب کے واقعات کا بنگال میں دہرایا جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایک تو پنجاب کے لوگ جن میں صدیوں کی فوجی روایات ہیں عام طور پر بنگال کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنگ جو ہیں۔ دوسرے پنجاب میں سکھوں کا مسئلہ تھا جنھیں تقسیم نے خاص طور پر نقصان پہنچایا تھا اور وہ شدید غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے پھر ۱۹۴۷ء میں مشرقی اور مغربی پنجاب کی اور خود ہند و پاکستان کی حکومتیں سو ڈیڑھ سو سال کے جمے ہوئے نظام کے اکھڑنے اور تقسیم کے فوری اثرات کی وجہ سے اتنی کمزور تھیں کہ فسادات روکنا تو ایک طرف انھیں اپنا قائم رکھنا مشکل تھا لیکن اب ۱۹۵۰ء میں ہند اور پاکستان کے سب حصوں میں حکومت کا نظم و نسق مضبوطی سے قائم ہو چکا ہے اور کہیں کی حکومت اتنی کمزور اور بے بس نہیں کہ فسادات کی آگ کو پھیلنے سے روک نہ سکے۔ اب رہی یہ بدگمانی کہ کوئی ایک حکومت یا دونوں خود ہی فساد کرانا چاہتی ہیں سراسر خلاف عقل ہے۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ پنجاب کے فساد نے دونوں ملکوں کی کمر جھکا دی ہے اور اگر خدا نخواستہ بنگال کا بھی یہی حال ہوا تو دونوں کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اگر حکومتیں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہیں اور نفرت و مخالفت کے جذبات سے بے قابو ہو جاتی ہیں تو وہ فرقہ وارانہ فساد کا راستہ نہیں بلکہ دوسرا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ غرض ہمیں افواہوں سے متاثر ہو کر اپنے اعصاب کو مختل اور دماغ کو پریشان نہیں ہونے دینا چاہئے بلکہ آئندہ کے موہوم خطرے کا خیال دل سے نکال کر موجودہ خطرے کا جو کلکتے کو درپیش ہے اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہئے کیونکہ بنگال کو جس میں پہلے ہی سے کافی سیاسی اور معاشی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

بزمِ بے تکلف

"ہم صبح چائے کے فراق میں میر صاحب کی بیٹھک میں جو داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ رنگ زرد ہے، ہونٹ خشک ہیں آنکھیں بند کئے بلک بلک کر دعا مانگ رہے ہیں" اے مرے، اللہ، جل تو جلال تو، صاحب کمال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔"

"ہم نے بھی ہانک لگائی" اے اللہ کے بندے، ہوش زرا سنبھال تو، دیکھ تو اپنا حال تو، لب پہ نہ لا یہ قال تو۔"

میر صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، ہم کو دیکھتے ہی ان کا خشوع و خضوع غائب ہوگیا اور اس کی جگہ قہر و جلال نے لے لی۔ ڈپٹ کر بولے" یہ کیا بے ہودہ پن ہے۔ کسی کی جان پر بنی ہے اور آپ کو دل لگی سوجھی ہے۔ تُک بندی فرمارہے ہیں۔"

ہم نے معصومیت کے انداز میں کہا" میر صاحب تُک بندی اگر کوئی بُری چیز ہے تو آپ کیوں فرما رہے تھے۔ قصور معاف۔ آپ جلالتو اور کمالتو کی ضربیں لگائیں تو وہ تھا بیہودہ پن ہے اور ہماری زبان سے حالتو اور فالتو نکل جائے تو بیہودہ پن ہوگیا خیر اسے چھوڑیے، یہ بتلایئے کہ یہ جان پر بننے کا کیا قصہ ہے۔ کیا خدانخواستہ وہ بواسیر کی شکایت پھر شروع ہوگئی؟"

"میر صاحب اور بھڑک گئے اس لئے کہ یہ ان کا سربستہ راز ہے جسے وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے وہ علت بواسیری کو شانِ میری کے خلاف سمجھتے ہیں اور جب یہ کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے تو اسے قبض کہا کرتے ہیں جیسے قبض کوئی بڑا ناگفتہ مرض ہو! کمزور کا غصے کے زور میں جو کٹکھنا لہجہ ہوجاتا ہے اس میں کہنے لگے" بس رہنے دو اپنی سفلی باتیں۔ تمیز سے گفتگو کرنا ہو تو کرنہ، ورنہ چلتے پھرتے نظر آیئے۔"

ہم میر صاحب سے پوچھنا چاہتے تھے کہ آخر سفلی چیز کے لئے علوی نام کہاں سے آئے۔ مگر مصلحت سمجھ کر ٹال گئے۔ اس لئے کہ ہمیں اس وقت یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ میر صاحب کی جانِ حزیں پہ کیا بنی ہے اور کیوں بنی ہے۔ چنانچہ ہم نے بڑی عاجزی سے کہا

"میر صاحب خدا کے لئے یہ بتا دیجئے کہ وہ کون سا درد نہاں ہے جس نے اندر سے آپ کے دشمنوں کی جان پر بنا دی اور باہر سے آپ کا حلیہ بگاڑ دیا۔"

ہمارے اس طرح چھینٹا دینے سے میر صاحب ٹھنڈے پڑ گئے اور آہ سرد بھر کر بولے" ارے میاں ہم کیا اور ہمارا حلیہ کیا، ہمیں تو اس نامراد دنیا کی فکر ہے کہ مفت میں حیدر جن کے ہاتھوں برباد ہورہی ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک پھونک میں بھک سے اُڑ جائے گی۔"

ہم کو بے اختیار ہنسی آگئی اور ہم نے کہا" بس؟ آپ کی یہ ساری ہول دلی جنات کے خوف سے تھی؟ آپ کو معلوم نہیں کہ اس بیسویں صدی میں پریوں کا سایہ اُٹھ گیا اور جن ہوا ہوگئے۔ مگر میر صاحب یعقوب جن کا ذکر تو مدت سے سن رہے تھے، حیدر جن کا نام آج ہی سُنا۔ آخر ان بزرگ کی شانِ نزول کیا ہے؟"

میر صاحب نے اس سادگی سے جس پر" کون نہ مرجائے اے خدا" فرمایا

"ارے بھئی یہ حیدر جن کوئی ایسا ویسا نہیں بڑا گمبھیر، گھن گرج، فرمائشی جن ہے، کیمیا، سیمیا کے اسم اعظم سے بلایا گیا ہے، کوئی کہتا ہے امریکہ نے بلایا ہے کوئی کہتا ہے روس نے۔ یہ بنے صاحب کے سوتیلے بیٹے جو اخبار کے دفتر میں نوکر ہیں نا، کہہ رہے تھے کہ صاحب جہاں غلیلہ چلایا، بس دم بھر آنکھوں سے آگ برسا تا، منہ سے انگارے اگلتا آن موجود ہوا، اور اس کی پھنکار اس غضب کی ہے کہ داستانِ امیر حمزہ کی تاریک شکل کش یاد آجاتی ہے۔ ایک سانس میں کوسوں تک کی زمین آدم زاد، چرند، پرند سب دھواں بن کر اُڑ جاتے ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوئے۔ اب تمھیں سوچو کہ اگر خدانخواستہ کسی نے اُسے ناس کی ایک چٹکی سنگھا دی اور چھینکیں آنے لگیں تو پھر یہ زمین کہاں آسمان کہاں، تم کہاں اور ہم کہاں؟"

ہم اب سمجھے کہ یہ حیدر جن کس چیز کا انگالہ ہے اور میر صاحب (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

نظم

عبادت بریلوی

خموشیوں سے یہ کہہ رہی ہے اداس راہوں کی چشمِ حیراں
ابھی تو وہ کارواں نہ گذرا کہ جس کے غم میں ہے اشک افشاں
یہ مہر و مہ، یہ چمکتے تارے، یہ سحر آگیں حسیں نظارے
یہ ریگ زاروں کے تپتے ذرّے، یہ بہتی ندی کے مڑتے دھارے
یہ جذب کب سے خموشیوں میں ہزاروں چیخیں ہزاروں آہیں
فضا کے سینے میں گھل چکیں ہیں کروروں دردِ آفریں کراہیں
تڑپ چکی ہیں تڑپ رہی ہیں ہزاروں لاشیں اسی زمیں پر
ہے ذرے ذرے میں خونِ انساں جو بول اٹھتا ہے تو رپا کر
مگر یہ کیا ہے کہ پربتوں کی وہ اونچی اونچی سی چوٹیاں اب
جبیں پہ افشاں لگا چکی ہیں مگر ہیں پھر بھی سکوت برلب
اور اُن کے اس پار کچھ ستارے فضا میں پر ربط بجاسے ہیں
اداس راہوں کی خامشی کے جو زمزمے سے سُنا رہے ہیں
اُداس راہیں مگر یہ اب تک ہزاروں سالوں سے سوچتی ہیں
نہ جانے گذرے گا کارواں کب کہ اب تو نظریں بھی تھک چکی ہیں

خزاں کے پھول

خلیل الرحمٰن اعظمی

دیارِ عشق کی یادوں سے کھیلنے والے
کہیں یہ خواب تری زندگی نہ بن جائے
کسک یہ ہجرِ مسلسل کی، یہ شبوں کا گداز
یہ اک چمک ہی کہیں روشنی نہ بن جائے

ابھی تو درد نے کروٹ سی لی تھی سینے میں
ابھی سجی بھی نہ تھی تیرے غم کی یہ محفل
کہیں وہ ایک شرارہ سا پھر بھڑک اٹھا
دھڑک کے رُکنے لگے جیسے ظلمتوں کے دل

کرن کے بھیس میں یہ جگنوؤں کی بے تابی
فریب دیتی رہی تیری ان نگاہوں کو
تمام عمر رہی جیسے آرزوئے سحر
جہاں میں حُسن و محبت کی جلوہ گاہوں کو

کسی کی بزم میں گذرے ہوئے نزرے لمحے
پلٹ کے پھر تری دنیا میں کیسے آسکتے
بہار جا بھی چکی وہ چمن اُجڑ بھی چکا
خزاں کے پھول یہ کس طرح مسکرا سکتے

اسی کھنڈر پہ مگر اب بھی اس تصور کے
نہ جانے کتنے ہی دیپک جلائے جاتے ہیں
اُداس راہوں پہ قدموں کے اب نشاں بھی نہیں
مگر ابھی وہیں سجدے لٹائے جاتے ہیں

دنیا کی رفتار

ہندوستان

پولیس کو اپنا طرزِ عمل بدلنا ہوگا

جب سے ہمارے ملک میں بدیسی حکومت آئی، پولیس اور عوام کے تعلقات میں ہمیشہ ان کی طرف سے معمولاً مخالفت کے اور بعض کبھی دشمنی کے جذبات پائے جاتے تھے خصوصاً جب سے آزادی کی تحریک شروع ہوئی اور عوام اس طرف کھینچنے لگے انگریزوں نے پولیس میں تشدد اور سختی پیدا کی، تعلقات پیدا ہو گئے۔ قصہ ...ری ... کو پولیس لیتا اور قصہ کار کا جب ... تعلق بھی پہنچا تھا لیکن آزادی کے بعد ان تعلقات میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے ورنہ ملک میں امن کسی طرح قائم نہیں رہ سکتا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس تبدیلی کے آثار ابھی کم نظر آتے ہیں۔ پچھلے ڈھائی سال میں عوام کی طرف سے پولیس کی دراز دستی کی بار ہا شکایت کی گئی جو کبھی صحیح اور کبھی غلط ثابت ہوئی۔ لیکن حتنا اشتعال پچھلے چند روز میں بریلی کے عام باشندوں میں ان غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہوا اور پولیس نے طالب علموں پر کی اتنا شاید آزادی کے بعد سے کبھی نہ پیدا ہوا ہوگا۔ اسی لئے فساد کی آگ اس شدت سے بھڑک کر کئی دن کے بعد فوج کی مدد سے قابو میں آ سکی۔ یو پی کی حکومت نے معاملے کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ پولیس کے تین افسر معطل کر دیے گئے ہیں اور واقعات کی پوری پوری تحقیقات کی جا رہی ہے لیکن ہمارے خیال میں محض اس ایک واقعے کی تحقیقات کر کے چند لوگوں کو سزا دے دینا کافی نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ بریلی کے افسوسناک ہنگامے سے عبرت حاصل کر کے نظم پولیس کے ماہروں اور عوام کے نمایندوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو سارے ہندوستان کا دورہ کرے۔ پولیس کے افسروں اور دوسرے لوگوں کی شہادتیں جمع کرنے کے بعد اس مسئلے پر غور کرے کہ ایک آزاد جمہوری ریاست میں پولیس کو اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ اس میں اور عوام میں تصادم نہیں بلکہ تعاون ہو۔ بہرحال موجودہ صورتِ حال نہایت ناقابلِ اطمینان ہے۔

جہاز بھی بند

ہندوستان کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ۱۵ فروری کے بعد سے پاکستان کے جہازوں کو ہندوستان کے ساحلوں پر تجارت کی غرض سے آمد و رفت کے لیسنس نہیں دیے جائیں گے۔ تقسیم کے بعد سے بنک پاکستان کے ریل سے کرچی ۲۵ دہ تک جہاز ہندوستان مال لاتے لے جاتے تھے۔ لیکن چونکہ ہندوستان پاکستان کی تجارت بہت الگ ہو گئی ہے اور ہندوستان نے جہازوں کے لئے جو ساحلی تجارت میں استعمال ہوتے ہیں، کافی مال نہیں ملتا۔ خصوصاً پاکستان کی بندرگاہوں سے مال لانے سے وہ بالکل محروم کر دیے گئے اس لئے حکومت کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔ ہند اور پاکستان کی تجارتی الجھن انتہا کو پہنچ گئی ہے جو دونوں کے لئے خصوصاً پاکستان کے لئے بہت مضر ثابت ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں تو زیادہ تر نقصان کپڑوں کے کارخانوں کو ہوا لیکن مجموعی طور پر ہندوستان کی بیرونی تجارت میں بہت اضافہ ہو گیا جس نے پاکستان سے کاروبار بند ہو جانے کی تلافی کر دی۔ چنانچہ درآمد کا اوسط جو اکتوبر تک ۴۰ کروڑ ہوا کرتا تھا، نومبر میں ساڑھے پچاس کروڑ اور دسمبر میں پچاس کروڑ رہا۔ لیکن پاکستان کی بیرونی تجارت جوٹ کی فروخت میں کمی ہونے کی وجہ سے گھٹ گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ پاکستان اس کمی کو مستقل سمجھتی ہے اس لئے کہ مشرقی بنگال کی حکومت نے پاکستان جوٹ بورڈ کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ سال وہاں جوٹ کی کاشت صرف روپے میں چھ آنے ہو اور جو زمین جوٹ سے خالی ہو اس میں غلہ پیدا کیا جائے۔ تا کہ مشرقی پاکستان میں غذا کی کمی نہ رہے۔ ہند اور پاکستان دونوں جگہ ان ہزارہا تاجروں کا کاروبار بیٹھ گیا ہے جو ایک دوسرے سے تجارت کیا کرتے تھے اس لئے عقل اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں طرف سے اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اب دیکھنا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان سکریٹریوں کی جو کانفرنس اس مہینے کے آخر میں ہونے والی ہے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

باہر کی دنیا

امنِ عالم کے لئے نیا خطرہ

ویٹ نام کی جمہوری حکومت کو جو ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قائم کی گئی ہے اور جس کے پہلے صدر ہوچی منہہ مقرر ہوئے ہیں کمیونسٹ چین، روس اور بعض دوسرے ممالک مثلاً شمالی کوریا، چیکوسلوویکیا، رومانیہ، پولینڈ، بلگیریا اور ہنگری نے باقاعدہ حکومت تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس سے بین الاقوامی سیاست میں اور زیادہ الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے اور جمہوری ملکوں اور روس کے ٹکراؤ کے امکانات بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ چونکہ ویٹ نام اس وقت ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ایسا نہ ہو یہ چھوٹا سا واقعہ کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ نہ ہو یعنی بڑی بڑی طاقتیں اپنے مفاد کی حفاظت میں ہند چین میں ٹکرائیں اور عالمگیر جنگ چھڑ جائے۔

اس قسم کا خطرہ آج سے تین سال پہلے ایران میں پیدا ہوا تھا۔ دو سال ہوئے یہی خدشہ یونان میں تھا۔ یہی ڈر پچھلے سال برلن میں ظاہر کیا جا رہا تھا اور کچھ عرصہ ہوا اسی قسم کی باتیں یوگوسلاویہ کے متعلق کی جا رہی تھیں۔ ان ملکوں کے مسائل تو کسی نہ کسی طرح حل ہو گئے، یا کچھ عرصے کے لئے ٹال دیے گئے۔ جس سے بڑی طاقتوں کے تصادم کا خطرہ، چاہے عارضی طور پر، بہرحال ٹل گیا، مگر ہند چین کی صورتِ حال ان سب سے مختلف اور بہت زیادہ نازک ہے فرانس، برطانیہ اور امریکہ نے باؤ دائی کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسری طرف کمیونسٹ چین، روس اور اس کے ساتھیوں نے ڈاکٹر ہوچی منہہ کی جمہوریہ کو تسلیم کر لیا ہے اور اس سے سیاسی ناطہ جوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اختلافات کی خلیج کم نہ ہوئی تو دونوں فریقوں کے بھیجے ہتھیار اور فوجی ماہرین ہند چین پہنچیں گے، اور ان سے جو آتش فشاں بن کر پھٹے گا اس سے دور دور تک کی زمین ہل جائے گی۔

اس صورتِ حال میں جمہوری طاقتوں بالخصوص فرانس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ اگر فرانس دور اندیشی اور تدبر سے کام لے اور جس طرح برطانیہ نے ہندوستان کو اور ہالینڈ نے انڈونیشیا کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح وہ بھی عقل سے کام لے اور ہند چین کی قسمت کا فیصلہ خود اس کے باشندوں پر چھوڑ دے تو یہ نازک صورتِ حال ٹل جائے گی۔ جس سے ایک طرف دنیا کے امن کو فائدہ پہنچے گا، دوسری طرف خود فرانس کے خلفشار کو کم کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ورنہ ہند چین کی یہ بے چینی خود فرانس کو بھی لے ڈوبے گی۔

دمشق اور عراق کو ملانے کی اسکیم

برطانوی سامراج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ آسانی سے ہار نہیں مانتی اور آخر دم تک سخت سے نامساعد حالات میں بھی اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اس کا چڑھتا ہوا سورج گہن میں آ گیا ہے۔ مگر اس کے استقلال اور ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ناموافق حالات کے باوجود وہ اپنی کوشش میں برابر لگی ہوئی ہے اس کی سب سے واضح اور روشن مثال اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں نظر آ رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں برطانوی سامراج کو اس وقت دو مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ایک وہاں کے عوام کی بیداری دوسرے امریکہ کی بعض ملکوں کے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی۔ دمشق میں برطانیہ کو اس وقت ان دونوں مشکلات کا سامنا ہے۔ دمشق اور عراق کو ایک دوسرے میں ملانے اور عرب ریاستوں میں وفاقی نظام قائم کرنے کی اسکیم زیرِ غور ہے۔ اس اسکیم کی خود دمشق میں نہایت شدت کے ساتھ مخالفت ہو رہی ہے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

جامعہ ملیہ میں جشنِ جمہوریت

۲۶ر جنوری کو صبح ۹ بجے جامعہ نگر کی ساری برادری "فلیگ اسٹاف" کے گرد جمع ہوئی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی جامعہ کے بچوں نے شفیع الدین نیر کا یہ ترانہ گایا:-

اچھا اچھا نیارا نیارا رنگ ترنگا پیارا پیارا
قوم کی اُمیدوں کا سہارا دیس دلارا جگ اجیارا
دل کی ٹھنڈک آنکھ کا تارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

ہوش میں ہم کو لانے والا جوش سے دل گرمانے والا
خدمت پر اُکسانے والا بیڑا پار لگانے والا
قوم کی نیا کھیون ہارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

آزادی کے پروانوں پر اس دیس کے دیوانوں پر
بلوانوں کو [illegible] دیس کے سب انسانوں کو
ہر کو اپنی جان سے پیارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جب جھنڈا لہراتا ہے یہ من کی جوت جگاتا ہے یہ
اپنایت پھیلاتا ہے یہ پریت کی ریت سکھاتا ہے یہ
پریم کا ساگر پریم کا دھارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

آؤ یہ جھنڈا لہرائیں آؤ اس پر بل بل جائیں
دیس کے بگڑے کام بنائیں آپس کے سب بیر مٹائیں
نکلے [illegible] ست جھنکارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

آخر میں محمد مجیب صاحب نے جامعہ برادری کو اس طرح مخاطب کیا:-

برادرانِ جامعہ!

بیس برس ہوئے اسی تاریخ کو ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں نے اور اُن کے ساتھ ہم نے عہد کیا تھا کہ ملک کو غیروں کی حکومت سے نجات دلائیں گے۔ یہ عہد پورا ہوگیا ہے، ہندوستان کا نیا دستور بن گیا ہے اور آج سے آزاد جمہوری ہندوستان کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے ہمارے ملک کو اور ہمیں یہ دن مبارک ہو۔

ہم تعلیم کا کام کرنے والے ہیں۔ ہمارے لئے یہ دن صرف خوشی کا نہیں بلکہ جانچ کا دن بھی ہونا چاہیئے۔ ایسی جانچ کا جس سے ذہن صاف ہو اور ہمت بڑھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ حیران ہیں، بعض غصے میں پوچھتے ہیں کہ ہمیں آزادی ملی تو کیا ملا۔ یہ سوال ضرور کرنا چاہیئے، اور صرف سال میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ روز کرنا چاہیئے۔ مگر اس طرح نہیں کہ نادانوں کے دل میں خیال پیدا ہو کہ ہمیں غلامی بہتر معلوم ہوتی تھی۔ یا اب ہم آزادی کا کوئی سودا کرنا چاہتے ہیں۔ آزادی ملتی ہے تو وہ تمام سہارے جو غلامی میں اطمینان کا سبب ہوتے ہیں، چھوٹ جاتے ہیں۔ آزادی کسی کو کچھ دیتی نہیں بلکہ اور الٹے مطالبے کرتی ہے اور یہ مطالبے پورے نہ کئے جائیں تو ایک حالت پیدا ہو سکتی ہے جس کے مقابلے میں غلامی بھی غنیمت معلوم ہو۔ آپ یہ سوال ضرور کیجئے کہ ہمیں آزادی ملی تو کیا ملا، مگر اس کا جواب دل کو ٹٹول کر دیجئے، یہ سوچ کر دیجئے کہ اس کا تعلق صرف آپ کی بھلائی، آپ کی خوشی آپ کے تصورات سے نہیں بلکہ پوری قوم کی بھلائی، پوری قوم کی خوشی اور نئی زندگی کے ان تمام تصورات سے ہے جو مختلف لوگوں کے ذہن میں تھے۔ بے صبری سے سوال کرنے اور جواب دینے سے علم نہیں بڑھتا، صرف الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، عمل کے راستے نظر نہیں آتے قدم اور لڑکھڑانے لگتے ہیں۔

آزادی کوئی تحفہ نہیں ہے جو کوئی کسی کو دے دیتا ہے۔ آزادی وہ کیفیت ہے جس میں آدمی اپنے ارادے سے سماج کی بہبودی کا ذمہ دار بنتا ہے، انصاف، اخلاق، رواداری، انسانیت کا علم بردار اور محافظ بننے کا عہد کرتا ہے۔ انسانی حاکم کا فرماں بردار ہونے کے بجائے صرف حق کی بندگی کرتا ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو غلامی کی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ پیدا نہ ہو آدمی اس کا حق دار نہیں ہوتا کہ انسان کہلائے۔ ہمارے تمام دینی اخلاقی اور سماجی تصورات غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرتے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں اب ٹوٹ گئی ہیں، ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ آج کے دن ہمیں خاص طور سے سوچنا چاہیئے کہ ہم اپنی اس ذمہ داری کو کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔ ہمارا عمل کس طرح انصاف کا نمونہ بن سکتا ہے۔ ہم اپنے اخلاق انسانیت کے اعتبار کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ ہماری رواداری ملک کے چمن میں [illegible] پھول کھلا سکتی ہے۔ ہم انسانیت کی قدروں پر ایک نئی تہذیب کی بنا کس طرح رکھ سکتے ہیں۔ آج کا دن نیک ارادوں اور اعلیٰ حوصلوں کا دن ہے۔

جامعہ کی [illegible] ایسی باتیں کرنا مناسب نہیں۔ [illegible] اب [illegible] آگئی ہے۔ جامعہ کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رہا [illegible] میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن [illegible] میں بر پا [illegible] ہمارا [illegible] اور اس [illegible] بات یہ ہے کہ [illegible] کے مقابلے میں نئی زندگی کے لئے زیادہ [illegible] نفرت اور [illegible] ہم پیش پیش رہے اور اس وقت [illegible] کوئی خوبی نہیں ہے [illegible] ہماری نظام تعلیم سے علیحدگی اس اصول کی بنا پر اختیار کی تھی [illegible] تعلیم کی ذمہ داری قوم کو اپنے اوپر لینا چاہیئے۔ اس اصول پر ہم قائم ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ حکومت ہمارے خرچ کی ذمہ داری لے کر ہمیں اپنا لے۔ ہم یہ ہیں چاہتے کہ وہ ہماری سرپرستی کر کے ہماری مشکلیں آسان کر دے۔ ہم اپنا کام اپنے طریقے پر کرنا چاہتے ہیں اور ہم کسی قسم کی امداد اور سرپرستی نہیں چاہتے جو ہم سے عمل کی آزادی چھین لے۔ ہمارا جو تعلیمی اور تہذیبی منصب پہلے تھا وہی اب بھی ہے اور اس میں کوئی فرق ہوا تو ہمارے ارادے سے ہوگا۔ دوسری طرف ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے آزاد ہونے سے ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اب ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم آزاد تعلیم کا جھنڈا لہرائیں۔ ہمیں رہنمائی کا کام کرنا ہے۔ صحیح منصوبے اور صحیح عمل کے نمونے پیش کرنا ہے۔ ان میدانوں میں قسمت آزمائی کرنا ہے جن میں اب تک لوگوں نے قدم نہیں رکھا ہے یا جہاں لوگوں کے قدم ٹھہرے نہیں ہیں۔ پہلے ہم وسائل کی کمی پر صبر کرتے تھے، اب ہمیں اسی کمی کو قوت ایجاد کا محرک بنانا ہے۔ ہمارے اوپر سوچنے اور تدبیریں کرنے، تعلیم کے ذریعے زندگی کی بہت مشکلیں پیدا کرنے کی ذمہ داری آگئی ہے۔ اس نئی عزت، ان نئی ذمہ داریوں کو قبول کیجئے، اور آج کے دن اس کا عہد کیجئے کہ مصلحت اندیشی، صبر اور استقلال سے اس عزت کو بڑھاتے اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہیں گے۔

دن کو جامعہ کے طلبہ اور استاد صدرِ جمہوریہ کا جلوس اور فوجی پریڈ دیکھنے کے لئے نئی دہلی گئے اور رات کو سارے جامعہ نگر میں چراغاں کیا گیا۔ ایک طرف مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی میں سینکڑوں بچے نشۂ مسرت سے سرشار ہزاروں موم بتیوں سے اپنی اپنی عمارتوں کے گنبد اور برآمدے، چھتیں، کنگورے اور کمرے سجا رہے تھے ...... تو دوسری طرف اراکینِ جامعہ کے چھوٹے چھوٹے مکان چراغوں اور موم بتیوں کی روشنی سے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ آخری سرے پر ستانوں کے مدرسے میں رنگ برنگ کے بجلی کے بلبوں سے قومی جھنڈا بنایا گیا تھا اور ان کے نیچے سینکڑوں برقی قمقمے دمک رہے تھے۔ روشنی کا یہ شاندار منظر میلوں دور سے نظر آتا تھا۔

اوکھلے کی چھوٹی سی بستی میں بھی جگہ جگہ دیئے کی روشنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی، اور آسمان پر چاند اس دلکش نظارے کو دیکھ کر شرمایا جا رہا تھا۔ یوں تو نئی دہلی اور پرانی دہلی میں جشنِ جمہوریت بڑے اہتمام اور دھوم دھام سے منایا گیا لیکن جامعہ ملیہ کے جشن میں خلوص اور سادگی کی ایک عجیب شان تھی۔

ادبی تبصرے

خواجہ احمد فاروقی

"سنگ میل" اختر رائے پوری کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اختر صاحب تنقید کے میدان میں نئے نہیں ہیں۔ اس سے پہلے بھی ان کے تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے یقیناً سنگ میل ہے۔ ادبی تنقید اور زندگی میں بظاہر جو خلا نظر آتا ہے۔ اختر نے اسے پر کرنے کی کوشش کی ہے وہ تنقید کو سائنس کے قریب لانے کی تمنا رکھتے ہیں اور سماجی و تہذیبی نشوونما کے عمل کو تنقیدی نظریات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں لیکن یہ مضامین اتنے مختصر اور تشنہ ہیں کہ ان اصولوں کا پورا حق ادا نہیں ہو سکا بعض تو چھوٹی چھوٹی تقریریں ہیں جو ریڈیو سے نشر ہوئی ہیں۔ بعض تبصرے ہیں جو رسالہ اردو میں ناخدا کے نام سے شائع ہوئے ہیں اور بعض کتابوں کے مقدمے ہیں جو اگر مجبوراً نہیں تو خوشی سے بھی نہیں لکھے گئے ہیں۔ اختر صاحب ہندی اور سنسکرت ادبیات سے واقف ہیں اور جب اس قسم کی کوئی بحث آ گئی ہے تو اس مقام پر ٹھہرے ہیں اور مزے لے لے کر لکھا ہے مثلاً کالی داس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"کالی داس بہرحال اپنے زمانے کی اولاد ہے۔ یہ وہ دن تھے جب بودھوں کے حملے کو روک کر برہمن پھر ابھر آیا تھا۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں سماجی احتجاج کی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی تھی۔ برہمن نے اسے دبا دیا تھا۔ اس کشمکش کا ردعمل اس صورت میں ہونا ہی تھا کہ لوگ اپنی روایتوں پر زیادہ شدت سے عامل ہو جائیں جب تک تاریخ کا نیا دور شروع نہیں ہوتا، ادب میں کوئی نیا رجحان پیدا نہیں ہوتا۔ حیرت تو یہ ہے کہ اتنے بندھنوں میں رہ کر بھی کالی داس یہ ستارہ کس آسمان سے توڑ لایا۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہمیں ایسا پھل نہ دے سکا جسے انسانیت چکھ سکے۔ لیکن اس کے بدلے اس نے ہمیں ایک ایسا سدابہار پھول دیا جسے ہم رہتی دنیا تک سونگھ سکتے ہیں"

اسی مجموعے میں ایک مضمون محفلِ رقص کی تصویر ہے جس میں کالی داس۔ پیرلوتی اور میر حسن کے اقتباسات دئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ تینوں کا موازنہ نہیں کیا گیا۔ "ٹیگور کی ایک نظم" میں مطالعہ فطرت کی غلطیاں نکالی گئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غیر مفید نہیں کہ اشارے کی راہ بہت ٹیڑھی ہے۔ اس پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے اور کوئی راستہ اختیار کرنے سے پہلے دل و نگاہ میں وسعت پیدا کرنا ضروری ہے۔

اس میں ایک مضمون اردو شیر پر بھی ہے جو گجرات کا باکمال شاعر ہے۔ اختر صاحب کو ترجمہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ایک ایک کیفیت کو گجراتی سے اردو میں منتقل کر دیں مثلاً جہاں محبوبہ کی رفتار کا ذکر ہے۔ وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے گھنگرو بج رہے ہیں۔ جہاں گفتار کا ذکر ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے

پریم چند سے متعلق جو مضمون ہے اس میں ان کا ایک خط ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آخر زمانہ میں پریم چند کی ادبی زندگی کس طرح گزر رہی تھی اور وہ رسالہ ہنس سے کیوں دست بردار ہو گئے تھے۔ ادب کے اس سرتاج کے متعلق اختر صاحب کا یہ خیال صحیح ہے کہ وہ فوٹوگرافر تھے، مصور نہیں تھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ اُن کی تصنیفات میں شوروغوغا اتنا زیادہ ہے کہ انسان کو کسی کونے میں بیٹھ کر اپنے اندر جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہ میدان عمل میں کسی قدر ہے لیکن دوسری جگہ اور کم ہے انھوں نے وقتی مسائل کی اہمیت کو سمجھا لیکن اس کے لئے فن کو قربان نہیں کیا۔

دوسری کتاب ہے کرشن چندر کی "سمندر دور ہے" اور یہ بھی نوبہار پبلشرز لمیٹڈ بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں گیارہ افسانے ہیں جن میں خاص طور پر قابل ذکر "سمندر دور ہے" "گوپال کرشن گوکھلے" "چھپٹی حسن" اور "جوتے پہننے کا" ہیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کتاب کا اثر بہت اچھا نہیں ہوتا۔ اس کو پورا پڑھنے کے بعد کرشن چندر کے فن سے خوش گمانی کم ہونے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ ختم ہو رہا ہے اور اس کی ادبی تصنیفات صحافت سے قریب ہوتی جا رہی ہیں تجربے اور مشاہدے اگر پوری طرح ہضم نہ ہوں اور خون میں شامل نہ ہوں تو ادب میں سستاپن آ جاتا ہے اور اس میں دیدہ وری بصیرت اور عالمگیر ہمدردی کے عناصر کم ہونے لگتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک تکلیف دہ یکسانیت ہے۔ وہی بمبئی ہے، وہی چور بازاری وہی کوکین فروشی، وہی عصمت و طہارت کی بے قدری وہی تاج و گرین کی ہنگامہ پروری، بعض حصے تو بالکل روزانہ اخبار کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت نگاری جو بادہ و ساغر کے پردہ میں تھی اب ختم ہو گئی ہے۔ وہ مشاہدۂ حق، جو دشنہ و خنجر کے پیرائے میں تھا۔ اب موجود نہیں ہے۔ اس مجموعے میں زندگی بے رنگ و بو ہے۔ کردار سب زندہ درگور، مردہ و بے ذوق جستجو یا ایسے جن کا نقش زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ اس میں زندگی اور موت محض سوء اتفاق ہے، حسن اتفاق نہیں۔ اس میں نصیحت ہے، موعظت ہے، نکتہ چینی ہے۔ لیکن دردمندی کم ہے۔ ان میں مشینوں کی ہماہمی ہے، اور مزدوروں کی بے کسی۔ ان مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں۔ یہ اہم اور بہت اہم ہیں۔ اتنے اہم کہ رسمی ذکر سے بالاتر ہیں، اور اصلی شکایت یہی ہے کہ ان کا ذکر رسمی طور پر ہوا ہے۔ آخر ہم سماج کی تلچھٹ کو کب تک کھنگالیں گے۔ اسے کب تک پئیں گے اور کب تک پلائیں گے۔ اب ہم صبح کے لئے بے چین ہیں، ظلمت شب کے بعد، صبح عید کی خوش خبری سننے کے لئے مضطرب، یہ زندگی ہے۔ ضرور زندگی ہے لیکن اس میں حسن بھی تو ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی تو اس میں بہت کچھ ہے، کرشن چندر نے جہاں ان گیتوں کے سرگم کو اپنی روح کے تاروں میں محسوس کر لیا ہے وہاں یہ نغمے قیامت آفریں بن گئے ہیں۔ اس کا نقطۂ نظر صحت مند اور ترقی پسندانہ ہے۔ کہیں کہیں ہلکا طنز ہے۔ مثلاً "کبھی تو وہ آزادی کا سپاہی ہوتا ہے، کبھی جمہوریت کا کبھی قومی عزت کا، نہ تہذیب، نہ کلچر، نہ آزادی، نہ جمہوریت" لیکن یہ انداز سپاٹ ہے۔ اس میں کرشن چندر کی قدیم عظمت نہیں ہے، اسی طرح ان افسانوں میں وہ تیکھاپن، وہ نشتریت، وہ ابھار اور وہ شخصیت بھی نہیں ہے۔ جو کرشن چندر کی طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ اس پورے مجموعے میں غالباً سب سے اچھا افسانہ "گوپال کرشن گوکھلے" ہے۔ آزادی کے بعد ہماری اخلاقی تہی مائیگی پر یہ بہت کامیاب طنز ہے بعض بعض جگہ وہ نشتر لگائے ہیں جو جگر میں پیوست ہو جاتے ہیں:- مثلاً

"کم بخت بنیوں نے ۱۵ اگست سے پندرہ روز پہلے ہی قومی جھنڈے کے دام بڑھا دئے تھے کہ ہر کس و ناکس کے لئے جھنڈا مول لینا ناممکن تھا"

آزاد بمبئی کی سیر کا منظر ملاحظہ ہو:-

"گاڑی سے اتر کر پہلے تو میں نے جی بھر کر بمبئی کی سیر کی۔ وہی خوب صورت عمارتیں تھیں وہی بھرے ہوئے بازار، وہی بھکاری مخلوق، وہی شیر بازار کے سیٹھوں کی گاڑیاں، وہی کارخانوں کی چمنیاں، وہی مزدوروں کی گندی چالیں، وہی قمار خانے تھے۔ وہی ریس کورس وہی اسٹاک ایکسچینج۔ وہی گداگر، وہی ہاکر، وہی فٹ پاتھ پر سونے والے"

آزادی کو جیتنا آسان ہے۔ اسے قائم رکھنا، اور سب تک پھیلانا اتنا آسان نہیں ہے۔ حیات نو کی تشکیل اور ہندوستان نو کی تعمیر کے لئے ہمیں نئے ساز و سامان کی ضرورت ہو گی۔ اس کٹھن منزل کو طے کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا ساز و سامان اور زاد راہ ہے؟ کرشن چندر نے ہم سے یہی سوال پوچھا ہے اور نہایت پر اثر انداز میں پوچھا ہے۔

"میں نے مڑ کر گوپال کرشن گوکھلے کے بت کی طرف دیکھا جواب ایک تاریک سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے کھڑا ہے"

اس سوال کی حسین اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ افسانہ نگار کا کام سوالوں کا جواب دینا نہیں ہے لیکن اگر وہ ہماری توجہ ان سماجی اور تہذیبی مسائل کی طرف مبذول کرا دے تو یہ بات بھی اہم اور بہت اہم ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں کرشن چندر کی عظمت ہمارے دل میں گھر کر جاتی ہے۔

بنگال کو بچاؤ

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

بے چینی موجود ہے۔ فرقہ وارانہ جنون کے نئے بھوت سے بچایا جائے۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کی حکومتیں تو یہاں تک کہنے پر تیار نظر آتی ہیں کہ ہندوؤں کی مشرق سے مغرب کو مسلمانوں کی اس کے خلاف سمت میں ہجرت کو قانوناً روک دیں لیکن ایسا

میں اسی وقت کہ ... بابی ہو سکتی ہے جب سارے عامہ اقلیتوں کی حفاظت کے معاملے میں حکومتوں کا پورا پورا ساتھ دے۔

اردو دوست اب کیا کریں؟

پروفیسر راجندر ناتھ شیدا

پچھلے ڈھائی برس میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ اردو کے مستقبل پر گہرے اور دور رس اثر ڈالیں گی۔ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے زمانے میں اردو دوستوں کو کانگریس، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت سے بڑی توقعات تھیں مگر اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ مہاتما گاندھی شہید ہو چکے۔ اردو کی شدید مخالفت نے پنڈت جی کو کچھ ایسے فیصلوں کے ماننے پر مجبور کر دیا جنہیں مختلف حالات میں شاید وہ گوارا نہ کرتے اور کانگریس اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنے کم عرصے میں ہوا کہ واقعات کو سمجھنے کے لئے وجوہات اور نتائج کا سلسلہ قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اگرچہ گذشتہ پچاس سال کی تاریخ کا نقطۂ غور سے مطالعہ کرنے اور صحیح واقعات کا علم حاصل ہونے کے بعد یہ ضرور محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس دور میں انتہا پسندی اور عصبیت کے جو رجحانات پیدا ہو گئے تھے ان کا اگر ٹھیک اسی طرح نہیں تو کم و بیش ایسے ہی واقعات کی صورت میں رونما ہونا ناگزیر تھا۔

یہاں ہمارا مقصد تاریخی واقعات دہرانا، ان کا تجزیہ کرنا، یا موجودہ لسانی تحریکوں پر ان کے اثرات ظاہر کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ممالک غیر سے قطع نظر خود اپنے ملک میں اردو کی پوزیشن کو سمجھنا اور موجودہ حالات میں اس کی بقا، ترویج اور ترقی کے لئے منصفانہ اور عملی تجاویز پیش کرنا ہے۔ اردو کے لئے ہندوستان میں جو ماحول پیدا ہو گیا ہے اس سے کم و بیش سبھی واقف ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ احباب تو ہندوستان میں اس کے مستقبل سے قطعی مایوس ہو چکے ہیں۔ کچھ کے دلوں میں ابھی امید کی شعاعیں جلوہ فگن ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو امید و بیم کی درمیانی راہ سے گذرتے ہوئے واقعات کا نظارہ کر رہے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں ہمیں اردو کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے مختلف خیالات کے لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے اور اسی سے "نئی روشنی" کے قارئین کے سامنے یہ تاثرات پیش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ درحقیقت ہمیں اردو دوستوں کے ذہنوں میں ایک عجیب طرح کا انتشار محسوس ہوا، عام طور پر لوگ ہراساں ہیں۔ ان کے دلوں میں گھٹی ہوئی تمنا اور دبی، گھٹی بے اطمینانی سانس لے رہی ہے، مگر وہ لسانی مسائل کو صحیح واقعات کی روشنی میں دیکھ کر مناسب اقدام کے لئے لائحۂ عمل مرتب نہیں کر سکتے۔ ہماری نظر میں یہ صورت حالات اردو ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے خطرناک ہے کیونکہ یہ بے اطمینانی ایک بڑی حد تک شکست خوردگی کا نتیجہ ہے جو لاشعور میں پہنچ کر طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ فکر و عمل کی قوت کا غلط راہوں پر پڑنا ہوگا۔ آج قومی حالات پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے لئے ہمارے نظام حیات میں مناسب جگہ پیدا کرانے کے واسطے کوئی واقعی مفید اور منظم کوشش عمل میں آ سکے۔

پیشتر اس کے کہ اردو کی بقا اور ترقی کے متعلق کوششوں کی نوعیت کو سمجھا جائے۔ ایک تازہ خبر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں آئندہ سارے اقدامات کا انحصار اسی پر ہوگا۔ سنا گیا ہے کہ اردو کے چند با اثر ادیبوں اور رہنماؤں کا یہ خیال ہے کہ اردو کو ہندوستانی مسلمانوں کی زبان تسلیم کر لیا جائے اور مذہبی اقلیت کی زبان ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے حقوق حاصل کئے جائیں۔ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔ کیونکہ ہم تک یہ بالواسطہ پہنچی ہے۔ اس لئے ہم اس کی صحت اور عدم صحت کے متعلق قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر یہ غلط ہے تب تو کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا لیکن اگر اسے صحیح فرض کیا جائے تو ہم یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا خیال کیوں پیدا ہوا۔ اردو کے خلاف بڑھتے ہوئے اور اہل قوم کے ایک گروہ کے ایسا کہنے کی وجہ سے یا غیر مسلموں کی اردو سے یکایک بے اعتنائی کے احساس سے۔ لیکن اتنا ہم ضرور عرض کریں گے کہ ایسا کرنے سے پہلے اردو کے مستقبل پر اس کے ممکن اثرات اور ان کے نشیب و فراز پر غور کر لینا چاہئے۔ اس کے بعد اگر وہ اردو کے لئے اسی اقدام کو بہتر تصور فرمائیں تو ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہاں اس کے اچھے برے نتائج کی کل ذمہ داری انہی ادیبوں پر ہوگی۔

جہاں تک ہماری رائے کا تعلق ہے ہمیں یہ نظریہ خواہ اردو کے دشمنوں کے ذہنوں کی پیداوار ہو یا دوستوں کے، اصولی طور پر غلط محسوس ہوتا ہے۔ زبانوں کا تعلق مذہبوں سے نہیں ہوتا خطوں سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے ساتھ مصر کا عیسائی عربی، عیسائی کے ساتھ جرمنی کا یہودی جرمن، اور ہندو کے ساتھ بنگال کا مسلمان بنگلہ نہ بولتا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، ہمیں تو اردو کے موجودہ مسائل پر غور کرنا ہے۔ جب تک مجلس دستور ساز نے سرکاری زبان کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اردو کے متعلق قیاس آرائیاں ہونا قدرتی امر تھا لیکن دیوناگری لپی میں ہندی کے سرکاری زبان قرار پانے کی وجہ سے اب ہم اپنی پوزیشن کو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ منظور شدہ دستور میں اردو علاقہ واری زبانوں میں سے تو ایک ہے مگر وہ سارے ہندوستان میں کسی خاص خطے یا سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکی۔ اس کی وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج کل اردو کے خلاف ایک شدید جذباتی ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ یہ فضا زیادہ عرصے تک قائم رہنے والی نہیں ہے مگر فی الحال ہمارے اقدامات پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ ان حالات میں مرکز یا صوبوں میں اردو کو سرکاری زبان منوانے کا مطالبہ یا کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ممکن ہے اس سے اردو کو اور نقصان پہنچ جائے۔ اتنا البتہ ہو سکتا ہے کہ اردو جاننے والوں کے لئے مرکز اور کئی صوبوں کی سرکاری امور میں کچھ سہولتیں حاصل ہو جائیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ نصب العین کسی قدر پست محسوس ہوتا ہے مگر جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں اپنی صلاحیتوں اور حالات موجودہ کے پیش نظر اس سے زیادہ کا حصول قرین قیاس نہیں۔

اردو کی تعلیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے ملک بھر میں خصوصاً ان صوبوں میں، جہاں ایک بڑی تعداد میں طلبہ اردو پڑھتے تھے۔ یہ تعداد بڑی تیزی کے ساتھ گرتی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تعداد کا گرنا سماج کی قدرتی ضرورتوں کا نتیجہ ہے یا حکومتوں نے اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا ہے جس سے اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کو بھی دشواری پیش آتی ہے؟ اول الذکر صورت میں ہمارے لئے کسی شکایت کا موقع نہیں ہے لیکن ہم حکومتوں کے سمت شکن رویے کے خلاف احتجاج ضرور کر سکتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر واقعی کوشش کی گئی تو اس میں کافی کامیابی بھی حاصل ہوگی۔ رہا سماج میں اردو دشمنی کا ماحول تو اس کا علاج خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس ماحول کو حسب مراد بنانے کے لئے اخلاقی قوت کی ضرورت ہے۔ کھلی مخالفت سے بد دل نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

اردو کے خلاف جو طرح طرح کے غیر واقعی الزامات تراشے جا رہے ہیں ان کو رد کرنے کے لئے صحیح واقعات کو روشنی میں لانا اردو دوستوں کا پہلا فرض ہے۔ تاکہ ماہرین تعلیم سمجھ جائیں کہ کسی منزل حیات پر بھی اردو پڑھنے سے طلبہ کے ذہنوں پر برے اثرات پڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خود نصاب کا فیصلہ کرنے والوں کو اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

ایک مشکل کی بات اور بھی ہے۔ تعلیمی اداروں کی ایک بڑی اکثریت کا انتظام مذہب زدہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو نوجوانوں کی ذہنیت کو پس ماندہ رکھنے میں مصلحت تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں اردو کی بجائے مذہبی پڑھنے سے طلبہ میں اپنے مذہب اور تہذیب کے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ شعوری طور پر اپنی درسگاہوں میں اردو کی تعلیم ختم کرنے کا ہر امکانی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور حکومت کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ مقررہ تعداد میں طلبہ اردو پڑھنے یا اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کرتے جن درسگاہوں میں اردو کی تعلیم ختم ہو چکی ہے یا ز بردستی کر دی گئی ہے اگر ان کی مجلس انتظامیہ کے با اثر اراکین

آزادی کی زنجیریں

چوتھا باب

ظفر میر مظفر حسن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور والد پنشن لے کر اپنے وطن دریاآباد میں رہتے ہیں یہیں سے اس سال ظفر نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔ وہ آگے کالج میں پڑھنا چاہتا ہے مگر اس کے والد مالی مشکلات کی وجہ سے اسے پڑھانے پر تیار نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ نوکری کر لے پر جب نوکری کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی اور ظفر کے ہیڈ ماسٹر شیو دیال صاحب انہیں سمجھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ظفر کو وظیفہ بھی ملے گا تو وہ اسے الہ آباد کالج بھیجنے پر تیار ہو جاتے ہیں

(قسط ۷)

کچھ تو اس عام ناہمواری کا اثر تھا جو نوجوانی کے زمانے میں ہر انسان کی نفسی سطح میں پائی جاتی ہے، اور کچھ ظفر کے اعصابی مزاج کی خصوصیت تھی کہ اس کی طبیعت میں خوش دلی اور بد دلی، شگفتگی اور پژمردگی کا جوار بھاٹا بڑی تیزی سے آتا رہتا تھا۔ کبھی اس کا باعث کوئی بیرونی تحریک، خارجی فضا کی کوئی تبدیلی ہوتی تھی اور کبھی کوئی اندرونی رو۔ عام طور پر اس کی مدت جزر کے مقابلے میں مد کی کم ہوتی تھی اور جزر کی زیادہ۔ مگر یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے الہ آباد بھیجا جائے گا خوش دلی کا جو ایک سیلاب سا آیا تھا وہ خلاف معمول پانچ چھ روز تک رہا۔ اس عرصے میں ظفر صبح سے شام تک ان دوستوں کے ساتھ جو اسی کی طرح میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو چکے تھے، اور آج کل آزاد تھے، گپ شپ کھیل کود، سیر و تفریح میں مشغول رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ بے تکلف، بے فکر، خوش دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ سامان سفر کی درستی سے خود اسے کچھ کرنا نہ تھا۔ میر صاحب نے درزی کو بلا کر اس کے کچھ نئے کپڑے بنوا دئے۔ پلنگ کی چادریں، تکیے کے غلاف بنانے کا حکم دے دیا، اور یہ فرمایا کہ شیروانیاں الہ آباد میں بنوانا اور تولیہ، رومال، موزے وغیرہ وہیں خرید لینا۔ بستر بند اور دو سوٹ کیس میر صاحب نے اپنے پرانے سامان میں سے دے دئے جو انھوں نے اس قدر احتیاط سے استعمال کئے تھے کہ قریب قریب نئے معلوم ہوتے تھے۔ ظفر کا صرف اتنا کام تھا کہ اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کچھ کتابیں انتخاب کر لے۔

اس کے والد کو کتب بینی سے کوئی خاص شغف نہ تھا مگر اس کے دادا نے چھوٹا سا کتب خانہ چھوڑا تھا جس میں مذہبی کتابوں کے علاوہ انگریزی، اردو، فارسی ادب اور تاریخ کی بھی تھوڑی سی کتابیں تھیں۔ یہ بیٹھنے کے کمرے میں دو الماریوں میں چنی ہوئی تھیں جن میں شیشے کے کواڑ تھے۔ الماریوں کی کنجی میر صاحب نے ظفر کو دے رکھی تھی۔ مگر یہ تاکید کر رکھی تھی کہ صرف تعطیل کے دن الماریاں کھول کر جھاڑ دیا کرو اور کوئی کتاب بغیر میری اجازت کے نہ نکالو۔ ظفر کچھ کتابیں ان کی اجازت سے اور باقی یوں ہی نکال لیا کرتا تھا۔ زیادہ شوق اسے ناولوں سے تھا جو وہ اپنے والد سے چھپا کر رات کو پڑھا کرتا تھا۔ انگریزی میں اسکاٹ، ڈکنس اور تھیکرے، اردو میں نذیر احمد، سرشار، سجاد حسین اس کے محبوب مصنف تھے۔ شرر کے چند تاریخی ناول اور پریم چند کی تین چار کتابیں اس نے اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر چوری سے خرید لی تھیں۔ شعر کا ذوق تو ذرا کم اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اُن کی اجازت سے اس نے اپنے اردو فارسی کے استاد سے انہیں سے کچھ مرثیے، دیوان غالب کی آسان غزلیں، کلام میر کا انتخاب اقبال کی بانگ درا اور شاہ نامے کے چند ٹکڑے پڑھے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ جو کتابیں اُسے خاص طور پر پسند ہیں اور جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے انھیں اپنے ساتھ لے جائے۔ والد صاحب سے پوچھنا بے کار تھا وہ ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اس نے ان کی غیر موجودگی میں دونوں الماریوں سے اور اپنے پوشیدہ ذخیرے سے تیس چالیس کتابیں چھانٹ کر کچھ تو سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے رکھیں اور کچھ بستر بند میں باندھ لیں۔ ڈکشنری وغیرہ اور کچھ درسی کتابیں جن پر کوئی قانونی اعتراض ہونے کا اندیشہ نہ تھا کھلم کھلا ایک کرمچ کے بیگ میں استعمال کی چھوٹی موٹی چیزوں کے ساتھ رکھ لیں۔

معمولی حالت میں ظفر کو کبھی یہ جرأت نہ ہوتی کہ اپنے والد سے چھپا کر ناجائز مال اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ اپنی خواہش لیدلہ عاکر دبا دیتا اور اپنے والد کے ظلم اور اپنی مظلومی پر دل ہی دل میں کڑھتا۔ مگر ان دنوں اس پر جو سرخوشی اور سرمستی کا عالم طاری تھا اس کی بدولت اس نے بے تامل یہ حرکت کر ڈالی بلکہ اسے ایک مہم جوئی کا کارنامہ سمجھ کر اس سے لطف اُٹھایا۔ میر صاحب سے اب وہ خاصی بے جھجک گفتگو کرتا تھا جس کی وجہ سے ان کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے اتنی بدظنی نہیں رہی تھی اور اسے ایک حد تک ذی عقل اور ذی ارادہ مخلوق سمجھنے لگے تھے۔

سارا دن دوستوں کے ساتھ قہقہوں، چہچہوں میں گذارنے کے بعد جب وہ رات کو بستر پر سونے کے لئے لیٹتا تو طبیعت اور عادت کے مطابق تنہائی میسر آتے ہی تخیل کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتا تھا۔ عارضی امید پرستی کے گھوڑے پر سوار، وقتی خود اعتمادی کے سلاح جنگ سے آراستہ وہ آئندہ تعلیمی اور عملی زندگی کے معرکے ہنستے کھیلتے طے کرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں امتحانوں میں اول آتا۔ انعام اور وظیفے حاصل کرتا۔ یونین میں اس کی دھواں دھار تقریروں کی دھوم مچ جاتی۔ میگزین میں اس کے مضامین پڑھ کر لوگ وجد کرتے یہاں تک کہ کھیل اور اسپورٹس میں جن سے اب تک اسے ذرا بھی مس نہ تھا وہ چھپا رستم نکلتا اور بیسے شمار کپ اور شیلڈ جیت کر اپنے کمرے میں سجاتا۔ لڑکے اس کے کمرے کو جو کھیل کی ان فتوحات اور طرح طرح کے تمغوں سے عجائب خانہ بن گیا تھا جوق جوق دیکھنے کے لئے آتے۔ لڑکے اور لڑکیاں ...... مگر لڑکیاں اندر قدم نہ رکھتیں۔ باہر سے جھانک کر چلی جاتیں عملی زندگی کی تصویریں مقابلتہً غیر معین اور مبہم تھیں مگر ان میں بھی کامیابی، شہرت، ہر دلعزیزی اس کے قدم چومتی ہوئی نظر آتی تھی۔ کبھی تعلیم، کبھی تصنیف و تالیف کبھی کاروبار، کبھی خدمت خلق اور کبھی سیاست کے میدان میں یہ باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آ جاتی اور خواب میں خیالات کا سلسلہ ٹوٹتا اور بکھرا ہوا بے جان تصورات کے بجائے جان دار اور متحرک تصویروں کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر جب الہ آباد جانے کا دن قریب آ گیا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ روانگی کا وقت مقرر ہو گیا تو یکایک ظفر کی طبیعت کی چڑھی ہوئی ندی اُترنے لگی۔ وطن کی مانوس فضا اور جانے بوجھے لوگوں سے جدائی اسے سخت تکلیف دہ نظر آنے لگی۔ غیر مقام اور غیر لوگوں میں جا کر رہنے اور نئے حالات سے سابقہ پڑنے کے خیال سے اُسے وحشت ہونے لگی۔ خیالی فتح مندیوں اور کامرانیوں کی جگہ اب خیالی مشکلیں اور رکاوٹیں اس کے ذہن پر مسلط ہو گئیں۔ "کالج میں پڑھائی اور بات چیت انگریزی میں ہو گی۔ نہ جانے میں اچھی طرح سمجھ سکوں گا اور بول سکوں گا یا نہیں۔ اب تک تو بالکل مشق نہیں۔ کبھی بولنے کا موقع پڑتا ہے تو اٹک اٹک کر دو چار جملے ادا کرتا ہوں اور پھر گاڑی رک جاتی ہے بلکہ اگر کوئی تیز بولتا ہو تو سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ امتحان میں سوالوں کے جواب بھی انگریزی میں دینے پڑیں گے۔ انگریزی میں ٹیکسٹ کا مطلب تو میں اچھی طرح بیان کر دیتا ہوں، مضمون بھی لکھ لیتا ہوں مگر دوسرے مضامین کا کیا ہوگا اور ہاں مضمون کون سے لوں گا۔ ہر دیال کو تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے تاریخ، سوکس اور اکنامکس لینے کی رائے دی ہے، میں تاریخ اور فارسی لے لوں۔ اب سائنس اور ریاضی وغیرہ کو چھوڑ کر یہی سوکس اور اکنامکس رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک لینا ہوگا۔ خدا جانے ان میں کیا ہوتا ہے۔ مجھ سے چلیں گے بھی یا نہیں؟ استادوں سے کچھ مدد ملنے کی اُمید نہیں۔ سنا ہے کلاس میں نوٹس لکھا دیتے ہیں اور بس۔ طالب علموں کی انفرادی مشکل کو حل نہیں کرتے۔ اور کریں بھی تو کیسے۔ ہر کلاس میں سیکڑوں لڑکے ہوتے ہیں۔ بہت سی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں لڑکوں کے پاس کیسے بیٹھتی ہیں؟ آپس میں باتیں کرتے شرم نہ آتی ہو گی مجھ سے تو کوئی لڑکی بات کرے گی تو میں شرم سے زمین میں گڑا جاؤں گا؟" لڑکیوں کے تصور میں اسے گھبراہٹ کے ساتھ لطف بھی آیا اس لئے بڑی دیر تک اس میں اُلجھا رہا۔ اسی سلسلے میں اُسے حسینہ کا خیال آ گیا جس سے بچپن میں اس کی نسبت ہوئی تھی، اور اب اس کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

ظفر نے حسینہ کو آخری بار آٹھ برس ہوئے دیکھا تھا۔ جب وہ آٹھ برس کی تھی اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ نازک اندام، خوب صورت اور شرمیلی تھی۔ جب تک اس کی والدہ زندہ تھیں۔ اکثر اس کی شادی کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہ اس ذکر سے خوش ہوتا تھا۔ مگر شرما کر بھاگ جاتا تھا۔ اور تھوڑی دیر اس خیال سے دل بہلا کر اُسے بھول جاتا تھا۔ اتنی دلچسپی اُسے پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اس موضوع کو اپنے تصورات کے سلسلے میں کوئی خاص جگہ دے اب چار برس سے جب سے کہ والدہ کا انتقال ہوا تھا اُسے حسینہ کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ تھوڑے دن ہوئے اُسے یہ معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب انجینیر ہو کر الٰہ آباد آگئے ہیں۔ حسینہ نے مڈل پاس کر لیا ہے اور اب نویں درجے میں داخل ہوگئی ہے۔ میر صاحب نے الٰہ آباد سے واپس ہو کر اُسے یہ بتایا تھا کہ اس کی پھپھی چاہتی ہیں کہ وہ الٰہ آباد میں اُن کے گھر رہے مگر اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ انھوں نے ظفر اور حسینہ کی شادی جلد ہونے کی تحریک کی اور وہ نامنظور ہوئی۔ پھپھی کے گھر رہنے کی تجویز کو ظفر نے کہا تھا کہ ان کا احسان لینا مناسب نہیں۔ میر صاحب نے اُسے دخل در معقولات کا ملزم قرار دے کر ڈانٹا تھا مگر اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر ظفر کے دل میں پھپھی اور اُن کی حسین بیٹی کی یاد کو تازہ کر گئی۔

اب اس کے دل میں اور طرح طرح کی فکروں کے ساتھ ایک فکر یہ بھی کھٹک رہی تھی کہ الٰہ آباد جاکر اُسے حسینہ اور اُس کے والدین سے تعلقات کی تجدید کرنی ہوگی۔ وہ نئے آدمیوں سے ملنے سے گھبراتا تھا اور ان لوگوں سے وہ اتنا کم واقف تھا اور اتنے دنوں بعد ملنے والا تھا کہ وہ اس کے لئے قریب قریب نئے تھے۔ جس زمانے میں اس کی نسبت حسینہ سے ہوئی تھی۔ صفدر علی صاحب اسسٹنٹ انجینیر تھے اور مالی اعتبار سے میر صاحب جنھیں تحصیل داری کی تنخواہ کے علاوہ جائداد سے معقول آمدنی تھی ان سے زیادہ خوش حال تھے۔ اب صفدر علی انجینیر ہوگئے تھے اور میر صاحب کی آمدنی اتنی کم ہوگئی تھی کہ وہ ان کے مقابلے میں غریبوں میں شریک ہونے کے لائق تھے۔ ظفر کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی مفلسی کی وجہ سے صفدر علی کے گھر میں اس کے ساتھ بے پروائی بلکہ ذلت کا برتاؤ نہ ہو۔ پھپھی عقیلہ تو کبھی ایسا نہیں کرسکتیں وہ بڑی نیک اور سمجھدار بیوی ہیں۔ اماں مرحومہ میں اور اُن میں آپس میں بڑی محبت تھی اور مجھے بھی بچپن میں بہت چاہتی تھیں۔ مگر صفدر علی صاحب اُسی زمانے میں صاحب بہادر تھے۔ اب اُن کا دماغ ساتویں آسمان پر ہو تو تعجب نہیں۔ اور حسینہ کوئی سولہ سترہ برس کی ہوگئی ہوگی۔ نہ جانے کیسی اُٹھی ہو۔ باپ کی طرح یا ماں کی طرح صورت شکل پہلے ہی کیا کم تھی۔ اب تو غضب کی حسین ہوگی۔ غرورِ حسن تو مشہور ہی ہے اگر اس کے ساتھ دولت کا غرور بھی ہوا تو میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ خیر نہ دیکھے مجھے کیا پروا ہے۔ اور میں وہاں جاؤں ہی کیوں؟ اماں کے انتقال کے بعد ان لوگوں سے خط و کتابت تک بند ہے۔ جب انھوں نے تعلق نہیں رکھا تو مجھے کیا ضرورت ہے؟ مگر نہیں ابا جان ابھی مل کر آئے ہیں۔ وہ لوگ بہت اچھی طرح ملے بلکہ پھپھی نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے کہا۔ مجھے ایک بار جانا ضرور چاہیئے۔ اگر صفدر علی صاحب نے یا حسینہ نے بے رخی برتی تو پھر دیکھا جائے گا۔"

(باقی آئندہ)

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

کے دماغ معطل میں کیتلی کر تیار رہا ہے۔ ہم نے دل میں خیال کیا کہ اس وقت تو میر صاحب کو کسی کسی طرح تسکین دینا چاہیئے۔ کہیں اس دھڑکے میں ان کا مرغ روح پرواز کر گیا تو بزم بے تکلف سونی پڑ جائے گی۔ چنانچہ ہم نے ہنس کر کہا "بھئی واہ میر صاحب! آپ بھی کیا کیا باتیں سوچ سوچ کر اپنا دل ہولایا کرتے ہیں جب سب کو یہ معلوم ہوگا کہ حیدر جن کی چھینکوں سے دوسروں کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائیں گے تو کس کو اپنی جان بھاری ہوگی جو اُسے ناس سنگھائے گا اور جو کہیں دنیا کے جنون و وحشت کی یہ نوبت پہنچ گئی کہ ایک پوری قوم دوسری کو مٹانے کے لئے خود مٹنے پر تیار ہو جائے تو پھر ایسی دنیا میں رہ کر اور اس دنیا کو رکھ کر کیا کیجیے گا۔ جب انسانیت ہی کا ناس لگ جائے تو ہمارے حساب دنیا مٹ چکی۔ پھر حیدر جن کو ناس سنگھانے یا نہ سنگھانے سے کیا فرق پڑے گا"۔

"واللہ سچ کہا تم نے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ اصل میں فکر انسانیت کی کرنی چاہیئے۔ وہ رہی تو جگ رہا اور وہ ڈوبی تو جگ ڈوبا"

اشتہار مشعر حکم حاضری مدعا علیہ

(زیر آرڈر ۵ قاعدہ ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی)

بعدالت شری مہندر سنگھ صاحب سب جج درجہ اول، دہلی

نمبر مقدمہ ۶۶۳ بابت ۱۹۴۹ء

پرماوتی پرشاد ولد رام کشور ذات جینی سکنہ حال چھتہ پرتاپ سنگھ، دہلی ۔ مدعی

بنام

شری نذر بائی دختر لڈو رل زوجہ ہری چند ذات جینی اوسوال سکنہ بیدواڑہ، دہلی مدعا علیہ

بنام شری متی نذر بائی دختر لڈو رل زوجہ ہری چند ذات جینی اوسوال سکنہ بیدواڑہ گلی نائی ناگر دہلی۔ دعوےٰ سترہ ہزار سات سو دس روپے (۱۷۷۱۰ روپے) سے مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعا علیہ مسمی نذر بائی تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے ۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام نذر بائی مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر بتاریخ ۵ ۔ ۔ ۔ سنہ ۵۰ء کو بمقام دہلی حاضر عدالت ہذا نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی

آج بتاریخ ۳۰ جنوری سنہ ۵۰ء کو بہ دستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا

مہر عدالت — دستخط جج

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی بی اے (جامعہ) مطبوعہ جید پریس دہلی

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

چین اور روس کا معاہدہ	اداریہ	۲
کشکول		۳
غزل	وامق احمد محتشمی	۳
غزل	فضا ابن فیضی	۳
دنیا کی رفتار		
(۱) ہندوستان	(ع ، ح)	۴
(۲) پاکستان	(ع ، ل) (ص)	۴
آزاد ہند کی عورتیں	صالحہ عابد حسین	۵
مصر کی حکومت کا بانی	عبدالحلیم ندوی	۷
آزادی کی زنجیریں	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
نئی ذہنیت کی ضرورت	گوپی ناتھ امن لکھنوی	۱۰

۸

مکتبہ جامعہ دہلی

ڈاکٹر سید عابد حسین

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

جلد ۴ | ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء | نمبر ۸

چین اور روس کا معاہدہ

دو مہینے سے چین کے وزیر اعظم ماؤ زے تنگ اور وزیر خارجہ چو این لائی ماسکو میں سوویت روس کی حکومت سے باہمی دوستی کے معاہدے کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ امریکہ کے اخبار اور بڑے بڑے ارکان ریاست بڑے جھجکڑ کے انداز میں دعوے سے کہہ رہے تھے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ دراصل روس منچوریا، بیرونی منگولیا اور دوسرے شمالی صوبوں کو اور ان کے علاوہ چینی ترکستان کو ہضم کرنا چاہتا ہے اور چین کے نمائندے اس پر راضی نہیں ہیں اس لئے انھیں اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ملک کا اتنا بڑا حصہ روس کو دینے پر راضی ہو گئے تو چین کی رائے عامہ ان سے برگشتہ ہو جائے گی۔

چند روز ہوئے یہ خبر آئی تھی کہ معاہدے کی شرطیں طے ہو گئی ہیں اور بہت جلد اس کی باضابطہ تکمیل ہونے والی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ۱۵ فروری کو معاہدے پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس کی شرطیں بھی شائع ہو گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین کے امریکی دوستوں کے اکثر اندیشے بالکل بے جا تھے۔ معاہدے کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) روس چین کو ایک لمبی مدت کے لئے ایک رقم قرض دے گا جس کی قیمت بتیس کروڑ امریکی ڈالر (موجودہ شرح کے مطابق تقریباً ڈیڑھ ارب روپئے) کے برابر ہوگی تاکہ چین صنعتی سامان اور ریل کا سامان روس سے خریدے۔

(۲) روسی فوجیں پورٹ آرتھر سے ہٹالی جائیں گی اور بندرگاہ ڈائرن سے بھی روس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

(۳) منچوریا ریلوے چینی حکومت کو واپس کر دی جائے گی۔

(۴) اوپر کی شرطیں جاپان سے صلح کا معاہدہ ہونے کے بعد نافذ ہوں گی یا اگر اس میں زیادہ دیر لگی تو ۱۹۵۲ء سے نافذ ہو جائیں گی۔

(۵) چین اور سوویت یونین دوسری طاقتوں کے ساتھ مل کر جو دوسری جنگ عظیم میں ان کی حلیف تھیں، جاپان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۶) روس بغیر کوئی معاوضہ لئے ہوئے چین کو وہ جاپانی کارخانے وغیرہ جو روسیوں نے حاصل کر لئے ہیں واپس کر دے گا۔

(۷) یہ عہدنامہ چین اور روس کے اس عہدنامے کو جو ۱۹۴۵ء میں چیانگ کائی شک کے ساتھ کیا تھا منسوخ کرتا ہے۔

(۸) نیا معاہدہ بیرونی منگولیا کی کامل آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔

(۹) روس اور چین مل کر جاپان یا کسی اور طاقت کو دوبارہ سامراجی یا جارحانہ اقدام کرنے سے روکیں گے۔

(۱۰) اگر دونوں فریقوں میں سے کسی پر جاپان یا اس کے حلیفوں نے حملہ کیا تو دوسرا فریق اپنے سارے وسائل سے اسے فوجی امداد دے گا۔

چین کے امریکی اور یورپی دوست بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ یہ شرطیں چین کے لئے نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضانہ ہیں۔ مگر اب انھیں یہ وہم ستا رہا ہے کہ شاید اس معاہدے میں کوئی خفیہ شرطیں ہوں گی یا ان کے علاوہ کوئی اور معاہدہ ہوا ہوگا جس کا اعلان نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے دعوے کی تردید خود چین اور روس کے سوا کوئی وثوق کے ساتھ نہیں کر سکتا ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ چین کے نئے لیڈر ماؤ نے چین کی قوم پرستی اور حب وطن میں آج تک کسی نے شبہ نہیں کیا کوئی ایسا خفیہ معاہدہ ہرگز نہیں کیا ہوگا جس سے ان کے ملک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

موجودہ معاہدے پر مغربی نقادوں کو دو بڑے اعتراض ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں چینی ترکستان کا کوئی ذکر نہیں جس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کم سے کم چینی ترکستان کو تو روس ضرور لے لے گا لیکن ہمیں زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ چینی ترکستان کے نمائندوں سے جو ماسکو گئے ہیں بات چیت ابھی ختم نہیں ہوئی اور کوئی عجب نہیں کہ اس کے لئے بھی بیرونی منگولیا کی طرح کامل آزادی منظور کر لی جائے۔ بہرحال چند روز میں معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں اندازوں میں سے کون سا ٹھیک ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ روس سے جو مالی مدد ملی ہے وہ چین کی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے ظاہر ہے کہ رقم کا تعین صرف چین کی ضرورتوں کے لحاظ سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں روس کے وسائل کو بھی مدنظر رکھنا ضروری تھا۔ اب رہی یہ امید جو مغربی نقادوں کے دل میں پیدا ہوئی ہے کہ چین کو اس ناکافی امداد کے علاوہ مغربی طاقتوں سے مزید امداد لینی پڑے گی تو ممکن ہے اس حد تک ٹھیک ہو کہ چین دوسری طاقتوں سے بھی مناسب شرطوں پر مالی مدد لینے کو تیار ہو جائے لیکن امریکہ کے سوا کوئی طاقت نظر نہیں آتی جو بڑے پیمانے پر روپیہ یا سامان قرض دے سکے اور امریکہ سے بظاہر معاملہ ہونا ممکن نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس اور چین کی دوستی سے جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے پھیلنے کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اسی لئے امریکہ کے سفیروں کی جو اس علاقے کی ریاستوں میں متعین ہیں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں اس پر غور کیا گیا کہ کس طرح ان ریاستوں کو اقتصادی اور فوجی مدد دے کر اتنا مضبوط اور خوش حال بنایا جائے کہ وہ کمیونزم کی لہر کو آگے بڑھنے سے روک سکیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس نئے معاہدے کی وجہ سے جو روس اور چین میں ہوا ہے تیسری جنگ عظیم کے چھڑنے کا امکان پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر چین اور روس ایک دوسرے کی مدد کا عہد نہ کرتے تو زیادہ قرین قیاس تھا کہ جاپان جس کو دوبارہ طاقت پکڑنے سے چاروں بڑی طاقتیں روک نہیں سکتیں اور ان میں سے دو تو روکنا چاہتی بھی نہیں۔ ایک دن چین پر یا اس مرتبہ ایشیائی روس پر حملہ کر دے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر کہ اسے دونوں سے ایک ساتھ نپٹنا ہوگا جاپان ذرا مشکل ہی سے اس کی ہمت کرے گا۔

ہمارے خیال میں روس اور چین کے معاہدے سے دنیا میں وہ توازن قوت پیدا ہو گیا ہے جو بڑی حد تک جنگ کو روکنے کا کام دیتا ہے کوئی تعجب نہیں کہ اس کی وجہ سے دنیا کی حالت میں جو ایک حد تک سکون پیدا ہو چکی ہے اور زیادہ سکون پیدا ہو جائے۔ جنگ کا خطرہ اگر بڑھ سکتا ہے تو روس اور چین کے اتحاد سے نہیں بلکہ امریکہ کے اس اعلان سے کہ وہ ہائیڈروجن بم بنانا چاہتا ہے۔ دھمکی ایک حد تک لڑائی کو روک سکتی ہے لیکن اس حد سے گزرنے کے بعد حریف کے دل میں بے حد غصہ یا بے حد خوف پیدا کر دیتی ہے اور یہ دونوں چیزیں لڑائی کی جڑ ہیں۔

شاید ”نئی روشنی“ کے قدر دانوں کو اس کی شکایت ہو گی کہ اس کے بارہ صفحوں میں سے ایک صفحہ ٹائٹل پیج میں نکل جاتا ہے اور ڈیڑھ دو صفحے اشتہاروں میں اس لئے مضمون کی جگہ کم رہ جاتی ہے۔ مگر ہم انھیں یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ ایک تو ہم یکم جنوری اور ۲۴ فروری کے پرچوں کی طرح کبھی کبھی بڑے پرچے نکال کر اس کی تلافی کرتے رہیں گے۔ دوسرے مستقل اشتہارات کافی تعداد میں مل جانے کے بعد کاغذ کے کنٹرولر سے اجازت حاصل کر کے ۱۴ صفحے یا ۱۶ صفحے کا پرچہ نکالنا شروع کر دیں گے۔ بہرحال سال کے آخر تک پڑھنے والوں کو پڑھنے کا مسالہ اتنا ہی یا اس سے زیادہ مل جائے گا جتنا پچھلے سال ملا تھا۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

کشکول

(کتنی ہی مرغوب غذا کیوں نہ ہو روز روز کھانے سے طبیعت اُکتا جاتی ہے اب آپ بنی اسرائیل ہی کو دیکھئے کہ من و سلویٰ نازل ہوتا تھا پھر بھی اکتا گئے ۔ روز شہد اور بھنا ہوا بٹیر اُڑاتے تھے جن کا نام سنتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے مگر ایک مدت کے بعد اس سے ایسا جی بھر گیا کہ اللہ میاں سے جھگڑ بیٹھے ۔ پیاز لہسن، ماش مسور کی فرمائش ہونے لگی ۔ لوگ کہتے ہیں " بزم بے تکلف " بڑے مزے کی چیز ہے ۔ ضرور ہوگی ۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے پڑھنے والے بے مزہ ہو گئے ہوں اور لکھنے والا بیچارہ دم بخت ہوکر رہ گیا ہو تو تعجب نہیں ۔ اس لئے اب ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بزم بے تکلف کو ذرا وقفے وار کر دیں یعنی ایک ہفتہ بیچ میں چھوڑ کر دیا کریں کوشش یہ ہوگی کہ جس ہفتے " بزم بے تکلف " کی باری نہ ہو تو اس کی جگہ " کشکول " کے نام سے ادھر اُدھر کے کچھ چٹکلے، کچھ لطیفے کچھ ظریفے پیش کیا کریں ۔)

ایک بے چارے نیاز مند شوہر تھے جنھیں بیوی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی جب بہت سانس گھٹنے لگتا تو حقے کا دم لگا کر دل کا بخار نکال لیا کرتے تھے ۔ ایک بار سننے میں آیا کہ انھوں نے حقہ پینا چھوڑ دیا ۔ ہم نے ان کے ایک دوست سے پوچھا " آخر انھوں نے برسوں کی عادت ایک دم سے کیسے چھوڑ دی ؟ اس کے لئے تو بڑی مضبوط قوت ارادی چاہئے " دوست نے کہا " سچ فرمایا آپ نے بات یہ ہے کہ ان کی بیوی کی قوت ارادی بہت مضبوط ہے "

نواب شمشیر یار جنگ بہادر کو اس پر بڑا ناز تھا کہ ان میں اور بیگم صاحبہ میں کبھی ان بن نہیں ہوتی ۔ ایک روز ان کے ایک یار غار نے کہا " بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں کون سا جادو آتا ہے ؟ آخر کبھی تم میں اور ان میں کسی بات پر اختلاف تو ضرور ہوتا ہوگا " نواب صاحب نے کہا " ہوتا کیوں نہیں ، کیا آپ نے مجھے ایسا کمترین شوہر ان سمجھا ہے کہ بیوی کی ہر رائے سے آنکھ بند کر کے اتفاق کر لوں مجھے سینکڑوں باتوں میں ان سے شدید اختلاف ہوتا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اس اختلاف کو ظاہر نہیں کرتا "

ایک ایسے ملک میں جہاں عورتوں کا دوسرا تیسرا نکاح اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ شاید پہلا نکاح بھی نہ ہوتا ہوگا ۔ ایک خاتون تھیں جو خیر سے اپنے دوسرے شوہر کی پہلی بیوی واقع ہوئی تھیں ۔ ان کو اپنے شوہر ثانی سے بد مزاجی اور بد سلوکی کی سخت شکایت تھی ۔ ایک دن ان کی سہیلی ان سے ملنے آئیں تو دیکھا کہ سیاہ ماتمی لباس پہنے بیٹھی ہیں ۔ سہیلی نے گھبرا کر پوچھا " اے بہن خیر تو ہے ؟ کیا تمھارے میاں کے دشمنوں کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا " انھوں نے بڑی حسرت سے جواب دیا " نہیں بہن یہ سوگ ان میاں کا نہیں ، ان کی حرکتوں سے جل کر اپنے پہلے میاں کا سوگ منا رہی ہوں "

ایک صاحب زادے زار و قطار روتے ہوئے اپنی ماں کے پاس آئے ۔ ماں نے پوچھا " کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہے ہو "

صاحب زادے نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا " ابا .... ابا "

بچاری ماں بدحواس ہو کر چلائی " ارے ابا کو کیا ہوا ؟ جلدی بتا میرا دم الٹتا ہے "

" دیوار میں ـــ کیلیں ـــ ٹھونک رہے تھے ـــ ہتھوڑی ـــ انگوٹھے پہ ـــ پڑ گئی "

ماں نے اطمینان کا سانس لیا بیٹے کی سعادت مندی پر انھیں بڑا پیار آیا اور اسے سمجھانے لگیں " بیٹا یہ ایسی کون سی رونے کی بات ہے ۔ ایسے موقعے پر تو دیکھنے والوں کو ہنسی آجاتی ہے "

بیٹا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا " اماں ـ یہی ـ تو ـ ہوا ـ تھا ـ مجھے ـ ہنسی ـ آ ـ گئی ـ تھی "

غزل

وامق احمد مجتبیٰ

وہ عہد مسرت کی باتیں، وہ وقت سہانا بھول گئے
جب سے غم دوراں یاد آیا سب لطف زمانہ بھول گئے

خاموش ہے گو بزم الفت، جاتی ہی نہیں دل کی وحشت
جس شمع سے روشن تھی محفل ہم اس کو بجھانا بھول گئے

تنظیم گلستاں کی دھن میں اب شاخ نشیمن یاد نہیں
اے گردش دوراں خوش ہو لے ہم اپنا ٹھکانا بھول گئے

جب ہنسنے ہنسانے کے دن تھے ہم آٹھ پہر روتے ہی رہے
اب وقت جو آیا رونے کا ہم اشک بہانا بھول گئے

اندوہ کی ماری دنیا میں کچھ اپنی زباں سے کہہ نہ سکے
اوروں کے فسانے سن سن کر ہم اپنا فسانہ بھول گئے

اے تندی صہبا ، دشمن غم کیفیت عالم دیکھ کے ہم
شیشے کو لگا کر ہونٹوں سے پھر اس کو ہٹانا بھول گئے

اک شور سے و مینا ہے کہ ہم ٹوٹ پڑے انگاروں پر
ہشیار بنا کر دنیا کو خود ہوش میں آنا بھول گئے

اس دور تلاطم میں وامق کتنے ہی سفینے کھے ڈالے
اور اپنی شکستہ کشتی کو موجوں سے بچانا بھول گئے

غزل

فضا ابن فیضی

وہ کیسی بندگی جس کو جبین شوق ہی سمجھے
ہو سجدہ یوں کہ سنگ آستان یار بھی سمجھے

مزا کیا غم ـــ جو تیری ادائے عاشقی سمجھے
مزا جب ہے کہ تو جس کا ہے تیرا غم وہی سمجھے

کہوں میں غیر سے کیوں غم کیوں حسرت مری سمجھے
جو میرے دل میں رہتا ہے مرے دل کی وہی سمجھے

کسی کے حال پر ڈر ڈر کے چھپ چھپ کے نوازش کیوں
کرم اس طرح سے کیجے کہ چشم غیر بھی سمجھے

ہم آویزش سرور و غم ہی دنیا عشق و الفت کی
ہم اس مے کو مئے گلگوں بھی سمجھے زہر بھی سمجھے

کہاں تک جشن خود بینی گذرے ہے آنکھ سے دل تک
مگر یہ بات میں کہہ دوں تو دنیا دل لگی سمجھے

یہ خار راہ کیا جانیں تری سختی منزل کو
تو اس کے سامنے رو جو زبان گریہ بھی سمجھے

محبت کی رہ دشوار بھی ہموار ہوتی ہے
وہ سمجھے گا جو خار راہ کو بھی پھول ہی سمجھے

حریم قدس کے نغمے تجھے الہام ہوتے ہیں
فضا کوئی حقیقت کیا ترے افکار کی سمجھے

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

بنگال بچ گیا

کلکتے میں فساد کی آگ بجھ گئی ہے اور اب شہر میں سکون ہے جو شدید مالی نقصان مسلمانوں کو پہنچا اس کا پورا اندازہ ابھی نہیں ہوا لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا چھرے بازی کے واقعات زیادہ نہیں ہونے پائے۔ حکومت اور مقامی لیڈروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ہنگامے کی خبر سن کر کلکتے پہنچ گئے تھے امن قائم کرنے کی دل و جان سے کوشش کی اور شہر کے عوام نے خصوصاً طالب علموں نے بڑے جوش و خروش سے ان کی مدد کی اس لئے فتنہ پردازوں کی یہ کوشش کہ کلکتے کی مسلمان آبادی ڈر کر شہر خالی کر دے کامیاب نہیں ہوئی۔ بہت کم لوگ شہر چھوڑ کر گئے۔ زیادہ تر فساد زدہ علاقے سے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے تھے اور اب ان کو اُن گھروں میں سے جا کر آباد کیا جا رہا ہے۔ حکومت نے ان کو عارضی امداد پہنچانے کا تو کچھ انتظام کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں، انھیں ان کے نقصانات کا مناسب معاوضہ دینے کی ضرورت ہے جیسے بمبئی کی حکومت نے گودھرا میں کیا تھا۔ ہمیں اُمید ہے کہ مغربی بنگال کی حکومت اپنے اس فرض کو جلد سے جلد ادا کرے گی۔

کانگریس کے ممبروں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوگی کہ ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کی تنظیم میں وہ اصلاحات جن کی ضرورت ایک مدت سے محسوس ہو رہی ہے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کئی تجویزیں مرتب کی ہیں جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دہلی کے اجلاس میں منظور کرائی جا رہی ہیں جن میں سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ کانگریس عہدہ داروں کے انتخاب میں "سرگرم ممبروں" کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مختلف اشخاص اور گروپ کانگریس کمیٹیوں پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے ڈھب کے "سرگرم ممبر" زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنانے کے لئے ہر قسم کی جائز اور ناجائز کوشش کر رہے ہیں ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے کے بعد ان کی یہ ساری کوششیں بے کار ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ورکنگ کمیٹی نے ملک کی معاشی منصوبہ بندی کی تجویز کے سلسلے میں جو اس نے پچھلے مہینے پاس کی تھی اپنی طرف سے ایک چھوٹی کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ معاشی منصوبہ بندی کا ایک پنج سالہ پروگرام بنا کر ملک کے سامنے پیش کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ورکنگ کمیٹی اس سارے نازک زمانے میں ہر ہر قدم پر کانگریس کی صحیح رہنمائی کرتی رہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا مناسب انتظام نہیں ہو سکا اور کانگریس اس کی رہنمائی سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی جیسا کہ ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کانگریس کو اس زمانے میں ایک ایسے قابل اور مضبوط پریسیڈنٹ کی ضرورت ہے جو اس کی تنظیم نئے حالات کے مطابق از سر نو کر سکے اور ان خرابیوں کو دور کر سکے جو اس کے اندر پیدا ہو گئی ہیں لیکن ایسے افراد کانگریس کے اندر یا باہر ہمارے ملک میں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ وزارت، سفارت یا گورنری میں کھپ گئے ہیں جب تک ان میں سے کوئی بزرگ کانگریس کی تنظیم نو کے کٹھن اور تکلیف دہ کام کو اپنے ذمے نہ لیں گے اس کی حالت سنبھل نہیں سکتی اور چونکہ ملک کی حکومت کی باگ کانگریس کے ہاتھ میں ہے اور بظاہر ایک مدت تک رہے گی اس لئے جو خرابیاں اس کے اندر ہیں وہ ملک کی عام حالت پر اثر ڈالتی رہیں گی۔

اُلجھن کے دور ہونے کی اُمید

ہندوستان اور پاکستان کی باہمی تجارت میں جو رکاوٹ سکے کے مسئلے سے پیدا ہو گئی ہے اور جس نے دونوں ریاستوں کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اب دور ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ابھی چند روز ہوئے پاکستان انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کا ممبر ہوا ہے اور ہندوستان پہلے ہی سے اس کا ممبر ہے اس ادارے کو ممبر ملکوں کے سکے کی شرح مقرر کرنے میں بہت کچھ دخل ہے اس کی طرف سے ایک کمیشن کراچی آیا تھا اور اس

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

پاکستان

دو ممتاز ہستیوں کی رحلت

پچھلے دنوں پاکستان اپنے دو لائق فرزندوں کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ ۶ر فروری کو محمد وسیم صاحب ایڈووکیٹ جنرل کا انتقال ہوا اور ۹ر فروری کو شیخ عبدالقادر نے وفات پائی۔

محمد وسیم صاحب اودھ چیف کورٹ کے ممتاز اور قابل بیرسٹر محمد نسیم صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ باپ کی طرح مرحوم بھی یوپی کے نہایت ہر دل عزیز اور کامیاب ترین بیرسٹروں میں سے تھے ۱۹۴۲ء میں آپ یوپی کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے تھے اور بنگال کی تقسیم کے سلسلے میں ریڈکلف کے سامنے آپ نے پاکستان کی طرف سے وکالت کی تھی تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں پہلے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ نے کشمیر کے بارے میں سکیورٹی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کی آپ کی اچانک اور بے وقت موت سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ہم مرحوم کے ضعیف والد اور اُن کے لائق بھائی پروفیسر محمد مجیب صاحب (نائب شیخ الجامعہ) اور پروفیسر حبیب صاحب (مسلم یونیورسٹی) کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے آمین (ع،ل)

شیخ عبدالقادر کی وفات اردو ادب اور اردو ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑا اندوہ ناک واقعہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ادبی دنیا کی بہت سی پرانی روایات اور خصوصیات بھی ختم ہو گئیں۔

شیخ عبدالقادر مرحوم یوں تو بڑے کامیاب اور نیک نام بیرسٹر، حکومت ہند کے لا ممبر، وزیر ہند کی کونسل کے صدر، مجلس اقوام کے نمائندہ، پنجاب اسمبلی کے صدر اور وزیر تعلیم وغیرہ بھی رہ چکے ہیں اور ان کی ملکی اور تعلیمی خدمات بھی اپنی جگہ اہم اور قابل قدر ہیں۔ لیکن جو چیز انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی وہ ان کا ادبی ذوق اور اردو کی بے لوث خدمت ہے۔

شیخ صاحب اُس دور میں پیدا ہوئے جب ایک ہندوستانی کے لئے اعلیٰ مغربی تعلیم معراج کمال سمجھی جاتی تھی۔ انھوں نے بھی اونچی مغربی تعلیم حاصل کی لیکن اس دور کے نوجوانوں کی طرح اپنی زبان کو گھٹیا نہیں سمجھا بلکہ اس کی محبت ان کے دل میں اور گہری ہو گئی اور وہ دل و جان سے اس کی ترقی کی کوشش میں لگ گئے۔ وہ پنجابی تھے۔ یوں تو پنجابیوں نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن عام بول چال اور روزمرہ کو پنجابی نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ لیکن شیخ عبدالقادر کو اردو زبان سے کو اس قدر گہرا لگاؤ تھا کہ انھوں نے بڑی محنت اور کوشش سے اردو کا روزمرہ، محاورے اور کہاوتیں سیکھیں اور ان کا لہجہ بھی اہل زبان کا سا تھا۔

شیخ صاحب جب ولایت سے واپس آئے تو اپنے منصبی فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی خدمت کا کام بھی شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے رسالہ مخزن کا اجرا کیا جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے صحیح اور سلجھا ہوا ادبی ذوق پیدا کرنے صحافت کے معیار بلند کرنے اور کئی ہونہار ادیبوں اور شاعروں کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے میں مخزن کا بڑا حصہ ہے مولانا راشد الخیری مولانا ظفر علی خاں۔ تلوک چند محروم منشی محمد ناظر، سید غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر اقبال اور دوسرے ادیب و شاعر شیخ عبدالقادر ہی نے کھوج کر نکالے، اُن کی ہمت افزائی کی اور ان کی تخلیقات کو مخزن جیسے بلند معیاری رسالہ میں جگہ دے کر اُن کی اور اس طرح اردو کی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اقبال کے جوہر کو سب سے پہلے شیخ صاحب ہی نے پرکھا اور انھیں بجائے فارسی کے اردو میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ اردو ادب کو اقبال جیسا گوہر بے بہا شیخ صاحب ہی کی بدولت ہاتھ آیا حاصل ہوا

شیخ عبدالقادر خود بڑے اچھے طرز تحریر کے مالک تھے۔ بڑا سلجھا ہوا اور سلیس انداز بیان جو بہت کم اردو ادیبوں کے حصے میں آیا ہے۔ تنقید نگاری میں اُن کا خاص درجہ ہے۔ ان کی نظر بڑی جچی تلی اور گہری ہوتی تھی۔ اقبال کی بانگ درا پر جو مقدمہ انھوں نے لکھا تھا وہ ادبی اور تنقیدی دونوں حیثیتوں سے بلند پائے کی چیز ہے۔ مخزن کے بند ہونے کے بعد بھی

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

آزاد ہند کی عورتیں

صالحہ عابد حسین

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ہندوستان میں عورتیں ہمیشہ سے بالکل آزاد رہی ہیں اور انھیں ہر قسم کے حقوق حاصل تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ پچھلے دو سو سال سے پہلے ہمارے دیس کی عورت کی اتنی ابتر حالت نہ تھی جو بعد میں ہو گئی۔ اسے بہت سے سماجی حقوق حاصل تھے اور کم سے کم گھر کے محدود دائرے میں رائے اور عمل کی پوری آزادی تھی لیکن غلامی نے پوری زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل ڈالا۔ ہماری پوری قوم دو سو سال تک غلامی کی زندگی بسر کرتی رہی اور اس کا اثر صرف اس کے جسم تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ذہنی طور پر بھی غلامی کی روح اس میں سرایت کر گئی۔ مرد چونکہ ایک غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انھوں نے عورت کو اپنا غلام بنا لیا اور اس طرح گویا اپنی حکومت کی پیاس بجھائی۔ یہ سب شعوری طور پر اور ایک دم سے ظہور میں نہیں آیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر عورت کی حیثیت گرتی گئی اور وہ مرد اور سماج کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم جب عرصے تک غلامی کی حالت میں رہے تو اور بہت سی خرابیوں کے ساتھ ساتھ اس کا اخلاق بھی پست ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی، عزتِ نفس اور دوسرے پر بھروسہ کرنے کا جذبہ اس میں کم ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں عورت پر پابندیاں بڑھتی گئیں، عام طور پر مردوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی تھی کہ انھیں نہ دوسرے مردوں پر اپنے آپ کو بھروسہ تھا نہ خود اپنی عورتوں پر اعتماد۔ اکثر لوگ نیک نیتی سے یہ سمجھنے لگے کہ عورت کی بھلائی اسی میں ہے اور یہی اس کی حفاظت کا واحد طریقہ ہے کہ اسے گھر کی چار دیواری میں بند رکھا جائے اور مرد اس کی چوکیداری کا فرض ادا کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کے پاؤں میں غلامی کی دہری دہری زنجیریں پڑ گئیں۔ سیاسی اور سماجی۔ اس کے مذہبی، سماجی اور انسانی حقوق چھن گئے، علم اور عمل کی راہیں بند ہو گئیں ذہنی نشو و نما رک گئی اور اس کے عمل اور تجربے کا میدان گھر کی کال کوٹھری تک محدود ہو کر رہ گیا۔

جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کی تحریک پورے زور شور سے اٹھی تو اسی کے ساتھ عورتوں کی آزادی کی تحریک کی ابتدا بھی ہوئی اور گاندھی جی اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے ہندوستانی عورت نے وہ زنجیریں جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی، ڈھیلی کرنی شروع کر دیں۔ آزادی کی تحریک میں عورتوں نے جس طرح دل و جان سے حصہ لیا اور ایثار و قربانی کی جو اسپرٹ ان سے ظاہر ہوئی اس نے لوگوں پر یہ بات روشن کر دی کہ عورتیں بھی اس کی مستحق اور اہل ہیں کہ خود آزادی حاصل کریں اور دیس کو آزاد کرانے میں مرد کی مدد کریں جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا واقعہ یہ ہے کہ ہندی عورت کی غلامی نتیجہ تھی مرد کی غلامی کا، جیسے جیسے مرد کا دماغ سیاسی غلامی کے جال سے آزاد ہوتا گیا عورت کی آزادی کا تصور بھی اس کے ذہن میں صاف ہونے لگا اور شاید ایک مبارک دن ایسا آئے جب ہماری پوری قوم اس ذہنی غلامی سے نجات حاصل کر لے، جو صدیوں کی محکومی نے اس میں راسخ کر دی ہے۔ اس وقت مرد عورت کو غلام بنائے رکھنے کا خیال بھی اپنے لئے شرمناک سمجھے گا۔

ہمارے ہاں سیاسی حقوق عورتوں کو قریب قریب مردوں کے برابر حاصل ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جب ان کے یہ حقوق تسلیم کئے گئے تو قوم نے ان کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ ووٹ کا حق جس کے لئے یورپ کے تعلیم یافتہ ملکوں میں عورتوں اور ان کی آزادی کی حمایت کرنے والے مردوں کو برسوں تک لڑنا پڑا ہمارے ہاں بغیر کسی خاص جد و جہد کے عورتوں کو حاصل ہو گیا اب آئینی اور قانونی طور پر بھی عورت کو مساوات اور برابری کے حقوق مل رہے ہیں یا اور ملنے والے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ آواز اٹھ رہی ہے وہ ایک محدود قدامت پرست طبقے کی ہے اور اس میں بھی زیادہ تر ان لوگوں کی جنھیں اپنے ذاتی مفاد کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہے۔ غرض یہ کہ سیاسی اور آئینی طور پر ہندوستانی عورت کی آزادی میں اب کوئی خاص رکاوٹ نہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ حقوق دراصل قانون یا آئین بنا دینے سے نہیں ملا کرتے۔ ایسے قانون موجود ہیں جن کی رو سے بعض فرقوں کی عورتوں کو بہت سے حقوق اور مساوات کا درجہ حاصل ہے لیکن سماج انھیں اس سے محروم رکھتا ہے۔ کوئی حق اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک عملی طور پر دینے والا اور لینے والا دل و جان سے اس کے لئے تیار نہ ہو اور جو رکاوٹیں اس کی راہ میں ہوں انھیں دور کرنے کا پکا ارادہ نہ کرے۔ اس لئے ہندوستانی عورت کو محض آئین اور قانون پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہنا نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنے کے لئے اپنے آپ کو اور اپنے مردوں اور بچوں کو تیار کرنا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہماری عورتوں پر صدیوں کی دہری دہری محکومی کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ عورت کی دماغی اور ذہنی نشو و نما رک گئی۔ اس کا حوصلہ اور عمل کا ولولہ سرد پڑ گیا۔ وہ علم کی روشنی سے محروم رہی اور اوہام پرستی، قدامت پسندی، تنگ نظری، خود پسندی اور بدگمانی۔ غرض جہالت اور محکومی کی بہت سی لعنتوں کا شکار ہو گئی۔ وہ مجبور اور محکوم ہونے کی وجہ سے بناوٹی بیماریوں اور (بعض اوقات) جھوٹی لگاوٹ کے گھٹیا اور اوچھے ہتھیاروں سے کام لینا سیکھ گئی، شعوری غیر شعوری طور پر ان کو جنسِ قوی کے خلاف آزمانے لگی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گی کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے، اس میں بہرحال کوئی شک نہیں کہ ہماری جنس کا بہت بڑا طبقہ ان لعنتوں میں گرفتار ہے جس کی وجہ سے ہماری ساری قومی زندگی مسموم ہو گئی ہے۔ ماؤں کی جہالت اور گراوٹ کا لازمی نتیجہ اولاد کی پستی اور خرابی تھا جس کا ایک اٹل ثبوت گذشتہ چند سال کے اندوہناک اور وحشیانہ واقعات سے مل سکتا ہے۔

اب آزاد ہندوستان میں ہمیں زندگی کے ہر شعبے کی نئی تعمیر کرنی ہے اور اس کے لئے سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی عورتوں کی زندگی کی نئی تشکیل ہو۔ ان کا فرض ہے کہ آزاد دیس کے آزاد باسیوں کی طرح اپنے حقوق حاصل کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اپنے فرائض کو سمجھیں اور انھیں خوبی سے ادا کریں۔ اپنی صلاحیتوں کو عمل میں لائیں اور ایک آزاد اور بہتر قوم اور سماج کے بنانے میں دل و جان سے حصہ لیں۔

اب تک ہمارے دیس کی عورت کا فرض زیادہ تر محض گھرداری، بچوں کی پرورش اور مرد کی خدمت سمجھا جاتا تھا میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ اور نہ کوئی سمجھدار انسان کر سکتا ہے کہ عورت کا سب سے پہلا اور اہم فرض ماں اور بیوی کے فرائض ادا کرنا ہے۔ ایک لونڈی کی طرح نہیں بلکہ قوم کی معمار کی حیثیت سے اس پر سب سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آیندہ نسل کو تندرست جسم، صالح دماغ اور اعلیٰ اخلاقی صفات سے آراستہ کرے اور ساتھ ہی یہ کہ موجودہ نسل یعنی اپنے شوہر، بھائی اور باپ چچا وغیرہ کے جسم و دماغ کو بھی تندرست اور صحیح رکھے اور خاندان کا شیرازہ نہ بکھرنے دے۔ یہ محض اس کے گھریلو فرائض ہی نہیں بلکہ یہ دیس اور قوم کی وہ اہم خدمات ہیں جن کے بغیر کوئی قوم، کوئی ملک صحیح معنوں میں ترقی کر ہی نہیں سکتا۔

یوں تو ہم ہندوستانی عورتیں اپنے گھریلو فرائض میں اپنی جان کھپانے اور اپنا تن من نثار کرنے میں کمی نہیں کرتیں۔ لیکن اگر میری بہنیں مجھے معاف کریں تو میں یہ کہوں گی کہ ہم اپنا سارا وقت اور ساری طاقت ان میں صرف کر دیتے ہیں، لیکن ان کو صحیح طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت اور قابلیت ہم میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ ہمارے گھروں میں نہ گھر والوں کو وہ سکون اور آسائش نصیب ہوتی ہے جو گھر کا اصلی مقصد ہے۔ نہ مائیں بچوں کی اچھی طرح پرورش اور ٹھیک تربیت کر سکتی ہیں اور نہ خاندانی زندگی میں وہ یک جہتی اور شیرازہ بندی ملتی ہے جس کے بغیر کسی بھی سماج کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے دیس کی عورتوں کو سب سے پہلے اپنی پوری توجہ اس بات پر لگا دینی چاہیئے کہ ہم کس طرح اپنے عورت کے مخصوص فرائض پوری خوبی اور اہلیت کے ساتھ انجام دیں۔ اگر ان میں ربط، نظم اور سلیقے سے کام لیا جائے تو پھر وقت کی کافی بچت ہو سکے گی۔ اب تک ہماری بہنیں دن کے سترہ، اٹھارہ گھنٹے ان کاموں میں الجھی رہتی ہیں جن کو دوسرے ملکوں کی عورتیں تین چار پانچ گھنٹے میں نپٹا دیتی ہیں لیکن اب ہمیں اپنے گھریلو کاموں کی تقسیم اور ترتیب اس طرح کرنی چاہیے کہ دوسرے کاموں کے لئے بھی وقت نکل سکے۔

اس وقت ایک طرف تو ہماری معاشی حالت ابتر ہے اور جب تک مرد کے ساتھ عورت بھی خاندان کی کفالت کے لئے کچھ نہ کچھ کام نہ کرے، موجودہ آمدنی کس طرح پوری پڑتی نہیں نظر آتی دوسری طرف آزاد دیس کے باسیوں کی حیثیت سے عورت پر اپنے دیس کا بھی حق ہے اور اس کو دیس کی سیوا اور قوم کی بھلائی اور بہبود کے کاموں میں پورے جوش اور انہماک سے حصہ لینا چاہیئے ۔

میرے نزدیک اصولاً عورت کو ہر وہ کام کرنے کا حق ہے جو مرد کرتے ہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ہر قسم کے کاموں میں حصہ لے سکتی ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعض کاموں کے لئے عورتیں مردوں سے زیادہ موزوں ہیں ۔ اور بعض کے لئے کچھ کم اس وجہ سے کہ وہ ان کاموں سے فطری مناسبت نہیں رکھتیں ۔ اور کچھ اس لئے کہ صدیوں سے ان کی ذہنی قابلیتوں کی نشوونما نہیں ہوئی ہے ۔ جب تک ہمارے ہاں بھی چند ایسی عورتیں نکل آئیں گی جو علمی فکر و تحقیق کی صلاحیت رکھتی ہیں ۔ ان کو یقیناً اس کا پورا حق ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے کو اور دیس کو فائدہ پہنچائیں ۔ لیکن عام طور پر ہمارے دیس کی عورت کو وہی کام کرنا چاہیئے جس کے لئے وہ مرد سے زیادہ موزوں ہے اور جن کو وہ زیادہ (کم سے کم برابر) خوبی اور کامیابی سے انجام دے سکتی ہے ۔ اب میں ان کاموں کا ذکر کروں گی جن میں عورتیں مردوں سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں مثلاً معلمی خاص طور پر چھوٹے بچوں کی تعلیم جس کو عورت ہی پوری خوبی سے انجام دے سکتی ہے اور بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ کام عورت ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے ۔ ان پڑھ بالغوں کی تعلیم کا کام بھی عورتیں بہت اچھی طرح کر سکتی ہیں، کیونکہ ان میں وہ صبر اور ضبط ہے جو بڑی عمر کے لوگوں کے پڑھانے کے لئے درکار ہے اسی طرح نرسنگ بھی عورتوں کا خاص میدان ہے نرسنگ کا کام ہمارے دیس میں بڑی کس مپرسی کے عالم میں ہے ۔ مرد فطرتاً تیمارداری نہیں کر سکتے، اور عورتیں اس کی طرف بہت کم توجہ کرتی ہیں ۔ جو تھوڑی سی نرسیں ہیں بھی (جن میں زیادہ تر یوریشین ہیں) وہ اتنی مہنگی ہوتی ہیں کہ سوا رئیسوں کے کسی اور کے لئے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانا محال ہے ۔ ہمارے دیس کی عورتوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس شریف پیشے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ۔ شاید عورت کے قدرتی جوہر کسی کام میں اتنے نہیں چمکتے جتنے تیمارداری میں ۔ بچوں کو پالنے اور ان کے لئے دکھ درد سہنے والی ہستی ہی بیمار کے لئے بھی اپنا آرام تج کر اس کے لئے آرام و سکون مہیا کر سکتی ہے معلمی اور نرسنگ کے علاوہ ڈاکٹری کا پیشہ بھی عورت کے لئے بہت موزوں ہے ۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے ۔ دیہات کے لوگ تو ابھی تک حکیموں یا نیم حکیموں اور ویدوں سے بلکہ زیادہ تر جھاڑ پھونک ہی سے شفا حاصل کرتے ہیں ۔ لیڈی ڈاکٹر تو اور بھی کم ہیں ۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ نسوانی امراض میں مبتلا لاکھوں ہندی عورتیں اپنی ساری عمر کرب و عذاب میں گذارتی ہیں یا اپنی جان ہی سے ہاتھ دھوتی ہیں ۔

تصنیف و تالیف اور ادبی خدمت کا میدان بھی عورت کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ اپنے قلم سے اپنی اخلاقی قدروں سے قوم کو روشناس کر سکتی ہے جن کی قدر عورت کے دل میں زیادہ ہوتی ہے وہ ان سماجی اور معاشرتی خرابیوں کو اجاگر کر سکتی ہے جن کو عورت کی باریک بین نگاہ زیادہ صفائی سے دیکھ سکتی ہے ۔ ان معاشی مسائل کی طرف حکومت کو متوجہ کر سکتی ہے جس کا مجموعی اثر خاندانی زندگی پر پڑتا ہے ۔ وہ جنگ اور تشدد کے خلاف آواز بلند کر سکتی ہے جس کی وجہ سے گھریلو اور خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور جس کا سب سے بڑا وار عورت کی مانگ اور کوکھ پر ہوتا ہے ۔ مختصر یہ کہ عورت شاعری مضمون نگاری، افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے ذریعے بھی قوم دیس اور انسانیت کی قابل قدر اور مفید خدمات انجام دے سکتی ہے ۔

سوشل سروس یا سماجی خدمت کا کام جو ہمارے دیس میں نہ ہونے کے برابر ہے اس کی اہمیت بھی میرے خیال میں عورت ہی میں زیادہ ہے عورت کی فطرت میں خدمت کا مادہ مرد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے ۔ دراصل عورت کا سب سے بلند نصب العین خدمت ہی ہے اس لئے یہ فرض بھی ہمارے دیس کی عورتوں ہی پر عائد ہوتا ہے کہ وہ سوشل سروس کے میدان میں زیادہ آئیں اور اپنے دیس کے لوگوں کی عام حالت سنوارنے اور ان کی تعلیمی سماجی اور اخلاقی حالت سدھارنے کا مقدس کام انجام دیں ۔

ہمارے ہاں کا معاشی مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے جس کو چند سطروں میں بیان کرنا ناممکن ہے ۔ میں صرف اتنا اشارہ کروں گی کہ اس وقت ملک کا اہم ترین مسئلہ غذا کا مسئلہ ہے ۔ پیداوار کم اور کھانے والے زیادہ ۔ اس لئے ہمیں باہر سے غلہ منگانا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں ۔ ملک کی کثیر دولت باہر چلی جاتی ہے اس لئے ہماری وہ لاکھوں کروڑوں عورتیں جو دیہاتوں میں اپنے کسان مردوں کے ساتھ کھیتی باڑی کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں ان کو اس چیز کا احساس دلایا جائے کہ وہ غلہ پیدا کرکے صرف اپنا ہی پیٹ نہیں پالتیں بلکہ وہ دیس کی بہت بڑی خدمت انجام دیتی ہیں، اور انھیں دیس کی بھلائی کے لئے اس خدمت کو اور زیادہ لگن اور محنت سے کرنا چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانی چاہیئے عورت پر یہ فرض اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ روٹی کھلانے والی بھی وہی ہے اور غلے کی کمی زیادتی، مہنگائی یا ارزانی کا اثر بھی سب سے پہلے اسی پر پڑتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ با اثر اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اور خود حکومت کو بھی ان لوگوں کی مشکلوں اور دقتوں کا سمجھنا اور دل و جان سے انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے جب تک ہم ان کی مصیبتیں اور مشکلیں سمجھ کر دل سے انھیں دور کرنے کی کوشش نہ کریں گے وہ بھی دیس کی اس غذائی مصیبت کو حل کرنے میں پوری طرح ہاتھ نہیں بٹا سکتے ۔

ہمارا ملک اتنا بڑا اور اس کی آبادی اتنی کثیر اور اتنی غریب ہے کہ قاعدے سے ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ہمارے ہاں کی عورتوں کا ہاتھ کا کام اتنا زیادہ ہوتا کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا لیکن اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ہم اکثر اپنی ضروریات کی معمولی معمولی چیزیں بھی خود تیار نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ بدیسی چیزیں خریدتے ہیں اور شرمندہ نہیں ہوتے کہ ہم ان کے محتاج ہیں ۔ پھر گھر کی سجاوٹ اور اپنے ذاتی سنگار اور آرائش کے لئے ہم اور ملکوں کی مشین کی بنی ہوئی مہنگی ناپائدار اور گھٹیا اور نقصان دہ چیزیں خریدتے ہیں ۔ حالانکہ اگر ان کی جگہ گھر کی بنی ہوئی اور دیسی اشیاء استعمال کی جائیں تو وہ ان سے کہیں زیادہ سستی اور پائدار ہوں گی ۔ اس امر پر سب عورتوں اور خاص کر شہری عورتوں کو (اور مردوں کو بھی) غور کرنا چاہیئے ۔ اس وقت دیس جس بحرانی دور سے گذر رہا ہے اس کی وجہ سے ضرورت اس بات کی ہے کہ مشینری وغیرہ خریدنے کے سوا دیس کا روپیہ کسی صورت میں باہر نہ جانے اور ہر قسم کے سامان آرائش و زیبائش کی درآمد بند کر دی جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک طرف ملک کا روپیہ باہر نہ جائے گا اور ملک کی صنعت و دستکاری کو ترقی ہو سکے گی ۔ اور ساتھ ہی خاندانی بجٹ میں بھی تھوڑی سی کفایت ہو جائے گی ۔ میرا خیال ہے کہ اگر عورتیں چاہیں تو ان باتوں کا خیال کرکے دیس کی بڑی خدمت انجام دے سکتی ہیں اس لئے کہ آرائش اور زیبائش کی چیزوں اور کپڑوں کی ضرورتوں کی خریدار زیادہ تر وہی ہوتی ہیں ۔

آزاد دیس کا ہر باسی پورے دیس کو اپنا سمجھتا ہے اور اس کی ہر بھلائی ہر سدھار کے کام کو اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ وہ صرف حکومت یا لیڈروں یا کسی خاص گروہ ہی سے توقعات وابستہ کرکے خود بے کار نہیں بیٹھا رہتا بلکہ دیس کی فلاح کے کاموں میں خود پیش پیش رہنا چاہتا ہے ۔ وہ محض زبان چلانے اور دوسروں پر اعتراض کرنے اور برا بھلا کہنے ہی سے اپنا دل ٹھنڈا نہیں کرتا بلکہ اپنے امکان بھر خود برائیوں کو دور کرتا اور اصلاح کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ اپنا تن من دھن اپنے دیس کی سیوا میں لگا دیتا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ خوش حال با عزت اور بلند ملک بنانا چاہتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے دیس کی عزت، اس کی عزت اور دیس کی ذلت و تباہی خود اس کی تباہی اور ذلت ہے ۔ ابھی ہم صرف آئینی طور پر آزاد ہوئے ہیں ۔ ہمیں سچی آزادی جان توڑ کوشش اور ان تھک محنت کرکے حاصل کرنی ہے اور اس کام میں مردوں کے دوش بدوش بلکہ ان سے پیش پیش آزاد ہند کی آزاد عورتوں کو ہونا ہے ۔ اس لئے کہ وہی اگلی قوم کی زندگی کی تشکیل کرنے والی اور حال اور مستقبل بنانے والی ہیں ۔

(اطلاعات، لکھنؤ)

مصر کی حکومت کا بانی

عبدالحلیم ندوی

۱۷۶۹ء میں سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضہ شہر "قولہ" میں ایک ترک خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ مسلمان ماں باپ نے اسے دینی مدرسے میں داخل کر دیا کہ پڑھ لکھ کر دین اور قوم کی خدمت کرے۔ مگر قدرت اس سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتی تھی۔ اس کا دل یہاں سے بہت جلد اُچاٹ ہو گیا اور اس نے فنونِ جنگ کی مشق شروع کر دی۔ اس کے بعد وہ شہر کی اس فوج میں شریک ہو گیا جو رات کو راستہ ناروں اور ڈاکوؤں کی نگرانی کرتی تھی اور دن میں لوگوں سے ٹیکس وصول کر کے حکومت کے خزانے میں جمع کرتی تھی۔ اس عرصے میں نپولین بونا پارٹ نے مصر پر حملہ کر دیا اور محمد علی کو ۱۷۹۸ء میں دولت عثمانیہ کی امدادی فوج میں شامل ہو کر مصر جانا پڑا۔ مصر پر اس وقت ملوکوں اور قبائل کی حکومت تھی جو دولت عثمانیہ کے ماتحت کام کرتے تھے، ان کی بدانتظامیوں، خود غرضیوں اور آپس کی چپقلش کی وجہ سے ملک کی حالت بہت ابتر تھی۔ نہ فوجی طاقت مستحکم تھی۔ نہ کوئی نظام تھا نہ قاعدہ قانون کی پابندی اور اس کا نفاذ۔ اسی لئے دولت عثمانیہ اور سلطنت انگلستان کی متحدہ کوششوں کے باوجود مصر پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر مصریوں نے اتنے ہنگامے کئے۔ فلاحوں نے اس قدر شورش مچائی کہ فرانسیسی فوجیں باوجود اپنی عظمتوں کے ان کو دبا نہ سکیں، اور تین ہی سال کے عرصے میں یہاں سے تنگ آ کر بھاگ گئیں۔ اب یہ نوجوان جو معمولی سپاہی کی حیثیت سے یہاں آیا تھا آگے بڑھا۔ مصریوں نے اس میں ایسے جوہر دیکھے کہ ۱۸۰۵ء میں اسے مصر کا پاشا بنا دیا۔ پاشا کا عہدہ گورنر کے برابر ہوتا تھا جو براہِ راست دولت عثمانیہ کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔

اس سپاہی نے پاشا بن کر ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے، حسنِ انتظام اور کاموں کے کرنے کا سلیقہ، سیاست دانی اور معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا ایسا عمدہ نمونہ پیش کیا کہ ساری مصری قوم اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئی اور آخر کار اسے تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ اب وہ مصر کو ایک سلطنت بنانے، اس کو مستحکم کرنے اور طاقت ور ملک بنانے میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔ آخر اس نے مصر کو دولتِ عثمانیہ کے نام نہاد اقتدار، انگلستان اور دوسری یورپی قوموں کی ریشہ دوانیوں، ممالیک اور قبائل کے تسلط سے آزاد کرا کے ایک خود مختار اور مستحکم مضبوط سلطنت بنا دیا ـــــ اور یہ تھا وہ نوجوان مردِ مجاہد۔ مصر کی قسمت بنانے والا رہنما محمد علی جسے دنیا محمد علی الکبیر کے نام سے یاد کرتی ہے، محمد علی جس نے بروقت مصر کو ڈوبنے سے بچا لیا ورنہ آج مصر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے اس محسنِ اعظم کی سیاست کے دو ایک پہلو آپ کے سامنے پیش کروں۔

محمد علی مرحوم نپولین کے حملے کے وقت باب عالی کی طرف سے لڑنے کے لئے پہلے پہل مصر آئے اور جب نپولین کی فوجوں نے مصر کو خالی کر دیا تو عثمانیہ سلطنت کے تحت ۱۸۰۵ء میں مصر کے پاشا بنائے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مصر پر ہر قوم کی للچائی نظر تھی خصوصاً جبکہ دولت عثمانیہ انتہائی کمزور ہو چکی تھی اور راستہ ... ہموار تھا۔ صرف برطانوی حکومت تھی، برطانوی حکومت ہمیشہ سے موقع کی تاک میں رہتی ہے۔ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر مصر کی بندرگاہ اپنے قبضے میں رکھنی چاہی تاکہ ہندوستان کا راستہ نہ صرف اس کے لئے کھلا رہے بلکہ دوسروں سے محفوظ بھی رہے۔ محمد علی بڑے تیز اور عقلی دور بیں آدمی تھے۔ وہ ان حالات کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے اس لئے انھوں نے اس کی کوشش کی کہ مصری حکومت کو نہ صرف مضبوط بنایا جائے بلکہ دوسرے عرب ملکوں کو ملا کر ایک وسیع عربی حکومت قائم کی جائے تاکہ پھر دوسری قومیں مشکل سے اس پر نظر ڈال سکیں۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے مصر کی اندرونی حالت درست کی۔ اندرونی شورشوں اور آپس کے جھگڑوں کو ختم کر کے زندگی میں سکون اور کاموں میں اعتدال پیدا کیا۔ جب حکومت اور عوام کی زندگی اعتدال پر آ گئی تو انھوں نے مصری حکومت کی توسیع کی طرف توجہ دی اور اسی کام کو انھوں نے اپنے بیٹے ابراہیم کے سپرد کیا جس نے اپنی بہادر اور جانباز فوجوں کے ذریعہ شام، لبنان، دمشق، فلسطین اور جزیرہ نمائے عرب پر قبضہ کر کے مصر کا جھنڈا گاڑ دیا۔ مصری سلطنت کی توسیع کے علاوہ محمد علی نے فوجوں کی پرانی تنظیم کو بدل کر انھیں بالکل نئے طریقے سے منظم کیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اسکول کھولے۔ بحری بیڑے کی تشکیل کی۔ جہاز بنانے اور مرمت کرنے کے لئے ایک بڑا کارخانہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے صنعتی ادارے کھولے۔ کاشتکاری کا نظام درست کیا۔ آبپاشی کے لئے نہریں اور کنوئیں کھدوائے۔ عوام کی تعلیمی حالت درست کرنے کے اسکول اور مدرسے قائم کئے۔ شام میں کوئلے اور لوہے کا پتہ لگا کر ان میں کھدائی شروع کرائی، اور ایک لمبی سڑک بنا کر مصر کو شام سے ملا دیا۔ یہ اور دوسرے اسی قسم کے بہت سے مفید کام کئے جنھیں تاریخ نہیں بھلا سکتی۔

محمد علی نے یہ سب کام محض اپنی طاقت اور اپنے بل بوتے پر کیا تھا۔ باب عالی یا کسی دوسری حکومت سے کسی قسم کی مدد نہیں لی تھی۔ اس لئے فطرتاً ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کی محنت کا پھل کسی دوسرے کو نہ ملے اور اس سے مصری قوم اور اُن کے بعد آنے والی نسلیں فائدہ اُٹھائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ مصر اپنی قسمت کا خود مالک بنے۔ باب عالی جس کا مصر کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں، کیوں مصر کے معاملات میں دخیل رہے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۳۲ء میں یورپی اقوام کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ اب مصر باب عالی کے ماتحت نہیں رہنا چاہتا۔ مصر نے اپنی قسمت خود بنائی ہے اور وہی اب اس کا مالک ہے۔ یہ سننا تھا کہ یورپ میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ انگلستان کے وزیر خارجہ لارڈ پامرسٹون نے محمد علی کو جواب میں لکھا کہ "بادشاہ سلامت کی حکومت اس تجویز کو ناممکن العمل سمجھتی ہے۔" فرانس نے بھی جس نے بڑی حد تک محمد علی کی پاسداری کی تھی، اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر پاشا نے اسے عملی جامہ پہنایا تو ہم بھی اس کی مخالفت کریں گے اور اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں گے۔ برطانوی رجعت پسند لیڈر بولے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ امن یورپ دوبارہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ محمد علی نے جب چاروں طرف سے اس قسم کی باتیں سنیں تو مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ خیال دل میں جما رہا اور وہ موقعہ کی تاک میں رہے۔ اور موقعہ بھی جلد ہی آ گیا۔ محمد علی کی فوجوں اور دولت عثمانیہ کی فوجوں میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی جس میں محمد علی کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھرتے بکھرتے رہ گیا۔ ابراہیم (محمد علی کے لڑکے) نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا اور اب ترکی سلطنت پر قبضہ کرنے میں اسے کوئی روک نہ تھی۔ اسی زمانے میں سلطان محمد ثانی کا انتقال ہو گیا جس سے اور بھی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ ادھر عثمانی بحری بیڑہ کا کمانڈر اپنا بیڑہ محمد علی کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ غرض موقع ایسا تھا کہ اگر محمد علی چاہتے تو سلطنت عثمانیہ پر بھی قبضہ کر لینا مشکل نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اس کو مناسب نہ سمجھا دولت عثمانیہ بھی موقعہ کی نزاکت کو سمجھ گئی اور اس نے فوراً انگریزوں کے دامن میں پناہ لی۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء میں لندن میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں سوائے فرانس کے تقریباً سارے یورپی ممالک شریک ہوئے اس کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ اگر محمد علی شام اور دیگر مقبوضہ اسلامی ممالک کو چھوڑ دیں تو مصر پر اُن کی اور اُن کے وارثوں کی حکومت تسلیم کر لی جائے محمد علی کے پاس جب یہ شرطیں آئیں تو انھوں نے ان کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب معاملہ بہت نازک تھا اور اس کے معنی جنگ کے تھے۔ انگلستان کو اب موقعہ ملا تو اس نے فوراً اپنا بحری بیڑہ ساحل مصر پر اتار کر ساحل کا محاصرہ کر لیا اور اسی کے ساتھ لبنان اور جبال میں شورش پیدا کر دی۔ محمد علی ان حالات سے بے خبر نہ تھے لیکن وہ خطرہ اتنا قریب نہیں سمجھتے تھے اب جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ انگریزی بحری بیڑہ سر پر ہے تمام درآمد برآمد کردہ اشیا اور جہازوں پر اس کا قبضہ ہو

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

آزادی کی زنجیریں

ظفر میر مظفر حسن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ والد پنشن لے کر اپنے وطن دریاپور میں مقیم ہیں۔ یہیں سے اس سال ظفر نے میٹرک پاس کیا ہے۔ وہ آگے کالج میں پڑھنا چاہتا ہے۔ پہلے تو اس کے والد مالی مشکلات کی وجہ سے اس پر تیار نہیں ہوتے اور نوکری کرانا چاہتے ہیں مگر پھر ظفر کے ہیڈ ماسٹر شیودیال صاحب نے جو میر صاحب کے گہرے دوست اور بڑے قابل آدمی ہیں سمجھانے اور یہ بتانے پر کہ ظفر کو وظیفہ ملے گا وہ آگے پڑھانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اور الہ آباد کالج میں بھیجنا منظور کر لیتے ہیں۔ ظفر اس فیصلے سے بے حد خوش ہیں اور مستقبل کے لئے خیالی قلعے بناتا رہتا ہے۔

(قسط ۸)

روانگی کے دن سے پہلے رات کو بستر تنہائی پر وہ اپنی زندگی کے آنے والے خیال کو چھوڑ کر پچھلی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی عمر کے اٹھارہ برس میں سے چودہ سال ماں کی محبت سے اور پچھلے چار سال اس محبت کی یاد سے معمور تھے کئی باتوں کے لحاظ سے اس کا بچپن بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کی صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کی والدہ بیماری کی وجہ سے عموماً گھر کی فضا پر ایک افسردگی سی چھائی رہتی تھی گھر میں اور بچے نہ تھے جن کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملتا شروع میں تو اس کے والد اُسے بہت پیار کرتے تھے جس کی یاد اب کچھ دھندلی سی باقی تھی۔ مگر جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ان کا لطف و کرم قہر و عصب سے بدل گیا تھا، اور وہ اُسے بات بات پر ڈانٹتے اور گھڑکنے لگے تھے اسکول کے نیچے درجوں میں اس کے ہم جماعت اس کی کمزوری اور دبلے پن سے فائدہ اُٹھا کر اُسے دق کرتے رہتے اور اکثر اس کی مرمت بھی کر دیتے چونکہ وہ عام طور پر خاموش اور سہما رہتا تھا اور اُستادوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جھجکتا تھا اس لئے وہ ایک عرصے تک کند ذہن اور بدشوق سمجھا گیا اور اُسے بے جا خفگیاں اور سختیاں اُٹھانی پڑیں۔ مگر ان کانٹوں بھری جھاڑیوں کے بیچ میں ماں کا پیار پھولوں کا ایک سدا بہار پودا تھا جس نے ظفر کی زندگی میں لطافت اور شادابی پیدا کر دی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ گو اس کی والدہ کے انتقال کو چار ہی سال گذرے تھے مگر ان کے چہرے کے خد و خال کا نقش اس کے حافظے میں بہت دھندلا ہو گیا تھا۔ بس اُمنڈتی ہوئی شفقت چھلکتی ہوئی محبت اور ایک غمگین تبسم، دلکش اور دلدوز تبسم کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی۔ اس وقت یہ تصویر ایک چھلاوے کی طرح ماضی کی تاریک فضا میں رہ رہ کر چمکتی ہوئی اُڑتی چلی جا رہی تھی اور ظفر اس کے پیچھے دوڑتا ہوا گذری ہوئی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ پچھلی زندگی کے مناظر اس کی تصور کی آنکھوں میں ایک ایک کرکے آ رہے تھے

.........وہ میعادی بخار کی شدت سے نیم جان بستر پر پڑا ہے۔ آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی ہیں۔ ایک چہرہ جو کمزوری سے سُتا ہوا اور پریشانی سے اُترا ہوا ہے جس میں خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس کے اوپر جھکا ہوا ہے ایک ہاتھ جو برف کی طرح ٹھنڈا ہے اس کے ماتھے پر رکھا ہے دو ہونٹ جن پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں" یا اللہ تیری مشیت میں بندوں کو دم مارنے کی مجال نہیں مگر دعا مانگنے کی تو نے اجازت دی ہے حکم دیا ہے۔ یہ تیری ناچیز گنہ گار بندی تجھے محمدؐ اور آل محمدؐ کا واسطہ دے کر تجھ سے دعا کرتی ہے میرے ظفر کو بچا لے اور اس کے بدلے مجھے دنیا سے اُٹھا لے۔ میرے مولا تو نے مجھے بہت سی نعمتیں دیں مگر سب سے بڑی نعمت یہ بچہ ہے۔ میں نے بڑے دکھ اٹھا کر اسے پالا ہے۔ اپنی جان اس کے اندر کھپا دی ہے۔ میرا مردہ جسم اب کسی کام کا نہیں اُسے مٹی میں مل جانے دے، مگر اس ننھی سی جان کو زندگی دے اس کے باپ کے سایے میں پروان چڑھا اور اس قابل بنا دے کہ دنیا میں بڑے کام کرے اور بڑا نام پائے"........

گرمیوں کی ایک ٹھنڈی صبح ہے وہ کسی کے شانے پکڑ کر ہلانے سے گہری نیند سے چونکتا ہے۔ ماں کی مسکراتی ہوئی شکل نظر آتی ہے۔ "اُٹھو بیٹے ساڑھے پانچ بج گئے سات بجے تمھیں مدرسے پہنچنا ہے۔ تم نماز پڑھ کر کلام مجید پڑھ لو اتنے میں تمھارے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں" "مگر اماں رات کو تو آپ کو بخار تھا، آپ چولھے پاس نہ جائیے وزیرن ناشتہ تیار کرے گی" "نہیں میاں میں اب بالکل اچھی ہوں وزیرن کے ہاتھ کی ٹکیاں تمھیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم ہی ایسا کیا ہے۔ آٹا گوندھ کر دو ٹکیاں ڈالنی ہیں۔ ایک انڈے کا حلوہ بنانا ہے۔ تمھارا آج امتحان ہے۔ اگر آج کچھ کھایا نہ گیا تو پرچہ کیسے ہوگا".........

.........وہ پریشان، رنجیدہ، دل گرفتہ اپنے کمرے میں چوکی پر کلام مجید کھولے بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں جنھیں وہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رات ماں کو درد کا شدید دورہ پڑا تھا۔ دو بجے تک پاس کے کمرے میں ڈاکٹر کے آنے جانے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز آتی رہی اس کا دل بے قرار تھا کہ جا کر ماں کو دیکھے اور ان کی خدمت کرے مگر ابا جان کا نادری حکم تھا کہ جب ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو وہ ان کے کمرے میں قدم نہ رکھے۔ وہاں جانے کا تو کیا ذکر ہے اس کی اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ دروازہ کھول کر برآمدے میں چلا جائے اور باہر سے جھانک کر دیکھے کبھی پلنگ پر پڑا کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی اُٹھ کر دروازے کی درز سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا تھا۔ دو بجے کے بعد جب مریضہ کو سکون ہوا اور گھر میں خاموشی چھا گئی تو وہ بھی سو گیا۔ صبح نماز کے وقت آنکھ نہیں کھلی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ابا جان نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا اور بہت بُری طرح ڈانٹا۔ اس وقت جب وہ قضا نماز پڑھنے کے بعد کلام مجید پڑھ رہا ہے اس کے دل میں ابا جان کے یہ الفاظ رہ رہ کر نشتر کی طرح چبھ رہے ہیں "ماں غریب رات بھر درد سے تڑپتی رہی اور صاحبزادے پاؤں پھیلا کر دن چڑھے تک سوتے رہے۔ نماز قرآن کی تلاوت سب غائب" ابا جان کی ناانصافی کا جو رنج ہے اس سے کہیں زیادہ یہ خیال اس کے دل میں کھٹک رہا ہے کہ اماں نے ان کے چیخنے کی آواز سنی ہوگی تو ان کو کتنا رنج اور صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ جا کر اماں کے قدموں پر گر پڑے اور رو رو کر اُن سے وہ سب باتیں کہہ دے جو ابا سے نہیں کہہ سکا۔ اتنے میں کسی کی آہٹ سنائی دیتی ہے، مڑ کر دیکھتا ہے تو ضعف سے نڈھال ماں ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتی چلی آ رہی ہے ہونٹوں پر وہی غمگین، دلکش، دلدوز تبسم ہے اور آنکھوں میں قلق، ترس، محبت، وہ بے اختیار سسکتے ہوئے دوڑتا ہے اور ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ ماں اپنی ناطاقتی کے باوجود اُسے بھینچ کر پیار کرتی ہے" ہائے میرا بچہ کیسا اُداس ہے بیٹا تم اپنے ابا کے کہنے کا بُرا نہ ماننا میں جانتی ہوں کہ تم میری تکلیف کی قدر میں جاگتے رہے اور صبح کو آنکھ لگ گئی اُن کے تو غصے میں حواس جلتے رہتے ہیں اور اصل میں غصہ نہیں۔ رنج، تکان اور پریشانی کی جھنجھلاہٹ ہے وہ ان لوگوں میں ہیں جن کا غم غصے کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے"........

یہ وہ تخیل پر تیرے ربط خلم کچھ دیر تک جاری رہا تھا کہ ظفر کو غیر محسوس طور پر نیند آ گئی۔ اب وہ خواب دیکھ رہا تھا اور اُسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں کو سمیٹ کر اپنے شانوں کو اس طرح بھینچ لیا تھا جیسے ماں کے گلے سے لپٹا ہوا ہو۔ اس کی پلکوں پر آنسو تھے اور ہونٹوں پر میٹھی اداس مسکراہٹ جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔

صبح اُٹھ کر جب وہ اسباب باندھ رہا تھا تو اسے یہ پتہ چلا کہ اس کا اپنا کمرہ، سارا گھر اور گھر کی ایک ایک چیز اسے کس قدر عزیز ہے۔ اس کی حالت کچھ ایسی تھی جیسے اس کی جڑیں ان سب چیزوں میں پیوست ہیں اور انھیں اکھاڑنے میں روحانی اذیت ہو رہی ہے۔ ناشتے پر اس نے اپنے والد کو خلاف معمول خاموش اور افسردہ پایا اس سے اسے سخت تکلیف ہوئی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کریں، جھنجھلائیں خفا ہوں، ان کا غصہ ناگوار ہوتا تھا مگر اس میں ایک طوفان کی سی کیفیت تھی جو احساس کی سطح پر تموج پیدا کرتی تھی یہ خاموشی اور اُداسی ایک دھوئیں کی طرح تھی جس سے دم گھٹتا ہے۔ ظفر کو دفعتاً محسوس ہوا کہ اُسے اپنے والد سے بھی گہری محبت ہے جو آزردگی اور رنجیدگی کی راکھ میں دب گئی ہے اور ہوا نہ لگنے سے کجلا کر رہ گئی ہے اور ان کو؟ ان کو اس سے محبت نہ سہی مگر ایک تعلق ضرور ہے جو ان کی سرد اور افسردہ زندگی میں حرارت پیدا کرتا ہے اُسے بڑا قلق ہو رہا تھا کہ ابا جان گھر میں بالکل اکیلے رہ جائیں گے" یوں تو بہت عرصے سے انھوں نے خانہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ زیادہ تر اپنے کمرے اور برآمدے میں بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں یا کبھی کوئی مذہبی کتاب یا کسی شاعر کا دیوان دیکھ لیتے ہیں پھر بھی میری وجہ سے صبح، شام

اس یکساں اور بے رنگ زندگی میں ذراسی تبدیلی ہوجاتی تھی۔ مجھ سے دن بھر کی مصروفیتوں کا حال پوچھتے، جرح کرتے، سمجھاتے بجھاتے، ڈانٹتے، ڈپٹتے۔ اب کوئی ملنے والا آگیا تو آگیا ورنہ یہ وقت بھی تنہائی میں گزرے گا۔ کاش کتب بینی کی طرف زیادہ توجہ کریں اور کچھ لکھنا شروع کردیں۔ کچھ نہیں تو خاندان کے حالات اور اپنی زندگی کے واقعات ہی سہی۔ جی چاہتا ہے اُن سے کہوں، مگر ہمت نہیں پڑتی۔ الہ آباد سے خط میں لکھ دوں گا۔"

ناشتے کے بعد میر صاحب نے جو واقعی بیٹے کی مفارقت کے غم سے مغلوب اور مضمحل ہو رہے تھے اپنے آپ کو سنبھالا اور بے تکلف اپنے پرانے انداز میں ظفر سے باتیں کرنے لگے۔

میر صاحب۔ کیوں بھئی تم نے ضرورت کی سب چیزیں رکھ لیں کچھ بھولے تو نہیں؟

ظفر۔ جی نہیں ابا جان میں نے الماری اور کمرے کا ایک ایک کونا دیکھ لیا، کوئی چیز نہیں رہی۔

میر صاحب۔ دیکھو خط جاتے ہی بھیجنا اور ہر ہفتے بھیجتے رہنا۔ میں نے اکرام اللہ کو خط لکھا تھا ان کا جواب آگیا ہے وہ اطمینان دلاتے ہیں کہ تمھارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھ کر ان کی اطاعت کرنا اور جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف کہہ دینا جس طرح یہاں تم گم صم رہتے ہو اس سے کام نہیں چلے گا سمجھے۔

ظفر۔ جی سمجھ گیا۔

میر صاحب۔ خرچ میں کفایت کرنا مگر اتنی تکلیف نہ اُٹھانا کہ تمھاری صحت پر بُرا اثر پڑے۔ خوب جی لگا کر پڑھنا۔ آوارگی میں نہ پڑ جانا۔ میری زندگی کا کچھ اعتبار نہیں تمھیں جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا بوجھ اُٹھانا ہے، اور ہاں آٹھویں دسویں اپنی پھپھی کے ہاں ضرور جانا۔ انھیں تمھاری ماں سے بڑی محبت تھی، اور تمھیں بھی اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں۔ یاد ہے نا!

ظفر۔ بہت اچھی طرح یاد ہے۔

میر صاحب۔ اور دیکھو نماز کو اور قرآن کی تلاوت کو نہ چھوڑنا۔ تمھاری یہی ایک عادت ہے جسے دیکھ کر میرا جی خوش ہوتا ہے اور جس سے یہ اُمید ہوتی ہے کہ تم زندگی میں سیدھی راہ پر چلوگے۔ اچھا اب جاکر اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب سے رخصت ہو آؤ۔ ہردیال کو تاکید کردینا کہ ٹھیک گیارہ بجے تمھیں یہاں سے لیتا ہوا اسٹیشن جائے۔ گاڑی گیارہ بج کر پینتیس منٹ پر چھوٹ جاتی ہے کچھ پہلے سے پہنچنا اچھا ہے۔

ظفر اُٹھ کر شیو دیال صاحب کے گھر کی طرف چلا جو قصبے کے شمالی سرے پر واقع تھا۔ بیچ بازار میں سے گزرنا پڑتا تھا جس سے ظفر کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ بے ڈھنگی بے تکی دکانیں، بے ترتیبی سے رکھا ہوا سامان موٹی توند یا جھکی ہوئی پیٹھ کے اور جنیئت دکان دار۔ تیلی گندی شکر کنجڑوں کے ٹوکروں کے آگے سڑے پھل اور گلی پتیاں بکھری ہوئی۔ حلوائیوں اور قصائیوں کی دکانیں مکھیوں سے پٹی ہوئی، جابجا تانگوں بیل گاڑیوں گھٹے بیلوں اور گدھوں سے راستہ رُکا ہوا۔ غرض وہ طوفانِ بے تمیزی کہ خدا کی پناہ۔ ظفر کسی خاص ضرورت کے بغیر ادھر نہیں آتا تھا اور جب آنا پڑتا تو جلدی سے خرید و فروخت سے نبٹ کر واپس جاتا۔ ہردیال سے ملنے شیو دیال صاحب کے ہاں عموماً وہ بہت پھیر کھا کر دوسرے راستے سے جایا کرتا تھا۔ کبھی عجلت کی وجہ سے ادھر سے جانا ہوتا تو جہاں تک ہو سکتا تیزی سے گزر جاتا مگر آج وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا، ایک ایک دوکان پر حسرت سے نظر ڈالتا۔ جان پہچان کے دکان داروں سے صاحب سلامت کرتا جا رہا تھا۔ وہی بازار جس سے اُسے سخت وحشت ہوا کرتی تھی آج اُس کے دل کو کھینچ رہا تھا اور اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ گرد، گندگی، بدسلیقگی اور بے ترتیبی کا مجموعہ کتنا ہی مکروہ کیوں نہ ہو اس کی اپنی ہستی کا ایک جزو ہے اور اپنے کو اس سے ایک مدت کے لئے جدا کرنا خاصا تکلیف دہ ہے۔

(باقی آئندہ)

مصر کی حکومت کا بانی

(بہ سلسلہ صفحہ ۔)

محمد علی معاہدہ کی شرطوں کو تسلیم کرلیں ورنہ وہ حکم ملتے ہی اسکندریہ کی اینٹ سے اینٹ بجاسکتے ہیں۔ اب خہاب کے سوا چارہ نہ تھا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ میدان میں تن تنہا ہیں۔ فرانس سے ان کو بڑی اُمید تھی لیکن وہ بھی اس موقعہ پر الگ ہوگیا۔ لیکن محمد علی نے ہمت نہ ہاری اور اپنے بحری بیڑے کو تیاری کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سارا بیڑہ مسلح ہوگیا اور انتظامات کرنے لگا۔

گرمی کا زمانہ ہے۔ محمد علی اپنے گرمی کے محل قصر راس التین واقع اسکندریہ میں مقیم ہیں سامنے ساحل ہے جس میں مصری بیڑہ تیار حکم کا منتظر ہے۔ اس میں ایک طرف وہ عثمانی بیڑہ بھی دکھائی دیتا ہے جس نے اپنے آپ کو محمد علی کے حوالے کردیا تھا۔ محمد علی اپنے محل سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ دیکھئے تقدیر کیا گل کھلاتی ہے کہ اتنے میں انگریزی بیڑے کے ایک جہاز میں حرکت ہوئی اور وہ سیدھا ان کے محل کے سامنے آکر رُکا اور اس میں سے بحری بیڑے کا سپہ سالار کوموڈور چارلس نائیپر نکلا اور محمد علی کے پاس پہنچا۔ محمد علی نے دیکھتے ہی کہا۔ کہئے خیر تو ہے؟ آپ یہاں کہاں؟ شاید بھول گئے کہ ہم میں اور آپ میں جنگ ہے؟ کہئے آپ بھی تو کہیں مسٹر پالمرسٹن کے فرستادہ نہیں؟

کوموڈور۔ مجھے معلوم ہے کہ حضور والا کو سارے حالات کی مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔ میں یہاں اپنی مرضی اور ارادہ سے آیا ہوں اور اسی لئے میری اس آمد کی اطلاع سوائے میرے نائب کے کسی کو نہیں۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ذاتی طور پر یہ عرض کردوں کہ ہم نے بیروت پر قبضہ کرلیا ہے اور عکہ میں اس قدر گولہ باری کی کہ وہ بھی ہمارے ہاتھ میں آگیا۔ سمندری ناکہ بندی اور جبال کے علاقے کی شورش سے گھبرا کر آپ کے فرزند ابراہیم جنوب کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور اس وقت اس عظیم الشان بحری بیڑے کے ساتھ ساحل کو گھیرے پڑا ہوں مجھے دُکھ ہو رہا ہے کہ ان ناہنجاروں اور ظالم سیاست دانوں کی خاطر مجھے اس خوب صورت اور بے مثال بندرگاہ کو تباہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے میری گذارش ہی کہ آپ شرائط کو تسلیم کرلیجئے۔ میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ اگر آپ نے شام کو خالی کردیا اور ترکی بحری بیڑہ سلطنت عثمانیہ کے حوالے کردیا تو پھر مصر پر آپ کی اور آپ کی اولاد کی حکومت ہمیشہ کے لئے تسلیم کرلی جائے گی۔

محمد علی۔ آپ کی عنایت اور صاف گوئی کا بہت بہت شکریہ، کوموڈور صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ کی بحری طاقت بہت ہے۔ مگر مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کامیابی آخر میں مجھے ہی ہوگی۔ بہرحال میں شام کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ پھر مجھے فرانس کی مدد اور اس کے وساطت پر بھی پورا بھروسہ ہے۔

کوموڈور "حضرت والا ان وعدوں وعیدوں پر نہ جائیے اس کا یقین رکھئے کہ شاہ فرانس لوئی فیلیپ محض مصر کی خاطر انگلستان سے دشمنی نہ مول لے گا۔ مجھ بوڑھے افسر کی بات مانئے اور میری درخواست قبول کیجئے۔ یاد رکھئے مصیبت کے وقت کوئی کام نہ آئے گا۔"

محمد علی۔ بہتر ہے، میں آپ کی رائے مانتا ہوں۔ لیکن اس پر عمل اس وقت تک نہ کروں گا جب تک کہ اس پر آپ کی حکومت کے دستخط نہ ہوجائیں گے (پھر اپنے وزیر باغوص کی طرف متوجہ ہوکر) آپ کو دفتر میں لے جائیے، اور معاہدۂ صلح لکھ کر اس پر میری طرف سے اپنے دستخط کردو۔ چنانچہ یہ معاہدہ لکھا گیا۔ جس کی منظوری دول یورپ نے اور باب عالی نے دے دی اور پھر جولائی سن ۱۸۴۱ء میں باب عالی سے ایک فرمان جاری ہوا جس کی رو سے مصر پر ہمیشہ کے لئے محمد علی اور ان کے بعد ان کی اولاد کی حکومت تسلیم کرلی گئی۔ اور اس طرح محمد علی نے اپنی سیاست دانی، معاملہ فہمی اور ذہانت سے مصر کو انگریزی اور خود دولت عثمانیہ کے پنجۂ اقتدار سے چھڑا کر آزاد مصری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد محمد علی آٹھ سال تک زندہ رہے۔ اگست ۱۸۴۹ء میں وہ دنیا کو رخصت ہوگئے۔ گذشتہ اگست میں ان کی وفات کو ایک سو برس ہو چکی ہے چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں مصری حکومت اور عوام نے اس مرد مجاہد، مصلح اعظم اور اپنے ملک و قوم کے محسن کی صد سالہ برسی کا بڑی دھوم دھام سے منائی۔ تعلیم گاہوں، عوامی انجمنوں اور اداروں نے اپنے اپنے اس ہیرو کی یاد میں بڑے بڑے شاندار جلسے کئے جن میں سے بعض میں خود فاروق الاول نے شرکت کی اور بعض میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اس اہم موقعہ پر مرحوم کی یاد میں ایک یونیورسٹی بھی "جامعہ محمد علی" کے نام سے اسکندریہ میں قائم کی گئی ہے۔ غرض مصر میں اس زمانے میں بڑی ہماہمی اور جوش و خروش رہا۔

نئی ذہنیت کی ضرورت

گوپی ناتھ امن لکھنوی

ہندوستان میں انگریزی حکومت ختم ہوئی نیا دور شروع ہوا، نیا آئین نافذ ہوا، اب سب سے بڑی ضرورت نئی ذہنیت کی ہے، ورنہ سب کھیل بگڑ جائے گا۔ بات تو بس اتنی ہی ہے، چند مثالوں کے ذریعے اسے واضح کرنا ہے

پہلے اس نئے جمہوریہ میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ قدرتی طور پر سرکاری ملازمتوں میں، وزارتوں یا تجارتی صیغوں میں اور سماجی زندگی کے سبھی شعبوں میں ہندو ہی زیادہ ہیں، اس لئے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی ذہنیت بدلے اگر عام ہندو مسلمانوں کو اسی نظر سے دیکھتا رہا کہ یہ وہی ہیں جنھوں نے دو ڈھائی سال پہلے تک مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور پاکستان بنوایا تو ایک مسلسل کشمکش جاری رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اب تو سب کو اسی دیس میں رہنا ہے اور مختلف مذہبوں کے مبلغ کتنا ہی زور باندھیں، مختلف مذہبوں کو بھی رہنا ہے تو پھر مل جل کر کیوں نہ رہا جائے۔ ایک دوسرے کی زندگی اجیرن کرنے سے کیا فائدہ۔

مسلمان اگر ان تمام واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کرلے جو اس ملک میں ہوئے جسے اب پاکستان کہتے ہیں اور وہاں ہندوؤں اور سکھوں پر جو کچھ بیتی اسے نظر انداز کرکے صرف مسلمانوں کا دکھڑا روئے اور ملک کی اکثریت کے خلاف دل میں خلش رکھے تو اس سے سوا کوفت کے کچھ حاصل نہ ہوگا، مسلمانوں کا بھی ستیاناس ہوگا اور ملک کا بھی، پاکستانی اخباروں کا مطالعہ جن مسلمانوں کو اس حماقت میں مبتلا کئے ہے کہ وہ لال قلعہ پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھیں، خدا ان کی حالت پر رحم کرے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

جن سکھوں نے مسلم لیگ سے سبق لے کر اپنے جداگانہ صوبے کا مطالبہ شروع کیا ہے وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پاکستان بنوانے میں تو انگریز کا ہاتھ تھا اب سکھستان یا خالصستان کس کے بل بوتے پر بنے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو دشمن سمجھ کر اپنے فرقوں کو اور ملک کو جو نقصان پہنچایا وہ ظاہر ہے۔ مگر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں فرقوں کی حماقتوں سے ان فرقوں کو زیادہ نقصان پہنچایا ملک کو البتہ سکھوں کی اقلیت ایسی ہے کہ اس کے بارے میں آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ علیحدگی کا جذبہ ملک کو جتنا نقصان پہنچائے گا اس سے زیادہ سکھوں کو۔

عیسائیوں کی تعداد بھی سکھوں سے ملتی جلتی ہے تقسیم ملک کے بعد انڈین یونین میں ان کی تعداد سکھوں سے کم رہ گئی ہے سیاسی اعتبار سے عیسائیوں کی وجہ سے ملک میں کوئی کشمکش نمایاں طور پر پیدا نہیں ہوئی لیکن سماجی طور پر جس کے بالواسطہ سیاسی نتیجے بھی تھے، عیسائیوں نے اپنا تمدن الگ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمان تو عرب تمدن کی تقلید کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ سنت نبوی کی پیروی کر رہا ہے۔ مجھے یہاں اس دلیل کی معقولیت سے بحث نہیں مگر عیسائی تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ حضرت عیسیٰ عربی نژاد تھے نہ انھوں نے کبھی کوٹ پتلون پہنا اور نہ ہیٹ لگائی، در اصل یہ عیسائیت تو نہیں ان انگریزوں یا فرنگیوں کی تقلید ہے جن کے ذریعے پچھلی صدی میں ہندوستان میں عیسائی مذہب کا پرچار ہوا۔

یہ تو مختلف فرقوں کے احساس علیحدگی یا اجنبیت کی بات ہوئی۔ اب ذرا اس پہلو پر نظر ڈالئے کہ داخلی اعتبار سے بھی فرقوں کو اپنا نظریہ بدلنے کی کتنی ضرورت ہے، نئے آئین نے چھوت چھات کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ لیکن اگر ہندوؤں کے دلوں سے چھوت چھات کا جذبہ دور نہ ہوا تو آئین کیا کرے گا۔ جب تک ہندوؤں کے سورن کہلانے والے طبقوں میں تحقیر یا تضحیک یا گالی کے طور پر چمار یا بھنگی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس وقت تک یہی سمجھنا چاہیے کہ ہم پرانی ذہنیت کے شکار ہیں۔ اس ذہنیت کے ردعمل کے لئے نئے آئین میں ذلیل فرقوں کے لئے کچھ امتیازی دفعات ہیں جب یہ ذہنیت بدل جائے گی تو اس امتیاز کی بھی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔

مسلمانوں میں اصولی طور پر باہمی امتیاز روا ہو یا نہ ہو مگر عملی صورت سے نظر آتا ہے۔ اقبال نامے میں مجھے یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ اقبال جیسا شخص بھی تشیع کے خلاف شدت کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتا تھا۔ حال میں ایک کتاب دیکھی جس میں مسلمان لڑکوں کو درس اسلامیات دیا گیا ہے۔ کتاب نظم میں ہے۔ نظم کی نوعیت جیسی کچھ ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن جہاں ان لڑکوں سے یہ کہا گیا ہے کہ تم داڑھی نہ رکھنے پر جہنم بھیج دئے جاؤ گے وہاں صرف یہی کہنا ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ہندوؤں کے ساتھ بلکہ شیعوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ حقیقت میں بعض پنڈت اور مولوی نرک یا جہنم کے دروازے بڑی فراخ دلی سے کھول دیتے ہیں۔

سکھوں میں ایک تو مذہبی سکھوں کا فرقہ قائم ہوا دوسرے بعض اوقات جاٹ اور کھتری یا اسی قسم کا اور امتیاز بھی ذہنی یا عملی طور پر روا رکھا جاتا ہے جو اصولی طور پر سکھ مذہب کے بالکل خلاف ہے۔ کچھ عرصہ پہلے سنگھ میں چنداں امتیاز نہ تھا۔ مگر اب بہت شدت سے ہے پہلے گرو کے وقت سے لے کر دسویں گرو کے وقت تک مختلف فرقے پنجاب یہ صورت ہے کہ جو سکھ نہیں اسے سنگھ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اداسی رام رائی یا گدی سہج دھاری ست نامی وغیرہ کے بارے میں برابر یہ بحث چلی آتی ہے کہ وہ سکھ ہیں یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ عیسائیوں میں ذات پات کا امتیاز اصولاً تو بالکل نہیں لیکن عملی طور پر ان میں بھی طبقے ہو گئے ہیں، میری مراد رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ وغیرہ سے نہیں بلکہ ایک اور طرف اشارہ ہے کوئی پچیس برس کی بات ہے کہ میرے چھوٹے بھائی گرسرن لال ادیب لکھنؤ میں عیسائی لڑکیوں کے ایک اسکول میں اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ بہت سے عیسائی پروفیسروں سے ان کے تعلقات تھے۔ ایک پروفیسر نے ان سے کہا کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کے لئے فکر مند ہوں، عیسائی نے کہا کہ آپ لوگوں کے یہاں تو چنداں دشواری نہیں ہے اس پروفیسر نے جواب دیا کہ میں برہمن عیسائی ہوں میں چمار عیسائی کے یہاں اپنی لڑکی بیاہنا نہیں چاہتا۔

غرضکہ خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے فرقوں کی ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ لیکن طبقوں کی ذہنیت بدلنے کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہے جب تک ادیب نواز ہستیوں کی قدر ادیبوں سے زیادہ ہے۔ جب تک شاعروں کے مقابلے میں شاعر پرور، زیادہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب تک کلام الملوک کو ملوک الکلام سمجھا جاتا ہے اس وقت تک یہ بات ظاہر ہے کہ ہم ادبی میدان میں بھی پرانی ذہنیت کے شکار ہیں اور ہمارا ادب نئے دور کی ضرورت کے مطابق پنپ نہیں سکتا۔

میں نے صرف ادب کی مثال پیش کی ہے ورنہ سماجی زندگی کے ہر شعبے میں یہی کیفیت ہے جس کی تشریح سے طول الکلام ہوتا ہے، سماج کے تمام ڈھانچے پر نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئے دور میں نئے آئین کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے کہ ہم میں صوبہ پرستی فرقہ پرستی وغیرہ کو ختم کرنے والی نئی ذہنیت پیدا ہو جو نئے تقاضوں کی طرف رخ کرکے تعمیری منصوبوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکے۔

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

نے پاکستان کے معاشی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ بھیج دی ہے عام خیال یہ ہے کہ اس رپورٹ پر غور کرنے کے بعد انٹرنیشنل فنڈ پاکستان کے سکے کی مناسب شرح مقرر کردے گا جسے ہند اور پاکستان دونوں مان لیں گے۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

اپنے منصبی فرائض کے باوجود اردو ادب سے محبت جوں کی توں رہی اور ہر ادبی تحریک کی سرپرستی اور ہمت افزائی کے لئے وہ ہمیشہ حاضر رہتے تھے

شیخ صاحب مرحوم کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی وسعت نظر اور بے پچی رواداری (بقیہ صفحہ ۲ پر)

تھی۔ اس دور میں جب بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ ان کا دامن مذہبی، صوبائی لسانی ہر قسم کے تعصب سے پاک رہا۔ ہندو مسلمان کا تعصب، پنجابی غیر پنجابی کی تفریق، اردو ہندی کا جھگڑا، وہ ان سب سے بلند تھے۔ ان کا مقصد اپنی محبوب زبان اردو کی فلاح و ترقی تھا لیکن کسی کی مخالفت اور مقابلہ کر کے نہیں بلکہ خاموشی سے علمی اور تعمیری خدمت کے ذریعے ان کی وسعت قلب کا یہ ایک بڑا روشن ثبوت ہے۔

ایسا مخلص خادم اور سچا عاشق اردو کو اب شاید ہی نصیب ہو افسوس ؎
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں (ص)

مطبوعہ ... جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

ہم کدھر جارہے ہیں	سالک ہندی	۲
بنگال کی فضا پھر بگڑی	(اداریہ)	۳
دنیا کی رفتار		
(۱) ہندوستان	ع ۰ ح	۴
(۲) باہر کی دنیا	ع ۰ ل	۴
بزم بے تکلف		۵
بت شکن (نظم)	خلیل اعظمی	۵
آزادی کی زنجیریں	ڈاکٹر سید عابد حسین	٦
یہ امریکہ ہے	محمد امین	۸
حالی ایک نقاد	سید منہاج الدین	۹

مکتبہ جامعہ دہلی

اڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر ہم کسی قوم کی تہذیب کو دوبارہ زندگی بخشنا اور اس کی تخلیقی قوتوں کو جگانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ادبی اور تاریخی روایتوں کا، اس کے پرانے ادب اور فلسفے اور آرٹ کا اور اس تمام مادی اور ذہنی ترکے کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس نے اپنے ماضی سے ورثے میں پایا ہے۔ چنانچہ جب سے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اب ہندوستان کی سیاسی غلامی کا زمانہ ختم ہونے کو آیا ہے۔ اس بات پر بجا طور سے زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں بجائے مغرب کی اندھی اور غلامانہ تقلید کرنے کے خود اپنی تہذیب کے سوتوں کو تلاش کرنا چاہیے اور انہیں سے قوت اور الہام حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ اہل علم اور اہل فکر بھی اس مقام پر پہنچ کر اپنا راستہ اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور بعض نے جان بوجھ کر اور بعض نے بے جانے بوجھے تہذیب کے میدان میں "رجعت پسندی" کی ایک ایسی تحریک شروع کر دی جو ہندوستانی تہذیب کی ارتقائی تاریخ کو بھلا کر آج کا رشتہ دو ہزار برس پرانی تہذیب سے ملانا چاہتی ہے۔

میں کچھ عرصے سے اس عنوان کے تحت کچھ نہیں لکھ سکا۔ اس کی ایک وجہ تو مصروفیت ہے اور دوسری ذہنی الجھن اور تذبذب۔ یعنی یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ "ہم" یعنی ہمارا دیس اور اس کے کروڑوں بسنے والے کس طرف جا رہے ہیں۔ جب میں راجہ جی یا پنڈت جی کے بیان اخباروں میں دیکھتا ہوں، یا "نئی روشنی" میں آپ کے ایڈیٹوریل یا "اہل علم کی آواز اور تہذیب کو کیوں کر بچائیں" جیسے مضمون پڑھتا ہوں تو میرا دل امید سے روشن ہو جاتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ ہم اس راستے پر چل رہے ہیں (یا کم سے کم چلنا چاہتے ہیں) جو شرافت، انصاف اور ترقی کا راستہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اخباروں، تقریروں، سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کے بیانوں اور پروگرام میں ایسے خیالوں اور قدروں کا بھیانک سایہ نظر آتا ہے جو ملک کو ترقی کے بجائے تنگی کی طرف لے جانے والی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ان میں سے کون سی تحریکیں گہری اور پائدار اور جنتا کی صحیح ذہنیت کی ترجمان ہیں اور کون سی محض عارضی اور سطحی اور خاص خاص گروہوں اور مفاد کی آواز ہیں۔ اصولاً تو میرا بھی آپ کی طرح اور گاندھی جی کی طرح اور دنیا کے سب ایمان والوں کی طرح یہ عقیدہ ہے کہ آخر میں جیت سچائی کی اور انصاف اور شرافت ہی کی ہوگی (اگر دنیا کا بھلا چاہنے والوں کو یہ امید نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی مایوسی کا علاج خودکشی میں تلاش کرتے!) لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس عقیدے کے سہارے مطمئن ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا نہ صرف ایک خطرناک غلطی بلکہ اخلاقی کمزوری بھی ہے۔ غلطی تو یہ ہے کہ حق کی کامیابی خود بخود نہیں ہو جاتی۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے دنیا میں کوئی بات بھی اچھی ہو یا بری۔ افراد کی کوشش اور ان کی دانش مندی یا حماقت کے بغیر نہیں ہوتی۔ قدرت اپنے مقصدوں کو پورا کرنے کے لئے آلہ کار تلاش کرتی ہے اور یہ تاریخ یا معاشیات کی مجرد تحریکیں نہیں ہوتیں بلکہ افراد اور جماعتیں ہوتی ہیں اس لیے یہ سمجھ لینا کہ بغیر ہماری جد و جہد کے حق کی قوتیں کامیاب ہوں گی۔ دراصل نادانستہ طور پر ناحق کی قوتوں کو مدد دینا ہے۔ ایسا سمجھنا اخلاقی کمزوری اس وجہ سے ہے کہ اگر ہم نے باطل کے مورچے کو فتح کرنے میں کوئی کام نہیں کیا۔ اگر حق اور انصاف کی کامیابی میں ہمارا اپنا ہاتھ نہ ہو بلکہ ان کی جیت دوسروں کی کوشش کی بدولت ہو تو ہم نے اپنا انسانی فرض پورا نہیں کیا۔ حق اور باطل کی اس جنگ میں جو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور صورتیں اور انداز بدل بدل کر ہمیشہ ہوتی رہے گی، اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہو کر حق کی حمایت کرنا انسان کا سب سے بڑا شرف ہے۔ جو شخص اپنی بزدلی یا فوری اور ذاتی فائدے کی وجہ سے اس سے پہلو بچاتا ہے وہ اپنے اصلی مقام سے بہت نیچے گر جاتا ہے .... اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جب کبھی ہم اپنی جماعت یا اپنی قوم یا دنیا کی حالت کا جائزہ لیں تو نہ صرف اس کے روشن پہلوؤں کو دیکھیں بلکہ اس میں جو تاریک اور خطرناک تحریکیں کام کر رہی ہیں ان کو بھی نظر میں رکھیں، ان کی قوت اور اثر کا ٹھیک اندازہ کریں اور سوچیں کہ دیس کو ان سے کس طرح نجات دلائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کام میں ایک خاص مشکل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسی تمام تحریکیں بنیادی طور پر غلط ہوں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی ابتدا کسی مناسب اور معقول جذبے سے ہوتی ہے لیکن حالات یا غلط رہبری کے اثر سے وہ اعتدال کی حد سے نکل جاتی ہیں اور ان میں ایک ایسا غلو اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو بے وقوفوں کی نظر میں تو زیادہ مقبول بنا دیتا ہے لیکن وہ قوم اور ملک کے عام مفاد کی دشمن بن جاتی ہیں۔ ممکن ہے یہ بحث آپ کو محض "نظری" معلوم ہو۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ چند مثالیں دے کر اس کی تشریح کی جائے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر ہم کسی قوم کی تہذیب کو دوبارہ زندگی بخشنا اور اس کی تخلیقی قوتوں کو جگانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی تہذیبی اور تاریخی روایتوں کا، اس کے پرانے ادب اور فلسفے اور آرٹ کا، اس تمام مادی اور ذہنی ترکے کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس نے اپنے ماضی سے ورثے میں پایا ہے۔ چنانچہ جب سے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اب ہندوستان کی سیاسی غلامی کا زمانہ ختم ہونے کو آیا ہے۔ اس بات پر بجا طور سے زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں بجائے مغرب کی اندھی اور غلامانہ تقلید کرنے کے خود اپنی تہذیب کے سوتوں کو تلاش کرنا چاہیے اور انہیں سے قوت اور الہام حاصل کرنا چاہیے، لیکن ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ اہل علم اور اہل فکر بھی اس مقام پر پہنچ کر اپنا راستہ اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور بعض نے جان بوجھ کر اور بعض نے بے جانے بوجھے تہذیب کے میدان میں "رجعت پسندی" کی ایک ایسی تحریک شروع کر دی جو ہندوستانی تہذیب کی ارتقائی تاریخ کو بھلا کر آج کا رشتہ دو ہزار برس پہلے کی تہذیب سے ملانا چاہتی ہے۔ اور بیچ کی جو نسلیں ہیں اور دوسری نسلوں اور مذہبوں اور جماعتوں اور گروہوں نے جو دولت اس کو بخشی ہے اس کو نظر انداز کر کے ان قدیم بنیادوں پر بیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب کی عمارت کھڑی کرنا چاہتی ہے کبھی اس ذہنیت کا مظاہرہ قومی زبان کی اس ناعاقبت اندیشانہ تحریک میں نظر آتا ہے جس کا مقصد ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس میں سے ان عناصر کو نکال دیا جائے جو سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانوں سے آئے ہیں۔ بلکہ لفظوں کی موجودہ صورت اور تلفظ تک کو چھوڑ کر وہ صورت اختیار کی جائے جو اب سے سینکڑوں برس پہلے رائج تھی لیکن زبان کی ترقی کے اٹل قاعدوں کی بدولت بدل چکی ہے کبھی سماجی اور سیاسی تاریخ کی ایک غلط تفسیر کا روپ اختیار کرتی ہے کبھی ادب کی تاریخ کو مسخ کر کے اس حقیقت سے انکار کرتی ہے کہ (مثلاً) اردو ادب کے بنانے میں ہندوؤں کا اور ہندی ادب کے سنوارنے میں مسلمانوں کا کافی بڑا حصہ ہے۔ کبھی وہ علم کے میدان میں تنگ نظری کہلاتا ہے۔ کبھی مذہب کے میدان میں تعصب۔ اس قسم کی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

جلد ۲	یکم مارچ سنہ ۵۰ء	نمبر ۹

بنگال کی فضا پھر بگڑی

کلکتے اور ڈھاکے میں فساد کی آگ بجھ چکی ہے مگر دھواں ابھی اٹھ رہا ہے۔ خوف و ہراس کی وجہ سے لوگوں کے اُدھر سے اِدھر آنے اور اِدھر سے اُدھر جانے کا سلسلہ زیادہ تر ہوائی جہاز کے ذریعے جاری ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی بنگال سے آنے والوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکے کے شدید ہنگامے کے بعد اب مضافات میں جابجا فساد ہو رہا ہے اور اقلیت میں بے حد خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ان چیزوں سے مغربی بنگال میں سخت بے چینی ہے اس کا اثر ہمارے ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ دہلی میں پارلیمنٹ کے اندر اس غم و غصے کی جھلک نظر آ رہی ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ لوگ حکومت سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ایک تو مشرقی بنگال کے صحیح حالات معلوم کرنے کا انتظام کرے دوسرے وہاں اقلیت کی حفاظت کے لئے مؤثر قدم اٹھائے۔ ۲۳ فروری کو وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں جو بیان دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پاکستان کی حکومت کے سامنے تجویز پیش کی تھی کہ دونوں بنگالوں کی صحیح صورت حال معلوم کرنے اور امن و سکون کی فضا پیدا کرنے کے لئے تین تدبیریں اختیار کی جائیں، ایک یہ کہ پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر مغربی بنگال کا دورہ کرے، دوسرے یہ کہ دونوں حکومتوں کا ایک مشترکہ کمیشن سارے بنگال میں گشت کرے، تیسرے یہ کہ پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں ساتھ ساتھ کلکتہ ڈھاکہ اور دوسرے مقامات پر جا کر لوگوں کو اطمینان دلائیں اور امن اور یک جہتی کی اپیل کریں۔ وزیر اعظم پاکستان نے تجویز کے صرف ایک جز کو منظور کیا کہ دونوں طرف کے ڈپٹی ہائی کمشنر حالات کا جائزہ لینے کے لئے دورہ کریں۔ اس پر بھی مشرقی پاکستان کی حکومت نے ہندوستانی ہائی کمشنر کے دورے کا فوری انتظام نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مہلت مانگی۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت کا یہ رویہ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نہایت ناقابلِ اطمینان ہے۔ اب پنڈت جی نے ایک نئی تجویز پیش کی ہے کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے لوگوں کو دونوں حکومتیں پوری سہولت دیں تاکہ وہ فساد زدہ علاقے میں جا کر صورت حال کا مطالعہ کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے حکومت پاکستان کو تنبیہ کیا ہے کہ اگر اس نے اپنے ہاں کی اقلیت کے جان و مال کے تحفظ کا جلد سے جلد معقول انتظام نہ کیا تو اس کا نتیجہ نہایت برا ہوگا۔ انھوں نے اس بات کو صاف کر دیا کہ آبادی کا تبادلہ جس طرح پنجاب میں ہوا تھا بنگال میں ناقابلِ عمل ہے۔ حکومت ہند پاکستان کی حکومت کو اقلیت کے بارے میں اس کے فرض کا احساس دلانے کے لئے سارے آئینی اور اخلاقی وسائل سے کام لے گی اور اگر ان سے کامیابی حاصل نہ ہوئی تو پھر مجبوراً دوسرے ذریعے اختیار کرے گی۔"

ہم پاکستان کی حکومت سے مذہب، اخلاق، انصاف اور مصلحت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ مشرقی بنگال میں فسادات کو کچلنے، مفسدوں کو سختی سے سزا دینے، اقلیت کے جان و مال کو محفوظ رکھنے، اور اس کے خوف و ہراس کو دور کرنے کے لئے فوری اور مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ ہم اسے اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بعض اندرونی اور بیرونی قوتیں ہند اور پاکستان میں جنگ کرانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں مگر دونوں ملکوں کے صلح پسند اپنی چوٹی کا زور لگا کر انھیں روک رہے ہیں۔ پنڈت نہرو کی تقریر سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی بنگال کے فسادات نے ہندوستان کے صلح پسندوں کے کام کو بہت مشکل کر دیا ہے۔ اب ان پاکستانیوں کے امتحان کا وقت ہے جو صلح اور امن کے علمبردار ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ ہمت اور صاف گوئی سے کام لے کر پاکستان کی حکومت اور رائے عامہ پر اچھی طرح جتا دینا چاہیے کہ مشرقی بنگال کی موجودہ صورت حال صلح و امن کے لئے برق خرمن سے کم نہیں۔ یہ سن کر خوشی ہوتی ہے کہ مشرقی بنگال کے وزیر اعظم نور الامین صاحب اور فضل الحق صاحب جن کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ سر فریڈرک بورن کی جگہ گورنر ہونے والے ہیں۔ مشرقی بنگال کی مسموم فضا کو صاف کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کی مرکزی حکومت کی بے پروائی اور سہل انگاری نہایت افسوس ناک ہے۔ اگر اسے حالات کی نزاکت کا اور اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہوتا تو لیاقت علی خاں صاحب پنڈت نہرو کے ساتھ مل کر امن کی مہم شروع کرنے سے انکار نہ کرتے۔ پاکستان کے اخبار یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ مارچ کے شروع میں شاہ ایران پاکستان آنے والے ہیں اس لئے لیاقت علی خاں صاحب کی اس وقت کراچی میں موجودگی ضروری ہے۔ اگر اسے مان بھی لیا جائے تو خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کو جن کا مشرقی پاکستان کے لوگوں پر سب سے زیادہ اثر ہے چند روز کے لئے وہاں جا کر بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور جو وہ بھی شاہ ایران کی وجہ سے کراچی سے نہ ل سکتے ہوں تو شاہ کی آمد کا پروگرام یقیناً ملتوی کر دینا چاہیے۔ آخر پاکستان کے معزز مہمان مشرقی بنگال بھی تو جا رہے ہیں۔ اگر وہاں یہی حالت رہی جواب ہے تو مشرقی بنگال کی حکومت کس منہ سے انھیں بلائے گی اور وہ وہاں جا کر کیا خوش ہوں گے۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے مشرقی بنگال کے فسادات انتہائی غم و غصے شرم و ذلت اور فکر و پریشانی کا باعث ہیں۔ غم و غصہ انسانی ہمدردی کی وجہ سے ہے۔ اس خیال سے دل کڑھتا ہے کہ تعصب، جہالت، وحشت اور لالچ سے اندھے ہو کر اکثریت کے کچھ افراد اقلیت کے لوگوں پر جو بعض کی طرح انسان ہیں، اُن کے ہم وطن اور بھائی ہیں زیادتی کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پنجاب کے فسادات بھی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے سے کم نہ تھے۔ مگر اس وقت تقسیم اور انقلاب حکومت کی وجہ سے ایسی بدحواسی اور گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی کہ لوگوں کے دماغی توازن بگڑ جانے کا کچھ تھوڑا سا عذر ہو سکتا تھا۔ آج کل تو یہ عذر بھی نہیں ہے۔ شرم و ذلت کا احساس ہندوستانی مسلمانوں کو اس لئے ہے کہ وہ ننگ انسانیت جنھوں نے مشرقی بنگال کے امن میں خلل ڈالا ہے، مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فتنہ پردازوں اور مفسدوں کا کوئی مذہب نہیں، پھر بھی اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے نام لیوا ایسی حرکتیں کرتے ہیں تو دنیا بھر میں اس مذہب کے لوگوں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اب رہی فکر اور پریشانی تو ہر چند سارے اخلاقی اور عقلی دلائل اس کے حق میں ہیں کہ پاکستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا اثر ہندوستان پر نہیں پڑنا چاہیے اور ہندوستانی حکومت کے علاوہ ہر فرقے کے انصاف پسند اور معقول پسند لوگ ان دلائل سے کام لے کر لوگوں کو صبر و سکون کی تلقین کر رہے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ مشرقی بنگال کے واقعات کا اثر کم و بیش ہر جگہ پڑ رہا ہے اور کشیدگی کی ایک عام کیفیت پیدا ہو رہی ہے جس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہاں کے فتنہ انگیز عناصر موقعے کی تاک میں ہیں۔ اس لئے فرض، جذبات، تحمل اور مصلحت کے تقاضے سے عام طور پر مسلمان اخبارات، انجمنیں اور اشخاص مشرقی بنگال کے فسادات پر اظہار افسوس اور اظہار ملامت کر رہے ہیں اور پاکستان کی حکومت سے مذہب، اخلاق، شرافت اور انسانیت کے نام پر اپیل کر رہے ہیں کہ فسادات کو روکنے، امن قائم کرنے اور اقلیت کے خوف و ہراس کو دور کرنے کے لئے جلد سے جلد مناسب تدبیریں اختیار کرے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہندوستانی مسلمان عام تقریروں اور تحریروں اور نجی خطوط کے ذریعے سے پاکستان کی حکومت اور رائے عامہ کو اپنے ان خیالات اور جذبات سے مطلع کرتے رہیں اس لئے کہ پاکستان کے اخبار یہاں کی صورت حال کا بہت غلط اندازہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسٹیسمین بھی جس کی رائے ہند اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں عام طور پر متوازن اور کبھی کبھی پاکستان کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے اپنے ۲۳ فروری کے ایڈیٹوریل میں لکھتا ہے کہ پاکستان کے بعض اخباروں نے کلکتے کے ہنگامے کے بارے میں نہایت مبالغہ آمیز خبریں اور بیانات شائع کیے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی خبریں آگ پر تیل چھڑکنے کا کام دیتی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ پاکستان کے اخبارات اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے پوری احتیاط سے کام لیں گے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

شرت چندر بوس کی وفات

بنگال کے نامور لیڈر اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کے حقیقی بھائی شری شرت چندر بوس جو ایک مدت سے قلب کی بیماری میں مبتلا تھے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ گرچہ سیاست میں ان کا راستہ سب سے الگ تھا اور ان کے پیروؤں کی تعداد بہت محدود تھی لیکن ان کی حب وطنی خلوص اور ان قابل قدر خدمات کی وجہ سے جو انھوں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں انجام دی تھیں سارا ملک دل سے ان کی عزت کرتا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فرقہ وارانہ تعصب سے پاک تھے اور اس پُر آشوب زمانے میں جب بڑے بڑے لوگ فرقہ پرستی کے سیلاب میں بہہ گئے شرت بوس چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اُن کی زندگی کے آخری چند روز کلکتے میں فساد کی آگ بجھانے اور امن قائم کرنے کے مبارک کام میں گذرے چنانچہ مرنے سے آدھ گھنٹے پہلے تک جب انھیں قلب کا دورہ پڑا وہ اپنے اخبار کے لئے اداریہ لکھوانے میں مصروف تھے نہ صرف بنگال میں بلکہ سارے ہندوستان میں ان کا ماتم اس شان سے ہوا جیسے قوم کے ایک سچے خادم کا ہونا چاہیے تھا۔ سیکڑوں لیڈروں نے جن میں سے اکثر ان کے سیاسی حریف تھے کھلے دل سے ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور ان کی روح کے آگے خراج عقیدت پیش کیا۔

آئندہ مردم شماری

۲۳ فروری کو نئی دہلی میں سردار پٹیل نے مردم شماری کے نگرانوں کی کانفرنس کا افتتاح کیا، انھوں نے اپنے ایڈریس میں اس پر زور دیا کہ آئندہ مردم شماری جو ۱۹۵۱ء کے شروع میں ہونے والی ہے کئی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے ایک تو پارلیمنٹ اور ریاستوں کی اسمبلیوں کے حلقہ ہائے انتخاب اسی مردم شماری کی بنیاد پر بنائے جائیں گے۔ دوسرے اس میں ذات اور گوت وغیرہ کی تفصیلات کے بجائے جن کی جمہوری ہند کو کوئی ضرورت نہیں ہے ایسی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے لوگوں کی عمرانی اور معاشی حالات کا صحیح اندازہ ہوسکے اور اس کے مطابق سماجی اصلاح اور معاشی ترقی کی اسکیمیں بنائی جاسکیں۔ سردار نے یہ بھی بتایا کہ اب مردم شماری پہلے کی طرح محض ہنگامی چیز نہیں ہوگی بلکہ نئے ایکٹ کے مطابق جو پچھلے سال پاس ہوا ہے مردم شماری کا ایک پورا مستقل محکمہ رہا کرے گا جس کے ذریعے سے مردم شماری اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہر قسم کی تازہ ترین معلومات حاصل ہوسکے گی۔

سردار کے ایڈریس کو پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری قومی حکومت مردم شماری کی علمی اور عملی قدر و قیمت کا پورا احساس رکھتی ہے اور اس سے وہ فائدے اٹھانا چاہتی ہے جو دنیا کے مہذب ملکوں میں اٹھائے جاتے ہیں۔

فتح مبارک

ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے پانچویں ٹسٹ میچ میں جو مدراس میں ہوا تھا کامن ویلتھ کی ٹیم کو تین وکٹ سے ہرا دیا۔ چونکہ اس سے پہلے دونوں ٹیمیں ایک ایک میچ جیت چکی تھیں اور دو میں برابر رہی تھیں اس لئے آخری میچ کے نتیجے سے یہ فیصلہ ہوگیا کہ پورے ربر میں مجموعی طور پر بھارت کی ٹیم کامیاب رہی۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے کھیل کو محض تفریح سمجھتے ہیں، لیکن ارباب نظر کے نزدیک بہت سے کھیل خصوصاً کرکٹ اخلاقی تربیت کے عمدہ ذریعے سمجھے جاتے ہیں۔ کرکٹ کے کھلاڑی پھرتی، چستی جفاکشی اور ٹیم ورک (یعنی مل کر کام کرنے) کے علاوہ جو سب کھیلوں میں یکساں ضروری ہیں اور کھیلوں سے کہیں زیادہ صبر و استقلال سے کام لینا پڑتا ہے اس لئے کہ اس کا سلسلہ کئی روز جاری رہتا ہے اور اس میں نشیب و فراز اور اتفاقی حادثے زیادہ ہوتے ہیں اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستانی ہاکی جیسے کھیلوں کے لئے تو موزوں ہیں جن میں تھوڑی دیر کے جوش، محنت، مستعدی اور دم کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کرکٹ جیسے صبر آزما کھیل میں ان کا معیار کچھ اونچا نہیں ہے یہ آزادی کی برکت سمجھئے کہ صرف پچھلے دو سال سے ہندوستانی کرکٹ کا معیار بڑھ رہا ہے اور وہ ان ملکوں سے ٹکر لے سکتا ہے جن میں اس کا رواج صدیوں سے چلا آیا ہے۔

باہر کی دنیا

امریکہ روس سے سمجھوتہ کرے

ادھر مسٹر چرچل نے اپنی انتخابی تقریروں میں دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لئے پریسیڈنٹ ٹرومین کو مشورہ دیا ہے کہ وہ موسیو اسٹالن سے اختلافی مسائل پر گفتگو کریں دوسری طرف مسٹر ہیرلڈ اسٹیسن نے بھی جو امریکی صدارت کے لئے پچھلے انتخاب میں ریپبلیکن پارٹی کی طرف سے امیدوار تھے روسی لیڈروں سے مل کر ایشیا اور ہائیڈروجن بم پر سمجھوتہ کرنے پر زور دیا ہے۔ مگر پریسیڈنٹ ٹرومین کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں روس سے گفتگو کرنے سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلے گا۔ انھوں نے اپنے پچھلے وعدے کو دہرایا ہے کہ جس وقت مناسب وقت آئے گا وہ چیف جسٹس ونسن کو گفتگو کے لئے ماسکو بھیجیں گے۔ انھوں نے امریکی بیرونی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ "امریکہ دنیا کا امن بحال رکھنے کے لئے ہر ملک سے ہر اسکیم پر گفتگو کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے" مگر ظاہر ہے کہ امن چاہنے والے مسٹر ٹرومین کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ اگر وہ امن کی اسکیموں پر گفتگو کرنے پر تیار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کے لئے پہل نہ کریں اور وہ کسی "مناسب وقت" کا انتظار کریں ممکن ہے کہ مسٹر ایچیسن کے خیال کے مطابق اس وقت روس سے گفتگو کرنے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے۔ لیکن اگر خلوص اور دیانتداری سے کوشش کی جائے، تو ایک طرف اعصابی جنگ میں خاصی کمی ہوجائے گی جس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف امریکہ کو دنیا کی رائے عامہ کی حمایت حاصل ہوگی، جو اس وقت حاصل نہیں ہے۔

برطانیہ کے انتخابات

برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں ۶۲۵ میں سے ۶۱۴ نشستوں کا نتیجہ معلوم ہوچکا ہے۔ لیبر پارٹی کے ۳۱۴ کنزرویٹو پارٹی کے ۲۹۵ لبرل پارٹی کے ۸ اور دوسری پارٹیوں کے ۲ ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ ۱۱ نشستوں کا نتیجہ ابھی باقی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اب تک لیبر دوسری پارٹیوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں صرف ۹ کی اکثریت رکھتی ہے اور غالباً باقی نشستوں کا نتیجہ معلوم ہونے کے بعد یہ اکثریت اور گھٹ جائے۔ بہرحال دستور کے مطابق لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر ایٹلی سے وزارت بنانے کو کہا جائے گا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ مسٹر ایٹلی اتنی کم اکثریت کے ساتھ وزارت بنانے پر راضی نہیں ہوں گے بلکہ دوبارہ انتخابات کرائیں گے مگر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ایک بار وزارت بنا کر اس کو کامیابی سے چلانے کی کوشش کریں گے لبرل پارٹی سے کولیشن ہوگیا جس کا امکان کم ہے، تو وزارت خاصی پائدار ہوجائے گی ورنہ ڈانواں ڈول رہے گی اور آئندہ پانچ سال میں ہر وقت اس کے ٹوٹنے اور نئے انتخابات ہونے کا امکان رہے گا۔

مغربی جاوا سنبھل گیا

انڈونیشیا کی نئی حکومت ابھی پوری طرح سنبھلی بھی نہیں تھی کہ سابق ڈچ کمانڈر ویسٹرلنگ نے اچانک حملہ کردیا اور بعض مقامات پر قبضہ کرلیا مگر جمہوری حکومت کو رائے عامہ کی پوری تائید حاصل ہے اس لئے ملک کے امن و امان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا اور مقبوضہ جگہوں پر بھی چند ہی دنوں میں دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ مغربی جاوا کے حالات البتہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ ویسٹرلنگ کے پروپگنڈے کا وہاں خاص طور پر بہت اثر ہوا تھا اور ڈچ فوج کے بہت سے فوجی افسر بغاوت میں شریک ہوگئے تھے، دارالاسلام کی تحریک بھی وہاں زوروں پر تھی کمیونسٹ بھی بعض مقامات پر چھائے ہوئے تھے مگر تازہ اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہاں کے حالات بھی اطمینان بخش ہیں اور انڈونیشی فوج کو اپنے پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی گڑبڑ کو دبانے میں کامیاب ہوجائے گی۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ کرنل ویسٹرلنگ مایوس ہوکر ملک چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے اور اس کے ساتھی دارالاسلام کی تحریک میں شامل ہوگئے ہیں۔

(ع، ل)

بزم بے تکلف

"سنا آپ نے میر صاحب۔ اس ستم ظریفی کو دیکھیے گا۔ اقوام متحدہ کے غذائی اور زراعتی ادارے کی کانفرنس کے لئے لکھنؤ جیسا شہر تجویز کیا گیا!"

"ٹھہریے گا حضرت۔ یہ لکھنؤ جیسا کیا معنی۔ آپ دہلی کی بولی کب سے بولنے لگے ہم اہل زبان ایسے موقع پر جیسا نہیں بلکہ ایسا کہتے ہیں۔"

"ذرا زبان روک کے قبلہ! ہمیں بھی آپ نے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے۔ بھلا ہم جیسے کی جگہ ایسا کیسے کہہ دیں جیسا عمر بھر کہتا آئے ہیں ویسا ہی کہیں گے۔"

"سچ ہے جیسے کو تیسا۔ اب سے کان پکڑلیے کہ زبان کے معاملے میں اہل یا نا اہل کسی سے نہیں الجھیں گے۔ مگر یہ تو بتلائیے یہ کھیت کھلیان کی کانفرنس جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں ہے کیا چیز؟ اور اگر ہمارے شہر میں ہو رہی ہے تو اس میں ستم ظریفی کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میر صاحب لڑائی کے بعد دنیا میں غذا کا ہوا توڑا اور لوگ کرنے لگے فاقے۔ یاران طریقت کو جو شہر کے اندیشے میں دُبلے ہیں یہ فکر پیدا ہوئی کہ بھئی یہ تو ٹھیک نہیں، اگر خلقت فاقوں مر گئی تو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کس پر آزمائے جائیں گے۔ مگر اب کریں تو کیا کریں؟ غذا کی پیداوار تو بڑھتے بڑھتے بڑھے گی تب تک بھوکوں کا پیٹ کیسے بھرے؟ مگر کیا کہنا ہے سیاست والوں کے دماغ کا۔ آخر ایسی تدبیر ڈھونڈ نکالی کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ انھوں نے سوچا

جانور فربہ شود از نائے و نوش آدمی فربہ شود از راہ گوش

جب تک لوگوں کو روٹی کی کمی ہے روٹی کے بارے میں لیکچر پلائے جائیں۔ چنانچہ یہ میٹی جسے آپ نے کھیت کھلیان کانفرنس کہا استھاپت کر ڈالی اب اس کی بیٹھک باری باری سے ہر دیس میں ہوتی رہتی ہے اور بیٹھک باز لفظوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیتے ہیں جن سے لوگوں کا پیٹ ناک تک بھر جاتا ہے۔"

"اچھا صاحب یہ تو سمجھ گئے مگر وہ ستم ظریفی والی بات رہ گئی۔"

"ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ دیر ہضم کانفرنس جسے مویشی وغیرہ کی نمائش نے اور بھی ثقیل بنا دیا ہے لکھنؤ جیسے (یا ایسے ویسے) شہر میں ہو رہی ہے جس کا ہاضمہ اتنا نازک ہے کہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں پچتی۔ بس ہوا پھانکتا ہے اور حقہ پیتا ہے۔ یہ ذکر ہم نے اس لئے چھیڑا کہ آج ہم بھی ادھر جا نکلے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مقرروں کی تقریریں جو سنیں تو بس کچھ نہ پوچھیے کہ کیا حال ہوا۔ پیٹ میں نفخ، سینے میں جلن، آنتوں میں قراقر، کھٹی ڈکاریں۔ ہم نے اپنے دل میں کہا جب ہم دیہاتیوں کی یہ کیفیت ہے تو شہر والوں پر کیا گذرے گی۔ مگر خدا بھلا کرے اس مدری ڈاکٹر کا، ایسا مسہل دیا کہ ساری کسر نکل گئی جی باغ باغ ہو گیا۔"

"وہ کیا شے تھی حضرت۔ ہمیں بھی اس کا نسخہ بتا دیجیے۔"

"کیا بتاؤں قبلہ، اس نے اس ذوق شوق سے عشق کا ترانہ چھیڑا کہ خشک اور بے رنگ مجلس کا رنگ ہی بدل دیا۔ پہلے اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور پھر کہنا شروع کیا

سرگذشت بلا کشاں نہ سنو۔ نہ سنو میری داستاں نہ سنو

حضرات میں کس زبان سے اپنا درد دل آپ کو سناؤں اور آپ کس دل سے سنیں گے۔ آنے کو تو میں آ گیا مگر اس نازنیں کی یاد جسے وہاں چھوڑ کر آیا ہوں دم بھر چین نہیں لینے دیتی۔ آہ وہ اس کا گداز بدن، وہ لقرئی جلد، وہ چوڑا ماتھا۔ وہ بڑی بڑی معصوم آنکھیں اور

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

وہ حسین نہ سہی مگر اس کی اٹھتی جوانی، اس کی بھولی ادائیں اس کی الھڑ چال اس غضب کی کشش رکھتی ہے کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ ہائے میری امینہ میری روح کی راحت۔ میرے دل کا چین۔

حضرات، بس میں اس کی ایک صفت اور بیان کروں گا جسے سن کر آپ کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔ وہ ہر فصل میں کوئی سو من دودھ دیتی ہے اور کیسا گاڑھا اور چکنا دودھ کہ بغیر متھانی کے انگلیوں سے مکھن نکال لو۔

(بقیہ صفحہ پر)

بُت شکن

خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ کون آج مرے غم کدے میں آیا ہے؟

اُبھر رہی ہے دھندلکے سے اک حسیں تصویر
کہ جیسے پھر کوئی مجھ کو پکارتا جائے
خزاں سے مانگ کے جیسے چمن کی رعنائی
کوئی اُداس دلوں کو سنوارتا جائے

مری نگاہ نے دیکھا ہے یہ بھی اک انداز
تمہارے بغیر تھے برباد یہ صنم خانے
ترے بغیر یہ دُنیا تباہ ہوتی تھی
تری ہی یاد میں آنسو بہائے جاتے تھے
ترے لئے ہی تو ہونٹوں پہ آہ ہوتی تھی

مگر جو ختم ہوا ہے کبھی یہ دورِ فراق
تو میں نے خود تری بزمِ وفا سے اُکتا کر
جلا کے رکھ دیا ہے اپنے آشیانوں کو
مٹا کے رکھ دیے ہیں وہ نقوشِ دلداری
زمینِ عشق کی بے کیفیوں سے پیار کیا
بھلا دیا ہے محبت کے آسمانوں کو

مگر یہ ترکِ رہ و رسم راس آ نہ سکی
فضائے دہر میں تنہائیوں کے یہ نغمے
مرے دھڑکتے ہوئے دل کو دے سکے نہ سکوں
کچھ اور بڑھ گیا میری نگاہ کا یہ جنوں
خلا میں جا کے یہ چمکے تو خاک کے ذرّے
جہانِ عشق کا لیکن غبار بن نہ سکے
حریفِ نغمۂ فصلِ بہار بن نہ سکے

پھر آج جاگ رہی ہے یہ جیسے دل کی تھکن
پھر آج جیسے تڑپ سی ہے ان جبینوں میں
پھر آج جیسے اُبھرتے ہیں وہ صنم خانے
پھر آج رند کی توبہ کا اعتبار آیا
پھر آج جامِ شکستہ سے اک صدا آئی
وہ مسکراتا ہوا موسمِ بہار آیا
چلو کہ چل کے اسی بزم کو سجانا ہے
ہے سر جھکانا اسی "بے وفا" کی چوکھٹ پر
انھیں حسینوں سے پھر آج دل لگانا ہے
فضائے عشق کی ویرانیوں میں مٹ مٹ کر
پھر اپنی کھوئی ہوئی وسعتوں کو پانا ہے

آزادی کی زنجیریں

ظفر میر مظفر حسن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ماں کا انتقال ہو گیا اور والد کے ساتھ اپنے وطن دریا پور میں رہتا ہے اسی سال اس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ اس کے والد پہلے تو اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے اسے کالج میں پڑھانے پر تیار نہیں تھے لیکن ظفر کے نانا اور ہمدرد ہیڈ ماسٹر شیو دیال کے سمجھانے اور یہ بتانے پر کہ تھوڑا سا وظیفہ بھی مل جائے گا وہ الٰہ آباد کالج بھیجنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ظفر بہت خوش ہے اور مستقبل کے رنگین خیالات میں غرق۔ مگر جب جانے کے دن قریب آتے ہیں تو اسے باپ کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ اپنی جان مال کی یاد، باپ کی جدائی وطن کی تنہائی سے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ آخر روانگی کا دن آ جاتا ہے والد اسے بہت کچھ نصیحت وغیرہ کرتے ہیں اور ظفر شیو دیال صاحب سے رخصت ہونے کے لئے جاتا ہے

(قسط ۹)

شیو دیال صاحب دھوتی باندھے کرتا پہنے اپنی بیٹھک میں تخت پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک ڈیسک پر لڑکوں کی کاپیوں کا ڈھیر تھا۔ ظفر جانتا تھا کہ یہ ریاضی کی اور انگریزی گرامر کی کاپیاں ہوں گی اس لئے کہ ماسٹر صاحب صرف یہی مضامین اپنی درجہ میں پڑھاتے تھے اور ان کے ذریعے سے لڑکوں کے خیال کو اس طرح منضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ گاڑی میں جتے ہوئے بیل کی طرح منطق کی لکیر پر سیدھا چلا چلے۔ ادھر ادھر نہ بھٹکے اور نہ ادھر ادھر سے ہرے بھرے کھیتوں پر منہ مارے۔ ظفر نے بیٹھک میں قدم رکھا تو قبل اس کے کہ وہ سلام کرے، ماسٹر صاحب نے کاپی پر جھکا ہوا سر اٹھائے بغیر گرمجوشی کے لہجے میں کہا "آئیے آئیے میر صاحب، تشریف رکھئے۔ (بلند آواز میں) ہردیال ادھر آؤ، دیکھو ظفر آئے ہیں" تھوڑی دیر میں ہردیال آیا ماسٹر صاحب نے کاپی کی جانچ ختم کر لی اور اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ عینک کو ماتھے پر چڑھا کر انھوں نے ظفر کی طرف دیکھا "کہو بھئی سفر کی تیاری ہو گئی؟"

ظفر - جی اسباب تو کئی دن سے تیار تھا۔ آج صرف بستر باندھنا تھا، اور چھوٹی موٹی چیزیں کہنی تھیں وہ رکھ لیں۔

ماسٹر صاحب - تم ہی اچھے رہے۔ یہ تمہارے دوست تو اتنے دن سیر سپاٹے، ہنسی دل لگی میں رہے اب کل رات سے سامان کے ٹھیک کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔

ہردیال - پتا جی میں ان کی طرح اونگھ اونگھ کر تو کام کرتا نہیں کہ ہفتوں پہلے سے شروع کرنے کی ضرورت ہو۔ کل رات دس بجے سے دو بجے تک سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا، بس کتابیں رہ گئی تھیں وہ اب رکھ لیں۔

ظفر - ارے تو اس سے کسے انکار ہے کہ تم بڑی پھرتی سے کام کرتے ہو۔ جلدی کام ہردیال کا، مثل مشہور ہے۔

ماسٹر صاحب - (ہنس کر) شاباش میاں ہردیال کو معلم الملکوت خوب بنایا۔ اچھا ہوا ظفر تم خود ادھر آ گئے ورنہ تم کو رخصت کرنے تمہارے گھر پر آنا پڑتا اور کام آج بہت ہے۔

ظفر - آپ کسی وقت والد صاحب کے پاس ہو آئیں میرے جانے سے بہت اداس ہیں اور یوں بھی اب تنہائی سے پریشان رہیں گے۔ آپ کبھی کبھی تشریف لے جاتے رہیں اور انھیں اپنے ہاں بلاتے رہیں تو بہت مناسب ہے۔

ماسٹر صاحب - ضرور ضرور۔ مگر وہ تو اب کچھ عجیب مزاج ہو گئے ہیں۔ خیر تم اطمینان رکھو میں ان کی خبر لیتا رہوں گا۔ اور اگر مجھ سے وحشت ہوئی تو بھی کسی طرح خبر لوں گا۔

ہردیال - پتا جی، انھیں کچھ نصیحت کر دیجئے بیچارے اسی لئے آئے ہیں۔

ماسٹر صاحب - نصیحت کا تو سارا دواخانہ میں نے تم لوگوں کو نو دس سال میں پلا چکا ہوں۔ اس وقت صرف وہ تریاق کا نسخہ یاد دلاتا ہوں، جو زہر کی دوا ہے۔ اپنا کام شوق سے محنت سے پابندی سے دھرم جان کر کرتے رہو۔ خدا نے چاہا تو ان سب بلاؤں سے محفوظ رہو گے۔ جو نوجوانوں کی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔

ظفر - انشاء اللہ ہم آپ کی ہدایت یاد رکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے (ہردیال) بھائی اسٹیشن جاتے ہوئے مجھے لے لینا۔ ابا جان کی تاکید ہے کہ تم ٹھیک گیارہ بجے آ جاؤ۔ تاکہ ہم لوگ کچھ پہلے سے پہنچ جائیں۔

ہردیال - اجی گیارہ کیا سوا گیارہ بجے پہنچ جاؤں گا۔ میرا کیا ہرج ہے۔

ظفر - ماسٹر صاحب اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کا اسکول جانے کا وقت قریب ہے۔

ماسٹر صاحب - اچھا میاں خدا حافظ۔ خدا تمھیں خوش اور تندرست رکھے۔

ظفر واپسی میں دوسرے راستے سے اپنے چند اور استادوں سے رخصت ہوتا ہوا دس بجے کے قریب گھر پہنچا تو دیکھا میر صاحب اپنے کمرے میں نماز کی چوکی پر بیٹھے کلام مجید کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر ناشتے کو پوچھا۔ معلوم ہوا تیار ہے اور رحیم بخش ناشتہ دان دھو رہا ہے تاکہ اس میں رکھ دے۔ ظفر وہاں سے آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ آج اس پر سفر پوری طرح سوار تھا۔ بےچینی کی حالت میں کبھی جیب سے بٹوا نکال کر نوٹ اور ریزگاری گنتا، کبھی سامان کا جو اس کے کمرے کے سامنے برآمدے میں رکھا تھا جائزہ لیتا رہا۔ بار بار کلائی پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ ہردیال کا تانگہ احاطے میں داخل ہوا۔ ظفر نے رحیم بخش کو پکارا کہ آ کر سامان رکھوا دے اس کی آواز سن کر میر صاحب کمرے سے نکل آئے جب تانگے پر سامان رکھا جا چکا تو میر صاحب نے ظفر اور ہردیال کو گلے لگایا اور ہردیال سے کہا "بیٹا ظفر کو تمہارے سپرد کرتا ہوں، یہ تم سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ مگر سمجھ اور تجربے کے لحاظ سے بالکل بچہ ہے۔ اچھا فی امان اللہ۔ اب خدا کا نام لے کر سدھارو۔ دیکھو انٹر میں جانا۔ پیسے بچانے کے لئے تھرڈ میں دھکے نہ کھانا۔ اسباب کا دھیان رکھنا"

اسٹیشن تک ہردیال نے میر صاحب کے لہجے میں تمسخر آمیز نصیحتیں کر کے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ مگر اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ظفر کا دھیان بٹ گیا اور وداع کے لمحے کا شدید صدمہ کسی قدر دھیما ہو گیا۔

انٹر کے جس چھوٹے سے ڈبے میں یہ دونوں سوار ہوئے اس میں دو مسافر اور تھے۔ ایک پچپن چھپن برس کی عمر کے بزرگ وار۔ موٹے تازے سیاہ رنگت داڑھی مہندی سے اور ہونٹ پان سے رنگے، ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ، شیروانی کا لمبا کرتا اور ریشمی صدری سر پر میرٹھی وضع کی کڑھی ہوئی گول ٹوپی پہنے دوسرے ایک دبلے پتلے گندمی رنگ کے نوجوان۔ کھدر کی دھوتی اور کرتے میں ملبوس، سر پر گاندھی کیپ، پتلی کمانی کی عینک لگائے۔ موٹے بزرگوار نے ہردیال سے مخاطب ہو کر پوچھا "کہاں کا عزم ہے"

ہردیال - جی ہم الٰہ آباد جا رہے ہیں۔ میرا نام ہردیال ہے۔ یہ ظفر حسن ہیں۔ ہم دونوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں داخل ہونے کا ارادہ ہے۔ ہمارے پاس کوئی محصولی چیز نہیں۔

ظفر نے ہردیال کی طرف گھور کر دیکھا، کھدر پوش مسکرائے اور داڑھی والے بزرگ نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا "ماشاء اللہ آپ بہت خوش طبع واقع ہوئے ہیں"

ہردیال - اگر میں نے کوئی گستاخی کی تو معاف فرمائیے۔

بزرگ - جی نہیں، معافی کی کیا بات ہے۔ میں تو آپ جیسے زندہ دل نوجوانوں کو بہت پسند کرتا ہوں مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے بغیر فرمائش کے اپنا تعارف کرا دیا۔

ہردیال - اب جناب سے فرمائشی تعارف کی درخواست ہے۔

کھدر پوش - آپ الٰہ آباد کے مشہور ادبی رسالے کشکول کے ایڈیٹر مولانا سائل ہیں۔

ہردیال - (کھدر پوش سے) آپ بھی اسی رسالے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کھدر پوش۔ جی نہیں، افسوس میں پانچوں سواروں میں نہیں ہوں، مجھے بال کرشن کہتے ہیں۔ الہ آباد کا رہنے والا ہوں اور گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایر میں پڑھتا ہوں۔

ہردیال۔ بہت خوب۔ آپ تو ہمارے بہادر کلاں نکلے مولانا کو آپ کہاں سے ڈھونڈ لائے۔

بال کرشن۔ مولانا اپنے وطن میرٹھ تشریف لے گئے تھے، میں ایک کام سے دہلی گیا تھا۔ وہیں سے دونوں کا ساتھ ہو گیا۔

ہردیال۔ مولانا سچ عرض کرتا ہوں، آپ کی زیارت سے طبیعت بے ساختہ محظوظ ہو گئی۔

مولانا۔ آپ کی نوازش، میں کس قابل ہوں۔

ہردیال۔ مولانا یہ میرے دوست ظفر صاحب بڑے چٹپٹے مضمون لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں بڑی سلاست، نفاست، برجستگی اور پختگی ہوتی ہے اور الفاظ مجھے آتے نہیں، مگر سب اُن کے یہاں موجود ہیں۔

مولانا۔ (ظفر سے) آپ کوئی چیز کشکول کے لیے بھیجئے نا

ظفر (اپنے حجاب پر غالب آنے کی کوشش میں جھلا کر) مولانا یہ احمق ہیں اور سمجھتے ہیں اپنے کو بڑا ظریف مجھے لکھنے کا شوق ضرور ہے مگر بالکل نومشق ہوں، نہ میرے مضمون اس قابل ہوتے ہیں کہ ادبی رسائل میں شائع ہوں۔

مولانا۔ آپ بھیج کر تو دیکھئے۔ اگر ادارے کو پسند آئے تو شکریے کے ساتھ شائع ہوں گے۔

ہردیال۔ مولانا ادارے کو پسند نہ آئے تو چھوڑے گا ورنہ شکریے کے ساتھ واپس ہو جائیں گے اور وہ بھی بیرنگ۔ واپسی کے لئے ٹکٹ جو مضمون کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں ہضم کر لیے جائیں گے۔

مولانا۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ آپ کسی مجہول رسالے کا ذکر کر رہے ہوں گے۔ ہمارے ہاں ایسی لغو حرکتیں نہیں ہوتیں۔

ہردیال۔ میں دل سے معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے قصبے میں ایک اشتہاری شاعر حضرت گھائل ہیں اُن کے ایسے چرکے بہت لگے ہیں۔ میں نے اُن سے سُنا تھا کہ بہت سے رسالے ایسی لغو حرکتیں کرتے ہیں۔

مولانا۔ تو میں آپ دونوں کے نام کشکول کے خریداروں میں لکھ لوں؟

ہردیال۔ جی نہیں، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے، رسالہ کالج کی لائبریری میں آتا ہی ہوگا، ہم وہاں سے پڑھ لیا کریں گے۔

مولانا کو اب تک ہردیال کی مسخرے پن کی باتیں ناگوار نہیں ہوئی تھیں۔ مگر یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو وہ اُتر کر لوٹے میں نل سے پانی لینے چلے گئے۔ ظفر نے ہردیال سے کہا "دیکھو تم ہر شخص سے مذاق نہ کیا کرو۔ یہ کیا بیہودہ پن ہے۔ آخر وہ بُرا مان گئے نا۔"

ہردیال۔ یار واقعی غلطی ہوئی۔ اب کیا کیا جائے۔

بال کرشن۔ مذاق تو مولانا سمجھتے نہیں مگر آپ نے رسالے کی خریداری کو ٹال دیا، اس سے چڑ گئے۔ اب آپ انھیں خوش کرنا چاہتے ہیں تو کچھ کھانے پینے کا ڈول ڈالئے۔

اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور مولانا دوڑنے کی وجہ سے ہانپتے ہوئے ڈبے میں داخل ہوئے۔ بڑا سا لوٹا پانی اور برف سے گلے تک بھرا ہوا تھا۔ مولانا نے سیٹ کے نیچے سے ٹفن باسکٹ نکالی، اُسے کھول کر اپنی سیٹ پر دسترخوان بچھایا، تام چینی کی چار پلیٹیں اور کچھ چھوٹے بڑے چمچے اس پر سجائے۔ اس کے بعد تام چینی کا بہت بڑا ناشتے دان جو ڈبے کے کونے میں رکھا تھا اُٹھایا اور تینوں نوجوانوں سے کہا "آئیے کھانا نوش فرمائیے۔" بال کرشن نے معذرت کی۔ ہردیال نے کہا "مولانا ہم لوگوں کے ساتھ بھی تھوڑا سا ناشتہ ہے۔ اجازت ہو تو وہ بھی نکال لیا جائے"۔ مولانا نے خوش ہو کر فرمایا "کیا مضائقہ ہے"۔ تینوں ناشتے دان کھلے اور اُن کے خانے دسترخوان کے درمیان خالی جگہ میں رکھ دیے گئے۔ اچھی خاصی باورچی کی دوکان معلوم ہونے لگی۔ مولانا کے ساتھ روغنی ٹکیاں، پالک اور قیمے کا سالن، آلو قیمہ اور شامی کباب تھے، مگر سب باسی۔ ظفر کے ناشتے دان سے پراٹھے اور بھنا ہوا مُرغ نکلا۔ ہردیال کے گھر سے پوریاں، آلو بھرے سموسے، تین طرح کی ترکاری اور مٹھائی آئی تھی، کھانا شروع ہوا۔

مولانا۔ (بال کرشن سے) دیکھئے کیسے لذیذ کھانے ہیں۔ آپ بھی ہاتھ دھو کر آ ہی جائیے۔

بال کرشن۔ آپ جانتے ہیں میں سفر میں کھانا نہیں کھاتا۔ صبح سے دو بار دودھ پی چکا ہوں، وہ میرے لئے کافی ہے اور یہ کھانے تو مجھے کبھی ہضم نہ ہوں۔

ہردیال۔ ہائے افسوس۔ یہ عمر اور یہ دودھ پیتا ہوا معدہ۔ بھلا جو ہوموپیتھک دودھ اسٹیشنوں پر ملتا ہے اس سے کیا پیٹ بھرا ہوگا، آپ کچھ علاج نہیں کرتے؟ مولانا سے وہ نسخہ پوچھ لیجئے نا۔

مولانا۔ کون سا نسخہ؟

ہردیال۔ جی ہاضمے کا، جو آپ کے تجربے میں آچکا ہو۔

مولانا۔ بھئی سب سے اچھا نسخہ یہی ہے کہ آدمی کھاتا رہے۔ ہضم کی فکر نہ رہے۔

ہردیال۔ (بال کرشن کی طرف اشارہ کر کے) اور ان کا اصول یہ ہے کہ بس ہضم کرتا رہے کھانے کی فکر نہ کرے۔

ظفر کو کھانے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ اُسے خیال آ رہا تھا کہ میر صاحب کھانے کی میز پر چپ چاپ اور اُداس بیٹھے ہوں گے۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح نوالہ حلق سے اُتار رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ اگر نہ کھایا تو ہردیال ناک میں دم کر دے گا۔ مولانا اور ہردیال میں زور شور سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ مولانا کے ساتھ کا سالن تو کھانے کے قابل نہیں رہا تھا، مگر روٹیاں، پوریاں اور پراٹھے مُرغ، ترکاری اور مٹھائی سب دیکھتے دیکھتے ٹھکانے لگ گیا۔ پانی کا پورا لوٹا کوئی پانچ سیر کا ختم ہو گیا۔ مگر برف بچ رہی۔ مولانا نے بال کرشن کی صراحی سے پانی انڈیل کر ایک تہائی لوٹا اور بڑھایا۔ ہردیال نے بڑی سعادت مندی سے برتن وغیرہ کر سب چیزیں بچے کھچے کھانے سے رکھ دیں۔ مولانا نے تکلف نہیں کرنے دی۔ انھوں نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ہاتھ دھوئے، کُلی کی۔ ڈبیا سے پان نکال کر کھایا اور پوری سیٹ پر دراز ہو گئے۔ سونے کا موقع نہ تھا اس لئے کہ الہ آباد بہت قریب آ گیا تھا۔ پھر بھی ذرا دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ سوا دو بجے گاڑی الہ آباد پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر اکرام اللہ موجود تھے۔ ظفر اور ہردیال مولانا اور بال کرشن سے رخصت ہوئے اور اکرام اللہ کے ساتھ اُن کی بگھی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

ذہنیت تو ہمیشہ زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے لیکن اس زمانے میں جب دنیا کی تمام تہذیبوں میں لین دین بہت زیادہ ہو گیا ہے اور کسی جماعت کے لئے ذہنی لحاظ سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہا اس قسم کے خیال ظاہر کرنا زمانے کی رو کے خلاف چلنا ہے حال ہی میں اس کی بہت سی مثالیں میرے علم میں آئی ہیں جو آپ کی نظر میں ہیں۔ میں اس سلسلے میں ہندوستان کے نامور سیاسی لیڈروں اور علم و تہذیب کے علم برداروں کو خطاب کر کے ایک گذارش کرنی چاہتا ہوں، گو اس کا امکان کم ہے کہ ان کے کانوں تک میری آواز پہنچے! اس وقت ملک کے سامنے سیاسی اور سماجی اور معاشی مشکلوں کے علاوہ ایک بہت اہم اور بہت نازک کلچرل مسئلہ یہ ہے کہ ہماری تہذیب آنے والے زمانے میں کیا رنگ اختیار کرے گی۔ آیا وہ رجعت پسندی کے پرندوں پر سوار ہو کر قدیم آریائی تہذیب کا روپ دھارنے کی کوشش کرے گی یا اپنی اصلی جنس اور زمانے کے تقاضے کے پیش نظر ایک ترقی پسند روادار اور معقول پالیسی اختیار کرے گی اور نہ صرف ان تمام عنصروں کی عزت اور حفاظت کرے گی جو گذشتہ تین چار ہزار برس میں اس کے رگ و پے پیوست ہو گئے ہیں بلکہ اس میں جو نئے عنصر شامل ہوں گے ان کا بھی سواگت کرے گی؟ میرے خیال میں تو اس سوال کا معقول جواب ایک ہی ہو سکتا ہے یعنی ہندوستان صرف ہندو تہذیب کا استھان نہیں بلکہ اس میں اسلامی، مسیحی، یہودی، پارسی، جینی، بودھی اور سکھ تہذیب کی قدروں کا پاس بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہندو تہذیب کا اور جب کبھی ہمیں کوئی مشترک چیز بنانی ہوگی خواہ وہ قومی زبان ہو یا قومی گیت یا کوئی اور چیز تو اس میں ان تمام چشموں کو ملانے کی کوشش کی جائے گی اور ہر اس چیز سے پرہیز کیا جائے گا جو کسی مذہب یا گروہ کے جذبات کو جائز طور پر دکھانے والی ہو۔ ہندوستان کے قومی گیت میں بت پرستی کے اشارے ایسے ہی (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

یہ امریکہ ہے

محمد امین

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کا دستور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا مکمل اختیار ہے۔ لیکن اگر ہم امریکہ کے اندرونی حالات کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہاں کتنی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ وہاں کے ترقی پسند عناصر جن کے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے کہ اُن کی ہمدردی روس کے ساتھ ہے وہ لوگ فوراً اپنی اپنی ملازمتوں سے برخاست کر دیئے جاتے ہیں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکال دیئے جاتے ہیں اور انھیں گرفتار کر کے فوراً جیل خانے میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور جو وکلا اُن کی حمایت میں ان کی پیروی کرتے ہیں بعد میں انھیں بھی یہ کہہ کر جیل بھیج دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بھی اُنھیں کے بھائی بند ہیں اور اتنے ہی خطرناک

نیویارک میں بچوں کے ایک رسالے کا نام SUPERMAN ہے۔ اس کی اشاعت بچوں کے دوسرے تمام رسالوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے یہ رسالہ عموماً آٹھ برس کے بچے پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے اس کو دیکھئے تو اس کے مضامین، اس کی تصویریں اور اس کے کارٹون دیکھ کر آپ کو یہی اندازہ ہوگا کہ یہ بچوں کا رسالہ ہے کہ چوروں یا بڑے بڑے قاتلوں کا۔ اس میں بعض ایسے آدمیوں کا کیرکٹر پیش کیا جاتا ہے جو جہازوں، بنکوں اور قیمتی رنگین تصویروں کو چراتے ہوئے دکھلائے جاتے ہیں بعض ریل گاڑیوں کو پٹری پر سے گراتے ہوئے دکھلائے جاتے ہیں بعض تصویریں جواہرات کی چوری کے گُر بتاتی ہیں۔ بعض نیویارک کے بڑے بڑے کلب گھروں سے سونے کے بڑے بڑے کپ کی چوری کی داستان بتاتے ہیں بعض شکل ایسی ہوتی ہیں کہ جو چوریوں کی تدابیر تو بتلاتی ہی ہیں موقع پڑنے پر قتل اور خون سے بھی باز نہیں آتیں۔ الغرض ایک نہیں سیکڑوں کہانیاں اس طرح کی ملیں گی جن کے ہیرو کسی نہ کسی طرح کی چوری کرتے ہیں۔ گویا جو بچے ان کہانیوں کو پڑھتے ہیں وہ بھی انھیں کی باتیں سیکھیں اور بڑے ہوکر انھیں کی بتائی ہوئی باتوں سے فائدہ اُٹھا کر چوری، مکاری اور بے ایمانی کے ہنر دکھلائیں۔

اس قسم کے قصے اور کہانیاں کہا جاتا ہے کہ بچوں کے مذاق کو اونچا کرتی ہیں اور ان کے اندر مزاحیہ صلاحیت کو بیدار کرتی ہیں۔

اندازہ ہے کہ اس طرح کے مذاق کی میگزین امریکہ میں فی بچہ پانچ کی تعداد میں ہفتہ وار شائع ہوتی ہیں ان کا رنگ چوکھا۔ ان کی سرخی رنگین اور خاص بچوں کے مذاق کی، لیکن ان کے مضامین اللہ کیا کہنے ہیں۔

اس قسم کے میگزین سے منافع تو بے شک لاکھوں ڈالر سالانہ ہوتا ہے لیکن ان کا اثر بچوں کے اوپر بہت بُرا پڑتا ہے۔ بہت سے بچے اس قسم کے قصے اور کہانیاں پڑھ پڑھ کر خراب عادتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اور بہت سے ننھے جرم کا تجربہ کرنا سیکھ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔

امریکہ میں نسلی امتیاز کھلے بندوں برتا جاتا ہے وہاں نیگروز (حبشی) کی آبادی کل ایک کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک برتا جاتا ہے۔ کہنے کو تو امریکہ جمہوریت کا علمبردار ہے لیکن ان کالے آدمیوں کی زندگی کو آپ دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ امریکہ کے نظامِ حکومت کی اصلیت کیا ہے۔ امریکہ میں یہ عام بات ہے کہ اگر کوئی سفید چمڑی والا کالے آدمی کو گولی مار دے تو سردست تو اُسے گرفتار کر لیا جائے گا لیکن بعد میں یہ کہہ کر اُسے رہا کر دیا جائے گا کہ حالات کے مطابق وہ ایسا کرنے کے لئے حق بجانب تھا۔

نیگرو لوگوں کے ساتھ آئے دن طرح طرح کی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن وہاں کی حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ فلاریڈا، جارجیا جنوبی کرولائنا کی ریاستوں میں سفید چمڑی کے لوگ کھلے بندوں حبشیوں کو نقصانات اور تکلیفیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں سفید چمڑی کے آقا نیگروز کو غلاموں کی طرح اب بھی رکھتے ہیں۔

سارے امریکہ میں اُن کے لئے ٹرینوں، سنیما گھروں، ریسٹوران اور تفریح گاہوں میں بالکل الگ الگ بیٹھنے کی جگہیں مقرر رہتی ہیں، جہاں کہ کوئی سفید آدمی نہیں بیٹھ سکتا۔ معمولی سے معمولی جرم پر انھیں گرفتار کیا جاتا ہے اور سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے۔ جب کسی گڑھے ہوئے جرم کے سلسلے میں اُس کو گرفتار کیا جاتا ہے اور اس کے حقوق کے تحفظ کے لئے اگر کوئی ترقی پسند اور روشن خیال سفید چمڑی کا آدمی وکالت کرتا ہے تو بعد میں اس پر پوشیدہ طور سے حملہ کیا جاتا ہے اور اُسے قتل کرنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس جذبے کے پس پشت مقصد یہ ہوتا ہے کہ نیگروز کی ہمدردی اور موافقت میں سفید چمڑی کے لوگوں میں کہیں کوئی گروپ نہ بن جائے جو نسلی برتری کو ایک سرے سے ختم کرنے کے لئے پروپگنڈا شروع کر دے۔

امریکہ میں روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے اور وہاں پر سرمایہ داروں، کروڑپتی اور اجارہ داروں کا اسی قدر زور ہے کہ حکومت کے بڑے بڑے افسروں اور وزرا اور ان کے مقاصدوں کے متعلق یہ یقین ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی کے ہاتھ میں بکے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ امریکہ کا بڑے سے بڑا وزیر کسی نہ کسی سرمایہ دار کے ہاتھ میں کھیلتا رہتا ہے اور وہ حکومت میں رہ کر اسی کے مفاد کے لئے کام کرتا ہے اور اپنی پالیسی مرتب کرتا ہے۔

اخبارات، ریڈیو اسٹیشن، بڑے بڑے میگزین اور رسالے سبھی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھلونا ہوتے ہیں اور اُن کی مدد سے وہ عوام کی رائے کا رُخ موڑتے ہیں اور اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹے موٹے پیمانے پر وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ خواہ تجارت ہو، کھیتی یا تعلیمی معاملہ ہر کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور بڑے بڑے سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا گلا گھونٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں تاکہ انھیں اپنی تجارت میں اجارہ داری حاصل ہو جائے اور وہ منہ مانگا دام پاکر عوام کو لوٹ سکیں۔

امریکہ کی معاشی زندگی میں تجارت اور جرم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سرمایہ دارانہ دنیا میں جرم کے لحاظ سے امریکہ سب سے آگے ہے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں وہاں ۱۶،۶۵،۱۱۰ جرم کئے گئے۔ امریکہ کے پریس اور اخباروں کا یہ کہنا ہے کہ ہر بیس سکنڈ کے بعد وہاں کوئی نہ کوئی شدید جرم عمل میں آتا رہتا ہے۔ امریکہ کے ماہرینِ اعداد و شمار کا کہنا ہے کہ صرف ایک سال میں جرم کی وجہ سے ۱۵،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ اور ۱۸،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر کے درمیان نقصان ہوتا ہے۔

ڈاکہ زنی نے باقاعدہ تنظیم کی شکل اختیار کر لی ہے ڈاکوؤں کے بڑے بڑے گروہ اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے مل گئے ہیں اور ان کی مخالفت میں جو کوئی آواز بلند کرتا ہے یا اُن کے منصوبوں میں جو کوئی روڑے اٹکاتا ہے اُسے لوٹ کر اس کو تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ چور بازاری بھی ایک فن سمجھا جاتا ہے چنانچہ امریکہ میں چور بازاری کے بڑے بڑے ماہرین ملیں گے۔

امریکہ میں بڑے بڑے افسروں اور غنڈوں کا ساتھ چولی دامن کا رہتا ہے ڈیموکریٹک (DEMOCRATIC) اور ری پبلکن (REPUBLICAN) پارٹی کے اُمیدوار دورانِ الکشن میں غنڈوں سے بہت کافی امداد حاصل کرتے ہیں۔ مزدور اور غریب طبقے کے لوگ جب کسی ایک پارٹی کو ووٹ نہیں دیتے تو اس پارٹی کے غنڈے انھیں دھمکی دیتے ہیں یا پھر جان لینے پر آمادہ رہتے ہیں اور اکثر مخالف پارٹی کو ووٹ دینے پر مار بھی ڈالتے ہیں بڑے بڑے صنعتی ماہرین زبردستی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ طور سے بڑی بڑی غنڈوں کی جماعت کی پرورش کرتے ہیں اور دل کھول کر روپے دیتے ہیں۔ موقع بے موقع بڑے بڑے کارخانوں میں جب مزدور ہڑتال کرتے ہیں تو انھیں غنڈوں کو مزدوروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور ان کے لیڈروں اور خاص کارکنوں کو موت کے گھاٹ اتار کے لئے تیار رہتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

حالی - ایک نقاد

سید منہاج الدین

حالی اردو کے پہلے نقاد ہیں۔ بات ذرا تعجب انگیز ہے لیکن سچی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حالی کے زمانے تک ہماری زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے جن میں مذاق سلیم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ادب کے متعلق کچھ اصولی باتیں بھی ادھر ادھر بکھری ہوئی صورت میں مل جاتی ہیں مگر ان چیزوں کو بمشکل تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے البتہ آزاد کی آب حیات اور سخندان پارس پر کہیں کہیں تنقید کا دھوکا ہو جاتا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد تقریظ اور تنقیص سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ انشاپردازی کی چمک دمک سے آنکھیں ضرور خیرہ ہو جاتی ہیں مگر سراب پھر بھی سراب ہے۔ اردو تنقید کو "آہ" اور "واہ" کے دائرے سے نکال کر اسے ایک علمی اور فنی حیثیت دینے کا سہرا حالی ہی کے سر ہے۔ کسی مصنف کی تعریف یا مذمت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دینا اور بات ہے، تہہ میں ڈوب کر اس کے نکات کو سمجھنا اور سمجھانا، ادب کے اصول متعین کرنا اور پھر ان کی روشنی میں کارناموں کا جائزہ لینا، مصنف کو اس کے ماحول اور سماجی حالات کے پس منظر میں دیکھنا یہ اور تنقید کے دوسرے تمام پہلو اردو میں اپنے وجود کے لئے حالی کے مرہون منت ہیں۔ کیونکہ حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تنقید کو ذاتی غرض سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ برتا اور بقول فراق مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں جدید شاعری کا مینی فسٹو پیش کیا۔

حالی اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں بھی تھے خلوص ہمدردی اور بے تعصبی جو ایک نقاد کے بنیادی لوازم ہیں وہ ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ آزاد اور شبلی اپنے پسندیدہ شاعر یا مصنف کو سب سے اچھا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے خواہ مذاق سلیم کی آنکھ میں دھول ہی کیوں نہ جھونکنا پڑے۔ آزاد کی جانبداری اور فریب دہی کے لئے تو خیر کسی ثبوت کی ضرورت نہیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شبلی جیسا صاحب ذوق بھی تعصب کی قربان گاہ پر تنقید کی بھینٹ چڑھائے انیس کو دبیر سے بڑا شاعر ثابت کرنے میں انھیں دوسروں کے خراب اشعار دبیر کے سر تھوپنے میں کوئی عار نہیں نفرت کا یہ عالم کہ دبیر کے کلام میں صرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ تعصب کی یہ حالت کہ شاہنامہ کی سرسری کمزوریاں مثلاً کردار نگاری میں ناکامی اور انداز بیان کی یکسانیت وغیرہ بھی ان کو نظر نہیں آتیں۔ حالی ہی صرف ایسے نقاد ہیں جن کا خلوص شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ جو کچھ وہ محسوس کرتے تھے وہی لکھتے تھے اور اس چیز میں وہ کبھی ہیرو پرستی کا شکار نہیں ہوئے مسدس کے دیباچے میں، انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کے بارے میں جو لکھا ہے وہ ان کے خلوص کا بہترین مظہر ہے اپنی ذات کے بارے میں بڑے بڑوں کے قدم صداقت سے منحرف ہو گئے ہیں۔ حالی اگر چاہتے تو اپنی گزشتہ شاعری کو کوئی اور معنی پہنا سکتے تھے مگر دھوکا دینا ان کی فطرت سے بعید تھا۔ ان کا خلوص اس سخت آزمائش میں بھی کامیاب ہوا۔ ان کی ہمدردی لامحدود تھی۔ وہ ایک ایک سطر ہر کارنامے کا ہمدردانہ مطالعہ کرتے اور اسی وجہ سے وہ ان پہلوؤں تک پہنچ جاتے جہاں دوسروں کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ میر اسنے اردو ادب پر انھوں نے بیدردی کے ساتھ اعتراضات کئے ہیں لیکن اس کی خوبیاں بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتیں۔ غالب کے بعض اشعار کے انھوں نے ایسے اچھے اور باریک معنی بتائے ہیں کہ ان اشعار میں ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ سعدی کے مطائبات اور مضحکات ان کو ناپسند ہیں مگر وہ اس کی وجہ سے سعدی کو مورد الزام قرار نہیں دیتے بلکہ ان کے عذر کی پذیرائی بھی کرتے ہیں۔ حافظ کی غزل ان کے نزدیک مخرب اخلاق ہے مگر وہ اس کی ہنگامی اور دائمی قدروں کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی ہمدردی ہی کا کرشمہ ہے کہ تصنیف میں خلوص اور بے تعصبی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حالی کی تنقید میں نہ تو آزاد کی مذہبی اور ذاتی تعصب کا گزر ہے اور نہ شبلی کے ذہنی تعصب کا۔ غالب حالی کے استاد تھے اور ذوق غالب کے حریف تھے مگر یادگار غالب میں نہ تو حالی نے کہیں غالب کو سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی کہیں ذوق پر کیچڑ اچھالی ہے۔ سعدی حالی کے محبوب مصنف ہیں مگر غزل میں حافظ کی عظمت سے انھیں انکار نہیں۔ ہاں ان میں دو تعصب ضرور پائے جاتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ مغربی مصنفین کے اقوال کو حرف آخر سمجھ لیتے ہیں دوسرا یہ کہ جو ادب قومی اصلاح میں مدد نہ دے وہ ان کے نزدیک بیکار ہے اور اس کے وجود کے لئے کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ مگر ان دو باتوں کو ماننے کے لئے ان کے زمانے کے تقاضوں نے انھیں مجبور کیا۔ جب زندگی کے ہر شعبے پر مغرب کی برتری کا رعب چھایا ہوا تھا اور زندگی کو بہتر بنانے کی اشد ضرورت تھی اس وقت ادب کیسے بچ سکتا تھا

ہمدردی، خلوص اور بے تعصبی آرٹ کی روح تک پہنچنے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں مگر ادب کی لطافتوں کو سمجھنے کے لئے کچھ اور بھی درکار ہے اور وہ ہے مذاق سلیم یا صحیح ذوق۔ آزاد اسی کے فقدان کی وجہ سے بعض اوقات بڑی بھونڈی حرکتیں کر جاتے ہیں۔ ذوق ان کے استاد تھے اور وہ ان کو سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جن اشعار پر ان کی عظمت کی بنیاد رکھتے ہیں وہ نہایت معمولی ہیں اسی وجہ سے ان کی کوشش مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ شبلی کے ساتھ قدرت نے اس معاملے میں بڑی فیاضی برتی تھی۔ محض اس شئے لطیف کی وجہ سے ان کے تنقیدی کارناموں میں جان پیدا ہو گئی ہے۔ حالی کو بھی یہ صفت عطا کیا گیا تھا۔ ایسے زمانے میں جبکہ لوگ چٹپٹے ادب کے عادی اور مداح تھے انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور حقیقی ادب کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا یہ ان کا ذوق صحیح اور وجدان ہی تھا، جس نے ان کو نہ صرف بدمذاقی سے بچا لیا بلکہ اچھے ادب کی طرف رہنمائی کی۔

لیکن شبلی کے مقابلے میں حالی کا ذوق جمال خام ہے اور بعض جگہ تو اس کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً یادگار غالب میں حالی نے غالب کی اس خصوصیت کو سب سے زیادہ اجاگر کیا ہے کہ ان کے اکثر اشعار دو معنی رکھتے ہیں یا پہلودار ہوتے ہیں حالانکہ ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ غالب کی عظمت کا راز یہ نہیں ہے۔ اس قسم کی چیزوں کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ حالی دراصل قدیم و جدید کی درمیانی کڑی ہیں۔ اس وجہ سے وہ جدید ذہن رکھتے ہوئے بھی قدیم ادبی بدمذاقی سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکے۔ شبلی نے چونکہ ایسے وقت میں تنقید کو ہاتھ لگایا جب جدید دور ابھر رہا تھا اس لئے ان کا ذوق زیادہ تربیت یافتہ ہے۔ حالی کا مطالعہ بھی شبلی کی طرح محدود ہے۔ لیکن یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ حالی کے اندر عمق کافی تھا جس کا اعتراف شبلی نے بھی کیا ہے۔ حالی صرف فارسی اور اردو ادب سے واقف تھے اور تھوڑا بہت عربی ادب سے مگر ان کی واقفیت سطحی نہیں تھی بلکہ کافی گہری تھی اور بہت مرتب شکل میں۔ پھر بھی مغربی تنقیدوں سے ناواقفیت ان کے لئے ایک بڑی کمی ثابت ہوئی۔

بحیثیت نظریہ ساز کے حالی کی اہمیت زیادہ تر تاریخی ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں پہلی بار شعر کی ماہیت اور اس کی حقیقت پر سنجیدگی سے بحث کی۔ اس کی خوبیوں کا سائنٹیفک تجزیہ کیا اور اس سے متعلق تمام مسائل پر روشنی ڈالی۔ علاوہ ازیں ہمارے کئی جدید بنیادی نظریات بھی انھیں کے خیالات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ مثلاً :-

(۱) ادب برائے زندگی ہوتا ہے نہ کہ برائے تفریح
(۲) ادب سوسائٹی کے تابع ہے اور سوسائٹی پر اثر انداز ہوتا ہے۔
(۳) وزن اور قافیہ شعر کے لوازم نہیں ہیں۔

ان تمام خیالات کی بنیاد حالی ہی نے مقدمہ شعر و شاعری میں رکھی ہے۔ شاعری کے لئے انھوں نے جو شرطیں ضروری قرار دی ہیں وہ آج بھی ضروری مانی جاتی ہے۔ اچھی شاعری کی جو خصوصیات انھوں نے بتائی ہیں وہ آج بھی موجود ہیں۔ ہنگامی اور دائمی قدروں کا امتیاز حالی ہی کے ذہن کی پیداوار ہے حیات سعدی میں اس

حصے کہ جس میں گلستاں کا مثنوی مولانا روم سے اور شاہنامہ کا دیوان حافظ سے موازنہ کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حالی کے لاشعور میں نیم بیدار طور پر اس کا احساس موجود تھا۔ غرض کہ موجودہ تنقید کے تقریباً تمام بنیادی تصورات اپنی ابتدائی حالت میں حالی کے یہاں مل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود حالی کے تنقیدی نظریوں کو جدید تنقید کا سنگِ بنیاد نہیں کہہ سکتے۔ سلطنت کا زوال حالی کی آنکھوں کے سامنے سے گذر چکا تھا۔ پھر پرانی زندگی کے بچے کھچے اثاثے کو لے کر اور پھر اپنے نئے عناصر کی مدد سے جو جلد از جلد دستیاب ہو سکے تھے انھوں نے ایک نئی عمارت کھڑی کی۔ یہی سبب ہے کہ ادب کے متعلق بھی اُن کے بنیادی نظریات زیادہ تر عربی تنقیدوں سے ماخوذ ہیں۔ خاص طور پر ابن رشیق کی کتاب العمارہ اور ابن رشد کا ترجمہ بوطیقا (ارسطو) سے اچھے شعر کی تعریف، شاعری کے لوازم وغیرہ پر حالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہیں سے لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں مغربی مصنفین کے اقوال کو نقل کر کے جدت کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر حالی نے عرب کے پرانے تنقیدی نظریوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی ہے۔ انھوں نے صرف کاٹ چھانٹ کر ان کو اپنا لیا ہے۔ بہر حال اس دور میں یہی بہت ہے کہ حالی نے صدیوں کی مسافت تنہا طے کر لی اور یہیں قطع برید میں کامیاب ہوگئے جو نہ صرف زمانۂ حال کا ساتھ دے سکے بلکہ مستقبل کے لئے بھی شمع راہ ثابت ہو۔

حالی کی علمی تنقیدوں کو بھی اُن کے زمانے کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ زندگی بہت تیزی کے ساتھ بدل رہی تھی۔ اگر اردو ادب اس کا ساتھ نہ دیتا تو ختم ہو جاتا۔ گرتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کے ادب کے لئے اس وقت کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے نقادوں کو بہت سخت رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ حالی کا مقدمہ اسی حقیقت کا اعتراف ہے۔

حالی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے معاصرین پر جو مضامین یا ریویو لکھے ہیں ان میں تعریف کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کا جواب حالی نے خود دیا ہے۔

"مصنف کا بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی عالت میں ہو نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے۔ شاید ایک ایسا زمانہ بھی آئے جب زمانۂ حال کی عمدہ تصانیف پر اس طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی سینا کی تصانیف پر کی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں پر خوردہ گیری کی نظر سے غور و خوض کرنا کیا بہ اعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا بہ اعتبار خیالات اہل وطن کے کیا بہ اعتبار مضمون کے اور کیا بہ اعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی تک وقت نہیں آیا۔"

اس سے آزاد کی علمی تنقید کی خصوصیات معلوم کرنا ہے تو یادگار غالب اور حیاتِ سعدی کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ غالب پر انھوں نے جو تنقید کی ہے وہ کئی لحاظ سے تشنہ ہے۔ زیادہ تر ان کی مضمون آفرینی، جدتِ ادا، اور حسنِ بیان پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے موضوع اور ان کے خیالات پر تقریباً بحث کی ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جن پہلوؤں پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے ان کو اتنا اجاگر کر دیا ہے کہ تشنگی کی ایک حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ سعدی پر حالی نے جو تنقید کی ہے وہ زیادہ جامع ہے مگر اس میں بھی تمام بحث انداز بیان ہی سے کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ حالی قدیم سے جدید تک چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے۔

تنقید کے اتنے ترقی کرنے کے بعد بھی حالی اپنی ایک خصوصیت میں منفرد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تمام زاویوں اور تمام پہلوؤں سے ادب کو نہ پرکھ سکیں بلکہ صرف چند پہلوؤں سے بحث کریں مگر وہ ان کو ہمارے سامنے اتنا واضح اور منور کر دیتے ہیں کہ کسی اور نقاد کے بس کی بات نہیں۔ سعدی اور حالی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر حالی کے تنقیدی فیصلے حرف آخر ہیں۔ ان کا انداز بھی بہت صاف سلجھا ہوا اور سائنٹیفک ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت واضح طریقے پر مثلاً صرف یہ کہہ کر نہیں گذر جاتے کہ سعدی کی غزل میں نمک پایا جاتا ہے بلکہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ نمک سے اُن کی کیا مراد ہے۔ اس لئے ان کی تنقیدوں میں ابہام اور الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک اچھی تنقید کی سب سے پہلی منزل ہے اور اس میں کوئی شخص بھی حالی سے زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

یہ امریکہ ہے

(بہ سلسلہ صفحہ)

رجعت پسند سیاست داں اور غنڈوں میں اس قدر گہرا سمبندھ ہے کہ یہ معلوم کرنا کہ غنڈہ گردی اور سیاست کی حدیں کہاں سے جُدا ہوتی ہیں بہت مشکل ہے۔ آج امریکہ غنڈہ گردی اور طاقت کی زبردستی یا جبر اور استبداد کو کھلم کھلا استعمال کر رہا ہے زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں یہ جبر اور ظلم روا رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داری جب پوری طرح سے اپنی ترقی کی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کی خصوصیت جبر استبداد اور غنڈہ گردی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ امریکہ آج اس طرف تیزی سے جا رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ آج امریکہ دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہے وہاں ۵۵،۰۰،۰۰۰ مزدور بے کار ہیں۔ ۹۰،۰۰،۰۰۰ آدمی صرف ادھورے طور سے ملازم ہیں جن کے متعلق خطرہ ہے کہ پتہ نہیں کب نکال دئے جائیں۔ محض نیویارک شہر میں ۵،۸۸،۰۰۰ آدمی بے کار ہیں۔ مساچوسٹس (MESSACHUSETS) میں ۲،۵۸،۰۰۰ آدمی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ریاست میشی گن میں ہر مزدور خاندان ادھ موا ہو رہا ہے سین فرانسسکو (SEN FRANCISCO) کے شہر میں مزدوروں میں سے دس فی صدی بے کار ہیں اور جو مزدور ملازم ہیں ان کی اجرت میں پندرہ فی صدی تخفیف کر دی گئی ہے۔

مزدوروں کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے انیس سال میں ۱۰،۲۲،۶۰۰ مزدور یا تو زخمی ہوگئے یا زخم کی وجہ سے بے کار ہوگئے اور ۲۴ ہزار کانوں میں حادثے کی وجہ سے مرگئے۔ محض ۱۹۴۳ء میں صنعتوں میں حادثے کی بنا پر ۲ لاکھ مزدور ہلاک ہوگئے۔ ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰ مزدور امریکہ میں گندی گلی کوچوں اور انتہائی پست و ذلیل جگہوں میں رہتے ہیں۔ ان جگہوں میں رہنے سے مزدوروں کی زندگی نصف سے زیادہ کم ہو جاتی ہے جن میں سے اکثر دق کے شکار ہوتے ہیں۔

باہر کے ملکوں میں جتنے بھی سفیر مقرر ہوئے ہیں وہ سفارت خانہ کا کام تو برائے نام کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی نفع کا کام، تجارت اور خوب کاروبار کرتے ہیں اور سینکڑوں روپے کماتے ہیں۔ اپنے ملک سے اپنے ساتھ چیزیں لاتے ہیں اور چور بازار میں اسے بیچ کر منافع کی تھیلی بھرتے ہیں۔ امریکہ کے بڑے سے بڑے سفیر یہ کام عام طور سے کرتے ہیں، لیکن حکومت اس پر کوئی دھیان نہیں دیتی۔

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

پہلے تو مجلس میں سناٹا تھا۔ ہمارے اور ثقہ سامعین دم بخود چیں بہ جبیں، بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ مگر ٹیپ کا بند سن کر سارا مجمع لوٹ لوٹ گیا!

"بھئی ماشاللہ لطف آگیا۔ واہ رے مصری کیا کہنے ہیں! بہ قول حیدر آبادیوں کے خوب مسکا لگایا۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۷)

بے محل ہوں گے جس طرح مثلاً پاکستان میں یہ اصرار کرنا کہ ہر شہری "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" گانے میں شریک ہو۔ جب تک ہندوستان یا پاکستان میں ایک بھی مسلمان یا غیر مسلم شہری موجود ہے اس کے معقول مذہبی جذبات کا احترام ایک مہذب حکومت کا فرض ہے، کوئی حکومت جو اپنی پالیسی محض تعداد کی کثرت کو دیکھ کر معین کرے۔ ایک مہذب حکومت نہیں کہلا سکتی۔ ممکن ہے بہت لوگوں کو یہ بات کڑوی لگے لیکن سچ نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ وہ ہر شخص کو میٹھا معلوم ہوگا!

چند کتابیں

عذرا

از صالحہ عابد حسین

اس سماجی و معاشرتی ناول میں ہندوستانی گھروں کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر، خانگی مسائل، گھریلو جھگڑے، قدامت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش، سیاست کی جھلک، پاکیزہ محبت کی بجلیاں، فراق کی جاں کاہیاں اور ملاپ کی دلکش تصویریں سب ہی نظر آئیں گی۔

ہم کیسے پڑھائیں؟

از ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب

ٹریننگ اسکول کے زیر تربیت اساتذہ کے ضرورت کی چیز ہے، اور اس میں پڑھانے کے عام طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

قیمت سے ر

پردۂ غفلت

از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر، تعلیم نسواں اور پردے پر مفید بحث، ایک دلچسپ ظرافت آمیز نتیجہ خیز قصہ

قیمت عہ ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (۱) ڈاک خانہ جامعہ نگر، دہلی (۲) پرنسس بلڈنگ نزدیک جے جے ہسپتال بمبئی نمبر ۳

مشرق و مغرب کے سب سے بڑے دانشور

اور

قوم کے سب سے بڑے رہنما

مہاتما گاندھی

کی

آپ بیتی

تلاشِ حق

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

قیمت حصہ اول ے ر حصہ دوم سے ر

ایشیا کے سب سے بڑے لیڈر

اور

ہندوستان کے وزیر اعظم

پنڈت جواہر لال نہرو

کی

مشہور کتاب

میری کہانی

جس میں آپ کو ہندوستان کی جنگ آزادی کی پوری تاریخ ملے گی

قیمت جلد اول للعہ جلد دوم للعہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (۱) ڈاک خانہ جامعہ نگر، دہلی (۲) پرنسس بلڈنگ نزدیک جے جے ہسپتال بمبئی نمبر ۳

بچوں کی کتابیں

	قیمت
قدرت کے کرشمے	۱۰ر
دنیا کے بچے	″ ۱۲ر
دنیا کے بسنے والے	″ ۱۲ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ۱	″ ۱۰ر
″ ″ ″ ۲	″ ۱۰ر
″ ″ ″ ۳	″ ۱۰ر
عقائد اسلام	″ ۶ر
ارکانِ اسلام	″ ۶ر
ہمارے نبیؐ	″ ۶ر
آں حضرتؐ	″ ۸ر
ہمارے رسولؐ	″ ۱۲ر
نبیوں کے قصے	″ ۱۴ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (۱) ڈاک خانہ جامعہ نگر، دہلی (۲) پرنسس بلڈنگ نزدیک جے جے ہسپتال بمبئی

اپنی

زندگی کا بیمہ

ہندوستان کی سب سے بڑی کمپنی سے کرائیے

پتہ:-

انڈسٹریل اینڈ پروڈنشل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

انڈسٹریل انشورنس بلڈنگ

چرچ گیٹ بمبئی

طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ:- جید پریس، دہلی

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

جلد ۲ | ۸ مارچ ۱۹۵۰ء | نمبر ۱۰

ہند اور پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ

دونوں بنگالوں میں بڑے پیمانے پر فساد ختم ہو گیا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ دونوں جگہ اقلیتوں میں ہراس اور گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے اور اس کے دور کرنے کی کوششوں میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن حالات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جذبات کا فوری اشتعال کچھ دھیما ضرور ہو گیا ہے اب حکومتیں اور امن پسند لیڈر ایک بار پوری کوشش کر ڈالیں تو یہ بھگدڑ جو اس وقت سرحد کے دونوں طرف خصوصاً مشرقی بنگال میں مچی ہوئی ہے رک جائے گی۔

لیکن جو سوال اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں پیدا ہو رہا ہے اور پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں پیدا ہو رہا ہوگا وہ یہ ہے کہ آخر اقلیتیں کب تک اس اندیشے میں گھلتی رہیں گی کہ ایسا نہ ہو کہ فتنہ و فساد کی آگ پھر بھڑک اٹھے اور ان کے جان و مال عزت آبرو کو خطرے میں ڈال دے! ہندوستان کی تقسیم اسی لئے تو کی گئی تھی کہ فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ جو کئی سال سے ہر وقت سر پر منڈلا رہا تھا دور ہو جائے۔ اگر یہ تقسیم کے بعد بھی دور نہیں ہو سکا تو پھر کب دور ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کشمیر کا۔ جائدادوں کے مبادلے کا اور پنجاب میں نہروں کے پانی کا معاملہ طے ہو جائے تو ہند اور پاکستان کی کشیدگی ختم ہو جائے گی۔ اور اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ فساد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے ان تینوں معاملات کا بہت جلد فیصلہ ہونے کی کوئی امید نہیں اور ہند و پاکستان کی موجودہ کشیدگی مہینوں یا برسوں میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی اور فرض کیجئے ہو بھی جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ پھر دونوں ہمسایوں کے تعلقات کشیدہ نہ ہو جائیں گے؟ کیا اقلیتوں کی قسمت ہمیشہ ہند و پاکستان کے تعلقات سے وابستہ رہے گی؟

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کسی طرح قابل اطمینان نہیں اور اس کی جلد سے جلد اصلاح ہونی چاہئے لیکن سوال تو یہی ہے کہ اصلاح کی کیا تدبیر اختیار کی جائے

بعض عقل کے دشمن دونوں ریاستوں میں بے سوچے سمجھے کہہ اٹھتے ہیں کہ آبادی کا مکمل مبادلہ کر لیا جائے سب ہندو پاکستان چھوڑ دیں، اور سب مسلمان ہندوستان سے چلے جائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ادھر سے سوا کروڑ اور ادھر سے پونے چار کروڑ یعنی کل پانچ کروڑ آدمی گھر سے بے گھر ہو جائیں۔ آپ پچھلے ایک کروڑ کی آبادی کے مبادلے کے مہلک نتائج بھگت چکے ہیں اور اب تک بھگت رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو اگر پورے پانچ گنے پیمانے پر مبادلہ ہو تو عارضی قتل و غارت کے علاوہ دونوں ملکوں کی معیشت کا کیا حشر ہوگا؟ ایک کروڑ آدمیوں کی خانہ بربادی سے دونوں ملکوں میں مہنگائی، بے روزگاری، افلاس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ پانچ کروڑ کی خانہ بربادی سے جو حالت ہوگی اس کا تصور کیجئے۔ اور پھر پونے چار کروڑ مسلمان پاکستان میں کیسے سمائیں گے؟ وہ فاتر العقل جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہندوستان کے اندر ایک گذرگاہ بنانا ممکن سمجھتے تھے یہ کہہ دیں گے کہ مبادلے کے ساتھ ساتھ پاکستان کو اور رقبہ دیا جائے۔ ذرا ان سے پوچھئے کہ ڈھائی کروڑ زیادہ آدمیوں کے لئے کتنا رقبہ چاہئے شاید پورا مغربی بنگال اور اڑیسہ؟ اور وہاں کے ہندو کہاں جائیں؟ کہا جائے گا باقی ہندوستان میں تقسیم ہو جائیں؟ گویا ڈھائی کروڑ کی اور خانہ بربادی ہو۔ کیا ہندوستان اس مجنونانہ تجویز کو مان لے گا؟ ظاہر ہے نہیں مانے گا تو کیا ہوگا؟ جنگ ہوگی؟ آئیے اس پر بھی غور کر لیں کہ دونوں ملکوں کو جنگ سے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہوگا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک طرف امریکہ دوسری طرف روس اور ان کے ساتھی جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ جب لڑائی ہو تو ایشیا اس کا خاص میدان بن جائے۔ یہ بھی ممکن بات ہے کہ ایشیا کے دو ملکوں میں جنگ ہوئی تو کسی ایک کو امریکہ مدد دے گا اور دوسرے کو لازمی طور پر روس سے مدد لینی ہوگی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نخواستہ اگر ہند اور پاکستان میں لڑائی چھڑی تو دونوں کو برابر باہر سے شہ ملتی رہے گی اور اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے کہ تیسری جنگ عظیم چھڑ جائے اور ہند کا برصغیر اس کا سب سے پہلا اکھاڑا بن جائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو ملک آنے والی جنگ عظیم کا اکھاڑا بنیں گے ان کی ہلاکت یقینی ہے اس لئے کہ اس جنگ میں اٹم بم ہائیڈروجن بم اور خدا جانے کن کن خوفناک ہتھیاروں سے کام لیا جائے گا۔ غرض جو حضرات آبادی کے مکمل مبادلے کی رائے دے رہے ہیں وہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے کی ایسی راہ دکھا رہے ہیں جو دونوں کے لئے خودکشی سے کم نہیں۔

تو پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟ اس کے حل ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہند و پاکستان کی حکومتیں اور عوام یہ فیصلہ کر لیں کہ اقلیتوں کے جان و مال اور ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت ایک ایسا مقدس فرض ہے جسے دونوں ملکوں کے تعلقات سے کوئی واسطہ نہیں یہ فرض تو بہر حال ادا کیا ہی جائے گا۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے دونوں اسے تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستان نے تو اپنے دستور کی رو سے اقلیت اور اکثریت میں کوئی فرق رکھا ہی نہیں۔ بلا تفریق سب کے بنیادی حقوق کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اب رہا پاکستان گو اس کا دستور ابھی تک نہیں بنا لیکن قائد اعظم مرحوم سے کر لیاقت علی خاں صاحب اور صوبوں کے وزیروں تک ہر شخص بار بار کہہ چکا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ نہ صرف انصاف بلکہ فیاضانہ سلوک کیا جائے گا۔ پھر دونوں ملکوں کی باہمی کانفرنسوں میں کئی بار اس قسم کے سمجھوتے ہو چکے ہیں کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص بورڈ بنائے جائیں گے۔ اور ان کے مشترک اجلاس ہوتے رہیں گے لیکن افسوس ہے کہ ان فیصلوں پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ اب بنگال کے فسادات نے جو بحرانی صورت پیدا کر دی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر اس قسم کا سمجھوتہ کیا جائے اور اس پر فوراً عمل شروع ہو جائے اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ پانچ اشخاص کا ایک مستقل بورڈ بنایا جائے جن میں پاکستان اور ہندوستان کی طرف سے دو دو ممبر ہوں اور پانچواں بورڈ کا صدر ہو جو ایک سال پاکستان سے اور ایک سال ہندوستان سے لیا جائے یہ بورڈ جہاں تک ممکن ہو ہائی کورٹ کے سابق ججوں پر مشتمل ہو جن کے ناموں پر دونوں حکومتیں متفق ہوں۔ اس کا مستقل قیام چھ مہینے دہلی میں اور چھ مہینے کراچی میں رہے۔ لیکن ضرورت کے وقت یہ ہر حصے میں جا سکے اس بورڈ کا کام یہ ہو کہ اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی کرتا رہے۔ ان کے بارے میں دونوں حکومتوں کو مشورہ دیتا رہے اور جب کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا ہو تو اس کی تحقیقات کر کے ایک مستند بیان شائع کرے تاکہ مفسدوں کو افواہیں پھیلانے کا اور عام لوگوں کو بے جا قیاس آرائی کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس تجویز پر عمل ہو تو ان غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا سدباب ہو جائے گا، جو فرقہ وارانہ فسادات کا باعث ہوتی ہیں۔

جناب محمد خاں صاحب شہاب لکھتے ہیں:۔
مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب نئی روشنی، تسلیم
۲۴ فروری ۱۹۵۰ء کے نئی روشنی میں شیخ عبد القادر صاحب مرحوم کے بارے میں جو بیان درج ہے اس میں ایک غلطی ہے یہ بیان کہ شیخ صاحب نے "مخزن" ولایت سے آ کر جاری کیا درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ صاحب نے گریجویٹ ہونے کے بعد کچھ دن انگریزی اخبار "آبزرور" کی ادارت کی۔ اس کے بعد لاہور سے "مخزن" جاری کیا۔ اس وقت مخزن کے سرورق پر شیخ صاحب کا نام صرف شیخ عبد القادر بی اے لکھا ہوا تھا یعنی جب مخزن جاری ہوا ہے وہ بیرسٹر نہ تھے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

ریلوے بجٹ اور عام بجٹ

آئندہ سال کے ریلوے بجٹ کے بارے میں عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ اس میں تین کروڑ روپیہ ریل کے مسافروں کو مزید سہولتیں بہم پہنچانے کی غرض سے رکھا گیا ہے اور یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اس کا بہت بڑا حصہ تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن عام بجٹ کے متعلق بہت شدید اختلاف ملتے ہیں۔ اس پر تو سب خوش ہیں کہ پچھلے سال خسارہ توقع سے بہت کم یعنی صرف پونے چار کروڑ ہوا اور اس سال ۳ ارب ۴۹ کروڑ ۱۹ لاکھ آمدنی کے مقابلے میں خرچ کا اندازہ ۳ ارب ۴۷ کروڑ ۸۸ لاکھ ہے یعنی ایک کروڑ ۳۱ لاکھ بچت کی امید ہے۔ یہ بھی بہت غنیمت سمجھا جا رہا ہے کہ کوئی نئے ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، لیکن اس بات پر صنعتی سرمایہ داروں اور اونچی آمدنی والوں کے چھوٹے سے طبقے کے سوا سب کو سخت اعتراض بلکہ رنج اور شکایت ہے کہ جتنی رعایتیں کی گئیں وہ سب اسی چھوٹے سے طبقے کے ساتھ کی گئیں یعنی کاروباری نفع پر جو ٹیکس اب تک تھا وہ منسوخ کر دیا گیا کمپنیوں کے ٹیکس میں تخفیف کر دی گئی اور ۱۰ ہزار سے ۲۵ ہزار تک آمدنی رکھنے والوں کے ٹیکس کی شرح گھٹا دی گئی۔ عام لوگوں کے ساتھ بظاہر یہ رعایت ہوئی کہ مقامی خطوں کا محصول آدھا، پوسٹ کارڈ کا دو تہائی کر دیا گیا۔ اور تار اور دور کے ٹیلیفونوں کی فیس میں کمی کر دی گئی لیکن ظاہر ہے کہ مقامی خط صرف بڑے شہروں کے لوگ لکھتے ہیں اس لئے اس کی شرح کم کرنے کا فائدہ صرف ان ہی کو پہنچے گا۔ اسی طرح تار اور دور کے ٹیلیفون سے بھی غریب آدمیوں کو بہت واسطہ پڑتا ہے اور اس کا محصول کم ہونے کا ان کے بجٹ پر بہت خفیف اثر پڑے گا۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے ان رعایتوں کا جو دولت مندوں کے ساتھ کی گئیں یہ جواز ہے کہ وہ صنعتوں میں زیادہ روپیہ لگائیں گے جس سے پیداوار بڑھے گی، اور مہنگائی کم ہوگی لیکن اول تو اس طبقے کے پچھلے رویے کو دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کہ یہ بغیر بھرپور منافعے کے جو آج کل نہیں مل رہا ہے کارخانوں میں زیادہ روپیہ لگائے گا۔ دوسرے ایسا ہوا بھی تو اس کا اثر مہنگائی پر ایک مدت میں جا کر پڑے گا۔ حالانکہ غریب طبقے کے کندھوں پر جس میں مزدور کسان اور نچلے متوسط طبقے کے لوگ شامل ہیں اس وقت ایسا ناقابل برداشت بوجھ ہے جسے فوراً ہلکا کرنے کی ضرورت ہے۔

معاشی منصوبہ بندی

نیشنل پلاننگ کمیشن کے ممبروں کے نام پڑھ کر خوشی ہوئی۔ موجودہ حالات میں یہ انتخاب بہت غنیمت ہے خصوصاً پنڈت نہرو کا صدر اور شری گلزاری لال نندا کا نائب صدر مقرر ہونا ہر طرح قابل اطمینان ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شری نندا کا درجہ منسٹر آف اسٹیٹ کا ہوگا اور وہ اپنے عہدے کا چارج ۲۰ مارچ تک لے لیں گے۔ شری آر کے پاٹل نے بھی فوڈ کمشنر کی حیثیت سے تھوڑے ہی دن میں وہ شہرت اور امتیاز حاصل کر لیا ہے کہ ان سے بھی منصوبہ بندی کے کام میں بیش بہا امداد ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ نندا کا محکمہ ان کی خدمات سے محروم ہو جائے گا۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اگر ایسا معاشی منصوبہ بن بھی جائے جو ہندوستانی عوام کے مرض کا علاج ہو سکتا ہے تو ہماری حکومت جو معاشی اصلاح یا ترقی کے میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے کمیشن کے بنائے ہوئے منصوبوں کو عمل میں بھی لا سکے گی۔

(ع، خ)

پاکستان

مشرقی بنگال کا فساد اور حکومت پاکستان

مشرقی بنگال کے فسادات کے بارے میں ابھی تک قابل اعتماد خبریں نہیں آئی تھیں۔ اس لئے کہ وہاں کی حکومت نے سخت سنسرشپ قائم کر رکھی تھی۔ ہندوستانی اخباروں کے نمائندوں کو تو ان سہولتوں سے بھی محروم کر دیا گیا تھا جو اخبار نویسوں کو عام طور پر دی جاتی ہیں۔ ہندوستانی حکومت کے سخت احتجاج کے بعد اب یہ پردہ ہٹا ہے اور خبریں آنی شروع ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد زیادہ تر صوبے کے جنوبی اور جنوب مشرقی حصے میں ہوا۔ باقی صوبے میں ڈھاکہ شہر اور سلہٹ سے متصل علاقے کے سوا سب اضلاع محفوظ رہے صوبے کی حکومت نے عام طور پر اس فتنے کو دبانے کی کوشش کی لیکن مقامی افسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جیسے دیناج پور کے مجسٹریٹ جن کی اشتعال انگیز تقریروں پر فساد کی ذمہ داری براہ راست عائد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے اخبارات نے اور ریڈیو نے مغربی بنگال کے فرقہ وارانہ ہنگامے کے بارے انتہا سے زیادہ مبالغہ انگیز خبریں شائع کر کے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اور زیادہ بھڑکایا چنانچہ اب لیاقت علی خاں صاحب نے بھی یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کلکتے میں مقتولوں کی تعداد کے بارے میں جو خبر پاکستان ریڈیو، ڈان اور دوسرے اخباروں نے شائع کی وہ غلط تھی اور اس کے بھیجنے والے کو سزا دی جائے گی۔ خود لیاقت علی خاں صاحب بھی اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے مشرقی پاکستان کے افسوس ناک فسادات کے بارے میں بہت بے توجہی اور غفلت سے کام لیا اور پنڈت نہرو نے امن قائم کرنے کے لئے جو تجویزیں پیش کیں ان کو ایک ایک کر کے رد کر دیا۔ اب لیاقت علی خاں صاحب کچھ ڈھیلے پڑے ہیں، اور انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بہت جلد مشرقی پاکستان جا کر بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کی کوشش کریں گے۔ ۳۰ مارچ کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مشرقی بنگال میں فساد رک گیا ہے۔ لیکن اقلیت اس قدر خوف زدہ ہو چکی ہے کہ اس کو اطمینان دلانے اور عام ہجرت کو روکنے کے لئے غیر معمولی کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ مقامی حکومت کے علاوہ حکومت پاکستان کو بھی اپنی ساری توجہ اس کی طرف مبذول کرنا چاہئے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب مشرقی بنگال میں بہت اثر رکھتے ہیں۔ اگر وہ وہاں جا کر دل و جان سے اقلیت کی دل جوئی کی کوشش کریں تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

شاہ ایران کی آمد

ہز میجسٹی شاہ ایران یکم مارچ کو کراچی پہنچے اور ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ معلوم ہوا ہے کہ ہز مجسٹی پہلے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کریں گے اس کے بعد مشرقی بنگال کی تشریف لے جائیں گے۔ اس سفر کے مقصد کے بارے میں پاکستان کے بعض اخبار لکھتے ہیں کہ حکومت پاکستان شاہ کو بیچ میں ڈال کر افغانستان سے مصالحت کی بات چیت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ خود ایران کے تعلقات افغانستان سے اچھے نہیں ہیں۔ وہ شاہ کی آمد کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان اور ایران کی دوستی کے مظاہرے سے افغانستان پر دباؤ ڈالا جائے بہرحال تہہ کے اندر جو کچھ بھی ہو سطح کے اوپر ہز مجسٹی اور خواجہ ناظم الدین کی تقریروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جلیل القدر مہمان محض اس لئے تشریف لائے ہیں کہ اپنے ہمسایہ ملک سے دوستی کے رشتے کو مضبوط کریں۔ ابھی چند روز ہوئے ایران اور پاکستان میں دوستی اور تجارت کا معاہدہ ہو چکا ہے اور اب شاہ پاکستان کے حکمرانوں سے شخصی ملاقاتوں کے ذریعے اس معاہدے پر مہر توثیق ثبت کر رہے ہیں۔

(ع، ح)

کشکول

علامہ چوروبٹ میں علمیت کوٹ کوٹ کر اور ٹھونس ٹھونس کر بھری ہے مگر جیسے بعض پہلوانوں کا چور بدن ہوتا ہے کہ دیکھنے میں کیا ٹٹولنے میں بھی پتہ نہیں چلتا اسی طرح چوروبٹ کا چور علم ہے۔ کیا مجال جو کوئی ان کی صورت شکل، وضع قطع، چال ڈھال بات چیت سے یہ بھانپ لے کہ یہ شخص لکھا پڑھا ہے۔ یہ تو ہوئی دماغی قابلیت، اب رہا دل تو وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سینے میں ایک گوشت کا لوتھڑا تو ضرور ہے جو ٹک ٹک کرتا رہتا ہے، مگر جذبات تو اور نہ ہوں - ان تلوں تیل ہی نہیں۔ چہرے پر ایسی دردناک فقاہت برستی ہے کہ دیکھ کر ترس آتا ہے۔ یہ ہیئت گذائی کچھ انھوں نے خود بنائی، کچھ خود بخود بن گئی۔ ڈاڑھی کو انھوں نے کچھ نہیں کیا صرف چھوڑ دی اور بالوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، آپ ہی آپ بڑھ گئے۔ ہاں ماتھے پر شکنیں ڈالنے اور آنکھوں میں وحشت پیدا کرنے میں کچھ کوشش ضرور کرنی پڑی۔ نہانا تو ظاہر ہے، اہل علم کی شان کے خلاف ہے اس لئے کپڑے بھی چہرے اور ڈاڑھی کی طرح میلے رہتے ہیں۔ غرض ہمارے علامہ بٹ سر سے پاؤں تک ایک ہی ٹال کے معلوم ہوتے ہیں۔

بے خیالی، جسے انگریز بے ادبی سے "غائب دماغی" کہتے ہیں اہل علم کا طرۂ امتیاز ہے۔ بھلا چوروبٹ صاحب میں کیوں نہ ہوتی؟ یہ تو ایک ادنیٰ سی بات ہے کہ قرض لے کر بھول جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ بھولے سے ایک ہی آدمی سے کئی کئی بار مانگ لیتے ہیں اور جب ایک مرتبہ مانگ بیٹھے تو اپنی اور اس کی عزت کے خیال سے لے ہی کر چھوڑتے ہیں۔ اسی "غائب دماغی" کا کرشمہ ہے کہ علامہ اکثر عالم وحشت میں آبادی کے ان حصوں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں فیشن ایبل کافی ہاؤس، سینما اور اسی قسم کی لغویات واقع ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ ان مقامات پر علامہ کو اپنے قرض پذیر دوست آشنا نظر آجاتے ہیں جن سے وارفتگی کے عالم میں قرض کا سودا ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان میں سے کوئی آگے چل کر علامہ کو یہ دادو ستد یاد دلانا چاہے تو وہ اس کی طرف کھوئی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جو زبانِ حال سے کہتی ہیں ؎

تھا خواب میں خیال کہ تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کبھی کبھی چوروبٹ کا عمل قرض اتنا زیادہ لاشعوری واقع ہوتا ہے کہ انھیں کیا اس غریب کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی جس پر یہ عمل کیا جاتا ہے۔ نقدی، گھڑی، فاؤنٹین پن وغیرہ اس کی جیب یا میز سے علامہ کی جیب میں اور وہاں سے چور بازار میں نہ معلوم تحت الشعور کے کس زمین دوز راستے سے پہنچ جاتا ہے۔ مالک کو جب پتہ چلتا ہے کہ اس کا مال غائب ہے تو وہ بہت تلملاتا ہے اور نامعلوم چور کو صلواتیں سناتا ہے مگر عالمانہ ظرف کا کیا کہنا! علامہ چوروبٹ کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ ان کے دوست کا مال جاتا رہا تو ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔

علامہ کی علمی تحقیقات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ زیادہ تر معاشیات سے تعلق رکھتی ہے اور عام طور پر وہ اتنی مجرد ہوتی ہے کہ الفاظ میں بیان ہی نہیں کی جا سکتی لیکن ان کا ایک نظریہ مشہور ہے جو گردش زر سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر زر اپنی گردش کے سلسلے میں کسی خاص نقطے مثلاً نقطہ الف سے گذرے تو اس کی مجموعی مقدار میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اور یہ محض نظریہ نہیں بلکہ عملیہ ہے۔ اس لئے کہ علامہ نے خود نقطۂ الف بن کر دیکھا ہے۔ ہمیں ان پر بڑا رشک آیا ہے، اور یہ دعا مانگا کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی نقطۂ الف بن جاتے اور زر کا بہاؤ ہمارے ہاتھ سے گذر جایا کرتا۔

(کچھ حصہ شنکرس ویکلی سے ماخوذ)

غزل

اثر لکھنوی

تو مجھ سے جدا لاکھ ہو کب دل سے جدا ہے
آئینۂ تصویر بھی تصویر نما ہے

جو ان میں جلا آگ میں اپنی ہی جلا ہے
دل سوختۂ شیوۂ اربابِ وفا ہے

اوراقِ گلِ تازہ شگفتہ پہ نظر کر
سب ایک ہیں گو ایک سے ایک ان میں جدا ہے

ہر آن بدلتا ہے نیا رنگ زمانہ
اس رخ کی ہوا ہے کبھی اس رخ کی ہوا ہے

نیرنگِ حقیقت کو بیاں کرتے ہیں یوں بھی
ہر ساز کے پردے میں وہی ایک صدا ہے

باوصف ادب لازمۂ پاکیٔ نگاہی
نظارہ مچلتا ہوا اُس رخ سے پھرا ہے

کھلتے ہیں مصیبت میں ہی انسان کے جوہر
اے مردِ خدا خوش ہو اگر وقت پڑا ہے

غفلت کا ٹھکانا ہے کوئی قافلے والو
نیند آتی ہے سن کر جسے وہ سوز درا ہے!

جس منزلِ تسلیم کا سودا ہے اثر کو
اس راہ کا اے خضر غبار آبِ بقا ہے

غزل

سید اختر علی تلہری

ہیں گلہ سنجِ تباہی غمزۂ قاتل سے کم
کس قدر نا آشنا ہیں ذوقِ اہلِ دل سے ہم

پھول بہار رنگ و بو مانگیں کسی محفل سے ہم
خود چمن بھی ہیں چمن آرا بھی ذوقِ دل سے ہم

پھونکتے جاتے ہیں ذرے ذرے میں روحِ طرب
زندگی لے کر چلے ہیں آپ کی محفل سے ہم

حسن تو آمادۂ جلوہ فروشی تھا مگر
رہ گئے الجھے ہوئے خود پردۂ محمل سے ہم

اب یہ اپنا اپنا دل ہے، اپنا اپنا حوصلہ
دور ہو گرداب سے تم، دور ہیں ساحل سے ہم

تھی نگاہیں تو کرم گستر مگر اب یہ نہ پوچھ
کیا خیال آیا کہ اٹھ آئے تری محفل سے ہم

تیرے اک جلوے نے آنکھیں کھول دیں اے برقِ حسن
گرہی ہیں تھے فریبِ دانشِ باطل سے ہم

ہے خزاں بھی اب نگاہوں میں چمن بندِ بہار
جلوے لے کر وہ اٹھے ہیں آپ کی محفل سے ہم

راستے میں خود فریبی کی وہ دلکش منزلیں
جلوہ گاہِ ناز تک پہنچے بڑی مشکل سے ہم

انجمن ہے دہر کی تاریک تو کچھ غم نہیں
ضو اسے بخشیں گے اختر جلوہ ہائے دل سے ہم

آزادی کی زنجیریں

پانچواں باب

ظفر میر مظفر حسن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ماں کا انتقال ہو گیا اور والد کے ساتھ اپنے وطن دریا پور میں رہتا ہے۔ اسی سال اس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ اس کے والد پہلے تو اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے اُسے کالج میں پڑھانے پر تیار نہ تھے لیکن ظفر کے قابل اور ہمدرد ہیڈ ماسٹر شیو دیال کے سمجھانے اور یہ بتانے پر کہ اسے بڑا سا وظیفہ بھی مل جائے گا وہ الہ آباد کالج میں اُسے بھیجنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ظفر بہت خوش ہے اور مستقبل کے رنگین خیالات میں غرق۔ مگر جب جانے کے دن قریب آتے ہیں تو ماضی کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ اپنی چاہنے والی ماں کی یاد، باپ کی جدائی، وطن کی دوری سے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ ہردیال کے ساتھ الہ آباد روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں ایک مولانا اور ایک [illegible] کا ساتھ ہوتا ہے اور سفر مزے سے کٹ جاتا ہے۔

(قسط ۱۰)

نئے آدمیوں کا سامنا ظفر کے لئے بڑی تکلیف دہ چیز تھی۔ جیسا کہ معلوم ہوا کہ الہ آباد میں اکرام اللہ صاحب کے ساتھ رہنا ہے [illegible] فکر تھی کہ خدا جانے یہ اکرام اللہ کس قسم کے آدمی ہوں گے۔ [illegible] کہ وہ [illegible] کے سربراہ کار ہیں وہ ان [illegible] سے کچھ بدظن سا ہو گیا تھا کیونکہ اپنے والد کی تحصیلداری کے زمانے میں اس نے بہت سے زمینداروں اور ان کے کارندوں کو دیکھا تھا اور ان میں سے اکثر نے ان کے اوپر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ ریاست کے سربراہ کار سے اس کی طرح یاد تھے لمبے چوڑے آدمی، چڑھی ہوئی داڑھی، سرخ آنکھیں [illegible] تھے، ہنٹر ہاتھ میں رکھتے تھے اور ذرا سے قصور پر [illegible] کو مارتے پیٹتے [illegible] میر صاحب ان کی شکایتیں سن سن کر اس [illegible] ہوئے تھے کہ ان کے زنانے کو کہہ کر انھیں برطرف کر دیا تھا۔ لہٰذا اکرام اللہ کا کچھ اسی قسم کا تصور اس نے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ مگر اسٹیشن پر انھیں دیکھا تو بالکل مختلف پایا۔ [illegible] درمیانی جسم کے مضبوط اور پھرتیلے [illegible] ان کی پیشانی پر [illegible] تیز چمکدار آنکھیں [illegible] میں پہنچے ہوئے اسٹیشن سے گھر پہنچتے پہنچتے ان میں اور ہردیال میں اس طرح باتیں ہونے لگیں جیسے برسوں کی ملاقات ہو اور ظفر کو بھی ان سے وحشت نہیں رہی۔

نواب صاحب کی کوٹھی اونچی کرسی پر دو منزلہ تھی۔ دونوں بازوؤں میں گول برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل نیچے کی منزل سے چھوٹی تھی اور ادھر ادھر چوڑی کھلی چھت تھی جس کے سرے نیم دائرے کی شکل کے تھے۔ اس لئے دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک جہاز کھڑا ہوا ہے۔ احاطہ بہت وسیع تھا جس کے بڑے حصے میں پھلدار اور سایہ دار درختوں کے قطعے تھے۔ بیچ کے حصے میں یعنی کوٹھی کے آس پاس کوئی چالیس پچاس گز تک پھولوں کا باغ تھا جس کی چمن بندی بڑے سلیقے سے کی گئی تھی۔ احاطے کے شمال مغربی کونے میں کوٹھی سے بہت دور اکرام اللہ کا بنگلہ تھا جس میں ایک بڑا اور چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اب تک وہ اس میں تنہا تھے۔ ان کے بیوی [illegible] نواب صاحب کے علاقے میں شرافت گنج قصبے میں ان کی بیوہ [illegible] والدہ کے ساتھ رہتے تھے

اور اکرام اللہ مہینے میں دو بار تین چار روز کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے مہمانوں کے لئے داہنے بازو کے دو متصل کمرے جن میں غسل خانہ مشترک تھا رکھے تھے۔ گول کمرے کو بیٹھنے اور کھانے کا کمرہ کر لیا تھا۔ داہنے بازو کے ایک کمرے کو جو در اصل کھانے کا تھا دفتر اور دوسرے کمرے کو جس کے ساتھ غسل خانہ تھا اپنی خواب گاہ بنا لیا تھا۔ ظفر اور ہردیال کو اپنے کمرے بہت پسند آئے۔ ہر کمرے میں صاف ستھری دری بچھی تھی۔ دیوار میں بنی ہوئی کتابوں کی الماری، ایک میز، دو کرسیاں، ایک اسٹول اور ایک ہلکی نواڑ کی چارپائی تھی۔ ہردیال نے اکرام اللہ سے کہا "آپ نے تو ہم دیہاتیوں کے ٹھہرنے کا ایسا انتظام کیا ہے جیسے ہم اچھے خاصے بڑے آدمی ہوں۔ مگر آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ یہ کیوں نہ کیجئے کہ ہم دونوں کو دونوں کا ایک کمرہ دے دیجئے اور یہ دوسرا آپ لے لیجئے۔"

اکرام اللہ۔ تم بڑے استاد معلوم ہوتے ہو۔ آئے ہی سب [illegible] کمرہ [illegible] نہیں بھائی یہ دو کمرے [illegible] میر صاحب کو یہاں رہنے پر کسی طرح راضی [illegible] انھیں دیہات ہی میں رہنا پسند ہے۔

ہردیال۔ پھر بھی اگر کوئی مہمان آ گیا تو دقت ہوگی۔

اکرام اللہ۔ نواب صاحب کے مہمان تو کوٹھی میں ٹھہرتے ہی ہیں، اب اپنے مہمانوں کو بھی وہیں ٹھہرایا کروں گا۔ تم دونوں کو مطالعے کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے، اگر مہمان یہاں ٹھہرے تو تمھارا حرج ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ جیسے میں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ گپ شپ میں ضائع کیا تم بھی کرو۔ میر مظفر حسن صاحب نے مجھے تاکید کی ہے کہ تم دونوں [illegible] خصوصاً ظفر کی بڑی سخت نگرانی رکھوں اور تمھیں نصیحت کرتا رہوں۔ نگرانی وگرانی، نصیحت فضیحت کا تو میں قائل نہیں اور نہ مجھ سے ہو سکتی ہے البتہ اپنی طرف سے یہ کوشش کروں گا کہ تمھیں کام کرنے کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاؤں۔

ہردیال۔ بہت مناسب ہے میں تو بڑا نیک سعادت مند لڑکا ہوں، میرے لئے نگرانی کی ضرورت ہی نہیں، رہے ظفر اُن کی نگرانی میں کرتا رہوں گا۔

اکرام اللہ۔ (ہنس کر) اس میں کیا شک ہے۔ مگر نیک سعادت مند دوسروں کی نگرانی کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس میں خاص طور پر نیک اور سعادت مند بھرتی کئے جاتے۔ اچھا اب تم لوگ نہا دھو کر آرام کرو، چائے پر ملاقات ہوگی۔

ظفر اور ہردیال نے ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمرے میں اپنا سامان ترتیب سے رکھا۔ کتابوں کو نکالنے اور رکھنے میں خاصی دیر لگی۔ اتنے میں آدمی نے کہا کہ چائے تیار ہے۔ اور انھیں اپنا کام ناتمام چھوڑ کر جانا پڑا۔ چائے کے دوران میں اکرام اللہ دونوں مہمانوں سے میر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی خیریت پوچھتے رہے۔ دیال ہائی اسکول اور اس کے استادوں کا ذکر آیا۔ اکرام اللہ اسکول کے پرانے طالب علم تھے۔ جب اسکول قائم ہوا تو نویں درجے میں داخل ہوئے تھے اور میٹرک وہیں سے پاس کیا تھا۔ وہ اسکول کی پرانی باتیں سناتے رہے۔ ہردیال نے پوچھا "اسکول کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم آپ نے یہیں حاصل کی تھی؟"

اکرام اللہ۔ ہاں جو کچھ حاصل کی وہ یہیں کی۔ کیا یونیورسٹی تو اس وقت تک محض ایک امتحان لینے والی جماعت تھی۔ فرسٹ ایر [illegible] سکستھ ایر تک سب درجوں کی تعلیم کالج میں ہوتی تھی۔ میں فرسٹ ایر میں میور سنٹرل کالج میں داخل ہوا اور سکنڈ ایر تک وہیں پڑھا۔

ظفر۔ سنا ہے میور کالج بڑا اچھا کالج تھا۔

اکرام اللہ۔ کیا کہنا ہے۔ ایسا کالج اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ کالجوں کے بجائے پڑھانے والی یونیورسٹیاں ہیں جن میں بڑے پیمانے پر مشینوں سے ڈھل ڈھل کر گریجویٹ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا [illegible] ہو مگر مجھے تو وہ میور کالج والی بات یونیورسٹی میں نظر نہیں آتی۔ اول تو داخلے میں بڑی سختی تھی، عام طور پر فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے میٹریکولیٹ داخل کئے جاتے تھے۔ دوسرے استادوں کے آپس میں اور شاگردوں سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ہر طالب علم کو استادوں کی [illegible] سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ ان کی صحبت سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ اکثر لڑکے پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے اور اب آدمیوں کا جنگل ہے جس میں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ استادوں میں پارٹیاں ہیں، انتظامی جماعتوں میں پارٹیاں ہیں۔ پڑھنے والوں کو کھیل سے واسطہ نہیں، کھیلنے والوں کی ایک الگ ٹولی بن کر رہ گئی ہے۔

ہردیال۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے جہاں ہزاروں طالب علم اور سینکڑوں استاد ہوں، وہاں وہ بات کیسے ہو سکتی ہے جو تھوڑے سے منتخب لڑکوں کے کالج میں۔ جب تک اعلیٰ تعلیم پانے والے تھوڑے سے تھے ایسی درس گاہیں ہو سکتی تھیں، اب دسیوں کالج قائم کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔

اکرام اللہ۔ ہاں، ہاں میں جانتا ہوں کہ جمہوریت کا زمانہ ہے، اور جمہوریت کی ساری خوبیاں اور خرابیاں تعلیم گاہوں میں آ گئی ہیں۔ مگر کم سے کم

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

کیا آپ کو پڑھنا آتا ہے؟

عبدالحلیم ندوی

آپ کہتے ہوں گے، کیا خوب۔ ارے صاحب پڑھنا نہ آتا تو آپ کا نئی روشنی کیوں جاری کراتے۔ اچھا تو اس مضمون کو پڑھنے سے پہلے ذرا گھڑی دیکھ لیجئے پھر اپنی معمولی رفتار سے اس مضمون کو پڑھنا شروع کر دیجئے۔ جب پورا مضمون ختم ہو جائے تو یہ دیکھئے کہ کتنی دیر میں آپ نے اسے پڑھ لیا۔ اس کے بعد اس مضمون کے الفاظ کو گن کر انھیں ان منٹوں سے تقسیم کر دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ نے ایک منٹ میں کتنے لفظ پڑھے۔ جب یہ کر چکئے تو آخر میں جو سوالات دیئے گئے ہیں ان کے جوابات ایک پرچے پر لکھ جائیے اور انھیں ہمارے جوابات صفحہ ۹ سے ملائیے۔ اس سے آپ کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے گا کہ واقعی آپ کو پڑھنا آتا ہے کہ نہیں۔ اور یہ کہ جو کچھ آپ پڑھتے ہیں اس میں سے کتنا سمجھ لیتے ہیں۔

عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تیز پڑھنے کے مقابلے میں دھیرے دھیرے اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے سے مضمون اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے اور معنی خوب ذہن نشیں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں۔ رک رک کر پڑھنے سے آدمی کو جگہ جگہ ٹھیرنا پڑتا ہے اور اس سے مضمون کی اکثر اہم چیزیں دماغ سے نکلتی جاتی ہیں، اور جو یاد بھی رہتا ہے وہ آدھا تہائی اور ادھورا سا۔ وجہ یہ ہے کہ پڑھنے میں آنکھ اور دماغ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ اب اگر آپ کی آنکھ الفاظ کو رک رک کر دیکھتی ہے تو لازمی ہے کہ جملہ بھی کٹا کٹا سا دماغ میں آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کٹے جملوں کو جوڑنے اور ان سے پورا مفہوم بنانے میں دماغ کو دیر لگے گی۔ کیونکہ مفہوم تو اسی وقت سمجھ میں آئے گا جب جملہ پورا ہوگا۔ مثلاً لفظ "ایک" ہے اگر اسے آپ الگ لکھیں تو اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اسی طرح "گرمی" کا لفظ بھی تنہا، کوئی خاص معنی نہیں دیتا۔ "کی" کے بھی کوئی معنی نہیں۔ جب تک اسے کسی اور لفظ سے نہ ملائیے۔ پھر "شام" کو بھی آپ الگ کر کے رکھ دیں تو یہ بے کار ہے۔ لیکن ہم اگر انھیں ان الگ الگ ہونے والے لفظوں کو ایک کڑی میں پرو کر پورا جملہ بنا دیں تو یہی سب مردہ الفاظ جان دار ہو جائیں گے۔ جیسے "گرمی کی ایک شام کو"۔

"نورمان لوئیس" کا جو مطالعے کے فن کے ماہر ہیں، کہنا ہے کہ "پڑھنا بھی بہت اہم فن ہے جسے ہمیں سیکھنا چاہیئے اور اسے اچھی طرح برتنے کی مشق کرنی چاہیئے" کیونکہ اس کی ہمیں ملازمتوں اور پڑھنے لکھنے کے کاموں میں بڑی ضرورت پڑتی ہے۔

امریکہ میں ۹۰ فی صدی پڑھے لکھے لوگوں میں سے صرف ۲۰ فی صدی لوگ مطالعے کے عادی ہیں۔ مگر ان کو اچھی طرح پڑھنے کا گر نہیں معلوم۔ پھر جو کچھ یہ لوگ پڑھتے ہیں وہ محض تفریحی چیزوں، معمولی خبروں اور مرنے جینے کے اعلانوں تک محدود ہوتا ہے۔ اس سے عقل میں جلا پیدا ہوتی ہے، اور نہ معلومات میں اضافہ برخلاف ان تفریحی چیزوں کے، علمی، ادبی، اقتصادی اور اجتماعی قسم کے مضامین پڑھے جائیں تو آدمی کی علمیت کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور پوری طرح سے مطالعے کا فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ یہی حال طالب علموں کا بھی ہے جس طالب علم کو مطالعے اور پڑھنے کا گر آتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہتا ہے بلکہ زندگی میں بھی پوری طرح کامیاب رہتا ہے۔

پڑھتے وقت آنکھیں حروف کے ساتھ حرکت کرتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سمجھ بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ لیکن جملے کا پورا مفہوم سمجھ میں اس لئے آتا ہے جب ہم پڑھتے پڑھتے اپنی پلک جھپکائیں اور اس حرکت میں ایک سیکنڈ کا صرف پچیسواں حصہ صرف ہوتا ہے۔ مگر جسے پڑھنے کا گر نہیں آتا اس کی آنکھ ہر جملے کے بعد ٹھہر جاتی ہے۔ برخلاف اس کے فن مطالعہ کا عالم پوری سطر میں صرف دو بار زائد سے زائد تین بار اپنی آنکھ جھپکاتا ہے۔ "تھیوڈور روز ویلٹ" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اتنی تیزی سے پڑھتا تھا کہ ایک بیٹھک میں پوری کتاب بلکہ کبھی کبھی دو کتابیں ختم کر ڈالتا تھا۔ اور اس طرح کہ پورا مضمون اور ساری اہم باتیں اس کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھیں۔ تیز پڑھنے میں اس نے اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ صرف ایک اچٹتی نظر میں پوری پوری سطر پڑھ لیتا تھا۔ چنانچہ جب کوئی کتاب پڑھنے بیٹھتا تو شروع صفحے سے آخر تک صرف ایک پھسلتی سی نظر ڈالتا جاتا اور بیچ میں جتنے جملے، ضمیریں، عطف اور اسی قسم کے دوسرے حرفوں کو جو جملوں کو جوڑتے ہیں چھوڑتا جاتا۔

مطالعے میں سست رفتاری عموماً زور زور سے، یا بدبدا کر پڑھنے یا نرخرے سے آواز نکالنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ زور سے پڑھتے ہیں یا نہیں تو پڑھنے کے دوران میں اپنے ہونٹوں کو ہلکے سے چھوئیے اگر ہونٹ نہ ہل رہے ہوں تو ٹھوڑی کے نیچے نرخرہ چھوئیے اگر یہ ہلتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ آپ مطالعے کے دوران میں زور زور سے پڑھتے ہیں آواز سنائی دے یا نہ دے اور اس سے آپ کے مطالعے کی رفتار سست ہوتی ہے۔ اور نفس مضمون بھی اچھی طرح ذہن نشیں نہیں ہوتا۔

تیزی کے ساتھ پڑھنے کے علاوہ جو کچھ آپ پڑھتے ہیں اس پر ذہن کو مرکوز رکھنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ آپ مصنف کے خیالات، افکار، تشریح اور توضیح میں اس کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔

مطالعے کے ماہروں کا اس پر اتفاق ہے کہ الفاظ کے ذخیرے کی کمی بھی دیر سے پڑھنے اور مشکل سے سمجھنے کا ایک بڑا سبب ہے کیونکہ جتنی دیر آپ لغت دیکھ کر لفظ کے معنی معلوم کرنے میں لگائیں گے کتاب سے آپ کے ذہن کا تعلق ختم ہو جائے گا، اور اس میں آپ نے جو کچھ پڑھا ہے خبط ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے ہر مشکل لفظ کو ڈکشنری میں دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جملہ ختم ہونے کے بعد مشکل لفظ خود بخود ذہن میں آ جائیں گے، اور پھر اس طرح ہر وقت لغت دیکھنے سے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ نہیں ہوتا وہ تو کثرت مطالعہ اور زیادہ کتب بینی سے بڑھتا ہے۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو زیر مطالعہ کتاب کے موضوع کے ابتدائی اصول اور بنیادی باتیں نہیں معلوم ہوتی ہیں تو اس کا اثر بھی اس کے پڑھنے کی رفتار اور سمجھ پر خاصا پڑتا ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ جب اس قسم کے کسی موضوع پر پڑھا جائے تو مطالعے کے درمیان میں کہیں کہیں رک جانا چاہیئے تاکہ جو نئی باتیں اس کتاب میں آئی ہیں وہ اچھی طرح ذہن میں بیٹھ جائیں لیکن اگر کوئی ناول یا لمبا قصہ ہے تو اس میں اس اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ بعض مناظر کے بھول جانے یا بعض کرداروں کے کسی خصوصیت کے ذہن سے اتر جانے سے قصے کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اچھا آپ کو پڑھنا کس رفتار سے چاہیئے؟ ابتدائی مدرسوں کے بچے جو پڑھتے ہیں وہ ایک منٹ میں تقریباً دو سو الفاظ پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن آپ کے لئے خصوصاً اخبار اور رسائل پڑھنے کے لئے یہ رفتار بالکل موزوں نہیں ہے۔ ہائی اسکول کے لڑکے اگر ایک منٹ میں تین سو الفاظ پڑھ لیں تو ان کے لئے بہت ہے لیکن یونیورسٹیوں کے طلبا کے لئے چار سو لفظ فی منٹ معیار ہے۔ اگر ان کی رفتار اس سے کم ہے تو ان کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی طرح بعض کام ایسے ہیں جن میں بہت تیزی سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے کام کرنے والے چھ سو لفظ فی منٹ نہ پڑھ پائیں تو اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔

حالیہ تجربوں سے پتہ چلا ہے کہ سست پڑھنے والے کوشش کریں تو اپنی رفتار ۵۰ فی صدی تک بڑھا سکتے ہیں بشرطیکہ ہر جملے پر رکیں نہیں اور جو کچھ پڑھ رہے ہیں اس پر اپنا ذہن مرکوز کر لیں اور اپنے الفاظ کے ذخیرے اور معلومات عامہ کو بڑھالیں اور سب سے بڑی شرط یہ کہ زور زور سے نہ پڑھیں۔

اچھا صاحب! آپ نے مضمون تو پڑھ لیا اب ذرا گھڑی تو دیکھئے کہ کتنے منٹ لگ گئے ہیں اب اس مضمون کے الفاظ کو ان منٹوں سے تقسیم

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

تھکا ہارا مسلم نوجوان اور اس کا مستقبل

مسیح الحسن رضوی

اگر آپ کے خوابوں کا تاج محل اڑا ڑا دھم کر کے زمین پر آ رہے، آپ کی اُمید نااُمیدی میں بدل جائے، آپ نے مستقبل سے جو توقعات قائم کر رکھی ہوں وہ ایک ایک کر کے جواب دے جائیں تو آپ کی کیا کیفیت ہو گی؟

اگر ان باتوں کا جواب مل جائے تو ہم آج کے مسلم نوجوانوں کی ذہنی ہل چل کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ آج کا یہ نوجوان چڑچڑا ہے، مایوسی کا شکار ہے اس کی زندگی میں کوئی اٹل عقیدہ نہیں رہ گیا ہے۔ گذشتہ دس پندرہ برس میں اس نے جس عقیدے کو پال پوس کر جوان کیا تھا، وہ عقیدہ اس سے روٹھ گیا ہے اور اب سرحد پار بیٹھا اس کا منہ چڑا رہا ہے۔ وہ نئے عقیدوں کو قبول کرنے ڈرتا ہے لیکن اس کے مزاج پر جمہوری رنگ غیر شعوری طور آہستہ آہستہ چڑھ رہا ہے۔ جب یہ رنگ ایک بار چڑھ جائے گا تو وہ اتنا گہرا ہو گا کہ وہ خود اگر آئینے میں اپنے خد و خال دیکھے گا تو مسکرا مسکرا پڑے گا۔ چونکہ یہاں جمہوری مزاج کی بات نکل آئی ہے اس لئے یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی سرے سے جمہوری مزاج پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ اگر ملک میں یہ جمہوری مزاج موجود ہوتا تو مسلم نوجوان کے قلب ماہیت کا عمل ذرا تیز ہو جاتا۔

اب تو یہ حال ہے کہ مسلم نوجوان کا سگا بڑا بھائی اس سے اسی طرح روٹھا ہوا ہے جس طرح ایک خاندان میں جائداد کے بٹوارے کے بعد دو مال جائے بھائی ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ چھوٹا بھائی (میرا مطلب مسلم نوجوان سے ہے) بڑے بھائی کی طرف ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھاتا ہے بڑا بھائی ہے کہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور اگر بات کرتا ہی ہے تو اس کا لب و لہجہ ایسا تند ہوتا ہے جو اس چھوٹے بھائی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ جاتا ہے اور "تو کی نمی دانم" چیخ اٹھتا ہے، یہ مایوسیاں خدا کی پناہ! بڑے بھائی کا یہ حال اور اپنا یہ حال ہے کہ ابھی تقسیم کی تلوار کی ضرب سے بدن کانپ اٹھتا ہے۔ دو سال ہی اوپر کی تو بات ہے گھر میں چہل پہل محلے میں گہما گہمی، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں رونق ہر طرف زندگی، چلتی پھرتی متحرک زندگی۔ اور اب وہ محبوبۂ عذرا جس سے منگنی ہوئی تھی راولپنڈی میں ہے بہن آنکھوں میں آنسو بھرے ایک دن گھر بھر کو اپنے پیارے پیارے نازک ہاتھوں سے آداب کرتی ہوائی جہاز پر سوار ہو کر لاہور چلی گئی۔ دوست احباب بچھڑ گئے اور

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

اور اب وہاں سے خطوں میں لکھتے ہیں کاش یہ نئی سرحدیں ختم ہو جاتیں، یہ تقسیم کی دیوار منہدم ہو جاتی۔ ہمارا یہاں دل نہیں لگتا۔ لوگ اجنبی، ماحول اجنبی، نہ لکھنؤ کی گلیاں اور نہ حضرت گنج۔ نہ دلی کی رنگینیں، نہ چاندنی چوک، نہ جامع مسجد کی سیڑھیاں۔

جب یہ تھکا دینے والی مایوسیاں ہوں، نامرادیاں ہوں تو زندگی میں کیا خاک دل لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشرمیٹ کے طالب علموں نے داڑھیاں رکھ لیں۔ کچھ نوجوان جماعت اسلامی کا رکن بن اللہ اللہ کرنے لگے۔ جنھوں نے داڑھیاں نہیں رکھائی تھیں انھیں یہ شکایت ہے کہ ملازمت نہیں ملتی۔ جمہوریت کے نام پر ملازمت کے دروازے ان پر بند کر دئے گئے ہیں۔ بابا جان نے دسواں پاس کر کے ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی تھی لیکن بیٹے کو کلرکی نہیں ملتی۔ ذرا سیاسی قسم کے بڑے بوڑھے مشورہ دیتے ہیں نوکری نہیں ملتی تو تجارت کرو، کوئی ان سے یہ پوچھنے والا نہیں کہ حضرت ذرائع پیداوار جب ایک طبقے کی ذاتی ملکیت ہوں تو کیا نوکری کیا تجارت ہمارے لئے سب دروازے بند ہیں اور اسی لئے یہ مسلم نوجوان ان دور کی لانے والے بزرگوں کے مشورے پر عمل نہیں کر پاتا بس گھر پڑے پڑے اخبار پڑھتا ہے سگریٹ پیتا ہے، کتابیں الٹتا پلٹتا ہے اور شام کو پرانا سوٹ پہن کر کسی تیسرے درجے کی فلم دیکھنے کے لئے چلا جاتا ہے اور جب زندگی کی اس یکسانی سے گھبرا جاتا ہے تو اپنے پاکستانی عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھ کر امکانات کے متعلق دریافت کرتا ہے وہاں سے جواب آتا ہے چلے آؤ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ابھی اس خط پر اچھی طرح غور بھی نہیں کر پاتا ہے کہ کسی نیتا کے نرم اور شیریں الفاظ کا شربت اس کے دل کو ٹھنڈک پہنچا دیتا ہے اور پھر وہ اُمید و بیم کے دوراہے پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یادش بخیر! ایک طبقہ ہمارے علمائے کرام کا ہے، جو اسے مشورہ دیتا ہے کہ خدا کے تصور کو مضبوطی سے پکڑے رہو بیڑا پار ہو جائے گا اب بھلا اُن سے یہ پوچھنے کی کس کو ہمت ہے کہ مولانا آپ نے اپنی جماعت کی سرگرمیوں کو جو تہذیبی حدود کے اندر مقید کر دیا ہے تو اس سے مسلمانوں کی دنیاوی فلاح کس طرح ہو سکے گی؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تہذیبی سرگرمیاں زندگی سے بے تعلق رہ سکتی ہیں؟ واللہ ناممکن، قطعی ناممکن۔ حضور آج تہذیب کی تسبیح کھڑکھڑانے سے نہ مسلمان کا بھلا ہو سکتا ہے اور نہ انسانیت کا۔ یہ بے چارا مسلمان غلط مذہبی نظریات کو قبول کر کے آج اس حالت کو پہنچا ہے۔ اس کی مزید بربادی کا سبب نہ بنئے۔ آپ اپنی تحریک کو شاہ ولی اللہؒ کی انقلابی تحریک سے وابستہ کرتے ہیں۔ انھوں نے تو مارکس کی مشہور تصنیف "کمیونسٹ مینی فسٹو" سے ایک صدی پہلے کہا تھا۔ "انسانوں کی دہقانی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری چیز ہے"۔

آپ اسے بار بار حکومت کا وفادار رہنے کا فرمان کیوں دیتے ہیں؟ آپ کے اس مشورے سے اس میں تازگی نہیں تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وفادار رہنے کے لئے موافق حالات کا پیدا ہونا اولین شرط ہے۔ جب حالات ناسازگار ہوں تو

"وفا کیسی، کہاں کا عشق......"

آپ موافق حالات پیدا کرنے کی کوشش کیجئے وفاداری کا سوال ہی نہیں آئے گا۔ جب کھانے کو روٹی ہو گی پہننے کو کپڑا ہو گا۔ رہنے کے لئے مکانات ہوں گے تو عوام خود بخود مطمئن ہو جائیں گے، اور یاد رکھئے کہ مسلم نوجوان عوام سے الگ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر ایک طبقہ سیاسی شعور رکھنے والے ذرا معمر قسم کے نوجوانوں کا ہے۔ یہ طبقہ ان لوگوں کا ہے جو غیر منقسم ہندوستان کی سیاست میں جمہوری تحریکوں کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنوں کی گالیاں کھائی تھیں۔ لیکن بات وہی کہتے رہتے تھے جس کو وہ حق سمجھتے تھے۔ آج وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے ہیں کہ جن لوگوں کے ساتھ رہ کر انھوں نے حق کو حق اور ناحق کو ناحق کہا تھا وہ آج ناحق کو حق کہہ کر پکار رہے ہیں۔ ان لوگوں نے قوم کے نام پر ایک ایسی زبان استعمال کی ہے جس سے ملک میں آگے کی مزید ناانصافیوں کے شدید امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک قوم ایک کلچر کا نعرہ دے کر ملک کے رجعت پسند عناصر کو طاقت کا انجکشن دے دیا ہے۔ وہ ایک ایسا سماجی نظام لانے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں جس میں بے شک بھارت کی ساری برائیاں تو ہوں لیکن بیسویں صدی کی برکات نہ ہوں۔ مسلم نوجوانوں کا یہ طبقہ چونکہ عوامی تحریکوں سے ذرا قریب رہا ہے۔ اس لئے وہ حالات سے اتنا مایوس نہیں ہے۔ یہ طبقہ موجودہ حالات پر زہرخند کی حیثیت رکھتا ہے جس کا موجودہ تاریخ کو جواب دینا ہے۔

ہمارے اس مسلم نوجوان کو لاڈلے بیٹے سے تشبیہ دینا صحیح ہو گا۔ لاڈلا بیٹا بچپن میں ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ شعور کو پہنچتا ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف ماں باپ ہی نہیں ہوتے ہیں۔ دوست ہوتے ہیں، دشمن ہوتے ہیں، اچھا چاہنے والے ہوتے ہیں، برا چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ انکشاف اس میں ایک قسم کا احساس کمتری پیدا کر دیتا ہے مسلم نوجوان کی بجنسہ یہی حالت ہے۔ کل تک ملک میں جس قسم کا سماجی نظام قائم تھا اس نے اسے لاڈلا بنا رکھا

منیڈک بنا رکھا تھا۔ وہ سیاسی تحریکوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن اس کا الگ پلیٹ فارم ہوتا تھا۔ اس پلیٹ فارم سے جن تقریروں کو اس نے سنا تھا انھوں نے اُسے یہ سکھایا تھا کہ تم دنیا میں سب سے اچھے ہو، دوسرے بُرے ہیں چنانچہ اس کا اثر اس پر بالکل وہی ہوا تھا جو لاڈ سے بچے پر ماں کی بے جا شفقت کا ہوتا ہے۔ وہ بالکل ایک بچے کی طرح اپنے کو دوسرے بچوں سے اچھا سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ایکا ایکی حالات نے پلٹا کھایا اور اس [illegible] تخیل کی گنگا [illegible] روشنی [illegible] حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔ اب جس ساحل پر آ کر وہ لگا تھا۔ اس پر رہنے والے اس کے لئے اجنبی تو نہ تھے لیکن دوست بھی نہیں تھے۔ اب وہ ہر چند چاہتا ہے کہ وہ اس شناسائی کو دوستی میں بدل دے، لیکن یہاں کے رہنے والے دوستی کے لئے عجیب عجیب شرطیں رکھتے ہیں۔ یہ شرطیں بڑی ٹیڑھی ہیں۔ وہ ان کو قبول نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ مایوسی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعض دانشور قسم کے لوگ نصیحت کے دفتر کھول کر اس کی اس مایوسی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے مشورہ دیتے ہیں کہ دیکھو تم نے گذشتہ برسوں میں بڑی غلط قسم کی ذہنیت کو قبول کر لیا تھا۔ تم نعرے لگاتے تھے ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کے لیں گے ہندوستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان۔ اب اس کا یا تو تم نتیجہ بھگتو یا "کان پکڑ کر" توبہ کرو کہ تم نے بہت برا کیا تھا۔ آئندہ کبھی اس قسم کی حرکتیں نہ کرو گے۔ اس قسم کی نصیحتیں کرنے والے یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ملک میں گذشتہ تیس برس میں جو ذہنیت پیدا ہوئی تھی اس کا صرف یہ مسلم نوجوان شکار نہیں ہے ہندو نوجوان بھی اس قسم کے نعروں کا پروردہ ہے۔ پھر ہم اس غریب کو کیوں مطعون کریں۔ پھر اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے آپ اس قسم کا پراپیگنڈا کر کے مسلم نوجوان کی خودداری کو کیوں مجروح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے معاشرہ کی پس منظر کی وجہ سے اس قسم کی ذلت کو کسی طرح قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکے گا۔ ملک میں جب صحیح سیاسی ماحول پیدا ہو گا تو اس قسم کی تلخ یادیں کرخود بخود محو ہو جائیں گے۔ فی الحال تو ایسی باتیں کرنا سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا ہے۔ پھر یہ مایوسی گھر کے باہر ہی نہیں ہے جب وہ حالات سے گھبرا کر فرار کرتا ہے تو گھر کے محدود ماحول میں بھی اسے سکون میسر نہیں آتا ہے۔ اس کے گھر کا نقشہ گذشتہ جنگ عظیم سے پہلے کچھ بدلنے لگا تھا۔ جنگ کے افراط زر نے جہاں اسے تھوڑا بہت فائدہ پہنچایا تھا وہ جنگ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ اور اب وہ اور اس کا خاندان سخت معاشی کش مکش میں مبتلا ہے۔ جب وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کا رخ کرتا ہے تو اسے یہاں سے وہ سبق ملتا ہے جو معاشیات کی بڑی بڑی کتابیں بھی اُسے نہ دے سکتی تھیں۔ بوڑھی ماں بیمار ہے، بہن کنواری ہے اس کا ہو پاک [illegible] نہیں کسی مہاجر لڑکی سے بیاہا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں لڑکے میسر نہیں ہیں اور جو کچھ بچے کھچے لڑکے ہیں ان کی حالت اس سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ یہاں سے وہ انقلابی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مارکس کا نام لیتا ہے۔ لینن اور اسٹالن کی باتیں کرتا ہے۔ اب ماوزے تنگ کا بھی ذکر کرنے لگا ہے لیکن چونکہ وہ محض جذباتی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ سائنسی نہیں ہوتی ہے۔ وہ کافی ہاؤس میں جا کر یونیورسٹی کے پروفیسروں، مصنفوں، شاعروں، اخبار کے ایڈیٹروں اور کالم نویسوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور یہ باور کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ انقلابی ہے، [illegible] اب انقلاب ہوا اور اب انقلاب ہوا۔

اگر کوئی ذرا زیادہ حساس ہوا (اور ان کی کمی نہیں) تو وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے جلسوں [illegible] شرکت کرتا ہے۔ سگریٹ چھوڑ کر پائپ پینا اور [illegible] لینا شروع کر دیتا ہے۔ ان نظموں میں وہ انقلاب کی اسی طرح تعریف کرتا ہے جس طرح اب سے دس پندرہ برس پہلے جوش ملیح آبادی نے کی تھی ...... ہیبت ناک ڈراؤنا اور خوفناک جو اپنے منہ سے آگ اگلتا اور زندگی کی اچھی بری قدروں کو روندتا چلا جاتا ہے اور اگر افسانے لکھنے پر آ گیا تو طوائف کی جنسی بے راہروی میں اپنے بیمار نفس کی تسکین [illegible] کرتا ہے۔

اس کے بعد چھوٹے چھوٹے شہروں کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے علی گڑھ، لکھنؤ، الہ آباد اور ملک کی دوسری درس گاہوں میں اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ یہ ایک خاص ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان لوگوں نے اعلیٰ تعلیم تو ضرور پائی ہے، لیکن چونکہ ان کا تعلق قصباتی زندگی کے جاگیردارانہ نظام [illegible] رہا ہے۔ اس لئے اب یہ دبتے دبتے شہروں [illegible] کر پھر اس نظام کی چکی میں پس رہے ہیں۔ خانہ زمین کا عفریت ان کے سامنے اپنا بھیانک منہ کھولے کھڑا ہے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا مضمون ہے۔ یہ لوگ چھوٹے موٹے کاروبار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اپنے شہر یا قصبے سے قریب بڑے شہر آ کر ہوٹل اور ریسٹوران کھولنے کی تجویز دل پر غور کر رہے ہیں جن کے یہاں کی زمینداریاں مہاجن کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں جا کر شکار کھیلتے ہیں۔ ان میں سے بعض ترقی کر کے گاؤں پنچائتوں کے ممبر بھی بن گئے ہیں۔ اس طبقے کے نوجوانوں کی حالت بڑی قابل رحم ہے۔ خان بہادر والد کھدر پوش بن گئے ہیں بیٹا نہ کھدر پہن کر خوش اور نہ سوٹ پہن کر مطمئن۔ وہ بھی اب غور کر رہا ہے کہ ان تبدیل شدہ حالات میں کیا کرے۔ حج کرنے چلا جائے یا رنجاں رنج قسم کی سیاست میں پڑ کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن لڑانے لگے۔ غرضیکہ یہ مسلم نوجوان حالات کی مجبوری سے مذہبی ہے، کمیونسٹ ہے، احد خاں خال نیشنلسٹ اور سوشلسٹ بھی ہے۔ لیکن ابھی اس کے اندر کا انسان سویا ہوا ہے جب وہ بیدار ہو گا تو وہ حالات سے مطابقت پیدا کر کے زندگی کی جدوجہد میں ایک مرد غازی کی طرح کود پڑے گا۔ پھر چاہے وہ کسی سیاسی پارٹی میں ہو، ملک کے لئے ایک سرمایہ ہو گا۔ اس وقت یہی کیا کم ہے کہ اس نے حالات کو ان کے صحیح پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ دس پندرہ سال کا نشہ دو سال کی قلیل مدت میں اُتر جانا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ آج اس کی ایک ایک قیمتی چیز اس سے جدا ہو گئی ہے۔ میر و غالب کے نغمے اس سے چھین لئے گئے ہیں۔ اسے سوشل زندگی میں ایک وحشی حیوان سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کے پڑوسی اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔ اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں اس کا ذکر کر کے ہنستے ہیں۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن اسے یہ بات یاد آنی چاہئے کہ ۱۹۴۷ء کے حیوانی دور میں بھی انسانیت کی ننھی ننھی قندیلیں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ جل رہی تھیں۔ جب انسان حیوان ہو گئے تھے اس وقت بھی انسانوں کی کمی نہیں تھی۔ انسانیت امر ہے۔ انسان نہیں مرا ہے۔ وہ زندہ ہے، اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگر مسلم نوجوان میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے تو اس کی بگڑی بن سکتی ہے۔ اسے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی محرومیوں کا سبب یہ نہیں ہے کہ ملک آزاد ہو گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ملک میں ابھی وہ پرانا نظام قائم ہے جس میں معاشی آزادی کا فقدان ہے۔ معاشی آزادی کے مطالبے کی بھی ابتدا ہو چکی ہے۔ ملک میں ترقی پسند تحریکیں شدت اختیار کرتی جاتی ہیں۔ سنگھ اور مہاسبھا کی رجعت پسند تحریکوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ میں جب کبھی نئی جماعتیں زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرانے کے لئے اٹھی ہیں تو ان کے پہلو بہ پہلو رجعت پسند طاقتوں نے بھی سر اٹھایا ہے۔ آخر [illegible] کامیابی ترقی پسند تحریکوں کو ہو گی۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے، لیکن آخری کامیابی کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس دو سال کے عرصے میں مسلم نوجوانوں کو جن جن محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ان کو عوامی راج کی برکتیں ایک ایک کر کے واپس کر دیں گی۔ میر و غالب کے نغمے نئے شاعروں کی نظموں میں جنم لیں گے۔ [illegible] کی اودھ کی شامیں پھر ہنگامہ آرا ہوں گی۔ اس کی محبوبہ شادی سے دلہن بن کر واپس آئے گی بہن کے آنسو مسرت کی خوشیوں میں بدل جائیں گے۔

لیکن عوامی راج کا خواب صرف خواہش کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے مسلم نوجوانوں کو کچھ نہ کچھ کرنا بھی ہو گا۔ پہلا کام تو انھیں یہ کرنا ہے کہ وہ مایوسی کی اس دلدل سے باہر نکل آئیں اور مستقبل سے پر اُمید ہو جائیں۔ جب وہ اپنی اس نفسیاتی الجھن پر قابو پائیں گے تو زندگی کا مقصد ان کے سامنے واضح اور صاف ہو جائے گا۔ پھر اس کے بعد ماحول کا صحیح جائزہ لینے اور اپنی منزل مقصود متعین کرنے میں آسانی ہو گی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنا چاہئے وہ ایک بہت خطرناک مشورہ دیتے ہیں۔ سیاست کو زندگی سے کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عوامی دور میں سیاست چند ممتاز افراد کا تفریحی مشغلہ نہیں رہ گئی ہے۔ اب ہر بالغ کو ووٹ دینے اور اپنی پسند کا نمائندہ چننے کا پہلی مرتبہ حق مل رہا ہے

مسلمانوں بھی یہ حق مل رہا ہے۔ انھیں اپنی بکھری ہوئی سیاسی طاقت کو یکجا کرنا چاہیے اور بلا خوف و خطر ان سیاسی جماعتوں سے اشتراک عمل کرنا چاہیے جو بہتر نظام زندگی قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

مسلم نوجوان اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں انھیں یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ مستقبل کو بنانے میں آج کے سیاست دانوں کا ہاتھ اتنا نہیں ہوگا جتنا ان کا ہوگا۔ وہ کل کے سیاسی اور معاشی ڈھانچے معمار ہیں۔ اس یقین کو لے کر مسلم نوجوانوں کو اٹھنا چاہیے اور ملک کے دوسرے ترقی پسند عناصر سے اشتراک عمل کر کے رجعت پسند طاقتوں کا ہر ہر مورچہ پر جم کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر انھوں نے اس طرح فتح کا عزم لے کر قوم کے کارواں کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھا لیا تو مستقبل ان کا ہے۔

اس سلسلے میں نوجوانوں کے ساتھ ان لوگوں کی ذمہ داریاں بھی تھیں جو اس وقت اپنے کو مسلمانوں کا لیڈر کہتے ہیں کتنے مسلمان لیڈر ہیں جنھوں نے ہمدردی سے ان نوجوانوں کی ضروریات پر توجہ کی ہے۔ کہنے کو بڑے بڑے مسلمان لیڈر اس وقت بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ لیکن وہ جب بھی ان مسلم نوجوانوں کو خطاب کریں گے تو آدرش کی زبان میں۔ افسوس کی بات ہے کہ ان میں کسی نے بھی مسلمانوں اور خصوصاً اس کے نوجوان طبقہ کی بپتا پر غور نہیں کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو نوجوان طبقہ کی موجودہ حالت کی ذمہ داری ان ہی لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں اس لیے وہ ان کو کوئی مفید مشورہ نہیں دیتے ہیں۔ اور اگر مشورہ دینے کی توفیق بھی ہوتی ہے تو ایسی فرسودہ زبان میں مشورہ دیتے ہیں جو سر سید مرحوم کے زمانے کے لئے تو درست کہی جا سکتی تھی لیکن آج کے حالات میں یہ مشورہ کسی طرح ٹھیک نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ریاست کے سیکولر آئیڈیل کا یہ مطلب کسی طرح کر سکتا کہ آپ ریاست میں بسنے والے ایک فرقے کی ضروریات ہی کو محسوس نہ کریں اور ملک کے معاشی ڈھانچے سے آنکھیں بند کر کے مسلمانوں کو تجارت اور کاروبار کرنے کا مضحکہ خیز مشورہ دینا شروع کر دیں۔

در اصل ان لوگوں کا فرض تھا کہ حالات کے ساتھ بہنے کے بجائے مسلمانوں کی اب تک سیاست کا جائزہ لیتے اور اس کے بعد سوچ سمجھ کر کوئی راہ متعین کرتے۔ اتحاد و ترقی کا اگر نام لیا تھا تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا اس کے لئے وہ مستقبل کی تاریخ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ مسلم نوجوان ان کی وجہ سے خسارہ میں کیوں رہے؟ کیوں نہ وہ ملک میں بڑھتے پھیلتے پھولتے نظریوں کو اپنا کر موجودہ نسل کا مستقبل سنوار دے؟

جوابات

(۱) غلط (۲) صحیح (۳) غلط (۴) غلط (۵) صحیح (۶) ۶۰ فیصدی (۷) ۳۵ فیصدی (۸) غلط (۹) غلط (۱۰) فورمان لوئس۔

آزادی کی زنجیریں

(بسلسلہ صفحہ ۵)

کوشش تو کرنا چاہیے کہ خوبیاں ہوں، خامیاں نہ ہوں۔

ہردیال۔ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ظفر۔ آپ نے ایف اے کرنے کے بعد میور کالج کیوں چھوڑ دیا؟

اکرام اللہ۔ ایف اے کس کم بخت نے پاس کیا ہمارے بھائی میری داستان بڑی افسوسناک ہے کسی وقت تمھیں سناؤں گا۔

ہردیال۔ زحمت نہ ہو تو اسی وقت سنا دیجئے۔ پتاجی کہتے تھے کہ آپ اسکول کے بہترین طالب علم تھے اور میٹرک کے امتحان میں ساری یونیورسٹی میں سیکنڈ آئے تھے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ نے ایف اے پاس کئے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ کیا مالی دشواریاں تھیں؟

اکرام اللہ۔ مالی دشواریاں کہاں مجھے تو مالی آسانیوں نے مارا۔ میرے والد صاحب نواب صاحب کی ریاست کے منیجر تھے۔ روپے کی ریل پیل تھی مجھے دل کھول کر جیب خرچ دیتے تھے۔ بچپن میں انھوں نے میری تربیت اتنی سختی سے کی کہ مجھے اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دربار ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اس وقت بھی گو کھانے پہننے میں کوئی کمی نہ تھی۔ مگر جیب خرچ کے نام ایک پیسہ بھی نہیں ملتا تھا جسے میں اپنی مرضی سے صرف کر سکتا۔ جب کالج میں آیا اور مسلم ہوسٹل میں داخل ہوا تو انھوں نے اپنی شان جتلانے کے لئے یہ چاہا کہ میں امیروں کے لڑکوں کی طرح رہوں ایک تو سترہ برس کی قید سخت کے بعد آزادی ملی اور اوپر سے خرچ کرنے کا روپیہ۔ پھر کیا تھا! کھل کھیلا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میور کالج میں اکثر لڑکے پڑھائی اور کھیل میں یکساں دلچسپی رکھتے تھے مگر میں ان میں سے نہ تھا۔ میری طبیعت پڑھائی کے جبر سے اکتا گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کچھ دن خوب عیش کروں۔ چلنے کا یہاں ماحول نہ تھا مگر صفدر رزمی اور یار بیتی پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میں نے کھیلوں میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ پہلے ہی سال کرکٹ اور ہاکی دونوں کی فرسٹ الیون میں آ گیا، اور دوسرے سال دونوں کا کیپٹن ہو گیا۔ پریکٹس میچ، پارٹیاں، دعوتیں اپنی ٹیموں کے ساتھ دور دور کے سفر اس پر طرہ یہ کہ شاعری کا شوق جو مجھے بچپن سے تھا ابھر آیا۔ شعر کہنے کی دردسری میرے بس کی نہ تھی مگر شعر سننے کی لت پڑ گئی۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ لکھنؤ اور آس پاس کے شہروں کا کوئی مشاعرہ مجھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھائی برائے بیت رہ گئی اور حاضریاں بھی کم ہو گئیں۔ اس لئے امتحان میں شرکت کی اجازت ہی نہ ملی۔ والد صاحب کو میری آوارہ گردیوں کی خبر ہی نہ تھی۔ وہ اس امید میں تھے کہ میں ایف اے میں بھی یونیورسٹی میں پوزیشن لاؤں گا۔ انھیں جب اصل واقعہ معلوم ہوا تو بس کچھ نہ پوچھو۔ قیامت آ گئی۔ اگر غصہ سچ مچ آگ ہوتا تو میں جل کر راکھ ہو گیا ہوتا مختصر یہ کہ انھوں نے میری تعلیم کا سلسلہ قطع کر دیا۔ اور مجھے اپنی نگرانی میں ریاست کے انتظام کا کام سکھانا شروع کر دیا۔ دو برس بعد انھوں نے میری شادی کر کے ایک اور بھاری زنجیر میرے پاؤں میں ڈال دی، اسی سال ان کا انتقال ہو گیا اور نواب صاحب نے از راہ عنایت مجھے ایک علاقے کا سربراہ کار مقرر کر دیا۔ تم دونوں کو میری داستان سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ میں ناصح مشفق نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے کہتا ہوں۔

ہردیال۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کا حال کچھ ایسا قابل عبرت تو نہیں معلوم ہوتا۔ آپ یہاں ملازم کی طرح نہیں بلکہ مالک کی شان سے رہتے ہیں۔

اکرام اللہ۔ یہ سچ ہے کہ نواب صاحب مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں معمولی سربراہ کاروں سے دگنی تنخواہ دیتے ہیں۔ دیہات کے ایک علاقے اور شہر کی جائداد کے انتظام میں انھوں نے مجھے اختیارات دے رکھے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ تین سال بعد جب موجودہ منیجر اپنی ڈپٹی کلکٹری پر واپس جائیں گے تو مجھے منیجر بنا دیں۔ مگر پھر بھی میں اس زندگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ تمھیں تھوڑے دن میں معلوم ہو جائے گا کہ میں جو اتنا خوش نظر آتا ہوں یہ خوش دلی نہیں بلکہ محض خوش مزاجی ہے۔ خیر اب اس ذکر کو چھوڑو، چلو تمھیں شہر کی سیر کرا دوں۔ کالج کھلنے میں دو دن باقی ہیں، مگر میں تمھیں پرنسپل صاحب سے ملا دوں تاکہ ان سے گفتگو کر کے اپنے مضامین طے کر لو، کورس کی کتابیں اور ضرورت کی سب چیزیں خرید لو۔ ورنہ پھر جہاں کالج کی چکی چلی پھر مشکل سے موقع ملے گا۔

ظفر۔ چلئے۔

بگھی تیار کھڑی تھی۔ اکرام اللہ دونوں لڑکوں کو لے کر روانہ ہو گئے

(باقی آئندہ)

کیا آپ کو پڑھنا آتا ہے؟

(بسلسلہ صفحہ ۶)

کر لیجئے۔ اس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ آپ نے ایک منٹ میں کتنے لفظ پڑھے۔ پھر نیچے دیئے ہوئے سوالات کے جواب دیجئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مضمون دوبارہ نہ دیکھئے اس سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ سمجھ کتنا لیتے ہیں ہر صحیح جواب کے نمبر ۱۰ ہیں۔ اگر آپ ۷۰ یا اس سے زیادہ نمبر حاصل کر لیتے ہیں تو سمجھئے کہ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں سے اکثر سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر نمبر کم ہیں تو آپ کو رفتار بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور ذہن کو مرکوز کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

یہ صحیح ہے یا غلط؟

۱۔ تیز پڑھنے والا اکثر چیزیں بھول جاتا ہے۔
۲۔ سست پڑھنے کا ایک سبب ذخیرہ الفاظ کی کمی ہے۔
۳۔ زور زور سے پڑھنے سے معنی مطلب اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں
۴۔ تھیوڈور روزولٹ ایک نظر میں پورا صفحہ پڑھ لیتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

اقبال اور عربی شعرا

یہ مضمون میرے فاضل دوست ڈاکٹر باقر علی ترمذی استاد عربی اسمٰعیل کالج کی فرمائش اور تحریک پر لکھا گیا ہے۔

ابراہیم ڈار

(۱)

اقبال ہمیشہ عجمیت کے مخالف اور عربیت کے دلدادہ رہے۔ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے ادبی نقطۂ نظر سے حافظ پر بڑی سخت نکتہ چینی کی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے صوفیانہ حلقوں میں غصہ اور ناپسندیدگی کی لہر دوڑ گئی اور خواجہ حسن نظامی اور مولوی ظفر علی خاں کے درمیان اختلافِ خیال نے نہایت ہی ناخوش گوار صورت اختیار کر لی۔ اقبال کے نقطۂ نظر کے خلاف اور موافق بہت کچھ لکھا گیا۔ اگرچہ شاعر اپنی رائے پر سختی سے قائم رہا تاہم اس نے جمہور کی رضا مندی کی خاطر حافظ والا حصہ دوسرے ایڈیشن سے خارج کر دیا، اور اس خلا کو پر کرنے والے اشعار میں ادب کی صحیح قدر و قیمت جانچنے کا معیار پیش کیا۔ اقبال گلشنِ عجم میں زندگی کی بو نہیں پاتے اس لئے ایک ادیب یا شاعر کو ان کا مشورہ یہ ہے کہ وہ عجم کے چمن زار کی گل چینی ترک کرکے عرب کی زندگی بخش فضا سے فیضان حاصل کرے اور اپنا دل عرب کی سلمیٰ کے سپرد کر دے تاکہ شام کردے سے حجازی صبح نمودار ہو۔

فکر صالح در ادب می بایدت
رجعتی سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زارِ عجم گل چیدہ ای
نو بہارِ ہند و ایران دیدہ ای
اندکی از گرمیِ صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عجمیت سے اس درجہ بیزاری کے باوجود وہ فارسی شعرا کے حلقۂ اثر سے اپنے کو آزاد نہ کر سکے۔ برادر عزیز ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون "اقبال کے مرغوب فارسی شعرا" میں بڑی تحقیق اور قابلیت سے اقبال کے کلام پر فارسی شعرا کا اثر دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ مرشد رومی تو خیر زمینوں اور آسمانوں پر ان کے رہبر ہیں۔ پیر رومی کے علاوہ بیسیوں فارسی شاعر ہیں جن کے کلام سے اقبال نے استفادہ کیا ہے، اس کے مقابلے میں اقبال کے یہاں بانگ درا میں عربی شعرا کا اثر بہت کم ہے۔ یورپ جاتے ہوئے وہ "تہذیبِ حجازی کے مزار" سسلی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے چونکہ سسلی ایک مدت تک اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اس لئے اقبال اسے دیکھ کر اپنے دیدۂ خونبار کو دل کھول کر رونے کی دعوت دیتے ہیں، اس سرزمین کی مرثیہ خوانی کرتے وقت انھیں سعدی اور داغ یاد آ جاتے ہیں۔ سعدی نے خلافتِ بغداد کے زوال پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ دلی کی ویرانی پر داغ کا شہر آشوب کافی مشہور ہے، اگرچہ احساس کی صداقت شدتِ غم اور فوقیتِ تاثیر میں مولانا حالی کے مرثیۂ دہلی کی برابری نہیں کر سکتا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اس سلسلے میں غرناطہ کی یاد بھی اقبال کے دل میں چٹکی لیتی ہے اور بے اختیار ان کی زبان پر ابن بدرون کا نام آ جاتا ہے جس کے دلِ ناشاد نے بقول اقبال دولتِ غرناطہ کی بربادی پر فریاد کی تھی۔ ابن بدرون تنہا عربی شاعر ہے جس کا ذکر بانگِ درا میں ملتا ہے آئیے دیکھیں کہ یہ ابن بدرون کون تھا اور اس کا وہ کون سا ادبی شاہکار ہے جس نے اقبال کو اس درجہ متاثر کیا۔ ابن بدرون کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ وہ چھٹی صدی عیسوی کے ادبا میں سے ہے معجم المطبوعات میں اس کا پورا نام یوں دیا ہے :۔
الشیخ الامام الکاتب الوزیر ابو مروان عبدالملک بن عبداللہ بن بدرون الحضرمی الاشبیلی السبتی،
اس مختصر سے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں یمنی تھا جیسا کہ اس کی نسبت حضرمی سے ظاہر ہے لیکن اس کا تعلق زیادہ تر اشبیلیہ اور سبتہ کے شہروں سے رہا ہے اس لئے وہ اشبیلی اور سبتی بھی کہلاتا ہے اپنے زمانے کا مشہور ادیب تھا اور غالباً انشا پردازی کی بدولت منصبِ وزارت پر بھی فائز رہا۔ وہ ۵۶۰ھ تک زندہ تھا، اس کی شہرت کا تمام تر مدار اس شرح پر ہے جو اس نے عبدون کے شان دار قصیدے پر لکھی ہے۔ سب سے پہلے ہالینڈ کے نامور مستشرق ڈوزی نے ۱۸۴۶ء میں اس شرح کو شائع کیا۔ بعد میں یہ کتاب مصر میں بھی حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی ابن عبدون کا اصلی قصیدہ عبدالواحد مراکشی کی عربی کتاب "المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں دیا ہے جس کی اشاعت کا شرف بھی ڈوزی کو حاصل ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈوزی کو لائیڈن کے کتب خانے میں ملا جسے اس مستشرق نے پوری تحقیق اور محنت سے ۱۸۴۷ء میں لائیڈن سے شائع کیا۔ ابن عبدون کے دل ہلا دینے والے قصیدے کا شان نزول یہ ہے کہ بطلیوس کے [illegible] عمران جن کا مسند سلطنت پر جلوہ افروز تھا علم و فن کے بڑے قدردان تھے۔ عبداللہ بن افطس ... المظفر کے لقب سے سرفراز تھا۔ نحو، لغت، شعر، تاریخ اور دوسرے فنون میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا عمر جس نے اپنے لئے المتوکل علی اللہ کا لقب اختیار کیا ایک طرف بہادری اور شہسواری کے لئے شہرۂ آفاق تھا تو دوسری طرف نثر اور نظم میں بلند پایہ کا مالک تھا۔ یہ خاندان ۴۸۵ھ تک برسر حکومت رہا جب کہ مرابطین کے امیر یوسف بن تاشفین کے آدمیوں کے ہاتھوں عمر اور اس کے بیٹے فضل اور عباس بڑی بیدردی سے قتل کر دئے گئے۔ ابن عبدون جس کا اصلی نام عبدالمجید ہے اور جسے المراکشی "الکاتب الفاضل ذو الوزارتین" کہہ کر پکارتا ہے، بڑی مدت اس خاندان کے ساتھ وابستہ رہا، اس وابستگی کا لازمی نتیجہ وہ شاندار قصیدہ ہے جس کے طفیل اس نے بقائے دوام کے دربار میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے۔ المراکشی اس قصیدے کے محاسن کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا سوز و گداز اور رقت آمیز اسلوب ہر دردمند دل کے لئے تاثیر اور اضطراب کا پیغام ہے۔ قصیدہ البسامہ کے نام سے اور اس کی شرح طوق الحمامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن بدرون کے علاوہ بعض دوسرے علما نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابن عبدون نے پانچویں صدی ہجری کے آخری ربع میں قصیدہ کہا اور چھٹی صدی ہجری کے دوسرے نصف یا ساتویں صدی کے شروع میں ابن بدرون نے اس کی شرح تیار کی اور نویں صدی ہجری کے اختتام کے قریب وقت غرناطہ کی تباہی عیسائی حملہ آوروں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی۔

ایک جگہ شانِ حیدری کا مرحب و عنترہ کی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

لیکن مرحب و عنترہ کے ذکر سے محض اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بعض عربی بہادروں کے کارناموں سے واقف ہے۔

اس بات کا پتہ چلانا ذرا مشکل ہے کہ کہاں کہاں اقبال اور عرب شعرا کے خیالات میں توارد پایا جاتا ہے۔ بانگِ درا میں مجھے صرف ایک شعر ایسا ملا ہے جس کے بارے میں اس قسم کے شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ایک جگہ اقبال کہتے ہیں :۔

طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ
اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش

یہ خیال ایک عرب شاعر کے یہاں اس طرح پایا جاتا ہے۔

صدغ الحبیب وحالی
کلاھما کاللیالی

محبوب کی زلفیں اور میری حالت دونوں راتوں کی طرح سیاہ و تاریک ہیں۔ [illegible]

کے دوران میں معانی و بیان کے شائقین کے ملاحظہ سے یہ شعر ضرور گذرا ہوگا۔

اسرار خودی میں جہاں اقبال شعر و ادب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک معیار پیش کرتے ہیں وہاں وہ عربیت کی طرف لپٹنے کی ترغیب دلاتے ہوئے شیخ حسام الحق ضیاء الدین کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں۔ اَمسَیتُ کردیا و اَصبَحتُ عربیاً (شام کے وقت میں کرد تھا اور صبح کے وقت ایک عرب تھا)

رموز بیخودی کا یہ شعر:

رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

بوصیری کے اس شعر کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے چنانچہ ذیلی حاشیے میں اقبال نے اسے نقل بھی کیا ہے۔

لما دعی اللّٰہ داعینا لطاعتہ
بأکرم الرسل کنا اکرم الامم

(جب خدا تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو جو ہمیں اس کی طاعت کی طرف بلاتے ہیں۔ اشرف رسل کہہ کر بلایا ہے تو ہم اشرف امم ٹھہرے۔)

رموز بیخودی کے آخر میں اقبال رحمۃ اللعالمین کے حضور میں دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں:

اے بصیری را ردا بخشندہ
بربط سلما مرا بخشندہ

بوصیری ساتویں صدی ہجری میں مصر میں انتقال کرتے ہیں۔ ان کا اصلی وطن ابوصیر جس کی وجہ سے وہ بوصیری کہلاتے ہیں۔ ایک دفعہ بیماری کی حالت میں جبکہ فالج نے انھیں اپاہج بنا رکھا تھا انھوں نے رسالتمآب کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کے طفیل آں حضرت صلعم نے ایک چادر عنایت کی جس کی تاثیر سے بوصیری کو کامل شفا ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ "البردہ" کے نام سے مشہور ہے اور مسلمان اسے روحانی برکت کا سرچشمہ جان کر بڑے ذوق و شوق سے اس کے اشعار پڑھتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ ان متعدد شرحوں سے ہو سکتا ہے جو اس پر لکھی گئی ہیں۔ کئی شاعروں نے بوصیری کی تقلید میں قصیدے لکھے ہیں۔ دور حاضر میں مصر کے ملک الشعراء احمد شوقی کا قصیدہ "نہج البردہ" اس تقلید کی بین مثال ہے۔ نہج البردہ کی شرح جامع ازہر کے سابق شیخ سلیم البشری نے لکھی ہے۔

عہد جاہلیت کے حکیم شاعر زہیر کا بیٹا کعب بھی زبردست شاعر تھا۔ کعب کا بھائی بجیر حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ تاہم کعب رسول مقبول کی مخالفت میں ایک مدت تک سرگرداں رہا۔ آخر کار جب اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تو اپنا چہرہ ڈھانپے پیغمبر اسلام کی بارگاہ میں پہنچا اور آپ کی شان میں وہ قصیدہ پڑھا جو عام طور پر بانت سعاد (سعاد چلی گئی) کے نام سے مشہور ہے اور جس پر کئی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں۔ رسول مقبول کی تعریف کرتے ہوئے اس نے آپ کو شمشیر ہندی سے تشبیہ دی تھی۔

سیف من سیوف الہند مسلول
(ہندی تلواروں میں سے بے نیام شمشیر یعنی پیغمبر صلعم نے فوراً سیوف الہند کی اصلاح سیوف اللہ کے الفاظ سے کی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیہ آورد از بانت سعاد
در ثنایش گوہر شب تاب سفت
سیف مسلول از سیوف الہند گفت
آن مقامش برتر از چرخ بلند
نامدش نسبت با قلیمی پسند
گفت سیف من سیوف اللہ گوی
حق پرستی جز براہ حق مپوی

اس کے صلے میں رسول مقبول نے کعب کو ایک چادر عنایت کی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ نے اسے کعب سے خرید لیا اور بعد میں وہ اموی خلفاء کے پاس بطور تبرک رہی۔

پیام مشرق گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے اس لئے اس کتاب میں عربی شعراء کا اثر تلاش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ زبور عجم میں اقبال ایک غزل میں اس شعر کے پہلے مصرعے کو بڑی خوبی سے کھپاتے ہیں جو عام طور پر بنو امیہ کے دوسرے خلیفہ یزید کی طرف منسوب ہے:

انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راقی
ادر کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساقی

اس شعر کا دوسرا مصرعہ الفاظ کی ترتیب کے الٹ پھیر کے ساتھ خواجہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل کا مصرعہ ہے

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

یزید جیسے شخص سے مصرعہ مستعار لینے پر بعض لوگوں کی طرف سے حافظ پر اعتراض کیا گیا ہے۔ لیکن دوسروں نے شاعر کی حمایت اس بنا پر کی کہ اگر ایک کتا منہ میں لعل لئے جا رہا ہو تو کون ہے جو لعل چھیننے کے لئے اس کتے کے پیچھے نہ دوڑے گا۔ اس قسم کے بیہودہ اعتراض سے بے نیاز ہو کر اقبال زبور عجم میں کہتے ہیں:

دل گیتی انا المسموم انا المسموم فریادش
خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راقی

ایران جدید کے سب سے بڑے محقق ایرانی عالم میرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے رسالہ یادگار میں یزید کی طرف اس شعر کے انتساب کو غلط ٹھہرایا ہے۔ بہر حال اس شعر کا حقیقی مالک یزید ہو یا کوئی اور اس کی دلکشی و دلآویزی حافظ اور اقبال ایسے بلند پایہ شعراء کے التفات و توجہ کی مستحق ٹھہرتی ہے۔

جاوید نامے میں اقبال پیغمبر اسلام کے اوصاف و محاسن آپ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کی زبانی بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ابوجہل رسول مقبول کی کامیابی اور اپنی ذلت و ناکامی پر نوحہ کرتے ہوئے عہد جاہلیت کے شاعر زہیر سے فریاد کرتا ہے کہ وہ اس کی امداد کے لئے اپنی قبر سے باہر نکلے:

چشم خاصان عرب گردیدہ کور
بر نیائی اے زہیر از خاک گور؟
اے تو را اندریں صحرا دلیل
بشکن افسون نوائے جبرئیل!

زہیر اپنے حکیمانہ خیالات کے لئے شہرت رکھتا ہے، اس کی بہترین تعریف مقامات الہمدانی کے مصنف نے المقامۃ القریضیہ (شاعری کا مقامہ) میں ان بلیغ الفاظ میں کی ہے: یذھب الشعر والشعر یذہبہ ویدعو القول والسحر یجیبہ (وہ شعر کو گھلاتا ہے اور شعر اس کو گھلاتا ہے۔ وہ شعر کو دعوت دیتا ہے لیکن سحر اس دعوت پر لبیک کہتا ہے) زہیر کے بیٹے کعب کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مشہور عرب شاعرہ الخنساء بھی اس کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی ابوجہل کے نوحہ میں اقبال امرء القیس کے شعر کا ایک ٹکڑا بطور اقتباس کے نقل کرتے ہیں:

اے ترا اندر دو چشم ما وثاق
مہلے "ان کنت ازمعت الفراق"

یہ وہی امرء القیس ہے جس کے متعلق اقبال اپنے مضمون "رسالت مآب کا ادبی تبصرہ" میں پیغمبر اسلام کی طرف منسوب قول بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں: اشعر الشعراء و قائدھم الی النار (وہ شاعروں میں سب سے بڑا تو ہے ہی لیکن دوزخ کی طرف ان کا رہبر بھی ہے۔)

اقبال نے اس قول کو بہت اہمیت دی ہے چنانچہ مرقع چغتائی کے دیباچے میں بھی وہ اسے نقل کرتے ہیں اور اپنی اس تقریر میں بھی اسے دہراتے ہیں جو انھوں نے کابل کی انجمن ادبی کے سامنے کی۔

امرء القیس کا پورا شعر یوں ہے:

افاطم مہلاً بعض ھذا التدلل
وان کنت قد ازمعت صرمی فاجملی

(اے فاطمہ یہ ناز ذرا کم کر اور اگر تو نے قطع تعلق ہی کی ٹھان لی ہے تو خوش اسلوبی سے کام لے۔)

غالباً معلقہ کا جو نسخہ اقبال کے پیش نظر ہے اس میں دوسرا مصرعہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ دیا گیا ہے۔ وان کنت ازمعت الفراق فامہلی (اگر تو نے جدائی کا پکا ارادہ کر لیا ہے تو ذرا مہلت دے۔)

(باقی آئندہ)

(بقیہ بہ سلسلہ صفحہ ۹)

۵۔ اچھی طرح پڑھنا ہر کام کے لئے ضروری ہے۔
۶۔ امریکہ میں پڑھے لکھے لوگوں میں ۵ فیصدی ۹ (ب) ۲۵ فیصدی ۹ (ج) ۷۰ فیصدی ۹ لوگ اچھی طرح پڑھنا نہیں جانتے۔
۷۔ سست رفتاری سے پڑھنے والا آدمی مشق سے ۱۰ فیصدی؟ (ب) ۳۵ فی صدی ۹ (ج) ۷۰ فیصدی ۹ فی منٹ ترقی کر سکتا ہے۔
۸۔ پڑھنے کے دوران میں مشکل الفاظ کے معنی لغت میں ضرور دیکھنا چاہیے۔
۹۔ یونیورسٹیوں کے طلبا اگر فی منٹ ۵۰۰ لفظ نہیں پڑھ پاتے تو اپنی تعلیم میں خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتے۔
۱۰۔ اس مضمون میں جس مشہور فن مطالعہ کے ماہر کا نام آیا ہے وہ (الف) انجیل نورمان (ب) نورمان لوئس (ج) لوئس شومان ہے۔

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

دنیا کی رفتار

۱۷

ہندوستان

عابد

ذاکر سید حسین

آئرلینڈ کا لسانی مسئلہ

خواجہ احمد فاروقی

آئرلینڈ کا لسانی مسئلہ بہت دلچسپ ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام پر آئرش کے احیاء کی کوشش کی گئی۔ جو اس سرزمین میں ۲۵۰۰ برس سے بولی جا رہی تھی۔ آئرش زبان نہیں، بولی ہے اور اس کا رشتہ بالواسطہ (CELTIC) کے ذریعے (GAELIC) تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کی دوسری بولیاں (SCOTS GAELIC) اور (MANX) ہیں جو اب بھی اسکاٹ لینڈ اور جزیرۂ انسال میں کہیں کہیں بولی جاتی ہیں۔ (CELTIC) زبانوں کی ایک دوسری شاخ جو مسیحی دور سے قبل یورپ اور ایشیا کے بہت سے حصوں میں مقبول تھی، برطانوی ہے جس میں CORNISH، WELSH اور BRITON زبانیں شامل ہیں۔ موخر الذکر کا رواج شمالی مغربی فرانس میں بہت رہا ہے لیکن یہ برطانوی زبان جزائر برطانیہ میں انگلز اور سیکسنوں کے حملے کے بعد جس کو ۱۵۰۰ برس ہوئے تقریباً ختم ہوگئی۔

سترہویں صدی تک آئرش (SCOTS GAELIC) میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان کا ادبی سرمایہ تک مشترک تھا لیکن بعد میں دونوں زبانیں الگ الگ ہوگئیں اور ان میں وہ اختلاط اور ارتباط نہیں رہا جو پہلے تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں آئرش زبان کا بھی آئرلینڈ میں عمل دخل کم ہوگیا۔ وہ انگریز جو یہاں آئے وہ ڈبلن کے علاقے کو چھوڑ کر باقی سب جگہ مقامی آبادی میں گھل مل گئے۔ لیکن نہ انھوں نے اپنے رسم رواج کو چھوڑا اور نہ اپنی زبان کو۔ ان کا مذہب بھی مختلف تھا۔ آئرلینڈ والوں کا کیتھولک اور انگریزوں کا پروٹسٹنٹ۔

لیکن انیسویں صدی کے شروع تک آئرستان کی دیہی آبادی آئرش ہی بولتی رہی اور اس میں تھوڑا بہت عوامی ادب بھی پیدا ہوتا رہا۔ لیکن پچھلی صدی میں آئرش زبان پر بہت سی کاری ضربیں لگیں اور زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ شروع میں انگلستان کے صنعتی انقلاب نے آئرلینڈ کی دیہی آبادی پر بہت کم اثر ڈالا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۷ء تک ملک میں قحط رہا۔ بہت سے مر کھپ گئے اور بہت سے جگہ چھوڑ کر چلے گئے ——— غرض ساری آبادی الٹ پلٹ ہوگئی اور آئرلینڈ کی دیہی آبادی کا پرانا روایتی نظام درہم برہم ہوگیا اس پر طرہ یہ کہ انگریزی حکومت نے اپنی پچھلی غلطیوں کی تلافی کرنے کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی کردی اور یہ طے کیا کہ وہ آئرش میں نہیں، انگریزی میں ہوگی۔ آئرلینڈ کے بعض انتہا پسند کہتے ہیں کہ اس سے مقصود اہل آئرستان کے زخموں پر مرہم رکھنا، ان کی حالت کو درست کرنا اور ان کو خواندہ بنانا نہیں تھا۔ بلکہ محض آئرش زبان کو نیست و نابود کرنا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت چند اعتدال پسند انگریز اکابر اور نیک نیتی کے ساتھ یہ چاہتے تھے کہ آئرش کاشتکار کی حالت سدھر جائے، اور انھوں نے اسی مقصد کے پیش نظر ابتدائی تعلیم پر زور دیا تھا۔

بہرحال اس زوال کا سبب صنعتی انقلاب ہو، قحط ہو یا انگریزی کی لازمی تعلیم ——— اس میں شک نہیں کہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء تک آئرش زبان پاتال کے گڑھے میں گر گئی۔ اس سے پہلے ۹۰ فی صدی آدمی اس زبان کو بول سکتے تھے لیکن ۱۸۹۱ء میں اس کے جاننے والوں کی تعداد ۳۷ فی صدی رہ گئی جن میں سے صرف ۱۰ فی صدی آدمی اس کو بول چال کے کام میں بھی لاتے تھے۔ اس کے بعد اس کے پیکر مردہ میں جان ڈالنے کی کوشش کی گئی اور اس کا جاننا اہل آئرستان کے لئے لازمی ہوگیا لیکن پھر بھی ۱۹۲۶ء تک اس کے بولنے والوں کی تعداد ۲۵ فی صدی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

آئرش زبان کے احیاء کی کوشش ۱۸۹۳ء سے شروع ہوئی اور اس وقت آئرش زبان کے عالموں کی ایک جماعت "گے لک" لیگ کے نام سے قائم ہوگئی۔ لیکن اس سے زبان کو بجائے فائدے کے نقصان ہوا۔ ان لوگوں نے زبان کو وسعت دینے اور اس کو موجودہ زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے لئے اس میں ایسے نامانوس الفاظ لانے شروع کئے جس کا بوجھ آئرش زبان برداشت نہ کر سکی۔ عوام سے عملی تعلق کم ہونے کی وجہ سے نہ اس میں زندگی کا خون باقی تھا اور نہ جذب کی قوت لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہی مضمحل اور مفلوج زبان آزادی کے حصول میں معاون ہوئی اور وہ "گے لک" لیگ جو اب تک صرف مصنفوں کی انجمن تھی رفتہ رفتہ انقلابیوں کی جماعت بن گئی۔

جو لوگ آئرلینڈ کی آزادی کے لئے کوشاں تھے وہی آئرش زبان کے بھی سب سے بڑے علمبردار تھے اس اتحاد و اشتراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۱ء میں جب آزادی حاصل ہوگئی تو آئرش زبان کے احیاء کا جوش و خروش بھی کم ہوگیا اور سوائے متعصب انتہا پسندوں کے سب کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ آئرش انگریزی کے آگے نہیں ٹھہر سکتی، اور اس کو زندہ کرنے کی ساری کوششیں بے کار ہیں۔

کئی دفعہ سیاسی جماعتوں نے اس پر زور دیا کہ اتنی بڑی بڑی رقمیں آئرش زبان کے احیاء کے لئے نہ صرف کی جائیں لیکن ہمیشہ ایک چھوٹی سی اقلیت نے اپنا دباؤ اور اثر ڈال کر اس قسم کی تجویزوں کو منسوخ کروا دیا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وطن پرستوں کی بہت بڑی جماعت یہ سمجھتی ہے کہ یہ احیائی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن مقطع میں بات آن پڑی ہے اس لئے ہر بچہ آئرش پڑھتا ہے۔ اور ذریعہ تعلیم بھی یہی زبان ہے لیکن طرفہ لطیفہ یہ ہے کہ تعلیم کا عام معیار افسوسناک حد تک گر گیا ہے اور ناخواندگی جو پہلے بالکل ختم ہو گئی تھی پھر تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

حکومت کی ملازمتوں میں آئرش زبان سے واقفیت لازمی شرط ہے اور اس کے لئے جو امتحانات مقرر کئے گئے ہیں وہ اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ جو لوگ ہر طرح لائق ہیں لیکن آئرش زبان میں اچھی لیاقت نہیں رکھتے، وہ انتخاب نہیں ہو سکتے حالانکہ اس زبان کے استعمال کی کبھی مطلق ضرورت پیش نہیں آتی۔

موجودہ حکومت اس صورت کو بدلنا چاہتی ہے، لیکن کھلم کھلا اس تبدیلی کا اعلان بھی نہیں کر سکتی اس لئے کہ انتہا پسند طبقہ اپنا ذاتی مفاد رکھتا ہے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے چند پرانی روایتوں کو بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ پھر بھی موجودہ حکومت نے سول سروس کے امتحانات کی سختیوں کو کم کر دیا ہے۔ بہت سے فارم جو پہلے دونوں زبانوں میں یا صرف آئرش زبان میں ہوتے تھے، اب محض انگریزی میں ملتے ہیں اور وہ ہزاروں روپے جو بے جان آئرش زبان کی ترقی کے لئے خرچ کئے جا رہے تھے ان میں اب "کفایت" کے خیال سے بہت کمی کر دی گئی ہے۔ اس طرح گذشتہ ۲۸ سال کی غلطیوں کو خاموشی کے ساتھ درست کیا جا رہا ہے۔

آزادی کی زنجیریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۷)

"خدا حافظ" سے کام لیا، صفدر علی صاحب بھی ان کے ساتھ باہر آئے۔ کار برساتی میں تیار کھڑی تھی صفدر علی صاحب نے ڈرائیور سے کہا "دیکھو پہلے ظفر میاں کو ابراہیم باغ پہنچا آؤ، اتنی دیر میں ہم تیار ہوتے ہیں"۔ ظفر کار میں بیٹھا۔ مالن جو پیچھے پیچھے مٹھائی کی کشتی لئے آئی تھی، کشتی ڈرائیور کو دی کہ میاں کے ساتھ جائے گی۔ ظفر نے کھڑکی سے منہ نکال کر چچا کو آداب کیا، اور کار روانہ ہو گئی۔

ظفر کی یہ کیفیت تھی جیسے دھڑکتے دل سے ریاضی کا پرچہ کرنے گیا ہو، پرچہ خلاف توقع بہت ص

ص آسان آیا ہو اور بہت اچھا ہوا ہو۔ مگر پھر بھی یہ فکر لگی ہوئی کہ کوئی سوال غلط تو نہیں ہو گیا۔ (باقی آئندہ)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبداللطیف اعظمی

جلد ۴   ۲۴ مارچ ۵۰ء   نمبر ۱۲

کل کیا ہوگا؟

مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں خونریز فسادات اور ہنگاموں کا جو سیلاب آیا تھا جس کی لہریں ہولی کے دنوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں تک پہنچی تھیں وہ اب فرو ہو گیا ہے، کہیں کہیں معمولی سے ہلکے ہلکے رہ گئے ہیں جو رفتہ رفتہ مٹ رہے ہیں۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۷ مارچ کو پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا جس میں انھوں نے اقلیتوں کے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی کا صاف صاف اعلان کر کے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت بہرحال اپنے ملک میں اقلیتوں کی حفاظت کرنے اور ان کو مساوی حقوق دینے کی پابند رہے گی۔ پاکستان کی اقلیتوں کی حفاظت کی ذمہ داری وہاں کی حکومت پر ہے لیکن حکومت ہند کو اس معاملے میں پوری دلچسپی ہے، اور برابر رہے گی۔ دونوں بنگالوں کے درمیان مکمل مبادلۂ آبادی ناقابل عمل ہے اگر امن و انتظام کے ساتھ پورا مبادلہ ہو تو اس میں ساڑھے پانچ سال لگ جائیں گے۔ اس کے علاوہ کروڑوں آدمیوں کا ادھر سے ادھر امن و انتظام کے ساتھ منتقل ہونا ممکن بھی نہیں۔ البتہ ایک محدود تعداد کو جو منتقل ہونا چاہتی ہو ضروری سہولتیں دی جا سکتی ہیں اور دی جا رہی ہیں، اگر پاکستان کی حکومت نے اقلیتوں کی حفاظت کے فرض میں کوتاہی کی تو حکومت ہند مناسب اور مؤثر تدبیریں اختیار کرے گی۔

وزیر اعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے ایک مشترکہ بیان شائع ہوگا جس میں اقلیتوں کو ان کے جان مال اور شہری حقوق کی حفاظت کا پوری طرح اطمینان دلایا جائے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ابھی تک اس کے مضمون کے بارے میں ہند و پاکستان میں اختلاف رائے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حالات کی نزاکت کا اندازہ کر کے حکومت پاکستان اس قسم کے بیان کی اشاعت میں زیادہ دیر نہیں لگائے گی۔ ورنہ اس کا اثر فرقہ وارانہ تعلقات پر بہت برا اثر پڑے گا۔ لیاقت علی خاں صاحب نے پچھلے مہینے کے آخر میں پنڈت نہرو کے ساتھ مل کر بنگال کا دورہ کرنے کی تجویز رد کر دی تھی اور اس سے لوگوں میں غم و غصہ اور خوف و ہراس بہت بڑھ گیا تھا اب انھیں یہ دوسری تجویز ہرگز رد نہیں کرنی چاہیے۔

مجموعی طور پر فضا میں سکون پیدا ہو گیا ہے مگر دلوں کے اندر ابھی تک سکون نہیں ہے۔ پاکستان کے ہندوؤں کی حالت کا تو ہم محض دور سے اندازہ کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اچھی طرح معلوم ہے۔ ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ آج تو یہ خطرہ ٹل گیا مگر کل کیا ہوگا؟

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان تعلقات بگڑے ہوئے ہیں دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو چین اور اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کب تک بگڑے رہیں گے؟ اس کا جواب تو سہل ہے ——— جب تک کشمیر کا جھگڑا طے نہیں ہوگا، لیکن اس کے بعد جو دوسرا سوال اٹھے گا کہ کشمیر کا جھگڑا کب طے ہوگا اس کا جواب اتنی آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی جہاں تک پچھلے ڈھائی سال کے حالات و واقعات کو غور سے دیکھنے کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کشمیر کی گتھی اس وقت سلجھے گی جب ہند و پاکستان کی حکومتیں اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ کوئی بیرونی طاقت اس قضیے کو نہیں نبٹا سکتی، یہ تو انھیں جیسے بھی ہو صلح و امن سے یا جنگ و جدل سے خود ہی نبٹانا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ کشمیر کے مقدمے کو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے سامنے حکومت ہند نے پیش کیا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے طور پر گفت و شنید بھی کرتی رہی۔ مگر حکومت پاکستان کو مقدمہ بازی میں ایسا لطف آیا کہ اس نے نجی گفت و شنید کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ بعض بیرونی طاقتوں نے اسے تھپکی دی اور اس دھوکے میں ڈال دیا کہ وہ کشمیر کے معاملے میں اس کی حامی ہیں۔ ان کے بل پر وہ ہندوستان سے اینٹھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جنگ کے بغیر قریب قریب جنگ کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں بیرونی طاقتوں کو پاکستان سے کوئی دلی تعلق نہیں وہ اس کی ہمدردی اور حمایت کا ڈھونگ اس لئے رچاتی ہیں کہ ہندوستان پر دباؤ ڈال کر اسے اپنے جتھے میں شامل ہونے پر مجبور کریں۔ اب تک انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور غالباً آیندہ بھی نہیں ہوگی، لیکن اگر ہو بھی جائے تو پاکستان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ بہت سخت نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔

اب تک مقدمے کا یہ رنگ ہے کہ کارروائی کے دوران میں پاکستان کی جائز اور ناجائز وکالت کی جاتی ہے لیکن جب فیصلے کا وقت آتا ہے تو وکیل جج بن کر میزان عدالت کے کانٹے کو ایسا سادھ کر رکھتے ہیں کہ کیا مجال جو ادھر یا ادھر جھک جائے۔ پاکستان اس مقدمہ بازی میں مست ہے۔ کشمیر کو کشمیر اس نے حیدرآباد کے بے جان مقدمے سے بھی ابھی تک بہت کچھ امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میر لائق علی اسی لئے حیدرآباد سے بھگا کر لائے گئے ہیں کہ حیدرآباد کے معاملے کو پھر سے اٹھایا جائے۔ ابھی تک ہمیں یقین نہیں آتا کہ میر لائق علی کو بین الاقوامی قانون و سیاست کا ماہر حیدرآباد کے مقدمے کی پیروی کرنے کی اجازت دے گا۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو دھوکے کا ایک اور پردہ آنکھوں پر پڑ جائے گا، اور کشمیر کی گتھی کا سلجھنا اور دور ہٹ جائے گا۔

بہرحال آپ کو یہ بات کتنی ہی عجیب معلوم ہو، ہم بہت غور کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کشمیر کے قضیے کا اور اسی کے ساتھ ہند و پاکستان کی اقلیتوں کے مسئلے کا طے ہونا اس پر موقوف ہے کہ حکومت پاکستان اپنی خارجی پالیسی کی عمارت تخیل اور خواہش کی موہوم بنیاد کے بجائے حقیقت کی ٹھوس بنیاد پر رکھے۔ دھوکے کا وہ طلسم جو بیرونی طاقتوں نے باندھا ہے اور جس میں پاکستان نے اپنے آپ کو مبتلا کر رکھا ہے ایک دن ٹوٹ کر رہے گا۔ لیکن اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان دونوں کے نتیجے الگ الگ ہوں گے۔ اگر خود پاکستان کے ارباب عقل و بصیرت نے ہمت سے کام لے کر اس طلسم کو ضرب کلیمی سے توڑ دیا تو نتیجہ بہت خوشگوار ہوگا۔ ہند اور پاکستان میں براہ راست گفت و شنید شروع ہو جائے گی۔ اور تھوڑے ہی دن میں یہ نظر آنے لگے گا کہ کشمیر کا مسئلہ اور وہ سارے نزاعی مسائل جو آج ناقابل حل کہے جاتے ہیں امن و آشتی سے حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر پاکستان غیروں کی حمایت کے طلسم فریب میں اس وقت تک مبتلا رہا جب کہ خود ان طلسم سازوں کی مصلحتیں انھیں اس کے توڑنے پر مجبور کر دیں گی تو جو نتیجہ ہوگا اس کا تصور کر کے دل دہل جاتا ہے۔ مایوسی اور غم و غصے کا شدید دھچکا جو ایسی صورتوں میں ایک دم سے لگتا ہے عقل و دانش، تدبیر و مصلحت اور ضبط و نظم کے بند توڑ کر افراد کی طرح جماعتوں پر ایسی حالت طاری کر دیتا ہے کہ ان میں ذمہ داری کا احساس نہیں رہتا، اور وہ کر گزرتی ہیں جس پر مدتوں پچھتانا پڑتا ہے۔

ابھی تک یہ امید باقی ہے کہ پاکستان کی حکومت وقت پر چیت جائے گی اور یہ افسوسناک صورت حال پیش نہیں آنے پائے گی۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

نے اپنے نئے بجٹ میں اون اور کھال کی صوبائی برآمد پر ٹیکس لگا دیا ہے۔ جو سراسر مرکز کے وسائل آمدنی پر قبضہ جمانے کے مترادف ہے۔ مختصراً یہ کہ مرکز اور صوبوں کے مابین کی چپقلش ناگوار شکل اختیار کر رہی ہے۔"

غرض ہندوستان کے نئے بجٹ کی طرح پاکستان کا بجٹ بھی عوام میں مقبول نہیں ہوا ہے اس کے بارے میں ہر طرف سے مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پاکستان ٹائمز (لاہور) کے نامہ نگار کراچی نے اطلاع دی ہے کہ موجودہ بجٹ سے امیروں کے علاوہ ہر طبقے کو انتہائی مایوسی ہوئی ہے، ان کا خیال ہے کہ جس قدر رعایتیں کی گئی ہیں ان سے امیروں کو فائدہ پہنچے گا اور غریب کا تو ذکر کیا متوسط طبقہ کا بھی بوجھ ذرا بھی کم نہیں ہوگا۔ اسی قسم کا ردعمل لاہور کا بھی ہے۔ محکمہ صنعت پنجاب کے ایک افسر نے نئے محصول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے ملک کی ترقی یقینی طور پر رک جائے گی اور کاغذ پر ٹیکس لگانا تعلیم پر ٹیکس لگانا ہے۔"

(ع۔ ل)

دنیا کی رفتار

ہندوستان

بجٹ کی بحثیں

مشرقی بنگال کے فسادات ختم ہوجانے کے بعد پارلیمنٹ کی فضا میں سکون پیدا ہوگیا ہے۔ وزیر اعظم نے ۷ / مارچ کی تقریر میں اقلیتوں کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا اس پر کچھ حلقوں کی طرف سے سخت نکتہ چینی ہورہی ہے، لیکن عام طور پر اس کا اثر بہت اچھا ہوا ہے اب پارلیمنٹ کو بجٹ کے مسائل پر زیادہ غور اور توجہ کرنے کا موقع ملا ہے اور وہ مختلف وزارتوں کے کاموں پر ہمدردی کے ساتھ مگر کبھی کبھی بڑی سختی سے نکتہ چینی کررہی ہے۔ ابھی تک اعتراضوں کی زیادہ بوچھار سب سے زیادہ وزارت خارجہ پر اور محکمہ بحالی پر رہی۔ وزارت خارجہ کی پالیسی کے اور تو ہر پہلو کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا مگر کئی ممبروں نے اس بات کی بڑی سخت شکایت کی کہ پاکستان کے ساتھ حکومت کا رویہ حد سے زیادہ نرم ہے۔

محکمۂ بحالی کے وزیر شری موہن لال سکسینہ جیسے ہمیشہ نشانۂ ملامت بنائے جاتے ہیں اس بار بھی بنائے گئے۔ انھوں نے بڑے صبر کے ساتھ اعتراضوں کا جواب دیا اور یہ بتایا کہ بحالی کے عظیم الشان کام کی مشکلات اور حکومت کی مجبوریوں کو محسوس کرکے انھوں نے کئی بار اپنے عہدے سے استعفا دینا چاہا مگر منظور نہیں ہوا۔ آخر میں انھوں نے شری ستیا کرپلانی اور بخشی ٹیک چند کے اس اعتراض کو تسلیم کیا کہ محکمۂ بحالی کے لئے اخراجات کا جو تخمینہ کیا گیا ہے وہ بالکل ناکافی ہے، اس لئے کہ اس میں اس بڑے پیمانے کی نئی ہجرت کا لحاظ نہیں رکھا گیا جو مشرقی بنگال کی طرف سے ہورہی ہے اور یہ وعدہ کیا کہ حکومت اس کے لئے مزید رقم منظور کرے گی۔

لسانی ریاستوں کا مسئلہ

آندھرا کے علاقے میں تلنگی زبان بولنے والوں کی جداگانہ ریاست بنانے کا قطعی فیصلہ پچھلے سال ہوچکا ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے لسانی ریاستیں بنانے کا مسئلہ کتنا مشکل اور پیچیدہ ہے۔ حکومت ہند نے اس بارے میں جو خط حکومت مدراس کو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

حکومت ہند نے آندھرا کی الگ ریاست بنانے کے لئے تین بنیادی شرطیں رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ آندھرا کے لوگ مدراس شہر پر دعوے چھوڑ دیں۔ دوسرے یہ کہ فریقین کے درمیان کل نزاعی مسائل طے ہوجائیں۔ تیسرے یہ کہ مجوزہ ریاست کی حدود وضاحت کے ساتھ متعین کردی جائیں۔ ان تینوں میں سے ایک شرط بھی اب تک پوری نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ آندھرا کی کانگریس کمیٹی اور شری پرکاشم جیسے اہم لیڈر تقسیم کرنے والی کمیٹی کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔

ان حالات میں حکومت ہند یہ ضروری سمجھتی ہے کہ اس سوال کو دوبارہ اٹھانے سے پہلے سب نزاعی امور کو طے کرلیا جائے اس عرصے میں مدراس کی ریاست کا نظم و نسق ایک واحد ریاست کی حیثیت سے جاری رہنا چاہیے، اور ہر طرح کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں خلل نہ پڑنے پائے۔

میر لائق علی کی خبر

حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم میر لائق علی کی فراری کا معمہ اب پوری طرح حل ہوگیا ہے سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ ۳ / مارچ کو بھیس بدل کر ریل کے ذریعے حیدرآباد سے بمبئی گئے اور ۵ / مارچ کو ہوائی جہاز کی معمولی سروس سے بمبئی سے کراچی پہنچ گئے۔ حکومت پاکستان نے کئی روز تک اپنی کسی مصلحت سے اس خبر کو چھپائے رکھا جس سے لوگوں کو طرح طرح کی افواہیں پھیلانے کا موقع ملا یہاں تک کہ یہاں کے بعض اخباروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حیدرآباد میں انھیں گولی ماردی گئی اور ان کے بھاگنے کی غلط خبر مشہور کردی گئی۔ آخر ۱۶ / مارچ کو حکومت پاکستان کی طرف سے باقاعدہ اعلان ہوا کہ میر لائق علی اور ان کا خاندان کراچی پہنچ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی صحت بہت خراب ہے۔ اس لئے وہ دو ہفتے کے لئے کسی صحت گاہ میں جاکر رہیں گے اور پھر کراچی واپس آکر اپنا آئندہ پروگرام بنائیں گے۔ (ع۔ح)

پاکستان

خسارے کا بجٹ

فنانس منسٹر غلام محمد صاحب نے ۵۱-۱۹۵۰ء کے لئے جو بجٹ پیش کیا ہے، اس میں ایک کروڑ نوے لاکھ کا خسارہ ہے جسے نئے ٹیکسوں کے ذریعے پورا کرنے کی سفارش کی گئی ہے اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ نئے ٹیکس تعیش کی چیزوں پر لگائے گئے ہیں، مگر ان میں سے بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جو ضروریات زندگی میں سے ہیں اور ان پر محصول لگانے سے متوسط بلکہ غریب طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً مٹی کا تیل، چائے، چھالیا، سائیکل اور اس کے پرزے وغیرہ۔

اس خسارے کی کئی وجہیں ہیں، ان میں سے ایک روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے کی پالیسی بھی ہے، جس پر حکومت پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کررہی ہے۔ اس پالیسی کا نتیجہ ہے کہ اس سے قبل پاکستان کی بیرونی تجارت متوازن تھی، مگر اب اس کا توازن غیر موافق ہوگیا ہے، اور فائدے کی جو امید تھی وہ پوری نہیں ہوئی جسے فنانس منسٹر نے بھی اپنی تقریر میں تسلیم کرلیا ہے کہ پاکستان کو فوج پر اپنی آمدنی کا بڑا حصہ صرف کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے منفعت بخش وسائل کو بڑھانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملتا ایک تیسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی صنعت ابھی ابتدائی منزل میں ہے اور اس کے قریب قریب تمام صوبے مرکز کی امداد کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔ اس کا مرکزی بجٹ پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستانی معاصر امروز (کراچی) نے اپنی ۹ / مارچ کی اشاعت میں بہت تفصیل سے لکھا ہے جس کا مختصراً خلاصہ ملاحظہ ہو:۔

اس میں شبہہ نہیں کہ بیرونی تجارت میں پاکستان کی محتاجی سے نجات حاصل کرچکی ہے۔ لیکن اب اس پر برطانیہ، جاپان اور دیگر یورپی ملکوں نے قبضہ جمالیا ہے جو خود ہی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری خام اشیا کے دام گرانے میں پیش پیش ہیں۔ دوسری طرف خود ہمارے ملک میں صنعتی تعمیر بھی چیونٹی کی چال چل رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مرکزی مالیات کے لئے بڑے مشکل مسائل آن پڑے ہیں دوسری صوبائی حکومتیں مطالبہ کررہی ہیں کہ متعدد وسائل آمدنی جن سے آج مرکز استفادہ کررہا ہے، صوبے کے حوالے کردیے جائیں یا صوبوں کے لئے زیادہ حصہ نکالا جائے صوبائی حکومتیں مرکز سے راست مالی امداد کا بھی مطالبہ کررہی ہیں۔ برآمد کے گھٹ جانے کی وجہ سے پٹ سن کے محاصل میں جو تخفیف واقع ہوئی ہے اس کا انکشاف مشرقی بنگال کے نئے بجٹ میں اچھی طرح ہوچکا ہے مشرقی بنگال کے وزیر اعظم وزیر مالیات مسٹر نور الامین نے مطالبہ کیا ہے کہ پٹ سن کے محاصل میں مشرقی بنگال کے لئے زیادہ حصہ نکالا جائے اور سرحدی پولیس کے تمام اخراجات مرکز ہی برداشت کرے صوبائی حکومتیں سیلز ٹیکس کی آمدنی کو پورے طور سے اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے عرصے سے جد و جہد کررہی ہیں۔ بجٹ کے موقع پر مسٹر نور الامین کی تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مرکز نے صوبوں کا یہ مطالبہ اب تسلیم کرلیا ہے۔ صوبہ سرحد تمام صوبوں سے زیادہ مرکز کی راست مالی امداد کا سہارا لے رہا ہے۔ سندھ اور پنجاب کے بجٹ ہنوز زیر ترتیب ہیں، لیکن سال کی ابتدا میں جو تخمینے پیش کئے گئے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرکز سے مالی امداد اور مرکز کے وسائل آمدنی اور مالی امداد دونوں کے خواہش مند ہیں۔ جناب عبد القیوم [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر)

بجٹ ایک نظر میں

متوقع آمدنی	ایک ارب ۱۳ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے
خرچ	ایک " ۱۵ " ۵۴ " "
خسارہ	ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپے
نئے مجوزہ ٹیکس سے زائد آمدنی	۲ "
متوقع بچت	۱۰ لاکھ

کشکول

اس مسئلے میں فلسفیوں میں بڑا اختلاف ہے کہ سیاسی لیڈروں میں وہ جوہر لطیف جسے روح کہتے ہیں پایا جاتا ہے یا نہیں مگر اس پر سب متفق ہیں کہ اُن میں ایک جوہر کثیف جو عرف عام میں فطرت کہلاتا ہے ضرور موجود ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جیسے روح عام انسانوں کے سارے جسم میں ساری ہے مگر اس کا خاص محل قلب و دماغ ہے۔ اسی طرح فطرت لیڈروں کی رگ رگ میں بسی اور پور پور میں سمائی ہوتی ہے مگر اس کا خاص مقام زبان ہے۔ یوں تو لیڈر کے کان بھی ہوتے ہیں، آنکھیں بھی ہوتی ہیں، اور اکثر دماغ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر وہ زبان ہی سے دیکھتا ہے اور زبان ہی سے سنتا ہے اور زبان ہی سے سوچتا ہے۔ اس کی آڑ کا اس کی ڈھال، اس کی تلوار جو کچھ ہے زبان ہے۔ وہ صرف حیوان ناطق ہی نہیں بلکہ حیوان لسان ہے اور اگر لسانی کے ساتھ ساتھ حاضر جوابی بھی ہو تو پھر کیا کہنا لیڈر مہا لیڈر بن جاتا ہے۔ عہد حاضر کے مہا لیڈروں کی حاضر جوابی کی چند مثالیں سنیے۔

پہلی جنگ عظیم کے بڑے حضرت لائڈ جارج کو دنیا ابھی تک نہیں بھولی ہے، اور ظاہر ہے کیسے بھولتی اس لئے کہ اُن کا لگایا ہوا صلح نامہ ورسائی کا پودا ابھی تک پھل لا رہا ہے۔ یہ حضرت ایک بار الیکشن کے سلسلے میں بڑے جوش و خروش سے تقریر کر رہے تھے "ہوم رول سارے عالم انسانیت کا فطری حق ہے۔ ایک آئرلینڈ پر کیا موقوف ہے ہم انگلینڈ کے لئے ہوم رول چاہتے ہیں... سکاٹ لینڈ کے لئے ہوم رول چاہتے ہیں، ویلس کے لئے ہوم رول چاہتے ہیں......" اتنے میں کسی بگڑے دل نے مجمع میں سے پکار کر کہا "ہم جہنم کے لئے ہوم رول چاہتے ہیں"۔ قہقہے کی توپیں چلنی شروع ہوئی تھیں کہ لائڈ جارج نے یہ کہہ کر ان کا رُخ حریف کی طرف پھیر دیا "شاباش میرے دوست، میں آپ کے حُبِ وطن کی دل سے قدر کرتا ہوں"۔

دو نوجوان پادریوں کو جو کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سگریٹ پینے کی ولیسی لت پڑ گئی تھی۔ اس کے بغیر ایک گھنٹہ بھی کاٹنا مشکل تھا ان کو اپنی خانقاہوں میں کئی کئی گھنٹے مراقبے میں صرف کرنے پڑتے تھے اور اس حالت میں سگریٹ پینے کی ان کا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر جب طلب نے بہت ستایا تو انھوں نے سوچا کہ ضمیر کے بجائے پیر سے رجوع کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ طے کیا کہ اپنے اپنے مرشد کو اپنا درد دل سنا کر دو دو دل کے نکالنے کی اجازت مانگیں۔ اس کے بعد جب دونوں میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک کو تو اپنے رہنما سے اجازت مل گئی مگر دوسرے کو اس کے مرشد نے اجازت نہیں دی۔ پہلے نے دوسرے سے دریافت کیا "آخر تم نے کیا کہا تھا؟"
"کہتا کیا۔ میں نے یہ پوچھا تھا کہ میں مراقبے کے وقت سگریٹ پی سکتا ہوں؟"
"واہ! میں نے تو یہ پوچھا کہ میں سگریٹ پیتے وقت مراقبہ کر سکتا ہوں؟"
یہ سگریٹ پیتے وقت مراقبہ کرنے والے بزرگ ڈی ولیرا تھے۔
نوٹ: (اگر آپ اسے حاضر جوابی کی مثال نہیں سمجھتے تو غائب سوائی کی سمجھ لیجیے)

لیڈی اسیسٹر جنھیں نے انگلستان کی خواتین میں پارلیمنٹ کی ممبری کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوا۔ بڑی تیز مزاج اور تیز زبان ہیں۔ ایک دن مسٹر ونسٹن چرچل سے فرمانے لگیں۔
"ونسٹن اگر میں تمھاری بیوی ہوتی تو میں تمھیں کافی کے پیالے میں زہر دے دیتی"۔
چرچل نے نکلف سے جواب دیا
"میڈم اگر میں آپ کا شوہر ہوتا تو اس کافی کے پیالے کو آنکھ بند کرکے پی جاتا"۔

بوئے پیرہن

روشن صدیقی

بت سازِ رہِ حُسن بت شکن ہے۔
اب سجدہ، شکستِ برہمن ہے

کیا ذکرِ بہارِ خود خزاں بھی
دیوانۂ شاہدِ چمن ہے

آساں تو ہے جوئے شیر لیکن
کچھ اور ہی عزمِ کوہ کن ہے

کیا دل پہ گذر گئی کہ اب تک
پیشانیٔ دہر پُر شکن ہے

اب صبحِ وطن کی آرزو کیا
ہے شامِ جہاں، نہیں وطن ہے

کیا اس کے بغیر زندگانی
مانا! وہ ہزار دل شکن ہے

قدرت ہے خموش، اور انساں
آوارۂ وادیٔ سخن ہے

اے دامنِ دوست! اب چلے ہم
احرامِ وفا نہیں، کفن ہے

سنسان سی ہو چلی ہیں راہیں
رہبر ہے نہ کوئی راہ زن ہے

اے آتشِ دل ادب ہے لازم
مجھ میں بھی وہ بوئے پیرہن ہے

یہ حسنِ غزل، کہ خود روشؔ سے
وہ جانِ کلام ہم سخن ہے

ماں

سیدہ فرحت

اے کہ تیری مامتا ہے ایک بحرِ بیکراں
تیری رگ رگ میں محبت خوں بن کے ہے رواں

بخشتی قدرت نہ تجھ کو جذبۂ الفت اگر
پرورش انسان کی دشوار ہوتی کس قدر

تیرے سوزِ دل سے روشن ہی جہاں میں چراغ
تو جگر کے خون سے سرسبز رکھتی ہے یہ باغ

تیرے ہی دم سے یہ رونق محفلِ ہستی میں ہے
کہ کبھی اس قدر دنیا کی ہر بستی میں ہے

تجھ سے بڑھ کر کون ہے انسانیت کا پاسباں
کاروانِ زندگی کی تو ہے میرِ کارواں

ایسے ایسے گود میں پلے ہیں لال ماں تیرے لال
عالمِ ہستی میں ہیں جو آپ ہی اپنی مثال

دین کے پیغامبر ہوں یا سیاست کے نقیب
وہ مفکر ہوں کہ موجد فلسفی ہوں یا ادیب

وہ علاو رجن کے افسانے ہیں مشہورِ جہاں
جاں نثارانِ وطن وہ عزم کے کوہِ گراں

سب ہوئے پل کر ترے آنچل کے سائے میں جواں
تربیت نے تیرے ہی بخشیں انھیں یہ خوبیاں

زندگی کا ہے بگڑنا اور سنورنا تیرے ہاتھ
نقشِ فطرت کا ہے مٹنا یا ابھرنا تیرے ہاتھ

اپنی عظمت بھی اگر لے ماں کہیں تو جان لے
ہیں فرائض اور کیا کیا یہ اگر پہچان لے

علم کے زیور سے ہو جائے جو تو آراستہ
جہل کے کانٹوں سے گر ہو صاف تیرا راستہ

تجھ سے بڑھ کر کون ہو پھر رہنمائے زندگی
تجھ سے بہتر کون ہو عقدہ کشائے زندگی

کیا کیا نہ کیا ــــ دولت کی خاطر!

پروفیسر رشید احمد صدیقی

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے "کیا کیا نہ کیا" کا ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا گیا تھا جس میں رشید احمد صدیقی نے کیا کیا نہ کیا ــــ دولت کی خاطر! ۱۳ فروری سنہ کو ایک تقریر نشر کی تھی۔ موصوف نے اس پر نظر ثانی کرکے نئی روشنی کو مرحمت فرمایا ہے جو نشر و نشرگاہ کے شکریے کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔)

دولت کی خاطر سب سے پہلے میں نے بھیک مانگنا شروع کیا۔ اس کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی صرف حلیہ کفایت کرتا تھا جو مجھے میسر تھا اور جس پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا۔ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے، حلیہ پر اعتماد ہونے سے مجھے بھیک مانگنے پر اعتماد ہوا، یہاں سے بڑھا تو قرض لینے پر اعتماد ہوا، پھر چوری پر، پھر سینہ زوری پر، پھر شعر و ادب پر، اس سے بڑھا تو پھر اپنی اصلیت پر آ گیا یعنی بھیک مانگنے پر۔ اسے کہتے ہیں گھوم پھر کر میرے حصے میں یہی چکر آیا۔ بعضوں کے حصے میں اور بہت سے چکر آئے ہیں۔ آپ کیوں اس چکر میں پڑیں!

میں نے بھیک مانگنا شروع کیا تو بھیک منگوں نے شاعری شروع کر دی۔ اب میرے لئے بڑی مشکل تھی۔ وہ یوں کہ لوگ یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ بھیک منگا کون ہے اور شاعر کون ہے۔ تمیز گھٹتی ہے تو دولت بڑھتی ہے لیکن جہاں دولت پہلے سے نہ ہو وہاں اس کے سوا چارہ نہیں کہ بھک منگے اور شاعر بڑھتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میونسپلٹی نے قانون پاس کر دیا کہ بھیک مانگنا جرم ہے۔ سارے بھک منگے شہر بدر کر دئے جائیں ان کے ساتھ شاعر بھی نکالے گئے۔ انھوں نے خلد سے آدم کے نکالے جانے اور کسی کی گلی سے خود اپنے نکالے جانے کا شعر بھی پڑھا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ کہا یہ گیا کہ آدم اس لئے نکالے گئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ آدمی تھے اور تم اس لئے نکالے جا رہے ہو کہ سرے سے آدمی نہیں ہو۔ اتنا بھی کسی نے نہ دیکھا کہ کتنے بھک منگے شاعر تھے یا شاعر بھک منگے۔ اب ان کی اوقات یہ رہ گئی تھی کہ دن بھر بھیک مانگتے، رات کو مشاعرہ کرتے۔ زندگی کا یہ انداز بہت مقبول ہوا، ایک نئی میونسپلٹی وجود میں آ گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی زندگی میونسپلٹی سے خالی نہیں۔ بھک منگے ممبر بنے، شاعر ووٹر رہ گئے مجھ میں دونوں کے خواص پائے گئے، اس لئے میں چیرمین تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن یہاں میں نے جلدی سے کام لیا، کام کی کچھ باتیں چھوٹ گئیں ــــ دولت کمانے شعر کہنے اور مار کھانے کا کوئی اصول نہیں، طریقے بہت سے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بھک منگوں اور شاعروں کا آج تک کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انھوں نے سب کچھ بگاڑا ہے، آپ نے سنا ہوگا کسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے تین طریقے بہت عام ہیں۔ بھیک مانگنا قرض لینا، چوری کرنا ان میں ہر ایک ایسا ہے جو سلیقے سے نہ برتا جائے تو آدمی جیل یا جہنم کو چلا جاتا ہے، اور سلیقے سے برتا جائے تو "نور" علیٰ نور!

دولت کمانے کی ان تینوں عبادتوں کو میں نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ میر نے کہا ہے۔ مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں! میرا کہنا یہ ہے کہ بھیک مانگنے میں بھی کچھ کم سلیقے کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً یہی دیکھئے کہ بھیک اس طرح مانگئے کہ لوگ چندہ مانگنا سمجھیں یا چوری اس طرح کرے کہ لوگ سمجھیں مذاق یا قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ یا قرض اس طرح مانگے کہ لوگ سمجھیں ملک خطرے میں ہے یا بیک وقت سب کچھ کر رہا ہو اور ہم آپ سمجھیں ترقی پسند ہے۔ یہ سب سلیقہ ہی کا کرشمہ ہے یا کسی اور کا!

بھیک مانگنے والوں نے اس فن کے جواز میں یہ بتایا ہے کہ بھیک مانگنا دراصل بھیک مانگنا نہیں ہے بلکہ بھیک دینے والے کو اس کا موقع دینا ہے کہ وہ خدا کو قرض دے جسے خدا آخرت میں ادا کر دے گا۔ میں اب تک یہ دریافت نہیں کر سکا ہوں کہ دنیا اور آخرت میں کون "سوفٹ کرنسی" رقبہ میں ہے اور کون "ہارڈ کرنسی" میں اور شرح مبادلہ کیا ہے۔

اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ اپنی خودی کو اتنا بلند کرو کہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ ممکن ہے خودی کے بلند ہو جانے پر خدا بندے کی رضا پوچھنے لگے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو خدا دو ہی ایک بندوں سے رضا پوچھنے کے بعد خودی کے مقررہ معیار پر نظر ثانی کر ڈالے گا۔ مجھے شبہ ہے کہ میری خودی کبھی بھی اتنی بلند ہو سکے گی کہ خدا مجھ سے میری رضا پوچھنا گوارا کرے گا۔ میں نے بھی بھیک مانگنے میں خدا سے کبھی نہ پوچھا کہ اس کی رضا کیا ہے۔ مجھے تو اکثر اس کا اندیشہ رہا کہ جو لوگ مجھے بھیک دیتے ہیں خدا ان کی رضا طلب کرنے کے بجائے ان سے جواب طلب کرے گا!

چور بازاری کی آمدنی پر خدا کو مقروض کرنا بالخصوص ایسی حالت میں کہ شرح مبادلۂ زر طے نہ ہوا میرے نزدیک کوئی شریفانہ فعل نہیں ہے۔ لیکن میں ایمان داری سے بھیک مانگتا ہوں یا نہیں اتنی بات ضرور ایمان داری سے کہوں گا کہ میں نے اتنی بھیک نہیں مانگی کہ بھیک دینے والے کو آخرت میں کچھ زیادہ آمدنی کی توقع ہو۔ مجھے امید ہے خدا میری اس خدمت کا ضرور لحاظ رکھے گا!

میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ دولت کمانے کے تین طریقے بہت مقبول ہیں، ان تینوں میں میں نے بھیک مانگنا اختیار کیا تھا، آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ قرض لینا اور چوری کرنا دراصل بھیک مانگنے ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، یہ تو توقع یا مصلحت ہوتی ہے کہ ہم کسی کو بھک منگا نہیں مقروض یا چور کہتے ہیں اور یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم ایک بھک منگے کو چور کہتے ہیں اور دوسرے بھک منگے کو غریب پرور سلامت! اور گذارش حال بھی ہے کہ غریب پرور سلامت پر برے دن آتے ہیں تو ہم ان کو ایسے لقب سے یاد کرتے ہیں جن سے بھک منگے مقروض اور چور کو بھی شرم آئے!

قرض لینے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کو پیسے کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرض دینے والا جب آپ ہی کی طرح آپ کا پیچھا کرنے لگتا ہو اس وقت آپ محسوس کرتے ہیں کہ پیسے کا پاس ہونا یا نہ ہونا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات میں نے کچھ یوں ہی سی کہہ دی ہے اور آپ کے لئے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جو شاید بھیک مانگنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے ہوں لیکن خرچ کرنے میں خاصے فارورڈ بلاک ہوتے ہیں!

قرض لینا بڑے ریاض کا فن ہے اس میں ذرا سی چوک ہو جائے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا، قرض کا علاج صرف قرض ہے۔ علاج سے ذرا غفلت برتی جائے تو مریض کہیں کا نہیں رہتا۔ قرض میں ٹھہراؤ ہوا نہیں کہ فن کا زوال ہو گیا جس طرح انسانی فضائل کی تکمیل میں عقل اور عشق دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے، اسی طرح قرض کے فن کی تکمیل میں بھی عقل و عشق کا دخل ہوتا ہے۔ یہاں بھی ابتداً عقل کی اور اس کے بعد عشق کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ عقل تو تماشائے لب بام سے آگے نہیں بڑھتی، آتش نمرود یا آتش مقروض میں عشق ہی کو کودنا پڑتا ہے!

دولت کی خاطر قرض لینا پڑتا ہے لیکن جب تک دولت نہ ہو اس وقت تک قرض نصیب بھی نہیں ہوتا۔ دولت نہ ہو اور قرض لینا پڑے تو پھر شخصیت کی ضرورت پڑتی ہے شخصیت کی پہچان یہ ہے کہ قرض آسانی سے مل سکے اور جب ادا کرنا چاہے تو قرض خواہ بُرا مان جائے! بالفاظ دیگر قرض دار میں شخصیت ہونی چاہیئے اور قرض خواہ میں محبت۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن یہ عجیب ہے نہیں اس لئے کہ قرض دینے والا محبت نہ کرے تو میں اس کا قرض لینا ادا کرنے لگا میں جس سے قرض لیتا ہوں اس سے ایک طرح کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ یعنی قرض دے کر ہم تو ایک دوسرے کو ایسا مچلکہ دیا ہے کہ تا ادائیگی قرض آپس میں شریفانہ طور طریقے برتیں گے۔ اس قرض پر نیک چلنی کے مچلکے بنانے کا تمام تر بار قرض دینے والے پر ہوتا ہے۔ میں صرف اتنی احتیاط برتتا ہوں کہ قرض دینے والے کے لئے حسن سلوک، نہ صرف حسن نیت سے یہ ظاہر کر دیا کرتا ہوں کہ صلح و شرافت کے اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر حتی الوسع یہ قرض ادا کیا جائے گا، یہی نہیں بلکہ اس قرض میں اضافہ ہوتا رہے گا، بقول شخصے جو گھل را گراں بینی!

یہ اس لئے کہ صلح و شرافت کی حیثیت ایک عفیفہ کی ہے جس کے تحفظ اور سلامتی کی متواتر اور مسلسل کوشش نہ کی جائے تو اس کا ہر وقت اندیشہ ہے کہ غیر ذمہ دار اس کی عصمت لوٹ لیں۔ اس بنا پر میرے نزدیک بھیک بطور قرض مانگی جا سکتی ہے اور قرض بطور تاوان لیا جا سکتا ہے، چوری بھی اس سے دور نہیں!

دولت کمانے کا تیسرا وسیلہ چوری ہے۔ اس کا رشتہ بھیک اور قرض دونوں سے ہے مثلاً دونوں کو ایک ادا میں رضامند کہ بھیک یا قرض مانگنے والے ایسے ہیں جو چوری کے مرتکب نہ ہوتے ہوں۔ میں ان کم لوگوں میں نہیں ہوں۔ چوری کا مدار ہمیشہ کسی کی حق تلفی پر نہیں ہوتا اپنی خوش قسمتی پر بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں کون ایسا بدنصیب ہے جو کسی نہ کسی حد تک خوش قسمت نہ ہو۔ میں بھی خوش قسمت ہوں اس لئے چوری سے باز نہ آیا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے بھیک قرض یا چوری کا مشغلہ کب سے شروع کیا ختم کر دینے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، بقول اقبال کارِ جہاں دراز ہے،

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

آزادی کی زنجیریں

ظفر حسن دریا پور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد میر مظفر حسن پنشن کے بعد وطن میں آ رہے تھے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے ہیڈ ماسٹر شیو دیال کے اصرار پر ظفر کے والد سے الہ آباد کالج میں داخل کرنے پر تیار ہو گئے۔ ظفر اور شیو دیال صاحب کا لڑکا ہردیال الہ آباد آئے اور اکرام اللہ صاحب کے ہاں ٹھہرے جو شیو دیال کے شاگرد اور میر مظفر کے دوست کے بیٹے تھے۔ کالج کا پہلا دن ظفر کے لئے سخت تھا اور جو کچھ ایک دن میں اس نے دیکھا اور سنا وہ اس کے لئے بالکل نیا تھا، نئے چہرے، نئی عمارتیں، نئی کتابیں، نیا ادب، سوشلزم اور دوسرے غیر مانوس الفاظ سب نے مل کر اس کے دماغ کو بہت متاثر کیا۔

(قسط ۱۲)

کالج میں لڑکیوں نے ظفر سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعض نے رومانی محبت کا سلسلہ بھی چھیڑا لیکن اس کے حد سے بڑھے ہوئے حجاب اور تکلف نے کسی کو زیادہ قریب نہیں آنے دیا۔ اس کے کلاس میں لڑکیاں بھی تھیں مگر ان میں سے اکثر بہت خوددار اور شرمیلی تھیں اور لڑکوں سے الگ الگ رہتی تھیں۔ دو چار کسی قدر چلبلی واقع ہوئی تھیں اور ہردیال جیسے بے باک لڑکوں سے بے جھجک ہنسی مذاق کرتی تھیں۔ ظفر ایک مدت تک ان سے کتراتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ یہ شوخ لڑکیاں اس کے جھینپو پن کو سادہ لوحی سمجھ کر اس کا مذاق اڑائیں گی۔ لیکن جب ان کی پیش قدمیوں سے مجبور ہو کر اسے ان سے بات چیت کرنی پڑی تو اس کا یہ اندیشہ دور ہو گیا اس نے دیکھا کہ وہ اس کے ساتھ خاصی سنجیدگی سے گفتگو کرتی ہیں، اور اس کی کم آمیزی کو قدر کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ بہر حال وہ اپنے ساتھیوں میں بے حس بے رنگ، زاہد خشک مشہور ہو گیا، اور انھوں نے یہ سمجھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ قدرت نے اسے انس و محبت کے لطیف جذبات سے محروم رکھا ہے، اس لئے اس سے میل جول پیدا کرنے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ مگر حقیقت میں جو معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، اس کی رمیدگی، اور وحشت کا باعث بے حسی اور خشکی نہ تھی بلکہ انتہائی زود حسی اور جذبات کی بے پناہ شدت۔ وہ برسوں سے محبت کا بھوکا تھا اور اب جنسی جبلت بھی جو کسی محرک کے نہ ہونے سے بہت دیر تک دبی رہی، زور شور سے ابھر آئی تھی۔ مگر اس میں بچپن کی حد سے زیادہ سخت تربیت کی وجہ سے اعتماد نفس کی بہت کمی تھی۔ وہ سمجھتا تھا اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں کہ کوئی لڑکا یا لڑکی اس سے محبت کر سکے۔ اگر کوئی اظہار محبت کرتا تو وہ اسے یا تو تمسخر سمجھتا یا ترحم اور اس کی خودداری کو نہ یہ گوارا تھا کہ کوئی اس کی ہنسی اڑائے اور نہ یہ کہ اس پر کوئی رحم کھائے۔ اس کے علاوہ وہ ڈرتا تھا کہ اگر ایک بار ضبط کے بند ٹوٹ گئے تو وہ رومانی اور جنسی محبت کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جائے گا۔ اور خود اپنی اور دوسروں کی نظر میں سبک اور حقیر ہو کر رہ جائے گا۔ وہ کلاس میں کلاس کے باہر دوسروں کی آنکھ بچا کر للچائی ہوئی نگاہوں حسینوں کے خرمن حسن کی گل چینی کرتا۔ رات کو بستر تنہائی پر جاگتے اور سوتے میں رنگین صحبتوں کے خواب دیکھتا۔ لیکن جہاں رومان کے حقیقت بننے کا خفیف سا بھی امکان ہوتا، کچھوے کی طرح ڈر کر خول کے اندر سر کھینچ لیتا۔

اکثر اسے حسینہ کا خیال آتا اور وہ عالم تصور میں اس کی بچپن کی تصویر کو حافظے کے صندوق سے نکال کر اس میں جوانی کا آب و رنگ بھرنے کی کوشش کرتا۔ ابھی تک وہ پھپھی کے گھر نہیں گیا تھا پہلے تو اس نے کم فرصتی اور کم ہمتی کی وجہ سے ارادہ ہی نہیں کیا جب میر صاحب کا خفگی کا خط آیا تو وہ سول لائنس میں صفدر علی صاحب کے بنگلے پر گیا، مگر معلوم ہوا کہ وہ ایک مہینے کی رخصت لے کر بیوی اور بیٹی سمیت نینی تال چلے گئے ہیں۔ دو روز ہوئے میر صاحب نے پھر تاکید سے لکھا تھا کہ تمھارے پھوپھا نینی تال سے آ گئے ہوں گے تم جلد سے جلد جا کر پھپھی سے ملو۔ ظفر اپنے دل کو مضبوط کر رہا تھا کہ اتوار کو اس مشکل کا سامنا کرے۔ فطری جھجک کے علاوہ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ پھپھی آمنہ شکایت کریں گی کہ وہ ان کے ہاں نہیں ٹھہرا اور اتنے دن تک ملنے کو نہیں گیا۔

اتوار کو نو بجے وہ اپنی سب سے اچھی ٹسر کی اچکن اور پیاجامہ پہن کر اسٹینلے روڈ کے قصد سے نکلا اسے یہ خیال آیا تھا کہ اکرام اللہ صاحب سے پوچھ کر تانگہ لے اور ٹھاٹھ سے سوار ہو کر جائے مگر پھر سوچا تو یہ بے جا نمود اور وہ بھی دوسرے کے برتے پر کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی۔ وہ کفایت کے خیال سے تانگے میں اب تک کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ صرف کالج میں نہیں بلکہ بازار میں بھی پیدل آتا جاتا تھا۔ آٹھ دس میل پیدل چلنا اس کے لئے معمولی بات تھی مگر آج اس نے ڈیڑھ میل جانے کے لئے ایک روپے کا خون کیا، اور کچہری کے پاس سے تانگہ لے کر روانہ ہوا صفدر علی صاحب کے بنگلے پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے رعب دار چہرے اور سڈول ورزشی جسم کے ساتھ ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ تانگہ برساتی میں رکا تو صفدر علی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کے چہرے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے ظفر کو اچھی طرح نہیں پہچانا، پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں ظفر نے تانگے سے اتر کر سلام کیا تو انھوں نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے انگریزی میں کہا "تشریف رکھئے" ظفر اس سرد مہری کے استقبال سے اور بھی گھبرا گیا۔ اور اس نے بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر کہا، "میں معافی چاہتا ہوں .... حاضر نہیں ہو سکا، والد صاحب نے آپ کو لکھا ہوگا" اب صفدر علی صاحب نے اسے پہچان لیا اور اٹھ کر گلے لگاتے ہوئے کہا" ارے ظفر تم تو سات آٹھ برس میں جوان کیا بوڑھے ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے ان صاحب کو کہاں دیکھا ہے۔ تمھاری پھپھی تو بہت دن سے تمھارے انتظار میں تھیں۔ مجھ سے بار بار کہتی تھیں کہ ظفر کا پتہ چلاؤ اور مجھے خیال نہیں رہتا تھا، چلو اندر چل کر پھپھی اور بہن سے ملو۔"

ظفر صفدر علی صاحب کے پیچھے گیلری میں سے گذر کر اندر کے برآمدے میں پہنچا تو دیکھا کہ کوئی بیالیس تینتالیس برس کی عمر کی ایک فربہ اندام خوب صورت بیوی نواڑ کے پلنگ پر بیٹھی ہاتھ میں کاپی پنسل لئے نوکر سے پوچھ کر حساب لکھ رہی ہیں۔ ظفر کو یقین تھا کہ پھپھی بغیر بتلائے اسے نہیں پہچانیں گی۔ انھوں نے ان دونوں کی آہٹ سن کر دروازے کی طرف دیکھا اور ظفر پر نظر پڑتے ہی اٹھ کر ننگے پیر دوڑیں اور اس سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ظفر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صفدر علی صاحب بھی بہت متاثر ہوئے۔ عقیلہ بیگم نے صفدر علی صاحب کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ظفر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا انھوں نے دوسرے ہاتھ سے رومال اٹھا کر آنسو پونچھے اور ادھر ادھر کی طرف دیکھا۔ مگر وہ پہلے ہی وہاں سے ٹل گیا تھا۔ وہ رقت کو ضبط کرتے ہوئے شکایت کے لہجے میں ظفر سے کہنے لگیں" واہ بھیا خوب انتظار دکھایا بھائی صاحب نے تمھارے آنے کے ڈیڑھ مہینے بعد لکھا کہ ظفر کالج میں داخل ہو گیا ہے۔ تم سے ملا ہوگا میں اسی روز تمھیں تلاش کرانا چاہتی تھی مگر اب سے دور ــــ حسینہ کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ میرے حواس جاتے رہے۔ خدا خدا کر کے اس کی طبیعت سنبھلی تو ڈاکٹر نے کہا کہ اسے پہاڑ پر لے جاؤ۔ صاحب ایک مہینے کی رخصت لے کر ہم دونوں کو نینی تال لے گئے وہاں سے آتے ہی صاحب سے تقاضا شروع کیا کہ ظفر کو بلوائیے مگر انھیں فرصت ہی نہ ملی۔ بھائی صاحب کو لکھ کر تمھارا پتہ پوچھوایا۔ کل شام ان کا جواب آیا کہ ابراہیم باغ میں ٹھہرا ہے۔ آج چپراسی کو بھیجا۔ شاید اب پہنچا ہوگا۔ کیوں میاں یہ نواب ابراہیم تمھارے کون ہیں جو تم پھپھی کا گھر چھوڑ کر ان کے گھر رہنے کو گئے؟"

ظفر۔ جی ــــ وہ بات یہ ہے کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے ہردیال وہاں ٹھہرے ہیں۔ ابا جان چاہتے

ہے کہ میں اُن کے ساتھ رہوں۔
عقیلہ بیگم۔ تو ددھیال سب کچھ ہوا اور ہم کوئی نہ ہوئے۔
ظفر۔ جی نہیں، یہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ اصل میں ابا جان کا یہ خیال تھا کہ ——— کہ پھپھا جان اکثر دورے پر رہتے ہیں، میری نگرانی اچھی طرح نہ ہو سکے گی۔
عقیلہ بیگم۔ تو تم استنے بڑے ہو گئے کہ ہر وقت تمھاری نگرانی کی ضرورت ہے۔ اور یہ ددھیال تمھاری بڑی اچھی طرح نگرانی کرتا ہوگا۔
ظفر۔ وہاں شیخ انعام اللہ صاحب کے بیٹے اکرام اللہ رہتے ہیں۔ ان کو میرا نگراں مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ابا جان کی خواہ مخواہ کی باتیں ہیں۔ مگر میں ان کے سامنے کیا کہہ سکتا ہوں۔
صفدر علی۔ خیر بھئی یہ ان کی مصلحت ہے۔ آپ بچارے لڑکے کو کیوں دق کر رہی ہیں۔ اپنے بھائی سے پوچھیے گا۔
عقیلہ بیگم۔ خیر وہ آئیں گے تو اس کا فیصلہ ہوگا، مگر ان سے یہ بھی نہ پوچھوں کہ کیا ابا جان نے یہاں آنے کو بھی منع کر دیا تھا۔
ظفر۔ انھوں نے تو بڑی تاکید کی تھی مگر مجھے شروع میں ایسی سخت مصروفیت رہی کہ سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی، پھر جب حاضر ہوا تو آپ کے نوکر نے بتایا کہ آپ لوگ نینی تال تشریف لے گئے۔
عقیلہ بیگم۔ خیر بھیا تم جیتے رہو اور خوش رہو آج بھابی بھی زندہ ہوتیں تو تم پر ہمارا زور ہوتا، بھائی نے تو جس دن سے پردیس میں بیاہ دیا، غیر ہی سمجھا بھابی کو خدا جنت نصیب کرے ان کے دم سے میکہ قائم تھا۔ اب تو نام ہی نام ہے، کبھی کبھی صورت دکھا جایا کرو تو تمھارا بڑا احسان ہے تمھیں دیکھ کر وہ نیک بیوی یاد آ جاتی ہیں جو میری ماں بہن، بھاوج سبھی کچھ تھیں۔
ظفر۔ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں۔ انشاءاللہ اب برابر حاضر ہوتا رہوں گا۔

اتنے میں عقیلہ بیگم کو کچھ خیال آیا تو وہ اٹھ کر اندر کمرے میں گئیں، صفدر علی صاحب ظفر سے اس کی پڑھائی کے متعلق سوال کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک ماما چاندی کی کشتی جس پر کروشیا کا ریشمی خوان پوش پڑا ہوا تھا، لے کر نکلی اور ایک تپائی پر ظفر کے سامنے رکھ دی۔ دوسرے کمرے سے عقیلہ بیگم برآمد ہوئیں اور اُن کی آڑ میں ایک لڑکی کی جھلک نظر آئی۔ ظفر کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ نظر نیچی کئے ہوئے کھڑا ہو گیا، عقیلہ بیگم نے اُسے بٹھایا اور کہا "حسینہ تمھیں آداب کر رہی ہے۔" ظفر نے گھبرا کر کہا "آداب، جیتی رہو" اور ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اس کے تخیل کی مست شباب جوان عورت کے بجائے وہی نازک اندام، پیاری بھولی بچی کھڑی ہے جسے اُس نے آٹھ برس ہوئے دیکھا تھا۔ حسینہ باپ کے قریب ایک پیڑھی پر شرمائی ہوئی بیٹھ گئی۔ ظفر نے پھپھی سے کہا "ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انھوں نے کہا "اللہ کا شکر ہے اب تو بالکل اچھی ہے۔ آٹھ روز کے بخار نے اس کے دشمنوں کو ایسا کر دیا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ بیمار پڑ رہنے سے اب کچھ چہرے پر رونق آئی ہے۔"

ظفر نے جرأت کر کے حسینہ کو ذرا غور سے دیکھا تو اسے اپنے پہلے تاثر میں ترمیم کرنی پڑی۔ حسینہ کے چہرے پر بچپنے کی معصومیت ضرور تھی، مگر اب وہ کسی قدر کھنچ کر کتابی چہرہ بن گیا تھا۔ اس کا قد بچپن میں اپنی عمر اور جسم کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ تھا اور اب اس میں بہت کم اضافہ ہوا تھا۔ اس لئے ظفر کی وہ پہلی نظر میں اتنی ہی بڑی معلوم ہوئی مگر دوسری بار دیکھنے سے پتہ چلا کہ قد میں فرق ضرور ہوا ہے اور اس کے ساتھ جسم بھی کسی قدر بھر آیا ہے، اس لئے جسم اور قد ایک دوسرے سے اس درجہ مناسبت رکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ رنگت پہلے کی طرح میدے میں شہاب ہے۔ مگر اب ملاحت نے اس میں اور نرمی اور دل کشی پیدا کر دی ہے۔ ظفر نے اسے اپنی خیالی تصویر سے زیادہ حسین پایا لیکن یہ حسن پرشور اور ہیجان خیز نہ تھا بلکہ پرسکون اور فرحت بخش۔ ظفر کو اس کے چہرے پر بیماری کے کوئی آثار نظر نہیں آئے اس نے سوچا کہ معمولی ملیریا ہو گیا ہوگا جسے ماں کی محبت نے سخت بیماری سمجھ لیا۔ وہ انھیں خیالات میں تھا کہ پھپھی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔
عقیلہ بیگم۔ لو بھیا کچھ مٹھائی پھل کھاؤ۔
ظفر۔ جی میں ناشتہ کر چکا ہوں، اس وقت کچھ خواہش نہیں۔
عقیلہ بیگم۔ اس عمر میں یہ حال ہے، کچھ تو کھاؤ۔
صفدر علی۔ بھئی خواہ مخواہ بے وقت کھانے پر مجبور نہ کیجئے۔ یہ کشتی اُن کے ساتھ کر دیجئے گا۔
عقیلہ بیگم۔ ساتھ تو لیتے بھی جائے گی، مگر میرے سامنے کھاتے تو میرا جی خوش ہوتا۔

ظفر نے خوان پوش ہٹا کر ایک سنترہ، کچھ خشک میوہ، دو ڈلیاں مٹھائی کی کھائیں۔ عقیلہ بیگم نے ماما کو آواز دی، وہ گلاس میں پانی اور اگالدان لے کر آئی۔ ظفر نے کلی کر کے رومال سے منہ پونچھا، اور صفدر علی سے مخاطب ہو کر کہا "اب مجھے اجازت دیجئے۔ یہاں کہیں تانگہ مل جائے گا؟"
صفدر علی۔ تانگہ یہاں کہاں؟ تم کار پر چلے جاؤ۔
عقیلہ بیگم۔ اے ابھی بیٹھو، ایسی کیا جلدی ہے کھانا کھا کر جانا یا اپنے اس اتالیق ہر دیال سے ڈرتے ہو؟
ظفر۔ جی نہیں، کام بہت کرنا ہے۔ انشاءاللہ اگلے اتوار کو حاضر ہوں گا۔
عقیلہ بیگم۔ اگلے اتوار ہی کو نہیں، اب ہر اتوار کو آنا ہوگا، اور کھانا یہیں کھانا پڑے گا، نہیں تو میں پھر بھائی کو خط لکھتی ہوں۔
ظفر۔ بہت اچھا، جہاں تک ہو سکا ہر اتوار کو آؤں گا۔ اگر کوئی مجبوری ہوئی تو اطلاع کر دوں گا۔

اس نے اٹھ کر پھپھا اور پھپھی کو سلام کیا "آداب" کی ایک باریک آواز سن کر دیکھا کہ حسینہ سر نیہوڑائے کھڑی ہے اور اُسے سلام کر رہی ہے۔ اب کی اس نے "آداب" اور "جیتی رہو" کے لفظ کے بیچ ....

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

کیا کیا نہ کیا — دولت کی خاطر!

(بہ سلسلہ صفحہ)

ایک طرح کی ادائیگی درباز ہوتی ہے، میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر اصرار بھی نہ ہوگا کہ میں یہ بتاؤں کہ یہ مشاغل میں نے کب سے شروع کئے۔ خود آپ میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو یہ نہ بتا سکیں گے کہ فطرت یا سوسائٹی کے مطالبات گناہ اول نے کب سے ادا کرنے شروع کئے۔ اسی وقت بائزالت کے پیش نظر عقل مندوں نے "گناہ اول" کا نظریہ ایجاد کیا اور ہم نے اپنے نکاح ثانی اور مہر شرعی کا! اس طور پر میرا خیال ہے زندگی کی ہر سرگرمی کا شجرہ نسب ان نظریات کی روشنی میں پیدا کیا جا سکتا ہے!

دولت کی خاطر میں نے کیا کیا نہ کیا کے اظہار خیال کرنے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ اس سے میری اس ہر دل عزیزی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے جو انکم ٹیکس والوں اور چور بازار کے کاروباریوں میں مجھے یکساں طور پر حاصل ہے۔ در اصل میں دولت پیدا کرتا ہی ہوں۔ انھی دونوں کی خاطر۔ میں چور بازار والوں کا احسان مند ہوں اس لئے کہ وہ یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ میں نے روپیہ کہاں کمایا اور کیسے کمایا۔ میں انکم ٹیکس والوں کا بھی شکر گذار ہوں کہ وہ اتنا پوچھتے ہیں کہ کتنا کمایا۔ ریڈیو والوں کے بارے میں کیا عرض کروں جو یہ دریافت کرنے پر تلے ہیں کہ کیونکر کمایا! انکم ٹیکس کا تو مقصد یہ ہے کہ اتنے میں اتنا رکھتے جاؤ، چور بازار والے اس کے درپے رہتے ہیں کہ سب کچھ رکھ جاؤ، ریڈیو اس فکر میں ہے کہ جیل خانے بھی جاؤ!

بھیک منگائی قرض، چوری کے تجربات ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ میرا سابقہ ایسے زمانے اور ایسے لوگوں سے ہوا جو دولت پیدا کرنے کے بجائے دولت لوٹنے کی عبادت میں مبتلا تھے مجھے لوٹنے والوں کے ہتھکنڈے معلوم تھے لیکن عقل کے اعتبار سے میں کچھ السامر مجان مرنج واقع ہوا تھا کہ جس آسانی سے دوسروں کی کامیابی دیکھتا اور للچاتا تھا اس کے بعد بہت زیادہ غور و فکر کے بعد بھی اور غالباً اسی وجہ سے، اپنی نالائقی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے لفنگوں کو لیڈر بنتے دیکھا لیکن خود لفنگا بننے کی کوشش شروع کی تو لفنگوں نے مار گرایا، دوبھی اس قابل کر خود لفنگا بن سکا نہ لفنگوں کا کچھ بگاڑ سکا۔ چور بازاری شروع کی تو چور بازار والوں نے مجھے خفیہ پولیس اور خفیہ پولیس نے دہشت پسند قرار دے کر چالان کر دیا اور ایک خاتون مجسٹریٹ نے ناقص العقل قرار دے کر چھوڑ دیا۔

اب میں نے سوچا کہ جمعے کے دن نمازیوں کی جوتیاں چراؤں گا۔ گاؤں کی معمولی سی مسجد تھی۔ حلیے نے وعادی انمازی یہ سمجھ کر میں واعظ ہوں۔ نماز کے بعد ہاتھ چومے، منبر پر بٹھایا اور وعظ سننے کے لئے سرِ بزانو ہو گئے۔ میں نے زکوٰۃ کی فضیلت اور جوتے چرانے کی معصیت پر تقریر شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ میرے وعظ کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو رہا تھا اس لئے کہ جب پر زکوٰۃ واجب آئی تھی وہ اونگھنے لگے تھے اور جن کی نظر جوتوں پر تھی وہ رہ رہ کر کن انکھیوں سے کچھ اس طرح میری طرف دیکھتے تھے کہ مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ باہر نکلا تو جوتا غائب! معلوم ہوا کہ اس دیار میں لوگ جوتے پہنے نہیں بلکہ ہاتھ میں لے کر چلتے ہیں اور لاٹھی کندھے پر رہتی ہے۔ غرض کچھ چیز سی معلوم ہوا کہ یہ لوگ بگڑ بیٹھے ہیں تو مجھ تاکید اتنی سے ....

(بقیہ صفحہ ... پر)

تقلیدی مذہب اور تقلیدی لامذہبی

صالحہ عابد حسین

"یہ کیا کہا آپ نے کہ "تم بس زبانی جمع خرچ کرنا جانتے ہو، فاقہ کبھی خود بھی کیا ہے یا محض خالی خولی باتیں کرتے ہو!" جی ہاں بے شک ہم نے بھی مدتوں فاقے کئے ہیں، بھوک کا مزا چکھا ہے ——— ابھی نوجوانی میں رمضان بھر کچھ اماں ابا کے ڈر سے کچھ آپ کے اللہ میاں کے خوف سے، روزے رکھا کرتے تھے۔ اوہ، روزے میں ہم پر کیا گذرتی تھی، بس ہمارا ہی دل جانتا ہے اگرچہ سحری کو خوب ڈٹ کر دودھ اور جلیبیاں، کباب اور پراٹھے کھا لیتے تھے اور اگلے دن دوپہر تک سو کر وقت اچھا کٹ جاتا تھا مگر بھی ——— تیسرے پہر سے دل میں خلش، پیٹ میں آگ سینے پر جلن اور انتوں میں کھرچن سی شروع ہو جاتی ہے۔ سنا ہے بھوک میں بڑی آنت چھوٹی آنت کو کھا جاتی ہے ——— ضرور کھاتی ہوگی ——— سارا دن ہمارا دل بس باورچی خانے ہی میں پڑا رہتا۔ بار بار کوئی بہانہ نکال کر ادھر جاتے اور دیکھتے کہ افطاری کے لئے کیا کیا پک رہا ہے۔ شربت دودھ اور برف کا ہے یا خالی شکر کا؟ پیسنے کی ہوائیاں اس پر ڈالی گئی ہیں یا نہیں۔ امرود کے کچالو بھی کسی نے بنالئے کہ یوں ہی بے کٹے پڑے رہنے دئے ہیں ——— مگر پھر بھی تسلی نہ ہوتی، دن پہاڑ ہو جاتا اور جیسے جیسے دن ڈھلتا جاتا ہمارا دل بہلنے سوچ سوچ کر اپنے کو بہلاتا، کل روزہ ہرگز نہ رکھیں گے ——— پیٹ میں درد ہے، سر بھاری ہے، قے اور متلی کی شکایت سینے پر جلن ——— اور یہ کچھ جھوٹ بھی نہ تھا ——— رات کو بے وقت کھانا سچ مچ مریض بنا دیتا تھا۔ مگر روزہ کھولنے کے بعد "تم مذہبی" اور "لامذہبی" کی باتیں ہوا ہو جاتیں اور جب ہم پلنگ پر لیٹ کر اپنے نقارہ کی طرح بھرے ہوئے پیٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے اور اجر ہاتھ پھر ہاتھ بھسم کر دل میٹھی بھات، وہ بالی تخت سلیمان کی، بن داؤد علیہ السلام کی" کا وظیفہ کھانا ہضم ہونے کے لئے شروع کر دیتے، اور آنکھیں بوجھل ہو کر آہستہ آہستہ بند ہونے لگتیں تو اگرچہ نماز کو گول کر جاتے تھے مگر روزے کے بارے میں لامذہبی کا جذبہ جو دن کی بھوک میں پروان چڑھتا رہا تھا غائب ہو جاتا اور ہم نہایت سعادت مندانہ انداز اور پرہیزگاری کے انکسار آمیز لہجے میں کہتے رات کو ہمیں ضرور جگا دیا جائے ——— اگرچہ ہماری طبیعت ناساز ہے مگر اس مرتبہ ہم نے پورے روزے رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور ہماری اماں کا جھریوں پڑا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا۔ اور وہ بڑے پیار بھرے انداز میں ہماری طرف دیکھ کر چھوٹی بہن سے کہتیں ——— "کتنا دین دار ہے میرا بچہ" ——— اللہ اس کی عمر دراز کرے "۔ کیا فرمایا آپ نے "جب رات کو اور سحری کو ڈٹ کر ثقیل چیزیں کھائی جائیں تو جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ فاقے کی نہیں زیادہ کھانے کی ہوتی ہے"۔ اب آپ کی اس دھاندلی کا کوئی کیا جواب دے ——— اور اسی پر کیا منحصر ہے ہم نے عشرۂ محرم کو بھی فاقہ کیا ہے، اس میں سحری بھی نہیں ملتی تھی۔ اور چار پانچ بجے شام تک بھوکا پیاسا رہنا پڑتا تھا ——— مگر ہماری جواں مردی دیکھیے کہ بچپن میں کبھی فاقہ نہیں توڑا، بلکہ مرثیوں، نوحوں تعزیوں اور مجلسوں میں بھوک کی جاں فرسا تکلیف کو بہلاتے رہتے تھے۔ بڑی بڑی شاباشیاں ملی ہیں، بڑی بڑی تعریفیں ہوئی ہیں ہماری، ہاں صاحب مانا کہ یہ سب شوقیہ فاقے تھے، مجبوری اور نہوت کے نہیں ——— اس سے پہلے اور بعد بندوق کی نالی کی طرح پیٹ کو بھر بھی لیا جاتا تھا، یہ بھی سہی کہ زیادہ تر بڑوں کو خوش کرنے اور تعریفیں کرانے کے لئے ہم یہ سب کام کرتے تھے ——— مگر اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ ہم تو خود ہی کہہ رہے ہیں، کہ "عاقل" و "بالغ" ہونے کے بعد ہم نے خود سمجھ لیا کہ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں ——— میں تو آپ کو اپنی بے وقوفی اور "زمانہ جہالت" کی داستان سنا رہا تھا ——— یہ تو حال ہی میں مجھ پر روشن ہوا کہ مذہب دھرم، خدا، ایشور سب فرضی ڈھونگ رچا رکھے ہیں۔ اس خود غرض دنیا نے اپنے فائدے کے لئے یہ سب قدیم، غیر مہذب اور جاہل انسان کے بہلانے اور پرچانے کے آرہے تھے ——— اور اب انسان ان فرسودہ عقیدوں کو خواہ مخواہ اور گھس رہا ہے۔ آپ ہی عقل اور انصاف سے کام لے کر بتایئے کہ اگر خدا ہوتا ——— یا ہے ——— تو آخر یہ سب جھگڑا فساد، یہ بیماری اور یہ فلاس یہ بھوک یہ خواہشوں کی پائمالی، آرزوؤں کی ناکامی کیوں ہے؟ ہم جس بات کی دعا مانگیں وہ کیوں پوری نہیں ہوتی ——— آپ کے اللہ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ وہ دنیا میں سکھ شانتی پھیلا سکے، لوگوں کی ضرورتیں اور خواہش پوری کر سکے ——— اگر نہیں ——— اور ظاہر ہے کہ نہیں ——— تو بندہ ایسے خدا کا قائل نہیں ہو سکتا ——— کیا کہہ رہے ہیں آپ کہ "خدا نے بڑی حد تک انسان کو خود مختار بنایا ہے اور یہ سب خود اس کے ہاتھ میں ہے کہ وہ چاہے تو اس دنیا کو امن و شانتی کی جنت بنا دے اور چاہے اپنی ذلیل حرکتوں سے مصیبت اور دکھوں کا جہنم۔ انسان کے ہر حرکت، ہر عمل کا ایک نتیجہ قدرت نے مقرر کر دیا ہے۔ اگر اندھوں کی طرح گڑھے میں گرے گا تو چوٹ ضرور لگے گی ——— اگر انسان خدا کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کریں گے تو سکھ شانتی سے رہیں گے اس کے خلاف کریں گے تو خون خرابہ، بھوک افلاس، نااتفاقی، خوف، تباہی و بربادی کا شکار بنیں گے"

اجی رہنے بھی دیجئے یہ کٹ ملاؤں جیسی باتیں، سب سنی ہیں ہم نے ——— حضرت پورے سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک مذہب پر ایمان رہا ہے، اللہ میاں کو مانا ہے۔ نمازیں جھاڑی ہیں، روزے کی مصیبت بھی سہی ہے ——— خوب دیکھ اور پرکھ چکے ہیں مذہب کو ہم ——— کیا فرمایا "نماز روزہ مذہب نہیں، مذہب کا ایک جز ہے"؟ تو پھر مذہب کس چڑیا کا نام ہے؟ ہاں ہاں قرآن بھی پڑھا ہے ——— جناب نو سال کی عمر میں قرآن ——— یہ لمبی چوڑی موٹی کتاب، اس جان ناتواں نے ختم کی تھی ——— اور سات، آٹھ برس تک روز صبح یا شام رٹتے رہے ہیں ——— ہم پر تو کہیں اسلام کی سچی تعلیم اور مذہب کی روح کا انکشاف نہ ہوا ——— جی ہاں عربی میں نہیں تو کیا قرآن انگریزی میں پڑھایا جاتا ہے؟ عربی سمجھنا؟ جی میں عربی نہیں سمجھتا ——— اردو ترجمہ ——— نہیں میں نے نہیں ——— خیر آپ یہی کہہ لیجئے کہ ہم نے توتے کی طرح قرآن رٹا تھا ——— اگر دوسرے کی تحقیر کر کے آپ کو مسرت ہوتی ہے یہی سہی ——— مگر ہمیں تو یہی بتایا اور سکھایا گیا تھا کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، قرآن کی تلاوت کرو ——— تم پورے مذہبی اور با ایمان بن جاؤ گے ——— خدا کے برگزیدہ اور پیارے بندے، جو مانگو گے ملے گا، جو چاہو گے ہوگا ——— فلاں دعا سے فلاں مرض چلا جائے گا، فلاں وظیفے سے ستر برس ادھر اور ستر برس ادھر کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، فلاں عمل سے خزانوں اور دولت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے ......

یہ سب جھوٹ نکلا، سب غلط ——— اب آپ نے یہ نیا فلسفہ نکالا ہے کہ "یہ لوگ مذہب کے سائے کو پکڑتے ہیں اور اس کی اصل کو چھو بھی نہیں پاتے ——— اسلام کی اصلی تعلیم کلام مجید کے مطالعے سے، اس پر غور و خوض کرنے سے سمجھ میں آ سکتی ہے، مذہب چند رسموں کے مجموعے کا نام نہیں، ایک مکمل نظام حیات ہے جس کے لئے ہر مذہب کی اصلی اور بنیادی تعلیم کو سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے ——— تم اسلام کو سمجھنا چاہتے تو کم سے کم چند سال صرف قرآن مجید کے الفاظ اور مطالب کو سمجھ کر پڑھو اور پڑھ کر غور کرو اور اس کی روح کو پہچانو ——— " اجی سب بے کار کی باتیں ہیں ——— ہمارے پاس کہاں سے اتنا فالتو وقت آیا کہ اس میں ضائع کریں ——— ہم نے تو اچھی طرح دیکھ لیا کہ مذہب افیون ہے، نشہ ہے جو لوگوں

کو سُلانے، بے کار اور بے عمل بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے —— یہ آپ برابر کیا بُرا بھلا کہے جا رہے ہیں کہ تم نہ صرف ناتجربہ کار اور بے وقوف ہو بلکہ فسادی اور تنگ نظر بھی ہو۔ تم جب بزعم خود مذہبی تھے تب بھی دوسروں کو خوش کرتے تھے یا پھر تقلید کرتے تھے، اور اب مذہب سے نفرت اور اظہارِ بے تعلقی بھی محض دوسروں کی دیکھا دیکھی ان کی تقلید میں ہے زمانے کے فیشن کے طور پر ہے! اِن اخلاقی پابندیوں سے بچنے کے لئے جو مذہب نے عائد کی ہیں —— نہ تم نے اس وقت مذہب کو سمجھا تھا —— اور سمجھتے کیا، نہ تمہاری عمر اس قابل تھی نہ تمہارے بزرگوں نے تمہیں مذہب کی روح اور اصلیت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی —— اور اب جو تم نے مذہب کے خلاف رائے قائم کی ہے اس میں بھی کوئی غور و فکر یا سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ان لوگوں کی تعلیم سے استفادہ کیا جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کی تحقیق اور تلاش میں بسر کی ہیں —— یہ دھوکا دینے والی باتیں کہ ہم نے دیکھ اور سمجھ لیا کہ مذہب زمانہ قدیم کے لئے ضروری ہو تو ہو —— اس زمانے کے لئے بالکل بے کار ہے —— تم محض دوسروں سے سن کر کہتے ہو۔

—— بولو —— کیا کیا پڑھا ہے تم نے مذہب کو سمجھنے کے لئے —— "آپ جیسے کٹر لوگوں سے یہی اُمید تھی کہ طعنے تشنے دینے لگیں —— معقول بات تو آپ کی سمجھ میں آتی نہیں، کٹ حجتی کرتے ہیں ——

جی کئی سال سے ہم اس پر غور کر رہے ہیں کہ یہ مذاہب کا ڈھونگ ہے کیا پر ہا رہی —— جی؟ کیا غور کر رہے ہو؟ کیا پڑھ رہے ہو؟" پڑھنے اور غور کرنے کو بہت کچھ ہے۔ موجودہ زمانے کے مسائل ہیں بھوک، افلاس، بے کاری، رشوت خواری، چور بازاری ہزاروں چیزیں ہیں جن پر سوچتے اور غور کرتے ہیں —— "مگر ان مسئلوں پر غور کرنے سے مذہب کی حقیقت تم پر کیسے روشن ہو گئی؟ اس مسئلے پر ہزاروں سال سے ہزاروں آدمی غور کرتے، تحقیق و تجزیہ کرتے آئے ہیں۔ اُن کے افکار و خیالات پڑھو، وہ الہامی کتابیں جن میں مذہبوں کی تعلیم اور اس کی روح موجود ہے پڑھو۔ ان لوگوں سے جو تم سے زیادہ عالم اور باخبر ہیں گفتگو کرو —— اور پھر مذہب کی صحیح ہدایت دین کی اصل حقیقت کی روشنی میں ان مسائل پر غور کرو کہ یہ کیوں اور کیسے ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ اس وقت تم پر روشن ہوگا کہ ان لعنتوں کا سبب مذہب نہیں، مذہب سے ناواقفیت ہے۔ ان کے پھیلنے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ہم مذہب کی روح سے، اس کی صحیح تعلیم سے بہت دور ہیں —— سچی مذہبی تعلیم کو جو ایمان و صداقت کی جان ہے، ہم سمجھتے ہی نہیں —— مذہب نام رکھا ہے چند رسموں اور عبادتوں کے مجموعے کا —— ایسے مذہبی لوگ بھی، اور تم جیسے مذہب سے متنفر بھی —— در اصل اپنی خواہشات کو پوجتے ہیں —— مذہب کی تعلیم پر غور کرو، اُسے سمجھو، اس پر سچے دل سے عقیدہ اور بھروسہ رکھو۔ اسی کے

بقیہ تیسرے کالم کے نیچے

بقیہ بسلسلہ صفحہ ۸

اور عدالت اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتی کہ آپ لاٹھی کے علاوہ جوتے سے بھی پیٹتے ہیں!

پھر میں نے خیال کیا کہ مکتب میں مدتوں معلمی کی ہے کیوں نہ کسی شاگرد کے یہاں قسمت آزمائی کی جائے۔ گاؤں میں ایک کھاتے پیتے کاشتکار تھے جنھوں نے مجھ سے سالہا سال حروف تہجی کا درس لیا تھا اس زمانے میں بنیادی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک حرف بتایا اور فوراً ہی کان مروڑ دیے تاکہ وہ حرف فرار نہ ہونے پائے بالآخر کچھ ایسی صورت ہو جاتی تھی کہ ٹیڑھے میڑھے کان اس قابل نہ رہ جاتے کہ کوئی اور حرف اندر داخل ہو سکے۔

انھوں نے بڑی محبت سے پذیرائی کی۔ کئی دن تک خاطر مدارات رہی۔ اس دوران میں کتنوں کو مذہب کی اہمیت اور فلسفے کی فضیلت بتائی، کتنوں کی جھاڑ پھونک کی، کسی کی صورت دیکھ کر اولاد کی تعداد بتائی اور کسی کا تیور دیکھ کر شادی کی ضرورت جتائی۔ جن کے مقدمے دائر تھے ان کے لئے جھوٹے بیانات تصنیف کئے۔ پٹواری سے ڈرنے اور زمیندار سے لڑنے کی تلقین کی نتیجہ یہ ہوا کہ چلتے لگا تو اچھا خاصا مالِ غنیمت ساتھ تھا ایک بوجھ گنے اور گیہوں کی ہری ہری بالیوں کا، چند سیر گڑ، کچھ اچار، ایک تھان گزی کا، ایک عدد مرغ، دو روپے سے کم کی ریزگاری۔ ان سب کو لاد پھاند کر گاؤں سے رخصت ہوا۔ راستے میں تھانے کی چوکی پڑتی تھی ہیڈ صاحب کی نظر پڑی، پکڑ بلایا!

ان دنوں آس پاس کے گاؤں میں چوریاں ہو رہی تھیں اور چور کا پتہ نہیں لگتا تھا، جو چیزیں چوری ہوئی تھیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا ان کی فہرست اور حلیے قلم بند تھے۔ جو چیزیں متفرق طور پر مختلف اوقات میں چوری گئی تھیں وہ مجموعی طور پر، میرے قبضے سے برآمد ہوئیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا ان کے حلیے کے مختلف اجزا مجموعی طور پر میرے حلیے میں ملے۔ ہیڈ صاحب نے فرمایا کیوں "آنچہ خوباں (دزداں) ہمہ دارند تو تنہا داری!" میں نے آہ سرد کھینچ کر کہا، "ہمارا آفرینا گنہگار ہیں ہم!" نتیجہ یہ ہوا کہ سارا سامان ضبط کر لیا گیا اور مجھے ہدایت کی گئی کہ آئندہ اس نواح میں نہ پایا جاؤں!

دولت کی خاطر میں نے "گرو مور فوڈ" (خوراک زیادہ پیدا کرو) کی تحریک پر بھی عمل کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلی یہ دقت محسوس ہوئی کہ جب تک زیادہ کھایا نہ جائے اس وقت تک زیادہ خوراک کیسے پیدا کی جائے۔ یہاں کھانے کو جو کچھ مل رہا تھا وہ پہلے ہی سے "خونِ دل بے منتِ کیموس تھا!" بہر حال ایک قطعہ اراضی حاصل کیا اور مریل بیل اور ایک شکستہ ہل بہم پہنچائے۔ فن کاشتکاری پر ایک کتاب چھپائی "گرو مور فوڈ" کے مسئلے پر تکلم سر لیڈروں کی جتنی تقریریں ہوئی تھیں وہ سب پڑھنے اور پڑھ دم کیں، قوم کے لئے نعرہ لگاتا، اپنے آپ پر لعنت بھیجتا، اور باشوق تیور اور ذرا لیڈروں کے حلیہ میں کھیت پر پہنچا۔ ہل کو ہاتھ لگایا، چابک کو اونچا کیا اور بیلوں کو وہ ایک رسید بھی کر دیے۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک جگہ پاؤں پڑا، زمین پر آ رہا لیکن ہل کو نہ چھوڑا اور گھسٹتا چلا گیا۔ جو زمین ہل سے کھدی تھی وہ ہموار ہو گئی۔ اور ایک ایسا طریقہ دریافت

ہو گیا جس سے بیک وقت زمین جتتی جائے، بیج پڑتے جائیں اور زمین ہموار ہوتی جائے۔ یہ طریقہ زیادہ شکم خواہش ضرور تھا لیکن فوراً ہی کسی بڑے جنرل کا قول یاد آیا کہ فوج پیٹ کے بل مارچ کرتی ہے۔ میں نے دل کو سمجھا دیا کہ گرو مور فوڈ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

قصہ ... میں طوالت سے مختصر یہ کہ ایک گڑھے میں برسات کا پانی جمع تھا، اس میں سنگھاڑے کی بیل ڈال دی، ایک طرف دھان کے بیج بکھیر دیے، کچھ ترکاریاں بو دیں دن رات کی کروٹوں کے ساتھ آفاتِ ارضی و سماوی بھی کروٹیں لیتی رہیں۔ یہاں تک خیریت رہی لیکن پودوں کے نمودار ہوتے ہی آفات نے کروٹیں لینا بند کر کے چھاپا مارنا شروع کر دیں۔ مجھے حفظ تھا کہ میں نے کہاں کیا بویا تھا اور کس قسم کی کاشتکاری شروع کی تھی، لیکن یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ میری کاشتکاری کتنی بابرکت تھی۔ سنگھاڑوں کے ساتھ میں نے گڑھے میں بھینسیں اُگتے دیکھیں جن پر کہیں کہیں بندر اُگے ہوئے تھے جن کے سروں پر سنگھاڑے اُگے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ ہر طرف مویشیاں، مرد عورت، بچے، مرغیاں بند چوہے خرگوش، پٹواری مہمان شاعر مسخرے بھی اُگنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوراک پیدا کرنے کے بجائے مجھے اس کا اندیشہ ہوا کہ کہیں میں ہی نہ خوراک بن جاؤں۔ ایک صاحب نے مجھے ایک فوٹو لا کر دکھایا جو اس ملک سے متعلق تھا، جب میں نے ہل چلا کر گرو مور فوڈ کا افتتاح کیا تھا اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "ھٰذا من فضل ربی!"

میرے ایک آتش نوا شاعر دوست اسی حالت کی خاطر قلم میں پہنچے تو زمانہ اُن کے اس اعلان سے گونج رہا تھا،

ہاں بغاوت آگ بجلی موت آندھی میرا نام
میرے گردو پیش اجل میری جلو میں قتل عام
میرا مولد مفلسی کا دل ہے عشرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجرے میں نہیں جلتا چراغ

وہاں سے نکلے تو اس عالم میں:

دیکھو دیکھو رے جوہنا ابھار
جیسے ترکوں کی فوج
جیسے گدر انار
دیکھو دیکھو رے جوبنا ابھار!

(بقیہ پہلا کالم)

بتائے ہوئے اصولوں پر خلوص سے عمل کرو۔ حق اور صداقت، انصاف اور رواداری کو اپنا اصول بناؤ جو ہر مذہب کا جوہر ہے، اور پھر اس کے بعد بھی یہی ناانصافیاں اور بربادیاں موجود رہیں —— اس وقت تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا، پرکھ لیا، عمل کر لیا، مگر مذہب ایک افیون، ایک نشے، ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت تمہارے انکار کی بھی قدر ہو سکتی ہے لیکن اب ——

اب "اچھا اچھا بہت سن لیا آپ کا وعظ —— دماغ پریشان کر دیا —— خدا بچائے ان لوگوں سے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں —— اجی سب بکواس جاہل قدامت پرست رجعت پسند لوگوں کی بے معنی باتیں"

۴ " افسوس تمہارے حال پر —— شاید اسی قسم کے لوگوں کے لئے کتاب الٰہی میں آیا ہے کہ اُن کی آنکھوں پر اندھیریاں چڑھی ہیں کان بہرے ہو گئے ہیں اور دلوں پر مہر ہے، وہ کچھ دیکھنا، سننا اور سمجھنا

مطبوعہ:- جید پریس، دہلی
طابع و ناشر:- عبداللطیف بی اے (جامعہ)

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

یکم اپریل سنہ ۵۰ء

دنیا کا انجام — خواجہ غلام السیدین — ۲

ہندوستانی مسلمان کیا کریں؟ (اداریہ) — ۲

دنیا کی رفتار:—

۱۔ ہندوستان ع ۰ ح — ۴

۲۔ باہر کی دنیا ع ۰ ح — ۴

بزم بے تکلف — ۵

نغمہ (نظم) — وامق احمد مجتبیٰ — ۵

غزل — انجم اعظمی — ۵

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۶

ملکی زبان کا روپ — ڈاکٹر وین بہاری ترویدی — ۸

مصر، برطانیہ اور امریکہ — محمد امین — ۹

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر دہلی

اڈیٹر

ڈاکٹر سید عابد حسین

دُنیا کا انجام

خواجہ غلام السیّدین

(۱)

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پڑھنا ہر تعلیم یافتہ آدمی کا فرض اور نہ پڑھنا جرم ہے۔ پرانے زمانے میں اسی قسم کی کتابوں میں شاید زیادہ تر مذہبی، ادبی اور اخلاقی کتابوں ہی کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں بعض بہترین ناول بھی اس معزز صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ وہ انسانی زندگی، اس کے نشیب و فراز، اس کی کامرانی اور ناکامی کی ترجمانی ایسے دل نشیں انداز سے کرتے ہیں کہ جو انسان ان سے ناآشنا ہے اس کی ذہنی تہذیب ناقص ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے ناولوں میں (مثلاً) ٹالسٹائے کا "جنگ اور امن"، رومان رولاں کا "جین کرسٹوفر"، الگزنڈر منتھے کی "سان مشل کی کہانی" اور اپٹن سنکلیر کا سلسلہ "دنیا کا انجام" شامل ہیں۔ میں آج آپ کا تعارف اسی کتاب سے کرانا چاہتا ہوں۔

اپٹن سنکلیر کو تو آپ جانتے ہوں گے؟ امریکہ کا سب سے مشہور اور بلند پایہ ناول نویس جس کو بہت سے روایت پسند مورخین ادب نے ابھی تک جدید انگریزی اور امریکی ادب کی تاریخ میں جگہ نہیں دی، کیونکہ ان کی نظر میں وہ محض ایک جرنلسٹ اور پراپگنڈا نویس ہے! کیوں؟ اس لئے کہ اس نے اپنے ناولوں، ڈراموں (اور دوسری درجنوں کتابوں) کو دور حاضر کے زندہ اور متنازع مسائل سے پاک نہیں رکھا، بلکہ جرأت اور صاف گوئی کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔ اس نے ادب کو ایک نفاست پسند ادیب کا گوشۂ عافیت نہیں سمجھا کہ اس کے ایوان میں زندگی کے جھنجھلائے ہوئے مسئلوں کو گھسنے نہ دیا جائے، اس نے امریکہ کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے تمام مریض پہلوؤں کو غیر جانبداری اور بے خوفی کے ساتھ ایک ایک کرکے بے نقاب کیا ہے۔ اس لئے اس کا جرم صرف یہی نہیں کہ وہ ادب میں ان سوالوں کو چھیڑتا ہے جو لوگوں کے ذہنی عیش میں خلل ڈالتے ہیں بلکہ اس کا انداز فکر و نظر ترقی پسندانہ ہے۔ وہ سماج کے پھوڑوں اور ناسوروں پر بے حسی کا غلاف ڈالنے کے بجائے ان کو اپنے نشتر سے ٹٹولتا ہے جس سے چھپا ہوا غلیظ مادہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے...... لیکن جو لوگ ادب کو نہ صرف زندگی کی تفسیر بلکہ حیات برتر کی تحصیل کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھیں سنکلیر کی ادبی قدر و قیمت کا احساس ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اس نے امریکہ کے ادب میں اپنے ناولوں کے ذریعے اسی قسم کی خدمت انجام دی ہے جیسی برنارڈ شا نے اپنے ڈراموں کے ذریعے انگریزی ادب میں۔ اس نے آج تک شاید ستر سے زیادہ ناول اور دوسری کتابیں لکھی ہیں (رسالوں اور پمفلٹوں کا تو شمار بھی مشکل ہے!) ان میں سے آخری سلسلے کا مجموعی نام "دنیا کا انجام" ہے جس میں دس ناول شامل ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

دنیا کا انجام، دو دنیاؤں کے بیچ میں، اژدہے کے دانت، دروازہ کھلا ہے۔ پریذیڈنٹ کا ایجنٹ، اژدہوں کا فصل۔ یہ دنیا جیتنی ہے۔ پریذیڈنٹ کا مشن۔ ایک واضح پکار۔ اے گڈریے بول!

اس سلسلے کا موضوع کیا ہے؟ امریکہ کے ایک نوجوان لینی بڈ کی ذہنی کشمکش کی داستان، جو دولت اور عیش و آرام کی گود میں پیدا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی قدرت کی طرف سے ایک بیدار ذہن اور حساس دل کی دولت لاتا ہے۔ زندگی کے پہلے پچیس سال میں اس کے اندر دو زبردست قوتوں کی رسہ کشی چلتی رہتی ہے ایک قوت ہے جو اس کو آرٹ اور کلچر اور تفریح کی دنیا کی طرف کھینچتی ہے اور یہ اس کی فطرت کے ایک رخ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ دوسری قوت اسے جھنجھوڑ کر انھیں زبردست بے امان سماجی اور اقتصادی جنگ کی طرف توجہ دلاتی ہے جو ہماری موجودہ نسل کے حصے میں آئی ہے اور جس کی طرف سے کوئی انسان دوست شخص بے پروا نہیں رہ سکتا۔ ان ناولوں کا زمانہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کا ہے۔ یورپ اور امریکہ بلکہ ساری دنیا میں یہ جنگ زیادہ خوفناک اور واضح ہوتی جاتی ہے، اور رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی قوتیں الگ الگ صف آرا ہوتی جاتی ہیں۔ (خصوصاً جب سرمایہ داری نازی لباس میں دنیا کے امن اور مستقبل پر چھاپہ مارتی ہے۔) لینی بڈ کے لئے ناممکن ہوتا جاتا ہے کہ وہ آرٹ کے پرسکون اور خوبصورت قلعہ میں پناہ لے اور رفتہ رفتہ خود کو عوام کی جنگ آزادی کے ساتھ زیادہ قطعی طور پر وابستہ کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی آرٹ کی سرگرمیاں محض ایک دھوکہ کی ٹٹی بن کر رہ جاتی ہیں جن کی آڑ میں وہ یورپ میں روزویلٹ کے ایک سیاسی جاسوس کا کام کرتا ہے اور خود کو نازی فلسفے اور سیاست کا ہم خیال ظاہر کرکے درپردہ وہ ان کی بیخ کنی کے لئے بار بار اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، کہانی کی وسعت، اس کی دلچسپی، اس کی قوت، جیتے جاگتے کرداروں کی ریل پیل، زندگی کی نقاشی، فرض اور محبت کی کشمکش، سرمایہ داری تمدن کی خواب آسا اور رنگین عیاشیاں، غربت اور محرومی کی دلدوز تصویریں۔ غرض ناول کی کون سی خوبی ہے جو اس کئی ہزار صفحوں کے زبردست اور ضخیم ناول میں نہیں ہے

لیکن اگر یہ محض ایک شخص کی زندگی اور کارناموں کی داستان ہوتی تو میں اس کی سفارش ضرور کرتا، لیکن اس کو نصاب تہذیب کا ایک لازمی جزو نہ قرار دیتا۔ دوسری بڑی کتابوں کی طرح اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک شخص کی داستان کو اس سارے زمانے اور ساری دنیا کی داستان بنا دیا ہے، یورپ اور امریکہ اور کسی حد تک دنیا کے دوسرے حصوں کی تہذیب اور سیاست، آرٹ اور ادب، سماجی زندگی اور اقتصادی کشمکش کا کون سا پہلو ہے جو اس کے صفحوں میں بے نقاب نہیں ہوا؟ انسانی دماغ اور اس کی نفسیات کا کون سا رخ ہے، شعوری اور غیر شعوری، جو اس مصنف کے تخلیقی اعجاز کی بدولت زندہ ہو کر ہمارے سامنے نہیں آیا؟ اور لطف یہ ہے کہ علاوہ درجنوں زندہ افسانوی کرداروں کے گزشتہ نصف صدی کے بہت کم مشاہیر ایسے ہیں جو شخصی طور پر اس ناول کے پلاٹ کا تانا بانا بننے میں شریک نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول کا ناول ہے اور تاریخ کی تاریخ۔ اس میں کوئی تاریخی واقعہ ایسا نہیں جس کی جزئیات تک میں صحت کا خیال نہ رکھا گیا ہو کیونکہ سنکلیر کو سچ کا احترام جنون کی حد تک ہے۔ (ان دس جلدوں میں جہاں تک میں اندازہ کرسکا ہوں اس بارے میں اس نے ایک صریح غلطی کی ہے اور وہ رسالت مآب صلعم کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگانے میں، لیکن اس بارے میں بھی جب میں نے اسے لکھ کر پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اس کے متعلق برٹش انسائیکلوپیڈیا کے بیان پر انحصار کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرانے مسیحی تعصب کے زیر اثر کہیں کہیں مستند مغربی کتابیں بھی کسی قدر ناقص ہو سکتی ہیں!) اس لئے میرا خیال ہے کہ دلچسپی کے ساتھ اور سمجھ کر ان دس جلدوں کا پڑھ لینا اتنی ہی علمی اور ذہنی اہمیت رکھتا ہے، جتنا ادبی معاشی اور تہذیبی رسائل پر ایک پورے کتب خانے کا مطالعہ!

اور یہ رائے صرف میری نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے مشاہیر جنھوں نے ان ناولوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے اس بارے میں میرے ہم خیال ہیں۔ ان میں سے صرف تین اقتباس آپ کی نذر ہیں!

برنارڈ شا

"جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تمھاری عمر بھر میں دنیا میں کیا قابل ذکر باتیں ہوئی ہیں، تو میں انھیں مستند کتابوں اور اخباروں کے فائلوں کا نہیں بلکہ سنکلیر کے ناولوں کا حوالہ دیتا ہوں۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کے کرداروں کا وجود ہی نہیں تھا اور نہ ان کے کام کسی نے کئے نہ ان کی باتیں کسی نے کہیں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ضرور ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ سنکلیر نے ان کو ایک انفرادیت بخشی، ان کے خیالوں کو زیادہ بہتر طریقے پر ظاہر کیا اور ان کے تجربوں کو ایک واضح اور بامعنی انداز میں مرتب کرکے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی
جلد ۴ یکم اپریل ۵۸ء نمبر ۱۳

ہندوستانی مسلمان کیا کریں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جیسا بُرا وقت پڑا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک نہیں پڑا تھا۔ ان کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے اور وہ ہوا میں معلق ہیں۔ ان کی پریشانی کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ اس وقت وہ تاریخ کے ایک نازک اور خطرناک مرحلے سے گذر رہے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آیندہ کے لئے انھیں اپنی منزل اور اپنی راہ صاف نظر نہیں آتی۔ بے منزلی اور بے راہی سے بڑھ کر کوئی چیز فرد اور جماعت کے لئے اضطرار کا باعث نہیں ہوتی۔

آیئے ہم نوے، بانوے سال پہلے کے بحران اور موجودہ بحران کا مقابلہ کرکے یہ دیکھیں کہ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا مشکلات درپیش تھیں اور اب کیا ہیں۔ اس وقت وہ اپنی مشکلوں پر کیوں کر غالب آئے، اور اب کیسے غالب آ سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے جو کوئی سو سال سے بے ضابطہ طور پر ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر حکومت کر رہے تھے اپنی باضابطہ سلطنت قائم کی اس وقت انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی قوت کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے سر میں ابھی تک بادۂ قبیلہ کا خمار باقی تھا اور ان کا دل کسی طرح نئی حکومت اور نئی تہذیب سے مانوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بحیثیت جماعت انگریزی تعلیم سے اور انگریزی حکومت سے دور ہی دور رہنا چاہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت دراصل ان ہی نے کی تھی اور اس میں ناکام رہنے کے بعد بھی ان کے تیور باغیانہ تھے۔ اس لئے قدرتی بات تھی کہ انگریزوں نے اپنی ساری طاقت ان کو کچلنے میں صرف کر دی۔ لاکھوں مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں، اور ہزاروں کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔ دلی کو جو ان کا سب سے بڑا مرکز تھا اس طرح اجاڑ گیا جیسے کبھی تاتاریوں نے بغداد کو اجاڑا تھا۔

عام مسلمانوں کو اس وقت مایوسی، خوف، غم و غصے اور ضد نے اس قابل نہیں رکھا تھا کہ اپنے بُرے بھلے کو سوچ سکیں۔ وہ آنکھیں بند کرکے زمانے کے بے پناہ قوت سے ٹکر لینے اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کو تیار تھے۔ لیکن ان میں سید احمد خان اور ان کے رفیقوں جیسے بیدار مغز عاقبت اندیش مدبر بھی موجود تھے جو انھیں عقل و تدبر کی راہ دکھانا چاہتے تھے۔ ان بزرگوں کی ان تھک کوشش سے کہیں بیس برس میں جا کر مسلمان اس بات پر آمادہ ہوئے کہ وقت اور مصلحت وقت سے زندگی اور زندگی کے تقاضوں سے مصالحت کریں، انگریزی تعلیم پائیں اور انگریزی حکومت سے باعزت تعاون کی کوئی صورت تلاش کریں لیکن جتنے عرصے تک مسلمان تعلیم کے مقام تک پہنچے، عام ہندوستانی آگے بڑھ کر سیاست کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ تیس سال کی مدت میں مسلمانوں کی ساری توجہ تو مغربی تعلیم پر صرف ہوتی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس جس سے وہ مجموعی طور پر الگ رہے اعتدال پسند سیاست میں بہت دور پہنچ گئی۔ اور جب مسلمانوں نے مسلم لیگ قائم کرکے اعتدال پسند سیاست میں قدم رکھا تو کانگریس انتہا پسند سیاست کا جھنڈا بلند کر چکی تھی۔ غرض تحریک خلافت کے چند سال کو چھوڑ کر جب کہ عام مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کی قیادت سے منحرف ہو کر دل جان سے تحریک آزادی میں کانگریس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی زمانے کی رفتار سے برابر پیچھے رہی اور بہت پیچھے رہی، یہی وجہ تھی کہ جب کانگریس کی تحریک کا نتیجہ ہندوستان کی آزادی کی شکل میں ظاہر ہونے لگا تو مسلمان جو سیاست کے مکتب میں نو آموز تھے آنے والے انقلاب سے گھبرا گئے اور سراسیمگی کے عالم میں ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے جو ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کے لئے کروڑوں غریب مسلمانوں کو ہلاکت کے خطرے میں ڈال کر ملک تقسیم کرانے پر اصرار کر رہے تھے۔

آخر ملک تقسیم ہوا اور پاکستان بنا جس میں معدودے چند مسلمان لیڈروں اور تاجروں کی چاندی، ساڑھے پانچ کروڑ کا مشتبہ فائدہ اور ساڑھے چار کروڑ کا یقینی نقصان تھا۔

اب یہ ساڑھے چار کروڑ مسلمان اس مصیبت میں ہیں کہ تعصب اور نفرت کی آگ جو نہ صرف ان کے کھلے ہوئے دشمنوں نے بلکہ ان کے خود غرض لیڈروں نے جو اب پاکستان میں براج رہے ہیں پچھلے دس بارہ سال میں بھڑکائی تھی انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے جب یہ آگ امن پسندوں کی انتہائی کوشش سے بجھنے لگتی ہے تو ہندوستان کے فتنہ انگیز اور فرقہ پرست عناصر اسے ہوا دے کر تیز کر دیتے ہیں اور اگر کہیں پاکستان سے ہندوؤں کے ساتھ بدسلوکی ہونے کی خبروں یا افواہوں کا جھونکا آ جائے تو پھر تو اس کے شعلے اٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں غرض مسلمانوں کے لئے کبھی کبھی اور کہیں کہیں گھربار اور جان و مال کے برباد ہو جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن اپنے بھائیوں کے لئے بار خاطر بن کر رہنے کی کوفت اور معاشی مشکلوں کا دباؤ تو ان کے لئے ایک مستقل مصیبت بن کر رہ گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ اس مصیبت کا مقابلہ کرکے اس پر غالب آنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کریں؟

ہمارے نزدیک سب سے پہلی اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہندوستان سے ترک وطن کرکے پاکستان جانے کے خیال کو جو بہت سے دلوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر موجود ہے بالکل ترک کر دیا جائے یہاں ان افراد کا ذکر نہیں جن کو پاکستان سے دلی لگاؤ ہے یا جو ملی حمیت اور غیرت سے اس قدر عاری ہیں کہ صرف اپنی جان بچانے یا اپنا پیٹ بھرنے سے غرض رکھتے ہیں ایسے لوگوں کو ضرور جانا چاہیئے اور جلد سے جلد جانا چاہیئے لیکن جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کی پوری جماعت کا تعلق ہے اس کے لئے تو اس نقل مکان کا ذرا بھی امکان نہیں۔ ساڑھے چار کروڑ مزید آبادی کی پاکستان میں قطعاً گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی طرح ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی آدھی تہائی تعداد میں بھی مسلمان وہاں پہنچ جائیں تو پاکستان کے معاشی نظام کو درہم برہم کر دیں گے اور اس کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائیں گے۔ پاکستان کی حکومت بھی اس کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے داخلے کو ممنوع تو نہیں قرار دے سکتی لیکن اس نے ایسی سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ اکا دکا آدمیوں کے سوا مسلمانوں کا مستقل قیام کے لئے پاکستان جانا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے عارضی حالات کی وجہ سے مشرقی بنگال میں یہ قیود ڈھیلی کر دی گئی ہیں لیکن صرف مغربی بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے لئے چند روز کے بعد پھر یہ سختیاں ہو جائیں گی۔

غرض جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کا ترک وطن کرکے پاکستان جانا قطعاً ناقابل عمل ہے اور اس خیال کو دل میں رکھنا ان کے لئے نہایت مضر بلکہ مہلک ہے۔ اس لئے کہ جب تک دل میں یہ چور رہے گا وہ دانت بھینچ کر زمین میں قدم گاڑ کر مشکلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مشکلیں اتنی بڑھی ہیں کہ بغیر اٹل ارادے، انتہا صبر ان تھک کوشش کے ان پر غالب آنا محال ہے، پوری یکسوئی کی ضرورت ہے پریشان خیالی اور دودلی سے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔

اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ ہر صورت اور ہر حال میں یہ ہر خطرے کو برداشت کرکے ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کرنے کے بعد ہندوستان کے مسلمان کیا کر سکتے ہیں اور انھیں کیا کرنا چاہیئے۔

عام طور پر انھیں جو ہدایت کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کے اور حکومت کے وفادار رہو۔ یہ بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے مگر کافی نہیں، ریاست اور حکومت کی وفاداری تو ہر ملک کے شہری کا پہلا فرض ہے، لیکن آج ہمارے سامنے اصل مسئلہ حکومت سے نبھانے کا نہیں بلکہ اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے نبھانے کا ہے پچھلی صدی کے بحران میں بے شک مسلمانوں نے حکومت سے تعاون کرکے اپنے لئے ایک حد تک اطمینان سے زندہ رہنے کی صورت نکالی تھی، لیکن موجودہ بحران میں محض حکومت کا سہارا کافی نہیں، اب حکومت جمہوری ہے جس کا دارومدار عوام کے اعتماد پر ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کی پالیسی مجموعی طور سے فراخ دلی رواداری

(بقیہ صفحہ ۵)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

مرحبا انسانیت کے شہید مرحبا

موجودہ فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں وحشت اور بہیمیت کے افسوسناک مناظر کے ساتھ ساتھ کہیں شرافت اور انسانیت کی شاندار مثالیں بھی نظر آتی ہیں جو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں اُمید کی جھلک دکھا دیتی ہیں۔ اس وقت ہم دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک ایسے لوگوں سے خالی نہیں جو گاندھی جی کے نقش قدم پر چل کر بے گناہ مظلوموں کی حمایت میں جان تک دے دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، ایک خبر شاہجہاں پور کے ضلع کی ہے کہ ایک شخص جنگی سنگھ اپنے گاؤں کے مسلمانوں کو بچاتے ہوئے کام آ گیا اور دوسرے کلکتے کی ہے کہ بنگال چیمبر آف کامرس کے پریسیڈنٹ مسٹر اے ایل کیمرن اپنے مسلمان بیرے کو ایک غضبناک مجمع سے بچانے کی کوشش میں مارے گئے ہندوستان جنگی سنگھ اور کیمرن جیسے سورماؤں پر جتنا فخر کرے کم ہے حق و انصاف کا نام دنیا میں ایسے ہی لوگوں کی بدولت باقی ہے، اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

کچھ تو اثر ہوا

نئے بجٹ کے خلاف پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عام طور پر بڑی لے دے ہوئی کہ اس میں صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کے نام سے بڑے سرمایہ داروں کو کئی طرح کا ٹیکس معاف کر دیا گیا، دس ہزار سے پچاس ہزار تک کی آمدنی والوں کے انکم ٹیکس میں بھی کچھ تخفیف ہوئی لیکن ان غریبوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوئی پروا نہیں کی گئی جن کی آمدنی دس ہزار سے کم تھی، اس احتجاج کا یہ نتیجہ نکلا کہ سلیکٹ کمیٹی نے عام انکم ٹیکس کی حد تین ہزار کے بجائے تین ہزار چھ سو اور مشترک ہندو خاندان کے لئے پانچ ہزار کے بجائے ساتھ ہزار دو سو مقرر کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس طرح متوسط طبقے کے بہت لوگوں کے جن پر گرانی کی چوٹ سب سے زیادہ پڑی ہے کچھ آنسو پونچھ جائیں گے۔

کیا بے بسی ہے!

بجٹ کو سلیکٹ کمیٹی میں بھیجنے کے بعد پارلیمنٹ میں کئی قانونوں کے مسودوں پر بحث ہوئی جن میں سب سے دلچسپ پروفیسر کے ٹی شاہ کا بل تھا جس میں چور بازاری کے مجرموں کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی تھی، ظاہر ہے بل تو کیا منظور ہوتا لیکن اس پر اور رشوت ستانی سے متعلق بل پر بحث کے دوران میں حکومت کا یہ اعتراف داد کے قابل ہے کہ تجارتی بدعنوانیوں کی روک تھام کرنے کے لئے جو قوانین موجود ہیں ان کی گرفت سے مجرم عام طور پر رشوت دے کر بچ جایا کرتے ہیں۔ حکومت نے اسے تو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ جب پرانے قوانین نافذ نہیں ہو سکتے تو نئے قوانین بنانا بیکار ہے۔ لیکن ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت ایسی بے بس ہے کہ اپنے ملازموں کی رشوت ستانی کا کوئی انسداد نہیں کر سکتی؟ ہمارے وزیر اعظم اور دوسرے وزیر اس بات کو بار بار تسلیم کر چکے ہیں کہ ہندوستان کے لئے سب سے زیادہ اہم گرانی کا مسئلہ ہے۔ اس کو حل کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے باندھے گئے، کمیشن مقرر ہوئے کمیٹیاں بنیں، مہمیں شروع کی گئیں لیکن یہ سب کچھ صرف ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کر یعنی پیداوار بڑھانے کے لئے کیا گیا، ظاہر ہے پیداوار کو بڑھانا بہت دیر طلب کام ہے اور اس کا نتیجہ برسوں میں جا کر نکلے گا گرانی میں فوری طور پر تھوڑا بہت فرق اگر پڑ سکتا ہے تو چور بازاری کی روک تھام سے اور اگر چور بازاری رشوت کے پردوں پر ساری ہے تو رشوت ستانی کا انسداد جو بہرحال ضروری ہے۔ اور زیادہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے معلوم ہوتا ہے حکومت نے اس مسئلے کی پوری اہمیت کو محسوس نہیں کیا ہے، ورنہ اس کو حل کرنے کے لئے کوئی قدم تو اٹھاتی، اور کچھ نہیں تو کم سے کم ایک کمیشن مقرر کر کے انسداد رشوت ستانی کے تمام امکانات پر غور کیا جاتا۔ شاید اس سلسلے میں کچھ عملی تجویزیں بھی سامنے آتیں۔

(ع، ح)

باہر کی دنیا

یوگوسلاویہ کے انتخابات

جنگ عظیم کے بعد یوگوسلاویہ کا دوسرا عام انتخاب ۲۶ مارچ کو ہوا۔ بین الاقوامی سیاست کے نقطۂ نظر سے اسے بڑی اہمیت دی جا رہی تھی اس لئے کہ مارشل ٹیٹو اور کومن فارم میں ان بن ہونے کے بعد اس بات کا اندازہ کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ یوگوسلاویہ کی رائے عامہ کس حد تک ٹیٹو کے ساتھ ہے۔ کمیونسٹ ملکوں کے دستور کے مطابق ووٹ صرف امیدواروں کی صرف ایک ہی فہرست کو یعنی مارشل ٹیٹو کے نیشنل فرنٹ کو دینے تھے البتہ لوگوں کو اصولاً یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ اس پارٹی کو پسند نہ کریں تو سادی پرچیاں ڈال دیں۔ آزاد یوگوسلاویہ کا ریڈیو جو کسی باہر کے ملک میں ہے بڑے زور شور سے اپیل کر رہا تھا کہ لوگ سادی پرچیاں ڈال کر ٹیٹو پر عدم اعتماد کا ثبوت دیں۔ ۲۷ مارچ تک بلگریڈ کے چند ووٹوں کے سوا باقی سب شمار ہو چکے تھے اور یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ٹیٹو کے نیشنل فرنٹ کے حق میں ۹۲٫۶ فی صدی ووٹ آئے۔ اگرچہ یہ یقینی امر ہے کہ بہت سے لوگوں نے حکومت کے دباؤ سے ووٹ دیئے لیکن چونکہ پچھلے انتخابات میں نیشنل فرنٹ کو ۸۹ فی صدی ووٹ ملے تھے اور اس بار ۹ فی صدی زیادہ ملے اس لئے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ٹیٹو کا جتنا اثر اپنے ملک کے عوام پر تھا اس سے کچھ بڑھ ہی گیا۔

اٹلی میں کسانوں کی فتح

اٹلی میں کسانوں کی حالت جنگ کے بعد سے اور بھی ابتر ہو گئی ہے اور لاکھوں آدمی زمینوں سے محروم ہیں، پچھلے دنوں کچھ لوگ کمیونسٹوں کے اکسانے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی نے مزدوروں کو بھی ابھارا اور ان سے ہڑتالیں کرائیں۔ اب اٹلی کی حکومت یہ پالیسی اختیار کرنا چاہتی ہے کہ کسانوں کو زمینیں تقسیم کر کے انھیں خوش کرے لیکن مزدوروں کی ہڑتالوں کا جو اس کے خیال میں سیاسی مقصد سے کی جا رہی ہیں اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرے۔ کسانوں اور مزدوروں میں پھوٹ ڈالنا اور اس سے فائدہ اٹھانا سرمایہ داری کا آزمودہ حربہ ہے لیکن اٹلی کو اس سے کام لینے کے لئے کم سے کم جاگیرداری نظام کو تو ضرور ختم کرنا پڑے گا۔ اس لئے اس کشمکش میں جو اس وقت اٹلی میں ہو رہی ہے کسانوں کی فتح یقینی معلوم ہوتی ہے۔

بلجیم کا بحران

بلجیم میں شاہ لیوپولڈ کو واپس بلانے کے سوال پر جو عام شماری ہوئی تھی اس میں اکثریت نے اُن کی واپسی کے حق میں رائے دی تھی لیکن وہاں کی پارلیمنٹ کی تین پارٹیوں میں سے صرف ایک یعنی کیتھولک پارٹی شاہ لیوپولڈ کی حامی ہے۔ لبرل اور سوشلسٹ دونوں ان کو دوبارہ بادشاہ بنانے کے مخالف ہیں۔ چونکہ یہ دونوں پارٹیاں بلجیم کے دارالعوام میں ۸۰ کی اکثریت رکھتی ہیں اس لئے انھوں نے کیتھولک پارٹی کی بات نہیں چلنے دی نتیجہ یہ ہوا کہ کیتھولک پارٹی اور لبرل پارٹی کی مشترک وزارت نے استعفا دے دیا اور دو ہفتے کی کوشش کے باوجود نئی وزارت نہیں بن سکی۔ اب لبرل پارٹی کے لیڈر موسیو البرٹ ڈیویز وزارت بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر یہ آخری کوشش بھی ناکام رہی تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ پارلیمنٹ توڑ دی جائے اور نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں۔

انڈوچائنا کا فیصلہ کن معرکہ

معلوم ہوا ہے کہ انڈوچائنا میں فرانس کی بنائی ہوئی باؤڈائی حکومت اور ڈاکٹر ہوشی من کی عوامی حکومت میں اب آخری مقابلہ ہونے والا ہے جس میں ادھر یا ادھر فیصلہ ہو جائے گا۔ ہوشی من نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی پوری طاقت سے ویٹنام پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ادھر ویٹنام کو امریکی حکومت فوجی سامان بھیج کر اس فیصلہ کن معرکے کے لئے تیار کر رہی ہے۔ سمجھا یہ ہے کہ باؤڈائی کی حکومت جسے اندرونی [illegible] م نے بہت کم زور کر دیا ہے، بیرونی امداد سے کس حد تک فائدہ اٹھا سکتی ہے؟ (ع، ح)

بزم بے تکلف

"ارے میں کہتی ہوں یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ ہونق شکل، بکھرے بال، سوکھے ہونٹ پھٹی آنکھیں جیسے کوئی ہوڑا جیل خانے سے چھٹ کر آ گیا ہو۔ میں سمجھی تھی کہ خدا نہ کرے پھر تمہیں اپنڈی سائٹس کا دورہ پڑ گیا ہے۔ مگر یہ چپ جو لگ گئی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ بس وہ ہوا خالی کر لیا ہے اور کچھ نہیں۔"

"ارے بیگم یہ تم کس وہم میں پڑی ہو۔ نہ اپنڈی سائٹس ہو نہ مالیخولیا مجھے تو کچھ اور ہی آزار ہے

ع۔ کیا کہوں حال دردِ پنہانی"

"لو اور سنو۔ نئے نئے درد نکلتے آتے ہیں۔ اتنی عمر ہو گئی پنہانی کا درد آج تک نہیں سنا تھا۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی یہ پنہانی کہاں ہوتی ہے۔"

"بیگم یہ جسمانی درد نہیں، روحانی کرب ہے۔ تم کیا جانو کہ ایک لیڈر کے دل پر ملک کا یہ حال زار دیکھ کر کیا گزرتی ہے۔"

"اچھا تو تمہیں لیڈری کے بائو گولے کا درد اٹھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہائے ہائے کاہے کی؟ کمر باندھ کر اٹھو اور جا کر دیس کے دکھ کی دوا کرو۔"

"اری نیک بخت اتنی ٹھٹھا نہیں جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔ آدمی بن مانس بن گئے ہیں، اپنے بھائیوں کو بھاڑ کے کھاتے ہیں، جو کوئی انھیں روکے یا سمجھائے اس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔"

"تو پھر دیس کے درد کا اور لیڈری کا نام ناحق بدنام کرتے ہو، صاف صاف کہو نا کہ مرنے کے ڈر سے مرا جاتا ہوں۔"

"تم بھی کیا باتیں کرتی ہو مرنے سے ڈرتے تو ہم پر کیوں مرتے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اپنے کو بھیڑیوں سے بھڑوا کر کتے کی موت مرنا اچھا نہیں لگتا۔"

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ہندوستانی مسلمان کیا کریں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

اور انصاف پسند ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے قابل اطمینان ہے لیکن حکومت کی پالیسی اکثریت کی مرضی کی پابند ہوا اور اس کی رائے سے بدل سکتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے مسئلے کا حقیقی اور مستقل حل یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اکثریت کے دل میں جگہ پیدا کریں، اس کی محبت اور اعتماد حاصل کریں۔

یہ کام بظاہر بہت دشوار معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ پچھلے بارہ سال میں مسلمانوں اور غیر مسلموں خصوصاً مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان باہمی خوف، شک و شبہات اور بیگانگی کی ایک بلند سخت دیوار کھڑی کر دی گئی ہے، لیکن اگر آپ خلوص، ہمت، صبر و استقلال کے ساتھ ایک طرف سے اس دیوار کو ڈھانا شروع کر دیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ دوسری طرف سے بھی بہت سے لوگ اسے منہدم کرنے میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں، لیکن فرض کیجئے کہ دوسری طرف سے بالکل مدد نہ ہو تو آپ کا کام مشکل ضرور ہو جائے گا، اس میں دیر ضرور لگے گی لیکن اگر آپ اپنی دھن میں لگے رہیں گے تو یہ دیوار ایک دن گر کر رہے گی۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ یاد کیجئے۔ کیا ان دنوں عام طور پر ہندو مسلمانوں میں میل جول اور باہمی اعتماد تھا یا نہیں۔ تو پھر اب کیوں نہیں ہو سکتا؟

شاید کوئی یہ کہے کہ اس زمانے میں تو ہندوؤں کو، کم سے کم کانگریسی ہندوؤں کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد کی ضرورت تھی اس لئے وہ ان سے ملنے پر تیار ہو گئے تھے۔ اب کیوں ہونے لگے؟ بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ افراد کی طرح جماعتوں کو باہمی مدد کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ کیا آج ملک کے سامنے مشکلیں اور خطرے نہیں ہیں جن کا مقابلہ کرنا ہے؟ کیا ان کے لئے مسلمانوں کی مدد کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا ساڑھے چار کروڑ آدمیوں کی مدد کوئی حقیر چیز ہے؟ یقین کیجئے آپ کی مدد آج بھی قابل قدر ہے اور اس کی قدر کی جائے گی۔ ضرورت اس بات کے ثابت کرنے کی ہے کہ آپ ملک کو اپنا ملک، اس کی مشکلوں کو اپنی مشکلیں، اس کے خطرے کو اپنے خطرے سمجھتے ہیں اور ان سے نپٹنے میں دوسروں کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ آپ کہتے ہیں ہم کیسے ثابت کریں۔ پہلے آپ صاف سچا پکا ارادہ تو کیجئے اس کو عمل میں لانے کے بہت سے موقع ملیں گے اور بہت سی صورتیں نکلیں گی۔

نغمہ

(اوکھلا میں جمنا کے کنارے ایک رات)

وامق احمد مجتبیٰ

دھندلا دھندلا رات کا پیکر
اس پہ روپہلی سی اک چادر
ڈھلتے ہوئے بادل سے فلک پر
کھیل رہے ہیں ماہ و اختر
جیسے موجیں مارے سمندر
دیکھ کے یہ کیف آگیں منظر
دل کچھ کہتا ہے رہ رہ کر
لیکن ان کو اس کی خبر کیا

ایسے میں جمنا کے کنارے
ہوتے ہیں فطرت کے نظارے
اٹھتی ہیں موجیں سینہ ابھارے
آنچل میں سے کر مہ پارے
گشت دہقاں بال سنوارے
جیتی ہے دنیا جس کے سہارے
اک پردیسی اور یہ نظارے
لیکن ان کو اس کی خبر کیا

بل کھاتا دریا کا دامن
بجتے ہوئے لہروں کے جھانجن
جیسے کوئی متوالی جوگن
گائے کنارے پر ساون
یا لہرائے ہار کے تن من
بین کی گت پر بجتی تانیں
بڑھ گئی دل کی اور بھی الجھن
لیکن ان کو اس کی خبر کیا

کیا شے چھلکی جام سے باہر
پی جانے کی حد سے گزر کر
آنسو کی اک بوند پلک پر
ساری دنیا جس کے اندر
کانپ رہی ہے تھر تھر تھر تھر
ٹپکے کیسے سوکھے کیوں کر
یوں ہی راتیں کٹتی ہیں آخر
لیکن ان کو اس کی خبر کیا

غزل

انجم اعظمی

نرگسی آنکھوں میں کون اشک یہ بھر لایا ہے
کس کی پلکوں پہ مرا پیار امنڈ آیا ہے

میری آنکھوں سے بھی پھوٹی ہیں لہو کی دھاریں
میں نے بھی درد بھرے جام کو چھلکایا ہے

جب سے بیمار ہوا ہے یہ جنونِ رسوا
میں نے ہر غم میں نیا کیف و اثر پایا ہے

حوصلے یوں بھی تھے بے راہ روی پر مائل
آپ کی چشمِ عنایت نے بھی بہکایا ہے

وادیٔ عشق سے ہے کون گریزاں لیکن
مجھ کو زنجیر کی جھنکار نے الجھایا ہے

آزادی کی زنجیریں

(چھٹا باب)

ظفرحسن دریاپور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا اس کے والد میر مظفر حسن پنشن کے بعد وطن میں آرہے تھے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے ہیڈ ماسٹر رشید دیال کے اصرار پر ظفر کے والد نے الہ آباد کالج میں داخل کرنے پر تیار ہو گئے۔ ظفر اور رشید دیال صاحب کا لڑکا ہردیال الہ آباد آئے اور اکرام اللہ صاحب کے ہاں ٹھہرے جو رشید دیال کے شاگرد اور میر مظفر کے دوست رہ چکے تھے۔ شروع کے دو مہینے ظفر کو کالج میں بڑی سخت محنت کرنی پڑتی اور اس عرصے میں وہ اپنی پھوپی کے ہاں نہ جا سکا، جب پڑھائی کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو وہ پھوپی کے ہاں گیا جہاں اس سے بے حد محبت سے ملیں اور حسینہ کو دیکھا جو اب ایک بڑی ہی حسین اور شرمیلی نازنین بن چکی تھی۔

(قسط ۱۳)

"نئے ادب" کے حلقے کے کئی جلسوں میں ظفر اور ہردیال کو بلاوا آیا۔ مگر وہ نہیں جا سکے تھے۔ اب کی سنیچر کو چھ بجے شام کو پھر اس کا جلسہ جارج ٹاؤن میں راج نرائن صاحب وکیل کے ہاں ہونے والا تھا اور بال کرشن کا سخت اصرار تھا کہ یہ دونوں اس میں ضرور شریک ہوں۔ بال کرشن نے انھیں راج نرائن صاحب کے صاحبزادے اقبال بہادر سے ملوایا جو یونیورسٹی میں بی۔ اے میں پڑھتے تھے اور حلقے کے روح رواں تھے۔ انھوں نے اور بھی زیادہ اصرار کیا اور ظفر اور ہردیال کو شرکت کا وعدہ کرنا پڑا۔

جمعہ کو رات کے کھانے پر ہردیال نے اکرام اللہ سے کہا "اکرام صاحب آپ نئے ادب کے حلقے سے واقف ہیں؟ کل شام ہم لوگوں کو اس کے جلسے میں شریک ہونا ہے، میں چاہتا ہوں پہلے سے کچھ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کیا بیچتے ہیں۔"

اکرام اللہ۔ میں شروع میں اس کے کئی جلسوں میں شریک ہوا تھا، مگر پھر جانا نہیں ہوا۔ چند قابل، مخلص نوجوانوں نے جو سوشلزم یا کمیونزم سے متاثر ہیں یہ حلقہ ادب کی اصلاح کے لئے قائم کیا ہے اور مہینے میں ایک بار جمع ہو کر مضامین اور افسانے پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ محض تفریح کے لئے یا نئے ادب کی قدردانی کو فیشن سمجھ کر شریک ہو جاتے ہیں۔

ہردیال۔ آپ میری جہالت پر ہنسیں گے مگر خدا کے لئے مجھ کو معاف کر دیجئے۔ میں نے سوشلزم، کمیونزم اور نئے ادب کا نام تو سنا ہے۔ لڑکوں پر رعب جمانے کے لئے کبھی کبھی یہ الفاظ اپنی تقریروں میں استعمال کئے ہیں۔ مگر قسم لے لیجئے جو یہ معلوم ہو کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ کسی دن کوئی پوچھ بیٹھا تو پول کھل جائے گی۔

اکرام اللہ۔ تم تو معاشیات اور تاریخ کے طالب علم ہو، بھئی ارے یہ پروفیسر تمہیں سوشلزم اور کمیونزم کے اصول علمی حیثیت سے سمجھا دیں گے۔ میں ایک غیر ذمہ دار یار باش آدمی ہوں۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا رہتا ہوں جن میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی ہیں جو کچھ سنی سنائی باتیں کان میں پڑ گئی ہیں تمہیں بتاتا ہوں سوشلسٹ تو وہ ہیں جو چاہتے ہیں کہ زمین، کانیں، کارخانے غرض سب چیزیں جو دولت یا مال کی پیداوار سے تعلق رکھتی ہیں کسی ایک شخص کی ملکیت نہ ہوں، بلکہ پوری جماعت کی اور ان کا سارا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہو تاکہ وہ انھیں اپنے ذاتی فائدے کے لئے نہ چلائے بلکہ سب کے فائدے کے لئے۔

ہردیال۔ بھئی واہ کیا اچھا اصول ہے

ع۔ بہار اپنی، گل اپنے، گلشن اپنا۔ باغباں اپنا

اور کمیونسٹ کیا چاہتے ہیں؟

اکرام اللہ۔ وہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ذاتی ملکیت ہونی ہی نہیں چاہئے۔ صرف دولت کی پیداوار ہی نہیں بلکہ اس کی تقسیم بھی حکومت کے ہاتھ میں ہو اور وہ سب کو ضرورت کے مطابق بانٹ دے۔ ان میں سے ایک فرقہ اتنا کٹر نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو کچھ اپنی ذاتی محنت سے کمائے۔ وہ اس کی ملکیت ہو۔ اسے جیسے چاہے خرچ کرے۔ مگر ایک تو وہ چیزیں جن کی سب کو ضرورت رہتی ہے اپنے حصے سے زیادہ نہ خریدے دوسرے کسی کو یہ حق نہ ہو کہ سرمایہ جمع کرکے سود پر چلائے، یا دوسروں کو نوکر رکھ کر ان سے محنت کرائے اور نفع اپنی جیب میں رکھے۔

ہردیال۔ یہ اس سے بھی چوکھی رہی، خود کنواں کھودو اور خود پانی پیو۔ مگر لوگ اتنے کمیونزم کے خلاف کیوں ہیں۔ ملوں کے مالک، زمیندار، بنئے، مہاجن مخالفت کریں تو ایک بات بھی ہے۔ میں نے تو اپنے جیسے غریب طالب علموں کو کمیونسٹوں کو بُرا بھلا کہتے سنا کہ یہ مذہب اور اخلاق کے دشمن ہیں۔

اکرام اللہ۔ بات یہ ہے کہ کمیونسٹ کارل مارکس کے فلسفے کے قائل ہیں جس کی رو سے مذہب اور اخلاق کی نشہ آور گولیاں سرمایہ داروں نے اس غرض سے تیار کی ہیں کہ غریب اور کسان ان [illegible] رہیں اور ان [illegible] نہ ہو کہ سرمایہ دار ان کی محنت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے۔

ہردیال۔ یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے؟ یہ میں کیسے مان لوں کہ جن بزرگوں نے مذہب کی تعلیم دی وہ سرمایہ دار تھے یا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھے میں نے ان کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اکرام اللہ۔ بھئی یہ تو میں نے تمہیں بہت سے مختصر لفظوں میں بتایا ہے۔ مارکس کے فلسفے میں بڑی باریکیاں ہیں۔ مجھے کمیونسٹ دوستوں نے اس کی موٹی سی کتاب "کیپٹل" پڑھنے کو دی مگر اس قدر دقیق ہے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور نہ یہ حضرات مجھے سمجھا سکے۔

ظفر۔ مگر سوشلزم اور کمیونزم کو ادب سے کیا تعلق ہے؟ اور یہ نیا ادب کیا چیز ہے؟

اکرام اللہ۔ اصل میں اسی نئے ادب کا خصوصاً تھیٹر کا شوق مجھے انقلابی نوجوانوں کی صحبت میں کھینچ لے گیا ہے ادب کی دو شاخیں ہیں، ایک تو وہ جس میں نیا پن زیادہ تر یہ ہے کہ شاعری اور انشا پردازی کے ضابطوں کو نظرانداز کرکے من مانے طریقے سے اظہار خیال کیا، نظم میں قافیے اور مقررہ وزن کی اور نثر میں ربط و تسلسل کی زنجیروں کو توڑ دیا جائے ان نئے ادیبوں اور شاعروں کے خیالات میں عموماً بے ربطی اور انتشار کے سوا کوئی جدت نہیں ہوتی یہ اصول فن کے خلاف بغاوت ہے جس میں کامیاب ہونے کے لئے غیر معمولی دل و دماغ کی ضرورت ہے وہ اب تک ان نو مشقوں میں سے کسی میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دوسری شاخ وہ ہے جس میں ادب کے قالب کے بدلنے پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا اس کی روح کے بدلنے پر۔ اسے ترقی پسند ادب کہتے ہیں اور اس قسم کے علم بردار عموماً کمیونسٹ یا سوشلسٹ نوجوان ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ادب و شعر کا موضوع رومانی کی خیالی دنیا نہ ہو بلکہ واقعی زندگی اور اس کی تلخ و ناگوار حقیقتیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاعر اور افسانہ نگار موجودہ نظام زندگی کی قباحتوں، افلاس، بیماری، بدکاری، لالچ، خود غرضی، ظلم کا پردہ کھولے، تاکہ لوگوں کے دل میں اس نظام سے نفرت اور اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو۔

ظفر۔ مگر اس میں نئی بات کیا ہوئی، پہلے بھی ادب میں ان برائیوں کا ذکر ہوتا تھا اور ان کا انجام برا دکھایا جاتا تھا۔

اکرام اللہ۔ پہلے صرف ان برائیوں کو برا کہا جاتا تھا جو سماج کے یعنی اونچے طبقوں کے بنائے ہوئے مذہب، اخلاق، قانون کے خلاف تھیں، جن برائیوں کو سماج نے جائز رکھا تھا بلکہ خود پیدا کیا تھا ان کا یا تو ذکر ہی نہیں آتا تھا یا ان پہ تاویل کا [illegible] ڈھانکنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ہردیال۔ آپ کی باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی نئے ادیبوں میں شامل ہیں۔ یہ تو بتلائیے آپ کمیونسٹ ہیں یا سوشلسٹ؟

اکرام اللہ۔ اسے [illegible] کیا ٹھیک ہے۔ میں نہ پہلے

ہوں تو وہ احساس نہ نیا ادیب نہ پرانا ادیب میں تو ایک کارندہ ہوں۔

ظفر۔ ادیب نہیں تو کم سے کم نقاد آپ ضرور ہیں؟ اس نئے ادب کے حلقے میں کیسے لکھنے والے ہیں؟

اکرام اللہ۔ ظاہر ہے ابھی سب تو مشق ہیں مگر ان میں سے وہ ایک ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی کمی مشاہدے کی ہے خصوصاً مزدوروں اور کسانوں کی زندگی سے بالکل واقف نہیں محض تخیل سے یا سنی سنائی باتوں سے کام لیتے ہیں۔

ہردیال۔ آپ تو کسانوں کی زندگی میں پورے ہوئے ہیں ہوں گے۔ اگر آپ لکھیں تو مزا آجائے۔

اکرام اللہ۔ بھائی رحم کرو۔ مجھے کیوں بچے کے سینے پر تمھیں یاد ہوگا کہ جس دن تم لوگ یہاں آئے تھے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں خوش نظر آتا ہوں مگر دراصل خوش نہیں ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میری زندگی سراپا شکست ہے، اور میں نے شکست کو چھپانے کے لئے فریب کا پردہ ڈال رکھا ہے۔

ہردیال۔ میری گستاخی آپ کو ناگوار ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے سچے دل سے یہ بات کہی تھی، طنز کا خیال نہ تھا۔

اکرام اللہ۔ سچی بات طنز سے کہیں زیادہ چبھتی ہے مگر تم سے مجھے شکایت نہیں تم نے تو اپنے خیال میں میری تعریف کی۔ بات یہ ہے کہ مجھے شعر و ادب کا فطری ذوق ہے، مگر اسکول کی تعلیم کے زمانے میں کچھ تو والد مرحوم کی کڑی نگرانی اور کچھ امتحان میں اول آنے کے شوق نے اسے دبائے رکھا کالج میں پہنچے میں خود آوارہ گردی میں پڑ گیا۔ اسی طرح میرا ذوقِ ادب بھی آوارہ ہو کر رہ گیا، یعنی مشاعروں کی شرکت اور سطحی ناولوں اور افسانوں کے مطالعے تک محدود ہو گیا عملی زندگی میں داخل ہوا تو ایسا ماحول ملا جس میں یہ ذوق کسی طرح پنپ ہی نہیں سکتا تھا۔ دل کو سمجھاتا رہا کہ چند سال کے بعد اس ماحول سے نکل کر آزادی کی فضا میں اپنی پسند کی زندگی بسر کروں گا، لیکن وقت گذرتا گیا اور جو لباس جسم پر زبردستی منڈھا گیا تھا وہ ایسا چمٹا کہ اتارے نہیں اترتا۔

ہردیال۔ مگر آپ کو دلچسپی سیاست سے نہیں ادب سے ہے، آپ کی ملازمت آپ کو سیاست میں شریک ہونے سے روکتی ہے مگر ادبی کاموں میں تو کوئی خاص رکاوٹ معلوم نہیں ہوتی۔

اکرام اللہ۔ ہاں غزل کہنے اور ادبِ لطیف چھانٹنے میں تو اس کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں کہ رئیس کی نوکری چوبیس گھنٹے کی غلامی ہے جس میں مرنے کی بھی فرصت نہیں، لیکن ترقی پسند ادب کا دامن سیاست سے بندھا ہوا ہے اس میں عملی حصہ لینے کی فرصت بھی ہو تو ہمت نہیں ہو سکتی جب میں نئے حلقے میں شریک ہوتا تھا اور نوجوانوں کی نظمیں اور افسانے سنتا تھا جن میں کسانوں کی مظلومی زمینداروں کے ظلم، مہاجنوں کی بیدردی اور پولیس کی بے ایمانی کی خیالی داستانیں ہوتی تھیں تو میرا دل تڑپتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر، راتوں کو جاگ کر دیہات کی عبرتناک زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں دکھاؤں۔ لیکن ایک تو لکھنے کی مشق نہیں اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ قلم اٹھا کر اوٹ پٹانگ لکھنا شروع کر دوں۔ دوسرے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ بھلا اس کو کیا کرے کہ اس کا اپنا گھر بار بال بچے سب کچھ لنکا میں ہے۔ زمینداروں کا نوکر ٹھہرا، مہاجنوں سے روز کا بیوہار، پولیس اور حکام سے ہر وقت کا واسطہ ان سے بگاڑ کر کہاں جاؤں۔ سچ پوچھو تو میں نے حلقے کے جلسوں میں جانا اسی وجہ سے چھوڑ دیا کہ جس راستے پر آدمی دور تک نہ جاسکے اس پر قدم رکھنے سے کیا فائدہ؟

ظفر۔ آخر آپ اس ملازمت کو جس سے اس قدر بیزار ہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

اکرام اللہ۔ بھئی کیا بتاؤں، میری خود غرضی، کم ہمتی سمجھیے ہوں کہ ایف اے تک بھی پاس نہیں، سرکاری نوکری کی عمر نہیں اور ہوتی بھی تو تیس چالیس کی کلرکی سے زیادہ کیا ملتی، تجارت کے لئے روپیہ نہیں، کوئی صنعت، کوئی ہنر آتا نہیں، خود کیا کھاؤں گا، اور بچوں کو کیا کھلاؤں گا۔ اس کے علاوہ تین پشتوں سے میرے بزرگ ریاست کی خدمت کر رہے ہیں۔ نواب صاحب مجھے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں، انھیں کیسے چھوڑ دوں، پھر یہ خیال آتا ہے کہ میری وجہ سے کم سے کم ایک علاقے میں کسانوں کی حالت کچھ غنیمت ہے۔ ریاست کے کارندے، تحصیل اور پولیس کے لوگ، انھیں نہیں ستا سکتے، بیگار ان سے نہیں لی جاتی۔ طرح طرح کے نذرانے نہیں وصول کئے جاتے، کچھ عرصے بعد منیجر ہوگیا تو پوری ریاست میں یہی طریقہ رائج کر دوں گا۔

ظفر۔ جب آپ غریب کسانوں کو اتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو اس زندگی کو بہت غنیمت سمجھئے اور اپنے ادبی حوصلوں کو اس پر قربان کر دیجئے (کچھ گھبرا کر) معاف کیجئے گا میں نے بے جا جسارت سے کام لیا۔

اکرام اللہ۔ بے جا جسارت، بے جا حجاب بہرحال بھلی ہے۔ یہی مشکل تو یہی ہے کہ میں کسانوں کو فائدہ بالکل نہیں پہنچا سکتا، زیادہ سے زیادہ نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ اور وہ بھی ہر نقصان سے نہیں، سود خوار مہاجنوں سے نہیں، فصل کی خرابی سے نہیں، بھوک سے نہیں، ملیریا سے نہیں میں نے چاہا کہ اُن کے لئے امدادِ باہمی کے بنک قائم ہوں۔ ان کو اچھے بیج دئے جائیں، حفظانِ صحت کا، تعلیم کا انتظام کیا جائے، مگر ایک نہ چلی نواب صاحب نیک دل اور ہمدرد آدمی ہیں، خیرات دل کھول کر کرتے ہیں۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے، بیماروں کے علاج کے لئے، مسجد، مندر، دھرم سالہ بنانے کو روپیہ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں مگر رفاہِ عام کے کاموں کو وہ اپنا فرض نہیں حکومت کا فرض سمجھتے ہیں۔ حکومت کے اربابِ حل و عقد تک میری رسائی نہیں، ضلع کے حکام تک پہنچ سکتا ہوں سو اُن کا یہ حال ہے کہ انھیں مال گذاری وصول کرنے اور کانگریس کی تحریک کو دبانے کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں اور چونکہ میرے کانگریس والوں سے گہرے تعلقات ہیں اس لئے مجھ سے خار کھاتے ہیں۔

ہردیال۔ اور نواب صاحب اس سے ناراض نہیں ہوتے کہ آپ کانگریس والوں سے میل جول رکھتے ہیں؟

اکرام اللہ۔ بچارے نواب صاحب کو

ع۔ غمِ صیاد و فکرِ باغباں ہے

انگریزوں کے سلامی تو ہیں ہی مگر کانگریس سے بھی نہیں بگاڑنا چاہتے۔ انگریز ان کا خطاب اعزاز، منصب چھین سکتے ہیں تو کانگریس والے اُن کے کسانوں کو بھڑکا سکتے ہیں خود تو ان میں اتنی ہمت نہیں کہ کانگریس کے لیڈروں سے ملیں مگر میرے اُن سے جو تعلقات ہیں انھیں غنیمت سمجھتے ہیں کہ شاید کسی وقت کام آجائیں مجھے ان کے کام نکالنے کے لئے اپنی عزتِ نفس کو قربان کر کے ان حاکموں کی بارگاہ کا طواف کرنا پڑتا ہے جو مجھے شبہے کی اور ذلّت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غرض ایک کشمکش میں زندگی گذرتی ہے۔

ع۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

(گھڑی دیکھ کر) بھئی باتوں میں گیارہ بج گئے تم کو ابھی اپنا کام کرنا ہے اور پھر صبح اٹھنا ہے۔ خدا حافظ

صرف ظفر ہی نہیں بلکہ ہردیال جیسا بے فکر بھی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا، ان کو اس احساس سے سخت دھچکا لگا کہ زندگی ایک قوت کے سہارے ایک خطِ مستقیم پر حرکت نہیں کرتی بلکہ مختلف و متضاد قوتوں کے عمل سے گھن چکر بن جاتی ہے اور دونوں خاموش فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے

(باقی آئندہ)

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

"چلو ہٹو یہ بوڑھے چونچلے رہنے دو۔ قرینے کی بات کرو اگر تم سچائی کے لیے مرنے کو کتے کی موت سمجھتے ہو تو تیاری کا ڈھونگ نہ رچاؤ۔ کہیں چوہے کا بل ڈھونڈھ کر جا چھپو، اور جو کچھ ہو بلا سے جان تو بچ جائے گی۔"

"ہائے افسوس بیگم تم نے ہمیں آج تک پہچانا۔ اختلاجِ قلب کی اور بات ہے ورنہ ہماری ہمت کے تو جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں تم ایسا بزدل اور بے حمیت سمجھتی ہو کہ اس خطرناک زمانے میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہاں اگر تم بھی ساتھ چلو تو ——"

"تو پاکستان چل کر جینے سے کنگلوں کی موت مریں یا بھیک مانگ کر عزت سے بسر کریں، دیکھو میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میرے سامنے کہیں آنے جانے کا نام نہ لینا، تم شوق سے جاؤ میں اپنے بچوں کو لئے یہیں پڑی رہوں گی۔ جب تک جس گھر میں پیدا ہوئی اُسے چھوڑ کر جانے کی تو بس خدا ہی کے گھر جانے کی حد تک جانے گا سکے گا جب جنازہ اٹھانے کا بن گئی مرنا نہیں اور اسی سے تو رنا نہیں۔" "تم

ملکی زبان کا روپ

ڈاکٹر وپن بہاری ترویدی

مترجمہ سید احتشام حسین

آج جبکہ ہندی ملک کی قومی زبان تسلیم کی جا چکی ہے یہ سوال غور کرنے کے قابل ہے کہ اس کا کیا روپ ہونا چاہیئے۔ دیسی اور بدیسی زبانوں کی تاریخ اور ترقی نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کی کوئی زندہ اور مستند زبان اپنا روپ بنانے میں کسی ایک آدمی کی خواہش یا کسی قانون پر اپنی بنیاد نہیں رکھتی اس لئے زبان سے عام دلچسپی لینے والے اور قومی خدمت گذار اس کے لئے پریشان رہیں تو رہا کریں لیکن قانون کے زور سے اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے یہ بات مشکوک ہے۔ اس صورت حال کو سمجھتے ہوئے بھی ادیبوں اور ادب سے دلچسپی لینے والوں کو ہندی کے موجودہ مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ زبان کا روپ بنانے کی ضرورت اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہندی ادیبوں کا ایک گروہ پیچھے لوٹ جانے والا (رجعت پسند) اور زبان کے معاملے میں بہت تنگ نظر ہے۔ وہ اس کو بھی نہیں کہ ہندی زبان پر خالص سنسکرت الفاظ استعمال کرنے کے موافق ہیں بلکہ ہر جگہ پرچار بھی بڑے زور کے ساتھ کر رہے ہیں۔

آج جبکہ ہندوستان کی الجھن سلجھ رہی ہے اور فرقہ وارانہ منافرت کے بگولے خاص طور سے اٹھ رہے ہیں ملکی زبان کے روپ کو بنیاد بنا کر جو ذمہ دارانہ اور غیر ذمہ دارانہ شکل میں چاروں طرف سے فتوے بازی ہو رہی ہے وہ کبھی اور کسی حد تک مفید ثابت ہوگی یا نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن آج کے مسائل کو اور زیادہ الجھانے میں تو اسے ضرور کامیابی ہوئی ہے اس لئے خالص سائنٹیفک نگاہ سے اس کا مطالعہ اور ضروری ہو گیا ہے۔

جو مختلف باتیں اٹھائی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ اس ایک مانگ میں دکھائی دیتا ہے کہ ہندی کے سارے لکھنے والے سنسکرت کے تت سم اور تد بھو لفظوں کے علاوہ کسی اور زبان کے لفظ استعمال نہ کرنے کی قسم کھا لیں۔ گولر کے پھول سے بھی زیادہ مشکل سے حاصل ہونے والے سوراج کی سی قیمتی چیز پانے کے بعد بھی صدیوں کے غلامی میں جکڑے ہوئے ذہن کی یہ خواہش فطری اور قابل معافی ہے اور علمی نقطۂ نظر سے اس قسم کی باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں، بلا شبہ ان کی تنقید ضروری نہیں ہوتی فرقہ وارانہ دشمنی کا رجعت پسندانہ رویہ بھی اسی طرح کا ہے اور وہ بھی علم دوستوں کے سوچنے کی چیز نہیں ان کے علاوہ دیکھنا ہوگا کہ اور کون سی ایسی وجہیں ہو سکتی ہیں جو اس مسئلے کے اندر تک پیوست ہیں۔ عام تقسیم کے لحاظ سے ان میں بعض وجہیں کچھ یوں بیان کی جا سکتی ہیں۔

(۱) خالص آریائی تہذیب کا دوبارہ زندہ کرنا۔

(۲) مجبوری سے دبائی اور کسی حد تک خود سے بھولی ہوئی سنسکرت زبان کی غیر محدود طاقت اور اختیار پر عقیدہ رکھنے کا مظاہرہ۔

(۳) اور شاید ان دونوں سے بھی زیادہ طاقتور اپنی بات کو اپنے مخالف کی بات سے الگ کرنے اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا جذبہ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں خیالات عام لوگوں کے ہو سکتے ہیں، اور بعض صورتوں میں ہیں بھی، لیکن ہندی زبان اور ادب کے سچے جنم داتا اوپر بیان کئے ہوئے نظریوں کی عزت کرتے ہوئے بھی ان سے متاثر نہیں ہو سکتے کیونکہ دوسرے ملکوں کی زبانوں کا تو ذکر ہی کیا، پاکیزگی کی آخری حدوں کو چھونے والی سنسکرت زبان کی تاریخ خود یہ بتاتی ہے کہ پانینی اور پاسک جیسے عالموں کی سخت حد بندیوں کے باوجود سنسکرت غیر ضروری گھیرے میں قید نہ رہ سکی۔ پانینی نے ویدک سنسکرت کے نکھارنے اور سنوارنے میں جو کوششیں کیں اُن سے آج کا کون سا پڑھا لکھا آدمی بے خبر ہے انھوں نے سنسکرت کو با قاعدہ بنانے کے لئے بارہ سو سوتروں سے گھٹا کر سات سو سوتر کئے۔ اس عظیم الشان قواعد کے اصولوں کو تو دوسرے قواعد والوں اور ادیبوں نے اپنایا اور اس کے بعد تقریباً پندرہ سو سال تک کالی داس، بھاروی، ماگھ، رتناکر، شری ہرش، شودرک، بھوبھوتی، راج شیکھر، ڈنڈی، بان وغیرہ کے ایسے فن کاروں نے سنسکرت کو بلندی پر پہنچا دیا، لیکن سنسکرت کی یہ نہر سوکھنے پر مجبور رہی کیونکہ یہ اپنا پانی دوسروں کو سیراب کرنے کے لئے دے سکتی تھی لیکن روزانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے باہر سے پانی نہیں لے سکتی تھی دنیا میں فخر سے اپنا سر اونچا رکھنے والی سنسکرت زبان کی اس نا وقت موت یا خودکشی سے دنیا کی ترقی پسند زبانوں کو سبق لینا نہ بھولنا چاہیے۔ جب پانینی نے سنسکرت کی فطری ترقی میں روڑا اٹکایا تو اس زبان نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنے آگے بڑھنے کا کام جاری رکھا۔ قدیم پراکرت (سنسکرت) کو ترقی دینے والے عالموں اور گیانیوں نے اپنے نام نہیں چھوڑے ہیں۔ لیکن ان کے کارناموں کا کچھ حصہ چاروں ویدوں، برہمنوں اور اپنشدوں کی شکل میں ہمیں آج بھی مل سکتا ہے، اگرچہ بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ پالی، پشاچی، اردھ ماگدھی، مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی اور اپ بھرنش زبانوں کے روپ میں ظاہر ہوا۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ آج کی بھارت کی زبانیں ہندی، بنگالی، گجراتی وغیرہ اس پراکرت کی فطری پیداوار ہیں۔ اگر پانینی کی زبان یعنی سنسکرت کا دامن وسیع کرنے والے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہوئے تو بعد کی بھاشاؤں کو بھی مہابیر، گوتم بدھ، اسوگھوش، گن ادھیہ، ہال، دھن پال، سومیچھ، دھنن جیہ اور ہیم چندر وغیرہ ملے جو کسی طرح بھی اُن سے کم نہ تھے۔ ساتھ ہی یہ یاد رکھنا بھی مناسب ہوگا کہ سنسکرت کے ادیب اور شاعر بھی ان پراکرتوں کو نظر انداز نہ کر سکے شاعری اور خاص کر ناٹکوں میں مختلف پراکرت بھاشاؤں کا استعمال اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

اس موقع پر ہندوستانی لفظوں کے بارے میں بھی کچھ صفائی دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آریہ قوم کے لوگ بھی بھارت کے قدیم باشندے نہیں تھے۔ وہ بھی بدیسی تھے اور اپنے ساتھ بھارت کے لئے ایک بدیسی بھاشا لائے تھے۔ ان کی اس بدیشی زبان نے (یعنی قدیم ہند آریائی نے) سیکڑوں کی تعداد میں غیر ہند آریائی لفظوں کو اپنا لیا جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

मतंग — मतँग — मयूर

— इष्टका — घर्म कदली —

बक्स — बाल — कम्बल —

पिन — ताम्बूल — बाण —

कर्पास (कपास) — उमा

اس کے بعد شاک، سیتھن، یونانی، ہن وغیرہ حملہ آور ہوئے اور ان کے ساتھ ان کی زبانوں کے نہ جانے کتنے لفظ یہاں آ کر ہندوستانی بن گئے جیسے یہ الفاظ۔ ہیرا (یونانی) کیندر (یونانی) دینار (لاطینی) ستیر (لاطینی)۔

ساتھ ہی دراوڑی زبانوں کے نہ جانے کتنے لفظ شامل ہو کر زبانوں پر چڑھ گئے جیسے:

पुष्प माला — नीर — सीप —

खूँटा — झगड़ा — घूँटना — आव

سنسکرت اور پراکرتوں میں باہری زبانوں سے داخل ہو جانے والے ان گنت لفظ آ گئے ہیں جو آج بھی اُن کے لغات میں شامل ہیں۔ خالص ہندی کی دہائی دینے والے انھیں جانتے اور ان جانے طریقے پر سنسکرت کے لفظ سمجھ کر بڑی خوشی اور جوش سے استعمال کرتے جا رہے ہیں۔ قومی زبان کے نام "ہندی" ہی کو لیجئے، یہ نہ ویدک ہے اور نہ سنسکرت نہ پراکرت، نہ اپ بھرنش، نہ دیسی، نہ آریائی نہ دراوڑی، بلکہ یہ عربی ہے اس نے ہندوستان میں

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

مصر، برطانیہ اور امریکہ

محمد امین

قاہرہ میں دریائے نیل کے کنارے برطانیہ کے سفارت خانہ کی عمارت بہت بڑی اور بہترین جگہ پر واقع ہے جہاں تک سفارت خانہ کی خاص عمارت کا تعلق ہے وہ ایک باغیچہ کے درمیان ایک پرانی وضع کی عمارت ہے سفارت خانہ کے اس پاس برطانیہ کے اور بہت سے دفاتر ہیں، مشرق وسطیٰ کے وزیر کی چانسلری، مشرق وسطیٰ خفیہ پولیس کا ہیڈکوارٹر، برطانیہ کی وزارت اطلاعات کا دفتر اور برطانیہ کی بہت سی کمپنیوں اور ایجنسیوں کے آفس۔ یہ تمام کے تمام دفاتر سفارت خانہ کے چاروں طرف اس طرح پھیلے ہوئے ہیں گویا وہ ایک مرغی ہے اور یہ سب اس کے بچے۔

مصر ایک خاصا بڑا ملک ہے جو فرانس، بلجیم، ہالینڈ اور سوئٹزر لینڈ کے مجموعی رقبے سے بڑا ہے لیکن اس کی سرزمین کا ۹۴ فی صدی علاقہ ریگستان ہے جو خشک بنجر اور غیر آباد ہے۔ تھوڑے سے بہت خانہ بدوش اپنے اپنے اونٹوں کو لے کر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں ان کی زندگی قدیم روایات اور جنگلی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ مصر کے ایک کروڑ نوے لاکھ باشندے نیل کے زرخیز خطہ میں گڈمڈ ہو کر رہتے ہیں۔ آبادی بہت گنجان ہے اور بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے جگہ کی کافی قلت ہے۔

مصر کی سماجی زندگی میں بہت تضاد ہے، جغرافیائی لحاظ سے اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ معاشی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے۔ ایک کروڑ ۵۵ لاکھ کسان ہیں دوسرے الفاظ میں گویا ۸۰ فی صدی انسانوں کے پاس ایک انچ بھی زمین نہیں۔ اس کے برخلاف زمیندار، تعلقدار، پاشا اور نواب جن کے قدم کبھی زمین پر نہیں پڑتے اُن کے قبضے میں دریائے نیل کی وادی کا سارا زرخیز علاقہ باغیچے اور گھاس کے میدان ہیں، مثلاً شاہی خاندان کے پاس اتنی زمین ہے جہاں کہ ۱۷،۶۵،۰۰۰ کسان کاشت کرتے ہیں۔ نوابین میں ساٹھ صرف ایسے ہیں جن کے قبضے میں زراعت کا دو تہائی علاقہ ہے۔

سماجی زندگی میں یہ بنیادی فرق ہے جس کا اثر سماج کے ہر ہر پہلو پر نظر آتا ہے، بڑے بڑے زمیندار جاڑوں میں قاہرہ میں رہتے ہیں اور گرمیوں میں انگلینڈ اور یورپ میں ہزاروں مصری پونڈ اپنی عیش و عشرت اور محلوں پر خرچ کرتے ہیں، اس کے برخلاف ایک کسان اپنے پورے خاندان پر سال بھر میں صرف نو پونڈ خرچ کر پاتا ہے، اپنی آمدنی میں سے وہ ۳۰ پونڈ اپنے بیلوں کے اوپر اور ۱۴ پونڈ اپنے خچروں کے اوپر خرچ کرتا ہے۔

دریائے نیل کی وادی دنیا کے بہترین اور سب سے زیادہ زرخیز علاقوں میں ہے۔ اس کی سرزمین پر رہنے والے عوام جو مصر کے لئے ساری دولت پیدا کرتے ہیں اور جن کے اوپر وہاں کے سارے معاشی نظام کا دارومدار ہے، وہ فقیروں کی مفلسوں کی اور قلاشوں کی زندگی گذارتے ہیں۔ زراعت پیشہ مزدور روزانہ اتنے پیسے بھی نہیں کما پاتے جن سے کہ وہ دو وقت روٹی ٹھیک سے کھا سکیں۔ دریائے نیل کے اوپری حصہ میں وہ بالکل غلاموں کی زندگی گذارتے ہیں اور اُن کی مزدوری کی قیمت انہیں پونڈ میں نہیں بلکہ اشیا کی شکل میں دی جاتی ہے۔ زمیندار اُسے تن ڈھکنے کے لئے کپڑا اور کھانے کو غلہ دیتا ہے۔ وہ کسان جن کے پاس کاشت کے لئے زمین نہیں ہوتی اپنی مزدوری کا بٹہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کی قیمت زراعت پیشہ مزدوروں سے کچھ اچھی نہیں ہوتی۔ وہ کسان بھی جو کھیتوں میں کاشت کرتے ہیں وہ بھی خوشحال نہیں ہوتے بلکہ وہ مویشیوں کی سی زندگی گذارتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں وہاں کے عوام زندگی کیسے گذارتے ہیں۔ اس کا جواب مصری اخبار کے ایک نمائندے نے بہت اچھا دیا تھا کہ ان کے زندگی گذارنے کا سوال ہی نہیں بلکہ وہ چپکے چپکے موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مصر میں مرنے کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے یہاں تک کہ ہندوستان سے بھی اس کا نمبر آگے ہے، ہیضہ کی عام وبا کے علاوہ مصری ملیریا، پیچش، انفلوئنزا وغیرہ کے بھی شکار ہوتے ہیں۔ مصری اعداد و شمار کے مطابق دس آدمیوں میں سے ہر نو آدمی ٹھیے کوما کا مریض ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں عبدالوحید سابق وزیر صحت نے کہا تھا کہ اوسطاً ہر دو مصری کی چار آنکھوں کے بجائے صرف تین ہی ہوتی ہیں، اس لئے کہ اندھوں اور ایک آنکھ والے حضرات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اس وقت سے کر اب تک حالات تقریباً ویسے ہی ہیں۔ پچھلے موسم خزاں کے زمانے میں ال قطلیہ نے جو گورنمنٹ کا ترجمان ہے، لکھا تھا کہ مصر میں امراض کثرت سے بڑھ رہے ہیں اور ہماری زندگی کی اوسط مدت کم ہوتی جا رہی ہے، مردوں کی عمر گھٹ کر صرف ۲۴ سال اور عورتوں کی ۲۷ سال رہ گئی ہے

یہ ساری خرابیاں اور ایسے شدید حالات آب و ہوا یا ملک کی جغرافیائی حالات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ حقیقتاً معاملہ کچھ اور ہی ہے جو گہرا اور پیچیدہ ہے۔ مصر کا حکمراں اور زمیندار طبقہ عوام کی صحت کی طرف سے غافل رہتا ہے۔ اندازہ اسی بات سے ہوتا ہے کہ ایک کروڑ نوے لاکھ کی آبادی میں کل صرف چار ہزار اطبا ہیں جن میں سے تین ہزار شہروں میں ہیں اور دیہاتوں کی ایک کروڑ ۵۵ لاکھ آبادی کے لئے صرف ایک ہزار جو گاؤں میں صرف دولت مند طبقے کو لوٹتے ہیں، اسپتال بہت تھوڑے اور گھٹیا ہیں اور جو ہیں بھی وہ زیادہ تر شہروں میں۔

غریب کسان اپنے افلاس کی وجہ سے عام طور سے نیم حکیموں سے علاج کرواتے ہیں جو بہت ہی ظالمانہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور ان کا خون چوستے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہیضہ اور دوسری قسم کی وبائیں جب آتی ہیں تو زرخیز علاقوں کے گاؤں کے گاؤں صاف کر دیتی ہیں۔

دوران جنگ میں امریکنوں نے برطانیہ کے دبدبہ رعب اور حکومت کی پائداری کو ٹھیس لگائی۔ اب تک برطانیہ تن تنہا میدان میں تھا جو چاہتا تھا کرتا تھا لیکن مٹی کے تیل کی سیاست نے نئے حالات پیدا کر دئے۔ امریکہ کی سیاست کا مقصد محض تیل کی اجارہ داری تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جہاں کہیں بھی تیل نکلنے کے امکانات ہوں وہاں تیزی سے اپنا اثر اور رسوخ قائم کر لینا چاہئے۔ امریکہ میں روزانہ تیل کے اخراجات کو سامنے رکھ کر یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ امریکن تیل کے ذرائع اور وسیلوں کو مستقبل میں بہت اہمیت دیں گے۔

جس وقت جنگ اپنے پورے شباب پر تھی تیل کی تلاش شروع ہوئی۔ امریکہ کے اجارہ داروں کی طرف سے کرنل جان لیول مشرق قریب میں تیل کی سیاست پڑھنے کے لئے بھیجے گئے، بغداد میں ہنڈرسن سفیر امریکہ کے ساتھ وہ بحیثیت تیل کے اتاشی مقرر ہوئے جس وقت کہ برٹش اور امریکن دوش بدوش اپنے دشمن کے خلاف لڑ رہے تھے۔ کرنل جان لیول تیل کی تلاش میں عراق، ایران، مصر، لبنان، لیبیا، سعودی عرب اور افریقہ کی سیر کرتے رہے۔ لیول کے فوراً ہی بعد ولیم ایڈی بھیجا گیا۔

ان ایجنٹوں کی کوشش سے یہ اندازہ ہو گیا کہ مشرق قریب میں ساری مشرقی دنیا (بجز یو، ایس، ایس آر کے) کے لئے بہت وسیع ذرائع ہیں اور کم از کم ایک پچاس کے لئے کافی ہیں اور اگر امریکہ ان کے استحصال کی طرف توجہ کرے تو کم سے کم ۵۵۰ ملین ڈالر سالانہ منافع کما سکتا ہے۔

نیویارک اور واشنگٹن میں اس رپورٹ سے ایک ہلچل مچ گئی۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے نیویارک میں فوراً مشرق قریب کے لئے ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی نے مصر اور دوسرے مشرق قریب کی ریاستوں کی پالیسی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ولیم ایڈی سعودی عرب کے سفیر مقرر ہوئے اور انھوں نے ابن سعود سے امریکہ کے لئے تیل نکالنے کے سلسلے میں بہت سی رعایتیں حاصل کر لیں۔ ٹھیک اسی وقت امریکنوں نے یہ اعلان کیا کہ "مشرقی دنیا میں داخل ہونے کے لئے مصر پہلا دروازہ ہے، جیسے کہ برٹش اُسے ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے پہلا دروازہ سمجھتے تھے"

برطانیہ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے امریکنوں نے بھی مصری پریس پر اثر ڈالنا شروع کیا اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک سال کے اندر اندر امریکنوں نے مصر میں دس لاکھ ڈالر صرف پروپیگنڈے کی خاطر خرچ کر ڈالا۔

ٹھیک اسی وقت امریکن سرمایہ داروں نے وہاں کی سیاسی جماعتوں اور طبقوں کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کی کوشش کی اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایجنٹ اور خفیہ طور سے کام کرنے والے ماہرین کے ذریعے خوب پروپیگنڈا کیا اور زر علیہ السلام سے جی بھر کر کام کیا۔

برطانیہ اور امریکہ دونوں باہم دست و گریباں تھے انگریزوں نے امریکنوں کی چال بازیوں کا معقول الزامات لگا کر جواب دینے کی کوشش کی۔ ان کی رقابت اور آپس کی نوک جھونک مصر کے اخباروں میں بہت نمایاں تھی لیکن اس کے باوجود دونوں اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور مصر کو مشرقی دنیا کا دروازہ سمجھ کر اپنا حق جتانے کی کوشش کرتے تھے۔

برطانوی اور امریکی سامراج دونوں ایک محاذ پر متفق ہیں، وہ یہ کہ دونوں وہاں کی خالص جمہوری طاقتوں کی تحریک اور ان کی جدوجہد کو کچلنا چاہتے ہیں جو کہ مصر کی زندگی اور قومی سماج کو بدلنا اور آزاد کرانا چاہتی ہیں مصر میں جتنے بھی غیر ملکی ایجنٹ ہیں وہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ذریعہ ان کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔

۱۹۴۶ء کے پہلے چھ مہینوں میں جبکہ برطانیہ کے خلاف عوام کا جذبہ بڑے پیمانے پر کارفرما تھا قاہرہ کی پولیس مصر کے دارالسلطنت کے مزدور اضلاع پر حملہ کر لی تھی اور شاید ان مزدوروں کے لیڈروں کی تلاش میں تھی، لیکن ان کی کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ برطانوی سفارت خانے کے اکسانے پر وہاں کے اخبارات، کمیونسٹ خطرہ کا نعرہ خوب بلند کرتے تھے۔ اور سارے عرب ممالک کو اس خطرہ سے آگاہ کرتے تھے، سلیم خوری پاشا نے ایک سازش کی تفصیل بھی چھاپی اور باوجود اس کے کہ یہ سازش سراسر جھوٹ اور غلط تھی، انگریزوں نے اصرار کیا کہ عوامی تحریک کو ختم کرنے کی ترکیب بتانے کے لئے قاہرہ کے گورنر کے دفتر میں ایک خاص کمیٹی متعین کی جائے۔ ظاہر ہے اس میں برطانوی پیش پیش تھے۔

اس سازش سے فائدہ اٹھا کر مصری حکومت پر بھی دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ترقی پسند جماعتوں کے اثر کو ختم کرنے کے لئے ایک خاص رقم متعین کرے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر میں وہاں کی سامراجی ذہنیت کس کس پہلو سے مصر کی ترقی پسند طاقتوں کے اثر کو ختم کرنے کی کیا کیا کوششیں نہیں کر رہی ہیں اور دن رات ان کا اختلاف شدید اور صاف ہوتا جا رہا ہے۔

مصری عوام ترقی پسند عناصر کے خلاف جو محاذ قائم کیا جا رہا ہے اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ محض ایک پردہ ہے۔ اور اس کے پس پشت برطانوی اور امریکن سامراج وہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں کی مدد سے جمہوری عناصر کو جو کہ قومی زندگی کی بحالی اور قومی بیداری کے لئے اور غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں ان کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہاں کے ایک اخبار "صوت العلا" نے لکھا ہے کہ ہماری سماجی حالت ایک ایسی جگہ پہنچ کر ساکت ہو گئی ہے کہ کوئی مصنف جرنلسٹ، ملازم اور طالب علم اپنے وطن کی محبت میں آکر حکومت کی پالیسی سے اختلاف کرتا ہے تو اسے فوراً خطرناک کمیونسٹوں کی فہرست میں داخل کر لیا جاتا ہے۔

باوجود پولیس کی ظالمانہ سختیوں کے ملک کو صحیح معنی میں آزاد کرنے کی تحریک جاری ہے اور دن بدن اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ مصری مزدور سماجی نظام کی خرابیوں کی وجہ سے تقریباً غلاموں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نئی طاقتوں کی مدد سے منظم کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو غلامی، جہالت اور جاگیرداری کے شکنجے سے نجات دلانے کے لئے پوری طرح سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

ملکی زبان کا روپ

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

جو آ گیا وہی ہندوستانی ہے اور ہندوستانی بھاشاؤں نے جن لفظوں کو کام کا اور قابل استعمال سمجھ کر اپنا لیا وہ ہندوستانی ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیت کا نعرہ سوچ سمجھ کر لگانا چاہیے۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کسی زبان میں دوسری زبانوں کے لفظ آخر آتے ہی کیوں ہیں اور کیسے؟ کون نہیں جانتا کہ لفظوں کی اس کے سوا اور کوئی قیمت نہیں ہے کہ وہ خیالات کے اظہار میں مدد دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب کسی خاص سبب سے کوئی باہری یا بدیسی خیال قبول کر لیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بدیسی لفظ بھی داخل ہو جاتا ہے۔ خیالوں کا قبول کرنا یا رد کرنا زیادہ تر تہذیبی ٹکر یا میل جول سے ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ تہذیبی تعلق خوشی سے ہو یا فطری طور پر ہو گیا ہو تو باہری خیالات اور ان کے ساتھ آتے ہوئے الفاظ بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ یہ لفظ مہمان بن کر نہیں آتے بلکہ دلہن بن کر جو اصل میں دوسرے خاندان کی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی اپنے ہی خاندان والوں کی طرح محبت کی جاتی ہے، اس کو بھی عزت کی جگہ دی جاتی ہے اور خوشی خوشی قبول کر لی جاتی ہے، دلہن کے ذریعے سے محض خاندان کی رونق ہی نہیں بڑھتی بلکہ وہ گھر کی بے حد خدمت بھی کرتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کہیں بدیسی خیالات اور الفاظ طاقت، دباؤ یا سمجھوتے کی شکل میں آتے ہیں یا داخل کر دئے جاتے ہیں تو وہ داشتہ عورتوں کی طرح خاندان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے زحمت اور تکلیف کا سبب بن جاتے ہیں۔ انھیں کوئی شخص اپنی محبت کی وجہ سے یا خود غرضی کے سبب چاہے قبول کرے لیکن انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔

اگر ہندی میں ترمیم کرنے والوں کے لئے کوئی مناسب کسوٹی ہو سکتی ہے جس پر وہ لفظوں کو لینے یا نکالنے کے لئے پرکھیں تو وہ یہی ہو سکتی ہے۔

ہندی زبان کے فعل اور ضمیر وغیرہ کے روپ نویں صدی سے نمایاں ہونے لگے تھے جس کا ثبوت اپ بھرنش ادب میں ملتا ہے۔ دسویں صدی میں تو یہ شکلیں اور واضح ہو چکی تھیں۔ دسویں، گیارھویں صدی کے شروع کی ہندی تصانیف آج نایاب ہیں۔ لیکن بارھویں صدی سے ہندی ادب کے اعلیٰ نمونے ملنے لگے ہیں۔ اس طرح ہندی ادب ساڑھے سات سو برس پرانا ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کے مسلمان فاتح ہزاروں کی تعداد میں عربی فارسی اور ترکی کے لفظ لائے جو اپنی قوت اور فائدے کے لحاظ سے نہ صرف ہندی میں بلکہ بھارت کی دوسری اہم بھاشاؤں میں شامل کر لئے گئے۔ ہندی اور دوسری بھاشاؤں میں وہ محض تت سم روپ ہی میں استعمال نہیں کئے گئے بلکہ پوری آزادی سے ان کی شکلیں بدل بھی دی گئیں۔ مقصد یہ ہے کہ سیکڑوں سامی لفظ اپنا لئے گئے۔ آج انھیں ہندی بھاشا سے الگ کرنا زبان کی سائنس یعنی علم اللسان کی مخالفت کرنا ہے، کچھ سامی لفظ دیکھئے جو ہندی میں شامل ہو چکے ہیں:

افسوس، خوشی، شادی، ہوش، سرسری، پہلوان، ولایت، مرد، عورت، آدمی، تنگ، گنبد، گرج، غصہ، چشمہ، دل، دیدا، دور، اندر، درخت، یار، درزی، غریب، امیر، کتاب، قلم، مال، خرابہ، لاش، بخار، قبلہ، حرارت، زردا، وقت، صلاح، قاعدہ، قانون، تہمت، حیران، سفارش، نرم، عزم، ملازم، عزت، قصور، معاف، مرضی، کفایت، نفع نقصان، عمر، دروازہ، تنخواہ، پیشہ، سال، شکل صورت، عیب، ہنر، سوال، جواب، بیگم، علت، چاکر، توپ، داروغہ، بہادر، بیبی، سہی، مسالچی۔

اسی طرح سیکڑوں یورپین لفظ بھی ہندی زبان میں داخل ہو گئے ہیں جن میں سے کچھ نئے ادارے ہیں جیسے بینک اور اسٹیشن اور کچھ نئی چیزیں ہیں جیسے موٹر، سائیکل، ریڈیو، بیٹری، کوٹ، گلاس وغیرہ جو ہندوستان میں آئے تو ان کے ساتھ ان کے بدیسی نام بھی آ گئے اور بھارت کی بھاشاؤں میں شامل ہو گئے۔ ان کے نکالنے کا ذکر ہو رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ تھوڑی بہت کامیابی بھی ہو جائے لیکن آخرکار ناکامی لازمی ہے۔

انگریزی زبان میں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانی، افریقی، برمی، چینی، اور مشرقی مجمع الجزائر کے الفاظ داخل ہو گئے ہیں، انھیں انگریزی کتابوں کی لغت میں جگہ بھی مل گئی ہے، لیکن آج تک اس زبان کے کسی وفادار ماننے والے نے ان کو نکالنے کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ دنیا میں آج کون ہے جو انگریزی زبان کی عظمت اور اہمیت سے واقف نہیں ہو۔

ہندی کے چاہنے والوں کو اس اٹل حقیقت کو بھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بھاشا نے کبھی کسی قانون کا دباؤ قبول نہیں کیا ہے اور نہ وہ کبھی کرے گی۔

دُنیا کا انجام

(بسلسلہ صفحہ ۲)

پیش کیا"

ایچ جی ویلز

"کتاب کا پلاٹ نہایت زبردست اور متوازن ہے۔ میرے خیال میں یہ اس زمانے کی سب سے زیادہ مکمل اور سچی تصویر ہے، جو کھینچی گئی ہے یا آئندہ کھینچی جائے گی"

آئن سٹائن

"مجھے یقین ہے کہ آپ جس قابلیت کے ساتھ اور جیتے جاگتے انداز میں امریکہ کے لوگوں کے سامنے ہمارے زمانے کے اس زبردست المیہ کا اقتصادی اور نفسیاتی پس منظر پیش کر رہے ہیں وہ ایک بہت قابلِ قدر کام ہے اور یہ صرف ایک سچے آرٹسٹ ہی کے بس کی بات تھی!"

غرض اس کتاب میں سے آپ کو حسب توفیق وہ سب کچھ ملے گا جس میں آپ کو دلچسپی یا جس کو لینے کی آپ میں صلاحیت ہو۔ پلاٹ کو دل کشی، کردار نگاری کا کمال، ادب، آرٹ اور فلسفے کی بحثیں یعنی بڑی کی آپ بیتی (جو اُسے ادب کے امر کرداروں میں جگہ بخشتی ہے) ہماری، آپ کی، سب کی جگ بیتی (جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اور ہماری تہذیب ایک خوفناک جوالا مکھی پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔) لیکن اس سارے طویل ناول کی پیچ در پیچ راہوں میں اس تیس سال کی المناک داستان میں، اس کی گرج اور کڑک، اس کے ظلم و ستم، اس کی خوں ریزی اور مردم آزاری میں اس کے گھپ اندھیارے میں، ایک سنہری تار ہے جس کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا جس کو لیفی بڈ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا جس کو ہم میں سے کوئی جس کے پہلو میں دل اور دل میں درد ہے، نہیں چھوڑ سکتا، اور وہ یہ حوصلہ آفریں امید اور پیغام ہے کہ ظلم اور باطل اور ناحق کی قوتوں کے سامنے سر جھکانا شرف انسانی کے خلاف ہے کہ ملبند انسان کو انسان سے ناتہ ہے وہ دوسرے تمام رشتوں سے جو رشتہ اور تمام باہمی مخالفتوں سے زیادہ اہم، کہ ہم دنیا میں کوئی معقول اور شریف سماج پیدا نہیں کر سکتے جب تک دوسروں کے لئے بھی، جن کو سماج یا حکومت کی ٹھکرائی نے محروم بنا رکھا ہے ہم وہی رعائتیں اور سہولتیں اور ترقی کے موقعے طلب نہ کریں جو اپنے لئے چاہتے ہیں، کہ سچی عزت اور سعادت اور مسرت دنیا کی دولت اور آرام بٹورنے میں نہیں بلکہ حق اور انصاف کی خاطر جد و جہد کرنے میں، اس کی خاطر زندہ رہنے میں اور وقت پڑے تو اس کی خاطر جان دینے میں ہے یعنی۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جب اس سلسلے کا پہلا ناول "دنیا کا انجام" شائع ہوا تو شکلیٹر نے ایک امریکی میگزین میں اس کی تصنیف کے بارے میں ایک عجیب مضمون لکھا تھا جواب دوسری جلد میں ضمیمے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں نے یہ مضمون پڑھا ہوگا اس لئے اس کا ترجمہ "نئی روشنی" کی اگلی اشاعت میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا:

طابع و ناشر:۔ عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ
مطبوعہ: جید پریس، دہلی

نئی روشنی

دہلی देहली

فہرست مضامین

۸ اپریل — سنہ ۱۹۵۰ء

دنیا کا انجام — خواجہ غلام السیدین — ۲

اس مرض کا کیا علاج — (ادارہ) — ۳

دنیا کی رفتار:-

۱- ہندوستان — ع۔ ج — ۴

۲- پاکستان — ع۔ ل

[illegible] — ۵

غزل — اقبال احمد سہیل — ۵

شاعر جواں مرگ نظم — خلیل الرحمن اعظمی — ۵

اپنے مزاج کا جائزہ لیجئے — ۶

مولانا شبلی کی اردو کی شاعری — فریدالوحیدی فیض آبادی — ۸

زندگی کا سوال — علی احمد صدیقی

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۹

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر دہلی

مدیر: ڈاکٹر سید عابد حسین

دُنیا کا انجام

خواجہ غلام السیدین

(یہ اپٹن سنکلیر کا وہ مضمون ہے جس کا حوالہ پچھلے پرچے میں دیا گیا تھا)

(۲)

قسمت نے مجھے اور آپ کو تاریخ کے ایک نازک زمانے میں پیدا کیا ہے۔ یہ زمانہ خطرناک بھی ہے اور ہنگامہ خیز بھی۔ آج سے پہلے ہم [illegible] کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے واقعات کے بارے میں اتنا کچھ جان سکیں جیسا اب جان سکتے ہیں مگر یہ میدان اس قدر وسیع ہے اور جو مسئلے اس میں درپیش ہیں وہ اتنے اہم [illegible] کی حیثیت سے ان سے برابر الجھتا رہا ہوں اور خود کو یہ کہہ کر سمجھاتا رہا ہوں کہ "میں ایک امریکی ہوں اور امریکہ میرے لئے کافی ہے"۔ اسی لئے میں نے اپنا ناول "آئیل" لکھا جو پٹرول کی صنعت کے متعلق ہے اور میرے پڑوس کی چیز ہے۔ "بوسٹن" لکھا جس میں سیکو اور وینزیٹی کے مشہور مقدمے کا حال ہے اور "کو اوپ" لکھا جس میں میری اپنی ریاست کے بے روزگاروں کا قصہ ہے اور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے چھوٹے چھوٹے امداد باہمی کے گروپ قائم کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اس عرصے میں میں برابر دنیا کے حالات کا مطالعہ کرتا اور اس کے قصے سنتا رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کوئی بھی چیز یا قوت ناول نویس کے تحت الشعور میں کام کرتی ہے وہ مجھ پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔ گویا یہ خاص موضوع میری گھات میں لگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ایک دن یہ مجھے پکڑ ہی لے گا۔ میں نے مسولینی اور ہٹلر اور فرانکو کا بھیانک عروج دیکھا اور اسپین کی دردناک تباہی نے میرے دل کو مسل ڈالا۔ پھر میونک کی قرارداد میری نظروں کے سامنے آئی اور میں نے خود سے کہا "یہ خاتمہ ہے، یہ ہماری دنیا کا خاتمہ ہے!"

ایک رات میں اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دفعتاً مجھے ایک عجیب تجربہ پیش آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسا کسی نے کوئی چھپا ہوا کھٹکا کھول دیا ہو۔ یا کوئی بٹن دبا دیا ہو۔ بہرحال میرے تخیل کے سامنے پورے ناول کا پلاٹ کھلتا چلا گیا، واقعات کا ایک طویل سلسلہ اور ان کے ساتھ جو جذبات وابستہ ہوتے ہیں، اور کرداروں کا ایک ہجوم جس میں اچھے بُرے، بوڑھے بچے، امیر غریب سب طرح کے لوگ شامل تھے۔ ایسا تجربہ مجھے پہلے بھی پیش آیا ہے لیکن کبھی اس قوت اور شدت اور استقلال کے ساتھ نہیں۔ اس کا مقابلہ کرنے کا نہ مجھ میں یارا تھا نہ میں نے اس کی کوشش کی۔ میں نے اگلے ۳۶ گھنٹے ایک استغراق کے عالم میں بسر کئے۔ بہت کم سویا لیکن بستر میں لیٹے لیٹے اپنے ناول کے پلاٹ کو "دیکھنے" کی کوشش کرتا رہا۔ اس عرصے میں میں نے بہت کم کھایا اور کم باتیں کیں۔ میری بیوی کی طبیعت بہت [illegible] اور صابر ہے اور جب میں اُسے بتا دیتا ہوں کہ مجھ پر [illegible] کیفیت گذر رہی ہے تو وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ میں باغ میں ادھر سے اُدھر ٹہلتا رہا اور بہت سے کاغذوں پر مختلف کرداروں اور مقامات اور واقعات کے متعلق نوٹ لکھ ڈالے جس میں تقریباً پورا منظر آگیا۔ بالآخر میرے پاس کوئی سو ٹائپ شدہ کاغذوں کا ایک مسودہ تیار ہو گیا جو خود ایک چھوٹی سی کتاب کے برابر تھا

میں ایک اعتبار سے امریکہ کے خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں، جہاں میں رہتا ہوں وہاں سال کے بیشتر حصے سورج کی روشنی میسر ہے اور میں اپنا ٹائپ رائٹر باغ میں لے جا کر وہاں کام کر سکتا ہوں ہلکے کپڑے پہنے اور ایک سفید کینوس کا ہیٹ اوڑھے اپنے ناول کے کرداروں کے ساتھ میں گلاب اور یاسمین کی جھاڑیوں کے پیچھے چہل قدمی کرتا ہوں، اور وہ مجھے اپنے کارنامے اور حالات اور خیالات سناتے ہیں۔ شاید نفسیات کا عالم یہ کہے کہ ایک ناول نویس کے دماغ میں جو کچھ گذرتا ہے وہ ایک منظم لیکن فرضی شخصیت کا اظہار ہے۔ یہ خیالی کردار میرے لئے ان لوگوں سے زیادہ حقیقی ہیں جو مجھے بیرونی دنیا میں ملتے ہیں، کیوں کہ ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا اور یہ میرے اپنے بچے ہیں جو اب بالغ ہو چکے ہیں، ان کا جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر بیٹھتے ہیں جن سے مجھے اچنبھا ہوتا ہے، لیکن میں فوراً ہی ان کو سمجھ لیتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ایک تاریخی ناول میں میں ہر چیز کو اپنے خیالی کرداروں پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں ہر روز کچھ وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا ہوں تاکہ لوگوں اور مقامات کے متعلق ان کی یاد تازہ ہو جائے۔ رات کے وقت یا میں پلنگ پر بیٹھ کر دن بھر کے لکھے کو دہراتا ہوں یا باغ میں چہل قدمی کرتا ہوں اور کہانی کے اگلے حصے کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میری چشم تخیل کے سامنے آجائے۔ ایک مصنف کے لئے غالباً یہ شاہانہ زندگی ہے۔ میں بہت کم کسی سے ملتا ہوں یا کہیں جاتا ہوں اور باقاعدہ اس معمول کی پابندی کرتا ہوں اور اس طرح ہر روز تقریباً ایک ہزار لفظ اور سال میں ایک ہزار صفحے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ سب محنت طلب کام ہے لیکن ساتھ ہی بہت خوشگوار تفریح بھی ہے۔ اس تمام محنت اور کوشش کی منزل مقصود آپ ہیں یعنی میری کتابوں کے پڑھنے والے اور جس دن آپ میری کوئی کتاب کو کھول کر اُسے پڑھنا شروع کرتے ہیں، میرا دل اچھل کر میرے منہ میں آجاتا ہے!

اس ناول میں دنیا کے انجام کا سین یورپ میں رکھا گیا ہے مگر اس کے دوران میں نیو انگلینڈ اور نیویارک کا ایک سفر بھی پیش آتا ہے۔ اس کی مدت سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک کی ہے۔ میں نے سنہ ۱۹۱۲ء اور سنہ ۱۹۱۳ء انگلستان، ہالینڈ، جرمنی، فرانس، اٹلی میں بسر کئے تھے اور جنگ اور صلح کی بازی گری کے زمانے میں قدرتی طور پر میرا خیال اسی طرف لگا ہوا تھا۔ علاوہ اس کے اس زمانے کے بارے میں بہت ضخیم ریکارڈ بھی موجود ہیں۔ اس ناول کو لکھنے کے سلسلے میں میں نے کوئی سو کتابیں تو پوری پڑھی ہوں گی اور مواد جمع کرنے کے لئے اور کئی سو کتابوں کی طرف رجوع کیا ہوگا۔

میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اہل یورپ کے متعلق ایک ناول لکھوں۔ سوائے اس کے کہ ان کی حیثیت ضمنی کرداروں کی ہو۔ اس لئے اس ناول میں بیشتر کردار امریکی ہیں جو یورپ میں رہتے ہیں میں ان میں سے بہتوں سے واقف ہوں اور بہت سے نئے لوگ مجھ سے ملتے رہتے اور میری یادداشت تازہ کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی مجھے کسی خاص مقام کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہوئی ہے مجھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا شخص مل گیا ہے جو وہاں جا چکا ہے۔ اگر مجھے کسی واقعے کو بیان کرنے کی ضرورت پڑی ہے تو مجھے کوئی ایسا شخص مل گیا ہے جس نے اُسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شاید میں نے اس ضمن میں سینکڑوں خط لکھے ہوں گے اور لوگوں سے ہزاروں سوال پوچھے ہوں گے۔

میں اپنے تجربے کی بنا پر جانتا ہوں کہ اس ناول میں کہیں کہیں غلطیاں ہوں گی، لیکن "دنیا کا انجام" نہ صرف ایک ناول ہے بلکہ تاریخ بھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس میں کوئی اہم غلطیاں نہیں ہیں۔ میرا اپنا ایک نقطۂ نظر ضرور ہے، لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ غیر جانبداری سے کام لوں، اس میں مختلف قسم اور مختلف خیال کے کردار ہیں اور وہ جو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ کتاب میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے ان میں سے بعض تو واقعی ہیں جو زندہ ہیں یا مر چکے۔ برنارڈ شا واقعتاً میرے یہاں آئے تھے اور لان پر میرے اور میرے بیوی بچوں کے ساتھ اسی انداز میں کھڑے تھے جیسا میں نے لکھا ہے۔ (بلکہ جیسا میری بیوی نے کہا تھا) "سورج کی روشنی ان کی مونچھوں میں چمکتی ہوئی!" ڈلکروز کے جشن کے موقع پر، واقعتاً ہم سب بچوں کی طرح خوش تھے، اگرچہ میں جانتا تھا کہ جنگ قریب ہے اور اسی وجہ سے میں نے اپنے لڑکے کو جرمنی کے اسکول سے اٹھا لیا تھا۔ اس ناول کے ابتدائی صفحوں میں میں نے پہلے آرفیس کے رقص کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا لیکن بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ ایک تاریخی ناول کی ابتدا دوزخ کی سیر کے ساتھ کرنا مناسب نہ ہوگا

(بقیہ صفحہ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

جلد ۲ ۸ راپریل ۵۰ء نمبر ۱۴

اس خوف کا کیا علاج؟

خوف اپنی فطری حالت میں ایک مفید جبلت ہے جو انسان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرکے اس سے بچنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن جب یہ جبلت مشاہدے اور عقل کے بجائے وہم و تخیل کی تابع بن جاتی ہے تو ایک نفسی بیماری کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ بے جا خوف انسان کو گھن کی طرح کھانے لگتا ہے اور اس کی ذہنی اور عملی قوتیں شل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ آج کل ہندوستان اور پاکستان میں کروڑوں آدمی اسی نفسی بیماری میں یعنی بے جا خوف میں مبتلا ہیں۔

بھلا آپ اسے بے جا خوف نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ ان شہروں اور قصبوں میں بھی جہاں ایک فرقے کی ایک چھوٹی سی تعداد دوسرے فرقے کی بہت بڑی تعداد کے بیچ میں گھری پڑی رہتی ہے، کبھی کبھی یہ افواہ مشہور ہوجاتی ہے کہ اقلیت فساد کی تیاری کررہی ہے اور اس سے اکثریت میں گھبراہٹ پھیل جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ ع ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم
ایک دانش مندانہ اصول ہے لیکن اس کے معنی دراصل یہ نہیں کہ جو تم سے ڈرتا ہو اس سے تمھیں بھی خواہ مخواہ ڈرنا چاہیے بلکہ شیخ سعدی نے اپنے خاص انداز میں نصیحت کی ہے کہ کمزور کو ستانے سے ڈرو اس لئے کہ اگر وہ تنگ آکر جان پر کھیل گیا تو پھر تمھاری بھی خیر نہیں۔ اگر اکثریت اقلیت کو جو ہر طرح سے کمزور ہے ستاتی نہیں تو پھر اسے اس اقلیت سے ڈرنے کی کوئی معقول وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اس کا خوف نفسی الجھن کی بدترین مثال ہے۔

لیکن شاید اس دہشت کو جو ہند اور پاکستان کی اقلیتوں میں پائی جاتی ہے آپ بے جا خوف ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ آپ یہ فرمائیں گے کہ جب آئے دن لوگوں پر قاتلانہ حملے ہوتے ہوں ان کے گھر لوٹے اور جلائے جاتے ہوں تو پھر ان میں دہشت پھیلنا بالکل قدرتی امر ہے اسے ہرگز بے جا خوف نہیں کہہ سکتے۔ بے شک ڈھاکہ، کلکتہ اور بعض دوسرے شہروں اور علاقوں میں جہاں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے اور حکومت غفلت سے یا مجبوری کی بنا پر ان پر جلد قابو حاصل نہیں کرسکی اقلیت کے لوگوں کا خوف و اضطراب بجا تھا اور انھیں کوئی ذی عقل الزام نہیں دے سکتا، لیکن ان ہزاروں مقامات پر جہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی یا ہوئی تو حکومت نے اسے فوراً بڑی سختی کے ساتھ دبا دیا، لوگوں کا بدحواس ہوکر گھر بار چھوڑ کر بھاگنا یا سہم کر گھروں میں دبک بیٹھنا اور ہفتوں تک نہ نکلنا ہرگز قدرتی فعل نہیں بلکہ نفسی بیماری کی علامت ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جنگ عظیم کے زمانے میں سارے یورپ کے شہروں میں اور ایک حد تک دیہات میں بھی لوگوں کا جان و مال گھر بار ہوائی حملوں کی وجہ سے ہر وقت خطرے میں رہتا تھا۔ شروع شروع میں بھگدڑ مچی مگر رفتہ رفتہ لوگوں کو عادت ہوگئی روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ چھوٹے چھوٹے مکانوں سے لے کر بڑے بڑے محلوں تک سینکڑوں عمارتیں ان کا ساز و سامان اور ان میں رہنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کی لاشیں ریزہ ریزہ ہوکر ہوا میں اڑتی ہیں یا ملبے کے انباروں میں دفن ہوجاتی ہیں اور اپنے دل میں ڈرتے تھے کہ نہ جانے کب ہماری باری آجائے مگر اس خوف کو چھپا کر، دبا کر جہاں تھے وہیں رہتے تھے اور جو کام کرتے تھے اسے جاری رکھتے تھے اور دور کیوں جائیے خود ہمارے ملک میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سی جگہوں پر ہیضہ، طاعون اور دوسری وبائیں پھیلتی ہیں۔ بیسیوں سے لے کر سینکڑوں تک روزانہ مرتے ہیں، ہر شخص کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے لیکن چند خفقانی آدمیوں کے سوا کوئی بدحواس نہیں ہوتا، کوئی گھر بار چھوڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر نہیں بھاگتا، پھر اس کو کیا کہئے گا کہ جہاں کسی مقام پر ذرا سی فرقہ وارانہ گڑبڑ ہوئی، دو ایک بم پھٹے، دو چار مکانوں میں آگ لگی، چند آدمیوں پر حملہ ہوا اور دہشت کا وہ سیلاب آیا کہ خدا کی پناہ محلے کے محلے خالی ہوگئے شہر کے شہر اجڑ گئے، علاقے کے علاقے ویران ہوگئے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بلکہ کبھی کبھی محض افواہوں یا دھمکیوں سے اقلیت کے لوگوں کے پیر اس طرح اکھڑ جاتے ہیں، کہ پھر کسی طرح جمنے کا نام ہی نہیں لیتے، آخر یہ ایک خطرناک نفسی بیماری نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ کہیں کہ اچھا اگر یہ بیماری ہے تو پھر اس کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں؟ بات یہ ہے کہ بیماری کا علاج تجویز کرنے سے پہلے اس کے اسباب کی تشخیص کرنا ضروری ہے اس لئے کہ علاج دراصل اسباب مرض کے دور کرنے ہی کا نام ہے۔

ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا کہ اس بے بنیاد خوف کے جو ہند اور پاکستان کی اقلیتوں پر مسلط ہے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ان کو اپنے اپنے ملک کی حکومتوں پر پورا اعتماد نہیں کہ وہ ان کے جان و مال کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں یا کرسکتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کے سامنے فرار کی راہ کھلی ہوئی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کو جب خطرہ پیش آتا ہے تو پاکستان کا خیال اور پاکستان کے ہندوؤں کو جب اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو ہندوستان کا تصور ان سے تاب مقاومت چھین لیتا ہے۔ ان کی ہمتوں کو پست کردیتا ہے اور ان کے خوف کو ہوا دے کر بھڑکا دیتا ہے۔

پہلے سبب کو دور کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر دونوں ملکوں کی حکومتوں پر ہے، ہندوستان کی حکومت کے بارے میں ہم کو یقین ہے اور پاکستان کی حکومت کے متعلق یہ حسن ظن ہے کہ وہ اپنی اپنی اقلیتوں کی حفاظت کی خواہش بھی رکھتی ہیں۔ اور اس کی قوت بھی رکھتی ہیں لیکن اقلیت کے دلوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے انھیں زیادہ مؤثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں صاحب کی ملاقات کا جو آج کل ہورہی ہے یہی مقصد ہے کہ اس قسم کی تدبیروں پر غور کریں اور ہمیں امید ہے کہ اس ملاقات کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا۔ ہم نے ایک پچھلے اداریے میں یہ رائے دی تھی کہ اقلیتوں کے حقوق کے متعلق محض کوئی سمجھوتا یا معاہدہ کرنا کافی نہیں بلکہ اس معاہدے کے نفاذ کی نگرانی کرنے کے لئے ایک مشترک بورڈ کی ضرورت ہے جو ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو۔ اگر اس بورڈ کو ایک باضابطہ عدالت کی حیثیت دی جاسکے تو اور بھی اچھا ہے، اس طرح اقلیتوں کو بہت کچھ اطمینان ہوجائے گا۔

اب رہا دوسرا سبب تو اس کا دور کرنا خود اقلیتوں پر موقوف ہے۔ جن حالات میں ہند کی تقسیم ہوئی ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ایک دوسرے کی اقلیتوں پر اپنے ملک کا دروازہ بند نہیں کرسکتیں، لیکن ان اقلیتوں کو اپنی اپنی جگہ یہ سوچنا ہے کہ اپنے آبائی وطن میں رہ کر برادران وطن کے دل میں گھر کرنے اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کی کوشش میں جان پر کھیل جانا بہتر ہے یا دوسرے ملک میں پناہ لے کر پناہ گزینی اور جلاوطنی جیسی قابل افسوس اور قابل رحم زندگی بسر کرنا۔ پاکستان کے ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو کشمکش حیات کا ایک بڑا زبردست معرکہ سر کرنا ہے اور دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی زبردست معرکہ راہ فرار اختیار کرنے سے سر نہیں ہوا بلکہ میدان میں قدم گاڑ کر جان کو جوکھم میں ڈال کر زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے۔

لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ معرکے اور مقابلے کے لئے تشدد کو ضروری سمجھتے ہیں اور جب اس کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے تو ان کی ہمت جواب دے دیتی ہے۔ اسی کمزوری کی تلافی کے لئے مہاتما گاندھی نے ہمیں ستیاگرہ کی تعلیم دی تھی اور اسی کو دور کرنے کے لئے سرسید نے بہ قول حالی ہمارے سامنے محبت کی لڑائی کا یہ نصب العین رکھا تھا۔

جور اخوان دیدن و در عشق اخوان زیستن
زخم پیکاں خوردن و مشتاق پیکاں زیستن

دنیا کی رفتار

ہندوستان

آثار تو اچھے ہیں

دو برس کے شروع سے ہندوستان و پاکستان کے سیاسی آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان اب آیا، اب آیا۔ لیکن مارچ کے آخر میں ایک دم سے ہوا پلٹ گئی، بادل تیزی سے چھٹنے لگے اور مطلع صاف ہونے لگا۔ اس تبدیلی کی ایک چھوٹی سی خبر تھی جو نہ صرف ان دونوں ملکوں کے بلکہ باہر کے اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے شائع ہوئی "پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب ۲ اپریل کو نئی دہلی تشریف لا رہے ہیں تاکہ بنگال کے مسئلے اور دوسرے مسائل کے بارے میں پنڈت نہرو سے گفتگو کریں" ۲ اپریل آگئی، لیاقت علی خاں صاحب تشریف لائے اور بات چیت شروع ہو گئی۔ ساری دنیا سانس روکے ہوئے اس گفتگو کے نتیجے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس وقت تک جتنی خبریں ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی اور مغربی بنگال کی اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ اتفاق رائے سے طے ہو چکا ہے۔ تجارتی معاملات کے متعلق گفتگو ہونے والی ہے اور کشمیر کے بارے میں اگر اس صحبت میں نہیں تو آیندہ صحبتوں میں یو۔این۔او کے نمایندے کے توسط سے گفت و شنید کا آغاز ہو جائے گا۔

ہر شخص یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا یہ بات چیت کامیاب ہوگی؟ کیا نزاعی مسائل کے بارے میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر پاکستان کی پالیسی میں یہ فوری تبدیلی کیوں ہوئی اور لیاقت علی خاں صاحب سوا دو برس تک اس قدر کھنچے رہنے کے بعد کہ رسمی مراسلات کا جواب بھی مشکل سے دیتے تھے خود دہلی آکر گفت و شنید کرنے پر کیسے راضی ہو گئے؟

بظاہر اس کی وجوہ حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں:

(۱) پاکستان نے بھی ہندوستان کی طرح محسوس کر لیا ہے کہ معاشی الجھن جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان کاروبار بند ہو گیا ہے۔ دونوں کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

(۲) مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے بحران سے یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے کہ کم سے کم اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں دونوں ملکوں کے باہمی مشورے اور مشترک عمل کی فوری اور شدید ضرورت ہے ورنہ بڑھتے پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اور دونوں کے لئے اور خصوصاً پاکستان کے لئے تو یقینی طور پر مہلک ثابت ہوگا اس لئے کہ سوا کروڑ ہندوؤں کے ایک دم سے چلے جانے کے بعد ہندوستان سے صرف اتنی ہی تعداد میں نہیں بلکہ شاید اس کی دگنی تعداد میں مسلمان جا کر نئی ریاست کی کمزور کشتی کو بحر بلا میں ڈبو دیں گے۔

(۳) پاکستان میں بہت سے لوگ چند نیم مجنون لیڈروں کے ساتھ ساتھ مدت سے جنگ کے نعرے لگا رہے تھے لیکن پچھلے دنوں جب جنگ کا ہسٹیریا ہندوستان میں بھی پھیل گیا اور پاکستان کی رائے عامہ کو جنگ کی مصیبت اصلی شکل قریب نظر آنے لگی تو اس نے اپنی حکومت پر زور ڈالا کہ اعصاب کی جنگ جلد سے جلد روکے ورنہ حقیقی جنگ کا روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ گفتگو ضرور کامیاب ہوگی اور اکثر نزاعی مسائل کے بارے میں ضرور کوئی نہ کوئی سمجھوتا ہو جائے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا یہ سمجھوتا پائدار ثابت ہوگا؟ کیا کشمیر کا مسئلہ بھی ہو فساد کی جڑ ہے طے ہو جائے گا؟ اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ حکومت پاکستان ابھی تک بیرونی طاقتوں کی حمایت کے دام فریب میں گرفتار ہے یا اس پر یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ ظفر اللہ صاحب کی مقدمہ بازیاں اور ریشہ دوانیاں یا دوسری باتیں یہ کر سکتی ہیں کہ ہندوستان کو انگلو امریکن بلاک میں دھکیل دیں مگر پاکستان کو کشمیر نہیں دلوا سکتیں۔ جب تک پاکستان کی خارجی پالیسی چودھری ظفر اللہ صاحب کے ہاتھ میں ہے جن کی ساری عمر بیرونی آقاؤں کے اشارۂ چشم پر گردش کرنے میں گذری اس وقت تک کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کے ساتھ کوئی سمجھوتا ہونا مشکل ہے۔

(ع، ح)

پاکستان

جواہر، لیاقت گفتگو کا خیر مقدم

وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں صاحب نے جب دستور ساز اسمبلی میں اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ بنگال کے امن و امان اور دونوں ملکوں کی اقلیتوں کی حفاظت کے مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے دہلی جائیں گے تو عام طور پر اس کا خیر مقدم کیا گیا اور پاکستان کے تمام اخبارات نے اس خبر کو نمایاں اور جلی سرخیوں سے شائع کیا اور گفتگو کی کامیابی کی توقعات ظاہر کیں۔ ڈھاکہ کے ایک انگریزی اخبار نے اپنے اداریہ میں وزیر اعظم پاکستان کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا کہ "ان تاریک لمحات میں بھی ہم امید کرتے ہیں کہ انسان کا ضمیر پھر جاگ اٹھے گا ہر وہ شخص جو دونوں ملکوں کا بہی خواہ ہے۔ لیاقت، جواہر گفتگو کی کامیابی کی دعا کرے گا" اس اخبار نے دونوں ملکوں کے فسادات کے اسباب اور ان کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔

روزنامہ امروز (کراچی) نے اپنی ۱۳ مارچ کی اشاعت میں اس سلسلے میں رائے ظاہر کی ہے کہ "پاکستان نے پھر ایک بار اس حقیقت کا عملی ثبوت مہیا کیا ہے کہ فرقہ وارانہ امن و امان اس کا مسلک ہے اور وہ خلوص دل سے بھارت کے ساتھ دوستی اور امن کے تعلقات برقرار رکھنا چاہتا ہے ..... وزیر اعظم پاکستان نے بذات خود دہلی جانے کا فیصلہ کر کے اس رواداری اور عمل پسندی کا ثبوت مہیا کیا ہے کہ پاکستان امن کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے چنانچہ ہم وزیر اعظم پاکستان کے اس فیصلے کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ ان کا سفر جو پاکستان کی صلح جوئی اور خلوص پسندی کا ایک مظہر ہے، اپنے مقصد میں پورے طور سے کامیاب رہے"

مرکز اور پنجاب کی کشیدگی میں اضافہ

پاکستان دستور ساز اسمبلی کی سات خالی جگہوں کو بھرنے کے لئے صوبائی مسلم لیگ نے سترہ ناموں کی جو فہرست پیش کی تھی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے اس بنا پر اسے بے قاعدہ قرار دے دیا کہ نامزدگی کا کام صوبائی لیگ کے بجائے اس کی ایک مقرر کردہ سب کمیٹی نے کیا تھا۔ بورڈ کے نزدیک صوبائی لیگ، سب کمیٹی بنانے کی مجاز نہیں تھی۔ اس لئے اس کارروائی کو بے قاعدہ قرار دے کر خود اس نے سات ناموں کی ایک فہرست پیش کی جسے دستور ساز اسمبلی نے بھاری کثرت رائے سے منظور کر لیا۔ اس پر پنجاب کے بعض ممبروں نے خاص طور پر میاں افتخار الدین اور شوکت حیات خاں نے بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے اور پنجاب کے اخبارات نے اس طریقہ کار کو نہ صرف غیر جمہوری قرار دیا ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صوبائی لیگ کو نظر انداز کر کے ان کے صوبے کی سخت توہین کی گئی ہے۔ چند اخبارات کے اقتباسات ملاحظہ ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ مرکز اور پنجاب کی کشیدگی کس تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے:۔

"نصیبے ہیں صحیح یا غلط طور پر یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ پنجاب کے ساتھ مرکز منصفانہ برتاؤ نہیں کر رہا ہے، یہی نہیں بلکہ پنجاب کو دبانے اور اس کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کے نمایندوں کے انتخاب میں صوبے کی سفارش کو ٹھکرا دینے سے یہ احساس یقینی طور پر اور زیادہ گہرا ہو جائے گا" (سول اینڈ ملٹری گزٹ)

"پنجاب کے نمایندوں کی خالی نشستوں کو پُر کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کے ارباب اقتدار جمہوریت کے معمولی اصولوں کا بھی احترام نہیں کرتے..... اگر مرکزی حکومت انتخاب کے لئے کوئی معقول طریقہ کار اختیار نہیں کر سکتی تھی تو بہتر ہوتا کہ اس بے تکے انتخاب کے بجائے ۲ مہینے بعد پنجاب کو صحیح نمایندگی دی جاتی"

(پاکستان ٹائمز)

"نامزدگی کا اصول جمہوری تقاضوں کی کھلی توہین ہے اور نامزد اشخاص کا پنجابی ہونا اس بات کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ پنجابی عوام کے جذبات کے صحیح ترجمان بھی ہیں"

(امروز)

(ع، ل)

کشکول

کبھی آپ کو یہ اتفاق ہوا ہے کہ ایک شخص جو دیکھنے میں عاقل و بالغ معلوم ہو ایسی نامعقول حرکت کر بیٹھے کہ جی جل کر سلفہ ہو جائے، آپ یہ سمجھیں کہ اسے سختی سے ٹوکنا بلکہ سے ٹھوکنا چاہیے مگر آپ دل ہی دل میں کڑھتے رہیں اور ہاتھ اٹھانا تو درکنار زبان تک نہ ہلا سکیں۔ اگلے زمانے میں اسے مروت کہتے تھے، مگر آج کل کے طبیب اسے ضعف اعصاب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اعصاب بھی عجیب و غریب ہیں جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو کڑی کمان کی طرح کھنچ جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کمان سے تیر اب چھوٹا، اب چھوٹا، مگر عین وقت پر ——— ٹائیں ٹائیں فش۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ہم اپنے دفتر میں رعب دار چہرہ بنائے تیوری پر بل ڈالے اینٹھے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح بیٹھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، پٹھے دکھنے لگتے ہیں، ہڈیاں بول اٹھتی ہیں مگر کیا کیا جائے کہ اس تکلف کے بغیر کم بخت چپراسی ہم جیسے کمزور آدمی کا رعب مانتا ہی نہیں۔ ہم ذرا ڈھیلے پڑے اور وہ سر پر چڑھا۔ خیر تو ہم اس شان سے بیٹھے تھے کہ ہمارے ایک مہربان نیم حکیم، ضخیم، فہیم جنھیں ہمارے ہی آپ کی زبان میں "خواہ مخواہ مرد آدمی" کہتے ہیں آ دھمکے اور بڑی بے تکلفی سے سامنے والی کرسی سے میز تک دراز ہو گئے ——— یعنی انھوں نے کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اور اس کی پشت سے پیٹھ لگا کر اسے پیچھے کو جھکا دیا۔ پاؤں پھیلا کر میز سے ٹکا دیے اور لگے جھولا جھولنے۔ اب ہمارا غصے اور شرم سے یہ حال کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹے اور ——— اور یہ حضرت کرسی سمیت اس میں سما جائیں۔ ہم نے کنکھیوں سے چپراسی کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہو بابو صاحب اب کیا رہ گئی؟ اپنے دھم دھوسڑ دوست کو لاکھ اشارے کیے کہ اس بھنگم ٹھاٹھ کو بدلو، یہ سرکس کا تماشہ موقوف کرو مگر ظاہر ہے کہ اتنی عقل ہوتی تو اتنی کیسے چڑھتی۔ سوچتے سوچتے ایسی ترکیب سوجھی کہ ہم پھڑک اٹھے۔ ہم نے دل میں کہا ہم الماری سے کاغذ نکالنے کے بہانے اٹھیں اور اس انسان نما ہنڈولے کے پاس سے گزرتے ہوئے بے خیالی میں کرسی کے ہتے سے چھو جائیں۔ بس پھر حضرت خود بخود توازن بگڑ جائے گا اور بات بن جائے گی۔ ایک نئی افتاد میں حضرت عمر بھر کے لیے نشست و برخاست کے آداب سیکھ جائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی اعصاب کی کمان کھنچ گئی اور یہ معلوم ہوا کہ تیر اب چھوٹا، اب چھوٹا۔ مگر افسوس عین وقت پر ——— ٹائیں ٹائیں فش۔

"سچ کہتا ہوں تمھاری بزدلی سے تو ناک میں دم آ گیا۔ روز کسی نہ کسی فرضی خطرے کا تصور باندھ کر خود بھی پریشان ہوتے ہو اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہو۔ آخر تم نے کبھی یہ سوچا کہ جن خطروں کے وہم سے تم مرے جا رہے ہو ان میں سے کوئی بھی آج تک پیش آیا؟ پھر اس وہم سے کیا فائدہ؟"

"لو اور سنو! تمھارے نزدیک یہ کوئی فائدہ ہی نہیں کہ جن جن خطروں کا میں نے وہم کیا ان میں سے کوئی بھی پیش نہیں آیا۔"

امریکی جمہوریت کا بانی جارج واشنگٹن اعلیٰ درجے کا سیاست داں ہونے کے باوجود ظرافت سے خالی نہ تھا۔ ایک مرتبہ امریکہ کی آئین ساز اسمبلی میں ایک ممبر نے جو ہماری پارلیمنٹ کے بعض ممبروں کی طرح اہل الحکمۃ میں شمار ہوتے تھے، یہ تحریک پیش کی کہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مستقل فوج کبھی پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہو"۔ جارج واشنگٹن صدر کی حیثیت سے خود کسی تحریک کی تائید یا مخالفت نہیں کر سکتا تھا، مگر اس نے چپکے سے ایک ممبر کے کان میں کہا "تم ایک ترمیم پیش کر دو کہ تحریک کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیے جائیں" اور کبھی کوئی دشمن ریاستہائے متحدہ پر تین ہزار سے زیادہ فوج سے حملہ نہ کرے۔"

غزل

آقبال احمد سہیل

اگر آئینے سے دل کے اٹھے پردہ توہم
تو جدھر اٹھیں گی آنکھیں نظر آؤ گے تمھیں تم

میں ستم کشِ الم ہوں، نہ سنو مرا ترنم
مرا نغمہ نالۂ غم میرا زمزمہ تظلم

کوئی مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ پڑا ہوں کیوں میں گم سم
کہ نہ تابِ خامشی ہے نہ جسارتِ تکلم

نہ سرِ سپاس مندی نہ دماغ شکوہ سنجی
نہ ترانۂ تملق نہ فسانۂ تحکم

شبِ غم کی چاندنی کیا رگِ برق کا تموج
مری دل شگفتگی کیا لبِ زخم کا تبسم

نہیں ابرِ برشگالی بھی یہاں خطر سے خالی
وہی فصلِ سبزہ و گل وہی دورِ مار و کژدم

نہ یہ مسکنت تھی ہم میں نہ یہ تمکنت تھی تم میں
وہ بدل گیا زمانہ نہ وہ ہم رہے نہ وہ تم

مرا صبر حد سے گذرا مگر اے سہیل اب بھی
میں زباں نکال پھینکوں جو طلب کرے ترحم

شاعرِ جواں مرگ

اشعر ملیح آبادی کی یاد میں

خلیل الرحمٰن اعظمی

آج پھر ایک حسیں قوس قزح ٹوٹ گئی
کتنے رنگین دھندلکوں نے سنوارا تھا اسے
مرمریں خواب کی لہروں نے پکارا تھا اسے
چھپ کے دیکھا تھا اسے شام کی تنہائی نے
اسے چاہا تھا شبِ ماہ کی رعنائی نے
یاد کرتے تھے دمِ صبح اسے کتنے گلاب
جیسے نازاں تھی ان آنکھوں پہ یہ موجِ مئے ناب

آج پھر ڈوب گئے کتنے ہی سورج ایسے
جن کو انسان نے سینوں میں چھپا رکھا تھا
آج پھر ڈوب گئے کتنے نئی صبح کے خواب
رات کے پچھلے پہر ہم نے جنھیں دیکھا تھا
آج خاموش ہے وہ درد بھرا گیت جسے
سن کے بیدار ہوا تھا یہ مرا عزمِ جواں
آج پھر دھندلے سے ہیں آئینے مستقبل کے
نکہت و نور میں پھر آج لہو میں غلطاں
آج پھر ایک حسیں قوس قزح ٹوٹ گئی

اپنے مزاج کا جائزہ لیجئے

مزاج کے لحاظ سے لوگوں میں بڑا فرق ہوتا ہے کچھ لوگ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور کچھ اپنی عادتوں اور اپنے مزاج کی وجہ سے ناشاد زندگی بسر کرتے ہیں۔

آپ کے مزاج کا کیا رنگ ہے؟ اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو ذیل کے سوالوں کے جواب میں "ہاں" یا "نہیں" لکھتے جائیے۔ اس کے بعد صفحہ ...... کو پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے جوابوں سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

(۱) اگر کوئی شخص آپ کو مشورہ دے کہ یہ کرنا چاہئے اور اس طرح کرنا چاہئے تو کیا آپ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، یا ذلت کا احساس ہوتا ہے؟

(۲) کیا آپ اپنے مسائل کے بارے میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور رفیقوں سے مشورہ کرنے کے بجائے تن تنہا ان سے نبٹنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟

(۳) جب کوئی بری خبر آئے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ اکیلے بیٹھے ہوئے کڑھتے رہیں

(۴) کیا کبھی آپ اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ بوڑھے، اپاہج یا تنہائی کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے پاس جا کر ان کی دل جوئی کریں؟

(۵) کیا آپ میں یہ کمزوری ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی چیز آپ کے بنائے ہوئے نقشے میں نہ کھپے تو آپ پر چڑچڑے پن، آزردگی، اداسی یا غصے کی کیفیت طاری ہو جائے۔

(۶) کیا آپ میں یہ فراخ دلی ہے کہ دوسروں کی کامیابی پر دل سے خوش ہوں اور بغیر حسد کے احساس کے ان کو خلوص سے مبارک باد دیں؟

(۷) کیا آپ بحث میں جھگڑنے لگتے ہیں اور گرم ہو جاتے ہیں؟

(۸) کیا جب آپ سے کسی خیراتی کام کے لئے چندہ مانگا جائے تو آپ جھٹ پٹ دے دیتے ہیں اور دے کر خوش ہوتے ہیں؟

(۹) کیا آپ کی عادتیں اتنی راسخ ہیں کہ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے تو آپ کو بڑی مشکل پیش آتی ہے؟

(۱۰) کیا خراب موسم میں بھی آپ عام طور پر خاصے ہشاش بشاش رہتے ہیں؟

(۱۱) کیا آپ کی یہ عادت ہے کہ دن بھر اپنے احساسات کو کرید اکرتے ہیں اپنے حال زار پر ترس کھاتے رہتے ہیں؟

(۱۲) کیا آپ کے خیال میں اپنے احساسات اور خواہشات کو سراسر اپنے عزیزوں یا دوستوں کے احساسات اور خواہشات کا تابع بنا دینا غلط ہے؟

(۱۳) اگر کوئی آپ کے سیاسی خیالات سے اختلاف کا اظہار کرے تو کیا آپ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں؟

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

دنیا کا انجام

(بسلسلہ صفحہ ۲)

اور میں نے ان کا یہ مشورہ مان لیا لیکن میں یہ کبھی نہ جان سکوں گا کہ ان کا یہ خیال صحیح تھا یا غلط!

میں نے دورا ڈنکن کو اس کے عالم شباب میں دیکھا تھا جبکہ اس کا جادو صرف اس کے رقص میں بلکہ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ رہتا تھا، اناطول فرانس اور روڈن سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بارے میں بہت مفصل مواد موجود ہے۔ میرے کئی دوست زہاروف (جنگ کے سامان کا سب سے بڑا تاجر) سے واقف تھے اور انھوں نے اس کے بارے میں جو کہانیاں مجھے سنائی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ عجیب ہیں، جو میں نے اس ناول میں شامل کی ہیں۔ وڈرو ولسن کو میں نے ایک دفعہ دیکھا تھا۔ جارج ہیرن اور لنکن سٹیفن میرے بہت پرانے دوستوں میں سے تھے اور ان کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی جانچ ان کی بیویوں نے کر لی ہے۔

پیرس کی امن کانفرنس جس کا ذکر اس ناول کے آخری حصے میں ہے، دنیا کی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ میرے ایک دوست نے ایک شخص سے جو اس زمانے کے ناولوں کے بارے میں ایک حکم کی حیثیت رکھتا ہے پوچھا تھا کہ کیا کسی شخص نے اس امن کانفرنس کو اپنے ناول کا موضوع بنالیا ہے۔ اس نے جواب دیا "کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے؟" میرا خیال تھا کہ کر سکتا ہے اور اب تو کسی نے ایسا کر بھی لیا ہے۔ آپ پوچھیں گے اور میں یقین کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ جہاں تک تاریخی کرداروں اور واقعات کا تعلق ہے میری تصویر تمام و کمال صحیح ہے۔ مسودہ کا یہ حصہ جس کے ۸۰۰ صفحے ہیں، آٹھ، دس ایسے شخصوں نے پڑھا ہے جو اس کانفرنس کے موقع پر امریکی مشن کے ممبر تھے، ان میں سے بعض اب بین الاقوامی سیاست کی دنیا میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ باقی کالجوں کے پریذیڈنٹ اور پروفیسر وغیرہ ہیں جن سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے خط صیغہ راز میں رکھوں گا بس اتنا کہنا کافی ہے کہ انھوں نے مسودے میں جو ترمیمیں تجویز کی تھیں وہ سب کر دی گئیں، اور جہاں ان میں اختلاف رائے تھا وہاں دونوں فریقوں کو اظہار کا موقع دیا گیا ہے۔

پیرس میں جرمن جاسوسوں کی کہانی اور اس کے عشق کی داستان خیالی ہے لیکن میں ایک کہانی سے واقف ہوں جو اس سے چنداں مختلف نہ تھی، جنگ اور محبت کی کہانی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ! اور میرے ایک دوست کو پیرس کی پولیس کے ساتھ تقریباً ایسا ہی تجربہ پیش آیا تھا جیسے میرے ہیرو کو۔ روسی انقلاب اور اس کے لیڈروں کی جو جھلک آپ کو اس میں نظر آئے گی وہ ذاتی واقفیت پر مبنی ہے کیونکہ ان میں بہت سی مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو میری نوجوانی کے زمانے سے میری دوست رہی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اگرچہ میں ان کے طریقہ کار سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن میرے دل میں ان کے خلوص کی قدر ہے ممکن ہے غیر امریکی حرکتوں کی جانچ پڑتال کرنے والی کمیٹی کے نزدیک یہ رویہ مشکوک ہو لیکن ایک ناول نگار کے لئے یقیناً مفید ہے۔

اب میرے دل و دماغ کی یہ پیش کش مکمل ہو گئی ہے اور میں اسے اپنی امن طلبی ہوئی دنیا کے ہم وطنوں کے سامنے پیش کرتا ہوں، ملٹن نے بغیر کسی بے جا انکسار کے لکھا تھا "ایک اچھی کتاب ایک ماہر فن کا خون ہے جسے آنے والی نسلوں کی خاطر محفوظ کر کے رکھا گیا ہو۔" میں اس کتاب کے بارے میں اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لیکن یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ میں نے اس میں اپنی بہترین اسپرٹ کو بھر دیا ہے اور انسان کے دل کا، اپنی اس دنیا کا اور جو مستقبل ہم بنانا چاہتے ہیں اس کا جو کچھ بھی مجھے علم ہے وہ اس تصنیف میں شامل ہے، کون جانتا ہے کہ وہ "خوب تر حیات" ہو گی جس کا پیغام دنیا کے ولی اور سنت دیتے آئے ہیں یا آگ اور تلوار کے ہاتھوں "دنیا کا انجام" جس کی پیشین گوئی اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے آسیا بنی ہوئی تھی۔

مندرجہ بالا سطریں سنہ ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی تھیں۔ اس وقت سے اب تک پورے نو سال میں نے مسلسل سخت محنت کی ہے اور اس سلسلے کے نو ناول اور لکھے ہیں جو الیس غیر ملکوں میں شائع ہو چکے ہیں یا ترجمہ ہونے کے بعد شائع ہوں گے ان پر کچھ مخالف تنقید بھی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ گاندھی اِشا، ولز، تامس ان آئن شٹائن اور تھیوڈور ڈرائزر جیسے نامور ہم عصروں نے ان کی پر خلوص تعریف بھی کی ہے، لاکھوں آدمیوں نے ان سے تفریح اور فائدہ حاصل کیا ہے اور دوستی اور شکریے کے اظہار کے طور پر میرے پاس ہزاروں خط آئے ہیں جس وقت میں یہ سطریں ٹائپ کر رہا تھا جاپان کے جزیروں سے اطلاع آئی ہے کہ ان کتابوں کا اشتہار نوٹس بورڈوں اور ٹراموں پر دیا جا رہا ہے۔

اور تین مہینوں میں "اژدہے کے دانت" کی بکری اتنی ہوئی ہے جتنی امریکہ میں سات سال میں! بعض برخود غلط نقادوں کی خدمت میں میں دوبارہ وہ چیلنج پیش کرتا ہوں جو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ دیا ہے۔ کسی ایسے امریکن مصنف کا نام بتلائیے جس کو اپنی زندگی ہی میں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی ہو اور مرنے کے بعد وہ شہرت ناپائیدار ثابت ہوئی ہو مگر کسی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔

نقادوں کی در اصل کوئی خاص اہمیت نہیں، ان کا تو ایک چھوٹا سا حلقہ ہے اور وہ ایک محدود حلقے کے لئے لکھتے ہیں، عام پڑھنے والے کو میں نے اس مسلسل افسانے میں دلچسپی اور معلومات بڑھانے کا سامان دیا ہے اور میں ان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ اس میں جو کچھ معلومات ہیں وہ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں، کیونکہ میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ واقعات کے بارے میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے کہیں کہیں بعض جزوی غلطیاں بتائی گئی ہیں اور میں نے ان کو درست کر دیا ہے لیکن کسی نقاد یا مؤرخ نے آج تک ان کتابوں میں کوئی اہم غلطی نہیں بتائی۔

مولانا شبلی کی اُردو شاعری

فرید الوحیدی فیض آبادی

ہم مولانا شبلی کو ایک عالم اور مؤرخ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں کسی سے ان کے متعلق دریافت کیجئے تو یقیناً ہر شخص ان کو ایک بہترین مؤرخ اور عالم بتلائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت ان کی زندگی میں اور ان کے بعد آج تک ہندوستان میں اسی حیثیت سے متعارف رہی۔ لیکن ان کے اشعار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بہترین شاعر تھے اور اگر وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر زور دیتے تو یقیناً آج ہم ان کو حالی، اقبال اور اکبر کی طرح جانتے۔ قدرت نے انھیں حساس قلب دیا تھا اور ان احساسات کو جو ان پر طاری ہوتے تھے وہ نہایت پراثر اور صحیح انداز میں بیان کر سکتے تھے اُن کے مضامین کی ندرت اور ترکیب کے اچھوتے انداز کو دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ کاش مولانا شبلی ایک شاعر اور صرف شاعر ہوتے لطف یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری ہمیشہ اصلاح اور استاد سے بے نیاز رہی۔ ان کے استاد فاروق صاحب چڑیا کوٹی کبھی کبھی غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ مگر مولانا نے کبھی اصلاح کی خواہش نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ یوں بھی شاعری کی طرف کبھی توجہ نہیں کی، طبیعت کی مناسبت اور آمد کی بنا پر شعر کہتے تھے، لیکن اسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جنھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر انھیں کسی استاد کی نگاہوں سے گذرنے کا موقع ملتا تو الفاظ کی نشست کا یہ عالم نہ ہوتا، مگر ایسے اشعار بہت کم ہیں، گویا نہ ہونے کے برابر۔ شاعری کے ابتدائی دور میں مولانا نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور اس ابتدائی زمانے میں اُن کا تخلص تسنیم تھا مگر آہستہ آہستہ یہ تخلص اور غزل گوئی دونوں ختم ہوگئے۔ اور اب وہ شبلی اور قومی شاعر ہوگئے۔ غزل انھوں نے بہت کم لکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مولانا کی شاعری تقریباً قومی نظموں تک محدود رہی۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کی طبیعت غزل کی جانب نہیں چلتی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قصداً اس کی جانب سے پہلو تہی کی ہے کیونکہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور غزلوں سے شروع ہوتا ہے، لیکن باوجود تلاش کے غزل کی تعداد بہت کم ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موجودہ غزلوں سے زیادہ کہی ہوں مگر بعد میں اس باب سے صرف نظر کی بنا پر وہ تلف ہوگئی ہوں، غزلوں میں بعض بعض اشعار مضمون کے اعتبار سے عامیانہ ہیں یا یوں کہئے کہ آج کے ادب میں ان کی یہ حیثیت نظر آتی ہے اور بعض اشعار میں خیالات کی ندرت کے ساتھ زبان میں بھی بڑی خوبی ملتی ہے۔ لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ مولانا نے غزلوں کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی اور بحیثیت مجموعی ان کی شاعری میں اس موضوع کا کوئی درجہ نہیں ایک غزل میں مولانا فرماتے ہیں:-

پوچھتے کیا ہو جو حالِ شبِ تنہائی تھا
رخصتِ صبر تھی یا ترکِ شکیبائی تھا
شبِ فرقت میں دلِ غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالمِ تنہائی تھا

صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی طبیعت غزل گوئی کے لئے ناموزوں تھی۔ زبان کے ساتھ خیالات بھی عامیانہ اور غیر دلچسپ ہیں، لیکن ایک دوسری غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اشک کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں جو نالہ سوئے گردوں تو اشک نے رُخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

یہ اشعار کچھ امید افزا ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ اگر مولانا اس راہ میں طبیعت کو آزاد چھوڑ دیتے اور اپنی طبیعت کے رومانوی تقاضوں کی قدر کرتے تو ان کی شاعری میں ایک رنگین اضافہ ہوتا۔

ہمیں مولانا کی ایک مثنوی بھی ملتی ہے، قدما کی مثنویاں اکثر طوالت اور ثقیل زبان سے پر ہیں، مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بے ساختگی ہو اور زبان سادہ اور عام فہم ہو، تاکہ پڑھنے اور سننے والے اکتانے کے بجائے مشتاق ہو جائیں۔ اصل مطلب کے علاوہ زوائد مثنوی میں عموماً گراں گذر جاتے ہیں، اگرچہ مولانا نے غالباً ایک ہی مثنوی لکھی ہے، مگر وہ بہت بہتر ہے اور میرا خیال ہے اس میں مذکورہ شرائط کا لحاظ مدنظر ہے عام طور پر مولانا نے اکثر قوم کا رونا رویا ہے اس مثنوی میں بھی مسلمانوں کے تنزل کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ زبان کی روانی اور تسلسل قابلِ ملاحظہ ہے۔

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرقِ آسمان کی
گل کر دئے تھے چراغ جس نے
قیصر کو دئے تھے داغ جس نے
جس چشمے سے اک جہاں تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا ہے اب آب
جو ابر ابھی برس گیا ہے
اک بوند کو اب ترس گیا ہے

آخر میں فرماتے ہیں:

اس حال میں بھی روش وہی ہے
دن ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی
اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز خودی ہے
مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

لگے ہاتھوں مسدس بھی ملاحظہ فرمائیے، اس میں بھی وہی قومی گریہ وزاری ہے جو مولانا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ مسدس جس وقت مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی تو سامعین اشکبار ہوگئے تھے مولانا حبیب الرحمن خان شروانی فرماتے ہیں کہ میں بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ مولانا کی پر درد آواز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے، ملاحظہ ہو کس قدر پراثر ہے اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ماحول کے لئے کس قدر موزوں۔

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و خوار
مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پر غمخوار
نظر آتے ہوں دمِ نزع کے سارے آثار
واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیرِ تماشے سے ابھی سیر نہیں
نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا؟
ہے یہ عبرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

اب مولانا کی سیاسی نظمیں ملاحظہ کیجئے۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور اس کی سیاست کا دور دورہ تھا، ہندوستان کے عام مسلمان یونیورسٹی اور سرسید مرحوم کے خیالات کے حامی اور پیرو تھے مولانا مرحوم یونیورسٹی میں دینیات کے ایک معلم کی حیثیت سے ملازم تھے، لہذا بعض نظمیں سرسید کی شان میں اور ان کی تعریف میں ملتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک رباعی میں سرسید کے متعلق غالباً غیر ارادی طور پر ایسی بات کہہ گئے ہیں جس سے تمام مناقب پر پانی پھیر دیا۔ نیز اس سے مولانا کی آزادیٔ رائے کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی مثنوی صبح امید میں سرسید کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صورت سے عیاں جلال شاہی
چہرے پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سفیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا
وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

مگر دوسری جگہ مذکورہ رباعی میں اُنھی کے متعلق فرماتے ہیں:-

کوئی پوچھے تو میں کہدوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

مولانا نے سیاسی نظموں میں بعض مقامات پر ایسے پُرزور اسلوب میں حالات کا نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔

قطع نظر اس کے ان نظموں میں منظر نگاری تشبیہیں نہایت برجستہ اور برمحل ہیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء کا معرکہ کانپور آپ حضرات بھولے نہ ہوں گے۔ مولانا نے اسی واقعہ کے متعلق لکھا ہے۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں پڑے نظر
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دل دادۂ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم! آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں

اسی سلسلے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنہاں جا رہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

مولانا نے مسلم لیگ پر بہت نظر عنایت فرمائی ہے اور اس کے لئے بہت سی طنزیہ نظمیں، رباعیاں وغیرہ لکھی ہیں۔ بہت سی منجملہ نظموں کے ایک رباعی ہے۔

لیگ والوں سے کہا میں نے یہ باتیں کب تک
یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بنا ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
حال بھی آئے گا اب تک تو یہ قوالی ہے

اسلام کے تاریخی واقعات اکثر شعراء نے نظم کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض نے اچھے انداز میں واقعات پیش کئے ہیں۔ مگر شاعری کے کمال کے ساتھ مبالغہ اور عامیانہ اسلوب سے مبرا ہو کر جس قدر مؤثر نظمیں مولانا نے لکھی ہیں۔ میرا خیال ہے اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں۔ واقعات وہی ہیں جو تاریخ بتلاتی ہے مگر طرز ادا اور ترکیب میں وہ خوبی پیدا ہو گئی ہے کہ پڑھنے والا اثر سے بھر جاتا ہے، فرماتے ہیں:

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئیں تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینے پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کے پاس تشریف لے گئیں اور کنیز کی فرمائش کی۔ حضورؐ نے دوسروں کا حق مقدم بتلایا، اس مکمل قصہ کو نہایت بہتر پیرائے میں بیان کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں۔

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

اس قسم کی دوسری نظمیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا اس طرف توجہ فرماکر اسلامی تاریخ کے کچھ اوراق نظم کر دیتے تو بعض دوسرے شعراء کی طرح مولانا کی نظمیں بھی زبان زد خاص و عام ہو تیں، بلکہ یقیناً ان سے کہیں زیادہ۔

جائزہ

(متعلق صفحہ ۶)

ہر طاق سوال کے جواب میں "نہیں" کے اور ہر جفت سوال کے جواب میں "ہاں" کے ۵ نمبر شمار کیجئے، اور جتنے نمبر آئیں ان کو جوڑ لیجئے۔

اگر مجموعی نمبر ۹۰ یا اس سے زیادہ ہوں تو خدا کا شکر کیجئے کہ آپ کو بڑی شادماں طبیعت ملی ہے۔ آپ رجائیت پسند، خوش خلق اور با مروت ہیں زندگی سے سازگاری کی صلاحیت رکھتے ہیں اور غالباً آپ کی ازدواجی زندگی اور عام سماجی زندگی چین سے گذرتی ہے یا گذرے گی۔

اگر نمبر ۶۰ اور ۸۵ کے درمیاں ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں آپ کی زندگی سراسر خوش گوار نہیں، پھر بھی آپ میں خوش رہنے کی کافی صلاحیت ہے، رہی یہ بات کہ آپ کو کتنی خوشی نصیب ہو گی سو یہ اس پر موقوف ہے کہ آپ کے حالات کیسے ہیں اور سابقہ کن لوگوں سے ہے؟ اگر آپ کے عزیز اور دوست نیک دل ہیں تو آپ کو نشاۃ زیست میں کافی حصہ ملے گا، پھر بھی اچھا ہے کہ آپ کی طبیعت جن کمزوریوں کی وجہ سے آپ کے نمبر کٹ گئے ہیں، ان کا احتساب کرتے رہیئے۔

۵۵ سے ۳۵ تک نمبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آپ اپنی طبیعت کا رنگ بدلنا چاہیں تو بڑی سخت کوشش کرنی پڑے گی۔ تاہم ابھی وقت ہے۔ ذرا ناموافق خیالوں پر نظر ڈالئے اور اصلاح کی کوشش ابھی سے شروع کر دیجئے۔

اور جو کہیں آپ کو ۳۵ سے بھی کم نمبر ملے ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ آپ بڑے ناشاد و نامراد ہیں آپ کی شخصیت اتنی الجھی ہوئی ہے کہ آپ خود اپنی کوشش سے اس کو نہیں سلجھا سکتے آپ کو کسی امراض نفسی کے ماہر سے مشورہ کرنا چاہیئے۔

زندگی کا مول

(سنہ ۱۹۱۷ء میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کلکتہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت مسٹر گوکھلے بانی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے ان کو سوسائٹی میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی اس دعوت سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بھائی بابو مہندر پرشاد جی کے نام ایک چٹھی لکھی تھی۔ یہ ان کے فلسفۂ حیات کا آئینہ ہے۔

علی احمد صدیقی

بھائی صاحب!

میں جذباتی آدمی ہوں اس لئے آپ کے روبرو بات چیت نہیں کر سکتا۔ اس وقت ایک ندا سن رہا ہوں جس سے نہ تو کان بند کر سکتا ہوں اور نہ اس کی صدا سے منہ پھیر سکتا ہوں۔ آواز کانوں سے اتر کر دل کی گہرائیوں میں گھر کر چکی ہے۔ اب بھلا اسے کیسے نکال دوں ممکن ہے کہ آپ کو اس سے پریشانیوں اور کشمکش میں چھوڑنا میرے لئے احسان فراموشی ہو، تاہم آپ کی خدمت میں ایک تجویز پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آپ اس موقع پر تیس کروڑ انسانوں کی خاطر اپنے جذبۂ ایثار کی روشنی اتنی تیز کر دیں جس کی چمک میری راہ کی اندھیاری دور کر دے اور جبکہ ایک بار اس ڈگر پر چلنے لگوں تو منزل کو پائے بنا دم نہ لوں۔ اگر میری تجویز آپ کی قبولیت سے مشرف ہوئی تو انشاء اللہ میری آنے والی زندگی کی واماندگیوں اور تلخیوں کا مداوا ہو جائے گا اور ایک نہ تھکنے والے سپاہی کی طرح اپنی راہ پر ہمیشہ گامزن رہوں گا۔

مسٹر گوکھلے کی سوسائٹی میں شریک ہونا میرے لئے کوئی شخصی قربانی نہیں ہے بلکہ دراصل آپ کی طرف سے قربانی ہو گی۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ خود کو حالات کے تقاضے کے مطابق ڈھال سکتا ہوں۔ میری رہائش اتنی سادہ ہے کہ مجھے کسی خاص آسائش کی ضرورت نہیں جو کچھ سوسائٹی سے ملے گا، میرے لئے کافی ہو گا مگر میں آپ کو کیسے تسلی دوں کہ آپ کو اس سے تکلیف نہ ہو گی، نہ معلوم آپ کے دل میں کتنی آرزوئیں، اور امید وں کا دیا جل رہا ہو گا۔ ہائے۔ بسا آرزو کہ خاک شدہ لیکن اس عارضی دنیا میں دولت وجاہ سب کو فنا کا جام پینا ہے۔

انسان جتنا زیادہ دولت مند ہوتا ہے اتنا ہی دولت کی طرف لپکتا ہے۔ اگرچہ لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ دولت مند ہونا چاندی کے انبار سے مطلق ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں۔ راحت اور مسرت دل کے سکون و اطمینان سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ کہ خارجی اسباب [illegible] ایک غریب انسان [illegible] میں اپنے جھونپڑی کا مالک ہے [illegible] تحقیر کیوں کریں۔ دنیا کی بڑی [illegible]

[illegible]

آزادی کی زنجیریں

ظفر حسن دریاپور کے ایک بگڑے ہوئے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا، اس کے والد منظفر حسن پنشن کے بعد وطن واپس آ رہے تھے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے ہیڈ ماسٹر شیو دیال کے اصرار پر ظفر کے والد اسے الہ آباد کالج میں داخل کرانے پر تیار ہو گئے۔ ظفر اور شیو دیال صاحب کا لڑکا ہردیال الہ آباد آئے اور اکرام اللہ صاحب کے ہاں ٹھہرے جو شیو دیال کے شاگرد اور منظفر کے دوست کے بیٹے تھے۔ شروع کے دو مہینے ظفر کو کالج میں بڑی سخت محنت کرنی پڑی اور اس عرصے میں وہ اپنی پھوپی کے ہاں نہ جا سکا جب پڑھائی کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو وہ پھوپی کے ہاں گیا جہاں سے بے حد محبت سے ملیں اور جسینہ کو دیکھا جو اب ایک بڑی ہی حسین اور شرمیلی نازنین بن چکی تھی۔ اس کے بعد ایک دن دونوں دوست نئے ادب کے جلسے میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے

قسط ۱۴

دوسرے دن شام کو دونوں دوست جارج ٹاؤن کی ایک سڑک پر راج نرائن صاحب کا گھر تلاش کر رہے تھے۔ دوسری طرف سے انھیں ایک عجیب و غریب ہیئت کا نوجوان آتا ہوا نظر آیا، دبلا پتلا پستہ قد۔ چہرہ لمبوترا جبڑا۔ رنگ زردی مائل، آنکھیں چھوٹی مگر ابھرتی ہوئی سر پر پٹے، ٹوپی ندارد۔ قمیص، بغیر بٹن کا کوٹ اور ڈھیلی مہری کا پاجامہ پہنے، پاؤں میں چپل ایک ٹانگ سے لنگڑاتا چلا آ رہا ہے۔ ان دونوں کو ادھر ادھر مکانوں کے نمبروں پر نظر ڈالتے دیکھ کر وہ تیزی سے بڑھتے بڑھتے ان کی طرف آیا اور پوچھا "کیا آپ راج نرائن صاحب کا بنگلہ تلاش کر رہے ہیں "

ہردیال۔ جی ہاں ہمیں اس سڑک پر نمبر ے کا پتہ دیا گیا تھا۔ مگر نمبر ۶ کے بعد نمبر ۸ آگیا۔ سات کا کہیں پتہ نہیں۔

اجنبی۔ نمبر ۶ کے پھاٹک کے اندر سے راستہ جاتا ہے اور مکان کسی قدر دور نمبر ۶ کی پشت پر ہے۔ آئیے آپ میرے ساتھ چلئے میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔

ہردیال اور منظفر مڑ کر اجنبی کے ساتھ ہو لئے

ہردیال نے پوچھا "آپ کا اسم شریف "

اجنبی۔ مجھے اخگر کہتے ہیں۔

ہردیال۔ وہ تو آپ کا تخلص ہوا۔ نام کیا ہے ؟

اخگر۔ تخلص، نام جو کچھ سمجھئے یہی ہے۔

ہردیال۔ نام میں بھی آپ نے کفایت برتی، بہت اچھی بات ہے۔

اخگر۔ آپ دونوں کی تعریف ؟

ہردیال۔ میرا نام ہردیال اور ان کا نام ظفر حسن ہے۔ ہم دونوں گورنمنٹ کالج میں فرسٹ ایر میں پڑھتے ہیں

اخگر۔ پہلے کبھی آپ کو حلقے میں دیکھا نہیں۔ شاید ابھی داخل ہوئے ہیں۔

ہردیال۔ جی آج پہلی بار داخل در معقولات کے لئے جا رہے ہیں۔

اخگر ایک ٹانگ پر پھدکتا ہوا اس تیزی سے چل رہا تھا کہ ان دونوں کو ساتھ دینا دشوار ہو گیا۔ راج نرائن صاحب کے بنگلے پر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ باہر لان پر دو تین میزیں بچھی ہیں۔ ان کے گرد کرسیوں پر دس بارہ نوجوان بیٹھے ہیں اور "ٹھنڈائی" یعنی لیمنیڈ وغیرہ کا دور چل رہا ہے، ان میں سے ایک نے اخگر کو دیکھ کر کہا پیچھے وہ تیمور کو چلے آئے۔ آج آپ دو اور شکاریوں کو پکڑ لائے ہیں؟ اقبال بہادر اور بال کرشن نے آگے بڑھ کر ظفر اور ہردیال کا استقبال کیا اور ان کا سب سے تعارف کرایا۔ نو واردوں کی تواضع "ٹھنڈائی" سے کی گئی۔ سگریٹ پیش کئے گئے تو تینوں نے شکریے کے ساتھ انکار کیا ظفر اور ہردیال تو تمباکو پیتے ہی نہ تھے۔ اخگر کو سگریٹ کی نہیں بلکہ بیڑی کی عادت تھی۔ چنانچہ اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور سب کی طرف مبارزانہ انداز سے دیکھ کر پینی شروع کر دی۔ ایک نوجوان کی تحریک پر اقبال بہادر جلسے کا صدر منتخب ہوا۔ اس نے اپنی کرسی کو ذرا پیچھے کھسکا کر کرسی صدارت بنا لیا۔ ایک موٹا گورے رنگ کا ہنس مکھ نوجوان جس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے لیا ہوا ہونے کے باوجود خاصا دل کش تھا۔ اپنی کرسی کو اٹھا کر صدر کے قریب لے آیا اور ایک کاغذ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ صدر نے کہا "حضرات آٹھ بج رہے ہیں، یہ ہو گئی ہے اور جلسہ اندھیرا ہونے سے پہلے ختم کر دینا ہے اس لئے کہ اس گھر میں جس پر ہم نے مخالفانہ قبضہ کر رکھا ہے، دعوت ہونے والی ہے، ہماری نہیں بلکہ ولیولا کی۔ اگر سورج ڈوبنے کے بعد ہم یہاں پائے گئے تو نہ جانے ہم پر بد اخلاقی بے جا کا مقدمہ چل جائے یا ہمیں جلسہ بے جا یا ضرب شدید کا مقدمہ چلانا پڑے۔ بہر حال پچھلے جلسے کی کارروائی پڑھنا ملتوی کیا جاتا ہے اور اس جلسے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مختار علی صاحب اپنا مختصر افسانہ "گڑیا" سنائیں گے۔"

مختار علی کا رنگ کالا چہک دار اور نقشہ بھدا تھا جس کی تلافی کے لئے وہ بالوں کی آرائش اور لباس کی زیبائش میں غیر معمولی اہتمام کرتا تھا، مگر حسن ذوق سے محروم ہونے کی وجہ سے بھڑکیلے ہندوستانی لباس میں ایکٹر سا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے افسانے میں بھی آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ تھا۔ یہ ایک امیر گھر کی لڑکی کی کہانی تھی جس کا بچپن میں اس قدر لاڈ پیار کیا جاتا تھا کہ وہ زندگی کو ایک گھروندا اور اپنے آپ کو گڑیا سمجھنے لگی۔ جوان ہو کر وہ ایک ادھیڑ عمر کے سنجیدہ مزاج مصنف سے بیاہ دی گئی جو اس سے یہ توقع رکھتا تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھال لے اور اس کے کام کے لئے امن و سکون کی فضا پیدا کر دے مگر گڑیا چاہتی تھی کہ کوئی ہر وقت اس سے کھیلتا رہے۔

چنانچہ شوہر کے دوستوں میں ایک کھلاڑی مل گیا جس نے اس کے شوق کو اچھی طرح پورا کیا۔ شوہر کو جب معلوم ہوا تو باوجود اس کے کہ وہ قدامت پسند ادیب تھا اس نے ترقی پسندی سے کام لیا بیوی کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو قصور وار ٹھہرایا کہ عمر اور طبیعت کے فرق کو نظر انداز کر کے محض خوب صورتی کی وجہ سے ایک گڑیا سے شادی کر لی۔ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے قیاس پر چھوڑ دیا گیا تھا زبان اچھی خاصی تھی، مگر جا بجا انگریزی محاوروں کے لفظی ترجمے کھٹکتے تھے۔ کردار بے جان تھے، خصوصاً گڑیا محض گڑیا تھی۔ اس میں انسانیت یا نسائیت کی کوئی ادا نہیں پائی جاتی تھی۔ افسانے کا منشا غالباً لڑکیوں کی ناقص تربیت اور بے جوڑ شادی کے خراب نتائج کا دکھانا تھا مگر گڈے گڑیا کا کھیل اس فنی شوق سے دکھایا تھا کہ اصل مقصد یہی بن گیا تھا۔

اس کے بعد صدر نے رفیع الدین صاحب کو اپنا افسانہ "جدید ضحاک" سنانے کے لئے بلایا ایک خوش قامت خوش رو نوجوان ڈھاکے کی سلک کا نفیس سوٹ پہنے آیا اور اس نے باریک سریلی آواز میں افسانہ پڑھنا شروع کیا جس میں ضحاک کی روایت سے استفادہ کر کے ایک زمیندار کا قصہ بیان کیا تھا۔ چودھری ظالم سنگھ کے پیٹ میں ایک پھوڑا ہے جس کی وجہ سے اس کے جسم میں خون اس قدر گھٹ گیا ہے کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر مرض کو لاعلاج بتاتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ اگر روز تازہ خون اس کے جسم میں داخل ہوتا رہے تو وہ مدت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ظالم سنگھ کی رعایا میں سے روز کئی اشخاص کے خون کا معائنہ ہوتا ہے اور جس کا نمبر ملتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ بوڑھا ہو یا جوان یا بچہ اس کی رگوں میں سے خون لے کر ظالم سنگھ کے چڑھا دیا جاتا ہے اس کا رنگ بارہ سنگھے سرخ رہتا ہے اور رعایا کا روز بروز زرد ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رعایا ایک نوجوان باغی الدین کی سرکردگی میں زمیندار کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے مکان پر حملہ کر دیتی ہے۔ باغی الدین ایک جراح کا نشتر لے کر ظالم سنگھ کی فصد کھلوانا چاہتا ہے، گاؤں کے مولوی طفیل بخش صاحب اس کو سمجھاتے ہیں کہ شرع کی رو سے اس طرح خون بہانا جائز نہیں۔ باغی الدین جواب دیتا ہے کہ میں اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لینا چاہتا، میں تو اپنے بھائیوں کا خون واپس لوں گا۔ خون بہنے سے ظالم سنگھ مر جاتا ہے اور مظلوموں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ قصے کا پلاٹ اچھا تھا، کردار نگاری بھی غنیمت تھی، مگر زبان کی غلطیاں بہت تھیں، غالباً ظفر کے سوا کسی کو ان کا زیادہ احساس نہیں ہوا، اس لئے کہ افسانہ ختم ہونے کے بعد زور و شور سے تالیاں بجا کر داد دی گئی۔

اس کے بعد ایک دبلے پتلے کشمیری نوجوان کیلاش ناتھ ملک کی باری آئی، جس کے خوب صورت چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس نے "اردو شاعری کے معشوق" کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون پڑھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے شاعروں کا بانکا، تیغ زن، عاشق کش جلاد در اصل سامنتی عہد کے سپاہی جاگیردار کا مجسمہ ہے اور بے بس، بے عذر، ظلم پسند عاشق اس عہد کے

ایک غریب عامی کا عکس ہے۔ سارا مضمون محض غزل کے شعروں کی حسب منشا تاویل پر مبنی تھا اس لئے اس کی تاریخی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہو وہ ظاہر ہے لیکن ادبی لطیفے کی حیثیت سے اچھا تھا۔ سننے والے جس طرح مسکراتے اور ہنستے رہے اس سے معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے بھی اسے کچھ بہت سنجیدہ چیز نہیں سمجھا۔

آخر میں حضرت اخگر کھڑے ہوئے تو پہلے ہی سے زور شور سے تالیاں بجنے لگیں۔ جب تالیاں رکیں تو اخگر نے کہا "جناب صدر، آج کی نظم کا عنوان ہے "انگارہ ہوں انگارہ" اس پر پھر فضا تالیوں کے شور سے گونج اٹھی۔ کئی نوجوان رعب دار آواز میں "گا" کی آواز کو کھینچ کر چنگھاڑے "انگارہ ہوں انگارہ" دو ایک نے باریک آواز میں کہا "چنگاری ہوں چنگاری" اخگر نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنی نظم بلند آواز میں تحت لفظ میں پڑھنی شروع کردی۔ یہ ایک ترجیع بند تھا جس کے کسی بند میں اخگر نے، سرمایہ داری کے دیو کو مخاطب کیا تھا کسی میں سامراج کے راکھشس کو، کسی میں رسمی مذہب کے جن کو۔ کسی میں رواجی اخلاق کے بھوت کو اور ہر بند کے آخر میں یہ ٹیپ آتی تھی، "میں تجھ کو پھونک ڈالوں گا جلا کر خاک کردوں گا" ٹیپ تو وہ اور بھی گرج کر ادا کرتا تھا۔ جو لوگ پیچھے دوسروں کی آڑ میں بیٹھے وہ اس کے ساتھ "بھو" کی آواز نکالتے تھے گویا انگارے کو دہکا رہے ہوں۔ نظم ختم ہونے پر ہی مسخرے انداز میں تال سے تالی بجنے لگی، اور کئی منٹ تک بجتی رہی۔ اخگر سارے جسم کا زور لگاکر پڑھنے سے شل ہوگیا تھا مگر اس کے چہرے سے فتح مندی کے آثار ظاہر تھے جس سے معلوم ہوتا تھا اسے یقین ہے کہ مشاعرہ اسی کے ہاتھ رہا۔ صدر نے پڑھنے والوں اور سننے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگلے جلسے کے وقت اور مقام کا اعلان بعد میں کیا جائے۔

جلسہ منتشر ہوگیا۔ ظفر اور ہر دیال بھی اقبال بہادر کا شکریہ ادا کرکے اور سب سے رخصت ہوکر اپنے گھر کی طرف چلے۔ ہر دیال نے کہا "بھئی بڑا لطف رہا، خصوصاً چنگاری کے انگارے نے بڑا مزا دیا" ظفر جس کی عین پسندی ادب کو تفریحی مشغلہ نہیں بلکہ ایک طرح کی عبادت سمجھتی تھی۔ سارے جلسے کے دوران میں سخت جز بز بیٹھا رہا تھا، ایک طرف تو اسے ان نئے ادیبوں کی مذہب، اخلاق، قانون اور رومان سے "بے ادبیاں" دھکے پر دھکا پہنچا رہی تھیں، دوسری طرف سننے والوں کی خفیف الحرکاتی سے کوفت ہو رہی تھی خصوصاً بچارے اخگر کا یہ لوگ جس طرح مذاق اڑا رہے تھے وہ اسے بہت ہی برا معلوم ہوا ہر دیال کی بات سن کر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اس نے کہا "لطف تمھیں آیا ہوگا مجھے تو بے طرح غصہ آرہا تھا، سخت نامعقول لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس غریب اخگر کے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑگئے محض اس لئے کہ وہ بدہیئت اور غریب ہے۔ حالانکہ ان میں سے اگر کوئی اپنے خیالات اور جذبات میں مخلص ہے تو وہی ہے اگر کسی کو ادب سے مس ہے تو اسی کو ہے، خیالات جیسے بھی ہوں مگر طبیعت موزوں ہے۔ زبان میں صفائی اور کلام میں زور ہے اور سب از بردستی ادب میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔"

ہر دیال۔ تمھارے خیال میں اس لنگڑے کے سوا کسی کو ادب میں ٹانگ اڑانے کا حق نہیں، تم اس کے بڑے حامی بن گئے، غریب ہو یا امیر جو بھلا ہے اسے لوگ ضرور بنائیں گے اور تمھاری سراسر دھاندلی ہے کہ اور کسی کو ادب سے مس نہیں۔ گڈے گڑیا کی کہانی بے شک مہمل تھی مگر وہ ظالم سنگھ والا قصہ بڑے زور کا تھا خصوصاً باغی الدین نے مولوی کو جواب خوب دیا کہ ہم اس کا خون نہیں چاہتے صرف اپنا خون واپس لیں گے۔

ظفر۔ افسانہ بے شک اچھا تھا مگر میرے تو ان خونخواری اور بے دینی کی باتوں سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ہر دیال۔ یہی تو لکھنے والا چاہتا ہے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔

ظفر۔ اجی یہ مطلب نہیں بلکہ لکھنے والے کے خیالات سے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے اس باغی سے یہ نہ کہا کہ ظالم سنگھ کی فصد لینے کی ضرورت نہیں بس اسے خون دینا بند کردو۔ آپ ہی مرجائے گا۔

ہر دیال۔ ہاں یہ تم نے خوب بات کہی۔ مہاتما گاندھی کے اہنسا اور ستیہ گرہ کا نچوڑ ایک جملے میں آگیا۔ اچھا وہ اردو شاعری کا معشوق کیسا دلچسپ مضمون تھا۔

ظفر۔ مضمون کیا تھا، مسخراپن تھا۔

ہر دیال۔ تو آخر مسخراپن کون سا گناہ ہے، تم جیسے چوب خشک کا ذکر نہیں اور ہم سب کو تو آخر بڑا مزہ آیا۔

ظفر۔ ارے بھئی تم کو مزہ آیا، مگر اس نے تفریح کے لئے تھوڑا ہی لکھا تھا۔ اس نے اپنے نزدیک تاریخی تحقیق اور ادبی تنقید کی داد دی ہے۔

ہر دیال۔ تم تو ہو بدھو، وہ بڑا تیز لڑکا ہے، تم زمین پر چیونٹیاں گن رہے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں وہ بہت سنجیدہ منہ بنانے کی کوشش کرتا تھا مگر مسکراہٹ آہی جاتی تھی۔

ظفر۔ خیر بھئی ہوگا، میرا تو اس نئے ادب کو دور سے سلام ہے جو بتوں کے ساتھ کعبے کو بھی ڈھا دینا چاہتا ہے۔ میں اب کبھی ان کے جلسوں میں نہیں جانے کا۔

ہر دیال۔ میں کعبہ اور بت خانہ تو جانتا نہیں اتنا مانتا ہوں کہ جلسہ بڑے مزے کا تھا، مگر تم نہیں جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میرے پیٹ میں کون سا ادب کا درد اٹھتا ہے سچی بات ہے کہ مجھے یہ حلقہ زیادہ تر اس وجہ سے پسند آیا کہ اس میں ہندو مسلمان نوجوان گھل مل کر رہتے ہیں۔ یہ آج کل بڑی بات ہے۔

ابراہیم منزل پہنچ کے ان دونوں کو معلوم ہوا کہ اکرام اللہ شام کی گاڑی سے گھر چلے گئے، ورنہ ان کے سامنے جلسے پر تبصرہ اور بحث ہوتی۔ کھانے کے بعد ظفر اس خیال سے کہ کل اتوار ہے، تھوڑا سا مطالعہ کرکے جلد سونے کو لیٹ گیا۔ جن نوجوانوں سے آج ملاقات ہوئی تھی ان کی صورتیں اس کی آنکھوں میں اور جن کے مضامین پڑھے تھے ان کے خیالات دیر تک اس کے دماغ میں پھرتے رہے اور وہ بڑی بے کلی سے ان پر غور کرتا رہا۔ جب آنکھ لگ گئی تو گڑیا کی کہانی سے کچھ ملتا جلتا خواب دیکھنے لگا۔ (باقی آئندہ)

اپنے مزاج کا جائزہ لیجئے

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

(۱۴) کیا آپ کے والدین باہمی محبت اور سلوک کی مثال اور یاد آپ کے لئے چھوڑ گئے ہیں؟

(۱۵) کیا آپ ایسے بچوں سے گھبراتے ہیں جن کی تربیت جدید نظریوں کے مطابق آزادی کے فضا میں ہوئی ہے، انسان کی انفرادیت کو نشوونما کا موقع دیا گیا ہے؟

(۱۶) کیا آپ سیر تماشے، تفریح وغیرہ میں دوسروں کے ساتھ شریک ہونے پر خوشی سے تیار ہوجاتے ہیں؟

(۱۷) کیا آپ کی طبیعت میں اتنا تلوّن ہے کہ کبھی تو رنجیدہ اور کبھی چونچال، ابھی خوش اور ابھی خفا؟

(۱۸) کیا آپ کو اس کا شوق ہے کہ اپنے گھر والوں یا دوستوں کو اچانک چھوٹے چھوٹے تحفے دے کر حیران اور خوش کردیں؟

(۱۹) کیا آپ لوگوں کو ان کے منہ پر کھری کھری سنا دینا، اخلاق اور مصلحت کی بنا پر خاموش رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں؟

(۲۰) کیا آپ کبھی کبھی اپنے دل میں یہ سوچتے ہیں کہ اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد کبھی اچھے دن بھی آئیں گے؟

زندگی کا مول

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

غریب ہی تو تھیں جن پر شروع شروع میں طرح طرح کے مصائب و مظالم توڑے گئے اور تذلیل و تکذیب کے تمام تیر و نشتر لگائے گئے، لیکن تحقیر و تمسخر اڑانے والے اور ستم و صعوبت پہنچانے والے خاک میں مل کر خاک ہوگئے جن کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔ درآں حالے کہ وہ مظلوم و معتوب شخصیتیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور لوگوں کی بنیاد میں بسی ہوئی اور دلوں پر چھائی ہوئی ہیں۔

میرے دل میں کوئی تمنا ہے تو بس مادر وطن کی خدمت کی۔ کیا کسی شہری کو یہ اثر، مرتبہ اور عزت حاصل ہے جو گوکھلے کو نصیب ہے۔ کیا گوکھلے ایک غریب انسان نہیں ہیں؟

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:۔

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

مطبوعہ جید پریس دہلی

[illegible]

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

[illegible] اپریل [illegible]

اشرف المخلوقات — صالحہ عابد حسین — ۳

بچوں کا حصّہ

ہند اور بیرون ہند — (ادارہ) — ۴

بزم بے تکلف — ۵

غزل — حفیظ اشکی ہوشیاری — ۵

رفیق شام تنہائی (نظم) — سیدہ فرحت — ۵

ترکی — محمد امین — ۶

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۷

ادبی تبصرے — خواجہ احمد فاروقی — ۸

رومان رولاں — بنارسی داس چترویدی — ۹

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

اشرف المخلوقات

صالحہ عابد حسین

خالقِ کائنات نے ہماری اس دنیا میں ہزاروں قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔ جمادات، نباتات اور پھر ان سب کی بے شمار قسمیں۔ ان سب کا رنگ الگ الگ ہے اور اسی رنگا رنگی سے دنیا کی رونق ہے۔ ان میں سے ایک مخلوق انسان کہلاتی ہے۔ وہ اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ صرف ایک عزت کا لفظ ہے جو انسان نے خود اپنے لئے گھڑ لیا ہے یا حقیقت میں اس نے اپنی صفات سے اور اپنے کارناموں سے ساری کائنات کی مخلوق میں برتری اور شرف حاصل کیا ہے۔

یہ انسان آخر ہے کیا؟ اس میں ایسی کون سی بات ہے کہ وہ دوسروں سے ممتاز ہے اور اپنے کو سب سے اعلیٰ اور اشرف سمجھتا ہے؟ ہم غور کریں تو اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے کہ آدمی میں چند ایسی صفات ہیں جو دوسری مخلوق میں نہیں۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے یعنی وہ باتیں کر سکتا ہے اور اپنا مطلب دوسروں کو سمجھا سکتا ہے لیکن غور کیجئے تو یہ بات زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ سبھی حیوان کسی نہ کسی قسم کی آوازیں نکالتے اور اپنا مطلب اپنے ہم جنسوں کو سمجھا دیتے ہیں۔ محض اس صفت کی بنا پر انسان کو سادی مخلوق پر درجۂ فضیلت حاصل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں صرف عقل اور ارادے کی قوت ہے جو انسان کو ساری دنیا کی مخلوق سے برتر اور اشرف بناتی ہے۔ وہ ارادے کا مالک ہے۔ اپنی خواہش اور رائے سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ وہ عقل اور ادراک کا حامل ہے جس سے کام لے کر برے بھلے میں تمیز کر سکتا ہے۔

اب ایک اور سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی عقل اور ارادے کا مالک ہے اور برے بھلے میں تمیز کر سکتا ہے تو پھر اکثر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان قوتوں سے کام لے کر وہ اس عالمِ آب و گل کو جنت الفردوس بنائے اکثر ایسی حیوانیت و شیطنت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ دنیا دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے اور نہ صرف اپنی ذات کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ سوچئے تو اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ قدرت نے انسان میں مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ ایک تو اس میں وہ بہت سی جبلتیں بھی موجود ہیں جو دوسرے جانوروں میں پائی جاتی ہیں اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی دوسرے حیوانات کی طرح اس کا رشتہ بڑا ہے۔ دوسرے اس میں بدی کی قوتیں، شر، فساد، ظلم، ناانصافی وغیرہ کا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو اگر اس کی طبیعت پر غالب آجائے تو اسے شیطانِ مجسم بنا دیتا ہے لیکن اس کو محض شر ہی شر نہیں بلکہ خیر کا جذبہ بھی ودیعت کیا گیا ہے اور جب وہ اس کو کام میں لاتا ہے تو فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے ——— غرض حیوانیت، شیطانیت اور ملکیت کے ان مختلف عناصر کے مجموعے سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اور ان کے ساتھ ہی اسے دو اور قوتیں یعنی عقل اور ارادہ بھی بخشی گئی ہیں اور ان ہی آخری صفات کے بل بوتے پر انسان بنا ہے اور اس نے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کیا ہے۔ جب وہ عقل اور ارادے کو کام میں لاتا اور اپنی ساری جبلی اور فطری خوبیوں اور کمزوریوں کو سمجھتا، اپنے نقائص کو پہچانتا ہے اور ان پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جب وہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور قابلیتوں سے واقف ہوتا ہے اور ان کو کام میں لگا کر انسانوں کی اور دنیا کی فلاح و بہبود کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی ذاتی ضرورتوں اور فرائض کو بھی پورا کرتا ہے اس وقت وہ انسان کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ درجہ بھی درمیانی ہے اور انسانوں میں بعض ایسی ہستیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو اس بیچ کی منزل کو طے کر کے انسانیت کے سب سے بلند زینے پر پہنچ جاتی ہیں اور انسانِ کامل کا لقب پاتی ہیں۔ یہ وہ مبارک ہستیاں ہوتی ہیں جو اپنی حیوانی اور شیطانی قوتوں کو مغلوب کر لیتی ہیں۔ وہ ان تمام ابتدائی اور درمیانی کٹھن منازل سے گزرتی ہیں جن سے آدمی کو انسان بننے کے لئے نبٹنا پڑتا ہے اور ان پر فتح پا کر فرشتوں سے بھی اونچا مقام حاصل کر کے خیرِ محض بن جاتی ہیں ...... ان کی ذات ان کی صفات، ان کا وجود اور ان کی مثال دوسرے آدمیوں کے لئے ایک بلند ترین نمونے کا کام دیتی ہے ——— ہر دور میں قدرت ایک آدھ ایسا انسان پیدا کر دیتی ہے تاکہ وہ عام لوگوں کو سچائی کا سیدھا راستہ دکھلائے اور اس کی ذات دوسروں کے لئے شمعِ راہ ہو اور اس کی صفات انسانیت کا سچا سب سے اعلیٰ نمونہ ....

انسانیت کے یہ کامل نمونے جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہر زمانے میں ہر ملک میں ہوتے ضرور ہیں لیکن خال خال۔ اکثریت معمولی انسانوں کی ہے جن میں کمزوریاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی، شر کی قوتیں بھی ان کے اندر موجود ہیں اور خیر کی بھی۔ وہ اچھے کام بھی کر سکتے ہیں اور برے بھی۔ یہ عام انسان جب تک اپنے عمل میں اعتدال قائم رکھتے ہیں، عقل اور سمجھ سے کام لیتے رہتے ہیں، شر کی قوت کو کچلنے، حیوانی جذبات کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، خیر اور نیکی کو بڑھانے اور پھیلانے کی سعی میں لگے رہتے ہیں، انسانیت کے نام لیوا اور اشرف المخلوقات کہلا سکتے ہیں۔

لیکن جب کوئی فرد یا جماعت اس اعتدال اور توازن کو کھو بیٹھے، اس پر حیوانی اور شیطانی صفات غالب آجائیں، خیر کی قوت کچل کر رہ جائے اور وہ شر اور بدی کی طاقتوں کا غلام بن جائے تو اس "اشرف المخلوقات" سے شیطان بھی پناہ مانگنے لگتا ہے۔ وہ طرح طرح سے دنیا میں تباہی پھیلاتا ہے کبھی جنگ کی صورت میں، کبھی امن کا ڈھونگ رچا کر، کبھی مذہب کی آڑ میں اور کبھی قومیت کے دامن تھام کر، کبھی انصاف اور رواداری کے پردے میں اور کبھی انتقام اور بدلے کا نام لے کر ...... وہ دنیا میں مصیبت اور بربادی، ظلم و ناانصافی پھیلا کر انسانیت کو رسوا اور سرنگوں کر دیتا ہے۔ ایسے ہی انسان کو دیکھ کر شاعر نے خالقِ کائنات سے سوال کیا تھا:

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟

کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خود بیں نہ خدا بیں نہ جہاں بیں

یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

آج جب ہم ہر طرف ایسے ہی آدمیوں کی کثرت دیکھتے ہیں جو انسان کے نام کو داغ لگانے اور انسانیت کو رسوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں اور دل درد سے بھر جاتا ہے کہ ہم حیوانی اور شیطانی قوتوں کے آلۂ کار بن گئے ہیں اور خیر و نیکی کو کچل رہے ہیں۔ جدھر دیکھئے ظلم و ناانصافی، تعصب و تنگ نظری، کینہ و شرارت کی گرم بازاری ہے جس کی بدولت ہمارے دیس میں مصیبت، بربادی اور تباہی کا دور دورہ ہے۔

ذرا ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا ہے کہ ان حیوانی اور شیطانی صفات کا مظاہرہ کر کے اور شر کو پھیلا کر یا شر اور بدی سے ڈر کر، دب کر، ان کے خلاف آواز نہ اٹھا کر ہم انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ اشرف المخلوقات ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں؟ میں سمجھتی ہوں کہ ہر انصاف پسند شخص یہ مانے گا کہ آج ہم اس کے مستحق نہیں رہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہمیں دنیا میں کیا بننا ہے؟ کیا ہم حیوان یا شیطان بن کر دنیا میں رہیں گے؟ ظاہر ہے کہ ہم میں سے بدتر سے بدتر آدمی بھی اسے منظور نہیں کرے گا۔ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں کسی نہ کسی طرح اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو حاصل کرنا ہے۔ خدا نے عقل اور ارادے کی جو زبردست قوتیں بخشی ہیں ان سے کام لے کر برائیوں کو دور کرنا، ظلم و ناانصافی کو مٹانا، شر کی قوتوں کو مغلوب کرنا، بدی کی طاقتوں سے لڑنا ہے، ہمیں خیر کی قوت کو ابھارنا، اور اپنے دیس، اپنی قوم، اپنی دنیا کی حالت سدھارنا اور اسے تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرنے سے بچانا ہے ——— اور اس سسکتی ہوئی انسانیت کو موت کے منہ سے بچانا اور دکھی اور غمی کے دکھوں کو دور کرنا ہے ——— یگانگی اور محبت، یکجہتی اور رواداری، انصاف اور اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لئے اپنی ان تھک کوشش اور جان توڑ محنت کرنی ہے ...... اس وقت ہم میں ہر شخص کا جو انسان بننا چاہتا ہے یہی سب سے اہم فرض ہے ...... تبھی ہم اشرف المخلوقات کہلانے کے مستحق ہیں ورنہ ہم کیا ہیں؟ یہ خدا ہی جانے!!

نئی روشنی جلد ۴ - نمبر ۱۵
۱۶ر اپریل ۵۰ء

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

(اب تک نئی روشنی کے اداراتی مضامین کی ترتیب یہ تھی کہ ہر ہفتے کسی اہم مسئلے پر طویل اداریہ اور ہندوستان کے اہم واقعات پر مختصر نوٹ شائع ہوتے تھے اور باری باری سے پاکستان اور دوسرے ملکوں کے حالات کا سرسری جائزہ لیا جاتا تھا۔ اب ہم آزمائش کے طور پر اس ترتیب کو بدل لیتے ہیں اور ایک ہی عام عنوان کے تحت ہند اور بیرون ہند کے نئے واقعات اور مسائل پر مختصر تبصرہ کیا کریں گے۔ امید ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ ترتیب زیادہ پسند آئے گی۔)

وزیروں کی ملاقات کا پس منظر

فروری اور مارچ میں ہند اور پاکستان کی کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ تجارتی تعلقات تو ایک مدت سے قطع ہو چکے تھے مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معمولی سفارتی تعلقات بھی مشکل سے قائم رہ سکیں گے۔ واشنگٹن میں کشمیر کے بارے میں جو گفت و شنید دو سال سے ہو رہی تھی اس کا سلسلہ ٹوٹنے پر آ گیا تھا۔ جنگ کا خوف جو دونوں ملکوں کی فوجی تیاریوں کی وجہ سے تھوڑا بہت رہا کرتا تھا بہت بڑھ گیا تھا۔ بنگال کے دونوں حصوں میں اس معاشی بے چینی کے علاوہ جو پٹ سن کی تجارت رک جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جنگ کے اندیشے نے بھی لوگوں کو بدحواس کر دیا تھا اور فرقہ وارانہ فسادات کی آگ اس زور شور سے بھڑک اٹھی تھی کہ دونوں طرف کی اقلیتوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے اور مکمل مبادلۂ آبادی کا مطالبہ ہونے لگا تھا۔ جنگ کا ہسٹیریا پاکستان سے ہندوستان پہنچ گیا تھا اور یہاں اس نے اور زیادہ شدید اور بحرانی شکل اختیار کر لی تھی۔ بقول پنڈت نہرو دونوں ملک "ہلاکت کے گڑھے کے عین کنارے تک پہنچ گئے تھے۔"

اس نازک موقع پر پنڈت جی نے مہاتما گاندھی کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اپنی صلح پسندی کی عالمگیر شہرت کو خطرے میں ڈال کر پاکستان کی حکومت کو تنبیہ کیا کہ اگر اس نے فرقہ وارانہ امن قائم کرنے میں حکومت ہند کے ساتھ تعاون نہ کیا تو جنگ کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر جیسے ہی انھوں نے یہ دیکھا کہ لیاقت علی خاں صاحب نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے مشرقی بنگال میں فرقہ وارانہ امن کی تلقین کی اور وہ اس معاملے میں حکومت ہند کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں تو انھوں نے اپنی حکومت، اپنی لیڈری بلکہ اپنی جان تک کو خطرے میں ڈال کر ہندوستانی پارلیمنٹ سے صاف کہہ دیا کہ نہ وہ مبادلۂ آبادی کے لئے تیار ہیں نہ جنگ کے لئے بلکہ گفت و شنید کے ذریعے سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔

ملاقات اور معاہدہ

ہندوستانی پارلیمنٹ اور رائے عامہ کو اس معاملے میں بہت شبہہ تھا کہ پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں کی گفت و شنید سے کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ یہ صرف پنڈت جی کی شخصیت کا زبردست اثر تھا کہ پارلیمنٹ اور پریس میں اس تجویز کی زیادہ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن جب لیاقت علی خاں صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ دلی پہنچے اور لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ دونوں وزیر بے خلوص کے ساتھ اقلیتوں کے مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کرنا چاہتے ہیں اور رفتہ رفتہ فضا بدلنے لگی۔ چنانچہ ۸ر اپریل کو جب معاہدے پر دستخط ہوئے تو مجموعی طور پر ملک میں اچھا خاصا خیر مقدم کیا گیا۔

جہاں تک معاہدے کی شرطوں کا تعلق ہے وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کافی اور ہر طرح سے قابل اطمینان ہیں۔ یہ شرطیں دو قسم کی ہیں۔ بعض عام ہیں جن کا تعلق سارے ہندوستان اور پاکستان سے ہے اور جن کو ہم اقلیتوں کے حقوق کا چارٹر کہہ سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو کامل مذہبی و تہذیبی آزادی حاصل ہوگی اور سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کے لحاظ سے ان میں اور اکثریت میں کسی قسم کی تفریق نہیں برتی جائے گی۔ ان فتنہ انگیز عناصر کو جو مختلف فرقوں میں فساد کرانے یا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کرانے کے لئے پروپیگنڈا کریں گے یا کوئی عملی قدم اٹھائیں گے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔ باقی شرطیں مشرقی اور مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ کے متعلق ہیں جہاں پچھلے دنوں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ جہاں سے لوگ بڑی تعداد میں گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) دونوں حکومتیں ایک تحقیقاتی کمیشن جس کا صدر کوئی ہائی کورٹ کا جج ہوگا فساد زدہ علاقوں میں مقرر کریں گی۔ یہ کمیشن فساد کی حقیقی روداد، اس کے اسباب اور آئندہ کے لئے اس قسم کے ہنگاموں کو روکنے کی تدابیر کے بارے میں رپورٹ دے گا۔

(۲) دونوں ان علاقوں میں کامل فرقہ وارانہ امن قائم کرنے، فتنہ انگیز عناصر کو سزا دینے اور اقلیتوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے مؤثر قدم اٹھائیں گی۔

(۳) اس کے باوجود اگر اقلیت کے لوگ عارضی یا مستقل طور پر ترک وطن کر کے جانا چاہیں تو انھیں حفاظت کے ساتھ سفر کرنے اور اپنا اسباب ساتھ لے جانے کے لئے ضروری سہولتیں دی جائیں گی۔ ان کی غیر موجودگی میں حکومت ان کی طرف سے ان کے مکان اور جائداد کی نگرانی کرے گی اور اگر وہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۰ء سے پہلے واپس آ جائیں گے تو ان کے حوالے کر دے گی۔ اس شرط کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوگا جو ان علاقوں سے باستثنائے بہار ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے یا اس کے خوف سے ترک وطن کر کے چلے گئے ہیں۔ اگر کسی مجبوری سے ان لوگوں کا مکان یا جائداد انھیں واپس نہ کی جا سکے تو حکومت ان کی بحالی کی ذمہ دار ہوگی۔ مشرقی اور مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ میں اقلیتوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کی جائیں گی ان میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) دونوں ملکوں کی حکومتیں مرکزی کیبنٹ کا ایک ایک منسٹر ان علاقوں میں متعین کریں گی تاکہ وہ اس معاہدے کی شرطوں پر عمل کرائے۔

(۲) مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کی وزارتوں میں اقلیتوں کا ایک ایک نمائندہ شامل کیا جائے گا۔

(۳) مشرقی بنگال، مغربی بنگال اور آسام میں ایک ایک کمیشن خاص اس غرض سے قائم کیا جائے گا کہ اس معاہدے پر عمل کرانے میں مدد دے۔

معاہدے کے اثرات اور نتائج

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہندوستان میں چند روز پہلے عام خیال یہی معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کے ساتھ اقلیتوں کے بارے میں کوئی سمجھوتا ہونا مشکل ہے اور ہو بھی جائے تو بے کار ہے۔ لیکن لیاقت علی خاں صاحب کے دلی آنے کے بعد سے یہ خیال رفتہ رفتہ بدلنے لگا۔ ان کی اور پنڈت نہرو کی گفتگو کے عام انداز سے، ان بیانات سے جو دونوں نے معاہدے کے بعد دئے۔ دونوں کی پریس کانفرنس اور ریڈیو کی تقریروں سے لوگوں کو یقین ہو چلا ہے کہ دونوں حکومتیں پورے خلوص کے ساتھ اس معاہدے پر عمل کرنا چاہتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی بنگال میں بہت سے لوگ اس معاہدے سے مطمئن نہیں ہیں اور شاید مشرقی بنگال میں بھی نہیں اور سارے ہندوستان اور پاکستان کے متعصب اور فتنہ انگیز عناصر کو یہ بات بہت شاق گذری ہے کہ جنگ کی فضا صلح کی فضا سے بدل رہی ہے لیکن دو ہی دن میں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ دونوں ملکوں کی رائے عامہ خاصے جوش و خروش کے ساتھ موجودہ معاہدے کا خیر مقدم اور اس خواہش کا اظہار کر رہی ہے کہ اور سب نزاعی امور اور بھی اسی طرح باہمی گفت و شنید سے طے ہو جائیں۔

ابھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کی دلی خواہش جلد پوری ہو سکے گی یا نہیں۔ ایک بات تو بالکل ظاہر ہے دونوں ملکوں کی موجودہ حکومتوں کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ آپس میں کے جھگڑے جلد طے نہ ہوئے تو ارباب غرض جنگ کے ہسٹیریا کو جو خدا خدا کر کے دبنا شروع ہوا ہے پھر ابھار دیں گے اور اب کی بار اس کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا۔ بعض قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حکومتوں کو بین الاقوامی حالات کی وجہ سے یہ دلی خطرے کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے بھی ان پر بہت زور پڑ رہا ہے کہ اپنی قوتوں کو باہمی نزاع میں ضائع کرنے کے بجائے مل کر مشترک خطروں کا مقابلہ کریں۔

پاکستان کا ردعمل

جیسا کہ ہم نے ۸ اپریل کے پرچے میں لکھا تھا پاکستان میں پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں صاحب کی گفت و شنید کا شروع سے نہایت جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جا رہا تھا۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے اتفاق رائے سے ایک رزولیوشن پاس کیا تھا جس میں مصالحت کی کوشش کی پوری تائید اور اس کی کامیابی کی دعا کی گئی تھی۔ پاکستان نیوز ایڈیٹرس کانفرنس نے بھی اسی قسم کی تائید کی تھی یہاں تک کہ الطاف حسین صاحب نے جن کا ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بگاڑنے میں بہت بڑا حصہ ہے یہ فرمایا تھا کہ لیاقت علی خاں صاحب جو سمجھوتا کریں گے اس پر عمل کرنے میں پاکستان کے اخبار دل و جان سے ان کا ساتھ دیں گے۔ معاہدے کی شرائط کا اعلان ہونے کے بعد پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار کی رپورٹ کے مطابق کراچی کے سب حلقوں میں اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اسے متفقہ طور پر اقلیتوں کے حقوق کا چارٹر، لیاقت علی خاں صاحب کے اعلیٰ تدبر کا کارنامہ اور ہندو پاکستان میں خوشگوار اور دوستانہ تعلقات کا پیش خیمہ قرار دیا گیا۔ پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی، جمعیت علمائے پاکستان، کراچی ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، مارننگ نیوز ڈھاکہ اور پاکستان آبزرور ڈھاکہ کو اگر پاکستان کی رائے عامہ کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی حکومت کو اپنی صلح جوئی کی پالیسی میں جس کا پہلا قدم دہلی کا معاہدہ ہے اہل پاکستان کی متفقہ تائید اور حمایت حاصل ہے۔

ایک مفید ادارہ

عہد قدیم میں ہندوستان ایک طرف چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے اور دوسری طرف مغربی ایشیا کے ملکوں سے تہذیبی تعلق رکھتا تھا۔ عہد وسطیٰ خصوصاً سلطنت مغلیہ کے عہد میں ان تعلقات کا دائرہ اور بھی وسیع ہو کر یورپ کے ملکوں تک پہنچ گیا تھا۔ مگر جب سے ہمارے ملک میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی ہم انگلستان کے سوا اور سب ملکوں سے قریب قریب بے تعلق ہو گئے تھے اور دنیا ہماری نظر میں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج اور برطانوی شہروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ آزادی کے بعد ہماری حکومت نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی اور دنیا کے اکثر ملکوں سے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کر لئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے دوسری قوموں کے ساتھ تہذیبی رابطے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال نئی دہلی میں ایک تہذیبی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے اہل علم آ کر شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک مستقل ادارہ انڈین کائونسل فار کلچرل ریلیشنس کے نام سے قائم کیا جائے اور فی الحال اس کا دائرہ عمل مغربی ایشیا، مصر، ترکی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں تک محدود رکھا جائے۔ اس سال یہ تجویز عمل میں آ گئی اور ۹ اپریل کو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، پنڈت جواہر لال نہرو نے نئے ادارے کا افتتاح فرمایا۔ اس کا صدر دفتر حیدرآباد ہاؤس نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک لائبریری کی طرح ڈالی گئی ہے جسے مولانا آزاد نے اپنا بیش بہا ذخیرۂ کتب عطیے کے طور پر دے دیا ہے۔ لائبریری میں مختلف ملکوں کی تاریخ اور تمدن کے متعلق کتابیں فراہم کی جائیں گی اور متعلقہ ریڈنگ روم میں ان ملکوں کے اخبارات اور میگزین مطالعے کے لئے رکھے جائیں گے۔ ادارے کی طرف سے ایک رسالہ عربی میں اسلامی ملکوں کے لئے اور ایک انگریزی میں جنوب مشرقی ایشیا کے لئے نکلے گا۔ ادارے کے اہتمام میں مختلف ملکوں کے علما اور ماہرین فن کو دعوت دے کر ان سے لکچر دلوائے جائیں گے۔ اور باہر کے پروفیسروں کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بلانے اور ہندوستانی پروفیسروں کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس ادارے کی شاخیں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں قائم ہوں گی۔

امید ہے کہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں اس ادارے کا خیر مقدم گرم جوشی سے کیا جائے گا اس لئے کہ آزاد ہندوستان کو بیرونی دنیا سے مدتوں کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے کی شدید ضرورت اور خواہش ہے۔ بیرونی ملکوں کے ان سفیروں کی تقریروں سے جو کانفرنس میں شریک ہوئے اور ان پیغاموں سے جو مصر، شام، لبنان، افغانستان، عراق، لنکا، برما اور انڈونیشیا سے موصول ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بھی ہندوستان سے تہذیبی تعلقات قائم کرنے کے دل سے آرزومند ہیں۔

ع، ح

جرمنی پھر ابھرے گا

یورپ کی بین الاقوامی سیاست میں جرمنی کو فوجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے اتنی اہم پوزیشن حاصل ہے کہ اسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جرمنی کے لیڈروں کو احساس ہے۔ اس لئے وہ اپنی اس حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں مغربی جرمنی کے وزیر اعظم (چانسلر) ڈاکٹر اڈیناور نے اپنے ایک طویل بیان میں کہا ہے "اگر جرمنی کمزور رہا تو یورپ کی مدافعت بہت مشکل ہوگی۔ اس لئے جرمنی کو یورپی نظام میں مساوی حیثیت سے شریک کیا جائے اور ضروری سامان سے اس کی مدد کی جائے"۔ انھوں نے فرمایا "جب تک یورپی کونسل کو ایسی پارلیمنٹ کی حیثیت نہ دے دی جائے گی جس کو حقیقی طاقت حاصل ہو اور جب تک مغربی جرمنی کو برابری کی حیثیت سے اس کا رکن نہ بنایا جائے اس وقت تک یورپ کی مدافعت کی تمام اسکیمیں غیر مؤثر ثابت ہوں گی اور یورپ دنیا کے امن و امان کے لئے خطرے کا باعث بنا رہے گا"۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ "یورپ کا حقیقی مسئلہ معاشی ہے۔ اگر وہ حل ہو جائے تو سیاسی مسائل کا حل خاصا آسان ہو جائے گا"۔ انھوں نے مسٹر بیون کی شکایت کی وہ یورپی یونین کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتے اور فرانس کے متعلق فرمایا کہ وہ جرمنی سے بلاوجہ ڈرتا ہے اور مجھ جیسے شخص پر بھی اسے بھروسہ نہیں جس نے دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے لئے ۲۵ سال تک کام کیا ہو"۔

ادھر برطانوی پارلیمنٹ میں بیرونی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے جرمنی کو مسلح کرنے پر زور دیا ہے۔ جن طاقتوں نے جرمنی کو ختم کیا تھا آج وہی سیاسی حالات سے مجبور ہو کر جرمنی کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور مسٹر چرچل جو پچھلی لڑائی کے زمانے میں جرمنی کے سب سے بڑے دشمن تھے آج جرمن وزیر اعظم کے نزدیک دنیا کے سب سے بڑے مدبر اور سیاست داں ہیں۔

برما کی حالت بہتر ہو رہی ہے

برما کی حالت کافی سنبھل گئی ہے اور برابر سنبھلتی جا رہی ہے۔ حالت کے بہتر ہونے کی بڑی وجہ وہ قرضہ ہے جو کامن ویلتھ کے ملکوں سے اسے ملا ہے۔ سرکاری فوجیں باغیوں کو برابر پیچھے ڈھکیل رہی ہیں۔ آمد و رفت کے وسائل پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔ چاول کی تجارت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ سیلون نے امسال دو لاکھ دس ہزار ٹن کا ٹھیکہ لیا ہے۔ جاپان نے اس سے کچھ زیادہ ہی خریدنے کا وعدہ کیا ہے۔ پچھلے مہینے جاپان سے جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس کی وجہ سے مشینوں کے پرزوں کی قلت دور ہو جائے گی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود حکومت کے سامنے بہت سے اہم مسئلے ہیں جن کا حل کچھ ایسا آسان نہیں۔ حکومت کی یہ مہم اگر برابر جاری رہے تب بھی مکمل طور پر امن کے قائم ہونے کے لئے ایک مدت چاہیے اور امن کے قائم ہو جانے کے بعد بھی یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ سارے سیاسی مسئلے حل ہو جائیں گے۔ دوسری سب سے بڑی دقت معاشی ہے جس کے دور ہونے میں بہت وقت لگے گا۔ اس خانہ جنگی نے برما کے معاشی نظام کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ برما کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ چاول ہے مگر ۱۹۵۰ء کے اندازہ کے مطابق اس کی مجموعی کاشت کا رقبہ دس ہزار ملین ایکڑ سے گھٹ کر آٹھ ہزار ملین ایکڑ سے بھی کم رہ گیا ہے اور برآمد کی مقدار تین سال سے آٹھ لاکھ ٹن کم ہے۔ اسی طرح برما کی شدید گرانی بھی رفتہ ہی رفتہ کم ہوگی۔

انڈونیشیا میں دوسری بغاوت

انڈونیشیا کو آزادی کے بعد سب سے پہلے ویسٹرلنگ کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا مگر نئی حکومت کو اس پر قابو حاصل کرنے میں بہت جلد کامیابی ہوئی۔ اسی طرح اس نے کمیونسٹوں اور دار الاسلام کی تحریکوں کو بھی ابھرنے اور پھیلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایک ہفتہ ہوا مشرقی انڈونیشیا میں ایک اور فوجی افسر کپتان عبدالعزیز نے بغاوت کر دی اور مکاسر پر قبضہ کر لیا۔ بظاہر یہ بغاوت بھی بہت جلد فرو ہو جائے گی مگر یہ ایک عام بے چینی کی علامت ہے جو جمہوری حکومت کی وحدانی ریاست کی پالیسی نے پیدا کر دی ہے اور غالباً اسے اس پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔

(ع، ل)

بزمِ بے تکلّف

"ٹھہرئے ٹھہرئے میر صاحب ذرا بات تو سنیئے۔ آپ تو ایسے اُڑے چلے جا رہے ہیں جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوں"

"میاں کیوں راہ کھوٹی کرتے ہو، بہت دور جانا ہے۔ خدا خدا کر کے آج پانچویں دن تو گھر سے قدم نکالنے کی نوبت آئی ہے۔ یہاں تندوں سے لگ رہے ہیں کہ کسی طرح اخبار کے دفتر میں پہنچ کر چار دن کا فاقہ توڑیں اور آپ ہیں کہ دقف لازم کی طرح بیچ میں روڑے پیادہ ٹھا رکھائے بیٹھے ہیں"

"تو کیا آپ کے محلے میں بھی کرفیو تھا؟ وہاں تو شاید ان دنوں کوئی فساد نہیں ہوا"

"شاید کی اور ان دنوں کی بھی ایک ہی رہی اسے حقیقت یہ بالکل قطعی حتمی یقینی امر ہے کہ جب سے دنیا کے پردے پر لکھنؤ کا شہر آباد ہوا ہمارے محلے میں فساد خون اور ہاتھ میں لے فساد کے سوا اور کسی فساد کا آج تک نام بھی سننے میں نہیں آیا مگر وہ کہتے ہیں ناکہ نہ کر تو کرفیو اور نہ کر تو کرفیو ——"

"میر صاحب اگر مثل میں ترمیم کرنا ہے تو پھر یوں کہیئے کہ تو کرفیو اور نہ کر تو ڈر فیو۔ بہر حال یہ سن کر بے حد قلق ہوا کہ آپ نے پورے چار روز سے کچھ نہیں کھایا اب آپ اتنی سی زحمت فرمائیں جو کچھ نان نمک موجود ہے ——"

"لاحول ولا قوۃ، تم بھی عجیب گھامڑ ہو۔ تم سمجھے کہ میں پیٹ کے فاقے کا ذکر کر رہا ہوں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ روٹی کی بھوک ہوتی تو اخبار کے دفتر میں جا کر کیا ایڈیٹر کا سر کھاتا۔ ارے بھئی اس چار روز میں اور تو جو کچھ گذرنی گذر گئی مگر اخبار کی ہڑک نے وہ حال کر دیا جو افیمی کا عمل کے بغیر ہو جایا کرتا ہے۔ طبیعت کند، جی نڈھال، بدن ٹوٹ رہا ہے جمائیاں آ رہی ہیں۔ آج چھوٹتے ہی آس پاس کے سارے اڈے جہاں اخبار ملتا تھا دیکھ ڈالے، مگر ایک اخبار بھی نظر نہ آیا۔ خدا جانے جیتے بچے یا سب کے کرفیو سے مر گیا۔ ناچار یہ سوچا کہ چلو بھئی جہاں تازے تازے گرم گرم اخبار تنور سے پک کر نکلتے ہیں وہاں چلیں۔ کچھ بنگال کے کام روپ کا حال تو معلوم ہو۔ فساد کا یہ سفلی جادو نہیں سے چلا ہے جب تک وہاں نہ روکا جائے یہاں کسی طرح نہیں رک سکتا۔ لوگوں کی کچھ ایسی مت ماری گئی ہے کہ کہیں کا بدلہ کہیں چکاتے ہیں۔ کوئی پوچھے "کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا" یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مگر صاحب وہ تو جادو کا پھیر ہے اس میں انصاف اور عقل کا کیا کام۔ اب نہ جانے اس چار روز میں ——"

"میر صاحب اتنا تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ بنگال کی حالت کچھ سدھر گئی ہے پچھلے چند روز میں کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا، مگر سب سے اہم خبر یہ ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب پنڈت نہرو سے بنگال کے معاملے میں اور دوسری چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دہلی آ رہے ہیں"

"ارے تو جیتا رہے، تیرے منہ میں گھی شکر، کیا خبر سنائی ہے کہ جی خوش کر دیا۔ بس اب اللہ نے چاہا تو بیڑا پار ہے"

"مگر میر صاحب اتنی زیادہ امید نہ باندھیئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک تو سمجھوتا ہونا مشکل ہے، اور ہو بھی جائے تو کیا خبر اس کا بھی وہی حشر ہو جو پہلے سمجھوتوں کا ہوا"

"لوگ جھک مارتے ہیں، ہم تمہیں ایک موٹی سی بات بتلاتے ہیں، اس کو سمجھ لو اب رہیں اس کی باریکیاں، ان کو تم خود سوچتے رہنا۔ اگر دو سیاسی پہلوان جب لنگوٹ کس کر خم ٹھونک کر ایک دوسرے سے گتھ جانے کو تیار ہوں مگر عین وقت پر ہاتھ ملاتے ہی گلے مل جائیں اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی جگہ تھپکانے لگیں تو اسے سیاست کی چال نہیں ستاروں کی چال سمجھو۔ گرم کھولتا ہوا خون ایک دم سے ٹھنڈا پڑ جائے تو جان لو کہ یہ طبیب کی مسکن گولی کا نہیں طبیعت کے استحالے کا کرشمہ ہے۔ اگر وہ تنا تنی جو سوا دو برس سے چلی آتی تھی یکا ایک ڈھیلی پڑ گئی تو خدا کا شکر کرو کہ بحران ختم ہوا اور مریض بچ گیا۔ اب طبیعت رفتہ رفتہ سنبھلتی چلی جائے گی"

غزل

حفیظ آتش بھوپالی

پلا کے جام شراب ساقی حقیقتوں کو مجاز کر دے
سرور بھر دے رگوں میں میری خودی سے بھی بے نیاز کر دے

اسی لئے سب ہوا تغافل کہ ان کا یہ سرشار الفت
ادب کی حد سے کہیں گذر کر نہ دست دامن دراز کر دے

نفس نفس ہے پر مست ساقی بھٹک نہ جائیں ہجوم غم میں
تو ان کی یاد کشتی میں پیدا ذرا سا سوز و گداز کر دے

نہ ہو جو وہ مبتلائے غم تو کرے بھی کیا بے کسی کے مارے
فریب نظر دل سے کھائے اپنی جو خود ہی افشائے راز کر دے

بجا ہے عرش بریں پہ پہنچے دماغ اس کا خیال اس کے
جسے یہ کافر ادا تبسم کرم سے ممنون ناز کر دے

اگر ہے عزم صمیم تیرا تو کیا ہے مائل تو اپنے مشکل
نشیب و پستی کے راستوں کو بلند کر کے فراز کر دے

عجیب زمانے کے انقلابوں سے آتش ہم بھی گذر رہے ہیں
جسے بھی چاہے خوار کر دے جسے بھی یہ سرفراز کر دے

رفیقِ شامِ تنہائی تمھاری یاد ہوتی ہے

سیدہ فرحت

تمھاری یاد اس ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے
اسی نے منتشر شیرازۂ ہستی سنوارا ہے
مری خاکستر دل میں یہی تو اک شرارا ہے
اسی اک یاد کی خاطر مجھے جینا گوارا ہے
رفیقِ شامِ تنہائی تمھاری یاد ہوتی ہے

مرے ہونٹوں پہ ہوتا ہے تبسم آنکھ میں آنسو
نکل آتے ہیں بے تابی میں کبھی تسکین کے پہلو
فرشتہ زندگی کا کھول دیتا ہے پر و بازو
تصور میں مرے آتی ہے اک تصویر رنگ و بو
رفیقِ شامِ تنہائی تمھاری یاد ہوتی ہے

کہوں کیا اس تمھارے یاد کی میں کیف رنگینی
بیاں کیا کیجیے جو کچھ ہے اس میں حسن و رنگینی
عجب لذت عطا کرتی ہے دل کو اس کی شیرینی
سرور اس کا مٹا دیتا ہے شام غم کی غمگینی
رفیقِ شامِ تنہائی تمھاری یاد ہوتی ہے

تمھاری یاد اک بہتا ہوا امرت کا دھارا ہے
شبِ غم کی سیاہی میں یہ اک روشن ستارا ہے
یہ نومیدی کی راہوں میں امیدوں کا منارا ہے
خزاں میں بھی یہ فصل گل کی جانب اک اشارا ہے
رفیقِ شامِ تنہائی تمھاری یاد ہوتی ہے

آزادی کی زنجیریں

ساتواں باب

ظفر حسن دریاپور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا اس کے والد میر مظفر حسن پنشن کے بعد وطن واپس آگئے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے ہیڈ ماسٹر ماسٹر شیو دیال کے اصرار پر ظفر کے والد اسے الہ آباد کالج میں داخل کرانے پر تیار ہو گئے۔ ظفر اور شیو دیال صاحب کا لڑکا ہر دیال الہ آباد آئے اور اکرام اللہ صاحب کے ہاں ٹھہرے جو شیو دیال کے شاگرد اور میر مظفر کے دوست کے بیٹے تھے۔ شروع کے دو مہینے ظفر کو کالج میں بڑی سخت محنت کرنی پڑی اور اس عرصے میں وہ اپنی پھوپی کے ہاں نہ جا سکا جب پڑھائی کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو وہ پھوپی کے ہاں گیا جہاں اس سے بے حد محبت سے ملیں اور جب کو دیکھا جو ایک بڑی حسین اور شرمیلی نازنین بن چکی تھی ظفر اور ہر دیال کو کالج میں نئے اونچے طبقے سے سابقہ پڑا اور وہ ہر سے ایک جلسے میں شریک ہوئے ہر دیال کے لئے تو یہ محض ایک تفریح تھی مگر ظفر نے نئے ادب کے نمونوں پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس کا پہلا تاثر کچھ اچھا نہ تھا۔

(قسط ۱۵)

شروع اکتوبر میں ظفر کو ملیریا نے آدبایا۔ ایک دن بیچ کرکے کوئی دو ہفتے تک تیز بخار آتا رہا۔ اکرام اللہ نے اس کے علاج اور تیمارداری میں بڑا اہتمام کیا۔ جاڑے بخار کی شدت میں اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے اور دوا اپنے ہاتھ سے پلاتے تھے۔ ہر دیال بھی جس دن ظفر کے بخار کی باری ہوتی صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے کالج جاتا، باقی سارے وقت ظفر کے پاس رہتا۔ ظفر نے اپنے والد کو بیماری کی اطلاع نہیں دی اور ہر دیال کو بھی منع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو نہ لکھے۔

سنیچر کو شام کے سات بجے ظفر اور ہر دیال برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اکرام اللہ کچھ دیر پہلے گھر جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو چکا تھا۔ ظفر خوش تھا کہ آج بخار کی باری ٹل گئی اور اب اس مصیبت سے نجات ملی۔ وہ کمزور ضرور تھا مگر کچھ ایسا زیادہ نہیں اس لئے کہ اکرام اللہ نے دودھ، پھل، انڈے، یخنی کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ وہ ہر دیال سے پوچھ رہا تھا کہ اتنے دنوں میں انگریزی، تاریخ اور سوکس میں کیا کیا پڑھا دیا گیا تھا کہ اتنے میں ایک چپراسی نے آکر سلام کیا اور ظفر کے اشارے پر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ظفر نے کھول کر دیکھا تو عقیلہ بیگم کا رقعہ تھا۔

ظفر میاں، دعائے صحت و عافیت

واہ بھیا، تم نے اپنا وعدہ خوب پورا کیا دو اتوار گزر گئے صورت بھی نہ دکھائی۔ فصل خراب ہو رہی ہے اس لئے پریشانی ہے کہ نہ جانے تمہارا جی کیسا ہے۔ خدا نہ کرے اگر تمہارے دشمن کچھ ماندے ہوں تو تم موٹر منگوا کر یہاں چلے آؤ۔ خبردار تکلف نہ کرنا نہیں تو میں خود وہاں پہنچوں گی۔ اور جو اللہ کے فضل سے طبیعت اچھی ہو تو کل ضرور آنا۔

تمہاری پھپی

ظفر کو اپنا وعدہ یاد تھا، اور اس نے کئی بار چاہا کہ صفدر علی صاحب کو اپنی بیماری کی اطلاع دے کر حاضر ہونے کی معذرت کرے مگر حیص بیص میں وقت گزرتا رہا۔ اس کو یہ خیال ضرور تھا کہ پھپی نے محض اخلاقاً اس سے ہر اتوار کو آنے کی فرمائش کی ہے اور انھیں اس کا کوئی خاص انتظار نہیں تھا۔ اس خط سے اُسے یہ معلوم ہوا کہ پھپی نے سچ مچ دل سے دعوت دی تھی اور وہ برابر راہ دیکھتی رہیں۔ اب اسے اور بھی زیادہ ندامت ہوئی اور اس نے بڑی عاجزی سے پھپی کو معذرت کا خط لکھا اور اپنی بیماری کا ذکر کرکے انھیں یقین دلایا کہ اب میں بالکل اچھا ہوں مگر کمزوری باقی ہے، کل تو نہ آسکوں گا مگر آئندہ اتوار کو ضرور حاضر ہوں گا۔

اتوار کا دن ظفر نے کالج جانے کی تیاری میں گزارا ظاہر ہے کہ دو ہفتے میں پڑھائی کا جو نقصان ہوا تھا اُسے ایک روز میں تو پورا نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے سب سے آخری دن کے سبق جس طرح دیکھے۔ ہر دیال کی کاپیوں سے لکچروں کے نوٹس نقل کئے، سلسلے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے مطلب کے سمجھنے میں جو دقت ہوتی تھی اُسے جہاں تک ہو سکا ہر دیال کی مدد سے رفع کیا اور آنے والے سبق کا مطالعہ جو ہر دیال کبھی نہیں کرتا تھا اپنے طور پر کیا۔

اس کی نقاہت روز بروز دور ہوتی گئی اور محنت کا جوش بڑھتا گیا یہاں تک کہ ہفتے کے آخر میں اس نے غیر حاضری کے دنوں کی کمی پوری کر لی۔ ادھر سے تو اس کے دل کو اطمینان ہو گیا مگر سنیچر کی شام سے یہ فکر سوار تھی کہ اتوار کو پھر پھپی کے یہاں جانا ہے۔ بیچ میں ایک دن صفدر علی صاحب اس کی مزاج پرسی کے لئے آئے تھے انھوں نے ہر دیال کو بھی دعوت دی تھی کہ اتوار کو ظفر کے ساتھ آکر دوپہر کا کھانا میرے ہاں کھانا اور چلتے وقت ظفر سے چپکے سے کہا تھا کہ ہر دیال کو ضرور لانا تمہاری پھپی کا بہت اصرار ہے۔ ظفر کو سخت تعجب تھا کہ پھپی کو ہر دیال سے یہ دلچسپی کیسے پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا کہ شاید ابا جان نے لکھا ہو کہ ظفر کے ساتھ ہر دیال کا بھی خیال رکھنا۔

اب اُسے صفدر علی صاحب کے ہاں جانے میں شوق کے ساتھ ساتھ جو جھجک ہوتی تھی وہ خود ان کی وجہ سے نہ تھی۔ دو بار کی ملاقات میں اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی انگریزیت محض وضع و لباس تک محدود ہے ورنہ بہت سیدھے بلکہ سادہ لوح آدمی ہیں اور ملنسار نہ سہی مگر خلیق ضرور ہیں۔ اصل میں ایک تو پھپی کی حد سے زیادہ شفقت سے وہ کسی قدر گھبراتا تھا اس لئے کہ اپنی خاموش اور شرمیلی طبیعت کی وجہ سے وہ ان کی سی گرم جوشی ظاہر نہیں کر سکتا تھا اور اس کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اس کو بد لحاظ اور بے مروت نہ سمجھیں۔ دوسرے جمیلہ کے بارے میں وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے کیسے پیش آئے۔ اس کا برتاؤ کیسے بامنگیتر کا اور یہ ابھی پوچھئے تو اُسے یہ معلوم بھی نہ تھا کہ منگیتر سے کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اسے ان سے انھیں پہلی بار، آنکھیں ملا کر باتیں کروں یا نظریں جھکا کر، اور باتیں کیا کروں؟ اس کی کتابوں اور لٹریچر سے عشق ہے۔ ہر دیال تو وہ اب کیا ملتی ہوگی اس کی سہیلیوں اور استانیوں کے متعلق ہے تو اس کی سہیلیوں کے بارے میں دلچسپی ظاہر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ تعلیم کی طبیعت کی رنگینی ہے تو آرٹسٹ کی طرح وہ بھی جوش و خروش سے اظہار محبت کی تو نظر ہے تو میرے لئے بڑی مشکل ہے۔ مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور وہ مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہے؟ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ پھپی کا خیال ابھی مجھ سے اس کی شادی کرنے کا ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے میرے سامنے کیوں کرتیں۔ مناسب تو لڑکیاں اپنے منگیتر سے چھپاتی ہیں مگر ممکن ہے تعلیم یافتہ خاندان اس رسم کو نہ مانتے ہوں؟"

ظفر کو اس کی بڑی فکر تھی کہ کسی طرح جمیلہ کے دل کا حال معلوم ہو کہ وہ اس سے محبت رکھتی ہے اور خوشی سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں مگر اس کا خیال تک نہیں آتا تھا کہ خود اپنے دل کا حال معلوم کرے۔ اگر وہ اپنی نفسی کیفیت کی تحلیل کرنا چاہتا اور کر سکتا تو اُسے اندازہ ہوتا کہ ایک عام جنسی اور جمالیاتی کشش کے علاوہ جو ہر جوان مرد ہر خوب صورت لڑکی کے لئے رکھتا ہے اگر کوئی احساس تھا تو ایک اشتیاق کا، ایک تجسس کا کہ اس خوش شکل کے اندر کیا ہے؟ محبت کا یا شادی کی خواہش کا سوال ابھی قبل از وقت تھا۔

صبح ناشتے پر ظفر چاہتا تھا ہر دیال سے پوچھے صفدر علی صاحب کے ہاں کب چلیں گے۔ اس ڈر سے کہ اگر اس نے وہاں جانے کے لئے بے قراری ظاہر کی تو ہر دیال اس کے جذبات کو بھانپ لے گا اور اسے بہت بنائے گا۔ خاموش رہا۔ ہر دیال نے خود ہی کہا "ارے میاں آج دوپہر کا کھانا تمہارے انکل صاحب کے ہاں کھانا ہے خانساماں سے کہہ دیں۔"

ظفر۔ وہ تو میں نے رات ہی کہہ دیا تھا۔

ہر دیال۔ تمہیں یقین تھا کہ میں بھی جاؤں گا؟ قاعدے سے تو مجھے ہرگز نہیں جانا چاہئے۔ میرا تمہارا کیا جوڑ ہے۔ تمہاری دعوت کرتے ہیں تو ہم مال مفت ہیں۔

ظفر۔ بھئی میں نئے آدمیوں سے ملنے سے گھبراتا ہوں، اور تم کو ہر ایک سے ملنے کا شوق ہے۔

ہر دیال۔ ہر ایک تو نہ کہو، مگر ایسے بڑے آدمیوں سے جو چھوٹے سی دعوت کر دیں ملنے کا شوق نہ ہوگا، تم جیسے جھینپو کا ذکر نہیں جو اپنے سالے سے بھی شرماتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ وہاں کب چلو گے؟

ظفر۔ جلدی چلنا چاہئے کہ سویرے سے چھٹی مل جائے۔

ہر دیال۔ اب کوئی ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ تھوڑی دیر کام کر لیں، دس بجے یہاں سے چلیں گے اور ٹہلتے ہوئے گیارہ بجے تک پہنچ جائیں گے۔ گھنٹہ بھر

میں ہل چل مچادی تھی اور عام ہیجان و انتشار کے باعث ادبی ترقی بھی رک گئی تھی اپنے رسالے کے بند ہونے دوستوں کے منتشر ہونے اور بیوی کو طلاق دے دینے کے باعث خود رومان رولاں کی خانگی زندگی اجاڑ ہوگئی تھی۔ اس نازک موقع پر اس اقبال مند نوجوان نے ادبی خادم بننے کا عزم مصمم کر لیا اور اپنے اس عہد کو انھوں نے اپنی آخری سانس تک نبھایا۔ اس مضمون کی ابتدا میں ان کے جو بے حد مختصر سا خاکہ سوانح پیش کیا ہے اس سے ان کی ادبی [illegible] کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں رومان رولاں ایک موٹر کے حادثے سے مرتے مرتے بچے۔ پھر بھی ان کے بڑی گہری چوٹ آئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور صحت یاب ہونے میں کافی دقت لگی اگر بدقسمتی سے اس دن ان کی وفات ہو جاتی تو شاید پیرس کے کسی اخبار میں ان کے متعلق چند تعزیتی سطور شائع ہو جاتیں جن کا لب لباب یہی ہوتا کہ موسیقی کے ایک معلم موٹر سے کچل کر رحلت کر گئے۔ پیرس کے لاکھوں باشندوں میں سے صرف دس ہی کو اس کا افسوس ہوتا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنی عالمگیر شہرت سے دو برس پیشتر تک رومان رولاں خود اپنے ملک میں کتنے کم مشہور تھے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک ان کے دس بارہ ڈرامے، سوانح عمری اور جین کرسٹوفر کی ۸ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔

رومان رولاں نے شہرت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کبھی کوئی ادبی جماعت نہیں بنائی اور نہ کسی گروہ بندی سے کام لیا۔ سنسکرت کے کسی شاعر نے کہا ہے "شہرت کی دوشیزہ ہمیشہ کنواری رہتی ہے جسے وہ چاہتی ہے وہ اسے نہیں چاہتا اور جو اس کے خواہش مند ہوتے ہیں انھیں وہ خود نہیں چاہتی" رومان رولاں کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی غیر معمولی ریاضت کا ثمرہ تھی۔ رومان رولاں کی تصانیف کا تعارف کرانے کا یہ موقع نہیں۔ علاوہ ازیں ان کی صرف تین چار کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں (۱) جین کرسٹوفر (۲) میں چین نہیں لوں گا (۳) عقو وغیرہ۔ البتہ ان کے متعلق کئی مضامین جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہماری نظر سے گذرے ہیں ——— اسٹیفن زوئگ کی لکھی ہوئی ان کی سوانح عمری پندرہ سال سے ہماری محبوب کتاب رہی ہے سرلیپ کمار نے اپنی کتاب "بڑے آدمیوں کے ساتھ" میں رومان رولاں کی بڑی دلکش تصویر پیش کی ہے ماڈرن ریویو میں وہ بات چیت بھی شائع ہوئی تھی جو نیتاجی سوبھاش چندر بوس اور رومان رولاں کے مابین ہوئی تھی۔ رومان رولاں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا تھا "میں کسان مزدوروں کا حامی ہوں اور اگر خود مہاتما گاندھی ان کی بہبودی کا خیال نہ کرتے تو میں ان کی بھی مخالفت کرتا۔" شانتی نکیتن سے رومان رولاں اور ٹیگور کی جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں رومان رولاں کے بائیس خطوط کو جمع کیا گیا ہے۔ رومان رولاں ہندوستانی طرز فکر سے کافی متاثر تھے اور انھوں نے رام کرشن، پرم ہنس اور مہاتما گاندھی کے سوانح بھی لکھے تھے۔ شاعر اعظم ٹیگور اور رشی اروندو کے بھی وہ بہت مداح تھے۔

رومان رولاں کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے خطوط کو حاصل ہے۔ اسٹیفان سوائگ نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری "کل کی دنیا" میں لکھا ہے "اگرچہ میں رومان رولاں کی سبھی تصانیف کی قدر کرتا ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کی تصانیف میں سب سے اہم جگہ ان کے خطوط کو ملے گی کیونکہ اس میں وہ انسانیت جیتی جاگتی نظر آتی ہے جس سے ان کا یہ درد قلب معمور تھا اور جس کو ان کے جذباتی ذہن نے تخلیق کیا تھا"

رومان رولاں کے ہزاروں جواہر ریزے جو خطوط کی شکل میں ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں ان کا محرک بلند پایہ مصنف ٹالسٹائے تھا۔ ۱۸۸۶ء کا واقعہ ہے، رومان رولاں اس وقت ۲۱ برس کے تھے حال ہی میں انھوں نے ٹالسٹائے کی کتاب "کیا کیا جائے" پڑھی تھی۔ اس کتاب سے ان کے قلب میں ایک ہیجان برپا ہو گیا اور انھوں نے فوراً ہی ایک خط ٹالسٹائے کے نام روس بھیجا۔ انھیں اس شہرۂ آفاق مصنف سے جواب کی کوئی توقع نہ تھی، اور وہ اپنے اس خط کو بھول بھی چکے تھے۔ لیکن ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی ڈاک میں ایک پیکٹ بھی ہے جس میں روس کی مہر ہے۔ وہ پیکٹ ٹالسٹائے کا مفصل خط تھا۔ کہاں وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنف اور کہاں یہ گمنام فرانسیسی نوجوان۔

ٹالسٹائے نے اپنے ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۶ء کے اس خط میں لکھا تھا "پیارے دوست تمھارا پہلا خط مجھے ملا اس نے میرے قلب کو متاثر کیا اور میں نے اسے اشک آلود نگاہوں سے پڑھا۔ اس کے بعد ٹالسٹائے نے اپنے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہی چیز دراصل بیش بہا ہے جو انسانوں میں باہمی رواداری پیدا کرتی اور ان کے قلوب کو ملاتی ہے اور سچا فن کار وہ ہے جو اپنے عقائد کے لئے قربانی کرتا ہو۔ کسی بھی فن کار کا سب سے پہلا فرض فن سے نہیں سماج سے محبت کرنا ہے جن کے قلوب انسانی حمیت سے معمور ہیں، صرف وہی فن کار اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔"

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ آگے چل کر اس اہم خط نے رومان رولاں کے ادبی نقطۂ نگاہ پر کتنا اثر ڈالا۔ لیکن اس وقت جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی ٹالسٹائے کی بے نظیر ہمدردی اور وسعت قلب، جس کے تحت انھوں نے ایک گمنام نوجوان کو یہ تسلی آمیز خط لکھا تھا۔ کہاں روس کا یہ شہرۂ آفاق مصنف، اور کہاں پیرس کی گلیوں کا ایک گمنام بائیس سالہ نوجوان ——— ٹالسٹائے کو اس طویل خط کے لکھنے میں یقیناً ایک دن لگا ہوگا ممکن ہے دو دن لگے ہوں۔ لیکن رومان رولاں کے لئے یہ ایک ایسی بے بہا تعلیم تھی جسے وہ عمر بھر نہیں بھول سکے جس دن انھیں ٹالسٹائے کا یہ اہم خط ملا تھا، اسی دن انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ مستقبل میں جب بھی کوئی شخص اپنے اندرونی ہیجان میں میری مدد یا میرا مشورہ طلب کرے گا تو میں بھی اسی طرح اس کی مدد کروں گا۔ فن کار کا سب سے پہلا اخلاقی فرض ہے کسی بھی روح کی پکار پر امداد کے لئے آمادہ رہنا ——— یہ بات اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہو گئی تھی اور اس وقت سے قلبی ہیجان میں مبتلا، کسی مراسلہ نگار کو انھوں نے مایوس نہیں کیا۔ ٹالسٹائے کا وہ تاریخی خط گویا برگد کے پیڑ کا ایک بیج تھا جس سے رومان رولاں کی خط کتابت کا وہ بڑا سلسلہ پیدا ہوا جس کی شاخیں اور برگ و بار سارے جہان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دکھے ہوئے دلوں کا سہارا دینے اور ڈھارس بندھانے والے خطوط کا یہ مجموعہ، دنیا میں لافانی رہے گا

(باقی آئندہ)

آزادی کی زنجیریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

دینا ہے، اور رڑکی کے کنونشن کے لئے تیاری کرنا ہے تم ان فضولیات میں کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔

ہردیال۔ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ لطیف صاحب مثلث اور مخمس کا وزن معلوم کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ رقبہ نکالئے رقبہ۔

لطیف۔ ارے بھئی مجھے وزن اور فلسفے سے کیا تعلق میں تو مہینے میں ایک بار جلسہ کر دیتا ہوں اور اس کی کارروائی لکھ لیتا ہوں۔

اتنے میں مامانے اندر سے آکر کہا کہ ظفر میاں اور لطیف میاں کو بیوی بلا رہی ہیں۔ وہ دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے اور ہردیال نے صفدر علی صاحب سے یہ سوال کر کے کہ الہ آباد کی سڑکوں کی حالت اس قدر ابتر کیوں ہے ان کے بیٹھے ہوئے ساز کو چھیڑ دیا اور خود اطمینان سے بیٹھ کر سننے لگا۔

(باقی آئندہ)

ترکی

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

افسروں کے پاس اپنا ایک ڈیلی گیشن بھیج کر مطالبہ کیا کہ ان کے کام کرنے کے اوقات میں ۲ گھنٹے کی تخفیف ہونی چاہیے۔

پچھلے ستمبر میں گورنمنٹ نے جائداد ضبط کرنے والا ایک کمیشن مقرر کیا۔ یہ کمیشن یانکس، ڈرے گیگلو اور کیپ (ضلع اسپارٹا) کے گاؤں میں مع مسلح فوجیوں کے گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جن کسانوں نے لگان نہیں دیا تھا ان کی زمینوں اور کھیتوں کو زبردستی ان سے چھین لیا جائے لیکن اس نے اپنا یہ کام شروع کیا تو کسانوں نے منظم ہو کر مزاحمت کی اور اپنی جائداد کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کئی گاؤں میں ۷۰۰ کسانوں نے زمین داروں سے زبردستی زمین چھین لی اور خود ان کے مالک بن بیٹھے۔

ترکی عوام کا ترقی یافتہ طبقہ یہ کام اچھی طرح سمجھتا ہے اور امریکہ کی فوجی اور سیاسی پالیسی سے وابستہ ہے اس وقت تک ترکی کے مزدور افلاس، بھوک غربت اور بے روزگاری سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتے۔ جمہوریت، آزادی اور امن کا نعرہ ترکی عوام میں دن بدن بہت مقبول ہو رہا ہے۔

ادبی تبصرے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

ہے کہ ان کی شرح میں بھی وہ دقائق و نکات ملتے ہیں جو ان کی بالغ نظری اور پختہ سخن فہمی کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے کلام غالب میں شکن زلف کی دلآویزی ہی محسوس نہیں کی، اس کے پیچ اور بل بھی دیکھے ہیں اور ان پر جہاں ضرورت سمجھی ہے سخت اعتراضات بھی کئے ہیں۔ انھوں نے دوسرے شارحین سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان کے خیالات کو خواہ مخواہ نقل نہیں کیا۔ دوسروں کی رائے کا احترام کیا ہے، لیکن اپنی رائے بھی صفائی اور بے ریائی کے ساتھ پیش کردی ہے۔

اس شرح کے شروع میں ۵۵ صفحے کا تبصرہ ہے جس میں اونچی جماعتوں کے طالب علموں کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے غالب کی شاعری سے بحث کی ہے، اس میں بھی وہ سنجیدگی اور اعتدال ہے جو اس قسم کی بحث کے لئے اشد ضروری ہے۔

کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے اور کاتب کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں۔

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:۔

سالانہ ... ... دس روپے | ششماہی ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں
"منیجر"

طابع و ناشر:۔ عبد اللطیف اعظمی، بی اے جامعہ
مطبوعہ:۔ جید پریس دہلی

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

۲۳ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

روح کلام غالب — فرید الوحیدی — ۲
پچھلا ہفتہ
ہند اور بیرون ہند میں — ع ۔ ج ۔ ع ۔ ل — ۳
کشکول
غزل — فضا ابن فیضی اعظمی — ۵
روایاتی شاعر سے (نظم) — غلام ربانی تاباں — ۵
آزادی کی زنجیریں مسلسل ناول
ڈاکٹر سید عابد حسین — ٦
رومن رولاں — بنارسی داس چترویدی — ۸
سوشل ایجوکیشن جموں و کشمیر
رگھو ناتھ مٹو — ۹

ڈاکٹر سید عابد حسین

نئی روشنی جلد ۴ - نمبر ۱۶
۲۴ر اپریل ۵۵ء ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ھفتہ

ھند اور بیرون ھند میں

معاہدے پر عمل ہو رہا ہے

اس عرصے میں ہند اور پاکستان سے جتنی خبریں آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہرو لیاقت معاہدے نے باہمی شکوک اور شبہات کے طلسم کو توڑ دیا ہے اور دونوں طرف سے صلح کی خواہش اور کوشش بڑھتی جاتی ہے۔ پاکستان میں ہر طرف معاہدے کی پذیرائی ہوئی اور مخالفت کی ایک مثال بھی سامنے نہیں آئی۔ ہندوستان میں کہیں کہیں مخالف آواز اٹھی مگر موافقت کے شور میں دب گئی اور اب روز بروز دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ کے بنگالی اور آسامی ممبروں اور مغربی بنگال اور آسام کی حکومتوں کی طرف سے احتجاج کا جو اندیشہ تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ دو مرکزی وزیروں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور شری نیوگی نے اختلاف رائے کی بنا پر استعفے دئے، لیکن خود ان کے دوستوں اور ہم خیالوں نے ان پر بہت زور ڈالا کہ اپنے استعفے واپس لے لیں۔ اس کے بعد دونوں حضرات کا علیحدگی پر اصرار یہ ظاہر کرتا ہے کہ استعفے کی وجہ دراصل کچھ اور ہے معاہدہ محض بہانہ ہے۔

دونوں ملکوں کی حکومتیں معاہدے پر عمل کرنے کے لئے تیزی سے قدم اُٹھا رہی ہیں۔ مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کی سرحد پر دونوں طرف سے چنگی اور پولیس کے افسروں کو تاکیدی احکام بھیج دئے گئے ہیں کہ مہاجرین کو اپنا سامان اور زیور وغیرہ لے جانے دیں اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اقلیتوں کی دل جوئی اور دل دہی کر کے انھیں ہجرت سے روکا جائے۔ اس میں کامیابی ہو رہی ہے اور ہجرت کرنے والوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ ہند کی اور ریاستوں خصوصاً اُتر پردیش میں جہاں پچھلے دنوں فرقہ وارانہ فساد کا بہت زور رہا اور اقلیت کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئیں، حکومت امن و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ اُمید ہے کہ چند روز کے اندر ہند و پاکستان کی مرکزی حکومتوں کی طرف سے معاہدے کی پابندی کرانے کے لئے دو وزیر بنگال بھیج جائیں گے۔

مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کی کیبنٹ میں اقلیتوں کے نمائندے شریک کئے جائیں گے اور ان دونوں صوبوں اور آسام میں اقلیتوں کے کمیشن مقرر ہو جائیں گے اور اس طرح جب پنڈت جواہر لال نہرو ۲۶ر اپریل کو کراچی جائیں گے تو موجودہ معاہدے کی وہ سب شرطیں جن پر فوری عمل ہو سکتا ہے پوری ہو چکی ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں صاحب کی یہ ملاقات بہت مختصر ہوگی۔ اس لئے کہ مؤخر الذکر ۲۹ر اپریل کو امریکہ کے ارادے سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اس میں دونوں حضرات صرف اس کا جائزہ لے سکیں گے کہ پہلے معاہدے پر کہاں تک عمل ہوا۔ اس میں کیا دقتیں پیش آ رہی ہیں اور ان کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ لیاقت علی خاں صاحب کا اس وقت چار پانچ ہفتے کے لئے باہر جانا بہت بُرا ہے اور اس کی وجہ سے موجودہ معاہدے پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیش آئے گی اور باقی نزاعی امور کے طے ہونے میں دیر لگے گی، لیکن اس قسم کے اندیشوں کو دل سے نکال دینا چاہئے۔ موجودہ مصالحانہ پالیسی لیاقت علی خاں یا پنڈت نہرو کی شخصی پالیسی نہیں بلکہ دونوں حکومتوں کی اجتماعی پالیسی ہے جو پاکستان اور ہندوستان کو ہلاکت کے خطرے سے بچانے کے لئے اختیار کی گئی ہے، اس لئے اس پر لیاقت علی خاں صاحب کے موجود نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ باقی نزاعی امور کے متعلق آخری تصفیہ ان کی امریکہ سے واپسی کے بعد ہی ہو سکے گا، لیکن اگر ۲۶ر اپریل سے شروع ہونے والی ملاقات میں کچھ اصولی باتیں طے ہو گئیں تو دونوں حکومتوں کے متعلقہ محکموں کے سکریٹری ان کی تفصیلات کے بارے میں گفتگو جاری رکھیں گے اور جب لیاقت علی خاں سفر سے واپس آ جائیں گے تو وہ پنڈت جواہر لال سے مل کر آخری اور قطعی فیصلہ کر لیں گے۔

کیا مسلمان سیاست سے الگ رہیں؟

آج کل ہندوستان کے مسلم اخباروں میں بعض ممتاز لیڈروں کی طرف سے یہ رائے ظاہر کی جا رہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا کم سے کم کچھ عرصے تک سیاست سے الگ رہنا مناسب ہے چنانچہ ہندوستانی پارلیمنٹ اور ریاستوں کی قانون ساز مجلسوں کے انتخابات میں جو آیندہ سال ہونے والے ہیں انھیں حصہ نہیں لینا چاہیے ہمارے خیال میں یہ مشورہ رنج و یاس اور خوف کی اس عارضی کیفیت کا نتیجہ ہے جو آج کل عام طور پر مسلمانوں کے دلوں پر چھائی ہوئی ہے، اور جب ہم اسے اخلاقی اصول یا عملی مصلحت کے معیار پر جانچتے ہیں تو کسی طرح پورا نہیں اُترتا۔

جہاں تک اصول کا تعلق ہے جمہوری ریاست کے ہر شہری کا فرض ہے کہ ووٹ کے حق سے جو اُسے ریاست کے آئین نے عطا کیا ہے کام لے اور مقننہ اور عاملہ کی تشکیل پر حتی الامکان اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ رائے عامہ کی تول میں اس کی رتی بھی کچھ نہ کچھ وزن رکھتی ہے اور کبھی کبھی اسی ایک رتی سے ترازو کا پلڑا ادھر یا اُدھر جھک سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس پر آشوب دور میں جب ہندوستان کے جسم جماعی میں نفرت اور تعصب کا زہر بہت پھیل گیا ہے اس کے اندر کچھ ایسے صالح عناصر بھی موجود ہیں جو اس زہر کا توڑ کرتے رہتے ہیں اس لئے ہندوستانی مسلمانوں پر جن کے لئے یہ زہر سم قاتل ہے۔ خاص طور پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ صالح عناصر کو تقویت پہنچائیں اور اس کا سب سے مؤثر ذریعہ ووٹ کا استعمال ہے۔

اب مصلحت کے لحاظ سے دیکھئے تو بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے مسلمانوں کے خلاف تعصب تین قسم کا ہے سیاسی، مذہبی، تہذیبی۔ سیاسی تعصب اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ نے برصغیر ہند کی تقسیم کی حمایت کی اور یہ اسی طرح دور ہو سکتا ہے کہ اب مسلمان موجودہ ہندوستان کو متحد اور مضبوط بنانے میں پورا حصہ لیں اور اس نقصان کی تلافی کریں جو تقسیم سے پہنچا ہے۔ اگر وہ انتخاب سے الگ رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور اس کے سیاسی مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس سے سیاسی تعصب جو رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے پھر بھڑک اٹھے گا، اور پرانے زخم جو مندمل ہو رہے ہیں پھر ہرے ہو جائیں گے۔ رہا مذہبی اور تہذیبی تعصب تو کیا وہ انتخابات میں حصہ نہ لینے سے جاتا رہے گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ تو جبھی جا سکتا ہے جب مسلمان اپنے مذہب اور تہذیب کو ترک کر دیں اور اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ غرض انتخابات میں حصہ نہ لینے سے دشمنوں کے دوست بن جانے کا کوئی امکان نہیں بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ جو لوگ اب تک دوست رہے ہیں اور جنھوں نے ضرورت کے وقت مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے وہ بھی بدل ہو جائیں گے۔

سچ پوچھئے تو ہمیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ انتخابات سے الگ رہنے کی تحریک مسلمانوں میں کامیاب ہو سکتی ہے الیکشن کا جوش بخار کی طرح چڑھتا ہے اور اسی کی طرح پھیلتا ہے۔ اگر لوگوں کو یہ ترغیب دینی ہو کہ الیکشن میں حصہ نہ لیں تو بڑی زبردست کوشش کی ضرورت ہے جس کے لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کے پاس کافی وسائل نہیں ہیں اور فرض کیجئے ہوں بھی تو اس پیمانے پر جدوجہد کرنے سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا جو علیحدگی کا مشورہ دینے والوں کے پیش نظر ہے کہ الیکشن کے بحرانی زمانے میں مسلمان گوشۂ عافیت میں بیٹھے رہیں۔ اگر الیکشن میں حصہ لینے سے فساد ہو سکتا ہے تو اس کے بائیکاٹ کا پروپاگنڈا کرنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ غرض ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کی تحریک سرے سے چل ہی نہیں سکتی اور اگر چلی بھی تو اسے بہت جلد رکنا پڑے گا۔

زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ تحریک نہ تو کوئی چلے گا اور نہ چلے گی۔ لیکن اس قسم کے بیانوں کی وجہ سے

ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے عام بدگمانی پیدا ہو جائے گی کہ وہ الیکشن کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور وہ بدگمانی واقعات کی شہادت سے بھی دور نہیں ہوگی۔

مسئلہ اقلیت کا ہے یا اکثریت کا؟

ہندوستان ٹائمز میں ایک صاحب اندرون پاکستان کے عنوان سے پاکستان کے حالات پر تبصرہ کیا کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتے انھوں نے لیاقت علی خاں صاحب کی تقریر پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "اہم حقیقت جو ہمیں یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ آج ہندوستان اور پاکستان میں دراصل اقلیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اقلیتیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتیں کہ انھیں چین سے رہنے دیا جائے مسئلہ دراصل اکثریت کا یعنی اس رویے کا ہے جو اکثریت کو اقلیت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ ہمیں اکثریت کو یہ تلقین کرنی ہے کہ اپنا رویہ بدلے نہ کہ اقلیت کو۔ اگر اقلیت کو اکثریت پر اعتماد نہیں ہے تو اس کی ساری ذمہ داری اکثریت کے سر ہے۔ اکثریت کو اپنا طرز عمل بدلنا چاہئے اپنے تعصبات کو دور کرنا چاہئے اور اپنی نئی طاقت کو ظلم و تعدی کے بجائے بہتر مقاصد میں صرف کرنا چاہئے۔ اقلیت چاہے اپنے اندر دنیا بھر کی خوبیاں پیدا کرلے مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب تک اکثریت اپنے سر سے نخوت کے نشے کو اور اس خیال کو دور نہ کر دے کہ وہ اقلیت کے ساتھ من مانا سلوک کر سکتی ہے۔" اصولاً یہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن عملاً اکثریت کے سر سے تعصب کے بھوت کو اتارنے کا کام اقلیت ہی کو کرنا پڑتا ہے، بہ شرطے کہ اُسے تسخیر کا عمل آتا ہو۔

تہذیبی فوقیت کا خیال خام

حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے وزیر شری آر آر دیواکر نے دہلی کی ایک تہذیبی انجمن کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"تہذیب کے میدان میں طاقت کی سیاست سے کام نہیں لینا چاہئے جس طرح سیاست میں کوئی ملک اس کا اہل نہیں کہ دوسرے ملک پر حکومت کرے اسی طرح کوئی تہذیب ایسی بدتر اور مکمل نہیں کہ اُسے دوسروں پر مسلط ہونے کا حق ہو۔" مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ آریوں کو دڑاوڑوں کی تہذیب سے بہت کچھ لے کر جذب کرنا پڑا۔

شری دیواکر کے نزدیک تہذیب خارجی مظاہر یعنی کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے اور بولنے چالنے کے طریقوں پر منحصر نہیں بلکہ "دراصل ذہنی اور اخلاقی چیز ہے۔" "تہذیب کی عظمت کا اندازہ کبھی قوموں کی عارضی جنگی طاقت یا مادی خوش حالی سے نہیں لگانا چاہئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ رومنوں کی قوم نے یونانیوں کو مغلوب کر لیا تھا حالانکہ یونانی ان سے ذہنی اور دماغی اوصاف کے لحاظ سے کہیں برتر تھے۔"

تہذیب کے مثبت عناصر کی تحلیل کرتے ہوئے شری دیواکر نے اس کا جوہر "روح کی پاکیزگی" کو قرار دیا۔ "یہی روحانی تہذیب" نوع انسانی میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ اگر ہم دنیا کو اپنے جیسے جنت بنانا چاہتے ہیں تو صرف روحانی تہذیب کے ذریعے سے بنا سکتے ہیں۔"

ہر معقول پسند آدمی شری دیواکر کے ان خیالات سے اتفاق کرے گا۔ یہ سچ ہے کہ "طاقت" ہو یا حکومت "تسلط" سب سیاسی اصطلاحیں ہیں جو تہذیب کے تصور کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔ وہ تہذیب جو اپنے آپ کو "مسلط" کرنا چاہتی ہے ہرگز تہذیب کہلانے کی مستحق نہیں۔ جو چیز دوسروں پر زبردستی "مسلط" کی جا سکتی ہے وہ ایک ظاہری خول ہے جسے شری دیواکر نے "خارجی مظہر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اگر کوئی شخص یا جماعت یہ خول دوسروں کو مار مار کر پہنائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس کے اندر تہذیب کی ذہنی اور اخلاقی روح فنا ہو چکی ہے اور وہ اسے دوسروں میں بھی فنا کرنا چاہتی ہے۔ سیاسی طاقت کے ذریعے سے تہذیبیں مٹائی جا سکتی ہیں، بنائی نہیں جا سکتیں۔ حقیقی تہذیب اپنے اندر خود ایک خاموش قوت رکھتی ہے جو چپکے چپکے غیر محسوس طور پر نفوذ کرتی رہتی ہے۔ حقیقی اور پائدار تہذیبی اثرات ہمیشہ اسی طرح پڑے ہیں اور اسی طرح پڑتے رہیں گے۔

استعفے منظور ہو گئے

پنڈت نہرو، ان کے رفیق کار وزیروں، اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی ساری کوششوں کے باوجود شری شیاما پرشاد مکرجی اور شری نیوگی اپنے استعفے واپس لینے پر راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ وزیر اعظم کو مجبور ہو کر یہ استعفے منظور کرنے پڑے۔

ان دونوں حضرات کا معاملہ بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل الگ الگ ہے۔ شری نیوگی مشرقی بنگال کے رہنے والے ہیں۔ وہاں کے فسادات کا اور اپنے عزیزوں کی تکلیفوں کا اُن کے دل پر اور اعصاب پر اتنا شدید اثر پڑا کہ ان کے لئے حکومت کی موجودہ پالیسی کا جو پاکستان کے ساتھ مصالحت پر مبنی ہے ساتھ دینا دشوار ہو گیا وہ چپ چاپ الگ ہو گئے اور اُمید ہے کہ آئندہ بھی خاموش رہیں گے اور حکومت کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ان کی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے اُن کے رفیقوں کے دل میں ان کی جگہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کچھ دن بعد ان کی خدمات سے کسی شکل میں پھر فائدہ اٹھا سکے۔

شری مکرجی کا استعفا ایک سیاسی داؤں ہے جو انھوں نے بہت موقع سے چلا ہے۔ ان کا سیاسی پلیٹ فارم کی کانگریس پارٹی سے برابر اختلاف رہا تھا اور اُن سے لوگوں کو طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ غالباً انھیں یہ اندازہ تھا کہ کیبنٹ کی نئی تشکیل میں ان کی جگہ نہیں نکل سکے گی۔ مشرقی بنگال کے ہنگامے اور حکومت ہند کی مصالحانہ پالیسی کی وجہ سے ان کے لئے یہ بڑی اچھی صورت نظر آئی کہ ایک اصولی مسئلے پر استعفا دیں تاکہ جہاں سمجھا جائے جنھوں نے نازک وقت میں چھوڑ دیا تھا ان کی شکل ایک ہیرو یا شہید کی حیثیت سے لیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ شری مکرجی کے استعفے کی وجہ سے بنگال کے معاملات میں اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی اور مفاہمت اور امن کی فضا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہو جائے گا لیکن اُمید ہے کہ صلح کی قوتیں اس نئی مشکل پر بھی قابو پا لیں گی۔ بہرحال شری مکرجی کے الگ ہو جانے کے بعد مرکزی کیبنٹ میں زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

(ع ، ح)

پاکستانی اخبارات کا مبارک اقدام

"معاہدہ دہلی" سے ہندوستان اور پاکستان کی فضا روز بروز خوش گوار ہوتی جا رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کے دلوں میں نفرت کی جگہ محبت، عداوت کی جگہ دوستی اور بے اعتمادی کی جگہ بھروسہ پیدا ہو گیا ہے اور دونوں اس معاہدے کو کامیاب بنانے کی دل و جان سے کوشش کریں گے۔

فضا کو خراب کرنے میں سب سے زیادہ دخل اخبارات کو تھا، مگر اب وہی فضا کو صاف کرنے میں پیش پیش ہیں۔ جواہر لیاقت گفتگو کے آغاز ہی میں پاکستانی پریس نے گفتگو کی کامیابی کی دعائیں مانگی تھیں اور اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اب معاہدے کے بعد یہی نہیں کہ انھوں نے اپنے لب و لہجہ کو یک سر بدل دیا ہے بلکہ خود ہی اپنے اوپر ایسی سخت پابندیاں عاید کر لی ہیں جو کوئی بیرونی قوت عائد نہیں کر سکتی تھی۔ مدیران کی انجمنوں کی ایک سب کمیٹی نے اخبارات کے لئے گیارہ قاعدے بنائے ہیں اور ان پر پابندی کے ساتھ عمل کرنے کی تمام اخبارات سے درخواست کی ہے۔ ان قاعدوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"فرقہ وارانہ جھگڑوں کی خبریں نمایاں کر کے شائع نہ کی جائیں۔ صرف مصدقہ خبریں شائع کی جائیں اور ایجنسی کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ فرقہ وارانہ خبروں اور مسئلوں پر اور ہندوستانی رہنماؤں کے ایسے بیانات پر جو معاہدے کے خلاف ہوں، بہت احتیاط سے تنقید کی جائے۔ یہی اصول کارٹونوں، مزاحیہ کالموں، نظموں اور مراسلات میں بھی برتا جائے، ایسی خبریں چھپا کر یا کر کے شائع کی جائیں جن سے فرقہ وارانہ تعلقات بہتر ہو سکیں۔ فسادات پر تبصرہ کرتے وقت فساد کی ذمہ داری پورے فرقے پر نہ ڈالی جائے اور اگر کسی فرقے کا خاص طور پر ذکر کیا جائے، تو بہتر ہوگا۔ مختصر یہ کہ دونوں ملکوں کے مسائل پر قلم اُٹھاتے وقت انتہائی احتیاط اور ضبط سے کام لیا جائے اور تنقید میں ہمیشہ تعمیری پہلو سامنے رہے۔"

یہ اصول ایسے ہیں کہ اگر واقعی ہند اور پاکستان کے اخبارات ان کی مستقل طور پر پابندی کریں تو دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی دور ہو سکتی ہے اور پائدار دوستی کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ چند روز میں دونوں ملکوں کے اخبار نویسوں کی ایک مشترکہ کانفرنس دلی میں ہونے والی ہے۔ امید ہے کہ اس وقت جو فضا پیدا ہو گئی ہے اس کو قائم رکھنے میں یہ کانفرنس مفید ثابت ہوگی اور کراچی کے اخبار نویسوں کی طرح وہ اخبارات پر ایسی پابندیاں عاید کرے گی جس سے موجودہ فضا بگڑنے نہ پائے۔

بقیہ صفحہ ۶ پر

کشکول

اس میں شک نہیں کہ یونان کے حکیم بھی بڑے بے ڈھب ہوتے تھے۔ اب آپ دیکھئے کہ حکیم سقراط صاحب زہر کا پیالہ غٹ غٹ چڑھا گئے اور منہ بنانا تو درکنار ایک الائچی تک بھی تو نہ کھائی کہ ذرا منہ کا مزا ہی بدل جاتا۔ ایک ہمارے حکیم صاحبان ہیں کہ دوسروں کو تو زہر کے قدحے کے قدحے پلا دیں اور خود یہ حال کہ بخار کی شدت سے نزع کے عالم میں ہوں اور کوئی کہے کہ حضرت بسم اللہ گلوسے تازہ، شاہترہ چرائتہ، خیساندہ، جوشاندہ صاف نمودہ نوش فرمائیے تو سنتے ہی دم نکل جائے۔ خیر تو ہم آپ کو یونان کے ایک حکیم ارشمیدس کا قصہ سناتے ہیں جس نے سقراط سے بھی بڑھ کر جراءت حکیمانہ سے کام لیا۔

ہوا یہ کہ یونان میں ایک سنار تھا اور

ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں شادی جس کی نہیں ہوتی تھی کہیں

بھی شادی ہوتی کیسے۔ کپڑے کا تھا راشن اور جہیز کے لئے کچھ نہیں تو اکیس جوڑے تو ہونے ہی چاہئے تھے جو بلیک مارکیٹ سے اتنا کپڑا خریدنے کے لئے مع مبالغہ مارشل ہلڈ کی رقم درکار تھی اور وہ سنار کے مقدور سے باہر تھی۔ آخر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک بڑا خوب صورت سونے کا تاج بنایا جس میں سونا کم اور دوسرا زیادہ تھا وہ تاج بادشاہ کے پاس لے جاکر سنار نے یہ مصلوت آمیز دعوی کیا کہ وہ خالص کندن کا بنا ہوا ہے۔ بادشاہ تھا بہ کار خویش ہشیار۔ اس نے سوچا کہ اگر سنار کا دعوے مان لیا تو ساری مارشل ایڈ تاج کی قیمت میں چلی جائے گی۔ پھر کمیونسٹوں سے لڑنے کے لئے سامان جنگ کاہے سے خریدا جائے گا اور اگر نہ مانا تو ایسی خوب صورت چیز کو توڑ کر یا گلا کر دیکھنا پڑے گا۔ اس نے حکیم ارشمیدس کو بلا کر کہا "حکیم جی کوئی ایسی جگت لڑاؤ کہ تاج بھی صحیح سلامت رہے اور کھرے کھوٹے کا امتحان بھی ہو جائے"۔

اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ اس فکر میں حکیم جی کا کھانا پینا، سونا چھوٹ گیا مگر شکر ہے کہ نہانا نہیں چھوٹا۔ بہرحال ایک دن وہ ننگ دھڑنگ نہانے کے ٹب میں داخل ہوئے تو بس کچھ نہ پوچھئے ایک دم سے خیال آ گیا۔ ایک چھلانگ میں ٹب سے باہر آ کر بغیر کپڑے پہنے (گویا نئے ادب کے جامے میں) گھر سے نکل کھڑے ہوئے بےخودی کے عالم میں رقص فرماتے اور یہ نعرہ لگاتے چلے جاتے تھے۔

"ڈھونڈھ لی! ڈھونڈھ لی"!

اب یہ ستم دیکھئے لوگ اس مجذوبانہ حرکت کی تاویل کیسی کثیف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھرے ٹب میں بیٹھنے سے پانی جو چھلکا تو حکیم کا ذہن کثافت نوعی کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوگیا اور اسے یہ بات سوجھ گئی ہر دھات کی ایک مقررہ مقدار پانی کی ایک مقررہ مقدار کو چھلکائے گی۔ اور اگر تاج کو اور اس کے ہم وزن خالص سونے کو بھرے پانی کے پیالے میں ڈال کر ایک تجربہ کیا جائے تو اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے گا۔

بھلا اس کو کون مانے گا کہ ارشمیدس جیسا جید حکیم کثافت نوعی کے سیدھے سادے اصول کو دریافت کرنے کے لئے کئی دن دریائے فکر میں غوطے کھاتا رہا تو کچھ نتیجہ نہ نکلا اور ٹب میں بیٹھتے ہی بات کی تہ کو پہنچ گیا؟ اور پھر یہ کون سی ایسی بڑی بات تھی جس پر حکیم جی ریشہ خطمی ہوگئے؟

سچ یہ ہے غریب اگلے زمانے والے تاریخ کی معاشی تعبیر کیا جانیں، انھیں کیا خبر کہ ارشمیدس دراصل اس ادھیڑ بن میں تھا کہ راشن کے زمانے میں کپڑے کا مسئلہ جس کی وجہ سے سنار کو سونے میں ملاوٹ کرنی پڑی، کیسے حل ہو۔ آخر اس پر یہ القا ہوا کہ

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

یہ تھی وہ زبردست حقیقت جس کے ڈھونڈھ نکالنے پر ارشمیدس فخر و مسرت کے جوش میں آپے سے باہر ہوگیا، اور یہ محض مجذوبانہ حرکت نہ تھی بلکہ اس عالم بے عمل نے مسئلے کا مجسم حل بن کر دکھا دیا۔

غزل

فضا ابن فیضی اعظمی

آشفتہ خاطری کے مسائل لئے ہوئے
مجھ کو پھرا رہا ہے مرا دل لئے ہوئے

وہ آ رہا ہے قشقہ لگائے ہوئے کوئی
روشن جبیں پہ اک مہ کامل لئے ہوئے

مہر جمال ثبت رخ صاف و سادہ پر
اور لعل لب پہ ایک حسیں تل لئے ہوئے

ہر ذرہ برق طور شعاع جمال سے
سو ماہ ایک مہ کے مقابل لئے ہوئے

نشتر اٹھے ہوئے مژہ ہلائے ورائے
ابرو میں شان خنجر قاتل لئے ہوئے

آسودہ میکدوں کی گھٹا زلف تیرہ میں
چہرے پہ مہر و مہ کے شمائل لئے ہوئے

کس بانکپن سے ہے صف مژگاں جھکی ہوئی
سو تیر ایک دل کے مقابل لئے ہوئے

رفتار حشر خیز کا اللہ رے بانکپن
ہر ہر قدم میں فتنۂ قاتل لئے ہوئے

ان نرم نرم شانوں پہ زلفیں رکی ہوئی
موجوں کو جیسے گود میں ساحل لئے ہوئے

ساغر بہ کف ہیں آنکھ میں جلوے بہشت کے
ہونٹوں میں اک خموشی قاتل لئے ہوئے

سامان دلبری کا یہ رنگیں مجسمہ
پہلو ہزار دید کے قابل لئے ہوئے

وہ سانحہ ہے یاد مجھے آج تک فضا!
سینے میں زخم خوردہ ہوں اک دل لئے ہوئے

روایاتی شاعری

غلام ربانی تاباں

زندگی خواب نہیں بادہ سر جوش نہیں

رفعت بام فلک صرف نگاہوں کا فریب
کہکشاں جادۂ افکار گذر گاہ خیال
ذوق پرواز — المناک حقائق سے گریز
یہ تصوف کے مسائل یہ سریلے قوال
راہ میں کوہ بھی تھے، باغ بھی تھے، راغ بھی تھے
ذہن بھٹکتا ہی رہا نجد کے صحراؤں میں
ترا موضوع سخن ابرو و رخسار حبیب
زندگی کاٹ دی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
پھر وہ فولاد کی جھنکار فضاؤں میں گونجی
تیرے ہونٹوں پہ ہے الفت کا ترانہ اب تک
پھول جلتے ہیں گلستاں سے دھواں اٹھتا ہے
تو نہ بھولا گل و بلبل کا فسانہ اب تک

زیست ایک تلخ حقیقت ہے تجھے کیا معلوم
یہی دوزخ، یہی جنت ہے تجھے کیا معلوم

آزادی کی زنجیریں

ظفر حسن دریاباد کے ایک بگڑے ہوئے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا اس کے والد میر مظفر حسن پنشن کے بعد وطن واپس گئے تھے ۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا ۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اس کے استاد ماسٹر شیو دیال کے اصرار پر ظفر کے والد نے اسے الہ آباد کالج میں داخل کرا دیا تھا ۔ ظفر اور شیو دیال صاحب کا لڑکا ہر دیال الہ آباد میں اکرام احمد صاحب کے ہاں رہتے تھے جو شیو دیال کے شاگرد اور میر مظفر حسن کے دوست کے بیٹے تھے ۔ ظفر کو جب پڑھائی کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو وہ اپنی پھوپی کے ہاں گیا جو اس سے بہت محبت کرتی تھیں اور حسینہ کو دیکھا جو ایک بڑی حسین اور غیر معمولی نازنین بن چکی تھی ۔ فصلی بخار کے حملے سے اُٹھنے کے بعد ظفر کی پھوپی نے اس کو اور ہردیال کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا وہاں ان کی عبد اللطیف سے جو بہت وہ ایک بار نئے ادب کے حلقے میں مل چکے تھے پھر ملاقات ہوئی ۔

قسط ۱۶

ظفر اندر پہنچا تو برآمدے میں عقیلہ بیگم اسی جگہ جہاں اس نے انھیں پچھلی بار دیکھا تھا نواڑ کے پلنگ پر گاؤ تکیہ لگائے حقہ پی رہی تھیں ۔ حسینہ پائینتی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور گھٹنوں پر کوئی کتاب رکھے پڑھ رہی تھی ظفر اور لطیف کو دیکھ کر اس نے کتاب جلدی سے بند کر کے رکھ دی اور کھڑے ہو کر سلام کیا ۔ عقیلہ بیگم نے دونوں لڑکوں کو اپنے پاس بلا لیا ، بلائیں لیں اور کرسیوں پر جو ذرا دور رکھی تھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ انھوں نے ظفر سے کہا " بھیا تم نے ایسی غیریت برتی کہ بس حد کر دی ۔ غضب خدا کا ۔ پندرہ دن بخار آتا رہا اور خبر تک نہ دی ، میں تمہیں یہاں بلا کر رکھتی اور خود دیکھ بھال کرتی ۔ دیکھو تو بچہ کیسا زرد ہو رہا ہے بھلا وہاں پرائے گھر مردانے کارخانے میں کون بیمار کے کھانے پینے کا خیال کرتا ۔ اکرام ٹھہرا دوسرے کا نوکر ۔ اُسے اپنے کام سے فرصت نہ ملتی ہوگی ، رہا ہردیال وہ آپ لڑکا ہے ۔ اُسے نہ جانے کیا سمجھتے ہو ۔ دم بھر کی جدائی گوارا نہیں ۔ اسی لئے میں نے آج اُسے بھی بلا لیا کہ تم اس کے لئے نہ ہٹ کرو ۔"

ظفر ۔ جی نہیں ، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ، ہردیال تیمار داری ۔ کھانے پینے سب کا بہت اچھا انتظام تھا ، معمولی سے بخار کی اطلاع آپ کو کیا دیتا ۔ میں نے ابا جان کو بھی نہیں لکھا کہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے

عقیلہ بیگم ۔ لو اور سنو معمولی سا بخار تھا ، سوکھ کر کانٹا تو ہو گئے صاحبزادے اور فرماتے ہیں کہ معمولی سا تھا ۔ اب تم کچھ دن کے لئے نینی تال چلے جاؤ ، صاحب وہاں ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے ، پہاڑ کی ہوا سے کچھ طاقت آ جائے گی ۔

ظفر ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بالکل کمزور نہیں ہوں ، میرا وزن اتنا ہی ہو گیا ہے جتنا بخار سے پہلے تھا ، خوب کام کرتا ہوں ، ذرا نہیں تھکتا ۔

لطیف ۔ کہو حسینہ تمہاری طبیعت اب کیسی رہتی ہے ۔

حسینہ ۔ خدا کا شکر ہے ، اب تو بالکل اچھی ہوں ، آپ نے بڑی جلدی پوچھا ۔

لطیف ۔ کیا کروں ، فرصت ہی نہیں ملتی ، تمہارے نینی تال سے واپس آنے کے بعد ایک دن آیا تھا ، مگر تم اور پھوپی جان کہیں گئی ہوئی تھیں

عقیلہ بیگم ۔ اچھا تم اس دن آئے ہو گے جس دن ہم لوگ حمید الدین بیرسٹر کے ہاں گئے تھے ، بھئی اس دن بھی کیا کوفت ہوتی ہے ، حسینہ جا کے ریحانہ کے ساتھ کیرم کھیلنے بیٹھ گئی اور میں اکیلی بیگم حمید کی شیخیاں سننے کو رہ گئی ۔ دو گھنٹے تک عجیب حال رہا نہ ہنستے بنے نہ روتے بنے ۔ تم تو وہاں آتے جاتے ہو لطیف کبھی تمہیں بھی گھیر پاتی ہیں ، نوابوں ، گورنروں سے اپنی اور اپنے میاں کی دوستی کے قصے سنائے ۔

لطیف ۔ جی میں تو رفیع سے ملنے اکثر جاتا رہتا ہوں بیگم صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتی ہیں اپنے افسانے اور مضمون خود پڑھ کر سناتی ہیں ۔

عقیلہ بیگم ۔ ہاں تو تم جیسے پڑھے لکھوں کو لکھی ہوئی کہانیاں سناتی ہوں گی ، ہم جیسوں کو زبانی گھڑ کر سنا دیتی ہیں ، نہ جانے میاں غریب کو کیا کیا سننا پڑتا ہوگا ۔

لطیف ۔ بیرسٹر صاحب کے سامنے ذرا کم بات کرتی ہیں ۔ رفیع اور ریحانہ سے بھی خفا رہتی ہیں کہ یہ دونوں میری باتوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں ۔

عقیلہ بیگم ۔ تو یہ کہئے گھر میں کوئی ان کی داستان گوئی کا قدردان نہیں ۔ اس کی کسر ہم لوگوں سے نکلتی ہے مگر ہیں بڑی نیک اور محبت کی بیوی ، ان ہی ناقدرے میاں اور بچوں پر جان چھڑکنے کو تیار ہیں

ظفر اس درمیان میں یہ سوچتا رہا کہ حسینہ سے بات چیت کیسے شروع کرے ۔ وہ گھر سے یہ سوچ کر آیا کہ اس کی طبیعت کا حال پوچھے گا اور اس طرح صحت کے متعلق عام گفتگو چھڑ جائے گی ۔ مگر یہ سوال لطیف نے پہلے ہی کر دیا ۔ اب اس کا موقع نہیں رہا ۔ لطیف پر اسے رشک آ رہا تھا کہ نہ صرف عقیلہ بیگم سے بلکہ حسینہ سے اس بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے جیسے اپنے کسی ہم جماعت سے ۔ خود اس کے لئے لطیف کی موجودگی اور رکاوٹ بن گئی ۔ شاید عقیلہ بیگم کو اس کے خیالات کا کچھ اندازہ ہو گیا ۔ انھوں نے حسینہ سے کہا " بیٹا تمہیں اپنی فارسی کی کتاب میں جو پوچھنا تھا وہ ان دونوں سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں ۔" حسینہ اٹھ کر کتاب لینے چلی گئی تو عقیلہ بیگم ظفر سے مخاطب ہو کر بولیں " حسینہ نے ابھی تک فارسی نہیں پڑھی تھی ، بھائی نے بڑی تاکید سے صاحب کو لکھا کہ اسے فارسی ضرور پڑھوائیں اس لئے اب نویں درجے میں لے لی ہے ۔ ماسٹر جو گھر پر پڑھاتے ہیں بیمار ہو گئے ہیں ورنہ اور سب چیزیں یہ خود گھر پر پڑھ لیتی ہے مگر فارسی میں کہیں کہیں گاڑی رک جاتی ہے ۔ میں نے دو ایک کتابیں پڑھی تھیں ، مگر اب بھول گئی ۔ رہے صاحب تو وہ پڑھانے کے نام سے گھبراتے ہیں ، اور فرصت بھی نہیں ملتی ۔" لطیف نے ہنس کر کہا " پھوپی جان میں بھی سائنس کے چکر میں فارسی وارسی سب بھول گیا حسینہ کو جو کچھ پوچھنا ہے ظفر صاحب سے پوچھ لے کیونکہ میرے نہ پڑھوائیے نہیں تو بڑی بھد ہوگی ۔" حسینہ کتاب لے آئی تو عقیلہ بیگم نے کہا " ظفر میاں ادھر تخت پر بیٹھ کر پڑھا دو ۔ لطیف اتنی دیر مجھ سے باتیں کریں گے ۔"

ظفر دل میں بہت خوش ہوا کہ تقریب بہر ملاقات نکل آئی اور وہ بھی ایسی جس میں اُسے حسینہ کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ کرنے اور اس سے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانے کا موقع ملے گا ۔ حسینہ کو گلستاں کے انتخاب میں بعض لفظوں اور ترکیبوں کے معنی پوچھنے تھے اور دو حکایتیں پڑھنی تھیں ۔ ظفر نے دیکھا کہ اس میں غیر معمولی ذہانت اور فراست ہے ۔ فارسی کو نیا مضمون سمجھ کر جھجکتی ہے ورنہ حقیقت میں اسے کسی مدد کی ضرورت نہیں ۔ عبارت کو صحیح تلفظ کے ساتھ سمجھ کر پڑھتی ہے اور اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعدی کے اسلوب بیان کے " ساختہ بے ساختہ پن " اور لطیف شوخیوں سے لطف اُٹھاتی ہے ۔ سبق ۲۰ ، ۲۵ منٹ میں ختم ہو گیا مگر ظفر نے لطیف حکایت کو دراز تر کرنے کے لئے کہا " تم تو خود فارسی کی خاصی مشکل عبارت اچھی طرح سمجھ لیتی ہو ، دو چار لفظوں کے معنی پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ لغت میں دیکھ سکتی ہو ، انھیں کسی سے پڑھنے کی کیا ضرورت ۔" حسینہ کے چہرے پر خوشی اور حجاب کی ہلکی سی سرخی دوڑ گئی " ظفر بھیا ، میں پڑھ تو لیتی ہوں اور سمجھ بھی لیتی ہوں ، مگر یقین نہیں ہوتا کہ ٹھیک ہے ۔" ظفر کو " بھیا " کے لفظ سے ایک دھچکا سا لگا ۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی یہ مشکل حل ہو گئی کہ حسینہ سے کس قسم کا برتاؤ کرے ۔ اب ظفر کو اپنی راہ صاف نظر آنے لگی اس نے مربیانہ انداز میں کہا " معلوم ہوتا ہے تمہارے لئے خواہ مخواہ پرائیوٹ ٹیوٹر رکھ کر سہارا لینے کی عادت ڈال دی گئی ہے ورنہ کم سے کم فارسی میں تو تم بغیر کسی کی مدد کے اچھی طرح کام چلا سکتی ہو ۔ غالباً تمہاری اردو بہت اچھی ہوگی ، اسی لئے فارسی اتنی جلدی قابو میں آ گئی ۔" اب کی بار حسینہ کے دل میں فخر کا جذبہ حجاب پر غالب آ گیا اور اس نے مسکرا کر کہا " اردو میں تو میں مڈل کے امتحان میں سارے صوبے میں اول آئی ہوں ۔" " شاباش ! اور مضامین میں کیسے نمبر تھے ۔" " سب میں اول درجے کے نمبر تھے لڑکیوں میں میری پوزیشن تیسری ، اور سب امیدواروں میں پانچویں تھی ۔"

ظفر تحسین و آفریں کے اور جملے کہنے والا تھا کہ اتنے میں باہر سے ملازم نے ماما کو آواز دے کر کہا " میاں پوچھتے ہیں کھانے میں کیا دیر ہے ۔" عقیلہ بیگم نے پلنگ

سے لطیف ہوئے کہا لطیف تم اور ظفر صاحب اور ہر دیال دونوں کو لے کر پانچ منٹ میں کھانے کے کمرے میں پہنچ جاؤ، میں کھانا لگواتی ہوں۔

کھانا دو قسم کا تھا۔ صفدر علی صاحب کے لئے سادہ انگریزی کھانا اور مہمانوں کے لئے خاصا پر تکلف ہندوستانی کھانا۔ صفدر علی صاحب نے ہر دیال سے کہا "تم ترکاری کھاتے ہوگے۔ سادہ پسند ہو تو میرے کھانے میں سے لو۔ مسالے دار کا شوق ہو تو ادھر سے لیجئے ترکاری آئی ہیں۔"

ہر دیال۔ جی مجھے ترکاری سے پرہیز نہیں، ضرور کھاؤں گا۔ دونوں قسم کی۔

لطیف۔ ہر دیال صاحب آپ کو کرکٹ سے بھی کچھ شوق ہے۔

ہر دیال۔ بہت، مگر دیکھنے کا۔ کھیلنا نہیں آتا۔

ظفر۔ یہ اکھاڑے کے استاد نہیں، منڈیر کے استاد ہیں، بڑے بڑے کھلاڑیوں پر اس طرح تنقید کرتے ہیں جیسے انھیں کے سکھائے ہوئے ہیں۔

ہر دیال۔ ہونہہ۔ کرکٹ کے کھلاڑی کیا چیز ہیں ہم لوگ تو اپنے ملک کے بلکہ دنیا بھر کے سیاسی لیڈروں کی اس طرح چتھاڑ کرتے ہیں جس طرح ہمارے سامنے طفل مکتب ہوں۔

لطیف۔ بس اب دو چار روز میں کرکٹ ٹورنامنٹ شروع ہونے والا ہے۔ اب کی بار دور دور سے ٹیمیں آ رہی ہیں۔ پنجاب، بمبئی اور کاٹھیاواڑ کی ٹیموں کا کھیل عمر میں پہلی بار دیکھنے میں آئے گا۔ بڑا لطف رہے گا (صفدر علی صاحب سے) چچا جان آپ تو ضرور دیکھیں گے۔ میرے خیال میں آپ خود ایک زمانے میں کرکٹ کھیلتے تھے۔

صفدر علی۔ میں علی گڈھ میں فرسٹ الیون میں تھا مگر میرا خاص کھیل فٹ بال تھا۔ تین سال فٹ بال کیپٹن رہا۔ میرے زمانے میں کالج میں فٹ بال کا بھی قریب قریب اتنا ہی زور ہو گیا تھا جتنا کرکٹ کا۔ مگر یہ پرانے قصے ہیں۔ اب تو ٹینس کے سوا سب کھیل چھوٹ گئے۔ ٹورنامنٹ دیکھنے کو جی تو بہت چاہتا ہے مجھے اس کی میٹنگ میں رکھ دیا ہے مگر اتنی فرصت کہاں کہ سب میچ دیکھ سکوں۔ سیمی فائنل اور فائنل دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

ہر دیال۔ دیکھیں انگریزوں کے جانے کے بعد کرکٹ، ہاکی، فٹ بال ہمارے ملک میں رہتے ہیں یا اُن کی جگہ کبڈی، گلی ڈنڈے کا زور ہوتا ہے۔

صفدر علی۔ کیا افیمیوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں کے جانے کا کیا ذکر ہے۔

ہر دیال۔ جی افیمیوں کو آپ کیا سمجھتے ہیں، بڑے پہنچے ہوئے لوگ ہیں، ایک پینک میں چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

صفدر علی۔ اب پراونشل آٹانومی مل رہی ہے، بچاس برس تو اس کے سنبھالنے کے لئے چاہئیں، دیکھئے کیسی جوتی پیزار ہوتی ہے۔

لطیف۔ یہی جوتی پیزار تو زندگی کی علامت ہے۔ انقلاب کے لئے زمین تیار ہو رہی ہے۔

ہر دیال۔ یار کہیں ایک دم سے کل نہ چلا دینا، تمھاری تو زمین تیار ہوگی ہم کیچوؤں کی طرح کٹ کر رہ جائیں گے۔

صفدر علی۔ بھئی کھانے کے وقت کیا ذکر چھیڑ دیا۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ لطیف کہ امتحان کی تیاری کیسی ہے؟

لطیف۔ فزکس میں مشکل پڑ رہی ہے خصوصاً کیمسٹری سے بہت جی گھبراتا ہے۔

صفدر علی۔ کیا خوب اگر یہ حال ہے تو آپ رڑکی کے کمپٹیشن میں کیا کریں گے۔

لطیف۔ دیکھئے پہلے بی۔ ایس۔ سی کا مرحلہ تو طے ہو۔ اس میں نکل گیا تو کمپٹیشن میں مر پڑ کے آ ہی جاؤں گا۔

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، اور ادھر ظفر یہ سوچ رہا تھا کہ آج صفدر علی صاحب کا برتاؤ میرے ساتھ کچھ بے رخی کا ہے یا یہ محض میرا وہم ہے۔ دراصل لطیف کو اس گھر میں اس قدر بے تکلف دیکھ کر اس کے دل میں ایک مبہم سی خلش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ لطیف صفدر علی صاحب کا بھتیجا ہے اس لئے قدرتی طور پر انھیں اس سے زیادہ تعلق ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بیوی کے بھتیجے کو بالکل نظر انداز کر دیں۔

کھانا ختم ہو گیا اور چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ملازم نے آ کر ہر دیال سے کہا کہ بیوی آپ کو اوٹ کے پاس بلا رہی ہیں۔ ہر دیال تعجب اور تامل کے ساتھ نوکر کے پیچھے پیچھے گیا اور کیلی ہی کے سرے پر اوٹ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے آواز آئی "کیا ہر دیال آ گئے؟"

ہر دیال۔ جی میں حاضر ہوں، آداب عرض ہے۔

عقیلہ بیگم۔ جیتے رہو بھیا، تم تو مجھے کیا جانتے ہوگے مگر ماسٹر صاحب سے پوچھنا کہ ہمارے تمھارے خاندان میں مردوں کے علاوہ عورتوں میں آپس میں کیسا پیار محبت کا برتاؤ تھا۔ تمھاری دادی نے مجھے گودوں کھلایا ہے اور تمھارے دادا نے بھی ہم لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جیسے کوئی سگی اولاد سے کرتا ہے۔ میرا دل بہت خوش ہوا کہ لڑکو بھائی صاحب نے تمھارے ساتھ رکھا ہے۔ میں نے انھیں شکایت کا خط لکھا تھا کہ آپ نے ظفر کو اپنا گھر چھوڑ کر غیر جگہ ٹھہرایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ظفر کو اس کے بڑے بھائی کے سپرد کر دیا ہے اور اس لڑکے کی سمجھ بوجھ پر مجھے اتنا ہی بھروسا ہے جتنا مجھے اپنے اوپر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں بھائی آٹھویں، پندرھویں یہاں آتے رہو تاکہ مجھے تمھاری خیریت معلوم ہوتی رہے، تم دونوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف مجھ سے کہلا بھیجنا۔ ظفر اس قدر جھینپو ہے کہ اس سے کہنا بے کار ہے تم سے کہتی ہوں کہ خبردار میرے ہوتے ہوئے کسی طرح کی تکلیف نہ اٹھانا۔

ہر دیال۔ آپ اطمینان رکھئے۔ میں تکلف بالکل نہیں کرتا، اور پھر اپنی پھپی کے ساتھ تکلف کروں گا۔ ظفر تو بے وقوف ہیں، ان کا بس چلے تو مجھ سے بھی اپنی تکلیف اور ضرورت کو چھپائیں۔ میں برابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو عرض کر دوں گا۔

عقیلہ بیگم۔ شاباش بھیا، تم سے مجھے یہی امید تھی۔ اچھا تم جاؤ، ظفر سے کہہ دینا کہ میرے پاس ہو کر جائے۔

ہر دیال ڈرائنگ روم میں پہنچا تو لطیف اور ظفر نے ایک ساتھ صفدر علی صاحب سے جانے کی اجازت مانگی انھوں نے کہا کہ اندر جا کر رخصت ہو آؤ۔ ہر دیال یہ دیکھ کر صفدر علی صاحب کچھ چپ چپ ہیں، دیوار کے قریب ایک گروپ کی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں صفدر علی صاحب فٹ بال ٹیم کے ساتھ تقسیم انعامات کے جلسے میں ایک انگریز کے ہاتھ سے کپ لے رہے تھے۔ صفدر علی صاحب لپک کر اس کے پاس پہنچے اور بڑے جوش کے ساتھ اس گروپ کی تفصیلات سمجھانے لگے۔ اتنی دیر میں لطیف اور ظفر اندر سے آ گئے اور صفدر علی صاحب نے انھیں اپنی کار میں رخصت کر دیا

(باقی آئندہ)

پچھلا ہفتہ (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

یروشلم کا بین اقوامی انتظام؟

عرب اور اسرائیل میں عارضی سمجھوتے ہوئے کافی مدت گذر چکی ہے مگر ابھی تک مستقل صلح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی اور فلسطین کے مسئلے جوں کے توں پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت سب سے زیادہ اختلافی مسئلہ یروشلم کے انتظام اور عرب مہاجرین کو دوبارہ آباد کرنے کا ہے۔ یروشلم کے شہر کو یو، این، او نے بین اقوامی انتظام میں لینے کا فیصلہ کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فیصلے کو نافذ کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ مگر اسرائیل اور شرق اردن جو آدھے آدھے شہر پر قابض ہیں اس کی شدت سے مخالفت کر رہے ہیں۔ عرب لیگ اس اسکیم کو اس شرط پر ماننے کے لئے تیار ہے کہ آئین میں اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ عربوں اور یہودیوں کی آبادی کا تناسب وہی ہوگا جو نومبر ۱۹۴۷ء میں تھا یعنی برطانوی انتداب ختم ہونے سے چھ مہینے پہلے (دسمبر ۴۷ء میں یہودیوں کی تعداد ایک لاکھ اور عربوں کی دس ہزار تھی) اور جو لوگ فلسطین کی قومیت اختیار کریں انھیں شہریت کے تمام حقوق مساوی طور پر حاصل ہوں اور ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء تک جو زرعی اراضیاں اور مکانات جن لوگوں کے قبضے میں تھے، وہ بجنسہ انھیں کے قبضے میں ہیں۔

چند روز ہوئے ایڈمیرل نمٹز نے یروشلم کے بین اقوامی انتظام کی مخالفت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکے گی اور اقوام متحدہ کی جو تھوڑی بہت ساکھ اس وقت دنیا میں ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کا صرف یہی حل ہے وہ یہ کہ دنیا کی رائے عامہ کا اثر اور زور ڈال کر دونوں فریقوں میں سمجھوتا کرا دیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس میں شبہہ نہیں کہ رائے عامہ کا اثر دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

روماں رولاں

بنارسی داس چترویدی

مترجمہ محمد عظیم فیروز آبادی

(۳)

روماں رولاں کے تین نوازش نامے میرے پاس محفوظ ہیں اور میں انھیں اپنا بیش بہا ذخیرہ تصور کرتا ہوں میں نے اُن سے پوچھا تھا کیا اہنسا پر آپ کا عقیدہ کچھ متزلزل ہو رہا ہے اس کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا "جادہ جہد کے پندرہ برس" نامی کتاب سے جو پیرس میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اہنسا سے متعلق میرے خیالات کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ اہنسا اس وقت تک صحیح معنوں میں مؤثر نہیں بن سکتا جب تک کہ کسی پورے ملک کا اس پر محکم یقین نہ ہو۔ یورپ میں معدودے چند اشخاص کو چھوڑ کر اور تمام لوگ اہنسا پر بھروسا نہیں کرتے۔ ایسی حالت میں جنگ و جدال کے موقع پر اہنسا کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا اہنسا کی بے اثری تو ثابت ہوگی ہی لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ موجودہ حالت میں یورپ کے عوام سے اہنسا کے ذریعے کسی بڑی قربانی کی توقع رکھنا ایک غیر اخلاقی فعل ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں وہ قربانی بے مقصد اور صداقت سے خالی ہوگی۔ اس لئے میں مغرب سے یہی کہتا ہوں کہ جب وقت آئے تو وحشی، بربری اور دوسروں کو غلام بنانے والی فسطائی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو ——— اپنی بھرپور طاقت سے، کیونکہ فسطائیت ہماری ساری تہذیب کو فنا کر دینا چاہتی ہے۔"

روماں رولاں کے فلسفہ حیات کو جاننے کے لئے ان کے تمام ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا، میں خدا کے شخصی وجود کا قائل نہیں ہوں خاص کر قاہر و جابر خدا کا۔ لیکن میں مانتا ہوں کہ جو کچھ موجود ہے رنج و راحت میں ہے، اور زندگی کے مختلف مظاہر کائنات اور ماورا کائنات میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہر آن نئی تخلیق ہو رہی ہے اور دھرم تو کبھی بوڑھا ہوتا ہی نہیں، پیہم عمل اور مسلسل جدوجہد کا ہی نام دھرم ہے، وہ بہتا ہوا چشمہ ہے، نہ کہ کوئی محدود تالاب۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا "آپ نے مجھ سے پوچھا ہے تکالیف میں کون سی چیز میری تسکین کا باعث ہوتی ہے میں عرض کروں گا ——— زندگی کی وہ رو جس سے میری روح لبریز ہے۔ جو ہر آن مجھے جدت کے سانچے میں ڈھال رہی ہے جو مجھ سے بلند و برتر ہے اور آفاقیت کا ایک جزو ہے۔ اپنی جوانی سے کر اب تک میرا کوئی دن ایسا نہیں گذرا جب میں نے کائنات کے ساتھ اپنے مسلسل تعلق کو نہ محسوس کیا ہو۔"

روماں رولاں بڑے بلند شخصیت کے مالک تھے اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو رابندر ناتھ ٹیگور ان سے برتر ادیب ثابت ہوں گے۔ لیکن وہ ویاس اور کالیداس کے پیرو تھے۔ جہاں تک ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دینے کا سوال ہے، روماں رولاں اُن سے کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔ دنیا میں جہاں کہیں بے انصافی ہوئی خواہ وہ ہندوستان میں ہو، اٹلی یا امریکہ میں ہو یا ہند چینی میں روماں رولاں اپنی آواز بلند کئے بغیر نہ رہتے، اپنی آخری سانس تک وہ رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ ساری دنیا کے شہری تھے، اور دنیا بھر کی تہذیبوں کو قریب تر لانے اور اس طرح آفاقی روح کی پوجا کرنے پر دل سے عقیدہ رکھتے تھے شکر گو الیار کے ایک طالب علم پر مانند پانڈے کو انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "عزیز پانڈیہ! تمھارے خط نے میرے قلب کو بہت متاثر کیا ہے۔ میرے ہندوستانی بھائی تم نے اپنی دوستی کا ہاتھ جو میری طرف بڑھایا ہے، اسے میں محبت سے قبول کرتا ہوں تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے دیس کے رشیوں سے اپنے آپ کو کسی قدر وابستہ سمجھتا ہوں۔ تم سب مغرب کے فن کاروں، مفکروں اور بڑی شخصیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے کام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لو۔ ہمیں ایک آفاقی روح پیدا کرنی ہوگی جو آج نا پید ہے، لیکن ایک دن پیدا ہو کر رہے گی۔"

مخلص روماں رولاں

روماں رولاں نے اپنی مشہور تصنیف جین کرسٹوفر میں ایک نہایت اہم جملہ لکھا ہے جسے ہر ادبی خادم کو اپنے کمرے میں آویزاں کر لینا چاہیئے۔

روز مرہ کی زندگی عوام کے سامنے پیش کرو۔ یہ زندگی سمندر سے بھی زیادہ گہری اور وسیع ہے۔ تم میں سے چھوٹے سے چھوٹا بھی اپنے اندر غیر محدود کو نہاں رکھتا ہے۔ ہر آدمی جس میں انسان بننے کی صلاحیت موجود ہے، لامحدودیت کا مرکز ہے، عاشق میں، دوست میں، اس عورت میں جو بچے کے جگمگاتے ہوئے پیدائشی دن کے لئے درد زہ کو برداشت کر لیتی ہے ہر اس مرد اور عورت میں جس کی زندگی ظلمت آلود ایثار کی زندگی ہے۔ جسے کبھی کوئی نہ جان سکے گا۔ ان سب میں لامحدود چھپا رہتا ہے۔ لامحدودیت ہی زندگی کی وہ رو ہے جو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جاری ہے، جو ایک سے دوسرے تک بہتی ہے، پھر لوٹتی ہے اور اس طرح اپنے دائرے کو پورا کرتی ہے ان معمولی انسانوں میں سے کسی ایک کی زندگی کو پیش کرو، اس کے پے بہ پے آنے والے دنوں اور اس کی خاموش راتوں کی کہانی لکھو۔ دن اور راتوں کی جو اپنی آمد میں یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور روز ازل سے ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ زندگی کے متعلق تمھارا انداز بیان سادہ ہونا چاہیئے۔ اتنا ہی سادہ جتنا کہ خود زندگی کا ارتقا ہے۔ الفاظ و اسالیب اور بے معنی کاوش پر جس میں آج کے فن کاروں کی طاقت ضائع ہو رہی ہے اپنی قوت متخیلہ کو برباد نہ کرو۔ چونکہ تم عوام کو مخاطب کرتے ہو اس لئے عوام کی ہی زبان استعمال کرو، کوئی لفظ بذات خود فصیح ہوتا ہے اور نہ غیر فصیح، اور نہ کوئی اسلوب تمام تر غیر موزوں۔ الفاظ و اسالیب کی دو ہی اقسام ہیں ایک وہ جو کچھ انھیں کہنا ہے، ٹھیک ٹھیک کہہ دیتی ہیں اور دوسری وہ جو اسے نہیں کہتی۔ تم کو جو کچھ محسوس کرنا ہے وہی محسوس کرو۔ اپنی تصانیف کو قلب کی موسیقی سے معمور ہونے دو۔ روح ہی اسلوب ہے۔

اگرچہ روماں رولاں اپنی آخری عمر میں سوویٹ روس اور کمیونزم کے حامی بن گئے تھے تاہم وہ انتہا پسندی سے کوسوں دور تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر آدمی حقیقت کا خود ہی تجربہ کرے اور جو لوگ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے میں فلاح سمجھتے ہیں اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا بھر کی بیماریوں کا اکسیر علاج صرف ہمارے ہی پاس ہے۔ وہ دراصل انتہا پسند ہیں خواہ وہ گاندھی کے پیرو ہوں یا کمیونسٹ ہوں اور دنیا کو سب سے زیادہ خطرہ ان ہی انتہا پسندوں سے ہے۔

روماں رولاں نے اپنے ایک مضمون (ٹالسٹائے ایک آزاد روح) میں لکھا تھا، اپنا راستہ خود نہ سفر کر کے دوسروں کی رہنمائی میں چلنا بڑا آسان کام ہے۔ لیکن یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس فیصلے کا بار دوسروں پر نہ ڈالیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر۔ خواہ ہمارے رہنما کتنے ہی قابل احترام اور ہر دل عزیز کیوں نہ ہوں۔ ہمیں اپنے سوال کو خود ہی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر ضرورت ہو تو انتہائی استقلال اور مستعدی سے اپنی جستجو میں لگے رہنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنی محنت سے نصف حقیقت کو بھی پا لیا تو وہ دوسروں کی بتائی ہوئی حقیقت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوگی۔ دوسروں کی تلاش کی ہوئی حقیقت تو طوطوں کی رٹ کے مانند ہے۔ وہ حقیقت دراصل فریب ہے جسے آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جائے۔ جسے عقیدت مندی سے سر تسلیم خم کر کے غلاموں کی طرح مان لیا جائے سیدھے کھڑے ہو، آنکھیں کھولو اور چاروں طرف دیکھو، بے خوف بنو۔ اور نسی بھی حقیقت جو تم خود اپنی محنت سے حاصل کرو گے وہ تمھارے لئے روشنی کا

ستارہ کا کام دے گی۔ ضرورت اس کی نہیں ہے کہ تم علم کی کثیر دولت فراہم کر لو بلکہ تھوڑا بہت جو کچھ علم تمھیں حاصل ہو وہ خود انسانی ہو جسے تم نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور بڑھایا ہو۔ روح کی آزادی ہی سب سے بیش بہا خزانہ ہے۔"

ہر زندہ ادبی خادم اور ترقی پسند فن کار کے سامنے کبھی نہ کبھی یہ سوال ضرور آتا ہے: آیا میں اپنے چاروں طرف کی ناگفتہ بہ حالت کو سدھارنے کے لئے ادب یا ادبی حلقوں کو چھوڑ کر سماجی خدمت میں لگ جاؤں یا نہیں؟ پرنس کروپاٹکن کی جوان عمری میں یہی سوال ان کے ذہن میں اُٹھا تھا اور انھوں نے اپنی انتہائی علمی زندگی کو سماج کی قربان گاہ پر چڑھا کر ایک انقلابی کی زندگی اختیار کر لی تھی، لیکن اس کے برعکس رومان رولاں کا یہ خیال تھا کہ ہمیں اپنے وقت اور طاقت کو ادبی خدمت میں لگانے کے بعد صرف بچے ہوئے وقت میں سماج کی خدمت کرنی چاہئے۔ جب دلیپ کمار رائے نے اپنے قلبی ہیجانات کے بارے میں انھیں لکھا تھا تو انھوں نے دلیپ کمار کو یہی مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنے دونوں رجحانات میں توازن پیدا کیجئے۔ انھوں نے دورانِ گفتگو میں دلیپ کمار سے کہا تھا "آخرکار ہم اس سوال سے نہیں بچ سکتے کہ فن کار کو کرنا کیا چاہئے؟ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک بہتر نظام کی تعمیر ہونی چاہئے اور وہ نظام جس قدر جلد قائم کیا جائے اسی قدر بہتر ہے آج انسانی سماج تہذیب کے ان اچھے اثرات سے محروم ہے جو روحانی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہی اصلی بیماری ہے۔ جہاں تک اس بیماری کی تشخیص کا سوال ہے۔ ہم سب متفق ہیں لیکن اصل اختلاف علاج کے بارے میں ہے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ اپنی تمام زندگی سے میں نے ایک ہی بات سیکھی ہے اور وہ یہ کہ ہر فن کار یا پیشہ ور ادیب کا سب سے پہلا اور ادبی فرض یہی ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر صداقت اور مستعدی سے عمل کرے، اپنی داخلی بصیرت کو نہ بجھنے دے، اپنی صلاحیت اور رجحان کے بموجب تخلیقی کام کرے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو وقت اور طاقت باقی رہے اس کا استعمال وہ سماجی کاموں میں کر سکتا ہے۔ جرمنی کے شاعرِ اعظم گوئٹے اس طریقے پر کاربند تھے جب اپنے ادبی شغل میں انھیں کچھ تھکن محسوس ہوتی تو وہ سماجی کاموں میں لگ جاتے لیکن ایک بار جب ان کی فکر بیدار ہو جاتی تو ان کے لئے دوسرا کام کرنا ناممکن ہو جاتا۔"

رومان رولاں نے خود مندرجہ بالا مشورہ کے بموجب کام کیا تھا۔ اپنی پندرہ سالہ مسلسل محنت سے لکھی ہوئی جین کرسٹوفر پر انھیں ایک لاکھ بیس ہزار کا جو انعام ملا تھا اُسے انھوں نے ریڈ کراس سوسائٹی کو دے دیا تھا اور جنگِ عظیم کے دنوں میں ڈیڑھ سال تک وہ سوئزرلینڈ کی ریڈ کراس سوسائٹی کے ماتحت چھ سات گھنٹے روزانہ کام کیا کرتے تھے۔ ان کا کام خطوط کو فائل کرنا اور ان کے جوابات لکھنا تھا۔ مختلف ملکوں کے جنگ میں گم شدہ سپاہیوں کے گھر والوں تک ان کی خبر پہنچانے کے لئے ان کو لاکھوں ہی خطوط لکھنے پڑتے تھے۔ جب جنگی میدان میں سپاہی ایک دوسرے کو مہلک زخم لگا رہے تھے یا انھیں موت کے گھاٹ اُتار رہے تھے تو سارے جہاں کا درد محسوس کرنے والے رومان رولاں اپنے اس کام میں لگے ہوئے تھے۔

رومان رولاں نے ایک جگہ لکھا ہے "جب تک کسی فن کار میں دوسروں کی مدد کرنے کی طاقت موجود ہے اس وقت تک اُسے دوسروں کی خدمت سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔

پچھلی جنگِ عظیم میں رومان رولاں جنگی قیدی بنائے گئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے کیا کیا لکھا اس کا ہمیں پوری طرح علم نہیں۔ اگرچہ ان کی تمام زندگی ہی بے انصافی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں گذری۔ تاہم علم کی دیوی کی پوجا وہ برابر کرتے رہے۔ رومان رولاں سے کسی نے پوچھا تھا آپ کس کے لئے لکھتے ہیں؟ اس کا جواب انھوں نے ان الفاظ میں دیا تھا:

"میں کس کے لئے لکھتا ہوں ———

ان کے لئے جو بڑھتی ہوئی فوج کے ہراول ہیں۔ ان کے لئے جو عظیم بین الاقوامی جنگ میں پیش پیش ہیں۔ اس جنگ میں جس میں کامیابی کے معنی ہوں گے غیر محدود اور غیر طبقاتی سماج کی تعمیر۔ کمیونزم ہی آج وہ عالم گیر سماجی تحریک ہے جو بغیر کسی ہچکچاہٹ یا جھجک کے اپنے جھنڈے کو آگے بڑھا رہی ہے اور صحیح فکر اور جوش و جذبہ کے ساتھ بلند پہاڑوں کو ختم کرنے پر آمادہ ہے، باقی فوج اس کے پیچھے آئے گی، خواہ اس میں سے کچھ لوگ منتشر دکھا جائیں یا فوج کو کئی بار پیچھے ہٹنا پڑے ہمیں ہراول اس سست عناصر کو تیز چلنے کی ترغیب دینی چاہئے۔ ان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ وہ ہمیں پکڑ لیں۔ بڑھنے والا اچھا ہرگز نہیں رُکتا۔"

رومان رولاں کی زندگی ہر خادم ادب کے لئے سبق آموز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کی تقلید میں ہم بھی کمیونزم کے حامی بن جائیں، ہاں اگر کسی کا عقیدہ ہی یہ ہو تو کچھ مضائقہ بھی نہیں۔ البتہ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے ملک کی موجودہ حالت پر نظر کر کے ہم بھی جد و جہد کی زندگی گذاریں۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ ہر وہ خادم ادب جو دنیا کے ترقی پسندانہ دھارے سے اپنے آپ کو الگ رکھے گا وہ اپنے آپ کو مردہ اور نامرد بنالے گا، اور جو ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانے میں جھجکے گا وہ اپنی موت کو آپ دعوت دے گا۔ ادبی خدمت ایک ریاضت ہے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنا ہمیشہ بیدار رہنا حقیقت کی تلاش میں رہنا اور اپنے تاثرات اور احساسات کو عوام کے سامنے پیش کرنا اسی کا طریقہ کار ہے۔

ادبی بھکشو رومان رولاں کی زندگی کا یہی پیغام ہے۔

براہِ کرم

خط لکھتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھا کیجئے۔ (منیجر)

سوشل ایجوکیشن جموں و کشمیر

رگھوناتھ مٹو

یکم کاتک سنہ ۲۰۰۶ بکرمی سے ریاست جموں و کشمیر میں بالغوں کی تعلیم و تربیت کے لئے چالیس سماجی مرکز قائم ہوئے ہیں جن میں سے بیس صوبہ جموں میں ہیں اور بیس صوبہ کشمیر میں۔ ان مرکزوں میں اس وقت ۱۲۲۲ ان پڑھ بالغ زیرِ تربیت ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مرکز ایسے ہیں جو کالج کے لڑکوں اور استادوں نے دیش سیوا کے جذبے کے ماتحت جاری کئے ہیں۔ ان مرکزوں میں رات کے چھ بجے سے آٹھ بجے تک کام ہوا کرتا ہے بعض مقامات پر مقامی حالات یا مقامی لوگوں کے پیشوں کو مدنظر رکھ کر سات یا نو بجے رات تک کام ہوتا ہے یہ مرکز صرف ان پڑھوں کو پڑھانے کے لئے مخصوص ہیں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، بڑی جانچ پڑتال کے بعد اچھے اور سمجھدار کارکنوں کو اس کام پر مقرر کیا گیا ہے اور انہیں یہ کام شروع کرنے سے پہلے ہفتہ دس دن کے لئے جموں اور سری نگر میں بلا کر ایک مختصر سی ٹریننگ بھی دی گئی ہے۔ ان لوگوں کو اس کا بیس روپیہ ماہانہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کام کے لئے ایسے کارکنوں کو چنا گیا ہے جو اپنے گاؤں یا قصبے میں بارسوخ ہیں۔ اور سرکاری ملازم نہیں ہیں۔ کہیں کہیں پنشن یاب استادوں کو بھی مقرر کیا گیا ہے۔ جہاں اس قسم کے کارکن نہیں مل سکے۔ وہاں سرکاری اور نجی مدارس کے استادوں سے کام لیا جاتا ہے۔

مرکزوں میں کام شروع ہوتے ہی ہر کارکن نے اپنے اپنے مرکز کے گرد و نواح میں ان پڑھوں کا شمار بھی کیا عام طور پر یہ مرکز سرکاری مدرسوں کی عمارتوں میں ہیں جہاں روشنی اور دوسری ضروریات کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر جہاں سرکاری عمارتیں گاؤں یا قصبے کے ایک سرے پر واقع ہیں لوگوں نے اپنی سہولت کے لئے گاؤں یا قصبے کے عین وسط میں مکانات کرائے پر لئے ہیں اور ان کا کرایہ وہ اپنی گرہ سے ادا کرتے ہیں۔ یہ چالیس مرکز اپنے موجودہ مقامات پر بیساکھ سنہ ۲۰۰۷ کے آخر تک رہیں گے۔ یکم جیٹھ سنہ ۲۰۰۷ سے یہ سب مرکز قریب کی بستیوں میں جہاں آبادی گھنی ہو اور اوسطاً ۶۰ ان پڑھ بالغ مل سکیں منتقل کر دئے جائیں گے، موجودہ مقامات پر ان کی جگہ دوسرے مرکز کھولے جائیں گے جن کا نام کمیونٹی سنٹر ہوگا۔ ان میں کام کرنے والوں کو صرف دس روپے ماہوار معاوضہ دیا جائے گا۔ کاتک سنہ ۲۰۰۷ میں اس عمل کو پھر دوہرایا جائے گا۔ اس حساب سے کاتک سنہ ۲۰۰۸ بکرمی میں ان مرکزوں کی تعداد ساری ساری ریاست میں بیس ہو جائے گی۔

یہ بات خاص طور پر محسوس کی گئی ہے کہ شہر والوں اور بڑے بڑے قصبوں کی بہ نسبت ہمارے مرکز دیہات میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔

بعض مرکزوں میں بالغوں کے علاوہ گیارہ پندرہ سال تک کی عمر کے بچے بھی پڑھنے کو آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ یتیم ہیں یا گھر کا سارا بوجھ ان کے کندھوں پر ہے اور وہ دن بھر سڑکوں پر مزدوری کا کام کرتے ہیں یا دوکان داروں کے پاس نوکر ہیں۔

محکمۂ تعلیمات نے اس کام کے لئے خاص نگراں اور ان کے اوپر ایک چیف سپروائزر مقرر کیا ہے۔ یہ لوگ ان مرکزوں کا کام دیکھتے رہتے ہیں اور کارکنوں کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔ مرکزوں کی نگرانی کے ساتھ نفنٹ اسکولوں کا کام بھی دیکھتے ہیں جن کی تعداد ساری ریاست میں ۶۶ کے قریب ہے۔ ان کے خرچ کا بوجھ سرکاری خزانے پر نہیں پڑتا۔ البتہ ابتدائی اخراجات مثلاً صدیوں، تختیوں کھلونوں وغیرہ کے لئے ایک رقم دینی پڑتی ہے۔ خاص نگرانوں کے علاوہ محکمۂ تعلیم کے انسپکٹر اور اسسٹنٹ انسپکٹر بھی ان مرکزوں کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے محکمے کے افسروں سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ وہ بھی اپنے دوروں میں ان مرکزوں کو ملاحظہ فرماتے رہیں اور ان کی بہتری کے لئے مناسب تجاویز بھیجتے رہیں اور اپنے اپنے محکموں کے متعلق بالغوں کو پوری پوری واقفیت بہم پہنچاتے رہیں۔

ہر مرکز پر تختہ سیاہ، لالٹین، مٹی کا تیل، قلم، گانے بجانے کا سامان، ہفتہ وار ماہانہ اور روزانہ رسالے اور اخبارات، تھوڑی بہت کتابیں اور حرفوں کے متعلق تھوڑا تھوڑا سامان مہیا کیا گیا ہے۔

مرکزوں میں بالغ، ہندی، اردو اور پنجابی رسم الخط میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات سے خبریں سنائی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں ریڈیو کا انتظام ہو سکتا ہے۔ وہاں پر ریڈیو سے خبریں سنتے ہیں۔ اس وقت تک محکمۂ براڈ کاسٹنگ سے سات ریڈیو سیٹ سوشل سینٹروں کے لئے مہیا ہو سکے ہیں، اور باقی سینٹروں کے لئے بھی توقع کی جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ عام معلومات صحت و صفائی، شہریت، حب وطن، تاریخی حالات، اقتصادیات، سیاسیات، نظم و نسق اور "نیا کشمیر" وغیرہ کے موضوع پر تقریروں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

سال رواں اس اسکیم کے لئے ۴۶۰۰۰ روپے کا بجٹ تھا جس میں سے دوران سال دس ہزار کی کمی کی گئی تھی۔ اب آئندہ سال کے ۳۰۰۰۰ روپے کا بجٹ رکھا گیا ہے ✤

"روحِ کلامِ غالب"

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

چھاپی۔ تھوڑے دنوں بعد مولانا طفیل احمد مرحوم کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" شائع کی، اور اس کے فوراً بعد "روح روشن مستقبل" طبع کی۔ ہو سکتا ہے کہ نظامی پریس نے اور دوسری روحیں بھی شائع کی ہوں جو ہم نہ دیکھ سکے ہوں۔ بہر حال روحوں کی اشاعت کا یہ شوق بالکل انوکھا اور کامیاب ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "روح کلام غالب" سے بہترین غزلوں کا انتخاب کر کے اگر نظامی پریس روح الروح کلام غالب شائع کر دے تو یہ بہت مستحسن اقدام ہوگا ✤

بقیہ بہ سلسلہ صفحہ ۷

عرب لیگ کی شرط، اسرائیل کا انکار

حکومت اسرائیل نے عرب لیگ کی یہ شرطیں کہ فلسطین کے مہاجرین کو واپس بلا لیا جائے اور ان کے نقصانات کا معاوضہ دیا جائے، نامنظور کر دیں۔ اس لئے صلح کی گفتگو شروع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

حالی اردن شاہ عبد اللہ اسرائیل سے الگ سمجھوتا کرنے کی ایک مدت سے کوشش کر رہے ہیں، مگر بظاہر عرب لیگ کے تیور اور برطانیہ و امریکہ کی سرد مہری دیکھ کر دب گئے ہیں تاہم فلسطین کا جو حصہ ان کے قبضے میں ہے اس کے الحاق کا وہ اعلان کر رہے ہیں اس لئے ان میں اور عرب لیگ میں ان بن ہونا ضروری ہے۔ ادھر عرب لیگ نے حکومت اسرائیل پر براہ راست دباؤ ڈالنے کے لئے اقتصادی بائیکاٹ کے بندھن اور سخت کر دئے ہیں۔ غرض فلسطین کا معاملہ جو عارضی طور پر سدھر گیا تھا پھر بگڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور وہاں جنگ چھڑ جانے کا ۴ اچھا خاصا امکان ہے ✤ (ع۔ ل)

نئی روشنی

دہلی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

یکم مئی سنہ ۱۹۵۰ء

کیا آپ سرمایہ داری کی ذہنیت رکھتے ہیں؟		۲
پچھلا ہفتہ	ع ح ع ل	۳
بزم بے تکلف		۵
اقبال کا تبرک	اقبال	۵
بنگال	جگر مرادآبادی	۵
آزادی کی زنجیریں	(مسلسل ناول) ڈاکٹر سید عابد حسین	٦
خوشی کیا ہے؟	ذکیہ سیدین	۸
کردستان کا مسئلہ	«ناظر»	۱۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی

اڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

کیا آپ
سرمایہ داری ذہنیت رکھتے ہیں؟

آج دنیا میں کروڑوں آدمی سرمایہ داری نظام کو برا سمجھتے ہیں اور اسے بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس نظام کو پر تشدد انقلاب کے ذریعے ایک دم ختم کرنا چاہتے ہیں اور کچھ بے تشدد انقلاب کے ذریعے سے، آہستہ آہستہ۔ انقلاب کی راہ میں حائل اور رکاوٹیں ہیں ایک نفسیاتی رکاوٹ بھی ہے۔ ایک حد تک جبلت کی بنا پر مگر زیادہ تر رسم و عادت کی وجہ سے دولت اور املاک کے شوق نے ہمارے دلوں میں جڑ پکڑلی ہے یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو بظاہر ان چیزوں سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں باطن میں ان کے پرستار ہیں۔

ع ۔ ہیں سینے میں چھپ چھپ کر بنالیتی ہیں تصویریں

آئیے ہم آپ آج اس کا امتحان کریں کہ ہمارے اندر دولت اور ملکیت کا شوق یعنی سرمایہ داری ذہنیت کی جڑ کتنی ہے؟ ذیل کے سوالوں میں سے ہر ایک پر غور کرکے اس کا جواب "ہاں" یا "نہیں" دیتے جائیے ہر "ہاں" کے پانچ نمبر شمار کیجئے۔ سب سوالوں کا جواب دینے اور نمبروں کو جوڑنے کے بعد صفحہ ۔ پر اس امتحان کے پرچے کا حل ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ کیا آپ سے کوئی قرض مانگے تو آپ کو بہت ناگوار ہوتا ہے؟

۲۔ کیا آپ کے پاس بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنھیں آپ کبھی استعمال نہیں کرتے لیکن اس لئے رکھ چھوڑی ہیں کہ شاید کسی دن کام آ جائیں؟

۳۔ اگر آپ کے ہم سایے کوئی ایسی چیزیں خریدیں جو آپ کے پاس نہیں ہے تو کیا آپ کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک آپ بھی اس چیز کو حاصل نہ کرلیں؟

۴۔ آپ کسی دوکان پر جائیں یا نیلام میں شریک ہوں تو کیا ایسی چیزوں کو دیکھ کر پھسل پڑتے ہیں اور خرید لاتے ہیں جن پر خرچ بہت ہوتا ہے، مگر ان سے فائدہ کچھ نہیں ہوتا؟

۵۔ کیا آپ کے پاس بہت سے کپڑے ہیں جنھیں آپ کبھی نہیں پہنتے؟

۶۔ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کتابیں خرید لاتے ہیں مگر انھیں پڑھتے نہیں؟

۷۔ جب آپ تعطیل میں تفریح کے لئے جاتے ہیں تو اتنا سامان لے جاتے ہیں جو آپ خود آسانی سے نہیں اٹھا سکتے؟

۸۔ کیا چیزیں خریدتے وقت ان کی پائداری پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں؟

۹۔ کیا ایسے خرچ سے آپ کا دل دکھتا ہے جس کے بدلے میں کوئی چیز ہاتھ نہ آئے؟

۱۰۔ اگر کوئی شخص سُتلی کی گرہ کھولنے کی جگہ اُسے کاٹ ڈالے تو آپ کو بہت بُرا لگتا ہے؟

۱۱۔ کیا آپ کو ٹکٹ سکے وغیرہ جمع کرنے کا بہت شوق ہے؟

۱۲۔ کیا آپ بڑے دولت مند بننے کی خواہش رکھتے ہیں؟

۱۳۔ کیا آپ کے پاس اپنا ذاتی مکان ہے؟

۱۴۔ کیا آپ دوسروں کو اپنی املاک دکھا کر بہت خوش ہوتے ہیں؟

۱۵۔ اگر اتفاق سے کسی شخص کے ہاتھ سے کوئی معمولی سی چیز ٹوٹ جائے یا خراب ہو جائے تو کیا آپ ایک ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں؟

۱۶۔ اگر آپ کے گھر میں آگ لگ جائے اور آپ کا سب کچھ برباد ہو جائے تو آپ کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہو جائے گی؟

۱۷۔ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو تحفے دینے کے لئے چیزیں خریدیں اور خود رکھ لیں؟

۱۸۔ کیا آپ کو ایسی چیزیں جیسے فاؤنٹن پن یا گھڑی ایک سے زیادہ رکھنے کا شوق ہے؟

۱۹۔ کیا آپ اکثر دوکانوں کے سامنے کھڑے ہو کر رنگ برنگ چیزوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے ہیں؟

۲۰۔ کیا آپ کے پاس اپنی ساری املاک کی فہرست موجود ہے؟

نئی روشنی جلد ۴ نمبر ۱۷
یکم مئی ۵۰ء

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

صلح کے پینگ بڑھ رہے ہیں

وزیر اعظم جواہر لال نہرو ۲۶ اپریل کو کراچی پہنچے تو صرف پاکستان ہی کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ شہر کے عوام کی طرف سے بھی ان کا خاصا شاندار استقبال ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل پاکستان کو اب اس حقیقت کا احساس ہو گیا ہے کہ مہاتما گاندھی کے بعد دنیا کے سیاسی رہنماؤں میں ان کا کوئی ہمدرد اور بہی خواہ جواہر لال سے بڑھ کر نہیں ہے۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ سر چودھری ظفر اللہ صاحب پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ ان کے مغربی دوستوں کی تشکیکوں اور ریشہ دوانیوں سے پاکستان جس خواب غفلت میں رہا اس سے نقصان ہی نقصان ہوا، کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس لئے وہ بھی اب اسی پالیسی کی طرف جھک رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے جھگڑے باہمی گفت و شنید سے طے کر لیں۔ چنانچہ انھوں نے پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں کہا "اگر دونوں ملک کشمیر کے معاملے کو سیکیورٹی کونسل کے باہر باہمی سمجھوتے سے طے کرنا چاہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے"۔

اندازہ یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال اور لیاقت علی خاں صاحب میں کشمیر کے مسئلے پر دہلی میں سرسری گفتگو ہو چکی ہے اور کراچی میں زیادہ تفصیل سے ہوگی لیکن اگر ہم یہ توقع کریں کہ ان دونوں کی گفت و شنید سے کشمیر کا معاملہ فوراً طے ہو جائے گا تو شاید ہمیں مایوسی ہوگی۔ اگر اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلے کہ دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو جذبات سے الگ ہو کر عقل و مصلحت کی روشنی میں سمجھنے لگیں تب بھی بہت غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اس صورت میں یہ امید ہو سکتی ہے کہ سر اوون ڈکسن جو لیک سکسیس پہنچ چکے ہیں اور مئی کے وسط سے پہلے ہندوستان آ جائیں گے یہاں آ کر لوہے کو نرم پائیں گے اور سمجھوتے کی کڑیوں کو ملانے اور جوڑنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

منصوبہ بندی کی کانفرنس

۲۴ اور ۲۵ اپریل کو صدر کانگریس ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیہ نے نئی دہلی میں معاشی منصوبہ بندی کی کانفرنس منعقد کی جس میں ریاستوں کے وزیر اعظم اور کانگریس لیجسلیچر پارٹیوں کے صدر شریک تھے۔ اس کا مقصد فضول پنڈت جواہر لال نہرو کے پیش کردہ منصوبہ بندی کے بارے میں حکومت اور عوام میں پورا تعاون پیدا کرنا تھا۔ کانفرنس کی طرف سے ایک یادداشت مرتب کی گئی ہے جو نیشنل پلاننگ کمیشن کو بھیجی جائے گی۔ اس میں ان چھ امور کے بارے میں مفصل تجاویز پیش کی گئی ہیں:

(۱) غذا کے بیشتر مال اور استعمال کی چیزوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے اور زیادہ کوشش کی جائے اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ نتیجہ جلد سے جلد نکلے اور بے روزگاروں کی بڑی سے بڑی تعداد کو کام سے لگایا جا سکے۔

(۲) جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے مگر انھیں سرمایہ جمع کرنے کی عادت نہیں ہے ان کی ہمت افزائی کرنے کے لئے سارے ملک میں انجمنیں قائم کرنے کی ایک مہم رضاکارانہ طور پر شروع کی جائے گی۔

(۳) زرعی اور صنعتی مزدوروں کی کارکردگی بڑھانے کے لئے ان کی زندگی کے حالات کو بہتر بنایا جائے اور پیداوار کی ترقی کے لئے پرانے طرز کے کنٹرول جو بے سوچے سمجھے عائد کئے گئے ہیں ہٹا دئے جائیں۔

(۴) کاروبار میں سرمایہ لگانے کی اجازت معقول اصول کے مطابق دی جائے اور ایک امیدوار کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے کوئی مناسب معیار مقرر کیا جائے۔

(۵) درآمد اور برآمد کا کنٹرول ہماری قومی معیشت کے تقاضوں کے مطابق کیا جائے۔

(۶) سٹے بازی کی روک تھام کے لئے زیادہ سخت تدبیریں اختیار کی جائیں۔

ان تجویزوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ بڑے غور و فکر کے بعد مرتب کی گئی ہیں لیکن جیسا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی تقریر میں کہا "ہمارے ہاں منصوبوں کی کمی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ ہم ان کو عمل میں لانے کی سچے دل سے کوشش نہیں کرتے۔" سردار نے کانفرنس کو تنبیہ کیا کہ جو امن و امان ملک میں بڑی مشکل سے قائم ہوا ہے اس کی بنیاد بہت ناپائدار ہے اگر وہ معاشی مشکلات جن میں کروڑوں آدمی مبتلا ہیں جلد سے جلد حل نہ ہوئیں تو اس امن کا قائم رہنا قطعاً ناممکن ہے۔ انھوں نے کانفرنس سے اپیل کی، معاشی تدبیروں میں خصوصاً غلے کی پیداوار بڑھانے کی مہم میں حکومت کی مدد کرے۔ کانفرنس کی یادداشت سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ اسی مخلوط معیشت کو مانتی ہے جس پر حکومت کی موجودہ پالیسی مبنی ہے جس میں سرمایہ داری نظام کو حکومت کی نگرانی کے اندر باقی رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ ہمارے ملک میں حکومت کی نگرانی سرمایہ داروں کی بدعنوانیوں کو روکنے میں قطعاً ناکام رہی ہے اس لئے اچھا ہوتا کہ کانفرنس اپنا سارا وقت یادداشت کی ترتیب میں صرف کرنے کے بجائے اس کا کچھ حصہ اس بحث میں صرف کرتی کہ سٹہ بازی، چور بازاری اور دوسرے معاشی جرائم کو روکنے کے لئے عوام حکومت کی کیا مدد کر سکتے اور کیسے دے سکتے ہیں۔ تحریک آزادی کے زمانے میں ہمارے رہنما جو کام عوام سے لینا چاہتے تھے اس کی مفصل اور واضح ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ اب محض مبہم الفاظ میں اپیل کیا کرتے ہیں جس سے عوام الجھن میں پڑ جاتے ہیں اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کاش کانگریس کو صدارت کے لئے کوئی مرد کار مل جائے جو اس نازک زمانے میں عوام کو راہ عمل دکھلا سکے۔

ہندوستان کا تجارتی سمجھوتا

بنگال کے فرقہ وارانہ فساد کے جس کی بدولت ہندوستان پاکستان میں لڑائی چھڑتے چھڑتے رہ گئی بہت سے اسباب بتائے جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا سبب وہ معاشی بحران تھا جو دونوں بنگالوں کے درمیان تجارتی کاروبار بند ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ مشرقی بنگال کے بے شمار کسانوں کی زندگی جوٹ کی کاشت پر اور مغربی بنگال کے لاکھوں مزدوروں کی روزی جوٹ کی صنعت پر منحصر تھی۔ جب ہندوستان نے پاکستان سے جوٹ خریدنا چھوڑ دیا تو ان کسانوں اور مزدوروں میں سے بہت سے فاقوں مرنے لگے اور جوٹ کے آڑھتیوں اور کارخانوں کے مالکوں کے لئے بھی بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ پہلے اس معاشی بے چینی نے اشتراکی شورش کی شکل اختیار کی لیکن آگے چل کر فرقہ پرست مفسدوں نے بڑی آسانی سے اس کا رخ فرقہ وارانہ فساد کی طرف موڑ دیا۔

اس لئے صلح پسندوں کو یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کی جو تجارتی گفتگو اپریل کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں ہوئی تھی اس میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک عارضی سمجھوتہ آخر جولائی تک کے لئے ہو گیا جس کی رو سے ہند اور پاکستان میں ہندوستانی سکے کی بنیاد پر جوٹ اور دوسری ضروری اشیا کا لین دین ہوگا۔ باخبر حلقوں میں عام طور پر یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ بہت جلد دونوں ملکوں میں مستقل اور مکمل تجارتی معاہدہ ہو جائے گا۔ بہرحال اس وقت یہ محدود سمجھوتہ بھی بہت غنیمت ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ دونوں بنگالوں کے درمیان جوٹ کا کاروبار جاری ہو جانے سے معاشی بے چینی کسی حد تک کم ہو جائے گی اور اس کا اثر بالواسطہ فرقہ وارانہ صورت حال پر بھی اچھا پڑے گا۔

یونیورسٹی کمیشن کی سفارش

جب ملک میں قومی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی تعلیمی اصلاح کے لئے کئی کمیشن مقرر ہوئے لیکن انھوں نے مسائل پر سرسری نظر ڈالی اور عام طور پر جو سفارشیں کیں وہ سطحی تھیں اس نظام تعلیم میں جو عرصہ سے چلا آ رہا ہے کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو سکی۔ یونیورسٹی کمیشن مولانا آزاد نے پچھلے سال مقرر کیا تھا اس کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ محض پیشہ ور معلموں اور محکمہ تعلیم کے افسروں پر مشتمل نہیں تھا جو عموماً لکیر کے فقیر ہوا کرتے ہیں بلکہ اس کے ممبروں میں متعدد ہندوستانی اور انگلستان اور امریکہ کے بعض تعلیمی ماہرین اور مفکر بھی تھے یہی وجہ ہے کہ اس کمیشن کی رپورٹ محض "واقعات کی کھتونی" نہیں بلکہ ہندوستان کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی کے مسائل کا ایک محققانہ جائزہ اور ان پر ایک عالمانہ تبصرہ ہے۔

۲۲ اور ۲۳ اپریل کو نئی دہلی میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے جلسے میں کمیشن کی رپورٹ پر غور کیا گیا اور اس کی سب سے اہم سفارشیں منظور کی گئیں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

(۱) یونیورسٹی اور کالج میں تعلیمی جماعتیں چھوٹی ہوں اور ہر طالب علم پر انفرادی توجہ کی جا سکے۔

(۲) نصاب کی کتابیں مقرر نہ ہوں، طالب علم استاد کے لکچر سنیں اور اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہیں۔

(۳) امتحان کا موجودہ طریقہ منسوخ کر دیا جائے طالب علموں کے کام اور قابلیت کو جانچنے کے جدید طریقوں سے کام لیا جائے۔

(۴) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

ان کے علاوہ استادوں کی تنخواہ بڑھانے، یونیورسٹیوں کے دستور اساسی میں تبدیلیاں کرنے اور دوسرے انتظامی امور کے بارے میں بھی متعدد سفارشیں ہیں جو ملک کے حالات کے صحیح اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہیں۔

ایڈوائزری بورڈ کی منظوری کے بعد ابھی رپورٹ کو انٹر یونیورسٹی بورڈ کے مرحلے سے گذرنا ہے تب کہیں حکومت کی منظوری کی نوبت آئے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اپنی موجودہ مالی حالت میں حکومت کمیشن کی اہم ترین سفارشوں پر عمل کر سکے گی یا کرا سکے گی اس لئے کہ قریب قریب سب میں روپے کا بہت بڑا خرچ ہے اور یہی سخن دراں بہت کا معاملہ ہے۔

چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ

کچھ دن ہوئے مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس صاحب نے شیخ عبداللہ صاحب وزیر اعظم حکومت کشمیر کے نام یہ پیام شائع کیا تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اپنی اپنی فوجیں کشمیر سے ہٹا لیں تو انھیں چودھری صاحب کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوگا کہ آزاد کشمیر کی فوج بھی وہاں سے ہٹ جائے اور شیخ عبداللہ صاحب کی قومی ملیشیا سرے سے منسوخ کر دی جائے بشرطیکہ اس فوج میں مسلمان ہوں یا کم سے کم مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے ہو۔ اس پر پاکستان کے بعض اخباروں میں بڑی لے دے ہوئی کہ چودھری صاحب نے سارے مقدمے کو جو پاکستان نے بڑی کوشش سے بنایا تھا بگاڑ کر رکھ دیا۔ پاکستان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ شیخ عبداللہ کو کشمیر کے لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہے اس لئے ان کی حکومت غاصبانہ حکومت ہے۔ اب چودھری صاحب شیخ صاحب کی قومی ملیشیا کے تقرر کا حق دے کر گویا ان کی حکومت کے حق کو تسلیم کر رہے ہیں۔ چودھری صاحب نے اپنی صفائی میں بڑا لمبا چوڑا بیان دیا ہے اور چودھری ظفر اللہ نے بھی ان کی طرف سے وکالت کی ہے کہ ان سب توجیہوں کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت کشمیر میں موجود ہیں اور ریاست کی حفاظت کے لئے مقامی ملیشیا بھرتی کرنے کی تجویز کمیشن اور سیکورٹی کونسل کے ریزولیوشنوں سے مطابقت رکھتی ہے اور اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ اس مقدمے میں چودھری غلام عباس کو بری کرتی ہے یا چودھری ظفر اللہ کو بھی ان کے ساتھ ملزم قرار دیتی ہے۔

(ح۔ ع)

جزیرہ ہینان کی فتح اور اس کے اثرات

جنرل سیمو چانگ کائی شک نے فارموسا میں پناہ لینے کے بعد اپنی قوم اور ساری دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ یہاں سے لڑائی جاری رکھیں گے اور چونکہ چینی کمیونسٹوں کے پاس ہوائی بحری فوج نہیں ہے اس لئے کیومن تانگ کی کامیابی یقینی ہے۔ یہ بات قرین قیاس بھی معلوم ہوتی تھی کہ چاہے نیشنلسٹ حکومت کو بڑی کامیابی نہ ہو مگر وہ ایک عرصے تک اس جزیرے سے برابر حملے کرتی رہے گی جن کی وجہ سے کمیونسٹ چین کو اطمینان اور سکون نصیب نہیں ہوگا اور چونکہ چین کا سارا ساحلی علاقہ جہاں بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی مرکز قائم ہیں ہر وقت خطرے میں ہوتا، اس لئے کمیونسٹ چین کو اپنے تعمیری منصوبوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ ملے گا، لیکن جزیرہ ہینان میں کمیونسٹوں کی فتح نے جنرل سیمو کے ان دعووں کی تردید کر دی اور دنیا کو یقین دلا دیا کہ فارموسا کی نیشنلسٹ حکومت غالباً زیادہ دنوں تک قائم نہ رہے گی۔

ہینان میں نیشنلسٹ حکومت کو شکست سے جو نقصانات ہوئے ہیں، ان کی تلافی بہت مشکل ہے لیکن اس کے باوجود کمیونسٹوں کی کامیابی کا دارومدار دو باتوں پر ہے ایک ان کے پاس اتنی بحری اور ہوائی طاقت ہو کہ وہ ... اپنا حملہ کر سکیں۔ دوسرے فارموسا کے ... لاکھ باشندے نیشنلسٹ حکومت کا نہیں بلکہ کمیونسٹوں کا ساتھ دیں۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے بعض خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شنگھائی میں بہت بڑی تعداد میں روسی ماہرین موجود ہیں، جو فوج کو تربیت دینے اور سامان جنگ تیار کرنے میں مدد دے رہے ہیں، نیشنلسٹ حکومت کا یہ بھی کہنا ہے کہ روس ہوائی جہازوں سے بھی کمیونسٹ چین کی مدد کر رہا ہے۔ اگر یہ اطلاعات صحیح ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کمیونسٹ فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اور ظاہر ہے ان کا یہ حملہ طوفانی موسم شروع ہونے سے پہلے یعنی اگست سے قبل ہو جانا چاہئے۔ رہا فارموسا کے باشندوں کا طرز عمل تو قیاس غالب یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد فارموسا میں کیومن تانگ نے جو لوٹ کھسوٹ کی تھی اور ۱۹۴۷ء کی بغاوت کو دبانے میں جس قدر سختیاں کی تھیں ان کو فارموسا کے باشندے ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔ بعض حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس وقت ان کی حیثیت بالکل قیدیوں کی سی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں وہ جنرل سیمو کے مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

لہروں کی تہہ میں عظیم الشان طوفان

جب بڑی بڑی موجیں ابھر رہی ہوں تو ہلکی ہلکی لہروں کی طرف عام طور پر لوگ توجہ نہیں کرتے یہی حال اس وقت دنیا کے سیاسی طوفان میں شمالی افریقہ کے عرب ملکوں کا ہے وہاں جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہو رہے ہیں بظاہر ان کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن ان کی ہلکی ہلکی لہروں کی تہہ میں جو عظیم الشان طوفان چھپا ہوا ہے، وہ دور بین نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔

شمالی افریقہ کے عرب ملکوں ——— الجیریا، ٹیونس اور مراکو وغیرہ ——— میں کافی عرصہ سے آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں اور دوسرے عرب ملکوں کی بیداری اور ... کی کامیابیوں سے ان تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچ رہی ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان کی رفتار بہت سست ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عرب ملکوں میں کوئی یکجہتی اور اتحاد نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کی سیاست جس رخ پر جا رہی ہے اس کے پیش نظر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ عرب ملکوں کی آزادی کی یہ تحریکیں چاہے کتنی ہی کمزور ہوں اور ان کی رفتار چاہے کتنی ہی سست ہو لیکن فرانسیسی سامراج کے قدم آنے والے طوفان میں قائم نہیں رہ سکیں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ریف کے مجاہد اعظم امیر عبدالکریم نے اس شرط پر کہ فرانس عرب ملکوں کی آزادی کا وعدہ کرے، مغربی ملکوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اسی کے ساتھ انھوں نے اس کی دھمکی بھی دی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اگر ضرورت پڑی تو وہ روس کا تعاون حاصل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کریں گے۔ چند روز ہوئے ٹیونس کی سب سے بڑی سیاسی جماعت دستور پارٹی نے ٹیونس کی تقسیم کے خلاف نہایت پر زور لفظوں میں احتجاج کیا تھا اور عرب ملکوں سے اسی سلسلے میں مداخلت کی اپیل کی تھی۔ اب قاہرہ کی وزارت خارجہ نے فرانس پر الزام لگایا ہے کہ معاہدہ اٹلانٹک کے ماتحت اسے امریکہ سے جو سامان جنگ مل رہا ہے اسے وہ شمالی افریقہ کے عرب ملکوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے

(باقی صفحہ ۹ پر)

خوشی کیا ہے؟

اندرے موروا

مترجمہ ذکیہ سیّدین

یہ سمجھتے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس میں خوشی حاصل کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے تو یہ واقعہ ہے کہ خوشی کا انحصار خارجی حالات پر نہیں بلکہ خود ہماری قوتِ ارادی پر منحصر ہے۔ ممکن ہے کہ آپ یہ اعتراض کریں کہ بھلا اُس کا قوتِ ارادی سے کیا تعلق! کیا مفلسی بیماری ظلم اور جنگ خوشی کے حصول کو بالکل ناممکن نہیں بنا دیتے؟ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے بارے میں دو باتیں ایسی ہیں جو ہم کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ انسان اصل مصیبتوں کی نسبت خیالی مصیبتوں سے زیادہ تکلیف اُٹھاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک مشہور ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ان دو بیماروں میں سے جو اس کے پاس علاج کروانے آتے تھے۔ تقریباً آٹھ کو کوئی خاص بیماری نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ان کو محض یہ وہم تھا کہ وہ بیمار ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہمی اور خیالی بیماری بھی اسی قدر تکلیف دہ ہو سکتی ہے جتنی حقیقی بیماری بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ!

مجھے ایک دفعہ ایک نوجوان انگریز سپاہی نے اپنا قصہ سنایا تھا کہ جس زمانے میں انگریزی فوج ۱۹۴۰ء کی سخت بیماری کے دوران میں ڈنکرک سے واپس ہو رہی تھی تو وہ اس زمانے میں وہیں تھا اور اس نے ساحل کی ریت میں اپنی حفاظت کے لئے ایک گڑھا کھود رکھا تھا اور وہ خود کو وہاں خاصا محفوظ سمجھتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُسے یہ خیال آیا کہ وہ اپنے سفری ریڈیو پر بی بی سی کی خبریں سنے۔ خبریں سنانے والا اس وقت ساحل ڈنکرک پر چھپے ہوئے انگریز سپاہیوں کی حالت بیان کر رہا تھا۔ وہ بیان اس قدر خوفناک اور مایوس کن تھا کہ وہ دہشت زدہ ہو کر تقریباً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور پھر جب اُس نے ریڈیو بند کر دیا، اور آنکھیں کھول کر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو اسے ذرا اطمینان حاصل ہوا، اور اس کا ذہنی توازن ٹھیک ہوا۔

یہ کہانی بیشتر آدمیوں کی ذہنیت کی ایک بہت اچھی مثال ہے، اس میں تو شک نہیں کہ ان کا خوفزدہ ہونا بالکل حق بجانب ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ خیالی خطروں سے اور بھی زیادہ ڈرتے ہیں اور وہ اکثر راتوں کی نیند اُن چیزوں کا خیال کر کے کھو دیتے ہیں جو شاید آگے چل کر پیش آئیں۔ لیکن اصل میں اب تک نہ تو ہوئی ہیں اور ممکن ہے نہ کبھی ہوں۔

بعض آدمیوں کو اپنے مالی نقصان کا دھڑکا لگا رہتا ہے، وہ سوچتے ہیں کہیں کاروبار کی حالت خراب نہ ہو جائے یا سکے کی قیمت نہ گر جائے یا کچھ اور نہیں تو شاید آگے چل کر جنگ ہی چھڑ جائے، کسی کو اپنی خوب صورت بیوی کی طرف سے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت نہ کرنے لگے اور اُسے چھوڑ دے۔ یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک ان کا محض اندیشہ ہی ہو تب تک کوئی اُن کے بارے میں کیا کر سکتا ہے؟ ان فرضی باتوں کے بارے میں فکر کرنا ثابت کرتا ہے دماغی صحت کی حالت مشکوک ہے۔ ہمیں خیالی خطروں کو بھول جانا چاہیئے رہے اصلی خطرے تو وہ وقت پڑے پر خود اپنا معاملہ سلٹ لیتے ہیں

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ایک مضبوط سیرت کا آدمی حقیقی مصیبتوں کے سمندر میں سے بھی خوشی کے موتی نکال سکتا ہے۔ ایک بیمار آدمی اگر واقعی بلند سیرت کا مالک ہے تو وہ اپنی جسمانی تکلیفوں سے بھی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی تکلیفیں اُسے تحمل اور صبر کی قوت پیدا کرنے کا موقع دیتی ہیں اور اس حالت میں تنہائی میں اسے سوچنے اور پڑھنے کا زیادہ وقت مل سکتا ہے۔

ہم بہت سے ایسے آدمیوں سے بھی واقف ہیں جنھوں نے اصل میں اپنی جسمانی تکلیفوں کی بدولت ہی اپنی سیرت کی تعمیر کی اور ان میں دوسروں کی رہنمائی کرنے کی قابلیت اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی مصیبت و کشمکش کے باوجود اپنی اندرونی قوتوں کی تربیت کی۔ ایک ایسے بہادر آدمی سے تو موت کا اندیشہ بھی اس کی باطنی خوشی نہیں چھین سکتا۔

سقراط جیل میں تھا اور جانتا تھا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ پھر بھی اس نے اس قدر زندہ دلی اور بہادری سے کام لیا جس سے اس کے ساتھیوں کی ہمت بڑھ گئی .... خارجی حالات کے ناسازگار رہنے کی وجہ سے خوشی حاصل کرنا مشکل ضرور ہو جاتا ہے لیکن ناممکن نہیں ....

ایک بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ اگر خارجی حالات موافق ہوں تو خوشی کا حصول لازمی ہے؟ نہیں جو شخص اپنے کو ہمیشہ تکلیف پہنچانے کے درپے رہتا ہے اُسے ہمیشہ پریشان ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا ہے۔ کیا کسی نے ایک شہرت پسند جاہ طلب آدمی کو اپنی قسمت پر کبھی قانع دیکھا ہے؟ اگر ہٹلر کو ٹھیک وقت پر یہ اندازہ ہو جاتا کہ کہاں پہنچ کر اُسے رک جانا چاہئیے تھا تو وہ شاید خوشی یا کم سے کم کامیابی تو حاصل کر سکتا تھا، لیکن اُسے دونوں میں سے ایک بھی نصیب نہ ہوئی دنیا میں بعض خوش قسمت آدمی ایسے ہیں جنھیں دولت صحت، اچھی بیوی پیارے بچے غرض دنیا کی ہر چیز میسر ہے لیکن کیا وہ مطمئن ہو کر ان نعمتوں سے لطف اٹھا سکتے ہیں؟ ...... ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے اکثر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ شاید انھوں نے فلاں کاروبار میں جو روپیہ لگایا تھا ڈوب جائے یا ان کے بچے بیمار پڑ جائیں یا ان کے ملک میں جنگ چھڑ جائے، اس طبیعت کے انسان کے لئے کوئی چیز بھی باعثِ مسرت نہیں ہو سکتی لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ خوشی کا انحصار محض خارجی حالات پر نہیں ہے۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ خوشی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہوتا ہے تو ہر بات چاہے وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کے لئے خوشی کا سرچشمہ بن جاتی ہے مثلاً جس ملک میں اس نے اپنا ہنی مون منایا ہوگا ہمیشہ کے لئے اسے دنیا کا سب سے خوب صورت ملک معلوم ہوگا۔ اس کو ہمیشہ یاد رہے گا کہ وہاں کا موسم کتنا عمدہ تھا اور وہاں کے لوگ جو اُسے سفر کے دوران میں ملے تھے کس قدر ہمدرد اور دلچسپ تھے ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس وقت اُسے ہر چیز اپنی خوشی کے رنگ میں رنگی نظر آتی تھی، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے مشہور عالم مصور ریمبراں کی نظر ایک حقیر ترین دکان کو بھی ایک شاہکار بنا دیتی تھی۔ بالکل اسی طرح ایک مسرور آدمی کے لئے ایک چھوٹی سی چیز بھی خوشی کا باعث بن سکتی ہے۔

لہٰذا آدمی کو خوش رہنے کے لئے کسی غیر معمولی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دراصل اس کا من شانت ہونا چاہیئے اور فکروں اور پریشانیوں کے بوجھ سے آزاد، اور ساتھ ہی اس کے سامنے کوئی واضح مقصد ہونا چاہیئے تاکہ اس کے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہو کہ اُسے کیا کرنا ہے اور یہ چیز اُسے محبت کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ خدا کی محبت ہو یا عورت (یا مرد) کی یا بچوں کی یا آرٹ کی اور یا کسی خاص کام کی محبت ہی میں آدمی کی نجات ہے کیوں کہ محبت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم صرف اپنے ذاتی فائدے ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے اپنی فکر و عمل کی قوتیں صرف کریں۔ اس کی بدولت ہماری زندگی میں وحدتِ مقصد پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم زندگی ان لوگوں وقف کر دیتے ہیں جن سے ہمیں محبت ہے....

خوشی قوتِ ارادی کا ایک فعل ہے یعنی اس امر کا فیصلہ کہ ہم بے بنیاد خوف و اندیشوں اور پچھتاووں کو چھوڑ کر کسی ایسے مقصد کے لئے زندہ رہیں جو ہماری ذات کی تنگ حدود سے بڑا اور بلند ہو۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بعض مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر در اصل زندگی بجائے خود خوش گوار یا ناگوار بناتے ہیں۔ مثلاً اگر سخت سردی پڑ رہی ہے تو ایک قنوطیت پسند شخص کہے گا کہ میں سردی سے ٹھٹھر جا رہا ہوں۔ برخلاف اس کے جو شخص چیزوں کے روشن

پہلو پر نظر رکھتا ہے، وہ اسی موقع پر کہے گا۔ ایک بڑے مزے کی سردی پڑ رہی ہے۔ اس کے خوش ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ وہ سردی محسوس نہیں کر رہا ہے، بلکہ خوش دلی کی وجہ سے اس کو گرمی محسوس ہو رہی ہے اگر وہ بیمار بھی ہو جائے گا تو اس کی رجائیت قائم رہے گی اور وہ بدترین واقعات میں بھی خوشی کے پہلو ڈھونڈ لے گا۔ مثلاً یرقان ایک ایسی بیماری ہے جس میں مریض ہمیشہ اداس رہتا ہے۔ مگر میرے ایک بوڑھے استاد کو یرقان ہو گیا۔ میں آج تک جتنے فلسفیوں اور رجائیت پسند لوگوں سے ملا ہوں وہ ان میں سب سے زیادہ عقل مند ہیں، ان پر بھی بیماری کا یہی اثر ہوا جو اور مریضوں پر ہوتا مگر انھوں نے اپنے خیال کو ایک عجیب انداز میں پیش کیا "یہ مجھے معلوم ہے کہ یہ یرقان ہے جس سے میں اداس ہوں مگر مجھے اداس ہونے کا غم نہیں (اس موقع پر مجھے وہ مشہور مصرعہ یاد آتا ہے

نہ دل تنگی نہ عالم بر دل تنگ است سی عالم

اور ان دونوں عالموں میں کتنا بڑا فرق ہے)

بدقسمتی سے ہر آدمی فلسفی نہیں پیدا ہوتا۔ امید پروری کی صفت بہت نایاب ہے۔ اول تو وہ والدین اور بچپن کے حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ جو بچہ ایسے گھر میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کے ماں باپ میں محبت اور اتفاق ہے اور وہ خود اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں تو اس کے دل پر ساری عمر محبت، مسرت اور باہمی مفاہمت کی اس فضا کا نقش قائم رہے گا اور بعد میں اسے جو کچھ بھی پیش آئے پر وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے گا۔ لیکن ایک ایسے گھر میں جہاں سوا آپس میں لڑائی جھگڑے اور مخالفتیں رہتی ہوں بچوں کی طبیعت خود بخود یاس پسندی کی طرف مائل ہو جائے گی۔ اسی طرح شادی بھی انسان کے کردار بنانے میں مدد دیتی ہے۔ ایک جھگڑالو، تانے تشنے دینے والی بیوی (میاں) ہر انسان کو یاس پسند بنا سکتا ہے۔ مگر جیسا ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ خوشی دراصل قوت ارادی کا ایک فعل ہے لہٰذا ایک ناخوشگوار بچپن اور ناسازگار شادی کے باوجود بھی ایک حد تک ہم اپنا کردار جیسا چاہیں ویسا بنا سکتے ہیں آئیے میں اس کی چند ترکیبیں آپ کو بتاؤں ....

گیٹے کا یہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "روح کو عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے، بے نتیجہ اور بے ثمر غور و فکر جن کے بغیر نہ کچھ کرنے کا ارادہ ہی ہو اور نہ امکان ہی ہمیشہ رنج کا پیش خیمہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے محض شک اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کام، جسے محنت اور قابلیت سے انجام دیا جائے خوشی کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا کام؟ اس کا جواب ہے کہ کوئی بھی ایسا کام جس کے لئے ہم اپنے آپ کو موزوں سمجھیں مشہور ماہر التعلیم برٹرانڈ رسل نے لکھا ہے کہ جب کبھی میں اپنے عقلیت پسند دوستوں کی باتیں سنتا ہوں تو میں زندگی سے بیزار ہو جاتا ہوں لیکن جب میں ایک محنت کش باغبان سے باتیں کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے زندگی حقیقت میں قابل قدر چیز ہے۔

انسان کو خوش رکھنے کے لئے ایسے مشغلے بھی مفید ثابت ہو سکتے ہیں جن کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا مثلاً کوئی کھیل کھیلنا یا کسی فن کا شوق۔ آرٹ ہمارے تخیل کو سکون اور ذوق حسن بخشتا ہے؟ اور کھیل ہماری توجہ کو ایک نامعلوم اور مایوس کن ناقابل تلافی ماضی کی طرف پھیر دیتا ہے ...... روح کی اصلی خوشی عمل میں پوشیدہ ہے خواہ وہ کسی قسم کا عمل ہو!

خوشی اور عمل میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ کسی آدمی کو کبھی بھی کام سے پورے طور پر دست بردار نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر بڑھاپے اور ضعیفی میں اسے اپنے کو بھرے مشغلے سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کوئی دوسرا کام چاہے وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو ڈھونڈھ سکتا ہے یا کوئی تفریحی مشغلہ اختیار کر سکتا ہے یا کسی خاص موضوع پر مطالعہ کر سکتا ہے بہر حال اس کو کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی چاہیئے، کیونکہ آدمی کے پاس اپنے ذہنی شباب کو قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

سقراط کے ایک شاگرد نے اس سے پوچھا کہ آپ اس وقت موسیقی کیوں سیکھ رہے ہیں جب کہ آپ قید میں ہیں اور آپ کا انجام نزدیک ہے۔ سقراط کا جواب نہایت معنی خیز اور دلکش تھا "تاکہ مرنے سے پہلے میں اس فن سے بھی بخوبی واقف ہو جاؤں ......"

خوشی حاصل کرنے کا دوسرا گر یہ ہے کہ جس بات کی تم پر ذمہ داری یا تمھاری ذات پر اس کا انحصار نہ ہو اور تم اس میں کچھ زیادہ نہ کر سکتے ہو اس کا بہت زیادہ اثر نہ لو۔ تم نے اکثر لوگوں کو اس قسم کی باتیں کہتے سنا ہوگا کہ میں کوریا کے متعلق بہت پریشان ہوں، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ایران کے بارے میں کیا کریں اور انڈونیشیا! انڈونیشیا کے متعلق تو مجھے سوتے میں بھی بھیانک خواب نظر آتے ہیں"، جبکہ نہ تو آپ اپنے ملک کے وزیر خارجہ ہیں اور نہ سیکیورٹی کونسل کے ممبر ہی ہیں۔ لہٰذا آپ کو انڈونیشیا اور کوریا جیسے مسئلے ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیں جو انھیں جانتے ہوں اور ان کے متعلق کچھ کر سکتے ہوں۔ ان معاملات کو جاننا اور سمجھنا تو یقیناً ضروری ہے لیکن آپ کا کام اپنے حلقے میں اچھا انسان اور اپنے شہر میں ایک اچھا شہری بن کر رہنا ہے نہ کہ ان معاملات میں الجھنا جو آپ کے بس سے باہر ہیں۔ اس کام کو ٹھیک سے انجام دیجئے جو آپ کے کرنے کا ہے اور اگر ہر شخص اپنے مکان کے سامنے کی سڑک صاف کر لیا کرے تو جلد ہی پوری سڑک صاف ہو جائے گی۔

تیسرا گر یہ ہے کہ گذری باتوں کو بھول جائیں، اور ماضی سے زیادہ حال پر توجہ رکھی جائے۔ دنیا میں بہت سی عورتیں اور مرد ایسے ہیں کہ اگر ان کے دماغ پر تکلیف دہ یادیں مسلط نہ ہوتیں تو وہ ضرور خوش رہ سکتے تھے۔ اسی طرح بعض شادی شدہ جوڑے اپنی زندگی عذاب بنا لیتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک اور شکایات جمع ہوتی رہتی ہیں اور یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ معمولی سی بات بھی ان کے لئے پورے بدقسمت ماضی کو دہرانے کا بہانہ بن جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو بھول جانا اور معاف کر دینا دل میں رکھنے کے نسبت بہت بہتر ہوتا ہے، نہ صرف دوسرے کے لئے بلکہ اپنے لئے بھی جو شخص نفرت کرنے میں ماہر ہوتا ہے وہ خود بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور جو گذشتہ باتیں نہیں بھول سکتا وہ اپنے دشمن آپ پیدا کرتا ہے، عقل مند آدمی ہمیشہ حال کی دنیا میں مگن رہتے ہیں ....

چوتھا گر یہ ہے کہ مصیبت آنے سے پیشتر اس کے بارے میں اندیشے مت کرو، پیش بینی اچھی چیز ہے۔ مگر وہ بھی بعض دفعہ حد سے گذر جاتی ہے، اکثر وہی باتیں پیش آتی ہیں جن کی بالکل توقع نہیں ہوتی۔ صرف یہی نہیں کہ ہم مستقبل کے واقعات سے ناواقف ہیں بلکہ اگر ہم ان کا صحیح اندازہ لگا بھی لیں تب بھی ممکن ہے اُن کا اثر ہم پر ہمارے اندیشے کے خلاف اور برعکس پڑے۔

بعض لوگوں کو موٹر کے حادثے کا ڈر یا ہوائی جہازوں کے گرنے کا خوف یا ریل گاڑی لڑنے کا خطرہ ستاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی حادثہ پیش آ جائے، لیکن اس وقت آدمی کو گھبرانے کا وقت بھی نہیں ملتا اور اس قسم کے خوف اپنے پر مسلط کرنے کے سوا اپنی زندگی عذاب بنانے کے اور کچھ نتیجہ نہیں۔

ہونا یہ چاہیئے کہ آدمی خواہ مخواہ قبل از وقت خطروں کی فکر اور پیش گوئیاں نہ کرے بلکہ اپنے کو اس کے لئے تیار رکھے کہ اگر کوئی ناگہانی مصیبت پڑے گی تو وہ اسے سہہ لے گا۔ انسانی زندگی میں ہر قسم کے نشیب و فراز پیش آتے رہتے ہیں لیکن اگر ہمارے اندر وہ اندرونی اطمینان و سکون ہو جو عقل کی رہنمائی سے پیدا ہوتا ہے تو ہماری خوشی خارجی واقعات پر منحصر نہ رہے گی ......

کسی کا قول ہے کہ اپنی ذات کے اندر خوشی ڈھونڈھنا مشکل ضرور ہے لیکن اس کی تلاش کسی اور جگہ تو ناممکن ہی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے آپ میں خوشی ڈھونڈھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ بہت سے خدا رسیدہ بزرگوں اور عقل مند آدمیوں کے تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ......

پچھلا ہفتہ (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

استعمال کر رہا ہے۔ اس سے امریکہ نے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فرانس کو اس وقت تک سامان جنگ نہ دے جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ ان کا استعمال انھیں مقاصد کے لئے ہوگا جن کے لئے وہ بھیجے جا رہے ہیں ٭

(ع ، ل)

کُردستان کا مسئلہ

(ناظر)

کہتے ہیں کہ بعض ادقات موسم میں کچھ وبائیں اور بلائیں چلا کرتی ہیں جن سے گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر صاف ہو جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی وباؤں میں ہیضہ، پلیگ، طاعون اور چیچک بہت بدنام ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے۔ پر یہ وبائیں کچھ قدرتی سی ہوتی ہیں، جن میں آدمی کا دخل بہت کم ہوتا ہے۔ مگر ان دنوں ایک ایسی وبا چلی ہے جسے قومیں پیدا کرتی ہیں۔ اور حکومتیں ان کے جراثیم پال پوس کر بڑھا کرتی ہیں اور جب یہ جراثیم بڑھ کر جان لیوا بن جاتے ہیں تو پھر حکومتوں سے بنائے کچھ نہیں بنتا۔ ہاتھ اور پاؤں پھول جاتے ہیں اور یہ ہے وبا "استان" کی۔ انیسویں صدی سے اس وبا کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے ہیں اور اس صدی میں انھوں نے اتنی خطرناک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے کہ جس ملک میں دیکھئے اس کا زور، جہاں سنیئے اس کا غلغلہ، اور پھر ایسی جان لیوا اور مہلک یہ وبا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہمارے یہاں چلی تو پاکستان بنا اور اس بننے میں ہزاروں گھرانے تباہ، لاکھوں جانیں ضائع اور سینکڑوں بنے بنائے خاندان دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے اور پھر فلسطین میں یہ ہوا چلی تو وہاں بھی اس نے کم و بیش یہی خونی ڈراما کھیلا اور اب مشرق ادنیٰ میں اس کا زور ہے اور یہاں اس بیماری نے "کردستان" کا روپ دھارن کیا ہے۔ دیکھئے یہاں یہ کیا گل کھلاتی ہے۔

اور جہاں بھی اس وبا کا زور ہوا آپ دیکھیں گے کہ اس کے جراثیم ایک مدت سے وہاں پھل پھول رہے تھے اور حکومت نے بروقت ان کا تدارک نہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ یک بیک یہ آتش فشاں پھٹ گیا اور سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، کچھ اسی طرح مشرق ادنیٰ میں بھی اس "استان" کی ابتدا ہوئی اور انیسویں صدی سے کردوں میں اپنی الگ خودمختار ریاست بنانے کا خیال پیدا ہونا شروع ہوا مگر متعلقہ حکومتوں نے خواہ عربی ہوں یا غیر عربی محض اپنے مفاد کی خاطر ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور دنیا کو بھی ادھر متوجہ نہ ہونے دیا۔ اخباروں خبر رساں ایجنسیوں صحافیوں اور دوسری خبروں کے ذرائع پر بڑی سخت پابندیاں لگائیں کہ ان ہنگاموں کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ پائے۔ مگر حقیقت کہیں چھپائے چھپتی ہے۔ چنانچہ اب اسی تحریک نے اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہے۔ اور کچھ ایسی پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں کہ اگر متعلقہ حکومتوں نے اس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا، اور دانشمندی سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش نہ کی تو ممکن ہے کہ ناک میں لگی ہوئی قوموں کے ریشہ دوانیوں سے اس کا بھی وہی حشر ہو جو لیبیا، سوڈان اور ابھی ابھی فلسطین کا ہو چکا ہے۔

کرد قوم کوئی نئی قوم نہیں ہے بلکہ یہ بھی دیگر قوموں کی طرح بڑی پرانی اور تاریخ کی مشہور قوم ہے اس نے دنیا میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اسلام لانے کے بعد جنگوں میں اس قوم نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور ان سے اسلامی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس قوم نے مشرق میں ایسے مشہور اور اولوالعزم بادشاہ اور ایسے تجربہ کار اور شہرۂ آفاق جنرل پیدا کئے ہیں جن کے نقش قدم اب بھی مشعل راہ ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو کون نہیں جانتا جس نے پھر ایک بار کلمۂ توحید کے لئے تہلکہ مچا دیا تھا، اسی قوم کا ایک فرد تھا۔ غرض اسی قوم نے تاریخ میں اپنی شان و شوکت اور حکومت و سطوت کے ایسے کارنامے چھوڑے ہیں جسے ہر تاریخ کا طالب علم جانتا ہے۔ اور آخر اس کا عروج ڈھل گیا۔ کردوں کی حکومت چھن گئی اور ان کی شان و شوکت داستان پارینہ بن کر رہ گئی۔ ان کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ اب عراق، ترکی، شام اور ایران میں قبیلوں کی شکل میں ان کی آبادیاں رہ گئی ہیں۔ اور جب سے ان کا قومی شعور بیدار ہوا ہے، ان کی کوشش ہے کہ ان ملکوں میں جہاں ان کی آبادی زیادہ ہے انھیں ملا کر ایک آزاد ریاست "کردستان" کے نام سے بنا دی جائے جہاں ان کی حکومت ہو، اور ان کا قانون۔

اس وقت دنیا میں کردوں کی مجموعی تعداد ۸ ملین ہے۔ جن میں سے ۴ ملین ترکی میں۔ ۳ ملین سے کچھ زیادہ ایران میں اور تقریباً ایک ملین عراق میں اور تھوڑی بہت تعداد ارمینیا اور شام میں ہے۔

کردوں نے "کردستان" کا مطالبہ اس وقت سے کرنا شروع کیا جب محمد علی پاشا مصر جدید کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ اس زمانے میں کرد حکومت عثمانی اور حکومت ایران کے ماتحت تھے۔ اور چونکہ باب عالی کا اقتدار ان پر بہت تھا اس لئے اسی زمانے میں انھوں نے سب سے پہلے اسی کے خلاف بغاوت کی لیکن قیادت کی غلطی اور حالات کے ناموافق ہونے کی وجہ سے یہ بغاوت ناکام ہو گئی اور اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک کہیں اس تحریک کا نام سننے میں نہیں آتا اس درمیان میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تحریک کردستان ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ لیکن یہ غلط تھا، چنگاریاں تھیں، لیکن راکھ میں دبی پڑی تھیں۔ جب موافق زمانہ آیا تو پھر یہ چنگاریاں بھڑک اٹھیں، کرد جاگے اور انھوں نے اپنی تنظیم کرنی شروع کی۔ سیاسی پارٹیاں بنیں اور ۱۸۹۸ء میں ایک پرچہ "کردستان" کے نام سے جاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس پرچے کا مقصد یہ تھا کہ کردی قوم کو پھر سے اٹھایا جائے اور کردستان کی تحریک کے لئے آمادہ کیا جائے اور ان میں پروپیگنڈا کر کے انھیں اس مقصد کے لئے متحد کیا جائے۔ اسی زمانے میں ترکی میں بغاوت ہوئی اور کردوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۰۸ء میں ایک مجلس "سیفی" کے نام سے بنائی جس کا مقصد اس قسم کے مطالبات کا مطالبہ کرنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم جب ختم ہوئی تو اس مجلس نے اپنا نام "کردی نیشنل کانگریس" رکھ لیا۔ اور اپنا مقصد حصول کردستان قرار پایا۔ اور پھر اس کے لئے کوشش کرنی شروع کی۔ اور اب تک یہی اس تحریک کو عملاً چلا رہی ہے۔ چونکہ کرد مختلف چار ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے کردی کانگریس سیاسی کاموں کے علاوہ ان کی تنظیم اور آپس میں اتحاد و اتفاق بڑھانے کے کام بھی کرتی رہتی ہے۔ کردی نیشنل کانگریس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد اتحادیوں نے "معاہدۂ سیفر" میں کردستان کا مطالبہ منظور کر لیا اور ان کی آزادی تسلیم کر لی۔ لیکن ترکی نے مصطفیٰ کمال کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور اتحادیوں پر زور ڈالا کہ اسے منسوخ کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے لوزان کانفرنس میں جو دراصل معاہدۂ سیفر کی جگہ پر ہوا تھا اس حق کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر جب ترکی تقسیم ہوئی تو کرد بھی بالواسطہ عراق، ایران، شام میں بٹ گئے اور اب بجائے "کرد" کہے جانے کے اس ملک کی طرف منسوب ہونے لگے۔ مگر کردوں کو یہ تقسیم ایک آنکھ بھی نہ بھائی چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف ہر جگہ مظاہرے کئے ہنگامے کئے۔ اور شورشیں برپا کیں۔ ہاں صرف شام ایسا ملک ہے جہاں کردوں نے بغاوت نہ کی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شام کے حصے میں آنے والے کرد اسے اپنی پناہ گیر سمجھتے تھے، دوسری بات یہ کہ اس علاقے میں جو کردی قبیلے آباد ہوئے وہ یہاں کے باشندوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان میں اور شامیوں میں کوئی نمایاں فرق نہ رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب ہیئت امم متحدہ کا وجود ہوا اور بین الاقوامی مسائل اس کے سامنے پیش ہونے لگے تو کردوں نے بھی اس کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ شاید یہی ان کے درد کا درماں تلاش کر دے چنانچہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو کردوں کے رہنماؤں نے امم متحدہ کو لیک سکسیس میں ایک عرضداشت اس مضمون کی بھیجی کہ ترکی، عراق اور ایران کے جن جن علاقوں میں کردوں کی اکثریت ہے ان کو ملا کر ایک کردی حکومت "کردستان" کے نام سے بنا دی جائے کیونکہ ان علاقوں

کردوں کو ... محسوس کر رہے تھے یہ اور ... نظر انداز
کر دیئے گئے تو انھوں نے باکو کے مقام پر نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک کانفرنس
منعقد کی ... قاضی محمد کے زیر صدارت ایک "کردی وطنی حکومت" اور ملا مصطفےٰ کے
تحت ایک کردی فوج کی تشکیل کی۔ اور اس وقت سے کردی تحریک نے نیا رنگ
اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔

روس ہمیشہ سے ایسے مواقع کی تاک میں رہتا ہے۔ اس نے جو دیکھا کہ ایک نیا شگوفہ
کھلا ہے تو اس نے بھی آگ کو ہوا دینی شروع کر دی ہے۔ اور چونکہ کردوں کو مغربی
طاقتوں کا تجربہ اب تک کڑوا رہا ہے اسلئے وہ بھی اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ کردوں
کا کہنا ہے کہ ہم نے گذشتہ دونوں جنگوں میں اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ ہر موقعہ پر ان کے
وعدوں اور ان کی باتوں پر بھروسہ کیا۔ پر جب ان کا موقع آیا تو انھوں نے صاف
جواب دے دیا۔ درحقیقت بھی یہی ہے واقعی کردوں نے اب تک دل وجان سے
اتحادیوں اور عربوں کا ساتھ دیا اور صرف اس لالچ میں کہ شاید ان کی ان قربانیوں
سے ان کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ محض طفل
تسلیاں اور زبانی وعدے تھے تو مجبوراً سوویت یونین کی طرف جھکنے لگے ہیں کیونکہ انھوں
نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ روس نے آرمینیوں کی جو بہت کچھ کردوں سے ملتے جلتے
ہیں اپنی حدود میں ایک جداگانہ حکومت اپنی یونین کے ماتحت قائم کر دی ہے اور وہ اس
کے لئے تیار ہے کہ سوویت یونین کی حدود میں کردوں کی آبادی جہاں ہے اسے ایک
کرد ریاست بنا دے جس میں مجوزہ کردستان کے اکثر بیشتر علاقے آجائیں گے۔
خصوصاً عراق اور ایران کے وہ علاقے جہاں پٹرول کی کانیں ہیں۔ اس خبر سے عربی
ممالک میں بڑا ہیجان ہے اور مصری اخبارات بڑی شدومد سے قضیہ کردستان کے
تصفیہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر متعلقہ حکومتیں اس طرف توجہ
نہ کریں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرق ادنیٰ میں بھی سوویت یونین کا ایک بلاک بن
جائیگا۔ جس سے اتحادیوں خصوصاً عربوں کا مفاد اور حکومتیں ہمیشہ خطرے میں
رہیں گی۔

ان دنوں عراق میں کردوں کی تحریک خاصی زور پکڑ رہی ہے لیکن عراقی حکومت
اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہی ہے۔ حالانکہ ایران اور ترکی کے کردوں
کے مقابلے میں عراقی کرد عراقیوں اور عربوں کے ساتھ شانہ بشانہ ہر زمانہ، ہر معرکہ اور
ہر موقعہ پر موجود رہے ہیں، اس طرح امن کے زمانے میں بھی انھوں نے ملکی حالت سدھارنے
میں برابر حصہ لیا ہے۔ اس لئے عراقی حکومت اور عربوں کے ان کی طرف سے غفلت
برتنے کے یہ معنی ہوں گے کرد ان سے مایوس ہو جائیں گے۔ مصری اخباروں
کا کہنا ہے کہ ایران اور ترکی اگر اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دیتے تو اس کے معنی یہ نہیں
ہیں کہ ہم بھی ان کی طرف سے غفلت برتیں۔ کیونکہ ان دونوں ملکوں میں تو مسئلہ بہت
کچھ مقامی ہے مگر یہاں سارے ممالک اسلامیہ کا اور سارے عربوں کا مسئلہ ہے۔
اور پھر کرد ابھی ہر طرح عربوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں چنانچہ ابھی "کردی نیشنل
کونسل" نے لندن میں اعلان کیا ہے کہ "کرد مستعمرین کے مقابلے میں عربوں کے
ساتھ ہر قسم کے تعاون اور اشتراک کے لئے تیار رہیں"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک
عرب ان سے الگ نہ ہوں کرد انھیں نہ چھوڑیں گے۔ ایسی صورت میں یہ کہاں کی
عقلمندی ہے کہ عرب ان دینی بھائیوں، مصیبت اور راحت کے ساتھیوں، اپنے
پڑوسیوں کو چھوڑ دیں۔ اور یہ خطرہ مول لیں کہ کردوں کی تلوار ان کے گلے کاٹنے
اس لئے عرب ملکوں اور عربی انجمنوں کو چاہیئے کہ اس کی طرف فوری توجہ کریں ورنہ
معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

حالیہ خبروں سے پتہ چلا ہے کہ عراقی حکومت نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع
کیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ دیگر عرب ممالک کے مداخلت اور بیچ میں پڑنے سے
معاملہ سلجھ جائے اور کردوں کا مطالبہ "کردستان" تسلیم کر لیا جائے یا اسے اس
طرح حل کیا جائے جس سے کرد مطمئن ہو جائیں۔

ضروری عرض: نئی روشنی کے کئی قلمی معاونین نے جو ابتدا سے ہمارے مدد کر رہے تھے اب کچھ
سے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اخبار کے مضمون تو مل جاتے ہیں اور سلسلے
... نئی روشنی کا خاص رنگ بغیر آپ کے تعاون کے مشکل ہے۔

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

۸ مئی ———————— ۱۹۵۰ء

ہم کدھر جا رہے ہیں : سالک ہندی ۲

پچھلا ہفتہ :—

ہند اور بیرون ہند میں ع ، ح ۳

کشکول ۵

غزل نسیم صدیقی ۵

دھڑکنیں جاوید اختر صدیقی ۵

عورتوں کے حقوق شریفہ حامد علی ۲

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)

ڈاکٹر سید عابد حسین ۷

اسلامی ساہتیہ سدن کی مطبوعات (ع، ح) ۹

شیخ عبدالقادر حامد علی خاں ۱۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر دہلی

ڈاکٹر سید عابد حسین

ہم کدھر جارہے ہیں؟

سالک ہندی

کچھ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ [illegible] اندھیرا جس میں ہندوستان اور پاکستان تین سال سے بھٹک رہے تھے ختم ہونے آیا ہے اور صبح امن و امید کی روشنی جھلملانے لگی۔ بہت سے لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ صبح کاذب کے آثار ہیں، صبح صادق کے نہیں۔ اس شبہ کا قطعی جواب تو وقت ہی دے سکتا ہے لیکن اگر قرائن کی بنا پر کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے تو شاید یہ کہنا جائز ہے کہ آخر عقل اور تدبر اور انسانیت نے تعصب اور نفرت اور حماقت کی دلدل میں شگاف ڈال دیا ہے اور عجب نہیں کہ اب ان دونوں بدقسمت ملکوں کے دن پھر جائیں۔

آج سے ایک مہینہ پہلے بھی کوئی اس قسم کی پیشین گوئی کر سکتا تھا؟ دونوں طرف کے رجعت پسند اور شاہی ذہنیت حلقوں نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ ان دونوں ملکوں میں جن کی قسمت کو تاریخ اور جغرافیہ اور کلچرل تعلقات نے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، جنگ کا چھڑ جانا ہرگز خلاف قیاس نہ تھا اور یہ جنگ صرف ہندوستان اور پاکستان ہی کی جنگ نہ ہوتی بلکہ شاید دنیا کی تیسری (اور آخری) عالمگیر جنگ کی ابتدا ہوتی اور آرام کرسی کے وہ سورما بھی جو اخباروں کے کالموں اور تقریروں کے پلیٹ فارموں پر اپنی بہادری کا اظہار فرماتے رہتے ہیں جنگ کا ایسا مزہ چکھ لیتے جس کا شاید انھیں کوئی اندازہ ہی نہیں ...... یہ ہو جاتا لیکن مشیت الٰہی کو یہ منظور نہ ہوا کہ اس نازک موقع پر پنڈت نہرو گاندھی جی کی اخلاقی قبا پہن کر اور جرأت کے ساتھ فسادی عناصر کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں کو نظر انداز کر کے پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور لیاقت علی خاں تدبر اور خلوص سے کام لے کر کھلے دل سے اس کا خیر مقدم کریں اور اس طرح ہند اور پاکستان کے تعلقات میں ایک نیا دروازہ کھل جائے اور انسانیت اور مصلحت اندیشی کی قوتیں سیاستدانوں کی باگ سنبھال لیں ......

ہر خطرناک بیماری میں خواہ وہ جسم کی ہو یا دماغ کی، ایک نازک موقع آیا کرتا ہے جسے بحران کہتے ہیں۔ اس وقت اندیشہ ہوتا ہے کہ جسم یا دماغ کی تمام قوتیں بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی اور مریض جانبر نہ ہو سکے گا۔ اگر اس وقت کسی طرح مریض کو تھوڑی سی مہلت مل جائے اور وہ بحران ٹل جائے تو اس بات کی امید بندھ جاتی ہے کہ جسم کی صحت بخش قوتیں پھر ایک دفعہ زور لگا کر بیماری پر قابو حاصل کر لیں گی۔ اس وقت کچھ ایسی ہی حالت ہندوستان اور پاکستان کی ہو گئی تھی۔ اب دونوں بڑے وزیروں کی دانشمندی کی وجہ سے سمجھدار اور امن پسند جماعتوں اور افراد کو اتنا موقع ملا ہے کہ وہ منظم ہو کر اپنے اپنے ملک میں عام ذہنیت کی اصلاح کر سکیں تاکہ مستقل طور پر خوشگوار مراسم اور دوستانہ حکمت عملی کی بنیاد پڑ سکے۔ اس نئے اقدام پر جو نہ صرف عقلمندی بلکہ اخلاقی جرأت کا ایک روشن ثبوت ہے دونوں وزیر اور ان کے ہم خیال لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن اس تاریخی کارنامہ کے اصل ہیرو نہ نہرو ہیں نہ لیاقت علی بلکہ گاندھی جی کی تعلیم اور ان کی یاد ہے۔ انھوں نے سیاست کے خارزار میں جہاں عام طور پر اخلاقی قدروں کے پاؤں نہیں جمتے ہیں، بمشکل سبق سکھایا تھا کہ نہ صرف برائی کرنا برا ہے بلکہ برائی کا جواب برائی سے دینا بھی شرافت، جرأت اور عقلمندی کے خلاف ہے اور برائی کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے اور اس کی وجہ سے نفرت اور انتقام کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مخالف کو جیت لینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ دوستی اور بھروسے کا سلوک کرو۔ اگر خلوص کے ساتھ ایسا کرو گے تو وہ بھی تمھاری طرف محبت اور اعتماد کا ہاتھ بڑھائے گا۔ چنانچہ اب چند ہی ہفتوں میں معلوم ہو گیا کہ یہ غیر معمولی اور سچائی سے بھری ہوئی سیاست کیسا معجزہ دکھا سکتی ہے۔ اس وقت دونوں ملکوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو گذشتہ چند سال کے تجربے کی بنا پر ایک دوسرے کی نیک نیتی پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں لیکن ابھی ابھی ہمارے دیکھتے دیکھتے لوگوں کی بالخصوص پاکستانی پریس کی ذہنیت میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ ان تاریک بیں لوگوں کو شرمانے کے لئے کافی ہے ......

لیکن یاد رکھئے کہ ابھی یہ مہم سر نہیں ہوئی، ابھی تو اس کا آغاز ہوا ہے لاکھوں شاید کروڑوں کے دل ابھی صاف نہیں، خاص طور پر جو لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے یا بہت سے اپنے عزیزوں کو کھو کر ہندوستان سے پاکستان یا پاکستان سے ہندوستان گئے ہیں ان کے دلوں اور دماغوں پر ابھی گہرے گھاؤ باقی ہیں جن کو وقت کا مہربان ہاتھ ہی مٹا سکتا ہے۔ مگر پچھلے چند سال سے دونوں ملکوں پر ایک ایسی ذہنی فضا مسلط رہی ہے کہ زخم کسی طرح بھرنے نہیں پاتا بلکہ تعصب اور خود غرضی کا ہاتھ برابر اس کو چھیڑتا رہتا ہے اور مندمل نہیں ہونے دیتا۔ اس کے علاوہ ایک خاصا بڑا اور زبان دراز طبقہ ایسا بھی ہے جو اپنے ذاتی مقاصد کی وجہ سے یہ نہیں چاہتا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات سنبھلنے پائیں۔ وہ اپنا ناپاک کھیل نفرت اور مخالفت کے اندھیرے ہی میں کھیل سکتے ہیں۔ موجودہ معاہدے کو نتیجہ خیز اور اس کو ایک مستقل پالیسی کا سنگ بنیاد بنانے کے لئے ان دونوں جماعتوں کی اصلاح ضروری ہے۔ دوسری جماعت کی اصلاح تو ایک مشکل کام ہے جس کے لئے کوئی گر تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ان کا علاج تو یہی ہے کہ ملک کی عام فضا بہتر ہو، لوگ ان کے نامبارک مشوروں پر دھیان نہ دیں بلکہ حقارت کے ساتھ انھیں مسترد کریں اور جس طرح ہوا اور روشنی اور صفائی کا انتظام کرنے سے مچھر، مکھی اور دوسرے گندے کیڑے مر جاتے ہیں اس طرح جنتا کے دل اور دماغ میں روشنی اور فراخی پیدا ہو جانے سے قدرتی اصولوں کے مطابق یہ گروہ اپنی سیاسی موت مر جائیں۔ البتہ خود جنتا کی اصلاح [illegible] فائدہ اٹھا کر [illegible] اختیار کرنی چاہئیں [illegible] تاریخی [illegible] تقسیم بھی نہیں مٹا سکتی۔ [illegible] سے یہ ملک ضرور الگ ہیں [illegible] حالات نارمل ہو جائیں [illegible] کہ دلوں کا ایکا باقی رہے۔ [illegible] اپنا اندازہ یہ ہے کہ [illegible] دوسرے کے بس میں ہے [illegible] ہندوستان اور پاکستان میں [illegible] تعلقات قائم کرنا کوئی ناممکن یا مشکل کام نہیں ہے۔ دوستی اور محبت [illegible] دشمنی اور [illegible] کو قائم رکھنے کے لئے نہ عقل کوئی دلیل دے سکتی ہے، نہ مصلحت، نہ اخلاق، نہ مذہب! اس کا جواز تو محض حماقت اور تعصب۔ اس لئے ضروری ہے کہ [illegible] سیاسی اور اقتصادی تدبیریں اختیار کرنے کے ہم [illegible] جلد سے جلد دوبارہ جوڑنے کی کوشش کریں۔ اس کی ابتدا [illegible] مقاموں کی زیارت کے لئے لوگ ادھر سے ادھر آنے جانے لگے ہیں۔ حال ہی میں ہندوستان اور پاکستان کے [illegible] میں جو باہمی تجارتی مراسم اور [illegible] ہوا ہے وہ ایک نیک شگون ہے مگر یہ کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ عام میل جول کو بڑھایا جائے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانے میں جو پابندیاں اور [illegible] ہیں انھیں کم کیا جائے، [illegible] کالجوں کے استادوں اور طلبہ کا باہمی تبادلہ کیا جائے اور مختلف علمی اداروں اور ماہرین فن میں اشتراک عمل قائم [illegible] تاکہ ایک دوسرے کے مسئلوں [illegible] میں مدد دے سکیں۔ کیا [illegible] ہم یورپ اور امریکہ سے ماہرین [illegible] حاصل کریں اور کل کے ہم وطنوں [illegible] کو اچھوت سمجھ کر ان سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ عام طلبہ اور اسکاؤٹوں کی پارٹیاں [illegible] تفریح کے لئے اور باہمی دوستی [illegible] سفیر بن کر ادھر سے ادھر جانی چاہئیں [illegible] میزبان ملک کو ان کی ایسی خاطر [illegible] کرنی چاہئے کہ وہ گویا دوسرے ملک کی طرف سے رفاقت کی پیامبر بن کر [illegible] آئیں ...... غرض ایسی بہت [illegible]

نئی روشنی جلد ۴ نمبر ۱۸ ۸ مئی سنہ ۱۹۵۰ء
ادارۂ تحریر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

کیا چودھری ظفر اللہ کی پالیسی بدل رہی ہے؟

ہم نے یہ بات بار بار کہی ہے کہ ہندوستان پاکستان کے بگڑنے کا سب سے بڑا سبب پاکستان کی خارجی پالیسی ہے جو اس رُخ پر چل رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ اپنے معاملات باہمی گفت و شنید سے طے کرنے کے بجائے باہر کے ملکوں کا دباؤ ڈلوا کر طے کرائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پالیسی پوری حکومت پاکستان کی منظوری کے بغیر اختیار نہیں کی گئی ہو گی لیکن اس کی اصل ذمہ داری چودھری ظفر اللہ خاں صاحب پر وزیر خارجہ کی حیثیت سے عائد ہوتی ہے ہم اس پر بحث کر چکے ہیں کہ اس پالیسی سے ہندوستان کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے لیکن پاکستان کو فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے کہ بیرونی طاقتیں اگر ہندوستان پر دباؤ ڈالنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو وہ اسے پاکستان کے مقاصد کے لئے نہیں بلکہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں گی، معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت پاکستان پر اور خود چودھری ظفر اللہ خاں صاحب پر یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی ہے کہ مغربی طاقتوں کی زیادہ نیاز مندی کرنا یا ان پر زیادہ بھروسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اپنا بوجھ اپنی ہی طاقت سے اُٹھتا ہے اور اپنی گتھی اپنے ہی ناخن تدبیر سے کھلتی ہے۔ اگر ہمارا اندازہ صحیح ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہند اور پاکستان کے باہمی سمجھوتے کی راہ سے بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی ہے اور ان میں مکمل مصالحت جس پر شدید ضرورتیں دونوں دونوں کو مجبور کر رہی ہیں ہو کر رہے گی۔

یہ قیاس ہم نے چودھری صاحب کی ان تقریروں سے کیا ہے جو وہ پچھلے دنوں کرتے رہے ہیں۔ ابھی ۲ مئی کو انھوں نے انڈو پاکستان فرینڈشپ اسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری نکھن پال صاحب سے جو ان سے ملنے کے لیے لاہور گئے تھے فرمایا:۔

”پاکستان اس پر تیار ہی نہیں بلکہ اس کے لئے بے چین ہے کہ کل نزاعی امور کو جن میں کشمیر کا معاملہ بھی شامل ہے۔ جلد سے جلد دوستانہ طور پر طے کر لے تاکہ آپس میں کامل ہم آہنگی اور دوستی ہو جائے“۔

صرف یہی نہیں بلکہ ایڈمرل نمٹز کا بھی جنھیں یو۔ این۔ او نے کشمیر میں رائے شماری کے لئے نامزد کیا تھا یہی اندازہ ہے چنانچہ انھوں نے ۲ مئی کو اخبار کے چند نامہ نگاروں سے بے ضابطہ گفتگو کے سلسلے میں کہا کہ ان بیانات کی بنا پر جو چودھری ظفر اللہ نے حال میں کراچی میں دیے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ بات امکان سے خارج نہیں کہ کشمیر کے جھگڑے کا تصفیہ بغیر کسی قسم کی رائے شماری کے ہو جائے۔

مہاجروں کے لئے اب مطلق گنجائش نہیں

افسوس کی بات ہے کہ نہرو لیاقت معاہدے کے بعد ہند و پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے ختم ہو جانے کے بعد بھی دونوں ملکوں سے اقلیتوں کی ہجرت برابر جاری ہے اور وہ صرف بنگال کے دونوں حصوں تک محدود نہیں بلکہ ہند کے اور صوبوں اور مغربی پاکستان کے درمیان بھی ہجرت کا سلسلہ جاری ہے خصوصاً یو۔پی کے مسلمان بڑی تعداد میں سندھ جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں معاشی مشکلات ترک وطن پر مجبور کر رہی ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان جانے سے معاشی مشکلات کیونکر حل ہو جائیں گی شاید ہزار میں ایک آدمی اپنے تعلقات اور وسائل کی وجہ سے پاکستان جا کر روزگار حاصل کر لے ورنہ اب وہاں اس کے دروازے بالکل بند ہو چکے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے وزیر بحالی خواجہ شہاب الدین نے یکم مئی کو کراچی میں پریس کانفرنس کے دوران میں یہ کہا کہ ”اب نئے مہاجروں کے لئے نہ مکان ہیں نہ ملازمتیں ہیں اور نہ کھیت ہیں۔ اگر کراچی میں مہاجروں کی آمد روکنے کے لئے بروقت تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو اغلب ہے کہ وبائیں پھوٹ پڑیں گی۔ انھوں نے مہاجروں سے اپیل کی کہ ہندوستان واپس جائیں“ انھوں نے کہا ”ابھی آپ کے لئے واپس جانا ممکن ہے“۔

پاکستان کے محکمہ بحالی کے ڈپٹی ڈائرکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اس مسئلے پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے پاکستان کے ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے کو بتایا کہ اس وقت روزانہ کوئی چار ہزار مہاجر ہندوستان سے آ رہے ہیں۔ اور ان سے شکارپور، سکھر، روہڑی حیدرآباد وغیرہ کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان سرحدی علاقوں میں پانی اور سر چھپانے کی جگہ کی شدید قلت ہے۔ اور اگر مہاجر آئے تو سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور بہت سے بوڑھے، عورتیں اور بچے لو اور پیاس سے مر جائیں گے“۔

انھوں نے فرمایا ”خدا کرے یہ خبر غلط ہو کہ ہندوستان کی ریلوے روزانہ دو اسپیشل ٹرینوں کے بجائے پانچ کا انتظام کرنے والی ہے اس لئے کہ اگر آنے والے مہاجروں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا تو ہمارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی“۔

ڈاکٹر قریشی نے اس بات سے قطعی انکار کیا کہ حکومت پاکستان مسلمان دستکاروں کو ہندوستان سے پاکستان آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا ”حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری حکومت کے لئے ان ہی مہاجروں کی بحالی کا مسئلہ بہت نازک ہو گیا ہے جو اب تک آ چکے ہیں“۔

جو لوگ اب بھی ہجرت کر کے پاکستان جانے کی دھن میں ہیں انھیں ان وزیروں کے بیان کو نظر میں رکھ کر یہ سوچنا چاہیے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو [illegible] کئے دیتے ہیں بلکہ پاکستان کی تباہی کا بھی سامان کر رہے ہیں۔

بدھو گھر کو لوٹے منانے جا رہے ہیں

کانگریس پارٹیوں کے مسلم ممبر

پنجاب اور بنگال میں پارٹی کے لیڈروں اور ممبروں میں [illegible] کچھ دنوں سے صلح صفائی کے سلسلے چلے گئے ہیں۔ یہ خلاف اس کے مدراس اور یو۔پی میں پارٹی کے اختلافات ابھر رہے ہیں اور اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ مدراس اسمبلی میں شری پرکاشم کے گروپ نے اور یو۔پی اسمبلی میں شری ترلوک سنگھ کے گروپ نے کانگریس پارٹی سے الگ ہو کر الگ بنچوں پر بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ ان دونوں جماعتوں نے اپنی اپنی ریاست کی وزارت پر کچھ الزام لگائے تھے اور ان کی چھان بین کا مطالبہ کیا تھا۔ مدراس میں کچھ تحقیقات ہوئی مگر شری پرکاشم اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ یو۔پی کے معاملے میں کانگریس پارٹی کی کمیٹی نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ معمولی پوچھ گچھ کرنے دونوں جگہ ”باغی“ گروہوں کو نوٹس دے دیا گیا کہ ان کے خلاف ”انضباطی کارروائی“ کی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ”باغیوں“ کا جوش بغاوت اور بڑھ گیا اور وہ دل پر پتھر رکھ کر پارٹی کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ اب کانگریس ورکنگ کمیٹی کو معاملے کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے اپنے ۳ مئی کے اجلاس میں مدراس کے معاملے پر دوبارہ غور کر کے یہ اعلان شائع کیا چونکہ مسٹر پرکاشم اس پر راضی ہو گئے ہیں کہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے مشورے کو قبول کر لیں گے اس لئے ان کو مدراس اسمبلی کے دوسرے ممبروں کو جنھوں نے الگ بیٹھنے کا فیصلہ کیا ہے انضباطی کارروائی کا جو نوٹس دیا گیا تھا وہ واپس لیا جا سکتا ہے“۔ شری پرکاشم کا جو بیان اس پر شائع ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بلا شرط ہتھیار نہیں ڈالے ہیں بلکہ ان سے ان کی شکایتوں کو دور کرنے کے بارے میں کوئی وعدہ کیا گیا ہے۔ بظاہر ورکنگ کمیٹی نے اس جلسے میں یو۔پی کے ”باغیوں“ کے معاملے پر باضابطہ غور نہیں کیا لیکن غالباً کوئی بے ضابطہ گفتگو ضرور ہوئی ہے اس لئے رفیع الدین قدوائی صاحب ۵ مئی کو ان سے گفتگو کرنے کے لئے

گفتگو جاری ہے ہیں۔ اگر یہ حضرات بھی نہرو پرکاش کی طرح کسی معقول سمجھوتے پر تیار ہوگئے تو کیا عجب ہے کہ یو پی کے معاملے میں بھی ورکنگ کمیٹی گرہ کو کاٹنے کے بجائے اُسے ناخن تدبیر سے کھولنے کی کوشش کرے۔

کسانوں کی بے دخلی ممنوع

مغربی پنجاب میں ایک عرصے سے یہ تحریک جاری ہے کہ کسانوں کو […] زمین پر حق ملکیت دے دیا جائے۔ پنجاب کی مسلم لیگ نے زرعی مسائل کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی رپورٹ میں بھی اس کی پرزور سفارش کی گئی۔ اس سے زمین کے مالکوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید کوئی ایسا قانون پاس ہو جائے جس کے ذریعے سے پرانے کاشتکاروں کو اپنی زمین کا مالک قرار دیا جائے اس لئے انھوں نے دھڑا دھڑ بے دخلیاں شروع کر دیں تاکہ پرانے کاشتکار باقی ہی نہ رہیں۔ پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اس سال کے ابتدائی دو مہینوں میں بے دخلی کی کارروائیوں کی تعداد خطرناک حد تک بڑھ گئی اور حکومت کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں زمین کے مالکوں اور اسامیوں میں خون خرابے کی نوبت نہ آ جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ لائلپور، منٹگمری اور اٹک کے ضلعوں میں بے شمار کسان بے دخل کئے گئے اور کہیں کہیں مالکوں نے انھیں زد و کوب بھی کیا۔"

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے قانون تحفظ و بحالی حقوق لگان داری پنجاب ۱۹۵۰ء کے نام سے ایک ایکٹ نافذ کیا ہے جس کی رو سے بے دخلی کی کل کارروائیاں جو ۱۵ جون ۱۹۴۹ء کے بعد ہوئی ہیں منسوخ کر دی گئی ہیں اور آئندہ کے لئے اس قسم کی کارروائی پر بڑی سخت پابندیاں لگائی گئی ہیں۔

لیاقت علی خاں واشنگٹن میں

پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب اور بیگم لیاقت علی خاں ۳ مئی کو ہوائی جہاز سے لندن سے واشنگٹن پہنچے۔ ہوائی اڈے پر ان کا فوجی اعزاز کے ساتھ شاندار استقبال ہوا۔ پریذیڈنٹ ٹرومین نے ایک مختصر تقریر میں اپنی طرف سے اور ساری امریکی قوم کی طرف سے معزز مہمان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور لیاقت علی خاں صاحب نے مناسب الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچسن نے اپنے ایک بیان میں لیاقت علی خاں کی آمد پر اطمینان و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہم انھیں موجودہ زمانے میں ایشیا کی ایک نہایت اہم شخصیت سمجھتے ہیں نہ صرف اس قابلیت کی وجہ سے جو انھوں نے پچھلے ڈھائی سال میں پاکستان کی تعمیر میں دکھائی بلکہ عالی ظرفی اور صبر و تدبر کی وجہ سے جس کا انھوں نے اور پنڈت نہرو نے حال ہی میں نئی دہلی اور کراچی کی کانفرنسوں میں ثبوت دیا۔"

واشنگٹن کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات بہتر ہو جانے کی وجہ سے لیاقت علی خاں کے سفر امریکہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جب تک دونوں ملکوں میں اتنی زیادہ کشیدگی تھی امریکہ کے ارباب حکومت دونوں میں سے ایک کے ساتھ بھی سیاسی اور معاشی مسائل پر کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے کو بدگمانی یا شکایت نہ ہو۔ لیکن اب اس کا قوی امکان ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا اور ہندو پاکستان کی اقتصادی نشوونما کے مسائل پر بات چیت شروع ہو جائے اگرچہ اس کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب امریکہ، پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے یک جا ہوں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بات تبھی چھڑ سکتی ہے جب لیاقت علی خاں صاحب پنڈت نہرو کی طرح بے رخی اور بے مہری کی اداؤں سے کام نہ لیں بلکہ دل نوازی اور دلداری کا ثبوت دیں۔ مشکل یہ ہے کہ انھوں نے روانہ ہونے سے پہلے ہی کراچی میں یہ کہہ دیا تھا کہ "میں کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے کر نہیں جا رہا ہوں۔"

مشرقی فلسطین کے الحاق کے اثرات

شاہ عبداللہ خوش ہیں کہ مشرقی فلسطین پر قبضہ کر لینے سے ان کے ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا اور خود ان کا بھی بول بالا ہوگا۔ اس الحاق کی وجہ سے شرق اردن کی آبادی دگنی ہو جائے گی اور اس کے ہاتھ بڑی زرخیز زمین آ جائے گی جس سے زراعت کو ترقی ہوگی۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عرب شرق اردن کے بدویوں سے تعلیم اور تہذیب میں بہت آگے ہیں اور اہل مغرب کے سابقے کی وجہ سے کاروبار اور نظم و نسق کے جدید طریقوں سے واقف ہیں اس لئے وہ سارے ملک کی عام ذہنی سطح کو اونچا کر دیں گے۔

عرب ریاستیں ابھی تک سخت برہم ہو رہی ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے عرب لیگ کی کونسل نے اپنے اس فیصلے کو دہرایا تھا کہ اسرائیل کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے بعد مشرقی فلسطین اہل فلسطین کو واپس کر دیا جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جو ریاست اس فیصلے کی خلاف ورزی کرے گی اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ اب اس کے لئے بڑی مشکل ہے کہ اگر اپنے فیصلے کے مطابق شرق اردن کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی ہے تو ایک نہیں بلکہ دو مہرے کھسکتے جاتے ہیں اس لئے کہ شرق اردن کے ساتھ عراق بھی جس کے حکمران شاہ عبداللہ کے قریبی عزیز ہیں لیگ سے نکل جائے گا اور اگر چشم پوشی سے کام لیتی ہے تو اس کی اور زیادہ بدرعبی ہوگی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناک بچانے کے لئے […] گی مگر کچھ کرے کرائے گی نہیں۔

برطانیہ نے تو اسے چاہا تھا کہ کم از کم فلسطین اس کے سپرد […] عبداللہ کو مل جائے تاکہ وہ پچھلے دروازے سے اس میں داخل ہو سکے۔ اب رہی اسرائیل کی حکومت وہ اس اقدام پر ناخوشی کا اظہار کر رہی ہے لیکن احتجاج کے سوا اور کیا کر سکتی ہے۔ […] فلسطین کی تقسیم ماننے کے بعد اس کا اس کے کسی حصے پر کوئی دعویٰ نہیں رہا۔

جنگ کی بشارت اور صلح کی کوشش

کوئی سال بھر سے دنیا کے اہل الرائے عام طور پر کہہ رہے ہیں کہ ابھی ایک مدت تک تیسری جنگ عظیم کے چھڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر کبھی کبھی امریکہ میں کوئی بزرگ قرب جنگ کی بشارت اس قدر وثوق سے دے دیتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی جنرل جارج کینی نے جو پچھلی جنگ میں بحر الکاہل کے علاقے میں اتحادیوں کی ہوائی فوج کے افسر اعلیٰ تھے فرمایا کہ روس سے جنگ ہونے ہی والی ہے جس میں روس پہل کرے گا۔ انھوں نے فرمایا کہ روس کی جنگ کی تیاریاں بہت دور تک پہنچ گئی ہیں اور اس نے لڑائی کی تاریخ بھی مقرر کر دی ہے۔ مگر تاریخ جنرل صاحب کو معلوم نہیں ہو سکی یا انھوں نے مصلحت جنگ کی بنا پر اسے ظاہر نہیں کیا۔

جنرل صاحب کی پیشین گوئی کہاں تک ٹھیک ہے یہ تو معلوم نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک روس اور امریکہ کی اعصابی جنگ اس شدت سے جاری ہے حقیقی جنگ کے شروع ہو جانے کا امکان ہر وقت موجود ہے۔ اسی خطرے کے احساس نے یو این او کے سیکریٹری جنرل موسیو لائی کو مجبور کیا ہے کہ وہ ۱۰ مئی کو ماسکو جا کر مارشل اسٹالن سے ملیں اور اعصابی جنگ دور کرنے کی ایک زبردست کوشش کریں۔ وہ اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں کہ سکیورٹی کونسل کے جلسے باری باری سے چاروں بڑی طاقتوں کی راجدھانیوں میں ہوا کریں تاکہ ان ریاستوں کے حکمران دوستانہ اور خفیہ گفتگو کر سکیں۔ دنیا کے سب امن پسندوں کی دعائیں موسیو لائی کے ساتھ ہیں۔

مصالحت کی مؤثر تدبیر

نہرو لیاقت معاہدے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کشیدگی کو دور کرنے اور ان میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے جتنی تدبیریں اب تک کی گئی ہیں ان میں سب سے اہم اور مؤثر اخباروں کے ایڈیٹروں کی کانفرنس ہے جو دہلی میں ۷ مئی سے شروع ہوئی۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے اخباروں کے نمائندے مل کر اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس غلط فہمی اور بدگمانی، نفرت اور تعصب کو جس کے پھیلانے میں خود انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہت بڑا حصہ لیا ہے کس طرح مٹایا جائے۔ کانفرنس میں دونوں ملکوں کے محکمہ اطلاعات کے وزیر […] شری دیواکر اور خواجہ شہاب الدین اور […] ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر […] پیر […] راشدی نے تقریریں کیں لیکن سب سے زیادہ اہم وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا خطبہ تھا جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہند اور پاکستان میں باہمی دوستی اور مشترک بیرونی اور دفاعی پالیسی دونوں ملکوں کی بقا اور ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ کانفرنس میں یہ اہم اعلان کیا گیا کہ دونوں حکومتوں نے اخباروں کے داخلے پر سے اور خبروں

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

کشکول

(جب زمانے کا رنگ بدلتا ہے۔ حکومت کا چولا بدلتا ہے۔ افسروں کی نیت بدلتی ہے۔ دوستوں کی نظریں بدلتی ہیں، دشمنوں کے پینترے بدلتے ہیں، سکے کی قیمت بدلتی ہے۔ شہروں کے نام بدلتے ہیں، تو پھر لفظوں کے معنی کیوں نہ بدلیں؟ اب لغت کی پرانی کتابوں کو تو بالائے طاق رکھئے اور ہماری "نئی روشنی" کی ڈکشنری سے فائدہ اٹھا سکیں تو فائدہ، نہیں تو کم سے کم لطف ہی اٹھائیے۔)

آبادی۔ وہ ہے جس کے لئے ملک کی تقسیم ضرب شدید کا کام دیتی ہے جس کے مبادی میں اتنا بڑھ تک جاتا ہے کہ دل کچھ نہیں رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار گیہوں کھانے سے بڑھنی شروع ہوئی تھی مگر اب گیہوں ملے یا نہ ملے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ فطرت اور سائنس اس کو روکنے کے لئے نت نئے منصوبے بناتی رہتی ہیں۔ مگر انسانی جبلت نے ایک پیچ ایسا بنا رکھا ہے کہ کشتی اسی کے ہاتھ رہتی ہے۔

اپیل (۱) جو عدالت سیشن سے خارج اور ہائی کورٹ سے منظور ہو جاتی ہے۔ (۲) جو والینٹروں کے لئے کی جائے تو کامیاب اور چندے کے لئے کی جائے تو ناکام رہتی ہے۔

اچاریہ۔ دو قسم کا ہوتا ہے، کھٹا اور میٹھا۔ کھٹا کانگریس پارٹی کے حلق میں پھنس جاتا ہے اور میٹھا سوشلسٹ پارٹی کے گلے اتر جاتا ہے۔

ادب۔ پرانا برائے ادب اور نیا برائے زندگی کہلاتا ہے مگر حقیقت میں پرانا برائے نام اور نیا برائے بیت ہوتا ہے۔

اردو۔ وہ زبان جو بتیس دانتوں میں رہ کر سلامت ہے اور رہے گی۔ وہ شیریں جس کے نخرے آج خسرو سے نہ اٹھے تو کل فرہاد اٹھائے گا۔

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہ کن ہست

آزادی۔ وہ صبح وصل جس کے انتظار میں ہجر کی ہزاروں راتیں تڑپ تڑپ کے کٹیں اور جس کے آتے ہی اپنی تو بجھ رہ گئی۔

اقلیت۔ وہ ناشکری جماعت جو ہند اور پاکستان میں تمام آئینی تحفظات کے باوجود محض جان و مال کے نقصان سے تنگ آ کر یہ فریاد کرتی رہتی ہے۔

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اکثریت۔ جو ظلم کبھی نہیں کرتی صرف ہندوستان کے ظلم کا پاکستان کے ظلم کا ہندوستان میں بدلہ لیتی ہے یہ اور بات ہے کہ بدلہ اکثریت ہی لے لیتی ہے۔

الیکشن۔ جس میں ووٹ کی کمی سے ہارنے والے کی ضمانت ضبط اور خرچ کی زیادتی سے جیتنے والے کی عقل خبط ہو جاتی ہے۔

آمدنی۔ جو خرچ کے پیچھے دوڑتی رہتی ہے، مگر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

امریکہ۔ وہ صیاد جس کے تیر زریں کا نشانہ راہب روما سے لے کر شیخ خرم تک کون ہے جو نہ ہو۔

ڈالر نے جس کے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

امن۔ جس کو کبھی خواب میں دیکھا تھا اور جس کا اب خواب دیکھا کرتے ہیں۔

اناج۔ جس کی پیداوار اور قیمت خدا کے فضل سے اور سرکار کے اقبال سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

انکم ٹیکس۔ جو امیروں پر تشخیص ہوتا ہے۔ متوسط طبقے پر عاید ہوتا ہے اور غریبوں سے وصول کیا جاتا ہے۔

اہنسا۔ جو انگریز سے بے ہتھیار کے کی گئی اور ایک دوسرے پر یعنی لاٹھی گولی سے کی جاتی ہے۔

غزل

نسیم صدیقی

قصر و ایوان کی بنیاد ہلا دیں آؤ
غم میں ڈوبے ہوئے لمحات کو رخصت کر کے
اب بھی روشن ہیں غریبوں کے لہو سے شمعیں
اب تو جذبات کا گھٹنا نہیں جاتا ہے گلا
خشک ہونٹوں پہ زباں کو کوئی کب تک پھیرے
بہکی بہکی ہوئی باتیں یہ کریں گے کب تک
ظلمتوں کو کہیں کھا سکتے ہیں بے نور دیے
کب سے یہ ڈھونڈ رہے ہیں کوئی ہمدرد اپنا

دہر سے لعنت افلاس مٹائیں آؤ
مسکراتے ہوئے لمحات کو لائیں آؤ
عزم کی پھونکوں سے ہم ان کو بجھائیں آؤ
دل کی آواز کو اب دوست اٹھائیں آؤ
میکدے کا نیا دستور بنائیں آؤ
آج دیوانوں کو ہم ہوش میں لائیں آؤ
ہر قدم پر نئی اک شمع جلائیں آؤ
بڑھ کے ناداروں کو سینے سے لگائیں آؤ

کھیلنے دو انھیں پستی کے نظاروں سے ابھی
اپنی نظروں کو بلندی پہ جمائیں آؤ

دھڑکنیں

جاوید اختر صدیقی

رات

یہ زرد چاند، یہ بوجھل فضا، یہ سناٹا
خموش پیڑوں کے بے جان اور گھنے سائے
نڈھال ہوئے نگوں سر ہیں اس طرح گویا
کہ جیسے چلتی ہوئی نبض وقت رک جائے

گردش

اداس شام کی ہلکی سی تیرگی اختر
حسین دن کی کلائی مروڑ جاتی ہے
مہیب رات، بھیانک خموشیوں کا طلسم
سحر گرجتی ہوئی آکے توڑ جاتی ہے

یاد

تھکا تھکا ہوا ماحول، زخم خوردہ ہوا
یہ رات سوگ میں ڈوبی ہوئی نہائی ہوئی
یہ کس نے جھانکا ہے دل کے نگار خانے سے
کہ یاد آئی کسی کی مجھے بھلائی ہوئی

سمجھ رہا ہوں کہ میں تجھ کو بھول جاؤں گا
نگاہ میں اب تک ہے تیری رعنائی
جدا تو کرتے ہیں تجھ سے یہ دن کے ہنگامے
مگر ابھارتی ہے دل کو شب کی تنہائی

وہ، دور، سامنے پیڑوں کے جھنڈ پہ اکثر
نظر جمائے ہوئے رات بیت جاتی ہے
یہ جانتا ہوں کہ تجھ کو نہ پا سکوں گا، مگر
ترے خیال سے تسکین روح پاتی ہے

عورتوں کے حقوق

شریفہ حامد علی

(بیگم شریفہ حامد علی آل انڈیا ویمنس کانفرنس کے بانیوں میں سے ہیں اور ہندوستانی عورتوں کی آزادی اور ترقی کی تحریک میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں بیگم صاحب اس کمیشن میں جو ادارہ اقوامِ متحدہ نے عورتوں کی سماجی حیثیت کے تعین کے لئے مقرر کیا تھا۔ ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے لئے گئی تھیں۔ ذیل میں ہم اس کمیشن کے کام کی ایک مختصر رپورٹ شائع کرتے ہیں جو بیگم صاحبہ نے مرتب کی تھی۔)

(ادارہ)

"عورتوں کی سماجی حیثیت کا کمیشن" اقوامِ متحدہ کی معاشی اور سماجی مجلس (UNESC) کی طرف مقرر ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ "سیاسی، معاشی، سماجی اور تعلیمی میدان میں عورتوں کے حقوق کی ضمانت کے لئے سفارشیں اور رپورٹیں مجلس کے سامنے پیش کیا کرے۔ اس کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا تھا کہ عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں جو مسائل فوری طور پر غور طلب ہوں ان کے متعلق سفارشیں کرے۔

اقوامِ متحدہ کے ممبر ملکوں میں سے پندرہ ملکوں کو منتخب کر کے انہیں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اپنا ایک ایک نمائندہ کمیشن میں بھیجیں۔ چنانچہ کمیشن کے پہلے اجلاس میں جو لیک سکسیس میں منعقد ہوا ان ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی:-

آسٹریلیا	بائلورشا	چین
کوسٹاریکا	ڈنمارک	فرانس
گوئٹے مالا	ہندوستان	میکسیکو
شام	ترکی	روس
برطانیہ	ریاستہائے متحدہ امریکہ	وینیزویلا

کمیشن نے معاشی اور سماجی مجلس کے اس رزولیوشن پر غور کرنے کے بعد جس کی رو سے اس کا تقرر ہوا تھا اپنے مقصد اور اپنے کام کے اصول طے کئے۔ اس نے اپنا مقصد عورتوں کے سیاسی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حقوق کی حفاظت قرار دیا۔

سیاسی حقوق کی تفصیل یہ ہے:-

حکومت میں عورتوں کی مردوں کے ساتھ برابر کی شرکت۔

شہریت کے مساوی حقوق یعنی ہر بالغ عورت کو ووٹ دینے کا، منتخب ہونے کا اور سرکاری ملازمت کا حق۔

۱۔ یہ تجویز منظور کی گئی کہ عام حق رائے دہندگی کی تشریح کر کے اس بات کو صاف کر دیا جائے کہ یہ حق ہر بالغ عورت کو حاصل ہوگا۔ اس پر لوگ بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔ اگرچہ انگلستان میں عام حق رائے دہندگی کے قانون میں ترمیم ہو گئی ہے اور عورتوں اور مردوں کے حقوق میں جو امتیاز تھا [illegible] گیا ہے، (سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک [illegible] انگلستان میں عورت کو ۳۰ برس کی عمر کے بعد ووٹ کا حق ملتا تھا حالانکہ مرد کو ۲۱ برس کی عمر میں مل جاتا تھا) پھر بھی انگلستان کے نمائندے نے آخر تک اس تجویز کی مخالفت کی۔ یہی حال امریکہ کے نمائندے کا تھا۔ یوں تو وہاں آئین کی دفعہ ۱۹ کے مطابق جو سنہ ۱۹۲۰ء میں منظور ہوئی سب شہریوں کو پورے اور برابر حقوق دے گئے ہیں تاکہ عورت اور مرد میں جو فرق کیا جاتا ہے وہ ختم ہو جائے لیکن ۴۸ ریاستوں میں سے صرف ۱۰ اس پر عمل کرتی ہیں، باقی کسی نہ کسی حیلۂ شرعی سے کام لے کر اس کی پابندی سے بچ جاتی ہیں۔ امریکی آئین کی دفعہ ۱۹ کے الفاظ یہ ہیں:-

"ریاستہائے متحدہ کے شہریوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان سے ریاستہائے متحدہ کی حکومت یا کوئی اور ریاست نہ کسی کو جنس کی بنا پر محروم کر سکے گی اور نہ ان حقوق میں کوئی کمی کر سکے گی۔ کانگریس کو یہ حق ہوگا کہ اس دفعہ کی نفاذ کے لئے مناسب قانون بنائے۔"

مگر سب جانتے ہیں کہ اس پُر زور اعلان کے باوجود امریکہ کے پرانے باشندوں میں جو انڈین کہلاتے ہیں نہ صرف عورتیں بلکہ مرد بھی ووٹ کے حق سے محروم ہیں اب رہے حبشی تو انھیں کاغذ پر تو یہ حق حاصل ہے مگر عملاً بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ آج بھی امریکہ میں "عام حق رائے دہندگی" حقیقت سے دور ہے۔ فرقہ وارانہ ٹیکس، میونسپل رجسٹریشن اور جداگانہ پولنگ اسٹیشن وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جن سے کام لے کر امریکہ کے حبشیوں اور امریکی عورتوں کی حقوق کو کم کر دیا گیا ہے۔

ووٹ کے حق کے علاوہ اور شہری حقوق یعنی شادی بیاہ، ولایت، قانونی حیثیت، سکونت، قومیت وغیرہ کے بارے میں بھی یہ سفارش کی گئی کہ عورتوں اور مردوں میں پوری مساوات رکھی جائے۔

۲۔ دوسری تجویز ہندوستان کی ڈیلی گیٹ نے قوانین کے انضباط کے بارے میں پیش کی، اس نے اس بات پر زور دیا کہ عورتوں کے متعلق جتنے قومی یا بین الاقوامی قوانین ہیں ان کو منضبط کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ان غریبوں کو رسم و رواج اور مقامی دستور کے تسلط سے نجات ملے جس نے ان کی سماجی قانونی اور معاشی حیثیت کو گرا دیا ہے۔ جب قوانین منضبط ہو جاتے ہیں تو ان کی خلاف ورزی ہونے پر قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے اور اکثریت اقلیتوں کو ان کے فائدے سے محروم نہیں کر سکتی۔

کمیشن نے اس تجویز کو منظور کر کے اسے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کا ایک اصول قرار دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ "اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کمیشن یہ چاہتا ہے کہ عورتوں کو قوم یا نسل یا زبان یا مذہب کی تفریق کے بغیر مردوں کے مساوی درجہ دیا جائے اور ان میں اور مردوں میں تحریری قوانین، قانونی مقولوں یا رواجی قوانین کے مطابق جو فرق برتا جاتا ہے اسے مٹا دیا جائے۔" آخری الفاظ اس وقت بڑھائے گئے جب ہندوستان کے نمائندے نے یہ بتایا کہ تحریری اور رواجی قوانین کی بعض نامناسب دفعات کی وجہ سے عورتوں کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ انضباطِ قانون کے بارے میں جو رزولیشن پاس ہوا اس کا ذکر (UNESC) کی رپورٹ کے پیراگراف ۲۶ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ "کمیشن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ معاشی اور سماجی کونسل جنرل اسمبلی سے یہ سفارش کرے کہ سب ملکوں کے کل قانون منضبط کر لئے جائیں تاکہ سب شہریوں کو بلا تفریق یکساں حقوق حاصل ہو سکیں اور اگر ضرورت ہو تو ہر ایک ملک سے یہ درخواست کی جائے کہ اپنے سب سیاسی، معاشی، شہری اور سماجی قوانین کو منضبط کر لے تاکہ سب عورتوں کو مساوی حقوق حاصل ہو سکیں۔"

۳۔ کمیشن نے پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تعلیم کا تعلق یونیسکو سے ہے لیکن ہندوستان کی ڈیلی گیٹ نے کہا بہتر ہوگا یہ کمیشن عورتوں کو یکساں تعلیمی مواقع دینے کے بارے میں ایک واضح اعلان کر دے تاکہ دوسری کمیٹیوں اور کمیشنوں کو تقویت پہنچے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۷ء کی رپورٹ میں یہ تحریک شامل کر لی گئی۔ عورتوں کو (عام تعلیم کے علاوہ) خاص مضامین کی تعلیم کے موقعے مردوں کے برابر دئے جائیں اور انھیں یہ حق ہو کہ سائنس کی ایجادات کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے کا علم حاصل کریں۔ ان مقاصد کے پیش نظر کمیشن کی تجویز ہے کہ دنیا کی رائے عامہ کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ عورتوں کے درجے کو بلند کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی حقوقِ انسانی کی حمایت اور قیامِ امن کا ایک وسیلہ ہے۔

۴۔ ہندوستان کی ڈیلی گیٹ نے اس پر زور دیا کہ چاروں قسم کی آزادی کا جس کا چارٹر میں ذکر ہے سب ملکوں کے باشندوں کے لئے مطالبہ کیا جائے اس لئے کہ جہاں خود مردوں کو سیاسی یا شہری حقوق حاصل نہ ہوں وہاں عورتوں کے لئے "مساوی حقوق" مانگنا بے معنی ہے۔ مگر معاشی اور سماجی کونسل نے اس مطالبے کو عورتوں کے کمیشن کے دائرہ بحث سے خارج قرار دیا اور اس پر غور نہیں کیا کہ عورتوں کے شہری حقوق کو عام شہری حقوق سے الگ کرنا کسی طرح ممکن نہیں......

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

آزادی کی زنجیریں

ظفر دریاپور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد پنشن کے بعد وطن میں آ رہے تھے۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا وہ پڑھنے میں بڑا تیز اور شوقین تھا۔ وہ اس کا دوست ہردیال دونوں الہ آباد میں فرسٹ ایر میں پڑھتے تھے اور اکرام اللہ صاحب کے ساتھ رہتے تھے ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم بھی اپنے شوہر اور لڑکی حسینہ کے ساتھ الہ آباد میں رہتی تھیں بچپن میں ظفر اور حسینہ کی منگنی ہو چکی تھی، پھوپھی کے ہاں آنے جانے سے ظفر کو حسینہ سے ملنے اور اسے پڑھانے کا موقع ملتا تھا اور وہ حسینہ کی ذہانت و ذکاوت اور معصوم حسن پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ الہ آباد میں ظفر کو نئے ادبی حلقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات لطیف سے ہوئی جو حسینہ کے چچا کا بیٹا تھا اور ظفر کے دل میں یہ خلش پیدا ہو گئی کہ کہیں حسینہ اور لطیف ایک دوسرے کو چاہتے تو نہیں مگر اسے اس کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

قسط ۱۸

یہی ہمدردی، ذکاوت فہم اور احساس تناسب کی صفات اس کی شخصیت میں نازک مزاجی اور خود داری، مزاج شناسی اور ہمدردی، خوش طبعی، توازن اور اعتدال پسندی بن کر ظاہر ہوئی تھیں۔ ظفر دیکھتا کہ عقیلہ بیگم غصہ ور اور تیز مزاج ہونے کے باوجود حسینہ سے نہایت سہولت اور نرمی سے گفتگو کرتی ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہے اس کا لحاظ رکھتی ہیں کہ کوئی بات اسے ناگوار نہ ہو۔ صفدر علی بھی عموماً اس کی خوشی کا خیال رکھتے لیکن کبھی بے خیالی میں جھنجھلا پڑتے یا ڈانٹ دیتے تو حسینہ کا چہرہ آزردگی اور غیرت سے تمتما اٹھتا، مگر وہ فوراً اپنے اوپر قابو پا لیتی۔ ایسے موقعوں پر وہ بالکل خاموش رہتی لیکن اگر بولنے کی ضرورت پڑتی تو اس کے الفاظ یا لہجے میں رنج یا غصے کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ وہ اپنی طرف سے ماں باپ کے ساتھ ادب اور فرماں برداری سے اور سب کے ساتھ یہاں تک کہ نوکروں کے ساتھ بھی خوش خلقی اور نرمی سے پیش آتی تھی۔ لیکن اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس سے بچوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے باپ کبھی کبھی شفقت آمیز مذاق میں اسے اس طرح چھیڑتے تھے جیسے بچوں کو چھیڑتے ہیں تو وہ ان کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے بچہ بن جاتی تھی، لیکن اگر اس چھیڑ میں سنجیدگی کا رنگ آ جائے تو وہ چھوئی موئی کی طرح مرجھا کر رہ جاتی تھی۔ وہ ان کی راحت اور آرام کا دل و جان سے خیال رکھتی تھی، نوکروں سے بڑھ کر خدمت کرتی تھی لیکن ان سے اس کا دل نہیں ملتا تھا۔ ان کی بزرگانہ نصیحت کا جو وہ دل کھول کر اور آنکھ بند کر کے کیا کرتے تھے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اپنی ماں کی ہر بات کو وہ غور سے سنتی تھی اور خوشی سے مانتی تھی۔ عقیلہ بیگم کا طرز اس کے ساتھ ایسا تھا جیسا ایک بہن کا دوسری بہن سے جو عمر میں کسی قدر چھوٹی ہو، وہ اسے نصیحت یا تنبیہہ کرنا چاہتیں تو بہت صبر و تحمل سے سمجھاتیں اور دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتیں اور اگر اس سے کام نہ چلتا تو تھوڑی سا روٹھ جاتیں، ان کی خفیف سی آزردگی اس کے لئے کافی تھی کہ حسینہ کا سر رنج اور ندامت سے جھک جائے اور اس کا دل ان کی نصیحت کو قبول کرنے کے لئے کھل جائے۔

حسینہ کی طبیعت ظفر کو، جہاں تک اس کا اندازہ کر سکتا تھا اپنی طبیعت سے بہت ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی۔ مگر دو باتوں میں بڑا فرق نظر آتا تھا۔ ایک تو یہ کہ حسینہ کا مزاج اعصابی نہ تھا اور اس کے اندر اس چھوٹی سی عمر میں وہ اعتماد نفس، وہ رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ پایا جاتا تھا جو ہندوستان میں عورتوں کا تو کیا ذکر ہے مردوں میں بھی بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے ظفر کے نزدیک اس میں محبت کا کم سے کم رومانی محبت کا مادہ نہیں تھا اردو کے غزل گو شاعروں نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ حسینوں کے لئے بے مہر اور سنگ دل ہونا ضروری ہے اور حسینہ کی حرکات و سکنات سے اس کی تصدیق ہوتی تھی۔ وہ ظفر کی پرشوق نگاہوں کا جواب شرمائی ہوئی جھکی ہوئی نظروں سے دیتی تھی، کبھی پڑھاتے وقت کتاب پر جھکنے میں اتفاقاً یا ارادۃً ظفر کا کندھا اس کے کندھے سے چھو جاتا تو وہ چپکے سے سرک کر الگ ہو جاتی۔ تنہائی میں اس سے بات کرتے ہوئے ظفر کی آواز میں لرزش پیدا ہو جاتی، مگر وہ اسی اطمینان اور بے پروائی سے گفتگو کرتی رہتی۔ ابھی سب چیزوں کو ظفر کی اعصابیت اور حد سے بڑھی ہوئی زود حسی بے حسی اور سنگ دلی پر محمول کرتی تھی۔ اس کا مشاہدہ کتنا ہی تیز ہو مگر ابھی اس میں اتنی گہرائی نہ تھی کہ ایک ہندوستانی دوشیزہ کے ان جذبات کا اندازہ کر سکے جنھیں وہ اپنے آپ پر بھی ظاہر نہیں کرتی۔

حقیقت میں حسینہ کے دل کے اندر محبت کا بھرپور خزانہ چھپا ہوا تھا، مگر وہ اسے جذبات پرستی کے سیلابوں میں ضائع کرنا نہیں جانتی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ سے قلبی محبت تھی جو خوش دلی اور خلوص سے ان کی خدمت اور اطاعت کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ظفر سے اسے بچپن سے انس تھا اور جب سے وہ اس کے ساتھ منسوب ہوئی تھی یہ انس گہرا ہو کر دلی تعلق بن گیا تھا۔ آٹھ برس کے عرصے میں جس میں دونوں ایک دوسرے سے الگ رہے ظفر اسے قریب قریب بھول گیا تھا، لیکن اس کے دل میں ظفر کی یاد ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ نشو و نما پاتی رہی اس پودے کی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی رہیں اور روز بروز مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ ظفر نے اسے آٹھ برس کے بعد پہلی بار دیکھا تو اسے حیرت و مسرت کا ایک دھچکا سا لگا جیسے ایک تہ شدہ نئے تجربے سے لگا کرتا ہے، لیکن حسینہ کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک تصویر کا بدلا سا خاکہ جو حافظے کے دھندلکے میں ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ اب مشاہدے کے روشنی پڑنے سے زیادہ صاف اور واضح ہو گیا ہے۔ اس کے لئے ظفر کی محبت کا احساس کوئی نئی چیز تھی کہ وہ چونک پڑتی، مضطرب ہو جاتی بلکہ ایک جانا بوجھا معلوم اور مانوس جذبہ تھا جس میں نئی بات صرف اتنی تھی کہ اس کی شدت اور تیزی کچھ بڑھ گئی تھی۔ اس نے ظفر کے قریب آنے اور اس سے ذہنی رابطہ پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ اس سے اپنی پڑھائی میں مدد لے اور اپنی ماں سے درخواست کی ظفر بھیا سے کہہ دیجئے، مجھے فارسی میں جو کچھ پوچھنا ہو بتا دیا کریں۔ عقیلہ بیگم اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھیں مگر انھیں اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی اور انھوں نے حسینہ کی تجویز اپنی طرف سے پیش کر دی۔ اگر ظفر کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ بے چینی سے اتوار کا انتظار کرتی رہتی ہے تاکہ سبق پڑھنے کے بہانے اسے ظفر کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے اور اس معمول میں ناغہ ہو جانے سے اسے سخت مایوسی ہوتی ہے، اگر وہ یہ محسوس کرتا کہ حسینہ کے حد سے بڑھے ہوئے حجاب اور رمیدگی میں شوق و آرزو کی تب و تاب پنہاں ہے تو وہ اس پر بے مہری اور سنگ دلی کا الزام نہ لگاتا۔

بہرحال ظفر محبت کے پہلے نشے کے ہلکے سے سرور محبوب کی مفروضہ بے اعتنائی کی خفیف سی اور رقیب کی دراندازی کے مبہم سے اندیشے کی اپنی سادگی اور ناتجربہ کاری سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ عشق کی شیرینی اور تلخی کا حقیقی مزہ چکھ رہا ہے۔ دراصل ابھی محبت کا آغاز نہیں ہوا تھا بلکہ محض تمہید تھی جس نے اس کی زندگی کی سطح میں کچھ برائے نام تموج پیدا کر دیا تھا سطح کے نیچے زندگی کا دھارا حسب معمول خاموشی اور سکون سے بہہ رہا تھا۔ جوں جوں امتحان قریب آتا جاتا تھا اس کا انہماک مطالعے میں بڑھتا جاتا تھا۔ مارچ کے شروع سے اس کا صفدر علی صاحب کے ہاں آنا بالکل چھوٹ گیا اور وہ اتوار کے دن اور دنوں سے بھی زیادہ مصروف رہنے لگا۔ کبھی کبھی وہ شام کو غروب آفتاب تک پڑھتا رہتا تھا۔ دور تک ٹہلنے کے بجائے ابراہیم منزل کے احاطے کے اندر ہی پندرہ بیس منٹ ہوا خوری کر لیتا تھا اور پھر کام میں جٹ جاتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا جگر خراب ہو گیا بھوک جاتی رہی اور کھانے کے بعد تبخیر ہونے لگی۔

ہردیال بھی اب یار باشی اور سیر تماشے چھوڑ کر دن رات پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کے قویٰ قدرت سے بہت اچھے تھے اس لئے اس کی صحت پر عارضی تشدد یا محنت کا کوئی اثر نہیں پڑا لیکن ظفر کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور ایک دن کہنے لگا۔ ارے بھائی ظفر تم تو امتحان کے پیچھے جان دئے دیتے ہو۔ کھانا پینا قریب قریب چھوڑ دیا ہے۔

اور دن بدن دُبلے ہوتے چلے جاتے ہو۔ یہی حال رہا تو امتحان ختم ہوتے ہوتے بالکل گھل جاؤ گے جب تم خود صفر ہو کر رہ گئے تو سو فی صدی نمبر کس کام آئیں گے۔

ظفر۔ کیا بتاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ طبیعت اس قدر شکست کیوں رہتی ہے۔ بھوک تو بالکل لگتی ہی نہیں۔

ہردیال۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ کام حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ورزش برائے نام رہ گئی ہے طبیعت شکست نہ ہو تو کیا اچھے، کودے، ناچے۔ پیٹ حلق تک کتابوں سے بھرا ہے اور پھر یہ شکایت ہے کہ بھوک نہیں لگتی۔

ظفر۔ یہ بھی تو دیکھو کورس کتنا زیادہ ہے؟ تاریخ اور انگریزی میں ابھی آدھی کتابیں باقی ہیں اور وقت ایک مہینے سے بھی کم رہ گیا ہے۔ پھر دماغ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ اس کے اندر کچھ ٹھہرتا ہی نہیں۔

ہردیال۔ صاحب زادے یہ اس کا نتیجہ ہے کہ تم نے مہینے مہینے اس میں چھید کر دیئے ہیں بھلا چھلنی میں کیا ٹھہرے گا۔ ایک تو تم ویسے ہی اپنے بوتے سے زیادہ محنت کرتے تھے، اوپر سے تمہارے ہی بھی نے رقیب روسیاہ کا ڈر دلا دے کر اور بھی ریڑ لگا دی۔ میاں تم اطمینان رکھو، لونڈیا تم ہی کو ملے گی۔ جب بھی تمہاری طرف ہیں تو بیچارے صفدر علی کیا کر سکتے ہیں۔

ظفر۔ پھر تم نے بیہودہ بکنا شروع کیا میں نے تم سے ہزار بار کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں مجھ سے مذاق نہ کیا کرو۔

ہردیال۔ ارے معاف کرنا، میں بھول گیا تھا دنیا و حرم کے معاملے میں پھر مذاق کر بیٹھا۔ مگر یہ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ میں تمہیں اپنی صحت برباد نہیں کرنے دوں گا۔ کل سے تمہیں روز آدھ گھنٹہ صبح کو اور ایک گھنٹہ شام کو میرے ساتھ ٹہلنے کو چلنا پڑے گا۔ اور رات کو دس بجے سو جانا ہوگا۔ نہیں تو میں تمہیں ایک دم سے عاق کر دوں گا اور اپنی ساری جائداد لطیف کے نام لکھ جاؤں گا۔

ظفر۔ دھنس کیا ہو تم بڑے مسخرے مگر بات ٹھیک کہتے ہو صبح شام ٹہلنا ضرور چاہیئے۔ میں تو تیار ہوں مگر تم اپنی کہو۔ آٹھ نو مہینے مزے کرتے رہے اب دن رات محنت نہ کرو گے تو کیسے پاس ہو گے

ہردیال۔ میری فکر نہ کرو۔ فرسٹ ایر کا امتحان بھی کوئی امتحان ہے، یہ تو گھر کی کھیتی ہے بس پروفیسر کے نوٹس رٹ لئے اور کام بن گیا۔ مجھے کچھ تمہاری طرح ریکارڈ تو توڑنا نہیں۔ گذارے کے لائق نمبر لینے ہیں، وہ میں ہنستے کھیلتے لے لوں گا۔

ظفر۔ اگر فرسٹ کلاس کے نمبر نہ آئے تو ہیڈ ماسٹر صاحب جاند عاق کر دیں گے۔

ہردیال۔ کر دیں گے تو اچھا ہے تیل کنگھے کی بچت ہو گی سچی بات یہ ہے کہ مجھے وکالت اور لیڈری کرنی ہے۔ اسی لئے پڑھائی کا وقت کاٹ کر یونین میں بحثیں کرنے کی اور کانگریس کمیٹی میں بیگار ٹالنے کی مشق کرتا رہا، ممبر بنائے۔ چندہ جمع کیا پچھلے مہینے الیکشن کا کام کرتا رہا۔ اس میں جو جو تجربے ہوئے ہیں وہ ہزاروں کتابوں کے برابر ہیں۔ اب امتحان سر پر آ گیا تو میں نے سب کاموں سے چھٹی لے لی اور کتابوں سے سر مارنا شروع کر دیا، امتحان تک گھونٹ کر رکھ دوں گا۔

ظفر۔ دوست بات یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا ڈنڈا سر پر نہیں تھا اور اکرام اللہ صاحب بھی پچھلے تین چار مہینے سے یہاں بہت کم رہے اس لئے تمہیں آزادی مل گئی اور خوب سیر سپاٹے کئے۔ اب وہ آنے والے ہیں تو تمہیں پڑھنے کی سوجھی ہے

ہردیال۔ کیا کہنا ہے، اکرام اللہ صاحب بڑے مکتب کے میاں جی ہیں جو لونڈوں کو گھیر کر بیٹھے ہیں۔ تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ وہ خود چار مہینے سے کس چکر میں ہیں؟ یہ جو اس قدر راز داری ہے کہ کسی کو ان کے آ جانے کا پتہ نہ چلے اس کا بھید یاروں نے معلوم کر لیا۔ بھلا ہم سے چھپ کر کہاں جائیں گے؟

ظفر۔ ہاں آخر یہ بات کیا ہے؟

ہردیال۔ بات یہ ہے کہ یونین بورڈ اور کانگریس کے امیدواروں کے لئے الیکشن کا کام کر رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔ آدمی واقعی بڑے ہوشیار ہیں۔ سارے ضلع میں پھر کر سینکڑوں آدمیوں سے جن کے قبضے میں ووٹ ہیں ملے اور وہ جوڑ توڑ کئے کہ ہزاروں ووٹ گھسیٹ لئے مگر کانگریس کمیٹی کے خاص خاص آدمیوں کے سوا کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

ظفر۔ واقعی کمال کر دیا۔ نواب صاحب کو بھی نہیں معلوم ہے؟

ہردیال۔ اصل میں شہ تو نواب صاحب ہی نے دی تھی۔ وہ ہیں تو زمیندار مگر چونکہ انھیں نیشنلسٹ پارٹی کے صدر نہیں بنائے گئے، اس لئے جل گئے اور اندر ہی اندر اس کی جڑ کھودنے کی فکر کرنے لگے اکرام اللہ صاحب تو خدا سے چاہتے تھے کہ کانگریس کا ساتھ دینے کا موقع ملے۔ نواب صاحب کا منشاء دیکھ کر انھوں نے زور شور سے کام کرنا شروع کر دیا۔

ظفر۔ مگر جب نواب صاحب کی مرضی سے کام کر رہے ہیں تو پھر چوری کس کی ہے؟

ہردیال۔ تم بھولے بھالے شریف آدمی ان باتوں کو کیا جانو۔ جب ذرا دُنیا دیکھو گے تو پتہ چلے گا ارے بھئی نواب صاحب اپنی پارٹی کو زک دینا چاہتے ہیں، مگر اتنی ہمت تھوڑی ہی ہے کہ اپنے آدمیوں کو کھلم کھلا کانگریس کے امیدواروں کے لئے کام کرنے دیں۔ ایک تو زمیندار برادری کا ڈر ہے کہ حقہ پانی بند نہ کر دے اور پھر ان دونا لاٹ صاحب کا خوف ہے کہ روزی نہ بند کر دیں۔

ظفر۔ لاحول ولا قوۃ۔ جب یہ لوگ اس طرح ایک دوسرے کی جڑ کاٹتے ہیں تو کیا حشر ہوگا؟

ہردیال۔ ہر لیگ میں جو حشر ہوگا وہ تو نظر آ رہا ہے مگر اس الیکشن میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ اب چند روز میں معلوم ہو جائے گا۔

ظفر۔ اچھا بھئی اب چل کر کام کریں۔ آج نو دس بجے کے بعد کام کرنے کی بندش نہیں ہے نا؟ تمہارا آرڈر تو کل سے نافذ ہوگا؟

ہردیال۔ میرے خیال میں اس وقت تو تم بالکل کام نہ کرو۔ کئی رات سے تمہیں نیند بہت کم آ رہی ہے۔ آج گرم دودھ پی کر جلد سے سو جاؤ صبح اٹھ کر دیکھنا دماغ کیسا تر و تازہ ہوتا ہے۔

ظفر۔ میری کیا نیت خود ہی ڈانواں ڈول تھی کہ تم نے اور کہہ دی۔ آج سو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔

ہردیال۔ تم لطف اٹھاؤ کر نکمے کو سٹے کا بہانہ [illegible]

ہردیال نے بھی چھٹی منائی اور ظفر کے کمرے میں جا کر سو گیا۔

(باقی آئندہ)

عورتوں کے حقوق

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کمیشن نے طریق کار کے بارے میں کئی تجویزیں منظور کرنے کے علاوہ معاشی اور سماجی کونسل سے اور بھی سفارشیں کیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

(الف) اس نے علاقہ واری کانفرنسوں کا ایک منصوبہ تیار کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ پہلی کانفرنس ۱۹۲۸ء میں ہو۔ اس نے اس پر بھی زور دیا کہ حقوق انسانی کے شعبے میں جو صیغہ عورتوں کے درجے سے تعلق رکھتا ہے اس کا افسر کسی قابل خاتون کو بنایا جائے۔

(ب) اس نے سفارش کی کہ عام طور پر عورتوں کو مردوں کے سماجی حقوق دینے اور ان سے مزدوری وغیرہ کا کام لینے میں صحت کا پہلو مد نظر رہے اور خاص طور پر زچگی کے زمانے میں عورتوں کی صحت کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

(ج) صحت اور سماجی حقوق کے بچاؤ کے لئے مؤثر قانون بنائے جائیں جن سے عورتوں کو اپنی صحت کے تحفظ اور بیماری کے علاج کا موقع مردوں کے برابر مل سکے۔ اس سلسلے میں ماؤں اور بچوں کے لئے خاص انتظام ہونا چاہیئے

(د) کمیشن نے معاشی اور سماجی کونسل کے اس رزولیوشن کی تائید کی جو شہروں اور مکانوں کے بارے میں ہے اور اس بات پر زور دیا کہ شہروں میں سماجی مرکزوں اور گھروں میں محنت بچانے کے طریقوں کا انتظام کیا جائے تاکہ گھر والیاں عمومی اور شہری معاملات میں حصہ لے سکیں۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ کمیشن کی قریب قریب سب سفارشوں کو معاشی اور سماجی کونسل اور یو۔ این۔ او کی جنرل اسمبلی نے منظور کر لیا جتنی جلدی ممکن تھا عورتوں کے کمیشن کی سیکریٹریٹ کا نگراں ایک خاتون کو بنا دیا گیا علاقہ واری کانفرنس جس کی سفارش کی گئی تھی مارچ ۱۹۳۹ء میں بیروت میں منعقد ہوئی اور اس میں مسز لکشمی مینن نے نہایت قابلیت سے ہندوستان

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

اسلامی ساہتیہ سدن کے مطبوعات

تقسیم ہند کے بعد جو حالات ملک میں پیدا ہوگئے ہیں ان کی وجہ سے بظاہر ہندوستانی مسلمانوں پر ایک دم مایوسی اور بے دلی چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ مایوسی اور بے دلی اس طبقے تک محدود ہے جس کے ہاتھ میں اب تک مسلمانوں کی سیاست کی باگ تھی، اور جو یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی ناعاقبت اندیشی کی پاداش میں مسلمانوں کی پوری جماعت سیاسی اور معاشی مشکلوں میں مبتلا ہوگئی ہے اور یہ مشکلیں جلد دور ہوتی نظر نہیں آتیں۔ ان حضرات کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی قدریں سیاسی طاقت اور معاشی خوش حالی ہیں جن کو انھوں نے اپنی حماقت سے کھو دیا ہے اس لئے انھیں مستقبل میں تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے لیکن انھیں ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مذہب اور اخلاق کو زندگی کی حقیقی قدریں سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ مصیبتوں کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے حقیقی مذہب اور اخلاق کو چھوڑ کر سیاسی مذہب اور اخلاق کے بت گھڑ لئے تھے۔ اور یہ امیدیں باندھ رکھی تھی کہ ان بتوں کی پرستش سے قوت اور دولت حاصل کرلیں گے اگر یہ خیال صحیح ہے تو ان بتوں کا ٹوٹنا اور ان امیدوں پر پانی پھر جانا در اصل کوئی مصیبت نہیں بلکہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے، اس لئے کہ طلسم باطل کی شکست ہمیشہ ظہور حق کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

بہرحال مذہبی رنگ کے مسلمانوں میں مایوسی اور بے دلی کے بجائے ایک نیا جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ تبلیغ و ہدایت کے کام میں مصروف ہیں۔ ان میں ایک ابو محمد امام الدین صاحب ہیں جنھوں نے رام نگر، بنارس میں اسلامی ساہتیہ سدن کے نام سے ایک دار الاشاعت اس غرض سے قائم کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے والی جماعت سے گہرے دور کرکے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے سازگار فضا پیدا کریں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ دونوں مقصد ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور دونوں بہت قابل قدر ہیں ہم امام الدین صاحب کو ان کی کوششوں پر مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔ ذیل میں اسلامی ساہتیہ سدن کی ان مطبوعات پر جو اب تک موصول ہوئی ہیں مختصر ریویو کیا جاتا ہے یہ سب کتابیں ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر ہیں۔

ہندی اردو لغت

اس میں ہندی کے تقریباً پانچ ہزار لفظ، ہندی حروف تہجی کی ترتیب سے دئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے سامنے اس کے معنی اردو زبان اور رسم خط میں درج ہیں۔ ہندی الفاظ ٹائپ کے بجائے لیتھو میں چھاپے گئے ہیں جس سے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور جا بجا غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ ۱۲۱ صفحے، قیمت ۱۲/

اردو ہندی لغت

اس میں اردو کے سات ہزار لفظوں کے معنی ہندی زبان اور رسم خط میں دئے گئے ہیں۔ ہندی لفظوں کے لیتھو میں ہونے کی وجہ سے اس میں بھی وہی دقت ہے۔ ۷۶ صفحے۔ قیمت ۱۰/

ہندی ماسٹر (تین حصے)

اس کے تین حصے چار جلدوں میں شائع ہوئے ہیں جن کو ختم کرنے کے بعد آدمی ہندی لکھنا پڑھنا اچھی طرح سیکھ جاتا ہے۔ ہندی اردو کی عبارتیں ٹائپ میں چھپی ہیں، آسانی سے پڑھی جا سکتی ہیں اور غلطیوں سے پاک ہیں۔

حصہ		صفحے	قیمت
حصہ اول	(قاعدہ)	۳۲ صفحے	قیمت ۴/
حصہ دوم	(نثر)	۴۸	۷/
حصہ دوم	(نظم)	۳۶	۵/
حصہ سوم		۴۲	۹/

ہندی دفتری مراسلات و کاغذات

اس میں سرکاری کاغذوں اور مراسلوں کی قسمیں اور ان کے لکھنے کے اصول سمجھائے گئے ہیں اور ہندی میں ان کے بہت سے نمونے دئے گئے ہیں۔

۱۲۰ صفحے۔ قیمت ۱۰/

اسلامی ساہتیہ

ایک ماہانہ رسالہ ہے جس کا ہر نمبر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ دسمبر ۱۹۴۸ء اور جنوری ۱۹۴۹ء کا مشترک نمبر "اسلام پریچے" کے نام سے ۱۵۰ صفحے پر شائع کیا گیا ہے، اس میں اسلام کے اصول و ارکان کی تشریح ہے اور اس کی قیمت ۱۲/ ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کا پرچہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے رسالے دین حق کا ترجمہ ہے جس کا ہندی نام "ستیہ دھرم" رکھا گیا ہے اس میں ۲۴ صفحے ہیں اور قیمت ۶ ہے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۴۹ء اور جنوری فروری ۱۹۵۰ء کا مشترک نمبر ۲۲۰ صفحے کی کتاب "اسلام اور غیر مسلم دوان" کے عنوان سے ہے جس میں یورپ ایشیا اور خاص کر ہندوستان کے علماء کی تصانیف سے وہ اقتباسات نقل کئے گئے ہیں جن میں اسلام اور پیمبر اسلام کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ غیر مجلد کتاب کی قیمت ۱۲/ اور مجلد کی ۱۴/ ہے

خطبۂ احیائے ملت

مولانا ابو الکلام آزاد کے ایک خط اور خطبوں کا مجموعہ اردو میں "خط غبار خاطر" میں سے لیا گیا ہے اور اس میں مولانا نے اپنی سیرت اور مزاج پر خود ہی تبصرہ کیا ہے۔ پہلا خطبہ البلاغ کا ایک مضمون ہے جو افسانۂ ہجر و وصال کے نام سے ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو شائع ہوا تھا، دوسرا خطبہ وہ تقریر ہے جو مولانا نے اکتوبر ۱۹۴۷ء کے پر آشوب زمانے میں جامع مسجد دہلی میں کی تھی۔ ۲۶ صفحے قیمت ۷/

دعوت حیات نو

مولانا ابو الکلام آزاد کا ایک اور خطبہ جو میلاد نبوی کے موقع پر دیا گیا تھا اور جس میں آں حضرت کی سیرت اور تعلیم کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

۴۸ صفحے۔ قیمت ۹/

اے مسلم بھائی

از لالہ کاشی رام چاولہ۔ اس میں قرآن، حدیث، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام صلح و آشتی، امن و عافیت، بے تعصبی اور رواداری کا مذہب ہے ۲۶۵ صفحے قیمت ۱۲/

ان کے علاوہ ادارے کی طرف سے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی مکمل فہرست شائقین کو ابو محمد امام الدین صاحب سے اسلامی ساہتیہ سدن رام نگر بنارس کے پتے سے مل سکتی ہے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟ (بسلسلہ صفحہ ۲)

ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں جلدی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس وقت دوستی کی جو خوشگوار فضا پیدا ہوگئی ہے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور وہ ایک عارضی کیفیت کے بجائے ایک مستقل صورت بن جائے۔

بقیہ بسلسلہ صفحہ ۸

کی نمائندگی کی۔ جو سوالنامہ پہلے کمیشن کی طرف سے بھیجا گیا تھا اس پر دوسرے کمیشن کی مقرر کی ہوئی کمیٹی نے غور کیا اور جن ملکوں کے سوالات ناقابل اطمینان سمجھے گئے ان سے مزید معلو[illegible] مطالعہ کیا گیا۔

پچھلا ہفتہ (بسلسلہ صفحہ ۴)

کے آنے جانے پر جتنی پابندیاں لگائی گئی تھیں وہ سب ہٹالی گئیں کانفرنس میں خلوص، محبت، یکجہتی اور اعتماد کا جو منظر دیکھنے میں آیا اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ دونوں ملکوں کے اخبار مل کر اس زہریلی فضا کو جو پچھلے تین چار سال سے بلکہ حقیقت میں تیرہ چودہ سال سے برصغیر ہند میں پیدا ہوگئی ہے اس حد تک صاف کردیں گے کہ یہاں انسانیت اور شرافت کا م

شیخ عبدالقادرؒ

حامد علی خاں

(۱)

شیخ عبدالقادر اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اس صدی کی ابتدا میں ان کا مشہور رسالہ "مخزن" ہمارے خود ایک دبستان ادب بن گیا تھا۔ یوں تو یہ کہنا بجا ہے کہ عبدالقادر کی ذات میں ہماری گذشتہ نصف صدی کی ادبی روایات جمع ہوگئی تھیں۔ ان کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے ان کو ... وہاں کے ملانے والی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور کسی نے انھیں قدیم تہذیب و شرافت کا پیکر گردانا ہے۔ کوئی اردو زبان سے ان کی گہری محبت کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ ہم اردو کو ترقی دے کر یہ ثابت کریں گے کہ اردو کے محسن ہمارے عبدالقادر اب بھی زندہ ہیں تو کوئی ان کو اس حیثیت سے بھی دیکھتا ہے کہ انھوں نے علامہ اقبالؒ کو شعرگوئی ترک کردینے کے ارادے سے روک کر گویا بالواسطہ وہ شاعری پیدا کی جس نے قوم کو پاکستان کی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ یہ سب کچھ درست ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے قوم کو جو نقصان پہنچا ہے ابھی ہمیں اس کا پورا اندازہ نہیں ہوا۔

اخبارات و رسائل میں اُن کے جو مختصر حالات زندگی شائع ہوئے ہیں ان میں ان کی تاریخ پیدائش اور بعض دوسری تاریخوں کے متعلق متضاد بیانات ملتے ہیں۔ حسن اتفاق سے میرے دوست جناب صادق قریشی نے شیخ صاحب کی زندگی میں ان سے ان اہم تاریخوں کے بارے میں استفسار کرکے انھیں قلم بند کرلیا تھا اور قلم بند کرنے کے بعد مزید تصدیق کے لئے انھیں دوبارہ شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کرکے اپنی تسلی کرلی تھی۔ یہ تاریخیں جیسی جناب صادق قریشی نے خود لکھ کر مجھے عنایت فرمائی ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱۸۷۴ء۔ لدھیانے میں پیدا ہوئے

۱۸۷۹ء۔ ان کے والد ماجد کی بہ سلسلۂ ملازمت قصور میں تبدیلی ہوئی۔

۱۸۸۳ء۔ کنبہ لاہور پہنچا اور شیخ عبدالقادر سنٹرل ماڈل اسکول میں تعلیم پانے لگے۔

۱۸۹۰ء۔ انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۹۴ء۔ بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۸۹۵ء۔ "پنجاب آبزرور" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے، اور ۲ سال بعد انگریز چیف ایڈیٹر کی جگہ حاصل کی۔

۱۹۰۱ء۔ رسالہ مخزن کا لاہور سے اجرا۔

۱۹۰۴ء۔ بیرسٹری کے لئے انگلستان روانگی، مخزن اس دوران میں جاری رہا۔

۱۹۰۷ء۔ لندن سے واپسی۔ دہلی میں پریکٹس شروع کی۔ رسالہ مخزن بھی دہلی سے نکلنے لگا۔

۱۹۰۹ء۔ لاہور واپس آکر یہاں پریکٹس شروع کی۔

۱۹۱۱ء۔ لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے اور آٹھ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۲۱ء۔ لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے

۱۹۲۲ء۔ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے

۱۹۲۳ء۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر بنے۔

۱۹۲۵ء۔ قائم مقام وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔

۱۹۲۶ء۔ ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے لیگ آف نیشنز کے اجلاس میں جنیوا گئے۔

۱۹۲۶ء۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی بہ مقام دہلی صدارت کی۔

۱۹۲۶ء۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (مدراس) کی صدارت کی۔

۱۹۲۷ء۔ پنجاب ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام ریونیو ممبر بنے اور سر کا خطاب ملا

۱۹۲۹ء۔ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔

۱۹۳۰ء۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج بنے۔

۱۹۳۴ء۔ ہائی کورٹ سے ریٹائرڈ ہوئے۔ (ملازمت کا تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے پنشن نہ ہوئی۔)

۱۹۳۴ء۔ وزیر ہند مقیم لندن کی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۵ سال تک لندن میں رہے۔

۱۹۳۹ء۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے چند روز قبل واپس ہندوستان آگئے

۱۹۳۹ء۔ اواخر سال میں کچھ عرصے تک وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام ممبر بنے۔

۱۹۴۲ء۔ بہاولپور کے چیف جسٹس بنے۔

۱۹۴۵ء۔ بہاولپور سے واپسی اور لاہور میں قیام۔

ایک کامیاب اور سیر حاصل زندگی گذارنے کے بعد افسوس کہ شیخ صاحب ۹ فروری ۱۹۵۰ء کی صبح کو رحلت فرماگئے۔ دنیوی ترقی کے جن مدارج پر شیخ عبدالقادر پہنچے وہ ادیبوں کو عموماً حاصل نہیں ہوتے اور اگر کوئی ادیب اس قسم کی ترقی کی شاہراہ پر پہنچ بھی جائے تو ادب سے اس کی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے لیکن یہ بے حد قابل قدر بات ہے کہ شیخ صاحب اپنی کامیاب زندگی کے ہر دور میں ادب و شعر کے شیدا رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھیں اردو زبان سے بے حد محبت تھی۔ یہ محبت اس لحاظ سے اور بھی گہری معلوم ہوتی ہے کہ شیخ صاحب کی جوانی کے زمانے میں جو لوگ انگریزی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے تھے وہ اردو کی طرف متوجہ ہونا کسر شان سمجھتے تھے، لیکن شیخ صاحب نے ایک موقر انگریزی اخبار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت کو بھی اپنے لئے "مخزن" کے اجرا کی راہ میں حائل نہ پایا۔ مخزن کا اجرا بھی اردو کی محبت کا ایک کرشمہ تھا خود شیخ صاحب کا بیان ہے:-

"مخزن کے اجرا کا خیال مجھے اردو کی حمایت کے ایک بڑے تاریخی جلسے میں بیٹھے ہوئے آیا جو مدت ہوئی، لکھنؤ میں ہوا تھا۔ ان دنوں اردو کی مخالفت جو صوبجات متحدہ میں پنڈت مدن موہن مالوی نے شروع کی تھی، اس کا فائدہ اٹھا کر ایک برطانوی لفٹنٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل نے پہلے ایک ضرب کاری اردو کے جسم پر لگائی اور ہندی کو اس کی جگہ دینا چاہی مسلمانوں میں اس پر بہت اضطراب پیدا ہوا اور اردو کے بچانے کے لئے لکھنؤ میں ایک اہم جلسہ طلب کیا گیا جس کی صدارت نواب محسن الملک نے کی۔ میں اور میر نیرنگ اور مرزا اعجاز حسین مرحوم پنجاب سے جاکر اس جلسے میں شریک ہوئے .... مگر ہمیں جاتے ہی معلوم ہوا کہ اودھ کی حکومت ہم تینوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی کررہی ہے۔ میکڈانل صاحب کا مزاج ان دنوں سخت برہم تھا اور وہ مسلمانوں کے بہت مخالف ہوگئے تھے۔ انھیں تعجب تھا کہ پنجاب کے تین آدمی لکھنؤ کے جلسے میں شرکت کے لئے کیوں آئے۔ میں نے ایک مختصر سی تقریر میں جس کا مجھے اس جلسے میں موقع ملا، لاٹ صاحب کے استعجاب کا جواب یہ دیا کہ اردو کا مسئلہ صرف صوبجات متحدہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ سارے ملک کے ان حصوں سے متعلق ہے جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہم مجروح اردو کی پکار سن کر آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر جگہ اردو کے لئے ایک دعوت جنگ ہے۔ مجھے اس جلسے میں دیکھ کر تعجب ہوا کہ لکھنؤ شہر میں جس میں اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے، اور جہاں اردو کے کئی مشہور شاعر اور نثر نگار ہندوؤں میں بھی موجود ہیں وہاں صرف ایک دو ہندو شریک جلسہ تھے۔ (ان میں ایک بنارس کا بوڑھا وکیل تھا اس نے اتنی ہمت کی کہ وہ جلسے میں شریک بھی ہوا اور تجاویز کی بحث میں بھی حصہ لیا) یہ تو ظاہر تھا کہ اس کی وجہ وہ دباؤ تھا جو ہندی کے حامیوں اور حکومت کے کارکنوں نے مل کر ان ہندوؤں پر ڈالا ہوگا جو دوسری صورت میں کم از کم جلسہ

Printed at Jayyed Press Delhi.

طابع وناشر:- عبداللطیف اعظمی پبلشر جامعہ

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

١٦ مئی — سنہ ٥٠ء

اپنا علاج آپ ہی کر سکتے ہیں ۳
پچھلا ہفتہ
ہند اور بیرون ہند ۳
بزم بے تکلف ٥
سوز دل (نظم) قابل مالیگانوی ٥
غزل راہی معصوم رضا ٥
ہالینڈ روجن ہم زہرہ سعدان ٦
کیا آپ شکست پسند ہیں ٦
آزادی کی زنجیریں مسلسل ناول
ڈاکٹر سید عابد حسین ٧
شیخ عبدالقادر حامد علی خاں ٨

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

اپنا علاج آپ ہی کر سکتے ہیں

یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر ایک بیماری اتنی عام ہے کہ اس کے مریضوں کی تعداد باقی نو سو ننانوے بیماریوں کے مریضوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔ جو لوگ ڈاکٹروں کے مطب کے چکر لگایا کرتے ہیں ان میں آدھے اسی کے چکر میں ہوتے ہیں۔ امریکہ کے ایک اسپتال میں پانسو مریضوں کا جو سلسلہ وار وہاں داخل ہوئے تھے معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ۳۸۶ یعنی ۷۷ فی صدی اسی ایک بیماری میں مبتلا ہیں۔ یہ ہر عمر اور ہر پیشے کے لوگوں کو لاحق ہو سکتی ہے۔ اس کی تشخیص اور علاج میں اتنا زیادہ خرچ ہوتا ہے کہ ہر بھلے آدمی کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔

اس کا نام بتاتے ہوئے تامل ہوتا ہے کہ کہیں آپ اس کے وجود ہی سے انکار نہ کر دیں۔ پہلے اسے نفسی اعصابی مرض کہتے تھے اب نفسی جسمانی کہتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ یہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے۔ مریض کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ اسی طرح حقیقی ہے جیسے درد قولنج کی تکلیف۔

یہ بیماری کسی قسم کی سمیت یا جراثیم سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ روزمرہ کے حالات سے۔ اس کے اسباب تین طرح کے ہوتے ہیں:۔

فکر و تردد، مشکلات و مصائب

اس کے مریضوں کی بھی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنھیں چڑچڑے پن کی عادت پڑ گئی ہے۔ میرے ایک دوست کا ایک نہایت عمدہ فارم ہے۔ ایک دن میں اُن سے ملنے گیا تو کھیتی کی کھیتی لہلہا رہی تھی میں نے کہا "بھئی اب کی تو بڑے زور کی فصل ہے"۔ کہنے لگے۔ "فصل تو اچھی ہے مگر کٹنے بھی نہ پائے گی کہ آندھیاں ستیاناس کر کے رکھ دیں گی"۔ جب فصل کٹ گئی اور بڑے اچھے دام پر بک گئی تو ایک دن پھر اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا "کہیے بھئی جی کیا حال رہا" فرمایا "پیداوار تو کافی ہوئی اور دام بھی اچھے اُٹھے مگر فصل جتنی اچھی ہوتی ہے اتنی ہی زمین کی طاقت گھٹ جاتی ہے"۔

ایسے حضرات کو نفسی جسمانی بیماری ضرور ہوگی اور جب ہوگی تو بڑی سخت ہوگی اور بڑی مشکل سے پیچھا چھوڑے گی۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں ہم میں سے اکثر لوگ داخل ہیں۔ ہم سارے دن اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی فکر لگائے رکھتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو شہر کا اندیشہ

من ز وضع زمانہ در فکرم
کہ مبادا ازیں بتر گردد

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو واقعی کسی پریشانی یا مشکل یا مصیبت میں مبتلا ہیں، چاہے وہ مالی دشواری ہو یا خانگی جھگڑا۔ عموماً ان کا علاج دوسری قسم کے لوگوں سے اور دوسری قسم کا پہلی قسم کے لوگوں سے سہل ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر پریشانی مشکل اور مصیبت کا اثر جسمانی مرض کی شکل میں کیوں کر ظاہر ہوتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس کا علم نہیں کہ خیالات اور جذبات کا تعلق صرف دماغ سے نہیں بلکہ پورے بدن سے ہے۔ سوچتے وقت سارے جسم کے اعصاب تن جاتے ہیں۔ غصے میں آدمی کا چہرہ سفید یا لال ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پھیل جاتی ہیں، پٹھے کھنچ جاتے ہیں اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ شرم سے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے۔ خون کو دیکھ کر جو کیفیت انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے غش آ جاتا ہے یا قے ہو جاتی ہے۔

عام طور پر ناخوش گوار نفسی کیفیتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پٹھے تن جاتے ہیں۔ اب اگر یہ حالت بہت دیر تک رہے تو اس سے مستقل درد یا بیماری پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ ہاتھ کی مٹھی کو بھینچ کر دیکھئے تھوڑی دیر میں درد ہونے لگے گا اور بڑھتا جائے گا۔ کئی گھنٹے کے بعد ممکن ہے کہ ہاتھ اکڑ کر رہ جائے۔ فکر و تردد کی وجہ سے گردن کے عضلات سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ شدید رنج کی حالت میں حلق کے پٹھے کھنچتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حلق میں کچھ اٹکا ہوا ہے۔

زیادہ تر فکر اور رنج کا اثر معدے پر پڑتا ہے جب معدے کے پٹھے کھنچتے ہیں تو اندر ایک تشنج کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور اگر یہ زیادہ شدید ہو تو بالکل ویسا ہی درد ہونے لگتا ہے جیسا معدے میں ٹانکیں پڑ جانے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑی آنت کے اور حصوں میں بھی دماغی کوفت کی وجہ سے ٹیسیں اٹھتی ہیں جن پر پتے کے ورم یا اپنڈکس کے ورم کا شبہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی نیم ڈاکٹر سے سابقہ پڑ جائے تو خواہ مخواہ بے چارے مریض کے پیٹ پر چھری چل جاتی ہے۔ ان عضلات کے علاوہ شریانوں کے پٹھے بھی جذبات کے ہیجان سے متاثر ہوتے ہیں، اور ان کے دبائو سے سر میں بڑا شدید درد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جلدی امراض میں سے ۳۳ فی صدی فکر، تردد اور نفرت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اختلاج قلب غشی، دم گھٹنا، چکر آنا یہ سب کیفیتیں اکثر فوری دہشت یا صدمے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی فوری ہیجان قلب کی شریانوں کو بھی متاثر کرتا ہے اور [illegible] کے دورے سے [illegible] اس بات پر [illegible] سمجھنا چاہیے کہ معاملہ خطرناک ہے۔

نفسی جسمانی امراض کے اکثر مریض اچھے خاصے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں سالہا سال سے [illegible] بستر ہیں اور ہزاروں اسپتالوں میں پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اگر آپ ان امراض سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے خیالات اور جذبات کی صحیح تربیت کیجئے اور جہاں تک ہو سکے خوش رہنے کی کوشش کیجئے۔ اصل میں اس کے لئے فن زندگی کے ایک پورے کورس کی ضرورت ہے پھر بھی ذیل کے اشارات سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔

(۱) ہر وقت اپنی حالت کا جائزہ نہ لیا کیجئے، یہ خود ایک مرض ہے اور بہت برا مرض ہے۔

(۲) جو کام آپ کو کرنا پڑتا ہے اُسے شوق و انہماک سے کیجئے۔ بیگار ٹالنا دیکھنے میں سہل معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے اعصاب پر بہت سخت بوجھ پڑتا ہے۔

(۳) کوئی تفریحی شغل ضرور رکھئے، چاہے وہ کھیل تماشا ہو، گپ شپ یا چہل قدمی ہو، مطالعہ ہو، سماجی خدمت ہو، غرض کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے کہ تھوڑی دیر کے لئے معمولی کام سے اور معمولی فکروں سے طبیعت ہٹک جائے۔

(۴) لوگوں سے مانوس ہونے کی کوشش کیجئے بیزاری یا کوفت صحت کے لئے مہلک ہے۔ ایک شخص کو محض اس وجہ سے اسپتال میں داخل ہونا پڑا کہ اُسے اپنا رفیق جس کے ساتھ اُسے دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا سخت ناپسند تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا "مجھے اس کے کنگھی کیے ہوئے بالوں سے کوفت ہوتی ہے اس کے سیٹی بجانے سے کوفت ہوتی ہے، اور اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے کہ وہ ہر بات 'دیکھئے' کہہ کر شروع کرتا ہے"۔

(۵) اگر حالات ایسے ہوں کہ ان کو بدلنا ناممکن ہے تو انھیں برداشت کرنے کی عادت ڈالئے۔ جب "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کا معاملہ ہو تو پھر شاد زیستن ہی اچھا ہے۔

(۶) مصیبت میں صبر کیجئے۔ خود مصیبت ہی کیا کم ہے کہ آپ اس کی وجہ سے کڑھ کڑھ کے نفسی جسمانی بیماری کا روگ بھی اپنے جی کو لگائیں۔

(۷) ایسی بات کہئے جس سے آپ کا جی خوش ہو اور دوسرے کا جی خوش ہو۔ جلی کٹی سنانے سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔ خوش مزاجی صرف اخلاقی حیثیت سے نہیں بلکہ طبی حیثیت سے بھی بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے۔

(۸) معاملے کا جی کڑا کر کے فیصلہ کر ڈالئے "چہ کنم" کی حالت سے زیادہ نفسی جسمانی صحت کے لئے کوئی چیز مضر نہیں۔

غرض اس عالم گیر مرض سے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے بچنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنے دل میں ٹھان لیجئے "جہاں تک ہو سکے گا میں اپنے طرز عمل اور طرز خیال میں خوش مزاجی سے کام لوں گا"۔ خوشی دراصل خوش مزاجی کا نام ہے۔

نئی روشنی جلد ۲ نمبر ۱۹ ۱۶ر اپریل ۱۹۵۵ء
ادارۂ تحریر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

ریل کا حادثہ یا خطرے کی گھنٹی

اس سال کے شروع سے ہمارے ملک میں ریل کے حادثے پے درپے ہو رہے ہیں۔ ان میں کمایوں ایکسپریس کا حادثہ جو پچھلے مہینے کے وسط میں بریلی کے قریب ہوا تھا، اور پنجاب میل کا حادثہ جو ۸ر مئی کو کلکتے سے ۲۰۶ میل کے فاصلے پر ہوا۔ دو باتوں کے لحاظ سے خاص طور پر الم ناک ہیں۔ ایک تو ان میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دوسرے ان کا سبب محض انجن سگنل پٹری وغیرہ کی خرابی یا ریلوے کے ملازموں کی غفلت نہ تھی، بلکہ مذہبی اور سیاسی تحریکوں کی قاتلانہ شرارت۔ اس لئے دونوں حادثے پلوں پر ریل کی پٹری اکھاڑنے کی وجہ سے ہوئے۔

حکومت ہند کے ریلوے کے وزیر شری گوپالا سوامی آئنگر نے ۸ر مئی کی شام کو اپنی ریڈیو کی تقریر میں پنجاب ایکسپریس کے حادثے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ اطمینان دلایا کہ حکومت پٹریوں میں ایسی فش پلیٹیں لگوانے کا انتظام کر رہی ہے جو آسانی سے اکھاڑی نہیں جا سکیں گی۔ اس کے علاوہ حفاظت اور پہرے کا بہتر انتظام کیا جا رہا ہے اور یہ تجویز ہے کہ زمانۂ جنگ کی طرح ان بستیوں کے رہنے والوں کو جو ریلوے کے دونوں طرف واقع ہیں لائن کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ شری آئنگر نے یہ بھی فرمایا کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں ریل کے حادثے زیادہ نہیں بلکہ کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں ۱۹۵۱ء میں ریل کے حادثوں میں اوسطاً دس کروڑ مسافروں میں سے ۱۵۰ ہلاک یا زخمی ہوئے اور ہندوستان میں ۲۷۔

شری آئنگر نے معاملے کے صرف ایک پہلو کو لیا ہے جس کا تعلق ان کے محکمے سے ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں ریلوں کی حفاظت کا انتظام دوسرے ملکوں سے کم نہیں ہے اور ریلوے بورڈ اپنے فرائض کا پورا احساس رکھتا ہے لیکن بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ خود ان کے قول کے مطابق حادثوں میں سے ۱۵ فی صدی کی تہ میں قاتلانہ شرارت تھی۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ سبوتاژ یعنی نقصان رسانی کی کوششیں بہت زیادہ تعداد میں ہوئیں لیکن لیکن ان میں سے اکثر ریلوے اسٹاف کی چوکسی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکیں ہمیں شری آئنگر سے اور پوری حکومت ہند سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا دوسرے ملکوں میں بھی نقصان رسانی کی کوششوں کی وجہ سے ریل کے اتنے حادثے ہوتے ہیں۔ جتنے ہندوستان میں؟ اس کا جواب ظاہر ہے یہی ملے گا کہ جنگ کی حالت میں تو ہو سکتے ہیں مگر امن کی حالت میں نہیں ہوتے۔ تو پھر کیا ہمارے ملک میں جنگ کی حالت ہے؟

ذرا سا غور کرنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے ہاں بہت چھوٹے پیمانے پر یہی حالت جنگ موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے گروہ مختلف محرکات کی بنا پر جو سیاسی، معاشی، مذہبی یا ان تینوں عناصر سے مرکب ہیں۔ موجودہ نظام حکومت سے بیزار ہیں اور اس کے نظم و نسق میں خلل ڈالنے کے لئے مختلف شکلوں میں نقصان رسانی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ ریل کی پٹریاں اکھاڑی جائیں۔ لیکن اس میں اور دوسری شکلوں میں بہت فرق ہے۔ یہ حد سے زیادہ افسوسناک اور خطرناک ہے اس لئے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شورش پسندوں کو ضد اور غصے کی شدت نے دیوانگی اور وحشت کے اس درجے تک پہنچا دیا ہے کہ وہ صرف حکومت کے یا کسی ایک فرقے یا طبقے کے نہیں بلکہ پوری سماج کے دشمن ہوگئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ضد اور غصے کی اس شدید لہر کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور اس کا علاج کیا ہے؟ اس وقت ہم دوسرے اسباب کو چھوڑ کر صرف ایک سبب کو لیتے ہیں اس لئے کہ اس کا ازالہ اتنا مشکل اور دیر طلب نہیں جتنا اور اسباب کا۔ ہمارے خیال میں حکومت کے مخالفوں میں اس شدت غضب کے پیدا ہونے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو قابو میں لانے کے لئے حکومت اس زعم میں کہ اکثریت اس کے ساتھ ہے تفہیم و تفہیم کے جمہوری طریقوں سے کام لینے کی ضرورت نہیں سمجھتی بلکہ صرف سختی کا طریقہ استعمال کرنا چاہتی ہے۔ مقامی حکام اور پولیس جن سے اسے یہ کام لینا ہے انگریزوں کے وقت سے اس کے عادی ہیں کہ سختی کی جائے تو پھر اتنی کی جائے کہ لوگ دہشت کے مارے سہم کر رہ جائیں۔ لیکن نئے حالات میں ان کو اس کا موقع نہیں ملتا کہ نادر شاہی طریقوں کو دل کھول کر برت سکیں۔ چنانچہ اکثر صورتوں میں وہ شروع تو بڑے زور شور سے کرتے ہیں مگر پھر لوگوں کے تیور دیکھ کر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخالفوں پر رعب و دہشت تو اسکر نہیں بیٹھتا بلکہ ان کے دلوں میں ضد اور غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ان پر ایک دیوانگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ حکومت کے مخالفوں میں سیاسی جنون کے زور پکڑنے کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کا نظم و نسق اپنے نئے جمہوری نظام کے مطابق نہیں بنا سکا وہ سمجھانے اور قائل کرنے کے بجائے پہلے کی طرح ڈرانا، دھمکانا چاہتا ہے اور یہ کر نہیں سکتا اس لئے مخالفت کی آگ نہ بجھتی ہے نہ دبتی ہے۔ بلکہ اور بھڑک اٹھتی ہے

معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو امور خارجہ کا قلمدان شری راجا گوپال چاری کے حوالے کر کے اپنے کام کو ہلکا کر رہے ہیں تاکہ انھیں اتنا وقت مل سکے کہ ملک کے حالات کا مطالعہ کرنے اور عوام سے ربط پیدا کرنے کے لئے سارے ہندوستان کا دورہ کرتے رہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اور مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کو خاص طور پر پیش نظر رکھیں گے کہ مقامی حکام اور پولیس کو جمہوری طریقوں سے آگاہ کریں اور نظم و نسق میں جمہوریت کی روح پیدا کریں! ورنہ وہ شدید خطرہ جس کی علامت پنجاب میل کا حادثہ ہے اور کسی طرح قابو میں نہیں آئے گا۔

پیر راشدی کی جرأت رندانہ

حال میں پاکستان اور ہندوستان کے اخبار نویسوں کی جو کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی تھی اس میں پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر پیر علی محمد راشدی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں رہی۔ پیر صاحب نے سب لوگوں پر اپنی قابلیت اور خلوص کا گہرا نقش بٹھا دیا اور صلح پسندوں کے دل میں یہ امید پیدا کر دی کہ اگر پاکستان کے اخبارات کو ان کی رہنمائی حاصل رہی تو ہندوستان اور پاکستان میں سچی اور پائدار دوستی کا رشتہ قائم ہونا جو اب تک بہت دشوار نظر آتا تھا آسان ہو جائے گا۔ پیر صاحب کی یہ اخلاقی جرأت اور زیادہ قابل تعریف ہے کہ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد وہ یو۔پی کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ لوگوں کو نہرو لیاقت معاہدے کی اہمیت سمجھائیں اور اس کی تعمیل پر آمادہ کریں۔ اگرچہ اب دونوں ملکوں کے تعلقات بہت بہتر ہو گئے ہیں پھر بھی پاکستان کے کسی اخبار نویس کا ہندوستان کے ایک ایسے حصے میں جہاں کل تک فرقہ وارانہ فسادات کا زور تھا، عام جلسوں میں تقریریں کرنا اور ان تقریروں میں حق گوئی اور صاف گوئی برتنا بڑے دل گردے کا کام ہے لکھنؤ میں اخبار نویسوں کی ایک صحبت میں انھوں نے یقین دلایا کہ پاکستان میں ایک ایک اخبار صلح کی مہم میں جو نہرو لیاقت معاہدے سے شروع ہوئی ہے، دل و جان سے حصہ لے گا رہا ہے اور یہ اپیل کی کہ ہندوستان کے اخبار نویسوں کو بھی اس کے کامیاب بنانے میں اپنا سارا زور لگا دینا چاہئے پیر صاحب نے کہا کہ اگر صلح نہ ہوئی تو جنگ کا ہونا لازمی ہے۔ اس جنگ کے نتائج دونوں فریقوں کے لئے اتنے ہولناک ہوں گے کہ ان کا خیال کر کے دل لرز جاتا ہے۔

عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پیر صاحب نے مسلمانوں کو [illegible] دیا کہ پاکستان سے رہنمائی اور

ممکن توقع نہ رکھیں کسی دوسری ریاست سے وفاداری کا رشتہ قائم کرنا اقلیتوں کے لئے مہلک ہوا کرتا ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں کو، اور ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی سرے سے بھی اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خود اپنی ریاست کو پوری مدد دینا اور تقویت پہنچانا چاہیئے۔ ہندوستان کے مسلمان پاکستان جانے کا ارادہ ہرگز نہ کریں۔ اس لئے کہ اس کے محدود وسائل ہیں اور مہاجرین کا بار کسی طرح نہیں اٹھا سکتے۔

برلی میں پیر صاحب نے ہندوستانیوں کو مہاتما گاندھی کی اہنسا کی تعلیم یاد دلائی اور ان سے اپیل کی کہ وحشت اور درندگی کے راستے کو چھوڑ کر شرافت و انسانیت کی راہ پر جو گاندھی جی نے دکھائی تھی چلیں۔

غرض پیر صاحب اس مہم کو جس کے سر کرنے کا انھوں نے بیڑا اٹھایا ہے بڑی بے جگری سے سر کر رہے ہیں۔ خدا انکی سعی کو مشکور کرے۔

جنوبی افریقہ ہند اور پاکستان

جنوبی افریقہ کے یورپی نسلی تعصب کے بارے میں دنیا میں سب سے زیادہ بدنام ہیں، اس صدی کے شروع میں مہاتما گاندھی نے اسی تعصب کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں ستیاگرہ شروع کی تھی، اور اس میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر پچھلے دنوں جنرل اسمٹس کے ہٹنے اور ڈاکٹر ملان کے وزیر اعظم ہونے کے بعد جنوبی افریقہ کی حکومت نے نسلی تعصب کی پالیسی اور زیادہ شدت سے برتنی شروع کی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں ہندوستان بڑی شدت کے ساتھ اس پالیسی کی مخالفت کر رہا تھا تقسیم ہند کے بعد بھی ہندوستان و پاکستان شروع میں اس معاملے میں متفق رہے اور دونوں ڈاکٹر ملان کے مجوزہ تفریقی قوانین کے خلاف جد و جہد کرتے رہے ہی نہیں بلکہ دونوں نے احتجاج کے طور پر جنوبی افریقہ سے کاروبار بند کر دیا۔ دونوں کی متحدہ کوشش سے یو، این او نے جنوبی افریقہ کے معاملے میں مداخلت کی اور اس پر زور ڈالا کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر ہندوستانی نسل کے لوگوں کے حقوق کے بارے میں گفتگو کرے لیکن اس عرصے میں ہند اور پاکستان کے تعلقات بگڑ چکے تھے اس لئے جنوبی افریقہ کے بارے میں ان کی ہم آہنگی قائم نہیں رہی پاکستان نے جنوبی افریقہ کے ساتھ کاروبار شروع کر دیا اور گو وہ اس کی متعصبانہ روش کی مخالفت کرتا رہا۔ مگر اس مخالفت میں وہ شدت نہیں رہی۔ ڈاکٹر ملان نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس شکنجے کو جس میں وہ ہندوستانیوں کو کسنا چاہتے تھے اور سخت کر دیا اور ایک مسودہ قانون گروپ ایریاز بل کے نام سے تیار کیا جس کی رو سے ہندوستانی سارے ملک میں نہیں رہ سکیں گے بلکہ خاص خاص خطوں میں رہنے پر مجبور ہوں گے۔

نہرو لیاقت معاہدے کی برکت سمجھئے کہ اب ہند و پاکستان کی پالیسی جنوبی افریقہ کے بارے میں پھر ہم آہنگی کی طرف مائل ہے۔ دونوں حکومتوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت سے پر زور اپیل کی ہے کہ اس بل کو ابھی ملتوی رکھے اور مجوزہ گول میز کانفرنس کے منعقد ہونے کے بعد اس پر غور کرے۔ اس کانفرنس کی کوئی تاریخ ابھی مقرر نہیں ہوئی ہے۔ لیکن خیال ہے کہ جاڑوں سے پہلے نہ ہوگی۔ اب ہند و پاکستان کی حکومتوں کا تقاضا ہے کہ کانفرنس جس قدر جلد ممکن ہو کر لی جائے۔ ڈاکٹر ملان کی حکومت سے تو یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ وہ معقول پسندی سے کام لے کر ہند و پاکستان کی اس درخواست کو منظور کرے گی البتہ نئے حالات میں جو نہرو لیاقت معاہدے کے بعد پیدا ہو گئے ہیں یہ امید کی جا سکتی ہے کہ پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں کی حکومتیں پھر مشترک دشمن کا مقابلہ مل کر کریں گی اور پاکستان بھی ہندوستان کی طرح جنوبی افریقہ سے تجارتی تعلقات قطع کرے گا۔

ع، ح

صلح کے نقیب

ہندوستان اور پاکستان کے اخبار نویسوں کی مشترک کانفرنس نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ دس ایڈیٹروں کی ایک مشترک کمیٹی بنا دی گئی ہے جس میں پانچ پاکستان کے نمائندے ہوں گے اور پانچ ہندوستان کے۔ یہ کمیٹی وقتاً فوقتاً جلسہ کر کے دونوں ملکتوں کے صحافتی مسائل کو طے کرتی رہے گی۔ دونوں ملکوں کے نمائندوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہر امکانی کوشش کریں گے کہ ان کے اخبارات ۸ اپریل کے معاہدے پر لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے عمل کریں اور کوئی ایسی چیز شائع نہ کریں جس سے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھیں۔ اسی طرح ایسی خبریں اور مضامین بھی نہ چھاپیں جن کی غرض لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرنا ہو۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ دونوں ملکوں میں ابھی ایسے اخبارات موجود ہیں جنھوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا ہے اور اشتعال انگیز خبریں شائع کر رہے ہیں۔ غرض انھوں نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کے اخباروں نے بہت سی افسوسناک غلطیاں کیں اور بعض اب تک کر رہے ہیں اور اس کا بیڑہ اٹھایا کہ آئندہ وہ خود ایسی غلطیاں نہیں کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا دوسروں کو بھی نہیں کرنے دیں گے۔

ان فیصلوں سے کہیں زیادہ اہم وہ تقریبیں ہیں جو پاکستانی ایڈیٹروں کے اعزاز میں نہایت کثرت سے منعقد کی گئیں۔ اخبار نویسوں کے علاوہ مختلف طبقوں کے ہندوستانیوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان سے اس طرح گھل مل کر باتیں کیں جیسے آپس میں کبھی کوئی اختلاف تھا ہی نہیں۔ خدا کرے کہ اس وقت دوستی کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے وہ مستقل طور پر قائم رہے اور دونوں ملکوں کے ایڈیٹر اپنے فیصلوں پر اسی خلوص اور دیانت داری سے عمل کریں جس کا انھوں نے کانفرنس کے دوران میں ثبوت دیا۔

وزرائے خارجہ کی کانفرنس

۱۱ مئی سے لندن میں نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی کونسل کا جلسہ ہو رہا ہے جس میں پہلی مرتبہ بارہ ملکوں کے وزرائے خارجہ شریک ہو رہے ہیں۔

اس کانفرنس میں مختلف مسائل پر جس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا۔ اس کا اندازہ امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ڈین اکیسن کی حال کی تقریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ جنگ کو روکنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کی پوری پوری تیاری کی جائے وہ موجودہ اعصابی جنگ کو ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کو جیتنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھیں اس میں کامیابی ہو گئی تو تیسری جنگ کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ان کا اعصابی جنگ کا نقشہ یہ ہے کہ کمیونزم کے پروپیگنڈے کو بے نقاب کیا جائے۔ پس ماندہ ممالک کی روپے، مشین اور ہتھیار سے مدد کی جائے۔ یورپی دنیا کو خاص طور پر جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو کمیونزم کے مقابلے پر آمادہ کیا جائے۔ کچھ دن ہوئے مسٹر ٹرومین نے فرمایا تھا کہ روسی پروپیگنڈے کی کاٹ کرنے کے لئے "سچائی کی مہم" شروع کرنی چاہئے۔ اس میں توپوں اور ہوائی جہازوں کے بجائے ریڈیو، اخبارات اور فلم استعمال کئے جائیں گے۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس اسی نقشے پر غور کرنے کے لئے ہو رہی ہے۔

چین کے بعد ہند چینی

ہند چینی میں ہوچی منہ کی حکومت فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر رہی ہے اس کے ہمدرد خود ویٹ نام کے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ایک اطلاع کے مطابق باؤدائی کے دفتروں میں کم سے کم دس فی صدی ہوچی منہ کے آدمی ہیں۔ جن کے ذریعے سے آئے سب راز معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ باؤدائی کی قلمرو سے بہت سے نوجوان ہوچی منہ کی فوج میں شریک ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کمیونسٹ چین سے بھی امداد پہنچنے کی خبریں موصول ہوئی ہیں۔

دوسری طرف امریکہ ہند چینی کے معاملات میں براہ راست دلچسپی لے رہا ہے اور اس نے فوجی امداد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ آثار بہت خطرناک ہیں، اور بقول متحدہ اقوام کے سکریٹری جنرل موسیو ٹرگیف لی کے "دنیا اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے"۔

پاکستان اور امریکی سرمایہ

لیاقت علی خاں صاحب امریکی سرمایہ داروں کو دعوت دے رہے ہیں کہ پاکستان کی صنعتوں میں دل کھول کر اپنا سرمایہ لگائیں انھوں نے ان حضرات کو یقین دلایا کہ پاکستان

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

بزمِ بے تکلف

"کہو لالہ کیا حال چال ہے؟"

"سب آنند ہے سرکار، اپنی ٹکے گز کی چال سے چلے جا رہے ہیں"

"بھئی تمھارے مزے ہیں، کوئی زمین داری کے غم میں مرا جاتا ہے، کسی کو دن سال کا لگان بھرنے کی فکر کھائے جاتی ہے۔ مگر تم ہو کہ آرام سے دکان پر بیٹھے ڈنڈی مارتے اور روپیہ بٹورتے رہتے ہو"

"دکان میں کیا رکھا ہے سرکار۔ کنٹرول کے بھاؤ بیچو تو روپئے پیچھے دو پائی کا بھی لابھ نہیں اُدھر چور بازاری کرو تو اِدھر پولیس والوں کی مٹھی گرم کرنا، اُدھر راشن والوں کا پیٹ بھرنا اور پھر اوپر سے پرماتما کی ڈر لگ گئی تو سب لفڑی ہو جاتا ہے"

"یہ پرماتما کا کیا ڈھونگ ہے لالہ۔ سال بھر تک غریبوں کو ٹھگ کر اپنی تجوری بھرتے رہے اور ایک دن بھگوان کے نام پہ چار پیسے کا دان دے دیا، بھلا اس سے کہیں پاپ کی کلنک مٹتی ہے؟"

"بھگوان پیسوں کو نہیں گنتا من کی بھاؤنا کو دیکھتا ہے۔ چار پیسے ہوں کہ چار توڑے جس نے سچے دل سے دان کر دئے، اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ سال بھر کیا عمر بھر کے پاپ دم بھر میں دھل جاتے ہیں۔ اب رہی غریبوں کو ٹھگنے کی بات سو غریب امیر کا بھید دنیا کے بنیا کبھی نہیں کرنے کا۔ وہ تو سب کو ایک ہی تکڑی پر تول لیتا ہے"

"اور ایک ہی بھاؤ بیچتا ہے۔ مگر لالہ بگلا بھگت تو بہت دیکھے تھے یہ بنیا بھگت پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے۔ دھرم کا دھندا بیوپار کی طرح کرتا ہے اور اوپر سے دل کھول کر لابھ اٹھاتا ہے۔ بس مالا پر رام رام جپتا ہے بس یہ جوڑتا جاتا ہے کہ رام سے اتنا بھر پایا، اتنا ادھار رہا، اور اس پر اتنا بیاج ہوا۔ کانگریس فنڈ میں چند لاکھ کا چندہ اس لئے دیتا ہے کہ پرلوک میں مکتی ملے جائے اور اس لوک میں کروڑوں انکم ٹیکس بچ جائے۔ شرنارتھیوں کو کمبل اس لئے بانٹتا ہے کہ دنیا میں نام ہو، من کو شانتی ہو، اور الکشن میں ووٹ ملیں"

ہم سمجھ گئے سرکار کس دھنا سیٹھ کا ذکر کر رہے ہیں مگر اس کو بنیا کہہ کر بنیوں کا نام تو نہ بدنام کیجئے بنئے میں بڑی سمائی ہوتی ہے سرکار۔ جس کے پاس پیسہ اچھلنے لگے، جو مول بیاج کا بیورا پھیلاتے پھیلاتے راج کاج کا سپنا دیکھنے لگے وہ اصلی بنیا نہیں رہا۔ بنا سپتی ہو کر ہو گیا"

"مگر لالہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں کہ بنیے حکومت کا خواب دیکھیں۔ آخر ہمارے دیس میں ہیمو بقال بھی گذرا ہے"

"گذرا نہیں سرکار، گیا گذرا کہیے۔ ہم نے بھی آپ کی دوا سے درنا کولر مڈل میں تاریخ پڑھی تھی۔ امتحان میں تو رہ گئے پر اتنا سبق سیکھ لیا کہ بنیے کی حکومت تلوار کے زور سے نہیں بہی کھاتے کے بل پر چلتی ہے۔ ہیموں بچارا کیا راج کرتا۔ راجہ ٹوڈرمل نے کیا ہے۔ اکبر بادشاہ کے حصے میں تو خالی حکومت کی شان ہی آئی تھی، جان ٹوڈرمل کی مٹھی میں تھی اگر ہمارے دھنا سیٹھ جیسا فراسی بھی بدھی ہوتی تو ہیموں کی جگہ ٹوڈرمل کی ریس کرتا"

"بھئی واہ لالہ تم تو بڑے تاریخئے نکلے۔ مگر یہ تو کہو ٹوڈرمل آج کل کے زمانے میں ہوتا تو کیا کرتا۔ ہمارے دیس میں تین سال میں تین ارتھ منتری بدل چکے ہیں، آخر ٹوڈرمل کتنے دن ٹکتا؟"

آج کل کے ٹوڈرمل ارتھ منتری بنا نہیں کرتے، بنیا یا اور بگلا کرتے ہیں ایک بات یاد رکھئے گا سرکار۔ اصل بنیا ہمارے دھنا سیٹھ کی طرح اتھلا نہیں ہوتا، اس کی تھاہ آج تک کسی نے نہیں پائی"

سوزِ دل

قابل مالیگانوی

مآلِ جوششِ محبت ہو کیا خدا جانے
جنوں کی حد سے گزرنے لگے ہیں دیوانے

چمن چمن میں کھلے رنگ و بو کے میخانے
دئے بہار نے ہر شاخِ گل کو پیمانے

بہار اب کے برس کیا کرے خدا جانے
کہ دل گرفتہ چمن ہیں خموش ویرانے

نکل کے دیکھ چمن سے چمن کے دیوانے
چھپائے بیٹھے ہیں کتنی بہار ویرانے

قدم قدم مری ہمت کا امتحاں لے کر
سکھا دئے مجھے آدابِ زیست دنیا نے

یہی تو راہِ طلب میں ہے ایک سنگِ گراں
خیالِ سود و زیاں کو بھلا بھی دیوانے

ہے ایک شائبۂ تعمیر ہر خرابی میں
چمن جو بن نہ سکا بن گئے ہیں ویرانے

یہ کیفِ شام یہ رنگین بدلیوں کا ہجوم
بکھر گئے ہیں فضاؤں میں جیسے افسانے

کسی کی یاد، شبِ ماہ، اور تنہائی
ہوائے سرد لگی دل کی آگ بھڑکانے

میری طرح "دلِ بیتاب" بھی تو پیدا کر
لبِ سکوت سے میں نے سنے ہیں افسانے

"جمالِ خاص" سے ہوتا ہے "سوزِ دل" پیدا
ہر ایک آگ میں جلتے نہیں ہیں پروانے

مٹا سکا نہ کوئی ربطِ عشق اے قابلؔ
ہیں ان کے نام سے مشہور میرے افسانے

غزل

راہی معصوم رضا

کہاں بہار کہ جھلسے چمن کچھ اور بھی ہیں
خزاں کی گود میں غنچہ دہن کچھ اور بھی ہیں

مجاہدانہ ابھی مالی کہاں اجل نے شکست
حدِ حیات میں "اہلِ کفن"[1] کچھ اور بھی ہیں

لہو کے سرخ ستارے یونہی چمکتے رہیں
نظامِ شمس کی رہ میں گہن کچھ اور بھی ہیں

افق کی سمت نہ دیکھو ابھی سے ہم سفرو
ابھی منازلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں

ابھی کھلا نہیں سب کا بھرم یہاں راہی
سخن فروش خدایانِ فن کچھ اور بھی ہیں

---

[1] جذبی سے معذرت کے ساتھ

آخر یہ ہائیڈروجن بم کیوں ؟

زہرہ سیّدین

(امریکہ کے ایک رسالے لائف میں ایک خط چھپا تھا جو کروڑوں انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ اس کے ایک حصے کا ترجمہ ہے)

میں نے "لائف" کا تازہ پرچہ پڑھا جس کا سرورق تو بہت دلکش تھا لیکن اس کے مضامین کو پڑھ کر ایک مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ افسوس اس زمانے میں کسی معقول آدرش کی حمایت کرنا بالکل بیکار اور ناممکن ہو گیا ہے! دنیا پر پہلے ہی سے خوف و ہراس مسلط ہے۔ "لائف" نے امن و سلامتی کے تصور کو ابھارنے کے بجائے دنیا کے لئے ایک ایسے تاریک مستقبل کی پیش گوئی کی ہے جو ایمان اور امید جیسے لفظ کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ اتنی زبردست اشاعت رکھنے والے رسالے کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے لاکھوں پڑھنے والوں کو مایوسی کی راہ پر گامزن کر دے۔ آخر کس طرح افراد، جماعتوں اور مصنفوں میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ ان کا کام قوموں کو جنگ کی تیاری پر آمادہ کرنا نہیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ لوگوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ان کے لئے امن کا قیام ایک ناگزیر اور اہم مسئلہ ہے۔ ہاں اگر ہم نے موجودہ زندگی سے عاجز آکر مکمل تباہی کی ٹھان لی ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ دنیا کب اُن صحرا میں بھٹکتی ہوئی نداؤں کو سنے گی جو امن کی طرف بلاتی ہیں۔ بجائے ان شورش انگیز لیڈروں کے گرد جمع ہونے کے جو نسل انسانی کو خودکشی کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر ہماری موجودہ عاقل و بالغ نسل دنیا کی تباہی اور بربادی پر تلی ہوئی ہے تو یہ ذمہ داری کیسے پوری ہو گی جو ساری دنیا کے نونہالوں کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "بدی" نے قوموں پر اپنا بحران اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ حکومتوں کو بربادی اور تباہی کے نت نئے آلات کو مکمل کرنے میں ایک کمینی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے دلوں سے برائی اور خوف کو کوئی کس طرح دور کرے؟

پریذیڈنٹ ٹرومین کو کیا حق تھا کہ براہ راست رائے شماری کے ذریعے لوگوں سے مشورہ کئے بغیر ہائیڈروجن بم کی تیاری کی منظوری دے دیں۔ ہم اپنے کو اس تباہی سے بچانے کے لئے کیا کریں؟ کیا اب سوائے موت کے نجات کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا؟ آخر یہ سارے پادری، مذہبی پیشوا، ربی اور خدا کے نیک بندے کہاں ہیں۔ کیا انھیں اس ڈراؤنے لفظ "کمیونسٹ" نے بالکل ہی بدحواس کر دیا ہے؟ کہاں ہیں بچوں کی مائیں جو انھیں زندگی بخشتی ہیں اور

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

کیا آپ شکست پسند ہیں؟

اس عنوان کو دیکھ کر آپ چکرائیں گے کہ ہائیں! اس کے کیا معنی؟ بھلا کوئی دنیا میں ایسا بھی ہے جو شکست کو پسند کرتا ہو؟ مگر یہ بتائیے کہ آخر ان لوگوں کو آپ کیا کہیں گے جو ایک ذرا سی مشکل کا سامنا ہوتے ہی میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی رائے دیتے ہیں، جن کے دل پر ناکامی کا خوف اس طرح مسلط رہتا ہے کہ کامیابی کی کوشش کو بھی خطرناک سمجھتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی "تقدیر" یا "زمانہ" یا "حالات" ہمیں اس طرح جکڑ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے ہاتھ پاؤں ہلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر ہماری بے بسی اور بے دست و پائی کا سبب خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتا ہے۔ خود ہمارے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو ہمارے ہاتھوں کی ہتکڑی اور پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہے۔ اسی کا نام شکست پسندی ہے۔ آئیے ذرا اپنے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھیں کہ کہیں ہم بھی اس "اختیاری مجبوری" میں گرفتار نہیں ہیں۔

ذیل کے سوالات کو غور سے پڑھئے اور ہر سوال کا جواب "ہاں" یا "نہیں" دیجئے۔ ہر "ہاں" کے پانچ نمبر شمار کیجئے، اور سب نمبروں کو جوڑ لیجئے۔ اس کے بعد صفحہ ۹ ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ کیا آپ اپنے مقصد کے لئے ہر کوشش، جس میں کامیابی کا اچھا خاصا امکان ہو، کرتے ہیں؟
۲۔ کیا آپ اپنے موجودہ کام کو چھوڑ کر کوئی ایسا کام کرنے پر تیار ہو جائیں گے جس میں نئے آدمیوں سے سابقہ ہو، اور نئے تجربے کرنے کا موقع ملے؟
۳۔ اگر آپ کو باہر کسی ملک میں بھیجا جائے تو آپ خوشی سے چلے جائیں گے؟
۴۔ کیا آپ بڑے بڑے کاموں کے خواب دیکھنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کام ہاتھ میں لیں اور انھیں تکمیل کو پہنچائیں؟
۵۔ کیا آپ زندگی میں عملی حصہ لینے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ دور سے دیکھا کریں اور تنقید کیا کریں؟
۶۔ کیا آپ ہمیشہ اس پر تیار رہتے ہیں کہ نئی چیزوں کو آزما کر دیکھیں؟
۷۔ اگر دوسرے نئی چیزوں کو آزما کر دیکھنا چاہیں تو آپ ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں؟
۸۔ کیا آپ اپنے دوستوں کی اخلاقی مدد کے بغیر اپنی رائے سے کام کر سکتے ہیں؟
۹۔ کیا آپ اتنی ہمت رکھتے ہیں کہ اس شخص کا ساتھ دیں جس سے لوگ خفا ہوں یا جس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو؟
۱۰۔ کیا آپ لوگوں کی تعریف اور ان کے اچھے کاموں کی قدر دل کھول کر کرتے ہیں؟
۱۱۔ کیا دوسروں کی کامیابی سے آپ کو سچی خوشی ہوتی ہے؟
۱۲۔ جب مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے تو آپ خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں؟
۱۳۔ کیا لوگ آپ پر بھروسا کر سکتے ہیں کہ نازک موقع پر آپ کے اوسان بجا رہیں گے؟
۱۴۔ کیا آپ خطرے کے وقت معاملے کے مضحک پہلو محسوس کر سکتے ہیں؟
۱۵۔ کیا آپ ناکامی یا تکلیف کی حالت میں اپنی مصیبت کا رونا رونے سے باز رہ سکتے ہیں؟
۱۶۔ کیا آپ پر غمگینی یا اداسی کا دورہ پڑے تو آپ اس پر قابو پا سکتے ہیں؟
۱۷۔ کیا آپ لوگوں سے بے جھجک اور بے تکلف ملتے ہیں؟
۱۸۔ کیا آپ کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہے کہ اپنا کام آسانی سے کر لیتے ہیں اور لوگوں سے اپنے تعلقات آسانی سے نباہ لیتے ہیں؟
۱۹۔ کیا لوگ اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ آپ سے گفتگو کریں اور مشورہ لیں؟
۲۰۔ کیا آپ میں اتنی سمائی ہے کہ آپ کی سبکی ہو جائے بلکہ آپ بے وقوف بھی بن جائیں، تب بھی زیادہ افسردہ یا آزردہ نہ ہوں؟

بقیہ سلسلہ پچھلا ہفتہ (صفحہ ۴)

میں ان کا سرمایہ بالکل محفوظ ہوگا۔ بنیادی صنعتوں میں ۷۰ فی صدی اور دوسری صنعتوں میں صرف ۳۰ فی صدی سرمایہ لگانے کا حق پاکستانیوں کے لئے محفوظ ہوگا۔ باقی سرمایہ لگانے کی غیر ملکیوں کو اجازت ہوگی۔ انھوں نے اس کا بھی انکشاف کیا کہ بہت کم صنعتیں حکومت کی ملکیت ہوں گی۔

ابھی تک دوسری طرف کا عندیہ ظاہر نہیں ہوا، لیکن لیاقت علی صاحب کی ملاقاتیں بڑے بڑے تاجروں اور سرمایہ داروں سے ہو رہی ہیں۔ تھوڑے دن میں معلوم ہو جائے گا کہ امریکی حکومت کن شرطوں پر پاکستان کی مدد کرنے کو اور امریکی سرمایہ دار کن شرطوں پر وہاں اپنا سرمایہ لگانے کو تیار ہیں۔

(ع ۔ ل)

آزادی کی زنجیریں

(نواں باب)

ظفر دریاپور کے ایک بڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدین بے کروطن میں رہتے تھے۔ ظفر اسی سال الہ آباد کالج میں داخل ہوا تھا وہ اور اس کا دوست ہردیال، اکرام اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپی عقیلہ بیگم، اس کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ حسینہ اور ظفر کی بچپن میں منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن اور ذہانت و ذکاوت پر فریفتہ ہو گیا۔ نئے ادب کے جلسے میں اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی کا خیال ہے کہ اگر ظفر اعلیٰ نمبروں سے پاس ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کردیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کا جذبہ اور خلش پیدا ہو گئی اور اس نے ایک طرف تو حسینہ کی سیرت اور جذبات کا غور سے مطالعہ کیا اور دوسری طرف پڑھنے میں جان کھپا دی۔

قسط ۱۹

اپریل کے تیسرے ہفتے میں ظفر اور ہردیال کا تیسرا ٹرمنل امتحان ختم ہو گیا، اور چند روز کے بعد نتیجہ معلوم ہو گیا۔ ظفر نے کوئی ۷۵ فی صدی نمبر حاصل کئے۔ مگر ہردیال بھی باسٹھ تریسٹھ فی صدی لے ہی مرا۔ اتفاق سے جس دن ان دونوں کو اپنے امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا اُسی دن الیکشن کے آخری نتائج بھی آ گئے۔ کانگریس کے ممبر بڑی تعداد میں منتخب ہوئے اور اسمبلی میں ان کی اکثریت ہو گئی۔ مسلمانوں میں یونٹی بورڈ کو بھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر نیشنلسٹ پارٹی کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کے بہت سے اُمیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ اکرام اللہ نے رات کو ظفر اور ہردیال کی بڑی پر تکلف دعوت کی اور الیکشن کے سلسلے میں اپنے کارنامے سناتے رہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا ہے اور اب گورنر چھ مہینے کے لئے چند زمینداروں وغیرہ کی عارضی وزارت بنوا رہے ہیں اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کانگریس اور یونٹی بورڈ کے کچھ ممبروں کو توڑ لیں اور اس طرح اکثریت کی حمایت حاصل کر لیں۔ ظفر کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ نواب ابراہیم صاحب جنھوں نے اکرام اللہ صاحب کو کانگریس کے اُمیدواروں کی مدد کا اشارہ کیا تھا اب عارضی وزارت میں لئے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہردیال کو نواب صاحب کی بے اصولی پر حیرت نہیں ہوئی مگر اس حماقت پر ضرور ہوئی کہ وہ عارضی وزارت کی کاغذی ناؤ پر سوار ہونا چاہتے ہیں، اور کانگریس سے جس کی وہ در پردہ مدد کر چکے ہیں لڑائی مول لینے کو تیار ہیں۔ مگر اکرام اللہ صاحب نے بتایا کہ ان کی وزیر بننے کی کوشش بھی زمیں دوز ہے اور چونکہ وہ کھلم کھلا کانگریس کا مقابلہ کرنے کو تیار نہیں ہیں اس لئے کوئی اُمید نہیں کہ گورنر کی نظر انتخاب ان پر پڑے۔ اب گھر جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ ہردیال تو دوسرے دن صبح کی گاڑی سے چلنے کو کہہ رہا تھا مگر ظفر کو صفدر علی صاحب کے ہاں جا کر رخصت ہونا تھا اس لئے سہ پہر کی گاڑی سے جانا طے پایا۔ ظفر صبح ناشتے کے بعد ہی صفدر علی صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ دوپہر کے کھانے سے پہلے واپس آ جائے۔ وہ کوئی پونے نو مہینے کے بعد اس راہ پر جس کا ہر قدم اُسے عزیز تھا جا رہا تھا۔ اس عرصے میں باوجود انتہائی مصروفیت کے حسینہ کی یاد اُسے برابر آتی رہی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ کانٹا برابر دل میں کھٹکتا رہا کہ حسینہ کو اس سے معمولی انس کے سوا جو عزیزوں کے ساتھ ہوتا ہے اور کسی قسم کا لگاؤ نہیں ہے، آج وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا "چاہے کچھ بھی ہو میں اس کے حقیقی جذبات کا پتہ چلا کر رہوں گا۔ اور اگر یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تو پھپی کو گھر جا کر خط لکھ دوں گا کہ حسینہ کو اس کی مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کرنے پر مجبور نہ کیجئے مجھ پر جو کچھ گذرے گی گذر جائے گی۔ ظاہر ہے کہ پھر میں عمر بھر شادی کا نام بھی نہیں لوں گا اور زندگی کی چہل پہل سے دور کسی گوشۂ تنہائی میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو لئے مطالعے میں اور تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کروں گا۔ ایسے دردناک اور دل گداز افسانے لکھوں گا کہ پڑھنے والا اگر پتھر کا دل بھی رکھتا ہو تو پگھل جائے۔ کسی فرضی نام سے مثلاً ——— قیس کے نام سے رسالوں میں چھپواؤں گا۔ نہیں نہیں قیس تو بہت فرسودہ نام ہے، کچھ اور ہونا چاہئے ——— اچھا! یہ ٹھیک ہے! نام کی جگہ غالب کا یہ مصرعہ لکھ دیا کروں گا۔

ع میں ہوں اپنی شکست کی آواز

لوگ حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ یہ کون شخص ہے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کریں گے مگر کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ البتہ حسینہ ان افسانوں کو پڑھ کر کھٹکے گی۔ اُسے بدنصیب ناکام عاشق میں میری اور سنگ دل بے مہر معشوقہ میں اپنی جھلک نظر آئے گی۔ وہ سمجھ جائے گی کہ وہ شکست کی آواز ظفر کے ٹوٹے ہوئے دل سے نکلی ہے۔ اس کی آنکھ سے پردے اُٹھ جائیں گے اور یہ معلوم ہو گا کہ وہ بے کس، بے زبان ظفر جس نے کبھی اپنا حال دل نہیں کہا اپنے سینے میں محبت کا ایک بے پایاں خزانہ رکھتا تھا اور وہ پچھتائے گی کہ اس نے اس دولت کو کھو دیا۔" محرومی اور شکستہ دلی، تنہائی اور عزلت نشینی کا یہ تصور دردناک ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خوش گوار تھا۔ ظفر سارے رستے اس میں محو رہا اور اس سے لطف اُٹھاتا رہا، یہاں تک کہ صفدر علی صاحب کے بنگلے کی برساتی میں اُن کے نوکر کی آواز نے اُسے چونکا دیا "سلام بھیا صاحب اور بیگم صاحب ابھی ابھی سوار ہو گئے ہیں، مگر بٹیا اندر ہیں۔ آپ گول کمرے میں تشریف رکھئے، میں جا کر اطلاع کرتا ہوں۔"

ظفر کمرے میں جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حسینہ اُس سے اپنے ماں باپ کی غیر موجودگی میں ملنے والی تھی۔ وہ خوش تھا کہ بے تکلفی سے باتیں کرنے کا موقع ملے گا مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا، اور وہ اعصابی بے چینی سے جلدی جلدی ہاتھ مل رہا تھا۔ اس کیفیت کو چھپانے کے لئے اس نے انگریزی کا ایک باتصویر رسالہ اُٹھا لیا اور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر تصویریں دیکھنے لگا۔ چار پانچ منٹ کے بعد یکایک اس کے کان میں آواز آئی "ظفر بھیا آداب عرض" وہ گھبرا کر چاہتا تھا کہ اُٹھ کھڑا ہو مگر دیکھا تو حسینہ سامنے کے صوفے کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر خاصی سدھی ہوئی آواز میں کہا "جیتی رہو، کہو اچھی ہو؟"

حسینہ:۔ خدا کا شکر ہے آپ کا مزاج تو اچھا ہے آپ کے نتیجے کا بڑا انتظار تھا۔ کئی دن سے آپ کی راہ دیکھی جا رہی تھی۔ ابا جان اور امی جان ابھی کوئی دس منٹ ہوئے پڑوس میں ڈپٹی صاحب کے ہاں گئے ہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے میں آ جائیں گے۔

ظفر۔ کل سہ پہر نتیجہ نکلا۔ میں اسی وقت یہاں آنا چاہتا تھا، مگر ہردیال پکڑ کر بازار لے گئے کہ جو کچھ خریدنا ہے خرید لو۔ وہ تو چاہتے تھے کہ ہم آج صبح ہی کی گاڑی سے چلے جائیں میں نے بڑی مشکل سے سہ پہر کی گاڑی سے جانے پر راضی کیا تاکہ یہاں آ کر تم سے ——— سب لوگوں سے رخصت ہو لوں۔

حسینہ۔ ہاں بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ بے ملے چلے جائیں، مگر نتیجہ تو بتا دیجئے۔

ظفر۔ (بے پروائی کے انداز میں) پاس ہو گیا، اچھے خاصے نمبر آئے۔

حسینہ۔ بھلا کتنے؟

ظفر۔ کوئی ۷۵ فی صدی، اپنے درجے میں اول رہا۔

حسینہ مبارک ہو ظفر بھیا۔ اب مٹھائی کھلوائیے اور وہ بھی دوہری۔ میں بھی نویں درجے میں اول آئی ہوں۔ مگر مجھے آپ کی طرح ڈھیروں نمبر نہیں ملے۔ چھ سو میں تین سو بانوے نمبر آئے۔

ظفر۔ شاباش ۶۵ فی صدی تو لے لئے اور کیا چاہتی ہو۔

حسینہ۔ یہ آپ کی عنایت ہے۔ سچ کہتی ہوں اگر آپ اپنی توجہ سے نہ پڑھاتے تو فارسی اور انگریزی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

شیخ عبدالقادرؒ

حامد علی خاں

(۲)

تاریخ عبدالقادر ... کو یاد ... رکھے گی عبدالقادر چیف جج اور عبدالقادر ... یا کونسل بھی یاد سے محو ہو جائے گا۔ لیکن عبدالقادر مدیر "مخزن" کا نام اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ وہ عبدالقادر جس کا رسالہ نئے ... اور ادیبوں کا سنگم بنا رہا۔ "مخزن" کی کوئی پرانی جلد اٹھا کر دیکھئے، آپ کو اس کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں اس قسم کے نام نظر آئیں گے۔

مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈاکٹر اقبال، تلوک چند محروم، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، حضرت نیرنگ، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، حسرت موہانی، نادر کاکوروی، نانک چند ناز، شاد عظیم آبادی، لبھو رام جوش ملسیانی، شاد عظیم آبادی، مولوی عزیز مرزا، احمد حسن شوکت، حامد علی خاں (بیرسٹر)، عبدالرحمٰن سیاح، دیا نرائن نگم، آغا حشر، شہزادہ ارشد گورگانی، محمود شیرانی، سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی، راشد الخیری، حفیظ جونپوری، امجد حیدر آبادی، داغ دہلوی، وحشت کلکتوی، ناصر نذیر فراق، سجاد حیدر یلدرم، سرور جہان آبادی، خوشی محمد ناظر، سید علی بلگرامی، طالب بنارسی، بیخود دہلوی، مولانا ذکاء اللہ، محسن کاکوروی، وحید الدین سلیم، مہدی حسن افادی الاقتصادی، سائل دہلوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، عزیز لکھنوی، شوق قدوائی، مولوی محی الدین ابوالکلام آزاد دہلوی وغیرہم۔

مولوی محی الدین صاحب ابوالکلام آزاد دہلوی کے نام سے مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا جو اب ایک لطیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لطیفہ مجھے شیخ صاحب نے خود نومبر ۱۹۴۳ء میں سنایا تھا۔ "مخزن" کے اجرا کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب (۱۹۰۲ء ہی میں) کلکتے گئے تھے۔ وہاں اردو کی حمایت میں کوئی جلسہ ہو رہا تھا۔ جب شیخ صاحب نے جلسے میں تقریر کی سامعین میں مولانا ابوالکلام آزاد ان کے والد اور ان کے بھائی غلام یٰسین آہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ ان دونوں نے تو میرے حال پر کوئی خاص توجہ نہ کی، لیکن مولانا ابوالکلام جو اس وقت بالکل نوعمر تھے، تقریر کے بعد میرے پاس آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا "آپ نے "مخزن" جاری کیا ہے، میں بھی اس کے لئے مضمون بھیجوں گا۔" یہ مضمون بعد میں انھوں نے بھیجا اس کا عنوان تھا (NEWS) اور اس میں کچھ اس قسم کی باتیں لکھی تھیں کہ یہ لفظ نارتھ، ایسٹ، ویسٹ، ساؤتھ کا مخفف ہے۔ یہ مضمون "مخزن" میں شائع کر دیا گیا۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے "مخزن" کے ابتدائی دور میں میر غلام بھیک نیرنگ سے کہہ رکھا تھا کہ آپ "مخزن" کے ہر پرچے پر تنقید لکھ کر مجھے بھیج دیا کیجئے۔ جب میر نیرنگ نے "مخزن" میں ابوالکلام آزاد کا یہ مضمون دیکھا تو بہت بگڑے اور لکھا "یہ تم نے کیا شائع کر دیا؟ "مخزن" بچوں کی مضمون نویسی کے لئے شائع نہیں کیا گیا۔"

اس کے بعد شیخ صاحب نے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کہ جن دنوں شملہ میں لارڈ ویول مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں سے گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام شملہ آئے، میں بھی ان دنوں وہیں تھا۔ اتفاق سے میرے پاس "مخزن" کا وہ پرانا پرچہ بھی موجود تھا۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گیا تو وہ پرچہ ساتھ لیتا گیا اور میں نے مولانا کو ان کے بچپن کا وہ مضمون دکھا کر میر نیرنگ کی تنقید کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کہا اب مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اسی وقت آپ کی ادبی منزلت کو پہچان لیا تھا۔ اس پر مولانا ابوالکلام آزاد بہت محظوظ ہوئے۔

"مخزن" کے ابتدائی دور کے ذکر میں شیخ صاحب نے ایک اور لطیفہ اپنے کسی بے تکلف دوست کا بیان کیا۔ اتفاق سے ان دوست کے ہاں "مخزن" نہیں پہنچا تھا، اس پر انھوں نے شیخ صاحب کے نام ایک خط بھیجا جس پر صرف یہ الفاظ لکھے تھے!

یا شیخ عبدالقادر، مخزن للہ!

شیخ صاحب خود لطیفہ گو اور لطیفہ سنج تھے ایک واقعہ اس وقت یاد آیا "مخزن" کے سہ بارہ اجراء پر پہلا مضمون لکھوانے کے چند دن بعد شیخ صاحب ایک طویل علالت میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کچھ واقعات مختصراً بیان کر کے مجھ سے کہا تھا کہ "ان کی یادداشت رکھ لیجئے۔" میرا خیال تھا کہ شاید بعد میں شیخ صاحب ان یادداشتوں سے کام لے کر کچھ مضامین خود لکھوائیں گے۔ لیکن اس کے بعد ان کی علالت اور ضعف نے وہ طول کھینچا کہ پھر مجھے ان سے مضمون کا تقاضا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگست ۱۹۴۹ء میں مجھے خیال آیا کہ ستمبر کے "مخزن" کے لئے ایک صفحہ قائداعظم کی یاد میں شیخ صاحب سے لکھوایا جائے۔ چنانچہ میں نے ان کے نام ایک خط اس غرض سے لکھ بھیجا کہ اگر آپ ایک صفحہ عنایت فرما سکیں تو میں لکھنے کے لئے حاضر ہوں۔ شیخ صاحب قبلہ نے دوسرے ہی دن مجھے بلا لیا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ حضرت قائداعظم کے متعلق ایک صفحہ کے بجائے کوئی تفصیلی مضمون لکھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ مضمون صرف اپنے صفحۂ اول کے لئے درکار تھا۔ اس لئے میں کچھ ضغطہ میں پڑ گیا، اور پھر میں نے کسی نہ کسی طرح اپنا مافی الضمیر ان پر ظاہر کر دیا اس پر شیخ صاحب نے فرمایا "بھئی پہلے صفحوں کے مضمون کو لوگ پچھلے صفحوں میں بھی تو لے جایا کرتے ہیں۔" میں نے کہا "جی ہاں وہ تو درست ہے مگر "مخزن" یہ نہیں کر سکتا۔" اس پر شیخ صاحب کو پھر ایک پرانا لطیفہ یاد آیا، بڑی متانت سے بولے:۔

رڈیارڈ کپلنگ جن کا ایک ایک لفظ انگلستان میں سونے سے تلتا تھا، کسی زمانے میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کے ادارتی عملے میں کام کرتے تھے انھیں دنوں ایک سیدھے سادھے بڈھے منشی فضل دین بھی پریس میں فورمین تھے۔ منشی فضل دین کے ہاتھ میں ہر وقت ایک فٹ رولر رہتا تھا اور وہ ایک فٹ رولر ہاتھ میں لئے ہوئے مسٹر روڈیارڈ کپلنگ کے کمرے میں داخل ہوتے اور فٹ رولر پر کہیں اپنا انگوٹھا رکھ کر اور رولر اوپر کو اٹھا کر مسٹر روڈیارڈ کپلنگ کو دکھاتے ہوئے انگریزی میں کہتے:۔

SAHIB! YOUR ARTICLE SO LONG!

مطلب یہ ہوتا کہ اخبار میں جگہ کم ہے اور تمھارا مضمون دو یا تین انچ لمبا ہے اسے مختصر کر دو، اس پر بے چارے رڈیارڈ کپلنگ اٹھتے اور قہر درویش بر جان درویش اپنے مضمون میں کانٹ چھانٹ کرتے۔"

میں اس لطیفے سے شیخ صاحب کا مطلب سمجھ گیا لیکن بادل ناخواستہ اپنا فیصلہ بدل نہ سکنے پر مجبور تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی فٹ رولر تو تھا نہیں میں نے ہنستے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ کھول کر اوپر کو اٹھایا اور بایاں ہاتھ کلائی پر رکھ کر جواب دیا:

SAHIB! ANYWAY YOUR ARTICLE

SHALL NOT EXCEED THIS

MUCH LENGTH.

شیخ صاحب مسکراتے ہوئے بولے "اچھا صاحب لکھئے میں کوشش کرتا ہوں کہ مضمون ایک ہی صفحے میں سما جائے" یہ مضمون ستمبر ۱۹۴۹ء کے "مخزن" میں "دو ملک" کے عنوان سے چھپا ہے............

بعض اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ شیخ صاحب نے خود بہت کم لکھا ہے اور وہ صرف دوسرے ادیبوں ہی کو لکھنے کی تحریک کرتے رہے۔ یہ قول پوری طرح درست نہیں "مخزن" کی پرانی جلدوں میں مختلف موضوعات پر شیخ صاحب کے بے شمار مضمون پھیلے پڑے ہیں جن سے ان کی وسعت معلومات اور گوناگوں دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا سفرنامہ ترکی جو "مقام خلافت" کے نام سے چھپا تھا، ایک قابل قدر کتاب ہے۔ شیخ صاحب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں ترکی

گئے تھے وہاں ان کا قیام سات ہفتوں کے قریب رہا۔ اس قلیل مدت میں انھوں نے شہر کی زندگی کے مختلف شعبوں کا جس خوبی سے مطالعہ کیا اس سے ان کی دقت نظر اور ذہانت کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

"مخزن" میں اپنی یورپی ممالک کی سیاحت کا حال بھی شیخ صاحب بڑی خوبی سے لکھتے رہے۔ اردو شعر و ادب کے متعلق انگریزی میں ان کی تین مستقل تصانیف کے نام یہ ہیں :-

(۱) دی نیو اسکول آف اردو لٹریچر
(۲) اردو لنگویج اینڈ لٹریچر
(۳) فیمس اردو پوئٹس اینڈ رائٹرز

کاروباری اور سرکاری مصروفیتوں سے جو وقت بچا تھا شیخ صاحب عمر بھر اسے علمی و ادبی مشاغل میں صرف کرتے رہے۔ جب ۱۹۴۸ء میں جب پنجاب یونیورسٹی میں اردو ایم اے کی جماعت کھلی اور یونیورسٹی کی درخواست پر شیخ صاحب نے ضعف پیری کے باوجود اردو کی اعزازی پروفیسرشپ قبول کر لی تو یہ اردو کے عشق ہی کا کرشمہ تھا۔ شیخ صاحب اس عمر میں بھی باقاعدہ لیکچر تیار کر کے طلبہ کو اس وقت تک مستفید کرتے رہے جب تک مرض کے ایک ہیبتناک حملے نے انھیں بالکل مجبور اور عاجز ہی نہیں کر دیا۔

شیخ صاحب گذشتہ نصف صدی کے آغاز سے لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کی روح رواں بنے رہے۔ اسی لئے لاہور کی فضائیں ان کے بغیر اداس معلوم ہوتی رہیں۔ اس عہد کے نوجوانوں نے انھیں ہمیشہ ادبی مجلسوں کے صدر کی حیثیت سے دیکھا ہے کسی نے خوب لکھا ہے کہ جس محفل میں شیخ عبدالقادر موجود ہوتے تھے اس کا صدر خواہ کوئی ہو اہل مجلس شیخ صاحب ہی کو صدر سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ صاحب کی شرکت سے ادبی مجالس کا وقار بہت بڑھ جاتا تھا۔ لیکن شیخ صاحب کو بعض دوسرے اکابر کی طرح صدارت کی خواہش ان مجالس میں نہیں لاتی تھی۔ اس کا ذمہ دار ان کا وہی بے انداز زبان و ادب کا عشق تھا جس کی وجہ سے اس عہد کے نوجوانوں کی طرح اب سے نصف صدی پہلے کے بوڑھوں نے نوجوان عبدالقادر کو اسی ذوق شوق سے اپنی ادبی محفلوں میں شامل ہوتے دیکھا تھا۔

اس بات کے ثبوت میں مرزا ارشد گورگانی کا ایک لطیفہ پیش کر کے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ شیخ صاحب نے مرزا ارشد گورگانی کے متعلق ایک یادگار مضمون لکھا تھا، وہی اس لطیفے کا ماخذ ہے غالباً ۱۹۰۲ء کا ذکر ہے کہ مرزا ارشد گورگانی نے لاہور کی چند مجالس میں نوجوان عبدالقادر کو دیکھا۔ "مخزن" جاری ہو چکا تھا اور مرزا صاحب "مخزن" سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ نوجوان ہی شیخ عبدالقادر مدیر "مخزن" ہے۔ اسی زمانے میں ایک دن مرزا صاحب کو راہ چلتے اتفاقاً شیخ صاحب مل گئے۔ شیخ صاحب نے مودبانہ سلام کیا تو مرزا صاحب نے کہا چلو میرے ساتھ چلو۔ ذرا راستہ بتا دو میں لاہور سے واقف نہیں ہوں۔ شیخ صاحب ساتھ ہو لئے اور جب مرزا صاحب مقام مقصود پر پہنچے اور وہاں شیخ صاحب کی بھی بہت آؤ بھگت ہوئی تو مرزا صاحب بہت کچھ حیران ہوئے۔ تعارف کے بعد جب اصل حقیقت کھلی تو مرزا صاحب نے شیخ صاحب سے بہت معذرت کی اور کہا "میں سخت نادم ہوں" شیخ صاحب نے کہا "مرزا صاحب آپ بزرگ ہیں، آپ کچھ خیال نہ فرمائیے" لیکن مرزا صاحب برابر کہتے گئے "لاحول ولاقوۃ۔ آپ نے میری کتاب شہنشاہ نامہ پر اتنا اچھا ریویو لکھا اور میں نے یہ قدر کی کہ آپ کو معمولی طالب علم سمجھ کر اپنے ساتھ گھسیٹے لایا۔ حقیقت میں میرا ارادہ تھا کہ آپ کے ہاں حاضر ہو کر اس ریویو کے لئے شکریہ ادا کروں پھر بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہی مخزن کے ایڈیٹر ہیں۔ میں تو آپ کو ہر مشاعرے اور ہر مجلس میں دیکھ کر یہ خیال کرتا تھا کہ آپ لاہور کے بیکار نوجوانوں میں سے ہیں جو ہر جگہ دل بہلانے کو پہنچ جاتے ہیں اور اسی لئے کبھی پروا نہیں کی تھی کہ کسی سے آپ کے متعلق پوچھوں۔"

یہ چند سطور اردو کی شمع کے اس پروانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں جو بالآخر خود شمع انجمن بن گیا اور جس کے بغیر لاہور کی ادبی محفلیں اب تیرہ و تار نظر آتی ہیں۔ سچ کہا گیا ہے ؎

اسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں
وہ تھا قلب و دماغ شہر لاہور

آخر یہ ہائیڈروجن بم کیوں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

وہ کیوں خاموش ہیں؟ کیا زندگی کے سرچشموں پر کسی موت کے تصور نے مسمریزم کر دیا ہے؟ کہاں ہیں معلم ..... کہاں ہیں صاحبانِ عقل و دانش ..... کہاں ہیں موسیقی اور مصوری کے خالق ..... کہاں ہیں حسین و دلکش الفاظ کے مصنف؟ یہ سب مل کر تخلیق کے اس دردناک انجام پر آنسو کیوں نہیں بہاتے؟

کیا آپ شکست پسند ہیں (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

۷۰ نمبر اچھے ہیں۔ ۶۰ تک بھی غنیمت ہیں۔ ۵۰ اور ۶۰ کے درمیان ہوں تو آپ کو اس کی ضرورت ہے کہ زیادہ من چلے پن سے کام لیں اور شاید اس کی بھی کہ اپنے ساتھ زیادہ سنجیدگی کا برتاؤ نہ کریں بلکہ کبھی کبھی اپنا مذاق اڑایا کریں۔ نمبروں کی تعداد ۵۰ سے بھی کم ہو تو سمجھ لیجئے کہ آپ اتنے زیادہ ڈرپوک اور عادتوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اصلاح کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس کمزوری کے اسباب معلوم کیجئے اور انھیں دور کیجئے۔

آزادی کی زنجیریں (بہ سلسلہ صفحہ)

ہم میرے لئے نمبر بھی نہیں آ سکتے تھے۔ انھیں دونوں مضمونوں میں سب سے زیادہ آئے ہیں۔

ظفر۔ اس میں کسی کی عنایت نہیں تمھاری ذہانت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ میں نے تمھیں زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ بار پڑھایا ہوگا اور وہ بھی اتنا کہ چند لفظوں کے معنی بتا دئے۔

حسینہ۔ آپ نے مجھے اٹھارہ سبق پڑھائے۔ جتنے مشکل ٹکڑے تھے اور ماسٹر صاحب کے سمجھانے سے میری سمجھ میں نہیں آئے تھے آپ نے ایسی اچھی طرح حل کر دئے جیسے کوئی پتھر کو پانی کر دے۔

ظفر۔ ارے نہیں حسینہ۔ کہیں پتھر بھی پانی ہوتا ہے۔ خیر میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگلے سال میں تمھیں کوئی مدد نہیں دے سکوں گا۔ ہمارا کورس آدھے سے بہت زیادہ باقی ہے۔ یہ سب آٹھ مہینے میں پڑھنا ہوگا اور پھر اس سال کے پڑھے ہوئے کو دہرانا ہے۔ مجھے شاید کبھی مہینے دو مہینے میں ایک بار آنے کا موقع ملے۔

حسینہ۔ جی معاف فرمائیے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس امید پر بیٹھی ہوں کہ اگلے سال میٹرک کی تیاری میں آپ سے اور زیادہ مدد ملے گی۔ یہ تعطیل کے ڈھائی مہینے اسی انتظار میں گذریں گے کہ آپ آ جائیں تو پھر سبق شروع ہو۔

ظفر۔ ایک بات پوچھتا ہوں حسینہ سچ سچ بتانا۔ تمھیں ——— مجھ ——— میرا جی انتظار رہتا ہے ——— وہ صرف پڑھنے کے لئے ہے، ویسے بھی میرا آنا اچھا لگتا ہے؟

حسینہ کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ مگر اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہنس کر کہا "یہ آپ نے کیا بات پوچھی؟ اور جو میں آپ سے پوچھوں کہ آپ صرف مجھے پڑھانے کو آتے ہیں یا ویسے بھی آپ کو یہاں آنا اچھا لگتا ہے؟"

ظفر۔ تو میں یہ کہوں گا کہ تم اپنے دل سے پوچھو۔

حسینہ۔ بس تو پھر آپ بھی ——— لو میں بالکل بھول گئی۔ باورچی سے یہ تو کہلوا دوں کہ آپ دوپہر کو کھانا یہیں کھائیں گے۔

ظفر۔ نہیں، کھانا تو میں گھر ہی پر کھاؤں گا۔ یہاں سے کھانا کھا کر جانے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ ہاں تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں، بات پوری نہیں ہوئی۔

حسینہ۔ آپ ہی نے تو مجھے بتایا ہے کہ بعض وقت ادھوری بات میں پوری بات سے زیادہ لطف ہوتا ہے۔

ظفر۔ (خوشی اور گھبراہٹ سے) حسینہ کیا میں تمھارے الفاظ کا وہی مطلب سمجھوں جو ———

جمہ — میں سمجھتا ہوں

حسینہ۔ اللہ تو یہ آپ تو بات پوچھنے میں بات کی جڑ پوچھتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ آپ تعطیل میں اماں جان کو خط لکھتے رہیں گے نہ؟

ظفر۔ ہاں ضرور، اور اگر تم کو خط لکھوں تو کچھ حرج ہے؟

حسینہ۔ امی جان کے خط ہی میں لکھ دیا کیجئے گا ویسے بھی میں اپنے سب خط اُن کو دکھا دیتی ہوں۔

ظفر۔ تم جواب بھی دو گی یا نہیں؟

حسینہ۔ اماں جان اجازت دیں گی تو میں بھی اُن کے خط میں کچھ لکھ دیا کروں گی ماموں جان کو تو امی خود کہہ کر مجھ سے لکھوا لی ہیں، کئی خطوں میں اُن سے یہ درخواست کی کہ کچھ دنوں کے لئے یہاں آجائیے مگر وہ ٹال دیتے ہیں کیا ہم لوگوں سے کچھ خفا ہیں؟

ظفر۔ نہیں خفا کیوں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ نانا ابا کے انتقال کے بعد سے انھوں نے دنیا یوں سے باہر جانا تو کیا گھر سے نکلنا ہی قریب قریب چھوڑ دیا ہے۔

حسینہ۔ ہائے انھیں نانی جان سے کتنی محبت ہوگی! مجھے بڑا قلق ہو رہا ہے کہ بالکل اکیلے رہتے ہوں گے۔ نہ کوئی بات کرنے والا نہ خدمت کرنے والا۔

ظفر ویسے نوکر تو بڑے کام کے اور ان کے مزاج داں ہیں اور کوئی تکلیف تو انھیں نہیں۔ ہاں تنہائی اور بے شغلی ضرور ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ آپ اپنی زندگی کے اور خاندان کے حالات لکھنا شروع کر دیجئے، کچھ تو جی بہلے گا۔ مگر انھوں نے اپنے خطوں میں اس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

اتنے میں موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور صفدر علی صاحب کی موٹر آکر برساتی میں رکی۔ وہ اور عقیلہ بیگم اندر دیکھ کر سیدھے ڈرائنگ روم میں آئے عقیلہ بیگم نے ظفر کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا "او بھیا جب سے امتحان ختم ہو گیا نتیجہ معلوم ہوا کہ نہیں"

حسینہ۔ امی جان ظفر بھیا کے ۸۰ فیصدی نمبر آئے ہیں مگر دیکھئے مٹھائی نہیں کھلاتے۔

عقیلہ بیگم۔ اے مٹھائی میں کھلاؤں گی، اس بچارے کو کیوں دق کرتی ہو لیکن یہ فی صدی کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا (صفدر علی سے) آپ بتائیے کون سا نمبر ہوا۔

صفدر علی۔ ماشاء اللہ بڑی شاندار کامیابی ہے۔ ظاہر ہے اپنے درجے میں اول آئے ہوں گے (ظفر سے) انگریزی میں کتنے نمبر ملے۔

ظفر۔ آپ کی دعا سے انگریزی میں ۸۰ فی صدی سے کچھ اوپر ہی ہیں۔

عقیلہ بیگم۔ شاباش میرے بچے اللہ تجھے مبارک کرے بھائی صاحب سُن کر نہال ہو جائیں گے، کہو پھر کب سدھارو گے؟

ظفر۔ جی تین بجے کی گاڑی سے جا رہا ہوں اسی وجہ سے کھانے پر نہیں ٹھہر سکتا ابھی اسباب بھی پورا نہیں بندھا۔ بس کھڑے کھڑے رخصت ہونے کے لئے آ گیا تھا اب اجازت دیجئے۔

عقیلہ بیگم۔ آج کوئی دو مہینے کے بعد تو آئے ہو اور کھانا بھی نہیں کھاؤ گے خیر میں بھائی صاحب کے خیال سے تمھیں نہیں روکتی وہ ایک ایک گھڑی گن رہے ہوں گے۔ اچھا میاں اللہ حافظ، بھائی صاحب کو ہم سب کی طرف سے آداب کہہ دینا اور خط برابر لکھتے رہنا۔

ظفر۔ بہت اچھا، ضرور لکھتا رہوں گا (صفدر علی سے) آداب عرض ہے (حسینہ سے) فی امان اللہ۔

صفدر علی۔ جیتے رہو۔ خدا حافظ، تعطیل میں اپنا مطالعہ جاری رکھنا، دیکھو تم میری کار میں چلے جاؤ، دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ حسینہ نے ظفر کو ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسوؤں کے دو چار قطرے ہزاروں لفظوں پر بھاری تھے، ظفر موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو متضاد جذبات کے دباؤ سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس احساس نے کہ حسینہ کو اس سے محبت اس کے دل میں فخر و مسرت کی ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، جو اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی، مگر اسی کے ساتھ جدائی کا صدمہ اور زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ پہلے پہل محبت کا جواب محبت سے ملنے کا مزہ چکھنا اور پھر ایک مدت تک کے لئے اس نعمت سے محروم ہو جانا ایسا تھا جیسے کسی کو ہرے بھرے میدان کی ایک جھلک دکھا کر تپتے ہوئے ریگستان میں چھوڑ دیا جائے

(باقی آئندہ)

NAI ROSHNI Registered No. D. 207.

جامعہ ملیہ کے قدردان

پریسیڈنٹ سوئکارنو ایک بچے کی آٹوگراف بک پر دستخط کر رہے ہیں۔ دائیں طرف شیخ الجامعہ محمد مجیب صاحب اور بائیں طرف مادام سوئکارنو اور پنڈت جی کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

پریسیڈنٹ راجندر پرشاد کو صنعتی نمائش میں جامعہ کے بچوں کا گارڈ آف آنر سلامی دے رہا ہے۔

کمانڈر انچیف جنرل کری آپا بچوں کے گارڈ آف آنر کی سلامی لے رہے ہیں

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کے ساتھ

جنرل کری آپا طالب علموں کے مجمع میں تقریر کر رہے ہیں

جنرل کری آپا جامعہ نگر میں بریگیڈیر عثمان کی قبر کو سلامی دے رہے ہیں۔

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی (برائے جامعہ)
مطبوعہ:— حید پریس دہلی

نئی روشنی جلد۲ - نمبر۲۰ ۲۴ر مئی سنہ۱۹۵۰ء

ادارۂ تحریر، ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا هفته

هند اور بیرون هند میں

معاہدے کے بعد

نہرو لیاقت معاہدے کے بعد ہندپاک[illegible]ستان میں اکثریت اور اقلیت کے تعلقات بہت کچھ سدھر گئے ہیں۔ مشرقی بنگال سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ وہاں کی حکومت ہندوؤں کی دلجوئی کی کوشش کررہی ہے اور اگر کہیں ان کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو ذمہ دار حکام سختی سے اس کا تدارک کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی بنگال میں بھی معاہدے کی شرطوں پر عمل ہورہا ہے۔ دونوں جگہ اقلیتوں کے دل میں رفتہ رفتہ اعتماد پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ہجرت کا سلسلہ ابھی رکا تو نہیں، مگر بہت کم ہوگیا ہے معاہدے سے پہلے کے ہفتوں میں اوسطاً کوئی بیس ہزار ہندو روز مشرقی بنگال سے آرہے تھے اور کوئی بارہ ہزار مسلمان مغربی بنگال سے جارہے تھے۔ مگر اب دونوں طرف کے مہاجروں کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ چنانچہ آنے والے ہندوؤں کی تعداد ۱۲ مئی کو ۳۴۸۰ اور ۱۷ مئی کو ۴۹۲۵ تھی اور جانے والے مسلمانوں کی تعداد ۱۷ مئی کو ۴۳۳۹ تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے مہاجر حالات کو سدھرتا دیکھ کر اپنے گھروں کو واپس جارہے ہیں۔ ۱۷ مئی کو ۶۲۲۵ ہندو مشرقی بنگال واپس گئے اور کوئی ساڑھے تین ہزار مسلمان پاکستان سے مغربی بنگال لوٹے۔ معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر ملک جو پاکستان میں اور مسٹر بسواس جو ہندوستان میں اقلیتوں کے وزیر مقرر ہوئے ہیں مل کر ۱۸ مئی سے دونوں بنگالوں کا دورہ شروع کرنے والے ہیں تاکہ دونوں جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دونوں کا خیال ہے کہ انھیں اقلیتوں کے مسئلے کو سیاسی یا قانونی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ محض انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ان دونوں حضرات کے احساس فرض اور بلند نظری کا اندازہ اس لئے ہوتا ہے کہ شری بسواس نے مشترک دورے پر روانہ ہونے سے پہلے کہا "اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تو صرف ہزاروں انسانوں کی جانوں کو نہیں بلکہ دو ریاستوں کی زندگی کو بچالیں گے" اور ڈاکٹر ملک نے فرمایا "سرحد کے پار کچھ بھی ہو مگر پاکستان معاہدے پر عمل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا"۔ صلح و آشتی کے ان نقیبوں کے دم خم دیکھ کر یہ امید کرنا بے جا نہیں کہ بہت جلد دونوں بنگالوں سے ہجرت کا افسوسناک سلسلہ بالکل رک جائے گا اور وہ چودہ لاکھ ہندو اور ساڑھے پانچ لاکھ مسلمان جو غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں رفتہ رفتہ اپنے وطن جاکر پھر سے بس جائیں گے۔

باقی ہندوستان میں یو پی اور راجپوتانے سے مسلمانوں کی تھوڑی بہت ہجرت اب تک جاری ہے لیکن اب یہ سلسلہ خود بخود منقطع ہوجائے گا اس لئے کہ حکومت پاکستان نے اعلان کردیا ہے کہ سندھ کی سرحد پر جو عارضی طور سے پرمٹ کی پابندیاں اٹھالی گئی تھیں پھر عاید کردی جائیں گی، اور ۲۰ مئی کے بعد کسی شخص کو پرمٹ کے بغیر پاکستان کی حدود میں قدم نہیں رکھنے دیا جائے گا۔ سندھ کے سرحدی علاقے میں پانی اس قدر کمیاب ہے کہ مہاجروں کے ہجوم کی وجہ سے مقامی باشندوں کو بھی اور خود مہاجروں کو بھی گرمی میں پیاس کی اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چند روز بعد حکومت پاکستان کو سندھ کی طرف سے داخلہ عارضی طور پر بالکل ہی بند کردے گی۔ لوگ پرمٹ لے کر بھی نہ جاسکیں گے۔

ہند و پاکستان کے اخبار مجموعی طور پر "دیانت داری کے ساتھ معاہدے کی پابندی کررہے ہیں۔ وہ ایسی خبروں اور مضمونوں کو شائع کرنے سے پرہیز کرتے ہیں جن سے اکثریت اور اقلیت یا ہند اور پاکستان کے باہمی تعلقات پر برا اثر پڑے اور صلح پسندوں کے کارناموں اور ان کے بیانات کو شائع کرنے میں کشادہ دلی سے کام لے رہے ہیں۔ مگر چند روز سے پھر نکتہ چینی اور طنز کے ایسے اور کرشمے جو اس ہم آہنگی میں خلل ڈالنے لگے ہیں۔ اگر ان کی ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو ڈر ہے کہ کہیں یہ خوش گوار فضا پھر نہ بگڑ جائے۔

پاکستان کے اخباروں میں سیر علی محمد راشدی کی تقریروں پر سخت نکتہ چینی ہورہی ہے جو مسلم لیگ کے ممتاز لیڈر ہیں اور ان سے خلاف مسلم لیگ سخت بیانات دے رہے ہیں۔ ان صاحب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ کو برا بھلا کہا اور ہند و پاکستان کے تہذیبی اشتراک کا ذکر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ راشدی صاحب کی زبان سے اس وقت جب وہ کسی ایک جماعت کی طرف سے نہیں بلکہ پورے پاکستان کی طرف سے دوستی اور محبت کا پیام لے کر ہندوستان آئے ہیں اپنے ملک کی برسرحکومت پارٹی کی تنقید بالکل بے موقع اور قابل شکایت ہے۔ مگر کراچی کے اخباروں کا دوسرا اعتراض کہ انھوں نے تہذیبی اشتراک کا نام کیوں لیا۔ بڑی تنگ دلی پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ راشدی صاحب کا مقصد "دو قوموں کے نظرئے" کی جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے مخالفت کرنا نہ تھا اور نہ کسی ذی عقل کو ان کی تقریر سے یہ غلط فہمی ہوسکتی۔ انھوں نے صرف یہی کہا کہ ہند و پاکستان کی تہذیب میں ایک قدر مشترک بھی ہے اور وہ بہت اہم ہے۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ جب ایک ملک سے کوئی شخص صلح کے مشن پر دوسرے ملک میں جاتا ہے تو باہمی اختلافات پر نہیں بلکہ ان چیزوں پر زور دیتا ہے جو دونوں میں مشترک ہیں۔

ادھر ہندوستان کے بہت سے اخبار لیاقت علی صاحب کی بعض تقریروں سے جو انھوں نے امریکہ میں کیں خفا ہیں ان کا کہنا ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب امریکہ میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کے بارے میں پاکستان کے نقطۂ نظر کا پروپاگنڈا کر رہے ہیں حالانکہ پنڈت نہرو نے وہاں اپنے سفر کے دوران میں اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب کو اس نامناسب پروپاگنڈا سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا اس لئے کہ کشمیر کے مقدمے کا فیصلہ امریکہ والوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود کشمیریوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس سے ان کے اس دعوے کی تصحیح ہونے میں بہت کچھ شبہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے اور ہندوستان کے اختلافات کو باہمی گفت و شنید سے طے کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو عین اس وقت جب سر اوون ڈکسن کے توسط سے کشمیر کے بارے میں گفت و شنید شروع ہونے والی ہے۔ وہ کشمیر کا رونا امریکہ کے آگے کیوں رو رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب خود اس بات کو محسوس کریں گے کہ یہ بات نہرو لیاقت معاہدے کی اسپرٹ کے خلاف ہے اور آئندہ احتیاط سے کام لیں گے۔

بعض ہندوستانی اخباروں کا یہ رویہ بھی قابل اعتراض ہے کہ انھوں نے پھر اس خبر کو پھیلانا شروع کردیا ہے کہ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ پاکستان کو اپنے سکے کی قیمت گرانے پر مجبور کر رہا ہے، اور جولائی سے پاکستانی روپے کی قیمت یقینا کم ہوجائے گی۔ خبر صحیح ہو یا غلط لیکن جب یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کی باتیں شدت سے ناگوار ہوتی ہیں تو پھر اسے شائع کرنے اور اس پر چبھتے ہوئے نوٹ لکھنے سے اگر لفظاً نہیں تو معناً نہرو لیاقت معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

اس مشترک کمیٹی کو جو دونوں ملکوں کے اخبار نویسوں کی کانفرنس نے بنائی ہے ہندوستان و پاکستان کے کم سے کم بڑے اخباروں کے طرز روش اور لہجے کی نگرانی زیادہ چوکسی سے کرنی چاہئے اور انھیں اس قسم کی لغزشوں پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے متنبہ کرتے رہنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ حکومتیں جو آپ کو جمہوری کہتی ہیں اخباروں کا اتنا سخت احتساب نہیں کرسکتیں لیکن وہ احتساب اخبار خود اپنے اوپر عاید کریں اسے کم سے کم بحران کے زمانے میں عارضی طور پر زیادہ کڑا کیا جاسکتا ہے۔

مرکزی کیبنٹ میں تبدیلیاں

اگست ۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کو آزاد ہند کی پہلی وزارت بنانے کا موقع ملا تو انھوں نے ملک کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاص

پارٹی کیبنٹ کے بجائے مخلوط کیبنٹ بنائی جس میں آدھے کانگریسی اور آدھے غیر کانگریسی وزیر تھے۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ موجودہ نازک دور میں جب ڈیڑھ سو سال کے جمے ہوئے سیاسی نظام کے ٹوٹنے سے عارضی طور پر نظم و نسق میں بڑی ابتری پھیل گئی تھی اور ملک کی تقسیم نے نئی حکومت کی مشکلات کو اور بڑھا دیا تھا، ملک قابل اور آزمودہ کار اشخاص کی خدمات سے خواہ وہ کسی سیاسی خیال کے ہوں فائدہ اٹھائے۔ پنڈت جی کو یہ امید تھی کہ ملک و قوم کی محبت ان مختلف عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر دے گی اور وہ کانگریس کی عام پالیسی کے ماتحت مل جل کر کام کر سکیں گے۔ لیکن تجربے نے بہت جلد یہ بتا دیا کہ غیر کانگریسی وزیروں میں سے بعض جن کا اپنا کوئی سیاسی رنگ نہیں تھا یا کم سے کم زیادہ گہرا نہیں تھا جیسے سردار بلدیو سنگھ، ڈاکٹر امبیڈکر، شری گوپالا سوامی آئنگر اس بچرنگی نقشے میں کھپ گئے، لیکن بعض کسی طرح نہیں کھپ سکے اور انھیں الگ ہونا پڑا۔ یہ سلسلہ شری بھابھا اور شری چیٹی سے شروع ہوا اور شری ستیا پرشاد مکرجی اور دوسرے دو وزیروں پر جنھوں نے حال ہی میں استعفا دے دیا ہے ختم ہوا۔ ان ناجنس عناصر کی وجہ سے کم سے کم صنعتی اور اقتصادی معاملات میں نہرو وزارت کانگریس کی پالیسی سے ہٹ گئی اور بہت سے کارہائے نمایاں کے باوجود جن پر دنیا کی ہر وزارت فخر کر سکتی ہے اپنی پارٹی کو اور عام طور پر قوم کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکی۔ اسی تجربے سے سبق لے کر اب پنڈت نہرو نے اپنی وزارت میں کاٹ چھانٹ کی ہے اور یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ جتنے نئے وزیر مقرر ہوئے ہیں سب پکے اور پرانے کانگریسی ہیں۔ ان تبدیلیوں پر خصوصاً شری ہرے کرشن مہتاب کے وزیر صنعت اور شری سری پرکاش کے وزیر تجارت بنائے جانے پر عام طور پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مگر پنڈت نہرو کا سب سے بڑا کارنامہ اور ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھوں نے شری راجگوپال اچاری کو وزارت خارجہ کا عہدہ قبول کرنے پر راضی کر لیا۔ یقین ہے کہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان اور بیرونی ممالک میں بھی نئے وزیر خارجہ کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ پھر بھی کیبنٹ کی تشکیل میں ایک بہت بڑی کمی ابھی تک باقی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شری گوبند ولبھ پنت نے مرکزی وزارت مالیات پر آنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اس اہم عہدے کے لئے جس کا حکومت کی پالیسی اور منصوبہ بندی سے گہرا تعلق ہے پنڈت نہرو کی نظر انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

سر اوون ڈکسن کی آمد آمد

آسٹریلیا کے مشہور ماہر قانون، سر اوون ڈکسن جو انجمن اقوام متحدہ کی طرف سے کشمیر کے معاملے میں پاکستان اور ہندوستان میں تصفیہ کرانے کے لئے مقرر ہوئے ہیں، ۲۷ مئی کو نئی دہلی پہنچ رہے ہیں جہاں وہ پنڈت نہرو سے گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد کراچی جا کر وہ [illegible] سے ملیں گے اور پھر سری نگر جائیں گے۔ انھوں نے لیک سکسیس میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کو صاف کر دیا کہ وہ ثالث یا حکم کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض صلح کار کی حیثیت سے کشمیر کے معاملے میں دخل دے رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا "میں محض ایک بچولئے کی حیثیت سے جا رہا ہوں اور جہاں تک میرے امکان میں ہے دونوں فریقوں کو مدد دوں گا۔" سر اوون کے انتخاب سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ قانونی موشگافیوں میں الجھ جائیں یا الجھا دئے جائیں اور کشمیر کا مسئلہ جو حقیقت میں ایک نفسیاتی مسئلہ ہے دیوانی کا مقدمہ بن کر رہ جائے۔ لیکن ان کے اس بیان سے اطمینان ہو جانا چاہیے کہ وہ بے کار اور لاطائل بحثوں میں نہیں پڑیں گے۔ بلکہ فریقین کے جوش جذبات کو ٹھنڈا کر کے انھیں عقل و مصلحت کی راہ دکھلائیں گے۔

ع، ح

مغربی جرمنی کو آزاد کر دیا جائے

لندن میں مغربی وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس ہو رہی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ ویسے تو اس کانفرنس میں دنیا کے تمام اہم مسئلوں پر غور کیا گیا مگر ان میں مغربی جرمنی کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ کانفرنس کے خاتمے پر ایک طویل بیان شائع ہوا ہے، جس میں وعدہ کیا گیا ہے کہ جرمنی پر اتحادیوں کے قبضے کے سلسلے میں جو قاعدے اور ضابطے نافذ ہیں ان پر نظر ثانی کی جاتی رہے گی اور رفتہ رفتہ جرمن حکومت کو پورے اختیارات سونپ دئے جائیں گے بشرطیکہ جرمنی کی آزادی سے خود اتحادیوں کی آزادی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ نیز جرمنی میں صحیح جمہوریت رائج کی جائے گی اور انفرادی آزادی کی ضمانت کی جائے گی۔

جمہوری ملکوں کو یہ قدم اس لئے اٹھانا پڑا کہ روس کے ساتھ جرمنی کے صلح نامے کے بارے میں سمجھوتے کی اب کوئی امید نہیں رہی اور اعصابی جنگ کو جیتنے اور خاص طور پر جنوبی مشرقی ایشیا کو کمیونزم کے سیلاب سے بچانے کے لئے اتحادی قوتیں یہ ضروری سمجھتی ہیں کہ مرکزی یورپ کی طرف سے انھیں اطمینان ہو۔ اسی لئے جرمنی میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے مگر اس ڈر سے کہ کہیں بعد میں خود جرمنی جمہوری ممالک کے لئے مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔ اس کے ساتھ صلح کی شرطیں کرنے میں کافی احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے چنانچہ اسی سلسلے میں فرانس کے وزیر خارجہ موسیو شومان نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جرمنی کی لوہے اور کوئلے کی صنعت کو جرمنی اور فرانس کے مشترک انتظام میں دے دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اقتصادی اور تجارتی لحاظ سے جرمنی پھر اس قابل نہیں رہ سکے گا کہ جمہوری ملکوں کے مقابلے میں آ سکے مگر اس اسکیم سے برطانوی تجارت کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔ اس لئے اس کا منظور ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ایشیا کی امداد کی اسکیم منظور

اعصابی جنگ کا دوسرا اور اہم ترین محاذ جنوب مشرقی ایشیا ہے۔ اس لڑائی کا خاکہ اگرچہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں بنایا جا چکا ہے۔ مگر اس کی تفصیلات برطانوی دولت مشترکہ کے ملکوں کی اس کانفرنس میں طے کی جا رہی ہیں جو آج کل سڈنی میں ہو رہی ہے۔

تھوڑی سی بحث کے بعد آسٹریلیا کی یہ تجویز مان لی گئی ہے کہ ۸ ملین پونڈ کا ایک فنڈ قائم کیا جائے جس سے ایشیا کے پسماندہ ملکوں کو فنی (ٹکنیکل) امداد دی جائے۔

ایشیائی ملکوں کی امداد کا مسئلہ بہت کافی عرصے سے امریکا کے پیش نظر ہے۔ کولمبو میں پچھلے جنوری میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظموں کی جو کانفرنس ہوئی، اس میں بھی اس ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ فروری میں انڈونیشیا، سیام، برما اور ملایا کے حالات کا مطالعہ کرنے اور یہ دیکھنے کو کہ ان ملکوں کو کس قسم کی اقتصادی اور فنی مدد کی ضرورت ہے [illegible] مشن بھیجا گیا تھا۔ دو مہینے کے دورے کے بعد یہ مشن واپس آیا تو اس نے ۴۴ ملین پونڈ کی امداد کی سفارش کی۔ ۲۳ ملین ہند چین کے لئے اور باقی رقم انڈونیشیا، سیام، برما اور ملایا کے لئے۔ سیاسی طور پر [illegible] مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ ان ملکوں میں اچھے اور قابل ماہرین [illegible] اسکیم کے مطابق [illegible]۔ ماہرین، [illegible]، اساتذہ [illegible] اتنی بڑی تعداد میں سند یافتہ اشخاص کی خدمات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جاپان سے ٹکنیکل ماہرین کافی تعداد میں مل سکتے ہیں۔ مگر ایشیا کے بہت سے ملک دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جاپان کے محکوم رہ چکے ہیں اور ان کو جاپانیوں سے شدید نفرت ہے۔ اس لئے جاپانیوں کا وہاں بھیجنا مصلحت کے خلاف ہے۔

لیکن ان دقتوں سے کہیں زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کمیونزم کے سیلاب کو روکنے اور اعصابی جنگ کو جیتنے کے لئے امداد کی جو اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں، کیا ان سے وہ مقاصد حاصل ہوں گے جو جمہوری ملکوں کے سامنے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ جب تک ایشیائی ملکوں میں سامراجی حکومتیں قائم رہیں گی اور ان کے باشندوں میں محکومی کا احساس باقی رہے گا اس قسم کی امدادیں ان میں وہ اخلاقی قوت پیدا نہیں کر سکتیں، جو کمیونزم کی مزاحمت کے لئے ضروری ہے۔

ترکی میں نئے انتخابات

ترکی میں پہلی مرتبہ آزاد انتخابات کئے گئے ہیں جس میں ریپبلکن پیپلس پارٹی (حزب خلق) کو جو ۲۷ سال سے برسر اقتدار تھی، بہت بری طرح شکست ہوئی۔ ۴۸۷ نشستوں میں سے صرف ۵۲ نشستیں اسے ملی ہیں اور ۴۳۴ نشستیں ڈیموکریٹک پارٹی کو۔

چونکہ ترکی کی سیاسی پارٹیوں کے خیالات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے خصوصاً بین الاقوامی سیاست کے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

کشکول

کیا فرمایا آپ نے ہمارے دیس میں آزادی کہاں ہے؟ قربان ہی تجاہل عارفانہ کے۔ اے حضرت میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ہمارے دیس میں وہ کون سا گوشۂ عافیت ہے، جہاں آزادی نہ ہو۔ گھر میں، گلی میں، سڑک پر، بس میں یا ٹرام میں، ہر جگہ آپ کے حواس خمسہ آزادی کی زد میں ہیں، کہیں اس سے مفر نہیں۔ وسط مئی کی چپچپے چپچپے سلگتی ہوئی رات ہے، دھیمی دھیمی گنگنی ہوا چل رہی ہے۔ ہلکا ہلکا سلونا پسینہ بہہ رہا ہے۔ آپ راشن کا چارگرہ کپڑا کمر میں باندھے کھری چارپائی پہ پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ ذرا آنکھ جھپکتی ہے کہ تیزی سے سروں میں ایک گھن گرج آواز کی چوٹ کان کے پردے پہ اس زور سے پڑتی ہے کہ جسم سے روح کا ہر تار اور جسم کا ہر تھپالز اٹھتا ہے۔ گھبرائیے مت یہ زلزلے کی گڑگڑاہٹ نہیں ہے۔ آپ کا ہمسایہ آزادانہ عبادت کا۔ آزاد شہری، حلق اور بھیپھڑے کی آزادی سے کام لے رہا ہے اور محلے والوں کی نیند کو موسیقی کی دیوی کے چرنوں پہ بھینٹ چڑھا رہا ہے۔

ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد صبح تڑکے آپ پلنگ سے اٹھتے ہیں اور جلدی جلدی کرتا چپل پہنتے ہیں کہ ندی پر جا کر عمل کریں۔ دروازہ کھول کر گلی میں قدم رکھتے ہی ایسا زناٹے کا جھٹکا آتا ہے کہ مشام جان تڑپ اٹھتا ہے۔ گلی میں جا بجا آزادی کے نتائج و عواقب کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن سے مناسب وقت پر کھیتوں میں غلے کی پیداوار بڑھانے کا کام لیا جائے گا۔

ندی پہ پہنچ کر سب سے پہلا منظر جو آپ کی نظروں کو کھینچتا ہے اور کھینچتے ہی دھکیل دیتا ہے یہ دکھائی پڑتا ہے کہ کنارے کے قریب با اقتدار عوامی جمہوریہ ہند کے ارکان ایک لمبی سی قطار میں اکڑوں بیٹھے ہوئے آزادی عمل کے بنیادی حق کا اظہار کر رہے ہیں۔ آپ منہ پھیر کر لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اس لئے کہ آپ کو بھی منزل سے پہلے اس کار ضروری سے فراغت پانی ہے۔ مگر ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں کوئی رفیق کار نہ ہو جہاں آپ اجتماعی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے یہ کام انفرادی پہلو سے انجام دے سکیں۔

نہا دھو کر لوٹتے لوٹتے دھوپ چڑھ آئی ہے۔ آپ کا قدم ذرا آہستہ پڑ رہا ہے۔ آپ سوچتے ہیں "مدرسہ صبح کا ہے ...... ابھی گھر جا کر ناشتہ کرنا ہے ...... کہیں دیر نہ ہو جائے ...... آؤ ٹرام ہی پہ چلے چلیں" مگر اکنی خرچ کرتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ اتنے میں ٹرام آتی نظر آتی ہے آپ کے قدم بے اختیار اٹھ جاتے ہیں اور قدم سے ڈولی ہاڈولی سے سرپٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اب آپ آزادی کی ترنگ میں چلتی ٹرام کا ڈنڈا پکڑا کر اچکنا چاہتے ہیں۔ اتنے میں پیچھے سے دھکا لگتا ہے اور آپ منہ کے بھل زمین پر آ رہتے ہیں، ہندی مسندی آزادی کمزور مریل آزادی کو گرا کر ٹرام پر چڑھ جاتی ہے۔

آپ ابھی کھڑے ہو کر اچھی طرح دھول بھی نہیں جھاڑنے پاتے کہ کوئی دو فرلانگ سے صور اسرافیل کی آواز سن کر اچھل پڑتے ہیں لیجئے آخر قیامت آ ہی گئی۔ مگر پھر فوراً خیال آ جاتا ہے

یہ بس آ رہی ہے قیامت نہیں ہے

اس وقت سڑک پر کوئی اور سواری، موٹر، تانگہ، چھکڑا نہیں ہے پیدل چلنے والے بھی کم ہی ہیں پھر بھی بس ڈرائیور پوری طاقت سے مسلسل ہارن بجا رہا ہے ورنہ اس کی آزادی میں بٹہ لگ جائے مگر ایک بڑے میاں یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی کا اصلی مزا سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں ہے۔ بہرحال ان کی وجہ سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بس کے ہارن کا چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ بس رک جاتی ہے اور آپ لپک کر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تین تین آدمیوں کی سیٹ پر دو دو آدمی آزادی سے پھیل کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ بڑی مشکل سے دو کے بیچ میں گھس بیٹھ کر سیٹ الٹک بیٹھتے ہیں تو راستے بھر یہ حالت رہتی ہے کہ ادھر ادھر سے دوہری آزادی کا دباؤ آپ کا کچومر نکالے دیتا ہے۔

غزل

وامق احمد مجتبیٰ

یہ رنج و خوشی خود کچھ بھی نہیں احساس و نظر کے دھوکے ہیں
اس بھول بھلیاں میں ان گنتی بام و در کے دھوکے ہیں

یہ قوس قزح یہ ہالۂ شب خورشید و قمر کے دھوکے ہیں
سمجھے ہو جسے تم رنگ شفق سب شام سحر کے دھوکے ہیں

یہ صبح ہے کیا یہ شام ہے کیا یہ قصۂ حسن و عشق ہے کیا
تخئیل کی بازی گریاں ہیں اپنی ہی نظر کے دھوکے ہیں

اے اندھی جوانی والے سن اے رنگ پہ جانے والے سن
یہ موہنی صورت والے سب بہروپ نگر کے دھوکے ہیں

ہنس کر جو کسی نے دیکھ لیا تم نے بھی وہیں دل پھینک دیا
سمجھے نہ ذرا بھی اس پردے میں دنیا بھر کے دھوکے ہیں

کیوں چٹکی کلی، کیوں پھول ہنسا کیوں سارا گلستاں جاگ اٹھا
وہ سیر چمن کو آئے ہیں یا باد سحر کے دھوکے ہیں

دیکھی ہے نظر نیاری ایسی جو آج ہے وہ کل کچھ بھی نہیں
دو عالم کی اس بہنگی میں اک بازی گر کے دھوکے ہیں

ہنستا ہے کوئی روتا ہے کوئی وامق نہ کرو تم فکر اس کی
کھوٹی نہ کرو منزل اپنی یہ راہ گذر کے دھوکے ہیں

سب کچھ ہے مگر حق بات اگر اس مادّی دنیا میں رہ کر
دھوکا ہی سمجھ میں آئے تو اوہام بشر کے دھوکے ہیں

غزل

جگن ناتھ آزاد

نہ پوچھ مجھ سے مری منزل قیام اے دوست!
جنوں رفیق، محبت مری امام، اے دوست!

کسی نے پھر نہ اشارہ کیا ہو باہر سے
رکا ہے دیکھ وہ گردش میں آکے جام اے دوست!

تجھے بھلا نہ سکوں، تجھ کو یاد رکھ نہ سکوں
یہ میری راہ میں آیا عجب مقام اے دوست!

نہ مل سکا تو اب اس کے سوا میں کیا سمجھوں
کہ دل میں تیری تمنا ابھی ہے خام اے دوست!

بلند نام سہی میں پر اس سے کیا حاصل
غضب تو یہ ہے کہ تو ہے بلند بام اے دوست!

گداز دل کا کبھی لب پہ آکے نالہ بنے
یہ بات شرع محبت میں ہے حرام اے دوست!

بساط کہنۂ عالم الٹنے والی ہے
مرا نہیں ہے یہ ہے وقت کا پیام اے دوست!

غلط نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے
بہ رنگ صبح درخشاں ہر اک شام اے دوست!

اُردو کا مستقبل

لکشمی نرائن تابش وششٹ

(۱)

انقلاب زندہ باد کی صدائے بازگشت کہاں کہاں جا کر نہیں ٹکرائی۔ ان ہی آنکھوں نے وہ بھی دیکھا جس کے دیکھنے کا ارمان تھا۔ انقلاب آیا اور اس نے پردۂ ظلمت کو چاک کر کے آزادی کی شمع کو روشن کر دیا جس سے اکھنڈ بھارت کے کونے کونے میں اجالا ہو گیا۔ اب کیا تھا نئی روشنی، روشنی نئی طاقت، نئے دور، دورے کی بنیاد رکھی جانے لگی۔ ہر چیز میں ایک طرز نو پیدا کرنے کی چاہت طبع انسانی میں نمودار ہو گئی اور آزادی کے علمبرداروں نے جہاں اہل ہند کو غلامی کی قعر مذلت سے نکال کر بام ترقی کی انتہائی منزل پر پہنچا دینے کا بیڑہ اٹھایا اسی کے ساتھ ساتھ ہر دور بدل اور تعمیر و تبدل نے بھی نئے ڈھنگ سے ناچنا شروع کیا کہ غلامی کی ہر شبیہ ... تھی۔ لوگوں نے اپنی خانگی زندگی کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے سیاست کے میدان میں جولانی شروع کر دی جس کو دیکھو آزاد ہندوستان کا نیا نقشہ اور نئی صورت اپنے دماغ میں لئے ہوئے عقلائے زمانہ کی صف میں پیش پیش دکھائی دینے لگا۔ کسی نے تہذیبی و ملی طریقوں میں ترمیم کا مسودہ بنا لیا۔ کسی نے مذہب میں اختراع کرنے کی ٹھانی اور کوئی سماج کو سدھارنے میں ہمہ تن مصروف دن رات ایک کرنے پر تل گیا۔ کسی نے زبان کے مسئلے کو اہمیت دے کر اور خواہ مخواہ ... کر مسند محفل بننے کی ٹھان لی۔

جب سے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہندی ملکی زبان ہو گی اس وقت سے ہر شخص یہ غور کر رہا ہے کہ اردو کا مستقبل کیا ہو گا یقینی طور پر یہ ایک اہم اور قابل غور مسئلہ ہے اور ہر اردو جاننے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خواہ اس کا عملی حل تلاش کرے اور سیاست کی الجھنوں سے اس لسانی مسئلے کو دور رکھے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ لوگ ہندی کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں اس کے لٹریچر میں چار چاند لگا دیں۔ اور کبیر، مبارک، تلسی داس، ملک محمد جائسی، میرا بائی، رحمن، بہاری، خسرو، سور داس اور فیضی کا گذشتہ زمانہ پھر آ جائے ہر ہندوستانی کے دل میں ایک نئی ... امنگ، امید، مسرت، شانتی، زندہ دلی، شادمانی اور آسودہ حالی کا سانس لیں۔ لیکن اردو بھی اپنے مادر وطن میں کچھ حقوق رکھتی ہے اور ہر انصاف پسند حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کے جائز مطالبات کو پورا کرے اور کبھی پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ اب تو ہندوستان جمہوریہ ہے اور سیکولر اسٹیٹ ہے ہر جمہوری ملک میں ہر زبان کو پنپنے اور ترقی کرنے کی پوری پوری آزادی ہوا کرتی ہے۔ اردو ہند آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کے لئے اگر کوئی زرخیز زمین اور سازگار ماحول ہو سکتی ہے تو صرف ہندوستان کی۔ حد یہ ہے کہ پاکستان میں بھی اس کو یہ ماحول نہیں مل سکتا۔ وہاں کسی حلقے میں کوئی ماں اپنے بچے کو اردو زبان میں لوری نہیں دیتی اس لئے اردو کی مادر وطن ہندوستان ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ماں ایسی بے درد ہو گی کہ وہ اپنے بچے کو مار ڈالے گی۔ اس لئے یہ دعویٰ کہ اردو مٹ جائے گی یہ بالکل غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں کرتے، باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ کسے زیادہ دیتے ہیں اور اب تو ایک نئی بات نکلی ہے ہم نے جیب سا ڈھال لی ہے ... ہوا کرے ہماری بلا سے میں جب اردو کے مستقبل پر غور کرتا ہوں تو ان دشمنوں سے زیادہ اپنوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے ان کی بے عملی، بے دلی اور بے ثباتی سے۔ ورنہ زبان کسی کے مٹانے سے مٹا نہیں کرتی جب زبان نہیں مٹی۔ پولشن (POLISH) نہیں مٹی پھر اردو کیوں مٹ جائے گی۔ اس میں اتنی جان ہے کہ وہ بغیر حکومت کی سرپرستی کے آگے بڑھتی رہی ہے اس کے پاس ادب کا لازوال خزانہ ہے۔ میر، درد، میر حسن، مرزا شوق، نسیم، مومن، غالب، انیس، حالی، اکبر، اقبال، چکبست، سرشار، نیاز، پنڈت کیفی، پریم چند، فراق اور کرشن چندر پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اردو میں بھارت بستا ہے اس نے آزادی کی دوڑ میں حصہ لیا ہے۔ اس نے ہمارے خون کو گرمایا ہے اس میں ہم نے آزادی کے گیت گائے ہیں پھر وہ اتنی ملنسار ہے کہ ہر زبان کے لفظ کو گلے لگانے کے لئے تیار ہے جس زبان میں اتنی وسعت، اتنی گہرائی، اتنی رواداری اتنا لوچ اور اتنا جذب ہو وہ ہرگز نہیں مٹ سکتی۔

ضرورت صرف جوش عمل کی ہے۔ اردو کو سنوارنے اور نکھارنے کی۔ اس کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے بھرنے کی۔ اگر اردو کے ادیب اور شاعر سرگرم عمل رہے تو اردو کا مستقبل شاندار ہے۔

اردو زبان کا تاریخی مطالعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو قطعی ہندوستانی ہے یہ زبان اسی ملک میں ہندو مسلم میل جول سے پیدا ہوئی، اسی نے اس کے آب و گل سے پرورش پائی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان فارسی کی مرہون منت ہے اور اس نے اس سے بہت فائدہ حاصل کیا لیکن کوئی زبان دوسری غیر زبان سے استفادہ کرنے کی بنا پر یا اس کے الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنے سے غیر نہیں کہلاتی جاسکتی۔ اس کی زندہ مثال انگریزی کی زبان ہے جو آج بین الاقوامی مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں فرانسیسی، جرمن، اطالوی، لاطینی اور دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن انگریزی نے انھیں اپنے دامن میں لے لیا ہے اور ان پر انگریزی کی مہر ثبت ہے۔ مختلف مسالوں کو کان میں سجانے کے لئے خاص سلیقے کی ضرورت ہے اسی زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی کسوٹی پر پرکھتی ہے اور پھر اپنی مہر لگا کر انھیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اس میں جذب کا مادہ ہے اس کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے اور یہی زبان ہمیشہ پھولتی پھلتی اور دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔ جو دوسری زبانوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے۔ اسی طرح اردو کا بول بالا رہے گا۔ پھر وہ زبان جس کی جڑیں عوام میں ہوں وہ سخت جان ہوتی ہے۔ حیاتیاتی عنصر کام کرے گا اور اردو ناسازگار حالات میں بھی ترقی کرتی رہے گی۔

اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں، منظروں، مشہور واقعات، جانوروں، مشاہیر، رسم و رواج، بہادروں، موسموں غرض کہ ہر ہندوستانی موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ہندوستان اردو کی ماں ہے وہ اپنے بچے کا گلا نہیں گھونٹ سکتی یا اسے گھونٹنا نہیں چاہیے۔ اردو کے زبردست محسن ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو دم واپسیں تک اس بات کا دم بھرتے رہے کہ اردو ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔ علامہ کیفی فرماتے ہیں کہ اردو ہندو مسلمانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اور ان کا قول یہاں تک کہنا ہے کہ میدان سخن ایک ایسی فضا ہے جس میں دیر و حرم، گبر و مسلمان، شیخ و برہمن سب برابر ہیں۔ اگرچہ مغلوں کے زمانے میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ لیکن ان حالات کے باوجود بھی اردو ترقی کرتی رہی۔ اسے کبھی کسی کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی۔ لوگوں نے اپنا کام نکالنے کی خاطر اسے اپنایا اور اپنے سینوں سے لگایا۔ چنانچہ انگریزوں کے سامنے بھی چند سامراجی مقاصد تھے۔ اسی لئے انھوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں انھوں نے فارسی سنسکرت سے سادہ اور سلیس اردو ہندی میں کتابوں کے تراجم کروائے تاکہ خود انگریز ہندوستانیوں کو بخوبی سمجھ سکیں وہاں ہی اردو ہندی کے جھگڑے کا بیج بو دیا گیا لیکن وہ بھی عوامی زبان کے بغیر کام نہ کر سکے۔

اردو کا تعلق جنگ آزادی سے ہے اردو شاعروں اور ادیبوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا۔ ہمیشہ ان کے خلاف برسر پیکار رہے۔ انھوں نے اتحاد، محبت اور حب الوطنی کے نغمے گائے۔ یہ ایک ایسا تاریک زمانہ تھا جب ہمارے قوائے عمل شل ہو چکے تھے ہم بالکل پست ہمت اور کمزور ہو گئے تھے۔ اس وقت اردو شاعروں اور ادیبوں نے ہمارے اندر زندہ دلی، بلند حوصلگی، ... اور جوش و خروش

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

آزادی کی زنجیریں

ظفر دریاپور کے ایک بگڑے ہوئے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدین نے کر وطن میں رہتے تھے۔ ظفر اسی سال الہ آباد کالج میں داخل ہوا تھا۔ وہ اور اس کا دوست ہردیال اکرام احمد کے ساتھ رہتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے حسینہ اور ظفر کی بچپن میں منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن اور ذہانت و ذکاوت پر فریفتہ ہو گیا۔ نئے ادب کے جلسے میں اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی کا خیال ہے کہ اگر ظفر اعلیٰ نمبر سے پاس نہ ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہو گئی اور اس نے ایک طرف تو حسینہ کی سیرت اور جذبات کا غور سے مطالعہ کیا اور دوسری طرف پڑھنے میں جان کھپا دی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق خاطر ضرور ہے

قسط ۳۰

الہ آباد سے دریاپور تک ریل کا سفر شدید گرمی کی وجہ سے سخت تکلیف دہ تھا۔ ظفر اور ہردیال رات بھر جاگے ہوئے تھے، مگر ایک تو گرمی سے بے چین تھے دوسرے تھوڑی دیر کا سفر تھا۔ اس لئے سو تو نہیں سکے مگر راستے بھر اونگھتے رہے۔ اسٹیشن سے ہردیال اور ظفر ایک ہی تانگے میں چلے۔ ظفر کا گھر پہلے آتا تھا۔ ہردیال اسے اتار کر اپنے گھر چلا گیا۔

ظفر نے دیکھا کہ میر صاحب اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں اور رحیم بخش اس کے کمرے کے سامنے اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اس نے اپنا سامان خود اٹھا کر کمرے میں رکھا اور پھر پیچھے سے جا کر دونوں ہاتھوں سے رحیم بخش کی آنکھیں بند کر لیں وہ چونک کر کھڑا ہو گیا اور چلا اٹھا۔ ہوئے ظفر بھیا آ گئے۔ ہم کا معلوم ہی نہ پڑا! یہ کہہ کے وہ دوڑا ہوا گیا۔ اور ظفر کے لئے آم کا آب شورہ برف پڑا ہوا لے آیا۔ ظفر آب شورہ پی چکا تو اس نے کہا "میاں نماج پڑھت رہن۔ اب پڑھ چکے ہوئیں تم ان کے پاس ہوئی آؤ۔ تب لگ ہم تمرا سامان ٹھکانے سے لگائے دیت ہیں"۔ ظفر میر صاحب کے کمرے میں گیا تو وہ وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جانماز پر بیٹھے بیٹھے اسے کھینچ کر گلے لگایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر میں شکر کا سجدہ کرنے کے بعد انھوں نے ظفر سے پوچھا "کہو اچھے تو رہے کچھ دبلے معلوم ہوتے ہو"۔

ظفر۔ الحمد للہ بالکل اچھا ہوں۔ ذرا ان دنوں محنت زیادہ پڑ گئی۔

میر صاحب۔ خیر خدا کے فضل سے نتیجہ اتنا اچھا رہا کہ ساری محنت سوارت ہو گئی۔ بھائی شیودیال صاحب کو صبح ہردیال صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تم نے ۷۵ فی صدی نمبر پائے۔ شاباش

ع۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ظفر۔ یہ سب آپ کی دعا کی برکت ہے۔ مگر ابا جان آپ بہت ضعیف نظر آ رہے ہیں۔ کیا کچھ طبیعت ناساز تھی؟ خط میں تو آپ نے کچھ لکھا نہیں۔

میر صاحب۔ بیٹا ضعیفی کی تو عمر ہی ہے۔ بس اب چل چلاؤ سمجھو۔

ظفر۔ نہیں ابا جان آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کی کچھ ایسی زیادہ عمر تو نہیں ہے

میر صاحب۔ ساٹھ سے زیادہ تو ہو گئی۔ اب اور کیا ہو گی۔ ہمارے خاندان میں بس ایسی ہی عمریں ہوتی ہیں، خیر یہ بتاؤ صفدر، عقیلہ، حسینہ سب خیریت سے ہیں۔

ظفر جی ہاں، سب اچھے ہیں آپ کو بہت بہت آداب کہا ہے۔

میر صاحب۔ اچھا بھئی اب کی ہم نے تمہارے کمرے کے لئے خس کی ٹٹی بنوائی ہے، اور پنکھا بھی لگوایا ہے۔ تاکہ دن کو اطمینان سے کام کر سکو مگر کوئی لڑکا نہیں ملا جو ٹٹی چھڑکتا رہے اور پنکھا بھی کھینچا کرے۔ رحیم بخش سے کہوں گا کہ دوپہر دو گھنٹے یہ کام کر دیا کرے۔

ظفر۔ ابا جان یہ نہیں ہو سکتا۔ ٹٹی آپ کے کمرے میں لگے گی اور پنکھا بھی وہیں دوپہر کو سوتا تو ہوں نہیں، وہیں بیٹھ کر پڑھا کروں گا۔ رحیم بخش اور میں باری باری سے پنکھا کھینچیں گے اور ٹٹی چھڑکیں گے۔

میر صاحب۔ دہنس کر) تم جانتے نہیں کہ بوڑھے آدمیوں کو گرمی کم لگتی ہے، مگر خیر تمہاری یہ خوشی ہے تو یوں ہی سہی، کھانا چلئے منگواؤں۔

ظفر۔ جی میں نے ابھی آم کا شوربہ پیا ہے۔ ذرا دیر میں نہا کر چائے پیوں گا۔

میر صاحب۔ اچھا تم جا کر غسل کرو میں اتنی دیر کلام مجید کی تلاوت کر لوں۔

ظفر وہاں سے اٹھا تو اسے دفعتہً یہ خیال آیا کہ اس نے اپنے والد سے عمر میں پہلی بار بے جھجک گفتگو کی اور وہ اس سے خوش ہوئے، اسے یہ محسوس ہوا کہ دونوں کے تعلقات میں ایک طرف سے بے جا خوف نے اور دوسری طرف سے بے جا خشونت نے جو رکاوٹیں ڈال رکھی تھیں۔ وہ اگر دور نہیں ہوئیں تو کم ضرور ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے آپ سے دو سوال کر رہا تھا کہ یہ نو دس مہینے ایک دوسرے سے الگ رہنے کا نتیجہ ہے یا اس کی امتحان میں کامیابی کی برکت ہے کہ اس کے والد کا برتاؤ اس کے ساتھ بدل گیا ہے۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ تبدیلی جو کچھ ہوئی ہے وہ خود اس کے اندر ہوئی ہے۔

دوسرے دن صبح کو وہ شیودیال صاحب سے ملنے کے لئے گیا۔ جب وہ قصبے کی گلیوں سے اور بازار سے گذر رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ ہر چیز پہلے سے چھوٹی نظر آ رہی ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا فاصلہ جتنا اس کے تصور میں تھا اس سے کم نکلا۔ قصبے کی بڑی سڑک، تحصیل، تھانے، اسپتال کی عمارتیں، مکان، دکانیں سب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سکڑ کر رہ گئی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بیٹھک میں تخت کے اوپر اپنی مقررہ جگہ پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور حقہ پی رہے ہیں ظفر کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے بڑی محبت سے گلے لگا کر کہنے لگے۔ جیتے رہو ظفر تم نے میری بات کو سچ کر دکھایا اور اسکول کی لاج رکھ لی۔ یہ کہہ کر انھوں نے ہردیال کو آواز دی کہ ظفر کے لئے چھاچھ لے کر آؤ۔ ہردیال اندر سے پھول کے کٹورے میں برف اور شکر پڑی ہوئی چھاچھ لے کر آیا اور ظفر کو دیتے ہوئے کہا "پتاجی دیکھئے، میں نے کہا تھا نہ کیسے لٹ لئے ہیں۔ اگر یہی رفتار رہی تو بی اے کرتے کرتے تین چوتھائی گھل جائیں گے۔ جب شادی ہو گی تو سسرال والے کہیں گے کہ ہم ایک چوتھائی دولہا لے کر کیا کریں۔ آپ سمجھائیے کہ اتنی زیادہ محنت نہ کریں میں کہتا ہوں تو یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے جلتا ہے۔

ماسٹر صاحب:۔ وہ گھوڑا جس کی لگام کھینچنا پڑے اس سے تو اچھا ہی ہے جسے ایڑ لگانے کی ضرورت ہو۔ انھیں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خاموش اور متین لڑکے کالج کے فرسٹ ایر میں اپنے خول سے باہر نہیں نکلتے اس لئے انھیں سوا پڑھنے کے کوئی کام نہیں ہوتا مگر سیکنڈ ایر میں پہنچتے پہنچتے آس پاس کی دلچسپیاں انھیں اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں اس وقت حد سے زیادہ کام کرنا تو ایک طرف یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں پڑھنا وڑھنا چھوڑ کر آوارہ گردی میں نہ پڑ جائیں۔ ظفر تو خیر بگڑ بھی جائیں تو تم سے اچھے رہیں گے۔ تم اپنی کہو۔

ہردیال۔ میری فکر نہ کیجئے، میں جتنا بگڑنا تھا بگڑ لیا۔

ظفر۔ یہ تو کہتے ہیں مجھے وکالت اور لیڈری کرنی ہے، اس کے لئے قابلیت کی ضرورت نہیں۔

ماسٹر صاحب۔ یہ ایسا کہتے ہیں تو جھک مارتے ہیں اب وہ دن گئے کہ صرف تیز پن اور کائیاں پن کے زور پر لیڈری اور وکالت چلتی تھی جیسے جیسے ہمارے ملک کے لوگ تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہوتے جائیں گے محض چالاکی، ہیکڑی اور لفاظی کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا، ان ہی وکیلوں اور لیڈروں کی قدر ہو گی جو علمی درجے کا دل و دماغ رکھتے ہیں

ہردیال۔ پتاجی آپ ظفر کی باتوں میں [illegible]

مسخرے ہیں۔ سنجیدہ باتوں میں مذاق کرنے لگتے ہیں۔ میں دل و دماغ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میرا دماغ کچھ ایسا برا نہیں اور دل کا کیا کہنا

ماسٹر صاحب۔ (ہنس کر) تم میں اور کچھ ہو یا نہ ہو سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ ظفر، منظفر حسن کیسے ہیں۔ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا ادھر جانا نہیں ہوا۔

ظفر۔ جی میں کیا عرض کروں۔ مجھے تو ان کی حالت دیکھ کر سخت قلق ہوا۔ آپ سے کئی سال چھوٹے ہیں۔ مگر دیکھنے میں کہیں زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ الہ آباد لے جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں۔

ماسٹر صاحب۔ بھئی ڈاکٹر کیا کرے گا۔ انھیں کوئی مرض تو ہے نہیں۔ تمھاری ماں کے مرنے کے بعد سے ان کا دل زندگی سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ جب تک تم یہاں تھے دنیا سے کچھ تھوڑا بہت تعلق باقی تھا۔ اب وہ بالکل جاتا رہا۔ اب تو دن رات عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ مجھ سے کہتے تھے کہ بھئی اب تو دل چاہتا ہے حج کو جاؤں اور وہاں سے عراق جا کر وہیں رہ جاؤں مگر ظفر کی وجہ سے مجبور ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کو سال چھ مہینے کے لئے ہو آنے دو۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی آرزو دل کی دل ہی میں رہ جائے۔

ظفر۔ مگر اس ضعیفی میں اتنے لمبے سفر کی تکلیف کیسے برداشت کریں گے؟

ماسٹر صاحب۔ یہ نہ کہو۔ انسان کا عقیدہ اس کی قوت برداشت کو بہت بڑھا دیتا ہے بہر حال یہ خلش جو ان کے دل میں ہے یہ بھی تو کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔

ظفر۔ بہت اچھا میں عرض کر دوں گا کہ آپ میری وجہ سے اپنی خواہش کو نہ روکئے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سفر کا خرچ کہاں سے آئے گا۔

ماسٹر صاحب۔ روپیہ تو کچھ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اسی وجہ سے تو یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ تم نے منڈی کے پاس وہ کھنڈر دیکھا ہوگا جو کسی زمانے میں تمہارے بزرگوں کا مکان تھا اسے منظفر حسن کسی طرح نہیں بیچتے تھے۔ مگر ایک ایسا اچھا موقع آیا کہ میں نے انھیں مجبور کر کے بکوا دیا۔ الہ آباد کے ایک شخص نے جو منڈی کے قریب دکانیں بنوانا چاہتا ہے وہ قطعہ پانچ ہزار میں لے لیا۔ اس میں سے آدھا روپیہ وہ تمھاری شادی کے لئے رکھنا چاہتے ہیں اور باقی حج اور زیارت کے لئے۔

ظفر۔ پھر تو آپ ضرور بھجوا دیجئے۔ مگر ایک تو ساتھ جانے کے لئے کوئی ہوشیار آدمی ہو، دوسرے ابا جان سے یہ وعدہ لے لیجئے کہ چھ مہینے میں ضرور لوٹ آئیں گے۔ یہ نہ ہو کہ جیسا وہ فرماتے ہیں عراق میں رہ پڑیں۔

ماسٹر صاحب۔ تم اطمینان رکھو، وہ واپس ضرور آئیں گے۔ تم سے انھیں اس سے زیادہ محبت ہو جتنی تم سمجھتے ہو یا وہ خود سمجھتے ہیں۔ اچھا میں کسی دن آ کر گفتگو کر لوں گا۔ وہ گئے تو کہیں نومبر دسمبر میں جائیں گے۔ اس لئے کہ حج جنوری میں ہوگا۔

ہردیال۔ چلو ظفر میں بھی چچا کو سلام کر آؤں ان کو تمھاری سب حرکتیں بتانا ہے۔

ظفر نے ماسٹر صاحب سے اجازت لی اور ہردیال کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

اُردو کا مستقبل

(بہ سلسلہ صفحہ ۷)

پیدا کیا۔ غدر سے پہلے ہمیں شاہ ولی اللہ کی تحریک نظر آتی ہے جس میں انگریزوں کے باہر نکالنے کی جدوجہد کی گئی تھی یہ ایک سیاسی اور اخلاقی انقلاب تھا اس میں بڑے بڑے فضلاء، عقلاء اور ادباء یعنی فضل حق خیر آبادی، مولانا عبد العزیز، سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید شامل تھے۔ انھوں نے متحد و متفق ہو کر بانگ دہل کہا کہ لوگوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنا چاہئے۔ ان کے خلاف لڑنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ انھوں نے ہمیں خدا ترسی، نیک چلنی، تربیت نفس، دیش بھگتی اور اچھے ہندو مسلمان بننے کی طرف رغبت دلائی۔ انگریزوں نے منیر شکوہ آبادی کو قید کر کے انڈمان بھیج دیا۔ شیفتہ کو سات سال کی سزا دی۔ آزردہ کی ساری جائداد غصب کر لی، صہبائی کو توپوں سے اڑا دیا اور غالب کے عزیز شاگرد میکش کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ یہ تمام مصیبتیں اور صعوبتیں اردو شاعروں اور ادیبوں نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ وہ ان مصائب اور مشکلات میں بھی مسکراتے رہے یہ واقعات ہمیں خون کے آنسو رلا دیتے ہیں۔ ہماری رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے اور ہم مدہوش ہو کر انھیں خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مومن سب سے پہلے غزل گو شاعر ہیں۔ جنھوں نے جہادیہ مثنوی لکھ کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ آگے چل کر سرسید کی تحریک نے لوگوں لوگوں کے دلوں سے شکست خوردگی کو دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ ماضی کے شاندار کارنامے الاپ کر ہمیں خواب غفلت سے بیدار کیا اور نفسیاتی جان پیدا کی۔ ذکاء اللہ حالی، شبلی، حکیم اجمل خاں شیدا، اقبال، محمد علی جوہر، چکبست، مجاز اور کیفی اعظمی نے ہمارے اندر نیا خون زندگی دوڑایا، حسرت، آزاد، فراق، محروم، پریم چند بھاشنبر سدرشن، نظیر اکبر آبادی اور علامہ کیفی نے ہمیں بستر خواب سے جگایا۔ نظیر اصفہان کی بلبل سے پیار نہیں کرتے۔ بلکہ ہندوستان کے جانوروں سے پیار کرتے ہیں ان کی ساری شاعری ہندی عناصر کی آئینہ دار ہے۔ ملک کی محبت ہمارے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ نہ لیں ہم بہشت بھی ہوم رول کے بدلے اسکے نعرے سے فضا گونج اٹھی۔ اس کی خاطر جان تک کی بازی لگا دی گئی۔ یہ تمام مشکلیں ہمارے اردو کے پریمیوں نے برداشت کی ہیں اور اپنے خون جگر سے گلشن ہند کی آبیاری کی ہے، یہی شہیدوں کی نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔ مرحبا اے جاں نثاران وطن! زندہ باد! دوسرے سیاسی لیڈروں کے دوش بدوش اردو کے ادیب اور شاعر آزادی کے دلدادہ رہے ہیں۔ ان کی قربانی اور تیاگ سیاسی لیڈروں سے کچھ کم وقعت نہیں رکھتا، وہ اس ہندوستان کے لئے مرمٹے ہیں جس کی خاک پاک نے ہمیں قبول کیا جس کی آب و گل سے ہماری پرورش ہوئی اور جس کی ہواؤں نے ہمیں پالا۔ انھوں نے اس کی آزادی کے لئے سرفروشی کی اور آج وہ مبارک دن ہے کہ ہم ان قربانیوں کی بدولت آزاد ہیں ان کی بے لوث قربانیاں اور ان تھک کوششیں رنگ لائیں اور اگرچہ وہ شمشان گھاٹوں، قبرستانوں میں آرام کر رہے ہیں اور ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی نشانیاں موجود ہیں، ان کے جواہر پارے موجود ہیں اور اگر یہ چیزیں موجود ہیں تو ہماری اردو بھی زندہ جاوید رہے گی۔

(باقی آئندہ)

پچھلا ہفتہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

بارے میں سب پارٹیوں میں اتفاق ہے۔ اس لئے حکمراں پارٹی کی شکست سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لوگ چند اشخاص کی مسلسل حکومت سے تنگ آ گئے ہیں اور اب دوسروں کو آزمانا چاہتے ہیں۔ جغرافی لحاظ سے ترکی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے اس انتخاب کی اہمیت محض مقامی نہیں ہے۔ حکومتیں بہت توجہ سے حالات کا مطالعہ کر رہی ہیں اور ۲۲ مئی کا انتظار کر رہی ہیں جب کہ گرانڈ نیشنل اسمبلی کا اجلاس اور نئے صدر کا انتخاب ہوگا۔

ڈیماکریٹک پارٹی میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ اس کی بھاری اکثریت ناتجربہ کار نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ سوا پارٹی لیڈر جلال بایر کے جو اتاترک کے زمانے میں وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور کوئی نہیں جو انتظامی تجربہ رکھتا ہو، لیکن یہ خامی ہر نئی پارٹی میں ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ دور ہو جاتی ہے۔

انڈونیشیا کا انقلاب انگیز فیصلہ

۱۹ مئی کو جاکارتا (بٹیویا) میں انڈونیشیا کی مرکزی حکومت اور ریاستوں کی حکومتوں کے نمائندوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انڈونیشیا ایک وحدانی ریاست ہوگی۔ مشرقی انڈونیشیا، مشرقی سماترا وغیرہ کی حکومتیں دو مہینے کے اندر اندر ختم ہو جائیں گی اور ان کے اختیارات مرکزی حکومت کی طرف منتقل ہو جائیں گے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

وہ کسان جس نے بادشاہ کو شکست دی

شیخ حبیب اللہ

یوں بھی جیسا کوئی کسان کسی بادشاہ کو ہرا دے تو یہ ایک سنسنی خیز خبر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن فرعون کی سرزمین مصر میں تو ایسی شکست ایک یادگار تاریخی واقعے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کسان کے گھر میں جنم لینے والے نحاس پاشا نے شاہ فاروق کے کفش بردار کو میدانِ انتخاب میں شکستِ فاش دے کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس نصرت و کامرانی کا غلغلہ پندرہ دن تک مصر کے دشت و جبل میں گونجتا رہا۔

ساری عرب دنیا میں نحاس پاشا آج انوکھی شخصیت کے حکمران ہیں۔ ان سے یہ امید وابستہ ہے کہ مصر کو مرضِ جہالت اور عسرت کے بھنور سے نکال کر صحت علم اور دولت کے ساحل تک پہنچائیں گے۔ بعض لوگوں کو تو یہاں تک توقع ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ کے بانی ہوں گے۔ وسیع عرب دنیا ابھی تک شرم و ندامت سے سرنگوں ہے۔ وہ اس رانے کو کسی طرح نہیں بھولتی کہ مٹھی بھر اسرائیلی فوج نے عرب ریاستوں کی فوجیں کو جو تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھیں فیصلہ کن شکست دی ہے۔ جو نوجی دنیا میں ایک ان ہونی بات سمجھی جاتی تھی

مصطفےٰ نحاس پاشا موٹے تازے آدمی ہیں۔ اور ان کا کینڈا کچھ سینما کے شریر کردار کا سا ہے ان کی بائیں آنکھ ساکن رہتی ہے اور داہنی آنکھ ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے۔ اس طرح وہ ایک ہی لمحے میں دو آدمیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی کھردری موٹی کھال کی وجہ سے وہ اور زیادہ بدہیئت معلوم ہوتے ہیں۔

ان کی عمر ۷۶ سال تھی، مگر اب ۷۱ سال بتائی جاتی ہے۔ یہ معمولی ردو بدل اس لئے کی گئی ہے کہ انھیں مصر کا "پیر فرتوت" کہلانا منظور نہیں۔

ان کی خوش الحانی اور خوش بیانی سینما کے شریر کردار کے رنگ کو اور نکھار دیتی ہے مقرر کی حیثیت سے ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ وہ صرف قدیم قرآنی عربی کے ماہر نہیں ہیں بلکہ وہ ادب العوام کے محاوروں کے بھی استاد ہیں۔ ان کی شخصیت رعب دار ہے دوستوں کی وفاداری حاصل کرنے کے گر اور عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے طریقے انھیں خوب آتے ہیں۔

اپنی متمول بیوی کے ساتھ وہ پایۂ تخت کے بہترین حصے میں رہتے ہیں اور اب تو ان کی مالی حالت اور ترقی کر گئی ہے۔ زرق برق لباس میں تنوں سے لدے ہوئے وہ مرغِ زریں معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ فاروق کو نحاس پاشا سے نفرت ہے اور وہ شاہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب نحاس پاشا نے لوگوں سے کہا تھا کہ شاہ کو خزانے پر اختیار نہ دیا جائے بادشاہ نے انھیں غدار کا خطاب دیا تھا اور ان پر یہ الزام لگایا تھا کہ انھوں نے اپنی روح کو حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

لیکن نحاس کی کامیابی نے شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ وفد پارٹی کے سامنے سر جھکا دیں۔ وفد پارٹی کی بنا سعد زاغلول پاشا نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ڈالی تھی۔ اس پارٹی کا واحد مقصد یہ تھا کہ مصر کو حکومتِ برطانیہ کی گرفت سے آزاد کیا جائے یہ زاغلول پاشا ہی تھے جو مصر کی آزادی کے لئے برطانیہ سے لڑ گئے تھے۔ اسی دن سے وفد پارٹی دنیا میں مشہور رہی ہے۔ برسوں تک وہ نہ صرف حکومت سے محروم رہی بلکہ پارلیمنٹ میں بھی قدم نہیں رکھنے پائی۔ اور اب اس کا آناً فاناً سارے مصر پر چھا جانا واقعی حیرت انگیز ہے۔

وزیر اعظم ہوتے ہی نحاس نے مصر کے مشہور نابینا فلسفی طٰہٰ حسین کو وزیر تعلیم مقرر کیا اور ہر خاص و عام کے لئے علم کے دروازے کھول دئے ہیں۔ آج مصر میں تعلیم عام اور مفت ہے۔ اب نحاس پاشا نے پنج سالہ ۲۵ کرور پونڈ کی سکیم کو خود اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ تاکہ کاشتکاری بجلی اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا جائے۔ زمینداری کا خاتمہ بھی وہ بہت جلد کرنے والے ہیں تاکہ غریب کاشتکار سکھ کا سانس لے سکیں۔ اپنے امورِ خارجہ کی پالیسی کی وضاحت انھوں نے صرف ایک جملے میں کر دی ہماری قوم اس بارے ایک زبان ہے کہ وادیٔ نیل کو مصر سے سوڈان تک ہر طرح کی بیرونی اغراض سے آزاد کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ برطانوی فوج نہر سوئیز سے رخت سفر باندھے اور وسیع سرزمین سوڈان مصر میں ضم ہو جائے۔

نحاس پاشا حیرت انگیز سیاسی چالوں کے لئے مشہور ہیں۔ یہ انھی کا کارنامہ تھا کہ برطانیہ کو ۱۹۳۶ء میں مصر کی "نظارت" سے دست بردار ہونا پڑا۔ یہ انھی کی کرامات تھی کہ دورانِ جنگ میں مصر کو برطانیہ کا ساتھ دینا پڑا حالانکہ بادشاہ ہٹلر کی پارٹی کے طرف دار تھے۔ انھی کی کوشش سے فرانس شام سے نکالا گیا۔

عرب لیگ بھی انھی کی تحریک ہے۔ نحاس پاشا ابتدا میں ڈاک خانے میں ملازم تھے اور ٹیلی گراف اپریٹر کا کام کرتے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے قانون کا امتحان پاس کر لیا اور وکالت کرنے لگے کچھ دن جج رہے اور پھر سیاست کے مردِ میدان اور زاغلول پاشا کے منظور نظر بن گئے۔ اس جلیل القدر بزرگ کی رفاقت میں جو مصر کا گلیڈسٹون تھا۔ نحاس کو اس قدر شہرت ہوئی کہ حکومتِ برطانیہ نے انھیں جلاوطن کر دیا اور وہ بحر ہند کے ایک گمنام جزیرے میں نظربند رہے۔ اس طرح انھیں سیاسی شہید کا مرتبہ اور زاغلول کی جانشینی کی عزت حاصل ہو گئی۔ دو سال کی جلا وطنی کے بعد ۱۹۲۳ء میں قید سے آزادی ملی اور اسی کے ساتھ سیاسی ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ زاغلول کی موت کے بعد وفد پارٹی کے سکریٹری جنرل ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وزیر اعظم مصر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۶ء میں بھی تھوڑے تھوڑے دن وزیر اعظم رہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب وادیٔ نیل جنرل رومل کی زد میں تھی برطانوی سفیر نے مطالبہ کیا کہ نحاس کو وزیر اعظم مقرر کیا جائے۔ شاہ فاروق نے انکار کر دیا۔ بات کی بات میں برطانوی ٹینک مصر پہنچ گئے اور شاہ کو مجبوراً نحاس کو وزیر مقرر کرنا پڑا۔

جنگ کے بعد فاروق نے نحاس کو ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ نحاس نے پارلیمنٹ سے فریاد کی۔ بادشاہ نے ایک مصنوعی وفد پارٹی گڑھ لی، اور چاہتا تھا کہ اسے حقیقی مان لیا جائے۔ مگر یہ پارٹی یا کوئی اور جماعت حکمرانی کے قابل تھی ہی نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کو اسرائیل کے ہاتھوں زبردست شکست کھانی پڑی۔ شاہ فاروق کی پارٹی نے جھوٹا "یوم الفتح" منانے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد سیاسی قتل شروع ہوئے اور وہ ابتری پھیلی کہ شاہ فاروق کا سیاسی گھروندا مسمار ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مصر کی تاریخی دنیا میں نحاس پاشا کون سا انقلاب لاتے ہیں۔ (ماخوذ)

بقیہ سلسلہ صفحہ ۸

بقیہ سلسلہ صفحہ ۸

اس فیصلے کے مقصد کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہر چند انڈونیشیا میں ڈچ وہاں کی مختلف ریاستوں کو بظاہر اس طرح کی کامل آزادی نہیں دے گئے جیسی انگریز ہندوستانی ریاستوں کو دے گئے تھے۔ بلکہ انھیں مرکزی حکومت کے ساتھ وفاق کے رشتے میں منسلک کر گئے لیکن اصل یہ ریاستیں مرکز کے خلاف سازشوں کے اڈے بن گئی ہیں۔ اور تھوڑے دن میں ان کی طرف سے کئی بغاوتیں ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان کو ختم کرنے کا فیصلہ انڈونیشیا کی قومی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت ضروری تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شاید اس کے نفاذ میں انڈونیشی حکومت کو اس سے کہیں زیادہ مشکلیں پیش آئیں جتنی ہندوستانی حکومت کو اپنی ریاستوں سے نبٹنے میں پیش آئیں ٭

اندلس میں عربوں کی علمی ترقیاں

(بسلسلہ صفحہ ۲)

عبدالرحمٰن بن الحکم نے طرزِ وزارت ایجاد کیا۔ مشہور مؤرخ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "اندلس کی قومی حکومت نے پہلی مرتبہ وزیر کو رکن دولت قرار دیا اور پھر وزارت کے کاموں کو مختلف اصناف تقسیم کر کے ہر صنف کا جداگانہ وزیر مقرر کیا۔ چنانچہ مالیات کا وزیر علیحدہ تھا۔ رسل و رسائل کا الگ تھا۔ اندرونی سیاسیات کا وزیر جدا تھا اور خارجی معاملات کا وزیر دوسرا تھا۔" علمی اور اقتصادی ترقیوں کے علاوہ فن تعمیر میں عربوں نے اندلس میں بہت سی عدیم المثال یادگاریں چھوڑی ہیں جنمیں قصر الحمرا، الزہرا، قصر اشبیلیہ وغیرہ بہت ممتاز عمارتیں تھیں۔ مشہور خلیفہ عبدالرحمٰن نے قصر دارالروضہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر میں ۵ لاکھ دینار اور پانچ برس صرف ہوئے تھے۔ ان عمارتوں کی عظمت اور حسن و آرائش کا مفصل تذکرہ زبان قلم کے بس سے باہر ہے۔ اور اگر کوئی منظر نگار اس طرف توجہ بھی کرے تو ضروری ہے کہ وہ ان عمارتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو مگر کوئی ایسی کتاب ہمیں نہیں ملتی جس میں باتفصیل ان عمارتوں کی تعریف و تذکرہ کما حقہ کیا گیا ہو۔ بعض کتابیں میں جن میں نسبتاً کچھ تفصیل اور خوبی ہے لی بان نے اپنی کتاب "عربوں کے تمدن" میں ان عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی عظمت اور حسن تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے مگر غالباً اس اندازہ میں ان کے تذکرے سے زیادہ کتاب کی تصویروں کا دخل ہے جو بہت ہی بے نظیر اور قیمتی ہیں۔

اور اب تو ان عظیم الشان عمارتوں میں جنات کا مسکن ہے، ابابیلوں کا بسیرا ہے۔ کھنڈرات باقی ہیں آہستہ آہستہ وہ بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ ان علمی ترقیوں، تہذیبی بلندیوں اور عظیم الشان محلات کی صرف یاد باقی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی مٹ جائے گی۔ اندلس، باقی ہندس۔

شرح چندہ
ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ	دس روپے
ششماہی	ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ	چار آنے

(مینیجر)

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں

(مینیجر)

مطبوعہ: جید پریس، دہلی

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی بی اے (جامعہ)

नई रोशनी देहली

مسئلہ زمینداری

شریعتِ اسلامی کی روشنی میں

حافظ محمد اسلم جیراجپوری

آج کل دینی لحاظ سے زمینداری کے جواز اور عدم جواز پر بحثیں ہو رہی ہیں، یہاں تک کہ پنجاب کے بعض مدعیان شریعت نے اس پر مستقل تصنیفیں کر ڈالی ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگوں نے مجھ سے اس کی حقیقت دریافت کی۔ اسی لئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ سمجھنے کی آسانی کے لئے زمینداری کو دو نوعیتوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

(۱)

پہلی نوعیت یہ ہے کہ زمیندار جس قطعہ اراضی کا مالک یا جس پر قابض ہو خود یا ہمسایہ کاشت کرتا ہو۔ یہ چیز فطرت، عقل اور دین سب کے مطابق اور معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ انسانی معیشت کا مدار اس کے اوپر ہے۔ قرآن کریم نے اگرچہ رقبہ کی حد بندی نہیں کی ہے کہ ایک کسان زیادہ سے زیادہ کس قدر زمین جوتنے کے لئے رکھ سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ تحدید کی ممانعت بھی نہیں فرمائی ہے۔ اور ہمارے اصول کے مطابق قرآن جس امر کو نفیاً اور اثباتاً ذکر نہ کرے وہ عقل پر محول ہے۔ کیونکہ قرآن کی مخاطب انسانی عقل ہی ہے۔ اس لئے اگر کسی زمان یا مکان میں حکومت جوت کے رقبے کی حد بندی کو ضروری سمجھے تو اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

(۲)

دوسری نوعیت زمینداری کی یہ ہے کہ کسی کے پاس اس قدر زمین ہے کہ وہ خود جوتتا ہے یا نہیں جوتتا مگر دوسروں کو کاشت کے لئے دیتا ہے اور ان سے لگان نقد یا جنس وغیرہ کی صورت میں وصول کرتا ہے یہ چیز قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس سے زمیندار اور اسامی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ شریف اور وضیع کے طبقات بنتے ہیں جن میں کشمکش ہوتی ہے اور اخوت مساوات اور جمہوریت کا خون ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے کرایہ کو خواہ کسی صورت میں ہو زمیندار کے لئے ناجائز قرار دیا، اور صاف صاف حکم دے دیا کہ جس کے پاس زمین ہے وہ خود جوتے یا اگر نہیں جوت سکتا تو دوسرے بھائی کو بلا کرایہ جوتنے کے لئے دیدے۔ یہاں تک کہ ان روایات میں یہ بھی ہے کہ جو ایسا نہ کرے گا تو اللہ اور رسول کی طرف سے اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

یہ روایات حدیث کی اُن کتابوں میں ہیں جو اہل سنت کے نزدیک صحیح ترین مانی جاتی ہیں، یعنی بخاری و مسلم وغیرہ۔ در اصل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سورہ الرحمٰن کی اس آیت کے مطابق ہے

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ

اور زمین کو اللہ نے جمہور کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔

زمیندار جو لگان وصول کرتا ہے وہ جمہور کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے۔ لہٰذا وہ "مَا وُضِعَ لَہٗ" کے خلاف ہے اور ظلم ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ وہ زمین کو بلا کرایہ دوسرے کے حوالے کر دے تاکہ حکومت اس سے زمین کی زکات وصول کرے جو بیت المال میں داخل ہو کر جمہور کے کاموں میں خرچ ہو۔

یہ بات میں نے اپنی کتاب "تعلیمات قرآن" میں لکھی تھی جو ۱۹۳۲ء میں شائع کی گئی۔ مولانا مودودی صاحب نے جو اس وقت رسالہ ترجمان القرآن حیدر آباد دکن سے نکال رہے تھے اس کی مخالفت کی۔ ان کو سمجھانے کے لئے مزید توضیح کے ساتھ مضمون بھیجا گیا جس کو انھوں نے اپنے رسالے میں شائع کیا مگر وہ موافق نہ ہو سکے اور اب تک بھی شاید وہ قسم دوم کی زمینداری کو جائز ہی سمجھتے ہیں مگر میرے خیال میں مسئلہ بالکل صاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگان کو ممنوع قرار دے کر ایک زمینداری توڑ دی۔ جو حضرات تقوے میں کامل تھے انھوں نے جیسا کہ ان حدیثوں میں ہے سنتے ہی اس پر عمل کیا اور اپنی فالتو زمینیں بلا کرایہ دوسروں کو دے دیں۔ لیکن یہ دیناہے سب کے لئے زمینداری کے فوائد سے دست بردار ہو جانا آسان نہ تھا۔ اس لئے ان صاف اور واضح روایتوں کی تاویلیں کی گئیں، اور ان میں حیلے نکالے گئے پھر ان کے خلاف دوسری حدیثیں روایت کرنا کیا مشکل تھا چنانچہ ان نکتوں کا سہارا لے کر مسلمانوں میں زمینداری قائم رکھی گئیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اسلام کا وہ اجتماعی نظام جو قرآن نے کر آیا تھا خلافت راشدہ کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ اور خلافت کے نام سے مستبد اور شخصی حکومت قائم ہو گئی تھی جس کے نزدیک زمینداری ناجائز نہیں بلکہ پسندیدہ تھی۔ زمینداری سیا انھوں نے تو غلامی کو بھی جس کا دروازہ قرآن نے بالکل بند کر دیا تھا، جاری رکھا

سرمایہ داری کی ابتدا اسی قسم کی زمینداری سے ہوئی۔ پھر اس کا دوسرا ذریعہ سود ہے۔ قرآن نے دونوں کو ممنوع قرار دیا۔ پھر بھی اگر کچھ سرمایہ جمع ہو جائے تو اس کی تقسیم یا تفریق کے لئے وراثت کا قانون رکھا، تاکہ مسلمانوں میں دولت پرستی نہ ہو۔

الغرض زمینداری کی وہ صورت کہ آدمی خود اپنے مقبوضہ رقبے پر کاشت کرے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور دوسری صورت یعنی کرایے پر زمین کو اٹھانا ناجائز ہے۔ اس سے معاشرے میں ایک مفت خور جماعت پیدا ہوتی ہے جن کے دماغوں میں بیشتر فساد کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔

اب رہا یہ کہ زمینداروں کا اپنی زمینوں پر قبضہ مالکانہ ہوگا یا منتفعانہ۔ یعنی آیت

"وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ"

میں "لام" تملیک کا ہے، یا انتفاع کا، اور حق ملکیت اور حق انتفاع میں کیا فرق ہے؟ اور کیا حکومت کسانوں کا قبضہ ان کی جوت پر برقرار رکھتے ہوئے ان کی زمینوں کو اپنی ملکیت قرار دے سکتی ہے؟ یہ سوالات ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ جب وقت اٹھائے جائیں گے اس وقت قرآن کی آیتوں سے ان کے جوابات نکالے جائیں گے۔

چند روائتیں

مولانا اسلم صاحب کے مذکورہ بالا مضمون میں جن روایتوں کا ذکر ہے، انھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

رافع کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زراعت کے لئے زمینیں لیتے تھے اور تہائی چوتھائی اور ایک خاص مقدار غلہ کرایے کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ ایک روز میرے چچاؤں میں سے ایک آئے اور انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لئے نافع تھا۔ مگر ہمارے لئے اللہ اور رسول کی تابع داری زیادہ نافع ہے۔ آپ نے ہم کو اس بات سے منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی اور چوتھائی اور مقرر مقدار غلے کے عوض انھیں کرایے پر دیں۔ اور آپ نے حکم دیا ہے کہ مالک زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لئے دے دے اور آپ نے زمین کے کرایے کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے اس کے علاوہ مصنف نے رافع بن خدیج کے حوالے سے سات اور روایات ذکر کی ہیں جن میں رسول اللہ صلعم یہ فرماتے ہیں کہ یا تو زمین خود جوتو یا اپنے بھائی کو مفت جوتنے کے لئے دو اور یا اسے روک لو۔ لیکن بٹائی یا کرایے پر نہ دو۔

یہ روایات، بخاری، ابن ماجہ، ابو داؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ کی ہیں۔

نئی روشنی جلد۲ نمبر۲۱ یکم جون سنہ ۵۰ء
ادارۂ تحریر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

سیٹھ ڈالمیا کا ضمیر

یوں تو دنیا میں ہر جگہ دولت ایک حد سے بڑھ جانے کے بعد طاقت کی صورت اختیار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں آج کل یہ رجحان اس قدر بڑھ گیا ہے کہ شاید اور کہیں نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں کی محکومی کے سبب میں اور خاص طور پر سرمایہ داری طبقے میں جسے اپنے کاروبار کے بڑھانے کے لیے عمر بھر ارباب اقتدار کی خوشامد میں پڑا رہنا پڑتا تھا اور کبھی کبھی ناگوار ذلتیں گوارا کرنی پڑتی ہے، بہت شدید جذبہ حقارت پیدا کر دیا ہے اور اس کی تلافی کے لیے نفس کی گہرائیوں کے اندر سے بے انت خودی کی خواہش طاقت کی صورت میں ابھر رہی ہے پچھلے دنوں سیٹھ رام کرشن ڈالمیا جو پینترے بدلتے رہے ہیں ان کی تہہ میں دراصل یہی چیز ہے ان کا خیال تھا کہ چونکہ انھوں نے جنگ کے زمانے میں بدیسی حکومت کی ہر طرح خوشامد کر کے بے اندازہ دولت کمائی اس لیے موجودہ قومی حکومت کو ان کی قدر کرنی چاہیے، اور ان کے مشورے کے مطابق کام کرنا چاہیے جب مایوسی ہوئی تو انھوں نے حصول کی دوسری راہ اختیار کی اور کانگریسی حکومت کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش شروع کر دی ان کے ضمیر نے ان کی بڑی مدد کی اور ان کے ہر قدم کو ایک اخلاقی اصول بنا دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے بداخلاقی مٹانے کے لیے گئو رکھشا کی مہم اٹھائی۔ مگر اس میدان میں کانگریس والے ان سے کہیں تیز نکلے اور سیٹھ جی ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ پھر وہ برادری اور امن کے علم بردار بنے مگر یہاں گاندھی جی کے پیرو پہلے ہی سے لہرا رہا تھا، ہمیشہ کے کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی اس کے بعد انھیں پاکستان کی تادیب کا خیال آیا پر افسوس یہ تیر بھی ترکش ہی میں رہ گیا۔ اب سیٹھ جی کے ضمیر نے یہ حکم دیا ہے کہ گاندھی میموریل فنڈ کے معاملے میں سردار پٹیل سے الجھیں چنانچہ انھوں نے ایک بیان میں یہ اعتراف کیا کہ خود ان کی اور دوسرے سرمایہ داروں کی نیت میموریل فنڈ میں چندہ دیتے وقت صاف نہ تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ کر چندہ دیا تھا کہ اس طرح جنگ کے زمانے میں کمائے ہوئے روپے پر انکم ٹیکس سے بچ جائیں گے۔ اس پر سردار پٹیل نے انھیں سختی سے لتاڑا، اور یہ مشورہ دیا کہ اپنا ناپاک روپیہ جو انھوں نے میموریل فنڈ میں چندے کے طور پر دیا تھا واپس لے لیں۔ سیٹھ جی دل سے چاہتے تھے کہ یہ بحث طول کھینچے تاکہ کسی طرح ان کا نام تو اچھلے چنانچہ حال میں انھوں نے پھر ایک لمبی چوڑی کھلی چٹھی سردار پٹیل کے نام لکھی اور اس میں اس الزام کو دہرایا کہ میموریل فنڈ کا چندہ حکومت کی طرف سے دباؤ ڈال کر وصول کیا گیا ہے اور اس کی پرائشچت کا یہ طریقہ بتایا کہ اس فنڈ سے کافی رقم مہاجرین کی امداد پر صرف کی جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سیٹھ جی کا الزام بالکل بے بنیاد ہے ہر شخص جس نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں حکومت کو چندے اور قرضے کا روپیہ وصول کرتے ہوئے دیکھا ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر موجودہ حکومت گاندھی میموریل فنڈ کے لیے چندہ کرنے میں دباؤ سے کام لیتی تو اس کی میزان دس بارہ کروڑ پر نہ رک جاتی بلکہ کم سے کم پچاس ساٹھ کروڑ تک پہنچتی۔ ہم نے تو ضلعوں کے حکام کو بار بار یہ شکایت کرتے ہوئے سنا تھا کہ حکومت نے میموریل فنڈ کے چندے کے سلسلے میں ہر قسم کی سختی کی ممانعت کر دی ہے اس لیے جتنا چندہ ہو سکتا تھا اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ اب رہی سیٹھ جی کی یہ تجویز کہ فنڈ کے روپے کا ایک حصہ مہاجروں کی امداد کے لیے صرف کیا جائے ظاہر ہے کہ محض مہاجروں کو کانگریس کے اور حکومت کے خلاف بھڑکانے کی اور آئندہ الیکشن میں ہندو مہاسبھا کے ووٹ لینے کی ایک ترکیب ہے یوں تو اس وقت مہاجروں کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ نہ صرف گاندھی میموریل فنڈ کی مجلس کو بلکہ ان سب اداروں کو جو خدمت عامہ کے لیے قائم ہوئے ہیں سب سے پہلے مہاجروں کا خیال رکھنا چاہیے اور وہ رکھتے بھی ہیں لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اس فنڈ کا روپیہ براہ راست مہاجروں کی بحالی پر صرف کیا جائے اور رفاہ عام کے ان اداروں کو جنھیں خود گاندھی جی نے قائم کیا تھا اور وہی چلاتے تھے محروم کر دیا جائے۔ مہاجروں کی بحالی کا کام اتنا بڑا ہے کہ حکومت اس پر اب تک بیسیوں کروڑ روپے خرچ کر چکی ہے اور آئندہ چند سال میں اسے اس سے کہیں زیادہ رقم صرف کرنی پڑے گی۔ اگر گاندھی میموریل فنڈ میں سے دو چار کروڑ روپیہ براہ راست مہاجروں کی امداد کے لیے دے دیا جائے تو وہ سوکھی ریت میں پانی کی طرح جذب ہو کر رہ جائے گا اور ادھر گاندھی جی کے چلائے ہوئے کام جن سے بالواسطہ مہاجروں کو بھی بے اندازہ فائدہ پہنچا ہے بند ہو جائیں گے یا کم سے کم اتنی اچھی طرح نہ چل سکیں گے جیسے اب چل رہے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ سردار پٹیل نے اس بار سیٹھ ڈالمیا کو صرف یہ مختصر جواب دیا ہے کہ آپ کے خط کے لہجے کو دیکھ کر اور آپ کی دماغی حالت کا اندازہ کر کے جو اس سے ظاہر ہوتی ہے، میں ان باتوں کا جو آپ نے لکھی ہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ نہ صرف سردار پٹیل بلکہ سب ذمہ دار لوگ سیٹھ جی کو اور ان کے ضمیر کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے، اور ان کی تحریروں کو جن کا سلسلہ فرصت کی فراوانی کی وجہ سے کبھی بند نہیں ہوگا۔ درخور اعتنا نہ سمجھیں گے سیٹھ جی کے قلم کی نوک کو جس سے وہ اپنے نزدیک تلوار کا کام لے رہے ہیں، کند کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

پنجاب کانگریس کے جھگڑے

کانگریس کے اندرونی جھگڑے بنگال مدراس، یوپی اور پنجاب میں باری باری سے ابھرتے ہیں۔ سردار پٹیل یا پنڈت نہرو کے دخل دینے سے تھوڑے دن کے لیے دب جاتے ہیں اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آج کل بنگال اور مدراس میں آپس کی لڑائی دھیمی پڑ گئی ہے یوپی میں چھوٹے گروپ کے کانگریس پارٹی سے الگ ہو جانے کی وجہ سے لڑائی نے بڑی شدت اختیار کر لی ہے اور اب بظاہر اس کا فیصلہ الیکشن کے میدان میں ہوگا۔ پنجاب کی حالت کچھ دن سے بظاہر سکون کی تھی لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ مخالفت کا مادہ اندر اندر اندر پک رہا ہے اور ایک دن پھوٹ کر رہے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس بار میدان جنگ اسمبلی نہیں بلکہ ضلع لدھیانہ کی کانگریس کمیٹی ہے۔ وہاں کے ایک پرانے کانگریسی مولوی عبدالغنی ڈار نے جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی تھے پنجاب کے بعض کانگریسی لیڈروں کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا تھا اور ان پر طرح طرح

المناک حادثہ

۲۲ مئی کو جامعہ نگر کی مختصر سی آبادی میں ایک نہایت دردناک حادثہ پیش آیا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے اکاؤنٹنٹ اور انجمن مکتبے کے نائب سکریٹری افتخار علی خاں صاحب جمنا کی نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مرحوم کی عمر بہ مشکل ۲۲ سال کی تھی۔ اس بے وقت اور اچانک موت پر ان کے اعزا، احباب اور رفقا کو جس قدر رنج اور غم ہوا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہمیں مرحوم کے والدین اور ان کے اعزا خاص طور پر جناب حامد علی خاں صاحب (مینیجنگ ڈائرکٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) سے انتہائی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

کے الزام لگائے گئے۔ اس جرم میں مکس کانگریس سے نکال دیا گیا۔ ان کی ہمدردی میں لدھیانے کی ضلع کانگریس کمیٹی اور تحصیل کانگریس کمیٹی کے سب عہدیداروں نے استعفے دے دیا ہے اور کانگریس کے الکشن کا جو چند روز میں ہونے والا ہے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا ہے۔ ان حضرات نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی ڈاکٹر بھارگو کی وزارت کو سہارا دے کر بڑی بے انصافی کر رہی ہے اس لئے کانگریس کی اکثریت اس وزارت سے بیزار ہے۔

ہمارے خیال میں پنجاب کانگریس کے دونوں حصوں کے اختلافات کا اسمبلی سے کانگریس کمیٹیوں تک پہنچ جانا نہایت خطرناک ہے۔ اسمبلی کی سازشوں اور وزارت کی الٹ پلٹ سے نظم ونسق کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ بھی بہت برا ہے۔ مگر کانگریس کمیٹیوں کے جھگڑوں کا اثر عوام تک پہنچتا ہے اور ان میں بددلی پھیلاتا ہے جو اس سے کہیں بدتر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اس بار پنجاب کے قضیے میں رفع الوقتی سے کام نہیں لے گی بلکہ معاملات کی پوری پوری تحقیقات کرکے قطعی اور آخری فیصلہ کر دے گی تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔ اس کی ذمہ داری خود لیڈروں پر کیسے ہی ہو لیکن ورکنگ کمیٹی پر اس طرز عمل کی بھی ہے کہ اس نے کبھی ایک فریق کی پیٹھ ٹھونکی، کبھی دوسرے کو تھپکی دی۔ اس ڈھیلی اور ڈانواڈول پالیسی سے کام نہیں چل سکتا۔

بیا کہ نوبت صلح است و آشتی و صفا

ابھی چند روز ہوئے پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر گیانی گرمکھ سنگھ مسافر سو سکھ زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ گورو ارجن دیو کی برسی کے موقع پر لاہور گئے تھے۔ وہاں سے آکر انھوں نے نئی دہلی میں یہ بیان دیا کہ "نہرو لیاقت معاہدے کا جو اثر سندھ اور پاکستان کے تعلقات پر پڑا ہے وہ معجزے سے کم نہیں۔ نہ صرف [illegible] حلقوں بلکہ عوام کے خیالات [illegible] بالکل بدل گئے ہیں۔ اس معاہدے سے پہلے سکھوں کی طرف سے کچھ کشیدگی [illegible] مگر اب تو پاکستان کے مسلمان ان کو دوست سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں"۔

"ایک مدت سے وہ لوگ جنھیں مغربی پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا ہے اس قسم کی خوش گوار اطلاعات دے رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں عام طور پر اپنے ہندو، سکھ بھائیوں کی محبت کا جوش [illegible] چاہتے ہیں کہ [illegible] زیادہ تعداد جلا وطنی کی زندگی چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس آجائے۔ اگر کچھ شکی مزاج کے لوگوں کو ان اطلاعات کی صحت میں کچھ تامل بھی ہوگا تو وہ اب گیانی گرمکھ سنگھ مسافر جیسے ذمہ دار لیڈر کے بیان سے دور ہو جائے گا۔

اسی طرح ان مسلمانوں کا بھی جو مشرقی پنجاب میں سفر کرتے ہیں یہ بیان ہے کہ لوگ ان کے ساتھ نہ صرف معمولی اخلاق [illegible] بلکہ محبت کا برتاؤ کرتے ہیں [illegible] سکھ [illegible] جاتے ہیں۔

اس سے ہماری اس رائے کو جو ہم کئی بار ظاہر کر چکے ہیں تقویت پہنچتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام بلا قید [illegible] دل سے اس کے لئے تڑپ رہے ہیں کہ دونوں ملکوں میں جلد از جلد صلح و آشتی کے تعلقات پیدا ہوں اور وہ کشیدگی جو کچھ دنوں سے نظر آرہی تھی اور بڑھتی چلی جاتی تھی، دور ہو جائے۔ لیکن عوام [illegible] تو جاہل ہیں اور اپنے لیڈروں پر [illegible] ان پر جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہو، سختی کے ساتھ تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ آنکھ بند کرکے بھروسا بھی کرتے ہیں۔ اس لئے دونوں حکومتیں اگر اپنے باہمی جھگڑوں کو طے کرکے پائدار دوستی کا رشتہ جوڑنا چاہیں تو اس میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ یہ عذر جو کبھی کبھی حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی زبان سے سننے میں آتا ہے کہ ہم تو صلح کی خاطر سب کچھ ماننے کو تیار ہیں مگر رائے عامہ سے مجبور ہیں۔ بالکل بے بنیاد ہے۔

بہترین انتخاب

خدا خدا کرکے وہ الجھن جو عام طور پر لوگوں کے دلوں میں تھی کہ [illegible] حکومت ہند کا وزیر مالیات کون مقرر ہوتا ہے، دور ہو گئی اور شری دیش مکھ کے تقرر کا اعلان ہو گیا۔ شری دیش مکھ ہمارے ملک کے چوٹی کے ماہر مالیات سمجھے جاتے ہیں۔ قومی حکومت نے انھیں پہلے ریزرو بینک کا گورنر اور پھر یورپ اور امریکہ میں ہند کا سفیر مالیات مقرر کیا تھا۔ یہ دونوں فرائض انھوں نے اس قدر خوبی سے ادا کئے کہ ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں ان کی قابلیت کی جو ساکھ بیٹھ گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ پچھلے سال انکو اقوام متحدہ کے مالیاتی ادارے انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا صدر مقرر کیا گیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ شری دیش مکھ بھی سرمایہ داری معیشت کے حامی ہیں اس لئے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ان میں اور ان کے پیشرووں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ مہارت اور قابلیت کے لحاظ سے وہ بہت اونچے ہیں اور ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مالیات کے پیچیدہ مسائل کو جن کے حل کرنے سے شری چیٹی اور شری متھائی کا ناخن تدبیر قاصر رہا، سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ع، ح

موسیو لائی کی امیدیں

یو، این، او کے سکریٹری جنرل موسیو لائی کو اپنے مشن میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے متعلق ابھی کسی کو کچھ علم نہیں۔ موسیو لائی نے ابھی حال میں جو مختصر سا بیان دیا ہے اس سے صرف اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ خود وہ مایوس نہیں ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ چاہے کئی مہینے لگ جائیں مگر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ہوگی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر حالات سازگار نظر نہیں آتے۔ یو، این، او کے تعطل کے ختم ہونے کا ابھی کوئی امکان پیدا نہیں ہوا۔ اعصابی جنگ کی شدت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ چار بڑی طاقتوں میں سے کوئی بھی مصالحت پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ موسیو لائی سے "راز و نیاز" کی جو باتیں ہوئی ہیں ان کا تو ہمیں علم نہیں، مگر بظاہر ہر ایک تیاری میں مشغول ہے اور ایسی تیاریاں ہیں جو کسی وقت بھی باقاعدہ جنگ کی محرک ہو سکتی ہیں۔

اسی تیاری کے سلسلے میں، پچھلے دنوں دو اہم خبریں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ روس مشرقی جرمنی کو مسلح کر رہا ہے دوسری یہ کہ جمہوری ملکوں نے مشرق وسطیٰ کو ہتھیار اور جنگی سامان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔

محض ہتھیار بھیج دینا کافی نہیں

اس میں شبہہ نہیں کہ تیل کی وجہ سے شرق وسطیٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر جنگی مصلحتوں کا یہ تقاضا تھا کہ اس علاقے کے ملکوں کو مسلح کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محض ہتھیار یا جنگی سامان بھیج دینا کافی ہے؟ ایسی صورت میں، جبکہ اسرائیلی حکومت اور عرب ریاستوں میں سخت دشمنی ہے اور عربوں کو امریکا اور برطانیہ کی پالیسی سے شدید اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں محض ہتھیار بھیج دینے سے جمہوری ملکوں کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے انھیں اس پالیسی کو بدلنا ہوگا جو اب تک عرب ملکوں کے ساتھ رہی ہے اور اس کے بعد فلسطین کے مسئلے کا ایسا حل تلاش کرنا ہوگا جسے دونوں فریق قبول کر سکیں۔ موجودہ حالات میں تو قدرتی طور پر اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ ہتھیار آپس کی لڑائی میں استعمال نہ کئے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جمہوری طاقتوں نے اس شرط پر ہتھیار دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ انھیں کسی جارحانہ حملے میں استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کی دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو [illegible] اور اس کے باہر سخت کارروائی کی جائے گی مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ کارروائی کس قسم کی ہوگی۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی مؤثر کارروائی کرنا ممکن بھی ہے؟!

روس کی جوابی کارروائی

مغربی طاقتوں کی طرح روس بھی بڑی گہری چالیں چل رہا ہے۔ جمہوری ملکوں نے جرمنی کو رفتہ رفتہ آزاد کرنے کا اعلان کیا اور پورے جرمنی کے مشترک انتخاب کی اسکیم تیار کی جس میں روس کا مقبوضہ علاقہ بھی شامل ہے تو روس نے جوابی کارروائی کے طور پر اپنے علاقے ——— مشرقی جرمنی ——— میں پچاس ہزار جرمنوں کو جدید ہتھیاروں سے مسلح کر دیا۔ اس کارروائی کا مقصد چاہے جو بھی ہو مگر اس میں شبہہ نہیں کہ اس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔ اسی قسم کے اسباب تھے جنھوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کو بہت جلد ایک مضبوط اور طاقتور ملک بنا دیا تھا، اسی طرح روس اور جمہوری ملکوں کے موجودہ اختلافات اسے دوبارہ ابھرنے اور طاقت حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچا رہے ہیں۔

(ع، ل)

بزم بے تکلف

"اے میں کہتی ہوں کہ آج چہرے پر محرم کیوں برس رہا ہے۔ کیا اس گموڑے چین یا جین سے پھر کوئی بری سی خبر آگئی؟"

"خدا نہ کرے خدا نہ کرے۔ بس تمھاری یہی بات تو مجھے زہر لگتی ہے کہ بے سوچے سمجھے بدفال منہ سے نکال بیٹھتی ہو۔ چین سے بری خبر کیوں آتی وہاں تو اب راوی چین لکھتا ہے۔"

"تو پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ جب سے ڈاک آئی ہے سر نہوڑائے منہ لٹکائے رونی صورت بنائے بیٹھے ہو۔"

"ارے بیوی بات کچھ بھی نہیں بس اک ذرا کلفی گری ہوئی ہے وہ جو ہم نے اس دن جواہر لال کو خط لکھا تھا کہ انڈونیشیا جانے سے پہلے ذرا ہم سے ملتے جانا تو آج اُن کے پرائیویٹ سکریٹری کا خط آیا ہے کہ آنریبل پرائم منسٹر کا وقت بالکل گھرا ہوا ہے انھیں افسوس ہے کہ وہ آپ سے نہیں مل سکتے۔"

"تو اور تم کیا سمجھے تھے کہ جواہر لال ہانپتے کانپتے دوڑے چلے آئیں گے میں نے لاکھ سمجھایا کہ یہ کیا حماقت کر رہے ہو، مگر تمھاری عقل پر تو کسی نے ٹوٹکا کر دیا ہے آخر کو خط لکھ ہی مارا۔ وہ تو کہو ان کا پرائیویٹ کوئی بھلا آدمی ہے نہیں تو وہ ڈانٹ بتاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا اور پھر اوپر سے پاگل خانے بھجوا دیتا۔"

"کیا مجال ہے اُس کی۔ یہ کوئی نادر شاہی تھوڑا ہی ہے جمہوری حکومت ہے۔"

"پاگل خانے بھجوانا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ چاہیئے۔"

"ڈاکٹر جب سنتا کہ ایک ملّا مکتب ہندستان کے وزیر اعظم کو اپنے گھر حاضری دینے کا حکم دے رہا ہے تو ساری فیکٹ کیا۔ موئے ڈپلومے کے ڈپلومے اُٹھا کے دے دیتا۔"

"لاحول ولا قوۃ، تم عورتوں کی عادت ہے کہ غیر متعلق بحثیں چھیڑ دیتی ہو اور اصل بات رہ جاتی ہے۔ ہمیں نہ اس پر اصرار تھا اور نہ اس کا افسوس ہے کہ جواہر لال ہمارے ہاں کیوں نہیں آئے۔ اگر وہ چاہتے اور ڈیڑھ ٹکے درجے کا آتے جاتے کا کرایہ بھیج دیتے تو ہم خود چلے جاتے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم سیاسی مشن پر جا رہے ہیں اور ادھر انھیں قیمتی مشورہ مفت مل رہا ہے۔ مگر انھیں توفیق نہیں کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔"

"لو اور سنو تم ہی تو ان کو مشورہ دو گے اور یہ اللہ کی سنواری اور ایشیا کی سوتیلی بیٹی ایشیا کہاں ہے اور تمھیں اس کی کیا خبر جو جواہر لال کو مشورہ دینے چلے ہو!"

"خالی ایشیا نہیں انڈونیشیا بحر الکاہل میں ملایا اور فلپائن کے درمیان ایک مجمع الجزائر ہے مگر تم نے ایشیا کی سوتیلی بیٹی کی خوب کہی سچ مچ اس کا رشتہ ایشیا سے یا کم سے کم ہندوستان سے ایسا ہی ہے جیسا سوتیلی بیٹی سے ہوتا ہے کہ سمجھو تو اپنی اولاد اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب بھی تمھیں کیا بتاؤں تم کیا سمجھو گی جواہر لال ہوتے تو ان کو سمجھاتا کہ ایک زمانے میں انڈونیشیا کا ہندوستان سے کتنا قریبی تعلق تھا اور اس کی تہذیب پر قدیم ہندی تہذیب کا کتنا گہرا اثر ہے ان کو چاہیئے اس ملک سے دوستی کی گرہ ایسی مضبوط باندھیں کہ دشمنوں کے توڑے نہ ٹوٹے اور کھولے نہ کھلے۔"

"اور وہ کا ہے کے لئے جا رہے ہیں، کالی مرچوں کا کاروبار کرنے؟ مگر تم نے یہ نہ بتایا کہ تمھیں اس ملک کا حال کہاں سے معلوم ہوا نہ کبھی آئے نہ گئے۔"

"تم بھی کیسی بھولے پن کی باتیں کرتی ہو، ارے کتابوں سے گھر بیٹھے بیٹھے ساری دنیا کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔"

"ہم نے اس کا ذکر "جگ بیتی" میں پڑھا ہے "تلاشِ ہند" میں پڑھا ہے"

"تو کیا جواہر لال نے یہ کتابیں نہیں پڑھی ہوں گی؟"

"ہرگز نہیں! اپنی لکھی ہوئی کتابیں کون پڑھتا ہے؟"

ننھا شاہکار

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرا ننھا سا شاہ کار تو ہے
ماں کی آنکھوں میں نوبہار ہے تو
پھول کی پنکھڑی سے نازک تر
حرفِ نازک سے شرمسار ہے تو
صبح کے ذوقِ شبنمی کی قسم
شام کا لطفِ انتظار ہے تو
ذہنِ شاعر کا اک لطیف خیال
بانگِ گل خندۂ بہار ہے تو
شعر ہے خون کا مجسم شعر
گنگناتا ہوا سا پیار ہے تو
ہیں غمِ زندگی کے ابروخم
بار ہے اور حسین بار ہے تو
جس کے ہونٹوں سے راز چھلکے گا
اے گلِ تر! وہ رازدار ہے تو
کس سے کہیئے کہ موجِ رقصِ بہار
جس میں پنہاں ہو وہ شرار ہے تو
جو محبت کو پہلی بار آیا
بے قراری میں وہ قرار ہے تو

غزل

گوپال متل

بہ اندازِ دگر اب عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں
کسی عنواں سہی، جینے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
خزاں کے دور کو جو مستقل سمجھے غلط سمجھے
بہار آئی گلستاں پھر گلستاں ہوتے جاتے ہیں
بجا تھا گر مجھے اپنی محبت پر بھروسا تھا
کہ اس جانب سے بھی اب عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں
جنھیں تھی موجِ بوئے گل نویدِ چاک دامانی
وہ دیوانے بھی مانوسِ بہاراں ہوتے جاتے ہیں
کہو اے بوم و شپرّ اب دلوں پر کیا گذرتی ہے
کہ آثارِ سحر کچھ کچھ نمایاں ہوتے جاتے ہیں

اُردو کا مستقبل

لکشمی نرائن تابش وششٹ

(۲)

ہم جغرافیہ کو تقسیم کر دیں لیکن تاریخ کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ زمانہ شاہد ہے کہ نسلیں آئیں، قومیں آباد ہوئیں، انقلابات آئے اور نقش قدم مٹ گئے۔ تاریخ اپنی نشو و نما کے ساتھ قائم رہی۔ اول تو یقین نہیں ہوتا اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اردو بھلائی بھی جائے گی تاہم اگر یہ وہم سچ بھی ہو تب بھی اس کی اول تاریخ کو فنا کرنا امر ناممکن ہے۔ لیکن جب تاریخ زندہ ہے تو زبان زندہ ہے اور ہماری امید زندہ ہے، ہمارا ادب سلامت ہے۔ ہماری بیٹی زبان محفوظ ہے۔ زمانہ ہمیشہ اچھے اچھے شاعر ادیب اور مفکر پیدا کرتا رہا ہے اور پیدا کرتا رہے گا۔ آج کل بھی بے شمار شعرائے پرفن اور ادبائے مسلم الثبوت دیکھنے میں آتے ہیں اور آنے والے زمانے میں بھی نظر آتے رہیں گے۔ اگر اچھے اہل قلم پیدا ہوتے رہیں گے تو اردو کبھی بھی فنا نہیں ہو گی لیکن ہمیں اس کو محض افسانۂ یاران کہن کے طور پر قائم رکھنا نہیں ہے۔ اس نے دامن کو خارستان جھاڑیوں سے بچانا ہے اور گل و بلبل، لیلیٰ مجنوں تک ہی محدود نہیں رکھنا ہے بلکہ اس کے دامن کو اور وسعت دینی ہے نئے نئے عمدہ خیالات لانے ہیں اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ اس کی خوشبو سے ہندوستان مہک اُٹھے گا۔

ذرا سوچئے جس چیز کو ہم کوتاہ نظری سے غیر سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ہماری اپنی ہے رادھا ہو یا شاردا، بیٹی میں فرق نہیں ہے۔ رام کہو یا رحیم بات ایک ہی ہے صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہے، ایک بات اور عرض کروں گا۔ ہندوستان کی عظمت کا ایوان محبت اور رواداری ہی پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ تنگ نظری اور عداوت سے کوئی ملک تہذیب یافتہ نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی کبھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ایک برائی دوسری برائی کے پیدا کرنے میں مددگار ہو جاتی ہے اس لئے برائی برائی سے ختم نہیں کی جا سکتی۔ برائی صرف نیکی سے دبائی جا سکتی ہے۔ دنیا کا امن نیکی، خلوص پیار و محبت، اتحاد اتفاق، نیک نیتی، انسانیت، ہمدردی اور اخوت پر مبنی ہے۔ بدی تو بے شک مٹ کر رہے گی لیکن نیکی کا نام اور پہلے سے زیادہ روشن ہو جائے گا۔ دنیا کی نگاہیں ہندوستان پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک صحیح قدم دنیا کے لئے بھلائی اور بہتری کا باعث بن سکتا ہے، اور ایک غلط قدم تمام دنیا کے واسطے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لئے ہمیں ماضی کی شاندار روایات کے پیش نظر وہ کام کرنا چاہئے جس سے تمام دنیا فیض یاب ہو، جس سے بھارت ماتا کا نام روشن ہو دنیا میں اس کی آواز سنی جائے اور لوگ اسے عزت کی نظروں سے دیکھیں۔

اردو زبان کے اندر ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج بھی اس کا بول بالا ہے اُسے سب سے زیادہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے لوگ اسے جانِ شیریں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں عوام اس کو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ ہم سب کی پیاری زبان ہے جب یہ ایک ایسا دلگداز نغمہ سناتی ہے تو سننے والے ایک دم رنج و غم میں ڈوب جاتے ہیں اور جس وقت یہ کوئی خوشی کا راگ الاپتی ہے تو لوگ اس سے محظوظ اور مسرور ہو جاتے ہیں اور یہی ایک زندہ رہنے والے ادب کی بڑی خوبی ہے۔ ہندو مسلم باہمی اتحاد و اتفاق اور گہرے تعلقات کی زندہ نشانی اردو زبان ہے اس میں دونوں کا مذہبی لٹریچر موجود ہے۔ اس میں رنگینی اور رعنائی ہے۔ اس کی ادا میں ایک عجیب دل کشی اور گیرائی ہے کہ چلتے چلتے آدمی کو اپنا گرویدہ و فریفتہ بنا لیتی ہے اس کا لب و لہجہ پیارا اور شگفتہ ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس نے ایامِ غلامی میں ہمارے دلوں کو گرمایا اور وطنیت کے جذبات و احساسات کوٹ کوٹ کر بھر دئے اس کا درد، اس کا پیار، اس کی محبت ہماری رگ رگ میں پوشیدہ ہے اس کی عالم گیر قوت محبت نے ہمارے دلوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اس کا دل موہ لینے والا انداز کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے انگریز اپنا سارا توپ خانہ لگا دیتے۔ تب بھی وہ بیکٹ کو بسکٹ اور لین ٹرن کو لال ٹین ہی کہتے ہیں۔ یہ کشادہ دل ہے، اس کی آغوش میں سب زبانوں کے الفاظ ہیں، اس میں سوز و گداز، رمزیت، بانکپن ظرافت شان و شکوہ، جوش و خروش، شوخی، نزاکت، اور ہندوستان کی صبح و شام کی رعنائی موجود ہے۔ یہ ہر قسم کے جذبات اور خیالات سے لطف اندوز ہوتی ہے اس کی بوقلمونی میں وہ یک رنگی ہے جو ہندی تہذیب کی خصوصیت ہے، اس میں وسعت، رواداری تحمل، انکسار، سادگی، بلاغت، فصاحت، بردباری جذب کا مادہ اور دل کشی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

اردو زبان عام لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور چونکہ وہ عوامی ضرورتیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں اسی لئے اردو زبان بھی نہیں مٹائی جا سکتی۔ اگر کوئی طاقت اس کو ختم کرتی ہے یا اس کی ترقی میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے تو وہ ترقی پسند کہلانے کی مستحق نہیں اور وہ سراسر غلطی کی مرتکب ہو گی۔ یہ بری بات ہو گی کہ ایک آدمی جس شاخ پر بیٹھا ہوا ہو اسی کو کاٹے۔

افسوس کا مقام ہے کہ آج اردو والے سہمے اور گھبرائے بیٹھے ہیں۔ ان کے اندر بے حسی اور ایک عجیب و غریب رد عمل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ رنجیدہ اور مایوس نظر آتے ہیں، لیکن آج کل جو دل شکن اور پریشان کن حالات رونما ہو رہے ہیں وہ کل بالکل ختم ہو جائیں گے لوگوں کی ذہنیت بدل جائے گی اور وہ نفرت اور تنگ نظری سے باز آئیں گے وہ سوال کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے سوچیں گے اردو کی حالت ان تیز و تند چشموں کی مانند ہے جو پہاڑوں کو چیرتے آگے بڑھتے ہیں۔ زمانہ بتاتا ہے کہ زبان کبھی نہیں مٹا کرتی اور نہ ہی کوئی اسے مٹا سکتا ہے۔ زبان کو ایک آدمی نہیں بناتا۔ وہ مختلف لوگوں کے باہمی اختلاط سے بنا کرتی ہے۔ زبان تہذیب و تمدن کا پیکرِ لطیف ہے۔ اگر ہم زبان کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کو مٹانے جا رہے ہیں۔ ہم اسی آشیانے کو نقصان پہنچا رہے ہیں جس میں ہم بسیرا کر رہے ہیں۔ ہم اسی گھر کو برباد کر رہے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں۔ اردو زبان ہندو مسلمانوں کی دو آنکھوں کی طرح ہے۔ اب چاہے ایک آنکھ کو پھوڑ کر ہم اپنے آپ کو کانا کہلائیں چاہے دونوں آنکھوں کو صحیح سلامت رکھیں۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کسی ایک کی ملکیت ہوتی ہے۔ سب لوگ اسے مل کر اپناتے ہیں۔ لوگ اسے روحانی اور ذہنی نشو و نما کے لئے سیکھتے اور اپناتے ہیں۔ اس میں ہر قوم کا مذہبی ادب ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں آج اس میں مسلمانوں کی مذہبی کتابیں پائی جاتی ہیں وہاں ہندوؤں کی متبرک اور دھارمک کتابیں رامائن مہابھارت گیتا، ستیارتھ پرکاش اور دوسری مشہور کتابوں کے تراجم موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو انقلابی ادب سے مالا مال ہے۔ اس نے اس تاریک زمانے میں علم بغاوت بلند کیا جب دستور زباں بندی محفل کا اصول بنا ہوا تھا۔ جب زبان بات کرنے کو ترستی تھی۔ اس پر آشوب زمانے میں بھی اردو کے شاعروں نے اپنے نغمے گائے، اور صحافیوں نے انگریزوں کے خلاف مضامین لکھے

اے میرے ہم وطنو! اگر ہم بھارت ورش کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے ہوئے دیکھنے کے خواہش مند ہیں، اگر ہم اس بات کے متمنی ہیں کہ ہمارا ہندوستان خوب پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ مادر وطن دوسرے آزاد اور ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش گامزن ہو۔ اگر ہم یہ بات دیکھنے کے آرزو مند ہیں کہ ہمارا عزیز ملک ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے رہے۔ اگر ہمیں ایشیا کی سرداری حاصل کرنی ہے۔ اگر ہم اپنے آدرشوں کو بلند کرنے کے خواہاں ہیں اور اگر ہماری دلی خواہش زندہ رہنے کی ہے تو ہمیں نفرت، خود غرضی تنگ نظری، انتقامی جذبات، حقارت، عداوت بغض، حسد اور امتیاز مذہب و ملت کی بیخ کنی کرنی

آزادی کی زنجیریں

ظفر دیناپور کے ایک بگڑے ہوئے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد پنشن لے کر وطن ہو بیٹھے تھے۔ ظفر اسی سال الہ آباد کالج میں داخل ہوا تھا۔ وہ اور اس کا دوست ہردیال اکرام اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے حسینہ اور ظفر کی بچپن میں منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن ذہانت و ذکاوت پر فریفتہ ہو گیا۔ نئے ادب کے جلسے میں اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی کا خیال ہے کہ اگر ظفر اعلیٰ درجے سے پاس نہ ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں یہ رقابت کی خلش پیدا ہو گئی اور اس نے ایک طرف تو حسینہ کی سیرت اور عادات کا غور سے مطالعہ کیا اور دوسری طرف پڑھنے میں جان کھپا دی۔ چنانچہ اُسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق خاطر ضرور ہے۔

(قسط ۲۱)

تعطیل کے دن کاٹنا ظفر کو مشکل ہو گیا۔ گرمی اس شدت کی تھی کہ دماغ پڑھنے پر اچھی طرح جمتا نہ تھا۔ صبح دھوپ چڑھنے سے پہلے دو تین گھنٹے کام ہو جاتا تھا اس کے بعد گیارہ بجے کھانا کھا کر پانچ بجے تک ظفر میر صاحب کے کمرے میں ایک ہاتھ میں پنکھے کی ڈوری اور دوسرے ہاتھ میں کتاب لئے کرسی پر بیٹھا اونگھا کرتا تھا۔ بیچ میں تھوڑی دیر کے لئے پنکھا رحیم بخش کو دے کر لیٹ جاتا تھا مگر سوتا نہیں تھا۔ شام کو ہردیال کے ساتھ کبھی اسکول اور اسٹیشن کی طرف اور کبھی ندی کی طرف ٹہلنے کو چلا جاتا تھا۔ نو بجے رات تک کھانے سے فارغ ہو کر مکان کی چھت پر چلا جاتا گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتا، لکھتا اور پھر سونے کو لیٹ جاتا۔ اکثر اسے دیر تک نیند نہیں آتی تھی اور رات کی تنہائی میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے لیٹا ہوا تخیل کی سیر بین سے عشق و رومان کی طلسمی دنیا کی سیر کیا کرتا تھا۔ کبھی حسینہ سے خلوت میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں، کبھی چاندنی رات میں وہ گنگا کی سطح سیمیں پر کشتی میں چلا جا رہا ہے اور حسینہ موتیا کے پھولوں کے زیور سے لدی ہوئی اس کے کندھے پر سر رکھے لہروں کے ساز کے ساتھ دھیمے سروں میں گا رہی ہے۔ کبھی دونوں ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز میں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے، گہرے سمندروں، سفید برف پوش پہاڑوں اور سرسبز اور وسیع میدانوں پر اڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ سرخوشی کے عالم میں خود بخود ایک قصے کا پلاٹ اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس نے اٹھ کر دو تین گھنٹے میں ایک خاکہ تیار کر لیا اور پھر چار پانچ روز کی محنت میں افسانہ مکمل ہو گیا۔ یہ افسانے جو ظفر نے اس زمانے میں لکھے، رومانی طرز کی خیال آرائی اور جذبات پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے مثلاً ایک میں جس کا عنوان "نالۂ نے" تھا، ایک ناکام عاشق کی داستان تھی جس کی محبوبہ اس سے پیمان وفا توڑ کر دولت مند رقیب سے شادی کر لیتی ہے۔ غریب عاشق دیوانگی کے عالم میں گھر کو چھوڑ کر ہمالیہ کے پہاڑوں سے سر ٹکراتا پھرتا ہے۔ شملے اور کشمیر کے درمیان ایک گھنے جنگل میں وہ مدت تک ایک سادھو کا مہمان رہتا ہے جو بانسری بجانے میں کمال رکھتا ہے۔ بانسری کی دردناک لے میں اس غضب کی تاثیر ہے کہ اُن کو سن کر نہ صرف انسانوں کے بلکہ جانوروں کے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ عاشق یہ محسوس کرتا ہے کہ جو آنسو اس نغمے کے اثر سے اس کی آنکھوں سے نکلتے ہیں وہ اس کے زخم دل کے لئے مرہم کا کام دیتے ہیں۔ وہ سادھو کی خدمت کر کے اس سے بانسری بجانا سیکھتا ہے، اور پھر گیروے کپڑے پہن کر اور بانسری لے کر چل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتا ہے۔ بانسری بجا کر روتا اور رلاتا ہے جس سے درد فراق کی کسک کو تھوڑی دیر کے لئے تسکین ہو جاتی ہے۔ پھرتا پھرتا وہ اس شہر میں جا نکلتا ہے جہاں اس کی محبوبہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ اس کے مکان کے سامنے ایک پیڑ کے تلے بیٹھ کر بانسری بجانا شروع کرتا ہے۔ محبوبہ اس سحر انگیز نغمے کی کشش سے بے اختیار کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی ہے اور اس کی غزالی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو جاتی ہیں۔ معشوق کی آنکھوں کو اشکبار دیکھ کر عاشق پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ نالۂ نے کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بانسری پھٹ جاتی ہے اور بجانے والا گر پڑتا ہے۔ اس کے قلب کی حرکت رک گئی ہے۔ وہ ایک لاش ہے سرد اور بے جان، مگر اس کا دردناک نالہ فضا میں اب بھی گونج رہا ہے۔

خدا خدا کر کے جون کے آخر میں بارش شروع ہوئی اور گرمی کی شدت سے نجات ملی۔ اب کالج کھلنے کا وقت نزدیک تھا۔ اس لئے ظفر زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ حسینہ سے ملنے کی گھڑی بھی قریب آ رہی تھی، اس کا تصور خیالی تمثال کے بجائے حقیقی پیکر بنتا جا رہا تھا اور ظفر کی آنکھوں میں آنے والی ملاقاتوں کے نقشے کھنچ رہے تھے۔ اس نے اپنے وعدے کے مطابق کبھی کبھی خط لکھے مگر حسینہ کو سوا دعا سلام کے کچھ لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کے جوابوں میں حسینہ کے قلم سے بھی رسمی آداب اور مزاج پرسی کی ایک آدھ سطر ہوتی تھی جس کی خوشنما تحریر ظفر کی آنکھوں کو نور بخشتی تھی مگر خشک الفاظ اس کے قلب کو سرور بخشنے سے قاصر رہتے تھے۔ عقیلہ بیگم نے دو ایک خطوں میں لکھا تھا کہ حسینہ گرمی کی وجہ سے بہت نڈھال رہتی ہے اور ظفر نے اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ بھی اس کی جدائی کو محسوس کرتی ہے۔ آخری خط میں یہ خبر تھی کہ لطیف بی اے کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے اور رڑکی کے مقابلے کی تیاری کر رہا ہے۔ ظفر نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اُسے لطیف کے پاس ہو جانے سے خوشی ہوئی، مگر اصل میں وہم کا کانٹا جو اس کے دل میں برابر موجود تھا، پھر کھٹکنے لگا کہ کہیں لطیف صفدر علی صاحب کی توقعات کو پورا کر کے ان کے نزدیک حسینہ سے شادی کرنے کا مستحق نہ بن جائے۔

منظور حسن صاحب کے دوستوں خصوصاً ماسٹر شیو دیال صاحب کے مشورے سے یہ بات طے ہو گئی تھی کہ میر صاحب نومبر کے آخر میں اپنے ایک سابق ملازم نور محمد کے ساتھ پانچ مہینے کے لئے حج و زیارت کے قصد سے روانہ ہو جائیں گے اور رحیم بخش اُن کی غیر موجودگی میں مکان کی حفاظت کرتا رہے گا۔ جائداد کی دیکھ بھال اور ظفر کو خرچ بھیجنے کی ذمہ داری ماسٹر صاحب کے ایک عزیز نے جو مختاری کا کام کرتے تھے، اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس فیصلے کا میر صاحب پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ دفعتاً اُن کی بے دلی اور افسردگی غائب ہو گئی اور پرانی شگفتہ مزاجی، زندہ دلی مستعدی اور ہمت کا ایک ہلکا سا رنگ پھر نظر آنے لگا۔ عبادت سے اُن کا شغف اور بڑھ گیا مگر اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے دو چار دوستوں کے ہاں آنا جانا، ملنا جلنا شروع کر دیا۔ ظفر سے وہ اس کے معاملات کے بارے میں کھل کر گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے اُسے بتایا کہ گو وہ اس کی شادی حسینہ کے ساتھ کرنے کے دل و جان سے خواہش مند ہیں۔ لیکن وہ صفدر علی کی آزاد خیالی سے کھٹکتے ہیں۔ اور انھیں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں حسینہ باپ کے اثر سے بے جا آزادی اور بے پردگی اختیار کر لے مگر جب ظفر نے اطمینان دلایا کہ صفدر علی کی آزاد خیالی محض دیکھنے ہی دیکھنے کی ہے، اور اصل میں وہ پردے کے مخالف نہیں ہیں، اور اگر ہوں بھی تو اس معاملے میں عقیلہ بیگم کے سامنے ان کی رائے نہیں چل سکتی۔ اُسے خیال آیا کہ میر صاحب سے لطیف کے قصے کا ذکر کر دے، لیکن ایک تو شرم دامن گیر ہوئی دوسرے اُس نے یہ سوچا کہ وہ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے اس کو سنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ خواہ مخواہ انھیں تکلیف ہوگی اور غصہ آئے گا اور انھوں نے اس غصے کا صفدر علی صاحب پر اظہار کر دیا تو آپس کے تعلقات بگڑ جائیں گے، اور معاملہ اور بھی خراب ہو جائے گا۔

وہ اس خلش کو شوق اور امید کے ساتھ ساتھ دل میں لئے ہوئے کالج کھلنے سے ایک دن پہلے ہردیال کی ہمراہی میں الہ آباد پہنچ گیا۔

(باقی آئندہ)

انڈونیشیا کی زبان

قومیت کی ضمنی پیداوار

تقدیر الیس جاہ بانا

مترجمہ مشتاق احمد

انڈونیشیا کی زبان کی ترقی اور انڈونیشیا کے [illegible] کی سیاسی بیداری، ان کی تحریک آزادی، دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی ان کی آرزو میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شروع شروع میں اپنے حکمراں ڈچ قوم کی نظروں میں جگہ پانے کے لئے انڈونیشیا کے لوگ ڈچ زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علوم و فنون اور سماجی برتری حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ڈچ ——— حکمران کی زبان ہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈچ حکومت نے اس صدی کے شروع میں متعدد ڈچ انڈونیشیائی اسکول قائم کئے۔ لیکن ڈچ زبان کے عاشقوں کی اس قدر کثرت تھی کہ ڈچ حکومت کی یہ چند "لیلیٔ سول سروس" پروانوں کی آتش عشق کو بجھا نہ سکیں۔

ڈچ زبان میں لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈچ ہی انڈونیشیا کی لنگوا فرینکا بن جائے گی۔ جی۔ این۔ نیوون ہس، جو انڈونیشیا میں سب سے بڑے ڈچ معلم تھے، کہا کرتے تھے کہ اگر دس لاکھ انڈونیشیائی ڈچ زبان سے آشنا ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ ڈچ مطبوعات بلکہ ڈچ مصنوعات کی بھی انڈونیشیا میں بڑی مانگ ہوگی۔ ان کے سامنے ہندوستان، فلپائن وغیرہ نوآبادیات کی مثالیں تھیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ کسی زبان کی جغرافیائی توسیع اس زبان کے مالک ملک کی سیاسی اور معاشی قبضہ کی مترادف ہے۔ لیکن دقیانوسی ڈچ حکمراں طبقہ کی تنگ نظری کو اسے نیوون ہس صاحب کی وسیع الخیالی بالکل راس نہ آئی۔ اس کے نزدیک تو یہ بڑے خوف کا مقام تھا کہ انڈونیشی ڈچ زبان سیکھ سیکھ کر مغربی خیالات اور طرز معاشرت سے بہرہ اندوز ہو کر حکمراں طبقے کی برابری کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے ڈچ انڈونیشائی "تعلیمی کمیشن" مقرر کیا جس نے بہت زیادہ سوچ بچار اور غیر منطقی بحثوں کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ انڈونیشیا کے لوگوں کو ڈچ زبان کے استعمال کی محدود اجازت دی جائے۔

اسی دوران میں انڈونیشیا میں قومی تحریک نے جنم لیا۔ زبان کا مسئلہ بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ابھرا۔ انڈونیشیا کے سیاسی لیڈر جنھیں اپنی قوم کے لوگوں میں نئی روح پھونکنی تھی، اس فکر میں ہوئے کہ لوگوں کو بیدار اور منظم کرنے کے لئے سب سے مؤثر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ سیاسی تعلیم کے اتنے زبردست پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انڈونیشیا کی مقامی بولیوں پر تکیہ کرنا مشکل تھا جن کی تعداد دو سو سے بھی اوپر تھی۔ اس لئے لوگوں کی نظریں ملایا زبان پر پڑنے لگیں۔ جو صدیوں تک دکھنی ایشیا کی عام زبان رہ چکی تھی۔ انڈونیشیا کی بڑی سیاسی جماعتیں مثلاً سرکت اسلام (مسلم لیگ) اور پارٹی کمیونسٹ انڈونیشیا بلا تکلف ملایا زبان استعمال کرنے لگیں اسی طرح پڑھا لکھا طبقہ بھی ملایا زبان کی طرف جھک گیا۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈچ حکومت نے ڈچ زبان سیکھنے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ملایا زبان کے استعمال میں جو ترقی ہوئی ہے اسے انھی عناصر کا مرہون منت سمجھنا چاہئے۔ ۱۹۴۰ء میں پچھلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس نے سیاسی اور سماجی حالات کو یک سر بدل دیا۔ جرمنوں نے NETHERLANDS پر قبضہ کر لیا تو انڈونیشیا کے ڈچوں کا ناتہ اپنی جنم بھومی سے ٹوٹ گیا اور ناتہ ٹوٹتے ہی انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے شاخ نازک پر آشیانہ بنا رکھا تھا۔ انڈونیشیا کے لوگوں، ان کی زبان اور تہذیب سے جو ان کا صحیح تعلق تھا وہ ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ کہاں تو ڈچ زبان سیکھنے پر پہرہ تھا کہاں لوگوں سے ربط و ضبط پیدا کرنے کے لئے خود پہرہ دار انڈونیشیائی زبان سیکھنے پر کمربستہ ہو گیا! لیکن اس فیصلے پر ابھی پوری طرح عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ جاپانی قبضے نے اُن کے فیصلے کی کمر توڑ دی۔

لوگوں کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ انڈونیشیائی زبان کی سب سے زیادہ ترقی جاپانی قبضے کے دوران میں ہوئی۔ انڈونیشیا میں داخل ہونے کے بعد جاپانیوں نے اندازہ لگایا کہ انڈونیشیا کے ستر لاکھ عوام تک پہنچنے کا سب سے آسان ذریعہ انڈونیشیائی زبان ہی ہے۔ ڈچ زبان کی سرکاری حیثیت ختم ہو گئی جاپانیوں نے ڈچ زبان کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان سے بھی جن کے نزدیک اس زبان میں تبادلۂ خیال شرافت کی نشانی تھی، یہ زبان رخصت ہونے لگی۔ گو یہ حقیقت واضح تھی کہ حملہ آور آخر کار جاپانی زبان ہی کو جو آگے انڈونیشیا کی سب سے اہم زبان بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن یہ مقصد رفتہ رفتہ ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لئے [illegible] کے ابتدائی زمانے میں جاپانیوں کو فطری اور سیدھے سادے پر چلنا پڑا یعنی انڈونیشیائی زبان کا استعمال جو تمام ملک میں بولی جاتی تھی۔ جاپانیوں کے اس فیصلے سے کہ جتنی جلد اور تیزی سے ممکن ہو سکے انڈونیشیائی زبان کو ترقی دی جائے انڈونیشیائی سوسائٹی میں کایا الٹ پھیر ہوا کیونکہ فوراً ہی ہر لیڈر کو زندگی کے ہر میدان میں ہر زبان کو چھوڑ کر انڈونیشیائی زبان کو اختیار کرنا پڑا۔ صرف اسکول کے استادوں ہی کو نہیں بلکہ [illegible] سے لے کر سرکاری افسر کو جو انڈونیشیائی زبان سے بس معمولی واقفیت رکھتے تھے۔ اس زبان کو سیکھنا اور استعمال کرنا [illegible] یہ کہ عام قوانین اور سرکاری اطلاعات انڈونیشیائی میں لکھی جانے لگے۔ بلکہ تمام سرکاری خط و کتابت خواہ محکموں کے درمیان ہو یا پبلک اور تعلیمی اداروں سے انڈونیشیائی زبان میں ہونے لگی چونکہ اب کتنے ہی ایسے مسائل اسی زبان میں بحث کرنا تھا جن پر اس سے پہلے اس زبان میں کچھ بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ترقی اس کے سر پر تھوپ دی گئی تاکہ جتنی سرعت سے ممکن ہو سکے وہ ایک مکمل و ترقی یافتہ زبان کے چند در چند فرائض کو سرانجام دے سکے۔ اس کے علاوہ جاپانی اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ وہ انڈونیشیا کے ہر باشندے کی قوت بازو سے جنگ جیتنے کا کام لیں گے۔ اس وجہ اندرون ملک دیہاتوں میں بھی گئے اور جہاں جہاں گئے اپنے ساتھ انڈونیشیائی زبان بھی لے گئے۔

اس طرح یہ زبان پھیلتی رہی اور لوگوں میں نئے احساس کی گرمی پیدا کرتی رہی جیسے جیسے زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو تیزی سے بولنا سیکھتے گئے اُن کے اندر اپنایت کا ایک نیا رشتہ پیدا ہوتا گیا۔ جاپانیوں کی اپنی زبان اور تہذیب کو استوار کرنے کی کوشش کے خلاف انڈونیشیائی زبان قومی اعتماد کا ایک نشان سمجھی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانیوں نے جب ہتھیار ڈالا تو اسی وقت انڈونیشیائی زبان ڈچ [illegible] مقامی زبانوں کے مقابلے میں بہت ہی مستحکم ہو چکی تھی اس لئے کہ انھیں قبضے کے ایام میں ترقی کا موقع نہیں ملا تھا۔

جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انڈونیشیا کی جمہوری حکومت نے اسے سرکاری زبان تسلیم کر لیا اور آج مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس میں کیا اضافے کئے جائیں کہ یہ بیسویں صدی کے انسانی کاروبار کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ مغربی زبانیں زمانۂ حال کی ضروریات کو پورا کرنے کی صدیوں میں اہل ہوئی ہیں لیکن اس زبان کو برسوں میں اس کا اہل بننا ہے۔ ورنہ ڈچ کی جگہ اس زبان کو سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ عوام کے حق میں مضر ثابت ہوگا اور انڈونیشیا دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

مغربی زبانیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، ڈچ وغیرہ کی طرح انڈونیشیائی زبان کو زمانۂ حال کی ایک ترقی یافتہ زبان بننے کے لئے چند بنیادی ضروریات کو پورا کرنا پڑے گا۔ مثلاً سب سے اہم مسئلہ خزانۂ الفاظ کا ہے۔ زمانۂ حال کی پیچ در پیچ اور نازک انسانی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کے لئے وسیع خزانۂ الفاظ ناگزیر ہے۔ ایسے الفاظ جو نازک فلسفیانہ خیالات اور سائنٹیفک مشاہدات کے جزئیات کو بیان کرنے پر قادر ہوں۔ لیکن جدید انسانی زندگی اتنی پیچیدہ ہے کہ نہ صرف سائنس سے متعلق بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق بھی اصطلاحی الفاظ بنانے ہی پڑیں گے۔ انڈونیشیائی زبان، ملایا زبان، اور انڈونیسی زبانوں کا ایک مجموعی مرکب ہے بعض حالتوں میں یہ باہری زبانیں انڈونیشیائی زبان کو اشدھ کر دیتی ہیں۔ اس کی روک تھام ضروری ہے لیکن اس مشکل کا حل کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ اگر یہ شدھ ملایا زبان ہی کی جھینپی بن کر رہ جاتی ہے تو انڈونیشیا کے لوگوں کی روزمرہ کی بول چال، انڈونیشیائی زبان کے مقبول اخبار، رسائل، کتابوں اور سیاسی تقریروں سے اس کا سنبندھ ٹوٹتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر مقامی زبانوں کے اثرات یہ بے روک ٹوک قبول کرلی رہے تو یہ قومی زبان چوں چوں کا مربہ بن جائے گی۔ ایک ایسی زبان تو بے شک وجود میں آجائے گی جو عام بول چال کے لئے نہایت ہی کارآمد ہوگی لیکن جس میں کوئی بھاری بھی یکسانیت ہوگی۔ پھر یہ ایک ایسی زبان بھی نہیں بن جائے گی جو اپنے اندر اپنی بدتری سے تمام مقامی زبانوں کو ایک دھڑے پر لگا کر اپنے ساتھ ساتھ لے کر چل سکے۔ اس میں اتنا ہلکا پن آجائے گا کہ یہ ایک علمی زبان باقی نہیں رہ جائے گی۔ اس لئے اسے قومی زبان کے درجے تک پہنچانے کے لئے بڑی دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں سب سے بڑی زحمت یہ ہے کہ پچھلے تیس سالوں میں ملایا یا اس کی پیداوار انڈونیشیائی زبان میں ڈچ عالموں نے کوئی علمی تحقیق نہیں کی۔ اور خود انڈونیشیائی ماہر لسانیات نے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اس میں کوئی ریسرچ نہیں کی۔

انڈونیشیائی زبان کو قومی زبان بنانے کی راہ میں خزانۂ الفاظ وغیرہ کی جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کے علاوہ اس کے مستقبل کا فیصلہ اس حقیقت سے بھی ہوگا کہ اس زبان میں "پڑھائی کا سامان" کیا اور کتنا ملتا ہے۔ اب تک انڈونیشیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ڈچ تھی۔ نہ صرف یہ کہ علمی اور سائنسی مسائل ڈچ زبان میں ہوتے تھے بلکہ خالص انڈونیشیائی مسائل پر بھی اسی زبان میں بحث ہوتی تھی۔ اس لئے انڈونیشیا کا پڑھا لکھا طبقہ اپنی علم کی پیاس بجھانے کے لئے ڈچ زبان کی مطبوعات کی طرف لپکتا تھا۔ پس اگر انڈونیشیائی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے پھلنا پھولنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بہت سی اہم کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس پروگرام کا دوسرا جزو یہ ہے کہ خود انڈونیشیا کے عوام تیزی سے اس زبان کو پڑھیں اور سیکھیں کہ اپنی قومی زبان میں سمجھ سکیں اور اسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکیں اگر ایسا ہوا تو بہت جلد اس زبان میں ایسے اخبارات اور رسائل نکل آئیں گے جو موجودہ دور کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوں گے ——— اور یہ ایک زبان کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

انڈونیشیا
کا
ترانۂ آزادی

(سمانروجو)

ہم انڈونیشیا کے آزاد باشندے ہیں
ہم اپنے وطن کی آزاد دھرتی پر کھڑے ہیں
ہم بندوقوں کی گرج میں
آزادی کا استقبال کرتے ہیں
وہ دیکھو ہمارے بہادر سپاہی لڑ رہے ہیں۔
وہ منزل کی سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں
ان کے بدن کٹ رہے ہیں
ان کا خون بہہ رہا ہے
وہ اپنی داستان سنہرے صفحات پر لکھ رہے ہیں
ہمارے دلوں میں
ہمارے بازوؤں میں
یقینی فتح ہے
ہم اپنے وطن کو مضبوط اور بلند بنائیں گے

لہرائے جا پرچم انڈونیشیا

(سمانروجو)

اے سرخ و سپید پرچم
لہرائے جا، لہرائے جا
جنگِ آزادی میں تو
مضبوط تھا قومی نشان
لہرائے جا۔ لہرائے جا
اپنے چمکتے اور باعزت رنگوں کو
لہرائے جا۔ لہرائے جا
ساری دنیا کے عوام کو
ہماری آزادی کے گیت
سنائے جا۔ سنائے جا
لہرائے جا۔ لہرائے جا
ان سے کہہ دے جو غلامی کو سہارا دیتے ہیں
اب ہم آزاد ہیں اور آزاد ہی رہیں گے
ان سے کہہ دے جو امن اور آزادی کے متوالے ہیں
ہم ان کے دوست ہیں
اے سرخ و سپید پرچم
تو شاہد ہے ہماری قوم کے اتحاد کا
جب جد و جہد کر رہے تھے
جب وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے گامزن
تو شاہد ہے ہمارے بیٹوں کی قربانیوں کا
جن کی بہادری بے مثال ہے
ہمارے اجداد کا ملک حاصل کرنا
ہمارے لئے ابدی نعمت ہے
اے سرخ و سپید پرچم
لہرائے جا۔ لہرائے جا
ظلم اور خون کے دریا
دبا سکتے نہیں ہمیں
ہم نے اپنے خون سے تجھ کو اے پرچم
یہ سرخ رنگ بخشا ہے
ہماری پاک الفت سے تجھے
یہ سپید رنگ ملا ہے
تو لافانی ہے اے پرچم
ہمارے جسم مر کر فنا ہو جائیں گے
لہرائے جا۔ لہرائے جا
اس وقت اے پرچم تو لہرائے جا
نہیں! تو ہمیشہ ہمیشہ لہرائے گا
یہ سرخ و سفید رنگ
باقی رہیں ہمیشہ
اس میں لگے نہ داغ
ہمیشہ نصب رہنا تو
لہرائے جا۔ لہرائے جا
چمکتا رہے صدیوں تلک
تو ہماری قوم کے
پیدائشی حق
انسانیت و تہذیب اور تاریخ کے
تاج کے ساتھ شامل رہے
اے پرچم انڈونیشیا
لہرائے جا۔ لہرائے جا

مسعود صدیقی ایم اے

اردو کا مستقبل

(بسلسلہ صفحہ ۶)

ہوگی ہمیں اپنے اپنے کام کرتے ہوئے یکدل رہنا ہوگا۔ اپنے اپنے مذہب کے صحیح راستوں پر چلتے ہوئے دکھائی دینا ہوگا۔ اردو سب سے بڑا رشتہ اتحاد ہے۔ اس کو باقی رکھنا ہے۔ اگر ہم دوسرے صوبوں کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ضرور اردو کو زندہ رکھنا پڑے گا ہندی کو بھی آسان کرنا پڑے گا جتنا ہم ایک دوسرے کو زیادہ سمجھیں گے اتنی ہی جلد بھارت ورش اُنتی کے شکھر پر چڑھے گا۔ ہندوستان کی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت اتحاد اور آمیزش ہے۔ یہ سرچشمہ مہنجوداڑو میں پھوٹا تھا اور عہد وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا ابھی تک رواں دواں ہے، اس تاریخی رجحان کو قائم رکھنا ہے اور میرا خیال ہے کہ اردو کی ترقی ہی اس رجحان کے فروغ میں مدد دے سکتی ہے۔

تبصرہ

"چھان بین"

باقر رضوی

چھان بین :۔ از اثر لکھنوی۔ ملنے کا پتہ :۔
دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت ۔

"چھان بین" اثر لکھنوی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ عرصہ ہوا "اثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔

کتابت اور طباعت یہ دیکھتے ہوئے کہ لکھنؤ میں ہوئی ہے بُری نہیں۔ کتابت کی غلطیاں ہیں مگر کم اور اُن سے اس وقت تک مفر نہیں جب تک کہ اردو کتابوں کے موجودہ طریقۂ اشاعت میں تبدیلی نہیں ہوتی اور لیتھو کے بجائے ٹائپ کا رواج نہیں ہوتا۔

"چھان بین" میں کل پندرہ مضامین ہیں جو ۲۴۵ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اثر کے یہ تنقیدی مضامین مختلف اوقات میں مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں ایک مضمون چکبست، ایک غالب ایک میر، ایک اصغر، دو تسہیل البلاغت، اور تین فراق اور اُن کی شاعری کے متعلق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان مضامین کو لکھتے وقت اثر نے کوئی خاص رنگین عینک استعمال نہیں کی ہے۔ اظہارِ خیال کرتے وقت۔ ان کے سامنے خالص فنی نقطۂ نظر رہا ہے جیسا کہ وہ خود "گذارش" کے عنوان سے کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں :۔

"میں تنقید میں کسی خاص اسکول یا اصول کا پابند نہیں گو اس موضوع پر اکثر کتب قدیم و جدید کا مطالعہ کیا ہے ان سے مستفید ہوا ہوں اور میرے ملکۂ نقد کی اصلاح و تربیت ہوئی ہے جو کچھ پڑھتا ہوں اپنے ذوق و وجدان کی رہبری میں اس کو جانچتا ہوں اور جو خوبیاں یا خامیاں نظر آتی ہیں مع وجوہ و دلائل پسندیدگی و ناپسندیدگی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس جانچنے میں ہر قسم کے صوری و معنوی محاسن و معائب شامل رہتے ہیں۔ منشا، اولین اپنی ذہنی آسودگی بعد ازاں دوسروں تک تبلیغ ہوتی ہے۔ تاکہ ذوقِ ادب عام ہو اور کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے۔ حاشا کسی سے ذاتی عناد یا پرخاش نہیں۔ البتہ شخصیت سے مرعوب ہونا مجھے نہیں آتا۔"

چھان بین کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے اثر نے ان تنقیدی مضامین کو لکھتے وقت جو مندرجہ بالا مقاصد پیشِ نظر رکھے ہیں۔ ان میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

کتاب "چکبست کی شاعری" پر ایک مضمون سے شروع ہوتی ہے جس کا ابتدائی حصہ پڑھتے وقت "آبِ حیات" کے مصنف کی تحریر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چکبست کی شاعری پر عمومی طور پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور رائے بڑی نپی تلی، متوازن، سنجیدہ اور وزنی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"چکبست کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہے۔ انتہائی غیرت اور خودداری کے باوجود نخوت کا شائبہ نہیں۔ سوز و گداز و خستگی کے باوصف یاس و حرماں کی افسردگی ہے نہ محرومی کی فریاد و زاری، جوش و خروش کی فراوانی ہے مگر کلام مبالغے سے پاک اور حقیقت سے ہم کنار ہے۔ شدید جذبۂ حُبِ وطن طاری ہے۔ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بھائی کا خون بھائی بہیمانہ بے دردی سے بہا رہا ہے، مگر کیا مجال کہ لہجے میں درشتی یا اندازِ بیان میں تلخی پیدا ہو۔ بے شمار اچھوتے خیالات نظم ہوئے ہیں مگر سب زبان کی حدوں میں اور کہیں کوئی گنجلک نہیں۔ ثقیل و نامانوس الفاظ اور کاواک تراکیب کا تو ذکر ہی کیا جو آج کل تبرّی سے شاعری کا طغرائے امتیاز ہیں۔ چکبست کی شاعری نہ صرف ملک کے لئے مفید بلکہ خود شاعروں کے لئے سبق آموز ہے۔"

اقبال کے بارے میں دو مضامین ہیں۔ ایک میں اُن کی غزل

> نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
> اپنے سینے میں زرا اور اسے تھام ابھی

پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا مدلّل اور تشفّی بخش جواب ہے۔ دوسرا مضمون "اقبال اور اندازِ بیان" پر ہے۔ جس میں اثر نے یہ بات ظاہر کی ہے کہ "اقبال کے کلام میں تخیل اور طرزِ ادا کا بے مثل امتزاج ہے۔"

"رم جھم" (احمد ندیم قاسمی کے قطعات کا مجموعہ کلام) پر جو تبصرہ ہے اس میں خاص طور پر اس مقدمہ پر بحث کی گئی ہے جو مرزا احسان احمد صاحب بی۔اے، ایل ایل۔بی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں اثر نے مرزا احسان کی شعر فہمی کی حقیقت بے نقاب کی ہے اور ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔

اس کے بعد دو اور مضامین ہیں جن میں مرزا احسان احمد کے اُن خیالات سے شدید اختلاف کیا گیا ہے جو انھوں نے لکھنوی شعرا کے بارے میں ظاہر کئے ہیں۔ مرزا احسان احمد لکھنؤ کی شاعری کو ایک سرے سے بلا کسی استثنا کے بُرا کہتے ہیں جس سے کسی معقول پسند اور انصاف پرور نقاد کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔

"ناسخ و آتش سے پیشتر ایک لکھنوی شاعر" پر ۶۰ صفحے کا ایک طویل مضمون ہے جس میں ۴۸ صفحوں میں کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ اگر یہ مضمون "چھان بین" میں شامل نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اختر (واجد علی شاہ نہیں) جیسے غیر معروف شاعر (جو مرزا قتیل کے شاگرد تھے) کا تذکرہ کوئی زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ پھر ۴۸ صفحوں کے اس انتخاب میں خال خال ہی اچھے شعر ملتے ہیں۔

محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد (دکن) کی تصنیف تسہیل البلاغت پر اثر نے دو مضمون لکھے ہیں۔ مرزا بیگ نے لکھنؤ اور دلی کے مرکزِ زبان ہونے کی جو بحث چھیڑی ہے اور لکھنؤ میں استعمال ہونے والے جن بعض الفاظ کا تذکرہ کیا ہے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اثر نے یہ دکھایا ہے کہ ابتداً زبان اردو کا مرکز دلی تھا۔ مگر دلی کی تباہی کے بعد یہ فخر لکھنؤ کو حاصل ہوا۔ سجاد مرزا بیگ کا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ اہلِ زبان صرف دہلی والے ہیں۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے طالب علموں کے لئے یہ بحث اور مضامین فائدے سے خالی نہیں۔

اثر نے غالب کے بعض ایسے مشکل اور مشہور اشعار کا مطلب لکھا ہے جن کے معنی و مطالب میں شارحین اختلاف رکھتے ہیں۔ اثر نے ان اشعار کی جو تشریح کی ہے اس سے غالب کے اشعار کا مطلب عمدگی اور آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے، اور ان اشعار میں لطف آنے لگتا ہے جو اب تک پہیلی بنے ہوئے تھے۔

ایک زمانے میں حضرت عندلیب شادانی کے سر میں اردو کے جدید اور قدیم غزل گو شعرا کی تضحیک اور تنقیص کا سودا تھا۔ چنانچہ "ساقی" میں انھوں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور "میر صاحب کا ایک خاص رنگ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر ان پر امرد پرستی کا الزام وارد کیا تھا۔ اثر نے اپنی اس کتاب میں "واہ ری خوش مذاقی!" کا عنوان دے کر ایک مضمون لکھا ہے اور ٹھوس واقعات اور استدلال و دلائل کو بنیاد بنا کر اس الزام کی پر زور تردید کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میر کے ۲۰ ہزار اشعار میں صرف ۱۶۰ شعر عندلیب صاحب نے ایسے ڈھونڈے ہیں جن میں لڑکوں کا تذکرہ ہے۔ پھر بھلا اس بنیاد پر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ میر کا خاص رنگ ہے۔ گو اکثر تذکرہ نویس اُن کے موافق نہ تھے

مگر کسی نے کبھی میر پر ابرو پرستی کا الزام نہیں لگایا۔ جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق اور سیرت سے واقف ہے وہ خود جانتا ہے کہ یہ اشعار سراسر تقلیدی ہیں۔

چھان بین کے آخر کے تین مضامین فراق اور ان کی شاعری کے متعلق ہیں ان مضامین میں اثر نے ایک ادبی جج بن کر تنقید کی عدالت سے فراق کی شاعری کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کیا ہے۔ اس کی ہمت شاید اس دور کا کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اثر ادب میں جماعت بندی کے قائل نہیں۔ ان کا مقصد اپنی جماعت کے ہر ساتھی کو پڑھنا اور اس کے ہر عیب و پاس کو سراہنا ہو۔ وہ یہ امید بھی نہیں رکھتے کہ اس باہمی امداد باہمی ستائش کا صلہ انھیں اپنے حلقے کے ارکین سے کھوئے کھوئے بکتے ہوئے شہرت کے سکوں میں ملے گا اور عام ناظرین تھوڑی دیر کے لیے خیرہ اور عام دماغ بھونچکے رہ کے لیے ان کی عظمت سے متاثر ہو جائیں گے۔

آج کل کے نئے تنقید نگاروں میں بیشتر یا تو حضرت فراق کے شاگرد ہونے کا شرف رکھتے ہیں یا پھر ان کے دوست یا ہم وطن ہیں یا پھر اسی ادبی جماعت کے رکن ہیں جس سے فراق کا تعلق ہے۔ اس لئے ایک سعادت مند شاگرد، ایک خوش عقیدہ دوست ایک مہربان ہم وطن اور ایک خطا بخش رفیق کار کی حیثیت سے ادبی دیانت داری اور انصاف پسندی سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اور فراق کی ہر چیز کی موقع بے موقع تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور ایسے غوغا بلند کرتے ہیں کہ متانت کو شرم آنے لگتی ہے اور انصاف دم بخود رہ جاتا ہے۔

یہ افسوسناک تماشا ہے کہ آج کل کے بلند آہنگ دعوے کرنے والے تنقید نگار جو ہر وقت زبان سے آزادی رائے اور غیر جانبداری کا دم بھرتے ہیں اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ تھوڑی دیر کے لئے تمام تعصبات اور تاثرات اور وابستگیوں سے الگ ہو کر صرف شاعر کے کلام کو پرکھیں کھوٹے کھرے کا پردہ کھولیں اور اس کے کلام کے حسن و قبح کو بلا کم و کاست منظر عام پر لائیں۔

مگر اثر ان لوگوں میں نہیں ہیں وہ نقاد کے مرتبے اور اس کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انھوں نے فراق کے کلام پر بے لوث اور بے لاگ تنقید کی ہے۔

انھوں نے دکھایا ہے کہ فراق نے اردو زبان کے مزاج سے نا آشنا ہو کر سنسکرت کے متعلق الفاظ کو اس میں ٹھونسنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اس میں وہ ناکام رہے ہیں اور ناکام رہیں گے۔ آپ ہی بتائیے کہ یہ مصرعے

یہ دلیپ شنکھا سی ناک کلیکا سے ادھر
کمیت ہے اسا وری کہ الکوں کی ٹہنی
کیٹھر وزنٹہ ارس کی مہ ریلا کونا سب بدن
(روپ سے)

بیچارے اردو کے حلق سے نیچے اتریں گے۔

اثر نے انھیں مضامین میں سے ایک میں فراق کی ایک غزل سے کر یہ دکھایا ہے کہ انھیں اردو کے معمولی معمولی الفاظ کو شاعری میں فنکارانہ طور پر بجا صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مثلاً دھیما دھیما درد اٹھا ہے (فراق) دھیما دھیما کے بجائے ہلکا ہلکا یا میٹھا میٹھا درست ہوگا (اثر)

فراق کا ایک شعر ہے

تو بھی فراق اب آنکھ لگا لے
صبح کا تارا ڈوب چلا ہے

آنکھ لگانے بمعنی سو جانا اردو کا محاورہ نہیں اس کی جو اصلاح اثر نے یوں کی ہے

تو بھی فراق اک جھپکی لے لے
صبح کا تارا ڈوب چلا ہے
(اثر)

دیکھئے اس اصلاح سے شعر کیا سے کیا ہو گیا

اثر نے صفحہ ۳۱۲ پر فراق کی ایک رباعی لکھ کر بتایا ہے کہ اردو میں کلس ظرف کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا مگر صفحہ ۳۲۰ پر معلوم نہیں کیوں ایک ایسی رباعی کی تعریف کرتے ہیں جہاں کلس بمعنی ظرف استعمال ہوا ہے۔

اثر نے روپ کی بعض ایسی رباعیوں کا بھی تذکرہ کر کے ان کی تعریف کی ہے جو شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہیں اور لکھا ہے کہ "روپ" (رباعیوں کا مجموعہ) میں خس و خاشاک زیادہ ہے اور پھول کم ہیں مگر جتنے ہیں ان کا رنگ چوکھا ہے۔

"فراق کا منشا رس کی کوک شاستر تصنیف کرنا تھا مگر قانونی شکنجے سے بچنے کے لئے انھوں نے اسے جمالیاتی رباعیوں کا "روپ" دے دیا۔"

جو لوگ ادب کے اس بحرانی دور میں جماعت بندی کی پروا کئے بغیر اور شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر شاعر اور مصنف کی تحریر اور تخلیق سے اس کو جانچنا اور پرکھنا اور اس کے متعلق صحیح تلی متوازن اور منصفانہ رائے قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے چھان بین کا مطالعہ ناگزیر ہے

چھان بین اسم بامسمیٰ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ صالح ذوق ادب کی تشکیل و ترویج میں بڑی مدد دے گا۔

Registered No. D. 207.

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ .... دس روپے
ششماہی .... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ .... چار آنے

(منیجر)

مطبوعہ: جید پریس دہلی

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)

ہفتہ وار

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

نمبر ۲۳	۱۶ر جون سنہ ۵۰ء	جلد ۳

عنوان	مصنف	صفحہ
ایک افسانوی مکالمہ	خواجہ احمد عباس	۲
پچھلا ہفتہ:-		
ہند اور بیرون ہند میں	ع، ح - ع، ل	۳
بزم بے تکلف	... ...	[illegible]
غزل	نواب جعفر علی خاں اثر	[illegible]
غزل	آفتاب عالم	[illegible]
آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)	ڈاکٹر سید عابد حسین	[illegible]
تبصرہ	... ...	[illegible]
کامن ویلتھ کے ایشیائی ملک	گن ڈولن - ایم کارٹر	[illegible]
جامعہ کے نئے منصوبے نئے ارادے		

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی

ایک افسانوی مکالمہ

"کچّی! کچّی!!"

خواجہ احمد عبّاس

"کچّی - کچّی - کیا کر رہی ہو؟ چائے نہیں بنائی؟"

....

"سنو، ایک بات کہنی ہے"

....

"کیوں موڈ خراب کر رکھا ہے کیا؟"

"بھئی مجھے مت چھیڑو۔"

"تو پھر کسے چھیڑیں گے۔ اگر اپنی بیوی کو نہیں تو کیا کسی راہ چلتی عورت کو چھیڑیں؟"

"مجھے کیا پتہ؟ راستہ چلنے والوں کو بھی چھیڑتے ہوں گے۔ جبھی تو عادت بگڑی ہوئی ہے۔"

"اچھا جی - اب ہمیں آوارہ بدمعاشی کا خطاب مل گیا؟"

....

"پہلے آوارگی کا طعنہ دیا اور پھر الٹی خود ہی چپ ہو گئیں۔ جلدی بولو نہیں تو گدگدی.........."

"میں ابھی چلاتی ہوں۔ اماں سنیں گی تو کیا سوچیں گی؟"

"یہی سوچیں گی کہ تمھیں پھر ہسٹیریا کا دورہ پڑ رہا ہے۔"

"اچھا میں تو ہسٹیریا کی بیمار پگلی سڑن ہوں۔ اور کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ایک بار شادی کر کے کون سا سکھ پایا ہے، جو غلطی دوبارہ کروں؟"

"چلو اچھا ہوا۔ آج تم نے صاف صاف ہی کہہ دیا۔"

"کیا کہہ دیا؟"

"یہی کہ مجھ جنم جلی سے بیاہ کر کے تم نے دکھ ہی دکھ اٹھایا ہے۔"

"تم سے تو کوئی مذاق کرنا بھی پاپ ہے۔"

"اب بات کو ٹالو مت، جو کہنا تھا وہ تو کہہ گئے"

"اچھا کہہ گئے۔ کر لو کیا کر سکتی ہو؟"

"میں بے چاری کر ہی کیا سکتی ہوں۔ ماں باپ آج زندہ ہوتے تو ان کے پاس ہی چلی جاتی، پر بھائی تو کبھی بھولے سے یہ نہیں پوچھتا کہ بہن زندہ ہے یا مر گئی۔ کروں گی کیا۔ کسی کنوئیں یا کھائی میں ایک دن کود کر مر جاؤں گی۔"

"غیرت دار کے لئے تو چلو بھر پانی ہی کافی ہے۔ کنوئیں کھائی کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہاں ہاں تم بھی یہی کہو۔ دن بھر تمھاری ماں کچوکے دیتی رہتی ہے۔ شام کو تم گالیاں سناؤ۔"

"آخر ہوا کیا، معلوم تو ہو؟"

"نہیں کیا۔ گھر سے تمھیں کوئی دلچسپی ہو تو معلوم ہو۔ بس سویرے اٹھے اور دفتر چلے گئے۔ شام ہوئی آ گئے۔ کھانا کھایا اور پڑ کر سو گئے.........."

"تو کیا ہوا۔ سونا بھی تو تمھارے.........."

"بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ رات کو کوٹھوں پر تو جھکتا نہیں پھرتا، ریس کورس نہیں جاتا، شراب نہیں پیتا۔ جوا نہیں کھیلتا.........."

"اور یہ ہر مہینے جو دس دس روپے کراس ورڈ پر لگاتے ہو یہ جوا نہیں تو کیا ہے؟"

"اب تم جاہل کیا جانو کہ یہ تو دماغی ورزش ہے۔"

"اچھا میں تو بالکل گنوار ہوں۔ اب کے کوئی پہلا انعام لے کر آنا۔ جو ناک چنے نہ چبوا دے۔ جب کوئی دوسری سوا سو روپے میں گھر چلا کر دکھا دے گی، تب جانوں گی۔"

"دنیا میں لاکھوں ایسے بھی ہیں جنھیں سوا سو روپے ماہوار بھی نہیں ملتا۔"

"ہاں ہوں گے۔ مگر وہ دن میں دو دو تین تین بار چائے نہیں پیتے۔ نہ ہر تیسرے دن سینما دیکھتے ہیں۔"

"تیسرے دن؟ جھوٹ بولو تو ایسا تو نہیں کہ آسمان پھٹ پڑے۔ مشکل سے مہینے میں ایک بار تو جاتا ہوں۔"

"کیوں پچھلے ہفتے ہی دو بار نہیں گئے تھے؟"

"مگر دوسری بار تو مفت گیا تھا، فری پاس سے۔"

"اور تانگے کا کرایہ؟ چائے، پان، سگرٹ؟ وہ سب بھی مفت ملا تھا؟"

"اب تم یہ چاہتی ہو کہ دن بھر دفتر میں مغز زنی کر کے سپرنٹنڈنٹ کی گالیاں اور صاحب کی جھڑکیاں سننے کے بعد آدمی کبھی گھڑی بھر تفریح بھی نہ کرے۔"

"کرو، شوق سے کرو۔ مگر اس سے پہلے مجھے اور دونوں بچوں کو زہر دے دو۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ بچوں بے چاروں کو کیوں دھر گھسیٹا؟"

"اس لئے کہ ننھے کا نام اسکول سے کٹ گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہم فیس نہیں دیتے؟"

"فیس نہیں دی ہے تبھی تو کٹا ہے۔"

"اوہ ــــ میں تو اس مہینے بھول ہی گیا تھا ــ

[illegible]

"بھئی کیوں نہیں لے گئے فیس، ہر بار بے چارے کراس ورڈ کے پیچھے ہی گھس گئے۔"

"مگر اس بار پچاس ہزار کا انعام تھا۔ یہ موقع کیسے چھوڑ دیتا؟"

"تو کون سا پچاس ہزار کا انعام تمھیں مل گیا۔ تین برس تو ہو گئے اسی کوشش میں۔ کبھی ایک دھیلا نہیں ملا۔ مجھے تو یہ سراسر دھوکے کا دھندا لگتا ہے۔"

"کیوں پارسال چار غلطیوں پر وہ چاندی کی پنسل نہیں ملی تھی؟"

"چاندی کی تھی وہ؟"

"چلو اصلی چاندی کی نہ سہی، چاندی کی طرح چمکتی تو تھی؟"

"جی، اور سترہ ہی دن میں ساری چمک اتر کے اندر سے پیتل نکل آیا تھا۔"

"جب تمھیں اچھی چیزوں کا استعمال ہی نہیں آتا تو اور کیا ہوگا۔ منی اس سے میز پہ ڈھول بجاتی تھی اور ننھا دیواروں پر تصویریں بناتا تھا۔ اور تم خود اس سے ازار بند ڈالنے کا کام لیتی تھیں۔"

"ہاں۔ جب تم ہزار بار کہنے پر بھی ازار بند ڈالنے کی لکڑی نہیں لا کر دیتے تو اور کس سے ڈالوں۔ اپنے سر سے؟"

"اچھا بھئی۔ اچھا۔ کل دو پیسے کی ازار بند ڈالنے کی لکڑی لا دیں گے۔ اگر یاد رہا۔"

"ابھی تمھیں میری کہی ہوئی بات کیوں یاد رہنے لگی۔"

"کیوں، اور کوئی بات کبھی بھولا ہوں، پرسوں ہی چائے کا ڈبہ لا کر نہیں دیا تھا۔"

"میں کون سی چائے کی شوقین ہوں۔ لائے ہوں گے تو اپنے شوق کے لئے۔"

"اچھا اسی بات پر چائے پلاؤ۔"

"پلاؤں کیا خاک؟ گھر میں شکر ہی نہیں ہے۔"

"شکر نہیں ہے؟"

"ہاں - ہاں بہرے ہو گیا۔ کہہ دیا ایک بار شکر نہیں ہے۔"

"جمعہ تھا دن ہے تو راشن آیا تھا۔"

"مگر کتنا؟ یہ بھی سوچا ہے۔ چار کارڈوں پہ آٹھ چھٹانک۔ ہفتے بھر کے لئے۔"

"میں تو دو چمچے ہی ڈالتا ہوں۔"

"مگر تمھارے سارے دوست تو چار چار چمچے ڈالتے ہیں۔ جو روز سویرے یہاں دھرنے دیتے ہیں۔"

"تو کیا میں ان کے یہاں چائے نہیں پیتا؟"

"بس تو آج بھی وہیں جا کر پی آؤ۔"

"اچھا خفا مت ہو، ہم گڑ ہی کی پی لیں گے۔"

"اور دودھ کی جگہ کیا ڈالو گے؟"

"کیوں دودھ بالکل نہیں بچا؟"

"ایسا کون دو تین سیر دودھ منگاتے ہو۔.......... تین پاؤ میں بھی بچوں کو صرف ایک وقت پاؤ پاؤ بھر

(بقیہ صفحہ ... پر)

نئی روشنی

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرونِ ہند میں

پنڈت نہرو انڈونیشیا میں

وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انڈونیشیا کی آزادی میں جو اہم حصہ لیا ہے ساری دنیا جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا کے عوام کو ان سے اس قدر گہری محبت اور عقیدت ہے کہ شاید کسی ملک کے لوگوں کو کسی غیر ملکی لیڈر سے نہ ہوگی۔ پنڈت جی کو انڈونیشیا کے جشنِ آزادی کے موقع پر بڑے اصرار سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ خود نہیں جا سکے تھے بلکہ راج کماری امرت کور اس مبارک تقریب میں حکومت ہند کی طرف سے شریک ہوئی تھیں۔ اس وقت پنڈت جی نے معذرت کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی انھیں موقع ملے گا وہ ہند اور انڈونیشیا کے رشتۂ محبت کو استوار کرنے کے لئے خود وہاں جائیں گے۔ اس کے بعد جب پریسیڈنٹ سوکارنو نے ہند کے جشنِ جمہوریت میں بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی تو پنڈت جی کے لئے اور بھی ضروری ہوگیا کہ جلد سے جلد اپنا وعدہ پورا کریں۔ چنانچہ وہ ۲ر جون کو ہندوستانی بحری فوج کے جہاز دہلی میں روانہ ہوئے ہر جون کو انڈونیشیا پہنچے اور آج کل وہاں دورے میں مصروف ہیں۔

یوں تو پنڈت جی کا استقبال امریکہ میں بھی بڑے زور شور سے ہوا تھا لیکن انڈونیشیا میں ان کے خیر مقدم کی شان ہی نرالی تھی۔ امریکہ نے تو انھیں معزز مہمان کی حیثیت سے سر آنکھوں پر بٹھایا لیکن انڈونیشیا نے اپنا سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا۔ اخباروں کے نمائندوں نے جو رپورٹیں بھیجی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ دارالسلطنت جاکرتا اور مغربی جاوا کے صدر مقام باندونگ میں پنڈت نہرو، ڈاکٹر سوکارنو کے ساتھ جدھر نکل جاتے ہزارہا ہزار آدمی جوش و مسرت سے ٹوپیاں اچھالتے اور بنگ نہرو (بھائی نہرو) اور بنگ سوکارنو (بھائی سوکارنو کے نعرے لگا کر یہ ظاہر کرتے کہ انھیں اپنے ہندوستانی دوست سے ویسی ہی برادرانہ محبت ہے جیسی اپنے پیارے پریسیڈنٹ سے ہے۔

ہند اور انڈونیشیا کا اتحاد جس کی بنا اب سے چار برس پہلے نئی دہلی کی ایشیائی کانفرنس کے وقت پڑی تھی اور اس کے بعد برابر مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے۔ نہ صرف ان دونوں ملکوں کے لئے بلکہ سارے ایشیا کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ ایشیا کے ملکوں میں چین اور ہندوستان کے بعد انڈونیشیا نہ صرف اپنے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بلکہ اپنے مادی وسائل کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا ملک ہے اس لئے اگر ایشیا کو ایک متحدہ محاذ بنا کر پرانی اور نئی سامراجی قوتوں کے مقابلے میں اپنی سیاسی اور معاشی آزادی کی حفاظت کرنی ہے تو ہند، چین اور انڈونیشیا میں باہمی خلوص اور اعتماد کا ہونا لازمی ہے۔ پنڈت نہرو نے اس حقیقت کو سب سے پہلے سمجھا، اور اپنی خارجی پالیسی کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔ انڈونیشیا کا ساتھ انھوں نے ایسے وقت میں جب ولندیزی سامراج اپنی پوری طاقت سے اس کی تحریکِ آزادی کو کچلنے پر تلا ہوا تھا۔ زیادہ تر انھی کی کوشش سے انڈونیشیا کا مسئلہ دنیا کی رائے عامہ کا مرکزِ توجہ بن گیا اور ہالینڈ کو مجبور ہو کر انڈونیشیا کو آزاد کرنا پڑا۔ اسی طرح چین کی نئی حکومت کو حکومتِ ہند نے پنڈت جی کی تحریک سے اس وقت تسلیم کیا جب امریکہ کے ڈر سے کسی غیر کمیونسٹ ریاست کو یہ قدم اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ امید ہے کہ انڈونیشیا اور چین دونوں پنڈت نہرو کے اس حسنِ سلوک کو کبھی نہیں بھولیں گے اور ان کے تجربے سے ہندوستان کے اور امید ہے کہ ایک دوسرے کے سچے دوست بن کر جنوبی ایشیا کا ایک مرکزی حلقہ بنائیں گے جس میں آگے چل کر دوسری ریاستیں بھی شریک ہوتی جائیں گی۔ شاید چین کے لئے اندرونی اور بیرونی حالات کی وجہ سے ایک عرصہ تک ایشیا کے متحدہ محاذ میں شریک ہونا مشکل ہو لیکن انڈونیشیا کے لئے جس نے اپنے آپ کو ابھی تک مغربی طاقتوں کے دونوں جتھوں سے الگ رکھا ہے بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔

کانگریس کی مخالف پارٹیاں

جمہوری سیاسی نظام کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ جو لوگ سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں ہم خیال ہوں وہ مل کر ایک پارٹی بنا لیں اور ملک کے عام رائے دہندوں میں اپنے خیالات کی اشاعت کر کے انتخابات میں زیادہ سے زیادہ ووٹ لینے اور اپنی پارٹی کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ۳۰ برس سے انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے منظم پارٹی ہے اور اسی کی کوشش سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی ہے۔ ۴۶ء میں جب معلوم ہوا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد کرنے پر تیار ہے۔ کانگریس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی بلندی کے انتہائی نقطے پر پہنچ گئی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند اور اس کے افسوسناک نتائج، فرقہ وارانہ فسادات اور معاشی مشکلات کی بدولت بہت سے خوش فہم لوگوں کو جنھوں نے کانگریسی حکومت سے حد سے زیادہ توقعات قائم کر رکھی تھیں اس کی طرف سے سخت مایوسی ہوئی۔ اُدھر حکومت ہاتھ میں آتے ہی دنیا کے دستور کے مطابق کانگریس پارٹی کے اندر باہمی رقابتیں اور جھگڑے شروع ہو گئے اور اس کے بعض ارکان کو اس نازک وقت میں ملک کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی پچھلی اصلی اور فرضی خدمات کا صلہ وصول کرنے کی فکر پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے پارٹی کی ساکھ عوام میں بھی کم ہونے لگی۔ کانگریس کے مخالف عناصر نے جن میں رجعت پسند اور ترقی پسند دونوں شامل تھے یہ سوچا کہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر کانگریسی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ چنانچہ ایک طرف ہندو مہاسبھا اور آر، ایس، ایس اور دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی نے اپنے اپنے حربوں سے کام لے کر فوری انقلاب کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ تین سال کے تجربے سے ان لوگوں کو یہ محسوس ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں تشدد کے ذریعے سے انقلاب کا کوئی امکان نہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ سوشلسٹ جماعت جسے ایک جداگانہ پولیٹیکل پارٹی کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ابھی دو ہی سال ہوئے ہیں آئینی طریقے پر عمل کر کے خصوصاً مزدوروں کے حلقے میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کر رہی ہے اور اگر وہ اسی رفتار سے ترقی کرتی رہی تو کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ انتخابات میں سب سے طاقتور مخالف پارٹی بن جائے۔ چنانچہ اب ہندو مہاسبھا نے تو قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ آئینی طریقے سے اگلے انتخاب میں کانگریس کا مقابلہ کرے۔ اور دوسری پارٹیاں بھی اس پر غور کر رہی ہیں۔ آر، ایس، ایس کا ابھی تک یہ دعویٰ ہے کہ وہ فی الحال سیاست سے الگ رہ کر اور صرف تہذیبی میدان میں کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ غالباً وہ اپنی منظم طاقت سے آئندہ انتخابات میں کچھ نہ کچھ کام لے گا اور موقع دیکھ کر یا تو ہندو مہاسبھا کا ساتھ دے گا یا اپنی الگ پارٹی کھڑی کرے گا۔ سیٹھ ڈالمیا اور بعض اور سرمایہ دار بھی سیاسی اکھاڑے میں اترنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ان کی انانیت دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں حائل نہ ہوئی اور انھوں نے ہندو مہاسبھا یا آر، ایس، ایس کے ساتھ باضابطہ تعاون کیا تو شاید داہنے بازو کی ایک مضبوط پارٹی کانگریس کے مقابلے میں آ سکے۔ اب رہے کمیونسٹ تو انھوں نے ابھی تک آئینی طریقے اختیار کرنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن غیر آئینی جد و جہد سے چارو ناچار پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ یہ رجحان اگر جاری رہا تو قدرتی طور پر کمیونسٹ پارٹی کو بھی دوسری پارٹیوں کی طرح پارلیمنٹری سیاست کی راہ پر چلنا پڑے گا۔

مخالف پارٹیوں کی روش میں جس صحت مندانہ تبدیلی کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ آل انڈیا ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی (کسان مزدور پارٹی) نے جو اب تک کمیونسٹوں کی طرح اندر ان کے ساتھ ساتھ غیر آئینی جد و جہد کر رہی تھی یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بائیں بازو کی دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر آئندہ انتخابات میں کانگریس کا مقابلہ کرے گی۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری

شری ایس ایس مور نے یہ بھی کہا کہ اُن کی پارٹی ہمیشہ سے مارکسی خیالات کی طرف مائل تھی مگر اب اُس نے واضح اور قطعی طور پر مارکسی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے لیکن وہ کومن فارم کے تابع رہنا نہیں چاہتی بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات کو مد نظر رکھ کر اپنے طور پر اشتراکی انقلاب پیدا کرنے کے لئے مناسب پروگرام اختیار کرے گی۔ اس طرح یہ پارٹی سوشلسٹ پارٹی کے بہت قریب آ گئی ہے اور جیسا کہ ان نے حال میں بائیں بازو کی پارٹیوں کا ایک متحدہ محاذ بنانے کا جو اعلان کیا ہے کوئی تعجب نہیں کہ وہ زیادہ تر اسی پارٹی کو ساتھ لینے کے لئے ہو۔

بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ کانگریس کے مخالف اب شورش انگیزی کو چھوڑ کر آئینی سیاسی جدوجہد کی راہ پر چل رہے ہیں یا چلنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اس شورش انگیزی سے جس سے وہ اب تک کام لیتے رہے کانگریس پارٹی کو کسی طرح زک نہیں پہنچی مگر ملک کا کافی نقصان ہوا۔ کانگریس کو اپنی اصلاح کرنے یا پھر میدان چھوڑ کر ہٹ جانے پر مجبور کرنے کی یہی صورت ہے کہ اس کے مقابلے میں باضابطہ مخالف پارٹیاں قائم ہوں اور وہ ذمہ داری کے ساتھ اس پر تنقید کریں۔

ہندوستان کی معاشی حالت ابتر ہو رہی یا بہتر؟

حال میں لندن کے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن میں مسٹر جی ڈبلیو ٹائی سن نے ہند برطانوی تجارت پر ایک تقریر کی اس پر بحث کے سلسلے میں ہندوستان کی معاشی حالت کے بارے میں دو مختلف نقطۂ نظر سامنے آئے۔ بمبئی کے پریم چند رائے چند اینڈ سنز کے نمائندے مسٹر ہیرا نند الی نے تو یہ رائے ظاہر کی کہ جب سے ہندوستان قرض دار ملک کے بجائے قرض خواہ ملک بن گیا ہے۔ اس کی معاشی حالت سدھرنے کی جگہ الٹی بگڑ گئی ہے۔ ہمارا بقایا اسٹرلنگ انگلستان کے ذمے ہے۔ اسی کی وجہ ہندوستان میں کثرت زر اور گرانی کی مصیبت آئی جس نے متوسط طبقے کی کمر توڑ دی جنگ سے پہلے جو روپیہ صنعت اور کاروبار میں لگایا جاتا تھا اس کا ۵۰ فی صدی متوسط طبقے کی جیب سے آتا تھا۔ اب یہ راہ بالکل بند ہو گئی اور اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ صنعتی ترقی رک کر رہ گئی ہے۔

برخلاف اس کے سر فریڈرک جیمس نے جو انگلستان میں ٹاٹا کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں، ان لال بجھکڑوں کی اچھی طرح خبر لی جو ہندوستان کی معاشی مشکلات کی وجہ اسٹرلنگ قرضہ کو قرار دیتے ہیں اور اس کے مستقبل سے مایوسی ظاہر کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی کثرت زر کی اصل وجہ اسٹرلنگ قرضہ نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے عالمگیر کثرت زر کا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان بھی معاشی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لیکن پچھلے ڈھائی سال میں دنیا کی جو حالت رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس نے صنعت و تجارت دونوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ آج کل سرمائے کے فراہم کرنے میں جو دقت ہے وہ عارضی ہے اور رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بہتری کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ آخر میں سر جیمس نے برطانیہ کے ارباب صنعت و تجارت کو تنبیہ کیا کہ اگر انھوں نے ہندوستان کی حالت کو ناقابل اطمینان سمجھ کر اس کے لئے مشینیں اور صنعتی مشورہ فراہم کرنے سے پہلو تہی کی تو ہندوستان یہ چیزیں جرمنی سے حاصل کرنے لگے گا اور برطانیہ کے ہاتھ سے اتنا بڑا بازار نکل جائے گا۔

یہ بات دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی کہ ایک غیر ملکی ماہر فن کو ہندوستان کی معاشی حالت کے بارے میں یہ حسن ظن ہے۔ اور ایک ہندوستانی سرمایہ دار کو یہ سوئے ظن۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستانی کارخانوں کے مالکوں اور تاجروں کو جنگ کے زمانے میں دونوں ہاتھوں سے نفع بٹورنے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ صنعت و تجارت میں منافع کی شرح کا گھٹ جانا ان کے نزدیک ایک ایسی مصیبت ہے جو تاریخ میں پہلی مرتبہ ان ہی پر پڑی ہے اور جس میں ساری دنیا کو اور خاص کر ہندوستان کی حکومت کو ان سے ہمدردی اور اُن کی دست گیری کرنی چاہئے۔

ع، ح

جنوبی افریقہ کی ہٹ دھرمی

ہندوستان نے جنوبی افریقہ کی مجوزہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی حکومت ایک ایسا قانون بنا رہی ہے جس کی رو سے یورپی مقامی اور کالے لوگوں کے لئے الگ الگ علاقے ہوں گے اور تجارت کرنے کے لئے صرف ایسے لوگوں کو لائسنس دئے جائیں گے جو اپنے متعینہ علاقوں میں رہتے ہوں اور قوانین کی پوری پوری پابندیاں کرتے ہوں۔ ظاہر ہے اس قانون کے بعد ہندوستانیوں کے لئے وہاں کاروبار کرنا اور باعزت زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ گول میز کانفرنس کا اصلی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اس لئے ہندوستان اور پاکستان نے جنوبی افریقہ کی حکومت سے درخواست کی تھی کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک کے لئے یہ قانون ملتوی کر دیا جائے لیکن ملان حکومت کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت سے ایشیائی قوموں کو وہاں سے نکالنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے اس درخواست کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ "یہ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے جس میں کسی دوسرے ملک کو مداخلت کرنے کا حق نہیں۔ دو جنوری اور فروری میں ہندوستان، پاکستان اور جنوبی افریقہ کے نمائندوں کے درمیان گول میز کانفرنس کے امکانات پر غور کرنے کے لئے جو ابتدائی بات چیت ہوئی تھی اس میں اس قانون کی بابت بتایا جا چکا تھا۔ اس لئے اس پر اعتراض کرنا اور اس کے ملتوی کرنے پر اصرار کرنا تعجب خیز اور ناقابل فہم ہے"۔ بظاہر جنوبی افریقہ کے یہ دونوں جوابات صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ پہلا جواب کوئی نیا نہیں ہے۔ یو۔ این۔ او کے جلسوں میں بارہا اس پر زور دیا گیا ہے۔ مگر یو۔ این۔ او نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ایک ایسا مسئلہ جس میں ایک قوم کے لاکھوں اشخاص کی زندگی اور ان کے ابتدائی اور بنیادی حقوق کا سوال ہو، اسے خانگی مسئلہ کہہ کر کیوں کر ٹالا جا سکتا ہے۔ دوسرے جواب کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ایک غیر رسمی گفتگو کے موقع پر ہندوستانی نمائندوں کو بتلا یا گیا تھا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت ایک ایسا قانون بنانے والی ہے جس سے نسلی امتیازات ختم ہو جائیں گے۔

ایسی صورت میں جبکہ جنوبی افریقہ کی حکومت یہ قانون ملتوی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندوستان کے لئے گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ پاکستان نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن امید ہے کہ وہ بھی ہندوستان کا ساتھ دے گا۔

امریکہ کا فوجی بجٹ

امریکہ کے نئے سال کے بجٹ پر جو یکم جولائی سے شروع ہوگا آج کل کانگریس کی ایک نامزد کمیٹی غور کر رہی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بجٹ بغیر کسی اہم ترمیم و تنسیخ کے منظور ہو جائے گا۔ مجوزہ بجٹ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ اس وقت سب سے زیادہ توجہ تیسری لڑائی پر دے رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے جہاں ساری دنیا متاثر ہوئی وہاں امریکہ بھی باوجود اپنی تمام دولت و ثروت کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں کی زندگی کا معیار کافی گر گیا ہے۔ بے روزگاری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ مکانوں کی قلت بدستور باقی ہے۔ طبی انتظام انتہائی غیر تسلی بخش ہو گیا ہے۔ لاکھوں بچوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے۔ تربیت یافتہ استادوں کی سخت کمی ہے۔ مگر ان تمام باتوں کو یا وجہ دان امور کا مجوزہ بجٹ میں بہت کم خیال کیا گیا ہے۔ تعلیم اور صحت عامہ پر ۲ فی صدی اور دوسری سماجی ضروریات کے لئے ۵ ۱ فی صدی رقم رکھی گئی ہے اور فوجی اخراجات کے لئے ۷۰ فی صدی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی طرح دوسرے بڑے بڑے ممالک بھی جن میں روس بھی شامل ہے لڑائی کی تیاری میں مشغول نظر آئیں گے۔ ویسے ہر ملک کہتا یہی ہے کہ وہ مدافعت کے لئے تیاری کر رہا ہے جارحانہ حملے کے لئے نہیں۔ چنانچہ امریکہ نے بھی اس بجٹ میں یہی دکھلایا ہے کہ یہ رقمیں ملک کی مدافعت میں صرف کی جائیں گی۔

خیر سگالی وفد کا شاندار خیر مقدم

لالہ بھیم سین سچر کی قیادت میں ہندوستان کا جو خیر سگالی وفد آج کل مغربی پاکستان کا دورہ کر رہا ہے اس کا ہر جگہ نہایت شاندار خیر مقدم کیا گیا اور سچر صاحب کی تقریروں کا پاکستان کے عوام پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر پڑا ہے۔

ع۔ ل

بزمِ بے تکلّف

"تم سے ہزار بار کہہ دیا کہ صبح صبح ہمیں نہ ستایا کرو ورنہ یاد رکھو کسی دن —"

"توبہ کیجئے میر صاحب۔ میں اور آپ کو ستاؤں۔ بھلا یہ بات عقل میں آتی ہے؟"

"عقل میں آئے یا نہ آئے عمل میں تو آتی ہی رہتی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ جدید فلسفہ کہتا ہے کہ عادت کبھی عقل کے خلاف نہیں ہو سکتی"

"جدید فلسفہ جھک مارتا ہے۔ تمہاری جتنی عادتیں ہیں سب عقل کے خلاف ہیں"

"اچھا آپ تو یہ بتائیے کہ صبح کے وقت ستایا جانا آپ کو کیوں برا لگتا ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمیں قبض کا مرض ہے، اور ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ صبح کو جی خوش ہو تو کاروائی آسانی سے ہو جاتی ہے اور جو طبیعت میں انقباض پیدا ہو گیا تو معاملہ اٹک اٹک کر رہ جاتا ہے۔"

"تو یہ کہیے کہ صبح کو بدہضمی کے وقت لڑکا نہیں چاہیے ورنہ اسیٹھ ہو جاتی ہے۔ مگر میر صاحب آپ کو برسوں سے یہ نامراد مرض ہے اور آپ نے کوئی علاج نہیں کیا؟"

"سچ کہتا ہوں بس یہ جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ غضب خدا کا یہاں ساری عمر حکیموں، ڈاکٹروں کے پھیر میں گذری۔ دواؤں کے مارے پیٹ عطار کی دکان بن کر رہ گیا۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ کوئی علاج نہیں کیا۔"

"معاف کیجئے قصور ہوا۔ واقعی غور سے دیکھا جائے تو آپ کے شکم مبارک پر طبلۂ عطار کا دھوکا ہوتا ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ تمہارے بے تکے پن سے ناک میں دم آگیا۔ کہاں روغن گل والا عطار کہاں روح گلاب والا، کہاں طبلچی کا طبلہ اور کہاں عطار کا طبلہ۔"

"چلیے استاد خالی است میر صاحب۔ بھلا آپ کی عربی دانی کا میری ہیچ مدانی کیا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

خیر بھئی اس دانی مدانی کو چھوڑو۔ آدمی سے چوک ہو ہی جاتی ہے۔ ذکر اس کا تھا کہ اس قبض سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ کون سی تدبیر تھی جو ہم نے نہ کی ہو اس کوشش میں ہمیں بے شرمی کی جن منزلوں سے گذرنا پڑا اس کی داستان بڑی عبرتناک ہے۔ پہلے دور میں جب تک ہم نے اس آبرو باختہ مرض کی ذات نہیں پہچانی تھی۔ شریف دواؤں کا استعمال کرتے رہے۔ جیسے گل قند، شربت ارزانی، شربت انجیر، پیٹرولاگر، ملک آف میگنیشیا۔ مگر توبہ، بھلا ہماری آنتیں اس شرافت کے برتاؤ سے ماننے والی تھیں۔ مجبوراً ہم نے کیسٹر آئل اور معجون کمونی جیسی کمینی چیزوں سے کام لینا شروع کیا۔ چند روز تک کچھ تھوڑا بہت نتیجہ نکلتا رہا مگر پھر کمبخت اوجھڑی اس طرح اینٹھ کر رہ گئی کہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آخر ہم بالکل سفلی علاج یعنی شلنے، عمل اینیما پر اتر آئے۔ مگر اس میں بھی وہی قصہ ہوا کہ پہلے کچھ دن کرم دھرم اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب ذلت و رسوائی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔ مگر ہم بڑے دھوکے میں تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ایک بزرگوار ملے جو قدرتی علاج کے ماہر کہلاتے ہیں۔ ان کو ہماری صورت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو گئی کہ یہ قبض محض ہمارے نکمے پن کی وجہ سے ہے۔ گویا ہم خاص کر کے گوٹ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہمارے لئے پیٹ کی مالش کی نامعقول سزا تجویز کی ہے۔ دیکھیے ابھی قسمت اور کیا کیا دکھاتی ہے۔"

"میر صاحب آپ گھبرائیے نہیں، آپ کی مشکل حل ہو جائے گی۔ آپ کے سب احباب خواہ دل کر دل سے دعا کریں گے کہ خدا آپ کی آنتوں کو کشائش بخشے۔"

غزل

نواب جعفر علی خاں اثرؔ (لکھنوی)

رخنتِ ہستی ہے سراپا ننگ عریانی مجھے
اب ہوا معلوم انجام تن آسانی مجھے

یا لُبھاتا تھا خیالِ عشرتِ فانی مجھے
یا طرب انگیز ہے غم کی فراوانی مجھے

اِس چمن میں ہر طرف شعلے اُگیں گے جائے گل
دعوتِ نالہ نہ دے اے مرغِ بُستانی مجھے

آفتوں میں گھر کے بھی اب دل کو ہوتی ہی خوشی
یا تصورِ غم کا تھا وجہ پریشانی مجھے

میں سجودِ غیر کی زینت دوبالا کیوں کروں
تیرا در تجھکو مبارک، میری پیشانی مجھے

جب تری تصویر بن جاتا تھا میرا ہر خیال
یاد آتی ہے بہت اب وہ غزل خوانی مجھے

شرم عصیاں سے بدل ٹھہرا جو سجدے کا اثر
غیرتِ یوسف ہے وہ اشکِ پشیمانی مجھے

غزل

آفتاب عالم

ہجومِ یاس میں اب زندگی گذارے کیا!
نگاہِ عزم میں طوفان کیا کنارے کیا!

وفورِ غم سے کبھی اشک بے کسی بن کر
کسی مژہ پہ نہ چمکیں تو وہ ستارے کیا!

تمھاری زلفِ پریشاں سے جس کو نفرت ہو
وہ اپنے گیسوئے تقدیر کو سنوارے کیا!

جلا جلا کے بجھتے رہے وفا کے چراغ
تری نگاہِ کرم کے حسیں سہارے کیا!

بجھا بجھا کے جلایا ہے خرمنِ ہستی
سکوں نوازِ تبسم کے برق پارے کیا!

حیاتِ نو کی بہاروں کا اعتبار نہیں
خزاں رسیدہ غمِ زندگی کے مارے کیا!

آزادی کی زنجیریں

ظفر ہریانہ [illegible] ایک بڑے زمیندار [illegible] خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد [illegible] لے کر وطن میں رہتے تھے۔ ظفر [illegible] الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ [illegible] یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن، ذہانت [illegible] پر فریفتہ ہو گیا۔ [illegible] ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی کا خیال ہے کہ اگر لطیف اعلیٰ نمبروں سے پاس [illegible] تو وہ حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں یہ رقابت کی خلش پیدا ہو گئی اور اس نے پڑھنے میں جان لڑا دی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہو گیا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق ضرور ہے مگر یہ کانٹا برابر کھٹکتا رہا کہ لطیف صفدر علی صاحب کی توقعات کو پورا کر کے ان کے نزدیک حسینہ سے شادی کرنے کا مستحق نہ بن جائے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس خلش کو شوق اور امید کے ساتھ دل میں لئے ہوئے کالج کھلنے [illegible] الہ آباد پہنچ گیا۔

(قسط ۲۳)

کالج کھلنے سے تیسرے دن اتوار تھا۔ ظفر کی آنکھ پہلے سے کھل گئی اور وہ بے چینی سے دن نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ صبح تڑکے سے صفدر علی صاحب کے یہاں پہنچ جائے مگر اس نے اپنے دل پر جبر کر کے مناسب وقت کا انتظار کیا اور ذرا سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے روانہ ہو گیا وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ناشتہ ہو رہا ہے۔ ظفر چاہتا تھا کہ ناشتہ ختم ہونے تک انتظار کرے مگر نوکر نے جا کر اطلاع کر دی اور اسے کھانے کے کمرے میں بلا لیا گیا۔ میز کے صدر میں عقیلہ بیگم تھیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف صفدر علی صاحب اور بائیں ہاتھ کی طرف حسینہ۔ ظفر نے سب کو سلام کر کے چاہا کہ صفدر علی صاحب کے پاس جا کر بیٹھے۔ مگر جب وہ اس شش و پنج میں ہوئے تو اپنے آپ کو حسینہ کے برابر بیٹھے ہوئے پایا۔ عقیلہ بیگم نے خانساماں کو اور توس لانے کا حکم دے کر چائے کی پیالی ظفر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کہو میاں سب خیریت ہے، بھائی صاحب تو اچھے ہیں؟"

ظفر۔ پھپھی توس نہ منگائیے، میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ ابا جان اچھے ہیں۔ آپ سب کو دعا کہی ہے۔

عقیلہ بیگم۔ تم نے لکھا تھا کہ حج اور زیارت کو جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ مگر تمہاری وجہ سے ہچکچاتے ہیں۔ پھر کیا فیصلہ ہوا۔

ظفر۔ جی یہ بات طے ہو گئی کہ دسمبر میں چھ مہینے کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ نور محمد کو آپ جانتی ہیں وہ ساتھ جائے گا۔

عقیلہ بیگم۔ اے ہے ایک اچھا موقع تھا میں بھی ہو آتی مگر ان کی حسینہ کو اور ان کے باپ کو کس پہ چھوڑ دوں۔

حسینہ۔ امی جان آپ شوق سے جائیے۔ میں اور ابا جان ایک دوسرے کی اور گھر کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔

عقیلہ بیگم۔ کیا کہنا ہے۔ دونوں ایک سے ایک بڑھ کر جوکس ہیں۔ بیٹی اسکول کی، باپ دفتر کے گھر کا اللہ مالک۔

صفدر علی۔ اب آپ کچھ دن بعد حسینہ کی شادی کر کے جائیے گا۔ میں بھی چلوں گا۔

عقیلہ بیگم۔ بس آپ جا چکے۔ آپ کا حج تو لندن میں ہوتا ہے۔ تو ظفر کیا بھائی صاحب یہاں نہ آئیں گے۔ بے ملے چلے جائیں گے؟

ظفر۔ ضرور آئیں گے۔ ان کا یہیں سے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

صفدر علی۔ بلکہ انہیں یہاں کچھ دن رہنا چاہئے تاکہ تمہاری پھپھی ان کے سفر کا سامان ٹھیک ٹھاک کر دیں۔

ظفر۔ جی بہت اچھا میں ان کو لکھوں گا۔ اگر پھپھی بھی لکھ دیں تو اچھا ہے

حسینہ۔ میں لکھوں گی۔ ماموں جان میری بات نہیں ٹالیں گے۔

اب ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ صفدر علی صاحب اٹھ کر اپنے دفتر کے کمرے میں ڈاک دیکھنے چلے گئے۔ باقی تینوں اندر کے برآمدے میں جا بیٹھے۔ عقیلہ بیگم نے خونسپان کھایا، ظفر کو بنا کر دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں "میں ابھی آتی ہوں۔ ذرا دیکھ آؤں کہ کھانے کا کیا ہو رہا ہے"۔ ظفر نے اب نظر بھر حسینہ کے چہرے کو دیکھا تو اس کو خوشی کے ساتھ ساتھ فکر کے آثار نظر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ شاید اسے لطیف کے معاملے کی کچھ سن گن ملی ہے۔ اس نے چاہا کہ اس ذکر کو چھیڑے مگر پھر ارادہ بدل دیا اور آہستہ سے کہا "حسینہ کیا بتاؤں کہ تم کتنی یاد آتی رہیں۔ تم نے کبھی کبھی پھپھی کے خط میں سلام تو لکھا، مگر سچ بتاؤ کبھی دل سے یاد بھی کیا۔"

حسینہ۔ جی نہیں یاد وہ کرتا ہے جو کبھی بھولتا بھی ہو۔

ظفر۔ کیا پیارا جواب ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔

حسینہ۔ تو آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔

ظفر۔ نہیں توبہ، جھوٹا کیا سمجھوں گا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید تم میرا دل رکھنے کو یہ بات کہہ رہی ہو۔

حسینہ۔ خیر آپ کا جی اس سے خوش ہوتا ہے تو یہی سمجھئے۔

ظفر۔ تم برا مان گئیں حسینہ۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ ورنہ میں تمہیں حسن کے ساتھ سچائی کا بھی مجسمہ سمجھتا ہوں۔

حسینہ۔ (شرما کر) انہیں کہتے ہیں دل رکھنے کی باتیں۔ خیر مجھے پڑھانا کب سے شروع کیجئے گا۔

ظفر۔ آج ہی سے بسم اللہ کر دو۔

حسینہ۔ اگلے اتوار سے۔ آج تو مجھے ریحانہ کے ہاں دعوت میں جانا ہے۔ ہاں یہ بتلائیے کہ آپ ریحانہ سے ملے، کچھ پسند آئی۔

ظفر۔ ہاں پرسوں رفیع صاحب نے ملوایا تھا بہت آزاد خیال اور بے باک معلوم ہوتی ہے۔

حسینہ۔ آزاد خیال تو سارا خاندان ہی ہے اور وہ ذرا مزاج کی تیز اور صاف گو ہے اس لئے لوگ بے باک سمجھتے ہیں۔ ویسے دل کی بڑی اچھی ہے۔

ظفر۔ تمہاری سہیلی ہے تو اچھی کیوں نہ ہو گی حسینہ تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، سچ سچ بتا دو گی۔

حسینہ۔ بتانے کی ہو گی تو سچ سچ بتاؤں گی۔ ورنہ چپ رہوں گی۔

ظفر۔ تم کچھ فکر مند معلوم ہوتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

حسینہ۔ وجہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، اور پھر مجھ سے پوچھتے ہیں۔

ظفر۔ پھپھی نے ہر دیال سے جو گفتگو کی تھی اس کے بعد کوئی نئی بات ہوئی۔

حسینہ۔ جی نہیں وہی پرانی بات۔ لطیف صاحب مقابلے کا امتحان دے چکے ہیں۔ نتیجہ نکل آیا ہو گا مگر اب تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔

ظفر۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو کیا پھر مجھے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے؟

حسینہ۔ نہیں مایوس تو کیا مگر ——— خیر آپ امی جان سے بات کیجئے گا۔

ظفر۔ اگر وہ مناسب سمجھیں گی تو خود ہی ذکر چھیڑیں گی۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ظفر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "حسینہ میں اپنے دل کا حال تمہیں کیسے بتاؤں۔ زبانی مجھ سے کہا نہیں جاتا۔ خط لکھ نہیں سکتا۔ کاش میں ———"

عقیلہ بیگم کے پیروں کی چاپ سن کر ظفر کو اپنا جملہ ناتمام چھوڑنا پڑا۔ مگر وہ اس کے چہرے پر بے ساختہ جوش اور اضطراب اور حسینہ کے چہرے پر ساختہ سکون و اطمینان کے آثار دیکھ کر سمجھ گئیں کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے حسینہ سے کہا "حسنو اب جا کر کپڑے بدل لو تم کو ریحانہ نے سویرے سے بلایا ہے۔ تم لوگ وقت کے وقت آؤ گی نہیں تو بیگم حمید گھنٹوں بک بک کر کے دماغ چاٹ جائیں گی۔" حسینہ اٹھ کر چلی گئی تو ظفر نے کہا "پھپھی کیا آپ بھی جا رہی ہیں۔ حسینہ نے تو صرف اپنی دعوت کا ذکر کیا تھا۔"

عقیلہ بیگم ۔ نہیں بھیا میری بھی کم بختی آئی ہے ۔ بیگم حمید کی محبت کی رگ پھڑکتی ہے تو انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ ادر لیوں بھی میں جہاں تک ہو سکتا ہے حسینہ کو کسی بے پردہ گھرانے میں اکیلا نہیں جانے دیتی ۔

ظفر ۔ آج حسینہ کا سبق تو ہوگا نہیں ۔ پھر مجھے اجازت دیجئے

عقیلہ بیگم ۔ اے تو کیا تم حسینہ کے ماسٹر بن کر آتے ہو ۔ سبق نہ ہوا تو چل دیئے ۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھ سے اور اپنے صاحب سے باتیں کرو ۔ پھر میں چلی جاؤں تو صاحب کے ساتھ کھانا کھا کر اپنے وقت پر جانا ۔ آخر تم ان سے الگ الگ کیوں رہتے ہو ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تمھارے کوئی ہیں ہی نہیں ۔ یہ بری بات ہے ۔

ظفر ۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود مجھ سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں ۔

عقیلہ بیگم ۔ نہیں وہ تو بڑے ملنسار آدمی ہیں ۔ تم ہی ہر ایک سے کچھ اس قدر چھپتے ہو کہ جو اچھی طرح نہ جانتا ہو وہ اکل کھرا سمجھتا ہے خود مجھ سے تم بہت دنوں تک اتنا تکلف کرتے رہے کہ میں لطیف والی بات تم سے منہ در منہ نہ کہہ سکی ۔ آخر ہر دیال سے کہلوانی پڑی ۔

ظفر ۔ پھوپھی کیا واقعی لطیف رڑکی کے مقابلے میں تسکین تو پھوپھا انھیں میرا حق دیدیں گے ۔

عقیلہ بیگم ۔ نہیں ۔ اللہ نہ کرے ۔ انھوں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے ۔ یوں ہی ایک خیال ہے آخر باپ ہیں بیٹی کی بھلائی کے لئے ہر طرح کی باتیں سوچتے ہیں ۔ تم اطمینان رکھو ۔ میں غافل نہیں ہوں ۔ اپنی سی تدبیر کر رہی ہوں ۔ مگر تمھیں بھی صاحب سے میل جول بڑھانا چاہئے ۔ اس سے میرا کام سہل ہو جائے گا ۔

ظفر نے اس روز پہلی بار تین گھنٹے صفدر علی صاحب کی صحبت میں بسر کئے ۔ جب تک عقیلہ بیگم رہیں زیادہ تر وہی باتیں کرتی رہیں ۔ اس کے بعد ظفر کو اپنی صحت ، مشاغل ، دلچسپیوں اور آئندہ کے ارادوں کے بارے میں صفدر علی صاحب کے بے شمار سوالوں کا جواب دینا پڑا اور ان کی لمبی چوڑی اکتا دینے والی نصیحت کی تقریریں سننی پڑیں انھوں نے نہایت صبر سے اور جہاں تک ہو سکا ، خوش مزاجی اور موقع شناسی سے اس آزمائش کو جھیلا اور جب وہ ان سے رخصت ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ کم سے کم ان کی طرف سے تکلف کا پردہ ہٹ گیا ہے ، اور شاید اس کے بارے میں ان کی رائے بھی کچھ بہتر ہو گئی ہے ۔ لیکن ظفر کے دل میں یہ بات اور بھی جم گئی کہ صفدر علی سخت دنیا پرست یعنی زر پرست اور جاہ پرست آدمی ہیں جنھیں وہ انسان کی سب سے معیوب صفات سمجھتا تھا ۔

(باقی آئندہ)

کچی ! کچی !!

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

مناسب ۔ وہ بھی آدھے سے زیادہ پانی ہی ہوتا ہے دیکھو تو سہی دونوں کا چمڑا ہڈی کو لگ گیا ہے ۔ یاؤ بھر چائے کو بچتا ہے ۔ اب چاہے سویرے چار چار دوستوں کو چائے پلا دو ، چاہے شام کے لئے رکھ لو ۔

" اچھا چھوڑو ۔ کنڈنسڈ ملک کا ڈبہ لے آئے ہیں ؟"

" لے آؤ ۔ مگر مجھ سے پیسے نہ مانگنا "

" تو میرے پاس پیسے کہاں سے آئے ۔ بس تین آنے ہیں ...... "

" کیوں صبح تو ڈیڑھ روپیہ تھا جیب میں ...... "

" پچاس کے نوٹ میں لگ گئے ۔ ایک آنے کا پان ڈال دیا ...... "

" ہاں ہاں یہ تو میں جانتی ہوں ، پر وہ ایک روپیہ کیا ہوا ، وہ اپنی کس چہیتی کو دے آئے ؟"

" یونین کا چندہ دیا ہے "

" یونین ۔ یونین ۔ یہ نگوڑی میری سوتن نہ جانے کہاں سے آگئی ہے ؟ جب دیکھو روپیہ مانگتی رہتی ہے ۔ میں کہتی ہوں تم کوئی کارخانے کے مزدور ہو جو تمھارے دفتر میں بھی یونین بن گئی ...... "

" تم تو کوئی بات سمجھتی نہیں ۔ یونین ہی تو ہماری ...... "

" ہاں ہاں یہ یونین ہی تمھاری بیوی ہے تمھاری بچی ہے ، تمھاری ماں ہے ۔ تو پھر اسی سے جاکر کہو پکائے پلائے تمھیں ۔ گھر میں چاہے فاقہ ہو ، بچوں کے نام اسکول سے کٹ جائیں ۔ مگر یہ ہیں کہ یونین نگوڑی کا چندہ ضرور دیں گے ...... میں نے ہزار بار کہہ دیا کہ تم اپنی بیوی اور نگوڑی یونین میں سے ایک کو پسند کر لو ۔ مجھے زہر دے دو اور پھر ساری کی ساری تنخواہ یونین ہی میں دے آیا کرو ...... "

" روز ہٹ ۔ اب تنخواہ ہی نہیں ملا کرے گی ۔ آج ہی کمپنی نے چالیس کلرکوں کو نوٹس دئے ہیں "

" تمھیں بھی ؟"

" ہاں "

" یہی بات کہنا چاہتے تھے ؟"

" ہاں "

" پھر اب کیا ہوگا ؟"

" جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے مزدوروں اور سرمایہ دار کی جنگ ۔ ہم لوگوں کی برطرفی غیر قانونی ہے ۔ یونین نے سٹرائک کا نوٹس دیا ہے "

" سٹرائک ؟"

" ہاں سب کلرک ، چپراسی تیار ہیں ۔ سٹرائک فنڈ جمع کیا جا رہا ہے "

" تمھیں اور کتنا دینا ہے ؟"

" پانچ روپے "

" ...... "

(تین گھنٹے بعد)

" اجی اور سو گئے ؟"

" نیند نہیں آرہی "

" کیا سوچ رہے ہو ؟"

" یہی کہ دنیا کب بدلے گی ؟ اور کل سویرے ٣

٣ پانچ روپے کہاں سے آئیں گے ؟"

" پانچ روپے ____ یہ لو "

" یہ کہاں سے آئے ؟"

" میں نے بچاکر رکھے تھے ۔ برسات میں تمھارے لئے چھتری لینے کو "

" اور اب یہ روپے یونین کو دے رہی ہو ____ اپنی سوتن کو "

" سوچتی ہوں یہ طوفان جو آیا ہے اس میں شاید یونین ہی چھتری کا کام دے گی "

" ...... "

" ہائے تم مرد ہو کر روتے ہو ...... "

" یہ خوشی کے آنسو ہیں "

" خوشی کے ؟"

" ہاں تم کتنی اچھی ہو "

" ...... "

" کچی ! کچی !"

" کیوں کیا ہے ؟"

" کچھ نہیں ۔ بس ۔ کچی کچی "

تبصرہ :-

سالنامہ ادب لطیف ۱۹۵۵ء

ترتیب دینے والے :- چودھری برکت علی ۔ مرزا ادیب

ملنے کا پتہ :- مکتبہ اردو ۔ لاہور

قیمت ـــ عہ/۸

حسب روایات سابق " ادب لطیف " کا یہ سالنامہ بھی گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے ۔ سرورق نہایت دیدہ زیب لکھائی چھپائی اور عام گٹ اپ ہمیشہ کی طرح بہت بلند مکتبہ اردو کو اتنا خوب صورت سالنامہ نکالنے پر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے ۔

" ادب لطیف " ان معیاری رسالوں میں سے ہے جو چند سال سے پابندی کے ساتھ جدید ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لے رہا ہے خاص طور سے اس کے سالنامے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ زیر نظر سالنامہ بھی صوری اعتبار سے اتنا ہی دل کش اور نظر فریب ہے ۔ مگر اس دفعہ لکھنے والے کچھ نئے سے ہیں ۔ ادب لطیف کا ایک مخصوص حلقہ تھا ۔ کسی پچھلے سالنامے کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں ان کا نام ضرور مل جائے گا اس کے پڑھنے والے ان ناموں کو دیکھنے کے کچھ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کی عدم موجودگی سے ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور معیار بھی کسی قدر گر گیا ہے حصہ نثر تو خاصا ہے ۔ تنقیدی مضامین اور کہانیاں بری نہیں ۔ مگر حصہ نظم بہت کمزور ہے ۔ خاص طور سے نظمیں تو بہت ہی معمولی ہیں ، غزلیں کچھ بہتر ہیں ۔ ڈاکٹر مسعود حسین کی غزل کا ایک شعر قابل توجہ ہے

دورا ہے پہ یہ لوگ کھڑے سوچتے کیا ہیں ۔ کہہ دو ادھر جائیں یا آ جائیں ادھر آج خاص خاص لکھنے والوں کی عکسی تصویروں نے پرچے کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے ۔

کامن ویلتھ کے ایشیائی ملک

گن ڈولن ۔ ایم کارٹر

ہندوستان، پاکستان اور سیلون کے کامن ویلتھ میں آزاد ممبر کی حیثیت سے شریک ہو جانے کے بعد سے اب ایشیا کامن ویلتھ کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ کامن ویلتھ کے غیر ایشیائی ملکوں کے باشندوں کی تعداد جو سب کے سب یورپی نسل سے ہیں۔ ۵۰ کروڑ ۵ لاکھ سے بھی کم ہے اور ایشیائی ممبر ملکوں کے باشندوں کی تعداد ۵۰ کروڑ ہے جن میں ۸۱ کروڑ سے زیادہ غیر یورپی نسل سے ہیں۔ اس نئی صورت حال سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی صحیح اہمیت کو سمجھنا چاہیئے۔ کامن ویلتھ کے تمام ملک خود مختار ہیں۔ اور اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے پر پوری آزادی کے ساتھ تنقید کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف اظہار خیال کرنے کی بھی آزادی ہے۔ لیکن سب نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ اگر کوئی غیر ممبر ملک ان میں سے کسی کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنے آپس کے تمام جھگڑے صلح و آشتی کے ساتھ مل جل کر طے کریں گے۔ اس قانونی عہد و پیمان کے علاوہ کامن ویلتھ کے یورپی نسل کے ممالک تہذیبی، تمدنی اور تاریخی اعتبار سے بھی ایک رشتے میں منسلک ہیں۔

آئرلینڈ کامن ویلتھ کے یورپی ممالک سے تاریخی تہذیبی اور سماجی تعلقات رکھنے کے باوجود صرف اس لئے کامن ویلتھ سے الگ ہو گیا کہ اُسے اپنی آزادی کے لئے برطانیہ سے لڑائی لڑنی پڑی تھی اور اس کی تلخ یاد اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان اور پاکستان اس نئے رشتے میں راحت محسوس کر سکیں گے جب کہ ان کے زخموں سے اب تک ٹیس اٹھتی رہتی ہے۔ وہی زخم برطانیہ نے جنگ آزادی کے زمانے میں لگائے ہیں

ہندوستان اور پاکستان کے کامن ویلتھ میں شریک رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں اپنی مرضی سے کامن ویلتھ میں شریک ہوئے ہیں ہند کا جمہوری دستور کامن ویلتھ کی شرکت کے خلاف نہیں ہے۔ شاید پاکستان شرکت سے پہلے کچھ شرطیں لگائے۔ سیلون اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہے پھر اس میں اتنا کس بل بھی نہیں ہے کہ وہ شرائط پیش کر سکے ایشیائی ممالک کامن ویلتھ میں اسی وقت تک شریک رہیں گے جب تک انھیں فائدے کی امید ہو گی لیکن نفع کی آرزو کے ساتھ ہی ساتھ ایشیائی ممالک کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کامن ویلتھ کی ایکتا کو قائم رکھیں۔

یہ تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ ایشیائی سلطنتیں گویا پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔ لیکن ان سب میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کی منزل سیکولر اسٹیٹ ہے اس کے برخلاف پاکستان اسلامی حکومت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ سیلون کی کل آبادی ۹۰ لاکھ ہے۔ اس مختصر سی آبادی میں بھی مختلف فرقے بستے ہیں

یہ تینوں ابھی ابھرتی ہوئی قومیں ہیں۔ لیکن خیال یہ ہے کہ ہندوستان اپنے قدرتی خزانوں کی بدولت ایک بڑی طاقت بن جائے گا۔ پاکستان کی اہمیت زیادہ تر ایک "مسلم ریاست" کی حیثیت سے ہوگی۔ اور سیلون صرف جائے وقوع کے لحاظ سے اہم ثابت ہوگا۔

لیکن اس فرق کے باوجود ان تینوں کو دو اہم مشترک مسائل کا سامنا کرنا ہے۔ انھی مسائل کی وجہ سے ان ایشیائی ممبروں کی حیثیت دوسرے ممبروں سے بالکل جدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اوروں کو مشکل ہی سے اس طرح کے مسئلوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔

ان میں سب سے واضح تو زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی افسوسناک کمی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کا معیار زندگی انتہائی پست ہے۔ دوسرا مسئلہ شاید اس سے بھی اہم ہے اور وہ ہے ہندوستان، پاکستان اور سیلون کے تعلیم یافتہ طبقے سوفسطائی لیڈروں اور جنتا میں زمین و آسمان کی دوری۔ ان میں سے بیشتر نے مغربی خیالات اور مغربی تہذیب کو اپنا لیا ہے یا پھر اپنی قدیم مشرقی تہذیب سے اُن کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور جنتا کی مثال تالاب کے مینڈک کی سی جس نے اپنے ماحول سے آگے بڑھ کر نہ کچھ دیکھا ہے نہ سنا۔ سوچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکمران طبقہ اور جنتا کے علمی معیار میں فرق تو ہوتا ہی ہے لیکن یہاں نہ صرف علمی معیار میں فرق ہے بلکہ نقطۂ نگاہ میں بھی ہے۔ صرف ایک یا دو فیصدی جنتا ان مغربی سیاسی خیالات سے واقف ہے جن پر ان کے ملک کے راج کی بنیاد ہے۔

صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی کامن ویلتھ کے رشتے کو سمجھتا ہے لیکن خود اس چھوٹے سے طبقے میں بھی اس مسئلے پر شدید اختلاف ہے کہ ان کے ملک کو کامن ویلتھ میں رہنا چاہیئے یا نہیں۔ ہندوستانی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کم از کم اس مسئلے پر تو متحد ہیں کہ ہندوستان کو کامن ویلتھ سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ اسی طرح بہت سے کانگریسی بھی اس "غیر قومی" اقدام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت نہرو کو بھی کانگریس پارٹی سے اپنی بات منوانے میں خاصی کوشش کرنی پڑی تھی۔

تو پھر کیا ان ممالک کی سیاسی رہنمائی میں جیسے ہی تبدیلی ہو گی کیا یہ کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو جائیں گے؟ شاید ایسا ہو لیکن سر دست اس کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ وہ چھوٹی سی اقلیت جو حکمرانی کرتی ہے اسے اس کا احساس ہے کہ اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے لوگوں کو مطمئن رکھنا ضروری ہے۔ پھر اس کی طاقت اور حیثیت کو دیکھتے ہوئے خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں بہت عرصے تک اُن کے اقتدار کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شریک رکھنے کے لئے پنڈت نہرو نے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا اس کی ایک وجہ تو اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ ہندوستان اور کامن ویلتھ کے ابتدائی ممبر ملکوں کی منزل اور اُن کے اغراض و مقاصد ایک ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ جو کامن ویلتھ کے متعلق کچھ ایسا گمان نہیں رکھتے وہ بھی اس سبب سے انگریزوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہے اور جب وعدہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر چلے گئے۔ اس کے علاوہ ایک احساس یہ بھی ہے کہ انگریز باوجود اپنی تمام خرابیوں کے بہت سی قوموں سے بہتر ہیں اور مقابلتہً ہندوستان میں ان کا رویہ شریفانہ رہا تھا یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی طرز حکومت میں برطانوی طرز کا پالا اب تک جاری ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ پنڈت نہرو نے کانگریس کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے مشترک بچاؤ پر بھی زور دیا تھا۔ سیلون کے لئے یہ فائدہ تو ایک کھلی حقیقت ہے۔ ٹرنکومالی کا اہم بندرگاہ کی وجہ سے برطانیہ اس کی حفاظت کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ تینوں ملکوں کی فوج میں بہت سے اعلیٰ عہدے اب تک انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگرچہ افسر پوری طرح ہندوستانی وزیروں کے ماتحت ہیں پھر بھی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے درمیان ایک رابطہ کا کام دیتے ہیں۔

بچاؤ ہی ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے۔ ان تینوں ملکوں میں بہادر سپاہیوں کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ فوجی نقطۂ نظر سے تینوں کا جائے وقوع بہت اہم ہے ہندوستان، پاکستان اور سیلون بحر ہند کی حفاظت کی کنجی ہیں جس کی حفاظت میں ۸ میں سے ۷ ممبر (سوائے کینیڈا کے بقیہ عام) براہ راست دلچسپی رکھتے ہیں اس کے برخلاف ان ایشیائی ملکوں میں جدید آلات کی بے انتہا کمی ہے۔ بحری بیڑہ تو ان کے پاس ہے ہی نہیں اور ہوائی بیڑہ بھی بس نام ہی کو ہے اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی خشکی کی سرحدیں بڑی خطرناک ہیں

اس میں شبہ نہیں کہ کشمیر کا مسئلہ کامن ویلتھ کے تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے نہ صرف یہی کہ اس مسئلے نے ہندوستان اور پاکستان کی توجہ بیرونی حفاظت اور اہم معاشی اصلاحات کی طرف سے ہٹا کر ایک نقصان دہ سمت میں لگا رکھا ہے بلکہ کامن ویلتھ کے دو ممبروں کے درمیان یہ ایک واضح

اور خطرناک جھگڑا ہے۔ ایسا جھگڑا شاید ہی کبھی دو ممبروں کے درمیان ہوا ہو۔ یہ مسئلہ انجمن اقوام کے سپرد کر دیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کامن ویلتھ اپنے گھریلو جھگڑوں کو چکانے کا اہل نہیں ہے۔ پاکستانی یہ شکایت کرتے ہیں کہ برطانیہ کے انصاف کا پلڑا ہر اہم موقع پر ہندوستان کی طرف جھک جاتا ہے اور اگر کشمیر کے سلسلے میں بھی برطانیہ کا یہی رویہ رہا تو قدیم تاریخی بندھن ایک آن میں ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن ہندوستانی اس کو ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ برطانیہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کی تائید کرتا ہے اور خود برطانیہ بھی اس الزام کی پرزور تردید کرتا ہے۔

کامن ویلتھ کے ایشیائی ممبر "سرخ خطرے" کی طرف سے پوری طرح بیدار نہیں ہیں۔ ہندوستان میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی آبادی اس قدر زیادہ ہے کہ روس یہاں آکر کیا لے گا۔ انسانوں کے اس سمندر میں کھو کر رہ جائے گا! پاکستان کو اس پر ناز ہے کہ اسلام کمیونزم کے خلاف ایک ڈھال ہے۔ مغربی لیڈروں کو اس سلسلے میں حقیقت بینی سے کام لینا چاہئے لیکن ساتھ ہی برطانوی مدبروں کو ہرگز کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہئے جس سے یہ معلوم ہو کہ مغرب ایشیائی ملکوں کو کمیونزم کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس فکر میں ہے کہ یورپ کی آئندہ جنگ ایشیائی سرزمین پر لڑی جائے۔

اہل مغرب کی نگاہ میں تو اس وقت ان تینوں ملکوں کا اہم مسئلہ دفاع اور خارجی پالیسی ہے لیکن درحقیقت اس وقت سب سے اہم معاشی مسئلہ ہے ان ملکوں کے لیڈروں کو چاہئے کہ جلد از جلد اس کی سبیل کریں کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو اور وہ غربت و افلاس کے چنگل سے نجات پائیں ورنہ چین اور سوویٹ یونین کی طرح عوام خود ہی اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر اس طرح کے انقلاب میں جتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں دینی ہوں گی۔

برطانیہ کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے کہ مالی امداد سے کامن ویلتھ کے رشتے کو مضبوط کرے۔ ایشیائی ملک برطانوی طریقوں، برطانوی انجینیروں اور برطانوی کارخانے داروں کے عادی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ برطانیہ کے ذرائع اتنے وسیع نہیں ہیں کہ وہ ان ملکوں کی معاشی ترقی میں بھرپور مدد دے سکے اس لئے عام طور پر اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ایشیائی ملک اپنی معاشی ترقی کے لئے امریکہ سے مدد لیں۔

لیکن اس "حل" میں بہت سی مشکلات ہیں۔ ایشیائی ملکوں کو یہ بات پسند نہیں کہ وہ اپنی ترقی کے لئے امریکہ کی معاشی غلامی کا جوا اپنی گردن ڈال لیں۔ تمام ایشیائی ملکوں میں اس خیال کے لوگوں کی کمی نہیں کہ اگر ہم امریکہ کی مدد سے اس نظام کہنہ کی بنیادوں کو استوار کریں گے تو آنے والے معاشی انقلاب میں جو آکر رہے گا ہماری مشکلات اور بڑھ جائیں گی۔

بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ یو، این، او کے ذریعے امداد دی جائے۔ لیکن رقم تو بہرحال امریکہ ہی سے آنے کی، اس لئے اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا ایک تجویز یہ ہے کہ کامن ویلتھ اور امریکہ کی مشترک مدد لی جائے۔ کینیڈا، آسٹریلیا اور برطانیہ فنی امداد دیں اور ہندوستانی، پاکستانی اور سیلونی طالب علموں کو سیکھنے کے مواقع بہم پہنچائیں۔ ان کے یہاں اس کے لئے فنڈ بھی موجود ہے، جسے وہ بخوشی ان ممالک میں خرچ کرنے کو تیار ہوں گے بشرطیکہ انھیں رقم کی واپسی اور حکومت کی پائداری کا بھروسہ ہو جائے۔ اور یہی اطمینان امریکی ساہوکار بھی چاہیں گے۔

سردست تو ہندوستانی اور پاکستانی حکومتیں کمیونزم اور دوسری انتہا پسند تحریکوں پر کڑی نگرانی رکھ رہی ہیں لیکن آخرکار انھیں ایسی سوشل اور معاشی پالیسی پر کاربند ہونا پڑے گا جو جہالت کا خاتمہ کرے، صحت کا گرا ہوا معیار بڑھائے اور خصوصاً پاکستان میں عورتوں کے لئے ترقی کے مساوی مواقع پیدا کرے۔

ایشیائی ملکوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری کامن ویلتھ کے لئے یہ دور ایک طرح تجربے کا دور ہے۔ یہ دونوں فریق کی سوجھ بوجھ اور سیکھنے کی صلاحیت کی جانچ کا زمانہ ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ کامیابی اور بردباری کا سہرا کس کے سر رہتا ہے۔

مترجمہ مشتاق احمد

جامعہ کے نئے منصوبے (بسلسلہ صفحہ ۱۰)

دو ہمدردوں کے خط

مکرمی! السلام علیکم

ہمدردان جامعہ کا حلقہ وسیع کرنے کے لئے آپ کی اپیل مجھے موصول ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو حال ہی میں چند ان مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے جن کا مقابلہ بآسانی کوئی ادارہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسے جلیل القدر اور مستقل مزاج کارکنوں کے زیر نگرانی اس پر سے وہ دور بھی گذر گیا جبکہ اس کے جاں بر ہونے کی امیدیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ آپ کی مساعی مشکور ہوئیں اور اب نئے قومی تعمیر کے پروگرام میں ہمارا یہ قومی ادارہ خدمت پر اسی طرح تیار ہے جس طرح کہ دیگر مستحکم اداروں سے توقع ہے۔ میں نے اپنے حلقۂ احباب میں ہمدردان جامعہ کی جماعت بنانے کے لئے کچھ کام شروع کیا ہے اور عنقریب کچھ فارم ممبری پر کرکے و دیگر امداد بترسیل زر کرکے اطلاع دوں گا۔

میں ممنون ہوں گا اگر مجھے جامعہ کا پورا پراسپکٹس اور نصاب مع قواعد و ضوابط و نقشہ بھجوا دئے جائیں آپ کو معلوم ہے کہ یوپی میں کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جہاں اردو کے یا اس زبان کے توسط سے اعلیٰ اور معیاری امتحانات ہوتے ہیں۔ چند اورنٹیل امتحانات فارسی عربی کے تو رائج ہیں، مگر اردو کا کوئی نہیں بالخصوص مسلمان عورتوں کے لئے یہ بڑی دقت ہے وہ چاہتی ہیں اگر ممکن ہو سکے تو ہائر سکنڈری ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں انگریزی سے مستثنیٰ ہو سکیں اور یا تو اردو کے ہی امتحانات انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے برابر کے ہوں اس میں شریک ہو سکیں اور اردو کے امتحانات پاس کرنے کے بعد صرف انگریزی کا بعد میں امتحان دے سکیں۔ کیا طالبات کے لئے بالخصوص کوئی آسانیاں جامعہ میں فراہم ہو سکیں گی۔ اس کی اطلاع دیجئے اور نصاب وغیرہ کی کاپی بھجوا دیجئے۔ اگر وہ وی پی سے بھیجی گئی تو میں روپے دے کر چھڑا لوں گا۔

جامعہ کی خدمت کے لئے میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی اسکیم نکالی جائے کہ ملازمین سرکار یا دیگر دلچسپی لینے والے اشخاص ایک یا دو ماہ کی رخصت لے کر اس ادارے میں رضاکارانہ خدمت انجام دے سکیں یہ اسکیم دیال باغ آگرہ میں رائج ہے جہاں سال کے مختلف حصوں میں اس قسم کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں وہاں ٹھہرتے ہیں اور اپنے قویٰ ذہنی و جسمانی کو ادارے کی خاطر استعمال کرکے اس کے اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھاتے ہیں

مجھے تعلیم و تعلم سے محض اس لئے لگاؤ نہیں ہے کہ میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوں بلکہ میری عین خواہش ہے کہ اس کے اعلیٰ مقاصد کی ترویج ہو اور اس کے لئے آپ یا کارکنان ادارہ جس طرح چاہیں میری خدمات کا استعمال کر سکتے ہیں۔ والسلام

نیازکیش حشمت حسین عثمانی
(ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول)

مکرمی و محترمی ۔ سلام مسنون

قرطاس رکنیت و اپیل مطبوعہ موصول ہوئے۔ یادآوری کا شکریہ۔

جامعہ ملیہ سے کسی نہ کسی صورت میں بالواسطہ میرا تعلق رہا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ بھارت کے مسلمان تعمیر نو کے لئے اپنے زندگی کے سرچشموں سے قریب تر ہوں۔ جامعہ کا نئے حالات کے مطابق نئے منصوبے کر کے جادہ پیماں ہونا ملت کے لئے نیک فال ہے۔ کارکنان جامعہ کا تجربہ، وسعت نظر، اولوالعزمی اور استقلال اس پرآشوب دور میں ملت کے لئے بڑا سہارا ہے۔ اللہ تعالیٰ کارکنوں کے عزائم میں استقلال اور برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

جامعہ کے حلقہ ہمدرداں میں شامل ہونا کچھ نہ کرنے کے مقابلہ میں غنیمت ہے مگر ان انفرادی کوششوں کے نتائج کے انتظار کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ہمدردوں کے مرکز جگہ جگہ قائم ہوں اور جامعہ کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے احباب مل جل کر کام کریں اور دیگر حضرات کو ہم خیال بنائیں۔ جس سے کہ نہ صرف ہمدردوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا بلکہ جامعہ کی مقبولیت اور ہردلعزیزی بڑھے گی۔ اس سلسلے میں اگر کوئی قابل عمل اسکیم آپ کے ذہن میں ہو تو مطلع فرمائیں۔

میری خوش نصیبی ہوگی اگر اس نازک دور میں کسی طرح جامعہ کے لئے کوئی خدمت مجھ سے بن آئے۔ نیازکیش رضا علی خان (سول اینڈ ایڈیشنل سیشن جج)

جامعہ کے نئے منصوبے

صحافت کی تعلیم

آج کل عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحافت کا کام ذہنی اور شخصی معاملوں میں کھوج کرنا خبروں کا لین دین کرنا اور بیانات اور واقعات کی ایسی تشریح کرنا ہے جس سے کوئی سیاسی مقصد پورا ہوتا ہو۔ اس لئے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ صحافت میں کامیاب وہ ہوگا جو دوسروں کو دھوکے دے کر اپنے [illegible] سکتا ہو [illegible] دوسروں کی غرض اور ضرورت سے فائدہ اٹھا کر اپنی ترقی کی راہیں نکال لے۔ صحافت کے بارے میں یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہمارے تمام ایماندار اور قابل جرنلسٹوں پر الزام آتا ہے اور ایک پیشے کی جو ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے بے آبروئی ہوتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ صحافت کے ذریعے [illegible] سے کام نہیں اور وہ ان قدروں کی عزت قائم رکھنے میں مدد دے جو صحافت متمدن اور ترقی پسند جماعتی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں تو صحافت کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کر دینا چاہئے

شاید ان غلط فہمیوں کا بڑا سبب یہ ہے کہ جرنلسٹ اپنے پیشے کو ارادے سے نہیں بلکہ اتفاق سے اختیار کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں خوش خیال ہوں۔ وہ علم رکھتے ہوں۔ صاحب رائے اور ہمت والے ہوں۔ اولوالعزم اور وضع دار ہوں۔ لیکن چونکہ صحافت کی کوئی مستند علمی اور اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے ان خصوصیتوں کو اس کے پیشے سے کوئی نسبت نہیں دی جاتی۔ یہ صفتیں ملازمت اور روزگار کی منڈی کا زائد مال سمجھی جاتی ہیں۔ کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ اس منڈی میں معاملے ان لوگوں سے کئے جاتے ہیں جن کے تعلقات اچھے ہوں یا قسمت اچھی ہو۔ اس میں قابلیت کی کوئی خاص قدر نہیں کی جاتی مگر صحافت کا منصب اتنا اہم ہے کہ ہم اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس پیشے کو برتنے والے اپنا حق ادا کر سکیں تو ہمیں اس کا انتظام کرنا چاہئے کہ صحافتی قابلیت کا ایک معلوم معیار ہو۔ جرنلسٹ کو اپنے اوپر اعتماد اور اپنے منصب پر اعتبار ہو اور دوسری طرف پبلک کو اس کا یقین ہو کہ اس میں اپنے فرائض کو خوبی کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت ہے اور وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی رائے اور اس کی ایمانداری پر بھروسا کیا جائے۔

اب چونکہ صحافت کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں صحافت کی تعلیم کی طرف توجہ کریں، اور ان نوجوانوں کی علمی اور عملی تربیت کا انتظام کریں جو صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کرنا چاہتے ہوں۔ بعض یونیورسٹیوں نے اس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جامعہ ملیہ کی سند کو حکومت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس لئے یہاں کا نصاب پہلے ہی سے ایسا رکھا گیا ہے کہ خیالات کو خوبی سے ادا کرنے کی صلاحیت، جو کہ صحافت کی بنیادی صفت ہے، پوری نشوونما پائے اور جامعہ کے کئی سند یافتہ طالب علموں نے صحافت میں امتیاز حاصل کیا۔ اب تمام رکاوٹیں جو قومی درسگاہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوئی تھیں دور ہو گئی ہیں یا سال دو سال کے اندر دور ہو جائیں گی اس لئے جامعہ میں صحافت کا خاص نصاب جاری کیا گیا ہے جامعہ کی فضا اور جامعہ والوں کے تعلقات صحافتی قابلیت کی پرورش کے لئے موزوں ہیں اور اس کا بھی معقول انتظام کیا جا سکے گا کہ طالب علموں کو صحافت کے عملی پہلو سے بھی اچھی واقفیت ہو جائے۔

صحافت کے کلاس میں داخلے کی شرط یہ ہوگی کہ امیدوار نے کسی یونیورسٹی یا بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہو یا ایسا کوئی امتحان جسے جامعہ کی مجلس تعلیمی میٹرک کے مساوی قرار دے۔ جو طالب علم نصاب کی تکمیل کر کے وہ امتحان پاس کر لیں گے جو جامعہ کی مجلس تعلیمی مقرر کرے انہیں صحافت کی سند دی جائے گی۔

صحافت کے نصاب کے دو حصے ہوں گے جن میں سے ہر ایک کی مدت دو سال ہوگی۔ پہلے دو سال کے مضامین حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ دینیات۔ بدھ مذہب اور اس کی تاریخ یا عیسائی مذہب اور اس کی تاریخ یا ہندو مذہب اور اس کی تاریخ یا اسلام اور تاریخ اسلام۔

۲۔ زبان اور ادب۔ ہندی اور انگریزی یا اردو اور انگریزی۔

۳۔ تاریخ عالم

۴۔ معاشیات

۵۔ سیاسیات۔

تیسرے اور چوتھے سال کے مضامین حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ علم مذاہب

۲۔ ہندی یا اردو یا انگریزی زبان اور ادب اور تہذیب کے اصول۔

۳۔ تاریخ ہندیا مین اقوامی سیاست کاری (۱۸۵۷ کے بعد سے) اور بین اقوامی قانون (جس میں سیاسی اور اطلاعات کے بارے میں مختلف قوموں کے اندرونی قانون شامل ہوں گے۔)

۴۔ معاشیات

۵۔ عمرانیات یا فنون لطیفہ کی تاریخ

ان مضامین کے علاوہ عملی کام [illegible] کا کام ہوگا جو صحافت کی مشق پر مشتمل ہوگا جیسے کہ خلاصے تیار کرنا، نامہ نگاری، تنقید، اخبار کی ترتیب۔

نیا سال اور نئے داخلے

جامعہ میں آج کل چھٹیاں ہیں۔ سوائے دفاتر کے تمام تعلیمی ادارے بند ہیں۔ چنانچہ جامعہ نگر کی مختصر سی آبادی میں صرف گنے چنے لوگ رہ گئے ہیں یکم جولائی کو دستکاری کا مدرسہ کھل رہا ہے۔ ۲۰ جولائی کو مدارس ابتدائی و ثانوی کھل رہے ہیں اور یکم اگست کو کالج۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں داخلے کی درخواستوں کی آخری تاریخ ۳۰ جون ہے جگہ محفوظ کرانے کے لئے ابتدائی کلاسوں کے لئے سات روپے اور ثانوی کلاسوں کے لئے دس روپے درخواست کے ساتھ آنا ضروری ہیں۔

بچیوں کی تعلیم

بچیوں کی تعلیم کے لئے ایک اقامتی اسکول قائم کرنے کی اسکیم بہت مدت سے جامعہ کے پیش نظر ہے۔ مگر مالی دقتوں اور دوسری دشواریوں کی وجہ سے اب تک اس کا قیام عمل میں نہ آ سکا اس سال سے مدرسہ ابتدائی میں بچوں کے ساتھ چھوٹی بچیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال کی عمر کی لڑکیوں کا داخلہ کیا جائے گا اور صرف ابتدائی جماعتوں میں۔

ہاتھ کا کام

جامعہ کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی یہ شروع سے خصوصیت رہی ہے کہ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی دستکاریاں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ اس سال سے مدرسہ ثانوی میں اس طرف خاص توجہ دینے کا ارادہ ہے۔ نجاری، کھلونا سازی اور [illegible] سازی کو ترقی دینے اور زیادہ بہتر بنانے کا خیال ہے۔ ان کے علاوہ ہاتھ کے دوسرے کاموں کی اسکیم بھی زیر غور ہے۔ ان کے ساتھ زراعت اور ڈیری کا کام سکھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ماہر زراعت کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں

دہلی میں مکمل امن ہے

بعض استاد جو ابھی حال میں بچوں کو ان کے وطن پہنچانے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بعض لوگوں کو دہلی کے امن و امان کے متعلق شبہ ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے میں تامل ہے۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ دہلی میں مکمل امن ہے اور مسلمان پوری آزادی کے ساتھ جہاں چاہتے ہیں اور جس وقت چاہتے ہیں آتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی میں بڑا اسا بڑا فساد ہوا مگر جامعہ نگر کوئی معمولی سا واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ اس لئے جو لوگ محض بد امنی کے ڈر سے اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے میں تامل ہے وہ بغیر کسی پس و پیش کے بھیج سکتے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

خوشبودار لباس مرد اور عورتیں اپنے نہانے اور دھونے کا سامان اپنے کپڑوں کی طرح پسند کرتے ہیں۔ دوسرے صابن کی طرح کانتی صابن میں بھی اچھی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ خوشبودار جھاگ جلد کو ملائم اور تر رکھتا ہے۔ اور تھوڑی قیمت پر مل سکتا ہے۔

کانتی

ٹائلٹ صابن

سواستک آئیل ملز لمیٹیڈ بمبئی

SHILPI TOM 34 URDU.

سیلز ڈپو (۱) برہانہ روڈ، کان پور (۲) سنٹ جیمس چرچ، کشمیری گیٹ، دہلی

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ
دس روپے
ششماہی
ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ
چار آنے

(منیجر)

آپ کی فرمائش

مشرقی طرز کے زرق برق نفیس اور نایاب کپڑوں کے لئے

مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی کو یاد رکھئے

مینجنگ ایجنٹ

اسٹنڈرڈ کمپنی لمیٹڈ
انڈین بلیچنگ، ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ
نیو چائنا ملز لمیٹڈ
سورت کاٹن اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
نیو شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

کیا کیا مال تیار ہوتا ہے

کورا سوت اور رنگین سوت، کٹ پیس (ٹکڑے) کوری اور دھلی ہوئی چادریں کورا دھلا ہوا رنگا ہوا چھپا ہوا لنکلاٹ۔ کوری اور دھلی ہوئی دھوتیاں کورا اور دھلا ہوا کرتے قمیض کا کپڑا۔ دھاری دار کرتے قمیص کا کپڑا۔ کوری دھلی ہوئی ساڑھیاں، کورا دھلا ہوا زین، دھلا ہوا لٹھا وغیرہ دھلے ہوئے میز پوش، چارخانہ اور دھاری دار کپڑا چھپا ہوا وائل وغیرہ وغیرہ

ملنے کا پتہ:
مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی لمیٹڈ
۲۹ ر چرچ گیٹ اسٹریٹ بمبئی

اچھی چھپائی

INDIA

ہم ہر قسم کے بہترین "ٹائپ میٹل" بناتے ہیں جو کہ ہندوستان بھر کے تمام مشہور چھاپے خانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ کم خرچ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ ہمارے بنائے ہوئے "لائینوٹائپ میٹل" اور "مونو ٹائپ میٹل" کی چھپائی نہایت صاف اور خوبصورت ہوتی ہے۔

نیچے لکھے ہوئے پتہ پر دریافت کیجئے۔

انڈین اسٹینڈرڈ میٹل کمپنی لمیٹڈ

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں
(منیجر)

طابع و ناشر۔ عبد اللطیف اعظمی بی۔ اے (جامعہ)　مطبوعہ: جید برقی پریس دہلی

نئی روشنی

देहाती

فہرست مضامین

جلد ۴ | ۲۴ رجون سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۲۴

تیسری جنگ کا محاذ	مہیش مہتہ	۲
پچھلا ہفتہ :		
ہند اور بیرون ہند میں	ع ، ح - غ ، ل	۳
کشکول	...	۵
عبث	باقر رضوی	۵
افسانہ ناتمام	قابل مالیگانوی	۵
آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶
جدید انگریزی شاعری	علی حماد عباسی	۷
دنیا کی تیسری طاقت	ڈاکٹر پرس رام	۹
اشتہارات	...	۱۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی

مدیر
ڈاکٹر سید عابد حسین

تیسری جنگ کا محاذ جنوب مشرقی ایشیا

رمیش مہتہ

جنوب مشرقی ایشیا میں ایک خوفناک طوفان اُٹھ رہا ہے، اور برطانیہ اور امریکہ اس طوفان کو دبانے کی بجائے اُسے پھیلانے میں مصروف ہیں۔ اگر یہی حالات رہے تو جنوب مشرقی ایشیا میں ایک خوفناک جنگ کا محاذ بنے گا۔

پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال نے جنوب مشرقی ایشیا کو غلام بنانا شروع کیا، ملایا، سنگاپور، پینانگ، بورنیو، اور ہانگ کانگ میں انگریز تاجروں اور پادریوں کی صورت میں آئے۔ ڈچ، جاوا اور سماٹرا میں داخل ہوئے۔ پرتگیز تیمور میں پہنچے اور فرانسیسی ہند چینی میں۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ ملایا، سنگاپور، بورنیو، پینانگ اور ہانگ کانگ پر قبضہ کرنے کے علاوہ چین کے کئی شہروں میں علاقائی حقوق حاصل کرکے اپنی تجارتی بستیاں آزاد کرلیں۔ ہالینڈ نے جاوا، سماٹرا اور بالی پر قبضہ کرلیا، اور فرانس نے ہند چینی پر۔ چاروں طاقتوں نے جاپان میں بھی مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ لیکن جاپان ایک طاقتور ملک ثابت ہوا اس لئے مغربی طاقتیں جاپان میں اقتدار حاصل نہ کرسکیں۔

برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال نے جنوب مشرقی ایشیا کے ان حصوں پر قبضہ کرکے ان کے قدرتی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ شروع کردی۔ ملایا کا ٹین اور ربڑ، جاوا اور سماٹرا کا پٹرول، جوٹ اور ربڑ اور ہند چینی کا چاول اور دوسری پیداوار مغربی یورپ کے ان ملکوں کے باشندوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ مغربی یورپ کو ان اشیاء سے نہ صرف تجارتی طور پر فائدہ ہوا۔ بلکہ انھوں نے ان ملکوں کو اپنے فوجی اڈوں میں تبدیل کرکے اپنا سیاسی اقتدار بڑھانا شروع کردیا۔ سنگاپور کا اڈہ جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا سمندری اڈہ ہے۔ ہانگ کانگ ایک دوسرا اڈہ ہے۔ ان دونوں اڈوں کے علاوہ بورنیو کے اڈوں پر کنٹرول کرکے برطانیہ نے سارے جنوب مشرقی ایشیا میں سمندروں پر کنٹرول کرلیا اس سے اس کا تجارتی بیڑا بڑھا۔ اس کے آدمیوں کو تجارت اور ملازمت میں روزگار ملا چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ نے سارے چین کی تجارت خود سنبھال رکھی تھی۔

ادھر ہالینڈ نے جاوا سماٹرا اور بالی پر قبضہ کرکے اپنے اقتدار کا حلقہ وسیع کرلیا تھا۔ ہند چینی میں فرانس کے باشندوں کو کاروبار ملازمت اور حکمرانی کرنے کا موقعہ ملا تھا اور اپنی فالتو آبادی کو اپنی نوآبادیوں میں بسانے کے لئے راہیں نکلتی تھیں۔

سوشلسٹ سوویٹ روس

چین

ہندوستان

پاکستان

برما

جاپان اور امریکہ

یہ وہ وقت تھا جب ساری دنیا میں برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کا طوطی بولتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جاپان کو ایک مضبوط طاقت بننے کا خیال آیا۔ جاپانیوں نے برطانیہ سے جہازوں کی تعمیر اور صنعتی ترقی کی اسکیموں میں امداد حاصل کی۔ لیکن یہ امداد برطانیہ کو بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ کیونکہ برطانیہ کی طرح جاپان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔ جاپان کے لئے ایک ہی راستہ تھا وہ یہ کہ اس فالتو آبادی کے لئے نوآبادیاں تلاش کرے۔ چنانچہ اس نے منچوریا پر قبضہ کرلیا اور پھر چین کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔

برطانیہ اپنے مفاد کی وجہ سے جاپان کی مخالفت کرنے کے لئے مجبور تھا۔ لیکن اس دوران میں امریکہ بھی تجارتی لحاظ سے ایک مضبوط طاقت بن رہا تھا۔ امریکہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ چین میں اپنے لئے منڈیاں تلاش کرے۔ اس لئے اس نے جاپان کے مقابلے میں چین کی امداد شروع کردی۔ لیکن یہ امداد اتنی نہیں تھی کہ چین کامیابی سے مزاحمت جاری رکھ سکتا۔

جاپان نے مغربی طاقتوں کو اپنے راستے میں رکاوٹ دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ ان طاقتوں کے خلاف محاذ قائم کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اس نے سارے جنوب مشرقی ایشیا میں مغربی سامراج کے خلاف عوام کی حمایت کرنے کا اعلان کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے عوام نے اپنے آپ کو غلام اور بے بس دیکھا تو جاپان کے اس نعرے سے متاثر ہوکر اس کی حمایت شروع کردی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسری جنگ عظیم میں جاپان میدان جنگ میں کودا تو اس نے دیکھتے دیکھتے سارے جنوب مشرقی ایشیا سے مغربی طاقتوں کا اقتدار ختم کردیا۔

جاپان کو جنگ جاری رکھنے کے لئے عوام کی امداد کی ضرورت تھی۔ اس لئے جاپان نے ہر جگہ مقامی باشندوں کو مغربی طاقتوں کے خلاف چھاپہ مار اور اپنی حفاظت کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلح کیا۔ بہت سے لوگ تو متاثر ہوئے۔ لیکن جو لوگ سیاسی طور پر صحیح معنوں میں بیدار تھے انھوں نے اپنے آپ کو الگ منظم کرنا شروع کردیا تاکہ جب بھی موقعہ ملے جاپانیوں سے آزاد ہوکر خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔

نیشنلزم کی تحریک

جاپان کے حملے سے اور کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ جنوب مشرقی ایشیا کے عوام کو پہلی مرتبہ اپنی غلامی کا احساس ہوا اور اس احساس کے ساتھ ہی آزاد ہونے کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ جاپانیوں کے پروپیگنڈہ کا اثر زائل کرنے کے لئے مغربی طاقتوں نے بھی جنگ کے دوران میں عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انھیں جنگ کے بعد آزاد کرنے کا وعدہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ختم ہونے پر عوام کے تمام طبقوں نے آزادی کا مطالبہ شروع کردیا۔

جاپان نے لڑائی میں ہارے بغیر ہی ہتھیار ڈال دئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملایا اور سنگاپور کے سوا جہاں برطانوی فوجیں پوری قوت سے اُتر چکی تھیں۔ باقی حصوں میں عوامی لیڈروں نے جاپانیوں کے ہتھیار ڈالتے ہی جمہوری حکومتیں قائم کرلیں۔ انڈونیشیا میں ریپبلکن لیڈروں نے اپنی حکومت قائم کرلی اور ہند چینی میں ڈاکٹر ہوچی منہ اور اس کے ساتھیوں نے۔ ہالینڈ نے انڈونیشیا کو مغلوب کرنا چاہا۔ مگر بالآخر مجبور ہوکر آزاد کرنا پڑا

ہند چینی میں انگریزوں نے سائیگان اور ہنوئی میں فوجیں اتار دیں اور جب فرانسیسی فوجیں اُتریں تو خود ہند چینی کو خالی کردیا۔

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

عظیم الشان مسئلے کا حل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کو اپنی اراضی کی مالیت کی املاک کا جو وہ اپنے سابق وطن میں چھوڑ کر آتے ہیں کسی نہ کسی صورت میں معاوضہ نہ ملے۔ ممکن ہے تارکین وطن کی املاک سے متعلق قانون میں ترمیم کرنے کا جو مطالبہ کمیٹی نے کیا ہے وہ اس پہلو پر بھی حاوی ہو۔ بہر حال ہند اور پاکستان میں مہاجروں کی بحالی کی مہم اس وقت تک ہرگز ختم نہیں ہو سکتی جب تک ان کی املاک کے معاوضہ کے بارے میں کوئی قابل اطمینان فیصلہ نہ ہو جائے۔ امید ہے کہ پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں صاحب کی ملاقات کے بعد دونوں حکومتیں تجارتی اور مالی مسائل کے ساتھ ساتھ اس پیچیدہ مسئلے کو بھی جلد سے جلد حل کرنے کی کوشش کریں گی۔

یو۔پی میں کانگریس کا انتشار

یوں تو قریب قریب ہندوستان کی سبھی ریاستوں میں کانگریس پارٹی کے اندر دو یا دو سے زیادہ حصے بن گئے ہیں اور ان کی باہمی کشمکش کانگریس کو کمزور کر رہی ہے لیکن یو۔پی میں تو یہ تفریق انتشار کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے وہاں یو۔پی اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کی ایک معقول تعداد نے پارٹی کی ممبری سے استعفا دے دیا تھا، اور یہ افواہیں برابر سننے میں آ رہی تھیں کہ یہ حضرات اپنی الگ پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اب بدقسمتی سے ان افواہوں نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے اور کانگریس کی سرکاری جماعت سے الگ ہونے والے ممبروں نے شری پالیوال کی صدارت میں اپنی جداگانہ پارٹی پیپلز کانگریس (عوامی کانگریس) کے نام سے بنا لی ہے اور اسمبلی کے صدر نے بہت کچھ تامل کے بعد اسے مخالف پارٹی کی حیثیت سے تسلیم بھی کر لیا ہے۔ اگر پیپلز کانگریس اور نیشنل کانگریس کی یہ کشمکش اسمبلی کے اندر تک ہی محدود رہتی تو چنداں ہرج نہ تھا۔ فکر کی بات تو یہ ہے کہ نئی پارٹی کے لیڈر اسمبلی کے باہر عوام میں بھی یو۔پی کی کانگریسی حکومت کے خلاف زور شور سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں اور بعض وزیروں پر بدعنوانی اور بددیانتی کے سنگین الزامات لگا رہے ہیں۔ مرکزی حکومت اور کانگریس ورکنگ کمیٹی دونوں کو چاہئے کہ جلد سے جلد یو۔پی کے جھگڑوں کی طرف توجہ کریں اور اس ابتری اور انتشار کو جو وہاں کی کانگریس میں پیدا ہو رہا ہے زیادہ نہ بڑھنے دیں ورنہ ہندوستان کی اس سب سے بڑی ریاست کا نظم و نسق درہم برہم ہو جائے گا اور اس کا اثر کسی نہ کسی حد تک سارے ہندوستان پر پڑے گا۔ ان جھگڑوں کا سب سے زیادہ ناگوار اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ متعدد حضرات نے جو کچھ پہلے تک یو۔پی کی کانگریس میں اہم اور نمایاں حیثیت رکھتے تھے چند وزیروں پر کھلم کھلا فرد جرم لگائی ہے اور حکومت اس معاملے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہی۔ ظاہر ہے کہ ان الزامات کی جو وزیروں پر لگائے گئے ہیں یا تو کوئی بنیاد ہے یا پھر یہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ پہلی صورت میں خود ریاست کی حکومت یا مرکزی حکومت اور یا کم سے کم کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اس معاملے کی باضابطہ تحقیقات کرانا چاہئے جس طرح مدراس میں کرائی گئی اور دوسری صورت میں الزامات لگانے والوں پر عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلانا چاہئے۔ بہرحال بات اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اسے نظر انداز کرنے سے حکومت کی بدنامی اور لوگوں کی بے چینی بڑھتی جائے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس معاملے کی پوری چھان بین کی جائے تاکہ لوگوں کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں
کہ سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد

ع ، ح

پاکستانی اخبارات کی یقین دہانی

انجمن مدیران جرائد پاکستان کے صدر پیر علی محمد راشدی نے پچھلے دنوں ہندوستان کے دورے کے زمانے میں جس جرأت اور بے باکی کے ساتھ بیانات دیئے تھے، اس کی وجہ سے ان کے مخالفوں کو ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ متعدد اخبارات نے اسی بنیاد پر انجمن سے استعفے دے دیئے اور راشدی صاحب کے خلاف ایسے بیانات دیئے جس سے ہندوستان کے بعض اخبارات کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ اخبارات نہرو لیاقت سمجھوتے کے مخالف ہیں اور ہندوستان اور پاکستان میں باہمی دوستی کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ان اخبارات نے اس مخالفت کو بہت اہمیت دی۔ استعفے کی خبر کو اور ان کے بیانات کو بہت نمایاں کر کے شائع کیا اور بعض نے اس پر نوٹ بھی لکھے۔ اگر یہ فضا یوں ہی قائم رہتی تو دونوں ملکوں کی موجودہ خوش گوار فضا کو جس کے بنانے میں اخبارات کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ استعفا دینے والے اخبارات نے ابھی حال میں ایک طویل بیان کے ذریعے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے نہرو لیاقت سمجھوتے کی حمایت کا یقین دلایا ہے۔ ان کے بیان کے چند اہم اقتباسات حسب ذیل ہیں:-

"ہم مدیران جرائد اس امر پر اظہار اطمینان کرتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں لیاقت نہرو معاہدے کو کامیاب بنانے کے لئے ہر امکانی کوشش کر رہی ہیں۔ اور اپنے اس عزم کا پرزور اعادہ کرتے ہیں کہ پاکستان کے تمام اخبارات خواہ وہ کسی نقطۂ نگاہ کے حامی یا کسی حکمت عملی کے پابند کیوں نہ ہوں، اس معاہدے پر عمل درآمد کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے۔"

"ہم اس کی پرزور تردید کرتے ہیں اور پاکستان اور ہندوستان کی رائے عامہ پر واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ بعض اخبارات نے انجمن مدیران جرائد پاکستان سے استعفے دے دیئے ہیں۔ لیکن اس اختلاف کی بنیاد لیاقت نہرو معاہدہ نہیں ہے بلکہ تنظیمی معاملات یا سیاسی نقطۂ نگاہ ہے اور اس اختلاف کے باوجود بلا استثنیٰ لیاقت نہرو معاہدے کے ہم حامی ہیں۔"

"یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ پیر علی محمد راشدی کے ذاتی خیالات یا تنظیمی فیصلوں کے متعلق ان کی تنقید کا لیاقت نہرو معاہدے سے کوئی تعلق ہے اور جہاں تک دونوں ملکوں کے مدیران جرائد کے باہمی سمجھوتے کا تعلق ہے خواہ پیر علی محمد راشدی سے ہمیں کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس کی تائید کی جائے گی۔"

لیکن ہم ان مخالف اخبارات سے اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ اگر وہ اپنے لہجے میں تھوڑا سا اور اعتدال پیدا کر لیں اور اپنے گھریلو اختلافات کو ہندوستان اور پاکستان کے مسائل کے ساتھ نتھی نہ کریں تو یہ دونوں ملکوں کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ماؤزے تنگ کا حالات سے سمجھوتا

پچھلے دنوں پیکنگ میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے عوامی جمہوریہ کے صدر ماؤزے تنگ نے جو تقریر کی تھی اس کی تفصیلات اب شائع ہوئی ہیں۔ اس تقریر میں ماؤزے تنگ نے سرخ چین کی معاشی پالیسی کا اعلان کیا ہے جس میں انھوں نے انتہا پسندی کی جگہ اعتدال پسندی اور جذبات پرستی کے بجائے مصلحت شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ اس وقت سرمایہ داری کو ختم کرنا ناممکن ہے اور معاشی اور تجارتی نظام میں بنیادی تبدیلی کے لئے تین سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت لگے گی اس لئے فی الحال نجی صنعتیں اور نجی تجارتیں باقی رہیں گی اور سرمایہ دار مزدور کے تعلقات میں اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان سے ان لوگوں کو مایوسی ہوگی جو سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب کے ساتھ چین کی معاشی زندگی میں بھی یک سر انقلاب ہوگا۔ نجی صنعتیں اور نجی کاروبار ختم ہوگا اور تمام زمین براہ راست حکومت کی ملکیت ہوگی۔ لیکن دراصل چین کی نئی حکومت کے لئے اس سے بہتر کوئی اور پالیسی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بارہ سال کی لڑائی نے چین کے اقتصادی نظام کو تہ و بالا کر دیا ہے اور زندگی کا شیرازہ بالکل منتشر ہو گیا ہے اس لئے عجلت اور انتہا پسندی نئی حکومت کے لئے نہایت مضر ہوگی۔

اریٹریا کے مستقبل کے بارے میں اختلاف

اریٹریا کے بارے میں یو۔این۔او کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ چند دنوں میں شائع ہونے والی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ کمیشن کے اراکین میں شدید اختلاف رائے ہے، اور وہ کسی تجویز پر متفق نہ ہو سکے۔

ع ، ل

کشکول

"ہسٹری کیسی ڈاکٹر صاحب؟ اتنا سا بچہ۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش اس کی ہسٹری بھلا کیا ہو گی۔ ہاں اس کے باپ دادا کے کارنامے ــــ"

"نہیں نہیں۔ کار کی بات چھوڑو۔ مرض کی بات بولو۔"

"قبلہ ہرج مرج تو آپ جانتے ہیں، انسان کی جان کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے اس وقت بچے کی بیماری نے اور سب باتیں بھلا دی ہیں اور اس کی ماں کا تو آپ سے کیا عرض کروں کیسا برا حال ہے۔ ایک تو یوں ہی دھان پان اور پھر ــــ"

"او بابا تم کیسا آدمی ہے۔ ہم بچے کا حال پوچھتا۔ تم ماں کا بتاتا۔"

"جی نہیں میں آدمی نہیں۔ اچھا خاصا بھلا آدمی ہوں۔ مگر آج کل ذرا گھبرایا ہوا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میری تین بیویاں نامراد دنیا سے گئیں۔ چوتھی بیوی کا یہی بچہ ہے۔ اس کی بیماری نے گھن چکر بنا رکھا ہے۔"

"تو بابو صاحب بیماری کیا ہے، کچھ بولو نا؟"

"بول تو میں برابر رہا ہوں۔ مگر یہ بھلا میں کیسے بتاؤں کہ بیماری کیا ہے۔ آپ مرض تشخیص مجھ سے کرانا چاہتے ہیں تو پھر آپ ڈاکٹر کاہے کے لئے بنے ہیں؟"

"ارے تم کچھ سمپٹم دیکھا؟ کیا ہے۔ سے معلوم ہوا بچہ بیمار ہے؟"

"یہ سمپٹم کیا بلا ہے ڈاکٹر صاحب، کوئی نئی بیماری ایجاد ہوئی ہے؟"

"سمپٹم انگریزی میں علامت کو بولتا۔"

"کب موت؟ اچھا اب سمجھا۔ یہ علامت کی خرابی ہے۔ ظالم نے صرف میں لگانے ہی پر اکتفا نہیں کی۔ دانت بھی سے کر کھینچ دیا۔ ارے ڈاکٹر صاحب آپ علامت کیا پوچھتے ہیں۔ یہ تو سر سے پاؤں تک علامت ہی علامت ہے۔ ایک تو بات یہ ہے کہ اس بری طرح حلق پھاڑ کر روتا ہے کہ چھت گرنے لگتی ہے اور کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ آنسو ایک نہیں نکلتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ دس بیس منٹ رو کر چپ ہو جائے۔ یہ بھونپو جہاں بجنا شروع ہوا دو دو، تین تین گھنٹے تک جاری چلا جاتا ہے۔ دوسرے کھانے پینے کا ہوکا اتنا بڑھ گیا ہے کہ خدا کی پناہ، دودھ تو خیر شیر مادر ہی ہے دن رات پیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] بھلا غرض کسی نہ کسی چیز کی چسکی جاری رہتی ہے۔ اور کھانے کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ دستر خوان پر جو کچھ ہو سب میں سے تھوڑا تھوڑا چکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ رو رو کر سب باغ چٹ کر جائے اور پھر اس کی کوئی قید نہیں کہ وہی چیز کھائے جو کھانے کی ہو بلکہ اور گویا کہے سستے سے کہ صابن، منجن، کریم، جھاڑن، اسفنج، کاغذ، قلم، پنسل، چاقو، پیپرویٹ، روپیہ، اٹھنی، چونی، دونی، اکنی، ادھنا، پیسہ، غرض جو بھی منہ کے اندر پہنچ سکے اسے چوسے گا چبائے گا یا نگل جائے گا۔ خیر یہاں تک غنیمت ہے۔ اب چند روز سے صاحب زادے کو مردم خوری کا چسکا پڑ گیا ہے کسی کی انگلی ہو، کان ہو، ناک ہو، بازو ہو یا جسم کا کوئی اور ابھرا ہوا حصہ جو اس کی زد میں آیا نہیں اور اس نے چبا کر کاٹا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایمان سے کہتا ہوں کہ اس کی یاد آ جاتا ہے۔ ابھی پرسوں چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا۔ انھوں نے بکار اس کا ٹمپریچر چارٹ رکھو۔ تو حضرت میں تھرمامیٹر خرید کر لایا اور صاحبزادے کے منہ رکھنا چاہتا تھا کہ بس مچل گئے۔ تھرمامیٹر تو زمین پر گر کر چور چور ہو گیا اور میری انگلی اس کے دانتوں میں آ گئی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھئے آنکھوں میں ایک بجلی سی اور درد کی لہر سارے بدن میں دوڑ گئی۔ دیکھنے میں تو یہ ننھی ننھی چھوٹی چھوٹی بتیسیاں ہیں مگر ان میں اس بلا کی کاٹ ہے کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ تو دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کر اور چاہے جو علاج تجویز کیجئے۔ مگر اس موذی ٹمپریچر کا نام نہ لیجئے گا۔"

"بابو صاحب بچے کو علاج کا کچھ ضرورت نائیں۔ تم اپنے دماغ کا علاج کرائے"

"ہائیں! یہ کیا بک رہا ہے، یعنی میں، میں، میں۔ اپنے اپنے۔"

عبث

باقر رضوی

دل میں تیری یاد، لب پر تیرا نام آیا تو کیا
اپنے ویرانے کو باراں کا پیام آیا تو کیا

تیرگی چھٹنے کی جب امید ہی باقی نہیں
نور پھیلاتا ہوا ماہِ تمام آیا تو کیا

قلب سے افسردگی کی بھی ہوس جاتی رہی
بام پر اب کوئی یا صد اہتمام آیا تو کیا

جب کسی کے پاس جانے کی کوئی خواہش نہیں
بارگاہِ حسن سے تب اذنِ عام آیا تو کیا

آرزو ہی جب نہیں ہے نامہ و پیغام کی
پھر پیام آیا تو کیا حاصل سلام آیا تو کیا

ایسے عالم میں دماغ عطر پیراہن گئے
بن کے گل بن کر خیال لالہ فام آیا تو کیا

ولولے ٹھنڈے پڑے ہیں آتشِ دل سرد ہے
خون گرمانے کوئی شعلہ بجام آیا تو کیا

میکدے سے جھومتا گاتا ہوا نکلے گا کون؟
میکدے پر گھر کے ابر نوش خرام آیا تو کیا

اب نہ شوقِ جادہ پیمائی ہے نہ ذوقِ بندگی
بت کدہ آیا تو کیا، بیت الحرام آیا تو کیا

ڈوبتا جاتا ہوں ہر لحظہ نئے گرداب میں
اس تباہی میں کوئی گر میرے کام آیا تو کیا

اس تجلی زار کو کچھ بھی نہ پایا جز سراب
سوئے دریائے طرب میں تیز گام آیا تو کیا

افسانۂ ناتمام

قابل مالیگانوی

میں کوئی غیر نہیں ہوں کوئی بیگانہ نہیں
مجھ سے پرہیز انھیں ساقی میخانہ نہیں

زندگی نام ہے ناکام تمناؤں کا
شکر کرتا ہوں کہ پورا میرا افسانہ نہیں

اک تصور پہ ترے لاکھ گلستاں صدقے
کوئی ویرانہ ہو میرے لئے ویرانہ نہیں

میں نے سمجھا تھا کبھی تک ہو مرا دورِ جنوں
اب تو اُن سے بھی سنبھلتا دلِ دیوانہ نہیں

منزلِ دوست میں کچھ لوگ بہک جاتے ہیں
ورنہ اس راہ میں کعبہ نہیں بت خانہ نہیں

حسن سے پوچھ کبھی سوزِ محبت کا وقار
"شمع کے دل کا اجالا" ہے یہ پروانہ نہیں

خاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے گلوں کو میں نے
میں چمن میں ہوں مگر سبزۂ بیگانہ نہیں

چاندنی رات یہ جنت کا سماں یہ لبِ جو
ہوش میں اپنے جو رہ جائے وہ فرزانہ نہیں

کون ان عقل کے اندھوں سے الجھنے جائے
میں تو قابل کوئی وحشی نہیں دیوانہ نہیں

آزادی کی زنجیریں

ظفر رامپور کے ایک نامی گھرانے کا خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ وطن لے کر وطن میں رہتی تھیں۔ ظفر اور اس کا دوست ہردیال الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ حسینہ اور ظفر کی بچپن میں منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن، ذہانت اور قابلیت پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ظفر امتحان میں [illegible] تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں یہ رقابت کی خلش پیدا ہوئی اور اس نے پڑھنے میں جان کھپا دی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق خاطر ہے مگر یہ کانٹا برابر کھٹکتا رہا کہ لطیف صفدر علی صاحب کی توقعات کو پورا کرکے ان کے نزدیک حسینہ سے شادی کرنے کا مستحق نہ بن جائے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ خلش کو شوق اور امید کے ساتھ دل میں لئے ہوئے کالج کھلنے سے ایک دن پہلے الہ آباد پہنچ گیا۔ کالج کھلنے پر رفیع الدین صاحب کے ذریعہ جن سے پچھلے سال حلقۂ ادب میں ملاقات ہوئی تھی، ان کی چھوٹی بہن ریحانہ سے تعارف ہوا جنھوں نے اس سال فرسٹ ڈویژن میں داخلہ لیا تھا۔

(قسط ۲۴)

زندگی کا معمولی چکر شروع ہوگیا۔ اس بار ہردیال بھی ادھر ادھر کی دلچسپیاں کم کرکے اپنا زیادہ وقت پڑھنے میں صرف کرنے لگا۔ ظفر ہفتہ بھر کے کام سے فارغ ہوکر پابندی سے حسینہ کو پڑھانے جاتا تھا۔ دوسرے پھیرے میں وہاں لطیف سے ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ رڑکی کے مقابلے کے امتحان میں ناکام رہا اور اس نے انجنیئری کا ارادہ ترک کرکے کیمسٹری کے ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ صفدر علی صاحب کو سخت مایوسی ہوئی جس کے اظہار میں انھوں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ اس کے بعد ان کی دلچسپی لطیف سے کم ہونے لگی اور ظفر پر بہت نوازش فرمانے لگے۔

لطیف کا کانٹا نکل جانے سے حسینہ کی زندگی میں بہار آگئی۔ اس کی شگفتگی اور شادابی دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلی پوری طرح کھل کر پھول بن گئی ہے۔ ظفر کے ساتھ اس کے برتاؤ میں لڑکپن کی سادگی اور بے تکلفی کی جگہ جوانی کا ناز و انداز اور حجاب و رمیدگی غالب آگئی۔ ظفر اب اپنے آپ کو بڑا فطرت شناس سمجھنے لگا تھا۔ مگر وہ اس تبدیلی سے حیران اور مضطرب ہوگیا۔ اسے پھر شبہات نے گھیر لیا۔ اور اس کے دماغ پر یہ خیال منڈلانے لگا کہ حسینہ کو دراصل اس سے محبت نہیں بلکہ محض اپنی ماں کی خوشی کے لئے چار و ناچار اس سے تعلق خاطر کا اظہار کرتی رہی۔

ادھر ریحانہ کا دل فریب اور ہوش ربا حسن اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ اتنی بے تکلفی اور گرمجوشی سے ملتی تھی کہ ظفر کے حجاب کا حصار جسے اب تک کوئی لڑکی نہ توڑ سکی تھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اگر کسی گھنٹے میں ظفر اور ریحانہ دونوں کی چھٹی ہوتی تو وہ اپنے ساتھ کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتی اور سارے وقت اس کے ساتھ رہتی۔ وہ اس سے ایسی بے باکی سے ہنس ہنس کر گفتگو کرتی، اسے چھیڑتی، بناتی، چڑاتی جیسے اپنی جماعت کی لڑکیوں کو۔ اگر کبھی چلنے میں وہ پیچھے رہ جاتا تو بے تکلف ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹ لیتی تھی۔ ظفر کا دوران خون محض اس کے پاس کھڑے ہونے ہی سے تیز ہو جاتا تھا، اس کا ہاتھ جسم سے لگتے ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ رگوں میں بجلی کی تیز رو دوڑ گئی اور دل اس زور زور سے دھڑکنے لگتا کہ اسے دھڑکن کی آواز اپنے کانوں میں محسوس ہوتی۔ مگر وہ بڑی سخت کوشش سے اپنے آپ کو قابو میں رکھتا اور اپنی بے چینی کو ظاہر نہ ہونے دیتا۔ گفتگو میں وہ اپنے نزدیک ضبط اور رکھ رکھاؤ سے کام لیتا تھا۔ مگر لوگوں کو یہ نظر آتا تھا کہ وہ ریحانہ سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتا ہے جیسے کالج میں کسی اور لڑکے یا لڑکی سے نہیں کرتا۔

وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ریحانہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوتی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو یقین دلاتا تھا کہ حسینہ اور اس کی محبت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ حسینہ دیکھتی تھی کہ ظفر کے برتاؤ میں کچھ رکاوٹ اور دوری آگئی ہے۔ مگر وہ اسے اس پر محمول کرتی تھی کہ جس طرح نسبت کا یقین ہو جانے کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ شرمانے لگی ہے۔ اسی طرح ظفر کا حجاب بھی بڑھ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر کے دل میں ریحانہ کا تصور تیزاب کی طرح حسینہ کی تصویر کو اور اسی کے ساتھ اس کے سکون اور اطمینان کو روز بروز کاٹ رہا تھا۔ جس یکسوئی سے وہ پہلے مطالعے میں منہمک رہتا تھا اس میں بہت فرق پڑ گیا تھا۔ کتابوں کے صفحوں پر دفعتہً ریحانہ کے شوخ چہرے کی جھلک اس کے اجتماع خیال کو درہم برہم کر دیتی تھی۔ اور جب وہ سونے کو بستر پر لیٹتا تھا تب تو یہ روئے آتشیں گھپ اندھیرے میں اڑتا ہوا بیتال کی طرح رہ رہ کر چمکتا تھا اور وہ اس کے تعاقب میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ ظفر کا تخیل ریحانہ کو کسی ملکوتی طلسم کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر لوح خیال پر جنسی اختلاط کے ایسے بے باک منظر دکھائی دینے لگتے تھے کہ وہ خون کے تاؤ اور شرم کی گرمی سے پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ ایک نامانوس لذت اور ایک نامعلوم خوف کا احساس اس کے دماغ کو منتشر کر دیتا تھا۔ اسے بڑی دیر میں نیند آتی تھی اور سوتے میں یہی کیفیات اور تصورات خواب پریشان کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ دن کو وہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ ورزش چھوٹ گئی تھی اور کھانا پینا کم ہوگیا تھا جس کا اثر اس کی صحت پر برابر پڑ رہا تھا۔

ہردیال ظفر کی حالت کو دیکھ رہا تھا اور اس سے بہت متفکر تھا۔ اس نے ایک بار مذاق کے پیرائے میں متنبہ کرنے کی کوشش کی کہ ریحانہ سے اتنا ربط ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظفر نے اس پر بدگمانی کا الزام لگایا اور خفا ہو کر بول چال بند کر دی۔ کئی دن تک دونوں کو وہ قلبی اذیت اٹھانی پڑی جو گہرے دوستوں کو باہمی رنجش سے اٹھانی پڑتی ہے۔ ہردیال نے منت خوشامد کا سوانگ بھر کر بڑی مشکل سے اسے راضی کیا۔ اس نے سوچا کہ چھیڑنے اور سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ظفر کی طبیعت کو دوسری طرف متوجہ کرنے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہئے۔ اس نے ظفر کی میز کی دراز میں ان افسانوں کے مسودے دیکھے تھے جو ظفر نے تعطیل میں لکھے تھے اور چوری سے پڑھے بھی تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر ان افسانوں کو کسی رسالے میں چھپوا دیا جائے تو غالباً لوگ بہت پسند کریں گے ظفر سے اور افسانوں کی فرمائش ہوگی اور اگر وہ لکھنے پر آمادہ ہو گیا تو اس کا دھیان بٹ جائے گا اور اس کی طبیعت کا ہیجان باہر نکلنے کی ایک نئی راہ ڈھونڈ لے گا۔ چنانچہ اس نے موقع پاکر "نالۂ نے" کا مسودہ اڑا لیا اور مولانا سائل کو دفتر کشکول کے پتے پر بھیج دیا۔

اس کے کئی ہفتے بعد ایک دن کالج میں ریحانہ ظفر کے نام اپنی والدہ کا پیغام لائی کہ اگر فرصت ہو تو اتوار کو ساڑھے چار بجے کی چائے ان کے ساتھ پیجئے۔ ظفر نے کہا میری طرف سے عرض کر دینا کہ میں ضرور حاضر ہوں گا۔ اس وقت اس نے ریحانہ کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ دیکھی اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات نے ایک ہلچل برپا کر دی۔ کالج میں اس روز اس کا دماغ اس قدر منتشر رہا کہ لیکچروں کے نوٹ نہ لے سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریحانہ سے باتیں کرنے کا موقع ملے تو وہ اس تبسم کے معنی پوچھے۔ مگر اتفاق سے تین دن تک ریحانہ کا کوئی گھنٹہ خالی نہ تھا اور اس سے بات چیت تو کیا صاحب سلامت بھی نہ ہو سکی۔ یہ تین دن کاٹنا ظفر کے لئے مشکل ہوگیا۔ اس کا قوی تخیل چائے کی دعوت کو بہانہ سمجھ کر ریحانہ سے خلوت کی ملاقات کے گوناگوں نقشے کھینچتا تھا اور مٹا دیتا تھا۔ کبھی اشتیاق اور امید کے طوفانی جھونکے دل میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔ کبھی خوف اور یاس کی تند ہوا وہ سکون طاری کر دیتی تھی جس سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔

اس نے عقیلہ بیگم کو ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا کہ میں ایک ضروری کام کی وجہ سے اس اتوار کو نہیں آ سکوں گا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ حسب معمول حسینہ کو پڑھانے گیا تو اس کے لئے اپنے دل کے اضطراب اور ہیجان کو چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ خصوصاً عقیلہ بیگم کی تیز نظر ضرور اس کی حالت بھانپ لے گی۔

اتوار کے دن ساڑھے تین بجے تک ظفر نہانے اور کھانے کے اوقات کو چھوڑ کر مسلسل کتابوں کے

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

جدید انگریزی شاعری

علی حماد عباسی

"ہماری شاعری کا مستقبل بہت ہی شاندار ہے اور اپنی عظمت کو برقرار رکھنے والی۔ کیونکہ یہی شاعری ہی ہمارے آیندہ ہماری قومی عظمت اور سربلندی کی بنیاد رکھی جائے گی" یہ بات میتھیو آرنلڈ جیسے بلند پایہ اور عظیم المرتبت نقاد نے انگریزی شاعری کے مستقبل کے متعلق کہی تھی اور وہ بھی اس حالت میں جب کہ وہ وکٹورین انگلستان کی تہذیبی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے سخت مایوس اور بیزار تھا ہو سکتا ہے، اس کی یہ بات ایک زمانے میں بڑے ہی شوق اور حوصلے کے ساتھ سنی اور مانی گئی ہو لیکن اب تو اس کی حیثیت ایک غلط اور الٹی پیشین گوئی سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ آج کل انگریزی شاعری جس بحران سے گذر رہی ہے اور جس طرح وہ عوام میں دن بدن اپنی ہر دل عزیزی کھوتی جا رہی ہے۔ اس حقیقت نے آرنلڈ کے اس قول کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف آج کل کے تمام بڑے بڑے نقادوں نے بھی کیا ہے۔ آئی اے رچرڈس نے اپنی کتاب "سائنس اور شاعری" میں لکھا ہے۔ "آج کل یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہے کہ شاعری کا مستقبل بہت ہی مایوس کن ہے۔ اس لئے کہ ایسے بہت سے نوجوان جن میں بہترین شاعر بننے کی کافی صلاحیتیں موجود ہیں یا کیمسٹری کے معمل میں کام کرتے ہیں" ایک دوسرے مشہور نقاد ایف آر لیوس نے بھی بالکل اسی طرح کی بات کہی ہے "موجودہ دور میں شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے صرف گنتی کے چند نوجوان شاعری کا ذوق اور رجحان رکھتے ہیں"

آخر ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی سب سے عظیم شاعری اس زبردست بحران سے دوچار ہے جو اس کی زندگی میں آج سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا اور وہ کیا اسباب ہیں کہ وہ آہستہ آہستہ عوام سے الگ ہوتی جا رہی ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی شاعری میں رومانی تحریک دم توڑنے لگی تھی۔ نہ ایک سائنس جو باقی رہ گئے تھے وہ بھی اکھڑے اکھڑے تھے جس پودے کو ورڈسورتھ اور کولرج نے بڑے جتن سے لگایا تھا اور جس کو شیلی، کیٹس اور بائرن جیسے نوجوان شاعروں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا وہ پودا اب مرجھا چلا تھا۔ اسی درمیان میں صنعتی انقلاب آگیا جس نے زندگی کی کایا پلٹ دی۔ برسوں سے جو رسم و رواج اور اعتقادات چلے آ رہے ہیں ان پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور ایسا ۱۹۱۴ء تک ہوتا رہا۔ اور پہلی جنگ عظیم کے چھڑتے ہی وکٹورین دور کے رہے سہے اثرات بھی لوگوں کے ذہن سے مٹ گئے۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو شاعروں نے اپنے آپ کو خیالات اور تصورات کی ایک نئی دنیا میں پایا۔

اسی زمانے میں انگریزی شاعری کے میدان میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کا ظہور ہوا۔ ان لوگوں نے شاعری کو حقیقت سے وابستہ کیا اور اس کا رشتہ براہ راست زندگی سے جوڑنا چاہا۔ لیکن چونکہ ان کا نقطۂ نظر یک طرفہ اور انتہا پسندی کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس لئے وہ زندگی کے نئے تقاضوں اور شاعری کے نئے مسائل کو پوری طرح سے نہ سمجھ سکے۔ لیکن بہرحال انھوں نے انگریزی شاعری میں نئی باتیں ضرور پیدا کیں مبہم سہی، مگر انھوں نے عصری میلانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ساتھ موضوع، ہیئت اور بحر و قافیہ میں نئے نئے اسالیب پیدا کئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید انگریزی شاعری کی بنیاد ڈالنے والے ایلیٹ اور پاؤنڈ ہیں۔ اور جدید شاعری میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی کی رومانی شاعری میں ورڈسورتھ اور کولرج کو حاصل ہے۔

اس نئی شاعری کی اٹھان یقیناً بہت اچھی تھی، مگر بعد میں اس میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اس کے علاوہ نئے شاعروں نے جوش میں قدیم اور رومانی شاعری کی اچھائیوں کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ رومانی شاعری، خیالات، تصورات اور احساسات سے مالا مال تھی۔ اس کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ جدید شاعری خشک، بے جان اور دقیق اصطلاحات اور استعارات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی۔ اس کا فوری ردعمل ہوا۔ ہربرٹ ریڈ اور ڈے لیوس وغیرہ نے اس کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی، لیکن اس مخالفت کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا شاعری کی دنیا پر ایلیٹ پاؤنڈ اور ہاپکنس کے اثرات جوں کے توں قائم رہے رومانی شاعری کے خلاف ان لوگوں نے تو محاذ قائم ہی کر رکھا تھا، ملٹن اور اسپنسر کو حقیر اور معمولی ثابت کرنے کی بھی ان تھک کوشش کی گئی۔ ملٹن نے ایک جگہ لکھا تھا کہ شاعری کو آسان، دلکش اور جذبات سے بھرپور ہونا چاہئے مگر اس کی بات کو ٹھکرا کر تحیر، ابہام اور اشارت کو شاعری کے امتیازی اوصاف قرار دیا گیا۔ ڈان جیسے معمولی شاعر کو بانس پر چڑھا کر ملٹن کے برابر کھڑا کر دیا گیا اور اس کی دور از فہم تشبیہات اور استعاروں کو بڑے فخر کے ساتھ سراہا گیا۔ جس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ جدید انگریزی شاعری ایک معمہ ہو کر رہ گئی اور لوگوں کی ضرورت سے بھی زیادہ ادیبوں کے لئے اس شاعری سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہو گیا۔ ایلیٹ اور پاؤنڈ نے اس پر اتنا اور رنگ چڑھایا اور شاعری کو پیچیدہ اور مشکل اور اشاراتی بنا دیا۔ اب اس شاعری کو سمجھنے کے لئے صرف زندگی کے مسائل سے ہی واقفیت رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ خاص علمی اور جدید اصطلاحات سے واقفیت بھی ضروری تھی۔ چنانچہ ایلیٹ کی کتاب ویسٹ لینڈ (WASTE LAND) اور ایش ونسڈے (ASH WEDNESDAY) کو سمجھنے کے لئے پانچ، چھ معاون کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب شاعری کوئی کھلا ہوا شگوفہ نہیں ہے کہ جو جس نے بھی چاہا اس سے لطف اٹھا لیا۔ بلکہ اب صرف محدود لوگوں کی دلچسپی کی چیز ہو کر رہ گئی ہے عام اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے کتاب کے آخر میں کچھ حوالے، اشارات اور نوٹ لکھ دئے گئے ہیں۔ اس سے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اوسط تعلیم یافتہ ان اشارات کی قندیل کی مدد سے ابہام اور مشکل پسندی کے اندھیرے میں کچھ دور چلتا ہے مگر آگے چل کر اس کا ذہن اور فہم رکنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ شاعر نے کیا کہا، کیوں کہا اور کس سے کہا۔ ڈبلیو۔ کے۔ رچینڈ نے اپنی کتاب "شاعری اور عوام" میں ایلیٹ اسکول کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "میں اس شاعری کو بالکل نہیں سمجھ سکا اس لئے میں اس پر کوئی رائے قائم کرنے کے بجائے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ شاعری ناقابل فہم اور عام زندگی سے دور ہے"

کچھ ترقی پسند نقادوں نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی اور جدید شاعری کی رجعت پسندی کو بے نقاب کیا، لیکن ایلیٹ اسکول کے حامیوں پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ایف آر لیوس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شاعری ایک ایسا وجدانی اور ذوقی فن ہے کہ اسے صرف تھوڑے سے ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مستقبل میں شاعری عوام کے لئے اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ آئی اے رچرڈس کا کہنا ہے کہ آیندہ شاعری اور بھی علامتی اور دقیق ہوگی جس کو صرف بڑے بڑے دماغ ہی سمجھ پائیں گے اس لئے ایسی شاعری کا حلقہ لازماً محدود ہوگا۔ رچرڈس کے خیال میں شاعری کا حلقہ محدود ہونا ہی چاہئے کیونکہ ہر زمانے میں اچھی اور بلند پایہ شاعری کو چند مخصوص لوگوں ہی نے سمجھا ہے اور انھوں ہی نے دوسروں کو سمجھایا ہے۔ مثلاً ملٹن، سپنسر، شیلی اور دوسرے

اس ادبی اور فنی بحران کی وجہ سے چند مسائل ہیں۔ ایک طرف تو آج کی تہذیب پیداوار کی طاقتوں کو بڑھانا چاہتی ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔ اور دوسری طرف جنتا کو روزی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں لوگ شاعری

دنیا کی تیسری طاقت۔ ایشیا

ہند اور پاکستان کی مشترک ذمہ داریاں

ڈاکٹر پرسرام

ترقی یافتہ ملکوں کے لئے آج کل اپنی مصنوعات کی کھپت کا انتظام کرنا خاصا پیچیدہ اور مشکل ہو گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور سائنسی دور ترقی میں جس تیزی کے ساتھ اور غیر محدود مقدار میں چیزیں پیدا کی جاتی ہیں عام حالات میں اسی سرعت اور اسی مقدار میں ان کی کھپت نہیں ہوتی۔ بعض ماہرین معاشیات کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ جوں جوں مصنوعات میں ترقی ہوتی جاتی ہے، اسی لحاظ سے قوت خرید کم ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ملک یا کارخانہ ہر مہینے دس ہزار موٹریں تیار کرتا ہے تو ہر مہینے دو ہزار کا بکنا بھی مشکل ہے تو ایسی صورت میں چیزیں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کھپت اور نکاس کی صورتیں بھی سوچی جاتی ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ خریداری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا کی جائیں۔ مثلاً ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قسطوں پر چیزیں بیچی جائیں جیسا کہ امریکہ میں عام طور پر ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے جہاں کم سے کم مقابلہ اور زیادہ سے زیادہ کھپت ہو۔ آج کل دنیا میں جو کشمکش نظر آتی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی ضرورت ہے۔

یورپ اور امریکہ کا دنیا کی تمام بڑی بڑی منڈیوں پر صدیوں سے قبضہ ہے اور اس کی بدولت انھوں نے خوب لوٹ کھسوٹ کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات اس قدر بدل گئے ہیں کہ اب ان کے لئے ان منڈیوں پر قبضہ رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی دو طرح کی ہوئی ہے ایک تو یورپ کو اب وہ سیاسی غلبہ حاصل نہیں رہا جو جنگ سے پہلے اسے حاصل تھا اس کی وجہ سے سامراجی بندھن ڈھیلے ہوئے، اور پس ماندہ ملکوں میں سیاسی بیداری کافی آگے بڑھ گئی دوسرے پچھلی لڑائی کے زمانے میں یورپ کے کارخانے سامان جنگ بنانے میں مشغول ہو گئے اور نقل و حمل میں زمانۂ امن کی سہولتیں باقی نہیں رہیں۔ اس لئے روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنا یورپ کے بس سے باہر ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پس ماندہ ملکوں میں بھی بہت سی چیزیں بنائی جانے لگیں۔ اور جہاں کی صنعتیں قریب قریب ختم ہو چکی تھیں وہاں از سر نو زندہ ہونے لگیں۔ دوسری طرف یورپ کو اس لڑائی میں اتنا شدید نقصان پہنچا کہ اس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔ البتہ امریکہ کو نقصان کم پہنچا اور فائدہ زیادہ ہوا مگر یہ مسئلہ اس وقت اس کے لئے بھی پریشانی کا باعث ہے کہ جنگ کے زمانے میں کارخانوں کو جو ترقی ہوئی ہے اس کو برقرار کیوں کر رکھا جائے۔ اگر تمام کارخانے حسب معمول جاری رہتے ہیں تو ان کی چیزوں کے لئے منڈیوں کی ضرورت ہے اور منڈیوں کے حصول میں بہت سی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں اور اگر انھیں بند کیا جاتا ہے تو ان کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کام مہیا کرنا حکومت کے بس سے باہر ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس لڑائی میں امریکہ کو دنیا کی چودھراہٹ مل گئی ہے، مگر وہ بھی گوناگوں پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں ایشیائی ملکوں کا فرض کیا ہے؟ کیا وہ حسب معمول کسی بیرونی طاقت کے غلام بنے رہیں یا موجودہ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کریں اور بین اقوامی سیاست میں تیسری طاقت کی حیثیت سے ایک ممتاز اور نمایاں جگہ پیدا کریں۔

اگر ایشیائی ممالک اپنی حیثیت کو پہچانیں اور جرأت اور تدبر سے کام لیں تو نہ صرف یہ کہ عالمی برادری میں ان کی ایک حیثیت ہوگی بلکہ بہت سے مسائل میں ان کی رائے فیصلہ کن ہوگی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۷ء میں ایشیائی ملکوں کی کانفرنس میں بالکل صحیح فرمایا تھا کہ روس اور امریکہ کے علاوہ اس وقت ایک تیسری طاقت ابھر رہی ہے اور وہ ایشیا ہے۔

ایشیا کو تیسری طاقت بنانے میں سب سے بڑی ذمہ داری ہندوستان اور پاکستان پر ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں میں اتحاد اور صلح ہو اور دونوں جگہ امن و امان ہو۔ اب جبکہ نہرو لیاقت سمجھوتے کی وجہ سے دونوں ملکوں میں خوش گوار فضا پیدا ہوئی ہے۔ دونوں جگہ کے عوام کا فرض ہے کہ وہ اس فضا کو پائدار بنائیں اور جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور کریں جن سے دونوں ملک گھرے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے ہم ترقی کے بجائے تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا اسباب ہیں کہ ملک کے تقسیم ہو جانے کے باوجود ہمارے مسائل جوں کے توں ہیں نہ مسلمان ہندوستان میں آرام کی نیند سو سکتا ہے اور نہ ہی ہندو پاکستان میں۔ آبادی کے تبادلے نے کروڑوں کو تباہ اور بے گھر کر دیا مگر چین اب بھی کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ہماری طاقت جو تعمیری کاموں میں صرف ہونی چاہئے تھی آپس کے جھگڑوں میں صرف ہو رہی ہے۔ دنیا اس وقت تیسری لڑائی کی تیاری کر رہی ہے اور ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی فکر میں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس عظیم الشان مقصد کے لئے جنگ آزادی لڑی گئی تھی، وہ بالکل پس پشت جا پڑا اور ہم فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ اندرونی اور بیرونی خطروں کو محسوس کریں اور آپس کے تعاون اور اشتراک عمل سے ہندوستان اور پاکستان کو مضبوط بنائیں اور بحیثیت ایشیائی جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کریں ——— ہندوستان اور پاکستان کے اتحاد میں نہ صرف ان دونوں کی بھلائی اور بہبودی ہے بلکہ پورے ایشیا کی آزادی اور سربلندی ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۸)

ہندوستان کو یقین ہے کہ اس سے ایشیا کی قومیں ہندوستان سے ناراض ہو جائیں گی اور روس اور چین ہندوستانیوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے۔ امریکہ ہندوستان کے اس رویہ سے خوش نہیں۔ لیکن ہندوستان کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ آسٹریلیا جاپان کو جنوب مشرقی ایشیا کا لیڈر یا دوسرے لفظوں میں امریکہ برطانیہ اور فرانس کے مفاد کا نگہبان بنایا جائے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ آخری نتیجہ کیا ہوگا لیکن یہ ظاہر ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا امریکہ اور روس کی ٹکر کا میدان بن رہا ہے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایچی سن نے صاف لفظوں میں ہند چینی میں فرانس کی امداد کا اعلان کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ امریکہ کو اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ہند چینی کی مدد کرنا چاہئے۔ مارشل پلان کے منتظم مسٹر ہافمین نے اس سلسلے میں کہا ہے کہ:۔

"اگر ہم نے تیزی کے ساتھ قدم آگے نہ بڑھایا اور ہند چینی کے بچاؤ کے لئے کوئی مناسب پروگرام نہ بنایا تو ہند چینی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ فرانس اس رفتار سے کامیابی حاصل نہیں کر رہا ہے جس رفتار سے اسے کرنی چاہئے"

یہ خطرے کا سگنل ہے۔ چین اور روس کی ہمدردی ہند چینی کے کمیونسٹ لیڈر ہوچی منہ کی گورنمنٹ سے ہے انھوں نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اگر امریکہ ہند چینی میں فرانس کی امداد کرے تو روس اور چین خاموش رہیں۔ یہ ایسی صورت حال ہے کہ جس سے کسی وقت امریکہ اور روس میں تصادم ہو سکتا ہے۔

آزادی کی زنجیریں (بہ سلسلہ صفحہ ۶)

ورق لوٹتا رہا، کورس کی کتابوں کا تو کیا ذکر ہے۔ دلچسپ سے دلچسپ ناولوں اور افسانوں پر بھی اس کی طبیعت کسی طرح نہیں لگتی۔ اسے جیتے جاگتے دل کش رومان کے مقابلے میں جو خود اسے درپیش تھا دوسروں کی رومانی داستانیں بے مزہ اور بے جان معلوم ہوتی تھیں۔ ہردیال جو دن بھر محنت سے کام کرنے کے بعد اتوار کو صبح سے دوستوں سے ملنے ملانے نکل جایا کرتا تھا اور شام کو آتا تھا۔ اس لئے ظفر نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کیا نہ نے اس جلسے پر مدعو ہے دس سال کی دوستی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ظفر نے ہردیال سے کوئی بات بالقصد چھپائی۔

شرح اشتہارات ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم

ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں۔ (منیجر)

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی

حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ امسال رمضان المبارک کے بعد مندرجہ ذیل جہازات حسب ذیل تاریخوں کے لگ بھگ بمبئی سے حاجیوں کو لے کر جدہ کے لئے روانہ ہوں گے۔

جہاز		تاریخ	
ایس، ایس "محمدی"	۷۰۲۶	۲۰ جولائی	۱۹۵۰ء
ایس، ایس "اسلامی"	۵۸۷۹	۲۱ "	"
ایس، ایس "اکبر"	۴۰۴۷	۲۳ "	"
ایس، ایس "علوی"	۳۵۶۶	۲۵ "	"
ایس، ایس "رضوانی"	۵۴۴۸	۱۲ اگست	"
ایس، ایس "مظفری"	۷۰۲۴	۱۳ "	"
ایس، ایس "جہانگیر"	۳۵۶۶	۲۰ "	"
ایس، ایس "خسرو"	۴۰۴۳	یکم ستمبر	"
ایس، ایس "رضوانی"	۵۴۴۸	۴ "	"
ایس، ایس "محمدی"	۷۰۲۶	۶ "	"

روانگی کی ٹھیک ٹھیک تاریخوں اور جدہ سے واپسی کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

جہاز کا کرایہ (مع خوراک)

بمبئی جدہ واپسی

درجہ (اول) ... ... ۱۱۰۵ روپے

عرشہ (ڈیک) ... ... ۳۹۸ "

ان کرایوں میں قرنطینہ کامران، حفظانِ صحت، جدہ کے محصل اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں جن کی مجموعی رقم ۴۷ روپے ۱۲ ار ہوتی ہے۔

نشستیں محفوظ کرائیے

عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اولین فرصت میں ان جہازوں کے لئے اپنی نشستیں محفوظ کرالیں، تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ درخواست کے ساتھ مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) ہر عازمین حج کا پورا نام (۲) والد یا شوہر کا پورا نام

(۳) جنسیت یعنی مرد یا عورت (۴) عمر

(۵) پورا پتہ خوش خط (۶) کس درجے کا ٹکٹ درکار ہے

(۷) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کرنا بھی ضروری ہے۔ خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں۔

درخواست بھیجنے کا پتہ:-

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس:-
دی مغل لائن لمیٹڈ
۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

تار کا پتہ:-
MOGUAL
BOMBAY

A world of Entertainment is yours with

G. Marconi

MARCONIPHONE

THE REAL THING IN RADIO

THE RADIOSALES LTD., RADIO HOUSE, APOLLO BUNDER, BOMBAY. 1.

اچھی چھپائی

ہم ہر قسم کے بہترین "ٹائپ میٹل" بناتے ہیں جو کہ ہندوستان بھر کے تمام مشہور چھاپے خانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ کم خرچ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ ہمارے بنائے ہوئے "اینٹی ٹائپ میٹل" اور "مونو ٹائپ میٹل" کی چھپائی نہایت صاف اور خوبصورت ہوتی ہے۔

نیچے لکھے ہوئے پتہ پر دریافت کیجئے۔

انڈین اسٹینڈرڈ میٹل کمپنی لمیٹڈ

چند اچھی کتابیں

ادبی

باغی ۔ از آصف علی	۱۲ر
نئے چراغ	۱؎
رسم تہذیب	۱۲ر
تاریخ زبانِ اردو	۱۲ر
تعمیرِ حیات	۱۲ر
نئی دنیا کو سلام	۷ر
نفرت کا بیج (ڈراما)	۱۲ر
دیوانِ غالب ۔ مطبوعہ جامعہ	۱۲ر
تسخیرِ سائنس	۵ر

تعلیمی

ہم کیسے پڑھائیں ؟
از ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب
ٹریننگ اسکول کے زیرِ تربیت استادوں
کی ضرورت کی چیزیں اور اس میں پڑھانے
کے طریقے بیان کئے گئے ہیں ۔ قیمت ۱۲ر

تعلیمی تاش اردو	۱۲ر
" " ہندی	۱۲ر
" " انگریزی ہندی	۱۲ر
" " " اردو	۱۲ر

جوئے شیر

آنند نرائن صاحب مُلّا کا مجموعۂ کلام حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ مُلّا صاحب کا کلام محتاج تعارف نہیں۔ کتاب ضخیم ہے۔ کتابت کاغذ بہت عمدہ۔ قیمت صر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، دہلی

پردۂ غفلت

از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر
تعلیم نسواں اور پردے پر مفید بحث
ایک دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ ۔
قیمت عہر

تلاشِ حق

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
یہ وہ کتاب ہے جسے عوام و خواص دونوں نے
پڑھا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ایک اچھے ترجمے
کی حیثیت سے بہت پسند کیا گیا ہے۔
قیمت حصہ اول ہے ۔ حصہ دوم سے ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ←
(۱) ڈاکخانہ، جامعہ نگر، دہلی
(۲) پرنسس بلڈنگ نزدیک جے جے ہسپتال بمبئی نمبر ۳

Printer & Publisher Abdul Latif Azmi, B. A. (Jamia)
Printed at Jayyed Electric Press Ballimaran, Dehli.

ہفتہ وار

نئی روشنی

नई रोशनी دہلی

فہرست مضامین

جلد ۹ | یکم جولائی سنہ | نمبر ۱

دوسرے منصوبہ کا سیاسی اور معاشی پہلو — عبد اللطیف اعظمی
پچھلا ہفتہ :۔
ہند اور بیرون ہند میں — ع ، ح ۔ ع ، ل
پیرمے نکلف
تابش سہیل — اقبال احمد سہیل
غزل — باقر مہدی
بیخود موہانی مرحوم — سید اختر علی تلہری
آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) — ڈاکٹر سید عابد حسین
ہندوستان میں ترقی کے امکانات — محمد امین
تانتا رام کا جہیز

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی

شومین منصوبہ کا سیاسی اور معاشی پہلو

عبداللطیف اعظمی

مئی کے پہلے ہفتے میں، لندن میں تین بڑے ملکوں کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس میں فرانس کے وزیر خارجہ موسیو شومین نے، مغربی یورپ کے کوئلے اور فولاد کی پیداوار کو ایک مشترک اور واحد انتظام کے ماتحت رکھنے کی اسکیم پیش کی تھی جسے شومین منصوبہ کہتے ہیں۔ اس منصوبے کا مغربی یورپ کے تمام ملکوں ——— اور امریکہ نے بھی، نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ مگر اس سے برطانیہ کی "چودھراہٹ" پر براہ راست ضرب آتی ہے اس لئے باوجود اس کے کہ اس نے فرانس کے اس اقدام کو سراہا ہے مگر فی الحال اس میں شرکت سے معذوری ظاہر کی ہے۔ چنانچہ ۲۰ جون کو پیرس میں اس اسکیم پر مزید غور کرنے کے لئے جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں برطانیہ شریک نہیں ہوا۔ اس منصوبہ کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک سیاسی، دوسرا معاشی۔ پیش نظر مضمون میں انھیں دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی بحالی کے لئے اب تک جتنی اسکیمیں پیش کی گئی ہیں، شومین منصوبہ ان سب سے ایک قدم آگے، اور یورپی اتحاد کی طرف پہلا قدم ہے۔

سیاسی پہلو

اس منصوبے کا مقصد سیاسی بھی ہے اور معاشی بھی۔ سیاسی تو یہ ہے کہ جرمنی کے کوئلے اور فولاد کی پیداوار پر قبضہ کر کے، اسے کبھی اس کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ پھر لڑائی کی تیاری کر سکے۔ جرمنی کو لڑائی کی تیاری میں سب سے زیادہ مدد روہر سے ملتی ہے۔ روہر نہ صرف یہ کہ یورپ میں، روس کے علاوہ کوئلے کا سب سے بڑا مرکز ہے بلکہ وہاں کوئلے کی بہترین قسمیں بھی پائی جاتی ہیں خصوصاً وہ کوئلہ جو لوہے کو پگھلانے میں کام آتا ہے۔ وہاں بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ خام دھات کو صاف کرنے کی عظیم الشان صنعتوں کا یہ مرکز ہے اور یہ واقعہ ہے کہ انھیں صنعتوں کی بنیاد پر جرمنی نے بہت کم مدت میں پہلی جنگ عظیم کی تباہی کے بعد دوسری لڑائی کے لئے بہت بڑے پیمانے پر تیاری کر لی تھی۔ اگر ان صنعتوں کو ترقی کرنے کے لئے یونہی چھوڑ دیا جاتا تو جرمنی پھر تیسری لڑائی کے لئے تھوڑے ہی سے وقفے میں تیار ہو جاتا اس لئے لڑائی جیتنے کے بعد اتحادیوں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا طریقے اختیار کئے جائیں کہ جرمنی آئندہ سر نہ اٹھا سکے۔

برطانیہ کا لیت و لعل اور ساتھیوں کا دباؤ

اتحادیوں کی اب تک پالیسی یہ تھی کہ جرمنی کو زیادہ سے زیادہ دبایا جائے چنانچہ ایسی تمام فیکٹریاں ختم کر دی گئیں جن میں ہتھیار بنایا جا سکتا تھا۔ خام دھات کو صاف کرنے والی فیکٹریوں کے بغیر یورپ کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے ان کو ختم تو نہیں کیا گیا مگر ان پر نگرانی بڑی سخت کر دی گئی اور بے شمار پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ لیکن شومین منصوبہ میں اس سے بالکل مختلف پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ اس پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی جرمنی کی صنعتی پیداوار سے یورپ فائدہ بھی اٹھائے اور جرمنی خطرے کا باعث بھی نہ بنے۔ چنانچہ بجائے محض جرمنی کی صنعتی پیداوار پر بیرونی قبضے اور نگرانی کے، اس منصوبہ میں تجویز کیا گیا ہے کہ جرمنی، فرانس، برطانیہ، بلجیم، ہالینڈ، لکسمبرگ اور اٹلی کے کوئلے اور فولاد کی پیداوار کو ایک بین اقوامی نگرانی میں دے دیا جائے اور اس نگرانی کے جو قاعدے، قانون بنائے جائیں تمام ممبر ممالک ان کے پابند ہوں۔ اصل تجویز میں اگرچہ صرف جرمنی اور فرانس کے کوئلے اور فولاد کی پیداوار کی مشترک نگرانی کا ذکر ہے اور یورپ کی دوسرے ملکوں کو اس میں شرکت کی عام دعوت دی گئی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ اتحاد صرف جرمنی اور فرانس تک محدود رہا تو توازن باقی رکھنا مشکل ہو جائے گا اس لئے کہ روہر کی پیداوار کا تنہا فرانس کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لئے بلجیم کی کوئلے اور لوہے کی صنعت، فیکٹریاں لکسمبرگ کے کچی دھات صاف کرنے والے کارخانے اور ہالینڈ کی کوئلے کی کانیں بھی شامل کر دی جائیں تو صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔ منصوبے کو کامیاب بنانے اور متوقع مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کی شرکت بہت ضروری ہے چنانچہ فرانس اور امریکہ کی طرف سے اس پر کافی دباؤ پڑ رہا ہے۔ امریکی سینیٹ کے ریپبلکن ممبروں نے تو یہاں تک دھمکی دی ہے کہ اگر برطانیہ شریک نہ ہو تو بطور جرمانہ ۴۰ء۳ ملین پاؤنڈ کی مارشل امداد بند کر دی جائے، خود برطانیہ کی مخالف پارٹی ——— کنزرویٹو اور لبرل ——— مطالبہ کر رہی ہے کہ جن شرائط پر ہالینڈ نے شرکت کی ہے انھیں پر برطانیہ بھی شریک ہو، لیکن لیبر حکومت شرکت کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہے۔

معاشی پہلو

معاشی نقطۂ نظر سے اس منصوبے کا پہلا مقصد یہ ہے کہ یورپ کی صنعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ جرمنی کی صنعتی پیداوار پر پابندی لگانے سے تنہا جرمنی کو نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ پورے یورپ کی پیداوار پر اثر پڑتا ہے۔ شومین منصوبے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جرمنی کی صنعتی صلاحیتوں سے پورے مغربی یورپ کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مشترک نگرانی کی وجہ سے نہ تو وہ امن عالم کے لئے خطرے کا باعث ہوگا اور نہ صنعت و تجارت میں مقابل کی حیثیت سے [illegible]

کوئلے کی کانیں
لوہا اور فولاد

نئی روشنی

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبد اللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرونِ ہند میں

صنعتی صلح کی مدت ختم ہو رہی ہے

پنڈت جواہر لال نہرو کی اپیل پر ۱۹۴۷ء سے تین سال کے لئے صنعتی سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ ملک جس نازک دور سے گزر رہا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں تک ہو سکے گا آپس میں اچھے تعلقات رکھیں گے اور اگر کوئی جھگڑا ہوا بھی تو اسے صنعتی عدالت یا غیر سرکاری پنچایت کے ذریعے سے طے کریں گے۔ مجموعی طور پر اس معاہدے کی پابندی ہو رہی ہے۔ خصوصاً مزدوروں نے اب تک شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا ہے۔ ان کے حب وطن کی داد دینی چاہئے کہ اس گرانی کے زمانے میں انھوں نے کبھی مزدوری بڑھانے پر بے جا اصرار نہیں کیا بلکہ اپنے جائز مطالبات کو پیش کرنے میں بھی صبر و تحمل اور سلامت روی سے کام لیا۔ سیاسی موقع پرستوں نے بڑی بڑی کوششیں کیں کہ حکومت کو زک دینے کے لئے ہڑتالیں کرائیں۔ لیکن بعض چھوٹی چھوٹی ہڑتالوں کے سوا کوئی بڑی کل ہند اسٹرائک نہیں ہونے پائی۔

اب سے چھ مہینے کے بعد یہ عارضی صلح کی مدت ختم ہونے والی ہے اور تینوں فریق یعنی حکومت مزدور اور سرمایہ دار یہ سوچ رہے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ حکومت کی طرف سے ایک "واجبی اجرت کا بل" مرتب کیا گیا ہے اور عن قریب رائے عامہ کے معلوم کرنے کے لئے شائع کیا جائے گا۔ سرمایہ داروں نے ابھی سے اس کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ انھیں نہ صرف اس تجویز پر اعتراض ہے کہ مزدوروں کو منافع میں حصہ دیا جائے بلکہ وہ اسے بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ اجرت بڑھانے کے مسئلے پر غور کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ صنعت کو توسیع دی جائے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو اور قیمتوں میں کمی کی جا سکے۔ اگر مزدوری بڑھا دی گئی تو نفع کی شرح بہت کم ہو جائے گی۔ پرانے کارخانوں کے مالکوں کے پاس اتنا بچے گا نہیں کہ وہ نئے کارخانوں میں لگا سکیں اور دوسرے لوگ جن کے پاس فالتو روپیہ ہے کم نفع کی وجہ سے کارخانے کھولنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ان کی ساری منطق کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ اجرت کی شرح میں اتنا زیادہ اضافہ ہونے والا ہے جس سے منافع قریب قریب ختم ہو جائے گا۔ جب تک مجوزہ بل کی دفعات سامنے نہ آئیں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔ بل کے نام سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اضافہ واجبی ہوگا یعنی سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔ بہر حال سرمایہ داروں کی قبل از مرگ واویلا نہایت نامناسب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ اس فراخ دلی کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہیں ہیں جس کا ثبوت مزدوروں نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آجروں کا رویہ یہی رہا تو مزدور اس ہمدردی کے باوجود جو انھیں قومی حکومت سے ہے اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے ہر قسم کے جائز اور موثر ذریعے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے یہاں تک تو خیر غنیمت ہے مگر اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ الیکشن قریب ہونے کی وجہ سے حکومت کے مخالفوں کا معقول اور ذمہ دار عنصر بھی مزدوروں کی بے چینی سے سیاسی فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رہے گا۔ اس لئے انسانی ہمدردی اور انصاف کے علاوہ غرض اور مصلحت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ حکومت "واجبی اجرت کے بل" کو قانون کی شکل دینے میں مضبوطی سے کام لے اور صنعتی سرمایہ داروں کے شور سے متاثر نہ ہو۔

مہاجروں کو واپسی کا موقع

نہرو لیاقت معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ مغربی اور مشرقی بنگال سے جو لوگ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ترک وطن کر کے چلے گئے ہیں وہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء تک اپنے گھروں کو واپس آ جائیں تو انھیں ان کے مکان اور زرعی جائداد وغیرہ واپس کر دی جائے گی۔ آگے چل کر اس دفعہ کا دائرہ بڑھا دیا گیا اور ان لوگوں کو بھی جو یکم فروری ۱۹۵۰ء کے بعد دوسرے علاقوں سے پاکستان گئے ہیں یا پاکستان سے دوسرے علاقوں میں آئے ہیں، یہ رعایت دی گئی کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء سے پہلے واپس جانے پر انھیں ان کی املاک واپس مل جائے گی۔ چنانچہ حکومت ہند نے سب ریاستوں (یعنی ہندوستان کے سب صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں) کی حکومتوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ یکم فروری کے بعد جو مسلمان پاکستان گئے ہیں ان کے مکانات اور جائدادیں کسی کو نامزد نہ کی جائیں۔ بلکہ ۳۱ دسمبر تک ان کے اصلی مالکوں کے لئے خالی رکھی جائیں۔ دہلی کے بارے میں یہ ہدایت ہے کہ چونکہ وہاں یکم فروری کے لگ بھگ کوئی فساد نہیں ہوا بلکہ ۱۹ مارچ کو ایک معمولی سا جھگڑا ہوا تھا، اس لئے وہاں سے جو لوگ ۱۹ مارچ کے بعد گئے ہوں ان کے مکانات اور جائداد اگر مسلم محلوں میں واقع ہوں تو ان کے انتظار میں خالی رکھی جائیں لیکن اگر دوسرے محلوں میں ہوں تو اس شرط پر الاٹ کر دی جائیں کہ اصل مالکوں کی واپسی کے بعد خالی کرنی پڑیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ ان مسلمانوں کے سوا جنھوں نے سوچ سمجھ کر ترک وطن کیا ہے دوسرے حضرات اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کریں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ مہاجر مقررہ میعاد کے اندر صرف اسی صورت میں واپس آ سکتے ہیں کہ انھیں واپسی کے پرمٹ آسانی سے مل جائیں ورنہ عموماً لوگوں کو اس کے لئے مہینوں دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد بھی اکثر ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔ حکومت ہند نے جہاں ریاستوں کی حکومتوں اور چیف کمشنروں کو مندرجہ بالا ہدایت دی ہے وہاں اپنے ہائی کمشنر اور ڈپٹی ہائی کمشنر کو بھی تاکید کر دے کہ جو لوگ معاہدے کی اس دفعہ کے تحت میں آتے ہیں ان کو جلد سے جلد پرمٹ دئے جانے کا انتظام کرے۔

تارکین وطن کی املاک کا مسئلہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہند اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی میں اور فرقہ وارانہ کشمکش میں جو دونوں ملکوں میں رہ رہ کر ہونے لگتی ہے سب سے زیادہ دخل کشمیر کے جھگڑے کو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کی وجہ سے جو اختلاف ہے اس کا تعلق دونوں حکومتوں سے ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کو اس سے دلچسپی ضرور ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کی وجہ سے فسادات تک نوبت پہنچے۔ فساد کی جڑ دراصل ان ڈیڑھ کروڑ آدمیوں کی املاک کا مسئلہ ہے جو تقسیم ہند کے بعد ترک وطن کر کے مہاجروں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں پیچیدگی یہ ہے کہ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے کہ ہندو اور سکھ جو شہری اور دیہی املاک وہاں چھوڑ کر آئے ہیں اس کی مجموعی قیمت اس املاک سے بہت زیادہ ہے جو مسلمان ہندوستان میں چھوڑ گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اسی لاکھ ایکڑ زمین تھی اور اس کے مقابلے میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی زمین چالیس لاکھ ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اب رہی شہری جائداد اس کے بارے میں تو یہاں تک دعوے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ جائداد کی مالیت چالیس ارب اور ہندوستان میں مسلمانوں کی متروکہ جائداد صرف چار ارب ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دعوؤں میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور ان کی حقیقت بغیر پوری تحقیقات کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں طرف کی املاک میں فرق ہے اور بہت بڑا ہے اور جب لیکھا جوکھا ہوگا تو پاکستان کے ذمے بہت بڑی رقم باقی رہ جائے گی۔ لیکن بہر حال اس معاملے کو کبھی نہ کبھی تو طے ہونا ہی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جلد سے جلد طے ہو جائے اس لئے کہ ان ہندوؤں اور سکھوں میں جو اپنی ساری املاک سے محروم ہو کر ہندوستان میں عسرت کی زندگی گزار رہے ہیں اور

اور ان مسلمانوں میں جو پاکستان میں اسی حالت میں بسر کر رہے ہیں قدرتی طور پر بہت سخت بے چینی ہے اور مسلسل یہی بے چینی مختلف شکلیں اختیار کر کے فرقہ وارانہ فساد کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ دونوں ملکوں کے لیڈروں نے پھر اس بات کو محسوس کیا ہے کہ اس گتھی کو جلد سلجھانے کی ضرورت ہے اور ۲۶ جون کو دہلی میں ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں پاکستان کی طرف سے محمد علی فضل صاحب سیکریٹری جنرل، زیڈ اے خان صاحب سیکریٹری محکمہ بحالی اور شہاب الدین صاحب وزیر بحالی اور شری مہر چند کھنہ شریک ہوں گے۔ ان سب لوگوں کو جو امن و انصاف کے حامی ہیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ ان حضرات کو یہ توفیق دے کہ وہ اس مسئلے کو باوجود اس کی ساری مشکلات کے حل کر کے چھوڑیں۔ اگر ایسا ہوا تو نہرو لیاقت معاہدہ واقعی صلح اور دوستی کی پائدار بنیاد بن جائے گا۔

سر اوون ڈکسن کی خاموشی

سر اوون ڈکسن جنھیں یو، این، او نے اس غرض سے مقرر کیا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان میں صلح کرانے کی کوشش کریں، سب فریقوں سے یعنی پنڈت نہرو، چودھری ظفر اللہ، شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس سے مل چکے ہیں اور مقامی حالات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے اب تک خاموشی سے کام لیا ہے اور ظاہر ہے ان سے توقع بھی یہی تھی کہ جب تک معاملہ کچھ روبراہ نہ ہو جائے گا وہ اس کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیں گے۔ پھر بھی اخباروں کو یہ پتہ چلا ہے یا وہ محض قیاس آرائی سے کام لے کر یہ کہتے ہیں کہ سر اوون نے ہند اور پاکستان کی فوجوں کو کشمیر سے ہٹانے کے بارے میں کوئی تجویز مرتب کی ہے اور دونوں حکومتوں کے پاس غور کرنے کے لئے بھیجی ہے جس کے مطابق پاکستان کو اپنی ساری فوج اور ہندوستان کو اپنی فوج کا بہت بڑا حصہ کشمیر سے ہٹانا پڑے گا۔ اور صرف اتنی ہندوستانی فوج وہاں رہ جائے گی جو امن و امان قائم رکھنے کے لئے کافی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں فوجوں کو واپسی کے لئے صرف چند ہفتے کی مہلت دی جائے گی۔ جو ۱۴ اگست تک ہوگی۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ آزاد کشمیر کی فوج کے مسئلے میں جو اتنا بنائے اختلاف رہا ہے سر اوون کی کیا تجویز ہے۔ جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کی واپسی کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو کشمیر کمیشن کے سامنے ہی ان میں اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ بات اسی لئے تو رکی تھی کہ پاکستان کی حکومت "آزاد کشمیر" کی فوج کو ہٹانے پر راضی نہیں ہوتی تھی اور ہندوستان کو اس پر اصرار تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کا رویہ بدلتا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سر اوون بھی اس گتھی کو سلجھانے میں اسی طرح ناکام رہیں گے جیسے کشمیر کمیشن ناکام رہا تھا۔

فوجوں کی واپسی کا مرحلہ طے ہو جائے تو پھر اصل مسئلہ اٹھے گا کہ رائے شماری کب اور کیوں کر ہو۔ حکومت ہند بار بار کہہ چکی ہے اور شیخ عبداللہ نے اپنے ایک تازہ بیان میں پھر ایک بار اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ رائے شماری اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ تین شرطیں پوری ہو جائیں:

(۱) ریاست کا جو حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے وہ حکومت کشمیر کو واپس کیا جائے۔

(۲) نام نہاد "آزاد کشمیر" کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی فوج توڑ دی جائے۔

(۳) جو لوگ ریاست کے مختلف حصوں سے ترک وطن کر کے چلے گئے ہیں ان کو واپس بلا کر اپنے گھروں میں بسا دیا جائے۔

بعض لوگوں کو شیخ عبداللہ پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اس وقت جب سر اوون مصالحت کی صورتوں پر غور کر رہے ہیں ایسا بیان کیوں دیا جس سے ان کے کام میں رکاوٹ پڑنے کا امکان ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شیخ صاحب کو یہ بیان چودھری ظفر اللہ صاحب کے اس بیان کے جواب میں دینا پڑا جو موصوف نے حال ہی میں دیا تھا اور جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "آزاد کشمیر" کا علاقہ حکومت کشمیر کو واپس نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب مقدمے کا ایک فریق قفل خاموشی کو توڑ دے گا تو پھر قیل قال کا دروازہ کھل جائے گا۔ بہرحال یہ بات افسوسناک ہے کہ قبل اس کے کہ سر اوون کوئی تجویز پیش کریں، پرانی بحثوں کا سلسلہ چھڑ گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ معاملے کے سب فریق ضبط سے کام لیں گے اور سر اوون کو اس مشکل مسئلے کے حل کرنے کے لئے اپنی سی کوشش کرنے کا موقع دیں گے۔

ع ، ح

خانہ جنگی یا تیسری جنگ کا آغاز؟

کوریا کی لڑائی کی تفصیلات اور اس کے ردعمل کی اب تک (۲۸ جون، صبح) جو خبریں آئی ہیں ان سے خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ خانہ جنگی کسی بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ نہ ہو۔ شمالی کوریا کے تیور اور اس کے آگے بڑھنے کی رفتار سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حملہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ ہے۔ اور حملہ آور کی پشت پر آہنی دیوار کھڑی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب کوریا کو جاپان کی ۳۵ سالہ غلامی سے نجات ملی تو ملک کے نصف حصے پر روس کا اور نصف پر امریکہ کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن اتحادیوں نے بالاتفاق اعلان کیا کہ پانچ سال کے اندر اندر کوریا کو مکمل آزادی دے دی جائے گی اور موجودہ تقسیم بالکل عارضی ہے۔ اس کے بعد ماسکو کانفرنس میں پورے ملک کے لئے ایک عارضی حکومت کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، اور تفصیلات طے کرنے کے لئے روس اور امریکہ کا ایک مشترک کمیشن مقرر کیا گیا۔ مگر جلد ہی روس اور امریکہ میں ایسے شدید اختلافات پیدا ہو گئے کہ یہ کمیشن اپنا کام جاری نہ رکھ سکا۔ اس کے بعد یو، این، او نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ لیکن یہ بھی کامیاب نہیں ہو سکا اور ۳۸ میل کی عارضی لائن جو ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے مستقل ہو گئی اور عملی طور پر شمالی کوریا روس کے قبضے میں چلا گیا اور جنوبی کوریا امریکہ کے۔

کوئی تین سال کے بعد روس اور امریکہ نے اپنی اپنی فوجیں کوریا سے واپس بلا لیں۔ لیکن روس اپنے ٹینک اور ہوائی جہاز چھوڑ آیا اور امریکہ اپنے فوجی مشیر۔ اس لئے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، حالات خراب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ شمالی حصے نے جنوبی حصے پر حملہ کر دیا۔ عام حالات میں یہ محض خانہ جنگی ہوتی مگر چونکہ ایک کے ساتھ روس کی ہمدردیاں ہیں اور دوسرے کے ساتھ امریکہ کی، اس لئے ڈر ہے کہ یہ خانہ جنگی کہیں تیسری جنگ کا سبب نہ بن جائے۔

(ع ، ل)

اعلان

(زیر آرڈر ۵ قاعدہ ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی)

بعدالت شری مہندر سنگھ صاحب سب جج بہادر، درجہ اول، دہلی

مقدمہ نمبر [illegible] سنہ ۱۹۵۰ء

لالہ ستیہ پرکاش گپتا، خلف لالہ منی لال، ذات ویش، سکنہ بازار سیتارام، شہر دہلی مدعی۔

بنام شری پرمانند ولد لالہ ادھو رام، شریک فرم پرمانند موہن لال ساکن پلاٹ نمبر [illegible]، بلاک نمبر [illegible] متصل مدعا علیہ کولھا پور سروس سبزی منڈی، دہلی۔

بنام شری پرمانند ولد لالہ مادھو رام شریک فرم پرمانند موہن لال ساکن پلاٹ نمبر 3، بلاک نمبر [illegible] متصل کولھا پور سروس، سبزی منڈی، دہلی

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مدعا علیہ مسمی شری پرمانند تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتا ہے اور روپوش ہے، اس لئے اشتہار ہذا بنام شری پرمانند مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مذکور بتاریخ 3 [illegible] کو بمقام کچہری کشمیری گیٹ حاضر عدالت ہذا نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یک طرفہ عمل میں آوے گی۔ آج بتاریخ 13 [illegible] ۵۰ کو بمہر میرے دستخط اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط

مہر عدالت

بزمِ بے تکلف

مرزا صاحب کے پونے قد، سوکھی چمڑی اور سوکھی ہڈیوں کو دیکھ کر لوگ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں "چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ" مگر جب سابقہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پدی غوغائی سے کم نہیں اس لئے کہ ماشاءاللہ آواز بڑی تانبیں اور کراری ہے اور اس سے کام بھی مرزا صاحب دل کھول کر یا یوں کہیے کہ پھیپھڑے کھول کر لیتے ہیں۔ بحث کا شوق ان کی گھٹی میں پڑا ہے اور وہ گھٹی نہ جانے کس غضب کی گڑ دی تھی کہ اس کی تلخی آج تک باقی ہے۔ سنتے ہیں کہ علم کے لئے بحث بہت ضروری ہے۔ مگر یہ مرزا صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ بحث کے لئے علم کی مطلق ضرورت نہیں، صرف دھونس اور ڈھٹائی کافی ہے۔ الٰہیات سے لے کر فکاہیات تک اور طبیعیات سے لے کر نفسیات تک کسی موضوع پر کوئی بات کہی جائے یہ ممکن ہے کہ مرزا صاحب اس کی تردید میں حنجرہ آزمائی نہ شروع کر دیں۔ مگر نو آموز کی طرح یہ نہیں کرتے کہ گلے کا پورا زور ایک دم سے لگا دیں بلکہ مشاق گویوں کی طرح دھیمے سے شروع کرتے، دھیرے دھیرے پنچم تک پہنچتے ہیں اور ان کی تردید کی بحث کی شدت و مدت بھی اسی طرح رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ مثلاً آپ ان کے سامنے کسی سلسلے میں یہ بات کہیں کہ ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے تو مرزا صاحب معمولی آواز میں، مگر کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ فرمائیں گے "بھئی کیا پیر عالِ خلقت ہے! بابا آدم کے زمانے میں کہیں کسی نے یہ کہہ دیا ہوگا کہ ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے۔ اب جسے دیکھئے وہی راگ الاپے جاتا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ لوگ زمین پر رینگتے رینگتے ہوا میں اڑنے لگے۔ راکٹ آسمان سے باتیں کرنے لگا، آب دوز پاتال کی خبر لانے لگی، مگر ہفتہ کم بخت وہی سات دن کا چلا جاتا ہے۔" اب اگر آپ سن کر منہ بنا دیں یا کم سے کم دم سادھ لیں تو خیریت ہے اور جو کہیں آپ نے کہہ دیا۔ "مرزا صاحب اس میں ہیر پھیر کا کیا سوال ہے اور اسے دنیا کی ترقی سے کیا تعلق ہے لوگوں نے مل کر ایک بات ٹھہرائی کہ سال کے دنوں کو سات سات دن کے ٹکڑوں میں بانٹ لیں اور ہر ٹکڑے کو ہفتہ کہیں اور ہماری زبان میں تو اس کے لئے لفظ ہی وہ رکھا گیا ہے جس کے معنی سات کے ہیں۔ ظاہر ہے اگر سات دن کا نہ ہوتا تو ہفتہ کیوں کہلاتا" اب مرزا صاحب کے مزاج کی حدت اور آواز کی شدت بڑھ جائے گی، ناک بھوں چڑھ جائے گی اور وہ آپ کا منہ چڑا کر کہیں گے "ظاہر ہے، ظاہر ہے آئے وہاں سے بڑے ظاہر شاہ کی دم بن کر۔ یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ ہفتہ کہلاتا ہے اس لئے سات دن کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کون کہتا ہے کہ ہفتہ ہماری زبان کا لفظ ہے ہم تو اپنی نانی دادی سے اٹھوارہ سنتے آئے ہیں۔ اس لئے آپ ہی کی دلیل کے مطابق اسے آٹھ دن کا ہونا چاہیئے۔ اب لگے بغلیں جھانکنے۔ کل کے لونڈے الف کے نام بھالا تک نہیں جانتے اور ہم سے بحث کرنے چلے ہیں۔"

آپ اگر چین اور آبرو کی سلامتی چاہتے ہیں تو اب بھی موقع ہے یا تو ہار مان لیجئے یا بات کو ٹال جائیے۔ لیکن آپ کی شامت ہی آگئی ہو اور آپ مسکرا کر یہ کہہ دیں "مرزا صاحب آپ اتنے چیں بہ جبیں کیوں ہوتے ہیں۔ آخر اس میں غصے کی کیا بات ہے بحث میں غصہ آیا اور آدمی گیا گزرا۔ پھر وہ ایسی ہی اٹکل پچو باتیں کرنے لگتا ہے جیسی اس وقت آپ کر رہے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہفتے کو اٹھوارہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ختم ہوتے ہی آٹھواں دن شروع ہو جاتا ہے اور پھر آپ کی نانی صاحبہ مرحومہ کی دنیا کے بعد اس لفظ کا استعمال بھی تو بہت کم ہو گیا ہے اس کا سہارا آپ بحث میں کیوں لیتے ہیں"

پھر تو بس جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو کا وظیفہ پڑھنے کے سوا کوئی تدبیر نہیں اور اس سے بھی کام چل جائے تو غنیمت ہے آپ کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی کہ مرزا صاحب کی مرزائی آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ آستین چڑھ جاتی، چہرہ تمتما اٹھتا ہے، آنکھیں ابلی پڑتی ہیں منہ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں اور جلتے بلتے، کھولتے فقروں کا سیلاب اس زور سے آپ کی طرف موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہے جیسے کوہ آتش فشاں کا لاوا ہو۔

دیکھئے ہماری بات مان لیجئے۔ کبھی بھولے سے بھی مرزا صاحب سے بحث نہ کیجئے گا۔ ورنہ مفت میں جان جائے گی اور عافیت الگ سے خراب ہوگی۔ اسی لئے کہ استاد کہہ گیا ہے

ع بحث بہ تیغ و زبان منظور نیست

تابشِ سہیل

اقبال احمد سہیل

عجب نیرنگ فطرت ہے سرشت نوع انساں بھی
یہی خنجر کا ہر من بھی ہے، یہی تصویر یزداں بھی

کسی کی جستجو میں کفر بھی سرگرم، ایماں بھی
بظاہر کشمکش آپس کی بھی، مگر اک ربط پنہاں بھی

اسی سنگم کے دو دھارے ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
گلے مل مل کے روتے بھی ہوئے دست و گریباں بھی

انھیں موجوں کی ٹکر نے اٹھائے کتنے طوفاں بھی
یہی اب مل کے سینچیں گے وطن کا باغ ویراں بھی

رہیں گے متحد باوصف تقسیم گلستاں بھی
ہمارے لالہ و گل بھی، ہمارے سرو و ریحاں بھی

جنوں میں چاک کر ڈالا، مگر اب ہیں پشیماں بھی
کہ خود اپنے ہی پیراہن کا ٹکڑا تھا گریباں بھی

کوئی دیر و حرم تک یہ مری فریاد پہنچا دے
کہاں کا شیخ کس کا برہمن جو ہو نہ انساں بھی

ہیں خاک تیرہ وہ خورشید، ہاں اتنا تعلق ہے
انھیں کے گرد سرگرداں بھی ہوں ان سے گریزاں بھی

کوئی دھبہ نہ چھوڑی خون دل کے داغ سے خالی
جنونِ چاک داماں کاش رہتا پاک داماں بھی

ابھی تو خانماں برباد پروانوں پہ آفت ہے
سحر تک دیکھ لیں گے سب مآل شمع سوزاں بھی

فروغ آتش گل نے جلائے آشیاں لاکھوں
نہ آیا راس اس گلزار کو جوشِ بہاراں بھی

بلا سے پھونک ڈالے برق میرے آشیانے کو
انھیں شعلوں سے ہوگا صحن گلشن میں چراغاں بھی

کئے جاتے ہیں پیدا نت نئے ساماں تباہی کے
یہ نادانی کہ ہے اس پر غرور علم و عرفاں بھی

ہوئی برباد خود نکہت نکل کر خانۂ گل سے
کیا بے درد نے شیرازۂ گل کو پریشاں بھی

سہیل اس بے نوائی پر بھی ہمت کا یہ عالم ہے
عوض خاک وطن کی میں نہ لوں ملک سلیماں بھی

غزل

باقر مہدی

آنسوؤں سے بھی جلائے کبھی یادوں کے چراغ
غم کدہ آج سجانے کی ہمیں فکر نہیں

کہکشاں، خواب گہ ناز کی ہے راہ گزر
آسمانوں پہ بھی جانے کی ہمیں فکر نہیں

خود فریبی کے حسیں رنگ محل کی خاطر
آئینہ خود کو دکھانے کی ہمیں فکر نہیں

اپنے اجداد کی عظمت کا فسوں ٹوٹ چکا
بجھتی شمعوں کو جلانے کی ہمیں فکر نہیں

ہر طرف آگ ہے، ہر سمت ہے شعلوں کی لپک
دامن زیست بچانے کی ہمیں فکر نہیں

اپنے ہر جوشِ جنوں خیز عزائم کی قسم
آج تو تیر بڑھانے کی ہمیں فکر نہیں

بیخود موہانی مرحوم

سید اختر علی تلہری

مرحوم بیخود موہانی آسمانِ شعر و ادب کے ایک درخشندہ ستارے تھے۔ ان کا مذاقِ شعر نہایت پاکیزہ تھا وہ جو کچھ کہتے تھے اپنے اردگرد کے واقعات سے اثر لے کر۔

وہ شاعر تھے۔ سوتے میں بھی جاگتے میں بھی۔ اُن کے منہ سے شاعری کے جو بول نکلتے تھے ان میں شعریت کا رس ہوتا تھا۔ شعریت کی مٹھاس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے اس فطری ذوق کی جِلا "فنِ شعر" کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل سے کی تھی۔ اس لئے اُن کے نتائجِ فکر میں فنی وقار "کا رکھ رکھاؤ بھی موجود ہوتا تھا۔ بیخود مرحوم مغربی رنگِ سخن اور اس کے ادب و شعر کے بہاؤ کے رُخوں سے کافی واقفیت رکھتے تھے، اور انھیں قریب قریب وہ سب کچھ معلوم تھا جو غزل کے خلاف مغربی ادب و شعر کی اداؤں پر ضرورت سے زیادہ مٹے ہوئے نقادوں کی طرف سے کہا جاتا ہے۔ مرحوم خود بھی ناقدانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے تنقید کی ان "تقلیدی خوش فعلیوں" سے کبھی اثر نہیں لیا۔ اور وہ اپنے ذوقِ شعر گوئی کے کام و دہن کی تواضع غزل ہی سے کرتے رہے۔

سچی بات بھی یہ ہے کہ غزل ارتقا پذیر شاعری کی ایک درخشاں لڑی ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ ان تمام متغزلین سے بحث نہیں جنھیں حقیقتاً صنم خانۂ شاعری کی آستاں بوسی تک کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔ لیکن جو لوگ رہ لیتے ہوش ربا کی سرمستیوں میں فی الواقع زندگی کی کچھ سانسیں صرف کر چکے ہیں۔ ان کی غزل کا تقریباً ہر شعر زندگی کے کسی نہ کسی منظر کا آئینہ ہوتا ہے۔ کبھی جذباتی تحریکوں کا ترجمان بن کر کبھی دوسرے مشاہدوں کا بیان بن کر اور یہ ترجمانی اور بیان ہوتا ہے، ان لفظوں اور ترکیبوں کے قالب میں جن سے صورت و ہیئت کی حسین تصویریں "ادب" کو ملتی ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی خوش ذوق شعر و سخن کی محفل سجانے والا چمنِ شاعری کے ایسے شاداب رنگین پھول "غزل" کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے؟

بیخود مرحوم نے چند قصیدے بھی کہے ہیں اور نعتیں یہ کہ بڑی دھوم دھام سے کہے ہیں مگر ان کی شاعری کی بیشتر کائنات غزل کی شاعری ہے اور وہ سب حقیقی شاعری کی طرح زندگی کے کسی نفسیاتی رُخ کی خوب صورت تفسیر ہے یا پھر زندگی کے کسی پہلو کی دلپذیر تنقید۔ ذیل کی دو تین مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

اک یوں چمن میں مہکے اک یوں قفس میں تڑپے
تو ہی بتا دے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل

گل و بلبل کے تذکرے پر بدمزہ ہونے والے نقاد ذرا غور سے دیکھیں کہ ان علامات کے ذریعے سے ہماری موجودہ زندگی کی کتنی بلیغ تفسیر اور اس پر کتنی حقیقت میں ڈوبی ہوئی تنقید کی گئی ہے۔ ایک پورے اقتصادی فلسفہ کو جس کے تحلیل و تجزیہ کے محور پر آج کل کا تمام صالح ترقی پسند شعر و ادب گردش کر رہا ہے، لطیف طنز کی زد پر رکھ کر کس طرح ہمارے دماغوں میں اتار گیا ہے۔

لذت کبھی تھی اب تو مصیبت سی بن گئی
مجھ کو گناہ کرنے کی عادت سی ہوگئی

انسانی فطرت کا ایک یہ بھی رُخ ہے کہ جن چیزوں کو کبھی لذت سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے وہ رفتہ رفتہ عادت میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر ان کا ترک کرنا آسان نہیں رہتا۔ دخترِ رز اس کی واضح مثال ہے۔ پہلے کیف و سرور کی جان سمجھ کر اُسے منہ لگایا جاتا ہے مگر تھوڑے ہی دن بعد یہ گناہ جزوِ عادت ہو جاتا ہے۔ اور اب انسان اپنے کو اس پر مجبور پاتا ہے کہ جام و سبو کے سہارے زندگی بسر کرے اور بُتِ میخانہ ہی کی پرستش میں عمر کاٹ دے۔ فطرت کا یہ بہاؤ بہت عام ہے۔ جناب بیخود نے حیاتِ انسانی کے اسی رُخ کی تفسیر شعر کے شیریں لہجے میں کی ہے۔

بس کُھل گئی حقیقتِ نقاشئ خیال
سب رنگ اپنے بھر دئے تصویرِ یار میں

خدا کیا ہے؟ اس میں کون سے صفات پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا علم کسی کو حقیقتاً نہیں ہے۔ جن صفات کو انسان پسندیدہ سمجھتا ہے انھیں کو ترقی یافتہ شکل میں خدا کی طرف نسبت دے دیتا ہے۔ گویا یہ سب خیال کی نقاشی ہے۔ ایسا حکیمانہ خیال اپنے لطیف پیرائے میں اور اتنے انکسار کے ساتھ ادا کر دینا ایک قادر الکلام غزل گو شاعر کے علاوہ اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بیخود کی غزلیہ شاعری کے بحث کے ضمن میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عام معاشرتی زندگی میں مرحوم کی تیز طرار فطرت شوخی کے نشتروں کی بھی مالک نظر آتی تھی چنانچہ کبھی کبھی ادبی نقد و انتقاد کی دنیا میں یہی نشتر دشنہ و خنجر کی صورت اختیار کر لیتے تھے لیکن اُن کی یہ فطری شوخی شاعری کے میدان میں [illegible] دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ضرور ہے کہ بیخود کوئی فرشتہ نہ تھے۔ ہمارے ہی جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے۔ جوانی کے تیز و تند دھارے سے اُلجھتے ہوئے کہولت کے ساحل پر (اگر اسے ساحل کہا جا سکے) پہنچے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ شباب کے پُر شور جذبات کا انھیں تجربہ نہ ہوا ہو اور حرص و ہوس کی لہریں اُن کے دل میں بھی نہ اُٹھتی رہتی ہوں۔ ایسی حالت میں اگر ان کی جوان فطری شوخی بانکپن اور چہلوں اور اُن سے لپٹی ہوئی خواہشوں سے کھیلنے لگتی تو کچھ تعجب نہ ہوتا۔ تاہم اس معصیت کی عمر میں بھی انھوں نے جذبات کو تنہا نہیں چھوڑا بلکہ پاسبانِ عقل کو اُن کے سر پر مسلط رکھا۔ اصل تو یہ ہے کہ انھوں نے عینِ شباب ہی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ دل میں پیدا ہونے والی تمام کیفیتوں کا منظرِ عام پر بے نقاب کرنا خوش مذاقی نہیں ہے کسی بے باک شاعر کا یہ مصرعہ

مستی کی بھی بلے تو روا ہے شباب میں

جس صنفی خواہش کو عریاں طور سے پیش کر رہا ہے وہ جوانی کی ایک فطری خواہش سہی۔ تاہم پس پردہ ہی رکھنے کی چیز ہے۔ ان خواہشوں کا یوں سرِ بازار اعلان شوخی کی مسخ شدہ ننگی تصویر ہے۔

جو ادب صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے وہ ان حیوانی جذبات کا اظہار اس بے باکی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ انسان بربریت اور بہیمیت کی حدوں سے بہت سی باتوں میں دور نکل چکا ہے۔ اب پھر اُسے انھیں حدوں کی طرف ڈھکیلنا رجعت پسندانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوگا۔ بیخود مرحوم نے جہاں تک میری اُن کی شاعری پر نظر ڈالی ہے اس "ادبی رجعت" کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ انسانی جذبات میں سے کون سے جذبے "شعری نغمہ" کے لئے مناسب ہیں اور کون سے نہیں۔ اس لئے اُن کے تغزل کے متعلق بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ وہ "جذباتیت" اور عقل کی لطیف آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اُن کی شاعری میں توازن کے ساتھ یہ دونوں چیزیں دوش بدوش رہتی ہیں اور یہی اُن کی وہ "انفرادیت" ہے جو عام متغزلین کی صف سے انھیں علیحدہ کرتی ہے

ان کی شاعری کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جس کا تعلق اُن کے طرزِ بیان اور شعر کی صوری حیثیت سے ہے۔

بیخود مرحوم باوجودیکہ مرزا غالب کے خمخانۂ شاعری کے بادہ نوش اور ان کی تخییل کی رفعتوں کے پرستار تھے۔ تاہم انھوں نے اپنی شاعری میں وہ "ترکیبی بندشیں" اختیار نہیں کیں جنھیں مرزا نے زبردستی برت ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیخود کے یہاں ٹکسالی محاورے ہیں۔ صاف ستھری ترکیبیں ہیں۔ فصاحت کی ترازو میں تُلے ہوئے لفظ ہیں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری کے نغمے انھیں بولوں میں ترتیب دئے ہیں جو اردو زبان میں خاصے کی چیزیں ہیں۔

ذیل میں بیخود مرحوم کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن سے ان خصوصیتوں کا پتہ چل سکے گا۔

آزادی کی زنجیریں

ظفر رحیم پور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ شیخ پور کے وطن میں رہتے تھے ظفر اور اس کا دوست ہردیال الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے حسینہ اور ظفر کی بچپن میں منگنی ہو چکی تھی یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن ذہانت و ذکاوت پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ظفر اعلیٰ نمبروں سے پاس نہ ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہو گئی اور اس نے پڑھنے میں جان لڑا دی۔ چنانچہ سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق ضرور ہے مگر یہ کانٹا برابر کھٹکتا رہا۔ لطیف صفدر علی صاحب کی توقعات کو پورا کر کے ان کے نزدیک حسینہ سے شادی کرنے کا مستحق نہ بن جائے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس خلش کو شوق اور امید کے ساتھ دل میں لئے ہوئے کالج کھلنے سے ایک دن پہلے الہ آباد پہنچ گیا۔ کالج کھلنے پر رفیع الدین کے ذریعے جس سے پچھلے سال ظفر اور ہردیال کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی چھوٹی بہن ریحانہ سے تعارف ہوا جنھوں نے اس سال فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔

قسط ۲۵

ساڑھے چار بجے سے چند منٹ پہلے ظفر حمید الدین صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کوئی نوکر ملے تو اطلاع کرائے کہ اتنے میں ایک کمرے سے رفیع الدین باہر نکلا اور ظفر کو بڑے تپاک سے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں ایک خاتون کوئی اڑتالیس برس کی عمر کی صوفے پر بیٹھی ایک کتاب ہاتھ میں لئے پڑھ رہی تھیں۔ ظفر نے دیکھا کہ ان کی صورت بہت کچھ ریحانہ کی سی ہے۔ البتہ مٹاپے نے ان کے بدن میں اور چہرے پر کسی قدر بھدا پن پیدا کر دیا ہے۔ اس کی نظر عورتوں کے لباس اور آرائش پر کبھی نہیں پڑتی تھی مگر وہ اس وقت یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ ادھیڑ عمر کی خاتون پوشاک اور بناؤ سنگار کے لحاظ سے نئی چھوکریوں کو بھی مات کرتی ہیں۔ خصوصاً پاؤڈر اور سرخی کا استعمال انھوں نے دل کھول کر کیا ہے۔ مگر ان سب تکلفات سے ان کے قدرتی حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ خارجی رنگوں کی چمک دمک نے ان کے اصلی رنگ پر جو غالباً کہیں زیادہ لطیف اور دلکش ہوگا، پردہ سا ڈال دیا ہے۔ رفیع نے انھیں پڑھنے میں محو دیکھ کر کسی قدر بلند آواز میں کہا "امی یہ لیجیے ظفر صاحب آ گئے۔" بیگم حمید نے چونک کر ظفر پر ایک مبصرانہ نظر ڈالی۔ اس کے سلام کا جواب دیا اور صوفے کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھیے ظفر صاحب بیٹھیے۔ آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ریحانہ اور رفیع سے آپ کی بڑی تعریف سنی تھی۔ بہت دنوں سے آپ کو بلانے کا ارادہ تھا مگر کیا بتاؤں مصروفیتوں کا چکر ایسا ہے کہ مرنے کی بھی فرصت نہیں۔ آپ جانتے ہیں ہر قسم کے پبلک کاموں کے لئے بہت سی بی بیاں موجود ہیں مگر مسلمانوں میں ہمارے شہر کا تو کیا ذکر سارے ملک میں بس یہی چار مبارک ہستیاں ہیں۔ اپنی بہنوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی ترقی کے لئے بے شمار کام کرنے ہیں اور کرنے والیاں نظر نہیں آتیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں ——— تو یہ آپ سمجھتے ہیں کہ مرد اگر یہ کام کریں گے؟ جی نہیں۔ ان کی جوتی کو کیا غرض۔ جو کچھ کرنا ہے ہم کو اور آپ کو کرنا ہے۔ خیر میں یہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح ہو سکتا ہے یہ بھاری بوجھ اٹھائے ہوں

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لائی

پھر سوشل ذمہ داریاں الگ ہیں۔ دعوتیں، پارٹیاں، شادی، غمی اور اوپر سے تصنیف و تالیف کا شوق

ع اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

رسالوں کے ایڈیٹروں نے اور ناک میں دم کر رکھا ہے آج اس کے سالنامے کے لئے لکھو۔ کل اس کے افسانہ نمبر کے لئے، پرسوں اس کے جوبلی نمبر کے لئے، اور میں مروت کی ماری کسی سے انکار نہیں کر سکتی۔ ہاں تو مطلب یہ ہے کہ بہت دن سے آپ کو بلانا چاہتی تھی مگر فرصت نہیں ملتی تھی۔ ابھی تین چار روز ہوئے مجھ میں اور رفیع میں ایک بحث چھڑ گئی جس کا آپ سے تعلق تھا۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ آپ کی دعوت کب سے ٹل رہی ہے۔ اگرچہ مجھے آج بیرسٹر صاحب کے ساتھ پارٹی میں جانا تھا مگر اسے ملتوی کر کے آپ کے لئے وقت نکالا اور آپ کو زحمت دی۔ بحث اس پر تھی کہ میں کہتی تھی کہ آپ کا افسانہ "نالۂ نے" جو کشکول میں چھپا ہے ترقی پسندانہ ہے اور ان کی ضد تھی کہ رومانی ہے ———"

بیگم صاحب سانس لینے کے لئے ایک لمحے کو رکیں تو رفیع نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ظفر سے کہا اس میں تو بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ آپ کا افسانہ خالص رومانی ہے۔ میں تو امی کو یہ سمجھا رہا تھا کہ آپ ترقی پسندی کا تصور پریم چند سے وابستہ کر دیں اور پریم چند کی ابتدائی تصانیف خصوصاً ناول رومانیت اور باطنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جیسے پردۂ مجاز۔ ان کو آپ ترقی پسندی کا معیار قرار دیتی ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے۔ آپ کا افسانہ اپنے رنگ میں نہایت عمدہ ہے۔ مگر آپ ہی بتائیے کہ اس پر کسی طرح بھی ترقی پسندی کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

ظفر اب تک حیرت کے اس دھچکے سے نہیں سنبھل سکا تھا جو اسے کشکول میں اپنا افسانہ چھپنے کی خبر سن کر لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ افسانہ کشکول کے دفتر میں کس طرح پہنچا۔ اسے خیال آیا کہ شاید ہردیال کی حرکت ہو مگر اس نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ آخر ہردیال کو چوری سے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے رفیع کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ صرف آخری جملہ اچھی طرح سن پایا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ اتنے میں ریحانہ داہنی طرف سے ایک کمرے سے ڈرائنگ روم میں یہ کہتی ہوئی داخل ہوئی "آداب عرض ہے ظفر صاحب۔ کہئے آپ کو معلوم ہو گیا کہ امی نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔ اگر میں آپ سے یہ کہہ دیتی کہ آپ کے افسانے سے بیڈمنٹن کھیلا جائے گا تو آپ آنے کا نام بھی نہ لیتے۔ رفیع کیا کھیل شروع ہو گیا؟ اب کس کی سروس ہے؟"

بیگم حمید۔ ریحانہ بیٹی، ظفر صاحب کے سامنے تو بے تکی باتیں نہ کرو، آؤ بیٹھو، اگر بحث میں حصہ لینا ہے تو ٹھکانے سے لو۔ ظفر صاحب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ رفیع کی بے سروپا گفتگو کا کیا جواب دوں، یہ اندھیر تو دیکھو کہ پریم چند کے ناولوں کو صاحب زادے رومانی بتاتے ہیں۔ آپ کے افسانے میں عورتوں کو عبرت دلائی گئی ہے کہ محض دولت کی وجہ سے ہوس پرستوں کو سچے عاشقوں پر ترجیح دینے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ میں نے بھی ایک ———"

رفیع۔ امی افسانے کو پھر ذرا غور سے پڑھئے اور سوچئے کہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دولت مند شوہر ہوس پرست ہے اور اسے اپنی بیوی سے محبت نہیں۔ افسانے میں کوئی سبق دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ محض زندگی کی تصویر ہے جو غلط اور گمراہ ہے۔ محبت کی ناکامیاں مضبوط دل کے لوگ ہمت اور استقلال سے، کمزور دل کے لوگ رو دھو کر بعد از خرابی بسیار برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن بہرحال کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی سوا اس شخص کے جو پہلے سے نیم مجنون ہو، دیوانہ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں سر ٹکراتا نہیں پھرتا اور نہ بانسری بجا بجا کر مر جاتا ہے۔ رومانی مذاق کے لوگ اپنی مریضانہ غم پسندی کو تسکین دینے کے لئے ایسی ایسی خیالی تصویریں بنا لیتے ہیں اور رو رو کر لطف اٹھاتے ہیں۔

بیگم حمید۔ لو اور سنو۔ رو رو کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ایسی اوندھی باتوں کو بھلا کون مانے گا۔ ظفر صاحب آپ نے یقیناً ترقی پسندانہ افسانہ لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ اسی قسم کا میرا بھی ایک افسانہ ———"

ریحانہ۔ امی افسانے کے مصنف کو بھی تو کچھ کہنے دیجئے۔ قصے کی خوبی میں تو کوئی کلام نہیں۔ سوال صرف

ہندوستان میں ترقی کے امکانات

محمد امین

ہندوستان کی آزادی کے بعد، اس کی بین الاقوامی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ روس اور امریکہ اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برطانیہ ایشیا میں اس کے بل بوتے پر کامن ویلتھ کے جلسے منعقد کرتا ہے۔ آسٹریلیا زیادہ سے زیادہ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ ہند چین، فلپائن، تھائی لینڈ، برما، انڈونیشیا اور لنکا غرض سارے ایشیائی ممالک ہندوستان کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں اور بین الاقوامی معاملات میں اس کی رہنمائی اور سرگرمی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ فرانس بھی زیادہ سے زیادہ اس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اس کی ہند چین کی پالیسی کو تقویت حاصل ہو، اور کسی طرح ہندوستان باؤ ڈائی کو تسلیم کر لے۔

اب سوال یہ ہے کہ آزاد ہو جانے کے بعد ہندوستان کیوں اتنی تیزی سے دنیا کا ایک اہم ملک بن گیا۔ زیادہ سے زیادہ کیوں اسے مغربی طاقتیں اپنے ساتھ ملائے رکھنا چاہتی ہیں؟ مستقبل میں ہندوستان سے کیا توقعات ہیں اور جغرافیائی لحاظ سے جو اسے اہمیت حاصل ہے، اسے برقرار رکھنے کی اس میں کتنی صلاحیت ہے؟ ایشیا کی قیادت کس حد تک کر سکتا ہے، اور اس کی تنظیم میں وہ کہاں تک کامیاب ہوگا؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان بے انتہا قدرتی دولت کا مالک ہے اس لئے ہر ملک اس کی دوستی کا خواہاں ہے اور اس کی کامیابی کا راز اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کتنی تیزی سے ترقی کرتا ہے اور کس طرح اپنے وسائل اور ذرائع کو اپنی قومی اور ملکی ضروریات کے لئے استعمال کر کے اپنے پڑوسی ملکوں کی معاشی زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم سے اس کا رقبہ کافی کم ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کا احساس اس لئے اور زیادہ ہے کہ ہماری زمین جو گیہوں اور لمبے ریشے والی کپاس اور پٹ سن اگلتی تھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی لیکن اس کے باوجود اگر غور سے دیکھا جائے، تو تقسیم سے کچھ بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ ہم نے اپنا کھویا ہوا رقبہ دیسی ریاستوں کی جتھہ بندی سے پورا کر لیا۔ پہلے ہندوستان میں چھ سو سے زیادہ ریاستیں تھیں۔ ان ریاستوں میں سے بہتوں کو صوبوں میں ملا دیا گیا، اور جو بڑی بڑی ریاستیں تھیں انہیں ملا کر بڑے بڑے صوبے بنا دئے گئے۔ جیسے راجستھان، مدھیہ بھارت، مدھیہ پردیش، ہماچل پردیش، پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین، کوچین ٹراونکور کی یونین وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح ان ریاستوں کی جتھہ بندی سے ملک کے رقبے اور قومی دولت دونوں میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اب بھی ہمارا رقبہ بہت بڑا ہے۔ شمال سے جنوب کا فاصلہ ۲۰۲۰ میل ہے، اور مشرق سے مغرب کا فاصلہ ۱،۵۰۰ میل سے زیادہ ہے۔ اتنے بڑے ملک کی عظمت کا کیا کہنا ہے۔ اس لئے ایشیا میں اس کی اہمیت روس اور چین کو چھوڑ کر سب سے زیادہ ہے۔

اس وقت ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ہے گویا چین کے علاوہ ہمارا ملک سب سے زیادہ گھنا آباد ہے۔ یہ بھی اس کی برتری کی ایک دلیل ہے لیکن اتنی بڑی آبادی کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو وہ ملک کے لئے ایک مصیبت بن جائے گی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ملک کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ان کی تربیت کی جائے۔ ان کو ہر طرح کی تعلیم دی جائے اور فنی کاموں میں لگایا جائے تاکہ ملک پر بار بننے کے بجائے قومی دولت میں اور ملک کی عظمت میں اضافہ کریں۔ سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ان کی معاشی حالت درست کی جائے۔ زمینداری کو جلد سے جلد ختم کیا جائے اور ان کو کھیتداری کے حقوق براہ راست دئے جائیں۔ کسانوں کا معیار زندگی بلند کیا جائے، ان کو پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ زراعتی نظام کی اصلاح کی جائے، دیہی صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ یہ سارا کام کل ہند پیمانے پر ایک خاص تنظیم کے ماتحت ہونا چاہئے۔

سر دست ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ غلہ اور چند ضروری خام اشیا کا ہے۔ اس وقت ملک میں بعض غذائی چیزوں کی کمی ہے اور بعض خام اشیا کے لئے ہم دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں لیکن تقسیم کے باوجود ہمارا ملک اتنا بڑا ہے کہ اس میں قریب قریب ہر چیز پیدا کی جا سکتی ہے ہمارا ملک رقبہ میں پاکستان، افغانستان، لنکا، برما، انڈونیشیا اور ملایا کے برابر ہے۔ گویا اتنے سارے ملک اگر ایک ساتھ ملا دئے جائیں تب کہیں جا کر وہ ہماری برابری کر سکتے ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں کیا گیہوں، چاول، پٹ سن، کپاس کی کاشت نہیں بڑھائی جا سکتی؟

آسام میں چائے دنیا کے ہر حصے سے زیادہ ہوتی ہے۔ چاول اور پٹ سن بھی کافی پیدا ہوتا ہے لیکن ابھی وہاں زمین کا بہت بڑا حصہ بیکار ہے۔ بارش بہت کافی ہوتی ہے۔ مٹی زرخیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر مزروعہ زمین کو قابل کاشت بنایا جائے، اور زراعت کے جدید طریقے اختیار کئے جائیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو بہت جلد تک ہم پٹ سن میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ چاول کی بھی بڑی حد تک کمی پوری کی جا سکتی ہے۔

آسام سے ذرا پچھم کی طرف بڑھئے تو کوچ بہار کی مرکزی ریاست ہے اس کے بعد بنگال کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ بنگال میں چاول بہت ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہاں کی زمین کا پورا پورا استعمال کیا جائے تو پیداوار میں اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ برسات کے زمانے میں سیلاب کی وجہ سے بہت بڑے رقبے پر کاشت نہیں کی جا سکتی۔ اگر سیلاب کو روکنے کا انتظام ہو جائے تو صوبے کی پیداوار میں بہت کافی اضافہ ہوسکے گا۔

بہار کی زمین بھی کافی زرخیز ہے۔ چاول اور گنا بکثرت ہوتا ہے۔ پٹ سن بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی سیلاب کی وجہ سے زراعت کو کافی نقصان ہوتا ہے سیلاب آنے سے زرخیز مٹی کی ایک تہہ ضرور جم جاتی ہے جس سے بعد میں وہاں کے کسان فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن سیلاب سے جتنا نقصان ہوتا ہے۔ اتنا فائدہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ کہ اگر ہم سیلاب کو روک کر انہیں کھیتوں میں مصنوعی کھاد بڑھا دیں تو ہماری پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا۔

یو پی کا صوبہ بہت مشہور ہے یہاں کئی قیمتی فصلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ سارے صوبے کی مٹی زرخیز ہے، لیکن درجہ حرارت، بارش اور موسم کے بہت بڑے فرق کی وجہ سے، بعض حصے چند فصلوں کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ مثلاً یوپی کے مشرقی حصے میں پٹ سن گنا اور چاول کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے۔ وسطی یوپی میں آب و ہوا درمیانی ہے۔ نہ تو بارش زیادہ ہوتی ہے اور نہ کم، اسی لئے چاول گنا اور گیہوں تینوں فصلیں کامیابی کے ساتھ پیدا کی جاتی ہیں۔ مغربی یوپی خشک ہے لیکن بارش کی کمی نہروں کے پانی سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس لئے گیہوں کے علاوہ گنا اور کپاس بھی بہت ہوتا ہے۔ بلکہ اس علاقے کا گنا مشرقی اور وسطی دونوں جگہوں سے زیادہ بڑا، اور میٹھا ہوتا ہے۔ گیہوں بھی اچھا ہوتا ہے، اور آب پاشی کی وجہ سے بڑے بڑے ریشوں والی کپاس پیدا ہوتی ہے لیکن اب بھی صوبے میں بہت سی زمین بیکار پڑی ہے۔ مشرقی یوپی میں گورکھپور، دیوریا، بستی، گونڈہ بلیا وغیرہ میں سینکڑوں ایکڑ زمین ایسی ہے کہ وہاں پٹ سن بڑے پیمانے پر لگایا جا سکتا ہے حکومت یوپی اس زمین کو اگر اپنی اسکیم میں شامل کرے تو مشرقی یوپی پٹ سن، چاول اور گنا کا مرکز بن سکتا ہے۔ وسطی اور مغربی یوپی میں بعض جگہ پانی کی قلت ہے اگر پانی کا انتظام ہو جائے تو بہت سے علاقوں میں کاشت بڑھائی جا سکتی ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں بھی جدید سائنس کی مدد سے بڑے پیمانے پر ہر چیز اگائی جا سکتی ہے، اور یہاں کے عوام کو خوش حال بنایا جا سکتا ہے۔

موجودہ کاشت چہانٹ کے باوجود پنجاب میں گیہوں، چنا، مٹر اور کپاس بہت کافی پیدا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں سینکڑوں قسم کے پھل ہوتے ہیں لیکن ابھی بہت سی زمین بیکار پڑی ہے۔ آب پاشی کے ذریعے کاشت بڑھانے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ پٹیالہ اور پنجاب کی ریاستوں کی یونین میں بھی گیہوں اور کپاس کی کاشت بہت زیادہ بڑھائی جا سکتی ہے۔ کشمیر ایک پہاڑی ریاست ہے لیکن اس کے باوجود یہاں پہاڑوں کے دامن میں دریاؤں کی وادیوں میں چاول کافی ہوتا ہے۔ لیکن حکومت کی زیر نگرانی اس کی کاشت بڑھائی جا سکتی ہے۔

مدھیہ بھارت اور راجستھان دونوں صوبے میں راجستھان ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے لیکن یہ سارا کا سارا بنجر اور ریگستان ہے۔ اگر کسی طرح سمندر کا کھاری پانی ہم یہاں لا کر راجستھان کی سرزمین میں پہنچا دیں تو یہاں کی زمین سونا اگل سکتی ہے۔ امریکہ نے تجربے سے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ سمندر کا کھاری پانی نتھار کر آب پاشی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس سے فائدہ اٹھائیں تو راجستھان ہمارے لئے گیہوں، کپاس، غلہ اور چاول کی پیداوار کا مرکز بن جائے گا۔

مدھیہ بھارت کی قریب قریب یہی حالت ہے جو راجستھان کی۔ یہاں تھوڑا بہت جوار، باجرہ ہوتا ہے اور بیشتر زمین بیکار پڑی ہے۔ یہاں کی زمین اگر قابل کاشت بنا دی جائے تو یہاں کی پیداوار میں بہت کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

مدھیہ پردیش چاول اور سنتروں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کی زمین پتھریلی اور سخت ہے۔ لیکن اس کے اوپر زرخیز مٹی کی ایک تہہ جمی ہوئی ہے۔ مٹی کے ماہرین کے مشورے سے اسے آسانی سے قابل کاشت بنایا جا سکتا ہے اور چاول اور سنتروں کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے اور سائنس اور جدید تجربات سے فائدہ اٹھا کر یہاں کے سنترے باہر کے ملکوں کو بھیجے جا سکتے ہیں۔

وندھیا پردیش یوپی اور مدھیہ پردیش کے درمیان ہے جس کی زمین بھی ترقی کی محتاج ہے۔ وہاں کی حکومت اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی حکومتوں سے امداد لے کر اپنی زمین کو قابل کاشت بنا سکتی ہے۔ اور ملک کو غلہ کی پیداوار میں خود کفیل بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔

اڑیسہ بنگال اور مدراس کا درمیانی صوبہ ہے۔ بہت سی ریاستوں کے شامل ہو جانے سے اس کا رقبہ کافی بڑھ گیا ہے۔ یہاں کے لوگ آسام کی طرح پست اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ چاول یہاں کی خاص فصل ہے۔ لیکن اس صوبے میں ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ گنا اور پٹ سن کی کاشت یہاں باآسانی بڑھائی جا سکتی ہے۔

حیدرآباد اور میسور مشہور پرانی ریاستیں ہیں۔ حیدرآباد میں جاگیرداری نظام کی اصلاح کر کے وہاں کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کپاس اور چاول کافی ہوتا ہے۔ لیکن ان کی پیداوار میں اضافے کی خاصی گنجائش ہے۔ میسور میں دریائے تنگ بھدرا کی وادی بہت زرخیز ہے اور یہاں جدید پیمانے پر کاشت بڑھائی جا سکتی ہے۔

مدراس رقبے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ اس میں متعدد دریاؤں کے ڈیلٹا ہیں اور اس کا ساحلی میدان کافی چوڑا اور زرخیز ہے۔ باوجود اس کے کہ یہاں کی مٹی اور آب و ہوا میں یکسانیت ہے، لیکن فصلوں میں کافی فرق ہے۔ چاول، گنا، چائے، ربڑ، قہوہ وغیرہ کے لئے الگ الگ خطے ہیں۔ چاول یہاں کی خاص فصل ہے۔ اس صوبے میں آب پاشی کا انتظام خصوصاً دریاؤں کے ڈیلٹا میں اچھا ہے۔ لیکن اب بھی زراعت کا بہت بڑا رقبہ قدرتی بارش کے رحم و کرم پر ہے۔ جس سال وہاں بارش کافی نہیں ہوتی، چاول کی فصل اچھی نہیں ہوتی۔ آب پاشی کے بہتر انتظام کے ذریعے یہاں کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے اور چاول کے معاملے میں صوبہ کو خود کفیل بنایا جا سکتا ہے۔

کوچین اور ٹراونکور یونین میں بارش بہت ہوتی ہے۔ چاول اور ناریل یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ لیکن اب بھی یہاں بہت سی زمین بیکار پڑی ہے۔ اسے صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ بمبئی کا صوبہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے آگے ہے۔ یہاں بھی پیداوار کو بڑھانے کی بابت کئی اسکیمیں کام کر رہی ہیں اور آب پاشی کا بہت اچھا انتظام ہے۔ لیکن باوجود اس کے اب بھی یہاں کی بہت سی زمین غیر مزروعہ ہے۔ اگر حکومت بمبئی اس طرف تھوڑی سی اور توجہ کرے تو اس کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے نئے مسائل کے حل کرنے میں کافی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ بمبئی میں کالی مٹی کا علاقہ کپاس کی کاشت کے لئے بہت مشہور ہے یہاں سینکڑوں ایکڑ زمین پر کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ حکومت اگر اس کی طرف توجہ دے اور کسانوں کو اس کپاس کی خرابی سے آگاہ کرے اور امریکی اور مصری کپاس کی کاشت کر کے اس کا فائدہ انھیں دکھلا دے تو یہاں کے کسان بہت جلد اس کپاس کی کاشت چھوڑ دیں گے۔ امریکی اور مصری روئی بڑے پیمانے پر پیدا ہونے لگے گی تو امریکہ، مصر، برازیل اور سوڈان سے کپاس منگانے کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

سوراشٹر اور کچھ میں سبزی اور چھوٹے چھوٹے رسیلے پھلوں کی کاشت کی جا سکتی ہے اور وہاں کی بیکار زمین سے بہت کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی مٹی اور مختلف آب و ہوا ہے اس لئے کوئی ایسی فصل یا کوئی ایسا پھل نہیں جو ہمارے دیش میں نہ ہوتا ہو۔ اور سال میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی نہ کوئی چیز نہ پیدا ہوتی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ان چیزوں کی پیداوار میں جدید طریقے استعمال نہیں کئے جاتے۔ سائنس کا دخل بہت کم ہے لیکن ہماری حکومت ان خامیوں کو محسوس کر رہی ہے اور کسانوں کو بہتر اور عمدہ بیج، کھاد اور آب پاشی کی سہولتیں بہم پہنچا رہی ہے اور زمینداری کو ختم کر کے کسانوں کو سائنٹفک اور جدید کھیتی کے طور طریقے سکھا رہی ہے۔ یہ کام اگر ہو گیا تو پانچ دس برس میں باوجود ہماری آبادی میں اضافہ ہونے کے ہمارے یہاں ہر چیز کی افراط ہوگی اور ہم کبھی بھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔

(باقی آئندہ)

شومن منصوبہ کا سیاسی اور معاشی پہلو

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

ہو سکے گا یہی نہیں بلکہ مغربی یورپ کے ممبر ملکوں کی کمپنیوں کے آپس کے مقابلے بھی ختم ہو جائیں گے۔

منصوبہ کا دوسرا معاشی مقصد یہ ہے کہ سستے سے سستے داموں اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں فولاد پیدا کیا جائے۔ امریکہ میں آج کل اس قدر ارزاں اور اس قدر افراط مقدار میں فولاد پیدا ہوتا ہے کہ وہ یورپ سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اگر یورپ کی پیداوار کو امریکہ کے معیار پر لانا ہے تو ضروری ہے کہ کوئلے کی پیداوار کو بہتر بنایا جائے۔ مقدار میں اضافہ کیا جائے اور قیمتوں میں تخفیف کی جائے۔

شانتا رام کا جہیز

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

شانتا رام کا جادو چل گیا ہے، اور انھوں نے اپنے اپنے کردار کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ جادو صرف جے شری پر نہیں چلا جس کی اداکاری میں نہ وہ پرانا بھولا پن اور سادگی ہے اور نہ نئی سنجیدگی اور گہرائی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں کے بار بار جھپکانے میں بڑی بناوٹ ہے۔ مکالمے کے بولنے کا انداز بھی بناوٹی لگتا ہے۔ ہاں آخری سین میں جب وہ ساس کے خلاف بغاوت کرتی ہے تو جے شری کی اداکاری میں "شکنتلا" کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

جے شری ہماری فلمی دنیا کا انمول رتن ہے۔ جسے کسی صورت میں بھی ہم نہیں کھو سکتے۔ ہم شانتا رام اور خود جے شری دونوں سے امید کرتے ہیں کہ ان کے آنے والی فلموں میں "شکنتلا" اور "ڈاکٹر کوٹنس" والی جے شری پھر ملے گی۔

"جہیز" ڈائرکشن، ٹکنیک، فوٹوگرافی، پرتھوی راج کی ایکٹنگ کے لحاظ سے لاجواب فلم ہے۔ کہانی کے لحاظ سے اچھی ہے۔ گانوں اور موسیقی کے لحاظ سے بھی "بری نہیں" ہر لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہے ــــــ مگر......

اس "مگر" کا مطلب وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو "دنیا نہ مانے" "آدمی" "پڑوسی" اور "ڈاکٹر کوٹنس" والے شانتا رام کے آرٹ کے متوالے ہیں!

ہماری رائے میں:-

شانتارام کا جہیز

آرٹ اور ٹکنیک کا کمال...... مگر کڑوی سماجی حقیقت پر فلمی شکر چڑھی ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے پندرہ برس میں شانتارام نے بہت سے اچھے اور ترقی پسند معاشرتی فلم بنائے ہیں۔ "دنیا نہ مانے" سے لے کر "اپنا دیش" تک شانتارام کے سب فلموں میں سماجی سوجھ بوجھ، ترقی پسندی اور انسانی ہمدردی کی ایک سیدھی لکیر ملتی ہے۔ "سنت تکارام" اور "چندر سینا" جیسے مذہبی یا تاریخی فلموں میں بھی کہیں نہ کہیں اس کے ترقی پسند خیالات کی ایک جھلک نظر آ جاتی ہے۔ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ انسانی بھائی چارہ (یعنی انسان انسان میں مذہب، ذات پات یا اقتصادی اونچ نیچ کی بنا پر امتیاز نہ ہونا چاہیے۔) انسانی ہمدردی اور عورتوں کے حقوق جو مردوں کی بنائی ہوئی سماج نے بری طرح کچل ڈالے ہیں۔ شانتارام ہندوستانی عورت کو "شوہر کے چرنوں کی داسی" کے روپ میں نہیں دیکھتا۔ بلکہ اسے مرد کے برابر درجہ دیتا ہے۔ شانتارام کی معیاری عورت روتی پیٹتی گڑگڑاتی نہیں، شوہر کے قدموں میں نہیں لیٹتی۔ ساس سسروں کی جوتیاں خوشی سے نہیں کھاتی، شکنتلا ہو یا "دنیا نہ مانے" کی نرملا یا "جہیز" کی چندا وہ اپنے انسانی حقوق مانگتی ہے۔

"جہیز" میں جیشری کی زبانی شانتارام نے ایک فقرہ کہلوایا ہے۔ جس میں اس فلم کا ہی نہیں شانتارام کے بنیادی فلمی مقاصد کا نچوڑ ہے۔ جب چندا سنتی ہے کہ اس کے پتی کو دوسرا بیاہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو وہ سسرال واپس جانا چاہتی ہے اور کہتی ہے "میں اپنا حق مانگوں گی اور اپنا فرض ادا کروں گی"۔ حق اور فرض ——— ان دو لفظوں میں کیک ہی نہیں۔ ہر انسان کا مقصد زندگی ملتا ہے۔ جیسی کہ شانتارام سے امید کی جا سکتی تھی۔ اس بار بھی انہوں نے کوئی چالو قسم کی پریم کہانی نہیں فلمائی۔ ایک سماجی مسئلہ اور معیار کو سامنے رکھ کر یہ کہانی چنی اور بنائی ہے۔ جہیز کا مسئلہ ہمارے سماج کی بڑی اور کڑی لعنتوں میں سے ایک ہے۔ غریب سے غریب ماں باپ بھی بیٹی بیاہنے کے لئے داماد کو ہزاروں کا جہیز دینے پر مجبور ہوتے ہیں جس کے لئے وہ اپنا سب کچھ بیچ ڈالتے ہیں۔ گھر کی چیزیں گروی اور کبھی کبھی گھر بھی گروی رکھ دیتے ہیں یا روپیہ لے کر اپنے آپ کو بھی ساہوکار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ تب جا کر بیٹی کے ہاتھ پیلے کر پاتے ہیں۔ تبھی تو بہت سے ہندوستانی گھرانوں میں بیٹی کے پیدا ہونے کو ہی نحوس سمجھتے ہیں ...... یہ جہیز دینے کی رسم ہمارے سماج کو برسوں سے گھن کی طرح کھا رہی ہے اور آج بھی جب سماج سدھار کا اتنا چرچا ہے بہت سی ذاتیں اس سے چھٹکارا نہیں پا سکیں۔ جہاں سدھار ہوا ہے وہاں بھی پرانی ریت نے نیا چولا پہن لیا ہے اور بس۔ سماج سدھار کے حامی داماد صاحب لقد روپے کے بجائے موٹر مانگنے لگے ہیں، یا دولہا کے باپ اشارہ کر دیتے ہیں کہ بیٹے کی تعلیم پوری کرنے کے لئے کچھ روپیہ چاہیے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی کامیاب کیسے ہوگی؟

اس لئے جہیز کے مسئلے پر کہانی لکھوا کر شانتارام نے اس بار بھی ہمارے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ ویسے جہیز کی لعنت پر دوسری کہانیاں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ فلمیں بھی بن چکی ہیں ایک فلم تو "بھائی بہن" کے نام سے دو ایک مہینے ہوئے نکل چکی ہے۔ مگر سماجی مسئلے کو شانتارام ہمیشہ انوکھے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ اس کی فلموں میں سماجی بے انصافی کا بھیانک روپ بڑے سچے بڑے سیدھے سادے ڈھنگ سے دکھایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم یہ امید کر "جہیز" دیکھنے گئے تھے کہ اس بار بھی شانتارام نے "دنیا نہ مانے" اور "آدمی" والی روایت کو اونچا رکھا ہوگا ......
مگر ......

منشی شمس کی لکھی ہوئی "جہیز" کی کہانی میں سب کچھ ہے۔ گڑیوں کا کھیل ہے، گانے ہیں، ناچ ہیں، لڑکی، لڑکی کا ہرم ہے، نئے نویلے بیاہتا جوڑے کا ہنسی کھیل ہے۔ بڑے دلچسپ کیرکٹر ہیں۔ جن میں سب سے شاندار اور اہم کیرکٹر صوبیدار کا ہے جسے پرتھوی راج نے بڑی شان سے نبھایا ہے۔ ڈرامائی واقعات بھی ہیں اور بڑا موثر دل ہلا دینے والا کلائمکس بھی ہے جس میں لڑکی کا باپ جہیز لے کر اس وقت پہنچتا ہے جب اس کی بیٹی یہ کہتی ہوئی باپ کی گود میں دم توڑ دیتی ہے کہ

"پتاجی! آپ نے جہیز میں سب کچھ دیا۔ مگر ایک چیز تو دینا بھول ہی گئے ...... کفن"۔ اور ہم یہ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ شمس صاحب نے اپنی کہانی میں سب کچھ تو دیا ہے اور دکھایا ہے مگر جہیز کی سماجی اہمیت دکھانا تو بھول ہی گئے۔

شانتارام کی فلموں کی بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ سماجی مسئلوں کو ان کے اصلی اقتصادی روپ میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ مگر "جہیز" دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اب وہ بھی زندگی کی کڑوی اقتصادی اصلیتوں سے گھبرانے اور کترانے لگے ہیں۔ کیا وہ بھی باکس آفس (یعنی تجارتی کامیابی) کے لئے سماجی سچائی کو تیاگ چکے ہیں؟ جہیز کا مسئلہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ اسے دکھانے کے لئے اقتصادی مشکلات، غریبی اور بے کاری کو دکھانا ضروری تھا۔ اتنی بڑی حویلی، جیشری کے بڑھیا کپڑے زیور، اس کی سہیلیوں کا جھرمٹ، دھوم دھام سے گڑیوں کی شادی۔ ان باتوں سے غریبی کی زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر بھی لاکھوں گھرانوں کے لئے "جہیز" کا اصلی مسئلہ یہ ہے کہ بغیر جہیز دئے ماں باپ بیٹی کا بیاہ نہیں کر سکتے۔ نہ کہ یہ بیاہ تو باتوں باتوں میں ہو جائے اور بعد میں ظالم ساس بہو کے دے دے کر بہو کو مار ڈالے ......
یہ تو جہیز کا اقتصادی مسئلہ نہیں۔ ساس کے ظلم کا نفسیاتی مسئلہ ہے۔

کہانی کے اس سماجی پہلو کو چھوڑ کر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہیز کے پہلے حصوں میں گانوں اور ناچ کا بھرتی کا مسالہ ہے۔ اصلی کہانی انٹرول کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ شانتارام کو شاید اپنے آرٹ کی پوری طاقت اور اثر کا اندازہ نہیں کہ وہ بغیر بھرتی کے گانوں اور ناچ کے بھی اپنی فلم کامیاب بنا سکتا ہے۔ اگر "جہیز" کامیاب ہے تو اس لئے نہیں کہ اس میں گڑیا کے بیاہ، چڑیوں کے ناچ اور جھولے کے گانے کے رنگین سین ہیں۔ یا درجن بھر گانے ہیں جن میں سے کوئی بھی بہت مقبول عام نہیں ہوا بلکہ اس لئے کہ شانتارام کی ڈائرکشن نے پرتھوی راج، الہاس اور للیتا پوار کے کرداروں میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے۔ اصل میں اس کہانی کی جان پرتھوی راج، اور للیتا پوار کے جیتے جاگتے کیرکٹر ہیں۔ ان کے ٹکراؤ ہی سے ڈراما پیدا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں جیشری اور کرن دیوان تو کٹھ پتلیاں لگتے ہیں یا وہ سندر گڑیاں جن کو اس فلم میں کئی بار تمثیلی طور پر دکھایا گیا ہے۔ آرٹ اور ٹکنیک کے اعتبار سے "جہیز" شانتارام کی شاندار پیش کش ہے۔ بڑے بڑے ڈائرکٹر بھی "جہیز" کو دیکھ کر ڈائرکشن کے فن کے کئی گہرے نازک اور دور رس نکتوں کو سیکھ سکتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز، گڑیا، کرسی، تصویر، لیمپ، بی کی مورتی، قانون کی کتاب۔ شانتارام کے آرٹ کے جادو سے زندہ ہو جاتی ہے۔

پرتھوی راج اور للیتا پوار کا کام تو خوب ہی ہے مگر الہاس اور کرن دیوان پر بھی اس بار

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

Printer & Publisher Abdul Latif Azmi, B.A. (Hons.) Printed at Jayyed Barqi Press ... Ballimaran, Delhi

نئی روشنی

देहली

فہرست مضامین

[جلد] ۵ | ۸ جولائی سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۲

[..]نگو	پروفیسر سعید انصاری	۲
پہلا ہفتہ		
ہند اور بیرون ہند میں	ع، ج ۔ ع ۔ ل	۳
[..]شکول		۵
[..]شورے	سروش عسکری طباطبائی	۵
[..] بادلوں کا تبسم	انجم اعظمی	۵
[..]دو کا مستقبل	ثریا درجوشی	۶
[..]ادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸
[..]دوستان میں ترقی کے امکانات	محمد امین	۹
[..]ی پسند ادیبوں کی کانفرنس	عبداللطیف اعظمی	۱۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی

ڈاکٹر سید عابد حسین

یونسکو

اُس کے مقاصد اور اُس کے کام

پروفیسر سعید انصاری

(۱)

گذشتہ جنگ عظیم سے دو بڑے نتائج مرتب ہوئے (۱) امن عالم صرف سیاسی اور معاشی اشتراک کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس کے لئے ذہنی اور اخلاقی اتحاد ہونا بھی ضروری ہے اور (۲) یہ کہ اب انسان کے پاس اس قسم کے اتحاد پیدا کرنے کے لئے غیر معمولی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں جو اس سے پہلے کبھی میسر نہ تھیں۔

غرض اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے اقوام متحدہ کے وزرائے تعلیم کی ایک کانفرنس ۱۹۴۵ء میں انگلستان میں منعقد ہوئی جس میں اس قسم کے نظام کا ایک خاکہ تیار کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ حکومت انگلستان کی طرف سے اس نظام کا ایک دستور مرتب کرنے کے لئے نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے، اور اس دستور کی دفعہ کی رو سے ایک ابتدائی کمیشن مقرر کیا جائے جو اس کا مفصل پروگرام تیار کرے۔

چنانچہ سب سے پہلی کانفرنس پیرس میں نومبر ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئی، اور اس ابتدائی کمیشن کی تجاویز پر غور کرنے کے بعد ایک مستقل ادارہ یو، این (ای، ایس، سی، او (یونسکو) کے نام سے قائم ہوا۔ انگریزی کے یہ حروف اختصار ہیں ایک ایک لفظ کے، اور انھی لفظوں میں اس ادارے کے مقاصد پنہاں ہیں۔ "یو" سے یونائیٹڈ (متحدہ) "این" سے نیشنس (اقوام)۔ "ای" سے ایجوکیشنل (تعلیمی) "ایس" سے سائنٹیفک (علمی)، "سی" سے کلچرل (تہذیبی)، "او" سے آرگنائزیشن (ادارہ)۔ یعنی یہ متحدہ اقوام کا ایک تعلیمی علمی اور تہذیبی ادارہ ہے جو امن عالم ان ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ابتداءً اس ادارے میں کوئی ۳۳ ریاستیں شریک ہوئیں۔ ان ریاستوں کے سرکاری رکن ہر سال ایک کانفرنس کی شکل میں جمع ہوتے ہیں اور آئندہ سال کے لئے پالیسی اور پروگرام طے کرتے ہیں۔ اس کانفرنس کی طرف سے ۱۸ آدمیوں کی ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے جو دوران سال میں وقتاً فوقتاً ضروری مسائل کے طے کرنے کے لئے منعقد ہوتی رہتی ہے۔ یہ اراکین اپنے ممالک کے نمایندوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کانفرنس کی طرف سے شرکت کرتے ہیں۔

اس کا ایک صدر دفتر بھی "یونسکو ہاؤس" کے نام سے پیرس میں ہے۔ اس دفتر کا ایک ڈائریکٹر جنرل ہوتا ہے جسے یہ مجلس منتظمہ نامزد کرتی ہے۔ سب سے پہلا ڈائریکٹر جنرل جو پیرس کانفرنس نے مقرر کیا وہ انگلستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر جولین ہکسلے تھے جن کا تقرر دو سال کے لئے عمل میں آیا ہے۔

اسی کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے منظور شدہ کاموں کو چلانے کے لئے ۷ ملین ڈالر یعنی ۳ کروڑ روپے کا ایک میزانیہ بھی منظور کیا گیا۔

یونسکو کے مقاصد

یو، این، او کی طرح یونسکو کا کام سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنا نہیں بلکہ اس کا کام تعلیم، سائنس اور تہذیب کے میدان میں کام کرنا ہے جس سے امن عالم کے قیام اور بین الاقوامی اتحاد میں مدد ملے۔ نیز جس سے قوموں کے درمیان غلط فہمیوں اور تعصبات کے رفع کرنے میں بھی کام لیا جا سکے۔

چنانچہ اس غرض کے لئے جنرل کانفرنس نے ۱۹۴۶ء میں حسب ذیل نوعیت کے کام اپنے ذمے لئے تھے:

۱۔ تعلیم، سائنس اور تمدن کے عام معیار کو بلند کرنا۔
۲۔ خیالات کا آزادانہ تبادلہ
۳۔ بین الاقوامی اتحاد کی تعلیم
۴۔ انسان اور دنیائے جدید

یہ سارے کام ایسے ہیں کہ یونسکو تن تنہا ان کے انجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتی، بلکہ اسے بہت سی دوسری انجمنوں اور جماعتوں سے بھی مل کر کام کرنا ہوگا۔ ان میں سے بعض مسائل پر دوسری جماعتیں پہلے سے کام کر رہی ہیں، بعض بہت آگے نکل چکی ہیں۔ بعض وسائل کی کمی کی وجہ سے اتنی ترقی نہیں کر سکی تھیں۔ یونسکو کے دستور میں ایسی گنجائش رکھی گئی ہے کہ جو جماعتیں اس قسم کا کوئی کام کر رہی ہیں وہ اپنی حکومت کی معرفت یونسکو کے کام میں چاہیں تو ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔

یونسکو کو کوئی عالمی یونیورسٹی یا ادارہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ایک نظام عصبی کے مرکز کی طرح ہے۔ جس کا کام ایک طرف معلومات اور حقائق بہم پہنچانا ہے اور دوسری طرف عمل کے لئے آمادگی اور تحریک پیدا کرنا ہے۔

یونسکو کے اراکین کی تعداد یکم نومبر ۱۹۴۷ء تک حسب ذیل تھی:

۱۔ آسٹریلیا
۲۔ بلجیم
۳۔ بولیویا
۴۔ برازیل
۵۔ کناڈا
۶۔ چین
۷۔ کیوبا
۸۔ چیکوسلوواکیا
۹۔ ڈنمارک
۱۰۔ جمہوریہ ڈومی نیکن
۱۱۔ ایکویڈور
۱۲۔ مصر
۱۳۔ فرانس
۱۴۔ یونان
۱۵۔ ہیٹی
۱۶۔ ہندوستان
۱۷۔ لبنان
۱۸۔ لائبیریا
۱۹۔ لکسمبرگ
۲۰۔ میکسیکو
۲۱۔ نیدرلینڈ
۲۲۔ نیوزی لینڈ
۲۳۔ ناروے
۲۴۔ پیرو
۲۵۔ فلپائنس
۲۶۔ پولینڈ
۲۷۔ سعودی عرب
۲۸۔ شام
۲۹۔ ترکی
۳۰۔ جنوبی افریقہ
۳۱۔ برطانیہ
۳۲۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ
۳۳۔ وینزویلا

ان کے علاوہ بھی انجمنیں جن کو میکسیکو کانفرنس منعقدہ نومبر ۱۹۴۷ء میں آبزرور بھیجنے کے لئے دعوت دی گئی تھی، ان کی تعداد کوئی ۲۵ کے قریب تھی۔

کچھ نوجوانوں کی انجمنوں کو خصوصیت سے نمایندے سرکاری طور پر بھیجنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا، ان کی تعداد تقریباً ۸ تھی۔ بعض نوجوانوں کی انجمنیں جن کو یونسکو سے باقاعدہ تعلق ہے، ان کی تعداد ۵ ہے۔ خواتین کی انجمنیں خصوصیت سے مدعو کیا گیا تھا، ان کی تعداد بھی ۵، اور بین الاقوامی انتظامی انجمنوں کی تعداد ۱۰ تھی۔

اسی طرح ایسی انجمنیں جنھیں باقاعدہ تو مدعو نہیں کیا گیا تھا، لیکن ان کے لئے اور دوسری سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ ان کی تعداد ۵۰ کے قریب تھی۔

بعض ممالک جن کے نیشنل کمیشن یونسکو کے ساتھ مل کر باقاعدہ طور پر کام کر رہے ہیں، ان کی تعداد ۱۵ ہے۔

جن ممالک کے اراکین اس کی مجلس منتظمہ میں شریک ہیں ان کی تعداد ۱۸ ہے۔

اسی طرح یونسکو نے اب تک جتنی مطبوعات شائع کی ہیں، ان کی تعداد ۱۳ ہے۔

بہ خیال طوالت صرف ان انجمنوں، ممالک اور مطبوعات کی تعداد پر اکتفا کیا جا رہا ہے اور ان کے ناموں کی تفصیل نہیں دی جاتی ہے۔

(باقی آیندہ)

لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو ہجرت کرنے کے بعد پچھتا رہے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ابھی تک اقلیتوں کے اپنے اپنے ہاں کی حکومت پر پوری طرح اعتماد پیدا نہیں ہوا اور ان کی شکایات کا کما حقہٗ سدباب نہیں ہوا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو ۲۵ جون کو ختم ہونے والے ہفتے کی رپورٹ سے ہوگا جس کے مطابق اُس ہفتے ۳۹۹۱۳ ہندو مشرقی بنگال سے مغربی بنگال آئے اور ۲۲۲۴۹ واپس گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد لوٹنے والوں سے تقریباً ۱۷ ہزار زیادہ تھی۔ اسی طرح مغربی بنگال سے جانے والے مسلمانوں کی گنتی ۲۷۳۵۶ اور واپس آنے والوں کی ۱۶۲۱۹ تھی۔ گویا یہاں بھی کوئی ۱۱ ہزار کا فرق ہے۔ یہ صورت حال قابل اطمینان نہیں ہے اور دونوں حکومتوں کو اس مسئلے کی طرف اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جتنی وہ اب تک کرتی رہی ہیں۔ ہماری رائے میں پاکستان اور ہندوستان کے وزیراعظموں کو اپنی آئندہ ملاقات میں اور امور پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کی چھان بین کرنی چاہئے کہ جو معاہدہ ہوچکا ہے اس کی تعمیل میں دونوں طرف سے کیا کسر ہے اور اقلیتوں کو کون کون سی تکلیفیں اور شکایتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پناہ گزینی کی افسوسناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

کیا غذا کا مسئلہ حل ہوجائے گا؟

پچھلے سال پنڈت نہرو نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کو غذا کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ۱۹۵۱ء کے بعد باہر سے غلہ منگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اب تک لوگ اس وعدے یا پیشین گوئی کے پورا ہونے میں شبہے کا اظہار کر رہے تھے اور حکومت کے بیانات کو جن میں بار بار اس کی تکرار کی جاتی تھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن اب وزیر زراعت و غذا شری منشی اور سابق فوڈ کمشنر شری آر کے پاٹل کے بیانوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اس کا قوی امکان ہے کہ ۱۹۵۱ء کے بعد ہندوستان کو باہر سے غلہ بالکل نہ منگانا پڑے۔ شری پاٹل نے فرمایا "ہندوستان بحران سے گذر گیا ہے اگر در سال اوسط درجے کی پیداوار بھی ہوئی تو ہم ۱۹۵۵ء تک غذا کے معاملے میں خود کفیل ہو سکتے ہیں" انھوں نے بتایا کہ حکومت ہند نے اس کا انتظام کیا ہے کہ پانچ ۱۹۵۱ء تک بہار میں ۳۰۰ ٹیوب ویل، اتر پردیش میں ۹۰۰ اور پنجاب میں ۲۵۰ تیار ہو جائیں۔ یہ تمیں مستقل طور پر جو ٹیوب ویل تیار کر رہی ہیں وہ ان کے علاوہ ہوں گے شری پاٹل کا کہنا ہے کہ آب پاشی کی چھوٹی چھوٹی اسکیموں کا عوام نے بڑے زور شور سے خیر مقدم کیا ہے کئی صوبوں میں کسان اس کے خرچ کا تہائی یا دو تہائی خود برداشت کرنے کو خوشی سے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مختلف ریاستوں کو غذا کی پیداوار بڑھانے کی اسکیموں میں دستکاری فولاد سمنٹ وغیرہ ملنے میں جو دقت پیش آتی تھی وہ اب دور ہو گئی ہے۔

شری منشی نے بھی اس پریس کانفرنس میں جس میں شری پاٹل نے مندرجہ بالا بیان دیا تھا غلے کی پیداوار کے امید افزا پہلو پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں حکومت کی یہ کوشش تھی کہ ۹ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن غلہ زائد پیدا کیا جائے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جون کے آخر تک ۹ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن زائد غلہ پیدا ہوا یعنی ہماری کوشش ۹۵ فی صدی کامیاب ہوئی۔ اس کا حال ہی میں پتا چلا ہے کہ آب پاشی کی چھوٹی چھوٹی اسکیمیں بہت کامیاب ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ پچھلے سال کے ۳۰ لاکھ ٹن غلے کے مقابلے میں اس سال حکومت کو باہر سے صرف ۱۵ لاکھ ٹن غلہ منگانا ہوگا۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کو اپنے دور آزادی کے پہلے تین سال میں غذا کی جو شدید دقت پیش آئی تھی وہ کم ہوتی جاتی ہے۔ پچھلے تو اسے ڈیڑھ ارب روپیہ ہر سال باہر سے غلہ منگانے پر صرف کرنا پڑتا تھا اب خرچ آدھے سے بھی کم رہ گیا ہے اور اگر وہ توقعات جن کا اظہار کیا جا رہا ہے پوری ہوگئیں تو ۲ سال بعد ہمیں اس سے بالکل نجات مل جائے گی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ متوسط اور مزدور پیشہ طبقے کو جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ صرف غلے کی کمیابی ہی کی نہیں بلکہ اس کی گرانی کی بھی ہے اور گرانی کے مسئلے کو حل کرنے میں حکومت اب تک قطعاً ناکام رہی ہے۔ غلے کی پیداوار بڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر اس کی تقسیم کا انتظام بہتر نہ ہوا تو کوئی تعجب نہیں کہ زمانہ جنگ کی طرح ہندوستان کا غلہ کھلا یا چوری چھپے دوسرے ملکوں میں پہنچتا رہے اور یہاں گرانی کی مصیبت بدستور رہے۔

ع، ح

لڑائی جاری ہے

کوریا کی لڑائی جاری ہے۔ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی کوریا کی فوجوں میں انتشار پیدا ہوگیا ہے اور اُن کے حوصلے ٹوٹ چکے ہیں۔ شمالی کوریا کی فوجیں ابھی تک (۵ جولائی) برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ جنوبی کوریا کا نہایت اہم محاذ سوان پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہوچکا ہے۔ امریکی ہوائی جہاز شمالی کوریا کے جنگی اڈوں پر مسلسل بمباری کر رہے ہیں۔ مگر امریکی بری فوج کی ابھی شمالی کوریا کی فوج سے باقاعدہ ٹکر نہیں ہوئی ہے۔ یہ تاخیر معلوم نہیں اتفاقی ہے یا جنگی مصلحت کی بنا پر۔

ایک دو خبریں اس بات کی ضرور آئی ہیں کہ روس کے ہوائی جہاز میدان جنگ میں دیکھے گئے مگر روس ابھی تک براہ راست جنگ میں شریک نہیں ہوا ہے۔ ۳ جولائی کو ماسکو ریڈیو نے مشہور روسی مصنف ایلیا اہرن برگ کا مضمون نشر کیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "جنگ دنیا کے چند سرمایہ پرست ملک جنگ میں کود پڑے ہیں۔ ہم روسی اب تک جنگ سے الگ ہیں جبکہ امریکہ کے ڈھنڈورچی ہائیڈروجن بم سے پیار سے میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں، ہم اپنے ملک میں غلہ اور ترکاریاں پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم دیگر اہم وقت بہت اہم کام میں مصروف ہیں — ہم اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں"۔

موجی منہ ریڈیو نے بھی اعلان کیا ہے کہ "روس جنوبی کوریا کی جنگ میں غیر جانب دار رہے گا"۔ انگلستان کے بعض اخبارات نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑائی عالمگیر جنگ کی صورت اختیار نہیں کرے گی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس بات کا ابھی پورا خطرہ موجود ہے کہ اگر کوریا کی جنگ نے طول کھینچا تو عالمگیر جنگ یقینی ہے، ممکن ہے کہ کوریا کی لڑائی میں روس براہ راست شریک نہ ہو اور صرف در پردہ جیسا کہ اس وقت کر رہا ہے مدد کرتا رہے۔ مگر وہ دوسری جگہوں پر بالکل اسی طرح کی صورت حال پیدا کر سکتا ہے، جیسا کہ کوریا میں پیش آئی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں ایسے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ادھر ایران سے جو خبریں آرہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی جو الا مکھی تیار ہو رہا ہے اس لئے ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ لڑائی صرف کوریا تک محدود رہے گی اور آگے نہیں بڑھے گی۔

مصر غیر جانبدار رہے گا

روس اور اس کے زیر اثر ملکوں کے علاوہ قریب قریب تمام ملکوں نے یو این او کی اپیل پر جنوبی کوریا کی مدد کا وعدہ کر لیا ہے۔ البتہ مصر نے اس اپیل کی تائید کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے اس کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ پہلی یہ کہ کوریا کا جھگڑا مشرق و مغرب کی کشیدگی کے سلسلے میں ایک اہم اقدام ہے، اور یہ ایسا قدم ہے کہ جس سے دنیا کا امن خطرہ میں ہے دوسری یہ ہے کہ اب تک کئی بار حملے ہوچکے ہیں اور اتحادی قوموں کے منشور کی خلاف ورزی کی جا چکی ہے۔ مگر اس سلسلے میں اتحادی قوموں کے ادارے نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اگرچہ مصر نے دوسرے سبب کی وضاحت نہیں کی ہے مگر عام طور پر خیال ہے کہ اس کا اشارہ فلسطین کے جھگڑے کی طرف ہے (ع۔ ل)

ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس

(بسلسلہ صفحہ ۱۱)

موجودہ حکومت کو اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود موجودہ حالات میں غنیمت سمجھتا ہے اور اس کی حمایت ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ نیز وہ شخص جو یو۔ این۔ او کو اس کی تمام خرابیوں کے باوصف، صرف اس لئے کہ اس سے بہتر اس وقت کوئی عالمی ادارہ نہیں ہے، اس کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس کو اور مضبوط کرنا چاہتا ہے تاکہ امن کے قیام میں وہ موثر کارروائی کر سکے، نیز وہ جو روس کو ہر حالت میں صحیح نہیں سمجھتا ہے، وہ اس مہم کے وسیع دائرے میں بلا شرط داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین واقعی تمام ادیبوں کا تعاون اور اشتراک عمل چاہتی ہے تو بقول ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے اسے ایسا نعرہ تلاش کرنا چاہئے جسے غیر کمیونسٹ بھی اپنا سکیں۔

کشکول

"آخ ......"

"ہائیں ہائیں! یہ آپ کیا غضب کرتے ہیں۔ تھوکنا ہے تو باہر جاکر تھوکئے۔ برآمدے میں تھوکنے پر صاحب بہت خفا ہوتے ہیں۔"

"استغفر اللہ! انگریز چلا گیا مگر اپنی ذریات کو ہم غریبوں کا گلا گھونٹنے کے لئے چھوڑ گیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں کسی فرنگی کی ارواح رہتی ہے، نہیں تو کبھی آکر تھوکتے بھی نہیں۔ کیوں بابو صاحب بھارت کے باسیوں کو آزادی جو ملی ہے وہ آخر کاہے کی آزادی ہے۔ کھانے کو تو ملتا نہیں۔ پینے کی اجازت نہیں اب اگر تھوکنے کی بھی بندش ہو گئی تو پھر جینا مشکل ہو جائے گا۔"

"مولانا آپ تو ناحق خفا ہو گئے۔ آپ کو تھوکنے کو کون منع کرتا ہے۔ شوق سے تھوکئے مگر مناسب محل ——"

"ارے تو ہم کب اندھا دھند، الٹکل پچو، تھوکتے ہیں۔ ہم نے بچپن سے سن رکھا ہے کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔ اس لئے ہم گلی میں جا رہے ہوں اور کوئی کوٹھے پر سے پان کھا کر کتنی ہی اشتعال انگیز پچکاری ہم پر چھوڑ دے، ہم وہ گھونٹ کر رہ جاتے ہیں، کبھی الٹ کر نہیں تھوکتے۔ اسی طرح ہم نے تجربے سے سیکھا ہے کہ ریل میں جا رہے ہوں یا تیز ہوا چل رہی ہو تو ہوا کے مخالف رُخ پر کبھی نہ تھوکئے ورنہ شیطان آپ پر تھوک بیٹھتا ہے۔"

"گستاخی معاف، آپ نے ریل میں سفر کیا ہوگا تو ہر ڈبے میں یہ ہدایت بھی لکھی دیکھی ہوگی——"

"تھوکو مت، اس سے بیماری پھیلتا ہے۔ جی ہاں دیکھی ہے اور لکھنے والے کی زبان دانی کی داد دی ہے جب اس چرکٹے کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ بیماری نر ہے یا مادہ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ کاہے سے پھیلتی ہے یا پھیلتا ہے، اور فرض کیجئے ایسا بھی ہو تو بعض بیماریاں سانس سے بھی پھیلتی ہیں۔ کل کو وہ بقراط کی دم کہہ دے گا کہ سانس مت لو۔"

"اب بھی کوئی کہے گا کہ میرا بیل منطق نہیں پڑھا ہے۔ خیر مولانا بیماری کو چھوڑئیے، یوں بھی تھوکنا بڑی گندی حرکت ہے۔ دیکھ کر گھن آتی ہے۔"

"اللہ ری تاناشاہی، تھوکنے سے گھن آتی ہے تو اپنی ولایت میں رہو اور شوق سے تھوک نگلا کرو، ہم تو تھوکیں گے اور بیچ کھیت تھوکیں گے۔ ہماری ساری تہذیب کی بنیاد، سارے اخلاق کا دارومدار تھوکنے پر ہے۔ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو، ہمارا دستورِ عمل ہے۔ ضبط و تحمل سے کام لینا ہو تو ہم غصے کو تھوک دیتے ہیں کسی کو اس کی ناشائستہ حرکتوں پر ملامت کرنا ہو اور شرم دلانا ہو تو تھڑی تھڑی کرتے ہیں اور وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کی اوقات پر تھوکتے ہیں۔ بڑا بول بولنے کے بعد پچھتاتے ہیں اور عاجزی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو تھوک کر چاٹتے ہیں۔ صدیوں سے ہمارے بزرگ اور ہم بھی دیکھتے اور کرتے آئے ہیں۔ اب یہ نئی پود پیدا ہوئی ہے جسے انگریزی ایسی چڑھی ہے کہ انگریزوں کی ہر کثافت لطافت اور ہماری ساری زندگی گندگی معلوم ہوتی ہے۔ غضب خدا کا ہمارے بچے جنہیں ہم نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہے ہم پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ ہماری اچھی بھلی عادتوں میں کیڑے ڈالتے ہیں۔"

ع - تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مشورے
سروش عسکری طباطبائی

وقت کے اجنبی آغوش میں مسکن کب تک
اے سکونِ ابدی! سینۂ بیتاب میں آ
تاکجا جلوہ گری، عیش کے کاشانوں میں
صبحِ نوروز! مری شامِ سیہ تاب میں آ
موجِ بے باک! تجھے تہ کی خبر لاتا ہے
دامِ ساحل سے نکل، حلقۂ گرداب میں آ
دشت و صحرا کو ہے طوفاں کی تمنا کب سے
جوئے خاموش سبک! منزلِ سیلاب میں آ
عقل کی وادیٔ لب تشنہ و ویراں سے گزر
عشق کے گلشنِ بالیدہ و شاداب میں آ!
اپنے رندوں سے یہ موہوم اشارے تاچند
رگِ مینا میں اُبھر، موجِ مئے ناب میں آ
جلوے بیتاب ہیں تیرے رُخِ زیبا کے لئے
صبحِ رنگیں میں جھلک، شامِ شفق تاب میں آ
یہ ترسے حسنِ برہنہ کو نگاہیں نہ نظر
بچ کے تاروں سے، ردائے شبِ مہتاب میں آ
عالمِ ہوش میں آتے جو حجاب آتا ہے!
خوابِ جاوید بن! اور دیدۂ بےخواب میں آ

بربادیوں کا تسلسل
انجم اعظمی

یہ تو معلوم تھا برباد مجھے ہونا ہے
آج کیوں درد سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں
اب تو دیوار پہ جلتی ہیں نہالوں شمعیں
اب تو آنکھوں میں ترا جھوٹ بھی سچ بنتا ہے
اب تو ہر گام پہ ماحول کے انگارے ہیں
اب تو ہر گام پہ کچھ ٹوٹے ہوئے تارے ہیں
اب تو ٹوٹی ہے مرے درد کی شوریدہ سری
اب تو آہیں مری سینے ہی میں کھو جاتی ہیں
لب تک آنے کی سکت ہی نہیں باقی رہتی
اشک پلکوں پہ کہاں ہوتے ہیں کب ہوتے ہیں
دل کے تاریک نہاں خانے میں جم جاتے ہیں
میں نے سنسان خلاؤں میں سہارا ڈھونڈا
تجھ کو پا کر مری دنیا میں اُجالا سا ہوا
تجھ کو پا کر مرے جذبات نے انگڑائی لی
تجھ کو پا کر ترے دیوانے نے چلنا سیکھا
تجھ کو پا کر تجھے کھو دینے کا اندیشہ تھا
آج تو لوٹ رہا ہے مرے خوابوں کا نشہ
تیری الفت بھی مرے کام نہ آئی افسوس!
اب کہاں جام چھلکتے ہیں تری محفل میں
تیرے ہونٹوں کا تبسم بھی کہاں عریاں ہے
مر چکی میرے لئے گرمیٔ رخسار تری
میری ویران نگاہی کا کوئی درماں ہے
مہرباں کون نہیں ہے مری بربادی پہ
مہربانی کا بھرم آج نہ کھل جائے کہیں

اردو کا مستقبل

ثریا دجوشی

(یہ مضمون مراٹھی رسالے "نوبھارت" میں شائع ہوا تھا، جو شریاد جوشی صاحب کی ادارت میں پونہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں خود انہی نے کیا ہے)

اور بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی فرصت کے وقت ریڈیو سننے کا شوق ہے۔ لیکن میرے پاس خود اپنا ریڈیو نہ ہونے سے میرا یہ شوق جنون نہیں بن پایا ہے۔ اور شاید اسی لئے ریڈیو سے میری دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے مجھے دہلی سے نشر ہونے والے پروگرام زیادہ پسند آتے تھے لیکن تقسیم کے بعد دہلی ہی جتنا لاہور مرکز بھی مجھے اچھا لگنے لگا۔ خاص کر جب دہلی کے ریڈیو مرکز میں کام کرنے والے کچھ دوستوں سے یہ معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد تقریباً سبھی اعلیٰ درجے کے گانے اور گانے والیاں پاکستان چلی گئی ہیں اور ہندوستان میں صرف بجانے والے ہی رہ گئے ہیں تو کراچی، پشاور اور ڈھاکے سے نشر ہونے والے پروگرام سننے کی بھی خواہش دل میں پیدا ہو گئی اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور سے نشر ہونے والے گانے کے پروگراموں سے دل کو بہت کچھ تسلی ہوئی۔

ایک دن یوں ہی لاہور مرکز لگا کر بیٹھا تھا کہ ملکہ پکھراج کی مردانہ آواز سنائی دی۔ وہ الطاف کا یہ گیت گا رہی تھیں:-

پردیسی کیوں دیس کو بھولے؟
کس ڈاکن نے ٹوکا تم کو
گھر آنے سے روکا تم کو
کس کی سنورنا پر بھولے؟

کون ہو جو الطاف پیا بن
اس بھولے بھالے رسیا بن
ہونٹوں کو ہونٹوں سے چھولے؟

اسی طرح ایک روز منور سلطانہ گا رہی تھیں:-

مالی رے پردیس نہ جا
جو تم نے سینچی پھلواری
ہری بھری اور پیاری پیاری
جس کی کلی سے تم نے اپنا خون بہایا!

پھر ایک بار کراچی سے سلطانہ بیگم احسان کا یہ گیت گا رہی تھیں:-

دنیا کا من رین کا سپنا
وہ نگر میں چین کا سپنا
روپ انوپ سے نین کا سپنا

کس کی ہار اور کس کی جیت
جھوٹے جگ کی جھوٹی پریت!

اس قسم کے گیت جب میں پاکستانی ریڈیو سے سنتا ہوں تو میرے دل میں ایک خیال بے اختیار آتا ہے کہ اگر گانے والوں اور گانے والیوں کے نام منور سلطانہ، ملکہ پکھراج، نسیم اختر، سلطانہ بیگم، زینت بیگم، شہناز بیگم، اختر مجید، ظہیر حسین، بہار بیگم وغیرہ نہیں بلکہ ایرا مجم، گائتری سرکار، کسم دریا، سیتا چکرورتی، سنتوش، ایرودھ، وجے کمار، پشپا ماتھر یا وِدیا ناتھ، سیٹھو وغیرہ بتلائے جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نہیں بلکہ ریڈیو پاکستان ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ان گیتوں میں ہندی کے لفظ اتنے زیادہ ہیں کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہندی کے گیت نہیں ہیں۔ ہاں وہ اردو رسم خط میں لکھے جاتے ہیں اور مسلم مغنی انھیں ریڈیو پاکستان سے گا کر سناتے ہیں۔ اسی لئے ان کو اردو گیت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا خیال دل میں آجاتا ہے کہ دیس کا بٹوارہ ہو جانے کے بعد آئندہ پاکستان میں اس طرح کی زبان لکھی یا بولی جانے کا امکان ہے؟

اور یہی خیال زیادہ دیر تک دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ کیوں کہ آج پاکستان میں جتنا علاقہ ہے اس میں تھوڑا سا حصہ بھی ایسا نہیں ہے جس کی ملکی زبان اردو ہو، یعنی کوئی پاکستانی ماں اپنے بچوں کو اردو میں لوری نہیں دیتی۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو طے پائی ہے۔ لیکن سارے دیس میں ایک کی بھی مادری زبان اردو نہیں ہے (تقسیم کے بعد جو مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے ہیں ان کی بات الگ) کسی کی مادری زبان سندھی ہے تو کسی کی پنجابی۔ کسی کی بلوچی ہے تو کسی کی پشتو اور سب سے بڑی تعداد تو ان کی ہے جن کی مادری زبان بنگالی ہے اور ان میں سے ہر گروہ کو اپنی مادری زبان پر ناز ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟

اردو کی پیدائش دکن میں بتائی جاتی ہے، مگر اردو زبان اور اردو کا اصل وطن اور گہوارہ یوپی کا مغربی حصہ اور دہلی کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ حیدرآباد (دکن) بھی اردو کا ایک ترقی یافتہ اور شاندار مرکز تھا۔ لیکن اس کا زور اور اس کی شان بناوٹی تھی۔ جب تک نظام کا راج رہا، اردو کا دور دورہ رہا۔ جب عوام کے ہاتھوں میں راج کی باگ ڈور آ جانے کی تو وہاں صوبائی زبانوں کے طور پر تیلگو، مراٹھی اور کنٹر زبانیں چلنے لگیں گی، اور سرکاری زبان ہندی بن جائے گی پھر وہاں اردو کا نام نشان بھی نہیں رہے گا، اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے کیونکہ وہاں اردو زبردستی لادی گئی تھی لیکن دہلی اور لکھنؤ کی یہ صورت نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں مرکزوں میں اردو کو پہلے پہل بادشاہوں اور نوابوں کی بدولت اہمیت حاصل ہوئی۔ لیکن مغل سامراج کے ختم ہو جانے کے بعد عام لوگوں نے اور عالموں اور ادیبوں نے یہاں اردو کو قائم رکھا اور اس کو فروغ دیا۔ اسی لئے دہلی اور لکھنؤ کے اطراف کا حصہ اردو کا وطن سمجھا جانے لگا۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد بڑی عجیب و غریب حالت پیدا ہوئی۔ پاکستان نے اردو کے درخت کو اپنے یہاں لے جا کر لگا تو دیا مگر اس کی جڑیں یہاں ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ اور بھارت کے لوگوں نے ہندی کو، ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کو، سرکاری زبان بنا کر اردو کو نیست و نابود کرنے کا یا کم سے کم دبا دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آئین ساز اسمبلی نے سرکاری زبان والی تجویز کی ساتویں مد میں اور زبانوں کی طرح اردو کو بھی جگہ دے دی ہے، لیکن وہ تو سنسکرت کی طرح صرف کاغذ پر ہی رہے گی، کیونکہ دوسری بارہ زبانوں کے الگ الگ صوبے بن سکتے ہیں (اور اس میں شک نہیں کہ بن کر رہیں گے) لیکن سنسکرت اور اردو زبانوں کے الگ صوبے نہیں بن سکتے۔ صرف کچھ لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے ان زبانوں کو تجویز میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ اردو کسی بھی ایک بڑے اور یکجا علاقے کی صوبائی زبان نہیں ہے اور سنسکرت تو صرف کتابوں کی زبان رہ گئی ہے۔

اردو کے لئے ایک نقصان دہ بات یہ بھی ہو گئی ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اس لئے جو لوگ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں وہ اردو سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اردو لکھنے والوں میں مسلمانوں سے زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنے ہی جتنے ہندو لیکھک بھی ہیں، بلکہ اردو کہانی، ناول اور ڈرامہ پر تو زیادہ تر ہندو مصنفوں کا قبضہ ہے۔ پرانے زمانے کے منشی دیا نرائن نگم، منشی نول کشور، دیا شنکر کول نسیم، منشی نہال چند، پنڈت بشن نرائن در، مراری لال جی، پنڈت منوہر لال زتشی، پنڈت مکند رام، پروفیسر رام چندر، لالہ سری رام دہلوی، للو لال جی، پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ ادیبوں کی بات چھوڑ دی جائے تو بھی نئے زمانے کے چکبست، عبرت، پنڈت کیفی

ڈاکٹر لکشمی دت، منشی پریم چند، پنڈت سدرشن، کرشن چندر، راما نند ساگر، اپیندر ناتھ اشک، رگھوپتی سہائے فراق، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی، دیویندر ناتھ ستیارتھی، بلونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد، گیان چند، پریم ناتھ پردیسی، ڈاکٹر تارا چند، کنھیا لال کپور، کرتار سنگھ دگل، ملک راج آنند، سنت سنگھ سیکھوں، رنبیر سنگھ بیر وغیرہ ادیب غیر مسلم ہیں۔ اس لئے دیش کی تقسیم کے ساتھ گویا اردو کے ادیبوں کی بھی تقسیم ہو گئی۔ ان غیر مسلم مصنفوں میں سے تقریباً سب کو اپنی مرضی کے خلاف مغربی پنجاب چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا لیکن مسلم لکھنے والے عام طور پر ہندوستان چھوڑ کر پاکستان نہیں گئے۔ جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ساغر نظامی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، جگر مراد آبادی، مجاز، مجروح، ظہیر ملیح آبادی، جمیلہ خاتون، نسیم باقر رضوی، احمد مجتبیٰ، وامق جونپوری، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، اختر انصاری، قدوس صہبائی، شکیلہ اختر، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محیب، رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، عبادت بریلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی محمد عبدالغفار، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، سید تمنا واحمد وغیرہ قریب قریب سبھی چوٹی کے لکھنے والے ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ پس ہندوستان میں اردو کا بازار سرد ہے۔

ایک مشہور اردو ادیب نے ایک بار کہا تھا کہ پاکستان قائم ہوتے ہی دہلی کے مسلمانوں نے اپنے بچوں کو ہندی پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ خدا جانے اب ہماری کتابیں کون پڑھے گا۔ سارے پنجاب میں میری اردو کی کتابیں رائج ہیں۔ اب دہلی کی سرکار کے حکم سے مجھے وہ سب ہندی زبان اور ناگری رسم خط میں شائع کرنا پڑ رہی ہیں۔ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بڑے ادیب مہاشہ سدرشن صاحب ہیں۔

یہ بات الگ ہے کہ ایسی حالت ہونی چاہیئے یا نہیں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایسی حالت موجود ہے۔

دیش کے بٹوارے کے بعد دہلی کے "تیج" اخبار کے دیوالی نمبر میں خواجہ احمد عباس نے "پاکستان کے قیام سے اردو ادب کا ستیاناس" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں "آج کل ہندوستان کے اتر کے جو علاقے ہیں جو خانہ جنگی ہو رہی ہے اس کے بدترین شکاروں میں اردو ادب ہے۔" اور اس کی وجوہ یہ بتاتے ہیں کہ اردو کی اشاعت کے تمام انتظام جو لاہور اور دہلی میں تھے، عملاً ختم ہو چکے ہیں۔

بیاشروں کی تقریباً دس لاکھ روپے کی کتابیں نادر قیمتی کتب خانے اور پرانے مسودے ادبی رسالوں اور ماہناموں کے دفتر جل گئے۔ آگ لگانے والوں نے اندھے پن اور بے وقوفی سے کام لیا۔ دہلی میں مکتبہ جامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کتب خانہ تھا اور جس نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیفوں کے اردو ترجمے شائع کئے تھے، تباہ ہو گیا۔ لاہور میں مکتبہ اردو جس میں جدید اور ترقی پسند اردو مصنفوں (ہندو، مسلمان اور سکھ) کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی جیسوں کی کتابیں چھپتی تھیں اپنے تمام قیمتی اسٹاک سے محروم ہو گیا۔

لیکن اس مادی نقصان سے ہزار گنا زیادہ نقصان تہذیب اور تمدن کے معاملے میں ہوا جیسا کہ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔ "پاکستان کے بن جانے سے ہندوستان کی جغرافیائی سیاسی اور آرتھک ایکتا تباہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہندوستان کی تمدنی وحدت کی بہت سی یادگاریں بھی تباہ ہو گئیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں یادگار اردو ادب اور اردو زبان تھی جو ہندوؤں کی اکثریت کے علاقے میں اردو کے خلاف جو رد عمل ہو رہا ہے وہ افسوسناک مگر قدرتی ہے۔"

پاکستان میں اردو کسی کی بھی مادری زبان نہیں اس لئے اس کا عام طور پر چالو ہونا مشکل ہے اور لاہور اور اس کے آس پاس کے کچھ پڑھے شہریوں کی بات چھوڑ دی جائے تو عام لوگوں کے کاروبار میں اردو کو کہیں بھی جگہ ملنا ممکن نہیں۔ پھر پنجابیوں کی سرزوری سے تنگ آئے ہوئے سندھی پٹھان بلوچی اور بنگالی لوگ آسانی سے اردو کو نہیں اپنائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے جس مذہبی جذبے کے زور پر پاکستان قائم کیا گیا اسی کو ابھار کر پاکستان کی دوسری زبانوں کو مٹا کر صرف اردو ہی کو پاکستان کی واحد زبان بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں ہندوستان میں بھی یہ چاہنے والے لوگ کم نہیں ہیں کہ سارے ہندوستان کی ایک ہی زبان ہو اور وہ ہندی ہو۔ مگر آج تو یہ بات اتنی آسان دکھائی نہیں دیتی۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہو تو بھی ہندوستان میں جو کہ اردو کا وطن ہے اردو کا مستقبل روشن کیوں نہ ہو؟ اصل میں ایسی ہی حالت ہونی چاہیئے تھی، لیکن اکثر مسلمانوں نے اردو کو اپنی مذہبی یا فرقہ وارانہ زبان مان کر اس کو حد سے زیادہ اونچا درجہ — قومی زبان کا درجہ — دلوانے کی تمنا دل میں رکھی اور اس کی کوشش بھی پر زور طریقے سے کی۔ ان کی اس کوشش میں سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تارا چند، پنڈت سندر لال، پنڈت برج نرائن چکبست وغیرہ جیسے ہندو عالم بھی شامل تھے۔ لیکن ان عالموں کو ہندو اکثریت کا اعتبار کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ اردو کے مسئلے میں ان کے ساتھ عام ہندوؤں کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے مسلمانوں نے اردو کو جو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا تھا وہ ان ہندوؤں کی کوشش سے نہیں ڈھل سکتا لیکن مسلمانوں کا اصلی قصور یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اردو کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی بلکہ ان کا اصلی قصور یہ ہے کہ انہوں نے ہر طریقے سے ہندی کو دبا دینے کی، اس کا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کا جو صیغہ مسلمان افسروں کے قبضے میں تھا۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں اور ہندو پرست ہندوؤں کی بھرمار کر دی، اس لئے اچھے اچھے ہندوؤں کے دل بھی مسلمانوں کی طرح اردو سے بھی پھر گئے۔ خاص کر یوپی کے پڑھے لکھے ہندوؤں کے دلوں میں اردو سے نفرت پیدا ہو گئی۔ جب تک مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دل صاف نہیں ہوں گے تب تک اردو کے بارے میں ان میں جو غلط فہمیاں جڑ پکڑ چکی ہیں، وہ نہیں جا سکتیں۔ پاکستان کی پالیسی سے ہندوؤں کے دل مسلمانوں کے خلاف بھڑکتے ہی جا رہے ہیں۔ اس لئے ابھی کچھ عرصے تک یہ ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ ہندوستان کے لوگ اردو کے بارے میں بے تعصبی سے سوچ سکیں۔

ایک بار ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے اس بارے میں باتیں ہو رہی تھیں اس وقت انہوں نے فرمایا تھا "آج ہندی کی جو شکل ہے اس میں اگر عوام کی ضرورت کے مطابق فرق نہ ہوا تو لوگ اردو کی طرف مائل ہو جائیں گے اور پھر اردو کا مستقبل روشن ہو گا لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو زبان اپنے رسم الخط کو ترک کر کے ناگری رسم خط کو اپنا لے۔"

میرے خیال میں اس سوال کا یہی جواب صحیح ہے آج ہندی سرکاری زبان تو بن گئی ہے مگر وہ ابھی تک قومی زبان نہیں بنی ہے۔ اس کے لئے سارے دیش سے منظوری کی مہر لگنی ضروری ہے۔ یہ منظوری صرف قانون ساز اسمبلیوں سے حاصل ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ جنتا کے جیون میں دکھائی دینی چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہندی کچھ جھک کر دوسری زبانوں کو ان کا مناسب درجہ دلانے میں مددگار بنے۔ لیکن آج تو ہندی بہت ہی مغرور ہے۔ اس میں یہ گھمنڈ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ سب ہندوستانی زبانوں کی رانی ہے۔ اس لئے اس کے سرکاری زبان بننے سے پہلے دوسری زبانوں کے دل میں اس کی جو عزت اور محبت تھی وہ بھی گھٹنے لگی ہے۔ اگر ایسی ہی حالت بہت عرصے تک رہی تو ہندی کے خلاف بڑا زبردست محاذ بن جائے گا اور اسے راج بھاشا کے سنگھاسن سے نیچے کھینچ کر اس کی جگہ گاندھی جی کی بنائی ہوئی علمی ہندوستانی کو رکھا جائے گا۔

افسوس کی بات ہے ہندی روز بروز مشکل اور بوجھل ہوتی جا رہی ہے رانی بن جانے سے اس کا جسم اس قدر موٹا ہوتا جاتا ہے کہ اس کے لئے پلنگ سے اٹھ کر بازار تک جانا مشکل ہے۔ آج کے ہندی اخبار رسالے اور کتابیں اتنی بھیانک سنسکرت آمیز زبان استعمال کر رہی ہیں کہ غیر ہندی والوں کی بات تو دور رہی خود ہندی والوں کے لئے بھی وہ ایک آفت جان بن گئی ہے۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔ تھوڑے ہی عرصے میں سچا جنتا راج قائم ہوتے ہی، جنتا کی زبان ہندی کی جگہ لے لیگی اور آج کی ہندی صوبائی زبان کی حیثیت سے رہ جائے گی۔ قومی زبان ہندی ہی کہلائے گی لیکن وہ نئی شکل و صورت میں نمودار ہوگی یہ نئی ہندی اردو سے بہت قریب ہوگی۔

آزادی کی زنجیریں

گیارھواں باب

ظفر دیالپور کے ایک بگڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد پنشن لے کر وطن میں رہتے تھے۔ ظفر اور اس کا دوست ہردیال الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم، ان کے شوہر صفدر علی اور ان کی لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے جسینہ اور ظفر کی بچپن میں نسبت ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن اور ذہانت و ذکاوت پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے اگر ظفر علی اچھے نمبروں سے پاس نہ ہوا تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہو گئی اور اس نے پڑھنے میں جان لڑا دی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق ضرور ہے۔

ظفر چھٹیوں کے بعد کالج آیا تو ریحانہ سے ملاقات ہوئی جس نے اسی سال فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں میں بڑی بے تکلفی ہو گئی اور آہستہ آہستہ ریحانہ ظفر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ادھر لطیف زندگی کے مقابلے کے امتحان میں ناکام رہا جس سے صفدر علی صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی اور اب وہ ظفر سے دلچسپی زیادہ لینے لگے۔ لطیف کا کانٹا نکل جانے سے حسینہ کی زندگی میں بھی بہار آ گئی۔

قسط ۲۶

کئی روز تک ظفر کالج میں ریحانہ سے الگ الگ رہا اور گھر پر ہردیال سے منہ پھلائے رہا۔ ریحانہ اپنی سادہ دلی سے یہ سمجھتی رہی کہ ٹرمینل امتحان نزدیک ہے اس لئے ظفر چھٹی کے گھنٹوں کو بھی مطالعے میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس کشیدگی کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کا اور الٹا اثر ہوا یعنی ظفر یہ سمجھنے لگا کہ ریحانہ نے چند روز اس سے دل بہلا کر چھوڑ دیا اور اب اس کی پروا نہیں کرتی۔ ہردیال ظفر کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ اس سے جو خفگی بغیر اجازت افسانہ چھپوا دینے کی وجہ سے ہے وہ محض بہانہ ہے۔ غصہ دراصل ریحانہ پر ہے مگر اس کی لپیٹ میں وہ بھی آ گیا ہے۔ رات کھانے پر اکرام اللہ کے سامنے ظفر اپنی آزردگی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا مگر جب وہ اور ہردیال اکیلے ہوتے تھے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور وہ یا تو بالکل چپ رہتا تھا یا اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا تھا۔ ہردیال بڑے صبر سے چند روز تک پارے کو دیکھتا رہا جب اسے غصے کی حرارت کچھ کم نظر آئی تو ایک دن صبح تڑکے ظفر کے کمرے میں جا کر اس نے بغیر ہیر پھیر کے بالکل سامنے سے حملہ کر دیا۔

ظفر۔ میں برابر دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھ سے خفا رہتے ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تمہارا افسانہ لے کر چھپنے کو بھیج دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا جی کسی طرح نہیں مانتا تھا کہ تم ایسے پھڑکتے ہوئے افسانے لکھو اور وہ میز کے کاپی میں بند رہیں۔ بہرحال اب تو مجھ سے قصور ہو گیا جو سزا چاہو دے لو مگر خدا کے لئے یہ منہ تھتھانا چھوڑ دو نہیں تو شکل بگڑ کر رہ جائے گی۔

ظفر کا غصہ جس کا تاؤ ختم ہو چکا تھا ایک ہی چھینٹے میں ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر بھی اس نے جواب غصے کے لہجے میں دیا۔ "بڑی جلدی آپ کو معافی مانگنے کا خیال آیا۔ آخر یہ تم کو سوجھی کیا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان افسانوں کو جو میں نے صرف اپنے لئے لکھے ہیں دوسرے پڑھیں۔ تم نے یہ غضب کیا کہ "نالۂ دل" کو جس کی میں کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیتا تھا چھپوا دیا اور وہ بھی مولانا سائل کے رسالے میں۔"

ہردیال۔ اچھا یہ بات ہے؟ کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے۔ مگر تمہیں کشکول پر کیا اعتراض ہے۔ وہ تو اردو کے چوٹی کے رسالوں میں سمجھا جاتا ہے۔ ہاں خوب یاد آیا، کل یالی روشن سے ملے تھے، تم سے بہت خفا تھے کہ تم پرانے ادب کے کیمپ میں چلے گئے۔ اُن سے مولانا سائل نے تمہارے مضمون کی بڑی تعریف کی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سائل تمہارا پتہ پوچھ رہے تھے کہیں نازل ہو جائیں تو تعجب نہیں۔

ظفر۔ یا اللہ یہ اور مصیبت آئی۔ اب وہ ناک میں دم کریں گے کہ اور افسانے لکھ دو۔

ہردیال۔ اجی اس کی فکر نہ کرو۔ اگر تم کہو گے تو میں انہیں صاف ٹال دوں گا۔ اس کا منتر تو میرے پاس ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے میرا قصور معاف کر دیا یا پھر میں ناک رگڑوں تمہاری ناک سے۔

ظفر۔ ارے بھئی یہ حرکتیں نہ کرو مجھے نزلہ ہے۔ اب اٹھنے دو ورنہ کالج کو دیر ہو جائے گی۔

ہردیال سے صفائی ہو جانے کے بعد ظفر کے دل کا ایک بوجھ جو اسے دبا کر کچلے دیتا تھا بہت گھٹ گیا۔ اور اس کا اعصابی دورہ ختم ہو گیا۔ اب وہ اس قابل تھا کہ ریحانہ کے معاملے پر بھی سکون کے ساتھ غور کر سکے۔ اس نے سوچا "آخر مجھے ریحانہ سے کس بات کی شکایت ہے؟ یہی نا کہ وہ اپنی ماں کا پیام پہنچاتے وقت ذرا سی مسکرا دی۔ اگر میں نے اس تبسم کی بنیاد پر آرزوؤں کا ایک طلسم تیار کر لیا اور وہ ٹوٹ گیا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اور یہ جسے میں آرزو کا طلسم کہتا ہوں دراصل کیا تھا؟ گندی خواہش، شرمناک خیالات۔ یا اللہ میں کس قدر گر گیا ہوں! صرف یہی نہیں کہ ایک شریف لڑکی سے ایسی بے ہودہ توقعات قائم کرتا ہوں بلکہ جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو اپنے کمینے پن اور حماقت پر شرم سے زمین میں گڑ جانے کے بجائے اس سے خفا ہوتا ہوں، جیسے اس نے میرا کوئی قصور کیا ہے؟ قصور وار گنہگار دراصل میں ہوں۔ ریحانہ کا جس کی میں نے اپنے تصور میں توہین کی اور حسینہ کا جس سے میں نے اپنے ارادے میں بے وفائی کی۔" اس قسم کے خیالات نے اس میں ندامت اور عاجزی کی کیفیت اسی شدت سے پیدا کر دی جیسے پہلے رنج اور آزردگی کی تھی۔ ریحانہ اور حسینہ سے وہ اس قدر غیر معمولی انکسار سے پیش آنے لگا کہ ان دونوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ ریحانہ نے تو اسے ایک من موجی کی سوجھ سمجھ کر ٹال دیا مگر حسینہ کو فکر ہو گئی کہ ایک عرصے تک کسی قدر سرد مہری کے برتاؤ کے بعد یکایک یہ نیازمندی کیوں؟

ایک دن اکرام اللہ بہت خوش خوش آئے اور انہوں نے ظفر کے کمرے میں آ کر، جہاں پر ہردیال بھی بیٹھا تھا یہ خبر سنائی کہ کانگریس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارت کے عہدے سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر انہیں یہ فکر تھی کہ چونکہ کانگریس یو۔ پی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ اور دوسرے صوبوں میں اور مسلم سیاسی جماعتوں کے ساتھ کولیشن بنانے کو تیار نہیں ہے اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سب جماعتیں کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیں۔ ہردیال نے اُن کے خیال سے اتفاق کیا اور کہا اس وقت مصلحت یہی ہے کہ کولیشن بنائے جائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ فرقہ وارانہ جھگڑے کانگریس کی وزارتوں کو کمزور کر دیں گے۔ ظفر کو سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر اکرام اللہ اور ہردیال کی صحبت کے اثر سے اُسے کانگریس سے بڑی گہری عقیدت ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ فطری طور پر تصوریت پرست اور انتہا پسند واقع ہوا تھا، دوسرے ناتجربہ کار اور حالات سے ناواقف تھا۔ اس لئے مفاہمت بینی اور مصالحت کی پالیسی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اس کے نزدیک کانگریس کا فیصلہ بالکل صحیح تھا اور ایک ایسی پارٹی کا جو فرقہ پرستی کی مخالف ہے کسی فرقہ وار پارٹی کے ساتھ کولیشن بنانا کسی طرح جائز نہ تھا۔ ان تینوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ مولانا سائل صاحب تشریف لائے ہیں۔ یہ تینوں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئے تو دیکھا مولانا ایک خاصی چوڑی کرسی پر پھنسے بیٹھے ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں کی تعظیم کے لئے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر ٹیک کر اٹھنے کے لئے زور لگانا چاہا تو اکرام اللہ نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر روک دیا اور کہا "مولانا تشریف رکھئے۔ بہت عرصے بعد آپ کی زیارت ہوئی۔" مولانا "کیا کروں آپ سے کہتے کہتے عاجز آ گیا کہ کچھ لکھا کیجئے جو ایسا پاکیزہ ادبی ذوق رکھتا ہو اور کبھی ایک مضمون بھی نہ لکھے وہ [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible])

ہندوستان میں ترقی کے امکانات

محمد امین

(۳)

معدنیات کے لحاظ سے بھی ہمارا ملک بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ کوئی ایسی دھات نہیں ہے جو یہاں نہ پائی جاتی ہو۔ لوہا، کوئلہ، نمک، ابرق، مینگنیز، سیمنٹ، یورینیم، تانبا، سیسہ، جستہ، مٹی کا تیل۔ غرض ہر چیز یہاں موجود ہے۔ سونا چاندی بھی ملتے اور نکالے جاتے ہیں۔ لوہا اور کوئلہ تمام صنعتوں کی جان ہیں۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں امریکہ اور روس سب سے آگے ہیں، کیونکہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے پاس لوہا اور کوئلہ بہت افراط سے ہے، اور اس کے بل بوتے پر وہ اپنی ہر چیز کی صنعت کو ترقی دے رہے ہیں جس ملک میں یہ دونوں دھاتیں نہیں ہوں گی وہ دنیا کا [illegible] ایک بڑی طاقت کبھی نہیں بن سکتا۔ ہمارا ہندوستان اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہے۔ لوہا سوویٹ یونین کو چھوڑ کر سارے ایشیا میں سب سے زیادہ ہے اور جتنا بھی ہے وہ نہایت عمدہ اور بہتر قسم کا۔ بہار، بنگال، آسام، مدراس اور میسور میں اس کے غیر محدود ذخیرے ہیں۔

کوئلے کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ سب سے عمدہ کوئلہ وہ ہوتا ہے جو لوہے اور فولاد کے پگھلانے کے کام آتا ہے۔ رانی گنج اور جھریا میں اس قسم کا کوئلہ کافی پایا جاتا ہے۔ بنگال اور بہار میں بھی اس کے ذخیرے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے قسم کے کوئلے مدراس، میسور، مدھیہ پردیش اور آسام میں بہت کافی ہیں۔

موجودہ دور میں مٹی کے تیل کی خاصی اہمیت ہے۔ اب تک اس کے چشمے ہمیں صرف آسام میں مل سکے ہیں۔ جو تیل ان سے نکلتا ہے ہماری ضرورت کے لئے ناکافی ہے نئے چشموں کی تلاش جاری ہے اور امید ہے کہ ہم اس کی پیداوار میں خود کفیل ہو جائیں گے۔

ابرق، مینگنیز، سیمنٹ اور نمک کی پیداوار میں ہمارے ملک کا شمار دنیا کے بڑے ملکوں میں ہے۔ سب سے زیادہ ابرق دنیا میں یہیں سے نکلتا ہے۔ مینگنیز میں روس کے بعد ہمارا نمبر ہے۔ سیمنٹ اور نمک کی بھی بہت اہمیت ہے۔ سیسہ، تانبہ، جستہ، سونا، چاندی ہماری ضرورت کے مطابق نہیں مل پاتا ہے۔ یورینیم کے ملنے کے امکانات جنوبی ہند میں بہت کافی ہیں۔

نئے نئے علاقوں میں معدنیات کی تلاش جاری ہے اور امید ہے کہ زمین کے ماہرین پرانی معدنیات کے ذخیروں میں اضافہ کریں گے اور بہت سی نئی نئی دھاتیں معلوم کر پائیں گے۔

لوہے اور فولاد کی صنعت کے لحاظ سے کامن ویلتھ کے اندر ہمارا ملک برطانیہ کے بعد پہلی صف میں ہے۔ سب سے بڑی ہماری صنعت جمشید پور میں ہے۔ اسی صنعت پر ملک کی ہزاروں صنعتوں کی ترقی کا دارومدار ہے۔ ہمارے یہاں سب سے اچھا اور سستا فولاد تیار ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک ہم نے اس فولاد کو اپنے دیش کی ضروریات کے لئے استعمال نہیں کیا ہے اور تمام فولاد دوسرے ملکوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے ملک میں طرح طرح کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے مشینیں بنائیں اور تیزی سے اپنے ملک کو آگے بڑھائیں۔ ہمیں بہت ساری مشینیں بنانی ہیں مثلاً بجلی کی مشین، سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کی مشین، کھیتی باڑی کی مشین، کھاد بنانے کی مشین، شکر بنانے کی مشین وغیرہ۔ اسی طرح کئی قسم کے انجن درکار ہیں۔ مثلاً ریل گاڑی کا انجن، موٹر کا انجن، ہوائی جہاز کا انجن، پانی کے جہاز کا انجن وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بنانے کی ضرورت ہے اور ان سب کے لئے ہمارے پاس لوہا، فولاد، چونا، مینگنیز، ابرق بہت کافی مقدار میں ہے۔ حکومت لوہے اور فولاد کی صنعت کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی مشینوں کے کارخانے بھی قائم کر رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ صرف [illegible] کی ضرورتوں کی مشینیں، انجن اور زراعت کے سامان تیار کر سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں بنگال میں ایک لوہے اور فولاد کی صنعت بہت بڑے پیمانے پر قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس اسکیم کے مکمل ہو جانے کے بعد ہم پانچ سال میں اپنی ضرورت کی ساری مشینیں خود بنانے لگ جائیں گے۔

یورینیم کی دھات مل جانے سے سائنس والوں کو تجربے کا نیا میدان ہاتھ آ گیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ ہم ایٹم بم بنانے کے چکر میں ہیں بلکہ ہماری یہ کوشش ہے کہ ایٹم بم کی شکتی کو ہم اپنی صنعت و حرفت میں استعمال کریں۔ ایک بار تھوڑا بہت تجربہ ہو جائے تو قوی امید ہے کہ ہم صنعت و حرفت کے میدان میں غیر معمولی ترقی کریں گے۔

صنعت و حرفت کے میدان میں ہم ذرا دیر میں قدم رکھ رہے ہیں لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ مغربی ملکوں کے تجربوں اور جاپان کی صنعتی ترقی سے ہمیں کافی مدد ملے گی بہت سی غلطیاں جو ان لوگوں نے کی ہوں گی ان سے ہم بچ سکتے ہیں اور عمدہ سے عمدہ ٹیکنیکل اور فنی امداد کی بنا پر بہتر سے بہتر صنعت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔

ہمارے دیش میں بجلی پیدا کرنے کے امکانات بھی غیر محدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی ملک میں بجلی کی طاقت اس وقت ترقی کر سکتی ہے جبکہ اس میں تین چیزیں موجود ہوں، دریاؤں میں سال بھر پانی رہتا ہو، اونچی نیچی ڈھال والی زمین ہو اور روپے کی فراوانی ہو۔ ہمارے ملک میں پہلی اور دوسری چیز موجود ہے یعنی ہمارے یہاں ایسے بہت سے دریا ہیں جن میں پانی سال بھر رہتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ پہاڑ سے نکل کر میدان میں بہتے ہیں جہاں پر بہت سے قدرتی آبشار بنتے ہیں۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے دونوں حصوں میں ایسے دریا ہیں جن میں پانی سال بھر رہتا ہے اور وہ بہت سے آبشار بناتے ہیں ہم نے ان کی مدد سے پہلے ہی تھوڑی بہت بجلی پیدا کر لی ہے۔ اور بمبئی اور مدراس، یو۔ پی اور پنجاب میں اس کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ہم نے اپنے دریاؤں کی ۱۰ فی صدی طاقت بھی بجلی پیدا کرنے کے لئے نہیں استعمال کی ہے۔ ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بہت سی اسکیمیں بنا رکھی ہیں۔ مثلاً پنجاب کا بھاکڑا ڈیم پروجیکٹ، یو۔ پی کا سرسند پروجیکٹ، بہار کا کوسی پروجیکٹ، بہار بنگال کا دامودر ویلی پروجیکٹ، اڑیسہ کا ہیراکڈ ڈیم پروجیکٹ۔ ان اسکیموں کے مکمل ہو جانے کے بعد ہمارے دیش میں کروڑوں کیلوواٹ مزید بجلی پیدا ہونے لگ جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ زراعت کا رقبہ بڑھ جائے گا۔ غلے کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوگا مگر ان اسکیموں کے عمل میں آ جانے کے بعد بھی بہت سی دریاؤں کا پانی ضائع ہوتا رہے گا۔ پانی کا شمار بھی ایک طرح کی دھات میں ہوتا ہے اور اگر ہم اپنی اس قیمتی دھات کو سارے ہندوستان میں بجلی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے صرف کریں تو ہمارا شمار دنیا کے اہم ترین ملکوں میں ہونے لگ جائے گا، اور بجلی کی طاقت کو نہ صرف روشنی کے لئے بلکہ بڑی بڑی صنعتوں اور دیہات کی چھوٹی موٹی صنعتوں کو چلانے میں بھی لگایا جا سکے گا۔

اس وقت ہمارا ملک آب پاشی کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں سے آگے ہے۔ یہاں نہروں، کنوؤں اور تالابوں سے آب پاشی تھوڑی بہت ہر جگہ ہوتی ہے۔ لیکن ان علاقوں میں کاشت اچھی ہوتی ہے۔ جہاں نہروں سے آب پاشی کا انتظام ہے۔ ہمارے دیس کی زمین کا سب سے بڑا مسئلہ پانی کا ہے۔ یہاں ایسے علاقے ہیں جہاں پانی افراط اور ضرورت سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف ایسے علاقے بھی ہیں جہاں پانی کی بہت قلت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں پانی زیادہ ہوتا ہے وہاں روکنے اور جمع کرنے کا انتظام کیا جائے اور وہاں

ان علاقوں میں بھیجنے کا جہاں پانی کی قلت ہے مثلاً شمالی اور جنوبی ہندوستان کے دریاؤں میں ہر سال سیلاب آتا ہے۔ اس سیلاب کو روک کر اگر زائد پانی کو ٹھیک طور سے ہم استعمال کریں تو شمالی اور جنوبی دونوں حصوں میں فصلوں کی پیداوار بہت بڑھ جائے گی، اور مغربی ہندوستان کو بھی پانی بہم پہنچا کر ہم سارے ملک کو بہت کافی خوش حال بنا سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں پہاڑوں پر بارش بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان پتھریلے علاقوں میں بھی نہایت کثرت سے جنگل پائے جاتے ہیں۔ ہمالیہ کی ترائی میں پنجاب یو۔پی، بنگال اور آسام میں بہت سی زمین جنگلات سے ڈھکی پڑی ہے۔ ان جنگلوں میں دیودار، چیڑ کی سخت اور نرم لکڑیاں پائی جاتی ہیں جو پانی کے جہاز، فرنیچر ریلوے کے ڈبے اور پٹریاں، کھیل کے سامان اور چائے کے ڈبے بنانے کے کام آتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمالیہ کی ترائی کے جنوبی ہندوستان میں وندھیا، چھوٹا ناگپور، مشرقی مغربی گھاٹ جنگلوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں ساگوان اور سال کی لکڑیاں پائی جاتی ہیں جو عمارت کا سامان فرنیچر اور کشتیاں بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان جنگلوں کی وجہ سے ہمارے دیش میں کبھی لکڑی کی کمی محسوس نہیں ہوگی اور لکڑی کی تمام صنعتیں تیزی سے ترقی کریں گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ نقل و حمل کے وسائل ہمارے یہاں بہت محدود ہیں اور اس لحاظ سے ہم بہت پیچھے ہیں۔ لیکن سڑکوں، ریلوں، ہوائی جہازوں اور نقل و حمل کے دوسرے وسائل کی جو اسکیمیں اس وقت ہماری حکومت کے سامنے ہیں ان کے پیش نظر ہمیں امید ہے کہ نقل و حمل کے ذرائع بہت جلد بہتر ہو جائیں گے۔ اور اس وقت نقل و حمل میں جو دقتیں ہیں اور گاؤں اور شہروں میں جو بے تعلقی ہے اس وقت یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی اور ہماری ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔

ریلیں ہمارے یہاں ۳۰ ہزار مربع میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ہماری آبادی کے لحاظ سے یہ ناکافی ہیں۔ ہمارا ملک ہموار اور میدانی زیادہ ہے۔ پہاڑی اور پتھریلا علاقہ کم ہے۔ اس لئے ہم کو ریلوے لائن بنانے میں آسانی ہے۔ شمالی ہندوستان میں ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لیکن ابھی اس حصے میں اور دوسرے حصوں میں ریل کے ذریعے آمد و رفت میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں سب سے بڑی دقت انجنوں کی ہے۔ جس وقت انجن ہمارے یہاں بننے لگیں گے، اس وقت ہماری ریلوے لائنیں بہت کافی بڑھائی جا سکیں گی۔

ہوائی جہاز کے ذریعے آمد و رفت بھی بہت بڑھ رہی ہے، لیکن ہمارے دیش میں ہوائی جہاز کی صنعت بن جانے کے بعد ہم ہر لحاظ سے ایشیا کے ملکوں میں سب سے آگے ہوں گے۔

ہمارے یہاں دریا کے ذریعے آمد و رفت کا رواج بہت کم ہے۔ مغربی ملکوں میں بڑے بڑے دریا نہروں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور نہروں ہی کے ذریعے اندرونی علاقوں کا تعلق سمندر سے بھی ہے۔ ان نہروں کے ذریعے بھاری اور وزنی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجی جاتی ہیں اور نہایت سستے داموں۔ اس نقطہ نظر سے ہم اگر اپنے دریاؤں کو مال لانے اور لے جانے کے لئے استعمال کریں تو ہمارا ملک بہت آگے بڑھ جائے گا۔

ہماری ترقی کا دار و مدار بڑی حد تک بیرونی تجارت پر ہے۔ اس وقت ہمارا تعلق ان ملکوں سے زیادہ ہے جن سے ہم کو مشینیں، انجن اور ٹریکٹر وغیرہ بآسانی مل سکتے ہیں یا جن سے ہم گیہوں اور کپاس خرید سکتے ہیں۔ اور ان چیزوں کے بدلے وہ ہمارے یہاں سے چائے، تلہن، جوٹ، مینگنیز، کوئلہ اور سوتی کپڑے لے سکتے ہیں۔ ہمارا ملک اندرونی لحاظ سے جوں جوں ترقی کرے گا۔ ہماری بیرونی تجارت کی اہمیت بھی بڑھتی جائے گی۔ اور ہماری ساکھ دنیا میں ہر جگہ قائم ہوتی جائے گی ؏

آزادی کی زنجیریں

(بقیہ صفحہ)

دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ جب آپ نے میرے معروضات کو لائق اعتنا نہ سمجھا تو میں نے زحمت دینا چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ آپ جانتے ہیں بے غرض ملاقات کی کسی ایڈیٹر کو تو فرصت نہیں ملتی۔ اس وقت تو میں مقطع ادیب کے ناتے ظفر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بھئی ظفر صاحب! مبالغہ نہ سمجھئے گا آپ کو مبداء فیاض نے وہ جوہر عطا کیا ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوتا۔ آپ کے پہلے ہی افسانے نے ادبی حلقے میں ہل چل ڈال دی ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دینے کے لئے اور یہ کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ اس سلسلے کو جاری رکھئے ذہن کو کند نہ ہونے دیجئے۔

اکرام اللہ۔ اچھا ظفر نے افسانہ لکھ ڈالا اور وہ چھپ بھی گیا۔ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ سال بھر سے اپنے کام کے علاوہ سیاسی قصوں میں ایسا الجھا ہوں کہ ادبی رسالوں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

ہردیال۔ دراصل یہ افسانے تو بہت دن سے لکھتے ہیں مگر جس طرح نئی دلھن منہ دکھلاتے ہوئے شرماتی ہے۔ بعض اپنے ہنر کے ظاہر کرنے سے حجاب آتا ہے۔ وہ تو میں نے زبردستی منہ دکھائی کی رسم ادا کر دی۔ اس کا انعام یہ ملا کہ یہ مجھ سے کئی دن روٹھے رہے اور پھر خوب برا بھلا کہا۔ مجھے یقین نہیں کہ اب یہ پھر گھونگھٹ الٹیں۔ ہاں اگر مولانا منہ دکھائی دیں تو شاید۔

مولانا۔ ہردیال صاحب ماشاء اللہ۔ آپ میں ظرافت کا خداداد مادہ ہے۔ آخر آپ مزاحیہ مضامین یا افسانے کیوں نہیں لکھتے؟

ہردیال۔ یہ لیجئے لگے ہاتھوں مجھ پر بھی وار ہو گیا۔ مولانا میں نے ایک روایت سنی ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے کہ ایک دن موت کا فرشتہ آپ سے اپنا چندہ وصول کرنے آیا تو آپ نے ایک قضائیہ مضمون کی فرمائش کر دی۔ اس دن سے غریب کی آپ کے پاس آتے روح فنا ہوتی ہے۔

مولانا۔ (ہنس کر) بھئی کیا کہی ہے۔ مگر آپ سے تو مجھے مایوس ہی ہو جانا چاہئے۔ جن حضرات کو باتیں کرنا آتا ہے وہ مضمون نہیں لکھا کرتے۔ تو ظفر صاحب دوسرا شاہکار کب تک مل جائے گا۔

ظفر۔ مولانا مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ اس سال مجھے ایف اے کا امتحان دینا ہے۔ بعض وجوہ سے پڑھائی میں پچھلے دنوں بہت حرج ہوا اور اب بہت جلد والد صاحب قبلہ حج کو جانے والے ہیں۔ ان کو رخصت کرنے میں اور وقت صرف ہوگا۔ اس سال تو مجھے معاف ہی کر دیجئے۔

مولانا۔ نمبر سالنامے کے لئے تو آپ کو ایک اعلیٰ درجے کا افسانہ لکھنا ہی ہوگا۔ ابھی کوئی جلدی نہیں۔ آخر نومبر تک دے دیجئے گا۔ دیکھئے مجھے محروم نہ پھیرئیے بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔

ظفر۔ مولانا اب میں کیا عرض کروں، آپ تو بہت شرمندہ کرتے ہیں۔

اکرام اللہ۔ سائل صاحب ایک فرض شناس طالب علم کو امتحان کے زمانے میں تو نہ چھیڑیئے۔ آپ کو بہت سے مل جائیں گے جو خوشامد کر کے اپنے شاہکار آپ کے ہاں چھپوائیں گے۔

مولانا۔ واہ ری قسمت۔ آپ جیسے قدیم عنایت فرما سے یہ امید تھی کہ میری تائید کریں گے۔ آپ نے الٹی ۔۔۔ مخالفت کرنے لگے۔ اچھا صاحب تخفیف تصدیع۔

ع۔ ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم

ہردیال۔ مولانا تشریف رکھئے۔ آپ تو خفا ہو گئے۔ دیکھئے میں آپ کی سفارش کرتا ہوں۔ ارے بھئی ظفر وہ دو تین افسانے جو تمہارے پاس لکھے رکھے ہیں، کیوں نہیں دے دیتے؟

اکرام اللہ۔ ظفر اگر واقعی تمہارے ہاں کوئی چیز ہو تو خدا کے لئے لا کر دے دو۔ ہردیال نے سائل صاحب کے سامنے کہہ دیا ہے۔ اب یہ تمہاری عاقبت تنگ کر دیں گے۔

ظفر ہردیال کو شکایت اور غصے کی نگاہ سے دیکھتا ہوا اٹھا اور اس نے اپنے کمرے سے کاغذوں کا ایک گٹھا لا کر مولانا کو دے دیا۔ ان کی خوشی نہ پوچھئے۔ ہردیال کا شکریہ تو خیر ادا ہی کیا مگر ظفر کو ایسی ایسی دعائیں دیں کہ اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ (باقی آئندہ)

ترقی پسند
ادیبوں کی کانفرنس

عبداللطیف اعظمی

یکم، ۲ اور ۳ جولائی کو دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی علاقائی کانفرنس منعقد ہوئی اور اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے اس کی صدارت کی۔

بہت دنوں سے فضا میں یہ خبر گونج رہی تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اپنی موجودہ پالیسی میں تبدیلی کرنے والی ہے اس لئے قدرتی طور پر بہت سے لوگوں کو توقع تھی کہ اس کانفرنس میں شاید اس طرح کی کوئی تجویز پیش ہو مگر چونکہ یہ کل ہند نہیں بلکہ محض دہلی، مشرقی پنجاب اور راجستھان کی علاقائی کانفرنس تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی جاسکتی جس کا کل ہند پالیسی پر اثر پڑتا ہو دوسرے یہ خبر اس بنا پر پھیلی تھی کہ کمیونسٹ پارٹی اپنی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کرنے والی ہے لیکن چونکہ بعض وجوہ سے پارٹی کا جنم ابھی تک نہیں ہو سکا اس لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کو اس کے انتظار میں رکنا پڑا۔ لیکن ادیبوں سے اپیل کی بحث کے دوران میں جو تقریریں کی گئی ہیں ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ارکان انجمن کی بہت بڑی تعداد موجودہ پالیسی سے مطمئن نہیں ہے وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ادیبوں کا تعاون اور اشتراک عمل، جہاں تک ممکن ہو حاصل کیا جائے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے بہت صاف صاف باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ساری دنیا جل رہی ہے اور صرف چند لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں حق پر ہیں جو اشتراکی انقلاب چاہتے ہیں وہ امن چاہتے ہیں۔ اس وقت عالم گیر جنگ کا بہت شدید خطرہ ہے اس لئے ایسے نعرے کی ضرورت ہے جسے سب اپنا سکیں" آخر میں انھوں نے بہت زور دے کر کہا "کچھ لوگ ہیں جو ہماری انجمن میں ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو شریک نہیں ہیں گو ... اور بہت ... کے فرق کو خاص طور پر نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے "

کانفرنس نے، ہندوستانی ادیبوں سے اپیل کی ہے کہ وہ امن کے قیام میں اور جنگ پسندوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے میں مدد دیں اور خاص طور پر ایٹم بم کے استعمال کے خلاف آواز بلند کریں۔ ظاہر ہے اس اپیل سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا بھلا جنگ کی کون حمایت کرے گا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ پچھلی لڑائی کے زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اس اپیل کا مقصد یہ ہے کہ تمام ادیب ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے اور اس کے مخصوص طریقوں کے مطابق جنگ کی مخالفت کریں، تو اس کی کامیابی مشتبہ ہے۔ وہ لوگ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے سیاسی اختلافات رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اس مہم میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی یا انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے آج کل امن کی جو مہم شروع کی گئی ہے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک ایسا شخص جو ہندوستان کی (بقیہ صفحہ ۴ پر)

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہازی کمپنی

حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ امسال رمضان کے حج کے لئے رمضان کے بعد اپنے پہلے چار جہازوں کی روانگی کا اعلان کرتی ہے :-

ایس، ایس "محمدی" ۷۰۲۶ ٹن

۲ر جولائی ۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس، ایس "اکبر" ۴۰۴۷ ٹن

۲۱ر جولائی ۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس، ایس "اسلامی" ۵۸۷۹ ٹن

۲۲ر جولائی ۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس، ایس "علوی" ۳۵۶۶ ٹن

۲۵ر جولائی ۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

جہاز کا کرایہ (مع خوراک)

بمبئی جدہ واپسی

درجہ اول ... ... ۱۱۰۵ روپے

عرشہ (ڈیک) ... ... ۳۹۸ روپے

ان کرایوں میں قرنطینہ کامران، حفظان صحت، جدہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں جن کی مجموعی رقم ۴۷ روپے ۱۲ر ہوتی ہے۔

عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے گھروں سے روانہ نہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کے لئے نہ لکھے۔

حاجیوں کو ان کی اپنی سہولت کے خیال سے مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوالیں، اور اپنے ضلع کے محکمہ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر ان کی تصدیق کرالیں۔ کرائے کی رقم بمبئی میں ٹکٹ خریدتے وقت ہی ادا کی جائے۔ کوئی صاحب ڈاک کے ذریعے روپیہ نہ بھیجیں

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس :-

تار کا پتہ،	دی مغل لائن لمیٹڈ
MOGUL	۱۶ بنک اسٹریٹ
BOMBAY	بمبئی

A world of Entertainment is yours with

MARCONIPHONE

THE REAL THING IN RADIO

THE RADIOSALES LTD. RADIO HOUSE, APOLLO BUNDER, BOMBAY 1

اچھی چھپائی

ہم ہر قسم کے بہترین "ٹائپ میٹل" بناتے ہیں جو کہ ہندوستان بھر کے تمام مشہور چھاپہ خانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں یہ کم خرچ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ ہمارے بنائے ہوئے "لائنو ٹائپ میٹل" اور "مونو ٹائپ میٹل" کی چھپائی نہایت صاف اور خوبصورت ہوتی ہے۔

نیچے لکھے ہوئے پتہ پر دریافت کیجئے

ہفتہ وار نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

جلد۵ | ۱۶ جولائی سنہ۱۹۵۵ء | نمبر۳

یونسکو	پروفیسر سعید انصاری	۲
پچھلا ہفتہ		
ہند اور بیرونِ ہند میں	ع ح ۔ ع ۔ ل	۳
بزم بے تکلف		۵
"کہت کبیرا"	اثر لکھنوی	۵
غزل	مسعود اختر جمال	۵
آزادی کی زنجیریں مسلسل ناول	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶
سائنس، آزادی اور امن	پروفیسر حبیب الرحمٰن	۷
تبصرہ "امیر خسرو"	پروفیسر سید احتشام حسین لکھنوی	۹
پاکستان کے معاشی مسائل پر تبصرہ	ع ۔ ل	۱۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

یونسکو

(۲)

پروفیسر سعید انصاری

۱۔ تعلیم، سائنس اور تمدن کی ترقی

یونسکو کے بڑے بڑے کاموں میں ایک کام تعلیم سائنس اور تمدن کے معیار کو بلند کرنا ہے۔ اس میں ان ملکوں کے معیار کا بلند کرنا شامل نہیں ہے جن کا خود ہی بلند ہے بلکہ جن کا معیار بہت نیچا ہے اُسے کم سے کم ایک سطح تک اونچا اٹھانا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ تعلیم، سائنس اور تمدن بذاتِ خود کوئی مقصد ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ایک دنیا کے تمام بسنے والے ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں اور تمام ملکوں کو یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہو سکیں۔

(الف) تعلیمی سامان کی فراہمی

چنانچہ ۱۹۴۷ء میں تعلیمی تنظیم کے سلسلے میں سب سے بڑا کام اکثر ملکوں کے لئے کاغذ قلم دوات، اور کتابیں فراہم کرنا تھا جن کے بغیر کسی قسم کی تعلیمی اور تمدنی زندگی کی تشکیل ممکن نہ تھی۔

اس سال فروری میں ۴۰ بین الاقوامی انجمنوں کے نمائندے پیرس میں اس غرض کے لئے جمع ہوئے کہ جن ملکوں میں جنگ کی تباہ کاریوں نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، ان میں یہ کام کیسے شروع کیا جائے۔ چنانچہ اس کانفرنس نے طے کیا ہے کہ تعلیمی تنظیم کے سلسلے ایک عارضی بین الاقوامی کونسل بنائی جائے جو سرمایہ اور سامان جمع کرنے کا کام کرے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء تک اس سلسلے میں کوئی ۲،۰ ملین ڈالر ایک امریکن کمیشن نے جمع کئے جو بین الاقوامی تعلیمی تنظیم کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ چیکوسلوکیہ، یونان، پولینڈ اور یوگوسلاویہ میں دورہ کرنے کے لئے مختلف جماعتیں بھیجی گئیں تاکہ وہ ان ملکوں کے حالات اور ضروریات کا پتہ لگائیں۔ چنانچہ انہی جماعتوں کی اطلاع کی بنیاد پر بعد میں روپے کی تقسیم کا کام شروع کیا گیا۔

اس سلسلے میں سرمایہ اور سامان کی تفصیل بھی کچھ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:۔

کینیڈا نے کوئی ۲۰۰ ٹن تعلیمی سامان، فرانس کی حکومت نے ۳۸ ہزار کتابیں پیش کیں۔ انگلستان سے کوئی ۵۰ ورکشاپ حاصل کی گئیں۔ جو چین، پولینڈ، چیکوسلوکیہ، یونان اور فلپائن میں تقسیم کی گئیں تاکہ وہ اپنے ہاں ان کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم میں مدد کریں۔

ان کے علاوہ کوئی ۲۰ ہزار کتابیں تقسیم کی گئیں ۷۰ ہزار مضامین اور مقالے سائنس کے رسالوں سے لے کر شائع کئے گئے اور تین ٹن سے اوپر انگریزی اور امریکی مطبوعات ان ملکوں میں تقسیم کی گئی ہیں جہاں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اور آگے چلئے: ۱۳ ہزار پونڈ انگلستان میں اس غرض سے جمع کئے گئے کہ یونسکو کی مدد سے مناسب ملکوں میں خرچ کیا جائے اور اس کا ایک حصہ مائیکرو فلم پڑھنے کے آلات خریدنے پر صرف کیا جائے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کتابیں چھپوانے پر جو کاغذ اور روپیہ صرف ہوتا اور پھر ان کتابوں کے رکھنے کے لئے جتنی جگہ کی ضرورت ہوتی وہ نہ ہوگی۔ بین الاقوامی مسائل پر سلسلہ مطبوعات کے ۲۵ سیٹ کارنیگی انڈاؤمنٹ کی طرف سے ۱۷ ملکوں کی یونیورسٹیوں کو بطور عطیے کے دئے گئے۔

تعلیمی تنظیم کے سلسلے میں یونسکو نے ان ملکوں کی ضروریات پر اس نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی ہے اور سائنس کے استادوں کے لئے جن کو سینما اور ریڈیو کی سہولتیں حاصل نہ ہوں۔ ایک "عارضی انتظام" پر رسالہ مرتب کیا ہے۔ حکومتِ یونان نے کچھ روپیہ دیا تھا جس سے ایک کتاب تیار ہوئی ہے جس کا نام ہے: "استاد اور بچہ" اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ان ملکوں میں جو جنگ کے ہاتھوں سب سے زیادہ تباہ ہوئے، تعلیم کے مسائل کو کس طرح حل کیا گیا ہے

عام لوگوں کی واقفیت اور اطلاع کے لئے یونسکو ایک ماہوار اخبار بھی "نیوز لیٹر" کے نام سے انگریزی فرانسیسی اور اسپینی تین زبانوں میں شائع کرتا ہے جس میں ان ملکوں کی ضروریات اور ان کی تکمیل کی اطلاعات درج ہوتی ہیں۔

عام اطلاع کے جو ذرائع ہیں مثلاً اخبار ریڈیو اور سینما، یونسکو ان کی ضروریات اور تکمیل کی تحقیق کا کام بھی کر رہی ہے۔ جن ممالک کی ضروریات اور حالات کا جائزہ لیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔ فرانس، بلجیم لکسم برگ، ہالینڈ، ناروے، ڈنمارک، پولینڈ، [illegible] اسے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے اس میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ باتیں درج ہیں کہ ان ملکوں کو کتنے ریڈیو ٹرانسمیٹر، فلم پروجیکٹر، کیمرا، ٹائپ مشین، اور چھپائی کے کاغذ کی ضرورت ہے۔ اور یہ چیزیں کس طرح ایک دوسرے کی امداد سے پوری کی جا سکتی ہیں۔

(ب) بنیادی تعلیم "FUNDAMENTAL EDUCATION"

۱۹۴۶ء میں یونسکو کی جنرل کانفرنس نے یہ محسوس کیا کہ "ایک دنیا" کا خواب جو ہم نے دیکھا ہے وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا نصف حصہ ان پڑھ ہے۔ اس لئے کہ ان پڑھ اور جاہل لوگ دنیا کے ایک بنانے میں کوئی مؤثر حصہ نہیں لے سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے ناخواندگی کے مسئلے کے ساتھ ساتھ جہالت، بیماری اور افلاس کا مسئلہ بھی آتا ہے چنانچہ ۱۹۴۷ء میں یونسکو نے فوراً یہ کام اپنے ذمے لیا کہ پس ماندہ لوگوں کے لئے کم سے کم مقدار میں بنیادی تعلیم کی ایک تجویز مرتب کرے۔

یہ تجویز "چند آزمائشی منصوبوں" (PILOT PROJECTS) کے ساتھ شروع کی گئی۔ آزمائشی اس لئے کہ پہلے چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا جائے۔ پھر اس کے نتائج دیکھ کر اسے بڑے پیمانے پر مختلف حکومتوں کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ یہ کام سب سے پہلے ہیٹی (HAITI) میں ایک چھوٹے سے کوروہ علاقے میں شروع ہوا جس کی آبادی کا کوئی ۷۵ فی صدی حصہ ان پڑھ ہے اور جو معاشی اعتبار سے دنیا کا سب سے بدترین علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس علاقے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ بستی کے لوگوں کی صحت ان کی زراعتی حالت کی اصلاح اور دوسری عام سماجی بہبود کا خیال بھی پیش نظر ہوگا۔

اس قسم کا دوسرا منصوبہ چین کے لئے تیار ہوا ہے اور اس سلسلے میں اس کی جلد ابتدائی تیاریاں ہو رہی ہیں ایک اسی قسم کا برطانوی مشرقی افریقہ کے لئے زیر غور ہے جس میں بڑے پیمانے پر مونگ پھلی کی کاشت بھی شامل ہے۔

یونسکو بنیادی تعلیم کا ایک مرکزی دفتر بھی قائم کر رہا ہے جس کا کام تمام ایسے ملکوں اور انجمنوں سے معلومات کا تبادلہ کرنا ہے جو اپنے ہاں کسی پیمانے پر بھی عوامی تعلیم کا کام کر رہی ہیں۔ اس پر اس نے ایک کتاب بھی شائع کی ہے جس کا نام ہے "بنیادی تعلیم، مختلف اقوام کی مشترک بنیاد" اس کتاب میں تمام بین الاقوامی شہرت کے لوگوں نے مضامین لکھے ہیں اور اس میں بعض ایسے ملکوں کے تجربے دئے ہوئے ہیں جیسے میکسیکو اور یو، ایس، ایس، آر جہاں بے تعلیمی کے مٹانے کے لئے سخت جہاد کئے گئے ہیں۔

یونسکو نے ایک کام اور یہ کیا ہے کہ جن ملکوں میں کسی امدادی زبان کی ضرورت (بقیہ صفحہ ۸ پر)

نئی روشنی

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ ہند اور بیرون ہند میں

پنڈت نہرو کی زبان سے

کوریا کی جنگ کے بارے میں ہندوستان کا جو رویہ ہے اس کو سر بی این راؤ اور وزارت خارجیہ کے دوسرے افسر اپنے بیانات اور اعلانات میں سمجھا چکے ہیں۔ لیکن اس کی سب سے مستند تشریح پنڈت نہرو کی زبان سے ۷ جولائی کی پریس کانفرنس میں ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان اس کمیشن کا ممبر ہے جو اقوام متحدہ کی طرف سے کوریا کے معاملات کی نگرانی کے لئے مقرر ہوا تھا اور اسے اپنے نمایندے کے ذریعے سے وہاں کی تفصیلی اطلاعیں پہنچ رہی ہیں۔ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہو چکے ہیں جن میں کبھی ایک کی طرف سے پہل ہوئی اور کبھی دوسرے کی طرف سے مگر اس مرتبہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جارحانہ اقدام شمالی کوریا کی طرف سے ہوا ہے اور وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ۔ اقوام متحدہ کی انجمن اس پر مجبور تھی کہ شمالی کوریا کو حملہ آور قرار دے اور جنوبی کوریا کی مدد کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اقوام متحدہ کی ساری عمارت مسمار ہو جاتی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس نے صرف یو، این، او کے ریزولیوشن کی تائید کی ہے۔ اس ریزولیوشن کے باہر جو کارروائی کی جائے (مثلاً امریکہ کی طرف سے فارموسا میں چیانگ کائی شک کی یا انڈوچائنا میں باوڈائی کی مدد) اس کا ہندوستان ہرگز حامی نہیں ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم سے شمالی اور جنوبی کوریا دونوں مصالحت کرانے کو کہیں تو ہم تیار ہیں لیکن یہ خبر غلط ہے کہ ہم خواہ مخواہ میر فیصل بننا چاہتے ہیں۔ کوریا کے جھگڑے کی تہہ میں دراصل امریکہ اور روس کی مخالفت ہے۔ اور اس جھگڑے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ چین کی کمیونسٹ حکومت کو سیکورٹی کونسل میں نمایندگی دئے جانے پر تیار نہیں ہوتا۔ ہندوستان کوشش کر رہا ہے کہ کمیونسٹ چین کو سیکورٹی کونسل میں لے لیا جائے تاکہ روس کی جو بائکاٹ جائے۔

پنڈت جی نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ ہندوستان جنوبی کوریا کو فوجی مدد دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستانی فوجوں کو دوسرے ملکوں میں جاکر لڑنے کے لئے تیار ہی نہیں کیا گیا ہے۔

پنڈت جی کے ان جوابات سے جو انھوں نے پریس کانفرنس میں دئے دوستوں اور مخالفوں کے شبہات اور الزامات کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سوشلسٹ پارٹی کا یہ الزام تو بالکل ہی بے بنیاد ٹھہرتا ہے کہ کوریا کی جنگ کے بارے میں ہندوستان کا طرز عمل صاف نہیں۔

جے پرکاش نرائن کی صاف گوئی

ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں شری جے پرکاش نرائن راست بازی اور صاف گوئی کے لحاظ سے پنڈت نہرو کا جواب سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سوشلسٹ پارٹی کی مجلس انتظامی کے سالانہ اجلاس میں جو پچھلے ہفتے مدراس میں منعقد ہوا اپنی رپورٹ میں صاف صاف اقرار کیا کہ سولہ مہینے پہلے پٹنہ کے اجلاس میں اس مجلس نے سوشلسٹ پارٹی کی کامیابی کے بارے میں جو امیدیں ظاہر کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ پارٹی نے مزدوروں میں جو کام کیا ہے اس کی تنظیم قابل اطمینان نہیں ہے اور کسانوں میں تو اس کا کام شروع ہی نہیں ہوا ہے "دراصل اب تک نظری مسائل اور عام پالیسی کے سوالوں پر حد سے زیادہ زور دیا گیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ بلند آہنگ تجویزوں اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا جائے"

پٹنہ کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ ایک سال میں پارٹی کے ممبروں کی تعداد کو ۱۲۹۵۰۰ تک پہنچانے کی کوشش کی جائے لیکن سولہ مہینے کے بعد یہ تعداد ۱۲۸۵۲۳ ہے تک نہ بڑھ سکی ان کے علاوہ ۲۲۵۲۵ ٹریڈ یونین بھی ہیں جن کا پارٹی سے الحاق کیا گیا ہے۔ پارٹی کے ممبروں میں سے تقریباً ۲۰ فی صدی مزدوروں کی انجمنوں کے اور کوئی ۳۰ فی صدی کسان پنچایتوں کے نمایندے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ کل ایشیائی کانفرنس منعقد کرنے کا خیال دو وجہوں سے ترک کر دیا گیا ایک تو ضروری سرمایہ فراہم نہیں ہو سکا دوسرے ایشیائی ملکوں کی سوشلسٹ جماعتوں نے اس کے لئے کوئی مستعدی ظاہر نہیں کی۔

مجموعی طور پر رپورٹ میں پارٹی کی حالت کے بارے میں مایوسی کا نہیں بلکہ امید کا اظہار کیا گیا ہے، اور آئندہ کے لئے تبلیغی اور عملی جدوجہد کا ایک حوصلہ پروگرام بنایا گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں جتنی حکومت کی مخالف پارٹیاں موجود ہیں ان میں سوشلسٹ پارٹی سب سے زیادہ جان دار ہے اور اس کا جوش اور خلوص اور احساس ذمہ داری قابل تعریف ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ پارٹی شاید جلد سے جلد کامیاب ہونے کے شوق میں کبھی کبھی ایسا طرز عمل اختیار کرتی ہے جس سے موقع پرستی کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً جن دنوں مشرقی بنگال کے ہنگاموں کی وجہ سے ہند اور پاکستان کے تعلقات کشیدگی کے انتہائی نقطے پر پہنچ گئے تھے اور فرقہ پرستوں کے ساتھ بہت سے قوم پرست بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ کر پاکستان سے جنگ کرنے کی رائے دے رہے تھے شری جے پرکاش نرائن نے بھی جنگ کے نعرے لگانے شروع کر دئے تھے۔ بعد میں موصوف نے اپنے بیانات کی تاویل کی مگر اس سے لوگوں کی پوری تسکین نہ ہو سکی۔ اسی طرح حال میں جب انھوں نے بمبئی میں مخالف پارٹیوں کی کانفرنس منعقد کی تاکہ ان طریقوں پر غور کیا جائے جن سے آیندہ انتخاب میں لوگ پوری آزادی سے رائے دے سکیں اور رائے شماری میں کسی قسم کی گڑبڑ یا بد دیانتی نہ ہو تو کمیونسٹ پارٹی کو نہیں بلایا مگر ہندو مہاسبھا کو دعوت دی۔ کمیونسٹ پارٹی کو نظر انداز کرنے کی وجہ شری جے پرکاش نرائن نے یہ بتائی کہ وہ تشدد کی حامی ہے اس کے معنی لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تشدد ان کی نظر میں ناقابل معافی جرم ہے لیکن فرقہ پرستی اور رجعت پسندی قابل معافی ہے ہمیں امید ہے کہ شری جے پرکاش اور دوسرے سوشلسٹ لیڈر اپنے قول اور عمل سے شبہات کو دور کر دیں گے ایک نئی پارٹی کے لئے کامیابی کی رفتار کا سست ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنی یہ بات ہے کہ کامیابی بلند اصولوں سے ہٹ کر اور موقع پرستی سے کام لے کر حاصل کی جائے۔

ہندوستان میں معاشی منصوبہ بندی

اشتراکیت کے مختلف نظریے اور مختلف رنگ ہیں۔ مگر بنیادی اصول جو ان سب میں مشترک ہے یہ ہے کہ ملک کی معیشت کو سرمایہ داروں کے ہاتھ میں نہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ نفع طلبی کے جذبے کے ماتحت اسے من مانے طریقے سے چلائیں بلکہ ریاست اشیاء کی پیداوار اور تقسیم کی نگرانی اور انتظام مفاد عامہ کو مد نظر رکھ کر کرے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریاست ایک مقررہ مدت کے لئے ملک کی ضرورت کا اور اس کے لحاظ سے پیداوار کی نوعیت اور مقدار کا اندازہ کرے۔ اسے معاشی منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنے آپ کو کبھی کسی اشتراکی پارٹی سے وابستہ نہیں کیا لیکن وہ جدید اشتراکی رجحانات سے اس حد تک ضرور متاثر ہوئے کہ معاشی منصوبہ بندی کے پرزور حامی بن گئے۔ چنانچہ اب سے بارہ تیرہ برس پہلے انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے زمانے میں انھوں نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی تھی جس نے ایک ضخیم رپورٹ مرتب کی تھی۔ آزاد ہند کے وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوتے ہی انھوں نے ایک سرکاری پلاننگ کمیشن مقرر کیا اور ذاتی طور پر اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ منصوبہ بندی کا کام اتنا بڑا تھا کہ بغیر پوری کیبنٹ سرکاری افسروں اور پبلک کے پرجوش اور پرخلوص تعاون کے کسی طرح انجام نہیں پا سکتا تھا اور یہ تعاون کمیشن کو حاصل نہیں ہو سکا کئی طرف سے اس کی کھلم کھلا یا در پردہ مخالفت ہوئی اور باقی لوگ بے پروائی اور سہل انکاری سے کام لیتے رہے مگر پنڈت نہرو اس پر جمے رہے کہ کمیشن کو کسی نہ کسی طرح کامیاب بنائیں گے۔ اسی سلسلے میں اُنھوں نے اور وزیر

مالیات ڈاکٹر متھائی نے وزیر صنعت شری شیاما پرشاد مکرجی نے اور وزیر تجارت شری نیوگی نے اختلاف رائے ہوا اور ان حضرات نے استعفیٰ دے دیا۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے پنڈت جی نے کمیشن کی تشکیل از سر نو کی اور اس کے لئے مالیات اور معاشیات کے بہترین ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کانگریس کو معاشی منصوبہ بندی میں دلچسپی لینے پر آمادہ کیا اور ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ایک پلاننگ کمیٹی مقرر کرائی۔ تیسری طرف مالیات، صنعت اور تجارت کے وزیر ایسے لوگ مقرر کئے جو منصوبہ بندی کے حامی ہیں۔ چنانچہ اب حالات پلاننگ کمیشن کے کام کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ سازگار ہوگئے ہیں اور اس کا خوش گوار نتیجہ نظر آ رہا ہے۔

تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین مہینے کے اندر کمیشن نے بہت کچھ کرلیا ہے۔ اس نے ملک کی معاشی حالت کا سرسری جائزہ ختم کرلیا ہے اور اپنے کام کی تنظیم مکمل کرلی ہے۔ مرکز میں اس کے ماتحت چھ ڈویژن ہیں اور انھوں نے مختلف وزارتوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے معین اور واضح ضابطے بنالئے ہیں۔ ریاستوں میں بھی کمیشن کے کام کو انجام دینے کے لئے کمیٹیاں بن گئی ہیں۔ امید ہے کہ اگلے سال تک ایک پنج سالہ معاشی منصوبہ بن جائے، اور اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ اس کا کام دو منزلوں میں تقسیم ہو گا۔ پہلی منزل سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۳ء تک اور دوسری سنہ ۱۹۵۳ء سے سنہ ۱۹۵۶ء تک ہو گی۔

ایک غلط فہمی جس کی وجہ سے کمیشن کے کام میں اب تک بڑی رکاوٹ پڑتی رہی ہے، یہ تھی کہ کمیشن کیبنٹ کے اختیارات کو غصب کرے گا۔ اب یہ بات اچھی طرح صاف کر دی گئی ہے کہ کمیشن کیبنٹ کے ماتحت ہوگا اور اس کی حیثیت محض مشاورتی ہوگی۔ اس کے مشوروں پر عمل کرنا مرکزی کیبنٹ اور ریاستوں کی وزارتوں کا کام ہو گا لیکن چونکہ کمیشن اپنا منصوبہ ان وزارتوں کے تعاون سے بنا رہا ہے اس لئے امید ہے کہ اس کے مشورے خوشی سے قبول کئے جائیں گے۔

کمیشن کے کام کے متعلق حقیقی رائے اس وقت دی جاسکتی ہے جب اس کا منصوبہ عمل [illegible] یہ بات بجائے خود باعث مسرت ہے کہ ملک کی معاشی حالت کو درست کرنے کی ایک منظم کوشش پوری ذمہ داری کے ساتھ کی جارہی ہے۔

(ع، ح)

ایک عبرت ناک خودکشی

پچھلے دنوں پاکستان سے ایک نہایت ہی دردناک اور عبرت ناک خودکشی کی اطلاع آئی ہے۔ حیدرآباد (دکن) کے امور خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری نظام الدین صاحب نے بیروزگاری اور معاشی پریشانیوں کی وجہ سے خودکشی کرلی۔ پاکستانی اخبارات نے خودکشی کے جو اسباب لکھے ہیں وہ قریب قریب انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:۔

"مرحوم نے ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے الٰہی بخش کالونی میں پان کی دوکان کھولی تھی، مگر دوکان کی اتنی آمدنی بھی نہیں تھی کہ مکان کا ۴۰ روپے کرایہ ادا کرسکتے۔ اس لئے مجبوراً آٹھ چھوٹے چھوٹے بچوں اور ایک دق زدہ سالی کے ساتھ، ایک چپراسی کے ساتھ رہنے لگے۔ گذشتہ دنوں فاقے کی نوبت آگئی۔ اسی زمانے میں کراچی جنرل ایڈمنسٹریٹر کے ہاں سے اطلاع ملی کہ انھیں ملازمت نہیں مل سکتی۔ کئی دن کے فاقے اور مسلسل مالی پریشانیوں سے وہ کافی مایوس ہوچکے تھے۔ اس اطلاع سے ان کی ہمت اور استقلال نے بھی جواب دے دیا۔ چنانچہ انھوں نے خودکشی کرلی۔"

مرحوم حیدرآباد ریاست کے قابل ترین لوگوں میں سے تھے اور نہایت ذمے دار عہدے پر فائز تھے کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد کا مقدمہ یو۔ این۔ او میں پیش کرنے کے لئے موصوف ہی نے تیار کیا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے قابل شخص کو پاکستان میں کوئی ملازمت نہ مل سکی اور وہ خودکشی پر مجبور ہو گیا۔ اس دردناک واقعے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے، جو ہندوستان سے بغیر سوچے سمجھے پاکستان بھاگے جا رہے ہیں۔

لیگ کونسل کا ہونے والا اجلاس

۲۳ جولائی کو پنجاب مسلم لیگ کونسل کا ایک ہنگامہ خیز اجلاس منعقد ہونے والا ہے۔ جس میں دولتانہ اور ممدوٹ گروپ میں [illegible] ہے۔ اس رسہ کشی میں نہ صرف دونوں گروپ کی طاقت کا فیصلہ ہوگا بلکہ اسی کے ساتھ پنجاب مسلم لیگ کے مستقبل اور اس کے صدر میاں عبدالباری کی قسمت کا بھی۔

اس اجلاس میں جو تجویزیں پیش ہونے والی ہیں، ان میں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ملک محمد انور خاں [illegible] گورنر پنجاب کے خلاف عدم اعتماد کی تجویزیں بھی ہیں۔ دولتانہ کے خلاف ایک تجویز میں الزامات کی ایک بہت طویل فہرست پیش کی گئی ہے جس میں دکھلایا گیا ہے کہ انھوں نے مالیات، صنعت، سول سپلائیز اور ٹرانسپورٹ کے وزیر کی حیثیت سے جانب داری، خویش پروری اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ اس لئے گورنر پنجاب سے درخواست کی گئی ہے کہ عدالت کے ذریعے ان الزامات کی فوراً تحقیقات کی جائے۔ ایک دوسری تجویز میں کونسل کے سابق فیصلے کو دہرایا گیا ہے کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کو فوراً منسوخ کیا جائے۔ ایک تجویز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس نے سکیورٹی کونسل کی درخواست پر جنوبی کوریا کی مدد کا جو وعدہ کیا ہے اُسے واپس لے لے اور اس خانہ جنگی میں کسی قسم کا حصہ نہ لے۔ ایک تجویز وقت مقررہ کے بعد پہنچی ہے۔ مگر صدر نے اس کو پیش ہونے والی تجویزوں میں شامل کرلیا ہے۔ اس تجویز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان تمام مہاجروں کو جو ہندوستان کی مرکزی اور صوبہ جاتی اسمبلیوں کے ممبر تھے، ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔ اس مطالبے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ مسلم لیڈروں کی ہجرت سے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت سخت نقصان پہنچا ہے، اور اس کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں لوگ پاکستان چلے آئے۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں ایسے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کا حل بہت مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً آبادی میں غیر معمولی اضافہ بیروزگاری اور طرح طرح کی بیماریاں۔ ان مسائل کی وجہ سے پاکستانی خزانے پر بہت بڑا بار پڑ گیا ہے اور پاکستان کی ترقی رک گئی ہے۔"

عرب لیگ کی ناکامی [illegible]

عرب ریاستوں میں [illegible] بدقسمتی سے کبھی بھی اتحاد قائم نہیں ہو سکا لیکن شرق اردن کے الحاق کے فیصلے پر امر کا یہ اتحاد اور کمزور ہوگیا اور اب کوریا کی خانہ جنگی مزید اختلافات کا باعث ہوگئی ہے۔ شرق اردن کے الحاق پر سعودی عرب اور مصر ہم رائے تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ در اصل یہی دونوں پیش پیش تھے۔ اردن کی کوششوں سے سات ریاستوں میں سے پانچ کا اتحاد باقی رہا۔ مگر مصر کے اس فیصلے پر کہ کوریا کی خانہ جنگی میں وہ غیر جانب دار رہے گا۔ سعودی عرب نے بہت سخت اعتراض کیا ہے۔ مصر کے غیر جانب دار رہنے کے اسباب اور اس کی مصلحتیں جو بھی ہوں لیکن عرب لیگ کے دوسرے ممبر اس معاملے میں مصر کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ کوریا کی لڑائی اگر بڑھی تو یا تو مصر کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا یا پھر عرب ریاستوں کا رہا سہا اتحاد بھی ختم ہو جائے گا۔

عرب لیگ کی پانچ سالہ زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مضبوط اتحاد کی صحیح بنیادوں پر کبھی کوشش نہیں کی گئی —— ممبر ملکوں کے درمیان کسٹم کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور معاشی اشتراک عمل کے بجائے ہمیشہ آزاد معاشی پالیسی پر عمل کیا گیا اور آپس کی تجارت میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ لیگ نے ممبر ملکوں کے درمیان ویزا اور پاسپورٹ میں سہولتیں پیدا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس پر بھی عمل نہیں ہوا۔ اسی طرح آپس میں تہذیبی تعلقات بھی پائیدار نہ ہوسکے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لیگ سیاست میں بہت زیادہ الجھ گئی۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اب بھی عرب ریاستوں کے اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنا دائرہ صرف معاشی، سماجی اور تہذیبی مسائل تک محدود رکھے۔

ع۔ ل

شرح چندہ نئی روشنی
سالانہ [illegible] ششماہی [illegible]
فی پرچہ [illegible]

بزم بے تکلف

"بیگم، بیگم، ارے تم کہاں ہو؟ چھڑ گئی، چھڑ گئی، خاک بخدا بچ مچ چھڑ گئی"

"الٰہی خیر! آج پھر دورہ پڑا ہے۔ جاؤ سیدھے غسل خانے میں جاؤ اور نل کے نیچے بیٹھ کر سر دھو ڈالو"

"دورہ نہیں بیگم، خبر ہے اخبار کی۔ یقین نہ ہو تو خود آ کر دیکھ لو"

"چولھے میں ڈالو موئے اخبار کو۔ یہاں پھونکتے پھونکتے ناک میں دم آ گیا اور یہ ٹھیبول چلی لکڑیاں ہیں کہ کسی طرح سلگنے میں نہیں آتیں"

"ارے تمھیں لکڑیوں کے سلگنے کی پڑی ہے۔ وہاں آگ لگ گئی، شعلے بھڑک اٹھے"

"ارے ہے کہاں لگ گئی آگ؟ خدا کے لئے جلدی بتاؤ، کہیں کاکوری کی خبر تو نہیں"

"کاکوری کی نہیں، کوریا کی خبر ہے بیگم۔ وہاں لڑائی کی آگ لگ گئی۔ جنگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر چڑھائی کر دی"

"اللہ توبہ! مجھے دہلا دیا تھا۔ میں سمجھی کہیں سچ مچ آگ لگ گئی"

"سچ مچ کی آگ اور کیسی ہوتی ہے۔ بسٹن گن، برین گن، چھوٹی بڑی توپیں۔ دنادن دھڑا دھڑ فیر کر رہی ہیں۔ ہزاروں آگن بان پھینکے جا رہے ہیں۔ سپر فورٹ ہوائی جہاز بم برسا رہے ہیں"

"چل تو جلال لو۔ ارے یہ کاکوریا ہے کہاں"

"کاکوری سے دور نہ سمجھو بیگم۔ کوریا منچوریا سے ملا ہوا ہے۔ منچوریا چین میں ہے اور چین کا ڈانڈا ہندوستان سے ملتا ہے۔ یہاں بھی لڑائی پہنچنے ہی کو ہے۔ اب آئی اب آئی"

"تم کو تو جب سے بڑے گیدڑ نے کاٹا ہول دلی کا مرض ہو گیا ہے۔ بات بے بات آپ ہولتے ہو اور دوسروں کو ہولاتے ہو۔ پچھلے دو تین سال میں خدا جھوٹ نہ بلائے کوئی دس بارہ مرتبہ تم نے لڑائی کا ہلڑ مچایا اور نہ کہیں لڑائی نہ وڑائی"

"خدا سے ڈر نیک بخت، ایک مرد مسلمان پر جو حاجی ہونے ہوتے رہ گیا، جھوٹ کی تہمت لگاتی ہے"

"بس رہنے دو یہ تو گنگار مجھے ایسی بدتمیزی زہر لگتی ہے"

"بدتمیزی نہیں بلاغت ہے بیگم۔ نیک بخت کے ساتھ کچھ غائب ہی کی ضمیر مزا دیتی ہے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے بھی جب کبھی میں نے لڑائی کا اندیشہ ظاہر کیا بے جا نہیں کیا منطقی استدلال بالکل صحیح تھا۔ اب اگر واقعات منطق کا ساتھ نہ دیں تو واقعات کا قصور ہے یا منطق کا؟ [illegible] کی بار تو واقعات بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آگ جو کوریا میں لگی ہے پھیلے گی اور جب پھیلی تو پھیلی، پھر کسی کے روکے نہیں رکتی"

"تو یہ بڑے بڑے ملک جو زمانے بھر کے چودھری بنے ہیں دنیا کو جلتے دیکھیں گے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے اور وہ اللہ کی سنواری قوموں کی پنچایت آخر کا ہے کے لئے عاقبت بخشوانے کے لئے؟"

"وہ بیچاری تو اپنی طرف سے بہتیرا چاہتی ہے کہ بیچ بچاؤ کر دے۔ مگر اس کے کرتا دھرتا بھی بڑے بڑے ملک ہیں اور کوریا میں لڑائی کی آگ ان ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ پھر بھلا یہ کیوں بجھانے لگے"

"اے تو سبھی آگ لگانے والے ہیں؟ آخر کوئی اللہ کے بندے بجھانے والے بھی ہوں گے"

"ہیں تو ضرور مگر مشکل یہ ہے کہ بجھانے والے خالی ہوا باندھتے ہیں اور لگانے والے تیل چھڑکتے ہیں"

"آگ لگے ان کی عقلوں کو۔ موئے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب ساری دنیا جلے گی تو خود بھی اس کے ساتھ بھسم ہو جائیں گے"

"اسی کا تو رونا ہے مگر جو عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور خدا جانے کیسے کیسے مہلک ہتھیار بنا رہے ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر آزمانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اگر واقعی استعمال ہوئے تو واقعی دنیا دھواں بن کر اڑ جائے گی پتہ بھی نہ چلے گا کہ کہاں گئی۔ اب بتاؤ میری پریشانی ہول دلی ہے یا دور اندیشی"

"میں تو جانتی تھی یہ بندر بھبکیاں ہیں کہ دوسروں کو تباہ کرنے کے لئے خود مٹا (بقیہ صفحہ ۴۴)

"کہت کبیرا"

دِل اگر پاک ہے تو ذات کا پھر کیا ہے سوال؟

نواب جعفر علی خاں اثر

کوئی ملا ہو تلنگا کہ سپر دائی ہو
جستجو اس کی ہے یاد اس کی تصور اس کا

کوئی سقہ ہو کہ بنجار ہو یا نائی ہو
بلکہ ریداس سہی سب ہیں اسی کے جویا

کوئی ہندو ہو مسلمان کہ عیسائی ہو
پا گیا جو اُسے اس کا تھا رہا اس کا سدا

[illegible] پھر تک ہو کہ تنہائی ہو
امتیاز من و تو خواب کہ افسانہ تھا

من کے درپن میں دیکھو وہ تھا اُسی کا تھا جمال
نہ بلندی تھی نہ پستی نہ عروج اور نہ زوال
سب تھے اک حال میں اور ایک ہوا سب کا مآل
دل اگر پاک ہے تو ذات کا پھر کیا ہے سوال (دلبطرز کبیر)

غزل

مسعود اختر جمال

جو مدعا ہے دلوں کا یہاں نہیں ملتا
جہان راز ہے۔ راز جہاں نہیں ملتا

خموشیوں میں جو ہے کیف وہ بیاں میں نہیں
بیاں کروں بھی تو لطف بیاں نہیں ملتا

جنوں کی راہ میں یہ کون سا مقام آیا
کہ اب سراغِ زمان و مکاں نہیں ملتا

نہ کچھ زمیں کی خبر ہے نہ آسماں کی خبر
مرے ہی نقش قدم کا نشاں نہیں ملتا

خزاں میں اہل نشیمن کو تھا بہار کا غم
بہار آئی تو اب آشیاں نہیں ملتا

محبتوں میں کمی کیا ہوئی کہ سینے میں
وہ بے قرار دل بدگماں نہیں ملتا

فضائے لالہ و گل سرد ہوتی جاتی ہے
جمالؔ سا کوئی شعلہ بیاں نہیں ملتا

آزادی کی زنجیریں

ظفر، ریاست ... کے ایک ذی حیثیت گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ ... رہتی تھیں۔ ظفر اپنے دوست ہردیال کے ساتھ الہ آباد میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور ان کی لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ حسینہ اور ظفر کی منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا ... اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ ظفر علی ... پاس نہ ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کر دیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہو گئی ... اس نے پڑھنے میں جان لڑا دی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر ... حسینہ کی اس سے کچھ تعلق ضرور ہے۔

ظفر تعطیل کے بعد کالج آیا تو ... ملاقات ہوئی جس نے اسی سال فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں میں بڑی بے تکلفی ہو گئی اور آہستہ آہستہ ... ظفر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ادھر لطیف ... کے مقابلے کے امتحان میں ناکام رہ گیا ... صفدر علی صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی اور اب وہ ظفر سے قریب زیادہ لینے لگے۔ لطیف کا کانٹا نکل جانے سے حسینہ کی زندگی میں بہار آ گئی۔

قسط ۲۷

مولانا کے جانے کے بعد ہردیال نے کہا "ظفر تم خفا تو بہت ہو گے کہ میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ مگر کیا کروں بوڑھے آدمی کو اس قدر منت سماجت کرتے دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ آخر افسانے بیکار رکھے تھے چھپ جائیں گے تو اس غریب کا بھلا ہو جائے گا۔"

اکرام اللہ۔ بھئی ایسے لوگوں پر رحم بھی آتا ہے اب انھی کو دیکھئے۔ ایک طرف تو ان کا شوق اور انہماک دیکھئے کہ رسالے کو چلانے کے لئے اپنی جائداد بیچ ڈالی، اور اپنی جان کھپا دی۔ ہاں نیا شہرت اور نمود کی خواہش کے ساتھ ادب کی محبت اور خدمت کا جذبہ بھی ضرور شامل ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر دوسری طرف اس پر بھی غور کیجئے کہ کچھ تو ادب کی عام ناقدری اور کچھ ان کی بد انتظامی کی وجہ سے رسالے کی مالی حالت ہمیشہ نازک رہتی ہے۔ مضمون نگاروں کو ایک پیسہ بھی معاوضہ نہیں دے سکتے۔ مفت مضمون لکھوانے کے لئے لوگوں کے پیچھے پڑ کر ان کو شرمندہ اور اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہیں۔ زیادہ تر طالب علم ہی ان کے پیچھے چڑھتے ہیں۔ ان کو پڑھا دے دے کر لکھواتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک تو ان کی پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے، دوسرے عام طور پر مضمون بہت ناقص ہوتے ہیں۔ جن نوجوانوں میں اچھا لکھنے کا مادہ ہوتا ہے وہ بھی قبل از وقت توڑ لینے کی وجہ سے بیکار رہ جاتا ہے۔

ہردیال۔ بات یہ کہ جیسا تیرا تانا بانا ویسا میرا سوت۔ جیسا پڑھنے والوں کا مذاق ہے ویسا میٹیریل اڈیٹر ان کے لئے فراہم کر دیتا ہے۔ اب رہا معاوضہ تو اونچے درجے کے رسالوں کے خریدار اتنے کم ہیں کہ انھیں معاوضہ دے کر لکھوانے کی مقدرت نہیں اور بازاری رسالوں کو اس کی ضرورت نہیں اس لئے کہ پڑھنے والے ہر ناکارہ افسانے کو شاہکار مان لیتے ہیں۔

ظفر کو اکرام اللہ کی یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی کہ طالب علموں کے مضامین عام طور پر ناقص ہوتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک وہ خود اپنے دل میں اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ ابھی اس کی تحریر میں بہت خامیاں ہیں اور اس کے افسانے شائع ہونے کے لائق نہیں، لیکن بیگم حمید اور مولانا سائل کی مبالغہ آمیز تعریف نے حسن نگر اس کی خود پسندی قوت تنقید پر غالب آ گئی، اور وہ اپنے افسانوں کو قدر کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اگر اپنا معاملہ نہ ہوتا تو اس کے نزدیک ان دونوں کی رائے کی کوئی وقعت نہ ہوتی، لیکن اپنی تعریف ایسی چیز ہے کہ انسان جس کی زبان سے سنتا ہے اس کو بڑا اہل الرائے اور مبصر سمجھنے لگتا ہے۔

بہرحال اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ظفر میں ایک خود اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ احساس کمتری جو ریحانہ کے معاملے کی وجہ سے ندامت اور انکسار کے پردے میں اس کی عزت نفس کو برباد کر رہا تھا بہت کم ہو گیا۔ وہ ریحانہ اور حسینہ دونوں سے اس بے تکلفی سے، جیسے پہلے ملتا تھا، ملنے لگا اور اپنا روزمرہ کا کام فارغ سکون اور اطمینان سے کرنے لگا۔

نومبر کے آخر میں میر صاحب الہ آباد تشریف لائے اور چار روز صفدر علی صاحب کے ہاں ٹھہرے اس عرصے میں ظفر کالج کے اوقات کے علاوہ اپنا سارا وقت وہیں گزارتا تھا۔ صرف رات کو سونے کے لئے ابراہیم منزل چلا جاتا۔ اس کو اب یہ فکر تھی کہ میر صاحب اتنے بڑھاپے سفر کی صعوبت کیسے برداشت کریں گے۔ یوں تو وہ بہت خوش اور تندرست معلوم ہوتے تھے۔ مگر ظفر کی آنکھیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ وہ پہلے سے زیادہ دبلے اور کمزور ہیں اسے ذہنی کی وفاداری اور کارکردگی پر پورا اعتماد تھا۔ پھر بھی وہ اسے بار بار تاکید کرتا رہا کہ میاں کے کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھنا۔ عقیلہ بیگم نے بھائی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ انھوں نے اس تھوڑے سے وقت میں ان کے کپڑوں کا جائزہ لے کر ضروری مرمت کرا ڈالی اور جس چیز کی کمی نظر آئی وہ ان سے کہے بغیر چپکے سے پوری کر دی۔ حسینہ بھی ہر وقت ماموں کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ صفدر علی نے ڈاکٹر کو بلا کر میر صاحب کے ہیضے اور میعادی بخار کا ٹیکہ لگوایا اور ضروری دوائیں فراہم کر کے ان کے ساتھ کر دیں۔

ظفر کے یہ چار دن اس قدر مصروفیت میں گزرے کہ اسے زیادہ سوچنے اور پریشان ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جب وہ اسٹیشن سے میر صاحب کو رخصت کر کے ہردیال کے ساتھ واپس آیا تو اس کا دل بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ اس پر یہ حقیقت کھلی کہ جدائی اور دوری کے احساس میں فاصلے کو دخل سے کہیں زیادہ دخل ہے۔ یوں تو وہ پچھلے سال اپنے والد سے دس مہینے الگ رہا تھا اور اب صرف پانچ مہینے کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ لیکن پہلے دونوں میں صرف ساٹھ میل کا فصل تھا اور اب خشکی اور سمندر کے دو تین ہزار میل حائل ہونے والے تھے پہلے تیسرے چوتھے دن خود ان کے یا ماسٹر صاحب کے خط سے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی اور اب ہفتوں تک کوئی خبر ملنے کی امید نہ تھی۔ پھر یہ اندیشہ اس کے لئے اور سوہان روح تھا کہیں دوران سفر میں ان کی صحت اور قوت جواب نہ دے جائے۔ یہ پریشانی اور افسردگی کی کیفیت کئی روز تک رہی مگر رفتہ رفتہ امتحان کی فکر اور کام کی دھن میں اس کی شدت کم ہوتے ہوتے ایک مبہم خلش سی رہ گئی۔

اگلے چار مہینے ظفر پر امتحان سوار رہا۔ صفدر علی کے یہاں اس کی آمد و رفت بہت کم ہو گئی۔ حسینہ میٹرک کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی اور اکثر کبھی دن بھر اپنی ایک سہیلی کے ساتھ پڑھتی تھی تاہم جب کبھی ظفر اس کے گھر آتا تو وہ تھوڑا سا وقت نکال کر سبق کی مشکلات پوچھنے کے بہانے اس کے پاس آ بیٹھتی۔ اس کے قرب سے ظفر کو ایک سکون اور آسودگی محسوس ہوتی اور وہ اس کی حجاب آگیں نظروں میں شوق و الفت کا ایک خاموش پیام پاتا۔ اس کے دل میں یہ آرزو ضرور تھی کہ محبت کی پیاس کو زیادہ تیز اور تند اور مشتعل ... مگر اس وقت وہ اسی شربت پر قانع تھا جس سے اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو راحت پہنچتی تھی۔

ریحانہ سے اس کا ملنا جلنا بدستور تھا۔ البتہ اس کے گھر جانے سے وہ بچتا تھا۔ بیگم حمید کی طرف سے دو ایک بار دعوت آئی مگر اس نے ٹال دیا اب وہ ریحانہ کی بے تکلفی بے باکی اور شوخی کو صحیح روشنی میں دیکھتا تھا۔ اور اس کی جیا پرچیں

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

سائنس، آزادی اور امن

آلڈوس ہکسلے

ترجمہ از پروفیسر حبیب الرحمٰن

"اگر سماج کی تنظیم خراب ہو (جیسے کہ ہماری ہے) اور تھوڑے سے لوگ بڑی تعداد پر قوت حاصل کر لیں اور اس پر ظلم کریں تو پھر انسان کو قدرت پر جو کوئی فتح حاصل ہوگی۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی قوت اور ظلم میں اور اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہی صورت عملاً پیش بھی آ رہی ہے۔"

ٹالسٹائے کو یہ الفاظ لکھے ہوئے کوئی پچاس سال ہونے کو آتے ہیں اور جو کچھ اس وقت پیش آ رہا تھا وہی اب تک برابر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے اس درمیان میں نمایاں ترقی کی ہے — اور ساتھ ہی سیاسی اور معاشی اقتدار کی مرکزیت بھی بہت بڑھ گئی ہے اور چند شہری اور شخصی راج بھی پھیل گیا ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ سائنس ہی اس صورت حال کا اکیلا سبب نہیں ہے۔ کوئی سماجی برائی ایسی نہیں ہو سکتی جس کا صرف ایک ہی سبب ہو اور یہی وجہ ہے کہ ایسی برائی کا مکمل علاج پیش کرنا دشوار ہے۔ ہمارا دعوےٰ صرف اس قدر ہے کہ بیسویں صدی کے دوران میں آزادی میں جو درجہ بدرجہ کمی اور اقتدار کی مرکزیت میں جو درجہ بدرجہ اضافہ ہوا ہے اس کے اسباب میں ایک سبب ترقی پذیر سائنس بھی ہے۔

افراد اور جماعتوں کی زندگی پر عملی سائنس کا اثر مختلف طریقوں سے پڑتا ہے۔ اسی مناسبت سے وہ طریقے بھی بہت کثیر اور مختلف ہیں جن کے ذریعے سائنس نے اکثریت پر اقلیت کے اقتدار کو بڑھایا ہے۔ ان میں سے جو طریقے زیادہ نمایاں اور اہم ہیں انھیں میں آئندہ کالموں میں پیش کروں گا اور یہ بتاؤں گا کہ کیونکر اور کن ذریعوں سے عملی سائنس نے اقتدار کو ایک چھوٹی سی حکمراں اقلیت کے ہاتھ سونپ دینے میں اپنا کام کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ کیونکر اور کن ذریعوں سے ایسے رجحانوں کو روکا اور آخر میں پلٹ دیا جا سکتا ہے۔

(۱) گذشتہ دو یا تین نسلوں کے دوران میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت دباؤ ڈالنے کے بعض ایسے کارگر آلے جن کی پچھلی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی سیاسی حاکموں کے ہاتھ لگ گئے ہیں — شعلے پھینکنے والے ایروپلین اور بم گرانے والے ایروپلین — یہ تو صرف تین مثالیں ہیں — ایسے آلے ہیں جن کے سامنے عوامی شورش کے پرانے طریقے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ نقل و حمل اور آمد و رفت کے ذریعوں میں حالیہ انقلابی ترقی نے پولیس کے ہاتھ بہت مضبوط کر دیے ہیں۔ اپنے خاص طرز پر فوشے اول درجے کی قابلیت کا آدمی تھا۔ لیکن ظلم و زیادتی کا جو ادارہ اس نے نپولین کے لئے گھڑا تھا وہ کسی احمق کا بد وضع ہتھیار معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ خفیہ پولیس کی اس طاقت سے کیا جائے جو موجودہ زمانے کے کسی ڈکٹیٹر — نہیں بلکہ کسی جمہوری حکومت کے پاس بھی موجود ہوتی ہے۔ گذشتہ زمانے میں شخصی اور سیاسی آزادی کا انحصار بڑی حد تک حکومت کی نااہلی پر ہوتا تھا۔ ظلم و جبر کا جذبہ تو ہمیشہ آمادۂ عمل تھا لیکن اس کی تنظیم اور مادی ساز و سامان عام طور پر ناقص تھے۔ ترقی پذیر سائنس اور ٹکنالوجی نے یہ حالت پورے طور پر بدل دی ہے۔ آج اگر کوئی مرکزی عامر ظالمانہ طریقے پر کام کرنا چاہے تو اس کے پاس دباؤ ڈالنے کے لئے ایک حیرت ناک طور پر کارگذار مشین تیار رہتی ہے جسے وہ فوراً حرکت میں لا سکتی ہے۔ طبیعیات اور کیمیا اور دھاتیں صاف کرنے کے اعلیٰ تربیت یافتہ ماہرین اور میکانکی موجدین کا احسان ہے کہ ان کی فطری ذہانت اور محنت اور باہمی تعاون کی بدولت ظالم حکمراں اس قابل ہو گئے ہیں کہ پہلے سے کہیں زیادہ فاصلوں پر لوگوں کو اندھا دھند ہلاک اور فنا کر سکیں۔ قدرت بہت سے محاذوں پر مغلوب ہو چکی ہے لیکن جیسا کہ ٹالسٹائے نے پیش بینی کی تھی کہ انسان اور اس کی آزادیوں نے پے در پے شکست کھائی ہیں۔

سائنس اور ٹکنیک کے میدان میں جس فریق کو حد سے زیادہ برتری حاصل ہو تو اس کا مقابلہ انھیں ہتھیاروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۴۸ء میں شکاری بندوق سے سپاہیوں کی دستی بندوقوں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا، اور الٹی ہوئی گاڑیوں، ریستا کے ٹھیلوں اور فرش کے پتھروں سے بنائے ہوئے مورچے کے ذریعے گھوڑے سواروں اور بھاری توپوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک سو سالہ ترقی کے بعد عام باشندے کو جو ہتھیار میسر ہیں وہ کبھی ان ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو حکمراں اقلیت کے ہتھیار رکھوں میں موجود ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اگر اکثریت کو اقلیت کا مقابلہ کرنا ہے تو اس کے لئے کوئی ایسا میدان تلاش کرنا چاہیے جہاں ٹکنیک کی برتری کوئی اثر نہیں رکھتی۔ جن ملکوں میں جمہوری ادارے موجود ہیں اور عامہ جمہوری اصولوں کی پاسداری پر آمادہ ہے وہاں اکثریت اپنا ووٹ کا حق استعمال کر کے، ہڑتال کر کے، جماعتی تنظیم کر کے، قانون ساز ادارے کے پاس محضر پیش کر کے، جلسے کر کے اصلاح کے لئے اخباروں میں پروپگنڈا کر کے حکمراں اقلیت سے اپنی حفاظت کر سکتی ہے، لیکن جہاں جمہوری ادارے موجود نہ ہوں یا جہاں کی حکومت جو اب تک جمہوری تھی آئندہ ان اصولوں پر عمل کرنے سے انکار کر دے وہاں ممکن ہے کہ اکثریت یہ محسوس کرے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ راست قدم اٹھانے اور مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جائے، لیکن چونکہ سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں قدرت کو مغلوب کیا ہے وہیں حکمراں اقلیت کی فوجی پولیسی طاقت میں زبردست اضافہ کر دیا ہے۔ اس لئے یہ راست اقدام اگر وہ تشدد پر مبنی ہو تو کسی کامیاب نتیجے کا حامل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہتھیاروں کی لڑائی میں یہ لازمی ہے کہ جس فریق کے پاس ڈیلیے، ایروپلین اور اگن بان ہوں گے، وہ دوسرے فریق کو جسے زیادہ سے زیادہ چھوٹے ہتھیار اور دستی بم میسر ہو سکتے ہیں، شکست دے۔

یہ عملی سائنس کا طفیل ہے کہ عوام خود کو اب اس ناموافق سیاسی حالت میں پاتے ہیں۔ کیا اس موقف سے باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟ ابھی تک صرف ایک پر امن راستہ دریافت ہوا ہے۔ پہلے جنوبی افریقہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں گاندھی اور ان کے پیرؤں کو ایک ظالم حکومت کا سامنا کرنا پڑا جو زبردست فوجی قوت سے مسلح تھی۔ گاندھی نے جو نہ صرف ایک تصوری اور اصولی آدمی بلکہ ایک پکے عملی سیاست داں بھی ہیں، اس بظاہر مایوس کن صورت حال سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے راست اقدام کی ایک تحریک شروع کی جس کی بنیاد عدم تشدد یا اہنسا پر ہے اور جسے ستیہ گرہ کہا جاتا ہے۔ جو ناظرین ستیہ گرہ کے طریقوں اور نتیجوں کی پوری کیفیت معلوم کرنا چاہیں انھیں کرشنا لال شری دھرانی کی کتاب "WAR WITHOUT VIOLANCE" (مطبوعہ نیویارک ۱۹۳۹ء) کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس طریقے کی بدولت کئی ایک نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئیں اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ مخالف قوتیں فوجی نقطۂ نظر سے بے حد زبردست تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کے صنعتی ملکوں کی تاریخی اور نفسیاتی صورت حال کے لئے گاندھی کی کامیابیاں غیر متعلق ہیں۔ ان لوگوں کو مشرقی دھرنی

کا یہ جواب ہے:۔

"مغربی دنیا کو قریب سے دیکھنے کے بعد عام خیال کے برعکس میری یہ رائے ہے کہ اگر ایک مرتبہ سچ مچ کر پورے احساس کے ساتھ ستیہ گرہ پر عمل شروع کر دیا جائے تو یہ اس کے چھلنے پھولنے کے لئے بمقابل مشرق کے مغرب کی سرزمین زیادہ زرخیز ثابت ہوگی۔ ستیہ گرہ کا حال پتنگ کا سا ہے۔ کامیابی کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بلند پیمانے کی قربانی، تنظیم اور ضبط کی ضرورت ہے۔ ستیہ گرہ کے لئے بھی یہی ضرورت درکار ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ اوصاف بہ مقابل مشرق کے مغرب میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ مغرب والے جنگ کے فن میں بڑی تیاری کر رکھتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ … ثابت ہوں۔ … صرف اس بات کی ہے کہ … وہ اس ایسے تاریخی موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔"

اکثر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جو تنظیم اپنی فوجی برتری سے بلا کسی جھجک، اور بس و پیش کے پورے طور پر کام لینے کے لئے تیار ہو، اس کے خلاف ستیہ گرہ کارگر نہیں ہو سکتی اور یقیناً صورت حال بہت کچھ ایسی ہی ہے۔ سیاسی جدوجہد کی کوئی شکل خواہ وہ تشدد کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ یہی حال ستیہ گرہ کا بھی ہے۔ عدم تعاون اور تھورو کے الفاظ میں سول نافرمانی اور ضبط کے ساتھ ایثار کے جذبے کے تحت سختیاں جھیلنے پر آمادگی یہ ساری باتیں ممکن ہے کہ ایک سراسر بے رحم دشمن کے مقابلے میں بے سود ثابت ہوں۔ باوجود اس کے جو نتیجہ اس کا نکلے گا وہ مادی طور پر اس صورت حال سے کچھ زیادہ خراب نہ ہوگا جو ناقابل برداشت ظلم کو چپ چاپ سہہ لینے یا اس کے خلاف قوت کا بے سود استعمال کرنے سے رونما ہوتی۔ لیکن نفسیاتی اور اخلاقی طور پر گمان غالب یہ ہے کہ یہ نتیجہ نسبتاً بہت کچھ بہتر ثابت ہوگا بہتر ان اشخاص کے لئے جو ستیہ گرہ میں شریک تھے۔ بہتر ان لوگوں کے لئے جو اس کے دیکھنے والوں میں تھے اور بہتر ان لوگوں کے لئے بھی جو صرف دوسروں سے اس کارنامے کا حال سن رہے تھے۔

ممکن ہے کہ آئندہ چند سال کے اندر ستیہ گرہ مغرب میں جڑ پکڑ لے ——— اس بنا پر نہیں کہ "لوگوں کے دل بدل گئے ہیں" بلکہ صرف اس وجہ سے کہ عوام کے ہاتھوں میں خاص کر مفتوحہ ملکوں کے اندر سیاسی جدوجہد کی تنہا یہی ایک عملی صورت رہ گئی ہے۔ رُوہر (RUHER) کے جرمنوں نے ۱۹۲۳ء میں فرانسیسیوں کے خلاف ستیہ گرہ کا حربہ استعمال کیا تھا۔ یہ تحریک اپنے آپ شروع ہو گئی تھی اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی نہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اور نہ اخلاقی اور تنظیمی نقطۂ نظر سے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آخر میں ناکام ہونا پڑا۔ تاہم وہ جتنے عرصے تک جاری رہی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مغربی قوم ——— اور وہ بھی ایسی قوم جو جنگ آزمائی کے اصول پر سب سے زیادہ عقیدہ رکھتی ہے ——— پورے طور پر یہ قابلیت رکھتی ہے کہ بغیر تشدد کے راست اقدام کرے اور ایثار کے جذبے کے تحت خندہ پیشانی سے سختیاں جھیلنا منظور کرے۔ ستیہ گرہ کی ایسی ہی تحریکیں، مگر اس مرتبہ زیادہ احساس کے ساتھ اور زیادہ تیاری کے بعد، مفتوحہ جرمنی کے عوام میں دوبارہ جاری کی جا سکتی ہے۔ کسی اور قسم کی سیاسی جدوجہد ناقابل عمل ہونے کے باعث بہت ممکن ہے کہ دیر سویر یہ صورت پیدا ہو جائے۔ تاریخ کا یہ ایک … ستم ظریفی ہوگی اگر وہی قوم جس … اور … ہار گئی اور … پیدا ہوئے … حالات سے مجبور ہو۔ مغربی دنیا میں بڑے … اقدام کی سب سے پہلی … کیونکہ … اس دور میں … انقلاب … بالکل … انسانیت کے پاس صرف یہی ایک قابل عمل بدل رہ گیا ہے۔

یُونِسکو (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

ہے اس کا تعین اور اس کے سکھلانے کے طریقے پر بہت مفید کام انجام دیا ہے۔

اس کے ساتھ بنیادی تعلیم میں ریڈیو، سنیما اور دوسری دکھائی جانے والی چیزوں کے استعمال کے بارے میں بھی وہ تحقیقات کا کام کر رہی ہے۔

(ج) تعلیم، سائنس اور تمدن کے مواقع

علاوہ تعلیمی تنظیم اور بنیادی تعلیم کے یونسکو اس بات کی بھی کوشش کر رہی ہے کہ تعلیم، سائنس اور تمدن کے مواقع ہر ایک کو یکساں اور برابر حاصل ہوں۔ مثلاً تعلیم بالغان کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے یونسکو بالغوں کی تعلیم کے لئے ایک بین الاقوامی مرکز بھی قائم کرنے کی فکر میں ہے۔

اس نے معلمین کے حقوق کے فرائض کی تحقیق کے متعلق بھی مطالعہ کا کام شروع کیا ہے اور دنیا کی تمام بڑی بڑی معلمین کی انجمنوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے خیالات اور تجاویز سے مطلع کریں ان معلومات کی بنیاد پر معلمین کے لئے ایک چارٹر تیار کرنے کا ارادہ ہے۔

اسی کے ساتھ اس نے تعلیم گاہوں کے مدارج اور یونیورسٹیوں کی ڈگریوں میں باہم مساوات قائم کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیا ہے۔

ایک کام جنگ کی وجہ سے چھوٹے بچوں پر ناگوار اثرات اور ان کے علاج سے متعلق بھی اس نے اپنے ذمہ لیا ہے اور اس کی تحقیق کا کام بھی جاری ہے

(باقی آئندہ)

آزادی کی زنجیریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

آرزوؤں کے محل نہیں بناتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلاتا تھا کہ اس نے اپنے مجنونانہ جذبات قابو پا لیا ہے۔ مگر کبھی کبھی اسے یہ محسوس ہوتا کہ آگ صرف دب گئی ہے بجھی نہیں ہے۔

جو توازن آج کل اس کی طبیعت میں تھا اس کی وجہ سے وہ پچھلے سال کی طرح اندھا دھندبے تحاشا محنت نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے اپنے اوقات کو اس طرح منضبط کر لیا تھا کہ کام کے ساتھ ساتھ آرام اور ورزش کے لئے بھی کافی گنجائش رہے۔ اصغر یار اور دیال کو یہ ضرورت نہیں پڑی کہ ظفر کو حد سے زیادہ محنت سے روکے بلکہ کبھی کبھی یہ خیال ہوا کہ اسے امتحان کی اتنی فکر نہیں جتنی ہونی چاہیئے۔ جب اس نے ظفر سے اس کا ذکر کیا تو ظفر نے … دیا کہ کیا کریں سارا وقت اس طرح گھرا رہتا ہے کہ فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی

مارچ کے آخر میں ظفر امتحان سے فارغ ہو گیا اس کے پرچے بہت اچھے ہو گئے تھے اور امتحان کا بوجھ سر سے اتر جانے کی وجہ سے طبیعت بہت ہلکی اور خوش تھی۔ میر صاحب برابر خط لکھ رہے تھے اور اپنی صحت کی طرف سے اطمینان دلا رہے تھے۔ وہ حج سے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے فارغ ہو کر عراق پہنچ چکے تھے۔ اور کربلائے معلیٰ میں مقیم تھے۔ وہاں سے ان کا ارادہ مشہد مقدس جانے کا تھا اور طہران سے موٹر کے ذریعے بلوچستان تک آنے کا تھا۔ انھیں امید تھی کہ مئی کے شروع میں دریاپور پہنچ جائیں گے۔ ظفر اس حیص بیص میں تھا کہ اپریل کا مہینہ الہ آباد میں گزارے یا دریاپور میں۔ ادھر اکرام اللہ کا اصرار تھا۔ یہیں رہو، گھر پر اکیلے رہ کر کیا کرو گے اور اس کے علاوہ حسینہ اور ریحانہ کی کشش بھی تھی ادھر یہ خیال تھا کہ گھر پہنچ کر میر صاحب کے آنے سے پہلے گھر کی سالانہ مرمت جو پچھلی برسات کے بعد نہیں ہو سکی تھی کرا لی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ان معاملات میں کوئی سلیقہ نہیں کام تو یہی ماسٹر صاحب کے سپرد کر گئے تھے جنھیں میر صاحب مکان اور جائداد سونپ گئے تھے۔ لیکن اسے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بغیر کسی معقول عذر کے اس موقعہ پر دریاپور سے غائب ہو

(باقی آئندہ)

بزمِ بے تکلف (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

بھی تباہ ہو جائیں گے۔ کہیں ہوئے نہ ہوں۔ تم دیکھنا جب وقت آئے گا تو تمہیں کاڑھ دیں گے۔ کہ لڑائی کیسی ہم تو مذاق کر رہے تھے اور جو کہیں سچ مچ مت ماری گئی ہے تو اچھا ہے قیامت ابھی چلے، نہیں تو اس پاگل دنیا میں زندگی عذاب ہو جائے گی۔ لے لو میری آگ سلگ اٹھی۔ مجھے جا کر ہنڈیا چڑھانی ہے۔"

تبصرہ

امیر خسرو

سید احتشام حسین

ڈاکٹر وحید مرزا صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب "امیر خسرو" حال ہی میں ہندوستانی اکیڈمی یوپی نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لندن یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا موضوع بھی "امیر خسرو" ہی تھا۔ یہ انگریزی مقالہ مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن تصنیف زیر نظر نہ تو اس مقالے کا ترجمہ ہے اور نہ خلاصہ بلکہ اپنی جگہ پر ایک نئی کتاب ہے جس میں نئی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے اور پرانی تصنیف کے بعض غیر ضروری مباحث چھوڑ دیے گئے ہیں۔ جو لوگ اردو کے ادیبوں، علما کی فہرست رسائل اور اخبارات کی مدد سے مرتب کرتے ہیں ان میں بہت سے کم ایسے ہوں گے جو ڈاکٹر وحید مرزا کو ایک مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ موصوف ان خاموش ادبی خدمت کرنے والوں میں سے ہیں جو نام و نمود کی خواہش مغلوب کر لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص بھی امیر خسرو کا مطالعہ کرے گا اسے نہ صرف ڈاکٹر وحید مرزا کے تبحر علمی، وسعت نظر اور دقت رسی کا اندازہ ہوگا بلکہ انداز نگارش میں حسن اور طرز اظہار میں توانائی کا احساس بھی ہوگا۔

امیر خسرو کا بڑا حصہ جسے حصہ اول کہا گیا ہے حیات خسرو پر مشتمل ہے جس کے آٹھ باب ہیں اور دوسرا حصہ تصنیفات کے جائزے کے لئے وقف کیا گیا ہے اس حصے میں بھی چھ باب ہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ ہے جس میں خسرو کی جامع اور مختلف الجہات کی شخصیت پر گہری روشنی ڈالی گئی ہے اس مقدمے کے بہت سے اجزا خوب صورت اردو نثر کا نمونہ ہیں اور مصنف کے فلسفیانہ مذاق کی غمازی کرتے ہیں۔ اگر یہ مقدمہ شامل کتاب نہ ہوتا تو اس کمی کا احساس ضرور ہوتا کہ سوانح حیات کے آخر میں خسرو کی شخصیت، مقبولیت اور عظمت کا ایک مجموعی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ گو ہر باب کے درمیان میں موقع کی مناسبت سے خسرو کی عام پسندی کا ذکر برابر آتا رہتا ہے۔ لیکن مقدمے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

خسرو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ان دلکش شخصیتوں میں سے ہیں جن سے ہر محفل میں روشنی ہر بزم میں رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ گروہوں، فرقوں اور طبقوں کی بندشیں توڑ کر خسرو کی مقبولیت عام ہوئی ہے۔ شاہی دربار سے لے کر نظام الدین اولیا کی محفل سماع تک اور بزم شعر و سخن سے عوامی گیتوں اور پہیلیوں سے دلچسپی لینے والوں تک تقریباً نصف صدی کی بات تک خسرو ہندوستان پر چھائے رہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی طویل زندگی کا تاریخی مطالعہ کیا ہے اور مختلف بادشاہوں کے دربار سے ان کا جو تعلق تھا اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ خسرو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ اپنا، اپنے عہد کا اور اپنے بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مثنویوں، مثنویوں میں اپنے فارسی دواوین کے دیباچے میں اپنے متعلق وہ بہت کچھ بتا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے تاریخوں کے ساتھ ساتھ ان خود نوشت اشاروں سے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ سوانح حیات کا تاریخی پس منظر بہت روشن اور دلکش ہے۔ لیکن ارتقائے تاریخ کا مطالعہ سماجی حالات کی روشنی میں نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے ان کی مقبولیت کا اصل راز اچھی طرح نمایاں نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے بڑی وضاحت سے خسرو کی مختلف درباروں سے وابستگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ خسرو کی نگاہوں کے سامنے صرف بادشاہ نہیں بیٹے بلکہ کئی خاندان آئے اور گئے لیکن وہ کسی بادشاہ یا کسی خاندان کے لئے ضرورت سے زیادہ غم ناک نہیں ہوتے اور حالات جو صورت اختیار کرتے ہیں انھیں تسلیم کر کے نئی زندگی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان میں یہ اخلاقی جرأت بھی تھی کہ علاء الدین کے سے بادشاہ سے بے باکی سے گفتگو کر سکیں۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے خصوصیت کے ساتھ خسرو کی ہندوستان دوستی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مختلف تصانیف میں ہندوستان سے محبت کا جذبہ ملتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے موسموں، شہروں، زبانوں ہر چیز کا تذکرہ محبت سے کیا اور ہندوستانی حسن کا ذکر بار بار ان کے قلم سے ہوا۔ کوئی شخص جو تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس وقت تک اپنے مطالعے کے مکمل ہونے کا دعوے نہیں کر سکتا جب تک کہ امیر خسرو کی نظم و نثر کا اچھی طرح مطالعہ نہ کر چکا ہو کیونکہ ان تصانیف میں یہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات کے خوب صورت اور سچے مرقعے بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے ان کا مناسب تذکرہ اپنی اپنی جگہ پر کیا ہے۔ یوں تو امیر خسرو کی حضرت نظام الدین اولیا سے گہری عقیدت ہمیشہ رہی لیکن عمر کے آخری حصے میں یہ عقیدت بیعت میں اور پھر غیر معمولی وابستگی میں تبدیل ہو گئی۔ خسرو نے اپنے مرشد کی نظر میں جو اہمیت اختیار کر لی ڈاکٹر وحید مرزا نے اسے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے اور ان کے انتقال پر انھوں نے جو ہندی شعر پڑھا تھا وہ نقل کیا ہے:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی سب دیس

مرشد کے انتقال کے چند مہینوں کے اندر خسرو کا بھی انتقال ہو گیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ سوانح حیات کی جاذبیت تو نہیں رکھتا لیکن ڈاکٹر وحید مرزا کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے خسرو کی تصانیف کی تعداد سے بحث کی ہے۔ ہر بڑے ادیب کے نام کے ساتھ بہت سی ایسی تصانیف بھی وابستہ ہو جاتی ہیں جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خسرو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے کتب خانوں کی فہرستوں، خسرو کی تصانیف کی داخلی شہادتوں وغیرہ سے اہم نتائج نکالے ہیں۔ موصوف نے خالق باری کو بھی خسرو کی تصنیف قرار دیا ہے جس پر بہت کچھ بحثیں محققین میں ہو چکی ہیں۔ خود راقم الحروف کا خیال ہے کہ خالق باری خسرو ہی کی تصنیف ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا نے کہا ہے، ممکن ہے خسرو کے اشعار کی تعداد اتنی نہ رہی ہو اور بعد میں دوسرے لوگوں نے اور اشعار اس میں جوڑ دیے ہوں۔ ادبی دنیا میں کئی دفعہ ایسا ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ خیال بالکل غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے خسرو کی اہم تصانیف کو سامنے رکھ کر ان کا ادبی اور تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور مثال میں کافی اشعار پیش کئے ہیں۔ پھر خسرو کی غزلوں کا ایک مختصر سا انتخاب بھی شامل کر کے اس مطالعے کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عام طور پر خسرو کی مقبولیت ان کی بزم پرسوز اور والہانہ انداز میں لکھی ہوئی غزلوں کی وجہ سے ہے لیکن خسرو خود غزل گوئی کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ جہاں غزلیں خسرو کے محض دل کا پتہ دیتی ہیں وہاں ان کی مثنویاں ان کے علم و فضل اور کمال شاعری کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہ تمام ابواب مختصر ہونے کے باوجود بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ آخری باب میں مصنف نے خسرو کی ہندی شاعری اور موسیقی کی مہارت سے بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ خسرو کا تذکرہ ان کی ہندی شاعری اور کمال موسیقی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہتا، کیونکہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا طبقہ خسرو کو فارسی کے شاعر کی حیثیت سے نہیں، ہندی شاعر اور موسیقی کے ماہر کی حیثیت سے جانتا ہے۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ مطالعہ اردو ادب میں ایک خاصے کی چیز ہے اور اردو کا کوئی کتاب خانہ اس کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہے۔ لیکن کاغذ بہت معمولی استعمال کیا گیا ہے۔ ٭

پاکستان کے معاشی مسائل پر تبصرہ

کوریا کی لڑائی کا قیمتوں پر اثر

کوریا کی لڑائی کی خبر پھیلتے ہی کراچی اور لاہور میں بدیشی چیزوں کی قیمتیں خاصی بڑھ گئیں، بمبئی، کراچی اور ہانگ کانگ کے سونے چاندی کے بازاروں میں ہماہمی پیدا ہو گئی۔ نیو یارک اور دوسرے اہم تجارتی مرکزوں کے اسٹاک ایکسچینج کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا اور نفع خوروں اور چور بازار میں کاروبار کرنے والوں کے چہرے جو کساد بازاری کی وجہ سے مرجھائے ہوئے تھے، عالمگیر جنگ کے امکانات دیکھ کر مسرت اور خوشی سے چمک اٹھے۔

پاکستان میں سب سے زیادہ کپڑے کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اعلان جنگ کے بعد ایک ہفتہ کے اندر قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ حسب ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔

کپڑا	اعلانِ جنگ سے پہلے کی قیمت (۲۴ر جون تک)	اعلان جنگ کے بعد کی قیمت (۳ر جولائی تک)
لٹھا سولہ ہزار	۷۳ روپے فی تھان	۹۰ روپے فی تھان
” دس ”	۷۰ ” ”	۸۶ ” ” ”
” چالیس ”	۹۱ ” ”	۱۰۵ ” ” ”
ململ نمبر ۸۱۸۱	۲۲ روپے ۱۲ر فی تھان	۳۰ ” ” ”

ایک طرف، اس خیال سے کہ عالمگیر جنگ کی صورت میں جاپان سے کپڑا منگوانا مشکل ہو جائے گا۔ کپڑے کی قیمتیں بڑھ گئیں، دوسری طرف، اس خطرہ پر کہ جاپان اور ہانگ کانگ کو روئی بھیجنا ممکن نہیں رہے گا، روئی کے داموں میں خاصی کمی ہو گئی ذیل کے اعداد ملاحظہ ہوں:-

روئی کی قسم	اعلانِ جنگ سے پہلے کی قیمتیں (۲۴ر جون تک)	اعلانِ جنگ کے بعد کی قیمتیں (۲ر جولائی تک)
روئی نمبر ۴ ایف، آر، جی	۷۸ روپے	۷۶ روپے ۸ آنے
” ” ایف، ایس، جی	۷۹ ”	۷۸ ”
” نمبر ۲۸۹ ایف	۸۴ ”	۸۲ ”

(پاکستان ٹائمز، لاہور)

کپڑے کی گرانی

کپڑے کی قیمتیں، اعلان جنگ سے بہت پہلے سے بڑھ رہی ہیں حالانکہ ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا کہ حکومت نے کپڑے کی درآمد سے لائسنس کی پابندیاں ہٹالی ہیں۔ ہندوستان سے تجارت کے راستے کھل گئے ہیں پچھلے دس ماہ میں کبھی بیرونی سکہ جات کی قیمتوں میں ردوبدل کے بعد سے کپڑے کی درآمد میں زبردست اضافہ ہوا ہے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر امید ظاہر کی جا رہی تھی کہ اب بیرونی مال کے دام گر جائیں گے۔ لیکن واقعات بالکل برعکس ہیں۔ پاکستان نے جب اپنے سکے کی قیمت گرانے سے انکار کیا تھا اس وقت بھی عام لوگوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ درساور کا مال سستا ہو جائے گا۔ یہ امید کہاں تک پوری ہوئی اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے، جو سرکاری ذرائع سے حاصل کئے گئے ہیں

ان اعداد و شمار کے ذریعے کراچی میں کپڑے کی قیمتوں کا حال بتایا گیا ہے:-

کپڑے کی قسمیں	قیمت فی تھان		
	ستمبر ۴۹ء دو شرح سکہ جات میں تبدیلی سے پہلے	نومبر ۴۹ء	جون ۵۰ء
گے لانگ کلاتھ (پی کورک)	۵۵ روپے	۷۰ روپے	×
لانگ کلاتھ نمبر سولہ ہزار جاپانی	۶۴ ”	۷۰ ”	۷۳ روپے
” ” دس ہزار ”	۶۱ ”	۶۲ ”	۶۸ ”

اعداد بالا سے واضح ہو گا کہ ستمبر ۴۹ء کے بعد سے کپڑے کی قیمتیں گرنے کے بجائے چڑھتی رہی ہیں۔

کوریا کی لڑائی سے قبل جو اضافہ ہوا ہے اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے

کپڑے کی قسمیں	مقدار اضافہ
لٹھا نمبر دس ہزار	ایک روپیہ فی تھان
” ” سولہ ”	” ” ”
” ” چالیس ”	۶ ” ”
ململ نمبر ۸۱۸۱	ایک روپیہ تا سوا روپیہ

عام خریداروں اور خوردہ فروشوں کے لئے یہ امر سخت حیران کن ہے کہ جب سے کپڑے کی کھلی درآمد کا اعلان ہوا ہے تب ہی سے دام بھی چڑھ گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ کراچی کے تھوک فروشوں نے کپڑے کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دی ہے اور حکومت نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی حالانکہ حکومت خود اعتراف کر چکی ہے کہ پاکستانی روپے کی قیمت کو برقرار رکھنے سے ہمیں جو مالی فائدہ پہنچ سکا ہے وہ سب کا سب بڑے بڑے تاجروں نے ہتھیا لیا ہے۔ پارلیمنٹ میں جب سے بجٹ پر بحث ہو رہی تھی تو کچھ وزراء نے بتایا کہ تھوک تاجر اس وقت ۷۰ فی صدی منافع کما رہے ہیں لیکن غیر سرکاری اور باوثوق اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ منافع کی شرح دراصل دو سو فی صدی تک پہنچ چکی ہے

ہمیں تسلیم ہے کہ جب سے پاکستان نے اپنے سکے کی قیمت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے دساور کے مال فروشوں نے بھی اپنے مال کے دام چڑھا دئے ہیں۔ برطانیہ کے مل مالک اس سلسلے میں خاص طور سے پیش پیش رہے ہیں لیکن اگر ہمارے تھوک تاجروں کو عوام کی خالی اور پھٹی ہوئی جیبوں کا خیال ہوتا تو کپڑا آج اتنا گراں نہ ہوتا، اور صورت حال کچھ نہ کچھ بہتر ضرور ہوتی۔

(امروز۔ کراچی)

پیداوار کم، ضرورت زیادہ

قیام پاکستان کے بعد ماہرین معاشیات اور صنعت کاروں کے لئے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ صنعتی اعتبار سے ملک کو جلد از جلد ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے تاکہ ہمارا ملک قوموں کی صف میں صحیح مقام حاصل کر سکے جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے لیکن صنعتوں کے قیام اور فروغ کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ اشیائے صرف کی پیداوار ناکافی ہے اور ملک کی ضروریات زیادہ ذیل کی جدول ملاحظہ ہو۔

	نام پیداوار	موجودہ پیداوار	مقدار مطلوبہ
۱	لوہا و فولاد		۲ لاکھ ٹن سالانہ
۲	کاغذ		۲۷ ہزار ٹن ”
۳	شکر	۳ ہزار ٹن	۲½ لاکھ ٹن ”
۴	کپڑا (بشمول دستی پارچہ)	۹ کروڑ گز	۱۰۴ کروڑ گز ”
۵	شیشہ	۵ ہزار ٹن	۲۰ ہزار ٹن ”

(پیام مشرق، کراچی)

آپ کی فرمائش

رنگ اور رنگے زرق برق نفیس اور نایاب کپڑوں کے لئے

مفت لال گگل بھائی اینڈ کمپنی کو یاد رکھئے

مینجنگ ایجنٹ

اسٹینڈرڈ کمپنی لمیٹڈ
انڈین بلیچنگ، ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ
نیو جاتنا ملز لمیٹڈ
سورت کاٹن اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
نیو شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

کیا کیا مال تیار ہوتا ہے

کورا اور رنگین سوت، کٹ پیس (ٹکڑے) کوری اور دھلی ہوئی چادریں
کورا دھلا ہوا رنگا ہوا چھپا ہوا لنکلاٹ، کوری دھلی ہوئی دھوتیاں
کورا دھلا ہوا کرتے قمیص کا کپڑا، دھاری دار کرتے قمیص کا کپڑا
کوری دھلی ہوئی ساڑھیاں، کورا دھلا ہوا زین، دھلا ہوا تولیہ، انگوچھے
چھپے میز پوش، چارخانہ اور دھاری دار کپڑا، چھپا ہوا اونی وغیرہ وغیرہ

ملنے کا پتہ: مفت لال گگل بھائی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۲۹ ریمپارٹ گیٹ اسٹریٹ، بمبئی

داخلہ

ڈگری طبیہ کالج

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کالج میں نئے طلبار کا داخلہ یکم اگست سنہ ۱۹۵۱ء سے شروع ہوگا۔ درخواست داخلہ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء تک پرنسپل صاحب طبیہ کالج علی گڑھ کے دفتر میں پہنچ جانا چاہئے، اور امیدوار کو فوراً مقرر کردہ تاریخ پر مع سرٹیفکیٹ حاضر ہونا چاہئے

مطبوعہ قواعد داخلہ

پرنسپل صاحب کے دفتر سے مفت طلب کیا جا سکتا ہے جس کے آخر میں درخواست داخلہ کا مطبوعہ فارم منسلک ہو۔ اس سال

۴۰ لڑکے اور ۱۰ لڑکیوں

کے داخلے کا انتظام کیا گیا ہے۔ درخواستیں جلد بھیجنا چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے نشستیں بھر جائیں۔

پرنسپل

ڈگری طبیہ کالج۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اچھی چھپائی

ہم ہر قسم کے بہترین "ٹائپ میٹل" بناتے ہیں جو کہ ہندوستان بھر کے تمام مشہور چھاپے خانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ کم خرچ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ ہمارے بنے ہوئے "اسٹیریو میٹل" اور "مونو ٹائپ میٹل" کی چھپائی نہایت صاف اور خوبصورت ہوتی ہے۔

نیچے لکھے ہوئے پتہ پر دریافت کیجئے

دی اسٹینڈرڈ میٹل کمپنی لمیٹڈ

جوپیٹر

انشورنس کمپنی لمیٹڈ

زندگی، آتش زدگی، جہاز، موٹر، مزدوروں کے معاوضے

اپنی حفاظتی خدمات

ہم پیش کرتے ہیں

اور

ہر طرح کے مطالبات کا فوری طور پر معاملہ کرتے ہیں

تفصیلات کے لئے لکھئے:۔

دہلی برانچ

چودھری بلڈنگ کے بلاک کناٹ سرکس

نئی دہلی

Printed at Jayyed Press, Delhi ... Printer & Publisher Abdul Latif Azmi B. A. (Jamia)

ہفتہ وار

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

جلد ۵ / ۲۲ جولائی سنہ ۵۸ء / نمبر ۴

یونسکو — پروفیسر سعید انصاری — ۲

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں — ع، ح - ع، ل — ۳

بزم بے تکلف ... ... — ۵

غزل — سید اختر علی تلہری — ۵

غزل — باقر مہدی — ۵

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۶

افریقہ اور اینگلو امریکی بلاک — محمد امین — ۸

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

یونسکو

(۳)

۲- خیالات و افکار کی آزادانہ آمد و رفت

پروفیسر سعید انصاری

ہوائی جہاز اور ریڈیو نے ملکوں کے درمیان فاصلے کو اس سے بھی زیادہ کم کر دیا ہے جتنا دیکھنے پر نظر آتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ موجودہ زمانے میں جو پابندیاں اور قیود حکومتوں اور قوموں نے عاید کر رکھی ہیں وہ امن عالم کی خاطر کم سے کم کی جائیں۔

(۱) اشخاص کا تبادلہ

اس کی ایک سب سے بڑی تدبیر یہ ہے کہ تعلیم سائنس اور تمدن کے میدان میں جو بڑے بڑے کام کرنے والے ہیں ان کا آزادانہ طور سے باہم تبادلہ ہوا کرے تاکہ اس طرح ایک ملک کے خیالات اور افکار دوسرے ملک تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ یونسکو برابر مختلف ملکوں کی حکومتوں اور انجمنوں کو اس بات پر آمادہ کرتی رہتی ہے کہ وہ اس کام کے لئے معتد بہ رقم خرچ کریں اور اس کے لئے وہ خود بھی معلومات اور سفر کی ضروری سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے "تبادلہ اشخاص" کے نام سے ایک دفتر بھی قائم ہے۔ سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ لوگ ان ملکوں میں کام کرنے کے لئے جائیں جو جنگ کے باعث تباہ ہو گئے ہیں ورنہ ان کو یونیورسٹیوں، اسکولوں، تجربہ گاہوں وغیرہ کے قیام سے کیا حاصل، جبکہ ان کے چلانے والے لوگ ہی نہ ہوں۔

یونسکو نے بعض ملکوں سے ایسے وظائف اور اسکالرشپ بھی حاصل کئے ہیں جن سے یہ ممالک فائدہ اٹھا سکتے ہیں مثلاً '۱۰' وظیفے انگلستان کی ایک فلم کمپنی نے فلم کی تعلیم کے لئے اور '۵' وظیفے پریس کا کام سیکھنے کے لئے انگریزی اخبارات کی طرف سے دئے گئے ہیں، تاکہ یہ ممالک ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ تجربہ کار لوگ جائیں تاکہ وہ اس سے پورا اور صحیح فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ ۲۵ ہزار ڈالر امریکہ کی ایک کیمیکل سوسائٹی کی طرف دئے گئے ہیں اس سے فن کیمیا میں تجربہ رکھنے والے امریکہ میں آ کر کیمیا کی مزید تعلیم حاصل کر سکیں اور اس کے لئے چین، چیکوسلاویکیہ، ندرلینڈ، یونان، اور پولینڈ کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اسی طرح حکومت فرانس کی طرف سے '۲۰' وظیفے صنعت و حرفت اور تعلیم کے مختلف شعبوں کے لئے دئے گئے ہیں۔ '۱۰' وظیفے بلجیم اور ہالینڈ کی حکومتوں نے دئے ہیں (ROYARY INTERNATIONAL) نے '۴' وظیفے اس غرض سے پیش کئے ہیں کہ اس سے معذور بچوں کی نفسیاتی دیکھ بھال کی تعلیم حاصل کی جائے

یونسکو نے اب تک ۵۶۴۰۰۵ ڈالر بطور امداد کے صرف کئے ہیں اور اس کی یہ بڑی کوشش ہے کہ سب ملکوں میں یکساں سائنس کی ترقی ہو۔ ۳۰۰۰۰۰ ڈالر اس غرض کے لئے رکھے گئے ہیں کہ اس سے سائنس کی مختلف انجمنوں کی امداد کی جائے۔ چنانچہ اس رقم سے ۵۰۰ بڑے بڑے سائنس دانوں نے ۶۰ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اس طرح باہمی تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کیا گیا۔

۳- بین الاقوامی اتحاد کی تعلیم

یونسکو کے اس کام کا مقصد یہ ہے کہ مختلف قوموں میں باہمی رواداری اور دوستی کے جذبات پیدا کئے جائیں جو واقعات پر مبنی ہوں تاکہ اس طرح ہر قوم میں ایسے شہری پیدا ہوں جو امن عالم کی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں۔ آج کل ہمارے مدارس اور کالجوں میں اس امن اور دوستی کے پیدا کرنے کے جو طریقے رائج ہیں ان کا ایک جائزہ لیا جا رہا ہے اور ہر ریاست کو اس جائزے کے لئے ضروری ہدایات بھیج دی گئی ہیں۔ چنانچہ یونسکو کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے یہ جاننا چاہتی ہے کہ طلبہ مدرسوں میں اس سلسلے میں کیا کچھ سیکھ رہے ہیں اور انھیں کیا کچھ مزید جاننے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ عنقریب اس تحقیقات کا نتیجہ ہمارے سامنے آ جائے گا۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں پیرس کے قریب ماہرین تعلیم کا ایک اجتماع ہوا جس میں ۳۱ ریاستوں کے تقریباً ۱۰۰ نمایندوں نے حصہ لیا۔ یہ لوگ کوئی چھ ہفتے تک اس مسئلے پر غور و بحث کرتے رہے کہ بین الاقوامی اتحاد کی تعلیم کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ان کے اس غور و بحث کے نتائج عنقریب ایک کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ بچوں کے علاوہ یونسکو نوجوانوں میں بھی اس قسم کی تعلیم کے مواقع پر تحقیق کا کام کر رہی ہے، اور وہ ایسی تمام بین الاقوامی انجمنوں اور مجلسوں کے حالات جمع کر رہی ہے جو اس قسم کا کام انجام دے رہی ہیں۔ اس نے ابھی حال میں ایسی انجمنوں کے لئے ایک کتابچہ بھی شایع کیا ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگوں سے تعلقات کیسے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی ان تدبیروں میں چند یہ ہیں مثلاً آمد و رفت، خط و کتابت، ان ممالک کے لوگوں کی امداد و اعانت۔

اس کے علاوہ درسی کتابوں کے مطالعے کا کام بھی پیش نظر ہے اور اس کے لئے ایک خاکہ تیار کر لیا گیا ہے جس سے ان کتابوں کی اصلاح ہو سکے ایسے اصولوں کا ایک خاکہ تیار کیا گیا ہے جس سے مختلف ریاستیں اپنے اپنے ہاں کی درسی کتابوں کے جائزہ لینے کا کام کر سکتی ہیں۔

یونسکو نوجوانوں کی انجمنوں میں بھی اپنا کام کر رہی ہے تاکہ ان کے ذریعے نوجوان، لڑکے اور لڑکیوں میں اتحاد، دوستی کے جذبات پیدا کئے جا سکیں [illegible] پولینڈ، فرانس اور چیکوسلواکیہ [illegible] شروع کیا تھا۔ بلجیم میں جو کیمپ ہوا اس میں تعلیم اور کاموں کے ان نوجوانوں نے کھیل کے لئے ایک بڑا ٹیلہ صاف کر کے کھیل کا ایک میدان بھی بنایا تھا۔ پولینڈ کے کیمپ نے گاؤں کے لئے گھر اور مدرسے بنا لئے تھے۔ غرض ان تمام کیمپوں میں تقریباً ۶ گھنٹے روزانہ ہاتھ سے کام کرنے کا معمول ہوتا تھا۔ شام کے وقت مطالعہ اور مباحثہ کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ یونسکو کی طرف سے چار کتب خانے بھی ان کے لئے بھیجے گئے تھے جن میں بیشتر کتابیں بین الاقوامی مسائل سے تعلق رکھتی تھیں۔

آخر میں اس غرض کے لئے یونسکو تمام ایسے اداروں اور انجمنوں کی جانچ پڑتال کا کام بھی کر رہی ہے جو بین الاقوامی مسائل کے لئے قائم ہیں اور ضرورت ہونے پر مزید مرکز قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے۔

۴- انسان اور موجودہ دنیا

انسان کا سماجی ماحول، اس کا اس کرۂ ارض سے تعلق، اس کی جماعت جس میں وہ رہتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس پر اس حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں کہ وہ کہاں تک امن عالم اور بین الاقوامی اتحاد کے مسلک کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ یونسکو کا ایک بڑا کام یہ بھی ہے کہ وہ انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک ایسا امتزاج پیدا کرے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔

یونسکو کی جنرل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں یہ بات طے پائی تھی کہ قوموں کے درمیان ان کشمکشوں کی تحقیقات کی جائے جو جنگ کا موجب ہوتی ہیں۔ [illegible] میں اس کی مجلس منتظمہ نے ماہرین کی امداد (بقیہ صفحہ [illegible])

ادارۂ تحریر:-
نئی روشنی — ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبد اللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

ثالث بالخیر

پنڈت جواہر لال نہرو کی صلح کل بیرونی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان کو اس وقت دنیا کے سب ملکوں میں یہ اعتبار حاصل ہے کہ جب کبھی دو مخالف طاقتوں میں مصالحت کرانے کا سوال آتا ہے تو دنیا کی نظریں ہندوستان ہی پر پڑتی ہیں۔ اس قسم کی خبریں کئی بار آ چکی ہیں کہ پنڈت نہرو نے [illegible] ویسٹ منسٹر میں روس اور امریکہ میں صلح کرانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ان خبروں کی عموماً سرکاری طور پر تردید ہوتی رہی لیکن اس کے باوجود لوگوں کا حسن ظن برقرار رہا۔ کوریا کی لڑائی شروع ہوتے ہی یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ پنڈت نہرو بیچ بچاؤ کرنے والے ہیں۔ خود پنڈت جی نے اپنی تقریر میں بھی فرمایا کہ ہندوستان یو این او کے رزولیوشن کی تائید کرتا ہے لیکن وہ جنوبی کوریا کو جنگی امداد نہیں دے گا بلکہ لڑنے والوں میں صلح کرانے کی کوشش کرے گا۔ پچھلے تجربات کی بنا پر یہ خیال تھا کہ پنڈت جی کی کوشش صرف دعوے ہی تک محدود رہے گی لیکن خوشی کی بات ہے کہ یہ خیال غلط ثابت ہوا اور اس بار پنڈت جی نے ہمت کر کے عملی قدم اٹھا ہی لیا۔ ادھر اخباروں میں خبر آئی اور ادھر نئی دہلی سے سرکاری اعلان ہوا کہ ہندوستان نے مارشل اسٹالین اور امریکی وزیر خارجہ ڈین اچیسن سے درخواست کی ہے کہ کوریا کی جنگ کو وہیں تک محدود رکھنے کی اور جلد سے جلد ختم کرانے کی کوشش کریں۔ اگرچہ پنڈت جی نے اپنے آپ کو بچولئے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دونوں فریق مصالحت پر تیار ہوئے تو انہی کو بیچ میں ڈالیں گے۔

اس کا ردعمل اب تک ساری دنیا میں بہت اچھا ہوا ہے۔ ایشیا، یورپ، امریکہ کے اخبار پنڈت نہرو کے قدم کو سراہ رہے ہیں۔ مارشل اسٹالن نے تو پنڈت جی کے خط کا جواب بھی بھیج دیا ہے جو امید افزا بتایا جاتا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ نے ابھی تک جواب نہیں دیا۔ لیکن جیسا امریکہ کے ایک اخبار نے لکھا ہے ان کو بھی لامحالہ اچھا ہی جواب دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اگر انھوں نے گھڑکی جھڑکی سے کام لینے کی حماقت کی تو دنیا پر کھل جائے گا کہ امریکہ کے صلح پسندی کے دعووں کی کیا حقیقت ہے۔ ممکن ہے چچا سام کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی ہو کہ ایشیا میں ہندوستان نے صلح کی تلقین کی جرأت کر کے بزرگ خاندان کا منصب ان سے چھین لیا ہے لیکن موقع ایسا ہے کہ ناراضگی کا اظہار کسی طرح نہیں کر سکتے۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس جرأت مدبرانہ کا صرف اتنا ہی نتیجہ ہوگا کہ ذاتی طور پر پنڈت جی کی واہ واہ ہو جائے یا قومی حیثیت سے ہندوستان کی صلح پسندی کا سکہ بیٹھ جائے یا اس کا کوریا کی جنگ اور عام طور پر روس اور امریکہ کے تعلقات پر بھی کچھ اچھا اثر پڑے گا؟ اس سوال کا قطعی جواب دینا ابھی مشکل ہے لیکن بظاہر تھوڑی بہت امید ہو رہی ہے کہ صلح کی کوشش آگے بڑھے گی۔ دراصل کوریا کے معاملے میں روس اور امریکہ دونوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے اور واقعات کی رفتار نے دونوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ روس کا یہ خیال تھا کہ شمالی کوریا اپنی فوجی برتری اور دوسرے سازگار حالات سے فائدہ اٹھا کر جنوبی کوریا پر آسانی سے قبضہ کرے گا اور امریکہ چین کی طرح یہاں بھی ایک فریق کو خالی خولی تھپکیاں اور دوسرے کو زبانی دھمکیاں دے کر رہ جائے گا۔ اس طرح امریکی مداخلت کا کانٹا برِ اعظم ایشیا کے پہلو سے نکل جائے گا اور کمیونسٹ جتھے کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ ادھر امریکہ سمجھتا تھا کہ شمالی کوریا والے اول تو دنیا کی ڈانٹ ڈپٹ ہی سے ڈر جائیں گے اور اگر انھوں نے زیادہ ڈھیٹ پن سے کام لیا تو تھوڑے سے ہوائی جہاز بھیج کر بم باری کرنے سے ان کی طبیعت درست ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ روس کی توقع کے خلاف امریکہ میدان جنگ میں کود پڑا اور امریکہ کی توقع کے خلاف شمالی کوریا دھمکی میں ڈر جانے کے بجائے مرد میدان ثابت ہوا۔ اب جنگ طویل کھنچتی معلوم ہوتی ہے اور اس کے پھیل کر تیسری جنگ عظیم بن جانے کا اندیشہ بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں تک باہر سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں عالم گیر جنگ کم سے کم اس وقت روس اور امریکہ دونوں نہیں چاہتے اس لئے تعجب نہیں کہ ہندوستان کی تحریک کو غنیمت جان کر دونوں صلح کی گفتگو کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن صلح اس وقت ہو سکتی ہے جب امریکہ چین کی نمائندگی کے بارے میں اپنی بے جا ہٹ سے باز آ جائے اور سیکورٹی کونسل سے چیانگ کائی شک کی برائے نام حکومت کے نمائندے کو الگ کر کے کمیونسٹ چین کے نمائندے کو جگہ دینے پر راضی ہو جائے۔ اس کا ذکر پنڈت نہرو نے اس خط میں جو انھوں نے امریکی وزیر خارجہ کو بھیجا ہے کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اپنی تقریروں میں وہ صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ چین کی الجھن کو دور کئے بغیر بین الاقوامی صورت حال کا سدھرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

خاتمہ زمینداری کا بھنور

کانگریس پارٹی نے کوئی چوتھائی صدی سے زمینداری کے خاتمے کو اپنے پروگرام کا ایک اہم جزو بنا رکھا ہے ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو کانگریس نے اس تجویز پر عمل کرنے کا ارادہ کیا لیکن ایک تو مرکزی حکومت جو اس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ زمینداروں کا طبقہ جو خود غرضی کی بنا پر اس کا سب سے زیادہ وفادار طبقہ تھا مٹ جائے، دوسرے کئی صوبوں میں خاص کر یو۔پی میں زمینداروں نے اپنی جان بچانے کے لئے فرقہ وارانہ منافرت کی آگ اس شدت سے بھڑکا دی تھی کہ کانگریسی حکومتوں کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا اس لئے خاتمہ زمینداری کی تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔ ۱۹۴۷ء میں جب صوبوں کے ساتھ ساتھ مرکز کی حکومت بھی کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں آ گئی تو اس نے پھر اس اہم مسئلے کی طرف توجہ شروع کی اور یو۔پی، بہار اور مدراس میں خاتمہ زمینداری کے لئے قانون کے مسودے مرتب ہونے لگے۔ اب پھر مخالفت کا شور بلند ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اس میں پہلا سا زور نہیں تھا اس لئے کہ زمینداروں کے سرپرست انگریز جا چکے تھے اور ملک کی تقسیم ہو جانے کے بعد فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بھی اتنی جان نہیں رہی تھی کہ ان کے ذریعے سے کانگریس کی توجہ خاتمہ زمینداری کی طرف سے ہٹائی جا سکے۔ لیکن جب قانون سازی کا ابتدائی کام شروع ہوا تو یہ حقیقت کھلی کہ موجودہ قوانین کی رو سے نقد معاوضے کے بغیر زمینداروں کو ان کی املاک سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بہار کی آئین ساز اسمبلی نے بڑی زمینداریوں کو نقد معاوضے کی جگہ مساوی رقم کے تمسکات دے کر ختم کرنے کا جو مسودہ بنایا تھا اسے گورنر جنرل نے نامنظور کر دیا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ آزاد ہند کے آئین میں حق ملکیت کے متعلق دفعات میں ایسی ترمیم کی جائے کہ زمینداریاں بغیر نقد معاوضہ ادا کئے ہوئے ختم کی جا سکیں۔ یہ ترمیم بڑی شدید مخالفت کے بعد خدا خدا کر کے پاس ہوئی مگر اس عرصے میں یو۔پی میں ایک نیا تجربہ شروع ہو گیا تھا کہ کاشتکاروں سے دس سال کا لگان یک مشت وصول کر کے انھیں زمینوں کا مالک بنا دیا جائے اور ان کی دی ہوئی رقم میں سے زمینداروں کو معاوضہ ادا کر دیا جائے۔ یہ اسکیم جو بظاہر بہت اچھی معلوم ہوتی تھی کچھ زمینداروں کی سازش، کچھ سوشلسٹ پارٹی کی مخالفت کچھ کانگریس والوں کی آپس کی جوتی پیزار کی وجہ سے مگر زیادہ تر اس لئے ناکام ہو گئی کہ کاشتکاروں کے پاس جس چھپی ہوئی دولت کا قیاس کیا تھا وہ نہیں نکلی۔ بہرحال یو۔پی کی حکومت مطلوبہ رقم کے دسویں حصے سے زیادہ وصول نہیں کر سکی۔

اب حالت یہ ہے کہ تینوں صوبوں

میں جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے خاتمہ زمینداری کے قانون تو پاس ہو رہے ہیں لیکن ان کو نافذ کرنے میں یہی دقت حائل ہے کہ معاوضے کی ادائگی کا طریقہ طے ہونے میں نہیں آتا۔ ادھر کاشتکاروں کو یقین ہو گیا ہے کہ زمینداروں سے ان کی زمینداری چھننے والی ہے اس لئے وہ لگان ادا کرنے میں آنا کانی کرتے ہیں اس لئے حکومت بھی پریشان ہے اور زمیندار بھی تنگ ہیں اور ان میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح تصفیہ ہو۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مضمون جو ریزرو بینک آف انڈیا کے تازہ بلیٹن میں شامل ہوا ہے قابل غور ہے۔ اس میں یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ مدراس، اتر پردیش، بہار، مدھ پردیش، مغربی بنگال، اڑیسہ اور آسام میں زمینداریوں کا مجموعی رقبہ ۱۷ کروڑ ایکڑ ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے معاوضے کی جو شرحیں مقرر کی گئی ہیں ان کے لحاظ سے حکومت کو چار ارب ۱۴ کروڑ روپے ادا کرنے ہوں گے۔ اس کے بعد اس کی مال گذاری میں ساڑھے انیس کروڑ کا اضافہ ہو جائے گا یعنی جو رقم وہ معاوضے کی صورت میں دے گی اس پر ۷ء۴ فی صدی منافع ہوگا۔ معاوضے کی ادائی کی سب صورتوں پر بحث کرنے کے بعد مضمون نگار کی رائے ہے کہ قابل عمل صورت صرف یہی ہے کہ معاوضہ ناقابل فروخت تمسکات کی شکل میں یا وثیقوں کی شکل میں دیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سود کے ساتھ زر اصل بھی چھوٹی چھوٹی قسطوں میں ادا ہوتا رہے۔ ہمیں امید ہے کہ متعلقہ ریاستوں کی حکومتیں ان تجویزوں کی چھان بین کرنے کے بعد جلد سے جلد کوئی فیصلہ کر دیں گی تاکہ خود وہ اور زمیندار اس بھنور سے نکل سکیں جس میں خاتمہ زمینداری کی تحریک نے دونوں کو ڈال دیا ہے۔

جو مزاج یار میں آئے

شری راجا گوپال چاری کے مرکزی کیبنٹ میں مقرر ہونے کا اعلان بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مگر علالت کی وجہ سے وہ اب تک اپنا چارج نہیں لے سکے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ راجاجی کامل صحت پانے کے بعد دہلی پہنچ گئے اور ۱۵ جولائی کو انھوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا جس زمانے میں یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ راجاجی کو مرکزی وزارت میں بلانے کی تجویز ہے تو بہت سے حضرات کا خیال تھا کہ گورنر جنرل کے منصب پر فائز رہنے کے بعد وہ وزارت قبول نہیں کریں گے۔ لیکن جو لوگ راجاجی کی طبیعت سے اور ان کی پچھلی زندگی سے واقف ہیں انھیں یقین تھا کہ راجاجی کی میزان قدر میں چھوٹے اور بڑے عہدے کے وزن میں کوئی فرق نہیں ان کے دوستوں اور رفیقوں خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے انھیں ملک کی خدمت جس طرح بھی کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ ضرور منظور کر لیں گے اور سچ پوچھئے تو راجاجی کا عہدہ کچھ بھی کہلائے وہ دہلی میں حکومت ہند کے بزرگ مشیر کی حیثیت سے رہیں گے اور حکومت کے فیصلوں پر اور سب سے زیادہ اثر ڈالیں گے۔

(ع، ح)

کیا کوریا کے بعد جرمنی کی باری ہے؟

اعصابی جنگ میں روس کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب جمہوری ملکوں کی کسی ایک محاذ کی طرف توجہ بہت زیادہ ہوتی تھی، تو وہ کسی دوسرے محاذ پر ایسی صورت حال پیدا کر دیتا تھا کہ جمہوری ممالک پہلے محاذ سے اپنی توجہ ہٹا کر دوسرے محاذ کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ کوریا میں جب لڑائی چھڑی تو سیاسی مبصروں نے عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس لڑائی میں بھی روس وہی طریقہ اختیار کر سکتا ہے جو اس نے اعصابی جنگ میں کیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ وہ کمیونسٹ کوریا کی براہ راست مدد کرے وہ کسی اور جگہ بالکل اسی طرح کا حملہ کرا دے گا جس سے جمہوری ملکوں کی طاقت بٹ جائے گی اور ان کی پریشانی میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ آج کل برلن کے روسی علاقے میں روس اور ستر ملکوں کے اہم ترین کمیونسٹ لیڈروں کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس سے اس خیال کو بڑی تقویت پہنچی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ کوریا اور جرمنی کی صورت حال بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔

اس کانفرنس کے ابتدائی جلاس میں جو تقریریں کی گئی ہیں ان سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً مغربی جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ جمہوری ملکوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے اور اس اقدام کے بنیادی مقاصد یہ ہوں:-

(۱) مشرقی جرمنی کے قومی محاذ کی تحریک کو مغربی جرمنی میں رائج اور مقبول بنایا جائے۔

(۲) ٹراٹسکی اور ٹیٹو کے حامیوں کو بے نقاب کیا جائے اور ان کو پارٹی سے خارج کر دیا جائے۔

(۳) مغربی جرمنی میں اسٹرائک کرائی جائیں اور بے اطمینانی پیدا کی جائے۔

اگر کوریا کی لڑائی سے پہلے کے واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فوج کشی سے قبل اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی جس کا نتیجہ باقاعدہ لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر جرمنی میں بھی روسی اور جمہوری ملکوں کے علاقوں میں اس طرح کی چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی تو ظاہر ہے اس کا نتیجہ بھی باقاعدہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا جس کے بعد عالمگیر جنگ کا امکان بہت قوی ہو جائے گا۔

برما کا نیا نعرہ

پچھلے سال ۱۹ جولائی کو آنگ سان کی دوسری برسی کے موقع پر برما کے وزیر اعظم تھاکن نو نے ایک سال کے اندر اندر ملک میں امن قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ بڑی حد تک پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب تیسری برسی کے موقع پر برما کے عوام نے عہد کیا ہے کہ وہ ملک کے امن کو پائدار اور حکومت کو مضبوط بنائیں گے۔ اگرچہ مکمل امن کے قیام کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سرکاری اندازے کے مطابق مکمل امن کے قیام میں صرف پانچ فیصدی کام باقی ہے۔ مگر بقول تھاکن نو کے، اس ۵ فیصدی کو کم نہ سمجھنا چاہیے۔ تقریباً ۲۰ ہزار باغی اب بھی حکومت کی مخالفت میں سرگرم ہیں اور انھوں نے اب جنگلوں میں پناہ لے لی ہے۔ جہاں سے ان کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں لیکن پچھلے ایک سال میں باغیوں کے دبانے میں حکومت کو جو کامیابی ہوئی ہے، اس کے پیش نظر پچھلے سال کا نعرہ کہ "امن ایک سال کے اندر" بدل کر نیا نعرہ مقرر کیا گیا ہے یعنی "امن سے استحکام تک"۔ ہمیں امید ہے کہ برما کا یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح پہلا اور عوام کی مدد سے امن کو مستحکم اور پائدار بنانے میں حکومت اپنی کوششوں میں پوری طرح کامیاب ہوگی۔

کامن ویلتھ کے معاشی ماہرین کا اجتماع

۱۴ جولائی کو سیلون میں کامن ویلتھ کے معاشی ماہرین کی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں جنوب مشرقی ایشیا کے پس ماندہ ممالک مثلاً برما، ہند، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ کو کلمبو اور سڈنی کانفرنسوں کے فیصلے کے مطابق ٹکنیکل امداد کے مسئلے پر غور کیا جائے گا اور ستمبر میں لندن میں محکمہ فنی امداد (ٹکنیکل ایڈ بیورو) کے قیام کے موقع پر جو اجتماع ہوگا اس کے لئے سفارشات تیار کی جائیں گی۔

مئی میں سڈنی کانفرنس نے ایشیا کے پس ماندہ ممالک کی فنی امداد کے لئے ۸ ملین پونڈ (۲۲ء۴ ملین ڈالر) منظور کئے ہیں۔ اگرچہ ابھی پوری رقم جمع نہیں کی جا سکی ہے مگر سڈنی کانفرنس میں تین سالہ امداد کا جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے امید ہے کہ اس کی تفصیلات اس کانفرنس میں طے ہو جائیں گی اور ستمبر میں بیورو کے افتتاح کے موقع پر اس کو عملی جامہ پہنانے کی بھی داغ بیل ڈال دی جائے گی۔

مصر اپنے فیصلے پر قائم ہے

امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات عام طور پر اس بات کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ملک اگر کسی بڑی طاقت کا سہارا نہ لیں گے تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو جنوبی کوریا کا ہوا۔ ان کے اس پروپیگنڈے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ مشرق وسطے کے ممالک خاص طور پر مصر سیکورٹی کونسل کے فیصلے کی حمایت کا اعلان کرے مگر مصر نے اپنے فیصلے کو بدلنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔ قاہرہ کے مشہور اخبار المصور کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے قائم مقام وزیر اعظم عثمان محرم پاشا نے کہا ہے کہ ہم نے برطانیہ کی دو لڑائیوں میں مدد کی ہے مگر اب ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دوسری لڑائی کے ختم ہونے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

بزم بے تکلف

"کون؟ میر صاحب بہادر ہیں؟ کہئے کیا خبر ہے؟"

"اے سبحان اللہ! کیا تمیز داری ہے! نہ دعا، نہ سلام، نہ مزاج پرسی بس ایک ڈھیلا سا کھینچ مارا کہ کہئے کیا خبر ہے۔ میں کوئی پرچہ نویس ہوں، شہر خبریا ہوں، آخر ہوں کون؟"

"توبہ، توبہ، شہر خبریے ہوں آپ کے دشمن، آپ تو میر خبر ہیں، میر خبر"

"نعمی واہ، واہ، وا! یہ میر شکار کے جوڑ پر میر خبر کی خوب رہی۔ پھبتی کی داد تو ہم سولی پر بھی دیں گے۔ چاہے ہم ہی پر کیوں نہ ہو۔ مگر تم لوگوں کو ہمارے متعلق بڑی غلط فہمی ہے، ہم کو اخبار کا جو اتنا شوق ہے وہ خالی خبریں پڑھنے کے لئے تھوڑی ہی ہے"

"اور کیا تو اب بٹورنے کے لئے ہے"

"ابھی ایک ثواب بٹورنا کیا، اخبار تو طالب علم کی تھگی سے بڑھ کر ہے اس سے جو کام چاہو لے لو۔ طالب علم کی تھگی کی یہی صفت ہے نہ کہ بچھائیے تو نرم، اوڑھیے تو گرم، باندھئے تو بھرم، دیکھئے تو دھرم، اب اخبار کو دیکھئے کہ کس کس طرح استعمال ہوتا ہے۔ میز پوش یا دسترخوان کی طرح بچھاتے اس کو ہیں، پنکھا اس سے جھلتے ہیں، مکھیاں اس سے مارتے ہیں، انگیٹھی اس سے سلگاتے ہیں انگیٹھے اور گلے کی انگلی سے مسل کر بتیاں اس کی بناتے ہیں اور جو بچ کر رہے اُسے ردی میں بیچ ڈالتے ہیں کہ پڑیا بنانے کے کام آسکے۔ آم کے آم اور گٹھلی کے دام"

"تو پھر لگے ہاتھوں یہ بھی کہہ ڈالئے کہ اضطراری حالت میں اس سے طہارت کا کام لیتے ہیں"

"وہ تو خیر تم جیسے نجس لوگ کرتے ہوں۔ البتہ قبض کے دفع کرنے میں ہم بھی اخبار سے مدد لیتے ہیں"

"کیسے میر صاحب یہ نسخہ تو ہمیں بھی بتائیے۔ اچھا سمجھ گیا۔ شاف ــــــ"

"استغفر اللہ! تم اپنی شیطنت سے باز نہ آؤ گے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ جن لوگوں کو قبض کی وجہ سے بہت دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ وقت کاٹنے کے لئے عام طور پر اخبار پڑھا کرتے ہیں"

"سچ کہا آپ نے۔ میں نے بہت سے حضرات کو دیکھا ہے کہ صبح تڑکے سے اخبار کے تازہ پرچے کا انتظار کیا کرتے ہیں اور جیسے ہی آتا ہے اُسے لے کے چلتے میں بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ اہل حاجت محض وقت کاٹنے کے لئے اخبار پڑھتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں اخبار میں ضرور کچھ مسہل کی خاصیت ہوگی ورنہ ایسے موقعوں کے لئے تو آج کل کا افسانوی ادب سب سے موزوں ہے۔ آخر اسے چھوڑ کر لوگ روکھے پھیکے اخبار کا ناشتہ کیوں کرتے۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر شخص کو کشود کار کے لئے کسی مخصوص اخبار کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ مثلاً ایک دوست ہیں جنھیں پائنیر کے بغیر کھل کر اجابت نہیں ہوتی۔ اگر کسی دن ہوکر میں اخبار والا امرت بازار پترکا دے جائے تو وہ کرنک ہو جاتے ہیں اور ان کا پیٹ پھول کر رہ جاتا ہے۔ ایک اور صاحب ہیں جن کی مشکل اسٹیٹسمین کے بغیر حل نہیں ہوتی۔ نیشنل ہیرلڈ سے انھیں پیچش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر کوئی اخبار ملین ہے یا نفاخ ہے یا مڑوڑ کرتا ہے تو اس کا اثر سب پر یکساں ہونا چاہیے"

"واللہ تم مسخرے پن میں کبھی کبھی پتے کی بات کہہ جاتے ہو۔ اخبار کی ان خاصیتوں پر ہم نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر تمھیں اس پر تعجب کیوں ہے کہ لوگوں پر مختلف اخباروں کا اثر مختلف ہوتا ہے یہ تو اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا ظرف ہے۔ ایک شخص کو ایک چیز سے انقباض ہوتا ہے، دوسرے کو اسی چیز سے انبساط ہوتا ہے"

"جلتے استاد غالبیت۔ میر صاحب نے اپنے قبض و بسط کے عقدے کو جس خوبی سے کھولا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے اور ہونا بھی چاہئے

ع کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا"

غزل

سیّد اختر علی تلہری

بزم تھی مے نوش تھے اور دور میں پیمانہ تھا
رات ساقی کے کرم سے رنگ پر مے خانہ تھا

دین سے مطلب نہ تھا دنیا سے میں بیگانہ تھا
سامنے آنکھوں کے میرے جلوۂ جانانہ تھا

عالم روحانیاں ہیں آج تک زیر و زبر
وہ ترے شوریدہ سر کا نعرۂ مستانہ تھا

مسکراتا ہی رہا جو حادثات دہر پر
ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزانہ تھا

ساقیٔ حق آشنا تھا مجھ سے منہ پھیرے ہوئے
میرا ذوقِ بادہ رہنِ شیشہ و پیمانہ تھا

تھی شہیدانِ وفا کی خاک اور سجدے مرے
کیش اپنا بندگی ہمت مردانہ تھا

عقل و دانش کے جنوں کی بدحواسی کچھ نہ پوچھ
تھا کبھی پیش نظر کعبہ کبھی بت خانہ تھا

تو نے خود ہی تو خیالِ ماسوا کو دی جگہ
ورنہ تیرا دل تو اس کا خاص خلوت خانہ تھا

عارضِ رنگین جاناں اور ندامت کا عرق
کس قدر اندازِ شکوہ میرا گستاخانہ تھا

آج کیوں دار و رسن کے نام سے لرزے میں ہے
کل اسی دل میں تو جوشِ جذبۂ پروانہ تھا

واعظِ خوش ذوق کی ظاہر پرستی کا یہ رنگ
اس کا سجدہ طالب سنگ درِ جانانہ تھا

کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں سب اسرار دہر
یوں تو کہنے کو یہ مرد باخدا دیوانہ تھا

مالکِ ارض و سما یہ داستاں جانے بھی دے
کیا بتائیں کیا تری دنیا میں تھا اور کیا نہ تھا

میں ابھی جو سن رہا تھا نغمۂ سازِ حیات
خوب تھا، اچھا تھا، دل کش تھا مگر افسانہ تھا

زمزمہ پیرا عنادل تھے گلوں کا تھا ہجوم
جانِ آبادی کبھی اختر یہی ویرانہ تھا

غزل

باقر مہدی

محفلوں میں جا کے گھبرایا کئے
دل کو اپنے لاکھ سمجھایا کئے

یاس کی گہرائیوں میں ڈوب کر
زخمِ دل سے خود کو بہلایا کئے

تشنگی میں یاس و حسرت کے چراغ
غم کدے میں اپنے جل جایا کئے

خود فریبی کا یہ عالم تھا کہ ہم
آئینہ دنیا کو دکھلایا کئے

ساحلوں والے بلانے آئے تھے
پھر بھی طوفانوں سے ٹکرایا کئے

خونِ دل عنوانِ ہستی بن گیا
آتشیں نغمات ہم گایا کئے

آزادی کی زنجیریں

ظفر دریاپور کے ایک بڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ والد پنشن لے کر دھن میں رہتے تھے۔ ظفر اور اس کا دوست ہردیال الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور ان کی لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ حسینہ اور ظفر کی منگنی ہوچکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن، ذہانت اور ادب پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کی ملاقات حسینہ کے چچا کے بیٹے لطیف سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ظفر اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کردیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہوگئی اور اس نے پڑھنے میں جان لگادی۔ چنانچہ اسے سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق رہا ہے۔

ظفر چھٹیوں کے بعد کالج آیا تو ریحانہ سے ملاقات ہوئی جس نے اسی سال فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں میں بڑی بے تکلفی ہوگئی اور آہستہ آہستہ ریحانہ ظفر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ادھر لطیف مڈل کے مقابلے کے امتحان میں ناکام رہا جس سے صفدر علی صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی اور اب وہ ظفر سے دلچسپی زیادہ لینے لگے۔ لطیف کا کانٹا نکل جانے سے حسینہ کی زندگی میں بھی بہار آگئی۔ مارچ کے آخر میں ظفر امتحان سے فارغ ہوا۔ اس کے والد حج کو گئے تھے اور مئی میں واپس آنے والے تھے۔ ظفر اس پس و پیش میں تھا کہ اپریل کا مہینہ الہ آباد میں گذارے یا دریاپور میں۔

قسط ۲

اس مسئلے کا فیصلہ اس طرح ہوا جس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ اکرام اللہ کے پاس نواب صاحب کا حکم آیا کہ بجٹ میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہردیال کا وظیفہ یکم اپریل سے بند کیا جاتا ہے۔ ہردیال نے یہ خبر سن کر کہا "ٹھیک تو ہے بچارے بال بچے والے آدمی ہیں کہاں تک یہ بوجھ برداشت کرتے۔ اتنے دن وظیفہ دیتے رہے، یہ بھی اُن کی عنایت ہے"۔

ظفر۔ یہ کیا مہمل بات لکھی ہے کہ بجٹ میں گنجائش نہیں۔ اگر ایسا تھا تو میرا وظیفہ بھی بند کر دیتے خیر میں خود ہی لکھے دیتا ہوں کہ اب مجھے وظیفے کی ضرورت نہیں۔ ان کا روپیہ ان کو مبارک رہے

اکرام اللہ۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس کی تہہ میں کیا ہے۔ ان سے کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ ہردیال پکے کانگریسی ہیں۔ آج کل نواب صاحب کانگریس کے نام سے چلتے ہیں۔

ہردیال۔ تو کیوں نہ جلیں گے۔ انھوں نے اپنی پارٹی کو دغا دے کر الیکشن میں چوری چھپے کانگریس کی اتنی مدد کی اور اب وہ اور زمینداروں کے ساتھ ان کی بھی جڑ کاٹ رہی ہے۔

اکرام اللہ۔ زمینداروں کی اپنی پارٹی تو ان کی نالائقی سے اور آپس کی پھوٹ سے ختم ہوگئی۔ اب یہ نئی اُپج یہ ہے کہ ہندو زمیندار مہاسبھا کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں اور مسلمان زمیندار مسلم لیگ کے سایے میں پناہ لے رہے ہیں جس کا زور ہمارے صوبے میں بہت بڑھ رہا ہے۔

ہردیال۔ تو اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ ان غریبوں کی گذر اوقات کا کوئی اور ذریعہ تو ہے نہیں۔ کسانوں کی گاڑھی کمائی سے جیسے تیسے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ آپ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ بھی ان سے چھین لیں۔ آخر وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کریں یا نہ کریں۔

اکرام اللہ۔ ہردیال یہ مذاق کی بات نہیں۔ ہماری تحریک آزادی کے لئے ہمارے صوبے اور سارے ملک کے لئے بڑا زبردست خطرہ ہے۔ تم جانتے ہو مجھے سوشلسٹ پارٹی سے صرف اتنا ہی اختلاف تھا کہ آزادی حاصل کرنے سے پہلے سرمایہ داروں کے مستقل حقوق پر ہاتھ ڈالنا ٹھیک نہیں ورنہ یہ اپنی پوری طاقت سے قومی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ وہی بات اب ہوتی نظر آتی ہے۔ اور اس سے بھی بدتر شکل میں۔ جب تک زمیندار اپنے حقوق کے لئے کھلے میدان میں آتے تھے اُن کا مقابلہ آسان تھا۔ چنانچہ الکشن کی جنگ میں کانگریس نے انھیں فیصلہ کن شکست دی۔ لیکن اب انھوں نے فرقہ وار پارٹیوں کی کمین گاہ سے حملہ شروع کیا ہے۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ یہ کس قدر خطرناک چیز ہے۔ سیدھے سادے جاہل لوگوں کو جنھیں اپنا مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے، مذہب کے نام سے بھڑکانا آگ سے کھیلنا ہے۔ مذہبی جنون کا شعلہ جب بھڑکتا ہے، تو عقل تمیز، تہذیب، اخلاق، انسانیت سب کو جلاکر خاک کر دیتا ہے۔

ظفر۔ آپ کو تو نواب صاحب بہت ملتے ہیں۔ آپ نے سمجھایا نہیں۔

اکرام اللہ۔ میں تو سمجھاتے سمجھاتے ہار گیا، جو فرمان آج صادر ہوا ہے اس سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ اب میرا اُن سے نباہ نہیں ہوسکتا بس آج ہی کل میں استعفےٰ بھیج دوں گا۔

ہردیال۔ واہ اکرام اللہ صاحب ہم تو آپ کو بڑا ٹھنڈا سمجھتے تھے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی ظفر کی طرح بس وہی ہیں جسے بھک سے اُڑ جانے والا مادہ کہتے ہیں۔ اتنی سی بات کے لئے آپ اتنی اچھی نوکری چھوڑ رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نواب صاحب کے وظیفے کے بغیر پڑھ نہیں سکتا۔ ایشور کی دیا سے مجھے حلال روٹی تو مل ہی جائے گی اور نہ بھی ملے تو کچھ دن پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی گذارا کر سکتا ہوں۔

اکرام اللہ۔ نہیں تو یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ماسٹر صاحب اپنا گھر لٹانے کے بعد بھی ایسے گئے گذرے تو نہیں کہ ایک لڑکے کو نہ پڑھا سکیں۔ میں نے صرف تمھاری وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کیا بلکہ یوں بھی میری نواب صاحب سے کسی طرح نہیں نبھ سکتی۔ جب تک وہ فرقہ واری جھگڑوں سے الگ تھے انھیں سیاست کی اونچ نیچ سمجھائی جاسکتی تھی مگر اب وہ اپنے آپ کو یہ دھوکا دے رہے ہیں کہ انھیں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے اور اسلام کو خطرے سے بچانا ہے۔ اس لئے میری رائے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ خودغرضی کسی اونچے مقصد کی آڑ لے تو بہری اور اندھی ہوجاتی ہے۔ بہرحال میرے اور اُن کے راستے الگ الگ ہوگئے ہیں۔ وہ میری رائے پر نہیں چلتے میں ان کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان کی نوکری کرنا بے ایمانی اور بے غیرتی ہے۔

ظفر۔ تو آپ الگ ہونے کے بعد کیا کیجیے گا۔ پہلے پہل تو بڑی مشکل ہوگی۔

اکرام اللہ۔ (ہنس کر) کیا تم نے ہردیال کی بات کو سچ مان لیا کہ میں بے سوچے سمجھے غصے کی جھانجھ میں کام کرنے والا آدمی ہوں۔ نہیں بھائی میں نے پہلے سے سب بندوبست کر رکھا ہے تم نے میور روڈ کے اس سرے پر وہ پرانا اجاڑ بنگلہ دیکھا ہوگا جو مدت سے خالی پڑا تھا۔ اب وہاں جاکر دیکھو گے تو شیشم، کیل، سال، ساگوان کی لکڑی کے انبار نظر آئیں گے۔ آرے، بسولے چلنے کی آوازیں سنائی دیں گی اور فرینڈز فرنیچر مارٹ کا سائن بورڈ دکھائی دے گا۔ یہ خاکسار کا کارخانہ ہے جو چند دوستوں کی شرکت میں قائم کیا گیا ہے۔ آج کل اس کی نگرانی ایک مستری کر رہا ہے۔ لیکن یکم مئی سے انشاء اللہ میں اس کام سے سبکدوش ہوکر کارخانے کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا، اور تعطیل کے بعد اگر تم دونوں شور و غل سے نہ گھبراؤ تو تمھیں ایک غریبانہ سا کمرہ اپنے رہنے کے لئے تیار ملے گا۔

ہردیال۔ بھئی واہ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ کمال ہی ہوگیا۔ بقول شخصے

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

اور آپ کی دعوت کا بہت بہت شکریہ مظفر کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا یہ ذرا نازک دماغ آدمی ہیں، یہاں تو پروا نہیں سر پہ آرے چلیں بسولے چلیں۔ یہ راضی ہوجائیں تو بندہ بڑی خوشی سے وہاں رہنے پر تیار ہے۔

ظفر۔ واقعی اکرام اللہ صاحب آپ نے بڑی تشویش سے نجات دی۔ میں اس وقت سے یہی سوچ رہا تھا کہ بغیر وظیفے کے ہم دونوں ہوسٹل کا خرچ تو برداشت نہیں کر سکتے۔ رہیں گے کہاں؟

ہردیال۔ دوست خرچ کی فکر نہ کرو تمھیں تو میں سمجھے یونیورسٹی سے وظیفہ مل ہی جائے گا۔ ہمارا بھی داؤں چل گیا تو کوئی چھوٹا موٹا ٹیوشن پا جائیں گے۔

اکرام اللہ۔ بس تو پھر طے ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ رہو گے۔ اس وقت تک انشاء اللہ مکان کی مرمت، احاطے کی صفائی اور چمن کی درستی ہو جائے گی۔

ہردیال۔ اور فرنیچر کی تو کوئی فکر ہی نہیں وہ تو گھر کی کھیتی ہے۔ بھئی ظفر بڑا مزا رہے گا۔ ہم تم بڑھئی کا کام سیکھیں گے اور مکان کے کرائے کے بدلے، اکرام اللہ صاحب کی مزدوری کیا کریں گے۔

اکرام اللہ۔ خیر بڑھئی کا کام تو تم کیا سیکھو گے اگر واقعی میری مدد کرنا چاہتے ہو تو روغن اور پالش کرنا سیکھ لو۔ تمھارا گھنٹے دو گھنٹے کا شغل رہے گا اور میرا کام ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد ظفر کے ابراہیم منزل میں رہنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس نے ہردیال کے ساتھ دریاپور چلنے کے لئے سامان باندھنا شروع کر دیا اور اس سے فارغ ہو کر اپنی پھوپھی اور حسینہ سے رخصت ہونے کے لئے صفدر علی کے ہاں گیا وہ تو یہی سمجھ کر دل گرفتہ اور ملول تھا کہ اس مرتبہ حسینہ سے ساڑھے تین مہینے کے لئے جدا ہوتا ہے مگر جب وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حسینہ کو میٹرک کے بعد علی گڑھ مسلم گرلز کالج میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اب اگلے چار برس تک اس سے جلد جلد ملاقات ہونے کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے تو اسے ایک ایسا سخت جھٹکا لگا کہ وہ سکون قلب اور اعصابی توازن جس پر اسے کچھ عرصے ناز تھا درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ دراصل حسینہ کی آیندہ تعلیم کے بارے میں اس کے ماں باپ کی رائے میں اختلاف تھا۔ صفدر علی کی خواہش تھی کہ اس کا پردہ چھڑا کر اسے الہ آباد میں گورنمنٹ کالج میں داخل کیا جائے۔ عقیلہ بیگم چاہتی تھیں کہ وہ علی گڑھ میں پڑھے تاکہ کچھ تھوڑا بہت پردہ باقی رہے۔ مگر وہ اتنی ہوشیار اور موقع شناس تھیں کہ انھوں نے پردے کے مسئلے کو بالکل نہیں چھیڑا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس بحث میں اپنے شوہر کو قائل نہیں کر سکتیں۔ انھوں نے اپنی تجویز کی تائید میں دوسری دلیلیں پیش کیں مثلاً یہ کہ حسینہ کو اردو سے خاص مناسبت ہے اور وہ اس میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتی ہے۔ علی گڑھ میں اردو کی تعلیم بہت اچھی ہے اس لئے اسے اس مضمون میں ترقی کا زیادہ موقع ملے گا۔ وہاں دینیات بھی پڑھائی جاتی ہے اور لڑکیوں کے لئے ورزش اور کھیلوں کا بھی انتظام ہے جس دلیل نے صفدر علی پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ یہ تھی کہ الہ آباد میں لڑکیوں کو ساتھ لڑکیاں بھی کانگریسی خیالات اور اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز یعنی اشتراکی خیالات اختیار کر لیتی ہیں۔ علی گڑھ میں حسینہ ان خطروں سے محفوظ رہے گی۔ غرض وہ اس پر راضی ہو گئے کہ حسینہ کو میٹرک پاس کرنے کے بعد مسلم گرلز کالج علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے۔ عقیلہ بیگم کے لئے حسینہ کی جدائی کا خیال بہت تکلیف دہ تھا مگر اسے پوری بے پردگی سے بچانے کے لئے وہ اس قربانی کے لئے تیار تھیں۔

ظفر کو بڑی مشکل سے پانچ سات منٹ کے لئے تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس کے دل میں جذبات کا ایک سیلاب اُمڈ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ضبط و احتیاط کے بند کو توڑ کر رکھ دے گا۔ مگر بچپن کی سخت تربیت اور اس سے بھی زیادہ خلقی حجاب نے ظفر کے جوش جذبات کو بڑی حد تک قابو میں رکھا۔ اس نے بھرائی آواز میں صرف اتنا کہا۔

حسینہ میں تم سے کیا کہوں، تمھارے علی گڑھ جانے کی خبر سن کر میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ میری بے کیف بے رنگ، سپاٹ، سنسان زندگی میں دو سال سے تمھاری محبت نے کچھ تھوڑی سی رنگینی، کچھ تھوڑا سا لطف پیدا کر دیا تھا، ہفتہ میں چھ دن میں لکچروں میں اور کتابوں میں سر کھپاتا تھا، اس امید پر کہ ساتویں دن کچھ دیر کے لئے تم سے ملاقات ہوگی۔ اب وہ سہارا ٹوٹ گیا۔ اب اتوار کا دن اور دنوں سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوا کرے گا پھر یہ خیال مجھے اور ستاتا ہے کہ کہیں تم وہاں کی مصروفیت اور دلچسپیوں میں مجھے بھول نہ جاؤ۔ اتنے دن کی تپسیا کے بعد جو جگہ میں نے تمھارے دل میں حاصل کر لی ہے، اگر وہ جاتی رہی ——— اُف اس خیال سے دل کانپ جاتا ہے۔"

حسینہ سر نہوڑائے چپ چاپ سن رہی تھی اس نے ایک لمحہ کے لئے گردن اٹھائی تو ظفر نے دیکھا کہ اس کی پلکوں پر آنسو جھلک رہے ہیں اور وہ انھیں پینے کی کوشش کر رہی ہے، آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ پہلے بھی رو چکی ہے۔ اس کا چہرہ رنج و الم سے متغیر تھا مگر جب بات کی تو اس کی آواز صاف اور سدھی ہوئی تھی۔

"مجھے تو آپ کی حالت کا کچھ اندازہ ہے اور اس کا بڑا قلق ہے۔ مگر مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کا آپ کو نہ کوئی اندازہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے جب آدمی اپنے دل کے جذبات کو خود اپنے پر ظاہر کرتے ہوئے شرماتا اور ڈرتا ہو تو وہ دوسروں پر کیوں کر ظاہر کرے۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں علی گڑھ کیا اگر دنیا کے دوسرے سرے پر بھی چلی جاؤں تو میں وہی رہوں گی جو اب ہوں۔"

ظفر۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ مجھے برابر خط لکھتی رہو گی۔

حسینہ۔ جی ضرور لکھوں گی، مگر آپ اس کا لحاظ رکھیے گا کہ آپ کے خطوں میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو، میں نے سنا ہے کہ وہاں لڑکیوں کی خط و کتابت پر بڑی کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے پرنسپل صاحبہ جب چاہتی ہیں خط کھول کر پڑھ لیتی ہیں۔

ظفر۔ یہ تو بڑی مشکل ہے۔ پرنسپل صاحبہ کو حاضر ناظر جان کر خط کیا خاک لکھا جائے گا خیر اتنا تو ہے کہ میں تمھیں اپنی یاد دلاتا رہوں گا اور تمھاری خیریت معلوم ہوتی رہے گی اور پھر جب تعطیل میں تم گھر آؤ گی تو چاہے میں دریاپور میں ہوں کسی نہ کسی بہانے سے الہ آباد آ جایا کروں گا۔

حسینہ۔ میں تو یہ دعا مانگتی ہوں کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں اچھے رہیں اور خوش رہیں، دیکھئے زیادہ محنت نہ کیجئے گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھئے گا۔

ظفر۔ حسینہ تم سے بچھڑ کر خوش رہنا تو ممکن ہی نہیں رہا صحت کا معاملہ تو جہاں تک افسردگی اور بیدلی کی حالت میں اس کا خیال رکھ سکتا ہوں، رکھوں گا مگر مجھ سے زیادہ کمزور تمھاری صحت ہے یہ فکر ہے کہ گرلز کالج کے بورڈنگ ہاؤس کا کھانا کھا کر تمھارا کیا حال ہوگا۔

حسینہ۔ آپ اطمینان رکھئے۔ امی جان نے مجھے بڑی تاکید کی ہے کہ دودھ پھل، انڈے استعمال کرتی رہوں، اور میں ان کی بات کبھی نہیں ٹالتی۔

اتنے میں عقیلہ بیگم نے حسینہ کو آواز دی تو ظفر کو بھی اس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ اس نے دل کڑا کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک دم بھر کے لئے حسینہ کو گلے لگا لیا اور اس کے دل کی دھڑکن اپنے سینے میں محسوس کی حسینہ اس کے ہاتھوں کو آہستہ سے جھٹک کر الگ ہو گئی اور جو لڑکی بھر کر کمرے سے نکل گئی۔ ظفر اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے ایک رسالے کو جو حسینہ نے پڑھ کر اسے واپس کیا تھا لئے ہوئے اس طرح باہر نکلا جیسے اس کے مطالعے میں ڈوبا ہوا ہو تھوڑی دیر تک وہ اپنی پھوپھی اور پھوپھا سے اپنے والد کے متعلق باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد رخصت ہو کر ——— سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ جہاں ہردیال اسباب لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

(باقی آیندہ)

پچھلا ہفتہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

جو مدد دی ہے اور قربانیاں کی ہیں اس کا صلہ یہ ملا ہے کہ نہ تو ہمارے قومی مفاد اور قومی وقار کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ ہمارے اسٹرلنگ فاضلات ہی واپس کئے گئے۔ اس سلوک کے بعد ہم سے تیسری غلطی کی توقع رکھنا بے سود ہے۔"

(ع، ل)

افریقہ اور اینگلو امریکن بلاک

محمد امین

یہ سوال دل میں بار بار اٹھتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ یو۔ این۔ او جنوبی افریقہ میں نسلی امتیازات کی روک تھام کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھا رہی ہے؟ اس کا جواب ہمیں لیک سکیس میں نہیں بلکہ لندن اور واشنگٹن میں ڈھونڈنا چاہیئے۔

یہ بات بہت ہی واضح اور صاف ہے کہ امریکی حکومت برطانیہ اور مغربی یورپین طاقتوں کی مدد سے ملان کی حکومت کو شہ دے رہی ہے۔ اسی جتھے کی رائے یو۔ این۔ او کے معاملات اور کارروائیوں میں اہم اور فیصلہ کن ہوتی ہے اس لئے کہ امریکہ کی خوشنودی کے لئے ساری چھوٹی بڑی حکومتیں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں اور کسی مسئلہ کے نشیب و فراز پر غور کئے بغیر آنکھ بند کر کے اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ جنوبی افریقہ کے خلاف ہندوستان نے جو شکایت کی تھی اس کے فیصلہ کی ذمہ داری اسی بلاک کے سر ہے۔

افریقہ میں قدرتی ذرائع اور وسائل لامحدود ہیں جو اب تک زمین کے اندر یوں ہی دفن پڑے ہیں۔ افریقہ کی آبادی ۱۵ کروڑ ہے جس سے سستے داموں کام کرانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ابھی تک افریقہ کے بہت سے قدرتی خزانے انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور زمین کے اندر پوشیدہ ہیں۔ لیکن موجودہ حالات میں براعظم افریقہ کی اہمیت بین الاقوامی افق پر روز بروز بڑھ رہی ہے۔ امریکہ کی ڈالر ڈپلومیسی اپنے اقتدار کے دائرے کو پرانی اقلیموں میں بڑھانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں کسی ملک یا براعظم کا اس کے اثر سے بچنا مشکل ہے۔

امریکہ کے بڑے بڑے تاجر ڈالر ڈپلومیسی سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں براعظم افریقہ کے بہت سے غیر ملکی مقبوضات کی معاشی اور سیاسی زندگی پر اندرونی طور سے وہ اپنا تسلط بٹھا رہے ہیں۔ جنگ کے ابتدائی زمانہ میں یورپ اور افریقہ کے درمیان تجارت کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اس سے امریکہ کے تاجروں کو ایک زریں موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے ایک ایسے بازار میں جس کا دروازہ ان کے لئے پہلے بند تھا۔ خوب خوب نفع کمایا۔ جنگ کے ابتدائی دو سال کے اندر اندر یو۔ ایس۔ اے اور افریقہ کی تجارت برآمد بڑھ کر ۱۷۸ فی صدی اور درآمد ۱۲۰ فی صدی ہو گئی تھی۔

جنگ کے بعد زمانہ میں "مارشل امدادی فنڈ" کی آڑ لے کر امریکی سرمایہ داروں نے اپنی معاشی بہبودی کے لئے مغربی یورپ کی طاقتوں کے افریقی مقبوضات کو بڑی چالاکی سے استعمال کرنا شروع کیا۔ یو۔ ایس۔ اے کے محکمۂ خارجہ نے اس بات پر زور دیا کہ جو ملک مارشل پلان کے تحت میں آئے ہیں ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس امداد کے بدلے جو امریکہ انہیں دے گا وہ اپنے ملک سے یا اپنے بیرونی مقبوضات سے کچا مال مہیا کریں خصوصاً رانگا، مینگنیز، سیسہ، جست وغیرہ۔

چونکہ مغربی یورپ کے ملک معاشی نقطۂ نظر سے اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اپنی مقبوضات کے وسائل کو امریکہ کی جارحانہ اسکیم کے مطابق ترقی دے سکیں اس لئے ان سب کو امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ امریکہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے والا ہے کہ وہ قرضہ دے کر پست حال اور غیر ترقی یافتہ مقبوضات کا کچا مال اور سستے مزدور اپنے مفاد کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔

اس طرح مارشل پلان والے ملک زیادہ سے زیادہ ڈالر حاصل کرنے کے لئے اپنے افریقی مقبوضات سے امریکن صنعتوں کو کچا مال بھیجنے پر مجبور ہیں۔ اس سلسلہ میں برٹش ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین لارڈ ٹریل گارن کی بات قابلِ غور ہے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے "اگر ہمارے مقبوضات میں سالانہ پیداوار بڑھ کر اگلے دس سال میں ۲۲۰ ملین پونڈ تک پہنچ جائے تو بے شک یہ ایک بہت بڑی بات ہو گی.... بیرونی مقبوضات پر خاص توجہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پیداوار ـــ غلہ اور خام اشیا ـــ امریکہ کو زیادہ درکار ہیں۔ رانگا، ربر اور کوکو کی بدولت ہمارے مقبوضات ڈالر اور اسٹرلنگ بلنس کے معاملہ میں بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں"۔

امریکہ افریقہ کی معاشی زندگی پر چھاتا جا رہا ہے۔ وہاں گھسنے کے لئے اس کے نزدیک صرف ایک مارشل پلان ہی کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس براعظم میں جہاں جہاں برطانیہ، فرانس اور بلجیم کی اجارہ داری ہے وہاں امریکہ تیزی سے صنعت و حرفت تجارت اور زراعت میں روپیہ لگا رہا ہے۔ ذیل میں ہم بعض ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کی مدد سے یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ امریکہ کیوں اور کس لئے افریقہ میں گھسنے کے لئے اس راہ کو ہموار کر رہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں بلجیم کانگو کو ۴۴ فی صدی مال بھیجتا تھا لیکن سنہ ۱۹۴۷ء میں یہ مقدار گھٹ کر ۲۶ فی صدی رہ گئی۔ اس کے برخلاف امریکہ سنہ ۱۹۳۹ء میں وہاں صرف ۳۰۰۵ (تین اعشاریہ پانچ) فی صدی مال بھیجتا تھا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں اس کے چھ گنے کے قریب بھیجا۔ اس کے علاوہ بلجین کانگو کی اشیا کے درآمد میں بھی امریکہ کا خاصا حصہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں اس نے ۴۸ فی صدی مال بھیجا جبکہ سنہ ۱۹۳۹ء میں صرف ۷ فی صدی بھیجا تھا۔ بلجیم پہلے وہاں ۴۸ فی صدی چیزیں بھیجتا تھا لیکن اب وہ صرف ۲۷ فی صدی رہ گئی ہیں۔ امریکہ اور بلجیم کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے جس کی رُو سے کانگو کی ساری یورنیم پر امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ یورنیم حاصل کرنے والی کچی دھات پر امریکہ کا قبضہ اس قدر سخت ہے کہ بلجیم کے سائنس دانوں کو شکایت ہے کہ اس تھوڑی سی دھات تجربہ کرنے کے لئے بھی نہیں ملتی۔

افریقہ میں انگولا کی ریاست پر پرتگال کا قبضہ ہے۔ پہلے یہاں برطانیہ تجارت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اب امریکی تاجر برطانیہ کے اقتدار کو ٹھیس لگا کر اس کو باہر نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہر چیز میں وہ برطانوی تاجروں کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کو شکست دیتے ہیں۔ اب انگولا اپنی ضروریات کی چیزیں جو پرتگال سے حاصل نہیں کر سکتا۔ امریکہ سے منگاتا ہے۔

موزمبیق کے جزیرے پر جو جنوبی افریقہ کے مشرقی ساحل کے قریب واقع ہے پرتگال کا قبضہ ہے اور یہاں حال ہی میں یورنیم کی نئی کان دریافت ہوئی ہے۔ امریکی تاجر اس خبر کو سن کر وہاں کی یورنیم پر قبضہ کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ سالے زار جو پرتگال کا آمر ہے امریکہ کو کچھ مراعات دے کر موزمبیق کی معدنیات کا سودا کرنے کو تیار ہے۔

بعینہٖ اسی طرح امریکہ برٹش افریقی مقبوضات میں وسیع پیمانے پر تجارت اور صنعت میں روپیہ لگا رہا ہے۔ شمالی روڈیشیا معدنیات سے مالا مال ہے۔ اس کی آمدنی صرف اس ایک مد سے ۱۰۰ ملین ڈالر سالانہ ہے۔ ساری معدنیات جو نکلتی ہیں امریکن فنانشل کارپوریشن کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کارپوریشن بہت سستے داموں اپنا کام چلاتا ہے اور مزدوروں کو برائے نام مزدوری دیتا ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ اسے تانبہ کی صنعت سے ہوتا ہے جو شمالی روڈیشیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مشہور ہے۔

افریقہ میں جنوبی افریقہ جہاں ڈاکٹر ملان کی فاشسٹ حکومت برسر اقتدار ہے امریکن سرمایہ کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ جنوبی افریقہ سونے کی کانوں کے لئے مشہور ہے۔ ایک تو ان کانوں سے سونے کی کھدائی کا سارا کام امریکہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ ان کانوں پر امریکن تاجروں کا ہی اثر ہے۔ دوسرے جنوبی افریقہ سونے کی کھپت اور مانگ امریکہ میں زیادہ ہے۔ چنانچہ ہر سال جنوبی افریقہ ۱۰۰ ملین پونڈ اسٹرلنگ سے زیادہ کا سونا امریکہ کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ جنرل موٹرس، فورڈ، فائرسٹون، گوڈایر، اسٹوڈی بیکر اور بہت سے صنعتی ڈپو جنوبی افریقہ میں اپنا اثر روز بروز بڑھا رہے ہیں۔

چند سال پہلے امریکنوں نے ایک سونے کی کان میں دو حصے خرید لئے تھے۔ ایک بار میدان میں آ جانے کے بعد امریکی تاجر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر ہمیشہ آگے کو رہتی اور وہ بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ چاروں طرف ہاتھ بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ جلد ہی آرنج فری اسٹیٹ میں نئے سونے کی کانیں دریافت ہوئیں۔ ان کانوں کو ترقی دینے کے لئے بہت روپے کی ضرورت تھی جو جنوبی افریقہ کے مقدور سے باہر تھا۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وال اسٹریٹ کے سرمایہ دار بآسانی سونے کی کانوں میں گھس گئے۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے درمیان اپنا پنجہ پھیلا کر انہوں نے ایک برٹش جنوبی افریقن کمپنی کو دبوچ لیا۔ رفتہ رفتہ اس کا قدم جمتا گیا اور جنوبی افریقہ میں ساری معدنیات میں ان کا زبردست حصہ ہو گیا۔ کم از کم سو صنعتی کمپنیوں پر ان کا مکمل قبضہ ہے۔ علاوہ سونے اور جواہرات کے مینگنیز اور کرومیم پر بھی امریکن اجارہ داری ہے۔ یہ دھاتیں ہزاروں ٹن ماہانہ جنوبی افریقہ سے امریکہ بھیجی جاتی ہیں۔ اسی عرصہ میں امریکی بنی ہوئی چیزوں سے جنوبی افریقہ کی منڈیاں پٹ گئی ہیں۔

اس کے باوجود جنوبی افریقہ میں نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ معاشی بحران میں مبتلا ہے جو سونے کے ذخیرے کم ہو جانے سے بہت نمایاں ہو گئی ہے۔ وہاں کی حکومت نے امریکہ کی اشیا کے درآمد پر کڑی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں خارجی سرمایہ کا استعمال اور اثر تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ملان کی مسلسٹ حکومت کے برسر اقتدار آنے کی وجہ سے فضا بدل گئی ہے۔ وہاں معاشی اور سیاسی حالات بہت غیر یقینی اور پریشان کن ہو گئے ہیں۔ اس لئے خارجی زر کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے۔ باہر کے ملک کے سرمایہ دار ایک ایسے ملک میں اپنا سرمایہ لگانا غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ جہاں کہ ملان کی گورنمنٹ کی نسلی اور غیر جمہوری پالیسی سے عوام کی اچھی خاصی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت یہ فاشسٹ حکومت یو۔ ایس۔ اے میں وہاں کی حکومت اور بڑے بڑے صنعتی سرمایہ داروں سے قرضہ لینے کے لئے گفت و شنید کر رہی ہے۔

افریقہ کی آزاد ریاستوں ملک حبش اور مصر میں وسٹنگ ہاؤس اور سنکلیر آئل کمپنی اپنے اپنے جال بچھا رہے ہیں اور وہاں کی اندرونی معاشی زندگی پر چھاتے جا رہے ہیں۔ ان ملکوں میں برطانیہ کے جمے جمائے اقتدار کو دھچکا لگ چکا ہے۔

براعظم افریقہ میں وال اسٹریٹ کی یہ زبردست معاشی کوششیں صرف نقد پیسے کمانے اور تجارت کے بڑھانے کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق واشنگٹن کی اس اسکیم سے بہت گہرا ہے جس کے ذریعہ وہ دنیا کے ہر ہر گوشہ میں ہوائی اڈے بنا رہا ہے اور ساری دنیا کو گھیر کر روس کے خلاف محاذ بنا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں امریکہ کی جارحانہ پالیسی کا یہ ایک حصہ ہے جس کی مدد سے نئی قائم کی ہوئی نوآبادیوں اور ریاستوں میں عوام کے مفاد کے خلاف رجعت پسند طبقہ کو ابھار کر وہ دنیا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سامراجی طاقتوں کے مقبوضات میں شہنشاہیت کے خلاف عوام کی ابھرتی ہوئی جدوجہد کو دبانا چاہتا ہے۔

ایشیا اب وہ دودھ دینے والی گائے نہیں رہی کہ جس کا جی چاہے اس کا دودھ نچوڑ لے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں عوامی تحریک دن بدن زور پکڑ رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ شہنشاہیت کے غلبہ کو مٹا کر رکھ دے۔ چین کو آزاد کرانے والی فوجوں کی معرکہ آرا فتوحات نے ایشیا میں شہنشاہیت کے اقتدار کو خطرہ میں ڈال دیا ہے اس لئے سامراجی طاقتیں مجبور ہو کر براعظم افریقہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر رہی ہیں۔

جنگ کے بعد کے زمانہ میں افریقہ پر سامراجی طاقتوں کی نظر صرف اسی لئے نہیں ہے کہ وہ خام مال کا ایک زبردست ذخیرہ ہے بلکہ اس کی ایک زبردست مرکزی حیثیت ہے جہاں سے عوام کی اٹھتی ہوئی تحریکوں کو دبایا جا سکتا ہے۔

اینگلو امریکی بلاک کی جو خارجی پالیسی ہے اس کے پیش نظر امریکی اور برٹش گورنمنٹ اپنے اپنے مقبوضات میں تیزی سے فوجی اڈے بنانے پر زور دے رہی ہیں۔ لائبیریا کی ریاست مغربی افریقہ کے ساحل پر واقع ہے۔ یہاں امریکہ اپنا پہلا جہازی بیڑہ، فوجی اور ہوائی اڈے کا مرکز بنا رہا ہے۔ امریکہ نے ایک سمجھوتہ کی رو سے منروویا کو جو لائبیریا کا دارالخلافہ ہے محض اپنے استعمال کے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اسے اپنا فوجی، جہازی اور ہوائی اڈہ بنا لیا ہے۔ امریکہ کے زیر اثر جنوب مشرقی ایشیاء میں بھی ہانگ کانگ اور سنگاپور کے اڈے بنائے جا رہے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے پاس پہلے ہی سے سائمون کا جزیرہ ہے جو اس کے جہازی بیڑہ کا مرکز ہے۔ بیسوں برس سے یہ برٹش سامراج کی خدمت کرتا رہا ہے۔ لیکن جنگ کے بعد برطانیہ مشرقی افریقہ میں اور بھی زبردست جنگی اڈے بنا رہا ہے۔ محل وقوع کے لحاظ سے یہ حصہ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ساحل سے خاصا قریب ہے اور بالکل اس کے سامنے ہے۔

فیلڈ مارشل مانٹگومری گزشتہ دو سالوں میں لندن، واشنگٹن، پیرس اور افریقہ کے درمیان کئی بار آ جا چکے ہیں۔ ان کے سفر کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ اینگلو امریکن بلاک اور شمال مغربی ملکوں کی یونین کے نقطۂ نظر سے افریقہ میں زمین ہموار کریں اور ضرورت کے مطابق اسے خاص فوجی لائن پر تیار کریں۔

اس قسم کی فوجی تیاریوں کے ساتھ ساتھ وائٹ ہال کی یہ اسکیم تھی کہ وہ اپنے مقبوضات میں اقتصادی اور معاشی پروگرام پیش کر کے انہیں ترقی کے راستہ پر لیجائے اور اس کے لئے اس نے کولونیل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے نام سے ایک کمپنی بنائی ہے بڑی بڑی اسکیموں کے ماتحت مقبوضات کو اس قابل بنایا جا رہا ہے کہ وہ نہ صرف گھر کی بگڑی ہوئی معاشی حالت کو درست کرنے میں مدد دیں بلکہ ڈالر اور اسٹرلنگ کے خسارہ کو بھی پورا کریں۔

ان مقبوضات کی دیسی اور سیاہ فام آبادی کے لئے یہ پالیسی غلامی کا دوہرا طوق ثابت ہوگی اول تو غیر ملکی حکومت دوسرے امریکہ کا استحصال۔ خطرہ ہے کہ کہیں یہ لوگ نفرت اور مخاصمت کا بیج بو کر عوام میں آپس میں پھوٹ نہ ڈلوائیں۔

اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ان مقبوضات کی غیر ملکی حکومتیں سفید چمڑی والے حکمران طبقہ کو متحد اور مضبوط بنا رہی ہیں اور دیسی باشندوں کو ایک محدود علاقے میں سمیٹ رہی ہیں۔ روڈیشیا اور نیاسالینڈ دونوں میں سنٹرل افریقی فیڈریشن بنانے کا خاص یہی مقصد ہے۔ کہ اس قسم کی اسکیموں میں مدد ملے۔ کینیا، اوگنڈا، ٹانگانیکا اور زنجبار میں بھی اسی طرح کا فیڈریشن بن چکا ہے۔

اس طرح افریقہ کا نقشہ بدلا جا رہا ہے۔ افریقہ اب ایک تاریک براعظم نہیں ہے جس کا مقصد محض یہ رہا ہو کہ وہ یورپ کی غیر ملکی حکومتوں کو خام اشیا مہیا کرے۔ امریکی شہنشاہیت کی ماسٹر پلان کے مطابق افریقہ کو تیزی سے ایک ایسے زبردست جنگی مرکز کی حیثیت دی جا رہی ہے جو اینگلو امریکی دفاع کی نئی لائن کا کام دے گا۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ ایسے مہلک اور عوام کے خلاف جو دنیا میں امن و امان کو برقرار رکھنے اور اپنے ملک کی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ جارحانہ قدم اٹھاتے وقت افریقہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور وہاں کی قومی زندگی میں یہ زہر نہ پھیلنے دیا جائے۔

تاہم براعظم افریقہ کو نئے سرے سے غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کے لئے امریکی شہنشاہیت اور غیر ملکی حکومتوں کو پہلے افریقی عوام کی آزادی کی جدوجہد سے نپٹنا ہوگا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس نے ۹۰ ہزار ملگسی وطن پرستوں کو میڈاگاسکر میں وہاں کے عوام کی آزادی کی جدوجہد کو کچلنے کے لئے استعمال کیا اور اس میں ہزاروں مارے گئے۔ مغربی افریقہ میں برطانیہ کی محکوم ریاست گولڈ کوسٹ میں عوام نے ایک زبردست مظاہرہ کیا تھا جس میں انہوں نے چڑھتی ہوئی قیمت اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ مظاہرہ اتنا شدید اور خطرناک ہو گیا تھا کہ برطانیہ کو اپنا ایک خاص جہازی بیڑہ حفاظت کیلئے وہاں بھیجنا پڑا تا کہ عوام کی بیداری اور آزادی کی تحریک کو دبایا جا سکے۔ بلجیم، برطانیہ اور فرانس کے مقبوضات کے مزدوروں میں خاصی بے چینی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کئی بار ہڑتال کی اور اس ہڑتال پر قابو پانے کے لئے پولیس کو ہمیشہ فوج کی امداد لینی پڑی۔ ان مقبوضات میں مزدوروں کو مزدوری برائے نام دی جاتی ہے۔ انہیں غلام سمجھ کر خوب اچھی طرح لوٹا جاتا ہے اور ان پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہاں کے عوام متحد ہو رہے ہیں اور اپنی مزدوری میں اضافہ کے لئے اجتماع پر احتجاج کر رہے ہیں۔ اس قسم کے مظاہرے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افریقہ کے عوام بیدار ہو رہے ہیں اور دنیا کی ترقی پسند طاقتوں اور امن و امان قائم رکھنے والی تحریکوں سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔

امریکہ کے دستور میں اس اعلیٰ اور مبارک اصول کا کیا کہنا جس میں یہ درج ہے کہ "امریکہ کا باشندہ ہر لحاظ سے یکساں سلوک کا مستحق ہے"۔ لیکن امریکہ میں جہاں تک ڈیڑھ کروڑ امریکی حبشیوں کا تعلق ہے۔ ان کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ سارے دستور پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہ نسلی امتیاز بہت نمایاں ہے اور خطرہ ہے کہ امریکی سرمایہ افریقہ کے اندرونی ملکوں میں بھی اسی قسم کے جذبے سے کام لے گا اور سفید چمڑی والوں کی عظمت اور برتری کا گیت گائے گا۔ اس سے یورپی طاقتوں کی سفید چمڑی والی پالیسی کو اور تقویت پہنچے گی اور زیادہ سے زیادہ مدد ملے گی۔

کیا اس پس منظر میں جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف یو۔ این۔ او کوئی موثر قدم اٹھا سکے گی؟ بہت مشکل ہے۔ یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ کہ بین الاقوامی امن و امان کو اس سے جو خطرہ ہے اس کی روک تھام کے لئے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا، جب تک کہ یو۔ این۔ او کے ممبر اینگلو امریکی جتھے کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔

یونسکو

(بسلسلہ صفحہ ۲)

سے اس بات کو اور واضح طور پر طے کیا تھا کہ کشیدگی سے کیا مراد ہے اور اس کے اثرات کا دائرہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ لندن اور شکاگو یونیورسٹیوں کے کچھ ماہرین عالم اجتماعیات نے اس مسئلے پر ایک بڑی اچھی یادداشت تیار کی ہے اور اس نے دائرۂ تحقیقات کو متعین کیا ہے۔ یہ یادداشت بہت سے علمائے اجتماعیات کو بھیجی گئی ہے تاکہ ان کے خیالات اور نظریوں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور پھر بعد میں کوئی پروگرام مرتب کیا جا سکے۔

یونسکو نے ان حالات کا مطالعہ بھی کیا ہے جس کے باعث اشخاص کا تبادلہ بین الاقوامی تعلقات کے لئے مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک شخص کتنی مدت تک کسی ملک میں قیام کرے اور وہ کس طرح وہاں کے حالات کا مطالعہ کرے۔

اس غرض کے پیش نظر یونسکو نے یو، این، او کے معاشی اور زرعی انجمنوں کے ساتھ مل کر اس تحقیقات میں بھی حصہ لیا ہے کہ کہاں تک کسی ملک کے وسائل کو بچا کر وہاں کے لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں مدد دی جا سکتی ہے۔ یہ خاندان اور جماعت کے لئے ایک بین الاقوامی ادارے کے قیام میں بھی یو، این، او کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ جون ۱۹۴۸ء میں اس غرض کے لئے ماہرین کا ایک جلسہ بھی یونسکو ہاؤس پیرس میں منعقد ہوا تھا

مقاصد کی تکمیل

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے یونسکو کا سب سے بڑا ذریعہ وہ قومی کمیشن ہیں جو ہر رکن ریاست نے اپنے ہاں مقرر کئے ہیں اور ان کے علاوہ وہ تعلیمی ادارے اور انجمنیں بھی ہیں جو اس کام میں ان کمیشنوں کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں۔

یہ کمیشن اپنے اپنے ملک میں تعلیم سائنس اور تمدن کے ماہروں کو وقتاً فوقتاً جمع کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کام ایک طرح سے یونسکو اور اپنی قوم کے درمیان ایک واسطے کا ہے۔ یہ اپنی حکومتوں کو یونسکو کے کاموں سے متعلق مشورے بھی دیتے رہتے ہیں۔ اور یونسکو کی طرف سے کوئی منصوبہ شروع کیا جائے تو اس میں مدد بھی پہنچاتے ہیں۔

یونسکو یو، این، او کا ایک حصہ ہے اور اس کے ایک مخصوص شعبے کی حیثیت سے کام کرتی ہے اس کا کام یو، این، او کے کاموں میں ہم آہنگی اور اشتراک پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں یو، این، او کی معاشی سماجی کونسل نے یونسکو کے ذمے یہ کام کیا کہ وہ دنیا کی ادبیات کے ترجمے کرائے اور اخبار و اطلاعات کی آزادی پر جو بین الاقوامی کانفرنس ہونے والی تھی اس میں وہ خود بھی حصہ لے۔ نیز جن ملکوں میں عورتوں کی تعلیم کو مساویانہ حقوق حاصل نہیں ہیں وہاں اس کے حصول کا ایک پروگرام بنائے۔ یونسکو یو، این، او کے ٹرسٹی شپ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی مل کر ایسے علاقوں میں جنھیں اب تک حکومت خود اختیاری حاصل نہیں ہے، تعلیم، سائنس اور تمدن کے دائروں میں کام کرتی ہے۔ اس نے انسانی حقوق کا جو منشور مقرر ہوا ہے۔ اس میں بھی بڑا کام ہوا ہے۔

یونسکو کی مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ غیر سرکاری انجمنیں اور ادارے ہیں جو بذات خود اس قسم کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یونسکو ان انجمنوں کے ساتھ یا تو بحیثیت مشیر کے کام کرتی ہے، یا پھر انھیں امداد دے کر ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس قسم کی کتنی ایسی انجمنیں ہیں جن کے ساتھ مل کر یہ اپنا کام کر رہی ہے۔

غرض یونسکو کا کام اس کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر والٹر، ایچ، سی، لاوسے کے لفظوں میں سماجی خدمت یا تبلیغ و اشاعت نہیں بلکہ اس کا مقصد یو، این، او کے اصولوں کو تعلیم، سائنس اور تمدن کے میدانوں میں پورا کرنے میں مدد دینا ہے۔ آپ یونسکو کے لئے کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے مقاصد کی تکمیل میں اپنے اپنے دائرے میں رہ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اس طرح امن عالم کے حصول اور لوگوں کے فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کر سکتے ہیں۔

تنقید و تبصرے

بیکراں

مصنف :- جگن ناتھ آزاد

ناشر :- مکتبہ فنصرار دو، اردو بازار دہلی - ۱۲

جگن ناتھ آزاد دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ نوجوان شعراء میں ان کی منفرد حیثیت ہے حسن زبان اور پختگی فن کے ساتھ ان کے کلام میں گہرا احساس اور خلوص ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سلیقے سے کہتے ہیں۔ اور بقول فراق ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنھیں واقعی شعر کہنا آتا ہے۔

بیکراں آزاد کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ غزلوں میں تغزل کے ساتھ ہلکی پھلکی غنائیت ہے جیسے کوئی مدھم سروں میں ستار بجا رہا ہو۔ نظموں میں انھوں نے زندگی کے اہم مسائل کو جو ان میں ڈال بھی شامل ہے۔ شاعری کے خوب صورت سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ آزاد کی نظر گہری مطالعہ وسیع اور دل دردمند ہے۔ اور یہی اچھی شاعری کے لوازمات ہیں۔

کتاب کا گرد پوش خاصا جاذب نظر ہے کاش لکھائی، چھپائی بھی اچھی ہوتی

اِدارہٴ علمیہ کی چند مطبوعات

اس ادارے کے قیام کا مقصد خود اس کے الفاظ میں یہ ہے کہ تمام مذاہب کی اصولی یکسانیت کو علمی انداز میں ظاہر کیا جائے۔ رنگ، نسل اور عقائدی تعصب کا فتنہ و فساد مٹے اور فطری اصولوں کے مطابق صحت بخش انسانیت کا نشوونما ہو۔"

اس ادارے کی حسب ذیل کتابیں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہیں :-

نغمۂ الوہیت

مترجمہ حسن الدین احمد صاحب مجلد سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ -

حجم ۱۲۲ صفحے - قیمت سے ر

یہ بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ ہے۔ پنڈت سندر لال صاحب کی اس ترجمے کے متعلق رائے ہے کہ "یا جو اس کے کہ حسن الدین احمد صاحب جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں سنسکرت زبان سے ناواقف ہیں جو کامیابی انھوں نے ترجمہ کرنے اور گیتا کے اشلوکوں کے مفہوم کو اردو میں ادا کرنے میں حاصل کی ہے وہ حیرت انگیز ہے"

اِسلامی تعلیمات

مصنفہ میر ولایت علی مجلد سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

حجم ۹۴۳ صفحے - قیمت للعہ ر

ادارے کے مقاصد کے پیش نظر اس کتاب میں اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا گیا۔ مصنف کے حسب ذیل خیالات سے کتاب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

اسلام اس طریقۂ زندگی کا نام ہے جس میں سلامت روی امن پسندی، رواداری، غم خواری ہو، یعنی اسلام مذہب فطرت اور عین انسانیت ہے۔ قرآن نے دنیا کے تمام مذاہب کے نیک انسانوں کو مسلم و متقی کہا۔ وحدت انسانی کے انتشار کو کفر و شرک بتلایا ...... غرض اسلام نسل اور شہرت کی اجارہ داری نہیں بلکہ انسانیت میں ترقی کرنے والے افراد کا اسم صفت ہے"

اِسلام اور اس کی حقیقت

مرزا ابوالفضل سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

حجم ۸۴ صفحات - قیمت ۱۲ ر

بدھ ازم اینڈ اسلام (انگریزی میں) ۸ ر

ھندوازم " " " ۴ ر

کرسچینٹی " " " ۴ ر

ان کتابوں کے ملنے کا پتہ :-

اِدارۂ عِلمیہ ۴۲۱ - اعظم پورہ - روبرو گنبد اعزہ حیدرآباد (دکن)

شرح اشتہارات ہندوستان و پاکستان

سالانہ: آٹھ روپے   ششماہی: چار روپے آٹھ آنے

فی پرچہ: تین آنے

"منیجر"

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:

سالانہ   دس روپے   ششماہی   ساڑھے پانچ روپے

فی پرچہ   ...   چار آنے

Printed at Jayyed Press, Delhi.   Printer & Publisher : Abdul Latif Azmi B. A., (Jamia)

ماہنامہ

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

جلد ۵ | یکم اگست [illegible] | نمبر ۵

...ن کمیشن کی رپورٹ — ع ، ل — ۲
...پچھلا ہفتہ
...ہند اور بیرون ہند میں — ع ، ج ، ع ، ل — ۳
...شگون
...زل — مسعود اختر جمال — ۵
...زل — باقر رضوی
...زادی کی زنجیریں مسس نادل — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۶
...نح ! ہلا بلا ! — سید مجتبیٰ حسن نقوی — ۷
...مرہ "شگفتہ کا بہترین ادب" — طاہر پرویز — ۹
...کاک — آر لال — ۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر دہلی

اڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستان کے معاشی مسائل

مالی کمیشن کی رپورٹ

فسیکل (مالی) کمیشن کی رپورٹ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ یہ رپورٹ جس محنت سے تیار کی گئی ہے اور ہندوستان کے معاشی، صنعتی، زراعتی اور تجارتی مسائل کا جس تفصیل سے تجزیہ کیا گیا ہے اس لحاظ سے اس سے بہتر اب تک کوئی سرکاری رپورٹ شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس رپورٹ پر بعض حلقوں کی طرف سے تنقید بھی کی گئی ہیں۔ مگر عام طور اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ اتنی اہم ہے کہ ہندوستان کے معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کی خدمت میں ہم اس کا مختصر خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ پوری رپورٹ ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے ظاہر ہے اس مختصر خلاصے سے رپورٹ کے حسن و قبح کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ البتہ ایک عام رائے قائم کرنے میں اس سے ضرور مدد ملے گی۔

معاشی پالسی کے بنیادی مقاصد

ہندوستان کی معاشی پالسی کے متعلق دستور اور انڈسٹریل پالسی کے بیان میں جس میں حکومت کی صنعتی پالسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ حسب ذیل بنیادی مقاصد بیان کئے گئے ہیں :-

(۱) تجارت کی توسیع اور پیداوار میں مستقل اضافہ کے ذریعے بیروزگاری یا نیم بیروزگاری کی روک تھام

(۲) قدرتی وسائل کا زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر استعمال۔

(۳) مزدوروں کے معیار زندگی اور بار آوری میں مستقل اضافہ اور ایسے محرکات پیدا کرنا جن سے تجارت میں جان پڑ جائے۔

(۴) زراعتی ترقی کے لیے خاص طور پر کوشش کرنا اور ملک کی ابتدائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری صنعتوں کا قیام اور ان کی ترقی۔

(۵) امداد باہمی یا انفرادی ذریعوں سے دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی۔

(۶) اس بات کا خیال رکھنا کہ بڑی صنعتوں سے پیداوار، بار آوری اور معیار زندگی میں نمایاں ترقی ہو۔

(۷) متنوع طریقوں سے مختلف فرقوں کی صلاحیتوں اور مختلف انسانی اور قدرتی وسائل و دولت کا ایسا استعمال جس سے جنتا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہماری رائے میں حسب ذیل باتوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(الف) آبادی کے مسائل کا گہرا مطالعہ (ب) معاشی طریقوں کے منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لئے عوام کی تائید اور حمایت حاصل کرنا۔

زراعتی نیم بے روزگاری

ہندوستان کی معاشی ترقی کی پالسی مقرر کرتے وقت، اس بات کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کی زندگی میں زراعت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

زراعتی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ نیم بیروزگاری کا ہے۔ اس کو حل کرنے کے لئے بیک وقت دو پروگراموں کو ساتھ ساتھ چلانا ہوگا۔ ایک عقلی اصولوں پر زراعت کی تنظیم دوسرے فاضل لوگوں کو زراعت سے نکال کر صنعت میں لگانا۔

دیہی اور چھوٹی صنعتوں کا منصوبہ بناتے وقت اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تنظیم اور ٹکنیکل تبدیلی میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے مسلسل تحقیقات اور دوسرے ذریعوں سے ایسے طریقے سوچنے ہوں گے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو نفع بخش روزگار میں لگایا جا سکے۔ اس کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف وہی دیہی صنعتیں کامیاب ہوں گی جو زرعی اور جنگلات کی پیداوار سے تیار کی جاتی ہوں اور جن مصنوعات کی عام طور پر دیہات کے لوگوں کو ضرورت ہے تاکہ بغیر کسی خاص کوشش کے ان کو بیچا جا سکے۔

سرکاری امداد اور نگرانی

ہمارے ملک میں تعلیم کی بہت کمی ہے اور دیہات میں ایسے لوگ بڑی مشکل سے اور بہت کم تعداد میں ملیں گے جو تنظیم اور کاروبار کی بہتر صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لئے دیہی اور چھوٹی صنعتوں کو چلانے کے لئے کم سے کم شروع میں سرکاری امداد اور نگرانی کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے خیال میں ہر صوبے میں ایسے کارپوریشن قائم کرنے چاہئیں جنھیں صوبجاتی حکومت کی امداد حاصل ہو اور ان کی نگرانی اور انتظام میں دیہی اور چھوٹی صنعتوں کو چلایا جائے۔

جن جگہوں پر بڑی اور چھوٹی صنعتوں میں مقابلہ اور اختلاف نہیں ہے، ایسی جگہوں پر بغیر کسی تاخیر کے صنعتی پالسی کے بیان (انڈسٹریل پالسی اسٹیٹمنٹ) میں حکومت نے کیے ہوئے فیصلے کے مطابق کام شروع کر دینا چاہئے اور جن چھوٹی اور دیہی صنعتوں میں سخت مقابلہ ہے وہاں حکومت کو چاہئے کہ دیہی صنعتوں کو اس وقت تک امداد دے اور ان کی حفاظت کرے جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو جائیں۔

بڑی صنعتیں

بڑی صنعتوں کی قسمیں بڑے پیمانے پر قائم کیا جائے گا، اجمالی فہرست حسب ذیل ہے :

(الف) مدافعت کی صنعتیں جن میں ہتھیار اور دوسرے جنگی سامان کے علاوہ ایسی ضمنی صنعتیں بھی شامل ہیں جو مدافعت کے علاوہ عام ضروریات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز، ریلیں اور بحری تار وغیرہ

(ب) بھاری کلیدی صنعتیں جن پر دوسری صنعتوں کا انحصار ہے مثلاً ایسی صنعتیں جن سے بار برداری کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں

(ج) بھاری بنیادی صنعتیں جن سے مشینیں اور عام ضرورت کی صنعتوں کے قیام میں مدد کی جاتی ہے مثلاً لوہے، فولاد اور اوزار کی صنعتیں، شہ بکھری اور دوسری بڑی مشینیں۔

(د) ہلکی بنیادی صنعتیں جن سے عام صنعتوں کی تیاری میں مدد لی جاتی ہے۔ مثلاً کاسٹک سوڈا، الکٹرو کیمیکل انجینیرنگ، زراعتی اوزار وغیرہ

(ھ) عام استعمال کی ضروری چیزوں کی صنعتیں جن کی پورے ملک میں مانگ ہے۔ مثلاً سوتی کپڑا، گرم کپڑا، سیمنٹ، شکر، کاغذ وغیرہ

ترجیح کی ترتیب

ہمیں اس کا پوری طرح احساس ہے کہ حکومت ہند ان تمام صنعتوں کو شاید ایک ساتھ شروع نہ کر سکے گی اس لئے ترجیح کے مقررہ ترتیب کے مطابق ان کو یکے بعد دیگرے شروع کیا جائے گا۔ انفرادی صنعتوں کے لئے ہماری رائے میں ترجیح کی ترتیب حسب ذیل ہونی چاہئے

(۱) مدافعت کی صنعتیں (۲) ایسی صنعتیں جن کا تعلق قدرتی وسائل دولت کی ترقی سے ہے۔ مثلاً پانی کی طاقت اور معدنیات مثلاً کوئلہ، پٹرول (۳) مفاد عامہ کی صنعتیں مثلاً ریل، بجلی وغیرہ (۴) بھاری کلیدی اور بنیادی صنعتیں جن کے قیام میں اگر عام تاجروں کا تعاون حاصل نہ ہو سکے تو حکومت انھیں اپنی طرف سے قائم کر سکتی ہے۔

جگہ کا انتخاب

بڑی صنعتوں کے قیام کے وقت جگہ کے انتخاب پر سب سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آئندہ صرف ایسی جگہوں پر صنعتیں قائم کی جائیں، جہاں متعلقہ ضروریات کو کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ مہیا کیا جا سکے۔ اس لئے جگہ کے انتخاب میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے

(۱) حفاظت (۲) خام اشیا اور طاقت کے وسائل (۳) مزدوروں کے انتظام کی سہولتیں (۴) مراسلت اور نقل و حمل کی آسانیاں (۵) منڈی کا فاصلہ (۶) دوسری صنعتوں کی موجودگی (باقی آئندہ)

نئی روشنی

اداراۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

کیا پنڈت نہرو کی کوشش اکارت گئی؟

پنڈت جی نے امریکہ اور روس سے صلح کی جو اپیل کی تھی اس کا مارشل اسٹالین نے خیر مقدم کیا مگر امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچیسن نے یہ جواب دیا کہ پہلے شمالی کوریا والے اپنی فوجیں جنوبی کوریا سے ہٹالیں اس کے بعد صلح کی بات چیت ہو سکتی ہے پنڈت جی نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ سیکورٹی کونسل میں چین کی کمیونسٹ حکومت کے نمائندے کو جگہ دی جائے تاکہ روس کا نمائندہ کونسل میں شریک ہو سکے۔ اور وہاں کوریا کے مسئلے پر غور کرکے اُسے پر امن طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ایچیسن صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ مسئلہ الگ ہے اسے کوریا کے جھگڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ایک قانونی جواب ہے ورنہ ہر شخص جس نے بین الاقوامی حالات کا مطالعہ کیا ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ دونوں معاملوں میں بہت گہرا تعلق ہے امریکہ کی اس عرصے کی دھاندلی نے کہ چین کی کمیونسٹ حکومت کو سیکورٹی کونسل میں نمائندگی دینے کی مخالفت کر رہا ہے چین اور روس کو بہت بدظن کر رکھا ہے جنوبی کوریا کا شمالی کوریا سے الگ ہو کر امریکہ کی حمایت میں ایک خود مختار ریاست بننا ان دونوں کو یوں بھی خطرناک نظر آتا تھا اس لئے کہ اس سے امریکہ کو چین ان کے سر پر اپنے جنگی اڈے بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ امریکہ نے کمیونسٹ چین سے بیر باندھ لیا۔ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوا اور وہ کچھ ایسا بے بنیاد بھی نہ تھا کہ موقع پاکر امریکہ جنوبی کوریا سے کمیونسٹ چین کے خلاف جنگی کارروائی کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ روس کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اس نے شمالی کوریا کو شہہ دے کر جنوبی کوریا پر حملہ کرا دیا تاکہ امریکہ کے قدم وہاں جمنے نہ پائیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ روس کے سوا کوئی اس جھگڑے کو پر امن طریقے سے طے نہیں کرا سکتا۔ اس لئے پنڈت نہرو کا اس بات پر اصرار کرنا کہ چین کی نمائندگی کے بارے میں روس کی جائز شکایت کو دور کر دیا جائے بالکل بجا ہے، اور کوریا کی گتھی کو بغیر طویل اور خوں ریز جنگ کے سلجھانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

بہرحال اس وقت پنڈت نہرو کی صلح کی کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فی الحال امریکہ محض ان شکستوں کی وجہ سے جو اس کی فوجوں کو کوریا میں ہو رہی ہیں صلح کی بات چیت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ لوگ اسے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی عاجزی اور مغلوبی کی نشانی سمجھیں گے۔ آگے چل کر جب لڑائی کا پانسہ اس کے حق میں پلٹے گا تو اس کا غصہ اور ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ پنڈت جی کی تحریک پر سنجیدگی سے غور کرے گا لیکن جنگ کی جو رفتار اب تک رہی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کو کوریا کی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہے اور اس کی یہ تیاریاں روس اور چین کی بدظنی میں اور اضافہ کر رہی ہیں اس لئے لڑائی کے پھیلنے اور تیسری عالمگیر جنگ بن جانے کا اندیشہ بڑھتا جاتا ہے۔ اگر امریکہ کی رائے عامہ واقعی اپنے ملک اور ساری دنیا کو تیسری جنگ عظیم سے بچانا چاہتی ہے تو اسے سطحی وطن پرستی کے جذبے کو چھوڑ کر اپنی حکومت کی پالیسی پر سختی سے نکتہ چینی کرنا اور اسے یہ سمجھانا چاہئے کہ وہ صلح کے اس موقع کو ہاتھ سے کھوتے میں بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔

کشمیر کی گتھی نہیں سلجھی

سر اوون ڈکسن نے جو اقوام متحدہ کی انجمن کی طرف سے کشمیر کے قضیئے کو طے کرانے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں لیاقت علی خاں صاحب کے واپس آتے ہی اُن کی اور پنڈت نہرو کی ملاقات کا انتظام کیا اور یہ گفتگو ۲۰ جولائی سے ۲۴ جولائی تک دہلی میں ہوئی۔ اس کے ختم ہونے کے بعد جو اعلان سرکاری طور پر ہوا تھا اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ گفتگو ناتمام رہی مگر ناکام نہیں ہوئی اور اس خبر نے کہ دونوں وزیر اعظموں کی دوسری ملاقات اگست کے شروع میں کراچی میں ہوگی یہ امید بندھائی تھی کہ اس وقت ضرور سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے گی لیکن لیاقت علی خاں صاحب ان جوابوں سے جو انھوں نے اخبار کے نمائندوں کو کراچی میں دئے ان امیدوں پر کچھ اوس سی پڑ گئی ہے۔ اول تو انھوں نے یہ بتایا کہ دوسری ملاقات کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے جس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ملاقات کا ہونا ابھی مشتبہ ہے۔ پھر یہ کہا کہ کشمیر کے قضیئے کو طے کرنے کے لئے رائے شماری بہت ضروری ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا اور جس پر ہر طرف سے بارہا زور دیا جا چکا ہے۔ اس کو پھر دہرانے سے یہی شبہ ہوتا ہے کہ رائے شماری کی راہ میں جو مشکلیں حائل تھیں ان کو دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اس سے بھی زیادہ کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ جب پوچھنے والے نے پوچھا فرض کیجئے کشمیر کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو ہندوستان اور پاکستان میں دوسرے معاملات کے متعلق گفتگو جاری رہے گی یا نہیں تو لیاقت علی خاں صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ایسی بات کیوں فرض کی جائے بلکہ یہ فرمایا کہ ہم ان معاملات کو پر امن طریقے پر طے کرنے کی کوشش برابر جاری رکھیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ کشمیر کے معاملے میں دونوں فریق اپنے دعوے اس شد و مد سے پیش کرتے رہے ہیں اور دونوں ملکوں کی رائے عامہ کو اس قدر جوش دلایا گیا ہے کہ ایک مدت تک اس قضیئے کا پر امن طریقے پر طے ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اب رہی جنگ تو دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس کے شروع کرنے کی ذمہ داری دونوں میں کوئی اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے فی الحال اس مسئلے کا قابل عمل حل اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ جو صورت حال ہے قائم رہے۔ مگر یہ امید کرنا بے جا ہے کہ اس حل کو قبول کرنے کا دونوں فریق اقرار کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ قصہ دیوانی کے مقدمے کی طرح جیسے کہ ڈھائی سال سے چل رہا ہے چلتا رہے لیکن اس کا اثر ہندو پاکستان کے تعلقات اور ان معاملات پر جو دونوں کو مل کر طے کرنے ہیں نہ پڑے۔ لیاقت علی خاں صاحب کے ان الفاظ سے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں اس کی اُمید پیدا ہوتی ہے کم سے کم یہی امید خدا پوری کردے۔

مزدوروں کی صحت کا بیمہ

کچھ عرصہ ہوا حکومت ہند نے ایک تجویز مرتب کی تھی کہ جتنے مزدور کارخانوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں ان کی صحت کا لازمی بیمہ ہوا کرے تاکہ جب وہ بیمار ہوں تو ان کا معقول علاج ہو سکے جو اس وقت ان کی ناداری کی وجہ سے ناممکن ہے چونکہ اس اسکیم میں خرچ کا بوجھ زیادہ تر کارخانوں کے مالکوں پر پڑتا ہے اس لئے ان کی طرف سے اس کی بڑی مخالفت ہوتی رہی اور اب تک وہ عمل میں نہ آسکی۔ مگر اب قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہے کہ حکومت کسی کی مخالفت کی پروا کئے بغیر اس اسکیم کو نمونے کے طور پر دہلی اور کانپور میں نافذ کرے گی۔

وزیر محنت شری جگ جیون رام نے جو حال ہی میں یورپ کے سفر سے واپس آئے ہیں وہاں کے ملکوں میں خصوصاً انگلستان میں اس قسم کی اسکیموں کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس لئے وہ اپنی ہیلتھ انشورنس اسکیم جو بظاہر طاق نسیاں پر رکھ دی گئی تھی پھر اٹھا رہے ہیں اور اس کو عملی جامہ پہنانے پر مصر ہیں۔ انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اکتوبر سے اسے دہلی میں نافذ کر دیں گے اور کانپور کے بارے میں یو، پی کی حکومت سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ اب تک کارخانوں کے مالک اپنی مخالفت کی بڑی وجہ یہ بتاتے تھے کہ جن شہروں میں یہ اسکیم آزمائش کے طور پر چلائی جائے گی وہاں کے مالکوں کو دوسرے شہر والوں کے مقابلے میں ایک

مدت تک بڑا نقصان رہے گا۔ حکومت نے اس شکایت کو دور کرنے کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ وہ اسکیم کا نفاذ فی الحال دو تین شہروں میں کرے گی لیکن آئندہ کا خیال رکھتے ہوئے بہتر [illegible] [illegible] کردیا جائے گا

دہلی کی تہذیب کہاں گئی؟

[illegible] ہندوستان کی تہذیب کا [illegible] [illegible] [illegible] میں تھیں لیکن [illegible] انھیں نہیں آتا [illegible] جس کی تہذیب [illegible] ہندوستان کے لئے نمونے کا کام دیتی تھی۔ اس تبدیلی کی تازہ [illegible] ہے کہ ۲۳ جولائی کو خاتمہ زمینداری کی بحث کے سلسلے میں یو۔ پی اسمبلی میں کانگریس پارٹی اور مخالف پارٹی کے ممبروں میں اس قدر ریک [illegible] ہوئی اور [illegible] اسمبلی کے سکریٹری پر شتم و اس [illegible] کی [illegible] انھوں نے دونوں فریقوں کو [illegible] ملامت کی اور غیرت دلائی کہ ان کی یہ حرکتیں اسمبلی کے لئے اور خود ان کے لئے بدنامی اور ذلت کا باعث ہیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ اس تنزل کی کیا وجہ ہے تو ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں بتا سکتے کہ فرقہ وارانہ تعصب [illegible] نے ایک [illegible] کے شریفوں کے اخلاق کو مسخ کردیا ہے۔ اس [illegible] میں جو فرقہ وارانہ [illegible] پر ایک مدت تک اوچھے اور چھچھورے ہتھیاروں اور گھناؤنے طریقوں سے لڑی گئی۔ ہماری سماج کے سفلی عناصر ابھرے اور اُبھر کر سماج پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے [illegible] بھلے [illegible] کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

صوبے کے معقول اور شریف لوگوں کو جو زمانے کا رنگ دیکھ کر اپنی آبرو لئے گوشہ گیر ہوگئے ہیں، یہ سمجھنا چاہئے کہ اس فراست سے کام نہیں چلتا۔ ان کا فرض ہے کہ [illegible] عوام کو اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کے خلاف اُبھاریں جس نے فرقہ پرستی کے سینے میں پرورش پائی ہے۔ ورنہ وہ ہماری اخلاقی زندگی کو گھن کی طرح کھا جائے گی۔ یہ معاملہ پارٹی کی سیاست سے بہت اونچا ہے۔ اور قومی اخلاق کی صحت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس میں سب پارٹیوں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔

بہار کا حال اچھا ہے

پچھلے دنوں بہار کے ایک دیہاتی علاقے سے بھوک کی وجہ سے کئی آدمیوں کے مرنے کی خبر آئی تھی، اس سے سارے ملک میں افسوس کے ساتھ ساتھ ایک دہشت کی لہر دوڑ گئی کہ کہیں چھ سات برس پہلے کے بنگال کے قحط کا المیہ بہار میں نہ دہرایا جائے۔ مگر بہار کے فوڈ منسٹر شری کے۔ ایم۔ منشی نے اپنے تازہ بیان میں کہا ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں قحط کا اندیشہ نہیں ہے اور اس بارے میں افواہیں مشہور ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ انھوں نے اطمینان دلایا ہے کہ ریاستوں کی حکومتوں نے گیہوں بہت کافی مقدار میں جمع کرلیا ہے اور مشرقی پنجاب اور وہاں کی ریاستوں سے جتنا گیہوں ملنے کی توقع تھی اس سے کہیں زیادہ یعنی ایک لاکھ ۳۴ ہزار ٹن کے بجائے ۲ لاکھ ۵۴ ہزار ٹن ملے گا البتہ چاول کی کمی ضرور ہے جس کی وجہ سے بنگال، مدراس اور بہار میں دقت پیش آرہی ہے لیکن حکومت ان علاقوں میں گیہوں اور موٹا اناج بھیجنے کا انتظام کررہی ہے تاکہ جب تک کافی چاول مہیا نہ ہو لوگ اسی سے کام چلاتے رہیں۔

(ع۔ ح)

دولتانہ گروپ کی فتح

۲۳ جولائی کو پنجاب مسلم لیگ کونسل کا ہنگامہ خیز اجلاس منعقد ہوا اور جیسا کہ عام طور پر اندازہ تھا، دولتانہ گروپ کو کونسل کی اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی بذات خود کوئی اہم واقعہ نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کیا دولتانہ گروپ کی اس کامیابی سے مغربی پنجاب کی سیاست میں بھی کوئی تبدیلی ہوگی؟ کیا پارٹی بندیاں ختم ہوجائیں گی یا ان کا زور کم ہوجائے گا؟ ان سوالات کا ابھی کوئی قطعی جواب دینا قبل از وقت ہے۔ مگر حالات جس رفتار سے اور جس نہج پر چل رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جب تک کونسل اور اسمبلی کے نئے انتخابات نہیں ہوجاتے۔ اس وقت تک سیاسی فضا قریب قریب ایسی ہی رہے گی۔

دولتانہ گروپ کی کامیابی کے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں اور چودھری خلیق الزماں کی اسے حمایت حاصل ہے۔ لیکن بڑا سبب یہ ہے کہ دو گروپوں ــ ممدوٹ اور دولتانہ ــ میں سے ایک کو عوام آزما کر دیکھ چکے ہیں وہ بالکل نکما اور نااہل ثابت ہوچکا ہے۔ اب دوسرے گروپ کو جو ابھی تک کسی امتحان سے نہیں گذرا ہے آزما کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ کس حد تک ان کے درد کا درماں ثابت ہوتا ہے اس لئے میاں ممتاز دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کی یہ کامیابی، ان کی آئندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ ضرور ہے مگر اس سے صوبے کی سیاست میں کسی بڑی تبدیلی کا امکان فی الحال بہت کم ہے

سیکورٹی کونسل میں روس کی واپسی

اس خبر سے کہ روس نے سیکورٹی کونسل کا بائیکاٹ ختم کردیا ہے، ان لوگوں کو جو روس اور جمہوری ملکوں کے موجودہ اختلاف کو امن عالم کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں، خوشی ضرور ہوئی ہے مگر پہلی اگست کو، روسی نمائندہ جیکب ملک نے سیکورٹی کونسل کا اپنی صدارت میں جو اجلاس طلب کیا ہے جب تک اس کا ایجنڈا نہ معلوم ہوجائے محض بائیکاٹ ختم کردینا خوشی اور اطمینان کا باعث نہیں ہوسکتا اس سی صورت حال میں جہاں پنڈت جواہر لال نہرو کی مصالحت کی کوششوں کی کامیابی کے امکانات بہت کافی بڑھ گئے ہیں وہاں نئی الجھنوں کے پیدا ہونے کے بھی قوی امکانات ہیں۔ روس نے بائیکاٹ ختم کرنے کا یہ فیصلہ امن اور صلح کی خاطر کیا ہے یا یو۔ این۔ او کی مشینری میں تعطل پیدا کرنے کے لئے اس کا صحیح فیصلہ جیکب ملک کا وہ طرز عمل کرے گا جو سیکورٹی کونسل کے صدر کی حیثیت سے وہ اختیار کریں گے۔

لڑائی کی صورت حال

کوریا کی لڑائی شروع ہوئے ایک مہینہ ہوچکا ہے۔ اس ایک مہینے کے حالات پر اگر غور کیا جائے تو جمہوری ملکوں کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ جب لڑائی چھڑی تھی تو لوگوں کا عام طور پر کہنا تھا کہ یہ دراصل چیونٹی اور ہاتھی کا مقابلہ ہے۔ یہ عام خیال تھا کہ اگر روس نے براہ راست کوریا کی مدد نہیں کی تو وہ چند دنوں سے زیادہ امریکہ کے مقابلے میں ٹک نہیں سکے گی تاریخ نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو صورت اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی جنوبی کوریا کے تین چوتھائی حصے پر شمالی کوریا کا قبضہ ہوچکا ہے اور پیش قدمی ابھی جاری ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا واقعی جمہوری ملکوں میں جیسا کہ کمیونسٹ پروپیگنڈا کرتے ہیں کمیونسٹ فوجوں کے مقابلے کی صلاحیت نہیں ہے یا کوئی اور سبب ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ امریکہ نے شمالی کوریا کی طاقت کا بالکل غلط اندازہ کیا تھا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سات ہزار میل کے فاصلے پر ہوائی جہاز کے ذریعے اتنا سامان جنگ اور فوج نہیں بھیجی جاسکتی تھی جو ایک ایسی فوج کی پیش قدمی روک سکے جو پہلے سے اچھی طرح تیار ہے چنانچہ جنرل میک آرتھر کا بیان ہے کہ شروع میں امریکی اور حملہ آور فوجوں میں ایک اور بیس کا تناسب تھا۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جنوب میں ایسے ہوائی اڈے بھی نہیں تھے، جہاں امریکی فوجیں اتر کر اہم مورچوں کو سنبھال لیتیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ امریکہ میں جو فوجیں بھیجی گئیں انھیں لڑائی کا تجربہ نہیں تھا اور شمالی اور جنوبی کوریا کی فوجوں کی وردیاں ایک ہی طرح کی ہیں اس لئے دونوں میں تمیز کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ امریکی فوجوں نے جنوبی کوریا کی فوجوں پر گولیاں چلائی ہیں اور بم برسائے ہیں لیکن اب ان نقائص پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے دوسری طرف سیکورٹی کونسل کی اپیل کے جواب میں امریکہ کے علاوہ دوسرے جمہوری ملک بھی ــ مثلاً برطانیہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور ترکی۔ اپنی زمینی فوجیں بھیج رہے ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ آئندہ چند دنوں میں میدان جنگ کا نقشہ بدل جائے اور جنرل میک آرتھر کا یہ خیال صحیح ثابت ہو کہ "دشمن کو بڑا اچھا موقع ملا تھا، مگر اب اس کے ہاتھ سے نکل گیا"۔ (ع۔ ل)

کشکول

"آئیے آئیے۔ بڑی دیر کی آپ نے۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں"

"ہونہہ! آپ دیر لئے پھرتے ہیں، یہی غنیمت سمجھئے کہ اس گلی سے صحیح سلامت گذر کر آپ تک پہنچ گیا"

"ماشاء اللہ! یہ گلی کیا کوئی ہفت خواں ہے جو اس کے سر کرنے میں آپ کو اس قدر دقت پیش آئی"

"مجھے تو یہ بھاگوان ہفت خواں کی بڑی بہن معلوم ہوئی۔ ہفت خواں میں تو بیچارے رستم جی کو فقط جان ہی کا خطرہ تھا اور یہاں ہر قدم پہ جان کے ساتھ آبرو کی بھی بازی لگانی پڑی"

"آخر کچھ تو بتلایئے آپ کے دشمنوں کی جان اور آبرو کون لے رہا تھا اور کیوں لے رہا تھا"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی رسوائی کی داستان سے آپ کی سمع خراشی کروں مگر آپ نہیں مانتے تو سنئے۔ مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ میں سڑک سے مڑ کر اس تیرہ بخت گلی میں دو ہی چار قدم چلا ہوں گا جو ایک دم سے ایسا معلوم ہوا جیسے خواجہ عمر عیار نے کمین گاہ سے دا دے بے ہوشی کا حقہ کھینچ مارا ہو۔ کچھ نہ پوچھئے کیسا ہوش ربا بھبکا تھا جس نے ناک سے لے کر دماغ تک ہل چل مچا دی۔ میں چکرا کر گرنے والا ہی تھا کہ جنگ کے زمانے کی ایک سنی سنائی بات یاد آ گئی۔ جب زہریلی گیس کا بم پھٹے تو اس سے دور بھاگتے ہوئے جتنی دیر ہو سکے سانس اندر مت لو بلکہ باہر نکالتے رہو۔ چنانچہ میں نے بڑی تیزی سے نتھنوں کی دھونکنی سے سوں سوں دھونکنا شروع کر دیا مگر مشکل یہ تھی کہ زہریلی گیس سے بھاگنے کے بجائے مجھے عین اسی طرف جانا تھا جدھر سے اس کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ خیر قہر درویش بر جان درویش کچھ دور چلنے کے بعد اس قاتل گیس کا خزانہ عامرہ جسے ٹھیکو زبان میں گھورا کہتے ہیں۔ آدھی گلی کو گھیرے ہوئے نظر آیا اور باقی آدھی میں ایک گوٹھ کے اوپر سے ایک بہت مفصل پرنالہ گر رہا تھا۔ خدا جانے کون کبوتر بام حرم اپنے جسم کے میل کو رہ گیر عام کے لئے بے دریغ بہا رہا تھا۔ اس مرحلے پہ پہنچ کر میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا مگر پھر خیال آبروئے ہمت مردانہ نے اکسایا تو ایک زقند میں گھورے کو صاف پھاند گیا مگر پرنالے کے چلتے چلاتے ایسا چھینٹا دیا کہ کپڑے "بوستان چھینٹ قلم کار" بن کر رہ گئے اور جو تے پاؤں سمیت کیچڑ میں جو گھسے اور پرنالے کے اشتراک عمل سے دور تک پھیلی ہوئی تھی، لت پت ہو گئے۔ بس کچھ نہ پوچھئے شرم کے اور کیچڑ کے مارے ایک ایک پاؤں سو سو من کا اور ایک ایک قدم ہزار ہزار قدم کا معلوم ہو رہا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح آگے کھسکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گلی کی چوڑائی میں خوفناک قسم کی بطخیں پرا باندھے کھڑی ہیں مجھے دیکھتے ہی ان دشمن جگتو نے حکومت کی پالیسی اور کانگریس کی آپسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دی اور نہ جانے میرے کھدر کے پاجامے سے چڑ کر یا اس میں بسی ہوئی کیچڑ سے خوش ہو کر سر اٹھائے، چونچیں کھولے میری طرف لپکیں۔ میں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ راہ فرار کا جائزہ لوں تو وہاں گھورے اور پرنالے کے علاوہ کہیں سے ایک لحیم شحیم سانڈ آ نکلا تھا جس کے نوک دار سینگ سورج کی ہلکی ہلکی روشنی میں آلہ دھار دار کی طرح چمک رہے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ حضرت خراماں خراماں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اب میرا یہ حال کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ پائے ماندن کا معاملہ بہر حال زیادہ خطرناک ہے اس لئے جائے رفتن کسی نہ کسی طرح نکالنی ہی چاہئے۔ چنانچہ دانت بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے میں ایک ہلے میں بطخوں کی صف کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ لیکن تو یہ بطخیں بھی غضب کی کینہ پرور ہوتی ہیں۔ انھوں نے فوراً پلٹ کر شمالی کوریا کی فوجوں کی طرح میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اب ذرا اس منظر پر غور کیجئے آزاد یا اقتدار ہندوستانی ریپبلک کا ایک معزز شہری سر پہ پاؤں رکھے بھاگ رہا ہے اور بطخوں کا شیطانی لشکر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس وقت گلی میں لونڈے نہ تھے ورنہ لو لو لول دیتے سو حضرت ہم نے تو آج سے کان پکڑے یہ دلی کی گلیاں آپ کو اور آپ کے دوستوں کو مبارک ہوں ہم تو ان میں قدم رکھنے کے نہیں۔ ع نہ بھائی ہماری یہ طاقت نہیں ہے"

غزل

مسعود اختر جمال

شاعری میری غم عشق کی تفسیر بھی ہے
رامش و رنگ کے لمحات کی تصویر بھی ہے

مژدۂ امن بھی ہے میری نوائے ہستی
وقت کے ہاتھ میں چلتی ہوئی شمشیر بھی ہے

ساز اٹھاتا ہوں مگر یاد رہے اہل نشاط
ساز کی لے میں نہاں سوز کی تاثیر بھی ہے

زندگی خواب سہی، خواب پریشاں ہی سہی
دل یہ کہتا ہی سہی۔ خواب کی تعبیر بھی ہے

سنگ اور خشت جو ہیں تابع تقدیر تو ہوں
قدرت نوع بشر۔ مائل تدبیر بھی ہے

ناشنیدہ ہے جواب تک مرے نغمے میں جمال
کچھ زمانے کی خطا۔ کچھ مری تقصیر بھی ہے

غزل

باقر رضوی

کام لیں گے پھر سے شمع کشتۂ محفل سے ہم
اک نیا آدم بنائیں گے اس آب و گل سے ہم

جی میں آتا ہے الٹ دیں خود نقاب زندگی
اب بہت گھبرا گئے ہیں پردۂ حائل سے ہم

وقت ہے ہو جائیں طوفانوں سے سرگرم ستیز
اس طرح دیکھا کریں گے کب تلک ساحل سے ہم

جا رہا ہے کس طرف یہ کاروان زندگی
دور ہوتے جا رہے ہیں ہر قدم منزل سے ہم

وادیٔ ادراک میں پھولے پھلے نخل حیات
خرمن ہستی بچا لائے ہیں برق دل سے ہم

کھیل لاکھوں کھیلنا ہیں جب بساط دہر پر
کیوں نہ اک بازی لگا کر دیکھ لیں پھر دل سے ہم

ہو گا کل مدیر یزدہ گر ہم سے شعار زندگی
گو گھڑے ہیں آج بابہ زیست پر سائل سے ہم

حال و ماضی کے فسانے گو بہت دل دوز ہیں
پھر بھی امید طرب رکھتے ہیں مستقبل سے ہم

آزادی کی زنجیریں

بارھواں باب

ظفر دریاپور کے ایک بڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ والد پنشن لے کر وطن میں رہتے تھے۔ ظفر اور اس کا دوست ہریال الہ آباد کالج میں پڑھتے تھے۔ الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم ان کے شوہر صفدر علی اور ان کی لڑکی حسینہ بھی رہتے تھے۔ حسینہ اور ظفر کی منگنی ہوچکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا تو وہ اس کے معصوم حسن، ذہانت اور ذکاوت پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کی ملاقات حسینہ کے چچازاد بھائی لطیف سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ظفر اعلیٰ نمبروں سے پاس نہ ہوا تو حسینہ کی نسبت لطیف سے کردیں۔ ظفر کے دل میں رقابت کی خلش پیدا ہوگئی اور اس نے پڑھنے میں جان کھپادی۔ نتیجہ یہ کہ سالانہ امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی۔ تعطیل میں گھر جانے سے پہلے ظفر کو اندازہ ہوا کہ حسینہ کو اس سے کچھ تعلق ضرور ہے۔

ظفر چھٹیوں کے بعد کالج آیا تو ریحانہ سے ملاقات ہوئی جس نے اسی سال فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں میں بڑی بے تکلفی ہوگئی اور آہستہ آہستہ ریحانہ ظفر کے دل و دماغ پر چھاگئی۔ ادھر لطیف رڑکی کے داخلے کے امتحان میں ناکام رہا جس سے صفدر علی صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی اور اب وہ ظفر سے زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ لطیف کا کانٹا نکل جانے سے حسینہ کی زندگی میں بھی بہار آگئی۔ مارچ کے آخر میں ظفر امتحان سے فارغ ہوا اور دریاپور چلا گیا۔

(قسط ۲۹)

دریاپور میں گرمی ابھی تک الہ آباد کے مقابلے میں کم تھی مگر آندھیاں اس سال بہت آرہی تھیں۔ ظفر پر ان دنوں جو وحشت طاری تھی اُسے ہوا کے تند و تیز جھکڑ اور بڑھا دیتے تھے۔ آسمان کی تاریکی، گرد و غبار کے ہجوم اور فضا کے شور و شر میں اسے اپنے قلب کی ظلمت اور کدورت اندرونی طوفان و ہیجان کی شدت اور زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ لطف یہ ہے کہ عین اسی وقت جب ظفر کی نفسی زندگی میں ایک تلاطم برپا تھا، اسے عمر میں پہلی بار بالکل تنہا رہنے کا اتفاق ہوا۔ سارے گھر میں یا وہ تھا یا بوڑھا ملازم رحیم بخش جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ گھر میں مرمت کے لئے مزدور لگے ہوئے تھے اور کمروں کا سامان الٹ پلٹ ہوتا رہتا تھا۔ ایسی حالت میں طبیعت قصے کہانی پڑھنے کے سوا کسی کام پر نہیں جمتی تھی۔ اس مرتبہ ظفر الہ آباد سے اپنی کتابوں کے علاوہ اکرام اللہ سے بہت سی کتابیں پڑھنے کے لئے مانگ کر لایا تھا۔ جن میں زیادہ تر نئے ادیبوں کے ناول، افسانے اور نظموں کے مجموعے تھے۔ ان میں سے تین قسم کی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ان کمیونسٹ اور سوشلسٹ خیال کے نوجوانوں کی تصانیف جو ترقی پسند مصنفوں کی بامقصد تحریک سے تعلق رکھتے ہیں دوسرے ان بازاری افسانہ نگاروں اور شاعروں کی کتابیں جو سطحی رومانی ادب کی سرد بازاری دیکھ کر سطحی حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوگئے ہیں اور جن کے سامنے اپنی کتابیں بیچنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔ تیسرے ان مبتدیوں کی تحریریں جن میں انشا پردازی یا شاعری کا تھوڑا بہت مادہ ہے مگر اتنی ہمت اور استقلال نہیں کہ فن سے حاصل کرنے کے لئے ریاضت کریں۔ اس لئے اپنی بے ربط اور بے معنی نثر اور بے اصول، بے تکی، بھونڈی نظم کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے تحلیل نفسی اور مطالعہ جنسیات کے نام سے فحش نگاری کی داد دیتے ہیں ظفر نے اپنے ستھرے ادبی مذاق اور قوت تنقید کی بدولت بہت جلد فیصلہ کرلیا کہ صرف پہلی قسم کی کتابیں ادبی اور تہذیبی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ ترقی پسند مصنف ابھی عام طور پر کم مشق اور خام کار ہیں۔ لیکن ان میں اور ایک اچھے مقصد کی لگن، زندگی کے گہرے مطالعے مطالعے کا شوق اور فن کے تقاضوں کا شعور پایا جاتا ہے جس سے ان کی موجودہ تصانیف میں اگر لطف نہیں تو وزن ضرور پیدا ہوگیا ہے، اور یہ امید ہوتی ہے کہ آگے چل کر ان میں سے بعض اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر ثابت ہوں گے۔ ظفر کو ان کے انقلابی خیالات سے اکرام اللہ کی صحبت کی بدولت وہ پہلی سی وحشت نہیں رہی تھی۔ بلکہ نواب محمد ابراہیم صاحب کے بالواسطہ سابقے نے اپنے زمینداروں اور عام طور پر دولت مندوں کی طرف سے اس قدر بدظن کردیا تھا کہ سرمایہ داروں کی مخالفت میں وہ ترقی پسندوں کا ہم خیال ہوگیا تھا۔ اسے اُن کی تصانیف میں زندگی کی حرارت، سچائی اور خلوص کی قوت محسوس ہوتی تھی اور اس کی وجہ سے وہ ان کی زبان و بیان کی خامیوں کو نظر انداز کردیتا تھا۔

باقی دونوں قسم کی کتابوں کو حقیقت میں پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ پر ان دنوں جنسی جبلت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ان افسانوں اور نظموں کی عریاں نگاری اُسے بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ ان مہملات کو اول سے آخر تک نہیں پڑھتا تھا بلکہ تیزی سے ورق الٹتا ہوا ان پر ایک سرسری نظر ڈالتا جاتا تھا اور صرف ان حصوں پر رکتا تھا جن میں کچھ جنسی چٹخارا ہو۔ اس طرح کے مطالعے سے ظفر کی طبیعت میں سخت ہیجان اور انتشار پیدا ہوتا تھا یہاں تک کہ اکثر اس کا سر چکرانے لگتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بخار چڑھ آیا ہو۔ پھر بھی وہ شرمندگی افسوس کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کیچڑ کے چٹخارے اُسے ترقی پسندوں کی سنجیدہ رہنمائی کے چلنے سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ جب وہ ان کتابوں کے پڑھنے سے تھک جاتا تھا تو عالم تخیل میں جنسی اختلاط کے گوناگوں مناظر سے لطف اٹھاتا تھا، اور مذہب، اخلاق، رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوکر بے دھڑک حسن و جوانی کی بہاریں لوٹتا تھا۔ ان خیالی صحبتوں میں حسینہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ حسینہ کے حجاب آگیں، پاکیزہ باوقار چہرے کا تصور ظفر کی وحشت دل کو افسردہ کردیتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے خیالات کا رخ حسینہ کی طرف سے شوخ اور طرار ریحانہ یا کسی فرضی لڑکی کی طرف پھیر دیتا تھا۔ ریحانہ کے متعلق اب وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلاتا تھا کہ دراصل اسے مجھ سے محبت ہے مگر وہ مجھے کم ہمت قدامت پرست اور رسم و رواج کا غلام سمجھ کر اس کے ظاہر کرنے میں احتیاط برتتی ہے وہ یہ سوچتا تھا کہ آئندہ میں جرأت رندانہ سے کام لوں گا اور یہ ثابت کردوں گا کہ میں نئے زمانے کا آزاد خیال ترقی پسند نوجوان ہوں، میرے سینے میں پرجوش دل اور رگوں میں گرم گرم خون ہے۔ اس کو یہ احساس نہ تھا کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ ہوس پرستی پر آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا ملمع چڑھا رہا ہے۔

اپریل کا مہینہ ظفر کو اس نفسی بحران کی حالت میں گذرا۔ ہریال روزانہ سہ پہر کو اس سے ملنے آتا تھا اور شام کو آ سے لے کر ٹہلنے کو جایا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ ظفر کھویا کھویا سا رہتا ہے اور اپنے آس پاس کی چیزوں میں معمول سے بھی کم دلچسپی لیتا ہے۔ ہریال کا خیال تھا کہ اُسے حسینہ کی جدائی کا صدمہ ہے اور وہ ہر طرح اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا مگر اُسے ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی اور ظفر پر وہی نیم مدہوشی کا عالم طاری رہا۔

آخر اس طلسم کو میر صاحب کے تار نے توڑا۔ وہ مشہد سے کوئٹہ پہنچ گئے تھے اور تین چار روز میں دریاپور پہنچنے والے تھے۔ مکان کی مرمت ختم ہوچکی تھی۔ ظفر گھر کے سامان کو جو برآمدے میں اندر کے صحن میں اور باہر کے احاطے میں بکھرا پڑا تھا، مزدوروں سے اٹھوا کر کمروں میں رکھوانے اور ہریال کی مدد سے اُسے سجانے میں مصروف ہوگیا۔ اس شغل میں پڑ کر اس کی توجہ اُن خیالات سے ہٹ گئی جنھوں نے اس کے دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہیجان انگیز کتابوں کا مطالعہ جو جنسی لذتوں کی بھوک کو کچھ موہوم سی تسکین دے کر دراصل اور تیز کردیتا تھا، بند ہوگیا۔ اور یہ بھوک غذا کے نہ پہنچنے سے عارضی طور پر مرگئی۔ گھر کے منتشر سامان کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ ظفر میر صاحب کے آنے سے پہلے اپنی بکھری ہوئی روزمرہ کی زندگی کو بھی سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ نماز جو کچھ دن سے چھوٹ گئی تھی اس نے پھر باقاعدہ پڑھنی شروع کردی اور کھانے، سونے اور ورزش کے اوقات کی پھر پابندی کرنے لگا۔

جس دن میر صاحب دریاپور پہنچنے والے تھے ظفر صبح سے اشتیاق اور انتظار کے (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ٹخ ٹخ! ہلا ہلا!

سید تقی حسن نقوی

گاڑی کو اپنی آنکھوں سے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا دیکھ لیا تب جان میں جان آئی۔ معلوم ہوتا تھا گاڑی جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہی ہے۔ میری گھڑی اگرچہ ریل کے گھنٹے سے پانچ منٹ تیز تھی لیکن گاڑی چھوٹنے کا وقت اسٹیشن کے گھنٹے کے مطابق بھی ہو چکا تھا۔ اپنی گاڑی کو موجود پا کر مجھے جتنی خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ دراصل ہمیں شہر میں دیر ہو گئی۔ سامان کافی خریدنا تھا اور ہم دو آدمی ——— میں اور میرا ساتھی۔ اگر الگ الگ ہو کر شاپنگ کرتے تو وقت میں کفایت ہو جاتی مگر یہ ناممکن تھا۔ نہ میں بغیر ساتھی کے مشورے کے کچھ خرید سکتا تھا اور نہ میرا ساتھی بغیر میری صلاح کے۔ کل چھ گھنٹے ہمارے پاس تھے۔ چنانچہ خرید و فروخت سے فارغ ہو کر جب ہم نے اسٹیشن کے لئے تانگہ پکڑا تو گاڑی کے چھوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔

میرا ساتھی فطرتاً قابل پسند واقع ہوا ہے۔ دیر سے سوتا ہے، دیر سے اٹھتا ہے، دیر سے کھاتا ہے اور دیر سے اسٹیشن پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس میں خاص کر ریل کے معاملے میں انتہائی عجلت پسند واقع ہوا ہوں۔ چنانچہ وہ جتنا مطمئن نظر آتا تھا، میں اتنا ہی پریشان اور حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اس کے اطمینان پر کبھی کبھی مجھے غصہ بھی آتا تھا اور اب چونکہ گاڑی موجود تھی اس لئے اس کا اطمینان میرے واسطے مستقل طنز بن گیا تھا۔

مجھے دراصل اندیشہ یہ تھا کہ اگر یہ گاڑی جو چار بجے چھوٹتی ہے اور جسے ہم لوکل ٹرین کے مقابلے میں ڈاک گاڑی کہا کرتے ہیں، نکل گئی تو ہمیں علاوہ اسٹیشن پر دو گھنٹے بیکار پڑے رہنے کے اس منحوس ٹرین سے سفر کرنا پڑے گا، جس سے مجھے نفرت ہے "ٹرمبا" اس علاقے میں اس چھکڑے کو کہتے ہیں جو رفتار کے اعتبار سے بالکل اونٹ گاڑی کے مشابہ ہے۔ اس کا انجن جو قد و قامت میں کینیڈا کے نئے انجنوں کی اولاد معلوم ہوتا ہے، معمولی نزلہ اور زکام کی شکایت پر کہیں بھی کھڑا ہو سکتا ہے اور گاڑی کو تین گھنٹے لیٹ کر سکتا ہے اور جس کی سیٹی پر گدھے کے رینکنے کی آواز کا شبہ ہوا کرتا ہے۔ اسٹیشن تو اسٹیشن، ہر ہالٹ پر رکتا ہوا جاتا ہے اور آدھ گھنٹے کا مختصر سفر اس بری طرح ڈیڑھ گھنٹے میں پورا کرتا ہے کہ آیندہ سفر کرنے سے کان پکڑنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ چلتے اور رکتے وقت کتنوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، کتنے بچے ماؤں کی گود سے گر پڑتے ہیں اور جتنی دیر سفر کیجئے چرخ چوں کی سریلی آوازیں مسلسل کانوں میں اتنا رس گھولتی ہیں کہ سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ سفر گویا وبال جان بن جاتا ہے۔

اس صورت میں ہم اپنی گاڑی کو کھڑا ہوا پا کر اطمینان کا سانس کیوں کر نہ لیتے؟ لپاک جھپاک ٹکٹ خریدے جلدی میں پل کے بجائے لائن پار کر کے بھاگم بھاگ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر پہنچے جس پر گاڑی کھڑی تھی اور تیزی سے ایسا ڈبہ تلاش کرنے لگے جس میں دو عدد مسافروں کی جگہ نکل آئے۔

یہ گاڑی عام طور پر خالی جانے کی عادی ہے۔ لیکن آج چونکہ ہمیں سفر کرنا تھا اور اسٹیشن بھی دیر سے پہنچنا تھا اس لئے آج یہ عمداً کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تھرڈ ——— تھرڈ ——— تھرڈ ——— مسلسل تھرڈ کے ڈبوں نے ناک میں دم کر دیا۔ سکنڈ ——— یعنی معمولی سکنڈ۔ ایک بھی نہ دکھائی دیا۔ میں غصے سے سلگ اٹھا اور دل ہی دل میں ریلوے والوں کو کوسنے لگا۔ آخر یہ تیسرے درجے کے اتنے ڈبوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سکنڈ کے ڈبے اتنے پیچھے کیوں لگائے جاتے ہیں کہ ان تک پہنچنے میں اتنی دیر لگتی ہے؟

بڑی مشکل سے سکنڈ نظر آیا مگر اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دوسرے کا بھی یہی حال تھا۔ تیسرا کچھ خالی خالی تھا، مگر وہ زنانہ نکلا۔ یہ آخر زنانہ ڈبے کے علیحدہ ہونے کی کب تک ضرورت پیش آتی رہے گی۔ کم از کم آزادی کے بعد تو اس قسم کی قدامت پرستی کو ختم ہو جانا چاہئے۔ اب تو تمام ان اداروں کو جن سے قدامت کی ذرا بھی بو آتی ہو بے سوچے سمجھے ختم کر دینے کی ضرورت ہے۔ اب ہندوستان کی سوئی ہوئی قسمت جاگ چکی ہے۔ قدم قدم پر انقلاب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ہر آنے والا لمحہ اپنے دامن میں انقلاب کا کوئی نہ کوئی پہلو چھپائے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والے سال میں کیا سے کیا ہونے والا ہے۔ چیزوں کے نام کتنی تیزی کے ساتھ بدلے جا رہے ہیں۔ صوبوں، سڑکوں، پارکوں، پبلک عمارتوں اور قومی اداروں کے نام سب بدلے جا چکے اور اب یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل میرا نام گھسیٹا اور میرے ساتھی کا سیٹھ برلا نہیں ہو سکتا۔ ناموں کی اس لوٹ پھیر کے سلسلے میں جتنی زحمت اس بے چارے "انٹر" کو برداشت کرنی پڑی ہے اتنی اور کسی کو نہیں۔ اچھے خاصے انٹر سے یک لخت ترقی کر کے سکنڈ کے درجے تک پہنچ گیا۔ شامت اعمال سے کچھ دنوں خوب اکڑ کر چلا اور اسی قصور کی پاداش میں شاید اس کا تنزل کر دیا گیا اور معمولی سکنڈ کہلانے لگا۔ اب سنتے ہیں کسی نئے تصور پر پھر "اپنے قرینہ" پر آنے والا ہے۔ نام کی اس معمولی رد و بدل میں یار لوگوں کا مقصد حاصل ہو ہی گیا۔ سرکار کو اسی سلسلے میں تین چار کروڑ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ چک! چک! ہا ہا!!

جگہ کی تلاش میں ہم اور آگے بڑھے۔ معمولی سکنڈ کے بعد فرسٹ اور اصلی سکنڈ کے ڈبے لگے ہوئے تھے اور اس کے بعد گارڈ کا ڈبہ تھا اور آگے بڑھے تو دو تین ڈبے اور جڑے ہوئے ملے۔ جن میں دو تھرڈ کے اور ایک ایک ہر دو سکنڈوں کے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ڈبے کسی ۹ ۳ سنے سے پہلے والی گاڑی کے ڈبے ہیں جو بھولے بھٹکے یہاں آ لگے ہیں۔ کیوں کہ ان میں دو دو چار چار مسافر اس طرح بیٹھے تھے جیسے انہیں کہیں جانا ہی نہیں ہے اور یہی ان کا گھر ہے۔ میں نے اپنے ساتھی کو پہلے اتنی عمدہ جگہ حاصل کرنے پر مبارک باد دی اور پھر اپنی جگہ سوچنے لگا کہ یہ ڈبے چونکہ سب سے پیچھے لگے ہیں۔ اس لئے مسافروں کی نظر سے محفوظ رہے فوراً ہی ہم نے دیکھا کہ چند مسافر ہماری دیکھا دیکھی ان پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ہمیں ان پر سبقت لینی دشوار ہو گئی۔ اس لئے اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مبادا ذرا سی دیر میں یہ بھی اتنے ہی بھر جائیں۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے سامان رکھ کر جگہ گھیر دی جائے۔

اطمینان سے سامان لگایا۔ ہیٹ رکھ کر سیٹوں کو رزرو کیا۔ آج کوئی بھی خواہش کرتے تو پوری ہو جاتی ہمیں گاڑی پکڑنے پر خوشی سے زیادہ اس بات پر فخر ہو رہا تھا کہ ہم نے اتنی عمدہ جگہ حاصل کی۔ خوش قسمتی کے اس نادر شاہکار پر میری روح کو تقویت پہنچ رہی تھی۔ لیکن ہمارے سینکڑوں بھائی بہن دوسرے ڈبوں میں اس طرح بیٹھے تھے جیسے کاٹن ہاؤس میں گانٹھیں بھینسیں جہاں عجب نہیں تھا کہ ایک آدھ دم گھٹ کر جاں بحق تسلیم ہو جائے۔ اس تصور سے مجھے اپنی کامیابی ہیچ معلوم ہونے لگی، اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان میں سے کم از کم دو چار کو ادھر ضرور کھینچ بلاؤں اور اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں ایسا کرنے سے باز نہ آتا۔ آج ہماری طرح کوئی دیر سے آنے والا جان پہچان جگہ کا متلاشی بھی ہاتھ نہ لگا جسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دیتا اور اتنی اچھی جگہ حاصل کرنے پر اپنی غیر متوقع کامیابی کی داد حاصل کرتا۔ میں سوچنے لگا اگر یہ دو چار مسافر جو ڈبے پر ہم سے پہلے قبضہ کر چکے تھے موجود نہ ہوتے تو ہمارا سفر کتنا پھیکا اور اداس ہو جاتا۔

ریل گاڑی بیچاری کی بھی مصیبت میں جان ہے۔ کس کس کی فرمائش پوری کرے اور کس کس کا کہا مانے؟ گاڑی بھری ہو تو مشکل، خالی ہو تو مشکل! بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ خالی گاڑی اداس معلوم ہونے لگے!

مجھے رہ رہ کر اس سے بھی وحشت ہو رہی تھی کہ ہمارے ڈبے کے آگے نہ وہ چہل پہل تھی، نہ بھیڑ بھاڑ، نہ قلیوں کی چیخ پکار، نہ خوانچے والوں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی بھری بھری آوازیں، جو چھوٹنے والی گاڑی کے سامنے عام طور پر سننے میں آیا کرتی ہیں۔ میں دل ہی

دل ہی دل میں جلنے لگا۔ میرا ساتھی دن بھر کا بھوکا تھا۔ اس لئے وہ کھانے پینے کی تلاش میں آگے جاکر کسی خوانچہ والے سے سودا چکنے لگا اس میں شاید یہ مصلحت ہوگی کہ اگر کہیں گاڑی چھوٹ جائے تو پچھلے ڈبے کو دوڑ کر آسانی سے پکڑا جاسکے۔ میرا ساتھی چلتی گاڑی میں بیٹھنے کا شوقین ہے۔ برخلاف اس کے مجھے چلتی گاڑی میں سوار ہونے سے نفرت ہے۔ میں چلتی گاڑی میں بیٹھنے پر گاڑی چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

ساتھی کے چلے جانے کے بعد میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے ڈبے کا دروازہ کھولا کیونکہ اب جگہ گھر جانے کا امکان جاتا رہا تھا اور اطمینان سے راستے میں کھڑا ہوگیا۔ جیب سے سگرٹ نکال کر جلایا اور مزے لے لے کر دھواں اڑانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کے دونوں سروں پر انجن جڑے ہیں جن میں سے ایک اسے پچھم کی طرف اور دوسرا پورب کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ہماری گاڑی پچھم کی طرف جانے والی تھی۔ مگر کسی طرح بھی چھوٹنے میں نہ آرہی تھی۔ اگر ہمارے اسٹیشن پہنچنے سے پہلے کہیں گاڑی چھوٹ گئی ہوتی تو اسٹیشن کے عملے کی جان مصیبت میں آجاتی۔ نہ جانے کتنی خاموش گالیاں ان بے چاروں کو سننی پڑتیں کہ ناک میں دم آجاتا، اور اب چونکہ ہمیں گاڑی مل چکی تھی اس لئے اب گاڑی چھوڑنے میں اتنی دیر لگانے پر وہ بے چارے گالیاں کھا رہے تھے یہ گاڑیاں آخر لیٹ کیوں ہوتی ہیں؟ خواہ مخواہ وقت خراب کرتی ہیں اور اب تو بعض گاڑیوں نے یہ فیشن اختیار کر رکھا ہے کہ اتنی لیٹ ہوتی ہیں کہ بالکل لیٹ رہتی ہیں بعض بعض اوقات ۱۷ر اپریل کو شام کے پانچ بجے چھوٹنے والی گاڑی چوبیس گھنٹے لیٹ ہونے کے بعد اگلے دن پانچ بج کر دس منٹ پر چھوٹتی ہے میں اسی طرح کے خیالات میں مستغرق تھا کہ یک لخت گارڈ کی کرخت سیٹی نے کان کے پردے پھاڑ دیئے۔ میں نے مڑ کر انجن کی طرف نظر دوڑائی اور میری آنکھیں ساتھی کو ڈھونڈھنے لگیں جو دور کہیں انجن کے آس پاس کسی دوسرے خوانچہ والے سے پھل خرید رہا تھا۔ اب گاڑی بس چھوٹنے والی تھی۔

"آداب عرض!" اچانک مجھے اجنبی کی مانوس آواز نے چونکا دیا۔ "آداب" کے دونوں الفوں کو کچھ اس طرح کھینچ کر ادا کیا گیا تھا کہ خواہ مخواہ متوجہ ہونا پڑا۔

"سعید! تم ——— تم! ———" میں فرط خوشی میں گاڑی سے نیچے اتر پڑا۔ اس نے اس قدر جھٹک کر ہاتھ ملایا کہ میری کلائی میں جھٹکا آگیا۔ چار مہینے کے بعد اس طرح اچانک اس سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

"مٹھائی کھلواؤ۔ تمھارا کام ہوگیا!" اس نے خوش خبری سنائی۔ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس بنچ کی طرف لے جانے لگا جو ڈبے کے سامنے چار پانچ قدم کے فاصلے پر پڑی تھی اور جس پر وہ پہلے سے بیٹھا تھا۔

سچ! میں نے خوشی میں جھوم کر بنچ کی طرف جانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ گارڈ صاحب جیسے سیٹی بجا کر سو گئے اور مجھے سعید سے باتیں کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ میں اس خبر کی تفصیلات جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ لیکن بہر صورت میں اپنی گاڑی چھوڑنے کی قیمت دے کر ڈبے کی مصیبت مول لینے کے لئے تیار نہ تھا میں چاہتا تھا کہ دہیں دروازے پر کھڑے کھڑے بات کرلیں لیکن گارڈ کی اس بے محل خاموشی سے ہم نے فائدہ اٹھا لیا اور میں اور سعید سامنے والی بنچ پر جا بیٹھے۔

سعید لکھنؤ سکریٹریٹ میں میونسپل کلرک ہے اور میری تنخواہ کے اضافے کا معاملہ اسی سے وابستہ تھا جس کے لئے میں پہلے چھ مہینے سے برابر سرگرداں تھا اور جس کی خاطر میں نے اس سے دوستی گانٹھی تھی۔

میں نے کہا "مٹھائی تو پکی ہوگئی۔ مگر یہ تو بتاؤ آخر یہ کیسے ممکن ہوسکا؟" میں نے تفصیلات جاننے کے لئے استفسار کیا۔

"اب یہ سب پوچھ کر کیا کروگے؟" اس نے فاتحانہ متانت کے ساتھ میری بے چینی کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا اور گارڈ نے دوسری سیٹی بجا کر کان کے پردے پھاڑ دئے۔ اس پر میں اور گھبرا گیا۔

"گھبراتے کیوں ہو! ابھی گاڑی نہیں چھوٹنے کی" سعید نے میری بدحواسی کو تاڑ کر بڑے اطمینان سے کہا۔ وہ خود شاید اس لئے مطمئن تھا کہ اس کی گاڑی تقریباً ایک گھنٹے بعد چھوٹنے والی تھی۔

"آخر ہوا کیا؟" میں نے پھر یاد دلایا۔ اور میں نے جیب سے سگرٹ نکال کر اول اسے پیش کیا ایک اپنے منہ میں لگایا۔ پھر دیا سلائی گھس کر پہلے اس کا سلگایا، پھر اپنا۔ سگرٹ کی رشوت پاکر وہ میرے سوال کا جواب دینے پر مجبور سا ہوگیا

"بس ہوا کیا!" اس نے دھواں اڑاتے ہوئے لاپروائی سے کہنا شروع کیا۔ "میں نے تمھارے موافق نوٹ لکھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کی تصدیق کردی، اور سکریٹری نے اس کی منظوری دے دی اور بس۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ضابطے میں اطلاع نہ آجائے، اس خبر کو راز میں رکھنا"

میں نے کہا "یہ مانا۔ مگر بھیا یہ جو تم نے چھ مہینے مجھے دق کیا۔ اس کا ہرجہ کون برداشت کرے گا؟ اگر پہلے سے یہ نوٹ لکھ دیا ہوتا تو معاملہ اتنا طول کیوں کھنچتا۔ یہ خیال کرکے کہ باقاعدہ منظوری آنے پر مجھے پچاس روپیہ ماہوار کے حساب سے چودہ مہینے کے اکٹھے سات سو روپے یک مشت ملیں گے۔ میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ جی چاہا سعید کو پیٹ بھر کے مٹھائی کھلا دوں، مگر گاڑی چھوٹ رہی تھی اس لئے میں نے تجویز پیش کی۔

"اس عجلت میں بھلا کیا مٹھائی کھلائی جائے۔ چلو میرے ساتھ گھر، صبح ہی لوٹ آنا"

"میری گاڑی پانچ پچپن پر چھوٹتی ہے اور مجھے اپنی بہن کو دیکھنے جانا ہے جو سخت بیمار ہے" اس نے سگرٹ کے چھلے بناتے ہوئے کہا۔

"تمھیں کہاں جانا ہے؟" میں نے بے ساختہ سوال کیا۔ کیونکہ آج تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

"منگیتہ" اس نے سگرٹ پھینک کر کہا۔

"اور تمھاری بہن کیا بیمار رہتی ہے؟" میں نے یوں ہی اظہار ہمدردی کی غرض سے پوچھ لیا

"یہ ایک لمبی داستان ہے" جس سے میں سمجھ گیا کہ مریض عشق ہوں گی اور میں نے اس کی بہن کی بیماری اس کی لکھنؤ سے آمد کے اسباب اور حالات کچھ اس طرح سننا شروع کیا جیسے میں واقعی اس کی داستان سے دلچسپی لے رہا تھا۔ میں کبھی تعجب سے آنکھیں پھاڑتا، کبھی منہ بناتا جیسے اس کی باتوں سے میں متاثر ہوکر میں در اصل بہت رنجیدہ اور فکر مند ہو رہا ہوں۔ میرا دل حقیقت میں ریل اور کان سیٹیوں کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ گارڈ صاحب ہی اب تک سیٹیاں بجا بجا کر اپنے مشغلہ میں مشغول رہے تھے اور خود انجن نے کوئی صدائے لبیک بلند نہ کی تھی۔ میرا ساتھی ابھی تک پھلوں میں مصروف تھا اس کا پیٹ اب یقیناً بھر چکا ہوگا اور اسے رات کو کھانے پینے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ باتیں بھی سب ختم ہوچکی تھیں اور اب سعید سے کسی نئے موضوع کو چھیڑنے کی نہ فرصت ہی تھی اور نہ ضرورت کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دے دی اور میں نے خدا حافظ کہہ کر جلدی میں ہاتھ ملایا اور ڈبے میں چڑھ گیا۔

چھک چھک!! گاڑی چل دی۔

تخ تخ ہلا ہلا!! میں نے اپنے ڈبے میں کوئی جنبش نہ پاکر مایوسی کے ساتھ طنز کیا۔ نیچے اترا تو ڈبے کے اوپر لگی ہوئی تختی پر نگاہ جا پڑی جس پر لکھا تھا "سہارن پور"

یوم چکبست

نئی نظم اور نثر میں جو ممتاز جگہ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی ہے اسے کون نہیں جانتا۔ اردو فارسی میں آپ کی تعلیم و تحصیل اور مطالعہ بہت وسیع اور آپ کی علمیت اور تحقیق مستند تھی چکبست ایک بہت بڑے فطری اور قومی شاعر تھے۔ انھوں نے نثر میں تنقید و تبصرہ کی وہ راہ نکالی جو آگے چل کر سب کے لئے شاہراہ بنی، نظم میں لکھنؤ کو شاعری کے نئے طرزوں اور اسلوبوں سے روشناس کرانے میں چکبست کا عظیم الشان حصہ ہے۔ انسانیت، حب الوطنی، اخلاقیات، اصلاح، فطری جذبات و مناظر کے مضامین، سیاسی تبصرہ حریت اور اتحاد کے نغمے، مغربی راہ کی بے راہ روی سے بچنا اور غلامی کے خلاف آواز اٹھانے میں بڑی بے باکی اور قومی حمیت سے کام لیا ہے۔ اس لئے ان کی یاد میں، ۸ر اگست کو "انجمن تعمیر اردو" کے اہتمام میں یوم چکبست منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

کانفرنس کے افتتاح اور مختلف اجلاس کی مختلف نشستوں کی صدارت کے لیے پنڈت نہرو، شیخ عبد اللہ سردار نجیب اللہ خاں۔ آچاریہ نریندر دیو اور مرزا محمود علی وغیرہ حضرات کو مدعو کیا گیا ہے۔ دعوتیں جاچکی ہیں جوابات کا انتظار ہے۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

دہلوی

تبصرہ

سنہ ۱۹۴۹ء کا بہترین ادب

اطہر پرویز

ترتیب دینے والے :- غلام ربانی تاباں - گوپال متل - کمال احمد صدیقی - پرکاش پنڈت

ضخامت ۳۰۰ صفحات - سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت چار روپے (للعہ ر)

ناشر :- مکتبہ شاہراہ ، اردو بازار ، دہلی

ادب کی فضا اتنی تیز ہے کہ فی زمانہ جو کچھ بھی ادب آج کل ہر ہفتہ وار پندرہ روزہ اور ماہنامہ میں شائع ہوتا ہے اس میں اچھے ادب کی بھی بہتات ہوتی ہے اس لئے اس کا کسی ایک کتاب میں احاطہ کرلینا نہ صرف مشکل ہو بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی ہے - چند سال سے ہمارے ناشروں نے سال کے بہترین ادب کے انتخاب کا سلسلہ شروع کردیا ہے اور یہ سلسلہ مقبول عام بھی ہورہا ہے۔ "۱۹۴۹ء کا بہترین ادب" مکتبہ شاہراہ کی اولین پیش کش ہے اس لئے اور بھی اہم ہے ، کیونکہ ادارہ شاہراہ ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کے علم برداروں میں سے ہے - جس کے ترتیب دینے والے ملک کے چار فن کار ہیں ان فن کاروں کے نام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ ہر طرح نمائندہ ہوگا اور ہمیں خوشی ہے کہ مرتبین نے ہمیں ناامید نہیں کیا -

اس مجموعے میں اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی ہے جن میں احتشام حسین ، رام بلاس شرما ممتاز حسین ، احمد ندیم قاسمی ، اختر الایمان جاں نثار اختر جوش ملیح آبادی ، عزیز حامد مدنی ، ساحر لدھیانوی ، سردار جعفری ، فراق گورکھپوری ، مجروح ، کیفی اعظمی ، فیض احمد فیض ، فکر تونسوی ، جذبی ، راشد ، ابراہیم جلیس کرشن چندر ، عصمت چغتائی ، کنھیا لال ، مہندر ناتھ ، ہنس راج رہبر قابل ذکر ہیں - اور اس طرح تقریباً ادب کے ساتھ ہی اردو کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کی بھی ایک بڑی حد تک نمائندگی ہوگئی ہے -

یوں تو ہر سال بہترین ادب کا انتخاب مختلف اداروں سے ہوتا ہے لیکن غالباً دوسرے اداروں نے اس امر پر توجہ نہیں دی کہ انتخاب کو ہر معنوں میں نمائندگی بخشیں چنانچہ وہ تمام توقعات جو عام لوگ اس قبیل کے انتخابات سے رکھتے ہیں وہ پوری نہیں ہوتیں - لیکن یہ انتخاب ہر طبقۂ فکر کی نمائندگی کررہا ہے - اس میں سردار جعفری بھی ہے اور ن م راشد بھی -

۱۹۴۹ء اردو ادب کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ملک کے قومی مسائل کے لئے ــــــ اس زمانے میں اچھے ادب کی تخلیق بڑی تیزی سے ہوئی اور یہ فطری امر بھی ہے کہ جب زندگی کے مسائل میں اتنا تیکھا پن آجائے تو ادب بھی اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا ، مسائل حاضرہ پر اردو ادب میں بے شمار تخلیقی نظمیں اور افسانے لکھے گئے - ادیبوں کے قلم میں ۱۹۴۹ء سے زیادہ تیزی آگئی اور اس عرصے میں جن ادیبوں نے وقت کے اہم تقاضوں کا ساتھ دیا ان میں ممتاز حسین ، کرشن چندر ، سردار جعفری ، احتشام حسین وغیرہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، کہیں کہیں انہوں نے اپنے قلم سے نشتر کا کام لیا ہے اور تاریخ کی منفی قوتوں کے خلاف بھرپور اور کھلم کھلا وار کیا -

اس کا عکس زیر ذکر کتاب میں بہت واضح نظر آتا ہے اور ہم جب اس کتاب کا جائزہ لیتے ہیں تو ادب کے تقاضے اور وضاحت سے ہمارے سامنے آتے ہیں حالی کے سیاسی شعور کا تجزیہ ایک ایسا تحقیقی مقالہ ہے جو تنقیدی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے ــــــ احتشام حسین نے حالی کے سیاسی شعور کو جن سماجی حالات کی روشنی میں پیش کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے - اس قسم کے تنقیدی مضامین کی ہمارے ادب میں بہت ضرورت ہے -

ممتاز حسین کا مضمون " ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق " بڑا اہم ہے - اس پر ترقی پسند حلقوں میں کافی بحث ہوئی ، لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ ممتاز حسین اردو کا وہ تنہا نقاد ہے جو فلسفہ اور سائنس کے سماجی پس منظر پر کلی طور پر عبور رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے - "تنقید اور خود تنقید" اسی بحث کی ایک کڑی ہے اور اس مضمون نے بہت سے ان مسائل کو واضح طور پر پیش کردیا ہے جس کی تکمیل زیر نظر مضمون میں نہ ہوسکی ــــــ لیکن اس کے باوجود ممتاز حسین نے ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں اور یہ مضمون اردو تنقید میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے -

تنقیدی حصے میں ڈاکٹر علیم ، ڈاکٹر رام بلاس شرما اور محمد حسن کے مضامین بھی ایسے ہیں جو یقیناً ۱۹۴۹ء کے ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں - ہمیں خوشی ہے کہ مرتبین نے اردو ، ہندی اور ہندوستانی کے مسئلے پر ڈاکٹر شرما کے معرکۃ الآرا مضمون کو شامل کرکے ایک بڑے اہم موضوع کو پیش کردیا ہے یہ مضمون مارکسی نقطۂ نظر سے زبان کے مسئلے پر بے حد اہم ہے اور اردو ہندی اور ہندوستانی کے قضیے پر فیصلہ کن روشنی ڈالتا ہے - رام بلاس شرما کو لسانیات کے مسئلے پر بڑا عبور حاصل ہے اور زیر نظر مضمون میں انھوں نے بڑے محققانہ انداز میں زبان کے قضیے کو پیش کیا ہے ڈاکٹر شرما نے پچھلے سال بے شمار مضامین اس ضمن میں لکھے - مگر یہ مضمون اپنی نوعیت اور مواد کے اعتبار سے منفرد ہے -

کہانیوں میں اردو کے اچھے افسانہ نگاروں نے اس مجموعے کی زینت بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ جہاں نسبتاً پرانے افسانہ نگاروں کی کہانیاں زیر نظر مجموعے میں نظر آتی ہیں - اس کے پہلو بہ پہلو چند جدید فن کار بھی موجود ہیں ـــ کہانیوں کا انتخاب بھی تنقید کے حصے کی طرح بھرپور ہے اور اس میں زیادہ تر کہانیاں بے حد شاندار ہیں -

کرشن چندر ، عصمت ، مہندر ناتھ ، ہنس راج رہبر ، اور پرکاش پنڈت کے افسانے ترقی پسند ادب میں بیش بہا اضافے ہیں ــــــ

"مہالکشمی کے پل" میں کرشن چندر نے ہمارے ملک کے افلاس کے باوجود ابھرتی اور جدوجہد کرتی ہوئی زندگی کی جو عکاسی کی ہے وہ نہ صرف ترقی پسند ادب کے لئے بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے - بلکہ مجموعی طور پر اردو ادب کے لئے اس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے - یوں تو کرشن چندر نے ۱۹۴۹ء میں چند بے مثل کہانیاں اور بھی لکھی ہیں لیکن مہالکشمی کا پل اس پورے سال کی ترجمانی کررہا ہے -

کرشن چندر نے زندگی کے تقابل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ، کہ دونوں طبقوں کی خصوصیات خود بخود اجاگر ہوتی جاتی ہیں - اور بالآخر کہانی جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے تو کرشن چندر کہتا ہے ــــــ

"دیکھئے میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں ، میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کررہا ہوں میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف ــــــ"

اور کہانی ختم ہوجاتی ہے -

کرشن چندر اردو افسانہ نگاروں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے افسانہ نگاروں کے درمیان بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے - اس نے اپنے افسانوں کے تار پود ہندوستان کی سیاسی زندگی سے بنائے ہیں اور ہندوستان کی تحریک آزادی ہو یا بنگال کی بھوک ، نیوی کی بغاوت ہو یا نام نہاد آزادی - ہندو مسلم فساد ہو یا محکوم اور نیم محکوم ایشیائی ملکوں کی عوامی تحریکات ــــــ کرشن چندر کے قلم نے ہر موقع پر نشتر کا کام کیا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ اردو کے اس دور میں ہمارے درمیان ایک افسانہ نگار موجود ہے جس کے افسانے تاریخ کے اوراق بھی ترتیب دے سکتے ہیں -

کرشن کے علاوہ عصمت ، مہندر ، پرکاش پنڈت

رہبر کے افسانے بھی بہت اچھے ہیں۔

البتہ مجھے شوکت صدیقی کی کہانی کے سلسلے میں کچھ کہنا ہے۔ شوکت صدیقی ہمارے ابھرتے ہوئے فن کاروں میں ایک نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن زیر نظر مجموعہ میں ان کی کہانی "تا تنہا" ایک عجیب الجھن ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ مرتبین نے اس میں ایسی کونسی خوبی دیکھی جس کی کوئی دوسری مثال ۱۹۴۹ء میں نہیں مل سکی۔

غالباً صفحات کی کمی کی وجہ سے بعض اچھے افسانے اور مضامین چھپنے سے رہ گئے ہوں گے اس لئے ... صفحات میں تمام افسانوں کا آجانا ناممکن ہے اس لئے مرتبین کو اور بھی احتیاط کرنی چاہئے تھی کہ ایسی کوئی چیز نہ آجائے جو خواہ مخواہ جگہ گھیرے ——— تا تنہا کا کردار ایک غیر فطری مجہول قسم کا کردار ہے جس کی اگر کوئی انفرادیت ہے تو صرف اتنی کہ اس کے کسی بھی فعل میں کوئی ربط نہیں ہے۔ ہر فعل اضطراری اور نہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں جب وہ اپنے کو ایک مزدور کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور طبقاتی ڈھنگ سے سوچنے لگتا ہے تو بھی اس کی کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہانی کا انداز بیان بڑا خوب صورت ہے اور یہی انداز بیان اس کو پڑھنے کے لائق بنا دیتا ہے۔

اس کتاب میں دو طنزیہ مضامین بھی فکر تونسوی اور کنھیا لال کپور کے ہیں ——— میرے پیلے ابا ——— شن، شن شان ——— اور یہ دونوں مضامین طنز کا بہترین نمونہ ہیں ——— اور کتاب کو دلچسپ اور جاندار بنانے میں ان کا بھی بڑا اہم حصہ ہے۔

اب رہ گیا نظموں کا حصہ ———

۱۹۴۹ء کے "بہترین ادب" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ترتیب دینے والوں میں سے تین چوتھائی شاعر ہیں ——— صرف ایک نثر نگار ——— لیکن نثر کا حصہ جتنا بلند ہے اگر یہ کہا جائے کہ نظم کا حصہ اتنا ہی پست ہے تو چنداں بے جا نہ ہوگا اور یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ غلام ربانی تاباں، گوپال متل اور کمال احمد صدیقی کے ہوتے ہوئے نظموں کے انتخاب میں بے حد کمزوری ہے۔ کیونکہ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ اس سال اچھی نظمیں نہیں لکھی گئیں ——— بلکہ بعض موضوعات پر تو اردو نظم کے بہت آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

مثلاً چین پر بیشتر ترقی پسند شعرا نے نظمیں لکھی ہیں جو بے حد کامیاب تھیں، لیکن زیر نظر مجموعہ میں ہمیں صرف ساحر کی نظم نظر آتی ہے۔ ورنہ ویسے سردار جعفری، کیفی اعظمی، حبیب تنویر، عبدالمتین عارف، عابد عشری وغیرہ کی نظمیں بے حد بلند ہیں اور اگر کہیں اس مجموعے کا ایک حصہ چین کے لئے بھی وقف ہوتا تو بھی بے جا نہ تھا کیونکہ چین کی آزادی نہ صرف ۱۹۴۹ء کا ایک اہم واقعہ ہے بلکہ استالن کے الفاظ میں تو دنیا کی تاریخ میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد ایک دوسرا اہم ترین واقعہ ہوا ہے جو تاریخ کے رخ کو موڑ رہا ہے۔

بس افسوس ہے کہ کیفی اعظمی کی نظم ٹرنک کال شامل کی گئی ہے جبکہ کیفی نے اس سے بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹرنک کال میں ایسا کون سا فنی حسن ہمارے مرتبین کو نظر آیا جو وہ اس کی انقلاب چین کی نظم اس کے مقابلے میں نظر انداز کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ساحر کی نظم "آہنگ انقلاب" کی عدم موجودگی بھی اتنی ہی کھٹکتی ہے جتنی کرن، م، راشد کی رجعت پسند نظم "ایران میں اجنبی" ——— کی موجودگی

تاہم مرتب کرنے والوں کی مجبوریوں کے پیش نظر ایسی فروگذاشتوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے ——— چونکہ مجموعی طور پر اس میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اس قسم کے مجموعوں میں ہونی چاہئیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو دان طبقے میں بے حد پسند کیا جائے گا جو لوگ اردو ادب کی رفتار کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں تو وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا ادب ترقی کی کن منازل میں ہے اور اس میں فارم اور مواد کے لحاظ سے کیا نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

"۱۹۴۹ء کا بہترین ادب" مضامین نظم و نثر کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی لائبریری میں بطور ایک "ریفرنس بک" کے بھی کام آسکتی ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کے شائقین اس ادب کے مجموعے کا ضرور مطالعہ کریں گے

کتاب انتہائی دیدہ زیب ہے اور ضخامت کو دیکھتے ہوئے قیمت بھی زیادہ نہیں۔

آزادی کی زنجیریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

مارے سخت بے چین تھا۔ ہردیال سے وعدہ تھا کہ وہ گیارہ بجے ظفر کے گھر پہنچ جائے گا۔ اور دونوں ساتھ اسٹیشن جائیں گے۔ ظفر نے بہت پہلے سے اپنے مکان کے سامنے ٹہل ٹہل کر ہردیال کی راہ دیکھنی شروع کر دی اور جب وہ ٹھیک گیارہ بجے نہیں پہنچا تو ظفر گھبرا کر پیدل اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دور پہنچا تھا کہ پانچ تانگوں کے ایک قافلے نے اسے آلیا۔ ایک میں ماسٹر صاحب اور ہردیال تھے اور باقی چار میں تحصیلدار تھانہ دار اور قصبے کے چند اور معززین جن کے میر صاحب سے تعلقات تھے۔ ماسٹر صاحب نے تانگہ روک کر ظفر کو بٹھا لیا اور ہردیال نے معذرت کی کہ بازار میں بھیڑ ہونے کی وجہ سے تانگے کے گذرنے میں دقت ہوئی۔ اس لئے چند منٹ کی دیر ہو گئی۔ اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ کچھ اور لوگ پہلے سے موجود ہیں خصوصاً قصبے کی انجمن اسلامیہ کے اراکین اچھی خاصی تعداد میں جمع ہیں۔

ظفر، ماسٹر صاحب اور قصبے کے دوسرے سربرآوردہ اصحاب کے ساتھ آگے کی صف میں کھڑا تھا مگر جب گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اسی دھکم دھکا شروع ہوا کہ وہ پیچھے ہٹ کر ہجوم کے بیچ میں پھنس کر رہ گیا۔ اسے مجمع کے اندر سے میر صاحب کی ایک جھلک نظر آئی کہ وہ گاڑی سے اتر کر ماسٹر صاحب سے بغل گیر ہوئے اور انجمن اسلامیہ کے سکریٹری نے اللہ اکبر کے نعروں کے درمیان ان کے گلے میں ہار ڈالا۔ اس کے بعد دو منٹ تک وہ انھیں دیکھنے کی اور ان کے پاس پہنچنے کی ناکام کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میر صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ باپ بیٹے اس طرح گلے ملے کہ دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

جب ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہوا تو ماسٹر صاحب میر صاحب اور ظفر کو اپنے ساتھ تانگے میں لے کر روانہ ہو گئے اور ہردیال کو نوکر کے ساتھ اسباب لانے کے لئے چھوڑ گئے۔ راستے میں ظفر نے میر صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ان کی گفتگو سنی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بہت بیمار اور کمزور ہیں۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور آنکھوں کے حلقے پہلے سے کہیں زیادہ گہرے تھے ان کی آواز اس قدر خفیف ہو گئی تھی کہ مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ بھائی مظفر یہ تم نے اپنا کیا حال کر لیا ہے تو انھوں نے بتایا کہ ان کا بچپن کا پرانا مرض پھر عود کر آیا ہے، اور کوئی ایک مہینے سے کھانا پینا قریب قریب چھوٹا ہوا ہے۔ ظفر جو ان کے پہلے خطوں کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اس سفر سے ان کی صحت کو بہت فائدہ پہنچا ہے، یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا اسے یاد تھا کہ دس سال پہلے میر صاحب خونی پیچش کے حملے سے مرتے مرتے بچے تھے۔

(باقی آیندہ)

قطعات

تیرے وعدوں پہ جی رہا ہوں میں
چاک دامن کو سی رہا ہوں میں
رستا ناسور زندگی ہے مری
پھر بھی ہمت سے جی رہا ہوں میں

تیرہ و تار زندگی اپنی!!
آج بھی ہے بری نگاہوں میں
جب بھی تیرا خیال آتا ہے
گیت ڈھلتے ہیں سرد آہوں میں

مسکراتے ہوئے حسیں تارے
آج مغموم کیوں نظر آئے
کس لئے یاد آگیا ماضی
میری آنکھوں میں اشک بھر آئے

(انور سدید)

بنکاک

حسین شہر، زرخیز زمین، بھوکے لوگ

آر لان

بنکاک سیام کا صدر مقام ہے۔ یہ شہر بہت خوب صورت اور عالی شان ہے۔ بڑی بڑی سڑکیں اونچی اونچی عمارتیں اور چاروں طرف سبزہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور بنکاک ہی پر کیا منحصر ہے، پورا ملک بہت خوب صورت ہے۔ عام طور پر سیاحوں کا خیال ہے کہ یہ ملک استوائی علاقے کی جنت ہے۔ جہاں چاروں طرف سبزہ ہے، عالی شان عمارتیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ملک خوب صورت ہے، بلکہ اس کے باشندے اور خاص طور پر شہری بہت مہذب ہیں۔ یہاں کی تہذیب قدیم اور جدید تہذیبوں کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔

ہم یہاں ایک امریکی جہاز میں آئے تھے ہمارے ساتھ ایک ہندوستانی تاجر بھی تھا۔ اس جہاز نے کلکتہ سے بنکاک کا راستہ راتوں رات طے کیا۔ اور تقریباً سارا جہاز خالی تھا۔ بس ہم تین یا چار آدمی سفر کر رہے تھے اس ہندوستانی تاجر نے ہمیں یہ بتایا کہ یہ جہاز اکثر خالی جاتے ہیں اور دن رات کرہی سفر کرتے ہیں اور یہ کمپنی نقصان سے کام کر رہی ہے۔ اس نے بتایا اس کمپنی کو امریکی حکومت سے مدد ملتی ہے۔ اسی تاجر نے ہمیں بتایا کہ بنکاک میں امریکی سیاحوں کو بغیر پاسپورٹ کے آنے کی اجازت ہے اور بنکاک کی تجارت پر بھی امریکی چھائے ہوئے ہیں اور تمام دکانوں پر امریکی مال بک رہا ہے۔

ہم جب بنکاک پہنچے تو شہر کے عالی شان ہونے کا اندازہ تو ہو گیا مگر یہ بھی صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ ساری امارت اور دولت صرف چند لوگوں تک محدود ہے۔

ہوائی اڈے سے شہر تک جو سڑک جا رہی تھی اس کے دونوں طرف چاولوں کے سبز پودوں کا سمندر تھا دور تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا تھا۔ سیام کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ فصل اچھی ہوتی ہے۔ لوگ سال بھر اسی کام میں جُتے رہتے ہیں۔ زمین اس قدر زرخیز ہے کہ اگر ریلوے لائن کے دونوں طرف دور دور تک خاص طور پر گھاس نہ کاٹی جائے تو تھوڑے دنوں میں ریل کی پٹری گھاس میں چھپ جائے۔

بنکاک ایک مسطح پہاڑی پر واقع ہے اور اس کے چاروں طرف سبزے کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا بے کنار اور لاانتہا سمندر ہے۔ ایک نظر میں سڑکوں اور راستوں کو گھاس کے میدانوں سے تمیز کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس سبزے کے سمندر کے درمیان چھوٹے چھوٹے مندر چھوٹے چھوٹے جزیرے معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کے درمیان بڑے بڑے ہوٹل، ریسٹورانٹ اور دوکانیں ہیں۔ مگر ریسٹورانٹ میں جانے والوں، ہوٹل میں ٹھہرنے والوں اور دکانوں سے سامان خریدنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایک دوکان کے منیجر نے مجھے بتایا کہ یہاں کے لوگ اتنے غریب ہیں کہ ہماری دوکان عجائب گھر بن کر رہ گئی ہے۔ لوگ آتے ہیں اور سامان دیکھ کر لوٹ جاتے ہیں۔

چاول کو تو بجا طور پر سیام کا سونا کہا جا سکتا ہے۔ ہم چاول کی کئی ملوں میں گئے۔ اور وہاں کی حالت اور کام کا مطالعہ کیا۔ یہ تنگ و تاریک ہیں۔ اور مزدوروں کے چہرے مدقوق۔ مزدوروں کی بڑی تعداد عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔ اجرت تو یہاں ویسے ہی بہت کم ہے اور پھر عورتوں اور بچوں کو تو اور بھی کم ملتی ہے۔ مزدوروں کی بہبود کے وہ قوانین جو دوسرے ملکوں میں عام طور پر رائج ہیں، یہاں مفقود ہیں۔ پھر مل مالکوں کو مزدوروں کی بیماری کی کیوں فکر ہو۔ ان کے دروازوں پر تو ہر وقت بے روزگاروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

سیام میں چینی مزدوروں کی بہت بڑی تعداد ہے سرمایہ دار چینی اور سیامی مزدوروں کے درمیان اختلاف پیدا کر کے انھیں خوب لوٹتے ہیں۔ چینی مزدوروں سے سخت کام لیا جاتا ہے۔ رکشا چلانے والوں میں بھی تخصیص کر دی گئی ہے۔ چینیوں کو صرف رکشا میں سامان لادنے کی اجازت ہے وہ سواریاں نہیں بٹھا سکتے۔ بنکاک کی آبادی کا دسواں حصہ کشتیوں میں رہتا ہے۔

جب ہم بڑی بڑی دکانوں پر گئے اور وہاں مالکوں سے ملاقات ہوئی کی شکایت سنی تو ہمیں ہندوستانی تاجر کی باتیں یاد آئیں۔ واقعی تمام دکانوں پر امریکی تاجروں کے بورڈ نظر آ رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے یہاں ایک بھی امریکی دکان نہ تھی۔ سیام کی اقتصادی حالت بھی ڈالر کی رہین منت ہے۔ اگر کوئی بڑی کمپنی امریکی سرمایہ لینے سے انکار کرتی ہے تو امریکی تاجر اس کا دیوالہ نکال دیتے ہیں پچھلے دنوں ایک کمپنی کے ڈائرکٹروں نے فیصلہ کیا کہ وہ دھات نکالنے کا کام خود کریں گے اور کسی امریکی کو اس کا ٹھیکہ نہ دیں گے۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس کمپنی کا دیوالہ نکل گیا اور اب وہی کمپنی اسی نام سے کام کر رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ امریکہ کا ہے۔ اور اس کا منافع سیام میں رہنے کی بجائے امریکہ چلا جاتا ہے ملکی مصنوعات کو ترقی دینے کی بجائے امریکی اور برطانوی تاجر منافع کمانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ سیام میں جو کچا مال نکلتا ہے وہ امریکی یا برطانوی نوآبادیات بھیج دیا جاتا ہے۔

سونگرام کی حکومت امریکی سرمایہ داروں کی دوست ہے۔ چنانچہ انھیں زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ مگر برطانوی سرمایہ دار بھی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور امریکہ کے مقابلے میں قدم جمانے کی فکر میں ہیں اور ان دونوں ملکی سرمایہ داروں کا مقابلہ بعض دفعہ تو بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے بنکاک کو جنوب مشرقی ایشیائی سیاست میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ برطانیہ اس کو آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ اور پھر دوسری جنگ کے بعد برطانیہ نے جنوب مشرقی ایشیا میں کئی اہم مقامات امریکہ کو دے دیئے ہیں یا پھر ان پر اشتراکیوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لئے برطانوی سرمایہ دار اس پر اپنا قبضہ ضروری سمجھتے ہیں۔

بنکاک کے سینماؤں پر ہالی وڈ کا قبضہ ہے۔ ہر امریکی فلم کا پروپیگنڈا ہوتا ہے اور برطانوی فلموں کو بس یونہی دکھا دیا جاتا ہے۔ مگر اتنے پروپیگنڈے کے بعد بھی لوگ سینما بہت کم جاتے ہیں۔ اس کی وجہ لوگوں کا افلاس ہے۔

سیام میں محنت کش طبقہ بہت کم ہے کل تعداد تین لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر مزدور تحریک ترقی کر رہی ہے۔ مزدوروں کی جماعت تو ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی مگر جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد مزدوروں کی تحریک بڑھتی گئی اور اب ٹریڈ یونین کے ممبروں کی تعداد ۷۰ ہزار ہو گئی ہے اور اب آہستہ آہستہ سیام کے عوام میں بیداری بڑھ رہی ہے۔

ترجمہ: حمید ہاشمی

نئی روشنی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

جلد ٥ ۸ اگست سنہ ۵۸ء نمبر ٦

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول)	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲
پچھلا ہفتہ : ہند اور بیرون ہند میں	ع، ح، ع، ل	۳
بزم بے تکلف		۵
اعتراف (نظم)	آنسہ کوثر بلگرامی	۵
تھامس لپٹن	محمد امین	۷
یہ گتھیاں کیسے سلجھیں ؟	صالحہ عابد حسین	۸
تبصرہ	باقر رضوی	۱۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

آزادی کی زنجیریں

ظفر ورنا پور کے ایک بچہ سے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد پنشن لے کر وطن میں رہتے تھے۔ ... الہ آباد میں ظفر کی پھوپھی عقیلہ بیگم، ان کے شوہر صفدر علی ... ان کی لڑکی حسینہ تھی ... اور ظفر کی منگنی ہو چکی تھی۔ یہاں ظفر کو حسینہ سے ملنے کا موقع ملا ... اس کی ملاقات حسینہ سے چھپ چھپ کر ... صفدر علی صاحب کا خیال ہے کہ ظفر علی ... کالج میں ظفر کی ملاقات ... دونوں میں ... محبت کی ... دوسرے سے ... وہ خود الیعسلہ کا امتحان دے کر آیا تھا اور ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

قسط ۳۰

گھر پہنچتے ہی میر صاحب چارپائی پر پڑ گئے۔ ماسٹر صاحب نے چاہا کہ ڈاکٹر کو بلا کر دکھائیں۔ مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر کے بجائے حکیم حبیب احمد صاحب کو بلانے پر اصرار کیا۔ حکیم صاحب جنھیں طبابت سے زیادہ خطابت اور علم مجلس میں کمال حاصل تھا۔ اس بات کے لئے مشہور تھے کہ چاہے مریض کو اچھا نہ کر سکیں مگر اسے خوش ضرور کر دیتے تھے۔ ان کی خوش ذائقہ دوائیں اور مزیدار باتیں مرض کو نہیں تو کم سے کم مرض کے احساس کو دور کر دیتی تھیں۔ جب ظفر انھیں بلانے گیا تو وہ دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولے کے لئے لیٹ گئے تھے مگر میر صاحب کا نام سنتے ہی فوراً چلے آئے۔ انھوں نے مریض کی نبض دیکھ کر کہا کہ آپ کو پرانی پیچش نہیں بلکہ سفر کی صعوبت اور نامناسب غذا کے استعمال کی وجہ سے عارضی طور پر آنتوں میں خراش پیدا ہو گیا ہے جو بہت جلد دور ہو جائے گا اور اپنے ابتدائی زمانے کے کئی دلچسپ قصے سنائے کہ کس طرح انھوں نے پیچش کے علاج میں آگرے کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو شکست دی اور یہ ثابت کر دیا کہ درحقیقت طب مغربی میں اس مرض کا کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اکثر پیچش کا سبب دماغی پیچ و تاب ہوتا ہے جس کا علاج سب سے اچھا موسیقی کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے۔ موصوف کو اپنے خیال میں گانے میں خاص مہارت تھی چنانچہ انھوں نے آواز کی مرورڑ کا جس سے آنتوں کی مروڑ جاتی رہتی ہے عملی مظاہرہ بھی کیا۔ غرض پون گھنٹے کی پرلطف صحبت کے بعد حکیم صاحب مریض کے لئے نسخہ اور غذا تجویز کر کے رخصت ہو گئے۔

آدھے دن اور پوری رات آرام کرنے کے بعد صبح کو میر صاحب کی طبیعت خاصی بحال تھی وہ ماسٹر صاحب اور دوسرے دوستوں کو جو ان کی عیادت کے لئے آئے تھے اپنے سفر کی روداد سناتے رہے اور قصبے کے حالات پوچھتے رہے۔ ان حضرات کے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے ظفر سے اس کی صحت اور پڑھائی کا حال اور حسینہ، عقیلہ بیگم اور صفدر علی کی خیریت پوچھی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حسینہ کو اس کی ماں محض پردے کے خیال سے علی گڑھ کے مسلم گرلز کالج میں داخل کر رہی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ظفر سے عقیلہ بیگم اور صفدر علی کو خط لکھوایا جس میں اپنی واپسی اور علالت کی اطلاع دی اور ان دونوں سے اور حسینہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ظفر نے یہ محسوس کیا کہ عام کمزوری کے ساتھ ان کا دل بھی بہت کمزور ہو گیا ہے۔ پہلے وہ ہمیشہ غصے کے سوا اور سب جذبات کے اظہار میں انتہائی ضبط اور اعتدال سے کام لیا کرتے تھے مگر اب یہ حال تھا کہ ذرا سی بات میں آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ نماز وہ پہلے بھی بہت خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے۔ اب نئی بات یہ تھی کہ دعا مانگتے ہوئے اور سجدۂ شکر کی حالت میں ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔

بظاہر ان کو حکیم صاحب کے علاج سے فائدہ تھا خون آنا بند ہو گیا تھا اور دستوں میں بھی کمی تھی لیکن بھوک نہیں لگتی تھی اور کمزوری برابر بڑھتی جاتی تھی حکیم صاحب روز آکر نبض دیکھتے تھے، اپنے ہاتھ سے دوا پلاتے تھے اور یہ اطمینان دلاتے تھے کہ طبیعت روبہ اصلاح ہے مگر ظفر سخت پریشان تھا اور ماسٹر صاحب اور سرتاپال بھی اس علاج سے مطمئن نہ تھے۔ ایک دن ظفر کی تحریک پر ماسٹر صاحب نے میر صاحب کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ انھیں الہ آباد جا کر ڈاکٹری علاج کرانا چاہئے۔ خود ظفر بھی کئی بار ان سے یہ بات کہہ چکا تھا مگر وہ چپ چاپ سن لیتے تھے کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ جب ماسٹر صاحب نے ان سے یہ گفتگو کی وہ برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے اور ماسٹر صاحب ان کے داہنے ہاتھ مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ ظفر خاص کر کے وہاں سے ٹل گیا تھا۔ میر صاحب اپنی نا تواں نگاہیں ماسٹر صاحب کے چہرے پر جمائے ہوئے غور سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے آنکھیں بند کر لیں جیسے تھک کر آرام کر رہے ہوں لیکن ان کی بھنوؤں کے کھچاؤ اور ماتھے کے بل سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر دم بھر کے لئے عزم و قوت کی تازگی جھلکنے لگی۔ اور انھوں نے دھیمی مگر ہموار اور صاف آواز میں کہا "بھائی صاحب زندگی کے چراغ میں اب تیل بالکل نہیں رہا ہے۔ بتی کو اکسا کر جلانے سے کیا فائدہ؟ آدمی یا تو جینے کے شوق میں جیتا ہے یا کسی مقصد کی لگن اسے زندہ رکھتی ہے۔ جینے کا شوق تو مجھے اس دن سے نہیں رہا جس دن ظفر کی ماں کا انتقال ہوا۔ مگر اس مقصد کے سہارے دن کٹتے رہے کہ ظفر کو تعلیم دلا کر اور نوکر رکھوا کر اس قابل کر دوں کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ مگر پچھلے دو سال میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ ظفر میری مدد کا کچھ زیادہ محتاج نہیں اور اس سفر میں جب حج اور زیارت کی برکت سے میرے دل کی آنکھیں کھلیں اور میں نے احتساب نفس سے کام لیا یوں کہئے کہ پرانے ماحول سے نکل کر نئی فضا کا میں مجھے اپنی زندگی پر بے تعصب نظر ڈالنے کا موقع ملا تو میں نے دیکھا کہ مدتوں دو رکاوٹیں ظفر کی سیرت کی نشوونما میں اور الٹی رکاوٹ ڈالتا رہا ہوں۔ میں نے بچپن سے اس کی تربیت میں بے حد سختی کی اور اسے ذرا بھی آزادی نہیں دی۔ اس زعم میں کہ میں دنیا کے تجربے سے مالا مال ہوں۔ میرے بیٹے کو زندگی میں ٹھوکریں اور دھکے کھا کر تجربہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میرے ذخیرے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مگر معلوم ہوا تجربے کی دولت روپے پیسے کی طرح ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں ہو سکتی۔ میں نے ظفر کو اپنی نوٹ یا زر سے یہ دولت کمانے سے روکا۔ مگر میں اپنی کمائی میں سے اسے تھوڑا ہی حصہ دے سکا اور پھر جو کچھ دیا بھی وہ زیادہ کارآمد نہ تھا۔ اس لئے کہ زمانہ بالکل نیا رنگ بدل رہا ہے نئے نئے حالات کی لہریں، نئی نئی تحریکوں کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ ساٹھ باسٹھ برس میں جو کچھ میں نے سیکھا وہ خود مجھے نئے زمانے کے سمجھنے اور اس سے نبٹنے میں کام نہیں دیتا تو ظفر کو کیا کام دے سکتا ہے۔ دراصل ان دو سال میں مجھ سے الگ رہ کر اسے بہت فائدہ ہوا ہے اس میں ذمہ داری اور خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے مدد کی ضرورت نہیں مگر یہ یقین ہو کہ میری مدد کی کوئی ضرورت نہیں تو پھر میں کیوں اس امید پر کہ شاید میری بے کار اور اداس زندگی اللہ میں علاج کرنے سے تین چار سال اور بڑھ جائے ہزاروں روپیہ خرچ کروں، دوسروں کو زحمت دوں اور خود کوفت اٹھاؤں؟ آخر یہ تو سوچئے کہ میں الہ آباد میں رہوں گا کہاں؟ صفدر علی میرا اپنے کسی دوست

ادارۂ تحریر
نئی روشنی ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرونِ ہند میں

پارلیمنٹ کا خاص اجلاس

شروع میں جب پارلیمنٹ کے کچھ ممبروں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ کوریا کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا جائے تو وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن جب اور زیادہ ممبروں کی طرف سے یہی مطالبہ پیش ہوا اور اس کی شدت بڑھتی گئی تو پنڈت جی کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور یہ اجلاس ۳۱ جولائی سے شروع ہوا۔ پہلے دن صدر جمہوریہ شری راجندر پرشاد نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا جس میں پچھلے چار مہینے کے واقعات اور حالات کا جائزہ لیا گیا اور مختلف معاملات کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا مکمل طور پر پسند کر لیا گیا۔ اس خطبے میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ صدر محترم نے ہند اور پاکستان کے وزیر اعظموں کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کے جلد سلجھنے کی کوئی توقع ظاہر نہیں کی لیکن یہ امید دلائی کہ مہاجروں کی املاک کا جھگڑا چکانے کی دونوں حکومتیں پوری پوری کوشش کریں گی۔ شری بھکت درشن نے صدر کے شکریے کا رزولیوشن پیش کیا جس کے معنی پارلیمنٹ کے رسم و آئین کے مطابق یہ سمجھے جاتے ہیں کہ ایوان حکومت کی کارگزاری اور اس کی پالیسی کو جس کا ذکر صدر کے خطبے میں آیا نظر تحسین سے دیکھتا ہے۔ کئی ممبروں نے اس رزولیوشن میں ترمیمیں پیش کیں جس سے مراد یہ نہیں کہ وہ صدر کا شکریہ ادا کرنے کے خلاف ہیں بلکہ یہ ہے کہ انھیں بعض معاملات میں صدر کی رائے سے یا حکومت کی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہے۔ دو روز تک ان ترمیموں پر بحث ہوتی رہی اور اس سلسلے میں مہاجروں کی بحالی، نہرو لیاقت معاہدے، شہری حقوق اور معاشی مسائل کے بارے میں حکومت کے طرز عمل پر نکتہ چینی کی گئی۔ حکومت کی طرف سے شری اجیت پرشاد جین وزیر بحالی اور شری دیشمکھ وزیر مالیات نے مدلل اور معقول تقریروں میں ان اعتراضات کا جواب دیا۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے معاہدے کے بعد دونوں بنگالوں میں فرقہ وارانہ تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ معاہدے کا اثر بہت خوش گوار ہوا ہے اور حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں ابھی تک پورا اعتماد پیدا نہیں ہوا ہے لیکن اس کے لئے مزید کوشش کی جا رہی ہے۔ سردار پٹیل نے شری کنزرو کے اعتراضات کے جواب میں حسب معمول بڑی سخت اور چبھتی ہوئی تقریر کی اور اس میں اس بات پر زور دیا کہ جب تک فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے والے شورش انگیزی اور تشدد کے ذریعے ہندو راج بلکہ برہمن راج کے قیام کی کوشش کرتے رہتے ہیں موجود ہیں حکومت کو شخصی آزادی پر پابندیاں لگانی پڑیں گی۔ آخر میں سب ترمیمیں واپس لے لی گئیں اور صدر کے شکریے کا رزولیوشن اتفاق رائے سے پاس ہو گیا۔ ۳ اگست سے کوریا کے مسئلے پر جس کے لئے یہ اجلاس خاص طور پر منعقد کیا گیا ہے بحث شروع ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ ہندوستان کی پالیسی کو حق بجانب ثابت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی جنگی طاقت اتنی نہیں ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست کی رو پر کوئی فوری اثر ڈال سکے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی پالیسی کو طاقت ور ملکوں کی مرضی کے تابع کرے اور ان کی ہر بات پر ایضاً کہا کرے۔ وہ عارضی مادی فائدے کی پروا کئے بغیر جس بات کو حق سمجھتا ہے اس پر اصرار کرے گا اور اس کی آواز ایک نہ ایک دن ضرور سنی جائے گی۔ انھوں نے کوریا کی پچھلی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ہم رنگ اور متحد قوم کا گھر ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کرنا سراسر زیادتی ہے۔ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا میں مدت سے چھوٹی چھوٹی سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں جن میں کبھی ایک طرف سے اور کبھی دوسری طرف سے پیش قدمی ہوتی تھی لیکن موجودہ جنگ میں شمالی کوریا کا پوری تیاری کے ساتھ جارحانہ قدم صریحی طور پر ثابت ہے۔ اسی لئے ہندوستان نے اقوام متحدہ کے اس رزولیوشن کی تائید کی جس میں شمالی کوریا کو قصوروار اور جنوبی کوریا کو مدد کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اس پالیسی کی حمایت نہیں کی کہ انڈو چائنا میں باؤڈائی کی حکومت کی اور فارموسا میں چیانگ کائی شیک کی حمایت کی جائے۔ پنڈت جی نے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان ایشیائی ملکوں کے حالات اور ان کے باشندوں کے جذبات کو مغربی قوموں سے زیادہ سمجھتا ہے، اور ان مغربی طاقتوں کے طرز عمل کو سخت ناپسند کرتا ہے جو ایشیا کے قلب و دماغ کی محرم نہیں ہیں اور ایشیائی ملکوں کے معاملات میں بھدے اور بھونڈے طریقے سے دخل دیتی ہیں۔ انھوں نے موجودہ صورت حال کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ روس کا سیکورٹی کونسل سے الگ ہو جانا کسی طرح مناسب نہ تھا اور اس کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں لیکن سیکورٹی کونسل کا یہ طرز عمل بھی سراسر غلط تھا کہ اس نے صریحی واقعات سے چشم پوشی کر کے چین کی کمیونسٹ حکومت کو نمائندگی دینے سے انکار کیا۔ اگر یہ غلطی نہ ہوتی اور پھر اس پر اصرار نہ کیا جاتا تو آج حالات کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ بہرحال ہندوستان کی پالیسی اس معاملے میں یہی ہے اور یہی رہے گی کہ کوریا کا معاملہ پر امن طریقے پر اس کے باشندوں کی مرضی کے مطابق طے ہو جائے اور لڑائی کی آگ پھیلنے نہ پائے۔ اس وقت خون کی گرمی نے جو حالت جنگ میں پیدا ہو جاتی ہے، لڑنے والوں کو ہندوستان کی صلح کی اپیل پر کان نہیں دھرنے دیا۔ لیکن امید ہے کہ آگے چل کر یہ اپیل اپنا اثر کرے گی اور کوریا کا جھگڑا اسی طریقے سے طے کیا جائے گا جو ہندوستان نے تجویز کیا ہے۔ اور جو حق و انصاف کا طریقہ ہے۔

وزیر اعظم کی تقریر کے بعد پارلیمنٹ کے ممبروں کی جو تقریریں ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت بڑی اکثریت حکومت کی پالیسی کی موید ہے، کچھ حضرات کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے ہندوستان لڑائی میں نہ پھنس جائے اور کچھ کو یہ شکایت ہے کہ سیکورٹی کونسل کے رزولیوشن کی حمایت کیوں کی گئی۔ پہلے دن کی بحث میں صرف ایک آواز سننے میں آئی کہ ہندوستان کو سیکورٹی کونسل کے رزولیوشن کی تعمیل میں جنوبی کوریا کی مدد کے لئے فوجیں بھیجنی چاہئیں، اور یہ یادداشت بخیر نذیر الدین احمد صاحب کی تھی۔

یقین ہے کہ پارلیمنٹ کوریا کے بارے میں پنڈت نہرو کی پالیسی کی دل و جان سے تائید کرے گی۔ اس نے ہندوستان کی ساکھ کو دنیا میں بڑھا دیا ہے اور ان قوموں کی نظر میں بھی جو اس وقت غرض مصلحت سے مجبور ہو کر شکایت اور اعتراض کر رہی ہیں اس کی عزت قائم کر دی ہے۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ ہندوستان کی صلح کی اپیل بالکل ہی بے کار گئی۔ اس لئے کہ اس نے ایشیا، یورپ اور امریکہ میں صلح پسندوں کی تھکی ہوئی ہمتوں کو تازہ کر دیا ہے اور یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ دنیا کی رائے عامہ چاہے کوریا کی جنگ کو جو بھڑک چکی ہے دیکھتے دیکھتے بھڑک اٹھی نہ روک سکے، لیکن اس کو پھیل کر تیسری عالم گیر جنگ نہیں بننے دے گی۔

یو، این، او یا گول میز کانفرنس؟

ہم عصر اسٹیٹس مین کے کراچی کے نامہ نگار نے لکھا ہے کہ پاکستان کی حکومت جنوبی افریقہ کے معاملے کے بارے میں حکومت ہند سے مشورہ کر رہی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس امر میں جس میں دونوں ملکوں کا مفاد مشترک ہے، دونوں حکومتیں باہمی مشورے اور تعاون سے کام لے رہی ہیں ورنہ پچھلے دنوں ہند و پاکستان کی عام کشیدگی کی بدولت اس منزل میں بھی دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ ہندوستان نے جنوبی افریقہ کا معاشی مقاطعہ کر رکھا تھا اور پاکستان نے ایک مدت تک اس کا مقاطعہ کرنے کے بعد بغیر نزاعی امور کو طے کئے ہوئے سپر ڈال دی تھی اور اس کے ساتھ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند یہ ارادہ کر رہی تھی کہ جنوبی افریقہ کے

ہندوستانیوں کے مسئلے کو پھر یو، این او کے سپرد کر دے۔ مگر حکومت پاکستان کے اصرار سے کہ پہلے گول میز کانفرنس کی تدبیر کو آزما کر دیکھنا چاہیئے انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور اب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے پر آمادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر ملان کی حکومت کی رعونت اور سینہ زوری کو دیکھتے ہوئے گول میز کانفرنس سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہے لیکن حکومت پاکستان کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ موجودہ حالات میں یو، این، او کی طرف رجوع کرنا بالکل بیکار ہے۔ یہ ادارہ روس اور امریکہ کے قضیے میں اس بری طرح الجھ گیا ہے کہ اسے اور معاملات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے اس لئے اچھا ہے کہ ہندو پاکستان اتمام حجت کے لئے گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر ڈاکٹر ملان کی حکومت سے ایک بار پھر افریقہ کے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے مطالبات منوانے کی کوشش کرلیں۔

ہجرت کے طوفان کا زور گھٹ رہا ہے

وزیر اعظم نے پارلیمنٹ کے سامنے بنگال میں فرقہ وارانہ تعلقات کے بارے میں جو امید افزا رائے ظاہر کی اس کی تصدیق پاکستان کے وزیر اقلیت، اے، ایم ملک کے بیان سے ہوتی ہے ملک صاحب کی نیک نیتی اور بے تعصبی کے ہندوستان اور پاکستان میں لوگ عام طور پر بہت معترف ہیں اس لئے ان کا بیان خاص طور پر توجہ کے قابل ہے، ملک صاحب نے اس بات پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا کہ ہندو بہت بڑی تعداد میں مشرقی بنگال واپس جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا میں نے خود ریل میں سفر کر کے دیکھا ہے کہ واپس جانے والے اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو لے جا رہے ہیں اور ان کے لئے راستے میں سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ہندوؤں کے دل میں اعتماد پیدا ہو جانے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نرائن گنج کے اسٹیشن پر جہاں سے سب ہندو قلی فروری میں بھاگ گئے تھے۔ اب ہندو قلیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور ریلوے اور اسٹیمر کے عملے میں بھی ہندو کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مغربی بنگال میں بردوان اور آسنسول میں مسلمان اب پورے امن کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے اور ہندوؤں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ ہگلی کے مسلمانوں میں ابھی تک کچھ گھبراہٹ پائی جاتی ہے مگر پھر بھی مسلمان وہاں واپس آ رہے ہیں۔

ہجرت کے جو اعداد و شمار آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی بنگال سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے مقابلے میں واپس آنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے پچھلے ہفتے میں چار دن ایسے گذرے ہیں جن میں مشرقی بنگال واپس جانے والے ہندوؤں کی تعداد وہاں سے آنے والوں کے مقابلے میں زیادہ تھی لیکن عام طور پر اب بھی کسی قدر کمی رہتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان میں ابھی تک مشرقی بنگال کی حکومت اور مسلمان باشندوں پر اتنا اعتماد پیدا نہیں ہوا جتنا مسلمانوں میں مغربی بنگال کی حکومت اور ہندو عوام پر پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے وجوہ معلوم کرنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک بڑی وجہ بالکل ظاہر ہے مگر اس کا دور کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کی مہاسبھا اور دوسرے اہل غرض ابھی تک پوری کوشش کر رہے ہیں کہ مہاجر ہندوؤں کو خوف دلا کر مشرقی بنگال واپس جانے سے روکیں۔ اس کے علاوہ خود مشرقی بنگال میں بھی ان کا پروپاگنڈا زور شور سے جاری ہے جس سے متاثر ہو کر اب تک وہاں کے ہندو اچھی خاصی تعداد میں ترک وطن کر رہے ہیں۔

(ع، ح)

امریکہ میں عالم گیر لڑائی کی تیاریاں

امریکہ میں جس وسیع پیمانے پر لڑائی کی تیاریاں کی جا رہی ہیں اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں یہ لڑائی صرف کوریا ہی تک محدود نہیں رہے گی بلکہ آگے بڑھے گی۔ پچھلے ہفتہ پریسیڈنٹ ٹرومین نے کانگریس کو جو تاریخی پیغام بھیجا ہے اس میں انھوں نے سامان جنگ کے لئے مزید دس بلین ڈالر یعنی امریکہ کے قومی بجٹ کے ایک چوتھائی رقم کے مساوی کی منظوری کی سفارش کی ہے اور انھوں نے مدافعت کے سکریٹری کو اس بات کا کلی اختیار دے دیا ہے کہ نیشنل گارڈ اور ریزرو فوج میں سے جس قدر تعداد کی وہ ضرورت محسوس کریں بلا سکتے ہیں ٹرومین نے فوج کی تعداد سے پابندی ہٹانے کی بھی سفارش کی ہے اس سفارش کے ساتھ ساتھ انھوں نے ریو (R/O) پیکٹ شمال اٹلانٹک پیکٹ، فلپائن، یونان، ٹرکی، ایران، ہندچین اور فارموسا میں چانگ کائی شک کو فوجی امداد اور پس ماندہ ملکوں کو فنی امداد کا بھی ذکر کیا ہے۔

لیکن ان سفارشات سے کہیں زیادہ اہمیت اس مسودہ قانون کی ہے جو اس وقت زیر غور ہے اور جس کی رو سے پریسیڈنٹ ٹرومین کو امریکہ کی قومی معیشت پر دو سال کے لئے مکمل اختیار حاصل ہوگا۔ اتنے وسیع اختیارات پریسیڈنٹ روز ویلٹ کو بھی دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں دیئے گئے تھے۔ مگر زمانہ امن میں امریکہ کی تاریخ میں کبھی کسی پریسیڈنٹ نے نہ تو اتنے وسیع اختیارات طلب کئے تھے اور نہ کانگریس نے دیئے تھے۔

اس بل پر تنقید کرتے وقت عام طور پر کہا گیا ہے کہ امریکہ نے ہمیشہ آزاد تجارت کی حمایت کی ہے، اس لئے حکومت کو اتنے وسیع اختیارات دینا ٹھیک نہیں ہے، مگر مخالفت کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لئے یقین ہے کہ مسودہ قانون چند دنوں میں منظور ہو جائے گا۔

شاہ لیوپولڈ کی تخت سے دست برداری

شاہ لیوپولڈ کی واپسی پر بلجیم میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی اور اتنے وسیع پیمانے پر ان کے خلاف مظاہرے اور اسٹرائکیں کی گئیں کہ عام بغاوت کا اندیشہ پیدا ہو گیا اس لئے شاہ بلجیم کو اپنے لڑکے کے حق میں حکومت سے دست بردار ہونے کا اعلان کرنا پڑا۔

اگرچہ مارچ میں جب شاہ لیوپولڈ کی واپسی کے بارے میں عام رائے شماری ہوئی تھی اور جون میں جب اسی مسئلے پر دوبارہ انتخابات لڑے گئے تھے، تو ان دونوں موقعوں پر شاہ کے حامیوں کو کامیابی ہوئی تھی مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی تھی کہ ملک کی بہت بھاری تعداد ان کی واپسی کے خلاف ہے، ایسی حالت میں جبکہ دنیا، عالم گیر لڑائی کے خطرے سے دوچار ہے شاہ بلجیم کا اصرار، تدبر اور مصلحت کے خلاف تھا۔

بلجیم، اٹلانٹک یونین کا ممبر ہے اور مغربی یورپ کی مدافعت کے لئے اس کا محل وقوع بہت اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہاں اس وقت کسی قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی کا ہونا مغربی طاقتوں کے لئے بہت مضر ہے۔ اس لئے شاہ بلجیم کے تخت سے دست برداری کے فیصلے نے جو اگرچہ بہت پہلے ہونا چاہئے تھا، جمہوری ملکوں کو بہت بڑی فکر سے اور بلجیم کو آنے والی مصیبت سے بچا لیا۔

پاکستان میں کاغذ کی مل کا قیام

حکومت پاکستان نے چٹاگانگ میں کاغذ کی ایک مل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے پاکستان میں یہ پہلی صنعت ہے جو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ ایکٹ کے ماتحت خالص حکومت کے سرمایہ سے قائم کی جا رہی ہے اس ایکٹ میں حکومت کو ۶ ضروری اور بڑی صنعتیں کو قائم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے سب سے پہلے حکومت نے مشرقی پاکستان میں جوٹ کی تین ملیں قائم کرنے کی ذمہ داری لی تھی، مگر ان میں صرف حکومت ہی کا سرمایہ نہیں ہوگا بلکہ انفرادی سرمایہ بھی لگایا جائے گا۔ کاغذ کی اس اسکیم پر کوئی چار کروڑ روپے صرف ہوں گے جس میں نصف کروڑ روپے قرض پر لئے جائیں گے۔ خیال ہے کہ اس مل کی پیداوار سے پاکستان کی کاغذ کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ سرکاری حلقوں کا اندازہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں بانس اتنا زیادہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے اس مل کی موجودہ اندازہ سے دوگنی ضروریات بھی پوری کی جا سکتی ہیں اور حسب معمول ہندوستان کی ہگلی مل کی سپلائی بھی جاری رہے گی امید ہے کہ ٹھیک دو سال میں یہ مل کاغذ بنانا شروع کر دے گی۔

کتابوں کے لائسنس کے خلاف احتجاج

حکومت پاکستان نے ہندوستان میں کتابیں بھیجنے کے لئے لائسنس کی قید لگا دی ہے۔ اس کے خلاف ۳ اگست کو لاہور میں ایک احتجاجی جلسہ کیا گیا جس میں پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کے صدر نے حکومت پاکستان کی بہت شدید مذمت کی۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت کے اس اقدام سے نہ صرف یہ کہ ہزاروں آدمی جو کتابوں کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں بے کار ہو جائیں گے اور بے روزگاری کے مسئلے میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی، بلکہ کتابوں کی وجہ سے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

بزمِ بے تکلف

"چشم بد دور! یہ مقطع قطع بہ تو واصورت اور ہاتھ میں یہ پتلی لاری کھرپا؟ کیا مچھلی کے شکار کے لئے کیچوے کی تلاش ہے جو یہ گرید ہو رہی ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ! میں مچھلی کے شکار کو جھک مارنا سمجھتا ہوں اور کیچوے پکڑنے کو تو کیا کہوں۔"

"جی جھک مارنے کے ساتھ کا دوسرا محاورہ تو یہ دوست ہے بے تکلف شوق فرمائیے مگر یہ تو بتاؤ آخر آج کون سی ہوا چلی ہے جس نے میاں خسرو کو کہ کن بنا دیا؟"

"خدا جانے تم کس خوابِ خرگوش میں رہتے ہو سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی ہے اور تم کو خبر تک نہیں کہ ہمارے ملک میں منسٹری نے شجر کاری کا دن منانا شروع کیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ ہر شخص ایک ایک پیڑ ضرور لگائیں۔ لہذا ———"

"زرا لیٹری کی باگیں روکے ہوئے۔ پہلے اس لفظ کے معنی سمجھائیے دن تو ہم تاڑ گئے کہ پیڑ کی سفید کھی ہے اور نہ جانے کیا مخفف ہے مگر یہ الٹی کیا لوئی پولیس کا جوڑ ہے۔"

"آپ تو بڑے ہیں، آپ سمجھ سکتے ہیں ہر بار ایک ہفتہ کا تہوار منانے سے لے کر کیا جانا ہے جیسے E.O.L.E میں دن منانے درخت لگانے کا عظیم الشان جشن ہے تو سال میں ایک مرتبہ اس ہفتے تک منایا جا رہا ہے۔ جدھر دیکھئے ہل چل مچی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے لوگ قوم کے مالی بنے ہوئے درخت لگا رہے ہیں، ان کی تصویریں کھنچتی ہیں اور اخباروں میں شائع ہوتی ہیں۔"

"واہ تمہیں بھی کوئی آن جان اس وقت دیکھے تو یہی سمجھے کہ قوم کا مالی ہے۔ مگر استاد یہ کھرپا بہادر بننے کی رسم اب سمجھ میں آئی۔ یہ وہی قصہ ہے

ع۔ نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

فوٹوگرافر کو بلوایا گیا ہوگا اور یہ تصویریں کھنچوا کر اخباروں کو بھیجی جائیں گی کہ

ع۔ بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے۔"

"توبہ! توبہ! تم نے مجھے ایسا شہرت کا بھوکا سمجھا ہے۔ میں نے کسی فوٹوگرافر کو نہیں بلوایا۔ ہاں لڑکے ضد کر رہے ہیں کہ درخت لگاتے ہوئے میری تصویریں لیں گے۔ اب اگر کوئی اخبار لے کر چھاپ دے تو میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح ہمارے ملک کی غذا کا مسئلہ حل ہو اور بھوکوں کا پیٹ بھرے جس کے لئے سرکاری منسٹری نے یہ مہم شروع کی ہے۔"

"ظاہر ہے ملک کے بھوکوں کا درد تمہارے دل میں ہوگا تو کیا ہمارے پیچھے ہوئے پیٹ میں ہوگا مگر یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس پیڑ بازی سے غذا کا مسئلہ کیسے حل ہو جائے گا؟"

"وہ بات ہی کیا ہوئی جو تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ ارے عقل مند جب ان درختوں میں پھل آئیں گے اور لوگ انہیں نوشِ جاں فرمائیں گے تو اناج کا خرچ کم ہوگا یا نہیں ہوگا، اور جب درختوں کی کثرت سے بارش زیادہ ہونے لگے گی تو غلے کی پیداوار بڑھے گی یا نہیں بڑھے گی۔"

"واہ رے میرے دنا بینی شیر، کیا کہنے ہیں تیری کمی یا زیادتی کے۔ ارے بندۂ خدا یہ بھی تو سوچ کہ جب تک یہ بیل منڈھے چڑھے گی، ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو آج بھوکوں مر رہے ہیں۔"

"اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ ایک ذرا سا قحط اور قحط بھی کہاں غلے کی ایک ذرا سی کمی ہوئی اور شور مچ گیا کہ مر گئے۔"

"واقعی ہندوستانیوں کی یہ جلد بازی ہمیں بھی پسند نہیں کہ ایک ذرا سی موت آئی اور مر گئے۔ خیر آپ ان موتوں کی پروا نہ کیجئے۔ حال کو گزار کر مستقبل کی پونڈ لگاتے رہئے۔ ایک دن آئے گا جب ہرے بھرے درخت میووں سے لدے ہوں گے اور یہ جلد باز مرنے والے پچھتائیں گے کہ کاش

ع۔ کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے۔"

اعتراف

(آنسہ) کوثر بلگرامی

بھول جاؤں تجھے اے دوست! یہ ممکن ہی نہیں
اور تری یاد ہے حرزِ نفس مشکل ہے!
زندگی چڑھتی چلی آتی ہے مثلِ طوفاں
بچ کے بے داغ نکل جائے یہ کس کا دل ہے!

تری الفت کے تقاضے میں ہر اک شے کھو دی
لیکن اک ہستیٔ ناشاد کہ وہ کھو نہ سکی
اور وہ ہستیٔ ناشاد ہے کتنی پر شور
سعیٔ پیہم سے بھی خاموش کبھی ہو نہ سکی

جانِ نازک پہ تقاضوں کی ہے پیہم بوچھار
ایسے بیدار تقاضے جو محبت کش ہیں
اک تپش، ایک خلش، ایک کسک، ایک کھٹک
میرے لمحاتِ مسرت بھی مسرت کش ہیں

میں نے چاہا تھا کہ دنیا سے کنارہ کر لوں
اور دنیائے تخیل میں سجا لوں محفل
میں ہوں اور یاد تری، کوئی نہ ہو اپنے سوا
لیکن اے دوست! یہ مشکل تھا بہت ہی مشکل

میری معصوم تمناؤں کے ہنستے دیپک
ضوفشاں، رقص کناں، خندہ دہاں رہ نہ سکے
زلفِ زرتار کو اک ہلکی سی جنبش دی تھی
بجھ گئے، تندیٔ ایام کو وہ سہہ نہ سکے

اور پھر ہو گئی وہ بزمِ حسیں تیرہ و تار
جس میں امکانِ محبت، نہ مسرت کا گذر
کتنی بے مقصد و بے کیف تھی ہستی اپنی
جیسے صحرا میں بھٹکتے ہوئے راہی کا سفر

اسی تاریکی میں اے دوست، سنا اک نغمہ
جس نے احساس کی دنیا میں مچا دی ہل چل
دھڑکنیں، سسکیاں، تپتی ہوئی آہیں، نالے
جیسے خود مادرِ گیتی کا ہو جیون بے کل

اس گھڑی میں نے تعجب سے یہ محسوس کیا
میرے پہلو میں بھی اک دل ہے، دھڑکتا ہوا دل
بھول جاؤں تجھے اے دوست، یہ ممکن ہی نہیں
اور تری یاد ہے حرزِ نفس ہے مشکل
زندگی چڑھتی چلی آتی ہے مثلِ طوفاں
بچ کے بے داغ نکل جائے یہ ہے کس کا دل؟

تھائی لینڈ کی درمیانی پوزیشن

محمد امین

تھائی لینڈ کی آبادی ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہے اس کی سرحد شمال مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق کی طرف برما، ملایا اور انڈو چین سے ملتی ہے ان تینوں ملکوں میں آج کل سیاسی لحاظ سے ایک خلفشار مچا ہوا ہے تینوں ہی ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہیں اور وہ طاقتیں جو وہاں کی حکومتوں کے خلاف برسرپیکار ہیں خالص کمیونسٹ ہیں۔ بہت سے سیاست دانوں اور مدبروں کا خیال ہے کہ تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے میں مغربی طاقتوں کے لئے سب سے بڑا سہارا بن سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ چین میں کمیونسٹوں کی فتوحات اور دوسرے سرحدی ملکوں میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمی کے پیش نظر سیام کب تک اپنے اندرونی حالات پر قابو رکھ سکتا ہے اور اپنے نظم و ضبط کو قائم رکھ سکتا ہے؟

مارشل فی بول سونگ کرام تھائی لینڈ کے وزیر اعظم ہیں۔ کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کو دیکھ کر انھوں نے حال ہی میں ایک اعلان کیا تھا کہ اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اب جلد ہی تھائی لینڈ کو کسی باہر کے ملک سے جدید قسم کے جنگی آلات اور ہتھیار منگا کر اپنی فوج کو مسلح کرنا پڑے گا۔ مارشل سونگ کرام تھائی لینڈ کے گرم و سرد آمر ہیں اور فوج کی مدد سے نظام حکومت کا تختہ الٹ کر خود زبردستی قابض ہونے کے آرٹ سے خوب واقف ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ سرحدی علاقوں میں گشت کرنے والی فوج کو وہ از سر نو منظم کر رہے ہیں اور داخلی کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کر کے اسے ختم کرنے کے لئے پوری پوری طرح تیار ہیں۔ پریس کے سامنے ایک بیان میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حال ہی میں انھیں بہت خطرناک خبریں ملی ہیں ——— کہ چینی کمیونسٹ شمال اور شمال مشرق کی سمت سے تھائی لینڈ میں بڑی تعداد میں گھس رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ان تمام طاقتوں کی ایک کانفرنس بلانا ضروری ہے جن کا مفاد خطرے میں ہے۔ اس بات پر انھوں نے زور دیا تھا کہ آپس کی امداد ایک دوسرے کو خواہ کتنی ہی درکار ہو وہ اس وقت تک مفید اور موثر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک کہ برطانیہ اور امریکہ کی حمایت حاصل نہ ہو۔

چند دن ہوئے سونگ کرام نے امریکن ایجنسی کے ایک نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر امریکن اور برٹش فوجیں تھائی لینڈ میں آئیں تو ہم خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں چونکہ کمیونسٹ خطرہ بہت بڑھ رہا ہے اس لئے اس وقت اس کی روک تھام کے لئے امریکہ اور برطانیہ کی فوجی امداد ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ان فوجوں کو ہم بہ حیثیت اپنے دوست کے سمجھیں گے اور یہ بات ہم کبھی نہیں بھولیں گے کہ مغربی طاقتوں نے ایک ایسے ملک کی مدد وقت پر کی ہے جو کہ دنیا میں کمیونزم کی بڑھتی تحریک کو روکنے کے لئے سب سے پیش پیش ہے۔

جنگ کے خطرے کا نعرہ لگا کر تھائی لینڈ میں رجعت پسند اور سامراجی عناصر وہاں کی بڑھتی ہوئی عوامی اور ترقی پسند تحریک کو دبانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس طرح مارشل سونگ کرام کی اپیل اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتی کہ تھائی لینڈ کے محبان وطن کو عالمگیر سامراجی طاقتوں کی مدد سے کچلا جائے جو کہ دن بدن زور پکڑتے جا رہے ہیں وہاں کا ترقی پسند پریس وزیر اعظم کے اس بیان کو ملک کے ساتھ زبردست دھوکہ اور غداری سے منسوب کرتا ہے۔ ایک اخبار نے تو صاف صاف یہ لکھا ہے کہ سونگ کرام جو سامراجی طاقتوں کو ہمارے ملک کی سرزمین میں مداخلت کے لئے بلا رہے ہیں، غدار اور عوام کے دشمن ہیں۔

مارشل سونگ کرام نے جب دیکھا کہ ان کے اس بیان سے ملک میں کافی کھلبلی اور ہلچل مچ گئی ہے اور ملک کی فضا ان کے خلاف ہو رہی ہے تو جلدی سے انھوں نے دوسرا بیان دیا جس میں انھوں نے اپنے پہلے بیان کی تردید کی اور یہ کہا کہ ان کی گفتگو ایک نمائندے سے پرائیویٹ طور سے ہوئی تھی جسے محض ایک خیالی بات سمجھنی چاہیے۔ لیکن ایک بار ایک بیان دینے کے بعد پھر اس کی تردید کرنا خاص طور سے ایک سیاست داں کے لئے زیب نہیں دیتا۔

تھائی لینڈ اس لحاظ سے بہت بدنام ہے کہ وہاں آئے دن سیاسی طوفان برساتی نالوں کی طرح چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے وہاں ایک ڈراما تیار کیا جاتا ہے اور قبل اس کے کہ یہ ڈراما کھیلا جائے، ایک دوسرا ڈراما اس کے خلاف تیار ہو کر اس کے کھلاڑیوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے لیکن اس قسم کے انقلابات جب کبھی بھی رونما ہوئے انقلاب برپا کرنے والوں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ کمیونسٹوں کا اثر کسی طرح سے بھی نہ آنے پائے لیکن جنگ کے حالات بدل گئے ہیں اور مارشل سونگ کرام نے کہا ہے کہ جنگ کے بعد پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ تھائی زبان کے اخباروں میں سے ایک بہت بڑی تعداد کمیونزم کے پرچار میں آگے آ گئی ہے اور اس کا پروپگنڈا کھلے بندوں وہ کرتے ہیں۔

تھائی لینڈ کی خاص پیداوار چاول ہے اور وہاں کی آبادی میں اکثریت کا پیشہ زراعت ہے۔ کسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دوران جنگ میں ان کی زندگی خاصی مشکل ہو گئی تھی۔ ان کے وجوہات کئی ایک تھے لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کی حکومت میں بے ایمانی اور رشوت خوری بہت بڑھ گئی تھی اور اس بات سے وہاں کے کسان بہت ناراض تھے لیکن اس کے باوجود کسانوں نے کمیونزم کی طرف رخ نہیں کیا اور ابتدا ہی سے حکومت کے وفادار اور فرماں بردار رہے مگر تھائی لینڈ کے اخباروں نے حکومت کی سخت نکتہ چینی کی اور فوجی آمریت اور جاگیردارانہ نقطۂ نظر کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں کے عوام بیدار ہونے لگے۔ خود تھائی لینڈ میں کمیونسٹ تحریک نے کبھی زیادہ زور نہیں پکڑا۔ لیکن اس کی سرحد یا محل وقوع ایسا ہے کہ ہند چینی، برما اور ملایا کی جانب سے کمیونسٹوں کے گھسنے کا امکان بہت ہے۔ باہر کے نامہ نگار برابر یہ سوال اپنے آپ سے پوچھتے رہے ہیں کہ کیا تھائی لینڈ اپنے کمیونزم کی تحریک کو باوجود اس کے اسے باہر سے امداد مل رہی ہے۔ روک سکتا ہے

تھائی لینڈ کے بہت سے لیڈروں کو یقین ہے کہ کمیونزم سے ان کے ملک کی بیزاری کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے باشندے اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی ذمہ داری وہاں کے کمیونسٹوں کے طرز عمل پر ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ تھائی لینڈ کے عوام قدرتی طور سے کمیونسٹ نظریہ اور کمیونسٹ انقلابی تصورات کے مخالف ہیں اس لئے تھائی لینڈ کمیونزم کی بڑھتی ہوئی تحریک کی زد میں نہیں آئے گا۔ لیکن وہ لوگ جو باہر کے ملکوں کے تعلیم یافتہ ہیں اور بہت سے ملکوں کی سیر کر چکے ہیں، اس کی تردید کرتے ہیں۔ ان کو سو فی صدی یقین ہے کہ تھائی لینڈ کا موجودہ جاگیردارانہ فوجی نظام حکومت کمیونسٹ تحریک کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لئے بہترین میدان ہے۔

تھائی لینڈ میں حقیقتاً بائیں بازو والی کوئی جماعت نہیں ہے۔ دائیں بازو والی جماعت کے کارکنوں کا خیال ہے کہ اگر بائیں بازو والی سیاست کو پنپنے اور بڑھنے اور باقاعدہ منظم ہونے کا موقع دیا گیا تو اس کی آڑ لے کر بہت سے کمیونسٹ اس میں گھس جائیں گے اور آہستہ آہستہ چھا جائیں گے سیاست کے میدان میں اس کمی کی وجہ سے کمیونزم کو بہت آسانیاں ہیں۔ لوگ کمیونزم کے نقطۂ نظر کو سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں پروپگنڈا بڑھنے کے ساتھ ساتھ لوگ اندرونی طور سے ان خیالات کے حامی ہوتے جا رہے ہیں۔

تھائی لینڈ میں مختلف خیالات کے لوگ ہیں جو کمیونزم کے خطرے کو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کی روشنی

ہیں دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مارشل سونگ کرام کہتے ہیں۔ کمیونزم چینی عوام کو اس لئے اپیل کرتا ہے کہ وہاں دیہاتوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو پریشان حال ہیں۔ لیکن تھائی لینڈ میں حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں کھانے پینے کی چیزیں بافراط ہیں اور ہر شخص خوش حال ہے۔ بہت سے چینی جب شروع شروع میں یہاں آئے تو وہ کمیونسٹ خیالات کے حامی اور علمبردار تھے۔ لیکن یہاں رہتے رہتے انھوں نے اپنا سیاسی رجحان بدل دیا اور تھائی لینڈ میں تجارت اور کاروبار کرکے بہت خوش حال اور مالدار ہو گئے۔ یہی خاص وجہ ہے، کہ تھائی لینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی نہیں قرار دیا گیا ہے۔

تھائی لینڈ کے شاہی خاندان کے ایک فرد کا خیال ہے کہ تھائی لینڈ میں کمیونزم کبھی بھی سرخروئی حاصل نہیں کر سکتا اور نہ جمہوری فارمنگ جڑ پکڑ سکتی ہے اس لئے کہ تھائی لینڈ ان قدیم ملکوں میں سے ایک ہے جس کی چین سے کوئی مشابہت نہیں۔

لیکن وہ اسکول جو عام رجحانات کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے اس کا دوسرا ہی خیال ہے۔ اس کو یقین ہے کہ تقاضائے وقت کے مطابق تبدیلیاں ہونی ہوتی ہیں وہ ضرور ہوتی ہے۔ انھیں دن بدن یہ احساس ہو رہا ہے کہ تھائی لینڈ میں کمیونزم یقیناً اپنا قدم جمائے گا اور ایک دن ایسا آئے گا جبکہ کمیونزم سارے ملک پر چھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال کے عرصے میں جتنی بھی نئی قوتیں ایشیا میں کارفرما ہوئی ہیں ان کا اثر تھائی لینڈ پر ضرور پڑا ہے اور کبھی کبھی عارضی طور سے اس نے غلبہ بھی حاصل کیا ہے۔

آج ایشیا میں کمیونزم بلاشبہ ایک زبردست بڑھتی ہوئی نئی قوت ہے اور بظاہر تھائی لینڈ خواہ کتنا ہی کمیونزم کے خیالات کا مخالف کیوں نہ ہو آخر میں وہ اس کا شکار ہو جائے گا۔ وہاں کمیونسٹوں کے اثرات اس دور طریقے سے پہلے ہی سے کام کر رہے ہیں اور اس سے باہر کے کمیونسٹوں کو گھسنے میں سہولت ہوگی اور سارے ملک میں انقلاب برپا کرنے میں مدد ملے گی۔

تھائی لینڈ کی آبادی میں ۳۰ لاکھ چینی ہیں۔ یہ اقلیت آپس میں مضبوط تاگے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ لیکن روحانی اور ذہنی رہنمائی کے لئے ہمیشہ وہ نانکنگ یا اب پیکنگ کی طرف کان لگائے رکھتے اور یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اب وہاں کمیونسٹ حکومت ہے۔

تھائی لینڈ میں اس وقت کمیونزم کے اثرات جو کچھ بھی پائے جاتے ہیں ان کی بنیاد سراسر چینیوں پر ہے۔ یہ لوگ اپنا کام اور پروپیگنڈا بہت زور شور کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے برخلاف جہاں تک کمیونزم کی مخالف طاقتوں کا تعلق ہے وہ سراسر تھائیوں پر مبنی ہے، جو لوگ کہ غیر مؤثر اور سست ہیں بینکاک کی کل ۰۰۰،۵۰۰،۸ آبادی میں سے صرف ۵۰ تھائی ایسے ہیں جو کمیونسٹ خیالات کی طرف

مائل ہیں لیکن ۰۰۰،۲۰،۱ اور ۰۰۰،۵۰،۱ چینی ایسے ہیں جن کے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ ویسے اندازہ ہے کہ وہاں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد ساڑھے سات لاکھ ہے۔

جس طرح کہ ملایا میں چینی کمیونسٹوں نے مزدوروں کو منظم کرنے میں خاص حصہ لیا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح بینکاک میں بھی مزدوروں کی یونین بنانے میں ان کا خاص ہاتھ ہے جنگ کے خاتمے کے بعد انھوں نے اپنی تحریک بہت تیز کر دی ہے اور بینکاک کی بائیں بازو والی ٹریڈ یونین کی فیڈریشن میں کئی ایک چینی کمیونسٹوں نے اس کی مجلس منتظمہ میں بہت با اثر پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ اس فیڈریشن کے ممبروں کی تعداد ۰۰۰،۰۰،۲ ہے۔

تھائی لینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کی ساری طاقت پوشیدہ ہے اور اسے معلوم کرنا وہاں کی حکومت کے لئے مشکل ہے۔ قیاس ہے کہ اس کے کارکن وہ لوگ ہیں جو فوجی ہیں اور بندوق بنانا، بندوق چلانا اور خفیہ طور سے ریڈیو بنانا اور اس کو استعمال کرنا خوب جانتے ہیں اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو بین الاقوامی مخبری کا کام بھی کرتے ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کے کمیونسٹوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بینکاک اور بہت سے مختلف سرحدی نقطوں کے درمیان کام کرتے ہیں جہاں پر کہ باہر کے ملکوں کے کمیونسٹ تھائی کمیونسٹوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

تھائی حکومت کے بہت سے ممبروں اور لیڈروں نے اپنی فوجی طاقت کو دیکھ [illegible] النعمت سے محروم ہیں جب اظہار کیا ہے۔ تھائی لینڈ کی فوج [illegible] طاقت کا حال صیغۂ راز میں ہے۔ سیاست کے میدان میں بے شک یہ طاقت ور ہے لیکن اس کے پرانے اسلحہ جات کو دیکھتے ہوئے اس کی جنگی طاقت کمزور ہے۔ گورنمنٹ غالباً کل ۰۰۰،۵۰ فوج جنگی محاذ کے لئے فراہم کر سکتی ہے لیکن اس فوج کی اکثریت ایسی ہے جس کے ہتھیار جنگ سے پہلے جاپانیوں کے چھوٹے چھوٹے اسلحہ جات پر مبنی ہیں۔

حال ہی میں امریکہ نے بعض جدید قسم کے ہوائی جہاز ہوابازوں کی ٹریننگ کے لئے تھائی لینڈ کو دئے ہیں۔ اس کی مدد سے حکومت اپنے ہوابازوں کی تعداد بڑھا رہی ہے۔

پولیس کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کی ٹریننگ نیم فوجی لائن پر ہے، لیکن موٹر جیسی تیز رفتار ذرائع آمد و رفت اور ریڈیو کی کمی ہے اور ملزموں کا سراغ لگانے والی مشینوں کی کمی ہے۔ دوسری بات جو خراب ہے وہ یہ کہ فوجی، بحری اور ہوائی طاقت اور پولیس تمام کی تمام بینکاک کی راج دھانی میں جمع ہے اس سے کہ وہاں نئے دن حکومت کا تختہ الٹنے کی چالیں عمل میں آنے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اس طرح تھائی لینڈ کے اندرونی اضلاع بالکل علیحدہ رہ جاتے ہیں اور وہاں دوسروں کے لئے میدان بالکل صاف رہتا ہے۔

تھائی لینڈ کو جنگ کا عملی تجربہ کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ پچھلی بحرالکاہل کی جنگ سے پہلے یہاں کی فوج نے انڈوچین میں فرانس کی فوجوں کے خلاف جو حملے کئے تھے وہ اس کے حق میں بہت ہی ناکامیاب ثابت ہوئے تھے۔ اسی طرح ۱۹۴۱ء میں تھائی فوجوں نے صرف چند گھنٹوں کی مدافعت کے بعد جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے مسلح فوجوں کی طاقت اور قومی سیاست کے آئے دن کے الٹ پھیر کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ وقت پڑنے پر تھائی لینڈ کمیونزم کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام کر سکے گا۔

موجودہ حالات میں جبکہ مارشل سونگ کرام وہاں کے وزیر اعظم ہیں، تھائی لینڈ کے لئے غیر جانب دار رہنا مشکل ہے۔ خصوصاً اس لئے اور بھی کہ انھوں نے مغربی طاقتوں سے کمیونزم کے خلاف محاذ بنانے کے مالی اور فوجی امداد بھی طلب کی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ بھی آج کل وہاں کی سیاست میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں اور امریکہ نے کئی کروڑ ڈالر قرض بھی دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ لیکن حالات جتنی تیزی سے بدل رہے ہیں انھیں دیکھ کر تھائی عوام کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ ایک غیر کمیونسٹ قوم بن کر رہیں اور ان کا ملک زبردستی جنگ کی آگ میں جھونک دیا جائے۔

تھائی لینڈ میں باوجود اس کے کہ مارشل سونگ کرام کی فاسسٹ حکومت برسر اقتدار ہے اور اس نے انڈوچائنا میں باؤڈائی کی حکومت کو تسلیم بھی کر لیا ہے لیکن تھائی عوام کا قومی جذبہ ہرگز یہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا کہ فرانس کی حکومت انڈوچائنا کو مستقل غلام بنائے [illegible] شک کی حکومت کو بھی اس نے [illegible] جنگ آزادی دی تھی لیکن پہلے کی حکومت سے ان کی حکومت کے تعلقات اچھے تھے۔ لیکن انڈونیشیا کی آزاد اور خود مختار حکومت کے لئے وہاں کے عوام بہت ہمدرد تھے۔ ملایا میں برٹش گورنمنٹ وہاں کا قومی جذبہ کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ لیکن تھائی عوام ہرگز اس پالیسی کو اچھا نہیں سمجھتے، اور ملایا کو از سر نو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھ کر وہ خوش نہیں ہیں۔ برما کی خانہ جنگی میں بھی تھائی عوام کی ہمدردی ترقی پسند عناصر کے ساتھ زیادہ ہے۔

عوام کے اس قسم کے تاثرات اور رجحانات کو دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں مغربی طاقتیں تھائی لینڈ کو اپنا اڈہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ انقلابی طاقتیں وہاں بڑھ گئی ہیں۔

بینکاک میں امریکہ کے سارے جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے سفیر اور مدبرین جمع ہوئے تھے۔ اور خاص طور سے اس میں شرکت کرنے کے لئے جوزف نام کے ایک سفیر کو بھی صدر ٹرومین نے بھیجا تھا۔ ان سب نے اس بات پر غور کیا کہ تھائی لینڈ کو کمیونزم کا خطرہ ہے یا نہیں اور جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے زیادہ کمزور ملک کون سا ہے جہاں سے کمیونزم کا سیلاب بڑھے گا فیصلہ غالباً یہ ہوا کہ انڈوچین اور تھائی لینڈ یہ دو ملک خصوصیت کے ساتھ بہت اہم ہیں اور ان میں

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

یہ گتھیاں کیسے سلجھیں؟

صالحہ عابد حسین

ایک تجربہ کار [illegible] میرا بیس سالہ شادی شدہ [illegible] کی حقیقی مسرتیں دراصل چند [illegible] ان کے [illegible] میاں [illegible] بلکہ ذہنی دماغی اور جذباتی [illegible] بالغ ہوں۔

وہ لکھتا ہے کہ [illegible] شادی ہوئی تو میں بائیس سال کا تھا اور میری [illegible] انیس سال کی اور ہم جب کسی [illegible] سمجھتے ہیں دونوں اپنے کو بڑا تجربہ کار [illegible] سمجھتے تھے۔ میں ایک ضدی خودسر [illegible] طبیعت اور مزاج کو [illegible] غلط فہمی تھی [illegible] کوئی غلطی نہیں [illegible] میں [illegible] ہوں اور [illegible] میری بیوی تھا دونوں میں سے [illegible] دوسرے سے [illegible] اور [illegible] بعد جاکر [illegible] ہر وقت طوفان آنے کا خوف اور [illegible] "پھٹ جانے کا ڈر لگا رہتا [illegible] اور ناخوش گوار [illegible] جس وقت میاں [illegible] زندگی کو بہرحال پُرمسرت اور پُرسکون [illegible] تو [illegible] اور [illegible] پر عمل کرنا شروع کیا۔ اپنی [illegible] خود غرضی اور تنگ پسندی پر غالب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی اُسے یہ اندازہ ہونے لگا کہ [illegible] اپنے پر قابو رکھ کر بیوی کی طبیعت [illegible] کی کوشش کرتا ہے، اس کے ساتھ سہل اور گھر [illegible] خوش گوار ہوتی جاتی ہے۔ بیوی کو بھی [illegible] کمزوریوں کا احساس ہوا اور وہ دل میں جھنکنے لگی کہ گھریلو جھگڑوں اور [illegible] زندگی کی ذمہ داری شوہر سے زیادہ خود اس پر ہے اب وہ دونوں دوسرے کی برائی ڈھونڈتے [illegible] قصوروار ثابت کرنے کے بجائے اس کھوج [illegible] لگے کہ وہ خود دوسرے کے ساتھ کیا زیادتی یا نقصان کرتے ہیں۔ وہ اپنے قصور پر شرمندہ ہوتے اور اپنے کو ملامت کرتے اور دوسرے [illegible] کی دل جوئی کی کوشش کرتے۔ اس طرح سالہا سال کی دائمی محنت اور مسلسل کوشش سے [illegible] خاص عمر پر پہنچ کر ان کی گھریلو زندگی کامیاب اور پھر پُرمسرت اور سچے سکون کی حامل ثابت ہوئی۔

یہ تجربہ [illegible] سیدھا سادا اور آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو یہ اتنا سہل نہیں۔ ہمارے دیس میں [illegible] چھوٹ نہ بولا جائے تقریباً [illegible] گھرانوں میں شادی شدہ زندگی اس قدر تلخ، ناکام اور اجیرن ہوتی ہے کہ میاں بیوی کی زندگی [illegible] تلخ کا نمونہ بن جاتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہی ناروا داری، عدم مساوات، اور بیجا غرور غلط ہوتا ہے۔ یوں تو شادی کے معنی ہی خوشی کے ہیں اور ہونا تو یہ چاہئے کہ شادی کی ابتدا اور انتہا مسرت سے معمور ہو۔ لیکن [illegible] سا ہوتا، مسرت کی یہ نایابی اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ ہم کبھی اس پر غور و فکر ہی نہیں کرتے کہ شادی شدہ زندگی کو کیسے کامیاب اور پُرمسرت بنایا جاسکتا ہے، ہم اپنا تجزیہ کرنے اپنے مزاج کو قابو میں رکھنے اور اپنی عادتوں میں نامناسب تبدیلیاں کرنے پر تیار نہیں، ہم دوسرے سے بہت کچھ چاہتے ہیں لیکن خود دوسرے کی مرضی اور خواہش کی بہت کم پروا کرتے ہیں حالانکہ شادی شدہ زندگی کی کامیابی اور مسرت کا راز ہی یہ ہے کہ "لو اور دو" "جیو اور جینے دو" کے [illegible] اصول پر عمل کیا جائے۔

شادی کے بعد میاں اور بیوی محبت اور خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کو پرکھیں اور سمجھیں عیب جوئی، نکتہ چینی کی غرض سے نہیں [illegible] اصلاح اور نباہ کی خاطر۔ ایک دوسرے کے جذبات [illegible] بات اور احساسات کا احترام کریں۔ [illegible] کو نظرانداز کریں اور مناسب وقت پر اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ دوسرے کی خوبیوں کی قدر کریں اور کبھی کبھی تعریف اور اعتراف بھی۔ ایک دوسرے کی [illegible] اور کام کو سمجھیں اور اس میں حصہ لیں اور [illegible] بٹائیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ کا احساس کریں اور دوسرے کے دکھ اور رنج کو دور کرنے کی کوشش کریں اگر دور نہ بھی کرسکیں تو کم سے کم شریک [illegible] زندگی کو یہ احساس کرادیں کہ وہ سچے معنوں میں اس کے شریک رنج و راحت ہیں۔ ہر معاملے اور ہر بات میں، ہر وقت اور ہر موقع پر اپنی ہی بات منوانا، اپنا ہی حکم چلانا۔ شادی شدہ زندگی کی مسرتوں کی موت ہے۔ جہاں حکومت ہو وہاں محبت کا گذر نہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ شادی شدہ زندگی میں میاں اور بیوی کے اکثر فرائض اور کام مختلف ہوتے ہیں، گھرداری اور بچوں کی پرورش اور تربیت کا بہت کچھ دارومدار بیوی پر، اور روزی کمانے کی زیادہ تر ذمہ داری شوہر پر ہوتی ہے۔ لیکن دائرہ عمل مختلف ہیں، طرز عمل یکساں ہی ہونا چاہئے۔ یہ خیال کہ ایثار اور قربانی، برداشت اور درگذر عورت کا حصہ اور فرض ہے۔ اور مرد تو خودسر اور سخت مزاج اور لیے سکے کا ہوتا ہی ہے، حکومت کرنا اور خدمت لینا، اور روٹی دینا ہی صرف اس کے فرائض ہیں۔ انتہائی غلط فہمی اور ناانصافی پر مبنی ہے چاہے اس اصول کی قائل عورتیں ہوں یا مرد۔ دونوں خطرناک غلطی کرتے ہیں۔ پُرمسرت شادی شدہ زندگی کا راز مکمل مساوات اور برابری کی محبت اور رواداری میں پوشیدہ ہے، حکومت کرکے اور خدمت لے کر آپ اور تو سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں مگر سچی اور دلی محبت نہیں، وہ تو پُرخلوص محبت اور رواداری ہی کے بل پر مل سکتی ہے اور جب تک یہ نہ ملے حقیقی خوشی اور سکون کسی بھی جوڑے کو نہیں مل سکتا جب آپس میں پُرخلوص اور پختہ کا [illegible] محبت ہو تو بہت سی چھوٹی چھوٹی خانگی پریشانیاں آسانی سے سلجھائی اور نبٹائی جاسکتی ہیں۔ جب دو آدمی ایک دل ایک جان ہوکر کسی مشکل کو حل کرنے پر جٹ جائیں تو وہ حل ہوکر ہی رہتی ہے

شادی شدہ زندگی کا تقریباً لازمی نتیجہ بچے ہیں بچے .... جو مسرتوں کی ایک دنیا اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے گھروں میں عام طور پر بچے بجائے نعمت کے لعنت بن جاتے ہیں اگرچہ اور بہت سے خارجی اور معاشی اسباب بھی اس کا باعث ہیں لیکن ایک بڑی وجہ ماں اور باپ کی بچوں کی پرورش اور تربیت سے ناواقفیت بھی ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک کسی وجہ سے بچے کا ہونا نہیں چاہتا۔ عام طور سے ہمارے دیس میں پہلے دوسرے بچے تک تو ماں باپ خوش رہتے ہیں لیکن جب یکے بعد دیگرے ہر دوسرے یا تیسرے سال "نعمت" نازل ہونے لگے تو فوراً ان ماں باپ گھبرا اُٹھتے ہیں۔ کبھی باپ ان ذمہ داریوں اور الجھنوں سے گھبراتا ہے جو بچوں کی وجہ سے پڑیں گی اور کبھی ماں ان جسمانی اور ذہنی تکلیفوں اور فرائض سے پریشان ہوجاتی ہے جو بچوں کی وجہ سے اُسے سہنی پڑیں گی۔ دونوں میں سے جو جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے اور اعصابی مزاج رکھتا ہے اُس پر یہ کیفیت زیادہ مسلط ہوتی ہے ایسی صورت میں تندرست جسم اور دماغ والے کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے کی ہمت بندھائے اور جو ذمہ داریاں اس پر ہیں ان میں ہاتھ بٹا کر اس کا کام ہلکا کرے اور ساتھ ہی دونوں میاں بیوی کو سوچ سمجھ کر اس مسئلے کو بھی سوچنا چاہئے کہ بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی پرورش کرنے اور ذمہ داریاں اُٹھانے کے وہ کہاں تک اور کس حد تک قابل ہیں۔ آج کل ہمارے ملک کی معاشی حالت اس قدر ابتر ہوگئی ہے کہ پہلے کے اچھی اچھی حیثیت والے اب پیٹ بھر کر اپنے بچوں کو کھلانے سے عاجز ہیں، تو ان غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو جو دن رات محنت کرتے، اپنی ہڈیاں پیستے ہیں اور پھر بھی بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے قابل نہیں کماسکتے۔ اس پر غور کرنا چاہئے کہ اگر بچوں کی تعداد یوں ہی ہر سال یا دوسرے سال بڑھتی رہی تو ماں کی، باپ کی اور خود بچوں کی کیا حالت ہوگی اور کیا انجام ہوگا۔ مانا کہ بچہ رحمتِ الٰہی اور نعمت

لیکن جب ہم اپنے نونہالوں کی اچھی طرح پرورش نہ کرسکیں، ان کو پیٹ بھر کر نہ کھلا سکیں، ان کا تن نہ ڈھانک سکیں، انھیں اچھی تعلیم و تربیت نہ دے سکیں، ان کو اچھا شہری نہ بنا سکیں تو محض ملک کی آبادی کی گنتی بڑھانے سے فائدہ؟ نہ اپنا دل خوش ہو نہ دوسرے کا۔ نہ دین کا بھلا نہ دنیا کا ـــــ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے اور اس بارے میں دونوں کو سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد فیصلہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اپنی مالی حالت، یا جسمانی صحت یا کسی اور وجہ سے بچوں کی گنتی بڑھانا نہیں چاہتے تو انھیں اپنے پر کچھ پابندیاں عائد کرنی چاہئیں خواہ وہ اخلاقی ہوں یا خارجی ـــــ اور اگر یہ نہیں کرسکتے تو پھر جو بھی نتائج ہوں ان کو خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سہنا چاہئے ...... اگرچہ بظاہر یہ مشکل نظر آتا ہے

کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے کہ میاں بیوی باوجود محبت اور یک جہتی کے نہیں چاہتے کہ بچہ پیدا ہو۔ یہ کیفیت نئی شادی شدہ جوڑوں میں زیادہ تر ہوتی ہے، انھیں اکثر یہ خوف ہوتا ہے کہ دوسرے کی محبت اور توجہ کم ہو جائے گی۔ میاں سمجھتا ہے کہ بچہ اس کا رقیب ہوگا (گیا ہے) جو اس کی جگہ بیوی کی محبت کا مرکز بن جائے گا۔ بیوی کو ڈر ہوتا ہے کہ بچہ ہونے سے پہلے اور بعد نہ شوہر کی اتنی ناز برداری اور اس کی خواہشوں کی تعمیل نہ کرسکے گی جتنی اب کرتی ہے، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس سے بیزار یا بے تعلق ہو جائے اور دوسری چیزوں یا دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ خوف عورت کے لئے سوہان روح ہو سکتا ہے اور وہ بچے جیسی بے بہا اور انمول دولت سے گھبرانے لگتی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے اور سمجھ داری سے کام لیا جائے تو یہ خوف بے بنیاد ہے۔ اگر میاں بیوی کی ازدواجی محبت کی بنیاد ایک دوسرے کو سمجھ کر چاہنے، دوسرے کی حالت اور کیفیت کو اچھی طرح جاننے اور اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے پر ہے، تو بچہ ان مسرتوں کو دائم و قائم بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ وہ جذباتی محبت جو ابتدا میں نفسانی خواہشات پر مبنی ہوتی ہے بچے کی پیدائش کے بعد زیادہ پائدار، زیادہ پاکیزہ اور استوار ہو جاتی ہے بچہ انھیں ایک اٹوٹ سنہری زنجیر میں باندھ دیتا ہے۔

بعض اوقات اس کے برعکس بچے کا نہ ہونا میاں بیوی کی محبت کو ختم کر دینے اور ان کے تعلقات بگاڑنے کا باعث بن جاتا ہے۔ دونوں اس بے بہا دولت کو حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوتے ہیں لیکن قدرت انھیں اس سے محروم رکھتی ہے یا دے کر چھین لیتی ہے ایسی صورت میں اکثر تو شوہر دوسری شادی کر کے پہلی سے قطع تعلق کر لیتے ہیں، ورنہ پھر دونوں عمر بھر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں۔ مرد تو پھر بھی اپنے کاموں میں منہمک رہ کر اس محرومی کی تلخی کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے لیکن عورت رجس کو ہمارے ہاں کوئی ذہنی اور دماغی مصروفیت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے)، اس کا بہت زیادہ اثر لیتی ہے اور اپنی زندگی بے انتہا تلخ اور بے مزہ کر لیتی ہے جس کا لازمی اثر شوہر پر بھی پڑتا ہے۔ حالانکہ اگر عقل و بصیرت سے کام لیا جائے تو یہی محرومی میاں بیوی کی دائمی اور لازوال محبت کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ قدرت سے لڑائی لڑنا انسان کے بس سے باہر ہے لیکن اپنی زندگی کو جنت یا جہنم بنانا خود اس کے ہاتھ ہے۔ اگر میاں بیوی حقیقت میں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو بغیر بچے کے بھی ان کی زندگی محبت اور مسرت سے بھرپور اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک حد تک ان لوگوں سے زیادہ جو بچے والے ہیں محبت کا وہ حصہ جو عام طور پر بچے بٹا لیتے ہیں وہ ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسی صورت میں دونوں کو ایک دوسرے کے نازک احساسات اور جذبات کا اور زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ بچے کی خواہش اور محبت عورت کی طبیعت کا لازمی جزو اور قدرت کا ودیعت کیا ہوا عطیہ ہے۔ اس کی مامتا کی تسکین کے لئے بچے کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کی طبیعت میں تلخی اور زندگی میں بے کیفی پیدا ہو جائے گی یہ بات کسی حد تک ضرور درست ہے کہ عورت کو قدرتی طور پر بچوں سے لگاؤ اور محبت ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت اس سے محروم ہے کہ اس کے اپنے اولاد ہو تو کیا دنیا میں بچوں کا کال ہے؟ وہ اپنی مامتا کی نعمت سے دوسرے بچوں کو بہرہ ور کر سکتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا ہوگا جو بچوں کی بھوکی عورت اپنے بچے سے محبت کرنے سے روکے اور ہمارے گرد و پیش کتنے ہی ایسے بچے ملیں گے جو مامتا کی بیش بہا نعمت سے محروم ہیں جب عورت اتنا بڑا ظرف اور وسیع دل رکھے کہ غیر کے بچے کو بھی اپنا بچہ سمجھ کر محبت کر سکے تو وہ اس بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہے جو نسوانیت کی معراج ہے

بہرحال ازدواجی زندگی کا مسئلہ جو ہمارے ہاں بڑا پیچیدہ اور کٹھن بن چکا ہے ہرگز ایسا نہیں جسے سلجھایا نہ جا سکے اور جسے میاں بیوی دونوں دل و جان سے کوشش کر کے حل نہ کر لیں۔ زندگی میں انسان کو خدا نے یوں تو لاکھوں نعمتیں بخشی ہیں لیکن ان میں سب سے بڑی نعمت وہ محبت اور رفاقت ہے جو مرد اور عورت زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کے رفیق بن کر حاصل کرتے ہیں۔ ان انمول دولت کو یوں مٹی میں ملانا اور ان مسرتوں کو اپنی ناسمجھی خود غرضی اور خود پسندی کی بدولت مٹا دینا بہت بڑا کفران نعمت ہے۔ اس سے صرف میاں بیوی کی اپنی ہی نہیں بلکہ ان کے دوسرے عزیزوں کی خاص طور پر ان کے بچوں کی زندگیاں بھی عذاب بن جاتی ہیں ماں باپ کی ان بن، نااتفاقی اور جھگڑوں کا اثر بچوں پر بڑا گہرا پڑتا ہے اور ساری عمر یہ اثرات ان پر سے دور نہیں ہو سکتے۔ کاش ہم اس راز کو سمجھ لیں کہ ہماری (اور ہمارے بچوں کی) عافیت اور مسرت بھی، بلکہ دنیا کی مسرت اور خوش حالی کا راز بھی گھریلو مسرت اور خوش گوار ازدواجی زندگی میں پنہاں ہے

آزادی کی زنجیریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

پر اپنی تیمارداری کا بوجھ ڈالنے کو میری غیرت کسی طرح گوارا نہیں کرتی۔ اب رہا یہ کہ اسپتال میں کمرہ لے کر رہوں یہ مجھ جیسے قدامت پرست مذہبی خیال کے آدمی کے لئے ناممکن ہے۔ میں تو اسپتال کے بستر یا نی یہاں تک کہ زمین کو بھی اگر ناپاک نہیں تو مشکوک سمجھتا ہوں اور نہ وہاں وضو کر سکتا ہوں نہ نماز پڑھ سکتا ہوں نہیں بھائی صاحب مجھے تو اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں، یہیں اپنے گھر میں بسر کرنے دیجئے جہاں میں اپنے معمول کے مطابق اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکتا ہوں، اب میں ڈاکٹروں کا سہارا ڈھونڈنا نہیں چاہتا بلکہ خدا سے لو لگانا چاہتا ہوں۔"

(باقی آیندہ)

تھائی لینڈ

(بہ سلسلہ صفحہ ۷)

سے اگر کوئی بھی کمیونزم کے چکر میں آگیا تو کمیونزم کا دھارا سارے جنوب مشرقی ایشیا کو بہا لے جائے گا اس خطرے کے پیش نظر امریکہ نے ہند چینی اور تھائی لینڈ دونوں کو بہت سی مالی اور فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ امریکہ نے چین میں مارشل چیانگ کائی شک کی حکومت کو بھی اسی قسم کی مالی اور فوجی امداد دی تھی۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہاں اسے کتنی زبردست شکست ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ امریکہ نے اس تجربے سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور اب بھی وہ رجعت پسند اور سامراجی عناصر کی امداد کرنے پر تلا ہوا ہے۔

پچھلا ہفتہ (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

دو پڑوسی ملکوں میں جو ذہنی اور علمی تعلق تقسیم کے باوجود قائم تھا وہ منقطع ہو جائے گا۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ لائسنس کی وجہ سے کتابوں کی تجارت قریب قریب ختم ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے ملک کو جو علمی اور مالی نقصان پہنچ رہا ہے اس کا حکومت کو صحیح اندازہ نہیں ہے۔ ورنہ غالباً وہ ایسا قدم نہ اٹھاتی جس سے کتابوں کی تجارت کو جس کی ہماری قومی اور ملی زندگی میں بہت بڑی اہمیت ہے، انتشار یا خطرہ لاحق ہو جاتا!"

انھوں نے اس بات کی شکایت کی کہ پبلشرز کے ساتھ حکومت کا رویہ انتہائی غیر ہمدردانہ ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں نشر و اشاعت اور علمی کام کرنے والوں کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جاتی ہے، اور کتابوں کی تجارت پر ایسے محاصل عائد نہیں کئے جاتے جس سے علم کی ترقی میں رکاوٹ ہو مگر پاکستان کے درآمد برآمد اور کسٹم والے محکموں کا سلوک انتہائی تکلیف دہ اور حوصلہ شکن ہے۔ (ع، ل)

تبصرہ

جلوۂ صد رنگ

باقر رضوی

جلوۂ صد رنگ: حبیب احمد صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی کا مجموعۂ کلام
مطبوعہ انتظامی پریس، کان پور
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
کتاب پر سن طباعت درج نہیں، اس لئے معلوم نہیں ہوتا کہ کب چھپی۔ بازار میں ابھی چند مہینے ہوئے آئی ہے
قیمت تین روپے (سے ر)

صدیقی کے اس مجموعے میں سنہ ۱۹۳۰ سے لے کر سنہ ۱۹۴۵ تک کی غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ اس میں سے بیشتر غزلیں اور نظمیں غیر مطبوعہ ہیں اور اس کی اصل وجہ انسان کی فطری کمزوری خود نمائی کے خلاف صدیقی کی کم نمائی، کم آمیزی اور دیر آشنائی ہے۔ ہم ان کے کان پور کے دوستوں کے ممنون ہیں جن کے اصرار سے یہ مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ ستارہ یوں ہی گمنامی کے بادل میں چھپا رہتا اور ان کے مخصوص دوستوں اور جاننے والوں کو چھوڑ کر کسی کو صدیقی کی شاعری کا علم بھی نہ ہوتا اور یہ صدیقی ہی کے لئے نہیں بلکہ اردو ادب کے لئے ایک ناخوش گوار سانحہ ہوتا۔

اس مجموعے میں صدیقی کی ۸۱ غزلیں اور ۱۳ نظمیں ہیں۔ فہرست میں غزلوں کے مطلع کا پہلا مصرع اور نظم کے عنوان دئے گئے ہیں تاکہ تلاش میں آسانی ہو۔ مصنف نے چند سطریں "ترتیب اور شکریہ" کے عنوان سے لکھی ہیں اور مجنوں گورکھپوری نے پانچ چھ صفحہ کا ایک مختصر مگر جامع "پیش لفظ" لکھا ہے۔

مجموعے میں ایک تصویر بھی ہے۔ جس پر اگرچہ نام نہیں ہے مگر غالب گمان یہی ہے کہ خود مصنف کی ہے۔ "جلوۂ صد رنگ" ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر غزل اور نظم کے نیچے جائے تحریر اور تاریخ تحریر درج ہے لیکن ترتیب میں ردیف، تاریخ تحریر یا مقام تحریر کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ بے ترتیبی ہی اس کی ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کتابت میں اکتا دینے والی یکسانیت ہے۔ ہر شعر کے دونوں مصرعے ایک ہی سطر میں لکھے گئے ہیں۔ گو طباعت اور کتابت اچھی ہے، پھر بھی کتابت میں ذرا تنوع سے کام لیا جاتا تو مجموعے کے ظاہری حسن میں اضافہ ہو سکتا تھا اور اس کی دیدہ زیبی اور بڑھ سکتی تھی۔

مجموعے کو شروع سے آخر تک پڑھ جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی کی طبیعت کو غزل سے خاص لگاؤ ہے نظم سے مزاج کو مناسبت نہیں۔ ان کی نظمیں بھی غزل نما ہیں۔ اس لئے اچھا تو یہ تھا کہ یا تو ان نظموں کو سرے سے ہی مجموعہ میں شامل نہ کیا جاتا یا اگر کسی نہ کسی وجہ سے ان کا شامل کرنا ضروری تھا تو انھیں اور تھوڑی ترمیم و تنسیخ کے بعد آسانی سے غزل مسلسل کا روپ دیا جا سکتا تھا۔

صدیقی کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت خیال اور انداز بیان کی پختگی ہے۔ ان کی غزلوں سے اضطراری اور اضطرابی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان کے جذبات کے منہ میں فکر و تامل کی لگام لگی ہوئی ہے اس لئے ان کا توسن سخن سوچ سمجھ کر وقار و متانت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے، اس میں شوخی، چھل بل اور چلبلاہٹ نہیں ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات کا سمندر اتھلا اور پایاب نہیں۔ اس میں ایک معنی خیز گہرائی اور وسعت ہے۔ ان کے یہاں آپ کو سطحیت ڈھونڈھے نہ ملے گی۔ بیشتر کلام ایک خاص قسم کے متفکرانہ انداز میں ڈوبا ہوا ملے گا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی غزلوں میں ایک مخصوص اور چوکھا انفرادی رنگ بھر دیا ہے۔

ان کے شعر مشاعروں میں "تحسین ناشناس" کے لئے نہیں، سخن شناسوں کا سکوت ہی ان غزلوں کی سب سے بڑی داد ہے۔ ان کی غزلوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک خاص قسم کے پاکیزہ ذوق اور جلا کئے ہوئے شعور کی ضرورت ہے۔ تنہائی میں ان کے شعر پڑھئے تو آپ کو عجیب لطف آئے گا اور ان کی عظمت اور شاعرانہ برتری کا احساس آپ کے دل میں گھر کرنے لگے گا اور "بقول مجنوں یہ غالب اور عرفی کے مطالعے کا صالح اثر ہے۔

جو لوگ خالص جذباتی شاعری کو وقیع سمجھتے ہیں، انھیں ان کے کلام سے مایوسی ہوگی، کیونکہ صدیقی کے خیال میں وقیع شاعری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ جذبات اور فکر و تامل شیر و شکر نہ ہوں، اور دونوں شعر کے قالب میں ایک رچے ہوئے رنگ میں پیش نہ ہوں"۔

انداز بیان میں بھی وہ اپنی فطری شائستگی، متانت، وقار اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی غزلوں میں ہر جگہ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور ایک خاص رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ کا پتہ چلے گا۔ جوش و خروش اور خطیبانہ انداز سے ان کا کلام یکسر پاک ہے۔ وہ اپنے جذبات اور خیالات کو مبہم کنایوں اور لطیف اشاروں میں ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی ٹھیٹھ زبان میں شاعری کی ہے۔ ان کے یہاں آپ کو غزل کی خالص نفیس اور نازک زبان میں بلند سے بلند پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات ملیں گے۔

صدیقی کی غزلیں پاکیزگی، نفاست، صفائی اور نزاکت کے لحاظ سے بلور کا ایک ہشت پہل ٹکڑا ہیں اور بلور کے اس ٹکڑے پر جب پڑھنے والے کے ذہن کی شعاعیں پڑتی ہیں تو شیشے کے اس سفید اور شفاف ٹکڑے میں سے "جلوۂ صد رنگ" نظر آتا ہے۔ شاعری کے اس گندم نما جو فروشی کے دور میں جب "پیدا گروں" نے چھوٹے رنگیں اور نظر فریب شیشوں کے ٹکڑوں سے اپنی شاعری کی دوکانوں کو سجا رکھا ہے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ بلور کے اس قسم کے اصلی اور صاف ستھرے ٹکڑوں کی تنقید کی روشنی کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے۔ اس سے دو بڑے مقصد پورے ہوں گے، ایک طرف تو چھوٹے شیشوں کا بازار گرم کرنے کا مصنوعی موتی بے آبرو ہوں گے اور دوسری طرف بلور سامنے آئے گا سچے موتی بازار میں بکنے لگیں گے اور گاہکوں کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس کی نگاہیں بھول کر بھی مصنوعی موتیوں اور چھوٹے رنگین شیشوں پر نہ پڑیں گی۔

صاف صاف یوں کہہ لیجئے کہ اس افراتفری کے دور میں صدیقی جیسے شاعروں کی صالح سنجیدہ صحت مند اور زندگی سے بھرپور شاعری کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی شدید ضرورت ہے۔ اس سے ایک طرف تو غزل سے بے اعتنائی کا جو رجحان پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہوگا اور دوسری طرف بہت سے اچھے شاعر جو جدید شاعروں کی طوفان بدتمیزی کو دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے تھے پھر بحر سخن کی شناوری اور غواصی کر کے ایسے ایسے موتی نکالیں گے جو اردو شاعری کے تاج میں ایک نیا حسن پیدا کریں گے۔

ہر سخن فہم اور اردو دوست کا یہ فرض ہے کہ اس قسم کے شاعروں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرے اور ان کے کلام کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور تبلیغ میں اپنے مقدور بھر کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہاں صدیقی کے کلام کا ایک مختصر انتخاب دیا جا رہا ہے، تاکہ صالح ذوق سخن شناسی کی تشکیل و تبلیغ ہو:-

مختصر انتخاب

عذاب جان ہے زندگی جو دل ہے وقف آرزو
عذاب جان ہے زندگی جو دل میں آرزو نہیں

اک مستقل جمود ہے ایک مستقل سکوت
آتا ہے دل میں وہم کہ منزل نہ ہو کہیں

Printed at Jayyed Press, Delhi.

Printer & Publisher : Abdul Latif Azmi B. A., (Jamia)

پندرہ روزہ

نئی روشنی

नई रोशनी

۳/

فہرست مضامین

جلد ۵ | ۱۶ راگست ۱۹۵۰ء | نمبر ۷

آزادی کی زنجیریں (مسلسل ناول) ڈاکٹر سید عابد حسین ۲
پچھلا ہفتہ
ہند اور بیرون ہند میں ع - ح - ع - ل ۳
کشکول ۵
یہ دورنگی کب تک (نظم) سیدہ فرحت ۵
نئے ادیب کی کہانی بیگم شفیع احمد قدوائی مرحوم ۶
آرٹ کی تعریف اور آرٹسٹ کا تعارف } عبدالحلیم انصاری ۸
ایک ضروری خط ۸
جدید یونان کی ٹریجڈی محمد امین ۹

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی

نئی روشنی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

پچھلا ہفتہ

ہند اور بیرون ہند میں

"نئی روشنی" کو بند کرنے کا فیصلہ

ہمارے اور آپکے سئے یعنی "نئی روشنی" کے خادموں اور اس کے قدردانوں کے لئے پچھلے ہفتے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ جو احباب اس اخبار کو چلا رہے تھے انھوں نے بادل ناخواستہ اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال اسی زمانے میں ہم نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید ہم کو مجبور ہوکر اخبار بند کرنا پڑے اس پر ہمارے بعض قدردانوں نے جن کی رائے ہمارے لئے قابل احترام ہے بڑی شدت سے اصرار کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے نئی روشنی کو چلاتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے پھر ایک مرتبہ ہمت باندھ کر اپنا سارا زور لگا دیا کہ انتظام کو بہتر کرکے خرچ کو گھٹا کر اور آمدنی کو بڑھا کر اخبار کو خود کفیل بنائیں۔ انتظام کو سدھارنے اور خرچ کو گھٹانے میں تو کچھ کامیابی ہوئی لیکن آمدنی انتہائی کوشش کے باوجود نہیں بڑھ سکی۔ نئی روشنی جیسا اخبار جو عام معیار کی پابندی کرنے کے بجائے اُسے بلند کرنا چاہتا ہے اور عام مذاق کی تقلید کی جگہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے کسی ملک میں بھی ہردلعزیز نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اور خاص کر اردو داں طبقے میں اس کا قبول عام حاصل کرنا اور وہ بھی آج کل بہت مشکل تھا۔ پھر بھی جہاں تک مستقل خریداروں کا تعلق ہے ان کی تعداد خاصی معقول ہو گئی۔ لیکن ایجنٹوں کے ذریعے سے فروخت کرنے کی کوشش جس پر اخبار کا چلنا منحصر ہے قطعاً ناکام رہی۔ معتبر ایجنٹ بہت کم مل سکے۔ اکثر حضرات کا رویہ کچھ ایسا رہا کہ جب تک قیمت کے وصول کرنے میں ڈھیل دی گئی وہ خاصی بڑی تعداد میں اخبار منگواتے رہے لیکن قیمت کا تقاضا کیا گیا تو ان کا جواب آیا کہ اخبار بکتا نہیں، بھیجنا بند کر دیجئے۔ اسی طرح اشتہار کے معاملے میں تلخ تجربے ہوئے۔ اس میں تو کوئی شکایت کی بات نہیں کہ محدود اشاعت کی وجہ سے اشتہار کم ملے لیکن اجرت کے وصول کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ ضرور افسوسناک ہیں۔ بہرحال ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مستقل خسارہ ہوتا رہا جس کا برداشت کرنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں وہی اخبار چل سکتا ہے جو کسی سیاسی پارٹی سے براہ راست تعلق رکھتا ہو یا دولت مند ارباب غرض کے کسی حلقے کا آلہ کار ہو علم و تعلیم کے خادموں کے ایک چھوٹے سے حلقے کا اخبار سوا دو برس چل گیا یہی تعجب ہے۔

بہرحال ہم انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ۲۳ اگست کا پرچہ شائع کرنے کے بعد نئی روشنی کو بند کر دیا جائے گا۔ اس پرچے میں ہم رخصتی اداریہ لکھیں گے جس میں پچھلے دو برسوں کے حالات کا جائزہ لے کر یہ دکھائیں گے کہ ہمارا ملک کدھر جا رہا ہے اور دنیا کدھر جا رہی ہے اور آنے والے زمانے میں "نئی روشنی" کے طرز خیال سے اتفاق رکھنے والے حضرات کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ اپنے خیالات کے اظہار اور اشاعت کا جو ممکن ذریعہ ہمیں ملے گا اس سے کام لیتے رہیں گے اور ان سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ اس وقت تو ہمیں اخبار کے مستقل خریداروں سے یہ التجا کرنی ہے کہ اُن کا جتنا چندہ ہمارے ذمے باقی ہو اس کے عوض یا تو مکتبہ جامعہ کی مساوی قیمت کی مطبوعات منگا لیں یا رسالہ پیام تعلیم اپنے بچوں کے نام جاری کرا لیں اگر یہ دونوں صورتیں منظور نہ ہوں تو ہدایت فرمائیں کہ بقیہ چندہ منی آرڈر سے آپکی خدمت میں روانہ کر دیا جائے۔

پنڈت نہرو اور کانگریس

پارلیمنٹ میں نہرو لیاقت معاہدے کے بارے میں جو بحث ہوئی اس کے سلسلے میں یہ بات اور اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ پنڈت نہرو کانگریس پارٹی کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس معرکے کی تقریر میں جس میں پنڈت جی نے شری شاما پرشاد مکرجی اور دوسرے نقادوں کے اعتراضوں کا مدلل جواب دیا۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ تقسیم ہند کو منسوخ کرنے، مغربی اور مشرقی بنگال میں تبادلۂ آبادی کرنے یا پاکستان سے مزید علاقہ مانگنے کی جو تجویزیں شری مکرجی اور ان کے ہم خیالوں نے پیش کیں وہ توقع کے خلاف نہ تھیں۔ خلاف توقع اور قابل افسوس بعض کانگرسی ممبروں کا رویہ ہے جو کانگریس کے بنیادی، اخلاقی اصولوں اور اس کی بہترین روایات کو پس پشت ڈال کر ان تجویزوں کی کھلی یا چھپی تائید کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے ممبروں کی تعداد زیادہ نہیں اور پارلیمنٹ کی کانگریس پارٹی کی بہت بڑی اکثریت فرقہ وارانہ مسائل اور ہندو پاکستان کے تعلقات کے بارے میں معقول اور منصفانہ رویہ رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات بجائے خود افسوسناک اور خطرناک ہے کہ کانگریس پارٹی کے اندر ان لوگوں کو جگہ مل سکتی ہے اور مل گئی ہے جو اس کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

زیادہ تفصیل سے پنڈت جی نے اس خیال کا اظہار اس بیان میں فرمایا ہے جس میں انھوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ کانگریس کے صدارتی انتخاب سے اپنا نام واپس لیتے ہیں ہم اس بیان کے متعلقہ ٹکڑوں کو ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

"مجھے ذاتی طور پر بڑی تشویش ہے کہ لوگوں نے بعض بنیادی اصول جن کی کانگریس ہمیشہ علم بردار رہی ہے، بھلا دئے ہیں اگر یہ بنیاد مٹ گئی تو جو عمارت اس پر بنے گی وہ کب تک رہ سکتی ہے اور اگر رہی بھی تو اس سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا؟ اس لئے مجھے یہ بات نہایت اہم معلوم ہوتی ہے کہ ہم کانگریس کے پرانے اصولوں کو مشعل راہ بنائے رکھیں۔ ان کی پھر سے وضاحت کریں اور ان کی پابندی پر زور دیں۔

پارلیمنٹ میں حال میں جو بحث ہوئی اس میں میں نے بعض اصولوں پر جن کی کانگریس ہمیشہ علم بردار رہی زور دینے کی جسارت کی ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ خود کانگریس والوں میں سے بعض ان سے بہت دور ہٹ گئے ہیں اور ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جن سے کانگریس کا ذہن بالکل بیگانہ ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ ناسک کانگریس اس کام کا بیڑا اُٹھائے گی کہ کانگریس پارٹی کے طرز خیال کی وضاحت کرے اور یہ اعلان کر دے گی کہ پرانے نصب العین بدستور قائم ہیں۔ اور سیاسی، فرقہ وارانہ اور دوسرے مسائل کے حل کرنے کے لئے اب بھی پرانے طریقوں کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ کانگریس کے جسم و روح کو ایک ایسا روگ لگ گیا ہے جو ممبروں کی تعداد کے بڑھنے سے دور نہیں ہو سکتا اس کے لئے اندرونی تدبیروں کی اور بنیادی علاج کی ضرورت ہے۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ ایک نازک موقع ہے اور اس وقت اصول افراد سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ انھیں پرانے اصولوں کی بنا پر سب فیصلے کئے جائیں گے اور کانگریس کا کام چلایا جائے گا۔"

آخری جملے میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو پنڈت جی سے اس معاملے میں رہنمائی چاہتے ہیں کہ کانگریس کے صدارتی انتخاب میں کسے ووٹ دیں۔ موصوف نے وزیراعظم کی حیثیت سے جہاں صدارت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے وہاں اس بات کو بھی نامناسب سمجھا ہے کہ کسی خاص اُمیدوار کی تائید کریں۔ انھوں نے اس بات پر زور دینا کافی سمجھا ہے کہ ترجیح اس امیدوار کو دی جائے جو سیاسی مسائل، فرقہ وارانہ مسائل اور دوسرے معاملات میں کانگریس کے پرانے اصولوں کا قائل اور ان پر عامل ہو۔ ہمارے خیال میں ان میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس معیار پر موجودہ اُمیدواروں میں شری شنکر راؤ دیو پورے اُترتے ہیں اور ہر سچے کانگرسی کا فرض ہے کہ شری دیو کو ووٹ دے اور اُن ہی کے لئے کوشش کرے۔ لیکن اگر قرعۂ فال کسی اور کے نام پڑا تو اُسے پنڈت نہرو کا اشتراک عمل حاصل کرنے کے لئے صاف لفظوں میں اعلان کرنا ہوگا کہ وہ کانگریس کے بنیادی اخلاقی اصولوں پر عمل کرے گا جن میں فرقہ وارانہ اتحاد اور اقلیتوں کے ساتھ انصاف خاص اہمیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ پنڈت جی کے اشتراک عمل کے بغیر کوئی کانگریس کا پریسیڈنٹ اپنا کام نہیں چلا سکتا

کشکول

"تکلیف؟ اجی نہیں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ عین راحت ہے۔ میرے لئے بھی اور میری چھتری کے لئے بھی۔ کیا فرمایا؟ آپ کو چھیلتے چھتے لگ جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں میرا دل ـــــ نہیں لاحول ولا قوۃ ـــــ میرا گھر بھی اسی طرف ہے۔ بھیگ جائیے گا ہیں۔ جی جگہ؟ ہاں تھوڑا سا چکر ضرور ہے۔ مگر اس میں کیا ہرج ہے۔ ذرا دیر اور تفریح ہو جائے گی۔ اس خوش گوار موسم میں جتنی سیر ہو اچھا ہے"

(خدا کی لعنت اس خوش گوار موسم پر، اور اس کم بخت مروت پر۔ آخر مجھے کیا ضرورت تھی کہ اس قیامت کی بارش میں اپنی ہتھیلی برابر چھتری میں ایک اور آدمی کو شریک کر لوں، اور یہ آدمی ہوتا تب بھی غنیمت تھا، پورا ارنا بھینسا ہے۔ کوئی پوچھے تو چھتری کی پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ تیری یہ موٹی کھال کس برساتی سے کم ہے۔ نامعقول دُہرا مزا لوٹ رہا ہے ایک تو خود بارش سے بچنے کا، دوسرے مجھے بھگونے کا۔ ذرا چھتری اپنی طرف کرتا ہوں تو پیچھے کو کھا اٹھا کر مجھے پانی سے باہر کر دیتا ہے)

"جی ہاں بڑے مزے کی بات ہے، اور ہوا کی چاپ۔ سبحان اللہ بھادوں ہی ہے نا۔ مگر جس کے پاس چھتری موجود ہو اسے کیا پروا ہے۔ نہیں نہیں یہ محض آپ کا خیال ہے۔ میں کہاں بھیگ رہا ہوں؟ بس ذرا سی بوچھار سر پر پڑ رہی ہے اور گرمی بھی۔ سچ پوچھئے تو مجھے مینہ میں نہانا بڑا اچھا لگتا ہے۔ چھتری تو آپ کی وجہ سے کھول لی تھی، ورنہ بند کر کے بغل میں دبا لیتا"

(آخر میں اس قدر بے تحاشا جھوٹ کیوں بول رہا ہوں۔ سر سے پاؤں تک اولتی لگ رہی ہے، بلکہ پرنالہ کہنا چاہئے۔ ٹوپی سے بالوں میں اور بالوں سے مغز کے اندر تک، اچکن اور کرتے سے گذر کر بنیان میں اور پیٹھ سے ریڑھ کی ہڈی کے گودے تک پانی کی دھار کنکھجورے کی طرح رینگتی چلی جا رہی ہے اور اوپر سے تیز ہوا کے جھونکے برف میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح لگ رہے ہیں۔ یا اللہ میرے گناہ بہت ہیں مگر کیا سب کی سزا آج ہی مل جائے گی)

"ہائے مر گیا! توبہ! توبہ! آپ معافی کا نام لے کر مجھے ناحق گنہگار کرتے ہیں۔ بھلا آپ میرا پاؤں کاہے کو کچلتے؟ غلطی میری تھی کہ اپنا پاؤں آپ کے پاؤں کے نیچے رکھ دیا۔ درد؟ جی نہیں درد بالکل نہیں ہوا، وہ تو ندامت کے مارے منہ سے چیخ نکل گئی تھی"

(خدا غارت کرے موذی کو۔ ایک تو اتنے بھاری گھر اور پھر بغل چڑھے ہوئے کیسی ہرے ہوئے سر۔ پانی کے لکڑ نوٹ خرید لایا ہے اور رستے کیلیں جڑوائی ہیں کہ گندار کہیں کا۔ کس رعونت سے رپ رپ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ جوتوں میں پانی بھر جانے سے جیب جیب کی آواز نکلتی ہے تو شرم آتی ہے)

"ارے لاحول ولا قوۃ! نہیں، نہیں آپ کے دھکے سے نہیں محض اتفاق سے میرا پاؤں گڑھے میں پڑ گیا۔ کیچڑ؟ جی ہاں کیچڑ جوتوں میں ضرور بھر گئی ہے۔ مگر یہ تو اچھا ہی ہے۔ اب پانی اندر نہیں جا سکے گا۔ (آچھیں) کیا فرمایا زکام؟ جی کچھ یوں ہی سا ہلکا ہلکا اور وہ بھی اب جاتا رہے گا۔ مجھے تو خشکی سے زکام ہوتا ہے۔ جہاں تری پہنچی اور ایسا غائب ہوا جیسے ــــــــ مطلب یہ کہ بالکل غائب ہو جاتا ہے (آچھیں آچھیں آچھیں) بس ناک کی راہ کھوں کھوں، کھوں کھوں) اور حلق کی راہ بہہ کر نکل جاتا ہے"

(انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آج نمونیہ ہوئے بغیر نہیں رہے گا اور یہ مرض کم بخت ہمارے خاندان کے لئے مہلک ہے۔ دادا ابا اسی میں گئے۔ نانی اماں اسی میں گئیں۔ بس اب اپنا بھی چل چلاؤ ہے۔ خیر کچھ بھی ہو، اس وقت تو دل میں ایک ہی آرزو ہے کہ مجھے نمونیا ہو، خناق ہو، گردن توڑ بخار ہو، جو کچھ بھی ہو وہ اس ارنے بھینسے کو ضرور لگ جائے۔ جو بھلے آدمیوں کی مروت سے فائدہ اٹھا کر ان کی چھتری میں آن گھستا ہے)

یہ دورنگی کب تک

سیدہ فرحت

چھائی ہوئی آکاش پہ گھنگھور گھٹائیں
اک کیف طرب خیز سے معمور فضائیں
جو ساز پہ بارش کے سنائے ہیں ہوا نے
وہ گیت بھی کیسے مدھر کیسے سہانے
یہ موجہ و گرداب کی دھمال یہ ہل چل
کیسا نظر افروز ہے یہ رقص مسلسل
ہر شاخِ شجر آج نظر آتی ہے دھانی
گل کیا کہ خس و خار پہ ہے حسنِ جوانی
طاؤس کا یہ رقص یہ چڑیوں کے ترانے
جھولے پہ یہ دیہات کی نوخیزوں کے گانے
اک سمت ہیں فطرت کے یہ معصوم نظارے
ہیں ایک طرف خون کے بہتے ہوئے دھارے
جس کے لئے فطرت نے یہ سامان کیا ہے
وہ موت کی آغوش میں دم توڑ رہا ہے
وہ مادرِ فطرت کی جو آنکھوں کا ہے تارا
وہ جس نے کہ ہے کاکلِ گیتی کو سنوارا
اس محفلِ ہستی کی جو زینت ہے وہ انساں
اب اس کی تباہی کے کئے جاتے ہیں ساماں
دولت کے پجاری وہ زر و سیم کے بندے
انساں کے جو دشمن ہیں وہ خونی درندے
رگ رگ میں بسی جن کے ہے سرمایہ پرستی
برہم کئے دیتے ہیں وہ شیرازۂ ہستی
اے ساتھیو! انساں کی محبت کی قسم ہے
ہاں امن و مساوات کی عظمت کی قسم ہے
ہستی کے دل آویز چمن زاروں کی سوگند
ان کیف میں ڈوبے ہوئے نظاروں کی سوگند
سفاکی و خوں ریزی کی بنیاد ہلا دو
ہاں ظلم کو اب صفحۂ ہستی سے مٹا دو

انسان کو دو موت کے پنجے سے رہائی
للہ سنو مادرِ فطرت کی دوہائی

نئے ادب کی کہانی

بیگم شفیع احمد قدوائی مرحوم

(۱)

اس سے پہلے کہ میں نئے ادب کی کہانی سناؤں [illegible] ہوگا کہ اب سے تیس سال پہلے کی عالمگیر [illegible]، سماجی ہل چل اور اندرونی و بیرونی کشمکش کا حال سنا دوں تاکہ پڑھنے والے اس پس منظر کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں جس میں اردو ادب نئے [illegible] متاثر ہوکر ذہنی انقلاب کا ذریعہ بنا۔

[illegible] نے گزشتہ ٹری جنگ جسے اس [illegible] امن پسند لوگ جنگ عظیم کہا کرتے تھے [illegible] پر بہت سی نئی نئی چیزیں ہندوستان [illegible]۔ مثلاً ڈینگو بخار، انفلوئنزا، ہوائی جہاز [illegible] کی لاج رکھنے والا جاپانی نقلی ریشم اور [illegible] سے بڑھ کر اشتراکیت کا نیا اور انوکھا [illegible] نظریات۔

ان میں سے کچھ چیزیں تو زور شور سے ملک میں داخل ہوئیں، اور کچھ دبے پاؤں اشتراکی تحریک جس طرح خاموشی سے آیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو پائی۔ اور وہ سیدھا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پہنچ کر ملک کے نوجوان دماغوں کو ٹٹولنے لگا۔

ملک میں اس وقت سیاسی بے چینی شروع ہو چکی تھی۔ لڑائی میں بیچارے ہندوستانی زبردستی گھسیٹے گئے تھے۔ خدا واسطے کو گرانی افلاس اور جنگی چندوں نے اس کا قتل کر رکھا تھا۔ لوٹا مارا ملک اقتصادی بدحالی کی بدولت یوں ہی بے اوسان ہو رہا تھا۔ اوپر سے گورنمنٹ نے کالے پیلے قانون گڑھ کر اور بھی مونگ پر سوڑے لگائے۔ حکومت کی مشنری جو دوران جنگ میں صرف روپیہ سمیٹنے اور پروپیگنڈا کرنے کے کام لگی رہی تھی، اک بارگی فاقہ کشی اور نیم جان ہندوستانیوں پر پل پڑی اور اس وقت پہلی مرتبہ ملک کی کارکن جماعتوں کے سامنے ہندوستان کی غلامی بھیانک صورت میں آئی۔ عوام نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، حکومت نے سختیاں کیں۔ آخر مایوسی اور بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہوکر کانگریس کو حکومت سے ٹکر لینے کے سوا چارہ کار نہ رہا۔ حکومت کی سختیاں بڑھیں۔ ملک کی اقتصادی حالت ابتر ہوئی اور ساتھ ہی بین الاقوامی خبروں نے ہندوستانیوں کو یقین دلا دیا کہ وہ بھی باقی دنیا ہی کا ایک حصہ ہیں، اور دور بہت دور کہیں ایک ایسا نظام بھی عالم وجود میں آ رہا ہے جو پس ماندہ انسانوں کو عزت، حکومت اور جینے کا حق عطا کرنے کا مدعی ہے۔

لیکن اس وقت کے اخبارات اور رسائل بولشویک نظام حکومت اور اس کے اشتراکیت و مساوات کے نظریے کو اس بری طرح توڑ مروڑ کر مضحکہ خیز بنا دیا کرتے تھے کہ عام طور پر بہر لغویت اور حماقت کے لئے لفظ بولشویزم استعمال کیا جانے لگا تھا۔ ہندوستانیوں کو یہ نیک مشورہ دیا جاتا تھا کہ سوویٹ روس اور اس کا دین و آئین ایک ایسی مہلک بیماری ہے جس سے قوم کی موت یقینی ہے اور اس میں مبتلا ہوکر انسانی شہری حقوق، عورتوں کی عزت اور مذہب و ملت کوئی چیز بھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔

ایسے ماحول اور اتنی سخت احتیاط و پیش بندی کے باوجود بھی روس کا انقلابی تخیل نہ معلوم کیسے گھس آیا۔ جب آنکھ کھلی تو باغیانہ جذبات ابھر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں اس پر تبصرے ہو رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی بن چکی تھی، اور سیاسیات عالم پر روسی نقطۂ نظر سے غور بھی کیا جا رہا تھا۔

جوں جوں واقفیت بڑھتی گئی، لوگوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بے چینی کیوں نہ ہوتی۔ کمیونزم نے ایک بڑا مسئلہ مزدور و سرمایہ دار کا دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مساوات اور عالمگیر برادری کا سوال اٹھا، اور غریبوں کے معیار زندگی کو اونچا کرنے، طبقاتی فرق کو مٹانے کی تحریک کی۔ یہ ناممکن تھا کہ ہندوستان جو خود ان تمام مشکلات کا شکار تھا، اس سے متاثر نہ ہوتا اور یہ بھی ناگزیر تھا کہ زبان و ادب پر اس کا اثر نہ پڑتا۔

برطانوی حکومت روس کی اس ڈھٹائی پر سٹ پٹانے لگی۔ اس نے پالیٹیکل لینن کو سارے کا سارا گن کر صلواتیں سنائیں، کانگریس کو ورغلایا اور مذہب کے نام پر قدامت پسندوں کو اس سرکش گروہ کے بھڑکا دیا۔

اس سیاسی کشمکش سے آخر ادب کا دامن کہاں تک محفوظ رہتا۔ ادیب اور شاعر سب ہی اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ خود ڈاکٹر اقبال نے انقلاب روس پر اظہار مسرت کیا اور اس جہان نو کی بہتری و بہبودی کی خوش گوار امیدوں کی توقع ظاہر کرتے ہوئے مخلصانہ مشورہ دیا کہ

> بگذر از لا جانب الا خرام

یعنی انکار و نفی کی منزل سے گذر کر ذرا اثبات و ایمان کی طرف بھی ٹہلتے چلے جاؤ۔ ان کا خداشناس دل روس کی لامذہبیت سے خوش نہ ہو سکا۔

ادبی حیثیت سے یہ وہ دور تھا کہ دہلی و لکھنؤ اسکول کے جھگڑے کو اقبال کی پنجابیت طے کر چکی تھی، حکمت، شبلی اور حسرت کسی نہ کسی طرح شعر کو سیاسی رنگ دے چکے تھے۔ اردو ادب میں ناولوں کی بہتات تھی۔ مترجموں کے ڈھیر تھے، معاونین کا انبار تھا، اور اصلاحی و تاریخی مضامین کی افراط تھی۔ مختصر افسانے کی ابتدا ہو چکی تھی اور غزل کی انتہا تھی۔ یہ سب چیزیں زندگی سے کچھ بہت دور نہ تھیں۔ لیکن یہ مانتا پڑے گا کہ اتنی قریب بھی نہ تھیں کہ ہم ان میں اپنے دل کی دھڑکن سن سکیں، آہوں کا دھواں اور تمناؤں کی کشمکش دیکھ سکیں۔ اگرچہ پریم چند کی بدولت دیہات کی سیدھی زندگی منظر عام پر آگئی تھی۔ مگر ریشم میں لپٹی ہوئی اور جوہر میں پڑے ہوئے ہیرے کو کرید نکالنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔

اس وقت کے وضع دار لوگ اپنے خود ساختہ تصورات اور روایتی اصولوں پر چل کر موجودہ زمانے کی کشتی سنبھالنا چاہتے تھے۔ آبا و اجداد کے نقش قدم کو انھوں نے دھرم، کرم کا فلسفہ مان رکھا تھا۔ ادب کو سیاست کے کانٹوں سے بچانے پر آج بھی ان کا ایمان تھا۔ اور اسی وجہ سے ان سرپھرے نوجوانوں کو کلہاڑی پکڑے اور درانتی سنبھالے ہوئے گلستان ادب کی طرف آتے دیکھ کر باغبانوں میں ہل چل مچ گئی۔

ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ آنے والے آئے مگر انھوں نے زیادتی یہ کی کہ کسی سے کچھ دن پہلے ہی اطلاع سے چند انگارے "خرمن ادب پر پھینک مارے"۔ "انگارے" کے مصنفین کا نہ کوئی مقصد تھا نہ خواہش شاید وہ پرانی دنیا والوں کو بس ذرا سا چونکا دینا چاہتے تھے۔ یا پھر ہوا کا رخ دیکھنا مقصود ہو۔ جو کچھ بھی ہو یہ کوئی نہ سمجھ سکا۔ البتہ اس ایک انگارے نے بزرگوں کی محفل میں وہ کھلبلی مچائی کہ مہینوں تقریروں اور تحریر و تقریر کا بازار گرم رہا۔ مصنفین پر کفر کے فتوے لگے، سماج سے اخراج کی دھمکیاں دی گئیں۔ ادھر مصنف دور کھڑے ہوئے اپنی پھینکی ہوئی چنگاری سے لوگوں کی بوکھلاہٹ اور بھاگم بھاگ کا تماشہ دیکھا کیے۔

میری آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ آخر انگارے میں کون سی چیز قابل اعتنا تھی۔ وہ تو چند مہینے بھی زندہ رہنے والی چیز نہ تھی۔ اگر مولویانہ متانت نوجوانی کی اس شرارت سے دست و گریباں نہ ہو بیٹھتی۔ اس تمام جھگڑے کا نتیجہ ہوا کہ نوعمر ادب کا اچھا خاصا پروپیگنڈا ہوگیا، حجاب بھی مٹ گیا، پردے بھی اٹھ گئے، اور کھلے بندوں شاہراہ ادب پر کمیونسٹ خیال کے گھوڑے دوڑنے لگے۔

کچھ ہی روز بعد سازش میرٹھ کا مقدمہ چلا اور کمیونسٹ نوجوانوں کا ایک گروہ اس میں ماخوذ ہوا۔ جلا نے تو ڈر ڈر کر کارروائی شائع کی اور بہت کچھ کھا گئے مگر ستم ظریفوں نے بند کمرے میں دیے ہوئے بیانات کو چھپوا کر تقسیم کیا اور عوام پہلی مرتبہ مارکس اور اس کے نظریے سے آشنا ہوئے۔

انگارے کی اشاعت کے بعد تھوڑے دن سکوت رہا، لوگ نادانی سے سمجھ بیٹھے۔

> "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

چند سنجیدہ سمجھے ہوئے اہل دماغ نئے انقلاب پر سوچ بچار بھی کرتے رہے۔ ایک تو دھرنے کی داستانیں کی

بنا تمائیت کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ ٹالسٹائی کی کہانیاں عوام میں مقبول ہوئیں۔ لیکن ہندوستانی خود ہی قناعت، صبر اور امن پسندی کے شیدائی تھے۔ مدت سے بھیک پیلے کھلونے کھا رہے تھے۔ انھیں تو اس وقت گرما گرم تیکھی چیزوں کی تلاش تھی اور ادب کا مصلحت آمیز تھپکیاں انھیں جمود لنظر آ رہا تھا۔

بہت جلد یہ اطمینان ہیجان میں تبدیل ہو گیا۔ ترقی پسندی کے آسمان سے پے در پے "شعلے، چنگاریاں، بگولے" اور "الاؤ" برسنے لگے۔ قدامت پسندوں نے کوشش کی کہ ادب شعور ملیت اور رومانیت کے سہارے یا پھر مذہب کی سپر سے کر اس آندھی کو سہا لے جائے لیکن دم لینے کا یارا ہی نہ ملا۔ اس تیزی سے نظم و نثر پر انھوں نے دھاوا ڈالا کہ بڑے بڑے سورما میدان چھوڑ کر بھاگے یا اسی رنگ میں رنگ کر ساتھ ہو لئے۔ یہ دیکھ کر "ستارے میں نے کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے" کچھ کف افسوس ملتے ہوئے کنارہ کش ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سی چیزیں ان کا راستہ روکے تھیں۔ ان خیالوں کو بتلائے بغیر ملک و قوم تک اُن کی رسائی ناممکن تھی۔ حکومت اور سماج دونوں ان کے خلاف تھے۔ نہ ان کو مجمع عام میں اظہار خیال کا کوئی موقع انھیں ملتا تھا۔ مگر من چلے لوگ تھے۔ اس لئے سوچ بچار کر انھوں نے یہ راستہ نکالا کہ خود نہ پہنچ سکو نہ سہی۔ اپنے الفاظ اور خیالات تو عوام تک ضرور ہی پہنچا دو۔ دل دماغ اور ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے یہ کامیاب ذریعہ انھوں نے اختیار کیا۔ لیکن ابھی اُن کی سوجھ بوجھ عالم طفلی میں تھی ہر پیلی چیز کو سونا سمجھ کر اس پر روسی ٹکسال کی مہر لگا دیتے تھے۔

نئے ادیب ذہنی اور فرضی چیزوں پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ وہ عالم کو "حلقۂ دام خیال" ماننے سے منکر تھے۔ زندگی ان کی نظر میں جامد یا مستحکم اور انسانیت کی منزل نہیں تھی۔ پرانا ادب انھیں زندگی پر ملمع کرنے والا نظر آتا تھا اور اسی لئے وہ سماج کے ساتھ ادب کا بھی پوسٹ مارٹم کرنا چاہتے تھے۔

نئے ادیب زبان و بیان کے الجھاؤ میں پڑنے کے سخت خلاف تھے۔ وہ ادب کو ملک کی اقتصادی مشکلات، سماجی کشمکش، بھوک، بیکاری، غلامی اور جہالت کا آئینہ بنا دینا چاہتے تھے۔ اپنی کوششوں میں وہ اعتدال کی حد سے بہت آگے نکل گئے۔ چونکہ وہ زندگی کو حرارت، جوش اور عمل سے بھرپور دیکھنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے پابندیوں کی تمام زنجیریں توڑ پھینکیں جس کے جی میں آیا اور جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔

پہلے پہل بہت سی ایسی اس نئے پن سے ایسی پھدی، بے تکی نظمیں کہ سچ مچ جی بھر گیا۔ ایسے ایسے لوگ بھی بقول شاعر

"وہ نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور"

انقلابی شاعر یا ترقی پسند مصنف بن بیٹھے۔ یا کوئی انتہائی لغو بیہودہ سا افسانہ لکھ کر اس پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اور بقول ایک ادیب کے "عوام میں عریاں کہانیوں کے ذریعے رذیل بھوک کی دکانداری کرنے لگے"۔ قوموں کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب جوانی بڑھاپے سے اور تخریب تعمیر سے ٹکرا کر تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ ایسے ہیجانی دور میں صرف تخریبی طاقتیں عروج حاصل کرتی ہیں۔ ہندوستان میں شاید وہ وقت آ گیا تھا۔ تخریب نے پرچم کھول دئے تھے اور ابھی کسی سمجھوتے کا سوال بھی نہ تھا۔ کیونکہ ابتدائی منزلوں میں سمجھوتا نہیں ہوا کرتا۔

کچھ سال بعد [illegible] میں نئی اصلاحات کے ماتحت کانگریسی وزارتیں بنیں اور ملک کی باگ ڈور قلیل عرصے کے لئے عوام کے نمائندوں کے ہاتھ آ گئی۔ بظاہر نوجوان جوشیلا گروہ بہت چراغ پا ہوا۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ

"وزارت کی منزل ہماری نہیں ہے"

نیری کا نشت گریزاں سے ستمگاں وزارت سے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر طبقے سے زیادہ ترقی پسند نوازشوں کے لئے وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسی زمانے میں اُن کی ادبی سرگرمیاں بڑھیں۔ اسی دور میں اُن کے اخبارات و رسائل عالم وجود میں آئے۔ اسی وقت انھوں نے سیاسی طور پر اہمیت حاصل کی۔ اور سیاسی گروہ بڑی بڑی وہ پھر سماج میں شامل ہوئے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن بن تو پہلے چکی تھی مگر کچھ کرکے دکھانے کی مہلت اس کو اب ہی ملی۔ شعراء میں جوش جیسے آتش نوا شعلہ بیان نے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ عارضی حکومت کی پشت پناہی کی بدولت ابھرے ہوئے جذبات کو اظہار کا راستہ انھیں دلوں نظر آیا۔ چونکہ تحریر و تقریر پر سے پابندی ہٹ گئی تھی اس لئے ملکی لٹریچر دھڑلے سے تقسیم کیا۔ کچھ مصنفین نے روسی ادب پر کتابیں بھی لکھیں۔ انقلاب روس کے سرکردہ لوگوں کے کارنامے، اُن کی سوانح عمریاں، چند بلند پایہ روسی افسانوں کے اردو ترجمے اس دور میں ہوئے۔ اس سے پہلے بالشاہی چیخوف اور موپاساں سے لوگ واقف ہو چکے تھے لیکن گورکی اور عہد انقلاب کے شاعروں اور ادیبوں کے ترجموں نے اردو ادب میں اور اضافہ کیا۔

اردو ادب پر اب سیدھی چوٹ پڑ رہی تھی نئی پگڈنڈیاں ہموار کی جا رہی تھیں۔ نئے زاویے بن رہے تھے۔ سوچنے کا طور طریق اور اظہار کا انداز بدل چکا تھا۔ چند ہی دنوں بعد شعر اور افسانے کو زندگی سے اتنا قریب کر دیا گیا کہ شعر کو زندگی کی ایک ضرورت تسلیم کر لینا پڑا۔

بے چارے قدامت پسند چیختے رہے کہ خدارا کیا کرتے ہو، بھلا شعر کی نرم و نازک زمین حقیقت کی کثافت کا اتنا بڑا بوجھ سنبھال سکے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے اپنی فردوس گوش بن جانے والی لطافت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لیکن نئے ادیب کہتے تھے ملک کو اس وقت نہ جنت نگاہ کی ضرورت ہے نہ موج کوثر و تسنیم کی بلکہ

جو ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی"

نئے ادیب جلد ہی قومی تباہی کے بنیادی عناصر دریافت کرنے میں لگ گئے۔ انھوں نے کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آسمان کی وسعت اور زمین کے پھیلاؤ میں نظر ڈالی۔ وہ ذوق سلیم سے محروم نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی دنیا آپ بنانی چاہی۔ اس لئے غلامی اور تقلید سے پہلو بچاتے ہوئے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر تسخیر ادب کرنے چل پڑے۔

چونکہ اس گروہ میں پختہ کاری کا نظم و ضبط نہ تھا اس لئے انھوں نے اول فول بھی بکا اور پتے پتے کی باتیں بھی کہیں۔ اکثر قدامت پسند نہ پاک بازی کو جتانے کے لئے بھی موتی میں کنکریاں پھینک کر چھینٹیں اُڑاتے رہتے تھے ابھی عوام ان سے بدظن تھے، اور غیر مطمئن بھی لیکن اس تیکھے الوکھے اور شوخ ادب میں اتنی کشش تھی کہ بہت جلد لوگ ان کی طرف کھنچنے لگے۔

مخالفین اب بھی برہم تھے کہ نئے ادب نے زبان کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔ سارا کاٹ کباڑ لاکر انتہائی گنوارپن سے ڈرائنگ روم میں ڈھیر کر دیا ہے انسان کے لطیف ترین احساسات و جذبات کو جو اب سے پہلے شاعرانہ کنایہ کے بھی مشکل سے متحمل ہو سکتے تھے عین چوراہے پر ننگا کر دیا ہے۔ ادب کو زندگی کا آئینہ بنانے کے شوق میں یہ لوگ ثقیل تشبیہیں بھدے استعارے اور غیر مانوس ترکیبیں رائج کر رہے ہیں۔ اسلوب بیان کی حلاوت اور تشبیہوں کی ندرت سب خاک مل گئی ہے۔ مثلاً وہ ان اشعار کا حوالہ دیتے تھے۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

یا مشرق کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعر سنائے تھے۔

ایک تنگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

اور مشرق

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں برسوں کا جذام

یا

باہمی نفرت کے شعلے جنگ کی پرہول آگ
پیر زن سرمایہ داری کی ہے بیوہ کا سہاگ

(باقی آئندہ)

ایک ضروری خط

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

میں بڑے شہر ہیں سب سے اہم ہے۔ آمدنی گھٹ جانے کی وجہ سے صاحب خیر حضرات کی توجہ کے متمنی ہیں۔ اور اس سلسلے میں دیگر امداد کے علاوہ زکوٰۃ کی رقموں سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ ان اہم مسائل پر ایک ایڈیٹوریل کے ذریعے پبلک کی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ مشرف کی شکر گزار رہیں گے۔ اگر ان اخباروں کی کاپیاں جن میں اپیل شائع کی جائے اور ایڈیٹوریل لکھا جائے مجھے بھیج دی جائیں تو بہت بڑا احسان ہوگا۔

جدید یونان کی ٹریجڈی

محمد امین

(۱)

۱۹۲۵ء میں امریکہ کے ایک مشہور تاریخ داں جیمس شاٹویل نے کہا تھا کہ "جہاں تک حکومت کا تعلق ہے یونان یورپ کے بدترین ملکوں میں ہے" انھوں نے اپنے بیان پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اپنی معاشی غربت اور سیاسی فرقہ واریت کی وجہ سے یونان بلقان کی ریاستوں میں سب سے زیادہ پست حال اور پیچھے ہے۔" یونان کے لئے یہ بات ۱۹۸۵ء میں بھی اسی حد تک صحیح ہے۔ اس لئے کہ آج بھی سیاسی بحران اور غربت میں یہ اسی قدر مبتلا ہے جتنا وہ ۱۹۲۵ء میں تھا۔

اگر ہم جدید یونان کی تاریخ پر گہری نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ یونان کی پست حالی اس کی دقتوں اور غربت کے کیا وجوہات ہیں۔ بدقسمتی سے اس ملک کا جغرافیہ اس طرح کا ہے کہ کسی نہ کسی بڑی خارجی طاقت نے ہمیشہ سے اس کے اندرونی معاملات میں دلچسپی لی ہے۔ اس پس منظر کے ساتھ آئیے ہم وہاں کے حالات کا جائزہ لیں۔

یونان کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہاں کی سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی بڑی خارجی طاقت کے زیر اثر رہیں، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے۔ روسوفیل یعنی روس دوست، انگلوفیل انگریز دوست یعنی انگریزی۔ فرانکو یعنی فرانس دوست، جرمنوفیل یعنی جرمن دوست، یہ چار وہاں کی خاص خاص سیاسی پارٹیاں ہیں۔ جو ہمیشہ آپس میں لڑتی رہی ہیں۔ ان میں سے جب کوئی ایک پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس نے آزاد اور اپنی قومی روش کی پالیسی نہیں برتی بلکہ ہمیشہ باہر کے ملک کا مفاد اور ترجیح پیش رکھنے پر مجبور رہی۔ ۱۸۳۲ء سے جب کہ موجودہ یونان کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے بڑی طاقتیں ہمیشہ یونان پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں جدوجہد کرتی رہی ہیں۔

یونان کی سیاسی جماعتیں اپنی خود غرضی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی خارجی پالیسی میں بھی شخصی مفاد اور خود غرضی کا رنگ جھلکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ سیاست کے میدان میں ان کا رجحان تعصب اور فرقہ پرستی کی طرف بھی رہا ہے۔ وہاں کی قومی زندگی میں جب کبھی نازک لمحات آئے تو یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی جیسے کہ جنگ آزادی، کریمیا کی جنگ ۱۸۵۴ء کی مقدس نسلی جنگ۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے موقع پر ہر دور میں، یونانی سیاست کے میدان میں غیر متحد تھے اور بڑی طاقتیں اس سے فائدہ اٹھا کر ان کو آپس میں لڑاتی تھیں اور اپنا الو سیدھا کرلی تھیں۔ یونان کی زندگی میں چار مواقع ایسے آئے جبکہ وہاں کی سیاسی جماعت نے بڑی طاقتوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے سامنے ان کی ایک پیش نہ گئی اور آخر میں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ پہلی جنگ اور دوسری جنگ عظیم کے موقع پر مغربی طاقتوں نے پیش قدمی کی اور یونان میں فوج بھیج کر قبضہ جما لیا تاکہ فوجی لحاظ سے روس اس اہم جزیرہ نما پر اپنا قبضہ نہ جما سکے۔

انیسویں صدی میں یونان زیادہ تر روس نواز سیاسی جماعت کے زیر اثر رہا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں کی تہذیب و تمدن اور مذہب بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ یونانی روس کی اس بات سے بہت خوش تھے کہ اس نے عیسائیوں کو ترکی کی جابرانہ آمریت کے چنگل سے نجات دلایا جبکہ مغربی طاقتیں خصوصاً انگلستان سسکتے ہوئے ترکوں کی پشت پناہی کرکے انھیں ابھارتا رہا۔ انیسویں صدی کے آخیر میں بلقان کی کایا پلٹ ہوگئی۔ سلافی قومیت کا زمانہ شروع ہوا اور اس کے عروج کے ساتھ ساتھ روس دوستی کا دور گھٹ گیا۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد وہاں ترقی پسند اور رجعت پرست طبقوں کی کشمکش نمایاں ہوگئی اور روس کا اثر تعلیم یافتہ اور مزدور طبقے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ خیالات کے اس الٹ پھیر کے باوجود یونان کا جغرافیہ جوں کا توں ہے۔ بین الاقوامی شطرنجی چال میں آج بھی یونان کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔ مشرق قریب کے ملک میں یہ اطالوی جرمن سوویٹ برٹش فرنچ اور امریکن سیاسی چالوں اور پالیسی کا مرکز ہے۔

آزادی کی جنگ

۱۸۲۱ء کے دوران میں بڑی بڑی طاقتیں انگلستان، فرانس، آسٹریا اور روس اپنے اپنے پانسے پھینکتی رہیں اور حکمت عملی کے میدان میں اپنی سیاست کے جوہر اور ہتھکنڈے دکھلاتی رہیں۔ سب اپنی جگہ پر ہوشیار تھیں اور موقع کی متلاشی۔ برطانیہ پس و پیش میں تھا اس لئے وہ چپکے چپکے انتظار کرتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وقت آگیا ہے اور رفتہ رفتہ وہ یونانی سیاست کے مستقبل پر فوقیت حاصل کرسکتا ہے تو اس نے کھلے بندوں یونان کے قومی مفاد کی تائید کی۔ اس خوف سے کہ کہیں یونان روس کے حلقۂ اثر میں نہ آجائے برطانیہ نے چالاکی سے ایک محدود رقبے کے اندر اندر خود مختار حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔

روس کی پالیسی یونانی قومی رجحانات کے بارے میں واضح اور صاف تھی۔ وہ عیسائیت کا علمبردار تھا اس لئے ترکی میں جو عیسائی تھے ان کے مفاد کو بچانے کے لئے پہلے کی طرح اب بھی وہ اٹل رہا ------ یعنی وہ چاہتا تھا کہ ترکی کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا کر یونانیوں کو آزاد کرا دیا جائے۔ اور ان کی خود مختار حکومت قائم کی جائے۔ یہ یونانیوں کے دل کی بات تھی۔ اسی لئے وہاں کی عوام کے تمام مغربی طاقتوں کے مقابلے میں روس کی طرف زیادہ مائل تھی۔

حکومت کا کام سنبھالنے کے لئے وہاں جب ایک حکمراں کی تلاش شروع ہوئی تو مغربی طاقتوں نے یونان کو اپنی ڈپلومیسی کا خوب تختۂ مشق بنایا۔ آخر میں باویریا کا ایک رئیس چنا گیا۔ باویریا جرمنی کا ایک حصہ ہے اسی لئے وہاں کی حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر جرمنوں نے فوراً اپنا قبضہ جما لیا۔ آزادی پسند جمہوری اور ترقی پسند عوام کو یہ بات بہت کھلی۔ اس لئے اور بھی کہ یونان کی سلطنت کے جسم سے اس کے بازو جیسے آیونیا کے جزیرے، کریٹ اور یونان کے علاقے کا زرخیز ملک کاٹ کر الگ کر دیئے گئے۔

بڑی بڑی طاقتوں نے یونان کو بہت سا روپیہ بطور قرض کے دینے کا وعدہ کیا جس سے وہاں کی حکومت اور بادشاہت کی ڈھارس بندھی، لیکن اس کے پس پردہ بڑی طاقتوں کی چال تھی اور ایک بار قرضہ لینے کے بعد یونانی حکومت دوسروں کے ہاتھ میں ایک آلۂ کار بن گئی۔ اس غلطی کی وجہ سے بڑی طاقتوں کے لئے یونان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔ ولیم ملر جو یونانی تاریخ کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں "ایتھنس" تین بڑی طاقتوں کی ڈپلومیسی کا خاص تختۂ مشق اور نشانہ تھا۔ انگریز دوست، فرانس دوست اور روس دوست جماعتوں کی سرکردگی کرنے کے لئے ہر ایک کے بہت بڑے بڑے لیڈر سیاست کے میدان میں پیش پیش تھے۔

باویریا کے جرمن رئیس کا نام جو یونان کا حکمراں بنایا گیا آٹو تھا۔ ۱۸۴۳ء تک اس کا دور دورہ تھا اور اس کے جرمن عہدہ دار مطلق العنان تھے لیکن اسی سال ایک ایسا ہنگامہ اور انقلاب برپا ہوا کہ بغیر خون خرابہ کے آٹو کو مجبوراً اپنے جرمن مشیر کار کو برخاست کرنا پڑا۔ اس نے قومی اسمبلی بلائی اور ایک خاص دستور کے مطابق حکومت بنائی۔ بڑی بڑی طاقتوں کے اہل کاروں اور ایجنٹوں نے انقلاب پسندوں کی جماعت کا ساتھ دیا۔ انگریز دوست اور روس دوست جماعتوں نے مل کر آٹو کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح شاید وہ آٹو کی جڑ کھود کر اسے حکومت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیں گے۔

بہت سے بنیادی مسائل جن سے ملک کی ترقی میں روڑے اٹکتے تھے، انقلاب کی وجہ سے وہ ویسے ہی پڑے رہے، بادشاہ اور اس کی خاص جماعت

اپنی مطلق العنانی برقرار نہ رکھ سکا۔ ملکی حالات بہتر ہونے کے بجائے بگڑتے ہی رہے۔ اوٹو کی حکومت کے ماتحت یونانی تھے انھیں آزاد کرانے کی تحریک دب گئی۔ فرانسیسی اور روسی جماعتیں یونان کے حلقۂ اثر کو بڑھانے کی موافق تھیں اور ترکی کی حکومت کے چنگل سے ان علاقوں کو آزاد کرانے میں پیش پیش تھیں جہاں یونانیوں کی اکثریت تھی۔ برٹش اس خوف سے کہ کہیں آیونیا کے جزیرے ان سے چھن نہ جائیں یونان کے حلقۂ اثر کو بڑھانا ناپسند کرتے تھے۔

برطانیہ اپنی پالیسی پر کچھ اس طرح کاربند رہا کہ ایک وقت ایسا آیا کہ ... چھوڑ گئے۔ سب سے پہلے قرض پر سود کا سوال اٹھا۔ پھر ۱۸۵۰ء میں آرین نسل کے خلاف مظاہرے میں برطانوی باشندوں کا جو نقصان ہوا تھا، اس کی واپسی اور ہرجانے کا مطالبہ اٹھا۔ یونانیوں نے اس سے صاف صاف انکار کر دیا اس سے برطانیہ بہت ناراض ہو گیا اور اس نے پائرس کی ناکہ بندی کر دی۔ ایک بار نہیں بلکہ دو تین بار اس کی نوبت آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ کا یہ رویہ بہت ہی ناجائز اور ظالمانہ تھا اور اسی لئے ساری دنیا میں اس کی بہت مذمت کی گئی۔

۱۸۵۳ء میں کریمیائی جنگ کے دوران جب یونان کی اہمیت بہت نمایاں ہو گئی۔ اس کا محل وقوع بین الاقوامی ہے۔ اس لئے یونان بڑی بڑی طاقتوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ کٹر مذہبی ہونے کی وجہ سے وہ روس کا ہمدرد تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر یونانیوں نے کئی بار کوشش کی کہ ترکی مقبوضات میں تھیسلی اور ایپائرس پر جہاں یونانیوں کی اکثریت تھی حملہ کر کے انھیں قابو میں کر لے۔ مگر قسمت ان کے ساتھ نہیں تھی۔ اس لئے ہر بار انھیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ یونانی رضاکاروں کا ایک بریگیڈ روسیوں کے دوش بدوش لڑتا تھا۔ برٹش اور فرانسیسی نے مل کر جب پائرس پر قبضہ کیا تو اپنی طاقت کے زور سے انھوں نے یونانیوں کو روس کا ساتھ دینے سے روکا۔ ان کی یہ پالیسی نہ صرف دوران جنگ میں رہی بلکہ جنگ کے بعد بھی وہ اس پر سختی سے کاربند رہے۔ اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر انھوں نے اپنی بازوئی قسم کی وزارت بنائی۔ یہ حکومت تین سال تک چلتی رہی اور برطانیہ و فرانس کی خواہشات کو پورا کرتی رہی۔ لیکن مصلحت کی بنا پر ۱۸۵۷ء میں ان دونوں طاقتوں نے یونان کو خالی کر دینے کا فیصلہ کیا۔

اس زمانے کی سیاسی چال اور طاقتوں کی ساز باز کو سامنے رکھا جائے تو یونان کو یورپ کا فٹ بال کہا جا سکتا ہے جسے اپنی مرضی کے مطابق ہر بڑی طاقت ٹھوکر لگاتی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کے دست بردار ہو جانے کے بعد یونان کی سیاسی اور معاشی بے چینی ویسی ہی قائم رہی۔ کریمیا کی جنگ کے بعد عام حالات بگڑتے گئے تھے اور شاہ آٹو کی عزت بہت گر گئی تھی۔ اندر ہی اندر جنتا کی بے چینی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ ۱۸۶۲ء میں وہاں دوسرا انقلاب آیا وقت کا تقاضا تھا کہ بادشاہ حکومت سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ اسے ایسا ہی کرنا پڑا۔

لیکن یہ تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ہی یونان ایک بار پھر بڑی طاقتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کریمیا کی جنگ میں حکومت یونان کی جو پالیسی تھی اس کی وجہ سے مغربی طاقتیں آٹو کی بری طرح مخالف تھیں سب سے اہم مسئلہ ایک نئے بادشاہ کی جستجو تھی اور ہر بڑی طاقت اس فکر میں تھی کہ نیا بادشاہ کوئی ان کا اپنا آدمی ہونا چاہئے تاکہ وہ ان کے مفاد اور مرضی کے مطابق حکومت کرے۔ اس سلسلے میں وکٹوریہ کا لڑکا ڈیوک آف ایڈنبرا کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا، یونان میں بھی لوگ عموماً یہی چاہتے تھے۔ خصوصاً اس لئے کہ یونانیوں کا خیال تھا کہ ایک بار اگر انگریزی نسل کا بادشاہ مقرر ہو جانے کے بعد یہ بات بڑی آسان ہو گی کہ برطانیہ سے آیونیا کے جزیرے واپس لے لئے جائیں۔ لیکن بڑی طاقتیں پہلے ہی آپس میں طے کر چکی تھیں کہ یونان کا شاہ کسی بڑی طاقت کے حکمراں طبقے کا کوئی فرد نہیں ہوگا۔ برطانیہ بذات خود ڈنمارک کا شہزادہ جارج کا موافق تھا اس لئے کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو برطانیہ کو آیونیا کے جزیرے چھوڑنے پڑتے۔ جو کہ اس کے قبضے میں ۱۸۱۵ء سے تھے۔ برطانیہ اپنے تدبر سے اپنی چال میں کامیاب ہو گیا۔ اور آخر میں ساری بڑی طاقتوں نے اس کی یہ بات مان لی۔ برطانیہ اور ڈنمارک کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ نیا بادشاہ ترکوں کے خلاف یونانیوں کو ہرگز نہیں بھڑکائے گا۔ اسی طرح یونانیوں میں ایک بار پھر باہر کے ایک حکمراں کو گدی پر بٹھا کر اسے دبا ڈالا گیا اور نئے شاہی خاندان کا آغاز کیا گیا۔ یونان میں یہ ایک خاندان اب تک قائم ہے اور باوجود اس کے کہ وہاں کے عوام اس کے دشمن اور مخالف ہیں۔ فوج اور طاقت کے زور سے اس کی حکومت قائم ہے۔

رفتہ رفتہ آیونیا کے جزیروں کی حکومت برطانیہ کے لئے ایک بوجھ بنتی گئی اور جب اس نے محسوس کیا کہ اب خطرہ ہے تو جون ۱۸۶۴ء میں برطانیہ اسے خالی کرنے پر مجبور ہو گیا اور چپکے سے اس نے اسے یونان کے حوالے کر دیا۔

نیا بادشاہ خاص توجہ کا مرکز بن گیا اور اس کے ارد گرد سیاسی چالوں کی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ سیاسی بدامنی اور معاشی بحران باقی رہا۔ کریٹ کا مسئلہ اہمیت کے ساتھ ایک خالص قومی مسئلہ بن گیا۔ اس جزیرے میں پے در پے کئی بار بغاوتیں ہوئیں ۱۸۶۶ء میں ایک بہت ہی خطرناک بغاوت ہوئی۔ سلطان کو عوام کے دباؤ کی وجہ سے جھکنا پڑا۔ سلطان نے یونانی رعایا کو لوکل گورنمنٹ میں بہت سے اختیارات دئے اور ان کی آبادی کے تناسب سے ان کی ذمہ داری حکومت میں بڑھا دی لیکن اس کے باوجود داخلی معاملات ویسے ہی بگڑے رہے اور یہ ایک محض عارضی سمجھوتہ تھا جزیرہ میں بدنظمی ویسی ہی قائم رہی۔ ۱۸۶۸ء میں برطانیہ نے ایک فارمولا کی تائید کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس جزیرے کو ترکوں کے حوالے کر دیا جائے، لیکن روسیوں اور فرانسیسیوں نے اس کی مخالفت کی اور کریٹ کو یونانیوں کے ساتھ شامل ہونے کی زبردست حمایت کی۔

روسی ترکی جنگ

۱۸۷۷ء میں روسی ترکی جنگ چھڑی یونان کے لئے ایک بہت ہی سنہرا موقع تھا کہ شاید وہ اپنا خواب پورا کرلے۔ یعنی تمام یونانیوں کو رہا کرانے کے بعد ان کی ایک خود مختار اور آزاد ریاست قائم کرے۔ ترکی کے خلاف جذبات زیادہ تھے اور روس کے ساتھ تعاون کی فضا ہموار تھی، یونان کا سارا قومی مفاد روس دوستی پر منحصر تھا۔ تھیسلی ایپائرس اور کریٹ میں یونانیوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اس موقع پر برطانیہ نے اندر ہی اندر بہت ساز باز کی اور اپنی مدبرانہ چالوں سے یونانیوں کو ترکوں پر حملہ کرنے سے باز رکھا اور وعدہ کیا کہ صلح کے موقع پر ان کے نظم و نسق میں اصلاح اور دوسری رعایتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

اسی درمیان میں روسی فوجوں کی پیش قدمی سے ترکوں کی زبردست سلطنت خطرے میں پڑ گئی تھی جنگی فضا اور قومی دباؤ کے پیش نظر یونانی حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ ایک نئی حکومت قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک خاص جنگی پالیسی اختیار کی جائے اور وقت کی ضرورت کے مطابق یونانی آرزوؤں کو حاصل کیا جائے۔ ۲ر فروری ۱۸۷۸ء کو یونانی حکومت نے ترکوں کے خلاف عملی قدم اٹھایا اور ترکی حکومت کے ان صوبوں میں جہاں یونانیوں کی اکثریت تھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ بدقسمتی سے یہ سب کچھ بہت دیر میں ہوا۔ روسی ترکی سمجھوتا ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود تھیسلی میں یونانیوں کی بغاوت جاری رہی اور ایک عارضی حکومت کا اعلان بھی ہو گیا۔ برطانیہ نے اس بغاوت کو ختم کرنے کی کوشش کی اور چند شرائط پر یہ بغاوت ختم ہو گئی۔ اس طرح یونانیوں نے ایک بہت بڑا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

فروری ۱۸۷۸ء میں روس نے سن اسٹیفانو کے صلح نامے پر دستخط کرتے وقت یونان کے قومی مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس کے برخلاف انھوں نے بلغاریہ کا ساتھ دیا اور اپنے زیر اثر عظیم بلغاریہ کی ریاست بنائی۔ اس ریاست میں میسی ڈونیا کا بہت بڑا علاقہ شامل تھا اس ریاست کے قیام کے بعد یونان اور سربیا دونوں کے لئے ایک نیا خطرہ ابھر آیا۔

مغربی طاقتوں نے برلن میں ایک کانگرس بلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ مشرق قریب کے بگڑے ہوئے حالات پر سوچ بچار کیا جائے۔ جون ۱۸۷۸ء کو اس کانگرس میں برلن کے نام پر ایک صلح نامہ طے پایا جس کی وجہ سے عظیم بلغاریہ کی ریاست ختم ہو گئی، لیکن اس کی سرزمین کا کوئی حصہ یونانیوں کو نہیں ملا۔ یونان کے شمالی صوبے پر

نئی روشنی
دہلی

नई रोशनी देहली

فہرست مضامین

جلد ۵ | ۲۴ر اگست سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر

آزادی کی زنجیریں	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲
رخصتی سلام	(ادارہ)	۳
شعبے کا بہترین ادب (تبصرہ)		۴
غزل	بیگم شہر آرا وفا	۵
غزل		۵
کلام واثق	احمد مجتبیٰ واثق	۵
کیسر کے دیس میں	پروفیسر محمد مجیب	۶
نئے ادب کی کہانی (۲)	بیگم شفیع احمد قدوائی مرحوم	۷
نادر سوغات		۹
اپیل		۱۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید عابد حسین

آزادی کی زنجیریں

ظفر دریا پور کے ایک بگڑے رئیس ارشاد خان کا چشم و چراغ تھا، اور الہ آباد کالج میں پڑھتا تھا، اس کی سب سے گہری دوستی تہمینہ نجیبن کے ساتھی ہردیال سے تھی، لیکن اپنے کالج کی ایک لڑکی ریحانہ سے بھی اُسے بڑی گہری دلچسپی تھی اس کے پھوپا اور پھوپھی اور ان کی لڑکی حسینہ جو ظفر کی منگیتر بھی تھی الہ آباد میں رہتے تھے اور اسے اکثر اس سے ملنے کا موقع ملتا رہتا تھا اور وہ اس کی ذہانت اور ذکاوت اور معصوم حسن پر فریفتہ تھا، اور بعض وقت ریحانہ سے لگاؤ اور حسینہ کی محبت میں کشمکش ہوا کرتی تھی۔

ظفر کی تربیت اور تعلیم قدامت پرست ماحول میں ہوئی تھی اور اس کے والد میر مظفر نے باوجود اس محبت کے جو انھیں اپنے اکلوتے بیٹے سے تھی اسے بہت سختی میں رکھا تھا جس سے اس کی شخصیت کچل کر رہ گئی تھی اور اس میں قوت ارادی کی اور جرأت کی کمی پیدا ہوگئی تھی۔

آج کل وہ وطن آیا ہوا تھا، اس کے والد سخت بیمار تھے اور وہ ان کے علاج و تیمارداری میں مصروف تھا اس کی پھوپھی اور حسینہ بھی میر صاحب کی بیماری کی خبر سن کر آگئیں۔ اور انھوں نے تیمارداری اپنے ہاتھ میں لے لی۔

قسط ۳۲

بیٹے اور بیٹی کی تیمارداری سے اور اس سے بھی زیادہ محبت کے نرم اور نازک ہاتھوں کے چھونے سے میر صاحب کو اس قدر آرام ملا کہ ان کا مرض تو نہیں مرض کا احساس دور ہوگیا۔ اور اصل زندگی کی اُمید اور آرزو اُن کے دل میں ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور اس کی جگہ ایک اور گہرے سکون کی خواہش نے لے لی تھی۔ کچھ تو آرام اور پرہیز کی وجہ سے اور کچھ حکیم حبیب احمد صاحب کی دوا سے اُن کی تپش میں کمی ہوگئی تھی اور درد اور مروڑ کی تکلیف بالکل جاتی رہی تھی۔ رہی دل کی شکایت اس کی وجہ سے اندر اندر ان کی طاقت ضرور گھٹتی جا رہی تھی لیکن باہر کے کسی قسم کے کرب یا بے چینی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی اس لئے جسمانی سکون انھیں بڑی حد تک میسر تھا اب وہ اپنے خیال اور ارادے ایمان اور عقیدے کی ساری قوت اس کوشش میں صرف کر رہے تھے کہ ذہنی اور روحانی سکون بھی حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ انسان اپنی گذشتہ زندگی سے کم و بیش مطمئن ہو۔ دوسرے آئندہ کے لئے وہ اس متحرک اور تغیر پذیر دنیا سے چاہے عملاً ترک تعلق کرے یا نہ کرے لیکن خیال اور احساس میں ضرور کرلے اور اپنی فکر اور جذبے کا مرکز کسی مجرد تصور کو بنالے جو حرکت اور تغیر سے بری ہو۔ بیتی ہوئی عمر سے انسان کا مطمئن ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ اس کے اپنے معیار قدر پر پوری اُتری ہے یا نہیں۔ میر صاحب پرانی چال کے سیدھے سادے مسلمان تھے۔ ان کا معیار قدر یہ تھا کہ انسان خدا کے اور بندوں کے حقوق جو شریعت نے مقرر کئے ہیں اپنے مقدور بھر ادا کرتا رہا ہے۔ اس کسوٹی پر وہ اپنے اعمال نامے کو جانچتے جتنی سختی سے کسے انھیں غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ صرف ایک خلش ان کے دل میں کچھ دن سے پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے ظفر کی تربیت میں بے جا سختی سے کام لیا اور اس کی شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیا۔ لیکن اس کے بارے میں ماسٹر شیو دیال صاحب نے یہ کہہ کر اُن کی تشفی کر دی تھی کہ گو آپ نے اب تک ظفر کی سیرت کی تعمیر خود اس کے ہاتھوں نہیں ہونے دی۔ لیکن بنیاد صحیح ڈال دی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ اب رہا ترک تعلق کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ میر صاحب ایک مدت سے خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور رفتہ رفتہ ان کا جی دنیا سے اور اس کی دلچسپیوں سے ہٹ گیا تھا۔ انھیں عبادت کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ اب اس میں اور زیادہ لطف آنے لگا تھا کمزوری کی وجہ سے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے مگر بیٹھے بیٹھے پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے تھے اور گاؤ تکیے سے پیٹھ لگا کر گھنٹوں قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ مگر وہ کیفیت جسے خدا سے لو لگانا اور ما سوا کو بھول جانا کہتے ہیں کبھی حاصل نہ ہوئی۔ شاید ظفر کی محبت اُن کے تجرد محض کے درجے تک پہنچنے اور کامل سکون قلب حاصل کرنے میں حائل ہوتی تھی۔ اس آخری تعلق کو وہ کسی طرح ترک نہیں کر سکتے تھے اور ظفر کو اکیلا چھوڑ کر دنیا سے جانے کا خیال اُن کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ تاہم عقیدہ ان کو سہارا دیتا تھا کہ حافظ حقیقی خدا ہے اسی نے اب تک ظفر کی حفاظت کی اور وہی آئندہ بھی کرے گا اور اس سے بھی زیادہ تقویت اس شرک آمیز خیال سے پہنچتی تھی کہ جب تک ماسٹر شیو دیال زندہ ہیں وہ ظفر کی دستگیری اور ہدایت اسی طرح کرتے رہیں گے جیسے اب تک کرتے رہے ہیں۔

میر صاحب کی گرتی ہوئی حالت کا ظفر کے سوا سب کو کم و بیش احساس تھا، ماسٹر صاحب، ہردیال اور عقیلہ بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی شمع زندگی کی لو روز بروز دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ حسینہ چونکہ ہر وقت پاس رہتی تھی اس لئے دیکھ رہی تھی کہ ظاہری سکون کے باوجود وہ برابر نڈھال ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حکیم حبیب احمد نے بھی حقیقت کو بھانپ لیا تھا اور ناچار آنا جانا کم کر دیا تھا۔ مگر ظفر کو ایک تو ناتجربہ کاری کی کم نگاہی بیماری کی کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں کرنے دیتی تھی دوسرے محبت نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ اس دھوکے میں تھا کہ میر صاحب کو رفتہ رفتہ صحت ہو رہی ہے خصوصاً حکیم صاحب کے کم آنے کو وہ اس پر محمول کرتا تھا کہ اُن کو بیماری کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے۔

ایک روز صبح تڑکے میر صاحب فجر کی نماز پڑھنے اُٹھے تو انھیں اس زور سے چکر آیا کہ گرتے گرتے بچے اس وقت عقیلہ بیگم اور حسینہ دونوں سو رہی تھیں میر صاحب نے اپنی ساری قوت ارادی صرف کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور جیسے تیسے وضو کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ بڑی مشکل سے بستر تک پہنچے اور بے دم ہو کر گر پڑے پلنگ کے دھڑکے کی آواز سے ماں بیٹیاں دونوں جاگ اُٹھیں اور گھبرا کر میر صاحب کے پلنگ کی طرف لپکیں دیکھا تو وہ بالکل بے ہوش ہیں۔ عقیلہ بیگم نے ظفر کو جو باہر احاطے میں سو رہا تھا اٹھا کر حکیم صاحب کے پاس دوڑایا۔ حکیم صاحب نے آکر نبض دیکھی تو ایک لمحے کے لئے اُن کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار جھلک اُٹھے مگر انھوں نے فوراً اپنی پریشانی پر قابو پاکر کہا "اس وقت ضعف زیادہ ہے۔ میاں ظفر آپ میرے ساتھ چلئے میں جواہر مہرہ دیتا ہوں اسے تھوڑے تھوڑے پانی سے گھس کر پلائیے اور خدا سے دعا کیجئے اس میں بڑی قدرت ہے" ظفر کو حکیم صاحب کے آخری الفاظ کھٹکے اور وہ سمجھ گیا کہ میر صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہے مگر اُسے ان کی حالت کی نزاکت کا پورا احساس نہیں ہوا۔ وہ حکیم صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر ان کے مطب کی طرف روانہ ہوگیا۔ حسینہ کا چہرہ حکیم صاحب کی بات سُن کر ہلدی کی طرح زرد ہوگیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ظفر کے جاتے ہی وہ سر تھام کر بیٹھ گئی اور چپکے چپکے سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ عقیلہ بیگم سارے جسم سے کانپ گئیں اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور حسینہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹی ضبط سے کام لو۔ ظفر تمھیں اس حالت میں دیکھے گا تو اس کا کیا حال ہوگا دیکھو بھائی کے پلنگ پر دھوپ آگئی ہے۔ رحیم بخش [illegible] سے کہو آہستہ سے پلنگ اندر کمرے میں لے چلیں اور تم بیٹھ کر پنکھا جھلو۔ میں اتنے کھرل نکال کر دھو لیتی ہوں۔ ظفر جواہر مہرہ لے کر آتا ہوگا"

دونوں ماں بیٹیاں اور دونوں نوکر مایوسی پر امید کا ملمع چڑھا کر بے نتیجہ دوڑ دھوپ اور بے کار کی خدمت کرتے رہے۔ ظفر جیسے حکیم صاحب کے ہاں سے لوٹنے کے بعد حقیقت حال کا اندازہ ہوگیا تھا عقیلہ بیگم کی ہدایت کے مطابق مریض کے سرہانے بیٹھا کلام مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس پر ایک بے خودی سی طاری تھی ظاہری حواس کام دیتے رہے تھے مگر خیال اور جذبات کی قوتیں معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ زوال کے وقت جواہر مہرے نے اتنا اثر دکھایا کہ مریض نے ایک لمحے کے لئے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولیں۔ آس پاس کے منظر پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی۔ ظفر کو بھنووں کے اشارے سے قریب بلایا۔ اپنی ساری قوت جمع کر کے داہنا ہاتھ اُٹھایا اور قرآن کے کھلے ہوئے صفحات پر رکھ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس کے بعد تابڑ توڑ دو تین ہچکیاں آئیں پتلیاں پھر گئیں۔ بے جان ہاتھ پلنگ کی پٹی پر گر پڑا اور خدا کا یہ نیک بندہ اس کی وحدانیت اور محمد کی رسالت کی شہادت دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(باقی)

ادارۂ تحریر:- نئی روشنی ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

رخصتی سلام

نئی روشنی کے پڑھنے والوں کی خدمت میں رخصتی سلام۔

سوا دو سال تک پابندی سے اور اپنے نزدیک دل سوزی اور دیانت داری سے آپ کی خدمت کرنے کے بعد "نئی روشنی" آپ سے رخصت ہوتا ہے۔

یہ اخبار ایک مستقل مقصد اور ایک عارضی مقصد کو سامنے رکھ کر جاری کیا گیا تھا۔ مستقل مقصد یہ تھا کہ عام طور پر ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن کو جو بیسویں صدی کے وسط میں بھی عہد وسطیٰ کی تاریکی میں بھٹک رہا ہے، عہد جدید کی روشنی دکھائی جائے اور انھیں رجعت پرستی اور قدامت پسندی سے نجات دلا کر ان کے اندر جمہوری روح اور علمی نظر پیدا کی جائے اور عارضی مقصد یہ تھا کہ تقسیم ہند کے المناک نتائج نے جو ہیجان و اضطراب اور خوف و ہراس ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں پیدا کر دیئے ہیں جن سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے، قوت مشاہدہ اور قوت فیصلہ ڈانواں ڈول ہو گئی ہے، اسے دور کر دیا جائے تاکہ وہ واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ سکیں، ان پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں اور جو عملی قدم اٹھائیں وہ دیکھ بھال کر سمجھ بوجھ کر اٹھائیں۔

اپنے پہلے مقصد کے حاصل کرنے میں "نئی روشنی" کو کس حد تک کامیابی ہوئی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کام اتنا بڑا ہے کہ سوا دو برس کی چھوٹی سی مدت میں ختم ہونا تو درکنار اچھی طرح شروع بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ رجعت پرستی اور قدامت پسندی ہندوستانیوں اور پاکستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں روایات کے چتر زریں کے سایے میں مذہب کی مسند پر غصب کئے بیٹھی ہے۔ اس کو یہاں سے بے دخل کرنے کے لئے مستقل اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اگر نئی روشنی نے کچھ ذی ہوش اور پرعزم دلوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا کر دیا ہو اور ہمیں یقین ہے کہ ضرور کر دیا ہوگا تو اس کی ستائیس مہینے کی زندگی کا بڑا خاصا کارنامہ سمجھا جائے گا۔

البتہ جہاں تک دوسرے یعنی عارضی مقصد کا تعلق ہے ہم اس کی کامیابی پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، اس لئے کہ پچھلے ڈھائی سال میں کئی شدید بحرانوں سے گزرنے کے بعد، جو خوش گوار تبدیلی ہندو پاکستان کے تعلقات میں اور ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی نفسی اور ذہنی حالت میں نظر آتی ہے اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ آپ کے "نئی روشنی" کا بھی ہے۔ وہ ان معدودے چند اخباروں میں تھا جنھوں نے جذبات کے تلاطم میں عقل کی کشتی کے لئے لنگر کا، تعصبات کے طوفان میں حق و انصاف کی شمع کے لئے فانوس کا کام دیا۔ اس نے مبالغے، رنگ آمیزی، خیال آرائی کے خوگر پڑھنے والوں کو روکھی پھیکی حقیقت کا، یک رخہ اور بے تحاشا تعریف یا مذمت کے پسند کرنے والوں کو معتدل اور متوازن تنقید کا، واقعات کو خواہش کی عینک سے دیکھنے والوں کو معروضی مشاہدے کا عادی بنانے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت محدود رہا، لیکن اس محدود حلقے میں لوگوں کو اس کی عادت ہو گئی یا ان کی یہ عادت اندر راسخ ہو گئی کہ واقعات کو سیدھی کھری بے لاگ نظر سے دیکھیں، حق و انصاف کی کسوٹی پر کسیں اور پھر عقل و مصلحت کی روشنی میں اپنے لئے راہ عمل متعین کریں۔ ان کی اور ان جیسے اور حضرات کی کوششوں سے صورت حال اس حد تک سدھر گئی ہے کہ ہندوستان میں تین چار کروڑ مسلمانوں کا اور پاکستان میں سوا کروڑ ہندوؤں کا رہنا بہت ممکن اور ہند و پاکستان میں جنگ کا چھڑنا بہت مشکل معلوم ہونے لگا اور وہ ہولناک تباہی جو دونوں کے سر پر آ پہنچی تھی ٹل گئی ہے۔

آج اگر آپ دونوں ملکوں کی حالت کا ایک سرسری جائزہ لیں تو یہ دیکھیں گے کہ پاکستان میں صلح پسند عناصر کو قطعی غلبہ حاصل ہے اور جنگ جو عناصر دب کر رہ گئے ہیں۔ وہاں کی حکومت اور عوام کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے کشمیر کے معاملے میں اور دوسرے معاملات میں شدید اختلاف باقی ہے۔ لیکن انھوں نے مجموعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ سارے نزاعی مسائل کو صلح و آشتی سے یا کم سے کم آئینی یا قانونی طریقے سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسی طرح ہندوستان میں صلح کے حامیوں کا بول بالا ہے اور جنگ کے حامیوں کی آواز بالکل دبی تو نہیں مگر مدھم پڑ گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا خوف و ہراس بڑی حد تک دور ہو گیا ہے۔ انھوں نے سیاسی حالات سے مطابقت پیدا کر لی ہے۔ البتہ وہ معاشی مشکلات سے پریشان اور رجعت پسندوں کے تہذیبی تعصبات سے بد دل ہیں لیکن جیسے جیسے ان کے دل سے ہجرت کر کے پاکستان جانے کا خیال جس نے انھیں بالکل نراس اور نڈھال کر دیا تھا دور ہوتا جاتا ہے۔ ان کے دل میں مشکلات سے نبٹنے کی قوت اور تعصبات کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ عمل کتنی ہی سست رفتار سے کیوں نہ ہو مگر جاری ہے۔

ہندوستان کو آئندہ چند سال میں یوں تو بہت سے مسئلوں کو حل کرنا ہے مگر سب سے بڑے دو ہیں جن میں سے ایک معاشی ہے اور ایک سیاسی اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ معاشی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک سے صنعتی ملک بننے کے عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ زراعتی ملکوں میں اور جو دقتیں بھی ہوں مگر غذا افراط سے اور سستی ہوتی ہے اس لئے لوگ نیچی سطح پر سہی مگر ایک حد تک اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ صنعتی ملکوں میں اگر غذا کی کمی بھی ہو تو اور چیزوں کی پیداوار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ مبادلے کے ذریعے سے باہر سے کافی غذا حاصل کی جا سکتی ہے اور زندگی کا ایک اونچا معیار قائم رکھا جا سکتا ہے، لیکن یہاں یہ قصہ ہے کہ غذا ضرورت سے کم ہے اور صنعتی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ قلت غذا کی تلافی [illegible] ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال نہایت خطرناک ہے اور اس کی وجہ سے اشیا اتنی کمیاب اور گراں ہیں کہ لوگوں میں خصوصاً متوسط طبقے میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی جسے دور کرنے کے لئے صنعت میں اضافے اور ترقی کی بہت شدید ضرورت ہے۔ اس پر سب کو اتفاق ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ صنعت کی ترقی سرمایہ داری نظام کے ذریعے سے ہو یا اشتراکی نظام کے ذریعے سے۔ اس مسئلے کے بارے میں کئی نقطۂ نظر ہیں ایک غیر محدود سرمایہ داری کا، دوسرا محدود سرمایہ داری کا، تیسرا تدریجی اشتراکیت کا، چوتھا انقلابی اشتراکیت کا۔

سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں غیر مذہبی ریاست ہو جس میں مختلف مذہبی فرقوں اور تہذیبی گروہوں کی حیثیت اور حقوق مساوی ہوں یا ہندو ریاست جس میں مذہب ایک نہ سہی مگر تہذیب ایک ہی ہو اور وہ خالص ہندو تہذیب ہو۔ اس مسئلے کے بارے میں بھی طرز خیال مختلف ہیں۔ ہندو تہذیب کے علمبرداروں میں بعض شدت پسند ہیں جو کھلم کھلا مذہبی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ غیر مذہبی ریاست کے حامیوں میں بعض سب فرقوں سے مساوات اور انصاف کا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض فرقہ وارانہ اختلافات کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ ان کو مٹانے کے لئے سرے سے مذہب ہی کو مٹا دینا چاہیے۔

ان دونوں مسائل میں جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں بہت گہرا تعلق ہے اور سیاست و معیشت میں گروہ بندی کی بنیاد قریب قریب ایک ہی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت ملک میں چار پارٹیاں ہیں (۱) ہندو مہاسبھا (۲) کانگریس (۳) سوشلسٹ پارٹی (۴) کمیونسٹ پارٹی۔ ہندو مہاسبھا ان لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو معیشت میں غیر محدود سرمایہ داری کے اور سیاست میں ہندو اسٹیٹ کے علمبردار ہیں۔ کانگریس بظاہر ایک ہے لیکن دراصل دو پارٹیوں کا کولیشن ہے۔ اس کا داہنا بازو محدود سرمایہ داری کا اور غیر مذہبی ریاست کے اندر ہندو تہذیب کے تسلط کا حامی ہے، بایاں بازو تدریجی اشتراکیت اور خالص غیر مذہبی جمہوری ریاست چاہتا ہے۔ سوشلسٹ پارٹی انقلابی اشتراکیت کی داعی ہے۔ لیکن انقلاب آئینی طریقوں سے لانا چاہتی ہے، فرقہ وارانہ مسئلے کے حل

کرنے کی تدبیر اس کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ امن کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ سوشلسٹ پارٹی اشتراکی انقلاب کے لئے تشدد کے طریقے استعمال کرنا جائز و ضروری سمجھتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق اس کا رویہ یہ ہے کہ طبقاتی جنگ جب زور پکڑے گی تو یہ مسئلہ ختم ہوگا تو مذہب اور ذات کے ساتھ ساتھ مذہبی اختلافات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جہاں تک ہندوستانی سماج کا تعلق ہے وہ کمیونسٹ پارٹی نے ہر جگہ ہندوستان کو مستقل اور بر اعظم کی حیثیت میں دیکھنا چاہتی ہے اقلیتی پارٹی کے نزدیک بنیادی اہمیت نہیں رکھتی۔ دوسری پارٹی نہرو حکومت کی موجودہ غیر جانبدارانہ پالیسی سے کم و بیش مطمئن ہے۔ البتہ سوشلسٹ برطانیہ کامن ویلتھ سے الگ ہونے اور ایک تیسرا ایشیائی جتھا بنانے پر زور دیتے ہیں۔

اس سرسری مضمون میں ان سیاسی پارٹیوں کے عملی پروگرام کو تفصیل سے بیان کرنے یا ان کی نظری بنیادوں پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہم تو اس وقت موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے اگلے چند سال میں واقعات کی رفتار کا اندازہ کرنا اور نئی روشنی کے پڑھنے والوں کو جو سوا دو برس کے عرصے میں ہمارے اصول اور مقاصد کو سمجھ چکے ہیں اور ان سے اتفاق رکھتے ہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

صورت حال اس وقت یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا سب رجعت پسند عناصر کو جنہیں اس کی کامیابی میں شبہ ہے اس لئے اس سے الگ ہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی ہے۔ اگر یہ تدبیر چل گئی تو اس کی قوت جو ابھی بہت کم ہے اچھی خاصی ہو جائے گی۔ سوشلسٹ پارٹی بھی ترقی پسند عناصر کا ایک متحدہ محاذ بنانے کی فکر میں ہے لیکن خود اس کے لیڈروں میں باہمی اختلافات اتنا زیادہ ہے کہ ان کے ساتھ دوسروں کا اتحاد ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی تفرقے اور انتشار کے دور سے گزر رہی ہے اور مستقبل قریب میں ملک کی سیاست پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں ڈال سکتی۔ انڈین نیشنل کانگریس میں بھی بہت سی کئی صدیوں میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں اس سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی ہیں۔ اس بڑی جماعت میں بھی اب تک یکجا ہے۔ داہنے بازو اور بائیں بازو کا اختلاف بڑھتا جاتا ہے کانگریس کی صدارت کے انتخاب میں شری ٹنڈن داہنے بازو کے، شری دیو اور آچاریہ کرپلانی بائیں بازو کے نمائندے ہیں۔ شری دیو اور آچاریہ کرپلانی کے اصولوں میں کوئی خاص فرق نہیں البتہ آچاریہ حکومت کے بڑے سخت نقاد ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اس کی پالیسی کی تشکیل میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اس سے زیادہ دخل ہو جتنا اب تک ہے۔ صدارت کے انتخاب کا جو بھی نتیجہ ہو اگلے سال پارلیمنٹ اور ریاستوں کی مجالس کے انتخابات میں داہنے بازو اور بائیں بازو کا مقابلہ بہت سخت ہوگا بلکہ ضعیف سا امکان اس کا بھی ہے کہ کانگریس میں کھلم کھلا پھوٹ پڑ جائے اور وہ دو الگ جماعتوں میں بٹ جائے۔

ہمارا مشورہ نئی روشنی کے پڑھنے والوں کو یہ ہے کہ وہ ہر حال میں کانگریس کے بائیں بازو کا ساتھ دیں اس لئے کہ وہ جواہر لال کے سچے پیروؤں کی جماعت ہے اور سب سے بڑی اور سب سے موثر ترقی پسند قوت ہے۔ وہ اس حقیقت کو جانتی ہے کہ جب تک ہندوستان کی جڑ میں فرقہ وارانہ منافرت کا زہر موجود ہے اس کی نشو و نما کسی طرح ممکن نہیں۔ اس نے اس زہر کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھا ہے اور اس کا تریاق تلاش کیا ہے۔ وہ اشتراکی انقلاب کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتی لیکن حکومت کی پالیسی کو جمہوری اشتراکیت کی طرف موڑنے میں اسی پارٹی کا زور لگ رہا ہے۔ وہ عوام سے اور سب جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ قریب ہے۔ ان کے جذبات اور خواہشات کو سب سے زیادہ سمجھتی ہے اور ان پر سب سے زیادہ اثر ڈال سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اب تک وہ آئین ساز مجالس اور حکومت کے اندر رجعت پسند عناصر کے نرغے میں گھری ہے اور بے کار سی نظر آتی تھی لیکن سارے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ انتخابات میں یا تو وہ آئین ساز مجالس اور حکومت پر حاوی ہو کر رہے گی یا پھر ایک جاندار اور پرزور مخالف پارٹی بن جائے گی۔

آخر میں ہم خاص طور سے اپنے مسلمان پڑھنے والوں سے خطاب کرتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی مسئلہ حل ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے دل میں ابھی تک ضد اور غصہ اور زبان پر شکایت اور طنز ہے لیکن عملاً انہوں نے اپنے آپ کو نئے سیاسی حالات کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ان کی موجودہ نفسی کیفیت زیادہ تر اکثریت کے غلط رویے کا رد عمل ہے اور اس رویے کے بدلنے سے دور ہو سکتی ہے۔ ان سے اندیشہ اس بات کا نہیں کہ وہ بے جا رعایتیں مانگیں یا فتنہ انگیزی نہ کریں بلکہ اس کا ہے کہ اپنے جائز حقوق سے دست بردار نہ ہو جائیں یا دوسروں کی فتنہ انگیزی کو چپ چاپ نہ سہہ لیں۔ انہیں یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں امن اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے جہاں اس کی ضرورت ہے کہ وہ ہندوستانی شہریت کے فرائض دل و جان سے ادا کریں وہاں اس کی بھی ہے کہ ہندوستانی شہریت کے حقوق حاصل کرنے پر اصرار کریں۔ لیکن ان کا اصل مسئلہ معاشی ہے معیشت کی کشمکش میں آج مسلمان کچھ تو دوسروں کے تعصب سے اور کچھ اپنی کاہلی اور آرام طلبی سے پسے جا رہے ہیں۔ اس زبردست مشکل کو حل کرنے کے لئے زبردست انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ معاشی میدان میں تعصب کو دور کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ خوش اخلاقی، خوش مزاجی، بردباری، شیریں زبانی سے دوسرے کے دل کو نرم کیا جائے اور قابلیت اور محنت اور دیانت سے اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت کیا جائے۔ یوں تو یہ سبھی کو کرنا پڑتا ہے مگر ہندوستانی مسلمانوں کو موجودہ دور میں خاص طور پر کرنا ہے۔ مصیبت اگر انسان کو پست ہمت اور بدحواس نہ کر دے تو اس کے اندر ایسے ایسے جوہر ابھر آتے ہیں جو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

یہ چند باتیں کہہ کر جو ہمارے دل سے نکلی ہیں ہم "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں سے رخصت ہوتے ہیں

خدا حافظ

سنہ ۱۹۴۸ء کا بہترین ادب

مرتبہ :- چودھری برکت علی
مرزا ادیب
قتیل شفائی

ناشر :- مکتبہ اردو، لاہور
قیمت :- چھ روپے ([illegible])
سائز و ضخامت :- رائل، ۴۴۴ صفحات

مکتبہ اردو لاہور نے پچھلے دنوں ۱۹۴۸ء کے بہترین ادب کا ایک انتخاب شائع کیا ہے جس میں ۱۹۴۸ء کے بہترین ادب کا انتخاب کیا ہے۔ مکتبہ اردو کو اس سلسلے کی اولیت کا فخر حاصل ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ اس نے عوام میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے کا مذاق بھی پیدا کر دیا ہے چنانچہ یہ سلسلہ مقبول بھی ہے اور پسند بھی کیا جاتا ہے اور اب تو مختلف اداروں سے اس قسم کے مجموعے مرتب کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء کے بہترین ادب میں اردو کے ممتاز اہل قلم حضرات نے شرکت کی ہے جن میں سجاد ظہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، جوش ملیح آبادی، خواجہ احمد عباس، منٹو، اشک، عصمت، ممتاز مفتی، کرشن چندر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض ترقی پسند بھی اور بعض اور بعض قدامت پسند بھی — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجموعے کی ترتیب میں کوئی خاص نظریہ کارفرما نظر نہیں آتا یا یہ کہ مرتبین کے نظریات میں شدید اختلاف ہے۔ اس اختلاف سے ناشر کو یہ فائدہ ضرور حاصل ہے کہ مختلف نظریات کے لوگوں کو اس مجموعے سے ذہنی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔

تنقیدی حصے میں سجاد ظہیر کا مضمون (لوک آرا گاؤں) سے متعلق، احتشام حسین کا مضمون 'اختر شیرانی کی رومانیت اور جمالیات کیا ہے؟' ممتاز حسین کا مضمون اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور یقیناً ۱۹۴۸ء کا بہترین ادبی تخلیقات ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں کرشن چندر کی کہانی "کالو بھنگی" اور عصمت کی کہانی "جڑیں" اور احمد عباس کی کہانی "سردار جی" بہت معرکے کی کہانیاں ہیں۔

نظموں کا حصہ بے حد تشنہ ہے اچھی نظمیں خال ہی خال ہیں۔ اختر الایمان، سردار جعفری اور ساحر کی نظمیں ان کی صحیح طور پر نمائندگی کر رہی ہیں۔

بحیثیت مجموعی ۱۹۴۸ء کا بہترین ادب ہر دور کے فکر کی کسی حد تک ترجمانی ضرور کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو داں طبقے میں شوق سے پڑھا جائے گا۔ اشاعتی محاسن کے اعتبار سے اس کتاب نے مکتبہ اردو کی روایات کو "ظاہری" حیثیت سے برقرار رکھا ہے۔

غزل

بیگم شہر آرا وفا

نگاہِ چارہ گر میں بے بسی معلوم ہوتی ہے
ہر اک سانس اب پیامِ آخری معلوم ہوتی ہے

کہوں کیا ہم نشیں تجھ سے یہ مایوسی کا عالم ہے
کہ خود اپنی تمنا اجنبی معلوم ہوتی ہے

نہیں اب نالۂ شب گیر میں رنگِ سحر پیدا
نگاہِ لطف میں اُن کے کمی معلوم ہوتی ہے

جو صحرا بھی نہ راس آیا تو جائیں گے کہاں ہمدم
نشیمن میں تو اب بیگانگی معلوم ہوتی ہے

نہ اب کلیوں سے ہیں واقف نہ یہ ہیں آشنا مجھ سے
چمن کی ہر روش بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے

نہ صحرا کی تلاش اب ہے نہ گلشن کی ضرورت ہے
یہ ہستی اپنی بارِ زندگی معلوم ہوتی ہے

کسی کی بزم سے میں وجہِ محرومی وفاؔ کیا کہوں
کچھ اپنے شوق کی کم ہمتی معلوم ہوتی ہے

غزل

نہیں جاتی یہ میرے دل کی نادانی نہیں جاتی
شکستوں میں بھی اُمیدوں کی ارزانی نہیں جاتی

نیازِ حسن بھی ہے رہ برِ زنداں کی منزل بھی
مگر یوسف کی سعیِ پاک دامانی نہیں جاتی

بدلتی رہتی ہیں گو سرخیاں اوراقِ عالم کی
محبت کی مگر آشوبِ عنوانی نہیں جاتی

وفورِ شوق میں شاید اک ایسا وقت آتا ہے
کہ جب اپنی تمنا آپ پہچانی نہیں جاتی

گل اپنے تبسم کا نظر میں ہے مگر پھر بھی
وفاؔ غنچوں سے رسمِ چاک دامانی نہیں جاتی

نادر موقع

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

کے لئے بھیجے جائیں گے جس قدر جلد ممکن ہوگا یہ سب افسانے اصل زبانوں میں ان کو بھیج دئے جائیں گے۔ بین الاقوامی انعام حاصل کرنے والے افسانے کو شائع کرنے کا حق ابھی تک صرف ہندوستان ٹائمز کو ہے۔ لیکن امید ہے کہ اور اخبار جو بین الاقوامی مقابلے میں حصہ لے رہے ہیں اس پر راضی ہو جائیں گے کہ ہماری تحریک میں شامل ہونے والے ہندوستانی اخباروں کو بھی یہ حق دیا جائے۔

(۲۶) ہمیں پر زور اور جیتے جاگتے افسانے چاہئیں جن کے پس منظر حقیقی ہوں کردار اصلیت کے مطابق ہوں اور مکالمے جاندار ہوں۔ وہ ہر عہد اور ہر مقام کے بارے میں ہو سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ آج کل کے لوگوں، موقعوں اور مسئلوں سے متعلق ہوں۔ محبت، نفرت، جرم، جنگ، مہم جوئی، نسل یا مذہب کی کشمکش رومان، خیال آرائی، دلچسپ طربیہ، دل دوز المیہ —— غرض کوئی موضوع بھی ممنوع نہیں ہے۔ اصل چیز قصہ ہے۔

(۲۷) ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے لکھنے والے اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور یہ ثابت کر دیں گے کہ دنیا کے ادیبوں میں ان کا درجہ اونچا ہے۔ اگر مختلف زبانوں کے لکھنے والوں سے اچھے اچھے افسانے حاصل ہو سکیں تو کوئی تعجب نہیں کہ ... ڈالر کا بین الاقوامی انعام کسی ہندوستانی کو مل جائے۔

(۲۸) اگر کسی معاملے میں شبہ یا نزاع ہوگی یا کسی شرط کی تعبیر میں اختلاف ہوگا تو شری دیوداس گاندھی مینجنگ ڈائرکٹر ہندوستان ٹائمز کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے گا۔

کلامِ وامق

احمد مجتبیٰ وامق

الھڑ سپاہی

شمع کی لوئیں اُبھر آئی ہیں ظلمت کی رگیں
بدلہ لینے پہ ہے آمادہ پتنگوں کی قطار
کتنے الھڑ یہ سپاہی ہیں کہ ڈرتے ہی نہیں
مرتے جاتے ہیں مگر ہیں کہ چلے آتے ہیں
جم کے بیدار لہو سے قدم ان کے اکھڑتے ہی نہیں
زندگی کے نئے انداز بتا جاتے ہیں
آگ کو آگ سمجھتے نہیں ہٹتے ہی نہیں
اپنی لاشوں سے بنا دیتے ہیں شعلے کا مزار
تاکہ وہ نسلیں جو کل آئیں گی محفوظ رہیں

قطعہ

دریا میں تلاطم برپا ہے کشتی کا فسانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمہیں تنکے کا سہارا کیا معنی
یہ نوحۂ کشتی بند کرو خود موجِ طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا، ساحل کی تمنا کیا معنی

غزل

ربابِ زندگی کے جتنے ٹوٹے تار ہوتے ہیں
مغنی کو جھنجھوڑ کر نغمے مرے تیار ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ غفلت توڑ کر بیدار ہوتے ہیں
سنبھل جا نشۂ دولت کہ ہم ہشیار ہوتے ہیں

زمیں لرزاں، زماں لرزاں، نگاہِ اہرمن لرزاں
کہ اب تیور ہمارے انقلاب آثار ہوتے ہیں

بھڑکنے دو ہیں شعلے زہر بر قلبِ آدم سے
کہ لب ہائے تبسم ریزہ آتش بار ہوتے ہیں

مقید ہے مری آواز لیکن کے صدا نالے
نکل کر چشمِ حسرت سے جگر کے پار ہوتے ہیں

گیت

بول رے ساتھی بول

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
کب تک یوں ہی بیٹھے رہنا بول رے ساتھی بول

جنتا جاگی بھارت جاگا جاگا سب سنسار — تیکھے گھاؤ لگانے والے کھینچے ہیں تلوار
بھور بھئی پو پھوٹن لاگی سپنے ڈانوا ڈول — راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
بول رے ساتھی بول

ہاتھی آیا ہاتھی آیا گاؤں میں اٹھا شور — ناچ کے جب آ پہنچا تو کیوا نکلا مور
اندھے ڈھول بجانے والے ڈھول کے اندر پول — راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
بول رے ساتھی بول

چلتے جانا چلتے جانا دن ہو چاہے رات — چلنے سے گھبرانا کیسا جب اپنی ہو بات
تھکنے والوں کی آنکھوں میں رستہ نکلا گول — راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
بول رے ساتھی بول

کیسر کے دیس میں

پروفیسر محمد مجیب

میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کے سامنے کشمیر کا ذکر کیجئے تو وہ کچھ نہیں بولتے۔ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ آپ اور کچھ کہیں تو وہ سمجھیں کہ مطلب کیا ہے۔ میں ایسوں سے ملا ہوں جو کشمیر گئے ہیں۔ پہاڑ نے دوستوں سے ایک نئی فضا میں ملاقاتیں کر کے اپنے شہر کی ہنگامی کا کشمیر کی ارزانی سے مقابلہ کر کے واپس چلے آئے ہیں۔ میں نے پہلگام کے راستے میں اچھے خاصے مہذب آدمی کو کہتے سنا ہے کہ سری نگر میں نزلہ کو بڑھتا ہی رہا۔ وہ جیسے پہلگام میں کچھ فائدہ ہوتا ہے یا نہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بعض لوگ کشمیر جا کر انسانی زندگی اور اس کے دھندوں کو بھول جاتے ہیں اور سبزے کے میدان میں یا چشمے کے کنارے خیمہ لگا کر قدرت کے حسن میں محو ہو جاتے ہیں۔ کیسر کا دیس سب کے لئے ایک سی چیز نہیں ہے۔ سب سے بڑا اندھیر یہ ہے کہ وہاں بھی پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کی ضرورت رہتی ہے۔ وہاں بھی نادار کو ناداری ستاتی ہے۔ وہاں بھی آدمی فکروں میں ایسا مبتلا ہوتا ہے کہ اپنی حاجت کو دیکھے اور قدرت کی فیاضی کو نہ دیکھے۔

کشمیر بھی دنیا کا ایک حصہ ہے۔ وہاں بھی وہی دن چلتا ہے جو کسی دیس میں، وہاں بھی انسان دکھی ہے اور دکھ سے نجات پانے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم کشمیر کے بارے میں یہ سمجھ کر رائے دیں کہ خوبصورت ملک میں انسانی زندگی ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئی ہے جو اور جگہ لاگو ہیں۔ کہتے ہیں ایک زمانے میں کشمیر کی وادی ایک بہت بڑی جھیل تھی اس جھیل کے پانی کو پہاڑوں سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے اور وادی انسانوں کے بسنے کے لئے خالی ہو گئی۔ شروع میں اس کی شکل وہ نہ ہوگی جو اب ہے۔ یہاں چنار اور شمشاد، اخروٹ اور بادام سیب اور ناشپاتی، آلو اور گلاس کے درخت باہر سے لا کر لگائے گئے ہیں۔ چشموں سے نہریں کاٹ کر بہت سی پہاڑیاں اور پہاڑوں کے دامن، کھیتوں اور باغوں سے سرسبز کئے گئے۔ کشمیر کو سینکڑوں برس قدردانوں کی نظریں دیکھتی رہی ہیں اور ان مقاموں کی طرف توجہ دلاتی رہی ہیں جہاں انھیں حسن کی کوئی خاص کیفیت نظر آتی۔ یہ بھی ایک تصویر کا خاکہ تھا جس میں بہت سے رنگ قدرت نے بھرے تو کچھ انسان نے بھی بھرے ہیں۔ قدرت کا کام ہزاروں برس ہوئے ختم ہو گیا۔ انسان کے کام ابھی تک جاری ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نئے مقام اور نئے منظر تلاش کئے جائیں۔ نئے راز اور نئے رازداں پیدا ہوں۔ کشمیر کے عاشقوں میں ان لوگوں کا مرتبہ سب سے اونچا ہے جو حسن کی نئی ادائیں دیکھنے کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ اور کشمیر کی باتیں اس سے کہتے ہیں جس کے دل میں انھیں اپنی جیسی تڑپ نظر آئے۔ ان لوگوں کے بڑوں کے نشان دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ بڑھتا ہے نئے مقاموں کے حسن کا چرچا ہوتا ہے۔ کشمیر کے تصور میں ایک نئے معنی کا اضافہ ہو جاتا ہے

کشمیر کے عاشقوں میں سب سے بڑا درجہ جہانگیر کا ہے۔ بہت سے لوگ مشہور باغوں کی جو اس کی یا اس کے زمانے کی یادگار ہیں سیر کر لیتے ہیں اور انھیں تسلی ہو جاتی ہے کہ انھوں نے کشمیر دیکھ لیا ہے۔ لیکن ہم کشمیر کا حق ادا کرنا چاہتے ہوں تو اسے جہانگیر کی نظروں سے دیکھنا ہوگا۔ آج کل لوگ اتوار کے دن چشمہ شاہی جاتے ہیں۔ اس لئے کہ چشمہ اسی دن چلتا ہے، اور اس کے پانی کا مزہ مشہور ہے۔ مگر چشمہ شاہی کا مقصد اصل منظر کا لطف اٹھانا تھا۔ جب ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ڈل میں نہاتی ہیں۔ جیسے نسیم باغ کے مقام کو پسند کرنے کا سبب سامنے کے پہاڑوں پر شفق کے طلسمی رنگوں کا عکس تھا۔ ہیرے کی کان میں بھی پرکھنے والی نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کشمیر کے منظروں کی قدر راستہ چلنے میں نہیں کی جا سکتی۔ وہاں شمشاد اور چنار کا ہر درخت، روشنی اور سائے کی ہر کیفیت ایک معنی رکھتی ہے۔ اور یہ معنی وہی سمجھ سکتا ہے جس کی صرف آنکھ نہ کھلی ہو بلکہ دل بھی بیدار ہو جو اپنے آپ کو منظروں کے دھیان میں گم کر سکتا ہو۔

یہ کوئی آسان بات نہیں۔ انسان میں اس کی صلاحیت ہے کہ ایک لمحے کے احساس کو ہزاروں برس کی حقیقت بنا دے۔ مگر کشمیر کے منظر ایسی صلاحیت رکھنے والوں کو بھی حیران اور عاجز کر دیتے ہیں۔ کوئی شمشاد چشمے کے پاس اکیلا کھڑا ہو یا کوئی بید دریا نہار رہا ہو۔ یا چار چھ شمشاد پانی کے کنارے سرگوشیاں کر رہے ہوں یا چناروں نے مل کر محفل بنائی ہو تو خیال کہیں اور جاتا ہے، دل کچھ اور چاہتا ہے۔ شالی کے سبز میدانوں کے بیچ بیچ میں چنار کے گنبد، شمشاد کی باڑھ گلاس کے باغ دیکھئے تو ایک الگ کیفیت پیدا ہوتی ہے پہاڑوں میں سے چشمے بل کھاتے ہوئے نکلتے ہوں، سامنے چوٹیوں پر برف ہو اور ادھر ادھر کھیت اور باغ۔ پیچھے وادی کی رنگین چادر تو جی چاہتا ہے کہ وہیں بیٹھ جائیں، ہمیشہ کے لئے گھر بنا لیں اور ایسا کچھ کریں کہ منظر زندگی کا سہارا، منظر زندگی کا سامان بن جائے۔ کشمیر پہنچ کر آدمی کی حالت ایسے مہمان کی سی ہو جاتی ہے جسے بہت سے دوست ایک ساتھ بلا رہے ہوں۔ وہ سب کو عزیز رکھتا ہو اور کسی کی دعوت کو نامنظور نہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسا مہمان انتخاب میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کشمیر کے منظروں کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ شمشاد کے پیر چومنے والے چشموں کی قلقل ایک دروازہ ہے جس کے اندر دیکھئے تو ایرانی تہذیب کی بزم آراستہ ہے۔ چنار کے نیچے بیٹھئے تو ہندوستانی تہذیب کی خنکی اور سکون یاد آتا ہے جسے سوا بے قراری کا کوئی قرار نہیں۔ وہ چشمہ جو پہاڑوں سے شور مچاتا ہوا میدان میں آتا ہے تہذیب کے ہنگاموں کی مثال ہے۔ اور اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے کہ انسان کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کس منزل کی طرف جا رہا ہے علم اور ادب اور فن کے سمندروں میں غوطے لگانے کی دعوت دیتا ہے لیکن علم اور ادب اور فن جو کچھ بتا سکتے ہیں اس سے کچھ زیادہ ہی بتاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میدان میں چلئے تو انسان کی محنت بار آور ہوتی ہوئی نظر آئے گی۔ چشمے کی شاخیں اس کا نمونہ بن جائیں گی، کہ زندگی میں کس طرح وسعت پیدا ہوتی، پھر دریا کا خاموش بہاؤ اس محویت کا پتہ دے گا جس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور آخر میں آپ وولر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔ یہ گویا زندگی کی آخری منزل ہے اس کے آگے پھر دریا ہے، پہاڑ ہیں میدان ہے۔ مگر یہ دوسری دنیا ہے جس سے ہمیں مطلب نہیں۔ چشمے کے ساتھ اوپر کی طرف چلئے تو حقیقت کے اور پردے اٹھتے ہیں۔ وادی کی گود چھوٹی ہوتی جاتی۔ چشمے کا شور بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے دھارا من چلے پن میں چٹانوں سے ٹکریں لیتا ہے۔ کہیں اچھلتا ہے، کہیں کودتا ہے۔ کہیں اس طرح خاموش ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سو گیا ہے۔ اس کی یہ کیفیتیں دیکھ کر اور بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اصلیت کا پتہ لگائیں اور جہاں بلندی ہوگی کہ زندگی کی ہلکی ہلکی گرمی سے برف کی منجمد صفائی شفاف پانی کے دھارے بن جاتی ہے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ صفائی گندگی کو گوارا کر سکے گی لیکن بہاؤ بھی ہردم بڑھتا نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ نہ ہوتا تو کشمیر کی وادی سیراب نہ ہوتی۔ وولر میں پانی نہ ہوتا وہ آبخرات نہ ہوتے جو جاڑوں میں برف بن کر پہاڑوں پر جم جاتے ہیں۔ زندگی کی ہلکی ہلکی گرمی کوئی اثر نہ دکھاتی پہاڑ ویران رہتے اور وادیوں کی گود خالی ہوتی۔

قدرت نے ملکوں کو ایک سا نہیں بنایا ہے۔ ہر جگہ ماحول اور انسانی زندگی کے مسئلے الگ ہیں۔ لیکن ہر جگہ انسان کی نظر ان مثالوں کو تلاش کر لیتی ہے جو اس کے نمونوں اور دائمی حقیقتوں کی طرف اشاروں کا کام دیتی ہیں۔ ملک کا ملک سے مقابلہ کرنا غلط ہے اور وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ خوبصورتی کو ناپ تول کر بتایا جا سکتا ہے کہ کہاں کم ہے اور کہاں زیادہ ہے۔ درحقیقت حسن کی قدر کر ہی نہیں سکتے۔ ان سے بھی زیادہ

(بقیہ صفحہ پر)

نادر موقع

مختصر افسانے لکھنے والوں کے لئے

اردو کے اہل قلم سے درخواست ہے کہ ذیل کے اعلان کو غور سے پڑھیں
ہندوستان ٹائمز کل ہند انعامی مقابلے میں ضرور حصہ لیں۔
اس کے علاوہ ان کی سہولت کے لئے "نئی روشنی" کی طرف سے
بھی اس سلسلے میں ایک مقابلہ ہو رہا ہے جس میں چار انعام حسب تفصیل
ذیل رکھے ہیں

پہلا انعام ۴۰۰ روپے تیسرا انعام ۲۰۰ روپے
دوسرا انعام ۳۰۰ روپے چوتھا انعام ۱۰ روپے

یہ چار افسانے انعامات کے مستحق سمجھے جائیں گے، ان کے انگریزی ترجمے
مقابلے اور بین الاقوامی مقابلے کے لئے ہندوستان ٹائمز کو بھیج دئے جائیں
انعام پانے والوں کو اختیار ہوگا کہ اپنے افسانوں کے انگریزی ترجمے خود
بھیجا کریں۔

"نئی روشنی" کے مقابلے کے لئے یہ شرطیں ہوں گی :-

(۱) افسانہ اردو زبان میں ہو، اس سے پہلے کہیں چھپا نہ ہو۔

(۲) اس میں چار ہزار الفاظ سے زیادہ نہ ہوں۔ اگر تین ہزار الفاظ ہوں تو
بہتر ہے

(۳) اس کی تین ٹائپ کی ہوئی یا کم سے کم صاف لکھی ہوئی نقلیں ایڈیٹر
نئی روشنی، جامعہ نگر، دہلی کے نام جلد سے جلد بھیج دی جائیں۔ پہنچنے کی
آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ہے۔ اس کے بعد جو افسانے پہنچیں گے وہ مقابلے
میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔)

۲۲ ملکوں کے خاص خاص اخبار اور رسالے مل کر اس سال کا وہ مختصر افسانہ جو دنیا بھر کے
... میں منتخب سمجھا جائے اور وہ ۵۵ بہترین افسانے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ انھیں ایک سال
اپنے اخبار یا رسالے میں شائع کرتے رہیں۔
اس سے پہلے کبھی دنیا کے ممتاز اخباروں اور رسالوں نے مل کر ایسا انتظام نہیں کیا تھا۔
اپنے پڑھنے والوں کے سامنے بہترین ادب جو ان کی متفقہ کوششوں سے حاصل ہو سکے پیش کریں
اس سے پہلے کبھی دنیا بھر کے لکھنے والوں کو اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لینے کے لئے
موقع اور ایسا محرک نہیں ملا تھا۔
یہ تحریک نیویارک ہیرلڈ ٹائمز کے یورپین ایڈیشن کی طرف سے شروع کی گئی اور پھر ۲۲
... ناشروں کے باہمی مشورے سے اس کی تکمیل ہوئی۔ ذیل میں ہم اس کی تفصیلات
بتاتے ہیں :-

(۱) ہر ملک جو اس کوشش میں شریک ہے اس کی نمائندگی کوئی اخبار یا اخباروں کا حلقہ کرتا
ہے ہندوستان کا نمائندہ ہندوستان ٹائمز ہے۔

(۲) ہر ایک ابتدائی مقابلہ اپنے ہاں کے لکھنے والوں میں کرے گا اور بین الاقوامی
... کے لئے دو سے لے کر چار تک مختصر افسانے منتخب کرے گا جو اخبار اس ملک کی نمائندگی
... انعامات دے گا اور ان افسانوں کے ورلڈ کاپی رائٹ کا مالک ہوگا۔

(۳) ۵۵ یا اس سے زیادہ افسانے جو ۲۲ ملکوں سے جمع کئے جا رہے ہیں اس تحریک میں
شریک ہونے والے سب اخباروں اور رسالوں کو بھیجے جائیں گے جو انھیں ہفتہ وار شائع
کرتے رہیں گے۔ اس طرح ہر لکھنے والے کا افسانہ دنیا بھر میں پھیل سکے گا۔ جب یہ سب
افسانے سال بھر کی مدت میں شائع ہو چکیں گے تو تحریک میں شریک ہونے والے اخباروں
کی کثرت رائے سے ایک افسانہ منتخب کر کے دنیا کا بہترین افسانہ قرار دیا جائے گا اور اس
کے لکھنے والے کو نیویارک ٹائمز کا دیا ہوا ۵۰۰۰ ڈالر (تقریباً ۲۴ ہزار روپے) کا انعام
ملے گا۔ اس خبر کی عالم گیر اشاعت کی جائے گی۔

(۴) مقابلے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں معمولی شرح معاوضہ سے
کہیں زیادہ معاوضہ دے کر معروف اور غیر معروف لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی
جائے تاکہ مختصر افسانہ نویسی کا معیار بڑھ جائے۔

(۵) توقع ہے کہ مختلف ملکوں کے بڑے بڑے فلم ساز اکثر افسانوں کے فلم بنانے پر
غور کریں گے۔ اسی طرح ریڈیو والے بھی ان سے کام لیں گے۔

(۶) اس تحریک کے شروع کرنے والے اور اس کو چلانے والے مسٹر سی پیٹرک
تھامسن ہیں جو لندن اور پیرس میں نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون سنڈیکیٹ کے منیجر اور خود بھی
ایک مشہور مصنف ہیں۔ اب تک اخباروں نے اور لکھنے والوں نے اس تحریک میں
جو دلچسپی لی ہے اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ یہ مقابلہ آئندہ بھی سال بہ سال ہوتا رہے گا۔

(۷) مقابلہ جو تحریک میں شامل ہونے والے سب ملکوں میں شروع ہو گیا ہے۔ آخر
ستمبر میں ختم ہو جائے گا۔ ان ملکوں اور ان کی نمائندگی کرنے والے اخباروں کے نام یہ ہیں:

آسٹریلیا میلبورن ہیرالڈ گروپ۔ یہ اس ملک کے اخباروں کا سب سے بڑا گروپ ہے
(اپنے ہفتہ وار قومی میگزین کے لئے)

بلجیم۔ ریک اینلا۔ سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار رسالہ جو فرانسیسی
میں شائع ہوتا ہے۔

برطانیہ اوڈھمس۔ اخباروں اور رسالوں کے سب سے بڑے ناشر۔
اپنے ہفتہ وار اخبار جان بل کے لئے جو اب خاص طور پر مختصر افسانے
شائع کرتا ہے۔

سیلون، ٹائمز آف سیلون لمیٹڈ۔ اپنے سنڈے اسٹریٹیڈ کے لئے

ڈینمارک پولیٹکن۔ سب سے کثیر الاشاعت اخبار اپنے سنڈے میگزین کے لئے

فن لینڈ ہینگن سینومیٹ اور الٹاسینومیٹ۔ سب سے بڑے روزانہ اور ہفتہ وار
اخبار۔

فرانس، فرانس سوآر گروپ۔ اخباروں اور رسالوں کے سب سے بڑے ناشر اپنے ہفتہ وار
اخبار فرانس دیمانش کے لئے۔

جرمنی، ڈی ویلٹ سب سے کثیر الاشاعت روزانہ اخبار اپنے سنڈے میگزین کے لئے

یونان، کیتھی مرینی۔ سب سے ممتاز روزانہ اخبار

ہندوستان، ہندوستان ٹائمز سب سے بڑا قومی اخبار اپنے سنڈے اڈیشن کے لئے

آئرلینڈ۔ آئرش ٹائمز گروپ۔ اپنے اخبار کے لئے۔

اسرائیل ہارتیز اپنے اخبار کے لئے۔

ہالینڈ ڈی نیوس کرانٹ۔ سب سے کثیر الاشاعت صبح کا اخبار۔

نیوزی لینڈ نیوزی لینڈ نیوز پیپر لمیٹڈ۔ اس ملک کے اخباروں کا سب سے بڑا
گروپ اپنے قومی میگزین کے لئے۔

ناروے۔ مارگن بلاڈٹ۔ سب سے ممتاز صبح کا اخبار اپنے سنڈے میگزین کے لئے۔

فلپائن۔ فلپائن ہیرلڈ۔ اس علاقے کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار۔

پرتگال۔ ڈیاریو ڈی نوٹیاز۔ سب سے ممتاز روزانہ اخبار۔

جنوبی افریقہ۔ آرگس ساؤتھ افریکن نیوز پیپرس۔ اخباروں کا سب سے بڑا
گروپ۔

سویڈن۔ آلینا آکر لنڈس۔ اخباروں اور رسالوں کا سب سے بڑا گروپ۔

سوئٹزرلینڈ۔ شوائتزر ایلوسٹریٹے۔ سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار میگزین۔

ترکی۔ ینی استنبول۔ ترکی کا سب سے ممتاز اور مقبول اخبار جو ادبی مضامین بھی
پابندی سے شائع کرتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ کالیرس نیشنل ویکلی۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ کچھ اور ملک بھی اس تحریک میں شریک ہو جائیں۔

(۸) امریکہ میں کالیرس میگزین چار بہترین افسانے اس عالمی مجموعے کے لئے منتخب کرے گا لیکن امریکی افسانے ۵۰۰۰ ڈالر کے بین الاقوامی انعام کے حق دار نہیں ہوں گے اس لئے کہ اس بین الاقوامی مقابلے کو جاپان امریکی رسالہ نے شروع کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ غیر امریکی افسانہ نگاروں کی ہمت افزائی کی جائے ... ۵ منتخب افسانوں کی اشاعت ... ہوں گے اس میں کالیرس میگزین کے علاوہ دوسرے اخبار بھی حصہ لیں گے ... اور لکھنے والوں کی امریکہ میں زیادہ سے زیادہ شہرت ہو۔

(۹) دنیا کے بہترین افسانے کا آخری انتخاب اور ۵۰۰۰ ڈالر کے انعام کی ادائگی کا ایک سال کا زمانہ اشاعت ختم ہونے کے بعد یعنی ۱۹۵۸ء کے آخر میں ہوگی۔ انتخاب ان اخباروں اور رسالوں کی شرکت والے ... جو اس انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے افسانوں کے سوا اور سب افسانوں کے بارے میں رائے دیں گے۔

(۱۰) اگر کسی افسانے کو دوسرے افسانوں کے مقابلے میں دوگنے ووٹ ملیں تو وہ تصریحی طور پر منتخب ... اول سمجھا جائے گا۔ اگر دو افسانوں کو برابر ووٹ ملیں تو ۵۰۰۰ ڈالر کی رقم ان میں بٹ جائے گی۔ اگر دو افسانوں کے ووٹ اور افسانوں سے خاصے زیادہ ہوں لیکن ان میں آپس میں صرف دو ایک ووٹوں کا فرق ہو تو ایک کو ۳۰۰۰ ڈالر اور دوسرے کو ۲۰۰۰ ڈالر ملیں گے۔ اگر بہترین افسانے کا تعین قطعی طور پر نہ ہو سکتا ہو مثلاً چار یا زیادہ افسانوں کے ووٹ قریب قریب برابر ہوں تو منتظمین تین ججوں کا ایک بورڈ مقرر کریں گے جو انعام کے لئے دو افسانوں کا انتخاب کرے گا۔

(۱۱) یونیسکو کی طرف سے ڈاکٹر لوتھر ایونز نے جو اس ادارے کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اس تحریک کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "یونیسکو ان سب بین الاقوامی تحریکوں کو جیسے یہ مختصر افسانوں کا مقابلہ ہے جتنی مدد دے سکتا ہے دے گا۔ اس لئے کہ اس کا مقصد قومی حدود کے باہر بہت بڑے پیمانے پر تخلیقی قوتوں کا ابھار ہے۔ اس قسم کا مبادلۂ خیال قوموں میں باہمی مفاہمت کو ترقی دینے کے لئے نہایت مفید ہو سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے ایک مثال قائم ہو جائے گی اور تخلیقی کاموں کے اور میدانوں میں بھی بین الاقوامی پیمانے پر باہمی تعاون سے اس قسم کی کوششیں کی جائیں گی۔

(۱۲) ہندوستان میں قومی مقابلہ ہندوستان ٹائمز کی طرف سے ہو رہا ہے اس میں ہندوستان کے سب لکھنے والے حصہ لے سکتے ہیں۔ افسانے انگریزی زبان میں یا ملک کی ان گیارہ زبانوں میں سے کسی زبان میں بھیجے جا سکتے ہیں:
ہندی، اردو، بنگالی، آسامی، اڑیا، تلنگی، تامل، ملایالم، کنڑی، مرہٹی، گجراتی

(۱۳) آٹھ منتخب افسانوں کو ہندوستان ٹائمز کی طرف سے یہ انعامات دئے جائیں گے:

انعام	رقم	انعام	رقم
پہلا انعام	۱۵۰۰ روپے	پانچواں انعام	۵۰۰ روپے
دوسرا "	۱۰۰۰ "	چھٹا "	۴۰۰ "
تیسرا "	۷۵۰ "	ساتواں "	۳۰۰ "
چوتھا "	۶۰۰ "	آٹھواں "	۳۰۰ "

(۱۴) ہندوستانی زبانوں کے حسب ذیل اخباروں نے ہندوستان ٹائمز کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا ہے کہ اپنی اپنی زبانوں میں مقابلے کا انتظام کریں۔ لکھنے والوں سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں جو اعلان ان اخباروں میں کئے جائیں ان کو ملاحظہ کریں:

تامل - کالکی مدراس۔
تلنگی - آندھرا پترکا، مدراس
ملایالم - ماترو بھومی، کالیکٹ
مرہٹی - لوکمانیہ، بمبئی۔
گجراتی - جنم بھومی، بمبئی
کنڑی - سمیکت کرناٹک - ہبلی
ھندی - ہندوستان، نئی دہلی
اردو - نئی روشنی، جامعہ نگر، دہلی

ان زبانوں میں جو افسانے لکھے جائیں۔ وہ ہندوستان ٹائمز کو نہیں بلکہ بالا اخباروں کو جو ان کے نمائندوں کے طور پر تحریک میں شریک ہیں بھیجے جائیں لیکن انگریزی میں لکھے ہوئے افسانے براہ راست ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی کو بھیجنا چاہیئے۔ اور زبانوں کے اخباروں سے بھی اس سلسلے میں بات چیت ہو رہی ہے۔

(۱۵) جو اخبار ہندوستانی زبانوں میں مقابلے کا انتظام کر رہے ہیں وہ اپنے طور پر بھی چار سے آٹھ تک انعام تقسیم کریں گے اور پہلے چار انعامی افسانوں کو ہندوستان ٹائمز کے کل ہند مقابلے کے لئے جس میں آٹھ انعام رکھے گئے ہیں بھیج دیں گے۔ اس طرح لکھنے والوں کو موقع ہے کہ نہ صرف اپنی زبان کا انعام بلکہ کل ہند انعام اور آخر میں بین الاقوامی انعام بھی حاصل کریں۔

(۱۶) ان میں سے ہر ایک اخبار شری دیوداس گاندھی منیجنگ ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز سے مشورہ کرکے تین جج جن کی ادبی حیثیت مسلم ہو مقرر کرے گا۔ یہ حضرات ... افسانوں کا انتخاب کریں گے۔

(۱۷) ہر اخبار جن چار افسانوں کو کل ہند مقابلے کے لئے ہندوستان ٹائمز کے پاس بھیجے گا اسے افسانوں کے ساتھ ان کے اچھے انگریزی ترجمے بھی بھیجنے ہوں گے، اس لئے کہ کل ہند مقابلے میں صرف انگریزی ترجموں ہی پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے مقابلوں میں انعام پانے والے افسانوں کا اعلان ہونے کے بعد افسانہ نگاروں کو اختیار ہوگا کہ وہ خود اپنے افسانے کا انگریزی ترجمہ کرکے یا کرا کے ...

(۱۸) کل ہند مقابلے میں انعامی افسانوں کا انتخاب مسلمہ ادبی حیثیت کے تین جج کریں گے جن کا انتخاب ہندوستان ٹائمز کی طرف سے ہوگا۔ ان کے ناموں کا اعلان بہت جلد کر دیا جائے گا۔

(۱۹) پہلے دو انعامی افسانوں کو ہندوستان ٹائمز بین الاقوامی مقابلے کے لئے بھیجے گا۔

(۲۰) پہلے دو انعاموں میں دونوں افسانوں کو پہلی بار ساری دنیا میں اور باقی انعامی افسانوں کو پہلی بار ہندوستان میں شائع کرنے کا کاپی رائٹ شامل ہے۔ آگے چل کر جب ان میں سے کوئی افسانہ کتابی شکل میں چھپے تو لکھنے والا آمدنی میں حصہ دار ہو اور باقی سب حقوق اسی کو حاصل ہوں گے۔ اس شرط کے ساتھ کہ جب تک سب افسانے تحریک میں حصہ لینے والے ملکوں میں شائع نہ ہو جائیں وہ اپنے کسی حق کا استعمال نہیں کرے گا۔

(۲۱) انگریزی کے افسانے ایک ایک سطر چھوڑ کر ٹائپ کئے ہوئے ہونے چاہئیں۔ ہر افسانے کی تین کاپیاں بھیجنی ضروری ہیں۔ دوسری زبانوں کے افسانے متعلقہ اخباروں کو ٹائپ کرکے بھیجے جائیں تو اچھا ہے، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوں۔ خط صاف ہو۔ الفاظ الگ الگ اور سطریں دور دور ہوں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ ہندوستانی زبانوں کے افسانے بھی اگر ٹائپ کئے ہوئے ہوں تو ان کی تین کاپیاں ہونی چاہئیں۔ اگر ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوں تو اصل کے علاوہ دو نقلیں ہونی چاہئیں۔ متعلقہ اخباروں میں اس سلسلے میں جو اعلان ہوں انھیں غور سے پڑھا جائے اور ان کی سب شرطوں کی پابندی کی جائے۔

(۲۲) افسانے آج کے بعد ہر وقت بھیجے جا سکتے ہیں۔ آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ہے لیکن مقابلے میں حصہ لینے والے اپنے افسانے جتنی جلدی بھیج دیں اتنی ہی منتظمین کو آسانی ہوگی اور ججوں کو غور سے پڑھ کر رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا۔ جن حضرات کی یہ خواہش ہو کہ ان کے افسانے انتخاب میں نہ آنے کی صورت میں ان کو واپس کر دئے جائیں انھیں اپنا پتہ ایک لفافے پر لکھ کر اور ٹکٹ لگا کر بھیجنا چاہیئے۔

(۲۳) افسانہ زیادہ سے زیادہ چار ہزار الفاظ کا ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر تین ہزار الفاظ ہوں تو بہتر ہے۔

(۲۴) ہر لکھنے والے کو افسانہ بھیجتے وقت اقرار صریح کرنا ہوگا کہ یہ اس کا طبع زاد ہے اور اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا ہے۔

(۲۵) ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کو جو اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں حق ہوگا کہ اس ملک میں جتنے افسانے انعام کے مستحق قرار پائیں، انھیں اپنے ہاں شائع کریں۔ (ان میں وہ دو افسانے بھی شامل ہیں جو بین الاقوامی مقابلے (بقیہ صفحہ ۵ پر)

درگاہ شریف اجمیر

اپیل

درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو معتقدین آستانہ اور دیگر صاحب خیر حضرات کی مالی امداد کی ضرورت ہے۔ وقف درگاہ شریف سے مندرجہ ذیل مدات پر خرچ کئے جاتے ہیں۔

آپ کی بھیجی ہوئی نذریں امداد یا چڑھاوہ انھی مدات پر یا ان میں سے اس مد پر جس پر کہ آپ چاہیں خرچ کی جائیں گی۔

۱۔ مزار اقدس پر پھول، صندل، خوشبو چڑھانا۔

۲۔ فاتحہ حضور غریب نوازؒ اور گنبد مبارک کے اندر کے دوسرے اخراجات۔

۳۔ غریبوں اور مسکینوں کو لنگر تقسیم کرنا اور ان کی طبی امداد۔

۴۔ یتیموں بیواؤں اپاہجوں اور غریب مسافروں کی امداد اور وظائف۔

۵۔ درگاہ شریف کی عمارتوں کی مرمت۔ صفائی، فرش، روشنی وغیرہ۔

۶۔ درگاہ شریف کی دیگوں کو پکوانا۔

۷۔ کتب خانہ دار المطالعہ اور تعلیم۔

۸۔ دیگر مصارف درگاہ شریف۔ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم صرف لہ پر خرچ کی جائے گی۔

زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم صرف مکہ پر خرچ کی جائے گی۔

مذکورہ کی آمدنی سے بڑھے ہوئے اخراجات کے علاوہ زائرین کی آسائش کے لئے کچھ نئی تعمیرات مثلاً پاخانہ غسل خانہ وغیرہ موجودہ عمارتوں کی مرمت، ایک نئی کتب خانہ کا قیام روشنی اور پانی کے انتظامات درگاہ شریف کی ایسی اہم ضرورتیں ہیں جن کے لئے کثیر روپیہ کی فوری ضرورت ہے اور جو معتقدین آستانہ اور صاحب خیر حضرات کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔

درگاہ شریف میں مختلف جگہوں پر نذریں اور امداد جمع کرنے کے لئے بکس لگائے گئے ہیں۔ اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ سوائے دفتر درگاہ شریف کے اجمیر میں یا اجمیر کے باہر کسی شخص کو درگاہ شریف کے نام پر نذریں یا امداد حاصل کرنے کا حق نہیں دیا گیا ہے حضرت **خواجہ غریب نوازؒ** کے آستانے سے متعلق ان امور خیر میں حصہ لینے کے لئے اور ان چیزوں کے قیام کے لئے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے امداد دینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی نذریں امداد یا چڑھاوہ صرف مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے۔ منتظمین درگاہ اس رقم کے متعلق جو کسی اور پتے پر بھیجی جائے گی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔

عبدالرؤف صدیقی ایڈمنسٹریٹر درگاہ خواجہ صاحب (پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳) اجمیر۔

Printed at Jayyed Press Delhi

Printer & Publisher Abdul Latif Azmi. B A (Jamia)